بسم اللہ الرحمن الرحیم

تبیان الفرقان
فی
تفسیر القرآن

شیخ المحدثین حکیم العصر

حضرت مولانا عبدالمجید لدھیانوی نور اللہ مرقدہ

شیخ الحدیث والتفسیر جامعہ اسلامیہ باب العلوم کہروڑ پکا

سابق امیر مرکزیہ عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت

خلیفہ مجاز

قطب الاقطاب سلطان الاولیاء

شیخ المشائخ سید نفیس الحسینی شاہ صاحب نور اللہ مرقدہ

سابق نائب امیر مرکزیہ عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت

نفیس قرآن کمپنی (رجسٹرڈ)

۵۔ لوئر مال ٥ بیسمنٹ مکہ سنٹر ٥ اردو بازار ٥ لاہور

فون: 042-37361460, 0321-320-9464017

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نام کتاب ---------- تبیان الفرقان فی تفسیر القرآن

---------- شیخ المحدثین حکیم العصر حضرت مولانا عبدالمجید لدھیانوی نور اللہ مرقدہ

باہتمام ---------- شیخ الحدیث حضرت مولانا منیر احمد صاحب دامت برکاتہم

سنِ اشاعت ---------- ۱۴۴۲ھ ۔ ۲۰۲۰ء

تعداد ---------- ۱۱۰۰

ناشر ---------- نفیس قرآن کمپنی (رجسٹرڈ) ۵۔لوئر مال ۰ بیسمنٹ مکہ سنٹر ۰ اردو بازار ۰ لاہور

جامعہ اسلامیہ باب العلوم

کہروڑ پکا ۔ ضلع لودھراں فون نمبر: 0608-342983

مکتبہ عثمانِ غنی

جامعہ دارالقرآن مسلم ٹاؤن فیصل آباد

فون نمبر: 0300-7203324

جامعہ حسینیہ باب العلوم

جڑانوالہ روڈ ۔ فیصل آباد

فون نمبر: 0321-6670225

مکتبہ رحمانیہ اردو بازار ۔ لاہور

اسلامی کتب خانہ

بالمقابل جامعہ اسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی

مکتبہ لدھیانوی

سلام کتب مارکیٹ بنوری ٹاؤن ۔ کراچی

021-34130020

021-24125590

بیت الکتب

بالمقابل اشرف المدارس گلشن اقبال، کراچی

دارالاشاعت اردو بازار ۔ کراچی

ادارہ تالیفات اشرفیہ ۔ ملتان

فہرستِ مضامین

***

سُورَةُ الانفال

رکوعاتها ۱۰ ۸ سُوْرَةُ الْاَنْفَالِ مَدَنِيَّةٌ ۸۸ آیاتها ۷۵

سورۂ انفال مدینہ میں نازل ہوئی اس میں پچھتر آیات ہیں، دس رُکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ ؕ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ ۚ فَاتَّقُوا

یہ لوگ آپ سے اَنفال کے بارے میں سوال کرتے ہیں، آپ کہہ دیجئے کہ اَنفال اللہ اور اس کے رسول کے لیے ہیں، پس تم ڈرو

اللّٰهَ وَاَصْلِحُوْا ذَاتَ بَيْنِكُمْ ۠ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗۤ اِنْ كُنْتُمْ

اللہ سے اور آپس میں تعلقات کو دُرست کرو اور اطاعت کرو اللہ اور اُس کے رسول کی اگر تم

مُّؤْمِنِيْنَ ① اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ

ایمان والے ہو① سوائے اس کے نہیں کہ ایمان والے وہی ہیں کہ جب اللہ کا ذِکر کیا جائے تو ڈر جاتے ہیں

قُلُوْبُهُمْ وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّعَلٰى رَبِّهِمْ

اُن کے دِل، اور جب اُن پر اس کی آیات پڑھی جاتی ہیں تو وہ اُن کے ایمان کو زیادہ کر دیتی ہیں، اور وہ اپنے رَبّ پر ہی

يَتَوَكَّلُوْنَ ۚ② الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ؕ③ اُولٰٓئِكَ

بھروسہ کرتے ہیں② جو نماز قائم کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے انہیں دیا ہے اُس میں سے خرچ کرتے ہیں ③ یہ

هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ؕ لَهُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَمَغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ۚ④

وہ لوگ ہیں جو سچے ایمان والے ہیں، اُن کے لیے اُن کے رَبّ کے پاس درجات ہیں اور مغفرت اور رزقِ کریم ہے④

تفسیر [1]

ماقبل سے ربط، سورت میں بیان کردہ مضامین اور وجہ تسمیہ

اس سورۃ کا نام سورۃ الانفال ہے، اور یہ سورۃ مدنی ہے، اس سے پہلی سورت میں مشرکین اور اہلِ کتاب کے ضد، اور عناد

(۱) ریکارڈنگ دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے یہاں سے چند آیات تک کا ترجمہ تفسیر "معارف القرآن" و "انوار البیان" سے ماخوذ ہے۔

اور کُفر وفساد کا تذکرہ خوب وضاحت کے ساتھ کیا گیا تھا، اور اس سورت میں زیادہ تر ذکر غزوۂ بدر کا ہے اور غزوۂ بدر کے تذکرے کے ضمن میں انہی مشرکین وکُفار کے بُرے انجام کو بیان کیا گیا ہے، اور اُن کی ناکامی ونامرادی کو واضح کرنے کے ساتھ ساتھ دوسری طرف مقابلے میں مسلمانوں کی کامیابی اور فتوحات کو ذکر کیا گیا ہے، جو مسلمانوں کے لیے احسان وانعام کا باعث ہے، اور کافروں کے لیے عذاب وانتقام کا باعث ہے، اس سورت کا نام الانفال اس سورت کی پہلی آیت یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الْاَنْفَالِ سے ہی ماخوذ ہے ''تَسْمِیَۃُ الْکُلِّ بِاسْمِ الْجُزْءِ'' کے تحت پوری سورت کا نام ہی سورۃ الانفال رکھ دیا گیا۔

مذکورہ آیات کا پس منظر

یہ آیات غزوۂ بدر میں پیش آنے والے ایک واقعے سے متعلق ہیں، آیات کی مفصل تفسیر سے پہلے وہ واقعہ سامنے رکھا جائے تو تفسیر سمجھنا آسان ہو جائے گا، واقعہ یہ ہے کہ غزوۂ بدر جو کُفر واسلام کا سب سے پہلا معرکہ تھا، اس میں جب مسلمانوں کو فتح ہوئی اور کچھ مالِ غنیمت ہاتھ آیا تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے درمیان اس کی تقسیم کے متعلق ایک ایسا واقعہ پیش آ گیا، جو اخلاص واتفاق کے اس مقام کے شایانِ شان نہ تھا، جس پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی پوری زندگی ڈھلی ہوئی تھی، اس لیے سب سے پہلی ہی آیت میں اس کا فیصلہ فرما دیا گیا، تاکہ اس مقدس گروہ کے قلوب میں صدق واخلاص اور اتفاق وایثار کے سوا کچھ نہ رہے، اس واقعہ کی تفصیل غزوۂ بدر کے شریک حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ کی زبانی مسند احمد، ترمذی، ابن ماجہ، مستدرک، حاکم وغیرہ میں اس طرح منقول ہے کہ حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے کسی نے آیت مذکورہ میں لفظ انفال کا مطلب پوچھا تو انہوں نے فرمایا، کہ یہ آیت تو ہمارے یعنی اصحابِ بدر ہی کے بارے میں نازل ہوئی ہے، جس کا واقعہ یہ تھا کہ مالِ غنیمت کی تقسیم کے بارے میں ہمارے درمیان کچھ اختلاف پیدا ہو گیا تھا، جس نے ہمارے اخلاق پر بُرا اثر ڈالا، اللہ تعالیٰ نے اس آیت کے ذریعہ اموالِ غنیمت کو ہمارے ہاتھوں سے لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد کر دیا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سب حاضرینِ بدر میں اُس کو مساوی طور پر تقسیم فرما دیا، صورت یہ پیش آئی تھی کہ ہم سب غزوہ بدر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نکلے اور دونوں فریق میں گھمسان کی جنگ کے بعد اللہ تعالیٰ نے دشمن کو شکست دی، تو اب ہمارے لشکر کے تین حصے ہو گئے، کچھ لوگوں نے دشمن کا تعاقب کیا تاکہ وہ پھر واپس نہ آ سکے، کچھ لوگ کُفار کے چھوڑے ہوئے اموالِ غنیمت جمع کرنے میں لگ گئے، اور کچھ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد اس لیے جمع رہے کہ کسی طرف سے چُھپا ہوا دشمن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر حملہ نہ کر دے، جب جنگ ختم ہو گئی، اور رات کو ہر شخص اپنے ٹھکانے پر پہنچا تو جن لوگوں نے مالِ غنیمت جمع کیا تھا، وہ کہنے لگے کہ یہ مال تو ہم نے جمع کیا ہے، اس لیے اس میں ہمارے سوا کسی کا حصہ نہیں، اور جو لوگ دشمن کے تعاقب میں گئے تھے، انہوں نے کہا کہ تم لوگ ہم سے زیادہ اس کے حقدار نہیں ہو، کیونکہ ہم نے ہی دشمن کو پسپا کیا، اور تمہارے لیے یہ موقع فراہم کیا کہ تم بے فکر ہو کر مالِ غنیمت جمع کر لو، اور جو لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کے لیے آپ کے گرد جمع رہے، انہوں نے کہا کہ ہم چاہتے تو ہم بھی مالِ غنیمت جمع کرنے میں تمہارے ساتھ شریک ہو جاتے، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت جو جہاد کا سب سے اہم کام تھا، ہم اُس میں مشغول رہے اس لیے ہم بھی اس کے مستحق ہیں، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی یہ گفتگو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچی تو اس پر یہ

آیت مذکورہ نازل ہوئی جس نے واضح کردیا کہ یہ مال اللہ کا ہے، اس کا کوئی مالک وحقدار نہیں، سوائے اُس کے جس کو رسول اللہ ﷺ عطا فرمائیں، آنحضرت ﷺ نے اللہ تبارک وتعالیٰ کی ہدایت واحکامات کے تحت اس مال کو سب شرکاء جہاد میں مساوی طور پر تقسیم فرمادیا، اور سب کے سب اللہ رسول کے اس فیصلہ پر راضی ہوگئے (ابن کثیر)، اور ان سے جوان کی شان کے خلاف صورت حال پیش آگئی، کہ آپس میں مال کے بارے میں جھگڑا شروع ہوگیا، یہ اُن کی شان کے خلاف تھا، کیونکہ صحابہ کرام ﷡ کا میدان جنگ میں آنا مال ودولت کو حاصل کرنے کے لیے نہیں تھا، بلکہ وہ تو اللہ تعالیٰ کے دین کی حفاظت اور اس کی سربلندی کے لیے نکلے تھے، جو ظاہراً توجہ مال کی طرف ہوگئی تھی، یہ اُن کی شان کے خلاف تھا تو تنبیہ ہوجانے کے بعد سب اس پر نادم ہوئے، اور ایک روایت میں اس آیت کے شانِ نزول کا ایک دوسرا واقعہ حضرت سعد بن ابی وقاص ﷛ کا بھی منقول ہے وہ فرماتے ہیں کہ غزوۂ بدر میں میرے بھائی عُمیر شہید ہوگئے، میں نے اُن کے بالمقابل مشرکین میں سے سعید بن العاص کو قتل کردیا، اور اُس کی تلوار لے کر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، میں چاہتا تھا کہ یہ تلوار مجھے مل جائے، کیونکہ اس کو میں نے ہی قتل کیا تھا اور اس کا سامان بھی میں نے ہی لوٹا تھا، مگر آنحضرت ﷺ نے حکم دیا کہ اُس کو مالِ غنیمت میں جمع کرادو، میں حکم ماننے پر مجبور تھا، مگر میرا دل اس کا سخت صدمہ محسوس کررہا تھا، کہ میرا بھائی شہید ہوا، اور میں نے اُس کے بالمقابل ایک دشمن کو مار کر اس کی تلوار حاصل کی وہ بھی مجھ سے لے لی گئی، مگر حضور ﷺ کے اس حکم کی تعمیل کے لیے مالِ غنیمت میں جمع کرانے کے لیے آگے بڑھا تو ابھی دُور نہیں گیا تھا، کہ رسول اللہ ﷺ پر سورۂ انفال کی یہ آیت نازل ہوئی، اور آپ ﷺ نے مجھے بلوا کر یہ تلوار مجھے عنایت فرمادی، بعض روایات میں یہ بھی ہے کہ حضرت سعد ﷛ نے رسول اللہ ﷺ سے عرض بھی کیا تھا، کہ یہ تلوار مجھے دے دی جائے، مگر آپ ﷺ نے فرمایا کہ نہ یہ میری چیز ہے جو کسی کو دے دوں اور نہ آپ کی ملک ہے اُس کو پورے مالِ غنیمت میں جمع کرادو اُس کا فیصلہ جو کچھ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے اُس کے مطابق ہوگا۔

تطبیق

اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں ہوسکتا ہے کہ یہ دونوں واقعات ہی پیش آئے ہوں، اور اُن دونوں ہی کے جواب میں یہ آیت نازل ہوئی ہو۔

اَنفال، غنیمت اور فَیٔ کی وضاحت

یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ اس آیت میں لفظ انفال جو آیا ہے یہ نفل کی جمع ہے، جس کے معنی ہیں فضل وانعام، نفلی نماز، روزہ، صدقہ کو بھی نفل اس لیے کہا جاتا ہے، کہ وہ کسی کے ذمہ لازم وواجب نہیں ہوتے، کرنے والے اپنی خوشی سے کرتے ہیں، اصطلاحِ قرآن وسنت میں لفظ نفل اور انفال مالِ غنیمت کے لیے بھی بولا جاتا ہے، جو کفار سے بوقت جہاد حاصل ہوتا ہے، مگر قرآنِ کریم میں اس معنی کے لیے تین لفظ استعمال ہوئے، اَنفال، غنیمت، فَیٔ، لفظِ "اَنفال" تو اسی آیت میں مذکور ہے، اور لفظِ "غنیمت" اور اُس کی تفصیل اسی سورت کی اکتالیسویں آیت میں آنے والی ہے جہاں آتا ہے وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ

خُمُسَهٗ، تو اس آیت میں جو غَنِمۡتُم ہے لفظِ ''غنیمت'' اسی غَنِمۡتُم سے لیا گیا ہے، اور لفظِ ''فَیْ'' اور اُس کے متعلق تفصیل سورۂ حشر میں بیان ہوئی ہے وَمَآ اَفَآءَ اللّٰهُ، اور ان تینوں کے معانی تھوڑے تھوڑے فرق کے ساتھ مختلف ہیں، فرق معمولی اور قلیل ہونے کی وجہ سے، بعض اوقات ایک لفظ دوسرے کی جگہ مطلقاً مالِ غنیمت کے لیے بھی استعمال کرلیا جاتا ہے، غنیمت عموماً اُس مال کو کہتے ہیں، جو جنگ و جہاد کے ذریعے مخالف فریق سے حاصل ہو، اور فیٔ اُس مال کو کہتے ہیں جو بغیر جنگ وقتال کے کُفار سے ملے کُفار ویسے ہی چھوڑ کر بھاگ جائیں، یا رضامندی سے دے دینا قبول کریں، اور ''نفل'' اور ''اَنفال'' کا لفظ اکثر اُس انعام کے لیے بولا جاتا ہے، جو اَمیرِ جہاد کسی خاص مجاہد کو اُس کی کارگزاری کے صلے میں غنیمت کے حصہ کے علاوہ بطور انعام عطا کرے، اور کبھی مطلقاً مالِ غنیمت کو بھی ''نفل'' اور ''انفال'' کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے، اُس آیت میں اکثر مفسرین نے یہی عام معنی مراد لیے ہیں، صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے یہی عام معنی نقل کئے گئے ہیں، اور حقیقت یہ ہے کہ یہ لفظ عام اور خاص دونوں معنی کے لیے بولا جاتا ہے اس لیے کوئی اختلاف نہیں۔

اُممِ سابقہ میں اَموالِ غنیمت کا حکم

پچھلی اُمتوں میں مالِ غنیمت کے لیے قانون یہ تھا، کہ وہ کسی کے لیے حلال نہیں تھے، تمام اموالِ غنیمت کو ایک جگہ جمع کر دیا جاتا تھا، اور آسمان سے قدرتی طور پر ایک آگ (بجلی) آتی تھی، اور اُس کو جلا کر راکھ کر دیتی تھی، اور یہ اس جہاد کے اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقبول ہونے کی علامت ہوتی تھی، اور اگر کوئی مالِ غنیمت جمع کیا گیا اور آسمانی بجلی نے آکر اُس کو نہ جلایا تو یہ اس بات کی علامت ہوتی کہ یہ جہاد اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقبول نہیں ہے، اس لیے اس مالِ غنیمت کو بھی مردود اور منحوس سمجھا جاتا تھا اور اُسے کوئی استعمال نہ کرتا تھا۔

اَموالِ غنیمت کے متعلق اُمتِ محمدیہ کی خصوصیت

اُمتِ محمدیہ پر اللہ تبارک وتعالیٰ نے جو خصوصی فضل فرمائے ہیں، اور اُمتِ محمدیہ کو جو خصوصیت عطا فرمائی ہیں، اُن میں سے اللہ تعالیٰ کا ایک خصوصی انعام اور فضل یہ بھی ہے، کہ جہاد وقتال کے ذریعے کافروں سے جو مال حاصل ہوتے ہیں، اُن کو مسلمانوں کے لیے حلال کردیا گیا ہے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بروایت حضرت جابر رضی اللہ عنہ بخاری و مسلم میں منقول ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے پانچ چیزیں ایسی عطا ہوئی ہیں، جو مجھ سے پہلے کسی پیغمبر اور اُن کی اُمت کو نہیں ملیں، انہیں پانچ میں سے ایک یہ ہے کہ: ''اُحِلَّتْ لِیَ الْمَغَانِمُ وَلَمْ تُحَلَّ لِاَحَدٍ قَبْلِیْ'' یعنی میرے لیے اموالِ غنیمت حلال کردیئے گئے، حالانکہ مجھ سے پہلے کسی کے لیے حلال نہ تھے۔

آیات میں بظاہر تعارض اور ان کے درمیان تطبیق

آیتِ مذکورہ میں اَنفال کا حکم یہ بتلایا گیا ہے، کہ وہ اللہ کے ہیں اور رسول کے ہیں، معنی اُس کے یہ ہیں کہ اصل ملکیت تو

اللہ تعالیٰ کی ہے، اور متصرف اُن میں اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں، جو حکم خداوندی کے مطابق اپنی صوابدید پر ان کو تقسیم کرتے ہیں، یہ آیت جو آپ کے سامنے پڑھی گئی، اس میں اور اس سورت کی اکتالیسویں آیت جو آگے آرہی ہے، اُن میں بظاہر تھوڑا سا تعارض معلوم ہوتا ہے، کہ اس آیت میں تو یہ ہے کہ وہ مال اللہ اور اس کے رسول کا ہے، اللہ کا رسول جہاں چاہے اُس کو خرچ کرے، اُس میں کسی دوسرے کی کوئی ملکیت نہیں ہے، اور جبکہ دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ نے مال غنیمت کی تقسیم کا اصول بیان کرتے ہوئے، اُس کے پانچویں حصہ میں رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کا بھی ساتھ شامل کیا ہے، تو ان دونوں آیتوں میں بظاہر تعارض ہے، اور یہ آیات ایک دوسرے کے خلاف معلوم ہوتی ہیں، اسی لیے ائمہ تفسیر کی ایک جماعت نے جن میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ، مجاہد، عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ داخل ہیں، وہ یہ فرماتے ہیں کہ یہ حکم ابتدائے اسلام میں تھا، جب تک تقسیم غنائم کا وہ قانون نازل نہ ہوا تھا، جو اسی سورت کے پانچویں رکوع میں آرہا ہے، کیونکہ اس میں پورے مال غنیمت کو رسول اللہ ﷺ کی صواب دید پر چھوڑ دیا ہے، کہ جس طرح چاہیں تصرف فرمائیں، اور آگے جو تفصیلی احکام آئے ہیں، اُن میں یہ ہے کہ کل مال غنیمت کا پانچواں حصہ بیت المال میں عام مسلمانوں کی ضروریات کے لیے محفوظ کر دیا جائے، اور چار حصے شرکاء جہاد میں ایک خاص قانون کے تحت تقسیم کر دیئے جائیں، جن کی تفصیل احادیث صحیحہ میں مذکور ہے، اس تفصیلی بیان نے سورۂ انفال کی پہلی آیت کو منسوخ کر دیا، اور بعض حضرات نے فرمایا کہ یہاں کوئی ناسخ منسوخ نہیں، بلکہ اجمال و تفصیل کا فرق ہے سورۂ انفال کی پہلی آیت میں اجمال ہے، اور اکتالیسویں آیت میں اسی کی تفصیل ہے البتہ مال فئ جس کے احکام سورۂ حشر میں بیان ہوئے ہیں، وہ پورے کا پورا رسول کریم ﷺ کے زیر تصرف ہے، آپ اپنی صواب دید سے جس طرح چاہیں عمل فرمائیں، اس لیے اُس جگہ (سورۂ حشر میں) اَحکام بیان فرمانے کے بعد یہ ارشاد فرمایا ہے: وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا، یعنی جو کچھ تم کو ہمارا رسول دے دے اس کو لے لو اور جس کو روک دے اس سے باز رہو، اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ مال غنیمت وہ ہے جو جنگ و جہاد کے ذریعے ہاتھ آئے، اور مال فئ وہ ہے جو بغیر قتال و جہاد کے ہاتھ آجائے، اور لفظِ انفال دونوں کے لیے عام بھی بولا جاتا ہے، اور خاص اس انعام کو بھی کہتے ہیں جو کسی غازی کو امیرِ جہاد عطا کرے۔

غازیوں کو اِنعام دینے کی چار صورتیں

اس سلسلے میں غازیوں کو انعام دینے کی چار صورتیں آنحضرت ﷺ کے عہد سے رائج ہیں، ایک یہ ہے کہ امیرِ جہاد یہ اعلان فرما دیں کہ جو شخص کسی مخالف کو قتل کرے تو جو سامان مقتول سپاہی سے حاصل ہو، وہ اسی کا ہے جس نے قتل کیا، یہ سامان مال غنیمت میں جمع ہی نہ کیا جائے گا، دوسرے یہ کہ بڑے لشکر میں سے کوئی جماعت الگ کر کے کسی خاص جانب جہاد کے لیے بھیجی جائے، اور یہ حکم دے دیا جائے کہ اس جانب سے جو مال غنیمت حاصل ہو، وہ اسی خاص جماعت کا ہوگا، جو وہاں گئی ہے صرف اتنا کرنا ہوگا، کہ اُس مال میں سے پانچواں حصہ عام مسلمانوں کی ضروریات کے لیے بیت المال میں جمع کیا جائے گا، تیسرے یہ کہ پانچواں حصہ جو بیت المال میں جمع کیا جاتا ہے، اُس میں سے کسی خاص غازی کو اس کی ممتاز کارگزاری کے صلہ میں امیر کی

صواب دید کے مطابق دیا جائے، چوتھے یہ کہ پورے مالِ غنیمت میں سے کچھ حصہ الگ کر کے خدمت پیشہ لوگوں کو بطورِ انعام دیا جائے، جو مجاہدین کے گھوڑوں اور وغیرہ کی نگہداشت کرتے ہیں اور اُن کے کاموں میں مدد کرتے ہیں۔

باہمی تعلقات کی خوشگواری کی تدبیر اور تقویٰ اور خوفِ خدا کا حکم

اس آیت کے آخری جملہ میں ارشاد فرمایا فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَصْلِحُوْا ذَاتَ بَيْنِكُمْ ۠ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗۤ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ جس میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو خطاب کر کے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرو، اور آپس کے تعلقات کو درست رکھو، اس میں اشارہ اس واقعے کی طرف ہے جو غزوۂ بدر میں اَموالِ غنیمت کی تقسیم کی بابت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے درمیان میں پیش آ گیا تھا، جس میں باہمی کشیدگی اور ناراضگی کا خطرہ تھا، اللہ تعالیٰ نے مالِ غنیمت کی تقسیم کا فیصلہ خود اس آیت کے ذریعہ فرما دیا، اب اُن کے دلوں کی اصلاح اور باہمی تعلقات کی خوشگوازی کی تدبیر بتلائی گئی ہے، جس کا مرکزی نقطہ تقویٰ اور خوفِ خدا ہے تجربہ شاہد ہے کہ جب تقویٰ اور خوفِ خدا غالب ہوتا ہے، تو بڑے بڑے جھگڑے منٹوں میں ختم ہو جاتے ہیں، باہمی منافرت کے پہاڑ گرد بن کر اُڑ جاتے ہیں، اہلِ تقویٰ کا حال بقول مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ یہ ہوتا ہے ؎

خود چہ جنگ وجدل نیک وبد کیں الم از صلحہا ہم میرمد

یعنی ان لوگوں کو کسی جنگ وجدل اور جھگڑے سے تو کیا دلچسپی ہوتی، اُن کو تو خلائق کی صلح اور درستی کے لیے بھی فرصت نہیں ملتی، کیونکہ جس کا قلب اللہ تعالیٰ کی محبت وخوف اور یاد میں مشغول ہو، اُس کو دوسروں سے تعلقات بڑھانے کی کہاں فرصت۔

بسودائے جاناں ز جاں مشتغل بذکر حبیب از جہاں مشتغل

اس لیے اس آیت میں تقویٰ کی تدبیر بتلا کر فرمایا وَاَصْلِحُوْا ذَاتَ بَيْنِكُمْ یعنی تقویٰ کے ذریعے آپس کے تعلقات کی اصلاح کرو، اس کی مزید تشریح اس طرح فرمائی وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗۤ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ یعنی اللہ اور رسول کی مکمل اطاعت ہو، اگر تم مؤمن ہو، یعنی ایمان کا تقاضا ہے اطاعت اور اطاعت نتیجہ ہے تقویٰ کا، یعنی ایمان کا سب سے بڑا تقاضا یہ ہے، کہ جس پر تم ایمان لائے ہو پھر تم اُس کی اطاعت اور فرمانبرداری بھی کرو، اور اطاعت وفرمانبرداری انسان تب ہی کرے گا، جب اُس کے اندر خوف وخشیت بھی ہوگی اور اسی کو تقویٰ کہتے ہیں، تو تقویٰ کے نتیجے میں اطاعت نصیب ہوتی ہے، اور جب اطاعت آ جائے تو پھر انسان گویا کہ اپنے دعویٰ ایمان کے اندر سچا ہے، تو انسان کے لیے جو ایمان کا دعویٰ کرتا ہے اطاعت بھی ضروری ہے، اور تقویٰ بھی ضروری ہے، اور جب یہ چیزیں لوگوں کو حاصل ہو جائیں تو اُن کے آپس کے جھگڑے خود بخود ختم ہو جائیں گے، اور دشمنی کی جگہ دلوں میں اُلفت ومحبت پیدا ہو جائے گی، کیونکہ پھر ہر شخص کا ذہن یہ ہوگا کہ ہم نے وہی کرنا ہے جو اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول کا حکم ہے، ہم نے اُن کے حکم کی خلاف ورزی نہیں کرنی، جب ہر ایک کی یہی سوچ ہوگی تو اُس کا لازمی نتیجہ یہی ہے کہ پھر انتشار وفساد خود بخود ختم ہو جائے گا۔

مؤمن کی مخصوص صفات اور اس کے حصول کی ترغیب

اگلی آیات میں ان مخصوص صفات کا بیان ہے، جن کا ہر مؤمن میں ضروری ہے، اس میں اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ ہر مؤمن اپنی ظاہری اور باطنی کیفیات اور صفات کا جائزہ لیتا رہے، اگر یہ صفات اس میں موجود ہیں تو اللہ تعالیٰ کا شکر کرے، کہ اُس نے اُس کو مؤمنین کی صفات عطا فرما دی ہیں، اور اگر ان میں سے کوئی صفت موجود نہیں یا ہے تو سہی مگر ضعیف و کمزور ہے تو اُس کے حاصل کرنے یا اُس کو قوی کرنے کی فکر میں لگ جائے۔

مؤمن کی پہلی صفت

پہلی صفت یہ بیان فرمائی اَلَّذِیْنَ اِذَا ذُکِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ یعنی جب ان کے سامنے اللہ کا ذکر کیا جائے تو ان کے دل سہم جاتے ہیں، مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عظمت و محبت ان کے دلوں میں رچی، اور بھری ہوئی ہے، جس کا ایک تقاضا ہیبت و خوف ہے، قرآن کریم کی ایک دوسری آیت میں اس کا ذکر کر کے اہل محبت کو بشارت دی گئی ہے وَبَشِّرِ الْمُخْبِتِیْنَ ۞ الَّذِیْنَ اِذَا ذُکِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ (سورۂ حج: ۳۵) یعنی خوشخبری دے دیجئے ان متواضع نرم خو لوگوں کو جن کے دل ڈر جاتے ہیں، جب اُن کے سامنے اللہ کا ذکر کیا جائے، ان دونوں آیتوں میں اللہ تعالیٰ کے ذکر اور یاد کے ایک خاص تقاضا کا ذکر ہے، یعنی ہیبت اور خوف اور دوسری آیت میں ذکر اللہ کی یہ خاصیت بھی بیان فرمائی گئی ہے، کہ اس سے دل مطمئن ہو جاتے ہیں اَلَا بِذِکْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ (سورۂ رعد: ۲۸) یعنی اللہ ہی کی یاد سے دل مطمئن ہوتے ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ اس آیت میں جس میں خوف و ہیبت کا ذکر ہے وہ دل کے سکون و اطمینان کے خلاف نہیں، جیسے کسی درندے یا دشمن کا خوف قلب کے سکون کو برباد کر دیتا ہے، ذکر اللہ کے ساتھ دل میں پیدا ہونے والا خوف اس سے بالکل مختلف ہے، اور اس لیے یہاں لفظ خوف استعمال نہیں فرمایا وجل کے لفظ سے تعبیر کیا ہے، جس کا ترجمہ مطلق خوف نہیں، بلکہ وہ ہیبت ہے جو بڑوں کی جلالت شان کے سبب دل میں پیدا ہوتی ہے، بعض مفسرین نے فرمایا کہ اس جگہ اللہ کے ذکر اور یاد سے مراد یہ ہے کہ کوئی شخص کسی گناہ کے ارتکاب کا ارادہ کر رہا تھا، اسی حال میں اس کو خدا تعالیٰ کی یاد آ گئی، تو وہ اللہ کے عذاب سے ڈر گیا اور گناہ سے باز آ گیا، اس صورت میں خوف سے مراد خوف عذاب ہی ہوگا۔

مؤمن کی دُوسری صفت

مؤمن کی دوسری صفت یہ بتلائی کہ جب اس کے سامنے اللہ کی آیات تلاوت کی جاتی ہیں، تو اس کا ایمان بڑھ جاتا ہے، ایمان بڑھنے کے ایسے معنی جن پر سب علماء مفسرین و محدثین کا اتفاق ہے، یہ ہیں کہ ایمان کی قوت و کیفیت اور نور ایمان میں ترقی ہو جاتی ہے، اور یہ تجربہ اور مشاہدہ ہے کہ اعمالِ صالحہ سے ایمان میں قوت اور ایسا شرحِ صدر پیدا ہو جاتا ہے، کہ اعمالِ صالحہ اس کی عادت طبعی بن جاتے ہیں، جس کے چھوڑنے سے اُس کو تکلیف ہوتی ہے، اور گناہ سے اس کو طبعی نفرت پیدا ہو جاتی ہے، کہ اُن کے پاس نہیں جاتا، ایمان کے اسی مقام کو حدیث میں حلاوتِ ایمان کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے جس کو کسی نے اس طرح نظم کیا ہے:

واذا حلت الحلاوة قلبا نشطت فی العبادة الاعضاء

یعنی جب کسی دل میں حلاوتِ ایمان جگہ پکڑ لیتی ہے، تو اُس کے ہاتھ پیر اور سب اعضاء عبادت میں راحت ولذت محسوس کرنے لگتے ہیں، اس لیے خلاصہ آیت کے مضمون کا یہ ہوا کہ مؤمن کامل کی یہ صفت ہونی چاہیے، کہ جب اُس کے سامنے اللہ تعالیٰ کی آیات پڑھی جائیں، تو اُس کے ایمان میں جلاء وترقی ہو، اور اعمالِ صالحہ کی طرف رغبت بڑھے، اس سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ جس طرح عام مسلمان قرآن پڑھتے ہیں، اور سنتے ہیں کہ نہ قرآن کے ادب واحترام کا کوئی اہتمام ہے، اور نہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی عظمت پر نظر ہے، ایسی تلاوت مقصود اور اعلیٰ نتائج پیدا کرنے والی نہیں، گو ثواب سے وہ بھی خالی نہ ہو۔

مؤمن کی تیسری صفت

تیسری صفت مؤمن کی یہ بیان فرمائی، کہ وہ اللہ پر توکل کرے، توکل کے معنی اعتماد اور بھروسہ کے ہیں، مطلب یہ ہے کہ اپنے تمام اعمال واحوال میں اُس کا مکمل اعتماد اور بھروسہ صرف ذاتِ واحد حق تعالیٰ پر ہو، صحیح حدیث میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ اُس کے یہ معنی نہیں کہ اپنی ضروریات کے لیے مادّی اسباب اور تدابیر کو ترک کرکے بیٹھ جائے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ مادّی اسباب وآلات کو اصل کامیابی کے لیے کافی نہ سمجھے، بلکہ بقدر قدرت وہمت مادی اسباب اور تدابیر کو فراہم کرنے اور استعمال کرنے کے بعد معاملے کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کرے، اور سمجھے کہ اسباب بھی اسی کے پیدا کیے ہوئے ہیں، اور اُن اسباب کے ثمرات بھی وہی پیدا کرتے ہیں، ہوگا وہی جو وہ چاہیں گے، ایک حدیث میں فرمایا: ''اَجْمِلُوْا فِی الطَّلَبِ وَلَا یَحْمِلَنَّکُمْ اسْتِبْطَاءُ الرِّزْقِ'' یعنی رزق اور اپنی حاجات کے حاصل کرنے کے لیے متوسط درجے کی طلب اور مادّی اسباب کے ذریعے کوشش کرلو، اپنے دل ودماغ کو صرف مادّی تدبیروں اور اسباب ہی میں نہ اُلجھائے رکھو۔

مؤمن کی چوتھی صفت

چوتھی صفت مؤمن کی اِقامتِ صلوٰۃ بتلائی، اس میں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے، کہ یہاں نماز پڑھنے کا نہیں، بلکہ نماز کی اقامت کا ذکر ہے، ''اقامت'' کے لفظی معنی کسی چیز کو سیدھا کھڑا کرنے کے ہیں، مراد اقامتِ صلوٰۃ سے یہ ہے کہ نماز کے پورے آداب وشرائط اس طرح بجالائے، جس طرح رسول کریم ﷺ نے قول وعمل سے بتلائے ہیں، آداب وشرائط میں کوتاہی ہوئی تو اُس کو نماز پڑھنا تو کہہ سکتے ہیں مگر اقامت صلوٰۃ نہیں کہہ سکتے، قرآن مجید میں نماز کے جو فوائد، آثار اور برکات ذکر کی گئی ہیں اور فرمایا گیا ہے اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ (سورۂ عنکبوت:۴۵) یعنی نماز روکتی ہے بے حیائی اور ہر گناہ سے، یہ بھی اقامتِ صلوٰۃ ہی پر موقوف ہے، جب نماز کے آداب میں کوتاہی ہوئی تو گو فتویٰ کی رو سے اُس کی نماز کو جائز ہی کہا جائے مگر نماز میں کوتاہی کرنے کے برکات میں ضرور کمی واقع ہوگی، اور بعض صورتوں میں ان برکات سے کلی طور پر محرومی ہوجائے گی تو اقامتِ صلوٰۃ کا معنی ہے اس کو پورے آداب وشرائط کی رعایت رکھتے ہوئے ادا کرنا اس میں وقت کی پابندی، جماعت کا اہتمام، طہارت کا خیال، رکوع وسجود کی صحیح ادائیگی وغیرہ سب چیزیں شامل ہیں۔

مؤمن کی پانچویں صفت

پانچویں صفت مردِ مؤمن کی یہ بیان فرمائی کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے اس کو رزق دیا ہے، وہ اُس میں سے اللہ کی راہ خرچ کرتے ہیں، یہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنا عام ہے اس میں تمام صدقات وخیرات اور عطیات شامل ہیں، صدقات واجبہ جیسے زکوٰۃ، صدقۃ الفطر اور قربانی وغیرہ بھی اس میں داخل ہیں، اور نفلی صدقات جو انسان کسی کو دیتا ہے یا مہمانوں، دوستوں اور رشتہ داروں پر جو خرچ کرتا ہے، یہ سب صورتیں اس میں شامل ہیں اور مطلب یہ ہے کہ مؤمن وہ ہے جو صدقات واجبہ میں بھی کوتاہی نہیں کرتا، اور صدقاتِ واجبہ کے ساتھ ساتھ صدقاتِ غیر واجبہ کا بھی اہتمام کرتا ہے۔

مذکورہ صفات کا حامل مؤمن کی شانِ عظیم

مردِ مؤمن کی یہ پانچ صفات بیان کرنے کے بعد ارشاد فرمایا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا یعنی ایسے ہی لوگ سچے مؤمن ہیں، جن کا ظاہر و باطن یکساں اور زبان اور دل متفق ہیں، ورنہ جن میں یہ صفات نہیں وہ زبان سے تو "اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ" کہتے ہیں مگر اُن کے دلوں میں نہ توحید کا رنگ اور نہ اطاعت رسول کا جذبہ، اُن کے اعمال اُن کے اقوال کی تردید کرتے ہیں، اس آیت میں اس طرح بھی اشارہ ہے، کہ ہر حق کی ایک حقیقت ہوتی ہے جب تک وہ حاصل نہ ہو حق حاصل نہیں ہوتا، ایک شخص نے حضرت حسن بصری رحمہ اللہ سے پوچھا کہ اے ابوسعید! کیا آپ مؤمن ہیں؟ تو آپ نے فرمایا کہ بھائی ایمان دو قسم کے ہیں، تمہارے سوال کا مطلب اگر یہ ہے، کہ میں اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتوں، کتابوں اور رسولوں پر اور جنت، دوزخ اور قیامت اور حساب کتاب پر ایمان رکھتا ہوں، تو جواب یہ ہے کہ بے شک میں مؤمن ہوں، اور اگر تمہارے سوال کا مطلب یہ ہے کہ میں وہ مؤمن کامل ہوں جس کا سورۂ انفال کی آیات میں ہے تو مجھے کچھ معلوم نہیں، کہ میں ان داخل ہوں یا نہیں، سورۂ انفال کی آیات سے یہی آیات مراد ہیں، جو ابھی آپ کے سامنے پڑھی گئی ہے۔

سچے مؤمنین کے لئے تین چیزوں کا وعدہ

آیاتِ مذکورہ میں سچے مؤمن کی صفات وعلامات بیان فرمانے کے بعد ارشاد فرمایا: "لَهُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَمَغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ" اس میں سچے مؤمنین کے لیے تین چیزوں کا وعدہ فرمایا، ایک درجات عالیہ، دوسرا مغفرت، تیسرا عمدہ رزق، تفسیر "بحرِ محیط" میں ہے کہ اس سے پہلی آیات میں سچے مؤمنین کی جو صفات بیان ہوئیں وہ تین قسم کی ہیں، ایک وہ جن کا تعلق قلب اور باطن کے ساتھ ہے، جیسے ایمان، خوفِ خدا، توکل علی اللہ، دوسری وہ جن کا تعلق جسمانی اعمال سے ہے، جیسے نماز وغیرہ، تیسری وہ جن کا تعلق انسان کے مال سے ہے جیسے اللہ کی راہ میں خرچ کرنا، ان تینوں قسموں کے بالمقابل تین انعاموں کا ذکر آیا ہے، درجاتِ عالیہ کا ذکر قلبی اور باطنی صفات کے مقابلہ میں ہے، مغفرت کا ذکر ان اعمال کے مقابلہ میں ہے جو انسان کے ظاہر بدن سے

متعلق ہیں، جیسے نماز، روزہ وغیرہ جیسا کہ حدیث میں آیا ہے، کہ نماز گناہوں کا کفارہ ہو جاتی ہے، اور رزق کریم کا ذکر اللہ کے راستے میں خرچ کرنے کے بالمقابل آیا ہے، کہ جو کچھ خرچ کیا اُس سے بہت بہتر اور بہت زیادہ اُس کو آخرت میں ملے گا۔

درجاتِ جنّت کی وسعت

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جنّت میں سو درجے ہیں، اور ان درجات کے درمیان آپس میں اتنا فاصلہ ہے، جتنا آسمان وزمین کے درمیان ہے، اُن میں فردوس سب سے اعلیٰ درجہ ہے، اسی سے جنّت کی چاروں نہریں جاری ہیں اور اس کے اوپر اللہ تعالیٰ کا عرش ہے، سو جب تم اللہ سے سوال کرو تو فردوس کا سوال کرو۔ حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جنّت میں سو درجات ہیں، اگر سارے جہاں ان میں سے ایک درجے میں جمع ہو جائیں تو اس ایک درجے میں سب سما جائیں۔

كَمَآ اَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْۢ بَيْتِكَ بِالْحَقِّ ۠ وَاِنَّ فَرِيْقًا

جیسا کہ آپ کے رَبّ نے آپ کے گھر سے حق کے ساتھ آپ کو نکالا، اور بلاشبہ مؤمنین کی ایک

مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَكٰرِهُوْنَ ۝۵ يُجَادِلُوْنَكَ فِي الْحَقِّ

جماعت کو گراں گزر رہا تھا⑤ وہ آپ سے حق کے بارے میں جھگڑ رہے تھے

بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ كَاَنَّمَا يُسَاقُوْنَ اِلَى الْمَوْتِ وَهُمْ يَنْظُرُوْنَ ۝۶

بعد اس کے کہ اس کا ظہور ہو چکا تھا، گویا کہ وہ موت کی طرف ہانکے جا رہے ہیں اس حال میں کہ وہ دیکھ رہے ہیں⑥

وَاِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحْدَى الطَّآئِفَتَيْنِ اَنَّهَا لَكُمْ وَتَوَدُّوْنَ

اور جب اللہ تم سے وعدہ فرما رہا تھا کہ دو جماعتوں میں سے ایک جماعت تمہارے لیے ہے اور تم خواہش کر رہے تھے

اَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ لَكُمْ وَيُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّحِقَّ الْحَقَّ

کہ جو جماعت شوکت والی نہیں ہے وہ تمہارے لیے ہو جائے، اور اللہ چاہتا ہے کہ حق کا حق ہونا ثابت فرمادے

بِكَلِمٰتِهٖ وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكٰفِرِيْنَ ۝۷ لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَيُبْطِلَ

اپنے کلمات کے ذریعے اور کافروں کی جڑ کاٹ دے⑦ تاکہ حق کو سچا کردے اور باطل کا

الْبَاطِلَ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ ⑧ إِذْ تَسْتَغِيْثُوْنَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ

باطل ہونا ثابت کردے اگرچہ مجرموں کو ناگوار ہو ⑧ جب تم اپنے رب سے فریاد کر رہے تھے سو اس نے تمہاری دعا قبول فرمائی

أَنِّيْ مُمِدُّكُمْ بِأَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُرْدِفِيْنَ ⑨ وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ إِلَّا بُشْرٰى وَ

کہ میں ایک ہزار فرشتوں کے ذریعے تمہاری مدد کروں گا جو مسلسل آتے رہیں گے ⑨ اور اس امداد کو نہیں بنایا اللہ نے مگر بشارت اور

لِتَطْمَئِنَّ بِهٖ قُلُوْبُكُمْ ۚ وَمَا النَّصْرُ إِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۭ إِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ⑩

تاکہ مطمئن ہو جائیں تمہارے دل، اور نہیں ہے مدد مگر اللہ ہی کی طرف سے، بے شک اللہ غلبہ والا حکمت والا ہے ⑩

تفسیر

ماقبل سے ربط اور سورۂ انفال میں بیان کردہ مضامین

شروع سورت میں یہ بیان ہو چکا ہے، کہ سورۂ انفال کے اکثر مضامین کفار و مشرکین پر عذاب و انتقام اور مسلمانوں پر احسان و انعام سے متعلق ہیں، اور اس کے ضمن میں دونوں فریقوں کے لیے عبرت و نصیحت کے احکام بیان ہوئے ہیں، اور ان معاملات میں سب سے پہلا اور سب سے اہم واقعہ غزوۂ بدر کا تھا، جس میں بڑے ساز و سامان اور تعداد و قوت کے باوجود مشرکین کو جانی اور مالی نقصانات کے ساتھ شکست، اور مسلمانوں کو باوجود ہر طرح کی قلت اور بے سامانی کے فتح عظیم نصیب ہوئی، اس سورت میں واقعہ بدر کا تفصیلی بیان ہے، جو آیات مذکورہ سے شروع ہو رہا ہے۔

غزوۂ بدر کا پس منظر

آگے بڑھنے سے پہلے پورا واقعہ ذہن نشین کر لینا چاہیے تاکہ آیت کریمہ میں جو اجمال ہے، اُس کی تشریح سمجھ میں آجائے، حاصل اس واقعہ کا یہ ہے کہ قریش مکہ ہر سال تجارت کے لیے ملک شام جایا کرتے تھے، مکہ معظمہ سے شام کو جائیں تو مدینہ منورہ راستہ میں آتا ہے اور مکہ سے شام یا شام سے مکہ آنے کے لیے مدینہ منورہ سے گزرنا پڑتا ہے، شہر مدینہ میں داخل نہ بھی ہوں تو بھی دُور سے یا قریب سے اس کے محاذات سے ضرور گزرنا پڑتا ہے، اب آگے یہ سمجھیں کہ قریش مکہ کا ایک قافلہ تجارت کے لیے شام گیا ہوا تھا، بہت سے لوگوں نے اس تجارت میں شرکت کی تھی اور اپنے اموال لگائے تھے، قافلہ کے سردار ابو سفیان تھے (جو اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے) جب ابو سفیان کا قافلہ شام سے واپس ہو رہا تھا، جس میں تیس یا چالیس افراد تھے، اور ایک ہزار اونٹ تھے تو سرور کائنات ﷺ کو اس قافلے کے گزرنے کا علم ہو گیا، آپ ﷺ نے اپنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے فرمایا کہ قریش کا قافلہ ادھر سے گزر رہا ہے چلو اس قافلے کو پکڑیں، ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے اموال ہمیں عطا فرما دے، آپ ﷺ

نے تاکیدی حکم نہیں فرمایا تھا، اور یہ بھی نہیں فرمایا تھا کہ جنگ کرنے نکل رہے ہیں، اس لیے بعض صحابہ رضی اللہ عنہم آپ ﷺ کے ہمراہ روانہ ہوگئے اور بعض مدینہ منورہ ہی میں رہ گئے۔ ابوسفیان کو خطرہ تھا کہ راہ میں مسلمانوں سے مڈبھیڑ نہ ہو جائے اس لیے وہ راستے میں راہ گیروں سے اس بات کا کھوج لگاتا ہوا جارہا تھا، کہ کہیں مسلمان ہمارے قافلے کے درپے تو نہیں ہیں۔ جب آنحضرت ﷺ نے اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ مدینہ منورہ سے سفر فرمایا تو ابوسفیان کو اس کی خبر مل گئی، اُس نے اپنا راستہ بدل دیا، اور ضمضم بن عمرو غفاری کو اہلِ مکہ تک خبر پہنچانے کے لیے جلدی جلدی آگے روانہ کر دیا، اُس کو اس کام کی اُجرت دینا بھی طے کر دیا، ضمضم جلدی سے مکہ پہنچا اور اُس نے خبر دے دی کہ محمد ﷺ اپنے ساتھیوں کے ساتھ تمہارے قافلے کے درپے ہیں، اور مدینہ منورہ سے روانہ ہو چکے ہیں، اپنے قافلے کی حفاظت کر سکتے ہو تو کرلو۔ سنتے ہی اہلِ مکہ میں ہل چل مچ گئی اور مقابلے کے لیے ایک ہزار آدمی جن کا سردار ابوجہل تھا، بڑے کرّوفرّ اور اَسبابِ عیش وطرب کے ساتھ اُکڑتے اور اِتراتے ہوئے بدر کی طرف روانہ ہوگئے، ''بدر'' ایک آبادی کا نام ہے جو مکہ معظمہ سے براستہ رابغ، مدینہ منورہ کو جاتے ہوئے راستے میں پڑتی ہے، یہاں سے مدینہ منورہ سو میل سے کچھ کم رہ جاتا ہے، ''بدر'' نامی ایک شخص تھا جس نے اس بستی کو آباد کیا تھا، اُس کے نام پر اس بستی کا نام ہے، اور ایک قول یہ ہے کہ مقامِ بدر میں ایک کنواں تھا اس کا نام بدر تھا، اسی کنویں کے نام سے یہ آبادی مشہور تھی، قریشِ مکہ اپنے ساتھ گانے بجانے والی عورتیں لے کر نکلے تھے، تاکہ وہ گانا گائیں اور لڑائی کے لیے اُبھاریں، اس لشکر میں تقریباً تمام سردارانِ قریش شامل تھے، صرف ابولہب نہ جاسکا تھا، اُس نے اپنی جگہ ابوجہل کے بھائی عاصم بن ہشام کو بھیج دیا تھا، ان لوگوں کے ساتھ دیگر سامانِ حرب کے علاوہ ساٹھ گھوڑے اور چھ سو زرہیں تھیں، اور سواری کے اونٹوں کے علاوہ کثیر تعداد میں ذبح کرنے اور کھانے کھلانے کے لیے بھی اونٹ ساتھ لے کر چلے تھے، سب سے پہلے ابوجہل نے مکہ سے باہر آ کر دس اونٹ ذبح کر کے لشکر کو کھلائے، پھر مقام عسفان میں اُمیہ بن خلف نے نو اونٹ ذبح کیے، پھر مقام قدید میں سہل بن عمرو نے اونٹ ذبح کیے، پھر اگلی منزل شیبہ بن ربیعہ نے نو اونٹ ذبح کیے، پھر اس سے اگلی منزل میں جو مقام جحفہ میں تھی) عتبہ بن ربیعہ نے دس اونٹ ذبح کیے، اس طرح ہر منزل میں دس دس اونٹ ذبح کرتے رہے اور کھاتے رہے، اور ابوالبختری نے بدر پہنچ کر دس اونٹ ذبح کیے، قریشِ مکہ تو مکہ معظمہ سے چلے اور آنحضرت ﷺ مدینہ منورہ سے روانہ ہوئے تھے، یہ رمضان المبارک کا مہینہ تھا، آپ نے عبداللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کو اپنا خلیفہ بنایا وہ آپ ﷺ کے تشریف لے جانے کے بعد لوگوں کو نماز پڑھاتے تھے، آپ ﷺ کے ساتھ روانہ ہونے والوں میں حضرت ابولبابہ رضی اللہ عنہ بھی تھے، آپ ﷺ نے انہیں مقام روحاء سے واپس کر دیا اور اُمیرِ مدینہ بنا کر بھیج دیا، آپ ﷺ کے لشکر کی تعداد تین سو تیرہ تھی، اور آپ ﷺ کے ساتھ ستر اونٹ تھے جن پر نمبروار سوار ہوتے تھے، ہر تین افراد کو ایک اونٹ دیا گیا تھا، خود آپ ﷺ بھی حضرت ابولبابہ رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ ایک اونٹ میں شریک تھے، نوبت کے اعتبار سے آپ بھی پیدل چلتے تھے، مقام روحاء تک ہی سلسلہ رہا جب روحاء سے حضرت ابولبابہ رضی اللہ عنہ کو واپس فرما دیا، تو آپ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت مرثد رضی اللہ عنہ کے ساتھ ایک اونٹ میں شریک رہے، حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ، جب آپ ﷺ کے پیدل چلنے کی نوبت آتی تھی تو حضرت ابولبابہ رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ عرض کرتے تھے، کہ یا رسول اللہ! آپ برابر سوار رہیں ہم آپ کی طرف سے پیدل چل لیں گے،

آپ نے جواب میں فرمایا: "مَا اَنْتُمَا بِاَقْوٰى مِنِّيْ وَلَا اَنَا بِاَغْنٰى عَنِ الْاَجْرِ مِنْكُمَا" (تم دونوں مجھ سے زیادہ قوی نہیں ہو اور ثواب کے اعتبار سے بھی میں تمہاری بہ نسبت بے نیاز نہیں ہوں) یعنی جیسے تمہیں ثواب کی ضرورت ہے، مجھے بھی ثواب کی ضرورت ہے، جب آنحضرت ﷺ وادیٔ ذفران میں پہنچے تو وہاں قیام فرمایا۔

بدر میں مشرکین سے مقابلے کے لئے مشورہ اور صحابہ رضی اللہ عنہم کا ایمانی جذبہ

اب تک تو ابوسفیان کے قافلے سے تعرض کرنے کی نیت سے سفر ہو رہا تھا، یہاں پہنچ کر خبر ملی کہ قریش مکہ سے جنگ کرنے کی نوبت آئے گی، آپ ﷺ نے حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مشورہ فرمایا، کہ قریش ہمارے مقابلے کے لیے نکل چکے ہیں، اب کیا کیا جائے، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور اچھا جواب دیا، پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے انہوں نے بھی اچھا جواب دیا، پھر حضرت مقداد رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے انہوں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! آپ اپنی رائے کے مطابق تشریف لے چلیں ہم آپ کے ساتھ ہیں، اللہ کی قسم ایسا نہ ہوگا جیسے بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہہ دیا تھا: "فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَاۤ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ" تو اور تیرا رب چلے جائیں دونوں قتال کرلیں، ہم تو یہاں بیٹھے ہیں۔ آپ تشریف لے چلیں ہم آپ کے ساتھ قتال کرنے والے ہیں، قسم اس ذات کی جس نے آپ کو حق دے کر بھیجا ہے، اگر آپ ہمیں "بَرْكِ الْغِمَاد" یہ یمن میں ایک جگہ کا نام ہے، اور ایک قول یہ ہے کہ یہ جگہ مکہ معظمہ سے پانچ رات کی مسافت پر ہے، تک ساتھ لے چلیں گے تو ہم ساتھ رہیں گے اور جنگ سے منہ نہ موڑیں گے۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا "اَشِيْرُوْا عَلَيَّ اَيُّهَا النَّاسُ" (اے لوگو! مشورہ دو) آپ کا مقصد یہ تھا کہ انصاری حضرات اپنی رائے پیش کریں، آپ کی بات سن کر حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا (جو انصار میں سے تھے) کہ یارسول اللہ! ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ ہم سے جواب لینا چاہتے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا ہاں! انہوں نے عرض کیا کہ ہم آپ پر ایمان لائے، آپ کی تصدیق کی، ہم نے گواہی دی کہ جو کچھ آپ لے کر آئے ہیں وہ حق ہے، اور ہم نے آپ سے عہد کیا ہے کہ ہم آپ کی بات مانیں گے اور فرمانبرداری کریں گے، آپ اپنے ارادے کے موافق عمل کریں، اور تشریف لے چلیں ہم آپ کے ساتھ ہیں، قسم ہے اُس ذات کی جس نے آپ کو حق دے کر بھیجا ہے! اگر راہ میں سمندر آ گیا اور آپ اس میں داخل ہونے لگیں تو ہم بھی آپ کے ساتھ داخل ہو جائیں گے، اور ہم میں سے ایک شخص بھی پیچھے نہ رہے گا، ہم جنگ میں ڈٹ جانے والے ہیں، اور دشمن کے مقابلے میں مضبوطی کے ساتھ معرکہ آرائی کرنے والے ہیں، امید ہے کہ اللہ تعالیٰ ہماری طرف سے آپ کو ایسی بات دکھادے جس سے آپ کی آنکھیں ٹھنڈی ہو جائیں گی، آپ اللہ کی برکت کے ساتھ چلئے۔ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کی بات سن کر آپ ﷺ کو بہت خوشی ہوئی، اور فرمایا کہ چلو خوش خبری قبول کرلو، اللہ تعالیٰ نے مجھ سے وعدہ فرمایا ہے کہ دو جماعتوں میں سے تم کو ایک جماعت پر غلبہ عطا فرمائیں گے، (ایک جماعت ابوسفیان کا قافلہ اور دُوسری جماعت قریش کا لشکر) آپ ﷺ یہ بھی فرمایا کہ اللہ کی قسم میں دیکھ رہا ہوں کہ جس جماعت سے مقابلہ ہوگا اُن کے مقتولین کہاں کہاں پڑے ہیں، اس کے بعد آپ ﷺ نے اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ بدر کی طرف روانہ ہوگئے، راستے میں ایک غلام سے ملاقات ہوئی، حضرت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اُس سے پوچھا

کہ ابوسفیان کا قافلہ کہاں ہے؟ اس نے کہا اس کا تو مجھے کوئی پتا نہیں، یہ ابوجہل، عتبہ اور اُمیہ بن خلف آ رہے ہیں، بعض روایات میں یوں ہے کہ جب ابوسفیان کے قافلے سے تعرض کرنے کے لیے روانہ ہوئے تھے، تو ایک دِن یا دو دِن کی مسافت طے کرنے کے بعد آپ ﷺ نے صحابہ سے مشورہ لیا تھا، کہ ابوسفیان کو پتا چل گیا ہے کہ ہم اس سے تعرض کرنے نکلے ہیں (وہ قافلہ تو نکل چکا ہے) اب قریشِ مکہ کے آنے کی خبر سنی گئی ہے، اُن سے مقابلہ ہونے کی بات بن رہی ہے، اس بارے میں کیا خیال ہے؟ اس پر بعض صحابہ نے کہا کہ ہم میں تو قریش کے لشکر سے مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں، آپ تو ابوسفیان کے قافلے کے لیے نکلے تھے، آپ ﷺ نے پھر وہی سوال فرمایا کہ قریشِ مکہ سے جنگ کرنے کے بارے میں کیا رائے ہے؟ اس پر حضرت مقداد رضی اللہ عنہ نے وہ جواب دیا جو پیچھے گزر چکا۔ بعض روایت میں ہے کہ یہ سوال جواب مقامِ روحاء میں ہوئے، بعض صحابہ نے جو یہ کہا تھا کہ ہمیں قریشِ مکہ سے جنگ کی طاقت نہیں، ان کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی وَ اِنَّ فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَكٰرِهُوْنَ ۙ يُجَادِلُوْنَكَ فِي الْحَقِّ بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ كَاَنَّمَا يُسَاقُوْنَ اِلَى الْمَوْتِ وَهُمْ يَنْظُرُوْنَ، اور بلاشبہ مؤمنین کی ایک جماعت کو گراں گزر رہا تھا وہ آپ سے حق کے بارے میں جھگڑ رہے تھے اس کے بعد کہ حق ظاہر ہو چکا تھا گویا کہ وہ موت کی طرف ہانکے جا رہے ہیں اس حال میں کہ وہ دیکھ رہے ہیں۔

ابوسفیان کا قریشِ مکہ کو واپس جانے کا مشورہ اور ابوجہل کا جواب

جب ابوسفیان اپنے قافلے کو لے کر مسلمانوں کی زد سے بچ کر نکل گیا، تو اُس نے قریشِ مکہ کے پاس خبر بھیجی کہ تم ہماری حفاظت کے لیے نکلے تھے، اب جبکہ ہم بچ کر نکل آئے ہیں تو تمہیں آگے بڑھنے کی ضرورت نہیں، لہٰذا واپس چلے جاؤ، اس پر ابوجہل نے کہا اللہ کی قسم! ہم واپس نہیں لوٹیں گے جب تک کہ ہم بدر نہ پہنچ جائیں، وہاں تین دِن قیام کریں گے، اُونٹ ذبح کریں گے، کھانے کھائیں گے، شرابیں پئیں گے اور گانے والیاں گانے سنائیں گی، اور عرب کو پتا چل جائے گا، کہ ہم مقابلے کے لیے نکلے تھے، ہمارے اس عمل سے ایک دھاک بیٹھ جائے گی، اور لوگ ہم سے ڈرتے رہیں گے، لہٰذا چلو آگے بڑھو۔

حضراتِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مشاورت

اللہ جل شانہٗ نے اپنے رسول ﷺ سے وعدہ فرمایا تھا کہ دونوں جماعتوں میں سے ایک جماعت پر تمہیں غلبہ دیا جائے گا، جب آپ ﷺ نے حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مشورہ فرمایا، تو اُن میں سے بعض صحابہ نے یہ مشورہ دیا کہ ابوسفیان کے قافلے ہی کا پیچھا کرنا چاہیے کیونکہ وہ لوگ تجارت سے واپس ہو رہے ہیں، جنگ کرنے کے لیے نہیں نکلے، ان میں لڑنے کی قوت اور شوکت نہیں ہے، لہٰذا اُن پر غلبہ پانا آسان ہے اور قریش کا جو لشکر مکہ مکرمہ سے چلا ہے وہ لوگ تو لڑنے ہی کے لیے چلے ہیں اور تیاری کر کے نکلے ہیں، لہٰذا اُن سے مقابلہ مشکل ہوگا، ان لوگوں کی اس بات کو ان الفاظ میں ذکر فرمایا وَتَوَدُّوْنَ اَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ لَكُمْ اور تم چاہتے تھے کہ وہ جماعت تمہارے قابو میں آ جائے جو قوت و طاقت والی نہیں تھی۔

بدر میں اہلِ حق کی واضح فتح اور مشرکینِ مکہ کی کھلی ذِلّت

قریشِ مکہ نے آنحضرت ﷺ کو اور آپ کے ساتھیوں کو بہت تکلیفیں دی تھیں، اور مکہ مکرمہ چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا، حق نہ خود قبول کرتے تھے اور نہ دوسروں کو قبول کرنے دیتے تھے، غیر موقع طور پر بدر میں پہنچے اور معرکہ پیش آنے کی صورت بن گئی، اس میں گو بعض اہلِ ایمان کو طبعاً کراہت تھی، لیکن اللہ تعالیٰ کی تقدیر سب پر غالب ہے، جنگ ہوئی اور اہلِ مکہ نے زبردست شکست کھائی اور اُن کا فخر اور طمطراق سب دھرا رہ گیا، جس کی تفصیل ان شاء اللہ تعالیٰ عنقریب بیان ہوگی، اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَيُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ اللہ کو یہ منظور تھا کہ اپنے کلمات کے ذریعے حق کو ثابت فرمادے، وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكٰفِرِيْنَ، اور کافروں کی بنیاد کاٹ دے، لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ تا کہ اللہ تعالیٰ حق کا حق ہونا ثابت فرمادے اور باطل کا باطل ہونا ثابت فرمادے، وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ، اگرچہ مجرموں کو ناگوار ہو، اللہ تعالیٰ نے ایسی تدبیر فرمائی کہ مشرکینِ مکہ ذلیل ہوئے، اسلام کا حق ہونا علی الاعلان ثابت ہوا اور باطل کا باطل ہونا بھی ظاہر ہو گیا، دوست اور دشمن سب نے دیکھ لیا اسی لیے یومِ بدر کو ''یوم الفرقان'' فرمایا۔

لفظ ''كَمَآ'' کے متعلق اَقرب تین اِحتمال

پہلی بات یہ ہے کہ آیت کا شروع كَمَآ اَخْرَجَكَ رَبُّكَ سے ہوتا ہے، اس میں لفظ كَمَآ ایک ایسا لفظ ہے جو تشبیہ کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، تو غور طلب بات یہ ہے کہ یہاں تشبیہ کس چیز کی کس چیز سے ہے؟ حضرات مفسرین نے اس کی مختلف توجیہات بیان فرمائیں ہیں، امام التفسیر علامہ ابوحیان رحمۃ اللہ علیہ نے اس طرح کے پندرہ اقوال نقل کیے ہیں، اُن میں زیادہ اقرب تین احتمال ہیں، اوّل یہ کہ اس تشبیہ سے مقصد یہ بیان کرنا ہے، کہ جس طرح غزوۂ بدر کے مالِ غنیمت کی تقسیم کے وقت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا آپس میں کچھ اختلاف رائے ہو گیا تھا، پھر حکمِ خداوندی کے تحت سب نے آپ ﷺ کے حکم کی تعمیل کی، اور اس کی برکات اور اچھے نتائج کا ظہور سامنے آ گیا، اسی طرح اس جہاد کے شروع میں کچھ لوگوں کی طرف سے ناپسندیدگی کا اظہار ہوا، پھر حکمِ ربانی کے ماتحت سب نے اطاعت کی اور اُس کے مفید نتائج اور اعلیٰ ثمرات کا مشاہدہ ہو گیا، یہ توجیہ فراء اور مبرد کی طرف منسوب ہے، اسی کو ''بیان القرآن'' میں ترجیح دی گئی ہے، جیسا کہ خلاصۂ تفسیر سے معلوم ہو چکا۔ دوسرا احتمال یہ ہے کہ گزشتہ آیات میں سچے مؤمنین کے لیے آخرت میں درجاتِ عالیہ، مغفرت اور باعزّت روزی کا وعدہ کیا گیا تھا، ان آیات میں اس وعدے کے یقینی ہونے کا ذکر اس طرح کیا گیا، کہ آخرت کا وعدہ اگرچہ ابھی آنکھوں کے سامنے نہیں، مگر اللہ تعالیٰ نے جو وعدہ جنگ بدر کے اندر نصرت اور فتح کا کیا تھا، اُس کا پورا ہونا تم کھلی آنکھوں دیکھ چکے ہو، اور اس کا مشاہدہ کر چکے ہو اُس سے نصیحت حاصل کرو۔ اور یقین کر لو کہ جس طرح یہ وعدہ دنیا ہی میں پورا ہو چکا ہے، اسی طرح آخرت کا وعدہ بھی ضرور پورا ہوگا۔ تیسرا احتمال یہ ہے ابوحیان رحمۃ اللہ علیہ نے مفسرین کے پندرہ اقوال نقل کرنے کے بعد لکھا ہے، کہ مجھے ان میں سے کسی قول پر اطمینان نہیں تھا، ایک روز میں اسی آیت پر غور وفکر کرتے ہوئے سو گیا، تو میں نے خواب میں دیکھا کہ کسی جگہ جا رہا ہوں اور ایک شخص میرے ساتھ ہے، میں اسی آیت کے متعلق اُس سے بحث کر رہا ہوں، اور یہ کہہ

رہا ہوں کہ مجھے کبھی ایسی مشکل پیش نہیں آئی جیسی اس آیت کے الفاظ میں پیش آئی ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کوئی لفظ محذوف ہے، پھر یکا یک خواب ہی میں میرے دل میں پڑا کہ یہاں لفظ ''نصرك'' محذوف ہے، اس کو خود میں نے بھی پسند کیا، اور جس شخص سے بحث کر رہا تھا، اُس نے بھی پسند کیا، بیدار ہونے کے بعد اس پر غور کیا تو میرا اشکال ختم ہو گیا، کیونکہ اس صورت میں لفظ کَمَآ تشبیہ کے لیے نہیں بلکہ بیان سبب کے لیے استعمال ہوا ہے، اور معنی آیت کے یہ ہو گئے کہ غزوۂ بدر میں اللہ جل شانہٗ کی طرف سے جو خاص نصرت وامداد آپ کی ہوئی اس کا سبب یہ تھا کہ اس جہاد میں آپ نے جو کچھ کیا، کسی اپنی خواہش اور رائے سے نہیں، بلکہ خالص اَمرِ ربی اور حکمِ خداوندی کے تابع کیا، اسی کے حکم پر آپ اپنے گھر سے نکلے، اور اطاعتِ حق کا یہی نتیجہ ہونا چاہیے، اور یہ یہی ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ کی امداد ونصرت اس کے ساتھ ہو جاتی ہے، بہر حال آیت کے اس جملہ میں یہ تینوں معنی محتمل اور صحیح ہیں۔

آیتِ بالا میں موجود اہم نکات

اس کے بعد اس پر نظر ڈالئے کہ قرآنِ کریم نے اس جہاد کے لیے رسول کریم ﷺ کا خود نکلنا ذکر نہیں کیا، بلکہ یہ بیان فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو نکالا، اس میں اشارہ ہے رسول کریم ﷺ کی کمال عبدیت واطاعت کی طرف کہ آپ کا فعل درحقیقت میں حق تعالیٰ کا فعل ہوتا ہے، جو آپ کے اعضاء جوارح سے صادر ہوتا ہے، جیسا کہ حدیث قدسی میں رسول کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ بندہ جب اطاعت وعبدیت کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کر لیتا ہے، تو اللہ تعالیٰ اُس کے بارے میں یہ فرماتے ہیں، کہ میں اُس کی آنکھ بن جاتا ہوں وہ جو کچھ دیکھتا ہے، میرے ذریعے دیکھتا ہے، میں اُس کے کان بن جاتا ہوں وہ جو کچھ سنتا ہے میرے ذریعے سے سنتا ہے، میں اس کے ہاتھ پاؤں بن جاتا ہوں، وہ جس کو پکڑتا ہے میرے ذریعے سے پکڑتا ہے، جس کی طرف چلتا ہے میرے ذریعے سے چلتا ہے، خلاصہ اُس کا یہی ہے کہ حق تعالیٰ کی خاص نصرت وامداد اُس کے ساتھ ہو جاتی ہے، جن افعال کا صدور بظاہر اس کے آنکھ، کان یا ہاتھ پاؤں سے ہوتا ہے، درحقیقت اس میں قدرت حق تعالیٰ شانہٗ کی کارفرما ہوتی ہے، خلاصہ یہ ہے کہ لفظ اَخْرَجَكَ میں اس طرف اشارہ کر دیا کہ آنحضرت ﷺ کا جہاد کے لیے نکلنا درحقیقت حق تعالیٰ شانہٗ کا نکالنا تھا جو آپ کی ذات سے ظاہر ہوا، یہاں یہ بات بھی قابلِ نظر ہے کہ اَخْرَجَكَ رَبُّكَ فرمایا جس میں اللہ جل شانہٗ کا ذکر صفتِ رَبّ کے ساتھ کر کے، اس طرف اشارہ کر دیا کہ اس جہاد کے لیے آپ کو نکالنا شانِ ربوبیت سے، اور تربیت کے تقاضا سے تھا، کیونکہ اس کے ذریعے مظلوم ومقہور مسلمانوں کے لیے فتح یاب، اور مغرور وظالم کُفار کے لیے پہلے عذاب کا مظاہرہ کرنا تھا، مِنْۢ بَیْتِكَ کے معنی ہیں آپ کے گھر سے، مطلب یہ ہوا کہ نکالا آپ کو آپ کے رَبّ نے آپ کے گھر سے، جمہور مفسرین کے نزدیک اس گھر سے مراد مدینہ طیبہ کا گھر، یا خود مدینہ طیبہ ہے، جس میں ہجرت کے بعد آپ مقیم ہوئے، کیونکہ واقعۂ بدر ہجرت کے دوسرے سال میں پیش آیا ہے، اس کے ساتھ لفظ بِالْحَقِّ کا اضافہ کر کے بتلا دیا کہ یہ ساری کارروائی احقاق حق اور ابطال باطل کے لیے عمل میں آئی ہے، دوسری حکومتوں کی طرح ملک گیری کی ہوس یا بادشاہوں کا غصہ اس کا سبب نہیں، آخر آیت میں فرمایا وَ اِنَّ فَرِیْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِیْنَ لَكٰرِهُوْنَ یعنی ایک جماعت مسلمانوں کی اس جہاد کو گراں سمجھتی اور ناپسند کرتی تھی۔

مسلمانوں کو پست ہمتی، آرام طلبی، وقتی اور ہنگامی چیز اختیار کرنے پر تنبیہ

پہلی اور دوسری آیت میں یہ بیان کیا گیا ہے، کہ جس وقت آنحضرت ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو یہ اطلاع ملی کہ قریش کا ایک عظیم لشکر اپنے تجارتی قافلہ کی حفاظت کے لیے مکہ سے نکل چکا ہے، تو اب مسلمانوں کے سامنے دو جماعتیں تھیں ایک تجارتی قافلہ جس کو روایات میں "عیر" سے تعبیر کیا گیا ہے، اور دوسری یہ مسلح فوج جو مکہ سے چلی تھی جس کو "نفیر" کے نام سے تعبیر کیا گیا ہے اس آیت میں یہ بتلایا، کہ اس وقت اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ اور آپ کے واسطہ سے سب مسلمانوں سے یہ وعدہ فرمایا تھا، کہ ان دونوں جماعتوں میں سے کسی ایک جماعت پر تمہارا مکمل قبضہ ہو جائے گا کہ اس کے متعلق جو تم چاہو گے کر سکو گے، اب یہ ظاہر ہے تجارتی قافلے پر قبضہ آسان اور بے خطر تھا، اور مسلح فوج پر مشکل اور خطرات سے پُر، اس لیے اس مبہم وعدہ کو سُن کر بہت سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تمنا اور خواہش بھی ہوئی، کہ وہ جماعت جس پر مسلمانوں کا قبضہ ہونے کا وعدہ اللہ کی طرف سے ہوا ہے، وہ غیر مسلح تجارتی قافلہ ہو جائے، لیکن رسول کریم ﷺ اور بہت سے اکابر صحابہ کا باشارات ربانی یہ ارادہ ہوا کہ اگر مسلح فوج پر قبضہ ہو جائے تو بہتر ہوگا، ان آیات میں غیر مسلح جماعت پر قبضہ چاہنے والے مسلمانوں کو متنبہ کیا گیا ہے، کہ تمہیں تو اپنی سہولت پسندی اور خطرات سے یکسوئی کے پیش نظر یہی پسند تھا کہ غیر مسلح تجارتی قافلے پر تمہارا قبضہ ہو جائے گا، مگر اللہ کا ارادہ یہ تھا اسلام کا اصل مقصد حاصل ہو، یعنی حق کا حق ہونا واضح ہو جائے اور کافروں کی جڑ کٹ جائے اور ظاہر ہے کہ یہ کام اسی وقت ہو سکتا تھا، جب کہ مسلح فوج سے مقابلہ ہو اور اس پر مسلمانوں کا مکمل قبضہ اور غلبہ ہو، خلاصہ اس کا یہ ہے مسلمانوں کو اس پر تنبیہ ہے کہ تم نے جو صورت پسند کی وہ نہایت پست ہمتی اور آرام طلبی اور وقتی اور ہنگامی فائدہ کی چیز تھی اللہ تعالیٰ نے جو ارادہ فرمایا وہ عالی ہمتی، بلند مقاصد اور مکمل اور دائمی فوائد پر مشتمل تھا، پھر دوسری آیت میں اس کو مزید واضح فرما دیا، اللہ تعالیٰ کے قبضۂ قدرت سے تو کوئی چیز باہر نہ تھی، اگر وہ چاہتے تو تجارتی قافلے پر مسلمانوں کا غلبہ اور قبضہ ہو جاتا، مگر اُس نے رسول کریم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی شان کے لائق اُس کو سمجھا کہ مسلح فوج سے مقابلہ ہو کر اُس پر قبضہ ہو، تا کہ حق کا حق ہونا اور باطل کا باطل ہونا واضح ہو جائے۔

کسی جماعت کو متعین کر کے ذِکر نہ کرنے کی وجہ

یہاں یہ بات غور طلب ہے، کہ حق تعالیٰ علیم و خبیر ہے اور ہر کام کے آغاز و انجام سے باخبر ہیں، اُن کی طرف سے اس مبہم وعدہ میں کیا مصلحت تھی؟ کہ ان دونوں جماعتوں میں سے کسی ایک جماعت پر مسلمانوں کا غلبہ اور قبضہ ہوگا، وہ ان میں سے کسی ایک کو متعین کر کے بھی فرما سکتے تھے، کہ فلاں جماعت پر قبضہ ہو جائے گا، اس ابہام کی وجہ واللہ اعلم یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا امتحان کرنا مقصود تھا، کہ آسان کام کو پسند کرتے ہیں یا مشکل کو، میدان جنگ کو ترجیح دیتے ہیں یا مال تجارت کو، اُن کے اندر مال کے حصول کا جذبہ زیادہ ہے یا حق کے لیے جاں بازی اور جاں نثاری کا جذبہ زیادہ ہے، دیکھنا یہ تھا کہ یہ اپنی ایمانی کیفیت کے ساتھ کسی بات کو اختیار اور پسند کرتے ہیں، اور اس میں اُن کی اخلاقی تربیت بھی تھی، جس کے ذریعے اُن کو عالی ہمتی اور اعلیٰ مقاصد کی جدوجہد اور خطرات سے نہ گھبرانا سکھایا گیا۔

معرکہ بدر سے قبل سرورِ کائنات ﷺ کا دُعا فرمانا

اگلی آیات میں اس واقعہ کا بیان ہے جو مسلح فوج سے مقابلہ ٹھن جانے کے بعد پیش آیا، کہ رسول کریم ﷺ نے جب یہ دیکھا کہ آپ کے رفقاء صرف تین سو تیرہ اور وہ بھی اکثر غیر مسلح ہیں، اور مقابلے پر تقریباً ایک ہزار جوانوں کا مسلح لشکر ہے، تو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں نصرت وامداد کے لیے ہاتھ اُٹھائے، آپ ﷺ دُعا مانگتے تھے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آپ کے ساتھ آمین کہتے تھے، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے آنحضرت ﷺ کی دُعا کے یہ کلمات نقل فرمائے ہیں، ''یا اللہ! مجھ سے یہ وعدہ آپ نے فرمایا ہے اُس کو جلد پورا فرمادے یا اللہ! اگر یہ تھوڑی سی جماعت مسلمین کی فنا ہوگئی، تو پھر زمین میں کوئی تیری عبادت کرنے والا باقی نہ رہے گا، (کیونکہ ساری زمین کفر وشرک سے بھری ہوئی ہے یہی چند مسلمان ہیں جو صحیح عبادت بجالاتے ہیں)''۔ آنحضرت ﷺ اسی طرح اِلحاح وزاری کے ساتھ دُعا میں مشغول رہے، یہاں تک کہ آپ ﷺ کے شانوں سے چادر بھی سرک گئی، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے آگے بڑھ کر چادر اوڑھائی، اور عرض کیا: یا رسول اللہ! آپ زیادہ فکر نہ کریں، اللہ تعالیٰ آپ کی دُعا ضرور قبول فرمائیں گے، اور اپنا وعدہ پورا فرمائیں گے، آیت میں اِذْ تَسْتَغِيْثُوْنَ رَبَّكُمْ کے الفاظ سے یہی واقعہ مراد ہے جس کے معنی یہ ہیں، کہ وہ وقت یاد رکھنے کے قابل ہے جب تم اپنے رَبّ سے استغاثہ کر رہے تھے، اور مدد طلب کر رہے تھے، یہ استغاثہ اگرچہ دراصل رسول کریم ﷺ کی طرف سے ہوا تھا، مگر تمام صحابہ رضی اللہ عنہم آمین کہہ رہے تھے اس لیے پوری جماعت کی طرف منسوب کیا گیا۔

دُعا کی قبولیت اور فرشتوں کی بڑی تعداد بھیجنے کی وجہ

اس کے بعد اس دُعا کی قبولیت کا بیان اس طرح فرمایا فَاسْتَجَابَ لَكُمْ اَنِّيْ مُمِدُّكُمْ بِاَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُرْدِفِيْنَ یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہاری فریاد سُن لی، اور فرمایا کہ ایک ہزار فرشتوں سے تمہاری امداد کروں گا، جو یکے بعد دیگرے قطار کی صورت میں آنے والے ہوں گے، فرشتوں کو اللہ تعالیٰ نے جو بے نظیر قوت وطاقت عطا فرمائی ہے، اس کا اندازہ اس واقعے سے ہوسکتا ہے جو قومِ لُوط کی زمین کا تختہ اُلٹنے کے وقت پیش آیا کہ جبرائیلِ امین نے ایک پَر کے ذریعے سے تختہ اُلٹ دیا، ایسی بے مثال طاقت والے فرشتوں کی اتنی بڑی تعداد مقابلے میں بھیجنے کی ضرورت نہیں تھی، ایک بھی کافی تھا، مگر اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی فطرت سے واقف ہیں، کہ وہ تعداد سے بھی متاثر ہوتے ہیں، اس لیے مقابل فریق کی تعداد کے مطابق فرشتوں کی تعداد بھیجنے کا وعدہ فرمایا، کہ اُن کے قلوب پوری طرح مطمئن ہوجائیں۔

غزوۂ بدر میں فرشتوں کی تعداد کے متعلق ہونے والے اِضطراب کا حل

غزوۂ بدر میں جو اللہ تعالیٰ کے فرشتے امداد کے لیے بھیجے گئے اُن کی تعداد اِس جگہ ایک ہزار مذکور ہے، اور سورۂ آلِ عمران میں تین ہزار اور پانچ ہزار ذکر کی گئی ہے، اس کا سبب دراصل تین مختلف وعدے ہیں، جو مختلف حالات میں کئے گئے ہیں، پہلا وعدہ

ایک ہزار فرشتوں کا ہوا، جس کا سبب رسول کریم ﷺ کی دُعا اور عام مسلمانوں کی فریاد تھی۔ دوسرا وعدہ جو تین ہزار فرشتوں کا سورۂ آل عمران میں پہلے مذکور ہے، وہ اُس وقت کیا گیا جب مسلمانوں کو یہ خبر ملی کہ قریشی لشکر کے لیے اور کمک آرہی ہے، ''رُوح المعانی'' میں ابنِ ابی شیبہ اور ابن المنذر وغیرہ سے بروایت شعبی منقول ہے، کہ مسلمانوں کو بدر کے دن یہ خبر پہنچی کہ کرز بن جابر محاربی مشرکین کی امداد کے لیے کمک لے کر آرہا ہے، اس خبر سے مسلمانوں میں اضطراب پیدا ہوا، اس پر آل عمران کی آیت اَلَنْ يَّكْفِيَكُمْ اَنْ يُّمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلٰثَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُنْزَلِيْنَ نازل ہوئی جس میں تین ہزار فرشتے امداد کے لیے آسمان سے نازل کرنے کا وعدہ ذکر کیا گیا، اور تیسرا وعدہ پانچ ہزار کا اس شرط کی ساتھ مشروط تھا کہ اگر فریقِ مخالف نے یکبارگی حملہ کر دیا تو پانچ ہزار فرشتوں کی مدد بھیج دی جائے گی، وہ آلِ عمران کی آیتِ مذکورہ کے بعد کی آیت میں اس طرح مذکور ہے بَلٰٓى ۙ اِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا وَيَاْتُوْكُمْ مِّنْ فَوْرِهِمْ هٰذَا يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِيْنَ (سورۂ آل عمران: ۱۲۵) یعنی اگر تم ثابت قدم رہے اور تقویٰ پر قائم رہے، اور مقابل لشکر یکبارگی تم پر ٹوٹ پڑا تو تمہارا رَبّ تمہاری امداد پانچ ہزار فرشتوں سے کرے گا، جو خاص نشان یعنی خاص وردی میں ہوں گے، بعض حضراتِ مفسرین نے فرمایا کہ اس وعدے میں تین شرطیں تھیں، ایک ثابت قدمی اور دوسری تقویٰ اور تیسری مخالف فریق کا یکبارگی حملہ، پہلی دو شرطیں تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں موجود تھیں، اور اس میدان میں اوّل سے آخر تک اُن میں کہیں فرق نہیں آیا، مگر تیسری شرط یکبارگی حملے کا واقعہ پیش نہیں ہوا، اس لیے پانچ ہزار ملائکہ کے لشکر کی نوبت نہیں آئی، اس لیے معاملہ ایک ہزار اور تین ہزار میں دائر رہا، جس میں یہ بھی احتمال ہے، کہ تین ہزار سے مراد یہ ہو کہ ایک ہزار جو پہلے بھیجے گئے، اُن کے ساتھ مزید دو ہزار شامل کر کے تین ہزار کر دیئے گئے، اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہ تین ہزار اس پہلے ہزار کے علاوہ ہوں۔

غزوۂ بدر میں فرشتوں کی تین جماعتیں اور ہر ایک کا خاص صفت سے موصوف ہونا

یہاں یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ ان تین آیتوں میں فرشتوں کی تین جماعتوں کے بھیجنے کا وعدہ ہے، اور ہر جماعت کے ساتھ ایک خاص صفت کا ذکر ہے، سورۂ اَنفال کی آیت جس میں ایک ہزار کا وعدہ ہے، اس میں تو ان فرشتوں کی صفت میں مُرْدِفِيْنَ فرمایا ہے، جس کے معنی ہیں ''پیچھے لگانے والے'' اس میں شاید اس طرف پہلے ہی اشارہ کر دیا گیا کہ ان فرشتوں کے پیچھے دوسرے بھی آنے والے ہیں، اور سورۂ آل عمران کی پہلی آیت میں ملائکہ کی صفت مُنْزَلِيْنَ ارشاد فرمائی، یعنی یہ فرشتے آسمان سے اتارے جائیں گے، اس میں اشارہ خاص اہمیت کی طرف ہے کہ زمین میں جو فرشتے پہلے سے موجود ہیں، اُن سے کام لینے کی بجائے خاص اہتمام کے ساتھ یہ فرشتے آسمان سے اسی کام کے لیے بھیجے جائیں گے، اور سورۂ آل عمران کی دوسری آیت جس میں پانچ ہزار کا ذکر ہے اس میں ملائکہ کی صفت مُسَوِّمِيْنَ ارشاد فرمائی ہے، کہ وہ ایک خاص لباس اور علامت کے ساتھ ہوں گے، جیسا کہ روایات حدیث میں ہے کہ بدر میں نازل ہونے والے فرشتوں کے عمامے سفید اور غزوۂ حنین میں مدد کے لیے آنے والے فرشتوں کے عمامے سُرخ تھے۔

آخری آیت میں ارشاد فرمایا وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ اس میں مسلمانوں کو تنبیہ فرمادی کہ جو مدد بھی کہیں سے ملتی ہے، خواہ ظاہری صورت سے ہو یا مخفی انداز سے سب اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہے، اسی کے قبضے میں ہے، فرشتوں کی مدد بھی اسی کے تابع فرمان ہے، اس لیے تمہاری نظر صرف اسی ذات وحدہٗ لاشریک لہٗ کی طرف رہنی چاہیے کیونکہ وہ بڑا قدرت والا اور حکمت والا ہے۔

اِذْ يُغَشِّيْكُمُ النُّعَاسَ اَمَنَةً مِّنْهُ وَيُنَزِّلُ عَلَيْكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً

یاد کرو اس وقت کو جبکہ اللہ نے طاری کر دی تم پر نیند اپنی طرف سے اطمینان کے طور پر، اور اللہ اُتارتا تھا تم پر آسمان سے پانی

لِّيُطَهِّرَكُمْ بِهٖ وَيُذْهِبَ عَنْكُمْ رِجْزَ الشَّيْطٰنِ وَلِيَرْبِطَ عَلٰى قُلُوْبِكُمْ

تا کہ اس کے ذریعے سے تمہیں صاف ستھرا کرے اور تا کہ تم سے شیطان کی پلیدی کو دُور کر دے اور تا کہ تمہارے دِلوں کو مضبوط کر دے

وَيُثَبِّتَ بِهِ الْاَقْدَامَ ﴿۱۱﴾ اِذْ يُوْحِيْ رَبُّكَ اِلَى الْمَلٰٓئِكَةِ اَنِّيْ مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا

اور تا کہ اس کے ذریعے سے تمہارے قدم جمادے ﴿۱۱﴾ جب حکم بھیجتا تھا آپ کا رَبّ فرشتوں کو کہ میں تمہارے ساتھ ہوں، تم مضبوط رکھو

الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ سَاُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ فَاضْرِبُوْا فَوْقَ الْاَعْنَاقِ

مؤمنوں کو، میں عنقریب ڈال دُوں گا کافروں کے دِلوں کے اندر رُعب، مارو ان کی گردنوں پر

وَاضْرِبُوْا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ ﴿۱۲﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ شَآقُّوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۚ وَمَنْ يُّشَاقِقِ

اور مارو ان سے ہر پور پور کو ﴿۱۲﴾ یہ اس سبب سے ہے کہ انہوں نے مخالفت کی اللہ کی اور اللہ کے رسول کی، اور جو کوئی اللہ اور اللہ

اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۱۳﴾ ذٰلِكُمْ فَذُوْقُوْهُ وَاَنَّ

کے رسول کی مخالفت کرتا ہے پس بیشک اللہ تعالیٰ سخت سزا والا ہے ﴿۱۳﴾ اس کا مزہ تو چکھ لو، اور (جان لو کہ)

لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابَ النَّارِ ﴿۱۴﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِيْتُمُ

کافروں کے لیے جہنّم کا عذاب ہے ﴿۱۴﴾ اے ایمان والو جس وقت ٹکر لگ جائے تمہاری

الَّذِيْنَ كَفَرُوْا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوْهُمُ الْاَدْبَارَ ﴿۱۵﴾ وَمَنْ يُّوَلِّهِمْ

کافروں کے ساتھ اس حال میں کہ تم ایک دوسرے کے سامنے ہو تو ان کی طرف پیٹھ نہ پھیرا کرو ﴿۱۵﴾ جو کوئی ان کی طرف اس دِن

يَوْمَئِذٍ دُبُرَهٗٓ اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَيِّزًا اِلٰى فِئَةٍ

پیٹھ پھیرے گا، سوائے اس شخص کے جو کہ جنگ کے لئے کوئی کرتب اختیار کرنے والا ہے یا اپنی جماعت کی طرف ٹھکانا لینے والا ہے،

فَقَدْ بَآءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۱۶﴾

(اس کے علاوہ جو کوئی پیٹھ پھیرے گا) پس وہ لوٹے گا اللہ کے غضب کے ساتھ اور اس کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بُرا ٹھکانا ہے ﴿۱۶﴾

فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ ۪ وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ

تم نے انہیں قتل نہیں کیا، لیکن اللہ نے انہیں قتل کیا، اور آپ نے (مٹی) نہیں پھینکی جب آپ نے پھینکی

وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى ۚ وَلِيُبْلِيَ الْمُؤْمِنِيْنَ مِنْهُ بَلَآءً حَسَنًا ؕ اِنَّ

لیکن اللہ نے پھینکی اور تاکہ اللہ مؤمنین پر اپنی طرف سے بہترین انعام کرے، بے شک

اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۷﴾ ذٰلِكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ مُوْهِنُ كَيْدِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۸﴾

اللہ تعالیٰ سننے والا جاننے والا ہے ﴿۱۷﴾ یہ بات ہو چکی، اور یہ بات تو ہے ہی کہ اللہ کافروں کی تدبیروں کو کمزور کرنے والا ہے ﴿۱۸﴾

اِنْ تَسْتَفْتِحُوْا فَقَدْ جَآءَكُمُ الْفَتْحُ ۚ وَاِنْ تَنْتَهُوْا فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ

اگر تم فیصلہ چاہتے ہو تو فیصلہ تمہارے پاس آگیا ہے، اگر تم باز آجاؤ تو یہی تمہارے لیے بہتر ہے

وَاِنْ تَعُوْدُوْا نَعُدْ ۚ وَلَنْ تُغْنِيَ عَنْكُمْ فِئَتُكُمْ شَيْئًا وَّلَوْ كَثُرَتْ ۙ

اگر تم عود کرو گے تو ہم بھی عود کریں گے، اور ہرگز فائدہ نہیں پہنچائے گی تمہیں تمہاری جماعت کچھ بھی اگرچہ زیادہ ہی ہو

وَاَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۹﴾

اور یہ واقعہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مؤمنوں کے ساتھ ہے ﴿۱۹﴾

تفسیر

ماقبل سے مذکورہ آیات کا ربط

سورۂ انفال کے شروع سے اللہ تعالیٰ کے ان انعامات کا بیان ہو رہا ہے، جو اُس کے فرمانبردار بندوں پر مبذول ہوئے، غزوۂ بدر کے واقعات بھی اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں، غزوۂ بدر میں جو انعامات حق تعالیٰ کی طرف سے عطا ہوئے، اُن میں سے پہلا

انعام تو خود اس جہاد کے لیے مسلمانوں کو نکالنا ہے جس کا بیان آیت کَمَآ اَخۡرَجَکَ رَبُّکَ میں ہوا ہے، دوسرا انعام فرشتوں کی مدد کا وعدہ ہے جس کا ذکر آیت اِذۡ یَعِدُکُمُ اللّٰہُ میں آیا ہے، تیسرا انعام دعا کی قبولیت اور مدد کا وعدہ پورا کرنا ہے جس کا ذکر آیت اِذۡ تَسۡتَغِیۡثُوۡنَ رَبَّکُمۡ میں ہوا ہے، مذکورہ آیات میں سے پہلی آیت میں چوتھے انعام کا تذکرہ ہے، جس میں مسلمانوں کے لیے دو نعمتوں کا ذکر ہے ایک سب پر نیند غالب آ کر پریشانی اور تھکان کا دور ہو جانا، دوسرا بارش کے ذریعہ اُن کے لیے پانی مہیا فرمانا، اور میدانِ جنگ کو اُن کے لیے ہموار اور دشمن کے لیے دلدل بنا دینا۔

قیامِ میدانِ بدر کے متعلق صحابہ رضی اللہ عنہم کے مفید مشورے

تفصیل اس واقعے کی یہ ہے کہ جس وقت کفر و اسلام کا یہ پہلا معرکہ ٹھن گیا تو کفارِ مکہ کا لشکر پہلے پہنچ کر ایک ایسے مقام پر پڑاؤ ڈال چکا تھا جو اونچائی پر تھا، پانی اُس کے قریب تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس جگہ پہنچے تو وادی کے نچلے حصہ میں جگہ ملی، قرآنِ کریم نے میدانِ جنگ کا نقشہ اِسی سورت کی بیالیسویں آیت میں اس طرح کھینچا ہے اِذۡ اَنۡتُمۡ بِالۡعُدۡوَۃِ الدُّنۡیَا وَهُمۡ بِالۡعُدۡوَۃِ الۡقُصۡوٰی جس کا مفصل بیان بعد میں آئے گا، جس جگہ پہنچ کر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اوّل قیام فرمایا، اس مقام کے واقف کار حضرت حباب بن منذر رضی اللہ عنہ نے اس کو جنگی اعتبار سے نامناسب سمجھ کر عرض کیا کہ یا رسول اللہ! جو مقام آپ نے اختیار فرمایا ہے کیا یہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہے، جس میں ہمیں کوئی اختیار نہیں یا محض رائے اور مصلحت کے پیشِ نظر اختیار فرمایا گیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ نہیں یہ کوئی حکمِ خداوندی نہیں، اس میں تغیر تبدل کیا جا سکتا ہے، تب حضرت حباب بن منذر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ پھر تو بہتر ہے، کہ اس مقام سے آگے بڑھ کر مکہ سرداروں کے لشکر کے قریب ایک پانی کا مقام ہے، اُس پر قبضہ کیا جائے وہاں ہمیں پانی اِفراط کے ساتھ مل جائے گا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کا مشورہ قبول فرمایا اور وہاں جا کر پانی پر قبضہ کیا، ایک حوض پانی کے لیے بنا کر اس میں پانی کا ذخیرہ جمع فرمایا، اس سے مطمئن ہونے کے بعد حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یا رسول اللہ! ہمارا خیال یہ ہے کہ ہم آپ کے لیے ایک سایہ بان کسی محفوظ جگہ میں بنا دیں، جہاں آپ مقیم رہیں، اور آپ کی سواریاں بھی آپ کے پاس رہیں، منشا اس کا یہ ہے کہ ہم دشمن کے مقابلے میں جہاد کریں گے، اگر اللہ تعالیٰ نے ہمیں فتح نصیب فرمائی تو یہی مقصد ہے، اور اگر خدانخواستہ کوئی دوسری صورت ہو تو آپ اپنی سواری پر سوار ہو کر ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ جا ملیں جو مدینہ طیبہ میں رہ گئے، کیونکہ میرا گمان یہ ہے کہ وہ لوگ بھی جاں نثاری، اور آپ سے محبت میں ہم سے کم نہیں، اور اگر اُن کو آپ کے نکلنے کے وقت یہ خیال ہوتا کہ آپ کا اس مسلح لشکر سے مقابلہ ہوگا، تو اُن میں سے کوئی بھی پیچھے نہ رہتا، آپ مدینہ میں پہنچ جائیں گے تو وہ آپ کے رفیق کار رہیں گے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کی جاں بازانہ پیش کش پر دُعائیں دیں، اور ایک مختصر سا سایہ بان آپ کے لیے بنا دیا گیا اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کے سوا کوئی نہ تھا، حضرت معاذ رضی اللہ عنہ دروازے پر حفاظت کے لیے تلوار لیے کھڑے تھے، معرکے کی پہلی رات تھی، تین سو تیرہ بے سامان لوگوں کا مقابلہ اپنے سے تین گنا تعداد یعنی ایک ہزار مسلح فوج سے تھا، میدانِ جنگ کا

بھی اچھا مقام اُن کے قبضے میں آچکا تھا، نچلا حصہ وہ بھی سخت ریتیلا تھا جس میں چلنا دُشوار مسلمانوں کے ہاتھ آیا تھا، طبعی پریشانی اور فکر سب کو تھی۔

معرکۂ بدر کی پہلی شب صحابہ رضی اللہ عنہم پر امن وسکون اور نیند کا طاری ہونا

تو[1] صورت حال یہ ہے جو آپ کے سامنے پیش کی جارہی ہے کہ ظاہری اسباب سارے کے سارے خلاف ہیں، اور ایسے وقت میں کسی کو نیند نہیں آسکتی، رات کو اگر کوئی شخص سو یا نہ ہو اور پریشانی میں سارے کا سارا وقت گزر جائے، تو صبح اتنے بڑے لشکر کے ساتھ مقابلہ اور لڑائی کس طرح سے ہوگی؟ اعصاب ڈھیلے ہوجائیں گے، ذہن کام ہی نہیں کرے گا، انسان قدم رکھے گا کہیں اور پڑے گا کہیں، کہنا کچھ چاہے گا منہ سے نکلے گا کچھ، ایک بدحواسی کی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے اگر انسان کو نیند نہ آئے اور پریشانی کے اندر ساری رات گزری ہو۔ تو یہ اللہ تعالیٰ کا خاص انعام ہوا کہ جب ان حالات میں یہ لوگ بدر کے اندر ٹھہرے ہوئے تھے، رات کو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی فوج پر اطمینان، امن اور سکون اُتارا، اور سب کو نیند آگئی اور سکون کے ساتھ سو گئے، اس رات میں سارے لوگوں کو نیند آئی سوائے سرورِ کائنات ﷺ اور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے، یہ حضرات ساری رات اللہ تعالیٰ کے سامنے ہاتھ پھیلائے ہوئے تھے، اور آپ جانتے ہیں کہ قائد جو ہوتا ہے عام حالات میں بھی اس کا حوصلہ، اس کی بیداری اور اس کی تدبیر یہی جان ہوتی ہے ساری قوم کی، اللہ تعالیٰ کے ساتھ ربط اگر قائد کا مضبوط ہے اور قوم پیچھے چلنے والی ہو تو اللہ تعالیٰ کی نصرت شامل حال ہوتی ہے، تو قوم نے تو لڑنا تھا عملاً، اس لیے اُن کو تو سلا دیا، اور سرورِ کائنات ﷺ کی معرفت اللہ تعالیٰ کی امداد آنی تھی، وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے ہاتھ پھیلائے بیٹھے ہیں، انہوں نے رات اس طرح سے گزار دی، تو یہ اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا اِنعام ہوا کہ اس میدان کے اندر مسلمانوں کی فوج پر اللہ نے نیند طاری کردی۔ ''نعاس'' اگرچہ ہلکی سی نیند کو کہتے ہیں۔ جس کو آپ ''اونگھ'' کہتے ہیں، لیکن یہ جاننے والے جانتے ہیں کہ ایسے حالات میں اونگھ ہی آیا کرتی ہے، ہلکی سی نیند ہی آیا کرتی ہے، ہلکی سی نیند آجائے تو وہ بھی اللہ کی بہت بڑی نعمت ہوتی ہے، باقی میدانِ جنگ کے اندر غفلت کی نیند سو جانا کہ ہوش ہی کوئی نہ ہو کہ کہاں پڑے ہیں کہاں نہیں پڑے، یہ حالات کا تقاضا نہیں ہوتا، اتنی سی نیند اللہ نے ڈال دی کہ اگر ہوشیار ہونا پڑے تو فوراً ہوشیار بھی ہوجائیں، اور دماغ کی تھکاوٹ بھی اُتر گئی اور اعصاب بھی سکون پکڑ گئے، ایک تو یہ اللہ نے اِنعام کیا جس کے ساتھ مسلمانوں کی یہ فوج تازہ دم ہوگئی، نیند آنے کے ساتھ پریشانیاں بھی ختم ہوگئیں، اور تھکاوٹ بھی کسی درجے میں دُور ہوگئی۔

میدانِ بدر میں دُوسرا اِنعام

اور پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے رات کو زوردار بارش آگئی، جب زوردار بارش آگئی تو اس سے میدان جنگ کا نقشہ بالکل پلٹ گیا کہ جدھر کفار ٹھہرے ہوئے تھے، انہوں نے وہ جگہ مضبوط سی دیکھ کے جس میں ریت زیادہ نہیں تھی وہ جگہ اپنے لیے تجویز کی تھی، اب بارش کے آنے کا اثر یہ ہوا کہ وہاں دلدل ہوگیا، اور کیچڑ ہوگیا، گارا ہوگیا جس میں چلنا پھرنا مشکل ہوگیا۔ اور جو جگہ

(۱) یہاں سے حضرت حکیم العصر کی تقریر ہے۔

مسلمانوں کے حصے میں آئی تھی وہ ریتلی تھی، اور ریت والی جگہ پر بارش ہوجائے تو وہ جم جاتی ہے، وہاں چلنا پھر آسان ہوگیا، اور بارش کی وجہ سے گڑھوں کے اندر پانی جمع ہوگیا، جس وقت پانی جمع ہوگیا تو وضو کی، غسل کی اور ہر چیز کی سہولت مہیا ہوگئی، اپنے پینے کے لیے بھی مل گیا، جانوروں کے پینے کے لیے بھی مل گیا، اور ادھر رسول اللہ ﷺ کی معرفت اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو بشارتیں آئیں تو اُس کے ساتھ دل اور مضبوط ہوگیا، اب یہ باطنی طور پر اس قسم کے اسباب مہیا ہونے لگ گئے، جس سے کفار کے حوصلے پست ہونے شروع ہوگئے اور مسلمانوں کے حوصلے بڑھنے شروع ہوگئے، اس آیت کے اندر اللہ تعالیٰ نے پہلے ان انعامات کا ذکر کیا ہے۔

نصرتِ خداوندی کے واقعات یاد رکھنے کا مقصد

اِذْ يُغَشِّيْكُمُ النُّعَاسَ اَمَنَةً: اس کا ترجمہ یہ جو کیا جاتا ہے کہ ''یاد کیجئے اس وقت کو'' اس کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ یہ وقت یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اللہ کی امداد کس طرح سے آئی تھی، اور یاد رکھو گے تو پھر فائدہ کیا ہوگا؟ کہ آئندہ کے لیے بھی جب اس قسم کے حالات ہوجائیں گے چاہے اُس وقت نبی ساتھ نہ ہو جو قطعی طور پر تمہیں اطلاع دے دے کہ اللہ کی طرف سے یہ فیصلہ ہوگیا، لیکن ان واقعات کو اگر یاد رکھو گے تو ان کو یاد رکھنے کے ساتھ اللہ کی نصرت پہ اعتماد ہوگا، اور آئندہ بھی تمہارے دل مضبوط رہیں گے، اسی مضمون کو کسی اردو شاعر نے ان الفاظ میں بند کیا ہے:

فضائے بدر پیدا کر فرشتے تیری نصرت کو اُتر سکتے ہیں گردوں سے قطار اندر قطار اَب بھی

کہ اللہ تعالیٰ کی نصرت صرف یہ نہیں کہ اسی میدان کے ساتھ خاص تھی، نہیں، فضائے بدر پیدا کر، حق اور باطل کھل کر سامنے آجائے، حق کی حمایت میں اہلِ حق کھڑے ہوجائیں، اور اپنی وسعت کے مطابق ہر قسم کے اسباب مہیا کرلیں جو اپنی وسعت میں ہیں، اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ کے سامنے ہاتھ پھیلا دیں کہ یا اللہ! ہم سے تو یہ ہوسکتا تھا ہم نے کرلیا، اب تو ہماری مدد کر، جتنی جانبازی کرسکتے تھے کرلی، اپنی طرف سے کوئی کمی نہیں چھوڑی، تو اللہ تعالیٰ کی نصرت آج بھی آسکتی ہے۔

تو یاد رکھنے کے قابل ہے یہ وقت، میں اس کا مفہوم ان الفاظ میں ادا کرتا ہوں، یعنی تمہیں کہا ہے یہ وقت یاد رکھنے کے قابل ہے، اس وقت کو یاد رکھو، یاد کرو اس وقت کو جب کہ اللہ نے طاری کردی تم پر نیند اَمَنَةً مِّنْهُ: اپنی طرف سے اطمینان کے طور پر، وَيُنَزِّلُ عَلَيْكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً: اور اللہ اتارتا تھا تم پر آسمان سے پانی۔ آسمان سے پانی اتار دیا، اب آسمان سے پانی اُتار لینا کسی کے بس کی بات نہیں ہے، نہر سے بھر لاؤ، دریا سے بھر لاؤ یہ تو ظاہری اسباب کے تحت ہوتا ہے، لیکن آسمان سے پانی اُترنا بالکل اسباب کے خلاف ہے، اور بالکل اللہ کے اختیار سے ہے، کسی بندے کے اختیار سے نہیں، یعنی دنیا میں ظاہری طور پر جو پانی لینے کے اسباب تھے وہ تو کفار کے قبضے میں آگئے، اب تمہارے بس میں نہیں تھا کہ تم پانی حاصل کرلو۔ اللہ تعالیٰ نے براہِ راست آسمان سے اتار دیا، اُس کی قدرت سے کیا چیز بعید ہے۔

میدانِ بدر میں بارش نازل کرنے کے مقاصد

پانی کیوں اُتارا تھا؟ لِيُطَهِّرَكُمْ بِهٖ: تاکہ اُس کے ذریعے سے تمہیں صاف ستھرا کرے، کیونکہ ایمان کے تقاضوں میں سے

ایک تقاضا ہے کہ انسان صاف ستھرا رہے، صاف ستھرا رہنے میں استنجا کرنا ہے، وضو کرنا ہے، غسل کی ضرورت پیش آجائے تو غسل کرنا ہے، یہ سب ظاہری اور باطنی طہارت ہیں۔ وَيُذْهِبَ عَنْكُمْ رِجْزَ الشَّيْطٰنِ اور تاکہ اللہ تعالیٰ تم سے شیطان کی پلیدی دُور کردے، شیطان کی پلیدی سے وہی شیطان کے وسوسے مراد ہیں، کیونکہ یہ قاعدہ ہے کہ جتنا انسان ظاہری طور پر نجس یا ناپاک ہو، اتنا ہی شیطان کا تسلط اور شیطان کے وسوسے زیادہ آتے ہیں، اور جتنا انسان طہارت کے ساتھ رہے گا اتنا شیطان کے وسوسوں سے بچتا ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ شیطان جو دل میں وسوسے ڈال رہا تھا، کہ یہاں تو پیاسے مروگے، پانی نہیں ملے گا، کیا کروگے، اس طرح سے دلوں میں وسوسے ڈال ڈال کے دلوں کو پریشان کررہا تھا، اب کیا وسوسہ ڈالے گا جب کہ پانی گڑھوں کے اندر بھر گیا، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے بارش ہوگئی، پانی کی فراوانی ہوگئی، تو یہ سارے کے سارے وسوسے ختم ہوگئے۔ ''اور تاکہ اللہ تمہارے دلوں کو مضبوط کردے'' یہ نیند کا اثر بھی تھا کہ نیند کے اثر سے دل مضبوط ہوگئے، اور جب یہ واقعات سامنے آئیں گے کہ اللہ تعالیٰ کی غیبی نصرت کس طرح سے آرہی ہے، تو اس سے بھی تو دل مضبوط ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہماری نصرت کس طرح سے فرمارہے ہیں۔ ''اور تاکہ تمہارے قدم جمادے'' اس کا تعلق بھی دونوں کے ساتھ ہوسکتا ہے، کہ تمہیں سلا اس لیے دیا تاکہ صبح ڈٹ کے لڑو، اور اگر یہ نیند نہ آتی اور پریشانیاں ہوتیں تو تم ڈٹتے کیسے؟ یہ تو باطنی حیثیت ہے کہ اللہ نے یہ اسباب مہیا کرکے تمہارے دلوں کو پختہ کردیا، اور ایک ظاہری حیثیت بھی ہے کہ تمہارے پاؤں ریت میں دھنستے پھرتے تھے، چلنے کی ہمت طاقت نہیں تھی، ریتلے علاقے میں کبھی گئے ہوں گے تو آپ کو معلوم ہوگا، ٹیلوں پر اگر کہیں چلنا پڑ جائے تو انسان کے پاؤں دھنستے ہیں، چلنا مشکل ہوتا ہے، پاؤں جمتے نہیں ہیں، جہاں رکھو پاؤں نیچے کو جاتا ہے، تو بارش آ کے ریت میں جو جم گئی تو قدم جم گئے، تو یہ بات بھی ہوگئی۔

غزوۂ بدر میں فرشتوں کی فوج براہِ راست اللہ تعالیٰ کی کمان میں

اِذْ يُوْحِيْ رَبُّكَ اِلَى الْمَلٰٓئِكَةِ: اور یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ آپ کا رَبّ حکم بھیجتا تھا فرشتوں کی طرف۔ اب یہ فرشتوں کی فوج چونکہ براہِ راست اللہ تعالیٰ کی کمان میں تھی، جس طرح ظاہری فوج ظاہری کمانڈر کے تحت ہوتی ہے، اور وہ انہیں اَحکام دیتا ہے، اور اَحکام کے تحت اس کو لڑاتا ہے، تو فرشتوں کی فوج براہِ راست اللہ تعالیٰ کی کمان میں تھی، اس لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُن کا اَحکام آرہے ہیں، یہ جو میدان میں اترے تھے جن کا ذکر پچھلے رکوع میں آیا تھا، کہ ایک ہزار اللہ نے اُتار دیے۔ حکم بھیجتا تھا آپ کا رَبّ فرشتوں کی طرف اَنِّيْ مَعَكُمْ کہ میں تمہارے ساتھ ہوں فَثَبِّتُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا: تم ثابت رکھو، مضبوط رکھو مؤمنوں کو، یعنی تمہارا فرض یہ ہے کہ تم مؤمنوں کے قلب کو قوت پہنچاؤ، کیونکہ لڑنا تو ظاہری طور پر مؤمنوں نے ہے، اور اللہ تعالیٰ کی امداد جو ظاہر ہوتی ہے تو وہ ظاہری اسباب کے پردے میں ہی ظاہر ہوتی ہے، تو یہ فرشتے دلوں کو مضبوط رکھیں گے، مؤمنوں کے دل تو مضبوط ہوجائیں گے فرشتوں کی دُعا کے ساتھ، فرشتوں کی توجہ کے ساتھ اور فرشتوں کی رفاقت کے ساتھ۔ یہ ہمیشہ قاعدہ ہوتا ہے بھئی! آپ نے دیکھا ہوگا کہ جس وقت دو کا آپس میں مقابلہ ہو، ایک آدمی تو ایسا ہو جس کو شاباش شاباش کرنے والے بہت ہوں، اور ایک آدمی ایسا ہو کہ اس کو زندہ باد کہنے والا، ''ہمت کرو، زور لگاؤ، شاباش'' اس طرح سے کہنے والا کوئی نہ ہو، تو دونوں کی قوت میں

بڑا فرق پڑ جاتا ہے، یعنی دو بچوں کو کشتی کرادو، ایک بچے کی حوصلہ افزائی کرنے والے بہت سارے ہوں، تو اس کی ہمت بڑھتی ہے، کیونکہ اصل جو لڑنا بھڑنا ہے وہ سارے کا سارا دِل کی قوت سے ہے، تو دِل کی قوت اگر ہو تو انسان کی ہمت بلند ہوتی ہے، اور حوصلہ بڑھ جاتا ہے، اور اگر دِل میں قوت نہیں تو حوصلہ چھوٹ ہوجاتا ہے، تو یہ ظاہری تھپکانا اور شاباش دینا اور حوصلہ بڑھانا یہ ایک بہت بڑی بات ہے جنگ اور مقابلے کے اندر۔ اب مؤمنوں کا حوصلہ بڑھانے کے لیے تو فرشتے آگئے، اور کافر جن پر تکیہ لگائے بیٹھے تھے جن سے مددیں مانگ کے آئے تھے وہ کیا کرتے؟ ان میں تو کوئی ہمت اور طاقت نہیں ہے کہ کسی کو مدد سے سکیں، اس لیے ان کے دِل چھوٹ گئے، ان کے دِل کو قوت نہیں ہے، یعنی مشرک کا سہارا چونکہ ظاہری معبودوں پہ ہوتا ہے جو خود بے طاقت ہیں، اس لیے جب اس قسم کا موقع آتا ہے تو مشرک دل چھوڑ دیتا ہے، اُس کے دِل میں قوت نہیں ہوتی، مؤمن کے دل میں قوت ہوتی ہے۔

مشرکینِ مکہ کے دِلوں پہ رُعب اور ان کو گاجر مولی کی طرح کاٹنے کا حکم

اس کے نتیجے میں مشرکوں پر رُعب پڑا، اور جس وقت رُعب پڑتا ہے تو حوصلہ چھوٹ جاتا ہے، اور جس وقت حوصلہ چھوٹ جاتا ہے پھر چاہے کتنا ہی اسلحہ کسی فوج کے پاس کیوں نہ ہو، جب فوجیوں کے دِل چھوٹ گئے تو وہی اسلحہ دشمن کے لیے چھوڑ کے سارے بھاگ جاتے ہیں، اور وہ اسلحہ اُلٹا دشمن کے کام آتا ہے، جس وقت کسی فوج کے میدان سے قدم اکھڑ جائیں اور وہ حوصلہ چھوڑ دے تو اسلحہ کسی کام نہیں آتا، بے جان چیز خود نہیں لڑسکتی، لڑنا ہوتا ہے جانداروں نے، انسانوں نے، اور انسانوں نے لڑنا ہے حوصلے سے اور دِل کی مضبوطی سے، اور اگر یہ دِل ہی اندر سے ہل گیا تو قدم نہیں ٹک سکتے، اور اسلحہ سارے کا سارا میدان میں پڑا رہ جائے گا اور فوج بھاگ جائے گی۔ تو یہاں وہی صورت پیش آئی کہ اللہ تعالیٰ فرشتوں کو کہتا تھا کہ تم نے تو مؤمنوں کو مضبوط رکھنا ہے، یہ تو مؤمنین کی حوصلہ افزائی ہے۔ ''اور میں عنقریب ڈال دُوں گا کافروں کے دِلوں کے اندر رُعب'' جب اُن پہ رُعب پڑ جائے گا، وہ مرعوب ہوجائیں گے، حوصلہ چھوٹ جائے گا، ان کے ہاتھ پاؤں کام ہی نہیں دیں گے، جب ہاتھ پاؤں کام نہیں دیں گے تو پھر حال یہ ہوجائے گا کہ مارو اُن کی گردنوں پر اور مارو اُن کے ہر پور کو، یعنی اس طرح سے تمہارے بس میں آجائیں گے کہ تمہاری مرضی اُن کی گردنیں کاٹو، تمہاری مرضی ان کے سرین کوٹو، پھر ہر طرح سے تمہارے بس میں ہوں گے، اور یہی حال ہوا، یعنی ہر ہر جگہ مارو جہاں تمہارا جی چاہے، ان کے گھٹنے توڑو، ان کے ٹخنے توڑو، ان کی گردنوں پر مارو، ان کے کندھے اتاردو، ان کے بدن کا ہر ہر حصہ تمہارے قابو میں ہوگا، اور ایسے ہی ہوا، کہ جس وقت اندر سے ان کے دِل چھوٹے پھر جس طرح سے پٹائی ہوسکتی تھی اسی طرح سے پٹائی ہوئی۔ ''مارو ان کی گردنوں پر'' یہ بڑے بڑے جو مسلح ہو کے آئے ہیں ان کو گاجر مولی کی طرح کاٹ کے رکھ دو، ان کے بدن کا کوئی حصہ نہ بچے، ان کے ہر ہر حصے پہ مارو، ان کا جوڑ جوڑ توڑ دو۔ فَاضْرِبُوْا: مارو گردنوں پر، اور مارو ان سے ہر پور پور کو۔ پور پور کو مارنے کا مطلب یہ ہے کہ ان کا سارا بدن تمہارے کنٹرول میں ہے، اب جہاں سے چاہو ان کی پٹائی کرو، اور یہ بالکل تمہارے بس میں ہیں۔

مشرکوں کی رُسوائی کی وجہ اور کافروں کو تنبیہ

اور یہ ان کی رسوائی کیوں ہوئی؟ اتنی تعداد اور اتنے سامان کے باوجود یہ کیوں پٹ گئے؟ اس لیے پٹ گئے کہ انہوں نے مقابلہ ٹھانا اللہ اور اللہ کے رسول سے، اور انسان کے اندر فطری طور پر اللہ اور اللہ کے رسول سے لڑنے کا کوئی جواز نہیں ہے، اس لیے اس لڑائی کی بنیاد بہت کمزور ہے، جب لڑائی کی بنیاد کمزور ہے تو کس حوصلے سے لڑ سکتے ہیں۔'' یہ اس سبب سے ہے کہ انہوں نے مخالفت کی اللہ اور اللہ کے رسول کی، اور جو کوئی اللہ اور اللہ کے رسول کی مخالفت کرتا ہے اِنَّ اللّٰہَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ وہ یونہی پٹتا ہے جس طرح سے یہ پٹے، پس بے شک اللہ تعالیٰ سخت سزا والا ہے۔''

آگے کافروں کو یہ تنبیہ ہے ذٰلِکُمْ فَذُوْقُوْهُ: یہ تو لو، اس کا مزہ تو چکھ لو جو تمہارے سامنے آ گیا، اور یہ بات یاد رکھو کہ جہنم کا عذاب آگے کھڑا ہے، یہ نہیں کہ صرف دُنیا میں تمہاری رُسوائی یا پٹائی ہوئی، آخرت کا عذاب سر پہ ہے، وَاَنَّ لِلْکٰفِرِیْنَ عَذَابَ النَّارِ: وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ لِلْکٰفِرِیْنَ عَذَابَ النَّارِ کافروں کے لیے جہنم کا عذاب ہے۔ ذٰلِکُمْ فَذُوْقُوْهُ کا معنی یہ ہے کہ یہ نقد لے لو، اس کا مزہ تو چکھ لو، یہ تو تمہارے سامنے آ گیا، اس کا تو مشاہدہ کر لو، اور اگلے کی خبر سُن لو! جہنم کا عذاب کافروں کے لیے ہے۔

جنگ سے بھاگنے کی حُرمت کا تعلق چھاپہ مار جنگ کے ساتھ نہیں

اب آگے اہلِ ایمان کو جنگی طور پر کچھ ہدایات دی جا رہی ہیں، جنگ کرنے کے اصل میں اس وقت بھی دو اُصول تھے، ایک ہے جس کو آج کی اِصطلاح میں ''گوریلا وَار'' کہتے ہیں، اُردو کے اندر جس کو ''چھاپہ مار جنگ'' کہتے ہیں، ''گوریلا وَار'' اور ''چھاپہ مار جنگ'' دونوں کا ایک ہی مطلب ہے، یہ کوئی باقاعدہ لڑائی نہیں ہوتی، بس دو دو چار چار آدمی، چالیس چالیس پچاس پچاس آدمی گروہوں کی شکل میں مختلف جگہوں میں چھپے رہتے ہیں، جنگلات میں چھپ جاتے ہیں، غاروں میں چھپ جاتے ہیں، گھاٹیوں میں چھپ جاتے ہیں، اور جہاں دُشمن کو نقصان پہنچانے کا موقع ملا، رات کی تاریکی میں، یا کسی وقت بھی، بس یکدم حملہ کر کے نقصان پہنچایا اور بھاگ گئے، اور جا کے پھر اپنی کمین گاہوں میں چھپ گئے، یہ گوریلا جنگ ہے، اور آج بھی یہ جنگ جاری ہے اور اُس وقت بھی، جسے چھاپہ مار جنگ کہتے ہیں کہ چھاپہ مارا، دُشمن کو نقصان پہنچایا اور بھاگ گئے، اور جا کے اپنی جگہ چھپ گئے، وہاں میدان میں ڈٹ کے لڑنا نہیں ہوتا، وہ کوئی باقاعدہ فوجوں کی لڑائی نہیں ہوتی، وہ موقع تلاش کر کے انسان نقصان پہنچاتا ہے، نقصان پہنچایا اور بھاگ گئے، (ان آیات میں جو ہدایات ہیں) یہ ہدایات اس چھاپہ مار جنگ کے متعلق نہیں ہیں۔ اور ایک ہوتی ہے باقاعدہ فوجوں کی آمنے سامنے لڑائی، کہ دُشمن بھی اپنی فوجیں لے آیا، اور اِدھر سے بھی فوجیں آ گئیں، صف بندی ہو گئی، یہ ہے میدان کے اندر لڑائی، یہ ہوتی ہے کسی آئین اور قانون کے تحت، جس کی پابندی دُشمن بھی کرتا ہے اور جس کی پابندی اپنے آپ کو بھی کرنی پڑتی ہے، یہ ہدایات اس کے متعلق دی جا رہی ہیں، اس لیے یہاں زَحْفًا کا لفظ ہے، مطلقاً لڑائی کی یہ بات نہیں کہ میدان سے بھاگا نہ کرو، چھاپہ مار جنگ کا تو اصول یہی ہے کہ بم پھینکو اور بھاگ جاؤ، اور جہاں کسی کو موقع ملا آگ لگاؤ اور بھاگ جاؤ، اس میں صرف اس طرح سے چھپ چھپا کے دُشمن کو نقصان پہنچانا مقصود ہوتا ہے، کارروائی کی اور دوڑ گئے، وہ چھاپہ مار

جنگ کا طریقہ اور ہے۔ صحابہ کرام ﷺ کے زمانے میں یہ جنگ بھی تھی، اور آج بھی دنیا کے اندر ہے، بلکہ لمبی جنگیں چھاپہ مار اُصول سے ہی جیتی جاتی ہیں، جیسے آج کل آپ سنتے ہیں کہ مجاہدینِ افغانستان چھاپہ مار جنگ لڑ رہے ہیں، اور برسہابرس تک ویت نام کے اندران لوگوں نے چھاپہ مار جنگ لڑی، اور فلسطینی کتنے سالوں سے یہی چھاپہ مار جنگ ہی لڑ رہے ہیں، کیونکہ آمنے سامنے کی میدان کی جولڑائی ہوتی ہے اس کا فیصلہ چند دِنوں اور چند ہفتوں میں ہوسکتا ہے، کہ ایک فوج فنا ہوگئی اور دوسری فوج غالب آگئی، میدان دوسرے نے مارلیا، جب کہ چھاپہ مار جنگ میں تو سارا ملک ہی میدانِ جنگ ہے، پتا نہیں کدھر سے آ کے کسی نے آگ لگا دینی ہے، کدھر سے آ کے کسی نے گولی چلا دینی ہے، کدھر سے آ کے کسی نے بم پھینک جانا ہے، یہاں کوئی میدان نہیں ہوتا جس کو کہیں کہ اس فوج نے میدان مارلیا ہے یا اس میدان سے فلاں فوج بھاگ گئی، طویل جنگیں ہمیشہ چھاپہ مار اُصول سے چلتی ہیں، مظلوم قومیں جن کے اوپر زیادہ طاقتور قوم مسلط ہوجاتی ہے جن کا وہ سامنے کھڑے ہوکر مقابلہ نہیں کر سکتے، تو اُن کے ساتھ جنگ ہمیشہ اِس دور میں بھی چھاپہ مار ہی لڑی جاتی ہے، جس کو گوریلا وار کہتے ہیں، فلسطین میں یہی ہو رہا ہے، افغانستان میں یہی ہو رہا ہے، اور اسی طرح بعض دوسرے ملکوں میں بھی جہاں کوئی زیادہ قوت اوپر مسلط ہے، تو کمزور قسم کے لوگ چھاپہ مار اصول کے ساتھ ہی دُشمن کو نقصان پہنچاتے ہیں، تو یہ اُصول اس کے متعلق نہیں ہے۔

دُشمن کے مقابلے میں میدان چھوڑنے کی اجازت کب ہے اور کب نہیں؟

یہ ہے جب لشکر ایک دوسرے کے بالمقابل آجائیں، اور دوبدو لڑائی ہو، اس وقت پھر مؤمنوں سے کہا جا رہا ہے کہ دیکھو! اللہ تمہارے ساتھ، فرشتے تمہارے ساتھ، ایسے وقت میں اگر تم پیٹھ پھیر کے بھاگ جاؤ تو اس کا مطلب تو یہ ہے کہ دُشمن کا حوصلہ بلند ہوجائے گا، اور تم نے نہ اللہ کی نصرت کی رعایت رکھی، اور نہ فرشتوں کی معیت کی رعایت رکھی، اس لیے اس میدان سے بھاگنا جب کہ دوبدو لڑائی ہو یہ اللہ سے بھی فرار ہے، اور اللہ کے فرشتوں سے بھی فرار ہے، اور اللہ کی نصرت سے بھی فرار ہے، پھر سوائے اس کے کہ تمہارے حصہ میں اللہ کا غضب آئے اور جہنم آئے اور کوئی چیز نہیں ہے۔ مشکوٰۃ شریف، باب الکبائر کے اندر آپ نے پڑھ لیا ہوگا، کہ جہاں سرورِ کائنات ﷺ نے بڑے بڑے گناہ بیان فرمائے ہیں، اُن کے اندر میدانِ جہاد سے بھاگنے کو بھی کبائر کے اندر شمار کیا گیا ہے،[1] پیٹھ پھیر کے بھاگ جانا کبائر میں شمار کیا گیا ہے، یہ کبیرہ گناہ ہے، تو جس طرح کبیرہ گناہ پہ اللہ کی لعنت ہوا کرتی ہے، اللہ کا غضب ہوتا ہے، اس کے اوپر جہنم کی وعید ہے، اسی طرح یہاں بھی جہنم کی وعید اس کے اوپر سنائی گئی ہے...... لیکن ایسے واقعات ہوجایا کرتے ہیں کہ ظاہری صورت میں تو پیٹھ پھیری ہے، لیکن وہاں میدان سے بھاگنا مقصود نہیں ہوتا، جیسے کوئی جنگ کا کرتب اور ہنر ہے پینترا بدلنا ہے، ان جنگی اصولوں کے طور پر اگر میدان سے پیچھے ہٹنا پڑے اور پیٹھ پھیرنی پڑے تو یہ اس میں داخل نہیں، اس کی تمہیں اجازت ہے، یہ نہیں کہ کوئی صورت پیش آجائے تم نے دُشمن سے منہ موڑنا ہی نہیں اور اس کی طرف پشت کرنی ہی نہیں، ایسی بات نہیں ہے، جنگی حرفہ، جنگی قانون اور جنگی ہنر کے طور پر اگر اس قسم کی بات پیش آجائے تو اس کی اجازت

---

(۱) مشکوٰۃ ص ۱۷، باب الکبائر فصل اول۔ ولفظہ: اجتنبوا السبع الموبقات قالوا: یارسول اللہ وما ھن، قال: الشرک باللہ والتولی یوم الزحف

ہے۔''اے ایمان والو! جس وقت ٹکر لگ جائے تمہاری کافروں کے ساتھ، اس حال میں کہ تم ایک دوسرے کے سامنے ہو لشکر کی صورت میں (زحفاً کا مفہوم جس طرح سے میں نے عرض کیا) تو ان کی طرف پیٹھ نہ پھیرا کرو۔ جو کوئی اُن کی طرف اس دن پیٹھ پھیرے گا سوائے اس شخص کے جو کہ جنگ کے لیے کوئی کرتب اختیار کرنے والا ہے، یا اپنی جماعت کی طرف ٹھکانا لینے والا ہے، اس شخص کے علاوہ جو کوئی پیٹھ پھیرے گا، پس وہ لوٹے گا اللہ کے غضب کے ساتھ اور اُس کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بہت بُرا ٹھکانا ہے۔'' سورۂ انفال میں ہی آگے جاکے تفصیل آئے گی، کہ پہلے پہلے اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے حکم تھا کہ دس گنا قوت کے مقابلے میں بھی ڈٹ جاؤ، اوراس سے تمہیں ہٹنے کی اجازت نہیں ہے، اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ يَغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ: اگر تم میں سے بیس بھی ہوں گے صبر کرنے والے مستقل مزاج، تو دوسو پہ غالب آئیں گے، اب بیس اور دوسو کا تناسب دس گنا ہے، وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ يَّغْلِبُوْٓا اَلْفًا: اور اگر تم میں سے ایک سو ہوا تو ہزار پہ غلبہ پائے گا، وہ بھی ایک اور دس کی نسبت ہے۔ لیکن اس کے بعد پھر اس کے اوپر نسخ آیا، اللہ تبارک وتعالیٰ نے تخفیف کردی، کہ ایک اور دو کی نسبت کردی، کہ اگر دشمن کی طاقت دوگنا ہو تو میدان سے ہٹنے کی اجازت نہیں ہے، اور اگر اس سے بھی زیادہ قوت آجائے تو پھر ایسی صورت میں انسان اگر میدان چھوڑ کے پیچھے ہٹے تاکہ کسی دوسرے موقع پر مقابلہ کیا جائے، اور اس وقت نقصان سے بچا جائے تو پھر اس کی اجازت ہے۔ ایک اور دو کی نسبت اگر ہو تو پھر مسلمان کو آج بھی میدان چھوڑنے کی اجازت نہیں ہے، دُگنی قوت کے ساتھ ٹکرانا یہ مسلمان کا ادنیٰ کرشمہ ہے، باقی! اس سے بھی زیادہ قوت کے ساتھ ٹکراؤ، تو آپ ''فتوح الشام'' پڑھ کے دیکھئے، اور اس قسم کی دوسری جنگیں جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے لڑی ہیں، تو ساٹھ ساٹھ آدمیوں نے ساٹھ ساٹھ ہزار آدمیوں کا مقابلہ کیا ہے، وہ تو ایک علیحدہ بات ہے۔ ورنہ اجازت دے دی گئی کہ دُگنی قوت تک تو میدان نہیں چھوڑنا، دُگنی قوت کے بعد اگر کوئی میدان چھوڑے تو اُس کے لئے اجازت ہے، یہ تفصیل آگے (اسی سورت میں) آپ کے سامنے آئے گی۔

معرکۂ بدر میں اَسبابِ ظاہری کے خلاف نتائج ظاہر کیوں ہوئے؟

اب بدر میں لڑائی کا نتیجہ ظاہر ہوا کہ ستر مشرک قتل ہوگئے، اور ستر گرفتار ہوگئے، گرفتار ہوجانا یہ قتل ہونے سے بھی ذلت زیادہ تھی، اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے صرف تیرہ اس میدان میں شہید ہوئے ہیں، ایک زخمی ہوا ہے جو واپس مدینہ منورہ کی طرف جاتے ہوئے راستے میں فوت ہوا ہے، گویا کہ کل چودہ شہید ہوئے ہیں، اور جس وقت یہ لڑائی ہورہی تھی اُس وقت سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے کنکریوں کی ایک مٹھی اُٹھائی اور ''شَاهَتِ الْوُجُوْهُ شَاهَتِ الْوُجُوْهُ'' کہہ کر اس طرح سے ان کی طرف پھینکی، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ سے یہ معجزہ ظاہر ہوا کہ وہ کافروں کی آنکھوں میں اس طرح جاکے پڑگئی جس طرح سے کوئی سخت آندھی آئے اور آنکھوں کو اندھا کردیتی ہے، پھر انسان کو نظر نہیں آتا کہ آگے ہے کیا۔ تو ایک مٹی کی مٹھی اس طرح سے سب کافروں کی آنکھوں کو خراب کرگئی، ہر کسی کو اپنی آنکھیں ملنے کی پڑگئی، اور آپ جانتے ہیں کہ جنگ میں تو ایک ایک لحہ سے فرق پڑتا ہے، جب ایک آدمی کی آنکھوں میں خاک دھول دی گئی، اور اس طرح سے اس پر مٹی ڈال دی گئی، تو اس کی آنکھیں ہی جس وقت بے کار ہوجائیں گی تو وہ آگے کیا

کرے گا، تو ایک مٹھی نے جنگ کا نقشہ پلٹ کے رکھ دیا، اب ظاہری اسباب میں اگر دیکھا جائے تو کوئی صورت نہیں تھی کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی یہ چند تلواریں جو کہ چیتھڑوں میں لپٹی ہوئی تھیں، اور بھی کسی قسم کا اسلحہ ساتھ نہیں تھا، تو وہ اتنے مشرکوں کو قتل کردیں؟ عقل کے ساتھ سوچو گے تو یہ بات سمجھ میں نہیں آتی۔ اور ایک مٹی کی مٹھی سارے لشکر کو اندھا کردے، ظاہری طور پر کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی، اس لیے اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس کو یوں نہ سمجھو کہ یہ تمہارا کمال تھا، یہ تو ہماری نصرت اور مدد تھی، باطنی خفیہ ہاتھ تو ہمارا تھا جس نے یہ سارے کا سارا کام کیا، اس لیے یہاں جو نفی کی جارہی ہے یہ نتیجے کے اعتبار سے ہے، فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ: تم نے انہیں قتل نہیں کیا، حالانکہ ظاہری طور پر تلوار تو انہی کی چلی تھی، لیکن چونکہ بالکل اسبابِ ظاہری کے خلاف نتائج ظاہر ہوئے، اس لیے نتیجے کی طرف دیکھتے ہوئے اس فعل کی نفی کی جارہی ہے، کہ ظاہری اسباب کو اگر دیکھو تو جو نتیجہ سامنے آیا ہے یہ کام تم نے نہیں کیا، یہ تو براہِ راست اللہ نے کیا ہے فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ تم نے انہیں قتل نہیں کیا وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ: لیکن اللہ نے انہیں قتل کردیا، کیونکہ جو نتیجہ ظاہری اسباب کے خلاف سامنے آیا کرتا ہے، اُس کی نسبت براہِ راست اللہ تعالیٰ کی طرف کردی جاتی ہے، اور ایسے ہی یہاں ہے، دیکھو! اِذْ رَمَيْتَ میں رمی کی نسبت رسول اللہ ﷺ کی طرف کی گئی ہے، "جب کہ تو نے پھینکا تھا، جب کہ مٹی تو نے پھینکی تھی" یہ ابتدائے فعل کی نسبت رسول اللہ ﷺ کی طرف ہے، پھینکنے کا اثبات ہے، لیکن "مَا رَمَيْتَ وہ تو نے نہیں پھینکی تھی" نتیجے کے اعتبار سے نفی ہے، یعنی ابتدائے فعل اگرچہ آپ کے ہاتھ سے ہوا، پھینکی آپ نے ہے، لیکن اس کے نتائج کی طرف دیکھتے ہوئے کہتے ہیں کہ آپ نے نہیں پھینکی وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى اللہ نے پھینکی ہے، تو اثبات کیا جارہا ہے ابتدائے فعل کے اعتبار سے، اور نفی کی جارہی ہے انتہائے فعل کے اعتبار سے، کہ اگرچہ ظاہری طور پر یہ فعل کیا تو آپ نے ہے، کہ مٹی کی مٹھی اس طرح سے پھینکی تھی، لیکن اس کے نتائج کی طرف دیکھ کر ہم کہتے ہیں کہ یہ آپ نے نہیں پھینکی یہ تو اللہ نے پھینکی ہے، اس لیے اس پر ایسے اثرات مرتب ہوگئے، وَلِيُبْلِيَ الْمُؤْمِنِيْنَ مِنْهُ بَلَآءً حَسَنًا: وَلِيُبْلِيَ کا معطوف علیہ اگر محذوف نکالنا ہو تو یوں کہہ لیں لِيَقْهَرَ الْكَافِرِيْنَ وَلِيُبْلِيَ الْمُؤْمِنِيْنَ، یہ سارے کے سارے آثار اس لیے نمایاں ہوئے تاکہ اللہ تعالیٰ کافروں کو مغلوب کرے، اُن کو ذلیل کرے، اور تاکہ مؤمنین پر اپنی طرف سے بہترین انعام کرے، اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ: بے شک اللہ تعالیٰ سننے والا جاننے والا ہے، ذٰلِكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ مُوْهِنُ كَيْدِ الْكٰفِرِيْنَ: ذٰلِكُمْ یہ بات ہو چکی، یہ بات ایسے ہی ہے، یہ بعض حکمت ہے اللہ تعالیٰ کی نصرت میں جو آپ کے سامنے ذکر کی گئی۔ اور یہ بات تو ہے ہی، آخرالامر تو یہی ہے کہ اَنَّ اللّٰهَ مُوْهِنُ كَيْدِ الْكٰفِرِيْنَ: اللہ کافروں کی تدبیروں کو کمزور کرنے والا ہے، وہ کتنے ہی مکر اور فریب کرلیں اُن کی تدبیروں میں قوت نہیں ہو سکتی۔

مشرکینِ مکہ کی طرف سے فیصلہ کُن جنگ کی تمنا

اِنْ تَسْتَفْتِحُوْا: یہ آیت نشاندہی کرتی ہے اسی بات کی جو تفصیل میں آپ کے سامنے آئی تھی، کہ جب یہ لشکر نکلا ہے تو بڑی دُعائیں کر کر کے نکلے تھے، جب ایک آدمی کو اپنی قوت پر پوری طرح سے مان ہوتا ہے، اور ان کو یقین ہوتا ہے کہ آج ہم جارہے ہیں تو صفایا کر کے ہی آئیں گے، تو پھر وہ ڈینگیں مارتا ہے، اور ڈینگوں میں یہ بات بھی ہوتی ہے، جیسے فرعون جب موسیٰ علیہ السلام کے

مقابلے میں آیا تھا، اور اُس نے سارے کے سارے جادوگر اکٹھے کر لیے تھے، اور جادوگروں نے آ کر جو اس فرعون کو ہوا دی، اور اس کو یہ کہا کہ ہم یوں کر دیں گے، ہم ووں کر دیں گے، یہ اکیلا ہمارا مقابلہ کیا کر سکتا ہے، تو یاد ہے آپ کو؟ فرعون نے بھی اعلان کروایا تھا "اے لوگو! سارے کے سارے اکٹھے ہو جاؤ، آج جو جیتے گا ہم اس کے ساتھ ہو جائیں گے، ہم جیتنے والے کے ساتھ ہو جائیں گے، دیکھیں گے آج کون غلبہ پاتا ہے" اس طرح سے فرعون نے بھی اعلان کیا تھا اور معاملہ الٹ نکل آیا، کہ قوم کا ذہن پہلے بنایا، اور ذہن اس طرح سے بنایا تھا کہ جو جیتے گا وہ حق پہ ہوگا، اور جیت گئے موسیٰ علیہ السلام، تو وہی پہلے کی ڈینگیں فرعونیوں کے لئے مصیبت بن گئیں، تو پھر اور تدبیریں اختیار کرنی پڑیں کہ جی! یہ تو سازش ہے، یہ تو انہوں نے آپس میں مل کے کر لیا، ورنہ اگر مقابلہ کرتے تو ہمارے جادوگر جیت جاتے، یہ تو استاد شاگرد ہیں، یہ تو اندر سے ان کی سازش ہے، پھر اُس نے اس قسم کی باتیں بنانی شروع کر دیں...... تو یہ بھی اسی طرح سے کہتے تھے کہ بس یہ فیصلہ کن جنگ ہوگی، آج جو حق پہ ہوگا وہ جیت جائے گا، اور اللہ تعالیٰ سے دعائیں کرتے تھے کہ یا اللہ! جو قاطع الرحم ہے اور جو فسادی ہے اس کو برباد کر دے۔ وہ اپنے طور پر گویا کہ تاثر دے رہے تھے کہ اب چونکہ میدان ہمارے ہی ہاتھ میں رہے گا، اور مسلمان ہمارا مقابلہ نہیں کر سکتے، یہ پہلا موقع تھا جب اس طرح سے وہ کھل کے سامنے آ رہے تھے، اور اس زعم کے ساتھ آ رہے تھے کہ آج ہم صفائی کر کے آئیں گے، تو گویا کہ لوگوں کے سامنے اس لڑائی کو میزان بنا رہے تھے، کہ یہ ترازو ہے، جس میں تولا جائے گا کہ کون فسادی ہے اور کون مصلح ہے؟ کون حق پر ہے اور کون غلط ہے؟ اس جنگ کو انہوں نے فیصلہ قرار دیا تھا، حتیٰ کہ بعض آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ ابوجہل نے میدانِ بدر میں یہ دُعا کی کہ یا اللہ! جو قاطع الرحم ہے، جس نے رشتہ داریوں میں پھوٹ ڈال دی، جس نے قوم کو فساد میں ڈال دیا ہے، اُس کو ہلاک کر دے۔[1] اور آگے (اسی سورت میں) لفظ آئیں گے اللّٰهُمَّ إِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَأَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَاءِ أَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ أَلِيمٍ: اے اللہ! جو کچھ یہ کہتے ہیں اگر یہ حق ہے تو پھر ہم پر پتھر برسا، یا دردناک عذاب سے ہمارا سامنا کر، تو ہم سمجھ جائیں کہ واقعی یہ حق ہے، اس قسم کی دُعائیں کر کے نکلے تھے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں اگر تم فیصلہ چاہتے ہو فیصلہ تو آ گیا، معاملہ صاف ہو گیا، کہ جو فسادی تھے شکست کھا گئے، اور جو حق والے تھے فتح پا گئے۔

وَإِنْ تَنْتَهُوا: اگر تم باز آ جاؤ، مخالفت کو چھوڑ دو فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ: تو یہی تمہارے لیے بہتر ہے۔ اور اگر تم عود کرو گے، دوبارہ ایسی حرکتیں کرو گے، نَعُدْ: تو ہم پھر موجود ہیں تمہارا علاج کرنے کے لیے، اگر تم دوبارہ اس قسم کی حرکتیں کرو گے تو ہم کہیں چلے تو نہیں گئے، دوبارہ سہی، إِنْ تَعُودُوا نَعُدْ: اگر تم عود کرو گے تو ہم بھی عود کریں گے، وَلَنْ تُغْنِيَ عَنْكُمْ فِئَتُكُمْ شَيْئًا: اور یہ یاد رکھو! کہ تمہاری جماعت خواہ کتنی زیادہ ہی کیوں نہ ہو تمہیں کوئی فائدہ نہیں دے سکتی، جیسے آج بھی تمہاری جماعت تین گنا زیادہ تھی اور کچھ کام نہ آئی۔ "ہرگز نہیں فائدہ پہنچائے گی تمہیں (أغنى عنه: فائدہ پہنچانا، کام آنا، دُور ہٹانا، یہ سب اس کے مفہوم ہوتے ہیں) ہرگز

---

(۱) سیرت ابن کثیر ۴۳۱/۲۔ ولفظه: أن أبا جهل قال حين التقى القوم: اللهم أقطعنا للرحم وأتانا بما لا نعرف فأحنه الغداة

فائدہ نہیں پہنچائے گی تمہیں تمہاری جماعت کچھ بھی وَلَوْ كَثُرَتْ: اگرچہ زیادہ ہی ہو۔ وَاَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ: وَالْاَمْرُ اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ: اور یہ واقعہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مومنوں کے ساتھ ہے۔

کیا ڈر ہے جو ہو ساری خدائی بھی مخالف کافی ہے اگر ایک خدا میرے لیے ہے

(مولانا محمد علی جوہرؔ)

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَوَلَّوْا عَنْهُ وَاَنْتُمْ

اے ایمان والو! کہنا مانو اللہ کا اور اس کے رسول کا اور اُس رسول سے پیٹھ نہ پھیرا کرو حالانکہ

تَسْمَعُوْنَ ﴿۲۰﴾ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ قَالُوْا سَمِعْنَا وَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ ﴿۲۱﴾ اِنَّ شَرَّ

تم سنتے ہو ﴿۲۰﴾ اور مت ہو جاؤ اُن لوگوں کی طرح جنہوں نے کہا ہم نے سُن لیا حالانکہ وہ سنتے نہیں ہیں ﴿۲۱﴾ بے شک

الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿۲۲﴾

جانوروں میں سے بدترین اللہ تعالیٰ کے نزدیک بہرے ہیں گونگے ہیں جو سمجھتے نہیں ﴿۲۲﴾

وَلَوْ عَلِمَ اللّٰهُ فِيْهِمْ خَيْرًا لَّاَسْمَعَهُمْ ۭ وَلَوْ اَسْمَعَهُمْ لَتَوَلَّوْا

اور اگر اللہ ان کے اندر کوئی بھلائی جانتا تو انہیں سنا دیتا، اور اگر ان کو سنائے (اندریں حالات) تو وہ پیٹھ پھیر جائیں گے

وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۲۳﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ

اس حال میں کہ اعراض کرنے والے ہیں ﴿۲۳﴾ اے ایمان والو! حکم مانو اللہ کا

وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ ۚ وَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ

اور اس کے رسول کا جس وقت کہ دعوت دے تمہیں وہ رسول اس چیز کی طرف جو تمہیں زندگی بخشتی ہے، اور جان لو بیشک اللہ تعالیٰ

يَحُوْلُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهٖ وَاَنَّهٗۤ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۲۴﴾ وَاتَّقُوْا فِتْنَةً

حائل ہو جاتا ہے انسان اور اُس کے دِل کے درمیان، اور (جان لو) کہ بیشک اسی کی طرف ہی تم جمع کیے جاؤ گے ﴿۲۴﴾ ڈرو تم اس فتنے

لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً ۚ وَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ

سے جو نہیں پہنچے گا اُن لوگوں کو جنہوں نے تم میں سے ظلم کیا خاص طور پر، جان لو کہ بے شک اللہ تعالیٰ

شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۲۵﴾ وَاذْكُرُوْٓا اِذْ اَنْتُمْ قَلِيْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ

سخت سزا والا ہے ﴿۲۵﴾ یاد کرو اُس وقت کو جبکہ تم تھوڑے سے تھے، کمزور سمجھے ہوئے تھے

فِى الْاَرْضِ تَخَافُوْنَ اَنْ يَّتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ فَاٰوٰىكُمْ

اپنے علاقے میں، تم ڈرتے تھے کہ تمہیں لوگ اُچک لیں گے، پھر اللہ نے تمہیں ٹھکانا دیا

وَاَيَّدَكُمْ بِنَصْرِهٖ وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۲۶﴾

اور تمہیں مضبوط کیا اپنی مدد کے ساتھ اور تمہیں رزق دیا پاکیزہ چیزوں سے تاکہ تم شکر گزار ہو جاؤ ﴿۲۶﴾

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ وَتَخُوْنُوْٓا

اے ایمان والو! اللہ اور اُس کے رسول سے خیانت نہ کیا کرو اور نہ خیانتیں کیا کرو

اَمٰنٰتِكُمْ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۷﴾ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ

اپنے حقوقِ واجبہ میں حالانکہ تم جانتے ہو ﴿۲۷﴾ اور تم اس بات کو جان لو کہ تمہارے مال اور تمہاری اولاد

فِتْنَةٌ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴿۲۸﴾ ع

فتنہ ہیں، اور (اس بات کو بھی جان لو کہ) بے شک اللہ تعالیٰ کے پاس اَجرِ عظیم ہے ﴿۲۸﴾

خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا: اے ایمان والو! اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ: کہنا مانو اللہ کا اور اس کے رسول کا، وَلَا تَوَلَّوْا عَنْهُ: عَنْهُ کی ضمیر رسول کی طرف راجع ہے۔ اور اُس رسول سے پیٹھ نہ پھیرا کرو، وَاَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ: حالانکہ تم سنتے ہو، وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ قَالُوْا: اور نہ ہو جایا کرو ان لوگوں کی طرح، مت ہو جاؤ ان لوگوں کی طرح جنہوں نے کہا، سَمِعْنَا وَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ: ہم نے سن لیا حالانکہ وہ سنتے نہیں ہیں۔ اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ: دواب یہ جمع ہے دابۃ کی، دابۃ کہتے ہیں مَا يَدِبُّ عَلَى الْاَرْضِ، جو چیز زمین کے اُوپر رینگتی ہے، چلتی ہے، اس لئے تمام حیوانات کیڑے مکوڑے سب کو یہ لفظ شامل ہے، اگرچہ عرفِ عام میں ''دواب'' کا لفظ چوپاؤں کے لئے بولا جاتا ہے جو چار ٹانگوں پہ چلتے ہیں، لیکن لغوی معنی کے لحاظ سے ہر چیز جو زمین پہ چلتی پھرتی ہے اس کو ''دابۃ'' کہتے ہیں، وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِى الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا (پارہ ۱۲ کا شروع) جو جاندار چیز بھی رزق کی محتاج ہے وہ ''دابۃ'' کا مصداق ہے، ہر زمین پر چلنے پھرنے والی چیز، اس کا رزق اللہ کے ذمے ہے۔ ''صُمّ'' کا لفظ آپ

کے سامنے پہلے گزرا، یہ "اَصَمّ" کی جمع ہے، جو کانوں سے بہرا ہو، اور "بُکْم" کا لفظ بھی پہلے گزرا، یہ "اَبْکَم" کی جمع ہے جو زبان سے گونگا ہو۔ "بیشک جانوروں میں سے بدترین اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ لوگ ہیں جو بہرے ہیں گونگے ہیں جو سمجھتے نہیں، جانوروں میں سے بدترین اللہ تعالیٰ کے نزدیک بہرے ہیں گونگے ہیں جو سمجھتے نہیں" وَلَوْ عَلِمَ اللّٰهُ فِيْهِمْ خَيْرًا: اور اگر اللہ ان کے اندر کوئی بھلائی جانتا، اگر اللہ کو ان میں کوئی خیر، بھلائی معلوم ہوتی، لَاَسْمَعَهُمْ: تو انہیں سنا دیتا، وَلَوْ اَسْمَعَهُمْ: اور اگر ان کو سنائے اندریں حالات جبکہ ان میں کوئی بھلائی نہیں ہے لَتَوَلَّوْا: تو وہ پیٹھ پھیر جائیں گے، وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ: اس حال میں کہ اعراض کرنے والے ہیں۔ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ: اے ایمان والو! حکم مانو اللہ کا اور اس کے رسول کا، اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ: جبکہ بلائے تمہیں وہ، یعنی اللہ اور اللہ کا رسول، لیکن دَعَا کی ضمیر رسول کی طرف لوٹائیں گے کہ رسول کا بلانا اصل میں اللہ کا ہی بلانا ہے۔ "جس وقت کہ بلائے تمہیں وہ رسول" لِمَا يُحْيِيْكُمْ: دعوت دے تمہیں وہ رسول اس چیز کی طرف جو تمہیں زندگی بخشتی ہے، جو تمہیں زندہ کرتی ہے، مَا يُحْيِيْكُمْ: جو چیز تمہیں حیات دیتی ہے۔ "جب بلائے وہ رسول تمہیں حیات بخش چیز کی طرف" وَاعْلَمُوْۤا: اور جان لو، اَنَّ اللّٰهَ يَحُوْلُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهٖ: بیشک اللہ تعالیٰ حائل ہو جاتا ہے انسان اور اس کے دل کے درمیان، يَحُوْلُ: حائل ہو جاتا ہے، رکاوٹ ڈال دیتا ہے وَاَنَّهٗۤ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ: اور جان لو کہ بیشک اسی کی طرف ہی تم جمع کیے جاؤ گے۔ اَنَّهٗۤ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ یہ بھی وَاعْلَمُوْۤا کا مفعول ہے۔ وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً: ڈرو تم اس فتنہ سے (فتنے سے یہاں عذاب مراد ہے) جو نہیں پہنچے گا ان لوگوں کو جنہوں نے تم میں سے ظلم کیا خاص طور پر، ڈرو اس فتنے سے جو خصوصیت کے ساتھ صرف ان لوگوں کو نہیں پہنچے گا جنہوں نے تم میں سے ظلم کیا، یہ ہے مفہوم اپنے الفاظ میں، اُس عذاب سے ڈرو جو خصوصیت سے صرف انہی کو نہیں پہنچے گا جنہوں نے تم میں سے ظلم کیا، وَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ: جان لو کہ بیشک اللہ تعالیٰ سخت سزا والا ہے۔ وَاذْكُرُوْۤا اِذْ اَنْتُمْ قَلِيْلٌ: یاد رکھو اس وقت کو، یاد کرو اس وقت کو جبکہ تم تھوڑے سے تھے، مُّسْتَضْعَفُوْنَ: کمزور سمجھے ہوئے تھے فِي الْاَرْضِ: زمین میں۔ زمین سے علاقہ مراد ہے، مکہ معظمہ کا علاقہ۔ "جبکہ تم تھوڑے سے تھے کمزور سمجھے ہوئے تھے اپنے ملک میں، اپنے علاقے میں" تَخَافُوْنَ اَنْ يَّتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ: تخطّف: اُچک لینا۔ تم ڈرتے تھے کہ تمہیں لوگ اُچک لیں گے۔ اچکنے کا معنی ہے کہ آسانی سے تمہیں ہلاک کر دیں گے، جیسے جھپٹ مار کے کسی چیز کو اچک لیا جاتا ہے، فَاٰوٰىكُمْ: پھر اللہ نے تمہیں ٹھکانا دیا، وَاَيَّدَكُمْ بِنَصْرِهٖ: اور تمہیں قوت پہنچائی اپنی مدد کے ساتھ، مضبوط کیا تمہیں اپنی مدد کے ساتھ۔ اَيَّدَ تَاْيِيْدًا: قوت پہنچانا، مضبوط کرنا۔ وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ: اور تمہیں رزق دیا پاکیزہ چیزوں سے، لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ: تاکہ تم شکرگزار ہو جاؤ۔ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا: اے ایمان والو!، لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ: اللہ اور اللہ کے رسول سے خیانت نہ کیا کرو وَتَخُوْنُوْۤا اَمٰنٰتِكُمْ: اس تَخُوْنُوْۤا کا عطف پچھلے تَخُوْنُوْا پر ہے اور یہ بھی لَا کے نیچے داخل ہے۔ امانات امانت کی جمع ہے، امانت کہتے ہیں ایسا حق جو آپ کے ذمے لگا ہوا ہے جس کا ادا کرنا آپ کے ذمے ضروری ہے، اس لئے حقوقِ واجبہ اس کا مفہوم ہے، جو آپ کے ذمے حق لگا ہوا ہو جس کا ادا کرنا ضروری ہو اس کو امانت کہتے ہیں۔ "اور نہ خیانتیں کیا کرو اپنے حقوقِ واجبہ

میں'' جن کا ادا کرنا تمہارے ذمے ہے ان حقوق کی ادائیگی میں خیانت نہ کیا کرو، وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ: حالانکہ تم جانتے ہو۔ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ: اور تم اس بات کو جان لو، اس بات کا علم حاصل کرلو، تمہیں اس بات کا یقین ہونا چاہئے کہ تمہارے مال اور تمہاری اولاد فتنہ ہیں۔ فتنہ: آزمائش کی چیز۔ تمہاری اولاد اور تمہارے اموال آزمائش کی چیز ہیں، فتنہ ہیں، وَّاَنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ: اور اس بات کو بھی جان لو کہ بیشک اللہ تعالیٰ کے پاس اجرِ عظیم ہے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

تفسیر

ماقبل سے ربط

اللہ تبارک وتعالیٰ کے فضل واحسان سے بدر میں فتح حاصل ہوئی، اور کُفّار ومشرکین کو ذِلّت نصیب ہوئی، شکست ہوئی، اُن کو جو ذِلت آئی تھی اور شکست ہوئی تھی اُس کی وجہ پچھلے رکوع میں یہ ذکر کی گئی تھی ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ شَآقُّوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ: یہ اس سبب سے ہے، یہ ذِلت ان کو اس لیے آئی، یہ شکست اس لیے ہوئی، ان کو مار اس لیے پڑی کہ انہوں نے اللہ اور اللہ کے رسول کی مخالفت کی تھی، اُن کے خلاف ضد باندھ لی تھی۔ اور جو بھی اللہ اور اللہ کے رسول سے ضد کرتا ہے، مخالفت کرتا ہے، تو اللہ تعالیٰ اُس کو ایسی ہی سزا دیتے ہیں، وہ سخت سزا دینے والے ہیں۔ تو اُس آیت میں مشرکین کے متعلق یہ بتایا گیا تھا کہ سزا اس لیے ہوئی چونکہ اللہ اور اللہ کے رسول کی مخالفت کرتے تھے، اور اس کے مقابلے میں مسلمانوں کو فتح ہوئی، اللہ کی نصرت حاصل ہوئی، وہ اس لیے حاصل ہوئی کہ وہ حق کے لیے جانباز تھے، انہوں نے اللہ اور اللہ کے رسول کے لیے جانبازی دکھائی تھی، رسول کی دعوت پر وہ نکل پڑے تھے، جان مال کی پروانہیں کی تھی، اس لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُن کو نصرت حاصل ہوگئی، غزوۂ بدر میں دونوں فریقوں سے متعلق حال کھل کر سامنے آگیا، تو اس رکوع میں اللہ تبارک وتعالیٰ مسلمانوں کو مزید اطاعت کی رغبت دلاتے ہیں، اور تاکید کرتے ہیں کہ کسی اعتبار سے بھی اللہ اور اللہ کے رسول کے احکام کی مخالفت نہ ہونے پائے، آخر رکوع تک مضمون یہی ہے۔

''یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا'' کا مفہوم

پہلی آیت میں تو بات صفائی کے ساتھ آگئی کہ ''اے ایمان والو!'' اب دیکھو! خطاب اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا کے ساتھ کیا جارہا ہے، جس کے متعلق پہلے آپ کے سامنے وضاحت کی جاچکی، کہ ایمان چونکہ اللہ کے ساتھ اطاعت کا معاہدہ ہے، تو وہی معاہدہ یاد دِلا کے، کہ جنہوں نے اطاعت کا عہد کیا ہے، فرمانبرداری کا عہد باندھا ہے انہی کو یہ خطاب کیا جارہا ہے۔ پھر ایمان اللہ تعالیٰ کے ساتھ اور اللہ کے رسول کے ساتھ محبت اور عشق کی بات ہے، کہ جو مؤمن ہوتے ہیں وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ (سورۂ بقرہ:۱۶۵) ان کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ بہت سخت محبت ہوتی ہے، تو جب اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا کے ساتھ خطاب کیا جائے، تو گویا کہ ان کو ان کا منصب یاد دِلایا جارہا ہے، کہ تم جو ایمان لائے، ایمان لا کے عاشقوں کی فہرست میں آگئے ہو، دین والوں کی فہرست میں آگئے، اور تم نے اطاعت

اور فرمانبرداری کا عہد باندھا ہے، تو تمہیں یاد دلایا جارہا ہے کہ اب یہ کام کرو۔ اس عنوان کے ساتھ خطاب کرنے میں یہ زور ہے، جب یہ ساری تفصیل ذہن میں ہو تو پھر ان الفاظ کے ساتھ خطاب کا مزہ آتا ہے۔

اللہ اور رسول کی اطاعت کی تاکید

اے ایمان والو! اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ: اللہ اور اللہ کے رسول کی اطاعت کرو، ان کے احکام مانو، وَلَا تَوَلَّوْا عَنْہُ: رسول سے پیٹھ نہ پھیرو، یعنی جس وقت رسول تمہیں کسی کام کی طرف بُلاتا ہے تو اس سے پیٹھ نہ پھیرو، حالانکہ تم اس کی باتیں سُن رہے ہو، اور اگر رسول اللہ ﷺ کی براہِ راست باتیں سُن کر بھی تم پیٹھ پھیرو گے، یعنی اطاعت نہیں کرو گے بلکہ منہ موڑ لو گے، تو اس سے زیادہ بدبختی پھر کیا ہوگی؟ براہِ راست رسول کی زبانی اللہ تعالیٰ کی باتیں سُن رہے ہو، رسول تمہیں براہِ راست باتیں سنا رہا ہے، تو ایسے وقت میں پیٹھ پھیرنا بہت عجیب ہے۔ وَاَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ: حالانکہ تم سن رہے ہو، عقیدت کے ساتھ سنتے ہو، محبت کے ساتھ سنتے ہو، اعتقاد کے ساتھ سنتے ہو، تو پھر تمہیں اس پر عمل بھی کرنا چاہیے، اطاعت کرنی چاہیے، پیٹھ نہیں پھیرنی چاہیے۔

اِنسان جانوروں سے کب بدتر کہلاتا ہے؟

وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ قَالُوْا سَمِعْنَا: اس سے اشارہ ہے یہود کی طرف، پہلی امتوں پر حال جس طرح سے گزرا، کہ وہ زبان سے تو کہہ دیتے تھے کہ ہم نے سُن لیا، اور سنتے کچھ نہیں تھے، کیونکہ جس سننے کے ساتھ سمجھنے کی کوشش نہ کی جائے، سمجھنے کے بعد اُس کے مطابق عقیدہ نہ رکھا جائے، عقیدہ بنانے کے بعد اُس کے مطابق عمل نہ کیا جائے تو وہ سنا نہ سنا برابر ہے۔ وہ زبان سے تو سَمِعْنَا کہہ دیتے تھے، لیکن حال سے عَصَیْنَا ہوتے تھے، سَمِعْنَا وَعَصَیْنَا (البقرہ: ۹۳، النساء: ۴۶)، جیسے یہود کے تذکرے کے اندر یہ بات آپ کے سامنے آئی تھی، ایسے نہ بن جانا، یہ کوئی اچھے لوگ نہیں ہیں جو سننے کی کوشش نہیں کرتے، سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے، حق کے مطابق بولتے نہیں، عقل سے کام نہیں لیتے، تو یہ بدترین قسم کے جانور ہیں، جانوروں میں سے بھی بدتر ہیں، کیونکہ جانور تو اگر بگڑے گا تو کتنا سا بگڑے گا؟ پھر بھی وہ کسی نہ کسی حد کے اندر رہ جاتا ہے، لیکن انسان جس کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں دی ہیں، وہ سوچ سمجھ کر اچھے عمل کو اختیار کرسکتا ہے، اگر وہ اپنی اس قوت کو استعمال نہ کرے تو جانوروں میں سے بدتر ہے، سورۂ اَعراف میں آپ کے سامنے لفظ آئے تھے: اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ (سورۂ اعراف: ۱۷۹)، وہاں اس مضمون کی تفصیل آپ کی خدمت میں عرض کردی گئی تھی۔ اور یہ اشارہ انہی یہود کی طرف ہی ہے جو بظاہر انبیاء ﷺ کی باتیں سنتے تو تھے، لیکن عملاً وہ عَصَیْنَا کا مصداق تھے کہ ہم مانیں گے نہیں، اَڑ جاتے تھے، نافرمانی کرتے تھے۔ ''ان لوگوں کی طرح نہ ہوجانا جنہوں نے کہا کہ ہم نے سُن لیا حالانکہ وہ سنتے کچھ نہیں ہیں''۔ ''سنتے کچھ نہیں ہیں'' کا کیا مطلب؟ کہ جب سُن کر اس پر عمل نہیں کرتے، سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے، اس کے متعلق عقیدہ نہیں بناتے، تو سنا نہ سنا برابر ہے، جس کو آپ کہا کرتے ہیں کہ ''سنی اَن سنی کردی''۔ تو جس پر انسان عمل نہ کرے وہ سنا نہ سنا برابر ہوتا۔ ''بے شک بدترین جانور، جانوروں میں سے بدتر اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ لوگ ہیں جو حق سننے سے بہرے ہیں، حق بولنے سے گونگے ہیں، اور جو سوچتے نہیں، عقل سے کام نہیں لیتے'' اس قسم کے لوگ اللہ تعالیٰ کے نزدیک

شَرُّ الدَّوَآبّ ہیں۔تیسویں پارے میں سورۂ بینہ کے اندر بھی یہ لفظ آئے گا اُولٰٓئِكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِيَّةِ کہ یہ جو کفر اختیار کرتے ہیں، شرک اختیار کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ کے اَحکام کے مطابق عمل نہیں چلتے اُولٰٓئِكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِيَّةِ یہ سب مخلوق میں سے بدتر ہیں، تو انسان کو جیسے اللہ تعالیٰ نے اشرف المخلوقات بنایا ہے، اعلیٰ شرف اس کو دیا ہے، تو اگر یہ نیکی کی طرف جائے تو واقعی اعلیٰ ہے، فرشتوں سے بھی آگے نکل جاتا ہے، جیسے مولانا حالی کا شعر ہے ۔

فرشتے سے بہتر ہے انسان بننا   مگر اس پہ لگتی ہے محنت زیادہ

محنت بہت کرنی پڑتی ہے، محنت کرو گے تو شرف اور فضیلت میں فرشتوں سے بھی آگے نکل سکتے ہو، لیکن انسان میں ایک اُلٹا گیئر بھی لگا ہوا ہے، کہ اگر یہ اُدھر کو مڑ جائے تو پھر یہ شیطان سے بھی بدتر ہے، اس کے کردار اور حال کو دیکھ کر شیطان بھی کان پکڑتا ہے۔ جس وقت یہ انسان بگڑتا ہے تو پھر یہ بہت آگے نکل جاتا ہے، تو جیسے اس کو شرافت حاصل ہے تو اس کا بگاڑ بھی اتنا ہی تیز ہے۔ ''جانوروں میں سے بدتر اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ لوگ ہیں جو حق سننے سے بہرے ہیں، حق بولنے سے گونگے ہیں اور جو عقل سے کام نہیں لیتے۔''

''وَلَوْ عَلِمَ اللّٰهُ فِيْهِمْ خَيْرًا لَّاَسْمَعَهُمْ'' کا واضح مفہوم

وَلَوْ عَلِمَ اللّٰهُ فِيْهِمْ خَيْرًا لَّاَسْمَعَهُمْ: اگر اللہ تعالیٰ ان کے اندر خیر دیکھتا تو ان کو سننے کی توفیق دے دیتا، انہیں سنا دیتا، سننے سے وہی قبول کرنے والا اسنا مراد ہے، خیر سے طلب حق مراد ہے، اگر ان کے اندر طلب حق ہوتی، اگر ان میں خلوص ہوتا تو اللہ انہیں سننے کی بھی توفیق دے دیتا۔ کیونکہ یہ سارے کا سارا سلسلہ جو چلتا ہے وہ صحیح طلب سے چلتا ہے، کہ انسان کی طبیعت میں یہ خلوص آ جائے یہ اخلاص آ جائے کہ واقعی وہ سن کے سمجھنا چاہتا ہے، اگر طلب حق کا جذبہ آ جائے تو پھر اللہ تعالیٰ آگے راستہ کھولتے جاتے ہیں، پھر انسان بات سنے گا بھی، سمجھے گا بھی، اور عمل کی بھی توفیق ہو جائے گی۔ ان کو اللہ تعالیٰ سننے کی توفیق دے دیتے لیکن انہوں نے تو ضد کر کر کے اپنے اندر سے طلب حق والا جذبہ ہی ختم کر دیا، اب تو کچھ ہو جائے یہ اپنی ضد پہ اَڑے ہوئے ہیں، تو ایسے وقت میں اگر ان کے کان میں بات ڈال بھی دی جائے تو کیا فائدہ؟ اسی طرح سے پیٹھ پھیر جائیں گے اعراض کر کے۔ دیکھو! ایک بیج میں صلاحیت ہے، جب اس کو زمین کے اندر ڈالا جائے تو ایک تن آور درخت بنتا ہے، اُس کو پھل اور پھول لگتے ہیں، یہ بیج میں صلاحیت ہے۔ اب ایک زمین صلاحیت رکھتی ہے، اچھی زمین ہے، زرخیز زمین ہے اس کے اندر وہ بیج ڈالو گے تو تن آور درخت بن جائے گا، آپ اس کا پھل بھی کھائیں گے، پھولوں کی خوشبو بھی لیں گے، سائے میں بھی بیٹھیں گے، سارے فوائد اس سے حاصل ہو جائیں گے۔ لیکن اگر ایک زمین شوریلی ہے، اس میں جو کچھ ڈال دیا جائے وہ سب کچھ ختم کر دیتی ہے، اس کو بھی کھا جاتی ہے، تو انسان کہتا ہے بیج ڈالنے کو میں ڈال دوں لیکن آگے اس میں صلاحیت بھی تو ہو، جو اس میں ڈالا جائے گا یہ اُس کو کھا کے ضائع کر دیتی ہے۔ بالکل اسی طرح سے سمجھانا بھی اُسی شخص کو کارآمد ہوتا ہے، جس کے متعلق پتہ تو ہو کہ اس کا سمجھنے کا ارادہ ہے، وہاں تو اگر سمجھایا جائے اور اس کے دل میں بات ڈالی جائے تو وہ سمجھے گا بھی اور عمل بھی کرے گا، لیکن اگر کسی شخص کے اندر طلب حق کا جذبہ ہی نہیں ہے تو تم

اگر اُس کے کان میں بات ڈال بھی دو گے تو کیا فائدہ؟۔ وہ موتی جیسی بات ہے، اعلیٰ سے اعلیٰ معیار کی بات ہے، اگر اس کو قبول کیا جائے، صالح دل کے اندر چلی جائے تو ایک تن آور درخت بن سکتا ہے، لیکن ان فاسد قلوب میں جس وقت جائے گی تو جا کے بھسم ہو جائے گی۔ یہی مطلب ہے اس کا، کہ اگر اللہ ان میں خیر جانتا، دیکھو! بظاہر اس میں علم کی نفی ہے کہ اللہ کو ان میں خیر معلوم ہی نہیں، تو بظاہر اس میں علم کی نفی ہے لیکن علم کی نفیسے مقصد اصل کے اعتبار سے اُس خیر کی نفی ہے، کیونکہ اگر خیر کا وجود ہوتا تو اللہ کے علم میں ضرور ہوتی، جب اللہ کے علم میں ہی نہیں، اور اللہ کا علم واقع کے مطابق ہے، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ان میں خیر ہی نہیں ہے۔ جیسے قرآنِ کریم میں ایک جگہ آتا ہے کہ اللہ کو تو اپنا کوئی شریک زمین و آسمان میں معلوم نہیں[1] تو اس کا یہی معنی ہے کہ اگر ہوتا تو اللہ تعالیٰ کے علم میں ہوتا، اللہ کے علم سے تو کوئی چیز باہر نہیں ہے، تو جب اللہ تعالیٰ کہے کہ میں تو جانتا نہیں کہ یہ بات ایسے ہے، تو اس کا مطلب ہے کہ وہ سرے سے ہے ہی نہیں۔ ''اگر اللہ کو ان میں خیر معلوم ہوتی'' بظاہر اس میں علم کی نفی ہے کہ اللہ کو ان میں خیر معلوم نہیں ہے، لیکن حقیقت میں خیر کی نفی مقصود ہے۔ لَاَسْمَعَهُمْ: تو ان کو سنا دیتا یعنی ان کے دل میں بات ڈال دیتا، اگر ان میں طلبِ حق ہوتی تو ان کو سننے کی توفیق دے دیتا، ایسا سننا جس کے اوپر نفع مرتب ہو، وَلَوْ اَسْمَعَهُمْ: اور اگر ان کو اللہ تعالیٰ اندریں حالات سنا دے، جبکہ ان کے اندر خیر نہیں ہے لَتَوَلَّوْا تو یہ پیٹھ پھیر جائیں گے وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ اس حال میں کہ اعراض کرنے والے ہوں گے۔ اس سنانے کا فائدہ کوئی نہیں، یعنی اگر ان کے کان میں بات پڑ بھی جائے، جیسا کہ واقعتاً پڑتی ہے، بات ان کے کان تک جاتی ہے، لیکن طلبِ حق نہیں ہے، جس کی بنا پر باتیں سنتے ہیں، سُن کر پیٹھ پھیر کر اعراض کر کے چلے جاتے ہیں۔

سوال:- جب خیر ہی نہیں ہے، تو پھر قیامت کے دن ان سے پوچھ کیوں ہوگی؟

جواب:- پوچھ اس لیے ہوگی کہ یہ خیر انہوں نے ضد کر کے ضائع کر دی، ورنہ اصل کے اعتبار سے تو اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو فطرتِ صحیحہ پر پیدا کیا ہے۔ آپ یہ تجربہ کر لیں، ایک آدمی سے آپ کی مخالفت ہو جائے، جب ابتدا ابتدا میں مخالفت ہوتی ہے تو آپ میں صلاحیت ہوتی ہے کہ ایک بات کو سمجھ کے آپ طے کر سکتے ہیں، لیکن پھر ضد کرتے کرتے انسان اتنا دُور نکل جاتا ہے، کہ پھر اس میں سمجھنے کی صلاحیت ہی ختم ہو جاتی ہے، یہ انسان کے قلب کی ایک حالت ہے۔

''وَلَوْ عَلِمَ اللّٰهُ فِيْهِمْ خَيْرًا لَّاَسْمَعَهُمْ'' پر ایک منطقی اِشکال اور اس کا جواب

تو پہلا جو لَاَسْمَعَهُمْ آیا، اس اِسماع سے مراد ہے کہ اللہ تعالیٰ اُن کو سنا دے، یعنی ایسا سنانا جو اُن کے لیے مفید بھی ہو، ان کے دل میں اللہ تعالیٰ بات ڈال دے۔ اور دوسرا جو اَسْمَعَهُمْ ہے اس کا معنی ہے کہ اندریں حالات جبکہ ان میں طلبِ حق نہیں ہے، تو اب اگر ان کے کان میں بات ڈال بھی دی جائے تو فائدہ کوئی نہیں ہے، یہ پیٹھ پھیر جائیں گے، اعراض کر جائیں گے، جیسا کہ واقعہ ہے کہ بات ان تک جاتی ہے لیکن اس کو قبول نہیں کرتے بلکہ پیٹھ پھیر جاتے ہیں...... منطقی اصول کے تحت اگر آپ دیکھیں، تو اس آیت کے اوپر بظاہر آپ کے دل میں ایک اشکال آئے گا اگر کچھ منطق آپ لوگوں کو یاد ہے تو۔ دیکھیے یہ شکل اوّل بن گئی، لَوْ عَلِمَ

(۱) پارہ ۱۱ سورۂ یونس آیت ۱۸۔ وَيَقُوْلُوْنَ هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ ؕ قُلْ اَتُنَبِّـُٔوْنَ اللّٰهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِی السَّمٰوٰتِ وَلَا فِی الْاَرْضِ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰی عَمَّا يُشْرِكُوْنَ

اللّٰہُ فِیۡہِمۡ خَیۡرًا لَّاَسۡمَعَہُمۡ یہ تو صغریٰ ہے، اور وَلَوۡ اَسۡمَعَہُمۡ لَتَوَلَّوۡا یہ کبریٰ ہے، اور اَسۡمَعَہُمۡ، اَسۡمَعَہُمۡ یہ بظاہر حدِ اَوسط ہے، اب اس حدِ اَوسط کو اگر گرا دو گے تو نتیجہ نکلا لَوۡ عَلِمَ اللّٰہُ فِیۡہِمۡ خَیۡرًا لَّتَوَلَّوۡا، اگر اللہ کو ان میں خیر معلوم ہوتی تو یہ پیٹھ پھیر جاتے، اور یہ نتیجہ بالکل غلط ہے، یعنی آپ کے منطقی اُصول کے مطابق صغریٰ کبریٰ ملا کے شکلِ اوّل کا نتیجہ غلط ہے، حالانکہ شکلِ اوّل قطعی ہے، اس کا نتیجہ بدیہی ہے جس میں اِشکال کی گنجائش نہیں ہوتی۔ تو منطقی اُصول سے جو سوال ہو سکتا تھا، اُس کا جواب میں نے آپ کی خدمت میں عرض کیا ہے کہ یہاں حدِ اَوسط متکرر نہیں، پہلا لَّاَسۡمَعَہُمۡ اور ہے، اور دوسرا اَسۡمَعَہُمۡ مقید ہے اس قید کے ساتھ۔ ''اگر اللہ تعالیٰ ان میں خیر دیکھتا تو ان کو سنا دیتا ایسا سنانا جو اُن کے لیے مفید ہوتا۔ اور اگر اللہ تعالیٰ ان کو اندریں حالات سنا دے جب کہ ان میں خیر نہیں ہے، طلبِ حق نہیں ہے تو کوئی فائدہ ہی نہیں ہے'' اس لیے حدِ اَوسط متکرر نہیں ہے، پہلے میں اِسماع اور ہے، اور دوسرے میں اِسماع اور ہے، اُس کے ساتھ اور قید لگی ہوئی ہے۔ تو جب حدِ اَوسط متکرر ہی نہیں، تو سرے سے یہ قیاس ہی نہیں بنتا، یہ دونوں باتیں ہی علیحدہ علیحدہ ہیں، ورنہ بظاہر تو یہ شکل اول بنی پڑی ہے، اور نتیجہ غلط دے رہی ہے۔ منطق یاد نہیں، ورنہ آپ یہ اعتراض ضرور کرتے۔

''علمِ منطق'' کی اہمیت

''منطق'' اسی لیے پڑھی پڑھائی جاتی ہے تاکہ سوچنے کی، سمجھنے کی، غور کرنے کی، اِشکالات پیدا کرنے کی، ان کے جوابات دینے کی صلاحیت اُبھرے، ہمارے اُستاذ تھے حضرت مولانا محمد رفیق صاحب رحمۃ اللہ علیہ شیخ الحدیث جامعہ دار العلوم ربانیہ، ضلع فیصل آباد، ترجمہ میں نے انہی سے پڑھا تھا، وہ بہت شفیق اور مہربان تھے، اللہ تعالیٰ اُن کے درجات بلند کرے، ہماری تو صحیح بنیاد حقیقت ہے کہ انہی کے ہاتھوں سے اُٹھی ہے، اگر اُن کی صحبت پہلے پہلے نصیب نہ ہوتی تو شاید علم کے بارے میں اس قسم کا شوق نہ ہوتا، جو اُن کی صحبت میں جا کے اللہ تعالیٰ نے عنایت فرما دیا، ان کی خدمت کا موقع ملا ہے، دو سال ان کے پاس رہا ہوں۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ منطق بذاتِ خود کچھ نہیں ہے، نہ اس میں کہیں اللہ کا ذکر، نہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر، نہ قبر میں کام آنے کی، نہ حشر میں کام آنے کی، بس ایسے ہی جوڑتے جاؤ اور توڑتے جاؤ، اسی قسم کا حال ہے، بظاہر اس میں کوئی فائدے کی بات معلوم نہیں ہوتی، لیکن وہ ہمیں کہا کرتے تھے کہ اس کے اُوپر محنت کرو، یہ اس طرح سے ہے جس طرح سے گوبر اور کھاد، جو فی حد ذاتہٖ تو ایک نجس چیز ہے، لیکن جب اُس کو زمین میں ڈال دیا جاتا ہے تو زمین زرخیز ہو جاتی ہے، پھر اس میں جو بوؤ گے وہ خوب اُگے گا، تو کہتے تھے کہ منطق اور فلسفہ دِماغ کے لیے ایک کھاد ہے، تو اگر ظاہری طور پر تمہیں یہ معلوم ہو کہ اس میں تو کام کی بات ہے ہی نہیں، لیکن یہ واقعہ ہے کہ جس وقت انسان اس کے اُصول اپناتا ہے، اور اس میں چوں چوں کرنی سیکھ لیتا ہے، ''چونکہ چنانچہ'' جس طرح سے چلتا ہے کہ یہ کیوں ہو گیا، وہ کیوں ہو گیا، اس قسم کے اِشکالات پیدا کر کے یہ بالکل ایسے ہے جس طرح سے کہ ذہن کی ایک ورزش کروائی جا رہی ہے۔ جیسے یہ پہلوان ورزش کرتے ہیں بظاہر ایسے ہی ایک دوسرے سے ٹکریں ماریں گے، اور ایک دوسرے سے کشتی کریں گے، تو اس میں بظاہر کوئی فائدہ معلوم ہوتا ہے؟ اور آپ دوڑ لگانی شروع کر دیں تو ایک بے کار سی حرکت معلوم ہوگی کہ کوئی کام نہیں، ایسے ہی بھاگے پھر رہے ہیں، لیکن اتنا تو آپ کو معلوم ہے کہ اس طرح سے بھاگنے کے ساتھ اور آپس میں کشتی کرنے

کے ساتھ آپ کی قوتیں بڑھ رہی ہیں، اور پھر جس وقت کوئی کام کا موقع آئے گا تو یہی قوت آپ کے کام آئے گی۔ تو قوت کو بڑھانے کے لیے بسا اوقات اس قسم کی ورزش کرنی پڑتی ہے، اس منطق اور فلسفے کے ساتھ بھی سوچ بچار کی قوت بڑھتی ہے، یا ایسے ہے جیسے زمین میں کھاد ڈالی جا رہی ہے۔ تو اگرچہ وہ بذاتِ خود کچھ نہ ہو، ایک نجس یا ناپاک چیز ہے، لیکن جب زمین میں ڈال دی جاتی ہے اور اس کے اندر جا کے مل جاتی ہے تو زمین زرخیز ہو جاتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ منطقی ذہن کے لوگ جو ہوا کرتے ہیں یا منطق جنہوں نے سمجھ کے پڑھی ہے وہ بات کو اخذ بڑا اچھا کرتے ہیں، اور اس میں اِشکالات بڑے اچھے پیدا کر لیتے ہیں، پھر اِشکالات کا جواب بڑے اچھے انداز سے دے لیتے ہیں، تو اس لیے اس کو بے کار نہ سمجھو، اس کے اوپر محنت کیا کرو۔

اللہ اور اس کے رسول کی باتیں اِنسان کے لیے حیات بخش ہیں

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِیْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ: استجابہ: جواب دینا، کسی کی بات کو مان لینا، قبول کر لینا۔ اے ایمان والو! اللہ اور اللہ کے رسول کا حکم مانا کرو، اُس کی بات کو قبول کیا کرو، کہ اس بات کے قبول کرنے میں فائدہ تمہارا ہے، اللہ اور اللہ کا رسول تمہیں ایسی باتیں بتاتا ہے جو تمہارے لیے حیات بخش ہیں، جس سے تمہاری زندگی بنتی ہے۔ ارے بھائی! زندگی تو وہی زندگی ہے جس میں کوئی شرافت اور انسانیت ہو، جس میں انسان آخرت کا نفع کمائے، ورنہ تو انسان مردہ ہے۔ اللہ اور اللہ کا رسول تمہیں ایسی باتیں بتاتے ہیں جن سے تمہاری زندگی بنتی ہے، یہ حیات بخش چیزیں ہیں، ورنہ تمہاری روح مردہ ہے، اور کردار کے لحاظ سے تم مردہ ہو، اور اللہ اور اللہ کے رسول کی باتیں جس وقت تم سیکھو گے تو تمہارے اندر صلاحیتیں ابھریں گی، نیکی کی توفیق ہوگی، زندگی سے فائدہ اُٹھاؤ گے۔ گویا کہ صحیح طور پر زندگی ملتی ہے، اللہ اور اللہ کے رسول کے احکام ماننے سے۔ ''جب کہ دعوت دے تمہیں اللہ کا رسول ایسی چیز کی طرف جو تمہیں زندگی دیتی ہے، جس سے تمہیں زندگی ملتی ہے، حیات بخش چیز کی طرف تمہیں بلاتا ہے'' تو تمہیں اس بات کو ماننا چاہیے، کیونکہ اس میں فائدہ تمہارا ہے، اور اس ماننے میں سستی نہ کیا کرو۔

''اَنَّ اللّٰهَ یَحُوْلُ بَیْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهٖ'' کے تین مفہوم

اس بات کو یاد رکھو! اللہ تعالیٰ انسان اور اُس کے دل کے درمیان میں حائل ہو جاتا ہے۔ ''حائل ہو جاتا ہے'' دو مطلب ہیں، یا تو مطلب یہ ہے کہ جس وقت کوئی نیکی کرنے کا موقع آئے، اللہ اور اللہ کے رسول کی بات پہنچے تو جلدی سے اُس پر عمل کر لیا کرو، ورنہ بسا اوقات یوں ہوتا ہے کہ انسان کہتا ہے کہ چلو! کر لیں گے، لیکن پھر بعد میں دل ایسا پھرتا ہے کہ پھر اپنے دل پہ کنٹرول ہی نہیں رہتا کہ انسان کچھ ارادہ کرے بھی تو دل نہیں مانتا، پتا نہیں دل کی کیفیت کیا ہو جائے گی، اس لیے وقت سے فائدہ اٹھاؤ، جس وقت رغبت ہے اسی وقت نیکی کرو، جب بلایا جا رہا ہے اسی وقت کر لو، ورنہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کے تحت، اللہ تعالیٰ کی حکمت کے تحت دل پلٹا کھا جاتے ہیں، جب دل پلٹا کھا جائے گا تو پھر تمہیں نیکی کرنے کی توفیق ہی نہیں ہوگی، اس لیے وقت کو ٹالا نہ کرو۔ جیسے حدیث شریف میں آتا ہے: ''یَا مُقَلِّبَ الْقُلُوْبِ ثَبِّتْ قَلْبِیْ عَلٰی دِیْنِكَ'' سرورِ کائنات ﷺ یہ دُعا فرمایا کرتے

تھے، اور فرمایا کرتے تھے: ''إِنَّ الْقُلُوْبَ بَيْنَ إِصْبَعَيْنِ مِنْ أَصَابِعِ اللهِ يُقَلِّبُهَا كَيْفَ يَشَاءُ''[1] بنی آدم کے قلوب اللہ تعالیٰ کی اُنگلیوں میں سے دو اُنگلیوں کے درمیان میں ہیں، ''يُقَلِّبُهَا كَيْفَ يَشَاءُ'' جیسے چاہتا ہے اُن کو پھیرتا رہتا ہے۔ دو اُنگلیوں کے درمیان میں ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا اُس کے اُوپر پورا مکمل تصرف ہے، جس طرح سے جو چیز آپ کی اُنگلیوں کے درمیان آگئی، تو آپ اس کو جیسے چاہے گھمالیں، آسانی کے ساتھ گھوم جاتی ہے، تو بنی آدم کے قلوب اسی طرح سے اللہ کے قبضے میں ہیں، جدھر چاہے گھماتا ہے، اس لیے حضور ﷺ دُعا فرمایا کرتے تھے: ''يَا مُقَلِّبَ الْقُلُوْبِ ثَبِّتْ قَلْبِيْ عَلٰى دِيْنِكَ'' میرے دل کو اپنے دِین پہ جمائے رکھنا، دِین سے میرے دِل کو پلٹنا نہ آئے، لیکن یہ بات تو ہے نا، کہ پتا نہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے کیا ہوجائے، اس لیے دیر نہ کیا کرو، بسا اوقات انسان اور انسان کے دل کے درمیان اللہ کی قدرت حائل ہوجائے گی، اللہ کا تصرف حائل ہوجائے گا پھر اپنے دل پر کنٹرول نہیں رہے گا، اس لیے جتنی جلدی ہوسکے عمل کرلیا کرو، دیر نہ کیا کرو، تاخیر کرنے کے ساتھ بسا اوقات دل بدل جاتے ہیں، اور پھر انسان کو عمل کی توفیق نہیں ہوتی۔

اور اس کا یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ انسان کے دل پر جتنا اللہ کا تصرف چلتا ہے اتنا انسان کا بھی نہیں چلتا، اتنا انسان اپنے دل سے قریب نہیں جتنا اللہ قریب ہے۔ اس لیے خلوص کے ساتھ، عقیدت کے ساتھ، محبت کے ساتھ اللہ اور اللہ کے رسول کے اَحکام کو مانا کرو، کہ تمہارے سارے کے سارے حالات اللہ کے سامنے ہیں۔ ''اللہ حائل ہوجاتا ہے'' یعنی تم اور تمہارا دل آپس میں اتنا قریب نہیں جتنا اللہ ہے، جس طرح سے قرآنِ کریم میں آتا ہے نَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ (سورۂ ق:۱۶)...... اور حضرت تھانوی ؒ نے اس کا یہ مطلب بھی ذکر کیا ہے، کہ اللہ حائل ہوجاتا ہے، یعنی اگر نیکی کرو گے تو تمہارے دل کی طرف بُرائی نہیں آنے دے گا، نیکی کی توفیق مزید بڑھتی چلی جائے گی، اور اگر کوئی شخص بُرائی پہ اڑا ہوا ہے تو اللہ حائل ہوجاتا ہے کہ اُس کے دل میں نیکی نہیں آنے دیتا، اس لیے طاعات پر دوام مفید ہے، اور معصیت پر دوام بہت نقصان دِہ ہے، طاعت کرنی شروع کرو گے تو اللہ کی طرف سے طاعت کی مزید توفیق ہوتی چلی جائے گی اور معصیت کو اللہ تمہارے دل کے قریب نہیں آنے دے گا۔ اور اگر معصیت پہ اَڑ گئے تو پھر معصیت پر ہی چلتے جاؤ گے، پھر اللہ تعالیٰ تمہارے دل کی طرف خیر کو قریب نہیں آنے دے گا۔ بہر حال اس میں ترغیب ہے کہ جس وقت کوئی بات سامنے آجائے تو فوراً اُس پر عمل کرلیا کرو، دیر نہ کیا کرو، بسا اوقات انسان کا اپنے دل پہ بھی اختیار نہیں رہتا، پھر توفیق سلب ہوجاتی ہے۔ اور اس بات کو بھی یاد رکھو کہ اسی کی طرف تم جمع کیے جاؤ گے، جب اُسی کی طرف ہی تمہارا حشر ہے، تم جمع کیے جاؤ گے تو نیکی کرو گے تو وہاں جاکے ثواب پالو گے، نیکی نہیں کرو گے تو محرومی ہوگی۔

''اَمر بالمعروف اور نہی عن المنکر'' کے ترک کا وبال

وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً: اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ اپنے آپ کو بھی سنوارو، اس میں کوئی شک نہیں کہ اطاعت کرو اور اللہ کے احکام مانو۔ لیکن ساتھ ساتھ دُنیا سے بُرائی کو مٹانے کی بھی کوشش کرو، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر

(۱) مشکوٰۃ ص ۲۲، باب الایمان بالقدر، فصل ثانی، عن انسؓ / سنن الترمذی ۲/ ۳۶، باب ماجاء فی ان القلوب بین الخ۔

بھی کیا کرو، اگر تمہارے اندر کچھ ایسے لوگ ہیں جو ظالم ہیں، ظلم کرتے ہیں اگرچہ بدکردار وہ ہیں، ظالم وہ ہیں، لیکن تم انہیں روکتے نہیں، یا اُن سے نفرت نہیں کرتے، اور اُس ظلم کے انسداد کی کوشش نہیں کرتے، تو یہ نہ سمجھنا کہ عذاب میں صرف ظالم ہی پھنسیں گے، جب عذاب آئے گا تو سارے ہی لپیٹ میں آجاؤ گے۔ تو بچنے کا طریقہ یہی ہے کہ خود بھی ظلم نہ کرو، اور ظلم کرنے والوں کو بھی ظلم سے روکو، تب جاکے تم شروفتن سے بچ سکتے ہو، ورنہ اگر ظالموں کا ہاتھ نہیں پکڑو گے تو جس وقت بھی ظلم کی سزا ملے گی، وبال آئے گا تو لپیٹ میں سارے ہی آجاؤ گے۔ سرورِ کائنات ﷺ نے اس بات کو ایک مثال کے ساتھ سمجھایا، کہ بعض لوگ تو ایسے ہیں جو اللہ کی حدود کو توڑتے ہیں، اللہ کے احکام کی نافرمانی کرتے ہیں، اور بعض ایسے ہیں جو اس بارے میں مداہنت کرتے ہیں، یعنی انہیں روکتے نہیں، منع نہیں کرتے، امر بالمعروف ونہی عن المنکر نہیں کرتے یہ مداہنین کا گروہ۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا ان کی مثال ایسے ہے جیسے ایک جماعت کشتی میں سوار ہوئی اور کشتی دو خانوں والی، دو منزلی، (جیسے آج کل جہاز تو چھ چھ سات سات منزلوں کے ہیں، اُس زمانے میں بھی معلوم ہوتا ہے ایسی کشتیاں بناتے ہوں گے جو کئی کئی منزلوں کی ہوتی تھیں، ورنہ رسول اللہ ﷺ یہ مثال کیسے بیان فرماتے، تو اس وقت بھی اس قسم کی بڑی کشتیاں تھیں جن میں دو منزلیں ہوتیں، ایک نیچے اور ایک اوپر) تو بعض لوگ نچلی منزل میں چلے گئے، اور بعض اُوپر کی منزل میں۔ اب نچلی منزل میں تو چونکہ دروازہ اور روشن دان کچھ نہیں ہوتا، اُن کو پانی لینے کی ضرورت پیش آتی تو وہ اُوپر کی منزل میں آکے سمندر میں سے پانی کھینچتے تھے، لیکن اُوپر والے تکلیف محسوس کرتے تھے کہ یہاں آکر پانی کیوں کھینچتے ہیں، تو نچلی منزل والوں نے کہا کہ بہت اچھا! اگر تمہیں تکلیف ہے پانی اوپر سے لینے میں، تو ہم نیچے سوراخ کر لیتے ہیں، یہاں سے پانی لے لیں گے، اب نیچے کلہاڑی لے کر جس وقت لگے سوراخ کرنے، تو حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ اگر اُوپر والے آکے ان کا ہاتھ پکڑلیں گے تو ان کو بھی بچالیں گے اور اپنے آپ کو بھی بچالیں گے۔ اور اگر یہی سوچتے رہے کہ ہمیں کیا، اپنے گھر کرتے ہیں جو کچھ کرتے ہیں، ہمیں اس سے کیا، اگر وہ پھٹا توڑنے لگے ہیں تو اپنے درجے میں توڑنے لگے ہیں، ہمارا اس میں کیا نقصان ہے، اگر وہ اس طرح سے سستی کر کے بیٹھے رہیں گے، تو پھر صرف نچلے نہیں ڈوبیں گے اُوپر والے بھی ساتھ ہی جائیں گے۔ جب کشتی ڈوبے گی تو صرف نچلی منزل تو نہیں ڈوبے گی، اوپر والے بھی ساتھ ہی جائیں گے۔ فرمایا یہی حال ہے اُن لوگوں کا جو اللہ کی حدود کو توڑتے ہیں، اور وہ لوگ جو چپ کر کے تماشا دیکھتے رہ جاتے ہیں، تو جب وبال آئے گا تو اس وبال کی لپیٹ میں صرف وہی نہیں آئیں گے جو اللہ کی حدود کو توڑنے والے ہیں، بلکہ جب عذاب آئے گا تو سارے ہی لپیٹ میں آجائیں گے۔[1] اس لیے بچنے کا طریقہ یہی ہے کہ خود بھی نیک عمل کرو اور دوسروں کو بھی نیکی کی تلقین کرو۔ اور اگر کوئی نہ روکے بلکہ بُرائی کرنے والوں کے ساتھ ہی شامل رہے، اور اُن کی بُرائی سے نفرت بھی نہ کرے تو عذاب کی لپیٹ میں وہ بھی آجاتا ہے۔ ''مشکوۃ شریف'' میں ''باب امر بالمعروف'' کے اندر ایک واقعہ ہے، کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے جبریل علیہ السلام کو کسی بستی کے متعلق حکم دیا کہ اُس کو جاکے اُلٹ دے۔ تو جبریل علیہ السلام نے کہا کہ یا اللہ! اس میں تو ایک ایسا آدمی ہے جس نے کبھی تیری نافرمانی نہیں کی۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا اُس کے ساتھ ہی اُلٹ دے، کیونکہ میری نافرمانی کو دیکھ کے کبھی اُس کا چہرہ بھی نہیں بدلتا، وہ نفرت کا اظہار نہیں کرتا، جب نفرت کا اظہار

---

(۱) صحیح البخاری ۱/ ۳۳۹ باب القرعۃ فی المشکلات۔ مشکوۃ ۲/ ۴۳۶ باب الامر بالمعروف، فصل اول۔

نہیں کرتا تو وہ بھی ساتھ ہی جائے گا۔"[1] تو یہاں یہی بات ہے کہ وہ فتنہ جو آئے گا، وہ عذاب جو آئے گا وہ صرف انہی کو نہیں پہنچے گا جو تم میں سے ظالم ہیں، بلکہ جو اُس ظلم کو روکنے پر قادر تھے، اور روکتے نہیں تھے، وہ بھی اس فتنے کی لپیٹ میں آجائیں گے۔ جیسے ایک بستی کے اندر گندگی عام ہو جائے تو ایک آدمی اگر اپنے گھر کو صاف کیے بیٹھا ہو تو اُس گندگی کی وجہ سے اگر کوئی وبا آئے گی، تو یہ شخص جس نے اپنا گھر صاف کر رکھا ہے بچے گا یہ بھی نہیں، صرف اپنا گھر صاف کر لینا کافی نہیں اگر ساری کی ساری بستی گندی ہے، ساری بستی کو صاف رکھنے کی کوشش کرو گے تو سارے صحت مند رہ جاؤ گے۔ اگر کوئی کہے ہمیں کیا، ہمارا گھر صاف ہے، اگر گندگی پھیلتی ہے تو پھیلتی رہے، لیکن اگر ہیضہ پھیلا، یا کوئی اور وبا آئی تو جس نے صرف اپنے گھر کو صاف رکھا ہے بچے گا وہ بھی نہیں۔ اس لیے حکم شریعت کا یہی ہے کہ صرف اتنا کافی نہیں کہ آپ نیکی کر لیں اور بُرائی سے بچ جائیں، بلکہ یہ بھی آپ پر فرض عائد ہوتا ہے کہ اپنی ہمت اور وسعت کے مطابق دوسروں کو نیکی کی تلقین کرو، اور بُرائی کو روکنے کی کوشش کرو۔ "بچو اس فتنہ سے جو نہیں بچے گا صرف ان لوگوں کو جو تم میں سے ظالم ہیں" وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ: یقین کر لو کہ بے شک اللہ تعالیٰ سخت سزا دینے والے ہیں۔

اللہ تعالیٰ قرآنِ کریم میں اپنے اِحسانات جگہ بہ جگہ کیوں جتلاتے ہیں؟

پھر یہ قاعدہ ہے کہ انسان احسانات سے متاثر ہوتا ہے، تو اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں جگہ بہ جگہ اپنے احسانات بھی جتلاتے ہیں۔ "یاد کرو اس وقت کو"...... "یاد کرو" کا مطلب یہ ہے کہ یاد رکھو، یہ چیزیں یاد رکھنے کی ہیں، ان باتوں کو ذہن میں رکھا کرو...... یاد کرو تم اس وقت کو جب تم تھوڑے سے تھے، کمزور سمجھے ہوئے تھے اپنے علاقے میں، تمہاری کوئی قوت اور طاقت نہیں تھی، ہر وقت تم ڈرتے تھے کہ لوگ تمہیں اُچک لیں گے، معلوم نہیں کس وقت ہم ان کا تر نوالہ بن جائیں، مشرک کس وقت ہمیں ختم کر دیں، اس طرح سے تمہارے پر خوف اور ہیبت طاری تھی، اللہ نے احسان کیا کہ تمہیں ٹھکانا دیا، یہ ٹھکانا مدینہ منورہ میں دیا، اور اپنی نصرت کے ساتھ تمہیں قوت پہنچائی، پاکیزہ چیزیں تمہیں کھانے کے لیے دیں، یہ سارے کام اس لیے کیے تاکہ تم شکر گزار ہو جاؤ، تو اللہ تعالیٰ کی شکر گزاری یہی ہے کہ اُس کے احکام مانو۔ اس قسم کی چیزوں کو احسانات کو یاد رکھا جائے تو احسانات کو یاد رکھنے سے اطاعت آسان ہوتی ہے، منعم کی فرمانبرداری انسان کی فطرت ہے۔

خیانت کی مختلف صورتیں

آگے بھی اسی کے متعلق ہی تاکید کرنی مقصود ہے۔ اے ایمان والو! اللہ اور اللہ کے رسول سے خیانت نہ کیا کرو، خیانت کا وہی مفہوم ہے کہ جو حق واجب آپ کے ذمہ لگا ہے وہ پورا ادا نہ کرو، دبا جاؤ۔ تو اللہ تعالیٰ کے احکام کو نہ مانا جائے، یا ظاہراً مانا جائے اور دل میں کھوٹ ہو، جیسے آپ نماز پڑھیں لیکن دل کے اندر خلوص نہیں ہے، یا نماز پڑھتے ہیں اور محض ٹرخانے کی کوشش کرتے ہیں، رُکوع سجدہ بھی صحیح نہیں کرتے، یہ سارے کے سارے کام اللہ کے احکام کے اندر خیانت ہے۔ اور اسی طرح سے اپنے حقوق میں بھی ایک دوسرے سے خیانت نہ کرو، جو حقوق ایک دوسرے کے تمہارے ذمے لگے ہوئے ہیں اُن کو بھی صحیح طور پر ادا کیا کرو۔

---

(۱) مشکوۃ ۲/۴۳۹، باب الامر بالمعروف، فصل ثالث/ شعب الایمان ۱۰/ ۷۳، رقم ۷۱۸۹۔

اللہ تعالیٰ کے حقوق ادا کرو، اللہ کے رسول کے حقوق ادا کرو، اور آپس میں حقوق ادا کرو، یہی چیز تمہارے فائدے کی ہے وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ: حالانکہ تم جانتے ہو کہ اللہ کی خیانت بُری ہے، اللہ کے رسول کی خیانت بُری ہے اور آپس میں ایک دوسرے کے حقوق میں خیانت کرنا بُرا ہے، یہ بات تم جانتے ہو، تو ایسے جاننے کی صورت میں، علم حاصل ہو جانے کے باوجود تمہیں چاہیے کہ خیانت نہ کرو، کیونکہ جس وقت خیانت کی عادت پڑ جائے گی، تو پھر یہ نہیں ہے کہ تم دوسرے کو نقصان پہنچاؤ گے، جب قومی مرض عام ہو جاتی ہے تو پھر ہر شخص ہی نقصان میں جاتا ہے۔

دُوسروں سے خیانت کا نقصان خود کو بھی ہوتا ہے

جیسے آج کل آپ دیکھتے ہیں کہ ہر شخص دھوکا دے کے زیادہ سے زیادہ کمانے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر تو دیانت داری ہو، عدل اور انصاف ہو تو سارے لوگ ہی راحت میں رہیں، اور امن وچین سے وقت گزرے، ہر کوئی دوسرے کے حق کی حفاظت کرے، لیکن جب لوٹ کھسوٹ پڑ جائے، تو میں خوش ہوں کہ میں نے اس کو دھوکا دے کے اس سے پیسے زیادہ لے لیے، لیکن اگر میں یہاں سے دھوکا دے کر پیسے زیادہ لے لوں، تو کوئی اور ہوشیار چور آئے گا وہ مجھے اس طرح سے لُوٹ کے لے جائے گا، پریشانی موجود رہے گی، مال اسی طرح سے چلتا پھرتا رہے گا، جس طرح سے عام پھرتا ہے، اگر عدل وانصاف کے ساتھ اس کو حرکت دو گے تو مال حرکت پھر بھی کرے گا، لیکن نتیجے میں تمہیں امن، سکون اور اطمینان نصیب ہوگا، اور اگر مال کی حرکت غلط طریقے سے ہو تو مال چلے گا پھر بھی، آپ زیادہ کما لیں گے تو کہیں زیادہ دینا پڑ جائے گا پریشانی نتیجے میں ملے گی، جیسے آج کل ماحول ہے..... حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ وعظ میں ایک مثال بیان فرماتے ہیں، کہ ایک شخص نے ایک گھوڑا کہیں سے چوری کر لیا، چوری کر کے وہ لیے جارہا تھا، تو راستے میں کوئی شخص آ گیا، وہ اُس سے پوچھتا ہے کہ کیا گھوڑا بیچنا ہے؟ وہ چور بڑا خوش ہوا کہ یہ تو بڑی اچھی بات ہے کہ ابھی تو لایا ہوں اور ابھی خریدار بھی مل گیا، تو بیچ کے میں اپنے پیسے کھرے کروں، تا کہ پھنسنے کا ڈر نہ رہے، وہ کہتا ہے ہاں جی! بیچنا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اچھا! مجھے ذرا اس پہ سواری کر کے دیکھنے دو۔ اپنا جُوتا اُتارا کہ یہ ذرا پکڑو، میں تھوڑا سا اس کو چلا کے دیکھوں کہ یہ کیسا چلتا ہے؟ جس طرح سے لوگ چیک کیا کرتے ہیں جو چیز خریدنی ہو۔ جوتے اُس کے ہاتھ میں دیے، اور خود گھوڑے کے اُوپر بیٹھا، اور ایڑ لگائی اور بھگا کے لے گیا، جب بھگا کے لے گیا تو جوتے اس کے ہاتھ میں ہیں اور یہ چلا جارہا ہے، کسی نے پوچھا کہ بھائی! ابھی تم گھوڑا لیے جارہے تھے، اُس کا کیا ہوا؟ کہتا ہے بیچ دیا۔ کتنے کا بیچا؟ کہتا ہے جتنے کا لیا تھا اتنے کا بیچ دیا، یہ جُوتے نفع میں۔ تو یہاں حساب وہی ہوتا ہے، کہ اگر دھوکے کے ساتھ ایک جگہ سے زیادہ کما لو گے تو اس سے زیادہ دھوکا باز آپ کو مل جائے گا، وہ آپ کو لُوٹ کر لے جائے گا۔ آپ نے رشوت لے لی اور آپ کے پیسے ڈاکٹر کے پاس چلے گئے۔ سُود کی رقم آپ نے جمع کر لی، پیسے مقدمے پہ لگ گئے۔ آپ کسی کی جیب کاٹ کر لائے، اور کوئی آپ سے زیادہ ہوشیار جیب تراش آپ کو مل گیا۔ ہوتا اسی طرح سے ہے کہ ادھر سے آتے ہیں اور اُدھر جاتے ہیں، لیکن ساری کی ساری دُنیا پریشان ہے، ہر کوئی شکوہ کر رہا ہے اس بات کا کہ جی! بڑی دھوکا بازی ہے۔ تو ہر کوئی دھوکا کرے گا اور ہر شخص دھوکے میں آئے گا۔ اور اگر ایک دوسرے کے حقوق کی حفاظت ہو جائے، بات

پھر بھی وہیں رہے گی، لیکن سارے امن چین سے رہیں گے۔ تو اس طرح سے آپس میں بھی ایک دوسرے کے حقوق میں خیانت نہ کیا کرو، کیونکہ اس میں اجتماعی نقصان ہے، امن تبھی ہوگا کہ اللہ اور اللہ کے رسول کی امانت کا بھی خیال رکھو، اور آپس کی امانات کا بھی خیال رکھو، ان میں بھی خیانتیں نہ کیا کرو۔

اِنسان کا خیانت پر برانگیختہ ہونے کا سبب

وَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّمَاۤ اَمۡوَالُكُمۡ وَاَوۡلَادُكُمۡ فِتۡنَةٌ: یہ اصل میں رَگ پکڑی ہے جس کی بنا پر انسان خیانت پر برانگیختہ ہوتا ہے، خیانت کا داعیہ جو پیدا ہوتا ہے اُس میں سوائے حبِ مال اور حبِ اولاد کے کوئی دوسری وجہ نہیں ہے، یا تو مال کی محبت ہے جس کی بنا پر انسان خیانت پر آمادہ ہوتا ہے یا اولاد کی محبت ہے، آپ دیکھیں گے، لوٹ پوٹ کے بات یہیں آتی ہے، اپنی اولاد کے لیے انسان بنانا چاہتا ہے، اپنی اولاد کو زیادہ اچھا کرنا چاہتا ہے، تب جا کے خیانتیں کرتا ہے، اللہ کے احکام چھوڑتا ہے، اللہ کے رسول کے احکام چھوڑتا ہے، لوگوں سے دھوکا بازیاں کرتا ہے، فریب کرتا ہے، زیادہ سے زیادہ جمع کرنے کی کوشش کرتا ہے، تو مال اور اولاد کی محبت میں آکے یہ خیانتیں ہوتی ہیں۔ اللہ فرماتے ہیں یہ بات تو تم ہمیشہ یاد رکھا کرو، یقین کے درجے میں جان لو کہ مال اولاد تمہارے لیے آزمائش ہیں، یہ فتنہ ہیں، اس آزمائش میں کامیاب ہوتے ہو یا نہیں؟ اگر اس آزمائش میں کامیاب نہ ہوئے، اور اس مال واولاد کی محبت میں مبتلا ہو گئے تو یہ آخرت میں بھی عذاب بنے گی، بلکہ بسا اوقات یہی مال اور یہی اولاد دنیا میں بھی عذاب بن جاتی ہے، اس میں کوئی شک نہیں فَلَا تُعۡجِبۡكَ اَمۡوَالُهُمۡ وَلَاۤ اَوۡلَادُهُمۡ ؕ اِنَّمَا يُرِيۡدُ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمۡ بِهَا فِى الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا وَتَزۡهَقَ اَنۡفُسُهُمۡ وَهُمۡ كٰفِرُوۡنَ، اگلی سورت میں یہ آیت آئے گی (آیت: ۵۵)، کہ ان منافقوں کے پاس مال اور اولاد دیکھ کے آپ تعجب نہ کریں کہ اس قسم کے نافرمانوں کو اللہ نے یہ مال اور اولاد کیوں دے رکھی ہے؟ یہ تو اللہ تعالیٰ کا عذاب ہے، اللہ تعالیٰ کا ارادہ ان کو عذاب میں مبتلا کرنے کا ہے، کمانے میں پریشان، جمع ہونے کے بعد رکھنے میں پریشان، اولاد جس طرح سے والدین کو پریشان کرتی ہے، یہ مثالیں بھی آپ کے سامنے ہیں، تو یہ دنیا کا عذاب ہے۔ اور جب ناجائز طریقہ سے ان کو حاصل کیا ہوگا، ناجائز طریقے سے اولاد کو پالا ہوگا تو آخرت کا عذاب تو سر پہ کھڑا ہے۔ تو یہ مال و اولاد اللہ تعالیٰ کی طرف سے بعض لوگوں کے لیے عذاب ہوتا ہے، یہ ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی نعمت نہیں ہے، نعمت یہ تبھی ہے جب اس کو صحیح طریقہ سے حاصل کرنے کی کوشش کرو، اور پھر اس پر اللہ کا شکر بجالاؤ، اس میں تصرف اسی طرح کرو جس طرح سے اللہ کا حکم ہے۔ تو خیانت چونکہ اسی مال و اولاد کی محبت کی وجہ سے ہوتی ہے، اس لیے آخر میں اس پر تنبیہ کردی۔ ''یقین کرلو، جان لو کہ تمہارے مال اور تمہاری اولاد تمہارے لیے آزمائش کا ذریعہ ہیں، وَّاَنَّ اللّٰهَ عِنۡدَهٗۤ اَجۡرٌ عَظِيۡمٌ: اور اس بات کا بھی یقین کرلو کہ بے شک اللہ کے پاس اجر عظیم ہے، جو مال اور اولاد کی محبت میں مبتلا نہیں ہوتے، اور اللہ تعالیٰ کے احکام کو بجالاتے ہیں اُن کے لیے اللہ کے پاس اجر عظیم ہے۔

سُبۡحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمۡدِكَ اَشۡهَدُ اَنۡ لَّاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنۡتَ اَسۡتَغۡفِرُكَ وَاَتُوۡبُ اِلَيۡكَ

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ یَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا وَّیُكَفِّرْ

اے ایمان والو! اگر تم اللہ سے ڈرتے رہو گے تو کردے گا اللہ تعالیٰ تمہارے لیے فرقان اور دور ہٹائے گا

عَنْكُمْ سَیِّاٰتِكُمْ وَیَغْفِرْ لَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِیْمِ ۲۹ وَاِذْ

تم سے تمہارے گناہ اور تمہیں بخش دے گا، اللہ تعالیٰ فضل عظیم والے ہیں۲۹ اور یاد کیجئے اُس وقت کو جب

یَمْكُرُ بِكَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لِیُثْبِتُوْكَ اَوْ یَقْتُلُوْكَ اَوْ یُخْرِجُوْكَ ؕ

مکر کرتے تھے آپ کے متعلق وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا تاکہ وہ کافر آپ کو قید کرلیں یا آپ کو قتل کردیں یا آپ کو نکال دیں،

وَیَمْكُرُوْنَ وَیَمْكُرُ اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ خَیْرُ الْمٰكِرِیْنَ ۳۰ وَاِذَا تُتْلٰى

اور وہ تدبیر کرتے تھے اور اللہ تدبیر کرتا تھا، اللہ تعالیٰ تدبیر کرنے والوں میں سے بہترین ہے۳۰ اور جب پڑھی جاتی ہیں

عَلَیْهِمْ اٰیٰتُنَا قَالُوْا قَدْ سَمِعْنَا لَوْ نَشَآءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَاۤ ۙ

ان پر ہماری آیات تو کہتے ہیں ہم نے سُن لیا، اگر ہم چاہیں تو ہم بھی اس کی مثل کہہ دیں،

اِنْ هٰذَاۤ اِلَّاۤ اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ ۳۱ وَاِذْ قَالُوا اللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ

نہیں ہیں یہ مگر پہلے لوگوں کی قصے کہانیاں۳۱ اور وہ وقت بھی قابلِ ذِکر ہے جب انہوں نے کہا

هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَیْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ

اے اللہ! اگر یہی حق ہے تیری جانب سے پھر برسا تو ہمارے اُوپر پتھر آسمان سے

اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ ۳۲ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِیُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ

یا لے آ ہمارے پاس دردناک عذاب۳۲ اور نہیں ہے اللہ کہ انہیں عذاب دے اس حال میں کہ

فِیْهِمْ ؕ وَمَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ یَسْتَغْفِرُوْنَ ۳۳ وَمَا لَهُمْ

آپ ان میں ہوں، اور نہیں ہے اللہ ان کو عذاب دینے والا اس حال میں کہ وہ اِستغفار کرتے ہوں۳۳ اور کیا ہے ان کے لیے

اَلَّا یُعَذِّبَهُمُ اللّٰهُ وَهُمْ یَصُدُّوْنَ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ

کہ اللہ انہیں عذاب نہ دے حالانکہ وہ روکتے ہیں مسجد حرام سے اور نہیں ہیں

وَمَا كَانُوْٓا اَوْلِيَآءَهٗ ؕ اِنْ اَوْلِيَآؤُهٗٓ اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ

یہ اُس مسجد کے متولی، نہیں ہیں مسجد کے متولی مگر متقین، لیکن اُن میں سے اکثر

لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۴﴾ وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ اِلَّا مُكَآءً

علم نہیں رکھتے ﴿۳۴﴾ اور نہیں ہے ان کی نماز بیت اللہ کے پاس مگر سیٹی بجانا

وَّتَصْدِيَةً ؕ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ﴿۳۵﴾ اِنَّ

اور تالیاں بجانا، پس چکھو تم عذاب اپنے کُفر کرنے کے سبب سے ﴿۳۵﴾ بے شک

الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ لِيَصُدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ

وہ لوگ جنہوں نے کُفر کیا خرچ کرتے ہیں اپنے مال تاکہ روکیں اللہ کے راستے سے،

فَسَيُنْفِقُوْنَهَا ثُمَّ تَكُوْنُ عَلَيْهِمْ حَسْرَةً ثُمَّ يُغْلَبُوْنَ ۬ؕ

پس وہ عنقریب خرچ کریں گے اپنے مالوں کو پھر وہ مال اُن کے اُوپر باعثِ حسرت ہوں گے پھر یہ مغلوب ہوجائیں گے،

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى جَهَنَّمَ يُحْشَرُوْنَ ﴿۳۶﴾ لِيَمِيْزَ اللّٰهُ الْخَبِيْثَ

اور وہ لوگ جنہوں نے کُفر کیا جہنّم کی طرف جمع کیے جائیں گے ﴿۳۶﴾ تاکہ جُدا کر دے اللہ تعالیٰ خبیث کو

مِنَ الطَّيِّبِ وَيَجْعَلَ الْخَبِيْثَ بَعْضَهٗ عَلٰى بَعْضٍ فَيَرْكُمَهٗ

طیب سے اور کردے خبیث کو بعض کو بعض پر پھر تہہ بہ تہہ کردے اس خبیث کو

جَمِيْعًا فَيَجْعَلَهٗ فِيْ جَهَنَّمَ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۳۷﴾ ع

سب کو پھر اُس کو جہنّم میں کردے، یہی لوگ ہیں خسارہ پانے والے ﴿۳۷﴾

خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا: اے ایمان والو! اِنْ تَتَّقُوا اللّٰہَ: اگر تم اللہ سے ڈرتے رہو گے، یَجْعَلْ لَّکُمْ فُرْقَانًا: کردے گا اللہ تعالیٰ تمہارے لئے فرقان۔ فرقان: حق اور باطل کے درمیان فرق، اور ہر ایسی چیز کو ''فرقان'' کہہ دیا جاتا ہے جو حق اور باطل کے درمیان فرق کرنے والی ہو، جیسے اسی سورت میں آگے آئے گا کہ ''یوم بدر'' کو بھی ''یوم فرقان'' قرار دیا، اور

قرآنِ کریم کو ''فرقان'' قرار دیا، توراۃ کو ''فرقان'' قرار دیا، معجزات کو ''فرقان'' قرار دیا، تو حق اور باطل کے درمیان فرق کرنے والی چیز ''فرقان'' کہلاتی ہے۔ ''کردے گا اللہ تعالیٰ تمہارے لئے فرقان''، وَیُکَفِّرْ عَنْکُمْ سَیِّاٰتِکُمْ: اور دُور ہٹائے گا تم سے تمہارے گناہ، وَیَغْفِرْ لَکُمْ: اور تمہیں بخش دے گا، وَاللّٰہُ ذُوالْفَضْلِ الْعَظِیْمِ: اللہ تعالیٰ فضل عظیم والے ہیں۔ وَاِذْ یَمْکُرُ بِکَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا: یاد کیجئے اس وقت کو، یاد کرنے کے قابل ہے وہ وقت جب مکر کرتے تھے آپ کے متعلق وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا۔ مکر: خفیہ تدبیر۔ لِیُثْبِتُوْکَ: اَثْبَتَ اِثْبَات: ثابت کرنا، جما دینا، اور یہاں گرفتار کرنے اور قید کرنے کے معنی میں ہے۔ تا کہ وہ کافر آپ کو گرفتار کرلیں، قید کرلیں، اَوْیَقْتُلُوْکَ: یا آپ کو قتل کردیں، اَوْیُخْرِجُوْکَ: یا آپ کو نکال دیں، وَیَمْکُرُوْنَ: اور وہ تدبیر کرتے تھے، وَیَمْکُرُ اللّٰہُ: اور اللہ تدبیر کرتا تھا، وَاللّٰہُ خَیْرُ الْمٰکِرِیْنَ: اللہ تعالیٰ تدبیر کرنے والوں میں سے بہترین ہے۔ وَاِذَا تُتْلٰی عَلَیْہِمْ اٰیٰتُنَا: اور جب پڑھی جاتی ہیں ان پر ہماری آیات، قَالُوْا: کہتے ہیں، قَدْ سَمِعْنَا: ہم نے سُن لیا، لَوْنَشَآءُ: اگر ہم چاہیں لَقُلْنَا مِثْلَ ھٰذَآ: تو ہم بھی ایسی بات کہہ دیں، ہم اس کی مثل کہہ دیں، ہم بھی اس جیسا بول بول دیں، اِنْ ھٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ: نہیں ہے یہ مگر پہلے لوگوں کی قصے کہانیاں جو منقول چلی آرہی ہے۔ اساطیر اُسْطُورۃ کی جمع ہے، اسطورۃ کہتے ہیں وہ حکایات جو منقول ہوتی آرہی ہیں۔ ''نہیں ہے یہ مگر پہلے لوگوں کی قصے کہانیاں'' وَاِذْ قَالُوْا: اور وہ وقت بھی قابل ذکر ہے جب انہوں نے کہا، اَللّٰہُمَّ: اے اللہ!، اِنْ کَانَ ھٰذَا ھُوَ الْحَقَّ: اگر یہی حق ہے جو یہ محمد ﷺ کہتے ہیں، مِنْ عِنْدِکَ: تیری جانب سے، اگر یہی حق ہے تیری جانب سے، فَاَمْطِرْ عَلَیْنَا حِجَارَۃً: پھر برسا تو ہمارے اُوپر پتھر، مِّنَ السَّمَآءِ: آسمان سے، اَوِائْتِنَا: یا لے آ ہمارے پاس، بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ: باء تعدیہ کی ہے، اس کی وجہ سے اِئْتِ متعدی ہوگیا۔ اَتٰی یَأْتِیْ: آنا۔ اور جب اس کے بعد باء آگئی تو اس کا معنی ہوگیا لانا۔ ''لے آ ہمارے پاس دردناک عذاب''۔ وَمَا کَانَ اللّٰہُ لِیُعَذِّبَہُمْ: اور نہیں ہے اللہ کہ انہیں عذاب دے وَاَنْتَ فِیْہِمْ: اس حال میں کہ آپ ان میں ہوں، وَمَا کَانَ اللّٰہُ مُعَذِّبَہُمْ: اور نہیں ہے اللہ ان کو عذاب دینے والا، وَھُمْ یَسْتَغْفِرُوْنَ: اس حال میں کہ وہ استغفار کرتے ہوں، وَمَا لَہُمْ اَلَّا یُعَذِّبَہُمُ اللّٰہُ: اور کیا ہے ان کے لئے، کیا استحقاق ہے ان کا، کیا ہے ان کے لئے کہ اللہ انہیں عذاب نہ دے، وَھُمْ یَصُدُّوْنَ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ: حالانکہ وہ روکتے ہیں مسجدِ حرام سے، وَمَا کَانُوْٓا اَوْلِیَآءَہٗ: اور نہیں ہیں یہ اس مسجد کے متولی۔ اَوْلِیَآءَہٗ کی ''ہٗ'' ضمیر مسجد کی طرف لوٹ گئی، اور اولیاء جمع ہے ولی کی۔ نہیں ہیں وہ اس مسجد کے متولی۔ اور اگر ''ہٗ'' ضمیر اللہ کی طرف لوٹائیں تو ایسا بھی ہوسکتا ہے ''اور نہیں ہیں یہ اولیاء اللہ، یہ اللہ کے دوست نہیں ہیں'' اِنْ اَوْلِیَآؤُہٗٓ اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ: نہیں ہیں اللہ کے ولی مگر متقون، یا نہیں ہیں مسجد کے متولی مگر متقون، مسجد کی تولیت متقین کو حاصل ہے، مسجد کے متولی اللہ سے ڈرنے والے ہوتے ہیں، وَلٰکِنَّ اَکْثَرَھُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ: لیکن ان میں سے اکثر علم نہیں رکھتے، وَمَا کَانَ صَلَاتُہُمْ عِنْدَ الْبَیْتِ: اور نہیں ہے ان کی نماز گھر کے پاس۔ بیت سے بیت اللہ مراد ہے۔ نہیں ہے ان کی نماز بیت اللہ کے پاس، اِلَّا مُکَآءً وَّتَصْدِیَۃً: مَکَا یَمْکُو: منہ کے ساتھ شُشکارنا، سیٹی بجانا۔ اور تَصْدِیَۃً: صَدّٰی تَصْدِیَۃً: تالی بجانا۔ ''نہیں ہے ان کی نماز بیت اللہ کے پاس مگر شُشکارنا اور تالیاں بجانا، یا سیٹی بجانا اور تالی بجانا'' فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا کُنْتُمْ تَکْفُرُوْنَ: پس چکھو تم عذاب اس کُفر کے سبب سے جو تم کرتے تھے، اپنے کُفر کرنے کے سبب سے تم عذاب چکھو۔ اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَہُمْ:

بیشک وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا خرچ کرتے ہیں اپنے مال، لِيَصُدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ: تاکہ روکیں اللہ کے راستے سے فَسَيُنْفِقُوْنَهَا: پس وہ عنقریب خرچ کریں گے اپنے مالوں کو، ثُمَّ تَكُوْنُ عَلَيْهِمْ حَسْرَةً: پھر وہ مال ان کے اوپر باعثِ حسرت ہوں گے، ثُمَّ يُغْلَبُوْنَ: پھر یہ مغلوب ہوجائیں گے، وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى جَهَنَّمَ يُحْشَرُوْنَ: اور وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا جہنم کی طرف جمع کئے جائیں گے، لِيَمِيْزَ اللّٰهُ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ: مَازَ يَمِيْزُ: جدا کردینا۔ تاکہ جدا کردے اللہ تعالیٰ، ممیز کردے اللہ تعالیٰ خبیث کو طیب سے، وَيَجْعَلَ الْخَبِيْثَ بَعْضَهٗ عَلٰى بَعْضٍ: اور کردے خبیث کو بعض کو بعض پر، اکٹھا کردے فَيَرْكُمَهٗ: پھر اس کی تہہ لگادے، ڈھیر لگادے، فَيَرْكُمَهٗ جَمِيْعًا: ''ہٗ'' ضمیر خبیث کی طرف راجع ہے۔ پھر تہہ بہ تہہ کردے اس خبیث کو سب کو، فَيَجْعَلَهٗ فِيْ جَهَنَّمَ: پھر اس کو جہنم میں کردے، اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ: یہی لوگ ہیں خسارہ پانے والے۔

تفسیر

ماقبل سے ربط

غزوۂ بدر کے ضمن میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اہلِ ایمان کو جونصیحتیں کی جارہی ہیں، اس رکوع کی ابتدائی آیات بھی اسی مضمون سے ہی تعلق رکھتی ہیں۔

''تقویٰ'' کے ثمرات اور ''فرقان'' کا مصداق

غزوۂ بدر کا خاکہ آپ کے سامنے گزر چکا کہ مشرکین کی کثیر تعداد تھی اور وہ بہت زیادہ مسلح تھے، مالی اسباب اُن کو حاصل تھے، جتھا اُن کا بڑا تھا، اور ان کے مقابلے میں اہلِ ایمان کی تعداد تھوڑی تھی، بے سروسامان تھے، فقروفاقہ میں مبتلا تھے، لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ کا تقویٰ ان لوگوں کے پاس تھا، یہ اللہ سے ڈرنے والے تھے، اللہ کے نبی کی قیادت میں کام کررہے تھے، تو اللہ تعالیٰ نے فیصلہ کن جنگ کے ذریعے سے ان کو فتح دی۔ اسی واقعہ کو سامنے رکھتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اے ایمان والو! اگر آئندہ بھی تقویٰ اختیار کروگے، اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہوگے تو يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا: اللہ تعالیٰ تمہارے لیے فرقان کردے گا، کہ یہ میدان بھی فیصلہ کن ثابت ہوا، لیکن ابھی چاروں طرف کُفر ڈٹا ہوا ہے، اور تم لوگ کُفر کے گھیرے میں ہو، تو یہ نہ سمجھنا کہ یہ عارضی سی فتح ہوگئی، نہیں! اگر اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہوگے، اللہ تعالیٰ کے احکام کی پابندی کروگے تو اللہ تعالیٰ فیصلہ اور نمایاں کرے گا، ایسا فیصلہ ہوجائے گا کہ یہاں پھر حق ہی حق چمکے گا اور باطل مٹ جائے گا، جتنا اللہ سے ڈروگے اور اس کے احکام کی پابندی کروگے اتنا ہی اللہ تبارک وتعالیٰ حق کو زیادہ چمکائیں گے، اور باطل کو مٹائیں گے۔ تو فرقان سے یہی فرقان مراد ہے کہ حق غالب آجائے اور باطل مٹ جائے، تقویٰ کے نتیجے میں یہ ہوگا۔ اور بعض حضرات نے فرقان سے مراد دل کی ایک کیفیت لی ہے، کہ اگر انسان تقویٰ اختیار کرے، اللہ تعالیٰ کے احکام کی پابندی کرے تو قلب کے اندر ایک کیفیت پیدا ہوتی ہے، قلب کا ذوق اور قلب کی حس اس قدر تیز ہوجاتی ہے، کہ حق اور باطل کے درمیان فیصلہ کرنا انسان کے لیے آسان ہوجاتا ہے، پھر ظاہری دلائل میں زیادہ اُلجھنے کی ضرورت

نہیں ہوتی، انسان کا دل کہتا ہے کہ حق کدھر ہے اور باطل کدھر ہے؟ حرام کیا ہے، حلال کیا ہے؟ تقویٰ کی برکت سے اللہ تبارک وتعالیٰ دل کے اندر یہ فیصلے کی قوت پیدا فرمادیتے ہیں۔ اور یہ بات بھی بالکل صحیح ہے، واقعہ کے مطابق ہے، کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی پابندی کرنے کے ساتھ باطنی حس انسان کی ایسی اجاگر ہوجاتی ہے کہ پھر دل کی آواز ہوتی ہے کہ یہ بات صحیح ہے کرلو، یہ بات غلط ہے اس سے باز آجاؤ، اور جس وقت یہ مرتبہ اور مقام حاصل ہوجاتا ہے، تو پھر ''اِسْتَفْتِ قَلْبَكَ''[1] یہ شریعت کی طرف سے حکم ہے، حدیث شریف میں جس طرح آتا ہے، کہ اپنے دل سے پوچھ لیا کرو کہ نیکی کیا ہے، برائی کیا ہے؟ تو دل بھی تمہیں اطلاع دے دے گا، دل کے ذریعے سے بھی احساس ہوجاتا ہے کہ یہ اچھائی ہے، اور یہ برائی ہے۔ تقویٰ کی برکت سے اللہ تبارک وتعالیٰ قلب کے اندر یہ بصیرت پیدا فرمادیتے ہیں۔ اور جتنا انسان فسق وفجور میں مبتلا ہوتا ہے قلب کا ذائقہ بگڑتا جاتا ہے، حتیٰ کہ قلب میں اتنی بے حسی آجاتی ہے کہ اُس کو اچھائی برائی کی کوئی تمیز ہی نہیں رہتی، بلکہ اور زیادہ فساد آجائے تو برائی کو لذیذ سمجھنے لگ جاتا ہے، اور اچھائی سے بدکنے لگ جاتا ہے۔ تو تقویٰ کا ایک یہ فائدہ بھی ہے۔ بہرحال دونوں باتیں قریب قریب ہی ہیں کہ کہ فرقان حاصل ہوجاتا ہے چاہے خارجی ہو چاہے باطنی، باطنی تو وہ بصیرت ہے، جس کے ذریعہ سے انسان حق اور باطل کے درمیان فیصلہ کرسکتا ہے۔ اور ظاہر کے اندر دلائل کے ساتھ، معجزات کے ساتھ، اللہ کی نصرت کے ساتھ باطل دب جاتا ہے اور حق غالب آجاتا ہے تو ''فرقان'' کا یہ مصداق بھی بن سکتا۔ متقین کے دل بھی حق اور باطل کا فیصلہ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، تو ظاہری طور پر دلائل میں زیادہ اُلجھنے کی ضرورت نہیں ہوتی، قلب شہادت دیتا ہے کہ یہ کام صحیح ہے یا نہیں، اور یہ کرنے کا ہے یا نہیں؟

''تقویٰ'' نام ہے فرائض کی پابندی اور کبائر سے اِجتناب کا

ایک فائدہ تو یہ ہوگا کہ تمہارے لیے فرقان ہوجائے گا، حق کا غلبہ نمایاں ہوجائے گا اور باطل مٹ جائے گا، اُس کی کوئی شان وشوکت باقی نہیں رہے گی، اور تقویٰ کا دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ یُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ: اللہ تعالیٰ تمہارے چھوٹے چھوٹے گناہ دُور کردے گا وَيَغْفِرْ لَكُمْ اور تمہیں بخش دے گا، متقی بننے کے لیے شرط ہے اجتناب عن الکبائر کبیرہ گناہوں سے بچو، کسی کبیرہ گناہ کا ارتکاب نہ کرو، فرائض کی پابندی، ہو کیونکہ فرض کا چھوڑنا بھی کبیرہ گناہ ہے، جس طرح سے زنا حرام ہے اسی طرح سے ترکِ صلوٰۃ تو بھی حرام ہے، جس طرح سے چوری حرام ہے اسی طرح سے روزہ کا چھوڑنا بھی تو حرام ہے، اس لیے فرائض کی پابندی اور کبائر سے اجتناب یہ ہے تقویٰ، تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ (سورۂ نساء: ۳۱) جن چیزوں سے تمہیں روکا گیا ہے ان میں سے بڑے بڑے گناہوں سے تم بچتے رہو، چھوٹے چھوٹے گناہ ہم دُور ہٹادیں گے، کیونکہ معمولی معمولی لغزشیں یہ تو لازمِ بشریت ہے، کہ انسان جس وقت اس دُنیا میں رہتا ہے تو چھوٹی موٹی غلطیاں ہو ہی جاتی ہیں، تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں وہ ہم معاف کردیں گے، لیکن شرط یہ ہے کہ تم بڑے بڑے گناہوں سے بچتے رہو۔ تو یہاں بھی ایسے ہی ہے کہ تقویٰ اختیار کرو، فرائض کی پابندی کرو، کبائر سے بچو، چھوٹے موٹے گناہوں کی کیا بات ہے، وہ ہم معاف کردیں گے۔ تقویٰ کا ایک فائدہ یہ بھی

(۱) مسند احمد رقم ۱۸۰۰۶۔ سنن دارمی رقم ۲۵۷۵/ مشکوٰۃ ۲۴۲/۱ باب الکسب، فصل ثانی، عن وابصۃ

ہوگا۔اور اگر تقویٰ اختیار نہیں کرو گے، کبائر سے نہیں بچو گے، تو پھر صغائر ان کبائر کے اندر زیادہ وزن پیدا کرتے ہیں، صغائر کبائر کا وزن اور بڑھا دیتے ہیں۔اور اگر کبائر سے بچو گے تو چھوٹے موٹے گناہ اللہ اپنے فضل کے ساتھ، نیکیوں کی برکت سے معاف کرتے رہتے ہیں۔وَیَغْفِرْ لَكُمْ اور آخرت میں اللہ تعالیٰ تمہیں بخش دیں گے، یہ سب تقویٰ کے فائدے ہیں۔اس لیے تمہیں چاہیے کہ ہر حال میں اللہ سے ڈرتے رہا کرو، اللہ کے احکام کی پابندی کرو۔وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ اللہ تو بہت فضل والے ہیں، بخشیں گے بھی اور اپنی طرف سے اور بھی زیادہ فضل دیں گے۔

''درالندوہ'' میں آپ ﷺ کے خلاف مشرکینِ مکہ کی مجلسِ مشاورت

اگلا واقعہ جو نقل کیا جا رہا ہے وہ یوں ہی سمجھو کہ اللہ تعالیٰ تقویٰ کی برکات ہی بتاتے ہیں، کہ جب اللہ تعالیٰ کی نصرت حاصل ہو جائے پھر حق و باطل کے درمیان فرق مشکل نہیں رہ جاتا، اور متقی لوگوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی نصرت کیسے ہوتی ہے، چاہے ظاہری اسباب کتنے ہی خلاف کیوں نہ ہوں، اللہ تعالیٰ حق کو باطل کے اوپر کس طرح غالب کرتے ہیں، اُس کا ایک نمونہ دکھایا جا رہا ہے۔ یہ نمونہ ہے سرورِ کائنات ﷺ کی ہجرت کے موقع کا، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تو مدینہ منورہ کی طرف منتقل ہو گئے، اور کچھ حبشہ چلے گئے، تو مشرکین یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ یہ بات تو بڑھتی جا رہی ہے، اس کو کسی طرح مٹانا چاہیے، یہ کشاکشی جو شروع ہو گئی اس کو مٹانا چاہیے، تو اپنے دارالندوہ میں (دارالندوہ: مشورے کا گھر۔وہ کوئی ایسا مکان تھا، جس میں بیٹھا کرتے تھے، اکٹھے ہو کے مشورہ کیا کرتے تھے) وہاں اکٹھے ہو گئے کہ اب اس تحریک کو دبانے کی کیا صورت ہے، یہ جو اختلاف شروع ہو گیا اس کو کسی طرح مٹائیں، اس کی صورت کیا ہے؟ تو مشورہ کرنے لگے، بڑے بڑے رؤسائے قریش بیٹھ گئے، بعضوں نے تو مشورہ یہ دیا کہ ان کو گرفتار کر لو، باندھ لو، باندھ کے کسی مکان میں بند کر دو، تو ملاقاتیں بند ہو جائیں گی، کسی سے ملیں گے نہیں، کسی کو کچھ کہیں گے نہیں، اس طرح سے ان کے دِین کی اشاعت ختم ہو جائے گی، کسی نے تو یہ مشورہ دیا۔اور کسی نے یہ مشورہ دیا کہ نہیں! ان کو اپنے شہر سے نکال دو، باہر جا کر جو چاہیں کرتے پھریں، یہاں تو کم از کم یہ کشاکشی ختم ہو جائے، اور کسی نے یہ مشورہ دیا کہ نہیں! ان کو بس سرے سے قتل ہی کر دو، کام ہی ختم ہو جائے۔اس طرح سے مختلف آرا جیسے مشورے میں آیا کرتی ہیں، اسی طرح سے مختلف آرا آئیں، لیکن آخر کار جس طرح سے روایات سے معلوم ہوتا ہے قرار اس بات پہ آیا کہ قتل کیا جائے، اور قتل بھی کس طرح سے کیا جائے؟ کہ سارے قبیلے اپنا ایک ایک آدمی دیں، اور وہ اکٹھے ہو کر ان کے اُوپر حملہ کریں، حملہ کر کے قتل کر دیں، تاکہ بنو ہاشم کسی سے قصاص کا مطالبہ نہ کر سکیں، آخر وہ دِیت کا مطالبہ کریں گے، تو کوئی بڑی بات نہیں، ہم سب اکٹھے ہو کے دیت دے دیں گے، یوں سارے کا سارا قصہ ختم ہو جائے گا، تو قرار اس مشورے پر ہوا۔چنانچہ سکیم بن گئی، اب سارے کے سارے اسباب ان کے پاس ہیں، سرورِ کائنات ﷺ تن تنہا ہیں، یا دو چار آدمی، جیسے حضرت علی رضی اللہ عنہ وہیں تھے، اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ مکہ معظمہ میں تھے، کچھ ضعفاء اور بھی تھے جو کوئی نقل و حرکت نہیں کر سکتے تھے، ورنہ اکثر آپ کے احباب، محبین، عاشقین، بمع حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے سب وہاں سے ہجرت کر کے جا چکے تھے، اکثر حضرات جا چکے تھے، اور یہ چند افراد باقی تھے۔اب سارے

خلاف ہے، ماحول اُن کا ہے، غلبہ اُن کا ہے، اسباب اُن کو حاصل ہیں، تو اپنے طور پر ان کو کامیابی کا یقین تھا، وہ چاہتے تھے کہ بس آج رات فیصلہ کر دیں تا کہ قصہ ہی ختم ہو جائے، تو سکیم بنالی، جب سکیم بنالی تو سرورِ کائنات ﷺ کو بھی اطلاع ہوگئی، جب اطلاع ہوگئی تو آپ ﷺ نے رات کو اپنے بستر پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو لٹا یا، اور گھر کے اندر جو لوگوں کی امانتیں رکھی ہوئی تھیں، وہ امانتیں اُن کے سپرد کیں کہ یہ فلاں فلاں کی چیز ہے اُن کے سپرد کر دینا اور خود آپ نے رات کے وقت اپنے گھر سے خروج کیا، محاصرہ ہو چکا تھا، مشرک اردگرد تھے، لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے آپ کی ایسی حفاظت ہوئی کہ آپ نے سورۂ یٰس پڑھتے ہوئے ایک مٹھی خاک کی لی، اور اس طرح بکھیری کہ سارے کافروں کی آنکھوں، اور اُن کے سَروں پر پڑ گئی، اس نرغے میں سے آپ نکلے، اور کوئی آپ کو دیکھ نہیں سکا، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے گھر تشریف لائے، اُن کو ساتھ لیا، اور جو مشورہ پہلے ہو چکا تھا، پہلے سے طے شدہ بات تھی، ثَور پہاڑ کے اُوپر ایک غار متعین تھی وہاں تشریف لے گئے، اس طرح سے کُفار خائب وخاسر رہ گئے، وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے، اُن کا مقصد تھا قتل کرنا، قتل ہونے سے اللہ تعالیٰ نے بچالیا، اور دِن کی روشنی میں اُن کو پتا چلا کہ جس کو ہم قتل کرنا چاہتے تھے وہ تو نکل گئے، اور حضرت علی رضی اللہ عنہ وہاں لیٹے ہوئے تھے، اُن کو انہوں نے کچھ کہنا نہیں تھا، اُن سے تو دُشمنی نہیں تھی۔

ہجری سال درحقیقت محرّم سے شروع نہیں ہوتا!

اب یہ اتفاق کی بات ہے کہ لوگوں نے چودھویں صدی کو ۲۹ رذی الحج پر ختم کر دیا، اور یکم محرّم سے پندرھویں صدی شروع ہوگئی، اور میں نے نہیں سنا کہ کسی نے اس بات کی طرف توجہ کی ہو، میں نے اس بات کو کئی مجلسوں میں ذکر کیا کہ چودھویں صدی ابھی ختم نہیں ہوئی، چودھویں صدی ختم ہونے کے بعد پندرھویں صدی کا آج (یکم ربیع الاوّل) پہلا دِن ہے، چودھویں صدی کل ختم ہوئی ہے، اور آپ سُن کر تعجب کریں گے، کیونکہ سرورِ کائنات ﷺ گھر سے جو نکلے ہیں اور حقیقتاً ہجرت کا جو واقعہ پیش آیا تو بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ۲۷ رصفر کو آپ گھر سے نکلے ہیں اور دِن سوموار کا تھا، اور اتفاق کی بات ہے کہ اس دفعہ بھی ۲۷ رصفر (۱۴۰۱ھ) کو سوموار تھا، پھر آپ تین دِن غار میں رہے ہیں ۲۷، ۲۸، ۲۹، یہ تین دِن آپ نے غار میں گزارے، تو کل (۲۹ رصفر) کا دِن آپ کا غار کا ہے۔ اور ربیع الاوّل کی یکم تاریخ یعنی آج والی تاریخ کی صبح کو رسول اللہ ﷺ غار سے نکلے ہیں، غار سے نکل کے مدینہ منورہ کا سفر اختیار کیا ہے، اور بارہ ربیع الاوّل کو رسول اللہ ﷺ مدینہ منورہ پہنچے ہیں، تو اب اگر ہجرت کی تاریخ مدینہ منورہ پہنچنے کے بعد قرار دی جائے تو حقیقتاً چودہ سو سال ہونے کو ابھی بارہ دِن باقی ہیں، اور اگر سفر کے آغاز کو دیکھا جائے تو جب مکہ معظمہ سے چلے تھے، غارِ ثور سے، تو آج چودہ سو سال پورے ہوگئے۔ باقی یہ سنِ ہجری یکم محرّم سے جو شروع کیا گیا یہ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک انتظامی سہولت کے طور پر کر دیا کہ بارہ ربیع الاوّل یا یکم ربیع الاوّل سے سال کیسے شروع ہو، جب کہ عام طور پر معمول یہی تھا کہ سال شروع ہوتا ہے محرّم سے، تو سال کی ابتدا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں محرّم سے قرار پائی ہے عام معمول کے مطابق۔ جیسے آج اگر کوئی اہم واقعہ پیش آجائے، صفر میں پیش آجائے، ربیع الاوّل میں پیش آجائے تو سال یاد رکھنے کے لئے اس تاریخ کو متعین طور پر نہ بنایا جائے، اور ابتدائے سال سے سال شمار کرنا شروع کر دیں کہ چار سال ہوگئے، پانچ سال ہوگئے۔

اسی طرح سن کی ابتدا محرم سے، یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے سے ہوئی ہے، ورنہ رسول اللہ ﷺ کے مدینہ منورہ میں جانے کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جو سال شروع کرتے تھے کہ ایک سال ہوگیا، دو سال ہوگئے، تین سال ہوگئے، یہ ربیع الاوّل سے شروع ہوتا تھا۔ اس لیے حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے ''نشر الطیب'' میں جہاں سن وار واقعات بیان کیے ہیں تو وہاں صراحت سے لکھا ہے کہ یہ جو ہم سن ذکر کریں گے یہ سن وہ ہوگا جو ربیع الاوّل سے لے کر ربیع الاوّل تک ہے، اس لیے جو واقعہ محرم میں پیش آیا ہے، مثال کے طور پر پہلے سال جو محرم میں واقعہ پیش آیا ہے یکم محرم کو یا پندرہ محرم کو، وہ سالِ اوّل کا واقعہ ہے، سالِ ثانی کا نہیں ہے، ورنہ تو ذی الحج پر سال پورا ہو کے محرم اگلے سال میں شمار ہو جائے، ایسا نہیں کیا گیا، بلکہ ربیع الاوّل سے پہلے جتنے واقعات پیش آئے ہیں ان کو سالِ اوّل کے واقعات قرار دیا ہے۔ تو اس لحاظ سے آج (یکم ربیع الاوّل ١٤٠١ھ بروز جمعرات) جس وقت آپ یہ سبق پڑھ رہے ہیں، آج پندرھویں صدی کا پہلا دِن ہے اگر ثور سے نکلنے کا اعتبار کیا جائے، اور اگر گھر سے نکلنے کا اعتبار کیا جائے لیکن چونکہ ابھی مکہ معظمہ کی حدود میں ہی ہیں، اس لیے گھر سے نکلنے کی تاریخ ٢٧ صفر ہے سوموار کا دِن، اور ثور سے تین دِن کے بعد نکلے ہیں، اور پھر بارہ دِن کی مسافت کے بعد مدینہ منورہ آپ بارہ ربیع الاوّل کو پہنچے ہیں، تو ہجرت کی ابتدا ربیع الاوّل میں ہوئی بایں معنیٰ کہ ثور سے چلے، اور بارہ ربیع الاوّل کو مدینہ منورہ پہنچے، تو اگر آپ نے سن شروع کرنا ہے مدینہ منورہ میں پہنچنے کے بعد تو ابھی چودھویں صدی کے بارہ دِن باقی ہیں، اور اگر سفر کا آغاز دیکھنا ہے تو سفر کا آغاز ہوا ہے یکم ربیع الاوّل کو، تو آج گویا کہ پندرھویں صدی کا پہلا دِن ہے، اور چودھویں صدی کل پوری ہوئی ہے۔ اور محرم سے جو سن کو شروع کیا گیا ہے تو وہ انتظامی سہولت کی وجہ سے ہے۔ تو ہجرت کا واقعہ ان آیات کے اندر ذکر کیا گیا ہے، جو اتفاق سے آج آپ کا سبق ہے، اور ہجرت کا واقعہ بھی انہی تاریخوں میں پیش آیا، (میں نے تو کل بھی تقریباً سارے اسباق میں اس بات کی طرف متوجہ کیا ہے کہ بھئی! آج صدی کا آخری دن ہے، لوگ چاہے ٢٩ ذی الحج کو صدی ختم کیے بیٹھے ہوں، اور پندرہویں صدی یکم محرم سے شروع کیے بیٹھے ہیں، لیکن حقیقت کے اعتبار صدی آج ختم ہو رہی ہے، یہ کل میں نے بتایا تھا، ''مشکوٰۃ'' کے سبق میں بھی، دورۂ حدیث والوں کو بھی بتایا تھا کہ آج صدی کا آخری دِن ہے اور کل کو اگلی صدی کا پہلا دِن ہے) اور یہ حُسنِ اتفاق ہے کہ ہمارا سبق بھی اسی تاریخ میں آگیا، تو سرورِ کائنات ﷺ مدینہ منورہ تشریف لے گئے۔

ہجرت سے اسلامی تاریخ کی اِبتدا کی وجہ

تو تدبیر مشرکوں نے بھی کی آپ ﷺ کو قتل کرنے کی، اور تدبیر اللہ نے بھی کی آپ کو بچانے کی، لیکن تدبیر اللہ کی ہی غالب رہی۔ اللہ کی تدبیر غالب کس طرح رہی؟ ایک تو اللہ تعالیٰ نے بچانا چاہا اور بچالیا، وہ قتل کرنا چاہتے تھے لیکن آپ قتل نہ ہوئے۔ پھر دشمن یہ سمجھتا ہے کہ ہم اپنے مقصد میں کامیاب ہیں، کہ ہم نے اپنے شہر سے نکال دیا، یہاں سے چلے گئے، ہمارے پہلو کا یہ کانٹا جو ہر وقت چبھتا رہتا تھا وہ ہم سے دُور ہوگیا، لیکن واقعہ اس طرح سے ہے کہ سرورِ کائنات ﷺ کا تشریف لے جانا ایسے تھا جیسے کہ قوم کا دل رخصت ہوگیا، رُوح نکل گئی، جس وقت تک سرورِ کائنات ﷺ وہاں موجود تھے اُس وقت تک اللہ تعالیٰ کے عذاب سے حفاظت تھی، جس طرح سے آگے آپ کے سامنے یہ بات آرہی ہے، اور جب رسول اللہ ﷺ وہاں سے تشریف لے گئے تو امان

ختم ہوگیا، اب وہ وقت ہے کہ جس سے پھر ان کی تباہی شروع ہوگی، اور ان کی تباہی کی ابتدا رسول اللہ ﷺ کے سنِ ہجرت سے ہوئی ہے۔ اور آپ وہاں سے تشریف لے گئے تو وہ سمجھے کہ بے وطن ہو گئے ہیں، گھر سے چلے گئے ہیں، باہر ان کو مشکلات پیش آئیں گی، لیکن آنے والے واقعات نے بتادیا کہ سرورِ کائنات ﷺ کا مکہ معظمہ سے تشریف لے جانا، یہ تو ایسے تھا جیسے بادلوں سے سورج باہر آگیا، کہ مکہ معظمہ میں رہتے ہوئے دبیز بادل چڑھے ہوئے تھے، اور روشنی کم پھیل رہی تھی، اب مدینہ منورہ میں جائیں گے تو دیکھو! حق کی روشنی کس طرح پھیلتی ہے، یہ سب اللہ تبارک وتعالیٰ کی تدبیر کے اندر خیر کے پہلو ہیں، کہ مشرک کیا چاہتے تھے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے سرورِ کائنات ﷺ کو کس کو طرح سے کامیابی کے ساتھ مدینہ منورہ پہنچایا گیا، اور کس طرح کامیابی کے ساتھ آپ کے دین کی اشاعت ہوئی؟ اور پھر یہ مشرک کس طرح سے اس حق کے ساتھ ٹکرائے، ٹکرانے کے بعد کس طرح سے پاش پاش ہوئے۔ تو ان کی بربادی کی تاریخ یہ بھی ہجرت کی تاریخ ہے، اور اسلام کے عروج کی تاریخ بھی ہجرت کی تاریخ ہے، اور یہی حکمت ہے اس بات میں کہ اسلامی سن کی ابتدا اسی سے کی گئی ہے، کیونکہ یہ غلبے کا گویا کہ سنگِ میل ہے، یہ غلبے کے لئے بنیادی دن ہے، یہاں سے حق چمکنا شروع ہوا، اور مشرکین کے اوپر بربادی شروع ہوئی اور اسلام کا غلبہ نمایاں ہونا شروع ہوا، یہ پہلی تاریخ ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے سرورِ کائنات ﷺ کو مشرکوں کے نرغے سے نکالا ہے، یہ سورج بادلوں سے باہر آیا ہے۔ ورنہ اگر اسلامی تاریخ کی ابتدا کی جاتی تو سنِ نبوت سے ابتدا ہو جاتی، جب وحی اُتری تھی اسی سے سن شروع ہو جاتا، لیلۃ المعراج سے سن شروع کر دیا جاتا، اتنا بڑا واقعہ پیش آیا تھا، سرورِ کائنات ﷺ کی وفات سے شروع کر دیا جاتا وہ بھی تو ایک بہت بڑا واقعہ ہے، آپ ﷺ کی ولادت سے شروع کر دیا جاتا، لیکن نہ یہ سنِ ولادت سے شروع ہوا، نہ یہ سنِ نبوت سے شروع ہوا، نہ لیلۃ المعراج سے شروع ہوا، نہ آپ ﷺ کی وفات سے شروع ہوا، بلکہ سن کی بنیاد رکھی گئی تو آپ کی تاریخِ ہجرت سے رکھی گئی، اس لیے کہ اسلام کے غلبے کی تاریخ یہی ہے، یعنی وہ مٹانا چاہتے تھے لیکن اللہ تعالیٰ نے اسی تاریخ اور اسی جگہ سے آپ کو اُبھارا ہے، اور اُبھار کے ساری دُنیا پہ چمکا دیا۔ تو یہ وہی مشورہ ہے جو کر رہے تھے۔ اور اللہ تعالیٰ کی نصرت کس طرح سے ہوئی؟ اور آپ کو اُن مخالف حالات میں کیسے بچالیا گیا؟ اس آیت کے اندر اس کا ذکر ہے۔

بوقتِ ہجرت مشرکین کی تدبیر پر اللہ کی تدبیر کے غلبے کا منظر

یاد کیجئے! جب کہ آپ کے متعلق تدبیریں کرتے تھے یہ کافر لوگ، لِيُثْبِتُوْكَ: تاکہ آپ کو قید کر دیں، ایک جگہ جما کے بٹھادیں، یعنی کسی کو ملنے نہ دیں، باندھ کے کسی کمرہ میں ڈال دیں، اَوْ يَقْتُلُوْكَ: یا آپ کو قتل کر دیں، یا آپ کو نکال دیں، اور وہ تدبیریں کرتے تھے اور اللہ تدبیر کرتا تھا وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ: اللہ تعالیٰ بہترین تدبیر کرنے والا ہے۔ اس تدبیر میں اس سارے سفر کی تدبیر شامل ہے، کہ کیسے آپ نرغے سے نکلے؟ کس طرح سے آپ ثور پہ پہنچے؟ اور اس غار میں آپ جا کے بیٹھے، پھر مشرکوں نے کس طرح سے آپ کا پیچھا کیا؟ اور وہاں پہنچنے کے بعد بھی اللہ تبارک وتعالیٰ نے کس طرح سے حفاظت فرمائی؟

غارِ ثور کا تفصیلی منظر اور محلِ وقوع

اگر آپ کبھی جائیں اس پہاڑ پر، اللہ تعالیٰ آپ کو لے جائے، پھر جا کے یہ بات پوری طرح سے سمجھ میں آتی ہے، کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے سرورِ کائنات ﷺ کی حفاظت کس طرح فرمائی ہے، وہ غار کیسی ہے جس کے اندر آپ ﷺ جا کر بیٹھے، اور دروازہ اُس کا کس طرح سے ہے کہ اُس کے اوپر مکڑی نے جالا تن دیا، کبوتری نے فٹافٹ انڈے دے دیے، وہ آئے اور آ کر دیکھا، کہنے لگے کہ یہاں تو کوئی نہیں ہوسکتا، اگر ہوتا تو یہ جالا کیسے باقی رہ گیا؟ اور یہ کبوتری کے انڈے کس طرح باقی رہ سکتے ہیں؟ اور اس غار کی اس طرح سے بناوٹ ہے کہ دروازے کے سامنے لوگ کھڑے ہوئے ہوں تو اندر بیٹھے ہوئے آدمی کی ان کے قدموں پر نظر پڑتی ہے، ہم جس وقت وہاں گئے، پانچ سات آدمی تھے، قاری نسیم صاحب ہمارے سالارِ قافلہ تھے، انہی کے ساتھ ہی ہمارا دل بہلتا رہتا تھا۔ جب ہم گئے تو تقریباً پون گھنٹہ ہم نے لگایا ہے اس بات کی تحقیق پر، کہ آپ ﷺ اس غار میں کدھر سے آئے ہوں گے، اور کیسے اس کے اندر بیٹھے ہوں گے، اور وہ مشرک کہاں کھڑے ہوں گے، جو ایک روایت میں آتا ہے کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کہا تھا، کہ ان کے قدم نظر آ رہے ہیں، اگر یہ اپنے قدموں کی طرف جھک کر دیکھیں گے تو ہمیں دیکھ لیں گے، رسول اللہ ﷺ فرماتے تھے کہ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا: ڈرنے کی بات نہیں ہے، اللہ ہمارے ساتھ ہے حدیث شریف میں یہ لفظ آتے ہیں: ''مَا ظَنُّكَ بِاثْنَيْنِ اللّٰهُ ثَالِثُهُمَا'' کہ ابوبکر! تیرا ان دونوں کے متعلق کیا خیال ہے جن کے ساتھ تیسرا اللہ ہے۔[1] تو اللہ تعالیٰ نے اُن کو جھک کے قدموں کی طرف دیکھنے کی توفیق ہی نہیں دی..... تو پھر ہم نے باہر اپنے ساتھیوں کو کھڑا کیا کہ تم یہاں کھڑے ہو، دیکھو کہ قدموں پر نظر کس طرح سے آتی ہے؟ اور جھکنے کے ساتھ اندر کس طرح سے دیکھا جاسکتا ہے؟ میں اس میں لیٹا اور ایک مولوی فیروز تھے لاہور کے، ان کی گود میں سَر رکھ کے لیٹا۔ تو ہم نے وہ ساری کی ساری صورت بنانے کی کوشش کی تا کہ اطمینان ہوجائے کہ واقعی اس طرح واقعہ پیش آیا ہوگا، تو اس سفر میں بہت لطف آیا، تقریباً پون گھنٹہ ہم نے وہاں اسی تحقیق کے اُوپر صرف کیا، تو آخر ایک نقشہ بنانے میں ہم کامیاب ہوگئے، یعنی جتنے اِحتمالات نکلتے تھے وہ سارے کے سارے اِحتمال ہم نے نکال کے دیکھے، اِدھر سے آئے ہوں گے، یوں بیٹھے ہوں گے، یہاں جگہ ہوگی..... لوگ تو جاتے ہیں، گئے، دو رکعت پڑھی، اور پڑھ کے آ گئے، وہاں جا کے اتنا دماغ تو کوئی نہیں مارتا..... ہم نے تو علمی ذہن کے ساتھ الحمدللہ! سب نے اپنے طور پر جتنے عقلی اِحتمالات نکل سکتے تھے سارے نکالے، نکال کے آخر ہمارا اتفاق ہوا کہ یہ صورت پیش آئی ہوگی، یہاں بیٹھے ہوں گے، یہاں لیٹے ہوں گے، اور یہ دروازہ تھا، اور مشرک یہاں کھڑے ہوں گے، دیکھو! یہاں کھڑے ہوں تو پیر نظر آتے ہیں، تو یہ ساری کی ساری صورت ہم نے وہاں بنائی..... تو یہ ساری کے ساری خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ کے اندر چھپی ہوئی حکایت ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تدبیر کیسی اچھی تھی، کہ سارے کے سارے اپنے آپ کو سمجھتے تھے کہ ہم بہت سمجھدار ہیں، بہت عقل مند ہیں، ہمارے پاس بڑے اسباب ہیں، لیکن ہر جگہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اُلّو بنایا، اور ان کی آنکھوں میں خاک جھونکی، اور یہ کسی چیز کو معلوم نہیں کر سکے۔

(۱) بخاری ۶۷۲/۲، کتاب التفسیر، سورۂ توبہ/مشکوۃ ۵۳۰/۲، کتاب المعجزات کی پہلی حدیث۔

سوال:- اس میں سوراخ بھی ہے جس سے سانپ نکلا تھا؟

جواب:- یہ سوراخ وغیرہ ہم نے دیکھنے کی کوشش کی، لیکن وہ خاص ہمیں معلوم نہیں ہوا، کیونکہ بعض بعض جگہ سے یہ نشان معلوم ہوتا تھا جیسے لوگوں نے تراش کے اس کو کچھ فراخ کیا ہوا ہے۔ ایک تو اس کا دروازہ ہے نکلنے کو، جدھر بیت اللہ ہے، سامنے غار کے اُوپر کھڑے ہوں تو مسجد کے مینار نظر آتے ہیں، اور اس وقت جب یہ مسجد اُونچی نہیں بنی ہوگی تو بیت اللہ نظر آتا ہوگا۔ غارِ حرا میں بھی ایسے ہی ہے، کہ غارِ حرا میں وہاں جا کے چٹان پہ کھڑے ہوں تو مسجدِ حرام نظر آتی ہے، اور جب یہ مسجد نہیں بنی ہوگی تو بیت اللہ نظر آتا ہوگا۔ اور بالکل اس کے مدِ مقابل دُوسری طرف غارِ ثور ہے، کہ غارِ ثور پہ کھڑے ہوں تو غارِ حرا بالکل سامنے نظر آتی ہے، اور درمیان میں مکہ معظمہ ہے، یہ ایک دُوسرے کے بالمقابل نظر آتی ہیں، اور غارِ ثور کے پاس چٹان پہ کھڑے ہوئے مسجد کے مینار نظر آرہے تھے، اور مسجد چونکہ اب بیت اللہ سے بہت اُونچی ہے، بیت اللہ کی چھت پہلی منزل کے برابر ہے، کہ مسجد کی پہلی منزل کے اُوپر اگر چلے جائیں تو بیت اللہ کی چھت نظر آتی ہے، یعنی مسجد اتنی اُونچی کر دی، تو اس لیے باہر سے اب بیت اللہ نظر نہیں آتا، مینار نظر آتے ہیں۔ اب چونکہ لوگ بہت جاتے تھے، اب ایک ہی دروازے سے اندر گھسیں، اسی دروازے سے باہر نکلیں تو اس میں دقت پیش آتی تھی، تو انتظامیہ نے دوسری طرف سے ایک راستہ بنا دیا، اب اُدھر سے لوگ اُترتے ہیں اور بیٹھ کے دو رکعت پڑھ کے جلدی سے یوں (دُوسری طرف) سے نکل جاتے ہیں، تو جدھر سے باہر کو نکلتے ہیں اصل دروازہ وہ تھا، اب ہم نے دیکھا تو اس کو کچھ تراشا ہوا تھا، تراش کے اس کو کچھ فراخ کیا ہوا تھا، وہ ہم نے نشان بھی متعین کر لیے۔ اب تراش کر فراخ کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ انسان بیٹھ کے آسانی سے نکل آتا ہے، اور اگر وہ اُوپر سے تراشا ہوا نہ ہوتا تو ہمارا اندازہ یہ تھا کہ پھر لیٹ کے اندر جانا پڑتا ہے، بیٹھ کے انسان اندر نہیں جاسکتا۔ اور اندر وہ بالکل اس طرح سے قدرتی طور پر (ہم نے وہاں دو تین غاریں دیکھیں اسی شکل کی، کہ نیچے پتھر رکھے ہوئے ہیں، اور ایک بہت بڑا پتھر اس طرح سے جیسے خیمہ لگا ہوا ہوتا ہے، اُوپر سے چکنا، یوں کر کے اُوپر پڑا ہوا ہے، اس کے نیچے غار ہے) اور لیٹ کے اندر جائیں تو اندر اس طرح سے ہے جس طرح سے سائبان ہوتا ہے، آسانی کے ساتھ آدمی بیٹھ جاتا ہے، اور اتنی فراخ ہے کہ ایک آدمی لیٹ بھی سکتا ہے، اور دُوسری طرف سے بھی جس طرح ہوا آنے کا راستہ ہوتا ہے، لیکن ادھر سے اندر جانا بہت مشکل ہے۔ ہم اندر بیٹھے ہوئے تھے کہ ملیشیا، انڈونیشیا کی طرف کے آدمی بہت ہلکے پھلکے سے ہوتے ہیں، یعنی اکثر و بیشتر ان کے جو پورے جوان ہوتے ہیں، شادی شدہ، جن کی بیویاں بھی ساتھ تھیں، ان کے قد چھوٹے چھوٹے ہیں، عورتوں کے بھی اور مردوں کے بھی، بہت ہلکے پھلکے سے ہیں۔ تو ہم میں سے اگر کوئی شخص لیٹ کے سینہ رگڑ کے اُدھر سے اندر جانا چاہتا تو شاید نہ جاسکتا، کیونکہ وہ جو دوسری طرف تھوڑا سا راستہ ہے، چٹان اُوپر کو اُٹھی ہوئی ہے، اور نیچے بھی چٹان ہے، تو تھوڑا سا فصل ہے، بالشت کے قریب ہوگا، لیکن وہ آدمی غالباً ملائشیا کا تھا یا انڈونیشیا کا تھا، وہ اُس طرف سے بھی لیٹ کر اندر آگیا، اور اگر اس سے موٹا آدمی ہوتا تو نہ آسکتا...... تو بہر حال یہ راستہ متعین ہوا، کہ جدھر سے لوگ نماز پڑھ کے نکلتے ہیں یہی راستہ تھا اندر آنے کا، اور جدھر سے لوگ اندر جاتے ہیں یہ بعد کا بنا ہوا ہے، وہ پہلے نہیں تھا، اور وہ (اصل راستہ) بھی اب تراش کے فراخ کیا ہوا ہے کہ بیٹھ کر انسان اندر آجاتا ہے، لیکن اگر وہ تراشا ہوا نہ ہو تو پھر لیٹ کر آدمی اندر جاسکتا ہے، بیٹھ کر نہیں جاسکتا۔ اور دروازے کے سامنے کوئی کھڑا ہو تو اندر بیٹھنے

والوں کو اس کے قدم نظر آتے ہیں۔ اور ہے بہت بلندی پر، یعنی غار حرا کے مقابلے میں بھی تین گنا زیادہ سفر ہے اور بہت بلندی پر ہے۔ اور اہلِ مکہ کہتے تھے، ہمیں وہاں بعض دوستوں نے بتایا کہ مکہ کے اندر اہلِ مکہ کے نزدیک یہ روایت تقریباً متواتر چلی آتی ہے، کہ کوئی رافضی ثور پہ نہیں چڑھ سکتا، اور واقعی وہاں چڑھنا ایک ہمت اور مستقل ارادہ چاہتا ہے، اتنی دُشوار گزار چڑھائی ہے کہ ہر کسی کے بس کی بات بھی نہیں ہے، لیکن یہ سنی لوگ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ایمان کا نقشہ دیکھنے کے لیے کہ کیسی مشقت کی بات تھی، اور وہ کیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اُٹھا کر اُوپر لے گئے، اور کیسا وہ سنگستان اور ویران جگہ ہے، تو اُس کو دیکھنے کے لیے حقیقت ہے کہ عشق کا مارا ہوا ہی جا سکتا ہے، اور اس جگہ کو دیکھنے کے لیے عورتیں تک جاتی ہیں، دس قدم چلیں پھر بیٹھ گئیں، پھر دس قدم چلیں پھر بیٹھ گئیں، اور ہم نے اُوپر جاتے ہوئے کم از کم چھ سات جگہ بیٹھ کر سانس لیا ہوگا تو تب جا کے اُوپر پہنچے۔ لوگ پانی ساتھ لے کر جاتے ہیں، ورنہ پیاس لگتی ہے، بہت دُشوار گزار راستہ ہے، تو جب رافضی کو نفرت ہے، اُس کو تو عشق ہے ہی نہیں، اُس نے اُس کے اُوپر کیا چڑھنا ہے؟ اس پر چڑھنے کے لیے تو واقعی عشق و محبت چاہیے۔ ویسے ہمیں اس سفر میں بہت لطف آیا۔

سوال:- کہتے ہیں کہ کافر اس پہاڑ پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں کے نشان تلاش کر رہے تھے، تو پہاڑ پر نشان کیسے بن گئے؟ وہاں تو مٹی ہی نہیں ہوتی۔

جواب:- جو لوگ پہاڑوں میں رہتے ہیں ان کے لئے یہ چیز زیادہ مشکل نہیں ہے، اب آپ کی جرنیلی سڑکوں پر چور پھرتے ہیں، کھوجی پھر بھی ان کے نشان تلاش کر لیتے ہیں، کیونکہ سارے پتھر ہی پتھر تو نہیں ہوتے، کہیں مٹی آگئی، کہیں پتھر، کہیں کیا، کہیں کیا، تو بہر حال نشان مل جاتے ہیں۔ اب چوریاں ہوتی ہیں، چور جرنیلی سڑکوں پر چلے جاتے ہیں تو بھی کھوجی تلاش کرتے کرتے ان کے قدموں کے نشان تلاش کر لیتے ہیں، تو جو وہاں کے رہنے والے ہوتے ہیں ان کے لیے اس قسم کی تفتیش آسان ہوتی ہے۔ بہر حال جیسے بھی ہوشیار تھے اللہ تعالیٰ نے ان کو ہر معاملے میں اندھا کر دیا۔

سوال:- یکم محرم سنِ ہجری شروع کرنے کی وجہ کیا تھی؟

جواب:- انتظامی سہولت۔ چونکہ عُرفِ عام میں سال اسی وقت ہی شروع ہوتا ہے، اور ذی الحج آخری مہینہ سمجھا جاتا ہے، جیسے آج ایک واقعہ پیش آئے سال کے دوران میں، تو ہم سال محرم سے شمار کریں گے، اسی طرح سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسی پر مدار رکھتے ہوئے، چونکہ سال کے بارہ مہینے ہیں، محرم پہلا مہینہ ہے، ذی الحج آخری مہینہ ہے، تو اسی کو تاریخ قرار دے دیا، ورنہ اصل میں واقعہ ربیع الاول میں پیش آیا۔

سوال:- اب کسی کو بتایا جائے کہ پہلے سال ربیع الاوّل سے شروع ہوتا تھا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے محرم سے شروع کرایا، تو وہ کہے گا کہ حضرت عمر نے یہ کیوں کیا؟

جواب:- اس میں تو کوئی ایسی بات نہیں، میں کہہ رہا ہوں نا، کہ یہ تو ایک انتظامی سہولت کے لئے سال وہاں سے شمار کرنا شروع کر دیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کا پہلا سال گویا کہ محرم سے شمار کر لیا گیا، اور ذی الحج کے اُوپر اس کو ختم کر دیا گیا۔ اب حقیقت تو کتابوں میں لکھی ہوئی ہے، آپ کے سامنے نمایاں کر رہا ہوں، اور یہ بات آپ نے کہیں سنی نہیں ہوگی، اور کسی کا اس طرف ذہن

متوجہ نہیں ہوا، یہ تو میں آپ کو متوجہ کر رہا ہوں، اور کل سے میرے ذہن میں یہ بات آئی ہے، کل سے میں سب جماعتوں میں ذکر کر رہا ہوں، دورے والوں میں ذکر کیا، مشکوۃ والوں میں ذکر کیا، کہ آج بھئی! چودھویں صدی کا آخری دن ہے، کل اگلی صدی کا پہلا دِن ہوگا۔ اور یہ بات حقیقت کے مطابق ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی ہجرت اسی دِن میں ہوئی ہے۔

وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ کے اندر یہ ساری حکایت سمیٹ دی گئی، کہ رسول اللہ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے کس طرح سے محفوظ رکھا؟ اور ان مشرکوں کو اپنے ارادے کے اندر کامیاب نہ ہونے دیا۔

قرآنِ کریم کی صداقت کا معیار

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا قَالُوْا قَدْ سَمِعْنَا: جس وقت ان پر ہماری آیات پڑھی جاتی ہیں، تو یہ کہتے ہیں کہ ہم نے سن لیں، یعنی ان آیات کے متعلق ہم کہتے ہیں کہ ہم نے سن لیں، اگر ہم چاہیں لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَآ: تو ہم بھی ایسی باتیں کر سکتے ہیں۔ یہ نضر بن الحارث ایک مشرک تھا، وہ یہی کہتا تھا کہ یہ کیا قرآن پڑھ رہے ہیں، کہتے ہیں کہ یہ قرآن اللہ تعالیٰ کی طرف سے کلام آئی ہوئی ہے، ہم نے یہ ساری آیتیں سن لی ہیں، ان میں کیا رکھا ہے؟ سوائے اس کے کہ پہلے لوگوں کے قصے، کہانیاں ہیں، اور اگر ہم چاہیں تو کیا ہم ایسی باتیں نہیں کر سکتے؟ لوگوں کے دل سے اس قرآن کی عظمت کو مٹانے کرنے لیے وہ اس قسم کی باتیں کرتا تھا، لیکن اس بدھوسے کوئی پوچھے کہ اگر تم چاہو تو ایسی باتیں کر لو، پھر تم چاہتے کیوں نہیں، جب کہ قرآن بار بار کہتا ہے کہ اس جیسی کوئی سورت بنا کے لاؤ تو تم سچے ہو، قرآنِ کریم نے تو بار بار چیلنج کیا ہے کہ قرآنِ کریم کی مثل لے آؤ، پھر کہا کہ دس سورتوں کی مثل لے آؤ، اور پھر کہا کہ ایک ہی سورت کی مثل لے آؤ، اور پھر یہ چیلنج کیا کہ وَلَنْ تَفْعَلُوْا (سورۂ بقرہ: ۲۴) کہ انہوں نے کیا بھی نہیں، اس کی مثل لا بھی نہیں سکتے، اور لائیں گے بھی نہیں، اس طرح جو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کے قرآن تمہیں کہہ رہا ہے کہ میری مثل لے آؤ تو پتا چلے کہ یہ انسان کی کلام ہے یا اللہ کی کلام ہے، قرآنِ کریم نے تو اپنی صداقت کا مدار ہی اس بات پہ رکھا ہے، کہ تم اس کی مثل لاؤ تو تم سچے، کہ یہ کسی انسان کا کلام ہے۔ وہ کہتے ہیں اگر ہم چاہیں تو بنالیں، لیکن پھر بناتے کیوں نہیں؟ صرف وہی بات ہے کہ لوگوں کے ذہن سے اس کی عظمت نکالنے کے لیے اس قسم کی باتیں کرتے تھے۔ جیسے شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی کہتے ہیں کہ ''یہ تو ایسی بات ہے جیسے کوئی کہتا ہے کہ میرا گھوڑا اگر چل پڑے تو ایک ہی دِن میں لندن پہنچے، لیکن کیا کروں چلتا نہیں' یہاں بھی وہی بات ہے کہ اگر ہم چاہیں تو ایسی باتیں ہم بھی کر سکتے ہیں، ہم بھی بنا سکتے ہیں، لیکن پھر بناتے کیوں نہیں؟ قرآنِ کریم تو چیلنج کرتا ہے، اور اپنی صداقت کا مدار ہی اس پر رکھتا ہے کہ تم نہیں کر سکتے۔ لیکن جب بدبختی غالب آتی ہے تو انسان اس قسم کی اینچ پینچ کرتا ہی رہتا ہے۔ ''اگر ہم چاہیں تو ہم بھی ایسا کرلیں''، اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ: نہیں ہے یہ مگر پہلے لوگوں کے قصے کہانیاں۔

مشرکینِ مکہ کی ضد کی اِنتہا

وَاِذْ قَالُوْا: اور یہ وقت بھی یاد رکھنے کے قابل ہے، جب انہوں نے خود کہا تھا کہ اے اللہ! اگر یہ حق ہے تیری طرف سے، تو ہم پہ پتھر برسا آسمان سے، یا لے آ ہمارے پاس دردناک عذاب۔ یہ بھی اُن کی ہٹ دھرمی کی ایک بات ہے، ورنہ دیکھو!

عقل مندی کا تقاضا تو یہ تھا کہ اللہ کے سامنے ہاتھ اُٹھاتے اور اللہ تعالیٰ سے کہتے کہ" یا اللہ! اگر یہ تیری طرف سے واقعی حق ہے تو ہمیں سمجھنے کی توفیق دے، ہمیں قبول کرنے کی توفیق دے۔" تو دُعا تو یوں ہونی چاہیے، کہ" اگر یہ واقعی حق ہے تیری طرف سے، یہ جو باتیں کی جارہی ہیں تیری طرف سے ہیں، اور یہ واقعی حق ہے، تو ہمیں توفیق دے کہ ہم اس کو سمجھیں، ہماری عقل میں ڈال دے، ہمارے دل میں ڈال دے، ہمارے دل میں جو اس سے نفرت ہے وہ دُور کردے، اگر یہ حق ہے تو ہمیں قبول کرنے کی توفیق دے!" بات تو یوں ہونی چاہیے لیکن جب انسان ضد میں آجاتا ہے تو اپنی پختگی ظاہر کرنے کے لیے کہتا ہے اگر یہی دین حق ہے تو بھئی! ہمیں غرق ہوجانا منظور ہے، ہم یہ ماننے کے لیے تیار نہیں۔ یہ ضد کی اِنتہا ہوتی ہے، کہ اگر یہی حق ہے تیری طرف سے جو یہ باتیں کرتے ہیں، تو ایسے حق سے تو ہمیں پتھروں کی بارش منظور ہے، تو کوئی دردناک عذاب ہمارے اُوپر ڈال دے، اس کو ہم قبول کرنے کے لئے تیار نہیں، یہ ضد کی اِنتہا ہے۔

مشرکینِ مکہ پر عذاب نہ آنے کی دو وجہیں

اب وہ اپنی زبان سے عذاب مانگتے تھے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں عذاب تو ان پر آنا چاہیے، جیسے کے آگے آئے گا کیا حق ہے ان کا کہ ان کو عذاب نہ ہو، کیا استحقاق ہے کہ ان کو عذاب نہ ہو، جب ان کے کرتوت یہ ہیں۔ لیکن ان کا مانگا ہوا عذاب ان پر کیوں نہیں آرہا؟ پہلی بات تو یہ ہے کہ آپ ان میں موجود ہیں، آپ کا وجود ان کے لئے زندگی کی ضمانت ہے، اور اللہ تعالیٰ کی عادت یہی ہے کہ جب تک نبی کسی قوم میں موجود رہتا ہے، اس وقت تک اس قوم پر عذاب نہیں آتا، استیصالی عذاب نہیں آتا، کہ جس میں اُن کی جڑ کاٹ دی جائے، واقعات آپ کے سامنے گزرے ہیں سورۂ اَعراف میں، کہ پہلے نبی کو وہاں سے نکالا جاتا ہے، پیچھے پھر قوم برباد ہوتی ہے۔ تو آپ کا وجود ان کے لیے مستقل مانع ہے، یہ آپ کو مصیبت سمجھ رہے ہیں، اور حقیقت یہ ہے کہ آپ ان کے لیے عذاب سے سپر (ڈھال) بنے ہوئے ہیں، جب آپ ان میں موجود ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کو عذاب کیسے دے؟ اور اسی طرح سے عذاب سے بچنے کی دُوسری بات اِستغفار کی ہے، کہ یہ اِستغفار کرتے ہیں، اِستغفار یہ تھا کہ جب وہ اِحرام باندھتے تھے، حج کرتے تھے تو" غُفْرَانَكَ، غُفْرَانَكَ" اس قسم کے لفظ وہ بھی کہتے تھے، تو اُن سے ظاہری فائدہ ان کو یہ پہنچ رہا تھا، یا حضور ﷺ جب اس قوم کے اندر موجود تھے اور مسلمان وہاں موجود تھے تو سرورِ کائنات ﷺ بھی ان کے لیے دُعائیں کرتے تھے، تو عذاب سے بچنے کی ایک یہ بات تھی، اور جب آپ ﷺ تشریف لے گئے، وہاں سے مسلمان بھی نکل گئے، حضور ﷺ بھی نکل گئے، تو اُس کے بعد ان پر عذاب آیا، لیکن عذاب اس طرح سے نہیں آیا کہ جس طرح سے کسی قوم کو جڑ سے اکھیڑ دیا جاتا ہے جیسے پہلے اُمتوں پہ آیا تھا، یہ اللہ تعالیٰ کی حکمت تھی، یہاں عذاب دوسری طرح کا آیا، کہ اہلِ حق کو اور اہلِ باطل کو ٹکرایا گیا، اور آہستہ آہستہ اہلِ باطل کو ختم کیا گیا، صرف اس لیے کہ اگر کوئی سمجھنا چاہے تو اس کے لیے سمجھنے کا بہت موقع ہے، ورنہ اگر ویسا عذاب آتا جیسے قومِ لُوط پہ آیا تھا، ویسا آتا جیسے قومِ عاد پہ آیا تھا، ویسا آتا جیسے قومِ ثمود پہ آیا تھا پھر سمجھنے کی کسی کو مہلت نہ ملتی، کوئی سنبھلنا چاہتا بھی تو سنبھل نہ سکتا، لیکن یہ اللہ تعالیٰ نے سرورِ کائنات ﷺ کی برکت سے اس اُمت کے اُوپر، جو اُمتِ دعوت ہے، جس کو حضور ﷺ دعوت دینے کے لیے آئے تھے،

ایسا عذاب نہیں ڈالا کہ بالکل جڑ سے کاٹ دیں، اور ان کو سنبھلنے کا موقع بھی نہ دیں۔ ''نہیں ہے اللہ تعالیٰ کہ ان کو عذاب دیں اس حال میں کہ آپ ان میں ہیں، اور نہیں ہیں اللہ تعالیٰ اُن کو عذاب دینے والے اس حال میں کہ وہ اِستغفار کرتے ہوں'' اِستغفار کرتے رہیں، اللہ تعالیٰ سے معافی مانگتے رہیں، کُفر و شرک سے توبہ کرلیں تو بھی ہمیشہ بچے رہیں گے، اور سرورِ کائنات ﷺ کا اپنا وجود بھی ان کے لیے اس قسم کے عذاب سے مانع ہے، جس قسم کا عذاب وہ مانگتے تھے، کہ ہم پر پتھروں کی بارش ہو آسمان سے، یا کوئی دردناک عذاب آئے جو بالکل نیست و نابود کر کے رکھ دے، اللہ کی حکمت یہ نہیں، آپ ﷺ کے آنے کے بعد اس قسم کا عذاب اس قوم پر نہیں آیا۔

مشرکینِ مکہ کے دعووں کی تردید

باقی جہاں تک ان کے اپنے اِستحقاق کا تعلق ہے، وہ تو ان پر عذاب آنا چاہیے۔ کیا ہے ان کے لیے کہ اللہ ان کو عذاب نہ دے حالانکہ ان کی حرکتیں یہ ہیں، کہ مسجدِ حرام سے لوگوں کو روکتے ہیں، مسجد جو کہ اللہ کا گھر ہے، اللہ کا ہر بندہ وہاں آ کر عبادت کر سکتا ہے، لیکن یہ روکتے ہیں، اور وہاں آ کر کسی کو عبادت نہیں کرنے دیتے، مسلمانوں کو وہاں جانے نہیں دیتے، جس طرح سے وہ حدیبیہ کے موقع پر روک لیا تھا، حضور ﷺ اور صحابہ کرام ؓ عمرہ کرنے کے لیے گئے تھے تو اُن کو نہیں پہنچنے دیا، وہ واقعہ آپ کے سامنے چھبیسویں پارہ میں سورۂ فتح میں آئے گا۔ وَمَا كَانُوْٓا اَوْلِيَآءَهٗ: اور یہ لوگ اس مسجد کے متولّی نہیں ہیں، یہ سمجھتے ہیں کہ ہم اس مسجد کے متولّی ہیں، بیت اللہ کے مجاور ہیں، جس کی وجہ سے ہمیں یہ حق پہنچتا ہے کہ ہم جس کو چاہیں آنے دیں جس کو چاہیں نہ آنے دیں، یا وہ یہ سمجھتے ہیں کہ جب ہم مسجدِ حرام کے متولّی ہیں اور بیت اللہ کے مجاور ہیں تو ہم اللہ کے ولی ہیں، اللہ کے مقبول ہیں، اس لیے دلیر ہو رہے ہیں کہ ہمیں عذاب نہیں آسکتا، چونکہ ہم بیت اللہ کے خادم ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ نہ یہ مسجدِ حرام کے متولّی ہیں، نہ یہ میرے دوست ہیں، میرے دوست یا مسجد کے متولّی تو متقی ہو سکتے ہیں، اللہ سے ڈرنے والے ہو سکتے ہیں۔ تو اس قسم کے بدمعاش، اس قسم کے لُچے، اس قسم کے مشرک کس طرح سے مسجدِ حرام کے متولّی ہو گئے؟ یا میں ان کو اپنا دوست کس طرح سے بنالوں؟ اللہ کا ولی اگر ہو سکتا ہے تو متقی آدمی ہو سکتا ہے، اور مسجد کی تولیت کا حق اگر ہے تو اُنہی لوگوں کو ہے جو اللہ سے ڈرتے ہیں، نہ یہ مسجد کے متولّی ہیں نہ یہ اللہ کے دوست ہیں۔ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ: لیکن ان میں سے اکثر جانتے نہیں، وہ سمجھتے ہیں کہ ہم چند شرکیہ رسموں کی پابندی جو کر رہے ہیں، اور مسجدِ حرام کے پاس رہتے ہیں، اور یہ چند رُسومِ شرکیہ کے پابند ہیں، تو اسی سے سمجھتے ہیں کہ ہم اللہ کے مقبول ہو گئے، اور ہمیں ہر قسم کی گڑبڑ کرنے کا حق ہے، بیت اللہ پر ہمارا اِستحقاق ہے کہ کسی کو آنے دیں، کسی کو نہ آنے دیں، یہ سب ان کی بے علمی کی باتیں ہیں۔

تعمیرِ بیت اللہ کا مقصد اور مشرکینِ مکہ کا غلط طرزِ عمل

اللہ تعالیٰ نے حضرات ابراہیم علیہ السلام کے ذریعے سے بیت اللہ کو تعمیر کروایا تھا، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہاں آ کر اپنی

اولاد کو بسایا تھا، جن کی اولاد میں ہونے کا اِن کو فخر حاصل ہے، لیکن ابراہیم علیہ السلام نے یہ گھر کیوں بنایا، اور یہاں اپنی اولاد کو کیوں بسایا، یہ سب باتیں انہوں نے اپنی بے عملی کی نظر کر دیں، اور اپنی جہالت کی بھینٹ چڑھا دیں، انہوں نے یہ نہیں یاد رکھا کہ بیت اللہ کیوں بنا تھا، اور ابراہیم علیہ السلام نے آ کے اپنی اولاد کو یہاں کیوں بسایا تھا، قرآنِ کریم نے وہ تاریخ دوہرائی ہے، قرآنِ کریم کہتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے اللہ کے سامنے دُعا کی تھی رَبَّنَآ إِنِّيٓ أَسْكَنتُ مِن ذُرِّيَّتِي بِوَادٍ غَيْرِ ذِي زَرْعٍ عِندَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ "رَبَّنَا لِيُقِيمُوا الصَّلَوٰةَ (سورۂ ابراہیم: ۳۷) اے اللہ! اس وادیٔ غیر ذی زرع میں جہاں کچھ پیدا نہیں ہوتا میں نے اپنی کچھ اولاد لا کے بسادی ہے، تیرے حرمت والے گھر کے پاس۔ بسا کس لیے دی ہے؟ لِيُقِيمُوا الصَّلَوٰةَ تا کہ یہ نماز پڑھیں، نماز کی پابندی کریں۔ توحید اختیار کرنے کے بعد نماز ایک بہت بڑا اہم مقصد ہے، تو بیت اللہ کی تو تعمیر ہی اس لیے ہوئی تھی، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی اولاد کو بسایا یہاں اسی لیے تھا تا کہ وہ اللہ کی نماز پڑھیں۔ اور بت پرستی سے بچیں جیسے کہ اگلی آیات میں آ گیا۔[1] لیکن انہوں نے معاملہ کیا کر دیا، کہ بھی بیت اللہ بتوں سے بھر دیا، اور نماز کی جگہ سیٹیاں اور تالیاں۔ سیٹیوں اور تالیوں کا کیا مطلب؟ یا تو یہ ہے کہ بیت اللہ کے اردگرد بیٹھتے تھے، تو جس طرح نوجوان طبقہ جب اکٹھا ہوتا ہے تو ہنستے ہیں، کھیلتے ہیں، تالیاں بجاتے ہیں، سیٹیاں بجاتے ہیں، جیسے میلوں ٹھیلوں میں ہوتا ہے، تو نماز کی جگہ انہوں نے یہ شغل اختیار کر لیا۔ اور توحید کا اس کو مرکز بنایا گیا تھا تو اس کو بت خانے کا مرکز بنا دیا، تو ان چیزوں کے باوجود یہ سمجھتے ہیں کہ ہمیں فخر حاصل ہے کہ ہم ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے ہیں اور اس مسجد کے متولی ہیں، ان کا حال یہ ہے کہ نماز کی جگہ سیٹیاں اور تالیاں آ گئیں، اور توحید کی جگہ ساری بت پرستی یہاں اکٹھی ہو گئی، پھر بھی ان کو فخر حاصل ہے بیت اللہ کی مجاورت کا؟...... یا تو یہ مطلب ہے کہ غفلت کے ساتھ جس طرح سے نوجوان طبقہ اکٹھا ہوتا ہے، وہاں کھیلتے ہیں، ہنستے ہیں، تالیاں بجاتے ہیں، سیٹیں بجاتے ہیں، تو مسجد کے آس پاس وہ بھی ایسے کرتے تھے، اور یہ چیز اُن کے لیے عبادت نہیں تھی، بلکہ اُن کی غفلت اور اُن کی جہالت کی یہ حرکتیں تھیں جو وہ مسجد کے پاس کرتے تھے...... اور ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ بطور عبادت کے انہوں نے یہ طریقے اپنا لیے ہوں، جس طرح سے آج کل بھی لوگ مزاروں پر جاتے ہیں تو وہاں جا کے ناچتے ہیں، اچھلتے ہیں، باجے بجاتے ہیں، تو ان کے نزدیک یہی اس بزرگ کو خوش کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ اور ہندو جو ہیں وہ اپنے بت خانے میں گھنٹیاں بجاتے ہیں، اور یہ گھنٹیاں بجانی اُن کے لیے عبادت ہے، اور یہ رافضی آپ کے ہاں محرم کے موقع پر کس قسم کی حرکتیں کرتے ہیں، دفیں بجاتے ہیں، شور مچاتے ہیں، اُچھلتے کودتے ہیں، ناچتے ہیں، لڑتے ہیں، بھڑتے ہیں، پتا نہیں وہ کیا کیا کرتے ہیں، ان کے نزدیک یہی ایک عبادت ہے۔ تو جس طرح سے ان جاہلوں نے اس قسم کی جاہلانہ حرکتوں کو عبادت سمجھ رکھا ہے، تو ہو سکتا ہے کہ ان جاہلوں نے بھی سیٹیاں اور تالیاں بجانے کو عبادت قرار دے دیا ہو...... یا تو یہ مطلب ہے کہ نماز کی جگہ یہ سیٹیاں بجانے لگ گئے کہ یہاں اودھم مچاتے ہیں، شور مچاتے ہیں، سیٹیاں بجاتے ہیں، تالیاں بجاتے ہیں، حالانکہ ان کو نماز پڑھنی چاہیے تھی۔ یا یہ ہے کہ واقعی انہوں نے عبادت کی یہی صورت بنالی۔ پہلی صورت کا مطلب یہ ہے کہ جیسے مسجد میں بیٹھا کوئی خرافات

(۱) وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ اجْعَلْ هَٰذَا الْبَلَدَ آمِنًا وَاجْنُبْنِي وَبَنِيَّ أَن نَّعْبُدَ الْأَصْنَامَ (سورۂ ابراہیم آیت ۳۵)

حرکتیں کر رہا ہو تو آپ کہیں گے کہ دیکھو! اس کی یہی نماز ہے۔ حالانکہ وہ اپنے خیال کے مطابق نماز نہیں پڑھ رہا، لیکن نماز کی جگہ چونکہ یہ ایسی حرکتیں کر رہا ہے تو کہتے ہیں بس یہی ان کی حرکتیں ان کی نماز ہے۔ جاٹ لوگ جس وقت آپس میں ملا کرتے ہیں (آپ لوگ آپس میں ملتے ہیں تو آپ کی ملاقات کے وقت طریقہ ہوتا ہے: ''السلام علیکم'') اور جس وقت یہ جاٹ لوگ آپس میں ملتے ہیں تو کہتے ہیں: ''تیری ماں نوں، کدروں آر یا ئیں!'' تو سلام کی جگہ ایک دوسرے کو گالی ٹھونک دیں گے، تو آپ کہیں گے کہ ان کا یہی سلام ہے۔ مطلب کیا؟ کہ سلام کی جگہ انہوں نے یہ جو گالی اختیار کر لی، اگر چہ وہ سلام کی نیت سے نہیں کہتے، لیکن سلام کی جگہ آ گئی، تو ہم کہیں گے کہ ان کا یہی سلام ہے۔ اسی طرح سے ان کو پڑھنی تو چاہیے تھی یہاں نماز، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بیت اللہ بنایا اس لیے تھا، اپنی اولاد کو آباد اس لیے کیا تھا، لیکن یہاں یہ سیٹیاں بجانا، تالیاں بجانا اس قسم کا شغل جو اختیار کر لیا تو گویا کہ ان کی یہی نماز ہے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ حرکتیں وہ بطور عبادت کے کرتے ہیں جیسے آج بھی جاہل لوگ قبروں پر، تعزیوں میں، اور ہندو اپنے مندروں میں گھنٹیاں بجانا، اچھلنا کودنا، ناچنا، ڈھلیں بجانا، یہ لوگوں نے بطور عبادت کے اختیار کر لیا، تو انہوں نے بھی ایسا کر لیا ہوگا۔ ''نہیں ہے ان کی نماز بیت اللہ کے پاس مگر سیٹی بجانا اور تالی بجانا'' ۔ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ: جب یہ ایسی حرکتیں آ گئیں تو چکھو عذاب۔ یہ ایک چپت تمہیں لگ گئی بدر میں تمہارے کفر کی وجہ سے، اب سمجھو کہ سلسلہ آگے چل پڑا، اب چپتیں لگتی جائیں گی، اور تم شمار کرتے رہنا کہ کتنی لگتی ہیں، اگر باز نہیں آؤ گے تو، جیسے آگے دھمکی آ رہی ہے، یہ شروع ہو گیا حساب...... اور یہ بھی مطلب ہو سکتا ہے کہ ہم آخرت میں ان کو کہیں گے، یہ جو اپنے آپ کو اولیاء بنائے بیٹھے ہیں کہ مسجد کے اولیاء یا یہ اللہ کے اولیاء ہیں، ان ولیوں کو ہم پوچھ لیں گے، قیامت کے دن ہم کہیں گے کہ چکھو عذاب اپنی ان کفریہ حرکتوں کے سبب سے جو تم کیا کرتے تھے۔

''اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ'' کا پس منظر

اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ: یہ کافر لوگ خرچ کرتے ہیں اپنے مالوں کو۔ جس طرح سے جنگ کی تیاری میں خرچ کیا۔ اور یہ چونکہ ایک فیصلہ کن جنگ لڑنے کے لئے آئے تھے تو جتنے مکہ کے افراد تھے، ہزار افراد پر مشتمل جو لشکر تھا، تو ایک ایک سردار ایک ایک دن ان کو کھانا کھلاتا تھا، اس طرح سے دھوم دھام کے ساتھ، شاہ خرچیوں کے ساتھ یہ نکلے، اپنے طور پر اپنے مسلک کو غالب کرنے کے لئے، تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ''اپنے مالوں کو خرچ کرتے ہیں تا کہ اللہ کے راستے سے روکیں، عنقریب یہ ان کو خرچ کریں گے، پھر یہی مال ان کے اوپر حسرت بن جائیں گے'' جب خرچ کرنے کا نتیجہ ان کے حق میں نہیں نکلے گا، بلکہ اُلٹا نتیجہ نکلا تو افسوس بھی ہوگا کہ خرچ بھی کیا، پلے بھی کچھ نہ پڑا۔ ''پھر یہ مغلوب ہو جائیں گے، اور کافر لوگوں کو جہنم کی طرف اکٹھا کیا جائے گا، تا کہ اللہ تعالیٰ خبیث کو طیب سے علیحدہ کر دے'' سورۂ یٰسٓ میں جس طرح سے الفاظ ہیں وَامْتَازُوا الْیَوْمَ اَیُّهَا الْمُجْرِمُوْنَ: اے مجرمو! آج صالحین سے ممتاز ہو جاؤ، علیحدہ ہو جاؤ۔ دُنیا کی آبادی کے اندر تو اچھے بُرے سب لوگ اکٹھے ہوتے ہیں، حق باطل کسی نہ کسی درجے میں ملا جلا سا رہ جاتا ہے، لیکن قیامت کے دن اللہ تعالیٰ خبیث اور طیب کو بالکل علیحدہ علیحدہ کر دیں گے۔ ''اور خبیث کو بعض کو بعض کے اوپر کر دیں گے'' جس طرح سے ڈھیر لگایا جاتا ہے تہہ لگائی جاتی ہے، فَیَرْكُمَهٗ: پھر اُس کو اچھی طرح سے

اکٹھا کر دیں گے، جَمِيعًا: سب کو، فَيَجْعَلَهُ فِي جَهَنَّمَ: پھر اس خبیث کو جہنم میں ڈال دیں گے۔ جس طرح سے کوڑا کرکٹ بکھرا ہوا ہوتا ہے، جھاڑو کے ساتھ آپ اس کو قریب کرتے ہیں، پھر ٹوکرے بھر بھر کر اس کا ڈھیر لگا دیتے ہیں، پھر اس کو تیلی لگا کے آپ آگ لگا دیتے ہیں، تاکہ یہ نجاست اور یہ کوڑا کرکٹ ختم ہو جائے، تو یہی صورت ان کے ساتھ پیش آئے گی۔ فَيَرْكُمَهُ جَمِيعًا اللہ تعالیٰ اس کو ڈھیر کر دے گا سب کو، ڈھیر لگا دے گا سب کو، تہہ بہ تہہ کر دے گا، قریب کرے گا بعض خبیث کو بعض کے، پھر اس کو اکٹھا کر دے گا سب کو فَيَجْعَلَهُ فِي جَهَنَّمَ: پھر اس کو کر دے گا جہنم میں، أُولَٰئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ: یہی لوگ خسارہ پانے والے ہیں، ان کی سب جدوجہد کا آخری نتیجہ ان کے حق میں خسارہ ہے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ أَسْتَغْفِرُكَ وَأَتُوبُ إِلَيْكَ

(طلبہ نے غارِ ثور کے موقع پر پیش آئے ہوئے لطائف سنانے کا اصرار کیا تو فرمایا) جس وقت ثور پر چڑھے جا رہے تھے تو مشقت تو بہت تھی، اور ہمارے نسیم صاحب ماشاء اللہ! چونکہ زیادہ چلنے پھرنے کے عادی نہیں تھے، تو میں نے انہیں کہا "نسیم صاحب! آج ادا کرو ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی سنت، اور مجھے اُٹھاؤ"۔ کہنے لگے "نہیں جی! میں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ادا کروں گا۔" کیا مطلب؟ کہ دُوسرے کے کندھے پہ چڑھوں گا، کسی کو اُٹھاؤں گا نہیں۔ بہرحال ایسے ہی ہنستے ہنستے بہت شاندار سفر ہو گیا۔

قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ يَّنْتَهُوْا يُغْفَرْ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ ۚ
آپ کہہ دیجیے اُن لوگوں کو جو کافر ہیں اگر وہ باز آ جائیں تو بخش دیا جائے گا اُن کو جو کچھ پہلے ہو چکا
وَاِنْ يَّعُوْدُوْا فَقَدْ مَضَتْ سُنَّتُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۳۸﴾ وَقَاتِلُوْهُمْ
اور اگر وہ پہلی حالت کی طرف لوٹیں گے پس تحقیق گزر گیا طریقہ پہلے لوگوں کا﴿۳۸﴾ (اے ایمان والو!) لڑو اُن سے
حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ۚ فَاِنِ
حتیٰ کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین سارے کا سارا اللہ کے لیے ہو جائے، پھر اگر
انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۳۹﴾ وَاِنْ تَوَلَّوْا
یہ لوگ باز آ جائیں پس بے شک اللہ تعالیٰ اُن کے عملوں کو دیکھنے والا ہے﴿۳۹﴾ اور اگر انہوں نے پیٹھ پھیری
فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَوْلٰىكُمْ ۭ نِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ ﴿۴۰﴾
تو تم یقین کر لو کہ بے شک اللہ تعالیٰ تمہارا مولیٰ ہے، اللہ بہت اچھا مولیٰ ہے اور بہت اچھا مددگار ہے﴿۴۰﴾

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ

جان لو جو کہ بیشک جو کچھ بھی تم مالِ غنیمت کے طور پر حاصل کرو تو (اس کا حکم یہ ہے کہ) اللہ کے لئے اُس کا پانچواں حصّہ ہے اور رسول کے لئے ہے

وَلِذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰكِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ ۙ اِنْ

اور ذی قرابت کے لئے ہے اور یتیموں کے لئے ہے اور مسکینوں کے لئے ہے اور مسافر کے لئے ہے اگر

كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا یَوْمَ الْفُرْقَانِ

تم ایمان لاتے ہو اللہ پر اور اُس چیز پر جو ہم نے اُتاری تھی اپنے بندے پر فیصلے کے دن

یَوْمَ الْتَقَی الْجَمْعٰنِ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۴۱﴾ اِذْ اَنْتُمْ

جس دِن دو جماعتوں کی آپس میں ٹکر ہوئی تھی، اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے ﴿۴۱﴾ جب کہ تم

بِالْعُدْوَةِ الدُّنْیَا وَهُمْ بِالْعُدْوَةِ الْقُصْوٰی وَالرَّكْبُ اَسْفَلَ

قریب والے کنارے میں تھے اور وہ دُور والے کنارے میں تھے اور وہ قافلہ تم سے نچلی

مِنْكُمْ ؕ وَلَوْ تَوَاعَدْتُّمْ لَاخْتَلَفْتُمْ فِی الْمِیْعٰدِ ۙ وَلٰكِنْ لِّیَقْضِیَ

جانب تھا، اگر تم آپس میں ایک دوسرے سے وعدہ کرتے تو تم وعدہ کرنے میں اختلاف کرتے لیکن تاکہ فیصلہ کر دے

اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا ۙ۬ لِّیَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْۢ بَیِّنَةٍ

اللہ تعالیٰ اس امر کا جس کا کرنا منظور تھا، تاکہ ہلاک ہو جو شخص بھی ہلاک ہو دلیل کے بعد

وَّیَحْیٰی مَنْ حَیَّ عَنْۢ بَیِّنَةٍ ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ لَسَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ﴿۴۲﴾ ۙ اِذْ

اور زندہ رہے جو بھی زندہ رہے دلیل کے بعد، بے شک اللہ تعالیٰ البتہ سننے والا ہے جاننے والا ہے ﴿۴۲﴾ قابلِ ذکر ہے وہ وقت جب

یُرِیْكَهُمُ اللّٰهُ فِیْ مَنَامِكَ قَلِیْلًا ؕ وَلَوْ اَرٰىكَهُمْ كَثِیْرًا لَّفَشِلْتُمْ

دِکھاتا تھا اللہ تعالیٰ آپ کو وہ لوگ آپ کی نیند میں تھوڑے سے، اگر آپ کو دِکھا دیتا وہ لوگ زیادہ تو تم ہمت ہار دیتے

وَلَتَنَازَعْتُمْ فِی الْاَمْرِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ سَلَّمَ ؕ اِنَّهٗ عَلِیْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۴۳﴾

اور تم جھگڑا کرتے اس معاملے میں لیکن اللہ تعالیٰ نے سلامت رکھا، بے شک وہ جاننے والا ہے دِلوں کی باتوں کو ﴿۴۳﴾

قَلِيْلًا	اَعْيُنِكُمْ	فِيْٓ	الْتَقَيْتُمْ	اِذِ	يُرِيْكُمُوْهُمْ	وَاِذْ

اور جب دکھاتا تھا اللہ تعالیٰ تمہیں وہ لوگ تمہاری آنکھوں میں تھوڑے جس وقت تم آپس میں ایک دوسرے کے مقابل ہوئے تھے

مَفْعُوْلًا	كَانَ	اَمْرًا	اللّٰهُ	لِيَقْضِيَ	اَعْيُنِهِمْ	فِيْٓ	وَيُقَلِّلُكُمْ

اور تمہیں کم کر کے دکھاتا تھا اللہ تعالیٰ اُن کی آنکھوں میں تاکہ پورا کردے اللہ تعالیٰ اس اَمر کو جس کا کرنا منظور تھا،

وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿۴۴﴾

اللہ ہی کی طرف تمام اُمور لوٹائے جاتے ہیں ﴿۴۴﴾

خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا: آپ کہہ دیجئے ان لوگوں کو جو کافر ہیں، اِنْ يَّنْتَهُوْا: اگر وہ باز آجائیں، يُغْفَرْ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ: مَا قَدْ سَلَفَ: جو کچھ پہلے ہو چکا۔ ''بخش دیا جائے گا ان کو جو کچھ پہلے ہو چکا'' وَاِنْ يَّعُوْدُوْا: اور اگر وہ پہلی حالت کی طرف لوٹیں گے فَقَدْ مَضَتْ سُنَّتُ الْاَوَّلِيْنَ: پس تحقیق گزر گیا طریقہ پہلے لوگوں کا۔ فَقَدْ مَضَتْ سُنَّتُ الْاَوَّلِيْنَ یہ اِنْ يَّعُوْدُوْا کی جزا پر دلالت کرتا ہے۔ اگر وہ پہلی حالت کی طرف لوٹیں گے تو پٹیں گے، پہلے لوگوں کا طریقہ گزر ہی چکا ہے، یعنی پہلے لوگوں کا جو طریقہ گزر چکا ہے اس سے جو بات سمجھ میں آتی ہے اِنْ يَّعُوْدُوْا کی جزا وہ ہے۔ اب وہ کیا طریقہ گزر چکا ہے؟ کہ نیست و نابود ہو گئے، اللہ تعالیٰ کے عذاب کا نشانہ بن گئے، اُن کی پھوں پھاں بہت جلدی نکل گئی، اللہ تعالیٰ نے انہیں برباد کر دیا، تو پہلے لوگوں کا طریقے سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے واقعات سن کے، تو وہ بات جو سمجھ میں آتی ہے اِنْ يَّعُوْدُوْا کی جزا وہی ہے۔ اگر وہ دوبارہ اس قسم کی حرکتیں کریں گے پہلی حالت کی طرف لوٹیں گے تو پہلے لوگوں کا قصہ معلوم ہی ہے، وہی ہوگا جو اُن کے ساتھ ہوا تھا، یہ مفہوم ہوا اس کا۔ وَقَاتِلُوْهُمْ: قَاتِلُوْا اَمر کا صیغہ ہے مقاتلہ سے۔ یہ خطاب ہے اہلِ ایمان کو۔ اے ایمان والو! لڑو اُن سے، حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ: حَتّٰى یہ غایت کے لئے ہے، تو جب یہ غایت کے لئے ہو تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ پہلا فعل اتنا ممتد ہونا چاہے کہ اس کا مابعد واقع ہو جائے، جس طرح سے ''روضۃ الادب'' میں آپ نے پڑھا: مَشَيْتُ حَتّٰى عَيِيْتُ: میں اتنا چلا کہ تھک گیا، یعنی میرے چلنے کا فعل اس وقت تک جاری رہا حتی کہ تھکنا پیش آگیا۔ اَكَلْتُ حَتّٰى شَبِعْتُ: میں نے اتنا کھایا کہ رَج گیا، اس کا مفہوم یوں ادا کیا جاتا ہے، ''اتنا کھایا، اتنا چلا'' یہ گویا کہ یہ پہلے فعل کے دوام کی طرف اشارہ ہے کہ پہلا فعل اتنی دیر تک جاری رہا جب تک کہ مابعد والا فعل واقع نہیں ہو گیا، جب مابعد والا فعل واقع ہو جائے گا تو اس وقت پہلا فعل ختم ہو جائے گا، کہ جب تھک گیا تو چلنا چھوڑ دیا، رَج گیا تو کھانا چھوڑ دیا۔ تو یہاں بھی اسی طرح سے ہے، اب اس کا مفہوم ہم یوں ادا کریں قَاتِلُوْهُمْ: ان کافروں سے اس وقت تک لڑو جب تک کہ فتنہ ختم نہ ہو جائے، حتّٰی کہ یہ واقعہ پیش آجائے کہ فتنہ نہیں رہا، ان سے اتنا لڑو، اس وقت تک لڑو کہ یہ فتنہ ختم

ہوجائے، حتّٰی کہ فتنہ باقی نہ رہے۔ فتنہ: فساد۔ اس کی تشریح پھر (ابھی) کرتا ہوں، وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ: اور دین سارے کا سارا اللہ کے لئے ہوجائے، یہ بھی ''حتّٰی'' کے نیچے داخل ہے، یعنی حتّٰی کہ فتنہ نہ رہے اور دین سارے کا سارا اللہ کے لئے باقی رہ جائے، سارے کا سارا دین اللہ کے لئے ہوجائے، فَاِنِ انْتَهَوْا: پھر اگر یہ لوگ باز آجائیں، فَاِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ: پس بیشک اللہ تعالیٰ ان کے عملوں کو دیکھنے والا ہے، وَاِنْ تَوَلَّوْا: اور اگر انہوں نے پیٹھ پھیری، فَاعْلَمُوْٓا: تو تم یقین کرلو اَنَّ اللّٰهَ مَوْلٰىكُمْ: کہ بیشک اللہ تعالیٰ تمہارا مولیٰ ہے، نِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ: بہت اچھا مولیٰ ہے اور بہت اچھا نصیر ہے۔ نصیر: مددگار۔ اور مولیٰ: حمایتی۔ بہت اچھا حمایتی ہے اور بہت اچھا مددگار ہے، یعنی اللہ۔ تو مولیٰ جو ہے یہ نِعْمَ کا فاعل ہوگیا، اور اسی طرح سے نصیر یہ بھی نِعْمَ کا فاعل ہوگیا، تو نعم بئس کے اندر آپ جانتے ہیں کہ ایک ان فعلوں کا فاعل ہوتا ہے، اور ایک مخصوص بالمدح یا مخصوص بالذم ہوتا ہے، تو یہاں مخصوص بالمدح اللہ ہے، نِعْمَ الْمَوْلٰى اللّٰهُ، نِعْمَ النَّصِيْرُ اللّٰهُ: اللہ بہت اچھا مولیٰ ہے اور اللہ بہت اچھا مددگار ہے۔

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ: اَنَّمَا میں ''مَا'' موصولہ ہے، مِّنْ شَيْءٍ یہ ''مَا'' کا بیان ہے۔ غَنِمَ کا معنی ہوتا ہے کوئی چیز مفت میں حاصل کرلینا، غنیمت اسی مال کو کہا جاتا ہے جو اللہ تبارک وتعالیٰ مسلمان کو ایک زائد دیتا ہے، ورنہ جہاد کا اصل ثواب تو آخرت میں ملے گا، مالِ غنیمت ایک زائد چیز ہے جو مسلمان کو دُنیا میں مفت مل جاتی ہے، یہ جہاد کا معاوضہ نہیں، جہاد کا معاوضہ آخرت میں ہوگا۔ تو مِّنْ شَيْءٍ یہ ''مَا'' کا بیان ہوگیا، تو معنی یوں بنا ''جو کچھ بھی تم غنیمت کے طور پر حاصل کرو (''جو کچھ بھی'' یہ تعمیم ہوگئی) جان لو کہ بیشک جو کچھ بھی تم مالِ غنیمت کے طور پر حاصل کرو'' فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ: تو اس کا حکم یہ ہے کہ اللہ کے لئے اس کا پانچواں حصہ ہے، اور رسول کے لئے ہے'' وَلِذِي الْقُرْبٰى: قربیٰ قرابت کے معنی میں۔ ذِی قرابت کے لئے ہے، وَالْيَتٰمٰى: اور یتیموں کے لئے ہے، وَالْمَسٰكِيْنِ: مسکینوں کے لئے ہے، وَابْنِ السَّبِيْلِ: اور مسافر کے لئے ہے۔ ابن سبیل کا لفظی معنی بنتا ہے راستے کا بیٹا، راستے کے بیٹے سے مراد ہوتا ہے راہ چلتا انسان، جس کا تعلق اپنے راہ سے ہی ہے، منزل سے ابھی تعلق نہیں ہوا، ''مسافروں کے واسطے'' اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ: اگر تم ایمان لاتے ہو اللہ پر، وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا يَوْمَ الْفُرْقَانِ: اور اس چیز پر جو ہم نے اتاری تھی اپنے بندے پر فیصلے کے دن، جو کچھ ہم نے اپنے بندے پر فیصلے کے دن اتارا، يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ: یہ يَوْمَ الْفُرْقَانِ سے بدل ہے۔ جس دن دو جماعتوں کی آپس میں ٹکر ہوئی تھی۔ جمعان: ایک جمعیت مسلمانوں کی اور ایک جمعیت مشرکوں کی۔ يَوْمَ الْفُرْقَانِ سے مراد ہے يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ، جس دن دونوں جماعتوں کی ٹکر ہوئی تھی۔ اِلتقاء: آپس میں ملنا، ٹکرانا۔ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ: اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔ اِذْ اَنْتُمْ بِالْعُدْوَةِ الدُّنْيَا: عدوہ کہتے ہیں کنارے کو اور گھاٹی کو۔ دنیا یہ ادنیٰ کا مؤنث ہے، قریب۔ اور الْقُصْوٰى یہ اقصیٰ کا مؤنث ہے، جیسے مسجد اقصیٰ کا لفظ قرآنِ کریم میں دوسری جگہ آیا ہوا ہے (پارہ ۱۵)، اقصیٰ دُور کو کہتے ہیں اَبعد کے معنی میں، تو قُصویٰ بُعدیٰ کے معنی میں آگیا، دُنیا کے مقابلے میں۔ '' جبکہ تم قریب والے کنارے میں تھے اور وہ دُور والے کنارے میں تھے'' وَالرَّكْبُ اَسْفَلَ مِنْكُمْ: اور وہ قافلہ، سواروں کا گروہ تم سے نچلی جانب تھا، وَلَوْ تَوَاعَدْتُّمْ: اگر تم آپس میں ایک دوسرے سے وعدہ کرتے۔ تَوَاعَدْتُّمْ باب تفاعل آگیا۔ اگر تم آپس میں ایک دوسرے سے وعدہ کرتے لَاخْتَلَفْتُمْ فِي الْمِيْعٰدِ: تو تم وعدہ کرنے میں اختلاف کرتے۔ میعاد مصدر ہے۔ وعدہ کرنے میں یعنی وقت متعین کرنے میں، جگہ متعین کرنے میں، لڑنے نہ

لڑنے میں تم آپس میں اختلاف کرتے، وَلٰکِنْ لِّیَقْضِیَ اللّٰہُ اَمْرًا کَانَ مَفْعُوْلًا: لیکن اللہ تعالیٰ نے تمہیں آپس میں لڑا دیا، تمہیں آپس میں بھڑا دیا، تمہاری ٹکر کروادی تا کہ فیصلہ کر دے اللہ تعالیٰ اس امر کا جس کا کرنا منظور تھا، کَانَ مَفْعُوْلًا: جو اللہ کے علم میں طے شدہ تھا، وہ امر مفعول تھا یعنی اللہ کے علم میں واقع کیا ہوا تھا۔ اللہ کے علم میں جو طے شدہ امر تھا، جس کا طے کرنا اللہ کو منظور تھا تا کہ اس بات کو فیصلہ کر دے، جو اللہ کے علم مقرر ہو چکا تھا، لِّیَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْۢ بَیِّنَةٍ: تا کہ ہلاک ہو جو شخص بھی ہلاک ہو دلیل کے بعد، عَنْۢ بَیِّنَةٍ: دلیل کے بعد، بعن بَعْدِ بَیِّنَۃٍ۔ وَّیَحْیٰی: اور زندہ رہے جو بھی زندہ رہے دلیل کے بعد، وَاِنَّ اللّٰہَ لَسَمِیْعٌ عَلِیْمٌ: بیشک اللہ تعالیٰ البتہ سننے والا ہے جاننے والا ہے۔ اِذْ یُرِیْكَهُمُ اللّٰهُ فِیْ مَنَامِكَ قَلِیْلًا: قابل ذکر ہے وہ وقت، یاد کرنے کا ہے وہ وقت جب دکھاتا تھا اللہ تعالیٰ آپ کو وہ لوگ آپ کی نیند میں تھوڑے سے۔ یُرِیْكَهُمْ! "کاف" پہلا مفعول، "ھم" دوسرا مفعول۔ آپ کو دکھاتا تھا وہ لوگ آپ کی نیند میں۔ منام یہ مصدر میمی ہے۔ آپ کی نیند میں قَلِیْلًا: تھوڑے۔ وَلَوْ اَرٰىكَهُمْ: اگر آپ کو دکھا دیتا وہ لوگ زیادہ، لَّفَشِلْتُمْ وَلَتَنَازَعْتُمْ: تو اے مسلمانو! تم حوصلہ چھوڑ دیتے۔ فشل: کمزور ہو جانا۔ تم ہمت ہار دیتے، وَلَتَنَازَعْتُمْ فِی الْاَمْرِ: اور تم جھگڑا کرتے اس معاملے میں، وَلٰکِنَّ اللّٰہَ سَلَّمَ: لیکن اللہ تعالیٰ نے بچا لیا، لیکن اللہ تعالیٰ نے سلامت رکھا، اِنَّهٗ عَلِیْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ: بیشک وہ جاننے والا ہے دلوں کی باتوں کو۔ صدور۔ صدر کی جمع ہے، صدر سینے کو کہتے ہیں، اور سینہ بول کے مراد دل ہی ہوتا ہے، سینے کا راز اور دل کا بھید ایک ہی بات ہے، اِنَّ اللّٰہَ عَلِیْمٌ بِاُمُوْرٍ ذَاتِ الصُّدُوْرِ، اللہ تعالیٰ ان سب باتوں کو جاننے والا ہے جو سینوں میں ہیں۔ وَاِذْ یُرِیْكُمُوْهُمْ اِذِ الْتَقَیْتُمْ فِیْۤ اَعْیُنِكُمْ قَلِیْلًا: اِذِ الْتَقَیْتُمْ: جب تم آپس میں ٹکرائے، جب تمہاری ٹکر ہوئی۔ یُرِیْكُمُوْهُمْ: اللہ تعالیٰ تمہیں دکھاتا تھا ان کو، یا اللہ تعالیٰ تمہیں دکھاتا تھا وہ لوگ، جس طرح سے چاہیں ادا کر لیں، مطلب یہ ہے کہ تمہیں وہ لوگ تھوڑے نظر آ رہے تھے، اللہ تعالیٰ تمہیں وہ لوگ کم دکھاتا تھا، یُرِیْكُمُوْهُمْ: دکھاتا تھا اللہ تعالیٰ تمہیں وہ لوگ فِیْۤ اَعْیُنِكُمْ: تمہاری آنکھوں میں قَلِیْلًا: تھوڑے سے۔ کب؟ اِذِ الْتَقَیْتُمْ: جس وقت تم آپس میں ایک دوسرے کے مقابل ہوئے تھے، وَیُقَلِّلُكُمْ فِیْۤ اَعْیُنِهِمْ: اور تمہیں کم کر کے دکھاتا تھا اللہ تعالیٰ ان کی آنکھوں میں، تمہیں قلیل قرار دیتا تھا اللہ تعالیٰ ان کی آنکھوں میں، تمہیں قلیل بناتا تھا اللہ تعالیٰ ان کی آنکھوں میں، یعنی ان کی آنکھوں میں تم تھوڑے نظر آ رہے تھے، لِیَقْضِیَ اللّٰہُ اَمْرًا کَانَ مَفْعُوْلًا: تا کہ پورا کر دے اللہ تعالیٰ اس امر کو جس کا کرنا منظور تھا، جو اللہ کے علم میں مقدر ہو چکا تھا، وَاِلَی اللّٰہِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ: اللہ ہی کی طرف تمام امور لوٹائے جاتے ہیں۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَیْكَ

تفسیر

گزشتہ سے پیوستہ

اس رکوع کی ساری کی ساری آیات غزوۂ بدر ہی سے متعلق ہیں جس کا ذکر پہلے سے آپ کے سامنے چلا آ رہا ہے۔

مشرکینِ مکہ کے لیے ترغیب اور ترہیب کا پہلو

پہلی آیت جو اس رکوع میں پڑھی گئی اس میں اہلِ شرک کے لیے ترغیب بھی ہے اور ترہیب بھی ہے، کہ اللہ تعالیٰ سرورِ کائنات ﷺ سے کہتے ہیں کہ آپ ان کے سامنے اعلان کر دیں، ان کے سامنے ظاہر کر دیں کہ اگر یہ باز آ جائیں تو جو پہلے غلطیاں کر چکے ہیں، جتنے بھی گناہ کر چکے ہیں، اسلام کی مخالفت کر چکے، اللہ کے رسول کو تکلیفیں پہنچا چکے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پہ مظالم کر چکے، کفر و شرک کے اندر اپنی عمریں بسر کیے بیٹھے ہیں، جو کچھ بھی پہلے ہو گیا سب ان کو معاف کر دیا جائے گا، کسی جرم کی بنا پر بھی ان کو کوئی سزا نہیں دی جائے گی اگر یہ باز آ جائیں، یعنی کفر و شرک سے باز آ جائیں اور ایمان لے آئیں، جس طرح سے اعلان ہے کہ ''اَلْاِسْلَامُ یَهْدِمُ مَا کَانَ قَبْلَهٗ''(۱) کہ اسلام لانے کے ساتھ پہلے کے تمام کے تمام جرائم مٹ جاتے ہیں، اسلام لانے سے پہلے جو کچھ بھی ہو جائے اسلام اس کو مٹا دیتا ہے۔ یہاں وہی بات ہے کہ اگر باز آ جائیں گے تو جو کچھ پہلے ہو چکا ہے انہیں معاف کر دیا جائے گا، وَاِنْ یَّعُوْدُوْا: یہ وعید ہے، ترہیب ہے، دھمکی ہے۔ اور اگر یہ باز نہیں آتے، ویسے ہی شرارتیں کرنا چاہتے ہیں جیسے پہلے کرتے رہے ہیں، تو کوئی بات نہیں، پہلے لوگوں کے قصے کہانیاں گزر رہی گئے ہیں تمہارے سامنے، پہلے لوگوں کے واقعات سُن ہی لیے ہیں۔ اس میں بہت زبردست دھمکی ہے کہ اگر یہ باز نہیں آئیں گے، دوبارہ اسی قسم کی حرکتیں کریں گے تو انہوں نے پہلے لوگوں کے قصے نہیں سنے؟ ان کے سامنے پہلے لوگوں کا طریقہ نہیں گزرا؟ کیا مطلب؟ کہ یہ سُن ہی چکے ہیں کہ عاد کے ساتھ کیا ہوا تھا، ثمود کے ساتھ کیا ہوا تھا، قومِ لُوط کے ساتھ کیا ہوا تھا، سرکشی کرنے والوں کو ہم نے کس طرح سے سبق پڑھایا، انہوں نے یہ بات سُن ہی لی ہے، مطلب یہ ہے کہ پھر ان کے ساتھ بھی وہی ہوگا، فَقَدْ مَضَتْ سُنَّتُ الْاَوَّلِیْنَ کے اندر بہت زبردست دھمکی ہے، گویا کہ پچھلی تاریخ کی طرف متوجہ کر کے اُن کو سمجھایا جا رہا ہے کہ اگر ایسی ہی حرکتیں کرو گے جیسے پہلے کرتے رہے ہو تو پہلے لوگوں کا طریقہ گزر ہی چکا ہے، یعنی پھر تم پر بھی وہی دہرایا جائے گا، ویسے ہی پٹو گے جیس طرح سے وہ پٹے۔

''حَتّٰی لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ'' کے دو مطلب

وَقَاتِلُوْهُمْ: اب یہ مسلمانوں کو ایک نصیحت کی جا رہی ہے کہ ان کے ساتھ تمہاری لڑائی جاری رہنی چاہیے، اس حد تک جاری رہنی چاہیے کہ فتنہ باقی نہ رہے، اور دِین سارے کا سارا اللہ کے لیے ہو جائے۔ ''فتنہ باقی نہ رہے'' اس کا کیا مطلب؟ اس کا مطلب دو طرح سے ادا کیا گیا ہے، فتنہ سے مراد فسادِ عقیدہ ہے، یعنی کُفر و شرک باقی نہ رہے۔ تو اس حد تک ان کے ساتھ لڑو کہ کُفر و شرک باقی نہ رہے، اور دِین سارے کا سارا اللہ ہی کے لیے ہو جائے، اسلام ہی اسلام ہو جائے، کُفر و شرک مٹ جائے، اس وقت تک ان کے ساتھ تمہاری لڑائی جاری رہنی چاہیے۔ اگر یہ مفہوم لیا جائے تو پھر اس کو جزیرۃ العرب کے ساتھ خاص کرنا پڑتا ہے، کہ وہاں مسلمانوں کے لیے جائز نہیں تھا کہ کسی کافر اور مشرک کو باقی چھوڑیں، وہاں تو صرف اسلام ہی اسلام چاہیے، حرمین شریفین میں

(۱) مسلم ۱/۷۶، باب کون الاسلام یھدم - مشکوۃ ص ۱۴، کتاب الایمان، فصل اول، عن عمرو بن العاص ؓ - ولفظہ: اَمَا عَلِمْتَ اَنَّ الْاِسْلَامَ یَهْدِمُ مَا کَانَ قَبْلَهٗ.

اوران کے اردگرد کُفر کو برداشت نہیں کیا گیا، اس لیے مشرکینِ عرب کے لیے جزیہ کا کوئی اُصول نہیں تھا، بس اُن کے لیے یا اسلام یا تلوار، یا تیسری صورت یہ تھی کہ علاقہ چھوڑ جائیں، علاقہ صاف ہوجائے اس علاقے کے اندر دوسرا مذہب برداشت نہیں۔ پھر تو روایات کی روشنی میں اس کو جزیرۃ العرب کے ساتھ خاص کیا جائے گا، کیونکہ باقی کُفار کے لیے تو قتال کے انتہا کے لیے ایک اور چیز بھی ہے، کہ اسلام قبول کرلیں تو بھی لڑائی ختم ہوجائے گی، جزیہ دینا قبول کرلیں تو بھی لڑائی ختم ہوجائے گی، جزیہ دینے کا مطلب یہ ہے کہ ماتحتی قبول کرلیں، اُن کی قوت مدمقابل نہ رہے، یوں کہیں کہ ہم تمہارے ماتحت ہیں۔ لیکن عرب کے مشرکوں کے متعلق جزیہ کا اُصول نہیں تھا، وہ تو یا اسلام قبول کریں، اور یا پھر سورۂ براءت کی اِبتدا میں آئے گا کہ علاقہ چھوڑ جائیں، یہاں سے نکل جائیں، اور یا پھر لڑائی۔ تو اگر فتنہ سے فسادِ عقیدہ مراد لیا جائے یعنی کُفر و شرک، اور لڑائی اس وقت تک جاری رکھنے کا حکم ہو جب تک کہ کُفر و شرک ختم نہیں ہوجاتا، تو پھر اس کو وہاں کے کُفار کے ساتھ خاص کریں گے۔ ''دِین سارے کا سارا اللہ ہی کے لیے ہوجائے'' یعنی اسلام ہی اسلام ہوجائے، کُفر و شرک باقی نہ رہے، اُس وقت تک اِن کے ساتھ لڑائی جاری رکھو۔ یہ تفسیر بھی کی گئی ہے اور یہ اپنی جگہ صحیح ہے۔

اور فتنہ کی ایک تفسیر حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت سے معلوم ہوتی ہے، بخاری شریف میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کا ایک واقعہ آیا ہے، کہ جن دنوں میں حجاج بن یوسف اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے درمیان لڑائی ہورہی تھی، اور اس علاقے کے اندر فساد ہی فساد تھا تو حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ ان صحابہؓ میں سے ہیں، کہ جو ان اختلافات میں بالکل یکسو ہوگئے تھے، اور انہوں نے کسی جماعت کا ساتھ نہیں دیا، ایسے بہت سارے صحابہؓ تھے، جب حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ میں اختلاف ہوا تو اُس وقت بھی وہ علیحدہ ہوگئے تھے، کسی جماعت میں شامل نہیں ہوئے، حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ انہی میں سے ہیں، حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ انہی میں سے ہیں، حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ بھی انہی میں سے ہیں، اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بھی انہی میں سے ہیں، کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا جب بھی آپس میں اختلاف ہوا، سیاسی سطح پر آپس میں ٹکراؤ ہوا، تو یہ حضرات ان اختلافات سے علیحدہ ہوگئے، بالکل کسی طرف شریک نہیں ہوئے..... تو حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے پاس انہی دنوں میں جب کہ بنواُمیہ کی حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کے ساتھ لڑائی جاری تھی، تو کوئی شخص آیا، اور آکے کہنے لگا اے عبداللہ! تُو دیکھ ہی رہا ہے کہ دُنیا کے اندر کس طرح سے فتنہ و فساد مچا ہوا ہے، اور تُو عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا لڑکا ہے، آپ ان معاملات کو سلجھانے کے لیے آگے کیوں نہیں آتے؟ تو حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے جواب دیا کہ بھائی! مسلمان کا خون اللہ نے حرام ٹھہرایا ہے، ہم اس میں مبتلا ہونے کے لیے تیار نہیں ہیں، یعنی دونوں طرف سے مسلمان ہیں، اور میں اس خونریزی میں نہیں آتا، اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کا خون حرام ٹھہرایا ہے۔ تو کہنے والا کہتا ہے کہ قرآنِ کریم میں یہ نہیں آتا؟ قَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ۔ تو حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کہنے لگے کہ اس آیت میں تم کہاں پھنسے پھر رہے ہو؟ اس کا مطلب تو یہ ہے کہ ایک وقت ایسا تھا کہ اہلِ اسلام کمزور تھے، اور جو شخص اسلام قبول کرلیتا تھا وہ کُفار کے مظالم کا نشانہ بن جاتا تھا، اور لوگ اُس کو مجبور کرتے تھے کہ اس دِین کو چھوڑ، اور کُفر کی طرف آ، تو اللہ تعالیٰ کا حکم تھا کہ تم ان کُفار

کے ساتھ اتنا لڑو کہ فتنہ ختم ہوجائے، کہ ان میں یہ جرأت نہ رہے کہ کسی مسلمان کو مجبور کرسکیں کہ تم کُفر اختیار کرو، ان کی طاقت توڑ دو، ان کے اندر یہ جرأت نہ رہے کہ یہ کسی مسلمان کو اسلام قبول کرنے پر دُکھ پہنچاسکیں۔ (ابن عمر رضی اللہ عنہما) کہتے ہیں کہ ہم نے اتنی لڑائی ان کے ساتھ کی کہ وہ فتنہ ختم ہوگیا، اب جو شخص چاہے جس طرح سے چاہے ایمان لائے، عقیدہ اختیار کرے، کوئی اُس کو کُفر کی طرف لے جانے کے لئے مجبور نہیں کرتا، ہم ان کے ساتھ اتنا لڑے کہ فتنہ ختم ہوگیا، اور دین سارے کا سارا اللہ کے لیے ہوگیا، دینِ اسلام کو غلبہ حاصل ہوگیا۔ تم اس لیے لڑ رہے ہو، تاکہ اور فتنے اٹھیں، یہ تمہاری لڑائیاں فتنے مٹانے کے لیے نہیں ہیں، تمہاری یہ لڑائیاں فتنے اُٹھانے کے لیے ہیں۔ اس لیے اس آیت سے استدلال نہ کرو، عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا مقصد یہ تھا۔[1] تو اس سے یہ تفسیر بھی سمجھ میں آگئی کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ان کو اتنا مارو، اتنا مارو کہ ان کی جرأت ختم ہوجائے، یہ کمزور ہوجائیں، پھر ان کو یہ جرأت نہ ہو کہ اگر کوئی شخص اسلام لائے اور ایمان قبول کرے تو یہ اس کو تنگ کریں اور مجبور کریں کہ تو کُفر اختیار کر۔ بلکہ اسلام کو آزاد ہوجانا چاہیے، دین کا غلبہ ہوجانا چاہیے، تاکہ لوگ آزادی کے ساتھ ایمان لائیں، اور آزادی کے ساتھ اس کے مطابق عمل کریں، کُفر وشرک کا زور ٹوٹ جانا چاہیے قَاتِلُوْهُمْ کی غایت یہ ہوگی، کہ ان کے ساتھ اتنا لڑو کہ ان کا زور ختم ہوجائے، اور یہ ظلم وستم اور ایذا کا معاملہ جو مسلمانوں کے ساتھ کرتے تھے ان کی یہ جرأت باقی نہ رہے۔ پھر یہ حکم عام ہے، کیونکہ جب کوئی شخص جزیہ دینا قبول کرلے تو ہمت تو اُس کی پھر بھی ٹوٹ گئی، اب وہ مسلمانوں پر ہاتھ نہیں اٹھا سکتا، جس کی وجہ سے قتال ختم ہوجائے گا۔ جب کُفار آگے ہتھیار ڈال دیں اور جزیہ دینا قبول کرلیں تو ان کا غلبہ ٹوٹ گیا، جب غلبہ ٹوٹ گیا تو اب وہ مسلمانوں کو تکلیف نہیں پہنچاسکیں گے، ایذا نہیں دے سکیں گے، کسی کو کُفر وشرک پر مجبور نہیں کرسکیں گے، جب یہ بات ہوگی تو فتنہ ختم ہوگیا اور دینِ اسلام کو غلبہ حاصل ہوگیا تو قتال منتہی ہوجائے گا، لڑائی ختم ہوجائے گی۔ تو حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے اس واقعے سے اس آیت کی تفسیر اس طرح متعین ہوتی ہے، اور یہ بات بھی اپنی جگہ ٹھیک ہے۔

اللہ تعالیٰ کے مولیٰ ونصیر ہونے پر یقین رکھنے کی تاکید

فَاِنِ انْتَهَوْا: اگر یہ باز آجائیں فَاِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ: اللہ تعالیٰ جو کچھ بھی یہ کرتے ہیں دیکھنے والا ہے، ان کے سب اعمال اللہ کے سامنے ہیں، پھر اللہ انہیں جزا دے گا۔ اور اگر یہ پیٹھ پھیریں، باز نہیں آتے، تو اللہ تعالیٰ اہلِ ایمان کو حوصلہ دلاتا ہے، کہ پھر تمہارے اندر یہ بات نہیں ہونی چاہیے، کہ تم ان کے لشکر سے ڈرو، ان کے سامان سے ڈرو، ان کی کثرت سے ڈرو، بلکہ پھر تم یقین رکھو کہ اللہ تمہارا مولیٰ ہے اور بہت اچھا مولیٰ ہے، اور بہت اچھا مددگار ہے، ایسا مولیٰ اور ایسا رفیق ہے ایسا حمایتی ہے کہ جس وقت بھی اُس کو مدد کے لیے پکارو وہ آئے گا، اور ایسا مددگار ہے کہ جس کی مدد پہ وہ آجائے وہ کبھی شکست نہیں کھا سکتا۔ تم پھر اللہ تعالیٰ کے مولیٰ اور نصیر ہونے پر یقین رکھو، پھر ان کافروں کے ساتھ خوب لڑو اور میدان جہاد کے اندر اترو، پھر ان کی کثرت سے، سامان سے اور ان کے اسلحے سے مرعوب ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔

---

(۱) بخاری ۲/ ۶۴۸، کتاب التفسیر، سورۃ بقرہ۔ ۲/ ۶۷۰ تفسیر سورۃ انفال/ مشکوۃ ۲/ ۵۵۳، باب مناقب قریش کا آخر۔

مالِ غنیمت کی تقسیم کا اُصول

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ: یہ وہ مسئلہ آ گیا جہاں سے سورت کی ابتدا ہوئی تھی، یاد ہوگا، میں نے اشارہ کیا تھا کہ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ، وہاں تو اتنا ہی اجمالاً کہہ دیا گیا کہ جو کچھ بھی یہ اموال حاصل ہوتے ہیں سب اللہ کے لیے ہیں، جس کا حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے استعمال کرنے کے لیے انسان کو مال و دولت دیا ہے، کافروں کے پاس بھی ہے، مسلمانوں کے پاس بھی ہے، لیکن اصل کے اعتبار سے یہ مال و دولت نعمت انہی لوگوں کے لیے ہے جو اللہ کے فرمانبردار ہیں، اب کُفّار باغی ہو گئے، اب کوئی موقع ایسا آ جائے کہ مسلمان ان باغیوں سے وہ مال چھین لیں، اس مال کا پھر مطلب یہ ہوا کہ گویا کہ وہ اموال کافروں سے جو چھینے ہیں تو ان کافروں کی سرکشی کی بنا پر وہ بحقِ سرکار ضبط ہو گئے، وہ سارے کا سارا مال اللہ کے لیے ہو گیا، براہِ راست اللہ کی ملکیت میں چلا گیا، جب براہِ راست اللہ کی ملکیت میں چلا گیا، تو اب اللہ تعالیٰ جس کو چاہے دے۔ تو یہ ''جس کو چاہے دے'' اس کے حصے یہاں متعین کیے ہیں، اس میں سے پانچواں حصہ تو نکال کے علیحدہ کر لیا کرو، وہ تو غانمین کا نہیں ہے، اور باقی چار حصے غانمین پر تقسیم ہو جائیں، یہاں پانچویں حصہ کی تفصیل مذکور ہے چار کی تفصیل مذکور نہیں ہے، لیکن ضمناً سمجھ میں آ رہی ہے کہ مَا غَنِمْتُمْ میں تو نسبت کر دی سارے مال کی طرف، جو کچھ بھی تم غنیمت میں حاصل کرو، تھوڑا ہو یا زیادہ، قلیل ہو یا کثیر، مِّنْ شَيْءٍ نے آ کر تعمیم پیدا کر دی۔ سرورِ کائنات ﷺ نے وضاحت کرتے ہوئے فرمایا ہے، کہ میدانِ جنگ میں اگر کسی کے ہاتھ میں سوئی بھی آ جائے تو وہ بھی جمع کراؤ، تاگا بھی آ جائے تو وہ بھی جمع کراؤ۔[1] کسی کو امام کی اجازت کے بغیر کوئی چیز نہیں رکھنی چاہیے، ورنہ یہ خیانت ہوگی اور غلول ہوگا، اور اس قسم کے غلول کرنے والوں کو سخت سزائیں دی گئی ہیں، مارا بھی گیا ہے، اُن کے سامان کو آگ بھی لگا دی گئی ہے، مختلف واقعات حدیث شریف میں آتے ہیں۔ تو یہ غلول جائز نہیں ہے، کہ مالِ غنیمت کی کوئی چیز اٹھا کے بغیر اجازت کے تم اپنے پاس رکھ لو، خیط اور مخیط تک واپس لوٹانے کا حکم ہے، ''تاگا'' مل جائے وہ بھی لے آؤ، ''سوئی'' مل جائے وہ بھی لے آؤ، سب جمع کرواؤ، بعد میں امام اس میں سے پانچواں حصہ نکال کے باقی غانمین پر تقسیم کر دے گا۔ تو مَا غَنِمْتُمْ میں تو نسبت آ گئی سب کی طرف، اور اس میں سے پانچواں حصہ نکال لیا گیا، تو معلوم ہو گیا چار حصے انہی کے ہیں جو غنیمت حاصل کرنے والے ہیں، وہ ان پر تقسیم ہو جائیں گے۔ شاہ سوار کو کتنا ملے گا؟ پیدل کو کتنا ملے گا؟ جو خدام قسم کے لوگ ہیں ان کو کتنا ملے گا؟ یہ تفصیل ساری کی ساری حدیث شریف میں موجود ہے۔

اَموالِ غنیمت میں سے پانچویں حصے کے مصرف

اس میں سے پانچواں حصہ نکال لو، وہ اللہ کے لیے ہوگا، اللہ کا ذکر بطور برکت کے ہے، وہ تو ہے ہی سارے کا سارا اللہ کے لیے، یا اس میں اس قسم کے کام داخل ہیں جو براہِ راست اللہ کے سمجھے جاتے ہیں، جیسے مسجدوں کی تعمیر ہو گئی، یہ مال اس قسم کے کاموں میں صرف کر دیا جائے۔ اور اللہ کے رسول کے لیے ہے کہ وہ اپنی ضروریات اس میں سے پوری کر سکتا ہے، ذی القربیٰ کے

---

(۱) ابن ماجہ ص ۲۰۴ باب الغلول۔ مشکوٰۃ ۲/۳۵۱ باب قسمۃ الغنائم فصل ثانی کا آخر۔ ولفظہ: اَدُّوا الْخِيَاطَ وَالْمِخْيَطَ۔

لیے ہے کہ وہ اپنے رشتہ داروں میں جن کو مناسب سمجھیں دے سکتے ہیں، اور اسی طرح یتیموں کے لیے ہے، مسکینوں کے لیے ہے، اور مسافروں کے لیے ہے۔ اور اس کے یہ مصارف بیان کر دیے گئے، یہ مالک نہیں ہیں کہ ان کے اوپر بانٹنا ضروری ہے اور پورے حصے کے طور پر بانٹنا ضروری ہے، نہیں، بلکہ یہ مصرف ہیں جیسا کہ زکوٰۃ میں ہے کہ آپ اگر سو روپے زکوٰۃ نکالنا چاہتے ہیں، تو اس کے جو مصارف ذکر کیے گئے ہیں، فقراء، مساکین، یتامیٰ، مسافر وغیرہ، تو سب کو دینا ضروری نہیں، یہ مصرف ہیں، ان میں سے جس کو مناسب سمجھیں جتنا چاہیں دے دیں۔ اسی طرح رسول اللہ ﷺ بھی پانچواں حصہ ان میں سے جس کو چاہیں جتنا چاہیں دے دیں، کیونکہ یہ قسمیں آپس میں متقابل نہیں ہیں، جو ذی القربیٰ ہو وہ یتیم بھی ہو سکتا ہے، مسکین بھی ہو سکتا ہے، ابن سبیل بھی ہو سکتا ہے، اور ایک آدمی یتیم بھی ہو، مسکین بھی ہو اور مسافر بھی ہو ایسا بھی ہو سکتا ہے، یہ قسمیں آپس میں متقابل نہیں ہیں، اس لیے ان سب کو برابر بانٹ کر دینا ضروری نہیں، بلکہ یہ بتا دیا گیا کہ مصرف یہ ہیں، جتنا چاہیں جس وقت چاہیں جس کو چاہیں آپ مناسب سمجھ کر دے سکتے ہیں۔ تو وہ پانچواں حصہ بیت المال میں جمع ہو جاتا تھا، اور رسول اللہ ﷺ اپنی صوابدید کے مطابق اسی طرح سے اس کو خرچ کرتے رہتے تھے۔

''اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ'' کا مفہوم و مطلب

اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ: ان الفاظ کا مطلب یہ ہے، کہ جاہلیت کے زمانے میں تو جو مال لوٹ لیتا تھا سارے کا سارا اسی کا ہوتا تھا، یا زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا کہ اُس کو جمع کر لیتے، اور چوتھا حصہ سردار لے لیتا اور باقی جس طرح سے مناسب سمجھتا وہ بانٹتا تھا، لیکن اسلام میں یہ احکام دے دیے گئے کہ جتنا اکٹھا کرو وہ تمہارا نہیں، اللہ کا ہے، اور اللہ کے حکم کے تحت پانچواں حصہ علیحدہ کر کے باقی تم پہ تقسیم ہوگا۔ تو کسی کے ذہن میں یہ اعتراض نہ آئے کہ لوٹا تو ہم نے، یہ پانچواں حصہ جدا کیوں کر لیا، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ مالِ غنیمت اللہ کی نصرت سے حاصل ہوا ہے، اس میں تمہارا کوئی کمال نہیں ہے، ورنہ جس طرح سے تم تعداد میں تھوڑے تھے، سامان تمہارے پاس کم تھا، مقابلہ میں لشکر زیادہ تھا، اور لڑائی بھی ایسے محل وقوع میں ہوئی کہ اچھی جگہ اُن کے حصے میں آئی، گھٹیا جگہ تمہارے حصے میں آئی، حالات کس قسم کے تھے، اگر تمہارا ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نصرت کے ساتھ فتح ہوئی، اور سرورِ کائنات ﷺ کی برکت سے اس کا ظہور ہوا، تو تمہیں یہ پانچواں حصہ علیحدہ کرنے میں کوئی کسی قسم کی گرانی نہیں ہونی چاہیے، اس لیے آگے اللہ تبارک وتعالیٰ نے میدانِ جنگ کا نقشہ کھینچا ہے کہ یہ واقعہ کن حالات میں پیش آیا تھا۔ ''اگر تم ایمان لاتے ہو اللہ پر اور اس چیز پر جو اتاری ہم نے اپنے بندے پر'' يَوْمَ الْفُرْقَانِ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ: فیصلے کے دن، جس دن کہ دونوں جماعتیں آپس میں ٹکرائی تھیں۔ اس سے اشارہ وہی بدر کے میدان کی طرف ہے۔ بدر کے واقعے کو يَوْمَ الْفُرْقَانِ کہا، اس کی وجہ ابتدا میں ذکر کی تھی، کہ گویا کہ یہ فیصلہ کن جنگ تھی، جس سے حق اور باطل بہت نمایاں ہو گیا، اور مشرکین نے اپنی دُعاؤں کے اندر بھی اس کو فیصلہ کن جنگ بنانے کے لیے اللہ تعالیٰ کے سامنے دامن پھیلایا تھا، تو اللہ نے حق اور باطل میں فرق کر کے دکھا دیا، تو يَوْمَ الْفُرْقَانِ کا تعارف کرا دیا بدل کے طور پر يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ کے ساتھ، یعنی جس دن دونوں جماعتیں ٹکرائی تھیں۔ ''جو کچھ ہم نے اتارا اپنے

بندے پر" یعنی مدد ہماری تھی، اور آئی ہمارے بندے کی وساطت سے، یعنی برکت رسول اللہ ﷺ کی تھی، عَلٰی عَبْدِنَا میں خصوصیت کے ساتھ ذکر کر دیا۔ ہم نے جو کچھ اُتارا اپنے بندے پر اور اس کی برکت سے تمہیں فتح حاصل ہوئی۔ مدد اللہ تعالیٰ کی، لیکن اس کا ظہور ہوا سرورِ کائنات ﷺ کی وساطت سے۔ اگر تمہارا یہ ایمان ہے کہ تم اس مدد کی بنا پر جیتے ہو، اس نصرت کی بنا پر جیتے ہو جو اللہ کی طرف سے آئی تھی اپنے بندے کے لئے، تو پھر تمہیں پانچواں حصہ جدا کرنے میں کوئی کسی قسم کی گرانی نہیں ہونی چاہیے۔ "اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔"

میدانِ بدر کا واقعہ، اس کا خاکہ، اللہ تعالیٰ کا طے شدہ فیصلہ

اب آگے وہی میدان میں جو واقعہ پیش آیا اُس کا ایک خاکہ پیش کیا جا رہا ہے۔ "یاد کیجئے جب کہ تم قریب والے کنارے پر تھے" یعنی اس میدان کا جو کنارہ مدینہ منورہ کی طرف قریب ہے تم اُس پر تھے، وَهُمْ بِالْعُدْوَةِ الْقُصْوٰى: اور وہ اس کنارے پر تھے جو مدینہ منورہ سے دوسری جانب ہے، دور کی جانب۔ لیکن اس میں کیا فرق پڑا، کہ کوئی قریبی کنارے پر ہو، کوئی بعیدی کنارے پر ہو۔ اگر اس میدان کو آپ دیکھیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اللہ تعالیٰ یہاں اپنی وہ نصرت ہی بتانا چاہتے ہیں، کہ اگر اس میدان کا نقشہ سامنے ہو، اور جس طرح سے وہ میدان دونوں فوجوں کے حصہ میں آ گیا تھا اس طرح سے سامنے ہو، تو معلوم ہوگا کہ واقعی اللہ کی نصرت سے ہی جنگ جیتی ہے، ورنہ ظاہری اسباب سارے کے سارے ہی مسلمانوں کے خلاف تھے، یہ عُدْوَہ دنیا سارے کا سارا ریتلا علاقہ ہے، ٹیلے ہیں، اور آج بھی اسی طرح سے ٹیلے نظر آتے ہیں، جیسے ریت کے پہاڑ ہوتے ہیں تو مسلمانوں کو ریتلے علاقے کے اندر جگہ ملی تھی، اور وہ میدان بڑا اچھا تھا جس پر آ کر انہوں نے قبضہ کر لیا، جیسے پہلے تفصیل عرض کرتے ہوئے میں نے ذکر کیا تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اس قسم کے مخالف ماحول میں جو جنگی اصولوں کے مطابق بھی موزوں نہیں تھا، تمہیں کس طرح سے فتح دی؟ اگر اس واقعہ کو اپنے ذہن میں رکھو تو تمہیں یقین ہوگا کہ واقعی وہ جنگ تم نے اللہ کی مدد سے جیتی ہے، ورنہ ظاہری تمہارے لیے کچھ نہیں تھے۔ "تم قریب والے کنارے پر تھے یعنی جو کنارہ مدینہ منورہ کی طرف قریب ہے، اور وہ دور والے کنارے پر تھے" وَالرَّكْبُ اَسْفَلَ مِنْكُمْ: اور قافلہ تم سے نیچے کو ہو کے گزر رہا تھا، نیچے سے ہو کے گزرنے کا مطلب یہ ہے کہ ابوسفیان نے وہ معروف راستہ چھوڑ دیا تھا جو بدر میں سے ہو کے گزرتا ہے۔ جب اُسے معلوم ہو گیا تھا کہ مسلمان راستہ روکنے کے لئے آئے ہوئے ہیں تو پھر وہ سمندر کے کنارے کنارے پہاڑوں کے نیچے سے ہو کے گزرا ہے، اور جہاں حضور ﷺ کا لشکر ٹھہرا ہوا تھا اس سے تقریباً تین چار میل کے فاصلے سے پہاڑوں کے نیچے سے قافلے کو لے کے جا رہا تھا۔ "قافلہ تم سے نیچے تھا" وَلَوْ تَوَاعَدْتُّمْ: اگر تم آپس میں ایک دوسرے سے وعدہ کرتے، یعنی اگر ایک دوسرے سے وقت متعین کر کے لڑائی کی کوشش کرتے، جس طرح سے آپس میں طے کر کے ایک اسکیم کے تحت لڑا جاتا ہے، اگر تم آپس میں ایک دوسرے سے وعدہ کرتے لَاخْتَلَفْتُمْ فِي الْمِيْعٰدِ تو تم وعدہ کرنے میں اختلاف کرتے، تو شاید اس طرح سے جنگ نہ ہوتی، جس طرح سے اب ہو گئی، کیونکہ مشرک اگرچہ تعداد میں زیادہ تھے لیکن اُن کو حوصلہ نہ ہوتا مسلمانوں کے مقابلے میں آنے کا، وہ اُن کی ایمانی قوت اور ان کی بے جگری سے ڈرتے، اور تمہاری نظر اُن کے ظاہری

سازوسامان پہ جاتی، تو شاید اس طرح سے ٹکرانے کی نوبت نہ آتی جس طرح سے اللہ تعالیٰ نے تمہیں ٹکرا دیا، ایک دوسرے سے کچھ ڈرتے رہتے، یا آپس میں اختلاف کرتے رہتے، کوئی کہتا کہ لڑنا چاہیے، کوئی کہتا نہیں لڑنا چاہیے۔ اسی طرح مشرکوں کا بھی آپس میں اختلاف ہوسکتا تھا، تمہارا وقت طے کرنے میں آپس میں اختلاف ہوسکتا تھا، جگہ طے کرنے میں اختلاف ہوسکتا تھا، تو شاید اسکی فیصلہ کن جنگ سامنے نہ آتی اگر تم آپس میں ایک دوسرے سے وعدہ کرتے۔ ''لیکن اللہ تعالیٰ نے تمہیں ٹکرا دیا تا کہ فیصلہ کرے اس امر کا جس کا کیا جانا مقدر ہو چکا تھا'' كَانَ مَفْعُوْلًا: جو بات اللہ کے علم میں طے شدہ تھی اُس کا فیصلہ کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اس طرح سے کر دیا۔

میدانِ بدر میں حق و باطل کی معرکہ آرائی کا مقصد

اس میں مقصد کیا تھا؟ لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْۢ بَيِّنَةٍ کہ حق اور باطل اتنا نمایاں ہو جائے، کہ اب اگر کوئی برباد ہوتا ہے تو دلیل کے بعد برباد ہو، یہاں ہلاکت سے معنوی ہلاکت مراد ہے، کہ اب اگر کوئی کُفر اور شرک کو اختیار کرے گا تو کھلے آنکھوں دیکھنے کے بعد کرے گا، اب حق اور باطل میں کوئی اختلاط اور اشتباہ نہیں رہ گیا، حق علیحدہ نمایاں ہو گیا، باطل علیحدہ نمایاں ہو گیا، اب اگر کوئی برباد ہوتا ہے تو دلیل کے بعد برباد ہو، دلیل بالکل نمایاں ہو گئی، اور اگر کوئی زندہ رہتا ہے، تو وہ بھی بینہ کے بعد زندہ ہو، زندہ رہنے سے مراد حق کو قبول کرنا ہے، کیونکہ حق کو قبول کرنا ہی حقیقت کے اعتبار سے حیات ہے، اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ کے تحت جس طرح سے ذکر کیا تھا، کہ جب رسول تمہیں بلائے ایسی بات کی طرف جو تمہیں زندگی دیتی ہے، معلوم ہو گیا کہ حق بات کو قبول کرنا یہی حقیقت کے اعتبار سے زندگی ہے۔ ''جو زندہ رہے وہ بھی بینہ کے بعد ہو، یعنی جو حق قبول کرے وہ بھی کھلی دلیل سامنے آجانے کے بعد کرے، اور جو برباد ہوتا ہے وہ بھی بینہ کے بعد ہو، بے شک اللہ تعالیٰ البتہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔''

نصرتِ خداوندی کی عجیب صورت

اگلی آیات میں بھی اللہ تعالیٰ نے اپنی ایک امداد ہی بتائی ہے کہ دیکھو! کیا صورت پیش آئی۔ اس کا قصہ یوں ہے کہ مشرکین کا لشکر ابھی سامنے نہیں آیا تھا، سرورِ کائنات ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے خواب کے اندر وہ لشکر دکھایا کہ یہ لشکر آرہا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت کے تحت تعداد اُن کی تھوڑی دکھائی، تو رسول اللہ ﷺ نے صبح اٹھ کے مسلمانوں کے سامنے بیان کیا کہ چھوٹا سا لشکر ہے جو مشرکین کی طرف سے آرہا ہے، کوئی بڑا لشکر نہیں ہے، اگر پوری تعداد سامنے آجاتی اور رسول اللہ ﷺ اسی طرح سے اُن کی اس شان و شوکت کو بیان کر دیتے تو آپ جانتے ہیں کہ بعض تو پہلے ہی دل چھوڑے ہوئے تھے کہ لڑنا نہیں چاہیے کیونکہ ہم لڑنے کے لیے نہیں آئے جیسے پیچھے آیا تھا: كَاَنَّمَا يُسَاقُوْنَ اِلَى الْمَوْتِ وَهُمْ يَنْظُرُوْنَ۔ تو اگر پوری قوت اور شوکت ان کے سامنے آجاتی تو وہ اور زیادہ حوصلے چھوڑ دیتے، پھر مقابلہ کس طرح سے ہوتا؟ لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت کے تحت مشرکین کی تعداد خواب میں اپنے نبی کو تھوڑی دکھائی، اور نبی نے وہ خواب بیان کیا، جس کی بنا پر مسلمانوں پر کوئی رُعب طاری نہ ہوا۔ یہ تو اس میدان کی بات ہوئی۔

ایک اِشکال اور اس کا جواب

لیکن اب اس میں بظاہر ایک اشکال ہے، وہ آپ کے ذہن میں تو شاید نہ آیا ہو، میں عرض کر دوں، کہ انبیاء ﷺ کا خواب بھی وحی ہوتا ہے، اور انبیاء ﷺ کا خواب ہمیشہ سچا ہوتا ہے، اس میں کوئی کسی قسم کی غلطی کا امکان نہیں ہوتا۔ لیکن قرآنِ کریم کے ان الفاظ سے تو معلوم ہوتا ہے کہ حضور ﷺ نے یہ خواب خلافِ واقع دیکھا، کہ تعداد اُن کی زیادہ تھی، اور اللہ تعالیٰ نے تھوڑی دکھادی، تو یہ خواب خلافِ واقع ہوا، تو کیا نبی کو خواب کے اندر کوئی خلافِ واقع چیز نظر آ جاتی ہے؟ اور اگر خواب میں خلافِ واقع چیز نظر آ جاتی ہے تو خواب سچا کیسے ہوا؟ تو اس میں بظاہر ایک سا اِشکال ہے۔ لیکن یہ اِشکال سطحی سا ہے، حقیقت یہ ہے کہ خواب جو بھی ہوتا ہے وہ اپنے ظاہر کے اعتبار سے معتبر نہیں ہوتا، بلکہ اپنی تاویل کے تحت اُس کا اعتبار ہوتا ہے جو اس کی تعبیر دی جائے، خواب حقیقت کے اعتبار سے اپنی تعبیر کے تابع ہوتا ہے، ظاہر بسا اوقات اس کا کیسا ہوتا ہے لیکن جو تعبیر ہوگی وہ ہوتی ہے حقیقی۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے مشرکین کا لشکر سرورِ کائنات ﷺ کو دکھایا، لیکن لشکر کی دو حیثیتیں ہوتی ہیں، ایک ہے اُس کا ظاہری وجود، اور ایک ہے اُس کی باطنی کیفیت، تو ظاہری طور پر اگرچہ وہ زیادہ تھے، لیکن اپنے شرک اور ضعفِ عقیدہ کی بناء پر وہ ایسے تھے گویا کہ تھوڑے سے ہیں۔ جیسے ایک ہزار آدمی آپ کے مقابلے میں آ گیا، لیکن وہ ثابت ایسے ہوا جیسے سو بھی نہیں تھے اپنی کمزوری کی بنا پر۔ تو اُن کی معنوی حیثیت نمایاں کی، کہ ظاہر کو دیکھنے کی ضرورت نہیں، معنوی حیثیت ان کی ایسے ہے گویا کہ اتنے سے آدمی ہیں، تعبیر کے طور یہ بات سامنے آئی۔ جیسے جب دونوں فوجیں آپس میں بالمقابل ہوئیں، اگلی آیت میں جس طرح سے آ رہا ہے، جب فوجیں بالمقابل ہوئیں تو مسلمان اپنی کھلی آنکھوں دیکھ رہے تھے کہ یہ تھوڑے سے ہیں، ان کے سامنے کھلی آنکھوں تعداد ایسے آ رہی تھی جیسے تھوڑے سے ہیں، اور کافر بھی ان کو تھوڑے سے سمجھتے تھے۔

میدانِ بدر میں اہلِ باطل کی نظر ظاہری تعداد پر...... اہلِ حق کی نظر باطنی تعداد پر

اب دونوں میں دو باتیں آ گئیں، کافران کو تھوڑے سمجھتے تھے تو اُن کے سامنے تو مسلمانوں کا ظاہر آیا، باطن نہیں آیا، ورنہ ایک ایک آدمی ان کو طوفان نظر آتا، کافروں نے صرف ظاہری کیفیت کو دیکھا کہ گنتی کے آدمی ہیں، لیکن یہ نہیں پتا کہ ایک ایک آدمی کے اندر ہزار ہزار آدمی کی قوت چھپی ہوئی ہے، اور یہ ایک ایک آدمی ہزار ہزار آدمی پر بھاری ہوگا، اگر مسلمانوں کی یہ باطنی کیفیت اُن کے سامنے آ جاتی تو وہ تو پہلے ہی میدان چھوڑ جاتے، پھر لڑائی کیسے ہوتی؟ اس لیے اُن کے سامنے تو صرف ظاہر آیا کہ یہ تعداد تھوڑی ہے، زیادہ نہیں ہے، اور مسلمانوں کے سامنے اُن کی ظاہری تعداد نہیں آئی، بلکہ باطنی تعداد اُن کے سامنے پیش کی گئی، کہ ان کو یوں سمجھو کہ چاہے ظاہری طور پر کتنے ہی کیوں نہ ہوں، تمہارے مقابلے میں ایسے ہیں جیسے تین سو کے مقابلہ میں سو، اور تمہیں ایسے ہی مشقت ہوگی جیسے تین سو آدمی سو کے مقابلے میں ہو، یہ باطنی کیفیت بتادی گئی۔ تو ایسے ہوتا ہے کہ انسان کی آنکھیں دیکھتی ہیں، لیکن ان کا دیکھنا اکثر وبیشتر دل کے جذبات کے تابع ہوتا ہے۔ جیسے دل کے جذبات ہوتے ہیں آنکھ ویسا ہی دیکھتی ہے، ایک

آدمی کو آپ محبت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں تو وہ آپ کو خوبصورت نظر آتا ہے، جب وہ باتیں کرتا ہے تو آپ کہتے ہیں ماشاء اللہ! منہ سے پھول گر رہے ہیں، عقیدت اور محبت کے ساتھ جس وقت آپ دیکھتے ہیں، اور کل کو اسی آدمی سے آپ کو نفرت ہو جاتی ہے، آپ کا دل پھر جاتا ہے بدل جاتا ہے، تو وہی آدمی آپ کو بگڑی ہوئی شکل میں نظر آئے گا، اور اُس کی شکل ایسی ہوگی کہ جیسے آپ کو گھن آتی ہے، اور جب باتیں کرے گا تو پھول تو کیا جھڑنے ہیں آپ کہیں گے بھونکتا ہے، بکواس کرتا ہے۔ اب آدمی وہی ہے، آنکھیں وہی ہیں، چہرہ اس کا وہی ہے، ہونٹ اس کے وہی ہیں جو گفتگو کرتے ہوئے حرکت کرتے ہیں، لیکن ایک وقت میں آپ کو وہاں سے پھول جھڑتے ہوئے نظر آتے ہیں، اور ایک وقت میں آپ کو ایسے لگتا ہے جیسے منہ بگڑا ہوا ہے اور بکواس کر رہا ہے۔ تو باہر میں تو کوئی فرق نہیں آیا، یہ فرق اندر سے پڑا ہے۔ اس لیے جب کسی آدمی کے اندر حوصلہ ہوتا ہے، ہمت ہوتی ہے، اپنے مقصد کو حاصل کرنے کا اس کو جنون ہوتا ہے، اور اپنے مقصد کے لیے مرنا مٹنا جانتا ہے، تو اُس کے سامنے ہمالیہ پہاڑ بھی ہو تو اسے ایسے لگے گا جیسے ریت کا تودا ہے، کہ یہ تو ریت کا ڈھیر ہے، ہم اس کو ایسے عبور کر جائیں گے جس طرح سے ریت کا ڈھیر ہوتا ہے۔ اور اگر کوئی شخص ہمت چھوڑ دے اور اُس کا دل اندر سے بیٹھ جائے تو سامنے بکری بھی کھڑی ہو تو اُس سے ایسے ڈرے گا جیسے شیر سے ڈرتا ہے، اور اگر ہمت اور بہادری ہو تو شیر کو سمجھے گا کہ یہ گیدڑ ہے۔ تو ظاہر کے حالات ہمیشہ دل کے جذبات کے تحت دیکھے اور سمجھے جاتے ہیں، تو مسلمانوں کے قلوب میں جو حوصلہ اور عشقِ الٰہی تھا، وہ اپنے مقصد کے لیے مرنا مٹنا جانتے تھے، شہادت کا جنون اُن کو چڑھ گیا تھا، تو ان کے سامنے ہزار کا لشکر ایسے تھا جیسے بھیڑ بکریاں ہیں، سو پچاس ہوں گی، اور کیا ہے۔ اور وہ چونکہ اس طرح سے نہیں تھے تو اُن کے سامنے صرف ظاہری کیفیت آئی، باطن اُن کے سامنے نمایاں نہیں ہوا، اس حکمت کے تحت اللہ تعالیٰ نے آپس میں بھڑا دیا، اس لیے نہ تو مسلمانوں کا دیکھنا خلافِ واقع تھا، نہ مشرکوں کا دیکھنا خلافِ واقع تھا، اور نہ سرورِ کائنات ﷺ کا خواب میں دیکھنا خلافِ واقع تھا، کسی کے سامنے ظاہر آیا کسی کے سامنے باطن آیا، اور ظاہر و باطن دونوں حیثیتیں تو ہوتی ہی ہیں، اور خواب ہمیشہ اپنی تعبیر کے تابع ہوتا ہے، نبی کے خواب میں جو تعبیر سامنے آجائے وہاں غلطی نہیں ہوسکتی، ظاہری طور پر خواب کیسا ہی کیوں نہ دیکھا ہو لیکن تعبیر وہی واقع ہوگی جو نبی کے خواب کی آئے گی، تو اس لیے ہم اس خواب کو یہ نہیں کہہ سکتے کہ غلط دیکھا، غلط نہیں دیکھا، صحیح دیکھا ہے، اس کا مقصد یہ تھا کہ یہ تمہارے سامنے ایسے ہوں گے جیسے مٹھی بھر ہیں، چاہے ظاہری تعداد ان کی کتنی ہی زیادہ کیوں نہ ہو؟

اللہ تعالیٰ کی نصرت کی ایک قسم

یہاں یہ واقعہ جو ذکر کیا جا رہا ہے تو یہ بھی چونکہ اللہ تعالیٰ کی نصرت ہی کی ایک قسم ہے، اس لیے اس کو یہاں ذکر کر رہے ہیں۔ ''یاد کیجئے! جبکہ اللہ تعالیٰ آپ کو دکھاتا تھا وہ لوگ آپ کی نیند میں تھوڑے سے، اگر آپ کو دکھا دیتا وہ لوگ زیادہ'' لَّفَشِلْتُمْ: دیکھو! دیکھنا آپ ﷺ نے تھا، اور فشل کی نسبت مسلمانوں کی طرف کی ہے، کہ مسلمان حوصلہ چھوڑ دیتے، آپ ﷺ نے تو حوصلہ نہیں چھوڑنا تھا، لیکن آپ ﷺ نے خواب دیکھ کے لوگوں کے سامنے بیان جو کرنا تھا، تو لوگوں کی ہمت چھوٹ جاتی۔ ''اگر دکھا دیتا

آپ کو وہ لوگ زیادہ تو تم لوگ ہمت چھوڑ دیتے، اور اس جہاد میں اور لڑائی کے معاملے میں آپس میں جھگڑا کرتے، لیکن اللہ تعالیٰ نے بچالیا، بے شک اللہ تعالیٰ جاننے والا ہے ان باتوں کو جو کہ سینے میں ہیں۔ اور یاد کیجئے جب تمہیں دکھاتا تھا اللہ تعالیٰ وہ لوگ جب تم ٹکرائے تمہاری آنکھوں میں تھوڑے سے، تم دیکھ رہے تھے تو تمہیں وہ قلیل نظر آتے تھے، اور تمہیں قلیل قرار دیتا تھا اُن کی آنکھوں میں، تاکہ فیصلہ کردے اللہ تعالیٰ اس امر کا جو کیا جانا تھا، وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ: تمام اُمور اللہ ہی کی طرف لوٹائے جاتے ہیں، ہر امر اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے، فتح ہو، شکست ہو، کسی کی ہلاکت ہو، کسی کی زندگی ہو، سب اُمور اللہ کی طرف لوٹائے جاتے ہیں، تو اللہ تعالیٰ نے اس میدان کے اندر حق کو فتح دی اور باطل کو شکست دے دی۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

يٰٓاَيُّهَا	الَّذِيْنَ	اٰمَنُوْٓا	اِذَا	لَقِيْتُمْ	فِئَةً فَاثْبُتُوْا
اے ایمان والو! جس وقت مڈبھیڑ ہوجائے تمہاری کسی جماعت سے تو ثابت قدم رہا کرو					
وَاذْكُرُوا	اللّٰهَ	كَثِيْرًا	لَّعَلَّكُمْ	تُفْلِحُوْنَ ۝٤٥	وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ
اور اللہ کو بہت یاد کیا کرو تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ ۝٤٥ اور اِطاعت کرو اللہ کی					
وَرَسُوْلَهٗ	وَلَا	تَنَازَعُوْا	فَتَفْشَلُوْا	وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ	وَاصْبِرُوْا
اور اُس کے رسول کی اور آپس میں جھگڑا نہ کیا کرو، پھر تم ہمت ہار جاؤ گے اور تمہاری ہوا اُکھڑ جائے گی اور صبر کرو					
اِنَّ	اللّٰهَ	مَعَ	الصّٰبِرِيْنَ ۝٤٦	وَلَا تَكُوْنُوْا	كَالَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ
بے شک اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے ۝٤٦ اور نہ ہوجاؤ ان لوگوں کی طرح جو نکلے					
دِيَارِهِمْ	بَطَرًا	وَّرِئَآءَ	النَّاسِ	وَيَصُدُّوْنَ	عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ
اپنے گھروں سے اکڑتے ہوئے اور لوگوں کو دِکھانے کے لیے، اور وہ روکتے ہیں اللہ کے راستے سے،					
وَاللّٰهُ	بِمَا	يَعْمَلُوْنَ	مُحِيْطٌ ۝٤٧	وَاِذْ زَيَّنَ	لَهُمُ الشَّيْطٰنُ
اللہ اِحاطہ کرنے والے ہیں ان کے عملوں کا ۝٤٧ قابلِ ذِکر ہے وہ وقت جبکہ مزین کیا ان کے لئے شیطان نے					

اَعْمَالَهُمْ وَقَالَ لَا غَالِبَ لَكُمُ الْيَوْمَ مِنَ النَّاسِ وَاِنِّيْ
اُن کی کارروائیوں کو اور کہا شیطان نے، لوگوں میں سے کوئی شخص آج کے دِن تم پر غالب آنے والا نہیں، اور میں تمہارا
جَارٌ لَّكُمْ ۚ فَلَمَّا تَرَآءَتِ الْفِئَتٰنِ نَكَصَ عَلٰى عَقِبَيْهِ وَقَالَ
حمایتی ہوں، جب دونوں جماعتیں رُوبرو ہوگئیں تو وہ شیطان واپس لوٹا اپنی ایڑیوں پر اور اس نے کہا
اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّنْكُمْ اِنِّيْٓ اَرٰى مَا لَا تَرَوْنَ اِنِّيْٓ اَخَافُ اللّٰهَ ؕ
میں تم سے لاتعلق ہوں، بےشک میں دیکھتا ہوں وہ چیز جو تم نہیں دیکھتے، میں اللہ سے ڈرتا ہوں،
وَاللّٰهُ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۴۸﴾ اِذْ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ
اللہ تعالیٰ سخت سزا والے ہیں﴿۴۸﴾ جب کہا منافقوں نے اور اُن لوگوں نے
فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ غَرَّ هٰٓؤُلَآءِ دِيْنُهُمْ ؕ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ
جن کے دلوں میں بیماری ہے، دھوکے میں ڈال دیا ان لوگوں کو ان کے دِین نے، اور جو کوئی شخص اللہ پہ بھروسہ کرتا ہے
فَاِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۴۹﴾
پس بےشک اللہ تعالیٰ زبردست ہے حکمت والا ہے﴿۴۹﴾

خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا: اے ایمان والو! اِذَا لَقِيْتُمْ فِئَةً: فِئَة: جماعت۔ لَقِيَ يَلْقٰى: ملنا، اور یہاں ملاقات بطور مقابلے کے اور ٹکراؤ کے ہے، اس لئے موقع محل کے مطابق اس کا ترجمہ یہ ہوگا ''جس وقت تمہاری کسی جماعت سے ٹکر ہوجائے'' اِذَا لَقِيْتُمْ فِئَةً: جس وقت مڈبھیڑ ہوجائے تمہاری کسی جماعت سے، فَاثْبُتُوْا: تو ثابت قدم رہا کرو، وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا: اور اللہ تعالیٰ کو بہت یاد کیا کرو، لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ: تاکہ تم کامیاب ہوجاؤ۔ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ: اور اطاعت کرو اللہ کی اور اس کے رسول کی، وَلَا تَنَازَعُوْا: آپس تنازع نہ کیا کرو، جھگڑا نہ کیا کرو، فَتَفْشَلُوْا: پھر تم ہمت ہار جاؤ گے، وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ: اور تمہاری ہوا چلی جائے گی، ہوا اُکھڑ جائے گی، وَاصْبِرُوْا: اور صبر کرو، اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ: بیشک اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے، وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بَطَرًا: اور نہ ہوجاؤ ان لوگوں کی طرح جو نکلے اپنے گھروں سے اکڑتے ہوئے۔ بطر اکڑنے کو کہتے ہیں۔ وَرِئَآءَ النَّاسِ: اور لوگوں کو دکھانے کے لئے، نمائش کرتے ہوئے، وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ: اور وہ روکتے ہیں اللہ کے راستے سے، وَاللّٰهُ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ: اللہ تعالیٰ گھیر اڈالنے والے ہیں ان کاموں کا جو وہ کرتے ہیں۔ وَاللّٰهُ مُحِيْطٌ اللہ احاطہ کرنے والے

ہیں ان کے عملوں کا۔ وَاِذْ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ: قابل ذکر ہے وہ وقت جبکہ مزین کیا ان کے لئے شیطان نے اَعْمَالَهُمْ: ان کے عملوں کو، ان کی کارروائیوں کو، وَقَالَ: اور کہا شیطان نے، لَا غَالِبَ لَكُمُ الْيَوْمَ: آج کے دن کوئی شخص تم پہ غالب آنے والا نہیں، مِنَ النَّاسِ: لوگوں میں سے کوئی شخص آج کے دن تم پر غالب آنے والا نہیں، وَاِنِّيْ جَارٌ لَّكُمْ: اور میں تمہارا جار ہوں۔ جار: پناہ دینے والا، مددگار حمایتی مراد ہے،'' اور میں تمہارا حمایتی ہوں'' فَلَمَّا تَرَآءَتِ الْفِئَتٰنِ: تَرَاءٰى: ایک دوسرے کے سامنے آنا۔ رَاٰى یَرٰی: دیکھنا۔ تَرَاءٰى: ایک دوسرے کو دیکھنا۔ الْفِئَتٰنِ فاعل ہے تَرَآءَتِ کا۔ جب دونوں جماعتیں آمنے سامنے آگئیں، جب دونوں جماعتیں رُوبرو ہوگئیں، نَكَصَ عَلٰى عَقِبَيْهِ: تو وہ شیطان واپس لوٹا اپنی ایڑیوں پر۔ نَكَصَ: لوٹ گیا، عَلٰى عَقِبَيْهِ: اپنی ایڑیوں پر۔ وَقَالَ: اور اس شیطان نے کہا اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّنْكُمْ: میں تم سے لاتعلق ہوں، اِنِّيْٓ اَرٰى مَا لَا تَرَوْنَ: بیشک میں دیکھتا ہوں وہ چیز جو تم نہیں دیکھتے، اِنِّيْٓ اَخَافُ اللّٰهَ: میں اللہ سے ڈرتا ہوں، وَاللّٰهُ شَدِيْدُ الْعِقَابِ: اللہ تعالیٰ سخت سزا والے ہیں۔ اِذْ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ: جب کہا منافقوں نے اور ان لوگوں نے جن کے دلوں میں بیماری ہے، غَرَّ هٰٓؤُلَآءِ دِيْنُهُمْ: دھوکے میں ڈال دیا ان لوگوں کو ان کے دین نے، ہٰؤُلَآءِ کا اشارہ اہلِ ایمان کی طرف ہے۔ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ: اور جو کوئی شخص اللہ پہ بھروسہ کرتا ہے فَاِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ: پس بیشک اللہ تعالیٰ زبردست ہے حکمت والا ہے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

تفسیر

گزشتہ سے پیوستہ

غزوۂ بدر کے حالات آپ کے سامنے شروع سورت سے چلے آرہے ہیں، اور اسی غزوہ کے ضمن میں اللہ تعالیٰ اہلِ ایمان کو مختلف ہدایات دے رہے ہیں، اس رُکوع میں بھی اللہ تعالیٰ نے غزوہ اور جنگ کے بارے میں بعض ہدایات دی ہیں۔

میدانِ جنگ میں نصرت کے متعلق عادت اللہ

جیسا کہ ابتدائی الفاظ میں آگیا کہ جب تمہاری ٹکر کسی جماعت سے ہوجائے تو تم ثابت قدم رہا کرو، جم جایا کرو، میدان کو چھوڑ نہ کرو۔ ثبات ظاہری بھی ہے کہ اس جگہ کو نہ چھوڑا، اور ثبات قلبی بھی ہے کہ دل کو مضبوط رکھا، کیونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی نصرت جو آتی ہے تو وہ ظاہری اسباب کے پردے میں ہی آتی ہے، اگر کوئی شخص یہ چاہے کہ میں تو میدان چھوڑ کے بھاگ جاؤں اور دشمن کے مقابلے میں بے ہمت ہوجاؤں، بزدل ہوجاؤں، اللہ تعالیٰ کی مدد آئے اور خود دشمن کو گرا کے مجھے زبردستی پکڑ کے جا کے اُس کے سینہ پہ چڑھادے، اگرچہ اللہ تعالیٰ کو یہ قدرت ہے لیکن اللہ ایسا کرتا نہیں، ایمان والوں کا کام یہ ہے کہ اپنے طور پر ہمت دکھائیں، ثابت قدمی دکھائیں، جان بازی دکھائیں تو اللہ تعالیٰ کی نصرت بھی آئے گی، دشمن مرعوب ہوجائے گا، اللہ تعالیٰ غلبہ دیں گے۔ وہ اسرائیلیوں کی بات ہے جو آپ کے سامنے گزری، کہ جب اُن کو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جہاد کے لیے بلایا تھا تو وہ کہنے لگے فَاذْهَبْ

اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ (سورۂ مائدہ: ۲۴) وہ ہمت چھوڑ گئے کہ ہم تو یہاں بیٹھے ہیں، ہم تو یہاں سے سرکنے والے نہیں ہیں، تُو جا اور تیرا ارَبّ جائے، جاکے لڑائی لڑلو، اور جس وقت ہمارے دشمن اس شہر سے نکل جائیں گے تو پھر ہم بھی اندر آجائیں گے، لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ باوجود اس بات کے کہ وہاں نبی کی رفاقت تھی، لیکن جب نبی کی ہدایات پر وہ نہیں چلے اور انہوں نے ہمت چھوڑ دی، میدان میں ڈٹے نہیں جمے نہیں، اور اپنی حد امکان تک انہوں نے کوشش نہیں کی، تو اللہ تعالیٰ کی گرفت میں یہ لوگ آگئے، وہ دشمن جو کہ مشرک تھے اُن پر اللہ تعالیٰ کا عذاب ان کے مقابلے میں نہیں آیا، جب تک انہوں نے ظاہری طور پر ہمت نہیں دکھائی۔ تو اسی طرح سے تمہارا پہلا کام یہ ہے کہ تم ڈٹ جاؤ، اپنے قدموں کو مضبوط رکھو اور اپنے دِلوں کو مضبوط رکھو۔

عین حالتِ جنگ میں یادِ خداوندی کا حکم اور اس کا فائدہ

اور دوسرا کام یہ کرو کہ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا: اللہ تعالیٰ کو بہت یاد کرو۔ اب لڑائی ایک ایسا وقت ہوتا ہے کہ جس میں افراتفری ہوتی ہے، بھگدڑ مچی ہوتی ہے، ہر کسی کو اپنی فکر ہوتی ہے، اپنے حالات کی فکر ہوتی ہے، تو ایسے موقع پر کوئی کسی کو کیا یاد کرے، اکثر و بیشتر ایسے موقع پر ہر چیز بھول جاتی ہے، اور وہ بہادر ہی ہوتا ہے جو ایسے موقع پر کسی چیز کو یاد رکھتا ہے، جیسا کہ عربی شاعروں کی کلام آپ پڑھیں گے، حماسہ میں پڑھیں گے کہ ایک شخص اپنی محبت کی شدت اپنی محبوبہ کو یاد دلاتا ہے، اور کہتا ہے کہ (ابتدا ابتدا میں یہ قصیدہ آتا ہے) ''ذَكَرْتُكِ وَالْخَطِّيُّ يَخْطِرُ بَيْنَنَا'' کہ میں نے تجھے ایسے وقت بھی یاد کیا جب کہ خطی نیزے ہمارے درمیان میں حرکت میں تھے، لہرا رہے تھے، یعنی جس وقت اپنی جان کی فکر پڑی ہوئی ہوتی ہے، میں نے اُس وقت بھی تجھے یاد کیا، یہ تعلق کی شدت کی علامت ہے۔ تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ مؤمنوں کو یہ تعلق اللہ تعالیٰ کے ساتھ چاہیے، کہ عین جنگ کے موقع پر بھی اللہ کو نہ بھولیں، اللہ کو کثرت سے یاد کریں، زبان سے بھی یاد کریں کہ اللہ اکبر پکاریں، اللہ کا نام لیں، اور دل میں بھی اللہ کا دھیان رکھیں، اس کا فائدہ کیا ہوگا؟ اللہ کے ذکر میں یہ خاصیت ہے کہ قلب کو قوت حاصل ہوتی ہے، قلب کو اطمینان نصیب ہوتا ہے، اور جس وقت قلب کو قوت حاصل ہوگی اور قلب کو اطمینان نصیب ہوگا تو قدم بھی جمیں گے، اور مشرک اور کافر قوم میں اسی قوت سے محروم ہیں، کہ اُن کے قلوب کے اندر قوت نہیں ہوتی، اس لیے جس وقت مسلمان کسی کافر قوم کے ساتھ بغیر ذکر اللہ کے ٹکرائے، اللہ اُسے یاد نہ ہو، اللہ کے احکام کی پابندی نہ ہو، تو پھر تو ایک انسان ایک انسان سے ٹکرا رہا ہے، جس کے بدن میں قوت زیادہ ہوگی، جس کے پاس اسلحہ اچھا ہوگا، جس کے پاس فوجیں اچھی ہوں گی وہ غلبہ پا جائیں گے، کیونکہ پھر تو مقابلہ سامان کا سامان کے ساتھ ہے، افراد کا افراد کے ساتھ ہے۔ لیکن اگر مسلمان قوم اس باطنی ہتھیار کے ساتھ یعنی اللہ کے ذکر کے ساتھ مسلح ہو، اور کافر قوم جو مقابلے میں ہوتی ہے اس کے پاس یہ ہتھیار ہوتا نہیں، پھر جس میدان کے اندر بھی اللہ کو یاد کرنے والوں کا ٹکراؤ کافروں کے ساتھ ہوا ہے، تو تاریخ شاہد ہے کہ پھر وہاں اللہ کے ذکر کرنے والے ہی دوسروں پر بھاری رہے ہیں، کیونکہ یہ باطنی قوت ایک ایسی ہے جس سے کافر محروم ہیں، اُن کے دل مرعوب ہو جاتے ہیں، اُن کے حوصلے چھوٹ جاتے ہیں، اور اللہ کا نام لینے والوں کے دل مضبوط رہتے ہیں، جس کی بنا پر ان کے قدم بھی جمتے ہیں، تو اللہ تعالیٰ ان کو فتح اور غلبہ دیتا ہے۔ سورۂ بقرۃ میں آپ کے سامنے طالوت کا قصہ ذکر کیا گیا تھا جالوت کے

مقابلے میں، وہاں بھی فئۃ قلیلہ تھی (قلیل جماعت) تھی، لیکن اللہ کو یاد کرنے والے تھے تو فئۃ کثیرہ پہ غالب آ گئے۔ اور اسی طرح سے بدر کے اندر بھی یوں ہی ہوا کہ اللہ کو یاد کرنے والے اور اللہ کے سامنے ہاتھ پھیلانے والے، اللہ پہ بھروسہ کرنے والے، قلیل تعداد اور بے سروسامان ہونے کے باوجود کثیر تعداد پر اور ہر قسم کے کیل کانٹے سے لیس لشکر کے مقابلے میں کامیاب ہو گئے، تو یہ ایک ہتھیار ہے جو ظاہری دشمنوں کے مقابلے میں بھی کام آتا ہے، اور باطنی دشمنوں کے مقابلے میں بھی کام آتا ہے۔

قرآن میں کثرت کی تاکید صرف ذِکر اللہ کے ساتھ خاص کیوں؟

وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا: اللہ کو بہت یاد کرو، بہت یاد کرنا اسی طرح سے ہے، کیونکہ نہ تو اس کا کوئی وقت متعین ہے، نہ اس کا کوئی رُخ متعین ہے، کہ فلاں طرف منہ کر کے یاد کیا جا سکتا ہے، دوسری طرف منہ کر کے نہیں یاد کیا جا سکتا، نہ اس کی کوئی ہیئت اور کیفیت متعین ہے، بے وضو، باوضو، مشرق، مغرب، شمال، جنوب جدھر کو منہ ہو، بیٹھتے اٹھتے لیٹتے، جیسے بھی ہو اللہ کو یاد کیا جا سکتا ہے، اس میں کثرت اس طرح پیدا کی جا سکتی ہے، یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم میں کسی اور عبادت کے متعلق كَثِيْرًا کا لفظ نہیں آیا، کہ نماز بہت پڑھا کرو، روزے بہت رکھا کرو، بلکہ جہاں بھی اس کا ذکر آیا ہے اللہ کے ذکر کے ساتھ آیا ہے، کہ اللہ کا ذکر بہت کرو، یہ بے قید ہے، جس طرح سے بھی کرنا چاہو کر سکتے ہو۔ اور اللہ کے ذکر میں زبان سے سبحان اللہ، الحمدللہ، یہ بھی، اور دل میں تصور بھی، اور اسی طرح سے اللہ کے احکام کا استحضار کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے احکام کی پابندی یہ بھی ذکر میں داخل ہے۔ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ: تاکہ تم فلاح پا جاؤ تو فلاح اگر تمہیں ملے گی ظاہری اور باطنی، دنیوی فلاح کہ فتح پا گئے، آخری فلاح کہ آخرت میں ثواب حاصل ہو گیا، اس کا دارومدار اگر ہے تو اللہ کے ذکر پہ ہے، اللہ تعالیٰ سے غافل ہو کر اگر ظاہری طور پر کامیابی پا بھی لو گے تو بے برکت ہوگی، اور اگر حقیقی کامیابی پانا چاہتے ہو تو اللہ کو کثرت سے یاد کرو۔

میدانِ جہاد میں اِطاعتِ اَمیر کی اہمیت

وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ: اب یہ ذکر کیا جا رہا ہے جہاد کے سلسلہ میں، کہ اللہ اور اللہ کے رسول کا کہنا مانو، کہنا ماننے کے اندر یہ بات بھی ہے، کہ اللہ اور اللہ کا رسول تمہیں جو ہدایات دیتا ہے اُس کی پابندی کرو، عام زندگی میں بھی اور خصوصیت کے ساتھ میدانِ جہاد میں، کیونکہ جس وقت اللہ اور اللہ کے رسول کے اَحکام کی پابندی کرو گے تو تمہارا ظاہری جماعتی نظم قائم رہے گا، جہاں اللہ کا رسول کسی کو کہہ دے کہ تم نے یہاں ٹھہرنا ہے وہیں ٹھہر جاؤ، جہاں اللہ کا رسول کہہ دے کہ تم نے اِدھر جانا ہے تو اُدھر ہی چلے جاؤ، جس کو آج کل کی اصطلاح میں کہتے ہیں کہ جماعتی ڈسپلن (Discipline) بحال رکھو، اپنے حاکم اعلیٰ اپنے قائد اور کمانڈر کی ہدایات پر عمل کرو، جس طرح سے وہ کہتا ہے اسی طرح کرو، میدانِ جنگ کے اندر اس نظم کو بحال رکھنا ضروری ہے، ورنہ قلوب کے اندر اگر انتشار ہو تو بھی ضعف کا باعث ہے، اور اگر ظاہر میں افراتفری ہو اور کوئی نظم و نسق نہ ہو تو ایسے وقت میں بھی دشمن کے مقابلے میں ہمتیں چھوٹ جاتی ہیں۔ ہر شخص اپنی رائے پہ چلنے والا ہو، ہر شخص اپنے مشورہ پر دوسرے کو مجبور کرنے والا ہو تو انتشار ہو جائے گا، نظم و ضبط قائم نہیں رہے گا، جس وقت نظم و ضبط قائم نہیں رہے گا تو پھر تم میدان میں ٹھہر نہیں سکتے، آپس میں اگر تمہارا تنازع ہو گیا،

ہر شخص اپنی اپنی رائے پر چلنے لگ گیا، حاکم اعلیٰ کی اگر اُس نے بات نہ مانی، جیسے اُس وقت اللہ کے رسول موجود تھے تو اللہ کے رسول کی ہدایات پر اگر تم نے عمل نہ کیا تو تمہارے اندر تنازع ہوگا، جھگڑے کی کیفیت پیدا ہوجائے گی، پھر تمہاری ہمتیں چھوٹ جائیں گی، اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی، اور ہوا اکھڑنے کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ دبدبہ ختم ہوجائے گا، وبدبہ تبھی قائم رہا کرتا ہے کہ جب اپنے سردار اور اپنے امیر کے کہنے کے مطابق نظم ونسق کو بحال رکھا جائے، پھر دل بھی مضبوط ہوں، قدم بھی جمے ہوئے ہوں، نظم ونسق بھی قائم ہو، ایسے وقت میں پھر انسان مضبوط بھی رہتا ہے...... اس کی مثال آپ یوں سمجھیے، کہ جس وقت آپس میں اتفاق ہوتا ہے پھر کوئی شخص اپنے آپ کو تنہا نہیں سمجھتا، بلکہ ہر شخص یہ خیال کرتا ہے کہ میرے ساتھ ایک جماعت کی قوت ہے، میں بھی یہ سمجھوں گا کہ میرے ساتھ ایک جماعت کی قوت ہے، تو میری ہمت اکیلے کی نہیں ہوگی بلکہ سب کے برابر ہوگی، اور آپ میں سے بھی ہر شخص یہ سمجھے گا کہ ہم اکیلے نہیں ہیں، بلکہ ایک جماعت ہمارے ساتھ ہے، تو انسان کو بڑا حوصلہ ہوتا ہے۔ اور جس وقت آپس میں اختلاف ہوجائے تو ہر شخص یہ کہتا ہے کہ میرا کسی نے ساتھ تو دینا نہیں، وہ اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتا ہے، اور جس وقت وہ اپنے آپ کو تنہا محسوس کرے گا، اور کہے گا کہ اس کا بھی میرے ساتھ اختلاف ہے، اس کا بھی میرے ساتھ اختلاف ہے، جیسے میں کہتا ہوں یہ نہیں کرتا، جیسے یہ کہتا ہے میں نہیں کرتا، تو انتشار پیدا ہوجانے کی صورت میں ہر شخص کا تصور یہ ہوجایا کرتا ہے کہ میں اکیلا ہوں میرے ساتھ کوئی نہیں، اور جس وقت یہ خیال آگیا کہ میں اکیلا ہوں میرے ساتھ کوئی نہیں، تو آپ جانتے ہیں کہ قوت ختم ہوگئی۔ اور جب آپس میں رائے کا اتحاد اور اتفاق ہوتا ہے، تو ہر شخص اپنے آپ کو ایک جماعت سمجھتا ہے اکیلا نہیں سمجھتا، اس لیے اندر سے حوصلہ مضبوط رہتا ہے، اور ظاہر میں بھی ہمت قائم رہتی ہے۔

اِتحاد واِتفاق میں برکت کی مثالِ حسی سے وضاحت

اگر آپ اس کی حسی مثال سمجھنا چاہیں تو یوں سمجھو کہ جیسے ایک رَسّی ہے جس وقت وہ بٹی ہوئی ہوتی ہے، اور خوب شدّت کے ساتھ آپس میں ملی ہوئی ہوتی ہے تو اس میں کتنی قوت ہے، اور اُس کا بٹ کھول دو، اب چاہے اس کے سارے ریشے اسی طرح سے ہوں گے جس طرح سے پہلے ہیں، ریشوں کی گنتی میں فرق نہیں آیا، لیکن کیا اس کا بٹ کھل جانے کے بعد رَسّی میں قوت وہی ہوتی ہے؟ اس میں کوئی قوت نہیں ہے۔ اب اس کی لڑیاں تو اتنی ہی ہیں جتنی پہلے تھیں، ریشے اور تاگے تو اتنے ہی ہیں جتنے پہلے تھے، لیکن جب آپس میں خوب اچھی طرح سے پھنسے ہوئے تھے، بٹے ہوئے تھے، ایک دوسرے سے جڑے ہوئے تھے، تو اُس کی قوت اِس سے سوگنا زیادہ تھی، اور جب اس کا بٹ کھول دیا گیا، چاہے ریشوں کی گنتی اتنی ہی ہے، اور تاگے اتنے ہی ہیں، لڑیاں اتنی ہی ہیں لیکن اب قوت ختم ہوگئی ہے۔ اب اتحاد واتفاق ایسے ہی ہے جیسے رسی کا بٹ مضبوط ہو، تو ہر ریشہ دوسرے کے لیے قوت کا باعث بنتا ہے، اور آپس میں انتشار، خیالات کا انتشار، آراء کا انتشار، اور اس قسم کا اختلاف جو آپس میں پیدا ہوجایا کرتا ہے، یہ بالکل اسی طرح ہے جیسے رسی کا بٹ کھل گیا، اور رسی کا بٹ کھل جانے کے بعد اگرچہ افراد اتنے ہی ہوتے ہیں، ریشے اس کے اندر اتنے ہی ہیں، لڑیاں اتنی ہی ہیں، لیکن قوت ختم ہوگئی۔ یہ ایک حسی مثال ہے جماعتی اتحاد کے اندر قوت اور جماعتی انتشار کے اندر ضعف

آجانے کی، اس لیے فرمایا کہ اللہ اور اللہ کے رسول کا کہنا مانو۔ اور اسی کے حکم میں ہے جو اس جہاد کا امیر ہو اس کے احکام کی پابندی، اس لیے سرورِ کائنات ﷺ بار بار تاکید فرمایا کرتے تھے "اِسْمَعُوْا وَاَطِيْعُوْا وَاِنِ اسْتُعْمِلَ عَلَيْكُمْ عَبْدٌ حَبَشِيٌّ" اپنے بڑے کی بات سنا کرو اور مانا کرو، اگرچہ تمہارے اوپر امیر ایک عبد حبشی کو بنا دیا جائے تو بھی اس کی بات سنو اور مانو۔ سمع وطاعت کی بہت تاکید فرمایا کرتے تھے کہ جو امیر تم پر بنا دیا جائے اس کی بات کو سنو اور مانو، اگرچہ وہ ظاہری حالت کے اعتبار سے ایک حبشی ہی کیوں نہ ہو، "كَاَنَّ رَاْسَهٗ زَبِيْبَةٌ"(۱) اس کا سر اتنا سا کیوں نہ ہو جتنا منقیٰ کا دانہ ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ظاہری طور پر وہ تمہیں کتنا ہی حقیر سا لگے، لیکن اگر تم پر امیر بنا دیا گیا تو تمہارا فرض ہے کہ اُس کی بات سنو اور اس کا کہنا مانو، کیونکہ اپنے امیر کا کہنا ماننے کے ساتھ ہی جماعتی نظم ونسق بحال رہا کرتا ہے، اور یہ جماعتی نظم ونسق افراد کے اندر قوت کا باعث بنتا ہے، وَلَا تَنَازَعُوْا: آپس میں جھگڑا نہ کرنا فَتَفْشَلُوْا: فشل کمزور ہونے کو اور نامرد ہونے کو کہتے ہیں۔ پھر تم بزدل ہو جاؤ گے، تمہاری ہمت چھوٹ جائے گی، وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ: اور تمہارا دبدبہ چلا جائے گا، تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی، ہوا اکھڑنا یہ دبدبہ چلے جانے سے کنایہ ہوتا ہے۔

"صبر" کی تاکید اور اس موقع محل میں "صبر" کا مفہوم

وَاصْبِرُوْا: یہ سب سے بڑا گر آ گیا کہ صبر کرو۔ "صبر" کا کیا معنی؟ برداشت۔ برداشت کرو، اپنے نفس کو روک کے رکھو۔ اس جگہ اس کا موقع محل یہ ہے کہ کوئی تکلیف آجائے تو اس کو سہہ جاؤ، خاص طور پر اپنے رفقاء کی باتیں برداشت کرو، جھگڑے جو آپس میں ہوا کرتے ہیں تو اس کا کیا منشا ہوتا ہے؟ کہ اپنی مرضی کے خلاف کسی کی بات سُن نہیں سکتے، اور اپنی رائے کے خلاف کسی کی بات مان نہیں سکتے، ہر شخص یہ کوشش کرتا ہے کہ میری مانی جائے اور میری مرضی کے مطابق کام ہو، اور کسی دوسرے کی بات میری مرضی کے خلاف نہ آئے۔ اور یہی صبر ہے جو جماعت کے اندر انسان کو کرنا پڑتا ہے، کہ بسا اوقات اپنی طبیعت کے خلاف بات بھی برداشت کرنی پڑتی ہے، اپنی طبیعت کے خلاف کسی کی رائے بھی ماننی پڑتی ہے، بیسیوں جگہ اپنی طبیعت کے خلاف اپنی رائے چھوڑنی پڑتی ہے، تبھی جا کے آپس میں اتفاق رہ سکتا ہے، ورنہ اگر ہر آدمی یہی کوشش کرے کہ میری مانی جائے اور میں کسی کی نہ مانوں، میں اپنی طبیعت کے خلاف کسی کی بات برداشت نہیں کر سکتا، تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ دُنیا کی کوئی طاقت آپ کو جوڑ کے رکھ لے، بجڑ کے آپ کبھی رہیں گے، جب آپ کی طبیعت میں اتنی برداشت ہو، کہ طبیعت کے خلاف کوئی معاملہ ہو جائے تو اس کو سہہ جاؤ، مزاج کے خلاف کبھی کسی کی رائے سامنے آجائے تو اُس کو مان لو، اور اگر اپنی رائے نہ مانی جائے تو مشتعل نہ ہو جاؤ، کہ چونکہ میری بات نہیں مانی گئی اس لیے میں یہ کام نہیں کرتا، اپنی منوانے کا جذبہ اور دوسرے کی نہ ماننے کا جذبہ فساد کی جڑ یہ ہے۔ اور اگر آپس میں بیٹھ کے مشورہ کر لیا اور مشورہ کرنے کے بعد ایک رائے سامنے آ گئی، چاہے اپنی مرضی کے مطابق ہے، چاہے مرضی کے خلاف ہے، طبیعت چاہتی ہے یا نہیں چاہتی، اپنے آپ کو اس کا پابند کر لو، اگر یہ صبر انسان کی طبیعت کے اندر آ جائے تو اجتماعی زندگی کے اندر اتفاق ہی اتفاق ہو گا، کبھی اختلاف ہو گا ہی نہیں۔ اور ہم آپس میں اسی لیے لڑتے ہیں کہ کسی کی بات طبیعت کے خلاف

---

(۱) بخاری ۲/ ۱۰۵۷، باب السمع والطاعة/ مشکوٰۃ ۲/ ۳۱۹، کتاب الامارۃ، فصل اول۔

ہو جائے تو ہم برداشت نہیں کر سکتے، اور ہماری نہ مانی جائے اور ہماری خواہش پوری نہ ہو تو ہم اس کو سہہ نہیں سکتے، ہر شخص کے دل میں یہ ہے کہ میں ہی غالب رہوں، میری رائے غالب رہے، اور کسی کی بات میں نہ مانوں، ہر کوئی میری مانے، جماعتی نظم کے اندر سب سے زیادہ خطرناک چیز یہ ہے۔ تو وَاصْبِرُوْا کا موقع محل یہاں یہ بھی ہے کہ ہر قسم کے اختلافات کو برداشت کر جاؤ، کوئی رائے تمہارے خلاف آ جائے، کوئی کام تمہاری مرضی کے خلاف آ جاؤ جماعت کے اندر، مثلاً امیر کا حکم تمہاری مرضی کے خلاف آ جاتا ہے، اس کو برداشت کرو، اور اپنے آپ کو ان احکام کا پابند رکھو، تب جا کے اللہ تعالیٰ کی معیت اور اس کی نصرت تمہیں حاصل ہوگی، اجتماعی زندگی کے لیے یہ بہترین اصول ہے۔

میدانِ جنگ میں ظاہری اسباب پر نظر رکھنے سے ممانعت

وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بَطَرًا وَّرِئَآءَ النَّاسِ نہ ہو جاؤ تم ان لوگوں کی طرح جو نکلے اپنے گھروں سے اکڑتے ہوئے اور لوگوں کو دکھلاوا کرتے ہوئے۔ ''بطر'' کا لفظ شکر کے مقابلہ میں آتا ہے، شکر کہتے ہیں قدردانی کو، قدردانی کا حاصل یہ ہے کہ کسی کے احسان کو احسان سمجھو، اور منعم کا حقِ طاعت بجالاؤ۔ شکر کا یہ معنی ہوتا ہے، کسی کے احسان کی قدردانی، احسان کی قدردانی کرو، محسن کا احسان مانو اور اس کی اطاعت بجالاؤ اور اُس کے سامنے تمہارا دل دماغ پستی اختیار کرے، یہ احسان کرنے والے کا حق ہوتا ہے۔ اُس کے سامنے ادب، تواضع، دب جانا، احترام، اُس کے احکام کی اطاعت، یہ اس کے احسان کی قدردانی ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے تمہیں جو نعمتیں دے رکھی ہیں، ان نعمتوں کا احساس کر کے کہ یہ اللہ کی دی ہوئی ہیں اللہ کے شکر گزار رہو، جو شکر گزار بندہ ہوتا ہے وہ ظاہری اسباب پر نظر ڈال کے کبھی اکڑتا نہیں کہ مجھے اتنے اسباب حاصل ہو گئے، اب میرے پاس بہت قوت آ گئی، اب میں یوں کر دوں گا، میں ووں کر دوں گا، تو یہ احساس نہیں رہتا کہ یہ سب کچھ تو اللہ کا دیا ہوا ہے، جب چاہے واپس لے لے، میرے پاس کیا قوت ہے؟ اگر یہ احساس رہے کہ میرے پاس کوئی قوت نہیں، یہ تو اللہ کا دیا ہوا ہے وہ جب چاہے گا واپس لے لے گا، پھر انسان اکڑتا نہیں ہے۔ اور اکڑتا اسی وقت ہی ہے جس وقت اس کو یہ غفلت آ جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احسان کو وہ احسان نہیں سمجھتا، یوں سمجھتا ہے کہ جو کچھ حاصل ہو گیا بس یہ میرے بس کی چیز ہے، میں جس طرح سے چاہوں کر لوں۔ آپ نے ''مشکوۃ، باب الکبر'' میں پڑھا تھا، حضور ﷺ سے کسی نے پوچھا تھا کہ یا رسول اللہ! کیا یہ تکبر ہے کہ کوئی شخص یہ چاہے کہ میرا لباس اچھا ہو، میرا جوتا اچھا ہو؟ آپ ﷺ نے فرمایا نہ! یہ تکبر نہیں، یہ تو جمال ہے، ''اِنَّ اللهَ جَمِيْلٌ يُّحِبُّ الْجَمَالَ'' اللہ تعالیٰ خود جمیل ہے اور جمال کو پسند کرتا ہے۔ تکبر تو یہ ہے: ''بَطَرُ الْحَقِّ وَغَمْطُ النَّاسِ''[1] کہ حق کے سامنے اکڑ جانا، حق کو قبول نہ کرنا۔ تو وہاں بطر کا لفظ آیا ہوا ہے۔ اور غالباً سورۂ قصص میں بھی اس قسم کے الفاظ آتے ہیں كَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍۢ بَطِرَتْ مَعِيْشَتَهَا (سورۂ قصص: ۵۸) ہم نے کتنی ہی بستیاں تباہ کر دیں جو اپنی معیشت پر اترا رہی تھیں، جو کہتے تھے کہ ہمیں بڑے معاشی اسباب حاصل ہیں، ہم بڑے خوش حال ہیں، اس لیے اُن کے اندر اکڑ پیدا ہو گئی تھی، اللہ تعالیٰ نے ان سب کو برباد کر کے رکھ دیا۔ اور یہاں اشارہ مشرکینِ مکہ کی طرف ہے

---

(۱) صحیح مسلم ۱/۶۵، باب تحریم الکبر و بیانہ/مشکوٰۃ ۲/۴۳۳، باب الغضب، فصل اول، عن ابن مسعودؓ۔

کہ مشرکینِ مکہ جس وقت مکہ معظمہ سے نکلے تھے، تو بڑی سج دھج کے ساتھ، باجے بجاتے ہوئے، ڈھول کوٹتے ہوئے نکلے تھے، کیونکہ سمجھتے تھے کہ ہمارا تنا بڑا لشکر ہے، ہم اتنے بڑے مسلح ہیں اور اتنی قوت کے مالک ہیں، اس وقت ہمارا مقابلہ کوئی نہیں کر سکے گا، اور ہم اِن کو نیست و نابود کر کے آئیں گے، اس طرح سے فخر کرتے ہوئے، اکڑتے ہوئے اِتراتے ہوئے جشن مناتے ہوئے مکہ معظمہ سے نکلے تھے، تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تمہاری حالت ایسی نہیں ہونی چاہیے، تم ہمیشہ اپنے اللہ پر نظر رکھا کرو، ظاہری اسباب پر کبھی نظر نہ لگاؤ۔ اگر ظاہری اسباب پر نظر لگاؤ گے تو اللہ تعالیٰ کی نصرت سے محروم ہو جاؤ گے۔ ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جو دِکھلاوا کرتے ہوئے، شو بازی کرتے ہوئے اتراتے ہوئے گھر سے نکلے، ہمیشہ نظر اللہ پہ رکھا کرو۔

نصرتِ خداوندی سے محرومی کا باعث بننے والی دو چیزیں

چنانچہ تاریخ نے ہمارے سامنے اسلامی جنگوں کے جو خاکے محفوظ رکھے ہیں آپ کے سامنے ہیں، ایک تو اُحد میں مسلمانوں نے مشرکینِ مکہ کے ہاتھ تھوڑی سے مار کھائی ہے، اُس کی وجہ قرآنِ کریم نے خود ذکر کی تَنَازَعْتُمْ فِي الْاَمْرِ سورۂ آلِ عمران (آیت: ۱۵۲) میں اس کی تفصیل گزر چکی، کہ تمہارا اس معاملے میں جھگڑا ہو گیا، وَعَصَيْتُمْ اور تم نے رسول اللہ ﷺ کی جو اس وقت امیر جہاد بھی تھے، تم نے ان کی نافرمانی کی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمہاری فتح شکست سے بدل گئی، یہ آپ کے سامنے آلِ عمران میں آ چکا۔ اور وہ نافرمانی کیا ہوئی تھی؟ کہ جہاں جمنے کے لیے کہا تھا وہاں نہیں جمے، جو ایک پہاڑ کے اوپر تیر انداز کھڑے کیے تھے انہوں نے اپنی جگہ چھوڑ دی، یہ نافرمانی ہوگئی، جب یہ نافرمانی ہوگئی، انہی کا آپس میں اختلاف ہوا تھا کہ یہاں رہنا ہے یا نہیں رہنا، کوئی کہتا تھا رہنا چاہیے، کوئی کہتا تھا نہیں رہنا چاہیے، تو اس تنازع کے نتیجے میں وہ مشرک غالب آ گئے، اور تم نے شکست کھائی۔ اور دُوسرا موقع جس میں مسلمانوں نے تھوڑی سے شکست کھائی وہ حنین کا واقعہ ہے وَيَوْمَ حُنَيْنٍ ۙ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْئًا وَّضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُّدْبِرِيْنَ (سورۂ توبہ: ۲۵) وہاں جو شکست کی وجہ ہوئی وہ کیا ہے؟ کہ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ: تمہاری کثرت نے تمہیں تعجب میں ڈال دیا، عُجب میں ڈال دیا، تم کثرت پر اعتماد کر بیٹھے کہ آج ہم بہت زیادہ ہیں، اس لیے ہمیں کوئی شکست نہیں دے سکتا، لیکن یہ جماعت تمہارے کچھ کام نہ آئی اور زمین تم پر کشادہ ہونے کے باوجود تنگ ہوگئی، پھر تم پیٹھ پھیر کے بھاگ گئے۔ یہ دو واقعے اسلامی تاریخ میں رسول اللہ ﷺ کی موجودگی میں پیش آئے، جس سے یہ بات سمجھ میں آ گئی کہ تنازع بھی مسلمان کے لیے شکست کا باعث بنتا ہے، اور ظاہری اسباب پر اعتماد اور اپنی کثرت پر بھروسہ یہ بھی اللہ کی نصرت سے محرومی کا باعث ہو جاتا ہے۔ اس لیے یہاں یہ کہا جا رہا ہے کہ ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو اپنے گھروں سے نکلے اُتراتے ہوئے، لوگوں کو دکھاتے ہوئے، وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ: اور وہ اللہ کے راستہ سے روکتے تھے، ان کی ساری کوشش باطل کے لئے تھی، اور وہ اکڑ رہے تھے، ظاہری اسباب پر اُن کو بھروسہ تھا، شو بازی کر رہے تھے، اور اُن کو یہ یاد نہیں تھا کہ اللہ تعالیٰ نے تو ان کے ارد گرد گھیرا ڈالا ہوا ہے، وہ کتنی ہی اپنی جولانی دکھالیں، کتنی ہی قوت اور جوش کا مظاہرہ کر لیں، اللہ تعالیٰ کی جو ارد گرد قدرت کی باڑ لگی ہوئی ہے اس سے وہ باہر نہیں نکل سکتے، جب اللہ تعالیٰ اُن کے عملوں کا گھیرا ڈالے ہوئے ہے، ان کی کارروائیوں کو گھیرے ہوئے ہے، تو

اللہ کی مرضی کے خلاف اللہ کی نصرت کے بغیر اُن کی کارروائیاں کیسے کامیاب ہوسکتی ہیں؟ پھر دیکھ لیا؟ ان اکڑنے والوں اور اسباب پر بھروسہ کرنے والوں کا کیا حال ہوا، اللہ تعالیٰ ان کے عملوں کا گھیرا ڈالنے والا ہے، احاطہ کرنے والا ہے۔

بدر کے موقع پر مشرکین کے قلوب میں شیطانی اِلقاء

اب آگے اُن کی یہی حالت ذکر کی ہے وَاِذْ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ قابلِ ذکر ہے وہ وقت جبکہ شیطان نے اُن کے لیے مزین کیا اُن کے اعمال کو، یعنی شیطان نے اُن کے قلوب میں وسوسے ڈالے کہ جو کچھ تم کررہے ہو بالکل ٹھیک ہے، یہی تمہاری قومی زندگی کے لیے ضروری ہے، اور یہی تمہارے مال ودولت کی حفاظت کے لیے ضروری ہے، اس کے بغیر چارہ نہیں، جو کچھ تم کررہے ہو بالکل ٹھیک کررہے ہو، اس طرح سے اُن کے قلوب کے اندر شیطان نے یہ وسوسے ڈالے، اور ان وسوسوں میں یہ بھی تھا کہ اُن کو ظاہری کثرت دکھائی، اور ظاہری مال اور سامانِ جنگ وغیرہ دکھا کے کہتا ہے کہ جب تم اتنی تعداد میں ہو، اتنے جنگجو اور بہادر ہو، اتنا سامان تمہارے پاس ہے، تو آج تم پہ کون غالب آسکتا ہے؟ یہ ہوا بھر بھر کے اُن کو آگے لے آیا، اور لا کے تباہی کے گڑھے میں ڈال دیا۔ یہ بھی وسوسے ڈالے کہ کوئی تمہارے اُوپر غالب آنے والا نہیں، اور میں بھی تمہارا مددگار ہوں، میری قوت بھی تمہارے ساتھ ہے، اس طرح سے اُن کو بھڑکاتا رہا، اور میدان میں لے آیا، جس وقت میدان میں دونوں جماعتیں آمنے سامنے ہوگئیں، اور فرشتوں کا نزول اس شیطان نے دیکھا تو پھر وہ بھاگ گیا، اور کہتا ہے کہ میرا تم سے کوئی تعلق نہیں، مجھے تو ڈر لگتا ہے، میں ایسی چیزیں دیکھ رہا ہوں جو تمہیں نظر نہیں آرہیں، یہ ہے ان آیتوں کا مفہوم جو آپ کے سامنے ذکر کی جارہی ہیں۔

بدر کے موقع پر شیطانی وسوسے کی کیا صورت تھی؟

لیکن اس میں قابلِ غور بات یہ ہے کہ یہ جو شیطان نے انہیں کہا تھا، تو کیا یہ کسی انسان کی شکل میں متشکل ہو کے آیا تھا، یا جس طرح اللہ تعالیٰ نے اُس کو قدرت دی ہے کہ محض اپنے تصرف کے ساتھ قلوب میں وسوسہ ڈالتا رہا، اور اس وسوسے کے اندر اس قسم کی باتیں ان کے دل میں جو ڈالی تھیں تو گویا کہ شیطان ان کو بہکا رہا تھا، اور جب آگے سے فرشتے اترے اور اللہ کا رسول سامنے آیا اور اللہ کی نصرت سامنے آئی تو سب شیطانی وسوسے ختم ہوگئے، ایسے معلوم ہوتا تھا جیسے قوت کا نشہ بھی اتر گیا، اور اپنے یار اور مددگار بھی ساتھ چھوڑ گئے، دل میں جو شیطانی وسوسے تھے وہ سارے ختم ہوگئے اور یہ بے ہمت ہوگئے، تو یہ سارے کا سارا قصہ باطنی ہے، اور باطن میں شیطان جو وسوسے ڈالتا ہے تو اس کو قال کے ساتھ تعبیر کیا کہ شیطان نے اُنہیں یہ کہا، سمجھایا، اور بجھایا۔ اور یہ بات بھی عین محاورے کے مطابق ہے کہ دل کے خیالات کو بھی قال کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے، آپ بھی تو کہا کرتے ہیں نا، ''میں نے اپنے دل میں کہا کہ یہ بات اگر یوں ہوجائے تو کیا ہوگا'' تو آپ اپنے دل کے خیالات کو بھی ایسے ہی نقل کیا کرتے ہیں، جیسے کسی کے ساتھ آپ گفتگو کررہے ہیں۔ یا وہ کسی انسانی شکل میں متشکل ہو کے آیا تھا، اور اگر انسانی شکل میں متشکل ہو کر آیا تھا تو کس انسان کی شکل میں آیا تھا؟ یہ بات ان آیات میں قابلِ غور ہے۔ قرآنِ کریم کے ظاہری الفاظ زیادہ تر ادھر ہیں کہ وہ کسی انسانی شکل میں متشکل ہی تھا، کیونکہ شیاطین انسانی بھی ہوتے ہیں، جنی بھی ہوتے ہیں۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اصل شیطان متشکل ہو کر آگیا ہو،

اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ انسانوں میں سے کچھ شیطان ہوں جو اُن کو اس طرح سے بہکا بہکا کے آگے لا رہے تھے، اور وقت پہ آ کے ساتھ چھوڑ گئے، (بات سمجھ رہے ہو؟) یعنی ہو اصل ابلیس اور انسانی شکل میں آ گیا ہو، ایسا بھی ہوسکتا ہے۔ اور ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ کچھ شیاطین من الانس تھے جو ان کو اس طرح سے بہکا بہکا کے، اکسا اکسا کے سامنے لا رہے تھے، اور موقع پر ان کی امداد نہیں کی۔ دونوں صورتیں متوقع ہیں۔ اصل کے اعتبار سے تین ہو گئیں کہ شیطان نے قلب میں وسوسہ ڈالا، یا متشکل ہو کے آیا، اگر متشکل ہو کے آیا تو واقعی وہ جن شیطان تھا جو متشکل ہو کے آیا، یا انسانوں میں سے کچھ انسان ہی ایسے شیطان تھے جنہوں نے شیطان کا کردار ادا کیا اور مشرکوں کو بہکایا پھر وقت پہ امداد نہیں کی، یہ ساری کی ساری صورتیں ممکن ہیں۔

اِنسانی شیاطین کے موقع پر ساتھ چھوڑنے کا ایک نمونہ

قرآنِ کریم میں اٹھائیسویں پارہ میں سورۂ حشر میں منافقین کا کردار اللہ تبارک وتعالیٰ نے ایسا ہی دکھایا ہے، کہ جنہوں نے یہود کو بہکایا تھا مسلمانوں کے مقابلے میں، (عبداللہ بن اُبیّ اور اس کی پارٹی)، اور یہ کہا تھا کہ تم اپنی جگہ ڈٹے رہو، اگر تمہارے ساتھ لڑائی ہو گئی تو ہم تمہارے ساتھ لڑیں گے، اگر تمہیں نکالا گیا تو ہم تمہارے ساتھ مل کے گھروں سے نکل جائیں گے، یہ دیکھو! اس میں یہ الفاظ ہیں اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ نَافَقُوْا يَقُوْلُوْنَ لِاِخْوَانِهِمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَئِنْ اُخْرِجْتُمْ لَنَخْرُجَنَّ مَعَكُمْ: اگر تم نکلے تو ہم تمہارے ساتھ نکلیں گے وَلَا نُطِيْعُ فِيْكُمْ اَحَدًا اَبَدًا: اور تمہارے بارے میں ہم کبھی کسی کا کہنا نہیں مانیں گے، وَاِنْ قُوْتِلْتُمْ لَنَنْصُرَنَّكُمْ: اگر تمہارے ساتھ لڑائی ہوئی تو ہم تمہاری مدد کریں گے وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ: اللہ گواہ ہے کہ یہ سب جھوٹے ہیں۔ جھوٹے کس طرح سے؟ لَئِنْ اُخْرِجُوْا لَا يَخْرُجُوْنَ مَعَهُمْ: اگر یہ یہودی نکال دیے گئے تو یہ منافق اُن کے ساتھ نہیں نکلیں گے، وَلَئِنْ قُوْتِلُوْا: اگر ان سے لڑائی ہو گئی لَا يَنْصُرُوْنَهُمْ: تو یہ ان کی مدد نہیں کریں گے۔ وَلَئِنْ نَّصَرُوْهُمْ اگر بالفرض مدد کریں گے بھی تو کیا ہوگا لَيُوَلُّنَّ الْاَدْبَارَ: پیٹھ پھیر کے بھاگ جائیں گے، ان کے اندر کوئی کسی قسم کی قوت اور طاقت نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کا یہ کردار نقل کیا ہے، اور پھر اُن کی مثال دی ہے كَمَثَلِ الشَّيْطٰنِ اِذْ قَالَ لِلْاِنْسَانِ اكْفُرْ: ان کی مثال تو شیطان جیسی ہے، کہ پہلے انسان کو کہتا ہے کُفر کر لے، فَلَمَّا كَفَرَ جب انسان کُفر کر لیتا ہے قَالَ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّنْكَ پھر شیطان کہتا ہے میرا تجھ سے کوئی تعلق نہیں اِنِّيْٓ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ: میں تو اللہ سے ڈرتا ہوں جو ربّ العالمین ہے۔ پہلے کُفر پہ بہکاتا ہے اور کُفر کروا کے پھر اُس سے لاتعلق ہو جاتا ہے، کہتا ہے کہ میرا کوئی تعلق نہیں، میں تو اللہ سے ڈرتا ہوں جو ربّ العالمین ہے فَكَانَ عَاقِبَتَهُمَآ اَنَّهُمَا فِي النَّارِ: لیکن ان کا انجام یہ ہوتا ہے کہ دونوں ہی جہنم میں جاتے ہیں، یعنی جس نے اکسا کے کُفر کروایا وہ بھی جہنم میں، اور کُفر کرنے والا بھی جہنم میں، دونوں ہی اس کُفر کے ذمہ دار ہوتے ہیں، بہکانے والا بھی اور کُفر کرنے والا بھی۔ یہ مثال ایسے ہی ہے جیسے ایک پہلوان تو اکھاڑے میں اُتر کے کشتی کرتا ہے، ایک جرم کے اکھاڑے میں اتر آیا، اور اُس نے جرم میں اپنا زور دکھانا شروع کر دیا، اور ایک اکھاڑے کے کنارے پہ بیٹھا ہوا اُسے داؤ پیچ بتاتا ہے، تو چاہے اکھاڑے کے اندر نہ آیا ہو، لیکن جرم میں تو برابر کا شریک ہے۔ ایک چور عملاً چوری کرتا ہے، اور ایک چوروں کا اُستاذ ہے جو چوری کے طریقے بتاتا ہے، اور وہ خود پولیس سے ڈرتا ہوا چوری میں ملوث نہیں ہوتا، لیکن جس وقت سراغ لگے

گا اور پکڑے جائیں گے تو چور اور چور کا اُستاذ دونوں ایک ہی درجے کے ہوتے ہیں، بلکہ ہوسکتا ہے کہ اُستاذ کو زیادہ مار پڑے جس نے ڈھنگ پیچ بتائے تھے اور اس چوری پہ اُکسایا تھا۔ تو یہ کردار بعض لوگوں کا ہوتا ہے جو حقیقت کے اعتبار سے ابلیس کا ہے، لیکن کچھ انسان بھی شیطان والا کردار ادا کرتے ہیں، تو اُن کی مثال بھی ایسے ہی دی جاتی ہے۔ تو یہاں دونوں صورتیں ممکن ہیں، اور دونوں کا ذکر ہی تفاسیر میں موجود ہے۔

مشرکین کو اپنے پیچھے دُشمن کا خطرہ، اور شیطان کا سراقہ کی شکل میں آنا

کہتے ہیں کہ مشرکین جس وقت مسلمانوں کے مقابلے میں آئے تھے، تو اُن کے دل میں ایک دھڑکا تھا کہ ہم یہ پوری کی پوری قوت لے کے جارہے ہیں، اور پیچھے مکہ معظمہ خالی ہے، کوئی معتد بہ اس میں قوت موجود نہیں ہے، اور بعض دوسرے قبیلے جیسے بنی بکر یا بنی کنانہ، یہ ہمارے دشمن ہیں، اگر اُن کو پتہ چل گیا کہ ہم اس طرح لشکر لے کے نکل گئے ہیں، تو کہیں ایسا نہ ہو کہ پیچھے وہ ہمارے گھر لوٹ لیں، یا کہیں ایسا نہ ہو کہ پیچھے سے یہ کوئی جنگ چھیڑ دیں، اور ہم مسلمانوں کے اور ان کے محاصرہ میں آجائیں، اور اس موقع پر وہ اپنی دشمنی نکال لیں، یہ اُن کے دل میں دھڑکا تھا۔ کہتے ہیں کہ فوراً ابلیس اُن کے سردار سراقہ بن مالک کی شکل میں آیا، اور ایسے معلوم ہوا جیسے جھنڈا اٹھایا ہوا ہے، اور لشکر ساتھ لیے ہے، مشرکین کی امداد کو پہنچ گیا، اور آکے انہیں کہتا ہے کہ فکر نہ کرو، تم تو اتنے زیادہ ہو، میں تمہارے ساتھ ہوں، کون تم پر غالب آسکتا ہے، اور میں تمہارا مددگار ہوں، تم اس سلسلہ میں کوئی فکر نہ کرو، تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا، یوں آکے تھپکا دیا اور ہوا دے دی۔ اور جس وقت میدان میں آئے تو یہ ساتھ ہی تھا، کہتے ہیں کہ ابوجہل کے بھائی حارث بن ہشام کے ہاتھ میں اُس کا ہاتھ تھا جب میدان میں آئے، اور جب ادھر سے فرشتوں کا نزول دیکھا تو ہاتھ چھڑا کے بھاگنے لگا، جب بھاگنے لگا تو انہوں نے کہا سراقہ! اب کہاں جارہے ہو، کہنے لگا نہ بھئی! یہ میرے بس کی بات نہیں ہے، تم جانو اور تمہارا کام جانے۔ اور وہاں سے پھر یہ بھاگ آیا۔ تو پھر یہ واقعہ ہی ایسا پیش آیا کہ سراقہ بن مالک کی شکل میں شیطان آیا، اور ان کو بہکا کے اس میدان میں بھیج کے فرشتوں کو دیکھ کے دوڑ آیا، یہ کہتا ہوا کہ مجھے ایسی چیزیں نظر آرہی ہیں، جو تمہیں نظر نہیں آرہیں، میں تو ڈرتا ہوں کہ کہیں میری پٹائی یہاں نہ ہوجائے، مجھے کیا ضرورت، تمہارا اپنا قومی جھگڑا ہے، تم جانو اور تمہارا کام جانے، اس طرح کہہ کے وقت پہ دھوکا دے کے واپس آگیا، اور تھا یہ حقیقت میں ابلیس۔ چنانچہ جس وقت یہ مشرکین واپس پہنچے ہیں، تو کسی کی ملاقات سراقہ سے ہوئی تو اُس نے ملامت کی کہ تو اچھا آدمی ہے، وقت پہ آکے ہمیں دھوکا دے دیا۔ تو اُس نے لاعلمی کا اظہار کیا، اور کہنے لگا مجھے تو تمہاری لڑائی کا پتہ ہی تب چلا ہے جب تم واپس مکہ پہنچ گئے، مجھے تو علم ہی نہیں کہ تمہارا مقابلہ کسی کے ساتھ ہوا ہے، پھر جا کے حقیقت نمایاں ہوئی کہ یہ کوئی جن یا شیطان تھا جو اس شکل میں آیا، اور اس طرح مشرکوں کو بہکا کے میدان میں لے گیا۔ ان آیات کی تفسیر میں یہ روایت بھی موجود ہے۔

اور ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ یہود ان سازشوں میں ابتداء سے ہی شریک تھے، اور اس قسم کے لوگ مشرکوں کو بہکاتے تھے، تو اُن بہکانے والوں کی مثال اس طرح سے ذکر کی گئی ہے، کہ یہ لوگ بہکا دیتے ہیں، بہکانے کے بعد خود کنارے پہ رہ جاتے ہیں، اور

دوسرے کی پٹائی کروادیتے ہیں۔ اور زندگی میں انسان کو اس قسم کے واقعات پیش آتے ہیں، آپ بھی اپنی زندگی میں غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ کئی شریر قسم کے لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ خود تو سامنے آتے نہیں، خود تو کسی وجہ سے ڈرتے ہیں، اور سمجھتے ہیں کہ اگر ہم نمایاں ہو گئے تو ہمارا نقصان ہو جائے گا، ہوشیاری یہ برتتے ہیں کہ کسی کو ہوا دے کے کٹھ پتلی کی طرح اس کو آگے میدان میں نچادیں گے، مطلب یہ ہوگا کہ جو ہمارا مقصد فساد اور شرارت ہے وہ بھی پورا ہو جائے، اور ہم کسی کے سامنے نمایاں بھی نہ ہوں، پٹے تو کوئی دوسرا پٹے، ہم کیوں پٹیں، اس قسم کے ہوشیار آدمی ہر موقع پر معاشرے کے اندر موجود ہوتے ہیں، اور سب سے بڑے فتنہ پرداز یہ ہوتے ہیں، یہ شریر نہیں شریروں کے استاذ ہوتے ہیں، یہ فتنہ پرور ٹولہ جو ہوتا ہے سب سے زیادہ معاشرے میں نقصان یہ کرتا ہے۔ ان کی مثال اسی شیطان کی ہے کہ بہکاتا ہے، اکساتا ہے کہ کفر کرو، شرارت پر بہکاتا ہے لیکن جس وقت موقع آتا ہے تو خود روپوش ہو جاتے ہیں، اور دوسرے کو پٹوا کے رکھ دیتے ہیں۔ اس لیے ہمیشہ انسان کو معاشرے میں رہتے ہوئے ہمیشہ اس بات پہ بھی غور کرنا چاہیے کہ میں کہیں کسی کے ہاتھ میں استعمال تو نہیں ہو رہا، اور اگر میں کسی کے ہاتھ میں استعمال ہو رہا ہوں تو جو مجھے سبق پڑھا رہا ہے کہ تو یہ کر، تو کیا یہ خود میدان میں اتر کے کام کرنے کے لیے تیار ہے، اگر وہ خود اس میدان میں اتر کے کام کرنے کے لیے تیار نہیں تو تم اُس کے ہاتھ میں استعمال ہو کے آگے کیوں آتے ہو؟ نقصان تمہارا ہو جائے گا، وہ بیٹھا اکھاڑے کے کنارے پہ تماشا دیکھے گا۔ تو ایسے شیاطین جو ہوا کرتے ہیں تو ان کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا گیا ہے، تو مشرکین کو بہکانے والے بھی کچھ اس قسم کے لوگ ہوں گے جن پر متنبہ کیا گیا ہے، کہ ان شیاطین نے ان کو ہلاکت کے گڑھے میں ڈالا ہے، اور ان کے اکسانے اور بہکانے کے ساتھ یہ میدان میں آ گئے، اور خود وقت پہ وہ ساتھ چھوڑ گئے، اس طرح سے عمومی مثال ہے، جیسے وہاں (سورۂ حشر میں) اللہ تعالیٰ منافقین کی مثال شیطان کے ساتھ دی ہے، تو ایسا کوئی گروہ، چاہے وہ یہود کا ہو یا کسی دوسرے کا ہو، جس نے مشرکین کو بہکایا تھا، اُن کی مثال بھی یہاں اسی طرح سے شیطانی کردار کے ساتھ دی گئی ہے۔ ''مزین کیا ان کے لیے شیطان نے ان کے اعمال کو'' یعنی ان کے کاموں کی تعریف کی کہ تم بڑا اچھا کر رہے ہو، یہی بہتر ہے، یہی تمہاری قومی زندگی کے لیے مفید ہے، اس کے بغیر تمہارا نقصان ہو جائے گا، اس قسم کی باتیں کر کے ان کی کارروائیوں کو مزین کر کے دکھایا، اور یہ کہا کہ کوئی آج تمہارے اوپر غالب آنے والا نہیں لوگوں میں سے، میں تمہارا مددگار ہوں۔ فَلَمَّا تَرَآءَتِ الْفِئَتٰنِ: جب دونوں جماعتیں آپس میں آمنے سامنے ہوئیں، نَكَصَ عَلٰى عَقِبَيْهِ: تو وہ شیطان اپنی ایڑیوں پہ واپس لوٹ گیا، ایڑیوں کے بل واپس لوٹ گیا، اور کہنے لگا اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّنْكُمْ: میں تم سے لاتعلق ہوں، میں تمہاری اس جنگ میں شریک نہیں ہوتا، اِنِّيْٓ اَرٰى مَا لَا تَرَوْنَ: میں ایسی چیزیں دیکھتا ہوں جو تم نہیں دیکھتے، اِنِّيْٓ اَخَافُ اللّٰهَ: میں تو اللہ سے ڈرتا ہوں۔ دیکھو! یہ مثال اس مثال کے کتنی مشابہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے منافقین کی بیان فرمائی ہے۔ وَاللّٰهُ شَدِيْدُ الْعِقَابِ: اللہ تعالیٰ سخت عذاب والا ہے۔

منافقین کی طعنہ زنی...... اللہ تعالیٰ کی طرف سے دفاع

اگلی ایک آیت (اِذْ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ) وہ بھی اسی مضمون سے متعلق ہے، کہ مسلمان جس طرح سے جانبازی دکھاتے تھے،

حوصلہ کے ساتھ کفر سے ٹکرانے کے لیے آتے تھے، تو بسا اوقات منافق یا جن کے دلوں میں تردد کی بیماری تھی وہ کہتے کہ یہ لوگ اپنے دین کی بنا پر دھوکے میں پڑے ہوئے ہیں، یوں سمجھتے ہیں کہ چونکہ ہم حق پہ ہیں اس لیے ہم ہر میدان میں فتح پائیں گے، ان کے دین نے اِن کو دھوکا دے رکھا ہے، حالانکہ ان کے پاس کوئی طاقت اور زور نہیں، دیکھنا! جس وقت ان کی کسی کے ساتھ ٹکر ہوگی تو منہ کی کھا کے آئیں گے۔ اِس وقت تو اپنے دین کے بھروسے پر یہ بہت دھوکے میں پڑے ہوئے ہیں۔ اس قسم کی باتیں اور طعنہ زنی وہ منافق ان مسلمانوں پر کرتے تھے جو حق کے حامی ہونے کی بناء پر حوصلہ کے ساتھ بڑی طاقت سے ٹکرانے کی بھی تمنا رکھتے تھے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ دھوکا نہیں ہے، ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ پر بھروسا ہے، اور جو اللہ تعالیٰ پر بھروسا کیا کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو پھر غالب کرتے ہی ہیں۔ ''یاد کیجئے! جب منافق کہتے تھے اور وہ لوگ جن کے دلوں میں بیماری ہے، کہ ان لوگوں کو ان کے دین نے دھوکے میں ڈال دیا'' مطلب یہ ہے کہ یہ دھوکا نہیں ہے۔ ''دین نے دھوکے میں ڈال دیا'' کا مطلب سمجھ گئے؟ یعنی یہ اپنے دین پہ بھولے پھر رہے ہیں، یہ سمجھتے ہیں کہ چونکہ ہمارا دین حق ہے اس لیے ہم جس سے بھی بھڑ جائیں گے، فتح پا جائیں گے، یہ دھوکے میں ہیں، جس وقت کہیں ٹکر ہوگی تو ان کو پتا چلے گا، ابھی تو اپنے دین کی بنا پر اس طرح سے یہ خیالات جمائے پھرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں یہ دھوکا نہیں ہے، یہ اللہ پہ توکل ہے، اور توکل کی برکت سے فتح ہوتی ہے، وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ: جو شخص بھی اللہ پر بھروسہ کیا کرتا ہے، پس بے شک اللہ تعالیٰ زبردست ہے، حکمت والا ہے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ يَتَوَفَّى الَّذِيْنَ كَفَرُوا ۙ الْمَلٰٓئِكَةُ يَضْرِبُوْنَ
اگر دیکھے تو جب وفات دیتے ہیں فرشتے ان لوگوں کو جنہوں نے کفر کیا، مارتے ہیں وہ فرشتے
وُجُوْهَهُمْ وَاَدْبَارَهُمْ ۚ وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ﴿۵۰﴾
اُن کے چہروں کو اور اُن کی پشتوں کو، اور (انہیں کہتے ہیں) چکھو جلنے والی آگ کا عذاب﴿۵۰﴾
ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ۙ﴿۵۱﴾
یہ عذاب بسبب ان اعمال کے ہے جو تمہارے ہاتھوں نے آگے بھیجے، اور یہ واقعہ ہے کہ اللہ بندوں کے لئے بالکل ظلم کرنے والا نہیں﴿۵۱﴾
كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۗ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ
ان کا حال فرعون کے متعلقین کے حال کی طرح ہے، اور اُن کے حال کی طرح ہے جو ان سے پہلے گزرے ہیں، انہوں نے اللہ کی آیات

اللّٰهِ فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ قَوِیٌّ شَدِیْدُ الْعِقَابِ ﴿۵۲﴾

کا انکار کیا، پس پکڑ لیا اُن کو اللہ تعالیٰ نے اُن کے گناہوں کی وجہ سے، بے شک اللہ تعالیٰ قوت والا ہے سخت سزا دینے والا ہے ﴿۵۲﴾

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ یَكُ مُغَیِّرًا نِّعْمَةً

یہ اس سبب سے ہے کہ بے شک اللہ تعالیٰ نہیں ہے بدلنے والا کسی احسان کو

اَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌ

جو اس نے کیا ہو کسی قوم پر جب تک کہ نہ بدلیں وہ لوگ اُس چیز کو جو اُن کے نفسوں میں ہے، بے شک اللہ تعالیٰ سننے والا

عَلِیْمٌ ﴿۵۳﴾ كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ كَذَّبُوْا

جاننے والا ہے ﴿۵۳﴾ ان کا حال فرعون کے متعلقین کے حال کی طرح ہے اور ان لوگوں کے حال کی طرح ہے جو ان سے پہلے گزرے، انہوں

بِاٰیٰتِ رَبِّهِمْ فَاَهْلَكْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ وَاَغْرَقْنَاۤ اٰلَ فِرْعَوْنَ ۚ

نے اپنے رب کی آیات کو جھٹلایا پھر ہم نے انہیں ہلاک کر دیا ان کے گناہوں کی وجہ سے اور ہم نے فرعون کے لوگوں کو غرق کر دیا،

وَكُلٌّ كَانُوْا ظٰلِمِیْنَ ﴿۵۴﴾ اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الَّذِیْنَ

وہ سارے کے سارے ظلم کرنے والے تھے ﴿۵۴﴾ بیشک زمین پر چلنے والی چیزوں میں سے بدتر اللہ کی نزدیک وہ لوگ ہیں جنہوں نے

كَفَرُوْا فَهُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ ﴿۵۵﴾ اَلَّذِیْنَ عٰهَدْتَّ مِنْهُمْ ثُمَّ یَنْقُضُوْنَ

کفر کیا پھر وہ ایمان نہیں لاتے ﴿۵۵﴾ وہ لوگ جن کے ساتھ آپ نے معاہدہ کیا ہے ان (کافروں) میں سے پھر وہ لوگ اپنے عہد کو

عَهْدَهُمْ فِیْ كُلِّ مَرَّةٍ وَّهُمْ لَا یَتَّقُوْنَ ﴿۵۶﴾ فَاِمَّا تَثْقَفَنَّهُمْ

توڑتے ہیں ہر مرتبہ اور وہ ڈرتے نہیں ﴿۵۶﴾ پھر اگر تو پالے انہیں

فِی الْحَرْبِ فَشَرِّدْ بِهِمْ مَّنْ خَلْفَهُمْ لَعَلَّهُمْ یَذَّكَّرُوْنَ ﴿۵۷﴾

لڑائی میں پس بھگا دے ان کی وجہ سے اُن لوگوں کو جو ان کے پیچھے ہیں تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں ﴿۵۷﴾

وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِیَانَةً فَانْۢبِذْ اِلَیْهِمْ عَلٰى

اور اگر تُو اندیشہ کرے کسی قوم کی طرف سے خیانت کا تو پھینک دے اُن کی طرف

سَوَآءٍ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْخَآئِنِيْنَ ﴿۵۸﴾ وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا

برابر سرابر، بے شک اللہ تعالیٰ نہیں پسند کرتے خیانت کرنے والوں کو ﴿۵۸﴾ جنہوں نے کُفر کیا وہ ہرگز گمان نہ کریں

سَبَقُوْا ۭ اِنَّهُمْ لَا يُعْجِزُوْنَ ﴿۵۹﴾ وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ

کہ وہ چھوٹ گئے، وہ لوگ عاجز نہیں کرسکتے ﴿۵۹﴾ اور تیار کرو اُن کے لیے جو تم سے ہوسکے

مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ

یعنی قوت اور بندھے ہوئے گھوڑے، ڈراتے ہو تم اس کے ذریعے سے اللہ کے دشمنوں کو اور اپنے دشمنوں کو

وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ ۚ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ ۚ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ ۭ وَمَا

اور اُن کے علاوہ اور لوگوں کو، نہیں جانتے تم ان کو، اللہ انہیں جانتا ہے، جو

تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يُوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ

چیز بھی تم اللہ کے راستے میں خرچ کرو گے تمہاری طرف پوری پوری ادا کردی جائے گی اور تم

لَا تُظْلَمُوْنَ ﴿۶۰﴾ وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۭ

حق تلفی نہیں کیے جاؤ گے ﴿۶۰﴾ اور اگر وہ لوگ مائل ہو جائیں صلح کی طرف تو تُو بھی مائل ہوجا صلح کی طرف اور اللہ پر بھروسا کر

اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۶۱﴾ وَاِنْ يُّرِيْدُوْٓا اَنْ يَّخْدَعُوْكَ

بے شک اللہ تعالیٰ سننے والا جاننے والا ہے ﴿۶۱﴾ اگر وہ لوگ ارادہ کریں آپ کو دھوکا دینے کا

فَاِنَّ حَسْبَكَ اللّٰهُ ۭ هُوَ الَّذِيْٓ اَيَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَبِالْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۶۲﴾

پس بے شک آپ کے لئے اللہ کافی ہے، وہ اللہ ہے جس نے قوت پہنچائی آپ کو اپنی مدد کے ساتھ اور مؤمنین کے ساتھ ﴿۶۲﴾

وَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ ۭ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا

اور مؤمنین کے دِلوں کو آپس میں جوڑ دیا، اگر خرچ کرتے آپ ان سب چیزوں کو جو زمین میں ہیں

مَّآ اَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَيْنَهُمْ ۭ اِنَّهٗ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۶۳﴾

تو آپ ان کے دلوں میں جوڑ نہ لگا سکتے لیکن اللہ تعالیٰ نے انہیں آپس میں جوڑ دیا، بے شک وہ زبردست ہے حکمت والا ہے ﴿۶۳﴾

يَاَيُّهَا النَّبِيُّ حَسْبُكَ اللّٰهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۶۴﴾

اے نبی! آپ کے لیے اللہ کافی ہے اور وہ مومن کافی ہیں جو آپ کے متبع ہیں ﴿۶۴﴾

خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ وَلَوْ تَرٰى اِذْ يَتَوَفَّى الَّذِيْنَ كَفَرُوا الْمَلٰٓئِكَةُ: اگر دیکھے تو جب وفات دیتے ہیں ان لوگوں کو جنہوں نے کفر کیا فرشتے، الْمَلٰٓئِكَةُ یہ یَتَوَفّٰی کا فاعل ہے،" وفات دیتے ہیں فرشتے ان لوگوں کو جنہوں نے کفر کیا" يَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَاَدْبَارَهُمْ: مارتے ہیں وہ فرشتے ان کے چہروں کو اور ان کی پشتوں کو، ادبار دُبر کی جمع، وُجوہ وجہ کی جمع، وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ: اور انہیں کہتے ہیں چکھو جلنے کا عذاب، یا، جلنے والی آگ کا عذاب، ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ: اور یہ عذاب بسبب ان اعمال کے ہے جو تمہارے ہاتھوں نے آگے بھیجے، وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ: وَالْاَمْرُ اَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ اور یہ واقعہ ہے کہ بیشک اللہ تعالیٰ بندوں کے لئے بالکل ظلم کرنے والا نہیں، یہ ظَلَّام یہ ظالم سے مبالغہ ہے، یہ عربی کا ایک اسلوب ہے کہ مبالغے پر جس وقت نفی آتی ہے تو وہاں نفی میں مبالغہ کرنا مقصود ہوتا ہے، مبالغے کے صیغے پر نفی اگر آ جائے تو نفی میں مبالغہ مقصود ہوتا ہے، جیسے ہم یہ کہیں کہ لَيْسَ بِقَاتِلٍ وہ قتل کرنے والا نہیں، اس کو مبالغے کے ساتھ ادا کریں گے تو یوں کہیں گے لَيْسَ بِقَتَّالٍ وہ بالکل قتل کرنے والا نہیں، لَيْسَ بِفَاعِلٍ وہ کرنے والا نہیں، لَيْسَ بِفَعَّالٍ وہ کچھ کرنے والا نہیں، اسی طرح سے لیس بِظَالِمٍ وہ ظالم نہیں، لَيْسَ بِظَلَّامٍ وہ بالکل ظلم کرنے والا نہیں، نفی کے اندر مبالغے والا معنیٰ پیدا ہو گیا،" یہ واقعہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے لئے بالکل ظلم کرنے والا نہیں، ذرہ برابر ظلم کرنے والا نہیں" لَيْسَ بِظَلَّامٍ کا یہ مفہوم ہو جائے گا۔ كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ دَاب حال کو کہتے ہیں، اور "آل" کا لفظ آپ کے سامنے پہلے سورۂ بقرہ میں آیا تھا تو بتایا تھا کہ یہ صرف اولاد کے ساتھ خاص نہیں بلکہ جتنے تبعین متعلقین ہوتے ہیں وہ سارے "آل" میں شامل ہیں، دَاْبُهُمْ كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ: ان کا حال فرعون کے متعلقین کے حال کی طرح ہے، وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ: اور ان کے حال کی طرح ہے جو ان سے پہلے گزرے ہیں، كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ: ان کا کیا حال تھا؟ انہوں نے اللہ کی آیات کا انکار کیا، فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ: پس پکڑ لیا ان کو اللہ تعالیٰ نے ان کے گناہوں کی وجہ سے، اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ شَدِيْدُ الْعِقَابِ: بیشک اللہ تعالیٰ قوت والا ہے سخت سزا دینے والا ہے۔ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ: اور یہ اس سبب سے ہے کہ بیشک اللہ تعالیٰ نہیں ہے بدلنے والا کسی احسان کو جو اس نے کیا ہو کسی قوم پر، حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ: جب تک کہ نہ بدلیں وہ لوگ اس چیز کو جو ان کے دلوں میں ہے، یا، ان کے نفسوں میں ہے، حتّٰی کے بعد نفی کا ترجمہ، جب تک کہ وہ لوگ اس چیز کو نہ بدلیں جو ان کے دلوں میں ہے، ان کے نفسوں میں ہے، ان کے اپنے آپ میں ہے، اس وقت تک اللہ تعالیٰ اپنے کیے ہوئے احسان کو بدلتا نہیں، وَاَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ: بیشک اللہ تعالیٰ سننے والا جاننے والا ہے۔ كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ان کا حال فرعون کے متعلقین کے حال کی طرح ہے، اور ان لوگوں کے حال کی طرح ہے جو ان سے پہلے گزرے كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ: انہوں نے اپنے رب کی آیات کو جھٹلایا، فَاَهْلَكْنٰهُمْ: پھر ہم نے انہیں ہلاک کر دیا، بِذُنُوْبِهِمْ: ان کے گناہوں کی وجہ سے، وَاَغْرَقْنَا اٰلَ فِرْعَوْنَ: اور ہم نے فرعون کے لوگوں کو

غرق کر دیا، وَكُلٌّ كَانُوْا ظٰلِمِيْنَ: وہ سارے کے سارے ظلم کرنے والے تھے۔ اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ: دواب کا لفظ پہلے بھی اسی سورت میں گزرا ہے، بیشک جانوروں میں سے، زمین پر چلنے والی چیزوں میں سے بدتر اللہ کے نزدیک وہ لوگ ہیں جنہوں نے کفر کیا، فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ: پھر وہ ایمان نہیں لاتے، اَلَّذِيْنَ عٰهَدْتَّ مِنْهُمْ: وہ لوگ جن سے آپ نے معاہدہ کیا ہے ان میں سے، کافروں میں سے جن کے ساتھ آپ نے معاہدہ کیا، عَاهَدَ مُعَاهَدَةً، جن کے ساتھ آپ نے معاہدہ کیا، ثُمَّ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَهُمْ: پھر وہ لوگ اپنے عہد کو توڑتے ہیں، فِيْ كُلِّ مَرَّةٍ: ہر مرتبہ، وَّهُمْ لَا يَتَّقُوْنَ: اور وہ ڈرتے نہیں، فَاِمَّا تَثْقَفَنَّهُمْ فِي الْحَرْبِ: پھر اگر تو پالے انہیں (ثقف: پالینا) اگر تو پالے انہیں لڑائی میں، فَشَرِّدْ بِهِمْ: تَشْرِيد: بھگا دینا، منتشر کر دینا، تتر بتر کر دینا ''پس بھگا دے ان کی وجہ سے ان لوگوں کو جو ان کے پیچھے ہیں'' لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ: تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں، وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً: اور اگر تو خوف کرے، اندیشہ کرے کسی قوم کی طرف سے خیانت کا، فَانْۢبِذْ اِلَيْهِمْ عَلٰى سَوَآءٍ: نَبَذَ يَنْبِذُ: پھینک دینا، نَبَذَ فَرِيْقٌ مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ (سورۂ بقرہ: ۱۰۱) یہ لفظ پہلے بھی گزرا تھا۔ ''پھینک دے ان کی طرف برابر سرابر'' اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْخَآئِنِيْنَ: بیشک اللہ تعالیٰ نہیں پسند کرتے خیانت کرنے والوں کو۔ وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَبَقُوْا: اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا یہ لَا يَحْسَبَنَّ کا فاعل ہے، ''جو لوگ کفر کرتے ہیں، جنہوں نے کفر کیا وہ ہرگز گمان نہ کریں'' سَبَقُوْا: کہ وہ چھوٹ گئے، اِنَّهُمْ لَا يُعْجِزُوْنَ: وہ لوگ عاجز کرنے والے نہیں، عاجز نہیں کر سکتے، لَا يُعْجِزُوْنَ کا مفہوم یہ ہے کہ ہم سے چھوٹ کے بچ کے جا نہیں سکتے کہ ہم انہیں پکڑ نہ سکیں، جیسے عربی میں محاورہ آتا ہے اَعْجَزَهُ الصَّيْدُ: شکاری کو شکار نے عاجز کر دیا، یعنی شکاری اس شکار کے پکڑنے پر قادر نہ ہوا، اَعْجَزَهُ الصَّيْدُ: شکار نے اس کو عاجز کر دیا، یعنی شکاری شکار کو پکڑ نہ سکا۔ لَا يُعْجِزُوْنَ: وہ عاجز نہیں کر سکتے، یعنی ہم سے بچ نہیں سکتے، وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ: اَعِدُّوْا اِعداد سے ہے تیار کرنا، ''تیار کرو ان کے لئے جو تم سے ہو سکے'' جو تم سے ہو سکے ان کے لئے تیار کرو، جو تم سے ہو سکے اس سے کیا مراد؟ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ: یہ مِن بیانیہ ہے، یعنی ہر قسم کی قوت اور پلے ہوئے گھوڑے، رِباط مربوط کے معنی میں، بندھے ہوئے، مقصد ایک ہی ہے، کیونکہ بندھے ہوئے کا معنی یہی ہے کہ جنگ کے لئے تیار کر کے رکھے ہوئے، مصدر کے معنی میں لے لیں تو ''قوت سے اور گھوڑے باندھنے سے، یعنی قوت اور گھوڑے باندھنا'' ''تیار کرو ان کے لئے جو تم سے ہو سکے، جس کی تم میں استطاعت ہے یعنی قوت اور گھوڑے باندھنا، یا، بندھے ہوئے گھوڑے'' تُرْهِبُوْنَ بِهٖ: بِهٖ کی ضمیر مَا اسْتَطَعْتُمْ کی مَا کی تاویل سے لوٹ رہی ہے، ''ڈراتے ہو تم اس قوت اور طاقت کے ذریعہ سے'' عَدُوَّ اللّٰهِ: اللہ کے دشمنوں کو، وَعَدُوَّكُمْ: اور اپنے دشمنوں کو، وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ: اور ان کے علاوہ اور لوگوں کو، لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ: نہیں جانتے تم ان اور لوگوں کو، اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ: اللہ انہیں جانتا ہے، وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ: جو چیز بھی تم اللہ کے راستے میں خرچ کرو گے، يُوَفَّ اِلَيْكُمْ: تمہاری طرف پوری پوری ادا کر دی جائے گی، وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ: اور تم حق تلفی نہیں کیے جاؤ گے، تمہارا حق دبایا نہیں جائے گا، وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ: اور اگر وہ لوگ مائل ہو جائیں صلح کی طرف، سلم صلح کو کہتے ہیں، فَاجْنَحْ لَهَا: تو تُو بھی مائل ہو جا صلح کی طرف، وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ: اور اللہ پہ بھروسا کر، اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ: بیشک اللہ تعالیٰ سننے والا جاننے والا ہے، وَاِنْ يُّرِيْدُوْٓا اَنْ يَّخْدَعُوْكَ: خَدَعَ يَخْدَعُ: دھوکا دینا، اگر وہ لوگ ارادہ کریں آپ کو دھوکا دینے کا، فَاِنَّ حَسْبَكَ اللّٰهُ: پس بیشک آپ کے لیے اللہ کافی ہے، هُوَ الَّذِيْٓ اَيَّدَكَ بِنَصْرِهٖ: وہ اللہ ہے جس نے آپ

کو قوت پہنچائی اپنی مدد کے ساتھ، وَبِالْمُؤْمِنِيْنَ: اور مؤمنین کے ساتھ، اپنی نصرت بھی بھیجی غائبانہ، اور مؤمنین آپ کے ساتھ کر دیے، یہ آپ کے لئے مضبوطی کا باعث ہیں، "قوت پہنچائی آپ کو اپنی مدد کے ساتھ اور مؤمنین کے ساتھ" وَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ: اور جوڑ دیا ان کے دلوں کو، اَلَّفَ تالیف سے ہے، اور مؤمنین کے دلوں کو آپس میں جوڑ دیا، لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا: اگر خرچ کرتے آپ ان سب چیزوں کو جو زمین میں ہیں مَّآ اَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ: تو آپ ان کے دلوں میں جوڑ نہ لگا سکتے، جو کچھ زمین میں ہے اگر آپ خرچ کرتے تو آپ ان کے دلوں میں جوڑ نہ لگا سکتے، وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَيْنَهُمْ: لیکن اللہ تعالیٰ نے انہیں آپس میں جوڑ دیا، اِنَّهٗ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ: بیشک وہ زبردست ہے حکمت والا ہے، يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ حَسْبُكَ اللّٰهُ: اے نبی! آپ کے لیے اللہ کافی ہے، وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ: اور وہ مؤمن کافی ہیں جو آپ کے متبع ہیں۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

تفسیر

رُکوع میں بیان کردہ مضمون

وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ يَتَوَفَّى الَّذِيْنَ كَفَرُوا:[1] یہاں سے برزخ کی سزا کا ذکر ہے کہ دُنیا کے اندر تو سزا ہو ہی چکی، جیسا کہ ظاہر میں مارے گئے، قتل کیے گئے، بدر کے اندر شکست کھا گئے، یہ تو دُنیا کی سزا ہے۔ اور کافر کے لیے صرف یہی سزا نہیں، اسی پر کفایت نہیں، بلکہ آگے برزخ میں بھی ان کے لیے سزا ہے، اور قیامت کے بعد بھی ان کے لیے عذاب ہے۔

لفظِ "برزخ" کی وضاحت

"برزخ" کا لفظ جو بولا جارہا ہے تو "برزخ" کا لفظی معنی ہوتا ہے رُکاوٹ، بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيٰنِ (سورۂ رحمٰن) ان دونوں دریاؤں کے درمیان میں رُکاوٹ ہے، وہ ایک دوسرے پر زیادتی نہیں کرسکتے۔ اور یہاں "برزخ" سے مراد ہوتا ہے اس دُنیوی زندگی کے ختم ہونے کے بعد قیامت کے قائم ہونے سے پہلے جو وقت گزر رہا ہے، وہ وقت "برزخ" کہلاتا ہے، اس موت کے بعد دوبارہ زندگی سے پہلے جو وقت ہے جس کو ہم قبر کی زندگی کہتے ہیں، قبروں میں جو وقت گزرتا ہے یہ "برزخ" ہے۔

"برزخ" میں راحت اور عذاب کا عقیدہ قطعی ہے

قیامت کے بعد تو جنت و دوزخ، راحت اور عذاب یہ تو بیسیوں آیات کے اندر آیا ہوا ہے اور یہ قطعیات میں سے ہے، جس کے اندر کسی تاویل کی گنجائش نہیں، تاویل کرنے والا بھی کافر ہے جیسے کہ انکار کرنے والا کافر ہے۔ قیامت جس وقت قائم ہوگی، سارے انسان اٹھائے جائیں گے، دوبارہ زندگی ہوگی اور نیکوں کے لیے جنت اور بُروں کے لیے دوزخ، یہ عقیدہ بنیادی عقائد میں سے ہے، توحید رسالت معاد یہ تین عقیدے ہی اسلام میں بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ برزخ کے اندر راحت اور عذاب

(۱) اس آیت پر ایک سوال اور اس کا جواب اسی درس کے آخر میں دیکھیں۔

بھی دلائل قطعیہ سے ثابت ہے، روایاتِ متواترہ سے ثابت ہے، قدر مشترک روایات کا متواتر ہے جس کے ساتھ یہ ثابت ہے کہ مرنے کے بعد قیامت سے پہلے جو یہ وقت گزرے گا جس کو ہم ''برزخ'' کا وقت کہتے ہیں، قبر کی زندگی کہتے ہیں، اس میں بھی ایسے نہیں کہ مٹی ہو کے پڑے رہیں، اور نہ کوئی راحت ہو نہ کوئی عذاب ہو، بلکہ اس میں بھی راحت ہے اور اس میں بھی عذاب ہے۔ تو برزخ کا عذاب اور برزخ کا ثواب یہ بھی اہل سنت والجماعت کے نزدیک قطعیات میں داخل ہے، اس لیے اگر کوئی شخص اس کا منکر ہو اور کہے کہ مرنے کے بعد قیامت سے پہلے کوئی سزا نہیں یا کوئی ثواب نہیں تو یہ شخص بھی اہلِ سنت والجماعت کے نزدیک کافر ہے۔ ہاں البتہ جو واقعات آتے ہیں کہ قبروں میں عذاب کس طرح ہوگا؟ زمین مل جائے گی، پسلیاں ادھر کی ادھر چلی جائیں گی، اتنے اتنے سانپ مسلط کیے جائیں گے، ان میں سے ہر ہر واقعہ خبرِ واحد سے ثابت ہے، اس لیے اس کا انکار گمراہی ہے، کسی خاص واقعے کے انکار پر کفر نہیں آئے گا، البتہ کلیۃً اگر اس طرح سے انکار کر دیا جائے کہ مرنے کے بعد قیامت سے پہلے کوئی عذاب نہیں کوئی ثواب نہیں، بلکہ انسان ایسے ہی پڑا رہے گا مٹی میں ملا ہوا، اللہ دوبارہ زندہ کریں گے اور قیامت میں عذاب اور ثواب ہوگا، اس طرح اگر کوئی شخص کہتا ہے تو پھر وہ کافر ہے۔ کسی خصوصی واقعہ کا اگر انکار کرے تو ایسے ہے جیسے خبرِ واحد کا انکار ہے، اور خبرِ واحد کا انکار آپ نے اُصولِ فقہ کے اندر پڑھا ہے کہ گمراہی ہے لیکن کفر نہیں، کیونکہ خبرِ واحد ظنی ہوتی ہے، لیکن اتنا قدرِ مشترک کہ کچھ نہ کچھ عذاب ضرور ہے، اور اسی طرح راحت ضرور ہے، یہ قدرِ مشترک متواتر ہے، اس کا انکار کفر ہے۔

عذابِ برزخ پر آیتِ قرآنی سے دلیل

تو جن آیات کے ساتھ برزخ کے عذاب اور ثواب پر استدلال کیا جاتا ہے، اُن آیات میں سے ایک آیت یہ بھی ہے، اسی مناسبت سے میں نے آپ کے سامنے برزخ کے عذاب کی اور اُس کے ثواب کی بات ذکر کی ہے۔ یہ آیت بھی برزخ کے عذاب پر دلالت کرتی ہے وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ يَتَوَفَّى الَّذِيْنَ كَفَرُوا، یہ خطاب عام ہے، سرورِ کائنات ﷺ کو بھی ہے اور ہر مخاطب جو بھی سننے والا ہو۔ ''اگر دیکھے تو جس وقت وفات دیتے ہیں فرشتے ان لوگوں کو جنہوں نے کفر کیا'' کافروں کو جس وقت فرشتے وفات دیتے ہیں۔ تَوَفِّيْ يَتَوَفّٰى وصول کرنے کو کہتے ہیں، یعنی جس وقت ان کی روح کو وصول کرتے ہیں، قرآنِ کریم میں دوسری جگہ جس طرح آیا ہے قُلْ يَتَوَفّٰىكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ (سورۃ الم سجدہ:۱۱) کہ ملک الموت تمہیں وصول کرتا ہے، تمہیں وفات دیتا ہے۔ جس وقت فرشتے کافروں کو وفات دیتے ہیں، يَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَاَدْبَارَهُمْ: یہ دیکھو! وہی سزا ہے۔ وہ ان کے چہروں پر بھی مارتے ہیں اور ان کی دُبروں پر بھی مارتے ہیں۔ کیا مارتے ہیں؟ کس طرح سے مارتے ہیں؟ یہ تفصیل یہاں نہیں ہے، ڈنڈے مارتے ہیں، تھپڑ مارتے ہیں، جُوتے مارتے ہیں، گرزیں مارتے ہیں، لوہے کی، آگ کی، جو کچھ بھی ہو، اس میں اجمال ہے۔ جیسے پولیس والے جب مجرم کو پکڑتے ہیں تو مارنے کا طریقہ یہی ہوتا ہے کہ منہ پر تھپڑ بھی مارتے ہیں، اور پشتوں پر ڈنڈے اور جُوتے بھی مارتے ہیں، تو فرشتے بھی اسی طرح سے پٹائی کرتے ہیں ان کافروں کی، ان کے مونہوں پر بھی مارتے ہیں اور ان کی دُبروں پر بھی مارتے ہیں۔ اور ساتھ ساتھ زبان سے تنبیہ بھی کرتے ہیں ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ: چکھو جلنے والی آگ کا عذاب، آگے چلو، اور جلنے والی آگ کا عذاب تمہارے

سامنے آنے والا ہے، یہ سارے کا سارا عذاب اور تکلیف ہے جو کافروں کو موت کے وقت آتی ہے، یہ بھی برزخ کے عذاب کا ایک حصہ ہے، یہ نہیں کہ بس روح نکلی اور ختم ہو گئے پھر قیامت کے دن اٹھیں گے، ایسا نہیں۔ موت جس وقت آتی ہے تو موت کے بعد کے حالات کافروں کے لیے باعث تکلیف ہیں اور مومنین کے لیے باعثِ راحت ہیں، اس آیت سے اس بات کی طرف اشارہ نکلتا ہے، چاہے یہ وفات کے وقت کی بات ہے لیکن اس سے یہ تو معلوم ہوا کہ وفات بھی ایسے نہیں آجاتی بلکہ اس میں بھی فرشتوں کی مار پڑتی ہے اور کافروں کو تکلیف دی جاتی ہے، توفی کے وقت بھی اس قسم کی سزا اسے ہوتی ہے، اور ساتھ زبان سے تنبیہ کرنے کے لیے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ تمہارے اعمال کی وجہ سے ہے جو تمہارے ہاتھوں نے آگے بھیجے، اور اللہ تعالیٰ تو بالکل اپنے بندوں پر زیادتی نہیں کرتا لَیْسَ بِظَلَّامٍ: بالکل ظلم کرنے والا نہیں ہے۔ جیسے میں نے عرض کیا کہ مبالغہ کے صیغے پر نفی داخل کر کے مبالغہ فی النفی کیا گیا ہے، لَیْسَ بِظَالِمٍ: ظلم کرنے والا نہیں۔ لَیْسَ بِظَلَّامٍ: بالکل ظلم کرنے والا نہیں اپنے بندوں کے لئے۔ یہ تمہارے اپنے کرتوت ہیں جو سامنے آ رہی ہیں، یہ تمہاری اپنی رس بھری (زہریلی) فصل ہے جو تم نے بوئی تھی آج تم اس کو کاٹو گے۔

کفارِ مکہ اور فرعونیوں کے حالات میں مشابہت

كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ: ان کا حال فرعون کے لوگوں جیسا ہے۔ فرعون کے لوگوں کا حال آپ کے سامنے سورۂ اعراف میں مفصل گزر چکا، کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کو بڑی خوش حالی دی ہوئی تھی، بہت اللہ تعالیٰ نے اُن پر انعامات کیے تھے، اور پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام جس وقت تشریف لے آئے تو انہوں نے ان آیات کا انکار کیا جو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اُن کے سامنے پیش کی تھیں، تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہلکی ہلکی تنبیہات عذاب کی شکل میں ان کے اوپر آئیں، ایک تنبیہ آتی پھر اُن کو مہلت دی جاتی، پھر تنبیہ آتی پھر مہلت دی جاتی، یہ سلسلہ جاری رہا، تو یہ اللہ تعالیٰ کی عادت ہے کہ یکدم ہلاک نہیں کرتا، بلکہ اس طرح سے تنبیہات اتارتے ہیں، تنبیہات کے ساتھ جو سدھر جاتا ہے تو ٹھیک، اور اگر کوئی نہیں سدھرتا تو پھر آخر فیصلہ کن عذاب آتا ہے جس سے تباہ کر دیا جاتا ہے۔ تو یہ ابتدائی تنبیہات کا ذکر ہے۔ ''ان کا حال فرعون کے لوگوں کے حال جیسا ہے، اور ان لوگوں جیسا ہے جو اُن سے پہلے گزرے، انہوں نے اللہ کی آیات کا انکار کیا، اللہ تعالیٰ نے انہیں پکڑا اُن کے گناہوں کے سبب سے مختلف عذابوں میں'' جیسے کئی قسم کے عذاب آپ کے سامنے گزرے تھے، پھلوں کا کم ہونا، ٹڈیوں کا آنا، خون کا آنا وغیرہ، آیات مفصلات کے عنوان سے جن کو ذکر کیا گیا تھا، تسع آیات، یہ نو قسم کے عذاب جو فرعونیوں پر آئے تھے، اُن کا ذکر سورۂ اعراف میں آپ کے سامنے گزر گیا۔ ''کفر کیا انہوں نے اللہ کی آیات کے ساتھ، تو اللہ تعالیٰ نے انہیں پکڑ لیا اُن کے گناہوں کے سبب سے، بے شک اللہ تعالیٰ قوت والا ہے اور سخت سزا والا ہے۔''

اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والی تنبیہات اور اس میں حکمت

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً: یہ جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے تنبیہات آتی ہیں، اس میں یہ حکمت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اگر

کسی قوم کو کوئی نعمت اور احسان دے رکھا ہے، جیسے دنیوی طور پر جاہ وجلال حاصل ہے، قوت اور اقتدار حاصل ہے، وہ لوگ معاشی طور پر خوش حال ہیں، یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک انعام ہے، تو اللہ تعالیٰ یہ انعام جلدی نہیں چھینتا، بلکہ مختلف طور پر تنبیہات کرتے ہیں۔ جس وقت وہ لوگ بالکل ہی اپنے حالات بدل دیتے ہیں، کہ ضد پہ آ گئے، عناد پہ آ گئے، حق قبول کرنے کی صلاحیت انہوں نے ختم کر دی، ان کا سمجھنے اور سوچنے کا ارادہ ہی نہیں، اللہ تعالیٰ کی نعمتیں اُن کے لیے مزید سرکشی کی باعث بن گئیں، جب وہ اپنے اس قسم کے حالات بنا لیتے ہیں، پھر اللہ تعالیٰ اپنے احسانات کو چھین لیتا ہے، یہ نہیں کہ دیا اور دینے کے بعد بلاوجہ چھین لیا، ایسا نہیں۔ بلکہ اللہ تعالیٰ پہلے اُن کو تنبیہات کرتے ہیں، اُن کے سامنے نصیحتیں آتی ہیں اور اُن کو تذکیر کی جاتی ہے، اگر وہ اس میں اپنے حالات کو بدل لیتے ہیں تو ٹھیک، اور اگر وہ نہیں بدلتے بلکہ وہ اپنے حالات کو شدت کی طرف لے جاتے ہیں، کہ پہلے اتنے منکر نہیں ہوتے جتنے پھر ہو گئے، پہلے اتنے سرکش نہیں ہوتے جتنے پھر ہو گئے، جیسے مشرکین مکہ سرورِ کائنات ﷺ کے آنے سے پہلے بت پرستی کرتے تھے، لیکن ان میں کچھ اچھی صفتیں بھی تھیں، صلہ رحمی کرتے تھے، بیت اللہ کی خدمت کرتے تھے، بیت اللہ کا حج اور عمرہ کرنے والوں کی خدمت کرتے تھے، اور اس قسم کی دوسری خوبیاں بھی اُن کے اندر پائی جاتی تھیں، لیکن جب اللہ کی طرف سے ان کے سامنے نصیحت آئی، قرآنِ کریم اترا، اللہ کا رسول آیا، تو ان کے اندر نہ وہ صلہ رحمی رہی، نہ وہ بیت اللہ کا احترام رہا، اب کوئی عمرہ کرنے کے لئے بھی آتا ہے تو اس کو بھی بیت اللہ میں آنے نہیں دیتے، لوگوں کو اللہ کا نام لینے نہیں دیتے، اپنے ہی رشتہ داروں کو، اپنے ہی عزیزوں کو اسلام قبول کرنے پر کس طرح مارنا اور قتل کرنا شروع کر دیا، جس کے نتیجے میں پھر ساری قوم کی قوم پٹ گئی۔ ''بیشک اللہ تعالیٰ نہیں بدلنے والا اس نعمت کو۔''

لَمْ يَكُ اصل میں لَمْ يَكُنْ تھا، اور كَانَ يَكُوْنُ کے متعلق یہ قاعدہ ہے کہ اس کے آخر میں جو لام کلمہ ہے اس کو بھی گرا دیا جاتا ہے، ویسے لَمْ يَقُلْ کی طرح یہ بھی لَمْ يَكُنْ ہے، سورۂ مریم میں بھی یہ لفظ آئے گا لَمْ اَكُ بَغِيًّا یہ اصل میں تھا لَمْ اَكُنْ بَغِيًّا، آخر سے نون ساقط کر دیا۔ اسی طرح یہاں بھی لَمْ يَكُنْ کی بجائے لَمْ يَكُ آ گیا۔ ''نہیں ہے بدلنے والا اللہ تعالیٰ اپنے احسان کو جو کر دے وہ کسی قوم پر جب تک کہ نہ بدلیں وہ ان حالات کو جو اُن میں ہیں، بے شک اللہ تعالیٰ سننے والا جاننے والا ہے'' یعنی اللہ کا عذاب، اللہ کی تنبیہ یہ کوئی اندھے کی لاٹھی نہیں، کہ جہاں لگ گئی لگ گئی، کوئی پتا نہیں کہ ٹھکانے لگ رہی ہے کہ نہیں لگ رہی، اللہ تعالیٰ کے فیصلے جتنے ہیں وہ سارے کے سارے سمع اور علم پر مبنی ہیں، اللہ تعالیٰ سب باتوں کو سنتا ہے اور سب باتوں کو جاننے والا ہے۔ ''ان کا حال فرعون کے لوگوں کی طرح ہی ہے، اور ان لوگوں کی طرح جو ان سے پہلے گزرے ہیں، انہوں نے اپنے رَبّ کی آیات کو جھٹلایا'' اب یہ شدت پیدا ہو گئی۔ فَاَهْلَكْنٰهُمْ: پھر ہم نے اُن کو اُن کے گناہوں کی وجہ سے ہلاک ہی کر دیا۔ پہلے پکڑ تھی، تھوڑی تھوڑی تنبیہات ہوئیں۔ ہم نے ان کو ان کے گناہوں کی وجہ سے ہلاک کر دیا، وَاَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ: اور فرعون کے متعلقین کو ہم نے ڈبو ہی دیا، وَكُلٌّ كَانُوْا ظٰلِمِيْنَ: اور یہ سارے کے سارے ظالم تھے، اللہ تعالیٰ کے حقوق کی حق تلفی کرنے والے تھے تو ان سب کو ہم نے غرق کر دیا۔

عند اللہ بدترین مخلوق

اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰہِ: یہ مذمت ہے اسی قسم کے لوگوں کی۔ کہ زمین کے اُوپر چلنے پھرنے والی چیزوں میں سے بدتر اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ لوگ ہیں جو کفر کرتے ہیں، پھر ایمان لاتے ہی نہیں، اس طرح سے کفر پر اڑ جاتے ہیں کہ اُن کو ہزار سمجھاؤ، ہزار سعی کرو، ماننے والے نہیں ہیں، اس قسم کے لوگ اللہ تعالیٰ کے نزدیک تمام حیوانات میں سے، تمام جانوروں میں سے بدتر ہیں۔ اس کی تفصیل پہلے آپ کے سامنے آچکی، (پارہ ۹ سورۂ اعراف آیت: ۱۷۹ کے تحت)۔

مدینہ طیبہ میں سرورِ کائنات ﷺ کی جنگی حکمتِ عملی

ان بدترین لوگوں میں سے، ان کافروں میں سے جن کے ساتھ آپ معاہدہ کرتے ہیں، یہ ہدایات ہیں جنگی اصول کے مطابق۔ ان کا حاصل یہ ہے کہ سرورِ کائنات ﷺ جس وقت مدینہ منورہ میں تشریف لے گئے، مدینہ منورہ میں تشریف لے جانے کے بعد آپ کے سامنے جو ملک کی صورتحال تھی وہ یہ تھی کہ اصل فکر تو تھی آپ کی مشرکین مکہ کے ساتھ، جو اپنی برادری اور اپنی ہی قوم تھی، اور مدینہ منورہ کے اردگرد یہودی قبائل آباد تھے، اور یہود کے قبائل سے آگے گزر کر اور مشرکین کے قبائل تھے۔ اب یہ رسول اللہ ﷺ کی حکمتِ عملی ہے کہ سب کے ساتھ بیک وقت فکر لینا بسا اوقات مصلحت نہیں ہوتی، تو آپ نے پھر وہاں جا کے معاہدوں کا سلسلہ شروع کیا، آس پاس والے قبائل جتنے تھے، یہود کے اور دوسرے، ان کے ساتھ ترکِ جنگ کا معاہدہ ہو گیا، کہ ہم تمہیں کچھ نہیں کہتے تم ہمیں کچھ نہ کہو، اور اگر کوئی شخص ہمارے ساتھ لڑنے کے لیے آئے تو تم نے اُن کی امداد نہیں کرنی، چاہے ہماری امداد کرو یا نہ کرو وہ ایک علیحدہ بات ہے، مخالفین کے ساتھ شامل ہو کے اُن کی امداد نہیں کرنی اور ان کو قوت نہیں پہنچانی۔ مقصد یہ تھا کہ تاکہ یہ قبائل اپنی اپنی جگہ ٹکے رہیں اور ہمارا مقابلہ اگر ہو تو قریش کے ساتھ ہی ہو، تو ایک قوم کو یا ایک شہر کو تو انسان سنبھال سکتا ہے، اب چاروں طرف سے دشمن کھڑے ہو جائیں، اور چاروں طرف کے قبائل جنگ میں شامل ہو جائیں تو اس میں تو بڑی پریشانی ہوتی ہے، تو آپ نے حکمتِ عملی کے طور پر تدبیر یہی رکھی، کہ یہود کے ساتھ ترکِ جنگ کا معاہدہ کر لیا، اور اردگرد کے دوسرے قبائل کے ساتھ بھی، اور جنگ صرف قریش کے ساتھ رہ گئی، لیکن ان یہود اور دوسرے مشرکین کا کچھ ایسا حال تھا کہ یہ اپنے معاہدے کی پابندی نہیں کرتے تھے، یہود تو درپردہ سازشیں کرتے، قریش کو بھڑکاتے، ان کو اسلحہ کی امداد پہنچاتے اور اس قسم کی چھیڑ چھاڑ کرتے تھے، اور بعض دوسرے لوگ بھی اس طرح سے کرتے تھے، لیکن سامنے نہیں آتے، درپردہ سازشیں کرتے تھے۔ چنانچہ جوں جوں اُن کی سازشوں کا پتا چلتا گیا، رسول اللہ ﷺ ان کا بھی سرکوبی کرتے چلے گئے، بنو نضیر نے سازش کی تو اُن کو وہاں سے جلاوطن کیا، اور بعد میں بنو قریظہ کی سازش ہوئی تو اُن کے جوانوں کو قتل کیا گیا، اور اُن کی عورتوں اور بچوں کو غلام بنایا گیا، اسی طرح سے دیگر قبائل، جن کی شرارتوں کا پتا چلتا اُن کا سرکوٹ دیا جاتا، اور جن کا پتا نہیں چلتا تھا، درپردہ وہ کرتے تھے تو ظاہری طور پر اُن کے ساتھ ترکِ جنگ کا معاہدہ تھا، وہ بھی اُس کو ظاہری طور پر نباہ رہے تھے اور مسلمان بھی اُس کے پابند تھے، اس قسم کے حالات ہوتے چلے گئے، لیکن آخر ایک وقت ایسا گیا کہ یہ یہود قابلِ اعتبار نہ رہے، لیکن اگر براہِ راست اس طرح سے یہود کے ساتھ جنگ کی جاتی

جس طرح سے مشرکین کے ساتھ جاری تھی، اور ادھر مشرکوں والا محاذ بھی کھلا ہوا تھا، تو پھر وہی بات تھی کہ مشرک ان کے ساتھ شامل ہو جائیں گے، پھر وہی جنگ میں شدت پیدا ہوتی ہے، تو اب سرورِ کائنات ﷺ نے مشرکینِ مکہ کے ساتھ ترکِ جنگ کا معاہدہ کیا، جو صلح حدیبیہ ہوئی تھی، اس میں دس سال کے لئے مشرکینِ مکہ کے ساتھ معاہدہ ہو گیا تھا کہ ہم آپس میں لڑیں گے نہیں، اور ایک دوسرے کے ساتھ میل ملاپ رہے گا، آتے جاتے رہیں گے، کوئی کسی کو تکلیف اور نقصان پہنچانے کی کوشش نہیں کرے گا۔ اب مشرکینِ مکہ کے ساتھ معاہدہ کر کے ادھر سے ہو گئے مطمئن، اور ادھر سے مطمئن ہونا ہی تھا کہ پھر یہود کا سرکوٹ دیا گیا، خیبر پر صلح حدیبیہ کے متصل ہی حملہ کیا گیا، یہ یہودیوں والا جو محاذ تھا یعنی خیبر جو یہودیوں کا مرکز تھا، اس کو پھر بعد میں فتح کر لیا گیا۔ تو ایک کے ساتھ معاہدہ ہے اور دوسرے کے ساتھ جنگ ہے تاکہ جنگ کے اندر وسعت پیدا نہ ہو، اور شدت پیدا نہ ہو، سرورِ کائنات ﷺ نے یہی حکمت عملی اختیار کی۔ پہلے یہود کے ساتھ معاہدہ تھا جب براہِ راست قریش کے ساتھ ٹکر لگی ہوئی تھی، لیکن یہود در پردہ گڑبڑ اور شرارتیں کرتے تھے، یہ قابلِ اعتماد ثابت نہ ہوئے، تو پھر مشرکین کے ساتھ ترکِ جنگ کا معاہدہ کیا گیا، ان کے ساتھ ترکِ جنگ کا معاہدہ کر کے یہود کے ساتھ لڑائی لڑی گئی، اور ان کو فتح کر لیا گیا، اور پھر مشرکین نے جس وقت در پردہ معاہدہ میں خیانت کی، اور معاہدہ کو توڑا تو حضور ﷺ نے مکہ معظمہ پر حملہ کیا اور اس کو فتح کر لیا۔ رسول اللہ ﷺ نے بیک وقت سب قبائل کے ساتھ جنگ نہیں لڑی، در پردہ وہ جس طرح چاہیں کرتے رہیں، لیکن آپ نے معاہدات کے ذریعہ سے جنگ کے اندر خفت پیدا کی ہے، اتنی شدت نہیں آنے دی۔

معاہدے توڑنے والوں کے متعلق اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایات

یہاں اللہ تعالیٰ یہ فرماتے ہیں، کہ جن کے ساتھ آپ معاہدہ کرتے ہیں، پھر وہ اپنے معاہدے کو ہر مرتبہ توڑ دیتے ہیں، ہر مرتبہ کا مطلب یہ ہے کہ جس وقت بھی جنگ کے حالات ہوتے ہیں، جس میں دشمن آتا ہے شرارت کرتا ہے، تو یہ ہر مرتبہ گڑبڑ کرتے ہیں دشمن کے ساتھ مل کر، وَّهُمْ لَا يَتَّقُوْنَ: اور اس معاہدہ کو توڑنے سے ڈرتے نہیں، فَاِمَّا تَثْقَفَنَّهُمْ فِي الْحَرْبِ: یعنی خفیہ طور پر کرتے ہیں تو کرتے رہیں، لیکن اگر کہیں لڑائی میں یہ سامنے آجائیں تو پھر لحاظ نہ کرنا کہ یہ کسی وقت میں ہمارے معاہد رہے ہیں، فَشَرِّدْ بِهِمْ مَّنْ خَلْفَهُمْ: پھر ان کو اس طرح سے مار مارو اور ان کی اتنی پٹائی کرو کہ ان کو بھی سبق حاصل ہو جائے، اور جو ان کے پیچھے ہیں وہ بھی ان کی وجہ سے تتر بتر ہو جائیں، ان کے بھی حوصلے پست ہو جائیں، پھر کوئی دوسرا بھی یوں گڑبڑ کرنے کی جرأت نہ کرے، جو ان کے پیچھے ہیں، جو ان کی وجہ سے ان کے پیچھے چھپے ہوئے گڑبڑ کرتے ہیں، مخفی طور پر جو گڑبڑ کرتے ہیں وہ بھی تتر بتر ہو جائیں، وہ بھی منتشر ہو جائیں، فَشَرِّدْ بِهِمْ: بھگا دے ان کے ذریعہ سے، منتشر کر دے ان کے ذریعے سے ان لوگوں کو جو ان کے پیچھے ہیں۔ کیا مطلب؟ کہ ان کو ایسی مار مارو اور ان کو ایسی سخت سزا دو کہ جو ان کے پیچھے ہیں وہ بھی حوصلہ نہ کریں اس طرح سے گڑبڑ کرنے کا، لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ: تاکہ یہ لوگ نصیحت حاصل کر لیں، اور ان کو پتہ چل جائے کہ معاہدہ کرنے کے بعد جو گڑبڑ کی جاتی ہے اس کا نتیجہ پھر کیا نکلتا ہے۔ وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً: اور اگر کسی قوم کے ساتھ آپ نے معاہدہ تو کیا ہوا ہے، لیکن آپ کو اندیشہ ہے کہ وہ قوم

اس معاہدے کا خیال نہیں کرے گی، اُن کی طرف سے آپ کو خیانت کا اندیشہ ہے، وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً: اگر آپ کسی قوم کی طرف سے خیانت کا خوف کریں تو آپ کو اجازت ہے کہ آپ ابتداءً معاہدہ توڑیں لیکن علی الاعلان، خفیہ طور پر نہیں، فَانْۢبِذْ اِلَیْهِمْ عَلٰی سَوَآءٍ: وہ معاہدہ ان کے منہ پہ دے مارو، اگر وہ قوم قابل اعتماد نہیں ہے، اور یہ اندیشہ ہے کہ ہم ان کے ساتھ معاہدہ کر کے مطمئن ہو کے بیٹھے رہیں گے، اور یہ گڑبڑ کریں گے، تو اس معاہدہ کی پابندی کی کوئی ضرورت نہیں، لیکن علی الاعلان توڑ دو، خفیہ نہیں، فَانْۢبِذْ اِلَیْهِمْ: وہ معاہدہ ان کی طرف پھینک دو، عَلٰی سَوَآءٍ: برابر سرابر، یعنی کہ اس کے ٹوٹنے کا تمہیں بھی علم ہو جائے اور ان کو بھی علم ہو جائے، تا کہ وہ سمجھ جائیں، یہ نہیں کہ ہم اپنے دل میں توڑ کے بیٹھ جائیں اور خفیہ طور پر ان کی مخالفت کریں، ایسے نہیں۔ جس طرح سے مشرک کافر کرتے تھے کہ درپردہ سازشیں کرتے تھے، ایسی بات نہیں، جن کے ساتھ معاہدہ ہے اور آپ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ قوم خائن ہے، معاہدے کا خیال نہیں کرتی تو علی الاعلان اس معاہدے کو توڑ دو، اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْخَآئِنِیْنَ: بے شک اللہ تعالیٰ خیانت کرنے والوں کو پسند نہیں کرتے۔

ہٹ دھرم کافروں کو دھمکی

اور ادھر کافروں کو دھمکی دی جا رہی ہے، جو اتنا سمجھانے کے باوجود سمجھتے نہیں، اور سیدھے راستے پر نہیں آتے، کہ کافر لوگ یہ نہ سمجھیں کہ وہ چھوٹ گئے، بچ گئے، اِنَّهُمْ لَا یُعْجِزُوْنَ: وہ بچ کے کہیں نہیں جا سکتے، وہ عاجز نہیں کر سکتے، جس طرح سے پیچھے آیا تھا کہ ہم اُن کا احاطہ کیے ہوئے ہیں، وہ ہمارے احاطے سے کہیں نکل نہیں سکتے۔

دشمنِ اسلام کے خلاف ہر قسم کی تیاری رکھنے کی ہدایات

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ: یہ بھی مسلمانوں کو جنگ کے متعلق ہدایات دی جا رہی ہیں، کہ اب جنگ عملاً چھڑ گئی، اور براہِ راست مقابلے ہونے لگ گئے، اس لیے ہر وقت اپنی تیاری مکمل رکھا کرو۔ ''تیار رکھو ان کافروں کے لیے جو تم سے ہو سکے'' اپنی امکان بھر قوت کو جمع رکھو۔ مَّا اسْتَطَعْتُمْ کا بیان آ گیا مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَیْلِ۔ اب قرآنِ کریم کا اعجاز دیکھو! کہ ''قوۃ'' کا لفظ عام بول دیا کہ ان کے لیے قوت جمع رکھو، اب اس قوت کا کیا مصداق ہے؟ ہر دور کے لحاظ سے اس کا مصداق بدلتا چلا جائے گا۔ سرورِ کائنات ﷺ کے زمانہ میں جو جنگ لڑی جاتی تھی وہ تیر کی تھی، تلوار کی تھی، نیزے کی تھی، لیکن ان میں سے سب سے زیادہ نقصان پہنچانے والی چیز تیر اندازی تھی، کیونکہ نیزے اور تلوار کے ساتھ تو انسان قریب سے لڑتا ہے، اور تیر اندازی دُور سے بھی کر سکتا ہے، اس وقت تیر اندازی ایسے تھی جس طرح سے دُور سے توپ کا گولا پھینک دیا، اور نیزے اور تلوار کی لڑائی آمنے سامنے اور دست بدست ہوتی ہے، تو سرورِ کائنات ﷺ نے اس وقت فرمایا: ''اَلَا اِنَّ الْقُوَّةَ الرَّمْیُ، اَلَا اِنَّ الْقُوَّةَ الرَّمْیُ، اَلَا اِنَّ الْقُوَّةَ الرَّمْیُ''[1] بار بار اعلان فرمایا، خبردار! سن لو! قوت کا مصداق تیر اندازی ہے، قوت کا مصداق تیر اندازی ہے، قوت کا مصداق

(۱) صحیح مسلم ۲/ ۱۴۳ باب فضل الرمی والحث علیہ/ مشکوٰۃ ۲/ ۳۳۶ باب اعداد آلۃ الجہاد کی پہلی حدیث عن عقبہ بن عامر۔

تیراندازی ہے۔اس لیے فرمایا کہ تیراندازی کی خوب مشق کیا کرو، نشانہ بازی کی مشق خوب کرو، اللہ تعالیٰ اس کے ذریعہ سے تمہیں شہر فتح کرائے گا۔تو اس زمانے میں آپ ﷺ نے اس کا مصداق تیراندازی کو قرار دیا،لیکن تیراندازی قوت کا اعلیٰ فرد ہے اُس دور کے اعتبار سے، ورنہ تلوار، نیزہ وغیرہ جتنے اسباب استعمال کیے جاتے ہیں وہ بھی قوت کا مصداق ہیں۔اور رِبَاطِ الْخَیْلِ: پلے ہوئے گھوڑے، بندھے ہوئے گھوڑے۔ان کا ذکر علیحدہ کر دیا، کیونکہ اس زمانے میں گھوڑوں کی اہمیت جنگ میں ایسی تھی جیسی آج ٹینکوں اور ہوائی جہاز کی ہے، کہ جس کے پاس گھوڑے اچھے ہوتے، زیادہ ہوتے وہ لوگ زیادہ کامیابی کے ساتھ جنگ لڑتے تھے، اور جن کے پاس گھوڑے نہ ہوتے یا کمزور قسم کے ہوتے، تربیت دیے ہوئے نہ ہوتے تو وہ اچھے انداز کے ساتھ لڑائی نہیں لڑ سکتے تھے، اس لیے ان کا ذکر علیحدہ کر دیا۔ورنہ اب اس دور میں قوت کا مصداق ہوائی جہاز ہیں، میزائل ہیں، ہر قسم کے بم ہیں، ٹینک ہیں، توپیں ہیں، تو جتنی بھی چیزیں آج کل استعمال ہوتی ہیں سب قوت کا مصداق ہیں، اور لفظ قوت کے اندر وہ ساری ہی آ گئیں۔ حتیٰ کہ بدنی ورزش اور بدنی قوت کو بحال کرنے کی کوشش کرنا یہ بھی اس قوت کا مصداق ہے، کہ دشمن کے مقابلے میں اپنی طاقت بحال رکھو، اگر کسی کے بازو میں قوت ہی نہیں ہے پھر اگر اُس کے پاس رائفل بھی ہو تو کیا چلائے گا، اور اگر کسی کی ٹانگوں میں قوت ہی نہیں ہے، اور دشمن کے پیچھے بھاگنا پڑے تو کیا بھاگے گا، بلکہ اگر ٹانگیں کمزور ہوں گی تو آدمی دشمن سے جان بچانے کے لیے بھی نہیں بھاگ سکے گا۔اس لیے اس قوت کا مصداق بدنی قوت بھی ہے، اور اسلحے کی قوت بھی ہے، تو اس لفظ کے اندر سارے کا سارا سامانِ جنگ آ گیا۔''جو تم سے ہو سکے تیار رکھو ان کے لیے ہر قسم کی قوت اور پلے ہوئے گھوڑے''، تُرْهِبُوْنَ بِهٖ: ڈراؤ گے تم ان کے ذریعے سے اللہ کے دشمن کو اور اپنے دشمنوں کو۔اُن کے دشمن اللہ کے دشمن ہی تھے، اور اللہ کے دشمن اُن کے دشمن تھے، کیونکہ مسلمانوں کی لڑائی اللہ ہی کے لیے تھی، اس لیے مسلمانوں کے دشمن وہی ہیں جو اللہ کے دِین کے دشمن ہیں، اور جو اللہ کے دِین کے دشمن ہیں وہی مسلمانوں کے دشمن ہیں۔''اور ان کے علاوہ اور لوگوں کو بھی جن کو تم نہیں جانتے اور اللہ اُنہیں جانتا ہے''، یعنی تمہارے سامنے تو اس وقت یہی یہودی اور یہی مشرک ہیں، لیکن اللہ کو پتا ہے کہ کیسے کیسے دشمن سامنے آنے والے ہیں، چنانچہ بعد میں ایران میں، فارس میں، شام میں، رُوم میں جتنی لڑائیاں ہوئیں وہ سب اس میں شامل ہیں، یعنی اگرچہ تم تو یہی سمجھتے ہو کہ دشمن یہی ہیں جو ارد گرد پھیلے ہوئے ہیں، لیکن ان کے علاوہ اور دشمن بھی ہیں جن کو اللہ جانتا ہے اور ابھی تم نہیں جانتے۔تو اتنی قوت اور طاقت جمع کرو کہ سب پر رُعب پڑے، جو تمہارے سامنے ہیں اِن پر بھی، اور جو ابھی تمہارے سامنے نہیں ہیں اُن پر بھی رُعب پڑے، اور وہ بھی ہیبت میں آ جائیں، اتنی طاقت جمع رکھو۔

جہاد فی سبیل اللہ کی تیاری کے لئے اِنفاق کی فضیلت

وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَیْءٍ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ: اور اس سامان جنگ کے مہیا کرنے میں اور گھوڑوں کے پالنے میں جو تمہیں پیسے خرچ کرنے پڑیں گے یہ فی سبیل اللہ ہے، ''اور جو کچھ بھی اللہ کے راستے میں خرچ کرو گے تمہاری طرف ادا کر دیا جائے گا، اور تم کمی نہیں

کیے جاؤ گے' اللہ کی طرف سے تمہاری حق تلفی نہیں ہوگی۔ اس لیے سامانِ جنگ خریدنے اور گھوڑوں کے پالنے میں خوب خرچ کرو، یہ فی سبیل اللہ ہے۔ اور حدیث شریف میں آتا ہے کہ جہاد کی تیاری پر جو روپیہ خرچ کیا جائے، عام طور پر اگر آپ کسی نیک کام میں خرچ کرتے ہیں یعنی فی سبیل اللہ، تو ایک کے دس کا وعدہ ہے، اور اس کے بعد اللہ کی طرف سے جتنا فضل ہو جائے، یعنی ایک کے دس کا وعدہ ہے اور آگے فضل جتنا ہو جائے، لیکن جب جہاد میں خرچ کیا جاتا ہے تو ایک پر سات سو کا وعدہ ہے، اور اُس کے اوپر اللہ کا فضل جتنا ہو جائے[1] یعنی جہاد کی تیاری میں جو پیسے خرچ کیے جاتے ہیں اُن کے اوپر اللہ تعالیٰ کی طرف سے عام خرچ کے مقابلہ اتنا زیادہ ثواب ملتا ہے، کہ عام حالات میں ایک کے دس کا وعدہ، اور اوپر اللہ کا فضل جو ہو جائے، اور جہاد کی تیاری میں جو خرچ ہو اس میں ایک کے سات سو کا وعدہ، اور آگے اللہ کا فضل جتنا ہو جائے۔

جہاد فی سبیل اللہ کی مختلف صورتیں

یہاں لفظ آیا تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ، کہ اس کے ذریعہ سے تم اللہ کے دشمنوں کو ڈراؤ گے، اس میں تعمیم ہے، جیسا کہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ جہاد باللسان بھی ہوتا ہے۔ جہاد بالنفس بھی ہے، اور جہاد بالمال بھی ہے بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ، اور حدیث شریف میں تعمیم ہے کہ جہاد زبان کے ساتھ بھی ہوتا ہے، جس سے معلوم ہو گیا کہ زبان ایسے طور پر استعمال کرنا جس سے دشمنوں کو مرعوب کرنا مقصود ہو، اسلام کا دفاع مقصود ہو، دشمنوں کے اعتراضات کا جواب دیا جائے، یہ بھی اللہ کے نزدیک جہاد کے حکم میں ہے۔ اور پھر آج کے دور میں قلم بھی زبان کے قائم مقام ہے، کہ دشمن اسلام کو شکست دینے کے لیے تحریری طور پر اعتراضات شائع کرتا ہے، یہ بھی تو سرد جنگ ہوتی ہے، میدان میں جو لڑائی لڑی جاتی ہے وہ گرم جنگ ہے، بحث و مباحثہ اور ایک دوسرے کے خلاف تحریرات اور ان کا دفاع یہ سرد جنگ کہلاتا ہے۔ اب مثال کے طور پر یہ عیسائیت اسلام پر حملہ آور ہے، شکوک شبہات پیدا کر کے مسلمانوں کو عیسائی بنا رہی ہے، تو گویا کہ یہ مسلمان قوم کو فتح کرتی جا رہی ہے، یا مرزائی شکوک و شبہات پیدا کر کے مسلمانوں کو مرزائی بنا رہے ہیں، یہ باقاعدہ محاذ ہیں جنگ کے۔ یا رافضی اپنے شکوک و شبہات پیدا کر کے لوگوں کو رافضی بنا رہے ہیں، تو یہ باقاعدہ جنگیں جاری ہیں، ان جنگوں کا دفاع کرنا کہ ان کی زبان کے مقابلے میں زبان استعمال کی جائے، اور ان کی تحریرات کا مقابلے میں تحریرات دی جائیں اور ان کے اعتراضات کے جواب دیے جائیں، اور ان کے اوپر جارحانہ اعتراضات کیے جائیں، جس سے ان کے مذہب کا باطل ہونا معلوم ہو، یہ بالکل اسی طرح سے جہاد ہے جس طرح میدان کے اندر جہاد کیا جاتا ہے۔ تو تحریر اور تقریر پر جو پیسے خرچ ہوں، جو محنت مشقت ہو یہ سب فی سبیل اللہ ہے، جہاد کے اندر یہ تعمیم ہے، حدیث شریف کے اندر "اَلْسِنَہ" کا لفظ آیا ہوا ہے کہ جہاد زبان کے ساتھ بھی ہوتا ہے، اپنی زبان کے ساتھ بھی جہاد کرو، مشرکین شعروں میں رسول اللہ ﷺ اور اسلام کی مذمت کرتے تھے تو حضور ﷺ اپنے شعراء کو کہتے تھے کہ ان کا جواب دو۔ تو اس طرح سے اعتراضات کا جواب دینا، اور اُن کے قبائح ظاہر کرنا اور ان کے عیوب ظاہر کرنا جس سے اُن کے مذہب کا ابطال ہو تو یہ بھی باقاعدہ جہاد ہے،

(۱) مشکوٰۃ ۲/۳۳۲، کتاب الجہاد، فصل ثانی۔ ترمذی ۱/۲۹۲، باب ماجاء فی فضل النفقۃ۔ مَنْ اَنْفَقَ نَفَقَةً فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ كُتِبَتْ لَهٗ بِسَبْعِ مِائَةِ ضِعْفٍ۔

اس کو ''سرد جنگ'' کہتے ہیں، اس ''سرد جنگ'' میں جو لوگ لگے ہوئے ہیں وہ بھی اس طرح مجاہد فی سبیل اللہ ہیں جس طرح کفار کے مقابلے میں ڈنڈا اٹھانے والے مجاہد فی سبیل اللہ ہوتے ہیں۔ وقت وقت کی بات ہوتی ہے، یہ جہاد باللسان اور جہاد بالقلم ہر وقت ہوتا ہے، کافروں کی طرف سے جس وقت بھی اس قسم کی اعتراض والی بات ہوتی ہے تو اس کا جواب دیا جائے، زبانی طور پر ان کی طرف سے تقریریں ہوتی ہیں، لوگوں کے سامنے کفر کی ترغیب آتی ہے تو ان کی تردید کی جائے، تو یہ تقریر اور تحریر سب جہاد کے حکم میں ہیں، یہاں بھی انسان کو اتنی تیاری کر کے رکھنی چاہیے کہ اگر کسی کافر کی طرف سے ایسا کوئی حملہ ہو زبان کی صورت میں یا قلم کی صورت میں، تو اس کا دفاع بھی کیا جا سکے، یہ فرض کفایہ ہے، ایسے لوگوں کا موجود رہنا جو زبان سے کیے ہوئے اعتراض کا جواب زبان سے دے سکیں، قلم سے کیے ہوئے اعتراض کا جواب قلم سے دے سکیں، بلکہ دوسروں پر جارحانہ حملہ بھی کر سکیں، ایسے لوگوں کا موجود رہنا فرض کفایہ ہے، اور اللہ کے فضل سے ہر زمانے میں اہل اسلام کے اندر ایسے لوگ رہتے ہیں، جو قلم کے میدان میں بھی مقابلہ کرتے ہیں، زبان کے میدان میں بھی مقابلہ کرتے ہیں، یہ ساری صورتیں جہاد کے اندر شامل ہیں۔

کافر قوم کے ساتھ صلح کرنے کے بارے میں ہدایات

وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ: اور اگر کوئی کافر قوم صلح کی طرف مائل ہو جائے، ترکِ جنگ کے لئے، کہ ہم آپس میں صلح کر لیں اور آپس میں نہ لڑیں تو آپ کو بھی اجازت ہے کہ آپ اُن سے صلح کر سکتے ہیں، لیکن پھر یہ خیال کہ ایسا نہ ہو کہ ظاہری طور پر صلح کر لیں، اور اندر اندر وہ گڑبڑ کریں اور ہمیں دھوکا دینے کی کوشش کریں، اس قسم کے توہمات میں پڑھنے کی ضرورت نہیں، تَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ: اللہ پہ بھروسا کیجئے، صلح کی پیشکش کرتے ہیں تو صلح کر لو اور اللہ پر بھروسہ کرو، بے شک وہ سننے والا جاننے والا ہے۔ اور اگر اُن کا ارادہ آپ کو دھوکا دینے کا ہی ہے کہ ظاہری طور پر صلح کر لیں، اور اندر اندر دشمنی کریں تو بھی کوئی بات نہیں فَاِنَّ حَسْبَكَ اللّٰهُ آپ نیک نیتی کے ساتھ حالات کو سنوارنے کی کوشش کریں، اگر اُن کے دل میں کسی قسم کا دھوکا ہو گا تو اللہ انہیں سنبھال لے گا۔ وَاِنْ يُّرِيْدُوْٓا اَنْ يَّخْدَعُوْكَ: اگر وہ ارادہ کریں آپ کو دھوکا دینے کا فَاِنَّ حَسْبَكَ اللّٰهُ: بے شک اللہ آپ کے لیے کافی ہے۔ ''اللہ وہ ہے جس نے آپ کو قوت پہنچائی اپنی مدد کے ساتھ'' یعنی پہلے جس طرح سے بدر میں آپ کو قوت اور طاقت دی، اللہ کی وہی نصرت اب بھی موجود ہے، اگر یہ کوئی دھوکا بازی کریں گے تو اللہ پھر آپ کو غالب کر دے گا۔ ''جس نے آپ کو قوت پہنچائی اپنی مدد کے ساتھ اور مؤمنین کے ذریعے سے'' یہ جو آپ کے ساتھ اہل ایمان لگا دیے، یہ آپ کی فوج بنا دی، یہ بھی اللہ کا ایک انعام ہے۔

اِتحاد، اِتفاق، اُلفت اللہ کا عظیم اِنعام ہیں

وَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ: یہ اس وقت کے اعتبار سے بہت بڑے انعام کی یاد دہانی ہے، کہ اللہ تعالیٰ نے مؤمنین کے دل آپس میں جوڑ دیے۔ غالباً سورۂ آلِ عمران میں آیا تھا وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا ۚ وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا (آیت: ۱۰۳)، یہ اللہ تعالیٰ نے اپنا انعام یاد دلایا کہ یاد کرو، تم آپس میں کس

طرح دشمن تھے، اور اس وقت جس قسم کی دشمنی ہوتی تھی آپ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے، کہ قبیلے کا قبیلے کے ساتھ ٹکراؤ، عصبیت، قومی عصبیت، وطنی عصبیت، اپنے اپنے مذہب کی عصبیت، اور اسی طرح سے ذرا ذرا بات پر انتہائی درجے کی شدت اور لڑائیاں کہ کوئی کسی کے سامنے جھکنے کے لئے، اور کسی کے ساتھ ملنے کے لیے تیار نہیں تھا، سارے کا سارا ملک خانہ جنگی میں مبتلا تھا، اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم کے ساتھ سرورِ کائنات ﷺ پر ایمان لانے والوں کو آپس میں متحد کر دیا، قبیلوں کا اختلاف ختم ہو گیا، برادریوں کا اختلاف ختم ہو گیا، مذہب کا اختلاف ختم ہو گیا، سارے ایک جان ہو گئے، یہ اللہ کا بہت بڑا انعام ہے کہ وَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ اللہ نے ان کے دلوں کو جوڑ دیا، ورنہ ان میں اختلافات کی شدت اتنی زیادہ تھی کہ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے نصرت نہ ہوتی اور اللہ کی طرف سے ان کے قلوب کو پھیرنا نہ ہوتا تو آپ تمام مال و دولت جتنا زمین میں موجود ہے، اگر آپ یہ چیے خرچ کر کے ان کو جوڑنا چاہتے تو آپ ان کو جوڑنے میں کامیاب نہ ہوتے۔ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا اگر آپ خرچ کر دیتے وہ سب چیزیں جو زمین میں ہیں تو آپ ان کے دلوں میں جوڑ نہ لگا سکتے، وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَيْنَهُمْ: لیکن اللہ نے ان کے دلوں کو جوڑ دیا۔ معلوم ہوا کہ کسی جماعت میں آپس میں اتفاق، محبت، اُلفت یہ اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا انعام ہے، اور یہ آپس میں اُلفت اور محبت اور آپس میں اتفاق یہ اللہ کے انعام کے ساتھ ہی ہوتا ہے، اگر اللہ کی طرف سے توفیق نہ ہو تو پھر انسان ظاہری طور پر کتنی ہی کوشش کر لے دل نہیں بدلے جا سکتے، دلوں کو بدلنا اللہ کے ہاتھ میں ہے، اتفاق بہت بڑی نعمت ہے۔ اِنَّهٗ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ بے شک اللہ تعالیٰ زبردست ہے حکمت والا ہے...... اے نبی! آپ کے لیے اللہ کافی ہے، اور وہ لوگ کافی ہیں جو آپ کے متبع ہیں، مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ یہ مَن کا بیان ہے، یعنی اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کیجئے، اور ظاہری طور پر مؤمنین کو ساتھ لیجئے، تو کوئی قوت آپ کے مقابلے میں نہیں ٹھہر سکتی، جس طرح سے آگے کچھ اسی قسم کی بات آ رہی ہے، کہ مؤمنوں کو اللہ تعالیٰ کس طرح سے غلبہ دے گا، اور ایک ایک مؤمن کتنوں پہ بھاری ہو سکتا ہے۔

وَاٰخِرُ دَعْوٰىنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ○

سوال:- ایک جگہ تو آ گیا: اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ (سورۂ زمر: ۴۲) کہ جانیں اللہ وصول کرتا ہے اور یہاں آ گیا: يَتَوَفَّى الَّذِيْنَ كَفَرُوا ۙ الْمَلٰٓئِكَةُ یہاں توفی کی نسبت فرشتوں کی طرف کی گئی ہے۔ یا اسی طرح الم تنزیل السجدہ کے اندر لفظ ہے: قُلْ يَتَوَفّٰىكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ: ملک الموت تمہیں وفات دیتا ہے۔ وہاں ایک فرشتے کا ذکر ہے اور یہاں ملائکہ کا ذکر ہے، اور وہاں اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ میں اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت کی گئی ہے، تو اس میں بظاہر تعارض معلوم ہوتا ہے۔

جواب:- آپ کی خدمت میں کئی دفعہ ذکر کیا جا چکا کہ وفات دینا اصل تو اللہ کا کام ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے کام کے لیے فرشتے جو متعین کر رکھے ہیں تو کبھی کبھی (اُن کی طرف) اسنادِ مجازی ہو جاتا ہے، وفات اللہ تعالیٰ دیتا ہے، اللہ کے حکم کے تحت ملک الموت آتے ہیں، اور پھر ملک الموت کے ساتھ اُن کے اعوان و انصار بہت سارے ہوتے ہیں، ملک الموت گویا کہ اس شعبے کا

اُمیر ہے، جس طرح سے کسی شعبے کا ایک انچارج ہوا کرتا ہے، باقی ان کے ساتھ اعوان وانصار اور بھی بہت زیادہ ہیں، اس لیے کبھی تو حقیقت کی طرف دیکھتے ہوئے صرف اللہ کی طرف نسبت آ گئی کہ وفات دینا اللہ کا کام ہے، اور کبھی اس شعبے کے اُمیر کی طرف نسبت آ گئی کہ یَتَوَفّٰکُمْ مَّلَکُ الْمَوْتِ، اور کبھی ان کے اعوان وانصار کی طرف نسبت کر دی گئی کہ یَتَوَفَّی الَّذِیْنَ کَفَرُوا الْمَلٰٓئِکَۃُ، تو تینوں کے درمیان کوئی تعارض نہیں ہے۔

یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِیْنَ عَلَی الْقِتَالِ ؕ اِنْ یَّکُنْ مِّنْکُمْ

اے نبی! مؤمنین کو لڑائی پر اُبھارو، اگر تم میں سے

عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ یَغْلِبُوْا مِائَتَیْنِ ۚ وَاِنْ یَّکُنْ مِّنْکُمْ

بیس ہوں گے ثابت قدم رہنے والے تو وہ دو سو پر غالب آجائیں گے، اور اگر تم میں سے

مِّائَۃٌ یَّغْلِبُوْٓا اَلْفًا مِّنَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا یَفْقَهُوْنَ ﴿۶۵﴾

سو ہوں گے تو وہ کافروں میں سے ہزار پر غالب آجائیں گے اس سبب سے کہ وہ کافر بے سمجھ لوگ ہیں ﴿۶۵﴾

اَلْـٰٔنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْکُمْ وَعَلِمَ اَنَّ فِیْکُمْ ضَعْفًا ؕ فَاِنْ یَّکُنْ

اب اللہ تعالیٰ نے تم سے تخفیف کردی اور اللہ کو معلوم ہے کہ بیشک تمہارے اندر کمزوری ہے، اگر تم میں سے

مِّنْکُمْ مِّائَۃٌ صَابِرَۃٌ یَّغْلِبُوْا مِائَتَیْنِ ۚ وَاِنْ یَّکُنْ مِّنْکُمْ

سو ہوں گے ثابت قدم رہنے والے تو غالب آجائیں گے دو سو پر، اور اگر تم میں سے ہزار

اَلْفٌ یَّغْلِبُوْٓا اَلْفَیْنِ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ ﴿۶۶﴾

ہوں گے تو غالب آجائیں گے دو ہزار پر اللہ کے حکم کے ساتھ، اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے ﴿۶۶﴾

مَا کَانَ لِنَبِیٍّ اَنْ یَّکُوْنَ لَهٗٓ اَسْرٰی حَتّٰی یُثْخِنَ فِی الْاَرْضِ ؕ

نبی کی شان کے لائق نہیں کہ اس کے لیے قیدی ہوں جب تک کہ خون ریزی نہ کرلے زمین میں،

تُرِیْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْیَا ۖ وَاللّٰهُ یُرِیْدُ الْاٰخِرَۃَ ؕ وَاللّٰهُ

تم ارادہ کرتے ہو دُنیا کے سامان کا، اللہ ارادہ کرتا ہے آخرت کا، اللہ تعالیٰ

عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿٦٧﴾ لَوْ لَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيْمَآ

زبردست ہے حکمت والا ہے﴿۶۷﴾ اگر اللہ کی طرف سے ایک لکھی ہوئی بات سبقت نہ لے جاتی تو البتہ پہنچتا تمہیں

اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿٦٨﴾ فَكُلُوْا مِمَّا غَنِمْتُمْ

عذابِ عظیم اس کام کی وجہ سے جس میں تم لگ گئے تھے﴿۶۸﴾ پس کھاؤ تم اس مال میں سے جو تم نے غنیمت میں حاصل کیا

حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿٦٩﴾ يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ

اس حال میں کہ وہ حلال اور پاکیزہ ہے، اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو، بیشک اللہ تعالیٰ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے﴿۶۹﴾ اے نبی! کہہ دو

لِّمَنْ فِيْٓ اَيْدِيْكُمْ مِّنَ الْاَسْرٰٓى ۙ اِنْ يَّعْلَمِ اللّٰهُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ

ان قیدیوں کو جو آپ کے قبضے میں ہیں اگر اللہ جانے گا تمہارے دِلوں کے اندر

خَيْرًا يُّؤْتِكُمْ خَيْرًا مِّمَّآ اُخِذَ مِنْكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ

بھلائی تو دے دے گا تمہیں اس سے بہتر چیز جو تم سے لی گئی ہے اور تمہیں بخش دے گا، اللہ تعالیٰ

غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿٧٠﴾ وَاِنْ يُّرِيْدُوْا خِيَانَتَكَ فَقَدْ خَانُوا اللّٰهَ

بخشنے والا رحم کرنے والا ہے﴿۷۰﴾ اور اگر یہ لوگ ارادہ کریں آپ سے خیانت کا پس تحقیق انہوں نے اللہ سے خیانت کی

مِنْ قَبْلُ فَاَمْكَنَ مِنْهُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿٧١﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ

اس سے پہلے بھی، اللہ نے ان پر قدرت دے دی، اور اللہ تعالیٰ علم والا ہے حکمت والا ہے﴿۷۱﴾ بے شک وہ لوگ

اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ

جو ایمان لائے اور انہوں نے ہجرت کی اور جہاد کیا اپنے مالوں کے ساتھ اور اپنی جانوں کے ساتھ اللہ کے

اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا اُولٰٓئِكَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ؕ

راستے میں اور وہ لوگ جنہوں نے ٹھکانا دیا اور مدد کی، ان کا بعض بعض کا دوست ہے،

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يُهَاجِرُوْا مَا لَكُمْ مِّنْ وَّلَايَتِهِمْ مِّنْ

اور وہ لوگ جو ایمان لے آئے اور انہوں نے ہجرت نہیں کی، تمہارے لیے اُن کی ولایت سے

شَیْءٍ حَتّٰی یُهَاجِرُوْاۚ وَاِنِ اسْتَنْصَرُوْكُمْ فِی الدِّیْنِ فَعَلَیْكُمُ

کچھ نہیں جب تک کہ وہ ہجرت نہ کرلیں، اور اگر وہ تم سے مدد طلب کریں دین کے معاملے میں تو تمہارے ذمے ہے

النَّصْرُ اِلَّا عَلٰی قَوْمٍۭ بَیْنَكُمْ وَبَیْنَهُمْ مِّیْثَاقٌؕ وَاللّٰهُ بِمَا

مدد کرنا مگر ایسے لوگوں کے خلاف کہ تمہارے اور ان کے درمیان عہد ہے، اللہ تعالیٰ

تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ ﴿۷۲﴾ وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا بَعْضُهُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍؕ

تمہارے عملوں کو دیکھنے والا ہے﴿۷۲﴾ اور وہ لوگ جنہوں نے کُفر کیا وہ بعض بعض کے وارث ہیں،

اِلَّا تَفْعَلُوْهُ تَكُنْ فِتْنَةٌ فِی الْاَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِیْرٌؕ ﴿۷۳﴾

اگر تم یہ کام نہیں کروگے تو علاقے میں فتنہ ہوجائے گا اور بڑا فساد ہوجائے گا﴿۷۳﴾

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَالَّذِیْنَ

اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور ہجرت کی اور اللہ کے راستے میں جہاد کیا اور وہ لوگ

اٰوَوْا وَّنَصَرُوْۤا اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّاؕ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ

جنہوں نے ٹھکانا دیا اور مدد کی یہی لوگ سچے پکے مؤمن ہیں، اُن کے لیے مغفرت ہے

وَّرِزْقٌ كَرِیْمٌ ﴿۷۴﴾ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا

اور رزقِ کریم ہے﴿۷۴﴾ جو اُس کے بعد ایمان لائیں گے اور ہجرت کریں گے اور جہاد کریں گے

مَعَكُمْ فَاُولٰٓىِٕكَ مِنْكُمْؕ وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰی بِبَعْضٍ

تمہارے ساتھ وہ بھی تم میں سے ہی ہیں، رشتے دار بعض بعض کے ساتھ زیادہ تعلق رکھنے والے ہیں

فِیْ كِتٰبِ اللّٰهِؕ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ﴿۷۵﴾

اللہ کے لکھے ہوئے قانون میں، بےشک اللہ تعالیٰ ہر چیز کے متعلق علم رکھنے والا ہے﴿۷۵﴾

خلاصہ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ حَسْبُكَ اللّٰهُ: اے نبی! آپ کے لیے اللہ کافی ہے، وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ:

مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ یہ مَن کا بیان ہے۔ اور وہ مؤمن کافی ہیں جنہوں نے آپ کی اتباع کی۔ یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِیْنَ: اے نبی! برانگیختہ کریں آپ مؤمنوں کو لڑائی پر۔ حَرِّضْ تحریض: برانگیختہ کرنا، ترغیب دے کر اُبھارنا، برانگیختہ فارسی کا لفظ ہے جس کا مفہوم ہے اُبھارنا۔ مؤمنین کو لڑائی پر اُبھارو، مؤمنین کو لڑائی کا شوق دلاؤ، اِنْ یَّکُنْ مِّنْکُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ: اگر تم میں سے بیس ہوں گے ثابت قدم رہنے والے، اگر تم میں سے بیس صابرون ہوں گے ثابت قدم رہنے والے ہوں گے، صبر کرنے والے ہوں گے، یَغْلِبُوْا مِائَتَیْنِ: تو وہ دوسو پر غالب آجائیں گے، وَاِنْ یَّکُنْ مِّنْکُمْ مِّائَةٌ: اور اگر تم میں سے سو ہوں گے یَّغْلِبُوْٓا اَلْفًا مِّنَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا: غالب آجائیں گے ہزار پر ان لوگوں میں سے جنہوں نے کُفر کیا، کافروں میں سے ہزار پر غالب آجائیں گے۔ اَلف ہزار کو کہتے ہیں۔ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا یَفْقَهُوْنَ: اس سبب سے کہ وہ کافر ایسی قوم ہے جو دِین کی سمجھ نہیں رکھتی، وہ ایسے لوگ ہیں جو سمجھتے نہیں ہیں، ان کو فقہ حاصل نہیں ہے، سمجھ حاصل نہیں ہے، بے سمجھ لوگ ہیں۔ اَلْئٰنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْکُمْ: اب اللہ تعالیٰ نے تم سے تخفیف کردی، بوجھ ہلکا کردیا، وَعَلِمَ اَنَّ فِیْکُمْ ضَعْفًا: اور اللہ کو معلوم ہے کہ بیشک تمہارے اندر کمزوری ہے، فَاِنْ یَّکُنْ مِّنْکُمْ مِّائَةٌ صَابِرَةٌ: اگر تم میں سے سو ہوں گے ثابت قدم رہنے والے، یَّغْلِبُوْا مِائَتَیْنِ: تو غالب آجائیں گے دوسو پر، وَاِنْ یَّکُنْ مِّنْکُمْ اَلْفٌ: اور اگر تم میں سے ہزار ہوں گے یَّغْلِبُوْٓا اَلْفَیْنِ: تو غالب آجائیں گے دو ہزار پر، بِاِذْنِ اللّٰهِ: اللہ کے حکم کے ساتھ، وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ: اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ مَا کَانَ لِنَبِیٍّ اَنْ یَّکُوْنَ لَهٗٓ اَسْرٰی: نبی کی شان کے لائق نہیں کہ اس کے لئے قیدی ہوں۔ اَسریٰ، اسیر کی جمع ہے جیسے قتیل کی جمع قتلیٰ آتی ہے۔ ''اس کے لئے قیدی ہوں'' حَتّٰی یُثْخِنَ فِی الْاَرْضِ: اَثْخَنَ اِثْخان کا معنی ہوتا ہے کسی کی قوت اور شوکت کو ختم کردینا، خونریزی کرکے کسی قوم کی کمر توڑ دی جائے، ان کی قوت اور شوکت کو ختم کردیا جائے تو اس کو اِثخان کہتے ہیں۔ ''جب تک کہ زمین میں کُفر کی شوکت کو ختم نہ کردے، جس وقت کہ زمین میں خون ریزی نہ کرلے'' یہ مفہوم ہے اس کا، یعنی اتنی خونریزی نہ کرلے جس سے مدِمقابل قوم کی قوت اور شوکت ملیامیٹ ہوجائے، مٹی میں مل جائے، ''جب تک کہ خون ریزی نہ کرلے زمین میں'' تُرِیْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْیَا: اس کا خطاب سرورِ کائنات ﷺ کے صحابہ کو ہے۔ تم ارادہ کرتے ہو دُنیا کے سامان کا، وَاللّٰهُ یُرِیْدُ الْاٰخِرَةَ: اللہ ارادہ کرتا ہے آخرت کا، وَاللّٰهُ عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ: اللہ تعالیٰ زبردست ہے حکمت والا ہے۔ لَوْلَا کِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ: کتاب مکتوب کے معنی میں۔ اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک بات لکھی ہوئی سبقت نہ لے جاتی، یعنی اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے پہلے سے ایک بات لکھی ہوئی نہ ہوتی، اگر اللہ کی طرف سے کتاب سبقت نہ لے جاتی، کتاب کا لفظ عربی میں مذکر ہے اور اُردو کے اندر یہ لفظ مؤنث ہے، یہاں کتاب مکتوب کے معنی میں ہے، لکھی ہوئی بات۔ ''اگر اللہ کی طرف سے ایک لکھی ہوئی بات سبقت نہ لے جاتی'' یعنی پہلے سے ایک بات لکھی ہوئی نہ ہوتی، تو لَمَسَّکُمْ فِیْمَآ اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ: لَمَسَّکُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ، البتہ لگتا تمہیں، چھوتا تمہیں، پہنچتا تمہیں عذابِ عظیم، فِیْمَآ اَخَذْتُمْ: اس کام کی وجہ سے جس میں تم لگ گئے تھے، جو تم نے اختیار کیا تھا، مَآ اَخَذْتُمْ: جو کام تم نے اختیار کیا، جس چیز کو تم نے لیا اس کے سبب سے تمہیں عذابِ عظیم پہنچتا۔ فَکُلُوْا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلٰلًا طَیِّبًا: پس کھاؤ تم اس مال میں سے جو تم نے غنیمت میں حاصل کیا، حَلٰلًا طَیِّبًا: حلال اور پاکیزہ، اس حال میں کہ وہ حلال اور پاکیزہ ہے، وَّاتَّقُوا اللّٰهَ: اللہ تعالیٰ سے

ڈرتے رہو، اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ: بیشک اللہ تعالیٰ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔ يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ: اے نبی! قُلْ لِّمَنْ فِيْٓ اَيْدِيْكُمْ مِّنَ الْاَسْرٰٓى: اَسریٰ کا لفظ پہلے گزر گیا۔ کہہ دے ان قیدیوں کو جو آپ کے قبضے میں ہیں، مِّنَ الْاَسْرٰٓى مَن کا بیان ہے۔ کہہ دے ان قیدیوں کو جو آپ کے ہاتھوں میں ہیں، جو آپ کے قبضے میں ہیں، اِنْ يَّعْلَمِ اللّٰهُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ خَيْرًا: اگر اللہ جانے گا تمہارے دلوں کے اندر بھلائی، يُّؤْتِكُمْ خَيْرًا مِّمَّآ اُخِذَ مِنْكُمْ: دے دے گا تمہیں بہتر اس چیز سے جو تم سے لی گئی ہے، مَا اُخِذَ مِنْكُمْ: جو تم سے لی گئی ہے اس سے بہتر چیز اللہ تمہیں دے گا، وَيَغْفِرْ لَكُمْ: اور تمہیں بخش دے گا، وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ: اللہ تعالیٰ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔ وَاِنْ يُّرِيْدُوْا خِيَانَتَكَ: اور اگر یہ لوگ ارادہ کریں آپ سے خیانت کا، فَقَدْ خَانُوا اللّٰهَ مِنْ قَبْلُ: پس تحقیق انہوں نے اللہ سے خیانت کی اس سے پہلے بھی، فَاَمْكَنَ مِنْهُمْ: اللہ نے ان کے اوپر قدرت دے دی، اس کا معنی یوں کرتا ہے، اللہ نے اِن پر قادر کر دیا، یعنی آپ کو اور آپ کی جماعت کو، ''اللہ نے اِن پر قدرت دے دی'' وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ: اور اللہ تعالیٰ علم والا ہے حکمت والا ہے۔ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا: بیشک وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے ہجرت کی وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ: اور جہاد کیا اپنے مالوں کے ساتھ اور اپنی جانوں کے ساتھ اللہ کے راستے میں، وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا: اور وہ لوگ جنہوں نے ٹھکانا دیا، وَّنَصَرُوْٓا: اور مدد کی، اُولٰٓئِكَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ: ان کا بعض بعض کا دوست ہے، بعض کا ولی ہے، حمایتی مددگار ہے، وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا: اور وہ لوگ جو ایمان لے آئے وَلَمْ يُهَاجِرُوْا: اور انہوں نے ہجرت نہیں کی، اپنے گھر بار کو نہیں چھوڑا، مَا لَكُمْ مِّنْ وَّلَايَتِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ: تمہارے لیے اُن کی ولایت سے کچھ نہیں، یعنی تمہارا ان کے ساتھ ولایت کا کوئی تعلق نہیں ہے، تمہارے لیے ان کی ولایت سے، ان کی رفاقت سے کچھ نہیں، حَتّٰى يُهَاجِرُوْا: جب تک کہ وہ ہجرت نہ کرلیں، وَاِنِ اسْتَنْصَرُوْكُمْ: اور اگر وہ تم سے مدد طلب کریں فِي الدِّيْنِ: دین کے معاملے میں فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ: تمہارے ذِمے ہے مدد کرنا، اِلَّا عَلٰى قَوْمٍۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ: مگر ایسے لوگوں کے خلاف کہ تمہارے اور ان کے درمیان عہد ہے، وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ: اللہ تعالیٰ تمہارے عملوں کو دیکھنے والا ہے۔ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا: اور وہ لوگ جنہوں نے کُفر کیا بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ: وہ بعض بعض کے اولیاء ہیں، رفیق ہیں۔ اور ''ولی'' کا معنی وارث بھی کیا گیا ہے، بعض بعض کے وارث ہیں۔ اِلَّا تَفْعَلُوْهُ: اگر تم یہ کام نہیں کرو گے، یہ قانون نہیں نافذ کرو گے جو پیچھے ذِکر کر دیا گیا ہے، ایمان کی بنا پر آپس میں تناصُر، ایمان کی بنا پر آپس میں وراثت، اور اہلِ ایمان کی مدد اگر وہ آپ سے مدد طلب کریں، ''اگر یہ نہیں کرو گے'' تَكُنْ فِتْنَةٌ فِي الْاَرْضِ: تو علاقے میں فتنہ ہو جائے گا، وَفَسَادٌ كَبِيْرٌ: اور فسادِ کبیر ہو جائے گا، بڑا فساد ہو جائے گا، علاقے میں فتنہ وفساد واقع ہو جائے گا اگر تم یہ کام نہیں کرو گے۔ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا: اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور ہجرت کی، وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ: اور اللہ کے راستے میں جہاد کیا، وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا: اور وہ لوگ جنہوں نے ٹھکانا دیا اور مدد کی، اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا: یہی لوگ سچے پکے مؤمن ہیں، لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ: ان کے لئے مغفرت ہے اور رزقِ کریم ہے۔ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْۢ بَعْدُ: جو اس کے بعد ایمان لائیں گے، اور ہجرت کریں گے اور جہاد کریں گے تمہارے ساتھ، وہ بھی تم میں سے ہی ہیں۔ وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ: اُولوا، ذُو کی جمع ہے صاحب کے معنی میں، اور اَرحام رَحم کی جمع ہے، رَحم اصل میں تو عورت کی بچہ دانی کو کہتے ہیں جس میں بچہ پیدا ہوتا ہے، لیکن آپس

میں رشتہ داری چونکہ اُسی تعلق کی بنا پر ہوتی ہے تو اس لیے اُولُوا الْاَرْحَامِ سے مراد رشتہ دار ہوتے ہیں۔ ''رشتے دار بعض بعض کے ساتھ زیادہ تعلق رکھنے والے ہیں اللہ کے قانون میں'' فِیْ کِتٰبِ اللّٰہِ: اللہ کے لکھے ہوئے قانون میں، اِنَّ اللّٰہَ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ: بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز کے متعلق علم رکھنے والا ہے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

تفسیر

کثرت سے صرفِ نظر...... اللہ تعالیٰ پر اِعتماد اور متبعین کو ساتھ رکھنے کا حکم

جہاد کی ترغیب دیتے ہوئے اللہ تعالیٰ سرورِ کائنات ﷺ کو خطاب کر کے کہتے ہیں، کہ آپ کے لیے اللہ کافی، اور مؤمنوں کی یہ چھوٹی سی جماعت کافی، اس لیے آپ دوسروں کی کثرت کو نہ دیکھئے، اور اللہ تعالیٰ پر اعتماد کیجئے، اور ظاہری طور پر اپنے متبعین مؤمنین کو ساتھ لیجئے، اور اللہ تعالیٰ کی مدد کے ساتھ اور ظاہری طور پر ان مؤمنین کے تعاون کے ساتھ اللہ تعالیٰ آپ کو کُفّار کے مقابلے میں فتح دے گا۔ اور مؤمنین کو بھی برانگیختہ کرتے رہیے، بھڑکاتے رہیے، ترغیب دیتے رہیے، شوق دلائیے، لڑائی پر اُبھاریے۔

اپنے سے دس گنا قوت سے مقابلہ کرنے کا حکم

اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اگلی بات جو کہی جارہی ہے بظاہر تو یہ خبر ہے لیکن معنیً اِنشاء ہے، صورۃً خبر ہے معنیً انشاء ہے، آپ کے سامنے کئی دفعہ مثال آتی رہتی ہے کہ بات کو ذکر تو کیا جاتا ہے خبر کے انداز میں، اور حقیقت میں حکم دینا مقصود ہوتا ہے، یہاں بھی اسی طرح سے ذکر تو یوں کیا جارہا ہے کہ اگر تم میں سے بیس آدمی ہوں گے مستقل مزاج، مصیبت برداشت کرنے والے، تکلیفیں سہنے والے، میدان میں جم جانے والے، تو اللہ تعالیٰ اُن کو دوسو کے اوپر غلبہ دے گا، یہ خبر ہے۔ اور اگر تم میں سے سو ہوں گے تو وہ کافروں میں سے ایک ہزار پر غالب آجائیں گے۔ اور اتنی بڑی تعداد پر اتنی قلیل جماعت کا غلبہ اس وجہ سے ہے کہ کافروں کو سمجھ حاصل نہیں ہے، جب اُن کو دِینی بصیرت حاصل نہیں تو نہ تو اُن کے سامنے کوئی پختہ مقصد ہے، اور نہ اُن کے اندر خون بہانے کے لیے اس قسم کا جذبہ ہے، جس طرح سے مؤمنین کو دِینی سمجھ حاصل ہوجانے کے بعد اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لیے، جنّت حاصل کرنے کے لیے، آخرت کی آبادی کے لیے جس قسم کا شوق اور جذبہ اُبھرتا ہے، کافروں کے پاس وہ جذبہ نہیں ہے، یہ قلبی بصیرت ہے جو انسان کے قدم جماتی ہے، حوصلہ بڑھاتی ہے، جانبازی پر انسان تیار ہوجاتا ہے، جان قربان کرنے کو اپنے لیے فخر سمجھتا ہے، یہ ایک دِینی بصیرت ہے، کافروں کو چونکہ یہ حاصل نہیں ہے، اس لیے یہ کمزور ہیں، اور مؤمنین کو حاصل ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کو مضبوط کر رکھا ہے، تو یہ اگر بیس ہوں گے تو دوسو پر غالب آجائیں گے، ایک سو ہوں گے تو کافروں میں سے ایک ہزار پر غالب آجائیں گے، تو یہ دیکھ لیجئے! نسبت دس گنا ہے، بیس کے مقابلے میں دوسو، یہ دس گنا زیادہ ہوئے، اور سو کے مقابلے میں ہزار یہ دس گنا زیادہ ہوئے، یہ صورۃً خبر ہے کہ ایسا ہوجائے گا، لیکن معنیً اِنشاء ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ بیس آدمیوں کے

مقابلے میں اگر دو سو کافر آئیں تو میدان سے ہٹنے اور بھاگنے کی اجازت نہیں ہے، اور اگر سو کے مقابلے میں ہزار کافر آجائیں تو میدان چھوڑنے کی اجازت نہیں ہے، دس گنا طاقت کے ساتھ ٹکرا جانا یہ مسلمانوں پر فرض ہے، اور صبر و استقامت کے ساتھ اگر یہ میدان میں ڈٹیں گے تو اللہ تعالیٰ فتح بھی دے گا۔ تو اس میں یہ حکم تھا کہ اگر (دشمن کی) دس گنا قوت ہو تو اس کی طرف سے پیٹھ نہیں پھیرنی، پہلے پہلے ابتدا میں ایسے ہی تھا۔

مذکورہ حکم میں تخفیف

لیکن جس وقت مسلمانوں کی تعداد بڑھ گئی، اور نئے نئے لوگ مسلمان ہو گئے، جماعت داخل ہو گئے تو کچھ مدت کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس حکم میں تخفیف کر دی، یہ آیت اگرچہ متصل ہی رکھی ہوئی ہے: اَلْـٰٔنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْكُمْ، لیکن اس کا نزول بہت بعد میں ہوا ہے، چونکہ مضمون ایک ہی ہے اس لیے دونوں کو یہاں اکٹھا کر دیا گیا۔ آیات کے اُترنے کی ترتیب اور ہے، اور قرآنِ کریم میں رکھے جانے کی ترتیب اور ہے، جیسے احادیث میں آتا ہے کہ جس وقت آیات اُترا کرتی تھیں تو سرورِ کائنات ﷺ کاتب کو بلاتے اور لکھواتے اور یہ کہتے کہ ان آیات کو فلاں سورت میں فلاں جگہ رکھ لو، ان آیات کو فلاں آیات کے ساتھ جوڑ دو۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ قرآنِ کریم کے اُترنے کی ترتیب اور ہے، اور اس کو جمع کرنے کی ترتیب اور ہے۔ تو یہ آیت اُتری تو کافی مدت کے بعد ہے، لیکن چونکہ اس کا مضمون اسی آیت کے ساتھ ملتا تھا، اس لیے اس کو اس کے ساتھ جوڑ دیا گیا۔ اَلْـٰٔنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْكُمْ: اللہ تعالیٰ نے اب تم پہ تخفیف کر دی۔ جس سے معلوم ہو گیا کہ پہلے ذمہ داری ڈالی تھی کہ بیس آدمی دو سو کے مقابلے میں ڈٹیں، ایک سو آدمی ایک ہزار کے مقابلے میں ڈٹیں، پہلے یہ ذمہ داری ڈال دی گئی تھی، یہ بوجھ اس اُمت کے کندھوں پر ڈالا گیا تھا، کہ اپنے سے دس گنا قوت کے ساتھ ٹکرلیں۔

تخفیف کی وجہ

لیکن بعد میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں نے تخفیف کر دی، کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ تمہارے اندر کمزوری ہے۔ یہ کمزوری کہاں سے آگئی؟ اصل بات یہ ہے کہ ابتدا میں جو مسلمان تھے خاص طور پر وہ مہاجرین جو مکہ معظمہ کے اندر کُفار کے ہاتھوں پٹتے رہے، ظلم و ستم کا نشانہ بنتے رہے، اُن کے اندر کُفر کے ساتھ ٹکرانے کا جو جوش خروش تھا، جو پختگی تھی، بعد میں جس طرح سے لوگ نئے نئے مسلمان ہوتے گئے، اُن کے اندر وہ پختگی نہیں تھی، السّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ کے جو جذبات تھے، وہ بعد والے لوگوں کے نہیں تھے، اور فقہ اور بصیرت جس طرح سے السّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ کو حاصل تھی، پچھلوں کو وہ فقہ اور بصیرت حاصل نہیں تھی، اور ویسے بھی یہ قاعدہ ہے کہ جب کام کرنے والے تھوڑے ہوں، اور اُن کے اوپر کوئی ذمہ داری ڈال دی جائے کہ تم نے یہ کام کرنا ہے، تو کتنا ہی مشکل کام کیوں نہ ہو وہ ہمت کر کے لگے رہتے ہیں۔ اور جس وقت بھیڑ زیادہ ہو جائے، بہت سارے لوگ ہو جائیں اور کہہ دیا جائے کہ یہ کام کرنا ہے، تو پھر ہر شخص کہتا ہے کہ بہت سارے ہیں، کر لیں گے، فلاں کر لے گا، فلاں کر لے گا، اس طرح سے پھر ہمت کے اندر کمی آہی جایا کرتی ہے۔ چنانچہ پہلا حکم اس وقت کا ہے جب مسلمانوں کی تعداد قلیل تھی، جیسے کہ بیس اور سو کی مثال وہاں

اختیار کی گئی، اور دُوسرا حکم اس وقت آیا جب مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہوگئی، اس لیے وہاں دیکھو! سو اور ہزار کی مثال اختیار کی گئی، یہ اُس وقت کی بات ہے جب کہ تعداد بڑھ گئی تھی، تو تعداد کے بڑھ جانے کی صورت میں بھی ہر شخص کی ہمت کے اندر کمی آجاتی ہے، اور السّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ کے بعد جو لوگ ایمان لا رہے تھے، اُن کے اس قسم کے جذبات نہیں تھے، اور اُن کو اس قسم کی بصیرت حاصل نہیں تھی، جس قسم کے جذبات اور بصیرت پہلے لوگوں کو حاصل تھی، اس لیے اللہ تبارک وتعالیٰ نے تخفیف کردی۔ تخفیف کا حاصل یہ ہے کہ اب دوگنا قوت کے ساتھ ٹکرانا ضروری ہے، دوگنا قوت کے مقابلے میں اگر قدم اکھڑ جائیں گے اور پیٹھ پھیر دو گے تو اللہ کے ہاں مجرم ہوگے، میدانِ جہاد سے بھاگنے کی سزا جس طرح سے پہلے آپ کے سامنے آچکی ہے کہ اللہ کی طرف سے غضب آتا ہے اور اللہ ناراض ہوتے ہیں، یہ گناہِ کبیرہ ہے۔ دوگنا قوت کے مقابلے میں مسلمان اگر میدان چھوڑتا ہے تو اللہ کے ہاں مجرم ہوگا، پہلے حکم تھا کہ دس گنا قوت کے مقابلے میں ڈٹ جانا ہے اور میدان کو چھوڑنا نہیں ہے، تو یہ دونوں آیتیں یہاں اکٹھی رکھ دی گئیں۔

''مؤمنوں کو برانگیختہ لڑائی پر، اگر تم میں سے بیس ہوں گے ثابت قدم، تو غالب آجائیں گے دو سو پر، اور اگر تم میں سے سو ہوں گے تو غالب آجائیں گے ہزار پر ان لوگوں میں سے جنہوں نے کفر کیا، اس سبب سے کہ وہ لوگ دِین کی سمجھ نہیں رکھتے۔ اب اللہ نے تم سے تخفیف کردی، اور معلوم کرلیا کہ تمہارے اندر کمزوری ہے، فَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ صَابِرَةٌ: اگر تم میں سے سو ہوں گے جمنے والے تو غالب آجائیں گے دو سو پر، وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ اَلْفٌ: اگر تم میں سے ہوں گے تو غالب آجائیں گے دو ہزار پر اللہ کے اِذن سے، وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ: اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ جتنا صبر اور استقامت اختیار کرو گے اللہ تعالیٰ کی طرف سے معیت اتنی ہی حاصل ہوگی۔

بدر کے قیدیوں کی فدیہ لے کر رہائی کے فیصلے پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے سخت تنبیہ

اگلی آیات کا تعلق بھی غزوۂ بدر کے واقعات سے ہی ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ بدر میں ستر کافر تو مارے گئے تھے، اور ستر گرفتار ہوگئے تھے، تو گرفتار کرکے اُن کو مدینہ منورہ میں لایا گیا، مدینہ منورہ میں آنے کے بعد مشورہ شروع ہوا کہ ان ستر کے ساتھ کیا برتاؤ کرنا ہے؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ ان دونوں کا مشورہ تو یہ تھا کہ اب سب کو قتل کردیا جائے، جب ہم ان کو قتل کردیں گے تو کُفر کی شوکت بالکل ٹوٹ جائے گی، یہ سارے کے سارے لوگ وہ ہیں جو اسلام کے انتہائی درجے کے بدترین دشمن ہیں، ان کو چھوڑنا مصلحت نہیں ہے، اگر یہ چھوٹ کے چلے گئے تو بعد میں جا کے پھر اسی قسم کی دشمنیاں کریں گے، اور جب ان کا خون بہا دیا جائے گا تو اس جماعت کی کمر ٹوٹ جائے گی، اور ان میں کوئی کسی قسم کی شوکت باقی نہیں رہے گی، ان دونوں کا مشورہ تو یہ تھا بلکہ بعض آثار میں آتا ہے کہ ان گرفتار ہونے والوں میں بعض حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قریبی رشتہ دار تھے، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مشورہ دیا تھا کہ ہر شخص اپنے قریبی رشتہ دار کو قتل کرے، میرا فلاں رشتہ دار میرے سپرد کرو، اس کو تو میں قتل کرتا ہوں، اسی طرح سے جس کا جو رشتہ دار گرفتار آیا ہوا ہے وہ اس کو قتل کرے، بڑی شدت کے ساتھ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ مشورہ دیا تھا، اور انصار میں سے سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کی رائے بھی یہی تھی۔ اور بعض دوسرے حضرات کہنے لگے کہ یا رسول اللہ! ان کو فدیہ لے کے چھوڑ دیا جائے، ایک تو

فائدہ یہ ہوگا کہ فدیہ سے جو مال حاصل ہوگا اس سے ہماری معاشی حالت اچھی ہوگی، آئندہ جہاد کے لیے تیاری کا موقع ملے گا، دوسرے یہ اپنی برادری ہے، اپنی قوم ہے، آج نہیں تو کل، ممکن ہے ان میں سے بعض کو اللہ تعالیٰ اسلام کی توفیق ہی دے دیں، اس لیے ان کو چھوڑ دینا چاہیے۔ اور سرورِ کائنات ﷺ نے فرمایا تھا کہ اگر ان کو چھوڑا گیا تو ان کے عوض میں اللہ تبارک وتعالیٰ کسی دوسرے موقع پر تم میں سے ستر آدمیوں کو شہادت دیں گے، ستر آدمی تم میں سے قتل کیے جائیں گے، یہ ساری کی ساری باتیں سامنے آگئی تھیں، اور مشورے کے اندر یہ بات ذکر کردی گئی تھی، تو صحابہ کرام ؓ نے جس وقت یہ دورائیں اختیار کرلیں، ابوبکر صدیق ؓ چونکہ طبعاً بہت شفیق اور رحیم تھے، بہت نرم تھے، اُن کی رائے یہی تھی کہ ان کو فدیہ لے کے چھوڑ دیا جائے۔ سرورِ کائنات ﷺ کے سامنے جب یہ دونوں رائیں آئیں، تو آپ ﷺ نے بھی اپنے رحمۃ للعالمین ہونے کے جذبے کے تحت اسی کو ترجیح دی، کہ ان کو قتل کرنے کی بجائے ان سے فدیہ لے لیا جائے، اور فدیہ لے کے ان کو چھوڑ دیا جائے، ممکن ہے کہ آنے والے وقت میں ان میں سے بعض مؤمن ہوجائیں، جیسا کہ واقعہ ہے کہ حضرت عباس ؓ بھی ان گرفتار ہونے والوں میں سے تھے، جو بعد میں مسلمان ہوئے، اور سرورِ کائنات ﷺ کے داماد ابوالعاص ؓ بھی ان میں سے تھے جو بعد میں مسلمان ہوئے، اور بھی ان میں کئی ایسے تھے جن کو بعد میں ایمان کی توفیق ہوئی، تو ترجیح اسی کو دے دی گئی کہ فدیہ لے کے ان کو چھوڑ دیا جائے، لیکن بعد میں اللہ تبارک وتعالیٰ کا منشا اس کے خلاف ظاہر ہوا کہ بات اسی طرح سے ٹھیک تھی جس طرح سے حضرت عمر ؓ نے کہی تھی۔[1] تو یہاں اللہ تبارک وتعالیٰ اس کے اُوپر کچھ تھوڑا سا عتاب فرماتے ہیں، لیکن پھر اس کے نتیجے میں مغفرت کا اعلان کرتے ہیں، کہ کسی نبی کے لیے مناسب نہیں کہ اس کے لیے قیدی ہوتے، جب تک کہ زمین کے اندر خون ریزی نہ کرلے، یعنی کفر کی قوت اور شوکت کو بالکل نہ مٹادے، جس وقت تک اُن کی قوت اور شوکت کو ملیامیٹ نہ کردے اُس وقت تک قیدی بنانا مناسب نہیں تھا۔ تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا: یہ خطاب ہے اُن لوگوں کو جنہوں نے مشورہ دیا تھا کہ فدیہ لے لیا جائے، چونکہ بظاہر اس میں دُنیا کا حصول تھا اس لیے اس جذبے کے اُوپر انکار کیا گیا کہ تم ارادہ کرتے ہو دُنیا کے سامان کا، اور اللہ ارادہ کرتا ہے آخرت کا، اللہ چاہتا ہے کہ ہر وقت تمہاری نظر آخرت کے ثواب پر ہونی چاہیے، دُنیا کے مال ودولت کے حاصل کرنے کا ارادہ اللہ کو پسند نہیں، وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ: اللہ تعالیٰ زبردست ہے حکمت والا ہے، پھر کسی دوسرے وقت میں تمہیں غلبہ دیتا اور اپنی حکمت کے تحت بہت ساری فتوحات تمہیں دیتا۔ لیکن اب یہ جو ہوگیا بس ٹھیک ہے ہوگیا، کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے قانون لکھا ہوا ہے، کہ مجتہد جس وقت اجتہاد کرے، اور اپنے طور پر دُرستی کو پانے کی کوشش کرے، پھر اگر اس سے لغزش ہوجائے تو اللہ تعالیٰ اس کے اوپر گرفت نہیں فرماتے، یا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے قانون یہی لکھا ہوا تھا کہ اس طرح سے فدیہ لینا بھی جائز ہوجائے گا جیسا کہ بعد میں شریعت کے اندر یہ قانون نافذ کردیا گیا کہ اِمام اگر مناسب سمجھتا ہے تو فدیہ لے کے چھوڑ سکتا ہے، اگرچہ جس وقت یہ واقعہ پیش آیا اُس وقت تک براہِ راست اس بارے میں کوئی ہدایات نہیں آئی تھیں، لیکن آئندہ یہ جواز آنے والا تھا، اور ان میں سے بعض لوگ ایمان لانے والے تھے، اللہ کی تقدیر میں یہ چیز موجود تھی، جس کی بنا پر اللہ تبارک وتعالیٰ نے تمہاری اس لغزش کو معاف کردیا، اور اس کے اُوپر کوئی کسی قسم کی گرفت

(۱) کتب سیرت میں اس کی تفصیل موجود ہے، دیکھئے: فتح الباری ج ۷ ص ۲۴۰ بحوالہ "سیرت مصطفیٰ" ج ۲ ص ۱۴۳

نہیں کی، اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک لکھی ہوئی بات پہلے گزری ہوئی نہ ہوتی تو جو تم نے لیا ہے، فِیْمَآ اَخَذْتُمْ: جو تم نے لیا ہے، یا جس کام میں تم لگ گئے، جو فعل تم نے اختیار کیا، اُس کی وجہ سے تمہیں عذاب عظیم پہنچتا۔ چنانچہ جب یہ آیات اُتری ہیں تو سرورِ کائنات ﷺ اللہ تعالیٰ سے جس طرح سے ڈرا کرتے تھے، تو آپ ﷺ نے ڈرتے ہوئے اللہ کے سامنے مزید توبہ واستغفار کی اور فرمایا کہ دیکھو! اگر اللہ کا عذاب آجاتا تو عمر اور سعد بن معاذ کے علاوہ کوئی نہ بچتا، کیونکہ ان کی رائے تھی کہ ان کو قتل کیا جائے اور ان کی خون ریزی کردی جائے۔ (۱)

جنگِ بدر سے حاصل کردہ مالِ غنیمت کے حلال ہونے کا حکم

فَكُلُوْا مِمَّا غَنِمْتُمْ: تو جس وقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ ظاہر ہوا کہ یہ کام تم نے اچھا نہیں کیا، اب ہوگیا تو چلو قابلِ برداشت ہے، کیونکہ اللہ کے قانون میں کچھ اس قسم کی گنجائش تھی، تو اب یہ شبہ ہوا کہ چلو گناہ تو معاف ہوگیا، لیکن یہ جو ہم نے مالِ غنیمت حاصل کیا ہے، یہ بھی حلال ہے یا نہیں؟ تو اس کے ساتھ ہی اجازت دے دی گئی کہ پھر کھاؤ تم اس مال کو جو تم نے غنیمت میں حاصل کیا اس حال میں کہ حلال اور طیب ہے، وَاتَّقُوا اللّٰهَ اللہ سے ڈرتے رہو، اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ: بے شک اللہ تعالیٰ بخشنے والے رحم کرنے والے ہیں۔ تو اس مال کو تمہارے لیے حلال کردیا گیا، اس کو اسی طرح سے کھا پی سکتے ہو۔

بدر کے قیدیوں کو کچھ تنبیہات اور ہدایات

اے نبی! کہہ دیجئے ان قیدیوں کو جو آپ کے قبضے میں۔ یہ ان قیدیوں کے لیے کچھ تنبیہات اور ہدایات ہیں۔ ان قیدیوں کو کہہ دیجئے جو تمہارے قبضے میں ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ تمہارے دل میں بھلائی دیکھے گا، یعنی اگر تمہارے دل میں خلوص پیدا ہوگیا اور تم مخلصانہ ایمان لے آئے، تو دے گا تمہیں بہتر اس چیز سے جو تم سے لی گئی ہے، یعنی فدیہ میں جو تم سے مال لیا گیا ہے، اس سے بہتر اللہ تعالیٰ تمہیں دُنیا اور آخرت میں دے گا، اور تمہارے گناہ بخش دے گا، اور اللہ تعالیٰ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔ اور اگر یہ فدیہ دے کے چھوٹ گئے، اور جا کے پھر کوئی خیانت کرنے لگے، تو اس خیانت سے کسی کا کچھ نہیں بگڑے گا، جیسے اللہ نے پہلے پکڑوا دیا، کسی دوسرے میدان میں پھر آپ کو اِن کے اوپر قدرت دے دے گا۔ اگر یہ ارادہ کریں گے آپ سے خیانت کا تو یہ خیانت کرچکے ہیں اللہ سے اس سے پہلے بھی، پھر اللہ نے ان کے اوپر قدرت دے دی، اور اللہ تعالیٰ جاننے والا حکمت والا ہے۔

''مہاجرین وانصار بعض، بعض کے اولیاء ہیں'' کا مفہوم

بے شک وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنہوں نے ہجرت کی (تحت اللفظ بات واضح ہے، اس میں کوئی خاص وضاحت کی ضرورت نہیں) بے شک وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے ہجرت کی، اور اپنے مالوں کے ساتھ اور اپنی جانوں کے ساتھ اللہ کے راستے میں جہاد کیا، اور وہ لوگ جنہوں نے ٹھکانا دیا (یہ اہل مدینہ ہوگئے جن کو ہم انصار کہتے ہیں) وہ لوگ جنہوں نے ٹھکانا دیا

---

(۱) تفسیر مظہری ج ۴ ص ۳۲، تحت سورۃ الانفال/ سعد بن معاذؓ کا نام زرقانی شرح مواہب ج ۱ ص ۴۴۲ پر موجود ہے، بحوالہ ''سیرت مصطفیٰ'' ج ۲ ص ۱۲۸

اور مدد کی، یہ سارے آپس میں ایک دوسرے کے ولی ہیں۔ چنانچہ پہلے پہلے جب مدینہ منورہ میں گئے ہیں تو مہاجرین وانصار میں سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے رشتۂ اُخوّت قائم کر دیا تھا، حتیٰ کہ مہاجرین وانصار کے اندر وراثت بھی جاری ہوگئی تھی، اگر انصاری کا کوئی رشتہ دار کافر ہے تو اُس کو وراثت نہیں پہنچتی تھی، بلکہ اس کا جو مسلمان بھائی مہاجر تھا اُس کو وراثت پہنچتی تھی، اس طرح سے آپس میں وراثت کا تعلق بھی لگا دیا گیا تھا، اور مہاجرین کے وارث جو کہ کُفّار تھے وہ وراثت سے محروم ہوگئے، اور اگر کوئی مہاجر مرتا تو اُس کی وراثت اس انصاری کو پہنچتی تھی جس کے ساتھ اس کی اُخوّت قائم کر دی گئی تھی۔ لیکن اگر رشتہ دار بھی مسلمان ہو جائیں، انصار کے ہوں یا مہاجرین کے، پھر رشتہ داروں کا حق مقدم ہے، جس طرح سے اس سورت کی آخری آیت کے اندر اشارہ کر دیا گیا، یعنی مہاجر اور انصار کو اس تعلق کی بنا پر وراثت تب پہنچتی تھی جب رشتہ داروں میں سے کوئی وارث مسلمان نہ ہو، اور اگر رشتہ داروں میں سے کوئی وارث مسلمان ہو تو پھر حق دار وہی رشتہ دار ہے، اگر کسی مہاجر کا بیٹا ہے اور وہ بھی مسلمان ہے اور ساتھ مہاجر ہو کر آیا ہوا ہے پھر تو وراثت اُسی کو پہنچے گی، لیکن اگر کوئی مہاجر ایسا ہے کہ اس کا کوئی رشتہ دار مسلمان نہیں، یا ہجرت کر کے مدینہ منورہ میں نہیں آیا ہوا، تو ایسی صورت میں اُس کی وراثت اُسے پہنچے گی جو انصاری اس کا بھائی بنا دیا گیا۔ تو یہاں اسی بات کو ذکر کیا جا رہا ہے کہ بعض بعض کے اولیاء ہیں، جس کے اندر وراثت بھی آگئی کہ بعض بعض کے وارث ہیں، حمایت اور نصرت کا تعلق بھی ہے۔

مسلمان اور کافر کی وراثت کا مسئلہ

اور وہ لوگ جو ایمان لے آئے اور انہوں نے ہجرت نہیں کی، دار الحرب میں بیٹھے ہیں، تمہارے لیے اُن کی ولایت سے کچھ نہیں، یعنی تمہارا اُن کے ساتھ ولایت کا کوئی تعلق نہیں ہے، یہاں وراثت جاری نہیں ہوگی۔ اختلافِ دارین کے ساتھ بھی وراثت کا تعلق توڑ دیا گیا، جس طرح سے اختلافِ دین کے ساتھ وراثت کا تعلق توڑ دیا جاتا ہے، ایک مسلمان ہو ایک کافر ہو تو ایک دوسرے کے وارث نہیں، اس وقت دار الاسلام اور دار الحرب کا مسئلہ بھی یہی تھا، کہ اگر مسلمان رشتہ دار دار الحرب میں بیٹھا ہے، تو وہ دار الاسلام کے مسلمان کا وہ وارث نہیں تھا، جب تک کہ وہ ہجرت کر کے نہ آجائیں۔

ہاں! البتہ دینی معاملہ میں اگر تم سے مدد مانگیں تو مدد تمہارے ذمے ہے، وَاِنِ اسْتَنْصَرُوْكُمْ: اگر تم سے مدد طلب کریں دین کے معاملے میں، تو تمہارے ذمے ہے کہ ان کی مدد کرو۔ ہاں! البتہ ایسا ہو سکتا ہے کہ دار الاسلام میں رہتے ہوئے تم نے کسی قوم کے ساتھ معاہدہ کیا ہوا ہے، اور دار الحرب میں جو مسلمان ہیں ان کا اُلجھاؤ اسی قوم سے ہوگیا، اسی کے خلاف کوئی گڑبڑ ہے، اب مسلمان اگر مدد مانگیں تو اپنے معاہدے کی پابندی تمہارے لیے زیادہ ضروری ہے، یعنی دار الحرب کے مسلمانوں کے معاملات دار الاسلام کے معاہدات پر اثر انداز نہیں ہونے چاہئیں، جہاں تک ہو سکے اُن کی امداد کرو، لیکن ایسے لوگوں کے خلاف امدا کرنا تمہارے لیے ٹھیک نہیں جن کے ساتھ تمہارا معاہدہ ہو چکا ہے۔ تو دار الاسلام کا معاہدہ مقدم ہے اور دار الحرب میں رہنے والوں مسلمانوں کے ساتھ تعاون اور نصرت بھی ضروری ہے، لیکن ایسی قوم کے خلاف تم کوئی مدد نہیں دے سکتے جن کے ساتھ تمہارا معاہدہ ہو چکا ہے، دار الاسلام کے معاہدے مقدم ہیں۔ ”مگر ایسی قوم کے خلاف کہ تمہارے درمیان اور ان کے درمیان میثاق ہے،

اللہ تعالیٰ تمہارے عمل کو دیکھنے والا ہے۔'' اور وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا، یعنی کافر، وہ بعض بعض کے وارث ہیں کافروں کی وراثت کافروں کو پہنچے گی۔

اسلام کی بنا پر آپس میں تناصر توارث نہ ہونے کا نقصانِ عظیم

اگر تم اس قانون کی پابندی نہیں کرو گے، یعنی اسلام کی بنا پر تمہارا آپس میں تناصر اور توارث نہیں ہوگا، ایک دوسرے کی نصرت اور وراثت کا تعلق اسلام کی بنا پر نہیں ہوگا، اور اگر تم مسلمانوں کی امداد نہیں کرو گے بلکہ وہی جاہلانہ تعصب رہے گا، کہ اپنے بھائی کی مدد کرو چاہے وہ کافر ہی کیوں نہ ہو، جس وقت تک تمہارے یہ جذبات نہیں بنیں گے کہ توارث، تناصر اور آپس میں ولایت اسلام کی بنا پر ہے، اس وقت تک اس علاقے سے فتنہ وفساد ختم نہیں ہوسکتا، اب تمہاری جماعت بندی اسلام اور ہجرت کی بنا پر ہونی چاہیے، کہ تمہارے آپس میں تعلقات مسلمانوں کے ساتھ ہوں، ان لوگوں کے ساتھ ہوں جو اپنے علاقے کو چھوڑ کے آ گئے ہیں، انہی کے ساتھ وراثت کا تعلق ہو، انہی کے ساتھ نصرت کا تعلق ہو، اگر اس ضابطے کی پابندی نہیں کرو گے تو فتنہ وفساد ختم نہیں ہوسکتا، فتنہ وفساد میں اصل یہی ہے کہ مسلمانوں پر کافروں کے مظالم جاری ہیں، مسلمانوں کی جماعت قوت نہ پکڑے۔ قوت تبھی پکڑے گی، کہ جس وقت تمہارا آپس میں تناصر اس اصول پہ آ جائے گا، جاہلانہ عصبیت کو ختم کر کے جماعت کی بنیاد اسلام اور ہجرت پہ رکھ دی گئی، کہ جو مسلمان ہوتا چلا جائے اور ہجرت کر کے آ جائے یہ ہیں تمہاری جماعت، ان کے ساتھ تمہارا آپس میں تناصر کا اور توارث کا تعلق ہونا چاہیے۔ ''اگر تم ایسا نہیں کرو گے تو علاقے میں بڑا فتنہ وفساد ہوگا۔''

مہاجرین وانصار کی فضیلت اور گزشتہ حکم کا تتمہ

وہ لوگ جو ایمان لاتے ہیں اور ہجرت کرتے ہیں، اور اللہ کے راستے میں جہاد کرتے ہیں، اور وہ لوگ جو ٹھکانا دیتے ہیں، اور مدد کرتے ہیں یہی سچے پکے مؤمن ہیں، ان کے لیے مغفرت ہے اور رزقِ کریم ہے۔'' اور وہ لوگ جو ایمان لائیں اس کے بعد'' یعنی پہلے تو سابقین اولین کی فضیلت ہوگئی، پہلی آیات تو سابقین اولین کے متعلق تھیں، اور یہ اگلی آیت اُن لوگوں کے بارے میں آ گئی جو بعد میں ایمان لائیں اور ہجرت کریں اور تمہارے ساتھ مل کے جہاد کریں وہ بھی تم میں سے ہی ہیں، اُن کے حقوق بھی وہی ہیں جو سابقین اوّلین کے ہیں۔ لیکن اگر تمہارے رشتہ دار موجود ہوں، یعنی رشتہ دار مسلمان ہیں اور ہجرت کر کے آئے ہوئے ہیں یہ مقدم ہیں اس اُخوتِ اسلامی والے بھائیوں سے جن کے ساتھ مواخات قائم کردی گئی، ان سے وہ رشتہ دار مقدم ہیں، وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ: فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ سے مراد اللہ کا قرآن ہے، یہ وضاحت میں نے آپ کے سامنے کردی، کہ اگر ایک شخص مسلمان ہے اور اس کا مسلمان رشتہ دار بھی مدینہ منورہ میں ہجرت کر کے آیا ہوا ہے پھر تو وراثت میں یہ رشتہ دار مقدم ہے، اور اگر رشتہ دار موجود نہ ہوں تو پھر وراثت پہنچے گی اُس مسلمان بھائی کو جس کے ساتھ سرورِ کائنات ﷺ نے اُخوت کا جوڑ لگا دیا تھا، اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ: بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز کے متعلق علم رکھنے والے ہیں۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ
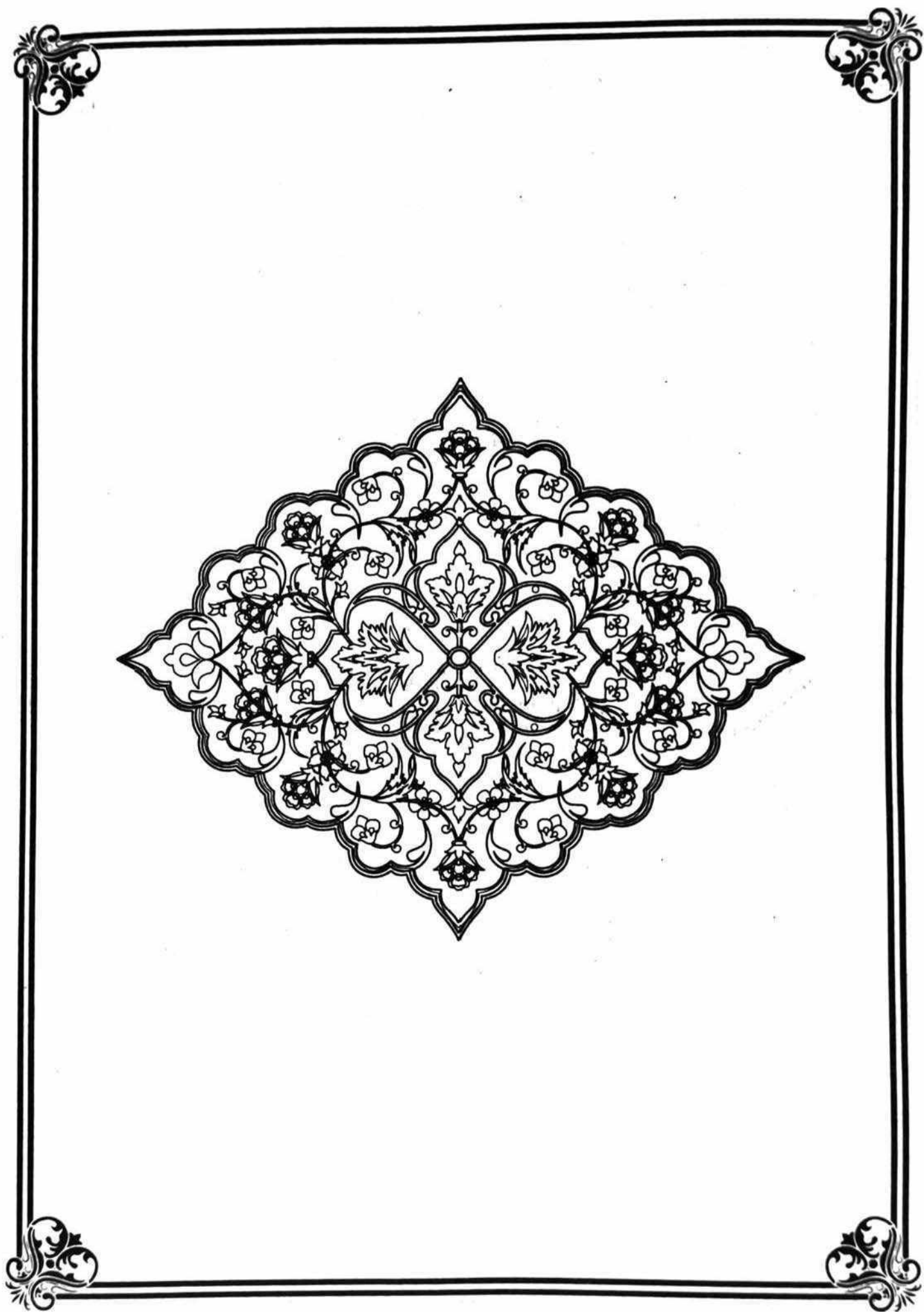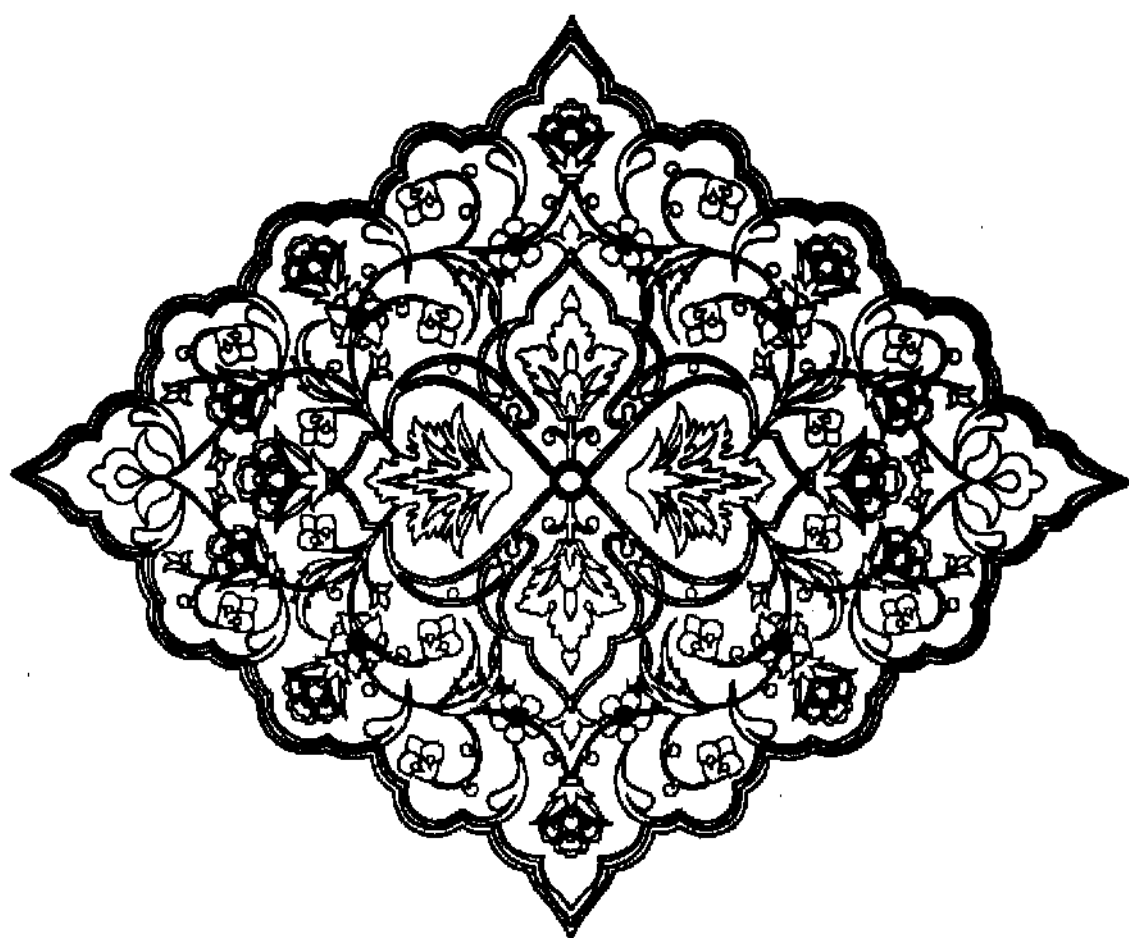
سُورَةُ التَّوْبَةِ

رکوعاتها ۱۶ — ۹ سُوْرَةُ التَّوْبَةِ مَدَنِيَّةٌ ۱۱۳ — آیاتها ۱۲۹

سورۂ توبہ مدینہ میں اُتری، اور اس میں ۱۲۹ آیتیں ہیں، ۱۶ رکوع ہیں

بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝۱

اللہ اور اللہ کے رسول کی طرف سے لاتعلقی کی اطلاع ہے اُن مشرکوں کو جن سے تم نے معاہدہ کیا تھا ①

فَسِيْحُوْا فِي الْاَرْضِ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ

پھر تم چل پھر لو علاقے میں چار مہینے اور یقین کرلو کہ بے شک تم اللہ کو

مُعْجِزِي اللّٰهِ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ مُخْزِي الْكٰفِرِيْنَ ۝۲ وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ

عاجز کرنے والے نہیں ہو، اور (یقین کرلو کہ) بے شک اللہ تعالیٰ رُسوا کرنے والا ہے کافروں کو ② اعلان ہے اللہ

وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ اَنَّ اللّٰهَ بَرِيْٓءٌ

اور اللہ کے رسول کی طرف سے ان لوگوں کی طرف حج اکبر کے دِن کہ بے شک اللہ تعالیٰ لاتعلق ہے

مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۙ وَرَسُوْلُهٗ ۭ فَاِنْ تُبْتُمْ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَاِنْ

مشرکین سے اور اُس کا رسول بھی، اگر تم توبہ کرلو تو وہ تمہارے لیے بہتر ہے، اور اگر

تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللّٰهِ ۭ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ

تم نے پیٹھ پھیری تو یقین کرلو کہ بے شک تم اللہ کو عاجز کرنے والے نہیں ہو، خبر دے دیجئے اُن لوگوں کو

كَفَرُوْا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝۳ ۙ اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ

جنہوں نے کُفر کیا دردناک عذاب کی ③ مگر وہ مشرک جن سے تم نے معاہدہ کیا

ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ شَيْـًٔا وَّلَمْ يُظَاهِرُوْا عَلَيْكُمْ اَحَدًا فَاَتِمُّوْٓا

پھر انہوں نے تمہیں کچھ نقصان نہیں پہنچایا، اور نہیں امداد کی انہوں نے تمہارے خلاف کسی کی، پھر تم پورا کرو

اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ۝۴

اُن کی طرف اُن کے عہد کو اُن کی مدت تک، بے شک اللہ تعالیٰ محبت کرتے ہیں متقین سے ④

فَإِذَا انسَلَخَ الْأَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِينَ حَيْثُ وَجَدتُّمُوهُمْ

پس جب گزر جائیں حرمت والے مہینے پھر تم قتل کرو مشرکوں کو جہاں بھی تم انہیں پاؤ

وَخُذُوهُمْ وَاحْصُرُوهُمْ وَاقْعُدُوا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ ۚ فَإِن

اورا نہیں پکڑلو اور انہیں گھیرلو اور بیٹھو ان کے لیے ہر گھات میں، پھر اگر

تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ فَخَلُّوا سَبِيلَهُمْ ۚ إِنَّ

وہ توبہ کرلیں اور نماز کو قائم کرلیں اور زکوٰۃ دینے لگ جائیں پھر اُن کا راستہ چھوڑ دو، بے شک

اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝ وَإِنْ أَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِينَ اسْتَجَارَكَ فَأَجِرْهُ

اللہ تعالیٰ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے⑤ اگر مشرکوں میں سے کوئی آدمی آپ سے پناہ مانگے پھر تُو اُس کو پناہ دے دے

حَتَّىٰ يَسْمَعَ كَلَامَ اللَّهِ ثُمَّ أَبْلِغْهُ مَأْمَنَهُ ۚ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُونَ ۝

یہاں تک کہ وہ مشرک اللہ کی کلام کو سُن لے پھر پہنچادے اس کو اس کے امن کی جگہ، یہ اس وجہ سے ہے کہ بے شک وہ بے علم لوگ ہیں⑥

خلاصہ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ۔ سورۂ توبہ مدینہ میں اُتری اور اس میں ایک سو انتیس (۱۲۹) آیتیں ہیں سولہ (۱۶) رُکوع ہیں۔ بَرَآءَۃٌ مِّنَ اللّٰہِ: براءۃ: لاتعلقی، دست برداری۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اور اللہ کے رسول کی طرف سے لاتعلقی اور بیزاری ہے۔ آگے صلہ آ گیا إلی، یہ صلہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ بَرَآءَۃٌ کے اندر اطلاع والا مفہوم بھی ہے، جس طرح سے ایک لفظ کے ضمن میں دوسرے لفظ کو ڈال دیا جاتا ہے اور اس کے معنی کا اظہار ہو جاتا ہے تو اسی طرح سے یہاں ہوگا، اب مفہوم اس کا یوں ادا کریں گے ''اللہ اور اللہ کے رسول کی طرف سے لاتعلقی کا اظہار ہے، لاتعلقی کی اطلاع ہے ان لوگوں کو جن سے تم نے معاہدہ کیا تھا'' مِنَ الْمُشْرِكِينَ یہ الَّذِیۡنَ کا بیان ہے، ''جن مشرکوں سے تم نے معاہدہ کیا تھا ان لوگوں کو اطلاع ہے اللہ اور اللہ کے رسول کی طرف سے لاتعلقی کی''۔ فَسِیۡحُوۡا: سَاحَ یَسِیۡحُ: چلنا پھرنا۔ سِیۡحُوۡا: اَمر کا صیغہ ہے بِیۡعُوۡا کی طرح۔ یہ خطاب ہے مشرکین کو جس کا ذکر پچھلی آیت میں آیا ہوا ہے۔ ''تو اے مشرکو! تم چل پھر لو'' فِی الۡاَرۡضِ: علاقے میں، زمین میں، زمین سے وہی زمین مراد ہے عرب کی۔ ''پھر تم چل پھر لو زمین میں'' اَرۡبَعَۃَ اَشۡہُرٍ: چار مہینے، وَاعۡلَمُوۡٓا: اور یقین کرلو، اَنَّکُمۡ غَیۡرُ مُعۡجِزِی اللّٰہِ: کہ بے شک تم اللہ کو عاجز کرنے والے نہیں ہو، اس کا معنی پیچھے ذکر کیا تھا کہ تم چھوٹ کے بچ کے نہیں جا سکتے، کہ اللہ تمہیں پکڑنا چاہے سزا دینا چاہے اور تم چھوٹ کے بچ کے چلے جاؤ، قابو میں نہ آؤ، ایسا نہیں ہو سکتا، جیسے محاورہ ذکر کیا تھا اَعۡجَزَہُ الصَّیۡدُ: شکاری کو شکار نے عاجز کر دیا، یعنی اس کی گرفت

میں نہیں آیا، شکاری اس کو پکڑ نہیں سکا۔ "یقین کرلو کہ تم اللہ سے چھوٹ کے بچ کے جا نہیں سکتے، تم اللہ کو عاجز کرنے والے نہیں ہو"،
اور اس بات کا بھی یقین کرلو کہ اَنَّ اللّٰهَ مُخْزِي الْكٰفِرِيْنَ: اَخْزٰى يُخْزِيْ اِخْزَاء: رُسوا کرنا۔ بے شک اللہ تعالیٰ رُسوا کرنے والا ہے
کافروں کو۔ وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ: اَذَان: اعلان۔ اٰذَنَ يُؤْذِنُ اَذَان۔ "اعلان ہے اللہ اور اللہ کے رسول کی طرف سے ان لوگوں کی
طرف حجِ اکبر کے دن" حجِ اکبر کا معنی: بڑا حج، اور "حجِ اکبر" کہہ کر عمرہ سے احتراز کیا گیا ہے، یعنی جس کو ہم حج کہتے ہیں یہی
"حجِ اکبر" ہے، اَنَّ اللّٰهَ بَرِيْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۙ وَرَسُوْلُهٗ: بے شک اللہ تعالیٰ لاتعلق ہے مشرکین سے اور اس کا رسول بھی، وَرَسُوْلُهٗ کا
عطف اللہ پر ہے۔ اللہ تعالیٰ لاتعلق ہے مشرکوں سے اور اس کا رسول بھی، فَاِنْ تُبْتُمْ: اگر تم توبہ کرلو فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ: تو وہ تمہارے لیے
بہتر ہے وَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ: اور اگر تم نے پیٹھ پھیری، فَاعْلَمُوْٓا: تو یقین کرلو اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللّٰهِ: کہ بے شک تم اللہ کو عاجز کرنے والے
نہیں ہو، اللہ سے چھوٹ نہیں سکو گے، اللہ تعالیٰ سے اپنے آپ کو بچا نہیں سکو گے، ایسا نہیں کہ تم اللہ کے قابو میں نہ آؤ، "بے شک تم
اللہ کو عاجز کرنے والے نہیں ہو"۔ مُعْجِزِي اصل میں مُعْجِزِيْنَ تھا جمع کے صیغے کے طور پر، نون اضافت کی وجہ سے گر گیا۔ وَبَشِّرِ
الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ: خبر دے دیجئے ان لوگوں کو جنہوں نے کفر کیا دردناک عذاب کی، اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ: مگر وہ
مشرک جن سے تم نے معاہدہ کیا، ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ شَيْئًا: پھر ان مشرکوں نے تمہارے ساتھ کوئی نقص نہیں ڈالا، معاہدے میں کوئی
گڑبڑ نہیں کی، کچھ قصور نہیں کیا تمہارا، لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ شَيْئًا: تمہیں کچھ نقصان نہیں پہنچایا، وَلَمْ يُظَاهِرُوْا عَلَيْكُمْ اَحَدًا: يُظَاهِرُ وا مُظَاهَرَة:
ایک دوسرے کی امداد کرنا، باب مفاعلہ۔ اور نہیں امداد کی انہوں نے تمہارے خلاف کسی کی، فَاَتِمُّوْٓا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ: پھر تم پورا کرو ان
کی طرف ان کے عہد کو، اِلٰى مُدَّتِهِمْ: ان کی مدت تک اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ: بے شک اللہ تعالیٰ محبت کرتے ہیں متقین سے۔ فَاِذَا
انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ: اِنْسَلَخَ: گزر جانا۔ پس جس وقت گزر جائیں۔ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ: حرمت والے مہینے۔ پس جب گزر جائیں
حرمت والے مہینے، فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ: پھر تم قتل کرو مشرکوں کو، حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ: جہاں بھی تم انہیں پاؤ، وَخُذُوْهُمْ: اور انہیں پکڑلو،
وَاحْصُرُوْهُمْ: اور انہیں گھیرلو، وَاقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ: مَرْصَد: انتظار کرنے کی جگہ، جس کو گھات کہتے ہیں۔ بیٹھو ان کے لیے ہر
گھات میں، ہر تاک کی جگہ میں، ہر مورچے میں۔ مَرْصَد: انتظار کرنے کی جگہ۔ جیسے ایک شخص کہیں چھپ کر بیٹھ جاتا ہے دشمن کے
انتظار میں کہ دشمن یہاں سے گزرے گا تو میں اس پر حملہ کروں گا، تو تاک کی جگہ کہہ لیجئے، گھات کہہ لیجئے۔ "بیٹھیے ان کے لئے ہر
گھات میں، ہر انتظار کرنے کی جگہ میں" فَاِنْ تَابُوْا: پھر اگر وہ توبہ کرلیں، وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ: اور نماز کو قائم کرلیں، وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ: زکوٰۃ
دینے لگ جائیں، فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ: پھر ان کا راستہ چھوڑ دو، اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ: بے شک اللہ تعالیٰ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔
وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ: اِسْتِجَار يَسْتَجِيْرُ: پناہ مانگنا، پناہ طلب کرنا۔ اگر مشرکوں میں سے کوئی آدمی آپ سے پناہ
مانگے، فَاَجِرْهُ: اَجِرْ یہ باب اِفعال سے آ گیا، اَجَارَ يُجِيْرُ۔ پھر تو اس کو پناہ دے دے، حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ: یہاں تک کہ وہ مشرک اللہ
کی کلام کو سن لے، ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ: پھر اس کو پہنچا دو امن کی جگہ، پھر پہنچا دے اس کو اس کے امن کی جگہ۔ مَاْمَن: امن کی جگہ۔ ذٰلِكَ
بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُوْنَ: یہ اس وجہ سے ہے کہ بے شک وہ لوگ علم نہیں رکھتے، بے علم لوگ ہیں۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

تفسیر

مذکورہ سورت کے دونام اور دونوں کی وجہ تسمیہ

یہ سورت جو آپ کے سامنے شروع ہورہی ہے اس کے دونوں نام ہیں: ''سورۂ براءۃ'' بھی اسے کہتے ہیں، اور ''سورۂ توبہ'' بھی کہتے ہیں۔ ''سورۂ براءۃ'' تو اس لیے کہ پہلا لفظ ''براءۃ'' کا آ گیا، اللہ اور اللہ کے رسول کی طرف سے براءۃ کی گئی ہے، لاتعلقی کا اظہار کیا گیا ہے، اس پہلے لفظ سے سورت کا نام اخذ کرلیا گیا۔ اور ''سورۂ توبہ'' اس لیے کہ اس میں کثرت سے توبہ کی تلقین کی گئی ہے، جیسا کہ آپ کے سامنے واقعات کے ضمن میں آجائے گا، کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی توبہ قبول فرمائی، مسلمانوں پہ رجوع فرمایا، اور دوسرے لوگوں کو بھی کثرت کے ساتھ توبہ کرنے کی ترغیب دی گئی ہے، جیسا کہ پہلا رکوع جو آپ کے سامنے آیا ہے، اس میں بھی فَاِنْ تَابُوْا کا ذکر آیا ہوا ہے، فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ۔ اور آگے واقعات کے اندر یہ چیز کثرت کے ساتھ آئے گی۔

سورۂ اَنفال وتوبہ کو علیحدہ علیحدہ رکھنے کی، اور ''براءۃ'' کے شروع میں ''بسم اللہ'' نہ لکھنے کی وجہ

اس سورت کی ابتدا میں جو آپ کو ایک نئی چیز نظر آرہی ہے، وہ یہ ہے کہ عام سورتوں کی طرح اس کے شروع میں ''بسم اللہ'' نہیں لکھی گئی، کیوں نہیں لکھی گئی؟ اس کی وضاحت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے خود فرمائی۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر سوال کیا، جس وقت قرآنِ کریم کو اشاعت کے لیے مصاحف میں نقل کیا جارہا تھا، کہ اس کی کیا وجہ ہے؟ کہ سورۂ اَنفال مثانی میں سے ہے، اور سورۂ براءۃ مئین میں سے ہے، اور آپ لوگوں نے اَنفال کو پہلے رکھا اور سورۂ براءۃ کو پیچھے رکھا۔ اور پھر اَنفال کو پہلی لمبی سورتوں میں رکھ دیا، جن کو سبع طوال کہا جاتا ہے، اور پھر اَنفال اور براءۃ کے درمیان میں ''بسم اللہ'' بھی نہیں لکھی، اس کی کیا وجہ ہے؟ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پہ سوال کیا تھا...... سوال کی وضاحت یہ ہے کہ قرآنِ کریم کو جمع کرتے وقت ترتیب اس طرح سے رکھی گئی، کہ لمبی لمبی سورتیں پہلے، اُس کے بعد اس سے چھوٹی سورتیں، اور آخر میں بالکل چھوٹی سورتیں رکھی گئیں۔ جن سورتوں میں سو سے زیادہ آیتیں ہوں اُن کو ''مئین'' کہتے ہیں، ''مائۃ'' سو کو کہتے ہیں، مئین: سو آیتوں والی سورت، سو سے زیادہ آیتیں جن سورتوں میں ہوں ان کو مئین کہتے ہیں، اور جن میں سو سے کم آیتیں ہوں جس طرح سے آپ نے سورۂ اَنفال کے آخر میں لکھا ہوا دیکھا ہوگا کہ غالباً اس میں پچھتر آیتیں ہیں، تو جن میں سو سے کم آیتیں ہیں ان کو ''مثانی'' کہا جاتا ہے، اور جو چھوٹی چھوٹی سورتیں ہیں اُن کو ''مفصلات'' کہا جاتا ہے، اور جو پہلی سات سورتیں ہیں لمبی لمبی، ان کو ''سبع طوال'' کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے۔ تو ترتیب یہ رکھی گئی کہ پہلے لمبی سورتیں، اس کے بعد اس سے چھوٹی، اور اس کے بعد بالکل چھوٹی چھوٹی، قرآنِ کریم کو جمع کرتے وقت ترتیب اس طرح سے رکھی گئی۔ سورۂ بقرۃ، سورۂ آل عمران، نساء، مائدہ، اَنعام، اَعراف یہ چھ ہوگئیں، اور ساتویں نمبر پہ اَنفال آگئی،

حالانکہ انفال کی آیتیں سو سے کم ہیں، یہ مثانی میں سے ہے، اور آگے براءۃ آجائے گی، یہ لمبی سورت ہے، اس میں سو سے زیادہ آیتیں ہیں۔ تو ترتیب کا تقاضا یہ تھا کہ براءۃ پہلے ہوتی اور انفال بعد میں ہوتی، اور عام سورتوں کی طرح درمیان میں ''بسم اللہ'' بھی لکھی جاتی، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے سوال کا یہ مطلب ہے، تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے آگے سے وضاحت فرمائی کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے آیات تھوڑی تھوڑی کر کے اُترتی تھیں، اور جس وقت آیات اُترتیں تو سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو جو کاتبِ وحی ہوتے تھے، فرمادیا کرتے تھے، کہ یہ فلاں آیت فلاں سورت میں رکھ دو، اور فلاں آیات فلاں سورت میں رکھ دو، اور جس وقت ایک سورت مکمل ہوجاتی اور دوسری سورت شروع ہوتی، تو ابتدا میں ''بسم اللہ'' بھی لکھواتے تھے، اور اللہ کی طرف سے ''بسم اللہ'' اُتری ہی اس لیے تھی تاکہ دو سورتوں کے درمیان میں فصل معلوم ہوجائے، سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ عادت تھی، تو نزولی ترتیب اور ہے، اور آیات کے رکھنے کی ترتیب اور ہے، جس طرح سے آپ اشارہ فرماتے تھے ویسے آیات کو رکھ دیا جاتا تھا۔ سورۂ انفال ان سورتوں میں سے ہے جو مدینہ منورہ میں ابتدا ابتدا میں اُتریں، کیونکہ اس میں سارے کے سارے بدر کے حالات ذکر کیے گئے ہیں، اور سورۂ براءت ان سورتوں میں سے ہے جو سب سے آخر میں اُتریں، لیکن مضمون دونوں کا بالکل آپس میں ملتا جلتا ہے، مضمون میں کسی قسم کا کوئی فرق نہیں، سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ہمارے سامنے یہ صراحت نہیں آئی کہ براءۃ مستقل سورت ہے یا انفال کا حصہ ہے، مضمون دونوں کا ملتا جلتا ہے، اس لیے میں نے دونوں کو جوڑ دیا، انفال چونکہ نزولاً مقدم ہے اس لیے اس کو پہلے رکھ دیا، اور براءۃ چونکہ نزولاً مؤخر ہے اس کو میں نے پیچھے رکھ دیا، چونکہ یہ بھی احتمال ہے کہ دونوں سورتیں علیحدہ نہ ہوں بلکہ ایک ہی ہو، اس لیے درمیان میں ''بسم اللہ'' نہیں لکھی، اور ایسا بھی احتمال ہے کہ شاید علیحدہ علیحدہ ہوں تو درمیان میں فصل چھوڑ دیا۔ تو اس میں احتمالِ جزئیت ہے، احتمالِ جزئیت کی بنا پر درمیان میں ''بسم اللہ'' نہیں لکھی گئی، اور یہ احتمال بھی ہے کہ دونوں سورتیں علیحدہ علیحدہ ہوں اس لیے درمیان میں فصل کر دیا، بالکل مسلسل اس طرح نہیں رکھا جس طرح ایک سورت چلا کرتی ہے، یہ وجہ ہے ان کو جدا جدا رکھنے کی، اور درمیان میں ''بسم اللہ'' نہ لکھنے کی۔

سورۂ توبہ کی ابتدا میں ''بسم اللہ'' پڑھنے اور نہ پڑھنے کے مسائل

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے اس بیان سے یہ بات واضح ہوگئی کہ ''بسم اللہ'' نہ لکھنے کی وجہ احتمالِ جزئیت ہے، اس لیے قرائے کرام کے اندر یہ بات چلی آرہی ہے، اور فقہاء کے نزدیک بھی مسئلہ اسی طرح سے ہے، کہ اگر کوئی شخص پیچھے سے تلاوت کرتا ہوا آرہا ہو، مثلاً سورۂ انفال پڑھتا ہوا آرہا ہے، دسواں پارہ تلاوت کرتا ہوا آرہا ہے، تو اُس کو سورۂ انفال کے آخر میں اِنَّ اللّٰہَ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ کے بعد ''بسم اللہ'' نہیں پڑھنی چاہیے، بلکہ اسی طرح سے بَرَآءَۃٌ مِّنَ اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ سے شروع کردینی چاہیے، مسلسل پڑھتا چلا جائے۔ اور اگر وہ اس سورت سے ابتدا کرنا چاہتا ہے جس طرح سے آج آپ نے ابتدا کی، تو پھر باقاعدہ جس طرح سے قرآنِ کریم پڑھا جاتا ہے ''اعوذ باللہ''، ''بسم اللہ'' کے ساتھ، اسی طرح سے قراءت کی ابتدا کرنی چاہیے۔ اور اگر سورۂ براءت کے

وسط سے آپ شروع کرنا چاہیں، جیسے کل کو اگلا رُکوع آپ پڑھیں گے، تو اس وقت بھی اسی طرح سے جیسے عام طریقہ ہے قرآن کریم پڑھنے کا، ''تعوّذ'' بھی کیا جائے اور ''بسم اللہ'' بھی پڑھی جائے۔

اور بعض لوگوں نے سورۂ براءت کے شروع میں ''بسم اللہ'' کو ویسے ہی ناجائز سمجھ رکھا ہے، کہ ''بسم اللہ'' پڑھنا ٹھیک ہی نہیں۔ اور ایک اور مصنوعی سی عبارت ''اَعُوْذُ بِاللهِ مِنَ النَّارِ''، اور اس قسم کی عبارت کسی کسی قرآن کے حاشیے میں لکھی ہوتی ہے، وہ اِبتدا کے اندر پڑھتے ہیں، وہ ٹھیک نہیں ہے، اس کا اس طرح سے پڑھنا ناجائز ہے۔ یعنی ''اعوذ باللہ'' اور ''بسم اللہ'' کو چھوڑ کر اُس کی جگہ اِس کو پڑھنا ٹھیک نہیں۔ ویسے تو وہ دُعائیہ کلمہ ہے جب چاہو پڑھتے رہو، لیکن ''اعوذ باللہ'' اور ''بسم اللہ'' کی جگہ اس کو پڑھنا ٹھیک نہیں ہے، بلکہ حضرت تھانوی ؒ نے صراحت کی ہے کہ یہ بدعت ہے (بیان القرآن)۔ اس لیے اگر آپ سورۂ اَنفال کی تلاوت کرتے ہوئے آئیں تو اسی طرح مسلسل پڑھتے چلے جائیں، اور اگر تلاوت کی اِبتدا یہاں سے کریں تو جس طرح سے قرآنِ کریم تعوّذ اور تسمیہ کے ساتھ پڑھا جاتا ہے اسی طرح سے ''اعوذ باللہ'' اور ''بسم اللہ'' پڑھ کے اس کو شروع کریں۔ ''بسم اللہ'' نہ لکھنے کی وجہ احتمالِ جزئیت ہے، تو جب دونوں سورتوں میں ایک ہونے کا احتمال ہے تو پھر یہ طوال میں آسکتی ہیں، پھر یہ لمبی سورتیں بن جاتی ہیں۔ تو یہ وضاحت خود حضرت عثمان ؓ کی طرف سے ہوگئی۔

ماقبل سورت سے ربط اور سورۂ توبہ کے مضامین کا خلاصہ

سورۂ اَنفال آپ کے سامنے گزری، اس کے اندر زیادہ تر ذکر تھا جہاد پر برانگیختہ کرنے کا، اور خاص طور پر بدر کے حالات ذکر کیے گئے ہیں، اب آگے سورۂ براءت آرہی ہے، اس کے اندر مشرکین سے لاتعلقی کا اعلان ہے، جس طرح سے آپ ابتدائی آیات میں سُن رہے ہیں، اور چند غزوات کا ذکر ہے، فتح مکہ، اس کے بعد غزوۂ حنین، اور پھر اس کے بعد غزوۂ تبوک، ان تین غزوات کے حالات اس میں آرہے ہیں، اور اس ضمن میں منافقین کے حالات کو کثرت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے، جن کا نفاق خصوصیت کے ساتھ غزوۂ تبوک کے موقع پر کھلا تھا، اُن کے حالات ذِکر کرکے اُن کو پھر توبہ کی طرف متوجہ کیا گیا ہے، کہ اپنے ان حالات سے باز آجائیں توبہ کرلیں، تو یہ ان کے حق میں بہتر ہے۔ اور مسلمانوں کو جہاد کی ترغیب دی گئی ہے۔ یہ اس سورت کے مضامین کا خلاصہ ہے۔

آیات کا پس منظر

غالباً آپ کے سامنے پہلے اس بات کا ذکر ہوا تھا، کہ مدینہ منورہ میں تشریف لے جانے کے بعد سرورِ کائنات ﷺ نے جہادی مہم جو شروع کی تو مختلف لڑائیاں ہوئیں، چھوٹے چھوٹے ٹکراؤ بھی ہوئے، بڑی لڑائیاں بدر، احد اور احزاب جیسے مشرکین مکہ کے ساتھ تصادم کے بڑے بڑے واقعات بھی ہوئے، چھ ہجری میں رسول اللہ ﷺ نے خواب دیکھا تھا کہ ہم عمرہ کرنے کے لیے گئے ہیں، اور وہاں بعض لوگوں نے سر منڈوایا ہے، بعض نے قصر کروایا ہے، یہ خواب حضور ﷺ نے صحابہ ؓ کے سامنے ذکر کردیا، خواب کے اندر وقت کی تعیین تو کی نہیں گئی تھی کہ کب جاؤ گے؟ صرف یہ تھا کہ جاؤ گے۔ تو چونکہ مکہ معظمہ چھوٹے ہوئے کافی مدت

ہوگئی تھی، اور ہر کسی کے دل میں تڑپ تھی، کہ بیت اللہ کا طواف کریں، بیت اللہ کی زیارت کریں، اس شوق میں صحابہ کرام ﷺ نے فوراً تیاری شروع کردی، کہ عمرے پہ جائیں گے، اور اللہ ہمیں عمرہ کرنے کی توفیق دے گا، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کو خواب میں نظر آیا ہے، اور بیت اللہ کا علاقہ چونکہ حرم کا علاقہ ہے، تو جاہلیت میں بھی اگر بدتر سے بدتر دشمن بھی بیت اللہ کا طواف کرنے اور بیت اللہ کی زیارت کرنے آنا چاہتا تھا تو مشرکینِ مکہ روکا نہیں کرتے تھے، اور نہ ہی اُن کے لیے روکنا جائز تھا، لیکن سرورِ کائنات ﷺ جس وقت اپنی جماعت کو لے کر چلے، چودہ یا پندرہ سو آدمی آپ کے ساتھ تھا علی اختلافِ روایات، آپ ﷺ نے مدینہ سے باہر نکل کر ذُوالحلیفہ پر احرام باندھا جو کہ مدینہ منورہ کا میقات ہے، اور مکہ معظمہ کے قریب آ کے حدیبیہ کے اندر آپ ٹھہر گئے، یہ میدانِ حدیبیہ حرم سے باہر حرام سے متصل ہے، بڑی کھلی وادی ہے، جدہ سے مکہ معظمہ کو جاتے ہیں، تو سڑک اسی وادی میں سے گزرتی ہے، اور اس جگہ جہاں سرورِ کائنات ﷺ ٹھہرے تھے اب وہاں مسجد بنی ہوئی ہے، اور لوگ آتے جاتے اس میں نوافل پڑھتے ہیں، وہ بالکل مین روڈ پر ہے۔ آپ ﷺ وہاں آ کے ٹھہر گئے، اور معلوم ہوا کہ مشرکینِ مکہ آگے سے رکاوٹ ڈال رہے ہیں، مکہ معظمہ میں جانے نہیں دیں گے، بہرحال حالات گزرے جیسے بھی تھے، وہ تفصیل یہاں بیان کرنا مقصود نہیں ہے، وہ سورۂ فتح کے اندر آئے گی، آخر سرورِ کائنات ﷺ کا مشرکین کے ساتھ صلح کا معاہدہ ہوگیا، اس صلح کے اندر جو شرطیں رکھی گئی تھیں، ان شرطوں میں سے ایک شرط یہ تھی کہ دس سال تک آپس میں جنگ بند رہے گی، ہم ایک دوسرے کے ساتھ چھیڑ چھاڑ نہیں کریں گے، براہِ راست بھی نہیں لڑیں گے، اور اگر کوئی دوسرا دشمن، ہم دونوں فریقوں میں سے کسی فریق کے ساتھ گڑبڑ کرے گا تو خفیہ اُس کی امداد نہیں کریں گے، ایک دفعہ تو اس صلح کے اندر یہ تھی، اور ایک دفعہ یہ تھی کہ براہِ راست تو دو فریق ہیں مشرکینِ مکہ اور سرورِ کائنات ﷺ کی جماعت، اور جو باقی قبائل عرب ہیں اُن کو اختیار ہے، اس صلح کے اندر اگر شریک ہونا چاہیں تو اُن کی مرضی مشرکینِ مکہ کے ساتھ مل کر شریک ہوجائیں، اُن کی مرضی مسلمانوں کے ساتھ مل کر شریک ہوجائیں، وہ بھی اس معاہدے کے اندر شریک ہوسکتے ہیں، یہ گنجائش بھی ساتھ رکھی گئی۔ اور ساتھ یہ شرط بھی تھی کہ آپ اس سال عمرہ نہ کریں، اس سال اسی طرح سے واپس چلے جائیں، اگلے سال آئیں اور آ کے عمرہ کر جائیں، یہ ضد انہوں نے اپنی پوری کروائی کہ اس سال ہم عمرہ نہیں کرنے دیں گے، ورنہ لوگوں میں مشہور ہوجائے گا کہ مکہ والے دب گئے، اس لیے اب تو واپس جاؤ، اگلے سال آنا، پھر عمرہ کر لینا۔ جس وقت آپ صلح حدیبیہ کی تفصیل پڑھیں گے، تو عجیب وغریب شرطیں ہیں، جو سرورِ کائنات ﷺ نے ساری کی ساری شرطیں کرلیں، چاہے بظاہر اس کے اندر مسلمانوں پر کتنا ہی دباؤ پڑا۔

جس وقت آپ ﷺ واپس تشریف لے گئے، تو مکہ معظمہ کے آس پاس دو قبیلے ہیں، ایک بنوبکر اور ایک بنوخزاعہ۔ بنوبکر مشرکینِ مکہ کے ساتھ حلیف ہو کر صلح میں داخل ہوگئے، اور بنوخزاعہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ شریک ہو کر اس صلح میں آگئے، اب بنوبکر اور بنوخزاعہ کو بھی آپس میں لڑنا ٹھیک نہیں تھا، لیکن ایک وقت بنوبکر نے بنوخزاعہ پر رات کو حملہ کیا، جاہلیت کے زمانے سے اُن کی ٹکر چلی آرہی تھی، تو مشرکینِ مکہ نے یہ خیال کر کے کہ مدینہ والے تو بہت دُور ہیں، کیا پتا چلے گا، اور رات کا وقت ہے، تو انہوں نے اپنے حلیف بنوبکر کی امداد کی، اور اس طرح سے بنوخزاعہ کو نقصان پہنچایا، بنوخزاعہ نے یہ اطلاع سرورِ کائنات ﷺ کو پہنچادی۔ تو گویا کہ مشرکینِ مکہ کی طرف سے خیانت ہوجانے کے بعد وہ معاہدہ ٹوٹ گیا، جب ٹوٹ گیا تو رسول اللہ ﷺ نے مناسب یہ سمجھا کہ

باقاعدہ اعلان کر کے لڑائی نہ لڑی جائے بلکہ ہم خفیہ طور پر تیاری کر لیں، اور اچانک اہلِ مکہ پر جا پڑیں، تاکہ حرم کے اندر خون ریزی نہ ہو، مشرکینِ مکہ کی طرف سے معاہدہ تو ٹوٹ ہی گیا تھا، حرم میں خون ریزی سے بچنے کے لیے آپ ﷺ نے جنگ کا اعلان نہیں کیا، بلکہ ارادہ یہ کیا کہ دفعۃً ہی جا کر اُن پر دباؤ ڈال دیا جائے، تاکہ مکہ فتح ہو جائے اور لڑائی کی نوبت نہ آئے، اس میں بھی گویا کہ حرم کا ایک قسم کا احترام ملحوظ تھا۔ چنانچہ مکہ کو فتح کرنے کی تیاری کی گئی، تو دس رمضان المبارک آٹھ ہجری کو آپ ﷺ نے مدینہ منورہ سے سفر شروع فرمایا، اور بغیر کسی خاص لڑائی کے مکہ معظمہ فتح ہو گیا، کوئی خاص تصادم نہیں ہوا، مکہ معظمہ فتح کر لیا گیا۔ تو آٹھ ہجری رمضان المبارک میں مکہ فتح ہوا، اور شوال میں آگے غزوۂ حنین پیش آ گیا جس کا ذکر آپ کے سامنے آئے گا، غزوۂ حنین کے متصل ہی چھوٹے چھوٹے غزوات پیش آئے غزوۂ اوطاس، غزوۂ طائف وغیرہ، اس سارے علاقے کو صاف کر کے رسول اللہ ﷺ واپس مدینہ منورہ تشریف لے گئے، اور یہاں اپنا نائب چھوڑ گئے۔ یہ ہیں آٹھ ہجری کے واقعات، آگے نو ہجری میں سرورِ کائنات ﷺ کے سامنے سب سے بڑا جو غزوہ پیش آیا وہ غزوۂ تبوک ہے، غزوۂ تبوک سے واپس آ کر پھر نو ہجری میں سرورِ کائنات ﷺ نے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو اُمیر بنا کے حج کے لیے بھیجا، نو ہجری میں رسول اللہ ﷺ نے حج نہیں فرمایا، ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی قیادت میں مسلمانوں کو حج کرنے کے لیے بھیجا۔ تو جس وقت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ حج کرنے کے لیے آئے ہیں، اور حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی ساتھ تھے، اُس وقت اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے یہ آیات اتر چکی تھیں، اور رسول اللہ ﷺ نے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کہا کہ منیٰ میں، عرفات میں مختلف جگہوں میں ان دنوں میں اِن آیات کا اعلان کر دیا جائے، تاکہ سب اہلِ مکہ کو پتا چل جائے کہ اب ہمارے متعلق یہ احکامات ہیں۔ تو نو ہجری میں یہ اعلانات کروائے جو کہ ان آیات میں آپ کے سامنے آ رہے ہیں، اور پھر دس ہجری میں سرورِ کائنات ﷺ خود حج کے لئے تشریف لائے ہیں، تو دس ہجری میں خود حج فرمایا، ذی الحجہ کے بعد محرم، صفر گزرے، اور ربیع الاوّل میں آپ کا انتقال ہوا، تو گویا کہ آخری سال میں رسول اللہ ﷺ نے حج فرمایا۔

مشرکین کے مختلف طبقات کے لئے حج کے موقع پر مختلف اِعلانات

تو یہ اعلان جو کیا گیا اس اعلان کا حاصل یہ ہے، کہ اس وقت مشرکوں کے طبقات مختلف تھے، بعض تو ایسے تھے جنہوں نے معاہدہ کیا تھا لیکن توڑ دیا، ان کے بارے میں تو اعلان کر دیا گیا کہ اب اِن کو کوئی امن نہیں ہے، مکہ فتح ہونے کے بعد ان کو جو عارضی امن دیا گیا تھا اب وہ امن اشہرِ حرم کے گزرتے ہی ختم ہو جائے گا، ان کو چاہیے کہ اشہرِ حرم کے اندر اندر، یعنی حرمت والے مہینوں کے اندر اندر یا مسلمان ہو جائیں یا اس علاقے کو چھوڑ کر چلے جائیں۔ اب یہ اعلان ذی الحجہ میں کیا جا رہا ہے، ذی الحجہ یہ بھی شہرِ حرام ہے، اور اس کے بعد محرم بھی شہرِ حرام ہے، اور محرم کے بعد صفر حلت والا مہینہ ہے یہ شہرِ حرام نہیں ہے، تو جس کا مطلب یہ ہوا کہ جن لوگوں نے یہ معاہدات توڑے تھے، معاہدوں کی پابندی نہیں کی تھی، اب اُن کو محرم کے آخر تک مہلت ہے، یا وہ مسلمان ہو جائیں یا وہ اس علاقے کو چھوڑ کر چلے جائیں ...... اور بعض فریق ایسے تھے جیسے بنو کنانہ کی دو شاخیں لکھی ہیں بنو ضمرہ اور بنو مدلج، انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ایک مدتِ معینہ کے لئے معاہدہ کیا تھا، اور یہ معاہدے پر پابند رہے، انہوں نے کوئی خیانت

نہیں کی، اور ذی الحجہ کے موقع پر جب یہ اعلان کرایا جا رہا تھا مشرکین سے لاتعلقی کا، تو اُن کے معاہدے میں ابھی نو مہینے باقی تھے، ان آیات کے اندر یہ ذکر کر دیا گیا کہ مسلمان اس معاہدے کے پابند ہیں، لیکن آئندہ نیا معاہدہ نہیں کریں گے، وہ اپنے اس معاہدے کی مدت تک اطمینان سے رہیں، کہ اس کے اندر اندر غور کر کے یا تو مسلمان ہو جائیں، یا پھر اس علاقے کو چھوڑ دیں، نیا معاہدہ ان کے ساتھ نہیں کیا جائے گا، ان کا معاہدہ ختم ہوگا نو مہینوں کے بعد رمضان المبارک میں، تو ان کو رمضان المبارک تک مہلت ہوگی......اور بعض مشرکوں کے قبائل ایسے تھے کہ جن کے ساتھ کسی قسم کا معاہدہ نہیں تھا، یا اُن کے ساتھ معاہدہ کچھ اس قسم کا تھا جس کی کوئی مدت متعین نہیں تھی، ویسے ہی آپس میں معاہدہ ہو گیا تھا کہ ہم ایک دوسرے سے لڑیں گے نہیں، مدت کوئی متعین نہیں کی گئی تھی، یا سرے سے معاہدہ تھا ہی نہیں، ان دونوں فریقوں کے متعلق اعلان کر دیا گیا کہ چار مہینے کی مہلت ہے، چار مہینے کے اندر اندر اپنی قسمت کا فیصلہ کر لو، یا تو مسلمان ہو جاؤ یا اس علاقے کو چھوڑ دو، تو ان کے ساتھ معاہدہ ختم ہوگا جا کر ربیع الثانی میں......تو کسی کے ساتھ معاہدہ ختم ہو گیا محرم کے اختتام پر صفر کے شروع میں، اور دو فریقوں کے ساتھ ختم ہو گیا اعلان کے بعد ربیع الثانی میں، اور بعض کے ساتھ ختم ہو گیا رمضان میں، تو سارے مشرک جتنے تھے وہ اس کے اندر آ گئے، اگلا حج آنے سے پہلے پہلے مشرکوں سے عرب کو پاک کرنے کا تہیہ کر لیا گیا، اور حضور ﷺ نے حج کے موقع پر یہ اعلان کروا دیا کہ اس سال کے بعد (اُس سال تو مشرک حج کرنے کے لئے آئے ہوئے تھے اپنے رواج کے مطابق، کیونکہ مشرک حج کرنے آتے تھے، اور ارد گرد کے عرب کے جتنے قبائل تھے سارے آتے تھے، بہت مجمع ہوتا تھا، سارے قبائل آئے ہوئے ہوتے تھے) اس سال کے بعد کوئی مشرک حج کرنے کے لیے نہ آئے۔ اب یہ رکاوٹ ڈال دی گئی کہ آئندہ مشرکوں کے لئے حج کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

''مشرکین، یہود و نصاریٰ'' سے جزیرۃ العرب کو صاف کرنا

چنانچہ رسول اللہ ﷺ جس وقت حج (کے لئے) تشریف لائے ہیں تو اس وقت حج کے اندر مسلمان ہی مسلمان تھے، کوئی غیر مسلم حج کرنے کے لئے نہیں آیا، اُن کے اوپر پابندی لگ گئی۔ تو رمضان المبارک تک سارے کا سارا ماحول صاف ہو گیا، اور پھر رسول اللہ ﷺ تشریف لائے تو ایک خالص اسلامی حکومت قائم ہو چکی تھی، اور اس کے اندر مشرکین کی کسی قسم کی آبادی باقی نہیں رہی، سارے جزیرۂ عرب کو صاف کر دیا گیا۔ باقی اہلِ کتاب سے بھی آپ ﷺ نے جزیرۂ عرب کو صاف کرنے کا ارادہ فرما لیا تھا، لیکن آپ ﷺ کو اس کی مہلت نہ ملی، تو پھر یہ اہلِ کتاب، یہود جو خیبر وغیرہ کے علاقے میں آباد تھے، ان کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے وہاں سے بھگایا، پھر یہ وہاں سے نکلے شام کے علاقے کی طرف، اور ادھر اُدھر منتشر ہو گئے، تو یہ علاقہ جو آج ''سعودی عرب'' کہلاتا ہے، اس کی حدود کے اندر اس وقت اہلِ کتاب میں سے بھی کوئی باقی نہ رہا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سارا علاقہ صاف کروا لیا تھا۔ یہ آیات جو آپ کے سامنے ابتداءً پڑھی گئی ہیں، ان کے اندر وہی اعلانِ براءت ہے جو مختلف فریقوں اور مختلف گروہوں کے متعلق کیا گیا، اور ایک سال کے اندر اندر اس علاقے کو صاف کر دیا گیا، اگلے سال کوئی مشرک باقی نہ رہا۔ اس تفصیل کے بعد اب آپ کے لیے آیات کا مضمون سمجھنا آسان ہے۔

کیا ''حجِ اکبر'' صرف جمعہ کا حج ہے؟

اس میں ''حجِ اکبر'' کا لفظ آرہا ہے، اس ''حجِ اکبر'' سے مراد حج ہی ہے، یہ نو، دس، گیارہ، بارہ، تیرہ، یہ جو حج کے ایام ہوتے ہیں یہی یوم الحج الاکبر ہے، اور عام طور پر لوگوں میں مشہور یہ ہے کہ ''حجِ اکبر'' وہ ہوتا ہے، جس میں عرفہ یعنی نو تاریخ جمعہ کو آئے، جمعہ کو حج ہو تو ''حجِ اکبر'' ہے، یہ عوامی اِصطلاح ہے، تحقیقی بات نہیں ہے۔ وہ اس اعتبار سے کہہ دیتے ہیں کہ چونکہ سرورِ کائنات ﷺ نے جب حج کیا تھا تو اتفاقی بات ہے کہ وقوفِ عرفہ جمعہ کو تھا، تو اب اگر ایسی موافقت ہوجائے کہ ذی الحجہ کی نو تاریخ جمعہ کو ہوجائے تو رسول اللہ ﷺ سے موافقت ہوجائے گی، کہ جیسے آپ ﷺ کا حج جمعہ کو ہوا تھا یہ بھی جمعہ کو ہوگیا، جس طرح سے ہم اِس سال اُمید لگائے ہوئے تھے کہ اگر وہاں سعودی عرب میں چاند انتیس کا ہوتا تو عرفہ جمعہ کو آرہا تھا، لیکن اتفاق ایسا ہوا کہ وہاں چاند تیس کا قرار پاگیا، جب چاند تیس کا قرار پاگیا تو آٹھ تاریخ جمعہ کو آگئی، اور نو تاریخ بروز ہفتہ حج ہوا، ورنہ اگر انتیس کا چاند ہوتا تو یہ عرفہ بھی جمعہ کو آرہا تھا، لیکن ایسا نہ ہوا۔ تو یہ ایک فضیلت ہے کہ وہی دن نصیب ہوجائے جو رسول اللہ ﷺ کے حج کا تھا، ورنہ ''حجِ اکبر'' مطلق حج کو کہتے ہیں، اور ''اکبر'' کا لفظ بول کر اصل میں عمرہ سے احتراز کرنا مقصود ہے، عمرہ کو ''حجِ اصغر'' کہا جاتا ہے۔ تو اس حج کے موقع پر آپ ﷺ نے یہ اعلان کروایا تھا۔

سوال:- مشرکین کے ساتھ یہ جو صلح ہوئی تھی، ان سب کے ساتھ صلحِ حدیبیہ کے موقع پر صلح ہوئی تھی، یا اس سے پہلے بھی ہوئی تھی؟

جواب:- صلحِ حدیبیہ میں جو شریک تھے ان کی تو صلح اس طرح سے ٹوٹی، لیکن پھر بھی جنہوں نے اپنی طرف سے کوئی خیانت نہیں کی تو ان کے ساتھ مسلمانوں نے رواداری کا معاملہ رکھا۔ لیکن جو بنوکنانہ کے ساتھ صلح تھی، یہ جو روایات میں آتا ہے کہ اس موقع پر ان کے نو مہینے باقی تھے، معلوم ہوتا ہے کہ ان سے کوئی مستقل صلح تھی، حدیبیہ میں شریک نہیں تھے، کیونکہ اگر حدیبیہ والی صلح میں ہوتے تو وہ تو دس سال کے لیے کی گئی تھی، اور دو سال کے اندر اندر ٹوٹ گئی۔

سوال:- ان دو قبیلوں کے ساتھ صلح سے پہلے کوئی لڑائی بھی ہوئی تھی؟

جواب:- نہیں، لڑائی کا تو کہیں ذکر نہیں آتا، کوئی ضروری نہیں کہ صلح لڑائی کے بعد ہی ہو، بغیر لڑائی کے بھی تو صلح کی جاسکتی ہے، جیسے مدینہ منورہ میں گئے تھے تو آپ ﷺ نے جا کر یہود کے ساتھ امن کا معاہدہ کرلیا تھا، حالانکہ ان کے ساتھ پہلے کوئی لڑائی نہیں ہوئی تھی۔ جب انہوں نے درپردہ خیانتیں شروع کیں تو پھر ان کا ٹر کوٹا گیا۔ صلح کے لئے، ترکِ جنگ کے معاہدے کے لئے پہلے جنگ کا ہونا ضروری نہیں ہوتا۔ مثلاً دو قبیلے ہیں ان کا آپس میں معاہدہ ہوگیا، کہ بھئی! ہم آپس میں نہیں لڑیں گے، تم ہمارے خلاف کوئی کارروائی نہ کرنا، ہم آپ کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کریں گے۔ تو یہ تفصیل ذکر کی ان قبائل کی چار حصوں میں تقسیم کرکے، جس طرح سے میں نے آپ کی خدمت میں عرض کردیا۔

خلاصۂ آیات

اللہ اور اللہ کے رسول کی طرف سے براءۃ کا اظہار ہے، لاتعلقی کا اعلان ہے اُن مشرکوں کی طرف جن سے تم نے معاہدہ کیا تھا، اب ہم لاتعلقی کا اعلان کرتے ہیں کہ اب معاہدے ختم۔ فَسِيْحُوْا فِي الْاَرْضِ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ: اس کا مصداق وہ لوگ ہوں گے جن کے ساتھ معاہدہ بلاتعیین مدت ہوا تھا، اور اسی کے حکم میں وہ ہیں جن سے معاہدہ تھا ہی نہیں، ان دونوں کو چار مہینے کی مہلت دی گئی ہے، جن سے بلاتعیین مدت معاہدہ ہوا تھا ان کو بھی چار مہینے کی مہلت دے دی گئی، یا کوئی سرے سے معاہدہ ہوا نہیں تھا تو ان کو بھی چار مہینے کی مہلت دیدی گئی۔ ''پھر چلو پھرو تم اے مشرکو! زمین میں چار مہینے تک، اور یہ یقین کرلو کہ اللہ کو تم عاجز کرنے والے نہیں'' اس میں ان کو دھمکا بھی دیا کہ یہ نہ کوشش کرنا کہ ہم کہیں بھاگ کر بچ جائیں گے اور اللہ کے عذاب میں نہیں آئیں گے، اللہ تعالیٰ اگر پکڑنا چاہے گا تو تم چھوٹ نہیں سکتے، اس میں ترغیب ہے کہ اب ہمت آزمائی اور قوت آزمائی کی کوشش نہ کرنا، بلکہ مسلمان ہوجاؤ۔ فَسِيْحُوْا فِي الْاَرْضِ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ: چلو پھرو زمین میں چار مہینے تک، وَّاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللّٰهِ: اور یقین کرلو کہ تم اللہ تعالیٰ کو عاجز کرنے والے نہیں، اور بے شک اللہ تعالیٰ رسوا کرنے والا ہے کافروں کو۔ ان کے متعلق تو یہ اعلان ہوگیا۔ وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ: اللہ اور اللہ کے رسول کی طرف سے اعلان ہے لوگوں کی طرف حجِ اکبر کے دِن۔ حجِ اکبر سے وہی حج کے ایام مُراد ہیں، نو ہجری کی بات ہے۔ ''کہ بے شک اللہ تعالیٰ لاتعلق ہے مشرکوں سے اور اس کا رسول بھی'' اللہ اور اللہ کے رسول کا مشرکوں سے کوئی تعلق نہیں فَاِنْ تُبْتُمْ: اے مشرکو! اگر تم توبہ کرلو گے، اپنے طریقے کو چھوڑ دو گے، مسلمان ہوجاؤ گے، فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ: تو یہ تمہارے لیے بہتر ہے۔ اپنی یہ ضد چھوڑ دو، وَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ: اور اگر تم نے پیٹھ پھیری پھر یقین کرلو کہ تم اللہ کو عاجز کرنے والے نہیں، پھر اللہ تعالیٰ کی گرفت میں آجاؤ گے، تم اللہ کے عذاب سے بچ نہیں سکتے۔ ''اور خبر دے دو، بشارت دے دو اُن لوگوں کو جنہوں نے کُفر کیا عذابِ الیم کی'' اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ: مگر مشرکوں میں سے وہ لوگ جن سے تم نے معاہدہ کیا، پھر انہوں نے تمہارے ساتھ کوئی نقص نہیں ڈالا، معاہدے میں کوئی کمی نہیں کی، لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ شَيْـًٔا: تمہیں کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچایا، کسی قسم کا کوئی قصور نہیں کیا، یہ وہ فریق ہے جن سے معاہدہ تھا اور تعیین مدت کا معاہدہ تھا اور وہ پابند رہے، خصوصیت سے اس آیت میں اشارہ ہے بنوکنانہ کی طرف اور ان کی دونوں شاخوں بنوضمرہ اور بنومدلج کی طرف۔ ''اور نہ انہوں نے تمہارے خلاف کسی کی امدد کی'' نہ خود معاہدے کو توڑا، نہ در پردہ کسی کی امداد کی، فَاَتِمُّوْٓا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ: تو اُن کی طرف اُن کے عہد کو پورا کرو اُن کی مدت تک۔ مدت تک عہد کے پورا کرنے میں اشارہ اس بات کی طرف ہوگیا، کہ اب آئندہ تجدیدِ معاہدہ نہیں کرنی، جتنی مدت متعین ہے اُس وقت تک پورا کردو۔ اعلان کے وقت ان کی مدت میں نو مہینے باقی تھے۔ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ: اللہ تعالیٰ متقین کو پسند کرتے ہیں۔ یہاں متقین سے تقویٰ اجتماعی مراد ہے کہ تمہاری طرف سے معاہدہ میں کوئی خلل نہ پڑے، اس بارے میں اللہ سے ڈرتے رہو۔ فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ: یہ اس گروہ کا ذکر آگیا جنہوں نے معاہدہ کر کے توڑا تھا اور گڑبڑ کی تھی، معاہدے کے خود پابند نہیں رہے، ان کے بارے میں اعلان آگیا کہ جب اَشہرِ حُرم گزر جائیں، اَشہرِ حُرم گزرنے میں اس وقت ذی الحجہ اور محرم باقی، آگے صفر آجائے گا۔ ''جب حُرمت والے مہینے گزر جائیں تو

مشرکین کو قتل کرو، یعنی پھران کے بعد تادیبی کارروائی شروع کردو، یہ مسلمان ہوتے ہیں تو مسلمان ہوجائیں، یا علاقہ چھوڑ دیں، اور اگر یہ ضد کریں کہ نہ مسلمان ہوتے ہیں نہ علاقہ چھوڑتے ہیں تو پھران کی خوب گردنیں ناپو۔ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ پھر قتل کرو مشرکوں کو حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ جہاں بھی تم انہیں پالو، وَخُذُوْهُمْ: اور انہیں پکڑلو، وَاحْصُرُوْهُمْ: اور انہیں گھیر لو، مطلب یہ کہ جنگ میں جیسی کارروائیاں ہوا کرتی ہیں ویسی کارروائیاں ان کے خلاف کرو، وَاقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ: اور ان کے لیے ہر گھات کی جگہ میں بیٹھو، یعنی ان کے خلاف مورچہ بندی کرو، جیسے جنگ کے اندر تدبیر ہوتی ہے، راہ ماروان کا، بیٹھو ہر انتظار کی جگہ میں۔ فَاِنْ تَابُوْا پھر اگر یہ توبہ کرلیں یعنی کفر و شرک سے، ایمان قبول کرلیں، وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ: اور ایمان قبول کرنے کی ظاہری علامت یہ ہے کہ تمہارے ساتھ مل کر نماز پڑھنے لگ جائیں، اور زکوٰۃ دینے لگ جائیں، یہ ایمان قبول کرنے کی ایک ظاہری علامت ہے فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ: پھران کا راستہ چھوڑ دو، پھر انہیں کچھ نہ کہو، پرانی دشمنیاں سب بھول جاؤ، کیونکہ تمہاری سب دشمنیاں اسی لیے تو تھیں کہ وہ کافر ہیں، جب وہ مسلمان ہوگئے تو پھر دشمنی کا کیا مطلب؟ پھران کا راستہ چھوڑو، ان کو آزاد پھرنے دو جس طرح سے پھرتے ہیں، اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ: بے شک اللہ تعالیٰ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔ اب آگے یہ کہہ دیا کہ جن کے خلاف اعلانِ جنگ کردیا گیا ہے اُن میں سے اگر کوئی شخص اب بھی آپ سے پناہ مانگتا ہے کہ میں صرف تمہارے دِین کی باتیں سننے کے لیے، اس پر تبادلہ خیالات کرنے کے لیے اور معلومات حاصل کرنے کے لیے چند دن پناہ لینا چاہتا ہوں، تو اُسے پناہ دو، اور خوب اُن کو اللہ کی آیات سناؤ، اُن کے شکوک شبہات جتنے ہیں سارے دور کرو، پھر اُس کو امن کی جگہ پہنچادو۔ اور یہ رعایت ان کو اس لیے دی جارہی ہے کہ یہ لوگ اصل کے اعتبار سے بے علم ہیں، اُمّی لوگ ہیں، کسی چیز کو سمجھتے سوچتے نہیں ہیں، پہلے سے کوئی کتاب والے نہیں ہیں، ان کے سامنے علمی باتوں کا چرچا نہیں تھا، تو اب بھی ان کو اتنی سہولت ہے کہ اگر کوئی سمجھنے کے لیے تم سے پناہ لے کہ میں دس دِن ٹھہرنا چاہتا ہوں، مجھے دِین کی باتیں سمجھاؤ، تو اس کو پناہ دے دو، پناہ دینے کے بعد باتیں سُنا کر پھر اس کو امن کی جگہ پہنچادو، جو اس کی جگہ ہے، جہاں وہ جانا چاہتا ہے، اُس کے بعد پھر پناہ ختم ہوجائے گی۔ وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ: اگر مشرکین میں سے کوئی شخص تجھ سے پناہ مانگے، فَاَجِرْهُ: تو اس کو پناہ دے دیا کر، حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ: یہاں تک کہ وہ اللہ کی کلام کو سُن لے، ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ: پھر اس کو امن کی جگہ میں پہنچادو۔ یہ رعایت ان کے لئے اس لیے رکھی گئی ہے کہ اتنی تبلیغ ہونے کے بعد اور اس قسم کا اعلان ہونے کے بعد پھر بھی یہ گنجائش رکھی گئی، ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُوْنَ ۝: یہ اس وجہ سے ہے کہ یہ لوگ علم نہیں رکھتے۔ یہ بے علم قسم کے لوگ ہیں، یہ مراعات ان کو اس لیے دی گئی ہیں۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

كَيْفَ يَكُوْنُ لِلْمُشْرِكِيْنَ عَهْدٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَعِنْدَ رَسُوْلِهٖٓ اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ
مشرکین کے لئے عہد کیسے باقی رہے گا اللہ اور اللہ کے رسول کے نزدیک مگر وہ لوگ جن سے تم نے معاہدہ کیا

عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ فَمَا اسْتَقَامُوْا لَكُمْ فَاسْتَقِيْمُوْا لَهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ

مسجدِ حرام کے پاس، پھر جب تک وہ تمہارے لیے سیدھے رہیں پس تم اُن کے لیے سیدھے رہو، بے شک اللہ پسند کرتا ہے

الْمُتَّقِيْنَ ۝ كَيْفَ وَاِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ لَا يَرْقُبُوْا فِيْكُمْ

متقین کو⑦ کیسے (عہد ہوگا مشرکین کے لئے) جبکہ ان کا حال یہ ہے کہ اگر وہ غلبہ پالیں تم پر تو نہیں لحاظ کریں گے تمہارے بارے میں

اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً ۭ يُرْضُوْنَكُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ وَتَاْبٰى قُلُوْبُهُمْ ۚ

قرابت کا اور نہ ذمہ داری کا، راضی کرتے ہیں وہ تمہیں اپنے مونہوں کے ساتھ اور انکار کرتے ہیں اُن کے دل،

وَاَكْثَرُهُمْ فٰسِقُوْنَ ۝ۚ اِشْتَرَوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا فَصَدُّوْا

اور اُن میں سے اکثر فاسق ہیں⑧ لیا انہوں نے اللہ کی آیات کے بدلے ثمنِ قلیل کو پھر روکا انہوں نے

عَنْ سَبِيْلِهٖ ۭ اِنَّهُمْ سَاۗءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ لَا يَرْقُبُوْنَ

اللہ کے راستے سے، بُرا ہے وہ عمل جو یہ کرتے ہیں⑨ نہیں لحاظ کرتے یہ

فِيْ مُؤْمِنٍ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُعْتَدُوْنَ ۝ فَاِنْ

کسی مؤمن کے بارے میں رشتے داری کا اور نہ عہد کا، یہی لوگ حد سے بڑھنے والے ہیں⑩ پھر اگر

تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ ۭ

توبہ کرلیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دینے لگ جائیں پھر یہ تمہارے بھائی ہیں دِین کے بارے میں،

وَنُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝ وَاِنْ نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ

اور ہم کھول کر بیان کرتے ہیں آیات اُن لوگوں کے لیے جو سمجھ دار ہیں⑪ اگر توڑ دیں یہ اپنی قسمیں

مِّنْۢ بَعْدِ عَهْدِهِمْ وَطَعَنُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ فَقَاتِلُوْٓا اَىِٕمَّةَ الْكُفْرِ ۙ

اپنے عہد کے بعد اور تمہارے دِین میں طعن وتشنیع کریں پھر لڑو تم کُفر کے پیشواؤں سے،

اِنَّهُمْ لَآ اَيْمَانَ لَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَنْتَهُوْنَ ۝ اَلَا تُقَاتِلُوْنَ قَوْمًا

بے شک یہ لوگ، ان کے لیے کوئی قسمیں نہیں ہیں تاکہ یہ باز آجائیں⑫ کیا نہیں لڑو گے تم اُن لوگوں کے ساتھ

نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ وَهَمُّوْا بِاِخْرَاجِ الرَّسُوْلِ وَهُمْ بَدَءُوْكُمْ اَوَّلَ

جنہوں نے توڑ دیں اپنی قسمیں اور ارادہ کیا انہوں نے رسول کو نکالنے کا اور انہوں نے پہلی مرتبہ تم سے

مَرَّةٍ ؕ اَتَخْشَوْنَهُمْ ۚ فَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشَوْهُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۳﴾

(لڑائی کی) ابتدا کی، کیا تم ان سے ڈرتے ہو؟ اللہ تعالیٰ زیادہ حق دار ہے اس بات کا کہ تم اس سے ڈرو اگر تم ایمان والے ہو﴿۱۳﴾

قَاتِلُوْهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَيْدِيْكُمْ وَيُخْزِهِمْ وَيَنْصُرْكُمْ عَلَيْهِمْ

لڑائی کرو ان کے ساتھ، عذاب دے گا اللہ تعالیٰ انہیں تمہارے ہاتھوں اور انہیں رُسوا کرے گا اور تمہاری ان کے خلاف مدد کرے گا

وَيَشْفِ صُدُوْرَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۴﴾ وَيُذْهِبْ غَيْظَ قُلُوْبِهِمْ ؕ

اور مؤمنین کے سینوں کو شفا دے گا﴿۱۴﴾ اور مؤمنوں کے دِلوں کی جلن کو لے جائے گا،

وَيَتُوْبُ اللّٰهُ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۱۵﴾ اَمْ

اور اللہ توجہ فرمائے گا جس پر چاہے گا، اللہ تعالیٰ علم والا حکمت والا ہے﴿۱۵﴾ کیا

حَسِبْتُمْ اَنْ تُتْرَكُوْا وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ

تم یہ سمجھتے ہو کہ تم چھوڑ دیئے جاؤ گے؟ حالانکہ ابھی تک اللہ تعالیٰ نے جُدا کر کے نہیں جانا اُن لوگوں کو جنہوں نے تم میں سے جہاد کیا

وَلَمْ يَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلَا رَسُوْلِهٖ وَلَا الْمُؤْمِنِيْنَ

اور جنہوں نے اللہ کے علاوہ اور اس کے رسول کے علاوہ اور مؤمنین کے علاوہ

وَلِيْجَةً ؕ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۶﴾

کوئی مخلص دوست نہیں بنایا، اللہ تعالیٰ خبر رکھنے والا ہے اُس کام کی جو تم کرتے ہو﴿۱۶﴾

خلاصہ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ كَيْفَ يَكُوْنُ لِلْمُشْرِكِيْنَ عَهْدٌ: مشرکین کے لیے عہد کیسے باقی رہے گا، عِنْدَ اللّٰهِ وَعِنْدَ رَسُوْلِهٖ: اللہ اور اللہ کے رسول کے نزدیک، اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ: مگر وہ لوگ جن سے تم نے معاہدہ کیا مسجدِ حرام کے پاس، فَمَا اسْتَقَامُوْا لَكُمْ: پھر جب تک وہ تمہارے لیے سیدھے رہیں فَاسْتَقِيْمُوْا لَهُمْ: پس تم ان کے لیے سیدھے رہو، اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ

الْمُتَّقِيْنَ: بے شک اللہ تعالیٰ متقین سے محبت رکھتا ہے، پسند کرتا ہے متقین کو۔ اور یہاں خصوصیت کے ساتھ تقویٰ کا مصداق ایفائے عہد ہے، کہ عہد کا پورا کرنا تقویٰ ہے، اور تقوے والوں کو اللہ تعالیٰ پسند کرتا ہے، یعنی جو اپنے عہد کو وفا کریں گے اللہ تعالیٰ انہیں پسند کرے گا۔ كَيْفَ: یہ اسی پہلے كَيْفَ کا اعادہ ہے۔ کیسے عہد ہوگا مشرکین کے لئے اللہ اور اللہ کے رسول کے نزدیک جبکہ ان کا حال یہ ہے وَاِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ لَا يَرْقُبُوْا فِيْكُمْ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً: اگر وہ غلبہ پالیں تم پر، نہیں لحاظ کریں گے تمہارے بارے میں قرابت کا اور نہ ذمہ داری کا۔ اِلّ قرابت کو کہتے ہیں، يُرْضُوْنَكُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ: راضی کرتے ہیں وہ تمہیں اپنے مونہوں کے ساتھ، وَتَاْبٰى قُلُوْبُهُمْ: اور انکار کرتے ہیں ان کے دل، وَاَكْثَرُهُمْ فٰسِقُوْنَ: اور ان میں سے اکثر فاسق ہیں، یہاں فسق اسی تقویٰ کے مقابلے میں ہے جو متقین کے اندر لفظ تقویٰ آیا تھا، تو یہاں فسق کا خصوصیت کے ساتھ مفہوم ہوگا عہد کو پورا نہ کرنا بلکہ عہد کے ساتھ غداری کرنا، ''ان میں سے اکثر غدار ہیں، ان میں سے اکثر عہد کا پاس رکھنے والے نہیں ہیں، یہ مفہوم ہوگا یہاں فاسقون کا، اس لیے حضرت شیخ (الہندؒ) نے ترجمہ کیا ہے ''اکثر ان میں بدعہد ہیں'' تو فسق کا معنی بدعہد یہ موقع محل کے مطابق کر دیا گیا ہے، جیسے تقویٰ کا معنی عہد کی پاسداری کیا گیا تھا۔ اِشْتَرَوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا: اِشْتَرٰى: خریدنا۔ ''خرید لیا انہوں نے اللہ کی آیات کے بدلے ثمن قلیل کو'' یہاں مطلقاً لے لینا مراد ہے، ''لیا انہوں نے ثمن قلیل کو اللہ کی آیات کے بدلے'' فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِهٖ: پھر روکا انہوں نے اللہ کے راستے سے، اِنَّهُمْ سَآءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ: مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ: جو کچھ یہ کرتے ہیں بہت برا ہے، برا ہے وہ عمل جو یہ کرتے ہیں، لَا يَرْقُبُوْنَ فِيْ مُؤْمِنٍ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً: نہیں لحاظ رکھتے یہ کسی مؤمن کے بارے میں قرابت کا، رشتے داری کا، اور نہ ذمہ داری کا، عہد کا، وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُعْتَدُوْنَ: یہی لوگ حد سے بڑھنے والے ہیں۔ فَاِنْ تَابُوْا: پھر اگر توبہ کرلیں، وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ: اور نماز قائم کریں، وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ: اور زکوٰۃ دینے لگ جائیں، فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ: پھر یہ تمہارے بھائی ہیں دین کے بارے میں، پھر یہ تمہارے دینی بھائی ہیں، وَنُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ: اور ہم کھول کر بیان کرتے ہیں آیات، لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ: ان لوگوں کے لئے جو جانتے ہیں، جو جاننا چاہتے ہیں، جو علم حاصل کرنا چاہتے ہیں، یا جو سمجھ دار ہیں، حضرت تھانویؒ نے ترجمہ اسی طرح سے فرمایا، سمجھ دار لوگوں کے لئے، علم والے لوگوں کے لئے ہم آیات کھول کر بیان کرتے ہیں۔ وَاِنْ نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ: اَیمان جمع یمین کی، یمین کہتے ہیں قسم کو، یہاں مراد عہد ہے۔ اگر توڑ دیں یہ لوگ اپنی قسمیں، یعنی جو عہد انہوں نے کیا ہے اگر اس کو یہ توڑ دیں، اگر توڑ دیں یہ اپنی قسمیں اپنے عہد کے بعد وَطَعَنُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ: اور تمہارے دین میں طعن کریں، طعن و تشنیع! تمہارے دین میں عیب لگائیں، طعن و تشنیع کریں، فَقَاتِلُوْٓا اَئِمَّةَ الْكُفْرِ: ائمہ امام کی جمع ہے۔ پھر لڑو تم کفر کے اماموں سے، کفر کے پیشواؤں سے لڑو، اِنَّهُمْ لَآ اَيْمَانَ لَهُمْ: بے شک یہ لوگ، ان کے لئے کوئی قسمیں نہیں، یعنی ان کی قسموں کا کوئی لحاظ نہیں لَعَلَّهُمْ يَنْتَهُوْنَ: تاکہ یہ باز آجائیں۔ اَلَا تُقَاتِلُوْنَ قَوْمًا نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ: کیا نہیں لڑو گے تم ان لوگوں کے ساتھ جنہوں نے توڑ دیں اپنی قسمیں، وَهَمُّوْا بِاِخْرَاجِ الرَّسُوْلِ: اور ارادہ کیا انہوں نے رسول کو نکالنے کا، رسول کو نکالنے کا ارادہ کیا، رسول کو نکالنے کے لیے منصوبے بنائے، وَهُمْ بَدَءُوْكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ: اور انہوں نے پہلی مرتبہ تم سے ابتدا کی، یعنی چھیڑ چھاڑ خود کی، پہلی مرتبہ انہوں نے تم سے خود لڑائی کی ابتداء کی، بَدَءَ شروع کرنے کو کہتے ہیں۔ اَتَخْشَوْنَهُمْ: کیا تم ان سے ڈرتے ہو؟ فَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشَوْهُ: اللہ تعالیٰ زیادہ حق دار ہے اس بات کا کہ تم اس سے ڈرو، اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ: اگر تم ایمان والے ہو۔

قَاتِلُوْهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَيْدِيْكُمْ: قَاتِلُوْا، مقاتلہ سے ہے۔لڑائی کرو ان کے ساتھ، عذاب دے گا اللہ تعالیٰ انہیں تمہارے ہاتھوں۔ ایدی ید کی جمع ہے۔ وَيُخْزِهِمْ: اور اللہ انہیں رُسوا کرے گا، وَيَنْصُرْكُمْ عَلَيْهِمْ: اور اللہ تمہاری ان کے خلاف مدد کرے گا، وَيَشْفِ صُدُوْرَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِيْنَ: اور ایمان والے لوگوں کے سینوں کو اللہ شفا دے گا، يَشْفِ: شفا دے گا، اور یہ جزم کی حالت ہے، يُعَذِّبْهُمْ کی طرح جوابِ اَمر ہونے کی وجہ سے۔ تم ان سے لڑو، اللہ انہیں عذاب دے گا، اور انہیں رُسوا کرے گا، تمہاری ان کے خلاف مدد کرے گا، مؤمنین کے سینوں کو شفا دے گا، وَيُذْهِبْ غَيْظَ قُلُوْبِهِمْ: اور مؤمنوں کے دِلوں کی جلن کو لے جائے گا۔ غیظ: غصہ، جلن۔ لے جائے گا مؤمنوں کے دِلوں کی جلن کو، وَيَتُوْبُ اللّٰهُ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ: اور اللہ تعالیٰ توجہ فرمائے گا جس پر چاہے گا، وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ: اللہ تعالیٰ علم والا حکمت والا ہے۔ اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تُتْرَكُوْا: کیا تم نے سمجھ لیا کہ تم چھوڑ دیے جاؤ گے؟ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَلَمْ يَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلَا رَسُوْلِهٖ وَلَا الْمُؤْمِنِيْنَ وَلِيْجَةً: علم کا صلہ جس وقت مِن آ جائے، یہ کئی جگہ آپ کے سامنے ذکر کیا تھا کہ اس میں تمیز والا معنی پیدا ہو جایا کرتا ہے، تو جس سے مفہوم یوں ادا ہوگا کہ ''کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ تم چھوڑ دیے جاؤ گے؟ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے جدا کر کے نہیں جانا ان لوگوں کو جنہوں نے تم میں سے جہاد کیا اور جنہوں نے اللہ کے علاوہ اور اس کے رسول کے علاوہ اور مؤمنین کے علاوہ کوئی مخلص دوست نہیں بنایا''، ولیجہ کہتے ہیں مخلص دوست کو جس کو انسان اپنے دل میں داخل کر لیتا ہے، وَلَجَ داخل ہونے کو کہتے ہیں۔ دوسری جگہ ''بطانہ'' کا لفظ استعمال ہوا، لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ (سورۂ آل عمران: ۱۱۸) اپنے لوگوں کے علاوہ کسی کو اپنا بطانہ نہ بنایا کرو، ''بطانہ'' کہتے ہیں اندر والے کپڑے کو جو بدن کے ساتھ لگا ہوا ہوتا ہے۔ وہاں بھی ہمراز ہی مراد ہے۔ ''جدا جدا کر کے نہیں جانا اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو جنہوں نے تم میں سے جہاد کیا، اور جنہوں نے تم میں سے اللہ کے علاوہ اور رسول کے علاوہ اور مؤمنین کے علاوہ کوئی دوست نہیں بنایا''۔ وَلَا رَسُوْلِهٖ اور وَلَا الْمُؤْمِنِيْنَ میں جو لَا ہے، یہ لَمْ يَتَّخِذُوْا کے اندر جو نفی ہے اس کی تاکید ہے۔ ''نہ اللہ کے علاوہ نہ اللہ کے رسول کے علاوہ، نہ مؤمنین کے علاوہ'' اس کا مفہوم یوں ادا ہوا کرتا ہے۔ ولیجہ: مخلص دوست، بھیدی۔ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ: اللہ تعالیٰ خبر رکھنے والا ہے اس کام کی جو تم کرتے ہو۔

تفسیر

مذکورہ رُکوع میں بیان کردہ مضمون

یہ آیات جو آپ کے سامنے پڑھی گئیں ان میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے خصوصیت کے ساتھ مشرکینِ مکہ کے خلاف جہاد پر برانگیختہ کیا ہے (کیونکہ ان میں سے بعض آیات بالیقین فتحِ مکہ سے پہلے کی ہیں، اور بعض آیات اُس وقت کی ہیں جس وقت انہوں نے حدیبیہ کا معاہدہ توڑ دیا تھا) اور فتحِ مکہ کی ترغیب دی جا رہی ہے، اور مشرکینِ مکہ یعنی قریش کے مقابلے میں مسلمانوں کو جہاد کرنے کے لیے اُبھارا جا رہا ہے۔ اور بعض آیات اس طرح سے معلوم ہوتی ہیں کہ ابھی انہوں نے معاہدہ توڑا تو نہیں، لیکن اندیشہ ظاہر کر دیا گیا ہے کہ یہ توڑیں گے، اور یہ عہد ان کے لیے باقی نہیں رہے گا، اس رکوع کے اندر جو آیات ہیں ان کا یہی مضمون ہے۔

مشرکینِ مکہ کی بدعہدی کی پیش گوئی

پہلی آیات اُن کے معاہدہ توڑنے سے پہلے کی ہیں، جس میں ایک قسم کی پیش گوئی ہے کہ یہ ایسا کریں گے، اگرچہ حدیبیہ میں انہوں نے معاہدہ کرلیا ہے لیکن ان کا یہ معاہدہ باقی نہیں رہے گا، یہ گڑبڑ کرنے کے عادی ہیں، زبانی زبانی باتیں کرکے تمہیں خوش کردیتے ہیں، باقی! ان کے دل کسی صورت میں تمہیں برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں، اس لیے جب بھی موقع ہوگا اس معاہدہ میں خیانت کریں گے، اور جب خیانت کریں گے تو ان کے لیے کوئی عہد باقی نہیں رہے گا، نہ اللہ کے نزدیک، نہ اللہ کے رسول کے نزدیک، کیونکہ معاہدہ یک طرفہ چیز نہیں ہے، یہ تو فریقین کے درمیان ہوتا ہے، اور دونوں فریق ہی اس کو باقی رکھیں تو باقی رہا کرتا ہے، یہ نہیں کہ ایک تو اُس کی خلاف ورزی کرتا رہے اور اس معاہدہ کے خلاف گڑبڑ کرتا رہے، اور دوسرا فریق اپنے معاہدے کا لحاظ کرتا ہوا جما رہے، یہ کوئی طریقہ نہیں ہے، بلکہ یہ دوطرفی چیز ہے، اگر دوسرا فریق لحاظ رکھے گا تو تم نے لحاظ رکھنا ہے، اور اگر دوسرا فریق اس معاہدے کا لحاظ نہیں رکھتا بلکہ اُس کے اندر خیانت کردیتا ہے تو اُن کا معاہدہ کوئی باقی نہیں ہے۔ دنیا کے اندر اگر انسان ایک دوسرے کا لحاظ رکھتا ہے تو معاشرتی طور پر تو اس کی وجہ ہوتی ہے رشتہ داری، کہ آپس میں رشتہ داری اور قرابت ہے، تو قرابت کی وجہ سے انسان ایک دوسرے کا لحاظ رکھتا ہے۔ اور سیاسی سطح پر ایک دوسرے کا لحاظ رکھنے کی وجہ سیاسی معاہدے ہوتے ہیں، کہ ایک قوم دوسری قوم کے ساتھ معاہدہ کرلے، ایک جماعت دوسری جماعت کے ساتھ معاہدہ کرلے، کہ تم نے ہمارا لحاظ رکھنا ہے اور ہم نے تمہارا لحاظ رکھنا ہے، اور مشرکوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ یہ دونوں قسم کی چیزوں کے اندر ہی خائن ہیں، مسلمانوں کے خلاف ان کے دل میں اتنا بغض اور اتنا عناد ہے کہ اگر یہ کسی صورت میں بھی قابو پا جائیں اور ان کا بس چلے، تو نہ تو تمہارے بارے میں کسی قرابت کا لحاظ رکھنے کے لیے تیار ہیں، کہ تمہیں یہ سمجھیں کہ ہمارے قریشی بھائی ہیں، ہماری برادری کے ہیں، چلو! اگر انہوں نے دوسرا نظریہ قبول کرلیا تو کیا بات ہے، برداشت کرلیں، ایسا نہیں۔ قرابت کا لحاظ بھی نہیں رکھیں گے، اور قابو پانے کی صورت میں کسی ذمہ داری اور عہد کا بھی خیال نہیں رکھیں گے۔ تو جو قوم اس قسم کی فاسق اور غدار ہو، اور اپنے عہد کا لحاظ رکھنے والی نہیں، اُن کے لئے عہد بھلا کیسے باقی رہ سکتا ہے؟ تو یہ آیات تو ایسی ہیں جن کو آپ پیش گوئی پر محمول کرسکتے ہیں کہ ایسا ہوگا، چنانچہ آنے والی تاریخ نے واضح کردیا کہ ایسا ہی ہوا، کہ مشرکینِ مکہ کی طرف سے وہ عہد توڑا گیا، اور انہوں نے اپنے حلیف قبیلے بنوبکر کی امداد کی تھی بنوخزاعہ کے خلاف جو کہ حضور ﷺ کا معاہد تھا، جیسا کہ سورت کی ابتداء میں تفصیلی حالات بیان کرتے ہوئے آپ کے سامنے ذکر کردیا گیا تھا۔ تو پہلی آیات کا مفہوم تو یہ ہے۔

اِبتدائی آیات پر ایک نظر اور!

كَيْفَ يَكُوْنُ لِلْمُشْرِكِيْنَ عَهْدٌ مشرکین کے لیے عہد کیسے باقی رہے گا اللہ اور اللہ کے رسول کے نزدیک؟ یہاں تک کلام پہنچا کر آگے اِستثنٰی لگادیا گیا، اور اس کلام کو اگلی آیت میں پورا کیا جائے گا كَيْفَ وَاِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ میں۔ اور یہ درمیان میں جملہ معترضہ آ گیا مستثنٰی کے طور پر کہ ''جنہوں نے تمہارے ساتھ معاہدہ کیا مسجد حرام کے پاس'' جیسے حدیبیہ میں جو معاہدہ ہوا تھا تو وہ بھی مسجد

حرام کے پاس ہی تھا، کیونکہ حدیبیہ کی سرحد حرم کے متصل ہے، جہاں حضور ﷺ اُس وقت ٹھہرے ہوئے تھے۔ فَمَا اسْتَقَامُوْا لَكُمْ جب تک وہ تمہارے لیے سیدھے رہیں فَاسْتَقِيْمُوْا لَهُمْ: تو تم اُن کے لیے سیدھے رہو، اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ: اپنے عہد کی پاسداری یہ تقویٰ ہے، اور اللہ تعالیٰ متقین کو پسند کرتا ہے۔ تو یہاں سیاسی تقویٰ مراد ہے، اپنے عہد اور اپنی زبان کی پابندی، کہ اگر کسی کے ساتھ معاہدہ کرلیا ہے تو اُس کی پابندی کرو، تقویٰ کا تقاضا یہی ہے، اور اللہ تعالیٰ اس قسم کا تقویٰ اختیار کرنے والے کو پسند کرتے ہیں۔ یہ درمیان میں بات کہہ دی۔ اور اگلی آیت ماقبل کے مضمون کے ساتھ جڑ گئی كَيْفَ وَاِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ: تو كَيْفَ کے اندر اسی مضمون کا اعادہ ہوگیا جو پہلے كَيْفَ کے بعد آیا تھا۔ مشرکین کے لیے اللہ اور اللہ کے رسول کے نزدیک عہد کیسے رہے گا، جب کہ اُن کا حال یہ ہے کہ اگر تم پر غالب آجائیں لَا يَرْقُبُوْا فِيْكُمْ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً: تو تمہارے بارے میں نہ کسی قرابت کا خیال کریں نہ کسی عہد کا۔ غلبہ پالینے کی صورت میں، بس چلنے کی صورت میں یہ نہیں دیکھیں گے کہ تم اُن کے بھائی بند ہو خاندانی طور پر، یا اُن کے ساتھ تمہاری کوئی قرابت ہے، یا اُن کے ساتھ تمہارا کوئی عہد ہے، تو یہ دو ہی باتیں ہیں جن کی بناء پر انسان کسی کا لحاظ رکھا کرتا ہے، معاشرتی طور پر آپس میں قرابت کا تعلق، یا جماعتی سطح پر سیاسی معاہدات، تو جب ان دونوں کا لحاظ ہی ان کے دل میں نہیں ہے تو ایسی صورت میں یہ بات کیسے باقی رہے گی؟ یہ جو معاہدہ تم سے کرتے ہیں تو اپنے منہ سے تمہیں خوش کر دیتے ہیں، باتیں بنا کے تمہیں راضی کر لیتے ہیں، گویا کہ تمہارے ساتھ نباہ کرنا چاہتے ہیں، تمہارے ساتھ مل جل کے رہنا چاہتے ہیں، تو زبان سے یہ تمہیں خوش کرتے ہیں وَتَاْبٰى قُلُوْبُهُمْ: ان کے دل انکار کرتے ہیں، ان کے دل اور زبان کا ایک حال نہیں، مجبوری کی بنا پر اگر یہ مصالحت کرلیں تو کرلیں، ورنہ ان کے دل تمہیں کسی صورت میں بھی برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں، اس لیے جہاں بس چلے یہ تمہیں نقصان پہنچائیں گے۔ ''خوش کرتے ہیں یہ تمہیں اپنے مونہوں کے ساتھ، اور انکار کرتے ہیں ان کے قلوب'' یعنی ان کے قلوب اور ان کی زبانیں آپس میں موافق نہیں ہیں، ان کی آپس میں موافقت نہیں ہے، ان کے دل کسی طرح ہیں اور زبانوں سے کچھ اور کہتے ہیں۔ وَاَكْثَرُهُمْ فٰسِقُوْنَ: اور ان میں سے اکثر فاسق ہیں۔ فسق کا معنی ہوتا ہے خروج عن الطاعۃ اور یہاں خصوصیت کے ساتھ فسق سے معاہدے کی خلاف ورزی مراد ہے، جس کو آپ غداری سے تعبیر کرتے ہیں، اُن میں سے اکثر ایسے ہیں جن کے دل میں عہد کا کوئی لحاظ نہیں، یہ غدار ہیں، یہ وفادار نہیں، یہ عہد کی پابندی نہیں کریں گے، یہ گڑبڑ کرنے کے عادی ہیں۔

مشرکین مکہ کی بدعہدی کی وجوہات

اور ایسا انہوں نے کیوں کیا؟ کسی چیز کا یہ لحاظ نہیں رکھتے، اس طرح سے یہ فاسق ہوگئے، طاعت سے نکل گئے، اُس کی وجہ یہ ہے کہ یہ دنیادار ہیں، اور دنیادار کی ہمیشہ خاصیت ہوتی ہے کہ جہاں اپنا مفاد دیکھتا ہے تو اُس کو معاہدہ بھی یاد رہتا ہے، جہاں اُس کو مفاد ہوتا ہے تو وہاں تو رشتہ داری کا لحاظ بھی رکھے گا، اور جہاں اُس کا مفاد نہیں ہے یا خلاف کرنے کی صورت میں اُس کا مفاد ہے تو پھر نہ رشتہ داری کا لحاظ کرے، نہ کسی زبان کا لحاظ کرے، حب دنیا اس کا باعث ہے اور مشرک دنیا کی محبت میں مبتلا ہیں، دنیا کی محبت میں مبتلا ہونے کی وجہ سے ان کو اپنا مفاد عزیز ہے، اپنا جاہ، اپنی عزت، اپنا مال اور اپنی دولت، اس مفاد کو پیش نظر رکھتے

ہوئے اگر کہیں معاہدہ کی صورت میں اُن کو مفاد حاصل ہوتا ہے تو معاہدہ کر لیتے ہیں، اور اگر کہیں معاہدہ توڑنے کی صورت میں اپنا فائدہ محسوس کریں گے تو معاہدہ توڑ کے رکھ دیں گے، اصل بات یہ ہے کہ ان کے سامنے آخرت نہیں، اللہ تعالیٰ کے سامنے حساب کتاب کا عقیدہ نہیں، کہ انہوں نے اللہ کے سامنے جا کے حساب کتاب دینا ہے وہ ان کے سامنے نہیں ہے، اگر وہ عقیدہ ہوتا پھر تو اپنا فائدہ ہو نہ ہو، انسان اپنی زبان کا لحاظ رکھتا ہے، کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے جا کر ہم نے حساب دینا ہے۔ آخرت کا تو عقیدہ ہے ہی نہیں، ان کے سامنے تو صرف دنیا ہے، تو جدھر یہ فائدہ محسوس کریں گے اُدھر کو ہو جائیں گے، تو ایسے لوگوں کے عہد کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا۔ ''لے لیا انہوں نے اللہ کی آیات کے بدلے ثمن قلیل کو'' ثمن قلیل سے دنیا کا ساز و سامان مراد ہے، ساری دنیا اس کا مصداق ہے۔ ثمنِ قلیل: تھوڑی سی قیمت۔ تھوڑی سی قیمت کا یہ معنی نہیں کہ چند پیسوں کے بدلے میں تو اللہ کی آیات کا بیچنا ٹھیک نہیں، اور اگر زیادہ پیسے مل جائیں تو بیچ دیا کرو، نہیں! ساری کائنات اللہ کی آیات کے مقابلے میں رکھ دی جائے تو بھی وہ ثمنِ قلیل ہے، اللہ کی آیات کی کوئی قیمت نہیں، اس لیے کسی مال کے لالچ میں آ کے اللہ کے احکام کی خلاف ورزی کرنا چاہے وہ مال کروڑوں اربوں میں شمار کیوں نہ ہو تو بھی اللہ کے حکم کے مقابلے میں وہ ثمنِ قلیل ہے، تو ثمنِ قلیل سے دنیا مراد ہے۔ ''لے لیا انہوں نے اللہ کی آیات کے بدلے ثمنِ قلیل کو، پھر روکا انہوں نے اللہ کے راستے سے'' یعنی یہی نہیں کہ خود دنیا دار ہو گئے اور اللہ کا راستہ اختیار نہیں کرتے، دنیا پہ مرتے ہیں، بلکہ دوسروں کو بھی گمراہ کرتے ہیں، اِنَّهُمْ سَآءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ جو کچھ یہ کرتے ہیں، بہت بُرا ہے۔

مشرکین کا مزاج......توبہ کے بعد برادرانہ سلوک کا حکم

لَا يَرْقُبُوْنَ فِيْ مُؤْمِنٍ: یہ اُن کا مزاج ذکر کیا، کہ صرف یہی نہیں کہ تمہارا لحاظ نہیں کریں گے، بلکہ کسی مؤمن کے بارے میں ان کے دل میں اچھے جذبات نہیں ہیں۔ ''نہیں لحاظ کریں گے کسی مؤمن کے بارے میں قرابت کا نہ ذمہ داری کا، یہ لوگ حد سے بڑھنے والے ہیں'' یہ حد پر نہیں رہتے، جو معاہدہ کی حد ہے اُس پر نہیں رہیں گے، جو رشتہ داری کا تقاضا ہے اُس پر نہیں رہیں گے، یہ حد سے نکلنے والے لوگ ہیں، کسی مؤمن کے بارے میں کوئی قرابت اور کوئی عہد ان کے نزدیک قابل لحاظ نہیں، اس لیے ان کے عہد کا باقی رہنا مشکل ہے، تو پھر چاہے تمہارے ساتھ یہ دشمنی کریں، جیسے جیسے بھی تمہیں نقصانات پہنچائیں، لیکن اگر اپنے طریقے سے باز آ جائیں، توبہ کر لیں، کُفر و شرک چھوڑ دیں، ایمان قبول کر لیں، یہاں توبہ سے توبہ عن الکفر و الشرك مراد ہے۔ ''اگر یہ کُفر و شرک سے توبہ کر لیں، اور نماز پڑھنے لگ جائیں، زکوٰۃ دینے لگ جائیں'' کیونکہ ایمان کا تعلق تو قلب کے ساتھ ہے، اور اس کا اظہار ہوتا ہے نماز اور زکوٰۃ کے ساتھ، یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی شخص کہے کہ میں مؤمن ہوں لیکن میں نماز نہیں پڑھتا، یا کہے کہ میں مؤمن ہوں لیکن میں زکوٰۃ نہیں دیتا، تو وہ مؤمن نہیں، اُس کا ایمان قابل اعتماد نہیں ہے، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جب لوگوں نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا تھا، تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اُن کے خلاف جہاد کیا، اور استدلال اسی قسم کی آیات اور روایات سے کیا ہے جن میں اللہ اور اللہ کے رسول نے بیان کیا، کہ جب تک نماز نہ پڑھیں اور زکوٰۃ نہ دیں اُس وقت تک ان کے ایمان کا اعتبار کوئی نہیں۔ تو یہاں بھی اسی طرح سے ہے کہ نماز پڑھنے لگ جائیں اور زکوٰۃ

دینے لگ جائیں پھر وہ تمہارے دینی بھائی ہیں، پھر ان کی پچھلی عداوتوں کو یاد نہیں رکھنا، کہ پہلے یہ کیا کرتے رہے، پھر یہ تمہارے بھائی ہیں پھر ان کے ساتھ معاملہ بھائیوں جیسا رکھو۔

تارکِ نماز کے لئے تخلیۂ سبیل ائمۂ اربعہؒ کے نزدیک نہیں

سوال:-یوں تو پھر اکثر لوگ نماز نہیں پڑھتے۔

جواب:-لیکن وہ کہتے ہیں کہ فرض ہے، تسلیم انہوں نے کی ہوئی ہے، یہ ہے عملی کوتاہی، یہ بغاوت نہیں ہے، عملی کوتاہی قابلِ برداشت ہے، قابلِ برداشت بایں معنی کہ ہم ان کو کافر قرار نہیں دیں گے، ورنہ اسلامی حکومت کو تو اَب بھی حکم ہے کہ ان کو پکڑو، فَخَلُّوْا سَبِیْلَهُمْ جو آیا تھا کہ اگر یہ نماز پڑھنے لگ جائیں اور زکوٰۃ دینے لگ جائیں تو ان کا راستہ چھوڑ دو، تو یہ تخلیۂ سبیل اِقامتِ صلوٰۃ اور اِیتائے زکوٰۃ پہ ہے، اور اگر اِقامتِ صلوٰۃ اور اِیتائے زکوٰۃ نہیں کرتے تو تخلیۂ سبیل نہیں، پھر ان کا راستہ روکا جائے گا، اگر شرعی حکومت آجائے، اور پورے طریقے کے ساتھ شریعت کا قانون لاگو ہوجائے تو بے نمازی کو آزادانہ نہیں پھرنے دیا جائے گا، وہ پکڑا جائے گا، پکڑنے کے بعد اسے کہیں گے کہ بندہ بن جا، اور اقرار کر اور عہد کر کہ نماز نہیں چھوڑے گا، سچی سچی توبہ کرلے، اگر وہ کہے کہ میں توبہ کرتا ہوں، نماز پڑھوں گا، تو اُسے چھوڑ دو۔ اگر وہ نماز نہیں پڑھتا، بار بار تنبیہ کے باوجود نہیں پڑھتا، اگرچہ کہتا ہے کہ فرض ہے، فرضیت کا قائل ہے، لیکن بار بار تنبیہ کے باوجود پڑھتا نہیں ہے، تو آپ کے چاروں اِماموں کی عدالت جو فیصلہ کرتی ہے اُس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ شرعی حکومت میں اس کے لیے تخلیۂ سبیل نہیں ہے، تین امام تو کہتے ہیں کہ ایسے آدمی کو قتل کردو، اِمام شافعی رضی اللہ عنہ کا یہی مسلک ہے، اور اِمام احمد رضی اللہ عنہ کا یہی مسلک ہے، اور اِمام مالک رضی اللہ عنہ کا بھی یہی مسلک ہے، کہ جو بار بار تنبیہ کے باوجود نماز نہیں پڑھتا، چاہے کہتا ہے کہ فرض ہے، اس کو قتل کردو، یہ اسلامی حکومت میں نہیں رہ سکتا۔ اب یہ قتل کیوں کیا جائے گا؟ اِمام شافعی رضی اللہ عنہ اور اِمام مالک رضی اللہ عنہ یہ دو اِمام کہتے ہیں کہ یہ قتل سزا کے طور پر ہے، ورنہ یہ کافر نہیں۔ جس طرح زانی کو مار دیا جاتا ہے، قاتل کو قتل کردیا جاتا ہے، اسی طرح سے اس بے نمازی کو قتل کردو۔ اور اِمام احمد رضی اللہ عنہ کے نزدیک یہ باقاعدہ مُرتد ہے، یہ شخص حقیقتاً کافر ہوگیا، اور اس کی سزا مُرتد والی ہے، اور آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ حنبلی ہیں، اور اُن کا مسلک ہے کہ بے نمازی کافر ہے، اب یہ جتنے شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ گیارہویں والے پیر کی گیارہویاں دینے والے ہیں، اکثر بے نمازی ہیں، اب اگر یہ کہیں شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی عدالت میں پیش ہوگئے، تو ان میں سے اکثر مسلمان نہیں ہوں گے اور ان کے متعلق حکم دیں گے کہ ان کو گھسیٹ کر جہنم میں پھینک دو، اور کہیں گے کہ ان کو مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کرنے کی اجازت نہیں، ان کا جنازہ نہیں پڑھا جائے گا، یہ ان کے نام پہ مَرتے ہیں اور گیارہویاں کھاتے اور کھلاتے ہیں، اُن کے نزدیک بے نماز مُرتد ہے، کافر ہے، اس کا جنازہ جائز نہیں، اور اس کو مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کرنا ٹھیک نہیں، اور اُن کے نزدیک وہ شخص جہنمی ہے، اور یہ سمجھتے ہیں کہ دُودھ کا ایک چلّو دے دیا جائے تو بس عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ اپنے قبضے میں آگیا، اب جو چاہے کرو، جو چاہے نہ کرو، اب آخرت انہی کی ہے، یہ کتنا بڑا مغالطہ ہے؟ اور حضرت ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک بے نمازی کی سزا قتل نہیں

ہے، ضربِ شدید ہے، ضربِ الیم ہے، کہ اس کی خوب پٹائی کرو، اور جیل میں ڈال دو، پھر تھوڑی دیر بعد پوچھو کہ نماز کی پابندی کرو گے کہ نہیں کرو گے؟ اگر وہ پابندی کرنے کا عہد نہیں کرتا، یا پابندی نہیں کرتا تو پھر مارو، اور اُسے جیل میں پھینکے رکھو حتیٰ کہ یا تائب ہو جائے، یا وہیں مر جائے۔ تو تخلیہ سبیل ان کے نزدیک بھی نہ ہوا۔

تارکِ زکوٰۃ کے لیے بھی تخلیہ سبیل نہیں

اور اسی طرح سے زکوٰۃ کی بات ہے، کہ اگر ایک شخص کہتا ہے کہ زکوٰۃ فرض ہے، لیکن وہ عملاً دیتا نہیں، تو ائمہ اربعہ کے نزدیک ہے تو یہ مؤمن، یہ کافر نہیں ہے۔ لیکن اگر تو ایک آدھا آدمی ہے تو حکومت بُلا کے کان سے پکڑ لے گی، اور کہے گی دے مال کا حساب، اور زکوٰۃ نکال۔ اور اگر کوئی جماعت ہی جماعت اکٹھی ہو جائے تو پھر ان کا حکم باغیوں کا ہے، پھر ان کے خلاف باقاعدہ جہاد کیا جائے گا۔ تو چھوٹے گا تارکِ زکوٰۃ بھی نہیں، تخلیہ سبیل اس کے لئے بھی نہیں ہے۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں دونوں قسم کے لوگ تھے، بعض تو ویسے ہی انکار کر گئے تھے، کہ ہم دیں گے ہی نہیں، وہ تو مُرتد تھے، اور بعض ایسے تھے جو کہتے تھے کہ دیں گے تو سہی، لیکن حکومت کو نہیں دیں گے، جو سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم بیت المال کے لئے زکوٰۃ وصول کیا کرتے تھے ہم حکومت کو نہیں دیں گے، ایسی صورت میں پھر اُن کا حکم باغیوں کا تھا، یہ کافر نہیں تھے باغی تھے، اور باغیوں کے خلاف بھی ویسے ہی جہاد کیا جاتا ہے، جیسے کافروں کے خلاف کیا جاتا ہے۔ تو اسلامی حکومت کے اندر تخلیہ سبیل تبھی ہے جب ایمان لانے کے بعد اِنسان اِقامتِ صلوٰۃ اور اِیتائے زکوٰۃ بھی کرے۔ اور اگر یہ کام نہیں کرتا، چاہے مؤمن ہی کیوں نہ ہو اسلامی حکومت کے اندر اس کے لیے تخلیہ سبیل نہیں، کہ اس کو آزاد نہ پھرنے دو، اسلامی حکومت میں ایسے لوگ آزاد نہیں پھر سکتے، آخرت کا معاملہ آخرت میں جا کے ہوگا، کہ کافر ہے یا مؤمن ہیں؟ کیا ہیں کیا نہیں ہیں؟ لیکن اسلامی حکومت کا فرض ہے کہ اس قسم کے لوگوں کا راستہ روکے، اسلامی حکومت میں پھرنے کی آزادی ان کو تبھی ہوگی جس وقت یہ ایمان بھی لائیں اور اس کے ساتھ اِقامتِ صلوٰۃ اور اِیتائے زکوٰۃ بھی کریں۔ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ پھر یہ تمہارے دینی بھائی ہیں، وَنُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ہم علم والے لوگوں کے لیے، سمجھ دار لوگوں کے لیے آیات کھول کھول کر بیان کرتے ہیں۔

مشرک دُنیا کی مرکزیت، ان کے اِماموں کا سَر کوٹنے سے ختم ہوگی

وَاِنْ نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ: اگر ان لوگوں نے اپنی قسمیں توڑ دیں عہد کے بعد۔ دیکھو! معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیات عہد توڑنے سے پہلے کی ہیں جو ایک قسم کی پیش گوئی کر رہی ہیں۔ اگر انہوں نے اپنے عہد کے بعد اپنی قسمیں توڑ دیں وَطَعَنُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ: اور تمہارے دین کے بارے میں طعن و تشنیع کرنے لگ گئے، جس طرح پہلے مذاق اڑاتے تھے، استہزا کرتے تھے، طعن و تشنیع کرتے تھے، اگر اس طرح سے کرنے لگ گئے، تمہارے دین کا لحاظ نہ کریں، فَقَاتِلُوْٓا اَئِمَّةَ الْكُفْرِ: اس سے مراد قریشی ہیں، مشرکینِ مکہ، چونکہ وہی کُفر کے اِمام تھے، مشرک دُنیا کی قیادت انہی کے ہاتھ میں ہی تھی، یہی بڑے سمجھے جاتے تھے، انہی کی قیادت کے اندر سارے کا سارا کام ہوتا تھا، بیت اللہ کے مجاور ہونے کی وجہ سے۔ ویسے بھی آپ نے سُن لیا کہ بیت اللہ کے آس پاس انہوں

نے تین سو ساٹھ بت رکھے ہوئے تھے؛[1] تین سو ساٹھ گنتی کے ہوں تو بھی ٹھیک ہے، جس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ سال کے تین سو ساٹھ ہی دِن ہوتے ہیں، اور کسی نہ کسی وجہ ہر دِن نیا معبود پُوجتے ہوں گے، کسی کے متعلق کوئی مہینہ، کوئی دِن لگا رکھا ہوگا، اور کسی کے متعلق کوئی مہینہ، کوئی دِن لگا رکھا ہوگا، ورنہ اصل بات یہ تھی کہ عرب کے اندر جتنے مشرک قبائل تھے اُن میں سے ہر ایک نے اپنا اپنا بُت اور معبود علیحدہ بنایا ہوا تھا، کسی کا لات تھا، کسی کا عُزّیٰ تھا، کسی کا منات تھا، کسی کا کچھ تھا، کسی کا کچھ تھا، تو انہوں نے تمام قبائل کے بُت بیت اللہ میں جمع کیے ہوئے تھے، بیت اللہ میں اس لیے جمع کیے ہوئے تھے گویا کہ ایک قومی رشتہ اور قومی اتحاد پیدا کیا ہوا تھا، تاکہ سارے کے سارے مشرک قبیلے بیت اللہ کو اپنی عبادت گاہ سمجھیں، اور اپنی اسی نسبت کے ساتھ وہ بیت اللہ کی طرف آئیں، اور وہ سمجھیں کہ یہاں ہمارا بھی حصہ ہے، تو ہر قبیلے اور ہر قوم کا جو بھی بُت تھا اس کو انہوں نے بیت اللہ میں جگہ دی ہوئی تھی، اس طرح گویا کہ مذہبی مرکزیت مکہ معظمہ میں تھی، اور یہ مشرک دُنیا کے قائد تھے، اس لیے اِن کو فَقَاتِلُوْٓا اَىِٕمَّةَ الْكُفْرِ کے ساتھ تعبیر کیا ہے کہ پھر ان کُفر کے پیشواؤں اور کُفر کے اِماموں کے ساتھ خوب لڑو، یہ کُفر کے اِمام ہیں، مقتدیٰ ہیں، پیشوا ہیں، اور جب ان کا سَر کوٹا جائے گا تو یوں سمجھو کہ مشرک دُنیا کی مرکزیت ختم ہو جائے گی۔ ''پھر لڑو ان کُفر کے اِماموں کے ساتھ'' اِنَّهُمْ لَآ اَيْمَانَ لَهُمْ: بے شک ان کی قسموں کا کوئی اعتبار نہیں، یعنی جب انہوں نے خود ہی توڑ دیں۔ کیونکہ معاہدہ دوطرفہ ہوا کرتا ہے، ایک طرف کا نہیں ہوتا، ایک فریق اگر معاہدے کو توڑ دے پھر آپس میں کھائی ہوئی قسموں کا کوئی اعتبار نہیں رہا کرتا، یہ معاہدہ دوطرفہ چیز ہے، ایک طرف کے باقی رہنے سے باقی نہیں رہا کرتی، اِنَّهُمْ لَآ اَيْمَانَ لَهُمْ ان کے لیے کوئی قسمیں نہیں لَعَلَّهُمْ يَنْتَهُوْنَ: لڑنا کیوں ہے؟ تاکہ یہ اپنی شرارتوں سے باز آ جائیں۔

مشرکین کے خلاف قتال کی ترغیب

اگلی آیات سے بظاہر معلوم یہ ہوتا ہے کہ یہ ان کے معاہدہ توڑنے کے بعد کی ہیں، جیسے پہلے آپ کی خدمت میں عرض کیا جا چکا، کہ قرآنِ کریم کی آیات کے اترنے کے ترتیب اور ہے، اور ان کی تالیف اور انداز سے ہوئی ہے، بسا اوقات آیات اتری تو ہوتی ہیں کافی وقفے کے ساتھ، لیکن سرورِ کائنات ﷺ اللہ تعالیٰ سے اشارہ پا کے ان آیات کو ایک ہی جگہ اکٹھا کروا دیتے تھے، جیسے سورۂ اَنفال میں وہ آیات گزری تھیں، کہ پہلے ایک دس کے مقابلے میں ذکر کیا گیا تھا، بعد میں ایک دو کے مقابلے میں ذکر کیا گیا، اور وہ دونوں آیتیں اکٹھی کر دی گئیں، حالانکہ دونوں کے درمیان میں وقت کے اعتبار سے بڑا فاصلہ ہے۔ یہاں بھی اسی طرح سے وقت کے اعتبار سے فاصلہ ہے، کہ پہلی آیات پیش گوئی کے طور پر ہیں کہ یہ ایسا کریں گے، اور جب ایسا کریں تو پھر تم نے بھی عہد کی رعایت نہیں رکھنی، اور ان کی قسموں کا کوئی اعتبار نہیں ہے، ان کا کوئی لحاظ نہیں رکھنا جب ان کی طرف سے خیانت ہو جائے گی اور یہ توڑ دیں گے۔ اور بعد میں جس وقت ٹوٹ گیا، جیسا کہ تقریباً دو سال کے بعد وہ معاہدہ ٹوٹا، تو اس معاہدہ کے ٹوٹنے کے بعد اب برانگیختہ کیا جا رہا ہے کہ اب ان کا سر کوٹو۔ اَلَا تُقَاتِلُوْنَ قَوْمًا نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ: کیا تم نہیں لڑو گے ایسے لوگوں کے ساتھ؟ یہ برانگیختہ

---

(۱) بخاری ۱/۳۳۶، باب هل تکسر الدنان الخ۔ ولفظہ: دَخَلَ النَّبِیُّ ﷺ مَکَّةَ وَحَوْلَ الْكَعْبَةِ ثَلَاثُ مِائَةٍ وَسِتُّوْنَ نُصُبًا۔

کرنے والی بات ہے۔ کیا تم ایسے لوگوں کے خلاف نہیں لڑو گے جنہوں نے اپنی قسمیں توڑ دیں، اور انہوں نے رسول کو نکالنے کا قصد کیا تھا۔ یہ پچھلی کارروائی یاد دِلا دی، کہ یہ ایسے شریر ہیں کہ پہلے سے ہی انہوں نے اللہ کے رسول کو برداشت نہیں کیا، نکالنے کا قصد کیا، یعنی نکالنے کے لیے کارروائی کی۔ یہ نکلنے کی نسبت ان کی طرف کی ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا نکلنا اللہ کے حکم سے ہوا، ورنہ جب تک اللہ نے اجازت نہیں دی تھی اُس وقت تک چاہے مشرک کتنا ہی زور کیوں نہ لگاتے رہے، حضور ﷺ مکہ معظمہ سے نہیں نکلے، وہ تو پہلے سے ہی تشدد کرتے رہے لیکن حضور ﷺ تشریف نہیں لائے، حضور ﷺ براہِ راست اللہ کے حکم کے ساتھ اور اللہ کی حکمت کے تحت مکہ معظمہ سے نکلے ہیں، اس لیے ان کے قصد کے اوپر تنقید کی ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ کو انہوں نے برداشت نہیں کیا، بلکہ اپنے شہر سے نکالنے کے لیے انہوں نے سازشیں کیں، اور انہوں نے قصد کیا، کارروائیاں کیں، منصوبے بنائے، یہ اُن کی خباثت کی طرف اشارہ کیا، کہ اس طرح سے یہ پاپی ہیں۔ وَهُمْ بَدَءُوْكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ: اور پھر بڑی بات یہ ہے کہ چھیڑ چھاڑ بھی پہلے یہی کر رہے ہیں، چھیڑ چھاڑ بھی تم نے نہیں کی، هُمْ بَدَءُوْكُمْ: انہوں نے اِبتدا کی تم سے پہلی مرتبہ۔ اَتَخْشَوْنَهُمْ: تم ان کے مقابلے میں آنے سے ڈرتے ہو؟ کیا تمہیں ان سے ڈر لگتا ہے؟ کیا تم ان سے ڈرتے ہو؟ فَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشَوْهُ: اللہ زیادہ حق دار ہے اس بات کا کہ تم اس سے ڈرو، اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ: اگر تم ایمان والے ہو۔ اور اللہ سے ڈرنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے حکم کی خلاف ورزی نہ ہونے پائے، اور جب اللہ تعالیٰ نے حکم دے دیا قَاتِلُوْٓا اَئِمَّةَ الْكُفْرِ کہ جب یہ قسمیں توڑ دیں گے تو پھر تم نے ان کُفر کے پیشواؤں کے ساتھ لڑنا ہے، اب اگر نہیں لڑو گے تو گویا کہ تم اللہ سے نہیں ڈرتے، اس لیے لڑو، اللہ سے ڈرنا چاہیے اور کسی سے نہیں ڈرنا چاہیے۔ قَاتِلُوْهُمْ: لڑو ان کے ساتھ، جس وقت تم لڑو گے، قتال ہوگا، مقابلہ ہوگا، يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَيْدِيْكُمْ: اللہ انہیں عذاب دے گا تمہارے ہاتھوں۔ کیونکہ ہمیشہ سے اللہ کی عادت یہ چلی آتی ہے کہ جب کوئی قوم اپنے رسول کو نبی کو اپنے میں سے نکال دیتی ہے تو پھر وہ قوم بچنے کی حق دار نہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی عادت ایسے ہے کہ اگر تو نکلنے والے مؤمن کمزور اور تھوڑے ہوتے ہیں پھر تو براہِ راست آسمان کی طرف سے عذاب آتا ہے اور قوم کو برباد کر دیتا ہے، اور اگر مؤمنین جن کو نکالا گیا ہے، وہ رسول کی جماعت طاقتور ہوتی ہے، تو اللہ تعالیٰ انہی کے ہاتھوں ان کی پٹائی کروا دیتے ہیں، تو مشرکینِ مکہ کے لیے یہی عذاب تجویز ہوا تھا، آسمان سے براہِ رات اُن پر عذاب نہیں اُتارا گیا، بلکہ اللہ کی حکمت کے تحت، اور اس میں بھلا تھا مشرکینِ مکہ کا، کہ ان کی پٹائی مؤمنین کے ہاتھوں سے کروائی جارہی ہے تاکہ ان کے لیے توبہ کرنے کا موقع باقی رہے، ورنہ اگر آسمان کی طرف سے ایسا عذاب آجاتا جو کہ جڑ ختم کرنے والا ہے تو پھر سنبھلنے کا کوئی موقع نہ ہوتا۔ ''لڑو ان سے، اللہ انہیں عذاب دے گا تمہارے ہاتھوں'' وَيُخْزِهِمْ: اور اللہ انہیں رُسوا کرے گا، ان کی عزت ملیامیٹ ہوجائے گی، وَيَنْصُرْكُمْ عَلَيْهِمْ: اللہ ان کے خلاف تمہاری مدد کرے گا، اور مؤمنین کے دل اور سینے ٹھنڈے کر دے گا، یعنی مؤمنین کے دلوں میں جو ان پر جلن ہے، خاص طور پر وہ مؤمنین جو مکہ معظمہ میں مشرکین کے ہاتھوں پٹتے رہے یا اب بھی کمزور ہونے کی بنا پر پٹ رہے تھے، اُن کے دل کے اندر جو ان کے خلاف ایک آگ بھڑکی ہوئی ہے، تو اللہ تعالیٰ تمہارے ہاتھوں سے ان کی پٹائی کروا کے، ان کو رُسوا کروا کے اُن کے دل ٹھنڈے کر دے گا۔ اور ایسا ہوتا ہی ہے کہ ایک ظالم جس وقت ظلم کرتا ہے اور مظلوم اس سے کوئی انتقام نہیں لے سکتا تو دل میں ایک ہوک سی تو اٹھتی ہے کہ یہ کسی

طرح سے برباد ہو۔ تو جس وقت پھر اس ظالم پر کوئی عذاب آتا ہے، تو پھر کہتے ہیں ''ہاں ٹھر گیا'' (سینہ ٹھنڈا ہو گیا)، دل ٹھنڈا ہو گیا، اب اس ظالم کے ساتھ ایسا معاملہ ہو گیا کہ ہمارا جی خوش ہو گیا، یَشْفِ صُدُوْرَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِیْنَ کا یہ معنی ہے، کہ اللہ تعالیٰ ایمان والے لوگوں کے دلوں کو شفا دے گا، یعنی ان کے دل کے اندر ایک غصّہ اور ایک گھٹن، اور ان کے خلاف جو ایک آتش انتقام ہے جلن ہے، اللہ تعالیٰ اس کو شفا دے دے گا۔ وَیُذْهِبْ غَیْظَ قُلُوْبِهِمْ: اور اُن کے دلوں کی جلن کو دُور کر دے گا، وَیَتُوْبُ اللّٰهُ عَلٰی مَنْ یَّشَآءُ: اور جب تم ان کے ساتھ جہاد کرو گے تو ان میں بعض ایسے بھی ہوں گے جن کو اللہ ایمان کی توفیق دے دے گا۔ ''رجوع فرمائے گا اللہ تعالیٰ جس پر چاہے گا'' چنانچہ ایسا ہوا، بہت سارے لوگ مؤمن بھی ہو گئے وَاللّٰهُ عَلِیْمٌ حَکِیْمٌ: اللہ تعالیٰ علم والا ہے اور حکمت والا ہے۔

ایمان کے بعد آزمائش کیوں ضروری ہے؟

اگلی آیت کا تعلق بھی ترغیب کے ساتھ ہی ہے اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تُتْرَكُوْا: تم یہ سمجھتے ہو کہ تم چھوڑ دیے جاؤ گے؟ یعنی صرف کلمہ پڑھ لیا اور کلمہ پڑھنے کے بعد تمہیں وفاداری کا تمغہ دے کر چھوڑ دیا جائے گا؟ کہ یہ اللہ کے وفادار ہیں۔ نہیں، اللہ تعالیٰ تو آزمائشوں کی بھٹی میں ڈالے گا، اور آزمائشوں میں ڈال ڈال کے دیکھے گا کہ کون اپنے دعویٰ ایمان میں سچا ہے اور کون وقت آنے پر پیچھے ہٹتا ہے، ابھی دیکھنا ہے کہ تم میں سے کون جہاد کرنے والا ہے، اور یہاں جہاد خصوصیت کے ساتھ اس لیے مطلوب ہے کہ یہاں براہِ راست اپنے رشتہ داروں سے ٹکر ہے، اپنی برادری سے ٹکر ہے، تو دیکھیں گے کہ کون بڑھ چڑھ کر جہاد کرتا ہے، اور کون ایسا ہے کہ جس کا تعلق صرف اللہ سے، اللہ کے رسول سے اور مؤمنین سے ہے، چاہے وہ مؤمن رشتہ دار ہیں چاہے نہیں، لیکن ایمان کے رشتے کی بنا پر قلبی تعلق یا اللہ سے ہے یا اللہ کے رسول سے یا مؤمنین سے، اور ان کے علاوہ کسی دوسرے کو اپنا ہم راز نہیں بنایا، اور کون ایسا ہے جو اللہ اور اللہ کے رسول اور مؤمنین کو چھوڑ کر یا اُن سے تجاوز کر کے غیروں کے ساتھ بھی محبت اور راز داری رکھتا ہے، اللہ تعالیٰ امتحان میں ڈال کے تمہیں دیکھے گا، اب جہاد کا حکم آ گیا، جو تو جہاد میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لے گا، اس کا مطلب یہ ہو گا کہ اس کا تعلق صرف اللہ اور اللہ کے رسول اور مؤمنین سے ہے، کافروں سے اس کا کوئی تعلق نہیں، چاہے وہ کتنے ہی قریبی رشتہ دار کیوں نہ ہوں، اور اگر اندر کسی قسم کی کوئی گڑبڑ ہو گی وہ بھی پتا چل جائے گا۔ ''کیا تم نے یہ سمجھ لیا ہے کہ تم چھوڑ دیے جاؤ گے'' یعنی تمہیں کسی آزمائش کی بھٹی میں نہیں ڈالا جائے گا وَلَمَّا یَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِیْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ: لَمَّا اور لم میں فرق آپ جانتے ہیں، کہ لم کے اندر تو صرف ماقبل کی نفی ہوتی ہے، ماضی میں فعل کی نفی ہوتی ہے، مابعد کی طرف کوئی اشارہ نہیں ہوتا، اور لَمَّا کے اندر ماضی میں نفی ہوتی ہے اور آئندہ کے لیے توقع کا اظہار ہوتا ہے۔ ''ابھی تک اللہ نے جدا کر کے جانا نہیں، ظاہری طور پر جدا جدا نہیں کیے'' جس کا مطلب یہ ہے کہ اب وقت آ گیا کہ اب جدا جدا کیے جائیں گے، پتا چلے گا کہ کون صحیح مجاہد ہے، کون اللہ اور اللہ کے رسول اور مؤمنین سے صحیح تعلق رکھنے والا ہے، اور کس کے دل کا تعلق کسی دوسرے کے ساتھ بھی ہے، اب اللہ تعالیٰ جدا جدا کر کے رہے گا۔ لَمَّا کے اندر یہ مستقبل کی طرف اشارہ نکل آیا۔ ''ابھی تک جدا کر کے نہیں جانا اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو جنہوں نے تم میں سے جہاد کیا، اور جنہوں

نے نہیں بنایا اللہ کے علاوہ، نہ اللہ کے رسول کے علاوہ، نہ مؤمنین کے علاوہ کوئی دوست۔ ولیجۃ: ہم راز۔ یہ جو ''نہ،نہ'' کے ساتھ ترجمہ کر رہا ہوں، یہ ''لا لا'' کا ترجمہ ہے، لَمْ یَتَّخِذُوْا کے اندر جو نفی ہے یہ ''لا'' اسی کی تاکید ہے۔ ولیجہ کہتے ہیں بھیدی اور راز دار کو۔ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ: اللہ تعالیٰ خبر رکھنے والا ہے اُن کاموں کی جو تم کرتے ہو۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يَّعْمُرُوْا مَسٰجِدَ اللّٰهِ شٰهِدِيْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ

نہیں ہے مشرکوں کے لیے کہ وہ آباد کریں اللہ کی مسجدوں کو اس حال میں کہ وہ شہادت دینے والے ہیں اپنے نفسوں پر

بِالْكُفْرِ ؕ اُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ ۚۖ وَفِى النَّارِ هُمْ خٰلِدُوْنَ ﴿۱۷﴾

کفر کی، یہی لوگ ہیں کہ ان کے اعمال ضائع ہوگئے، اور جہنم میں یہ ہمیشہ رہنے والے ہیں﴿۱۷﴾

اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ

سوائے اس کے نہیں کہ آباد کرتا ہے اللہ کی مسجدوں کو وہ شخص جو ایمان لاتا ہے اللہ پر اور یوم آخر پر اور نماز کو قائم کرتا ہے

وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَلَمْ يَخْشَ اِلَّا اللّٰهَ فَعَسٰٓى اُولٰٓئِكَ

اور زکوٰۃ دیتا ہے اور اللہ کے علاوہ کسی سے نہیں ڈرتا، قریب ہے کہ یہی لوگ

اَنْ يَّكُوْنُوْا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ ﴿۱۸﴾ اَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَآجِّ وَعِمَارَةَ

سیدھا راستہ پانے والے ہیں﴿۱۸﴾ کیا بنالیا تم نے حاجیوں کو پانی پلانے کو اور

الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَجٰهَدَ

مسجد حرام کو آباد کرنے کو اس شخص کے عمل کی طرح جو اللہ پر ایمان لایا اور یوم آخر پر ایمان لایا اور اُس نے اللہ کے راستے میں

فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ لَا يَسْتَوٗنَ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى

جہاد کیا، اللہ کے نزدیک یہ برابر نہیں، اللہ تعالیٰ ظالم لوگوں کو

الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۹﴾ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِىْ

ہدایت نہیں دیتا﴿۱۹﴾ وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے ہجرت کی اور اللہ کے راستے

سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ۙ اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ

میں جہاد کیا اپنے مالوں کے ساتھ اور جانوں کے ساتھ زیادہ بڑے ہیں از روئے درجے کے

اللّٰهِ ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ﴿۲۰﴾ يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ

اللہ کے نزدیک، اور یہی لوگ ہیں کامیاب ہونے والے ﴿۲۰﴾ بشارت دیتا ہے ان کا ربّ ان کو اپنی طرف سے رحمت کی

مِّنْهُ وَرِضْوَانٍ وَّجَنّٰتٍ لَّهُمْ فِيْهَا نَعِيْمٌ مُّقِيْمٌ ﴿۲۱﴾ ۙ خٰلِدِيْنَ

اور رضامندی کی اور جنات کی، اُن جنات میں ان کے لیے قائم رہنے والی خوش حالی ہے ﴿۲۱﴾ ہمیشہ اس میں

فِيْهَآ اَبَدًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴿۲۲﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ

رہنے والے ہوں گے، بےشک اللہ تعالیٰ کے پاس اَجرِ عظیم ہے ﴿۲۲﴾ اے ایمان والو!

اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْٓا اٰبَآءَكُمْ وَاِخْوَانَكُمْ اَوْلِيَآءَ اِنِ اسْتَحَبُّوا

نہ بنایا کرو اپنے باپ دادوں کو اور اپنے بہن بھائیوں کو دوست اگر وہ کُفر کو پسند کریں

الْكُفْرَ عَلَى الْاِيْمَانِ ؕ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ

ایمان کے مقابلے میں اور جو ان سے دوستی لگائے گا تم میں سے پس یہی لوگ

الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۳﴾ قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ

ظالم ہیں ﴿۲۳﴾ آپ کہہ دیجئے کہ اگر تمہارے باپ دادے اور تمہاری اولاد اور تمہارے بہن بھائی

وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ِۨ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ

اور تمہاری بیویاں اور تمہارا قبیلہ اور مال جو تم نے کمائے اور تجارت

تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ

جس کے مندے پڑجانے سے تم ڈرتے ہو اور تمہارے پسندیدہ مکانات، اگر یہ ساری کی ساری چیزیں زیادہ محبوب ہیں تمہیں اللہ

وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ

اللہ کے رسول کے مقابلے میں اور اللہ کے راستے میں جہاد کے مقابلے میں، تو تم انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنا حکم لے آئے،

وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۲۴﴾

اللہ تعالیٰ نافرمان لوگوں کو ان کے مقصد تک نہیں پہنچاتا ﴿۲۴﴾

خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يَّعْمُرُوْا مَسٰجِدَ اللّٰهِ: نہیں ہے مشرکوں کے لئے کہ وہ آباد کریں اللہ کی مسجدوں کو۔ عَمَرَ يَعْمُرُ: آباد کرنا، جس میں عمارت بنانا بھی داخل ہے، اور اس میں عبادت وغیرہ کرنا بھی داخل ہے، انتظام کرنا، وغیرہ سب اس عمارت کے اندر آجائے گا۔ ''مشرکوں کے لئے نہیں کہ آباد کریں اللہ کی مسجدوں کو'' شٰهِدِيْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ بِالْكُفْرِ: اس حال میں کہ وہ شہادت دینے والے ہیں اپنے نفسوں پر کفر کی، اور شهادة على النفس کا مفہوم ہوتا ہے اقرار کرنا، اپنے آپ پر شہادت دینے کا معنی ہے اقرار کرنا، اس حال میں کہ وہ اپنے آپ پر کفر کا اقرار کرنے والے ہیں، اُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ: یہی لوگ ہیں کہ ان کے اعمال ضائع ہوگئے وَفِي النَّارِ هُمْ خٰلِدُوْنَ: اور جہنم میں یہ ہمیشہ رہنے والے ہیں۔ اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ: اِنَّمَا حصر کے لئے آتا ہے۔ سوائے اس کے نہیں کہ آباد کرتا ہے اللہ کی مسجدوں کو وہ شخص جو ایمان لاتا ہے اللہ پر اور یومِ آخر پر، وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ: اور نماز کو قائم کرتا ہے، وَاٰتَى الزَّكٰوةَ: اور زکوٰۃ دیتا ہے، وَلَمْ يَخْشَ اِلَّا اللّٰهَ: اور اللہ کے علاوہ کسی سے نہیں ڈرتا، فَعَسٰٓى اُولٰٓئِكَ اَنْ يَّكُوْنُوْا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ: اُمید ہے، قریب ہے کہ یہی لوگ سیدھا راستہ پانے والے ہیں، ہدایت یافتہ ہیں۔ اَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَآجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ: سِقَايَة سَقٰى يَسْقِيْ سے، پانی پلانا۔ کیا بنالیا تم نے حاجیوں کو پانی پلانے کو اور مسجد حرام کی آبادی کو، آباد کرنے کو، كَمَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ من امن بالله یہ شخص ہے، اور پیچھے عمل مذکور ہے سِقَايَةَ الْحَآجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ، اس لیے ''کاف'' کے بعد مضاف محذوف ماننا پڑے گا۔ حاجیوں کو پانی پلانا اور مسجد حرام کو آباد کرنا، کیا تم نے اُس شخص کے عمل کی طرح سمجھ لیا، اُس شخص کے عمل کی طرح قرار دے دیا جو اللہ پر ایمان لایا اور یومِ آخر پہ ایمان لایا، اور اس نے اللہ کے راستے میں جہاد کیا، مفہوم یہ نکلے گا کہ حاجیوں کو پانی پلانا اور مسجد حرام کو آباد کرنا ایمان لانے اور اللہ کے راستے میں جہاد کرنے کی طرح نہیں ہے، تم نے ان دونوں کو ایک جیسا سمجھ لیا؟ ایک جیسا قرار دے لیا؟ لَا يَسْتَوٗنَ عِنْدَ اللّٰهِ: اب لَا يَسْتَوٗنَ میں دو فریق آگئے، پہلا فریق ہے حاجیوں کو پانی پلانے والا اور مسجد حرام کو آباد کرنے والا، اور دوسرا فریق جو اللہ پہ ایمان لاتا ہے اور یومِ آخر پہ ایمان لاتا ہے اور اللہ کے راستے میں جہاد کرتا ہے، لَا يَسْتَوٗنَ عِنْدَ اللّٰهِ: اللہ کے نزدیک یہ برابر نہیں، لَا يَسْتَوٗنَ کی ضمیر چونکہ افراد کی طرف لوٹ گئی تو یہ دو فریق ہوگئے، وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ: اللہ تعالیٰ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا، یہاں ہدایت کا مفہوم یہ ہے کہ یہ بات تو واضح سی ہے کہ یہ دونوں کام برابر نہیں ہیں، لیکن کافر لوگوں کی، ظالم لوگوں کی مت ماری جاتی ہے، وہ ان باتوں کو سمجھ نہیں سکتے، صحیح بات سمجھنے کی طرف ظالم لوگوں کو اللہ راہ نہیں دیتا، راہ نہیں دکھاتا۔ ''اللہ راہ نہیں دیتا، راہ نہیں دکھاتا'' یہ بات پہلے آپ کے سامنے آچکی کہ چونکہ ہر چیز کا خالق اللہ ہے، تو ان کے اندر جو بد فہمی پیدا ہوگئی تو پیدا ہونے کے اسباب انہی کی طرف سے متحقق ہوئے، اور خالق ہر کیفیت کا اللہ ہے۔ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ: وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے ہجرت کی اور اللہ کے

راستے میں جہاد کیا اپنے مالوں کے ساتھ اور جانوں کے ساتھ، زیادہ بڑے ہیں از روئے درجے کے اللہ کے نزدیک، بہت بڑے ہیں از روئے درجے کے اللہ کے نزدیک، وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ: اور یہی لوگ ہیں فلاح پانے والے، کامیاب ہونے والے۔ فائزون فوز سے ہے، فوز: اپنے مطلب کو حاصل کر لینا، يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ: بشارت دیتا ہے ان کا رَبّ ان کو اپنی طرف سے رحمت کی وَرِضْوَانٍ: اور رضامندی کی، وَّجَنّٰتٍ: اور جنات کی۔ رحمت رضوان اور جنّت کی اِن کو بشارت دیتا ہے اِن کا رَبّ، لَّهُمْ فِيْهَا نَعِيْمٌ مُّقِيْمٌ: اُن جنات میں ان کے لئے خوش حالی ہے دائم۔ نعیم کے معنی خوشحالی، مقیم کے معنی قائم رہنے والی، ''اُن کے لئے ان جنات میں قائم رہنے والی خوش حالی ہے'' خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا: ہمیشہ یہ اس میں رہنے والے ہوں گے، ہمیشہ اس میں ٹھہرنے والے ہوں گے، یعنی ایک تو ہوتا ہے کہ آپ موجود ہیں لیکن نعمت ختم ہوگئی، ایسا بھی نہیں ہوگا، اور ایک ہے کہ نعمتیں موجود ہیں آپ کو وہاں سے نکال دیا گیا، ایسا بھی نہیں ہوگا، دونوں باتوں کا یہ حاصل ہے، نعمتیں قائم رہنے والی ہیں، خوش حالی قائم رہنے والی ہے، اور یہ اہلِ ایمان اہلِ جہاد بھی ان نعمتوں میں ہمیشہ رہنے والے ہیں، یا ان باغات میں ہمیشہ رہنے والے ہیں، اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ: بے شک اللہ تعالیٰ کے پاس اَجرِ عظیم ہے۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْٓا اٰبَآءَكُمْ وَاِخْوَانَكُمْ اَوْلِيَآءَ: اے ایمان والو! نہ بنایا کرو اپنے آباء کو اور اپنے اِخوان کو۔ آباء آب کی جمع، جس کا معنی ہو گیا باپ دادے، اور وَاِخْوَانَكُمْ: اپنے بہن بھائی، اِخوان اَخ کی جمع ہے، بھائی کو کہتے ہیں، اور یہاں تغلیباً مذکر مؤنث دونوں مراد ہیں۔ ''نہ بنایا کرو اپنے باپ دادوں کو'' اس سے اصول مراد ہو گئے، وَاِخْوَانَكُمْ: اور اپنے بہن بھائیوں کو، اَوْلِيَآءَ: دوست۔ اولیاء ولی کی جمع ہے۔ ان کو دوست نہ بنایا کرو، اِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى الْاِيْمَانِ: اگر وہ کُفر کو پسند کریں ایمان کے مقابلے میں۔ اِستحباب: پسند کرنا۔ اگر وہ پسند کریں کُفر کو ایمان کے مقابلے میں، وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ: اور جو اِن کو دوست بنائے گا، یعنی اپنے آباؤ اجداد کو، اپنے بہن بھائیوں کو جو کہ ایمان کے مقابلے میں کُفر کو پسند کرتے ہیں، جو اِن سے دوستی لگائے گا تم میں سے، فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ: پس یہی لوگ ظالم ہیں، یہی اپنا نقصان کرنے والے ہیں، اپنے آپ پہ ظلم کرنے والے ہیں۔ قُلْ: آپ کہہ دیجئے، اعلان کر دیجئے، اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ: آباء وہی! باپ دادا ہو گئے، وَاَبْنَآؤُكُمْ: ابناء بیٹے پوتے ہو گئے، آباء سے اُصول مراد ہیں تو ابناء سے فروع مراد ہیں، بیٹے بیٹیاں پوتے نواسے سب اس میں آجائیں گے، وَاِخْوَانُكُمْ: تمہارے بھائی، اس میں بہنیں بھی تغلیباً شامل ہیں، تمہارے بہن بھائی، اس لیے ترجمہ یونہی کر دیا جائے گا، وَاَزْوَاجُكُمْ: اور تمہاری بیویاں، وَعَشِيْرَتُكُمْ: اور تمہارا قبیلہ، برادری، وَاَمْوَالُ: اور مال اقْتَرَفْتُمُوْهَا: جو تم نے کمائے، اِقتراف اِکتساب کے معنی میں ہے، ''اور مال جن کو تم نے کمایا'' وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا: اور تجارت، خرید و فروخت، ''اور تجارت جس کی کساد بازاری سے تم ڈرتے ہو'' کساد کا معنی مندہ پڑ جانا، ''جس کے مندے پڑ جانے سے تم ڈرتے ہو'' وَمَسٰكِنُ: اور مکانات تَرْضَوْنَهَآ: جن کو تم پسند کرتے ہو، تمہارے پسندیدہ مکانات، اِنْ كَانَ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ: اگر یہ ساری کی ساری چیزیں جن کو شمار کر دیا گیا ہے زیادہ محبوب ہیں تمہیں اللہ اور اللہ کے رسول کے مقابلے میں اور اللہ کے راستے میں جہاد کے مقابلے میں، فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ: پھر تم انتظار کرو حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ اپنا حکم لے آئے۔ ''حکم'' سے حکمِ عذاب مراد ہے۔ اگر یہ ساری چیزیں تمہیں زیادہ پسند ہیں اللہ اور اللہ کے رسول کے مقابلے میں اور اللہ کے راستے میں جہاد کے مقابلے میں تو تم انتظار کرو، حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ

بامر ہٖ: یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنا حکم لے آئے۔ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ: اللہ تعالیٰ فاسق لوگوں کو، نافرمان لوگوں کو ان کے مقصد تک نہیں پہنچاتا۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

تفسیر

ماقبل سے ربط اور مذکورہ رُکوع کا مضمون

جاہلیت کے زمانے سے مسجدِ حرام کی تولیت قریش کے لیے تھی، اور سرورِ کائنات ﷺ جب تک مکہ معظمہ میں رہے اُس وقت تک بھی متولی یہ مشرک ہی تھے، مدینہ منورہ میں تشریف لے جانے کے بعد بھی تولیت انہی کے لیے رہی۔ مسجدِ حرام کو بنانا، ظاہری طور پر اُس کی اینٹ پتھر دُرست کرنا، اور اُس کا انتظام کرنا، جس طرح سے آج کل مساجد میں چٹائیوں کا انتظام کرنا، لوٹوں کا انتظام کرنا، پانی کا انتظام کرنا، جو جو بھی اہلِ مسجد کی ضرورت ہوا کرتی ہے اس کا انتظام کرنا۔ تو بیت اللہ اور مسجدِ حرام میں اس قسم کی جتنی ضروریات تھیں وہ ساری کی ساری قریش کے ذمے تھیں، اور قریش ان خدمات کو سرانجام دیتے تھے، اور یہ خدمات ان کے لیے باعثِ فخر تھیں، ان خدمات پر یہ فخر بھی کرتے تھے، اور لوگوں کے اندر انہی خدمات کی وجہ سے ان کو عزّت اور جاہ بھی حاصل تھا۔ تو جس وقت سرورِ کائنات ﷺ نے مکہ معظمہ کو فتح کیا ہے، تو فتح کرنے کے بعد یکدم ان سب کو وہاں سے ختم نہیں کیا، بلکہ اہلِ شرک کی جو رُسوم پہلے چلی آ رہی تھیں، بُت تو نکال دیے، وہ تو توڑ دیے، لیکن بعض لوگوں کے ساتھ چونکہ معاہدہ تھا، بعض کو امن دے دیا تھا، تو یکدم مشرکین کا تعلق مسجد سے ختم نہیں کیا گیا، بلکہ ایک سال تک آزادانہ اردگرد سے مشرک آتے رہے، اور اپنے رسم ورواج کے مطابق بیت اللہ کا طواف بھی کرتے تھے، اور اپنے رسم ورواج کے مطابق عبادت بھی کرتے تھے، چنانچہ ننگا طواف کرنے کا جو رواج پڑ گیا تھا، یہ طواف بھی اسی طرح سے جاری تھا، تفصیل آپ کے سامنے پہلے عرض کی تھی کہ نو ہجری میں، یعنی فتحِ مکہ کے تقریباً چودہ مہینے بعد، کیونکہ مکہ معظمہ تو فتح ہو گیا آٹھ ہجری رمضان المبارک میں، اور شوال ذی قعدہ ذی الحجہ یہ اس سال کے تین مہینے اور اگلا سارا سال اور پھر ذی الحجہ پندرہ مہینے ہو گئے، پندرہ مہینے کے بعد جب حج آیا، اس آٹھ ہجری والے حج کو گزار کے اگلا حج جو آیا تو اُس وقت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو سرورِ کائنات ﷺ نے بھیجا تھا، اور آپ کے ساتھ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھیجا تھا، تو اُس وقت منیٰ میں عرفات میں ہر جگہ یہ اعلان کر دیا گیا، کہ اس سال کے بعد کوئی مشرک حج کے لیے نہیں آسکتا اور کوئی شخص بیت اللہ کا ننگا طواف نہیں کر سکتا، گویا کہ مشرکین کا داخلہ نو ہجری میں حج کے دِن ممنوع قرار دے دیا گیا، اور یہ اعلان کر دیا گیا، آئندہ کے لیے ان کا داخلہ ممنوع ہو گیا، اور جس قسم کی یہ شرکیہ رسمیں کرتے تھے اور بیت اللہ کا ننگے طواف کرتے تھے اُن پر پابندی لگا دی گئی، کہ اب کسی کو اجازت نہیں ہے کہ یہاں آ کر ننگا طواف کرے، جس طرح سے مشرک پہلے کرتے تھے۔ اب اس رکوع میں اللہ تبارک وتعالیٰ مشرکین کی انہی باتوں کی تردید کرتا ہے، کہ یہ کام، مسجد کی خدمت وغیرہ کے، یا مسجد کی تولیت جو تمہیں حاصل تھی، تم اس کے حق دار نہیں، سورۂ انفال میں بھی جس طرح سے آیا تھا اِنْ اَوْلِيَآؤُهٗٓ اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ کہ مسجد کے متولی متقی لوگ ہی ہو سکتے ہیں،

کیونکہ مسجد آباد کی گئی ہے اللہ کا نام لینے کے لئے اور اللہ کی عبادت کے لئے، مسجد اصل میں توحید کا مرکز ہوتا ہے، اور اگر اس مسجد کے اندر اس کے مقصد کے خلاف ہی حرکتیں شروع ہو جائیں تو ظاہری طور پر اگرچہ اس کے اینٹ پتھر دُرست ہیں لیکن حقیقت کے اعتبار سے مسجد کو ویران کر دیا گیا، کہ جس مقصد کے لیے مسجد بنائی گئی تھی وہ مقصد تو فوت ہو گیا۔ اب ایک مسجد کا متولی ہے وہ مسجد کے اندر ہی شرکیہ کام شروع کر دے، اب صرف اس وجہ سے کہ وہ لوٹوں کا انتظام کرتا ہے، چٹائیاں بچھاتا ہے اُس کا مسجد پر حق باقی نہیں رہنے دیا جائے گا، کیونکہ یہ تو مقصد کے خلاف ہے، مقصد کو محفوظ رکھتے ہوئے اس قسم کی خدمات قابلِ تعریف ہیں اور باعثِ ثواب ہیں، کہ مسجد کے مقصد کو بھی محفوظ رکھے کہ اس میں نماز پڑھے اور پڑھنے دے، اللہ کا نام لے اور دوسروں کو لینے دے، اللہ تعالیٰ کی توحید کا پرچار کرے، سرورِ کائنات ﷺ کے دِین کی تعلیم تعلم کا سلسلہ جاری ہو، پھر اس کے ساتھ ساتھ اگر وہ لوٹا، مصلے کا انتظام بھی کرتا ہے، پانی کی دیکھ بھال کرتا ہے، مسجد کی صفائی کا انتظام کرتا ہے تو باعثِ تعریف ہے، لیکن اگر وہ اس میں تو قوالی شروع کر دے، اور اس میں غیر اللہ کے لیے کام ہونے لگ جائیں، تو پھر صرف اس وجہ سے کہ جھاڑو دیتا ہے، صفیں بچھاتا ہے، پانی کا انتظام کرتا ہے، لوٹے رکھتا ہے، اس سے اُس کا حق مسجد پر باقی نہیں رہنے دیا جائے گا۔

مشرک کسی مسجد کا متولّی نہیں ہوسکتا

مشرکین کی یہی بات تھی کہ جس مقصد کے لیے اس بیت اللہ کو تعمیر کیا گیا تھا، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جس مقصد کے لئے اس کو آباد کیا تھا، وہ مقصد تو انہوں نے بالکل ختم کر دیا، اب صرف ظاہری خدمات ان کے لیے کیا باعث فخر رہ گئیں، ان کا کوئی حق نہیں ہے، اس لیے ان کو معزول کر دیا گیا، اور ان کے حق کو سرے سے ختم کر دیا گیا، اور یہ کہہ دیا گیا کہ تمہاری یہ خدمات بے جان ہیں، اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ پہلی آیت کے اندر یہی اعلان کیا گیا ہے، کہ مشرکوں کے لیے یہ مناسب ہی نہیں، مشرکوں کے لیے یہ لائق ہی نہیں کہ اللہ کی مسجدوں کو آباد کریں۔ ''مساجد اللہ'' جمع کا صیغہ آ گیا، حالانکہ یہاں قصہ صرف مسجدِ حرام کا ہے، اور قاعدہ عام بتا دیا گیا کہ مسجدِ حرام ہی نہیں، کوئی مسجد ہو، اس کی تولیت مشرک کو حاصل نہیں ہوسکتی، مشرکوں کی شان کے لائق ہی نہیں کہ اس طرح سے مسجدوں کو آباد کریں، ان کو تولیت نہیں مل سکتی۔ تو مسجدِ حرام کی تولیت سے منسوخ کر دینا گویا کہ ساری دُنیا کی مسجدوں کی تولیت سے منسوخ کرنا ہے، بتا دیا گیا کہ کوئی مسجد ہو، مسجدِ حرام ہو یا کوئی دوسری مسجد ہو، مشرک لوگ اُس کی تولیت کے لائق نہیں ہیں۔ ''نہیں ہے لائق مشرکوں کے کہ وہ آباد کریں اللہ کی مسجدوں کو اس حال میں کہ وہ اپنے نفسوں کے اوپر کُفر کا اقرار کرنے والے ہیں'' وہ اپنی زبان سے اقرار کرتے ہیں کہ ہم کافر ہیں۔

مشرکینِ مکہ اپنے مشرک ہونے کا اِقرار خود کرتے تھے

یہ اقرار کس طرح سے کرتے تھے؟ مشرکینِ مکہ کی نوعیت کچھ عجیب قسم کی ہے، مشرک تو ہم نے نصاریٰ کو بھی ثابت کیا ہے، مشرک تو ہم نے یہود کو بھی ثابت کیا ہے، لیکن نصاریٰ ہوں یا یہود ہوں، اُن میں سے کوئی شخص ایسا نہیں کہ جو اپنی زبان سے اپنے آپ کو مشرک کہنا گوارا کرے اور یہ کہے کہ ہم اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہراتے ہیں، اللہ کے علاوہ ہم کسی دوسرے کو الٰہ

مانتے ہیں، اُن میں سے کوئی بھی اس بات کا اقرار کرنے کے لیے تیار نہیں، آج بھی نہیں کہتے کہ "ہم اللہ کے علاوہ کسی دوسرے کو بھی اِلٰہ مانتے ہیں، اِلٰہ ایک نہیں بلکہ متعدّد ہیں" یہ بات نہ نصاریٰ مانیں نہ یہود مانیں، اور نہ وہ لوگ جن کو آپ مشرک کہتے ہیں یعنی قبر پرست، یہ اپنے آپ کو مشرک نہیں کہیں گے، یہ نہیں کہیں گے کہ ہم اللہ کے علاوہ کسی دوسرے کو اِلٰہ مانتے ہیں، اللہ کے علاوہ کوئی دوسرا اِلٰہ بھی ہے، یہ اپنی زبان سے نہیں کہیں گے، ان کو اگر آپ مشرک ثابت کریں گے تو استدلالاً، کہ ان کے بعض اقوال اس بات پر دلالت کرتے ہیں جس سے شرک لازم آ گیا، ان کے بعض اعمال اور افعال اس قسم کے ہیں جو مشرکانہ ہیں جس سے شرک لازم آ گیا۔ ایک ہوتا ہے اِلتزامِ کُفر، اور ایک ہے لزومِ کُفر، ایک اِلتزامِ شرک ہے اور ایک ہے لزومِ شرک، "اِلتزام" کا معنی تو یہ ہے کہ مان لیا کہ ہم اللہ کے علاوہ کسی دوسرے کو اِلٰہ کہتے ہیں، یا اُس نے مان لیا کہ ہاں میں آخرت کا منکر ہوں، یہ تو "اِلتزام" ہے، کہ اُس نے خود تسلیم کر لیا، اس میں تاویل کی گنجائش نہیں ہوتی۔ اور ایک ہے "لزوم"، "لزوم" کا مطلب یہ ہے کہ تو نے جو بات کہی ہے اس سے کُفر لازم آتا ہے، اگرچہ تیرا مقصد یہ نہیں، لیکن اس بات سے لازم آ گیا۔ تو "اِلتزام" میں اور "لزوم" میں فرق ہوتا ہے، اب یہ لوگ ایک دوسرے کی عبارتیں لیتے ہیں، اور عبارتیں لے کر ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں، کہ دیکھو! یہاں سے کُفر ثابت ہو گیا، یہاں سے شرک ثابت ہو گیا، لیکن جو متکلم ہے یا جو کاتب ہے یعنی اس عبارت کا لکھنے والا، یا اس کلمہ کو بولنے والا، وہ کہتا ہے کہ بالکل نہیں، یہاں سے شرک ثابت نہیں ہوتا، یہاں سے کُفر ثابت نہیں ہوتا، جس سے تم کُفر نکالتے ہو اس کا مقصد یہ نہیں ہے، تو اس کی نوعیت اور ہے۔ اور ایک آدمی کہتا ہے کہ ہاں میں اِس چیز کا قائل ہوں (جو کُفر ہے)، مثلاً وہ کہتا ہے میں آخرت کو نہیں مانتا، تو اُس نے اپنے اُوپر کُفر کا اقرار کر لیا، تو مشرکینِ مکہ اللہ کے علاوہ بتوں کے لیے یا دوسری چیزوں کے لیے "آلہہ" کا لفظ استعمال کرتے تھے اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا (سورۂ ص: ۵) کیا اس نے سارے خداؤں کو چھوڑ کے ایک ہی اِلٰہ بنا دیا؟ یہ باقیوں کے لیے اِلٰہ کا لفظ استعمال کرتے تھے۔ تو جب اللہ کے علاوہ دوسروں کے لیے "آلہہ" کا لفظ استعمال کرتے تھے تو گویا کہ یہ شرک کا اقرار کرتے ہیں، اور شرک وکُفر ایک ہی چیز ہے، اللہ کو مان کے اُس کے ساتھ کسی کو شریک بنا لیا جائے یہ ایسے ہے گویا کہ اللہ کو مانا ہی نہیں، اور سرے سے اللہ کا انکار کر دیا جائے تو بھی کُفر ہے، تو اس طرح سے ان کے جو عقائد تھے گویا کہ وہ شرک کا اقرار تھا۔ جس وقت یہ حج کرنے کے لئے آتے، طواف کرنے کے لئے آتے تو حدیث شریف میں آتا ہے کہ یہ تلبیہ پڑھتے تھے، جس طرح سے ہم تلبیہ پڑھتے ہیں: "لَبَّيْكَ اَللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ. لَبَّيْكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ لَبَّيْكَ. اِنَّ الْحَمْدَ وَالنِّعْمَةَ لَكَ وَالْمُلْكَ. لَا شَرِيْكَ لَكَ" یہ تلبیہ جو حاجی پڑھتا ہے، طواف کرتا ہوا بھی پڑھتا ہے، حج کے سفر میں بھی پڑھتا ہے۔ تو حدیث شریف میں آتا ہے کہ مشرک بھی تلبیہ پڑھتے تھے، اور اُن کا تلبیہ کس طرح سے تھا؟ "لَبَّيْكَ اَللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ. لَبَّيْكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ" جب یہاں تک پہنچتے تو حضور ﷺ فرماتے ہیں: جب وہاں موجود ہوتے "قَدْ قَدْ" بس بس، یہیں ٹھہر جاؤ، آگے نہ بولنا، یعنی "لَا شَرِيْكَ لَكَ" جس وقت وہ کہہ لیتے تو آپ ﷺ فرماتے: "قَدْ قَدْ" بس یہیں ٹھہر جاؤ، آگے نہ بولو، لیکن وہ آگے کیا کہتے تھے؟ "اِلَّا شَرِيْكًا هُوَ لَكَ تَمْلِكُهٗ وَمَا مَلَكَ" یہ ساتھ وہ اضافہ کرتے تھے،[1] کہ ہاں! ایسے شریک تیرے ہیں جو تیرے کنٹرول میں ہیں، تو اُن کے کنٹرول میں نہیں، یعنی وہ تیرے چھوٹے ہونے کی

---

(۱) مسلم ۱/۳۷۶ باب التلبیة۔ مشکوۃ ۱/۲۲۴ باب الاحرام فصل ثالث۔

حیثیت میں تیرے ساتھ شریک ہیں "تَمْلِكُهٗ وَمَا مَلَكَ" ایسا شریک ہے جس کا تُو مالک ہے وہ تیرا مالک نہیں ہے، وہ ساتھ یہ اضافہ کرتے تھے۔ تو جس کا مطلب ہے کہ وہ شریک بنانے کا اقرار کرتے تھے، کہ اللہ کے شریک بھی ہیں، چاہے انہوں نے اپنے طور پر حیثیت اُن کی مملوک کی بنائی، چھوٹے ہونے کی بنائی، لیکن "شَرِيْكًا" کا لفظ استعمال کرتے تھے، اپنے ان معبودوں کو شرکاء کہتے تھے، قرآنِ کریم میں کتنی جگہ ہے کہ انہوں نے "شرکاء" کا لفظ استعمال کیا،[1] "آلہہ" کا لفظ استعمال کیا کرتے تھے، "اِلٰہ" کا لفظ استعمال کرتے تھے،[2] تو یہ ہے شٰهِدِيْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ بِالْكُفْرِ کہ اتنے زیادہ ڈھیٹ ہیں کہ اپنے نفسوں کے اوپر اقرار کرتے ہیں کُفر کا، اور پھر بھی اللہ کے گھروں کی آبادی کا ان کو حق حاصل ہو، یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ "اس حال میں کہ اقرار کرنے والے ہیں اپنے نفسوں پر کُفر کا، یہ لوگ ان کے اعمال ضائع ہوگئے" اعمال سے مراد یہی عمارتِ مسجد، مسجدِ حرام والے اعمال، کہ مسجدوں کی خدمت کرنے کے لیے چاہے یہ کیسے ہی اچھے اچھے کام کرتے ہیں، مسجدوں کی خدمتیں کرتے ہیں، آنے والوں کی خدمتیں کرتے ہیں جیسا کہ آگے آرہا ہے، یہ ساری کی ساری کارروائیاں ضائع ہیں، ایمان اگر نہ ہو تو یہ اعمال کوئی حیثیت نہیں رکھتے، ان اعمال میں اگر رُوح پڑتی ہے تو ایمان کے ساتھ پڑتی ہے، کُفر اور شرک کے ساتھ اگر اس قسم کے کام کیے جائیں تو یہ ضائع ہیں، ان کے اُوپر اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے رحمت نہیں آسکتی، اَعْمَالُهُمْ سے یہی اعمال مراد ہیں جو مسجد کی خدمت سے تعلق رکھتے ہیں، جن کو وہ لوگ کرتے تھے، یہ سب ضائع ہیں، وَفِي النَّارِ هُمْ خٰلِدُوْنَ: یہ ان کی مسجد کی خدمت ان کو جہنّم سے نجات نہیں دلاسکتی، جہنّم کے اندر یہ ہمیشہ رہنے والے ہوں گے۔

مساجد کی حقیقی آبادی

"سوائے اس کے نہیں کہ اللہ کی مسجدوں کو آباد کرتا ہے وہ شخص جو اللہ کے ساتھ ایمان لائے، یومِ آخر کے ساتھ ایمان لائے، نماز پڑھے اور زکوٰۃ دے، اور اللہ کے علاوہ کسی سے ڈرے نہیں" یہ لوگ ہیں جن کو مسجدیں آباد کرنے کا حق ہے، اور انہی کی وجہ سے مسجدوں کی آبادی ہے۔ مسجدوں کے آباد کرنے کا حق بھی انہی کا ہے، اور یہی لوگ وہاں جائیں اور جاکر اللہ کو یاد کریں اور عبادت کریں، تو یہی حقیقت میں مسجد کی آبادی ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے، سرورِ کائنات ﷺ نے آخر زمانے کے حالات بیان کرتے ہوئے فرمایا، غالباً "مشکوٰۃ شریف، کتاب العلم" میں آپ کے سامنے یہ روایت گزر گئی جس میں یہ الفاظ ہیں: "لَا يَبْقٰى مِنَ الْإِسْلَامِ إِلَّا اسْمُهٗ، وَلَا يَبْقٰى مِنَ الْقُرْاٰنِ إِلَّا رَسْمُهٗ، مَسَاجِدُهُمْ عَامِرَةٌ وَهِيَ خَرَابٌ مِّنَ الْهُدٰى، عُلَمَاؤُهُمْ شَرٌّ مَنْ تَحْتَ أَدِيْمِ السَّمَاءِ"[3] کہ ایک وقت ایسا آجائے گا کہ قرآنِ کریم کے صرف نشانات ہی نشانات اور اس کے رُسوم ہی باقی رہ جائیں گے، حقیقت اس کی اُٹھ جائے گی، اور اسلام کا صرف نام ہی نام باقی ہوگا، حقیقت اس کی بھی ختم ہوجائے گی، جو اسٹیج پر چڑھتا ہے

---

(۱) فَقَالُوْا هٰذَا لِلّٰهِ بِزَعْمِهِمْ وَهٰذَا لِشُرَكَآئِنَا (الانعام:۱۳۶)، وَاِذَا رَاَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا شُرَكَآءَهُمْ قَالُوْا رَبَّنَا هٰٓؤُلَآءِ شُرَكَآؤُنَا (النحل:۸۶)، لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكْنَا (الانعام:۱۴۸)

(۲) اِنْ كَادَ لَيُضِلُّنَا عَنْ اٰلِهَتِنَا لَوْلَآ اَنْ صَبَرْنَا عَلَيْهَا (الفرقان:۴۲)، وَيَقُوْلُوْنَ اَئِنَّا لَتَارِكُوْٓا اٰلِهَتِنَا لِشَاعِرٍ مَّجْنُوْنٍ (الصافات:۳۶)، وَقَالُوْٓا ءَاٰلِهَتُنَا خَيْرٌ اَمْ هُوَ (الزخرف:۵۸)، نیز سورۂ ص:۵

(۳) مشکوٰۃ ۱/۳۸، کتاب العلم کا تقریباً آخر، عن علیؓ۔

''اسلام، اسلام، اسلام''، جس نے اپنا کام نکالنا ہوتا ہے، جتنا یہ لیڈر طبقہ اسلام کو پکارتا ہے کوئی دوسرا پکارتا ہے؟ ''اسلام زندہ باد'' کے نعرے جتنے آج لگتے ہیں کسی زمانے کے اندر اتنے نعرے لگے ہیں؟ لیکن جہاں تک اس کی حقیقت کا تعلق ہے وہ ختم ہے، نام ہی نام باقی ہے، لوگوں نے اپنا مقصد نکالنے کے لیے لکھا ہوا ہے، اسی وقت کے متعلق فرمایا کہ ''مَسَاجِدُهُمْ عَامِرَةٌ وَهِيَ خَرَابٌ مِّنَ الْهُدٰى'' اب یہ دو لفظ آگئے کہ مسجدیں ہوں گی تو عامرۃ، عامرۃ بھی فرمایا، اور ''خَرَابٌ مِّنَ الْهُدٰى'' بھی فرمایا کہ ہدایت سے ویران ہوں گی۔ آباد ہوں گی بظاہر، لیکن ہدایت سے خالی ہوں گی۔ تو یہاں عامرۃ سے مراد ہے کہ بڑی ٹیپ ٹاپ ہوگی، بڑی خوبصورت بنی ہوئی ہوں گی، قالینیں بچھی ہوئی ہوں گی، دریاں بچھی ہوئی ہوں گی، فانوس لگے ہوئے ہوں گے، قمقمے چمک رہے ہوں گے، زیب وزینت خوب کی ہوئی ہوگی، جس سے بظاہر معلوم ہوگا کہ بڑی آباد ہے، لیکن ہدایت سے خالی ہوں گی، ہدایت کی بات اندر سے نہیں ہوگی۔ تو ایک ظاہری ڈھانچہ ہوگا، لیکن جس مقصد کے لیے مسجد بنائی جاتی ہے وہ ختم ہو جائے گا۔ اب آج کل یہ ساری کی ساری باتیں آپ کے سامنے ہیں، دیہاتوں میں جا کر دیکھ لو، مسجدیں بنی ہوئی بڑی شاندار ہیں، سب کچھ ہوگا، لیکن نماز پڑھنے والا موجود نہیں۔ جس طرح سے علامہ اقبال رحمہ اللہ اپنے زمانے کے اعتبار سے کہتے ہیں:

مسجدیں مرثیہ خواں ہیں کہ نمازی نہ رہے یعنی وہ صاحب اوصاف حجازی نہ رہے

(بانگ درا)

تو یہ ظاہری آبادی ہے، لیکن حقیقت کے اعتبار سے یہ ویرانی ہے۔ اب جس طرح سے یہ مسجدوں کے اندر اکٹھے ہو کے شور کرتے ہیں، بدتمیزیاں کرتے ہیں، اُچھلتے ہیں، کودتے ہیں، اور دُنیا کی باتیں ہوتی ہیں، تو ظاہری طور پر اگر مسجد میں ٹیپ ٹاپ ہے، خوبصورت بنی ہوئی ہے، تو یہ کیا ہے؟ کچھ بھی نہیں۔ تو اللہ والے جس وقت مسجد میں بیٹھیں، مسجد میں جا کے صحیح نہج سے عبادت کریں تو مسجد کی آبادی اسی سے ہے۔ اسی لیے سرورِ کائنات ﷺ نے فرمایا کہ جس شخص کو تم دیکھو کہ مسجد کا خیال رکھتا ہے، مسجد میں آتا جاتا ہے، حاضری پابندی سے دیتا ہے، تو اس کے لیے گواہی دے دیا کرو کہ یہ مؤمن ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ مسجدوں کو آباد کرنا مؤمنوں کا ہی کام ہے۔[1] وہاں جا کے اللہ کا نام لیا جائے، اللہ کے دِین کی اشاعت کی جائے، پڑھا پڑھایا جائے، نماز پڑھی جائے، نوافل پڑھے جائیں، تلاوت کی جائے، دِین کا تذکرہ کیا جائے، دِین کی باتیں ہوں، حقیقت کے اعتبار سے مسجد اسی لیے ہے، اور اسی کے ساتھ ہی مسجد کی آبادی ہے۔

''اِیمان باللہ'' کب معتبر ہے؟

''سوائے اس کے نہیں کہ آباد کرتے ہیں اللہ کی مسجدوں کو وہ لوگ جو اللہ پر ایمان لے آئے (مَن لفظوں میں مفرد ہے، حقیقت میں جمع ہے) جو اللہ پہ ایمان لائے اور یومِ آخر پر ایمان لائے''، اور ''ایمان بالرسول'' اس میں خود آ گیا، کیونکہ ''ایمان باللہ'' معتبر وہی ہے جو ''ایمان بالرسول'' کے ساتھ ہو، جو رسول کی وساطت سے لایا جائے۔ رسول اللہ ﷺ کا واسطہ چھوڑ کر اگر کوئی

(۱) ترمذی ۱۴۰/۲، ابواب التفسیر، سورۃ التوبۃ/ مشکوۃ ۶۹/۱، باب المساجد، فصل ثانی۔ اِذَا رَاَيْتُمُ الرَّجُلَ يَعْتَادُ الْمَسْجِدَ فَاشْهَدُوْا لَهٗ بِالْاِيْمَانِ الخ

اللہ کو ماننا ہے، وہ نہ ماننے کے برابر ہے۔ چنانچہ ''مشکوٰۃ شریف، کتاب الایمان'' میں آپ نے پڑھا کہ وفد عبدالقیس کی روایت میں ''اَمَرَهُمْ بِالْاِیْمَانِ بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ'' حضور ﷺ نے اُن کو ایمان باللہ وحدہٗ کا حکم دیا، پھر پوچھا کہ ''اَتَدْرُوْنَ مَا الْاِیْمَانُ بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ'' تمہیں پتا ہے کہ ایمان باللہ کیا ہوتا ہے؟ تو جس وقت انہوں نے آگے سے کہا ''اَللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ!'' تو آپ ﷺ نے جواب یہی دیا کہ ایمان باللہ یہ ہے کہ ''شَهَادَةُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ'' تو اس کی بنیاد اسی پر ہی رکھی کہ اللہ کی توحید کی شہادت اور سرورِ کائنات ﷺ کی رسالت کی شہادت۔ پھر آگے فرمایا: ''وَاِقَامُ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَاءُ الزَّكٰوةِ وَصَوْمُ رَمَضَانَ''[1] بہر حال ''ایمان باللہ وحدہٗ'' کی تفصیل آپ نے یہی فرمائی کہ ''شَهَادَةُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ'' رسالت کی شہادت بھی ''ایمان باللہ'' میں داخل ہے، اس کے بغیر ''ایمان باللہ'' معتبر نہیں۔ یہ میں نے اس لیے کہہ دیا کہ کہیں آپ یہ نہ کہیں کہ اس میں تو صرف اللہ پر اور یومِ آخر پر ایمان لانے کا ذکر آیا ہے، تو کیا رسالت پہ ایمان لانا ضروری نہیں؟ رسالت پہ ایمان لانا اسی طرح سے ضروری ہے جس طرح سے اللہ کو اور آخرت کو ماننا ضروری ہے، اللہ پر ایمان لانا معتبر وہی ہے جو اللہ کے رسول کے بتانے کے مطابق لایا جائے، اپنے طور پر عقل کے ساتھ سوچ کر اگر آپ اللہ پر ایمان لائیں گے تو وہ ایمان لانا کوئی معتبر نہیں ہے۔

شرک کی بنیاد کس چیز پر ہے؟

اور آخر میں فرمایا کہ وَلَمْ يَخْشَ اِلَّا اللّٰهَ: یہ شرک کی جڑ کاٹی، کیونکہ شرک کی بنیاد جتنی بھی ہے وہ سب غیر اللہ کے خوف پر ہے، کہ فلاں ہماری ٹانگ توڑ دے گا، فلاں ہماری بھینس بگاڑ دے گا، جس طرح سے جاہل کہا کرتے ہیں کہ اگر ہم گیارہویں کا دُودھ نہیں دیتے، یا فلاں قبر پر چڑھاوا نہیں چڑھا کر آتے تو ہماری بھینس دُودھ ہی نہیں دیتی، یا بچہ مر جائے گا، اس قسم کے اندیشوں کے تحت یہ لوگ حرکتیں کرتے ہیں۔ موحد وہ ہوتا ہے جس کے دل میں اللہ کے علاوہ کسی کی طرف سے کسی قسم کا اندیشہ نہ ہو، بس اللہ کے ساتھ ہی اُس کا جوڑ ہو، یہ ہے عقیدے کے طور پر خوف اور خشیت۔ باقی یہ ہے کہ ظاہری طور پر ظاہری اسباب کے تحت کسی موذی چیز سے ڈرنا، جیسے کُتا آگے سے آ گیا اور آپ ڈر گئے، سانپ بچھو سے آپ کے دل میں خوف پیدا ہو گیا، دشمن لاٹھی اُٹھا کے آ گیا اور آپ اُس سے ڈر گئے، یہ طبعی خوف ہوتا ہے، یہ قابلِ اعتبار نہیں۔ لیکن عقیدے کا جو خوف ہے، کہ ہمارا کوئی بگاڑ سکتا ہے، اور اگر ہم نے فلاں کام نہ کیا تو ہم اجڑ جائیں گے، یہ خوف، خشیت ان کو صرف اللہ سے ہوتا ہے، کسی دوسرے سے نہیں۔ باقی ان تکلیف پہنچانے والی چیزوں سے ظاہری طور پر ڈرنا، یہ عقیدۂ توحید کے خلاف نہیں ہے، مافوق الاسباب درجے میں نقصان پہنچانے کا اختیار صرف اللہ کے لئے ہے، اور شرک کی جڑ یہی ہے کہ غیر اللہ سے ان کے دل میں خوف اور ہراس ہوتا ہے، جس کی بنا پر یہ اُس کے سامنے جھکتے ہیں، اور مؤمن صحیح طور پر وہ ہے جس کی یہ صفت بھی ساتھ ہو کہ لَمْ يَخْشَ اِلَّا اللّٰهَ کہ اللہ کے علاوہ اس کے دل میں خوف اور خشیت کسی کی نہیں ہوتی، فَعَسٰۤى اُولٰٓئِكَ اَنْ يَّكُوْنُوْا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ: یہ لوگ جو یہ کام کرتے ہیں، یہ ہیں مہتدین میں

---

(۱) بخاری ص ۱۳ باب اداء الخمس / مشکوٰۃ ص ۱۲ عن ابن عباس

سے،قریب ہے کہ یہ لوگ مہتدین میں سے ہوں گے،اُمید ہے کہ یہ لوگ ہدایت یافتہ ہوں گے، اللہ تعالیٰ کی کلام کے اندر اُمید وعدے کی جگہ ہی ہوتی ہے، یہ ہیں اپنے مقصد کو صحیح پانے والے۔

پس منظر

اَجَعَلْتُمْ سِقَایَةَ الْحَآجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ یہ خطاب مفسرین کی تفصیل کے مطابق مشرکین کو بھی ہو سکتا ہے، اور شانِ نزول کی بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خطاب مؤمنین کو بھی ہے۔ مشرکین کو تو ہے ہی، جو کہ حاجیوں کو پانی پلانے کو اور مسجدِ حرام کی خدمت کرنے کو اپنے لیے سمجھتے تھے کہ ہمارے لیے یہ باعثِ فخر ہے، اُن سے کہا گیا کہ ایمان اور جہاد کے مقابلے میں یہ کچھ نہیں ہیں، ایمان و جہاد اصل ہے، اگر ایمان کے ساتھ ساتھ یہ خدمات انجام دی جائیں تو باعث فضیلت ہیں، ورنہ کچھ نہیں۔ تم اس طرح سے نہ سمجھو کہ تم صرف حاجیوں کو پانی پلا کر مؤمنوں اور مجاہدوں کی طرح ہو گئے، تمہاری یہ خدمات کوئی حیثیت نہیں رکھتیں۔ اور مسلمانوں کے لئے خطاب اس طرح سے ہوگا، روایاتِ تفسیر سے معلوم ہوتا ہے، کہ ایک مجلس میں چند مسلمان حضرات کا آپس میں اس بات پر مذاکرہ ہوا کہ افضل کام کون سا ہے؟ بعض نے کہا کہ حاجیوں کو پانی پلانا بہت افضل ہے، مسجدِ حرام کی خدمت افضل ہے۔ بعض دوسرے کہنے لگے کہ اللہ کے راستے میں جہاد کرنا افضل ہے، جس میں چاہے بظاہر مسجد سے دُوری ہے، لیکن اللہ کا نام اُونچا کرنے کے لیے جو جد وجہد کی جاتی ہے وہ افضل ہے، اس طرح آپس میں تذکرہ ہوا تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ آیت اُتاری۔ لیکن راجح یہی معلوم ہوتا ہے کہ اصل میں تو اس آیت سے مشرکوں کا دماغ سیدھا کرنا مقصود ہے، لیکن اس کے ضمن میں چونکہ یہ بات ثابت ہوگئی، کہ ایمان اور جہاد افضل ہے حاجیوں کو پانی پلانے سے، اس لیے اگر مسلمانوں کا آپس میں کوئی اختلاف ہو کوئی گفتگو ہو تو اس موقع پر یہ آیت پڑھی جا سکتی ہے، چونکہ اسکے اندر فضیلت دوسرے اعمال کی نکلتی ہے ان کے مقابلے میں۔ تو دونوں باتیں اپنی جگہ صحیح ہو سکتی ہیں، اور اسلاف میں یہ طریقہ تھا کہ جب کوئی واقعہ پیش آجائے اور اس پر کسی آیت سے استدلال کیا جائے، تو اس واقعہ کو بھی اس آیت کے شانِ نزول میں بیان کر دیتے ہیں، گویا کہ یہ آیات اسی واقعے کے متعلق اُتری ہیں۔ کوئی ضروری نہیں ہوتا کہ وہ واقعہ پہلے پیش آیا ہو، اور آیات بعد میں اُتری ہوں۔ آیات پہلے اُتری ہیں لیکن اس واقعے کا حکم نکالنے کے لیے ان آیات کی تلاوت کی گئی (تو اس کو بھی کہہ دیتے ہیں کہ یہ آیات اس کے بارے میں اُتری ہیں)۔ جیسے آج ایک چور پکڑا ہوا آ گیا تو میں کہوں کہ اس کے بارے میں یہ آیت اُتری ہے: اَلسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَیْدِیَهُمَا، تو اب اس کا یہ معنی نہیں کہ یہ واقعہ پہلے پیش آیا اور آیت بعد میں اُتری۔ اس طرح سے استدلال جو کیا جاتا ہے بعض واقعات کا حکم نکالنے کے لیے تو اسلاف اس کو بھی شانِ نزول کے ساتھ تعبیر کر دیتے ہیں۔

''جہاد'' سقایۃ الحاج اور عمارۃ المسجد سے افضل ہے

کیا بنا دیا تم نے حاجیوں کے پانی پلانے کو اور مسجدِ حرام کے آباد کرنے کو اُس شخص کے عمل کی طرح جو ایمان لاتا ہے اللہ پر اور یومِ آخر پر اور اللہ کے راستے میں جہاد کرتا ہے۔ تم نے اس شخص کے عمل کی طرح بنا دیا؟ جس کا مطلب یہ ہے کہ ایسا نہیں۔

ایمان لانا افضل ہے سِقَایَةَ الْحَآجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ سے، اس لیے اگر کوئی مشرک یہ کام کرتا ہے اور دوسرا شخص ایمان لاتا ہے لیکن حاجیوں کو پانی پلانے کا کام اس کے ذِمّے نہیں، تو ایمان لانے والا اعلیٰ ہے، اور اس کے مقابلے میں یہ کام کوئی چیز نہیں۔ اسی طرح جہاد بھی پانی پلانے سے افضل، اور مسجد حرام کو آباد کرنے سے افضل ہے۔ جس وقت یہ عمل افضل ہو گئے تو عامل کی افضلیت خود نکل آئی، کہ ایک شخص ایمان لاتا ہے اور جہاد کرتا ہے، یہ اس شخص کے مقابلے میں افضل ہے جو حاجیوں کو پانی پلاتا ہے اور صرف مسجد کی خدمت کرتا ہے، تو عاملین کی فضیلت خود نکل آئی۔ لَا یَسْتَوٗنَ عِنْدَ اللّٰهِ یہ دونوں فریقوں کی طرف اشارہ ہے، کہ دونوں فریق برابر نہیں ہیں وَاللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ ظالم لوگوں کو اللہ صحیح راستہ نہیں دیتا، اُن کو حقیقت سمجھنے کی توفیق نہیں دیتا، کیونکہ کُفر اور شرک کے نتیجے میں دل کا مزاج ایسا بدل جاتا ہے کہ پھر بری چیزوں کی طرف رغبت زیادہ ہوگی، اچھی چیز کی طرف رغبت نہیں ہوتی، تو صحیح بات اُن کو سمجھانے کی کوشش کی جائے تو ان کی سمجھ میں نہیں آتی۔ اور ایمان کی برکت سے اللہ تعالیٰ دل کا مزاج ایسا صحیح کر دیتا ہے اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ یَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا، ان لفظوں کے تحت جس طرح بیان کیا تھا، کہ ایمان کی برکت سے، تقویٰ کی برکت سے اللہ تعالیٰ دل کے اندر ایسی نُورانیت پیدا فرما دیتے ہیں کہ جس کی وجہ سے دل خود حق اور باطل میں فرق کرنے لگ جاتا ہے، کہ یہ حق ہے یہ باطل ہے، یہ صحیح ہے یہ غلط ہے۔ تو ظالم لوگوں کو جو بدکردار ہیں اُن کو اللہ تعالیٰ صحیح بات سمجھنے کی توفیق ہی نہیں دیتا، اُن کا مزاج اس طرح بگڑ جاتا ہے کہ وہ فرق ہی نہیں کر سکتے، ورنہ اللہ پر ایمان لانا، یوم آخر پر ایمان لانا، اللہ کے راستے میں جہاد کرنا، ان کی بلندی خود بخود داتی نمایاں ہے کہ کون سی ایسی مخفی بات ہے کہ مسجد کی آبادی اور حاجیوں کے پانی پلانے کو شرک کے ساتھ گوارا کر لیا جائے، ان کا آپس میں کوئی مقابلہ نہیں۔ تو اُدھر کافر اور مشرک ہو تو بھی اسی طرح سے ہے، اور اگر کوئی مؤمن اس طرح سے کہے کہ ایمان لانے کے بعد حاجیوں کو پانی پلانا اور مسجد کی آبادی یہ جہاد کے مقابلے میں افضل ہے، تو اس کا بھی اس میں جواب آ گیا کہ نہیں، جہاد فی سبیل اللہ افضل ہے، جہاد کو ترجیح ہے، ایمان میں چاہے برابر ہوں، وہ بھی مؤمن وہ بھی مؤمن، لیکن ایک نے حاجیوں کو پانی پلانے کا کام اختیار کر لیا، اور ایک نے دِین کی نشر و اشاعت کے لیے جدوجہد شروع کر دی (کیونکہ جہاد کا حاصل یہی ہے) تو جو شخص دِین کی اشاعت کے لیے جدوجہد کر رہا ہے، اس کا عمل اِس کے عمل کے مقابلے میں افضل ہے۔

مؤمنِ مہاجر اور مجاہد کا مقام و مرتبہ

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا: جو لوگ ایمان لاتے ہیں اور اپنے گھر بار چھوڑتے ہیں، اور جہاد کرتے ہیں اللہ کے راستے میں اپنے مالوں کے ساتھ بھی۔ دِین کی اشاعت کے لئے مال بھی خرچ کرتے ہیں، اور اپنی جانوں کو بھی کھپاتے ہیں، اپنی جانوں کے ساتھ جہاد کرتے ہیں۔ تو جانوں کے ساتھ جہاد کرنے میں جہاد بالالسنہ بھی داخل ہے، جسے ''جہاد باللسان'' کہتے ہیں، اس میں بھی تو اپنے بدن کو لگایا جاتا ہے، ''جہاد باللسان'' کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ باطل کی تردید کرو اور حق کے دلائل مہیا کرو، اُن کے اعتراضات کا جواب دو، دلائل کے ساتھ حق کا اثبات کرو، یہ ''جہاد باللسان'' ہے، یہ بھی ''جہاد بالانفس'' میں داخل ہے۔ ''اپنے مالوں کے ساتھ جہاد کرتے ہیں اور اپنی جانوں کے ساتھ جہاد کرتے ہیں'' اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ: اللہ کے نزدیک ان کا درجہ بڑا

ہے۔اب اگر تو سِقَايَةَ الْحَآجِّ اور عِمَارَةَ الْمَسْجِدِ والا مؤمن ہے پھر تو اَعْظَمُ اسم تفضیل اپنے ظاہر پر ہے،اور اگر وہ کافر ہے تو پھر اَعْظَمُ صرف مبالغے کے طور پر ہے۔''اللہ کے نزدیک ان کا بہت بڑا درجہ ہے'' کیونکہ کافر کا عمل تو قابلِ اعتبار ہی نہیں،تو اُس کو مقابلے میں کس طرح لایا جاسکتا ہے؟ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ: یہ لوگ فوز وفلاح پانے والے ہیں،کامیاب ہونے والے ہیں۔

مؤمنینِ مہاجرین اور مجاہدین کے لئے دائمی اِنعامات کی تفصیل

ان کی کامیابی کیا ہے؟ اس کی تفصیل اگلے الفاظ میں ذکر کردی، کہ ان کا رَبّ ان کو بشارت دیتا ہے اپنی طرف سے رحمت کی،اور رضا مندی کی اور جنات کی۔ پیچھے تین عمل آئے تھے ایمان باللہ، ہجرت اور جہاد۔ اور ان کے ثمرہ کے اندر بھی تین چیزیں ذکر کردی گئیں، اللہ کی طرف سے رحمت، رضا، اور جنات۔ ان میں لف ونشر غیر مرتب ہے، رحمت کا تعلق تو ایمان کے ساتھ ہے، اللہ کی رحمت تو ایمان کی برکت سے حاصل ہوتی ہے، اور رضوان کا تعلق جہاد کے ساتھ ہے، کہ اللہ کی اعلیٰ درجے کی رضا مجاہدین کے لیے ہے، اور جنہوں نے اللہ کے راستے میں گھر بار چھوڑا تھا جنات کا تعلق اُن کے ساتھ ہے، کہ اللہ تعالیٰ اُن کو رہنے بسنے کے لیے اُن کے گھروں کے مقابلے میں اچھے گھر دے گا۔ تو جب کوئی شخص تینوں چیزوں کا جامع ہوگیا کہ ایمان بھی لے آیا، اللہ کے لئے گھر بار بھی چھوڑ دیا، اللہ کے راستے میں جہاد بھی کیا تو رحمت بھی حاصل ہوگئی، اللہ کی رضا بھی حاصل ہوگئی، اور رہنے کے لیے باغات بھی مل گئے۔ پھر دنیا کے اچھے مکانات، دنیا کے باغات ان کے مقابلے میں کیا حیثیت رکھتے ہیں، نہ تو ان کی نعمتیں دائم اور نہ ان کے اندر رہنا دائم، اگر آپ کے پاس باغ ہے ہی سہی، تو اُس کا ایک وقت پھل ہوتا ہے ایک وقت ختم ہوجاتا ہے، پھر آپ چاہے ترستے رہ جائیں آپ کو کھانے کے لیے نہیں ملے گا، موسم گزر گیا تو پھل ختم ہوگیا، اور کبھی ایسے بھی ہوگا کہ پھل لگا ہوا ہے اور جناب ہی رخصت ہوگئے، یہ بھی ہوتا رہتا ہے۔ لیکن اللہ کی طرف سے جو جنات (باغات) ملیں گے اُن میں ہمیشہ ہمیشہ خوش حالی ہوگی، کبھی وہ خوش حالی ختم نہیں ہوگی، اور یہ لوگ بھی اُس میں ہمیشہ رہنے والے ہوں گے، ایسا بھی نہیں ہوگا کہ جنت تو آباد ہے اور جنتیوں کو کہیں بھگا دیا جائے، ایسا بھی نہیں ہوگا۔ مطلب یہ کہ عیش وعشرت ہمیشہ رہے گی، یہ چند دن کی مشقت ہے جہاد اور ہجرت کی، اس کو جو لوگ برداشت کریں گے وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے راحت اور آرام میں رہیں گے۔ اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ: اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ تو ظاہری چیزیں ہیں جو تمہارے سامنے ذکر کردی گئیں، ورنہ اور بھی اللہ تعالیٰ نے پتا نہیں کیا کیا اجر تیار کر رکھے ہیں اہلِ جنت کے لئے، جن کے متعلق حدیث شریف میں آتا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''اَعْدَدْتُ لِعِبَادِيَ الصَّالِحِيْنَ مَا لَا عَيْنٌ رَأَتْ وَلَا اُذُنٌ سَمِعَتْ وَلَا خَطَرَ عَلٰى قَلْبِ بَشَرٍ''[1] میں نے اپنے نیک بندوں کے لیے ایسی ایسی نعمتیں تیار کر رکھی ہیں جو کبھی آنکھوں نے دیکھی نہیں، کانوں نے سنی نہیں، اور اُن کا خیال تک کسی بندے کے دِل میں نہیں آیا۔ تو ایسی ایسی نعمتیں بھی اللہ نے تیار کر رکھی ہیں۔

اللہ اور رسول کے مقابلے میں ہر تعلق قربان کرنے کا حکم

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْٓا اٰبَآءَكُمْ وَ اِخْوَانَكُمْ اَوْلِيَآءَ: ان آیات کے اندر ہجرت اور جہاد پر برانگیختہ کرنا مقصود ہے،

---

(۱) بخاری ۱/ ۴۹۵ باب ما جاء فی صفۃ الجنۃ/مشکوۃ ۲/ ۴۹۵ عن ابی ہریرۃ ؓ باب صفۃ الجنۃ واھلھا.

کیونکہ جہاد و ہجرت سے کون سی چیز مانع ہوتی ہے؟ برادری کے تعلقات، رشتہ داروں سے محبت، کہ انسان کہتا ہے کہ ٹھیک ہے یہ کافر ہیں، میں نے ایمان قبول کرلیا، لیکن اب ماں باپ کو چھوڑ کے کہاں چلا جاؤں، بہن بھائیوں سے جدائی کس طرح سے اختیار کرلوں؟ اور پھر جدھر میں جاؤں گا وہاں مجھے پتا نہیں رہنے کو مکان ملے گا یا نہیں ملے گا؟ کھانے کو کچھ ملے گا کہ نہیں ملے گا؟ اس قسم کی چیزیں ہیں جو انسان کے لیے جہاد اور ہجرت سے مانع ہوتی ہیں، تو اللہ تعالیٰ یہاں اسی کی ترغیب دیتے ہیں، اور صاف صاف فیصلہ سناتے ہیں کہ یہ دوٹوک فیصلہ کرلو، کہ اللہ اور اللہ کے رسول سے تعلق رکھنا ہے یا برادریوں اور کاروبار کو دیکھنا ہے، اگر تو برادریوں اور کاروبار کو مقدم رکھنا ہے تو اللہ کے عذاب کے منتظر رہو، یہ کوئی ایمان نہیں ہے کہ اللہ اور اللہ کے رسول کے مقابلے میں تم ان تعلقات کو بحال رکھو، اور اگر اللہ اور اللہ کے رسول سے تعلق رکھنا ہے تو پھر چاہے باپ ہی کیوں نہ ہو، ماں ہی کیوں نہ ہو، بہن بھائی ہی کیوں نہ ہوں، اگر وہ تمہارے راستے پر نہیں ہیں، کُفر اختیار کیے ہوئے ہیں، ایمان کے مقابلے میں کُفر کو پسند کرتے ہیں، تو اگر تمہیں ان کے خلاف بھی تلوار اٹھانی پڑ جائے تو اٹھانی ہوگی، انہیں دوست بنانا اور ان کے ساتھ تعلق رکھنا بالکل ٹھیک نہیں ہے، گویا کہ یہ دوٹوک فیصلہ سنادیا گیا۔ ''اے ایمان والو! اپنے آباؤاجداد کو، اپنے بھائیوں کو، یعنی بہن بھائیوں اور برادری والوں کو دوست نہ بنایا کرو'' کب؟ اِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى الْاِيْمَانِ: اگر ایمان کے مقابلے میں کُفر کو پسند کریں تو ایسے وقت میں ان کو دوست نہ بنایا کرو۔ اب والدین، بہن بھائیوں اور دیگر اہلِ قرابت کے حقوق کتنے زیادہ ہیں، اور قرآنِ کریم میں کتنی وضاحت کے ساتھ بیان کیے ہوئے ہیں، لیکن جہاں ایمان کی بات آگئی وہاں کسی کی پروا نہیں ہے۔ جس طرح سے ہمارے شیخ (سعدیؒ) کہتے ہیں:

ہزار خویش کہ بیگانہ از خدا باشد فدائے یک تنِ بیگانہ کہ آشنا باشد

کہ اگر اپنا ہزار ہے لیکن خدا سے بیگانہ ہے، وہ اپنا ہزار اس ایک بیگانے پہ قربان کیا جا سکتا ہے جو کہ اللہ سے آشنا ہے (گلستان، باب ۲، حکایت ۴۱)۔ تو اگر وہ ایمان کے مقابلے میں کُفر کو پسند کرتے ہیں، تو نہ باپ سے محبت رکھنی جائز، نہ بھائیوں سے محبت رکھنی جائز، اِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى الْاِيْمَانِ۔ اُس وقت تک اُن کے ساتھ تعلقات رکھے جا سکتے ہیں جب تک ہم یہ سمجھیں کہ ممکن ہے کہ یہ سمجھانے سے سمجھ جائیں گے، لیکن جب یہ فیصلہ ہوگیا کہ ان کے نزدیک کُفر ہی پسندیدہ ہے، کسی صورت میں اس کو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں، پھر ان کے ساتھ تعلقات رکھنے ٹھیک نہیں۔ محبت کا تعلق ٹھیک نہیں، باقی جو اُن کے دنیوی حقوق ہیں وہ کُفر کے باوجود بھی ادا کیے جائیں گے، قرآنِ کریم میں جس طرح سے آتا ہے کہ: صَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوْفًا[1] کہ اگر والدین تمہیں کسی غلط کام پر، کُفر، شرک پر برانگیختہ کرتے ہیں، مجبور کرتے ہیں تو اُن کا کہنا نہ ماننا فَلَا تُطِعْهُمَا، ان کا کہنا نہ مانو، وَّاتَّبِعْ سَبِيْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَيَّ: اس شخص کے پیچھے لگ جا جس کا رجوع میری طرف ہے وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوْفًا، لیکن دنیا کے اندر ان کے ساتھ برتاؤ اچھا کرو۔ اس لیے والدین اگر کافر بھی ہوں تو ان کا خرچ بیٹے کے ذِمّے ہے، اگر والدین محتاج ہیں اور اُن کو کما کر دینے والا کوئی نہیں ہے اور بیٹا خوش حال ہے، لیکن دونوں میں دِین کا فرق ہے کہ وہ کافر، مشرک ہیں اور یہ مؤمن ہیں تو بھی اُن کا خرچ اس کے ذِمّے ہے،

(۱) پارہ نمبر ۲۱ سورۂ لقمان آیت نمبر ۱۵: وَاِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰٓى اَنْ تُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوْفًا وَّاتَّبِعْ سَبِيْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَيَّ۔

دُنیوی خدمت پھر بھی ان کی کرنی چاہیے، لیکن ان سے دوستی اور محبت رکھنا ٹھیک نہیں۔ ''جو کوئی اُن سے دوستی لگائے گا تم میں سے پس یہی ظالم لوگ ہیں۔''

''آپ اعلان کر دیجئے'' اب اس آیت کے اندر سارے ہی تعلق والے شمار کرا دیے، کہ ''تمہارے آباؤ اجداد، تمہارے بیٹے، تمہارے بھائی، تمہاری بیویاں، تمہارا قبیلہ'' لیجئے! کچھ باقی نہیں رہا، یہ تو سارے کے سارے تعلقات آ گئے۔ ''اور تمہارے مال جن کو تم نے کمایا'' یہ قید اس لیے لگا دی کہ اپنے کمائے ہوئے مال سے بہت محبت ہوتی ہے، اپنا کمایا ہوا نہ ہو، کسی دوسرے کا کمایا ہوا ہو اور مفت میں ہاتھ آ جائے تو ایسی صورت میں اس مال ضائع کے ہونے کی اتنی فکر نہیں ہوتی اور اس مال سے اتنی محبت نہیں ہوتی، جب اپنی محنت کی کمائی ہوتی ہے تو اس سے تعلق بہت لگا ہوا ہوتا ہے، اس لیے اِقْتَرَفْتُمُوْهَا کے ساتھ اس کو مقید کر دیا، کہ وہ مال جن کو تم نے کمایا ہے۔ اور چلتی تجارت ہے، اور خطرہ ہے کہ اگر ہم نے یہ طریقہ نہ اپنایا تو ہماری تجارت مندی پڑ جائے گی، دُکان داری مندی ہو جائے گی، مال کی نکاسی بند ہو جائے گی، خرید و فروخت چھوٹ جائے گی، گھاٹا پڑ جائے گا، ''تجارت جس کے تم کساد سے ڈرتے ہو'' یعنی اس کے مندا پڑ جانے سے ڈرتے ہو۔ ''اور تمہارے مکانات'' حویلیاں بنا رکھی ہیں، کوٹھیاں بنا رکھی ہیں، اُن کے ساتھ دل اٹکا ہوا ہے، وہ پسندیدہ ہیں۔ ''اگر یہ ساری کی ساری چیزیں تمہیں اللہ اور اللہ کے رسول اور اللہ کے راستے میں جہاد کرنے کے مقابلے میں زیادہ پسند ہیں، تو اللہ تعالیٰ کے حکمِ عذاب کا انتظار کرو'' جس سے معلوم ہو گیا کہ ان تعلقات میں سے کوئی تعلق بھی اللہ اور اللہ کے رسول کے تعلق کے مقابلے میں راجح نہیں ہونا چاہیے۔

محبتِ اِختیاری اور غیر اِختیاری کی تفصیل

اور اس محبت سے محبت اختیاری مراد ہے۔ اضطراری محبت، قلب کا میلان، قلب کے اندر بے چینی یہ بسا اوقات انسان کے بس میں نہیں ہوتی۔ والدین کے متعلق انسان کے دل میں جو بے چینی ہے، یا اپنے بہن بھائیوں کے ساتھ تعلق میں دل کے اندر جتنا میلان ہے، بسا اوقات ہم اللہ اور اللہ کے رسول کی طرف اس طرح سے محسوس نہیں کرتے، یہ طبعی محبت ہے اور غیر اختیاری ہے، یہ انسان کے بس میں نہیں ہے۔ محبت کے بارے میں تو لوگ کہتے ہیں کہ یہ وہ آگ ہے جو لگائی نہ لگے اور بجھائی نہ بجھے، کہ کہیں لگانا چاہو تو لگتی نہیں، کہیں بجھانا چاہو تو بجھتی نہیں، یہ اپنی آزادی کے ساتھ ہی چلتی ہے، اس قسم کی غیر اختیاری محبت زیر بحث نہیں، اس کا انسان کو مکلف نہیں کیا جا سکتا۔ یہاں محبت اختیاری اور عقلی مراد ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ دونوں کے درمیان میں تعارض آ جائے تو تم کس کو ترجیح دیتے ہو؟ ایک طرف باپ کا حکم آ گیا، ایک طرف اللہ کا حکم ہے، اس موقع پر اگر باپ کا حکم لے لیا اور اللہ کا حکم چھوڑ دیا تو تم نے باپ سے محبت زیادہ رکھی بمقابلہ اللہ اور اللہ کے رسول کے۔ اور اگر ایک حکم شریعت کا آ گیا کہ گھر بار چھوڑ دو، نکلو، ہجرت کرو، اور تم کہتے ہو کہ میں ایسے بنائے ہوئے مکانات کیسے چھوڑ کر چلا جاؤں، وہاں پتا نہیں مکان ملے گا کہ نہیں ملے گا؟ کوٹھی کے ساتھ دل لگا ہوا ہے میں اسے کس طرح سے چھوڑ دوں؟ یا یہاں میری دُکان داری ہے تجارت ہے، اگر میں ہجرت کر کے نکل گیا،

چھوڑ کر چلا گیا تو میرا کاروبار سارے کا سارا برباد ہو جائے گا، یا یہ ہے کہ میں اتنا مال جو کمائے بیٹھا ہوں اتنی جائیداد جو بنائے بیٹھا ہوں میں اس کو چھوڑ کر کہاں چلا جاؤں؟ یا میں اپنے رشتہ داروں کو چھوڑ کے کیسے چلا جاؤں؟ یا میں ان رشتہ داروں کے خلاف تلوار کس طرح سے اٹھالوں؟ اگر ان باتوں کو سوچ کر اللہ اور اللہ کے رسول کے حکم کو پس پشت ڈال دیا، تو پھر آپ کی محبت ان چیزوں کے ساتھ ہے، اللہ اور اللہ کے رسول کے ساتھ نہیں ہے۔ پتا مقابلہ میں لگا کرتا ہے، ایک طرف بیوی کی فرمائش ہے دوسری طرف شریعت کا حکم ہے، اگر شریعت کا حکم مانا تو گویا کہ شریعت اور اللہ اور اللہ کا رسول تمہیں زیادہ پسند ہے بیوی کے مقابلے میں، اور اگر بیوی کا حکم مان لیا اور اللہ اور اللہ کے رسول کے حکم کی مخالفت کر لی تو اللہ اور اللہ کے رسول کے مقابلے میں بیوی کو تم نے ترجیح دے دی، تو یہ پتا چلتا ہے مقابلے کے وقت میں۔ اور یہ محبت ہی اصل چیز ہے جس کے ساتھ انسان کے لیے طاعات آسان ہوتی ہیں، اگر اللہ اور اللہ کے رسول کی محبت ترجیح پکڑ جائے تو ہر قربانی انسان کے لیے آسان ہو جاتی ہے، ہر عمل انسان کے لیے آسان ہو جاتا ہے، اور اگر اللہ اور اللہ کے رسول کو محبت راجح نہیں، مال کی محبت راجح ہے، تو اس میں سے چالیسواں حصہ نکال کر دینا بھی گوارا نہیں ہوتا۔ یہ جو زکوٰۃ نہیں دیتے اللہ کا حکم سامنے آ جانے کے بعد، یعنی اللہ کے دیے ہوئے مال میں سے چالیسواں حصہ بھی دینے کے لیے آمادہ نہیں ہوتے، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اُن کے دل میں مال کی محبت زیادہ ہے، اللہ اور اللہ کے رسول کے حکم کی پروا نہیں ہے۔ ''اگر یہ زیادہ پسند ہیں تمہیں'' اَحَبَّ: دیکھو! یہ تفضیل کا صیغہ آ گیا، جس کا مطلب یہ ہے کہ فی الجملہ ان سے محبت گوارا ہے، ماں باپ سے، بہن بھائیوں سے بیویوں سے اپنے قبیلے سے محبت کر سکتے ہو، اپنے مالوں سے محبت رکھ سکتے ہو، اپنے مکانات سے محبت لگا سکتے ہو، کاروبار سے محبت ہو سکتی ہے، سرے سے محبت سے روکنا مقصود نہیں ہے، لیکن یہ احب نہیں ہونے چاہئیں، اللہ اور اللہ کے رسول کے مقابلے میں زیادہ محبوب نہیں ہونے چاہئیں، اس لیے ان کے حکم کے تحت تو بے شک سب سے محبت رکھو، لیکن جہاں مقابلہ آ جائے وہاں اللہ اور اللہ کے رسول کے حکم کو ترجیح دو، پھر تو تم ہو مؤمن، اور اگر اللہ اور اللہ کے رسول کے حکم کو ترجیح نہیں دیتے بلکہ وہاں بھی ان چیزوں کی رعایت رکھتے ہو تو پھر اللہ کے حکم کا انتظار کرو۔

فاسقوں کی اپنے مقصد میں ناکامی

وَاللّٰہُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْفٰسِقِیْنَ: یہاں فاسق سے وہی لوگ مراد ہیں جو ان کے تعلقات کو اللہ اور اللہ کے رسول کے مقابلے میں ترجیح دیتے ہیں۔ یہ فاسق لوگ، یہ اللہ کی طاعت سے نکلنے والے لوگ، اللہ تعالیٰ ان کو ان کے مقصد میں کامیاب نہیں کرتا، ان کا مقصد ہے کہ ہم ان تعلقات سے فائدہ اٹھائیں گے، لیکن اللہ تعالیٰ ان کو فائدہ اٹھانے کی بھی توفیق نہیں دے گا، موت آئے گی تو سب کچھ ہی ختم کر دے گی۔ اگر ان کا مقصد ہے کہ ہم انہی کے ساتھ ہی رہیں، اور انہی سے فائدہ اٹھائیں، تو کیا اس مقصد میں کوئی آدمی کامیاب ہو سکتا ہے؟ سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اللہ تعالیٰ یا مال چھین لے گا یا انسان کو مار دے گا، تجارت میں نقصان ہو جائے گا، ماں باپ اور دوسروں سے موت کے ساتھ جدائی ہو جائے گی، ان مقاصد میں کوئی شخص کامیاب نہیں ہو سکتا۔ ہاں البتہ اللہ اور اللہ کے رسول کے حکم کے تحت جس وقت وہ چلے گا تو پھر وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہے، کہ اللہ کی رضا بھی حاصل ہو گی، اور اگر یہ

لوگ بھی اچھے ہوئے تو آخرت میں جا کے وہاں پھر آپس میں رفاقت ہو جائے گی، جیسا کہ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ کے اندر یہی مضمون تو بتایا گیا ہے، کہ کوئی مرجائے یا کوئی نقصان ہو جائے، تو یہ سوچو کہ ہم تو اللہ کے لیے ہیں، جو تصرف اُس کا ہوگا ہمیں قبول ہے، اور اُسی کی طرف ہم لوٹ کر جانے والے ہیں، یہ عارضی جدائی ہے، جب اللہ کے پاس چلے جائیں گے وہاں جا کے پھر سارے کے سارے اکٹھے ہو جائیں گے۔ تو یہ نافرمان لوگ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتے، اگر اُن کا مقصد ہے کہ ہم ان چیزوں سے فائدہ اٹھاتے رہیں گے تو یہ ممکن نہیں ہے۔ اس لیے ہمیشہ اللہ اور اللہ کے رسول کے حکم کو ترجیح دو ان تعلقات کے مقابلے میں۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِيْ مَوَاطِنَ كَثِيْرَةٍ ۙ وَّيَوْمَ حُنَيْنٍ ۙ

یہ بات پکی ہے کہ اللہ نے تمہاری مدد کی بہت سے مقامات میں اور خصوصیت سے حنین کے دن،

اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْـًٔا

جب کہ تمہیں عُجب میں ڈال دیا تھا تمہاری کثرت نے پھر وہ کثرت تمہارے کچھ کام نہ آئی

وَّضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ

اور تم پر زمین تنگ ہوگئی باوجود اس کے کشادہ ہونے کے، پھر تم پیٹھ پھیر کے

مُّدْبِرِيْنَ ۝٢٥ ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى

بھاگ گئے ۝٢٥ پھر اللہ تعالیٰ نے اپنا اطمینان اُتارا اپنے رسول پر اور

الْمُؤْمِنِيْنَ وَاَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا وَعَذَّبَ الَّذِيْنَ

مؤمنین پر، اور ایسے لشکر اُتارے جن کو تم نے نہیں دیکھا، اور عذاب دیا اللہ تعالیٰ نے

كَفَرُوْا ؕ وَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ ۝٢٦ ثُمَّ يَتُوْبُ اللّٰهُ مِنْۢ بَعْدِ

کافروں کو، کافروں کا بدلہ یہی ہے ۝٢٦ پھر اللہ تعالیٰ توجہ فرماتا ہے اس کے بعد

ذٰلِكَ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝٢٧ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا

جس پہ چاہتا ہے، اللہ تعالیٰ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے ۝٢٧ اے ایمان والو!

اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ

اس کے سوا کچھ نہیں کہ مشرک ناپاک ہیں، پھر یہ قریب نہ آئیں مسجدِ حرام کے

عَامِهِمْ هٰذَا ۚ وَاِنْ خِفْتُمْ عَيْلَةً فَسَوْفَ يُغْنِيْكُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖٓ

اپنے اس سال کے بعد، اور اگر تم اندیشہ کرتے ہو فقر کا تو قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں اپنے فضل سے غنی کر دے گا

اِنْ شَآءَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۸﴾ قَاتِلُوا الَّذِيْنَ

اگر چاہے گا، بےشک اللہ تعالیٰ علم والا ہے حکمت والا ہے﴿۲۸﴾ لڑائی لڑو اُن اہلِ کتاب کے ساتھ

لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ

جو اللہ پر ایمان نہیں لاتے اور نہ یوم آخر پر ایمان لاتے ہیں، نہ اللہ اور اس کے رسول کی حرام ٹھہرائی ہوئی چیزوں

اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا

کو حرام ٹھہراتے ہیں، نہ دینِ حق کی اتباع کرتے ہیں

الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ ﴿۲۹﴾ ع

حتیٰ کہ وہ تمہارے غلبے کے سبب سے جزیہ دینے لگ جائیں اس حال میں کہ وہ پست ہوجائیں﴿۲۹﴾

وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ ابْنُ اللّٰهِ وَقَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيْحُ

یہود نے کہا کہ عزیر اللہ کا بیٹا ہے، نصاریٰ نے کہا کہ مسیح

ابْنُ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ ۚ يُضَاهِـُٔوْنَ قَوْلَ الَّذِيْنَ

اللہ کا بیٹا ہے، یہ اُن کی بات ہے اپنے منہ سے، نقل اُتارتے ہیں اُن لوگوں کی بات کی

كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ ۭ قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ ۚ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ﴿۳۰﴾ اِتَّخَذُوْٓا

جنہوں نے ان سے پہلے کفر کیا، اللہ انہیں برباد کرے، یہ کہاں پھرے جا رہے ہیں؟﴿۳۰﴾ بنالیا انہوں نے

اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ

اپنے علماء اور اپنے مشائخ کو رَبّ اللہ کے علاوہ اور خصوصیت کے ساتھ مسیح ابنِ

مَرْيَمَ ۚ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ

مریم کو (ربّ بنا لیا)، اور نہیں حکم دیئے گئے مگر یہی کہ وہ عبادت کریں ایک اِلٰہ کی، اس کے علاوہ کوئی دُوسرا اِلٰہ نہیں،

سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۳۱﴾ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ

ان کے شریک ٹھہرانے سے وہ پاک ہے﴿۳۱﴾ یہ لوگ چاہتے ہیں کہ بجھا دیں اللہ کے نُور کو

بِاَفْوَاهِهِمْ وَيَاْبَى اللّٰهُ اِلَّآ اَنْ يُّتِمَّ نُوْرَهٗ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۳۲﴾

اپنے مونہوں کے ساتھ اور اللہ تعالیٰ اپنے نُور کو پورا کیے بغیر نہیں رہے گا اگرچہ کافروں کو یہ بات ناگوار ہی گزرے﴿۳۲﴾

هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ

اللہ وہ ہے جس نے اپنے رسول کو بھیجا ہدایت اور سچا دِین دے کر تاکہ غالب کر دے اللہ تعالیٰ اس دِین کو

عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۙ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ﴿۳۳﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا

سب دِینوں پر اگرچہ مشرکین کو یہ بات ناگوار گزرے﴿۳۳﴾ اے ایمان والو!

اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ

علماء اور مشائخ میں سے بہت سے البتہ کھاتے ہیں لوگوں کا مال

بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ

غلط طریقے سے اور اللہ کے راستے سے روکتے ہیں، اور جو لوگ گاڑکر رکھتے ہیں

الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ

سونا اور چاندی اور اُس کو اللہ کے راستے میں خرچ نہیں کرتے پس انہیں بشارت دے دے

بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿۳۴﴾ ۙ يَّوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى

دردناک عذاب کی﴿۳۴﴾ جس وقت ان اموال کو گرم کیا جائے گا جہنّم کی آگ میں، داغے جائیں گے

بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ ؕ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ

اُن اموال کے ذریعے سے ان کے ماتھے اور اُن کے پہلو اور اُن کی پشتیں، (اور کہا جائے گا کہ) یہ ہے جس کو تم گاڑ گاڑ کر رکھتے تھے

لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ ﴿۳۵﴾

اپنے نفسوں کے لیے، مزہ چکھو اس چیز کا جس کو تم گاڑتے تھے ﴿۳۵﴾

خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِيْ مَوَاطِنَ كَثِيْرَةٍ: مواطن مَوْطِن کی جمع ہے بمعنی جگہ، مقام، لَقَدْ تاکید کے لئے آگیا، اور اس سے کلام اتنی مؤکد ہو جایا کرتی ہے جیسے کہ قسم کھائی جائے ''بے شک یہ بات پکی ہے، بلاریب درست ہے، کہ اللہ نے تمہاری مدد کی بہت سے مقامات میں''، وَّيَوْمَ حُنَيْنٍ: اور خصوصیت سے حنین کے دن، ''حنین'' ایک جگہ کا نام ہے، اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ: جبکہ عُجب میں ڈال دیا تھا تمہیں تمہاری کثرت نے، تمہیں عُجب میں ڈال دیا تھا تمہاری کثرت نے، یعنی اپنی کثرت پر تم خوش ہو رہے تھے، فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْئًا: تُغْنِ کی ضمیر کثرت کی طرف لوٹ گئی، پھر وہ کثرت تمہارے کچھ کام نہ آئی، اَغْنٰى عَنْهُ: فائدہ پہنچانا، دُور ہٹانا، کام آنا، یہ کئی دفعہ آپ کے سامنے ذکر کیا جا چکا ہے، وہ کثرت تمہارے کچھ کام نہ آئی، یا، اس کثرت نے تمہیں کچھ فائدہ نہ پہنچایا، وَّضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْاَرْضُ: اور تم پر زمین تنگ ہو گئی، بِمَا رَحُبَتْ: مَا مصدریہ ہے، باوجود اس کے کشادہ ہونے کے، ثُمَّ وَلَّيْتُمْ: پھر تم نے پیٹھ پھیری، مُّدْبِرِيْنَ: یہ وَلَّيْتُمْ کے لئے حالِ مؤکدہ ہے، پھر تم پیٹھ پھیر کے بھاگ گئے، حاصل ترجمہ یوں کر دیا جاتا ہے، ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ: پھر اللہ تعالیٰ نے اپنا اطمینان اُتارا، عَلٰى رَسُوْلِهٖ: اپنے رسول پر، وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ: اور مؤمنین پر، وَاَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا: اور ایسے لشکر اُتارے جن کو تم نے نہیں دیکھا، لَمْ تَرَوْهَا یہ جُنُوْدًا کی صفت ہے اس لیے ترجمے میں ''ایسے'' کا لفظ بول رہا ہوں، وَعَذَّبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا: اور عذاب دیا اللہ تعالیٰ نے کافروں کو، وَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ: کافروں کا بدلہ یہی ہے، ثُمَّ يَتُوْبُ اللّٰهُ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ: پھر اللہ تعالیٰ توجہ فرماتا ہے اس کے بعد جس پہ چاہتا ہے، وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ: اللہ تعالیٰ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے، يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ: اے ایمان والو! اس کے سوا کچھ نہیں کہ یہ مشرک ناپاک ہیں، یعنی مشرک ناپاک ہی ہیں، ان میں طہارت اور پاکیزگی کا وجود نہیں، نجس نجاست کے معنی میں ہے، مجسمۂ نجاست، فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ: پھر یہ قریب نہ آئیں مسجدِ حرام کے، بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا: اپنے اس سال کے بعد، وَاِنْ خِفْتُمْ عَيْلَةً: اور اگر تم اندیشہ کرو احتیاج کا، اگر تمہیں محتاج ہونے کا اندیشہ ہو، فقر کا اندیشہ ہو، فَسَوْفَ يُغْنِيْكُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖۤ اِنْ شَآءَ: یہ اِنْ کی جزاء پر دال ہے، اگر تمہیں فقر کا اندیشہ ہے تو تم اللہ کے فضل سے اُمید رکھو، کہ تمہیں محتاج نہیں ہونے دے گا، ''اگر تم اندیشہ کرتے ہو فقر کا تو قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں اپنے فضل سے غنی کر دے گا اگر چاہے گا'' اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ: بے شک اللہ تعالیٰ علم والا ہے حکمت والا ہے۔ قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ: قَاتِلُوْا: لڑائی کرو، مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ یہ الَّذِيْنَ کا بیان ہے، اس لیے مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ کو اگر اس الَّذِيْنَ کے ساتھ جوڑ لیا جائے تو ترجمہ یہاں اکٹھا ہو جائے گا، ''لڑائی لڑو ان اہلِ کتاب کے ساتھ'' یہ الَّذِيْنَ اور مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اکٹھا ہو گیا چونکہ مِن بیانیہ ہے، ''لڑائی لڑو ان اہلِ کتاب کے ساتھ جو اللہ پر ایمان نہیں لاتے اور نہ یومِ آخر پر ایمان لاتے ہیں، نہ اللہ

کی حرام ٹھہرائی ہوئی چیزوں کو حرام ٹھہراتے ہیں، نہ دِینِ حق کی اتباع کرتے ہیں'' لڑتے رہو، لڑائی کرو حَتّٰی یُعْطُوا الْجِزْیَةَ عَنْ یَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ: ید ہاتھ کو کہتے ہیں لیکن یہاں غلبہ مراد ہے، اور عَنْ سببیت کے لئے ہے، ''حتیٰ کہ وہ تمہارے غلبے کے سبب سے جزیہ دینے لگ جائیں اس حال میں کہ وہ پست ہو جائیں''، تمہارے مطیع ہو جائیں، تمہاری حکومت کو تسلیم کرلیں، سامنے ذلیل ہو جانے کا مطلب یہی ہے کہ تمہارے آئین کے تابع ہو گئے، تمہارے سامنے پست ہو گئے، تمہارا غلبہ تسلیم کر کے جزیہ دینے لگ جائیں، ''جزیہ'' کا لفظی معنی بدلہ ہوتا ہے۔ وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ ابْنُ اللّٰهِ: یہود نے کہا کہ عُزیر اللہ کا بیٹا ہے، وَقَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ: نصاریٰ نے کہا کہ مسیح اللہ کا بیٹا ہے، ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ: یہ ان کی بات ہے ان کے اپنے منہ سے، یعنی اس کا واقعے سے کوئی تعلق نہیں، منہ سے بول دی کوئی بات، اپنے منہ سے کہی ہوئی بات ہے، منہ زبانی بول رہے ہیں، باقی واقعہ خارج میں کوئی نہیں ہے، یہ ان کی بات ان کے اپنے منہ سے، يُضَاهِـُٔوْنَ قَوْلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ: مُضَاهَاة: نقل اُتارنا، مشابہت اختیار کرنا، ''مشابہت اختیار کرتے ہیں ان لوگوں کی بات کی، نقل اُتارتے ہیں ان لوگوں کی بات کی جنہوں نے ان سے پہلے کفر کیا'' قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ: اللہ انہیں برباد کرے، اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ: یہ کہاں پھرے جا رہے ہیں، قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ یہ لعنت کا کلمہ ہے، جس طرح سے آپ کسی کے لئے بددُعا کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اللہ اسے غارت کرے، یہ ویسے ہی بات ہے، اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ: کہاں پھرے جا رہے ہیں، کہاں چکر دیے جا رہے ہیں، اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ: اَحبار یہ حِبر کی جمع ہے ''حِبر'' عالم، فقیہ کو کہتے ہیں، اور رُهبان راهب کی جمع ہے، ''راهب'' درویش کو کہتے ہیں، تو اَحبار و رُهبان یہ دونوں لفظ علماء اور مشائخ کا مفہوم ادا کر رہے ہیں، ''بنالیا انہوں نے اپنے علماء اور اپنے مشائخ کو، بنالیا انہوں نے اپنے علماء کو اور اپنے پیروں کو، درویشوں کو'' اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ: رَبّ اللہ کے علاوہ، اَرباب رَبّ کی جمع ہے، اللہ کے علاوہ ان کو رَبّ بنالیا، وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ: اور خصوصیت کے ساتھ مسیح ابن مریم کو رَبّ بنالیا، وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا: اور نہیں حکم دے گئے مگر یہی کہ وہ عبادت کریں اِلٰہ واحد کی، ایک خدا کی عبادت کے علاوہ ان کو کسی چیز کا حکم نہیں دیا گیا، لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ: وہ اِلٰہ واحد وہی ہے کہ جس کے علاوہ کوئی دوسرا اِلٰہ نہیں، سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ: مَا مصدریہ ہو جائے گا، ان کے شریک ٹھہرانے سے وہ پاک ہے، شریک ٹھہرانا ایک عیب ہے اور اللہ اس عیب سے پاک ہے۔ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ: یہ لوگ چاہتے ہیں کہ بجھا دیں اللہ کے نُور کو۔ اَطْفَأَ اِطْفَاءً: بجھانا۔ یہ لفظ پہلے بھی گزرا تھا كُلَّمَآ اَوْقَدُوْا نَارًا لِّلْحَرْبِ اَطْفَاَهَا اللّٰهُ (سورۂ مائدہ: ۶۴) وہاں بھی اَطْفَاَ کا لفظ آیا تھا کہ جب بھی یہ لڑائی کی آگ بھڑکاتے ہیں اللہ اسے بجھا دیتا ہے۔ ''چاہتے ہیں کہ بجھا دیں اللہ کے نُور کو'' بِاَفْوَاهِهِمْ: اپنے مونہوں کے ساتھ، وَيَاْبَى اللّٰهُ اِلَّآ اَنْ يُّتِمَّ نُوْرَهٗ: اور اللہ انکار کرتا ہے مگر اس بات کا کہ اپنے نُور کو پورا کرے، اللہ انکار کرتا ہے ہر چیز کا مگر اس بات کا کہ اپنے نُور کو پورا کرے، لفظی ترجمہ اس طرح سے ہے، اور محاورۃً اس مفہوم کو یوں ادا کریں گے ''اور اللہ تعالیٰ اپنے نُور کو پورا کیے بغیر نہیں رہے گا'' وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ: اگرچہ کافروں کو یہ بات ناپسند ہی ہو، کافر ناک رگڑ لیں، جس طرح سے چاہیں کرلیں، اللہ اپنے نُور کو پورا کیے بغیر نہیں رہے گا، اس کے بغیر اللہ مانے گا ہی نہیں، يَاْبَى اللّٰهُ کا یہ معنی ہے ''اللہ تعالیٰ اپنے نور کو پورا کیے بغیر نہیں رہے گا اگرچہ کافروں کو یہ بات ناگوار ہی گزرے''۔ هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ: اللہ وہ ہے جس نے اپنے رسول کو بھیجا، بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ: ہدایت کے ساتھ اور سچے دین کے ساتھ۔ هُدٰى: رہنمائی۔ ''ہدایت اور سچا دِین

دے کر'' سچے دین سے عقائد کی طرف اشارہ ہوجائے گا، اور ھُدیٰ سے دیگر اَحکام کی طرف اشارہ ہوجائے گا، دونوں لفظ بول کے مجموعۂ دِین مراد ہے جو عقائد اور اَعمال پر مشتمل ہے، لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ: تاکہ غالب کردے اللہ تعالیٰ اِس دِین کو سب دینوں پر، وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ: اگرچہ مشرکین کو یہ بات پسند نہ ہو، اگرچہ مشرکین کو یہ بات ناگوار گزرے، یعنی ان کے علی الرغم، ان کی مرضی کے خلاف، اللہ تعالیٰ اپنے اِس دِین کو باقی دینوں پر غالب کر کے رہے گا۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ: اے ایمان والو! علماء اور مشائخ میں سے بہت سے لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ: البتہ کھاتے ہیں لوگوں کا مال بِالْبَاطِلِ: غلط طریقے سے، وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ: اور اللہ کے راستے سے روکتے ہیں، وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ: كَنَزَ يَكْنِزُ: اصل کے اعتبار سے اس کا معنی ہوتا ہے گاڑنا، پُرانے زمانے میں جس وقت یہ بینکیں وغیرہ نہیں بنی تھیں اور یہ کاغذ کا نوٹ نہیں تھا، سونے چاندی کا ہی سکہ تھا، تو اس وقت میں یہ رواج چلا آتا تھا یعنی آج سے پچاس ساٹھ سال پہلے بھی، اور اب بھی دیہاتوں میں شاید رواج ہوگا، کہ لوگ اپنی دولت کو گھڑوں میں ڈال کر زمین میں دفن کردیا کرتے تھے تاکہ چور اس کو نکال کر نہ لے جائیں، دیواریں چنتے وقت دیواروں کے اندر اپنی دولت چھپا دیتے تھے، چنانچہ ہندوؤں کے مکان جو مہاجرین کے حصے میں آئے تو کوئی جگہ جب یہ مکان گرائے گئے توڑے گئے تو ان کی دیواروں سے زیورات اور اس قسم کی سونے کی چیزیں نکلیں۔ تو ''کنز'' گاڑنے کو کہتے ہیں، تو يَكْنِزُوْنَ کا مطلب یہ ہوا کہ جو زمین میں گاڑتے ہیں یعنی جمع کر کر کے اس کو زمین میں دفن کرتے جاتے ہیں، دفینہ بناتے ہیں اس کو، اور اس کا مفہوم مطلقاً جمع کرنا ہے، کیونکہ اُس وقت جمع کرنے کی صورت یہی تھی جس طرح سے آج کہیں کہ جو لوگ پیسوں کے ساتھ بینکوں کو بھر رہے ہیں اور ان کو اللہ کے راستے میں خرچ نہیں کرتے، یہ وہی مفہوم ہے، اُس وقت چونکہ اس طرح سے بینکیں ہوتی نہیں تھیں تو لوگ گھڑوں میں دولت ڈال کر زمین میں دفن کردیتے تھے، سونے چاندی کا سکہ اکٹھا کیا اور کوئی لوہے کا گھڑا لے کے یا کوئی دوسری چیز لے کے اس کو جمع کر کے زمین میں دفن کردیا، پرانا محاورہ اسی طرح سے ہے، چونکہ رواج ایسے ہی تھا، اس لیے گلستاں کے اندر حضرت شیخ (سعدیؒ) کا جو ایک فقرہ آتا ہے اس کا بھی یہی مفہوم ہے، وہ فرماتے ہیں کہ ''بخیل کی دولت زمین سے اُس وقت باہر آتی ہے جب خود بخیل زمین میں چلا جاتا ہے'' تو اس کا یہی معنی ہے، بخیل زمین میں اترا اور اندر کی دولت باہر آگئی، یعنی اس کے ورثاء بعد میں نکالتے ہیں، نکال کر تقسیم کرتے ہیں، اپنی زندگی میں تو یہ جوڑ جوڑ کر جمع ہی کرتا رہتا ہے۔ تو لفظی معنی تو اس کا گاڑنا ہی ہے جیسے کہ حضرت شیخ (الہندؒ) ترجمہ کر رہے ہیں ''جو لوگ گاڑ کر رکھتے ہیں سونا اور چاندی''، ''گاڑ کر رکھتے ہیں'' اب یہ لفظ آپ کو اس لیے سمجھ میں نہیں آئے گا اگر آپ صرف ترجمہ دیکھیں گے کہ وہ پچھلا رواج اور عرف آپ کے سامنے نہیں، اور مفہوم یہاں صرف جمع کرنے کا ہے۔ ''جو لوگ سونے چاندی کو جمع کر کے زمین میں دفن کرتے ہیں اور اس کو اللہ کے راستے میں خرچ نہیں کرتے'' فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ: پس انہیں بشارت دے دے دردناک عذاب کی، يُنْفِقُوْنَهَا: ھا ضمیر فضۃ کی طرف لوٹ رہی ہے، یہ اس فضۃ کو خرچ نہیں کرتے، تو فضۃ سونے کے مقابلے میں ادنیٰ چیز ہے، جب اس کے خرچ نہ کرنے پر وعید ہوگی تو سونا خود اس میں آگیا۔ یا اموال کی تاویل کے ساتھ ''ھا'' ضمیر ادھر لوٹا لیجئے، فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ: انہیں بشارت دیجئے دردناک عذاب کی، يَّوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ: يُحْمٰى فعل مجہول ہے، عَلَيْهَا اس کا نائب فاعل ہے۔ جب ان اموال کو تپایا جائے گا جہنم کی آگ میں۔ حَمٰی

گرم کرنے کے معنی میں ہے، ''جس وقت ان اموال کو گرم کیا جائے گا جہنم کی آگ میں'' فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ: كَوٰى يَكْوِى كَيًّا: داغ لگانا۔ ''مشکوۃ شریف'' میں ''کتاب الرقاق'' (فصل ثالث) میں ہے: ''كَيَّةٌ كَيَّتَانِ''، داغ کے معنی میں، ایک دینار کو آپ نے فرمایا تھا: كَيَّةٌ، دو دیناروں کو فرمایا: كَيَّتَانِ، یہ دو داغ ہیں (ج ۲ ص ۴۴۳)۔ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ: داغے جائیں گے ان اموال کے ذریعے سے اِن کے ماتھے، داغی جائیں گی ان کی پیشانیاں، جَبْهَةٌ پیشانی کو کہتے ہیں، وَجُنُوْبُهُمْ: جَنب کی جمع۔ اور ان کے پہلو، وَظُهُوْرُهُمْ: اور ان کی پشتیں۔ ظَہر: کمر۔ ان کی پیشانیاں، ان کے پہلو اور ان کی کمروں کو داغا جائے گا، داغ دیا جائے گا ان اموال کے ذریعے سے، هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ: اور کہا جائے گا کہ یہ چیز ہے جس کو تم گاڑ گاڑ کے رکھتے تھے اپنے نفسوں کے لئے، فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ: اپنی گاڑی ہوئی چیز کا مزہ چکھو، مزا چکھو اس چیز کا جس کو تم گاڑتے تھے۔ اور اگر مَا کو مصدر یہ بنالیا جائے جیسے کہ حضرتِ شیخ (الہندؒ) کے ترجمے سے اشارہ نکلتا ہے تو پھر معنی یہ نکلا ''اپنے گاڑنے کا مزا چکھو'' مفہوم وہی ہوگا، اپنے گاڑے ہوئے مال کا مزا چکھو جس کو تم گاڑ گاڑ کے رکھتے تھے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

ماقبل سے ربط

اس رُکوع سے پچھلی آیت میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے جہاد کی ترغیب دی تھی، اور پوری وضاحت کے ساتھ یہ کہا تھا، کہ دُنیوی تعلقات چاہے اپنے اقارب اور رشتہ داروں سے ہوں، چاہے کاروبار سے ہوں، چاہے جائیداد سے ہوں، یہ جہاد سے مانع نہیں ہونے چاہئیں۔ اگر یہ چیزیں جہاد سے مانع بن گئیں، اور اللہ اور اللہ کے رسول کے حکم کے مقابلے میں تم ان کو ترجیح دینے لگ گئے، تو پھر یاد رکھو! اللہ کی طرف سے عذاب کا حکم آجائے گا، وہ جہاد پر ترغیب دینے کی بات تھی، اسی طرح اگلی آیت میں بھی اللہ تبارک وتعالیٰ جہاد کی ہی ترغیب دیتے ہیں اپنی نصرت اور مدد کا حوالہ دے کے، اپنی یہ چیزیں مانع نہیں ہونی چاہئیں، اور مدمقابل سے ڈرنا نہیں چاہیے، اور اللہ کی رحمت پہ بھروسا رکھنا چاہیے، اپنے ظاہری اسباب پر نظر نہ رکھا کرو، اس مفہوم کو سمجھانے کے لیے آگے غزوۂ حنین کا حوالہ دیا جارہا ہے۔

غزوۂ حُنین کا واقعہ

غالباً اِجمالی طور پر آپ کے سامنے غزوۂ حنین کا ذکر آیا تھا، یہ غزوہ فتح مکہ کے متصل پیش آیا، جس وقت سرورِ کائنات ﷺ نے مکہ پہ تسلط حاصل کرلیا، تو مکہ معظمہ سے قریب ہی چند میلوں کے فاصلے پر یہ حنین ایک وادی ہے، مکہ معظمہ سے طائف کی طرف جائیں تو یہ راستے میں آتی ہے، اس وادی کے آس پاس قبیلہ بنوثقیف، بنوہوازن آباد تھے، اور ان کی مختلف شاخیں تھیں جو طائف تک پھیلی ہوئی تھیں، تعداد کے اعتبار سے بھی یہ بہت تھے، فنونِ سپاہ گری میں، یعنی جنگ کے اُصولوں میں بھی یہ لوگ بہت ماہر

تھے، اور ان کی شہرت تھی کہ یہ بہت لڑاکے اور بہادر قسم کے لوگ ہیں، مالیات کے اعتبار سے بھی ان کو اردگرد کے لوگوں پر فوقیت حاصل تھی، یعنی دُنیا میں کسی قبیلے کے اعلیٰ سے اعلیٰ ہونے کی جو علامات ہوتی ہیں وہ ان لوگوں میں موجود تھیں۔ ان کا اس وقت لیڈر اور قائد مالک بن عوف تھا، اُس نے ان قبیلوں کے بڑے بڑے لوگوں کو اکٹھا کیا، اور اکٹھا کر کے کہنے لگا، کہ اب مسلمان مکہ معظمہ پر غالب آگئے ہیں، اور جس وقت ان کے قدم یہاں مضبوط ہو جائیں گے، تو ان کا اگلا نشانہ ہم ہی ہیں، پھر یہ ہم پہ حملہ کریں گے، اور ابھی وہ تازہ تازہ ہیں، پوری طرح سے اُن کے قدم مضبوط نہیں ہوئے، تو یہ موقع ہے کہ ہم اکٹھے ہو کے اُن پر حملہ آور ہو جائیں، اور ہم انہیں شکست دے دیں، تو اپنا بھی تحفظ ہو جائے گا، اور آئندہ کے لیے خطرات بھی ٹل جائیں گے، اگر اس وقت ہم نے سستی برتی اور اس موقع سے فائدہ نہ اُٹھایا، تو پھر جس وقت اُن کے قدم مکہ معظّمہ میں مضبوط ہو جائیں گے، تو اس کے بعد پھر اگلا نمبر ہمارا ہے، اس طرح اُس نے اپنے قبائل کی تمام شاخوں کو اکٹھا کر کے برانگیختہ کیا، اور مسلمانوں کے خلاف ایک فیصلہ کن جنگ لڑنے کا تہیہ کر لیا۔

دُشمن کی تیاری اور ان کی تعداد

ان کی تعداد کتنی تھی؟ بعض روایات میں تو ہے کہ ان کی تعداد چار ہزار تھی، اور بعض روایات میں ہے کہ ان کی تعداد چوبیس ہزار تھی، لیکن یہ چوبیس اور چار ہزار دونوں میں تطبیق اس طرح ہے، کہ میدان میں سامنے آکر لڑنے والے تو چار ہزار تھے، اور ان قبیلوں کی کل آبادی جن کو یہ اکٹھا کر کے میدان میں لائے تھے، روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنے اہل وعیال کو، بیوی بچوں کو، بوڑھوں کو، جتنے بھی لوگ تھے سب کو اکٹھا کر کے یہ میدان میں لے آئے تھے، تاکہ لڑنے والے جوان بھاگنے کی کوشش نہ کریں، اگر اُن کو بھاگنے کا خیال آئے گا تو فوراً یہ چیز مانع ہو جائے گی کہ ہمارے بیوی بچے مال اولاد جو کچھ ہے وہ سارا ہی اس میدان میں موجود ہے، ہم چھوڑ کے کہاں جائیں؟ یہ اپنا پورا سرمایہ نقد کی صورت میں، اور مویشی اُونٹ، بکری جو کچھ ان کے پاس تھا بمع اہل وعیال کے، اکٹھا کر کے یہ میدان میں آگئے تھے، اور مقابلہ کرنے والے تقریباً چار ہزار تھے، اور بچوں عورتوں اور بوڑھوں کو ملا کے تعداد بیس ہزار سے اُوپر تھی، مویشی وغیرہ سب ساتھ لے آئے تھے، اس طرح سے انہوں نے اکٹھے ہو کر، یعنی اپنی موت وحیات کا فیصلہ کرنے والی بات تھی، کہ اگر غلبہ پا گئے تو ٹھیک ہے، ورنہ پھر ہمیں اسی طرح سے ختم ہو جانا چاہیے، اور اگر ہم اس موقع سے فائدہ نہیں اٹھائیں گے تو آخر ہونا ہمارے ساتھ یہی ہے۔

سرورِ کائنات ﷺ کی تیاری

سرورِ کائنات ﷺ کو اِطلاع ہوگئی، تو آپ ﷺ نے یہ مناسب سمجھا کہ اُن کو مکہ پر حملہ کرنے کا موقع نہ دیا جائے، بلکہ آگے بڑھ کے ہم اُن کا راستہ روکیں، اور اُن کے ساتھ مقابلہ کسی دوسرے میدان میں ہو۔ تو سرورِ کائنات ﷺ نے کوچ کا اعلان فرما دیا، اور چونکہ بہت بڑی قوم تھی جس کے ساتھ مقابلہ تھا، تو رسول اللہ ﷺ نے اہتمام کے ساتھ اس موقع پر سامانِ جنگ اکٹھا کیا، چنانچہ مشرکینِ مکہ سے جو اُس وقت مفتوح ہوئے تھے، آپ ﷺ نے بہت سارا سامان مستعار لیا ہے استعمال کرنے کے لئے، زرہیں لی ہیں، نیزے لیے ہیں، اس قسم کی بہت ساری چیزیں لی ہیں، دس ہزار کا لشکر تو رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھا جو مدینہ منورہ سے

فتحِ مکہ کے لیے آئے تھے، بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ بارہ ہزار تھے، اور تقریباً دو ہزار آدمی مکہ معظمہ سے ساتھ شامل ہو گیا، جن میں سے بعض تو وہ تھے جو نئے نئے مسلمان ہوئے تھے، اور بعض تماشائی ہونے کی حیثیت میں ساتھ چلے گئے، چونکہ مکہ ابھی نیا نیا فتح ہوا تھا، تو سب لوگ ابھی پوری طرح سے صاف نہیں ہوئے تھے، مشرک اپنے شرک پر قائم تھے، کافر اپنے کفر پر قائم تھے، اگرچہ اُن کو اَمان حاصل ہو گیا تھا، لیکن ابھی اُن کے عقیدے صحیح نہیں ہوئے تھے، اس لیے تفسیری روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض لوگ تو بدنیتی کے ساتھ گئے تھے، کہ اگر اس میدان کے اندر مسلمانوں کو شکست ہو گئی تو ہمیں بھی انتقام لینے کا موقع مل جائے گا، پھر ہم بھی اُن کے خلاف بغاوت کر دیں گے، اور اس طرح سے مسلمانوں کو نقصان پہنچائیں گے، اور اگر فتح پا گئے تو پھر جس طرح ہیں اسی طرح رہیں گے، تو یہ حنین بہت بڑا میدان اور بہت بڑی وادی ہے، جس میں سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم اُن کے مقابل ہوئے۔

حنین میں عارضی شکست اور اس کی وجہ

راستے میں جاتے ہوئے بعض مؤمنوں کی زبانوں سے کچھ ایسے الفاظ نکل گئے جن سے معلوم ہوتا تھا کہ اب ان کی نظر اسباب کی طرف زیادہ ہو گئی، اور اللہ کی رحمت اور نصرت پر وہ نظر نہیں رہی، بعض لوگ کہنے لگے کہ جس وقت ہم تھوڑے سے تھے اُس وقت بھی غالب آئے تھے، آج تو ہم اتنے ہیں، تو ہم پر کون غالب آ سکتا ہے؟ اپنی کثرت پر نظر آ گئی، اور اس گفتگو میں کثرت پر اعتماد سا نمایاں ہوا، اور اللہ تعالیٰ کو یہ بات پسند نہیں تھی، کہ ذہن اس طرح سے پلٹا کھا جائے، کہ اسباب پر نظر ہو جائے اور اللہ پر نظر نہ رہے، تو جیسے میدانِ اُحد میں سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات کی خلاف ورزی ہوئی، اور فوراً اللہ کی طرف سے تنبیہ آ گئی، تا کہ لوگوں کے ذہن میں یہ بات پختہ ہو جائے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت ہی برکت کا باعث ہے، اور اس پر اللہ کی نصرت اور فتح ہوتی ہے، جب بھی عصیان اختیار کیا جائے، ہدایات کی خلاف ورزی کی جائے، تو اللہ کی نصرت ختم ہو جاتی ہے، تو چند تیر اندازوں کی غلطی تھی جس کی بنا پر وہ قوم شکست سے دوچار ہو گئی، اب یہاں بھی بعض لوگوں کی زبان سے اس قسم کی بات جو نکلی، تو اللہ تعالیٰ نے یہاں بھی سبق پڑھایا۔ وہ لوگ بہت زیادہ تیر انداز تھے، انہوں نے آ کے اس میدان میں پہلے مورچے سنبھال لیے، اِدھر اُدھر پہاڑوں کی گھاٹیوں میں تیر اندازوں کو چھپا دیا، اور ادھر اِن کو اپنی کثرت کا خیال جو آیا تو اِن میں وہ چستی وہ ہوشیاری وہ ہونہاری باقی نہ رہی، کیونکہ جس وقت انسان یہ سوچتا ہے کہ ہم بہت سارے ہیں، ہمارا مقابلہ کون کر سکتا ہے؟ تو اس کے نتیجے میں یقیناً انسان میں کچھ نہ کچھ لاپروائی سی آ جاتی ہے، تو یہ جس وقت آگے بڑھے اور اُدھر سے یکبارگی حملہ ہوا، اور اردگرد سے تیروں کی بارش ہوئی، تو پھر فوراً قدم اُکھڑ گئے، جس وقت قدم اُکھڑے تو پھر سارے اس میدان کو چھوڑ کر بھاگے، بھگدڑ مچ گئی۔

مسلمانوں کی فتح اور دُشمن کی شکست

سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم اس میدان کے اندر ثابت قدم رہے، جس طرح روایات میں تفصیل آتی ہے، اور بعد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو آواز دی کہ لوگوں کو واپس بُلاؤ، یہ بہت بلند آواز تھے، جیسے روایات میں آتا ہے: ''کَانَ صَیِّتًا''، ان کی آواز بہت بلند اور اونچی تھی، تو انہوں نے اصحابِ سمرۃ کو آواز دی جنہوں نے حدیبیہ کے میدان میں کیکر کے نیچے

بیٹھ کے موت پر بیعت کی تھی، اور اسی طرح مختلف طبقات کو آوازیں دی، پھر وہ سارے کے سارے رسول اللہ ﷺ کی طرف دوبارہ سنبھل کے آگئے، اور پھر مقابلہ ہوا،(۱) اور پھر اس مقابلے میں بنوثقیف اور بنوہوازن کے قدم اُکھڑ گئے، کچھ لوگ بھاگ گئے، کچھ مارے گئے، اور جو کچھ وہ اہل وعیال اور مال ودولت لائے تھے سارے کا سارا مسلمانوں کے قبضے میں آگیا، جیسے کہ ایک روایت میں یہ بھی ذکر کیا گیا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ وہاں جاکے ٹھہرے تھے، تو کسی نے آکے اطلاع دی کہ یارسول اللہ! وہ تو سارا مال دولت اسباب جو کچھ ہے سب ساتھ لے آئے ہیں، تو آپ ﷺ نے مسکرا کے فرمایا تھا: ''تِلْكَ غَنِيْمَةُ الْمُسْلِمِيْنَ غَدًا اِنْ شَآءَ اللهُ''(۲) کہ اگر وہ سب کچھ اکٹھا کر کے لے آئے ہیں تو کیا ہو گیا، کل کو یہ سب مسلمانوں کو بطور مالِ غنیمت کے ملے گا، چنانچہ وہ مالِ غنیمت کے طور پر ہی سارے کا سارا اکٹھا کر لیا گیا۔

مالِ غنیمت کی تقسیم میں تاخیر کی وجہ

لیکن حالات کچھ اس قسم کے تھے، کہ سرورِ کائنات ﷺ نے جس طرح مکہ معظمہ میں بہت نرم دلی کا مظاہرہ کیا تھا، تو یہاں بھی آپ ﷺ کا ارادہ ایسے ہی تھا، کہ اگر یہ لوگ آجائیں اور توبہ کر لیں، مسلمان ہو جائیں تو میں ان کے اموال بھی واپس دے دُوں اور ان کے قیدی بھی چھوڑ دُوں، کیونکہ یہی علاقہ ہے جس میں حضور ﷺ نے اپنی شیر خوارگی کا زمانہ گزارا ہے، اور جس قبیلے میں آپ ﷺ نے دُودھ پیا ہے، یہ حلیمہ سعدیہ کا قبیلہ، وہ بھی انہی کی شاخ ہے، تو یہاں آپ ﷺ کا وقت گزرا ہوا تھا، آپ کا اس علاقے سے رضاعی تعلق بھی تھا، اور آپ چاہتے تھے کہ نرمی کے ساتھ یہ سارے کا سارا معاملہ طے ہو جائے، تو یہ سارا مال ودولت آپ ﷺ اکٹھا کر کے وادئ جعرانہ میں آکے ٹھہر گئے، ''جعرانہ'' بھی بہت کھلا میدان ہے...... یہاں تک تو ہمارا ابھی جانا ہوا تھا، کیونکہ عمرہ کرنے کے لئے چونکہ حضور ﷺ نے وہاں سے اِحرام باندھا تھا، لوگ اس کو ''بڑا عمرہ'' کہتے ہیں، مکہ معظمہ سے جاتے ہیں جعرانہ میں، وہاں مسجد بنی ہوئی ہے جہاں حضور ﷺ ٹھہرے تھے، وہ کنواں بھی ابھی اسی طرح سے موجود ہے جس سے حضور ﷺ نے پانی لے کر استعمال کیا تھا، تو وہاں سے لوگ اِحرام باندھ کر آتے ہیں، اور اس کو ''بڑا عمرہ'' کہتے ہیں۔ اور مقامِ تنعیم جہاں سے رسول اللہ ﷺ نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا اِحرام بندھوایا تھا، یہ قریب ہے، یہ مسجدِ حرام سے تقریباً تین میل کے فاصلے پر ہے، اس کو ''چھوٹا عمرہ'' کہتے ہیں۔ اور ''جعرانہ'' تقریباً پچیس کلومیٹر کے قریب ہے طائف والی سڑک پر جاتے ہوئے سڑک سے ایک جانب کو تھوڑا سا ہٹ کے ہے۔ تو وہاں سے اِحرام باندھ کر آتے ہیں اور اس کو ''بڑا عمرہ'' کہتے ہیں، وہاں تو دو دفعہ جانا ہوا، پہلے سفر میں بھی اور اس سفر میں بھی...... تو بہت کھلا میدان ہے، اور ساری کی ساری چیزیں وہاں جمع کر لیں، اور کتنے دنوں تک رسول اللہ ﷺ نے انتظار کیا، کہ یہ لوگ اگر توبہ کر کے آجائیں، تو میں ان کو یہ سب کچھ واپس کر دُوں گا، قیدی بھی چھوڑ دُوں اور

(۱) مسلم ۲/ ۱۰۰ باب فی غزوة حنین۔مشکوة ۲/ ۵۴۳ باب المعجزات، فصل اول، عن عباس۔ نوٹ: حضرت عباسؓ نے حضور ﷺ کی سواری کی لگام پکڑی ہوئی تھی۔

(۲) سنن ابی داؤد ا/ ۳۳۸ باب فی فضل الحرس فی سبیل اللہ/ مشکوة ۲/ ۵۴۴ باب المعجزات، فصل ثانی کا آخر، عن سہل۔

ان کا سامان بھی دے دُوں، لیکن جب وہ نہیں آئے تو پھر رسول اللہ ﷺ نے وہ قیدی تقسیم کر دیے اور ان کو غلام باندیاں بنادیا، اور وہ مال بھی سارے کا سارا مسلمانوں کے درمیان میں تقسیم کر دیا۔

تقسیمِ غنیمت کے بعد بنوثقیف اور بنوہوازن کے وفد کی آمد اور سرورِ کائنات ﷺ کا دانش مندانہ اقدام

جب تقسیم کر دیا، اور تقسیم کر کے آپ ﷺ واپس آگئے، تو اس کے بعد بنوثقیف اور بنوہوازن کے لوگ ایک وفد کی صورت میں سرورِ کائنات ﷺ کی خدمت میں آئے، اور آکے کہنے لگے کہ یا رسول اللہ! ہم مسلمان ہو گئے ہیں، اس لیے ہمارا مال اور ہمارے قیدی واپس کر دیں۔ تو یہ مطالبہ انہوں نے کچھ دیر سے کیا، تو رسول اللہ ﷺ نے جواب دیا کہ دیکھو! بات وہی اچھی ہے جو سچی ہو اور واقعے کے مطابق ہو، تم دیکھ رہے ہو کہ میرے ساتھ کتنی بڑی جماعت ہے، اور اب وہ مال ان میں تقسیم ہو گیا، اور ان کی ملکیت میں جا چکا۔ اب ان دونوں میں سے ایک چیز واپس کروا سکتا ہوں، یا تو اپنے افراد واپس لے لو یا مال واپس لے لو، ان میں سے ایک، احدی الطائفتین کو منتخب کر لو، وہ میں واپس کروا سکتا ہوں، دونوں چیزیں اب مشکل ہیں، کہ ان کو بالکل ہی خالی کر دوں اور ان کے پاس کچھ بھی نہ رہے، ایسا مشکل ہے، اس میں ان کی بھی دل شکنی ہوگی، ایک چیز میں واپس کروادُوں، منتخب کر لو کہ ان دونوں میں سے کون سی چیز لینی ہے۔ وہ کہنے لگے یا رسول اللہ! ہمارے افراد چھوڑ دیے جائیں، یہ مرد و عورت جو گرفتار کر لیے گئے جن کو غلام باندیاں بنالیا گیا ہے یہ چھوڑ دیے جائیں۔ تو سرورِ کائنات ﷺ نے لوگوں کو اکٹھا کر کے خطبہ دیا، اس خطبے کے اندر ترغیب دی، کہ دیکھو! تمہارے بھائی ہیں، مسلمان ہو کے آگئے ہیں، اور میں پہلے ان کا انتظار کرتا رہا، یہ نہیں آئے، دیر سے پہنچے ہیں، اب مجھ سے آکے انہوں نے مطالبہ کیا ہے کہ ہمارا مال بھی واپس کر دیا جائے اور ہمارے افراد بھی واپس کر دیے جائیں، تو میں نے ان سے کہا ہے کہ میں ایک چیز واپس کروادُوں گا، جو تمہیں پسند ہو، اور انہوں نے افراد منتخب کر لیے ہیں، اب میرا ارادہ ان کے افراد واپس کرنے کا ہے، اس لیے جن لوگوں میں وہ تقسیم ہوئے ہیں، میں اُن سے کہتا ہوں کہ اگر تو وہ خوشی کے ساتھ چھوڑ دیں تو اُن کی مرضی ہے، اور اگر وہ یہ چاہتے ہیں کہ ہم نہیں چھوڑتے بلکہ ہم معاوضہ لے کے چھوڑیں گے، تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ جب کوئی دوسرا موقع ہوگا، اللہ تعالیٰ کوئی مالِ فَیْ ہمیں عطا کرے گا، تو میں اُس کا معاوضہ ادا کروں گا، کوئی معاوضہ سے دینا چاہتا ہے تو معاوضہ سے دے دے، خوشی سے دینا چاہتا ہے تو خوشی سے دے دے، میں نے ان سے وعدہ کر لیا ہے کہ ان کے افراد واپس کر دُوں گا۔ جب رسول اللہ ﷺ نے یہ اعلان فرمایا تو مختلف جگہوں سے آوازیں بلند ہوئیں، کہ یا رسول اللہ! ہم نے خوشی سے چھوڑا، ہم نے خوشی سے چھوڑا۔ لیکن آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس طرح سے ہمیں نہیں پتا چلتا، کہ کون خوشی سے چھوڑ رہا ہے، اور کون چھوڑنا نہیں چاہتا؟ (جیسے ہمارے قائدِ عوام [بھٹو] کی عادت تھی کہ جو کام کرنا ہوا، ایک مجمع لگالیا، جیسے جب بنگلہ دیش کو الگ کرنا تھا، مجیب کو چھوڑنا تھا تو کراچی میں جلسہ کر لیا، اور کہتا ہے دیکھو! یہاں پنجابی بھی ہیں، سندھی بھی ہیں، بلوچی بھی ہیں اور پٹھان بھی ہیں، یہ سارے ملک کا نمائندہ اجلاس ہے۔ تو کیا تم اجازت دیتے ہو، میں یوں کر لوں؟ اور بعض لوگ اس قسم کے ہوتے ہیں، کہ ہاں جی! ضرور کر لیجئے، تو کہہ دیا کہ چلو! بس یہ ٹھیک ہے، ساری قوم کی مرضی یہی ہے، چند ہاتھ اُٹھوائے اور ساری قوم پر فیصلہ مسلط کر دیا)

لیکن رسول اللہ ﷺ تو ہر بات کو میزانِ عدل پہ تولتے تھے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس طرح ہمیں نہیں پتا چلتا کہ کون خوشی سے چھوڑ رہا ہے، کون خوشی سے نہیں چھوڑ رہا، کیونکہ بعض لوگ چپ بھی رہ سکتے ہیں، اور بعض دوسروں کو دیکھا دیکھی طبعی ناگواری کے باوجود ہاتھ اُٹھا سکتے ہیں، جس طرح سے واعظ لوگ آپ کے ہاتھ اُٹھواتے ہیں، تو اگرچہ ان کا فیصلہ آپ کی مرضی کے خلاف ہی ہو، لیکن دیکھا دیکھی ہاتھ آپ بھی اُٹھا دیتے ہیں، کتنے موقع جلسوں کے ایسے آتے ہیں کہ آپ مسجد میں بیٹھ کے ان کے کہنے پر ہاتھ اُٹھا اُٹھا کے وعدے کر کر آتے ہیں، اور وہاں سے نکلتے ہی ان سب کو بھول جاتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے اس طرح نہیں کیا کہ قوم کے چند افراد کے ہاتھ اُٹھوا لیے یا چند افراد کی آواز سُن لی تو کہہ دیا کہ ہاں یہ ساری قوم کا فیصلہ ہے۔ فرمایا: نہیں، اپنی اپنی جگہوں پہ واپس جاؤ، اور تمہارے سردار فرداً فرداً سب کی مرضی معلوم کریں، اور بعد میں آ کے مجھے بتائیں کہ کیا لوگ خوشی سے چھوڑ رہے ہیں، یا کوئی معاوضہ لینے پر بھی آمادہ ہے۔ تو لوگ گئے اور ہر قبیلے کے جو عریف اور سردار تھے، انہوں نے آ کر بتایا کہ یارسول اللہ! سب لوگ خوشی کے چھوڑتے ہیں، تو آپ ﷺ نے اعلان فرما دیا، اور بنو ثقیف اور بنو ہوازن کے جتنے قیدی تھے وہ سارے کے سارے رہا کر دیے گئے، یعنی حضور ﷺ نے جب تقسیم کر کے اُن کی ملکیت میں دے دیا تو پھر اُن کی ملکیت کو حاکمانہ انداز میں سلب نہیں کیا، چاہے مصلحت اسی میں سمجھی کہ یہ واپس کرنے ہیں، لیکن پھر بھی زبردستی نہیں کی، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شخصی ملکیت قائم ہونے کے بعد شریعت میں اس کا کتنا احترام ہے۔ ان کو خوش کر کے پھر ان سے چیز لے کر واپس کی، تو زبردستی کسی کے املاک پر قبضہ کر لینا چاہے کتنی ہی مصلحت کیوں نہ ہو یہ مناسب نہیں ہے، اور یہ واقعہ یہی بتاتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بھی باوجود اس بات کے کہ مصلحت اسی میں سمجھی کہ چھوڑ دیے جائیں، لیکن جب تک سب کو خوش نہیں کر لیا اُس وقت تک واپس نہیں لیے۔ اعلان یہ تھا کہ خوشی سے دے دو، اور اگر کوئی خوشی سے نہیں دینا چاہتا تو ہم وعدہ کرتے ہیں کہ اس کو معاوضہ ادا کریں گے۔

واقعۂ حنین بیان کرنے کا مقصد

بہرحال اس میں اللہ تبارک وتعالیٰ کی نصرت چونکہ نمایاں ہوئی، کہ پہلے شکست ہوئی تھی، پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے نصرت آئی اور فتح پائی۔ تو وہ واقعہ یاد دلا کے مسلمانوں کو اس بات پر تنبیہ کرنا مقصود ہے، کہ تمہارا اعتماد اللہ کی نصرت پر ہونا چاہیے، ظاہری اسباب پر نظر نہ رکھا کرو، اگر اللہ تعالیٰ تمہاری نصرت اور مدد کرے گا، تو کوئی تم پر غالب آنے والا نہیں اِنْ يَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ، اگر اللہ تمہاری مدد کرے تو تم پر کوئی غالب آنے والا نہیں، وَاِنْ يَّخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِيْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِهٖ (سورۂ آل عمران: ۱۶۰) اگر وہی تمہاری مدد چھوڑ دے، تو پھر کون ہے جو اس کے بغیر تمہاری مدد کرے گا؟ اس لیے اسباب پر نظر رکھنے کی بجائے اللہ تعالیٰ کی نصرت پر نظر رہنی چاہیے، یہ واقعہ یہاں اس لیے یاد دلایا جا رہا ہے۔ لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِيْ مَوَاطِنَ كَثِيْرَةٍ: اللہ تعالیٰ نے بہت ساری جگہوں میں تمہاری مدد کی ہے، اور خصوصیت کے ساتھ حنین کے دِن بھی، اور یہ واقعہ کب پیش آیا تھا؟ جبکہ تم اپنی کثرت پہ خوش ہونے لگ گئے تھے، تمہاری کثرت نے تمہیں خوشی میں ڈال دیا، عجب میں ڈال دیا، خود پسندی میں ڈال دیا، پھر وہ کثرت تمہارے کچھ کام نہ آئی، اور زمین تم پر تنگ ہوگئی باوجود کشادہ ہونے کے، اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جب افراتفری میں انسان بھاگتا ہے تو

چھپنے کی جگہ نہیں ملتی، حالانکہ زمین اتنی کشادہ ہے، لیکن پتا نہیں چلتا کہ انسان کدھر جائے، ایسے ہوتا ہے جیسے راستہ ہی نہیں ملتا، کوئی چھپنے کی جگہ نہیں ملتی۔ ''کشادگی کے باوجود زمین تنگ معلوم ہونے لگ گئی اور تم پیٹھ پھیر کے بھاگ گئے، پھر اللہ نے اپنا اطمینان اُتارا اپنے رسول پر اور مؤمنین پر، اور ایسے لشکر اُتارے جن کو تم نے نہیں دیکھا'' اس کا مصداق فرشتے ہیں، جو اللہ تعالیٰ نے نصرت کے طور پر اُتارے۔ ''اور عذاب دیا اللہ نے اُن لوگوں کو جنہوں نے کُفر کیا، اور کافروں کا یہی بدلہ ہے'' وَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ، اُن کا یہی بدلہ ہے کہ ان کو دُنیا میں بھی رُسوا کیا جاتا ہے، اور آخرت میں تو ہوگا جو کچھ ہوگا۔ ''پھر اللہ تعالیٰ توجہ فرمائے گا'' یہ مضارع کے ساتھ ذکر کردیا، اصل میں مفہوم ماضی کا ہے، کیونکہ اس کے بعد اکثر و بیشتر لوگ مسلمان ہوگئے تھے۔ ''پھر اللہ توجہ فرماتا ہے اس کے بعد جس پہ چاہتا ہے، اور اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے'' یعنی اس کے بعد کہ کافروں کو سزا ہوئی، شکست کھا گئے، پکڑے گئے، قتل ہوئے، گرفتار ہوئے، اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے جس پہ چاہا توجہ فرمائی، یعنی اُس کو ایمان کی توفیق دے دی۔ اللہ غفور رحیم ہے۔

حرمِ مکہ میں مشرکوں کے داخلے کی ممانعت

یہ بات بھی آپ کے سامنے تفصیل سے عرض کردی گئی تھی، کہ یہ غزوہ آٹھ ہجری شوال میں پیش آیا ہے۔ رمضان المبارک میں مکہ معظمہ فتح ہوا، اور شوال کے اندر یہ غزوہ حنین پیش آیا ہے، اور اس کے متصل ہی چھوٹے چھوٹے غزوات پیش آئے ہیں، کیونکہ جب یہ میدان چھوڑ کے بھاگے، کوئی پارٹی کدھر کو نکل گئی اور کوئی کدھر کو نکل گئی، تو حضور ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی مختلف جماعتیں ان کے پیچھے لگادی تھیں، اس لیے غزوۂ اوطاس اور غزوۂ طائف سب اسی کے ساتھ ہی تعلق رکھتے ہیں، اوطاس میں تھوڑا سا مقابلہ ہوا، پھر یہ جا کے طائف کے قلعوں میں محصور ہوگئے تھے، وہاں بھی آپ نے کچھ دن محاصرہ رکھا ہے، لیکن پھر ایسے ہی چھوڑ کے آگئے تھے، اُن کا پیچھا اس طرح نہیں کیا کہ بالکل ان کو نیست و نابود کردیا ہو، بہرحال اُن کے قدم اکھڑ گئے، فیصلہ کن شکست ہوگئی، طائف کا محاصرہ چند دِن تک آپ نے باقی رکھا ہے، لیکن وہ طول پکڑ رہا تھا، چونکہ ان کے قلعے بہت بڑے بڑے تھے، تو اس لیے آپ اسی طرح سے چھوڑ کر واپس آگئے تھے، تو یہ سارے چھوٹے چھوٹے غزوات اسی سفر میں پیش آئے ہیں، پھر آپ ﷺ واپس تشریف لے گئے تھے۔ تو آٹھ ہجری کا حج بالاہتمام نہیں ہوا، اس میں اسی طرح سے چھٹی تھی جس طرح مشرکین آتے تھے اور آ کے ننگے طواف کرتے تھے، جو کچھ تھا اسی طرح سے آزادی رہی، اگلا سن نو ہجری کا آگیا، تو نو ہجری کے حج میں رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو اُمیر بنا کے بھیجا تھا، اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ساتھ بھیجا تھا، اور اس وقت اعلان کردیا تھا کہ آئندہ کے لیے مشرکین کا داخلہ بند ہے، نہ کوئی ننگا شخص طواف کرے اور نہ ہی آئندہ کوئی مشرک حج کرنے کے لیے آئے، اس سال کے بعد کوئی مشرک حج کے لیے نہ آئے۔ چنانچہ اس کے آس پاس ایام میں ہی حرمِ مکہ کُفار اور مشرکین سے بالکل صاف کردیا گیا تھا، جیسا کہ اسی سورت کے پہلے رکوع میں آپ کے سامنے تفصیل آئی ہے۔ اب اسی کے متعلق ہی ہدایات ہیں جو یہاں اللہ تعالیٰ نے دیں، يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا: اے ایمان والو! مشرک ناپاک ہیں، نجس ہیں۔ نجاست ان میں کس طرح سے ہے؟ ایک تو نجاست ظاہری ہوتی ہے، جیسے کوئی شخص پیشاب سے آلودہ ہے، پاخانہ سے آلودہ ہے، یہ ظاہری نجاست بھی ایک نجاست ہے، ایک نجاست معنوی ہوتی ہے

جس کو آپ ''حدث'' کے ساتھ تعبیر کرتے ہیں، جیسے جنبی ہے، جنابت کی حالت ہے، یہ بھی ایک نجاست ہوتی ہے۔ اور ایک نجاست معنوی ہے جس کو آپ ''خباثتِ طبعی'' سے تعبیر کرتے ہیں، جیسے عقائدِ فاسدہ یعنی بُرے عقیدے دِل کے اندر چھپا رکھے ہوں، تو یہ بھی نجاست ہے۔ تو مشرکوں کے اندر تینوں نجاستوں کا ہی احتمال ہے، جیسے شراب وغیرہ کے ساتھ ان کا اختلاط تھا تو ظاہری بدن بھی ان کا پاک نہیں ہوسکتا، پیشاب وغیرہ سے احتیاط نہیں کرتے، اور حدث بھی ہوسکتا ہے کہ جنبی ہونے کی حالت میں غسل نہیں کرتے، اور عقائدِ فاسدہ بھی مراد ہوسکتے ہیں۔ لیکن ظاہری بدن ناپاک ہونے کی صورت میں مسجد میں نہ آئیں، یا حدیث کی صورت میں مسجد میں نہ آئیں، یہ حکم ایسا نہیں کہ جو صرف مشرکوں کے ساتھ ہی خاص ہو، یہ حکم مسلمانوں کے متعلق بھی ہے، کہ اگر اُن کا بدن پاک نہیں یا اُن کو حدث ہے تو ایسی صورت میں وہ مسجد میں نہیں آسکتے، جیسے حائضہ عورت نہیں آسکتی، جنبی آدمی نہیں آسکتا، یہ حدث کی حالت ہے، اور ظاہری بدن ناپاک ہو تو بھی مسجد میں نہیں آنا چاہیے، مسجد میں آنا ممنوع ہے۔

حرمین اور عام مساجد میں دُخولِ کُفّار کے متعلق اَئمہ اَربعہ کا مسلک

یہاں جس قسم کی نجاست اُن کے متعلق ذکر کی جارہی ہے، جس کی وجہ سے کہا جارہا ہے کہ یہ مسجدِ حرام کے قریب نہ آئیں، یہ اُن کے عقائدِ فاسدہ ہیں، اور قریب نہ آئیں کا مطلب یہ ہے کہ عبادت کرنے کے لیے نہ آئیں، ان کو مسجدِ حرام میں اب عبادت کرنے کا حق نہ دیا جائے، ان کو حج کرنے اور طواف کرنے کی اجازت نہ دی جائے، اَحناف کے ہاں اس کی مراد یہی ہے، اس لیے اگر کوئی کافر ظاہری طور پر صاف ستھرا ہے، نہا کے آیا ہے، صاف ستھرے کپڑے اس نے پہنے ہوئے ہیں، تو کسی مصلحت کے تحت اُس کو مسجد میں بٹھا دیا جائے، یا مسجد میں داخلے کی اجازت دے دی تو یہ اَحناف کے مسلک کے خلاف نہیں ہے۔ چنانچہ یہی وفد ہوازن جو آیا تھا رسول اللہ ﷺ کے سامنے اطاعت کا اظہار کرنے کے لیے، غالباً اس موقع پر یا کسی دوسرے موقع پر رسول اللہ ﷺ نے اُن کو مسجد میں ٹھہرایا۔ اور مدینہ منورہ میں بھی ثمامہ بن اُثال ایک مشرک تھا جو پکڑا گیا تھا، صحابہ اس کو پکڑ کر لے آئے تھے، یمامہ کے علاقے کا رہنے والا تھا، اُس کو لا کے مسجد میں باندھا گیا تھا، یہ آپ کے سامنے حدیث شریف میں آئے گا۔(۱) اسی طرح جو وفود آتے تھے، چاہے انہوں نے ابھی تک ایمان قبول نہ کیا ہو، اکثر و بیشتر حضور ﷺ انہیں مسجد میں ہی ٹھہراتے تھے۔ تو ہمارے ہاں کافر کا داخلہ مسجد میں مطلقاً ممنوع نہیں ہے، کسی مصلحت کے تحت اگر اس کو بلا لیا جائے اور مسجد میں بٹھا لیا جائے تو یہ جائز ہے، لیکن کافر کو مسجد میں عبادت کرنے اور شرکیہ رُسوم کی ادائیگی کی اجازت نہیں دی جائے گی، اس لیے حرم میں کُفّار کا داخلہ اَحناف کے نزدیک جائز ہے، لیکن بطورِ غلبہ کے نہیں، اور برائے عبادت نہیں، اور دنیا کی باقی مساجد کا بھی یہی حکم ہے۔ لیکن باقی ائمہ میں سے امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک تو ساری دُنیا کا مسئلہ ایک ہی ہے، کہ کسی کافر کو مسجد میں داخل ہونے کی اجازت نہیں ہونی چاہیے،

---

(۱) بخاری ۱/۶۶، باب الاغتسال الخ۔ مسلم ۲/۹۳، باب ربط الاسیر الخ/ مشکوۃ ۲/ ۳۴۳، باب حکم الاسراء۔ نوٹ: ثمامہ اسی موقع پر مسلمان ہوگئے تھے رضی اللہ عنہ۔

چاہے وہ مسجدِ حرام ہے، چاہے مسجدِ نبوی ہے، چاہے کوئی اور مسجد ہے، کافر مسجد میں نہ آئے، مسلمانوں کو اس بات کا حکم ہے، مطلقاً ممانعت ہے کہ کافر کو اندر نہ آنے دیا جائے۔ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یہ حکم مسجدِ حرام کے متعلق ہے، اور مسجدِ حرام سے سارا حرم مراد ہے، اور اس میں کافر کا داخلہ ممنوع ہے، باقی مسجدوں کے متعلق یہ حکم نہیں، لیکن حرم کے بارے میں اُن کا مسلک یہی ہے کہ حرم کے اندر کافروں کے داخلہ کو مطلقاً روک دیا گیا ہے۔

اور موجودہ سعودی حکومت چونکہ حنبلی مسلک کی ہے، اس لیے وہ اسی مسلک پر ہی ہیں، کہ حرم کی حدود میں کسی کو آنے نہیں دیتے، جتنی سڑکیں باہر سے آتی ہیں، اُن سڑکوں پر حرم سے دو تین فرلانگ پیچھے بڑے بڑے بورڈ لگے ہوئے ہیں ''ممنوع دخول غیر المسلمین'' غیر مسلم کا داخلہ ممنوع ہے، اور یہ عبارت انگریزی میں بھی لکھی ہوئی ہے، بڑے بڑے بورڈ لگا کے حد بندی کر دی گئی، کہ اس سے آگے غیر مسلم نہ آئے، چوری چھپے اگر کوئی چلا جائے اور اُن کو پتا چل جائے تو وہ گرفتار کر لیں گے، اس لیے مرزائی اگر چلا جائے اور اُن کو پتا چل جائے کہ یہ مرزائی ہے تو اُس کو گرفتار کر لیتے ہیں۔ اور اردگرد پھرنے کے لیے اُن کی علیحدہ سڑکیں بنا دی گئیں، چنانچہ یہ غیر مسلم طائف جانے کے لیے مکہ معظمہ کا راستہ استعمال نہیں کر سکتے، چونکہ غیر مسلم سعودیہ میں ہیں تو سہی، کام وغیرہ کرتے ہیں، ان کے ٹھیکے ہیں، ان کی فرمیں ہیں، تو ان کو جدہ سے طائف جانے کے لئے سڑک حرم سے باہر باہر بنا دی ہے، کہ وہ آئیں تو ادھر سے طائف کی طرف نکل جائیں، مکہ معظمہ کے راستے سے نہیں جا سکتے، بلکہ جو سڑک غیر مسلموں کے لیے بنائی گئی ہے وہاں کے لوگ اس کو مزاحاً کافر روڈ کہتے ہیں، کیونکہ وہ قصداً کافروں کے لیے ہی بنائی گئی ہے، تا کہ اُن کا داخلہ حرم میں نہ ہو، بلکہ حرم سے باہر باہر چلے جایا کریں۔ تو وہ حرمِ مکہ میں بھی نہیں آنے دیتے، اور حرمِ مدینہ میں بھی نہیں آنے دیتے، وہاں بھی اسی طرح سڑکوں کے اردگرد بورڈ لگے ہوئے ہیں، جن میں یہ لکھا ہوا ہے کہ اس سے آگے غیر مسلم نہ آئے۔

بہرحال ہمارے ہاں اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کو بطور حج کرنے اور بطور عمرہ اور طواف کرنے کے ان کو مسجد کے قریب نہ آنے دیا جائے، یہ ناپاک لوگ ہیں، یہ گندے لوگ ہیں، اور یہاں گندگی سے عقائد کی گندگی مراد ہے، ظاہری اور حسی گندگی مراد نہیں، کیونکہ ضروری نہیں کہ مشرک ظاہر میں بھی گندا ہو، اور اگر ظاہر میں گندگی مراد ہو تو پھر ظاہری گندگی کے ساتھ تو مسلمان بھی مسجد میں نہیں آسکتا، اسی طرح حدث وغیرہ مراد ہو تو اس میں بھی مشرکین کی خصوصیت نہیں، مسلمان بھی محدث ہو تو اس کو بھی مسجد میں نہیں جانا چاہیے، اگر وہ جنابت کی حالت میں جائے گا تو حرام ہے، بے وضو ہونے کی حالت میں جائے گا تو مکروہ اور خلافِ اَولیٰ ہے۔ بہرحال جس وقت مسجد میں جائیں تو ظاہری بدن بھی پاک صاف ہونا چاہیے، اور معنوی حدث وغیرہ بھی زائل ہونا چاہیے۔ اس لیے ہمارے ہاں اس آیت کی مراد یہی ہے کہ جس طرح پہلے وہ آتے تھے، اُن کو تسلط حاصل تھا، حج کرنے کے لیے آتے تھے، عمرہ کرنے کے لیے آتے تھے، طواف کرنے کے لیے آتے تھے، اس لحاظ سے اُن کو قریب نہ آنے دیا جائے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ بعد میں سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طرح سے یہ اعلان فرمایا تھا، کسی کو چار مہینے مہلت دی، کسی کو کتنی مہلت دی، اس کے بعد پھر شرک اور

کفر کو اس علاقے سے ویسے ہی ختم کر دیا گیا۔ یہود و نصاریٰ کچھ آباد تھے، آپ کو اپنی زندگی میں ان کے خاتمے کا موقع نہیں ملا، تو جاتے ہوئے وصیت کر گئے تھے: ''أَخْرِجُوا الْيَهُوْدَ مِنْ جَزِيْرَةِ الْعَرَبِ'' جزیرۂ عرب سے یہود کو بھی نکال دینا۔[1] چنانچہ اس حکم پر عمل حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں بھی نہیں ہوا، کیونکہ آپ کا زمانہ تھوڑا تھا اور آپ داخلی فتنوں کے اندر ہی اُلجھے رہے، منکرینِ زکوٰۃ، مدعیانِ نبوت، اس قسم کے فتنے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ہوئے تو آپ کا زیادہ وقت انہی کے پیچھے گزر گیا۔ اس حکم پر عمل حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ہوا ہے، کہ جتنے یہود تھے خیبر اور اِردگرد، سب وہاں سے نکال دیے گئے، اور وہ شام کی طرف چلے گئے، پھر وہ علاقہ صاف ہو گیا، اس کا ذکر آپ کے سامنے پہلے رکوع میں آ گیا ہے۔

سوال:- شام جزیرہ عرب میں شمار نہیں ہوتا؟

جواب:- نہیں۔ شام اس وقت بھی دُوسرا ملک سمجھا جاتا تھا۔ اب اگرچہ اس کو عالمِ عرب کے اندر شامل کر لیا، اس وجہ سے کہ صحابہ کرام نے جب ان علاقوں کو فتح کیا، وہاں جا کے آباد ہو گئے تو اب ان علاقوں کی زبان بھی عربی ہے، یہ اس لحاظ سے عالمِ عرب کہلاتا ہے، ورنہ اس وقت عرب تقریباً اتنا ہی تھا جتنی کہ اب سعودی حکومت ہے، باقی ملک سارے علیحدہ شمار ہوتے تھے۔

کافروں کے داخلے پر پابندی کی صورت میں ایک اندیشہ اور اس کا حل

اے ایمان والو! مشرک ناپاک ہیں، مشرک سراپا ناپاک ہیں، فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ: یہ مسجدِ حرام کے پاس نہ آئیں، بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا: اپنے اس سال کے بعد۔ وَإِنْ خِفْتُمْ عَيْلَةً: اب جس وقت مشرک قوموں کا داخلہ ممنوع قرار دیا گیا، تو ایک اِشکال سامنے آتا تھا کہ مکہ معظمہ والوں کا تو گزران ہی تجارت پر ہے، اور باہر کی قومیں جو تجارت کے لیے آتی ہیں وہ ساری کافر اور مشرک ہیں، وہ حج کے بہانے سے آتے تھے، سامان لاتے تھے، حج بھی کرتے تھے، اور خرید و فروخت بھی کرتے تھے، اس طرح اہلِ مکہ کا گزارہ ہوتا تھا، اب جس وقت اُن کو حج اور عمرہ کرنے کی ممانعت ہو جائے گی، تو پہلے کی طرح نہیں آئیں گے، جب نہیں آئیں گے تو خرید و فروخت بھی نہیں ہوگی، یہ تو معاشی مشکلات پیدا ہو جائیں گی، اگر کسی جگہ تجارتی قوموں کو روک دیا جائے کہ کوئی خرید و فروخت کے لئے نہ آئے، جس شہر کا گزارہ ہی تجارت پر ہے، تو یہ تو ان کو نقصان پہنچے گا، یہ لوگ معاشی تنگی کے اندر مبتلا ہو جائیں گے یہ ایک اندیشہ ہو سکتا تھا، جس کو اگلے الفاظ میں زائل کر دیا گیا، کہ اگر تمہیں احتیاج کا اندیشہ ہے کہ تم محتاج ہو جاؤ گے اور تجارت بند ہو جائے گی، تو یاد رکھو! اللہ تعالیٰ تمہیں اپنے فضل سے غنی کر دے گا اگر چاہے گا، اللہ کی مشیت ہوگی تو تمہیں غنی کر دے گا، چنانچہ ایسے ہی ہوا کہ وہی تاجر قومیں جن کے متعلق اُن کا خیال تھا کہ اگر ان کا داخلہ بند ہو گیا، حج عمرہ کے لئے یہ لوگ نہیں آئیں گے، خرید و فروخت کس طرح سے ہوگی، اللہ تعالیٰ نے اُن سب کو مسلمان کر دیا، وہ بھی مسلمان ہو گئے، جب وہ مسلمان ہو گئے تو اب مسلمان ہی تجارت کرتے ہیں، اور اتنی وسعت سے کرتے ہیں کہ پہلے سے بھی زیادہ خوش حالی ہو گئی، جیسے آج موجودہ دور ہے کہ اب بھی مکہ معظمہ کی خوش حالی تجارت کی وجہ سے ہی ہے، اور اب مسلمان آتے ہیں اور خرید و فروخت وسعت کے ساتھ ہوتی ہے، اہلِ مکہ

---

(۱) معجم کبیر طبرانی ۲۳/ ۲۶۵، احادیث أم سلمة بعنوان يزيد بن أبي حبيب عن أبي سلمة عن أم سلمة۔

کے لیے اللہ تعالیٰ نے رزق کی کشادگی اتنی کر دی جس کا حد حساب ہی کوئی نہیں۔ "قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں اپنے فضل سے غنی کر دے گا اگر چاہے گا، بے شک اللہ تعالیٰ علم والا ہے حکمت والا ہے۔"

فتح مکہ وخیبر کے بعد مشرکین اور اہلِ کتاب کے لیے قانون

قَاتِلُوا الَّذِیۡنَ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰهِ سے لے کر فَذُوۡقُوۡا مَا كُنۡتُمۡ تَكۡنِزُوۡنَ تک اَحکام اہلِ کتاب کے متعلق ہیں۔ پیچھے مشرکین کے متعلق ہدایات دے دی گئیں، اور یہاں سے اہلِ کتاب کا ذکر شروع ہو رہا ہے، سرورِ کائنات ﷺ جب مدینہ منورہ میں تشریف لے گئے ہیں، تو اردگرد یہود کے قبائل آباد تھے جس کی تفصیل آپ کے سامنے متعدد بار آ چکی، اُن کے ساتھ معاہدے ہوئے، ٹوٹے، اختلافات ہوئے، آخر یہود کے قبائل میں سے کچھ قبیلے لڑائی کے اندر مارے گئے، قتل کیے گئے، اور کچھ جلا وطن ہو گئے، جلاوطن ہونے والے خیبر کے علاقے میں جا کر آباد ہو گئے تھے، صلحِ حدیبیہ کے بعد پھر سرورِ کائنات ﷺ نے خیبر کو فتح کیا۔ تو مکہ معظمہ کے فتح ہونے کے بعد مشرکین کے متعلق تو یہ اعلانات آ گئے، جس کا حاصل یہ تھا کہ اس علاقے کو ان سے صاف کر لیا جائے، آئندہ کے لئے یہاں کسی مشرک کے آنے جانے کی گنجائش نہیں ہے، اور مشرکینِ مکہ کے متعلق دو ہی صورتیں سامنے رکھی گئی تھیں یا اسلام یا تلوار، اور تیسری شق یہ تھی کہ اس علاقے کو چھوڑ کے جانا چاہیں تو چھوڑ جائیں، وہاں رہتے ہوئے مشرک کا وجود گوارا نہیں، البتہ عرب کے لوگ جو اہلِ کتاب تھے ان کے متعلق اتنی سی گنجائش رکھی گئی کہ اگر وہ جزیہ دینا قبول کر لیں، اسلامی حکومت کو قبول کر لیں، اُن کے ماتحت رہنا گوارا کر لیں، مزاحمت چھوڑ دیں تو اُن کے لیے گنجائش تھی کہ وہ وہاں رہ سکتے ہیں، ان آیات کے اندر ذکر صرف اہلِ کتاب سے جزیہ لینے کا ہے۔

مشرکینِ عرب کے علاوہ باقی تمام کُفّار سے جزیہ لیا جا سکتا ہے

"جزیہ" کا لفظی معنی بدلہ ہے، اور اس کا مصداق کچھ رقم ہے جو اہلِ کتاب سے لی جاتی تھی ان کے جان مال اور عزّت کے تحفظ کے بدلہ میں، قرآنِ کریم میں غیر اہلِ کتاب سے جزیہ لینے کا ذکر نہیں ہے، لیکن روایاتِ حدیث سے ثابت ہے کہ سرورِ کائنات ﷺ نے بعض علاقوں کے مجوسیوں سے بھی جزیہ لیا ہے، جیسے ہجر کے علاقے کے مجوسیوں سے جزیہ لیا،[1] اس لیے صحابہ کرام ؓ نے مشرکینِ عرب کے علاوہ باقی دوسری جگہوں کے مشرکوں سے اور دوسرے کافروں سے بھی جزیہ لیا ہے اور جزیہ کی گنجائش رکھی ہے۔ تو اَب اَئمۂ اَربعہ کے نزدیک متفق علیہ مسئلہ ہے کہ اہلِ کتاب ہوں یا کسی دوسرے مسلک سے تعلق رکھنے والے کافر ہوں، اگر وہ مسلمانوں کی حکومت کو قبول کر لیں اور اُن کے ماتحت رہنا گوارا کر لیں تو اُن سے جزیہ لیا جا سکتا ہے، اور نزولِ قرآن کے وقت چونکہ مسلمانوں کا تصادم اہلِ کتاب سے ہی تھا، مشرکینِ مکہ کا تو فیصلہ ہو گیا، اس لیے خصوصیت کے ساتھ یہاں تذکرہ اہلِ کتاب کا ہے۔ قَاتِلُوا الَّذِیۡنَ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَلَا یُحَرِّمُوۡنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوۡلُهٗ وَلَا یَدِیۡنُوۡنَ دِیۡنَ الۡحَقِّ مِنَ الَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡكِتٰبَ۔

---

(۱) بخاری ۱/۴۴۷ باب الجزیۃ/مشکوٰۃ ۲/۳۵۳ باب الجزیۃ کی پہلی حدیث۔

اہلِ کتاب اور مشرکینِ مکہ سے بنیادی اختلاف

ان آیات کا ترجمہ کل آپ کے سامنے ہو چکا۔ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ یہ پچھلے الَّذِيْنَ کا بیان ہے۔ ''جو لوگ کتاب دیے گئے ان سے لڑو، ان کا حال یہ ہے کہ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ نہ یہ اللہ پہ ایمان لاتے ہیں نہ یوم آخر پہ ایمان لاتے ہیں، نہ اللہ اور اللہ کے رسول کی حرام ٹھہرائی ہوئی چیزوں کو حرام ٹھہراتے ہیں، نہ دینِ حق کو قبول کرتے ہیں، یہ اہلِ کتاب کے متعلق تذکرہ ہوا کہ ایسے اہلِ کتاب سے لڑو، بظاہر اہلِ کتاب اللہ کو مانتے تھے، اور یومِ آخر پر بھی اُن کا ایمان تھا، کیونکہ یہود ہوں یا نصاریٰ، دینِ سماوی چونکہ توحید پر زور دیتا ہے، آخرت کا عقیدہ بھی پیش کرتا ہے، تو اہلِ کتاب کا عقیدہ اللہ تعالیٰ کے متعلق بھی تھا، اور آخرت کے متعلق بھی تھا، اِرسالِ رُسل کے، رسالت کے بھی وہ قائل تھے، توحید، رسالت اور معاد اُن کے عقیدوں میں شامل ہے، اُن کے ساتھ اگر بنیادی طور پر اختلاف تھا تو سرورِ کائنات ﷺ کی نبوّت اور رسالت کے تسلیم کرنے کے متعلق تھا، اس لیے یہود کو جب دعوت دی گئی تو یہی دعوت دی گئی کہ سرورِ کائنات ﷺ کو رسول تسلیم کریں، نصاریٰ کو تو دعوت دی گئی تو یہی دی گئی، روایاتِ حدیث سے جس طرح معلوم ہوتا ہے۔ مشرکینِ مکہ سے بنیادی اختلاف توحید کا تھا، اس لیے وہاں زیادہ تر زور توحید پہ دیا گیا ہے اور مدینہ منورہ میں مخاطب چونکہ اہلِ کتاب تھے، اور وہ توحید کے مدّعی تھے، ''لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ موسیٰ کلیم اللہ'' کہتے تھے، ''لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ عیسیٰ روح اللہ'' کہتے تھے، وہ ''لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ'' کے قائل تھے، وہاں زیادہ تر مسئلہ رسالت کا آیا ہے کہ وہ حضور ﷺ کو رسول مانیں۔ تو اس آیت میں کہا جا رہا ہے کہ ان کا نہ اللہ پر ایمان ہے اور نہ یوم آخر پر، جس سے یہ ثابت ہو گیا کہ سرورِ کائنات ﷺ کے تشریف لے آنے کے بعد اگر کوئی شخص اللہ اور یومِ آخر کو ماننے کے لیے رسول اللہ ﷺ کا واسطہ اختیار نہیں کرتا، تو نہ اس کا اللہ کو ماننا معتبر، نہ یومِ آخر کو ماننا معتبر۔ اللہ کو اس طرح سے مانا جائے جس طرح سے سرورِ کائنات ﷺ بیان فرماتے ہیں تو ہی ایمان باللہ معتبر ہے، اور آخرت پر ایمان اسی طرح رکھا جائے جس طرح سے رسول اللہ ﷺ کہتے ہیں تو ہی ایمان بالآخرت معتبر ہے۔ اب وہ اللہ کے قائل تھے، توحید کے مدّعی تھے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے عقیدے ایسے اختیار کر لیے کہ جن کے اندر شرک شامل ہو گیا، جیسے اگلی آیت میں آئے گا کہ انہوں نے عُزیر کو اِبن اللہ کہا، یا کسی نے مسیح کو اِبن اللہ کہا، تو اِبنیت اور اس قسم کے عقیدے اختیار کرنے کے ساتھ اُن کی توحید بے معنی ہو کے رہ گئی، اس لیے اُن کی توحید معتبر نہیں، اور ان کا اللہ پر ایمان لانا معتبر نہیں ہے۔ آخرت کے متعلق وہ قول کرتے تھے کہ آخرت آئے گی، قیامت آئے گی، اٹھنا ہے، اللہ کے سامنے حساب کے لیے پیش ہونا ہے، لیکن ساتھ ہی انہوں نے نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ (سورۂ مائدہ:۱۸) کا عقیدہ بھی بنا لیا، اور کہتے تھے: سَيُغْفَرُ لَنَا (سورۂ اعراف:۱۶۹) کہ ہمارے لیے تو مغفرت ہے ہی ہے، چونکہ ہم مقبولین کی اولاد ہیں، انبیاء کی اولاد ہیں، ہم تو بخشے ہی جائیں گے، اس قسم کے عقیدے نے اُن کا ایمان بالآخرت بھی بے حقیقت کر دیا، تو سرورِ کائنات ﷺ نے آ کے توحید کو نکھارا، اور آخرت کا صحیح مفہوم واضح کیا، تو اب اللہ اور آخرت پر ایمان وہی معتبر ہے جو سرورِ کائنات ﷺ کے بیان کے مطابق ہوگا، اس لیے اگر یہ زبان سے ''لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ'' کہیں بھی تو ان کا کوئی اعتبار نہیں، آخرت کے عقیدے کا اظہار کریں بھی تو ان کے اس عقیدے کا کوئی اعتبار نہیں۔ اور اگلی

بات تو صاف ہے کہ اللہ کی حرام ٹھہرائی ہوئی چیزوں کو یہ حرام نہیں ٹھہراتے، بلکہ بہت ساری چیزوں کو انہوں نے اپنے لیے حلال کر لیا، حالانکہ اللہ کی طرف سے ان کی حرمت کا بیان ہے، اور بعض چیزیں ایسی ہیں جن کو اللہ نے حلال ٹھہرایا اور ان کو یہ حرام سمجھتے ہیں، تو یہ اللہ کے احکام بھی تسلیم نہیں کرتے، دینِ حق کو قبول نہیں کرتے، تو جب یہ ساری باتیں اُن کے اندر پائی گئیں، تو اب ان کو یہ حق نہیں ہے کہ اپنے لیے علمی سیادت اور امامت کا دعویٰ کریں، جس طرح سے پہلے سے علمی قیادت انہی کے ہاتھ میں تھی، اب ان کی وہ قیادت منسوخ کر دی گئی، اب ان کا دور ختم ہو گیا، اب ان کا حکم بھی باقی کفار کی طرح ہی ہے، لیکن صرف اتنی رعایت رکھی گئی کہ اگر یہ جزیہ دے دیں اور مسلمانوں کا غلبہ تسلیم کر کے ماتحتی قبول کر لیں تو ان کو زندہ رہنے کا حق ہے۔ یہ حَتّٰى جو ہے یہ قَاتِلُوا کی غایت ہے۔ قَاتِلُوا حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ ان کے ساتھ اس حد تک لڑائی لڑو، اس وقت تک ان کے ساتھ لڑائی جاری رکھو جب تک کہ وہ جزیہ نہ دے دیں۔ حتی کا مابعد جو مضارع ہے اس کا ترجمہ محاورۃً نفی سے کر دیا جاتا ہے، یہ قاعدہ کئی دفعہ آپ کو سمجھایا گیا۔ ''جب تک کہ جزیہ نہ دے دیں''۔ عَنْ يَّدٍ: عَنْ سببیہ ہے۔ ید: غلبہ۔ یعنی جب تک مسلمانوں کے غلبہ کے سبب سے جزیہ نہ دے دیں اُس وقت تک ان کے ساتھ لڑائی جاری رکھو، وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ: اور اس حال میں کہ وہ مسلمانوں کے سامنے ذلیل ہو جائیں، ذلیل ہونے کا مطلب یہ ہے کہ تابع ہو جائیں، مطیع ہو جائیں، مسلمانوں کے آئین اور قانون کو قبول کر لیں، ماتحتی قبول کر لیں، ایسے طور پر اگر جزیہ دینے لگ جائیں تو بھی ان کے ساتھ لڑائی کو بند کیا جا سکتا ہے۔

عُزیر علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق اِبنیت کے عقیدے کا پس منظر

اب یہ جو آیا تھا کہ ان کا اللہ پر ایمان نہیں، تو اُس کی یہ وضاحت ہے وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ ابْنُ اللّٰهِ یہود کہتے ہیں کہ عُزیر اللہ کا بیٹا ہے، اللہ کے لیے ابنیت کا قول کر دیا، اور بیٹا ہر لحاظ سے باپ کا ہم جنس ہوتا ہے، باپ کی صفات اُس کے لیے ثابت ہوتی ہیں، تو اس کا نتیجہ یہ ہے کہ عُزیر علیہ السلام کے لیے بھی الوہیت ثابت ہو گئی، اللہ کی صفت جو مختص ہے وہ بیٹے کے لیے بھی ثابت ہو گئی، کیونکہ بیٹا باپ کا ہم جنس ہوتا ہے، تو جب انہوں نے ابنیت کا قول کر لیا، تو ان کی توحید کہاں رہی، اور ان کا اللہ کو ماننا کیسے معتبر رہا؟ حضرت عُزیر علیہ السلام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے تقریباً ساڑھے چار سو یا پانچ سو سال پہلے گزرے ہیں، اور ان کا زمانہ اہلِ کتاب کی انتہائی مظلومیت کا زمانہ ہے، بخت نصر جو کہ عراق کا بادشاہ تھا، اُس نے اہلِ کتاب کو بہت زیادہ اُجاڑا، قتل کیا، جس کا ذکر سورۂ بنی اسرائیل کے پہلے رکوع میں آئے گا، اس کے حملوں کی تفصیل آئے گی، کہ انہوں نے کس طرح سے مارا تھا اور قتل کیا تھا، اور کس طرح سے لوگوں کو گرفتار کر کے لے گئے تھے، اور مسجدِ اقصیٰ کو بھی برباد کر دیا تھا، اور اس کے حملوں میں توراۃ بھی اُس وقت تقریباً ناپید ہو گئی تھی، توراۃ کو بھی ضائع کر دیا گیا تھا، تو توراۃ کا وجود خارج میں نہیں تھا، اور حضرت عُزیر علیہ السلام اللہ کے پیغمبر ہیں، انہوں نے اپنی یادداشت کے ساتھ توراۃ کو ناپید ہونے کے بعد دوبارہ مرتب کیا ہے، اس لیے بعض مفسرین کا خیال یہ بھی ہے کہ ان کو جو ''ابن اللہ'' مشہور کیا گیا تھا، تو شاید اس کے پس منظر میں یہ بات ہو، تاکہ ان کی حیثیت کو عام انسانوں سے زیادہ کر کے اللہ کے ساتھ ان کا خاص رشتہ قائم کر کے توراۃ کی مقبولیت کو زوردار بنایا جا سکے، اور لوگوں کے دل دماغ کے اوپر زور ڈالا جا سکے کہ اگر توراۃ پہلے اللہ

نے اُتاری تھی اور وہ ہمارے ہاتھوں سے ضائع ہوگئی، تو اب یہ اللہ کے بیٹے کی مرتّب کی ہوئی ہے، تو اس کی حیثیت وہی ہے جو پہلے تھی۔ تو اس کی حقّانیت کو زیادہ ثابت کرنے کے لیے اور لوگوں کے دل دماغ پر رُعب ڈالنے کے لیے، گویا کہ مرتّب کے متعلق انہوں نے ''اِبن اللہ'' کا لفظ استعمال کیا، اور اس کے بعد جہالت کے زور سے وہ حقیقت میں بیٹا سمجھنے لگ گئے، مغالطے اسی طرح سے ہوا کرتے ہیں، کہ پہلے چاہے کسی اچھی مصلحت کے طور پر اور کسی اچھے نظریہ کے ساتھ ہی کوئی لفظ استعمال ہوا ہو، اور بعد میں اس کا مفہوم لوگوں کے درمیان خلط ملط ہو جاتا ہے۔ جیسے ہمارے مفسرین لکھتے ہیں کہ پُرانی کتابوں میں اللہ تعالیٰ کے لیے ''اَب'' کا لفظ استعمال ہوا ہے، لیکن اس کا مفہوم وہ نہیں جو باپ کا ہوتا ہے، اور ''اِبن'' کا لفظ اگر استعمال ہوا ہے تو اس کا وہ مفہوم نہیں جو ہمارے ہاں بیٹے کا ہوتا ہے، وہ اپنے اپنے زمانے کے محاورے ہیں۔ وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ ۨابْنُ اللّٰهِ: یہود نے کہا کہ عزیر اللہ کا بیٹا ہے، وَقَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ: نصاریٰ نے کہا کہ مسیح اللہ کا بیٹا ہے۔ تو یہود نے عُزیر علیہ السلام کے متعلق اِبن اللہ کا نظریہ وضع کیا، چاہے اس کی ابتدا کیسے ہوئی، اور اسی طرح سے نصاریٰ نے مسیح علیہ السلام کے متعلق ابنیت کا نظریہ وضع کیا، اُس کی بنیاد انہوں نے اس بات پر رکھی کہ جب خارج میں اُن کا باپ کوئی نہیں، تو اُن کی نسبت اللہ کی طرف قائم کر دی۔ بہر حال جس وقت اللہ کے متعلق یہ نظریہ قائم کر دیا کہ اللہ کی اولاد ہے، اللہ کا بیٹا ہے تو پھر توحید بے معنی ہوگئی، کیونکہ بیٹا باپ کا ہم جنس ہوتا ہے، تو اگر باپ کے لیے اُلوہیت ثابت ہے تو بیٹے کے لیے بھی اُلوہیت ثابت ہونی چاہیے، خلاف جنس اگر ثابت کریں گے تو یہ عیب ہے، ہم جنس اگر ہوگا تو اُس کے لیے بھی اُلوہیت ویسے ہوگی جیسے اللہ تعالیٰ کے لیے ہے، تو اولاد کا نظریہ اللہ کی طرف عیب کی نسبت ہے، جس طرح سے اللہ تعالیٰ آگے جا کر سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ کے اندر عیوب سے اپنی پاکی کو ذکر کریں گے، جس کے ساتھ ان کے نظریے کی تردید ہوتی ہے۔

ایک مسلمان ''بھڑبھونجے'' کے سامنے عیسائی پادری کی بے بسی

ہندوستان میں جس وقت انگریزوں کی حکومت آئی، اور ہندوستانیوں کو عیسائی بنانے کے لیے پادریوں کا سیلاب آیا، تو جگہ بہ جگہ عیسائی تقریریں کرتے تھے، اور اپنے مذہب کی تبلیغ کرتے تھے، اور مسلمان چونکہ پٹ چکے تھے، حکومت اُن کی ضائع ہوگئی تھی، اس لیے لوگوں کے دل میں مرعوبیت تھی، لیکن علماء کا طبقہ ایک ایسا طبقہ تھا جو علمی سطح پر اُن کے مقابلے میں آتا تھا، تو اُس وقت عجیب وغریب لطیفے بنتے تھے، ایک واقعہ کتاب میں نقل کیا گیا ہے کہ ایک پادری دہلی میں تقریر کر رہا تھا، اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا ثابت کر رہا تھا، کہ عیسیٰ علیہ السلام اللہ کا بیٹا ہے۔ تو یہ جو بھٹیوں پر دانے بھونا کرتے ہیں ان کو کہتے ہیں ''بھڑبھونجے''، تو ایک ''بھڑبھونجا'' اُٹھ کر کھڑا ہوگیا، اَن پڑھ سا تھا، وہ پادری سے سوال کرتا ہے کہ پادری صاحب! عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے بیٹے ہیں؟ تو پادری کہنے لگا: ہاں جی! بالکل، اللہ کے بیٹے ہیں۔ تو اُس نے پوچھا کہ ان کے علاوہ کوئی اور بیٹا بھی ہے؟ تو پادری کہنے لگا کہ نہیں، اور کوئی بیٹا نہیں، عیسیٰ اللہ تعالیٰ کا اکلوتا بیٹا ہے، اور اُن کی کتابوں میں اکلوتا بیٹا ہی لکھا جاتا ہے، کہ یہ اللہ کا اکلوتا بیٹا ہے۔ تو ''بھڑبھونجا'' کہتا ہے کہ بتایئے کہ اس میں اللہ کا کیا کمال ہوا؟ جو اس نے اتنے عرصے میں ایک ہی بنایا، میری شادی کو اتنے سال ہوئے ہیں اور میرے بارہ بیٹے ہیں، اتنے سالوں میں میرے تو بارہ ہوگئے اور اللہ تعالیٰ نے اتنی مدت میں ایک ہی بنایا؟ اب یہ بظاہر دیکھنے میں

یہ ایک جاہلانہ اعتراض ہے، لیکن پادری چپ ہوگیا۔ جس وقت یہ بات دیوبند میں حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب ﷫ کے پاس پہنچی جو دارالعلوم دیوبند کے صدرِ اوّل ہیں، تو آپ نے فرمایا کہ یہ اتنا زبردست اعتراض ہے کہ پادری کیا پادری کا باپ بھی آجائے تو اس کا جواب نہیں دے سکتا، "بھڑبھونجے" کی بات کا حاصل یہ ہے، کہ یہ بتاؤ کہ اولاد کا ہونا کمال ہے یا نقص؟ انہوں نے اس کو علمی اصطلاح پہ چڑھا دیا، اگر اولاد نقص ہے تو ایک بھی عیب ہے، تو ایک بھی نہیں ہونا چاہیے، اور اگر یہ کمال ہے تو جس طرح اللہ تبارک وتعالیٰ کے اندر کمال ہر مخلوق سے زیادہ ہے، جو کمال کی صفت ہے وہ اللہ تعالیٰ میں سب سے زیادہ ثابت ہے، تو پھر اگر اولاد کا ہونا کمال ہے تو اللہ کی اولاد ساری مخلوق میں سے زیادہ ہونی چاہیے، کہ اس میں مخلوق اس کا مقابلہ نہ کرسکتی، تو یہ کیسا کمال ہوا کہ اللہ کی مخلوق اللہ سے بڑھ گئی، اگر اولاد کا ہونا کمال ہے تو اللہ کی اولاد اتنی ہونی چاہیے تھی، کہ مخلوقات میں سے کسی کی اتنی نہ ہوتی، تا کہ یہ کمال سب سے زیادہ اللہ میں موجود ہوتا، اور اگر یہ نقص ہے تو جس طرح سو کا ہونا نقص ہے تو ایک کا ہونا بھی نقص ہے، تو بات اسی طرح سے ہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف اولاد کی نسبت بہر حال عیب ہے، جس کو اللہ تعالیٰ سُبْحٰنَهٗ کے لفظ کے ساتھ رَدّ فرماتے ہیں، کہ یہ تو ایک شرک کا شعبہ ہے، بلکہ جو انہوں نے "اِبن" قائم کر کے میری اُلوہیت میں دوسروں کو شریک کرلیا، میں تو اُن کے شرک کرنے سے پاک ہوں، اس قسم کا عیب میرے اندر نہیں ہے۔ دوسری آیات کے اندر اور بھی مختلف انداز کے ساتھ اس کی تردید کی گئی ہے اَنّٰى يَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَمْ تَكُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ (سورۂ انعام: ۱۰۱) کہ اللہ کی اولاد کیسے ہوسکتی ہے؟ اُس کی تو کوئی بیوی ہی نہیں، یعنی اگر تم نے بیٹے کو اسی مفہوم میں لینا ہے جس طرح سے دُنیا میں بیٹا ہوتا ہے تو پہلے اللہ کی کوئی بیوی تو ثابت کرو، پھر اللہ کی بیوی ثابت کر کے اُس کے ساتھ اللہ کے اسی قسم کے تعلقات ثابت کروگے جس طرح سے خاوند بیوی کے ہوتے ہیں، تو یہ اللہ کی شان کیا رہی؟ یہ تو عیب ہی عیب ہے۔ تو جب اس قسم کے ان کے نظریے ہیں تو ان کا ایمان باللہ کوئی معتبر نہیں۔

یہود ونصاریٰ کی خارج اَز حقیقت باتیں

ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ: یہ ان کی اپنے منہ سے بولی ہوئی باتیں ہیں، جس کا مطلب ہے کہ خارج میں کوئی واقعہ نہیں ہے، بات جو ہوا کرتی ہے اگر تو خارج میں کوئی واقعہ ہو، اور وہ خبر اس خارج کے واقعے سے اخذ کی گئی ہو تو اس کا مصداق خارج میں ہوتا ہے، اور اگر خارج میں اس کا مصداق نہیں اور اپنی طرف سے بنالی تو ایک منہ سے بولی ہوئی بات ہے، اس میں حقیقت کچھ نہیں۔ "یہ ان کی اپنے مونہوں کی بولی ہوئی باتیں ہیں" يُضَاهِئُوْنَ قَوْلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ جو لوگ پہلے کافر ہوئے اُن کی بات کی یہ نقل اُتارتے ہیں، یہ نقال ہیں، حقیقت ان کے سامنے بھی نہیں۔ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ سے کون مراد ہیں؟ یا تو موجودہ یہود ونصاریٰ کے پیشوا مراد ہیں، کہ یہ تنقید تو اُن پہ کی جارہی ہے جو اس وقت موجود ہیں، اور کہا جارہا ہے کہ ان کے پہلوں نے کُفر ایجاد کیا، اور ان کے یہ پیچھے لگ اسی طرح سے نقل اُتارتے جارہے ہیں، اس بات کی تحقیق انہوں نے بھی نہیں کی کہ یہ بات کہاں تک صحیح ہے؟ جنہوں نے پہلے کُفر ایجاد کیا ہے اور اس قسم کی بات بولی ہے یہ اُس کی نقل اُتارتے چلے جارہے ہیں۔ اور یا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ سے مشرکین اقوام مراد ہیں، جن کا نظریہ تھا کہ فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں، مشرکینِ مکہ کا بھی اور بعض دوسری اقوامِ مشرکہ کا بھی یہ نظریہ تھا، کہ وہ

فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں کہتے تھے، انہوں نے فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں تو نہ کہا اور ایک ایک بیٹا تجویز کرلیا، کہ فلاں اللہ کا بیٹا ہے اور فلاں اللہ کا بیٹا ہے، تو یہ مشرک لوگوں کی نقل اُتار رہے ہیں، جیسی بات انہوں نے کہی تھی ویسی انہوں نے کہنی شروع کردی۔ دونوں طرح سے اس کا مطلب ذکر کیا جاسکتا ہے۔ باقی آج جو یہودی موجود ہیں، ان میں کوئی شخص "عزیر ابن اللہ" کا قائل نہیں ہے، ہمارے مفسرین جس طرح سے لکھتے ہیں، لیکن یہ حقیقت ہے کہ جس وقت قرآن اتر رہا تھا اور قرآنِ کریم نے یہ بات نقل کی اُس وقت یقیناً ایسے یہودی موجود ہوں گے جو اس نظریہ کے تھے، ورنہ فوراً وہ اس بات پر اعتراض کرتے، کہ قرآن ہم پر اتہام لگاتا ہے اور یہ غلط کہتا ہے، ہم بالکل "عزیر ابن اللہ" کے قائل نہیں، اور تاریخ کے کسی ورق پر یہود کا یہ اعتراض منقول نہیں ہے، اگر اس قسم کی بات ہوتی تو وہ قرآنِ کریم کے خلاف شور مچا دیتے، کہ ہمارے اُوپر اتہام ہے، ہم پر بہتان لگایا جارہا ہے، ہم "عزیر ابن اللہ" کے قائل نہیں ہیں۔

عدیؓ بن حاتم کا سوال اور سرورِ کائنات ﷺ کا جواب

جس طرح سے آگے ایک بات آرہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ذکر کیا اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ: کہ ان یہود و نصاریٰ نے اپنے احبار و رہبان کو اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ بنالیا ہے، اس بات پر اعتراض ہوا ہے، حاتم طائی جو مشہور سخی گزرا ہے یہ عیسائی تھا، نصرانی تھا، اس نے حضور ﷺ کا زمانہ پایا ہے، لیکن ایمان نہیں لایا، یہ اسی طرح عیسائیت پر مرا ہے، اور اس کا بیٹا عدی مسلمان ہوا ہے، عدی بن حاتم ؓ صحابی ہیں۔ جس وقت یہ مسلمان ہو کے آئے تو چونکہ یہ عیسائی تھے، نصرانی تھے، تو انہوں نے سرورِ کائنات ﷺ کے سامنے یہ اعتراض کیا ہے کہ یارسول اللہ! قرآن کہتا ہے کہ اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ، حالانکہ ہم لوگ یا عیسائی لوگ اَحبار و رُہبان کو رَبّ تو نہیں بناتے، تو گویا کہ اُس کے نزدیک یہ بات اپنے عقائد کے مطابق خلافِ واقعہ تھی، اس لیے جب وہ مسلمان ہو کے آیا تو اُس نے یہ اعتراض کیا، کہ قرآن کیسے کہتا ہے کہ انہوں نے اَحبار و رُہبان کو رَبّ بنالیا، حالانکہ عیسائی اور یہودی ان کو رَبّ تو نہیں کہتے؟ تو آپ ﷺ نے اُس سے پوچھا کہ اچھا یہ بتاؤ کہ کیا اَحبار و رُہبان کے متعلق ان لوگوں کا یہ رویہ نہیں کہ جس چیز کو یہ چاہیں حلال کردیں، چاہے اللہ کی کتاب میں حرام ہی ہو، تو یہ لوگ حلال جاننے لگ جاتے ہیں، اور جس چیز کو یہ چاہیں حرام کردیں چاہے اللہ کی کتاب میں حلال ہی ہو تو اس کو یہ لوگ حرام جاننے لگ جاتے ہیں، یعنی تحلیل و تحریم کا اختیار کیا ان لوگوں نے اپنے مولویوں اور پیروں کو نہیں دے رکھا؟ ان علماء اور درویشوں کو یہ حیثیت نہیں دے دی؟ کہ ان کے فتوے پر عمل کرتے ہیں، چاہے کتاب اللہ کے خلاف ہی کیوں نہ ہو، جس چیز کو چاہیں وہ منسوخ کردیں، جس چیز کو چاہیں باقی رکھیں، جس چیز کو چاہیں حلال ٹھہرادیں، جس چیز کو چاہیں حرام ٹھہرادیں، کیا یہ حیثیت اَحبار و رُہبان کی نہیں ہے؟ وہ کہنے لگا جی! یہ بات تو ہے۔ تو فرمایا یہی اتخاذِ رَبّ ہے، یعنی قرآنِ کریم نے جو کہا ہے کہ انہوں نے ان کو رَبّ بنالیا، تو رَبّ بنانے کا مطلب یہ تھا کہ ان کی اطاعت اس طرح سے کرنے لگ گئے جس طرح سے رَبّ کی کی جاتی ہے، تو تم رَبّ کا لفظ استعمال نہ کرو لیکن جب تم نے اُن کو یہ حیثیت دے دی تو تم نے اُن کو رَبّ بنالیا، جس پر وہ خاموش ہو گئے۔ تو معلوم ہوا کہ جس بات کو خلافِ واقعہ سمجھا گیا تھا، تو

اُس پہ اعتراض فوراً کیا گیا، اور سرورِ کائنات ﷺ نے وضاحت کردی، وضاحت کرنے کے بعد وہ مطمئن ہو گئے۔ تو اگر ''عزیر ابن اللہ'' والی بات بھی خلافِ واقع ہوتی، تو کوئی تو اس اعتراض کو اٹھاتا، اور جب اس اعتراض کو اٹھاتا تو اس کی وضاحت ہو جاتی، جب انہوں نے آگے سے خاموشی سادھ لی، چپ ہو گئے تو معلوم ہو گیا کہ اس زمانے میں اس نظریہ کے لوگ تھے، اور آج اگر موجود نہیں ہیں تو اس میں کوئی اِشکال کی بات نہیں، فرقے اُٹھتے ہیں، پیدا ہوتے ہیں، ختم ہو جاتے ہیں، اس میں کوئی بات نہیں ہے۔ لیکن حاجی امداد اللہ رحمہ اللہ کے ایک مرید ہیں حاجی امیر احمد خان رحمہ اللہ ''ارواحِ ثلاثہ'' میں جن کی روایتوں سے بہت سارے واقعات لکھے ہوئے ہیں، یہ سیاح قسم کے آدمی تھے، یہ کہتے ہیں کہ میں جس وقت شام کے علاقے میں سیاحت پہ گیا ہوں تو بعض یہودی مجھے اس نظریے کے ملے ہیں جو ''عزیر ابن اللہ'' کہتے تھے، اور وہ لوگ ''عزیری'' کہلاتے ہیں، اور وہ جماعت وہ فرقہ ''عزیریہ'' کہلاتا ہے۔ تو ہو سکتا ہے کہ وہ ایسی سطح پر نہ ہوں کہ جن کا کوئی تذکرہ ہو، یا وہ اس قسم کے عقیدے کو علی الاعلان بیان نہ کرتے ہوں، تو کچھ باقی بھی ہو سکتے ہیں، لیکن عام طور پر مفسرین یہی لکھتے ہیں کہ اس وقت تو یہودی اس نظریہ کے نہیں ہیں، اور اُس زمانے میں ایسا ہو گا۔

اِتخاذِ رَبّ کی نسبت یہود و نصاریٰ کی طرف کیوں کی جاتی ہے؟

اور یہ واقعہ ہے اس وقت بھی، کہ اَحبار و رُہبان کی ان کے ہاں حیثیت یہی ہے، کہ جو کچھ وہ کہہ دیں وہی دِین ہے، جو نظریہ وہ پیش کر دیں بس وہی ان کے ہاں دِین بن جاتا ہے۔ چند سال پہلے کی بات ہے جب میں کبیروالہ کے آخری سالوں میں تھا،[1] تو ایک دفعہ بہاولپور آیا تو یہاں کے دوستوں سے مل کر، (بہاولپور میں امریکا کا ایک بہت بڑا گرجا گھر ہے) گرجا گھر دیکھنے کی ہم نے خواہش کی کہ ذرا دیکھیں کہ ان کے ہاں کیا ہوتا ہے؟ چنانچہ اجازت لے لی، اُس وقت یہاں ایک امریکی پادری تھا، ہم گئے تو اُس نے گرجا گھر کھول دیا، جب ہم اندر گئے تو دیکھا کہ وہ عیسیٰ علیہ السلام کو پھانسی دیے جانے کی تصویریں، کہ کس طرح پکڑ رہے ہیں، کس طرح اُن کو پھانسی پر چڑھا رہے ہیں، کس طرح رَسّے باندھ رہے ہیں، وہی ساری کی ساری مجسم فلم تیار کر کے انہوں نے دیواروں پر لگائی ہوئی ہے، اور اتوار کے دِن وہ عبادت کے لیے جمع ہوتے ہیں۔ اب ان کا قبلہ تو بیت المقدس ہے، ہم نے اس سے پوچھا کہ یہ نماز کس طرح سے پڑھتے ہیں؟ (پادری کے کھڑے ہونے کی جگہ بھی دیکھی ہوئی تھی) کہتا ہے کہ پہلے تو رواج تھا کہ پادری کا منہ بھی ادھر کو ہوتا تھا جدھر ہمارا قبلہ ہے، اور قوم کا منہ بھی ادھر کو ہوتا تھا۔ اور کہنے لگا کہ اب کچھ عرصہ سے ہم نے یہ رواج بدل دیا ہے، اب پادری کا منہ قوم کی طرف ہوتا ہے، اور قوم کا منہ قبلہ کی طرف ہوتا ہے، تاکہ قوم یہ دیکھتی رہے کہ پادری صاحب کیا پڑھتے ہیں اور کس طرح سے پڑھتے ہیں، انہوں نے اس کو قبول کر لیا، یعنی قوم کا منہ کدھر کو اور ان کے اِمام کا منہ کدھر کو۔ وہ کہتا ہے کہ اب یہ طریقہ جاری ہے، یعنی یہ میں نے خود سوال کیا ہے اور اُس کی وضاحت انہوں نے یہ کی ہے، کہ اب کچھ دیر سے یہ طریقہ بدل دیا گیا ہے، اب جس وقت بیٹھتے ہیں تو قوم کا منہ ادھر کو ہوتا ہے اور پادری کا منہ ادھر قوم کی طرف ہوتا ہے، اور اس میں مقصد یہ

(1) جامعہ دار العلوم کبیر والا ضلع خانیوال میں حضرت حکیم العصر رحمہ اللہ نے دس گیارہ سال تدریس فرمائی ہے، جو آپ کی تدریس کا سنہری دور کہلاتا ہے۔

ہے کہ تا کہ قوم دیکھتی رہے کہ پادری کیا پڑھتا ہے، اور کس طرح سے پڑھتا ہے؟ تو جو طریقہ وہ تجویز کر لیں قوم اُسی کو قبول کرتی ہے، انہوں نے ان کو یہ منصب دے رکھا ہے، وہ ان کو نائب خدا سمجھتے ہیں، جس طرح سے مسیح کو اللہ کا بیٹا بنایا، تو اب ان کا جو پوپ اور بڑا پادری ہوتا ہے وہ سمجھو کہ مسیح کا قائم مقام ہوتا ہے، مسیح کا قائم مقام ہونے کی وجہ سے اُس کے اَحکام کو یہ لوگ بالکل اَحکامِ اِلٰہیہ کے برابر سمجھتے ہیں، تو جس وقت اَحکامِ اِلٰہیہ کے برابر سمجھتے ہیں تو چاہے اُس کو رَبّ نہ کہیں، لیکن رَبّ والا مفہوم اس پر ثابت ہوگیا، جس وقت ثابت ہوگیا تو اتخاذِ رَبّ کی اُن کی طرف نسبت کی جاسکتی ہے۔ تو بہرحال حضرت عدی ابن حاتم رضی اللہ عنہ نے یہ اِعتراض کیا تھا، اور اس اِعتراض کا سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ جواب دیا۔

ہم اَئمہ کی بات کیوں مانتے ہیں؟

ہمارے ہاں یہ حیثیت نہیں ہے، ہم بھی مولوی سے فتویٰ لے کر کام کرتے ہیں، کہ مولوی حلال کہہ دے تو ہم کہتے ہیں کہ حلال ہے، مولوی حرام کہہ دے تو ہم کہتے کہ حرام ہے، یا ہم اَئمۂ مجتہدین سے پوچھتے ہیں، لیکن اَئمۂ مجتہدین کی بات یا مولوی کی بات ہمارے ہاں یہ حیثیت نہیں رکھتی کہ اگرچہ ہمارے علم میں ہو کہ اللہ کی کتاب میں اس کے خلاف ہے، اور حدیث کے اندر اس کے خلاف ہے، تو بھی ہم ان کے فتوے کو مانیں گے، یہ حیثیت اُمتِ مسلمہ میں نہیں ہے، بلکہ وہ علماء پر اگر اعتماد کرتے ہیں تو اس لحاظ سے کرتے ہیں، کہ یہ کتاب اللہ کی تشریح کر کے ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں، اس بات کی جو صراحتاً قرآن وسنت میں نہیں ہوتی۔ اب مثال کے طور پر بالفرض اگر کوئی ایسی صورت پیش آجائے کہ سارے مولوی اکٹھے ہو کر کہہ دیں کہ نمازیں پانچ نہیں، تین ہیں، تو قوم چاہے جاہل ہے، جُوتا اُٹھا کے ابھی پٹائی کردے گی، یعنی چاہے جاہل ہیں، جیسے بھی ہیں، اگر وہ اس قسم کی باتیں کہنی شروع کردیں تو آج ہی لوگ ڈنڈا اُٹھا کر کھڑے ہوجائیں گے جاہل بھی، وہ اگر بات مانتے ہیں تو اس حیثیت سے مانتے ہیں، کہ ہم براہِ راست چونکہ قرآن کو سمجھتے نہیں، حدیث کو سمجھتے نہیں، یہ لوگ قرآن اور حدیث کی بات ہمیں بتاتے ہیں، ہم ان کو ترجمان سمجھ کر ان کی بات لیتے ہیں، ان کو مستقل حیثیت نہیں دیتے کہ ان کو اَحکام دینے کا حق ہے، ان کو اَحکام دینے کا قطعاً حق نہیں، آج اگر ثابت ہوجائے کہ ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا فلاں قول حدیث صحیح غیر مؤوّل، غیر منسوخ کے خلاف ہے، تو آج ہم اُس قول کو چھوڑ دیں گے اور حدیث صحیح کو لیں گے، تو ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے اقوال اگر ہم لیتے ہیں تو اس لیے لیتے ہیں، کہ ہم اُن کو قرآن اور حدیث کی تفسیر سمجھتے ہیں، چنانچہ ان حضرات کا خود اپنا قول بھی ہے کہ اگر ہمارے قول کے خلاف تمہیں کوئی صحیح حدیث مل جائے، یعنی حدیثِ صحیح کا مطلب یہ ہے کہ سند کے لحاظ سے صحیح ہو اور اس کا مفہوم واضح ہو، یعنی تاویل کی اس میں گنجائش نہ ہو، اور وہ منسوخ نہ ہو، اس قسم کی کوئی حدیث اگر سامنے آجائے تو اس کے ہوتے ہوئے کسی مجتہد کے اِجتہاد کو لینا جائز نہیں، اور یہ خود ان اَئمہ کے اقوال ہیں کہ اس قسم کی اگر حدیث مل جائے تو ہمارے قول کو چھوڑ دو، لیکن احادیث جس قسم کی سامنے آتی ہیں جن کو آپ سمجھتے ہیں کہ یہ فقہ کے اقوال کے خلاف ہیں، یا تو وہ صحیح نہیں ہوتیں، یا صحیح ہوتی ہیں تو قابلِ تاویل ہوتی ہیں، یا وہ منسوخ ہوتی ہیں۔

مسئلہ قراءتِ خلف الامام

مثلاً یہی روایت عام طور پر لوگ سنتے رہتے ہیں: ''لَا صَلَاةَ لِمَنْ لَمْ يَقْرَءْ بِفَاتِحَةِ الكتاب'' لوگ کہتے ہیں کہ دیکھو جی! حدیث میں تو یہ آتا ہے، متفق علیہ روایت ہے، بخاری میں بھی ہے، مسلم میں بھی ہے،[1] صحیح حدیث ہے، لیکن اس کے مقابلے میں یہ اِمام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا قول لیتے ہیں، اِمام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اِمام کے پیچھے قراءت نہیں کرنی چاہیے (یہ ایک مثال دے رہا ہوں) تو کہتے ہیں کہ ''فقہاء کا یہ قول تو حدیث صحیح کے خلاف ہے، تو یہ حدیث صحیح کو چھوڑتے ہیں اور اِمام کا قول لیتے ہیں'' یہ غلط اتہام ہے۔ حدیث صحیح ہے، اس میں کوئی شک نہیں، لیکن یہ صریح نہیں، قابلِ تاویل ہے، قابلِ تاویل کس طرح سے؟ کہ ''لَا صَلَاةَ'' کا جو لفظ ہے یہ حدیث شریف کے اندر دو مفہوم ادا کرتا ہے، کہ ''لَا'' نفیِ جنس کے لیے بھی ہوتا ہے اور نفیِ کمال کے لیے بھی ہوتا ہے، اگر نفیِ جنس کے لیے ہو تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ بالکل سرے سے نماز ہوئی ہی نہیں، اس میں یہ احتمال بھی ہے، اور نفیِ کمال کے لیے ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ نہیں پڑھو گے تو کامل نہیں ہوگی، نماز صحیح ہے لیکن اس میں کمال نہیں آئے گا، دونوں احتمال اس میں نکل آئے، تو یہ اگر ثبوت کے اعتبار سے روایت قطعی بھی ہو مثال کے طور پر، تو دلالت کے اندر یہ قطعی نہیں، اس کا مفہوم واضح نہیں، اور پھر ہم اس میں ''لَا صَلَاةَ كَامِلَةً'' کی توجیہ کرتے ہیں۔ اس لیے کہ اس میں بعض صحیح روایتوں کے اندر یہ اضافہ ہے، کہ ''لَا صَلَاةَ لِمَنْ لَمْ يَقْرَءْ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ فَصَاعِدًا''،[2] ''لَا تُجْزِئُ صَلَاةٌ لَا يُقْرَأُ فِيهَا بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ وَشَيْءٍ مَعَهَا''،[3] ''لَا صَلَاةَ لِمَنْ لَمْ يَقْرَأْ بِالْحَمْدُ وَسُورَةٍ فِي فَرِيضَةٍ أَوْ غَيْرِهَا''[4] کہ فاتحۃ الکتاب کے بغیر کوئی صلوٰۃ نہیں، اور اس سے کچھ زیادہ بھی پڑھنا پڑتا ہے، فاتحۃ الکتاب کے بغیر نماز نہیں ہوتی، اور اس کے ساتھ ایک سورت بھی ملانی پڑتی ہے، تو یہ اضافہ بتاتا ہے کہ جس طرح سے سورت کا ملانا واجب ہے، اسی طرح فاتحہ کا پڑھنا بھی واجب ہے، اور واجب چھوٹ جانے کی وجہ سے نماز ناقص ہوتی ہے، البتہ ادا ہو جاتی ہے۔ اور پھر یہ تو ہوئی ایک اِجمالی بات، لیکن یہ جو آیا: ''لَا صَلَاةَ لِمَنْ لَمْ يَقْرَءْ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ'' کہ نماز اس شخص کی نہیں جو فاتحۃ الکتاب نہ پڑھے، اس مَنْ سے کیا مراد ہے؟ اس کے اندر تاویل کی گنجائش ہے، ہم اس مَنْ سے مراد لیتے ہیں منفرد اور اِمام، کیونکہ سورت پڑھنے کا حکم انہی دونوں کو ہے، اِمام بھی سورت پڑھتا ہے اور منفرد بھی سورت پڑھتا ہے، اور مقتدی کے لیے بالاتفاق سورت ملانے کا حکم نہیں، تو ہم کہتے ہیں یہ حکم اسی کے متعلق ہوگا جس کو سورت بھی ساتھ ملانے کا حکم ہے، لہٰذا منفرد کے بارے میں یہی ہے کہ فاتحۃ الکتاب پڑھنی چاہیے، اور اِمام کے بارے میں بھی یہی ہے کہ فاتحۃ الکتاب پڑھنی چاہیے، یہ اگر نہیں پڑھیں گے تو ایسی صورت میں نماز نہیں ہوگی یعنی اُس کا اعادہ واجب ہے، جب اعادہ واجب ہو گیا تو ہم بھی کہہ سکتے ہیں کہ نماز نہیں ہوئی، ''تَنْزِيْلُ النَّاقِصِ بِمَنْزِلَةِ الْمَعْدُوْمِ''، ہمارا نظریہ بھی یہی ہے، ہم اگر یہ کہیں کہ فاتحۃ الکتاب کے بغیر نماز نہیں ہوتی، تو ہمارے لیے بھی

---

(۱) بخاری ۱/۱۰۴، باب وجوب القراءۃ الخ/ مسلم ۱/۱۶۹، باب وجوب قراءۃ الفاتحۃ الخ/ مشکوۃ ۱/۷۸، باب القراءۃ کی پہلی حدیث۔

(۲) سنن ابی داؤد ۱/۱۱۹، باب من ترک القراءۃ فی صلاتہ/ نیز مسلم اور مشکوۃ کا حوالہ سابقہ۔

(۳) مسند ابی یعلی ۲/۳۳۶، رقم ۱۰۷۷۔ نیز تاریخ اصبہان ۱/۲۱۳۔ ۲/۳۰۵

(۴) ترمذی ۱/۵۵، باب ما جاء فی تحریم الصلوۃ۔

گنجائش ہے، کیونکہ ہم اعادہ کو واجب کہتے ہیں۔ باقی رہا مقتدی کہ مقتدی کیا کریں؟ مقتدی کے متعلق آگے دوسری روایت ہے جس میں حضور ﷺ نے تقسیم کردی، کہ مقتدی نے کیا کرنا ہے اور اِمام نے کیا کرنا ہے، ''اِنَّمَا جُعِلَ الإِمَامُ لِيُؤْتَمَّ بِهٖ'' اِمام تو بنایا ہی اس لیے جاتا ہے تاکہ اس کی اِقتدا کی جائے، ''اِذَا كَبَّرَ فَكَبِّرُوْا۔ اِذَا رَكَعَ فَارْكَعُوْا۔ اِذَا سَجَدَ فَاسْجُدُوْا'' یہ سارے کے سارے الفاظ ہیں، اور ساتھ ہے: اِذَا قَالَ: غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ، فَقُوْلُوْا: اٰمِيْنَ، جس وقت وہ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ کہا کرے تو تم آمین کہا کرو، تو وہاں قَالَ کی نسبت اِمام کی طرف ہے کہ اِمام پڑھے گا غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ، اور تم نے کہنی ہے آمین۔ اور اسی روایت میں مسلم شریف میں اضافہ ہے کہ ''اِذَا قَرَءَ فَاَنْصِتُوْا''[1] جب وہ قرآن پڑھے تو تم چپ رہا کرو۔ اب ان سب روایتوں کو سامنے رکھ کے ایک اِمام نے یہ تاویل کی ہے، کہ مقتدی کے لیے فاتحہ کی قراءت نہیں ہے۔ تو یہ مسئلہ جو سمجھا ہوا ہے تو احادیث سے ہی سمجھا ہوا ہے، یہ احادیث کی مخالفت نہیں ہے، یہ ایک مثال دے رہا ہوں کہ ایک بڑا اہم مسئلہ لوگوں کے اندر یہ چلتا ہے، تو جہاں بھی آپ دیکھتے ہیں، کہ ائمہ کے اقوال کے خلاف روایات صحیحہ موجود ہیں، تو وہ مؤوّل ہوتی ہیں، اُن کے اندر تاویل کی گنجائش ہوتی ہے، لیکن حدیثِ صحیح غیر مؤوّل غیر منسوخ اگر مل جائے تو ممکن ہی نہیں کہ اُس کے مقابلے اِمام کا قول موجود رہ جائے، اِمام کا قول اُٹھا کے دیوار پہ مار دیا جائے گا۔ اس لیے ہم ائمہ کے جو اقوال لیتے ہیں، تو ہمارے ہاں یہ حیثیت نہیں ہے، کہ ہم ان کو رَبّ بناتے ہیں، وہ خود کہتے ہیں کہ اگر اس قسم کی حدیث تمہیں مل جائے تو ہماری بات اُٹھا کے دیوار پہ ماردو۔ اور ہم اپنے اِمام کی بات دیوار پر ماریں گے اگر ہمیں مل جائے، کہ ہمارا اِمام قرآنِ کریم کی صریح آیت کے خلاف کہتا ہے، یا حدیثِ صحیح غیر مؤوّل غیر منسوخ کے خلاف کہتا ہے تو ہم قطعاً ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی بات ماننے کے لیے تیار نہیں۔ تو پھر ہمارے لیے اِتخاذِ رَبّ کا حکم کیسے ثابت ہوا؟ تو ہم ان کے فتوے کو جو مانتے ہیں، ان کی تحقیق کو جو مانتے ہیں، تو قرآن اور حدیث کی تشریح سمجھ کر مانتے ہیں، کہ یہ اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کی بات کی وضاحت ہمارے سامنے کرتے ہیں، ہم ان کو اس لیے تسلیم کرتے ہیں۔ ورنہ اگر ہمیں پتا چل جائے کہ اپنی طرف سے بناتے ہیں، اور ان کے پاس قرآن و حدیث سے کوئی سند نہیں، تو ہم قطعاً ماننے کے لیے تیار نہیں، چاہے کوئی ہو، اس لیے جو ہمارا عقیدہ ہے وہ اتخاذِ رَبّ کا نہیں ہے۔

قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ یہ لعنت کا لفظ ہے اللہ انہیں برباد کرے، اللہ انہیں غارت کرے، یہ کدھر کو پھرے جاتے ہیں، یعنی جس وقت ایک حقیقت بہت ہی نمایاں ہو، اور کوئی شخص اس کو تسلیم نہ کرے، تو اس وقت اسی طرح سے اُس سے بیزاری کا اظہار کیا جاتا ہے۔ ان لوگوں کا یہ حال ہے کہ انہوں نے اپنے اَحبار و رُہبان کو (اَحبار حَبر کی جمع ہے ''عالم'' کے معنی میں، رُهبان راهب کی جمع ہے درویش کے معنی میں) انہوں نے اپنے علماء کو، درویشوں کو اللہ کو چھوڑ کے رَبّ بنالیا، اور مسیح ابن مریم کو بھی رَبّ بنالیا، اور نہیں حکم دیے گئے تھے یہ مگر یہی کہ عبادت کریں اِلٰہِ واحد کی، جس کے علاوہ کوئی معبود نہیں، سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ: ان کے شریک ٹھہرانے سے وہ پاک ہے۔ حکم تو ان کو توحید کا دیا گیا تھا، کہ اللہ تعالیٰ کی توحید اختیار کریں، لیکن اِتخاذِ رَبّ کے ساتھ یہ مشرک ہو گئے اور

(۱) یہ حدیث مختلف صحابہ سے مختلف الفاظ سے مروی ہے۔ دیکھیں: مسلم ۱/ ۱۷۴، حدیث ابی موسیٰ/ نسائی ۱/ ۹۴، باب مبادرۃ الامام/ بخاری ص ۵۵، باب الصلاۃ فی السطوح۔

اللہ تعالیٰ کی ابنیت کا عقیدہ اختیار کرنے کے ساتھ یہ لوگ مشرک ہو گئے، اللہ تعالیٰ ان سب عیوب سے پاک ہے، کہ اس کی طرف کسی شریک کی نسبت کی جائے۔

مخالفینِ اِسلام کے اِعتراضات کی حیثیت

یہ خود اپنی تو دِین کی دولت یوں برباد کر بیٹھے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو دی گئی تھی، اور اب یہ سرورِ کائنات ﷺ کی مخالفت، اور اسلام کی مخالفت کرتے ہیں، یہ زور اس بات پر لگا رہے ہیں کہ اسلام کی اشاعت نہ ہو اور اس دِین کو مٹا دیا جائے، یہ بھولے ہوئے ہیں، اب یہ مٹنے کا نہیں، ان کے اعتراضات کی حیثیت ایسی ہے، جس طرح سے اللہ کا چراغ سورج آسمان پر دمک رہا ہے، اور کوئی نادان پھونکیں مار کے اس کو بجھانا چاہے، تو کسی کے پھونکیں مارنے سے یہ چراغ بجھتا ہے؟ اب اسی طرح سے سمجھو کہ اسلام ایک آفتاب کی طرح چمک اٹھا ہے، نکل آیا ہے، طلوع ہو گیا ہے، اب لوگوں کے منہ کے اعتراضات اور زبان کی باتیں اس کو مٹا نہیں سکیں گی، اس لیے اگر یہ سمجھتے ہیں کہ ہم اس طرح سے مخالفت کر کے، اعتراضات کر کے اس آنے والے دِین کو مٹا دیں گے تو یہ بھول میں پڑے ہوئے ہیں، ایسا نہیں ہو سکتا، یہ ممکن نہیں ہے۔ اس میں اُن کو مایوس کیا جا رہا ہے کہ اب تمہاری یہ مزاحمت، یہ زبانی اعتراضات اور اس قسم کے اشکالات اب اس دین کا راستہ نہیں روک سکتے۔ یُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللہِ: یہ ارادہ کرتے ہیں کہ اللہ کے نُور کو بجھا دیں اپنے مونہوں کے ساتھ، مونہوں کے ساتھ بجھانے کا وہی معنی کہ منہ سے پھونک مار کے یہ اللہ کے نُور کو منہ کے پھونکوں سے بجھانا چاہتے ہیں، گویا کہ ان کی حیثیت ایسی ہے جیسے کہ پھونک ماری جائے، اور اللہ کا نُور ان کی پھونکوں سے بجھے گا نہیں، وَیَاْبَی اللہُ اِلَّآ اَنْ یُّتِمَّ نُوْرَهٗ: اس کا ترجمہ آپ کو سمجھایا تھا، کہ لفظی معنی تو بنتا ہے کہ "اللہ انکار کرتا ہے مگر اس بات کا کہ اپنے نُور کو پورا کرے اگرچہ کافروں کو یہ بات ناگوار ہی گزرے"، لیکن محاورۃً اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ "اللہ تعالیٰ اپنے نُور کو پورا کیے بغیر نہیں رہے گا، اگرچہ کافروں کو یہ بات ناگوار ہی گزرے" کافروں کے علی الرغم، اُن کے چڑنے اور پریشان ہونے کے باوجود اللہ تعالیٰ اس کو پورا کر کے رہے گا، جیسے آپ اُردو میں اسی مفہوم کو ادا کرنے کے لیے شعر بھی پڑھا کرتے ہیں ۔

نُورِ خدا ہے کُفر کی حرکت پہ خندہ زن پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

(مولانا ظفر علی خانؒ)

اس میں اسی آیت کے مضمون کی طرف اشارہ ہے۔

غلبۂ اِسلام کی دو صورتیں

ھُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی "اللہ وہ ہے جس نے اپنے رسول کی ہدایت اور دِینِ حق کے ساتھ بھیج دیا تاکہ غالب کر دے اس دِین کو سب دِینوں پر اگرچہ مشرکوں کو یہ بات ناگوار ہی گزرے" تو اس دِین کو اللہ تعالیٰ سب دِینوں پر غالب کر کے رہے گا۔ اب غلبہ کی دو صورتیں ہیں، ایک ہے علمی غلبہ، کہ اس دِین کی باتوں کو اتنا مدلل کر دیا گیا اور اتنا واضح کر دیا گیا کہ اس کے مقابلے میں کسی کی بات نہیں چل سکتی، یہ غلبہ تو پہلے دِن سے لے کر آج تک نمایاں ہے، اللہ تعالیٰ کا یہ احسان ہے، چودہ سو سال کی

تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ جس میدان کے اندر بھی اسلام کے مقابلے میں کوئی دوسرا نظریہ آیا، اور بحث مباحثہ کی نوبت آئی، دلائل کی بات آئی، تو دلائل کے میدان میں اسلام کے مقابلے میں آج تک کوئی فتح نہیں پا سکا، چودہ سو سال کی تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ دلائل کے لحاظ سے اسلام وزنی ہے، اور کوئی شخص اس کے مقابلے میں نہیں آسکتا، یہ غلبہ تو اللہ تعالیٰ نے دے دیا۔ اور ایک ہے حسی غلبہ کہ اس کے مقابلے میں کسی کا اقتدار نہ رہے، یہ بھی معتد بہ درجے میں تقریباً ایک ہزار سال تک رہا، کہ سرورِ کائنات ﷺ کے بعد بہت تیزی کے ساتھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے زمانے میں بڑی بڑی حکومتیں ختم کردی گئیں، اور بڑی حکومتیں اس وقت دو ہی تھیں، ایک قیصر کی اور ایک کسریٰ کی، ایک رُوم کی اور ایک ایران کی، یہی دو حکومتیں تھیں جو خلفائے راشدین کے زمانے میں زیر ہوگئیں، اور باقی اپنے علاقوں میں معمولی معمولی ریاستیں چھوٹی چھوٹی بستیاں اگر تھیں تو اُن کی مسلمانوں کی حکومتوں کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں تھی۔ بالکل آپ اس طرح سمجھ لیجئے کہ جس طرح سے آج دُنیا کے اُوپر امریکا اور رُوس کا ڈنکا بج رہا ہے، اور اگر کوئی شخص اُن دونوں کو پاؤں کے نیچے دبا لے، ایک ٹانگ اُس کی رُوس پہ اور ایک امریکا پہ ہوجائے، ان دونوں پر غالب آجائے تو یوں سمجھو کہ ساری دُنیا پر غالب آگیا، کیونکہ ان دونوں کے مقابلے میں باقی حکومتوں کی کوئی حیثیت نہیں ہے، وہ تو ایسے ہیں چھوٹے چھوٹے معمولی معمولی، بڑے چوہدری تو یہی دونوں ہیں، اور اگر اِن کی ناک میں نکیل ڈالی جائے اور ان کو قابو میں لے لیا جائے تو یوں سمجھو کہ ساری دُنیا پہ تسلط ہوگیا۔ اسی طرح سے قیصر و کسریٰ کی حکومتیں توڑنے کے بعد جب مسلمانوں کا طول اور عرض کی بڑی بڑی حکومتوں پر قبضہ ہوا تو یوں سمجھو کہ مسلمانوں کے مقابلے میں کوئی دوسری طاقت نہیں تھی، ایک ہزار سال تک تقریباً مسلمانوں کی حیثیت یہی رہی، اس کے بعد پھر زوال شروع ہوا ہے اللہ تعالیٰ کی حکمت کے تحت، پھر برطانیہ کو عروج ہوا، ایک وقت ایسا تھا کہ برطانیہ کے مدِمقابل دُنیا کی کوئی حکومت نہیں تھی، اس کی بڑی قوت تھی، کہ سورج اس کی حکومت میں غروب نہیں ہوتا تھا، سوڈیڑھ سو سال برطانیہ کے اقتدار کا گزرا، اور یہ جنگ عظیم ثانی جو ہوئی تو اس سے برطانیہ کو زوال شروع ہوا، رُوس اور امریکا کی عمر تو پچاس پچپن سال ہے جب سے ان کو عروج ہوا ہے۔ جنگِ عظیم پہلی جو ہوئی تھی اُس کے بعد ٹرکی میں مسلمانوں کی خلافت کی قوت ٹوٹی ہے، اور اس کے بعد رُوس، امریکا اور اس قسم کی حکومتوں نے سر اُٹھایا، اور پھر برطانیہ کا زوال شروع ہوا، اور اب یعنی کوئی زیادہ سے زیادہ پینتیس یا چالیس سال سے دُنیا پر غلبہ امریکا اور رُوس کا ہے، برطانیہ کی اب کوئی حیثیت نہیں رہی، ورنہ اس سے پہلے برطانیہ سب پر غالب تھا۔ تو بہت تھوڑے زمانے سے یہ لوگ سامنے آئے ہیں۔

''اَقوامِ متحدہ'' میں دعوتِ اِسلام

اور ایک وقت ایسا آئے گا اب بھی، جس طرح سے آثار بڑی تیزی سے پیدا ہوتے جارہے ہیں، کہ یہ قوتیں پھر ٹوٹیں گی، اور ان شاء اللہ العزیز! دُنیا دیکھے گی کہ پھر کلمۃ الاسلام ہی ساری دُنیا پر حاوی ہوگا، اور یہ آثار بڑی تیزی کے ساتھ بنتے جارہے ہیں، جب ساری کی ساری دُنیا ایک کلمے پر اکٹھی ہوجائے گی، اور وہ کلمہ کلمۂ اِسلام ہوگا، تمہید تو اس کی شروع ہوگئی، اللہ تعالیٰ نے یہ اعزاز بھی پاکستان کے صدر کو بخشا کہ ''اقوامِ متحدہ'' میں جہاں ساری کی ساری دُنیا کے چنے ہوئے دماغ اکھٹے تھے، ساری دُنیا کے

نمائندے وہاں موجود تھے، یہ پہلا موقع ہے ساری تاریخ میں کہ وہاں کھڑے ہو کر اسلام کی دعوت اتنی جامعیت اور اتنے کھلے الفاظ کے ساتھ دی گئی ہو، اس سے پہلے ایسا موقع کوئی نہیں آیا، وہ تقریر اس جگہ ہوئی، پھر ریڈیو پر نشر ہوئی، ٹیلی ویژنوں پہ دکھائی گئی، تو اللہ تعالیٰ نے یہ اِتمام تو ساری دُنیا پر کھلے طور پر کر دیا، ہے تو پہلے بھی، ریڈیو میں قرآن پڑھا جاتا ہے، اور دوسری جگہ پڑھا جاتا ہے، سب کچھ ہے، لیکن اتنے شاندار طریقے سے اور اتنے اعلیٰ معیار پر یہ شرف پہلی دفعہ ہمارے صوفی ضیاء الحق صاحب کو حاصل ہوا ہے، اور وہ تقریر اس کی واقعی ایسے تھی جس طرح سے کوئی بہت بڑا مبلغ اسلام، اور بڑی جرأت کے ساتھ اور اپنے عقائد پر پوری پختگی کے ساتھ یقین رکھتا ہوا جس طرح سے پیش کرتا ہے، اس نے ''اقوامِ متحدہ'' کے سامنے اسلام کی دعوت اس طرح سے پیش کی ہے۔ اور اس طرح سے بات آگے آہستہ آہستہ بڑھے گی، لوگ سنیں گے، سوچیں گے، جس طرح وہاں بہتوں نے زبانی طور پر تعریف بھی کی، کہ بہت اچھی تقریر ہوئی، اور بڑے اچھے حقائق پیش کیے گئے۔ پھر اس نے غلافِ کعبہ کو بطور نشان کے پیش کیا ہے کہ یہ امن کا مذہب ہے، اور نشان کے طور پر غلافِ کعبہ جو پیش کیا وہ شیشے میں جڑا کر ''اَقوامِ متحدہ'' کے دفتر میں لگا دیا گیا۔ تو گویا کہ مرکز تک آواز بہت صاف الفاظ میں پہنچ گئی۔

کُفر دُنیا سے مکمل طور پر کب ناپید ہوگا؟

اب آگے تصادم شروع ہوگا، شکست و ریخت ہوگی، کہیں مسلمان نقصان اٹھائیں گے، کہیں کُفر کو نقصان پہنچے گا، کرتے کراتے نتیجہ اِن شاء اللہ العزیز! حضرت مہدی کے زمانے میں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں ایسا آجائے گا کہ کُفر اس دنیا سے بالکل ناپید ہو جائے گا، کُفر کی آواز کہیں باقی نہیں رہے گی، اور سارے کے سارے لوگ جتنے بھی اس وقت موجود ہوں گے (بڑے بڑے چوہدری تو آپس میں لڑ کر مر چکے ہوں گے، جب ان کی آپس میں جنگ چھڑے گی تو اس کے بعد تو یہ منٹوں میں جائیں گے، یہاں تو دیر ہی نہیں لگے گی) اور جو باقی رہ جائیں گے وہ سارے کے سارے اِن شاء اللہ العزیز! کلمۃ الاسلام کے تابع ہوں گے، پیش گوئیاں روایات کے اندر صراحت کے ساتھ موجود ہیں، اور آنے والا وقت اِن شاء اللہ! اس کے ایک ایک نقطے کو ثابت کر کے رہے گا، جس طرح سے حضور ﷺ کی باقی پیش گوئیاں آنے والے وقت کے متعلق ایک ایک ہو کے سچی ہو رہی ہیں، اسی طرح یہ بھی سچی ثابت ہو کر رہیں گی، وہاں پھر غلبہ حسی طور پر بھی نمایاں ہو جائے گا۔

یہود و نصاریٰ کے علماء کی باطل طریقے سے لوگوں کا مال کھانے کی صورتیں

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا: اب یہ بات کہی تو جا رہی یہود و نصاریٰ کی، لیکن خطاب کیا جا رہا ہے مسلمانوں کو۔ اے ایمان والو! اَحبار و رُہبان میں سے بہت سے اِنَّ کَثِیْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّھْبَانِ یہ بھی قرآنِ کریم کا انصاف ہے، کل اَحبار و رُہبان نہیں کہے، عیسائیوں اور یہودیوں کے سارے ہی مولوی، سارے ہی عالم، سارے ہی درویش باطل پرست اور حرام خور ہو گئے، ایسا نہیں کہا، کیونکہ انہی میں کچھ گنے چنے اہلِ حق بھی تھے، جو ان کی کتابوں سے اُن کے سامنے عقیدے تھے وہ اُن پر ثابت تھے، چنانچہ جب

رسول اللہ ﷺ تشریف لے آئے اور اُن کے سامنے حقیقت آ گئی جس کو وہ پہچانے بیٹھے تھے، تو فوراً قبول کرلیا، دیر ہی نہیں کی، جس طرح سے یہودیوں میں سے عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کا گروہ تھا، رسول اللہ ﷺ سے ایک ہی ملاقات ہوئی، جب پہچان گئے کہ جن کا ذکر کتابوں میں ہے یہ وہی ہیں، تو فوراً مسلمان ہو گئے، اور عیسائیوں میں سے نجاشی تھا، اور اس قسم کے دوسرے لوگ، کہ جس وقت اُن کے سامنے حقیقت آئی تو فوراً انہوں نے قبول کرلی، اس لیے سارے ایسے نہیں تھے، کثیر کا لفظ بولا ہے کہ بہت سارے ایسے ہیں۔ اَحبار: علماء۔ رُھبان: درویش۔ علماء اور درویشوں میں سے بہت سارے لوگ لَيَأْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ لوگوں کے مال غلط طریقے سے کھا رہے ہیں، انہوں نے دنیا کو مقصود بنا لیا ہے، اور مال سمیٹنے کے لیے انہوں نے مختلف قسم کے دھندے ایجاد کرلیے ہیں، باطل طریقے سے مال کھاتے ہیں، باطل طریقے سے کھانا کیسے تھا؟ رشوتیں لے کر مسئلے غلط بتاتے تھے، مثلاً کوئی چلا گیا کہ میں یوں کرنا چاہتا ہوں تو کہتے کہ اتنے پیسے دے دو، فتویٰ ہم لکھ دیتے ہیں، پیسے لیے اور غلط فتویٰ لکھ دیا، یہ بھی حرام خوری ہے۔ اور پھر سب سے آسان طریقہ حرام خوری کا جو ان لوگوں نے ایجاد کیا ہوا ہوتا ہے وہ ہے رسوم کی ایجاد، فلاں موقع پر تم اتنا دو، فلاں موقع پر اتنا دو، تو تمہیں آخرت میں یہ ثواب ملے گا، فلاں موقع پر اتنا دو تو یہ ملے گا، عیسائیوں کے پادریوں نے تو خاص طور پر یہ گویا کہ براءت نامے لکھنے شروع کردیے تھے کہ ہمارے پاس آؤ، اور آکر اپنے گناہ کا اعتراف کرو کہ ہم نے یہ گناہ کیا ہے، تو ہم معافی نامہ لکھ دیں گے، اور اتنی فیس ہوگی، اور اللہ کی طرف سے یوں سمجھو کہ معافی ہوگئی، اس طرح سے لوگوں کو جہالت میں ڈال کر لوگوں کے ذہن پہ مسلط ہو کے انہوں نے یہ طریقے ایجاد کیے ہوئے تھے۔

اُمتِ محمدیہ میں یہود و نصاریٰ کی بیماریاں

اور سرورِ کائنات ﷺ نے فرمایا کہ میری اُمت یہود و نصاریٰ کے طریقے پر چلے گی، اور اتنی ان میں آپس میں مطابقت ہوگی جس طرح سے ایک جُوتا دوسرے کے مطابق ہوتا ہے، اور روایات میں آتا ہے، یعنی مطابقت میں کمالِ مشابہت کو بیان کرنے کے لیے حضور ﷺ نے فرمایا کہ اگر ان (یہود و نصاریٰ) میں کوئی شخص ایسا ہوگا جو گوہ کے سوراخ میں گھسا ہوا ہوگا، تو میری اُمت میں بھی ایسے لوگ ہوں گے جو اُن کے پیچھے گوہ کی کھُڈ میں گھسیں گے۔[1] بلکہ یہاں تک فرمایا اگر ان لوگوں کے اندر اگر کوئی شخص ایسا ہوگا جو اپنی ماں سے زِنا کرتا ہوگا تو میری اُمت میں بھی ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو اس طرح سے اپنی رُوسیاہی کریں گے،[2] اتنا حضور ﷺ نے زور دے کر فرمایا کہ اُمت ان طریقوں پر چلے گی جن پر پہلے لوگ چلے ہیں۔

راہِ حق کی نشاندہی

جس طرح سے وہ ایک روایت آتی ہے کہ بنی اسرائیل کے تو بہتر ہی فرقے ہوئے تھے، اور میری اُمت کے تہتر ہوں

(۱) بخاری ۱/۴۹۱، باب ما ذکر عن بنی اسرائیل۔ مشکوٰۃ ۲/۴۵۸، باب تغیر الناس۔ ولفظه: حَتّٰی لَوْ سَلَكُوْا جُحْرَ ضَبٍّ لَسَلَكْتُمُوْهُ۔

(۲) ترمذی ۲/۹۳، باب ما جاء فی افتراق ھذہ الامۃ۔ مشکوٰۃ ص ۳۰، باب الاعتصام، فصل ثانی۔ حَتّٰی اِنْ كَانَ مِنْهُمْ مَنْ اَتٰی اُمَّهٗ عَلَانِيَةً لَكَانَ فِيْ اُمَّتِيْ مَنْ يَصْنَعُ ذٰلِكَ۔

گے، اور بہتر اس وجہ سے کہ بہتر تو بہتر کے مطابق ہو گئے جو گمراہی کی طرف چلے گئے، اور یہاں ہمیشہ اہلِ حق کا ایک ٹولہ موجود رہے گا وہ تہترواں فرقہ ہے، جب رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا کہ وہ کون لوگ ہیں؟ تو فرمایا کہ "مَآ اَنَا عَلَيْهِ وَاَصْحَابِي"[1] جو میرے طریقے پر اور میرے صحابہ کے طریقے پر چلنے والے ہیں، یہ ہے ناجی گروہ، یہ ہے اہلِ حق کا ٹولہ، اور جو اس طریقے سے ہٹتے چلے جائیں گے، مختلف راہیں اختیار کرتے چلے جائیں گے، اُن کی مثال یہود ونصاریٰ جیسی ہوگی، "مَآ اَنَا عَلَيْهِ" یہ ہے سُنّت، "وَاَصْحَابِي" یہ ہے جماعت، تو اس لیے ہم جو "اہل السنۃ والجماعۃ" کا لفظ استعمال کرتے ہیں وہ اسی حدیث سے ماخوذ ہے۔ "اہل السنۃ والجماعۃ" کون لوگ ہیں؟ جو سرورِ کائنات ﷺ کے طریقے کو اور صحابہ کرام کے طریقے کو اپناتے ہیں۔ "اہل السنۃ والجماعۃ" کا یہ معنی ہے۔ تو "اہل السنۃ والجماعۃ" وہ ہیں جو اپنے طرزِ عمل کو سُنّت اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے طریقے کے مطابق رکھتے ہیں، تو یہ تو ہیں نجات پانے والے، باقی بہتر کے بہتر فرقے ویسے ہی ہوں گے جیسے یہود ونصاریٰ نے مختلف راہیں نکال لیں، ان کی بھی مختلف راہیں ہوں گی۔

"قبوری شریعت" ایک مستقل فتنہ

اب اس چیز کو سامنے رکھ کے اگر ان قبروں کا، یا "قبوری شریعت" کا مطالعہ کریں، یہ "قبوری شریعت" ایک مستقل شریعت ہے، یہ قبروں سے متعلق جو لوگوں نے عقیدے بنا لیے، اور وہاں جو گدی نشین بیٹھے ہوئے ہیں، انہوں نے کیسے کیسے نظریے چھوڑے ہوئے ہیں، کہ فلاں تاریخ کو گائے دو گے تو یہ کام ہو جائے گا، اگر فلاں تاریخ کو دودھ لے کر آؤ گے تو یہ ہو جائے گا، اگر دودھ نہیں دو گے تو تمہاری بھینس خراب ہو جائے گی، اور اسی طرح سے چادر چڑھائی جائے تو یہ فائدہ ہوتا ہے، اور یہ کیا جائے تو یہ فائدہ ہوتا ہے۔ آئے دِن وہاں نذرانوں کے ڈھیر جو لگتے جا رہے ہیں وہ انہی غلط نظریوں کے نتیجے میں ہیں جو لوگوں کے ذہنوں میں ڈال دیے گئے، اور اپنے معتقدین کو سمجھا دیے گئے، اس لیے وہ معتقدین اپنی جہالت کی وجہ سے پٹ رہے ہیں، لُٹ رہے ہیں، محنت کے ساتھ کماتے ہیں، اور پیر کے ہاں چڑھاوا ضرور چڑھائیں گے، ورنہ اُن کو یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ ہمارا کوئی نقصان ہو جائے گا، ہم برباد ہو جائیں گے، سالانہ بکرے جاتے ہیں، کپڑے جاتے ہیں، سونے چاندی کے ڈھیر وہاں لگتے ہیں، یہ سب اَکل بالباطل ہے اور حرام طریقے سے کھاتے ہیں۔ جب ایک رسم ایسی ایجاد کر دی گئی جس کا ذکر قرآن وحدیث میں نہیں ہے، تو اس رسم کے انداز سے جو شخص بھی وصول کر کے کھائے گا (یہ اَکل بالباطل ہے)، مثلاً اب یہ کہہ دیا گیا کہ مُردے کے لئے ضروری ہے کہ قل خوانی کے اندر اتنے چھوارے ہوں، اتنے چھولے ہوں، اتنا فلاں کچھ ہو، اتنا فلاں کچھ ہو تب اس کی جان چھوٹے گی ورنہ جان نہیں چھوٹے گی، حالانکہ اس کی کوئی اصلیت نہیں، تو اس بہانے کے ساتھ مولوی کے پیٹ میں اور اس "لیٹر بکس" میں جو کچھ آئے گا وہ سارے کا سارا اَکل بالباطل ہے۔ تو یہ حرام خوری کے طریقے ہیں، یہ علماء اور درویشوں نے سب نے جاری کیے ہوئے تھے، اب خانقاہوں میں بیٹھنے والے اور قبروں پہ بیٹھنے والے یہ عیسائیوں اور یہودیوں کے رُہبان کا مصداق ہیں، اور یہ غلط مسئلے

---

(۱) ترمذی ۲/۹۳، باب ما جاء فی افتراق ھذہ الامۃ/ مشکوۃ ۱/۳۰، باب الاعتصام، فصل ثانی۔

بتانے والے اور لوگوں کو خواہ مخواہ غلط فہمیوں کے اندر ڈال کر قوم کو لڑا کے اپنا الو سیدھا کرنے والے یہ سارے یہود اور نصاریٰ کے اَحبار کی مثال ہیں، اور اس قسم کے طریقے دُنیا کے اندر چلتے رہتے ہیں۔

(یہاں کسی کے سوال پر فرمایا)..... علماء اور مشائخ حق بھی ہوتے ہیں، وہ بھی سارے ایسے نہیں تھے، یہاں بھی سارے ایسے نہیں ہیں، تو خانقاہیں اور مدرسے صحیح بھی ہیں، جہاں اللہ اور اللہ کے رسول کے اَحکام کی تلقین ہوتی ہے، عمل کی تلقین ہوتی ہے، لیکن یہ جو قبریں بنا کے بیٹھ گئے، اور قبروں کے چڑھاووں پر جن کے گزارے ہیں، وہاں کون سا اللہ کا نام اُجاگر کیا جاتا ہے؟ وہ تو سب یہود و نصاریٰ کی طرح ہیں، ان (یہود اور نصاریٰ) کے حالات سمجھنے کے لیے ان کا دیکھ لینا کافی ہے، پھر تو انہوں نے طریقے ایسے ایسے ایجاد کر لیے کہ جہالت کا اِستحصال عجیب طریقے سے کرتے ہیں۔

باطل طریقے سے لوگوں کا مال کھانے پر ایک عجیب لطیفہ!

حضرت تھانوی ؒ نے اپنے وعظ کے اندر ایک لطیفہ بیان کیا ہوا ہے، کہ ایک مولوی ایک مسجد میں رہتا تھا، اور لوگ اُس کو ختم پہ بُلایا کرتے تھے، جو کچھ انہوں نے اپنے مُردوں کو دینا ہوتا تھا وہ اسی مولوی صاحب کو دے دیتے، مولوی صاحب خوب اچھی طرح سے عیش کرتا تھا۔ ایک دفعہ کوئی درویش آ کر اُس مسجد میں ٹھہر گیا، اور کسی نے ختم پڑھوانا تھا، وہ بُلانے کے لئے آئے، مولوی صاحب تھے نہیں، وہ اس درویش کو لے گئے، تو اُس نے جا کر ختم پڑھ دیا، جب مولوی کو پتا چلا کہ یہ تو اس سے ختم پڑھوالیا تو اُس کو فوراً خیال ہوا کہ اگر لوگ اس طرح سے کرنے لگ گئے، کہ اوروں کو بُلا بُلا کے ختم پڑھانے لگ گئے تو میرا تو کام خراب ہو جائے گا، کہتے ہیں کہ مسجد میں آ کر وہ اس طرح سے جس طرح سے کسی کے ساتھ لڑ رہا ہو، کبھی اُس کونے میں بھاگتا ہے، کبھی ادھر بھاگتا ہے، کبھی ڈنڈا اُٹھا کر مارتا ہے، کبھی چیختا ہے، کبھی چلاتا ہے، کبھی گرتا ہے کبھی اُٹھتا ہے، تو اُس نے سارے کا سارا مسجد میں اُودھم مچادیا، جب اُودھم مچایا تو لوگ اکٹھے ہو گئے کہ مولوی صاحب! کیا ہو گیا؟ کہتا ہے کہ کیا ہو گیا، بس چھوڑو، میری تو جان جانے لگی ہے، میں یہاں نہیں رہتا، انہوں نے کہا کہ بتاؤ تو سہی، آخر کیا بات ہے؟ کہنے لگا: بات کیا بتاؤں، میں اتنے دنوں سے تمہارے ہاں رہتا ہوں، مجھے پتا ہے کہ کس کا مُردہ ہے، کیا اُس کا نام ہے، کیسے اُس کو چیز بھیجنی ہے، کس چیز کی اُس کو ضرورت ہے، میں تو ہر ایک کو اس کا حصہ پہنچا دیتا ہوں، یہ ایک نیا آدمی آیا ہوا تھا، پتا نہیں اس نے ثواب کس کو پہنچایا، کس کو نہیں پہنچایا، سارے مُردے میرے ساتھ لڑ رہے ہیں، اب مجھ سے یہ مصیبت برداشت نہیں ہوتی، وہ کہنے لگے، نہیں! مولوی صاحب! آئندہ کے لئے ہماری توبہ، جو کچھ کرنا کرانا ہوگا تمہاری وساطت سے ہی کیا جائے گا، آپ یہیں رہ جائیں۔ اب کیا یہ اَکل بالباطل نہیں؟ کہ لوگوں کے ذہن میں یہ ڈال دیا کہ جب تک مجھے نہیں دو گے اس وقت تک تمہارے مُردوں کو صحیح نہیں پہنچے گا، اب اس قسم کے نظریات لوگوں کے ذہن میں ڈال کر جو بھی وصول کرتا ہے وہ سب اَکل بالباطل ہے، صحیح بنیاد پر نہیں ہے، اپنی طرف سے نظریات بنا لیے، اور اُس کو آمدنی کا ذریعہ بنا لیا، لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ کے یہ سارے طریقے ہیں۔ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ: اور اللہ کے راستے سے روکتے ہیں، یعنی لوگوں کا مال کھاتے ہیں، اور اُلٹا اُن کو گمراہی کی طرف لے جاتے ہیں، یہ نہیں کہ اُن سے پیسے لیں تو ان کو بات صحیح

بتادیں، صحیح بات نہیں بتاتے، اللہ کے راستے سے روکتے اس لیے ہیں کہ اگر یہ لوگ اللہ کے راستے پر سیدھے چل پڑے تو ہماری آمدنی بند ہو جائے گی۔

ادائیگیٔ زکوٰۃ نہ کرنے پر وعیدِ سخت

اب انہی لوگوں کے متعلق وعید ہے کہ جو باطل طریقے سے مال جمع کرتے ہیں، حرام خوری کرتے ہیں، اصل مصداق تو ان الفاظ کا وہی یہود و نصاریٰ ہیں۔ وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ: جو لوگ سونے چاندی کو جمع کر کر کے زمین میں گاڑ کے رکھتے ہیں وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ: ''اور اس کو اللہ کے راستے میں خرچ نہیں کرتے، ان کو دردناک عذاب کی بشارت دیجیے، جس دن اس سونے چاندی کو ان پہ تپایا جائے گا جہنم کی آگ میں، پھر داغا جائے گا اس کے ذریعے سے ان کی پیشانیوں کو اور ان کے پہلوؤں کو اور ان کی کمروں کو، اور کہا جائے گا کہ یہ وہ چیز ہے جس کو تم جمع کر کر کے زمین میں گاڑتے تھے اپنے نفسوں کے لیے، آج اپنے گاڑنے کا مزہ چکھو، یا اپنے گاڑے ہوئے، دبائے مال کا مزہ چکھو!'' یہ آیات اس موقع پر، ہیں تو یہود و نصاریٰ کے متعلق ہی، جو غلط طریقے سے مال کو جمع کرتے تھے، اور غلط طریقے سے اُس کو کھاتے تھے، اللہ کے راستے میں خرچ نہیں کرتے تھے۔ لیکن انداز ایسا اپنایا گیا جو عموم کے طور پر مسلمانوں پہ بھی صادق آئے گا، کہ جو یہ طریقہ اپنائے کہ سونا چاندی کو جمع کر کر کے رکھتا ہے اور اللہ کے راستے میں خرچ نہیں کرتا، تو وہ بھی اسی طرح سے معذب ہوگا، اللہ کی طرف سے اُس کو اسی طرح سے عذاب دیا جائے گا۔ اسی لیے جس وقت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے یہ آیت سنی تو اُن پر یہ آیت ذرا گراں گزری جیسے حدیث شریف میں آتا ہے، وہ گراں اس لیے گزری کہ اس میں تو یہ کہہ دیا گیا کہ سونا چاندی کو جمع کر کے زمین میں دبا کے رکھنا عذاب کا ذریعہ ہے، اور ہر شخص اپنی ضرورت کے لیے کچھ نہ کچھ پیسے بچا کے رکھتا ہے، ہمارے ہاں بینک میں جمع کرا دیتے ہیں، اور ان دنوں میں چونکہ بینک نہیں تھے تو کسی گڑھے میں ڈال کر زمین میں دفن کر دیتے تھے، اور آیت کے ظاہر سے معلوم ہوتا ہے کہ بالکل جمع کر کے رکھنا جائز نہیں ہے، اور جو جمع کر کے رکھے گا اُس کو آخرت میں عذاب ہوگا، اس لیے اس آیت کو سُن کر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کچھ گھبرائے، اُن کی گھبراہٹ اور اُن کے ذہن میں اشکال آنا یہ خود اس بات کی دلیل ہے، کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس آیت کو مسلمانوں کے متعلق بھی سمجھا، یہ صرف اہلِ کتاب کے متعلق نہیں ہے، اگرچہ سلسلۂ کلام اہلِ کتاب کے متعلق ہی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرمانے لگے کہ اس مشکل کو میں حل کرتا ہوں، سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تشریف لے گئے، اور جا کر پوچھا کہ یا رسول اللہ! یہ آیت تو آپ کے صحابہ پہ بڑی گراں گزر رہی ہے، کہ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ گھر میں سونا چاندی رکھنا بالکل ہی ٹھیک نہیں، بس اس کو اللہ کے راستے میں خرچ کرنا چاہیے، ورنہ یہ عذاب کا ذریعہ بن جائے گا۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نہیں! اللہ نے زکوٰۃ کو اس لیے فرض کیا ہے تاکہ ماقی تمہارے لیے حلال ہو جائے، اور اللہ تعالیٰ نے میراث کا دستور جو جاری جو کیا ہے وہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ جمع کر کے رکھنا ٹھیک ہے، اگر کوئی جمع کر کے نہیں رکھے گا تو وراثت میں کیا تقسیم ہوگا، اور زکوٰۃ اللہ تعالیٰ نے اسی لیے فرض کی ہے تاکہ باقی ماندہ مال تمہارے لیے حلال

ہوجائے۔[1] اسی سے اخذ کر کے وہ ایک فقرہ مشہور ہے: ''مَا اُوتِيَتْ زَكَاتُهٗ فَلَيْسَ بِكَنْزٍ'' کہ جس سونا چاندی سے زکوٰۃ ادا کردی جائے وہ کنزِ مذموم نہیں ہے،[2] جس کی وعید اس آیت میں آئی ہوئی ہے، اگر کوئی شخص زکوٰۃ بھی ادا نہیں کرتا تو ایسی صورت میں اس کا جمع کیا ہوا مال اُس کے لیے باعثِ وبال بنے گا۔

زکوٰۃ کے علاوہ دیگر واجب اِخراجات

لیکن یہ ایک عمومی عنوان ہے، جس وقت عام حالات کے تحت دیکھا جائے تو شریعت کے اندر یہ مسئلہ منقّح ہے، قرآنِ کریم کے اندر بھی اور احادیث کے اندر بھی، کہ انسان کے اوپر خرچ صرف زکوٰۃ کے طور پر ہی فرض نہیں بلکہ کچھ مصارف اور بھی ہیں، مثلاً جن اہل وعیال کا نفقہ اس کے ذمہ ہے وہ نفقہ دینا فرض، اگر یہ نفقہ نہیں دے گا تو بھی اسی قسم کا عذاب ہوگا، اور دوسرے صدقات واجب ہوگئے، صدقۃ الفطر ہے، قربانی ہے، اسی طرح سے حج اگر فرض ہوگیا تو حج کے اندر صرف ہے، اب وہ پیسوں میں بخل کرتا ہوا صرف زکوٰۃ تو دیتا ہے، لیکن حج کے مصارف برداشت نہیں کرتا، قربانی کا خرچ برداشت نہیں کرتا، صدقۃ الفطر ادا نہیں کرتا، تو بھی اس کے لیے یہی وعید ہے۔ اور اس سے بڑھ کر قومی اور دینی ضرورتیں اس قسم کی آجایا کرتی ہیں موقع محل کے مطابق، جن میں خرچ کرنا فرض ہوجاتا ہے، ایک آدمی بھوکا مر رہا ہے اور آپ کے پاس ضرورت سے زائد کھانا ہے، تو اُس کو دینا آپ کے ذِمّے فرض ہے، جیسے حضور ﷺ نے فرمایا کہ وہ شخص مؤمن نہیں جو خود پیٹ بھر کے کھائے اور اُس کا پڑوسی بھوکا پڑا ہوا ہو۔[3] قومی ضرورتیں پیش آجاتی ہیں، کہ اگر اس وقت لوگ بخل کریں اور پیسہ خرچ نہ کریں تو قوم کی قوم برباد ہوتی ہے، دِینی ضرورتیں اس قسم کی پیش آجاتی ہیں کہ اگر لوگ اس میں خرچ ہی نہیں کریں گے تو دِین کی نشر واشاعت بند ہوتی ہے، یہ بھی فرض ہیں، اور یہ فرض ہوتے ہیں مختلف حالات کے تحت، تو جو شخص اس قسم کے فرض ادا کرنے میں کوتاہی کرے گا، وہ اسی طرح سے جمع شدہ مال کی وجہ سے عذاب میں مبتلا ہوگا۔ لیکن ایک قطعی اور دائمی فرض چونکہ زکوٰۃ ہے اس لیے عنوان زکوٰۃ کا اختیار کرلیا جاتا ہے، کہ زکوٰۃ دیتے رہو تو ایسی صورت میں جمع کیا ہوا مال تمہارے لیے وبال نہیں ہوگا، لیکن فرض صرف زکوٰۃ ہی نہیں، موقع محل کے مطابق اس میں عموم ہے، اس لیے اگر حکومت کوئی قومی ضرورت سمجھتی ہے، اور دینی اشاعت کے لیے کسی قسم کی ضرورت سمجھتی ہے، تو دولت مند طبقوں پر فرض ہے کہ اس سلسلے میں چندہ دیں اور تعاون کریں، اگر تعاون نہیں کریں گے اور دین کو نقصان پہنچے گا یا قوم کو نقصان پہنچے گا، تو یہ مال ان کے لیے اسی طرح سے وبال بنے گا جس طرح سے زکوٰۃ ادا نہ کرنے کی صورت میں وبال ہے۔ تو حاصل اس کا یہ ہوا کہ جتنے مالی فرائض انسانوں پر عائد ہوتے ہیں اُن کو ادا کرتا رہے، اور اُن کو ادا کرنے کے بعد پھر اگر کچھ بچ جاتا ہے اور گھر کے اندر پڑا رہ جائے، تو ایسی صورت میں وہ عذاب کا ذریعہ نہیں، اگرچہ یہ اعلیٰ معیار بھی نہیں۔

---

(۱) سنن ابی داؤد ا/ ۲۳۴ باب فی حقوق المال/ مشکوٰۃ ج ا ص ۱۵۶ عن ابن عباسؓ۔ کتاب الزکوٰۃ۔

(۲) ابوداؤد ا/ ۲۱۸ باب الکنز ما ھو مشکوٰۃ ا/ ۱۶۰ باب ما یجب فیہ الزکاۃ پر حدیث ہے: مَا بَلَغَ اَنْ تُؤَدّٰی زَكَاتُهٗ فَزُكِّيَ فَلَيْسَ بِكَنْزٍ

(۳) شعب الایمان، رقم ۳۱۱۷۔ مشکوٰۃ ۲/ ۴۲۴ باب الشفقۃ فصل ثالث۔ ولفظ الحدیث: لَيْسَ الْمُؤْمِنُ بِالَّذِي يَشْبَعُ وَجَارُهٗ جَائِعٌ اِلٰى جَنْبِهٖ

مال جمع کرنے اور نہ کرنے میں سُنّت طریقہ

اعلیٰ معیار یہی ہے سرورِ کائنات ﷺ کی سنت کی طرف دیکھتے ہوئے، کہ ضرورت پوری کرو، باقی مال جمع کرکے گاڑ کے نہ رکھو، بلکہ اس کو آگے چلتا کرو، جتنا چلتا ہوگا اتنا ہی وہ صاف ستھرا رہے گا، اور اتنا ہی دوسرے لوگوں کے لیے باعثِ راحت بنے گا، اور اپنے لیے بھی باعثِ راحت بنے گا، جتنا جمع ہو کے ایک جگہ ٹھہرنا شروع ہو جائے گا اتنا ہی یہ وبالِ جان بن جائے گا، مال کے جمع کرنے کی شریعت میں حوصلہ افزائی نہیں کی گئی، اگرچہ مالی فرائض کے ادا کرنے کے بعد ہی بچا ہوا ہو تو بھی قابلِ تعریف نہیں ہے، اگرچہ بعض صورتوں کے اندر جائز قرار دے دیا گیا۔ تو اب اس آیت کا مفہوم یہی ہوگا، اس لیے وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ کا لفظ ہے، جہاں فی سبیل اللہ خرچ کرنا ضروری ہو جائے گا اور آپ لوگ خرچ نہیں کریں گے، اور مال آپ کے پاس موجود ہوگا، تو ایسے وقت میں وہ مال وبالِ جان ہے، جس میں زکوٰۃ بھی شامل ہے، صدقاتِ واجبہ بھی شامل ہیں، قومی ضرورتیں اور دینی ضرورتیں جتنی پیش آجایا کرتی ہیں وہ ساری کی ساری اس میں شامل ہیں، اگر ان کے اندر کوتاہی ہوگی، اور مال کی محبت میں مال کو جمع کرکے گاڑ گاڑ کے رکھو گے، اور ان ضرورتوں کے اندر صرف نہیں کرو گے تو یہ ساری کی ساری وعید آئے گی۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ
بے شک مہینوں کی گنتی اللہ کے نزدیک بارہ ہے اللہ کی کتاب میں
يَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ مِنْهَآ اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ۭ
جس دِن اُس نے پیدا کیا آسمانوں کو اور زمین کو، اُن بارہ میں سے چار حُرمت والے مہینے ہیں،
ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ڏ فَلَا تَظْلِمُوْا فِيْهِنَّ اَنْفُسَكُمْ
یہی سیدھا دِین ہے، پس تم ظلم نہ کیا کرو ان مہینوں کے بارے میں اپنے نفسوں پر،
وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَاۗفَّةً كَمَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ كَاۗفَّةً ۭ
اور لڑو سب مشرکین سے جس طرح سے وہ تم سب سے لڑتے ہیں،
وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ۝ اِنَّمَا النَّسِيْۗءُ زِيَادَةٌ فِي الْكُفْرِ يُضَلُّ
اور یقین کرلو کہ بے شک اللہ تعالیٰ متقین کے ساتھ ہے ۝ مہینوں کو مؤخر کردینا کُفر میں زیادتی ہے، گمراہ کیا جاتا ہے

بِهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُحِلُّوْنَهٗ عَامًا وَّيُحَرِّمُوْنَهٗ

اس کے ذریعے سے اُن لوگوں کو جنہوں نے کفر کیا، حلال قرار دیتے ہیں اس مہینے کو کسی سال اور حرام قرار دیتے ہیں اُس مہینے کو

عَامًا لِّيُوَاطِـُٔوْا عِدَّةَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ فَيُحِلُّوْا مَا

کسی سال تاکہ موافقت کریں وہ اللہ تعالیٰ کے حرام ٹھہرائے ہوئے مہینوں کی تعداد کی، پس حلال ٹھہراتے وہ اُس مہینے کو جس کو

حَرَّمَ اللّٰهُ ؕ زُيِّنَ لَهُمْ سُوْٓءُ اَعْمَالِهِمْ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۳۷﴾

اللہ نے حرام ٹھہرایا، مزین کردیے گئے ان کے لیے ان کے بُرے اعمال، اور اللہ تعالیٰ ہدایت نہیں دیتا کافر لوگوں کو ﴿۳۷﴾

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَا لَكُمْ اِذَا قِيْلَ لَكُمُ انْفِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ

اے ایمان والو! تمہیں کیا ہوگیا جب تمہیں کہا جاتا ہے اللہ کے راستے میں نکلو

اثَّاقَلْتُمْ اِلَى الْاَرْضِ ؕ اَرَضِيْتُمْ بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا مِنَ الْاٰخِرَةِ ۚ

تو تم زمین کی طرف بوجھل ہوئے جاتے ہو، کیا تم راضی ہوگئے دُنیوی زندگی پر آخرت کے مقابلے میں؟

فَمَا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا قَلِيْلٌ ﴿۳۸﴾ اِلَّا تَنْفِرُوْا

نہیں ہے دُنیوی زندگی آخرت کے مقابلے میں مگر بہت تھوڑی سی ﴿۳۸﴾ اگر تم نہیں نکلوگے

يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۙ وَّيَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوْهُ

تو اللہ تعالیٰ تمہیں دردناک عذاب دے گا، اور تمہارے بدلے میں لے آئے گا تمہارے علاوہ اور لوگوں کو، اور تم اُس اللہ کو کچھ بھی نقصان

شَيْـًٔا ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۳۹﴾ اِلَّا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ

نہیں پہنچا سکوگے، اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے ﴿۳۹﴾ اگر تم اُس رسول کی مدد نہیں کروگے پس تحقیق اُس کی تو اللہ

اللّٰهُ اِذْ اَخْرَجَهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثَانِيَ اثْنَيْنِ اِذْ هُمَا فِي الْغَارِ

مدد کرچکا جبکہ نکال دیا تھا اُس کو کافروں نے اس حال میں کہ یہ رسول دو میں سے ایک تھا، جبکہ وہ دونوں غار میں تھے

اِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا ۚ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ

جبکہ وہ رسول اپنے ساتھ والے سے کہہ رہا تھا غم نہ کر بے شک اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے، پھر اُتارا اللہ نے

سَكِيْنَتَهٗ عَلَيْهِ وَاَيَّدَهٗ بِجُنُوْدٍ لَّمْ تَرَوْهَا وَجَعَلَ كَلِمَةَ

اپنا اطمینان اس رسول پر اور اُسے قوت پہنچائی ایسے لشکروں کے ذریعے سے جن کو تم نے نہیں دیکھا اور کردیا اللہ تعالیٰ نے کافروں

الَّذِيْنَ كَفَرُوا السُّفْلٰى ؕ وَكَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۴۰﴾

کی بات کو نیچی، اور اللہ کی بات ہی اُونچی ہے، اللہ تعالیٰ زبردست ہے حکمت والا ہے ﴿۴۰﴾

خلاصہ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ: بے شک مہینوں کی گنتی (شهور شهر کی جمع، شهر مہینے کو کہتے ہیں) بے شک مہینوں کی گنتی اللہ کے نزدیک بارہ ہے فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ: اللہ کی تحریر میں، اللہ کی کتاب میں، يَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ: جس دِن اس نے پیدا کیا آسمان کو اور زمین کو، زمین وآسمان کے پیدا کرنے کے دِن اللہ تبارک وتعالیٰ کے نزدیک مہینوں کی تعداد بارہ قرار پائی، اور یہی بات اس کی کتاب میں درج ہے لوحِ محفوظ میں درج ہے، یا، اللہ کے قانون میں اللہ کے نزدیک مہینوں کی تعداد بارہ ہے، اور یہ تعداد اس دِن قرار پائی جس دن کہ اللہ تعالیٰ نے زمین وآسمان کو پیدا کیا، یعنی اس کا ظہور اس وقت ہوا، ورنہ اللہ کے علم میں تو زمین وآسمان کے پیدا کرنے سے پہلے ہی تھی، عملاً ظہور اس کا اس وقت ہوا جب زمین وآسمان پیدا کردیے اور اس کے بعد یہ اوقات کا حساب شروع ہوا تو اس وقت یہ بات ظاہر ہوگئی، ورنہ اللہ تعالیٰ کے علم میں تو ازل سے ابد تک یہ بات تھی، مِنْهَآ اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ: ان بارہ مہینوں میں سے چار حرمت والے مہینے ہیں، حُرم یہ حرام کی جمع ہے اور مراد ہے حرمت والے مہینے، ''ان بارہ میں سے چار حرمت والے مہینے ہیں'' ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ: یہی سیدھا دین ہے، دُرست دین ہے، فَلَا تَظْلِمُوْا فِيْهِنَّ اَنْفُسَكُمْ: پس تم ظلم نہ کیا کرو اُن مہینوں کے بارے میں اپنے نفسوں پر، اگر ''هِنَّ'' کی ضمیر بارہ مہینوں کی طرف لوٹائیں، ''پھر بارہ مہینوں کے بارے میں اپنے نفس پر ظلم نہ کرو'' یعنی ان میں گڑبڑ کرکے، اور اگر ''هِنَّ'' کی ضمیر اَرْبَعَةٌ کی لوٹ جائے چار مہینے جو اشہرِ حُرم ہیں (تو مطلب ہوگا) ''ان چار مہینوں میں اپنے نفسوں پر ظلم نہ کرو'' یعنی ان کے اَحکام کی مخالفت کرکے، ان کے آداب کی خلاف ورزی کرکے، وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً: كَآفَّةً یہ قَاتِلُوا کی ضمیر سے حال واقع ہے، اور یہ الْمُشْرِكِيْنَ سے بھی حال واقع کیا جاسکتا ہے، ''لڑو سب مشرکوں سے'' كَمَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ كَآفَّةً: جس طرح سے وہ تم سب سے لڑتے ہیں، جماعتی طور پر مشرکین یعنی مشرکین جماعت کے طور پر ان کے ساتھ لڑو، سب مشرکوں کے ساتھ لڑو، جس طرح سے وہ تم سب سے لڑتے ہیں، وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ: اور یقین کرلو کہ بے شک اللہ تعالیٰ متقین کے ساتھ ہے۔ اِنَّمَا النَّسِيْٓءُ زِيَادَةٌ فِي الْكُفْرِ: نَسِيْءٌ یہ نَسَأً سے ہے، مؤخر کرنے کے معنی میں، پیچھے ہٹانا، چنانچہ آپ کے ہاں بھی نقد ونسیئہ یہ دو لفظ استعمال کرتے ہیں، نقد کے مقابلے میں نسیئہ کا لفظ اُدھار کا مفہوم ادا کرتا ہے، تو یہ فعیل کا وزن ہے، مصدری معنی بھی ادا کرتا ہے اور مفعول کا معنی بھی ادا کرتا ہے، یہاں ترجمہ مصدر کے ساتھ زیادہ صاف ہے، اور النَّسِيْٓءُ پر الف لام عوضِ مضاف الیہ ہے نَسِيْءُ الشُّهُوْرِ، یا، نَسِيْءُ الشَّهْرِ، کسی مہینے کا مؤخر کردینا، یا،

مہینوں کو مؤخر کر دینا یہ کفر میں زیادتی ہے، يُضَلُّ بِهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا: گمراہ کیا جاتا ہے اس نَسِیء کے ذریعے سے ان لوگوں کو جنہوں نے کفر کیا، يُحِلُّوْنَهٗ عَامًا: "ہٗ" ضمیر شہر کی طرف لوٹ رہی ہے جس پر النَّسِیْءُ کا لفظ دلالت کر رہا ہے، "حلال قرار دیتے ہیں اس مہینے کو کسی سال" وَّيُحَرِّمُوْنَهٗ عَامًا: اور حرام قرار دیتے ہیں اس مہینے کو کسی سال، لِّيُوَاطِـُٔوْا عِدَّةَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ: تاکہ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ کی تعداد کو موافق کر لیں، تاکہ موافقت کریں وہ اللہ تعالیٰ کے حرام ٹھہرائے ہوئے مہینوں کی تعداد کی، گنتی کی، فَيُحِلُّوْا مَا حَرَّمَ اللّٰهُ: پس حلال ٹھہراتے ہیں وہ اس مہینے کو جس کو اللہ نے حرام ٹھہرایا، زُيِّنَ لَهُمْ سُوْٓءُ اَعْمَالِهِمْ: مزین کر دیے گئے ان کے لئے ان کے برے اعمال وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ: اور اللہ تعالیٰ ہدایت نہیں دیتا کافر لوگوں کو، يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا: اے ایمان والو! مَا لَكُمْ: تمہیں کیا ہو گیا، اِذَا قِيْلَ لَكُمْ: جب تمہیں کہا جاتا ہے انْفِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ: اللہ کے راستے میں نکلو، اثَّاقَلْتُمْ اِلَى الْاَرْضِ: تم زمین کی طرف بوجھل ہوئے جاتے ہو؟ تثاقل اِثَّاقَلَ: بوجھ محسوس کرنا، یعنی اتنا بوجھ محسوس کرنا کہ انسان اس میں دبتا چلا جائے، جیسے کسی شخص کو کسی ایسے کام کے متعلق کہہ دیا جائے جس کو وہ اپنے لیے مشکل سمجھتا ہے تو واقعہ یہی ہے کہ اُٹھنے کی ہمت نہیں ہوتی، ایسے ہوتا ہے جیسے انسان زمین کی طرف گرا جا رہا ہے، اس بات کا بوجھ اتنا پڑ گیا، اس ذمہ داری کا بوجھ اتنا پڑ گیا کہ انسان سمجھتا ہے کہ میری تو ٹانگوں میں قوت نہیں، کمر میں قوت نہیں، اُٹھا نہیں جاتا، زمین کی طرف انسان گرا جاتا ہے، اثَّاقَلْتُمْ اِلَى الْاَرْضِ کا یہی مفہوم ہے، تو تم زمین کی طرف ڈھے جاتے ہو، گرے جا رہے ہو، بوجھل ہوئے جاتے ہو زمین کی طرف، اَرَضِيْتُمْ بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا مِنَ الْاٰخِرَةِ: کیا تم نے آخرت کے مقابلے میں دُنیوی زندگی کو پسند کر لیا؟ کیا تم راضی ہو گئے دُنیوی زندگی پر آخرت کے مقابلے میں؟ فَمَا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا قَلِيْلٌ: نہیں ہے دُنیوی زندگی آخرت کے مقابلے میں مگر بہت تھوڑی سی۔ فِي الْاٰخِرَةِ: فِيْ جَنْبِ الْاٰخِرَةِ۔ نہیں ہے دُنیوی زندگی آخرت کے مقابلے میں مگر بہت قلیل، اِلَّا تَنْفِرُوْا يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا: اگر تم نہیں نکلو گے تو اللہ تعالیٰ تمہیں دردناک عذاب دے گا، وَّيَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ: اور بدلے میں لے آئے گا کوئی اور غیر قوم، تمہارے علاوہ کوئی دوسری قوم، ایسی قوم جو تمہارا غیر ہو گی، مغایر ہو گی، تمہارے بدلے میں لے آئے گا تمہارے علاوہ اور لوگوں کو، وَلَا تَضُرُّوْهُ شَيْـًٔا: اور تم اس اللہ کو کچھ بھی نقصان نہیں پہنچا سکو گے، وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ: اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔ اِلَّا تَنْصُرُوْهُ: اگر تم میرے رسول کی مدد نہیں کرو گے۔ "ہٗ" ضمیر رسول اللہ ﷺ کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اگر تم اس کی مدد نہیں کرو گے فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ: پس تحقیق اس کی تو اللہ مدد کر چکا، مدد کا ثبوت دے چکا، مدد کا ظہور ہو چکا، فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ: پس تحقیق مدد کی اس کی اللہ تعالیٰ نے، اِذْ اَخْرَجَهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا: جبکہ نکال دیا تھا اس کو کافروں نے، نکال دیا تھا اس کو ان لوگوں نے جنہوں نے کفر کیا، ثَانِيَ اثْنَيْنِ: اس حال میں کہ یہ رسول دو میں سے ایک تھا، لفظی معنی ہے دو میں سے دوسرا تھا، جس وقت دو آدمی ہوں تو ان میں سے ہر ایک ثَانِيَ اثْنَيْنِ کا مصداق ہوتا ہے، دو میں سے دوسرا، ایک اور دو، مطلب یہ ہے کہ تیسرا کوئی نہیں تھا۔ "اس حال میں کہ وہ دو میں سے دوسرا تھا" یعنی دو میں سے ایک تھا اِذْ هُمَا فِي الْغَارِ: جبکہ وہ دونوں غار میں تھے، اِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ: جبکہ وہ رسول اپنے ساتھ والے سے کہہ رہا تھا، اپنے رفیق سے کہہ رہا تھا، اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا، لَا تَحْزَنْ: غم نہ کر، اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا: بے شک اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے، فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ: پھر اُتارا اللہ نے اپنا اطمینان، عَلَيْهِ: اس رسول پر، وَاَيَّدَهٗ: اور اسے قوت پہنچائی، بِجُنُوْدٍ لَّمْ تَرَوْهَا: ایسے لشکروں کے ذریعے سے جن کو تم نے نہیں

دیکھا، وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا السُّفْلٰى: اور کردیا ان لوگوں کی بات کو جنہوں نے کفر کیا نیچی۔ سفلی أسفل کی مؤنث ہے۔ کافروں کی بات کو نیچی کردیا، کافروں کا کلمہ نیچا ہوگیا، کردیا اللہ تعالیٰ نے کافروں کی بات کو نیچی، وَكَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا: اور اللہ کی بات ہی اونچی ہے۔ عُلْیَا اعلیٰ کی مؤنث ہے، اسفل کی مؤنث سفلیٰ، اور اعلیٰ کی مؤنث علیا، اللہ کی بات اونچی رہی اور کافروں کی بات نیچی ہوگئی، وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ: اللہ تعالیٰ زبردست ہے حکمت والا ہے۔ اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّثِقَالًا: خِفاف خفیف کی جمع ہے، اور ثقال ثقیل کی جمع ہے۔ نکلو ہر حال میں ہلکے ہو یا بوجھل ہو، ہلکے ہو یعنی تمہارے پاس سامان زیادہ نہیں ہے، مال و دولت زیادہ نہیں ہے، اور بوجھل ہو کہ تم لدے لدائے ہو، ''نکلو اس حال میں کہ تم ہلکے پھلکے ہو اور بوجھل ہو'' یعنی دونوں حال میں نکلو چاہے ہلکے ہو چاہے بوجھل ہو، وَّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ: اور جہاد کرو اپنے مالوں کے ساتھ اور جانوں کے ساتھ اللہ کے راستے میں ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ: یہ تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم جانو۔ لَوْ كَانَ عَرَضًا قَرِيْبًا وَّسَفَرًا قَاصِدًا: اگر ہوتا سامان جلدی حاصل ہونے والا۔ عرض سامان کو کہتے ہیں، قریب سے مراد ہے قریب الحصول۔ ''اگر ہوتا سامان جلدی حاصل ہونے والا یا سفر ہوتا ہلکا سا'' قاصد: درمیانہ سا سفر۔ ''سفر ہوتا ہلکا سا'' لمبا سفر نہ ہوتا، لَّاتَّبَعُوْكَ: تو یہ لوگ آپ کی اتباع کرتے، وَلٰكِنْۢ بَعُدَتْ عَلَيْهِمُ الشُّقَّةُ: شُقّہ کہتے ہیں مسافت کو، ایسی مسافت جس کو مسافر مشقت کے ساتھ طے کر سکے، ''لیکن ان کے اوپر مسافت دراز ہوگئی، بعید ہوگئی ان پر مسافت'' وَسَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ: اور عنقریب قسمیں کھائیں گے اللہ کی، لَوِ اسْتَطَعْنَا: اگر ہم طاقت رکھتے لَخَرَجْنَا مَعَكُمْ: تو ہم تمہارے ساتھ نکلتے، يُهْلِكُوْنَ اَنْفُسَهُمْ: ہلاکت میں ڈالتے ہیں یہ اپنی جانوں کو، وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ: اللہ جانتا ہے کہ بے شک یہ جھوٹے ہیں۔

سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ○ وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ ○ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○

تفسیر

ماقبل سے ربط

شروعِ سورت سے تو مشرکین کا تذکرہ تھا اور پچھلی چند آیات میں اہلِ کتاب کا ذکر کردیا گیا تھا، اور ان کے خلاف بھی جہاد کی ترغیب دی گئی تھی جس طرح سے کہ مشرکین کے خلاف جہاد کی ترغیب دی گئی تھی، اور اہلِ کتاب کے خلاف جہاد کی ترغیب دیتے ہوئے ظاہر کیا گیا تھا، کہ اب ان اہلِ کتاب اور مشرکین میں کوئی خاص فرق نہیں ہے، اِن کا دعویٰ اگرچہ توحید کا ہے، آخرت کا یہ قول کرتے ہیں لیکن ان کا ماننا نہ ماننا برابر ہے، چونکہ انہوں نے بھی اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کے نظریات وضع کرلیے ہیں، اور اللہ کی حلال کی ہوئی چیزوں کو حرام ٹھہرانا شروع کردیا ہے، دُنیا دار ہوگئے ہیں، دُنیا کو ترجیح دینے لگ گئے ہیں، مال کے پیچھے مرتے ہیں، ان کا علم اور ان کا دین سب بکاؤ مال ہوگیا ہے، جہاں سے پیسے ملتے ہیں اسی طرح سے بات کردیتے ہیں، حرام خور ہوگئے، رشوتیں لیتے ہیں، دین فروشی کرتے ہیں، تو اس لیے ان میں اور مشرکین میں کوئی فرق نہیں رہا، تو جس طرح مشرکین کے ساتھ جہاد کیا گیا ہے ان کے ساتھ بھی جہاد کرو، یہ دنیا میں بھی اپنے ان کرتوتوں کی بنا پر ذلیل ہوں گے اور آخرت میں بھی ان کے لیے عذاب

ہے اس مال کی محبت کی بنا پر جس کی وجہ سے یہ دِین فروشی کررہے ہیں، پچھلی آیات کا حاصل یہ تھا۔ اگلی آیات جو رکوع تک پڑھی گئیں، ان میں مشرکین کی ایک عادت کو ذکر کیا گیا ہے، جس میں اللہ تعالیٰ کی حرام ٹھہرائی ہوئی چیزوں کو حلال ٹھہرانا، اور اللہ تعالیٰ کی حلال ٹھہرائی ہوئی چیزوں کو حرام ٹھہرانا مذکور ہے، تو گویا کہ ان کی یہ خصلت اہلِ کتاب کی اس خصلت کی طرح ہے جیسے ان کے متعلق پیچھے آیا لَا یُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ جس چیز کو اللہ اور اللہ کے رسول نے حرام ٹھہرایا اُس کو یہ حرام نہیں ٹھہراتے، جس کا مطلب ہے کہ اس کو حلال ٹھہرا لیتے ہیں، تو اسی طرح سے مشرکین کی بھی ایک عادت ذکر کی جارہی ہے کہ وہ بھی اللہ کی محرمات کے اندر تبدیلی کرتے تھے، تو اس خصلت کے اعتبار سے بھی اہلِ کتاب اور مشرک آپس میں برابر ہوئے۔

قمری مہینوں کی اہمیت

یہاں جو بات ذکر کی جارہی ہے اُس کو آپ اس طرح سمجھ لیجئے کہ اللہ تعالیٰ نے جس وقت سے زمین آسمان پیدا فرمائے، اُس وقت سے اپنے قانون میں سال کے بارہ مہینے قرار دیے، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے جتنی شریعتیں آئیں وہ ساری کی ساری چاند کے مہینوں کے ساتھ ہی متعلق تھیں، یعنی اگرچہ اوقات کی تحدید سورج کے ساتھ بھی ہے، اور اللہ تعالیٰ نے سورج اور چاند دونوں کو ذکر کرنے کے بعد کہا لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِیْنَ وَالْحِسَابَ تاکہ تم سالوں کی گنتی اور حساب معلوم کرلو، اللہ نے سورج کو چلایا، چاند کے لیے منزلیں متعین کیں قَدَّرَهٗ مَنَازِلَ، اور لفظ یہ ذکر فرمائے لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِیْنَ وَالْحِسَابَ (سورۂ یونس:۵) تاکہ تمہیں سالوں کی گنتی معلوم ہوجائے اور تم حساب کو جان لو۔ تو سورج کی حرکت کے ساتھ بھی سال بنتا ہے، موسموں کا تغیر تبدل آتا ہے، جیسے اب سردی ہے اور کچھ وقت گزرنے کے بعد گرمی آجائے گی، پھر گرمی گزرے گی پھر سردی آجائے گی، یہ چکر سال میں پورا ہوتا ہے، تو سال شمسی بھی ہے اور قمری بھی ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے شریعت کے احکام ہمیشہ قمری سال کے ساتھ لگائے ہیں، اور چاند کے ساتھ یہ بارہ مہینے بن جاتے ہیں، حج کا تعلق بھی قمری مہینے سے ہے، رمضان المبارک کا تعلق بھی قمری مہینے سے ہے، زکوٰۃ کا وجوب بھی قمری مہینے کے ساتھ ہے، دس محرم کو روزے کی فضیلت ہے، یہ سب قمری حساب سے ہے۔

قمری اور شمسی سالوں میں فرق

قمری سال اور شمسی سال میں تقریباً گیارہ دِن کا فرق ہے، کہ شمسی سال گیارہ دِن بڑا ہے، اور قمری سال تقریباً گیارہ دِن چھوٹا ہے، یہی وجہ ہے کہ جو شمسی مہینے ہیں وہ تو ہمیشہ ایک ہی حالت پہ رہتے ہیں، مثلاً ہمارے اس علاقے میں دسمبر اور جنوری سردی کے مہینے ہیں، تو ہر سال سردی دسمبر اور جنوری میں ہی آئے گی، اور جولائی اگست گرمی کے مہینے ہیں، تو ہر سال گرمی جولائی اور اگست میں ہی ہوتی ہے، سورج کے مہینوں کا حساب اس طرح سے رکھا ہوا ہے کہ موسم ان مہینوں کے ساتھ متعین رہتا ہے، لیکن قمری مہینے چونکہ گیارہ دِن چھوٹے ہیں، تو شمسی مہینوں کے ساتھ یہ چکر چلتا رہتا ہے، ہر سال ایک مہینہ گویا کہ گیارہ دِن پہلے آجاتا ہے، اور تینتیس سال کے بعد چاند کے مہینے لوٹ کے انہی دِنوں میں آجاتے ہیں جن دِنوں میں پہلے ہوتے ہیں، مثلاً جس وقت آپ کا پاکستان بنا ہے، آپ کو تو ہوش نہیں ہوگی، کیونکہ آپ میں سے تو اکثریت ''میڈ اِن پاکستان'' ہیں، جب پاکستان کے وجود کا اور

ہندوستان کی تقسیم کا اعلان ہوا ہے، تو چودہ اگست تھی، چودہ اگست سن ۱۹۴۷ء میں پاکستان کا اعلان ہوا تھا، اس لیے اب چودہ اگست کو پاکستان چھٹی ہوتی ہے، اور یہ دِن ''یومِ آزادی'' کے طور پر منایا جاتا ہے، تو جب یہ چودہ اگست کی تاریخ تھی تو رمضان شریف کا مہینہ تھا اور ستائیس تاریخ تھی، ستائیس رمضان اور چودہ اگست یہ دونوں آپس میں مطابق تھے، اب یہ جو اگست ابھی گزرا ہے چودہ اگست سن ۱۹۸۰ء، تو آپ کو معلوم ہوگا یہ بھی رمضان شریف میں ہی آیا ہے، اب یہ تینتیس سال پورے ہو گئے تھے، چودہ اگست سن ۱۹۴۷ء سے چودہ اگست سن ۱۹۸۰ء یہ تینتیس سال پورے ہو گئے، جب تینتیس سال پورے ہو گئے تو تینتیس سال کے بعد پھر وہی تاریخیں آ گئیں، اِس سال جو چودہ اگست آیا تو ہمارے ہاں ستائیس رمضان کو دس اگست تھی، اور چودہ اگست دو شوال کو تھی، چار دِن کا فرق پڑ گیا، تو تینتیس سال کے بعد دوبارہ وہی تاریخیں آ گئیں۔ یہ کچھ فرق ہے چاند اور سورج کے مہینوں میں، یہی وجہ ہے کہ رمضان شریف کبھی گرمیوں میں آتا ہے، کبھی سردیوں میں آتا ہے، کبھی معتدل موسم میں آتا ہے، سارے سال کے اندر یہ مہینے گھومتے رہتے ہیں، جب ہر سال دس گیارہ دِن پیچھے ہٹتے جائیں گے، تو تین سال کے بعد ایک مہینے کا فرق پڑ جائے گا، اور کچھ دِن زائد، اور تینتیس سال کے اندر یہ چکر پورا ہو جاتا ہے، یہ ہے مہینوں کا حساب جو چلا آ رہا ہے۔

مشرکینِ مکہ کی طرف سے مہینوں کی ترتیب میں گڑبڑ کی صورت

اب ملتِ ابراہیمی میں بھی حساب قمری مہینوں کا ہی تھا اور بارہ مہینے تھے، لیکن مشرکینِ مکہ نے کچھ اس طرح سے گڑبڑ کر رکھی تھی کہ چار مہینے اس میں حرمت والے تھے، جس میں لڑائی اور کوئی دوسری گڑبڑ کرنی جائز نہیں تھی، اب یہ عقیدے کے طور پر تو ان مہینوں کو حرمت والا مہینہ سمجھتے تھے، اور یہ جانتے تھے کہ مہینے بارہ ہیں، اور ان میں سے چار مہینے حرمت والے ہیں، لیکن جس وقت یہ اللہ تعالیٰ کے خوف سے آزاد ہوئے تو انہوں نے اپنی شہوات پرستی کے طور پر ان میں گڑبڑ کرنی شروع کر دی، کہ اگر مثال کے طور پر محرّم کا مہینہ آ گیا اور ان کو کسی کے ساتھ لڑنے کی ضرورت ہے، کسی کے ساتھ لوٹ مار کرنے کی ضرورت ہے، تو یہ کہتے کہ اس دفعہ محرّم بعد میں آئے گا اور صفر پہلے آئے گا، اپنی گڑبڑ کرنے کے لئے صفر کو مقدم کر لیتے اور محرّم کو مؤخر کر دیتے، اور اگر کسی سے لڑائی ہوتی اور اِدھر سے رجب کا مہینہ آ جاتا تو اس کو آگے کر دیتے اور دوسرے مہینے کو پہلے لے آتے، اس طرح سے مہینے آگے پیچھے کرتے رہتے تھے، آگے پیچھے کرنے کے ساتھ سال کے دوران میں چار کی تعداد تو پوری کر لیتے کہ چار مہینے حرمت کے گزر گئے، لیکن تعیین باقی نہیں رکھی، کسی مہینے کو کسی سال حلال ٹھہرا لیتے، کسی مہینے کو کسی سال حرام ٹھہرا لیتے، تو اللہ تعالیٰ نے جن کو حرام ٹھہرایا تھا اُن کی حرمت ان لوگوں نے باقی نہیں رکھی۔ جس وقت مکہ معظمہ فتح ہو گیا، تو فتحِ مکہ کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سن نو ہجری میں حج کے لیے تشریف لے گئے ہیں، تو اس قسم کی ساری رُسوم کو ختم کرنے کا اس وقت اعلان ہو گیا تھا، اور کہتے ہیں کہ جس سال ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ حج کرنے کے لیے گئے ہیں، وہ اگرچہ مشرکین کی قرارداد کے مطابق تو ذی الحجہ کا مہینہ تھا، لیکن چونکہ مہینوں میں انہوں نے گڑبڑ کر رکھی تھی تو حقیقت کے اعتبار سے وہ ذی الحجہ نہیں بنتا تھا بلکہ ذی قعدہ تھا تو حج ان دنوں میں صحیح تاریخوں میں نہیں ہو رہا تھا۔

حج کے موقع پر سرورِ کائنات ﷺ کے اہم اعلانات

اور سرورِ کائنات ﷺ اگلے سال تشریف لے گئے تو اس سال ان کے حساب سے بھی وہ مہینہ ذی الحجہ تھا، اور واقع کے لحاظ سے بھی ذی الحجہ تھا، اس لیے حج کے موقع پر سرورِ کائنات ﷺ نے باقاعدہ خطبہ کی صورت میں اعلان کیا: ''اِنَّ الزَّمَانَ قَدِ اسْتَدَارَ كَهَيْئَتِهٖ يَوْمَ خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ. اَلسَّنَةُ اِثْنَا عَشَرَ شَهْرًا. مِنْهَا اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ''(1) یہ اس خطبے کے اندر الفاظ ہیں جو حضور ﷺ نے حج کے موقع پر دیا ہے، کہ زمانہ گھوم کے آ گیا اپنی اسی حالت پر جس حالت پر وہ اُس وقت تھا جب اللہ تعالیٰ نے یہ زمین آسمان پیدا کیے ہیں، سال کے مہینے بارہ ہیں، اور اُن میں سے چار حُرمت والے ہیں۔ لوگوں سے تعیین کرا کے پوچھا کہ یہ کون سا مہینہ ہے؟ سب کے سامنے ذکر کیا کہ یہ ذی الحجہ ہے، اور آج ذی الحجہ کی نو تاریخ ہے، یہ سب ذکر کرنے کے بعد حضور ﷺ نے پھر فرمایا جس طرح سے آج کے دِن کی حُرمت تم کرتے ہو، آج کے مہینے کی حُرمت کرتے ہو، اسی طرح سے ہمیشہ کے لیے مسلمانوں کی جان، مال، عزّت ایک دوسرے پر حرام ہے، یہ آگے اعلان فرمائے۔ بہرحال خصوصیت کے ساتھ یہ اعلان فرمایا: ''اِنَّ الزَّمَانَ قَدِ اسْتَدَارَ كَهَيْئَتِهٖ'' زمانہ گھوم کے اپنی حالت پر آ گیا، اب اس کے اندر کسی قسم کا کوئی تغیر تبدل نہیں کیا جا سکے گا۔

مہینوں کی ترتیب میں گڑبڑ کے متعلق دُوسری تفسیر

عام طور پر تو مفسرین نے ذکر یہ کیا ہے کہ یہ جو گڑبڑ کرتے تھے، یہ محرّم اور صفر کے مہینے میں ہی کرتے تھے، محرّم کو آگے کر دیتے اور صفر کو پہلے لے آتے، عام طور پر مفسرین یوں ہی ذکر کرتے ہیں، لیکن جس وقت ان روایات کی طرف دیکھا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے، کہ ان کی یہ گڑبڑ ایک ہی مہینے سے تعلق نہیں رکھتی تھی، اگر ایک ہی مہینے سے تعلق رکھتی اور وہ لوگ مہینے بارہ ہی قرار دیتے، اور بارہ میں سے اَشہرِ حُرم چار قرار دیتے، اور گڑبڑ صرف ایک مہینے کی تقدیم تاخیر کے ساتھ ہوتی، تو اتنے اہتمام کے ساتھ یہ اعلان کرنے کی ضرورت نہیں تھی: ''اِنَّ الزَّمَانَ قَدِ اسْتَدَارَ كَهَيْئَتِهٖ''، اور ''اَلسَّنَةُ اِثْنَا عَشَرَ شَهْرًا'' کہ سال کے بارہ مہینے ہیں، اور زمانہ لوٹ کے اپنی پہلی کیفیت پہ آ گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مہینوں میں بھی گڑبڑ کرتے تھے، اور تعداد میں بھی گڑبڑ کرتے تھے، اس کی جو صورت بعض مفسرین نے لکھی ہے وہ زیادہ اطمینان بخش ہے، وہ کہتے ہیں کہ کچھ آثار سے معلوم یوں ہوتا ہے کہ مشرکینِ مکہ نے اپنے آرام کے لیے قمری مہینوں کو شمسی مہینوں کے ساتھ مطابق کر لیا تھا، تاکہ حج ہمیشہ کسی ایک موسم میں ہو، کبھی گرمی میں کبھی سردی میں اس طرح سے نہ ہو، ایک موسم متعین کر لیا، جیسے مثال کے طور سردی میں حج ہونا چاہیے یا مثلاً معتدل موسم میں حج ہونا چاہیے، اس کو متعین کر لیا، متعین کرنے کے بعد عربی مہینوں کو اس کے مطابق بنانے کی کوشش کی، عربی مہینوں کو اس کے مطابق چلایا، ذی الحجہ کے وہ دِن متعین ہو گئے اور اس کے بعد پھر مہینوں کا شمار کرتے چلے گئے، تو جب اس طرح سے شمار کریں گے، تو آپ جانتے ہیں کہ گیارہ دِن کم رہ جائیں گے، اور گیارہ دِن کم رہنے کی وجہ سے آٹھ سال بعد تین مہینوں کا فرق پڑ جائے گا، تو جس وقت تین مہینوں کا فرق پڑے گا، تو اب موسم کو برابر کرنے کے لیے وہ ان تین مہینوں کا آٹھ سال کے بعد اضافہ کر دیتے، یعنی

(1) بخاری ۲/ ۸۳۳، من قال الاضحی یوم النحر/ مسلم ۲/ ۶۰، باب تغلیظ تحریم الدماء/ مشکوۃ ج ۱ ص ۲۳۳ عن ابی بکرہ ؓ۔ باب خطبۃ یوم النحر

کبھی وہ سال کو پندرہ مہینے کا بنا دیتے، اور کبھی اُن کا سال بارہ مہینے کا ہوتا تھا، تو سال کے پندرہ مہینے بنا کے اُس کو پھر اُس کے مطابق کر لیتے، تو تینتیس سال کے بعد وہ مہینہ اصل مہینہ میں آئے گا، جس طرح سے پہلے میں نے عرض کیا کہ سورج کے ساتھ مطابقت کرتے کرتے دیکھو! رمضان شریف تینتیس سال بعد اگست میں ہی آ گیا۔ اب اگر رمضان انگریزی مہینے میں متعین کر دیا جائے تو انگریزی حساب سے متعین رہے گا لیکن واقع کے اعتبار سے رمضان کبھی رجب میں، کبھی جمادی الاخریٰ میں، کبھی شعبان میں، اس طرح سے مہینے بدلتے رہیں گے، اگرچہ نام وہ اس کا رمضان ہی رکھیں گے، تینتیس سال کے بعد جب دوبارہ وہی موسم آئے گا تو واقعۃً رمضان اپنے دنوں میں آ گیا۔ اسی طرح سے انہوں (مشرکین) نے جو گڑبڑ کر رکھی تھی، تو سرورِ کائنات ﷺ جس سال حج کے لیے تشریف لے گئے ہیں، تو اُس وقت تینتیس سال کے بعد دوبارہ ذی الحجہ صحیح وقت میں آ گیا تھا، اور وہ صحیح وقت تھا جب آپ ﷺ حج ادا کرنے کے لیے گئے، اس وقت آپ ﷺ نے اعلان کیا کہ نہ مہینوں کی تعداد میں گڑبڑ کرنی جائز ہے، اور نہ مہینوں کے اندر تقدّم و تاخر کرنا جائز، آئندہ کے لیے مہینے بارہ ہی رہیں گے، اور ان کے اندر چار مہینے حُرمت والے ہیں، جن کی تعیین کر کے بتایا کہ ذی قعدہ، ذی الحجہ، محرم یہ تین اکٹھے ہیں، اور ایک رجب جو جمادی الاخریٰ اور شعبان کے درمیان میں ہے، رجب کی تعیین اس طرح صراحت کے ساتھ اس لیے فرمائی، کہ کہتے ہیں کہ بعض مشرکین رجب کو شعبان کے بعد قرار دیتے تھے، رمضان المبارک والے مہینے کو وہ ''رجب'' کہتے تھے، آپ ﷺ نے تعیین کر دی کہ رجب وہ ہے جو جمادی الاخریٰ اور شعبان کے درمیان والا رجب ہے جس کو رجب مضر کہتے ہیں، یہ رجب حُرمت والا مہینہ ہے، اس طرح سے آپ نے تعیین کر دی۔ تو یہ جو ان کی گڑبڑ جاری تھی تو مہینوں کی تعداد میں بھی گڑبڑ کرتے تھے، اور اسی طرح مہینوں کے تقدّم اور تاخر میں بھی گڑبڑ کرتے تھے، یہ ایک مشرکانہ رسم تھی، جس کے نتیجے میں کبھی حُرمت والا مہینہ حلال ہو جاتا، اور کبھی حُرمت والا مہینہ حرام ہی رہتا، جیسا کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ محرم اپنے صحیح وقت پر آ گیا، ذی الحجہ اپنے صحیح وقت پہ آ گیا، اور کبھی ایسا ہوا کہ محرم ذی الحجہ میں ہو گیا، ذی الحجہ، ذی قعدہ میں ہو گیا، اسی طرح محرم صفر کی جگہ آ گیا، کبھی صفر، ذی الحجہ کی جگہ آ گیا، اس طرح سے واقع کے لحاظ سے یہ مہینے بدلتے رہتے تھے۔ تو یُحِلُّوْنَهٗ عَامًا وَّيُحَرِّمُوْنَهٗ عَامًا کا یہ مفہوم ہو گا کہ کسی سال ان کے ہاں وہ حُرمت والا مہینہ حرام ٹھہرتا اور کسی سال حُرمت والا مہینہ ان کے ہاں حلال ہو جاتا، تو یہ دنوں کے اندر جو انہوں گڑبڑ کر رکھی تھی یہاں اس رسم بد کی تردید کی گئی ہے۔

قمری تاریخ کی اہمیت

تو شریعت نے اپنے اَحکام کا مدار قمری مہینوں پہ رکھا ہے، اس لیے مفسرین لکھتے ہیں کہ قمری مہینوں کی یادداشت اور ان کی تاریخوں کی تعیین فرضِ کفایہ ہے، اگر ساری اُمت ہی بھول جائے کہ یہ کون سا مہینہ ہے، اور آج کون سی تاریخ ہے، تو ایسی صورت میں سارے ہی گناہ گار ہوں گے، البتہ اگر بعض کو یاد رہے اور بعض کو یاد نہ رہے تو فرض ادا ہو گیا، جس سے صحیح طور پر تعیین ہو گئی کہ یہ رمضان شریف، یہ ذی الحجہ ہے، یہ فلاں مہینہ ہے۔ اور ان تاریخوں کو یاد رکھنے کا آسان ذریعہ چونکہ یہی ہے کہ اپنے کاروبار میں ان تاریخوں کو استعمال کرو، خط و کتابت میں ان تاریخوں کو استعمال کرو، اس لیے قمری مہینے کی تاریخیں استعمال کرنا

بہر حال ایک فرض کی ادائیگی ہے یاد داشت رکھنے کے لئے، اور باعث ثواب ہے، اگرچہ مسئلے کی رُو سے شمسی مہینے کی تاریخیں استعمال کرنا بھی جائز ہے، حرام نہیں ہے، لیکن اگر ان کو ایسے طور پر استعمال کیا جائے کہ قمری مہینے یاد ہی نہ رہیں، اور ان کی تاریخیں یاد نہ رہیں، یہ البتہ بُری بات ہے۔ تو مسلمان کو چاہیے کہ قمری مہینے اور اُن کی تاریخ کو ضبط رکھنے کی کوشش کرے، اور اس کا آسان طریقہ یہی ہے کہ اپنے خط و کتابت میں اور دوسرے کاموں میں یہ تاریخ استعمال کی جائے۔ تو ہمارے جتنے بھی اَحکام ہیں وہ سارے کے سارے قمری مہینوں سے ہی متعلق ہیں، اگرچہ روز مرّہ کی ہماری جو نمازیں ہیں ان کا تعلق شمسی حساب کے ساتھ لگایا گیا ہے، کہ سورج جس وقت اتنا چڑھ آئے گا تو یہ نماز پڑھی جائے گی، سورج کے زوال کے وقت یہ نماز پڑھی جائے گی، زوال کے بعد اتنا وقت گزر جائے گا تو یہ نماز پڑھی جائے گی، سورج غروب ہو جائے گا تو یہ نماز پڑھی جائے گی، غروب ہونے کے بعد اتنا وقت گزر جائے گا تو یہ نماز پڑھی جائے گی، طلوع ہونے کے بعد اتنا وقت ہوگا تو یہ نماز پڑھی جائے گی، تو یہ روز مرّہ کی نمازیں تو سورج کے حساب سے ہیں، اس لیے کُتبِ سابقہ کے اندر اس اُمت کی علامات جو ذکر کی گئی ہیں اُن میں ایک علامت یہ بھی منقول ہے کہ وہ رُعاۃ للشمس سورج کی بہت رعایت رکھنے والے ہوں گے، سورج کی بہت رعایت یوں ہے کہ ہمارا جو چوبیس گھنٹوں کا نمازوں کا نظام ہے اس کا تعلق شمس سے ہے، یعنی سورج کے ڈھلنے اور غروب ہونے اور طلوع ہونے کے ساتھ ہے، باقی شریعت کے جتنے اَحکام ہیں مثلاً زکوٰۃ کی فرضیت ہے، حج کی فرضیت ہے، روزوں کی فرضیت ہے، یہ سارے قمری مہینوں سے تعلق رکھتے ہیں۔

اِنَّمَا النَّسِیْٓءُ زِیَادَۃٌ فِی الْکُفْرِ: مہینوں کا پیچھے کو ہٹا دینا یہ کُفر میں زیادتی ہے، یعنی یہ کافرانہ حرکت ہے، جتنی یہ حرکت کریں گے اتنا کُفر میں اضافہ ہوگا، یُضَلُّ بِهِ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا: گمراہی میں ڈالے جاتے ہیں اس کے ذریعے سے کافر لوگ، حلال ٹھہراتے ہیں اس مہینے کو کسی سال، اور حرام ٹھہراتے ہیں اس مہینے کو کسی سال، لِّیُوَاطِـُٔوْا عِدَّةَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ: تاکہ موافق کرلیں حرام ٹھہرائے ہوئے مہینوں کی گنتی کو، یعنی اس گنتی کو تو موافق کر لیتے ہیں، وہ چار کی تعداد پوری کر لیتے ہیں، لیکن تعیین نہیں رہنے دیتے۔ فَیُحِلُّوْا مَا حَرَّمَ اللّٰهُ: پس حلال ٹھہراتے ہیں اُس کو جس کو اللہ نے حرام ٹھہرایا، زُیِّنَ لَهُمْ سُوْٓءُ اَعْمَالِهِمْ: ان کے لیے ان کے بُرے اعمال مزین کر دیے گئے، یعنی یہ اپنی کارروائیوں پر خوش ہیں، ان کو یہ کام اچھے لگ رہے ہیں، ہوشیاری دکھاتے ہیں، سمجھتے ہیں کہ ہم مہینے بھی پورے رکھ رہے ہیں اور اپنا مطلب بھی نکال رہے ہیں، وَاللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْكٰفِرِیْنَ: اللہ تعالیٰ کافر لوگوں کو صحیح بات سمجھنے کی توفیق نہیں دیتا، کافر لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا، کُفر کرتے کرتے ان کے دل اس طرح سے سیاہ ہو جاتے ہیں کہ پھر صحیح بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی۔

سوال:- اربعۃ حُرم میں محرّم کا ذکر ہے، اور ربیع الاوّل کا ذکر نہیں جس میں اتنا بڑا عظیم الشان واقعہ پیش آیا۔

جواب:- یعنی آپ کا کیا خیال ہے کہ محرّم اس لیے حُرمت والا ہے کہ اس میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ شہید ہوئے ہیں، تو ربیع الاوّل حُرمت والا ہونا چاہیے چونکہ اس میں حضور ﷺ پیدا ہوئے ہیں۔ یہ کہنا چاہتے ہیں؟ ربیع الاوّل کی کوئی فضیلت نہیں ہے، اور اس کے متعلق شریعت میں کوئی حکم نہیں ہے، یہ بالکل باقی مہینوں کی طرح ہے، اور محرّم کی جو اہمیت ہے وہ کربلا کے واقعے کی وجہ سے نہیں ہے، اس کی عظمت پہلے سے ہے، کربلا کا واقعہ تو سرورِ کائنات ﷺ کی ہجرت کے ساٹھ سال بعد پیش آیا ہے۔ تو ان مہینوں

کی حُرمت والے اَحکام پہلے سے ملّتِ ابراہیمی سے چلے آرہے ہیں، بلکہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آدم علیہ السلام کے بعد سے ہی اللہ تبارک وتعالیٰ کی جتنی شریعتیں تھیں سب کے اندر قمری حساب کو مدنظر رکھا گیا ہے، اور فطرت کے بھی زیادہ مطابق ہے، پہچاننا اسی کا زیادہ آسان ہے، سورج کے ساتھ پہچاننا کہ اب کونسا مہینہ ہے، جس وقت تک کوئی شخص علمِ ہیئت کے قوانین نہ جانتا ہو معلوم نہیں کرسکتا، اس کا حساب رکھنا بہت مشکل ہے، اور اگر چاند میں ایک مہینے میں مغالطہ ہو ہی جائے تو جس وقت نیا چاند چڑھے گا، اس وقت آپ حساب پھر صحیح کرلیں گے، اور اس کی کمی پیشی خود تعیین کرتی رہتی ہے، کہ یہ کتنے دِنوں کا ہے اور کتنے دِنوں کا نہیں ہے۔ تو اس دِینِ فطرت کے لیے یہ قمری حساب ہی مناسب ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ نے اسی کو قرار دیا ہے، باقی یہ حُرمت والے چار مہینے پہلے سے متعین چلے آرہے ہیں، سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریف لانے کے بعد واقعات کی وجہ سے مہینوں پر کوئی اثر نہیں پڑا، کہ کس مہینے میں کیا واقعہ پیش آیا؟ اور اس کو شریعت میں اہمیت دی گئی ہو، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔

غزوۂ تبوک کا پس منظر

اگلی آیات کا تعلق غزوۂ تبوک کے ساتھ ہے، اس کا اجمالی ذکر بھی آپ کے سامنے پہلے ہوگیا تھا، کہ مکہ آٹھ ہجری میں فتح ہوگیا، اور نو ہجری میں یہ غزوہ پیش آیا، اور یہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری غزوہ ہے، ''تبوک'' ایک جگہ ہے شام کی سرحد کے قریب، اور شام میں اس وقت رُومیوں کی حکومت تھی، سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع ملی کہ رُومی فوجیں اکٹھی کررہے ہیں، اور وہ مدینہ منورہ پر حملہ آور ہونا چاہتے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مناسب یہ سمجھا کہ ان کو حملہ کرنے موقع نہ دیا جائے، بلکہ اُن کی سرحد پر ہی اُن کو روکا جائے، موسم گرمی کا تھا، کھجوریں پک رہی تھیں، باغات اپنی اِنتہا کو پہنچے ہوئے تھے، اور آپ جانتے ہیں کہ جس وقت فصل پکنے کے دِن ہوتے ہیں تو تقریباً تقریباً ان دِنوں میں کاشت کار خالی سے ہوئے بیٹھے ہوتے ہیں، پچھلی فصل کی آمدنی ختم ہوچکی ہوتی ہے، اور نئی فصل کی توقع ہوتی ہے، جس طرح سے ملازم طبقہ مہینے کے آخر میں تقریباً خالی ہوتا ہے، اسی طرح سے کاشت کار بھی آنے والی فصل کے موقع پر پچھلی فصل کی آمدنی سے تقریباً تقریباً خالی ہوئے بیٹھے ہوتے ہیں، تو یہ وقت کچھ افلاس اور تنگدستی کا بھی تھا، اور آئندہ اُمید تھی کہ فصل قریب آنے والی ہے، گرمی کا شدید موسم تھا، سفر بہت لمبا تھا، اور مقابلہ باقاعدہ ایک باقاعدہ قواعددان فوج کے ساتھ تھا، بہت بڑی سلطنت کی فوج تھی جس کے ساتھ مقابلے کی تجویز ہوئی، سرورِکائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے نفیرِ عام (اعلانِ عام) فرمادیا کہ سب چلو، تو ایسے موقع پر لوگوں کے طبقات مختلف ہوگئے، جو مخلص تھے وہ تو اعلان سنتے ہی آمادہ ہوگئے، اور انہوں نے اپنی تیاری شروع کردی، اور بعض ایسے تھے کہ جو پہلے متردّد ہوئے لیکن پھر اپنے آپ کو سنبھال لیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہوگئے، اور بعض خالص منافق قسم کے تھے جنہوں نے نکلنے کا ارادہ ہی نہیں کیا، اور جھوٹے بہانے تراش لیے، اور بعض مخلص بھی ایسے تھے کہ اُن کے پاس عذر کوئی نہیں تھا لیکن سستی کی بنا پر وہ رہ گئے، تو آگے جو آیات آرہی ہیں ان میں مختلف طبقات کے متعلق تذکرے ہیں، بعض آیات ایسی ہیں جو غزوہ سے پہلے کی ہیں، اور بعض آیات ایسی ہیں جو غزوہ کے بعد کی ہیں۔

غزوۂ تبوک میں ڈِھیلے پڑنے والوں کو تنبیہ

پہلی آیات جو آپ کے سامنے ذکر کی گئی ہیں ان میں اگرچہ عمومی عنوان کے ساتھ جہاد کی ترغیب دی گئی ہے، لیکن اس میں اصل کے اعتبار سے تنبیہ اُن لوگوں کو ہے جو اس اعلان کے بعد کچھ ڈھیلے سے ہو گئے، وہ سوچنے لگ گئے کہ اتنے سخت موسم میں اتنا لمبا سفر، اور اُدھر باغات پھلے ہوئے ہیں، اُن میں نقصان کا اندیشہ ہے، ایسے موقع پر جانا بڑا مشکل ہے، تو کچھ ڈھیلے سے جو ہو رہے تھے اُن کو ان آیات کے اندر کچھ تنبیہ کی گئی ہے۔ ''اے ایمان والو!'' مَا لَكُمْ اِذَا قِيْلَ لَكُمُ انْفِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ: تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ جب تمہیں کہا جاتا ہے، کہ اللہ کے راستے کی طرف نکلو، اثَّاقَلْتُمْ اِلَى الْاَرْضِ: تم زمین کی طرف گرے جارہے ہو، زمین کی طرف دبے جارہے ہو، اس اعلان سے تم اتنا بوجھ کے نیچے آگئے کہ جیسے بالکل ہی اٹھنے کی ہمت نہیں رہی، اثَّاقَلْتُمْ اِلَى الْاَرْضِ کے اندر یہ سارا مفہوم ہے۔ جیسے میں نے عرض کیا کہ انسان جس وقت ایسی بات سنتا ہے جس کی برداشت اس میں نہیں ہوتی تو اس میں اٹھنے کی ہمت نہیں ہوتی، ایسے زمین کی طرف گرتا ہے۔ ''تم زمین کی طرف ڈھے جارہے ہو، بوجھل ہوئے جارہے ہو، گرے جارہے ہو زمین کی طرف''، ''کیا تم نے دنیوی زندگی کو آخرت کے مقابلہ میں پسند کر لیا؟'' تو اصل بنیادی کمزوری یہی ہے کہ جب دنیوی زندگی پسند ہو جاتی ہے، اور انسان اُس کی محبت میں مبتلا ہوتا ہے، تو پھر نیکی کے کام کرنے کی جرأت نہیں ہوتی، خاص طور پر وہ کام جس میں دنیا کی زیب وزینت یا دنیا کے سامان کی قربانی دینی پڑے، مشقت اٹھانی پڑے۔ تو یہ ہے اندر دُکھتی رگ جس کی نشاندہی کر دی گئی ''کیا تم نے دنیوی زندگی کو پسند کر لیا'' فَمَا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا قَلِيْلٌ: دنیوی زندگی کا سامان آخرت کے مقابلے میں نہیں مگر بہت تھوڑا۔ یہ سودا تمہیں مہنگا پڑے گا، اگر تم نے دنیوی زندگی کا سامان لیا اور آخرت کے کام چھوڑ دیے، تو تم نے کثیر کو چھوڑ کر قلیل کو لے لیا، یہ سودا نفع کا نہیں، خسارہ کا ہے، آخرت کے مقابلے میں دنیوی زندگی کا سامان بہت تھوڑا ہے۔ تو ہم جو کہہ رہے ہیں کہ نکلو، اور اس دنیا کے مقابلہ میں آخرت کو ترجیح دو، اس میں فائدہ تمہارا ہے، ورنہ اگر تم نہیں نکلو گے تو ہمارا کام تو تم پر موقوف نہیں، کہ اگر تم چھوڑ دو گے تو یہ دین کا کام کوئی نہیں کرے گا۔ ''اگر نہیں نکلو گے تو اللہ تعالیٰ تمہیں دردناک عذاب دے گا، اور تمہارے علاوہ اور لوگوں کو بدل کے لے آئے گا'' اور تم اللہ کا کیا بگاڑ سکو گے؟ لَا تَضُرُّوْهُ شَيْئًا: اللہ کو تم کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتے، اللہ ہر چیز پر قادر ہے، تمہیں عذاب دینے پر بھی قادر، اور تمہارے بدلے میں اور لوگوں کو لانے پر بھی قادر، اور اپنے دین کو بچانے پھیلانے اور ہر طرح سے بالادست کرنے پر بھی قادر ہے۔ تم یہ نہ سمجھو کہ یہ کام تم پر موقوف ہے، یہ تو تمہاری سعادت ہے کہ تم ایسا کر لو، اگر ایسا کرو گے تو اس میں نفع تمہارا ہے، کسی دوسرے کا نہیں، جیسے کہتے ہیں کہ:

منت مَنِہ کہ خدمتِ سلطاں ہمے کنی   منت شناس ازو کہ بخدمت گذاشتت

کہ اگر تم بادشاہ کی خدمت کرتے ہو تو یہ احسان تمہارا نہیں، بلکہ اُس بادشاہ کا احسان ہے جس نے اپنی خدمت کے لیے تمہیں تجویز کر لیا، ورنہ اُس کی خدمت کے لیے اور تھوڑے ہیں؟

واقعۂ غارِ ثور اور اس کے ذِکر کرنے کا مقصد

اِلَّا تَنْصُرُوْهُ: یہ ایک واقعہ کی طرف توجہ دلادی، کہ آج اللہ کے رسول ﷺ نے جہاد کا اعلان کر دیا، اور اگر تم اس کے ساتھ مدد کے لیے نہیں اُٹھو گے تو یاد رکھو! میرا یہ رسول بھی تمہاری مدد کا محتاج نہیں، تمہارے سامنے یہ واقعہ ہونا چاہیے کہ جس وقت ان کو بے کسی کی حالت میں نکال دیا گیا تھا، صرف دو تھے ایک آپ اور ایک ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، (صاحب کا مصداق بالاتفاق قطعی طور پر یہاں ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں، اور کوئی نہیں) دو ہی تو تھے، تیسرا کوئی بھی نہیں تھا، دو میں سے ایک یہ تھے، ایک ان کا ساتھی تھا، جب ان کو نکال دیا تو اُس وقت بھی اللہ نے ان کی مدد کیسے کی؟ کہ سارا شہر مخالف تھا، قتل کرنا چاہتے تھے، محاصرہ کیا ہوا تھا، لیکن وہاں سے نکل آئے اور وہ کچھ نہیں بگاڑ سکے، اور پھر غار کے اندر پہنچ گئے، اور پیچھے سے وہ تلاش کرتے کرتے غار کے دروازے تک بھی آئے، لیکن دیکھو! اللہ نے کیسے حفاظت کی، یہ اللہ کی مدد نہیں ہے؟ ان حالات میں بچا کر نکال لینا یہ اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نصرت ہے، تو جب ایسے موقع پہ اللہ نے نصرت کی ہے، اگر کوئی اور موقع آئے گا تو اللہ پھر بھی امداد کرے گا۔

''یارِ غار'' کا مصداق

یہاں ''غار'' سے وہی ''غارِ ثور'' مراد ہے۔ ''ثور'' پہاڑ ہے، اور اس پر جو غار ہے وہ ''غارِ ثور'' ہے۔ تو یہاں چونکہ ''غارِ ثور'' کا ذکر آیا، تو ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ چونکہ حضور ﷺ کے ساتھ تھے اور صاحب تھے، تو ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سرورِ کائنات ﷺ کے لیے ''یارِ غار'' کا مصداق ہیں، صاحب فی الغار، یہ ''یارِ غار'' کا لفظ جو آپ استعمال کیا کرتے ہیں، کہ فلاں میرا بڑا یارِ غار ہے، یا فلاں فلاں کا بڑا یارِ غار ہے، تو یہ لفظ تشبیہاً ہوتا ہے، یعنی اس لفظ کو استعمال کر کے آپ یہ تاثر دینا چاہتے ہیں، کہ فلاں شخص میرے نزدیک ایسے ہی قابلِ اعتماد ہے جس طرح سے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سرورِ کائنات ﷺ کے لیے تھے، اب ''یارِ غار'' کا لفظ مخلص دوست کے لیے محاورہ بن گیا۔

''غارِ ثور'' کے کچھ حالات

جبکہ وہ دونوں غار میں تھے اِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ جس وقت وہ اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا لَا تَحْزَنْ: غم نہ کر، اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا: اللہ ہمارے ساتھ ہے، جیسے حدیث شریف میں الفاظ آتے ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا تھا: ''مَا ظَنُّكَ بِاثْنَيْنِ اللّٰهُ ثَالِثُهُمَا''(۱) ابوبکر! تیرا ان دو کے متعلق کیا خیال ہے جن کے ساتھ تیسرا اللہ ہے؟ اس لیے یہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے، حضور ﷺ نے بڑے اطمینان کا اظہار کیا، اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اطمینان دلایا۔ اور ابوبکر رضی اللہ عنہ کو غم کس بات کا تھا؟ اگر ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اپنی جان کا فکر ہوتا تو ساتھ نکل کر کیوں آتے؟ کون سی مجبوری تھی؟ جب اپنے آپ کو رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جوڑ لیا، تو اپنی جان کا فکر نہیں تھا، سرورِ کائنات ﷺ کا فکر تھا، کہ اب یہ غار کے دروازے پر پہنچے ہوئے ہیں، اور ہم اندر بیٹھے ان کے قدم دیکھ رہے ہیں، اگر انہوں نے ذرا سا جھک کر

---

(۱) بخاری ۶۷۴/۲، کتاب التفسیر، سورۂ توبہ/ مشکوۃ ۵۳۰/۲، باب المعجزات کی پہلی حدیث۔

دیکھ لیا تو اندر نظر پڑ جائے گی، پکڑے جائیں گے، تو رسول اللہ ﷺ کو نقصان پہنچے گا، یہ غم تھا جو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو کھائے جا رہا تھا، تو سرورِ کائنات ﷺ نے تسلی دے دی کہ یہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے، آپ غم نہ کیجئے۔ ورنہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے جذبات اوّل سے آخر تک ایسے ہیں کہ اپنی جان کی تو پرواہی کوئی نہیں۔ جیسے سورۂ اَنفال میں تفصیل عرض کرتے ہوئے میں نے آپ کو بتایا تھا کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ پہلے غار کے اندر گئے، اور جا کے غار کو صاف کیا، اور اس میں ایک سوراخ تھا، اس میں اپنا پاؤں دے دیا، اور رسول اللہ ﷺ کو اندر بلا لیا، رسول اللہ ﷺ آپ کی ران پر سر رکھ کے لیٹ گئے، اور اسی سوراخ کے اندر کوئی سانپ تھا، زہریلا جانور تھا، جس نے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو کاٹا، وہاں واقعات میں یہ آیا ہے کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کو پتا چل گیا کہ مجھے زہریلی چیز نے کاٹ لیا ہے، زہر نے اثر کرنا شروع کر دیا، لیکن ابوبکر رضی اللہ عنہ حرکت نہیں کرتے تھے "مَخَافَةَ أَنْ يَنْتَبِهَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ" اس اندیشے سے کہ کہیں حضور ﷺ کی آنکھ نہ کھل جائے، یعنی اپنی جان کو حضور ﷺ کی نیند پہ قربان کر رہے تھے، کہ تھکے ہوئے آئے ہیں پہاڑوں میں سفر کرتے ہوئے، تھوڑی سی آنکھ لگی ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ میرے حرکت کرنے کے ساتھ آنکھ کھل جائے، تو یہاں جان کو حضور ﷺ کی نیند پہ قربان کیا جا رہا ہے، تو ایسے وقت میں ان کو اپنی جان کی کیا فکر ہوگی؟ اپنی جان کی فکر نہیں تھی، سرورِ کائنات ﷺ کا فکر تھا، اس لیے حضور ﷺ نے اطمینان دلایا کہ فکر کرنے کی بات نہیں، اللہ ہمارے ساتھ ہے، یہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے پھر اس طرح سے نصرت فرمائی، کہ وہ اپنے قیافے لگاتے ہوئے اور ٹوہ لگاتے ہوئے دروازے تک پہنچ گئے، لیکن بعض آثار سے جس طرح معلوم ہوتا ہے کہ دروازے پہ مکڑی نے جالا تن دیا، اور وہیں کسی کبوتری نے انڈے دے دیے، تو مشرک کہنے لگے کہ قیافہ شناس نے قیافہ غلط لگایا ہے، یہ کیسے ہو سکتا ہے، یہ جالا تو محمد ﷺ کی ولادت سے پہلے کا معلوم ہوتا ہے، اگر یہاں آئے ہوئے ہوتے تو یہ جالا نہ ٹوٹ جاتا؟ تو لوگ جو کام قلعوں اور ٹینکوں سے لیتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے وہ کام مکڑی کے جالے سے لے لیا، جس کو قرآنِ کریم نے خود "اوھن البیوت" سے تعبیر کیا ہے (سورۂ قصص: ۴۱)، کہ تمام کمزور چیزوں میں سے سب سے زیادہ کمزور مکڑی کا جالا ہے، لیکن آج مکڑی کا جالا جو تھا وہی قلعے کا کام دے گیا۔ تو اللہ نے اس طرح سے حفاظت فرمائی۔

اِذْ هُمَا فِي الْغَارِ: جب یہ دونوں غار میں تھے، اِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ: جب وہ کہہ رہے تھے اپنے ساتھی سے، لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا: غم نہ کر، بے شک اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے۔

اللہ کی توفیق کے ساتھ اس سال جب اس غار پر ہمیں جانے کا اتفاق ہوا، قصہ آپ کو اَنفال میں سنایا تھا، تو وہاں غار کے اندر بیٹھ کر، اپنا ذہن لڑا کر سب نے ایک نقشہ متعین کیا، کہ یہی صورت ہو سکتی ہے کہ یوں بیٹھے ہوں گے، یوں لیٹے ہوں گے، ایک مولوی فیروز صاحب تھے لاہور کے، وہ بیٹھے اور میں ان کی ران پہ سر رکھ کر لیٹا، لیٹ کر وہ ساری کی ساری کیفیت بنائی، اور پھر قاری صاحب کی خدمت میں ہم نے درخواست کی کہ اب وہی رکوع پڑھو جس میں اِذْ هُمَا فِي الْغَارِ کا ذکر آیا ہوا ہے، تو غار میں بیٹھ کر قاری نسیم الدین صاحب سے یہی رُکوع سنا، تو اس وقت جو لطف آیا وہ لفظوں میں کس طرح سے ادا کیا جا سکتا ہے۔

فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلَيْهِ: اللہ تعالیٰ نے اپنا طمینان اُتارا، عَلَيْهِ: اس پر۔ کیونکہ اصل حضور ﷺ ہی تھے، حضور ﷺ کو

اطمینان ہوا، تو آپ کے اطمینان کا اثر ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ پہ بھی پڑا۔'' آپ ﷺ پر اطمینان اُتارا'' وَاَيَّدَهٗ بِجُنُوْدٍ لَّمْ تَرَوْهَا: اور قوت پہنچائی اس کو اللہ نے ایسے لشکروں کے ذریعے جن کو تم نے دیکھا نہیں، اور اللہ تعالیٰ نے کافروں کی بات نیچی کر دی، اُن کی تدبیر فیل ہوگئی وَكَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا: اللہ کی بات ہی اُونچی رہی، کہ اللہ تعالیٰ حفاظت کرنا چاہتا تھا، اپنے رسول کو بچانا چاہتا تھا، بچالیا، وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ: اللہ تعالیٰ زبردست ہے حکمت والا ہے۔ اس لیے نہ میرا رسول تمہاری مدد کا محتاج، اور نہ میرا دین تمہاری مدد کا محتاج، تمہیں جو نکلنے کے لیے کہا جا رہا ہے اس میں فائدہ تمہارا ہی ہے۔ اگر تم دین کی مدد نہیں کرو گے اور میرے رسول کی مدد نہیں کرو گے تو کوئی پروا نہیں، ان کی مدد تو ہوتی رہتی ہے، اور پہلے بھی ہم کرتے رہے ہیں، آئندہ بھی کریں گے۔

اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّثِقَالًا وَّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ

نکلو اس حال میں کہ ہلکے پھلکے ہو یا بوجھل ہو اور جہاد کرو اپنے مالوں کے ساتھ اور جانوں کے ساتھ

فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝۴۱ لَوْ كَانَ

اللہ کے راستے میں، یہ بہتر ہے تمہارے لیے اگر تم جانتے ہو ۝۴۱ اگر وہ

عَرَضًا قَرِيْبًا وَّسَفَرًا قَاصِدًا لَّاتَّبَعُوْكَ وَلٰكِنْۢ بَعُدَتْ

جلدی حاصل ہونے والا سامان ہوتا اور درمیانہ سا سفر ہوتا تو البتہ یہ لوگ آپ کی پیروی کرتے لیکن ان کے

عَلَيْهِمُ الشُّقَّةُ ؕ وَسَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَوِ اسْتَطَعْنَا لَخَرَجْنَا

اُوپر یہ مسافت دراز ہوگئی، اور عنقریب قسمیں کھائیں گے اللہ کی، اگر ہم طاقت رکھتے البتہ ضرور نکلتے

مَعَكُمْ ۚ يُهْلِكُوْنَ اَنْفُسَهُمْ ۚ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ۝۴۲

تمہارے ساتھ، اپنی جانوں کو ہلاکت میں ڈالتے ہیں، اللہ جانتا ہے بے شک یہ لوگ جھوٹے ہیں ۝۴۲

عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ ۚ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيْنَ

اللہ آپ سے درگزر کرے، آپ نے اُن کو کیوں اجازت دی؟ جب تک واضح نہ ہوجاتے آپ کے لیے وہ لوگ

صَدَقُوْا وَتَعْلَمَ الْكٰذِبِيْنَ ۝۴۳ لَا يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ

جنہوں نے سچ بولا اور جب تک آپ جان نہ لیتے جھوٹوں کو ۝۴۳ نہیں اجازت طلب کرتے آپ سے وہ لوگ جو ایمان لاتے ہیں

بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ اَنْ يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ۭ

اللہ کے ساتھ اور یوم آخر کے ساتھ اس بات سے کہ وہ جہاد کریں اپنے مالوں کے ساتھ اور اپنی جانوں کے ساتھ،

وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالْمُتَّقِيْنَ ﴿۴۴﴾ اِنَّمَا يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ

اللہ جاننے والا ہے متقین کو﴿۴۴﴾ سوائے اس کے نہیں کہ اجازت طلب کرتے ہیں آپ سے وہ لوگ جو ایمان نہیں لاتے

بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَارْتَابَتْ قُلُوْبُهُمْ فَهُمْ فِيْ رَيْبِهِمْ

اللہ کے ساتھ اور یوم آخر کے ساتھ، اور ان کے دِل شک میں پڑے ہوئے ہیں، پس وہ لوگ اپنے شک میں

يَتَرَدَّدُوْنَ ﴿۴۵﴾ وَلَوْ اَرَادُوا الْخُرُوْجَ لَاَعَدُّوْا لَهٗ عُدَّةً وَّلٰكِنْ

بھٹک رہے ہیں﴿۴۵﴾ اگر یہ نکلنے کا ارادہ کرتے تو تیار کرتے اس کے لیے کوئی سامان، لیکن

كَرِهَ اللّٰهُ انْۢبِعَاثَهُمْ فَثَبَّطَهُمْ وَقِيْلَ اقْعُدُوْا مَعَ الْقٰعِدِيْنَ ﴿۴۶﴾

اللہ نے ناپسند کیا ان کے اُٹھنے کو پس منع کر دیا ان کو اللہ نے، اور کہہ دیا گیا کہ بیٹھے رہو تم بیٹھنے والوں کے ساتھ﴿۴۶﴾

لَوْ خَرَجُوْا فِيْكُمْ مَّا زَادُوْكُمْ اِلَّا خَبَالًا وَّلَاَاوْضَعُوْا خِلٰلَكُمْ

اگر یہ نکلتے تم میں تو نہ زیادہ کرتے یہ تمہیں مگر خرابی، اور البتہ یہ دوڑاتے اپنی سواریوں کو تمہارے درمیان

يَبْغُوْنَكُمُ الْفِتْنَةَ ۚ وَفِيْكُمْ سَمّٰعُوْنَ لَهُمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ

طلب کرتے تم میں شرارت، تمہارے اندر ان کے لیے سننے والے موجود ہیں، اللہ تعالیٰ جاننے والا ہے

بِالظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۷﴾ لَقَدِ ابْتَغَوُا الْفِتْنَةَ مِنْ قَبْلُ وَقَلَّبُوْا لَكَ الْاُمُوْرَ

ظالموں کو﴿۴۷﴾ البتہ تحقیق انہوں نے شرارت طلب کی تھی اس سے پہلے بھی اور الٹ پلٹ کیے آپ کے لیے بہت سے کام

حَتّٰى جَاۗءَ الْحَقُّ وَظَهَرَ اَمْرُ اللّٰهِ وَهُمْ كٰرِهُوْنَ ﴿۴۸﴾ وَمِنْهُمْ

یہاں تک کہ حق آگیا اور اللہ کا حکم غالب آگیا اس حال میں کہ وہ ناخوش ہیں﴿۴۸﴾ اور ان میں سے کوئی وہ بھی ہے

مَّنْ يَّقُوْلُ ائْذَنْ لِّيْ وَلَا تَفْتِنِّيْ ۭ اَلَا فِي الْفِتْنَةِ سَقَطُوْا ۭ

جو کہتا ہے کہ مجھے اجازت دے دو اور مجھے فتنے میں نہ ڈالو، خبردار! فتنے میں تو وہ لوگ گر گئے

وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ۝۴۹ اِنْ تُصِبْكَ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ ۚ

اور بے شک جہنم البتہ گھیرا ڈالنے والی ہے کافروں کو۴۹ اگر آپ کو کوئی اچھی حالت پہنچتی ہے تو وہ ان کو غم میں ڈالتی ہے،

وَاِنْ تُصِبْكَ مُصِيْبَةٌ يَّقُوْلُوْا قَدْ اَخَذْنَآ اَمْرَنَا مِنْ قَبْلُ

اور اگر آپ کو کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو یہ لوگ کہتے ہیں ہم نے اختیار کرلیا اپنا امر اس سے پہلے ہی،

وَيَتَوَلَّوْا وَّهُمْ فَرِحُوْنَ ۝۵۰ قُلْ لَّنْ يُّصِيْبَنَآ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ

اور پیٹھ پھیر کے جاتے ہیں اس حال میں کہ خوش ہوتے ہیں۵۰ آپ کہہ دیجئے کہ ہرگز نہیں پہنچے گی ہمیں مگر وہی چیز جو اللہ نے

لَنَا ۚ هُوَ مَوْلٰنَا ۚ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝۵۱ قُلْ هَلْ

ہمارے لیے لکھ دی، وہ ہمارا کارساز ہے، اور اللہ پر ہی توکل کرنا چاہیے ایمان والوں کو۵۱ آپ کہہ دیجئے نہیں

تَرَبَّصُوْنَ بِنَآ اِلَّآ اِحْدَى الْحُسْنَيَيْنِ ۭ وَنَحْنُ نَتَرَبَّصُ بِكُمْ

انتظار کرتے تم ہمارے متعلق مگر دو بھلی حالتوں میں سے ایک بھلی حالت کا، اور ہم انتظار کرتے ہیں تمہارے متعلق

اَنْ يُّصِيْبَكُمُ اللّٰهُ بِعَذَابٍ مِّنْ عِنْدِهٖٓ اَوْ بِاَيْدِيْنَا ڮ فَتَرَبَّصُوْٓا

کہ پہنچا دے تمہیں اللہ تعالیٰ عذاب اپنے پاس سے یا ہمارے ہاتھوں، پس تم انتظار کرو

اِنَّا مَعَكُمْ مُّتَرَبِّصُوْنَ ۝۵۲ قُلْ اَنْفِقُوْا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا لَّنْ يُّتَقَبَّلَ

بے شک ہم بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والے ہیں۵۲ آپ کہہ دیجئے کہ خرچ کرو تم خوشی سے یا ناگواری سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا

مِنْكُمْ ۭ اِنَّكُمْ كُنْتُمْ قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ۝۵۳ وَمَا مَنَعَهُمْ اَنْ تُقْبَلَ

تمہاری طرف سے، بے شک تم نافرمان لوگ ہو۵۳ نہیں روکا اُن کو یعنی ان کے صدقات قبول کیے

مِنْهُمْ نَفَقٰتُهُمْ اِلَّآ اَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَبِرَسُوْلِهٖ وَلَا يَاْتُوْنَ

جانے کو مگر اس بات نے کہ بے شک انہوں نے کفر کیا اللہ کے ساتھ اور اُس کے رسول کے ساتھ، اور نہیں آتے وہ

الصَّلٰوةَ اِلَّا وَهُمْ كُسَالٰى وَلَا يُنْفِقُوْنَ اِلَّا وَهُمْ

نماز کے پاس مگر اس حال میں کہ وہ سستی کے مارے ہوئے ہوتے ہیں اور نہیں خرچ کرتے وہ مگر اس حال میں کہ وہ دل سے

كٰرِهُوْنَ ﴿۵۴﴾ فَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ ؕ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ

ناخوش ہوتے ہیں ﴿۵۴﴾ پس آپ کو تعجب میں نہ ڈالیں اُن کے مال اور نہ اُن کی اولاد، سوائے اس کے نہیں کہ اللہ تعالیٰ ارادہ کرتا ہے

لِيُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَتَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ وَهُمْ

کہ عذاب دے ان کو ان کے مالوں کے ذریعے سے دُنیوی زندگی میں اور چلی جائیں اُن کی جانیں اس حال میں کہ یہ

كٰفِرُوْنَ ﴿۵۵﴾ وَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ اِنَّهُمْ لَمِنْكُمْ ؕ وَمَا هُمْ مِّنْكُمْ

کافر ہوں ﴿۵۵﴾ قسمیں کھاتے ہیں اللہ کی کہ بے شک وہ البتہ تم میں سے ہیں، وہ تم میں سے نہیں ہیں،

وَلٰكِنَّهُمْ قَوْمٌ يَّفْرَقُوْنَ ﴿۵۶﴾ لَوْ يَجِدُوْنَ مَلْجَاً اَوْ مَغٰرٰتٍ اَوْ مُدَّخَلًا

لیکن وہ لوگ ڈرتے ہیں ﴿۵۶﴾ اگر پالیں وہ کوئی ٹھکانا یا کوئی غاریں یا کوئی گھسنے کی جگہ

لَّوَلَّوْا اِلَيْهِ وَهُمْ يَجْمَحُوْنَ ﴿۵۷﴾ وَمِنْهُمْ مَّنْ

تو البتہ پیٹھ پھیریں وہ اُس کی طرف اس حال میں کہ وہ رسّے تڑاتے ہوں ﴿۵۷﴾ اور ان میں سے بعض وہ ہے

يَّلْمِزُكَ فِى الصَّدَقٰتِ ۚ فَاِنْ اُعْطُوْا مِنْهَا رَضُوْا وَاِنْ لَّمْ

جو آپ کو طعنہ دیتا ہے صدقات کے بارے میں، اگر دے دیے جائیں ان صدقات میں سے تو یہ خوش ہوجاتے ہیں، اگر

يُعْطَوْا مِنْهَآ اِذَا هُمْ يَسْخَطُوْنَ ﴿۵۸﴾ وَلَوْ اَنَّهُمْ رَضُوْا مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ

صدقات میں سے نہ دیئے جائیں تو اچانک یہ ناراض ہوجاتے ہیں ﴿۵۸﴾ اور اگر یہ راضی ہوجاتے اس چیز پر جو اللہ نے دی ان کو

وَرَسُوْلُهٗ ۙ وَقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ سَيُؤْتِيْنَا اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ

اور اس کے رسول نے دی، اور کہتے کہ ہمارے لیے اللہ کافی ہے، عنقریب دیں گے اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے فضل سے

وَرَسُوْلُهٗٓ ۙ اِنَّآ اِلَى اللّٰهِ رٰغِبُوْنَ ﴿۵۹﴾ ع

اور اس کا رسول ہمیں دے گا، بے شک ہم اللہ کی طرف رغبت کرنے والے ہیں (تو یہ حالت ان کے لئے بہتر ہوتی) ﴿۵۹﴾

خلاصہ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّثِقَالًا: خِفاف خفیف کی جمع ہے ہلکے پھلکے، اور ثِقال ثقیل کی جمع ہے،

بھاری بھرکم، بوجھل۔ ''نکلو اس حال میں کہ تم ہلکے پھلکے ہو یا بھاری بھرکم ہو، بوجھل ہو'' وَ جَاهِدُوا بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ: اور جہاد کرو اپنے مالوں کے ساتھ اور جانوں کے ساتھ اللہ کے راستے میں، یہ بہتر ہے تمہارے لیے اگر تم جانو، اگر تم جانتے ہو، اگر تمہیں علم ہے۔ لَوْ كَانَ عَرَضًا قَرِيبًا: كَانَ کا اسم ہے مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَيْهِ وہ چیز جس کی طرف آپ انہیں دعوت دے رہے ہیں، اگر وہ جلدی حاصل ہونے والا سامان ہوتا، قریب سے مراد قریب الحصول، وَسَفَرًا قَاصِدًا: اور ہلکا سا سفر ہوتا، درمیانہ سا، لَاتَّبَعُوْكَ: تو البتہ یہ لوگ آپ کی پیروی کرتے، آپ کی اتباع کرتے، وَلٰكِنْ بَعُدَتْ عَلَيْهِمُ الشُّقَّةُ: شُقہ کہتے ہیں ایسی مسافت کو جو مشقت سے طے کی جائے، ''لیکن ان پر یہ مسافت دراز ہوگئی'' وَسَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ: اور عنقریب قسمیں کھائیں گے اللہ کی، لَوِ اسْتَطَعْنَا: اگر ہم طاقت رکھتے، لَخَرَجْنَا مَعَكُمْ: البتہ ضرور نکلتے تمہارے ساتھ، يُهْلِكُوْنَ اَنْفُسَهُمْ: اپنی جانوں کو ہلاکت میں ڈالتے ہیں، وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ: اللہ جانتا ہے بے شک یہ لوگ جھوٹے ہیں۔ عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ: اللہ آپ سے درگزر کرے۔ عَفَا يَعْفُو: درگزر کرنا۔ دُعائیہ جملہ ہے، جس طرح سے دُعائیہ جملے کا ترجمہ مضارع کے ساتھ کیا جاتا ہے تو یہاں بھی مضارع کے ساتھ ہی ترجمہ ہوگا، ''اللہ آپ سے درگزر کرے'' لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ: آپ نے ان کو کیوں اجازت دی؟ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَتَعْلَمَ الْكٰذِبِيْنَ: حتّٰی کے بعد مضارع آجائے تو آپ کی خدمت میں کئی دفعہ عرض کیا کہ اس کا ترجمہ نفی کے ساتھ کیا جائے تو محاورۃً زیادہ اچھی طرح سے بات واضح ہو جاتی ہے، تو یہاں بھی نفی کے ساتھ جب ترجمہ کریں گے تو معنی یوں ہو جائے گا ''جب تک واضح نہ ہو جاتے آپ کے لیے وہ لوگ جنہوں نے سچ بولا اور جب تک کہ آپ جان نہ لیتے جھوٹوں کو'' نفی کے ساتھ ترجمہ کریں گے تو یوں ہو جائے گا۔ ''آپ نے انہیں اجازت کیوں دے دی حتّٰی کے ظاہر ہو جاتے آپ کے لیے وہ لوگ جنہوں نے سچ بولا اور حتّٰی کہ جان لیتے آپ ان لوگوں کو جو جھوٹے ہیں'' اس طرح سے بھی مفہوم صحیح ہے۔ لَا يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ: نہیں اجازت طلب کرتے آپ سے وہ لوگ جو ایمان لاتے ہیں اللہ پر اور یومِ آخر پر اس بات سے کہ وہ جہاد کریں اپنے مالوں کے ساتھ اور جانوں کے ساتھ، اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ جہاد کرنے سے اجازت نہیں طلب کرتے (یعنی جہاد سے بچنے کے لئے) وہ لوگ جو ایمان لاتے ہیں اللہ کے ساتھ اور یومِ آخر کے ساتھ، اللہ تعالیٰ جاننے والا ہے متقین کو۔ سوائے اس کے نہیں کہ اجازت طلب کرتے ہیں آپ سے وہ لوگ جو نہیں ایمان لاتے اللہ کے ساتھ اور یومِ آخر کے ساتھ، وَارْتَابَتْ قُلُوْبُهُمْ: اور ان کے دل شک میں پڑے ہوئے ہیں، فَهُمْ فِيْ رَيْبِهِمْ يَتَرَدَّدُوْنَ: یہ رَیب اِرتابت کا مجرد ہے، اِرتاب: شک میں پڑنا۔ رَیب شک کو کہتے ہیں جیسے ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ۔ وَارْتَابَتْ قُلُوْبُهُمْ: ان کے دل شک میں پڑے ہوئے ہیں پس وہ لوگ اپنے شک میں متردد ہیں، بھٹک رہے ہیں، وَلَوْ اَرَادُوا الْخُرُوْجَ: اگر یہ نکلنے کا ارادہ کرتے لَاَعَدُّوْا لَهٗ عُدَّةً: تو تیار کرتے اس کے لیے کوئی سامان۔ عُدّۃ تیار کیے ہوئے سامان کو کہتے ہیں۔ البتہ تیار کرتے اس کے لیے کوئی سامان، وَلٰكِنْ كَرِهَ اللّٰهُ انْۢبِعَاثَهُمْ: لیکن اللہ نے ناپسند کیا ان کے اٹھنے کو۔ بَعَثَ يَبْعَثُ: اٹھانا۔ اِنْبِعَاث: اُٹھنا۔ اللہ تعالیٰ نے ناپسند کیا ان کے اُٹھنے کو، فَثَبَّطَهُمْ: ثَبَّطَ تَثْبِيْط: روک دینا، منع کر دینا، اصل میں اس کا مفہوم ہوا کرتا ہے کہ کسی کام میں بے رغبت بنا کر کسی کو اس کام سے روک دینا، فَثَبَّطَهُمْ کا یہی معنی ہے، اللہ تعالیٰ نے ان کو جہاد کے معاملے میں بے رغبت بنا کر بٹھا دیا، روک دیا، ان کو جہاد کا شوق نہیں رہا، ان کو شوقِ جہاد سے محروم کر کے جہاد کی نعمت سے انہیں روک دیا'' پس

منع کر دیا اُن کو اللہ نے" وَقِيْلَ اقْعُدُوْا مَعَ الْقٰعِدِيْنَ: اور کہہ دیا گیا کہ بیٹھے رہو تم بیٹھنے والوں کے ساتھ، یہ جو اُقْعُدُوْا ہے یہ تکوینی اَمر ہے کن فیکون والا، کہ جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم آجائے تو اس کے اوپر اثر مرتب ہو جاتا ہے، یہ تکوینی اَمر ہے، گویا کہ تکویناً ان کے لیے کہہ دیا گیا کہ تم بیٹھنے والوں کے ساتھ شامل ہو کر بیٹھے رہو۔ لَوْ خَرَجُوْا فِيْكُمْ: اگر یہ نکلتے تم میں، یعنی تم میں شامل ہو کر جہاد کے لیے اگر یہ نکلتے، مَّا زَادُوْكُمْ اِلَّا خَبَالًا: خبال خرابی کو کہتے ہیں، یہ لفظ پہلے بھی گزر اتھا لَا یَاْلُوْنَکُمْ خَبَالًا (آل عمران:۱۱۸) تمہیں خرابی میں ڈالنے میں یہ لوگ کوتاہی نہیں کرتے۔ "تو نہ زیادہ کرتے یہ تمہیں مگر خرابی" یعنی تمہارے اندر خرابی ہی بڑھاتے، وَّلَاۡاَوْضَعُوْا: اور البتہ یہ بھگاتے سواریوں کو، یا دوڑ دھوپ کرتے، دونوں طرح سے اس کا مفہوم ہے۔ اَوْضَعَ الرَّاحِلَةَ: اپنی سواری کو تیز رفتار کر دینا، "البتہ یہ دوڑاتے اپنی سواریوں کو" خِلٰلَكُمْ: تمہارے درمیان، يَبْغُوْنَكُمُ الْفِتْنَةَ: تلاش کرتے، طلب کرتے تم میں شرارت، وَفِيْكُمْ سَمّٰعُوْنَ لَهُمْ: تمہارے اندر اُن کے لیے سننے والے موجود ہیں۔ سَمّاع کا لفظ "جاسوس" کے لیے استعمال ہوتا ہے جو کسی کی باتیں سُن کے کسی دوسرے تک پہنچائے، اس لیے حضرتِ شیخ (الہندؒ) نے بھی یہاں ترجمہ "جاسوس" کے ساتھ ہی کیا ہے، اور "بیان القرآن" میں حضرت تھانوی ؒ نے بھی ترجمہ "جاسوس" کے ساتھ ہی کیا ہے، "تمہارے اندر اُن کے لیے سننے والے موجود ہیں" جو تمہاری باتیں سُنیں گے اور دوسروں کو پہنچائیں گے، اُن کے جاسوس تمہارے اندر موجود ہیں۔ اور یہ بھی اس کا مطلب ہوسکتا ہے کہ "تم میں بعض لوگ موجود ہیں جو اُن کی باتیں کان لگا کے سنتے ہیں" یعنی اِن کی طبعی رغبت اُن کی طرف ہے اور ان کی باتوں سے متاثر ہوتے ہیں، بعض کمزور قسم کے لوگ جو ان سے متاثر ہیں وہ تمہارے اندر موجود ہیں جو ان کی باتیں خوب توجہ سے سنتے ہیں، مطلب یہ ہے کہ وہ فتنہ پرداز ہیں، اور کچھ کمزور لوگ ایسے تمہارے اندر بھی شامل ہیں جو ان کی باتوں میں آجاتے ہیں، یہ مفہوم بھی اس کا ہوسکتا ہے۔ "اللہ تعالیٰ جاننے والا ہے ظالموں کو"۔ لَقَدِ ابْتَغَوُا الْفِتْنَةَ: البتہ تحقیق انہوں نے شرارت طلب کی تھی، مِنْ قَبْلُ: اس سے پہلے بھی، وَقَلَّبُوْا لَكَ الْاُمُوْرَ: اور تیرے لیے امور کو اُلٹ پُلٹ کیا تھا، یعنی آپ کے لیے مختلف تدبیریں کرتے رہے، اُلٹ پُلٹ کیے آپ کے لیے بہت سے کام، حَتّٰى جَآءَ الْحَقُّ: یہاں تک کہ حق آگیا وَظَهَرَ اَمْرُ اللّٰهِ: اور اللہ کا حکم غالب آگیا، وَهُمْ كٰرِهُوْنَ: اس حال میں کہ وہ کراہت کرنے والے ہیں، اُن کو پسند نہیں، وہ ناخوش ہیں۔ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ ائْذَنْ لِّيْ: اور اِن میں سے کوئی وہ بھی ہے جو کہتا ہے کہ مجھے اجازت دے دو، وَلَا تَفْتِنِّيْ: اور مجھے فتنے میں نہ ڈالو، اَلَا فِي الْفِتْنَةِ سَقَطُوْا: خبردار! فتنے میں تو وہ لوگ گر گئے، وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ: اور بے شک جہنم البتہ گھیرا ڈالنے والی ہے کافروں کو، گھیرے ہوئے ہے کافروں کو۔ اِنْ تُصِبْكَ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ: اگر آپ کو کوئی اچھی حالت پہنچتی ہے تو وہ اچھی حالت اُن کو غم میں ڈال دیتی ہے۔ تَسُؤْ کی ضمیر حَسَنَةٌ کی طرف جارہی ہے۔ اور حسنہ کی مصداق ہوتا ایسی حالت جو انسان کے نزدیک پسندیدہ ہے، مرضی کے مطابق ہے، خواہش کے مطابق ہے۔ "اگر تمہیں کوئی اچھی حالت پہنچتی ہے تو وہ ان کو غم میں ڈال دیتی ہے" وَاِنْ تُصِبْكَ مُصِيْبَةٌ: اور اگر آپ کو کوئی مصیبت پہنچتی ہے يَّقُوْلُوْا: تو یہ لوگ کہتے ہیں، قَدْ اَخَذْنَآ اَمْرَنَا مِنْ قَبْلُ: تحقیق ہم نے اختیار کر لیا اپنا امر اس سے پہلے ہی، اس امر سے اَمرِ احتیاط مراد ہے، ہم نے اپنا احتیاطی پہلو پہلے ہی اختیار کر لیا تھا، وَيَتَوَلَّوْا: اور آپ کی مجلس سے وہ اٹھ کے جاتے ہیں، پیٹھ پھیر کے جاتے ہیں، وَّهُمْ فَرِحُوْنَ: اس حال میں کہ خوش ہوتے ہیں۔ قُلْ لَّنْ يُّصِيْبَنَآ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا: آپ کہہ دیجئے کہ ہرگز نہیں پہنچے گی

ہمیں مگر وہی چیز جو اللہ نے ہمارے لیے لکھ دی۔ ''مَا'' سے مصیبت مراد ہے۔ هُوَ مَوْلٰىنَا: وہ ہمارا کارساز ہے، مولیٰ ہے، وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ: اور اللہ پر ہی توکل کرنا چاہیے ایمان والوں کو۔ قُلْ: آپ کہہ دیجئے هَلْ تَرَبَّصُوْنَ بِنَآ: نہیں انتظار کرتے تم ہمارے متعلق اِلَّآ اِحْدَى الْحُسْنَيَيْنِ: مگر دو اچھی باتوں میں سے ایک بات کا۔ الْحُسْنَيَيْنِ حُسنٰی کا تثنیہ ہے۔ نہیں انتظار کرتے تم ہمارے متعلق مگر دو بھلی حالتوں میں ایک بھلی حالت کا، وَنَحْنُ نَتَرَبَّصُ بِكُمْ: اور ہم انتظار کرتے ہیں تمہارے متعلق اَنْ يُّصِيْبَكُمُ اللّٰهُ بِعَذَابٍ مِّنْ عِنْدِهٖٓ: کہ پہنچا دے تمہیں اللہ تعالیٰ عذاب اپنے پاس سے اَوْ بِاَيْدِيْنَا: یا ہمارے ہاتھوں، براہِ راست اللہ کی طرف سے عذاب آجائے یا ہمارے ہاتھوں تمہیں اللہ کوئی عذاب پہنچا دے، فَتَرَبَّصُوْٓا: پس تم انتظار کرو، اِنَّا مَعَكُمْ مُّتَرَبِّصُوْنَ: بے شک ہم بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والے ہیں۔ قُلْ اَنْفِقُوْا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا: آپ کہہ دیجئے کہ خرچ کرو تم خوشی سے یا ناگواری سے، لَّنْ يُّتَقَبَّلَ مِنْكُمْ: ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا تمہاری طرف سے، اِنَّكُمْ كُنْتُمْ قَوْمًا فٰسِقِيْنَ: بے شک تم نافرمان لوگ ہو، فاسق لوگ ہو۔ وَمَا مَنَعَهُمْ اَنْ تُقْبَلَ مِنْهُمْ نَفَقٰتُهُمْ: اَنْ تُقْبَلَ مِنْهُمْ نَفَقٰتُهُمْ، یہ مَنَعَهُمْ کی ''هم'' ضمیر سے بدل اشتمال ہے۔ نہیں روکا ان کو یعنی ان کے صدقات قبول کئے جانے کو مگر اس بات نے۔ اَنَّهُمْ كَفَرُوْا یہ ''مَنَعَ'' کا فاعل ہے۔ نہیں روکا ان کو یعنی ان کے صدقات قبول کئے جانے کو مگر اس بات نے کہ بے شک انہوں نے کفر کیا اللہ کے ساتھ اور اس کے رسول کے ساتھ، وَلَا يَاْتُوْنَ الصَّلٰوةَ اِلَّا وَهُمْ كُسَالٰى: اور نہیں آتے وہ نماز کے پاس مگر اس حال میں کہ وہ سستی کے مارے ہوئے ہوتے ہیں۔ كُسَالٰى كَسْلان کی جمع ہے۔ وَلَا يُنْفِقُوْنَ اِلَّا وَهُمْ كٰرِهُوْنَ: اور نہیں خرچ کرتے وہ مگر اس حال میں کہ وہ دل سے ناخوش ہوتے ہیں، فَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ: پس آپ کو تعجب میں نہ ڈالیں ان کے مال اور نہ ان کی اولاد، اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ بِهَا: سوائے اس کے نہیں کہ اللہ تعالیٰ ارادہ کرتا ہے کہ عذاب دے ان کو ان کے مالوں کے ذریعہ سے فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا: دنیوی زندگی میں، وَتَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ: اور چلی جائیں ان کی جانیں، وَهُمْ كٰفِرُوْنَ: اس حال میں کہ یہ کافر ہوں۔ وَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ اِنَّهُمْ لَمِنْكُمْ: قسمیں کھاتے ہیں اللہ کی کہ بے شک وہ البتہ تم میں سے ہیں، یعنی تمہارے جماعت کے فرد ہیں، وَمَا هُمْ مِّنْكُمْ: وہ تم میں سے نہیں ہیں، وَلٰكِنَّهُمْ قَوْمٌ يَّفْرَقُوْنَ: لیکن وہ لوگ ڈرتے ہیں۔ فَرِقَ فَرَقًا: ڈرنا۔ وہ لوگ ڈرتے ہیں، لَوْ يَجِدُوْنَ مَلْجَاً: اگر پالیں وہ کوئی ٹھکانا، اَوْ مَغٰرٰتٍ: یا پالیں وہ کوئی غاریں۔ مَغٰرٰتٍ مغارۃ کی جمع ہے، پہاڑوں کے اندر جو کھوہ ہوتی ہے۔ ''یا پالیں وہ غاریں'' اَوْ مُدَّخَلًا: یا کوئی گھسنے کی جگہ جہاں وہ سر چھپا سکیں، مُدَّخَل: جہاں بہ تکلف گھس کے سر چھپا لیں، ''یا پالیں وہ کوئی گھسنے کی جگہ'' لَّوَلَّوْا اِلَيْهِ: البتہ پیٹھ پھیر کے بھاگ جائیں اس جگہ کی طرف، وَهُمْ يَجْمَحُوْنَ: جمح الفرس، جمح البعیر، اس کا مفہوم ہوتا ہے تَغَلَّبَ عَلٰى رَاكِبِهٖ اپنے سوار پر وہ غالب آگیا، روکا ہوا رُکتا نہیں، جس طرح سے جانور سرکش ہو جائے اور سنبھالا ہوا نہ سنبھالا جائے تو اس کے لیے ''جمح'' کا لفظ بولتے ہیں، اور ہماری زبان میں اس مفہوم کو ادا کرنے کے لیے ''رَسّے تڑانے'' کا لفظ ہے، ''رَسّا تڑا کے بھاگ گیا، رَسّا چھڑا کے بھاگ گیا'' مطلب یہی ہے کہ وہ قابو میں نہیں رہا، اور جس وقت کوئی آدمی کسی جگہ سے کسی کام سے شدت کے ساتھ انکار کرتا ہوا جاتا ہے تو کہا جاتا ہے کہ ہم نے اسے بہت سنبھالا لیکن وہ تو رَسّا تڑا کے بھاگ گیا، تو یہ مفہوم ہے یہاں، ''پیٹھ پھیریں وہ اس کی طرف اس حال میں کہ وہ رَسّے تڑاتے ہوں'' یعنی اس طرح سے بدک کر بھاگیں جس طرح سے کوئی جانور رَسّے تڑا کے دوڑتا ہے۔ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّلْمِزُكَ فِي الصَّدَقٰتِ:

اوران میں سے بعض وہ ہے جو آپ کو طعنہ دیتا ہے صدقات کے بارے میں۔لَمز طعنہ دینے کو کہتے ہیں، لُمَزَة کا لفظ تیسویں پارے میں ہے هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ۔ فَاِنْ اُعْطُوْا مِنْهَا: اگر وہ دے دیے جائیں ان صدقات میں سے۔مَن لفظوں میں مفرد ہے اس لیے یَلْمِزُ کی ضمیر مفرد لوٹی، لیکن مصداق کوئی ایک آدھا فرد نہیں ہے بلکہ جماعت کی جماعت ہے اس لیے اُعْطُوْا میں ضمیر جمع کی لوٹائی گئی۔ ''اگر دے دیے جائیں وہ ان صدقات میں سے'' رَضُوْا: تو یہ خوش ہو جاتے ہیں، وَاِنْ لَّمْ يُعْطَوْا مِنْهَآ: اور اگر ان صدقات میں سے نہ دیے جائیں، اِذَا هُمْ يَسْخَطُوْنَ: تو اچانک یہ ناراض ہو جاتے ہیں، وَلَوْ اَنَّهُمْ رَضُوْا مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ: اور اگر یہ خوش ہوتے اس چیز کے ساتھ، راضی ہو جاتے اس چیز پر جو اللہ نے دی ان کو اور اس کے رسول نے دی وَقَالُوْا: اور کہتے کہ حَسْبُنَا اللّٰهُ: ہمارے لیے اللہ کافی ہے سَيُؤْتِيْنَا اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَرَسُوْلُهٗٓ: عنقریب دیں گے اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے فضل سے اور اس کا رسول ہمیں دے گا، اِنَّآ اِلَى اللّٰهِ رٰغِبُوْنَ: بے شک ہم اللہ کی طرف رغبت کرنے والے ہیں۔ لَوْ اَنَّهُمْ رَضُوْا لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ، یہ اس کی جزاء محذوف ہوگی۔ ''اگر یہ خوش ہوتے اس چیز پر جو اللہ نے دے دی اور اس کے رسول نے دے دی اور اللہ پر یہ اپنا اعتماد ظاہر کرتے تو یہ حالت ان کے لیے بہتر ہوتی۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

ماقبل سے ربط

پہلی آیت تو پچھلے مضمون سے متعلق ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ نے جہاد کی ترغیب دی تھی، اور یہ موقع ہے غزوۂ تبوک کا، اور اس موقع پر سرورِ کائنات ﷺ کی طرف سے نفیرِ عام ہو گیا تھا، امام کی طرف سے جب نفیرِ عام ہو جائے تو پھر جہاد فرض علی الکفایہ نہیں رہتا، بلکہ فرض علی العین ہو جاتا ہے، تو یہ موقع بھی ایسے ہی تھا کہ اس جہاد کو فرض علی العین کر دیا گیا، سب لوگوں کو حکم دے دیا گیا تھا کہ نکلو، چاہے کسی کے پاس پورا سامان ہے، چاہے کسی کے پاس نہیں ہے، جیسے کیسے بھی ہیں اس جہاد کے اندر سب نکلو۔

غزوۂ تبوک کی تیاری اور سیّدنا عثمان رضی اللہ عنہ کی سخاوت

تفصیل عرض کرتے ہوئے یہ بات پہلے آپ کے سامنے آئی تھی، کہ اس موقع پر لوگوں کے مختلف گروہ ہو گئے، بعض جو اعلیٰ درجے کے مخلصین تھے وہ تو فوراً تیار ہو گئے اور انہوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، یہی موقع ہے کہ جس میں سرورِ کائنات ﷺ نے جب سامانِ جہاد کے لیے چندے کی اپیل کی تھی، تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے سو اونٹ پیش کیا تھا، اور ایک ہزار دینار دیا تھا، اور پھر دوبارہ اپیل کی تو پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کھڑے ہو گئے پھر سو اونٹ پیش کیا بمع ساز وسامان کے، پھر تیسری دفعہ حضور ﷺ اعلان فرمایا تو پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے پھر ایک سو اونٹ پیش کیے۔ اگرچہ ان الفاظ کی تعبیر علماء نے دو طرح سے کی ہے، کہ پہلے اعلان پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے کہا تھا کہ میرے ذمہ ایک سو اونٹ ہے بمع ساز وسامان کے، اور دوسری دفعہ اعلان کیا تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے

کہا کہ میرے ذمہ دوسو اونٹ ہیں بمع ساز وسامان کے، اور تیسری دفعہ اعلان کیا تو حضرت عثمان ﷛ نے کہا کہ میرے ذمہ تین سو اونٹ ہیں بمع ساز وسامان کے، تو سرورِ کائنات ﷺ یہ کہتے ہوئے منبر سے اتر آئے تھے کہ آج کے بعد عثمان اگر کوئی نیکی کا کام نہ کرے تو اس کا کوئی نقصان نہیں۔[1] مطلب یہ تھا کہ یہی عمل اس کی نجات کے لیے کافی ہے۔ تو یہ دوسو اونٹ اگر ماقبل والے ساتھ ملا کر ہوں تو سو پہلے کہا، سو پھر ہو گیا، دوسو ہو گئے، اور تین سو اونٹ اگر ماقبل والے ساتھ ملا کر ہوں تو دوسو پہلے تھے، ایک سو کا اور اضافہ کر دیا، تین سو ہو گئے، یہ بھی اس کی مراد ہے۔ اور ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ وہ سو علیحدہ، دوسو علیحدہ، اور تین سو علیحدہ، تو اس طرح سے مجموعہ چھ سو اونٹ ہو جاتے ہیں۔ تو اس طرح سے لوگوں نے بڑھ چڑھ کے حصہ لیا، جتنے مخلص تھے کسی نے کمی کوتاہی نہیں کی۔

مذکورہ آیات میں بیان کردہ مضمون

اور منافقین جو تھے وہ بھی اس جہاد میں بہت اچھی طرح سے کھل کر سامنے آ گئے، اُن کی حالت بہت نمایاں ہو گئی، بعض تو ایسے تھے جو گھروں میں بیٹھ رہے، نہ کوئی عذر ہی کرنے کے لیے آئے اور نہ وہ ساتھ ہی چلے، اُن کا ذکر آگے آ رہا ہے اسی پارے کے آخر میں، اور بعض ایسے تھے جن کا ارادہ جہاد پہ جانے کا بالکل نہیں تھا، تیاری بھی کوئی نہیں کی، لیکن جب سرورِ کائنات ﷺ روانہ ہونے لگے تو آئے اور جھوٹی قسمیں کھا کے کہنے لگے کہ ہمارا ارادہ تو تھا، لیکن یہ عذر پیش آ گیا، ہمارا ارادہ تو تھا لیکن یہ مجبوری ہو گئی، اس قسم کی انہوں نے آ کر معذرتیں کرنی شروع کر دیں، رسول اللہ ﷺ نے بھی اپنے کریم النفسی سے کسی پر گرفت نہیں فرمائی، بلکہ جو آ کے کسی قسم کا عذر کرتا آپ اُس کے عذر کو قبول کر لیتے، اور اُسے اجازت دے دیتے۔ اب آپ جانتے ہیں، کہ جس وقت رسول اللہ ﷺ کی طرف سے اجازت ہو گئی، تو اب سچے اور جھوٹے کے اندر ظاہری طور پر کوئی فرق نہ رہا، اگر سرورِ کائنات ﷺ اجازت نہ دیتے اور کہتے کہ نہیں، کوئی عذر قبول نہیں ہے، تو جو منافق تھے انہوں نے جانا تو تھا ہی نہیں، نہ انہوں نے تیار کرنی تھی، تو پھر یہ بالکل نمایاں ہو جاتے، ان کے اندر کسی قسم کا کوئی خفاء نہ رہتا، اور جب وہ عذر کر کر کے اجازت لے گئے تو اب اس میں اشتباہ ہو گیا کہ ان میں سے کون سچا ہے اور کون جھوٹا ہے؟ تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہاں سرورِ کائنات ﷺ کے اوپر تھوڑی سی اس بارے میں کچھ تنبیہ فرمائی، کہ اگر آپ اجازت نہ دیتے تو آج یہ کھل کے سارے سامنے آ جاتے، آپ نے اجازت جو دے دی تو ان کے اوپر ایک پردہ پڑ گیا، اس بات کو کہتے وقت ابتدا کے اندر عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ پہلے ہی معافی کا اعلان بھی کر دیا، کہ یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے کہ جس پر کوئی ناراضگی باقی رہ جائے، لیکن مصلحت کے خلاف بات ہو گئی کہ آپ ﷺ کو چاہیے تھا کہ آپ ان کو اجازت نہ دیتے تا کہ ان کا جھوٹ اچھی طرح نمایاں ہو جاتا، سچے اور جھوٹے میں فرق ہو جاتا، اگر تو یہ سچے ہوتے کہ ہمارا ارادہ تھا، تو آپ اجازت نہ دیتے تو بھی چل پڑتے، اور اگر اجازت نہ دینے کے باوجود گھروں میں بیٹھے رہتے تو ان کا نفاق کھل کر سب کے سامنے آ جاتا، اصل بات یہ ہے کہ اگر کوئی تر لقمہ نصیب ہونے والا ہوتا، جس چیز کی طرف آپ دعوت دے رہے ہیں، کوئی بہت جلدی سامانِ غنیمت ملنے والا ہوتا، سفر تھوڑا سا ہوتا، پھر تو یہ بھاگ بھاگ کے آتے، لیکن چونکہ اب سفر دراز ہے، مشقت اس میں بہت

[1] ترمذی ۲/۲۱۱ باب فی مناقب عثمان / مشکوٰۃ ج ۲ ص ۵۶۱ عن عبد الرحمان بن سمرہ۔

ہے، اس لیے یہ لوگ گھروں کے اندر دَب کے بیٹھ گئے، جہاد کرنے پر یہ آمادہ نہیں، تو اگلے رکوع کے اندر ساری انہی کی کوتاہیاں واضح کی ہیں، کافی دُور تک یہ مضمون چلا گیا ہے، ساتھ ساتھ آیات کو دیکھتے چلیے۔

پہلے تو وہی جہاد کے متعلق ترغیب ہے کہ اگر سامان تمہارے پاس کم ہے، زیادہ ہے، جیسا بھی ہے، نکلو، یہ نفیر عام ہے، ''اور اپنی جانوں کے ساتھ اور مالوں کے ساتھ اللہ کے راستے میں جہاد کرو، یہ تمہارے لیے بہتر ہے اگر تمہیں علم ہو'' یعنی جہاد پر جس قسم کے منافع آنے والے ہیں، جہاد پر جس قسم کا اجر آتا ہے، اللہ کی رضا آتی ہے، اُس کے مقابلے میں یہ دنیا کی مشقت کوئی چیز نہیں۔

غزوۂ تبوک کے وقت منافقین کا حال

آگے تذکرہ شروع ہو گیا منافقین کا۔ کَانَ کا اسم میں نے واضح کر دیا، کہ وہ چیز جس کی طرف آپ انہیں دعوت دے رہے ہیں، اگر یہ کوئی جلدی حاصل ہونے والا سامان ہوتا، یا سفر زیادہ لمبا نہ ہوتا، درمیانہ سا سفر ہوتا، تو پھر یہ آپ کی اتباع کرتے، کیونکہ اس میں پھر ان کو دنیوی منافع زیادہ معلوم ہوتے تھے۔ اب یہ جو مسافت بعیدہ ہے، جدھر آپ ان کو بلا رہے ہیں، وہ ان کو بڑی دراز معلوم ہو رہی ہے، اس لیے وہ ادھر جانے کی جرأت نہیں کر رہے، اور قسمیں کھائیں گے اللہ کی، کہ اگر ہم میں طاقت ہوتی تو ہم ضرور آپ کے ساتھ چلتے، اس طرح سے جھوٹ بول بول کر اپنے آپ کو مزید ہلاکت میں ڈالتے چلے جا رہے ہیں، کیونکہ ایک تو جہاد سے کوتاہی کہ دبک کے گھر میں بیٹھ رہنا یہی بُری بات ہے، یہ بھی اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالا، اور پھر اس کو چھپانے کے لیے مزید جھوٹ بولنا اور جھوٹی قسمیں اٹھانا یہ اور زیادہ وبال میں اضافہ ہوا، تو اپنے نفسوں کو ہلاکت میں ڈال رہے ہیں، اور اللہ جانتا ہے کہ یہ جھوٹے ہیں۔

''اللہ تعالیٰ آپ سے درگزر کرے، آپ کو معاف کرے'' دیکھو! پہلے ہی عفو کا ذکر کر دیا، تا کہ معلوم ہو جائے کہ آگے جو بات ذکر کی جا رہی ہے یہ خلافِ مصلحت ہونے کی بنا پر یہ ایک قسم کی نشاندہی کی جا رہی ہے، کہ بات خلافِ مصلحت ہو گئی، ورنہ اس کے اوپر آئندہ کوئی گرفت کا اندیشہ نہیں۔ ''اللہ آپ سے درگزر کرے، آپ نے ان کو اجازت کیوں دے دی'' یعنی اجازت نہ دیتے تا کہ آپ کے لیے سچے اور جھوٹے واضح ہو جاتے۔ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ: آپ نے ان کو اجازت کیوں دے دی؟ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا: حتیٰ کہ واضح ہو جاتے آپ کے لیے وہ لوگ جنہوں نے سچ بولا، اور حتیٰ کہ آپ جان لیتے جھوٹوں کو، یعنی اجازت نہ دیتے تو یہ دونوں گروہ ممتاز ہو کے سامنے آ جاتے۔ ''نہیں اجازت طلب کرتے آپ سے وہ لوگ جو اللہ پر ایمان لاتے ہیں اور یوم آخر پر ایمان لاتے ہیں، جہاد سے بچنے کے لیے'' اَنْ يُّجَاهِدُوْا: اَىْ مِنْ اَنْ يُّجَاهِدُوْا، جہاد کو ترک کرنے کے لیے، جہاد کو چھوڑ کر بیٹھنے کے لیے یہ لوگ آپ سے اجازت طلب نہیں کرتے، کہ وہ جہاد کریں اپنے مالوں کے ساتھ اور اپنی جانوں کے ساتھ، اللہ تعالیٰ متقین کو خوب جانتا ہے۔ جن میں ایمان ہے جب آپ کی طرف سے اعلان ہو گیا تو وہ جہاد پر آمادہ ہیں، اپنی جان اور مال سب کچھ لگا دینا

چاہتے ہیں۔ جان اور مال کو بچانا اور جہاد کو ترک کرنا، اس کے لئے مؤمن اجازت نہیں لیتے۔" اجازت وہی لوگ لیتے ہیں جن کا اللہ پر ایمان نہیں اور یوم آخر پر ایمان نہیں، اور ان کے دل شک میں پڑے ہوئے ہیں" شک ان کو یہی تھا کہ معلوم نہیں اتنے لمبے سفر پر جائیں گے، آگے بہت بڑی حکومت کے ساتھ ٹکر ہے، قواعد دان فوجیں ہیں، وہاں سے بچ کے آئیں گے یا نہیں آئیں گے، اور ادھر ہمارے باغات کا بھی نقصان ہو جائے گا۔ اللہ تعالیٰ کے وعدوں پر ان کو یقین نہیں، اسی قسم کے تردد میں یہ بھٹکتے پھر رہے ہیں۔ فَهُمْ فِیْ رَیْبِهِمْ یَتَرَدَّدُوْنَ۔

سچے اور جھوٹے عُذر کی پہچان

اور ان کے جھوٹے ہونے کی علامت یہ ہے کہ اگر ان کے نکلنے کا ارادہ ہوتا تو یہ کچھ تیاری کرتے، اگر تیاری کرتے پھر موقع پر کوئی عذر آجاتا تو سب کو معلوم ہوتا، کہ واقعی ان کی تیاری تو تھی، اور اگر یہ عذر پیش نہ آتا تو یہ ضرور چلتے۔ دیکھو! سچے اور جھوٹے عذروں کے اندر یہ ایک بہت بڑا ظاہری امتیاز ہے، کہ ایک آدمی اپنی طرف سے پوری کوشش صرف کرتا ہے، ارادہ اس کا مکمل ہوتا ہے، مثلاً صبح کسی کا اُٹھنے کا پکا ارادہ ہے کہ میں اٹھوں گا اور تہجد پڑھوں گا، اپنے طور پر وہ وقت پہ سوتا ہے، کسی دوسرے ساتھی سے کہہ کے سوتا ہے کہ اگر آنکھ کھل جائے تو مجھے جگا دینا، یا کوئی ٹائم پیس یا الارم کا انتظام کرتا ہے، الارم لگاتا ہے کہ جب یہ بجے گا تو میں اٹھوں گا، ہر چیز کا وہ انتظام کر کے سوتا ہے، لیکن پھر اتفاق ایسا ہوا کہ ایسی گہری نیند آئی کہ آنکھ نہیں کھلی، یا وہ جگانے والا نہیں آیا، اب یہ شخص معذور ہے، اگر تہجد کے لیے نہیں اُٹھ سکا تو اللہ تبارک وتعالیٰ اس کے ارادہ کے طور پر اس کو ثواب دیں گے۔ اور اگر ایک شخص ایسا ہے کہ اُس کی اِبتدا سے ہی نیت خراب ہے، اور سویا وہ ایسے انداز سے ہے کہ اُس کا اٹھنے کا ارادہ ہی نہیں، تو یہ شخص اس نیکی سے محروم ہوگا، پھر اس کا یہ کہنا کہ جی! مجھے کوئی جگانے کے لیے نہیں آیا، میں اس لیے نہیں اٹھا، یا ٹائم پیس کا الارم مجھے نہیں سنا، تو یہ ایک دین داری کا پردہ ڈالنے والی بات ہے، اور حقیقت کے اعتبار سے اس کا خود ارادہ تھا کہ اچھا ہے آنکھ نہ کھلے تو ساری رات سوئیں گے۔ تو ایک آدمی حتی الامکان اسباب کو جمع کرے، پھر موقع پر کوئی عذر پیش آجائے تو یہ سچا عذر ہوتا ہے، (مثلاً) جمعہ کا دِن ہے اور جمعہ کی تیاری آپ کرتے ہیں، اچھی طرح سے کپڑے دھوئے ہیں، نہائے ہیں، اور عین موقع پر کوئی اس قسم کی تکلیف ہوگئی، یا کوئی رکاوٹ پیش آگئی کہ آپ پہنچ نہ سکیں، تو ہر کوئی جانتا ہے کہ آنے کا ارادہ تو تھا، لیکن یہ عذر پیش آگیا۔ اور جو کوتاہی کر کے کسل مندی کے ساتھ بیٹھے ہوئے ہوں، اور اس طرح سے حیلے بہانے کرتے ہیں، تو ان کا جھوٹ اسی سے نمایاں ہو جاتا ہے، کہ قبل از وقت تو ان کو پتا نہیں تھا، کہ ہمارے سامنے کوئی رکاوٹ آجانی ہے، یہ پہلے ہی ہاتھ پاؤں جوتوڑ کے بیٹھ گئے تو یہ جھوٹے ہیں۔ منافقین کا یہی حال تھا، یہ نہیں کہ انہوں نے سامان اکٹھا کرنے کی کوشش کی تھی، سواری تیار کی تھی، ہتھیار مہیا کیے تھے، لیکن عین روانگی کے وقت سخت بخار ہو گیا، یا کوئی چوٹ لگ گئی، یا کوئی اور عذر پیش آگیا، ایسی بات نہیں تھی۔ تو یہاں اللہ تبارک وتعالیٰ اُن کے جھوٹ کے لیے اُن کی اس کسل مندی کو ہی بطور نشانی کے پیش کرتے ہیں، کہ اگر ان کے نکلنے کا ارادہ ہوتا تو یہ کچھ سامان تیار کرتے۔ یہ تو ان کی طرف سے بات ہوئی۔

غزوۂ تبوک میں منافقین کے شریک نہ ہونے میں حکمت

اب اہلِ ایمان کو تسلی دی جا رہی ہے، کہ ان کا نہ نکلنا ہی یوں سمجھو کہ تمہارے لیے مفید ہے، کیونکہ یہ مخلص تو ہیں نہیں، اور ایسے نازک موقع پر غیر مخلص جب جماعت میں شامل ہو جایا کرتے ہیں تو مختلف حرکتیں کر کے شرارتیں بھڑکاتے ہیں، کسی کے ساتھ لڑیں گے، کبھی یہ غلط افواہیں پھیلائیں گے، کبھی بزدلی کا مظاہرہ کر کے باقیوں کا دل بھی توڑیں گے، تو ایسے موقع پر اتنے دراز سفر کے لیے، اتنے مشکل جہاد کے لیے ان کا نہ نکلنا ہی تمہارے لیے مفید تھا، وَلٰكِنْ كَرِهَ اللّٰهُ انْۢبِعَاثَهُمْ: اللہ نے ان کا اٹھنا مکروہ جانا، یعنی اس کو پسند ہی نہیں کیا، اور ان کو بے رغبت کر کے بٹھا دیا، اور تکوینی طور پر کہہ دیا گیا کہ بیٹھنے والوں کے ساتھ بیٹھے رہو، اگر یہ نکلتے تمہارے اندر تو سوائے خرابی کے کچھ نہ بڑھاتے، ان کے نکلنے کا فائدہ نہ ہوتا، نقصان زیادہ تھا، نقصان اس طرح تھا کہ شرارتیں کرتے، کسی کے ساتھ لڑتے، کسی کے ساتھ فتنہ اٹھاتے، اور مختلف قسم کی افواہیں پھیلا کر بددلی پھیلاتے، وَلَاۡاَوْضَعُوْا خِلٰلَكُمْ يَبْغُوْنَكُمُ الْفِتْنَةَ: تمہارے اندر یہ سواریاں دوڑاتے ہیں شرارت طلب کرنے کے لیے، لگائی بجھائی جس طرح سے منافقین کی عادت ہے، اِدھر کی اُدھر لگاؤ، وَفِيْكُمْ سَمّٰعُوْنَ لَهُمْ: اب بھی تمہارے اندر اُن کے بعض جاسوس موجود ہیں جو تمہارے حالات اُن تک پہنچائیں گے، یا (مطلب یہ ہے کہ) تمہارے اندر کچھ کمزور لوگ اس قسم کے موجود ہیں جو اُن سے متاثر ہیں اور اُن کی باتیں توجہ سے سنتے ہیں، اِن کی طرف بھی ذرا نظر رکھیو، ان کو تاڑ کر رکھیو، تاکہ یہ بھی اپنی کمزوری کی بناء پر کوئی شرارت نہ اٹھا سکیں، اگرچہ ان کے سرغنے نہیں آئے، ان کے بڑے نہیں آئے، لیکن پھر بھی چھوٹے موٹے لوگ موجود ہیں، اور ایسے لوگ تھے جن سے بعض باتیں اس قسم کی پیش آئیں جن کا ذکر آگے قرآنِ کریم میں آئے گا۔ ''اللہ تعالیٰ ظالموں کو خوب جانتے ہیں''۔ انہوں نے اس سے پہلے بھی شرارت طلب کی تھی لَقَدِ ابْتَغَوُا الْفِتْنَةَ مِنْ قَبْلُ: اس مِنْ قَبْلُ سے اشارہ ہے جنگِ اُحد کی طرف، کہ یہ ساتھ شامل ہو کے نکلے تو تھے، لیکن شہر سے باہر جا کے پھر کوئی بہانہ کر کے عبداللہ بن ابی اور اس کے تمام رفقاء واپس آگئے۔ اب اس قسم کی حرکت باقیوں کے حوصلے توڑنے کے لیے بھی بسا اوقات اثر انداز ہو جاتی ہے، کہ جب ایک ہزار آدمی نکلیں، تین سو اُن میں سے کوئی بہانہ کر کے واپس آ جائیں، تو باقیوں کے دل بھی چھوٹ سکتے ہیں، جس طرح سے دو گروہوں نے اس طرح سے دل چھوڑنے کا کچھ ارادہ کر لیا تھا اِذْ هَمَّتْ طَّآئِفَتٰنِ مِنْكُمْ اَنْ تَفْشَلَا (سورۂ آل عمران: ۱۲۲) دو طائفوں نے دل چھوڑنے کا قصد کر لیا تھا، لیکن اللہ نے انہیں سنجال لیا۔ تو اسی طرح سے جیسے اس وقت انہوں نے شرارت کی تھی، اب بھی کوئی ایسی شرارت کرتے، احد میں شرارت کی تھی، اس سے پہلے غزوۂ مریسیع پیش آیا تھا، اُس میں مہاجرین وانصار کو لڑانے کے لیے شرارت برپا کی تھی، حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے متعلق اس قسم کی باتیں اُڑا کے فتنہ اُٹھایا تھا، یہ سارے فتنوں کی طرف اشارہ ہو سکتا ہے۔ وَقَلَّبُوْا لَكَ الْاُمُوْرَ: آپ کے لیے بھی بہت ساری باتوں کو اُلٹ پلٹ کرتے رہے ہیں، اس قسم کی گڑبڑ کرتے رہے ہیں آپ کو شکست دینے کے لیے، لیکن اللہ کی طرف سے حق آ گیا اور اللہ کا اَمر غالب رہا، اور یہ دل سے خوش نہیں ہیں، اسلام کا غلبہ دیکھ کر اور آپ کا غلبہ دیکھ کر ان کو کوئی خوشی نہیں ہے۔

ایک منافق کا ’’کلابی تقویٰ‘‘

’’اور ان میں سے کوئی یہ بھی ہے جو کہتا ہے کہ مجھے اجازت دے دو، اور مجھے فتنے میں نہ ڈالو!‘‘ مفسرین نے یہاں خاص طور پر ذکر کیا کہ ایک منافق تھا جَد بن قیس، جد اُس کا نام تھا، قیس کا بیٹا ہے، یہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور بہت دِین داری اور تقویٰ کا مظاہرہ کیا، بایں الفاظ کہ یارسول اللہ! میں نے سنا ہے کہ رُومی عورتیں بڑی خوبصورت ہیں، اور میں عورتوں کے بارے میں کچھ جذباتی واقع ہوا ہوں، تو میں اگر آپ کے ساتھ اس علاقے میں چلا گیا اور کسی عورت پر میری نظر پڑ گئی تو میں خواہ مخواہ فتنے میں پڑ جاؤں گا، اس لیے میرا یہاں بیٹھا رہنا ہی مناسب ہے، مجھے اجازت دے دیں، اور کچھ پیسے دیے کہ میں جہاد میں چندہ دے دیتا ہوں، یعنی تھی تو اندر خباثت، کہ جہاد میں جانا نہیں چاہتا تھا، اُدپر سے تقویٰ کا اور خدا خوفی کا پردہ ڈال لیا، کہ میں اگر وہاں جاؤں گا تو کسی فتنے میں مبتلا ہو جاؤں گا۔ جیسے کوئی شخص نماز با جماعت میں اصل تو اس لیے نہ جائے کہ آرام طلبی ہے، کون سردی میں نکلے، اور مسجد کی طرف جائے، لیکن کہے کہ میں اس لیے مسجد میں نہیں آتا کہ رِیاکاری کا اندیشہ ہے، اس لیے چھپ کے نماز پڑھنا زیادہ بہتر ہے۔ تو اس قسم کے ’’کلابی تقوے‘‘ کہ حقیقت کچھ اور ہوتی ہے، اور پردہ انسان کچھ اور ڈال لیتا ہے، تو ایسی باتیں ہوتی ہیں، اپنی باطنی کمزوریوں کو چھپانے کے لیے انسان اس کے اوپر دِین کا پردہ ڈال لیتا ہے، تو اس نے بھی دِین کا پردہ اوپر ڈالا، کہ میں جاؤں گا تو اندیشہ ہے کہ کسی عورت پر میری نظر پڑ جائے گی، تو میں اپنی اس کمزوری کی بنا پر کسی فتنے میں پڑ جاؤں گا۔ تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ’’فتنے میں پڑ جاؤں گا‘‘ یہ تو بعد کی بات ہے، اور یہ وہی بات ہے کہ وہاں جا کے کوئی فتنہ پیش آتا ہے یا نہیں آتا، اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کے حکم کی مخالفت کے طور پر گھر میں بیٹھ جانا، جہاد کو چھوڑ دینا یہ تو نقد فتنہ ہے جس کے اندر یہ واقع ہو گئے، اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کے حکم کو چھوڑ کر فتنے میں تو یہ لوگ پڑ گئے، فتنے میں تو مبتلا ہو گئے، اور یہ جاتے، وہاں کسی عورت پہ نظر پڑتی، دل میں کوئی خلل آتا یا نہ آتا، اس کا ان کو قبل از وقت کیا پتا ہے، وہ تو بعد کی بات ہے، تو موہوم فتنے سے بچنے کے لیے یہ حقیقی فتنے میں واقع ہو گئے، یہ بات ان کی صحیح نہیں، باقی رہا خرچ کا معاملہ، کہ چندہ دیتے ہیں، تو خوشی سے دیں یا ناگواری سے دیں جیسے کیسے دیں ان کے صدقات قبول نہیں ہیں، کیونکہ ان کے دل کے اندر ایمان اور خلوص نہیں۔ اور جو شخص ظاہری حالات سے مجبور ہو کے خرچ کرتا ہے، دل کے اندر خلوص نہیں، اور اللہ کی رضا کی طلب نہیں، تو ایسے لوگوں کے صدقات قبول نہیں ہوا کرتے۔ ’’ان میں سے کوئی یہ بھی ہے جو کہتا ہے کہ مجھے اجازت دے دو، اور مجھے فتنے میں نہ ڈالو۔ خبردار! فتنے میں یہ لوگ گر گئے، اور جہنم کافروں کو گھیرنے والی ہے‘‘ آخرت میں خوب اپنے احاطے میں لے لے گی، اور دنیا کے اندر جہنم میں جانے کے اسباب جب انسان کے اردگرد پھیلے ہوئے ہوں تو دنیا میں بھی کافروں کو جہنم نے گھیرا ہوا ہے۔

منافقین کا مسلمانوں کے بارے میں جذبہ

اِنْ تُصِبْكَ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ: یہ ان کا ایک جذبہ نمایاں کیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آپ کے خیرخواہ نہیں، اور آپ کے ساتھ ان کو کوئی ہمدردی نہیں ہے۔ دوست دوست کے ساتھ جس وقت ہمدردی رکھتا ہے، تو دوست کی خوشی اُس کے لیے خوشی ہوتی

ہے، دوست کی مصیبت اُس کے لیے مصیبت ہوتی ہے، لیکن یہ لوگ ایسے ہیں کہ اگر تو تمہیں کوئی اچھی حالت پہنچ جاتی ہے، اللہ کی طرف سے کامیابی ہوگئی، مالِ غنیمت مال گیا، تو ان کو صدمہ ہوتا ہے کہ ایسا کیوں ہوگیا، اور اگر کسی جگہ کسی سفر میں آپ کو تکلیف پہنچ جاتی ہے، نقصان ہوجاتا ہے تو پھر یہ بغلیں بجاتے ہیں، کہ اچھا ہوگیا کہ ہم نے احتیاط برت لی، ہم نہیں گئے، ورنہ اگر ہم جاتے تو ہماری بھی یوں ہی پٹائی ہوجاتی۔ مجلس سے اٹھ کے جاتے ہیں تو خوشی کرتے ہیں، بغلیں بجاتے ہیں، کہ اچھا ہوگیا کہ ہم نے پہلے احتیاط کرلی۔ اگر یہ مخلص ہوتے، اور مسلمانوں کی جماعت کے ساتھ اور آپ کے ساتھ ان کو ہمدردی ہوتی تو آپ کی خوشی ان کے لیے خوشی کا باعث ہوتی، اور آپ کو کوئی صدمہ پہنچتا تو اس صدمے کو یہ ایسے ہی محسوس کرتے، جیسے انہیں صدمہ پہنچا ہے۔ تو دوسرے کو اچھی حالت پہنچنے پر دل میں صدمہ محسوس کرنا یہ حاسد ہونے کی علامت ہے، اور دوسرے کو تکلیف پہنچنے پر اپنے لیے خوشی محسوس کرنا یہ علامت ہے اس بات کی یہ تمہارے ساتھ ہمدرد نہیں، خیر خواہ نہیں، بلکہ اندر اندر سے دشمن ہیں، اس لیے تمہاری بُرائی چاہتے ہیں، اچھائی نہیں چاہتے۔ ''اگر تمہیں پہنچے کوئی اچھی حالت تو انہیں غم میں ڈال دیتی ہے، اور اگر تمہیں کوئی مصیبت پہنچ جائے تو کہتے ہیں کہ ہم نے اپنا امر اختیار کرلیا'' یعنی احتیاطی امر اختیار کرلیا، ''اس سے قبل ہی''۔ ''اور وہ اٹھ کے جاتے ہیں خوشیاں مناتے ہوئے'' یعنی جب مجلس سے جاتے ہیں تو بغلیں بجاتے ہیں، خوشیاں مناتے ہیں، کہ اچھا ہوگیا کہ ہم اس سفر میں ساتھ نہیں تھے۔

''مریں تو شہید اور ماریں تو غازی!''

''آپ انہیں کہہ دیجئے کہ تکلیف تو ہمیں وہی پہنچے گی جو اللہ نے ہمارے لیے لکھ رکھی ہے، اور اللہ کی طرف سے آئے گی، اللہ ہمارا کارساز ہے، ہمارا تو ہر لحاظ سے اللہ پر ایمان ہے، اس لیے ہماری تکلیف آپ کے لیے کوئی خوشی کی بات نہیں۔ ایک بات تو یہ ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہمارے لیے تو ظاہری کامیابی ہو یا ناکامی ہو دونوں ہی حسنیٰ کا مصداق ہیں، ایک تو ظاہر ہے ہی، کہ اللہ نے فتح دے دی، مالِ غنیمت دے دیا، کامیابی ہوگئی، یہ تو حسنیٰ کا مصداق ہے ہی۔ اور اللہ کی طرف سے اگر کوئی تکلیف آتی ہے تو یہ بھی ہمارے لیے حسنیٰ ہی ہے، کہ اس کے ساتھ گناہ معاف ہوتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ آخرت میں ثواب دے گا، نتیجہ کے اعتبار سے مؤمن مخلص کے لیے مصیبت بھی حسنیٰ کا ہی مصداق ہے، اس میں مسلمان کا کوئی نقصان نہیں، جیسے کہتے ہیں کہ ''مریں تو شہید اور ماریں تو غازی'' مسلمان تو دونوں صورتوں میں ہی کامیاب ہے۔

ہمی پھر بہر حال لے جائیں بازی　　　مریں تو شہید اور ماریں تو غازی!

کہ جب انسان مخلص ہوجاتا ہے تو ہر طور کامیابی اسی کی ہے، اگر مر گیا تو شہید ہے، مار کے آ گیا تو غازی ہے، اس کے لیے تو کوئی بُری حالت ہے ہی نہیں۔ تم ہمارے لیے تو حُسنیین میں سے ہی ایک کے منتظر ہو، چاہے وہ اچھی حالت ہے چاہے تمہارے خیال کے مطابق وہ بُری حالت ہے، وہ بھی ہمارے لیے حقیقت کے اعتبار سے حسنیٰ ہی ہے، اس لیے ہماری تکلیف پر تمہارے خوش ہونے کی کوئی بات نہیں ہے۔ اور ہم کس بات کے منتظر ہیں تمہارے متعلق؟ کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے براہِ راست عذاب آ جائے اور تمہیں ہلاک کردے، یا اللہ تعالیٰ ہمارے ہاتھوں سے تمہاری پٹائی کرادے، ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ تمہارا نفاق نمایاں ہوجائے، تمہارا کُفر

ظاہر ہو جائے، اور اللہ کی طرف سے حکم آجائے کہ اب منافقوں کے ساتھ مسلمانوں والا برتاؤ نہ کرو، بلکہ کافروں والا کرو، تو ایسی صورت میں ہمارے ہاتھوں بھی تمہاری پٹائی ہو سکتی ہے۔ تو تمہارے لیے دونوں حالتیں ہی جن کا ہم انتظار کیے ہوئے ہیں وہ نقصان کی ہیں، اور ہمارے متعلق تم جو بھی سوچو وہ ہمارے لیے نفع کی بات ہے۔ ''نہیں انتظار کرتے تم ہمارے متعلق مگر حسنیین میں سے ایک کا، اور ہم انتظار کرتے ہیں تمہارے متعلق کہ پہنچادے اللہ تعالیٰ تمہیں عذاب اپنے پاس سے'' یعنی براہِ راست، جس میں ہمارا دخل نہ ہو'' یا ہمارے ہاتھوں۔ پس تم بھی انتظار میں رہو، اور ہم بھی تمہارے ساتھ انتظار میں ہیں'' دیکھیں گے کہ کون لوگ نتیجۃً نقصان میں رہتے ہیں۔

منافقین کی نماز اور اِنفاق عنداللہ معتبر کیوں نہیں؟

اور یہ جو صدقات پیش کرتے ہیں، جہاد میں چندہ دیتے ہیں، ''کہہ دیجئے کہ تم خوشی سے خرچ کر دیا ناگواری سے، اللہ تمہاری طرف سے ہرگز قبول نہیں کرے گا، بے شک تم بدمعاش لوگ ہو، نافرمان ہو'' اور ایسے لوگوں کے صدقات اللہ قبول نہیں کرتا۔ اور قبول کیوں نہیں کرے گا؟ اس کی وجہ یہ ذکر کر دی کہ یہ اندر سے کافر ہیں، اور جو کُفر کی حالت میں صدقات پیش کرتا ہے وہ قبول نہیں ہوا کرتے ''نہیں روکا ان کو یعنی ان کے صدقات قبول کیے جانے کو مگر اس بات نے کہ انہوں نے کُفر کیا اللہ کے ساتھ اور اُس کے رسول کے ساتھ'' اللہ اور اللہ کے رسول کے ساتھ کُفر کرنے کی وجہ سے ان کے صدقات قبول نہیں۔ اور اس سے مراد اندرونی اور باطنی کُفر ہے، ورنہ ظاہر میں تو یہ کلمہ پڑھتے تھے، لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ پڑھتے تھے، یہ باطنی کُفر ہے، اور اس باطنی کُفر کا یہ اثر نمایاں ہے کہ لَا يَأْتُوْنَ الصَّلٰوةَ اِلَّا وَهُمْ كُسَالٰى نہیں آتے نماز کے پاس مگر سستی کے مارے ہوئے، جی ہارے ہوئے، اٹھنے کی ہمت نہیں، بس ایسے جیسے انسان بندھا بندھایا آتا ہے، نماز میں شوق ذوق سے نہ آنا یہ علامت ہے کہ ان کے دل میں کُفر ہے، اور اسی طرح سے دل کی خوشی کے ساتھ اور اللہ کی رضا چاہنے کے لیے خرچ نہ کرنا، یہ علامت ہے اس بات کی کہ یہ منافق ہیں، ان کے اندر کُفر ہے، سستی کے مارے ہوئے اٹھتے ہیں، شوق ذوق نہیں ہوتا، تو یہاں جو کسلان ذکر کیا گیا ہے، سستی جو ذکر کی گئی ہے یہ اعتقادی کسل ہے، کہ چونکہ وہ آخرت کے قائل ہی نہیں، اور اللہ کے حکم کو وہ سمجھتے نہیں ہیں، اور سرورِ کائنات ﷺ پر ان کا ایمان نہیں، نماز پڑھنی ہے محض دکھاوے کی، تو جہاں دکھاوا ہو وہاں تو وہ آئیں گے، اور جہاں دکھاوا نہ ہو وہاں وہ کترا جائیں گے، تو جب دکھاوا ہی کرنا ہو پھر بھی صرف اٹھک بیٹھک ہوگی، باقی! دل کے اندر تو خلوص ہوگا نہیں، تو ایسے وقت میں انسان کے اندر چستی چالاکی نہیں ہوا کرتی، بلکہ بس ایک وقت ٹالنے والی بات ہوتی ہے، کہ مرے مرے اور بندھے بندھائے آگئے، اور دو چار ٹھونگے مار گئے، اٹھنا بیٹھنا ہو گیا، باقی! حقیقت میں ان کی نماز کوئی نہیں ہے، جیسا کہ غالباً یہ الفاظ پہلے بھی آئے تھے وَاِذَا قَامُوْٓا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى ۙ يُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِيْلًا (سورۂ نساء: ۱۴۲) اللہ کا ذکر بہت کم کرتے ہیں، محض ایک دِکھلاوا ہی مقصود ہوتا ہے۔ اور دل کی خوشی سے خرچ نہ کرنا یہ بھی ان کے نفاق کی علامت ہے۔ ''اور نہیں خرچ کرتے مگر اس حال میں کہ وہ ناخوش ہیں۔''

مال و دولت دُنیا و آخرت میں کب راحت کا ذریعہ ہیں؟

جب یہ اس قسم کے بدباطن ہیں، تو ان کے مال اور ان کی اولاد آپ کو کسی تعجب میں نہ ڈالیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اتنا مال اور اولاد کیوں دے رکھا ہے؟ مال اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے، اس میں کوئی شک نہیں، اگر اللہ تعالیٰ کسی کو مال دے اور اُس کو پھر حق میں صرف کرنے کی توفیق دے دے، تو یہ شخص ان دو شخصوں میں سے ہے جن پر سرورِ کائنات ﷺ نے غبطہ کرنے کا ذکر کیا ہے، ''مشکوٰۃ شریف، کتاب العلم'' میں آپ نے روایت پڑھ لی ہوگی: ''لَا حَسَدَ اِلَّا فِي اثْنَتَيْنِ''، ان میں سے ایک آدمی سرورِ کائنات ﷺ نے وہی ذکر کیا کہ جس کو اللہ تعالیٰ نے مال دیا ہو، ''آتَاهُ اللهُ مَالًا فَسَلَّطَهٗ عَلٰى هَلَكَتِهٖ فِي الْحَقِّ''[1] پھر اللہ تعالیٰ نے اس کو حق میں صرف کرنے کی توفیق دے دی ہو، ایک تو یہ شخص ہے کہ جس جیسا ہونے کی تمنا کرنی چاہیے، یعنی حاصل اس روایت کا یہ ہے کہ دنیا میں دو ہی شخص ایسے ہیں کہ جن جیسا بننے کی تمنا انسان کے دل میں آئے کہ یا اللہ! مجھے بھی ایسا کردے، اُن میں سے ایک وہ ہے جس کو اللہ نے مال دیا ہے اور حق میں صرف کرنے کی توفیق دی ہے، دوسرا وہ ہے جس کو اللہ نے علم وحکمت دی ہے، اور وہ اس کے مطابق فیصلے کرتا ہے، اور اس کے مطابق اس کی نشر و اشاعت کرتا ہے، تو علم دے دیا اور علم کی نشر و اشاعت کی توفیق دے دی یہ بھی اس درجے کا شخص ہے کہ تمنا کرو کہ اللہ ہمیں ایسا کردے، اور اگر اللہ نے کسی کو مال دیا ہے، پھر اُس کو حق میں صرف کرنے کی توفیق دے دی، یہ بھی اس قابل ہے کہ تمنا کرو کہ اللہ ہمیں بھی ایسا کردے، اس کے علاوہ کوئی شخص ایسا نہیں کہ جس کے متعلق تمنا کرو کہ اللہ ہمیں بھی ایسا بنا دے، ''لا حسد الا فی اثنتین'' کا یہی مطلب ہے۔ تو یہ کتنی بڑی نعمت ہے کہ جس سے انسان دنیا میں بھی راحت اٹھاتا ہے اور آخرت کے درجات بھی پاتا ہے، لیکن اگر یہی مال انسان کے دل میں گھس جائے، اور انسان اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں اس مال کے ساتھ زیادہ محبت کرنے لگ جائے، تو یہی مال بقول آپ کے ''بیڑی بوڑ دیتا ہے'' (کشتی ڈبو دیتا ہے)، بیڑی میں پتھر ڈال دیتا ہے۔ جیسے مولانا رُومی رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے کہ مال کی مثال تو پانی کی ہے، کہ اگر یہ کشتی کے نیچے نیچے رہے تو کشتی کے لیے مفید ہے، کشتی اس کے اوپر تیرتی ہے، اور ایک کنارے سے دوسرے کنارے لگتی ہے، اور اگر یہی پانی کشتی کے اندر آجائے تو کشتی کو ڈبونے کا ذریعہ بن جاتا ہے، یہ کشتی کو ڈبو دیتا ہے۔[2] تو مال کی مثال بھی ایسے ہی ہے، کہ اگر تو یہ دل سے باہر باہر ہو، انسان اس کی محبت میں مبتلا نہ ہو، تو دنیا میں بھی راحت اور آخرت میں بھی راحت، یہ مال بہت ساری کامیابیوں کا ذریعہ بنتا ہے، آپ زکوٰۃ دیں گے، صدقہ کریں گے، خیرات کریں گے، حج کریں گے، اور اس قسم کے کتنے کام ہیں جو مال کی وجہ سے ہو سکتے ہیں، اگر مال نہ ہو تو یہ نہیں ہو سکتے۔ اور اسی طرح سے اولاد بھی مفید ہے کہ اللہ تعالیٰ بچے دے اور اُن کو دِین کے کام میں لگایا جائے، تو صدقاتِ جاریہ میں سے سرورِ کائنات ﷺ نے ایک اس کو بھی ذکر کیا ہے، کہ کسی کا نیک بچہ ہو جو پیچھے رہ گیا ہو، وہ اُس کے لیے دُعائیں کرے گا، نیکی کے کام کرے گا، ماں باپ اُس کو نیک راستے پر لگا گیا، تو جس وقت تک یہ سلسلہ چلے گا، آپ کو ثواب ملتا رہے

---

(۱) بخاری ص ۱۷ باب الاغتباط فی العلم / مشکوٰۃ ص ۳۲ کتاب العلم فصل اول، عن ابن مسعود۔

(۲) آب در کشتی ہلاک کشتی است آب اندر زیر کشتی پشتی است (مثنوی، دفتر اول، بخشش ۵۰، بعنوان باز ترجیح نہادن الخ)

گا، چاہے آپ اس دُنیا سے چلے ہی جائیں، یہ عمل منقطع ہونے والا نہیں۔ لیکن اگر یہی اولاد کی محبت انسان کو اللہ کے راستے میں جہاد کرنے سے روک لے، بخل اور جبن کا باعث بن جائے، جس طرح سے مبخلة مجبنة کا لفظ آتا ہے کہ یہ اولاد بخل کا باعث بھی ہے اور جبن کا باعث بھی ہے، تو اگر ان کی وجہ سے انسان بخل اور جبن میں مبتلا ہو جائے تو یہی اولاد وبالِ جان ہے۔ ''سوائے اس کے نہیں کہ ارادہ کرتا ہے اللہ تعالیٰ ان کے ذریعہ سے ان کو دنیوی زندگی میں عذاب دینے کا'' کہ یہاں بھی ان کی محبت میں یہ ہر وقت پریشان ہیں، حاصل کرنے میں پریشان، بچانے میں پریشان، سنبھالنے میں پریشان، اس اندیشہ سے پریشان کہ کہیں مال ضائع نہ جائے، بچے کہیں مر نہ جائیں۔ ''اور چلی جائیں ان کی جانیں اس حال میں کہ یہ کافر ہوں'' جب ان کی محبت میں مبتلا ہوں گے تو ان کو صحیح ایمان نصیب نہیں ہوگا، تو ان کے لیے یہ عذاب کا ذریعہ ہیں، مال اور اولاد کی وسعت ان کے لیے کامیابی کا ذریعہ نہیں ہے، اور اللہ تعالیٰ کی رحمت نہیں ہے۔

منافقین کی قسموں کی حیثیت اور ان کا کردار

''اور قسمیں کھاتے ہیں اللہ کی یہ تمہی میں سے ہیں'' یعنی تمہاری جماعت میں سے ہیں، ہم بھی مسلمانوں کی جماعت میں شامل ہیں، وَمَا هُمْ مِّنْكُمْ: اور یہ تم میں سے نہیں ہیں، یعنی حقیقت یہ ہے کہ یہ تم میں سے نہیں ہیں وَلٰكِنَّهُمْ قَوْمٌ يَّفْرَقُوْنَ: باقی تمہارے اندر یہ خلط ملط کیوں ہو کر رہتے ہیں؟ قسمیں کھا کھا کر اپنی اس کمزوری پہ پردہ کیوں ڈالتے ہیں؟ کہتے ہیں تاکہ زیادہ قسمیں کھانا انسان کے جھوٹے ہونے کی علامت ہوتی ہے، وجہ وہی ہے کہ جب انسان کا عمل اُس کے قول کی تصدیق نہ کرے تو پھر اس خلا کو پُر کرنے کے لیے انسان قسمیں کھاتا ہے، ورنہ اگر انسان کا عمل اور اُس کا طرزِ عمل اس کے قول کے صداقت کو پیش کرتا ہے، کہ جو یہ زبان سے کہہ رہا ہے دل بھی اس کا ایسے ہی ہے، حقیقت بھی ایسے ہی ہے تو قسمیں کھانے کی کیا ضرورت ہے، بات خود وزنی ہوتی ہے۔ اگر کوئی آپ کا سچا دوست ہے، تو اُس کے اُٹھنے بیٹھنے سے میل ملاپ سے آپ کا دل خود یہ شہادت دے گا کہ واقعی یہ دوستی کا قول جو کرتا ہے تو سچا ہے، اور اگر اس کا کردار تو ہو دشمنوں جیسا، پھر وہ زبان سے قسمیں کھا کھا کے وزن ڈالے اپنے بات میں، اور آپ کو یقین دلائے کہ میں آپ کا بڑا سچا اور بڑا مخلص دوست ہوں، تو یہ ایسے ہے بات ہوتی ہے۔ کردار جو قول کی صداقت مہیا کرتا ہے اس کے مقابلے میں قسم کوئی چیز نہیں ہے، اور اگر اپنا کردار اور عمل تو قول کی تصدیق پیش نہیں کرتا، قسمیں کھا کے تم اس میں وزن ڈالو گے اور اس کو سچا ثابت کرنے کی کوشش کرو گے، تو اس طرح سے کوئی دھوکے میں نہیں آتا۔ ''قسمیں کھاتے ہیں اللہ کی کہ وہ تمہی میں سے ہیں، وہ تم میں سے نہیں، لیکن یہ ڈرپوک ہیں'' ڈرتے ہیں، اس لیے دل کی بات ظاہر نہیں کرتے، اور تمہارے اندر شامل ہونے کی کوشش کر رہے ہیں، ان کے دل میں تمہارا خوف ہے، تو خوف کی بنا پر یہ جھوٹ بولتے ہیں، اور سچی بات بتاتے نہیں کہ ہمارا تمہارے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ اگر ان کو کوئی ٹھکانا مل جائے، کوئی پہاڑوں کے اندر کھوہ (غار) مل جائے یا کہیں گھسنے اور سر چھپانے کی جگہ مل جائے تو یہ ادھر بھاگ جائیں، اور بھاگیں بھی ایسے کہ پھر تم انہیں روکتے رہو تو یہ رکیں بھی نہیں، جس طرح سے کوئی رسے تڑوا کے بھاگتا ہے یوں بھاگ جائیں، یعنی ان کے دل تم سے اتنے متنفر ہیں، لیکن کریں کیا، کہ کہیں جگہ ہی نہیں، جائیں کہاں، کوئی

سر چھپانے کی جگہ ہی نہیں ملے گی، اور یہ جائیداد چھوڑ نہیں سکتے، مکانات چھوڑ نہیں سکتے، اپنے مفادات قربان کر نہیں سکتے، ورنہ اگر ان کو کسی جگہ بھی تحفظ مل جائے، چاہے کسی پہاڑ کی غار میں ہی ہو، کہیں سر چھپانے کی جگہ مل جائے تو یہ تمہارے اندر ایک منٹ رہنا بھی گوارا نہ کریں۔

تقسیمِ صدقات کے متعلّق منافقین کی طعنہ زنی

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّلْمِزُكَ فِي الصَّدَقٰتِ: چونکہ مال کی محبت میں مبتلا تھے، اگر کبھی سرورِ کائنات ﷺ کوئی مال وغیرہ تقسیم کرتے، تو ان کی نظر اس بات پہ رہتی کہ ہمیں زیادہ ملے، اور اگر کسی وقت کسی کو کم ملتا تو پھر وہ طعن کرتا کہ دیکھو! فلاں کو اتنا دے دیا اور مجھے تھوڑا دیا، یہ علامت ہے اس بات کی کہ ان کو مال کے ساتھ محبت بہت زیادہ ہے، اور سرورِ کائنات ﷺ کی تقسیم اور آپ کے فیصلے پر یہ قلبی طور پر مطمئن نہیں ہیں، یہ بھی ان کے نفاق کی علامت ہے۔ ''ان میں سے بعض وہ ہیں جو آپ کو طعنہ دیتے ہیں صدقات کے بارے میں، اگر اُن کو اِن صدقات میں سے دے دیا جائے تو خوش ہو جاتے ہیں، اگر نہ دیا جائے تو ناراض ہو جاتے ہیں'' ان کی یہ بات بھی انہی کے لیے نقصان دِہ ہے ''اگر یہ راضی رہتے اس بات پر جو اللہ نے انہیں دے دیا، اور اس کے رسول نے'' یعنی اللہ کے حکم کے تحت اللہ کے رسول ﷺ نے جو کچھ دیا اُس پر خوش رہتے'' اور یوں کہتے کہ اللہ ہمارے لیے کافی ہے، عنقریب اللہ ہمیں اپنے فضل سے دے گا، اور ہمیں رسول بھی دے گا'' یعنی آئندہ بھی اس قسم کے مواقع آتے رہیں گے، کہ اللہ بھی ہمیں دے گا اور اس کا رسول بھی ہمیں دے گا تو یہ ان کے لیے بہتر ہوتا۔

اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا
اس کے سوا کچھ نہیں کہ صدقات فقراء کے لئے ہیں، مساکین کے لئے ہیں، اور اُن صدقات پر جو عمل کرنے والے ہیں ان کے لئے ہیں،
وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغٰرِمِيْنَ
اور اُن لوگوں کے لئے ہیں جن کے قلوب مانوس کیے گئے ہیں، اور (صدقات خرچ ہونے چاہئیں) گردنوں کے چھڑانے میں، اور مقروضوں کے بارے میں
وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۭ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۶۰﴾
اور اللہ کے راستے میں، اور مسافروں کے بارے میں، یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ٹھہرایا ہوا ہے، اللہ تعالیٰ علم والا ہے حکمت والا ہے ﴿۶۰﴾
وَمِنْهُمُ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ النَّبِيَّ وَيَقُوْلُوْنَ هُوَ اُذُنٌ ۭ قُلْ اُذُنُ خَيْرٍ
ان منافقین میں سے وہ لوگ ہیں جو نبی کو تکلیف پہنچاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ تو کان ہے، آپ کہہ دیجئے کہ تمہاری بھلائی کا

لَّكُمۡ يُؤۡمِنُ بِاللّٰهِ وَيُؤۡمِنُ لِلۡمُؤۡمِنِيۡنَ وَرَحۡمَةٌ لِّلَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا

کان ہے، ایمان لاتا وہ نبی اللہ پر اور تصدیق کرتا ہے مؤمنین کی باتوں کی اور سراپا رحمت ہے اُن لوگوں کے لئے جو تم میں سے ایمان

مِنۡكُمۡ ؕ وَالَّذِيۡنَ يُؤۡذُوۡنَ رَسُوۡلَ اللّٰهِ لَهُمۡ عَذَابٌ اَلِيۡمٌ ﴿۶۱﴾

لے آئے، جو لوگ اللہ کے رسول کو تکلیف پہنچاتے ہیں اُن کے لیے دردناک عذاب ہے ﴿۶۱﴾

خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ۔ اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلۡفُقَرَآءِ: اِنَّمَا حصر کے لئے ہے، اس کے سوا کچھ نہیں کہ صدقات فقراء کے لئے ہیں، مساکین کے لئے ہیں، وَالۡعٰمِلِيۡنَ عَلَيۡهَا: اور ان صدقات پر جو لوگ عمل کرنے والے ہیں یعنی صدقات وصول کرنے والے جو عامل متعین کیے ہوئے ہیں ان کے لئے ہیں، وَالۡمُؤَلَّفَةِ قُلُوۡبُهُمۡ: اَلَّفَ تَاۡلِيۡف: جوڑنا، مانوس کرنا، اور ان لوگوں کے لئے ہیں جن کے قلوب مانوس کیے گئے ہیں، جن کے قلوب کی تالیف کی گئی ہے، وَفِى الرِّقَابِ: فِيۡ فَكِّ الرِّقَابِ، رِقاب جمع رَقبة کی، رقبة کہتے ہیں گردن کو، اور گردن کا لفظ بول کر مراد ہیں غلام، لفظی معنی بنے گا ''اور صدقات گردنوں کے چھڑانے میں ہیں'' یعنی گردنوں کے چھڑانے میں ان کو صرف کرنا چاہیے، اور مقصد یہ ہوگا کہ غلاموں کو امداد دی جائے تاکہ وہ اپنا بدلِ کتابت وغیرہ ادا کر کے آزاد ہوجائیں، یہ بھی مصرف ہے صدقات کا، وَالۡغٰرِمِيۡنَ: غَرِمَ يَغۡرَمُ: تاوان میں پڑجانا، کسی چٹی کا لازم آجانا، غارمین کا معنی ہوگا جو لوگ تاوان میں دب گئے، مقروض ہوگئے، مقروض بھی اس کا مصداق ہوسکتا ہے، ذِمّے میں کوئی تاوان آگیا، کوئی بوجھ پڑگیا، ''اور مقروضوں کے لئے'' وَفِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ: اور اللہ کے راستے میں خرچ ہونے چاہئیں، رِقاب کے بارے میں خرچ ہونے چاہئیں، غارِمین کے بارے میں خرچ ہونے چاہئیں، اللہ کے راستے میں خرچ ہونے چاہئیں، وَابۡنِ السَّبِيۡلِ: اور مسافروں میں خرچ ہونے چاہئیں، سبیل راستے کو کہتے ہیں، ابن سبیل: راستے کا بیٹا، مراد مسافر ہے، فَرِيۡضَةً مِّنَ اللّٰهِ: فَرَضَ اللّٰهُ فَرِيۡضَةً، یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے متعین کردہ چیز ہے، یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ٹھہرایا ہوا ہے، وَاللّٰهُ عَلِيۡمٌ حَكِيۡمٌ: اللہ تعالیٰ علم والا ہے حکمت والا ہے۔ وَمِنۡهُمُ الَّذِيۡنَ يُؤۡذُوۡنَ النَّبِىَّ: ان منافقین میں سے وہ لوگ ہیں جو نبی کو تکلیف پہنچاتے ہیں، يُؤۡذُوۡنَ: تکلیف پہنچاتے ہیں، ایذا دیتے ہیں، النَّبِىَّ: نبی کو، وَيَقُوۡلُوۡنَ هُوَ اُذُنٌ: اور کہتے ہیں کہ وہ تو کان ہے، اُذُن کان کو کہتے ہیں قُلۡ اُذُنُ خَيۡرٍ لَّكُمۡ: آپ کہہ دیجئے کہ تمہارے نفع کے لئے تمہاری بھلائی کا کان ہے، يُؤۡمِنُ بِاللّٰهِ: ایمان لاتا ہے وہ نبی اللہ پر، وَيُؤۡمِنُ لِلۡمُؤۡمِنِيۡنَ: اور تصدیق کرتا ہے مؤمنین کی باتوں کی، ایمان کا صلہ لام آجائے تو تصدیق کے معنی میں یعنی یقین کرنے کے معنی میں، ''یقین کرتا ہے مؤمنین کی باتوں کا''، ''ایمان لاتا ہے اللہ پر اور یقین لاتا ہے مؤمنین کے لئے'' یعنی مؤمنین کی باتوں پہ یقین لاتا ہے، وَرَحۡمَةٌ لِّلَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا مِنۡكُمۡ: اور سراپا رحمت ہے ان لوگوں کے لئے جو تم میں سے ایمان لے آئے، رَحۡمَةٌ کا حمل نبی پر ہے، وَالَّذِيۡنَ يُؤۡذُوۡنَ رَسُوۡلَ اللّٰهِ: جو لوگ اللہ کے رسول کو تکلیف پہنچاتے ہیں لَهُمۡ عَذَابٌ اَلِيۡمٌ: ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔ يَحۡلِفُوۡنَ بِاللّٰهِ لَكُمۡ لِيُرۡضُوۡكُمۡ: وہ منافق قسمیں

کھاتے ہیں اللہ کی تمہارے لیے تاکہ تمہیں خوش کرلیں، وَاللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗٓ اَحَقُّ اَنْ یُّرْضُوْہُ: اللہ اور اللہ کا رسول زیادہ حق دار ہے اس بات کا کہ وہ اس کو راضی کریں، اَنْ یُّرْضُوْہُ میں ''ہٗ'' کی ضمیر مفرد لوٹا دی، یہ لوٹے گی رسول کی طرف، ''اللہ اور اللہ کا رسول اس بات کا زیادہ حق دار ہے کہ وہ لوگ اللہ کے رسول کو راضی کرلیں'' کیونکہ اللہ کا رسول راضی ہوگیا تو اللہ راضی ہوگیا، مفرد کی ضمیر لوٹا کے دونوں کی رضا کی وحدت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ اللہ راضی تو اللہ کا رسول راضی، اللہ کا رسول راضی تو اللہ راضی، دونوں کی رضا ایک ہے، ''اگر یہ لوگ ایمان لانے والے ہیں''۔ اَلَمْ یَعْلَمُوْٓا: کیا ان کو پتا نہیں؟ اَنَّہٗ مَنْ یُّحَادِدِ اللّٰہَ: کہ جو شخص بھی اللہ کی مخالفت کرتا ہے، اللہ کے مقابلے میں ضد باندھتا ہے، وَرَسُوْلَہٗ: اور اس کے رسول سے مقابلہ کرتا ہے، اس کے مقابلے میں ضد باندھتا ہے، فَاَنَّ لَہٗ نَارَ جَہَنَّمَ: پس بے شک اس کے لئے جہنم کی آگ ہے خَالِدًا فِیْہَا: ہمیشہ پڑا رہے گا اس میں، ذٰلِکَ الْخِزْیُ الْعَظِیْمُ: یہ بہت بڑی رسوائی ہے، خِزْی رسوائی کو کہتے ہیں، یَحْذَرُ الْمُنٰفِقُوْنَ اَنْ تُنَزَّلَ عَلَیْہِمْ سُوْرَةٌ: منافق بدکتے ہیں، ڈرتے ہیں، ''ڈرتے ہیں منافق اس بات سے کہ اُتاردی جائے مسلمانوں پر کوئی سورت'' عَلَیْہِمْ کی ضمیر مؤمنین کی طرف لوٹ رہی ہے، تُنَبِّئُہُمْ بِمَا فِیْ قُلُوْبِہِمْ: وہ سورت خبردار کردے اِن مسلمانوں کو اُن چیزوں سے جو اِن منافقین کے دلوں میں ہیں، ان کے رازوں پر مطلع کردے، ایسی سورت کے اُتارے جانے سے منافق ہر وقت ڈرتے ہیں، ان کے دل کھٹکتے ہیں، قُلِ اسْتَہْزِءُوْا: آپ کہہ دیجئے کہ تم ہنسی مذاق کرتے رہو، اِنَّ اللّٰہَ مُخْرِجٌ مَّا تَحْذَرُوْنَ: بے شک اللہ تعالیٰ نکالنے والا ہے اس چیز کو جس سے تم ڈرتے ہو، جس کے ظاہر ہونے سے تم ڈرتے ہو اللہ اس کو ظاہر کرنے والا ہے، وَلَئِنْ سَاَلْتَہُمْ: اور اگر آپ ان سے سوال کریں لَیَقُوْلُنَّ: تو البتہ ضرور کہیں گے وہ، اِنَّمَا کُنَّا نَخُوْضُ وَنَلْعَبُ: ہم تو باتوں میں لگے ہوئے اور کھیل کود کرتے تھے، دل لگی ہنسی کرتے تھے، خوش طبعی کرتے تھے، خوض اصل میں غور کرنے کو کہتے ہیں، غور خوض، ایک بات سے دوسری بات نکلتی چلی جائے اس کو بھی خوض کہتے ہیں، ہم تو ایسے ہی باتوں میں لگے ہوئے تھے اور دل لگی کرتے تھے، قُلْ اَبِاللّٰہِ وَاٰیٰتِہٖ وَرَسُوْلِہٖ کُنْتُمْ تَسْتَہْزِءُوْنَ: آپ کہہ دیجئے کہ کیا اللہ اور اس کی آیات اور اس کے رسول کے ساتھ تم استہزا کرتے تھے؟ لَا تَعْتَذِرُوْا: مت عذر کرو، قَدْ کَفَرْتُمْ بَعْدَ اِیْمَانِکُمْ: تم نے کفر کیا اپنے ایمان کے بعد، اِنْ نَّعْفُ عَنْ طَآئِفَةٍ مِّنْکُمْ: اگر درگزر کرگئے ہم تم میں سے ایک طائفہ سے، نُعَذِّبْ طَآئِفَةً: ایک طائفہ کو ہم عذاب دیں گے، بِاَنَّہُمْ کَانُوْا مُجْرِمِیْنَ: اس وجہ سے کہ وہ جرم کرنے والے تھے۔

سُبْحَانَکَ اللّٰھُمَّ وَبِحَمْدِکَ اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُکَ وَاَتُوْبُ اِلَیْکَ

تفسیر

ماقبل سے ربط، اور منافقین کی طعنہ زنی کا جواب

پچھلے رکوع کی آخری آیت میں ذکر کیا گیا تھا، کہ منافقین سرورِ کائنات ﷺ کو صدقات کی تقسیم کے بارے میں طعنہ دیتے ہیں، الزام لگاتے ہیں، مقصد اُن کا یہ ہے کہ دوسروں کو دے دیا اور ہمیں نہیں دیا، تقسیم صحیح نہیں ہوئی، اور اُن کے نزدیک تقسیم وہی صحیح ہے جس میں سے ان کو مل جائے، اگر ان کو دے دیا جائے اور دوسروں کو محروم کردیا جائے تو ان کو کوئی اعتراض نہیں، کہتے ہیں

بالکل صحیح تقسیم ہے، اور اگر کسی وقت دوسروں کو دے دیں اور ان کو نہ دیں یا کم دیں تو پھر ان کے نزدیک اس تقسیم پر اعتراض ہے، تو اصل میں ان کی خود غرضی ہے، اپنی غرض کو سامنے رکھتے ہیں اور جس وقت اپنی غرض پوری ہوتی ہے تو خوشی کا اظہار کرتے ہیں، جس وقت اپنی غرض کے خلاف کچھ پیش آتا ہے تو اعتراض کرتے ہیں، یہ رویہ ان کے لیے اچھا نہیں، ان کو چاہیے تھا کہ اللہ اور اللہ کے رسول کی تقسیم پہ خوش رہتے، جو کچھ اللہ نے دلوادیا اور جو کچھ اللہ کے رسول نے دے دیا اُس پر قناعت کرتے، اور آئندہ کے لیے اللہ کی رحمت سے امید رکھتے، یہ ان کے لیے بہتر تھا، پچھلی آیت کا مفہوم یہ ہے، اور اس رکوع کی پہلی آیت کا تعلق اسی مضمون سے ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ ظاہر فرماتے ہیں کہ صدقات کی تقسیم ایسے نہیں، بے ڈھنگے پن سے، کہ جس کو چاہے دے دی، جس کو چاہے نہ دی، بلکہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کے مستحقین متعین کیے ہیں، اور اللہ کا رسول تقسیم کرتے وقت ان کی رعایت رکھتا ہے، جس کو مستحق پاتا ہے اُسے دیتا ہے، جس کو مستحق نہیں پاتا اُسے نہیں دیتا، چنانچہ حدیث شریف میں بعض روایات میں آتا ہے کہ اگر کوئی شخص سرورِ کائنات ﷺ کے پاس صدقے کا سوال کرنے لیے آتا، تو آپ ﷺ فرماتے کہ دیکھو بھائی! صدقات کی تقسیم ایک ایسی ہے جو اللہ نے اپنے رسول کے بھی سپرد نہیں کی، بلکہ اس کے مصرف خود بتائے ہیں، اور یہ یہ اس کے مصرف ہیں، اگر تو ان میں سے کسی کے اندر داخل ہے تو بتادے، میں تجھے دے دیتا ہوں، اور اگر ان میں تو داخل نہیں ہے، ان میں سے کسی قسم کا بھی تو مصداق نہیں ہے، تو پھر میں نہیں دے سکتا۔[1] تو یہ تقسیم اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاتھ میں لے لی، خود بتادیا کہ فلاں کو دینا ہے، فلاں کو نہیں دینا، اگر تو ان قسموں میں سے کسی قسم کا مصداق ہو تو میں تمہیں دے دیتا ہوں، اور اگر ان قسموں میں سے کسی قسم کے مصداق نہیں ہو تو پھر نہیں دیتا۔

اور صدقات سے یہاں باجماعِ اُمّت اور باجماعِ صحابہؓ صدقاتِ فرض یعنی زکوۃ مراد ہے، کیونکہ نفلی صدقات کے اندر وسعت ہوتی ہے، وہ غنی کو بھی دیا جاسکتے ہیں، اور دوسرے مصارف کے اندر بھی صرف کیے جاسکتے ہیں، لیکن یہ زکوۃ جو فرض صدقہ ہے، جیسا کہ دوسری جگہ لفظ آیا خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ (سورۂ توبہ: ۱۰۳) تو وہاں بھی صدقہ سے زکوۃ مراد ہے یعنی صدقۂ فرض، تو یہاں بھی اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ سے صدقاتِ مفروضہ مراد ہیں یعنی زکوۃ، تو اگلے جو مصارف ذکر کیے جارہے ہیں یہ زکوۃ کے مصارف ہیں، عام صدقاتِ نفلیہ کے مصارف نہیں، کیونکہ اُن میں وسعت ہے، وہ اور مقامات پر بھی صرف ہوسکتے ہیں۔

''فقیر'' اور ''مسکین'' کا معنی اور ان دونوں میں فرق

سب سے پہلے ذکر کیا ''فقراء'' کا، دوسرے نمبر پہ ذکر کیا ''مساکین'' کا، ''فقراء'' اور ''مساکین'' دو لفظ آگئے، عام طور پر تو ان دونوں کے مفہوم میں کوئی فرق نہیں، ''فقیر'' کا لفظ بولیں تو اس کا مفہوم ''مسکین'' کو بھی شامل ہوتا ہے، ''مسکین'' کا لفظ بولیں تو اس کا مفہوم ''فقیر'' کو بھی شامل ہوتا ہے، اور مقصود اس سے یہ ہوتا ہے کہ محتاج آدمی جس کے پاس اپنی ضروریات پورا کرنے کے لیے سرمایہ نہیں، اس کا ہمارے ہاں یہ مفہوم ادا کردیا جاتا ہے کہ ''جو نصاب کا مالک نہ ہو'' مسکین آدمی، محتاج آدمی، جس کے پاس اپنی ضروریات پورا کرنے کے لیے سرمایہ نہیں ہے اُس کو فقیر یا مسکین ہم کہہ دیتے ہیں، لیکن جب دونوں لفظ اکٹھے آجائیں تو

---

(۱) ابوداؤد ۲۳۰/۱ باب من یعطی من الصدقة/مشکوۃ ۱۶۱/۱ باب من لا تحل له الصدقة فصل ثانی۔

پھران میں کچھ فرق کردیا جاتا ہے، کہ ''فقیر'' اُس کو کہتے ہیں جس کے پاس بقدرِ ضرورت نہ ہو، اور ''مسکین'' اُس کو کہتے ہیں جس کے پاس کچھ بھی نہ ہو، اور بعض نے اس کے برعکس کہا ہے، یا ''فقیر'' اُس کو کہتے ہیں جو محتاج ہے اور محتاج ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے احتیاج کو لوگوں کے سامنے ظاہر بھی کرتا ہے، اور ''مسکین'' اُسے کہتے ہیں کہ جو محتاج تو ہے لیکن اپنے احتیاج کو چھپائے ہوئے ہے (مظہری)، جیسا کہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ کامل درجے کا مسکین وہی ہے جس کے پاس اتنا مال بھی نہیں جس سے اپنی ضرورت پوری کرلے اور اپنی حاجت کو وہ کسی کے سامنے ظاہر بھی ہونے دیتا، کہ دوسرے صدقہ دے دیں، کھڑا ہو کے سوال نہیں کرتا۔[1] تو ایسے مسکینوں کو تلاش کر کر کے دیا کرو۔ تو فرق کرنے کے لیے اس قسم کی بات کہہ دی جائے گی، ورنہ مفہوم کے اعتبار سے دونوں لفظ قریب قریب ہیں، کہ محتاج کو کہتے ہیں جس کے پاس اپنی ضروریات پورا کرنے لیے سرمایہ نہ ہو۔

''عاملین'' کی وضاحت

وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا: اس کا مطلب یہ ہے کہ زکوٰۃ کا وصول کرنا اسلامی حکومت میں حکومت کا فرض ہے، جس طرح سے سرورِ کائنات ﷺ کے زمانے میں زکوٰۃ بیت المال کے لیے وصول کی جاتی تھی، اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور دیگر خلفائے راشدین کے زمانے میں بھی زکوٰۃ بیت المال میں اکٹھی کی جاتی تھی، اور وہاں سے تقسیم ہوتی تھی، اور آپ جانتے ہیں کہ جس وقت ملک کے سارے باشندوں سے زکوٰۃ وصول کرنی ہے، تو سربراہِ مملکت خود تو گھر گھر جا کر وصول نہیں کرسکتا، آخر اس کے وصول کرنے کے لیے کوئی عملہ رکھنا پڑے گا جو لوگوں سے لے کر آئیں گے، اور پھر اس کا حساب کتاب کرنے کے لیے منشی اور کلرک رکھنے پڑیں گے، اور اس کو سنبھالنے کے لیے دفاتر قائم کرنے پڑیں گے، تو یہ جو زکوٰۃ کو اکٹھا کرنے کا شعبہ ہے اس کے جتنے مصارف ہیں، اکٹھا کرنے والوں کی تنخواہیں، ان کا سفر خرچ اور اُن کی دیگر ضروریات وہ بھی اسی شعبہ سے پوری کی جاتی ہیں، تو وَالْعٰمِلِيْنَ سے مراد ایسے لوگ ہیں جو اس شعبے میں اس خدمت پر متعین کردیے گئے، اور باتفاقِ اُمّت ان کا محتاج ہونا ضروری نہیں، یہ نہیں کہ زکوٰۃ اکٹھی کرنے کے لیے غریب آدمی متعین کیا ہو تو اس کو دی جاسکتی ہے، بلکہ یہ غنی ہوں تو بھی لینے کے حق دار ہیں، ہاں! البتہ ہاشمی نہیں ہونا چاہیے، اس کی ممانعت صراحتاً آتی ہے، جس کو ہماری زبان میں ''سیّد'' کہتے ہیں، سرورِ کائنات ﷺ کی آل سے جو تعلق رکھنے والے ہیں، ان کو عامل ہونے کی حیثیت میں بھی زکوٰۃ کے مال سے نہیں دیا جاسکتا، باقی اگر غنی ہے، مال دار ہے لیکن اس شعبے کے اندر اس کو متعین کردیا گیا، وہ اس میں سے لے سکتا ہے۔ تو اصل بات یہ ہے کہ امامِ وقت کو چونکہ مُلک پر ولایتِ عامہ حاصل ہے، تو جس وقت کوئی شخص بیت المال کے لیے زکوٰۃ سپرد کردے تو امام خود اُس پر قبضہ کرلے یا اس کا نمائندہ قبضہ کرلے تو ایسی صورت میں دینے والے کی زکوٰۃ فوراً ادا ہوجاتی ہے، جب فوراً ادا ہوگئی تو یہ جو ''عاملین'' ہیں یہ گویا کہ امام کی طرف سے کارندے ہیں، اور زکوٰۃ دینے والوں کی طرف سے وکیل ہیں، ایسی صورت میں جو کچھ ان کو دیا جائے گا ان کی خدمات

---

(۱) بخاری ۱/۲۰۰، باب قول الله لا یسئلون الناس الحافا/ مشکوٰۃ ۱/۱۶۱، باب من لا تحل الصدقة

کے عوض میں، وہ زکوٰۃ نہیں، زکوٰۃ تو ادا ہوگئی، یہ تو ایسے ہے جیسے قومی خزانے میں سے اُن کی خدمت کردی جاتی ہے، اس لیے ان کا فقیر اور محتاج ہونا ضروری نہیں ہے، البتہ ''عامل'' اگر ''ہاشمی'' ہو تو وہ اس میں سے نہیں لے سکتا۔

''مؤلفۃ القلوب'' کے متعلق مفسرین کی مختلف آرا

وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ: اس سے مراد ایسے لوگ ہیں جو نئے نئے مسلمان ہوئے ہوں، تو اُن کو اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ مزید مانوس کرنے کے لیے اُن کے اوپر کچھ مالی عنایات کردی جائیں، تو زکوٰۃ میں سے اُن کو دیا جاسکتا ہے۔ باقی اس میں مفسرین کی دونوں رائے ہیں کہ اُن کا فقیر ہونا ضروری ہے یا نہیں؟ بعض کہتے ہیں کہ فقیر ہونا بھی کوئی ضروری نہیں، بلکہ ایسے لوگوں کی دلجوئی کے لیے ان کو زکوٰۃ دی جاسکتی ہے۔ بعض کے نزدیک اس کا مصداق ایسے لوگ ہیں جو کافر ہیں، اور کچھ کچھ مسلمانوں کی طرف مائل ہیں، تو اُن کو مزید مالی امداد پہنچائی جائے تاکہ وہ اسلام قبول کرلیں۔ بہر حال یہاں مفسرین کی آراء مختلف ہیں جو تفاسیر کے اندر لکھی ہوئی ہیں کہ ان کا محتاج ہونا شرط ہے یا نہیں؟ یہ ایک وقتی مد ہے، کہ اگر امام مناسب سمجھے اور اس قسم کی ضرورت محسوس کرے، جس طرح سے سرحد پر جو لوگ آباد ہوتے ہیں، اُن کو مانوس رکھنے کے لیے اس قسم کی مالی امداد دی جاتی ہے، تاکہ کوئی دوسرا شخص ان کو خرید نہ لے، اور خرید کر اُن کو شر و فساد کا ذریعہ نہ بنالے، اُن کو مطمئن رکھنے کے لیے امام اگر مصلحت سمجھتا ہے تو ایسا کرلے، ورنہ جہاں ضرورت نہ ہو تو یہ مد ختم ہوجائے گی، جیسا کہ خلفائے راشدین کے زمانے میں اس قسم کی ضرورت نہیں رہی تھی تو انہوں نے اس مد کو ختم کردیا تھا، اور اگر کسی وقت اس قسم کی ضرورت پیش آجائے اور ملکی خزانے میں دوسری مدات کے اندر گنجائش ہو تو وہاں سے بھی امداد دی جاسکتی ہے، اور اگر اور مدات میں گنجائش نہ ہو تو زکوٰۃ میں سے بھی ان لوگوں کو مطمئن کرنے کے لئے بعض کے نزدیک کچھ رقم دی جاسکتی ہے۔ (۱)

''رِقَاب'' کا مفہوم

وَفِي الرِّقَابِ: اور گردنوں کے چھڑانے میں زکوٰۃ صرف ہونی چاہیے۔ گردنوں کے چھڑانے کا مصداق ائمۂ ثلاثہ کے نزدیک تو مکاتب ہے، یعنی جس غلام کو مالک نے کہہ دیا کہ اتنا مال کما کے دے دے تو تو آزاد، اور اُس کو عملاً کمانے کے لیے چھوڑ دیا جاتا ہے، تو ایسے شخص کی امداد کی جائے تاکہ وہ اپنا بدلِ کتابت ادا کرکے اپنی گردن چھڑالے، اور حضرت امام مالک رحمہ اللہ کا قول آتا ہے کہ اس سے مراد یہ بھی ہے کہ غلام خرید کر اُس کو آزاد کردیا جائے، یعنی قیمت مالک کی طرف ادا کردی جائے، اور غلام کو آزاد کردیا جائے، باقی ائمہ کے نزدیک یہ ٹھیک نہیں، کیونکہ اس میں تملیک کی صورت نہیں پائی جاتی۔

''وَالْغٰرِمِيْنَ وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ'' کا مصداق

وَالْغٰرِمِيْنَ: غارمین کے معنی ہے کہ مقروض ہوگئے، کوئی چٹی پڑگئی، کوئی تاوان آگیا، جیسے کاروبار میں گھاٹا پڑ جاتا ہے،

(۱) امام اعظم ابوحنیفہ اور امام مالک کے نزدیک عاملین صدقہ کے علاوہ باقی تمام مصارف میں فقر و حاجت مندی شرط ہے، اس لئے مولفۃ القلوب کا حصہ بھی ان کو اسی شرط کے ساتھ دیا جائے گا کہ وہ فقیر و حاجت مند ہوں (معارف القرآن)۔ نیز اب کسی کافر کو زکوٰۃ بالاتفاق نہیں دی جاسکتی۔ واللہ اعلم۔

کوئی حادثہ پیش آجاتا ہے، آگ لگ گئی اور کسی کا سامان جل گیا، پانی کا سیلاب آیا اور سارا گھر بہہ گیا، فصلیں برباد ہوگئیں، یا تجارت کے اندر گھاٹا پڑ گیا، انسان بوجھ تلے دب گیا، تو ایسے شخصوں کو اُٹھانے کے لیے، دوبارہ پاؤں پر کھڑا کرنے کے لیے زکوٰۃ کو صرف کرنا چاہیے...... وَفِيْ سَبِيْلِ اللهِ: یہ باقی اُمورِ خیر کے لیے عام ہوگیا، عام طور پر روایات کے اندر فِيْ سَبِيْلِ اللهِ کا مصداق یا جہاد ذکر کیا گیا ہے یا حج، یعنی ایک آدمی پر حج فرض لیکن اس کے پاس اب اتنا سرمایہ رہا نہیں کہ جس کے ساتھ وہ حج کرلے، ایسے شخص کو اِمداد دی جائے تو یہ فی سبیل اللہ ہے، اور اسی طرح سے مجاہد جہاد پہ گیا ہوا ہے، راستے کے اندر اس کا زادِ راہ ختم ہوگیا، یا اُس کو سامانِ جنگ خریدنے کے لیے پیسوں کی ضرورت ہے، تو اپنے گھر کے اندر اگرچہ وہ فقیر نہیں، لیکن اُس کے اپنے پاس اتنی مالی گنجائش نہیں کہ جس کے ساتھ وہ سامانِ جنگ خرید لے یا سفرخرچ برداشت کرلے، تو ایسے وقت میں اس کو امداد دی جائے تو یہ بھی فی سبیل اللہ ہے، اور اسی کے حکم میں طالب علم کو لکھا ہے، کہ علم پڑھنے کے لیے کوئی وطن سے نکلا ہے تو یہ بھی فی سبیل اللہ ہے، جیسے صراحۃً روایت کے اندر آتا ہے کہ علم کے طلب کرنے کے لیے جو شخص نکلے تو ''فَهُوَ فِيْ سَبِيْلِ اللهِ حَتّٰى يَرْجِعَ'' جب تک کہ واپس گھر لوٹ کر نہ آجائے وہ بھی فی سبیل اللہ ہے، اس لیے طالب علموں کو جو امداد دی جاتی ہے علم حاصل کرنے کے لیے، اور اُن کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے تو یہ بالکل فی سبیل اللہ کا مصداق ہے، اور ان کا فی سبیل اللہ ہونا صراحتاً حدیث شریف میں آیا ہوا ہے ''مَنْ خَرَجَ فِيْ طَلَبِ الْعِلْمِ فَهُوَ فِيْ سَبِيْلِ اللهِ حَتّٰى يَرْجِعَ''[1] ''مشکوٰۃ شریف، کتاب العلم'' کے اندر یہ روایت آپ کے سامنے گزری ہوگی...... وَابْنِ السَّبِيْلِ سے مسافر مراد ہے، اور مسافر سے مراد ایسا شخص جو سفر میں ضروریات پوری کرنے کے لئے محتاج ہوگیا ہو، چاہے اپنے گھر کے اندر اُس کے پاس کتنا ہی مال کیوں نہ ہو، لیکن سفر میں کسی وجہ سے، مثلاً اس کی جیب کٹ گئی، سامان ضائع ہوگیا، یا خرچ ختم ہوگیا، ایسی صورت میں اُس کو کرائے کی ضرورت ہے، کھانے پینے کی ضرورت ہے، یا کوئی اور ضرورت پیش آجاتی ہے، تو ایسی صورت میں اس مسافر کو بھی دیا جائے، چاہے وہ اپنے گھر کے اندر اتنے مال کا مالک ہے جس کو غنی کہتے ہیں، لیکن سفر میں وہ محتاج ہوگیا، تو اُس کو سفر میں خرچ دیا جاسکتا ہے۔ فَرِيْضَةً مِّنَ اللهِ: یہ اللہ کی طرف سے متعین کی ہوئی چیز ہے، اس کی خلاف ورزی جائز نہیں، وَاللهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ: اللہ تعالیٰ علم والے ہیں حکمت والے ہیں۔

ادائیگیٔ زکوٰۃ کے لئے تملیک کی شرط، ''جماعتِ اسلامی'' کا غلط طریقہ، اور قرآن سمجھنے کا صحیح طریقہ

اس آیت کے ضمن میں ہی مفسرین نے یہ مسئلہ ذکر کیا ہے، کہ زکوٰۃ کی ادائیگی ایسے طور پر ہونی چاہیے کہ کسی نہ کسی مستحق کو اُس کا مالک بنایا جائے، اور اس کو مجمع علیہ اور متفق علیہ قرار دیا ہے، اس لیے ایسے کاموں پر زکوٰۃ کو صرف کرنا جن کا فائدہ اگرچہ محتاج لوگ اُٹھائیں، یا رفاہِ عامہ کے کام جن سے عام لوگ فائدہ اُٹھاتے ہیں لیکن کوئی اس کا مالک نہیں ہوتا، ایسے کام میں زکوٰۃ لگانا ٹھیک نہیں، اگر لگائی جائے گی تو زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی، جیسے کوئی زکوٰۃ کے پیسوں سے مسجد بنادے، زکوٰۃ کے پیسوں کا کنواں لگادے، زکوٰۃ کے پیسے سے سرائے وغیرہ تعمیر کردے جس سے مسافر وغیرہ فائدہ اٹھائیں، زکوٰۃ کے پیسوں سے ہسپتال بنادے جس سے

(۱) ترمذی ۲/۹۳ باب فضل طلب العلم / مشکوٰۃ ص ۳۴ عن انس ''کتاب العلم فصل ثانی۔

مریضوں کی خدمت کی جائے، لیکن چونکہ کوئی اس کا مالک نہیں ہوتا، تملیک نہیں ہوئی، کسی کی مِلک میں زکوٰۃ نہیں گئی، تو ایسے طور پر زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی۔ حضرت مفتی شفیع صاحب ﷫ نے ''معارف القرآن'' میں اس مسئلے کو اچھی طرح سے واضح کر کے لکھا ہے، اور یہ جو ''جماعتِ اسلامی'' والوں کا طریقہ ہے، کہ یہ زکوٰۃ میں تملیک کو ضروری نہیں سمجھتے، بلکہ زکوٰۃ اکٹھی کرتے ہیں، اور اس کے بعد اُس کو رفاہِ عامہ پہ لگا دیتے ہیں، ہسپتال قائم کر دیے، لائبریریاں قائم کر دیں، اس قسم کی چیزیں جو کسی کی ملکیت میں نہیں ہوتیں، تو اس انداز کے ساتھ زکوٰۃ بالکل ادا نہیں ہوتی، جب تک کسی مستحق کو خصوصیت کے ساتھ اس کا مالک نہ بنایا جائے، اس مسئلے کو ائمۂ اربعہ کی طرف نسبت کرتے ہوئے لکھا ہے، اور اُمت کا متفق علیہ مسئلہ لکھا ہے۔ اس لیے محض قرآنِ کریم کے الفاظ میں اُلجھاؤ پیدا کر کے جو مطلب سمجھا جائے وہ ہمارے نزدیک معتبر نہیں ہے، قرآنِ کریم کا مطلب وہی معتبر ہے جو صحابہ کرام ﷢ نے دینی مزاج کے تحت سمجھا، سرورِ کائنات ﷺ کی تربیت سے جو ان کا مزاج بنا، اور صحابہ کرام ﷢ کے مسلک کی تعیین کے لیے مابعد والے علماء جو چودہ سو سال سے سمجھتے آرہے ہیں، ہمارے نزدیک قرآنِ کریم کی آیات کا وہی مطلب صحیح ہے۔ آج الفاظ کے پیچ و تاب کے ساتھ اُلٹ پلٹ کر کے اگر کوئی شخص مسئلہ نکالتا ہے، اور اسلاف نے وہ بات نہیں سمجھی، تو ہم اس قسم کے مطلب کو اخذ کرنے کے لیے تیار نہیں ...... اس اُصول کو ہمیشہ یاد رکھیے، اگر اس اُصول پر آپ قائم رہیں گے تو بہت ساری گمراہیوں سے بچ سکتے ہیں، اور اگر صرف الفاظ میں اُلجھنے لگ گئے کہ اس لفظ کا یہ مفہوم ہے، اس لفظ کو اس معنی میں استعمال کیا گیا ہے، الفاظ کی بحث کے ساتھ اگر مسئلہ نکالنے کی کوشش کرو گے تو کئی جگہ لغزش کھاؤ گے، قرآنِ کریم سمجھنے کا طریقہ یہی ہے کہ اللہ کی کلام کو اللہ کے رسول کی زبان سے سمجھیے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو مُبیِّن بنا کر بھیجا ہے، اور اللہ کے رسول ﷺ کی کلام کو صحابہ کرام ﷢ کی تعبیر کے ساتھ سمجھیے، کیونکہ سرورِ کائنات ﷺ نے ''مَا اَنَا عَلَیْہِ وَاَصْحَابِیْ'' کے اندر اصحاب کو اپنے طریقے کے لئے معیارِ حق قرار دیا ہے۔ اور صحابہ کرام ﷢ کے اقوال، سُنّتِ رسول اللہ، کتابُ اللہ کی آیات کا صحیح مفہوم وہی ہے جو بعد کے اسلاف نے ان سب چیزوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اخذ کیا ہے، چاہے لفظی دلالت کے ساتھ آپ کو بات سمجھ میں آئے چاہے سمجھ میں نہ آئے، مطلب وہی ہے جو ان مزاج شناسانِ شریعت نے اخذ کیا ہے، اس اُصول کو اگر اپناؤ گے تو بہت ساری گمراہیوں سے بچ جاؤ گے، لفظوں کے چکر کے اندر تو انسان بہت دفعہ دھوکا کھا جاتا ہے، کیونکہ لفظوں سے مراد سمجھنے کے لیے صرف لغوی معنی کا جاننا کافی نہیں ہوتا، ایک خاص مزاج بھی ہے جس کے ساتھ کلام کا صحیح مفہوم سمجھ میں آتا ہے، اور وہ مزاج سرورِ کائنات ﷺ کی تربیت سے صحابہ کرام ﷢ کو حاصل ہوا، اور پھر اس کے بعد محبینِ صحابہ، صحابہ کے اقوال کو مدنظر رکھ کر جو دین کا مطلب سمجھنے والے ہیں وہی ہیں مزاج شناس، اور وہی کلام کا صحیح مفہوم سمجھتے ہیں۔ اس اُصول کو ہمیشہ مدنظر رکھیے۔

اس آیت کا تعلق تو پچھلے مضمون کے ساتھ تھا، کہ صدقات کی تقسیم کے بارے میں یہ لوگ زبان درازی کرتے ہیں، تو اللہ تعالیٰ نے اس کے مصارف متعین کر دیے کہ نبی ان مصارف کا لحاظ رکھے گا، لہٰذا جو شخص ان مصارف میں شامل ہوگا اُسے تو صدقات میں سے ملے گا، اور جو ان مصارف میں شامل نہیں ہوگا اُس کو نہیں ملے گا۔ پھر ان میں بھی قوت اور ضعف کا فرق ہوتا ہے،

کسی میں فقر زیادہ، کسی میں مسکنت کم، کسی کی حاجت کتنی، اور کسی کا قرضہ کم، کسی کا قرضہ زیادہ، کسی کا قرضہ ہے اور ذرائع آمدنی بھی ہیں، ان چیزوں کی طرف دیکھتے ہوئے کمی بیشی ہوتی رہتی ہے، یہ اللہ کا رسول جس طرح سے مصلحت سمجھے اسی طرح سے ان مصارف کے اندر کمی بیشی کے ساتھ خرچ کرسکتا ہے۔

منافقین کی پہچان کے لئے علامات

آگے پھر وہی منافقین کا تذکرہ ہے، ان آیات کا مفہوم سمجھنے کے لیے آپ پہلے ایک بات ذہن میں بٹھالیں، منافقین کے دل میں تو کفر تھا، اور اُوپر سے وہ ایمان ظاہر کرتے تھے، نہ اُن کو دین کے ساتھ ہمدردی تھی، اور نہ مسلمانوں کی جماعت کے ساتھ ہمدردی تھی، اور نہ سرورِ کائنات ﷺ کے ساتھ محبت تھی، مجبوری کے مارے ہوئے پھنسے ہوئے تھے، اور ظاہری فوائد حاصل کرنے کے لیے اور نقصان سے بچنے کے لیے مسلمانوں کے ساتھ وہ شامل رہتے تھے، جیسا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے پچھلی آیات کے اندر ذکر کیا تھا، کہ یہ قسمیں کھاتے ہیں کہ یہ تم میں سے ہیں، لیکن یہ تم میں سے نہیں، ڈرتے ہیں، اس لیے اپنے آپ کو علیحدہ ظاہر نہیں کرسکتے، تمہارے اندر شامل ہو کے رہتے ہیں، وَلٰكِنَّهُمْ قَوْمٌ يَّفْرَقُوْنَ ڈرنے کی بنا پر ایسے کرتے ہیں، باقی قسمیں کھا کھا کر کہتے ہیں کہ ہم تم میں سے ہیں، حقیقت میں تم میں سے نہیں ہیں، اگر یہ تمہارے ہوتے، تم میں سے ہوتے تو تمہاری بھلائی پہ خوش ہوتے، تمہیں کوئی تکلیف پہنچتی تو تمہارے صدمے میں یہ برابر کے شریک ہوتے، اب یہ کیسا دوست ہے کہ جو اپنے دوست کی تکلیف پر تو خوش ہوتا ہے، اور اگر اُس کو بھلائی پہنچ جائے تو اس کو دکھ ہوتا ہے، کہ اس کو بھلائی کیوں نصیب ہوئی، یہ کیفیت جس شخص کی ہو کہ آپ کی تکلیف پر وہ خوش ہو، اور آپ کی بھلائی پہ وہ جلے کہ ایسا کیوں ہوگیا، سمجھ لو کہ در پردہ یہ دشمن ہے، چاہے دعویٰ دوستی کا کرتا ہو، دوستی دشمنی کا اصل جذبہ اگرچہ دل سے تعلق رکھتا ہے، لیکن اُس کو پہچاننے کے لیے کچھ آثار تو ہوتے ہیں، ان آثار میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اگر آپ کو کسی جگہ خوشی کی بات نصیب ہوگئی، کوئی کامیابی نصیب ہوگئی، کوئی اچھی حالت آپ کو پہنچ گئی تو وہ بھی آپ کے ساتھ خوش ہو، ایسے سمجھے کہ جیسے اُسے خوشی ہوئی ہے، پھر تو آپ سمجھ لیجئے کہ وہ آپ کا ساتھی ہے اور آپ کے ساتھ دِلی طور پر یہ تعلق رکھتا ہے، کہ آپ کی خوشی کو اُس نے اپنی خوشی سمجھا۔ اور اگر آپ کو کوئی تکلیف پہنچ جائے، تو جس طرح سے آپ دکھ محسوس کررہے ہیں، وہ آپ کی طرح دکھ محسوس کرے کہ آپ کو یہ تکلیف کیوں پہنچ گئی؟ بخار آپ کو چڑھا ہوا ہے، اور پریشان وہ پھرتا ہے، یہ ہے دِلی طور پر ہمدردی، اُس وقت انسان سمجھ سکتا ہے کہ یہ میرا مخلص دوست ہے، دیکھو! میری تکلیف کی بنا پر کس طرح سے دُکھ محسوس کرتا ہے۔ لیکن اگر حالت ایسی ہے کہ دسترخوان پر تو آپ کے ساتھ شریک ہے، کھانے پینے کے لیے تو ساتھ لگا رہتا ہے، اور جہاں کہیں آپ کو دُکھ پہنچ جائے تو کہتا ہے کہ بڑا اچھا ہوا، ایسے ہی ہونا چاہیے تھا، اور اگر کسی جگہ آپ کو کوئی کامیابی ہوجائے کوئی اچھی حالت نصیب ہوجائے تو دِل میں یہ جلے کہ ایسا کیوں ہوگیا؟ آپ کی اچھی حالت کو دیکھ کر اُس کا چہرہ افسردہ ہوجائے، تو سمجھ لیجئے کہ کسی مصلحت کے طور پر ساتھ لگا ہوا ہے، ورنہ در پردہ یہ دشمن ہے۔ تو ان کی دشمنی کی یہ علامت ذکر کی گئی تھی، اور کہا گیا تھا کہ

قسمیں کھا کھا کر بھی کہیں کہ ہم تم میں سے ہیں، تو ان کو اپنے میں سے نہ سمجھو، یہ ڈرپوک ہیں، اس لیے اپنے دِل کی بات سیدھے طریقے سے کہتے نہیں۔

اور نبی کے ساتھ ان کی عدمِ عقیدت یہاں سے واضح ہے کہ اگر تو ان کو منہ میں کچھ دے دیا جائے تو بڑے خوش رہتے ہیں، اور جہاں کسی مصلحت کے طور پر ان کو کچھ نہ دیا جائے تو فوراً اعتراض کرنے لگ جاتے ہیں، کہ دیکھو جی! کیا ہو گیا، فلاں کو دیا، ہمیں نہیں دیا، یہ بھی کوئی تقسیم ہے، یہ بھی کوئی عدل ہے، یہ بھی کوئی انصاف ہے؟ اس قسم کی باتیں ایسے موقع پر ظاہر ہونا یہ علامت ہے کہ دِلی طور پر یہ اللہ کے رسول کے ساتھ کوئی عقیدت اور محبت نہیں رکھتے، اگر یہ عقیدت اور محبت رکھتے تو کسی وقت کی بیشی ہوجاتی، کسی وقت نہ بھی دیں، تو چاہیے تھا کہ یہ کہتے کہ اللہ کی مرضی اور اللہ کے رسول کی مرضی، جیسے انہوں نے حکمت سمجھی ویسے کرلیا۔ یہ علامات متعین کی گئی ہیں تو ان کے دِل کے روگ کو سمجھنے کے لیے اور ان کے باطن کی نشاندہی کے لئے۔

منافقین کے خبثِ باطنی کا ذِکر اور ان کو تنبیہ

اسی طرح اب یہ اگلی بات ہے کہ اپنی مجلسوں میں جس وقت بیٹھتے (سمجھانے کے لیے عرض کروں) یہ قاعدہ ہے کہ جن طلبہ کی ہمارے ساتھ محبت ہو، وہ جس وقت اپنی مجلس کے اندر بیٹھیں گے تو جس وقت بھی ہمارا تذکرہ کریں گے تو لفظ لفظ سے محبت نمایاں ہوگی، ہماری خوبیاں نمایاں کریں گے، تعریف کا پہلو اختیار کریں گے، اچھی باتوں کا تذکرہ کر کے خوشی کا اظہار کریں گے کہ دیکھو! ہمارے استاذ جی کی یہ صفت اچھی ہے، یہ عادت اچھی ہے، وہ ہم پہ یوں مہربان ہیں، اور یہ خوبی ہے، وہ خوبی ہے، محبت کے ساتھ تذکرے کر کے آپس میں خوش ہوتے ہیں، اہلِ محبت تو خلوت کے اندر بھی تذکرے یوں کرتے ہیں، جب نام لیں گے تو عظمت سے لیں گے، اور اس قسم کی باتوں کو ذکر کریں گے کہ جن سے محبت اور عظمت نمایاں ہوگی۔ لیکن بعض لوگ اس قسم کے ہوتے ہیں، کہ جن کے دِل میں عقیدت نہیں ہوتی، اور وہ مصیبت کے مارے سامنے گھٹنے ٹیکتے ہیں، دِل میں کوئی عظمت اور عقیدت نہیں، تو وہ جس وقت خلوت میں اکٹھے ہوں گے تو مذاق اڑائیں گے، اور اس قسم کے تذکرے کریں گے جس سے معلوم ہو جائے گا، کہ ان کے دِل میں کوئی عزت نہیں، کوئی عظمت نہیں، نقلیں اُتاریں گے، مذاق اُڑائیں گے، ہنسیں گے، اس قسم کی باتیں اُچھالیں گے کہ جس قسم کی باتیں ظاہر نہیں کرنی چاہئیں، کمی کے پہلو تلاش کریں گے، اور ان پہلوؤں کو تلاش کر کر کے اپنی مجلس کو سجائیں گے، پھبتیاں کسیں گے، ان کی یہ عادت ہوتی ہے۔ تو اس قسم کے جو لوگ ہوا کرتے ہیں جو مجلسوں میں بیٹھ کے اس قسم کی باتیں کرتے ہیں، اگر کسی وقت اُن سے کوئی کہہ دے کہ دیکھو بھائی! اُن کو پتا چل جائے گا، پتا چلنے کے بعد وہ ناراض ہوں گے، تو ان کے سامنے اگر بات چلی گئی تو پھر کیا کرو گے؟ وہ کہتے ہیں کہ بھائی! کوئی بات نہیں، اُن کی عادت ہے ہر قسم کی بات سن لیتے ہیں، جس وقت ہم جا کے معذرت کر دیں گے، اور کہہ دیں گے نہیں، ہم تو ایسی باتیں نہیں کرتے، قسم اٹھا لیں گے تو وہ ہمارے اوپر یقین کر لیں گے، کیا فرق پڑتا ہے؟ تو اس میں وہ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ وہ تو بھولے بھالے لوگ ہیں، ان کی کوئی بات نہیں، جس طرح چاہو جا کے اُن کو

دھوکا دے دو، ''وہ تو کان ہی کان ہیں، سراپا کان ہیں'' سراپا کان کہنے کا مطلب ویسے ہی ہے جیسے ہم اپنی زبان میں کہتے ہیں کہ وہ کانوں کا کچا ہے! اُس کو تو جس طرح کوئی بھر دے وہ بھر جاتا ہے، ہر کسی کی بات توجہ سے سُن لیتا ہے، تو ہم بھی جائیں گے، جا کر کہہ دیں گے کہ ایسی بات نہیں ہے تو وہ فوراً یقین کرلیں گے۔ یہ دھوکا ان کو کیوں لگتا ہے؟ یہ اس لیے لگتا ہے کہ کئی واقعات ایسے پیش آتے ہیں، اور وہ آ کے جھوٹ موٹ عذر معذرت کرتے ہیں، اور بڑا آدمی اپنی کریم النفسی کے ساتھ، شرافت کے تحت سُن کے خاموش ہوجاتا ہے، کہتا ہے ٹھیک ہے بھائی! ایسے ہی ہوگا، کوئی گرفت نہیں کرتا، گرفت اس لیے نہیں کرتا کہ ہروقت ان پلیدوں کے پیچھے پڑنے کی کیا ضرورت ہے، چلو یہ کہتے ہیں کہ ہم نے ایسا نہیں کیا، تو ٹھیک ہے بھئی! ایسا نہیں کیا ہوگا، یوں درگزر کرگئے۔ جیسے سرورِ کائنات ﷺ کی عادت تھی، کہ آپ ان کے حالات کو سمجھتے تھے، لیکن جب بھی یہ آ کر جھوٹ موٹ کا عذر کرتے تو آپ گرفت نہ فرماتے، بلکہ درگزر کر جاتے۔ اس سے اُن لوگوں کو دھوکا یہ ہوا کہ ان کے کان ایسے ہی ہیں، بس جو جا کر ڈال دو یقین کر لیتے ہیں، تو اگر اس قسم کی نوبت آ ہی گئی تو ہم جائیں گے، جا کر معذرت کرلیں گے اور وہ قبول کرلیں گے، ہمارا کیا بگڑتا ہے؟ عادت نہیں چھوڑتے تھے، خبث کو ظاہر کرتے، لیکن ساتھ ساتھ یہ کہتے کہ وہ تو کانوں کے کچے ہیں، جب ہم جائیں گے، جا کر ہم ان کے کان میں کوئی بات ڈال دیں گے تو وہ ہماری بات مان لیں گے۔ اب آپ جانتے ہیں کہ یہ بات کہنا کہ ''وہ کانوں کے کچے ہیں، ہر کسی کی بات سن لیتے ہیں، جیسے چاہو اُن کے کان بھر دو'' یہ الٹا اور توہین ہے اور الٹا اور ایذاء کا باعث ہے، اس قسم کی باتیں وہ کرتے ہیں۔ تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہاں صفائی دی کہ یہ اس قسم کے تذکرے کرتے ہیں جو باعث ایذاء ہیں، اور نبی کو سمجھتے ہیں کہ یہ کانوں کا کچا ہے، جس طرح سے چاہیں ان کے کان بھر دیں، لیکن ان کو یہ پتا نہیں کہ نبی ہر قسم کی بات سن کے قبول نہیں کیا کرتا، نبی کا ایمان تو اللہ پہ ہے، اللہ کی طرف سے جو بات پہنچے اس پہ یقین کرتے ہیں، یا نبی مؤمنین مخلصین کی بات کا یقین کرتا ہے، جن کو وہ سمجھتا ہے کہ مؤمن ہیں مخلص ہیں، جس طرح سے ثقہ اور عادل کی بات مانی جاتی ہے ان کو دل سے جانتے ہیں کہ یہ ٹھیک ہیں، ان کی باتوں کا یقین کرتے ہیں۔ باقی! عام مؤمنین کے لئے مہربان ہیں، اس لیے ہر ہر بات پر گرفت نہیں کرتے، اگر کوئی آ کر جھوٹ موٹ عذر بھی کر جاتا ہے تو درگزر کر جاتے ہیں، یہ تمہیں دھوکا لگا ہوا ہے جو تم سمجھتے ہو کہ اللہ کا رسول تمہاری حالت سمجھتا نہیں، وہ سمجھتا تو ہے لیکن اپنی کریم النفسی کی بنا پر مہربان ہے کہ تمہیں کچھ کہتا نہیں، اور تم یہ سمجھ رہے ہو کہ ہم انہیں دھوکا دے رہے ہیں، ان آیات کے اندر یہ مفہوم ذکر کیا گیا ہے، یعنی ان کے اس باطنی خبث کو نمایاں کر کے اُن کو تنبیہ کی گئی ہے، کہ تمہارے ان حالات کی نبی کو خبر ہے، اللہ کی طرف سے بھی خبر پہنچتی ہے، مؤمنین مخلصین کی طرف سے بھی خبر پہنچتی ہے، جب مؤمنین مخلصین کی طرف خبر پہنچتی ہے تو نبی سمجھتا ہے کہ بات صحیح ہے، وہ ایسے ہی کرتے ہیں۔ لیکن عام مؤمنین کے ساتھ ان کا رحمت کا برتاؤ ہے، مہربانی کا برتاؤ ہے، تو آ کر تم جھوٹ موٹ عذر کر جاؤ تو وہ چپ ہوجاتے ہیں، اور تمہیں یہ دھوکا لگ گیا کہ شاید ہماری حالت کو وہ صحیح طور پر سمجھتے نہیں، اور ہماری باتوں میں آجاتے ہیں، تو مجلسوں میں بیٹھ کر اس قسم کی باتیں کرنا یہ نبی کے لئے مستقل باعث ایذا ہے، اور پھر ان کے لئے یہ کہنا کہ هُوَ اُذُنٌ وہ کانوں کا کچا ہے، اور اس قسم کی باتیں کرنا یہ مستقل باعث ایذا ہے۔ اور جو اس قسم کی ایذا نبی کو دیتے ہیں اُن کے لیے دردناک

عذاب ہے۔اس آیت کا ایک مفہوم تو یہ ہوا۔ پہلے اس کو دیکھ لیجئے! وَمِنْهُمُ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ النَّبِيَّ: ان میں سے بعض وہ ہیں جو نبی کو تکلیف پہنچاتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ وہ تو کان ہے یعنی سراپا کان ہے، ہر قسم کی بات سن لیتا ہے، اور سن کے یقین کر لیتا ہے، گویا کہ بھولا ہے، ان کو کیا سمجھ ہے کہ حقیقت کیا ہوتی ہے، جیسے کوئی باتیں کرے اسی کے پیچھے لگ جاتے ہیں، جس طرح جاسوس جو متعین کیا ہوا ہوتا ہے لوگوں کے حالات دیکھنے کے لئے، عربی میں اس کو عَيْن کہتے ہیں، عین بمعنی جاسوس، کیونکہ اس کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ ہر چیز کو تاڑ کے دیکھنا، گویا کہ وہ سراپا آنکھ ہے، اسی طرح سے یہاں اُذُنٌ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ تو کان ہی کان ہیں، ہر قسم کی بات سنتے ہیں، جو بھی اس کے کان میں ڈالے سن لیتے ہیں، اور سن کے اس پر یقین کر لیتے ہیں۔" آپ کہہ دیجئے کہ وہ تو کان تمہاری بھلائی کے ہیں" یعنی تمہاری بھلائی کے لیے باتیں سنتے ہیں، اور اُن کی ہر وقت خواہش ہے کہ تمہاری طرف سے اُن کو کوئی بھلی بات پہنچے، باقی جہاں تک یقین کرنے کی بات ہے، تو یقین تو وہ اللہ پر کرتے ہیں یا مؤمنین کی باتوں کا یقین کرتے ہیں، اور عام مؤمنین جو تم میں سے ایمان کا اظہار کرتے ہیں اُن پر وہ مہربان ہیں، مہربان ہونے کی وجہ سے زیادہ کھود کرید نہیں کرتے اور زیادہ پکڑ دھکڑ نہیں کرتے، اور تم یہ سمجھتے ہو کہ ہم نے دھوکا دے لیا۔" یاد رکھو! جو لوگ اللہ کے رسول کو تکلیف پہنچاتے ہیں اُن کے لیے دردناک عذاب ہے" یہ انہیں دھمکا دیا۔ایک مفہوم تو مفسرین نے اس کا اس طرح سے ذکر کیا ہے۔

"وَيَقُوْلُوْنَ هُوَ اُذُنٌ" کا ایک اور مفہوم

اور ان آیات کا دوسرا مفہوم اور طرح سے بھی ادا کیا گیا ہے، اور وہ بھی ان کی ایک نفسیاتی بیماری ہے جس کو ذکر کیا گیا ہے۔ اس سورت کے اندر منافقین کا تذکرہ بہت کثرت کے ساتھ آیا ہے، اور اللہ تعالیٰ نے یہاں نفسیات کو خوب اچھی طرح سے واضح کیا ہے، کہ نفاق کی کیا علامتیں ہوتی ہیں؟ منافق کے نفسیات کیا ہیں؟ اخلاص کی کیا علامت ہوتی ہے؟ اور جو مؤمن مخلص ہوتے ہیں ان کے نفسیاتی تقاضے کس قسم کے ہوتے ہیں؟ اس سورت میں بہت وسعت کے ساتھ ان کو بیان کیا گیا ہے، جس طرح سے دوست دشمن کے آثار پیچھے ظاہر کیے گئے۔تو اس میں بھی ایک نفسیاتی بات ہے جس کو واضح کیا گیا ہے، ایک جماعت میں ایک بڑا آدمی ہے، جیسے سمجھانے کے لئے عرض کروں کہ یہاں آپ مدرسے میں ہیں، مدرسے کے اندر ایک منتظم آدمی بیٹھا ہوا ہے، بعض لوگ جو دلی طور پر اس سے ہمدردی نہیں رکھتے، یا اُن کے دل میں عقیدت اور محبت نہیں ہے، مدرسے کے مقاصد سے متفق نہیں ہیں اور کسی وجہ سے اندر گھسے ہوئے ہیں، شخصیت پر متفق نہیں ہیں، تو وہ مجرمانہ حرکتیں کرتے ہیں، اپنی نجی مجلسوں کے اندر ہنسی کریں گے مذاق اڑائیں گے اور قانون کی خلاف ورزی کریں گے، اُن کا طرزِ عمل مجرمانہ ہوتا ہے، اور اس مجرمانہ طرزِ عمل کا ایک خاصہ ہے کہ پھر ہر وقت وہ ڈرتے بھی ہیں، کہ کہیں ہماری بات کوئی آگے پہنچا نہ دے، ہماری کوئی شکایت نہ کر دے۔جس آدمی کا باطن صاف ہوتا ہے، اور وہ قاعدے اور قانون کے مطابق چلتا ہے، اس کے دل میں دھڑکا کبھی نہیں آتا کہ کہیں میری کوئی شکایت نہ کر دے، کبھی نہیں سوچے گا، اس کو وہم ہی نہیں آئے گا کہ کہیں میری کوئی شکایت نہ کر دے، کیونکہ اس کا ضمیر اتنا مطمئن ہوتا ہے، کہ میرے متعلق اگر کوئی کہے گا بھی تو کیا کہے گا؟ جب وہ کسی جرم کا ارتکاب ہی نہیں کرتا تو اس کو شکایت کیے جانے کا ڈر کیسا۔اور جب انسان مجرم ہوتا ہے تو پھر وہ

اندر سے ڈرتا ہے کہ کہیں ہماری حالت کا پتا نہ چل جائے، کوئی ہماری شکایت نہ کردے...... اچھا! شکایت کون کیا کرتے ہیں؟ شکایت وہ لوگ کیا کرتے ہیں جو اس شخصیت کے معتمد علیہ ہوتے ہیں، جو اس کے پاس اٹھنے بیٹھنے والے ہوتے ہیں وہی جا کے حالت پہنچا سکتے ہیں اور بات کی اطلاع دے سکتے ہیں، اور بات کی اطلاع دینا کسی درجے میں شرعی طور پر فرض بھی ہوتا ہے، وہ کیسے؟ حدیث شریف میں آپ نے پڑھا کہ ''مَنْ رَأٰى مِنْكُمْ مُنْكَرًا فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهٖ'' کہ جو تم میں سے کوئی بُری بات دیکھے اسے چاہیے کہ ہاتھ سے بدل دے، ''فَإِنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهٖ'' اگر ہاتھ سے بدل نہیں سکتا تو اپنی زبان سے بدل دے، ''فَإِنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهٖ'' اور اگر زبان سے بدلنے کی بھی طاقت نہیں رکھتا تو اپنے دل کے ساتھ اُس کو بدلے ''ذٰلِكَ أَضْعَفُ الْإِيْمَانِ''[1] ایک روایت میں ہے ''وَلَيْسَ وَرَآءَ ذٰلِكَ مِنَ الايمانِ حَبَّةُ خَرْدَلٍ'' او کما قال علیہ الصلاۃ و السلام [2] یعنی قلبی کراہت ایمان کا آخری درجہ ہے، سب سے کمزور درجہ ہے، اور فرمایا کہ اس کے بعد رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان باقی نہیں ہے۔ اب ایک آدمی دیکھتا ہے کہ جماعتی سطح پر ایک جرم کیا جا رہا ہے، یا ادارہ کے مفاد کے خلاف کوئی حرکتیں کی جا رہی ہیں، یا اس قسم کی باتیں ہو رہی ہیں جن کا نتیجہ کسی وقت بھی نقصان کی شکل میں سامنے آ سکتا ہے، تو مخلص آدمی اور مؤمن کامل کا فرض ہے کہ پہلے تو خود روکے کہ بھائی! ایسی باتیں نہ کرو۔ ہاتھ اٹھانے کی تو اجازت نہیں ہوتی، ہاتھ اٹھانا تو حکام کا کام ہے، وہ صرف زبان سے منع کرے، اگر زبان سے منع کرنے کے باوجود اس قسم کی مجرمانہ زندگی کو نہیں چھوڑتے، اور اندیشہ ہے کہ ماحول خراب ہو جائے گا یا ادارے کو نقصان پہنچے گا، جماعت کو نقصان پہنچے گا، تو پھر جو مؤمن مخلص ہوا کرتا ہے اس کو ہر وہ تدبیر اختیار کرنی چاہیے جس کے ساتھ اس جرم کی جڑ کاٹ دی جائے، اور ان تدبیروں میں سے ایک تدبیر یہ بھی ہے کہ جس کے ہاتھ میں اختیار ہے اسے اطلاع دے دو، کہ اس قسم کی حرکتیں ہوتی ہیں، اگر ان کو روکا نہ گیا تو کسی وقت بھی نقصان ہو سکتا ہے، یہ اخلاص کا تقاضا بھی ہے، محبت کا تقاضا بھی ہے اور فرض شناسی بھی ہے، ایمان کامل کا تقاضا ہے کہ اگر انسان خود اس جرم کو نہ مٹا سکے تو کم از کم کسی ایسے شخص کو اطلاع دے جس کے ذریعے سے اس جرم کو مٹایا جا سکے، تو یہ ایمان کامل اور اخلاص کا نتیجہ ہے۔ اور اگر جاننے کے باوجود، مطلع ہونے کے باوجود آپ اطلاع نہیں دیتے، چاہے آپ اس جرم میں شریک بھی نہیں، اس حدیثِ صحیح کی رو سے آپ اس گناہ کے اندر برابر کے شریک ہوں گے اگر آپ اس کے اوپر پردہ داری کرتے ہیں، چور بھی مجرم ہے اور چور کی چوری کو چھپانے والا اور اُس کی پردہ داری کرنے والا بھی برابر کا مجرم ہے، جب وہ دیکھتا ہے کہ فلاں شخص لوگوں کو نقصان پہنچا رہا ہے، اور اس کی اطلاع دے کے اُس کا انسداد نہیں کرتا، تو اس نقصان اور اس ظلم کے اندر وہ بھی برابر کا شریک ہے، اس لیے مخلصین کا ہمیشہ قاعدہ یہ ہوا کرتا ہے کہ اس قسم کی بات کی نشاندہی کرتے ہیں، تا کہ اُس کا ازالہ کر دیا جائے۔ آپ جانتے ہیں کہ جو بھی منتظم ہوگا، براہِ راست تو ہر وقت وہ نگرانی کر نہیں سکتا، اُس کو احوال پہنچیں گے تو ہی جا کے وہ اصلاحی کارروائی کر سکتا ہے، اب اگر تو کسی مخلص سے لغزش ہوگئی اور اطلاع پہنچے، تنبیہ کریں گے، وہ مطمئن ہو جائے گا، لیکن جن کی عادت مجرمانہ ہوا کرتی ہے وہ یہ چاہتے ہیں کہ ہماری پردہ داری کی جائے اور ہماری شکایت کوئی نہ

(۱) مسلم ۱/۵۱، باب بیان کون النہی عن المنکر من الایمان/ مشکوٰۃ ۲/۴۳۶، باب الامر بالمعروف کی پہلی حدیث۔
(۲) مسلم حوالہ مذکورہ/ مشکوٰۃ ج۱ ص۲۹، باب الاعتصام، فصل اول، عن عبد اللہ بن مسعودؓ۔

کرے، پھر اس کے ساتھ ساتھ اُن میں ایک اور عادت اجاگر ہوتی ہے، کہ اپنے جرموں کو چھپانے کے لیے، اپنے آپ کو صحیح ثابت کرنے کے لئے اپنے ساتھیوں کے سامنے پھر ایک پروپیگنڈہ کرتے ہیں، وہ کیا؟ کہ جی! یہ جو ہمارے منتظم ہیں یہ تو کانوں کے کچے ہیں، گھٹیا قسم کے اور شرارتی قسم کے لوگ جا کے ہماری شکایت کر دیتے ہیں، تو فوراً اعتبار کر لیتے ہیں۔ تو گویا کہ اُن پر بھی بداعتمادی کا اظہار، کہ ہم تو اپنی جگہ صحیح ہیں، لیکن اُن کو شکایت سننے کی عادت ہے، جو بھی جا کے کہہ دے مان جاتے ہیں، اور بات پہنچانے والے پر بھی بداعتمادی کا اظہار ہے، کہ یہ لوگ ایسے ہی جا کے کان بھرتے ہیں، کانوں میں لگے رہتے ہیں، وہ کانوں کے کچے ہیں اور یہ کان بھرتے رہتے ہیں، اس طرح سے ہمارے مخالف کر دیتے ہیں، ورنہ ہم تو ایسے نہیں ہیں، یہ پروپیگنڈا ساتھ ساتھ وہ کرتے ہیں، صرف اس لیے تا کہ اگر کسی وقت یہ گرفت کے اندر آ بھی جائیں، تو دوسرے لوگ یہ سمجھیں کہ یہ تو صرف شکایت کرنے والوں کی شکایت کرنے کی بنا پر اور اُن کے کان بھرنے کی بناء پر اِن کے اوپر گرفت کر لی گئی، ورنہ یہ ایسے نہیں۔ تو یہ پہلے ہی پروپیگنڈا کر کے رکھتے ہیں تا کہ اگر کوئی ایسا واقعہ پیش آ جائے تو لوگ یقین کر لیں کہ واقعی وہ سچ کہتے ہیں، کہ یہ مخالف ہیں اس لیے شکایتیں کر دیتے ہیں، اور اُن کے کان کچے ہیں ان کو جو کوئی جا کے کہہ دے بس اس کی بات سن لیتے ہیں، سننے کے بعد فوراً مان جاتے ہیں، مجرم آدمی کی یہ خاصیت ہے کہ وہ اپنے حاکم کے متعلق اور اپنے امیر کے متعلق اپنے ماحول میں اس قسم کی پروپیگنڈا کرتا ہے، کہ ہمارا حاکم، ہمارا امیر، ہمارا منتظم کانوں کا کچا ہے، اور یہ جو آس پاس اٹھنے بیٹھنے والے ہیں یہ شکایتی ٹٹو ہیں، یہ چغلی خور ہیں، اور یہ جا کے اس قسم کی باتیں بطور شکایت کے ذکر کرتے ہیں، اور سن کے ان کی بات پہ یقین کر لیتے ہیں اور ہمارے مخالف ہو جاتے ہیں، اس طرح سے کام بگڑتا ہے ورنہ ہم ایسے کہاں ہیں، یہ پروپیگنڈا کر کے رکھتے ہیں تا کہ اگر کسی وقت گرفت میں آ بھی جائیں تو اس کا دفاع انہوں نے پہلے ہی مہیا کیا ہوا ہوتا ہے، یہ مجرمانہ زندگی کی ایک خاصیت ہے، ورنہ جن کے دل صاف ہوں اور وہ صحیح طور پر زندگی گزاریں اُن کے دل میں کبھی یہ کھٹکا آتا ہی نہیں، کہ کہیں ہماری کوئی شکایت نہ کر دے، کوئی بیٹھا رہے کوئی چلتا رہے ان کو کبھی دھڑکا نہیں ہوتا کہ شاید یہ ہماری باتیں کر رہا ہے، اور جو مجرم ہوتا ہے وہ جس کو دیکھتا ہے کہ پاس کھڑا ہے، وہ سمجھتا ہے کہ بس یہ میری شکایتیں کر رہا ہے، تو قبل از وقت ہی اس کے متعلق پروپیگنڈہ شروع کر دیتا ہے کہ وہ تو ایسا ہے، وہ تو ایسا ہے، حالانکہ سمجھدار آدمی ان کے اس طرز سے سمجھ جاتا ہے کہ یہ مجرم ہیں جنہوں نے قبل از وقت اس قسم کی باتیں کرنی شروع کر دیں۔

لطیفہ مشہور ہے، لوگوں میں ایک بات مشہور ہے، حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک جگہ وعظ میں ذکر فرمائی ہے، ویسے بھی آپ نے سنی ہوگی، کہ ''جو کانا ہوتا ہے وہ حرام زادہ ہوتا ہے!''، ''حرام زادہ'' سے مراد ہے کہ شرارتی ہوتا ہے، جیسے کہتے ہیں کہ اُس کی ایک رگ زائد ہوتی ہے۔ تو ایک کانا چلا جا رہا تھا اور سامنے سے ایک آدمی آ رہا تھا، تو یہ کانا اُس کو دیکھ کے کہتا ہے کہ تو حرام زادہ ہے، وہ شریف آدمی کہتا ہے کہ بھئی! میں نے تجھے کچھ کہا نہیں، تُو نے میرے اُوپر جلدی سے یہ فتویٰ کیسے ٹھونک دیا؟ میں نے تو تجھے کچھ نہیں کہا۔ وہ کہتا ہے کہ مجھے پتا ہے کہ جب تیری نظر مجھ پہ پڑتی اور تُو دیکھتا کہ یہ کانا ہے تو تُو نے دِل میں سمجھنا تھا کہ میں حرام زادہ ہوں، میں نے اس کا جواب پہلے ہی دے دیا کہ تُو حرام زادہ ہے۔

یہ اصل میں اپنی کمزوری کا احساس اپنے دل میں ہے، اور وہ سمجھتے ہیں کہ جو شخص بھی ہمیں دیکھے گا وہ ایسے ہی سمجھے گا، تو

قبل اَز وقت اُس کا دفعیہ کرنے کے لیے یہ طرز اپنا لیا جاتا ہے، کہ اس قسم کے لوگوں کے خلاف پہلے ہی پروپیگنڈا کردو، تا کہ اگر کوئی ایسی بات ہو تو لوگ یہ سمجھیں کہ واقعی کسی نے شکایت کر دی، اور وہ کانوں کے کچے ہیں، سنتے ہیں، اور سن کے فوراً یقین کر لیتے ہیں، جو بھی منتظم ہوگا اس کو حالات پر کان رکھنے پڑتے ہیں کہ کیا ہو رہا ہے، کیا نہیں ہو رہا؟ اُس کی خواہش تو یہ ہوتی ہے کہ اس کے کان میں اچھی باتیں آئیں، اچھی باتیں سن کر وہ خوش ہوگا، کہ یہ سارے کے سارے ٹھیک چل رہے ہیں، ان کا کردار ٹھیک ہے، ان کا عمل ٹھیک ہے، یہ باتیں سن کے طبیعت خوش ہوتی ہے، اور اگر کسی قسم کی بری بات سامنے آ جائے اور پہنچانے والا عادل ہو ثقہ ہو، تو اس کا اعتبار نہ کرنا بھی ایک غلطی ہے، اعتبار کر کے اس کا ازالہ کرنا چھوٹوں پر شفقت ہوتی ہے، اگر پتا ہو کہ چھوٹے اس قسم کی حرکت کر رہے ہیں، اپنے ماتحت کوئی اس قسم کی حرکت کر رہے ہیں جو خود ان کے لیے نقصان دہ ہے، تو بات سن کے اور اُس پر یقین کر کے اُس کے اِزالے کی کوشش کرنا یہ اپنے چھوٹوں پر مہربانی ہوتی ہے۔ اور جو اچھے لوگ ہوتے ہیں، وہ اس قسم کی گرفت اور اس قسم کی تنبیہ کو اپنے لیے مفید سمجھتے ہیں، کہتے ہیں کہ ٹھیک ہے ہم میں ایک غلطی تھی، اُس پر تنبیہ ہوگئی، آئندہ ہم ٹھیک ہو کے رہیں گے، وہ تو اس طرح سے اصلاح کی طرف جائیں گے اور حالات سدھرتے چلے جائیں گے، اور جو بد باطن ہوتے ہیں وہ انہی چیزوں کو مزید فساد کا ذریعہ بنا لیتے ہیں، تو منافقین کی یہ خصلت تھی جو یہاں ذکر کی گئی، کہ جب وہ اس قسم کی حرکتیں کرتے، اور حضور ﷺ کو پتا چل جاتا، اللہ کے بتانے کے ساتھ یا مؤمن مخلصین کے بتانے کے ساتھ، جیسے حدیث شریف میں آپ پڑھیں گے کہ فتح مکہ کے بعد جو غزوہ حنین پیش آیا تھا تو اس میں رسول اللہ ﷺ نے جو غنیمتیں تقسیم کیں، تو انصار کے بعض نو جوانوں نے کچھ اس قسم کی باتیں کہیں جو آپ ﷺ کی عظمت کے خلاف تھیں، تو ان باتوں کی اطلاع جا کر عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے دی تھی، اور ان کے اطلاع دینے پر رسول اللہ ﷺ نے اُن انصار کو بلایا اور انہیں تفہیم کر دی،[1] تفہیم کرنے کے بعد وہ سمجھ گئے اور قصہ ختم ہو گیا۔ تو یہ مہربانی ہوتی ہے کہ بات کا پتا چل جانے کے بعد اس کا اِزالہ کر دیا جائے...... جب حضور ﷺ کو پتا چلتا اور آپ ﷺ کچھ تنبیہ کرتے تو پھر یہ منافق اپنی خفگی مٹانے کے لیے یوں کہتے کہ بس جی! کیا کریں، ہمارے بڑے تو کانوں کے کچے ہیں، جو ان کے کان میں جا کے کچھ ڈال دیتا ہے اسی کی بات مان جاتے ہیں، ہر کسی کی بات کو مان جاتے ہیں، اور ایسی باتوں میں آ کر ہمارے اُوپر گرفت شروع کر دیتے ہیں، حالانکہ ہم ایسے کب ہیں؟ یہ باتیں نبی کے لیے مستقل باعثِ ایذا تھیں۔ تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس طرح سے نہ کہو، یہ باعثِ ایذا ہے، وہ تو تمہاری بھلائی کی بات سنتے ہیں، اور اُن کا باتیں سننا تمہاری بھلائی کے لیے ہی ہے، اچھی بات کی خبر پہنچے گی تو خوش ہوں گے، اور اگر کوئی بُری خبر پہنچے گی تو اُس کی اصلاح کر دیں گے، اس میں بھی تمہارا بھلا ہے۔ باقی! نبی ہر کسی کی نہیں مانتا، نبی تو جو اللہ کی طرف سے اطلاع آئے اس پر یقین لاتا ہے، یا مؤمن مخلصین جو کچھ بتائیں اس پہ ایمان لاتا ہے، اور یہ انتظام کے لیے ضروری ہے، اگر مؤمنین مخلصین عادل اور ثقہ آدمیوں کی رپورٹ کا بھی اعتبار نہ کیا جائے، تو آخر انتظام کو بحال رکھنے کی صورت کیا ہے؟ اور مؤمنین مخلصین کے ذِمّے ہوتا ہے، کہ کوئی کمی خامی محسوس کریں تو اطلاع دیں، کیونکہ یہ بھی تغییر منکر ہے، ورنہ اگر ایک بُرائی

(۱) الکامل فی التاریخ ج ۲ ص ۱۲۲ مطبوعہ دار الحدیث، القاہرہ، پرمکمل خطبہ سرورِ کائنات ﷺ کا موجود ہے۔

کو دیکھنے کے بعد آپ یوں پردہ ڈالیں کہ ہمیں کیا، تو "ہمیں کیا" کہنے کے ساتھ آپ اس جرم کے گناہ میں برابر کے شریک ہوں گے، یہ فرض ہوتا ہے کہ جہاں کمی کوتاہی محسوس کرو، یا تو خود اِزالہ کرنے کی کوشش کرو، اور اگر خود اِزالہ نہیں کر سکتے تو کم از کم دوسرے ایسے شخص کو اطلاع دو جو اس کا اِزالہ کرے اور اس پر کنٹرول کرے، تو ان آیات کے اندر اُن کو اس طرح بھی تنبیہ کی گئی ہے۔

يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَكُمْ لِيُرْضُوْكُمْ ۚ وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَحَقُّ

یہ منافق قسمیں کھاتے ہیں اللہ کی تمہارے لیے تاکہ تمہیں خوش کرلیں، اللہ اور اس کا رسول زیادہ حق رکھتا ہے

اَنْ يُّرْضُوْهُ اِنْ كَانُوْا مُؤْمِنِيْنَ ﴿۶۲﴾ اَلَمْ يَعْلَمُوْٓا اَنَّهٗ مَنْ يُّحَادِدِ

اس بات کا کہ یہ اُس کو راضی کریں اگر یہ لوگ ایمان والے ہیں ﴿۶۲﴾ کیا انہیں معلوم نہیں کہ بے شک جو شخص مخالفت کرے

اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاَنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خَالِدًا فِيْهَا ۭ ذٰلِكَ الْخِزْيُ

اللہ اور اس کے رسول کی پس اُس کے لیے جہنّم کی آگ ہے، پڑا رہے گا اُس میں، یہ بہت بڑی

الْعَظِيْمُ ﴿۶۳﴾ يَحْذَرُ الْمُنٰفِقُوْنَ اَنْ تُنَزَّلَ عَلَيْهِمْ سُوْرَةٌ

رسوائی ہے ﴿۶۳﴾ منافقین ڈرتے ہیں اس بات سے کہ اُتار دی جائے مؤمنین پر کوئی سورت

تُنَبِّئُهُمْ بِمَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ ۭ قُلِ اسْتَهْزِءُوْا ۚ اِنَّ اللّٰهَ مُخْرِجٌ

جو خبردار کردے مؤمنین کو ان باتوں سے جو اِن (منافقین) کے دِلوں میں ہیں، آپ کہہ دیجئے تم ٹھٹھہ کرتے ہو، بے شک اللہ ظاہر کرنے والا ہے

مَّا تَحْذَرُوْنَ ﴿۶۴﴾ وَلَىِٕنْ سَاَلْتَهُمْ لَيَقُوْلُنَّ اِنَّمَا كُنَّا نَخُوْضُ

اُس بات کو جس سے تم ڈرتے ہو ﴿۶۴﴾ اور اگر تو ان سے پوچھے تو البتہ ضرور کہیں گے یہ لوگ کہ سوائے اس کے کچھ نہیں کہ ہم باتوں میں لگے ہوئے تھے

وَنَلْعَبُ ۭ قُلْ اَبِاللّٰهِ وَاٰيٰتِهٖ وَرَسُوْلِهٖ كُنْتُمْ تَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۶۵﴾

اور دِل لگی کرتے تھے، آپ کہہ دیجئے کہ کیا اللہ کے ساتھ اور اُس کی آیات کے ساتھ اور اُس کے رسول کے ساتھ تم ٹھٹھہ کرتے تھے؟ ﴿۶۵﴾

لَا تَعْتَذِرُوْا قَدْ كَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ ۭ اِنْ نَّعْفُ عَنْ

عذر مت کرو، تم نے کفر کیا اپنے ایمان کے بعد، اگر درگزر کریں گے ہم

طَآئِفَةٍ مِّنْكُمْ نُعَذِّبْ طَآئِفَةًۢ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا مُجْرِمِيْنَ ﴿٦٦﴾

تم میں سے ایک طائفہ سے تو عذاب دیں گے ہم دوسرے طائفہ کو اس سبب سے کہ وہ جرم کرنے والے تھے ﴿٦٦﴾

اَلْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ بَعْضُهُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ

منافق مرد اور منافق عورتیں ان کا بعض بعض سے ہے، حکم دیتے ہیں

بِالْمُنْكَرِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوْفِ وَيَقْبِضُوْنَ اَيْدِيَهُمْ ۭ نَسُوا اللّٰهَ

بُرائی کا، روکتے ہیں بھلائی سے، اور بند کرتے ہیں اپنے ہاتھوں کو، انہوں نے اللہ کو بھلا دیا،

فَنَسِيَهُمْ ۭ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿٦٧﴾ وَعَدَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِيْنَ

اللہ نے انہیں بھلا دیا، بےشک منافق وہ نافرمان ہیں ﴿٦٧﴾ وعدہ کیا اللہ تعالیٰ نے منافق مردوں سے

وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْكُفَّارَ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ هِىَ حَسْبُهُمْ ۚ

اور منافق عورتوں سے اور سب کافروں سے جہنم کی آگ کا، اس میں ہمیشہ رہیں گے، یہ آگ ان کے لیے کافی ہے،

وَلَعَنَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ﴿٦٨﴾ ۙ كَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ

اور لعنت کی اللہ تعالیٰ نے اُن پر، اور ان کے لئے دائمی عذاب ہے ﴿٦٨﴾ (اے منافقو!) تم اُن لوگوں کی طرح ہی ہو جو تم سے پہلے گزرے ہیں

كَانُوْٓا اَشَدَّ مِنْكُمْ قُوَّةً وَّاَكْثَرَ اَمْوَالًا وَّاَوْلَادًا ۭ فَاسْتَمْتَعُوْا

وہ زیادہ سخت تھے بمقابلہ تمہارے از روئے قوت کے اور بہت زیادہ تھے از روئے اموال کے اور اولاد کے، پس انہوں نے فائدہ اُٹھایا

بِخَلَاقِهِمْ فَاسْتَمْتَعْتُمْ بِخَلَاقِكُمْ كَمَا اسْتَمْتَعَ الَّذِيْنَ

اپنے حصے کے ساتھ پھر تم نے بھی فائدہ اُٹھایا اپنے حصے کے ساتھ جیسے کہ فائدہ اُٹھایا تھا اُن لوگوں نے

مِنْ قَبْلِكُمْ بِخَلَاقِهِمْ وَخُضْتُمْ كَالَّذِيْ خَاضُوْا ۭ اُولٰٓئِكَ

جو تم سے پہلے گزرے ہیں اپنے حصے کے ساتھ، اور تم بھی باتوں میں گھسے اُسی طرح سے جیسے وہ گھسے تھے، وہ لوگ

حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ

ان کے اعمال ضائع ہوگئے دُنیا اور آخرت میں، اور یہی لوگ

الْخٰسِرُوْنَ ﴿۶۹﴾ اَلَمْ يَاْتِهِمْ نَبَاُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ قَوْمِ نُوْحٍ

خسارہ پانے والے ہیں ﴿۶۹﴾ کیا ان کے پاس خبر نہیں آئی اُن لوگوں کی جو ان سے پہلے گزرے ہیں یعنی نوح علیہ السلام کی قوم

وَّعَادٍ وَّثَمُوْدَ ۙ وَقَوْمِ اِبْرٰهِيْمَ وَاَصْحٰبِ مَدْيَنَ

اور عاد اور ثمود اور ابراہیم علیہ السلام کی قوم اور مدین والے

وَالْمُؤْتَفِكٰتِ ؕ اَتَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ۚ فَمَا كَانَ اللّٰهُ

اور پلٹا کھانے والی بستیاں، اُن کے پاس اُن کے رسول آئے واضح دلائل لے کر، پس نہیں تھا اللہ

لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۷۰﴾ وَالْمُؤْمِنُوْنَ

کہ اُن پر ظلم کرتا، لیکن وہ اپنے نفسوں پر خود ہی ظلم کرتے تھے ﴿۷۰﴾ اور مؤمن مرد

وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ

اور مؤمن عورتیں، ان کا بعض بعض کا دوست ہے، حکم دیتے ہیں یہ بھلائی کا

وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ

اور روکتے ہیں برائی سے اور قائم کرتے ہیں یہ نماز کو اور دیتے ہیں

الزَّكٰوةَ وَيُطِيْعُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ؕ اُولٰٓئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللّٰهُ ؕ

زکوٰۃ اور اللہ اور اللہ کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں، یہی لوگ ہیں کہ ضرور اللہ تعالیٰ ان پر رحم فرمائے گا،

اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۷۱﴾ وَعَدَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ

بے شک اللہ تعالیٰ زبردست ہے حکمت والا ہے ﴿۷۱﴾ وعدہ کیا اللہ تعالیٰ نے مؤمن مردوں سے اور مؤمن عورتوں سے

جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً

باغات کا کہ جاری ہوں گی اُن کے نیچے سے نہریں، اُس میں ہمیشہ رہنے والے ہوں گے، اور (وعدہ کیا) عمدہ مکانات کا

فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ؕ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۷۲﴾

ہمیشگی کے باغات میں، اور اللہ کی رضا تو بہت بڑی چیز ہے، یہ بہت بڑی کامیابی ہے ﴿۷۲﴾

خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَكُمْ: یہ منافق قسمیں کھاتے ہیں اللہ کی تمہارے لیے، لَكُمْ کا خطاب اہلِ ایمان کو ہے، ''تاکہ تمہیں خوش کرلیں'' وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَحَقُّ اَنْ يُّرْضُوْهُ: اللہ اور اللہ کا رسول زیادہ حق رکھتے ہیں اس بات کا کہ یہ لوگ اس کو راضی کریں، ''ہٗ'' ضمیر مفرد لوٹادی، چاہے اللہ کی طرف لوٹادو تو اللہ کے رسول کی رضا اس کے لئے لازم ہے، اور چاہے رسول کی طرف لوٹادو تو اللہ کی رضا اس کے لئے لازم ہے، دونوں کی رضا میں تفریق نہیں کی جاسکتی ہے، ایک کو راضی کرنا دوسرے کو راضی کرنا ہے، ''اللہ اور اس کا رسول زیادہ حق رکھتا ہے اس بات کا کہ اُس کو راضی کریں اگر یہ لوگ ایمان والے ہیں''۔ ''کیا اِن کو پتا نہیں؟ کیا انہیں معلوم نہیں؟ کیا یہ جانتے نہیں؟ کہ بے شک جو شخص مخالفت کرے اللہ اور اس کے رسول کی پس اس کے لئے جہنم کی آگ ہے، پڑا رہے گا اس میں'' ذٰلِكَ الْخِزْيُ الْعَظِيْمُ: یہ بہت بڑی رُسوائی ہے۔ يَحْذَرُ الْمُنٰفِقُوْنَ: منافقین ڈرتے ہیں، بدکتے ہیں اس بات سے کہ اُتار دی جائے مؤمنین پر کوئی سورت جو خبردار کردے مؤمنین کو ان باتوں سے جو اِن (منافقین) کے دلوں میں ہیں۔ آپ کہہ دیجئے کہ تم اِستہزا کرتے رہو، ٹھٹھہ کرتے رہو، بے شک اللہ تعالیٰ نکالنے والا ہے، ظاہر کرنے والا ہے اس بات کو جس سے تم ڈرتے ہو۔ اور اگر تو ان سے سوال کرے، ان سے پوچھے تو البتہ ضرور کہیں گے یہ لوگ کہ سوائے اس کے کچھ نہیں کہ ہم باتوں میں لگے ہوئے تھے، مشغلہ کرتے تھے، دل لگی کرتے تھے۔ آپ کہہ دیجئے کہ کیا اللہ کے ساتھ اور اس کی آیات کے ساتھ اور اس کے رسول کے ساتھ تم ٹھٹھہ کرتے تھے؟ عذر مت کرو، تم نے کُفر کیا اپنے ایمان کے بعد، اگر درگزر کریں گے ہم تم میں سے ایک طائفہ سے، ایک گروہ سے تو عذاب دیں گے ہم دوسرے طائفہ کو، اس سبب سے کہ وہ جرم کرنے والے تھے۔[1] اَلْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ: منافق مرد اور منافق عورتیں، بَعْضُهُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ: ان کا بعض بعض سے ہے، یعنی یہ سب ایک دوسرے کے ہیں، ایک دوسرے سے اِن کا شدید تعلق ہے، يَاْمُرُوْنَ بِالْمُنْكَرِ: حکم دیتے ہیں بُرائی کا، وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوْفِ: روکتے ہیں بھلائی سے، وَيَقْبِضُوْنَ اَيْدِيَهُمْ: اور بند کرتے ہیں اپنے ہاتھوں کو، یعنی جہاں خرچ کرنے کا موقع ہوتا ہے وہاں اپنی مٹھی بھینچ لیتے ہیں، ''بند کرتے ہیں اپنے ہاتھوں کو'' نَسُوا اللّٰهَ: انہوں نے اللہ کو بھلایا، فَنَسِيَهُمْ: اللہ نے انہیں بھلا دیا، نسیان کی نسبت جس وقت اللہ کی طرف کی جائے تو اس سے حقیقت مراد نہیں ہوتی بلکہ نتیجہ مراد ہوتا ہے، کیونکہ اللہ پر نسیان نہیں آسکتا، اللہ کے علم میں ہر چیز ہر وقت موجود ہے، تو اس کا معنی ہوتا ہے توجہ چھوڑ دینا، انہوں نے اللہ کو بھلا دیا، انہوں نے اللہ کو یاد نہیں رکھا، اُس کے احکام کی اطاعت نہیں کی، اللہ تعالیٰ نے اِن کو اپنی رحمت سے چھوڑ دیا، کہ اللہ کی رحمت اِن پر نہیں ہوئی، اللہ نے بھی اِن کے ساتھ ویسے ہی معاملہ کیا، اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ: بے شک منافق وہ فاسق لوگ ہیں، نافرمان ہیں، بدمعاش ہیں۔ وَعَدَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَ الْمُنٰفِقٰتِ: وعدہ کیا اللہ تعالیٰ نے منافق مردوں سے اور منافق عورتوں سے اور سب کافروں سے جہنم کی آگ کا، خٰلِدِيْنَ فِيْهَا: اُس میں ہمیشہ رہیں گے، هِيَ حَسْبُهُمْ: یہ آگ ان کے لئے کافی ہے، وَلَعَنَهُمُ اللّٰهُ: اور اللہ نے اُنہیں پھٹکار دیا، اپنی رحمت سے دور کردیا، لعنت کی اللہ تعالیٰ نے

(۱) یہاں تک کی آیات کا خلاصہ الفاظ کی تحقیق کے ساتھ پچھلی آیات کے تحت بھی بیان ہوا ہے، اس لیے یہاں اختصار کے ساتھ خلاصہ بیان کیا گیا ہے۔

اُن پر، وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ: اور اِن کے لئے دائمی عذاب ہے۔ كَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ اَنْتُمْ كَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ اے منافقو! تم ان لوگوں کی طرح ہی ہو جو تم سے پہلے گزرے ہیں، وہ زیادہ سخت تھے بمقابلہ تمہارے از روئے قوت کے اور بہت زیادہ تھے از روئے اموال کے اور اولاد کے، فَاسْتَمْتَعُوْا بِخَلَاقِهِمْ: استمتاع: نفع اُٹھانا، پس انہوں نے فائدہ اُٹھایا اپنے حصے کے ساتھ، فَاسْتَمْتَعْتُمْ بِخَلَاقِكُمْ: پھر تم نے بھی فائدہ اُٹھایا اپنے حصے کے ساتھ، كَمَا اسْتَمْتَعَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ: جیسے کہ فائدہ اُٹھایا تھا اُن لوگوں نے جو تم سے پہلے گزرے ہیں بِخَلَاقِهِمْ: اپنے حصے کے ساتھ، وَخُضْتُمْ كَالَّذِيْ خَاضُوْا: اور تم بھی باتوں میں لگے، مشغلے میں لگے، باتوں میں گھسے، اُسی طرح سے جیسے وہ گھسے تھے، اُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ: وہ لوگ، اُن کے اعمال ضائع ہو گئے دنیا اور آخرت میں، وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ: اور یہی لوگ خسارہ پانے والے ہیں۔ اَلَمْ يَاْتِهِمْ نَبَاُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ: کیا اِن کے پاس خبر نہیں آئی ان لوگوں کی جو اِن سے پہلے گزرے ہیں، اُن کا واقعہ اِن کے سامنے نہیں آیا؟ نبأ: خبرِ عظیم کو کہتے ہیں، بڑے واقعے کو، الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ سے کیا مراد ہے؟ قَوْمِ نُوْحٍ وَّعَادٍ وَّثَمُوْدَ وَقَوْمِ اِبْرٰهِيْمَ وَاَصْحٰبِ مَدْيَنَ وَالْمُؤْتَفِكٰتِ: وہ لوگ جو اِن سے پہلے گزرے ہیں یعنی نوح کی قوم، عاد، ثمود، اور ابراہیم کی قوم، مدین والے (جو حضرت شعیب کی قوم تھی) اور پلٹا کھانے والی بستیاں، یہ قومِ لُوط کی بستیاں ہیں، مؤتفکات: اُلٹی جانے والی بستیاں، پلٹا کھانے والی بستیاں، اَتَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ: اُن کے پاس اُن کے رسول آئے واضح دلائل لے کر، فَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ: پس نہیں تھا اللہ کہ اُن پر ظلم کرتا، وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ: لیکن وہ اپنے نفسوں پر خود ہی ظلم کرتے تھے۔ وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ: اور مؤمن مرد اور مؤمن عورتیں، بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ: ان کا بعض دوست ہے بعض کا، یعنی یہ آپس میں دوست ہیں، ایک دوسرے سے تعلق رکھنے والے ہیں، اِن کا بعض بعض کا مددگار ہے، بعض بعض کا دوست ہے، يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ: حکم دیتے ہیں یہ بھلائی کا، وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ: اور روکتے ہیں بُرائی سے، وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ: اور قائم کرتے ہیں یہ نماز کو اور دیتے ہیں زکوٰۃ، وَيُطِيْعُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ: اور اللہ اور اللہ کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں، اُولٰٓئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللّٰهُ: یہی لوگ ہیں کہ ضرور اللہ تعالیٰ ان پر رحم فرمائے گا، اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ: بے شک اللہ تعالیٰ زبردست ہے حکمت والا ہے۔ وَعَدَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ: وعدہ کیا اللہ تعالیٰ نے مؤمن مردوں سے اور مؤمن عورتوں سے، جَنّٰتٍ تَجْرِيْ: باغات کا کہ جاری ہوں گی ان کے نیچے سے نہریں، خٰلِدِيْنَ فِيْهَا: اس میں ہمیشہ رہنے والے ہوں گے، وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً: اور وعدہ کیا اللہ تعالیٰ نے مؤمن مردوں اور عورتوں سے بہترین عمدہ پاکیزہ مکانات کا، گھروں کا، مساکن مسکن کی جمع ہے، فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ: ہیشگی کے باغات میں، وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ: اور اللہ کی رضا تو بہت بڑی چیز ہے، ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ: اور یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

تفسیر

ماقبل سے ربط

منافق لوگ جو درپردہ کافر تھے اور ظاہری طور پر ایمان لائے ہوئے تھے، ایمان کا اظہار کرتے تھے، اُن کی طرف سے

جس قسم کی تکلیفات سرورِ کائنات ﷺ کو پہنچتی تھیں، اور جیسے اُن کے ظاہر اور باطن کے اختلاف کا مظاہرہ ہوتا تھا، ان آیات میں بھی وہ بات بیان کی جارہی ہے، کل آپ کے سامنے اُن کی ایک بات کی تشریح کردی گئی تھی، یَقُوْلُوْنَ هُوَ اُذُنٌ، کہ وہ نبی کو کہتے ہیں کہ یہ تو سراپا کان ہے، اس کی مکمل وضاحت آپ کے سامنے ہوگئی تھی، اور اللہ تعالیٰ نے ان کو دھمکا دیا تھا کہ تمہاری یہ باتیں ایذا کا باعث ہیں، اور جو لوگ بھی اللہ کے رسول کو ایذا دیتے ہیں، تکلیف پہنچاتے ہیں ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔

منافقین کی در پردہ مجرمانہ زندگی کی نقاب کشائی

تو قصہ تو وہی ہے کہ اپنی مجلسوں کے اندر وہ استہزا کرتے تھے، مذاق اڑاتے تھے، سرورِ کائنات ﷺ کی باتوں پر پھبتیاں کستے، نقلیں اُتارتے، اور جب اس قسم کی کوئی بات ظاہر ہوتی اور مؤمنین ان کو گہری نظر سے دیکھتے، تو یَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَكُمْ لِيُرْضُوْكُمْ تمہارے سامنے آ کے قسمیں کھاتے ہیں تاکہ تمہیں خوش کرلیں، تم اُن پہ راضی رہو، اُن پہ مطمئن رہو، یعنی در پردہ ان کی زندگی مجرمانہ ہے، اپنی مجلس کے اندر تمہارا مذاق اڑاتے ہیں، پھبتیاں کستے ہیں، استہزا کرتے ہیں، لیکن سامنے آتے ہیں تو قسمیں کھا کے یقین دلانے کی کوشش کرتے ہیں لِيُرْضُوْكُمْ: تاکہ تمہیں خوش کرلیں، کیونکہ تمہاری طرف سے اُن کو ڈر ہے کہ آپ لوگ کہیں ان کے جان اور مال کی خبر نہ لے لیں، اور اللہ اور اللہ کے رسول کی رضا کی ان کو فکر نہیں، ورنہ یہ در پردہ خلوتوں میں اور نجی مجلسوں میں اس قسم کی باتیں کیوں کریں؟ ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ اور اُس کا رسول زیادہ حق رکھتا ہے اس بات کا کہ یہ لوگ اُس کو خوش کریں، اللہ اور اللہ کا رسول اگر خوش ہوجائے تو مؤمنین کی جماعت تو خوش ہے ہی، اور اگر بالفرض انسان خوش نہ ہوں اور اللہ اور اللہ کا رسول ﷺ خوش ہوجائے تو یہ کافی ہے، اور اگر انسان اپنے جیسوں کو خوش کرلے، قسمیں کھا کے یقین دلا دے، اعتماد دلا دے، ان کو خوش کرلے لیکن اللہ کی ناراضگی ہو، اور اللہ کی ناراضگی کی بناء پر اللہ کا رسول بھی ناراض ہو، تو مؤمنین کی رضا ان کے کیا کام آسکتی ہے؟ یہ ان کی حماقت ہے کہ اللہ اور اللہ کے رسول کی پروا نہیں کرتے، اور نجی مجلسوں کے اندر اس قسم کے مذاق اڑاتے ہیں، اور تمہارے سامنے آتے ہیں تو تمہیں قسمیں کھا کے خوش کردیتے ہیں، اگر ان میں ایمان ہے جس طرح یہ اپنی زبان سے کہتے ہیں کہ ہم مؤمن ہیں، تو انہیں اللہ اور اللہ کے رسول کی رضا کی فکر ہونی چاہیے، اس لیے اپنی خلوتوں کو ٹھیک کریں، نجی زندگی کے اندر اللہ اور اللہ کے رسول کے احکام کی اطاعت کریں اگر یہ ایمان لانے والے ہیں، جس طرح سے یہ اپنی زبان سے ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں، اگر واقعی ان میں ایمان ہے تو تمہارے مقابلے میں اللہ اور اللہ کے رسول کی رضا کی فکر زیادہ ہونی چاہیے۔ آگے وعید ہے کہ ان کو پتا نہیں؟ یہ جو رسول کے مقابلے میں پارٹی بنائے بیٹھے ہیں اور جماعت بنائی ہوئی ہے، اور اللہ کے رسول کا مقابلہ کررہے ہیں، مخالفت کررہے ہیں، کیا ان کو پتا نہیں، کہ جو شخص بھی اللہ اور اللہ کے رسول کے مقابلے میں آتا ہے، اُس کی مخالفت کرتا ہے، اُس کے لیے جہنم ہے، ہمیشہ وہ جہنم میں پڑا رہے گا، اور یہ بہت بڑی رسوائی ہے، آج اگر تم قسمیں کھا کے اپنی عزت بچاتے بھی ہو تو کل کو اس رسوائی سے نہیں بچ سکو گے، اللہ اور اللہ کے رسول کے مقابلے میں گروہ بندی جہنم میں لے جائے گی، اور یہ بہت بڑی رُسوائی ہے، اس رُسوائی سے تمہیں ڈرنا چاہیے۔ یہ بھی ان کے نفسیات کی اسی قسم کی بات ہے، جیسے پیچھے ذکر کیا تھا کہ جب اُن کی زندگی مجرمانہ تھی

تو ہر وقت ان کے دل میں دھڑکا رہتا تھا، کہ کہیں اللہ کی طرف سے ایسی سورت نہ آجائے، کہ جن کو ہم قسمیں کھا کے خوش کر لیتے ہیں اُن پر اللہ کوئی ایسی سورت نہ اُتار دے جس کے ساتھ ہمارے اندرونی جذبات نمایاں ہو جائیں، تو جب اللہ کی طرف سے ایک سورت اتر آئے گی، جس میں ہمارے باطن کے جذبات کو نمایاں کیا گیا ہوگا، تو پھر مسلمان ہماری قسموں کا کہاں اعتبار کریں گے، تو جس خطرے سے بچنے کے لیے جھوٹی قسمیں کھاتے تھے، وہ خطرہ پھر سر پہ آکھڑا ہوگا۔ جب بھی کوئی سورت نازل ہوتی، کوئی اس قسم کی بات ہوتی تو یہ اندر سے ڈرتے، کہ کہیں ہمارے متعلق اس میں تذکرہ نہ آجائے، جیسے میں نے کل پوری طرح سے آپ کے سامنے وضاحت کر دی تھی، کہ جب انسان کی نجی زندگی مجرمانہ ہوتی ہے، تو نفسیاتی طور پر انسان کے دل اور دماغ میں خوف سا سوار رہتا ہے، کہ مجرم آدمی کو جس وقت بھی کوئی بلانے کے لیے آجائے کہ آپ کو فلاں شخص بلا رہا ہے، تو فوراً اس کا دل دھڑکے گا کہ کہیں میری اُسی بات کا پتا نہ چل گیا ہو جس بات کو میں چھپائے پھر رہا ہوں، تو فوراً اس قسم کے خیالات آتے ہیں۔ جیسے سورۂ منافقون کے اندر یہ لفظ آئیں گے یَحْسَبُوْنَ كُلَّ صَيْحَةٍ (سورۂ منافقون: ۴) کہ جہاں کہیں بھی کوئی آواز بلند ہوتی ہے، کوئی شور اُٹھتا ہے، تو یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارے خلاف ہی کوئی شور ہوا ہے، یہ وہی اندر کا دھڑکا ہے، اور جس وقت انسان اپنی نجی زندگی کے اندر صالح ہوتا ہے اور مجرمانہ کردار اس کا نہ ہو، تو اُس کو اتنا اطمینان ہوتا ہے کہ کوئی کسی طرف سے شور مچتا رہے، کوئی بلانے کے لئے آجائے، کوئی ملنے کے لئے آجائے، کسی کی طرف سے کوئی پیغام آجائے تو بھی دل دماغ میں یہ تشویش نہیں آتی کہ پتا نہیں کیا ہو گیا، اور کہیں میرے اوپر اس قسم کی بات تو نہیں ہو گئی۔ تو مجرمانہ زندگی انسان کو کبھی بھی اطمینان سے وقت نہیں گزارنے دیتی، اور جو غیر مجرمانہ زندگی ہوتی ہے اُس میں اطمینان ہی اطمینان ہوتا ہے، دل میں بھی اور دماغ میں بھی، سکون ہی سکون ہوتا ہے، پھر اس قسم کے وسوسے آکے انسان کو پریشان نہیں کرتے۔ ''ڈرتے ہیں منافق، ہر وقت ڈرتے ہیں کہ اُتار دی جائے مؤمنین پر کوئی سورت جو خبر دے دے ان مؤمنین کو ان باتوں کی جو اُن کے دلوں میں ہیں'' یعنی جو چھپی ہوئی ہیں، اور جو نجی مجلسوں کے اندر وہ باتیں کرتے تھے وہ بھی چونکہ ان کے ہاں رازداری تھی وہ بھی ایسے ہی تھیں گویا کہ ان کے دلوں کی باتیں ہیں، جو اپنی مجلسوں کے اندر بیٹھ کے کرتے ہیں، تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے انہیں کہا جا رہا ہے، کہ ڈرتے رہو تو ڈرتے رہو، اللہ تو ظاہر کر دے گا جو کچھ تم کرتے ہو۔ قُلِ اسْتَهْزِءُوْا: تم استہزا کرتے رہو، اپنی مجلس میں بیٹھ کر اللہ کی باتوں کا، اللہ کے رسول کی باتوں کا اور مؤمنین کا مذاق اڑاتے رہو، ''بے شک اللہ تعالیٰ ظاہر کرنے والا ہے اُس بات کو جس سے تم ڈرتے ہو'' تمہاری یہ باتیں چھپی نہیں رہیں گی، آخر نمایاں ہو جائیں گی، اور ان کے حالات ان آیات میں نمایاں کیے جا رہے ہیں۔ وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ: یہ آگے پھر ان کی ایک کمزوری بتائی، کہ اگر آپ ان کو بلالیں اور بلا کر ان سے پوچھیں کہ کیا تم نے خلوت میں اس قسم کی باتیں کی تھیں؟ تم نے اس طرح سے مذاق اڑایا تھا؟ نقلیں اُتاری تھیں؟ پھبتیاں کسی تھیں؟ اپنی مجلس اس قسم کی باتیں تم کرتے تھے؟ تو وہ آکر کہیں گے کہ نہیں، وہ باتیں ہمارے دل میں تو نہیں ہوتیں، وہ تو ایسے ہنسی مذاق تھا، دل لگی کے طور پر اس قسم کی باتیں ہو جاتی ہیں، ہمارا عقیدہ تو اس کے مطابق نہیں ہے، وہ تو ہم ایسے ہی دل لگی کرتے تھے، جہاں ساتھی اکٹھے مل کے بیٹھتے ہیں تو دل لگی کے لیے اس قسم کے مشغلے ہو ہی جایا کرتے ہیں، وہ تو ہم اس قسم کے مشغلے کرتے تھے، ورنہ وہ ہمارے دل کے عقیدے کی بات نہیں، وہ تو ایسے ہے جیسے دل لگی ہوتی ہے مجلس میں وقت گزارنے

کے لئے، جسے وقت بازی کہتے ہیں، وقت گزارنے کے لئے، مجلس پھبانے کے لئے، ہنسی کے لئے کوئی اس قسم کی بات ہو جائے تو ہو جائے، ورنہ ہم کوئی اس قسم کا عقیدہ تو نہیں رکھتے، پھر آ کر وہ یوں تاویلیں کریں گے۔ تو ان بدبختوں سے کہو کہ تمہیں ہنسی کرنے کے لیے، اپنی مجلس میں رونق پیدا کرنے کے لیے، اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ اور اس کی آیات کے ساتھ ہی استہزا تمہیں سوجھا ہے؟ اور کوئی ہنسی کی باتیں نہیں آتیں؟ تمہیں ہنسی اور دل لگی اتنی عزیز ہوگئی کہ تم اللہ اور اللہ کے رسول کی آیات اور ان کے احکام، اور ان کی ان باتوں پر ہنسی اڑاتے ہو؟ تمہیں ہنسی کرنے کے لئے کوئی اور بات نہیں ملتی جس سے تم اپنی دل لگی کر لیا کرو۔ اللہ اور اللہ کے رسول کی آیات کو تختۂ مشق بنانا، بس یہی تمہاری دل لگی رہ گئی، یعنی ہنسی مذاق کی عادت جس وقت پڑ گئی تو تم یہاں تک بڑھ گئے ہو؟ اور باتیں نہیں ہیں جن کے ساتھ تم دل بہلاؤ؟ جیسے فارسی کا محاورہ آتا ہے: ''بازی بازی، باریش بابا ھم بازی'' تمہیں کھیلنے کی اتنی عادت پڑ گئی، تم کھیلتے ہو کھیلتے ہو، حتیٰ کہ بابے کی داڑھی سے بھی کھیلنے لگ گئے، اتنی عادت تم نے ڈال لی کھیلنے کی اور ہنسی مذاق کی کہ بابے کی داڑھی کو بھی تختۂ مشق بنالیا؟ تو یہاں وہی حساب ہے کہ اگر تم دل لگی کرتے ہو، ٹھیک ہے جس وقت ہم عمر بیٹھا کرتے ہیں، ساتھی بیٹھا کرتے ہیں تو ہنسی مذاق ہوا کرتا ہے، لیکن ہنسی مذاق کے لئے تمہیں اللہ کی باتیں اور اللہ کے رسول کی باتیں ہی ملتی ہیں؟ یہ آگے اِن کو ڈانٹ پلائی جا رہی ہے، وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ: اگر تم ان سے پوچھو گے تو یہ ضرور کہیں گے کہ جی! ہم تو ایسے ہی مشغلے میں لگے ہوئے تھے، دل لگی کرتے تھے، یہ ہمارا عقیدہ تھوڑا ہے؟ ہم تو ایسے ہی اوپر سے دل لگی کے طور پر یہ باتیں کرتے تھے۔ آپ کہہ دیجئے کہ کیا اللہ اور اس کی آیات کے ساتھ اور اس کے رسول کے ساتھ ہی تم استہزا کرتے ہو؟ یعنی تمہیں دل لگی کرنے کے لئے یہی باتیں ملیں؟

منافقین کی نجی مجلسوں کا کردار اور ان کی دِل دِماغ کی کیفیت

لَا تَعْتَذِرُوْا: عذر نہ کرو، یعنی تمہارا عذر کوئی قبول نہیں ہے قَدْ كَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ تم نے ایمان کا اظہار کرنے کے بعد ان باتوں کے ذریعے سے کُفر کا اظہار کر دیا، تم کافر ہو گئے، اس لیے فقہاء نے یہ مسئلہ لکھا ہے کہ اللہ کے احکام کے ساتھ استہزا، اللہ کی کسی بات پر پھبتی کسنا، چاہے مشغلے اور دل لگی کے طور پر ہو تو بھی کُفر ہے، جیسا کہ اس آیت کے اندر صراحتاً آ گیا، یعنی اللہ کی کسی بات کا مذاق نہ اڑاؤ، چاہے تمہارے دل میں عقیدہ نہ ہی ہو اور صرف وقتی طور پر ایک ہنسی بنانے کے لئے تم نے کسی بات کا مذاق اڑا دیا تو بھی یہ کُفر ہے، اللہ اور اس کے رسول کے مقام کو پہچانو، اور اُس کی آیات کے مقام کو پہچانو، ان کے ساتھ دل لگی کُفر ہے، اس قسم کی ہنسی کم از کم اس بات پر صراحۃً دلالت کرتی ہے کہ دل میں عظمت نہیں، ورنہ اگر دل میں عظمت ہو، جس طرح سے کوئی لڑکا کسی استاذ کا مذاق اڑاتا ہے خلوت میں بیٹھ کر، تو اگر دل میں عظمت ہو تو کبھی اس قسم کی باتیں زبان پہ آتی ہیں؟ چاہے وہ کہے کہ ایسے ہی شغل تھا، مشغلے کے طور پر ہم ایسا کر رہے تھے لیکن دلالت ہے اس بات پر کہ دل میں عزت نہیں ہے، یہاں بھی اسی طرح سے ہے۔ قَدْ كَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم ظاہری طور پر ایمان لائے تھے، تو ان باتوں کے ساتھ تم نے کُفر کر لیا، یہ صراحت ہو گئی اس بات کی کہ دل لگی والا عذر کوئی قبول نہیں ہے، لَا تَعْتَذِرُوْا: عذر نہ کرو، کیا مطلب؟ کہ تمہارا عذر کوئی قبول نہیں

ہے، تم نے کفر کیا اپنے ایمان کے بعد۔ اِنْ نَّعْفُ عَنْ طَآىِٕفَةٍ مِّنْكُمْ: اگر تم میں سے ایک طائفہ سے ہم درگزر کر گئے، کیا مطلب؟ کہ اس کو ایمان کی توفیق ہوگئی، یا یہ ہے کہ کسی مصلحت کی بناء پر اس کو دنیا میں سزا نہ ہو نُعَذِّبْ طَآىِٕفَةً: تو ہم دوسرے طائفہ کو عذاب دیں گے، طائفہ دونوں جگہ نکرہ ہے، اور آپ نے اُصولِ فقہ کے اندر پڑھا ہے کہ اگر نکرہ کا تکرار نکرہ کے ساتھ آجائے تو ثانی غیر اُولیٰ ہوتا ہے، پہلے طائفہ کا مصداق اور ہے دوسرے طائفہ کا مصداق اور ہے۔ ''اگر ایک طائفہ سے ہم درگزر کر گئے تو ہم دوسرے طائفہ کو عذاب دیں گے'' یہ دوسرے کا لفظ جو بول رہا ہوں یہ اسی اصول سے اخذ کیا جارہا ہے، کہ نکرہ کا تکرار نکرہ کے ساتھ ہے، تو دوسرے طَآىِٕفَةً سے پہلے طائفہ کے علاوہ دوسرا طائفہ مراد ہے، ''ہم عذاب دیں گے دوسرے طائفہ کو اس وجہ سے کہ وہ جرم کرنے والے تھے'' یعنی کسی طائفہ سے درگزر کر بھی گئے تو کسی کو پکڑ کے رگڑ بھی دیں گے، یہ ہماری اپنی حکمت ہے کہ کس سے درگزر کرنا ہے اور کس کو پکڑنا ہے، یہ بھی موقع محل کے مطابق ہوتا ہے، کسی کی رسی ذرا ڈھیلی چھوڑ دی جاتی ہے اور کسی کا رگڑا ذرا جلدی لگا دیا جاتا ہے۔ ''اس سبب سے کہ وہ جرم کرنے والے تھے''۔ تو یہ ان کی نجی مجلسوں میں مجرمانہ کردار کی نشاندہی ان آیات میں کی گئی ہے، اور ان کی دل دماغ کی کیفیت کو نمایاں کیا گیا ہے۔

منافق مرد اور منافق عورتوں کی باہمی مناسبت کا ذِکر

اَلْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ بَعْضُهُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ: منافق مرد ہوں یا عورتیں ہوں سب ایک جیسے ہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ نفاق عورتوں میں بھی تھا، بلکہ نفاق میں انسان زیادہ تر مال واولاد کی محبت کی وجہ سے مبتلا ہوتا ہے، جبن اور بخل انسان پر طاری ہوتا ہے تو انسان منافق بنتا ہے، اور اس قسم کے کاموں کے اندر عورتیں مردوں کے اوپر اثر زیادہ ڈالتی ہیں، مال واولاد کی محبت میں مبتلا کرنے کے لیے عورتوں کا کردار زیادہ نمایاں ہوتا ہے، وہ اپنے خاوندوں کو زیادہ مجبور کرتی ہیں، تو یہ بھی اُن کے ساتھ اس بُرائی میں برابر کی شریک ہوگئیں۔ ان کا مزاج فاسد ہے، اور یہ مزاج کا فساد ہے کہ جہاں کہیں بُرائی کی تحریک اٹھے اُس میں فوراً دوڑ کر شامل ہوتے ہیں، بُرائی کی اشاعت کے لیے ان کے دل کے اندر جذبہ موجود رہتا ہے، کہ کہیں ذرا شرارت اٹھی اور وہیں ان کے جذبات ساتھ ہوجاتے ہیں، اور جہاں کہیں بھلائی کی تحریک اٹھائی جائے، بھلائی کے لیے کہا جائے وہاں طرح طرح کے بہانے کرکے یہ روڑے ڈالتے ہیں، اچھے کام کی طرف ان کو دعوت دی جائے تو ان کو بہانے بسیار، اور اگر کسی قسم کی برائی آجائے تو چھلانگیں لگا لگا کے اور اچھل کود کے جاکے وہاں شامل ہوجاتے ہیں، یہ علامت ہے اس بات کی کہ مزاج میں فساد ہے۔ اگر مزاج صالح ہو، جیسے ان کے مقابلے میں مؤمنین کا ذکر آئے گا، تو اچھائی کی طرف انسان کھچا ہوا جاتا ہے، اور اس کو آگے بھی پھیلانا چاہتا ہے، اور جہاں بُرائی کا نشان ملے اُس کو مٹانے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن جس وقت مزاج میں فساد آجائے، آپ معاشرے میں دیکھیں گے تو اس قسم کے افراد آپ کو اپنے معاشرے میں بھی مل جائیں گے، بُرائی کی حمایت کرنے والے، بُرائی کو تحفظ دینے والے، آپ کے چوہدری، آپ کے ممبر بہت سارے ایسے ہوتے ہیں، کہ جس وقت بُرائی کو مٹانے کے لئے آگے کوئی جائے تو یہ رکاوٹ بننا شروع کردیتے ہیں، لیکن اگر کسی نیکی کے کام کے لیے ان کو دعوت دی جائے تو ایسے کترا جاتے ہیں کہ کہیں نظر ہی نہیں آتے، تو یہ دل کے فساد کی

علامت ہے، کہ دلوں کے اندر روگ ہے، طبیعت کو مناسبت بُرائی کے ساتھ ہے، اچھائی کے ساتھ نہیں ہے، اس لیے بُرائی کی طرف راغب ہیں، بُرائی کی اشاعت چاہتے ہیں، اور نیکی سے بدکتے ہیں، نیکی کی اشاعت نہیں چاہتے۔ تو یہ منافق مرد ہوں یا عورتیں سب ایک جیسے ہیں، ایک دوسرے کے ساتھ ان کا مزاج ملتا ہے، ان کی باہمی مناسبت ہے۔ ''حکم دیتے ہیں بُرائی کا'' حکم دینا ضروری نہیں کہ زبان سے ہو، جس طرح سے میں نے آپ کے سامنے تفصیل عرض کردی، برائی کی طرف راغب ہیں، اور اپنے عمل اور کردار سے بُرائی کی اشاعت کرتے ہیں۔ ''اور اچھی بات سے روکتے ہیں'' جب کوئی اچھا کام سامنے آتا ہے تو خود بہانے بناتے ہیں، خود پیچھے ہٹتے ہیں، اور دوسروں کو بھی بٹھانے کوشش کرتے ہیں، وَيَقْبِضُوْنَ اَيْدِيَهُمْ: اور جہاں کہیں کارِ خیر میں خرچ کرنے کا موقع آجائے تو اپنی مٹھیاں بند کر لیتے ہیں، ہاتھ روک لیتے ہیں، ان کو خرچ کرنے کی توفیق نہیں ہوتی، نَسُوا اللّٰهَ: ان لوگوں نے اللہ کو بھلا دیا، یہ اللہ کے احکام کو یاد نہیں رکھتے، اللہ ان کو یاد نہیں، ورنہ اس قسم کی حرکتیں نہ کرتے، تو کیا نقصان ہوا؟ ''اللہ نے انہیں بھلا دیا'' اللہ کی رحمت ان کی طرف متوجہ نہیں، ''بے شک یہ منافق بدکردار ہیں۔''

منافقین کے لیے جہنّم کی وعید

''اللہ نے ان منافق مردوں سے اور منافق عورتوں سے اور سب کافروں سے وعدہ کیا ہے جہنّم کی آگ کا، اس میں ہمیشہ رہیں گے، یہی ان کے لیے کافی ہے، اللہ نے ان کو پھٹکار دیا، اپنی رحمت سے دُور کر دیا، اور ان کے لیے دائمی عذاب ہے'' اتنے کھلے کھلے الفاظ میں منافقین کا تذکرہ اور ان کے اوپر وعیدیں اور ان کے کردار کی نمائش جس طرح سے اس سورت میں کی گئی ہے، قرآنِ کریم کی دوسری سورتوں میں نہیں ہے، یہاں بہت واضح طور پر ان کے حالات کو ذکر کیا گیا، اور اُن کے اوپر وعیدیں کی گئیں ...... یہ انہی منافقوں کو خطاب کر کے کہا گیا ہے، کہ تمہارا حال اُن لوگوں جیسا ہی ہے جو تم سے پہلے تھے كَانُوْٓا اَشَدَّ مِنْكُمْ قُوَّةً: قوت کے اعتبار سے وہ تم سے زیادہ تھے، مال واولاد کے اندر تم سے کثیر تھے، مال واولاد بھی اُن کے پاس تم سے زیادہ تھا، قرآنِ کریم میں یہ جو الفاظ آتے ہیں ان کی طرف دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ جیسے ہم آج سمجھتے ہیں کہ ہم بہت ترقی یافتہ ہیں، اور گزشتہ لوگ ترقی یافتہ نہیں تھے، جو امتیں اللہ نے فناء کر دیں، جن کا نام اور نشان اس زمین سے مٹا دیا، معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی اسی قسم کے ترقی یافتہ تھے، اور اتنے ترقی یافتہ تھے کہ بعد میں آنے والے وہاں تک پہنچے ہی نہیں، قوت ان کے پاس زیادہ، اسباب اُن کے پاس زیادہ، اس لیے کیا پتا ہے کہ اس زمین کے اندر کیسی کیسی قومیں پیوست ہوئیں، اور ترقی کرتے کرتے انہوں نے اپنی عیش اور عشرت کے لیے کیا سامان بنائے ہوئے تھے، اب اس وقت دنیا کے اندر جو بڑی بڑی ترقی یافتہ اقوام موجود ہیں، ان کو اگر اللہ فنا کر دے، فنا کرنے کے بعد دوبارہ لوگ آباد ہوں، تو اِن کا حال اُن کے سامنے کہاں رہے گا؟ اور وہ جتنا سا اپنا عیش وعشرت کا سامان بنالیں گے وہ سمجھیں گے کہ جتنا ہم نے سامان بنایا اور جتنا ہم عیش وعشرت میں ہیں پچھلوں کو کہاں حاصل تھی؟ اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ پچھلوں کو تم سے زیادہ حاصل تھی۔ تو یہاں سے معلوم یوں ہی ہوتا ہے کہ پہلے لوگ جو تھے یعنی قرآنِ کریم کے نزول سے قبل کے لوگ، وہ بھی اپنے وقت میں بڑے ترقی یافتہ تھے، انہوں نے بڑی قوت جمع کر رکھی تھی، مال واولاد کے اعتبار سے بہت تھے، ''پس انہوں نے

فائدہ اٹھایا اپنے حصے سے" جواُن کا حصہ تھا مال واولاد میں، دنیا کی عیش وعشرت میں، انہوں نے فائدہ اٹھایا "تم نے بھی فائدہ اٹھایا اپنے حصے سے، جیسے کہ فائدہ اٹھایا ان لوگوں نے جوتم سے پہلے تھے اپنے حصے سے، اورتم بھی اسی طرح سے مشغلوں میں لگے ہوئے ہو، جیسے وہ مشغلوں میں لگے تھے" كَالَّذِيْ خَاضُوْا، ای کالخوضِ الذی خاضوا، جس قسم کے خوض میں وہ تھے اسی قسم کے خوض میں تم ہو، جیسے باتوں میں مشغلوں میں دل لگیوں میں ہنسی مذاق میں تم لگے ہوئے ہو وہ بھی ایسے ہی تھے۔" تو یہی لوگ ہیں جن کے اعمال دنیا اور آخرت میں برباد ہوگئے" جتنی کارروائیاں انہوں نے کیں اپنی ترقی کی، اپنی عیش کی اپنی عشرت کی، حق کے مقابلے میں کامیابی کی، دنیا اور آخرت میں سب برباد ہوگئیں، "اور یہی لوگ خسارہ پانے والے تھے" سب کچھ گنواں بیٹھے، اولاد بھی گئی، مال بھی گیا، جانیں بھی گئیں، زندگی بھی ختم ہوگئی، اور آگے اللہ کا عذاب خریدا، اس سے زیادہ خسارہ اور کیا ہوگا، یہ لوگ بہت خسارے میں رہے۔

"کیا اِن کے پاس (یہ جو موجودہ ہیں کیا اِن کے پاس) خبر نہیں آئی ان لوگوں کی جو ان سے پہلے گزرے ہیں؟ انہوں نے وہ واقعات نہیں سنے؟ یعنی قومِ نوح، عاد، ثمود، قومِ ابراہیم، اصحابِ مدین اور مؤتفکات، ان کے واقعات انہوں نے نہیں سنے؟" اور قرآنِ کریم میں دوسری مکی سورتوں کے اندر یہ واقعات واضح کر دیے گئے ہیں، اور یہ سورت مدنی ہے جس کا مطلب ہے کہ سن چکے ہیں، ان کو عبرت حاصل کرنی چاہیے، فَاعْتَبِرُوْا يٰٓاُولِي الْاَبْصَارِ (سورۂ حشر: ۲)، اور عبرت کا مطلب یہ ہوتا ہے (جس کو ہم قیاس کرنا کہتے ہیں) کہ جو حال اُن کا ہوا تھا اگر اس قسم کا کردار ہم نے اپنایا تو وہی حال ہمارا ہوگا، اسی کو قیاس کہتے ہیں، اس طرح سے اپنے آپ کو ان پر قیاس کرو، اچھے لوگوں پر بھی اپنے آپ کو قیاس کرو، کہ جیسے اعمال انہوں نے کیے تھے اور وہ کامیاب ہوئے، ہم ویسے اعمال کریں گے تو ہمیں بھی کامیابی ہوگی، اور جیسا برا کردار انہوں نے اپنایا تھا، اگر اس قسم کا کردار ہم اپنائیں گے تو وہی عذاب ہم پر بھی آئے گا۔ قومِ نوح، عاد، ثمود یہ سب واقعات آپ کے سامنے کچھ سورۂ اعراف میں گزر چکے ہیں، اور آگے سورۂ ہود میں بھی آرہے ہیں، ابراہیم کی قوم، مدین والے (یہ حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم ہے)، وَالْمُؤْتَفِكٰتِ: پلٹا کھانے والی بستیاں، جو اُلٹ دی گئی تھیں، یہ قومِ لُوط کی بستیاں ہیں، حاصل ان سب کا کیا تھا؟ کہ اَتَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ: ان کے پاس رسول واضح دلائل لے کے آئے، پھر اس کے بعد اللہ نے ان پر ظلم نہیں کیا، کہ وہ تو اچھے تھے اور اللہ نے خواہ مخواہ اُن کو عذاب کا نشانہ بنادیا، ایسی بات نہیں، وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ لیکن وہ اپنے نفسوں پر ہی ظلم کرنے والے تھے، انہوں نے اپنے پہ ظلم خود کیا، جو شخص زہر کھائے گا تو آخر موت تو اس کو آئے گی، اب کوئی کہے کہ یہ اللہ نے اس پر زیادتی، تو یہ ویسے ہی بات ہے، کیونکہ اللہ کا قانون ہے کہ زہر کھاؤ تو مرجاؤ گے، گاڑی کے نیچے سردے دو تو کچلے جاؤ گے، تو انہوں نے اسی قسم کا کردار اپنایا جس کے نتیجہ میں بربادی آنی تھی، تو آگئی، تو اللہ تعالیٰ کو اس کا الزام کس طرح سے دیتے ہیں۔

ظاہری دوستی باطنی جذبات کو سمجھنے کی علامت ہوتی ہے

اب ان منافقین کے مقابلے میں مؤمنین کا تذکرہ ہے۔ جو مخلص مؤمن ہیں، مرد ہوں یا عورتیں، سب ایک دوسرے سے محبت رکھتے ہیں، ایک دوسرے کے دوست ہیں، یہ بات بھی آپ کے سامنے بارہا ذکر کی جاچکی، کہ دوستی اور محبت یہ بھی باطنی

مناسبت پر مبنی ہوتی ہے، اس لیے کہا کرتے ہیں کہ کسی شخص سے پوچھنے کی ضرورت نہیں کہ تو اچھا ہے یا بُرا، اُس کے دوستوں کو دیکھ لو کہ کیسے ہیں؟ اگر اس کے دوست اچھے ہیں تو یہ علامت ہے کہ اس کی طبیعت میں بھی اچھائی کا جذبہ ہے، اور اگر اُس کے دوست بُرے ہیں تو یہ علامت ہے کہ اُس کی طبیعت میں بھی بُرائی ہے، بُرائی بُرائی کے ساتھ مانوس ہوتی ہے، اچھائی اچھائی کے ساتھ مانوس ہوتی ہے، اگر آپ کے دل میں نیکی ہے تو آپ نیک ماحول میں خوش ہوں گے اور نیک دوست اختیار کریں گے، اور اگر آپ کے دل میں بُرائی ہے تو آپ بُرائی کو پسند کریں گے اور بُرے لوگوں کے ساتھ مانوس ہوں گے، جیب تراش جیب تراش سے بڑی جلدی دوستی گانٹھ لے گا، چور چور کے ساتھ بڑی جلدی دوستی گانٹھ لے گا، ''ولی را ولی مے شناسد'' ولی کی دوستی ولی کے ساتھ ہوگی، تو باطنی جذبات نمایاں ہوتے ہیں اس ظاہری میلان کے ساتھ، کہ جس آدمی کے دل میں ایمان خالص ہوگا، وہ یقیناً مؤمنین سے ہی تعلق رکھے گا، اور جس کے دل میں نفاق ہے وہ منافقوں کو پسند کرے گا، تو ظاہری طور پر جو دوستی ہوا کرتی ہے یہ باطنی جذبات سمجھنے کے لئے علامت ہوتی ہے۔ انسان کا قلب اتنا گہرا ہے، اس میں کیا کچھ بھرا ہوا ہے، یہ دوسرا انسان دیکھ کے محسوس نہیں کر سکتا، اللہ نے اِس کو پردے کے اندر رکھا ہوا ہے، دیکھو! کس طرح سے آہنی سلاخیں ہیں اور پھر اس کو کس طرح سے چھپا کے رکھا ہے، اگر یہ سینے کے اوپر ہی لگا ہوا ہوتا تو پتا نہیں آپ کتنی دفعہ ایک دوسرے کا دل توڑ کے دوڑ جایا کرتے، لیکن اللہ نے اس کو بہت محفوظ کر دیا ہے، اب کہتے تو ہیں کہ ''وہ دل نکال کے لے گیا'' لیکن یہ بات ہی بات ہوتی ہے، دل کہاں نکلتا ہے، وہ تو اللہ نے بہت محفوظ رکھا ہے، ''دلبر، دلبر'' جو آپ کہتے ہیں، کہ دل لے گیا، دلبر کا معنی ہے دل لے جانے والا، یہ ایسے ہی مفروضے ہیں، دل کو کوئی نہیں لے جا سکتا، اللہ تعالیٰ نے اس کو بہت محفوظ کیا ہے، اور اگر کہیں یہ باہر لگا ہوا ہوتا تو پھر آپ توڑ کے بھاگ جایا کرتے۔ اور اس میں جو خیالات آتے ہیں، جس قسم کے جذبات ہیں وہ تو اتنے مخفی در مخفی ہیں کہ اُن کو آپ کس طرح سے معلوم کر سکتے ہیں، کہ میرے دل میں کیا ہے، اور آپ کے دل میں کیا ہے؟ تو یہ بہت مخفی چیز ہے، جس طرح سے پنجابی میں کہتے ہیں، حضرت (مولانا محمد علی جالندھری رحمۃ اللہ علیہ) پڑھا کرتے تھے کہ ''دل دریا سمندروں ڈُونگا، کون دلاں دیاں جانڑے'' کہ دل ایک ایسا دریا ہے جو سمندر سے بھی زیادہ گہرا ہے، اس لیے کوئی نہیں جان سکتا کہ دل میں کیا کچھ ہے۔ تو دل کے جذبات اگر پہچانے جاتے ہیں تو ظاہری عادات سے پہچانے جاتے ہیں، کہ ظاہر میں اس شخص کی افتاد کیا ہے، کدھر کو اس کا رجحان ہے، کیسی چیزوں کو یہ پسند کرتا ہے، مثلاً ایک آدمی خلوت میں بیٹھا شعر گنگنا رہا ہو تو وہ شعر بھی اُس کے باطنی جذبے کی نشاندہی کرتا ہے، کیونکہ خلوت میں بیٹھا ہوا آدمی اسی قسم کی باتیں گنگنایا کرتا ہے جس قسم کے اس کے دل اور دماغ میں خیالات آتے ہیں، اشعار اس کو وہی پسند ہوں گے جو اُس کے جذبات کے مطابق ہوں، اس لیے عام طور اس کو جس قسم کے اشعار اس کو یاد ہیں، جس قسم کے اشعار بیٹھ کر گنگناتا ہے یہ علامت ہے کہ اس کے دل میں جذبات اسی قسم کے ہیں، اور ایسے ہی ظاہری طور پر میل جول کس قسم کے لوگوں سے ہے، یہ بھی باطنی جذبات کے پہچاننے کا ایک ذریعہ ہے ''لَا تَسۡئَلِ الۡمَرۡءَ وَانۡظُرۡ خَلِيۡلَهٗ'' آدمی کے متعلق پوچھنے کی ضرورت نہیں، اس کے دوستوں کو دیکھ لیا کرو، کہ اس کے دوست کیسے ہیں، اور یہ کس قسم کے ماحول کو پسند کرتا ہے، تو باطن کی عکاسی ہو جاتی ہے، کہ اس کے اپنے جذبات کیسے ہیں۔ پرانے بزرگوں کے محاورات حقیقت کے بڑے ترجمان ہوا کرتے ہیں، پنجابی میں مشہور ہے کہ ''کوڑھی کوڑھی نوں سومیل دا پھیر پا کے دی

جاملد ائے'' یہ پرانے بزرگ کہا کرتے ہیں، یعنی جو خود کوڑھی ہوتا ہے وہ دوسرے کوڑھی کو تلاش کر لیتا ہے، چاہے اس کو سومیل کا چکر ہی کیوں نہ کاٹنا پڑے، تو اس کا مطلب یہی ہے کہ جیسا آدمی خود ہوتا ہے وہ ویسے دوست تلاش کر لیتا ہے۔

مؤمنین اور منافقین کی زندگی کا موازنہ

تو مؤمنین مرد ہوں یا عورتیں، یہ آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ، ان کا مزاج مشترکہ ہے، نیکی کی اشاعت میں دلچسپی لیتے ہیں یَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ لوگوں کو بھلے کام کے لیے کہتے ہیں، بھلے کام کی کوئی تحریک اٹھے تو اُس میں تعاون کرتے ہیں، اپنے کردار اور گفتار کے ساتھ اُس کو قوت پہنچاتے ہیں وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ: اور بُرائی کو مٹاتے ہیں، جہاں کوئی بُرائی اٹھتی ہے اُس کو مٹانے کی ہر طرح سے کوشش کرتے ہیں، قول سے فعل سے جس طرح سے بھی ہو سکے اُس کی مخالفت کرتے ہیں، یہ ان کا مزاج مشترکہ ہے۔ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ: وہ تو اللہ کو بھولے ہوئے تھے لیکن یہ نماز پڑھتے ہیں، وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ: وہ تو جہاں خرچ کرنے کا موقع ہو مٹھیاں بند کر لیتے تھے، اور یہ لوگ زکوٰۃ دیتے ہیں، مال خرچ کرتے ہیں، وہ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ تھے، یہ وَيُطِيْعُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ہیں، وہ نافرمان تھے ان کا مزاج نافرمانی کی طرف جاتا ہے، وہ ہمیشہ حزبِ مخالف کی طرف ہی جاتے ہیں، کہ جہاں کوئی بات آ گئی تو انہوں نے الٹ راستہ ہی لینا ہے، دوسری طرف کو جانا ہے، لیکن یہ اُيُطِيْعُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ: اللہ اور اللہ کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں۔

دونوں کے انجام کا موازنہ

اُن کے متعلق آیا تھا لَعَنَهُمُ اللّٰهُ کہ اللہ نے ان کو پھٹکار دیا، ان کے متعلق آ گیا اُولٰٓئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللّٰهُ کہ ان پر اللہ کی رحمت ہوگی، اللہ تعالیٰ ان پر رحم کرے گا، اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ: بے شک اللہ غالب ہے حکمت والا ہے...... وَعَدَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ یہ وَعَدَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِيْنَ کے مقابلہ میں آ گیا، وہاں تھا کہ اللہ نے منافق مردوں عورتوں اور کافروں سے وعدہ کیا نارِ جہنم کا، اور یہاں آ گیا کہ اللہ نے مؤمن مردوں سے اور مؤمن عورتوں سے وعدہ کیا باغات کا، جاری ہوں گی اُن کے نیچے سے نہریں۔ وہ باغ جس میں نہریں جاری ہوں وہ سرسبز ہوتا ہے، شاداب ہوتا ہے، ہر قسم کی عیش و عشرت اس میں حاصل ہوتی ہے۔ وہ جہنم میں ہمیشہ رہنے والے تھے، ان کے لیے اللہ تعالیٰ نے بڑے عمدہ مکانات ہمیشگی کے باغات میں بنائے ہیں، باغات ہوں گے، اس میں کوٹھیاں ہوں گی، بنگلے ہوں گے، نہریں بہتی ہوں گی، دنیا کے اندر ظاہری طور پر زیب و زینت عیش و آرام اگر آپ سوچ سکتے ہیں تو اس سے زیادہ کا تصور نہیں لا سکتے...... وہاں اللہ اُن کے اوپر ناراض ہوا تھا، اور یہاں رِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ ان نعمتوں کے مقابلے میں بھی اللہ کی رضا بہت بڑی چیز ہے جو مؤمنین کو حاصل ہوتی ہے، جیسے کہ حدیث شریف میں آتا ہے، کہ جس وقت جنتی جنت میں چلے جائیں گے، تو اللہ جنتیوں سے پوچھیں گے کہ کچھ اور چاہیے؟ مانگو، تمہیں کیا ضرورت ہے؟ وہ کہیں گے یا اللہ! اب تو کوئی ضرورت نہیں، ہر ضرورت

تُو نے پوری کردی، ہمیں تُو نے ایسی عیش دے دی، کہ ہم جہاں چاہتے ہیں پھرتے ہیں، اس قسم کے باغات ہیں، وہ آگے سے اپنی خوشی کا اظہار کریں گے، اس کے بعد اللہ تعالیٰ اعلان فرمائیں گے کہ آج میں تم پر اپنی رضا ظاہر کرتا ہوں، آج کے بعد میں تم پہ ناراض نہیں ہوں گا۔(۱) اب دیکھو! جو اپنا محسن ہوتا ہے، جو اپنا بڑا ہوتا ہے اُس کی ناراضگی ساری عیش کو مکدر کر کے رکھ دیتی ہے، اچھا کھانے کو موجود ہے، اچھا پہننے کو موجود ہے، لیکن اپنا میزبان ناراض ہوگیا، تو اس سے انسان کی طبیعت مکدر ہو جاتی ہے، نہ کھانے میں مزہ، نہ پہننے میں مزہ، نہ رہنے میں مزہ، سارے کا سارا معاملہ پریشان کن سا ہو جاتا ہے، تو جس وقت ان لوگوں کو اللہ کی ناراضگی کا تصوّر ہوگا تو جنّت کی نعمتوں میں کیا عیش کریں گے، کیا لطف پائیں گے؟ اور جب اللہ کی طرف سے رضا کا اعلان ہوگیا اور ساتھ یہ بھی ہوگیا کہ اب کبھی ناراض نہیں ہوں گا، تو اب ہر طرح سے بےفکری ہوگئی، اب خوب کھاؤ پیوا چھلو کودو، جو چاہو کرو، اب کوئی فکر نہیں۔ اب یہ ڈر بھی نہیں کہ کوئی ایسی حرکت نہ ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ ناراض ہو جائے، یہ خوف بھی ذہن سے نکل جائے گا۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ جنّتی اس اعلان پر، اس رضا کی خبر پر اتنا خوش ہوں گے اور اس میں اتنا مزہ لیں گے کہ جنّت کی نعمتوں میں انہوں نے اتنی خوشی محسوس نہیں کی تھی، جتنی اس اعلان کے ساتھ وہ خوشی محسوس کریں گے کہ اللہ راضی ہوگیا، اور اس نے یہ بھی کہہ دیا کہ اب میں آئندہ ناراض بھی نہیں ہوں گا، رِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ: اَكْبَرُ کا یہاں معنی ہے کہ جنّت کی تمام نعمتوں کے مقابلے میں اللہ کی رضا بڑی چیز ہے...... اور اُن بدبختوں کے متعلق ذکر کیا تھا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ کہ یہ لوگ خسارے اور گھاٹے میں ہیں، اور اِن نیک بختوں کے متعلق کہہ دیا ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ یہ بہت بڑی کامیابی ہے، اس لیے کامیابی ہے کہ اس زندگی کے چند روز اللہ کی مرضی کے مطابق ایک طریقے پہ گزار دیے، اللہ کا دیا ہوا تھا اللہ کے راستے میں دے دیا، مال اور اولاد اللہ نے دیے تھے اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے اُن کے اندر بھی اللہ کے احکام کی رعایت رکھی، دس سال کی مشقت ہے یا بیس سال کی مشقت ہے، یا پچیس سال کی مشقت ہے، کتنی مشقت ہے، آخر ایک وقت ختم ہو جائے گی، جو چیز ختم ہونے والی ہے چاہے دس سال میں، چاہے پندرہ سال میں ہو، چاہے چالیس پچاس سال میں، آخر ختم ہو ہی جانی ہے، محدود ہی ہے، لیکن اس کے مقابلے میں جو کچھ حاصل ہوا، کھوٹا سکہ دے کے اس قسم کی دائمی نعمتیں حاصل کرلیں، اس سے بڑھیا نفع کی تجارت اور کون سی ہو سکتی ہے، یہ بہت بڑی کامیابی ہے جو ان مؤمنین کو حاصل ہوئی۔

دونوں کے حالات بیان کرنے کا مقصد

تو مقابلۃً دونوں کی کیفیتوں کو واضح کر دیا گیا، جب دونوں جماعتوں کی کیفیتیں سامنے آگئیں، تو کبھی بیٹھ کے سوچو گے تو آپ کو خود معلوم ہو جائے گا، کہ یہ جماعت اختیار کرنے کے قابل ہے، اور یہ اختیار کرنے کے قابل نہیں، اِن کے موجودہ حالات یہ

---

(۱) بخاری ۱۱۲۱/۲، باب کلام الرب مع اھل الجنۃ/ مسلم ۳۷۸/۲، باب احلال الرضوان الخ

ہیں اور ان کا انجام یہ ہے، اور اُن کے موجودہ حالات یہ ہیں اور انجام یہ ہے، جب دونوں باتیں صاف طور پر سامنے آجائیں گی تو پھر انسان کو سوچنے کے لیے آسانی ہوجاتی ہے، کہ ہمیں کس جماعت کو اختیار کرنا چاہیے، اور کس جماعت کے مطابق ہمیں زندگی گزارنی چاہیے، تا کہ ہماری عاقبت اچھی ہوجائے، دونوں جماعتوں کے سامنے ہونے کے بعد یہ بات سوچنی آسان ہوجاتی ہے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ؕ وَمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ

اے نبی! کفّار اور منافقین سے جہاد کیجئے اور اُن پہ سختی کیجئے، او اُن کا ٹھکانا جہنّم ہے،

وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۷۳﴾ يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ مَا قَالُوْا ؕ وَلَقَدْ قَالُوْا كَلِمَةَ

اور وہ بہت بُرا ٹھکانا ہے﴿۷۳﴾ قسمیں کھاتے ہیں اللہ کی کہ انہوں نے نہیں کہا، البتہ تحقیق کہی انہوں نے کُفر

الْكُفْرِ وَكَفَرُوْا بَعْدَ اِسْلَامِهِمْ وَهَمُّوْا بِمَا لَمْ يَنَالُوْا ۚ

کی بات، اور انہوں نے کُفر کیا اپنے اسلام کے بعد، اور قصد کیا انہوں نے ایسی چیز کا جس کو وہ حاصل نہیں کر سکے،

وَمَا نَقَمُوْٓا اِلَّآ اَنْ اَغْنٰىهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ

نہیں انتقام لیتے وہ مگر اس بات کا کہ اللہ اور اللہ کے رسول نے انہیں غنی کردیا اللہ کے فضل سے،

فَاِنْ يَّتُوْبُوْا يَكُ خَيْرًا لَّهُمْ ۚ وَاِنْ يَّتَوَلَّوْا يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ

اگر وہ توبہ کرلیں تو وہ ان کے لئے بہتر ہے، اور اگر یہ پیٹھ پھیریں گے تو اللہ تعالیٰ انہیں دردناک عذاب

عَذَابًا اَلِيْمًا ۙ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ وَمَا لَهُمْ فِي الْاَرْضِ

دے گا دُنیا اور آخرت میں، اور نہیں ہوگا اُن کے لیے زمین میں

مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿۷۴﴾ وَمِنْهُمْ مَّنْ عٰهَدَ اللّٰهَ لَئِنْ

کوئی یار نہ کوئی مددگار﴿۷۴﴾ اور ان میں سے وہ شخص بھی ہے جس نے اللہ سے معاہدہ کیا کہ اگر

اٰتٰىنَا مِنْ فَضْلِهٖ لَنَصَّدَّقَنَّ وَلَنَكُوْنَنَّ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۷۵﴾

اللہ تعالیٰ ہمیں دے دے اپنے فضل سے تو البتہ ضرور صدقہ کریں گے ہم اور البتہ ضرور ہوجائیں گے ہم اچھے لوگوں میں سے﴿۷۵﴾

فَلَمَّآ اٰتٰىهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ بَخِلُوْا بِهٖ وَتَوَلَّوْا وَّهُمْ

اور جب اللہ نے اُنہیں دے دیا اپنے فضل سے تو وہ اللہ کے فضل کے ساتھ بخل کرنے لگ گئے اور انہوں نے پیٹھ پھیری اس حال میں کہ وہ

مُّعْرِضُوْنَ ﴿۷۶﴾ فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِيْ قُلُوْبِهِمْ اِلٰى يَوْمِ يَلْقَوْنَهٗ

اِعراض کرنے والے ہیں ﴿۷۶﴾ اللہ تعالیٰ نے ان کے فعل کی سزا کے طور پر ان کے پیچھے لگا دیا نفاق ان کے دِلوں میں اُس دِن تک جس دِن وہ اللہ تعالیٰ

بِمَآ اَخْلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوْهُ وَبِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ﴿۷۷﴾ اَلَمْ

سے ملاقات کریں گے بسبب خلاف کرنے ان کے اللہ تعالیٰ سے اس چیز کو جس کا انہوں نے وعدہ کیا تھا اور بسبب ان کے جھوٹ بولنے کے ﴿۷۷﴾

يَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ سِرَّهُمْ وَنَجْوٰىهُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ عَلَّامُ

کیا ان کو پتا نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے ان کی پوشیدہ باتوں کو اور ان کی سرگوشیوں کو اور (کیا یہ جانتے نہیں؟) کہ اللہ تعالیٰ غیبوں

الْغُيُوْبِ ﴿۷۸﴾ ج اَلَّذِيْنَ يَلْمِزُوْنَ الْمُطَّوِّعِيْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ

کو جاننے والا ہے ﴿۷۸﴾ وہ لوگ جو طعنہ دیتے ہیں مؤمنین میں سے اُن لوگوں کو جو صدقات کے بارے میں دِل کی خوشی کے ساتھ

فِي الصَّدَقٰتِ وَالَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ اِلَّا جُهْدَهُمْ فَيَسْخَرُوْنَ

کام کرنے والے ہیں اور اُن کو (طعنہ دیتے ہیں) جو نہیں پاتے مگر اپنی کوشش، تو یہ منافق ان سے ٹھٹھہ

مِنْهُمْ ط سَخِرَ اللّٰهُ مِنْهُمْ ز وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۷۹﴾ اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ

کرتے ہیں، اللہ نے ان سے ٹھٹھہ کیا، اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے ﴿۷۹﴾ آپ ان کے لیے اِستغفار کیجئے

اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ط اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً

یا اِستغفار نہ کیجئے، اگر آپ ان کے لیے اِستغفار کریں گے ستر مرتبہ

فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ط ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ط وَاللّٰهُ

اللہ انہیں ہرگز نہیں بخشے گا، یہ اس وجہ سے ہے کہ انہوں نے کُفر کیا اللہ کے ساتھ اور اس کے رسول کے ساتھ، اللہ تعالیٰ

لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۸۰﴾ ع فَرِحَ الْمُخَلَّفُوْنَ بِمَقْعَدِهِمْ

فاسق لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا ﴿۸۰﴾ خوش ہوگئے پیچھے چھوڑے ہوئے اپنے بیٹھ رہنے کی وجہ سے

خِلٰفَ رَسُوْلِ اللّٰهِ وَكَرِهُوْٓا اَنْ يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ

اللہ کے رسول کے بعد، اور انہوں نے ناپسند کیا اس بات کو کہ جہاد کریں اپنے مالوں کے ساتھ اور اپنی جانوں کے ساتھ

فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَقَالُوْا لَا تَنْفِرُوْا فِي الْحَرِّ ؕ قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ

اللہ کے راستے میں، اور انہوں نے کہا کہ گرمی میں نہ نکلو، آپ کہہ دیجئے کہ جہنم کی آگ

اَشَدُّ حَرًّا ؕ لَوْ كَانُوْا يَفْقَهُوْنَ ۝٨١ فَلْيَضْحَكُوْا قَلِيْلًا وَّلْيَبْكُوْا

زیادہ سخت ہے از روئے گرمی کے، کیا ہی اچھا ہوتا کہ یہ سمجھتے ۝٨١ یہ لوگ ہنسیں گے تھوڑی دیر اور روئیں گے

كَثِيْرًا ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝٨٢ فَاِنْ رَّجَعَكَ اللّٰهُ اِلٰى

زیادہ زمانہ، بدلہ دیے جائیں گے بدلہ ان کاموں کا جو یہ کرتے تھے ۝٨٢ اگر اللہ تعالیٰ آپ کو لوٹا دے

طَآئِفَةٍ مِّنْهُمْ فَاسْتَاْذَنُوْكَ لِلْخُرُوْجِ فَقُلْ لَّنْ تَخْرُجُوْا

ان میں سے ایک طائفہ کی طرف پھر وہ آپ سے اجازت طلب کریں نکلنے کی تو آپ کہہ دیجئے کہ تم ہرگز ہرگز میرے ساتھ نہیں

مَعِيَ اَبَدًا وَّلَنْ تُقَاتِلُوْا مَعِيَ عَدُوًّا ؕ اِنَّكُمْ رَضِيْتُمْ

نکلو گے، اور تم ہرگز میرے ساتھ مل کر کسی دشمن سے نہیں لڑو گے، بے شک تم خوش ہو گئے

بِالْقُعُوْدِ اَوَّلَ مَرَّةٍ فَاقْعُدُوْا مَعَ الْخٰلِفِيْنَ ۝٨٣ وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓى

بیٹھنے کے ساتھ پہلی مرتبہ، پس بیٹھے رہو تم پیچھے رہنے والوں کے ساتھ ۝٨٣ نہ نماز پڑھ تو

اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ ؕ اِنَّهُمْ كَفَرُوْا

ان میں سے کسی پر جو مر جائے کبھی بھی اور نہ کھڑا ہو اس کی قبر پر، بے شک انہوں نے کفر کیا

بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَمَاتُوْا وَهُمْ فٰسِقُوْنَ ۝٨٤ وَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ

اللہ کے ساتھ اور اللہ کے رسول کے ساتھ اور مر گئے اس حال میں کہ وہ نافرمان ہیں ۝٨٤ نہ تعجب میں ڈالیں تجھے ان کے مال

وَاَوْلَادُهُمْ ؕ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الدُّنْيَا

اور نہ ان کی اولاد، سوائے اس کے نہیں کہ اللہ ارادہ کرتا ہے کہ انہیں عذاب دے ان چیزوں کے سبب سے دنیا میں

وَتَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ وَهُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿۸۵﴾ وَاِذَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ اَنْ
اور چلی جائیں ان کی جانیں اس حال میں کہ یہ کافر ہوں ﴿۸۵﴾ اور جب کوئی سورت اُتاری جاتی ہے کہ
اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَجَاهِدُوْا مَعَ رَسُوْلِهِ اسْتَاْذَنَكَ اُولُوا الطَّوْلِ
ایمان لے آؤ اللہ پر اور جہاد کرو اس کے رسول کے ساتھ مل کر تو اجازت طلب کرتے ہیں آپ سے قدرت والے
مِنْهُمْ وَقَالُوْا ذَرْنَا نَكُنْ مَّعَ الْقٰعِدِيْنَ ﴿۸۶﴾ رَضُوْا بِاَنْ يَّكُوْنُوْا
ان میں سے، اور کہتے ہیں کہ چھوڑ دیجیے ہمیں کہ ہم بیٹھنے والوں کے ساتھ بیٹھ رہیں ﴿۸۶﴾ خوش ہو گئے اس بات پر کہ ہو جائیں وہ
مَعَ الْخَوَالِفِ وَطُبِعَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ ﴿۸۷﴾
عورتوں کے ساتھ جو پیچھے بیٹھنے والی ہیں اور ان کے دِلوں کے اُوپر مُہر ہوگئی، یہ سمجھتے نہیں ﴿۸۷﴾
لٰكِنِ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ جٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ
لیکن رسول اور وہ لوگ جو رسول کے ساتھ ایمان لے آئے جہاد کرتے ہیں اپنے مالوں کے ساتھ
وَاَنْفُسِهِمْ ۭ وَاُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْخَيْرٰتُ ۡ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۸۸﴾
اور اپنی جانوں کے ساتھ، انہی کے لیے بھلائیاں ہیں، یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں ﴿۸۸﴾
اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ
تیار کیے اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے باغات، جاری ہیں اُن کے نیچے سے نہریں، ہمیشہ
فِيْهَا ۭ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۸۹﴾ ع
اس میں رہنے والے ہوں گے، یہ بہت بڑی کامیابی ہے ﴿۸۹﴾

خلاصہ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ: اے نبی! جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ: کُفّار اور منافقین سے جہاد کیجیے، وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ: اوران پہ سختی کیجیے، وَمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ: اوران کا ٹھکانا جہنّم ہے، وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ: اوروہ بہت بُرا ٹھکانا ہے، يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ مَا قَالُوْا: قسمیں کھاتے ہیں اللہ کی کہ انہوں نے نہیں کہا، وَلَقَدْ قَالُوْا كَلِمَةَ الْكُفْرِ: البتہ تحقیق کہی انہوں نے کُفر کی بات، وَكَفَرُوْا بَعْدَ اِسْلَامِهِمْ:

اور انہوں نے کفر کیا اپنے اسلام کے بعد، وَهَمُّوْا بِمَا لَمْ يَنَالُوْا: اور قصد کیا انہوں نے ایسی چیز کا جس کو وہ حاصل نہیں کر سکے، نَالَ يَنَالُ: حاصل کرنا، وَمَا نَقَمُوْٓا اِلَّآ اَنْ اَغْنٰىهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ مِنْ فَضْلِهٖ: نہیں انتقام لیتے وہ مگر اس بات کا کہ اللہ اور اللہ کے رسول نے انہیں غنی کر دیا اللہ کے فضل سے، فَاِنْ يَّتُوْبُوْا يَكُ خَيْرًا لَّهُمْ: اگر وہ توبہ کر لیں تو وہ اُن کے لئے بہتر ہے، وَاِنْ يَّتَوَلَّوْا: اور اگر یہ پیٹھ پھیریں گے، يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ عَذَابًا اَلِيْمًا ۙ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ: اللہ تعالیٰ انہیں دردناک عذاب دے گا دنیا اور آخرت میں، وَمَا لَهُمْ فِي الْاَرْضِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ: اور نہیں ہوگا ان کے لئے زمین میں کوئی یار نہ کوئی مددگار، وَمِنْهُمْ مَّنْ عٰهَدَ اللّٰهَ: اور ان میں سے وہ شخص بھی ہے جس نے اللہ سے معاہدہ کیا، لَئِنْ اٰتٰىنَا مِنْ فَضْلِهٖ: اگر اللہ تعالیٰ ہمیں دے دے اپنے فضل سے، مَن چونکہ لفظوں میں مفرد ہے اس لیے عٰهَدَ کی ضمیر مفرد لوٹی، اور اٰتٰىنَا معنی کے اعتبار سے ہے، اس سے کئی آدمی بھی مراد ہو سکتے ہیں، ''اگر دے دے ہمیں اپنے فضل سے'' لَنَصَّدَّقَنَّ: البتہ ضرور صدقہ کریں گے ہم، وَلَنَكُوْنَنَّ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ: اور البتہ ضرور ہو جائیں گے ہم اچھے لوگوں میں سے، فَلَمَّآ اٰتٰىهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ: اور جب اللہ نے انہیں دے دیا اپنے فضل سے، بَخِلُوْا بِهٖ: تو وہ اللہ کے فضل کے ساتھ بخل کرنے لگ گئے، وَتَوَلَّوْا وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ: اور انہوں نے پیٹھ پھیری اس حال میں کہ وہ اعراض کرنے والے ہیں، منہ موڑ کے چلے گئے، فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِيْ قُلُوْبِهِمْ: اَعْقَبَ کا معنی ہوتا ہے کسی فعل کی سزا کے طور پر کوئی چیز پیچھے لگا دینا، اللہ تعالیٰ نے ان کے فعل کی سزا کے طور پر نفاق پیدا کر دیا ان کے دلوں میں، ان کے اس کردار کے پیچھے نفاق پیدا کر دیا ان کے دلوں میں، سزا کے طور پر اللہ تعالیٰ نے ان کے پیچھے لگایا، ان کے فعل کے اثر کے طور پر پیدا کیا نفاق ان کے قلوب میں، اِلٰى يَوْمِ يَلْقَوْنَهٗ: اس دن تک جس دن وہ اللہ تعالیٰ سے ملاقات کریں گے یعنی مرنے کے دن تک، موت کے دن تک نفاق ان کے قلوب میں ثابت کر دیا ان کے کردار کی سزا کے طور پر، بِمَآ اَخْلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوْهُ: بسبب خلاف کرنے ان کے اللہ تعالیٰ سے اس چیز کے جس کا انہوں نے وعدہ کیا تھا، جس کا حاصل مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کیے ہوئے وعدوں کا خلاف کرنے کی وجہ سے، وعدہ خلافی انہوں نے کی، وَبِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ: اور بسبب ان کے جھوٹ بولنے کے، اس وجہ سے کہ وہ جھوٹ بولتے تھے، اَلَمْ يَعْلَمُوْٓا: کیا ان کو پتا نہیں اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ سِرَّهُمْ: کہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے ان کی پوشیدہ باتوں کو، وَنَجْوٰىهُمْ: اور ان کی سرگوشیوں کو، نجویٰ: سرگوشی، جو چپکے چپکے ایک دوسرے کے کان میں بات کی جاتی ہے، وَاَنَّ اللّٰهَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ: اور کیا وہ یہ بات نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ غیبوں کو جاننے والا ہے، اَلَّذِيْنَ يَلْمِزُوْنَ الْمُطَّوِّعِيْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ فِي الصَّدَقٰتِ: لَمز: طعنہ دینا، یہ لفظ پہلے بھی گزرا ہے وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّلْمِزُكَ فِي الصَّدَقٰتِ، مطوعین: تَطَوَّعَ باب تفعل سے، خوشی کے ساتھ کوئی کام کرنا، وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيْمٌ (سورۂ بقرہ: ۱۵۸) مطوعین: خوشی کے ساتھ دینے والے مؤمنین میں سے، خوشی کے ساتھ صدقات میں عمل کرنے والے، نفلی صدقات دینے والے، فِي الصَّدَقٰتِ یہ الْمُطَّوِّعِيْنَ کے متعلق ہے جو صدقے میں متطوع ہیں، یعنی صرف یہی نہیں کہ فرض مقدار ادا کرتے ہیں، نفلی صدقات دیتے ہیں، ''جو صدقات کے بارے میں دل کی خوشی کے ساتھ کام کرنے والے ہیں'' یہ مفہوم ہو جائے گا اس کا اگر فِي الصَّدَقٰتِ کو الْمُطَّوِّعِيْنَ کے متعلق کریں، اور اگر اس کو يَلْمِزُوْنَ کے متعلق کر لیں تو ''طعنہ دیتے ہیں صدقات کے بارے میں'' پھر بھی یہ مفہوم ٹھیک ہو سکتا ہے، ''وہ لوگ جو طعنہ دیتے ہیں مؤمنین میں سے ان لوگوں کو جو صدقات میں خوش دِلی سے دلچسپی لیتے ہیں، جو صدقات میں نفلی عمل بھی کرنے والے ہیں'' جس انداز سے چاہیں

آپ اس مفہوم کو ادا کر لیں، یا، "مؤمنین جو خوش دلی کے ساتھ صدقہ کرنے والے ہیں ان کو صدقات کے بارے میں طعنہ دیتے ہیں" وَالَّذِیْنَ لَا یَجِدُوْنَ: اور جو ان لوگوں کو طعنہ دیتے ہیں جو نہیں پاتے اِلَّا جُہْدَہُمْ: مگر اپنی کوشش، فَیَسْخَرُوْنَ مِنْہُمْ: تو یہ منافق ان سے ٹھٹھہ کرتے ہیں، سَخِرَ اللّٰہُ مِنْہُمْ: اللہ نے ان سے ٹھٹھہ کیا، وَلَہُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ: اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے، اِسْتَغْفِرْ لَہُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَہُمْ: آپ ان کے لئے استغفار کیجیے یا استغفار نہ کیجیے، اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَہُمْ سَبْعِیْنَ مَرَّۃً: اگر آپ ان کے لئے استغفار کریں گے ستر مرتبہ، فَلَنْ یَّغْفِرَ اللّٰہُ لَہُمْ: اللہ انہیں ہرگز نہیں بخشے گا، ذٰلِکَ بِاَنَّہُمْ کَفَرُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ: یہ اس وجہ سے ہے کہ انہوں نے کفر کیا اللہ کے ساتھ اور اس کے رسول کے ساتھ، وَاللّٰہُ لَا یَہْدِی الْقَوْمَ الْفٰسِقِیْنَ: اللہ تعالیٰ فاسق لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔ فَرِحَ الْمُخَلَّفُوْنَ: مُخَلَّف: پیچھے چھوڑے ہوئے، خوش ہو گئے پیچھے چھوڑے ہوئے، بِمَقْعَدِہِمْ: اپنے بیٹھ رہنے کی وجہ سے خِلٰفَ رَسُوْلِ اللّٰہِ: اللہ کے رسول کے برخلاف، اللہ کے رسول کے بعد، ان کے چلے جانے کے بعد اپنے بیٹھے رہنے پر یہ مخلف خوش ہو گئے، وَکَرِہُوْٓا اَنْ یُّجَاہِدُوْا بِاَمْوَالِہِمْ الخ: اور انہوں نے ناپسند کیا اس بات کو کہ جہاد کریں اپنے مالوں کے ساتھ اور اپنی جانوں کے ساتھ اللہ کے راستے میں، وَقَالُوْا: اور انہوں نے کہا کہ لَا تَنْفِرُوْا فِی الْحَرِّ: گرمی میں نہ نکلو، لَا تَنْفِرُوْا: مت نکلو، فِی الْحَرِّ: گرمی میں، قُلْ نَارُ جَہَنَّمَ اَشَدُّ حَرًّا: آپ کہہ دیجیے کہ جہنم کی آگ زیادہ سخت ہے ازروئے گرمی کے، لَوْ کَانُوْا یَفْقَہُوْنَ: کیا ہی اچھا ہوتا کہ یہ سمجھتے، فَلْیَضْحَکُوْا قَلِیْلًا: چاہیے کہ یہ لوگ تھوڑی دیر ہنس لیں، وَّلْیَبْکُوْا کَثِیْرًا: اور طویل زمانہ تک یہ روئیں گے، یہ صورۃً انشاء ہے معنیً خبر ہے، "ہنسیں گے تھوڑی دیر اور روئیں گے زیادہ زمانہ" یہ صورۃً انشاء ہے معنیً خبر ہے، اور امر کے ساتھ بھی اس کا مفہوم انشائی طور پر بھی درست ہو سکتا ہے جیسے کہ آپ کے سامنے تفصیل عرض کروں گا، پھر معنی یہ ہوگا کہ یہ تھوڑا ہنسیں، روئیں زیادہ، یہ انشاء کے طور پر بھی مفہوم اس کا صحیح ہو جائے گا، تفصیل آپ کے سامنے آ جائے گی، جَزَآءًۢ بِمَا کَانُوْا یَکْسِبُوْنَ: مَا کَانُوْا یَکْسِبُوْنَ: جو کچھ یہ کرتے تھے اس کے بدلے کے طور پر، یا، بدلہ دیے جائیں گے بدلہ بِمَا کَانُوْا یَکْسِبُوْنَ: ان کاموں کا جو یہ کرتے تھے۔ فَاِنْ رَّجَعَکَ اللّٰہُ اِلٰی طَآئِفَۃٍ مِّنْہُمْ: اگر اللہ تعالیٰ آپ کو لوٹا دے ان میں سے ایک طائفہ کی طرف فَاسْتَاْذَنُوْکَ لِلْخُرُوْجِ: پھر وہ آپ سے اجازت طلب کریں نکلنے کی فَقُلْ لَّنْ تَخْرُجُوْا مَعِیَ اَبَدًا: آپ کہہ دیجئے کہ تم ہرگز ہرگز میرے ساتھ نہیں نکلو گے، وَّلَنْ تُقَاتِلُوْا مَعِیَ عَدُوًّا: اور تم ہرگز میرے ساتھ مل کر کسی دشمن سے نہیں لڑو گے، اِنَّکُمْ رَضِیْتُمْ بِالْقُعُوْدِ اَوَّلَ مَرَّۃٍ: بے شک تم خوش ہو گئے بیٹھنے کے ساتھ پہلی مرتبہ، فَاقْعُدُوْا مَعَ الْخٰلِفِیْنَ: پس بیٹھے رہو تم پیچھے رہنے والوں کے ساتھ۔ وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓی اَحَدٍ مِّنْہُمْ مَّاتَ اَبَدًا: نہ نماز پڑھ ان میں سے کسی پر جو مر جائے، نہ نماز پڑھ کبھی کبھی۔ صلوٰۃ علیٰ احد سے مراد جنازہ ہے۔ ان میں سے کسی کا جنازہ کبھی نہ پڑھیے جو ان میں سے مر جائے، "نہ نماز پڑھ تو ان میں سے کسی پر جو مر جائے، نہ نماز پڑھ کبھی بھی" اَبَدًا کا تعلق لَا تُصَلِّ کے ساتھ ہے، وَلَا تَقُمْ عَلٰی قَبْرِہٖ: اور نہ کھڑا ہو اس کی قبر پر، اِنَّہُمْ کَفَرُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ: بے شک انہوں نے کفر کیا اللہ کے ساتھ اور اس کے رسول کے ساتھ، وَمَاتُوْا وَہُمْ فٰسِقُوْنَ: اور مر گئے اس حال میں کہ وہ نافرمان ہیں، وَلَا تُعْجِبْکَ اَمْوَالُہُمْ وَاَوْلَادُہُمْ: نہ تعجب میں ڈالیں تجھے ان کے مال اور نہ ان کی اولاد، ان کی اولاد اور ان کے اموال آپ کو تعجب میں نہ ڈالیں، اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰہُ اَنْ یُّعَذِّبَہُمْ بِہَا: سوائے اس کے نہیں کہ اللہ ارادہ کرتا ہے کہ انہیں عذاب دے ان کے سبب سے دنیا میں، وَتَزْہَقَ اَنْفُسُہُمْ: اور چلی جائیں ان کی جانیں وَہُمْ کٰفِرُوْنَ: اس حال میں

کہ یہ کافر ہوں۔ وَاِذَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ اَنْ اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ: اور جب کوئی سورت اُتاری جاتی ہے کہ ایمان لے آؤ اللہ کے ساتھ، وَجَاهِدُوْا مَعَ رَسُوْلِهِ: اور جہاد کرو اس کے رسول ساتھ مل کر، اسْتَاْذَنَكَ اُولُوا الطَّوْلِ مِنْهُمْ: طَول: قدرت اور طاقت۔ اجازت طلب کرتے ہیں آپ سے قدرت والے اِن میں سے، یعنی جن کو جہاد پہ قدرت ہے، جن کو جہاد کی طاقت حاصل ہے وہ بھی تجھ سے اجازت طلب کرتے ہیں، وَقَالُوْا: اور کہتے ہیں کہ ذَرْنَا نَكُنْ مَّعَ الْقٰعِدِيْنَ: چھوڑ دیجئے ہمیں کہ ہم بیٹھنے والوں کے ساتھ بیٹھ رہیں رَضُوْا بِاَنْ يَّكُوْنُوْا مَعَ الْخَوَالِفِ: خوالف خالفة کی جمع ہے یہ مؤنث کا صیغہ ہے۔ خوش ہوگئے اس بات پر کہ ہو جائیں وہ عورتوں کے ساتھ جو پیچھے بیٹھنے والی ہیں، گھر میں بیٹھنے والی عورتوں کے ساتھ یہ رہ کر خوش ہیں، وَطُبِعَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ: اور ان کے دلوں کے اوپر مہر ہوگئی فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ: یہ سمجھتے نہیں، لٰكِنِ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ: لیکن رسول اور وہ لوگ جو رسول کے ساتھ ایمان لے آئے، جٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ: جہاد کرتے ہیں اپنے مالوں کے ساتھ اور اپنی جانوں کے ساتھ، وَاُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْخَيْرٰتُ: انہی کے لئے بھلائیاں ہیں، خوبیاں ہیں، وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ: یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں، اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ: تیار کیے اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے باغات، جاری ہیں ان کے نیچے سے نہریں، خٰلِدِيْنَ فِيْهَا: ہمیشہ اس میں رہنے والے ہوں گے، ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ: یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔

تفسیر

ماقبل سے ربط

منافقین کا ہی ذکر چلا آرہا ہے، اس سورت کے نازل ہونے تک منافقین کے ساتھ سرورِ کائنات ﷺ کا برتاؤ بہت نرمی کا تھا، اور ان کو مسلمانوں میں کسی حیثیت سے ممتاز نہیں کیا گیا تھا، بلکہ اُن کی دل جوئی کے لیے سرورِ کائنات ﷺ اُن کے ساتھ زیادہ اچھا معاملہ کرتے تھے، کہ کسی طرح یہ احسان سے متاثر ہو کے سیدھے ہو جائیں، لیکن جب ہر تدبیر ناکام ہوگئی، اور ان لوگوں کے دلوں کا روگ نہ گیا، تو اس سورت میں اللہ تعالیٰ نے منافقین پر کھل کے بات کی ہے، اور ان کے حالات کی وضاحت کی ہے، اور سرورِ کائنات ﷺ سے کہا ہے کہ اب اِن کو ننگا کیجئے، اب ان کی پردہ داری نہ کریں، اور ان پر سختی کا معاملہ کریں، نرمی کے ساتھ تو یہ ٹھیک نہیں ہوئے، تو یہ ناقابلِ اصلاح ہیں، جب ناقابلِ اصلاح ہیں تو ان کو اپنی جماعت میں ممتاز کر دینا چاہیے، جیسے کہ عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ کے بعد بھی یہی مضمون ذکر کیا گیا تھا، کہ آپ ان کو اجازت نہ دیتے تو یہ نمایاں ہو جاتے، اب یہ آپ کی اجازت کا پردہ ڈال کے بیٹھ گئے، لوگوں کو پتا نہیں چلا کہ ان میں سے کون مخلص ہے اور کون جھوٹا ہے، اگر آپ اجازت نہ دیتے تو جو مخلص تھے وہ جاتے اور جو مخلص نہیں تھے وہ پیچھے رہ جاتے، تو جب آپ کی اجازت کے بغیر رہتے تو ایسی صورت میں اُن کا نفاق زیادہ کھل کے سامنے آجاتا، تو یہاں بھی اسی قسم کی ہدایات دی گئی ہیں، اور ان کے کردار کو نمایاں کیا گیا ہے۔

منافقین اور کُفّار سے جہاد کی علیحدہ علیحدہ نوعیت

اے نبی! کافروں اور منافقوں کے ساتھ جہاد کر، یہاں منافقین کو کُفّار کی صف میں شامل کر دیا گیا، لیکن دونوں کے ساتھ

جہاد کی نوعیت علیحدہ علیحدہ ہے، کافروں کے ساتھ تو جہاد بالسیف والسنان تھا، تلوار اور نیزے کے ساتھ تھا، اور منافقین کے ساتھ جہاد باللسان ہے، کہ خوب ان کی برائی کیجئے، اور اپنی جماعت کے اندر ان کو نمایاں کیجئے۔ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ: ان کے ساتھ سختی کا معاملہ کیجئے، اب ان کے ساتھ نرمی نہ کریں، ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بہت بُرا ٹھکانا ہے، آخرت میں تو یہ برباد ہیں ہی، بلکہ آخرت میں ان کی سزا کفار کے مقابلے میں بھی زیادہ سخت ذکر کی گئی ہے اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ (سورۂ نساء: ۱۴۵) کہ منافق نچلے درجے میں ہوں گے، کیونکہ کھلے دشمن اور پوشیدہ دشمن میں فرق ہوتا ہے، پوشیدہ دشمن زیادہ بُرا ہوتا ہے، کافر کھلے دشمن ہیں اور منافق پوشیدہ دشمن ہیں، جنہیں مارِ آستین کہا جاتا ہے۔

تبوک کے راستے میں منافقین کی ناکام سازش

يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ مَا قَالُوْا: یہ بھی ایک واقعہ کی طرف اشارہ ہے، غزوۂ تبوک میں جو کچھ منافق ساتھ رہ گئے تھے، انہوں نے آپس میں مشورہ کیا اس سفر میں سرورِ کائنات ﷺ کو نقصان پہنچانے کا، جس کی صورت یہ تھی کہ راستے میں پہاڑی سفر تھا، اور آپ کبھی پہاڑوں میں جائیں تو دیکھیں گے، کہ پہاڑ کے اوپر سے جس وقت کوئی راستہ گزرتا ہے، تو بہت چھوٹی سی پگڈنڈی ہوتی ہے، دائیں بائیں بسا اوقات اس قسم کی گہرائی ہوتی ہے، کہ اگر کسی کا ذرا سا قدم پھسل جائے تو انسان کلابازیاں کھاتا ہوا سینکڑوں فٹ پہ جا کے گرتا ہے، پھر بچنے کی اُمید نہیں ہوتی، اور وہ راستے بہت تنگ تنگ ہوتے ہیں، تو ایک جگہ ایسی آنے والی تھی جہاں سے رسول اللہ ﷺ کی سواری نے گزرنا تھا تو انہوں نے مشورہ کیا کہ کوئی ایسی صورت بنائی جائے کہ ایسے موقع پر آپ ﷺ کی سواری بدک جائے، اس کو ڈرا دیا جائے، یا آگے سے کوئی مزاحمت کوئی صورت پیدا ہو جائے، جس سے سواری کا قدم پھسلے اور آپ ﷺ پہاڑ سے گر جائیں، اور اس طرح (نعوذ باللہ) آپ ﷺ وفات پا جائیں گے، یہ انہوں نے تدبیر کی اور آپس میں اس قسم کی گفتگو کی، اور پھر انہوں نے اس قسم کی کوشش بھی کی، جس طرح کہ بعض تفسیری روایات سے معلوم ہوتا ہے، لیکن حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ اور حضرت عمار رضی اللہ عنہ ان دونوں کی کوشش سے وہ لوگ پیچھے ہٹ گئے، اور کسی قسم کی کارروائی نہ کر سکے، لیکن انہوں نے منہ وغیرہ چھپائے ہوئے تھے جس کی وجہ سے رات کی تاریکی میں پہچانے نہیں گئے، تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے سرورِ کائنات ﷺ کو اطلاع ہوئی، یا بعض آثار اور قرائن اس قسم کے سامنے آئے کہ یہ شرارت فلاں لوگوں کی ہے، تو اُن کو بلایا گیا، بلانے کے بعد پوچھا گیا تو وہ قسمیں کھا گئے کہ ہم نے تو اس قسم کی نہ کوئی بات کی ہے، نہ کوئی اس قسم کی حرکت کی ہے، جیسے اُن کی عادت تھی کہ آگے قسمیں کھا جاتے تھے، تو اللہ تعالیٰ نے یہاں اُن کے جھوٹ کو نمایاں کیا ہے، جس طرح سے پچھلی آیات میں بھی ایسے واقعات کے اندر ان کے جھوٹ کو ظاہر کیا گیا۔

منافقینِ مدینہ کا نمک حرام ٹولا

''قسمیں کھاتے ہیں کہ انہوں نے بات نہیں کی، وَلَقَدْ قَالُوْا كَلِمَةَ الْكُفْرِ: لَقَدْ یہ تاکید کے لئے ہے اس میں قسم والا معنی ہوتا ہے کہ انہوں نے کُفر کی بات کی ہے، یعنی نبی کو ہلاک کرنے لیے انہوں نے اپنی مجلس کے اندر اس قسم کے مشورے کیے ہیں،

وَكَفَرُوْا بَعْدَ اِسْلَامِهِمْ: اور اپنے اسلام کے بعد انہوں نے کُفر کا اظہار کیا، یعنی پہلے زبانی اسلام لائے تھے، اور اس قسم کی باتیں کر کے انہوں نے کُفر ظاہر کر دیا، اور انہوں نے قصد کیا ایسے معاملہ کا جس کو یہ پہنچ نہیں سکے هَمُّوْا بِمَا لَمْ يَنَالُوْا: جس کو یہ حاصل نہیں کر سکے ایسی بات کا انہوں نے قصد کیا، اور وہ ہے سرورِ کائنات ﷺ کو ہلاک کرنا۔ مَا نَقَمُوْٓا اِلَّآ اَنْ اَغْنٰىهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ: اس عبارت کا مفہوم ہے تَاكِيْدُ الشَّيْءِ بِخِلَافِهٖ خلاف چیز کو ذکر کر کے کسی کو پختہ کرنا، جیسے ہم کسی پر کوئی احسان کریں، اور اس احسان سے متاثر ہو کر وہ ہمارے ساتھ محبت نہ کرے، اطاعت قبول نہ کرے، بلکہ وہ در پردہ اور زیادہ دشمنی کرنے اور نقصان پہنچانے کی کوشش کرے، تو جس وقت اُس کی طرف سے کوئی اس قسم کا معاملہ سامنے آئے، جو نقصان پہنچانے کا ہے یا دشمنی کا ہے، تو ہم کہیں گے کہ بھائی! یہ میرے احسان کا بدلہ دے رہا ہے، اس نے یہ معاملہ میرے ساتھ اس لیے کیا ہے چونکہ میرے اس کے اوپر بہت سارے احسانات ہیں، تو آپ جانتے ہیں کہ یہ احسانات کا بدلہ تو نہیں، یہ تو اس کی احسان ناشناسی ہے، نمک حرامی ہے، لیکن اس کو ذکر ایسے انداز میں کیا جاتا ہے، اور اس میں قباحت زیادہ نمایاں ہو جاتی ہے، کہ یہ میرے ساتھ ایسا برتاؤ اس لیے کر رہا ہے چونکہ میں اس پر بہت مہربان ہوں، یہ میری مہربانی کا جواب ہے، یہ میرے احسانات کا بدلہ چکا رہا ہے، تو ایسا کہنے کے ساتھ اس کی مذمت زیادہ نمایاں جاتی ہے، یہاں بھی یہی حال ہے کہ منافقین کا جو ٹولا تھا، یہ سرورِ کائنات ﷺ کے مدینہ منورہ تشریف لانے سے قبل فقر و فاقہ اور غربت میں تھے، ان کی کوئی خاص آمدنی نہیں تھی، یہود ان سے سود لے لے کے ان کو کنگال کیے رکھتے تھے، حضور ﷺ تشریف لائے تو جس وقت یہ فتوحات شروع ہوئیں، تو مدینہ منورہ کے بسنے والے سارے خوش حال ہوئے اپنے اپنے درجے میں، لیکن یہ منافقین کا ٹولا سب سے زیادہ خوش حال ہوا، سب سے زیادہ خوش حال کیوں ہوا؟ ایک تو رسول اللہ ﷺ ان کی دل داری کے طور پر ان کو ہر موقع پر دیتے تھے، جب بھی کوئی مالِ غنیمت آتا یا اس قسم کی چیزیں آتیں تو ان کو دیتے تھے کہ یہ کھا پی کے مطمئن ہو جائیں، کسی طرح سے یہ مانوس ہو جائیں، ان کے دلوں کا روگ چلا جائے، آپ ان کو ترجیح دیتے تھے، پھر وہ بھی مختلف بہانوں کے ساتھ حضور ﷺ سے لیتے رہتے، اور پھر سب سے بڑی بات یہ تھی کہ ان منافقوں کے پاس لینے والا ہاتھ ہی تھا، دینے والا ہاتھ تھا ہی نہیں، باقی مسلمانوں کو بھی اموال ملتے تھے، لیکن جب اللہ کے رسول کی طرف سے کوئی اعلان ہوتا کہ جہاد کی ضرورت کے لیے چندہ دو تو لوگ گٹھڑیاں باندھ باندھ کے لاتے، بوریاں بھر بھر کے لاتے اور لا کے دیتے تو اپنے گھروں کو پھر خالی کر دیتے، سرورِ کائنات ﷺ کی طرف سے اگر اُن پر مال تقسیم ہو چکا ہوتا پھر کسی حاجت مند کے لئے اگر یہ اعلان کر دیا جاتا کہ لاؤ، تو وہ لاتے، اس طرح اُن کی کوٹھیاں پھر خالی ہو جاتیں، لیکن یہ ایسے تھے کہ لینے میں تو سب سے آگے آگے ہوتے تھے، اور جس وقت دینے کا موقع آتا تھا تو سب سے پیچھے ہوتے تھے، اس لیے اِن کے پاس مال جمع رہتا، تو یہ صحیح معنیٰ میں غنی ہو گئے، تو ان کے اوپر اللہ اور اللہ کے رسول کا اتنا احسان تھا، کہ فقر و فاقہ سے نکلے، غنی بن گئے، مال دار ہو گئے، آج یہ اسی چیز کا بدلہ چکا رہے ہیں، کہ جہاں دشمنی کرنے کا موقع ملتا ہے پیچھے نہیں ہٹتے، اس آیت کا مفہوم یوں ہے ''نہیں بدلہ دیتے یہ مگر اس بات کا کہ اللہ اور اللہ کے رسول نے انہیں غنی کر دیا، یا نہیں انتقام لیتے مگر اس بات کا کہ اللہ اور اللہ کے رسول نے انہیں غنی کر دیا'' یہ اللہ اور اللہ کے رسول کے احسان کا بدلہ ہے جو یہ انتقام لیتے ہیں، اور اس طرح سے ہر معاملے میں جہاں بھی کہیں دشمنی کرنے کا موقع ملتا ہے یہ چوکتے نہیں، یہ اللہ اور

اللہ کے رسول کے احسانات کا بدلہ ہے جو یہ دیتے ہیں، تو یہ گویا کہ مخالف سمت ذکر کرکے مذمت کی گئی ہے، مِنْ فَضْلِهٖ کی ضمیر اللہ کی طرف لوٹ رہی ہے کیونکہ فضل اصل میں تو اللہ ہی کا ہے، اگر چہ اس فضل کی ظاہری تقسیم اللہ کے رسول کے ہاتھ سے ہوئی۔ ''اللہ اور اللہ کے رسول نے اس کو اپنے فضل سے غنی کردیا'' فَاِنْ يَّتُوْبُوْا يَكُ خَيْرًا لَّهُمْ: ابھی بھی ان کے لیے توبہ کا دروازہ بند نہیں ہے، اگر یہ توبہ کرلیں تو یہ ان کے لیے بہتر ہے، وَاِنْ يَّتَوَلَّوْا: اگر یہ پیٹھ پھیریں گے، يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ عَذَابًا اَلِيْمًا ۙ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ: اللہ تعالیٰ انہیں دردناک عذاب دے گا دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی، پھر یہ دنیا اور آخرت میں رسوا ہوں گے، جب اللہ کی گرفت میں آئیں گے، تو ان کو اپنے علاقے میں وَمَا لَهُمْ فِي الْاَرْضِ: ارض سے وہی ارضِ مدینہ مراد ہے۔ اپنے علاقے میں، یا روئے زمین میں ان کو کوئی یار اور مددگار نہیں ملے گا جب یہ اللہ کی گرفت میں آجائیں گے، چنانچہ یہاں مفسرین نے لکھا ہے کہ بعض ایسے بھی تھے جو صدقِ دل سے توبہ کرگئے تھے، اور اللہ نے اُن کی توبہ قبول کرلی۔

''وَمِنْهُمْ مَّنْ عٰهَدَ اللّٰهَ'' کا شانِ نزول

وَمِنْهُمْ مَّنْ عٰهَدَ اللّٰهَ: اس میں بھی ایک واقعے کی طرف اشارہ ہے، ویسے تو عمومی مزاج ان کا یہی تھا، لیکن خصوصیت کے ساتھ ایک واقعہ ہے ثعلبہ بن حاطب کا، جس نے حضور ﷺ سے کہا کہ یا رسول اللہ! میرے لیے دُعا کیجئے، کہ اللہ تعالیٰ مجھے مال دار کردے، آپ ﷺ نے اُسے سمجھایا کہ ثعلبہ! زیادہ مال دار ہونا اچھا نہیں، تھوڑا ہو، ضرورت کے لیے کافی ہو، وہ بہتر ہے اس زیادہ سے کہ جس میں انسان مشغول ہو کے اللہ کی اطاعت سے ہی غافل ہوجائے، وہ کہنے لگا کہ نہیں جی! بالکل نہیں! میں اللہ سے وعدہ کرتا ہوں اور آپ سے بھی عہد کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مجھے مال دے گا اور میں غنی ہوجاؤں گا، تو میں اللہ کے راستے میں خرچ کروں گا، حقوق ادا کروں گا، آپ ﷺ نے پھر بھی سمجھایا، لیکن وہ پیچھے پڑا رہا کہ میرے لیے دُعا کردیجئے، تو رسول اللہ ﷺ نے اُس کے لیے دُعا کردی، جب دُعا کردی تو اس کا مال بڑھنا شروع ہوا، پہلے مدینہ منورہ میں رہتا تھا، پھر اُس کی بکریاں وغیرہ جو بڑھیں تو مدینہ منورہ میں گنجائش نہ رہی، باہر جنگل میں چلا گیا، نماز باجماعت سے محروم ہوا، حضور ﷺ کی مجلس سے محروم ہوا، آٹھویں دِن جمعہ کے لیے آجاتا، پھر مال بڑھنے کے ساتھ انتظام اور زیادہ مشکل ہوگیا تو جمعہ بھی چھوٹ گیا، پھر جس وقت زکوٰۃ کا حکم آیا: خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ تو سرورِ کائنات ﷺ نے عاملین کو زکوٰۃ وصول کرنے کے لیے بھیجا، تو اس کی طرف بھی دو آدمی گئے جن کے پاس رسول اللہ ﷺ کا تحریری فرمان بھی تھا صدقات وصول کرنے کے لئے، اور حساب کتاب اُن کے پاس تھا، تو جب وہ ثعلبہ کے پاس گئے اور اُس نے جس وقت وہ فرمان دیکھا، تو دیکھ کر کہتا ہے کہ زکوٰۃ، جزیہ کی بہن معلوم ہوتی ہے، اس کا مسلمانوں سے کیا تعلق؟ یہ تو جس طرح سے کافروں سے جزیہ لیا جاتا ہے یہ تو ایسے ہی ہے، ٹال مٹول کردی کہ تم آگے ہو آؤ، پھر آؤ گے تو میں دیکھتا ہوں، سوچتا ہوں، وہ باقی لوگوں سے صدقات وصول کرکے آئے تو پھر اُس نے اسی طرح سے ٹال مٹول کی کہ اچھا اب جاؤ، پھر کسی دِن سہی۔ تو جب سرورِ کائنات ﷺ کو اس بات کی اطلاع ملی تو آپ ﷺ نے بہت افسوس کا اظہار کیا، وَيْحَ ثَعْلَبَةَ! ثعلبہ کی حالت پہ افسوس ہے! تو ثعلبہ کو کسی نے جاکر اطلاع دے دی کہ رسول اللہ ﷺ کی مجلس میں تیرا اس طرح سے تذکرہ ہوا ہے، اور آپ ﷺ

نے مذمت کے انداز میں تیرے اوپر افسوس کا اظہار کیا ہے، تو پھر اُس کو کچھ تنبہ ہوا، پھر وہ اپنی زکوٰۃ لے کے آیا، لیکن معلوم یوں ہوتا ہے کہ وہ صرف ظاہرداری کے طور پر لے کے آیا تھا، ورنہ اُس نے زکوٰۃ کی اہمیت اور اُس کے فرض ہونے کو اپنے دل سے قبول نہیں کیا تھا، رسول اللہ ﷺ پر یہ آیات نازل ہو چکی تھیں، آپ ﷺ نے اسے کہا کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے تیری زکوٰۃ وصول کرنے سے منع کر دیا ہے، اس لیے میں وصول نہیں کر سکتا، پھر اُس نے بہت چیخ و پکار کی، لیکن کوئی بات نہیں ہوئی، وہ واپس چلا گیا، حضور ﷺ کی وفات کے بعد ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس آیا تو انہوں نے بھی رَدّ کر دیا کہ جب حضور ﷺ نے تیری زکوٰۃ وصول نہیں کی تو ہم بھی نہیں کر سکتے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آیا تو انہوں بھی رَدّ کر دیا، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس آیا تو انہوں نے رَدّ کر دیا حتیٰ کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے میں اُس کا انتقال اسی حالت میں ہو گیا (مظہری، آلوسی وغیرہ)، اس طرح سے وہ برباد ہوا، تو یہاں منافقین کا عمومی مزاج بھی مذکور ہے، لیکن خصوصیت سے اس آیت کا مصداق ثعلبہ بھی ہو سکتا ہے۔

منافقین کے دِل میں نفاق موت تک قائم کر دیا گیا

''ان میں سے بعض وہ ہے جس نے معاہدہ کیا اللہ کے ساتھ، کہ اگر اللہ ہمیں اپنے فضل سے دے دے تو البتہ ضرور ہم صدقہ کریں گے اور ضرور ہو جائیں گے اچھے لوگوں میں سے، جب اللہ تعالیٰ نے اُن کو اپنا فضل دے دیا، یا اپنے فضل سے اپنی مہربانی سے مالِ کثیر دے دیا، یا تو فضل سے مراد ہی مال ہے، یا مطلب یہ ہے اللہ نے اپنی مہربانی سے مال دے دیا (یعنی مفعول محذوف ہے، ناقل) بَخِلُوْا بِہٖ: تو وہ اُس مال کے ساتھ بخیل ہو گئے، انہوں نے اللہ کے فضل کے ساتھ بخل کیا، وَتَوَلَّوْا: اور پیٹھ پھیر گئے وَّھُمْ مُّعْرِضُوْنَ: اس حال میں کہ وہ منہ موڑنے والے تھے، منہ موڑنے کا مطلب یہ ہے کہ مکمل طور پر پیٹھ پھیر کے چلے گئے، بعض دفعہ یہ ہوتا ہے کہ ایک آدمی مجلس سے اُٹھ کر جاتا ہے لیکن تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد مڑ مڑ کے دیکھ رہا ہوتا ہے جس سے اس کے دِل کی رغبت معلوم ہوتی ہے کہ یہ پیچھے کو آنا چاہتا ہے، تو ایسے شخص پہ توقع ہوتی ہے کہ اس کو اشارہ کر کے بلا لو تو شاید وہ واپس آ بھی جائے گا، لیکن جو مجلس سے ایسے طور پر منہ موڑ کے چلا جائے کہ پیچھے مڑ کے دیکھتا ہی نہیں تو اس کے واپس آنے کی کوئی توقع نہیں ہوتی، اس لیے یہاں بھی ان کی تولی کی شدت کو بیان کرنے کے لئے وَّھُمْ مُّعْرِضُوْنَ کی قید ساتھ لگا دی، کہ جب منہ موڑ کر اُٹھ کے چلے گئے تو پیچھے مڑ کے نہیں دیکھا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ اُن کے اس فعل کی سزا کے طور پر اُن کے دلوں میں نفاق پیدا کر دیا موت تک، یہ آیت گویا کہ قطعی طور پر نشاندہی کر گئی کہ یہ لوگ منافق ہیں، منافق کا معنی ہوتا ہے دل سے بے ایمان، جب وہ دل سے بے ایمان ہیں، زکوٰۃ کو فرض ہی نہیں سمجھتے، اُن کے دل میں زکوٰۃ کی اہمیت ہی نہیں، تو جو کچھ وہ لے کے آئے ہیں یہ صرف ظاہرداری ہے، زکوٰۃ ہے ہی نہیں۔ تو اللہ کی طرف سے جو حکم تھا کہ اب ان پر سختی کیجئے، اور ان کی پردہ داری نہ کیجئے، اسی کے تقاضے سے ظاہر کر دیا گیا کہ اب تمہاری کوئی عبادت قبول نہیں ہے، زکوٰۃ بھی قبول نہیں ہے، کیونکہ اس آیت نے نشاندہی کر دی کہ ان کے اس کردار کے نتیجے میں، ان کے اس کردار کی سزا کے طور پر اللہ نے تعالیٰ ان کے دل میں موت تک کے لئے نفاق قائم کر دیا، جس کا مطلب تھا کہ اب یہ مخلص مؤمن بن ہی نہیں سکتے، اللہ تعالیٰ نے خبر دے دی، تو اُن کی عبادت جو بھی ہے چاہے وہ زکوٰۃ ہو یا وہ

دوسری عبادت ہو، وہ ظاہرداری ہے، حقیقت میں تو ان کے دل میں ایمان ہے ہی نہیں، تو اب پردہ داری کی کوئی ضرورت نہیں تھی، اس لیے حضور ﷺ نے رَدّ کر دیا، اِلٰی یَوْمِ یَلْقَوْنَهٗ: اللہ سے ملاقات کے دن تک یعنی مرنے تک، اب موت تک ان کے دل میں نفاق رہے گا، اللہ نے نفاق ثابت کر دیا ان کے کردار کی سزا کے طور پر ان کے قلوب میں نفاق پیدا کر دیا، جما دیا، اور مرنے کے بعد تو پھر توبہ کا امکان ہی نہیں کہ یہ نفاق زائل ہو جائے، پھر تو دائمی ہو گیا۔

سوال: - جب ان کی توبہ کا امکان ہی نہیں تو پھر پیچھے فَاِنْ یَّتُوْبُوْا یَكُ خَیْرًا لَّهُمْ کہہ کر ان کو توبہ کی دعوت کیوں دی گئی ہے؟

جواب: - یہ دوسرے لوگوں کے متعلق ہے جنہوں نے اس قسم کی باتیں اپنی مجلس میں کی تھیں، ان کو کہا جا رہا ہے کہ توبہ کر لو تو گنجائش ہے۔ اور جس کے متعلق آگے کہا کہ ان کے دِلوں میں نفاق قائم کر دیا گیا یہ دوسرا فریق ہے جنہوں نے اللہ اور اللہ کے رسول کے ساتھ کھل کھل کے معاہدے کیے تھے، اور معاہدے کرنے کے بعد پھر وہ پھر گئے، ان کے دلوں میں نفاق پکا ہو گیا، ان کو توبہ نصیب نہیں ہو گی، یہ مختلف گروہوں کے مختلف احکام ہیں، اُن کے متعلق اس قسم کی بات نہیں، اُن کو دعوت دی گئی ہے کہ اگر توبہ کر لیں، باز آ جائیں تو ان کا یہ گناہ معاف ہو سکتا ہے کہ انہوں نے مجلس کے اندر بیٹھ کے اس قسم کی باتیں کی تھیں۔

بِمَآ اَخْلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوْهُ جو انہوں نے اللہ سے وعدہ کیا تھا اس کے خلاف کرنے کی وجہ سے، اور ان کے جھوٹ بولنے کی وجہ سے، ایمان کا جھوٹا دعویٰ کرتے تھے۔ کیا ان کو پتا نہیں؟ کہ اللہ ان کے بھید جانتا ہے اور ان کی سرگوشیاں جانتا ہے، اور اللہ تعالیٰ علام الغیوب ہے، چھپی ہوئی باتوں کو جاننے والا ہے۔

منافقین خود بخیل ہیں اور دُوسروں کے لئے بخل پسند کرتے ہیں

آگے بھی ان منافقین کا ایک کردار ذکر کیا ہے، اس کا حاصل یہ ہے کہ جو لوگ بخیل ہوتے ہیں اُن کی ایک نفسیاتی بات ہے، کہ اُن کا دل یہ چاہتا ہے کہ باقی لوگ بھی بخیل ہو جائیں، کسی کو سخاوت کرتا ہوا دیکھتے ہیں تو چڑتے ہیں، کیوں؟ کہ اگر سارے بخیل ہو جائیں گے تو حال ایک جیسا رہ جائے گا، اور ان کا عیب نمایاں نہیں ہو گا، اور اگر باقی لوگ خیرات کریں، صدقات دیں، سخاوت کریں، اور یہ نہ کریں، تو یہ علیحدہ نمایاں معلوم ہوں گے، تو ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ جس طرح ہم بخیل ہیں دوسرے بھی بخل کریں، تاکہ ہم ایک جیسے ہو جائیں اور ہمارے اُوپر انگلی نہ اٹھے، اَلَّذِیْنَ یَبْخَلُوْنَ وَیَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ (سورۂ نساء: ۳۷) خود بخیل ہیں، اور لوگوں کو بھی بخل کرنے کے لیے کہتے ہیں، اور جس وقت کوئی سخاوت کرتا ہے یا لوگوں کے سامنے صدقات دیتا ہے تو ان کو بڑی تکلیف ہوتی ہے، یہ طعن و تشنیع کرتے ہیں تاکہ یہ طعن و تشنیع سے تنگ آ کے باز آ جائیں، اور سارے کے سارے ایک سطح پر آ جائیں۔ پنجابی کی کہاوتوں میں جو واقعات لوگ ذکر کیا کرتے ہیں ان میں ایک یہ بھی ہے نا، کہ کچھ آدمی بیٹھے ہوئے تھے ان سب کے ناک کٹے ہوئے تھے، ایک آدمی ناک والا آ گیا، اب اس خیال سے کہ یہ ناک والا کہیں ہمارا مذاق نہ اڑائے، تو ان ناک کٹوں نے پہلے ہی مذاق اڑانا شروع کر دیا ''نکوآ گیا، نکوآ گیا''، تو نکو نکو کہہ کر اس کا مذاق اڑایا، گویا کہ اس کے لمبے ناک پر پہلے ہی پھبتیاں کسنی شروع کر دیں، تاکہ ان کے کٹے ہوئے ناک پر وہ کسی قسم کی بات نہ کر سکے، تو کسی شخص کو نکو بنا دینے کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ عیب

والے لوگ دوسرے کی خوبی نہیں دیکھ سکتے، بلکہ اس کے اوپر یوں زبان درازی کرتے ہیں تا کہ تنگ آ کر وہ بھی اس خوبی کو چھوڑ دیں، تو کم از کم ہمارے اوپر الزام نہ آئے، سارے ایک جیسے ہو جائیں گے، جب ایک جیسے ہو جائیں گے تو کوئی کسی کی طرف انگلی نہیں اٹھائے گا۔ تو یہاں بھی یہی قصہ تھا کہ منافق خود تو ناک کٹے تھے، وہ تو صدقات دیتے نہیں تھے، خیرات کرتے نہیں تھے، تو جب اللہ کے رسول کی طرف سے کوئی اعلان ہوتا اور لوگ خوشی خوشی، یعنی زکوۃ نہیں، بلکہ اور صدقات خوشی خوشی لاتے اور پیش کرتے، تو یہ طعنے دیتے، طعنے کس طرح سے؟ اگر تو کوئی کثیر مقدار لے آیا تو کہتے کہ دیکھو! ریا کار ہے، دکھلاوے کے لئے کر رہا ہے، اس کو کیا ضرورت تھی اتنا مال پیش کرنے کی، شہرت حاصل کرنا چاہتا ہے، اپنا نام پیدا کرنا چاہتا ہے، اس کے متعلق تو اس طرح کہتے۔ اور جو لوگ بیچارے محنت مزدوری کرتے، چند کھجوریں کما کے لاتے، اس میں سے بھی حصہ اللہ کے رسول ﷺ کی خدمت میں لا کے پیش کرتے، تو یہ لوگ کہتے کہ لو! آ گئے ہیں یہ خیرات کرنے، انہوں نے کیا حاتم کی قبر پہ لات ماردی، اگر یہ چند مٹھیاں کھجور کی اور جَو کی نہ لے کے آتے تو اللہ تعالیٰ کا کون سا کام اس پہ اٹکا پڑا تھا، کیا ضرورت تھی اتنا سا لانے کی، اگر اور نہیں تھا تو یہ بھی نہ لاتے، اس طرح سے باتیں کرتے تھے، نہ زیادہ لانے والوں کو چھوڑتے، نہ تھوڑا دینے والوں کو چھوڑتے، اس طرح سے طعنے دیتے تھے، طعنے دینے کا مقصد ہی یہی تھا تا کہ یہ لوگ بھی باز آ جائیں تو کم از کم ہمارا عیب چھپا رہ جائے۔ تو یہاں اللہ تعالیٰ اُن کی خبر لیتے ہیں، کہ یہ وہ لوگ ہیں طعنہ دیتے ہیں صدقات میں خوشی کے ساتھ زیادہ دینے والوں کو، صدقات میں رغبت کرنے والوں کو (فِي الصَّدَقٰتِ کو الْمُطَّوِّعِيْنَ کے متعلق کر دیا جائے) یہ طعنہ دیتے ہیں صدقات کے بارے میں مؤمنین میں سے ان لوگوں کو جو خوشی سے صدقہ کرتے ہیں، اور اُن کو لوگوں کو طعنہ دیتے ہیں جو نہیں پاتے مگر اپنی جہد، اپنی کوشش، یعنی کوشش مشقت مزدوری کر کے کماتے ہیں، اور تھوڑا بہت لے آتے ہیں، فَيَسْخَرُوْنَ مِنْهُمْ: یہ منافق اُن سے ٹھٹھا کرتے ہیں، سَخِرَ اللّٰهُ مِنْهُمْ: اللہ نے ان منافقوں سے ٹھٹھا کیا، کیا مطلب؟ کہ ان کے تمسخر کا اللہ تعالیٰ انہیں بدلہ دے گا، یہ جزا ہے جس کو بصورتِ عمل ذکر کیا گیا ہے، جیسے اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ (سورۂ بقرہ: ۱۵) یہ استہزا کرتے ہیں، اللہ ان سے استہزا کرتا ہے، اللہ تعالیٰ نے جو ان کی رسّی ڈھیلی چھوڑ رکھی ہے، یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے ساتھ استہزا ہے۔ ''اللہ تعالیٰ نے ان کا ٹھٹھا کیا'' وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ: اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے، گویا کہ تنبیہ کر دی گئی، چاہے نام نہ لیے جائیں کہ یہ تمسخر کون کرتے ہیں، مذاق کون اڑاتے ہیں، لیکن جس معاشرے کے اندر یہ آیات اتر رہی ہیں اُس معاشرے کے اندر اس قسم کے لوگ ممتاز ہوتے ہیں، لوگوں کو خود پتا چل جاتا ہے کہ اَلَّذِيْنَ يَلْمِزُوْنَ کا مصداق کون کون لوگ ہیں؟ اور اس آیت کے اندر ان کو تنبیہ کی گئی ہے۔ جہاں یہ واقعہ پیش آ رہا ہو تو پیش آنے کے وقت وہ لوگ ممتاز ہوتے ہیں، لہٰذا صحابہ کے سامنے جو حضور ﷺ کی زبان سے یہ آیات سنتے تھے، اُن کے نزدیک اس میں کوئی ابہام نہیں تھا کہ ان سے کون لوگ مراد ہیں؟ ہم چاہے تعیین نہ کر سکیں لیکن ان کو پتا تھا کہ فلاں نے طعنہ دیا تھا، فلاں نے زبان کھولی تھی، فلاں نے مذاق اڑایا تھا، اور اس آیت کے اندر اللہ تعالیٰ نے ان کی خبر لی ہے۔ تو اُن (صحابہ) کے سامنے بات واضح ہوتی ہے، اور جنہوں نے ایسا کام کیا ہوتا ہے ان کے بھی سر نیچے ہو جاتے ہیں، وہ سمجھ جاتے ہیں کہ یہ آیات ہم پر فٹ آ رہی ہیں، اور یہ ہمیں دھمکایا جا رہا ہے۔

منافقین کے لئے اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا سخت اظہار

اب ان کی شرارتیں اس درجے تک پہنچ گئیں کہ حضور ﷺ سے کہا جا رہا ہے کہ اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ: کہ آپ ان کے لیے استغفار کریں یا نہ کریں، ان کے لیے معافی مانگیں یا نہ مانگیں، اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً: اگر آپ ان کے لیے ستر دفعہ بھی استغفار کریں گے فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ: اللہ تعالیٰ انہیں ہرگز نہیں بخشے گا، یہ اس حد تک پہنچ گئے کہ اب آپ کا استغفار ان کے لیے کوئی مفید نہیں ہے، ستر دفعہ کا ذکر کثرت کے لیے ہے، جیسے ہم بھی کسی کو کہتے ہیں کہ میں نے تجھے ستر دفعہ سمجھایا ہے، لیکن تو سمجھتا نہیں ہے، میں نے تجھے سو دفعہ کہا ہے، یہ اپنی اپنی زبان کے محاورے ہوتے ہیں تو سَبْعِيْنَ کا لفظ عربی کے اندر کثرت کے لیے استعمال ہوتا ہے، یعنی جتنا چاہیں آپ ان کے لیے استغفار کریں، ان کو کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا، یہ اس وجہ سے ہے کہ انہوں اللہ اور اللہ کے رسول کے ساتھ کفر کیا، اور اللہ تعالیٰ فاسق لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا، اب یہ لوگ کسی طرح سے بھی اپنے مقصد تک نہیں جا سکتے، جنت کو حاصل نہیں کر سکتے، نافرمان لوگوں کو اللہ تعالیٰ سیدھی راہ نہیں دیتا، اس میں یہ فیصلہ سنا دیا گیا، اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ کا مطلب یہ ہے کہ حضور ﷺ جس طرح سے صحابہ کے لیے استغفار کرتے تھے تو اُس کی لپیٹ میں یہ بھی آجاتے تھے، اللہ تعالیٰ سے حضور ﷺ ان کے لیے مغفرت مانگتے تھے، کہ اللہ انہیں کسی طرح معاف کردے، کہ یہ صحیح راستے پہ آجائیں، لیکن ان کے کردار نے انہیں انتہا پہ پہنچا دیا، اب اللہ کے رسول کا استغفار بھی ان کے لیے کافی نہیں ہے۔

منافقین کا جہاد فی سبیل اللہ کو مکروہ جاننا

فَرِحَ الْمُخَلَّفُوْنَ بِمَقْعَدِهِمْ خِلٰفَ رَسُوْلِ اللّٰهِ: یہ آیات غزوۂ تبوک کے سلسلے کی ہیں جیسے پہلے بھی ذکر ہوا تھا، تو جو پیچھے چھوڑے گئے، جن کو پیچھے چھوڑ دیا گیا ''مخلف'' کے لفظ میں یہ تصور دیا گیا ہے، کہ وہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ شاید ہم بہانے کر کے پیچھے رہ گئے، لیکن اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ ٹھکرائے گئے، یہ پیچھے چھوڑ دیے گئے، ان سے خیر کی توفیق ہی سلب ہوگئی، ''یہ پیچھے چھوڑے ہوئے اللہ کے رسول کے بعد اپنے بیٹھے رہنے پہ خوش ہیں'' کہ اللہ کا رسول چلا گیا، اس کے برخلاف یہ جو بیٹھے رہ گئے، تو اپنے اس کام پر خوش ہو رہے ہیں کہ ہم نے بڑا اچھا کام کیا ہے، اس مصیبت سے بچ گئے، ''اور یہ مکروہ جانتے ہیں اس بات کو کہ اپنے مالوں کے ساتھ اور جانوں کے ساتھ جہاد کریں اللہ کے راستے میں'' خود بھی نہیں نکلتے اور دوسروں کو بھی کہتے ہیں لَا تَنْفِرُوْا فِي الْحَرِّ موسم بڑا گرم ہے، جانے کی ضرورت نہیں، گرمی میں باہر نہ نکلو، دوسروں کو بھی اس طرح سے کہتے ہیں، یا لَا تَنْفِرُوْا فِي الْحَرِّ اپنے آپ کو کہتے ہیں، جس طرح سے انسان جس وقت سوچتا ہے کہ میں یہ کام کروں یا نہ کروں، تو دل میں خیال آتا ہے کہ اتنی گرمی میں نہیں جانا چاہیے، یعنی اپنے متعلق ہی اُن کے دل میں خیال آیا کہ گرمی نہ نکلو، تو یہ اپنے متعلق بھی ہو سکتا ہے، اور ہو سکتا ہے کہ اپنے بھائی بندوں اور اپنے ہم مسلکوں کے سامنے تذکرہ کرتے ہوں کہ کون اتنی گرمی میں جائے، اتنی گرمی میں نہیں جانا چاہیے، تکلیف زیادہ ہوگی، اتنا لمبا سفر ہے، کون اس مصیبت کو جھیلے، اس طرح سے آپس میں وہ یوں کہتے ہیں لَا تَنْفِرُوْا فِي الْحَرِّ: مت نکلو گرمی میں۔ تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ اَشَدُّ حَرًّا: انہیں کہہ دو کہ تم اس دنیا کی گرمی سے تو بچ رہے ہو، اور اپنے آپ کو جہنم کی آگ کا مصداق

بنا رہے ہو، یہ کون سی عقل مندی ہے؟ یہ تو وہی مثال ہوگئی، ''فَرَّ مِنَ الْمَطَرِ وَقَامَ تَحْتَ الْمِيزَابِ'' کہ ایک آدمی بارش سے ڈر کے بھاگا اور جا کے پرنالے کے نیچے کھڑا ہوگیا، چھوٹی مصیبت سے بچتا بچتا بڑی مصیبت میں جا پھنسا، تو تم اس گرمی سے بچتے بچتے جہنم میں جا گرے، یہ کون سی عقل مندی کی؟ ''جہنم کی آگ زیادہ سخت ہے از روئے گرمی کے'' لَوْ كَانُوْا يَفْقَهُوْنَ: کیا ہی اچھا ہو کہ یہ سمجھ جائیں، ان کو اگر سمجھ ہوتی تو ان کو معلوم ہوتا کہ آج کی گرمی برداشت کر کے اگر جہنم کی آگ سے بچتے ہیں تو یہ اچھا ہے، اور آج کی گرمی سے بچ کے اگر جہنم کی آگ میں پڑتے ہیں تو یہ نقصان ہے۔

منافقین اب روئیں زیادہ اور ہنسیں کم

فَلْيَضْحَكُوْا قَلِيْلًا وَّلْيَبْكُوْا كَثِيْرًا: خبر کے طور پر تو اس کا ترجمہ میں نے آپ کو سمجھایا، جس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے ہنسنے کا زمانہ تھوڑا ہے اور ان کے رونے کا زمانہ زیادہ ہے، یہ چند دن ہیں جن میں یہ خوش ہو رہے ہیں، یہ ہنسنے کے دن تھوڑے ہیں، اور رونے کا زمانہ زیادہ ہے، اور یہ بدلہ دیے جائیں گے اپنے ان کاموں کا جو یہ کرتے ہیں، روئیں گے زیادہ دیر، یعنی آخرت میں، اب یہاں دنیا میں تو خوش ہیں، کہ ہم نے بڑا اچھا کیا، سائے میں بیٹھے رہ گئے، دھوپ میں نہیں نکلے، تو یہ خبر کے طور پر ہے، ''یہ ہنسیں گے تھوڑی دیر، روئیں گے زیادہ زمانہ'' یعنی رونے کا زمانہ زیادہ دراز ہے۔ اور اگر اس کو انشاء کے طور پہ ہی ذکر کیا جائے تو پھر بھی بڑا لطیف معنی پیدا ہو جاتا ہے، کہ اپنے اس کردار پر یہ تو خوش ہیں، بغلیں بجاتے ہیں، ہنستے ہیں کہ اچھا ہوگیا، ہمیں چھٹی مل گئی، دیکھو! ہم نے کیسا بہانہ کیا، مصیبت سے بچ گئے، اپنی اس حالت پہ خوش ہیں، تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں یہ تھوڑا ہنسیں اور روئیں زیادہ، ان کا یہ کردار رونے کے قابل ہے ہنسنے کے قابل نہیں ہے، یہ بات رونے کی ہے ہنسنے کی نہیں ہے، جو کام ان سے ہوگیا، جو کچھ یہ کر بیٹھے، جس قسم کا کردار انہوں نے نمایاں کیا، اس پہ ان کو ہنسنا نہیں چاہیے رونا چاہیے، یہ رونے کی بات ہے ہنسنے کی نہیں ''تھوڑا ہنسیں، زیادہ روئیں'' تھوڑا ہنسیں کہ ظاہری طور پر فائدہ ہے، اور زیادہ روئیں کہ حقیقت میں برباد ہوگئے، ان کا یہ کردار ہنسنے کا نہیں، رونے کا ہے۔ ''بدلہ دیے جائیں گے اس کام کا جو یہ کرتے ہیں''۔ ''اگر اللہ تعالیٰ آپ کو واپس لے جائے ان میں سے ایک طائفہ کی طرف'' اگر کا مطلب یہ ہے کہ ہو سکتا ہے کہ آپ کے جانے سے پہلے کچھ مر ہی جائیں۔ ''اگر ان میں سے ایک طائفہ کی طرف اللہ تعالیٰ تمہیں واپس لے جائے پھر یہ تجھ سے اجازت مانگیں نکلنے کی'' آئندہ کے لیے کہیں کہ ہم آپ کے ساتھ جہاد پہ چلتے ہیں ''آپ کہہ دیجئے! ہرگز نہیں نکلو گے تم میرے ساتھ کبھی بھی، اور نہیں لڑو گے تم میرے ساتھ مل کر کسی دشمن سے، تم نے پسند کر لیا بیٹھ رہنا پہلی مرتبہ، اب بیٹھے رہو پیچھے رہنے والوں کے ساتھ'' یعنی اب معاملہ بالکل صاف کر دو، کہ بھئی! بس نکے رہو، اب جو کہتے ہو کہ ہم ساتھ جائیں گے، ہمیں نہ تم پر اعتماد ہے، نہ ہم تمہیں لے جانا چاہتے ہیں، جب ایک موقع تھا اس وقت تم ساتھ چلے نہیں، اب بیٹھے گھروں میں، ہمیں تمہاری کوئی ضرورت نہیں ہے، صفائی سے کہہ دیں، اب ان کو کاٹ دیں، جماعت میں سے علیحدہ کر دیں، شامل ہونا بھی چاہتیں تو اب ان کو ساتھ شامل نہ کرو، انہیں کہہ دو جیسے پہلے خوش ہو گئے تھے بیٹھنے کے ساتھ، اب بھی جاؤ، جا کے بیٹھو پیچھے رہنے والوں کے ساتھ۔

نمایاں منافقین کے جنازے اور احتراماً ان کی قبر پر کھڑا ہونے کی ممانعت

اب اگلی بات اور زیادہ نمایاں کر دی کہ وہ منافقین چونکہ ظاہری طور پر مسلمانوں کے ساتھ ملے جلے رہتے تھے، ان کے ساتھ معاملہ مسلمانوں جیسا ہوتا تھا، تو زندگی کا آخری آخری معاملہ ایک یہی ہوتا ہے، کہ ایک مسلمان مرجائے تو مسلمانوں کی جماعت اُسے نہلائے، کفن دے، اٹھائے، عزت احترام کے ساتھ جا کر اُس کا جنازہ پڑھے، دُعاؤں کے ساتھ اُس کو رخصت کرے، یہ ایک اعزاز ہے جو مسلمان آدمی کے لیے مسلمان جماعت کی طرف سے ہوتا ہے، تو اللہ تعالیٰ نے یہاں سرورِ کائنات ﷺ کو منع کر دیا، کہ اب یہ جو نمایاں قسم کے منافق ہیں ان کا آئندہ کے لئے نمازِ جنازہ پڑھنے کی بھی اجازت نہیں ہے، اور ان کے کفن دفن کے لیے وہاں اعزازاً جا کے کھڑا ہونے کی بھی ضرورت نہیں، ایک ہے کہ عبرت حاصل کرنے کے لیے یا کسی اور کام کے لیے قبرستان چلے گئے، وہ ایک علیحدہ بات ہے، یہاں یہ ہے کہ جس طرح سے محبت کے ساتھ اکراماً جا کے انسان کسی قبر پہ کھڑا ہوتا ہے، قبر والے کے ساتھ دلچسپی لیتا ہے، تو ایسا کرنے کی بھی اجازت نہیں، نہ ان کا جنازہ پڑھو، نہ ایصال ثواب کے لیے، فاتحہ خوانی کے لئے، اکرام و اعزاز ظاہر کرنے کے لئے ان کی قبر کے پاس جا کے کھڑے ہوؤ، ان کو بالکل ممتاز کر دو۔

”لَا تُصَلِّ عَلٰٓی اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا“ کا پس منظر

عبداللہ بن اُبی ابن سلول، اُبی اس کا باپ ہے، سلول اس کی ماں ہے، اس لیے اس کو یوں پڑھا جاتا ہے ”عَبْدُاللّٰہِ بْنُ اُبَیٍّ اِبْنُ سَلُوْلٍ“ ابنِ سلول نہیں پڑھا جاتا، کیونکہ یہ ”اِبنِ اُبَیٍّ“ کی صفت نہیں ہے کہ ”اُبَی“، ”سلول“ کا بیٹا ہو، ایسی بات نہیں ہے، بلکہ ابنُ سلول براہِ راست عبدُ اللہِ کی صفت ہے، ”سلول“ اس کی ماں کا نام ہے، ”سلول“ اس کے باپ کا نام نہیں ہے، یہ ”رئیس المنافقین“ تھا، اس کا نفاق بہت کھلا ہوا تھا، یہ مرگیا، جب مرگیا تو اس کا بیٹا اس کا نام بھی عبداللہ ہے، اور وہ مخلص ہے، وہ سرورِ کائنات ﷺ کے پاس آیا اور آ کر اُس نے اطلاع دی کہ عبداللہ بن اُبیّ وفات پا گیا ہے، یا رسول اللہ! آپ اپنی قمیص دے دیجئے، میں اُس کو کفن میں دے دُوں، آپ ﷺ نے اُس کو اپنی قمیص دی کفن میں دینے کے لئے، اس میں عبداللہ یعنی جو بیٹا تھا اس کو خوش کرنا مقصود تھا جو کہ مخلص تھا، دوسرے یہ کہ کہتے ہیں کہ عبداللہ بن اُبیّ کا ایک احسان بھی تھا جس کا بدلہ رسول اللہ ﷺ یہیں چکانا چاہتے تھے، کہ جس وقت بدر کے قیدی آئے ہیں، تو اُن گرفتار ہونے والوں میں حضور ﷺ کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ بھی تھے، اور اُن کے بدن پر قمیص نہیں تھی، تو رسول اللہ ﷺ نے چاہا کہ کوئی شخص اس کو اپنی قمیص پہنا دے تو حضرت عباس رضی اللہ عنہ چونکہ دراز قد کے تھے، تو کسی دوسرے کی قمیص ان پر منطبق نہیں ہوتی تھی، تو عبداللہ بن اُبیّ کی قمیص اُن کے فٹ آ گئی، تو اس نے حضور ﷺ کے چچا کو قمیص پہنائی تھی، تو رسول اللہ ﷺ نے اس کا احسان باقی نہیں رکھنا چاہا بلکہ اُس کو اپنی قمیص کفن میں دے دی، اور اُس کے کفن میں حضور ﷺ نے تبرک کے طور پر اپنا لعابِ دہن بھی ڈالا، اس طرح سے اُس کے ساتھ معاملہ کیا، اور اُس کے بیٹے کو یہ کہا کہ جب جنازہ تیار ہو جائے تو مجھے اطلاع دے دینا، آپ ﷺ کو اطلاع ملی تو آپ ﷺ جنازہ پڑھانے کے لیے تیار ہو گئے، اور وہ آیت پہلے اُتر چکی تھی اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ۔ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ آگے آ رہے

ہو گئے، اور حضور ﷺ کا کپڑا پکڑ لیا، کہنے لگے: یا رسول اللہ! اس منافق کا جنازہ پڑھانے کے لیے جا رہے ہو؟ اس نے فلاں وقت یوں کہا تھا، فلاں وقت یوں کہا تھا، اور اللہ نے کہہ دیا ہے کہ ان کے لیے اِستغفار نہ کرو، تو آپ ان کا جنازہ پڑھانے کے لیے کیسے جا رہے ہیں؟ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آگے سے رُکاوٹ ڈال دی، حضور ﷺ نے فرمانے لگے کہ مجھے اللہ نے کوئی منع نہیں کیا، اختیار دیا ہے کہ تو اِستغفار کر، یا نہ کر، اگر مجھے معلوم ہو جائے کہ ستر دفعہ سے زیادہ اِستغفار کرنے کے ساتھ یہ بخشا جا سکتا ہے، تو میں ستر دفعہ سے بھی زیادہ اِستغفار کروں گا، یوں کہہ کر دامن چھڑایا اور جنازہ پڑھانے کے لیے چلے گئے، اب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مشورہ تھا، لیکن جب آپ نے نہیں مانا، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی ساتھ ہی ہو گئے، پھر یہ نہیں کہ احتجاج کر کے بیٹھ جاتے، کہ جب میری نہیں مانی تو میں ہڑتال کرتا ہوں، تو احتجاج نہیں کیا، مشورہ تھا، جب نہیں مانا گیا تو وہ بھی ساتھ ہو گئے۔ اب جنازہ تو پڑھ لیا، لیکن اللہ کی طرف سے یہ حکم آ گیا کہ لَا تُصَلِّ عَلٰٓى اَحَدٍ مِّنْهُمْ، ان کا جنازہ بالکل نہیں پڑھنا چاہیے، آئندہ کے لیے ممانعت کر دی، باقی حضور ﷺ نے اپنے اس عمل کی خود وضاحت کی کہ نہ میری قمیص اس کے لیے مفید، نہ میرا تھوکنا اس کے لیے مفید، لیکن میں اس کے ساتھ حسنِ سلوک کر کے یہ چاہتا ہوں کہ اس کے متعلقین پہ اس کا اثر پڑے، اور اس اخلاق سے متاثر ہو کے کم از کم وہ تو سیدھی طرح سے مسلمان بن جائیں، دوسروں پر اچھا اثر ڈالنے کے لیے ایسا کیا، سرورِ کائنات ﷺ کے ذہن میں یہ مصلحت تھی۔

سَروَرِ کائنات ﷺ اور سیّدنا عمر رضی اللہ عنہ میں اِختلافِ رائے کی وجہ

اب سوال یہ ہے کہ یہی آیت مختلف فیہ ہوئی حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضور ﷺ کے درمیان، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہتے تھے کہ آپ کو اِستغفار کرنے سے روک دیا گیا ہے، حضور ﷺ کہتے تھے کہ نہیں روکا گیا، اب آیت ایک ہی ہے، عربی الفاظ ہیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کیسے سمجھا کہ یہاں سے روک دیا گیا ہے، اور حضور ﷺ نے کیسے سمجھا کہ نہیں روکا گیا، یہ لفظوں سے استدلال کس طرح ہوا؟ دونوں کے سامنے ایک ہی آیت ہے، ایک سمجھتا ہے کہ ممانعت ہے، اور ایک سمجھتا ہے کہ ممانعت نہیں ہے بلکہ اباحت ہے اگر کرنا چاہوں تو کر سکتا ہوں، تو اصل بات یہ ہے کہ اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ یہ جو ترکیب ہے اپنی وضعی حیثیت سے نہ یہ ممانعت پر دلالت کرتی ہے، اور نہ اجازت پر دلالت کرتی ہے، یہ ترکیب دونوں باتوں کو برابر ٹھہرانے کے لیے ہے کہ استغفار کرو یا نہ کرو، دونوں باتیں برابر ہیں، ان کے اوپر کوئی فائدہ نقصان مرتب ہونے والا نہیں، کرو یا نہ کرو دونوں باتیں برابر ہیں، جیسے کرنا مفید نہیں اسی طرح نہ کرنا بھی مفید نہیں ہے، دونوں ایک ہی چیز ہیں، ان کو کوئی فائدہ پہنچنے والا نہیں، اب اگر تو کوئی اور خارجی مصلحت ہو جائے تو اس کام کے کرنے کو بھی ترجیح دی جا سکتی ہے، اور اگر کوئی خارجی مصلحت ایسی آ جائے کہ نہ کرنا بہتر ہے تو نہ کرنے کو ترجیح دی جا سکتی ہے، اس میں یہ تو بتایا گیا کہ آپ کا اِستغفار اور عدمِ اِستغفار دونوں برابر ہیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ذہن میں تو یہ بات تھی، کہ اگر ان منافقوں کے ساتھ یوں ہی دلداری رہی تو اس میں مخلصین کی حوصلہ شکنی ہے، کہ یہاں تو جی! دشمن ہو دوست ہو سب ایک ہی کانٹے میں تلتے ہیں، کوئی مخلص ہو، کوئی غیر مخلص ہو، کوئی مخالفت کرتا رہے، کوئی موافقت کرتا رہے، ان کے ہاں کوئی فرق ہی نہیں،

تو جس وقت مخلصین اس قسم کا حال دیکھتے ہیں تو بسا اوقات مخلصین کی حوصلہ شکنی ہوتی ہے، اور جو منافق اور منکر ہوتے ہیں ان کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے، کہ جو چاہو کرو، وہ تو دُعائیں بھی کرتے ہیں اور استغفار بھی کرتے ہیں، بس ایسے ہی معاملہ چلتا ہے، ان پر رُعب نہیں بیٹھتا، اور ان کی حوصلہ شکنی نہیں ہوتی، اور مخلصین کی حوصلہ شکنی ہو جاتی ہے کہ اس مجلس میں دوست دشمن کا کوئی امتیاز نہیں ہے، دشمنوں کے ساتھ بھی وہی معاملہ ہے، دوستوں کے ساتھ بھی وہی معاملہ ہے، تو پھر کیا ضرورت ہے کہ ہم اس طرح سے بڑھ بڑھ کے بازی لگائیں، اس قسم کے اثرات مرتب ہو سکتے ہیں، اس لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تو مصلحت یہ سمجھی کہ ان کے لیے استغفار نہیں کرنا چاہیے، جنازہ نہیں پڑھنا چاہیے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مصلحت دوسری سمجھی کہ اگر اس قسم کے دشمن کے ساتھ بھی یوں معاملہ کرو ں گا، تو ہو سکتا ہے کہ اخلاق سے متأثر ہو کر ان کے متعلقین ہی مخلص ہو جائیں، اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے استغفار کرنے کو ترجیح دی، جیسے دوسری جگہ قرآنِ کریم میں بالکل اسی قسم کی ترکیب ہے: سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ (البقرہ:٦، یٰس:١٠)، ان پر برابر ہے کہ آپ انہیں ڈرائیں یا نہ ڈرائیں، یہ ایمان نہیں لائیں گے، یہ ترکیب بھی ایسے ہی ہے، لیکن اس کے باوجود حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کو تبلیغ بھی کرتے تھے، سمجھاتے بھی تھے، ہر طرح سے ان کے اوپر محنت بھی کرتے تھے، تو وہاں (آیت) سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ممانعت نہیں سمجھی کہ تبلیغ کرنا منع ہے، لیکن دوسری مصلحت کے طور پر تبلیغ میں فائدے محسوس کیے گئے جن کی بنا پر ان کے لئے مفید ہو یا نہ ہو، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تبلیغ سے اور کئی قسم کے فوائد نمایاں ہوتے تھے، تو وہاں تبلیغ کا ممنوع ہونا نہیں سمجھا گیا، بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ (سورۂ مائدہ:٦٧) کے تحت حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہر بات ان کو پہنچاتے تھے، چاہے ان کو مفید ہو چاہے مفید نہ ہو، تو یہ ترکیب اپنی ذاتی حیثیت سے نہ ممانعت پر دلالت کرتی ہے، اور نہ اجازت پر دلالت کرتی ہے، بلکہ ممانعت یا اجازت خارجی قرائن کے ساتھ سمجھی جاتی ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے اور قرائن تھے، سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اور قرائن تھے۔

سوال:- حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے لعاب مبارک کہاں ڈالا تھا؟

جواب:- کفن میں!

سوال:- پھر یہ جو آتا ہے کہ جس کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بدن کا کوئی حصہ لگ جائے تو اس کو آگ نہیں چھوئے گی۔

جواب:- یہ کہاں آتا ہے کہ کافر کے ساتھ بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بدن کا کوئی حصہ لگ جائے تو اس کو بھی آگ نہیں چھوئے گی، مکہ کے مشرک بچپن میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو گود میں اُٹھاتے رہے ہوں گے، تو ان کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا بدن نہیں لگا؟ اصل میں یہ سب مغفرت کے ذرائع اور وسیلے ہیں، لیکن ان کے لئے ایمان شرط ہے، کہ اگر ایمان ہو تو پھر یہ چیزیں ترقی درجات کا ذریعہ بن سکتی ہیں، اللہ کی رحمت حاصل کرنے کا ذریعہ بن سکتی ہیں، اگر ایمان نہیں تو پھر کچھ بھی نہیں۔

''نماز نہ پڑھئے ان میں سے کسی کی کبھی بھی جو مر جائے'' وَلَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ: اور ان کی قبر پر جا کے کھڑے نہ ہوئیے، یعنی ان کے اکرام کے طور پر، محبت کے اظہار کے لئے، باقی! اگر کوئی انتظام کرنا پڑ جائے، یا کوئی عبرت حاصل کرنے کے لئے، یا کسی اور مصلحت سے آدمی قبرستان جائے تو کافر کی قبر کے پاس کھڑا ہونا ممنوع نہیں ہے، لیکن عزت اکرام محبت کا اظہار ٹھیک نہیں۔

''تبرکات'' کی شرعی حیثیت

تو یہ تبرکات وسائل ہیں، ایمان کے ساتھ تو یہ یقیناً ترقی کا باعث ہیں، اب یہ سمجھ لینا کہ چونکہ فلاں کے لئے مفید نہیں اس لیے بالکل ہی مفید نہیں، یہ بات غلط ہے۔ حضرت مدنی ؒ نے اپنے بزرگوں کے ملبوسات کے بعض ٹکڑے محفوظ رکھے ہوئے تھے اور ان کی وصیت تھی کہ ان سب کو میرے کفن کے ساتھ جوڑ دینا، چنانچہ کہتے ہیں کہ جتنے بھی مختلف بزرگوں کے ملبوسات کے ٹکڑے تھے وہ سارے آپ کے کفن کے ساتھ جوڑے گئے، تو اس قسم کے تبرکات کو لوگ اپنے لیے وسیلہ نجات سمجھتے ہیں۔ ابھی اسی سفر میں مدینہ منورہ میں ایک غیر مقلد تھا جس کے ساتھ ہم نے جدہ کی طرف آنے کے لئے بات کی، دو کاروں کی ضرورت تھی، ہم نے تو اپنی کار کا پہلے ہی انتظام کیا ہوا تھا، وہ تو تبلیغی جماعت کا تھا، اور تھا بھی ہمارے جھنگ کے علاقے کا، اور دوسرے حاجی خلیل صاحب تھے اشرف جھنکوی کے چچا، ان کے بال بچے ساتھ تھے، وہ کہنے لگے کہ میرے لیے بھی انتظام کرلو، اگر بڑی ویگن پر نہیں جانا تو پھر کاریں دو کر لیتے ہیں، تو ہم ایک لڑکے کو بلایا وہ غیر مقلد تھا، اور یونیورسٹی میں پڑھتا تھا، وہ کہنے لگا کہ میں نے مکہ معظمہ جانا ہے، تو میں جدہ کی طرف سے چلا جاؤں گا، میں لے چلتا ہوں، تو اس کے ساتھ دو سو روپے میں گاڑی کر لی، تو مجلس میں بیٹھے ہوئے جنت البقیع کا تذکرہ ہوا کہ یہاں دفن ہونا مفید ہے وغیرہ، اصل میں ایک واقعہ پیش آیا تھا کہ ایک شخص مرگیا اور وہ تھا پاکستانی، اور اس کا کفیل چونکہ اس پر بہت خوش تھا، وہ کہنے لگا کہ ان کے گھر رابطہ قائم کر کے پتا کرلو، اگر وہ اس کی لاش کو منگوانا چاہتے ہیں، تو میں اپنے خرچ پر اس کی لاش پاکستان بھیج دیتا ہوں، ہمارے عارف شاہ صاحب مکی رباط والے اس سلسلے میں گفتگو کرتے پھر رہے تھے، کہ وہاں پاکستان میں رابطہ قائم کرلو، اگر وہ اس کی لاش کو پاکستان منگوانا چاہیں تو میں اپنے خرچ پر بھیج دیتا ہوں، تو اسی مجلس میں کسی نے کہا کہ کوئی بے وقوف ہی ہوگا جو مدینہ منورہ سے اس کی لاش کو پاکستان منگوائے، جنت البقیع میں دفن ہونے کے لئے تو لوگ کتنا کتنا سفر کر کے آتے ہیں، گھر بار چھوڑ کر آ کے بیٹھ جاتے ہیں۔ تو غیر مقلد بڑے سڑے ہوئے انداز میں کہتا ہے، کہ جنت البقیع میں کیا ہے؟ عبداللہ بن اُبیّ کی قبر جنت البقیع میں نہیں؟ اس کا مطلب تھا کہ عبداللہ بن اُبیّ کی قبر بھی تو جنت البقیع میں ہے، تو جنت البقیع میں دفن ہونے سے کیا ہو جاتا ہے...... تو یہ ذہن بھی غلط ہے، کہ ایک مؤمن کو کافر کی طرح سمجھ کر اس کے ساتھ بھی وہی لب ولہجہ اختیار کرلیا جائے۔ اگر ایک شخص کے پاس ایمان نہیں، تو اس کو تو آپ جتنے بھی نجات کے وسائل دے دیں وہ سب اس کے لئے بے کار ہیں، لیکن اگر کسی کے پاس ایمان ہے تو اس کے لیے دُعا بھی مفید، استغفار بھی مفید، جنازہ بھی مفید، اب انہیں کوئی کہے کہ عبداللہ بن اُبیّ کے لئے حضور ﷺ کا استغفار بھی مفید نہیں، پھر تمہارے لیے اور تمہارے باپ کے لیے استغفار کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ اس کا تو حضور ﷺ نے جنازہ بھی پڑھا، تب بھی کچھ نہیں بنا، تو پھر تمہارا بھی جنازہ پڑھنے کی کیا ضرورت ہے؟ اللہ نے بخشنا ہوگا تو ویسے بخش دے گا۔ تو یہ جتنے وسائل ہیں، یہ سب ایمان کے ساتھ تو مفید ہوتے ہیں، بغیر ایمان کے مفید نہیں ہیں، تو یہ سمجھنا کہ جب کافر کے لئے مفید نہیں تو مؤمن کے لئے بھی مفید نہیں، یہ بد دماغی ہے۔

اِنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ: بے شک انہوں نے کُفر کیا اللہ کے ساتھ اور اس کے رسول کے ساتھ، وَمَاتُوْا وَهُمْ فٰسِقُوْنَ: اور مر گئے اس حال میں کہ وہ نافرمان ہیں۔ اگلی آیت آپ کے سامنے پہلے بھی گزر چکی ہے وَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَاَوْلَادُهُمْ: آپ کو تعجب میں نہ ڈالیں ان کے مال اور ان کی اولاد۔ اگر بظاہر یہ مال اور اولاد والے نظر آرہے ہیں، تو آپ ان پر کوئی تعجب نہ کیجئے، یہ ان کے لیے نعمتیں نہیں، بلکہ یہ تو آلۂ عذاب ہیں، ''اللہ تعالیٰ ان کے ذریعے سے ان کو عذاب دے گا اور ان کی جانیں چلی جائیں گی اس حال میں کہ یہ کافر ہوں گے''، یعنی کُفر کی حالت میں ان کو موت آئے گی، اپنے مال اور اولاد کی وجہ سے اس طرح سے مست رہیں گے کہ ان کو اللہ یاد ہی نہیں آئے گا، مال بھی ان کے لیے نافرمانی کا باعث، اولاد بھی ان کے لیے نافرمانی کا باعث، اس طرح سے کُفر کی حالت میں ان کی جانیں نکل جائیں گی۔ ''اور جب کوئی سورت اُتاری جاتی ہے کہ اللہ پر ایمان لاؤ اور اللہ کے رسول کے ساتھ مل کر جہاد کرو، اسْتَاْذَنَكَ اُولُوا الطَّوْلِ مِنْهُمْ: تو قدرت والے، اہلِ مقدرت، جن کو جہاد کرنے کی قدرت ہے، وہ بھی چھٹی کی درخواستیں لے کے آجاتے ہیں، رخصت کی عرضیاں لے کے آجاتے ہیں، کہ ہمیں چھٹی دے دو، ہم نہیں جاسکتے، یہ مجبوری ہے، یہ مجبوری ہے۔'' کہتے ہیں کہ ہمیں چھوڑ دو، ہم پیچھے بیٹھنے والوں کے ساتھ ہی بیٹھے رہیں، خوش ہوگئے اس بات پر کہ یہ عورتوں اور بچوں کے ساتھ شامل ہو کے بیٹھیں''، یعنی ان کی غیرت ہی ماری گئی، ان کو حیا ہی نہیں آیا پیچھے چوڑیاں پہن کے بیٹھ رہنا، جس طرح سے عورتیں گھروں میں بیٹھی ہوتی ہیں، یہ کوئی مردوں کا کام ہے؟'' یہ پسند کرتے ہیں اس بات کو کہ پیچھے رہنے والی عورتوں کے ساتھ ہو جائیں'' چوڑیاں پہن کے گھر بیٹھ جائیں، جس طرح ہمارے ہاں کہتے ہیں، فلاں چوڑیاں پہن کے گھر بیٹھ گیا، یعنی عورتوں کی طرح، کہ جس طرح عورتوں کا کام ہے کہ گھر میں گھسی بیٹھی ہیں اسی طرح سے یہ گھر میں گھس کے بیٹھ گیا۔'' ان کے دل ہی مسخ ہوگئے، ان پہ مہر ہوگئی'' فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ: اب یہ سمجھتے نہیں کہ حیا کیا ہوتی ہے، مردانگی کیا ہوتی ہے، بے حیائی کیا ہے، مردوں کے حالات کس قسم کے ہونے چاہئیں، عورتوں کے ساتھ شامل ہونے کی خواہش دل میں کیوں پیدا ہو رہی ہے، یہ باتیں ان کی سمجھ میں نہیں آتیں۔ ''لیکن اللہ کا رسول اور وہ لوگ جو اللہ کے رسول کے ساتھ ایمان لائے ہیں'' جب اس قسم کا اعلان ہوتا ہے، کہ اللہ کے راستے میں جہاد کرو، تو وہ چھٹی کی عرضیاں اور درخواستیں لے کے نہیں آتے، بلکہ وہ تو مال اور سر اللہ کے راستے میں پیش کرتے ہیں، اللہ کے رسول کے سامنے مالوں کا اور جانوں کا نذرانہ پیش کرتے ہیں، وہ ان کی طرح رخصتیں نہیں مانگتے، جٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ: وہ جہاد کرتے ہیں اپنے مالوں کے ساتھ اور اپنی جانوں کے ساتھ، اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْخَيْرٰتُ: انہی کے لیے خوبیاں ہیں، انہی کے لئے بھلائیاں ہیں، وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ: اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ جَنّٰتٍ: تیار کیے اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے باغات تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ: ان کے نیچے سے نہریں جاری ہوں گی خٰلِدِيْنَ فِيْهَا: ہمیشہ ان باغات میں رہنے والے ہوں گے ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ: یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

(سفر کرتے ہوئے جس وقت ہم بدر کے مقام پہ پہنچے، ایک کار اسی غیر مقلد کی تھی، ایک ہمارے ساتھی کی تھی، تو وہاں ظہر

کی نماز پڑھ کے جب فارغ ہوئے تو میں نے حاجی خلیل صاحب سے کہا کہ شہداء کے مزار پر فاتحہ پڑھ کے چلتے ہیں، تو وہ غیر مقلد کہنے لگا کہ مجھے تو ذرا جلدی ہے، ہم سیدھے چلے جاتے ہیں، آپ ادھر سے ہو کے آجائیں، تو ہم اپنی کار لے کر شہداء کی طرف چلے گئے اور وہ سیدھے جدہ کی طرف چلے گئے۔ تو بعد میں مجھے حاجی خلیل صاحب نے سنایا کہ وہ غیر مقلد کہنے لگا کہ مولوی صاحب کو کیا ہوگیا؟ وہاں کیا رکھا ہے؟ ادھر کیوں چلے گئے؟ یعنی شہداء کی قبر پہ جانا بھی ان کے نزدیک ناگواری بات ہے)۔

وَجَآءَ الْمُعَذِّرُوْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ لِيُؤْذَنَ لَهُمْ وَقَعَدَ
بدویوں میں سے جھوٹے بہانے بنانے والے آگئے تاکہ انہیں اجازت دے دی جائے، اور بیٹھ رہے
الَّذِيْنَ كَذَبُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ؕ سَيُصِيْبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا
وہ لوگ جنہوں نے اللہ اور اللہ کے رسول سے جھوٹ بولا تھا، ان میں سے جو لوگ کافر رہیں گے
مِنْهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿٩٠﴾ لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَآءِ وَلَا عَلَى
عنقریب انہیں عذابِ الیم پہنچے گا ﴿٩٠﴾ نہیں ہے کمزوروں پر اور نہ
الْمَرْضٰى وَلَا عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ مَا يُنْفِقُوْنَ
بیماروں پر اور نہ ان لوگوں پر جو نہیں پاتے وہ چیز جس کو خرچ کریں
حَرَجٌ اِذَا نَصَحُوْا لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ؕ مَا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ مِنْ
(نہیں ہے ان پر) کوئی حرج جب وہ خیرخواہ رہیں اللہ اور اللہ کے رسول کے لیے، نیکوکاروں پر
سَبِيْلٍ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿٩١﴾ وَّلَا عَلَى الَّذِيْنَ اِذَا مَآ اَتَوْكَ
کوئی الزام نہیں، اللہ تعالیٰ بخشنے والا ہے رحم کرنے والا ہے ﴿٩١﴾ اور نہ اُن لوگوں پر کوئی حرج ہے جو جس وقت آپ کے پاس آئے
لِتَحْمِلَهُمْ قُلْتَ لَآ اَجِدُ مَآ اَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ ۪ تَوَلَّوْا وَّاَعْيُنُهُمْ
تاکہ آپ انہیں سوار کریں تو آپ نے کہہ دیا نہیں میں پاتا ایسی چیز جس پر میں تمہیں سوار کرادوں، وہ اُٹھ کر چلے گئے اور اُن کی آنکھیں
تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا اَلَّا يَجِدُوْا مَا يُنْفِقُوْنَ ﴿٩٢﴾ اِنَّمَا
بہہ رہی تھیں آنسوؤں سے غم کرنے کی وجہ سے اس بات پر کہ وہ نہیں پاتے ایسی چیز جس کو وہ خرچ کریں ﴿٩٢﴾ سوائے اس کے نہیں

السَّبِيۡلُ عَلَى الَّذِيۡنَ يَسۡتَاۡذِنُوۡنَكَ وَهُمۡ اَغۡنِيَآءُ‌ ۚ رَضُوۡا بِاَنۡ

کہ الزام تو اُن لوگوں پر ہے جو آپ سے اجازت طلب کرتے ہیں حالانکہ وہ مال دار ہیں، پسند کیا انہوں نے

يَّكُوۡنُوۡا مَعَ الۡخَوَالِفِ ۙ وَطَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوۡبِهِمۡ فَهُمۡ لَا يَعۡلَمُوۡنَ ﴿۹۳﴾

کہ ہو جائیں وہ خانہ نشین عورتوں کے ساتھ، اللہ تعالیٰ نے ان کے دِلوں پر مُہر کردی، پس وہ جانتے نہیں ﴿۹۳﴾

يَعۡتَذِرُوۡنَ اِلَيۡكُمۡ اِذَا رَجَعۡتُمۡ اِلَيۡهِمۡ‌ ؕ قُلْ لَّا تَعۡتَذِرُوۡا

عُذر بیان کریں گے تمہاری طرف جب تم اُن کی طرف لوٹ کے آؤ گے، آپ کہہ دیجئے کہ بہانے مت بناؤ

لَنۡ نُّؤۡمِنَ لَـكُمۡ قَدۡ نَـبَّاَنَا اللّٰهُ مِنۡ اَخۡبَارِكُمۡ‌ ؕ وَسَيَرَى اللّٰهُ

ہم تمہاری باتوں پر یقین ہرگز نہیں کریں گے، اللہ تعالیٰ نے ہمیں تمہارے حالات بتلا دیے ہیں، عنقریب دیکھے گا اللہ

عَمَلَـكُمۡ وَرَسُوۡلُهٗ ثُمَّ تُرَدُّوۡنَ اِلٰى عٰلِمِ الۡغَيۡبِ وَالشَّهَادَةِ

اور اس کا رسول تمہارے عمل کو پھر لوٹائے جاؤ گے ایسے کی طرف جو چھپی اور ظاہر سب باتوں کو جاننے والا ہے،

فَيُنَبِّئُكُمۡ بِمَا كُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۹۴﴾ سَيَحۡلِفُوۡنَ بِاللّٰهِ لَـكُمۡ اِذَا

پھر وہ تمہیں بتلائے گا جو تم کام کیا کرتے تھے ﴿۹۴﴾ عنقریب وہ اللہ کی قسم کھائیں گے تمہارے لیے جس وقت

انۡقَلَبۡتُمۡ اِلَيۡهِمۡ لِـتُعۡرِضُوۡا عَنۡهُمۡ‌ ؕ فَاَعۡرِضُوۡا عَنۡهُمۡ‌ ؕ اِنَّهُمۡ

تم ان کی طرف لوٹ کے جاؤ گے، تاکہ تم ان سے اِعراض کرجاؤ، تم ان سے منہ موڑ جاؤ، بے شک وہ

رِجۡسٌ‌ ۚ وَّمَاۡوٰٮهُمۡ جَهَـنَّمُ‌ ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوۡا يَكۡسِبُوۡنَ ﴿۹۵﴾ يَحۡلِفُوۡنَ

ناپاک ہیں، اور اُن کا ٹھکانا جہنم ہے، بدلے کے طور پر ان کاموں کے جو وہ کرتے تھے ﴿۹۵﴾ قسمیں کھائیں گے

لَـكُمۡ لِتَرۡضَوۡا عَنۡهُمۡ‌ ۚ فَاِنۡ تَرۡضَوۡا عَنۡهُمۡ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَرۡضٰى

تمہارے لیے تاکہ تم ان سے راضی ہو جاؤ، پس اگر تم ان سے راضی ہو بھی گئے تو بے شک اللہ تعالیٰ راضی نہیں ہوتا

عَنِ الۡقَوۡمِ الۡفٰسِقِيۡنَ ﴿۹۶﴾ اَلۡاَعۡرَابُ اَشَدُّ كُفۡرًا وَّنِفَاقًا وَّاَجۡدَرُ

نافرمان لوگوں سے ﴿۹۶﴾ یہ بدوی لوگ زیادہ سخت ہیں از روئے کفر اور نفاق کے اور یہ زیادہ لائق ہیں

أَلَّا يَعْلَمُوا حُدُودَ مَا أَنزَلَ اللَّهُ عَلَىٰ رَسُولِهِ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ

اس بات کے کہ نہ جانیں اس چیز کی حدود کو جو اللہ نے اُتاری ہے اپنے رسول پر، اللہ تعالیٰ علم والا ہے

حَكِيمٌ ﴿٩٧﴾ وَمِنَ الْأَعْرَابِ مَن يَتَّخِذُ مَا يُنفِقُ مَغْرَمًا وَيَتَرَبَّصُ

حکمت والا ہے ﴿٩٧﴾ بدویوں میں سے بعض وہ ہے جو قرار دیتا ہے تاوان اس مال کو جس کو کہ خرچ کرتا ہے، اور انتظار کرتا ہے

بِكُمُ الدَّوَائِرَ ۚ عَلَيْهِمْ دَائِرَةُ السَّوْءِ ۗ وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿٩٨﴾

تمہارے متعلق گردشوں کا، انہی پر ہی بری گردش پڑنے والی ہے، اللہ تعالیٰ سننے والا ہے جاننے والا ہے ﴿٩٨﴾

وَمِنَ الْأَعْرَابِ مَن يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَيَتَّخِذُ مَا

اور ان بدویوں میں سے بعض وہ بھی ہے جو اللہ پر ایمان لاتا ہے اور یوم آخر پر ایمان لاتا ہے اور قرار دیتا ہے اُس چیز کو جس کو کہ

يُنفِقُ قُرُبَاتٍ عِندَ اللَّهِ وَصَلَوَاتِ الرَّسُولِ ۚ أَلَا إِنَّهَا قُرْبَةٌ لَّهُمْ ۚ

خرچ کرتا ہے اللہ تعالیٰ کے نزدیک قربت کے ذرائع اور رسول کی دُعاؤں کا ذریعہ، خبردار! بے شک اُن کے مال اُن کے لئے قربت ہیں،

سَيُدْخِلُهُمُ اللَّهُ فِي رَحْمَتِهِ ۗ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿٩٩﴾

عنقریب داخل کرے گا اللہ تعالیٰ اِن کو اپنی رحمت میں، بے شک اللہ تعالیٰ بخشنے والا ہے رحم کرنے والا ہے ﴿٩٩﴾

وَالسَّابِقُونَ الْأَوَّلُونَ مِنَ الْمُهَاجِرِينَ وَالْأَنصَارِ وَالَّذِينَ اتَّبَعُوهُم

وہ لوگ جو سب سے پہلے سبقت لے جانے والے ہیں مہاجرین اور انصار میں سے اور وہ لوگ جنہوں نے اُن کی اتباع کی

بِإِحْسَانٍ رَّضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ وَأَعَدَّ لَهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي

اچھے طریقے سے، اللہ اُن سے راضی ہوگیا، وہ اللہ سے راضی ہوگئے، اور تیار کیے اللہ تعالیٰ نے اُن کے لئے باغات، جاری ہوں گی

تَحْتَهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ۚ ذَٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ﴿١٠٠﴾

اُن کے نیچے سے نہریں، اُن میں ہمیشہ رہنے والے ہوں گے، یہ بہت بڑی کامیابی ہے ﴿١٠٠﴾

خلاصہ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ وَجَآءَ الْمُعَذِّرُوْنَ: یا تو یہ باب افتعال سے ہے اِعْتَذَرَ يَعْتَذِرُ مُعْتَذِرُوْن، تاء کو ذال سے

بدل کر ذال کو ذال میں ادغام کیا، تو اس کا اصل معتذرون بھی نکل سکتا ہے، یا یہ باب تفعیل سے ہے اور باب تفعیل تو واضح ہے عَذَّرَ يُعَذِّرُ تَعْذِيرٌ - اِعْتَذَرَ جس وقت باب افتعال اپنے ظاہر پہ ہو تو اس کا معنی ہوتا ہے عذر بیان کرنا، جس میں دونوں ہی احتمال ہوتے ہیں کہ اس کا عذر صحیح ہے یا غلط، جو جھوٹ موٹ کا عذر پیش کر رہا ہو اس پر بھی اِعْتَذَرَ صادق آتا ہے، اور جو صحیح عذر کر رہا ہو اس پر بھی اِعْتَذَرَ صادق آتا ہے، لیکن جس وقت اس میں تاء کو ذال میں ادغام کر کے، یا اس کو باب تفعیل پہ لے جائیں عَذَّرَ يُعَذِّرُ تَعْذِيرٌ، تو پھر اس کے مفہوم میں صرف جھوٹے عذر کو داخل کرتے ہیں، جھوٹ موٹ عذر کرنا، اس میں پھر سچائی کا احتمال نہیں ہوتا، جھوٹے عذر بیان کرنے والے کے لئے عَذَّرَ کا لفظ استعمال ہوتا ہے، یہاں قرآنِ کریم میں جو مُعَذِّرُون کا لفظ استعمال کیا گیا تو اس لفظ میں یہ تاثر دے دیا گیا کہ یہ صرف محض جھوٹے عذر بیان کرنے والے ہیں۔ جَآءَ الْمُعَذِّرُوْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ: اَعراب یہ اسم جمع ہے، اور یہ لفظ بولا شہروں سے باہر جنگلوں میں رہنے والوں پر بولا جاتا ہے، جیسے لوگ خیموں میں رہتے ہیں، خانہ بدوش قسم کے لوگ، تو عرب کے اندر بھی چونکہ اکثر آبادی اسی طرح سے تھی جنہیں بادیہ نشین کہا جاتا ہے، اہلِ بوادی، جنگلوں میں رہنے والے، وہیں اپنی بکریاں رکھتے ہیں، اُونٹ رکھتے ہیں، چراتے ہیں، گزارہ کرتے ہیں، اور وہ مستقل آبادیوں میں نہیں رہتے، ان کو ''اَعراب'' کہا جاتا ہے، اور اگر اس کا مفرد لانا ہو تو ''اَعرابی'' کہیں گے، جس طرح سے ''انصار'' ایک جماعت ہے، ''انصارِی'' ایک فرد کے لئے بولا جائے گا، اسی طرح سے یہاں ایک فرد کے لئے ''اَعرابی'' کا لفظ بولیں گے، جن کو ''بدوی'' کہتے ہیں، ''بَدو'' کا لفظ شہر سے باہر والی آبادی کے لئے بولا جاتا ہے، تو باہر رہنے والے، جنگل میں رہنے والے، آبادیوں سے دُور، خانہ بدوش قسم کے لوگ، ان کو بدوی کہا جاتا ہے۔ ''بدویوں میں سے جھوٹے بہانے بنانے والے لوگ آ گئے'' جھوٹے بہانے بنانے والے یہ مفہوم لفظ مُعَذِّرُون سے اخذ کیا گیا ہے، جس طرح سے میں نے آپ کے سامنے اس کا لغوی مفہوم ذکر کیا، ''بدویوں میں سے جھوٹے بہانہ باز آ گئے'' لِيُؤْذَنَ لَهُمْ: تاکہ انہیں اجازت دی جائے، وَقَعَدَ الَّذِيْنَ كَذَبُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ: اور بیٹھ رہے وہ لوگ جنہوں نے اللہ اور اللہ کے رسول سے جھوٹ بولا تھا، سَيُصِيْبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ: ان میں سے جو لوگ کافر ہیں گے عنقریب انہیں عذابِ الیم پہنچے گا۔ اگر تو مِنْهُمْ کی ضمیر اَلْمُعَذِّرُوْنَ کی طرف لوٹائی جائے یا اَلَّذِيْنَ كَذَبُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ کی طرف لوٹائی جائے تو پھر تو اس کا ترجمہ یونہی کرنا ہے ''ان میں سے جو لوگ کافر رہیں گے'' یعنی جو توبہ نہیں کریں گے، سیدھے راستے پہ نہیں آئیں گے، آخر وقت تک کُفر پہ رہیں گے تو عنقریب انہیں عذابِ الیم پہنچے گا۔ اور اگر یہ ضمیر اَعراب کی طرف لوٹائی جائے تو پھر تبعیض کا مفہوم اس طرح سے ادا کر لیا جائے گا ''ان اَعراب میں سے جو لوگ کافر ہیں'' یعنی دلی طور پر جنہوں نے کُفر کیا ہے اُن کو عذابِ الیم پہنچے گا۔ لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَآءِ وَلَا عَلَى الْمَرْضٰى: ضعفاء ضعیف کی جمع، مرضیٰ مریض کی جمع۔ نہیں ہے کمزوروں پر اور نہ بیماروں پر، وَلَا عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ مَا يُنْفِقُوْنَ: اور نہ ان لوگوں پر جو نہیں پاتے وہ چیز جس کو خرچ کریں، جن کو خرچ کرنے کے لئے کچھ نہیں ملتا، جن کے پاس خرچ کرنے کے لئے کچھ ہے نہیں، حَرَجٌ: لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَآءِ حَرَجٌ، ان کمزوروں پر ضعیفوں پر اور بیماروں پر اور ان لوگوں پر جو خرچ کرنے کے لئے کچھ نہیں پاتے کوئی حرج نہیں، تو وَلَا عَلَى الْمَرْضٰى میں لَا، اور وَلَا عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ میں لَا یہ لَيْسَ والے معنی کی تاکید کے لئے ہے، تو ترجمہ اکٹھا ہو جائے گا، نفی کو ایک ہی دفعہ ظاہر کیجئے ''کمزوروں پر، بیماروں پر اور جن کو خرچ کے لئے کچھ نہیں ملتا اُن پر کوئی حرج

نہیں" نہ اُن پر حرج نہ ان پر حرج، اِذَا نَصَحُوْا لِلّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ: جبکہ وہ خیر خواہی کریں اللہ اور اللہ کے رسول کے لئے۔ نُصح خیر خواہی کو کہتے ہیں، یہ جو نصیحت کی جایا کرتی ہے تو یہ بھی خیر خواہی کی بات ہوتی ہے۔ "جب وہ خیر خواہ رہیں اللہ کے لئے اور اللہ کے رسول کے لئے" مَا عَلَی الْمُحْسِنِیْنَ مِنْ سَبِیْلٍ: نیکوکاروں پر کوئی الزام نہیں وَاللّٰہُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ: اللہ تعالیٰ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔ وَّلَا عَلَی الَّذِیْنَ اِذَا مَآ اَتَوْکَ: اور نہ ان لوگوں پر کوئی حرج ہے جو جس وقت آپ کے پاس آئے لِتَحْمِلَھُمْ: تاکہ آپ انہیں سوار کریں، سواری کے لئے کوئی جانور دیں، قُلْتَ: آپ نے کہہ دیا لَآ اَجِدُ مَآ اَحْمِلُکُمْ عَلَیْہِ: نہیں پاتا میں ایسی چیز جس پر میں تمہیں سوار کرادوں، تَوَلَّوْا: وہ اٹھ کر چلے گئے وَّاَعْیُنُھُمْ: اور ان کی آنکھیں تَفِیْضُ مِنَ الدَّمْعِ: بہہ رہیں تھیں آنسوؤں سے۔ فَاضَ یَفِیْضُ: بہنا۔ ان کی آنکھیں بہہ رہی تھیں آنسوؤں سے، حَزَنًا: غم کرنے کی وجہ سے اس بات پر اَلَّا یَجِدُوْا مَا یُنْفِقُوْنَ: کہ وہ نہیں پاتے ایسی چیز جس کو وہ خرچ کریں، اس بات پر غم کرتے ہوئے ان کی آنکھیں آنسوؤں سے بہہ رہی تھیں، اِنَّمَا السَّبِیْلُ عَلَی الَّذِیْنَ یَسْتَاْذِنُوْنَکَ: سوائے اس نہیں کہ الزام تو ان لوگوں پر ہے جو آپ سے اجازت طلب کرتے ہیں وَھُمْ اَغْنِیَآءُ: حالانکہ وہ مال دار ہیں، اغنیاء غنی کی جمع، رَضُوْا بِاَنْ یَّکُوْنُوْا مَعَ الْخَوَالِفِ: خوالف خالفہ کی جمع، یہ لفظ پہلے بھی آیا تھا، عورتوں کے لئے بولا جاتا ہے۔ پسند کیا انہوں نے کہ ہو جائیں وہ خانہ نشین عورتوں کے ساتھ وَطَبَعَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ: اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر مہر کر دی، فَھُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ: پس وہ جانتے نہیں۔

یَعْتَذِرُوْنَ اِلَیْکُمْ اِذَا رَجَعْتُمْ: عذر بیان کریں گے تمہاری طرف جب تم ان کی طرف لوٹ کے آؤ گے، قُلْ لَّا تَعْتَذِرُوْا: آپ کہہ دیجئے کہ عذر نہ بیان کرو، بہانے مت بناؤ، لَنْ نُّؤْمِنَ لَکُمْ: اٰمَنَ کا صلہ جس وقت لام آجائے تو یہ یقین کرنے کے معنی میں ہوتا ہے۔ ہم تمہاری باتوں پر یقین ہرگز نہیں کریں گے، قَدْ نَبَّاَنَا اللّٰہُ مِنْ اَخْبَارِکُمْ: اللہ تعالیٰ نے ہمیں تمہارے حالات بتلادیے ہیں، نَبَّاَ یُنَبِّئُ۔ اخبار خبر کی جمع ہے۔ تمہاری خبریں، تمہارے حالات اللہ تعالیٰ نے ہمیں بتا دیے ہیں، وَسَیَرَی اللّٰہُ عَمَلَکُمْ وَرَسُوْلُہٗ: عنقریب آنے والے وقت میں دیکھے گا اللہ اور اس کا رسول تمہارے عمل کو، ثُمَّ تُرَدُّوْنَ اِلٰی عٰلِمِ الْغَیْبِ: پھر لوٹائے جاؤ گے تم عٰلِمِ الْغَیْبِ وَالشَّھَادَۃِ کی طرف، فَیُنَبِّئُکُمْ بِمَا کُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ: وہ خبر دے گا تمہیں ان کاموں کی جو تم کیا کرتے تھے، لوٹائے جاؤ گے تم ایسے کی طرف جو چھپی اور ظاہر سب باتوں کو جاننے والا ہے پھر وہ تمہیں بتلائے گا جو تم کام کیا کرتے تھے، سَیَحْلِفُوْنَ بِاللّٰہِ لَکُمْ: عنقریب وہ اللہ کی قسم کھائیں گے تمہارے لیے اِذَا انْقَلَبْتُمْ اِلَیْھِمْ: جس وقت تم ان کی طرف لوٹ کے جاؤ گے، لِتُعْرِضُوْا عَنْھُمْ: قسمیں کھانے سے ان کا مقصد یہ ہوگا کہ تم ان سے اعراض کر جاؤ، ان کے اوپر گرفت نہ کرو، فَاَعْرِضُوْا عَنْھُمْ: تم ان سے منہ موڑ جاؤ، درگزر کر جاؤ، انہیں نظر انداز کر دو، اِنَّھُمْ رِجْسٌ: بے شک وہ ناپاک ہیں، وَّمَاْوٰىھُمْ جَھَنَّمُ: اور ان کا ٹھکانا جہنم ہے جَزَآءًۢ بِمَا کَانُوْا یَکْسِبُوْنَ: بدلے کے طور پر ان کاموں کے جو وہ کرتے تھے۔ یاجُوزُوا جزاءً یُجزَونَ جزاءً وہ بدلہ دیے جائیں گے ان کاموں کا جو وہ کرتے تھے، یا یہ جہنم بدلے کے طور پر ہے ان کاموں کے جو وہ کرتے تھے۔ یَحْلِفُوْنَ لَکُمْ: قسمیں کھائیں گے تمہارے لیے لِتَرْضَوْا عَنْھُمْ: تاکہ تم ان سے خوش ہو جاؤ، راضی ہو جاؤ، فَاِنْ تَرْضَوْا عَنْھُمْ: پس اگر تم ان سے راضی ہو بھی گئے فَاِنَّ اللّٰہَ لَا یَرْضٰی عَنِ الْقَوْمِ الْفٰسِقِیْنَ: بے شک اللہ تعالیٰ راضی نہیں ہوتا نافرمان لوگوں سے۔ اَلْاَعْرَابُ اَشَدُّ کُفْرًا وَّنِفَاقًا: یہ بدوی لوگ، جنگلوں میں رہنے

والے، بادیہ نشین، گنوار، یہ زیادہ سخت ہیں ازروئے کُفر اور نفاق کے، وَاَجْدَرُ اَلَّا يَعْلَمُوْا حُدُوْدَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ: اور یہ زیادہ لائق ہیں اس بات کے کہ نہ جانیں مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ کی حدود کو، اس دِین، اس شریعت کی حدود کو جو اللہ نے اپنے رسول کے اُوپر اُتاری ہیں، اس کے ضابطوں سے ناواقف رہنا ان کی شان کے زیادہ لائق ہے، وہ ایسے ہی ہیں، ''لائق ہیں کہ نہ جانیں اس چیز کی حدود کو جو اللہ نے اُتاری ہے اپنے رسول پر'' وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ: اللہ تعالیٰ علم والا ہے حکمت والا ہے۔ وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يَّتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ مَغْرَمًا: مغرم: تاوان، چٹی، جرمانہ جو کسی کے اوپر پڑ جائے، جیسے وَالْغٰرِمِيْنَ (سورۂ توبہ: ۶۰) کے اندر یہی لفظ آیا تھا کہ جو کسی تاوان میں پھنس گئے، ان کے اوپر کوئی تاوان لازم آ گیا۔ ''بدویوں میں سے بعض وہ ہے (مَن مفرد ہے اس لیے يَتَّخِذُ کی ضمیر مفرد لوٹ رہی ہے) جو قرار دیتا ہے اس مال کو جس کو کہ خرچ کرتا ہے ایک تاوان اور چٹی'' قرار دیتا ہے اسے چٹی تاوان جس کو کہ خرچ کرتا ہے، وَيَتَرَبَّصُ بِكُمُ الدَّوَآئِرَ: اور انتظار کرتا ہے تمہارے متعلق گردشوں کا۔ دوائر دائرہ کی جمع، دائرہ گردش کو کہتے ہیں، چکر کھا جانا، تم پر کوئی چکر پڑ جائے، یعنی ترقی کی طرف سے تم تنزل میں آ جاؤ، کسی مصیبت میں پھنس جاؤ، اس بات کے وہ منتظر رہتے ہیں، عَلَيْهِمْ دَآئِرَةُ السَّوْءِ: انہی پر ہی بُری گردش پڑنے والی ہے، وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ: اللہ تعالیٰ سننے والا ہے جاننے والا ہے۔ وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ: اور ان بدویوں میں سے بعض وہ بھی ہے جو اللہ پر ایمان لاتا ہے، یوم آخر پر ایمان لاتا ہے، اور سمجھتا ہے، قرار دیتا ہے اس چیز کو جس کو کہ خرچ کرتا ہے قُرُبٰتٍ عِنْدَ اللّٰهِ: اللہ کے نزدیک تقربات، قربت کے ذرائع، وَصَلَوٰتِ الرَّسُوْلِ: اور قرار دیتا ہے انہیں اللہ کے رسول کی دُعاؤں کا ذریعہ، اُس خرچ کیے ہوئے کو اللہ تعالیٰ کے نزدیک قربات سمجھتا ہے اور اللہ کے رسول کی دُعاؤں کا ذریعہ سمجھتا ہے، اَلَآ اِنَّهَا قُرْبَةٌ لَّهُمْ: خبردار بے شک ان کے وہ خرچ کیے ہوئے اموال ان کے لئے قربت ہیں، ان کے لئے اللہ تعالیٰ کے تقرّب کا ذریعہ ہیں، سَيُدْخِلُهُمُ اللّٰهُ فِيْ رَحْمَتِهٖ: عنقریب داخل کرے گا اللہ تعالیٰ ان کو اپنی رحمت میں، اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ: بے شک اللہ تعالیٰ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔ وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ: وہ لوگ جو سب سے پہلے سبقت لے جانے والے ہیں مہاجرین اور انصار میں سے، وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ: اور وہ لوگ جنہوں نے ان کی اتباع کی بِاِحْسَانٍ: اچھے طریقے سے، رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ: اللہ ان سے راضی ہو گیا، وَرَضُوْا عَنْهُ: وہ اللہ سے راضی ہو گئے، وَاَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ: اور تیار کیے اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے باغات، جاری ہوں گی ان کے نیچے سے نہریں، خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا: ان میں ہمیشہ رہنے والے ہوں گے، ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ: یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

تفسیر

ماقبل سے ربط، دیہاتی مؤمنین اور منافقین کا ذِکر

پہلے زیادہ تر ذِکر ان منافقین کا آیا تھا جو مدینہ منورہ میں رہنے والے تھے، اور ان آیات کے اندر اُن کا ذکر کیا جا رہا ہے جو مدینہ منورہ سے باہر ملحقہ علاقے میں رہتے تھے، باہر جنگل میں دیہات میں، تو یہ لوگ چونکہ شہری آبادی سے دُور ہوتے ہیں، اور

اللہ کے رسول کے پاس ان کی آمد و رفت بھی کم تھی، علمی مجلسوں میں بھی کم آتے تھے، تو ان میں سے اکثریت ایسے لوگوں کی تھی جو اسلام کی خوبیاں دیکھ کر، یا اسلام کے اندر جس قسم کی رُوحانیت ہے اُس کو محسوس کر کے وہ مسلمان نہیں ہوئے تھے، بلکہ جیسے شہر کے اندر ایک مسلک آ گیا اُس نے زور پکڑا، اور اُس کے سیاسی غلبہ اور اُس کی طاقت سے متاثر ہو کر سطحی طور پر انہوں نے کلمہ پڑھ لیا، حقیقت سمجھنے کی کوشش نہیں کی، علم حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی، سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلسوں میں کثرت سے نہ آئے، بلکہ باہر جنگلوں میں، دیہاتوں میں، اپنے جانوروں میں، اپنی کھیتی باڑی میں وہ مشغول رہے، اس قسم کے جو لوگ تھے وہ قلبی طور پر مسلمان کم تھے، یہی وجہ ہے کہ جب فتنۂ ارتداد پھیلا، سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں یہ آگ بھڑکی، تو اس آگ کا زیادہ تر ایندھن انہی بدویوں اور دیہاتیوں سے مہیا ہوا، زیادہ تر یہ فتنہ انہی میں پھیلا تھا، تو اللہ نے یہاں ان کا تذکرہ کیا ہے۔ لیکن ان میں سے بعض لوگ ایسے بھی تھے جو بالکل صحیح طور پر سچے دل سے مسلمان ہوئے، باوجود اس بات کے کہ جنگل میں رہنے والے تھے، گاہے گاہے وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آتے تھے، صحبت میں بیٹھتے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے دعائیں لیتے تھے، اللہ کے راستے میں خرچ کرتے تھے، اُن کی ساتھ ساتھ تعریف بھی کر دی گئی، جس طرح ''مشکوٰۃ شریف'' میں ''باب المزاح'' کے اندر زاہر بن حرام کا قصہ آیا ہوا ہے، وہ بھی تو بدوی تھا، جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا: ''اِنَّ زَاهِرًا بَادِيَتُنَا وَنَحْنُ حَاضِرُوْهُ''[1] یہ ہمارا بدوی ہے، ہم اس کے شہری ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے ساتھ کتنی محبت کرتے تھے، اور وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کتنی محبت کرتا تھا، تو ''باب المزاح'' کے اندر ''مشکوٰۃ شریف'' میں یہ واقعہ آپ کے سامنے گزرا ہے، تو اس قسم کے لوگوں کی ساتھ تعریف بھی کر دی گئی، تو یہاں ابتدائی آیات انہی دیہاتیوں کے بارے میں ہیں، اور درمیان میں جو صحیح عذر کرنے والے لوگ تھے، یعنی صحیح طور پر معذور تھے، اُن کا ذکر بھی کر دیا تاکہ جو لوگ جہاد سے پیچھے بیٹھے رہیں، کہیں سننے والے لوگ ان سب کو ایک ہی ڈنڈے سے نہ ہانک لیں، کہ جتنے تھے سب ایک ہی جیسے ہیں، اور جتنی مذمت کی آیتیں آئی ہیں وہ سب پر ہی صادق آتی ہیں، اور جتنے یہ عذر کرنے والے ہیں سارے ہی جھوٹے ہیں، نہیں! اللہ کی کتاب میں بہت اعتدال ہے واقعات بیان کرنے کے اعتبار سے، پوری پوری بات کو نقل کیا جاتا ہے، تاکہ غلطی کے ساتھ کہیں مخلصین پر بھی ان آیات کو فٹ نہ کر لیا جائے جو جھوٹے بہانہ باز لوگوں کی مذمت کے بارے میں اُتری ہیں، اس لیے خصوصیت کے ساتھ اُن کو مستثنیٰ کر دیا، کہ یہ لوگ واقعی معذور ہیں، اور یہ اگر پیچھے رہے تو اس میں کوئی قسم کا کوئی حرج نہیں ہے، درمیان میں وہ آیات آئی ہوئی ہیں۔

غیر مخلص بدویوں کی دو قسمیں

وَجَآءَ الْمُعَذِّرُوْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ لِيُؤْذَنَ لَهُمْ: اب بدوی جو کہ غیر مخلص تھے اُن کی بھی دو قسمیں ہو گئیں، بعض تو ایسے تھے کہ جو سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جھوٹ موٹ بہانے لے کے آ ہی گئے، اور اپنی کوئی مجبوری ظاہر کر دی کہ جی! ہم مجبور ہیں، ہم نہیں جا سکتے، اور بعض ایسے تھے جنہوں نے صرف زبان سے کلمہ پڑھا تھا، اور خالص جھوٹے تھے، انہوں نے یہ ضرورت ہی محسوس نہیں

---

(۱) مشکوٰۃ ۲/ ۴۱۶ عن انس رضی اللہ عنہ، باب المزاح، فصل ثانی/ شمائل ترمذی، باب ما جاء فی صفة المزاح/ مسند احمد ج ۲۰ ص ۹۰، رقم ۱۲۶۴۸

کی کہ آ کے عذر ہی کریں، وہ ویسے ہی بیٹھے رہ گئے، تو یہ بدوی جو تھے جن کے دل میں ابھی ایمان نہیں اُترا تھا نفاق تھا، وہ بعض تو ایسے تھے کہ جنہوں نے اپنی بات کو ظاہری طور پر نبھایا، تو کم از کم وہ بہانہ کرنے کے لیے آ گئے، چاہے وہ بھی جھوٹا تھا، اور جو بالکل ہی جھوٹے تھے جن کے دل میں اللہ کی اور اللہ کے رسول ﷺ کی کوئی کسی قسم کی عظمت نہیں تھی، اور انہوں نے دل سے ایمان کو قبول نہیں کیا، وہ تو ویسے ہی بیٹھ رہے، وہ آئے ہی نہیں، تو پہلی آیت میں دونوں فریقوں کو ذکر کیا ہے وَجَآءَ الْمُعَذِّرُوْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ لِيُؤْذَنَ لَهُمْ: بدویوں میں سے جھوٹے بہانہ باز آ گئے تا کہ اُن کو اجازت دے دی جائے وَقَعَدَ الَّذِيْنَ كَذَبُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ اور جو اللہ اور اللہ کے رسول کے معاملے میں بالکل ہی جھوٹے تھے، وہ ویسے ہی بیٹھے رہے، انہوں نے ضرورت ہی محسوس نہیں کی کہ آ کے کوئی عذر ہی کریں، اِن میں سے جو لوگ کافر رہیں گے، جنہوں نے توبہ نہ کی، اور اپنے دل سے اس کُفر کو نہ مٹایا اُن کو عذابِ الیم پہنچے گا، ''کافر رہیں گے''، یعنی اس وقت اگر چہ کُفر ہے کہ جھوٹ بولے، دل کے اندر ایمان نہیں، لیکن اگر توبہ کر لیں گے تو پھر یہ کُفر زائل ہو جائے گا، جب کُفر زائل ہو جائے گا تو اللہ کی رحمت آ جائے گی، لیکن جو انہی جذبات پر رہیں گے اور توبہ نہیں کریں گے اُن کے لیے عذابِ الیم ہے۔

سچّے معذورین کا ذِکر

آگے سچے معذوروں کا ذکر آ گیا، کہ اگر کوئی شخص کمزور ہے، کمزور سے مراد ہو جائے گا کہ وہ بوڑھا ہے، اس کے بدن میں اتنی طاقت نہیں، یا بعض لوگ خلقی طور پر ہی، چاہے عمر کے کسی حصے میں ہوں، اُن میں اس قسم کی کمزوری ہوتی ہے، کہ نہ سفر برداشت کر سکتے ہیں نہ دشمن کے مقابلے میں جا سکتے ہیں، اس قسم کے ضعفاء کمزور، یا بیمار ہیں اور سفر کے متحمل نہیں، یا وہ لوگ ایسے ہیں جن کے پاس خرچ کرنے کے لیے کچھ بھی موجود نہیں، کیونکہ یہ سفر جو پیش آ رہا تھا اُس وقت غزوۂ تبوک کا، یہ سفر بہت لمبا تھا، اس لیے سرورِ کائنات ﷺ نے تیاری کرنے کا جو حکم دیا، تو جس شخص کے پاس سواری نہیں تھی اُس کو بھی معذور سمجھا گیا، کہ وہ اگر نہ جائے تو کوئی حرج نہیں، کیونکہ بغیر سواری اور بغیر اس قسم کے سامان کے اتنا لمبا سفر کرنا مشکل ہے، تو جن کے لیے یہ سامان مہیا نہیں ہو سکا تو وہ بھی بالکل صحیح طور پر معذور تھے۔ لَا يَجِدُوْنَ مَا يُنْفِقُوْنَ: نہیں پاتے اُس چیز کو جس کو وہ خرچ کریں، ان پر کوئی حرج نہیں، اللہ کی طرف سے ان کے اوپر کوئی ملامت نہیں، اور ان کا کوئی نقصان نہیں، یہ واقعی صحیح طور پر معذور ہیں، لیکن ان کے ساتھ بھی قید لگا دی اِذَا نَصَحُوْا لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ: ان لوگوں کے دلوں میں اللہ اور اللہ کے رسول کی خیر خواہی ہونی چاہیے، پھر اگر گھر میں بھی بیٹھے رہیں تو کوئی حرج نہیں، اللہ اور اللہ کے رسول کی خیر خواہی کس طرح سے؟ جس طرح سے ایک جماعت جہاد کرنے کے لیے چلی گئی، اب پیچھے بعض لوگ ایسے ہیں جو عذر کی بناء پر بیٹھے رہے، دل اُن کا ہمیشہ اس جماعت کی طرف لگا ہوا ہے، دِل سے دُعائیں کرتے ہیں کہ یا اللہ! ان کو فتح دینا، خیر اور سلامتی کے ساتھ یہ لوگ واپس آ جائیں، کسی قسم کی تکلیف نہ پہنچے، اور پیچھے نہ کوئی افواہیں اُڑاتے ہیں، نہ کوئی گڑبڑ کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اس قسم کے مخلص اگر کسی عذر کی بنا پر گھروں میں بیٹھے رہ گئے تو کوئی حرج نہیں۔ اور اگر کوئی ہے تو بیمار، گھر میں رہ گیا کمزوری کی بنا پر، لیکن پیچھے وہ حرکتیں ایسی کرتا ہے اور افواہیں اُڑاتا ہے، اور اس کے دل میں اس قسم کے

جذبات اُٹھتے ہیں کہ ان لوگوں کا ذرائع کُو ٹا جائے تو ٹھیک ہے، یہ شکست کھائیں، اس طرح سے اگر اس کے دل میں بدخواہی کے جذبات ہیں تو پھر وہ بھی معذور نہیں، چاہے بیمار ہی گھر پڑا ہو، لیس حرج کی بات جو کی جارہی ہے یہ ان کے لئے نہیں ہے جو خیر خواہ نہیں ہیں۔ ہاں! جو خیر خواہ ہیں، دُعائیں کرتے ہیں، عذر کی بنا پر بیٹھے ہوئے ہیں، اُن کے متعلق تو سرورِ کائنات ﷺ نے فرمایا، جس وقت واپس آرہے تھے، مدینہ کے قریب آئے، تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ بعض لوگ ایسے ہیں جو مدینہ منورہ میں گھروں میں پڑے ہوئے ہیں، لیکن وہ تمہارے ساتھ ہر معاملے میں ثواب میں برابر کے شریک ہیں، صحابہ کرام ﷺ نے کہا یا رسول اللہ! باوجود اس بات کے کہ وہ گھروں سے نہیں نکلے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ہاں باوجود اس کے کہ وہ گھروں سے نہیں نکلے، وہ تمہارے ساتھ ثواب میں برابر کے شریک ہیں۔[1] یہ وہی ہیں جن کو صحیح عذر نے روک رکھا ہے، اور اُن کے دل تڑپتے ہیں کہ ہم آپ کے ساتھ ہوتے، اور اُن کے دل کے اندر اس قسم کی خواہشات کروٹیں لیتی ہیں، ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے ثواب برابر سرابر دے گا، ان کے لیے یہ بشارت ہے۔ تو اللہ اور اللہ کے رسول کے ساتھ خیر خواہی ہونی چاہیے، پھر گھر میں بھی بیٹھے رہیں تو کوئی حرج نہیں، یہ لوگ ''محسنین'' کا مصداق ہیں، یہ نیکوکار ہیں، اچھا کام کرنے والے ہیں، ان کے اوپر کوئی کسی قسم کا الزام نہیں، اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے، وہ تو حقیقی کوتاہیوں کو بھی معاف کر دیتا ہے، ان کی طرف سے تو کوئی کوتاہی ہے ہی نہیں، یہ تو بیچارے مجبور ہیں۔

بعض مخلصین معذورین

اور ان میں سے بھی خصوصیت کے ساتھ ایک ٹولے کا ذکر کیا، کہ جب جہاد کے لیے حضور ﷺ کی طرف سے اعلان ہوا تو کچھ لوگ حضور ﷺ کے پاس آئے، آکر کہنے لگے یا رسول اللہ! ہم بھی جہاد پہ جانا چاہتے ہیں، ہمارے لیے کوئی سواری کا انتظام کر دیجئے، ہمارے پاس سواری نہیں ہے، تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ میرے پاس کوئی ایسا سبب نہیں، کوئی سواری نہیں ہے جو میں تمہیں دے دُوں، کوئی جانور نہیں ہے جو میں تمہیں دے دُوں جس پر تم سوار ہو کے چلے جاؤ، تو آپ ﷺ نے بھی معذوری ظاہر کر دی، کہ اس وقت میرے پاس کوئی گنجائش نہیں۔ اب اُن کے دل میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جانے کی کتنی تڑپ تھی، اور اُن کو جہاد کا کتنا شوق تھا، وہ کس طرح سے اللہ کے راستے میں جان کی بازی لگانا چاہتے تھے، اس کا اندازہ اس سے کیجئے کہ جب وہ مایوس ہو گئے کہ نہ تو ہمارے پاس کچھ ہے، اور نہ دربارِ رسالت سے ہی ہمیں اس قسم کی امداد ملی، کہ ہم وہ اسباب مہیا کر کے ساتھ چل دیتے، تو بے اختیار اُن کی آنکھوں سے آنسوں بہہ نکلے، یہ علامت ہے اس بات کی کہ اُن کے دل میں صحیح تڑپ تھی اور وہ جانا چاہتے ہیں، لیکن اس مجبوری کی بنا پر اگر یہ سعادت سے محروم ہوتے ہیں، تو ایک ایک بال اُن کا اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ واقعی اُن کو شوق تو تھا، اگر رہ گئے تو مجبوری کی بنا پر ہی رہ گئے، اس جذبے سے اُن کی آنکھوں سے جو پانی ٹپکا، دل کے شوق اور ذوق نے جو آنسوؤں کی صورت اختیار کی، اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب کے اندر ان آنسوؤں کی بھی قدر کی ہے، دیکھو! ان کو بھی ظاہر کر دیا، اللہ نے کتاب کے اندر ذکر کر کے آنسو بہانے والوں کے آنسوؤں کو ذکرِ دوام بخشا، جس سے معلوم ہو گیا کہ اگر ایک آدمی کسی نیکی کے

(۱) بخاری ۲/۶۳۷، باب نزول النبی الحجر سے اگلا باب/ مشکوۃ ۲/۳۳۱، کتاب الجهاد فصل اول کا آخر۔

کرنے پر قادر نہیں، اور اس کے دل کے اندر تڑپ ہے وہ نیکی کرنے کی، اور اس سے محرومی کی بنا پر اس کی آنکھوں سے آنسو نکلتے ہیں تو وہ بھی اللہ تعالیٰ کے نزدیک بہت قابلِ قدر ہیں، تو لَا یَجِدُوْنَ مَا یُنْفِقُوْنَ میں سے اس گروہ کو علیحدہ کر کے ذکر کیا ہے، اور ان کا شرف ظاہر کیا ہے، اور اُن کے خلوص کے اوپر ان کے آنسوؤں کو دلیل بنایا ہے، کہ اگر یہ مخلص نہ ہوتے تو اسباب مہیانہ ہونے کی صورت میں یہ روتے کیوں؟ روتے ہوئے اُٹھ کے جا رہے ہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا جی تو بہت چاہتا تھا، تڑپ تو بہت ہے، لیکن کیا کریں، مجبوری ہے، تو ان کے آنسوؤں کو اللہ نے اپنی کتاب میں ذکر کر کے ان کو دوام بخش دیا، اور اس گروہ کو باقیوں سے ممتاز کر کے ذکر کر دیا، کہ اللہ کے دربار میں اس طرح سے رولینا کسی نیکی کے اسباب مہیانہ ہونے کے موقع پر، یہ بھی اللہ کے ہاں بڑی قدر کی چیز ہے۔ وَّلَا عَلَى الَّذِيْنَ اِذَا مَآ اَتَوْكَ: اُن لوگوں پر بھی کوئی حرج نہیں کہ جب وہ آئے آپ ﷺ کے پاس آئے تا کہ آپ انہیں سوار کریں، آپ نے کہہ دیا کہ نہیں پاتا میں ایسی چیز جس پہ میں تمہیں سوار کروں، تَوَلَّوْا: تو آپ کی مجلس سے اُٹھ کے چلے گئے اس حال میں کہ اُن کی آنکھیں آنسو بہا رہی تھیں، اُن کی آنکھیں بہہ رہی تھیں آنسوؤں سے فَاضَ يَفِيْضُ: بہنا، ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے، لفظی معنیٰ بنے گا ''ان کی آنکھیں بہہ رہی تھیں آنسوؤں سے''، حاصل یہ ہوگا کہ اُن کی آنکھیں آنسو بہا رہی تھیں، آنسو کیوں بہا رہی تھیں؟ اس بات پر صدمہ اور غم کرنے کی وجہ سے کہ وہ نہیں پاتے وہ چیز جس کو اللہ کے راستے میں خرچ کریں، اُن کو خرچہ نہیں مل رہا، ان کو زادِ راہ نہیں مل رہا، جس کو وہ خرچ کر کے اللہ کے راستے میں جہاد کریں، اس پر اُن کو اتنا حزن اور دکھ ہوا کہ بے اختیار ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے، ان پر کوئی حرج نہیں۔

مخلفینِ اَغنیاء کا ٹولا

اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَسْتَاْذِنُوْنَكَ: الزام تو اُن لوگوں پہ ہے جو آپ سے اجازت لینے کے لئے آجاتے ہیں وَهُمْ اَغْنِيَآءُ: حالانکہ وہ غنی ہیں، سب کچھ موجود ہے خرچ کرنے کے لیے، اسباب اُن کو مہیا ہیں، لیکن آپ سے اجازت لینے کے لیے آجاتے ہیں، الزام تو اُن لوگوں پہ ہے، ''یہ راضی ہیں اس بات پر کہ عورتوں کے ساتھ شامل ہو کے گھروں میں بیٹھے رہیں''، یہ دیکھو! یہ اُن کی مذمت کا پہلو ہے، یعنی ایسے موقع پر دبک کے بیٹھنا یہ تو چوڑیاں پہننے والی عورتوں کا کام ہوتا ہے، ان مردوں کو حیا نہیں آتی؟ جو عورتوں کے ساتھ شامل ہو کے ایسے موقع پر پیچھے رہنا چاہتے ہیں، تو جب ان کا ذکر کیا جا رہا ہے تو خوالف کے ساتھ معیت کا ذکر کیا جا رہا ہے کہ عورتوں کے ساتھ مل کے بیٹھ رہنا، بچوں کے ساتھ مل کے بیٹھ رہنا، زنانیوں کے ساتھ مل کے بیٹھ جانا، بس یہ ان کو اچھا لگتا ہے، خوش ہو گئے اس بات کے ساتھ کہ وہ رہ جائیں خوالف کے ساتھ، پیچھے رہنے والی عورتوں کے ساتھ، اللہ نے اُن کے دلوں پر مہر کر دی، یہ جانتے نہیں، اس قسم کی باتوں کو اب یہ سمجھتے نہیں، ان کی اہمیت ختم ہو گئی۔

غیر مخلص معذروں سے اِعراض کا حکم

يَعْتَذِرُوْنَ اِلَيْكُمْ اِذَا رَجَعْتُمْ اِلَيْهِمْ اور جس وقت تم واپس لوٹ کے مدینہ پہنچو گے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیات سفر میں اُتری تھیں مدینہ منورہ میں پہنچنے سے پہلے پہلے، جس وقت تم ان کی طرف لوٹ کے جاؤ گے تو یہ عذر کرنے کے لیے آجائیں گے، عذر

کریں گے تمہاری طرف جب تم اُن کی طرف لوٹ کے آجاؤ گے، تو صاف صاف کہہ دینا، اب اُن کی باتوں میں آنے کی ضرورت نہیں، لَا تَعْتَذِرُوْا: مت عذر بیان کرو، یعنی تمہارا یہ عذر کوئی قبول نہیں ہے، تم غلط کہتے ہو، جھوٹے ہو، لَنْ نُّؤْمِنَ لَكُمْ: ہم تمہاری باتوں کی ہرگز تصدیق نہیں کریں گے، یقین نہیں کریں گے ہم تمہاری باتوں کا، اللہ تعالیٰ نے ہمیں تمہارے حالات بتادیے، جب اللہ تعالیٰ نے تمہارے حالات بتادیے ہیں تو سچی بات تو وہی ہے جو اللہ نے بتائی کہ تم جھوٹے ہو، اب اپنی زبان سے اگر قسمیں کھا کھا کے ہمیں خوش بھی کرنا چاہو گے تو ہم تمہاری باتیں کیسے مان سکتے ہیں؟ دیکھو! کسی آدمی کے جھوٹا ہونے کے لیے اگر قوی دلیل مل جائے تب تو ہم اُس کی زبان کا اعتبار نہیں کریں گے، اور اگر اس کے جھوٹے ہونے کا کوئی قرینہ ہمارے سامنے نہ ہو تو مسلمان کا کام یہی ہے، کہ جب کوئی عذر کرتا ہے تو اس کے عذر کو قبول کرلیا جاتا ہے، لیکن یہاں تو اللہ تعالیٰ نے حقیقت ظاہر کردی کہ یہ زبان سے کچھ کہتے ہیں، دلوں میں کچھ ہے۔

سوال:- جب انہوں نے پہلے ہی اجازت لے لی تھی تو پھر ان کو عذر بیان کرنے کے لئے آنے کی کیا ضرورت تھی؟

جواب:- ایسا ہوسکتا ہے کہ پہلے بھی اجازت لی تھی، اور پھر جب حضور ﷺ واپس آگئے تو پھر آ کے اسی طرح سے باتیں کرنے لگ گئے کہ جی! ہم فلاں وجہ سے نہیں جاسکے تھے، تو وہی باتیں دوہرائی جاتی ہیں، یہ تو ہوتا ہی ہے، جس وقت ایک آدمی جھوٹا ہوتا ہے، تو اس کو بار بار اس قسم کی باتیں کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے، تو پہلے بھی آئے اور اس قسم کی باتیں کیں، اور پھر آئے تو اسی قسم کی باتیں کیں، جیسے سورۂ فتح میں آئے گا شَغَلَتْنَآ اَمْوَالُنَا وَاَهْلُوْنَا، کہ ہمیں ہمارے اموال نے اور بال بچوں نے مشغول رکھا جس کی وجہ سے ہم نہیں جاسکے، تو اللہ تعالیٰ نے وہاں بھی یہی کہا کہ نہیں! تمہارے دل میں یہ تھا کہ یہ بچ کے نہیں آئیں گے اس لیے تم گھر میں دبک کے بیٹھ گئے۔

تو عذر کریں گے، انہیں یہ کہہ دو کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں تمہاری خبریں بتلادیں وَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُوْلُهٗ: آئندہ اللہ اور اللہ کا رسول تمہارے عمل دیکھے گا کہ آئندہ تم کیا رویہ اختیار کرتے ہو، تمہارا عمل تصدیق کرے کہ تم دل کے اعتبار سے سچے ہو، صرف زبان سے کہنا کافی نہیں، آئندہ دیکھیں گے ہم کہ تم کیا عمل اختیار کرتے ہو، اور پھر تم لوٹائے جاؤ گے عالم الغیب والشہادۃ کی طرف، پھر وہ خبر دے گا تمہیں ان کاموں کی جو تم کیا کرتے تھے۔ عنقریب قسمیں کھائیں گے اللہ کی تمہارے لیے جب تم ان کی طرف لوٹ کے جاؤ گے، مقصد اُن کا کیا ہوگا؟ کہ تم اُن سے اعراض کر جاؤ، ان سے تعرض نہ کرو، ان پہ کوئی ملامت نہ کرو، ان کو کوئی سرزنش نہ کرو، ان کا مقصد یہ ہے، یعنی وہ معافی والا اعراض چاہتے ہیں، کہ ان کے حالات سے درگزر کرلیا جائے، اور انہیں کچھ کہا نہ جائے، بلکہ ان کو سچا سمجھ لیا جائے۔ تو آپ ان سے منہ موڑ جایئے، لیکن یہ اعراض ناراضگی والا اعراض ہے، آپ ان سے منہ موڑ جایئے، کیونکہ یہ ناپاک ہیں ان کو سمجھانے اور ان کے پیچھے پڑنے کا فائدہ ہی کوئی نہیں، انسان ملامت تو وہاں کرے، سمجھانے کی کوشش تو وہاں کرے کہ جن کے سمجھنے کی توقع ہو، ان کا مقصد یہ ہے کہ تم انہیں کچھ نہ کہو، تو کچھ نہ کہو، انہیں ان کے حالات کے سپرد کردو، جہنم میں جائیں گے، جلیں گے، یہ پلیدی جہنم میں ڈالنے کے قابل ہے، توجہ کرنے کے قابل نہیں ہے، یہ لوگ نجس ہیں، وَمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ان کا ٹھکانا جہنم ہے جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ: ان کاموں کی جزا کے طور پر جو یہ کرتے تھے۔ ''قسمیں کھائیں گے تمہارے لیے تاکہ

تمہیں خوش کر دیں، تم ان پہ مطمئن رہو، فَاِنْ تَرْضَوْا عَنْهُمْ: اگر تم ان سے خوش ہو بھی گئے تو اللہ ایسے بدمعاشوں سے خوش نہیں ہوتا، اس لیے تمہیں خوش کر کے وہ کیا پالیں گے، یعنی اوّل تو تم ہی خوش نہیں ہو گے جیسا کہ ''اِنْ'' بالفرض کے طور پر ہے۔ اور اگر بالفرض تم خوش ہو بھی ہو گئے تو کیا فائدہ، جب اللہ تعالیٰ خوش نہیں۔ تو خوب صفائی کے ساتھ ان جھوٹے بہانہ بازوں کو یہاں نمایاں کر دیا گیا۔

اَلْاَعْرَابُ اَشَدُّ كُفْرًا وَّنِفَاقًا: بدوی لوگ شہریوں کے مقابلے میں زیادہ اشد ہیں اَز رُوئے کُفر اور نفاق کے، اَشَدُّ: اسم تفضیل کا صیغہ ہے۔ ان میں کُفر اور نفاق زیادہ ہے، اور یہ اس لائق ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے اُتارے ہوئے دِین کی حدود کو یہ نہ جانیں، کیونکہ وہاں کوئی علم کا چرچا نہیں، علمی مجلسوں میں یہ آتے نہیں، حضور ﷺ کی صحبت میں بیٹھتے نہیں، تو یہ اسی قابل ہیں کہ یہ ان چیزوں سے جاہل رہیں، اللہ تعالیٰ علم والا ہے حکمت والا ہے۔

جرمانہ سمجھ کر خرچ کرنے والے اَعرابی

اور بعض بدوی ایسے ہیں، بعض اَعراب ایسے ہیں کہ جو کچھ اللہ کے راستے میں خرچ کرتے ہیں تو اس طرح دبے دبائے خرچ کرتے ہیں جیسے اُن کو کوئی جرمانہ ہو گیا ہو، جس طرح سے کسی سے کوئی مطالبہ کیا جائے کہ یہ نیکی کا کام ہے، اس میں کچھ دے دو، تو ایک تو یہ ہے کہ آدمی خوش دلی کے ساتھ دیتا ہے، اور ایک بہت مجبوری کا مارا ہوا دیتا ہے کہ اگر میں نے نہ دیا تو لوگ کیا کہیں گے، اور دل میں سمجھتا ہے کہ یہ کیا ہے، خواہ مخواہ کا ایک جرمانہ ہی ہے، ایک چٹی پڑ گئی، ایک بوجھ پڑ گیا، اس کو برداشت کرو، جس طرح سے ہوتا ہے کہ اس قسم کے جذبات دل میں ابھرتے ہیں، تو یہاں انہی کا ذکر ہے کہ جو کچھ خرچ کرتے ہیں اس کو ایک تاوان سمجھتے ہیں اور تمہارے متعلق وہ دوائر کے منتظر ہیں کہ تم کسی چکر میں آ جاؤ، تمہارے اوپر کوئی گردش پڑ جائے، اُن کے دل میں یہ ہوتا تھا کہ کہیں جائیں اور کوئی ان کو سنبھال لے، ہماری جان چھوٹے، روز جو مطالبہ کرتے رہتے ہیں کہ اللہ کے راستے میں خرچ کرو، صدقہ دو، زکوٰۃ دو، ان سے جان اسی طرح چھوٹے گی کہ یہ کہیں جائیں اور کسی مصیبت کا شکار ہو جائیں، یعنی دل میں خیر خواہی نہیں تھی، وہ یہی دیکھتے رہتے تھے کہ کہاں یہ پھنسیں اور ہماری جان چھوٹے، اس قسم کے حادثات کے وہ تمہارے متعلق منتظر ہیں، انہی پر ہی بُری گردش پڑنے والی ہے، اب گردش مسلمانوں پر نہیں آئے گی، ان کو دن بدن عروج ہو گا، بُرا چکر انہی پر پڑے گا، اللہ تعالیٰ سننے والا ہے جاننے والا ہے۔

دِل کی خوشی سے خرچ کرنے والے اَعرابی

اور آگے اچھے اَعراب کا ذکر کر دیا کہ بعض بعض دیہاتی ایسے بھی ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے خلوص دیا ہے، وہ آتے جاتے رہتے ہیں، ملتے ہیں، علم حاصل کرتے ہیں، اللہ کے راستے میں شوق سے خرچ کرتے ہیں، سارے دیہاتی بھی ایک جیسے نہیں ہیں، لیکن جہالت کی وجہ سے اکثریت اُن کی ہے اور ان میں سے اس قسم کے لوگ بھی ہیں ''اور بعض بدوی ایسے ہیں جو ایمان لاتے ہیں اللہ پر اور یوم آخر پر، اور جو کچھ خرچ کرتے ہیں اُس کو اللہ کے نزدیک نزدیکیوں کا باعث سمجھتے ہیں، اور اللہ کے رسول ﷺ کی دُعاؤں کا ذریعہ سمجھتے ہیں'' کیونکہ سرورِ کائنات ﷺ کی عادت تھی کہ جس وقت کوئی شخص صدقہ وغیرہ لے کے آتا تو آپ ﷺ اُس کو

دُعائیں بھی دیتے تھے، خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ ۖ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ (سورۂ توبہ: ۱۰۳) ان سے صدقہ لو، اس سے ان کے مال پاک صاف ہوں گے اور یہ بھی صاف ستھرے ہوں گے، اور ان کے لیے دُعائیں بھی کرو، تو حضور ﷺ کی عادت تھی کہ جس وقت بھی کوئی صدقہ لے کے آتا تو آپ ﷺ اس کے لیے دُعا بھی کرتے تھے، اور اسی لفظ کے ساتھ کرتے تھے ''اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلَيْهِ ''(۱) چونکہ قرآنِ کریم میں یہی لفظ آیا ہوا ہے۔ ''سمجھتے ہیں وہ اس مال کو جو وہ خرچ کرتے ہیں اللہ کے نزدیک قربات، اور اللہ کے رسول کی صلوات'' یعنی اللہ کی قربات کا ذریعہ اور اللہ کے رسول کی دعاؤں کا ذریعہ سمجھتے ہیں، اَلَآ اِنَّهَا قُرْبَةٌ لَّهُمْ: خبردار! یہ ان کے اموال جو خرچ کیے ہوئے ہیں یہ ان کے لیے قربت کا ذریعہ ہیں، اور صلوات الرسول تو وہ اپنے کانوں سے سُن لیتے تھے اُس کو ذکر کرنے کی کیا بات ہے، رسول اللہ ﷺ جو دُعائیں کرتے تھے وہ تو ان کے مشاہدے میں آجاتی تھیں، کانوں سے سُن لیتے تھے، اور اللہ کے رسول کی دُعا بھی تو اللہ کی نزدیکی حاصل کرنے کے لئے مطلوب ہے، تو جس وقت اللہ کی قربت کی بشارت دے دی تو سب کچھ حاصل ہو گیا۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ یہاں قربت کا ذکر کیا، اور صلوۃ الرسول کا ذکر دوبارہ نہیں آیا، ان کو خبر یہ دی ہے کہ ان کے اموال اللہ کے نزدیک قربت کا ذریعہ ہیں، تو وہ تو اللہ کی قربت کا ذریعہ بھی سمجھتے تھے اور اللہ کے رسول کی دُعاؤں کا ذریعہ بھی سمجھتے تھے، تو یہاں یوں نہیں ذکر کیا گیا کہ ''ان کے لیے قربت کا ذریعہ ہیں اور اللہ کے رسول کی دُعاؤں کا ذریعہ ہیں'' کیونکہ ''دُعاؤں کا ذریعہ ہیں'' یہ کہنے کی ضرورت ہی نہیں، وہ تو انہوں نے کانوں سے سُن لیں، کہ جب کسی نے صدقہ دیا تو اللہ کے رسول نے دُعا کر دی۔ اور اللہ کی نزدیکی حاصل ہوئی یا نہیں، یہ معنوی چیز ہے، اس لیے صرف قربت کا ذکر کر دیا۔ یا یہ ہے کہ اللہ کے رسول کی دُعا اگر مطلوب ہے تو وہ بھی تو اللہ کی نزدیکی حاصل کرنے کے لئے ہے، تو جب اللہ کی نزدیکی حاصل ہو گئی تو سب کچھ حاصل ہو گیا، ''یہ ان کے خرچ کیے ہوئے اموال ان کے لیے قربت کا باعث ہیں'' سَيُدْخِلُهُمُ اللّٰهُ فِيْ رَحْمَتِهٖ: اللہ تعالیٰ انہیں اپنی رحمت میں داخل کرے گا، اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ: اللہ تعالیٰ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔

''اَلسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ'' کے مصداق میں مختلف اقوال

وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ: یہ خصوصیت کے ساتھ اَلسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ کی تعریف ہے۔ اَلسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ کا مصداق کون ہیں؟ اس میں مختلف اقوال ہیں، لیکن ان اقوال میں کوئی تعارض نہیں، بعض حضرات تو یہ کہتے ہیں کہ مہاجرین وانصار میں سے وہ لوگ جنہوں نے دونوں قبلوں کی طرف نماز پڑھی، یہ ہیں اَلسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ، اور قبلہ تبدیل ہو جانے کے بعد جو لوگ مسلمان ہوئے چاہے وہ مہاجر ہیں چاہے وہ انصار ہیں وہ اَلسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ نہیں، بلکہ دوسرے درجے کے ہیں، یہ آپ کو معلوم ہے کہ جب حضور ﷺ مدینہ منورہ میں تشریف لے گئے تھے تو اُس وقت بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھا کرتے تھے، سولہ یا سترہ مہینے حضور ﷺ نے بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی ہے، اُس کے بعد تحویل قبلہ کا حکم آ گیا تھا، جس کا ذکر آپ کے سامنے دوسرے پارے کی ابتدا میں آیا تھا، اور جہاں یہ آیت اُتری تھی اُس مسجد کو ذوقبلتین کہتے ہیں، دو قبلوں

---

(۱) صحیح البخاری ۲/۹۴۱، باب هل يصلى على غير النبي

والی مسجد، ویسے تو مدینہ منورہ میں جو مسجدیں اس وقت بنی ہوئی تھیں جیسے مسجدِ نبوی اور مسجد قباء ہے، ان دونوں مسجدوں میں دونوں قبلوں کی طرف نماز پڑھی گئی، پہلے سولہ یا سترہ مہینے بیت المقدس کی طرف، اور بعد میں مکہ معظمہ کی طرف، تو ہر مسجد ہی ذوقبلتین ہے کہ اس میں دو مختلف اوقات میں دو قبلے استعمال ہوئے، اس لیے ایک مسجد جس کو اب بھی لوگ دیکھنے کے لئے جاتے ہیں اس مسجد کو مسجد ذوقبلتین کہتے ہیں، وہاں جا کے لوگ نوافل بھی پڑھتے ہیں، زیارت کے لئے بھی جاتے ہیں، تو اُس کو ذوقبلتین اس لیے کہتے ہیں کہ وہاں یہ آیت اتری تھی، رسول اللہ ﷺ اس محلے میں تشریف لے گئے تھے تو ظہر کی نماز کے وقت یہ آیت اُتری، تو پہلی نماز کعبۃ اللہ کی طرف اس مسجد میں پڑھی گئی، مسجدِ نبوی میں آ کے عصر کی نماز پہلی کعبۃ اللہ کی طرف پڑھی گئی (مظہری)، تو وہاں چونکہ یہ آیت اُتری تھی تو اس آیت کے اُترنے کی وجہ سے اس مسجد کو ذوقبلتین کہتے ہیں، تو اس دوران میں جو مسلمان ہوئے، مکہ معظمہ والے سارے جو مسلمان ہو کے گئے تھے یعنی مہاجر، اور مدینہ منورہ میں جو لوگ مسلمان ہو گئے تھے وہ تو اَلسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ میں داخل ہیں، اور اس کے بعد جو مسلمان ہوئے چاہے وہ ہجرت کر کے آئے چاہے وہ مدینہ منورہ کے تھے، وہ دوسرے نمبر پہ ہیں۔ اور بعض حضرات نے اَلسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ کا فرق ذکر کیا ہے غزوہ بدر سے، کہ بدر میں شریک ہونے والے، اور بدر سے پہلے اسلام قبول کرنے والے اَلسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ میں ہیں، اور بعد والے دوسرے نمبر پہ ہیں۔ اور بعض نے صلح حدیبیہ کے اوپر اس کا مدار رکھا ہے، کہ حدیبیہ کے واقعے سے پہلے جو مسلمان ہو گئے وہ اَلسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ ہیں، اور بعد والے دوسرے نمبر پہ ہیں۔ اور بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا مدار فتح مکہ پہ ہے اور اس کی صراحت آپ کے سامنے سورۂ حدید (پارہ ۲۷) میں آئے گی لَا يَسْتَوِيْ مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقٰتَلَ ۚ اُولٰٓئِكَ اَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِيْنَ اَنْفَقُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَقٰتَلُوْا: فتح سے وہاں فتحِ مکہ مراد ہے۔ تو جو فتحِ مکہ سے پہلے اللہ کے راستے میں خرچ کرتے رہے، اور فتحِ مکہ کے بعد جنہوں نے خرچ کیا، فتحِ مکہ سے پہلے جو اللہ کے راستے میں لڑے اور فتحِ مکہ کے بعد جو اللہ کے راستے میں لڑے، یہ دونوں برابر نہیں ہیں، لیکن كُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى: اللہ نے حسنیٰ کا وعدہ سب کے ساتھ کیا ہے، جس سے معلوم ہو گیا کہ چاہے اَلسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ ہوں، چاہے بعد والے ہوں، مہاجر انصار جتنے تھے كُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى اللہ کی طرف سے اچھائی کا وعدہ سب کے ساتھ ہے، اس لیے صحابہ کرام ﷢ جتنے بھی ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں مغفور ہیں، جیسے یہاں سے معلوم ہوتا ہے اور اسی طرح سے سورۂ حدید کی اُس آیت سے معلوم ہوتا ہے، کہ دو حصوں میں بانٹ دیے: ۱۔ فتح مکہ سے پہلے خرچ کرنے والے اور لڑنے والے۔ ۲۔ فتحِ مکہ کے بعد خرچ کرنے والے اور لڑنے والے، اگرچہ درجے میں برابر نہیں ہیں، بلکہ جو فتحِ مکہ سے پہلے خرچ کرتے رہے اور اللہ کے راستے میں جہاد کرتے رہے ان کا درجہ اونچا ہے اور جو بعد والے ہیں ان کا وہ درجہ نہیں، لیکن كُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى اللہ نے حسنیٰ کا وعدہ ہر کسی کے ساتھ کیا ہوا ہے، تو اَلسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ کا مصداق کو بھی بنایا جا سکتا ہے۔ اور ایک اور توجیہ اور اچھی توجیہ یہی ہے کہ مہاجرین وانصار سرورِ کائنات ﷺ کے زمانے میں جتنے ایمان لانے والے تھے وہ سارے کے سارے ہی اَلسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ ہیں مابعد والی امت کے اعتبار سے، تو اس توجیہ کے مطابق مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ کا مِنْ تبعیض کے لئے نہیں ہے، پہلی جتنی توجیہات آپ کے سامنے کی ہیں ان میں مِنْ تبعیض کے لئے ہے، کہ بعض انصار ومہاجر

اَلسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ کا مصداق ہیں، اور بعض اَلسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ کا مصداق نہیں ہیں، تو یہ مِن کے ساتھ تبعیض کردی گئی۔ اور ایک یہ ہے کہ مِن بیانیہ ہو، بیانیہ کا مطلب یہ ہے کہ مہاجرین وانصار جو اَلسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ کا مصداق ہیں، اور ان کو اَلسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ کہہ دیا گیا مابعد کے اعتبار سے، کہ پچھلی اُمت کے اعتبار سے یہی اَلسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ ہیں، تو سارے مہاجرین اور انصار اس میں آجائیں گے، پھر ترجمہ یوں ہوجائے گا ''وہ لوگ جو سب سے پہلے سبقت لے جانے والے ہیں، یعنی مہاجرین وانصار۔''

اِتباعِ صحابہ پر بشارتِ عظمیٰ

وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ: اور وہ لوگ جو اُن کے پیچھے لگ گئے اچھے طریقے سے، نیک نیتی کے ساتھ، احسان اور خلوص کے ساتھ جنہوں نے اُن کی اتباع کی، پہلی توجیہات کے مطابق اس کا مصداق ہوں گے، پیچھے آنے والے صحابہ، یعنی دوسرے نمبر والے صحابہ، اور اس آخری توجیہ کے مطابق اس کا مطلب ہوگا جس کو ہم اپنی اصطلاح میں ''تابعین'' کہتے ہیں، جو صحابہؓ کے بعد والے دور کے ہیں، بہرحال ان لفظوں میں وسعت ہے، کہ جو لوگ بھی صحابہ کی اتباع خلوص نیت کے ساتھ کریں گے اُن کے لیے بھی یہی بشارت ہے کہ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ، اتباعِ صحابہ خدا تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کا ذریعہ ہے، جیسا کہ اہلِ حق کی علامات ذکر کرتے ہوئے آپ کے سامنے ذکر کیا گیا تھا کہ حضور ﷺ نے فرمایا تھا کہ نجات پانے والی جماعت، حق پر ثابت رہنے والی جماعت وہی ہوگی ''مَا اَنَا عَلَيْهِ وَاَصْحَابِيْ'' جو اس طریقے کی پابندی کریں گے جو میری طرف منسوب ہے، اور جو میرے صحابہ کا طریقہ ہے۔ تو گویا کہ اتباعِ صحابہ کے لئے اس کو دلیل بنایا جاسکتا ہے کہ اتباعِ صحابہ بھی اللہ کی رضا حاصل کرنے کا ذریعہ ہے، ''جنہوں نے ان کی اتباع کی'' چاہے وہ دوسرے نمبر کے صحابہ ہیں، چاہے صحابہؓ کے بعد والے دور کے جو بھی خلوص کے ساتھ اور اچھی نیت کے ساتھ اُن کی اتباع کرنے والے ہیں، وہ سب اس میں آجائیں گے، ''اللہ اُن سے راضی ہوگیا وہ اللہ سے راضی ہوگئے'' اللہ اُن سے خوش ہے وہ اللہ سے خوش ہیں، اَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ: تیار کیا اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے باغات کو، جن کے نیچے سے نہریں جاری ہیں، خٰلِدِيْنَ فِيْهَاۤ اَبَدًا: اُن کے اندر ہمیشہ رہنے والے ہوں گے، ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ: یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

وَمِمَّنْ حَوْلَكُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ مُنٰفِقُوْنَ ۛؕ وَمِنْ اَهْلِ الْمَدِيْنَةِ ۛ
ان بدویوں میں سے تمہارے اردگرد کچھ لوگ منافق ہیں، اور اہلِ مدینہ میں سے بعض لوگ وہ ہیں
مَرَدُوْا عَلَى النِّفَاقِ ۫ لَا تَعْلَمُهُمْ ؕ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ ؕ سَنُعَذِّبُهُمْ
جو بڑے اَڑے ہوئے ہیں نفاق پر، آپ ان منافقین کو نہیں جانتے، ہم انہیں جانتے ہیں، ضرور عذاب دیں گے ہم انہیں

مَّرَّتَيْنِ ثُمَّ يُرَدُّوْنَ اِلٰى عَذَابٍ عَظِيْمٍ ﴿١٠١﴾ وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا

دو مرتبہ پھر یہ لوٹائے جائیں گے ایک بڑے عذاب کی طرف ﴿۱۰۱﴾ اور کچھ اور لوگ بھی ہیں جنہوں نے اپنے گناہوں کا

بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَيِّئًا ؕ عَسَى اللّٰهُ اَنْ

اعتراف کرلیا، ملا دیا انہوں نے نیک عمل کو اور دُوسرے بُرے عمل کو، قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ

يَّتُوْبَ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿١٠٢﴾ خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً

اُن کے اُوپر توجہ فرمائے گا، بے شک اللہ تعالیٰ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے ﴿۱۰۲﴾ لے لیجئے ان کے مالوں میں سے صدقہ،

تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ

اس صدقے کے ذریعے سے آپ اُن کو پاک کریں گے اور صاف کریں گے، اوران کے لئے دُعا کیجئے، بے شک آپ کی دُعا ان کے لئے سکون

لَّهُمْ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿١٠٣﴾ اَلَمْ يَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ هُوَ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ

کا باعث ہے، اللہ تعالیٰ سننے والا جاننے والا ہے ﴿۱۰۳﴾ کیا ان کو پتا نہیں کہ بے شک اللہ ہی توبہ کو قبول کرتا ہے

عَنْ عِبَادِهٖ وَيَاْخُذُ الصَّدَقٰتِ وَاَنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿١٠٤﴾

اپنے بندوں کی جانب سے، اور صدقات کو لیتا ہے، اور بے شک اللہ تعالیٰ بہت توجہ فرمانے والا رحم کرنے والا ہے ﴿۱۰۴﴾

وَقُلِ اعْمَلُوْا فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُوْلُهٗ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ؕ

اور آپ کہہ دیجئے کہ تم عمل کرتے رہو، پس عنقریب دیکھے گا تمہارے عمل کو اللہ اور اس کا رسول اور مؤمنون،

وَسَتُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿١٠٥﴾

اور جلدی ہی لوٹا دیے جاؤ گے تم عالم الغیب والشہادۃ کی طرف، پھر تمہیں خبر دے گا اُن کاموں کی جو تم کیا کرتے تھے ﴿۱۰۵﴾

وَاٰخَرُوْنَ مُرْجَوْنَ لِاَمْرِ اللّٰهِ اِمَّا يُعَذِّبُهُمْ وَاِمَّا يَتُوْبُ عَلَيْهِمْ ؕ

اور کچھ اور لوگ بھی ہیں ڈھیل دیے ہوئے ہیں وہ اللہ کے حکم کے لئے، یا تو اللہ انہیں عذاب دے گا یا ان کی توبہ قبول کرلے گا،

وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿١٠٦﴾ وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَّكُفْرًا

اللہ تعالیٰ علم والا ہے حکمت والا ہے ﴿۱۰۶﴾ اور وہ لوگ جنہوں نے بنائی مسجد نقصان پہنچانے کے لیے اور کُفر کے لیے

وَتَفْرِيْقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَاِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ

اور مؤمنین کے درمیان پھوٹ ڈالنے کے لئے اور مورچہ مہیا کرنے کے لئے اس شخص کے واسطے جس نے کہ اللہ اور اللہ کے رسول سے اس سے

مِنْ قَبْلُ ؕ وَلَيَحْلِفُنَّ اِنْ اَرَدْنَآ اِلَّا الْحُسْنٰى ؕ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ

قبل لڑائی لڑی، اور البتہ ضرور قسم کھائیں گے یہ لوگ کہ نہیں ارادہ کیا ہم نے مگر اچھی بات کا ہی، اور اللہ گواہ ہے کہ بے شک یہ لوگ

لَكٰذِبُوْنَ ﴿١٠٧﴾ لَا تَقُمْ فِيْهِ اَبَدًا ؕ لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ

جھوٹے ہیں ﴿١٠٧﴾ نہ کھڑے ہوں آپ اس مسجد میں کبھی بھی، البتہ وہ مسجد جس کی بنیاد رکھی گئی ہے تقویٰ پر

اَوَّلِ يَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ ؕ فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا ؕ

پہلے دن سے ہی، وہی حق دار ہے اس بات کی آپ اس میں کھڑے ہوں، اس مسجد میں ایسے لوگ ہیں جو پسند کرتے ہیں پاک صاف رہنے کو

وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ ﴿١٠٨﴾ اَفَمَنْ اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰى تَقْوٰى

اور اللہ تعالیٰ پاک صاف رہنے والوں کو پسند کرتا ہے ﴿١٠٨﴾ کیا پھر وہ شخص جس نے بنیاد رکھی اپنی عمارت کی اللہ کے ڈر پر

مِنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٍ خَيْرٌ اَمْ مَّنْ اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰى شَفَا

اور اللہ کی رضا پر وہ بہتر ہے؟ یا وہ شخص جس نے بنیاد رکھی اپنی عمارت کی گرنے والی گھاٹی کے کنارے پر

جُرُفٍ هَارٍ فَانْهَارَ بِهٖ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿١٠٩﴾

پس وہ گھاٹی گرگئی اپنے بانی کو ساتھ لے کر جہنم کی آگ میں، اللہ تعالیٰ ظالم لوگوں کو سیدھا راستہ نہیں دِکھاتا ﴿١٠٩﴾

لَا يَزَالُ بُنْيَانُهُمُ الَّذِيْ بَنَوْا رِيْبَةً فِيْ قُلُوْبِهِمْ

ہمیشہ رہے گی اُن کی یہ عمارت جو انہوں نے بنائی اُن کے دِل میں کھٹکے کا ذریعہ

اِلَّآ اَنْ تَقَطَّعَ قُلُوْبُهُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿١١٠﴾ ع

مگر یہ کہ ٹکڑے ٹکڑے ہوجائیں ان کے دِل، اللہ تعالیٰ جاننے والا ہے حکمت والا ہے ﴿١١٠﴾

خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ وَمِمَّنْ حَوْلَكُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ مُنٰفِقُوْنَ: مَنْ حَوْلَكُمْ: جو لوگ تمہارے اردگرد ہیں۔ مِن تبعیضیہ

ہے۔ اور مِنَ الْاَعْرَابِ میں مِن بیانیہ ہے، اور مِنَ الْاَعْرَابِ یہ مَنْ حَوْلَكُمْ کا بیان ہے۔ جو اعراب تمہارے اردگرد ہیں، جو جنگلی دیہاتی بدوی تمہارے اردگرد ہیں ان میں سے بعض منافق ہیں۔ پہلا مِن تبعیضیہ ہے۔ ان اعراب میں سے جو تمہارے اردگرد ہیں، جو جنگلی، دیہاتی، بدوی آپ کے اردگرد ہیں ان میں سے بعض منافق ہیں، پہلا مِن تبعیضیہ ہے،''ان اعراب میں سے جو تمہارے اردگرد ہیں کچھ لوگ منافق ہیں۔'' وَمِنْ اَهْلِ الْمَدِيْنَةِ: اس کے آگے پیچھے آپ دیکھ رہے ہیں کہ تین نقطے لگے ہوئے ہیں اور میں نے آپ کی خدمت میں پہلے بار بار عرض کیا ہے کہ ترکیب کے لحاظ سے یہ جملہ دونوں طرف جڑ سکتا ہے، آگے بھی اور پیچھے بھی، اگر پیچھے اس جوڑیں گے تو مِنْ اَهْلِ الْمَدِيْنَةِ کا عطف مِمَّنْ حَوْلَكُمْ مِنَ الْاَعْرَابِ پر ہو جائے گا،''اور اہل مدینہ سے بھی'' یعنی کچھ لوگ منافق ہیں، پھر اس کی خبر منافقون نکل آئے گی،''تمہارے اردگرد والے بدویوں میں سے کچھ لوگ منافق ہیں اور اہلِ مدینہ سے بھی'' یعنی اہلِ مدینہ سے بھی بعض منافق ہیں، مَرَدُوْا عَلَى النِّفَاقِ: یہ ضمیر پھر سب کی طرف لوٹ جائے گی، جو نفاق پر اَڑے ہوئے ہیں، جو نفاق پر بڑے مشاق ہیں، اُن کا نفاق بہت گہرا ہے، جس کی وجہ سے اُس کے اوپر اطلاع نہیں پائی جاتی، کیونکہ نفاق ایک اِخفاء کی اور پوشیدہ رکھنے کی چیز ہے، تو جو علامات سے پہچانا جائے تو اس کا نفاق اتنا گہرا نہیں، گہرا نفاق اس کا ہوتا ہے جو علامات سے پہچانا بھی نہ جائے، تو مَرَدُوْا عَلَى النِّفَاقِ کا مطلب یہ ہے کہ یہ نفاق پر جمے ہوئے ہیں، نفاق پر بڑے مشاق ہیں۔ اور اگر مِنْ اَهْلِ الْمَدِيْنَةِ کو مابعد کے ساتھ جوڑیں تو بھی بات صاف ہے، وَمِنْ اَهْلِ الْمَدِيْنَةِ مَرَدُوْا عَلَى النِّفَاقِ: اہلِ مدینہ میں سے بعض لوگ وہ ہیں جو نفاق کے اوپر بڑے مشاق ہیں اور بڑے جمے ہوئے ہیں، بڑے اَڑے ہوئے ہیں نفاق پر، لَا تَعْلَمُهُمْ: آپ ان منافقین کو نہیں جانتے، نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ: ہم انہیں جانتے ہیں، سَنُعَذِّبُهُمْ مَّرَّتَيْنِ: ضرور عذاب دیں گے ہم انہیں دو مرتبہ، ثُمَّ يُرَدُّوْنَ اِلٰى عَذَابٍ عَظِيْمٍ: پھر یہ لوٹائے جائیں گے ایک بڑے عذاب کی طرف۔ وَاٰخَرُوْنَ: اور کچھ اور لوگ بھی ہیں اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ: جنہوں نے اپنے گناہوں کا اعتراف کر لیا، خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَيِّئًا: ملا دیا انہوں نے نیک عمل کو اور دوسرے بُرے عمل کو، نیک عمل اور بُرے عمل کو انہوں نے خلط ملط کر لیا ہے، یعنی کچھ ان کے نیک اعمال بھی ہیں اور کوئی ان سے بُرا عمل بھی ہو گیا، عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْهِمْ: قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ اُن کے اوپر توجہ فرمائے گا، اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ: بے شک اللہ تعالیٰ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔ خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً: لے لیجئے ان کے مالوں میں سے صدقہ، تُطَهِّرُهُمْ: اُس صدقے کے ذریعے سے آپ ان کو پاک کریں گے، وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا: اور صاف کریں گے۔ بِهَا کی ضمیر صدقہ کی طرف لوٹ گئی۔ اس صدقے کے سبب سے آپ ان کی تطہیر وتزکیہ کریں گے، پاک صاف کریں گے آپ انہیں صدقے کے سبب سے، وَصَلِّ عَلَيْهِمْ: اور ان کے لئے دُعا کیجئے، صلوٰۃ کا صلہ علیٰ آیا کرتا ہے دُعا کرنے کے معنی میں، اور آپ ان کے لئے دُعا کیجئے، اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ: بے شک آپ کی دُعا ان کے لئے سکون کا باعث ہے، وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ: اللہ تعالیٰ سننے والا جاننے والا ہے۔ اَلَمْ يَعْلَمُوْا: کیا ان کو پتا نہیں اَنَّ اللّٰهَ هُوَ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ: کہ بے شک اللہ ہی توبہ کو قبول کرتا ہے عَنْ عِبَادِهٖ: اپنے بندوں کی جانب سے، وَيَاْخُذُ الصَّدَقٰتِ: اور صدقات کو قبول کرتا ہے، صدقات کو لیتا ہے وَاَنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ: اور بے شک اللہ تعالیٰ توبہ قبول کرنے والا رحم کرنے والا ہے، بہت توجہ فرمانے والا رحم کرنے والا ہے۔ وَقُلِ اعْمَلُوْا: اور آپ کہہ دیجئے کہ تم عمل کرتے رہو، فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُوْلُهٗ: پس عنقریب دیکھے گا تمہارے عمل کو اللہ اور اس کا

رسول اور مؤمنون، اللہ اور اس کا رسول اور مؤمنون تمہارے عمل کو دیکھیں گے کہ تم آئندہ کیا عمل کرتے ہو، وَسَتُرَدُّوْنَ اِلٰی عٰلِمِ الْغَیْبِ: اور پھر تم لوٹا دیے جاؤ گے۔ ''س'' مستقبل قریب کے لئے۔ جلدی ہی لوٹا دیے جاؤ گے تم عٰلِمِ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ کی طرف، فَیُنَبِّئُکُمْ: پھر وہ تمہیں خبر دے گا، بِمَا کُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ: ان کاموں کی جو تم کیا کرتے تھے۔ وَاٰخَرُوْنَ: اور کچھ اور لوگ بھی ہیں مُرْجَوْنَ لِاَمْرِ اللّٰہِ: جو مؤخر کر دیے گئے ہیں اللہ کے حکم کے لئے، ڈھیل دے دیے گئے ہیں، اِرجاء ڈھیل دینے کو کہتے ہیں، قرآنِ کریم میں دوسری جگہ بھی یہ لفظ آئے گا تُرْجِیْ مَنْ تَشَآءُ (سورۂ احزاب: ۵۱) آپ جس کو چاہیں مؤخر کر دیں، ڈھیل دے دیں۔ ''ڈھیل دیے ہوئے ہیں وہ اللہ کے حکم کے لئے'' اِمَّا یُعَذِّبُهُمْ: یا تو اللہ انہیں عذاب دے گا، وَاِمَّا یَتُوْبُ عَلَیْهِمْ: یا ان کو معاف کر دے گا، ان کی توبہ قبول کر لے گا، وَاللّٰہُ عَلِیْمٌ حَکِیْمٌ: اللہ تعالیٰ علم والا ہے حکمت والا ہے۔ وَالَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا: ضِرَارًا مفعول لہٗ ہے اتَّخَذُوْا کا۔ اور وہ لوگ جنہوں نے بنائی مسجد نقصان پہنچانے کے لئے، وَّکُفْرًا: اور کفر کے لئے، وَّتَفْرِیْقًا بَیْنَ الْمُؤْمِنِیْنَ: اور مؤمنین کے درمیان پھوٹ ڈالنے کے لیے، وَاِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰہَ وَرَسُوْلَهٗ مِنْ قَبْلُ: اور ایسے شخص کو پناہ دینے کے لئے، ایسے شخص کو مورچہ مہیا کرنے کے لئے (مَرصد کہتے ہیں گھات کو جہاں بیٹھ کر کسی دشمن کی نگرانی کی جاتی ہے) پناہ دینے کے لئے، مورچہ مہیا کرنے کے لئے اس شخص کے واسطے جس نے کہ اللہ اور اللہ کے رسول سے اس سے قبل لڑائی لڑی۔ حَارَبَ مُحَارَبَة: آپس میں لڑائی کرنا۔ لڑائی کی اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ اس سے پہلے ہی، اُس کو ٹھکانا دینے کے لئے، وَلَیَحْلِفُنَّ: اور البتہ ضرور قسم کھائیں گے یہ لوگ اِنْ اَرَدْنَآ اِلَّا الْحُسْنٰی: کہ نہیں ارادہ کیا ہم نے مگر اچھی بات کا ہی۔ حُسنیٰ: اچھی حالت۔ ہم نے اچھی حالت کا ارادہ کیا ہے، اچھائی کا ہی ارادہ کیا ہے، وَاللّٰہُ یَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَکٰذِبُوْنَ: اور اللہ گواہ ہے کہ بے شک یہ لوگ جھوٹے ہیں، لَا تَقُمْ فِیْهِ اَبَدًا: قیام نہ کریں آپ اس مسجد میں کبھی بھی، یہاں قیام للصلاۃ مراد ہے، آپ اس میں نماز پڑھنے کے لئے کھڑے نہ ہوں، ''نہ کھڑے ہوں آپ اس مسجد میں کبھی بھی'' لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَی التَّقْوٰی: البتہ مسجد جس کی بنیاد رکھی گئی ہے تقویٰ پر، مِنْ اَوَّلِ یَوْمٍ: پہلے دن سے ہی اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِیْهِ: وہی حق دار ہے اس بات کی کہ آپ اس میں کھڑے ہوں، فِیْهِ رِجَالٌ یُّحِبُّوْنَ اَنْ یَّتَطَهَّرُوْا: اُس مسجد میں ایسے لوگ ہیں جو پسند کرتے ہیں پاک صاف رہنے کو، وَاللّٰہُ یُحِبُّ الْمُطَّهِّرِیْنَ: اور اللہ تعالیٰ پاک صاف رہنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ اَفَمَنْ اَسَّسَ بُنْیَانَهٗ عَلٰی تَقْوٰی مِنَ اللّٰہِ: کیا پھر وہ شخص جو بنیاد رکھے اپنی عمارت کی اللہ کے ڈر پر اور اللہ کی رضا پر، وہ بہتر ہے یا وہ شخص جو بنیاد رکھے اپنی عمارت کی عَلٰی شَفَا جُرُفٍ هَارٍ فَانْهَارَ بِهٖ فِیْ نَارِ جَهَنَّمَ: شَفا کہتے ہیں کنارے کو، یہ لفظ پہلے بھی آپ کے سامنے گزرا، کُنْتُمْ عَلٰی شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ (آل عمران: ۱۰۳) تم جہنم کے گڑھے کے کنارے پر تھے۔ جُرف کہتے ہیں گھاٹی کو، گھاٹی سے مراد یہ ہے جیسے دریاؤں کے کنارے پہ آپ نے دیکھا ہوگا جہاں سے سیلاب بہتا ہے، نیچے نیچے سے مٹی نکل جایا کرتی ہے اور اُوپر ایک تہہ ٹھہر جاتی ہے، جس طرح سے چھجا ہوتا ہے نیچے سے مٹی نکل جائے اور کھوکھلی سی ایک گھاٹی کھڑی ہو جاتی ہے اس کو جُرف کہتے ہیں، جو ہر وقت اس حال میں ہوتی ہے کہ ابھی گری اور ابھی گری، اس کو جرف کہتے ہیں، اور ''هَارٍ'' یہ هَارَ یَهُوْرُ سے ہے جس کا معنی ہوتا ہے عمارت کا بوسیدہ ہو کر پھٹ کر گرنے کے قریب ہو جانا، هَارَ کا مفہوم یہ ہوتا ہے، اب یہ هَارٍ جو ہے یا یہ تو اصل میں هَوِرٌ تھا صفت کا صیغہ، تو واؤ کو الف سے بدل دیا تو هَارٍ بن گیا، کیونکہ هَارَ یَهُوْرُ اجوف ہے، تو معنی اس کا وہی ہوگا جیسے حَذِرٌ ڈرنے

والے کو کہتے ہیں تو اسی طرح سے ھوِرٌ گرنے والے کو کہیں گے، تو واؤ کو الف سے بدل دیا تو ھَارٍ اس طرح سے ہو گیا۔ اور یا اس میں قلب کر لیا گیا ہے عین کو لام کے ساتھ، ایسا بھی ہوتا ہے کہ عین کو لام میں لے گئے اور لام کو عین میں لے آئے تو پھر یہ لفظ بن گیا ھارِی، داعِی کی طرح، تو جس طرح سے داعی کے آخر میں تنوین کی حالت میں ''یاء'' گر جایا کرتی ہے داعٍ پڑھ لیتے ہیں اسی طرح سے یہ ھارِی کے بجائے ھَارٍ پڑھ لیا گیا، اور قلب کے قاعدے سے ایسا ہوتا رہتا ہے، ویسے یہ لفظ اجوف ہے ناقص نہیں، جیسے شَوکۃ کا لفظ آپ کے سامنے سورۂ انفال میں آیا تھا غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ، شَوکۃ جنگی ہتھیار کو اسلحہ کو کہتے ہیں، تو شوکۃ سے اسم فاعل کا صیغہ آیا کرتا ہے شَائِكٌ، قَائِلٌ کی طرح، شائِكُ السِّلاح وہ شخص جس نے ہتھیار پہن لئے ہوں، ہتھیاروں کے ساتھ مسلح ہو گیا ہو، تو اس کے لئے لفظ شائِكُ السِّلاح آتا ہے اصل وضع کے اعتبار سے، لیکن اب وہ لفظ استعمال ہوتا ہے شَاکِي السِّلاح، تو شَاکِي یہ بھی اسی طرح سے ہوا کہ عین کو لام میں لے گئے اور لام کو عین میں لے آئے، تو شَاکِي السِّلاح کا معنی ہو گا وہ شخص جس نے ہتھیار پہن رکھے ہیں، تو قلب کے قاعدے کے ساتھ لام کو عین میں اور عین کو لام میں لے جاتے ہیں، یہ قاعدہ عربی میں چلتا رہتا ہے، اور یہ ہر زبان میں ہوتا ہے جس طرح سے آپ لوگ ''مطلب'' بولتے ہیں یہ صحیح لفظ ہے، اور بعض لوگ اس کو ''مطبل'' بولتے ہیں، اور اسی طرح سے ''چاقو'' ہے، اس کو بعض پنجابی دیہاتی بیچارے ''قاچو'' بولتے ہیں، تو اس قسم کا قلب ہر زبان میں ہوتا ہے، اور جَذَبَ: کھینچنا، اس سے قلب ہو کے بن گیا جَبَذَ۔ يَجْبِذُ لِسَانَهٗ یہ ''مشکوٰۃ شریف''[1] میں لفظ آیا تھا کہ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ اپنی زبان کو پکڑ کر کھینچ رہے تھے، يَجْبِذُ لِسَانَهٗ، حالانکہ وہ لفظ ہے يَجْذِبُ، جَذَبَ کھینچنے کے معنی میں ہوتا ہے، تو جَذَبَ کو جَبَذَ پڑھ لیتے ہیں، تو یہ اسی طرح سے قلب ہو گیا۔ تو جُرُفٍ هَارٍ کا معنی ہو گیا ایسی گھاٹی جو بالکل گرنے کے قریب ہے، گرنے والی گھاٹی، تو شَفَا جُرُفٍ هَارٍ: گرنے والی گھاٹی کا کنارہ۔ ''یا وہ شخص بہتر ہے کہ جس نے بنیاد رکھی اپنی عمارت کی گرنے والی گھاٹی کے کنارے پر'' فَانْهَارَ بِهٖ: بِهٖ کی ضمیر اس بانی کی طرف ہے۔ پس وہ گھاٹی گر گئی اپنے بانی کو ساتھ لے کر، فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ: جہنم کی آگ میں، وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ: اللہ تعالیٰ ظالم لوگوں کو سیدھا راستہ نہیں دکھاتا، ظلم کرتے کرتے ان کی صلاحیت ایسی خراب ہو جاتی ہے کہ اب ان کو سیدھا راستہ نظر ہی نہیں آتا، ہمیشہ اُلٹے راستے ہی چلتے ہیں۔ لَا يَزَالُ بُنْيَانُهُمُ الَّذِيْ بَنَوْا: ہمیشہ رہے گی ان کی یہ عمارت جو انہوں نے بنائی، رِيْبَةً فِيْ قُلُوْبِهِمْ: ان کے دل میں کھٹکے کا ذریعہ، تردّد کا ذریعہ، یہ ان کے دل میں رڑکتی رہے گی، کھڑکتی رہے گی، اِلَّآ اَنْ تَقَطَّعَ قُلُوْبُهُمْ: مگر یہ کہ ان کے دل ہی ٹوٹ جائیں، ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں ان کے دل، یعنی جب تک ان کے دل صحیح سالم ہیں اس وقت تک تو یہ کانٹا ان کے قلوب سے نہیں نکلے گا، مقصد یہ ہے کہ بالکل نہیں نکلے گا، ہمیشہ تک ساری زندگی وہ ان کے دل کے اندر حسرت ہی بنی رہے گی، تردّد اور کھٹکے کا باعث ہی بنے رہے گی، جیسے کسی کپڑے کے اوپر گہرا سا داغ لگ جائے تو کہتے ہیں یہ داغ کپڑے کے ساتھ ہی جائے گا، اب وہاں داغ کا جانا بتلانا مقصود نہیں ہوتا کہ داغ چلا جائے گا، یہ کپڑے کے ساتھ ہی جائے گا یعنی جس وقت کپڑا ختم ہو جائے گا داغ ختم ہو جائے گا، مطلب یہ ہوتا ہے کہ داغ زائل ہونے والا نہیں، کہ کپڑا باقی رہ جائے داغ زائل ہو جائے ایسا نہیں ہو گا، ''یہ داغ تو کپڑے کے ساتھ ہی جائے گا''، تو اسی طرح سے ان کے دل میں جو کھٹکا پیدا ہو گیا اس

(۱) مشکوٰۃ ۲/ ۴۱۵، باب حفظ اللسان، فصل ثالث، عن اسلم

عمارت کی وجہ سے وہ ان کے دِلوں کے ساتھ ہی جائے گا، جب ان کے دِل ٹکڑے ہوجائیں گے تو چاہے وہ ختم ہوجائے، ورنہ جب تک ان کے قلوب باقی ہیں یہ ختم نہیں ہوگا، وَاللّٰہُ عَلِیْمٌ حَکِیْمٌ: اللہ تعالیٰ جاننے والا ہے حکمت والا ہے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

تفسیر

ماقبل سے ربط

تذکرہ تو چلا آرہا ہے غزوۂ تبوک کے موقع پر جو مختلف طبقات بن گئے تھے اُن کا، اور منافقوں کو خاص طور پر بہت نمایاں کیا جارہا ہے، اور ان کے بالمقابل مخلصین کی تعریف کی جارہی ہے، جس طرح سے پچھلی آیت مخلصین کی تعریف میں ہی تھی، اور آگے اسی طرح سے کچھ دوسرے طبقات کا ذکر ہے۔

مخفی اور گہرے منافقین سے چوکس رہنے کا حکم

پہلے تو یہ ذکر کیا کہ ایسے منافق جن کو آپ نے پہچان لیا ہے، یا جن کی نمایاں علامات ہیں، یہ نہ سمجھ لینا کہ صرف یہی منافق ہیں، بلکہ ان سے بھی زیادہ مخفی اور گہرے منافق باہر دیہات میں اور تمہارے شہر میں اردگرد موجود ہیں، یہ کہنے سے کیا مقصد؟ کہ مخلصین کی جماعت زیادہ ہوشیار ہوجائے، اور کبھی اُن لوگوں کے دھوکے میں نہ آئے، ایک تو اس طرح اپنی جماعت کو ہوشیار کردیا گیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کہہ دیا گیا کہ ہر شخص قابلِ اعتماد نہیں، بعض اس قسم کے منافق بھی تمہارے اردگرد ہیں جن کا نفاق نمایاں نہیں ہے، علامات سے آپ اُن کو نہیں پہچان سکتے، اللہ اُن کو جانتا ہے آپ نہیں جانتے، اس میں احتیاط کی تعلیم ہوگئی کہ ہر آدمی اعتماد کے قابل نہیں، ہر آدمی سے چوکس رہیں، پتا نہیں کون کون اس قسم کے گہرے منافق جن کا علامات سے پتا نہیں چلتا، اور یہ بات کہنے کے ساتھ ان منافقوں پر بھی سرزنش ہوگئی، کہ جو دل میں اتنا نفاق کو چھپائے ہوئے تھے، کہ کسی بات سے اور کسی حال سے ظاہر نہیں ہونے دیتے تھے، کہ ہم اندر سے مخلص نہیں ہیں، اُن کے سر پر بھی یہ چوٹ لگ گئی کہ تم یہ نہ سمجھنا کہ دل کی گہرائیوں میں اگر تم نے کوئی مخالفت چھپا رکھی ہے، تو وہ سب سے چھپی ہے، نہیں! وہ اللہ جانتا ہے، اور جب چاہے گا اللہ تعالیٰ اس کو نمایاں بھی کردے گا، تو یہ اُن لوگوں کی دُکھتی رگ کے اوپر ہاتھ رکھا ہے تاکہ وہ اگر سمجھنا چاہیں تو سمجھ جائیں، وہ یہ جان لیں کہ دل کی کتنی ہی گہرائی میں ہم اسلام کی مخالفت کا جذبہ رکھیں گے وہ مخفی نہیں رہے گا، ہم بہت عقل مند بنے ہوئے ہیں، بہت ہوشیار بنے ہوئے ہیں کہ نہ کسی بات سے ظاہر ہونے دیتے ہیں، نہ کسی حال سے ظاہر ہونے دیتے ہیں، لیکن پھر بھی ہمارے وہ مخفی جذبات معلوم ہیں، تو اس سے اگر کسی کی قسمت میں توبہ ہوئی اور کوئی سمجھنے والا ہوگا تو اس سے تنبیہ ہوجائے گی اور وہ سمجھ جائے گا، تو ہوشیار کردیا گیا، جب جماعت میں اس قسم کے افراد موجود ہوں تو ہر شخص کی بات ذرا دھیان سے سن کر اس کو جانچ کے قبول کیا جائے، کسی کے دھوکے میں نہ آئیں، ورنہ اگر ہر کسی پر ظاہری طور پر اعتماد شروع ہوجائے، کہ یہ بھی مخلص ہے، یہ بھی مخلص ہے، تو مخفی عداوت رکھنے والے لوگ اسی طرح سے

اخلاص کے پردے میں آتے ہیں، اور اپنی بات کا یقین دلا کے اپنی کارروائی کر گزرتے ہیں، پتا اُسی وقت ہی چلتا ہے جب کوئی خاصا نقصان ہو جاتا ہے، ایسے نہیں پتا چلتا، جیسے ہمارے حضرت شیخ (سعدی ﷫) بھی تو یہی نصیحت کرتے ہیں، کہتے ہیں کہ:

نگہ دارد آں شوخ در کیسہ دُر   کہ بیند ہمہ خلق را کیسہ بُر[1]

انہوں نے بہت ہی ہوشیار رہنے کی تاکید کی، حاصل اس کا بھی یہی ہے کہ ''وہی ہوشیار آدمی اپنی جیب کے اندر موتی کو محفوظ رکھ سکتا ہے جو ہر کسی کو جیب تراش ہی سمجھے'' جب ہر کسی کو جیب تراش سمجھے گا تو جیب محفوظ رہ جائے گی، اور جب اعتماد کرنا شروع کر دیا کہ یہ تو سارے ہی صوفی ہیں، یہ تو سارے ہی نیک ہیں تو لاپروا اور بےفکر ہو جائے گا، تو کوئی جیب تراش آئے گا اور جیب کاٹ کے لے جائے گا۔ تو اس طرح سے ماحول کے اندر چوکس رہنا چاہیے، ہر کسی کی بات کو سنا جائے، سننے کے بعد اچھی طرح سے جانچا جائے، اُس کا نشیب و فراز دیکھا جائے، تب جا کے اُس کے اوپر اعتماد کیا جائے، ورنہ بعض ایسی مخفی عداوتوں والے لوگ ہوتے ہیں جو نہایت مخلص بن کے آتے ہیں، اور اخلاص کے پردے میں اس قسم کی باتیں کر جاتے ہیں، ایسے مشورے چھوڑ جاتے ہیں، ایسی بات چلا جاتے ہیں کہ جس کا نتیجہ بہت نقصان دِہ ہوتا ہے، ہر آدمی پہ اعتماد نہ کیا جائے۔ تو جتنے نمایاں ہو گئے یہ نہ سمجھنا کہ صرف یہی ہیں، بلکہ کچھ اور بھی ہیں جن کے اوپر علامات نمایاں نہیں، اللہ ان کو جانتا ہے۔ اور اُنہیں دھمکا دیا کہ وہ دنیا میں بھی ذلیل ہوں گے، اور اللہ تعالیٰ ان کو آخرت میں عذابِ عظیم کی طرف لے جائے گا، سَنُعَذِّبُهُمْ مَّرَّتَيْنِ: ہم انہیں دو دفعہ سزا دیں گے، ''دو دفعہ'' سے اگر واقعی دو دفعہ مراد ہو تو مطلب یہ ہوگا کہ دنیا میں بھی اپنے نفاق کی سزا پائیں گے، برزخ میں بھی پائیں گے، یہ دو دفعہ ہو گئی، اور آگے جس عذاب کی طرف رد کرنے کا ذکر ہے اُس سے آخرت کا عذاب مراد ہے قیامت کے بعد۔ یا پھر مَّرَّتَيْنِ کا لفظ تکرار کے لیے ہے، ہم انہیں بار بار سزا دیں گے، بار بار ان کو سزا یہی ہے کہ جب بھی مسلمانوں کو کوئی غلبہ یا کامیابی نصیب ہوتی ہے تو یہ جلتے ہیں تو یہ بار بار عذاب میں مبتلا ہوتے ہیں، پھر برزخ میں بھی ہوں گے، اور پھر آخرت میں جا کے بڑے عذاب کی طرف لوٹا دیے جائیں گے۔ پہلی آیت کا مضمون تو یہی ہے ''جو اَعراب تمہارے اردگرد ہیں اُن میں سے بعض منافق ہیں، اور اہلِ مدینہ سے بھی، اَڑے ہوئے ہیں نفاق پر، جمے ہوئے ہیں نفاق پر، ان کے دل سے نفاق ہلتا نہیں، بڑے مشاق ہیں، لَا تَعْلَمُهُمْ: آپ انہیں نہیں جانتے، یعنی اگرچہ آپ کتنے زیرک ہیں، ہوشیار ہیں، صاحبِ فراست ہیں، لیکن اُن کا نفاق اتنا مخفی ہے کہ اُس کے اوپر علامات نمایاں نہیں، آپ انہیں نہیں جانتے، نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ: ہم انہیں جانتے ہیں، سَنُعَذِّبُهُمْ مَّرَّتَيْنِ: ہم انہیں عنقریب عذاب دیں گے بار بار، یا دو مرتبہ، ثُمَّ يُرَدُّوْنَ اِلٰى عَذَابٍ عَظِيْمٍ: اب عذابِ عظیم کا مصداق تو یقیناً قیامت کے بعد والا عذاب ہے، اور مَّرَّتَيْنِ کے اندر یا تو دنیا کی پریشاں آگئیں، دنیا میں یہ جلن جو مسلمانوں کی ترقی دیکھ دیکھ کے ان کو ہو رہی تھی، اور پھر برزخ کا عذاب، دو دفعہ یہ لے لیجئے، یا مَّرَّتَيْنِ تکرار کے لیے ہے۔ جیسے سورۂ ملک کے اندر ایک لفظ آئے گا ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ: كَرَّتَيْنِ سے وہاں دو دفعہ ہی مراد نہیں، بلکہ (مطلب ہے کہ) بار بار اپنی نگاہ اٹھاؤ، اور دیکھو آسمان کی طرف، تمہیں اس کے

(۱) بوستان سعدی، باب اوّل کا تقریباً آخر۔

اندر کوئی نقص نظر آرہا ہے؟ تو اسی طرح سے یہاں بھی مَرَّتَیْنِ سے بار بار مراد لے لیا جائے، اور ہر واقعہ مسلمانوں کی فتح اور غلبے کا ان کے لئے مستقل عذاب تھا، جس سے ان کے دل کے اندر جلن پیدا ہوتی اور وہ پریشان ہوتے تھے۔

مخلصین کی توبہ کی قبولیت

وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ اب یہ ایک اور طبقے کا ذکر آ گیا، آپ کی خدمت میں عرض کیا تھا کہ جس وقت غزوۂ تبوک پیش آیا تھا، اُس وقت لوگوں کے مختلف حالات ہو گئے تھے، بعض تو ایسے مخلصین تھے کہ اعلان سنا اور فوراً تیاری شروع کر دی، اور بعض مخلص ایسے بھی تھے کہ دل میں نفاق نہیں تھا، اسلام اور مسلمانوں کے لیے ہر طرح سے مخلص اور جانباز تھے۔ پہلے غزوات میں بھی شرکت کرتے رہے، ہر موقع پر انہوں نے جاں نثاری دکھائی، لیکن اس موقع پر کچھ طبعی سستی کی بنا پر وہ پیچھے رہ گئے، سرورِ کائنات ﷺ کے ساتھ غزوہ پہ نہ جا سکے، اس قسم کے دس آدمی تھے جن سے یہ کوتاہی ہوئی، تھے وہ مخلص، نفاق اُن میں بالکل نہیں تھا، لیکن کچھ طبعی سستی ہو گئی کہ اعلان ہونے کے بعد وہ سستی میں پڑے رہے، اب اس قسم کے مخلص جو پیچھے رہنے والے تھے وہ دو حصوں میں تقسیم ہو گئے، سات ایک جانب اور تین ایک جانب، سات تو ایسے تھے کہ جس وقت اُن کو پتا چلا کہ سرورِ کائنات ﷺ غزوہ سے واپس تشریف لا رہے ہیں، تو اُن کو اپنی کوتاہی کا استحضار ہوا، کہ ہم تو بہت بڑی غلطی کر بیٹھے، ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا تو اُن لوگوں نے اپنے آپ کو لے جا کے مسجد کے ستونوں کے ساتھ باندھ دیا، گویا کہ عملاً اپنے آپ کو مجرم قرار دے کے پیش کر دیا، اور یہ کہا کہ یہ ہماری غلطی ہے، ہم نے غلطی کی، ہم اپنے آپ کو سزا کے لیے پیش کرتے ہیں، جس وقت تک اللہ کا رسول معاف کر کے ہمیں خود نہیں کھولے گا ہم یہاں بندھے رہیں گے، کھانا چھوڑ دیا، سونا چھوڑ دیا، ہر قسم کی راحت اور آرام کو چھوڑ کے اپنے آپ کو گویا کہ سزا کے لیے پیش کر دیا، یہ ایک قسم کی لجاجت ہوتی ہے کہ ہمیں معاف کر دیا جائے، اس بات پہ تعجب نہ کیجئے کہ اُن لوگوں نے اس قسم کا اقدام کیوں کیا؟ آج آپ جانتے ہیں اس مادّی دور میں جب کہ پیٹ اور جیب ہی انسان کا سب کچھ ہے، تو کیا یہ مزدور اور ملازم طبقہ تنخواہ میں چند ٹکوں کے اضافے کروانے کے لیے بھوک ہڑتال نہیں کرتے؟ بھوک ہڑتال کر کے بیٹھ جاتے ہیں جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اگر ہمارا مطالبہ نہ مانا گیا تو ہم اسی طرح سے مر جائیں گے، تو آج مادّی دور ہے، پیسوں کی عظمت ہے، پیسوں کی قدر و قیمت ہے، اس لیے پیسے حاصل کرنے کے لیے یہ لوگ بھوکا مرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں، لیکن رُوحانی دور میں اللہ کی معصیت ہو جانے کے بعد انسان کے اوپر یہ کیفیت طاری ہوتی ہے، کہ گناہوں کی معافی کے لیے وہ سونا چھوڑ دے، کھانا چھوڑ دے اور مرنے کے لیے تیار ہو جائے، کہ یا تو مجھے معاف کر دیا جائے، ورنہ میں اسی طرح بلک بلک کر اور تڑپ تڑپ کے اپنی جان دے دوں گا، تو جس چیز کی عظمت کسی کے دل میں ہوتی ہے اس کے لیے وہ ہر قسم کی بازی لگا دیتا ہے، آج لوگ اپنے مطالبے منوانے کے لیے کیا کچھ نہیں کرتے، لوگ اپنے مطالبے منوانے کے لیے زندہ جلنے تک تو اقدام کر جاتے ہیں، اور بھوک ہڑتال تو عام ہے کہ جہاں کسی کا مطالبہ نہیں مانا گیا تو وہ بھوک ہڑتال کر کے بیٹھ جاتا ہے کہ بس میں اسی طرح سے مر جاؤں گا، یہ ایک زبردست احتجاج ہوتا

ہے کہ میرے مطالبے کو مان لیا جائے۔ تو ان لوگوں کے لیے چونکہ اللہ کی طرف سے اور رسول اللہ ﷺ کی طرف سے معافی کا اعلان یہ بہت بڑا مقصود تھا، اور انہیں اپنی کوتاہی کا احساس ہوا تو اس لیے وہ مرنے کے لیے تیار ہو گئے، کہ بھوکے رہیں گے، سوئیں گے نہیں، سب راحتیں چھوڑ دیں گے، تو یہ ایک قسم کی عملاً لجاجت ہے، کہ ہمیں معاف کر دیا جائے، اور اس میں اپنے دل کی بے چینی کا اظہار ہے، ان سات نے تو اس طرح کر دیا، ان سات میں سے خصوصیت کے ساتھ ابولبابہ رضی اللہ عنہ کا ذکر آتا ہے...... اور اس وقت مسجدِ نبوی میں جو پختہ ستون بنے ہوئے ہیں، ترکوں نے اس بات کا اہتمام کیا تھا، کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں جہاں جہاں ستون تھے، کھجور کے درختوں کے تنے کاٹ کے جو ستون بنائے ہوئے تھے اور اوپر چھپر ڈالا ہوا تھا، تو مسجدِ نبوی میں پختہ ستون انہی انہی جگہوں پہ بنائے گئے ہیں، تو وہاں سے پوری نشاندہی ہو جاتی ہے اور انہوں نے نشان باقی رکھے ہوئے ہیں، کہ حضور ﷺ کے زمانے میں یہ مسجدِ نبوی تھی، پھر حضور ﷺ کے زمانے میں اس میں یہ توسیع ہوئی، تو ستونوں کی قطار کے آخر میں ستونوں کے اوپر یہ لکھا ہوا ہے "هٰذَا حَدُّ مَسْجِدِ النَّبِيِّ ﷺ. هٰذَا حَدُّ مَسْجِدِ النَّبِيِّ ﷺ" تو اس سے یہ بات ممتاز ہو جاتی ہے، پھر ان ستونوں میں سے بھی جس کے ساتھ کوئی بھی واقعہ پیش آیا ہوا ہے وہ بھی ان ستونوں کے اوپر لکھا ہوا ہے، جس سے معلوم ہو جاتا ہے، کہ یہاں یہ واقعہ پیش آیا تھا، وہ ستون جس کے ساتھ حضور ﷺ کھڑے ہو کے خطبہ دیا کرتے تھے، بعد میں منبر بن گیا تو آپ ﷺ منبر پہ تشریف لے گئے، وہ کھجور کا تنا جسے اسطوانہ کہتے ہیں، وہ رونے لگ گیا، بلکنے لگ گیا تھا، چیخیں مارنے لگ گیا تھا رسول اللہ ﷺ کے علیحدہ ہو جانے کے بعد، "مشکوٰۃ شریف" میں معجزات میں یہ واقعہ آئے گا، کہ جمعہ کے خطبے کے لئے آپ منبر پر تشریف لے گئے تو اس ستون میں سے جو کھجور کا تنا تھا، اس میں سے اس طرح رونے کی آواز آنے لگ گئی کہ جس طرح کوئی بچہ بڑی بے تابی سے روتا ہے، تو رسول اللہ ﷺ منبر سے اُتر کے آئے، اور آ کے اس کو اپنے ساتھ لگایا اور تسلی دی، جس کے بعد وہ اس طرح سے ہچکیاں لینے لگ گیا، جس طرح کوئی بچہ رو رہا ہو،[1] اور اس کو آپ دباؤ دے کے یا پیار کے ساتھ چپ کرا دیں تو وہ ہچکیاں لیتا ہے، ایسا ہوتا ہے نا؟ کہ اندر سے رونے کا جذبہ ہوتا ہے اور اُوپر سے دباؤ ہوتا ہے کہ چپ رہو تو پھر ایک ایسی کیفیت پیدا ہو جایا کرتی ہے جس کو "ہچکیاں لینا" کہتے ہیں، تو وہ یوں بچوں کی طرح ہچکیاں لینے لگ گیا، اس کو "اسطوانہ حنانہ" کہتے ہیں، اور اس کا دوسرا نام "اسطوانہ مخلقہ" ہے، کیونکہ اس کے اس امتیاز کی بنا پر لوگ عموماً جا کے اس کے اوپر خوشبو چھڑکتے تھے، خوشبو لگاتے تھے، "خلوق" خوشبو کو کہتے ہیں، تو حدیث شریف میں آپ پڑھیں گے "اسطوانہ مخلقہ"، تو اس کے اوپر یہی لکھا ہے "اسطوانہ مخلقہ"، تو یہ وہی اسطوانہ ہے، یعنی اس سے نشاندہی ہوتی ہے کہ وہ اسطوانہ جس کے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا تھا وہ یہاں تھا۔ اور ایسے ہی ابولبابہ رضی اللہ عنہ نے اپنے آپ کو جس ستون کے ساتھ باندھا تھا، اور اُن کی توبہ قبول ہوئی تھی، اُس کے اوپر یہی نام لکھا ہوا ہے "اسطوانہ توبہ" یا "اسطوانہ ابی لبابہ"، تو "اسطوانہ توبہ" کا نشان اس کے اوپر دیا ہوا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ابولبابہ رضی اللہ عنہ والا ستون ہے، جس کے ساتھ ابولبابہ رضی اللہ عنہ نے اپنے آپ کو باندھا تھا، تو وہاں مسجد کے اندر اس قسم کے نشانات باقی رکھے ہوئے ہیں، جن کے ساتھ اُس زمانے کی بات کچھ

(۱) بخاری ۱/۲۸۱، باب النجار/ مشکوۃ ۲/۵۳۶، باب فی المعجزات، فصل اول، عن جابر رضی اللہ عنہ

سامنے آجاتی ہے۔تو جس وقت سرورِ کائنات ﷺ تشریف لائے اور ان کو اس طرح سے اپنے آپ کو پیش کیے ہوئے دیکھا، تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اچھا ہے، جب اللہ کی طرف سے ان کی توبہ کی اطلاع آجائے گی، اُس وقت میں بھی کھول دُوں گا، اپنی طرف سے میں بھی نہیں کھولتا، جب انہوں نے اپنے آپ کو خود اللہ کے سامنے پیش کر دیا ہے تو اللہ جانیں اور یہ جانیں، جس وقت ان کی معافی کا اعلان آجائے گا اور ان کی توبہ قبول ہوجائے گی تو اس کے بعد میں کھول دُوں گا، تو چند دِن وہ اسی طرح سے رہے، پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ آیات اُتریں، جن میں اُن کی توبہ کی قبولیت کا اشارہ ہے، پھر سرورِ کائنات ﷺ نے اُن کو جا کے کھولا اور اُن کا یہ جرم معاف ہوا۔اور باقی تین رہ گئے، انہوں نے اپنے آپ کو اس طرح سے بھی پیش نہیں کیا، وہ تینوں ہی بہت اعلیٰ درجے کے لوگ تھے، تینوں کا نام حدیث شریف میں آتا ہے، ایک کعب بن مالک رضی اللہ عنہ، یہ بیعتِ عقبہ میں شریک ہوئے تھے، جنہوں نے مکہ معظمہ میں اِبتدا اِبتدا میں سرورِ کائنات ﷺ کی بیعت کی تھی، جس کے نتیجے میں آپ ﷺ ہجرت کر کے مدینہ منورہ آئے تھے، اس بیعت کے اندر یہ کعب بن مالک رضی اللہ عنہ شریک تھے، یہ اتنے اعلیٰ درجے کے آدمی اور اتنے سابقین میں سے ہیں، اور دوسرے دو تھے مُرارۃ بن الربیع رضی اللہ عنہ اور ہلال بن اُمیہ رضی اللہ عنہ، یہ دونوں ہی بدری ہیں، بدر میں بھی شریک ہوئے تھے، اور اس کے بعد بھی جتنے غزوات ہوئے یہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ رہے، ان تینوں نے اپنے آپ کو وہاں باندھا نہیں، جب سرورِ کائنات ﷺ تشریف لائے، مسجد میں آکر بیٹھے، آپ ﷺ کی عادت شریفہ یہی تھی کہ جس وقت سفر سے تشریف لاتے تو سیدھے مسجد میں آیا کرتے تھے، مسجد میں آکے دو رکعت پڑھتے، پھر وہیں بیٹھ جاتے، لوگ ملاقاتوں کے لیے آتے، جب ملاقاتوں سے فارغ ہوجاتے پھر اُٹھ کے گھر جایا کرتے تھے۔تو جس وقت آپ ﷺ مسجد میں بیٹھے تو کعب رضی اللہ عنہ آگئے ان کا لمبا واقعہ ہے، بخاری شریف[1] میں تین صفحے کی روایت ہے، انہوں نے خود اپنا سنایا ہے کہ میرے ساتھ کیا گزری، حاصل اُس کا یہی ہے کہ جس وقت یہ سامنے آئے ہیں تو حضور ﷺ ان کی طرف دیکھ کے مسکرائے جس طرح سے غصے والا آدمی مسکرایا کرتا ہے، وہ محبت کا مسکرانا نہیں تھا، غصے کا مسکرانا تھا، اور پوچھا کہ کیا بات ہے، تم کیوں نہیں گئے؟ تو انہوں نے صاف صاف بات کر دی کہ یا رسول اللہ! اگر ہم کسی دُنیادار کے سامنے ہوتے تو ہمیں اللہ نے جھگڑنے کی بڑی توفیق دی ہے، ہمیں بات بنانے کا بڑا طریقہ آتا ہے، ہم ضرور یہاں سے اپنے آپ کو بَری الذمہ ثابت کر کے نکل جاتے، لیکن آپ ﷺ کے سامنے ہم غلط بات نہیں کر سکتے، اگر آج آپ کو خوش کرلیں گے تو اللہ کل کو ناراض کر دے گا، اور اگر آج ہمارے سچ بولنے پر آپ ناراض ہو بھی گئے تو ہمیں اللہ سے توقع ہے کہ ہماری توبہ قبول ہوجائے گی، اور اللہ آپ کو خوش کر دے گا، اصل بات یہ ہے کہ کچھ نہیں تھا، سوائے اپنی کوتاہی کے کوئی ہمارے پاس عذر نہیں، تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ بہت اچھا، پھر جاؤ، یہ معاملہ اللہ کے سپرد ہے، جس وقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی اطلاع آئے گی تو اس کے مطابق تمہارے ساتھ معاملہ کیا جائے گا۔تو پچاس دِن تک پھر ان کا بائیکاٹ رہا، کوئی مسلمان ان سے بولتا نہیں تھا، کوئی ان سے ملتا نہیں تھا، اس کا ذکر آگے آئے گا کہ ان کا یہ حال ہوگیا کہ ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَنْفُسُهُمْ: دل ان کے تنگ

(۱) صحیح البخاری ۲/ ۶۳۴ تا ۶۳۶، باب حدیث کعب

ہو گئے، زمین ان کے لیے تنگ ہو گئی، تو پچاس دن کے بعد پھر اللہ کی طرف سے اُن کی توبہ قبول ہوئی تو پھر ان کو بھی معاف کیا گیا۔
اب اگلی آیات میں ان دونوں طبقوں کا ذکر ہے، وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ: اور کچھ اور بھی ہیں جنہوں نے اپنے گناہوں کا اعتراف کر لیا، اور نیک عمل کو اور بُرے عمل کو خلط ملط کر لیا، کہ اُن کے پاس نیک عمل بھی ہیں، لیکن ساتھ بُرے عمل کو بھی شامل کر لیا، یہ بُرا عمل تھا تخلّف عن الغزوہ، یعنی یہ غزوے سے پیچھے رہ گئے، یہ بُرا عمل تھا جس کو ساتھ ملا لیا۔

سوال:- جنہوں نے اپنے آپ کو باندھ لیا تھا، تو کیا وہ نماز نہیں پڑھتے تھے؟

جواب:- نماز کے وقت کھول دیے جاتے تھے، پیشاب پاخانے کے وقت کھول دیے جاتے تھے، جو ضروریاتِ طبعیہ یا ضروریاتِ شرعیہ ہوا کرتی ہیں، وہ تو خود بخود ہی مستثنیٰ ہوتی ہیں، ان کے ذکر کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔

تو عملِ سیئہ سے مراد ہے ان کا اس غزوے میں بلا عذر پیچھے رہ جانا، کیونکہ جن کے پاس صحیح عذر تھے ان کی تو پیچھے اللہ تعالیٰ نے صفائی دے دی، ضعفاء اور جن کے پاس اسباب مہیا نہیں تھے ان کا تو پہلے ذکر آ چکا، اور یہ تھے بغیر عذر کے رہنے والے، عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْهِمْ: یہی اللہ کی طرف سے توبہ کی قبولیت ہے۔ ''قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ اُن کی توبہ قبول کرلے گا، اللہ تعالیٰ ان کے اُوپر رجوع کرے گا'' لیکن سرورِ کائنات ﷺ نے انہی الفاظ سے سمجھا کہ اللہ نے ان کی توبہ قبول کر لی، کیونکہ عسیٰ کے لفظ میں جو اُمید دلائی جاتی ہے یہ اُمید اللہ کی طرف سے وعدہ ہوتا ہے۔ ''بے شک اللہ تعالیٰ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔'' تو انہوں نے تو اپنے آپ کو اس طرح سے سزا میں ڈالا اور ان کو معافی مل گئی۔

مخلفین مخلصین وغیر مخلصین کے قلبی جذبات میں فرق

منافقین کے بارے میں آیا تھا کہ انہیں اعلان کر دو کہ اگر تم خرچ کرو گے، چاہے رضا مندی سے خرچ کرو، چاہے کراہت کے ساتھ خرچ کرو، تمہارے صدقات قبول نہیں ہیں، اور اُن کے صدقات ان کے لیے نہ گناہ کی معافی کا ذریعہ بنتے تھے اور نہ درجات کی بلندی کا، اور ان کا جنازہ تک پڑھنے سے ممانعت کر دی گئی تھی، کہ ان کے لیے استغفار کوئی مفید نہیں۔ کرو یا نہ کرو، پھر صراحت کے ساتھ آ گیا کہ اگر یہ مر جائیں تو ان کا جنازہ نہ پڑھو، گویا کہ ان کے نفاق کی وجہ سے ان کو دو چیزوں سے محروم کیا گیا، ایک اس چیز سے محروم کیا گیا کہ ان کے صدقات قبول نہیں ہیں اور یہ صدقات ان کے لیے صفائی ستھرائی کا ذریعہ نہیں بنیں گے، اور دوسرے سرورِ کائنات ﷺ کی دُعاؤں سے ان کو محروم کر دیا گیا، کہ اوّل تو آپ ﷺ دُعا کریں گے نہیں، کریں گے تو فائدہ کوئی نہیں، اور صراحتاً منع کر دیا کہ ان کا جنازہ نہ پڑھنا۔ اب یہ لوگ عملاً اگرچہ منافقین میں شامل ہو گئے تھے، کہ جس طرح منافقین غزوہ سے پیچھے رہ گئے تھے یہ بھی پیچھے رہ گئے تھے، لیکن قلبی جذبات کا فرق تھا، اور اس کی انہوں نے سزا پالی، جب سزا پالی تو اب آگے دونوں باتیں آ گئیں، کہ ان کے صدقات کو بھی قبول کرو، اور ان صدقات کے ذریعہ سے اُن کو صاف ستھرا کرو، ان کے ظاہری باطنی گناہ دھلیں گے، صاف ہوں گے، کیونکہ اگر کسی شخص سے کوئی گناہ ہو جائے تو اس کے بعد اگر انسان شرعی طریقے کے مطابق توبہ بھی کر لے تو ٹھیک ہے کہ آخرت کا وبال ٹل جاتا ہے، لیکن دل کے اوپر کچھ اس قسم کے اثرات گناہ کے رہ جایا کرتے ہیں، کہ اگر

ان کے ازالے کی فکر نہ کی جائے تو خطرہ ہوتا ہے کہ انسان دوبارہ پھر اس گناہ میں مبتلا ہو جائے گا، اس لیے ایک دفعہ توبہ کرنے کے بعد بار بار استغفار اور اللہ کے راستے میں صدقہ خیرات، یہ ہے جو قلب کو اچھی طرح سے صاف کرتا ہے، اب اس گناہ کے معاف ہونے کے بعد وہ صدقات آپ کے سامنے لائیں گے، آپ اُن کو قبول کیجئے، اور ان صدقات کے ذریعے سے ان کو صاف ستھرا کیجئے، اس سے ان کے دل میں زیادہ صفائی آئے گی، ان کی باطنی صلاحیتیں ابھریں گی، جیسا کہ تزکیہ کا نتیجہ ہے، تطہیر تو ہوگئی کہ گناہ معاف ہو گئے، ظاہری باطنی صفائی حاصل ہوگئی، تزکیہ سے مراد ہے آئندہ کے لئے اچھی صفات کی نشوونما ان میں کریں گے، وَصَلِّ عَلَیْہِمْ اور ان کے لیے دُعا بھی کیجئے، جس میں یہ بھی شامل ہے کہ ان کا جنازہ بھی پڑھنا ہے، زندگی میں بھی ان کے لیے دُعا کرو، اور آپ کی دُعا ان کے لیے سکون کا باعث ہے، وَاللّٰہُ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ اللہ تعالیٰ سننے والا ہے جاننے والا ہے۔

زکوٰۃ کی وصولی اور خرچ اسلامی حکومت کے فرائض میں شامل ہے

تو خُذْ مِنْ اَمْوَالِہِمْ صَدَقَۃً، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی عادت اسی طرح سے تھی، کہ جس وقت کوئی صدقہ خیرات کرنا ہوتا تو وہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے کے آیا کرتے تھے، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم وصول کرتے تھے، زکوٰۃ میں تو حکم ہی یہی تھا، ابتدا سے ہی زکوٰۃ کی وصولی حکومت کی ذمہ داری رہی ہے، حکومت زکوٰۃ وصول کرتی ہے، صدقات وصول کرتی ہے، پھر اُس کو اس کے مصارف کے اُوپر خرچ کرتی ہے، یہی وجہ ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں جو ارتداد پھیلا تھا اُس میں دونوں قسم کے لوگ تھے، بعض تو وہ تھے جو سرے سے منکر ہو گئے، وہ تو صحیح معنی میں مرتد تھے، جنہوں نے زکوٰۃ کا انکار کر دیا کہ ہم نماز تو پڑھیں گے، لیکن زکوٰۃ نہیں دیں گے، یہ تو مرتد قرار پائے اور کافر ہو گئے، اور بعض وہ تھے جو کہتے تھے کہ ہم امام کے پیچھے نماز تو پڑھیں گے، لیکن زکوٰۃ امام کو نہیں دیں گے، کیونکہ یہ خصوصیت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تھی خُذْ مِنْ اَمْوَالِہِمْ صَدَقَۃً وہ کہتے تھے کہ بس صدقہ لینا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت تھی، اب یہ زکوٰۃ ہم حکومت کو نہیں دیں گے، تو جس وقت انہوں نے اس قسم کا انکار کیا تو ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اور صحابہ رضی اللہ عنہم نے ان کو باغی قرار دیا، اور ان کے ساتھ لڑائی ویسے ہوئی جیسے باغیوں سے ہوتی ہے، تو لڑائی مرتدوں کے ساتھ بھی ہوئی اور ان کے ساتھ بھی ہوئی، اور آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں اس وقت تک ان کے ساتھ لڑوں گا جس وقت تک یہ ایک رَسّی جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ادا کرتے تھے، اور میری طرف ادا نہیں کریں گے، اُس وقت تک میں ان کے ساتھ لڑائی کروں گا، حتیٰ کہ وہ رَسّی بھی میری طرف ادا کریں جو یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ادا کیا کرتے تھے،[1] تو یہ نظامِ زکوٰۃ اسلامی حکومت کے فرائض میں سے ہے، کہ زکوٰۃ اکٹھی کرے اور اُس کے بعد اپنے انتظام کے تحت اس کو مصارف پر خرچ کرے۔

''قومی اِتحاد'' کے منشور میں موجود ''نظامِ زکوٰۃ'' پر خدشات

آپ حضرات کو شاید یاد ہوگا کہ ''نظامِ مصطفیٰ'' کی جو تحریک چلی تھی اس میں ''قومی اتحاد'' نے الیکشن سے پہلے اپنا منشور شائع کیا تھا، جب نو ستارے اکٹھے ہو گئے تھے، تو ان کا منشور چھپا تھا، اگر آپ نے منشور دیکھا ہو تو آپ کو یاد ہوگا، میں نے جس

(۱) صحیح البخاری ۱/ ۱۸۸ باب وجوب الزکاۃ مشکوٰۃ ج ۱ ص ۱۵۷، کتاب الزکاۃ فصل ثالث، عن ابی ہریرۃ

وقت اس منشور کا مطالعہ کیا، تو اُس میں ایک دفعہ یہ بھی تھی کہ اگر ''قومی اتحاد'' کی حکومت قائم ہوگئی تو ہم ''نظامِ زکوٰۃ'' رائج کریں گے، زکوٰۃ اور عشر کا نظام رائج کریں گے، جس کا مطلب یہ کہ زکوٰۃ اور عشر حکومت وصول کرے گی، وصول کرنے کے بعد اُس کے مصارف پر خرچ کرے گی۔ آپ یقین جانیے کہ جس وقت مطالعہ کرتے ہوئے میں اس دفعہ پر پہنچا تو میں پیشانی پکڑ کے بیٹھ گیا، میں نے کہا کہ ''قومی اتحاد'' والوں نے جو یہ شوشہ چھوڑ دیا، اور اس اعتماد پہ چھوڑ دیا ہے کہ حکومت انہی کی آرہی ہے، اب اگر حکومت ان کی بن گئی اور انہوں نے اپنے اس منشور پر عمل کیا اور ''نظامِ زکوٰۃ وعشر'' جاری کر دیا، تو کیا یہ ضروری ہے کہ ''قومی اتحاد'' کی حکومت بن جانے کے بعد سربراہ مفتی (محمود) صاحب ہی ہوں گے؟ اس لیے زکوٰۃ اور عشر صحیح ہاتھوں میں جائے گا، صحیح طور پہ وصول کریں گے، صحیح طور پر خرچ کریں گے، اور اگر حکومت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھ میں چلی ہی گئی تو کیا مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بعد بھی یہ توقع ہے کہ مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ جیسا ہی آدمی حاکم آئے گا، جو زکوٰۃ صحیح طور پر وصول کرے گا، اور صحیح طور پر خرچ کرے گا۔ اور اگر بالفرض مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی حکومت نہ بنی اور بھٹو صاحب آ گئے، تو انہوں نے اچھا بھلا راستہ بھٹو صاحب کو دکھا دیا، کہ زکوٰۃ اور عشر بھی حکومت وصول کر سکتی ہے، اور وصول کرنے کے بعد جس طرح چاہے اپنی مرضی کے مطابق اس کو مصارف پہ خرچ کرے، تو مدارس کا گلا گھوٹنے کے لیے بھٹو صاحب کے ہاتھ میں ایک شاندار ہتھیار آ جائے گا، کیونکہ مدارس کے جو رُوحِ رواں ہیں وہ تو یہی صدقات اور زکوٰۃ، عشر وغیرہ ہی ہیں، اور جس وقت یہ حکومت وصول کر لے گی تو مدارس کی رگ حکومت کے ہاتھ میں آ جائے گی، تو اس وقت میرا ماتھا ٹھنکا تھا کہ یہ کسی نہ کسی قسم کی گڑبڑ ہو جائے گی، یہ دفعہ اُن کو اشاعت میں نہیں لانی چاہیے تھی، اگر حکومت بن جاتی اور پھر اس قسم کا اقدام ہوتا تو بالکل موقع محل کے مطابق تھا، کیونکہ اسلامی حکومت کا فرض ہے کہ زکوٰۃ وصول کرے اور اپنی صوابدید کے مطابق اُس کے مصارف پہ خرچ کرے۔ تو ہوا وہی، کہ منشور ''قومی اتحاد'' نے دیا تھا، اور اُس کے اوپر عمل کرنے کی توفیق ہمارے صوفی (ضیاء الحق) صاحب کو ہوگئی، اور جس وقت صوفی صاحب نے اعلان کیا، کہ زکوٰۃ ہم وصول کریں گے اور اس کی تقسیم ہم کریں گے، تو پھر وہی خطرات سامنے آ گئے کہ ان کے زکوٰۃ وصول کرنے کا طریقہ صحیح ہے یا غلط؟ اور پھر زکوٰۃ جو وصول کریں گے تو ان کے خرچ کرنے کا طریقہ صحیح ہے یا غلط؟ یہ تو غلط ہاتھوں میں چلی گئی، ان کے اوپر ہم کیسے اعتماد کر سکتے ہیں، کہ یہ صحیح مصرف میں خرچ کریں گے؟ یہ تو خود کھا جائیں گے، یہ تو یوں کریں گے، پھر اس قسم کے خطرات اُبھر اُبھر کے سامنے آ گئے، لیکن صوفی صاحب اس معاملے پر ڈٹے ہوئے ہیں، اور اللہ تعالیٰ ان کو صحیح طور پر اس نظام کو جاری کرنے کی توفیق دے، جس وقت ایک کام غلط ماحول میں شروع کیا جایا کرتا ہے، تو پہلے پہلے اس کے اندر واقعی دُشواریاں بھی ہوتی ہیں، کوتاہیاں بھی ہوتی ہیں، علماء کا فرض ہے کہ گرفت کرتے رہیں، اور اُن کو صحیح مشورہ دیتے رہیں، اور اگر وہ دیانت دار ہوں گے تو علماء کے مشورے کے تحت اپنے اس قانون کے اندر ترمیم کرتے رہیں گے، اور جس قسم کی خامیاں سامنے آئیں گی اُن کا ازالہ کرتے رہیں گے، تو اگر اس طرح سے دو طرفہ تعاون رہا، علماء کی ہمدردانہ تنقید، خیر خواہی کے ساتھ نیک مشورے دینا، اور اُن کی طرف سے خیر خواہی کے ساتھ ان مشوروں کے اوپر نظر ڈالنا، اور جس چیز کی نشاندہی علماء کریں اُس کو اپنانا، کوتاہیوں کو دُور کرنا، اگر یہ سلسلہ جاری رہا تو کچھ دیر میں یہ نظم صحیح بھی ہو جائے گا، اور اگر ضد شروع ہوگئی کہ علماء صحیح طور پر ایک بات کہتے ہیں، لیکن وہ قبول کرنے کے لیے تیار نہیں، اور اس کو اپنی عزت کا مسئلہ بنا لیں، تو

پھر یہ عنوان اسلام کا ہوگا اور معاملہ سارے کا سارا گڑ بڑ ہو جائے گا، تو یہ ''نظامِ زکوۃ'' اور ''نظامِ عشر'' کا جاری کرنا، یہ راستہ اس کو ''قومی اِتحاد'' نے دِکھایا ہے، اور اس قسم کے خطرات جیسے میں نے محسوس کیے تھے، کہ اگر یہ غلط ہاتھوں میں چلا گیا تو عنوان تو اچھا ہوگا، لیکن معاملہ گڑ بڑ ہوگا، یہ زکوۃ اور عشر جو مدرسوں کا سرمایہ ہے وہ بھی حکومت چھین لے گی، اب اسی قسم کے خطرات سامنے آگئے، یہی باتیں کہی گئیں کہ یہ نظم دیانت دار ہاتھوں میں نہیں ہے، وصولی کا طریقہ صحیح نہیں ہے، اور اس میں کیا ضمانت ہے کہ وصول کرنے والے خرچ کریں گے، یہ تو کھا جائیں گے، یہ تو یوں کریں گے، وغیرہ وغیرہ، اس قسم کے سارے خطرات اُبھر کے سامنے آگئے، بہر حال جو عنوان اُس نے رکھا ہے وہ یہی ہے کہ چونکہ اسلامی حکومت ہے اور اسلامی حکومت کی وجہ سے زکوۃ اور عشر کا نظام انہی کے ذِمے ہے، اعلان کر دیا ہے، اب دیکھو! آگے اس میں کیا ترمیم ہوتی ہے، صحیح ہوتا ہے یا نہیں ہوتا، بہر حال یہ راستہ ''قومی اِتحاد'' کا دِکھایا ہوا ہے۔

ادائیگیٔ زکوۃ سے تطہیر اور تزکیہ کا حاصل ہونا

اور خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ میں اس طرف بھی اشارہ ہو گیا، کہ صدقہ صدقہ دینے میں اصل فائدہ دینے والوں کو ہی ہوتا ہے، کہ ان کی تطہیر اور تزکیہ ہوتا ہے، پہلا فائدہ انہی کا ہے، اور آگے دوسرا فائدہ ہے کہ مساکین کی حاجت بھی پوری ہو جائے، محتاجوں کو گزران مہیا ہو جائے، اس قسم کے فوائد ثانوی درجے میں ان کے ہیں، اوّل فائدہ دینے والوں کا ہے، کہ ان کے ذریعے سے یہ پاک صاف ہوتے ہیں اور ان کو تزکیہ حاصل ہوتا ہے۔

اَلَمْ يَعْلَمُوْٓا: کیا ان کو پتا نہیں؟ یعنی یہ جانتے ہیں، کہ بے شک اللہ تعالیٰ توبہ قبول کرتا ہے اپنے بندوں سے، یہ ترغیب ہے توبہ کرنے کی، کہ پھر بھی اگر کوئی بُرا عمل ہو جائے تو اسی طرح سے توبہ کرنی چاہیے، ''اور اللہ تعالیٰ صدقات بھی قبول کرتا ہے، اور بے شک اللہ تعالیٰ تواب اور رحیم ہے۔''

مخلفین مخلصین کو آئندہ کے لئے تنبیہ

اور آگے ایک اور تنبیہ آگئی کہ جب ایک دفعہ غلطی کر بیٹھے...... دیکھو! اس میں اپنی پچھلی تاریخ داغ دار کر لی، پہلے مخلص چلے آرہے تھے اور اب یہ غلطی ہو گئی اور مخلصین کو غلطی پر رگڑا کچھ زیادہ ہی لگا کرتا ہے، کیونکہ اس میں غصہ یہی ہوتا ہے کہ جب پہلے سے صاف ستھرے آرہے تھے، تو اب اپنے دامن کو داغ دار کیوں کر لیا؟ اعتماد کو بحال کیوں نہیں رکھا؟ جو پہلے اعتماد تھا اس کو دھچکا لگتا ہے، اس لیے جن کی عادت مخالفت کرنے کی ہوتی ہے، سازشیں کرنے کی ہوتی ہے، اُن کی طرف سے کوئی مخالفت یا سازش سامنے آجائے تو انسان کو اتنی تکلیف نہیں ہوتی، اور اپنے یاروں اور دوستوں کی طرف سے اور قابلِ اعتماد لوگوں کی طرف سے اگر تھوڑی سی بھی کوتاہی ہوتی ہے تو تکلیف زیادہ ہوتی ہے، اسی طرح یہ جو مخلص تھے ان کو رگڑا زیادہ لگا، ان کو خوب اچھی طرح سے مانجا گیا اور صاف کیا گیا، اور اس گروہ کو آئندہ کے لیے کچھ دھمکایا بھی دیا گیا، کہ اچھا! اب تو کوتاہی ہو گئی، آئندہ دیکھیں گے کہ کیا کرتے ہو؟ اللہ، اللہ کا رسول اور مؤمنین تمہارے عمل کو دیکھیں گے، کہ آئندہ تم کیا طرزِ اختیار کرتے ہو، اگر توتوبہ سچی ہوئی تو آئندہ

کبھی ایسی کوتاہی نہیں کرو گے، اور اگر کوئی گڑبڑ ہوئی تو پھر اسی طرح سے پھسل جاؤ گے۔'' آپ کہہ دیجئے کہ تم عمل کرو، ضرور دیکھے گا اللہ تعالیٰ تمہارے عمل کو، اور اُس کا رسول اور مؤمنین'' وَسَتُرَدُّوْنَ اِلٰی عٰلِمِ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ: اور عالم الغیب والشہادۃ کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے، فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ: پھر وہ خبر دے گا تمہیں اُن کاموں کی جو تم کیا کرتے تھے۔

سوال:- اللہ تعالیٰ کو تو پتا ہی ہے کہ آئندہ انہوں نے کیا کرنا ہے، تو اس کہنے کی کیا ضرورت ہے؟

جواب:- اللہ بھی تو دیکھے گا، یہ تو نہیں کہ اللہ پہلے جانتا ہے تو آئندہ نہیں دیکھے گا، جو عمل ظاہری صورت میں آئے گا وہ اللہ کے بھی سامنے ہوگا۔ اور ویسے بھی اللہ کا ذکر ایسے موقع پر محض تبرکاً کیا ہوتا ہے، ورنہ اللہ تعالیٰ کے سامنے تو ہر چیز واضح ہے، کوئی چیز مخفی نہیں۔ '' آئندہ تمہارے اعمال اللہ، اللہ کے رسول اور مؤمنین کے سامنے آجائیں گے'' اللہ کے سامنے تو بہر حال آنے ہیں، وہ تو عالم الغیب والشہادۃ ہے، اور ظاہری طور پر مؤمنین اور اس کے رسول کے سامنے بھی آجائیں گے۔

اور آگے ذکر ہے اُن تین آدمیوں کا جن کی توبہ کی قبولیت کو کچھ مؤخر کر دیا گیا تھا، اور آگے ان کی قبولیتِ توبہ کا ذکر بھی اسی سورت میں آئے گا، وَّعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا، وہاں ذکر آئے گا۔ وَاٰخَرُوْنَ مُرْجَوْنَ لِاَمْرِ اللّٰهِ: اور کچھ اور بھی ہیں جن کو مؤخر کر دیا گیا ہے، ڈھیل دے دی گئی اللہ کے حکم کی وجہ سے، اللہ کے حکم کے لیے، کہ اللہ کا حکم کیا آتا ہے۔ '' یا اللہ انہیں عذاب دے گا یا ان کی توبہ قبول کرے گا، اللہ تعالیٰ علم والا ہے حکمت والا ہے'' تو یہاں ان کے معاملہ کو معلق کر دیا گیا ہے، کہ ابھی دیکھو! ان کا کیا حال سامنے آتا ہے، چاہے اللہ انہیں عذاب دے چاہے ان کی توبہ قبول کرلے، اگلی آیات میں آپ کے سامنے آجائے گا کہ پھر ان کی توبہ بھی قبول ہوگئی تھی اور بہت اچھے طریقے سے قبول ہوئی۔ کعب بن مالک رضی اللہ عنہ اپنا واقعہ مفصل بیان کیا ہوا ہے۔

''مسجدِ قباء'' کی فضیلت، ''مسجدِ ضرار'' کا محلِ وقوع اور پس منظر

وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا: اب یہ بھی منافقین کے ایک ٹولے کا ذکر ہے۔ جس وقت سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم مکہ معظمہ سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ میں تشریف لے گئے ہیں، تو سب سے پہلے آپ کا قیام قباء میں ہوا ہے، یہاں اردگرد اوس قبیلہ آباد تھا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس جگہ جا کے ٹھہرے تھے، اُس مکان میں آج کل مدرسہ بنا ہوا ہے، یہ حکومت نے اچھا کیا ہے کہ اس قسم کے جتنے بھی مقامات تھے اکثر و بیشتر ان میں مکتب لائبریریاں اور مدرسے بنا دیے، تو اس مکان میں اب مدرسہ ہے، مسجد نبوی کی جو کعبے کی طرف والی دیوار ہے اس کے قریب ہی ہے، وہاں نشاندہی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہاں آکر ٹھہرے تھے، اور اس جگہ اسی وقت مسجد کی بنیاد رکھی گئی جہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھتے تھے، مسجد بنالی گئی، جہاں آج کل بھی مسجد ہے، اس کو ''مسجد قباء'' ہی کہتے ہیں، اور اس کی فضیلت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائی کہ جو شخص گھر سے وضو کر کے چلے اور مسجد قباء میں آکے دو رکعت پڑھے تو اُس کے لیے ایسے ہی ثواب ہے جس طرح سے کہ اس نے عمرہ کرلیا،[1] تو جو لوگ مدینہ منورہ جاتے ہیں وہ اکثر و بیشتر مسجد قباء میں نوافل پڑھنے کے لیے بھی جاتے ہیں، اور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت بھی یہی رہی تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کبھی پیدل اور کبھی سوار ہو کر

---

(۱) سنن ابن ماجہ ص ۱۰۲ باب ما جاء فی الصلاۃ فی مسجد قباء۔ ولفظ الحدیث: مَنْ تَطَهَّرَ فِيْ بَيْتِهٖ ثُمَّ أَتٰى مَسْجِدَ قُبَاءٍ فَصَلّٰى فِيْهِ صَلَاةً كَانَ لَهٗ كَأَجْرِ عُمْرَةٍ

مسجدِ قباء میں جایا کرتے تھے، اور مسجدِ قباء کا جو آج کل اِمام ہے اُس سے میری ملاقات ہوئی، وہ وہاں کا بہت بڑا زمین دار ہے، اس کی جگہ ساتھ ہی ہے، عبدالحمید عباس، یعنی عبدالحمید اُس کا نام ہے اور عباس کا بیٹا ہے، اوس قبیلے میں سے ہے، اسی سے میں نے پوچھا، تو وہ کہنے لگا کہ یہ ہمارے باغات مِنْ زَمَنِ رَسُوْلِ اللہِ ہیں، یہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے سے چلے آرہے ہیں، تو میں نے ان سے پوچھا کہ کیا آپ انہی لوگوں میں سے ہی جو یہاں آباد تھے اَنْتُمْ مِنْهُمْ؟ تو کہنے لگا: ان شاء اللہ! یہ "ان شاء اللہ" یہ تبرک کے طور پر اُس نے کہا، وہ اس علاقے کا بہت بڑا عالم بھی ہے اور زمین دار بھی ہے، بلکہ حکومت میں محکمۂ زراعت کا سربراہ ہے، تو اُس سے تو مجھے اس وقت پوچھنا یاد نہ رہا، مسجدِ قباء کے سامنے ایک چھوٹی سی کتابوں کی دُکان ہے، چونکہ یہاں مدرسہ ہے اور جہاں مدرسہ ہو تو قلمیں، کتابیں وغیرہ کے لئے دُکان ہوتی ہی ہے، اور اُس دُکان دار کا نام نصر اللہ ہے، افغانستان کا پٹھان ہے، اور اُس سے میری پہلی ملاقات عبدالحمید عباس کی مجلس میں ہوئی تھی، تو اُس نے مجھے کہا کہ کسی وقت میرے پاس آیئے، مجھے وقت دیجئے، میں تمہیں سیر کراؤں گا، تو ایک دِن ہم اپنی کار لے کر وہاں چلے گئے، تو وہ ہمارے ساتھ گیا، بنو قریظہ کا قلعہ دِکھایا، اور ہمارے ساتھ پھرتا رہا، اس سے میں نے پوچھا کہ مسجدِ ضرار کہاں تھی؟ وہ کہنے لگا کہ اس کا کوئی نشان متعین نہیں ہے، لیکن بعض لوگ کہتے ہیں کہ اب جہاں طہارت خانے بنے ہوئے ہیں ادھر کو مسجدِ ضرار تھی، اور وہ اب مسجد سے زیادہ فاصلے پہ نہیں ہے، کیونکہ اب تو مسجد میں توسیع ہوگئی تو مسجد کچھ بڑی ہوگئی، تو مسجد کی قبلے کی طرف منہ کر کے جو پچھلی دیوار ہے، اس سے باہر سڑک ہے، اور اس سڑک کو عبور کر کے پھر اس مسجد کا وضوخانہ، غسل خانے، بیت الخلا وغیرہ ہیں، تو وہ کہنے لگا کہ جہاں غسل خانے اور طہارت خانے بنے ہوئے ہیں، لوگ کہتے ہیں کہ مسجدِ ضرار یہاں تھی۔ اب سرورِ کائنات ﷺ کے زمانے میں اصل مسجد بہت چھوٹی ہوگی، اور وہ قبلے والی دیوار کے ساتھ ہوگی، اور مسجدِ ضرار اگر یہاں بنائی ہو تو درمیان میں فاصلہ زیادہ نہیں ہے، لیکن بسا اوقات یوں ہوتا ہے کہ جیسے اب یہ دیکھو کہ جو پرلے مکان والے ہیں وہ اس درس گاہ سے زیادہ فاصلے پر نہیں ہیں، لیکن چونکہ مکانوں کا سلسلہ اس طرح سے ہے کہ ان کو ادھر آنے کا راستہ نہیں ہے، اب اگر ہم یہاں نماز پڑھیں اور ان لوگوں نے ہمارے ساتھ نماز پڑھنی ہو تو ان کو اوپر سے چکر کاٹ کے آنا پڑے گا، چونکہ مختصر راستہ نہیں ہے، آپ نے شہروں میں دیکھا ہوگا کہ گلیاں بنی ہوئی ہوتی ہیں، اب یہاں اگر مسجد ہے تو دوسری طرف کے مکانوں کی پشت چاہے ادھر لگتی ہو لیکن نماز پڑھنے کے لئے ان کو بڑا چکر کاٹ کے آنا پڑے گا، تو وہ اپنی ضرورت کے لئے دوسری گلی میں مسجد بنالیں گے، تو چاہے مسجدوں کے درمیان فاصلہ زیادہ نہیں ہوگا، لیکن اس محلے والوں کو سہولت ہو جاتی ہے، تو یہ مسجدِ قباء جو پہلے بنائی گئی تھی یہ وہ لوگ تھے جو مخلصین تھے، ان کے ہاتھوں سے اس کی بنیاد رکھی گئی، جیسے آگے آئے گا، یہ تو مقبول ترین عمارت ہے، رسول اللہ ﷺ کے صحابہ نے اخلاص کے ساتھ اس کی بنیاد رکھی۔

قبا میں جس جگہ صحابہ کرام نے وہ مسجد بنائی تھی، وہاں کچھ منافق بھی بستے تھے، اور منافق چونکہ در پردہ اسلام کے دشمن تھے تو وہ چاہتے تھے، کہ ہمیں کوئی ایسا مقام اور ایسا اڈا مہیا ہو جائے کہ جہاں بیٹھ کے ہم آپس میں مشورے کرلیا کریں، اور جب مزاج ایک جیسا نہ ہو تو اکٹھے بیٹھنے میں ویسے بھی دِقت محسوس ہوتی ہے، اور اس علاقے میں ایک راہب تھا، جس کا نام "ابو عامر" لکھا

ہے، خزرج قبیلے سے تعلق رکھتا تھا، عیسائی ہو گیا تھا، اور راہبانہ زندگی گزار رہا تھا، اور اس کا بیٹا ہے حنظلہ رضی اللہ عنہ جو غسیلِ ملائکہ ہیں، بہت مخلص مسلمان تھے، اُحد میں شہید ہوئے، فرشتوں نے ان کو غسل دیا، جس کا ذکر روایات میں آتا ہے، اِس (ابو عامر) کی ان منافقوں کے ساتھ کوئی ساز باز تھی، تو انہوں نے اپنے لیے ایک بیٹھک اور مجلس بنانے کے لئے تجویز یہ ٹھہرائی کہ مسجد کی شکل میں کوئی عمارت بنائی جائے، تا کہ اُس میں اکٹھا ہونا کسی کے نزدیک باعثِ اِشتباہ بھی نہ ہو، کیونکہ مسجد میں مسلمان اکٹھے ہوا ہی کرتے ہیں، تو وہاں نماز کے بہانے سے اکٹھے ہو جایا کریں گے، اور جو مشورہ کرنا ہو گا وہ مشورہ بھی کر لیا کریں گے، اور کبھی وہ ابو عامر اگر آ جائے تو اس کو بھی ٹھہرنے کے لیے ایک جگہ مل جائے گی، تو مسجد کی صورت بنا کر وہ ایک پردہ مہیا کرنا چاہتے تھے، کہ اپنی سازشوں کے اوپر ایک پردہ پڑ جائے، کوئی چھوٹی سی عمارت بنانے کے بعد سرورِ کائنات ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور کہنے لگے یا رسول اللہ! ہم نے اپنے محلے میں ایک چھوٹی سی مسجد بنائی ہے، مقصد یہ ہے کہ کبھی بارش ہوتی ہے، کبھی اندھیرا ہوتا ہے، تو بعض لوگ ہیں جو مسجدِ قبا میں نماز پڑھنے کے لئے نہیں جا سکتے جو پہلے سے بنی ہوئی ہے، تو ہم نے اُن کی سہولت کے لیے یہ ایک مسجد بنا دی ہے، ہم چاہتے ہیں کہ ''آپ کے ہاتھوں اس کا افتتاح کروائیں'' آج کل کی اِصطلاح میں جیسے کہتے ہیں، تو آپ اس میں تشریف لے آئیں، کچھ نماز پڑھ لیں تا کہ وہ مسجد بھی برکت والی ہو جائے، اور آپ کے ہاتھوں اُس کا افتتاح ہو جائے، مقصد یہ تھا کہ جب رسول اللہ ﷺ وہاں جا کے نماز پڑھ لیں گے تو گویا کہ ہر طرح سے اُن کے لیے ایک جواز متحقق ہو جائے گا، کہ ہم نماز پڑھنے کے لیے وہاں نہ جائیں، یہاں پڑھ لیا کریں، کیونکہ جیسے حضور ﷺ نے وہاں نماز پڑھی ہے تو یہاں بھی پڑھی ہے، اس طرح سے وہ درپردہ ایک سازش کیے ہوئے تھے، اور حقیقت کے اعتبار سے انہوں نے اپنے لیے ٹھکانا بنایا تھا اور اس کی صورت مسجد جیسی بنائی، تو سرورِ کائنات ﷺ ان دنوں جب یہ آپ ﷺ کی خدمت میں آئے ہیں، غزوۂ تبوک کی تیاری میں تھے، تو آپ ﷺ نے اُن کے ساتھ اس طرح سے وعدہ فرما دیا کہ اب تو فرصت نہیں، اب تو ہم جا رہے ہیں، واپسی پر دیکھا جائے گا، جس وقت واپس تشریف لا رہے تھے تو راستے میں یہ آیات اُتریں جس میں اُن کی سازش کو واشگاف کر دیا، ظاہر کر دیا کہ یہ مسجد نہیں، اصل کے اعتبار سے یہ کُفر کا اڈّا ہے۔

منافقین کا ''مسجدِ ضرار'' بنانے کا مقصد

اور ان کا مقصد مسلمانوں کے درمیان پھوٹ ڈالنا ہے، کیونکہ جس وقت دوسری مسجد بنے گی تو لازماً نمازی دو حصوں میں بٹ جائیں گے، اور جیسے پہلے اجتماعیت ہے وہ اجتماعیت نہیں رہے گی، مسجدیں جو متعدد بنتی چلی جاتی ہیں اس کے ساتھ واقعی پارٹی بازی زیادہ ہوتی ہے، تفریق ہو جاتی ہے، مسجد ہی ایک ایسی جگہ ہے کہ جس میں محلے کے مسلمان پانچ وقت اکٹھے ہوں، آپس میں ایک دوسرے کے حال سے بھی آگاہ ہو جائیں گے، اور اکٹھے مل کے اللہ کی عبادت کر لیں گے، تو آپس میں الفت اور محبت رہے گی، اور جہاں ذرا سا اختلاف ہوتا ہے، فٹ دوسری مسجد بن جاتی ہے، تو اس مسجد کے بننے کے ساتھ لوگ دو حصوں میں تقسیم

ہوجاتے ہیں، جب دو حصوں میں تقسیم ہوگئے، نماز بھی ایک دوسرے کے ساتھ مل کے نہیں پڑھتے تو اس سے پھر آگے اختلافات بڑھتے ہیں، گھٹتے نہیں، اُن کا مقصد بھی اسی طرح سے جماعت کے درمیان میں تفریق ڈالنا تھا، اس لیے شرعی مزاج یہی ہے کہ جہاں تک ہوسکے مسلمان اکٹھے ہوکر نماز پڑھیں، جماعتیں متعدد نہ ہوں، مثلاً جمعہ شہر میں ایک جگہ ہو، فقہِ حنفی کے اندر مسئلہ اسی طرح سے لکھا ہوا ہے کہ اصل تو یہی ہے کہ جمعہ ایک جگہ ہو، تاکہ کم از کم ہفتہ وار سارے کے سارے مسلمان ایک جگہ اکٹھے ہوجائیں، اور اگر شہر دو حصوں میں تقسیم ہے مثلاً درمیان میں کوئی دریا ہے، ادھر والوں کو اُدھر جانے میں دقت ہے تو ایسی صورت میں دو جگہ بھی جمعہ ہوسکتا ہے، اصل مسئلہ اسی طرح سے ہے، لیکن جب مسلمانوں میں پھوٹ پڑی اور اکٹھے ہوکے ایک جگہ نماز پڑھنے پہ آمادہ نہ ہوئے تو پھر دو جگہ شروع ہوا، تین جگہ شروع ہوا، اب تو حال یہ ہے کہ محلے کی چھوٹی چھوٹی مسجدوں کے اندر بھی جمعہ ہوتا ہے، مسلمان کسی وقت ضرورت محسوس ہی نہیں کرتے کہ ایک جگہ اکٹھے ہوجائیں، عیدیں علیحدہ علیحدہ ہونے لگ گئیں، جمعے علیحدہ علیحدہ ہونے لگ گئے، اور مسلمانوں کی جو اجتماعیت تھی وہ پارہ پارہ ہوگئی، پہلے تو مسلک کا اختلاف تھا مثلاً فقہ کے اعتبار سے لوگ مختلف المسلک تھے، کوئی حنفی، کوئی شافعی، کوئی حنبلی، کوئی مالکی ہے، اور کوئی ''اہلِ ظواہر'' میں سے ہے، ظاہرِ روایات پر عمل کرنے والے جو آج کل اپنے آپ کو ''اہلِ حدیث'' کہلاتے ہیں، یہ اصل کے اعتبار سے ''اہلِ ظواہر'' میں سے ہیں، یہ اختلاف فقہی ہوا، لیکن یہ فقہی اختلاف رواداری کے درجے میں تھا، اور آج بھی یہ اختلاف رواداری کے درجے میں ہے، جہاں مختلف مسلک کے لوگ موجود ہیں وہ ان فقہی مسائل پر نہیں لڑتے، حنفیوں کے پیچھے شافعی پڑھ لیتے ہیں، شافعیوں کے پیچھے حنفی پڑھ لیتے ہیں، حرمین شریفین میں جب بھی لوگ جاتے ہیں تو حنفی ہوں یا کسی مسلک کے ہوں وہاں کے اَئمہ کے پیچھے نمازیں پڑھتے ہیں، چاہے وہ اِمام کسی مسلک کے ہوں، جس نے رفعِ یدین کرنا ہے وہ رفعِ یدین کرتا رہے، جس نے نہیں کرنا وہ نہ کرے، جس نے اِمام کے پیچھے فاتحہ پڑھنی ہے وہ پڑھتا رہے، جس نے نہیں پڑھنی وہ نہ پڑھے، ان اختلافات کو برداشت کیا گیا ہے، ان فقہی اختلافات کے باوجود مسلمان ایک مسجد میں اکٹھے ہوتے تھے اور اب بھی ہوتے ہیں، یہ مسلک کا اختلاف آپس میں بغض اور عداوت کا ذریعہ نہیں بنا، جو اختلافات نفسانیت سے پیدا ہوئے وہ بغض وعداوت کا ذریعہ بنے، جس طرح سے ہمارے علاقے میں دیوبندی، بریلوی کا اختلاف ہوا، اور شدّت کے ساتھ ہوا، تو اس نے آ کے مسجدوں کو تقسیم کردیا، کہ ایک نظریے کے لوگ ایک مسجد میں اکٹھے ہوگئے، اور دوسرے نظریے والوں نے اپنی علیحدہ مسجد بنالی، ایک سے دو مسجدیں بن گئیں، پھر آپس میں اتنا بعد ہوا کہ وہ اُن کی مسجد میں نہیں جاتے، اور وہ اُن کی مسجد میں نہیں جاتے، اور ایک دوسرے کی مسجدوں کو اس طرح سے دیکھتے ہیں گویا کہ یہ مسجد ہی نہیں کوئی بت خانہ ہے یا گردوارہ ہے، تو مسلمانوں کے درمیاں یوں تفریق پیدا ہوتی چلی گئی، اس نے آ کے پارٹیاں بنالیں، مسلمانوں کا آپس میں بُعد پیدا کردیا، مسجدوں کا تعدد اسی طرح سے اِنتشار کا باعث بنتا چلا گیا، پھر یہ اختلاف تو تھا کہ مسجدیں کچھ علیحدہ ہوئیں، کچھ اہل حدیثوں کی مسجدیں علیحدہ ہوگئیں، کچھ بریلویوں کی علیحدہ ہوگئیں، کچھ دیوبندیوں کی علیحدہ ہوگئیں، پہلے تو یہ تفریق تھی۔

مساجد کو سیاسی مقاصد کے لئے اِستعمال کرنے کا نقصان

اب یہ پچھلے دس سالوں میں اور جو مصیبت آئی، یہ سیاسی اختلافات میں جو تشدد پیدا ہوا، تو اب یہ حال ہو گیا کہ ایک سیاسی مسلک کے لوگ کسی دوسری مسجد میں نماز پڑھنے کے روادار نہیں، آپ نے دیکھا ہوگا، یہ دس سال پہلے جس وقت الیکشن کا قصہ شروع ہوا ہے جس میں بھٹو کامیاب ہوا ہے، یحییٰ کے زمانے میں جو الیکشن کی مہم چلی تھی اس میں سیاسی تشدد اتنا آیا کہ جو مسجد جس خیال کے آدمی کے قبضے میں ہے اس نے ہر وقت، منبر پر، خطبے میں، تقریر میں اور صبح درس میں اس طرح سے دوسرے سیاسی لوگوں پر بوچھاڑ کرنی شروع کی، کہ جو شخص کسی وجہ سے اس امام کی سیاسی جماعت میں شامل نہیں ہے، مسجد کا خطیب ہے اس کا ایک سیاسی مسلک ہے وہ اس سیاسی مسلک کو منبر پر لے آیا اور اتنی شدت کے ساتھ لے آیا کہ جو اس کے ساتھ اتفاق نہیں کرتا، آیات اس کے اوپر فٹ کر کر کے، روایات اس کے اوپر فٹ کر کر کے، ان کا ایسا حال کرنا شروع کر دیا، کہ اب وہ دوسرا شخص جو اس مسلک کا نہیں ہے، ہے وہ مسلمان، حنفی ہے، دیوبندی ہے، لیکن بالفرض وہ کسی وجہ سے اس مسلک کا نہیں ہے، کیونکہ سیاسی باتیں کوئی قطعیات میں تو ہیں نہیں، کہ اس میں انسان کو اپنی رائے میں آزاد نہ چھوڑا جائے، تو اپنی سیاسی آزادی کی بنا پر اس نے کوئی دوسرا مسلک اختیار کر رکھا ہے، اب وہ مسجد میں جاتا ہے تو سارے جمعے میں یا تو اپنے متعلق اس قسم کی تیز تیز باتیں سنے اور صبر کر کے بیٹھا رہے، اور اگر بولتا ہے تو فساد ہوتا ہے، اتنی دیر تک صبر کرنا بھی مشکل، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں نے سیاسی مسلک کے اختلاف کے طور پر جو ایک دوسرے کے پیچھے نماز پڑھنی چھوڑ دی، اب اگر کسی کو اس مسلک والے کی مسجد مہیا ہو گئی تو اس مسجد میں نماز پڑھنے لگ گیا، ورنہ سرے سے مسجد ہی چھوڑ گیا، یہ میں بالکل صحیح کہہ رہا ہوں، واقعہ ایسے ہی ہے، کہ دوسرے مسلک کے لوگ اس مسجد میں آنا ہی چھوڑ گئے، اگر تو کوئی دوسری مسجد تھی جس میں جا کے وہ نماز پڑھ سکتے تو پڑھتے، ورنہ سرے سے نماز ہی چھوڑ گئے، اس طرح سے اس سیاسی تشدد کو منبر پہ لانے کے بعد مسجدوں کو ویران کیا گیا، تو اس دس سالہ تجربے کے بعد میری تو رائے اس بارے میں صاف صاف ہو گئی کہ جمعے کی تقریر ایسی ہونی چاہیے جو مشترکہ موضوع پر مشتمل ہو، تذکیرِ آخرت ہو، ذِکر اللہ کی تلقین ہو، کبائر سے احتراز کا ذِکر ہو، نیکی کی ترغیب ہو، صحابہ کرام کی محبت، قرآنِ کریم کی عظمت، علم دین کی عظمت، اس قسم کے موضوعات پر مشتمل ہونی چاہیے، جس کو ہر خیال کا آدمی تسلی کے ساتھ سن لے، باقی سیاست میں حصہ لینا یہ بھی نیک نیتی کے ساتھ اگر ہو تو یہ بھی خدمت خلق ہے اور عبادت ہے، لیکن اس کا تشدد مسجد کے اندر مناسب نہیں، تاکہ دوسرے لوگ مسجدیں نہ چھوڑ جائیں، ہاں البتہ اگر سیاسی تقریر کرنی ہو تو اپنے مسلک کے مطابق پوری شدت کے ساتھ کرو، لیکن اس کے لیے باہر کا پلاٹ تجویز کرو، کہ جب بھی سیاسی طور پر جلسہ کرنا مقصود ہو تو پارک میں ہو، باہر کسی پلاٹ میں ہو، کسی کھلے میدان میں ہو، مسجد میں نہ ہو، تاکہ ہر قسم کے لوگ آئیں اور آپ کی تقریر سنیں، جو سننا چاہتے ہیں سنیں، جو نہیں سننا چاہتے نہ سنیں، جمعے کے خطبے کو اس چیز سے خالی ہونا چاہیے، کیونکہ جمعے کے خطبے میں اگر کسی قسم کا تشدد آ جائے، تو پھر مخالف نظریے کے لوگ اس خطبے میں بیٹھ نہیں سکتے، یا تو وہ مسجد میں آئیں گے نہیں، اور اگر آئیں گے تو دل میں بیٹھے

کڑھتے رہیں گے، اور جب امام کے ساتھ دلی تعلق نہیں ہوگا، دماغ ادھر متوجہ نہیں ہوگا تو اس نماز کے پڑھنے کا کیا فائدہ ہوگا؟ تو یہ سیاسی تشدد جو مسجدوں میں شروع ہوا یا خانقاہی بزرگ جس وقت اس تشدد میں آگئے، تو جتنی کثرت کے ساتھ ان دس سال میں لوگ مدرسوں سے خانقاہوں سے اور مسجدوں سے دُور ہوئے ہیں، شاید اس سے پہلے اتنی تیزی کے ساتھ کبھی زوال نہیں آیا، حتیٰ کہ سمجھ دار لوگ مجبور ہوگئے کہ مسجدوں کے اندر لکھ لکھ کے بورڈ لگا دیے کہ یہاں کسی کو سیاسی تقریر کرنے کی اجازت نہیں، یا کسی کو یہاں کے منتظم کی اجازت کے بغیر تقریر کرنے کی اجازت نہیں، تو جس جگہ اس کی پابندی کی گئی اور اختلافی تقریر جہاں نہیں کرنے دیتے، جیسے بڑے شہروں میں دیکھو، کراچی جا کر دیکھو، اکثر مسجدوں میں پابندی ہے، اس طرح سے تقریر نہیں کرنے دیتے، تو آج ان مسجدوں میں رونق ہے، لوگ کثرت کے ساتھ آتے ہیں، اور جن مسجدوں کے اندر اس قسم کا تشدد شروع ہوگیا وہ مسجدیں ویران ہوگئیں۔ آپ نے فقہ کے اندر مسئلہ پڑھا ہوگا، اور حدیث شریف میں صراحتاً آتا ہے کہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ ایک دفعہ عشاء کی نماز پڑھانے لگے تو سورۂ بقرۃ شروع کردی، قراءت لمبی کردی، اور پیچھے سے ایک شخص نے نماز توڑ کے اپنی پڑھی اور چلا گیا، لوگ اُس کے پیچھے پڑ گئے "اَنَافَقْتَ یَافُلَان؟" اے فلاں! کیا تو منافق ہوگیا؟ تُو نے جماعت سے نماز نہیں پڑھی، تُو نے جماعت کو کیوں چھوڑ دیا؟ وہ کہنے لگا میں منافق نہیں ہوا، میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے جاکے یہ واقعہ ذکر کروں گا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں گیا، جا کر کہنے لگا: یا رسول اللہ! ہم محنت مشقت کرنے والے آدمی ہیں، سارا دِن تو ہم پانی ڈھوتے ہیں اور مشقت کرتے ہیں، تھکے تھکائے رات کو جاتے ہیں، اور معاذ یہاں آپ کے پاس سے دیر سے پہنچا، اور عشاء کی نماز دیر سے پڑھائی اور سورۂ بقرۃ شروع کردی، مطلب اس کا یہ تھا کہ اتنی لمبی نماز ہم نہیں پڑھ سکتے، اس لیے ہم جماعت چھوڑنے پر مجبور ہیں، تو حدیث شریف میں آتا ہے کہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو وعظ کے اندر اتنا غصے میں کبھی نہیں دیکھا گیا جتنا اُس دِن وعظ میں غصے تھے، اور فرمانے لگے کہ تم لوگوں کو متنفر کرتے ہو؟ اِنَّکُمْ مُنَفِّرُوْنَ؟ لوگوں کو بِدکاتے ہو؟ لوگوں کو مسجدوں سے بھگاتے ہو؟ خبردار! اگر کسی کو نماز پڑھاؤ تو ہلکی نماز پڑھایا کرو، اس میں کوئی ضرورت مند ہوتا ہے، اس میں کوئی بیمار ہوتا ہے جو زیادہ دیر تک نہیں رہ سکتا، تو نماز ہلکی پڑھاؤ جس کو مقتدی برداشت کرلیں،[1] یعنی لمبی قراءت کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے برداشت نہیں کیا، جس کے نتیجے میں نمازی کم ہوجائیں اور لوگ چلے جائیں، تو اگر اس قسم کی سیاسی تقریروں کے ساتھ مسجد کے نمازی نمازی بھاگتے ہیں تو کیا شرعی طور پر یہ قابلِ برداشت ہے؟ یعنی نماز میں قرآنِ کریم اتنا پڑھنا گوارہ نہیں کیا، جو مقتدی کی برداشت سے زائد ہو، اور مقتدی تکلیف محسوس کرتے ہوئے اُس امام کے پیچھے نماز پڑھنی چھوڑ دیں، کہ یہ تو بڑی لمبی قراءت کرتا ہے، ہم اتنی لمبی قراءت برداشت نہیں کرسکتے، اس کے اوپر حضور صلی اللہ علیہ وسلم انتہائی ناراض ہوئے، اور فرمایا نماز میں قراءت اتنی ہی کرو جتنی تمہاری قوم اور تمہارے مقتدی برداشت کرجائیں، اتنی لمبی نماز نہ پڑھایا

---

(۱) بخاری ۲/ ۹۰۲، باب من لم یر اکفار الخ۔ ۱/ ۱۹، باب الغضب الخ۔ مسلم ۱/ ۱۸۷، باب القراءۃ فی العشاء/ مشکوۃ ۱/ ۷۹، باب القراءۃ فی الصلاۃ۔
نوٹ: یہ کئی احادیث کا مجموعی مضمون ہے۔

کرو، کسی کو نماز پڑھاؤ تو تخفیف کی رعایت رکھا کرو، پیچھے کوئی بیمار ہوگا، کوئی ذُوالحاجۃ ہوگا، اس لیے تطویل مناسب نہیں، تطویل کے نتیجے میں لوگ بِدکتے ہیں، اور جماعت میں آنا چھوڑ جائیں گے۔ تو اتنا اہتمام تھا مسلمانوں کو اکٹھا کرنے کے لیے کہ امام کو پابند کر دیا کہ تطویلِ قراءت سے احتراز کرے، تا کہ لوگ کہیں اُس کے پیچھے نماز پڑھنے سے نہ رک جائیں، تو مسجدوں کی آبادی تو بھائی! اسی طرح سے ہوگی، اس لیے میں تو اب اکثر مجلسوں کے اندر اس بات کو دوہراتا ہوں، کہ بھائی! مسجدوں پہ رحم کرو، پہلے تو تقسیم ہوگئی دیوبندی بریلوی کی، شیعہ سنی کی، اہل حدیث اور غیر اہل حدیث کی، اب تم سیاسی مسلک کے طور پر مسجدوں کو تقسیم نہ کرو، کہ لوگ کہیں کہ یہ جماعتِ اسلامی کی مسجد ہے، یہ جمعیت علمائے اسلام والوں کی مسجد ہے، یہ اَحرار والوں کی مسجد ہے، یہ فلاں کی مسجد ہے، یہ فلاں کی مسجد ہے، اب اس طرح سے اُمت کے اندر اِنتشار برپا کرنا مناسب نہیں ہے، اس لیے مسجد کے ماحول کو ایسا رکھو کہ جس میں ہر مسلک کا آدمی آ کے نماز پڑھ سکے، ہاں البتہ سیاست میں حصہ لو، سیاست میں حصہ لینا بھی عبادت ہے، خدمتِ خلق ہے، صحیح اُصول پہ سیاسی زندگی انبیاء علیہم السلام نے بھی اپنائی ہے، جیسا کہ حدیث شریف کے اندر آتا ہے: ''کَانَتْ بَنُوْ إِسْرَائِیلَ تَسُوْسُهُمُ الْأَنْبِیَاءُ''(۱) بنی اسرائیل کی سیاست انبیاء علیہم السلام کے ہاتھ میں تھی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرے بعد نبی تو کوئی ہوگا نہیں، خلفاء کثرت کے ساتھ ہوں گے، تو خلفاء سیاسی زندگی کا ایک نشان ہیں، سارا سیاسی انتظام خلفاء کے ہاتھ میں ہوتا ہے، تو سیاست بھی دِین کا ایک شعبہ ہے اور یہ ایک عبادت ہے، لیکن اس کے لیے تقریر جس وقت کرنی ہو اور اپنے نظریے کو لوگوں میں پھیلانا ہو تو مسجد کی بجائے باہر کے میدان کو اختیار کرنا چاہیے، تا کہ جس کا جی چاہے سنے، جس کا جی چاہے نہ سنے، وہاں کوئی آئے یا نہ آئے اس کا کوئی الزام نہیں ہے، اور اگر مسجد میں اس قسم کی باتوں کے نتیجے میں نمازی کم ہونا شروع ہوگئے، یا لوگ ہٹنے شروع ہوگئے، تو میں تو سمجھتا ہوں کہ یہ مناسب نہیں، اس میں مسجدوں کی ویرانی ہے، کہ تفریق بین المسلمین بہت بڑا جرم ہے۔

''مسجدِ قباء'' اور ''مسجدِ ضرار'' میں فرق

تو اللہ تعالیٰ نے اس مسجد کے بنانے والوں کے متعلق یہی نشاندہی کی، کہ دوسری مسجد بنا کے یہ تفریق بین المسلمین کا جرم کر رہے ہیں، اور اس مسجد کے بنانے کا داعیہ کُفر ہے، اور یہ مسلمانوں کو نقصان پہنچانا چاہتے ہیں، اسلام کے مخالفین کو اپنی اس جگہ میں ٹھکانا دینا چاہتے ہیں، یہ مسجد صحیح نیت کے ساتھ نہیں بنائی گئی، اس لیے حقیقت کے اعتبار سے یہ مسجد نہیں ہے، جب یہ مسجد نہیں ہے تو ہم آپ سے کہتے ہیں کہ آپ کبھی اس مسجد میں نماز پڑھنے کے لیے نہ جائیں، جب بھی قباء کی طرف جانا ہو تو اسی مسجد میں جا کر نماز پڑھو جس کی بنیاد مخلص ہاتھوں کے ساتھ تقویٰ پہ اٹھائی گئی ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ ساری نشاندہی کر دی گئی، جب یہ نشاندہی کر دی گئی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ منورہ میں پہنچ گئے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چند افراد کو بھیجا وہ گئے، جا کے انہوں نے مسجد کو آگ لگا دی، ڈھا دیا، بے نشان کر دی، اور سرے سے اس کو مٹا دیا، اب وہ لوگ جنہوں نے ایک سازش بنائی تھی اور وہ ایک چال

(۱) بخاری ۱/۴۹۱، باب ما ذکر عن بنی اسرائیل/ مشکوۃ ۲/۳۲۰، کتاب الامارۃ، فصل اول۔

چلے تھے، اور وہ چال کامیاب نہ ہوئی، اور اس طرح سے اُن کی بنی بنائی عمارت ڈھ گئی اور گر گئی، تو یہ چیز اُن کے دل کے اندر غصہ اور کینہ زیادہ پیدا کر گئی، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ سارے کا سارا اقدام اُن کے دل کے اندر ایسا تردد اور ایسا نفاق پیدا کر گیا کہ اب یہ مٹے گا نہیں، جب تک ان کے دل ہیں، بطور کانٹے کے یہ مسجد ان کے دل میں رڑکتی رہے گی، ہاں! جب دل ہی ٹکڑے ہو جائیں تو علیحدہ بات ہے، مقصد یہ ہے کہ اب یہ نفاق ان میں سے جائے گا نہیں، یہ دل کے اندر اس قسم کے اثرات چھوڑ گئی، تو یہ آیات منافقوں کے اسی ٹولے کی نشاندہی کر رہی ہیں۔

سوال:- کچھ لوگ کعبہ میں جا کے اِمام کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے، ان کا کیا حکم ہے؟

جواب:- جو کعبہ میں جا کے امام کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے ان سے زیادہ بدبخت اور کون ہو گا، کہ اس وجہ سے وہ مسجدِ حرام کی فضیلت سے محروم ہو جائیں، وہاں جا کے بھی اگر وہ اِجتماعیت کو قبول نہیں کرتے تو اس سے زیادہ بدبختی اور کیا ہو گی!

سوال:- ائمۂ حرمین پر بھی کچھ لوگوں نے کُفر کے فتوے بھی لگائیں ہیں۔

جواب:- کُفر کے فتوے لگانے والے معلوم نہیں خود کیا ہیں، بہر حال یہ گمراہ ٹولا ہے، اور اس طرح سے مسلمانوں کی اجتماعیت کو نقصان پہنچانا ٹھیک نہیں، ٹھیک ہے فقہی اختلاف ہے کہ وہ حنبلی مسلک کے ہیں، ہم حنفی مسلک کے ہیں، اور فقہی اختلاف قابلِ برداشت ہے، باقی! اور کون سا کوئی اس قسم کا عقیدے کا اختلاف ہے جس کو کُفر و ایمان کی بنیاد بنا کے ان کو کافر ٹھہرایا جائے؟ قبروں کے بارے میں انہوں نے تشدّد کیا، اور حق تشدّد کیا ہے، احادیث کی روشنی میں کیا ہے، کسی کو وہ سجدہ نہیں کرنے دیتے، قبّے وغیرہ جو بنے ہوئے تھے انہوں نے وہ سارے ڈھا دیے، اپنے مسلک کے مطابق اگر انہوں نے توحید کے تحفظ کے لئے کیا ہے تو ہم تو ان کے اس اقدام کی تائید کرتے ہیں، کہ اگر انبیاء علیہم السلام اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی قبروں کو شرک کا ذریعہ بنالیا جائے تو وقت کے حاکم کا فرض ہے کہ وہ اس کو ہٹائے، تو انہوں نے اس بارے میں بہت بڑی خدمت انجام دی ہے، باقی یہ ہے کہ رَدِّ عمل کے طور پر جب کوئی چیز آیا کرتی ہے تو اس میں تشدّد زیادہ معلوم ہوا کرتا ہے، تو پہلے لوگوں نے قبروں کے سلسلے میں جس قسم کی وسعت کر رکھی تھی، چونکہ انہوں نے اس کو مٹایا ہے تو اس لیے لوگوں نے اس کو محسوس زیادہ کیا، تو یہ کوئی کُفر کی بات تو نہیں، بلکہ یہ تو انہوں نے توحید کا تحفظ کیا ہے اور یہ اچھا کیا ہے، وہاں جا کے بھی کُفر و شرک ہونے لگ جائے تو بتائیے اس سے بڑھ کے اور افسوس کی بات کون سی ہو گی؟ باقی الحمد للہ وہ نیک لوگ ہیں، سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت سے بھرپور ہیں، ان کے خطبے سنو، ان کی باتیں سنو، وہ بالکل شریعت کے پابند ہیں، تو مسلک کے اختلاف کے طور پر بعض جزئیات میں اگر اختلاف ہو جائے تو ایسی کون سی کُفر کی بات ہے۔

سوال:- انہوں نے جو قبّے گرائے ہیں اس سے تو مسلمانوں کا دل دُکھا ہے۔

جواب:- مسلمانوں کے دل اگر اس وجہ سے دُکھے ہیں کہ قبروں پر سے قبّے کیوں گرا دیے؟ تو میرا تو خیال یہ ہے کہ یہ آپ نام کے مسلمانوں کا تذکرہ کر رہے ہیں، ورنہ تو اس میں دِل کے دُکھنے کی بات نہیں ہے، صحیح حدیث میں آتا ہے کہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم حضرت علی رضی اللہ عنہ کو کسی علاقے میں بھیجا تھا، تو اس وقت ان کو نصیحت کی تھی: ''اَنْ لَا تَدَعَ تِمْثَالًا اِلَّا طَمَسْتَهٗ'' کہ

اگر کوئی تمثال سامنے آ جائے تو اس کو مٹا دینا، ''وَلَا قَبْرًا مُشْرِفًا اِلَّا سَوَّيْتَه'' اور اگر کوئی اُونچی قبر سامنے آ جائے تو اس کو برابر کر دینا۔[1] تو قبر مُشرَف اگر ہو تو اس کے تسویہ کا حکم تو حدیث شریف میں موجود ہے، حضور ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو یہ حکم دے کر بھیجا تھا، تو اتنے بڑے بڑے جو لوگوں نے قبے بنا دیے تھے تو انہوں نے اُن کو ڈھایا ہے تو شرعی طور پر اس کی گنجائش ہے، اس میں کوئی کُفر کی بات نہیں ہے، انہوں نے مقامِ توحید کا تحفظ کیا ہے۔ باقی! ہمارے اکابر کی کچھ عبارات اور کچھ تحریرات ان لوگوں کے خلاف کتابوں میں موجود ہیں، جیسے حضرت مدنی رحمہ اللہ نے ''الشہاب الثاقب'' میں ان کے خلاف بہت سخت لکھا ہے، اور اسی طرح دُوسری کتابوں میں بھی ہے، نجدیوں کے متعلق، جو اس وقت حرمین شریفین کے متولّی ہیں ان کے متعلق کچھ سخت تحریرات ہمارے حضرات کی کتابوں میں بھی آئی ہیں، لیکن اب ان سب تحریرات کے متعلق موجودہ حضرات نے جو بیانات دیے ہیں تو اس کا حاصل یہ ہے کہ وہ بھی پروپیگنڈے سے متأثر ہو کر لکھی گئی تھیں، بایں معنی کہ پہلے ان لوگوں نے حرمین شریفین کے اُوپر حملہ کیا تھا، اور حملہ کر کے ترکوں سے یہ علاقہ چھین لیا تھا، اور وہاں یہ قابض ہو گئے تھے، لیکن پھر بعد میں ترکوں کی فوج نے ان کو وہاں سے نکال دیا، یہ پھر اپنے علاقے میں چلے گئے، تو چونکہ ترکوں کے ساتھ ایک سیاسی ٹکر لگ گئی تھی، اور یہ (علمائے دیوبند) وہاں موجود نہیں تھے، وہاں ترک موجود تھے، تو انہوں نے مسلمانوں کے دِلوں میں ان کے خلاف نفرت پیدا کرنے کے لئے پورے سرکاری ذرائع استعمال کیے ہیں، ان کے خلاف پروپیگنڈا، ان کے خلاف کتابیں، ان کے خلاف پمفلٹ، یہ سارے کے سارے شائع کیے گئے، جیسے اب مثال کے طور پر کسی علاقے میں بریلوی علماء کی ریاست قائم ہو جائے اور وہ اپنی ریاست کے اندر لٹریچر سارا وہی دیں جو علمائے دیوبند کے خلاف لکھا ہوا ہے تو وہاں اگر کوئی مخلص بھی ہوگا تو ان تحریرات کو دیکھ کر متأثر ہو سکتا ہے، اور وہ کہے گا کہ فلاں نے کہا، فلاں نے لکھا، وہ بیسیوں حوالے دے دے گا...... لیکن جس وقت یہ لوگ دوبارہ حرمین شریفین میں آئے اور ان کے حالات سارے کے سارے سامنے آئے، تو حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری رحمہ اللہ نے بھی اپنے ان خیالات سے رُجوع کیا، اور اسی طرح حضرت مدنی رحمہ اللہ نے اپنے خیالات سے رُجوع کیا، اور اس بارے میں وضاحت حضرت مولانا منظور نعمانی رحمہ اللہ نے ایک رسالے کے اندر کی ہے، اور وہ رسالہ چھپ کے تقسیم بھی ہوا، عربی میں بھی اور اُردو میں بھی، اُردو رسالہ جو وہاں اس سلسلے میں تقسیم ہوا وہ میرے پاس موجود ہے، اس سفر میں میں وہ لے کر آیا ہوں، تو اس میں انہوں نے اپنے حضرات کی آراء باحوالہ لکھی ہیں کہ فلاں فلاں بزرگ نے اپنے خیالات سے رُجوع کیا، اور یہ سارے کا سارا اس زمانے میں ترکی حکومت کے پروپیگنڈے کا اثر تھا کہ یہ حضرات بھی متأثر ہو گئے اور انہوں نے ان کے خلاف بہت کچھ لکھ دیا، خاص طور پر ''الشہاب الثاقب'' میں سخت تحریرات ہیں جو حضرت مدنی رحمہ اللہ کی کتاب ہے، اور اسی طرح حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری رحمہ اللہ کی بھی بعض تحریرات ایسی ہیں، حضرت مولانا سہارنپوری تو پھر بعد میں تشریف بھی وہیں لے گئے تھے، انتقال ہی ان کا وہیں ہوا، اور حضرت مدنیؒ کا سارا خاندان وہاں آباد تھا، تو ان نجدیوں کے آنے کے بعد بھی وہ وہاں آتے جاتے رہے، تو مولانا منظور نعمانی نے اس بارے میں وضاحت شائع

---

(۱) صحیح مسلم ۱/ ۳۱۲، کتاب الجنائز، باب تسویة القبر/ مشکوٰۃ ۱/ ۱۴۸، باب دفن المیت فصل اول، عن ابی الهیاج

کردی ہے اور وہ کتاب میرے پاس موجود ہے۔ تو اس وقت اس قسم کے غلط پروپیگنڈے سے متأثر ہو کر ہمارے حضرات نے بھی ان کے خلاف بہت کچھ لکھا ہے، لیکن اب حقیقت کھل گئی اور اُن کے جو جانشین اور ان کے جو ترجمان ہیں انہوں نے یہ سب تحریریں اُجاگر کردی ہیں، جو اپنے رُجوع کے متعلق انہوں نے شائع کی تھیں، اب یہی ہے کہ وہ ہمارے معتمد علیہ ہیں، ہمارے دِل میں ان کا احترام ہے، اور جو طرزِ عمل انہوں نے اپنایا ہے تو فقہی جزئیات میں کچھ اختلاف ہوسکتا ہے، چونکہ وہ حنفی نہیں ہیں، دوسرے مسلک سے تعلق رکھتے ہیں، لیکن فقہی جزئیات کا اختلاف ایسا نہیں ہوتا کہ جس کی بنا پر ایک دوسرے سے اتنی نفرت کی جائے، اور انسان ان کے پیچھے نماز پڑھنا بھی چھوڑ دے۔ یہ بہت بڑی سعادت سے محرومی ہے، تو بعض لوگ ہم بھی دیکھتے رہے ہیں کہ جماعت سے نماز نہیں پڑھتے، لیکن یہ بہت بڑی محرومی ہے، اگر وہاں جا کر بھی دِل کی کدورت نہ گنوائی جائے، اور اُمت کی اِجتماعیت کی کوشش نہ کی جائے تو پھر اور کون سا مقام ہے جہاں جا کر کسی کا دِل نرم ہوگا!

اِختلاف کے نتیجے میں دُوسری مسجد بن جائے تو اس کو ''مسجدِ ضرار'' نہیں کہیں گے

وَ الَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَّ كُفْرًا: اور وہ لوگ جنہوں نے مسجد بنائی نقصان پہنچانے کے لیے اور کُفر کرنے کی وجہ سے وَ تَفْرِیْقًۢا بَیْنَ الْمُؤْمِنِیْنَ: اور مسلمانوں کے درمیان پھوٹ ڈالنے کے لیے، یعنی اس عمارت کو بنانے کا داعیہ ایک تو مسلمانوں کو نقصان پہنچانا ہے، دوسرے اللہ کے ساتھ کُفر، کیونکہ در پردہ دل کے اندر وہ کُفر چھپائے ہوئے تھے، اور ان کا تیسرا مقصد مسلمانوں کے درمیان میں پھوٹ ڈالنا ہے، اور ان کا چوتھا مقصد وَ اِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ مِنْ قَبْلُ: جو شخص اللہ اور اللہ کے رسول کے ساتھ لڑائی لڑ رہا ہے، جو محارب ہے (اس سے اسی ابو عامر راہب کی طرف اشارہ ہے) اس کو ٹھکانا دینے کے لیے، اُس کے لئے مورچہ مہیا کرنے کے لیے یہ عمارت بنائی ہے، تو جنہوں نے ان مقاصد کے تحت مسجد بنائی ہے یہ بھی منافق ہیں، منافقوں میں شامل ہیں (وَ الَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا کی خبریں نکلے گی)، یہ بُرے لوگ ہیں، یہ اچھے لوگ نہیں، قابلِ اعتماد نہیں۔ اب ان مقاصد کے تحت جو بنائی گئی تو صورتاً مسجد تھی، حقیقتاً مسجد نہیں تھی، اس لیے حضور ﷺ نے اس کو آگ لگوادی، ڈھادیا، گرادیا، اب جو مسلمانوں میں آپس میں پھوٹ پڑتی ہے، اور پھوٹ پڑنے کے بعد دوسری مسجد بن جاتی ہے، تو چاہے اُس کی بنیاد آپس کا اختلاف ہی ہو، لیکن یہ مقاصد اُس میں نہیں ہوتے، اس لیے اگر اختلاف کے طور پر دوسری مسجد اگر کھڑی ہوجائے تو اُس کو مسجدِ ضرار نہیں کہا جاسکتا، وہ مسجد ہی ہوگی، اُس کے احکام مسجد والے ہی ہوں گے، اس کی توہین اور بے حرمتی جائز نہیں ہے، یہ علیحدہ بات ہے کہ فرقہ بازی کی بنا پر اس قسم کا اقدام مناسب نہیں، لیکن اس مسجد میں نماز پڑھنا درست، اور اس مسجد کو مسجد ہی سمجھا جائے گا، کیونکہ آج کل جو اختلاف کی بنا الگ مسجد بنتی ہے اس میں یہ مقاصد نہیں ہوتے، نہ نقصان پہنچانا، نہ کُفر، نہ اللہ کے ساتھ لڑنے والے کو مورچہ مہیا کر کے دینا، اس قسم کے مقاصد مسلمانوں کے ذہن میں نہیں ہوتے، اس لیے اپنی مسجد کے مقابلے میں اگر کوئی شخص اختلاف کر کے دوسری مسجد بنالے، تو چاہے یہ اقدام بُرا ہے کہ اس سے نمازیوں میں پھوٹ پڑگئی، محلے میں دوسری مسجد بننے کے ساتھ آپس میں اختلاف کو ہوا ہوگی،

لیکن اس کو ''مسجدِ ضرار'' نہیں کہا جاسکتا، اور اس کے لیے یہ نہیں ثابت کیا جاسکتا، کہ یہ جلانے اور ڈھانے کے قابل ہے، جس طرح سے حضور ﷺ نے ڈھادی تھی، نہیں! وہ مسجد ہی ہوگی اور اُس کے سارے احکام مسجد والے ہی ہوں گے، اگرچہ جن لوگوں نے کسی اختلاف کی بنا اس مسجد کو بنایا ہے انہوں نے اچھا نہیں کیا، چاہیے تھا کہ آپس کے اختلاف کو مٹانے کی کوشش کرتے، آپس میں مسلمان متحد ہو کے رہتے، اور مسجد ایک ہی رہتی، آپس میں مل کے نماز پڑھتے، آپس میں محبت ہوتی، یہ اچھی بات تھی، تو یہ اقدام غلط ہے، لیکن اُس مسجد کو مسجد ضرار نہیں کہیں گے، یہ چار مقصد ذکر کیے گئے ہیں، جن کے تحت ان لوگوں نے مسجد بنائی تھی۔

منافقین کی قسموں کا کوئی اعتبار نہیں

وَلَيَحْلِفُنَّ اِنْ اَرَدْنَآ اِلَّا الْحُسْنٰى: یہ تو ہمیشہ قاعدہ ہے کہ جھوٹا آدمی کبھی بھی یہ نہیں کہتا کہ میں یہ بات جھوٹی کہہ رہا ہوں، اس لیے وہ تو قسمیں کھا کے کہیں گے کہ بڑی نیک نیتی سے اور بڑے اخلاص سے بنائی ہے، اس لیے ہر اِخلاص کے مدعی کا اعتبار نہیں کرلیا جاتا، چاہے وہ کتنی ہی قسمیں کیوں نہ کھائے، دیکھنا تو یہ ہوتا ہے کہ باقی قرائن اور آثار کیا بتاتے ہیں، آخر زبان دل کے مطابق نہیں ہوتی، دِل میں کچھ ہوتا ہے اور زبان سے انسان کچھ کہتا ہے، جس طرح کسی بزرگ کا قول آتا ہے کہ ''جب سے ہم نے برادرانِ یوسف کا قصہ سنا ہے اُس وقت سے ہم کسی رونے والے کا جلدی سے اعتبار نہیں کرتے'' ورنہ انسان کہتا ہے نا، کہ وہ بات کرتے ہوئے رو پڑا، اپنے دُکھ درد کا اس نے اظہار کیا، تو شاید یہ سچ ہی بول رہا ہو، تو کہتے ہیں برادران یوسف نے یہ پردہ بھی چاک کردیا، کہ بسا اوقات اندر کچھ ہوتا ہے، اور اُوپر سے بات بناتے ہوئے لوگ کس طرح سے آنسو بہاتے ہیں اور کس طرح سے دُکھ اور درد کا اظہار کرتے ہیں، تو ہر رونے والا بھی سچا نہیں ہوتا، اسی طرح سے ہر قسمیں کھانے والا بھی سچا نہیں ہوتا'' البتہ ضرور قسمیں کھائیں گے کہ نہیں ارادہ کیا ہم نے مگر حسنیٰ کا'' ہم نے بھلائی کا ہی ارادہ کیا ہے وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ: اللہ گواہ ہے کہ یہ سب جھوٹے ہیں، ان کی زبان اور ہے اور ان کا دِل اور ہے۔ لَا تَقُمْ فِيْهِ اَبَدًا: اس مسجد میں آپ کبھی کھڑے نہ ہوں، یعنی نماز پڑھنے کے لیے اس میں کبھی نہ جائیں۔

''لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى'' سے کون سی مسجد مراد ہے؟

لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى: البتہ وہ مسجد جس کی بنیاد تقویٰ پر رکھی گئی ہے پہلے دِن سے ہی، اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ: تو زیادہ حق رکھتا ہے کہ اسی میں ٹھہرے، اسی میں قیام کرے، نماز اسی میں پڑھے، تو آیات کے شانِ نزول کے تحت اس مسجد کا مصداق قطعی طور پر ''مسجدِ قباء'' ہے، جو آج بھی الحمدللہ! اپنی جگہ قائم ہے، آباد ہے، لوگ شوق سے جاتے ہیں، وہاں نماز پڑھتے ہیں، اور اس کے محراب والی دیوار کے اوپر وہ روایت بھی لکھی ہوئی ہے، جس کا مفہوم یہی ہے جو کل آپ کی خدمت میں عرض کیا تھا، کہ جو شخص اپنے گھر سے باوضو نکلے اور ''مسجدِ قباء'' میں آئے اور آ کر دو رکعت پڑھے تو اُس کو عمرہ جیسا ثواب ملتا ہے، یہ روایت اس کی محراب والی دیوار کے اوپر لکھی ہوئی ہے، تو لوگ شوق سے جاتے ہیں، جا کے وہاں نفل پڑھتے ہیں، اس کا قطعی مصداق تو وہی ہے، لیکن حدیث شریف میں آتا ہے کہ سرورِ کائنات ﷺ سے پوچھا گیا کہ لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى کون سی مسجد ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ

''مَسْجِدِیْ هٰذَا''(۱) مسجدِ نبوی کے متعلق فرمایا کہ یہ ہے مَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى۔ ''ترمذی شریف'' کے اندر روایت موجود ہے، لیکن ان دونوں باتوں میں بالکل تعارض نہیں ہے، کیونکہ وہ مسجد جو قباء میں بنی تھی، مخلصین نے بنائی تھی، وہ مسجد بھی اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى ہے، اور حدیث شریف سے معلوم ہوا کہ بدرجۂ اولیٰ اس کا مصداق مسجدِ نبوی بھی ہے، جو حضور ﷺ نے خود اپنے ہاتھوں سے بنائی، اور اس کے اندر زندگی بھر نماز پڑھتے رہے اور وہی مخلص صحابہ اس میں بھی نماز پڑھتے رہے، تو مطلب یہ ہوا کہ مسجد اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى صرف مسجدِ قباء نہیں ہے، بلکہ مسجدِ نبوی بدرجۂ اولیٰ اس میں شامل ہے، تو اس روایت کا یہی معنی ہے کہ مسجدِ نبوی کو بھی اس کا مصداق بنانا مقصود ہے، ورنہ ان آیات کے شانِ نزول میں تو متعین ہے کہ اس سے مسجدِ قباء ہی مراد ہے۔

''مسجدِ قباء'' کے نمازیوں کی پاکیزگی کی تعریف

لَا تَقُمْ فِيْهِ اَبَدًا: آپ اس میں کھڑے نہ ہوں، یعنی نماز پڑھنے کے لیے کھڑے نہ ہوں، ''وہ مسجد جس کی بنیاد رکھی گئی تقویٰ پر پہلے دن سے ہی، وہ زیادہ حق رکھتی ہے اس بات کا کہ آپ اس میں قیام کریں'' اب وہاں نماز پڑھنے والوں کی تعریف اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں فرمائی کہ فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا: اس مسجد میں ایسے لوگ ہیں جو پاک صاف رہنے کو پسند کرتے ہیں، اُن کے تطہر کی تعریف فرمائی ہے کہ بہت پاک صاف رہنا چاہتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ پاک صاف رہنے والوں کو بڑا پسند کرتا ہے، عقیدے کی صفائی بھی ان میں تھی، بدن کی صفائی بھی ان میں تھی، لباس کی صفائی بھی ان میں تھی، تو اس قسم کے صاف ستھرے لوگ اس مسجد میں نماز پڑھتے ہیں، تو گویا کہ جو منافق تھے وہ ''مسجدِ ضرار'' کے عنوان سے چھٹ گئے، اور جو وہاں نماز پڑھنے والے تھے ان کی یہ تعریف فرمائی کہ بڑے صاف ستھرے لوگ ہیں اور اللہ تعالیٰ ان صاف ستھرے لوگوں کو پسند فرماتے ہیں۔ جس وقت یہ آیت اتری تو سرورِ کائنات ﷺ نے ان لوگوں سے جو ''مسجدِ قباء'' میں نماز پڑھنے والے تھے، اُن سے پوچھا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے تطہر کی تعریف کی ہے، کہ تم بڑے صاف ستھرے رہتے ہو، تو کون سا امتیازی نشان ہے جس کی بنا پر اللہ نے تمہاری یہ تعریف کی؟ وہ کہنے لگے کہ یا رسول اللہ! ہماری عادت یہ ہے کہ جس وقت ہم بیت الخلا میں جاتے ہیں، تو ہم ڈھیلے بھی استعمال کرتے ہیں، اور ڈھیلے استعمال کرنے کے بعد پانی بھی استعمال کرتے ہیں، تو آپ ﷺ نے فرمایا یہی وجہ ہے جس کی بنا پر تمہیں خصوصیت کے ساتھ متطہر قرار دیا گیا، کہ بڑے صاف ستھرے لوگ ہو۔(۲)

اِستنجے میں فقط ڈھیلے پر اِکتفا کا جواز اور اس کی تفصیل

اصل بات یہ ہے کہ عرب کے اندر پانی کی کمی کی بنا پر اکثر و بیشتر لوگ صرف ڈھیلے پر اکتفا کرتے تھے، پاخانے گئے اور ڈھیلے کے ساتھ صفائی کر لی، پانی کے ساتھ استنجا کرنے کی وہ ضرورت محسوس نہیں کرتے تھے، اور اگر پانی کے ساتھ استنجا بھی کر لیا جائے تو آپ جانتے ہیں کہ یہ زیادہ صفائی کا باعث ہے، تو ڈھیلا بھی استعمال ہو جائے اور پانی بھی استعمال ہو جائے تو یہ بہت اچھی

---

(۱) ترمذی ۲/ ۱۴۱، ابواب التفسیر۔ تفسیر سورۃ التوبۃ۔ نیز مسلم ۱/ ۴۴۷، باب بیان المسجد الذی اسس علی التقوی
(۲) ابن کثیر، جلالین وغیرہ بحوالہ بزار۔ نوٹ: لیکن عام کتب حدیث میں صرف پانی کا ذکر ہے، ڈھیلے کا نہیں۔

بات ہے، تو قباء کے لوگوں کی یہ عادت تھی، کہ جہاں باہر جاتے تو ڈھیلا بھی استعمال کرتے، اور اس کے بعد پانی کے ساتھ بھی استنجا کر لیتے۔ تو صرف ڈھیلے پر اکتفا جائز ہے، لیکن اس صورت میں جب نجاست اپنے مخرج سے ادھر ادھر پھیلی نہ ہو، فقہ کی کتابوں کے اندر آپ یہ تفصیل پڑھتے رہتے ہیں، مخرج معاف ہے، اگر نجاست صرف مخرج تک ہو تو ڈھیلے پہ اکتفاء کرلیا جائے اور پانی سے استنجا نہ کیا جائے تو یہ بالکل دُرست ہے، آپ نے پیشاب کیا، پیشاب کرنے کے بعد خشک استنجا کرلیا، اور پیشاب کے چھینٹے اِدھر اُدھر نہیں پڑے تو ایسی صورت میں اگر پانی سے استنجا نہ کیا جائے تو بلا کراہت نماز دُرست ہے، اس میں کوئی کسی قسم کی کراہت نہیں، ہمارے ہاں چونکہ پانی فراوانی کے ساتھ ملتا ہے اس لیے لوگ پانی کے ساتھ استنجا کرنے کے بہت عادی ہو گئے، وہ سمجھتے ہیں کہ جب تک پانی سے استنجا نہ کیا جائے اُس وقت تک نماز ہی نہیں ہوتی، تو استنجے کے لیے انتظار میں کھڑے رہیں گے، چاہے جماعت نکل جائے، باری کا انتظار کرتے رہیں گے، کہیں مجمع ہو جائے تو ایسی صورت میں کوئی ضرورت نہیں، انسان دیکھ لے کہ اگر اِدھر اُدھر چھینٹے نہیں پڑے اور نجاست نہیں پھیلی تو صرف خشک ڈھیلے پر اکتفا کیا جا سکتا ہے، سفر میں بھی اس کی سہولت رہتی ہے، اور گاہے گاہے ایسا کرنا چاہیے تاکہ طبیعت وسوسہ قبول نہ کرے، ورنہ اگر پانی کے ساتھ استنجے کی اتنی پختہ عادت رکھی جائے تو پھر کبھی ضرورت کی بنا پر پانی سے استنجا نہ کیا، یا آپ نے کہیں پیشاب کیا اور خشک ڈھیلا استعمال کرلیا اور استنجا کرنا یاد نہ رہا، نماز پڑھنے کے بعد یاد آیا، یا نماز کے دوران میں یاد آیا تو طبیعت میں ایسا وسوسہ ہوتا ہے کہ جی چاہتا ہے کہ انسان نماز کو لوٹائے، یا درمیان میں یاد آجائے تو جی چاہتا ہے کہ نماز ہی توڑ دے، طبیعت کے اندر یہ وسوسہ آتا ہے، تو گاہے گاہے یہ عادت رکھنی چاہیے کہ انسان صرف خشک استنجے پر اکتفا کرلے۔ لیکن پاخانے کے معاملے میں احتیاط کرنی چاہیے، کیونکہ اس زمانے میں لوگ خشک کھاتے تھے، محنت، مشقت کرتے تھے، رُطوباتِ زائدہ نہیں ہوتی تھیں، جس طرح سے ''ہدایہ'' کے حاشیے میں وہ روایت لکھی ہوئی ہے کہ ''إِنَّهُمْ يَبْعَرُونَ بَعْرًا'': کہ وہ لوگ اس طرح سے پاخانہ کرتے تھے جس طرح سے لید ہوتا ہے، اِدھر اُدھر تلویث کا اندیشہ نہیں ہوتا تھا، کہ مقام سے اِدھر اُدھر پھیل جائے، ''وَأَنْتُمْ تَثْلِطُونَ ثَلْطًا''[1] تم تو پتلا پتلا ہگتے ہو، جس کی بنا پر زیادہ اندیشہ ہوتا ہے کہ مخرج سے اِدھر اُدھر پھیل جائے گا، تو ایسے وقت میں پانی کے ساتھ استنجا کرنا بہتر ہے، لیکن اگر قبض کی سی کیفیت ہے، یا انسان کو یقین ہو کہ مخرج سے اِدھر اُدھر نجاست نہیں لگی، تو پاخانے میں بھی صرف ڈھیلے کے اُوپر اکتفا کیا جا سکتا ہے، اور اگر پانی موجود ہو تو پانی کے ساتھ استنجا کرلیا جائے، اور دونوں میں سے ایک پر اکتفا کرنا ہو تو پانی پر اکتفا کرنا اَولیٰ ہے۔

آج کل بیت الخلا میں ڈھیلے کے عدمِ جواز کا فتویٰ

لیکن یہ یاد رکھیے! ڈھیلے کی یہ فضیلت ہے کہ پہلے ڈھیلا کرنا چاہیے اور اس کے بعد پانی استعمال کرنا چاہیے، لیکن جو آج کل مروجہ بیت الخلا بنے ہوئے ہیں گٹر والے، اس بارے میں حضرت مفتی رشید احمد صاحب رحمہ اللہ نے بہت وضاحت کے ساتھ لکھا ہے، ''احسن الفتاویٰ'' جلد دوم کے اندر انہوں نے اس استنجے کے مسئلے کو بڑا شاندار واضح کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ ان

(۱) علل دار قطنی ۴/ ۵۴، رقم ۴۲۵۔ مصنف ابن ابی شیبہ ۱/ ۱۴۲ باب من کان یقول اذا خرج من الغائط الخ وھو قول علی رضی اللہ عنہ

بیت الخلاؤں میں تو ڈھیلے کا استعمال کرنا حرام ہے، انہوں نے ''حرام'' کا لفظ لکھا ہے، کہ لوگ تو مستحب پہ عمل کرتے ہیں، لیکن اس مستحب کے نتیجے میں جس وقت یہ گٹر بند ہو جاتے ہیں تو اس سے مسلمان جتنی تکلیف اُٹھاتے ہیں یہ ایذائے مسلم ہے، اور ایذائے مسلم حرام ہے، اس لیے اگر اس قسم کے بیت الخلاؤں میں پیشاب کرنے کی نوبت آجائے تو ڈھیلا استعمال نہ کرو اور پانی پہ اِکتفا کرو۔ باقی! انہوں نے قطرے والی بات کو بڑا صاف کیا، کہ یہ جو پیشاب کا قطرہ آتا ہے اور کتنی دیر تک لوگ ڈھیلے کے ساتھ خشک کرتے رہتے ہیں، عام طور پر جس طرح سے یہاں مروّج ہے، کہ چلتے پھرتے ڈھیلا کرتے رہتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ قطرے کا آنا مثانے کی کمزوری کی بنا پر نہیں، اگر مثانے کی کمزوری کی بنا پر ہوتا تو یہی مسئلہ عورتوں کے لئے بھی ہوتا، مثانہ عورتوں کا بھی کمزور ہو سکتا ہے، لیکن عورتیں پیشاب کرتی ہیں اور فوراً وہیں اِستنجا کر لیتی ہیں، فقہ میں بھی اسی طرح سے لکھا ہوا ہے، ان کے لئے کوئی اس قسم کا حکم نہیں، تو قطرے کے آنے کا اِحتمال مرد کی پیشاب کی نالی کے لمبے ہونے کی وجہ سے ہے، ورنہ مثانے کا مسئلہ نہیں ہے، مثانے کے کمزور ہونے کی صورت میں تو بار بار پیشاب آئے گا، اور مرد اور عورت دونوں اس میں مشترک ہیں۔ تو مرد کی نالی پیچ دار اور لمبی ہے، جس میں یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ کوئی قطرہ رہ جائے گا، اور وہ کھڑے ہونے کے بعد نکل سکتا ہے، تو فرماتے ہیں کہ ذرا اہتمام کے ساتھ اس نالی کو سوت (نچوڑ) لیا جائے، اور پانی سے اِستنجا کر لیا جائے تو بعد میں قطرہ نہیں آتا۔ تو جتنا اس وسوسے کے اندر مبتلا ہوں گے، خاص طور پر صوفیہ حضرات اس وسوسے میں بہت مبتلا ہوتے ہیں، آدھا آدھا گھنٹہ ان کا ڈھیلا ہی نہیں ہوتا اور پیشاب ہی خشک نہیں ہوتا، اور بہت وقت ضائع کر دیتے ہیں، تو اس میں اتنا زیادہ وسوسے میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں، انسان سادگی کے ساتھ اچھی طرح سے احتیاط سے وہیں بیٹھ کر چاہے کچھ کھانس لے، اور نالی کو ذرا سوت کر صاف کر لے، تو اس کے اُوپر اِکتفا کیا جا سکتا ہے، یہ مسئلہ انہوں نے بڑی وضاحت کے ساتھ لکھا ہے، تو ڈھیلا اگرچہ افضل ہے لیکن اس قسم کے بیت الخلاؤں میں جن میں گٹر سسٹم ہے، اور ان کے بند ہو جانے کے بعد تکلیف ہونے کا اندیشہ ہے، تو وہاں ڈھیلا استعمال کرنا جائز نہیں۔ حضرت مفتی صاحب نے صاف ''حرام'' کا لفظ استعمال کیا ہے، تو اس میں احتیاط کرنی چاہیے۔ بہرحال روایات میں یہ آیا ہے کہ انہوں نے کہا کہ ہم ڈھیلا بھی استعمال کرتے ہیں اور پانی بھی استعمال کرتے ہیں، جس کی بنا پر ان کا یہ اہتمام اللہ تعالیٰ کے نزدیک قابلِ تعریف ہوا۔ وَاللّٰہُ یُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ: اللہ تعالیٰ طہارت کرنے والوں کو، صاف ستھرا رہنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

''مسجدِ قباء'' اور ''مسجدِ ضرار'' بنانے والوں کا حال

اَفَمَنْ اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰى تَقْوٰى: کیا پھر وہ شخص جس نے اپنی عمارت کی بنیاد اللہ کے تقویٰ پہ رکھی، خلوص پر اور اللہ کی رضا پر رکھی، وہ بہتر ہے، یا وہ شخص بہتر ہے؟ جس نے اپنی عمارت کی بنیاد ایسی گھاٹی کے کنارے پہ رکھی کہ جو گرنے والی ہے۔ یعنی اُس کی کوئی بنیاد ہی نہیں، فَانْهَارَ بِهٖ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ: فَانْهَارَ کی ضمیر عمارت کی طرف راجع ہے، لفظی تحقیق کل آپ کے سامنے ذکر کر دی گئی تھی۔ پھر وہ عمارت اپنے بانی کو لے کر جہنّم کی آگ میں گر گئی، اللہ تعالیٰ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں کرتا، ورنہ بات تو یہی سیدھی ہے کہ

عمارت مضبوط وہی ہوگی جس کی بنیاد اللہ سے ڈرنے پہ ہو، اور اللہ کی رضا پہ ہو، یہی قبولیت کی بات ہے اور اسی کے ذریعے سے درجات نصیب ہوں گے۔ اور یہ جو دِل میں خبث ہے یہ ایسے ہی ہے جیسے کہ ناپائیدار گھاٹی کے اوپر عمارت کی بنیاد رکھ دی جائے، یہ بات بڑی واضح ہے، لیکن جن لوگوں کو ظلم کرنے کی عادت پڑگئی اور اپنی صلاحیتیں خراب کرلیں، تو اس قسم کی صاف باتیں بھی اُن کی سمجھ میں نہیں آتیں۔ لَا یَزَالُ بُنْیَانُهُمُ الَّذِیْ بَنَوْا: ہمیشہ رہے گی وہ عمارت جو انہوں نے بنائی رِیْبَةً فِیْ قُلُوْبِهِمْ: ان کے دل کے اندر کھٹکے کا باعث، ان کے دِلوں کے اندر وہ کھٹکتی رہے گی، کانٹے کی طرح رڑکتی رہے گی، رِیْبَةً تردّد کو کہتے ہیں، ''ان کے دِلوں میں شبہ اور تردّد کا باعث بنی رہے گی، مگر یہ کہ ان کے دل ہی ٹکڑے ٹکڑے ہوجائیں''، دل ٹکڑے ٹکڑے ہوجائیں تو پھر یہ تردد ختم ہوگا، اس کا حاصل یہی ہے کہ اب ان کی زندگی میں یہ چیز ان کے دل سے جائے گی نہیں، جیسے کسی کپڑے کے اوپر اگر پختہ داغ پڑ جائے اور اُترنے والا نہ ہو تو اس کو کہتے ہیں، کہ اب یہ داغ تو کپڑے کے ساتھ ہی جائے گا، جس کا مطلب یہ ہے کہ کپڑا ختم ہوگا تو یہ داغ ختم ہوگا، ورنہ کپڑا باقی ہو اور داغ ختم ہوجائے ایسا نہیں، اسی طرح سے یہ زندہ رہیں اور ان کے دل باقی ہوں اور نفاق اور تردّد ان کے دِل سے ختم ہوجائے ایسا نہیں ہوگا، جب دِل ہی ٹکڑے ٹکڑے ہوں گے تو یہ ختم ہوجائے گا، زندگی بھر یہ چیز ان کے ساتھ لازم رہے گی، وَاللّٰهُ عَلِیْمٌ حَكِیْمٌ: اللہ تعالیٰ علم والا ہے حکمت والا ہے۔

إِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ أَنْفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ بِأَنَّ

بے شک اللہ تعالیٰ نے خرید لیا مؤمنین سے اُن کی جانوں کو اور اُن کے مالوں کو اس بات کے بدلے

لَهُمُ الْجَنَّةَ ۭ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ ۣ وَعْدًا

کہ اُن کے لیے جنت ہے، لڑائی کرتے ہیں وہ اللہ کے راستے میں پھر وہ قتل کرتے ہیں اور قتل کیے جاتے ہیں، یہ وعدہ ہے

عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرٰىةِ وَالْإِنْجِيْلِ وَالْقُرْاٰنِ ۭ وَمَنْ أَوْفٰى بِعَهْدِهٖ مِنَ

اللہ کے ذمے سچا توراۃ میں انجیل میں اور قرآن میں، کون زیادہ وفا کرنے والا ہے اپنے عہد کو

اللّٰهِ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِيْ بَايَعْتُمْ بِهٖ ۭ وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ

اللہ کے مقابلے میں، (اے ایمان والو!) خوش ہوجاؤ اس بیع پر جو تم نے اللہ کے ساتھ کرلی، یہ بہت بڑی

الْعَظِيْمُ ﴿۱۱۱﴾ اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ السَّآئِحُوْنَ

کامیابی ہے ﴿۱۱۱﴾ وہ مؤمن ایسے لوگ ہیں جو توبہ کرنے والے ہیں عبادت کرنے والے ہیں اللہ کی حمد کرنے والے ہیں بے تعلق رہنے والے ہیں

الرّٰكِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ

رکوع کرنے والے اور سجدہ کرنے والے ہیں، بھلائی کا حکم دینے والے ہیں اور برائی سے روکنے والے ہیں،

وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ ؕ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۱۲﴾ مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ

اور اللہ کی حدود کی نگہبانی کرنے والے ہیں، ایمان والوں کو بشارت دے دیجیے﴿۱۱۲﴾ نہیں لائق نبی کے

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ وَلَوْ كَانُوْٓا اُولِيْ قُرْبٰى

اور نہ مؤمنوں کے کہ وہ استغفار کریں مشرکین کے لیے اگرچہ وہ رشتہ دار ہی ہوں

مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُمْ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ﴿۱۱۳﴾ وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ

بعد اس کے کہ اُن کے لیے واضح ہوگیا کہ وہ جہنم والے ہیں﴿۱۱۳﴾ اور نہیں تھا استغفار

اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَآ اِيَّاهُ ۚ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗٓ

ابراہیم کا اپنے باپ کے لیے مگر ایک وعدے کی وجہ سے جو ابراہیم نے اپنے باپ سے کرلیا تھا، جس وقت ابراہیم کے لئے یہ بات

اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ ؕ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيْمٌ ﴿۱۱۴﴾ وَمَا كَانَ

واضح ہوگئی کہ وہ تو اللہ کا دشمن ہے تو ابراہیم اپنے باپ سے لاتعلق ہوگئے، بے شک ابراہیم نرم دِل تھے بُردبار تھے﴿۱۱۴﴾ اور نہیں ہے

اللّٰهُ لِيُضِلَّ قَوْمًۢا بَعْدَ اِذْ هَدٰىهُمْ حَتّٰى يُبَيِّنَ لَهُمْ مَّا

اللہ کہ کسی قوم کو گمراہی میں ڈال دے بعد اس کے کہ اللہ نے ان کو ہدایت دے دی جب تک کہ واضح نہ کردے اُن کے لئے اُن چیزوں کو

يَتَّقُوْنَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۱۱۵﴾ اِنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ

جن سے وہ بچیں، بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز کے متعلق علم رکھنے والا ہے﴿۱۱۵﴾ بے شک اللہ کے لئے ہی سلطنت ہے آسمانوں کی اور زمین کی،

يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ؕ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿۱۱۶﴾

وہی زندگی دیتا ہے وہی موت دیتا ہے، اور نہیں ہے تمہارے لیے اللہ کے علاوہ کوئی یار نہ کوئی مددگار﴿۱۱۶﴾

لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ الَّذِيْنَ

اللہ رحمت کے ساتھ متوجہ ہوا اپنے نبی پر اور مہاجرین پر اور انصار پر جنہوں نے

اتَّبَعُوْهُ فِيْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ مِنْۢ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيْغُ قُلُوْبُ فَرِيْقٍ مِّنْهُمْ

اتباع کی تھی اُس نبی کی تنگی کی گھڑی میں بعد اس کے کہ قریب تھا کہ ان میں سے ایک فریق کے دل ٹیڑھے ہو جائیں

ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّهٗ بِهِمْ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۱۷﴾ وَّعَلَى الثَّلٰثَةِ

پھر اللہ نے ان پر توجہ فرمائی، بے شک اللہ ان سب کے ساتھ نرمی کرنے والا رحم کرنے والا ہے ﴿۱۱۷﴾ (اور اللہ متوجہ ہوا) اُن تین پر

الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا ؕ حَتّٰۤى اِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ

جن کا معاملہ ملتوی کردیا گیا تھا، حتیٰ کہ جس وقت اُن کے اُوپر زمین تنگ ہوگئی باوجود کشادہ ہونے کے

وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَنْفُسُهُمْ وَظَنُّوْۤا اَنْ لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّاۤ اِلَيْهِ ؕ

اور تنگ ہوگئے اُن پر اُن کے اپنے جی، اور انہوں نے گمان کیا کہ اللہ کے عذاب سے ٹھکانا نہیں مگر اللہ ہی کی طرف

ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوْبُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۱۸﴾

پھر اللہ نے اُن پر توجہ فرمائی تا کہ وہ بھی آئندہ اللہ کی طرف متوجہ رہیں، بے شک اللہ متوجہ ہونے والا رحم کرنے والا ہے ﴿۱۱۸﴾

خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۔ اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ: بے شک اللہ تعالیٰ نے خرید لیا مؤمنین سے ان کی جانوں کو اور ان کے مالوں کو اس بات کے بدلے کہ ان کے لئے جنت ہے، يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ: لڑائی کرتے ہیں وہ اللہ کے راستے میں، فَيَقْتُلُوْنَ: پھر وہ قتل کرتے ہیں وَ يُقْتَلُوْنَ: اور قتل کئے جاتے ہیں، وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرٰىةِ: یہ وعدہ ہے اللہ کے ذِمّے سچا توراۃ میں، انجیل میں اور قرآن میں، وَمَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ: کون زیادہ وفا کرنے والا ہے اپنے عہد کو اللہ کے مقابلے میں، یعنی سب سے زیادہ عہد کو وفا کرنے والا اللہ ہی ہے، فَاسْتَبْشِرُوْا: یہ خطاب ہے اہلِ ایمان کو۔ اے ایمان والو! خوش ہو جاؤ، بِبَيْعِكُمُ الَّذِيْ بَايَعْتُمْ بِهٖ: اس بیع پر جو تم نے اللہ کے ساتھ کر لی، جو سودا تم نے اللہ کے ساتھ کر لیا اس کے اوپر خوش ہو جاؤ، وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ: یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔ اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ: وہ مؤمن ایسے لوگ ہیں جو توبہ کرنے والے ہیں، الْعٰبِدُوْنَ: عبادت کرنے والے ہیں، الْحٰمِدُوْنَ: اللہ کا شکر ادا کرنے والے ہیں، اللہ کی حمد کرنے والے ہیں، حمد شکر کے معنی پہ مشتمل ہے جس طرح سے حدیث شریف میں آتا ہے: ''رَأْسُ الشُّكْرِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ''[1] السَّآئِحُوْنَ: یہ لفظ سیاحت سے لیا گیا ہے، سَاحَ يَسِيْحُ، اور یہ لفظ پہلے بھی اسی سورت میں آیا تھا فَسِيْحُوْا فِي الْاَرْضِ زمین میں چلو پھرو، تو سیاحت کا مفہوم اصل میں یہ ہے کہ پرانے زمانے میں

(۱) الامثال للحکیم الترمذی ۱/ ۱۵۸ / نیز مشکوۃ ۱/ ۲۰۱، باب ثواب التسبیح. ولفظہ: اَلْحَمْدُ رَأْسُ الشُّكْرِ

لوگ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے کے لئے اپنے گھروں سے نکل جایا کرتے، اپنے ماحول سے نکل جاتے، جنگلات میں رہتے پہاڑوں میں رہتے بیابانوں میں رہتے، چشموں کا پانی پی لیتے، جنگلی پھل کھا لیتے، اور غاروں کے اندر بیٹھ کر اللہ کو یاد کرتے رہتے، اور اگر وہ آبادیوں میں آتے بھی تو اس طرح سے کہ صبح کہیں شام کہیں، رات کہیں دن کہیں، یہ ان کا ایک عبادت کرنے کا طریقہ تھا، ہر قسم کے تعلقات سے منقطع ہو کر وہ یوں نکل کھڑے ہوتے، مقصد اُن کا یہ ہوتا تھا کہ جہاں انسان مستقل رہتا ہے، جو اپنا وطن ہوتا ہے، وہاں دوستیاں رشتہ داریاں تعلقات اس قسم کے ہوتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونے سے مانع ہو جاتے ہیں، عبادت نہیں کرنے دیتے، تو ان تعلقات سے جان چھڑا کر وہ یوں نکل جاتے، اور ہماری امت میں سرورِ کائنات ﷺ نے یہ بات واضح کردی کہ اس قسم کی سیاحت جس میں بالکل ہی تعلقات کو چھوڑ دیا جائے اور اہلِ حقوق کے حقوق ختم ہوں یہ راہبانہ زندگی اختیار کرنی ٹھیک نہیں ہے، جس طرح سے آتا ہے: ''لَا رَهْبَانِيَّةَ فِي الْإِسْلَامِ ''[1] کہ اسلام میں رہبانیت نہیں، یوں تعلقات قطع کرنا تو ٹھیک نہیں، ہاں! البتہ کسی درجے میں اگر علیحدگی اختیار کی جائے کچھ کچھ وقت کے لئے، تو اس کی حوصلہ افزائی کی گئی ہے جیسے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: ''سِيَاحَةُ أُمَّتِي الْجِهَادُ فِي سَبِيلِ اللهِ ''[2] اللہ کے راستے میں جہاد پہ نکل جاؤ، تو جتنے دن جہاد میں گزریں گے تو اس دوران تعلقات ختم ہو جاتے ہیں، یا مسجد کے اندر معتکف ہو کر بیٹھ جاؤ اس طرح سے بھی تعلقات کم ہو جائیں گے، یا حج بیت اللہ کو کسی درجے میں سیاحت قرار دیا گیا، تو گاہے گاہے اتنا سا تعلق قطع کرنا جس میں اہلِ حقوق کے حقوق بھی تلف نہ ہوں اور مقصد بھی حاصل ہو جائے کہ ماحول سے علیحدگی اختیار کر کے انسان ایک اچھی عادت ڈال لے، کچھ دیر کے لئے اللہ کی طرف متوجہ رہ جائے، چلہ کشی جس طرح سے ہوا کرتی ہے، تو اس کو باقی رکھا گیا ہے، اس لیے سیاحت کا مفہوم یہاں مختلف انداز سے بیان کیا گیا ہے، بعضوں نے اس کا مفہوم ذکر کیا کہ جو روزہ رکھنے والے ہیں، روزے میں بھی کسی درجے میں لاتعلقی ہو جاتی ہے، کھانے پینے سے بھی اور بیوی سے بھی، تو اس درجے کی سیاحت بھی برداشت کی گئی، تو سائحون صائمون کے معنی میں آ گیا، اور یا سائحون کا مصداق ہو جائے گا اللہ کے راستے میں نکلنے والے، جس کا مصداق جہاد کرنے والے بھی ہو سکتا ہے، طلبِ علم کے لئے نکلنے والے بھی ہو سکتا ہے، ہجرت کرنے والے بھی ہو سکتا ہے، سائحون کے اندر یہ سارے مفہوم آ سکتے ہیں، اللہ کے راستے میں نکلنے والے، ''اللہ کے راستے میں تعلقات کی پروانہ کرنے والے'' یہ السَّآئِحُوْنَ کا مفہوم نکل آئے گا، ویسے عام طور پر مترجمین نے اس کا ترجمہ ''روزے رکھنے والے'' کے ساتھ کیا ہے، بیان القرآن میں تو یہی ترجمہ کیا گیا ہے، اور حضرت شیخ (الہندؒ) نے ایک بڑا جامع سا لفظ بولا ہے، السَّآئِحُوْنَ کا ترجمہ کرتے ہیں ''بے تعلق رہنے والے'' یہ ترجمہ سیاحت کے مفہوم کے زیادہ قریب ہے۔ الرّٰكِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ: رکوع کرنے والے اور سجدہ کرنے والے ہیں، الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ: بھلائی کا حکم دینے والے ہیں وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ: اور برائی سے روکنے والے ہیں وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللهِ: اور اللہ کی حدود کی نگہبانی کرنے والے ہیں،

---

(۱) تفسیر روح المعانی سورۃ مائدہ آیت ۸۲ کے تحت، وغیرہ۔ لیکن فتح الباری ۹/۱۱۱ پر ہے: وأما حديث: لا رهبانية في الإسلام فلم أره بهذا اللفظ لكن في حديث سعد بن أبي وقاص عند الطبراني إن الله أبدلنا بالرهبانية الحنيفية السمحة وعن ابن عباس رفعه لا صرورة في الإسلام أخرجه أحمد

(۲) ابوداؤد ۱/ ۳۳۶، باب النهي عن السياحة/ مشكوة ۱/ ۶۹، باب المساجد، فصل ثانی عن عثمان بن مظعونؓ۔

اللہ کے ضابطوں کی حفاظت کرنے والے ہیں، جو حدیں اللہ تعالیٰ نے باندھ دیں ان سے تجاوز نہیں کرتے ، وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ: ایمان والوں کو بشارت دے دیجئے ۔ مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا: نہیں لائق نبی کے اور نہ مومنوں کے اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ: کہ وہ استغفار کریں مشرکین کے لئے، بخشش طلب کریں مشرکین کے لئے وَلَوْ كَانُوْٓا اُولِيْ قُرْبٰى: اگرچہ وہ رشتہ دار ہی ہوں ۔ قربیٰ، قرابت کے معنی میں ہے۔ اگر چہ رشتہ دار ہی ہوں، مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ: بعد اس کے کہ ان کے لیے واضح ہو گیا اَنَّهُمْ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ: کہ وہ جہنم والے ہیں ۔ اَنَّهُمْ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ یہ تَبَيَّنَ کا فاعل ہے۔ اُن کے جہنمی ہونے کے واضح ہونے کے بعد کسی مؤمن کے لئے یا نبی کے لئے یہ لائق نہیں کہ ان کے لئے استغفار کریں، وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ: اور نہیں تھا استغفار ابراہیم کا اپنے باپ کے لئے اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَآ اِيَّاهُ: مگر ایک وعدے کی وجہ سے جو ابراہیم نے اپنے باپ سے کرلیا تھا۔ وَعَدَهَآ کی ''ھا'' ضمیر مَوْعِدَةٍ کی طرف لوٹ رہی ہے۔ جو وعدہ ابراہیم نے کرلیا تھا، اِيَّاهُ: اپنے باپ سے، فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗٓ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ: جس وقت ابراہیم کے لئے یہ بات واضح ہوگئی کہ وہ تو اللہ کا دشمن ہے، تَبَرَّاَ مِنْهُ: تو ابراہیم اپنے باپ سے لاتعلق ہو گئے، انہوں نے اُس سے بیزاری کا اظہار کردیا، اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيْمٌ: بے شک ابراہیم البتہ اَوّاہ تھے اور حلیم تھے، حلیم کے معنی بُردبار، اور اَوّاہ کے معنی رقیق القلب، دوسرے کی تکلیف پر جس کا دل جلدی سے نرم ہو جاتا ہے، آہیں بھرنے والے۔ ''رقیق القلب تھے، نرم دِل تھے، بُردبار تھے''

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِلَّ قَوْمًا: اور نہیں ہے اللہ کہ کسی قوم کو گمراہی میں ڈال دے بَعْدَ اِذْ هَدٰىهُمْ: بعد اس کے کہ اللہ نے ان کو ہدایت دے دی، حَتّٰى يُبَيِّنَ لَهُمْ: جب تک کہ واضح نہ کردے ان کے لئے مَّا يَتَّقُوْنَ: ان چیزوں کو جن سے وہ بچیں، جن چیزوں سے وہ بچیں جب تک ان چیزوں کو واضح نہ کردے اس وقت تک اللہ تعالیٰ کسی گمراہی میں ڈالتا ہدایت کے بعد، اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ: بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز کے متعلق علم رکھنے والا ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ: بے شک اللہ کے لئے ہی سلطنت ہے آسمانوں کی اور زمین کی، يُحْيٖ وَيُمِيْتُ: وہی زندگی دیتا ہے وہی موت دیتا ہے، وہی زندہ کرتا ہے وہی مارتا ہے، حیات وموت اسی کے اختیار میں ہے، وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ: اور نہیں ہے تمہارے لیے اللہ کے علاوہ کوئی یار نہ کوئی مددگار۔ لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهٰجِرِيْنَ: تاب کا لفظ آپ کے سامنے پہلے کئی دفعہ گزر چکا، اس کی نسبت اللہ کی طرف بھی ہوتی ہے بندے کی طرف بھی ہوتی ہے، تابَ العبدُ اور تابَ اللہ دونوں کی طرف اس کی نسبت ہوتی ہے، توبہ کا معنی اصل کے اعتبار سے ہوتا ہے رجوع کرنا، تابَ العبدُ الی اللہ جب بندے کے ساتھ اس کی نسبت ہوگی تو آگے الیٰ آئے گا، بندے نے رجوع کیا اللہ کی طرف، بندہ اللہ کی طرف متوجہ ہوگیا، یعنی معصیت میں مبتلا ہونے کی وجہ سے جو اس نے اللہ سے رُخ پھیرلیا تھا اب اس نے اپنا رخ اللہ کی طرف کرلیا، یعنی اُس معصیت سے باز آگیا، نافرمانی سے باز آگیا، اس نے اعراض چھوڑ دیا، اور تابَ اللّٰهُ عَلَيْهِ جب اللہ کے ساتھ یہ لفظ آئے تو اس کا صلہ ''علیٰ'' آیا کرتا ہے، اللہ اس پر متوجہ ہوگیا یعنی اللہ نے اس پر رحم فرمایا، یعنی اللہ تعالیٰ جو ناراض ہوگیا تھا اس نے بھی اپنی رحمت روک لی تھی بندے کی معصیت کی وجہ سے، تو اللہ بھی اس پر متوجہ ہوگیا، تو اس توبہ کے اندر رحمت والا مفہوم ہوتا ہے، اللہ اس کے اوپر رحمت کرنے لگ گیا، رحمت کے ساتھ متوجہ ہوگیا، ''اللہ تعالیٰ نے توجہ فرمائی، اللہ مہربان ہوا'' یہ وہی رحمت کے معنی کی تضمین کی بنا پر حضرت شیخ (الہندؒ) نے ترجمہ ''اللہ مہربان ہوا'' کے ساتھ کیا ہے، کہ اس توبہ کے اندر رحمت والا معنی آگیا، ''اللہ

رحمت کے ساتھ متوجہ ہوا اپنے نبی پر اور مہاجرین پر اور انصار پر جنہوں نے اتباع کی تھی اُس نبی کی" فِیْ سَاعَۃِ الْعُسْرَۃِ: تنگی کی گھڑی میں، مِنْۢ بَعْدِ مَا كَادَ یَزِیْغُ قُلُوْبُ فَرِیْقٍ مِّنْهُمْ: بعد اس کے کہ قریب تھا کہ ان میں سے ایک فریق کے قلب ٹیڑھے ہوجائیں۔ زیغ: سیدھے راستے سے ہٹ جانا، کج ہوجانا، جیسے دوسری جگہ ہے فَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ زَیْغٌ۔ رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا (آل عمران: ۷، ۸) فَلَمَّا زَاغُوْۤا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ (سورۂ صف: ۵) ان آیات میں اِس لفظ کا معنی یہی ہے کجی۔ "بعد اس کے کہ ان میں سے ایک فریق کے دلوں میں کچھ کجی پیدا ہوگئی تھی، دل پھرنے لگے تھے" ثُمَّ تَابَ عَلَیْهِمْ: پھر اللہ ان کے اوپر مہربان ہوا، اللہ نے ان پر توجہ فرمائی، اِنَّهٗ بِهِمْ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ: بے شک اللہ تعالیٰ ان سب کے ساتھ نرمی کرنے والا رحم کرنے والا ہے۔ وَّعَلَى الثَّلٰثَةِ: اور اللہ مہربان ہوا اُن تین پر، الَّذِیْنَ خُلِّفُوْا: یہاں خُلِّفُوْا کا معنی یہ ہے کہ "جن کا معاملہ ملتوی کردیا گیا تھا"، یہاں خُلِّفُوْا "پیچھے چھوڑ دیے گئے" کے مفہوم میں نہیں، بلکہ دوسرے لوگوں سے پیچھے ہٹا دیے گئے تھے، یعنی معافی ملنے میں، اس سے مراد وہی تین حضرات ہیں کعب بن مالک، ہلال بن اُمیہ، مُرارۃ بن ربیع، یہ تین حضرات جن کا ذکر آپ کے سامنے پہلے ہوا تھا، "اور اللہ مہربان ہوا، اللہ متوجہ ہوا ان تین پر جن کا معاملہ ملتوی کردیا گیا تھا، جو پیچھے رکھے گئے تھے" یعنی معافی ملنے سے ان کو پیچھے ہٹا دیا گیا تھا، حَتّٰۤى اِذَا ضَاقَتْ عَلَیْهِمُ الْاَرْضُ: حتیٰ کہ جس وقت ان کے اُوپر زمین تنگ ہوگئی بِمَا رَحُبَتْ: باوجود کشادہ ہونے کے، وَضَاقَتْ عَلَیْهِمْ اَنْفُسُهُمْ: اور تنگ ہوگئے ان پر ان کے اپنے جی، اپنے نفس، وَظَنُّوْۤا: اور وہ سمجھ گئے، انہوں نے گمان کیا، اَنْ لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّاۤ اِلَیْهِ: مَلْجَاَ: ٹھکانا، بچنے کی جگہ، پناہ گاہ۔ اللہ کے عذاب سے ٹھکانا نہیں مگر اللہ ہی کی طرف، اللہ کی گرفت سے بچاؤ کا کوئی ذریعہ نہیں مگر اللہ ہی کی طرف، ثُمَّ تَابَ عَلَیْهِمْ: پھر اللہ نے ان پر توجہ فرمائی لِیَتُوْبُوْا: تاکہ وہ بھی آئندہ اللہ کی طرف متوجہ رہیں، اِنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ: بے شک اللہ تعالیٰ توبہ قبول کرنے والا، متوجہ ہونے والا، رحم کرنے والا ہے۔ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ: اے ایمان والو! اللہ سے ڈرتے رہو، وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ: اور صادقین کے ساتھ رہو۔ صادقین صدق سے لیا گیا ہے، اور صدق کا معنی یہ ہوتا ہے کہ ان لوگوں کے ساتھ رہو جو اپنی باتوں میں سچے ہیں، یعنی ان کے دِل کے جذبات بھی ان کے قول کے مطابق ہیں، منافق نہیں ہیں، کہ دِل میں کچھ ہو زبان سے کچھ کہتے ہوں، بلکہ جن کا حال اور قال ایک جیسا ہے، جن کے قول اور فعل میں مطابقت ہے، جو زبان سے کہتے ہیں وہی دِل میں ہے، جو زبان سے کہتے ہیں وہی کر کے دِکھاتے ہیں، صَادِقُوا الْقَولِ صَادِقُوا الْفِعلِ، "اچھے لوگوں کے ساتھ رہو" مَا كَانَ لِاَهْلِ الْمَدِیْنَةِ وَمَنْ حَوْلَهُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ: نہیں ہے اہلِ مدینہ کے لئے اور ان لوگوں کے لئے جو بدوی اہلِ مدینہ کے اردگرد ہیں۔ مِنَ الْاَعْرَابِ یہ مَن کا بیان ہے۔ نہیں ہے لائق اہلِ مدینہ کے اور نہ ان بدویوں کے جو مدینہ والوں کے اردگرد ہیں، اَنْ یَّتَخَلَّفُوْا عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ: کہ اللہ کے رسول سے پیچھے رہ جایا کریں، وَلَا یَرْغَبُوْا بِاَنْفُسِهِمْ عَنْ نَّفْسِهٖ: اور نہ یہ ان کے لائق ہے کہ اپنی جانوں کی طرف رغبت کریں نبی کی جان سے اعراض کر کے۔ رَغِبَ کا صلہ عَنْ آئے تو اعراض کرنے کے معنی میں ہوتا ہے۔ نبی کی جان سے اعراض کرتے ہوئے اپنی جانوں کی طرف رغبت کرنے لگ جائیں یہ بھی ان لوگوں کے لئے مناسب نہیں، کہ نبی تو اپنی جان خطرے میں ڈال دے اور یہ لوگ نبی کی پروا نہ کریں اور اپنی جانوں کے تحفظ میں لگ جائیں، اپنی جان بچانے کی فکر پڑ جائے، یہ لائق نہیں، ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ: یہ جو ہم کہتے ہیں کہ ایسا نہیں چاہیے، کیونکہ اس میں محرومی ان کی ہے، "یہ اس وجہ سے ہے کہ بے شک یہ

لوگ' لَا يُصِيْبُهُمْ ظَمَاٌ: نہیں پہنچتی ان کو پیاس۔ ظَمَاٌ پیاس کو کہتے ہیں، جس طرح سے سورۂ طٰہٰ کے اندر لفظ آئے گا اَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا (آیت:۱۱۹) حضرت آدم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ تجھے جنت میں پیاس نہیں لگتی۔ تو ظمأ پیاس کو کہتے ہیں۔ ظمآن: پیاسا۔ لَا يُصِيْبُهُمْ ظَمَاٌ: نہیں پہنچتی ان کو کوئی پیاس، وَّلَا نَصَبٌ: نہ کوئی مشقت، وَّلَا مَخْمَصَةٌ: اور نہ بھوک۔ مَخْمَصَة بھوک کو کہتے ہیں، یہ لفظ بھی قرآنِ کریم میں دوسری جگہ ہے فَمَنِ اضْطُرَّ فِيْ مَخْمَصَةٍ (سورۂ مائدہ:۳)۔ فِيْ سَبِيْلِ اللهِ: نہیں پہنچتی ان کو کوئی پیاس نہ کوئی مشقت نہ کوئی بھوک اللہ کے راستے میں، وَلَا يَطَـُٔوْنَ مَوْطِئًا: اور نہیں روندتے یہ کسی روندنے کی جگہ کو، یعنی نہیں چلتے یہ کوئی چلنا، يَّغِيْظُ الْكُفَّارَ: جو کُفّار کو غصے میں ڈالے، جو کُفّار کے لیے جلن کا باعث بن جائے۔ تو مَوْطِئًا مصدر میمی بھی بن سکتا ہے اور ظرف بھی بن سکتا ہے، ''نہیں روندتے یہ کسی جگہ کو کہ وہ روندنا کُفّار کے لئے باعثِ غیظ ہو جائے' وَلَا يَنَالُوْنَ مِنْ عَدُوٍّ نَّيْلًا: اور نہیں حاصل کرتے یہ دشمن سے کچھ حاصل کرنا، اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ بِهٖ عَمَلٌ صَالِحٌ: مگر لکھا جاتا ہے ان کے لئے اس کے بدلے میں نیک عمل، اِنَّ اللهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ: بے شک اللہ تعالیٰ محسنین کے اجر کو ضائع نہیں کرتا۔ وَلَا يُنْفِقُوْنَ نَفَقَةً صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً: اور نہیں خرچ کرتے یہ لوگ تھوڑا انفقہ نہ زیادہ نفقہ۔ نفقہ سے وہ مال مراد ہے جو اللہ کے راستے میں خرچ کیا جاتا ہے، نہیں خرچ کرتے یہ لوگ کوئی مال تھوڑا اور نہ زیادہ، وَّلَا يَقْطَعُوْنَ وَادِيًا: اور نہیں قطع کرتے یہ کسی وادی کو، اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ: مگر یہ عمل بھی ان کے لیے لکھا جاتا ہے، لِيَجْزِيَهُمُ اللهُ: تاکہ اللہ تعالیٰ انہیں بدلہ دے اَحْسَنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ: جو کچھ یہ کرتے ہیں ان میں سے بہترین اعمال کا، تاکہ اللہ تعالیٰ ان کو ان کے بہترین اعمال کا بدلہ دے، یا اچھا بدلہ دے ان اعمال کا جو یہ کرتے ہیں۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

ماقبل سے ربط

پیچھے منافقین کی مذمت کی گئی، اگلی آیات کے اندر مؤمنین کو اُن کا منصب یاد دلایا گیا ہے، اور ایمان کے تقاضے یاد دِلائے گئے ہیں، حاصل ان آیات کا یہی ہے کہ مؤمنین کو کیسا ہونا چاہیے؟ ایمان لانے کا کیا مطلب ہے؟ ایمان لانے کے بعد انسان کے اُوپر کیا ذمہ داری عائد ہوتی ہے؟ اگلی آیات کے اندر مؤمن کے منصب کو واضح کیا گیا ہے، جس میں مؤمن کی فضیلت بھی ہے، اور اچھے انجام کی نشاندہی بھی ہے۔

''اِیمان باللہ'' اللہ کے ساتھ سودا ہے!

سب سے پہلے تو اللہ نے یہ ذکر فرمایا کہ جو شخص ایمان لاتا ہے، وہ اللہ کے ساتھ ایک سودا کرتا ہے، یہ بھی ایک قسم کی بیع وشراء ہے، جس وقت آپ کسی کے ساتھ کوئی سودا کیا کرتے ہیں، تو اس میں آپ جانتے ہیں سودے کے مکمل ہونے کے لیے چار چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے، ایک بائع ہوتا ہے اور ایک مشتری، ایک جو بیچتا ہے اور دوسرا جو خریدتا ہے، اور ایک وہ چیز جو بیچی

جائے، اور ایک وہ چیز جو اس کے بدلے میں دی جائے یعنی مبیع اور ثمن، یہ چار چیزیں ہوں تو بیع والا معاملہ مکمل ہوتا ہے، بائع مشتری مبیع اور ثمن، اور جس وقت آپ بیع کر لیں تو اس کا اثر کیا پڑتا ہے؟ جس وقت آپ اپنی چیز کسی کے ہاتھ بیچ دیں اور دوسرا اس کو خرید لے، بعتُ اور اشتریتُ ہو گیا، تو اس کے بعد کیا ذمہ داری آیا کرتی ہے؟ کہ جو چیز آپ نے بیچ دی وہ آپ اپنے پاس نہیں رکھ سکتے، اس پر اب آپ کا تصرف نہیں چلے گا، اب اس کے اوپر مشتری کا تصرف چلے گا، وہ جو چاہے اُس میں تصرف کرے، آپ اس میں تصرف نہیں کر سکتے، اب آپ کا اس کے اوپر کوئی زور نہیں، ہاں البتہ اس کے بدل میں آپ قیمت کے حق دار ہیں، مشتری کے ذمے ہے کہ قیمت چکا دے، قیمت دینا مشتری کے ذمے ہے۔ تو یہ ایک ایسی حقیقت ہے، کہ جس کو ہر عالم جاہل، پڑھا لکھا، اَن پڑھ، مؤمن کافر سب جانتے ہیں، کہ جب کوئی چیز بیچ دی جائے پھر اُس چیز کے اوپر اپنا اختیار نہیں ہوا کرتا، پھر اُس کے اندر اختیار اُسی کا ہوتا ہے جس نے وہ چیز خرید لی، ہاں البتہ بیچنے والے کو قیمت ملے گی۔ تو اب یہ جو تم ایمان لاتے ہو تو ایمان لانے کے ساتھ تم بھی اللہ کے ساتھ ایک سودا کرتے ہو، اپنی اس حیثیت کو یاد رکھو! سودا کیا کیا؟ کہ تم نے جان اور مال اللہ کے سپرد کر دیا، اور اللہ نے مقابلے میں جنت دینے کا وعدہ کر لیا، تو جو شخص ایمان لاتا ہے، اٰمَنْتُ بِاللهِ کہہ دیتا ہے، تو گویا کہ اُس نے بیع اور شراء کر لی، ایجاب اور قبول ہو گیا، جب ایجاب وقبول ہو گیا تو اب تو ایمان لانے کا مطلب ہی یہی ہے کہ نہ جان تمہاری رہی نہ مال تمہارے رہے، یہ تو اللہ تعالیٰ کی ایک مہربانی ہے اور مہربانی کی حد ہے کہ جان دی بھی اُسی نے، مال بھی اُسی نے دیا، اور ہمارے ہاتھ میں دینے کے بعد پھر کہتا ہے کہ آؤ، میرے ساتھ سودا کر لو، یہ چیز میرے پاس بیچ دو، دی ہوئی اُسی کی ہے، اور جب وہ چاہے لے لے، ہمارا اس میں کیا زور ہے، لیکن یہ اُس کی عنایت ہے کہ ہماری طرف اُس کی نسبت کر دی کہ یہ جان تمہاری ہے، یہ مال تمہارا ہے، آؤ! اب میرے ساتھ سودا کر لو، اب اگر سودا کر لو گے تو میں تمہیں مقابلے میں جنت دوں گا، یہ جان اور مال مجھے دے دو، اور ہم نے کہہ دیا: اٰمَنْتُ بِاللهِ ہم اللہ پہ ایمان لے آئے، ''لا اِلٰہ اِلّا اللہ محمد رسول اللہ''، محمد رسول اللہ ﷺ کی وساطت سے ہم نے یہ سودا کر لیا، بس اتنی سی بات ہے۔

اللہ سے سودا کرنے کے بعد مال وجان میں ہم اپنی مرضی سے تصرف نہیں کر سکتے

جب یہ سودا ہو گیا تو پھر تم یہ سوچو کہ جان اور مال تو تم نے دے دیے، اور مقابلے میں تم نے جنت لینی ہے، اب جنت تو مانگو، اللہ سے اپنے مال کی قیمت تو مانگو، لیکن مال اللہ کے سپرد نہ کرو تو یہ کہاں کی عقل مندی ہے؟ لیکن اس مال اور جان کو اللہ کے سپرد کرنے کا کیا مطلب؟ یہ نہیں، کہ ایمان لاتے ہی خودکشی کر لو، اور سارا مال نکال کے گھر سے باہر پھینک دو، اللہ کے سپرد کرنے کا یہ مطلب نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ سے صرف یہ چاہتا ہے کہ ایمان لانے کے بعد تم اپنی جان اور اپنے مال کو اپنا نہ سمجھو، یہ کہو کہ یہ اللہ کا ہے، اس لیے ہم اپنی جان میں اپنے مال میں اپنی مرضی کے مطابق اب تصرف نہیں کریں گے، اللہ تعالیٰ کے ہم امانت دار ہیں جیسے وہ کہتا جائے گا ہم اپنی جان کو صرف کریں گے، جیسے وہ کہتا جائے گا ہم اپنے مال کو صرف کریں گے، بس اتنی سی بات ہے۔ تو اگر تم اللہ کے احکام کے مطابق اپنی جان اور اپنے مال کو صرف کرو گے تو تم نے جان اور مال اللہ کے سپرد کر دیا، جب اللہ کے سپرد کر دیا تو

اللہ کی طرف سے جنت کا وعدہ ہے، اللہ بھی قیمت دے گا، اور اگر کوئی موقع آجائے جان کو خرچ کرنے کا اور تم جان کو بچانے لگ جاؤ، اللہ کے حکم کے مطابق میدان میں نہ اترو، اور کبھی مال خرچ کرنے کے لئے اللہ کہہ دے کہ میرا مال جو تمہارے پاس ہے، میرا دیا ہوا جو تمہارے پاس ہے، (کیونکہ اب تو وہ اللہ کا ہو گیا) میرا مال جو تمہارے پاس ہے اس میں سے اتنا وہاں خرچ کرو، اور تم خیانت کرنے لگ جاؤ اور وہاں خرچ نہ کرو، تو تمہارا مقام وہی ہوا، کہ چیز بیچ بھی دی، دوسرے کی قرار بھی دے دی، لیکن اب اس کی مرضی کے مطابق صرف نہیں کرتے، جب صرف نہیں کرتے تو پھر اللہ کی طرف سے تم قیمت وصول کرنے کے بھی حق دار نہیں، اس لیے مؤمن کو اپنا یہ منصب یاد رکھنا چاہیے۔

اللہ سے سودا کرنے میں فائدہ ہی فائدہ

اور اس منصب کے اندر کامیابی کس نے حاصل کی؟ سودے کے اندر دونوں احتمال ہوتے ہیں، بیچنے والا خسارے میں رہ گیا، کہ اس نے قیمتی چیز دے دی لیکن قیمت کم وصول ہوئی، اس صورت میں بیچنے والا خسارے میں ہوتا ہے، اور کبھی خریدار خسارے میں ہوتا ہے، کہ تھوڑی قیمت کی چیز تھی لیکن اس نے زیادہ قیمت میں خرید لی، دنیا کے اندر جب بھی کوئی سودا کیا جائے تو احتمال دونوں طرف ہوتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ مؤمنو! یہ سودا تمہارے لیے نفع کا ہے، تمہیں تو اس سودے پر خوش ہوجانا چاہیے، اس میں غم کی کون سی بات ہے؟ ایک ایسی چیز تم نے دی، کہ اوّل تو دی ہوئی اسی کی ہے:

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی　　　حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا
(غالبؔ)

ایک تو دیا ہوا اسی کا ہے، ہم جس وقت دُنیا میں آئے تھے ننگ دھڑنگ تھے، پاس کچھ بھی نہیں تھا، نہ کوئی مال نہ کوئی دولت، نہ کوئی قوت نہ کوئی طاقت، جو کچھ دیا اسی نے دیا، وجود اُسی نے دیا، عقل اسی نے دی، صلاحیتیں ساری کی ساری اُسی نے دیں۔ تو اوّل تو دی ہوئی بھی اُسی کی ہے، ساری کی ساری عنایت بھی اُسی کی ہے، پھر یہ فانی چیز ہے کہ اگر یوں سپرد نہیں کرو گے تو آخر یہ چلی تو جانی ہے، نہ مال پاس رہنے کی چیز ہے نہ جان پاس رہنے کی چیز ہے، یہ تو یوں سمجھو جس طرح سے آپ برف کی ایک سِل لے آئے، اُس کو بیچنے کے لیے آپ بازار میں بیٹھ جائیں، جتنی جلدی اس کو بیچ دو گے اتنے نفع میں رہ جاؤ گے، ورنہ جتنی دیر کرو گے وہ پگھل جائے گی، جب پگھل جائے گی تو تمہارے پلے کچھ بھی نہیں رہے گا، تو یہ زندگی تو برف کی طرح ایک پگھلنے والی چیز ہے، اور مال بھی برف کی طرح بہنے والی چیز ہے، اس کو تو جتنی جلدی بیچ کے پیسے کھرے کرلو گے اتنا ہی اچھا ہے، ورنہ اگر دیر کرو گے تو دیر کرنے کے ساتھ یہ زائل تو ہو ہی جائے گی، تو اس قسم کی فانی چیز دے کے تم نے باقی چیز خرید لی، یہ تم نے بہت بڑی کامیابی حاصل کرلی، کبھی یہ خیال نہ آئے، کہ ہم اللہ کے ساتھ معاہدہ کر کے کہاں پھنس گئے، کبھی حکم آگیا کہ زکوٰۃ دے دو، کبھی حکم آگیا کہ صدقۃ الفطر دے دو، کبھی حکم آگیا کہ قربانی دے دو، کبھی حکم آگیا کہ جہاد کے لیے چلو، یہ ہم معاہدہ کر کے کہاں پھنس گئے، اس قسم کا

خیال تمہارے دل میں نہیں آنا چاہیے، یہ تو تم نے اللہ کے ساتھ بہت کامیابی کا سودا کیا ہے، کہ ایک عارضی سی چیز دے کے دائمی نعمتیں حاصل کر رہے ہو۔

ایک شبہ کا جواب

ہاں! البتہ اس میں اگر کوئی شوشہ چھوڑ سکتا ہے، کوئی شبہ پیدا کر سکتا ہے، تو یہی کر سکتا ہے کہ مال تو ہم نقد چکا رہے ہیں اور قیمت اُدھار ہے، اس میں بسا اوقات کوئی آدمی سوچ سکتا ہے، کہ قیمت تو اُدھار ہے اور مال نقد دیا جا رہا ہے، تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس کو ایسا نہ سمجھو کہ اگر تم نے اُدھار کا سودا کر لیا تو وہ وعدہ سے پھر جائے گا، اور مشتری تمہارے پیسے دبا لے گا، ایسی بات نہیں ہے، ایک بات تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے زیادہ عہد کو وفا کرنے والا کوئی نہیں، دوسری بات یہ ہے کہ اللہ کا یہ عہد اتنا پختہ عہد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی تحریر تو راۃ میں بھی دے دی، انجیل میں بھی دے دی اور قرآن میں بھی دے دی، تین کتابوں کے اندر تو اس کی تحریر دے دی، کہ جو اس طرح سے میرے سپرد کرے گا میں اُس کو جنت دُوں گا، تحریر بھی وہ دیے بیٹھا ہے، سب سے زیادہ باوفا بھی وہ ہے، تو اس قسم کا اُدھار تو نقد سے بھی بہتر ہوتا ہے، اس لیے اس کو اُدھار سمجھ کے بھی ایسا نہ کیجو، بہرحال ہر پہلو سے یہ سودا تمہارے لیے مفید ہے، تمہیں چاہیے کہ جہاں اللہ کا حکم آ جائے نہ جان کی پروا کرو نہ مال کی پروا کرو، کیونکہ ایمان لانے کا مطلب ہی یہ ہے کہ تم یہ چیزیں اللہ کے سپرد کر بیٹھے۔ پہلی آیت کے اندر تو یہ منصب ذکر کیا ہے، اس کے بعد پھر مؤمنین کی صفات ذکر کی ہیں کہ مؤمنین کو کیسا ہونا چاہیے، مؤمنوں کے اندر کیسی کیسی صفتیں پائی جانی چاہئیں۔

اللہ سے سودا کرنے کا مطلب، مؤمن ہر حال میں کامیاب، اللہ کی کمالِ وعدہ وفائی

پہلی آیت کا مفہوم دیکھ لیجئے اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ: بے شک اللہ تعالیٰ نے خرید لیا ہے مؤمنین سے، خریدنے والا اللہ ہے، اور مؤمنین سے خریدا ہے، گویا کہ بیچنے والے مؤمن ہیں۔ ''خرید لیا اُن کی جانوں کو اور اُن کے مالوں کو اس بات کے بدلے کہ اُن کے لیے جنت ہے'' تو ثمن جنت ٹھہری، اب یہ مؤمن جو اللہ سے سودا کر لیتے ہیں، ''یہ اللہ کے راستے میں لڑتے ہیں'' یہ لڑنا جان سپرد کرنے والی بات ہے، کہ جہاں جہاد کا موقع آیا تلوار اُٹھائی اور اللہ کے راستے میں نکل گئے، فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ: پھر دونوں ہی صورتیں ہیں، بہرحال تم نے اپنے معاہدے کو پورا کر دیا، چاہے دشمن کو مار کے آ جاؤ چاہے مر جاؤ، یہ نہ خیال کرنا کہ اگر مار دیا تو کامیاب ہیں، اور اگر مر گئے تو ہم فیل ہو گئے نہیں! فیل ہونے والی یہاں کوئی بات نہیں، اللہ کے نام پہ ایک دفعہ نکل آ ؤ پھر ''مریں تو شہید اور ماریں تو غازی'' دونوں صورتوں میں کامیاب ہو، تم نے اپنے معاہدے کو پورا کر دیا، پھر تمہارے ذمہ یہ نہیں کہ دوسرے کو قتل ہی کر کے آ ؤ تو ہم سمجھیں گے کہ تم کامیاب ہو، نہیں، قتل ہو کے آ جاؤ یا قتل کر کے آ جاؤ، دونوں صورتوں میں اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ تم نے اپنے وعدہ پورا کر دیا۔ فَيَقْتُلُوْنَ: پھر قتل کرتے ہیں، وَيُقْتَلُوْنَ: اور قتل کیے جاتے ہیں، دونوں صورتیں ہو سکتی ہیں۔ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا: اللہ تعالیٰ نے سچا وعدہ کیا ہے، یہ سچا وعدہ اللہ کے ذمے ہے تو راۃ میں اور انجیل میں اور قرآن میں، یعنی اس کا ذکر قرآن میں بھی ہے، انجیل میں بھی ہے، اور تو راۃ میں بھی ہے، تینوں کتابوں کے اندر اللہ نے اپنے اس وعدے کی تحریر دے دی۔ وَمَنْ اَوْفٰى

بِعَهْدِهٖ مِنَ اللهِ: اللہ سے زیادہ عہد کو پورا کرنے والا کون ہے؟ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِيْ بَايَعْتُمْ بِهٖ: اے ایمان والو خوش ہو جاؤ اس سودے پر جو تم نے اللہ کے ساتھ کر لیا، ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ: یہ تو بہت بڑی کامیابی تم نے حاصل کر لی، کہ ایک فانی چیز دے کے باقی چیز حاصل کر لو گے، چند روزہ زندگی اللہ کے راستے میں خرچ کر کے ہمیشہ کے لیے راحت حاصل کر لو گے، یہ تو بہت بڑی کامیابی ہے۔

مؤمنین کی صفات

اَلتَّآئِبُوْنَ: مؤمن توبہ کرنے والے ہوتے ہیں، توبہ کا معنی اللہ کی طرف رجوع کرنے والے، کہ اس زندگی کے اندر چلتے ہوئے ٹھوکریں لگتی ہیں، اس میں کوئی شک نہیں، جس وقت انسان اس دنیا کے اندر اپنی زندگی گزارتا ہے، وقت گزارتا ہے تو قدم پھسلتا ہے، ٹھوکریں لگتی ہیں، لیکن ایمان کا تقاضا ہے کہ ٹھوکر لگے تو انسان سنبھل جائے، جہاں قدم پھسلے جلدی سے اپنے آپ کو سنبھال لے، اللہ کی طرف متوجہ ہو جائے، یہ مطالبہ قطعاً نہیں کہ تم سے کوئی گناہ نہ ہو، اور اگر تم سے کوئی گناہ ہو گیا تو تم ایمان سے ہی خالی ہو گئے، تمہارے ایمان کا کوئی اعتبار نہیں، ایسی بات نہیں ہے، اللہ تعالیٰ نے توبہ کا دروازہ کھلا رکھا ہے، مؤمن کا کام یہ ہے کہ اگر اپنی زندگی کے اندر کہیں لغزش کھا جاتا ہے، کہیں اُس کو ٹھوکر لگ جاتی ہے، کبھی کسی وجہ سے، اپنی نفسانی شہوات سے متاثر ہو کر، ماحول سے متاثر ہو کر، کوئی فرضی سی مجبوری سمجھ کر اگر وہ کبھی اللہ کے حکم کے خلاف کر بیٹھتا ہے تو وہ بغاوت پہ جم نہیں جاتا، بلکہ اس کو جس وقت تنبہ ہوتا ہے، اپنی بات اس کو یاد آ جاتی ہے، کہ میرا تو اللہ پہ ایمان ہے تو فوراً اللہ کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے، یہ مؤمن کا کام ہے، گویا کہ ایمان کے بعد پہلا قدم توبہ ہے، کہ اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ رہو، جہاں کوئی غلطی ہوئی، جہاں کوئی لغزش ہوئی تو فوراً اللہ کے سامنے ہاتھ باندھ لو، جیسے کہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ ''كُلُّ بَنِيْ اٰدَمَ خَطَّاءٌ'' کہ آدم کے جتنے بچے ہیں سب خطا کار ہیں، غلطی سب سے ہوتی ہے، ''وَخَيْرُ الْخَطَّائِيْنَ التَّوَّابُوْنَ''(۱) لیکن ان خطا کاروں میں بہتر وہ لوگ ہیں جو توبہ کرنے والے ہیں، جو خطا ہو جانے کے بعد اللہ کی طرف متوجہ ہو جائیں، اللہ کے سامنے توبہ کر لیں یہ سب سے بہتر ہیں، خطا تو سارے ہی کرتے ہیں۔
اَلْعٰبِدُوْنَ: عبادت کرنے والے ہیں، بندے بن کے رہنے والے ہیں، ہر وقت اللہ کی عبادت کو مدنظر رکھتے ہیں اَلْحٰمِدُوْنَ: اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے والے ہیں، اللہ کی نعمتوں کا احساس کرتے ہیں، حمد کا مفہوم یہی ہوتا ہے کہ اللہ کی نعمتوں کا احساس کیا جائے، اور نعمتوں کا احساس کر کے اللہ تعالیٰ کی طرف اس کی نسبت کی جائے، کہ یہ اللہ کی دی ہوئی ہے، اور اس کو منعم سمجھتے ہوئے اس کی اطاعت کی جائے۔ اَلسَّآئِحُوْنَ: اس کا مفہوم پہلے میں نے آپ کی خدمت میں عرض کر دیا، اس کا معنی ہے بے تعلق رہنے والے، روزہ رکھنے والے، یا تعلقات کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اللہ کے راستے میں نکلنے والے، جس کے اندر جہاد بھی آ سکتا ہے، طلبِ علم بھی آ سکتا ہے، اللہ کے راستے میں ہجرت بھی آ سکتی ہے، سارے مفہوم اس میں شامل ہیں۔ اَلرّٰكِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ یہ دونوں لفظ بول کر نماز مراد ہوتی ہے، کبھی اللہ کے سامنے رکوع کرتے ہیں کبھی سجدہ کرتے ہیں، رکوع کرنے والے ہیں سجدہ کرنے والے ہیں، وَالْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ: اور پھر یہی نہیں کہ خود نیکی کرتے ہیں، بلکہ نیکی کو پھیلانے کا جذبہ رکھتے ہیں، معروف کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے

(۱) ابن ماجہ ص ۳۱۳ باب ذکر التوبۃ/ ترمذی ۲/ ۷۶/ مشکوٰۃ ۱/ ۲۰۴ باب الاستغفار فصل ثانی۔

روکنے والے ہیں، اور آخری بات ایک جامع ہے کہ اللہ کے ضابطوں کی رعایت رکھنے والے ہیں وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ: اللہ کی حدود کی حفاظت کرنے والے ہیں، جو ضابطے اللہ نے بنادیئے اُن کی نگرانی کرتے ہیں، اُن کی خلاف ورزی نہیں کرتے، اللہ کی کسی حد کو پھلانگتے نہیں، یہ مؤمن ہیں جو اس قسم کا کام کرنے والے ہیں، وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ: ان مؤمنین کو بشارت دے دیجئے اچھے انجام کی، اچھا انجام انہی کے سامنے آنے والا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں کسی سے دوستی نہ رکھنے کا حکم

اگلی آیت کا حاصل بھی منصبِ ایمان کی یاددہانی ہی ہے، کہ جس وقت تم اللہ پہ ایمان لے آئے، جان مال سب کچھ اللہ کے ہاتھ میں بیچ دیا، تو اب وہ لوگ جو مشرک ہیں، جو اللہ کے ساتھ اس قسم کا سودا نہیں کرتے، اُن کے ساتھ تمہارا کوئی محبت کا تعلق باقی نہیں رہنا چاہیے، جس طرح سے پہلے براءت کا اعلان کردیا، اور اس سورت کی مختلف آیات کے اندر ذکر کیا گیا ہے کہ اگر اللہ کے مقابلے میں ان سے محبت زیادہ رکھو گے، تو پھر اللہ کے حکم کا انتظار کرو، اللہ کی طرف سے عذاب آئے گا۔ اور ایک آیت میں یہ بھی آیا تھا کہ اگر تمہارے والدین اور رشتہ دار اِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى الْاِيْمَانِ: اگر یہ ایمان کے مقابلے میں کُفر کو پسند کرتے ہیں تو تم اُن سے دوستی نہ لگاؤ۔ تو نہ زندگی کے اندر ان کے ساتھ دوستی لگانے کی اجازت، اور نہ مرنے کے بعد ان کے ساتھ کوئی ہمدردی رکھنے کی اجازت ہے، اگلی آیت کا حاصل یہ ہے، کہ زندگی میں بھی ان کے ساتھ محبت کا تعلق نہ رکھو اور ان کے ساتھ دوستی نہ لگاؤ، اور مرنے کے بعد بھی ان کے ساتھ کسی قسم کی ہمدردی نہ رکھو، اور اگر کوئی مشرک رشتہ دار مرجائے تو اُس کے لیے دُعا اور اِستغفار بھی جائز نہیں ہے۔

شانِ نزول

اس آیت کے شانِ نزول میں لکھا ہوا ہے، کہ ابوطالب جس وقت بیمار ہوئے اور آثار اس قسم کے ہوئے کہ اب ان کا انتقال ہوجائے گا، تو یہ ابوطالب ایک ایسا شخص ہے کہ جس نے ساری زندگی سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہمدردی کی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم آٹھ سال کے تھے جس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جدّ اَمجد عبدالمطلب فوت ہوگئے، تو اُس کے بعد آپ کی سرپرستی ابوطالب نے کی ہے، بچوں کی طرح پالا، اولاد کی طرح رکھا، شادی اپنی سرپرستی میں کی، کاروبار اپنی سرپرستی میں کروایا، اور جس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوّت کا اظہار کیا ہے، تو اُس کے بعد کُفّار نے جہاں بھی آپ کی مخالفت کی، ابوطالب ہمیشہ آپ کے ساتھ رہے، حتّٰی کہ جس وقت انہوں نے مقاطعہ کردیا تھا، بائیکاٹ کردیا تھا، شعبِ ابی طالب کے اندر یہ لوگ محصور ہوکے رہ گئے تھے، اُس وقت بھی ابوطالب ساتھ ہی رہے ہیں، ساری برادری سے کٹے، ساری برادری سے ٹکرائے، پریشانیاں اُٹھائیں، لیکن بھتیجے کو نہیں چھوڑا، لیکن قسمت کی بات ہے کہ مسلمان نہیں ہوا، اولاد مسلمان ہوگئی، حضرت علی رضی اللہ عنہ مسلمان ہوگئے، جعفر رضی اللہ عنہ مسلمان ہوئے، عقیل رضی اللہ عنہ مسلمان ہوئے، البتہ بڑا لڑکا جو تھا "طالب"، اُس کا اِنتقال کُفر پہ ہوا ہے، اُسی کی وجہ سے ان کی کنیت "ابوطالب" ہے، ویسے ان کا نام "عبدمناف" ہے، بڑے لڑکے کا نام "طالب" تھا، اس کی بنا پر ان کی کنیت "ابوطالب" تھی، اور دُوسرے تین بچے جعفر، عقیل،

علی ﷺ، یہ تینوں مسلمان ہوئے ہیں اور تینوں صحابی ہیں، اور خود یہ لوگوں کو کہتے رہے کہ یہ اچھا دین ہے اس کو قبول کرو، لیکن خود کلمہ نہیں پڑھا، اب یہ ایک آخری وقت تھا اگر یہ وقت بھی ٹل گیا تو اس کے بعد کیا گنجائش تھی، اس لیے سرورِ کائنات ﷺ کو اِنتہائی درجے کی فکر تھی، کہ اگر اب اس نے کلمہ نہ پڑھا اور کُفر پہ موت آ گئی، تو میں آگے کچھ نہیں کر سکوں گا، اللہ کی رحمت کے دروازے بند ہو جائیں گے۔ تو وہاں بیٹھے ہیں، ترغیب دے رہے ہیں کہ اے چچا! ایک دفعہ کلمہ پڑھ دے، تو ہونٹ ہلا دے، میں تیرے ہونٹوں کو اس کلمے کے ساتھ ہلتا ہوا دیکھ لوں، تو میں اس کلمے کی وجہ سے تیری مغفرت کے لیے اللہ تعالیٰ سے جھگڑا کر لوں گا، وہاں تیری سفارش کروں گا، تو ایک دفعہ کلمہ پڑھ دے،[۱] اور اس مجلس کے اندر ابوجہل وغیرہ بھی بیٹھے تھے، یہ مکی زندگی کی بات ہے، چونکہ ابوطالب بنوہاشم کے معزّز خاندان میں سے تھے، تو دُوسرے لوگ بھی عیادت کے لیے آئے بیٹھے تھے، وہ دوسری طرف زور لگا رہے تھے، کہ دیکھو ابوطالب! کہیں جاتے ہوئے اپنے باپ کا طریقہ نہ چھوڑ دینا، کہیں عبدالمطلب کے طریقے کو نہ چھوڑ جائیو! اس قسم کی کشاکشی کی باتیں دونوں طرف سے جاری تھیں، اسی حال میں آخروقت آ گیا، تو ابوطالب نے آخری آخری بات جو حضور ﷺ سے کہی، وہ یہ کہی کہ بھتیجے! میں یہ کلمہ پڑھ کے تیرا دل ٹھنڈا کر دیتا، لیکن میں یہ خیال کرتا ہوں، مجھے اس بات سے شرم آتی ہے، کہ قریش کی عورتیں کہیں گی کہ جہنم سے ڈر کے بھتیجے کا کلمہ پڑھ گیا![۲] گویا کہ ''اِخْتَرْتُ النَّارَ عَلَی الْعَارِ'' میں عار برداشت نہیں کر سکتا، جہنم کی آگ برداشت کر سکتا ہوں، اور آخر آخر میں جو اعلان کیا وہ یہی تھا ''عَلٰی مِلَّةِ عَبْدِالْمُطَّلِبِ''[۳] میں تو عبدالمطلب کے طریقے پہ ہوں، میں تو اسی طریقے پہ جاؤں گا، یہ اُس نے آخری فیصلہ سُنا دیا، یعنی بدبختی کی بات ہے، کہ صرف اتنی سی بات پر کہ عورتیں کہیں گی کہ ''لو! آخروقت میں ابوطالب ڈر گیا'' تو یہ عار دِلانے والی بات میں نہیں سُن سکتا، تو میں عار کے مقابلے میں نار برداشت کر لوں گا، اور میں تو اپنے باپ کے طریقے پر ہی جا رہا ہوں۔ جب یہ بات ہوئی تو حضور ﷺ وہاں سے روتے ہوئے اُٹھے ہیں، اور یہ کہتے ہوئے کہ اچھا! مجھ سے جو کچھ ہو سکے گا میں تیرے لیے دُعا کروں گا، تیرے لیے اِستغفار کروں گا، آپ ﷺ مایوس ہو کے اس مجلس سے اُٹھ کے آ گئے، اور ابوطالب کا انتقال اسی طرح سے ہوا۔ روایات میں آتا ہے کہ حضرت علی ﷺ نے جا کر حضور ﷺ کو اطلاع دی ''اِنَّ عَمَّكَ الضَّالَّ قَدْ مَاتَ'' آپ کا گمراہ چچا مر گیا! تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ جاؤ، اس کو کہیں دفن کر دو، دبا دو،[۴] تو سُنّت کی رعایت کیے بغیر ان کو وہیں دفن کیا گیا ہے جو قریش کا پُرانا قبرستان تھا، جنّت المعلیٰ کے اندر وہ پُرانا حصّہ، آج کل اس کو مقفل کر دیا گیا ہے، لوگوں کو وہاں زیادہ جانے نہیں دیتے، حضرت خدیجہ ﷺ کی قبر بھی اُدھر ہی ہے، حضور ﷺ کی اولاد جو

---

(۱) بخاری ۱/۵۴۸ باب قصة ابی طالب. وغیرہ. ولفظه: أَیْ عَمِّ قُلْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ كَلِمَةً أُحَاجُّ لَكَ بِهَا عِنْدَ اللّٰهِ.

(۲) لَوْلَا أَنْ تُعَيِّرَنِي قُرَيْشٌ يَقُولُونَ إِنَّمَا حَمَلَهُ عَلٰی ذٰلِكَ الْجَزَعُ لَأَقْرَرْتُ بِهَا عَيْنَكَ. (مسلم ۱/۴۰، باب الدلیل علی صحة اسلام الخ) اور الایمان لابن منده رقم ۳۸، وغیرہ میں الفاظ ہیں: لَوْلَا أَنْ تُعَيِّرَنِي نِسَاءُ قُرَيْشٍ تَقُولُ: إِنَّهُ حَمَلَهُ الخ۔ مظہری میں بھی یہی الفاظ ہیں۔

(۳) بخاری ۱/۵۴۸، باب قصة ابی طالب. حَتّٰی قَالَ آخِرَ شَيْءٍ كَلَّمَهُمْ بِهِ عَلٰی مِلَّةِ عَبْدِالْمُطَّلِبِ فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ لَأَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ مَا لَمْ أُنْهَ عَنْهُ فَنَزَلَتْ مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ الخ.

(۴) ابو داؤد ۲/۱۰۲، کتاب الجنائز. باب الرجل یموت له قرابة مشرك. عَنْ عَلِيٍّ قَالَ قُلْتُ لِلنَّبِيِّ ﷺ إِنَّ عَمَّكَ الشَّيْخَ الضَّالَّ قَدْ مَاتَ. قَالَ: اذْهَبْ فَوَارِ أَبَاكَ.

مکہ معظمہ میں فوت ہوگئی تھی اُن کی قبریں بھی وہیں ہیں، اور ابوطالب کی قبر بھی وہیں ہے، وہ نشان اب بھی ہے، اور چاردیواری کر کے لوہے کا پھاٹک لگا کے اس کو مقفل کر دیا ہے، پھاٹک میں سے تو وہ قبریں نظر آتی ہیں، اور آگے وہ جانے نہیں دیتے۔ بہرحال آپ ﷺ نے فرمایا کہ جاؤ، اس کو کہیں چھپا آؤ، مٹی میں دفن کر آؤ، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کو دفن کیا، جو طریقہ مسلمانوں کے درمیان تھا اس کو نہیں اپنایا گیا، بلکہ پُرانے رواج کے مطابق اس کو دفن کر دیا گیا۔ تو حضور ﷺ کی تسلی کے لیے وہ آیات اُتری تھیں جو دوسری سورت میں ہیں: اِنَّكَ لَا تَهْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ (سورۂ قصص:۵۶) کہ غم کرنے کی کیا بات ہے، ہدایت آپ کے اختیار میں تو ہے نہیں، جس کو اللہ مناسب سمجھتا ہے اسے ہدایت دیتا ہے، اور اِس آیت کے اندر ممانعت کر دی گئی، کہ ان کے لیے اِستغفار کرنے کی بھی اجازت نہیں، تو ان آیات کا شانِ نزول ابوطالب کے متعلق ہے، لیکن عام ضابطے کے طور پر تمام مؤمنین کو ہدایت دے دی گئی، کہ اگر کسی کا کوئی مشرک رشتہ دار فوت ہو جائے تو اس کے لیے اِستغفار اور دُعا کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

اہلِ سُنّت کے نزدیک ابوطالب کے بارے میں نظریہ

تو حدیث شریف میں آتا ہے، کہ لوگوں نے پوچھا: یارسول اللہ! ابوطالب نے زندگی بھر آپ کے ساتھ بڑی ہمدردی کی، تو کیا یہ ہمدردی اس کے کام آئے گی، اس کو کوئی فائدہ ہوگا؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ہاں! اگر میں نہ ہوتا تو وہ جہنم کے نچلے گڑھے میں ہوتا، جس طرح سے عام مشرک ہوں گے، لیکن چونکہ اُس نے میرے ساتھ ہمدردی کے ساتھ وقت گزارا ہے، تو اب وہ جہنم سے نکلے گا تو نہیں (حاصل اس روایت کا یہ ہے کہ) جہنم سے نکلے گا تو نہیں، کیونکہ کافر جہنم سے نکل نہیں سکتا، لیکن "اَهْوَنُ اَهْلِ النَّارِ"[1] تمام جہنم والوں سے ہلکا عذاب اُس کو ہوگا۔ تو وہ صرف ٹخنوں تک جہنم میں ہوگا، اور باقی بدن اس کا آگ سے بچا ہوا ہوگا، اتنا ہلکا عذاب اس کو ہوگا، رہے گا جہنم کی چاردیواری میں، باہر نہیں نکل سکتا، ٹخنوں تک آگ میں ہوگا، یا ایک روایت میں ہے کہ اس کو آگ کے جُوتے پہنائے جائیں گے، لیکن ساتھ یہ لفظ بھی ہے کہ آگ کے ان جُوتوں کی وجہ سے اس کا دِماغ اس طرح سے کھولے گا کہ جس طرح سے ہانڈی پکتی ہے، اور وہ سمجھے گا کہ میرے سے زیادہ سخت سزا کسی کو نہیں مل رہی، لیکن ہوگا وہ "اَهْوَنُ اَهْلِ النَّارِ" تمام جہنم والوں میں سے ہلکا ہوگا ازروئے عذاب کے۔ اہلِ سُنّت والجماعت کا مسلک یہی ہے کہ ابوطالب کا انتقال کُفر پہ ہوا ہے، وہ جہنمی ہے، صحیح روایت کے اندر اس کا ذِکر آیا ہوا ہے، ایمان اس کو نصیب نہیں ہوا، ہمدردیاں اس کی اپنی جگہ رہیں، ان ہمدردیوں کی وجہ سے ہی اس کو اَہون عذاب ہوگا، کیونکہ اُس نے دِین کی مخالفت نہیں کی، حضور ﷺ کو تکلیف نہیں پہنچائی، مؤمنوں کے ساتھ بُرے رویے سے پیش نہیں آیا، تو حضور ﷺ کے ساتھ نہ ہونے کی وجہ سے جو عذاب میں سختی آنی تھی وہ سختی ختم ہوگئی، رہے گا جہنم میں۔ البتہ شیعہ اس کو مؤمن ثابت کرتے ہیں اور مؤمن قرار دے کر انہوں نے اُن کی قبروں پہ جا کے ماتم وغیرہ کی گڑبڑ کرنی شروع کر دی تھی، جس کی بنا پر حکومت نے وہاں آمدرفت بند کر دی، اِن کے نزدیک وہ مؤمن ہے، جبکہ صحیح روایت کے اندر اُس کے کُفر کا ذکر آیا ہوا ہے، اور ان آیات کے شانِ نزول میں مفسرین نے یہ ساری باتیں نقل کی ہیں جو آپ کی خدمت میں عرض کر رہا ہوں۔

---

(۱) دیکھئے: مسلم ۱/ ۱۱۵ باب شفاعة النبی لابی طالب/ مشکوٰۃ ۲/ ۵۰۲ باب صفة النار۔

سوال:۔شعب ابی طالب کی وجہ تسمیہ کیا ہے؟

جواب:۔''شعب'' گھاٹی کو کہتے ہیں، وہاں چونکہ ان کی رہائش تھی، اس لیے وہ شعب ان کی طرف منسوب ہے۔ چونکہ وہ اس وقت اپنے خاندان کے معزز فرد تھے، اس لیے اس گھاٹی کو جہاں ان کی رہائش تھی ''شعب ابی طالب'' کہتے ہیں، یہ جبل ابی قبیس کے دامن میں ہے، اس دفعہ ہم نے جا کر تلاش کی، وہ گلی کوچے سارے دیکھے، اور جس مکان کے اندر ابوطالب رہتے تھے جہاں حضرت علی رضی اللہ عنہ پیدا ہوئے ہیں، وہ مکان ''مولدِ علی'' کے ساتھ مشہور ہے، اور اب وہاں بھی مدرسہ ہے۔ اور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا مولد جہاں آپ پیدا ہوئے تھے وہ محلہ ایک ہی معلوم ہوتا ہے، کہ عبدالمطلب کی ساری اولاد اسی محلے میں تھی، وہ وہاں سے کچھ تھوڑا سا فاصلے پر ہے، اور وہ سڑک شارع بنی ہاشم کہلاتی ہے، اور معلوم ہوتا ہے کہ اسی شارع پر ہی سارے آباد تھے، تو ''مولدِ علی'' والی جگہ پر بھی مدرسہ ہے، اور ''مولد النبی'' جہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت ہوئی تھی وہاں لائبریری ہے، کُتب خانہ ہے، وہاں مدرسہ نہیں ہے، کُتب خانے کی شکل میں ایک عمارت ہے اور وہ اس نام کے ساتھ مشہور ہے، اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا مکانِ شارع الصاغۃ یعنی سناروں کی گلی میں ہے، وہاں سناروں کی دُکانیں بہت ہیں، پہلے شارع ابنِ حجر کہلاتی تھی اب جدید نام اس کا شارع الصاغۃ ہے، وہ مکان بھی ہم نے تلاش کیا، وہ ''مولدِ فاطمہ'' کے نام سے مشہور ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد ساری وہیں پیدا ہوئی، شادی کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم وہیں رہے، وہاں بھی مدرسہ ہے، اور اس وقت یہ عمارتیں بند تھیں چونکہ حج کے ایام کی وجہ ان سب اداروں میں چھٹیاں تھیں، تو ان میں سے کوئی عمارت ہم نے کھلی ہوئی نہیں دیکھی، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت وہیں سے یعنی حضرت خدیجہ کے مکان سے ہوئی ہے۔ یہ حرم کے زیادہ قریب آجاتا ہے، اور یہ (شعبِ ابی طالب) ذرا حرم سے فاصلے پر ہے، تو یہ جگہ جبل ابوقبیس کے دامن میں ہے، تو وہ شعب یعنی پہاڑ کی گھاٹی ابوطالب کی طرف منسوب تھی، وہیں یہ محصور ہو گئے تھے، ان کے پاس نہ کوئی آتا تھا، نہ کسی کے پاس ان کو جانے کی اجازت تھی، گویا کہ محلے کے اندر ان کو قید کر دیا گیا، ان کی اپنی آبادی میں، وہ محلہ ممتاز ہے، نشاندہی انہی علامات کے ساتھ ہے۔

مشرک کے لئے اِستغفار کی ممانعت اور اس کی تفصیل

مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ: نبی کے لیے مناسب نہیں اور نہ اُن لوگوں کے لیے مناسب ہے جو ایمان لے آئے، کہ اِستغفار کریں مشرکین کے لیے، یعنی مشرکین کے ساتھ اُن کی موت کے بعد بھی کوئی ہمدردی کا عنوان باقی نہیں رہنا چاہیے، اگرچہ وہ رشتہ دار ہی ہوں، بعد اس کے کہ واضح ہو گیا کہ وہ جہنمی ہیں، کیونکہ جب موت شرک پہ ہو گئی تو یہ بات واضح ہے کہ وہ جہنمی ہیں، کسی کی موت کُفر اور شرک پہ نہ آئی ہو تو اس میں تو احتمال ہے کہ ایمان پہ خاتمہ ہو، جس طرح سے آج گناہ گار مسلمان ہیں، چاہے ہمیں پتا نہ ہو کہ انہوں نے چلتے وقت کلمہ پڑھا ہے، لیکن ظاہر یہی ہے کہ جب مؤمن تھے تو ایمان پہ خاتمہ ہوا۔ ان کے لیے دُعا اور اِستغفار کیجیے، لیکن اگر ایک آدمی کی زندگی کُفر پر گزر رہی ہے اور وفات سے پہلے اُس کا ایمان معلوم نہیں ہوا، تو ظاہر ہے کہ وہ کُفر پہ مرا ہے، جب وہ کُفر پہ مرا ہے تو بات خود واضح ہو گئی کہ جہنمی ہے، اُس کی مغفرت کا کوئی امکان نہیں، اللہ تعالیٰ نے مشرکین

کے لئے مغفرت کا دروازہ ہی بند کر دیا، تو جب یہ پتا چل جائے کہ اُس کی وفات شرک پہ ہوئی ہے تو یہ واضح ہو گیا کہ وہ جہنمیوں میں سے ہے، تَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُمْ أَصْحٰبُ الْجَحِيمِ۔

باقی یہاں ایک سوال ہوسکتا ہے، کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا باپ آزر تو مشرک تھا، جس کا ذکر قرآنِ کریم میں آیا ہے، لیکن ابراہیم علیہ السلام نے تو اُس کے لیے دُعا کی تھی وَاغْفِرْ لِأَبِي إِنَّهُ كَانَ مِنَ الضَّالِّينَ (سورۂ شعراء:۸۶) میرے باپ کو بخش دے وہ گمراہوں میں سے ہے، تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ کے لیے دُعا کی تھی، حالانکہ اُس کا انتقال شرک پہ ہوا تھا، تو یہ پھر کیسے جائز ہوا؟ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دُعا کی تھی تو اُن کے نمونے پہ چلتے ہوئے کوئی دوسرا بھی دُعا کرے تو اس کو کیوں روک دیا گیا؟ یہ ایک سوال ہوسکتا تھا، کسی کے دل کے اندر یہ وہم آ سکتا تھا، تو اللہ تعالیٰ نے یہاں وضاحت کر دی کہ ابراہیم علیہ السلام کے اِستغفار کا یہ معنیٰ نہیں کہ اُس کی وفات کے بعد اُس کے لیے اللہ سے مغفرت مانگتے رہے، اُن کی یہ دُعا اُس کی زندگی میں تھی، اور جب اُن کو پتا چل گیا کہ اُس کا انتقال بھی شرک پہ ہو گیا اور یہ بخشا نہیں جا سکتا تو ایسے وقت میں ابراہیم علیہ السلام بھی اس سے لاتعلق ہو گئے۔ اور زندگی میں کسی مشرک کے لیے مغفرت مانگی جا سکتی ہے، کیونکہ مغفرت مانگنے کا مطلب یہ ہے کہ اے اللہ! اس کو ایمان کی توفیق دے تاکہ یہ آخرت میں بخشا جائے، زندگی میں اگر کسی کافر کے لئے آپ دُعا کریں کہ اے اللہ! اس کے لئے بخشش کا سامان پیدا کر دے، تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کو ہدایت دے دے، اس کو ایمان دے دے، تو زندگی میں یہ دُعا کی جا سکتی ہے، لیکن جس وقت اُن کو پتا چلا کہ اُس کا انتقال بھی شرک پہ ہوا ہے تو وہ بھی لاتعلق ہو گئے، اس لیے انہوں نے جو اِستغفار کیا تھا تو اوّل تو وعدہ کر کے آئے تھے، جب ان کے باپ نے کہا تھا، کہ یہاں سے، میرے پاس سے نکل جا، ورنہ میں تجھے پتھر مار مار کے مار دوں گا وَاهْجُرْنِي مَلِيًّا، ایک زمانہ دراز تک مجھ سے جدا ہو جا، تو حضرت ابراہیم علیہ السلام جاتے ہوئے اس سے وعدہ کر آئے تھے کہ اچھا! سَأَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّي ۖ إِنَّهُ كَانَ بِي حَفِيًّا (سورۂ مریم:۴۶، ۴۷) جب تک ہو سکے گا میں تیرے لیے اِستغفار کروں گا، یہ وعدہ کر آئے تھے، اور اس وعدے کی بنا پر اپنے والد کے لیے دُعا کرتے رہے، لیکن جب پتا چل گیا کہ وہ بھی جہنمی ہے، اور وہ اللہ کا دشمن ہے، ایمان اُس کی قسمت میں نہیں ہوا، اور اُس کا انتقال کُفر پہ ہو گیا ہے، تو تَبَرَّأَ مِنْهُ: ابراہیم علیہ السلام نے بھی کوئی تعلق نہیں رکھا، تو اسی طرح تمہیں بھی جس وقت پتا چل جائے کہ کسی کا انتقال کُفر و شرک پہ ہو گیا ہے، تو تمہیں بھی لاتعلق ہو جانا چاہیے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ہمارے لیے نمونہ اسی طرح سے ہے، کہ زندگی میں دُعا کر سکتے ہو کہ اللہ اس کو گمراہی سے بچا لے، ہدایت دے دے، مغفرت کا سامان کر دے، لیکن کُفر پر انتقال کی صورت میں نہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے والد کے لیے دُعا کی، نہ تم کرو۔

اِیمان کے بغیر نجات ممکن نہیں

اس میں یہ بات بھی واضح ہو گئی، کہ اگر ایمان نصیب نہ ہو تو کسی نبی کے ساتھ بھی قربت کا تعلق ہو تو وہ بھی آخرت میں نافع نہیں، جیسے حدیث شریف میں آتا ہے، کہ قیامت کے دن حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے باپ آزر سے ملیں گے، جب ملاقات ہو گی تو

دیکھیں گے کہ "غَبَرَةٌ قَتَرَةٌ" اس کے اُوپر طاری ہے جس طرح سے کافروں کے متعلق اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ذکر کیا ہے کہ منہ گردآلود ہوگا، رنگ اُڑا ہوا ہوگا، سیاہی طاری ہوگی، بہت بُرے حال میں ہوں گے، تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کہیں گے کہ اے باپ! میں تجھے نہیں کہتا تھا کہ میری نافرمانی نہ کر؟ تو آزر آگے سے کہے گا کہ میں اب وعدہ کرتا ہوں کہ اب تیری نافرمانی نہیں کروں گا، لیکن وہ وقت تو اب گزر گیا، اب فرمانبرداری کا کون سا موقع رہ گیا، لیکن اللہ تعالیٰ کے سامنے حضرت ابراہیم علیہ السلام اس وقت ایک بات کہیں گے کہ اے اللہ! تُو نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ میں تجھے رُسوا نہیں کروں گا، جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دُعا قرآن کریم میں ہے: وَلَا تُخْزِنِي يَوْمَ يُبْعَثُونَ (سورۂ شعراء: ۸۷) اے اللہ! مجھے قیامت کے دِن رُسوا نہ کرنا، حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یہ دُعا غالباً سورۂ شعراء کے اندر ان الفاظ کے ساتھ مذکور ہے، اور اللہ تعالیٰ نے وہ دُعا قبول کرنے کا وعدہ کر لیا ہوگا، جس کی وجہ سے حدیث میں لفظ آتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کہیں گے کہ اے اللہ! تُو نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ میں تجھے رُسوا نہیں کروں گا، تو میرے لیے اس سے بڑھ کے اور کیا رُسوائی ہوگی کہ میرا باپ اس حال میں ہے، یعنی جب لوگ دیکھیں گے کہ یہ ابراہیم علیہ السلام کا باپ ہے، اور اس حال میں ہے، تو میرے لیے تو یہ بے عزتی کی بات ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے آپ کو خزیان سے بچانے کے لیے اللہ تعالیٰ کے سامنے درخواست کریں گے، باپ کی سفارش کرنی مقصود نہیں ہوگی، تو اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ اب اس رُسوائی کو دُور کرنے کا یہ طریقہ تو نہیں ہے، کہ اسے بخش دُوں، یہ تو نہیں بخشا جائے گا، جنت کافروں کے اُوپر حرام ہے، ہاں! البتہ ایک دوسرا طریقہ ہے (یہ اس روایت کا حاصل عرض کر رہا ہوں اپنے الفاظ میں) حضرت ابراہیم علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ اپنے پاؤں کے نیچے دیکھو! جب وہ دیکھیں گے تو اپنے باپ کو ایسے دیکھیں گے "فَإِذَا هُوَ بِذِيخٍ مُتَلَطِّخٍ" جس طرح سے ایک بجو ہوتا ہے گندگیوں میں اور نجاستوں میں آلودہ، اس طرح اُس کی شکل مسخ ہوجائے گی، اور اس کی انسانی شکل باقی نہیں رہے گی، جس وقت اس شکل میں اسے دیکھیں گے، پھر "فَيُؤْخَذُ بِقَوَائِمِهِ فَيُلْقَى فِي النَّارِ" اُس کو اس کے پاؤں سے پکڑ کے جہنم میں پھینک دیا جائے گا۔[1] جب جہنم میں پھینک دیا جائے گا، تو اب جتنے لوگ بھی جہنم میں ہوں گے، کوئی دیکھنے والا پہچانے گا ہی نہیں، کہ یہ ابراہیم علیہ السلام کا باپ ہے، اب اگر کسی شخص کا باپ مثال کے طور پر گداگری کرتا پھر رہا ہے، لیکن کسی کو پتا ہی نہیں کہ یہ فلاں کا باپ ہے، تو اُس کا گداگری کرنا اس کے لیے باعث ذِلت نہیں ہے، ہاں! البتہ اگر کسی کو پتا ہو کہ یہ فلاں کا باپ ہے اور یہ کام کرتا پھر رہا ہے، تو پھر لوگ کہیں گے دیکھو! خود کیسا ہے اور اس کا باپ کس حال میں پھر رہا ہے؟ تو جب اُس کو کوئی پہچانے گا ہی نہیں تو کوئی ابراہیم علیہ السلام کی طرف نسبت کرے گا ہی نہیں۔ تو معلوم ہوگیا کہ ایمان کے بغیر کوئی بڑے سے بڑا وسیلہ بھی آخرت میں کام آنے کا نہیں، آخرت میں جا کے اگر نجات ہوسکتی ہے تو ایمان کی برکت سے ہوسکتی ہے، ایمان حاصل ہو تو پھر اس قسم کے تعلقات اور وسائل مزید نجات اور ترقی درجات کا باعث ہوسکتے ہیں، لیکن چھٹکارا اگر ہوگا تو ایمان کی برکت سے ہوگا، انسان کو کتنا ہی بڑے سے بڑا وسیلہ اور ذریعہ حاصل ہو، لیکن اگر ایمان نہیں ہے تو بے کار ہے۔

---

(۱) بخاری ار ۴۷۳ باب قول اللہ واتخذ اللہ ابراھیم خلیلا ۔ مشکوۃ ۲ر ۴۸۳ باب الحشر فصل اول۔

اِبراہیم علیہ السلام کے دو نمونے (نرمی اور سختی)

وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَاۤ: نہیں تھا اِستغفار ابراہیم کا اپنے باپ کے لیے مگر ایک وعدے کی وجہ سے جو ابراہیم علیہ السلام نے اس سے کرلیا تھا، فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗۤ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ: جب اس کے لیے یہ بات واضح ہوگئی کہ یہ اللہ کا دُشمن ہے، یعنی اللہ کی عداوت پر ہی اس کا خاتمہ ہوا، تو تَبَرَّاَ مِنْهُ: اس سے بیزار ہوگئے، اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيْمٌ: بے شک ابراہیم علیہ السلام رقیق القلب تھے، بہت حلیم الطبع تھے، اس لیے باپ کی سختیوں کے باوجود، انتہائی درجے کی بے مروّتی کے باجود اُن کے دِل کے اندر رِقت تھی، جس کی بنا پر پھر بھی باپ کے لیے روتے رہے، اور بردبار تھے کہ اپنے باپ کی ان سختیوں سے وہ مشتعل نہیں ہوئے، لیکن جس وقت پتا چل گیا کہ یہ اللہ کا دُشمن ہے تو پھر لاتعلق ہوگئے، گویا کہ مؤمن اپنے ان تعلقات کی بنا پر موم ہوسکتا ہے، لیکن جب وضاحت ہوجائے کہ اب یہ شخص اللہ کا ہونے والا نہیں، اور اللہ کے اوپر ایمان لانے والا نہیں، تو پھر اُس کو اس سلسلے میں پتھر بھی ہوجانا چاہیے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دونوں نمونے ہمارے سامنے آگئے۔

''آزر'' اِبراہیم علیہ السلام کا باپ تھا یا چچا؟

یہاں لِاَبِيْهِ کا لفظ آیا، اور دوسری جگہ آتا ہے لِاَبِيْهِ اٰزَرَ (سورۂ اَنعام: ۷۴)، قرآنِ کریم کا تبادر اسی بات پر دلالت کرتا ہے کہ ''آزر'' حضرت ابراہیم علیہ السلام کے باپ تھے اور وہ کافر تھے، بُت فروش تھے بلکہ بُت گر تھے جس طرح سے تاریخ کے اندر مذکور ہے، اور وہ بخشے نہیں گئے، آخرت میں اُن کا جہنّم میں جانے کا ذکر ہے، لیکن یہ بات کچھ علماء اور مفسرین کے درمیان زیرِ بحث آئی ہے، بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا باپ نہیں تھا بلکہ چچا تھا، اور چچے کو بھی باپ سے تعبیر کردیا جاتا ہے، یہ بات ظاہر کے خلاف ہے لیکن کہنے والے لوگ بہت بڑے بڑے ہیں، اِمام رازی رحمہ اللہ نے تو باپ ہی قرار دیا ہے، اور ''رُوح المعانی'' والے چچا قرار دیتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ اِمام رازی رحمہ اللہ نے جو کہا ہے یہ باپ ہیں، من قلة التتبع، اِمام رازی نے اس کا تتبع زیادہ نہیں کیا، تلاش زیادہ نہیں کی،[1] اور وہ اُن کے باپ کا نام ''تارخ'' ذکر کرتے ہیں، کہتے ہیں کہ اُن کے کُفر کی کوئی صراحت نہیں، اصل میں وہ ثابت یہ کرنا چاہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے آباء واجداد میں جتنے لوگ ہیں وہ سب مغفور ہیں، اس بارے میں انہوں نے زور لگایا ہے، اور اس سلسلے میں بڑے بڑے لوگ ہیں، ہمارے ''تفسیر مظہری'' والوں نے بھی یہی موقف اختیار کیا ہے، علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے بھی یہی موقف اختیار کیا ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین کے بارے میں تو خیر بہت لوگوں کا یہی موقف ہے، جیسا کہ سورۂ شعراء کے اندر ذکر کروں گا، وہاں تو ''روح المعانی'' والے اس مسئلے کو بیان کرتے ہوئے بڑے تیز ہوگئے، اور ان کے کچھ اس قسم کے الفاظ ہیں: ''اَنَا اَخْشَى الْكُفْرَ عَلٰى مَنْ يَّقُوْلُ فِيْهِمَا رضی الله تعالی عنهما عَلٰى رَغْمِ اَنْفِ عَلِيِّ الْقَارِيْ وَاَضْرَابِهٖ بِضِدِّ ذٰلِكَ'' حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین کے متعلق ''رضی اللہ عنہما'' کا لفظ بول کر کہتے ہیں کہ جو ان کے متعلق طعن کرے مجھے تو خود اس کے کُفر کا اندیشہ ہے۔ اور علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے اس موضوع پر تقریباً چھ رسالے لکھے ہیں۔ بہر حال وہ تاریخی حیثیت میں ایک مسئلہ ہے،

---

(۱) روح المعانی سورۂ انعام آیت ۷۴ کے تحت لکھا ہے: والقول بان ذلك قول الشيعة كما ادعاه الامام الرازي ناشيء من قلة التتبع.

شیعہ ''آزر'' کو ابراہیم علیہ السلام کا باپ نہیں مانتے، ان کا تو متفقہ قول ہے، وہ کہتے ہیں یہ باپ نہیں تھا، اور ہمارے علماء میں اس سلسلے میں اختلاف ہے، لیکن قرآنِ کریم کا تبادر اس طرف ہے کہ جہاں ذکر کیا ہے ''اَب'' کے لفظ کے ساتھ ہی ذکر کیا ہے، اور حدیث شریف میں بھی جب ذکر کیا ہے ''اَب'' کے لفظ کے ساتھ ہی ذکر کیا ہے، کہیں ''عم'' کے ساتھ ذکر نہیں آیا، باقی یہ ضابطہ کوئی منصوص نہیں، کہ انبیاء علیہم السلام کے اُصول وفروع کے متعلق اللہ تعالیٰ کا اس قسم کا کوئی خصوصی معاملہ ہو، نوح علیہ السلام کے بیٹے کا ذکر قرآنِ کریم میں ہے کہ وہ کافر تھا، تو فروع کے بارے میں بھی کوئی ضمانت نہیں ہے، اسی طرح اُصول کے بارے میں بھی قرآنِ کریم میں کوئی صراحت نہیں، کہ نبی کے اُصول مغفور ہوں گے، مغفور ہونا اپنے ایمان کی وجہ سے ہوگا، باپ ہونا اور دادا ہونا یہ کوئی اس قسم کی بات نہیں۔ بہرحال یہ مسئلہ علماء کے درمیان مختلف فیہ ہے، اور تفاسیر کے اندر اس قسم کی روایات موجود ہیں۔

ممانعت سے قبل اِستغفار باعثِ جرم نہیں

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِلَّ قَوْمًا بَعْدَ اِذْ هَدٰىهُمْ: یہ اطمینان دلایا ہے کہ اگر پہلے اِستغفار کر بیٹھے ہو تو یہ کوئی ایسا جرم نہیں کہ جس کے اوپر اللہ تعالیٰ گرفت کرے گا، کیونکہ پہلے اُس نے ممانعت نہیں کی تھی، اگر ممانعت ہو چکی ہوتی اور پھر تم ایسی کوتاہی کرتے تو یہ جرم تھا، جب ممانعت ہی نہیں کی تو ایسے وقت میں تمہیں گمراہی کے اندر نہیں ڈالا جائے گا، تو اس آیت کے اندر یہ اطمینان دلایا ہے، کہ اللہ تعالیٰ کسی قوم کو ہدایت دے دے، جس طرح تم ہدایت یافتہ ہو گئے، پھر اللہ تعالیٰ اُس قوم کو گمراہی میں نہیں ڈالا کرتا جب تک کہ بتا نہ دے کہ انہوں نے کن کن چیزوں سے بچنا ہے، تو پہلے بتائے گا کہ بچنا کن کن چیزوں سے ہے، پھر اگر نہیں بچو گے تب گمراہی کا فیصلہ ہوتا ہے، اور جس بات کو اللہ تعالیٰ پہلے واضح نہ کر دے تو ہدایت دینے کے بعد پھر ایسے ہی اُس کو گمراہی میں نہیں ڈالتا، لہٰذا اگر تم کسی مشرک کے لیے اِستغفار کر بیٹھے یا دُعا کر بیٹھے، تو یہ کوئی گمراہی نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے پہلے تمہارے سامنے واضح نہیں کیا تھا کہ تم نے کن کن چیزوں سے بچنا ہے، اب واضح کر دیا تو اب اگر کوئی اِستغفار کرے گا یا اس قسم کا تعلق رکھے گا تو وہ مجرم ہوگا۔ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ: بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز کے متعلق علم رکھنے والا ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ: اللہ ہی کے لیے سلطنت ہے آسمانوں کی اور زمین کی يُحْيٖ وَيُمِيْتُ زندگی دیتا ہے اور موت دیتا ہے وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ اور نہیں ہے تمہارے لیے اللہ کے علاوہ کوئی یار اور نہ کوئی مددگار۔

مشکل وقت میں نبی کا ساتھ دینے والوں پر اللہ کی عنایات

اگلی آیت کے اندر ان تین صحابہ کی توبہ کی قبولیت کا ذکر ہے، اور ساتھ ساتھ باقیوں پر بھی جو اللہ کی عنایت ہوئی تھی اُس کو ذکر کر دیا گیا، یہ مضمون ضمناً پہلے آپ کے سامنے آ چکا ہے، جہاں غزوہ تبوک میں پیچھے رہنے والوں کا تذکرہ کیا تھا۔ ''اللہ تعالیٰ متوجہ ہو گیا نبی پر'' متوجہ ہوا رحمت کے ساتھ، ''اور مہاجرین وانصار پر جنہوں نے اُس نبی کی اتباع کی تنگی کی گھڑی میں'' مشکل وقت میں جو کام آئے، مشکل وقت میں جو متبع رہے، خاص طور پر غزوۂ تبوک، اس کو ''غزوۂ عُسرہ'' اس لیے کہتے ہیں، کہ بہت تنگی کے حالات میں پیش آیا تھا، گرمی کا موسم تھا، فصلیں پک رہی تھیں، مسافت دُور تھی، بہت بڑی قواعد دان فوج کے ساتھ مقابلہ تھا، تو ایسے وقت

میں بعض مخلصوں کے دِل بھی ڈُوبنے لگ گئے جس طرح سے آگے ذکر ہورہا ہے، تو جنہوں نے ایسے وقت میں ساتھ دیا اُن کے اُوپر اللہ کی خصوصی توجہ ہے، ''جنہوں نے اتباع کی اس نبی کی اس تنگی کی گھڑی میں بعد اس کے کہ ان میں ایک فریق کے دِل ٹیڑھے ہوگئے تھے، پھر اللہ اُن پہ متوجہ ہوا'' یعنی اُن کو پھسلنے نہیں دیا، سنبھال لیا، جن کے دِلوں میں کچھ تردّد پیدا ہوا تھا ان کو بھی اللہ نے سنبھال لیا'' بے شک اللہ تعالیٰ مؤمنوں کے ساتھ نرمی کرنے والا رحم کرنے والا ہے۔''

''مخلفین'' میں سے تین صحابہ کی توبہ کی قبولیت کا ذِکر

''اور ان تین پر بھی اللہ متوجہ ہوگیا جن کو پیچھے چھوڑ دیا گیا تھا'' معافی ملنے کے اعتبار سے، جن کے معاملے کو معلق کر دیا گیا تھا، اس سے وہی تین حضرات مراد ہیں جن کے نام پہلے آئے ''حتیٰ کہ جب اُن کے اوپر زمین تنگ ہوگئی باوجود کشادگی کے'' زمین کے تنگ ہونے کا مطلب یہ ہوتا ہے، کہ دیکھو! اب ایک شہر میں ایک محلے میں انسان رہتا ہے، یا آپ لوگ مدرسے میں رہتے ہیں، ہر طرف عزت احترام، جہاں چاہو بیٹھو، جہاں چاہو اٹھو، تو بڑی کشادگی معلوم ہوتی ہے، اور اگر سارا ماحول ہی خلاف ہوجائے کہ کوئی بلانے کے لیے تیار نہیں، کوئی اپنے پاس بٹھانے کے لیے تیار نہیں، کوئی آپ کو کمرے میں نہ گھسنے دے، تو اتنی کشادہ جگہ ہونے کے باوجود ایسے معلوم ہوگا جیسے آپ کے لیے کوئی جگہ نہیں، اور پھر اگر اندر سے دل مطمئن ہو تو پھر بھی انسان علیحدہ اپنی چارپائی پر بیٹھا رہے گا، کوئی فکر نہیں ہوگی، لیکن اگر اندر دل بھی پریشان ہوگیا، تو اندر سے بھی باہر سے بھی، ہر طرف سے پریشانی انسان کو گھیر لیتی ہے، ان تین حضرات کا یہی حال ہوا تھا، کہ حضور ﷺ نے بائیکاٹ کروادیا تھا، پچاس دن تک ان کے ساتھ کوئی بولا نہیں، نہ کوئی گھر کا بولے نہ کوئی باہر کا بولے، اور اللہ اور اللہ کے رسول کی ناراضگی کے اندیشے سے دل بھی انتہائی پریشان تھا، تو ایسے تھا کہ دنیا اُن کے سامنے اندھیر ہوگئی جیسے کہیں بھی ان کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے، ''زمین ان کے اوپر تنگ ہوگئی باوجود کشادگی کے، اور ان پر ان کی اپنی جانیں بھی تنگ ہوگئیں، اور یہ سمجھ گئے کہ اللہ کے عذاب سے بھاگنے کی کوئی جگہ نہیں مگر اللہ کی طرف'' یعنی اللہ کی گرفت اگر ہوگئی، تو اس گرفت سے اللہ کے سامنے جھکنے سے ہی چھٹکارا ہوگا، کوئی دوسری جگہ نہیں جدھر ہم بھاگ کے چلے جائیں، جس طرح سے آپ عصر کے بعد وظیفہ پڑھا کرتے ہیں: ''لَا مَلْجَأَ وَلَا مَنْجٰى مِنَ اللّٰهِ اِلَّا اِلَيْهِ'' تو ملجا اور منجیٰ دونوں کا مفہوم ایک ہی ہے، ملجأ: پناہ گاہ۔ منجیٰ: نجات پانے کی جگہ، اس کا معنی ہے اللہ کی گرفت سے پناہ اور نجات پانے کی جگہ کوئی نہیں سوائے اللہ کے، کہ اللہ ہی پناہ اور نجات دے تو دے سکتا ہے، اگر اللہ کی طرف سے کوئی کسی قسم کی گرفت آجائے، کوئی کسی قسم کا امتحان آجائے تو ہم کہیں جا کر نہیں بچ سکتے، بس اللہ کی طرف ہی جھکیں گے، اللہ کے سامنے ہی روئیں گے، وہی ہمیں بچائے گا۔ تو اس کلمے کا مفہوم بھی یہی ہے۔ تو وہ بھی سمجھ گئے کہ اللہ کے عذاب سے بچنے کے لئے کوئی ٹھکانا نہیں، مگر اللہ کی طرف ہی متوجہ ہونا، اسی سے نجات ملے گی، ''پھر اللہ تعالیٰ ان پہ متوجہ ہوا، تاکہ وہ بھی آئندہ اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ رہیں'' اِنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ: بے شک اللہ تعالیٰ توبہ قبول کرنے والا رحم کرنے والا ہے۔

کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کا مکمل واقعہ ''تفسیرِ عثمانی'' سے

وَّعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا: اس آیت میں جن تین حضرات کا ذکر ہے ان میں سے حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ نے اپنا واقعہ نہایت شرح وبسط سے عجیب موثر طرز میں بیان فرمایا ہے، ''صحیح بخاری'' وغیرہ میں (تفصیلی واقعہ) ملاحظہ کیا جائے، یہاں اس کے بعض اجزاء نقل کیے جاتے ہیں۔ کعب بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ تبوک کی مہم چونکہ بہت سخت اور دشوار گزار تھی، حضور ﷺ نے صحابہ کو عام حکم تیاری کا دیا، لوگ مقدور واستطاعت کے موافق سامانِ سفر دُرست کرنے میں مشغول تھے مگر میں بے فکر تھا کہ جب چاہوں گا فوراً تیار ہو کر ساتھ چلا جاؤں گا، کیونکہ بفضل ایزدی اس وقت ہر طرح کا سامان مجھ کو میسر تھا، ایک چھوڑ دو سواریاں میرے پاس موجود تھیں، میں اسی غفلت کے نشے میں رہا، ادھر نبی کریم ﷺ نے تیس ہزار مجاہدین اسلام کو کوچ کا حکم دے دیا، مجھے اب بھی یہ خیال تھا کہ حضور ﷺ روانہ ہو گئے تو کیا ہے، اگلی منزل پر آپ ﷺ سے جا ملوں گا۔ آج چلوں کل چلوں، اسی امروز وفردا میں وقت نکل گیا۔ حضور ﷺ نے تبوک پہنچ کر فرمایا: ''مَا فَعَلَ كَعْبُ بْنُ مَالِكٍ؟'' (کعب بن مالک کو کیا ہوا؟) بنی سلمہ کا ایک شخص بولا کہ یارسول اللہ! اس کی عیش پسندی اور اِعجاب وغرور نے نکلنے کی اجازت نہ دی۔ معاذ بن جبل نے کہا کہ تُو نے بُری بات کہی، خدا کی قسم! ہم نے اس میں بھلائی کے سوا کچھ نہیں دیکھا، حضور ﷺ یہ گفتگو سُن کر خاموش رہے۔ کعب کہتے ہیں کہ آپ ﷺ کی تشریف آوری کے بعد بہت زیادہ وحشت اس سے ہوتی تھی کہ سارے مدینہ میں پکے منافق یا معذور مسلمان کے سوا مجھے کوئی مرد نظر نہ پڑتا تھا۔ بہرحال اب دِل میں طرح طرح کے جھوٹے منصوبے گانٹھنے شروع کیے کہ آپ کی واپسی پر فلاں عذر کر کے جان بچالوں گا، مگر جس وقت معلوم ہوا کہ حضور ﷺ خیر وعافیت سے واپس تشریف لے آئے، دِل سے سارے جھوٹ فریب محو ہو گئے، اور طے کر لیا کہ سچ کے سوا کوئی چیز اس بارگاہ میں نجات دلانے والی نہیں، حضور ﷺ مسجد میں رونق افروز تھے، اصحاب کا مجمع تھا، منافقین جھوٹے حیلے بہانے بنا کر ظاہری گرفت سے چھوٹ رہے تھے کہ میں حضور ﷺ کے سامنے آیا، میرے سلام کرنے پر آپ نے غضب آمیز تبسم فرمایا اور غیر حاضری کی وجہ دریافت کی، میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! اگر اس وقت میں دُنیا والوں میں سے کسی دوسرے کے سامنے ہوتا تو آپ دیکھتے کہ کس طرح زبان زوری اور چرب لسانی سے جھوٹے حیلے حوالے کر کے اپنے آپ کو صاف بچالیتا، مگر یہاں تو معاملہ ایک ایسی ذات مقدس سے ہے جسے جھوٹ بول کر اگر میں راضی بھی کر لوں تو تھوڑی دیر کے بعد خدا اس کو سچی بات پر مطلع کر کے مجھ سے ناراض کر دے گا، برخلاف اس کے سچ بولنے میں گو تھوڑی دیر کے لیے آپ کی خفگی برداشت کرنی پڑے گی لیکن اُمید کرتا ہوں کہ خدا کی طرف سے اس کا انجام بہتر ہو گا، اور آخر کار سچ بولنا ہی مجھے خدا اور رسول کے غصّے سے نجات دِلائے گا، یارسول اللہ! واقعہ یہ ہے کہ میرے پاس غیر حاضری کا کوئی عذر نہیں، جس وقت حضور کی ہم رکابی کے شرف سے محروم ہوا، اس وقت سے زیادہ فراخی اور مقدرت کبھی مجھ کو حاصل نہ ہوئی تھی، میں مجرم ہوں، آپ کو اِختیار ہے جو فیصلہ چاہیں میرے حق میں دیں۔ آپ نے فرمایا کہ یہ شخص ہے جس نے سچی بات کہی، اچھا! جاؤ اور خدائی فیصلے کا انتظار کرو۔ میں اُٹھا اور تحقیق سے معلوم ہوا کہ

(ہلال بن اُمیہ اور مرارہ بن ربیع) یہ دو شخص میرے ہی جیسے ہیں۔ ہم تینوں کے متعلق آپ ﷺ نے حکم دے دیا کہ کوئی ہم سے بات نہ کرے، سب علیحدہ رہیں۔ چنانچہ کوئی مسلمان ہم سے بات نہ کرتا تھا، نہ سلام کا جواب دیتا تھا۔ وہ دونوں تو خانہ نشین ہو گئے، شب و روز گھر میں وقفِ گریہ و بکا رہتے تھے، میں ذرا سخت اور قوی تھا، مسجد میں نماز کے لیے حاضر ہوتا، حضور ﷺ کو سلام کر کے دیکھتا تھا کہ جواب میں لب مبارک کو حرکت ہوئی یا نہیں، جب میں حضور ﷺ کی طرف دیکھتا آپ میری طرف سے منہ پھیر لیتے تھے، مخصوص اقارب اور محبوب ترین اَعزّہ بھی مجھ سے بے گانہ ہو گئے تھے۔ اس اثنا میں ایک روز ایک شخص نے بادشاہِ غسان کا خط مجھے دیا، جس میں میری مصیبت پر اظہارِ ہمدردی کرنے کے بعد دعوت دی تھی کہ میں اس کے ملک میں آ جاؤں وہاں میری بہت آؤ بھگت ہوگی، میں نے پڑھ کر کہا کہ یہ بھی ایک مستقل امتحان ہے، آخر وہ خط میں نے نذرِ آتش کر دیا۔ چالیس دِن گزرنے کے بعد بارگاہِ رسالت سے جدید حکم پہنچا کہ میں اپنی عورت سے بھی علیحدہ رہوں، چنانچہ اپنی بیوی کو کہہ دیا کہ اپنے میکے چلی جائے، اور جب تک خدا کے یہاں سے میرا کوئی فیصلہ ہو، وہیں ٹھہری رہے۔ سب سے بڑی فکر یہ تھی کہ اگر اسی حالت میں موت آ گئی تو حضور میرا جنازہ نہ پڑھیں گے، اور فرض کیجئے ان دِنوں میں آپ ﷺ کی وفات ہو گئی تو مسلمان ہمیشہ یہ ہی معاملہ مجھ سے رکھیں گے، میری میّت کے قریب بھی کوئی نہ آئے گا، غرض پچاس دِن اسی حالت میں گزرے کہ خدا کی زمین مجھ پر باوجود فراخی کے تنگ تھی بلکہ عرصۂ حیات تنگ ہو گیا تھا، زندگی موت سے زیادہ سخت معلوم ہوتی تھی کہ یکا یک جبل سلع سے آواز آئی: ''یا کعبَ بنَ مَالِكٍ! أبْشِرْ'' (اے کعب بن مالک! خوش ہو جا) میں سنتے ہی سجدے میں گر پڑا۔ معلوم ہوا کہ اخیر شب میں حق تعالیٰ کی طرف سے پیغمبر ﷺ کو خبر دی گئی کہ ہماری توبہ مقبول ہے، آپ ﷺ نے بعد نمازِ فجر صحابہ کو مطلع فرمایا، ایک سوار میری طرف دوڑا کہ بشارت سنائے، مگر دُوسرے شخص نے پہاڑ پر زور سے للکارا، اس کی آواز سوار سے پہلے پہنچی اور میں نے اپنے بدن کے کپڑے اُتار کر آواز لگانے والے کو دیے، پھر حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، لوگ جوق جوق آتے اور مجھے مبارک باد دیتے تھے، مہاجرین میں سے حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نے کھڑے ہو کر مصافحہ کیا، حضور ﷺ کا چہرہ خوشی سے چاند کی طرح چمک رہا تھا، آپ ﷺ نے فرمایا، خدا نے تیری توبہ قبول فرمائی۔ میں نے عرض کیا کہ اس توبہ کا تتمہ یہ ہے کہ اپنا کُل مال و جائیداد خدا کی راہ میں صدقہ کرتا ہوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ سب نہیں، کچھ اپنے لیے روکنا چاہیے، چنانچہ میں نے خیبر کا حصہ الگ کر کے باقی مال صدقہ کر دیا۔ چونکہ محض سچ بولنے سے مجھ کو نجات ملی تھی، اس لیے عہد کیا کہ خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو، آئندہ کبھی جھوٹ نہ بولوں گا، اس عہد کے بعد بڑے سخت امتحانات پیش آئے، مگر الحمدللہ! میں سچ کہنے سے کبھی نہیں ہٹا، اور نہ ان شاءاللہ! تازیست ہٹوں گا۔ یہ واقعہ ہے جس کی طرف ان آیات میں اشارہ کیا گیا ہے، گویا ان تینوں پر خدا کی پہلی مہربانی تو یہ ہی تھی کہ ایمان و اخلاص بخشا، نفاق سے بچایا۔ اب نئی مہربانی یہ ہوئی کہ توبۂ نصوح کی توفیق دے کر پھر اپنی طرف کھینچ لیا اور کوتاہیوں کو معاف فرما دیا، (تفسیرِ عثمانی)۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ أَسْتَغْفِرُكَ وَأَتُوْبُ إِلَيْكَ

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿١١٩﴾ مَا كَانَ

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور سچوں کے ساتھ رہو﴿۱۱۹﴾ نہیں مناسب

لِاَهْلِ الْمَدِيْنَةِ وَمَنْ حَوْلَهُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ اَنْ يَّتَخَلَّفُوْا

اہلِ مدینہ کے لیے اور اُن بدویوں کے لیے جو اہلِ مدینہ کے اردگرد ہیں کہ پیچھے ہوجائیں

عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ وَلَا يَرْغَبُوْا بِاَنْفُسِهِمْ عَنْ نَّفْسِهٖ ۚ ذٰلِكَ

اللہ کے رسول سے، اور نہ یہ مناسب ہے کہ نبی کی جان سے اعراض کرتے ہوئے اپنی جانوں میں رغبت کریں، یہ

بِاَنَّهُمْ لَا يُصِيْبُهُمْ ظَمَاٌ وَّلَا نَصَبٌ وَّلَا مَخْمَصَةٌ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ

اس لیے کہ بےشک وہ لوگ، نہیں پہنچتی اُنہیں کوئی پیاس اور نہ کوئی مشقت اور نہ بھوک اللہ کے راستے میں،

وَلَا يَطَـُٔوْنَ مَوْطِئًا يَّغِيْظُ الْكُفَّارَ وَلَا يَنَالُوْنَ مِنْ عَدُوٍّ

اور نہیں چلتے یہ ایسا چلنا جو غصّے میں ڈالتا ہو کافروں کو اور نہیں حاصل کرتے وہ دشمن سے

نَّيْلًا اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ بِهٖ عَمَلٌ صَالِحٌ ۚ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ

کچھ بھی حاصل کرنا مگر لکھا جاتا ہے اُن کے لئے اِس کی وجہ سے نیک عمل، بےشک اللہ تعالیٰ نہیں ضائع کرتا

الْمُحْسِنِيْنَ ﴿١٢٠﴾ وَلَا يُنْفِقُوْنَ نَفَقَةً صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً

محسنین کے اجر کو﴿۱۲۰﴾ اور نہیں خرچ کرتے وہ مال تھوڑا اور نہ زیادہ

وَّلَا يَقْطَعُوْنَ وَادِيًا اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ لِيَجْزِيَهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا

اور نہیں قطع کرتے وہ کسی وادی کو مگر یہ عمل اُن کے لیے لکھا جاتا ہے، تاکہ بدلہ دے اللہ تعالیٰ اُن کو بہترین بدلہ

كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿١٢١﴾ وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً ۚ فَلَوْلَا

اُن کاموں کا جو وہ کرتے تھے﴿۱۲۱﴾ نہیں مناسب مؤمنوں کے لیے کہ نکل جایا کریں سارے ہی، کیوں نہ

نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ

سفر کیا اُن کی بڑی جماعت میں سے چھوٹی جماعت نے تاکہ وہ لوگ سمجھ حاصل کریں دین میں

وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْٓا اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ ﴿۱۲۲﴾ يٰٓاَيُّهَا

اور تاکہ ڈرائیں وہ اپنی قوم کو جس وقت کہ وہ لوٹ کے آئیں اُن کی طرف تاکہ وہ ڈریں﴿۱۲۲﴾ اے

الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَاتِلُوا الَّذِيْنَ يَلُوْنَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوْا فِيْكُمْ غِلْظَةً ؕ

ایمان والو! لڑائی کرو ان کافروں سے جو تمہارے قریب ہیں اور چاہیے کہ وہ کافر تمہارے اندر سختی محسوس کریں

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۲۳﴾ وَاِذَا مَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ

اور یقین کرلو کہ بےشک اللہ تعالیٰ متقین کے ساتھ ہے﴿۱۲۳﴾ جب کوئی سورت اُتاری جاتی ہے

فَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ اَيُّكُمْ زَادَتْهُ هٰذِهٖٓ اِيْمَانًا ۚ فَاَمَّا الَّذِيْنَ

ان میں سے کوئی وہ ہے جو کہتا ہے کہ تم میں سے کون ہے کہ زیادہ کیا ہو اُس کو اس سورت نے از روئے ایمان کے، پس وہ لوگ

اٰمَنُوْا فَزَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّهُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ ﴿۱۲۴﴾ وَاَمَّا الَّذِيْنَ

جو ایمان لے آئے یہ سورت ان کو بڑھاتی ہے از روئے ایمان کے اور وہ خوش ہوتے ہیں﴿۱۲۴﴾ لیکن وہ لوگ جن کے

فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا اِلٰى رِجْسِهِمْ وَمَاتُوْا

دلوں میں بیماری ہے تو یہ سورت ان کی پلیدی کے ساتھ اور پلیدی کا اضافہ کرتی ہے، اور وہ مرتے ہیں

وَهُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿۱۲۵﴾ اَوَلَا يَرَوْنَ اَنَّهُمْ يُفْتَنُوْنَ فِيْ كُلِّ عَامٍ مَّرَّةً

اس حال میں کہ کافر ہوتے ہیں﴿۱۲۵﴾ کیا وہ لوگ دیکھتے نہیں کہ وہ آزمائش میں ڈالے جاتے ہیں ہر سال ایک مرتبہ

اَوْ مَرَّتَيْنِ ثُمَّ لَا يَتُوْبُوْنَ وَلَا هُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ﴿۱۲۶﴾ وَاِذَا مَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ

یا دو مرتبہ، پھر بھی وہ توبہ نہیں کرتے اور نصیحت حاصل نہیں کرتے﴿۱۲۶﴾ اور جس وقت کوئی سورت اُتاری جاتی ہے

نَّظَرَ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ ؕ هَلْ يَرٰىكُمْ مِّنْ اَحَدٍ ثُمَّ

تو اُن کا بعض بعض کی طرف جھانکتا ہے کہ کیا کوئی تمہیں دیکھ تو نہیں رہا؟ پھر

انْصَرَفُوْا ؕ صَرَفَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ ﴿۱۲۷﴾ لَقَدْ

اُٹھ کر چلے جاتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کو پھیر دیا اس وجہ سے کہ وہ لوگ سمجھ دار نہیں ہیں﴿۱۲۷﴾ البتہ تحقیق

جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ
آ گیا تمہارے پاس رسول تم میں سے ہی، گراں ہے اس پر تمہارا مشقت میں پڑ جانا، حریص ہے تم پر
بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۲۸﴾ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ
خصوصیت کے ساتھ مؤمنوں سے بہت نرمی کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے ﴿۱۲۸﴾ پھر اگر یہ لوگ پیٹھ پھیر لیں تو آپ کہہ دیجئے
حَسْبِيَ اللّٰهُ ۖ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ﴿۱۲۹﴾
کہ میرے لیے اللہ کافی ہے، اس کے بغیر کوئی معبود نہیں، میں نے اُسی کے اوپر بھروسا کیا، وہ عرشِ عظیم کا ربّ ہے ﴿۱۲۹﴾

خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ: اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور سچوں کے ساتھ رہو۔ صادقین سے مراد زبان کے سچے، جو سچ بولتے ہیں، کردار کے سچے، خاص طور پر اس میں یہ مفہوم ہوتا ہے کہ جن کا عمل ان کے قول کے مطابق ہے، جو زبان سے کہتے ہیں تو ان کا حال اور ان کا فعل بھی اسی طرح سے ہی ہے، تو یہ صادقین منافقین کے مقابلے میں آ جائے گا جو زبان سے کچھ کہتے تھے اور ان کے دل میں کچھ ہوتا تھا، ان کا قول کچھ تھا اور کردار کچھ تھا، "سچے لوگوں کے ساتھ رہو۔" مَا كَانَ لِاَهْلِ الْمَدِيْنَةِ وَمَنْ حَوْلَهُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ: نہیں مناسب اہل مدینہ کے لئے اور ان بدویوں کے لئے جو اہل مدینہ کے ارد گرد ہیں کہ پیچھے ہو جائیں اللہ کے رسول سے، اور نہ یہ مناسب ہے کہ نبی کی جان سے اِعراض کرتے ہوئے اپنی جانوں میں رغبت کریں، اور یہ اس لیے کہ بے شک وہ لوگ، نہیں پہنچتی انہیں کوئی پیاس اور نہ کوئی مشقت اور نہ بھوک اللہ کے راستے میں، اور نہیں چلتے وہ کوئی چلنا کہ غصے میں ڈالتے ہوں کافروں کو، (يَغِيْظُ یہ مَوْطِئًا کی صفت ہے) ایسا چلنا کہ وہ چلنا غصے میں ڈالتا ہو کافروں کو، اور نہیں حاصل کرتے وہ دشمن سے کچھ بھی حاصل کرنا، مگر لکھا جاتا ہے اُن کے لئے اِس کی وجہ سے عملِ صالح، بے شک اللہ تعالیٰ نہیں ضائع کرتا محسنین کے اُجر کو۔ اور نہیں خرچ کرتے وہ نفقۂ صغیرہ یعنی مال تھوڑا یا بہت، نہیں خرچ کرتے وہ مال تھوڑا اور نہ زیادہ، وَلَا يَقْطَعُوْنَ وَادِيًا: اور نہیں قطع کرتے وہ کسی وادی کو، اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ: مگر یہ عمل ان کے لئے لکھا جاتا ہے، لِيَجْزِيَهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ: تا کہ بدلہ دے اللہ تعالیٰ ان کو بہترین بدلہ ان کاموں کا جو وہ کرتے تھے۔ تو اَحْسَنَ معنیٰ جزاء کی صفت ہو جائے گی، بہترین بدلہ دے اس چیز کا جو کہ وہ کرتے تھے۔[1] وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً: نہیں مناسب مؤمنوں کے لئے کہ نکل جایا کریں سارے ہی۔ نَفْر: کوچ کرنا، سفر پہ جانا۔ فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ: فرقہ سے بڑی جماعت مراد ہے، طائفہ سے چھوٹی۔ کیوں نہ کوچ کیا ان میں سے بڑی جماعت میں سے چھوٹی جماعت نے، کیوں نہ سفر کیا ان کی بڑی جماعت میں سے

---

(۱) یہاں تک کی آیات کا خلاصہ پچھلی آیات کے تحت بھی ہے اس لیے یہاں اختصار ہے۔

ایک چھوٹی جماعت نے، لِیَتَفَقَّهُوْا فِی الدِّیْنِ: تا کہ وہ لوگ سمجھ حاصل کریں دین میں، تا کہ وہ لوگ فقہ فی الدین کو حاصل کریں، دین کی سمجھ کو حاصل کریں، وَلِیُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ: اور تا کہ ڈرائیں وہ اپنی قوم کو، اِذَا رَجَعُوْٓا اِلَیْهِمْ: جس وقت کہ وہ لوٹ کے آئیں ان کی طرف، لَعَلَّهُمْ یَحْذَرُوْنَ: تا کہ وہ بچیں، ڈریں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے۔ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا: اے ایمان والو! قَاتِلُوا الَّذِیْنَ یَلُوْنَکُمْ مِّنَ الْکُفَّارِ: لڑائی کرو ان کافروں سے جو تمہارے قریب ہیں۔ یَلُوْنَ: وَلِیَ یَلِیْ: قریب ہونا۔ لڑو ان کافروں سے جو تمہارے قریب ہیں، وَلْیَجِدُوْا فِیْکُمْ غِلْظَةً: اور چاہیے کہ وہ کافر تمہارے اندر سختی محسوس کریں، سختی پائیں، وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِیْنَ: اور یقین کرلو کہ بے شک اللہ تعالیٰ متقین کے ساتھ ہے، اس کی نصرت تقویٰ والوں کے ساتھ ہے، وَاِذَا مَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ: جب کوئی سورت اُتاری جاتی ہے، فَمِنْهُمْ مَّنْ یَّقُوْلُ: ان میں سے کوئی وہ ہے جو کہتا ہے اَیُّکُمْ زَادَتْهُ هٰذِهٖٓ اِیْمَانًا: تم میں سے کون شخص ہے کہ زیادہ کیا ہو اس کو اس سورت نے از روئے ایمان کے؟ تم میں سے کون ہے جس کے ایمان کو اس سورت نے بڑھایا ہو؟ فَاَمَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا: پس وہ لوگ جو ایمان لائے فَزَادَتْهُمْ اِیْمَانًا: یہ سورت ان کو بڑھاتی ہے از روئے ایمان کے، وَّهُمْ یَسْتَبْشِرُوْنَ: اور وہ خوش ہوتے ہیں، وَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ: لیکن وہ لوگ جن کے دلوں میں بیماری ہے فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا اِلٰی رِجْسِهِمْ: تو یہ سورت زیادہ کرتی ہے انہیں پلیدی پلیدی کے ساتھ، پلیدی کو بڑھاتی ہے اِلٰی رِجْسِهِمْ: یعنی مَضْمُوْمًا اِلٰی رِجْسِهِمْ: ایسی پلیدی جو ان کی پہلی پلیدی کے ساتھ ملنے والی ہوتی ہے، یا ''الیٰ'' بمعنی ''مع'' ہے، ان کی پلیدی کے ساتھ اور پلیدی کا اضافہ کرتی ہے، وَمَاتُوْا وَهُمْ کٰفِرُوْنَ: اور مرتے ہیں اس حال میں کہ کافر ہوتے ہیں۔ اَوَلَا یَرَوْنَ: کیا وہ لوگ دیکھتے نہیں، اَنَّهُمْ یُفْتَنُوْنَ فِیْ کُلِّ عَامٍ مَّرَّةً اَوْ مَرَّتَیْنِ: کہ وہ لوگ فتنہ میں ڈالے جاتے ہیں، آزمائش میں ڈالے جاتے ہیں ہر سال (عام سال کو کہتے ہیں) ایک مرتبہ یا دو مرتبہ، پھر بھی وہ توبہ نہیں کرتے اور نصیحت حاصل نہیں کرتے، وَاِذَا مَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ: اور جس وقت کوئی سورت اُتاری جاتی ہے نَّظَرَ بَعْضُهُمْ اِلٰی بَعْضٍ: اُن کا بعض بعض کی طرف جھانکتا ہے، هَلْ یَرٰىکُمْ مِّنْ اَحَدٍ: جھانکتا ہے اور آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے سے گویا کہ سوال کرتے ہیں کہ کیا کوئی تمہیں دیکھ تو نہیں رہا؟ ثُمَّ انْصَرَفُوْا: پھر اٹھ کر چلے جاتے ہیں، صَرَفَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ: اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کو پھیر دیا، بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا یَفْقَهُوْنَ: اس وجہ سے کہ وہ لوگ سمجھدار نہیں ہیں۔ لَقَدْ جَآءَکُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِکُمْ: البتہ تحقیق آ گیا تمہارے پاس رسول تم میں سے ہی، عَزِیْزٌ عَلَیْهِ مَا عَنِتُّمْ: مَا عَنِتُّمْ میں ''مَا'' مصدریہ ہے، عَنِتَ: مشقت میں واقع ہونا۔ تمہارا مشقت میں واقع ہونا اس کو ناگوار ہے، عَزِیْزٌ عَلَیْهِ مَا عَنِتُّمْ: بھاری ہے اس پر، گراں ہے اس پر تمہارا مشقت میں پڑ جانا، حَرِیْصٌ عَلَیْکُمْ: تمہارے نفع پہ حریص ہے، حریص ہے تم پر، بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ: خصوصیت کے ساتھ مؤمنوں سے بہت نرمی کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے، بِالْمُؤْمِنِیْنَ یہ متعلق مقدم ہونے کی وجہ سے اس میں خصوصیت کا معنی پیدا ہو گیا، خصوصیت کے ساتھ مؤمنوں کے ساتھ بہت ہی نرمی کرنے والا اور مہربانی کرنے والا ہے۔ فَاِنْ تَوَلَّوْا: پھر اگر یہ لوگ پیٹھ پھیر لیں، فَقُلْ حَسْبِیَ اللّٰهُ: تو آپ کہہ دیجئے کہ میرے لیے اللہ کافی ہے، لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ: اس کے بغیر کوئی معبود نہیں، عَلَیْهِ تَوَکَّلْتُ: میں نے اسی کے اوپر بھروسا کیا، وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِیْمِ: وہ عرش عظیم کا رب ہے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَیْكَ

تفسیر

ماقبل سے ربط

سورت اِختتام کو پہنچ رہی ہے، واقعات آپ کے سامنے تفصیل کے ساتھ گزر گئے، خصوصیت کے ساتھ وہ واقعات جو غزوۂ تبوک سے تعلق رکھتے ہیں، پچھلی آیات میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُن لوگوں کے حال پر توجہ فرمانے کا ذکر تھا، جنہوں نے اس غزوہ میں کوتاہی کی تھی، اور پھر سرورِ کائنات ﷺ کے سامنے آکے اپنی غلطی کا اقرار کرلیا تھا، اور اللہ تعالیٰ نے اُن کے معاملے کو ملتوی کردیا تھا، پچاس دِن کے بعد پھر اُن کی توبہ قبول ہوئی، تو خصوصیت کے ساتھ اُن کے حال کو پچھلی آیات میں ذکر کیا گیا تھا، اگلی آیات میں نصیحت کرنا مقصود ہے کہ آئندہ اس قسم کے حالات نہ ہونے پائیں۔

دِل میں تقویٰ اور رِفاقتِ صادقین کی اہمیت

پہلے تو یہ کہا کہ اللہ سے ڈرو، دِل میں تقویٰ ہونا چاہیے، اللہ کا خوف دِل میں ہو، اور پھر رِفاقت صادقین کی اختیار کرو، دو باتیں آگئیں، دِل میں تقویٰ اور صادق کی رفاقت، اصل یہ ہے کہ انسان کے سیدھا رہنے کے لیے اور لغزش سے بچنے کے لیے یہ دونوں باتیں ہی ضروری ہیں، دِل میں خدا کا خوف ہو تو دِل شیطان کے حملوں سے محفوظ رہتا ہے، اور قلب کے اندر نافرمانی نہیں گھستی، جب دِل کے اندر اللہ کا خوف ہو تو نافرمانی کے جذبات موجود نہیں رہ سکتے، اور اچھے ماحول کے اندر رہنا یہ باہر سے شیطانی حملوں سے تحفظ کرتا ہے، کہ جب انسان کے پاس اُٹھنے بیٹھنے والے لوگ اچھے ہوں گے، اور اس کا ماحول اچھا ہوگا، اس نے اپنے اِردگرد اچھے لوگوں کو جمع کیا ہوا ہوگا، تو پھر بُرائی نہیں آتی، اچھائی کا ماحول انسان کو اچھائی کی طرف لے جاتا ہے، انسان کی نشوونما میں اس کے ماحول کا بہت اثر ہے، تو جس وقت تم ان لوگوں کے ساتھ اُٹھو بیٹھو گے جن کی زبان اچھی، جن کا کردار اچھا، جن کے جذبات اچھے، جن کا عمل اچھا، تو لازماً ان کے ساتھ مل کر تمہیں بھی اچھے کام کرنے کی عادت پڑے گی، اور جہاد کے اندر جو بعض لوگوں سے کوتاہی ہوئی، ہوسکتا ہے کہ اس میں کسی درجے میں منافقین کی رفاقت کا دخل ہو، کہ منافق خود جہاد کے لیے آمادہ نہیں تھے، اور باتیں اس قسم کی کرتے تھے، کہ جن سے جہاد کی اہمیت کم ہوتی تھی، تو ہوسکتا ہے کہ اُن کی باتیں کسی درجے میں طبیعت پر اثرانداز ہوئی ہوں جس کی وجہ سے سستی طاری ہوگئی، تو یہ خصوصیت کے ساتھ تنبیہ کردی گئی، کہ اپنے رفیق اور اپنے ساتھی ایسے لوگوں کو بناؤ جو کردار کے پکے ہیں، قول کے سچے ہیں، تو پھر اس قسم کی کوتاہی نہیں ہونے پائے گی۔

اچھی اور بُری صحبت کے اِنسانی زندگی پراثرات

صحبت اور رفاقت انسان کے اندر رُجحان پیدا کرنے میں بہت دخیل ہے، اس لیے سرورِ کائنات ﷺ نے خصوصیت کے ساتھ تاکید فرمائی ہے کہ بُری صحبت سے بچو اور اچھی صحبت اختیار کرو۔ ایک روایت میں ہے: ”اَلْوَحْدَةُ خَيْرٌ مِّنْ جَلِيْسِ السُّوْءِ

وَالْجَلِيْسُ الصَّالِحُ خَيْرٌ مِّنَ الْوَحْدَةِ ''[1] بُرے ساتھی سے تو بہتر یہ ہے کہ انسان تنہائی میں زندگی گزار لے، اور تنہائی سے اچھا ساتھی بہتر ہے، یعنی اگر کسی کو اچھا ساتھی مل جائے جس کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا اُس کے علم میں اضافے کا باعث بنے، اس کے عمل میں اضافے کا باعث بنے اور اس کے نظریات کی اصلاح کا باعث بنے، اس قسم کے ساتھی کا اپنے ساتھ رہنا یہ خلوت میں بیٹھنے سے بہتر ہے۔ اور اگر کوئی اس قسم کا دوست ہو جو ایسی باتیں کرتا ہے جس کے ساتھ برائی کو تقویت پہنچتی ہے، انسان کا دل دماغ خراب ہوتا ہے، خود اُس کا کردار خراب ہے، اور دوسرے پر اثر انداز ہونے کی کوشش کرتا ہے، تو ایسے دوست سے تنہائی اور علیحدگی بہتر ہے، مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ نے اسی بات کو بیان فرمایا کہ: ''یارِ بد بدتر بود از مارِ بد'' بُرا دوست ''مارِ بد'' سے بھی بُرا ہے، ''مارِ بد'' کا معنی زہریلا سانپ، بُرا دوست زہریلے سانپ سے بھی زیادہ بُرا ہے، وجہ اس کی ظاہر ہے کہ سانپ اگر ڈس جائے گا، سانپ اگر کاٹ کھائے گا تو زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا کہ مر جاؤ گے، تو یہ کوئی نیا کام نہیں ہے، مرنا تو بہر حال ہے ہی، سانپ نہیں ڈسے گا تو ویسے مر جاؤ گے، بیمار ہو کے مرو گے، کسی حادثے کا شکار ہو جاؤ گے، اس سے زیادہ تو کوئی بات نہیں ہے، سانپ کے ڈسنے کے ساتھ آپ کے سامنے کوئی نئی بات نہیں پیش آئے گی، بس یہی ہے کہ مر جاؤ گے، اس کا نتیجہ موت ہے، لیکن یہ موت ایسی ہے کہ آئے گی، اگر سانپ کی وساطت سے نہ آئی تو کسی اور حادثے کا شکار ہو جاؤ گے، بیمار ہو کے مر جاؤ گے، سانپ کے ڈسنے کا اس سے زیادہ کوئی نقصان نہیں ہے، لیکن اگر یارِ بد کی زہر انسان کو چڑھ جائے تو پھر یہی نہیں کہ وہ مرتا ہے، بلکہ دُنیا بھی برباد ہوتی ہے، آخرت بھی برباد ہوتی ہے، سانپ کا کاٹا آخرت میں روئے گا نہیں، قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے سامنے جس وقت پیشی ہوگی تو سانپ کا کاٹا روئے گا نہیں، کہ میرا نقصان ہو گیا، مجھے سانپ کیوں کاٹ گیا، آج میرے سامنے عذاب آرہا ہے، لیکن یار کا کاٹا روئے گا، اور اس کے رونے کی چیخیں اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب کے اندر آپ کو سنائی ہیں: يَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰى يَدَيْهِ يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِي اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُوْلِ سَبِيْلًا ۝ يٰوَيْلَتٰى لَيْتَنِيْ لَمْ اَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِيْلًا، ظالم اپنے ہاتھوں کو کاٹے گا اور کہے گا ہائے کاش! میں رسول کی اتباع میں آجاتا، ہائے میری بربادی! کیا ہی اچھا ہوتا کہ میں فلاں کو دوست نہ بناتا، لَقَدْ اَضَلَّنِيْ عَنِ الذِّكْرِ بَعْدَ اِذْ جَآءَنِيْ (سورۂ فرقان: ۲۷ تا ۲۹) میرے پاس نصیحت آگئی تھی، لیکن اس دوست نے مجھے اُس پر عمل نہیں کرنے دیا، اس خلیل نے مجھے نیکی اختیار نہیں کرنے دی، یہ اُس کے رونے کی آواز ہے اور اس کی چیخیں ہیں جو قیامت کے دِن ہوں گی، اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں اس کو ذِکر کیا ہے، تو بُرے یار کا کاٹا ہوا قیامت میں چیخے گا، سانپ کا کاٹا ہوا قیامت میں روئے گا نہیں۔ اَلْاَخِلَّآءُ يَوْمَئِذٍ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِيْنَ (سورۂ زُخرف: ۶۷) جتنے دوست ہیں وہ سب قیامت کے دِن ایک دوسرے کے دُشمن ہوں گے، دُشمن بھی اس طرح کہ آج جن دوستوں کے متعلق یہ کہتے ہو کہ اُن کے بغیر وقت نہیں گزرتا، کیسے کہا کرتے ہیں کہ:

''خاک ایسی زندگی پہ، تم کہاں اور ہم کہاں!''

کہ اگر کسی وجہ سے دُوری ہو گئی اور ملاقات نہ ہوئی، تو کہتے ہیں ایسی زندگی کا کیا فائدہ، زندگی تو وہی ہے جو اکٹھے رہنے میں ہو، لیکن اگر وہ دوست ایسا ہے جو بُرائی کی طرف لے جاتا ہے اور نیکی سے روکتا ہے، اور آپ کی طبیعت کے اُوپر بُرا اثر ڈالتا ہے، تو قیامت

---

(۱) مشکوۃ ص ۴۱۴ عن عمران بن حطان ۔ باب حفظ اللسان والغیبۃ والشتم / مستدرک حاکم ج ۳ ص ۳۸۷ / شعب الایمان ج ۷ ص ۵۸۔

کے دن اس دوست کے متعلق کیا جذبات ہوں گے، يٰلَيْتَ بَيْنِيْ وَبَيْنَكَ بُعْدَ الْمَشْرِقَيْنِ (سورۂ زخرف: ۳۸) کہ کیا ہی اچھا ہوتا کہ ایک مشرق میں ہوتا اور ایک مغرب میں ہوتا، اتنی دُوری ہمارے درمیان ہوتی، کہ ایک دُوسرے کی شکل دیکھنی نصیب نہ ہوتی، مشرق اور مغرب کا فاصلہ ہمارے درمیان میں ہوتا تو کیا ہی اچھی بات تھی، اس قسم کے دوستوں کے متعلق پھر ایسے جذبات ہوں گے۔

اور اللہ تعالیٰ نے اِلَّا الْمُتَّقِيْنَ کہہ کے بتا دیا کہ جن کی دوستی بنیاد تقویٰ پہ ہے، ان کی دوستیاں آخرت میں بھی مفید ہوں گی، یہ آپس میں ایک دوسرے کے دشمن نہیں ہوں گے، کیونکہ جو متقی ہوتے ہیں وہ ایک دوسرے کو تقویٰ کی تلقین کر کے نیکی کے لیے معاون ہوتے ہیں، تو یہ معاونت آخرت میں مفید ہوگی، اور اس رفاقت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی رحمت حاصل ہوگی، اللہ واسطے جو تعلق ہو، جس محبت کی بنیاد اللہ کے تعلق پر ہو، یہ عمل اللہ کے ہاں بہت مقبول ہے، قیامت کے دِن کہ جس وقت سخت گرمی ہوگی، لوگ سائے کو ترسیں گے، تو سات نیک بخت آدمی ایسے ہیں، کہ جن کو اللہ تعالیٰ اپنے سائے میں جگہ دیں گے، ''سَبْعَةٌ يُظِلُّهُمُ اللهُ فِي ظِلِّهِ يَوْمَ لَا ظِلَّ اِلَّا ظِلُّهٗ'' سات آدمی ایسے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ اپنے سائے میں جگہ دیں گے جس دِن کوئی سایہ نہیں ہوگا اللہ کے سائے کے علاوہ، ان میں سے ایک یہ بھی ہے ''رَجُلَانِ تَحَابَّا فِي اللهِ اِجْتَمَعَا عَلَيْهِ وَتَفَرَّقَا عَلَيْهِ ''[1] وہ دو شخص جن کی آپس میں اللہ واسطے محبت ہے، اللہ کے تعلق کی بنا پر آپس میں تعلق رکھتے ہیں، اکٹھے ہوتے ہیں تو اسی محبت پر، اور اگر جدا ہوتے ہیں تو اسی محبت پر، یہ نہیں کہ صرف منہ دیکھی محبت ہے، آپس میں ایک دوسرے سے جدا ہوں تو بھی اسی محبت پہ ہوتے ہیں۔

اچھے اور بُرے دوست کی مثال

اور اسی صحبت کے مسئلے کو سمجھانے کے لیے حضور ﷺ نے وہ مثال بھی دی کہ اچھے جلیس کی مثال دی حامل المسك کے ساتھ، جیسے کوئی کستوری بیچنے والا ہو، خوشبو بیچنے والا ہو، کہ اگر کوئی آدمی اس کے پاس بیٹھے گا تو یا تو کبھی عطیۃً ویسے ہی خوشبو دے گا، جیسے خوشبو بیچنے والوں کی عادت ہوتی ہے، کہ وہ پنبہ لیتے ہیں، خوشبو لگا کر کان میں رکھ لیتے ہیں، تو آپ کو خوشبو حاصل ہو جائے گی، اور کبھی ایسا ہوگا کہ آپ قیمتاً ہی خرید لیں گے، اور اگر قیمتاً بھی نہیں خریدیں گے تو جتنی دیر تک پاس بیٹھو گے تو کم از کم خوشبو کے ساتھ دِماغ تو معطر رہے گا، تو اسی طرح سے نیک صحبت ہے کہ جس وقت کسی نیک آدمی کے پاس بیٹھو گے، تو بسا اوقات انسان دیکھا دیکھی بغیر کسی مجاہدے کے نیک عادت اختیار کر لیتا ہے ماحول کی وجہ سے، اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کوئی عادت پسند آ گئی تو انسان مشقت اُٹھا کے وہ عادت ڈال لیتا ہے، اور اگر کچھ بھی نہ ہو تو کم از کم جب تک اچھے ماحول میں بیٹھے ہو تو کوئی اللہ کا نام سنو گے، اللہ کے لیے کیا گیا کوئی کوم دیکھو گے، طبیعت پر کوئی بُرا اثر نہیں پڑے گا، صحت افزا مقام ہے، جہاں بیٹھو گے سانس لو گے، صحت کے لئے مفید ہے، تو یہ مثال تو آپ ﷺ نے نیک صحبت کی دی، اور بُری صحبت کی مثال دی نافخ الکیر کے ساتھ، یعنی بھٹی دھونکنے والے کے ساتھ، اگر اُن کے ساتھ یاری لگا لو اور اُن کے پاس جا کے بیٹھ جاؤ، تو یا تو کوئی چنگاری اُڑے گی اور آپ کے کپڑوں پہ پڑے گی، کپڑے جل جائیں گے، اور اگر ایسا نہ بھی ہوا تو اس ماحول میں جتنی دیر تک بیٹھے رہو گے آنکھیں سے پانی ٹپکتا رہے گا،

(۱) بخاری ۱/۹۱، باب من جلس فی المسجد الخ/ مسلم ۱/۳۳۱، باب فضل اخفاء الصدقة/ مشکوۃ ۱/۶۸، باب المساجد، فصل اول، عن ابی ہریرہؓ۔

ناک سے پانی ٹپکتا رہے گا، دھوئیں کے ساتھ دماغ خراب ہوگا، بہرحال اس میں کوئی اچھی بات تو نہیں ہے، تو بُرے ماحول کی یہی مثال ہوتی ہے۔[1] تو یہ بہت بڑی اہم بات ہے جو اللہ تعالیٰ نے یہاں ذکر فرمائی، کہ اپنے قلب کے اندر بھی تقویٰ پیدا کرو، تو تمہارے اُوپر اندر سے شیطان کا حملہ نہیں ہوگا، اور اپنے اردگرد صادقین کا مجمع رکھو، صادقین کے اندر شامل ہو کے رہو، تو بُرائی تمہارے قریب نہیں آئے گی، اور جس وقت صادقین سے علیحدہ ہو کے کسی دوسرے ماحول میں جاؤ گے یا علیحدگی اختیار کرو گے تو شیطان کا تو ہی ہوگا، ورنہ نیکوں کی مجلس میں بیٹھنے والا شیطان کے حملوں سے بچا رہتا ہے، محفوظ رہتا ہے، یہ تاکید کردی کہ جب تم اپنے رُفقاء ایسے لوگوں کو بناؤ گے تو پھر کسی کام میں کوتاہی نہیں ہو سکے گی۔

ہر نقل وحرکت عملِ صالح کب بنتی ہے؟

آگے جو ترغیب دی گئی وہ لفظوں سے ہی نمایاں ہے، کہ اہلِ مدینہ، شہری لوگ، ان کو کبھی نہیں چاہیے، اور اِردگرد جو بدوی موجود ہیں ان کو بھی نہیں چاہیے، کہ اللہ کے رسول سے پیچھے رہ جایا کریں، اللہ کے رسول کی جان کے مقابلے میں اپنی جان کو عزیز رکھیں، یہ مناسب نہیں ہے، کہ اللہ کا رسول تو گرمی میں طویل سفر پر اتنی مشقت اٹھاتا ہوا جائے، اور تم گھر کے اندر عیش وآرام میں مبتلا رہو، سائے میں بیٹھے ہو، گھر کی نعمتیں کھاتے ہو، یہ مناسب نہیں ہے، اللہ کے رسول سے اپنی جان کو عزیز نہ سمجھیں، اللہ کے رسول کی جان سے اعراض کرتے ہوئے اپنی جان کو عزیز سمجھیں یہ مناسب نہیں، یہ جو ہم ترغیب دے رہے ہیں کہ ایسا تخلف اختیار نہیں کرنا چاہیے، بلکہ رفاقت اختیار کرنی چاہیے اور ساتھ دینا چاہیے، یہ ہم اس لیے کہہ رہے ہیں کہ اس میں فائدہ ہی فائدہ ہے، کوئی قدم اس میں نقصان کا نہیں ہے، گھر میں بیٹھے رہو گے، پیچھے رہ جاؤ گے تو ٹھیک ہے چند دن کا آرام ہے، لیکن پھر خسارہ ہی خسارہ ہے، اور اگر اللہ کے نبی کے ساتھ نکلو گے، مشقت اٹھاؤ گے تو جو ٹھوکر بھی تمہیں لگے گی وہ بھی تمہارے درجات بلند کرے گی، جو تکلیف تمہیں پہنچے گی وہ اللہ کی رضا کا باعث بنے گی، تو ساتھ رہنے میں بہرحال فائدہ ہے،'' یہ اس وجہ سے ہے کہ نہیں پہنچتی اُن کو کوئی پیاس اور نہ مشقت اور نہ بھوک اللہ کے راستے میں، اور نہیں چلتے یہ کوئی چلنا جو کفّار کے لیے باعث غیظ ہو، ان کے سفر کرنے کی وجہ سے کافر جلیں کہ مسلمانوں کی فوج آرہی ہے، کوئی اقدام اس قسم کا ہو جس کے ساتھ کافروں کا حوصلہ پست ہوتا ہے، دشمن کو کوئی نقصان پہنچائیں، دشمن سے کوئی چیز حاصل کریں، ان سب کی وجہ سے ان کے لیے عمل صالح لکھا جاتا ہے، اب یہاں ہے كُتِبَ لَهُمْ بِهٖ کہ اس کی وجہ سے عمل صالح لکھا جاتا ہے، کیونکہ ان میں سے اکثر کام ایسے ہیں جو غیر اختیاری ہیں، پیاس لگنا غیر اختیاری ہے اس میں آپ کے عمل کا دخل نہیں، لیکن پیاس آپ کو لگی، اللہ تعالیٰ اُس کو بھی آپ کے لیے باعث اجر لکھے گا، بھوک لگنا غیر اختیاری چیز ہے، بھوک کو بھی اللہ آپ کے لیے اَجر کا باعث لکھے گا، کوئی مشقت یا کوئی اور کسی قسم کی تکلیف آگئی، اور چلنا اور کافروں کا جلنا، کہ کافر جلیں گے اور درجات آپ کے بلند ہوں گے، تمہاری وجہ سے دشمن کو کوئی کسی قسم کی تکلیف پہنچے یہ آخرت میں ثواب کا باعث ہے، اِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ: اللہ تعالیٰ محسنین کے اجر کو ضائع نہیں کرتے، گویا کہ احسان کی صفت اپناؤ تو پھر تمہاری بھوک

---

(۱) بخاری ۲۸۲/۱، باب فی العطار۔ ۸۳۰/۲، باب المسک/ مسلم ۳۳۰/۲/ مشکوۃ ۴۲۶/۲، باب الحب فی اللہ، فصل اول۔

کیا، پیاس کیا، جو قدم بھی اللہ کے راستے میں اُٹھے گا سب اجر کا باعث ہے، اور احسان یہی ہوتا ہے کہ خلوص ہو، دل کے اندر اللہ اور اللہ کے رسول کے ساتھ خیر خواہی ہو، اور اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لیے ہی عمل کیا جائے، جس وقت یہ جذبہ قلب کے اندر پیدا ہو جائے گا تو پھر تمہاری ہر نقل و حرکت تمہارے لیے عمل صالح کا باعث ہے، اور جو بھی وہ اللہ کے راستے میں خرچ کریں چاہے تھوڑا ہو یا زیادہ، نفقہ صغیرہ: چھوٹا مال۔ نفقہ کبیرہ: بڑا مال، یعنی تھوڑا خرچ کریں یا زیادہ خرچ کریں، اور کسی وادی کو روندیں، یہ سب ان کے لیے لکھا جائے گا، خرچ کرنا چونکہ خود اپنا عمل ہے، وادی کو قطع کرنا خود اپنا عمل ہے، تو یہ عمل بھی اُن کے لیے لکھا جائے گا، اللہ تعالیٰ سب ریکارڈ محفوظ کرلیں گے تا کہ ان کے لیے ان کے عملوں کا بہترین بدلہ دیں۔ تو کتنے نفع کی چیز ہے جس کی طرف تمہیں ترغیب دی جارہی ہے، تو اس قسم کے مفید اور کارآمد سفر کو چھوڑ کے گھر بیٹھ جانا یہ کوئی عقل مندی نہیں۔

جہاد کے فرضِ کفایہ اور فرضِ عین ہونے کی تفصیل

اگلی آیت کا حاصل یہ ہے کہ یہ تو واقعہ ہے کہ ہے کہ جہاد فرضِ کفایہ ہے، فرضِ کفایہ کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ کسی شخصِ معین کی ذمہ داری نہیں، بلکہ اجتماعی طور پر ساری قوم کی ذمہ داری ہے، یہ اجتماعی ذمہ داری ہے، انفرادی ذمہ داری نہیں، جس طرح کسی مسلمان کا نماز جنازہ پڑھنا اور اُس کے کفن دفن کا انتظام کرنا یہ جماعتی ذمہ داری ہے، یہ ایک فرد کی ذمہ داری نہیں، اسی طرح جہاد بھی جماعتی ذمہ داری ہے، اتنے لوگ اس میں لگیں کہ جن کے ساتھ ضرورت پوری ہو جائے تو باقی سارے کے سارے اس ذمہ داری سے سبکدوش ہو جاتے ہیں، چند آدمیوں نے مل کے کفن دفن کا انتظام کر دیا، جنازہ پڑھ لیا تو سارے مسلمان اس سے بَری گئے، کسی کے ذِمّے کوئی بات نہیں ہے، تو جہاد میں بھی اتنے لوگوں کو لگنا چاہیے، اور باقی لوگ اپنی دوسری ضروریات میں لگیں، آخر زندگی میں اور بھی بہت ساری باتیں ایسی ہوتی ہیں کہ جن کے لئے انسانوں کی ضرورت ہے، وہ ہوں گے تو کام بنے گا، وہ نہیں ہوں گے تو کام کیسے چلے گا۔ تو سب کو نہیں جانا چاہیے، کچھ لوگ باقی رہ جائیں، لیکن اگر امام کی طرف سے نفیرِ عام ہو جائے، اعلانِ عام ہو جائے تو پھر سب پر جہاد فرض ہو جائے گا، پھر کسی کا پیچھے رہنا جائز نہیں، جیسا کہ غزوۂ تبوک میں صورت حال یہی پیش آئی تھی، کہ حضور ﷺ کی طرف سے نفیرِ عام ہو گیا تھا، عام اعلان ہو گیا تھا کہ سب چلو، یہی وجہ ہے کہ پیچھے رہنے والوں کے اُوپر انکار کیا گیا، اور اُن کی مذمت کی گئی، یا اُن کو سزا دی گئی، تفصیل آپ کے سامنے آ چکی ہے، چونکہ اس سلسلے میں بہت طویل آیات آ گئیں، کہ جہاد میں پیچھے رہنے والوں پر ملامت کی گئی، تو کوئی شخص یہاں سے یہ تاثر لے سکتا ہے، کہ جب بھی جہاد کا موقع ہو تو سب کو ہی نکل پڑنا چاہیے، ورنہ جو پیچھے رہ جائیں گے ان کی اسی طرح سے مذمت ہوگی، جس طرح یہاں پیچھے رہنے والوں کی ہوئی تھی، تو یہاں اس حقیقت کو واضح کر دیا گیا کہ جب جہاد کا موقع ہو تو سب کو جانے کی ضرورت نہیں، کہ باقی ساری ضروریات رہ جائیں، عام حالات میں حکم یہی ہے، ہاں البتہ خصوصی حالات کے تحت جب امام کی طرف سے اعلان ہو جائے، تو پھر یہ فرض عین ہو جائے گا، پھر کبھی ضرورت پیش آ جائے اور بچوں عورتوں اور بوڑھوں کو بھی نکلنا پڑے گا، وہ امام کے اعلان پر ہے، ورنہ عام حالات میں جہاد فرضِ کفایہ ہے، فرضِ عین نہیں۔

تفقہ فی الدین حاصل کرنے کی اہمیت

تو یہاں اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس بات کو واضح کرنے کے لیے خصوصیت کے ساتھ اس بات کی طرف متوجہ کیا ہے، کہ سارے لوگ نہ جایا کریں، بڑی جماعت میں سے کوئی چھوٹی جماعت چلی جائے، اور باقی جو رہ جائیں وہ کیا کریں؟ وہ علم حاصل کریں، تفقہ فی الدین حاصل کریں، اس ضرورت کو خصوصیت کے ساتھ سامنے رکھا ہے، کیونکہ جس طرح سے جہاد جماعتی طور پر فرض ہے، اس طرح تفقہ فی الدین بھی جماعتی طور پر فرض ہے، لیکن اس کے دو درجے ہیں، ایک فرضِ عین کا ہے اور ایک فرضِ کفایہ کا ہے، فرضِ عین تو یہ ہے کہ وہ ضروریات جو انسان کو پیش آتی ہیں اُن کے اَحکام حاصل کرے، آپ بالغ ہوگئے تو غسل کے اَحکام، نماز کے اَحکام، روزے کے اَحکام، آپ کے ذِمے ہے کہ ان کا علم حاصل کریں، آپ اگر مال دار ہیں تو زکوۃ کے اَحکام، حج کا ارادہ کرلیا ہے تو حج کے اَحکام، شادی ہوگئی تو بیوی کے حقوق اور اولاد کے حقوق، اپنے خاندان کے حقوق اس قسم کی چیزیں جو ہر شخص کے ساتھ تعلق رکھتی ہیں، اتنا علم حاصل کرنا تو ہر کسی کے ذِمے فرض ہے، اور اتنا علم حاصل کرلینا کہ سارا قرآن سمجھ میں آجائے، ساری سُنّت پہ نظر ہو جائے تاکہ کسی کو کوئی واقعہ پیش آجائے، اور آپ سے پوچھے تو آپ اُس کا جواب دے سکیں، یہ فرضِ کفایہ ہے، ہر شخص کے بس میں بھی نہیں، اور ہر شخص یہ مہارت پیدا بھی نہیں کرسکتا، لیکن جماعت کے اندر اتنے لوگوں کا موجود رہنا ضروری ہے، کہ جو بوقتِ ضرورت اس مسئلے کو حل کرسکیں، اگر سارے کا سارا علاقہ اور سارے کا سارا شہر ہی اس سے خالی ہو جائے، کہ کوئی مسئلہ بتانے والا نہیں، کسی کو کوئی واقعہ پیش آجائے تو فتویٰ دینے والا کوئی نہیں، تو پھر ساری کی ساری جماعت اور سارے کے سارے مسلمان گنہگار ہیں۔ تو جیسے جہاد فرض، اسی طرح سے علم حاصل کرنا بھی فرض، فرضِ عین کے درجے میں بھی اور فرضِ کفایہ کے درجے میں بھی، تو یہاں کہا جارہا ہے کہ جہاد کے موقع پر بھی طالب علموں کو اور پڑھنے پڑھانے والوں کو پیچھے رہ جانا چاہیے، تاکہ وہ اپنے علم میں مہارت پیدا کریں، فقہ فی الدین حاصل کریں، جس وقت جہاد کرنے والے جہاد کرکے واپس آئیں تو اُن کے سامنے تبلیغ کریں، اور انہیں دِین کی باتیں سمجھائیں، یہ بھی تو ایک بہت بڑا فرض ہے، لیکن یہاں صورت یوں ہوسکتی ہے کہ اگر تو رسول اللہ ﷺ سفر پہ تشریف لے جائیں تو آپ ﷺ کے ساتھ جانے والی جماعت دِین کا علم حاصل کرے گی، اور جب واپس لوٹیں گے تو آکے پچھلی قوم کو ڈرائیں گے اور ان کو انذار کریں گے، اور اگر رسول اللہ ﷺ شہر میں ہوں اور باقی جماعت جہاد پر بھیجی ہو تو یہ پیچھے رہنے والے علم حاصل کریں، تاکہ جب جہاد کرنے والے واپس آئیں تو یہ اُن کے سامنے انذار کریں، اس کا مفہوم دونوں طرح سے نکل سکتا ہے، حضور ﷺ کی زندگی میں۔ بعد میں تو حال یہی ہوگا کہ جہاد پر جانے والے چلے جائیں، اور پیچھے رہنے والے تفقہ فی الدین حاصل کریں، اور تفقہ فی الدین حاصل کرکے باقی قوم کو بھی تبلیغ کریں اور ان کو دین سمجھائیں، اور جب جہاد کرنے والے واپس آئیں تو اُن کے سامنے بھی تبلیغ کریں اور ان کو بھی اللہ کے احکام بتائیں۔ تو علم حاصل کرنے کا درجہ جہاد کے برابر ٹھہرادیا گیا، اس لیے مجاہدین میدان میں جاکے جہاد کریں اور اہلِ علم اپنے علم پر محنت کریں، تاکہ دِین کی سمجھ حاصل ہو، دِین محفوظ ہو، اور دوسروں تک بھی دِین پہنچایا جائے، یہ کوئی کم درجہ نہیں ہے، جیسے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو بھی علم کی طلب میں نکلتا ہے

''مَنْ خَرَجَ فِيْ طَلَبِ الْعِلْمِ فَهُوَ فِيْ سَبِيْلِ اللهِ حَتّٰى يَرْجِعَ ''(۱) مشکوۃ میں یہ روایت آپ نے پڑھ لی ہوگی، جو علم کے طلب کرنے کے لیے نکلتا ہے وہ ایسے ہی ہے جیسے فی سبیل اللہ جہاد کے لیے نکلتا ہے، جب تک کہ واپس نہ آجائے اس کا درجہ بھی مجاہدین جیسا ہی ہوتا ہے، اور اس کی اہمیت اس سے خود واضح ہوگئی کہ جہاد جیسے شغل کے وقت بھی کہا گیا ہے، کہ ایک جماعت رہے جو دین کا علم حاصل کرے، یہ بہت ضروری ہے۔

آج کل کی افراتفری اور علمی زوال

اور آج کل ہمارے ہاں جو افراتفری ہوگئی، کہ کہیں کوئی تحریک چل پڑے تو لوگ کہتے ہیں کہ سب مولوی، سب طالبِ علم، سب مدرسے والے باہر نکل آئیں، یہ بہت بڑی بے اعتدالی ہے، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ علم پہ زوال آگیا، پڑھنے پڑھانے والوں کا دِل بھی پڑھنے پڑھانے میں نہیں لگتا، جس کی بنا پر علم اُٹھتا جا رہا ہے، سب کے میدان میں نکلنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ میدان بھی ہاتھ سے گیا اور وہ گوشہ مدرسہ اور مسجد بھی ہاتھ سے گئی، یہ افراتفری نہیں ہونی چاہیے، موقع محل پر سوچ کر انسان کام کرے، جس طرح وہ کام اہم ہے کہ کسی باطل کے خلاف تحریک چلائی جائے، اسی طرح یہ کام بھی اہم ہے کہ علم کو محفوظ کرلیا جائے، اور دِین کی سمجھ پیدا کی جائے، سب کو کھینچ لینا ایسے ہی ہے کہ جیسے کوئی عمارت بنانے لگیں تو تقسیم کار ہے، کوئی اینٹیں اُٹھائے گا، کوئی گارا بنائے گا، کوئی اینٹیں چنے گا، کوئی باہر سے لائے گا ڈھوئے گا، کوئی مٹی لائے گا، یہ سارے مل کر اس طرح سے تقسیم کار کے ساتھ، کام کو تقسیم کرکے اگر چلیں گے تو عمارت اپنی صحیح رفتار کے ساتھ بنتی چلی جائے گی، اور اگر سارے کے سارے اینٹیں ہی پکڑ کے پہنچانے لگ جائیں، یا سارے گارا ہی بنانے لگ جائیں، تو اس طرح کام خراب ہوجاتا ہے، تو دینی ضرورتیں اور دنیوی ضرورتیں بھی اسی طرح تقسیم چاہتی ہیں کہ کچھ لوگ وہ کام کریں، اور کچھ لوگ یہ کام کریں، اس لیے پڑھنے پڑھانے والوں کے لئے اہم ہے کہ تحریکات میں عملاً حصہ نہ لیں، بلکہ ان کو چاہیے کہ اپنے مطالعے میں، تکرار میں، دِین کی سمجھ حاصل کرنے میں لگے رہیں، جس وقت کامل اور فاضل ہوجائیں، تو اس وقت میدان میں نکل کے قوم کی قیادت کریں، جس طرح سے چاہیں کریں، علم کے حاصل کرنے کے وقت اس قسم کے مشاغل ٹھیک نہیں، اور ان کا درجہ جہاد کے برابر ہے، اس لیے خلوت میں بیٹھنے والے، درس گاہوں میں بیٹھنے والے یہ نہ سمجھیں کہ ہم جہاد نہیں کررہے، یہ بھی جہاد کر رہے ہیں، دِین کی سمجھ حاصل کرنا، اور قوم کے لئے تبلیغ کے اسباب پیدا کرنا بہت بڑا جہاد ہے۔ تو یہاں یہی بات بیان کی گئی ہے کہ وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً: مؤمنوں کے لیے یہ مناسب نہیں، یعنی عام حالات میں کہ وہ سارے کے سارے ہی چلے جایا کریں، کوچ کرلیا کریں، فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ: کیوں نہیں جاتی ان کی بڑی جماعت میں سے ایک چھوٹی جماعت، لِيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ: تا کہ وہ جانے والے فقہ فی الدین حاصل کریں، یہ صورت اُس وقت صادق آئے گی جس وقت حضور ﷺ کے ساتھ سفر پر جائیں، یا تا کہ وہ باقی رہنے والے، یعنی ایک جماعت تو جہاد پر چلی جائے، اور باقی رہنے والے فقہ فی الدین حاصل کریں، لِيَتَفَقَّهُوْا کی ضمیر دونوں کی طرف لوٹ سکتی ہے،

---

(۱) مشکوۃ ص ۳۴ عن انس ؓ، کتاب العلم فصل ثانی/ترمذی ۹۳/۲، باب فضل طلب العلم

موقع محل کے مطابق یہ بات دونوں صورتوں میں صادق آسکتی ہے، کہ کوچ کر کے جانے والے فقہ فی الدین حاصل کریں تاکہ جب واپس آئیں تو اپنی قوم کو اَحکام شریعت سنائیں، یا کوچ کرنے والے جہاد کے لئے چلے جائیں اور باقی رہنے والے فقہ فی الدین حاصل کریں، سرورِ کائنات ﷺ کی موجودگی میں یہ دونوں صورتیں پیش آسکتی تھیں، کہ تفقہ فی الدین وہ جماعت حاصل کرتی جو آپ ﷺ کے ساتھ رہتی، اگر آپ جہاد پر گئے ہیں تو ساتھ جانے والے تفقہ فی الدین حاصل کریں، اور اگر آپ جہاد میں ساتھ نہیں گئے بلکہ اور جماعت بھیج دی تو پیچھے آپ کے ساتھ رہنے والے دین کی سمجھ حاصل کریں۔ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ: اور تاکہ یہ اپنی قوم کو ڈرائیں، اِنذار: ڈرانا۔ لیکن یہاں ڈرانا وہ مراد ہے جو شفقت کے ساتھ ہوتا ہے، ایک ڈرانا ہوتا ہے جیسے دشمن سے ڈرا دیا، سانپ بچھو سے ڈرا دیا، ایک ڈرانا تو یہ ہے، اور ایک ڈرانا ہوتا ہے جس طرح والدین اپنے بچے کو کسی غلط عادت کے نتیجے سے ڈراتے ہیں، بار بار سمجھائیں گے، شفقت کے ساتھ سمجھائیں گے، اس ڈرانے کے اندر شفقت شامل ہوتی ہے، اِنذار اصل کے اعتبار سے یہ ہے، محبت کے ساتھ اس کو بتاؤ کہ دیکھو! اگر یہ عادت اختیار کرو گے تو نتیجہ یہ نکلے گا، یہ تمہارے لیے نقصان دِہ ہے، یہ منصب اصل کے اعتبار سے انبیاء ﷺ کا ہے، اور علماء چونکہ ان کے جانشین ہیں تو یہی منصب ان کا بھی ہو جائے گا، اِذَا رَجَعُوْا اِلَيْهِمْ: جس وقت وہ ان کی طرف لوٹ کے آئیں لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ: تاکہ وہ لوگ بچیں، حذر اختیار کریں، اللہ کی نافرمانی اختیار نہ کریں۔ تو علم کے حصول کی اہمیت اس آیت کے اندر واضح کر دی گئی۔

ترتیبِ جہاد

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَاتِلُوا الَّذِيْنَ يَلُوْنَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ: اے ایمان والو! لڑائی کرو اُن کافروں کے ساتھ جو تمہارے قریب ہیں، یعنی ترتیب جہاد کی یہ رکھو، قریب یعنی مکان کے اعتبار سے، جن کی سرحدیں تمہارے ساتھ لگتی ہیں، پہلے تو قتال اُن کے ساتھ ہونا چاہیے، قریب والوں کو چھوڑ کے دُور والوں سے جاکے لڑو گے، تو اس میں بسا اوقات کامیابی کی بجائے خطرات زیادہ ہوتے ہیں، کہ جو پیچھے رہ جائیں گے جن کو چھوڑ کے آپ آگے نکل جائیں گے، تو وہ فتنہ کھڑا کر سکتے ہیں، اس لیے ترتیب ایسی ہونی چاہیے کہ جو قریب والے ہیں پہلے اُن کے ساتھ قتال ہو، جب وہ علاقے فتح ہوتے چلے جائیں، تو پھر آگے کو چلو، جیسا کہ حضور ﷺ کے زمانے میں بھی ایسے ہی ہوا، اور خلفائے راشدین کے زمانے میں بھی ایسے ہی ہوا۔ اور اسی طرح سے يَلُوْنَكُمْ سے مراد قُربِ نسبی بھی ہوسکتا ہے، کہ یہ نہیں کہ لڑنا صرف پرائیوں سے ہی ہے، اگر اپنے بھی سیدھے نہیں ہیں تو اُن کے ساتھ بھی لڑائی لڑو، اقرباء کی محبت میں مبتلا ہو کے ان سے جہاد کو ترک نہ کرو، یہ مؤمن کے لیے ایک بہت بڑا امتحان ہے، کہ اللہ کے نام پر اپنے اقرباء کے خلاف تلوار اُٹھالے، جس طرح صحابہ کرام ﷡ اس امتحان میں مبتلا ہوئے اور کامیاب رہے، اور اگر اپنے اقرباء کی محبت میں آکے اُن کے خلاف ڈنڈا نہیں اٹھاؤ گے تو یہ ایک کمزوری ہوگی، جب دو جماعتیں بن گئیں کافر اور مسلم، تو چاہے کوئی تمہارے قریبی ہیں، چاہے تمہارے بعید والے ہیں، اب کسی کا لحاظ نہیں ہے۔ وَلْيَجِدُوْا فِيْكُمْ غِلْظَةً: وہ تمہارے اندر سختی محسوس کریں، تمہارے اندر نرمی محسوس نہ کریں، اُن کو یقین آجانا چاہیے کہ اللہ والے اللہ کے نام پر جب اٹھتے ہیں، تو پھر یہ نہیں دیکھتے کہ کون ہمارا رشتہ دار ہے اور کون ہمارا

رشتہ دار نہیں ہے، جو کافر ہیں، اللہ تعالیٰ کے منکر ہیں، مشرک ہیں، اُن کے مقابلے میں اِن سب میں جذبات ایسے ہی ہیں، قریبوں کے مقابلے میں بھی اور دور والوں کے مقابلے میں بھی۔ تو یَلُوْنَ کے اندر یہ مفہوم بھی آ سکتا ہے، جس طرح سے تبلیغ میں بھی ترتیب یہی ہے کہ اَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ (سورۂ شعراء: ۲۱۴) اپنے قریب والے قبیلے کو ڈراؤ۔ سردرِ کائنات ﷺ نے جس وقت تبلیغ کی ابتداء کی تھی، تو روایات میں آتا ہے، ''مشکوۃ شریف'' میں بھی آئے گا، کہ رسول اللہ ﷺ نے اس آیت کے اُترنے کے بعد اپنے سارے خاندانوں کو آواز دے کر اکٹھا کیا صفا پہاڑی کے پاس، اور پہلے انہی کے سامنے دین پیش کیا، اور بنیاد اس بات سے اُٹھائی کہ مجھے بتاؤ کہ اگر میں یہ کہوں کہ اس پہاڑ کے پیچھے ایک لشکر ہے جو تم پر حملہ کرنا چاہتا ہے، تو تم میری بات مان لو گے؟ انہوں نے کہا کہ بالکل مانیں گے، ''مَا جَرَّبْنَا عَلَيْكَ اِلَّا صِدْقًا''[1] ہم تو آپ کو بار بار آزمائے بیٹھے ہیں، ہم نے تو آپ کے اندر سوائے سچائی کے کچھ دیکھا ہی نہیں، مطلب اُن کا یہ تھا کہ اگرچہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ اس پہاڑ کے پیچھے کچھ نہیں ہے، اس کے دامن میں کوئی حملہ کرنے والا لشکر نہیں ہے، لیکن اگر آپ ہمیں کہیں گے کہ یہاں کوئی لشکر ہے جو تمہارے اُوپر حملہ کرنا چاہتا ہے، تو ہم پھر بھی آپ کی تصدیق کر دیں گے، کیونکہ آپ سچ ہی بولتے ہیں جھوٹ نہیں بولتے۔ یہ گفتگو پہلے خاندان والوں کے ساتھ ہوئی تھی، پھر جس وقت آپ ﷺ نے آخرت یاد دِلائی، توحید کی دعوت دی تو پھر وہ بِدک گئے۔ تو آپ ﷺ نے ابتدا اپنے خاندان سے کی تھی، اپنے اَقربا سے کی تھی، اَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ: اپنے قریبی رشتہ داروں کو پہلے ڈراؤ۔ تو جس طرح سے انذار کی ابتدا اَقربا سے ہے، تو لڑائی اور جہاد بھی پہلے اَقربا کے ساتھ ہوگا، پہلے انہی کے ساتھ ہی اپنی کوشش صرف کرو، اور اس کے بعد آگے درجہ بدرجہ بات چلتی چلی جائے گی، تو يَلُوْنَكُمْ کے مفہوم میں دونوں باتیں آ سکتی ہیں، قربِ مکانی بھی اور قربِ نسبی بھی، ''لڑو ان کافروں کے ساتھ جو تمہارے قریب ہیں'' وَلْيَجِدُوْا فِيْكُمْ غِلْظَةً: اور چاہیے کہ تمہارے اندر وہ سختی محسوس کریں، وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ: اور اس بات پہ ہمیشہ یقین رکھو کہ اللہ تعالیٰ کی مدد متقین کے ساتھ ہے۔

نئی آیات کے نازل ہونے کے وقت منافقین کی حالت

وَاِذَا مَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ: اب یہ پھر منافقین کا تذکرہ ہے، آخر آخر میں پھر انہی کی بات کی جا رہی ہے، کہ جس وقت کوئی سورت اُترتی ہے، سورت سے قرآنِ کریم کی پوری سورت یا سورت کا حصہ دونوں مراد ہو سکتے ہیں، یعنی قرآنِ کریم کا کوئی ٹکڑا، آیات، ''جس وقت کوئی سورت اترتی ہے اور اُس کے اندر کچھ اَحکام ہوتے ہیں، کچھ مطالبے ہوتے ہیں تو ان میں سے بعض وہ ہے (مَن چونکہ لفظوں میں مفرد ہے تو يَقُوْلُ کی ضمیر مفرد لوٹ رہی ہے) جو کہتا ہے کہ کون ہے تم میں سے جس کو اس سورت نے بڑھا دیا ازروئے ایمان کے'' یہ کسی کی بات کا استہزا اور تحقیر کا ایک طریقہ ہے، کہ سن لو بھئی! کتنی اچھی بات کہہ دی، بتاؤ کس کو فائدہ ہوا اس بات کا؟ کیا مطلب؟ کہ کچھ نہیں، بس ایسے ہی ہے، کوئی ہے تم میں سے جس کے ایمان میں ان باتوں سے کچھ اضافہ ہوا ہو؟ یہ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اس میں کون سی بات ایسی تھی جو اُتار کے ہمارے سامنے بیان کر دی، یہ کون سے ایمان کے اضافے کی بات ہے،

(۱) بخاری ۲/ ۷۰۲۔ مشکوۃ ۲/ ۴۶۰ باب الانذار. واللفظ لہ نیز بخاری ۲/ ۷۴۳۔ مسلم ۱/ ۱۱۴۔ ولفظہ: مَا جَرَّبْنَا عَلَيْكَ كَذِبًا

اس طرح سے کہہ کے بات کا وزن ہلکا کیا جاتا ہے، صراحتاً تو وہ مخالفت نہیں کر سکتے تھے، لیکن اس قسم کی باتوں کے ساتھ اپنے دل کی بھڑاس نکالتے تھے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ مؤمنوں کے لیے تو ہر اُترنے والی سورت زیادۃِ ایمان کا باعث ہے، کیونکہ اس میں جو باتیں اُترتی ہیں، کسی میں شک وشبہ کا ازالہ ہوتا ہے، کسی میں کوئی نیا حکم آ گیا، کسی میں اللہ تعالیٰ نے کوئی اور بات واضح کر دی، جتنا سنتے جائیں گے مانتے جائیں گے اتنا ایمان بڑھتا چلا جائے گا، ایمان میں پختگی آتی چلی جائے گی، ایمان کا مزہ دوبالا ہوتا چلا جائے گا جتنا اللہ تعالیٰ کی باتیں سامنے آئیں گی۔ ایمان والوں کے دل میں تو یہ اترنے والی آیات ایمان کا اضافہ کرتی ہیں، اور جن کے دلوں میں پہلے ہی مرض ہے، اُن کے دل میں پہلے ہی پلیدی موجود ہوتی ہے، تو اور آیات جو آتی ہیں تو اس پلیدی کے ساتھ اور پلیدی کا اضافہ ہو جاتا ہے، یہ بالکل اسی طرح سے ہے جس طرح صاف ستھری زمین پر بارش ہو تو یہ بارش اُس کے لیے حیات کا باعث ہے کہ نباتات اُگے گی اور فائدہ ہوگا، اور اگر کوئی مردار مرا پڑا ہے تو اُس کے اوپر جتنی بارش ہوگی بدبو زیادہ پھیلے گی، گندگی کے اندر جتنی اس قسم کی چیز اتنا اس کے اندر اضافہ ہوتا ہے، تو یہ بھی جس وقت نئی سورت اترتی ہے، ان کے لیے انقباض کا باعث بنتی ہے، نئے اَحکام آتے ہیں، ان کی یہ تکذیب کرتے ہیں، تو اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کا کُفر دِن بہ دِن بڑھتا چلا جاتا ہے، نجاست پر نجاست چڑھتی چلی جاتی ہے، ان کا حال یہی ہے، اچھی غذاء کسی صحت مند کو دو تو دِن بہ دِن اُس کی صحت میں اضافہ ہوگا، قوت بڑھتی چلی جائے گا، اور اگر کوئی معدہ کا مریض ہے اور اُس کو اچھی اور مقوی غذاء کھلا دو تو وہی غذا اُس کے لیے موت کا باعث بھی بن سکتی ہے، اُس کی بیماری میں اضافہ ہو جائے گا، تو ایسے ہی اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے جو آیات اترتی ہیں، وہ مؤمن کے لیے تو ایمان کا اضافہ ہے، ان کے دل کے اندر تو اللہ کے ساتھ تعلق بڑھتا ہے، اور اُن کے ایمان میں قوت پیدا ہوتی ہے، لیکن جن کے دل کے اندر وہی شک والا مرض ہے، نفاق ہے اُن کی پلیدی پر پلیدی چڑھتی چلی جاتی ہے، مَاتُوْا وَهُمْ كٰفِرُوْنَ: مرجائیں گے اسی حال میں کہ وہ کافر ہوں گے، یہی بیماری ان کے لیے جان لیوا ثابت ہو جائے گی، موت تک ان کو ایمان نصیب نہیں ہوگا۔ تو قلب کے اندر صلاحیت ہو تو اللہ تعالیٰ کی آیات ایمان کا باعث بنیں گی، اور اگر قلب میں صلاحیت نہیں تو وہی آیات مزید کُفر کا باعث بن جاتی ہیں۔

منافقین آزمائش کے وقت رُجوع الی اللہ نہیں کرتے

آگے اُن کے حال پر ایک قسم کا تاسف ہے، کہ یہ دیکھتے نہیں کہ ان کو آزمائش میں ڈالا جاتا ہے ہر سال ایک مرتبہ یا دو مرتبہ، مختلف قسم کے واقعات ان پہ آتے ہیں جو ان کے لیے آزمائش بنتے ہیں، تو اگر ان کی فطرت سلیم ہوتی تو کسی واقعے میں یہ سمجھ جائیں کہ اللہ کی طرف سے ہمیں یہ سزا ہوگئی، اللہ کی طرف سے ہمیں امتحان میں ڈال دیا گیا، تو یہ سمجھنے کی کوشش کریں، لیکن یہ تو نہ اللہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں لَا يَتُوْبُوْنَ، کوئی واقعہ ان پر آتا چلا جائے، کسی قسم کی بات ہو جائے، آزمائش آ جائے، تو نہ یہ اللہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، اور نہ ہی یہ نصیحت حاصل کرتے ہیں۔ توبہ اصل کے اعتبار سے دل کا فعل ہے، اللہ کی طرف متوجہ ہو جانا، یہ دو لفظ جو آپ بولا کرتے ہیں توبہ اور استغفار، ان کے اندر فرق یہی ہے کہ استغفار زبان سے ہوتا ہے اور توبہ قلب سے ہوتی ہے۔ دل اللہ کی طرف متوجہ ہو جائے، اور زبان سے معافی مانگی جائے، جب یہ دو باتیں ہو جاتی ہیں، تو اس وقت انسان پوری طرح سے

اللہ کے سامنے نادم ہوگیا، اور پھر اللہ کی طرف سے گناہ کی معافی ہوجاتی ہے، قلب بھی متوجہ ہوگیا اور زبان سے اقرار بھی کرلیا، جس طرح سے ایمان ہے کہ دل سے تصدیق بھی ہوگئی، اور زبان سے اقرار بھی ہوگیا، اسی طرح سے قلب میں ندامت بھی آگئی، زبان سے اِستغفار بھی ہوگیا تو توبہ مکمل ہوگئی، تذکر عقل کے ساتھ ہوتا ہے کہ نصیحت حاصل کریں، جس کا مطلب یہ ہوگا کہ ان کا دل اور دِماغ دونوں ہی ماؤف ہیں، یہ واقعات جو انسان کو چونکانے کے لیے کافی ہوتے ہیں، ایک آدمی غفلت سے چلا جارہا ہے اور اس کو ٹھوکر لگتی ہے تو عقل مند آدمی فوراً سمجھ جاتا ہے، اور سمجھتا ہے کہ یہ میری غفلت کا نتیجہ ہے، آئندہ میں آنکھ کھول کے اور دیکھ کے چلوں، کہیں پھر ٹھوکر نہ لگ جائے، سمجھ دار آدمی تو یوں کرتا ہے، ہر ٹھوکر پر اس کی عقل چمکتی ہے اور وہ چوکنا ہوجاتا ہے آئندہ چلنے کے لئے، لیکن جس نے اپنے دِل دِماغ کے پیچھے لٹھ ہی اُٹھا رکھی ہے، اور ان کی صلاحیتیں برباد کر رکھی ہیں، تو ٹھوکر چھوڑو، وہ گڑھے میں بھی گرتے جائیں انہوں نے پھر بھی آنکھیں بند کر کے ہی چلنا ہے، اِن کا حال ایسے ہی ہے، کہ واقعات اِن کے اوپر آتے ہیں، اگر یہ سنبھلنا چاہیں تو سنبھل سکتے ہیں، اگر یہ عقل حاصل کرنا چاہتے تو یہ واقعات ان کو سمجھانے کے لئے اور چونکانے کے لئے کافی ہیں، لیکن نہ ان کے دِل ٹھیک ہیں نہ ان کے دِماغ ٹھیک ہیں، نہ یہ اللہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں نہ توبہ کرتے ہیں اور نہ یہ کوئی نصیحت حاصل کرتے ہیں۔

اچھی مجالس سے منافقین کی بیزاری کا عجیب عالم

اور نیک باتوں سے ان کی بیزاری ایسی ہے، کہ جس وقت کوئی سورت اُترتی ہے (اس بات کو ذرا سمجھ لیجئے!) کسی مجلس کے اندر آپ بیٹھے ہوں، اور وہاں آپ کی مرضی کے خلاف کچھ باتیں ہونے لگ جائیں، یا کوئی اس قسم کا مطالبہ شروع ہوجائے، یہ آپ نے دیکھا ہوگا، کتنی واضح مثال ہے کہ یہ ہمارے تبلیغی جماعت والے لوگوں کو مسجد میں اکٹھا کر لیتے ہیں، وعظ ونصیحت کرتے ہیں، لیکن بعض لوگ پھنسے پھنسائے آجاتے ہیں، اور جس وقت اِن کی طرف سے چلنے کا مطالبہ شروع ہوتا ہے، تو اُن لوگوں کے دِل دِماغ پہ بڑا ناگوار گزرتا ہے، تو جس وقت وہ اس قسم کی بات کرتے ہیں، تو وہ کتنی اچھی بات ہے، کتنی اچھی بات کی دعوت دیتے ہیں، لیکن جن کی مرضی کے خلاف ہے وہ ایک دوسرے کی طرف یوں جھانکیں گے کہ چلیں، (جیسے کسی کو آنکھ سے اُٹھ جانے کا اشارہ ہوتا ہے)، یہ آنکھوں آنکھوں میں بات ہوجاتی ہے، کہتے ہیں نا!:

میانِ عاشق ومعشوق رمزیست کہ کراماً کاتبین را ہم خبر نیست

آنکھوں آنکھوں میں بہت باتیں ہوجایا کرتی ہیں۔ تو یہ آنکھوں آنکھوں میں بات کرتے ہیں اور بات کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی دیکھتے ہیں، کہ جس کی وجہ سے ہم آئے ہیں وہ ہمیں دیکھ تو نہیں رہا، کہیں وہ محسوس کرلے کہ اس موقع پر یہ کھسک گئے تھے، اور بعد میں ہمیں کوئی الزام دے، تو یہ ساری کی ساری بات آنکھوں آنکھوں میں طے کر کے ایک دوسرے کی طرف جھانک کے آہستہ سے کھسک جاتے ہیں۔ یہ بھی اسی طرح تھے، حضور ﷺ کی مجلس میں بیٹھے ہوتے، کوئی سورت اترتی جس میں اللہ کے راستے میں خرچ کرنے کا مطالبہ ہوتا، جہاد کا مطالبہ ہوتا، یا رسول اللہ ﷺ کسی جماعت کو ممتاز کرنا چاہتے جس کو کسی جہاد پر بھیجنا

ہوتا، تو یہ سمجھتے کہ کہیں یہ ذمہ داری ہم پہ نہ آجائے، ہم سامنے نہ آجائیں، ہم پر یہ ذمہ داری نہ ڈال دی جائے، تو یوں آپس میں ایک دوسرے سے آنکھیں لڑاتے ہیں، آنکھوں آنکھوں میں بات کر کے، (هَلْ يَرٰىكُمْ مِّنْ اَحَدٍ یہ آنکھوں کی بات ہے، زبان کی نہیں) ایک دوسرے کی طرف جھانکتے کہ کہیں تمہیں کوئی دیکھ تو نہیں رہا، تو جس وقت آپس میں طے ہو جاتا ہے کہ کوئی نہیں دیکھ رہا، اُن کی توجہ دوسری طرف ہے تو ثُمَّ انْصَرَفُوْا: پھر اٹھ کے آہستہ سے کھسک جاتے ہیں۔ قرآنِ کریم میں دوسری جگہ ان کے اس طرزِ عمل کو ان لفظوں سے ذکر کیا گیا ہے، سورۂ نُور کے آخر میں آئے گا، يَتَسَلَّلُوْنَ مِنْكُمْ لِوَاذًا: ایک دوسرے کی اُوٹ لے کے، ایک دوسرے کے پیچھے چھپتے چھپتے مجلس سے کھسک جاتے ہیں۔ آپ اگر اپنی مجلسوں میں دیکھیں گے تو اس قسم کے افراد اب بھی آپ کی آنکھوں کے سامنے آسکتے ہیں، کہ جب کوئی بات اُن کی مرضی کے خلاف ہوتی ہے، یا کسی قسم کا مطالبہ شروع ہو جاتا ہے، تو جو ایک مسلک کے ہوتے ہیں وہ آنکھوں آنکھوں میں معاملہ اور پروگرام طے کر لیتے ہیں، طے کرنے کے بعد ایک ایک کر کے چھپ چھپا کے ایک دُوسرے کی اوٹ میں نکلنا شروع کر دیتے ہیں، تو یہی ان منافقوں کا حال ہے، کہ آپ کی مجلس میں آتے ہیں، مؤمن تو آپ کی طرف متوجہ ہو کے بیٹھیں گے، دل کے دروازے کھول کے بیٹھیں گے، تاکہ باتیں سیدھی دل میں جائیں، لیکن یہ ایسے ہیں کہ جب کوئی بات ان کی مرضی کے خلاف ہوتی ہے، تو یہ ایک دوسرے کے ساتھ آنکھیں لڑاتے ہیں اور بچ بچا کے مجلس سے نکل جاتے ہیں، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ کیا اٹھ کے گئے صَرَفَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ: اللہ نے ان کی قلوب کو ہی چکر دے دیا، ان کے دِلوں کو ہی پھیر دیا، اس وجہ سے کہ یہ سمجھ دار نہیں ہیں، ان کی یہ حرکتیں بہت بے سمجھی کی ہیں، یہ دیکھتے ہی نہیں کہ ہمیں ہمارے نفع کی طرف بُلایا جا رہا ہے یا نقصان کی طرف بلایا جا رہا ہے، بس اپنی شہوات پہ چلنے والے ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کو ہی پلٹا دے دیا۔

سَرورِ کائنات ﷺ کے منصب کی وضاحت اور منافقین کی بے اِعتنائی

سورت کے آخر میں حضور ﷺ کا منصب واضح کیا جا رہا ہے، تاکہ آپ ﷺ کے ساتھ عقیدت اور محبت ہو، اور اس عقیدت اور محبت کی بنا پر پھر اطاعت آسان ہو جائے، منافقین کا جذبہ تو یہ تھا کہ وہ اللہ کے رسول کو اپنے لیے ایک مصیبت سمجھتے تھے نعوذ باللہ! کہ یہ آگئے، آئے دن کبھی کوئی مطالبہ کر لیتے ہیں، کبھی کوئی مطالبہ کر لیتے ہیں، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ اللہ کا بہت بڑا احسان ہے جو اللہ نے تم پر کیا ہے، اس نعمت کی قدر پہچانو، یہ ہر وقت تمہارے نفع کی باتیں کرتے ہیں، تمہارے نفع کے بارے میں حریص ہیں، تم کسی مشقت میں پڑو، یہ ان کو بڑا ناگوار گزرتا ہے، اس قسم کے خیر خواہ اور اس قسم کے دل سوزی کرنے والے کو اگر انسان یہ سمجھے کہ یہ ہمارے لیے مصیبت ہے، تو اس سے زیادہ بدبختی اور کیا ہو سکتی ہے؟ یہ منافقین کے جذبات کے خلاف بات کہی جا رہی ہے، تاکہ آپ ﷺ کے منصب کو پہچانیں اور منصب کو پہچاننے کے بعد آپ کی اطاعت کریں۔ ''تمہارے پاس رسول آگیا تمہی میں سے ہی'' جو جنسِ بشر میں سے ہے، تمہی میں سے ہے، عربوں میں سے ہے، جس کی عادات اور حالات سے تم اچھی طرح واقف ہو، اور ایسے کے ساتھ مانوس ہونا اور عقیدت لگانا آسان ہوتا ہے، عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ: تمہارا مشقت میں پڑنا اسے بہت گراں گزرتا ہے، اتنا ہمدرد اور خیر خواہ ہے، کہ مشقت میں تم پڑتے ہو، کوئی تکلیف تمہیں پیش آنے والی ہے، اور ناگواری انہیں گزر

رہی ہے، بوجھ ان کے اوپر پڑ رہا ہے، جس طرح سے رسول اللہ ﷺ نے مثال بیان فرمائی کہ میرا حال تو اسی طرح سے جیسے کسی شخص نے آگ جلائی اور آگ جلانے کے بعد پتنگے اُس میں گر رہے ہیں، اور وہ شخص پکڑ پکڑ کے اُن کو بچاتا ہے کہ تم آگ میں نہ گرو، ایسے ہی میں تمہیں سمجھاتا ہوں اور تم دوڑ دوڑ کے آگ کی طرف جاتے ہو،[1] حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ: تمہارے نفع کے لیے بڑا حریص ہے، یعنی ہر وقت فکر رکھتے ہیں کہ تمہیں نفع کی طرف لے جائیں، تمہارے بھلے کی فکر کرتے ہیں، ''خصوصیت سے مؤمنوں کے ساتھ بہت ہی نرمی کرنے والے اور بہت ہی رحم کرنے والے ہیں'' یہ خطاب تو اُن کو کیا، کہ تمہیں چاہیے کہ ایسے رسول کی قدر کرو۔ اور آگے رسول اللہ ﷺ کو کہہ دیا گیا کہ اگر یہ پیٹھ پھیریں، اور آپ کی بات یہ نہ مانیں، آپ کی طرف متوجہ نہ ہوں، تو آپ کو پروا کرنے کی ضرورت نہیں، ''آپ کہہ دیجئے کہ میرے لیے اللہ ہی کافی ہے، اُس کے علاوہ کوئی معبود نہیں، اُسی پر میں نے بھروسا کیا، اور وہ عرشِ عظیم کا رب ہے۔'' تو آپ انہیں یہ کہہ دیجئے تاکہ ان کو پتا چل جائے کہ اگر ہم ان کی پروا نہیں کرتے تو یہ بھی ہماری پروا نہیں کرتے۔

نزول کے اعتبار سے آخری آیات

لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ سے لے کر آخر تک یہ آیات نزول کے اعتبار سے سب سے آخری آیات ہیں (جلالین)، جیسے بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے بعد پھر کوئی اور آیات نہیں اُتریں۔ تو یہ آخری آخری آیات ہیں جن میں سرورِ کائنات ﷺ کے منصب کو واضح کیا گیا، اور پھر یہ جو آخری الفاظ ہیں حَسْبِيَ اللّٰهُ ۖ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ اس کی فضیلت بھی حدیث شریف میں بہت آتی ہے، حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کی روایت ہے، اور ابوداؤد میں مذکور ہے کہ جو شخص صبح وشام ان الفاظ کو سات دفعہ پڑھتا رہے، اللہ تعالیٰ اس کے تمام ہموم وغموم کے لیے کافی ہوجاتے ہیں،[2] یعنی یہ غم کے حالات جس قسم کے انسان کو پیش آتے ہیں، تو اللہ تعالیٰ کافی ہوجاتے ہیں، دِل کو قوت حاصل ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف اسباب موافق ہوجاتے ہیں، پھر انسان پریشان نہیں ہوتا۔ تو یہ چھوٹے چھوٹے وظیفے جن کے اس قسم کے اثرات ذکر کیے گئے ہیں، ان کو اپنی عادت میں رکھو۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

---

(۱) بخاری ۲/ ۹۶۰، باب الانتہاء عن المعاصی/ مسلم ۲/ ۲۴۸، باب شفقتہ علی امتہ/ مشکوٰۃ ۱/ ۲۷، باب الاعتصام، فصل اول، عن ابی ہریرۃ۔

(۲) سنن ابی داؤد ۲/ ۳۳۷، کتاب الادب، باب ما یقول اذا اصبح۔

سُورَةُ يُونُسَ
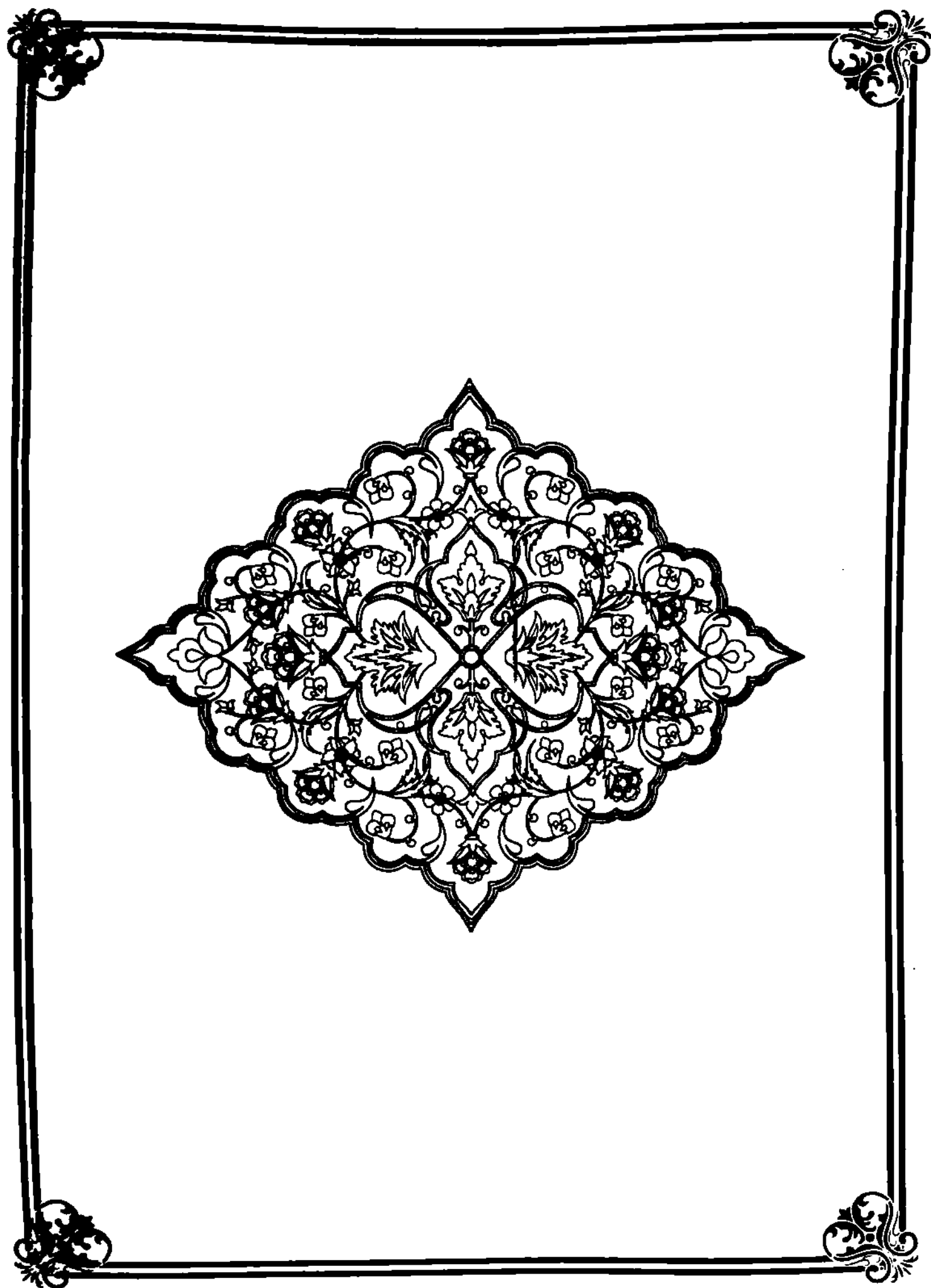
اٰيَاتُهَا ۱۰۹ ۱۰ سُوْرَةُ يُوْنُسَ مَكِّيَّةٌ ۵۱ رُكُوْعَاتُهَا ۱۱

سورۂ یونس مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی ایک سونو آیتیں، گیارہ رُکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

الٓرٰ ۚ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ ۝۱ اَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا اَنْ اَوْحَيْنَآ اِلٰى رَجُلٍ مِّنْهُمْ

الٓرٰ۔ یہ حکمت والی کتاب کی آیتیں ہیں ۝۱ کیا لوگوں کے لئے باعث تعجب ہے یہ بات کہ ہم نے وحی کی ان میں سے ایک آدمی کی طرف

اَنْ اَنْذِرِ النَّاسَ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ عِنْدَ

یہ بات کہ ڈراتو لوگوں کو اور بشارت دے ان لوگوں کو جو ایمان لے آئے اس بات کی کہ ان کے لئے اچھا مرتبہ ہے ان کے رَبّ

رَبِّهِمْ ۗ قَالَ الْكٰفِرُوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ مُّبِيْنٌ ۝۲ اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ

کے پاس، کافروں نے کہا کہ بے شک یہ آدمی البتہ صریح جادوگر ہے ۝۲ بے شک تمہارا رَبّ وہ اللہ ہے جس نے پیدا کیا آسمانوں

وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ ۗ مَا مِنْ شَفِيْعٍ اِلَّا

اور زمین کو چھ دِن میں پھر اس نے قرار پکڑا عرش پر، ہر کام کا انتظام کرتا ہے، کوئی سفارش کرنے والا نہیں مگر

مِنْ بَعْدِ اِذْنِهٖ ۗ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ۗ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۝۳ اِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ

اس کی اجازت کے بعد، یہی اللہ تمہارا رَبّ ہے پس اسی کی عبادت کرو، کیا تم نصیحت حاصل نہیں کرتے؟ ۝۳ اسی کی طرف تم سب کا

جَمِيْعًا ۗ وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا ۗ اِنَّهٗ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ لِيَجْزِيَ

لوٹنا ہے، یہ اللہ تعالیٰ نے سچا وعدہ کیا ہے، بے شک وہ شروع کرتا ہے پیدا کرنا پھر وہی اس پیدا کرنے کا اعادہ کرے گا تا کہ بدلہ دے

الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ بِالْقِسْطِ ۗ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَهُمْ شَرَابٌ

ان لوگوں کو جو ایمان لے آئے اور انہوں نے نیک عمل کیے انصاف کے ساتھ، اور وہ لوگ جنہوں نے کُفر کیا ان کے لئے مشروب ہے

مِّنْ حَمِيْمٍ وَّعَذَابٌ اَلِيْمٌ بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ ۝۴ هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَآءً وَّالْقَمَرَ

گرم پانی سے اور دردناک عذاب ہے بسبب اس کے کہ وہ کُفر کرتے تھے ۝۴ اللہ وہی ہے جس نے سورج کو روشن بنایا اور چاند کو

نُوْرًا وَّقَدَّرَهٗ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَالْحِسَابَ ۭ مَا خَلَقَ اللّٰهُ ذٰلِكَ اِلَّا بِالْحَقِّ

نُورانی بنایا اور بنایا اس کی چال کو مختلف منزلیں تاکہ تم جان لو سالوں کی گنتی اور حساب، نہیں پیدا کیا اللہ نے یہ سب کچھ مگر حق کے ساتھ

يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝۵ اِنَّ فِي اخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَمَا

کھول کے بیان کرتا ہے آیات ان لوگوں کے لئے جو علم رکھتے ہیں ۝۵ بے شک رات اور دِن کے اختلاف میں اور ان چیزوں میں جو

خَلَقَ اللّٰهُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَّقُوْنَ ۝۶ اِنَّ الَّذِيْنَ لَا

اللہ نے پیدا کیں آسمانوں میں اور زمین میں البتہ نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو کہ تقویٰ اختیار کرتے ہیں ۝۶ بے شک وہ لوگ جو نہیں

يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا وَرَضُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَاطْمَاَنُّوْا بِهَا وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنْ اٰيٰتِنَا

اُمید رکھتے ہماری ملاقات کی اور راضی ہوگئے وہ دنیوی زندگی کے ساتھ اور اسی پر وہ مطمئن ہوگئے اور وہ لوگ جو کہ ہماری آیات

غٰفِلُوْنَ ۝۷ اُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمُ النَّارُ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝۸ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا

سے غافل ہیں ۝۷ یہی وہ لوگ ہیں جن کا ٹھکانا جہنم ہے بسبب ان کاموں کے جو یہ کرتے تھے ۝۸ بے شک جو لوگ ایمان لے آئے

وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ يَهْدِيْهِمْ رَبُّهُمْ بِاِيْمَانِهِمْ ۚ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمُ

اور انہوں نے نیک عمل کیے ان کا رَبّ ان کو ان کے ایمان کی برکت سے منزلِ مقصود تک پہنچائے گا، ان کے نیچے سے نہریں جاری

الْاَنْهٰرُ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ۝۹ دَعْوٰىهُمْ فِيْهَا سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ وَتَحِيَّتُهُمْ

ہوں گی خوش حالی کے باغات میں ۝۹ ان کی پکار ان باغات میں یہ ہوگی کہ اے اللہ! تُو پاک ہے، اور ان کا آپس میں تحیہ

فِيْهَا سَلٰمٌ ۚ وَاٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝۱۰

ان باغات کے اندر سلام ہوگا اور ان کی دُعا کا آخر یہ ہوگا کہ سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جو رَبّ العالمین ہے ۝۱۰

خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ سورۂ یونس مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی ایک سو نو آیتیں، گیارہ رکوع ہیں۔ الٓرٰ: حروفِ مقطعات ہیں، "اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِمُرَادِهٖ بِذٰلِكَ" ان حروف سے اللہ کی جو مراد ہے وہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ: حکیم: ذُو حکمت۔ یہ حکمت والی کتاب کی آیتیں ہیں، اَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا اَنْ اَوْحَيْنَآ اِلٰى رَجُلٍ مِّنْهُمْ: اَنْ اَوْحَيْنَآ اِلٰى رَجُلٍ

مِّنْهُمْ، یہ اَنْ مصدر یہ ہے، مابعد والے فعل کو مصدر کی تاویل میں کر کے کَانَ کا اسم بنا دے گا۔ اور عَجَبًا یہ کَانَ کی خبر ہے۔ لِلنَّاسِ یہ عَجَبًا کے متعلق ہے۔ اَنْ اَنْذِرِ النَّاسَ: بِاَنْ اَنْذِرِ النَّاسَ یہ اَوْحَیْنَآ کے متعلق ہے، یا، اَنْ اَنْذِرِ النَّاسَ والا جملہ مصدر کی تاویل میں ہو کر اَوْحَیْنَآ کا مفعول ہو جائے گا، "ہمارا وحی کرنا ان میں سے کسی آدمی کی طرف، یہ مضمون وحی کرنا کہ ڈرا تو لوگوں کو اور بشارت دے ان لوگوں کو جو ایمان لے آئے اس بات کی کہ ان کے لئے اچھا مرتبہ ہے ان کے رَبّ کے پاس، کیا ہمارا یہ وحی کرنا لوگوں کے لئے باعثِ تعجب ہے؟" سارے لفظ آ گئے۔ "کیا لوگوں کے لئے باعثِ تعجب ہے یہ بات کہ ہم نے وحی کی ان میں سے ہی کسی آدمی کی طرف یہ بات یعنی وحی کی یہ بات کہ ڈرا تو لوگوں کو اور بشارت دے ان لوگوں کو جو ایمان لے آئے، بشارت اس بات کی کہ ان کے لئے اچھا مرتبہ ہے ان کے رَبّ کے پاس، تو یہ بات ان کے لئے کوئی باعثِ تعجب ہے؟ حیرانی کا باعث ہے؟ قَدَمَ صِدْقٍ: قدم کا معنی تو یہی ہے جو انسان کا ایک عضو ہے، لیکن یہ عضو جسے ہم قدم کہتے ہیں یہ آگے بڑھنے کا ذریعہ ہے، جب انسان چلتا ہے تو انہی قدموں کے ساتھ آگے بڑھتا ہے، یہ تقدم کا ذریعہ ہے، اس لئے قدم بول کر یہاں عالی مرتبہ مراد ہے، اور قَدَمَ صِدْقٍ: اچھا مرتبہ، جس کا حاصل ہونا یقینی ہے، جو اعلیٰ ہے، لازوال ہے، صدق کے اندر یہ سارے مفہوم ہیں۔ قَدَمَ صِدْقٍ کے اندر موصوف کی اضافت صفت کی طرف ہے، اور یہ ترکیب قرآنِ کریم میں کئی جگہ آئی ہے۔ فِیْ مَقْعَدِ صِدْقٍ یہ ترکیب بھی ہے ایک جگہ (القمر: ۵۵)، اجْعَلْ لِّیْ لِسَانَ صِدْقٍ فِی الْاٰخِرِیْنَ (سورۂ شعراء: ۸۴) تو اس میں لِسَانَ صِدْقٍ۔ مُبَوَّاَ صِدْقٍ (یونس: ۹۳)۔ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ۔ اَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ (سورۂ اسراء: ۸۰) یہ سارے کے سارے الفاظ اسی طرح سے ہی ہیں۔ قَدَمَ صِدْقٍ: ان کے لئے اچھا مرتبہ ہے ان کے رَبّ کے پاس۔ قَالَ الْکٰفِرُوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ مُّبِیْنٌ: کافروں نے کہا بے شک یہ (هٰذَا کا اشارہ اِلٰی رَجُلٍ مِّنْهُمْ میں جو رجل کا ذکر آیا تھا اس کی طرف ہے) کافروں نے کہا کہ بے شک یہ آدمی البتہ صریح جادوگر ہے۔ مُّبِیْنٌ کے معنی بیّن، واضح۔ واضح قسم کا جادوگر ہے جس کے جادوگر ہونے میں کوئی کسی قسم کا خفاء نہیں۔ اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ: بے شک تمہارا رَبّ وہ اللہ ہے جس نے پیدا کیا آسمانوں کو اور زمین کو چھ دن میں، ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ: پھر اس نے قرار پکڑا عرش پر، یُدَبِّرُ الْاَمْرَ: امر کی تدبیر کرتا ہے، ہر کام کا انتظام کرتا ہے، مَا مِنْ شَفِیْعٍ: کوئی سفارش کرنے والا نہیں، اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اِذْنِهٖ: مگر اس کی اجازت کے بعد، ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ: یہی اللہ تمہارا رَبّ ہے، فَاعْبُدُوْهُ: پس اسی کی عبادت کرو، اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ: کیا تم نصیحت حاصل نہیں کرتے، تم سوچتے نہیں؟ اِلَیْهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِیْعًا: اسی کی طرف تم سب کا لوٹنا ہے، وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا: یہ اللہ تعالیٰ نے سچا وعدہ کیا ہے۔ وَعَدَ اللّٰهُ وَعْدًا حَقًّا اصل میں یہ ترکیب یوں ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ نے یہ سچا پکا وعدہ کیا ہے، جو واقع کے مطابق ہے، ایسا ہو کے رہے گا۔ اِنَّهٗ یَبْدَؤُا الْخَلْقَ: بے شک وہ شروع کرتا ہے پیدا کرنا۔ خلق: پیدا کرنا۔ یَبْدَؤُا: شروع کرتا ہے۔ جس کا مفہوم یہ ہوگا کہ ابتداءً وہی پیدا کرتا ہے۔ ثُمَّ یُعِیْدُهٗ: "ہ" کی ضمیر خلق کی طرف لوٹ گئی، ثم یعید الخلق، پھر وہی اس پیدا کرنے کا اعادہ کرے گا، "اسی نے پیدا کرنے کی ابتدا کی، وہی اعادہ کرے گا" لِیَجْزِیَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا: تاکہ بدلہ دے ان لوگوں کو جو ایمان لے آئے، وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ: اور انہوں نے نیک عمل کئے بِالْقِسْطِ: انصاف کے ساتھ، انصاف کے ساتھ بدلہ دے، وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا: اور وہ لوگ جنہوں

نے کُفر کیا، لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِيْمٍ: شراب: پینے کی چیز، مشروب۔ مِّنْ حَمِيْمٍ اس کا بیان ہے۔ حمیم: گرم پانی۔ ''ان کے لئے پینے کے لئے گرم پانی ہے، ان کے واسطے شراب ہے گرم پانی سے، ان کے لئے شراب ہے یعنی گرم پانی''، وَّعَذَابٌ اَلِيْمٌ: اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے، بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ: بسبب اس کے کہ وہ کُفر کرتے تھے۔ هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَآءً وَّالْقَمَرَ نُوْرًا: ضیاء بھی روشنی کو کہتے ہیں اور نُور بھی روشنی کو کہتے ہیں، لیکن ''ضیاء'' کے اندر چمک اور گرمی ہوتی ہے، اور ''نُور'' میں اتنی چمک نہیں ہوتی اور گرمی بھی نہیں ہوتی بلکہ ٹھنڈک ہوتی ہے، اس طرح سے دونوں کے درمیان میں فرق ہوجائے گا۔ ''اللہ وہی ہے جس نے سورج کو روشن بنایا اور چاند کو نُورانی بنایا'' وَّقَدَّرَهٗ مَنَازِلَ: قَدَّرَهٗ اَيْ قَدَّرَ سَيْرَهٗ، اور چاند کی چال کو مختلف منزلیں بنایا، بنایا اس کی چال کو مختلف منزلیں، لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَالْحِسَابَ: تا کہ تم جان لو سالوں کی گنتی اور تا کہ تم جان لو حساب۔ مَا خَلَقَ اللّٰهُ ذٰلِكَ اِلَّا بِالْحَقِّ: نہیں پیدا کیا اللہ تعالیٰ نے یہ سب کچھ (ذٰلِكَ کا اشارہ المذکور کی طرف) نہیں پیدا کیا اللہ تعالیٰ نے یہ سب کچھ مگر حق کے ساتھ، مصلحت کے ساتھ، حکمت کے ساتھ، يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ: کھول کے بیان کرتا ہے آیات لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ: ان لوگوں کے لئے جو علم رکھتے ہیں۔ اِنَّ فِي اخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ: بے شک رات اور دِن کے اختلاف میں، وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ: اور ان چیزوں میں (وَمَا کا عطف اخْتِلَافِ کے اوپر ہے) اور ان چیزوں میں جو اللہ نے پیدا کیں آسمانوں میں اور زمین میں، لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَّقُوْنَ: البتہ نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو کہ تقویٰ اختیار کرتے ہیں، ڈرتے ہیں، اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا: بے شک وہ لوگ جو نہیں اُمید رکھتے ہم سے ملاقات کرنے کی۔ رَجاء: اُمید کرنا۔ ان کو ہماری ملاقات کا کوئی اندیشہ نہیں، کوئی کھٹکا ہی نہیں، ''بے شک وہ لوگ جو نہیں اُمید رکھتے ہماری ملاقات کی'' وَرَضُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا: اور راضی ہوگئے خوش ہوگئے وہ دُنیوی زندگی کے ساتھ، وَاطْمَاَنُّوْا بِهَا: اور اسی دُنیوی زندگی پر وہ مطمئن ہوگئے، وَرَضُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا: خوش ہیں وہ دُنیوی زندگی سے، کسی اور چیز کی ان کو طلب نہیں رہی، وَاطْمَاَنُّوْا: بالکل مطمئن ہوگئے، کسی دُوسری زندگی کا انہیں کھٹکا نہیں رہا، وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنْ اٰيٰتِنَا غٰفِلُوْنَ: اور وہ لوگ جو کہ ہماری آیات سے غافل ہیں، اُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمُ النَّارُ: یہی وہ لوگ ہیں جن کا ٹھکانا جہنم ہے، بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ: بسبب ان کاموں کے جو یہ کرتے تھے۔ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ: بے شک وہ لوگ جو ایمان لے آئے اور انہوں نے نیک عمل کئے، يَهْدِيْهِمْ رَبُّهُمْ بِاِيْمَانِهِمْ: اللہ تعالیٰ ان کو ان کے ایمان کی برکت سے منزلِ مقصود تک پہنچائے گا۔ یہاں ''ہدایت'' ایصال الی المطلوب کے معنی میں ہے۔ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ: ان کے نیچے سے نہریں جاری ہوں گی، ان کے نیچے سے یعنی ان کے مساکن کے نیچے سے، ان کے محلات کے نیچے سے نہریں جاری ہوں گی، فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ: خوش حالی کے باغات میں، دَعْوٰىهُمْ فِيْهَا سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ: ان کی دُعا، ان کی پکار ان باغات میں سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ ہوگی، اے اللہ! تُو پاک ہے، وَتَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ: اور ان کی آپس میں ایک دوسرے کو دُعا ان باغات کے اندر سلام ہوگا، آپس میں تحیہ سلام ہوگا، تحیہ اصل میں تَحْيِيَة ہے، اس کا اصل مفہوم ہوا کرتا ہے کسی کو ''حَيَّاكَ الله'' کہنا کہ اللہ تعالیٰ تجھے زندہ رکھے، کسی کے لئے زندگی کی دُعا دینا، تو پہلے لوگ جو آپس میں ملا کرتے تھے تو ایک دوسرے کے لئے ایسی دُعائیں دیا کرتے تھے جیسے آج کل بھی رواج ہے جس وقت ملاقات ہوتی ہے تو اسلامی طریقے کے مطابق انسان السلام علیکم بھی کہتا ہے

اور پھر ساتھ ہی ایک دوسرے کے لئے دُعائیں بھی ہوتی ہیں، وَ تَحِیَّتُہُمْ فِیْہَا سَلٰمٌ: اور ان کا آپس میں تحیہ ان باغات کے اندر سلام ہوگا۔ وَاٰخِرُ دَعْوٰىہُمْ: اور ان کے دعویٰ کا آخر، ان کی دُعا کا آخر یہ ہوگا اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ: سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جو ربّ العالمین ہے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

تفسیر

مکی سورتوں کے مضامین اور سورۂ یونس کا موضوعِ سخن

یہ سورت مکی ہے جس طرح سے ابتدا کے اندر مذکور ہوا، اور آپ کی خدمت میں یہ بات بارہا ظاہر کی جاچکی ہے کہ مکی سورتوں میں اَحکامِ عملیہ کم ہیں، ان میں زیادہ تر بحث عقائد پر ہوتی ہے، کیونکہ مکہ معظمہ میں زیادہ تر زور عقیدوں پر ہی دیا گیا ہے، اور عقیدے کے ساتھ ہی انسان کُفر سے نکل کر اسلام میں آتا ہے، اعمال کا درجہ تو بعد میں ہے، زیادہ تر اَحکام مدنی زندگی میں جا کے آئے ہیں، جس وقت ایک اسلامی معاشرہ قائم ہوگیا اور اسلام کے ساتھ ایک جماعت متشکل ہوگئی، مکی سورتوں میں زیادہ تر عقائد کا ذِکر ہے۔ بنیادی عقائد جن کے ساتھ ایک شخص مسلمان ہوتا ہے وہ تین ہی ہیں توحید، رِسالت اور معاد۔ توحید: اللہ کو یکتا جاننا، اس کی ذات وصفات میں کسی دوسرے کو شریک نہ کرنا، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والے رسولوں پر ایمان لانا اور قرآنِ کریم کے نزول کے وقت خصوصیت کے ساتھ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کا رسول ماننا، کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اللہ کی مرضیات کے ترجمان ہیں، جو کچھ یہی کہیں گے وہی مانا جائے گا، اپنی عقل کے ساتھ یا کسی دوسرے ذریعے سے اللہ تعالیٰ کے متعلق کوئی بات نہیں بنائی جاسکتی۔ اور تیسرا بنیادی عقیدہ جس کے ساتھ انسان مسلمان ہوتا ہے وہ ہے ''معاذ'' کا یعنی لوٹنے کا، کہ مرنے کے بعد دوبارہ پھر زندگی کی طرف لوٹنا ہے، یہ ہے ''معاذ'' کا حاصل۔ یہ تین عقیدے ہیں جن کے اُوپر مذہب کی بنیاد رکھی گئی ہے، اور ان تینوں کے اختیار کرنے کے ساتھ ایک آدمی کُفر کی طرف سے نکل کر اسلام میں آتا ہے۔ تو مکی سورتوں میں انہی عقیدوں کے متعلق ہی ذکر آیا ہے، اور یہ تینوں ہی عقیدے ایسے تھے جو مشرکین کے لئے محلِ اِشکال تھے، وہ نسل درنسل شرک کے عادی تھے، اس لیے جب توحید کا تذکرہ ان کے سامنے آتا تو اس پر بھی وہ بدکتے تھے، اور یہ بات ان کے ذہن میں ہی نہیں آتی تھی کہ اللہ تعالیٰ کسی انسان کو، ہم جیسے کسی بندے کو، رَجل کو اپنا نمائندہ بنا کے بھیج دے، یہ بات ان کے فہم میں نہیں آتی تھی، اس لیے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول ماننے کے لئے بھی تیار نہیں ہوتے تھے، اور نہ ان کی سمجھ میں یہ بات آتی تھی کہ جب ایک آدمی مرجاتا ہے، مرنے کے بعد ریزہ ریزہ ہوجاتا ہے، ہڈیاں اس کی بوسیدہ ہوجاتی ہیں، اس کے گوشت کے کروڑہا ذرّات بن جاتے ہیں، تو ایسی صورت میں دوبارہ اس میں جان کیسے ڈالی جائے گی؟ یہ بات بھی ان کی سمجھ میں نہیں آتی تھی، اس لیے ان عقیدوں کے بارے میں ان کے جو اشکالات تھے، ان کے ذہن کے اندر جو تردّد تھا، مکی سورتوں کے اندر اس کو زائل کیا گیا ہے، اثباتی دلائل بھی دیے گئے ہیں، اور ان کے شبہات کو دُور بھی کیا گیا ہے، رَدّ بھی کیا گیا ہے۔

اور پھر ان عقیدوں کو ذکر کرتے ہوئے ساتھ ساتھ ترغیب وترہیب بھی ہے، ترغیب وترہیب اُخروی عذاب اور نعمتوں کے ساتھ بھی، اور دُنیوی حالات کے ساتھ بھی، اور پھر اس ترغیب وترہیب کو واضح کرنے کے لئے (ترغیب: رغبت دلانا، شوق دلانا، یہ ہوتا ہے اچھی باتوں کے ذکر کرنے کے ساتھ، کہ اگر یہ قبول کرو گے تو تمہارا انجام اچھا ہوگا۔ ترہیب: ڈرانا، یہ ہوتا ہے عذاب کے تذکرے کے ساتھ، کہ اگر نہیں مانو گے تو پٹو گے، مار کھاؤ گے) پھر اس ترغیب اور ترہیب کو مثالوں کے ساتھ واضح کیا گیا ہے کہ دیکھو! فلاں وقت میں اللہ کی طرف سے ایک رسول آئے تھے، انہوں نے یہی باتیں اپنی قوم کے سامنے پیش کی تھیں، توحید رسالت اور معاد کی، وہ قوم دوحصوں میں بٹ گئی، بعضوں نے مانا، بعضوں نے نہیں مانا، تو دُنیا کے اندر بھی دونوں کا انجام مختلف ہوا کہ نہ ماننے والے اللہ کے عذاب کا نشانہ بنے، ماننے والے کامیاب رہے، اللہ کے عذاب سے بچ گئے، بالکل اسی طرح سے آخرت میں جا کے بھی ان کے ساتھ یہی حال ہوگا کہ نہ ماننے والے بہت سخت قسم کے عذاب کے اندر مبتلا ہوں گے، اور جو ماننے والے ہیں وہ بہت خوش حال ہوں گے۔ تو اُمتوں کے واقعات ذِکر کر کے گویا کہ اس ترغیب وترہیب کو اور زیادہ واضح کیا گیا ہے مثالوں کے ساتھ، گزشتہ تاریخ کے حوالے دے کے۔ اس قسم کے مضمون کی سورتوں میں آیا کرتے ہیں، اور یہ سورۂ یونس بھی انہی مضامین کے اُوپر مشتمل ہے، اور یہ تینوں مضمون آپس میں خلط ملط سے ہو کر آتے ہیں۔

قرآنِ کریم کی عظمت کا بیان

پہلی آیت جو آپ کے سامنے ذکر کی گئی اس میں تو اِس کتاب کے متعلق دعویٰ ہوا کہ یہ کتاب جو اس وقت آپ پر اُتاری جارہی ہے یہ بہت پُرحکمت ہے، حکمت سے بھری ہوئی ہے، دانش مندی سے بھری ہوئی ہے، اس کی ہر بات ٹھوس ہے، عقلی دلائل کے ساتھ بھی مدلل ہے، نقلی دلائل کے ساتھ بھی مدلل ہے، اس کی لفظی حیثیت بھی مضبوط، معنوی حیثیت بھی مضبوط، واقعات جو اس میں ذکر کیے گئے وہ بھی بالکل صدق کے ساتھ موصوف ہیں اور حق کے مطابق ہیں، تو ''حکیم'' کے اندر یہ سارے کے سارے مفہوم ہیں۔ یہ تو قرآنِ کریم کی عظمت ہوئی، اور قرآنِ کریم کی عظمت پر ہی بنیاد اُٹھتی ہے باقی چیزوں کے ماننے کی، کہ ایک آدمی اگر یہ تسلیم کرلے کہ یہ کتاب بڑی پُرحکمت ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئی ہے، کسی انسان کی بنائی ہوئی نہیں، تو جو کچھ اس میں لکھا ہوا ہوگا اس کا قبول کرنا اس کے لئے آسان ہوجائے گا۔ تِلْكَ کا اشارہ اسی سورت کی طرف ہے جو کہ اتر رہی ہے، ''یہ حکمت والی کتاب کی آیتیں ہیں۔''

اِثباتِ رِسالت

اس کے بعد اگلی آیت رسالت کے مسئلے پر مشتمل ہے، کہا یہ جارہا ہے کہ اس میں ان کے لئے کون سی حیرانی کی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ ان میں سے کسی بندے پر وحی کردے، اللہ کی طرف سے کسی بندے پر وحی آجانا یہ کوئی ایسی حیرانی کی بات نہیں، یہ کیوں حیران ہوگئے؟ ان کے لئے یہ بات باعث تعجب کیوں ہوگئی؟ اگر فرشتہ آتا تو ان کو اچھی طرح سے سمجھا نہ سکتا، کیونکہ وہ ان کا ہم جنس نہیں، بہت سارے کام ایسے ہیں جو انسان کو انسان ہی کر کے دکھا سکتا ہے، فرشتہ اُس طرح سے کر کے نہیں دکھا سکتا، انسان

کے جذبات کو انسان اچھی طرح سے سمجھتا ہے۔ پھر اگر کوئی باہر کا انسان ہم ان کی طرف بھیجتے جس کے صدق و کذب سے یہ واقف نہ ہوتے تو اس کو ماننا بھی ان کے لئے مشکل ہو جاتا، یہ ہے بھی ان میں سے ہی، جس کے سارے کے سارے حالات یہ جانتے ہیں، اور پھر جو مضمون وحی کیا گیا ہے وہ مضمون بھی کوئی ایسا عجیب نہیں، جس پر یہ حیران ہیں، یہی تو ہے کہ ماننے والوں کے سامنے اچھا نتیجہ آنے والا ہے، اور جو کفر کرنے والے ہیں ان کے سامنے بُرا نتیجہ آنے والا ہے، تو اس میں کون سی بات حیرانی کی ہے جو ان لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی۔ پہلی آیت میں انداز یہی اختیار کیا گیا" کیا لوگوں کے لئے یہ بات باعث حیرانی ہے، باعث تعجب ہے کہ ہم نے ان میں سے ہی ایک آدمی کی طرف وحی کر دی، اور وحی میں یہ مضمون پہنچایا کہ تم لوگوں کو ڈراؤ اور ماننے والوں کو، جو لوگ ایمان لے آئے ان کو بشارت دے دو کہ ان کے لئے اچھا مرتبہ ہے ان کے رَبّ کے پاس۔"

سَروَرِ کائنات ﷺ کو مشرکین جادوگر کس اِعتبار سے کہتے تھے؟

یہ باتیں آئیں تو کافروں نے کہا کہ یہ تو صریح جادوگر ہے، یعنی اُس رَجل کو جس پر وحی آئی، جس نے اللہ کی طرف سے اِنذار اور تبشیر کرنی شروع کی، اُس کو کافروں نے کہا کہ یہ تو صریح جادوگر ہے۔ جادوگر کس اعتبار سے کہتے تھے؟ اصل میں جادو ہوتا ہے شعبدہ بازی، اور جادوگر ہوتا ہے شعبدہ باز، کہ چیز ہوتی کچھ ہے اور وہ کر کے کچھ دکھا دیتا ہے، باطل کو حق کا رنگ چڑھا کے لوگوں کو اس سے متاثر کر لیتا ہے، اور اس کے تصرف میں اتنا زور ہوتا ہے کہ دل اور دماغ اس کے مقابلے میں کام چھوڑ دیتے ہیں، جادو میں اسی قسم کی باتیں ہوتی ہیں، تو وہ جس وقت دیکھتے تھے کہ یہ کتاب جو پیش کر رہا ہے، یہ کلام جو پڑھ رہا ہے یہ اتنی مؤثر ہے کہ اچھے بھلے لوگ اس کے سامنے بے بس ہو جاتے ہیں، اور ان کا دل دماغ اس کے قبضے میں آ جاتا ہے، متاثر ہوتا چلا جاتا ہے، پھر یہ معجزات جو دکھاتا ہے یہ بھی اسی قسم کی باتیں ہیں، تو کوئی تاویل ان کی سمجھ میں نہیں آتی تھی سوائے اس کے کہ یہ کوئی بہت ماہر جادوگر ہے، جادو کے ساتھ ہی یہ اس قسم کے واقعات دکھاتے ہیں اور جادو کے ساتھ ہی ان کی کلام میں یہ اثرات پیدا ہو گئے ہیں کہ جب انسان سنتا ہے تو اس کا دِل کھنچتا ہے، یہ جو اثرات نمایاں ہوتے تھے اس کی تاویل انہوں نے یہ کی۔

جادوگروں اور انبیاء کے حالات میں فرق

قرآنِ کریم میں بارہا ذکر کیا جائے گا کہ اس کلام کی کوئی نسبت نہیں جادو کے ساتھ، اور سرورِ کائنات ﷺ کو کوئی نسبت نہیں جادوگروں کے ساتھ، جادوگر شیاطین کے تصرف سے لوگوں کے سامنے چشم بندی کر کے شعبدے دکھاتے ہیں، انتہائی گندے ہوتے ہیں، قول کے جھوٹے ہوتے ہیں، ان کی ایک بات سچی نکلتی ہے تو ننانوے باتیں غلط نکلتی ہیں، اخلاق اور کردار ان کا کوئی نہیں ہوتا، تو انبیاء علیہم السلام کے حالات میں ذرا غور کرنے والا انسان فرق کر سکتا ہے کہ جادوگر کیا ہوتے ہیں اور انبیاء علیہم السلام کیا ہیں؟ وہ خود غرض، دُنیا کمانے والے، اور لوگوں کے سامنے شعبدے بازی کر کے اپنے مفاد حاصل کرنے والے، کون سی بات ایسی ہے جو اس نبی کے اندر پائی جاتی ہے جس کی بنا پر تم شبہ کرتے ہو۔" کافروں نے کہا کہ یہ صریح جادوگر ہے۔"

اللہ تعالیٰ کی قدرت کا نمونہ

آگے دلائل کا سلسلہ شروع ہوا، اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ: تمہارا رَب وہی اللہ ہے جس نے آسمانوں کو اور زمین کو چھ دِن میں پیدا کیا ہے، چھ دن میں پیدا کرنے کا ذکر آپ کے سامنے سورۂ اَعراف میں آچکا ہے، یہ وقت کا اندازہ ہے، دِن سے حقیقی دِن مراد نہیں جو سورج کے غروب اور طلوع کے ساتھ بنتے ہیں، کیونکہ جب زمین آسمان ابھی بنے ہی نہیں تھے تو سورج اور چاند بھی نہیں تھے، یہ دِن اور رات بھی نہیں تھے، تو اس لیے چھ دِن سے چھ دِن کا اندازہ مراد ہے۔ پھر یہ دِن دُنیا کے دن ہی ہوں جو ہمارے سامنے ہیں، جو چوبیس گھنٹے میں گزر جاتے ہیں، یا آخرت کا دِن مراد ہے جو اِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ (سورۂ حج: ۴۷) ایک دِن تیرے رَبّ کے نزدیک ہزار سال کے برابر ہے جس کو تم شمار کرتے ہو، یہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ اس چھ دِن سے کتنا وقت مراد ہے اور کتنا اندازہ ہے؟ تو اس کو ان دِنوں کے اوپر قیاس نہیں کیا جاسکتا۔ چھ دِن اتنے ہی ہوں جتنے یہ (دُنیا والے) دِن رات ہیں، تو بھی کوئی اِشکال کی بات نہیں، اللہ کی قدرت تھی کہ ایک لمحے میں موجود کر دیتا، لیکن اس نے اپنی حکمت کے ساتھ ان کو تدریجاً بنایا، جس طرح سے آپ لوگوں کا وجود ہے، آپ میں سے کوئی اٹھارہ سال کا ہے، کوئی بیس سال کا ہے، اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو پہلے دِن ہی تمہارا قد اتنا کر دیتا، لیکن یہ تمہاری تربیت جو ہوئی اور اس نہج تک اللہ تعالیٰ نے تمہیں جو پہنچایا، اٹھارہ سال میں، بیس سال میں، بائیس سال میں تم اس حد تک پہنچے ہو، ایک درخت پیدا ہوتا ہے، اللہ چاہے تو اسے ایک ہی دِن میں تن آور کر دے، جتنا پھیلانا ہے پھیلا دے، لیکن کوئی دو سال میں مکمل ہوگا، کوئی تین سال میں مکمل ہوگا، یہ اللہ تعالیٰ کی تخلیق کی ایک حکمت ہے کہ تدریجاً وہ کسی چیز کو عروج تک پہنچاتا ہے، اسی طرح سے زمین وآسمان اور اس کے اندر خوراکوں کا رکھنا، باقی حالات کا رکھنا، پہاڑوں کا قائم کرنا، جس طرح سے تفصیل آپ کے سامنے آگے سورۂ حم السجدہ میں آئے گی، وہاں تقسیم ہوگی کہ کتنے دِنوں میں زمین کا نظم ٹھیک ہوا، کتنے دِنوں میں آسمان کا ہوا، کتنے دِنوں میں اِس میں اقوات رکھی گئیں قَدَّرَ فِيْهَآ اَقْوَاتَهَا، تو یہ تفصیل حم السجدہ میں آئے گی، بہرحال یہ کوئی وقت ہے جس اندازے میں اللہ تعالیٰ نے زمین آسمان کو پیدا کیا اپنی حکمت کے ساتھ۔

''متشابہات'' کے متعلق عقیدہ

''اور پھر عرش پہ قرار پکڑ گیا''، عرش پہ قرار پکڑنے کا ذکر بھی آپ کے سامنے سورۂ اَعراف میں ہوا تھا، کہ عرش پر قرار پکڑنے کا ایک معنی تو یہ ہے کہ عرش ایک وجودی چیز ہے جس طرح سے ایک تخت ہوتا ہے اور اِستواء کا معنی اس کے اُوپر درست ہو کے سنبھل کر بیٹھ جانا، اب یہ جو لفظوں سے مفہوم سمجھ میں آتا ہے ہم اس کی نسبت اللہ کی طرف نہیں کر سکتے، احادیث سے اتنا تو معلوم ہوتا ہے کہ عرش کوئی وجودی چیز ہے جو زمین وآسمان کو محیط ہے، اور اللہ نے اس کے اوپر قرار کس طرح سے پکڑا؟ ہم اس چیز کو اپنے الفاظ میں بیان نہیں کر سکتے، یہ متشابہات میں سے ہے، کیونکہ جس وقت اللہ تعالیٰ کی ذات ہمارے سامنے پوری طرح سے منکشف نہیں تو ہم اس اِستواء کی حقیقت کو بھی ذِکر نہیں کر سکتے، کسی کی صفات اس وقت سمجھ میں آیا کرتی ہیں جب پہلے اس کی ذات سمجھ میں آئے۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ اسی آیت کے تحت میں نے یہ تفصیل آپ کی خدمت میں عرض کی تھی، کسی چیز کی صفات صحیح معنی

میں سمجھ میں آتی ہیں اس کی ذات کے سمجھ آ جانے کے بعد، جس وقت تک کسی چیز کی حقیقت سے آپ واقف نہ ہوں اس وقت تک آپ اس کی صفات کو سمجھ نہیں سکتے، یہ ایک بہت موٹی سی بات ہے۔ مثلاً ایک صفت ہے آنا، ''فلاں آ گیا'' یہ ایک نسبت ہے، لیکن آنے کا کیا مفہوم ہے؟ جس کی طرف آپ نسبت کریں گے اگر آپ اس کی حقیقت کو جانیں گے تو سمجھ سکیں گے کہ آنا کیسے ہوتا ہے مثلاً میں کہتا ہوں بادل آ گیا، فوراً آپ کے ذہن میں ایک کیفیت آ گئی کہ بادل یوں آتا ہے، میں کہتا ہوں بارش آ گئی، تو جب آپ بارش کو جانتے ہیں تو اس کا آنا بھی فوراً آپ کی سمجھ میں آ گیا کہ یہ پانی کے قطرے آسمان کی طرف سے زمین پر آتے ہیں، میں کہتا ہوں گاڑی آ گئی، ریل گاڑی آ گئی تو اس کے آنے کا آپ یہ مطلب نہیں سمجھیں گے جس طرح سے بادل آتا ہے، یا جس طرح سے آسمان سے بارش آتی ہے تو ریل گاڑی بھی ایسے ہی آتی ہے، آپ یہ مطلب نہیں سمجھیں گے، ''دھوپ آ گئی، سایہ آ گیا، نہر میں پانی آ گیا''، اور یہاں سے جس وقت ہم چلتے ہیں تو کہتے ہیں لودھراں آ گیا، بہاولپور آ گیا، تو دیکھو کتنی چیزیں ہیں جن کے متعلق یہ لفظ استعمال ہوتا ہے، میرے دل میں خیال آ گیا، بخار آ گیا، اب ایک ہی لفظ ہے لیکن نسبتوں کے بدلنے کے ساتھ اس کا مفہوم کتنا مختلف ہے، جب آپ کہیں بخار آ گیا، تو کیا اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جس طرح سے نہر میں پانی آتا ہے بخار بھی ایسے ہی آتا ہے؟ یا ''بہاولپور آ گیا'' تو وہ ایسے ہی آتا ہے جس طرح سے یہ کوا آ گیا؟ تو ''آنا'' ایک ایسا لفظ ہے جس کو آپ اپنی زبان میں استعمال کرتے ہیں لیکن اس کی کیفیت اس کے موصوف کے سمجھ آنے کے ساتھ ہی سمجھ میں آ سکتی ہے، کہ جس کے متعلق ہم کہہ رہے ہیں جس وقت تک اس کی حقیقت سمجھ میں نہ آئے گی ہم اس کے آنے کا تصور نہیں کر سکتے، یہ روزمرہ کے استعمال کی بات ہے۔ تو اسی طرح سے اللہ تعالیٰ کی ذات کی طرف جب بھی کسی چیز کی نسبت کی جائے چاہے وہ ید ہے، چاہے وہ وجہ ہے، چاہے اِستواء ہے، چاہے اس کا آنا ہے، جس طرح سے حدیث میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اُترتے ہیں، رات کو آسمانِ اوّل پہ آتے ہیں، اللہ تبارک وتعالیٰ کی اس قسم کی جتنی بھی صفات ہیں ان کے متعلق یہی کہا جائے گا: ''کما یلیق بشأنہ'' جیسے اس کی شان کے لائق ہے، جب ہم اس کی حقیقت نہیں سمجھتے تو اس کی صفات کی حقیقت بھی نہیں سمجھ سکتے، ہاتھ ہو، پاؤں ہو، (پاؤں کا ذکر بھی حدیث شریف میں ہے) وَجہ کا ذکر ہے، سب کے بارے میں یہی بات ہوگی ''کما یلیق بشأنہ'' ایک تو ہے اس صفت کا مبدأ، کہ عرش پہ قرار پکڑ لیا، اور ایک ہوتا ہے اس کا اثر، اثر ہم بیان کر سکتے ہیں، جس طرح سے دیکھنا اللہ کی ایک صفت ہے، کیسے دیکھتا ہے ''کما یلیق بشأنہ''، ہم دیکھتے ہیں تو ہمارا ایک تو مبدأ ہے کہ یہ آنکھ ہے، اس کے ذریعے سے ہم دیکھتے ہیں، ہمارے دیکھنے کی کیفیت یہ ہے کہ ہم آنکھ کھولتے ہیں، چیز سامنے ہو تو دیکھتے ہیں، خاص فاصلے پہ ہو تو دیکھتے ہیں، زیادہ فاصلے پہ چلی جائے تو نہیں دیکھ سکتے، بالکل ہی پاس آ جائے تو نہیں دیکھ سکتے، یہ ہمارے دیکھنے کا انداز ہے، تو ایک تو یہ مبدأ ہے آنکھ، اور ایک اس کا اثر ہے کہ مبصرات ہمارے علم میں آ گئیں، تو اللہ تعالیٰ بصیر ہے اس کا یہ اثر تو ہے کہ جتنی مبصرات ہیں وہ سب اللہ کے سامنے ہیں، جو چیزیں دیکھی جاتی ہیں وہ سب اللہ کے علم میں ہیں، جس طرح سے ہم مبصرات کا علم آنکھ کے ساتھ حاصل کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کے لئے بھی ساری کی ساری مبصرات ایسے ہیں جس طرح سے آنکھ کے سامنے ہوتی ہیں، باقی! اس کا مبدأ کیا ہے؟ یہ صفت اس کے لئے کس طرح سے ثابت ہے؟ ''کما یلیق بشأنہ''، اسی طرح سے ایک تو ہے تخت نشین ہونا، تخت پہ بیٹھنا، جس طرح سے میں اس جگہ بیٹھا ہوا ہوں، یہ بھی تو ایک مختصر سا تخت

ہے جس پہ میں بیٹھا ہوں، تخت نشین ہوں، ایک تو یہ کیفیت ہے کہ اس طرح سے کوئی تخت ہو اور اس کے اوپر کوئی دوسرا بیٹھے، اور ایک اس کا اثر ہوتا ہے کہ جس مُلک میں کوئی شخص تخت نشین ہو جاتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس مُلک کی حدود میں حکومت اس کی ہے، کوئی دوسرا اس کی حکومت میں شریک نہیں، ''تخت نشین ہونا'' یہ دُنیا کا ایک محاورہ ہے حکومت سنبھالنے کے لئے: ''بابر تخت نشین ہوا، اس کے بعد ہمایوں تخت نشین ہوا، اس کے بعد جلال الدین اکبر تخت نشین ہوا، اس کے بعد جہانگیر تخت نشین ہوا، شاہ جہان تخت نشین ہوا'' اس کا یہی مطلب ہوتا ہے کہ ایک مرتا ہے، اس کے مرنے کے بعد دوسرا اس کی جگہ تخت پہ بیٹھ جاتا ہے اور حدودِ مملکت کے اندر حکومت اب اسی کی ہوگی، اس کے ساتھ کوئی دوسرا نہیں ہے۔ تو یہاں زمین آسمان کو پیدا کرنے کے بعد اس کائنات کے اندر تخت نشین اللہ ہو گیا، یعنی پیدا کرنے والا بھی وہی اور اس کا حاکم بھی وہی، اس کے اوپر حکومت بھی اسی کی ہے کسی دوسرے کی نہیں ہے، تو تخت نشین ہونے کا یہ مفہوم اپنی جگہ واضح ہے، یعنی یہ نہیں کہ بنا کے حکوت کسی دوسرے کے سپرد کر دی، جیسے مدرسہ بنایا اور مہتمم کسی دوسرے کو بنا دیا ایسی بات نہیں، بلکہ کائنات کو بنایا ہے تو اس کی حکومت بھی اللہ نے خود سنبھالی، اس کے اندر تخت نشین وہی ہے، تو ''تخت نشین'' ایک محاورہ ہے، جس طرح سے آج کل چھوٹی چھوٹی حکومتوں کے لئے ''چیئرمین'' ایک محاورہ ہے، ''اس شہر کا چیئرمین فلاں ہے''، ''چیئرمین'' کا معنی ''کرسی پر بیٹھنے والا آدمی''، ''مَین'' کہتے ہیں ''آدمی'' کو، ''چیئر'' کہتے ہیں ''کرسی'' کو، تو ''چیئرمین'' کا معنی ''کرسی پہ بیٹھنے والا''، مطلب یہ ہے کہ کرسی، اِقتدار کی ایک نشانی ہے، اور اس شہر کا اقتدار فلاں شخص کو مل گیا، تو اس شہر کا چیئرمین فلاں ہے، اس کمیٹی کا چیئرمین فلاں ہے، یہی مفہوم ہوتا ہے اس ''تخت نشین'' کا، تو ''تخت نشین اللہ ہو گیا'' اس کائنات کے اندر حکومت اس کی ہے۔

مشرکینِ مکہ کے شرک کی حقیقت

اور پھر یہ نہیں کہ تخت نشین تو وہ ہے لیکن نیچے وزیر بنا دیے اور دوسرے کارکن بنا دیے اور خود بادشاہ سلامت عیش وعشرت کے لئے بیٹھے ہیں ان کو کسی کام کی فکر نہیں، نیچے کارندے کام کرنے والے ہیں، وہ سیاہ کریں سفید کریں، بادشاہ کی حکومت قائم ہے، اس قسم کا بادشاہ نہیں، یُدَبِّرُ الْاَمْرَ: ہر معاملے کا انتظام بھی اسی کی ہاتھ میں ہے، تدبیر بھی اسی کی ہے، اور یہی ہے مشرکین کی دُکھتی رَگ جو قرآنِ کریم نے پکڑی ہے، قرآنِ کریم آپ کے سامنے واضح کرے گا کہ جب آپ ان سے پوچھیں کہ زمین آسمان کو کس نے پیدا کیا؟ تو فوراً کہیں گے اللہ نے، جب اِن سے آپ سوال کریں کہ زمین وآسمان کو کس نے پیدا کیا؟ تو فوراً کہتے ہیں کہ اللہ نے، اس میں تو ان کو انکار تھا ہی نہیں کہ اللہ ان کو پیدا کرنے والا ہے، یہ تو مشرک بھی مانتے تھے، تو یہ کہا جا رہا ہے کہ زمین وآسمان کو جس نے پیدا کیا رَبّ وہی ہے، اور زمین وآسمان کو جس نے پیدا کیا ان کے اندر حاکم وہی ہے، اور زمین وآسمان کو جس نے پیدا کیا ان کے اندر منتظم وہی ہے، یہ باتیں وہ نہیں مانتے تھے، وہ کہتے تھے کہ اللہ تو بہت بڑا ہے، وہ چھوٹے چھوٹے کام خود نہیں کرتا، اس نے محکمے تقسیم کر دیے ہیں، جس طرح سے بادشاہ محکمے تقسیم کیا کرتا ہے، اور ہر کسی کے محکمہ سپرد کر کے اس کو خود مختار کر دیتا ہے، چاہے اس کو معزول کر سکتا ہے، اس میں کوئی شک نہیں، لیکن جب سپرد کر دیا تو خود مختار ہے، کوئی گورنر بنا دیے، کوئی کمشنر بنا دیے، کوئی ڈی سی

بنا دیے، کوئی چھوٹے کوئی بڑے، تو دنیا کا دستور یہ ہے کہ جس وقت کوئی کام کروانا ہو تو بادشاہ نے یہ محکمے جن کے سپرد کر دیے ہیں درخواستیں وہاں دی جایا کرتی ہیں، اب اگر ہمیں دو سیر یا پانچ سیر چینی چاہئے، کوئی شادی کا موقع آ جاتا ہے تو لوگ بیس سیر چینی کے لئے درخواست دیتے ہیں، تو براہِ راست صدر مملکت کو تو کوئی درخواست نہیں دیتا، اس نے فوڈ کنٹرول کا خوراک کا ایک محکمہ بنا دیا ہے، اور اس کے اوپر سے نیچے تک حکام ہیں، اگر آپ کو چینی چاہیے تو اس دفتر میں جاؤ، جا کے وہاں درخواست دو، اور وہ حاکم تمہیں چینی دے دے تو صدر ضیاء الحق کو پتا ہی نہیں کہ دی یا نہیں دی، اور اسی طرح سے اگر آپ نے کوئی پانی وانی کا قصہ طے کرنا ہے، کوئی کھالا (ندی) لینا ہے، کہیں سے پانی بڑھانا ہے، کہیں گھٹانا ہے، تو محکمہ انہار موجود ہے وہاں جا کے درخواست دے دو، تو نیچے والے حکام کے سامنے درخواست جائے گی، نیچے والے حکام خوش رہیں گے تو آپ کا کام ہو جائے گا، بڑے کے ساتھ کوئی واسطہ نہیں، بڑا اِن کے اُوپر بڑا ہے، ہمارا واسطہ اِن سے ہے۔ اسی طرح آپ کہیں خط پہنچانا چاہتے ہیں تو ڈاک خانے والوں سے آپ کو رسوخ رکھنا پڑے گا، یہاں جاؤ گے اور ان کو جا کے درخواست دو گے، ان کے سپرد کرو گے تو یہ آگے پہنچا دیں گے، تو یہ محکمۂ ڈاک ہے۔ اسی طرح آپ بیمار ہو گئے کوئی علاج کروانا ہے تو محکمۂ صحت موجود ہے، ڈاکٹر کے پاس جاؤ، ہسپتالوں میں جاؤ جو قائم کر دیے گئے ہیں، اب تمہیں قبض ہو جائے اور تم گولی کے لئے صدر ضیاء الحق کو درخواست دو تو یہ کوئی بات ہے؟ یہاں جو ہسپتال اس نے قائم کر دیا، یہاں ڈاکٹر موجود ہے، اس قسم کی آپ کو ضرورت ہے تو جاؤ، اس ڈاکٹر کے پاس جا کے درخواست دو، وہ ڈاکٹر تمہیں دوائی دے دے گا، تمہیں صحت حاصل ہو جائے گی۔ وہ (مشرک) اللہ تعالیٰ کی یوں حکومت بنائے بیٹھے تھے کہ اللہ تو سب سے بڑا ہے اور اس نے اپنی حکومت کے اندر دوسروں کو شریک کر لیا ہے، اور بندوں کا تعلق ان نچلوں کے ساتھ ہے جو ماتحت ہیں، اس لیے ہمیں جس وقت درخواست دینے کی ضرورت پیش آئے گی ہم ان کے دروازے پر جائیں گے، یہ آگے سے لیں جو کچھ کرنا ہے، ان کا معاملہ اوپر ہے، ہمارا معاملہ اِن کے ساتھ ہے، یہ خوش رہیں گے تو ہمارا کام بنے گا، اگر یہ ناراض ہو گئے تو اوپر والا خوش رہے ناراض رہے ہمیں کوئی فائدہ نہیں، ایسے ہی ہوتا ہے نا؟ اگر نچلے حکام کا تعلق آپ کے ساتھ ٹھیک ہے، یہاں کی پولیس آپ کے ساتھ مطمئن ہے اور یہاں کے حکام آپ کے ساتھ خوش ہیں تو آپ کی زندگی ٹھیک گزرے گی، اوپر سے آپ کو کیا بحث کہ وہ راضی رہے یا ناراض؟ اُس کا واسطہ اِن سے ہے، اور اگر ہم نے اِن کو ناراض کر لیا تو اوپر والا کچھ نہیں کر سکے گا، کیونکہ اوپر والے نے جو کچھ کرنا ہے ان کی وساطت سے کرنا ہے، اس لیے یہ مشرک نچلوں کے سامنے تو جھکتے تھے، نچلوں کے سامنے تو ناک رگڑتے تھے، اللہ تعالیٰ کو انہوں نے ایک طرف ٹھکانے ہی لگا دیا تھا اور یہ کہہ کے کہ وہ سب سے بڑا ہے، ہمارا اس سے واسطہ نہیں ہے، یہ ہے ساری کی ساری شرک کی رَگ! محکمے تقسیم کر دیے، کسی کو بیٹے دینے والا بنا لیا، کسی کو بارش دینے والا بنا لیا، کسی کو رزق دینے والا بنا لیا، کسی کو صحت دینے والا بنا لیا، یہ سارے کے سارے محکمے تقسیم کر کے اپنا دلی تعلق جتنا تھا وہ سارا ان کے ساتھ لگا لیا، یہ ہے حقیقت ہے اس شرک کی جو مشرک کرتے تھے، ورنہ مشرک اس بات کو مانتے تھے کہ زمین و آسمان سورج چاند سب کو بنانے والا اللہ ہے، اس میں ان کو اختلاف نہیں تھا۔ یہاں اس کے خالق ہونے کا اقرار کروا کے، خالق ہونے کی خبر دے کے اس کے حاکم اور اس کے مدبر ہونے کا

اِثبات کرنا مقصود ہے اوراس کے رَبّ ہونے کا اِثبات کرنا مقصود ہے، رَبّ کا مطلب ہے کہ تمہاری ضرورتیں پوری کرنے والا وہی، اس کائنات کے اندر حکومت اسی کی، اس کائنات کا انتظام سارے کا سارا اسی کے ہاتھ میں، اگر تو یہ عقیدہ بنالو تو تم موحد ہو اور اگر یہ عقیدہ نہیں بناتے، پیدا کرنے والا اللہ کو مانتے ہو لیکن انتظام اللہ کا نہیں مانتے، حکومت اللہ کی نہیں مانتے، بلکہ اس حکومت کو دُوسروں میں بانٹ رکھا ہے تو تم مشرک ہو، اتنی سی بات ہے ساری، کتنا موٹا سا عقیدہ ہے، اور کتنی عام سمجھ آنے والی بات ہے۔

موحد اور مشرک میں بُنیادی فرق

ہم نے بھی اللہ تبارک وتعالیٰ کے ساتھ کچھ دوسرے کارکن بنائے ہوئے ہیں، آپ کہتے ہیں کہ بارش اُتارنے کے لئے میکائیل علیہ السلام متعین ہیں، وحی اُتارنے کے لئے اورعلوم اُتارنے کے لئے اللہ کی طرف سے جبریل علیہ السلام واسطہ ہیں، جبریل آتے ہیں، رُوح ڈالنے کے لئے فرشتے آتے ہیں، سب واقعات حدیث شریف میں ہیں، کارکن تو ہم نے بھی بنائے ہوئے ہیں، ہم بھی ان کو ''کارکنانِ قضاوقدر'' کہتے ہیں، لیکن ہم ان کو حکومت میں شریک نہیں سمجھتے، دونوں میں ذرا فرق کر لیجیے! اللہ تعالیٰ اپنی حکمت کے تحت فرشتوں سے کام لیتا ہے، فرشتوں کو اس نے کارکن بنایا ہوا ہے، لیکن یہ حکومت میں شریک نہیں ہیں، ان دونوں میں فرق کیا ہے؟ فرق اس طرح سے ہے کہ اُن کا عقیدہ تھا کہ جس طرح سے علاقے کا ڈی سی ہے، ڈی سی بنادیا، بنانے کے بعد وہ اپنے علاقے کے اندر وہ جس طرح سے چاہے دورے کرے، کسی کو دے کسی کو نہ دے، اب یہ خود مختار ہے، یہ نہیں کہ ہر ہر بات وہ صدر ضیاء سے پوچھ کے کرے گا، ایک صوبے کی حکومت جب ایک گورنر کو دے دی، چاہے بنانے کا مختار بھی ضیاء ہے ہٹانے کا مختار بھی ضیاء ہے، صوفی صاحب کا اتنا تصرف اس پہ چلتا ہے کہ چاہے تو گورنری سے ہٹادے، چاہے گورنر بنادے، لیکن جتنے دنوں تک یہ گورنر ہیں اتنے دنوں تک صوبے کے اندر تصرف انہی کا ہوگا، یہ ہر بات میں ضیاء سے پوچھنے کے محتاج نہیں ہیں، اور ہر بات کی اس کو اطلاع دینے کے بھی محتاج نہیں ہیں، جو چاہیں کریں، اپنی مرضی کے ساتھ یہ چلتے ہیں، یہ تو ہیں حکومت میں شریک، اس لیے ان سب کو حکام کہا جاتا ہے، یہ اقتدار میں شریک ہیں، یہ اقتدار کا طبقہ ہے۔ اور ایک ہوتا ہے جس طرح سے ضیاء الحق کے دروازے پہ اردلی کھڑا ہے، چپڑاسی جس طرح سے ہوتا ہے، کھڑا وہ بھی وہیں ہے، اور جو حکم وہ دیں گے اسی کے مطابق اس نے کرنا ہے، ''یہ کاغذ فلاں کو دے آؤ'' وہ وہاں جاکے دے کے آئے گا، کسی اور کو دینے کا مجاز نہیں ہے، ''یہ رقم فلاں کو پہنچادو'' وہ وہیں پہنچائے گا، کسی اور کو دینے کا مجاز نہیں ہے، چپڑاسی کبھی اپنے آپ کو نہیں سمجھتا کہ میں بھی حکومت میں شریک ہوں اور حکام کی فہرست میں میرا نام بھی ہے، کیا خیال ہے آپ کا؟ چپڑاسی اقتدار میں شریک ہوتا ہے؟ (نہیں)، تو چپڑاسی اقتدار میں شریک نہیں، یہ تو جو حکم وہ دیں گے اس کے مطابق اس نے عمل کرنا ہے، ذرہ برابر بھی اِدھر سے اُدھر نہیں کرسکتا، اور گورنر حکومت میں شریک ہے جس وقت آپ کہیں گے ''حکام''، تو اس میں ڈی سی، کمشنر، تھانیدار، یہ سب حکام ہیں، یہ حکومت میں شریک ہیں، ان کو کہا جاتا ہے اقتدار والا طبقہ، یہ اقتدار والے ہیں، صاحبِ اقتدار لوگ ہیں، یہ ایک فہرست میں آتے ہیں، کوئی بڑا کوئی چھوٹا، لیکن یہ جو کارندے اس قسم کے ہوتے ہیں، اردلی، چپڑاسی دفتروں کے اندر، کہ اِدھر کی چیز اُدھر پہنچادی، اُدھر کی چیز لے کر اِدھر پہنچادی، وہ حاکم کے حکم کی مخالفت نہیں کرسکتے۔

تو فرشتے اگر کارکن ہیں تو اس قسم کے ہیں جس طرح سے دفتر کے کارکن ہوتے ہیں، کہ حاکم جو کہے گا انہوں نے وہی کرنا ہے اس کے خلاف نہیں کرتے، اس لیے ان کو اقتدار میں شریک نہیں کہا جاتا، یہ حکام کا گروہ نہیں ہے، حاکم صرف اللہ تبارک وتعالیٰ ہے، کوئی دوسرا اس کائنات کے اندر حاکم نہیں ہے، حکومت کے اندر کوئی دوسرا شریک نہیں ہے، کارکن چاہے دوسرے بھی ہیں، اس میں کوئی بات نہیں ہے، جس طرح سے علم آپ کی طرف آپ کے اساتذہ کی وساطت سے منتقل ہو رہا ہے لیکن دینے والا اللہ ہے، استاذ کے اختیار میں کوئی نہیں، ایک شاگرد کے اوپر انتہائی شفقت ہوتی ہے، انسان پوری محنت کرتا ہے، لیکن وہ ''الف اُلو'' نہیں سیکھتا، اور ایک شخص کے اوپر کچھ بھی نہیں ہوتا لیکن وہ محنت کرتا ہے اور پڑھتا پڑھاتا ہے تو کامیاب ہو جاتا ہے، جس سے معلوم ہو گیا کہ علم آتا تو براہِ راست اللہ کی طرف سے ہے، یہ درمیان میں واسطے ہیں جن کے لئے کوئی کسی قسم کا اختیار ثابت نہیں ہے، جیسے ڈاکیا آتا ہے اور آ کے آپ کو سو روپے کا منی آرڈر پہنچا جاتا ہے، اب پہنچایا آپ کو اس ڈاکیے نے ہے، وصول آپ نے اس کے ہاتھ سے کیا ہے، لیکن جس وقت آپ اپنے دل دماغ میں غور کرتے ہیں تو کسی وقت بھی خیال نہیں آتا کہ یہ اس نے دیا ہے، اگر یہ پیچھے سے چلا ہے تو اس کا باپ بھی پہنچائے گا، اور اگر پیچھے سے نہیں چلا تو چاہے تم اس کو سجدے کرتے رہو، چاہے اس کے سامنے ہاتھ باندھتے رہو، چاہے ہر روز اس کو چائے پلاتے رہو کہ جی اقبال صاحب! ہمارے لیے منی آرڈر لے آنا، ہمیں سو روپے کی ضرورت ہے، ہمارے لیے منی آرڈر لے آنا، ہر روز اس کے سامنے سجدے کرو اور اس کو نیاز مندی کے ساتھ جس طرح سے چاہو کرو، تو یہ تمہیں منی آرڈر دے دے گا؟ نہیں! پیچھے سے چلا ہے تو یہ پہنچا دے گا، اگر پیچھے سے نہیں چلا تو نہیں پہنچائے گا، اس لیے آپ اپنے ماں باپ کا احسان تو مانیں گے، اس کا احسان نہیں مانیں گے، یہ تو نوکر ہے، یہ اس کے خلاف کر کس طرح سے سکتا ہے؟ اسی طرح سے اگر اللہ تعالیٰ نے کارکن بنائے ہیں تو ان کی حیثیت یہ ہے کہ وہ ایک پتے کو حرکت نہیں دے سکتے اللہ کی اجازت کے بغیر، اللہ تعالیٰ اپنے تصرفات نمایاں انہی کی وساطت سے کرے گا لیکن ان کو اختیار کوئی نہیں ہے، اور اُنہوں نے محکمے تقسیم کر رکھے تھے ان کو بانٹ رکھا تھا، کہ اس محکمے کا اختیار ان کو دے دیا، جتنی دیر تک یہ ہے اتنی دیر تک تو یہی دے گا یہی لے گا، جو کچھ کرے گا یہی کرے گا، یہ علیحدہ بات ہے کہ اس کو بنانا بھی اللہ کے اختیار میں، ہٹانا بھی اللہ کے اختیار میں ہے، اقتدارِ اعلیٰ اس کے ہاتھ میں ہے، باقی! اقتدار میں شریک یہ سارے ہیں، اس مثال کے ساتھ آپ کے سامنے شرک کی حقیقت آ گئی، اور اللہ تبارک وتعالیٰ اسی شرک کو مٹاتے ہیں کہ ایسا نہیں، پیدا کرنے والا بھی وہی، اور اس کے اندر حاکم بھی وہی، اور سارے کا سارا انتظام بھی اسی کے ہاتھ میں، کسی کے ہاتھ میں انتظام ہونا تو کجا، اللہ کے سامنے بغیر اس کی اجازت کے کوئی زبان نہیں ہلا سکتا کہ اللہ سے کہہ ہی دے تو یہ کام ایسے کر لے، ایسے نہ کر، اللہ کی اجازت کے بغیر کسی کو زبان ہلانے کی بھی جرأت نہیں مَامِنۡ شَفِيۡعٍ اِلَّا مِنۡۢ بَعۡدِ اِذۡنِهٖ، اللہ کی طرف سے اجازت ہو تو اللہ کے سامنے کوئی بول سکتا ہے، تم نے کیا سمجھ لیا کہ یہ خوش ہو گئے تو کر لیں گے اگرچہ اللہ نہ چاہے، ایسا نہیں ہو سکتا، اللہ تعالیٰ کے سامنے کسی کو زبان ہلانے کی جرأت نہیں، تمہارا یہ عقیدہ غلط ہے کہ یہ منوا لیتے ہیں، اگر یہ ہم پہ خوش ہو گئے ہماری درخواست انہوں نے اگر پاس کر دی تو اوپر سے یہ پاس کروا لیں گے، یہ بات بالکل غلط ہے، ساری کی ساری توحید انہی الفاظ میں آ گئی اور اسی میں ان کے عقیدے کی اصلاح ہے۔ ''بے شک تمہارا رَبّ وہ اللہ ہے جس نے پیدا کیا آسمانوں کو اور زمین کو چھ دن

میں، پھر قرار پکڑا عرش پر، انتظام کرتا ہے امر کا، کوئی سفارش کرنے والا نہیں اس کی اجازت کے بغیر، یہی اللہ تمہارا رَبّ ہے پس تم اسی کی پُوجا کرو' فَاعْبُدُوْهُ: اسی کی عبادت کرو، بندگی کا تعلق اسی کے ساتھ رکھو، کوئی دوسرا نہیں کہ جس کے سامنے ناک رگڑا جائے اور لجاجت کی جائے یا ذِلّت کا اظہار کیا جائے، ضرورتیں پوری کرنے والا یہی اللہ ہے جس کی صفت اوپر آئی، عبادت کا تعلق تمہارا اسی کے ساتھ ہی ہونا چاہیے۔

مشرکین اپنے معبودوں کے لئے ''اِلٰہ'' اور ''عبادت'' کا لفظ اِستعمال کرتے تھے

یہ جو مثال میں نے آپ کو دی ہے کہ وہ اقتدار میں شریک بناتے تھے اسی کی وجہ سے وہ جس طرح سے اللہ کو ''اِلٰہ'' کہتے تھے تو باقیوں کے لئے بھی ''آلِہہ'' کا لفظ استعمال کرتے تھے: اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا (سورۂ ص:۵) کیا اس نے سب آلِہہ کو ایک ہی اِلٰہ بنا دیا؟ تو صراحتًا ان کے لئے ''آلِہہ'' کا لفظ استعمال کرتے تھے، اور ''آلِہہ'' کا لفظ قرآنِ کریم میں متعدد جگہ ان کی طرف نسبت کر کے آیا ہے، اور وہ ان کے ساتھ جو معاملہ کرتے تھے اس کو وہ عبادت کہتے تھے: مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى (سورۂ زمر:۳)، اَتَنْهٰىنَآ اَنْ نَّعْبُدَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا (سورۂ ہود:۶۲)، تو جو برتاؤ ان کے ساتھ کرتے تھے اس کو ''عبادت'' کہتے تھے، جس کا مطلب یہ ہے کہ ان کو باقاعدہ مقتدر، صاحبِ اقتدار حاکم سمجھتے تھے، تو جیسا معاملہ اللہ کے ساتھ کرتے تھے ویسے ہی ان کے ساتھ کرتے تھے، اُن کے لئے ''اِلٰہ'' کا لفظ استعمال کرتے تھے، اور اپنے اس برتاؤ کو جو ان کے ساتھ کرتے تھے عبادت قرار دیتے تھے، جو مفہوم عبادت کا ہے وہ ان کے اعمال پر صادق آتا تھا، جو مفہوم ''اِلٰہ'' کا ہے وہ ان کے خیال میں ان کے معبودوں پر صادق آتا تھا، تو ان کو باقاعدہ اقتدار کا ٹولہ بنا رکھا تھا، ان کے خیال میں یہ سارے اقتدار میں شریک تھے، سارے کے سارے حکام تھے، اور نیازمندی اور تذلّل ان کے سامنے اسی طرح سے کرتے تھے جس طرح سے اللہ کے سامنے کیا جاتا ہے۔ تو فَاعْبُدُوْهُ کا مطلب یہ ہو گیا کہ تم عبادت اسی کی کرو۔ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ: کیا تم اس بات کو سمجھتے نہیں ہو؟ ان باتوں سے نصیحت حاصل نہیں کرتے؟

''عقیدۂ معاد'' کی خوبصورت وضاحت

آگے ''معاد'' آ گیا، اِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا: تم سب نے اسی کی طرف ہی لوٹ کر جانا ہے، جب اسی کے سامنے جانا ہے تو وہ زندگی کے اعمال کا محاسبہ بھی کرے گا، یہ ''معاد'' کا عقیدہ آ گیا، اور اس کو ایسے ہی بات نہ سمجھو، وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا: اللہ کے ذِمّے یہ سچا وعدہ ہے، تم نے اس کے سامنے ضرور جانا ہے، جس وقت اس کے سامنے جاؤ گے تو پھر کیا منہ دکھاؤ گے اگر تم نے اس کی عبادت نہ کی اور غیروں کے سہارے لے کے بیٹھے رہے، اور وہ سہارے سہارے ہوں گے نہیں۔ اِنَّهٗ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ میں اس کی دلیل دے دی کہ تمہارے ذہن میں جو کیڑا ہے وہ یہ ہے کہ ریزہ ریزہ ہو جانے کے بعد دوبارہ کیسے اٹھا لے گا کوئی، مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ (سورۂ یٰس:۷۸) جب ہڈیاں بوسیدہ ہو جائیں گی تو ان کو زِندہ کون کرے گا؟ اس کی دلیل ساتھ دے دی کہ زندہ وہی کرے گا جس نے پہلی دفعہ پیدا کیا تھا، پہلی دفعہ پیدا کرنے کو مانتے ہو، تو جو پہلی دفعہ پیدا کرنے پر قادر ہے وہ لوٹانے پر کیوں قادر نہیں؟ یا تو یہ ہے کہ تم یہ کہو کہ پہلی دفعہ بھی ہمیں کسی نے پیدا نہیں کیا، اس کو تو تم مانتے ہو، مشرک اس بات کو تسلیم کرتے تھے کہ ہمارا خالق اللہ ہے،

یہ بات مان لینے کے بعد کہ ابتداءً ہمیں اس نے پیدا کیا پھر یہ ماننے میں تمہیں کیا رکاوٹ ہے کہ دوبارہ بھی بنا سکتا ہے، بلکہ اعادہ تو ابتدا کے مقابلے میں اَہوَن ہوتا ہے، آسان ہوتا ہے، پہلی دفعہ بنانا مشکل ہوتا ہے۔ اِنَّهٗ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ: بے شک وہ پیدا کرنے کی ابتدا کرتا ہے یعنی ابتداءً پیدا وہی کرتا ہے، ثُمَّ يُعِيْدُهٗ: وہی دوبارہ اعادہ کرے گا، اور اس اِعادہ کرنے سے مقصد یہ ہوگا لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ بِالْقِسْطِ: تاکہ بدلہ دے ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے انصاف کے ساتھ، انصاف کے ساتھ بدلہ دے، یہ بدلہ انصاف پہ مبنی ہوگا، لیکن انصاف کی کیا صورت ہے؟ انصاف کا مطلب یہاں یہ ہے کہ بغیر کسی جرم کے سزا نہ دے، یہ ہے انصاف کا تقاضا، اور اگر جرم پر سزا نہ دے اور معاف کردے یہ تو رحم ہے، ایک مجرم حاکم کے سامنے چلا گیا جس جرم کی سزا قانونی طور پر تین سال تھی، اور وہ حاکم کے سامنے جس وقت پیش ہوا تو حاکم کہتا ہے کہ چلو! میں نے تجھے بَری کردیا، اتنا سا اختیار مجھے ہے کہ میں تجھے معاف کرسکتا ہوں، میں نے معاف کردیا، تو وہ کہے کہ حاکم صاحب! یہ تو آپ نے انصاف نہیں کیا، قانون کا تقاضا تین سال کی سزا ہے، آپ معاف کیسے کرسکتے ہیں، یہ تو کوئی احمق ہی ہوگا جو کہے کہ یہ بات انصاف کے خلاف ہے، کسی جرم پر سزا نہ دی جائے یہ تو رحم ہے۔ تو بِالْقِسْطِ کا مفہوم آپ کے سامنے ذکر کررہا ہوں کہ انصاف کے ساتھ بدلہ دینے کا یہ مطلب ہے کہ نیکی کی ہوئی کو بلاوجہ ضائع نہ کرے اور بغیر کسی جرم کے سزا نہ دے، انصاف کا تقاضا یہ ہے، باقی! اگر کسی نے جرم کیا ہے اور اللہ تعالیٰ اس کے اوپر سزا نہ دے بلکہ معاف کردے یہ اس کا فضل اور اس کا رحم ہے، یہ بات انصاف کے خلاف نہیں، اور جتنی نیکی آپ نے کی تھی اس کا اجر آپ کے اندازے سے بہت زیادہ دے دے یہ بھی اس کا فضل ہے یہ بھی انصاف کے خلاف نہیں، نیکی کو ضائع کردیا جائے اور بغیر کسی جرم کے سزا دے دی جائے اس کو آپ صورۃً ظلم کہہ سکتے ہیں کہ یہ انصاف کے خلاف ہے، تو بِالْقِسْطِ کا مفہوم یہ ہوگیا، ''اللہ تعالیٰ انصاف کے ساتھ بدلہ دے ان لوگوں کو جو ایمان لے آئے اور انہوں نے نیک کام کیے''۔ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا: اور دوبارہ لانے سے مقصد یہ بھی ہوگا کہ جو کافر ہیں جو نہیں مانے، لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِيْمٍ: ان کے لئے گرم پانی پینے کے لئے ہوگا، وَّعَذَابٌ اَلِيْمٌ بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ: اور ان کے لئے دردناک عذاب ہوگا بسبب اس کے کہ وہ کُفر کرتے تھے، کُفر کی وجہ سے ان کو دردناک عذاب دیا جائے گا، کُفر کا انجام یہ ہوگا۔ تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے بتادیا کہ یہ زندگی گزارنے کے بعد دوبارہ لوٹائے جاؤ گے، اللہ کے سامنے پیش ہونا ہے، اور وہاں جاکے دو طبقوں کا انجام اس طرح سے سامنے آئے گا۔

تمام اَدیانِ سماویہ میں عبادت کا نظم اللہ نے چاند کے ساتھ متعلّق کیا

هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَآءً وَّالْقَمَرَ نُوْرًا: یہ اللہ تعالیٰ نے اپنے تصرفات ظاہر فرمائے ہیں، يُدَبِّرُ الْاَمْرَ کے اندر جس طرح سے (ضمناً) آگئے، اللہ تعالیٰ نے سورج بنایا اور اس کو تیز روشنی دی، اس روشنی کے اندر گرمی بھی ہے، اللہ تعالیٰ نے سورج کو ضیاء بنایا، یعنی ایسا روشن کہ جس کے اندر تیزی اور گرمی ہے، اور اللہ تعالیٰ نے چاند کو نور بنایا، وَّقَدَّرَهٗ مَنَازِلَ: اور اس کی چال کے لئے منزلیں متعین کیں، اور بالکل نمایاں قسم کی منزلیں جو ایک مہینے میں یہ پوری کرلیتا ہے اور اپنا چکر پورا کرلیتا ہے، تاکہ تم اس کے ذریعے سے سالوں کا حساب جان لو اور عام حساب جان لو، سالوں کی گنتی جان لو۔ تو اللہ تعالیٰ نے دینِ سماوی جتنے بھی تھے ان کے

اندر عبادت کا حساب کتاب جتنا ہے وہ سب چاند کے مہینوں پر ہی رکھا ہے، سورج بھی سال میں ایک چکر پورا کرتا ہے، اس کی منزلیں ۳۶۵ ہیں یا جتنی بھی ہیں، حساب دانوں کے نزدیک، تو یہ پورا چکر کرتا ہے تو ایک سال بنتا ہے، اور چاند کا جو چکر ہے اس کی ۲۸ منزلیں ہیں، ۲۹ یا ۳۰ دن کے بعد یہ دوبارہ اپنے پہلے ٹھکانے پہ آجاتا ہے، تو چونکہ آسمانی دین جتنے بھی ہیں وہ سارے کے سارے اللہ نے آسان رکھے ہیں، فطرت کے قریب تر رکھے ہیں تو چاند کے ساتھ حساب رکھنا آسان ہے کہ اس میں بھولنے کا امکان کم ہے، اگر کسی وقت تاریخ بھول بھی جائے کہ آج تاریخ کون سی ہے تو جب نئے سرے سے چاند چڑھے گا پھر پتا چل جائے گا، اور چاند کے بڑے چھوٹے ہونے کے ساتھ بھی لوگ تعین کر لیتے ہیں کہ اتنے دن ہو گئے، اتنے دن ہو گئے، اور جس دن سورج کے غروب ہوتے ہی نظر نہیں آئے گا تھوڑے سے وقفے کے ساتھ نکلے گا تو لوگ اندازہ کر لیتے ہیں کہ آج پندرہویں تاریخ ہے، سورج کے غروب ہوتے ہی نمایاں ہو جاتا ہے اور پورا مکمل ہو جاتا ہے تو لوگ اندازہ کر لیتے ہیں کہ آج چودھویں تاریخ ہے، تو اس سے حساب رکھنا آسان ہے، تو دینِ سماوی جتنے بھی ہیں سب میں عبادات کا نظم اللہ تعالیٰ چاند کے ساتھ لگایا ہے، جیسے ہمارے ہاں رمضان المبارک، روزے کی فرضیت چاند کے ساتھ تعلق رکھتی ہے، حج چاند کے ساتھ تعلق رکھتا ہے، زکوٰۃ کی فرضیت چاند کے ساتھ تعلق رکھتی ہے، اور طلاق وغیرہ کی صورت میں عدت چاند کے ساتھ تعلق رکھتی ہے، یہ حساب اسی طرح سے ہی کیے جاتے ہیں، ان کو شمسی حسابات کے تحت داخل نہیں کیا جاسکتا، یہ ناجائز ہے، اس لیے یہ جو انگریزی مہینے ہیں شمسی مہینے ہیں اگر کوئی شخص ان مہینوں کے اعتبار سے زکوٰۃ کا حساب قائم کر لے، مثلاً یکم جنوری کو زکوٰۃ دیتا ہے تو ۳۳ سال گزر جانے کے بعد ایک سال کی زکوٰۃ اس کے ذِمّے مزید آئے گی، کیونکہ ۳۳ سال میں ایک سال کا فرق پڑ جائے گا، اور یہ شرعی طور پر چاند کے مہینوں کا مکلف ہے، تو جس وقت ۳۳ سال انگریزی گزریں گے تو چاند کے حساب سے ۳۴ سال گزر چکے ہوں گے، پھر اس کو اس کو زکوٰۃ دُہری دینی پڑے گی، اگر یہ زکوٰۃ نہیں دے گا تو ایک سال کی زکوٰۃ ادا نہ کرنے کا مجرم ہوگا۔ باقی! دیگر حساب جو لین دین کے ہوتے ہیں تجارت وغیرہ کے، وہ اگر شمسی مہینوں کے ساتھ بھی رکھ لیے جائیں تو جائز ہے، اس میں کوئی شک نہیں، لیکن انبیاء ﷺ کی سُنّت اور خلفاء کی سُنّت یہی ہے کہ عام حساب کتاب کے اندر بھی چاند کے مہینوں کو ہی استعمال کیا جائے۔ اس لیے چاند کی تاریخ کی حفاظت اُمّت کے ذِمّے فرضِ کفایہ ہے، کہ اگر سارے کے سارے ہی اس کو چھوڑ کے بیٹھ جائیں گے تو فرض کے تارک ہیں، اور آپ یہ سمجھتے ہیں کہ فرضِ کفایہ اگرچہ چند آدمیوں کے ادا کرنے کے ساتھ باقی سب کے ذِمّے سے اُتر جاتا ہے، لیکن جو ادا کرتے ہیں ان کو ثواب فرض ادا کرنے کا ملتا ہے، یہ تو ایک واضح سی بات ہے، مثلاً جنازہ فرضِ کفایہ ہے، چند آدمی اگر مل کر جنازہ پڑھ لیں تو مسلم کا حق ادا ہوگیا، باقی اُمّت گنہگار نہیں ہے، لیکن جنہوں نے جنازہ پڑھا ہے، جس کی وجہ سے اُمّت کے سر سے یہ بوجھ اُترا، ان کو ویسے ہی ثواب ملے گا جس طرح سے ایک فرض کے ادا کرنے کا ہوتا ہے، اس لیے جو لوگ ان عربی تاریخوں کو، چاند کی تاریخوں کو محفوظ رکھے ہوئے ہیں، اپنے حساب کتاب میں استعمال کرتے ہیں، خط و کتابت میں استعمال کرتے ہیں تو ان کے لئے ثواب ویسے ہی ہے جس طرح سے کہ فرض کے ادا کرنے کا ہوتا ہے، اگرچہ چند آدمیوں کے محفوظ رکھنے کی وجہ سے باقی اُمّت گنہگار نہیں، اور اگر سارے ہی چھوڑ کے بیٹھ جائیں گے تو گنہگار ہیں، اس لیے خط و کتابت میں اور عام حالات میں چاند کی تاریخ کا تذکرہ باعثِ ثواب ہے، کیونکہ اس

کے ساتھ اس فرض کی ادائیگی ہوتی ہے جو مجموعی طور پر اُمّت کے ذِمّے ہے، سارے مِل کے اگر چھوڑ دیں کہ تاریخ غلط ہی ہو جائے اور محرم، صفر یاد ہی نہ رہیں، جب کسی سے پوچھو کہ سال کے کتنے مہینے ہیں اور کون کون سے ہیں؟ تو بچے سے لے کے بوڑھے تک اور جوان جتنے ہیں سب جنوری فروری مارچ اپریل شمار کرنے شروع کر دیتے ہیں، یا زیادہ سے زیادہ بڑی عمر کے لوگ چیتر، بیساکھ، جیٹھ ہاڑ، یہ مہینے شمار کرلیں گے، اور محرم، صفر پوچھو تو کسی کو یاد ہی نہیں، اگر سارے ہی لوگ اس طرح سے ہو جائیں کہ چیتر، بیساکھ، جیٹھ، ہاڑ، ہی کرنے والے ہوں، جنوری، فروری، مارچ، اپریل والے ہوں، تو ساری اُمّت گنہگار ہے، کیونکہ محرم، صفر، ربیع الاوّل ان مہینوں کا محفوظ رکھنا ضروری ہے، اسی کے ساتھ ہی حج کا نظم، اسی کے ساتھ ہی روزے کا نظم، اور اسی کے ساتھ ہی باقی عبادات کا تعلق ہے، یہی وجہ ہے کہ یہاں صرف چاند کی منزلوں کو ذِکر کیا گیا، سورج کی منزلوں کا یہاں تذکرہ نہیں، اگرچہ سورج کی بھی منزلیں ہیں اور سورج بھی سال بناتا ہے، اس کے ساتھ بھی حساب کتاب ہوتا ہے لیکن اس کا جاننا ہر کسی کے بس میں نہیں، حساب دان لوگ ہی جانتے ہیں کہ اس وقت سورج کس منزل میں ہے اور کونسی تاریخ بن گئی، اس وقت کس منزل میں ہے اور کون سا مہینہ بن گیا، عام لوگ اس کو پہچان نہیں سکتے، جیسے سورج پہ حساب رکھنے والے رات کو بارہ بجے تاریخ بدلتے ہیں، ان کی نزدیک اس وقت سورج ایسی منزل پہ پہنچتا ہے کہ جس کے بعد اس کی دوسری منزل شروع ہوتی ہے، تو رات کے ۱۲ بجے تاریخ بدلتی ہے، اور چاند والے غروبِ شمس پر مدار رکھتے ہیں کہ رات آئی، چاند کا دور شروع ہوا تو تاریخ بدل گئی، آپ کا گھڑیوں کا نظام جتنا بھی ہے وہ سب سورج کے ساتھ ہی ہے، یہ جو رات کو ۱۲ بجتے ہیں، اس وقت گویا کہ ایک خاص نقطے پہ جب سورج پہنچتا ہے اس وقت ہر ملک والے ۱۲ بجا لیتے ہیں، ۱۲ بجانے کے بعد پھر ۲۴ گھنٹے اسی چکر کے ساتھ چلتے رہتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ ریڈیو کا وقت صحیح ہوتا ہے کہ یہ محکمۂ موسمیات والے اور رصد والے، ہیئت والے یہ متعین کرتے ہیں کہ اس وقت گھڑی پہ کیا بجنا چاہیے، جب وہ نقطہ آتا ہے تو ۱۲ بج گئے، تو وقت صحیح ہے، اور جو گھڑیاں اس کے مطابق ہوں گی ان کا وقت صحیح ہوگا، ورنہ غلط ہے، یہ حکمت ہوتی اس کی کہ ریڈیو پہ ہر روز اعلان ہوتا ہے کہ اس وقت یہ وقت ہوا، اس وقت یہ وقت ہوا، وہ وقت ان کا صحیح ہوتا ہے چونکہ قواعد کے ساتھ متعین کیا ہوا ہوتا ہے، اس کا جاننا ہر کسی کے بس میں نہیں ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ نعمتیں دیں، سورج بنایا، چاند بنایا، اس کے لئے منزلیں متعین کیں، تمہارے لیے سالوں وغیرہ کا حساب سارے کا سارا آسان کر دیا۔

اللہ تعالیٰ کے اِنعامات کی بارش اور اس کا تقاضا

مَا خَلَقَ اللّٰهُ ذٰلِكَ اِلَّا بِالْحَقِّ: نہیں پیدا کیا اللہ تعالیٰ نے ان کو مگر مصلحت کے ساتھ، یہ بے کار نہیں، بلکہ مصلحت اور حکمت کے ساتھ ہیں، مصلحت اور حکمت بظاہر ان میں یہی ہے تا کہ انسان اپنی ضروریات کو پورا کرے، ضروریات کو پورا کرنے کے بعد جس نے یہ اِنعامات اور اِحسانات کیے ہیں اس کی عبادت کرے، اس کے سامنے جھکے، تذلّل کا اظہار کرے، یہ نہیں کہ انسان ان سب نعمتوں سے فائدہ تو اُٹھاتا جائے اور اپنے اوپر کوئی کسی قسم کی ذمہ داری قبول ہی نہ کرے۔ ارے بھائی! ایک آدمی پر اتنے احسانات جو کیے گئے، اور اس کے لئے اتنے انتظامات جو کیے گئے، تو اس کے اُوپر کوئی ذمہ داری نہیں؟ اللہ نے اس اشرف المخلوقات

کو صرف کھاد فیکٹری ہی بنایا ہے؟ یعنی اگر اس کے سامنے کوئی حساب کتاب نہیں، کسی قاعدہ یا قانون کا یہ پابند نہیں، تو اس کی حیثیت اس کے بغیر کیا ہے کہ یہ کھاد فیکٹری ہے، اللہ کی نعمتوں کو کھاتا جائے اور نکالتا جائے، پاکیزہ چیز کھائے اور پلید کر کے ڈال دے، اس کے بغیر اور کچھ حاصل ہے انسان کی زندگی کا؟ تو جس نے اتنے انتظامات کیے اور اتنے احسانات کیے وہ آخر ایک دن تم سے پوچھے گا بھی کہ کھایا پیا تو سب کچھ تھا، ذمہ داری کیا ادا کی؟ وہ ذمہ داری وہی عبادت کا قانون ہے جو اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان انسانوں کے اوپر لاگو کیا ہے، جو اس قانون کی رعایت رکھے گا تو اس نے گویا کہ اس کھانے کا بھی حق ادا کر دیا اور جو ذمہ داری کا احساس نہیں کرتا تو اس نے کھاپی سب کچھ لیا، ذمہ داری سمجھی نہیں، تو آخر یہ دینا پڑ جائے گا، کھایا ہوا ناک کے راستے نکلے گا۔

''اللہ تعالیٰ تفصیل کے ساتھ بیان کرتا ہے آیات کو علم والے لوگوں کے لئے'' یہ سب اللہ تعالیٰ کے تصرفات اور تدبیر امر ہے جو آپ کے سامنے واضح کی جارہی ہے، اسی کی قدرت اور اسی کے انعامات ہیں، یہ اسی توحید کی عقیدے کی تقویت کے لئے ہے کہ اوقات بھی اللہ کے قبضے میں، زمان بھی اللہ کے قبضے میں، مکان بھی اللہ کے قبضے میں، تمہاری ہر ضرورت اللہ سے متعلق ہے، کسی کے سامنے درخواست دینے کی ضرورت نہیں، اور کسی کے سامنے تذلّل اختیار کرنے کی ضرورت نہیں ہے، بس اتنی سی بات کہ سب سے دل ٹوٹ کے ایک اللہ سے جُڑ جائے یہی توحید ہے، اور جہاں دوسروں کے سہارے اس قسم کے بنائے ہوئے ہوں گے کہ یہ ہمارا کام بنا سکتا ہے یہ بگاڑ سکتا ہے اور اللہ کی طرف انسان کا دھیان نہ جائے تو یہی شرک ہے، بہت واضح سی بات ہے، اس میں کسی قسم کا کوئی خفا نہیں ہے...... ''رات اور دن کے اختلاف میں'' اختلاف کی دونوں صورتیں ہوتی ہیں، ایک جاتا ہے دوسرا آتا ہے، کس طرح سے باری باندھ رکھی ہے، اور اسی طرح سے ان کا بڑا چھوٹا ہونا، دیکھو! پچھلے دنوں میں رات بڑی ہوتی جارہی تھی دن چھوٹے ہوتے جارہے تھے، اب دن بڑے ہوتے جارہے ہیں رات چھوٹی ہوتی جارہی ہے، رات کے اجزاء کٹ کٹ کے دن کی طرف آرہے ہیں، ''دن اور رات کے اختلاف میں اور اس چیز میں جو کچھ زمین و آسمان میں اللہ نے پیدا کیا، بے شک نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو کہ تقویٰ اختیار کرتے ہیں۔

آخرت کو برباد کرنے والی چیزیں

''بے شک وہ لوگ جو ہماری ملاقات کی امید نہیں رکھتے'' یہ منکر آخرت ہیں، ''اور اسی دنیوی زندگی پہ خوش ہو گئے'' ان کے دل میں کوئی آخرت کی طلب نہیں، اسی پہ مطمئن ہو گئے، کوئی دوسرا ان کے ہاں کھٹکا نہیں، یعنی یہیں ہیں کھانے پینے والے لوگ، وہ سمجھتے ہیں کہ یہیں کماؤ اور کھاؤ، بس اتنا سا کام ہے، ''اور ہماری آیات سے غافل ہیں، یہ لوگ ہیں جن کا ٹھکانا جہنم ہوگا'' کہ انہوں نے کھاپی تو سب کچھ لیا، اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے فائدہ تو اٹھالیا، لیکن اللہ کی طرف سے جو ذمہ داری عائد ہوئی تھی وہ نہیں نبھائی، ناکامیاب ہوں گے فیل ہوں گے، اور'' آخرت میں ان کا ٹھکانا جہنم ہوگا ان کاموں کی وجہ سے جو یہ کرتے تھے''۔ اللہ تعالیٰ سے ملاقات کی امید نہ رکھنا، دل کے اندر کسی قسم کا کھٹکا نہ ہونا، دنیوی زندگی پہ مطمئن ہوجانا اور اسی پہ خوش ہوجانا، اللہ کی آیات سے غافل ہونا، گویا کہ یہی آخرت کی بربادی کو انسان کے سامنے لاتا ہے۔

مؤمن کی منزلِ مقصود

''اور بے شک وہ لوگ جو ایمان لاتے ہیں اور نیک عمل کرتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کو ایمان کی برکت سے منزلِ مقصود تک پہنچائے گا'' وہ منزلِ مقصود جنّت ہے، ان کے مساکن کے نیچے سے، ان کے مکانات کے نیچے سے نہریں بہتی ہوں گی، خوش حالی کے باغات میں، ان کا آخری انجام یہ ہوگا، اور جس وقت وہاں جائیں گے تو ان کی زبان پر کیا لفظ جاری ہوں گے سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ، جس وقت اللہ تعالیٰ کی کوئی نعمت سامنے آئے گی بلا اختیار زبان کے اوپر ''سبحان اللہ، سبحان اللہ'' جاری ہو جائے گا، اور اسی ''سبحان اللہ'' کی برکت سے مزید ان پر اللہ کی عنایات ہوں گی، کوئی سوال کرنے کی اپنی کوئی حاجت ظاہر کرنے کی نوبت نہیں آئے گی، صرف ''سبحان اللہ، سبحان اللہ'' کا ذکر ہوگا، زبان پہ یہی الفاظ ہوں گے جس کے ساتھ ہر قسم کی نعمتیں سامنے آتی چلی جائیں گی، یہ تو اللہ کی تسبیح پڑھیں گے، اور آپس میں جس وقت ملیں گے تو سلام، تَحِيَّتُهُمْ فِيهَا سَلٰمٌ، ان کا آپس میں تحیہ جو ہوگا، ایک دوسرے کو دُعا جو دیں گے تو سلام کہیں گے، لیکن تَحِيَّتُهُمْ کا یہ معنی بھی ہے کہ ان کو جو تحفہ دیا جائے گا وہ بھی سلام ہوگا، اللہ تعالیٰ بھی ان کو سلام کہیں گے سَلٰمٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِيْمٍ سورۂ یٰس میں جس طرح سے آتا ہے، اور فرشتے بھی جس وقت آئیں گے وَالْمَلٰٓئِكَةُ يَدْخُلُوْنَ عَلَيْهِمْ مِّنْ كُلِّ بَابٍ ۞ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ (سورۂ رعد: ۲۴) فرشتے اِدھر سے آ رہے ہیں السلام علیکم، اُدھر سے آ رہے ہیں السلام علیکم، گویا کہ کان کے اندر سلامتی ہی سلامتی کی آواز آئے گی، کوئی آفت کوئی مصیبت کوئی پریشانی نہیں، ہر وقت سلامتی ہی سلامتی ہوگی، کامیاب قسم کے لوگ آپس میں جس وقت ملتے ہیں تو کہتے ہیں ''مبارک باد، سلامت رہو'' اس طرح سے جیسے ایک دوسرے سے خوشی کی بات کرتے ہیں تو یہاں بھی آپس کا سلام جو ہوگا گویا کہ ایک قسم کی ایک دوسرے کو مبارکباد ہے۔ اور جب آپس میں ملیں گے، باتیں یاد کریں گے کہ دنیا میں ہم یوں ہوتے تھے، یہ تھا، وہ تھا، آخرکار جس وقت کلام ختم ہوگی تو ان کی زبان کے اوپر یہی لفظ جاری ہوں گے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ، مجلس کے اختتام پر یہ الفاظ آئیں گے کہ اللہ کا شکر ہے جو کہ ربّ العالمین ہے، اس سے معلوم ہوگیا کہ اچھے لوگوں کی مجلس کا خاتمہ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے ذکر پر ہونا چاہیے، اور اکثر و بیشتر حالات میں زبان کے اوپر تسبیح اور تحمید جاری ہونی چاہیے، یہ جنّتی ہونے کی علامت ہے۔

دُعائے ''کفّارۃ المجلس''

حدیث شریف میں آتا ہے کہ جس مجلس کے اختتام پر زبان پر یہ کلمہ جاری کر دیا جائے: ''سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ أَسْتَغْفِرُكَ وَأَتُوْبُ إِلَيْكَ'' یا بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے: ''سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ۞ وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ ۞ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ''[1] تو حدیث شریف میں آتا ہے کہ اس مجلس کے اندر کوئی کسی قسم کا گناہ ہوگیا، زبان

---

(۱) پہلے الفاظ کے لئے دیکھئے: ابو داؤد ۲ / ۳۱۳، باب فی کفارۃ المجلس، نیز ترمذی ۲ / ۱۸۱، مشکوۃ ۱ / ۲۱۴۔ دوسرے الفاظ کے لئے دیکھیں: ابن کثیر، سورۃ صافات کا آخر۔

سے کوئی کمی بیشی کے الفاظ نکل گئے، اللہ تعالیٰ اس ذکر کی برکت سے اس کا کفارہ کردیتے ہیں، اس لیے یہ دُعا "کفّارۃُ المجلس" کہلاتی ہے، تو یہ مجلس کا ادب ہے کہ اس کا اختتام اللہ کی حمد وثناء پر ہونا چاہیے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ○ وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ ○ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○

وَلَوْ يُعَجِّلُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ الشَّرَّ اسْتِعْجَالَهُمْ بِالْخَيْرِ لَقُضِيَ اِلَيْهِمْ اَجَلُهُمْ ؕ

اگر اللہ تعالیٰ لوگوں کے لئے شر جلدی بھیج دے مثل جلدی طلب کرنے ان لوگوں کے خیر کو تو ان کی طرف ان کی عمر پوری کردی جائے،

فَنَذَرُ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ⑪ وَاِذَا

پس ہم چھوڑے رکھتے ہیں ان لوگوں کو جو ہماری ملاقات کی اُمید نہیں رکھتے ان کی سرکشی میں وہ بھٹکتے پھرتے ہیں ⑪ اور جب

مَسَّ الْاِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنْۢبِهٖٓ اَوْ قَاعِدًا اَوْ قَآئِمًا ۚ فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُ

انسان کو نقصان پہنچتا ہے پکارتا ہے ہمیں اپنے پہلو پر لیٹا ہوا یا بیٹھا ہوا یا کھڑا ہوا، پھر جب ہم دُور ہٹادیتے ہیں اس سے

ضُرَّهٗ مَرَّ كَاَنْ لَّمْ يَدْعُنَآ اِلٰى ضُرٍّ مَّسَّهٗ ؕ كَذٰلِكَ زُيِّنَ

اس کی تکلیف کو وہ یوں گزر جاتا ہے گویا کہ نہیں پکارا اس نے ہمیں کسی تکلیف کی طرف جو اس کو پہنچی تھی، اسی طرح سے مزین کردیا گیا

لِلْمُسْرِفِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ⑫ وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ

حد سے بڑھنے والوں کے لئے ان کاموں کو جو وہ کرتے ہیں ⑫ پکی بات ہے کہ ہم نے بہت ساری جماعتوں کو ہلاک کیا تم سے پہلے

لَمَّا ظَلَمُوْا ۙ وَجَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ وَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا ؕ كَذٰلِكَ

جب وہ ظالم ہوگئے، اور ان کے پاس ان کے رسول آئے واضح دلائل لے کر نہیں تھے وہ لوگ کہ ایمان لے آئیں، اسی طرح سے

نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ ⑬ ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِي الْاَرْضِ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ

بدلہ دیتے ہیں ہم جرم کرنے والے لوگوں کو ⑬ پھر ہم نے تمہیں بنادیا زمین میں خلیفے ان کے بعد تاکہ ہم ظاہری طور پر دیکھیں کہ تم کیسے

تَعْمَلُوْنَ ⑭ وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيَاتُنَا بَيِّنٰتٍ ۙ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ

عمل کرتے ہو ⑭ جب ان پر ہماری آیات پڑھی جاتی ہیں واضح واضح تو کہتے ہیں وہ لوگ جو ہم سے ملنے کی اُمید نہیں رکھتے لے آ

بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ ۭ قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ

کوئی قرآن اس کے علاوہ اور، یا اسی میں تبدیلی کر دے، آپ کہہ دیجئے کہ میرے لئے یہ ممکن ہی نہیں کہ میں اس میں تبدیلی کر دوں

مِنْ تِلْقَاۗئِ نَفْسِيْ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ ۚ اِنِّىْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ

اپنی طرف سے، نہیں پیروی کرتا میں مگر اسی بات کی جو میری طرف وحی کی جاتی ہے، میں تو ڈرتا ہوں اگر میں نے اپنے رب کی

رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝ قُلْ لَّوْ شَاۗءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَيْكُمْ وَلَآ اَدْرٰىكُمْ

نافرمانی کی، بڑے دن کے عذاب سے ⑮ آپ کہہ دیجئے کہ اگر اللہ چاہتا تو میں اس کی تلاوت نہ کرتا تم پر اور نہ وہ اللہ تمہیں اس کی

بِهٖ ڮ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ

اطلاع ہی دیتا، تحقیق میں ٹھہر چکا تمہارے اندر ایک طویل عمر اس سے قبل، کیا تم سوچتے نہیں ہو؟ ⑯ پھر کون بڑا ظالم ہے اس شخص

افْتَرٰى عَلَي اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ ۭ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْمُجْرِمُوْنَ ۝ وَ

سے جو اللہ پر جھوٹ گھڑے یا اس کی آیات کو جھٹلائے، بے شک بات یہ ہے کہ مجرم لوگ فلاح نہیں پائیں گے ⑰ اور

يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّھُمْ وَلَا يَنْفَعُھُمْ وَيَقُوْلُوْنَ

عبادت کرتے ہیں یہ اللہ کے علاوہ ایسی چیزوں کی جو ان کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتیں اور نہ ان کو نفع پہنچا سکتی ہیں، اور یہ کہتے ہیں کہ

هٰٓؤُلَاۗءِ شُفَعَاۗؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ ۭ قُلْ اَتُنَبِّـــُٔوْنَ اللّٰهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي

یہ ہمارے شفعاء ہیں اللہ کے سامنے، آپ کہہ دیجئے کہ کیا تم خبر دیتے ہو اللہ کو ایسی چیز کی جس کو اللہ نہیں جانتا آسمانوں میں نہ

الْاَرْضِ ۭ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝ وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّآ اُمَّةً وَّاحِدَةً

زمین میں، پاک ہے وہ اور بلند و بالا ہے ان چیزوں سے جن کو تم شریک ٹھہراتے ہو ⑱ نہیں تھے لوگ مگر ایک ہی جماعت

فَاخْتَلَفُوْا ۭ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَھُمْ

پھر انہوں نے آپس میں اختلاف کیا، اگر نہ ہوتی ایک بات جو سبقت لے گئی تیرے رب کی طرف سے تو ان کے درمیان فیصلہ کر دیا جاتا

فِيْمَا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ۝ وَيَقُوْلُوْنَ لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۚ

اس چیز میں جس میں کہ یہ اختلاف کرتے ہیں ⑲ اور یہ لوگ کہتے ہیں کیوں نہیں اُتاری جاتی اس پر کوئی نشانی اس کے رب کی طرف سے،

فَقُلْ اِنَّمَا الْغَیْبُ لِلّٰہِ فَانْتَظِرُوْا ۚ اِنِّیْ مَعَکُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِیْنَ ۝۲۰

آپ کہہ دیجیے غیب تو اللہ ہی کے لئے ہے، پس تم انتظار کرو، میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں سے ہوں ۲۰

خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ وَلَوْ یُعَجِّلُ اللّٰہُ لِلنَّاسِ الشَّرَّ: یُعَجِّلُ تعجیل سے لیا گیا ہے جلدی کرنے کے معنی میں، ''اگر اللہ تعالیٰ لوگوں کے لئے شر جلدی بھیج دے، شر پہنچانے میں جلدی کرے'' اسْتِعْجَالَهُمْ بِالْخَیْرِ: مثل جلدی طلب کرنے ان لوگوں کے خیر کو، یہاں تقابل ہے دونوں لفظوں میں، جس کا مفہوم یہ ہوگا کہ لوگ اللہ تعالیٰ سے خیر جلدی طلب کرتے ہیں، اکثر وبیشتر اللہ تعالیٰ خیر انہیں جلدی دے دیتا ہے، اگر اسی طرح سے جب وہ اپنے لئے شر طلب کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ شر بھی جلدی دے دیا کرے، لَقُضِیَ اِلَیْهِمْ اَجَلُهُمْ: تو ان کی طرف ان کی عمر پوری کردی جائے۔ اَجل: مدتِ معینہ۔ ان کی طرف ان کی اجل پوری کردی جائے، لیکن اللہ تعالیٰ کی رحمت غضب پر غالب ہے، اس لئے اکثر وبیشتر اپنی حکمت کے تحت وہ خیر تو جلدی پہنچادیتا ہے جس وقت لوگ خیر طلب کرتے ہیں، وہ شر جلدی بھی طلب کریں تو بھی اللہ تعالیٰ جلدی شر نہیں پہنچاتا، بلکہ مہلت دے دیتا ہے، ڈھیل دے دیتا ہے، ورنہ اگر شر بھی اللہ تعالیٰ جلدی پہنچادیا کرے تو ان کا ویسے ہی خاتمہ ہوجائے، یہ مفہوم ہے ان الفاظ کا، تو ایک طرف استعجال محذوف ہے یعنی وہ شر کو جلدی طلب کرتے ہیں اللہ جلدی شر نہیں دیتا عام طور پر، اور دوسری طرف تعجیل کا مفہوم محذوف ہے کہ جس طرح سے وہ خیر کو جلدی طلب کرتے ہیں اللہ تعالیٰ عادۃً خیر جلدی دے دیتا ہے۔[1] فَنَذَرُ الَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا: پس ہم چھوڑتے ہیں ان لوگوں کو جو ہماری ملاقات کی اُمید نہیں رکھتے، فِیْ طُغْیَانِهِمْ: ان کی سرکشی میں۔ چھوڑتے ہیں یعنی ان کو ترک کردیتے ہیں، ان کے اُوپر گرفت نہیں کرتے، ''ہم چھوڑے رہتے ہیں ان لوگوں کو جو نہیں اُمید کرتے، چھوڑے رکھتے ہیں ان لوگوں کو'' جس طرح سے چاہیں ان الفاظ کو ادا کرسکتے ہیں، ''جو ہماری ملاقات کی اُمید نہیں کرتے چھوڑتے ہیں ہم انہیں ان کی سرکشی میں'' یَعْمَهُوْنَ: بھٹکتے پھرتے ہیں۔ وَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ الضُّرُّ: اور جب انسان کو ضُر پہنچتا ہے۔ ضُر: تکلیف، نقصان۔ جب انسان کو نقصان پہنچتا ہے دَعَانَا لِجَنْۢبِهٖٓ اَوْ قَاعِدًا اَوْ قَآئِمًا: لِجَنْۢبِهٖٓ کا معنی مُضْطَجِعًا عَلٰی جَنْبِهٖ، پکارتا ہے ہمیں اپنے پہلو پر لیٹا ہوا، یا بیٹھا ہوا، یا کھڑا ہوا، کیونکہ یہ تین ہی حال ہیں انسان کے، پہلو پر لیٹا ہوا، یا بیٹھا ہوا، یا کھڑا ہوا، کھڑے ہونے کی حالت میں، بیٹھنے کی حالت میں، لیٹنے کی حالت میں، فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُ ضُرَّهٗ: پھر ہم جب دُور ہٹادیتے ہیں اس سے اس کی تکلیف کو، مَرَّ كَاَنْ لَّمْ يَدْعُنَآ اِلٰى ضُرٍّ مَّسَّهٗ: مَرَّ: وہ گزر جاتا ہے۔ ''یوں چل دیتا ہے، یوں گزر جاتا ہے گویا کہ نہیں پکارا اس نے ہمیں کسی تکلیف کی طرف جو اس کو پہنچی تھی'' اَیْ اِلٰی کَشْفِ ضُرٍّ مَّسَّهٗ، گویا کہ اس نے ہمیں اس تکلیف کے دُور کرنے کی طرف بُلایا ہی نہیں تھا جو تکلیف اس کو پہنچی تھی ایسے گزر جاتا ہے، كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْمُسْرِفِيْنَ: اسی طرح سے ہم نے مزین کردیا ہے، کھبادیا ہے مسرفین کے لئے، حد سے بڑھنے والوں کے لئے ان کاموں کو جو وہ کرتے ہیں۔ وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ: یہ پکی بات ہے کہ ہم نے بہت ساری جماعتوں کو ہلاک کیا تم سے پہلے۔ قرون

(۱) ومعنی الاٰیۃ لَوْ یُعَجِّلُ اللّٰہُ لِلنَّاسِ الشَّرَّ الذی دعوہ واستعجلوہ تعجیلًا کتعجیلہ لھم الخیر حین دعوہ واستعجلوہ (مظہری)

قرن کی جمع، ایک عصر کے لوگ جو ہوتے ہیں آپس میں ملتے جلتے وہ قرن کہلاتے ہیں، ایک زمانے کے لوگ، ''ہم نے بہت سی جماعتوں کو تم سے پہلے ہلاک کیا'' لَمَّا ظَلَمُوْا: جس وقت انہوں نے کفر وشرک کا ارتکاب کیا، اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ (سورۃ لقمان: ۱۳) شرک یہ بہت بڑا ظلم ہے، ''جس وقت انہوں نے کفر وشرک کا ارتکاب کیا، جب وہ ظالم ہوگئے'' وَجَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ: اور ان کے پاس ان کے رسول آئے واضح دلائل لے کر، وَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا: نہیں تھے وہ لوگ کہ ایمان لے آئیں، وہ ایمان لانے والے نہیں تھے، كَذٰلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ: اسی طرح سے بدلہ دیتے ہیں ہم جرم کرنے والے لوگوں کو۔ ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ: پھر ہم نے تمہیں بنادیا خَلٰٓئِفَ فِي الْاَرْضِ: زمین میں خلیفے۔ خلائف خلیفہ کی جمع ہے، جانشین، ''پہلی جماعتوں کے جانشین'' پہلی قوم گئی اور دوسری قوم آگئی، مِنْۢ بَعْدِهِمْ: ان کے بعد، ان کے پیچھے ہم نے تمہیں زمین میں خلیفے بنادیا، لِنَنْظُرَ: تاکہ ہم ظاہری طور پر دیکھیں، كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ: کہ تم کیسے عمل کرتے ہو۔ وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيَاتُنَا بَيِّنٰتٍ: جب ان پر ہماری آیات پڑھی جاتی ہیں واضح واضح، قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا: کہتے ہیں وہ لوگ جو ہم سے ملنے کی امید نہیں رکھتے، لِقَآءَنَا: ہم سے ملنے کی امید نہیں رکھتے۔ لِقَآءَ مصدر ہے اس کی اضافت مفعول کی طرف ہے۔ کہتے ہیں وہ لوگ: ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ: لے آ کوئی قرآن اس کے علاوہ اور، اس کے علاوہ کوئی اور قرآن لے آ، اَوْ بَدِّلْهُ: یا اسی میں تبدیلی کردے، قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ: آپ کہہ دیجئے کہ میرے لئے یہ ممکن ہی نہیں کہ میں اس میں تبدیلی کردوں، مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيْ: اپنی طرف سے، اور جب تبدیلی کرنے کا ہی اختیار نہیں تو اور لانے کا کیا اختیار ہے، اس کی بدرجہ اَولیٰ نفی ہوجائے گی، ''نہیں ہے میرے لئے کہ میں بدل دوں اس قرآن کو، مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيْ: اپنے نفس کی طرف سے، اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ: نہیں پیروی کرتا میں مگر اسی بات کی جو میری طرف وحی کی جاتی ہے، اِنِّيْٓ اَخَافُ: میں تو ڈرتا ہوں، اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ: اگر میں نے اپنے ربّ کی نافرمانی کی، عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ: یہ اخاف کا مفعول ہے، ڈرتا ہوں میں بڑے دن کے عذاب سے۔ قُلْ لَّوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَيْكُمْ: آپ کہہ دیجئے کہ اگر اللہ چاہتا تو میں اس کی تلاوت نہ کرتا تم پر، وَلَآ اَدْرٰىكُمْ بِهٖ: اور نہ اللہ تعالیٰ تمہیں اس قرآن کی اطلاع ہی دیتا۔ اَدْرٰى يُدْرِيْ: بتلانا۔ وَلَآ اَدْرٰىكُمْ: اَدْرٰى کا فاعل اللہ ہے، ''نہ وہ اللہ تمہیں اس بات کی اطلاع ہی دیتا، اس قرآن کی اطلاع ہی دیتا'' فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ: تحقیق میں ٹھہر چکا تمہارے اندر، عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ: ایک طویل عمر اس سے قبل، عُمُرًا سے عمر کا کافی حصہ مراد ہے، میں اس سے قبل تمہارے اندر کافی عمر ٹھہر چکا، میری کافی عمر تمہارے اندر گزری ہے، اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ: کیا تم سوچتے نہیں ہو، عقل سے کام نہیں لیتے؟ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ: پھر کون بڑا ظالم ہے اس شخص سے جو اللہ پر جھوٹ گھڑے یا اس کی آیات کو جھٹلائے، اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْمُجْرِمُوْنَ: بے شک بات یہ ہے (''ہٗ'' ضمیر ضمیر شان) بے شک بات یہ ہے کہ مجرم لوگ فلاح نہیں پائیں گے۔ وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ: اور عبادت کرتے ہیں یہ اللہ کے علاوہ ایسی چیزوں کی جو نہیں ان کو کوئی نقصان پہنچاسکتیں اور نہیں ان کو کوئی نفع پہنچاسکتیں۔ لَا يَضُرُّ کی ضمیر ''مَا'' کی طرف ہے و لا ینفع کی ضمیر بھی ''مَا'' کی طرف ہے، تو جب ہم اس کا ترجمہ اشیاء کے ساتھ کریں گے ''ایسی چیزوں کی پوجا کرتے ہیں جو چیزیں نہ ان کو نقصان پہنچاسکتی ہیں نہ انہیں نفع پہنچاسکتی ہیں، یعنی عبادت نہ کرنے کی صورت میں ان کا کچھ بگاڑ نہیں

سکتیں اور عبادت کرنے کی صورت میں ان کا کچھ بنا نہیں سکتیں۔ وَيَقُولُونَ هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ: اور یہ کہتے ہیں کہ یہ ہمارے شفعاء ہیں اللہ کے سامنے۔ شفعاء شفیع کی جمع۔ شفیع: سفارش کرنے والا۔ ''یہ ہمارے شفعاء ہیں اللہ کے سامنے'' گویا اللہ تو بڑا ہے سب کا، اور یہ وہاں سے ہمارا کام کروالیتے ہیں۔ قُلْ اَتُنَبِّـُٔوْنَ اللّٰهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ: آپ کہہ دیجئے کہ کیا تم خبر دیتے ہو اللہ کو ایسی چیز کی جس کو اللہ نہیں جانتا آسمانوں میں نہ ہی زمین میں۔ یہ ''نَفْيُ الشَّيْءِ بِنَفْيِ لَازِمِهٖ'' جو آپ فصاحت بلاغت میں قاعدہ پڑھیں گے کہ کبھی کسی چیز کی نفی کرنی ہوتی ہے تو براہِ راست اس کی نفی نہیں کرتے بلکہ اس کے لازم کی نفی کردیتے ہیں، اور جس وقت لازم کی نفی کردیں گے تو اصل شئ کی نفی خود بخود ہوگئی، اگر کوئی چیز موجود ہو تو اس کا اللہ کے علم میں ہونا لازم ہے، ایسا نہیں ہوسکتا کہ کوئی چیز موجود ہے لیکن اللہ کے علم میں نہیں، اللہ کے علم کے احاطے سے باہر ہے ایسا نہیں ہوسکتا، اگر کوئی چیز موجود ہوتی تو اللہ کے علم میں ضرور ہوتی۔ تو یہاں اللہ تعالیٰ کہتا ہے مجھے خود ہی معلوم نہیں کہ کوئی شفیع ہے جو اس طرح سے مجھ سے منوالیتا ہے اور میں اس کی بات کو ٹال نہیں سکتا، مجھے نہیں پتا کوئی ایسا ہے کہ نہیں ہے، اور میں نہیں جانتا ایسے شفیع کو، میرے علم میں ہی نہیں ہے کوئی ایسا شفیع، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کا سرے سے وجود ہی نہیں، یہ کہتے ہیں کہ منوالیتے ہیں، مجھے تو معلوم نہیں کون مجھ سے منوالیتا ہے، تو مطلب یہ ہے کہ ایسے شخص کا وجود ہی نہیں، تو تم اللہ کو ایسی چیز کی خبر دیتے ہو جو اللہ کے علم میں نہیں ہے؟ تو براہِ راست اس میں اگرچہ نفی اللہ کے علم کی ہورہی ہے لیکن حقیقت کے اعتبار سے شفعاء کے وجود کی نفی کرنی مقصود ہے، اگر چیز موجود ہوتی تو اللہ کے علم میں ضرور ہوتی، اور جب اللہ ہی نہیں جانتا کسی شفیع کو کہ کوئی شفیع ہے جو مجھ سے منوالیتا ہے یا میرے اور ان کے درمیان میں اس طرح سے واسطہ ہے کہ مجھ سے ان کی ضرورتیں پوری کروالیتا ہے، مجھے تو کوئی نہیں معلوم، جب مجھے معلوم نہیں تو اس کا مطلب ہے کہ ہے ہی نہیں سرے سے۔ تو براہِ راست تو اس میں اللہ کے علم کی نفی ہورہی ہے لیکن حقیقت کے اعتبار سے ان شفعاء کے وجود کی نفی کرنی مقصود ہے، ''کیا تم خبر دیتے ہو اللہ کو ایسی چیز کی جس کو اللہ نہیں جانتا آسمانوں میں نہ زمین میں'' سُبْحٰنَهٗ: وہ اللہ پاک ہے ہر قسم کی عیب سے، اور اس قسم کے شفعاء کا وجود جن کی اللہ ٹال نہ سکے جو اللہ کو مجبور کر کے منوالیں یہ تو اللہ پر تم ایک بہتان باندھ رہے ہو، اللہ پر ایک عیب لگا رہے ہو، اللہ ہر عیب سے پاک ہے، اللہ کسی کے سامنے مجبور نہیں، نہ اس کو کوئی مجبور کرسکتا ہے، ''پاک ہے وہ'' وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ اور بلند و بالا ہے ان چیزوں سے جن کو تم شریک ٹھہراتے ہو۔ وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّآ اُمَّةً وَّاحِدَةً: نہیں تھے لوگ مگر ایک ہی جماعت، فَاخْتَلَفُوْا: پھر انہوں نے آپس میں اختلاف کیا، وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ: اگر نہ ہوتی ایک بات جو گزر گئی تیرے رَبّ کی طرف سے، سبقت لے گئی تیرے رَبّ کی طرف سے، لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ تو ان کے درمیان فیصلہ کردیا جاتا، فِيْمَا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ: اس چیز میں جس میں کہ یہ اختلاف کرتے ہیں۔ وَيَقُوْلُوْنَ لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ: اور یہ لوگ کہتے ہیں کیوں نہیں اتاری جاتی اس پر کوئی نشانی اس کے رَبّ کی طرف سے، فَقُلْ: آپ کہہ دیجئے، اِنَّمَا الْغَيْبُ لِلّٰهِ: غیب تو اللہ ہی کے لئے ہے، فَانْتَظِرُوْا: پس تم انتظار کرو، اِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ: میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں سے ہوں۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

تفسیر

گفتگو چلی آرہی ہے مشرکین کے ساتھ، ترغیب وترہیب کے سلسلے میں پچھلی آیات کے اندر دونوں کا انجام ذکر کیا گیا تھا۔

اللہ تعالیٰ کا اپنی مخلوق کے ساتھ رحمت والا معاملہ ہے

قرآنِ کریم کی بہت ساری آیات میں یہ بات مذکور ہے کہ جس وقت مشرکین کے سامنے عذاب کا ذکر آتا وہ فوراً کہنے لگ جاتے کہ ہمارے پاس لے آ عذاب، کون سا عذاب ہے جس سے تُو ہمیں ڈراتا ہے، فَأْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ (سورۂ اعراف: ۷۰ وغیرہ) یہ کتنی جگہ ذکر کیا گیا ہے، جہاں کسی نبی نے کسی مشرک قوم کو خطاب کیا اور اس کو اللہ کے عذاب سے ڈرایا تو آگے سے وہ ڈھیٹ ہو کر یونہی کہتے تھے کہ کس عذاب کی دھمکی دیتے ہو؟ لے آؤ، ہمارے سامنے لے آؤ، کیوں نہیں ہمارے اُوپر اس قسم کا عذاب آتا؟ تو اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتے ہیں کہ مخلوق کے ساتھ میرا معاملہ رحمت کا ہے، ''رَحْمَتِیْ سَبَقَتْ غَضَبِیْ'' جس وقت اللہ نے مخلوق کو بنایا تھا تو اس وقت ہی یہ ایک مرکزی نقطہ متعین کر لیا تھا، اور یہ عبارت اللہ کے پاس عرشِ الٰہی پہ لکھی ہوئی ہے،[1] گویا کہ اللہ تعالیٰ کا معاملہ مخلوق کے ساتھ اس اصول کے تحت ہے کہ ''رَحْمَتِیْ سَبَقَتْ غَضَبِیْ'' میری رحمت میرے غضب پر سابق رہے گی، مخلوق کے ساتھ معاملہ رحمت کا زیادہ ہے غضب کا کم ہے، اس لیے جس وقت لوگ اللہ سے خیر طلب کرتے ہیں تو اللہ کی عام عادت یہ ہے کہ خیر پہنچاتا ہے، زندگی میں آپ دیکھیں گے تو باوجود نافرمانیوں کے اللہ کی طرف سے نعمتوں کی بوچھاڑ ہے، اگر اس طرح سے جس وقت لوگ شر طلب کرتے ہیں تو شر بھی جلدی پہنچا دیا کرے تو ان میں سے بچے گا کون؟ ''شر جلدی طلب کرتے ہیں'' یہ یوں بھی تھا جس طرح سے مشرک کہتے تھے لے آ عذاب، برسا دے ہمارے اُوپر آسمان سے پتھر، یا آسمان کو ہمارے اوپر ٹکڑے ٹکڑے کر کے گرا دے، فَأَسْقِطْ عَلَيْنَا كِسَفًا مِّنَ السَّمَآءِ (سورۂ شعراء: ۱۸۷) آسمان کے ٹکڑے کر کے ہمارے اوپر گرا دو، اس طرح بھی وہ عذاب طلب کرتے تھے۔ اور ایسے بھی ہوتا ہے کہ جب انسان اُکتا جاتا ہے تو اپنے آپ کو بددُعائیں دینے لگ جاتا ہے اور اپنے اہل وعیال کو بددُعائیں دینے لگ جاتا ہے اور اپنے مال اور اولاد کے متعلق بددُعا کے الفاظ کہنے لگ جاتا ہے، یہ کاشت کار، زمین دار جس وقت ہل جوتے ہوئے ہوتے ہیں اور بیل سیدھی طرح سے نہ چلے تو کہتے ہیں اومریں، تیرے سَپ لڑے (تُو مر جائے، تجھ سانپ ڈس لے)، اور اِس علاقے کے لوگ جس وقت کسی کے ساتھ کوئی تھوڑی سی سخت کلامی کرتے ہیں تو کہتے ہیں ''مُردار تھیویں، مریں شالا'' اس قسم کے الفاظ عام طور پر لوگ بولتے رہتے ہیں، اب اگر اللہ تعالیٰ ان کی اس قسم کی دُعائیں ہر وقت قبول کرنی شروع کر دے تو ذرا سنتا، گھروں کے اندر مائیں اپنے بچوں پہ جب ناراض ہوتی ہیں تو کیسے کیسے تیز لفظ بولتی ہیں، تو اگر وہ فوراً قبول ہو جایا کرے تو ہم میں سے کوئی موجود ہوتا؟ اپنے ماں باپ کی دُعاؤں کے ساتھ ہی سر سے لگ جاتے، تو یہ اللہ کی رحمت ہے کہ اگر

---

(۱) بخاری ج ۲ ص ۱۱۰۳، باب قول اللہ و کان عرشہ علی الماء/ مشکوۃ ج ۱ ص ۲۰۶، باب سعۃ رحمۃ اللہ کی پہلی حدیث۔

کوئی شر طلب کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ جلدی نہیں دیتے، اس لیے حدیث شریف میں آتا ہے کہ اپنی اولاد کے لئے بددُعا نہیں کرنی چاہیے،[1] عام طور پر ٹھیک ہے کہ اللہ تعالیٰ قبول نہیں کرتے، لیکن کبھی اللہ کی طرف سے ایسا وقت ہوتا ہے کہ اس وقت جو مانگو اللہ مان لیتا ہے، تو اگر تمہاری یہ بددُعا کسی ایسے وقت سے موافق ہوگئی جس میں اللہ تعالیٰ نے یہ طے کر دیا ہے کہ جو کوئی مانگے گا دوں گا، تو اپنی زبان سے اپنے مال واولاد کے لئے بربادی کیوں مانگتے ہو؟ تو ان کے اس شبہ کا ازالہ اس میں کیا گیا کہ اگر اللہ تعالیٰ لوگوں کو شر جلدی دے دیتا جس وقت یہ شر طلب کرتے ہیں، جس طرح سے ان کے خیر طلب کرنے کے وقت اللہ تعالیٰ عام طور پر خیر جلدی دے دیتا ہے، لَقُضِيَ اِلَيْهِمْ اَجَلُهُمْ تو ان کا تو وقت ہی پورا ہو چکا ہوتا، ان کی تو عمر ہی ختم ہوگئی ہوتی، یہ تو سرے سے ختم ہو گئے ہوتے، جب یہ خود عذاب مانگتے ہیں اور اللہ کی طرف سے ان کے مانگنے پہ عذاب فوراً آجائے تو پھر یہ باقی کیسے رہتے، ''ان کی طرف ان کی عمر پوری کر دی جاتی'' لیکن اللہ کی یہ عادت ہے کہ اس قسم کے لوگوں کو بھی جو اللہ سے ملاقات کی امید نہیں رکھتے ان کو بھی ڈھیل دے دیتا ہے، ڈھیل دینے میں مصلحت یہ ہوتی ہے کہ اگر ان میں سے کسی میں کچھ سمجھنے کا جذبہ ہوگا تو سمجھ جائے گا ورنہ پھر ان کی شرارت اور ان کی سرکشی اس معیار پہ پہنچ جانی چاہیے کہ جب اللہ کی گرفت ہو تو پھر چھوٹنے کے لئے کوئی بہانہ ان کے پاس موجود نہ ہو، ''ہم چھوڑے رکھتے ہیں، چھوڑ دیتے ہیں ہم ان لوگوں کو جو ہماری ملاقات کی امید نہیں کرتے ان کی سرکشی کے اندر، وہ بھٹکتے پھرتے ہیں'' یہ مہلت دیتے ہیں، ہماری یہ عادت ہے، اور یہ بھی ایک قسم کی رحمت کا تقاضا ہے جو اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کے ساتھ کرتا ہے۔

جلد باز اِنسان کی کمزوری اور اِحسان فراموشی

مانگتا تو ہے جلدی جلدی شر، لیکن آگے ہمت پھراتی ہے، حوصلہ اتنا ہے کہ اگر اللہ کی طرف سے تھوڑا سا ایک تھپیڑا لگ جاتا ہے تو اکڑفوں جتنی ہے فوراً نکل جاتی ہے، وَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ الضُّرُّ: جب انسان کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے۔ الْاِنْسَانَ کو مطلق ذکر کر دیا، یہ قضیہ مہملہ کے درجے میں ہے، نہ تو سب انسان ایسے ہیں اور نہ سارے انسان ایسے نہیں ہوتے، بلکہ بعض افراد ایسے ہیں لاعلی التعیین، اس لیے اس کو قضیہ مہملہ کے انداز میں ذکر کر دیا گیا ہے، افراد متعین نہیں کیے گئے، تو جس وقت اس جماعت کے اندر چند افراد بھی اس قسم کے موجود ہوں گے تو بات اپنی جگہ صحیح ہے، ''جب انسان کو کوئی تکلیف پہنچ جاتی ہے پھر وہ ہماری طرف متوجہ ہوتا ہے'' ویسے تو ہم اسے یاد نہیں آتے، پھر تو اٹھتے بیٹھتے لیٹتے جب دیکھو دُعائیں کر رہا ہے، یا اللہ! رحم فرما، یا اللہ! یہ تکلیف دُور کر دے، ہائے اللہ! ہائے اللہ! پھر تو ہر وقت یہی بات ہوتی ہے، لیٹا ہوا ہے تو اسی طرح سے پکار رہا ہے، بیٹھا ہوا ہے تو اسی طرح سے پکار رہا ہے، کھڑا ہے تو اسی طرح سے پکار رہا ہے، اور انسان کے اوپر عموماً یہی تین حال ہوتے ہیں یا وہ بیٹھا ہوتا ہے، یا کھڑا ہوتا ہے، یا لیٹا ہوتا ہے، مطلب یہ ہے کہ پھر ہر وقت ہمارے سامنے وہ چیخ و پکار کرتا ہے جس وقت اس کو کوئی تکلیف پہنچی ہوئی ہوتی ہے۔ اور جب اللہ تعالیٰ اس تکلیف کو دُور کر دیتے ہیں فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُ ضُرَّهٗ: جب ہم اس سے اس کی تکلیف کو دُور کر دیتے ہیں تو پھر یوں

---

(۱) مسلم ج ۲ ص ۴۱۶، باب حدیث جابر الطویل/مشکوۃ ج ۱ ص ۱۹۴، کتاب الدعوات، فصل اول، عن جابرؓ۔ ولفظ الحدیث: لَا تَدْعُوا عَلٰى اَوْلَادِكُمْ

گزر جاتا ہے جیسے اس نے کبھی ہمیں بلایا ہی نہیں کسی تکلیف کے ازالے کے لئے، پھر اس کو کوئی پرواہی نہیں ہوتی، اور انسان کا یہ حال ایک واقعہ ہے، دیکھ لیا کرو جس وقت کوئی شخص بیمار ہو، اس کو کوئی تکلیف پہنچ جائے، اس وقت اس کی حالت کیسی ہوتی ہے؟ کہ بڑا اللہ کا نام لیتا ہے، اللہ کے سامنے بہت چیخ و پکار کرتا ہے، اور اپنے دل کے اندر اپنے کردار پہ نادم ہوتا ہوا کہتا ہے کہ اب اگر اللہ تعالیٰ شفادے دے تو اب نماز پڑھا کروں گا، اب میں یہ کام کیا کروں گا، اس کے دل میں اس قسم کی بڑی آرزوئیں اٹھتی ہیں، بڑے وعدے کرتا ہے، لیکن جس وقت تکلیف دُور ہو جاتی ہے تو جس طرح سے پہلے تھا ویسے کا ویسا پھر، کوئی پروانہیں ہوتی، تو یہ انسان کی ایک کمزوری ہے، اللہ تعالیٰ اسی کمزوری کا یہاں ذکر کرتے ہیں، کہ منہ سے تو مانگتا ہے تکلیفیں، لیکن ہمت اتنی سی ہے کہ جس وقت کوئی تکلیف پہنچ جاتی ہے پھر ہر وقت چیختا ہے، لیکن پھر احسان فراموش اتنا ہے کہ جب ہم اس کی تکلیف کو دُور کر دیتے ہیں پھر یوں منہ موڑ کے چل دیتا ہے جیسے کبھی اس نے ہمیں پکارا ہی نہیں کسی تکلیف کے ازالے کے لئے، لَمْ یَدْعُنَآ اِلٰی ضُرٍّ مَّسَّهٗ، گویا کہ اس نے ہمیں کبھی بلایا ہی نہیں کسی تکلیف کے دُور کرنے کی طرف جو اس کو پہنچی تھی، یعنی پھر سب وعدے بھول جاتا ہے، كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْمُسْرِفِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ: مسرفین: جو حد سے گزرنے والے ہیں ان کے لئے ان کا کردار اسی طرح سے خوشنما کر دیا گیا، ان کو اپنی یہی حرکتیں اچھی لگتی ہیں، ورنہ جو مسرف نہیں ہیں معتدل ہیں، حد سے تجاوز کرنے والے نہیں ہیں، اعتدال کے ساتھ چلنے والے ہیں جس طرح سے مؤمن ہوتے ہیں، وہ تکلیف پہنچے نہ پہنچے، ویسے بھی اللہ کو یاد کرتے ہیں، تکلیف پہنچتی ہے تو بھی اللہ کے سامنے گریہ زاری کرتے ہیں، تکلیف دُور ہو جانے کے بعد اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں، تکلیف ہو راحت ہو ہر وقت ان کی توجہ اللہ کی طرف ہوتی ہے، راحت پہنچے گی تو اللہ کا شکر ادا کریں گے، تکلیف پہنچے گی تو صبر کریں گے اور اللہ سے اس کے ازالے کی درخواست کریں گے، وہ کسی حال میں بھی اللہ کو بھولتے نہیں۔ یہ لوگ جو حد پہ نہیں رہتے بلکہ حد سے تجاوز کرنے والے ہیں، جب تکلیف پہنچے تو سب سے زیادہ چیخ و پکار یہی کرتے ہیں اور جس وقت تکلیف دُور ہو جائے تو سب سے زیادہ لاپرواہی ہوتے ہیں، ان کو اپنا یہی کردار اچھا لگتا ہے، ''مسرفین کے لئے ان کے کردار کو جو کچھ یہ کرتے ہیں مزین کر دیا گیا۔''

تاریخِ سابقہ کے ذریعے ترہیب

وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ: اب یہ پچھلی تاریخ کا حوالہ دے کے ترہیب کی جارہی ہے کہ ہم تمہیں سمجھا رہے ہیں، اپنے منہ سے اپنی موت نہ مانگو، ورنہ اگر تم نمونہ دیکھنا چاہتے ہو کہ تم جیسے لوگوں کا کیا انجام ہوا کرتا ہے تو ذرا پچھلی تاریخ اٹھا کے دیکھو! ہم نے بہت ساری جماعتیں تم سے پہلے ہلاک کر دیں جب وہ اسی طرح سے کفر و شرک میں مبتلا ہوئیں، حالانکہ ان کے پاس ان کے رسول واضح دلائل لے کے آئے لیکن وہ ماننے والے کہاں تھے؟ جب ایک دفعہ ان کے منہ سے ''نہ'' نکل گئی پھر وہ ''ہاں'' سے نہیں بدلی، پھر وہ اَڑے ہی رہے، وہ ماننے والے نہیں تھے، ''ایسے ہی ہم مجرم لوگوں کو بدلہ دیا کرتے ہیں'' اس لیے اگر تمہارے اندر اسی قسم کا جرم پایا گیا جس طرح سے انہوں نے ظلم کا کفر و شرک کا ارتکاب کیا تھا، اگر تمہارے اندر بھی پایا جائے گا تو تمہیں بھی ایسے ہی سزا ملے گی، گویا کہ اپنے آپ کو ان کے اوپر قیاس کر لو کہ جس طرح سے انہوں نے جرم کا ارتکاب کیا تھا، برباد ہوئے، اللہ کے عذاب کا

نشانہ بنے، تم بھی اگر اس قسم کا جرم کرو گے تو اللہ تعالیٰ اپنی عادت کے تحت تمہیں بھی برباد کر دے گا، اس لیے جلدی بربادی طلب کرنے کی بجائے سوچو، سوچ کر اپنی حالت کو سنوارنے کی کوشش کرو، اسی میں تمہارا بھلا ہے، ورنہ اللہ تعالیٰ کے لئے ہلاک کرنا یا برباد کرنا کوئی مشکل نہیں ۔ ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِي الْاَرْضِ مِنْۢ بَعْدِهِمْ: پھر اُن کو برباد کرنے کے بعد ہم نے تمہیں جانشین بنا دیا، علاقے خالی ہوئے اور اس جگہ دوسری قومیں آ کے آباد ہو گئیں، پہلی قومیں چلتی ہیں دوسری قومیں آ جاتی ہیں، ''ان کے پیچھے ہم نے تمہیں ان کا جانشین بنا دیا زمین میں'' لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ: تاکہ ہم ظاہری طور پر دیکھیں کہ تم کیا کرتے ہو؟ تو اگر تو جانے والوں کا حال دیکھو گے، حال دیکھ کے اس سے عبرت حاصل کرو گے تو تمہارا انجام اچھا ہو جائے گا، ورنہ اگر وہی طریقہ تم نے اپنا لیا جس قسم کا طریقہ انہوں نے اپنایا تھا تو وہی انجام تمہارا ہو گا جو ان کا ہوا تھا۔

قرآنِ کریم کے متعلّق مشرکین کے دو مطالبے

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيَاتُنَا بَيِّنٰتٍ: جب ان پر ہماری واضح واضح آیات پڑھی جاتی ہیں، یہ جو قرآنِ کریم میں اترتی ہیں، جب ہمارے رسول کی زبانی ان کو سنائی جاتی ہیں، تو یہ اس قرآن کو اپنی مرضی کے خلاف پاتے ہیں، ان کے نظریات کے خلاف ہے، ان کے آباء و اجداد کے طریقے کے خلاف ہے، اب یہ چاہتے ہیں کہ درمیان میں کوئی مصالحت کر لیں، کچھ لو کچھ دو کے اصول پر، کہ جی ہم آپ کی مخالفت چھوڑ دیتے ہیں، ہم آپ کے ساتھ لگ جاتے ہیں، لیکن یہ قرآن جس میں ہمارے آباء و اجداد کی تحمیق کی جاتی ہے کہ وہ بے وقوف تھے جاہل تھے، ان کا طریقہ اچھا نہیں تھا، وہ مشرک تھے، وہ تو جہنم کا ایندھن تھے، اس قسم کی باتیں ہم سے برداشت نہیں ہوتیں، دوسرے یہ ہے کہ ہمارے جو معبود ہیں جن کو ہم باپ دادے سے پُوجتے چلے آ رہے ہیں ان کو چھوڑنا ہمارے لیے کچھ مشکل ہے، یا تو کوئی اور کتاب لے آؤ جس میں یہ باتیں نہ ہوں، یا اگر اسی کو رکھنا ہے تو یہ باتیں جو ہمارے خیالات اور نظریات سے ٹکراتی ہیں یہ نکال دو، ہماری آپس میں صلح ہو جائے گی، اختلاف ختم ہو جائے گا، یعنی وہ اس طرح سے اپنے موقف کو تو چھوڑنا نہیں چاہتے اور اللہ کے رسول کو مجبور کرتے ہیں کہ اگر تُو نے کوئی کتاب لانی ہے تو ایسی کتاب بنا، اور ان کا یہ مطالبہ اسی نظریے پر مبنی تھا گویا کہ یہ کتاب ان کی خود کی بنائی ہوئی ہے، کہ ہم تیری مخالفت نہیں کریں گے لیکن کتاب کسی اور طرح کی لے آ، یا اسی میں کچھ ترمیم کر دے کہ وہ آیات اس میں سے نکال دے جن کے ساتھ ہم تکلیف محسوس کرتے ہیں، تو اس کے پس منظر میں گویا کہ یہی بات ہے، وہ سمجھتے ہیں کہ یہ خود بناتا ہے، اس لیے صلح یوں ہو سکتی ہے کہ اس قسم کی باتیں بنانا چھوڑ دے، جو پہلے بنا چکا ہے وہ اپنی کتاب میں سے خارج کر دے۔ ''جب ان کے اوپر ہماری آیات پڑھی جاتی ہیں واضح واضح، تو کہتے ہیں وہ لوگ جو ہماری ملاقات کی امید نہیں رکھتے'' دیکھو! بار بار لفظ یہی آ رہا ہے لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر قسم کی بدمعاشی، ہر قسم کی شرارت، ہر قسم کا ظلم، ہر قسم کی بدعملی کی بنیاد اس پر ہے کہ کوئی شخص آخرت کا معتقد نہ ہو، آخرت سے جو غفلت ہے، اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہونے کا جو ڈر نہیں، اسی کے ساتھ ہر قسم کی بدعملی انسان کے اندر پیدا ہوتی ہے، ورنہ اگر انسان کے دل کے اندر یہ خیال آ جائے کہ میں نے اللہ تعالیٰ سے ملنا ہے اور اس کے سامنے کھڑے ہو کے میں نے حساب دینا ہے تو اس کی حرکات متوازن ہو جاتی

ہیں، وہ سوچ سوچ کے قدم اُٹھائے گا کہ میں ایسا کام کروں کہ کل اللہ تعالیٰ کے سامنے جاؤں تو مجھے کسی قسم کی شرمساری نہ ہو۔ تو ان کی اصل بیماری یہی تھی کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے جانے کا ان کو یقین نہیں تھا، اس کی ملاقات کی امید نہیں رکھتے تھے، اس لیے ان کے ہر بُرے عمل کی بنیاد اسی پہ رکھی جاتی ہے کہ جن کو ہمارے ساتھ ملنے کی امید نہیں وہ یوں کرتے ہیں، جن کو ہمارے ساتھ ملنے کی امید نہیں وہ اس قسم کی باتیں کرتے ہیں، یہ بنیاد ساری اسی پر آرہی ہے۔ ''تو کہتے ہیں وہ لوگ جو ہماری ملاقات کی امید نہیں رکھتے'' ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَیْرِ ھٰذَآ: اس قرآن کے علاوہ کوئی اور قرآن لے آ، اَوْ بَدِّلْهُ: یا اسی میں کچھ ترمیم کردے، اس میں کچھ تبدیلی کردے۔

مشرکین کے مطالبات کا جواب

قُلْ مَا یَكُوْنُ لِیْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِیْ: مطالبے ان کے دو تھے، یا تو اور قرآن لے آ، یا اسی کے اندر تبدیلی کردے، یہاں جو جواب دیا جارہا ہے وہ ان کے ایک مطالبہ سے تعلق رکھتا ہے کہ ''کہہ دیجیے کہ میرے لیے تو یہ ممکن ہی نہیں، میرے لیے تو یہ لائق ہی نہیں کہ میں اپنی طرف سے اس کے اندر کوئی کسی قسم کی تبدیلی کروں'' تو جب اس کی چند آیات کو میں بدل نہیں سکتا تو اس کی بجائے دوسرا قرآن کہاں سے لاسکتا ہوں؟ اُس کی نفی بدرجہ اولیٰ ہوگئی، دو مطالبے تھے جب ان میں سے ادنیٰ کی نفی ہوگئی کہ میرے اختیار میں تو یہ بھی نہیں، تو دوسری طرف سے اختیار کی نفی خود معلوم ہوگئی کہ سارے قرآن کو بدل کے لے آنا، اس کے بدلے میں اور قرآن لے آنا میرے بس میں کیسے ہوسکتا ہے؟۔ ''آپ کہہ دیجیے کہ میرے لیے تو یہ ممکن ہی نہیں کہ میں بدل دوں اس کو اپنی طرف سے'' اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰٓی اِلَیَّ: نہیں پیروی کرتا میں مگر اسی بات کی جو میری طرف وحی کی جاتی ہے، اس میں میرا کوئی بس نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو وحی کی جاتی ہے میں تو اس کا متبع ہوجاتا ہوں، تو یہ میرا بنایا ہوا ہے ہی نہیں، یہ تو اللہ کی طرف سے وحی آئی ہوئی ہے، اس لیے اس میں ترمیم وغیرہ میں نہیں کرسکتا، اِنِّیْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَیْتُ رَبِّیْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ: تم تو بے فکر ہو لیکن میں ڈرتا ہوں، کہ اگر میں نے اپنے ربّ کی نافرمانی کی تو میں ڈرتا ہوں بڑے دن کے عذاب سے، بڑے دن سے وہی ملاقات والا دن مراد ہے، میرا تو اس ملاقات پر یقین ہے، مجھے تو پتا ہے کہ ایک بہت بڑا دن آنے والا ہے جس میں اللہ کے سامنے جانا ہے، اگر میں نے اپنی طرف سے اس کے اندر کوئی گڑبڑ کرلی یہ اللہ کی نافرمانی ہوگی، اور اگر نافرمانی کروں گا تو مجھے تو بڑے دن کے عذاب سے ڈر لگتا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ تمہیں بھی ڈرنا چاہیے اس دن کے عذاب سے۔

سَرورِکائنات ﷺ کا تلاوتِ قرآن کرنا اللہ کی مشیت سے ہے

اور آپ یہ بھی کہہ دیں کہ یہ تو اللہ کی مشیت کے تحت میں پڑھ رہا ہوں، اللہ نے چاہا کہ میں اس کی تلاوت کروں تو تلاوت کررہا ہوں، اور اگر اللہ چاہتا کہ میں تلاوت نہ کروں تو میں تلاوت نہ کرسکتا، یہ تو اللہ کے چاہنے کے ساتھ ہی ہے جو کچھ ہے، ''اگر اللہ چاہتا تو میں نہ پڑھتا اس قرآن کو تمہارے اوپر، اور نہ اللہ تعالیٰ تمہیں اس قرآن کی اطلاع ہی دیتا'' یہ تو سارے کا سارا اسی کے چاہنے کے ساتھ ہی ہورہا ہے، وہ چاہتا ہے تو میرے اوپر کتاب اترتی ہے اور میں تلاوت کرتا ہوں، اگر وہ دوسری بات چاہ لیتا تو

میں اس کو پڑھ نہ سکتا، اور اللہ تعالیٰ اس قرآن کی تمہیں کسی طرح سے اطلاع ہی نہ دیتا، میرے بس میں کیا ہے، یہ تو سارے کا سارا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے جو کچھ ہو رہا ہے۔

سَرورِ کائنات ﷺ کا اپنے کردار کو مشرکین کے سامنے پیش کرنا

اس کے لئے کتنی واضح اور کتنی صاف دلیل مشرکوں کے سامنے پیش کی، کہ بھئی! میں کہیں باہر سے نہیں درآمد کیا گیا، کہ یکدم تمہارے سامنے آیا ہوں اور آ کے میں نے اس قسم کے حالات پیدا کر دیے اور اس قسم کی باتیں کرنی شروع کر دیں، میں تو تمہارے اندر پیدا ہوا ہوں اور ایک عمر تمہارے اندر گزار چکا ہوں، تم میری پچھلی عمر کو دیکھو جو زندگی تمہارے اندر میں نے گزاری ہے، اس کے بعد تم میری ان باتوں کو سوچو، تمہیں خود پتا چل جائے گا کہ اس میں میرے بس میں کچھ نہیں، چالیس سال جو میں نے تمہارے اندر گزارے، اس دوران تم نے کب پایا کہ میرے اندر کوئی سرداری کی ہوس ہے، بڑا بننے کا شوق ہے، مجھے کوئی لیڈر بننے کا شوق ہے، یا مجھے کب تم نے دیکھا کہ میں کسی استاذ کے سامنے بیٹھا ہوں اور میں نے وہاں سے علم وفضل سیکھا ہو، کسی مدرسے میں داخل ہوا ہوں، کسی عالم کی صحبت میں رہا ہوں، یا کب تم نے میری کسی مجمع کے اندر پہلے تقریر سنی تھی جو مجھے تقریر کرنے کی عادت ہے اور میں ایسی ایسی باتیں تمہارے سامنے کرتا ہوں، شاعروں کے ساتھ میری دوستیاں تم نے کب دیکھی ہیں؟ کسی وقت تم بتاؤ کہ کسی مجلس کے اندر آ کے میں نے کوئی بات اس قسم کی کہی ہو جس کے متعلق تم کہہ سکو کہ اس کی یہ سوچ پہلے ہی تھی جس کو یہ آج ظاہر کر رہا ہے، تمہیں میری پچھلی زندگی کا کوئی جوڑ میری ان باتوں کے ساتھ معلوم ہوتا ہے؟۔ دیکھو بھائی! بات واضح ہے کہ انسان کے خیالات میں تبدیلی کوئی ایک رات میں نہیں آجایا کرتی، انسان کا کردار ایک ہی رات میں کہیں پلٹا نہیں کھا جایا کرتا، اس کی بنیاد بہت پیچھے سے اٹھا کرتی ہے، ایک بچہ اگر مقرر بننے والا ہے تو بچپن سے اس کو اس قسم کی باتیں کرنے کا شوق ہوگا، اور اگر کوئی شاعر بننے والا ہے تو ابتدا سے بے ڈھنگے سے شعر پہلے ہی کہنے شروع کر دے گا، آخر ترقی کرتا، کرتا، کرتا، کرتا، علامہ اقبال کی طرح وہ ملک الشعراء بن جاتا ہے، لیکن یہ چیز جو شروع ہوگی تو بچپن سے ہی رجحان شروع ہو جاتا ہے، تو میرے بچپن کے رجحان دیکھو، میں نے بچپن تم میں گزارا، میں نے جوانی تم میں گزاری، میں نے ادھیڑ عمر تم میں گزاری، آخر چالیس سال کو میں پہنچا، کوئی بات اس قسم کی بتاؤ جس سے تمہیں اندازہ لگتا ہو کہ میں پہلے ہی یہی سوچ رہا تھا کہ میں نے یوں بننا ہے، یا کوئی تقریر کرنے کی، شعروشاعری کی، مضمون بنانے کی، سجع بندی کی مجھے کوئی پہلے عادت تھی، تم ذرا میری پچھلی عمر کو دیکھو تو سہی، تو پھر اندازہ لگاؤ کہ یکدم ایک ہی رات میں یہ انقلاب کس طرح سے آ گیا؟ کہ میں ایسی باتیں تمہارے سامنے کرنے لگ گیا کہ جس کا لفظی حیثیت میں کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا، معنوی حیثیت میں کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا، فصاحت بلاغت کے اعلیٰ معیار پر ہے، تو ایک ہی رات میں یہ انقلاب کس طرح سے آ گیا؟ اگر تم اس انداز سے سوچو گے تو تمہیں پتا چل جائے گا کہ یہ میری بنائی ہوئی نہیں، یہ تو باہر سے میرے اوپر آ رہی ہے جو تمہیں سنا رہا ہوں، ورنہ بغیر اتنی مشق کرنے کے کس طرح سے ہو سکتا ہے، اور تم اتنے مشاق ہو کر اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے، تو اس سے تمہیں پتا نہیں چلتا؟

ایک بات! دُوسری بات یہ ہے کہ میں جو تمہارے سامنے کہہ رہا ہوں ٹھیک کہہ رہا ہوں، سچ بول رہا ہوں، جھوٹ نہیں بول رہا، میں تمہارا خیر خواہ ہوں، یہ تو امانت ہے جو تمہارے سامنے ادا کر رہا ہوں، آج تم مجھے سمجھتے ہو کہ میں نے جھوٹ بولنا شروع کر دیا ہے، میں نے کوئی خیانت شروع کر دی، اللہ کے اوپر بہتان باندھنا شروع کر دیا، اللہ کے بندو! میں کوئی تمہارے سامنے آج ہی تو نہیں آیا، میں نے چالیس سال تمہارے اندر گزارے ہیں، میری چالیس سالہ زندگی کا مطالعہ کرو، کہیں انگلی تو رکھو کہ مجھے جھوٹ بولنے کی عادت ہو، کبھی کسی کی امانت کے اندر خیانت کرنے کی عادت ہو، اگر میری ساری زندگی اس بات پہ شہادت دیتی ہے اور آج سے قبل تم بھی مجھے امین سمجھتے تھے، دیانت دار سمجھتے تھے، سچا سمجھتے تھے، جیسے پہلے اقرار بھی کروایا تھا ''مَا جَرَّبْنَا عَلَيْكَ إِلَّا صِدْقًا''[1] کہ ہم نے تو تیرے متعلق صدق ہی آزمایا ہے، تجھے جھوٹ بولنے کی عادت نہیں، تو صادق ہے تو امین ہے، یہ اس قسم کے لفظ بولتے تھے، تو جو شخص چالیس سال کی عمر تک تو کبھی جھوٹ بولا نہیں، اور کبھی کسی انسان کے اوپر وہ اِفترا نہیں کرتا، کبھی کسی انسان کے حق کے اندر وہ خلل نہیں ڈالتا، تو تم یہ سوچتے نہیں؟ کہ آج چالیس سال کے بعد مجھے کیا ہو گیا کہ میں اٹھ کر مخلوق پر نہیں، اُلٹا خدا پہ بہتان باندھنے شروع کر دوں، اللہ کے متعلق جھوٹ بولنا شروع کر دوں، جس نے آج تک تمہارے مال میں ایک پیسے کی خیانت نہیں کی وہ آج اپنے رَبّ سے خیانت کرنے لگ جائے گا؟

سَرورِ کائنات ﷺ کی صداقت کے بارے میں دربارِ قیصر میں سوال جواب

حدیث شریف میں آتا ہے، ابوسفیان رضی اللہ عنہ ایک واقعہ سناتے ہیں جو ان کے ساتھ پیش تو آیا تھا کُفر کے زمانے میں، لیکن وہ سناتے ہیں مسلمان ہونے کے بعد، اور اس قسم کی بات حجت ہوتی ہے جس کا تحمل تو اگرچہ کسی نے کُفر و شرک کے زمانے میں کیا ہے لیکن ادا کرتا ہے وہ اسلام میں آنے کے بعد۔ جب صلحِ حدیبیہ ہو گئی تھی تو سرورِ کائنات ﷺ نے اس کے بعد بادشاہوں کو تبلیغی خطوط لکھے تھے، تبلیغ کے طور پر خطوط لکھے تھے، تو شاہِ رُوم قیصر کو بھی آپ ﷺ نے خط لکھا تھا، جس وقت قیصر کو حضور ﷺ کا خط پہنچا تو اس نے لوگوں سے پوچھا تھا کہ اس علاقے میں وہاں کا کوئی آدمی آیا ہوا ہو تو اسے بلاؤ، میں کچھ حالات کی تحقیق کرنا چاہتا ہوں، اتفاق ایسا تھا کہ ابوسفیان تجارتی قافلہ لے کر شام میں گئے ہوئے تھے اور اسی شہر میں موجود تھے، تو ان کو اور ان کے رُفقاء کو دربار میں بلا لیا، ''مشکوٰۃ، باب علامات النبوۃ'' میں اور ''بخاری شریف'' میں بھی متعدّد جگہ وہ روایت موجود ہے، اِبتدا اِبتدا میں ''باب بدء الوحی'' کے اندر بھی یہ روایت ہرقل والی ذکر کی گئی ہے، تو ساری روایت تو بیان کرنا تو مقصود نہیں، اس میں ایک سوال ہرقل کا یہ تھا کہ اس دعویٰ کرنے سے قبل تم نے اس کے اوپر کبھی کوئی جھوٹ آزمایا؟ کہ اس نے کبھی غلط بیانی کی ہو، کبھی جھوٹ بولا ہو، کیا تم نے اس کو کبھی اس طرح سے پایا ہے، تو ابوسفیان نے جواب دیا تھا کہ نہیں جی! ہم نے آج تک اس کے متعلق کوئی جھوٹ نہیں پایا، اس دعوے سے پہلے بھی ہم نے اس کو کبھی جھوٹا نہیں پایا، وہ جھوٹ بولنے کا عادی نہیں۔ تو سارے سوالات کرنے کے بعد ابوسفیان سے جواب لے کر پھر اس نے جوابات پر تبصرہ کیا تھا، اس جواب پر قیصر (''ہرقل'' اس کا نام ہے، ''قیصر'' لقب ہے) نے یہ تبصرہ

---

(۱) بخاری ج ۲ ص ۷۰۲، کتاب التفسیر، سورۃ الشعراء / مشکوٰۃ ج ۲ ص ۴۵۹ باب الانذار، فصل اول، عن ابن عباس

کیا تھا، کہ میں نے تجھ سے پوچھا کہ کیا اس نے پہلے کبھی جھوٹ بولا تھا، تُو نے کہا کہ نہیں، تو میں پہچان گیا کہ جس شخص کو مخلوق میں سے کسی انسان پر جھوٹ بولنے کی عادت نہیں، یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ مخلوق کو چھوڑ کے وہ اللہ پر جھوٹ باندھنے لگ جائے؟

انبیاء کی زندگی اِظہارِ نبوت سے پہلے بھی بے داغ ہوتی ہے

تو اس بارے میں عمر کو دلیل میں پیش کیا، کہ تم نے مجھے کبھی جھوٹا پایا؟ مجھے اِفترا کی عادت ہے؟، غلط بیانی کی عادت ہے؟ دھوکا دہی کی عادت ہے؟ اگر میری چالیس سالہ زندگی اس بات پہ شہادت دیتی ہے کہ میں نے کبھی دھوکا نہیں کیا، میں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا، کبھی تمہارے حقوق میں خیانت نہیں کی، تو تم سوچتے نہیں کہ آج اتنی جلدی میں اتنا جھوٹا کیسے ہوگیا؟ اور اتنا بڑا جھوٹ میں کیسے بنانے لگ گیا؟ کہ میں کہوں کہ اللہ نے مجھے رسول بنایا ہے، اللہ میرے اوپر کتاب اتارتا ہے، آیات اتارتا ہے، تو اتنا بڑا جھوٹ میں اتنی جلدی کیسے بولنے لگ گیا؟ تمہیں عقل نہیں ہے؟ کتنی سادی اور کتنی پختہ دلیل ہے جو کہ اس وقت سامنے پیش کی گئی، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی سابقہ عمر اظہارِ نبوت سے پہلے بھی اتنی بے داغ ہوتی ہے کہ بدترین سے بدترین دشمن بھی ان کے کسی کردار کے اوپر انگلی نہیں رکھ سکتا جس کو وہ حجت میں پیش کر کے کہے کہ آج تم ایسی باتیں کرتے ہو، کل تم کیا تھے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعے سے دلیل

دیکھو! ایک بات تھی، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کچھ اپنی ابتدائی زندگی فرعون کے پاس گزاری تھی، اور اس زندگی کے اندر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ایک کام ہوگیا تھا کہ ایک قبطی کے مکا مارا تھا اور وہ چت ہوگیا، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام پھر وہاں سے فرار ہوگئے، اور جا کے وقت سارے کا سارا گزارا مدین میں حضرت شعیب علیہ السلام کے پاس، اور جب پیغمبر بنے اور بن کے آئے، اور آ کے دربار کے اندر کھڑے ہو کے فرعون کے سامنے حق کا نعرہ بلند کیا، تو فرعون کہتا ہے: تُو وہی نہیں؟ جو ہمارا ایک آدمی قتل کر گیا تھا، قتل کر کے بھاگ گیا تھا، تُو وہی نہیں ہے؟ اس نے فوراً اعتراض کر دیا، کیونکہ اس کے خیال کے مطابق یہ ایک نقص تھا، گویا کہ انہوں نے ایک جرم کیا تھا اور جرم کرنے کے بعد بھاگ گئے تھے، یہ ایک اعتراض ہوسکتا تھا جو فرعون نے فوراً جڑ دیا، موسیٰ علیہ السلام نے وضاحت کر دی کہ ٹھیک ہے، اس وقت کیا تھا، مارا تھا، میری وہ غلطی تھی ایک قسم کی، لیکن وہ غلطی ہوئی کیوں؟ اسی بنا پر تو ہوئی تھی کہ تُو نے ساری کی ساری قوم کو غلام بنا رکھا تھا اور ان کے اوپر ظلم و ستم تھا، اب ساری قوم جس کے ظلم و ستم کے اندر پس رہی ہے اس کا ایک آدمی اگر مر جائے تو یہ کوئی جرم ہے جس کو تُو میرے سامنے لا رہا ہے؟ اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ یہ لفظ آئیں گے (سورۂ شعراء: ۲۲) کہ یہ جو تُو بات کر رہا ہے تو یہ تو ساری کی ساری اسی کے نتیجے میں پیش آئی، گویا کہ ظالم قوم میں سے ایک فرد کو ظلم سے روکتے ہوئے اگر اس کے ایک مکا لگا ہی دیا اور وہ اتفاقاً مر گیا تو یہ تو کوئی ایسا عیب نہیں جو تُو میری طرف منسوب کرتا ہے۔ پھر یہ تو اُلٹا میرے سچے اور حق پر ہونے کی دلیل ہے کہ ایک وقت میں جب میں ایک عامی انسان سمجھا جاتا تھا اور میں اللہ کی طرف سے رسول نہیں بنا تھا اس وقت تو تم سے ڈرتا ہوا بھاگ گیا، فَفَرَرْتُ مِنْكُمْ لَمَّا خِفْتُكُمْ (سورۂ شعراء: ۲۱) میں تم سے ڈر کے بھاگ گیا، تو آج میں کونسی فوج لے کے آیا ہوں جو تمہارے سامنے آ گیا ہوں، یعنی اس وقت بھی تو میں ہی تھا، میں نے ایک جرم کیا تھا، جب تم سے میں نے ڈر محسوس کیا میں بھاگ

گیا، جب اس وقت بھی میں اکیلا تھا، اور یہ جرم کیا، میں نے سمجھا کہ اب تم مجھے پکڑو گے، میں چلا گیا، تو آج جو تمہارے سامنے آ گیا ہوں تو کونسی فوجیں لے کے آیا ہوں؟ معلوم ہو گیا کہ جس وقت تک میری بات تھی میں بھاگ گیا تھا، اب کسی کا بھیجا ہوا آیا ہوا ہوں، اب اس کی قوت میری محافظ ہے۔ دیکھو! اپنے خیال کے مطابق وہ کسی بات پر اُنگلی رکھ سکتا تھا اس نے اُنگلی رکھ دی کہ تُو نے تو یہ تصور کیا تھا، تو انہوں نے مان لیا تھا کہ ہاں کیا تھا لیکن ان حالات میں کیا تھا، اب ان حالات میں سامنے آیا ہوا ہوں، تو اس کی صفائی ہوگئی۔ تو اگر سرورِ کائنات ﷺ کی زندگی کے اندر اس قسم کی کوئی بات ہوتی، اخلاق کی کمزوری ہوتی، کردار کی کمزوری ہوتی، آپ ﷺ نے کبھی کوئی جھوٹ بولا ہوتا، کسی کو کوئی دھوکا دیا ہوتا، کوئی کمزوری قوم کے ہاتھ میں ہوتی تو آج وہ سامنے اٹھ کے کھڑے ہوتے کہ آج اس قسم کی باتیں کرتے ہو کل تمہارا یہ حال تھا، اب یہ کہنے کا کوئی موقع ہی نہیں، بلکہ خود عمر کو پیش کر دیا کہ تم میری عمر کو جانچو، اگر تو میں پچھلی عمر کے اندر تمہارے سامنے کھرا ہوں تو آج بھی کھرا ہوں، اور اگر تم نے پچھلی عمر کے اندر میرے اندر کوئی جھوٹ کوئی فریب کوئی اس قسم کی بات پائی ہے تو پھر آج بھی تم میری بات نہ مانو، کتنا بڑا چیلنج ہے اور کتنی واضح دلیل ہے۔

''میں تمہارے اندر اس سے قبل ایک عمر گزار چکا ہوں'' اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ: کیا تم سوچتے نہیں ہو؟ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا: کون بڑا ظالم ہے اس سے جو اللہ کے اوپر جھوٹ گھڑے، یعنی اگر میں جھوٹ گھڑتا ہوں تو میں بہت بڑا ظالم، ''یا کون بڑا ظالم ہے اس سے جو اللہ کی آیات کو جھٹلائے'' اگر اللہ کی آیات کو تم جھٹلاتے ہو تو تم بڑے ظالم، ''مجرم فلاح نہیں پائیں گے'' دنیا میں یا آخرت میں برباد ہوں گے، میرا تو یہ عقیدہ ہے اس لیے جب میں یہ سمجھتا ہوں کہ مجرم فلاح نہیں پا سکتے تو میں خود جرم کس طرح سے کروں؟

''عبادت'' کا معنی اور مفہوم، مثالوں سے وضاحت

وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ: اب ان کے شرکاء کی حیثیت واضح کی جا رہی ہے، یہاں دیکھیے! یَعْبُدُوْنَ عبادت کا لفظ استعمال کیا ہے کہ یہ عبادت کرتے ہیں، عبادت کا معنی ہوتا ہے غایت تذلل، کسی کے سامنے انتہائی تذلل کا اظہار کرنا، انتہائی ذلت اختیار کرنا، اس کے متعلق یہ عقیدہ رکھتے ہوئے کہ اس کو مافوق الاسباب میرے اوپر قدرت حاصل ہے، کسی کے متعلق مافوق الاسباب قدرت کا عقیدہ رکھتے ہوئے، (ذرا بات کو سمجھ لیجئے!) مافوق الاسباب کسی کے متعلق یہ عقیدہ رکھتے ہوئے کہ اس کو میرے اوپر قدرت حاصل ہے، اس کے سامنے انتہائی درجے کا تذلل اور عاجزی ظاہر کرنا اس کو کہتے ہیں عبادت، جس وقت تک مافوق الاسباب قدرت کا آپ عقیدہ نہیں رکھیں گے اس وقت تک آپ کا کسی کے ساتھ تواضع سے پیش آنا، انکسار سے پیش آنا عبادت نہیں، چاہے اس کی صورت ویسی ہو جس طرح سے کہ اللہ کی عبادت کی جاتی ہے، تشہد کی صورت میں آپ اللہ تعالیٰ کے سامنے دوزانو ہو کے بیٹھتے ہیں یہ عبادت ہے، آپ اپنے استاذ کے سامنے بھی دوزانو ہو کے بیٹھ جاتے ہیں۔ اسی طرح اللہ کے نام پر آپ خیرات کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ کے نام پہ صدقہ دیتے ہیں، مال خرچ کرتے ہیں تا کہ اللہ خوش ہو جائے، آپ اپنے استاذ اور پیر کو بھی ہدیے دیتے ہیں تا کہ وہ خوش ہو جائے، آپ اللہ تعالیٰ کی تعریف کرتے ہیں تو آپ اپنے اساتذہ اور دوسروں کے متعلق بھی

تعریف کے الفاظ بولتے ہیں، لیکن یہ عبادت نہیں، حتیٰ کہ ایک شخص اگر دوسرے کو سجدہ کرتا ہے تو دیکھو! یہ سجدہ کتنا بڑا فعل ہے، لیکن ہر سجدہ عبادت نہیں ہوتا، یہ بات یاد رکھئے! اگر ایک آدمی سجدہ ہی کرتا ہے کسی دوسرے کو تو یہ سجدہ کتنی خالص عبادت کا نشان ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کو سجدہ کرتے ہیں لیکن یہ سجدہ بھی ہر جگہ عبادت کے لئے نہیں ہوتا، کیونکہ سجدہ صرف عبادت کے لئے ہی ہو تو شرک ہوگا، اور شرک کسی اُمت کے اندر مشروع نہیں رہا، اور پہلی امتوں کی روایات کے اندر موجود ہے کہ وہ سلام کے طور پر تعظیم کے طور پر اپنے بڑوں کو سجدہ بھی کیا کرتے تھے، تو تعظیم کے لئے سجدہ مشروع رہا ہے، خَرُّوْا لَهٗ سُجَّدًا (سورۂ یوسف: ۱۰۰) یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کی طرف نسبت کی گئی ہے کہ وہ اس کے سامنے سجدے میں گر گئے، فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ ہمارے بڑے میاں کو فرشتوں نے سجدہ کیا تھا تو معلوم ہوگیا کہ ہر سجدہ عبادت نہیں ہے، اس میں فرق کہاں سے آگے پڑا؟ یہ فرق اسی نظریے سے آگے پڑا، کہ جس کو سجدہ کیا جارہا ہے اگر آپ اس کو اپنے اوپر مافوق الاسباب قادر مانتے ہیں پھر اس کے سامنے اس قسم کا تذلل اختیار کرتے ہیں تو یہ عبادت ہے اور شرک ہے، اور اگر اس قسم کا عقیدہ نہیں تو پھر اس کو عبادت نہیں قرار دے سکتے، پھر یہ تعظیم ہوگی، یہ علیحدہ بات ہے کہ تعظیما سجدہ کرنا بھی اس اُمت کے لئے حرام ٹھہرا دیا گیا، لیکن ہر سجدہ شرک نہیں ہے، دیکھنا یہ پڑے گا کہ جس کے سامنے سجدہ کیا جارہا ہے جس کے سامنے یہ ہدیے اور تحفے مالی طور پر پیش کیے جارہے ہیں، جس کے سامنے آپ دوزانو ہو کے بیٹھتے ہیں، تعظیما اس کے سامنے آپ جھکتے ہیں، اس کے متعلق آپ کا نظریہ کیا ہے؟ اگر آپ کا نظریہ یہ ہے کہ یہ محض واسطہ فی الاحسان ہیں، ورنہ جو کچھ ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے، ان کے اختیار میں کچھ نہیں کہ یہ اشارے کے ساتھ ہی دل کے ارادے کے ساتھ ہی جس کو چاہیں بنا دیں، جس کو چاہیں بگاڑ دیں، ایسا نظریہ نہیں ہے، چونکہ اللہ تعالیٰ نے ہم پر احسان کیا ہے اور ان کی وساطت سے کیا ہے، پیدا اللہ نے کیا ہے ماں باپ کی وساطت سے پیدا ہوئے، "مَنْ لَمْ يَشْكُرِ النَّاسَ لَمْ يَشْكُرِ اللهَ"[1] کہ جو احسان میں واسطہ ہوتا ہے جب انسان اس کا شکر گزار نہ ہو تو وہ اللہ کا بھی شکر گزار نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو احسانات پہنچتے ہیں جن واسطوں سے پہنچتے ہیں ان واسطوں کا ادب اور ان کا احترام اور ان کی تعظیم یہ شرافت کا ایک تقاضا ہے، ماں باپ خالق نہیں ہیں، خالق اللہ تعالیٰ ہے، لیکن اس خلق کا ظہور ماں باپ کی وساطت سے ہوا، ہم خالق اللہ کو مانتے ہیں، لیکن ماں باپ کا شکر یہ بھی ادا کرو اَنِ اشْكُرْ لِيْ وَ لِوَالِدَيْكَ (سورۂ لقمان: ۱۴) میرا بھی شکر ادا کرو، والدین کا بھی شکر ادا کرو، شکر کے اندر ان کی اطاعت بھی ہے، ان کی تعظیم بھی ہے، ان کی خدمت بھی ہے، سب کچھ ہے۔ اسی طرح سے علم دیتا اللہ ہے لیکن واسطہ اساتذہ ہیں، اللہ چاہے گا تو ملے گا، استاذ تو محض ایک واسطہ ہے، اس کے بس میں کچھ نہیں، لیکن چونکہ اللہ کے اس احسان کا ظہور ان کی وساطت سے ہوا ہے تو ان کی تعظیم ان کی خدمت اور ان کے سامنے ادب یہ ایک شرافت کا تقاضا ہے، کہ جب ان واسطوں کا ہم ادب کریں گے احترام کریں گے تو یہ بھی اللہ کی شکر گزاری ہے۔ رزق ہمیں اللہ دیتا ہے لیکن والد کے ہاتھ سے پہنچا، رزق ہمیں اللہ دیتا ہے لیکن کسی دوست کی وساطت سے پہنچ گیا تو جس کی

---

(۱) ترمذی ج ۲ ص ۱۷، باب ما جاء فی الشکر / مشکوٰۃ ج ۱ ص ۲۶۱، باب العطایا سے اگلا باب، فصل ثانی، عن ابی ہریرۃؓ۔

وساطت سے پہنچا ہے اس کا بھی شکریہ ادا کرو، اس کا بھی احسان مانو، یہ شرافت کا تقاضا ہے، لیکن ہم نسبت ہر چیز کی حقیقت کے اعتبار سے اللہ کی طرف ہی کرتے ہیں، اور ان کو محض ظاہری طور پر ایک واسطہ اور ایک ذریعہ سمجھتے ہیں، اس لیے ذریعے کا ہم ادب کرتے ہیں، ان کے متعلق ہمارا نفع نقصان کا عقیدہ نہیں کہ جس کو چاہیں بگاڑ دیں جس کو چاہیں سنوار دیں۔ اور اگر اس کے متعلق وہی کن فیکونی عقیدہ ہو، کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اختیار دے دیا ہے، ان کے اشارے کے ساتھ ہی بنتا ہے، ان کے اشارے کے ساتھ ہی بگڑتا ہے، نسبت ان کی طرف کر دی گئی، جس طرح سے کل شرک کا معنی سمجھاتے ہوئے آپ کی خدمت میں عرض کیا گیا تھا، جیسے کہا کرتے ہیں، مناجات کے اندر ایک شعر بھی آتا ہے:

تُو شاہوں کو گدا کر دے، گدا کو بادشاہ کر دے اشارہ تیرا کافی ہے بنانے میں، گرانے میں

تو اشارے کے ساتھ ہی کوئی بنتا ہے اور اشارے کے ساتھ ہی کوئی بگڑتا ہے، جس طرح سے اللہ تعالیٰ کو کوئی اور قوت نہیں صرف کرنی پڑتی، کن فیکون، اللہ کا تعالیٰ کا ارادہ ہوا، قصد ہوا، کسی بات کی طرف توجہ ہوئی تو فیکون، اس قسم کے اختیارات اگر کسی کی طرف منسوب کر کے اس کے سامنے تذلل اختیار کیا جائے تو اس کو عبادت کہتے ہیں۔ صحت ہمیں ملتی ہے ڈاکٹر کی وساطت سے، لیکن کس طرح سے وہ اسباب اختیار کرتا ہے، کوئی گولی دے گا، کوئی معجون دے گا، کوئی مکسچر پلائے گا، کوئی بھی چیز دے گا، اب یہ صحت حاصل ہوئی، ''ڈاکٹر نے ہمیں صحت دی'' اگر اس طرح سے کوئی عنوان اختیار کرے تو اس میں تاویل یہی ہے کہ اس نے کوشش کی، اسباب اس کی طرف سے پائے گئے، جس کی بناء پر یہ نتیجہ نکل آیا، یہ بات ٹھیک ہے، اس طرح سے اسباب کے طور پر کسی کا کوئی کام کر دیا، کسی کو کوئی نقصان پہنچا دیا، دونوں باتیں ہوتی رہتی ہیں، لیکن قطع نظر اسباب سے حقیقت کے اعتبار سے اس فعل کی نسبت کس کی طرف ہے؟ اللہ کی طرف، اللہ تعالیٰ اپنے کاموں کے اندر اسباب کا محتاج نہیں، اس نے ارادہ کیا تو ارادہ کرنے کے ساتھ ہی وہ کام ہو گیا، اس طرح سے مافوق الاسباب اگر کسی کے لئے قدرت مان لی جائے پھر اس کے سامنے جو بھی تذلل اختیار کیا جائے چاہے سر جھکایا جائے، چاہے دوزانو ہو کے بیٹھیں، چاہے اس کے نام پر کوئی مال دیں کوئی پیسے دیں، یہ سارے کے سارے کام پھر عبادت کہلائیں گے، قولی فعلی بدنی مالی یہ سب پھر عبادت کی قسمیں قرار پا جائیں گی، وہی حرکات اگر آپ اپنے اساتذہ کے ساتھ کرتے ہیں تو عبادت نہیں، اپنے پیروں کے ساتھ کرتے ہیں تو عبادت نہیں، ماں باپ کے ساتھ کرتے ہیں تو عبادت نہیں، لیکن اس قسم کا نظریہ اختیار کر لینے کے بعد اگر آپ اس قسم کی حرکت کریں گے، چاہے کسی انسان کے متعلق، چاہے کسی جن کے متعلق، چاہے کسی فرشتے کے متعلق، چاہے کسی نبی کے متعلق، چاہے غیر نبی کے متعلق، پھر یہی حرکات عبادت بن جائیں گی۔ تو مشرکین نے اپنے ان معبودوں کو اللہ کے سامنے شفعاء بنایا ہوا تھا، شفعاء کا مفہوم یہ تھا کہ وہ شفاعتِ جبری کے قائل تھے کہ یہ اللہ کو منوا لیتے ہیں، بس ان کو خوش ہونا چاہیے ہمارا کام بن جائے گا، اگر یہ خوش نہ ہوئے تو ہمارا کام نہیں بنے گا، باقی! یہ علیحدہ بات ہے کہ یہ کرتے کراتے اللہ سے ہیں، اللہ نے ان کو اختیار دیا ہوا ہے، جس کام کے متعلق یہ خوش ہو جائیں گے کرانا چاہیں گے تو کرا لیں گے، اور اس

لیے ان کے ساتھ ویسے ہی نظریات رکھ کے معاملات کرتے تھے جس قسم کے معاملات کو عربی کے اندر عبادت کہتے ہیں، اور وہ صاحب لسان تھے، لفظ کا مفہوم صحیح سمجھتے تھے۔

''شرک'' کے دو دروازے

تو عبادت ان کا فعل تھا، یَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ: اللہ کے علاوہ یہ دوسری چیزوں کی عبادت کرتے ہیں، اور وہ چیزیں ایسی ہیں کہ نہ انہیں نقصان پہنچا سکتی ہیں نہ انہیں نفع دے سکتی ہیں، اور یہ ہیں شرک کے دونوں دروازے کہ انسان اگر کسی کے سامنے جھکتا ہے تو یا نقصان سے ڈر کر یا نفع کے لالچ میں، اور اگر کوئی شخص ان دونوں جذبوں کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ متعلق کر لے تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ وہ کسی کے سامنے جھک جائے، یا تو انسان کسی کے سامنے اس اندیشے سے دبتا ہے کہ یہ مجھے کوئی نقصان پہنچادے گا، یا انسان کسی کے سامنے اس لالچ میں دبتا ہے کہ یہ مجھے فائدہ پہنچائے گا، اور اگر یہ دونوں جذبے ہی مخلوق سے قطع ہو جائیں، اللہ کے ساتھ لگ جائیں تو صحیح طور پر توحید آ گئی، جیسے ہمارا شیخ (سعدیؒ) کہتا ہے:

موحد چہ در پائے ریزی زرش چہ شمشیر ہندی نہی بر سرش
امید وہراسش نہ باشد ز کس بریں است بنیادِ توحید و بس[1]

اس کو نہ کسی سے لالچ ہوتا ہے نہ کسی سے خوف ہوتا ہے، توحید کی بنیاد اسی بات پہ ہے، یہ قبروں پہ جانے والے دونوں قسم کے جذبات رکھتے ہیں یا تو اس لیے جاتے ہیں، جا کے وہاں ہاتھ پھیلاتے ہیں، سجدے کرتے ہیں، چڑھاوے چڑھاتے ہیں کہ ہماری اولاد بچی رہے، ہماری یہ کھیتی اس طرح سے ہو جائے، مصیبت سے بچے رہیں، یا نفع کے لالچ میں جاتے ہیں کہ اولاد نہیں ہے مل جائے، کھیتی نہیں ہے اچھی ہو جائے، بھینس دودھ نہیں دیتی، دودھ دینے لگ جائے، بس اسی قسم کے جذبات ہیں جب یہ دونوں باتیں ہی اللہ تعالیٰ سے متعلق ہو جائیں گی کہ نفع نقصان کسی کے اختیار میں نہیں سوائے اللہ کے، تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ انسان کسی کے سامنے دبے یا جھکے، دبنا اور جھکنا اتنا ہی ہوگا جتنا کہ ایک محسن کے ساتھ انسان برتاؤ کرتا ہے، باقی! دل دماغ اس طرح سے مطیع ہو جائے جس طرح سے کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے مطیع ہے اس طرح سے نہیں ہو سکتا۔ ''یہ عبادت کرتے ہیں اللہ کے علاوہ ایسی چیزوں کی جو انہیں نقصان نہیں پہنچا سکتیں، جو انہیں نفع نہیں دے سکتیں۔''

مشرکین کے عقائدِ شرکیہ کی تردید

''اور یہ کہتے ہیں کہ یہ ہمارے شفعاء ہیں اللہ کے سامنے، آپ کہہ دیجیے کہ تم اللہ کو ایسی بات بتاتے ہو، ایسی چیز کی خبر دیتے ہو جس کی اللہ جانتا ہی نہیں''، ''اللہ جانتا ہی نہیں'' کا کیا مطلب؟ کہ اگر ہوتی تو اللہ ضرور جانتا، تم کہتے ہو ''شفعاء''، میں تو ایک شفیع بھی نہیں جانتا کہ کوئی زمین میں موجود ہے یا آسمان میں موجود ہے جس کا میرے ساتھ یہ معاملہ ہے کہ جو چاہے مجھ سے

(۱) گلستاں، باب ہشتم کا آخر۔

کروالے، یا میں اس کی بات ضرور مانتا ہوں، مجھے تو کوئی معلوم نہیں کہ کوئی مجھ سے اس طرح بات منوالیتا ہے، اب اللہ تعالیٰ اپنے علم کی نفی جو کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسی چیز موجود ہی نہیں، اگر موجود ہوتی تو اللہ کے علم میں ضرور ہوتی۔ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰی عَمَّا یُشْرِكُوْنَ: اللہ پاک ہے اور بلند و بالا ہے ان چیزوں سے جن کو یہ شریک ٹھہراتے ہیں۔ اگلی آیت میں یہ کہا جارہا ہے کہ یہ شرک فطرت کا تقاضا بھی نہیں، اور ابتدا سے اللہ تبارک وتعالیٰ نے جو دین انسانوں کے اندر اتارا ہے وہ دینِ دینِ توحید ہی ہے، یہ بعد میں لوگوں نے خود ساختہ نظریات بنائے ہیں، یہ باتیں خود ساختہ ہیں، ''نہیں تھے لوگ مگر ایک ہی جماعت'' جیسے حضرت آدم علیہ السلام آئے اور انہوں نے اپنی اولاد کو ایک ہی طریقہ سکھایا، سارے ایک ہی نظریات پہ تھے فَاخْتَلَفُوْا: پھر انہوں نے اختلاف کیا۔ اور حضرت نوح علیہ السلام تک لوگ سارے کے سارے یوں سمجھو کہ ایک ہی نظریات کے اور ایک ہی طور طریقے کے تھے، بعد میں اختلاف شروع ہوا، سب سے پہلے پیغمبر جو شرک کے مقابلے میں، شرک کو مٹانے کے لئے، مشرکین کو سمجھانے کے لئے بھیجے گئے ہیں، قرآنِ کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ حضرت نوح علیہ السلام ہی ہیں، تو اس سے پہلے آدم علیہ السلام کی جتنی اولاد تھی وہ سارے کے سارے دین توحید پر تھے۔ ''اگر نہ ہوتی ایک بات جو تیرے رَبّ کی طرف سے سبقت لے گئی'' وہ یہ ہے کہ دنیا کے اندر انسان کو مختار کر دیا، آزاد چھوڑ دیا، تا کہ سوچ سمجھ کے کوئی طریقہ اختیار کرے، سارا عذاب آخرت میں ہوگا، ضروری نہیں کہ ہر حرکت پر دنیا میں عذاب دے دیا جائے، اگر یہ بات اللہ کی طرف سے طے شدہ نہ ہوتی تو ان کے درمیان میں فیصلہ کر دیا جاتا اس چیز کا جس میں یہ اختلاف کرتے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے چونکہ اپنی عادت یہ بنالی اور یہ فیصلہ شدہ بات ہے کہ پورا عذاب آخرت میں ہوگا، دُنیا دارُالابتلاء ہے، اس میں حق اور باطل کچھ مشتبہ سے رہیں گے، انسان کو یہ اختیار دیا ہے کہ اپنی عقل فہم کے ساتھ سمجھ کے حق کو قبول کرے، باطل سے بچے، اس لیے یہاں نقد بہ نقد فیصلہ نہیں کیا جاتا۔ وَیَقُوْلُوْنَ لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَیْهِ اٰیَةٌ: اور یہ کافر مشرک یوں بھی کہتے ہیں کہ اس کے اوپر کوئی نشانی کیوں نہیں اتاری جاتی، یعنی جس قسم کی نشانی ہم مانگتے ہیں اس کے رَبّ کی طرف سے وہ نشانی کیوں نہیں اتاری جاتی؟ آپ کہہ دیجئے کہ غیب تو اللہ کے لئے ہے، اللہ جانتا ہے کہ نشانی آئے گی کہ نہیں آئے گی، میرے اختیار میں کچھ نہیں، فَانْتَظِرُوْا: تم بھی انتظار کرو، اِنِّیْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِیْنَ: میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں ہوں۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَیْكَ

وَاِذَآ اَذَقْنَا النَّاسَ رَحْمَةً مِّنْۢ بَعْدِ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُمْ اِذَا لَهُمْ مَّكْرٌ فِیْٓ اٰیَاتِنَا ؕ قُلِ
جب ہم چکھاتے ہیں لوگوں کو رحمت اس تکلیف کے بعد جو انہیں پہنچی تھی تو اچانک ان کے لئے مکر ہے ہماری آیات میں، آپ کہہ دیجئے
اللّٰهُ اَسْرَعُ مَكْرًا ؕ اِنَّ رُسُلَنَا یَكْتُبُوْنَ مَا تَمْكُرُوْنَ ﴿۲۱﴾ هُوَ الَّذِیْ
کہ اللہ زیادہ جلدی کرنے والا ہے از روئے تدبیر کے، بے شک ہمارے رسول لکھتے ہیں تمہارے مکر کرنے کو ﴿۲۱﴾ اللہ وہ ہے جو

يُسَيِّرُكُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ۭ حَتّٰٓي اِذَا كُنْتُمْ فِي الْفُلْكِ ۚ وَجَرَيْنَ بِهِمْ بِرِيْحٍ طَيِّبَةٍ

تمہیں چلاتا ہے خشکی میں اور سمندر میں، حتیٰ کہ جس وقت تم کشتیوں میں ہوتے ہو اور وہ ان لوگوں کو لے کر چلتی ہیں عمدہ ہوا کے ساتھ

وَّفَرِحُوْا بِهَا جَاۗءَتْهَا رِيْحٌ عَاصِفٌ وَّجَاۗءَهُمُ الْمَوْجُ

اور وہ اس ہوا کی وجہ سے خوش ہوتے ہیں، پھر آ جاتی ہے ان کے پاس توڑنے پھوڑنے والی ہوا، اور آ جاتی ہیں ان کے اُوپر موجیں

مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّظَنُّوْٓا اَنَّھُمْ اُحِيْطَ بِهِمْ ۙ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ

ہر طرف سے اور وہ گمان کرتے ہیں کہ ان کا احاطہ کر لیا گیا، پکارتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کو اس حال میں کہ اس کے لئے خالص کرنے والے

لَهُ الدِّيْنَ ڬ لَىِٕنْ اَنْجَيْتَنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ۝۲۲ فَلَمَّآ

ہوتے ہیں عقیدہ، اگر تُو نے ہمیں نجات دے دی اس مصیبت سے البتہ ضرور ہو جائیں گے ہم شکر گزاروں میں سے ﴿۲۲﴾ جس وقت

اَنْجٰىھُمْ اِذَا ھُمْ يَبْغُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۭ يٰٓاَيُّھَا النَّاسُ اِنَّمَا بَغْيُكُمْ

اللہ تعالیٰ انہیں نجات دے دیتا ہے اچانک وہ زمین میں سرکشی کرنے لگ جاتے ہیں ناحق، اے لوگو! تمہاری یہ شرارت

عَلٰٓي اَنْفُسِكُمْ ۙ مَّتَاعَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۡ ثُمَّ اِلَيْنَا مَرْجِعُكُمْ فَنُنَبِّئُكُمْ

تمہارے ہی نقصان میں ہے، فائدہ اُٹھا لو دُنیوی زندگی کا فائدہ پھر تمہارا لوٹنا ہماری طرف ہے، پھر ہم تمہیں خبردار کریں گے

بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝۲۳ اِنَّمَا مَثَلُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَاۗءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَاۗءِ

ان کاموں کے ساتھ جو تم کرتے تھے ﴿۲۳﴾ سوائے اس کے نہیں کہ دُنیوی زندگی کا حال ایسے ہے جیسے کہ ہم نے پانی اُتارا آسمان سے

فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ مِمَّا يَاْكُلُ النَّاسُ وَالْاَنْعَامُ ۭ حَتّٰٓي اِذَآ اَخَذَتِ

پھر اس پانی کی وجہ سے زمین کی انگوریاں خلط ملط ہو گئیں ان میں سے جس کو انسان کھاتے ہیں اور جانور، حتیٰ کہ جب زمین نے

الْاَرْضُ زُخْرُفَهَا وَازَّيَّنَتْ وَظَنَّ اَهْلُهَآ اَنَّھُمْ قٰدِرُوْنَ عَلَيْهَآ ۙ اَتٰىهَآ

اپنی رونق اختیار کر لی اور وہ خوب اچھی طرح سے مزین ہو گئی اور اس زمین والوں نے سمجھ لیا کہ وہ اس پر قادر ہیں، آ گیا اس زمین کے پاس

اَمْرُنَا لَيْلًا اَوْ نَهَارًا فَجَعَلْنٰھَا حَصِيْدًا كَاَنْ لَّمْ تَغْنَ بِالْاَمْسِ ۭ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ

ہمارا حکم رات کو یا دن کو، بنا دیا ہم نے اس کو کٹی ہوئی کھیتی، گویا کہ وہ کل یہاں تھی ہی نہیں، اسی طرح سے کھول کھول کر بیان کرتے ہیں ہم

الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ ﴿۲۴﴾ وَاللّٰهُ یَدْعُوْۤا اِلٰى دَارِ السَّلٰمِ ؕ وَیَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ اِلٰى

نشانیاں ان لوگوں کے لئے جو کہ سوچتے ہیں ﴿۲۴﴾ اللہ تعالیٰ دعوت دیتا ہے سلامتی کے گھر کی طرف اور جس کو چاہتا ہے صراطِ مستقیم کی طرف

صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ﴿۲۵﴾ لِلَّذِیْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَزِیَادَةٌ ؕ وَلَا یَرْهَقُ وُجُوْهَهُمْ قَتَرٌ وَّلَا

ہدایت دیتا ہے ﴿۲۵﴾ ان لوگوں کے لئے جو کہ بھلائی کرتے ہیں بھلائی ہے اور زیادتی ہے، نہیں ڈھانپے گی ان کے چہروں کو سیاہی اور نہ

ذِلَّةٌ ؕ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۶﴾ وَالَّذِیْنَ كَسَبُوا السَّیِّاٰتِ جَزَآءُ

ذلت، یہی لوگ جنت والے ہیں، اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں ﴿۲۶﴾ اور وہ لوگ جو بُرے کام کرتے ہیں ان کے لئے ان کی بُرائی کا

سَیِّئَةٍۭ بِمِثْلِهَا ۙ وَتَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ؕ مَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ عَاصِمٍ ۚ كَاَنَّمَاۤ

بدلہ ہوگا اس بُرائی کے برابر، اور ان کے اُوپر ذلت طاری ہوگی، اللہ کے عذاب سے ان کو کوئی بچانے والا نہیں ہوگا، گویا کہ

اُغْشِیَتْ وُجُوْهُهُمْ قِطَعًا مِّنَ الَّیْلِ مُظْلِمًا ؕ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِیْهَا

طاری کردیے گئے ان کے چہروں پر تاریک رات کے ٹکڑے، یہی لوگ جہنم والے ہیں، اس میں

خٰلِدُوْنَ ﴿۲۷﴾ وَیَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِیْعًا ثُمَّ نَقُوْلُ لِلَّذِیْنَ اَشْرَكُوْا

ہمیشہ رہنے والے ہوں گے ﴿۲۷﴾ اور جس دن ہم ان سب کو اکٹھا کریں گے پھر کہیں گے ہم ان لوگوں کو جنہوں نے شرک کیا تھا کہ

مَكَانَكُمْ اَنْتُمْ وَشُرَكَآؤُكُمْ ۚ فَزَیَّلْنَا بَیْنَهُمْ وَقَالَ شُرَكَآؤُهُمْ مَّا كُنْتُمْ اِیَّانَا

اپنی جگہ ٹھہرے رہو تم بھی اور تمہارے شرکاء بھی پھر ہم پھوٹ ڈال دیں گے ان کے درمیان اور کہیں گے ان کے شرکاء تم ہماری

تَعْبُدُوْنَ ﴿۲۸﴾ فَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِیْدًۢا بَیْنَنَا وَبَیْنَكُمْ اِنْ كُنَّا عَنْ عِبَادَتِكُمْ

پوجا نہیں کرتے تھے ﴿۲۸﴾ اللہ کافی گواہ ہے ہمارے درمیان اور تمہارے درمیان، بے شک بات یہ ہے کہ ہم تمہاری عبادت سے

لَغٰفِلِیْنَ ﴿۲۹﴾ هُنَالِكَ تَبْلُوْا كُلُّ نَفْسٍ مَّاۤ اَسْلَفَتْ وَرُدُّوْۤا اِلَى اللّٰهِ

بے خبر تھے ﴿۲۹﴾ اس موقع پر آزمالے گا ہر نفس ان اعمال کو جو اس نے آگے بھیجے، اور لوٹائے جائیں گے یہ لوگ اللہ کی طرف

مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا یَفْتَرُوْنَ ﴿۳۰﴾ ع

جو ان کا مولیٰ حقیقی ہے، گم ہوجائیں گی ان سے وہ سب باتیں جو یہ تراشا کرتے تھے ﴿۳۰﴾

خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ وَاِذَآ اَذَقْنَا النَّاسَ رَحْمَۃً مِّنْۢ بَعْدِ ضَرَّآءَ مَسَّتْھُمْ اِذَا لَھُمْ مَّکْرٌ فِیْٓ اٰیَاتِنَا: جب ہم چکھاتے ہیں لوگوں کو رحمت تکلیف کے بعد۔ ضَرَّآءَ: تکلیف۔ اور رحمت کا مصداق ہے اس تکلیف سے عافیت۔ جس وقت ہم لوگوں کو تکلیف کے بعد رحمت چکھاتے ہیں، رحمت کا مزہ چکھاتے ہیں، مَسَّتْھُمْ: ایسی تکلیف جو انہیں پہنچی تھی، یہ ضَرَّآءَ کی صفت ہے، اِذَا لَھُمْ مَّکْرٌ فِیْٓ اٰیَاتِنَا: اِذَا مفاجاتیہ ہے، اچانک ان کے لئے مکر ہے ہماری آیات میں۔ مکر کا لفظ پہلے بھی آپ کی خدمت میں گزرا ہے مَکَرُوْا وَمَکَرَ اللّٰہُ (آل عمران: ۵۴) مکر کا مفہوم ہوتا ہے کسی کام کے لئے خفیہ تدبیر کرنا، اگر تو وہ کسی اچھے مقصد کے لئے تدبیر کی گئی ہے تو مکر اچھا ہے، اور اگر کسی بُرے کام کے لئے تدبیر کی گئی ہے تو اس میں بُرائی ہے، مکر فی حد ذاتہ نہ اچھا ہے نہ بُرا، اُردو زبان میں ''مکر'' چونکہ فریب کے معنی میں آتا ہے اس لئے یہ لفظ کچھ عجیب سا معلوم ہوتا ہے جب اس کی نسبت اللہ کی طرف آئے، لیکن عربی زبان میں اس لفظِ مکر میں کوئی کسی قسم کا مذموم پہلو نہیں بلکہ یہ اپنے مقصد کے تابع ہے، اگر کسی اچھے مقصد کے لئے کوئی خفیہ تدبیر کی گئی تو وہ تدبیر اچھی ہے، اور اگر کسی بُرے مقصد کے لئے کی گئی تو وہ مکر قبیح ہے، اس لیے مَکَرُوْا، اُن کی طرف بھی نسبت آئی، وَمَکَرَ اللّٰہُ، اللہ کی طرف بھی نسبت آئی، اُن کا مقصد ہے حق کا اِبطال، اور اللہ کا مقصد ہے حق کا اِحقاق یا اہلِ حق کی حفاظت جیسے موقع محل کے مطابق ہے، تو اللہ تعالیٰ کا مکر اچھا ہوا اور لوگوں کا مکر بُرا ہوا، اور یہاں بھی نسبت دونوں کی طرف ہی آرہی ہے، اِذَا لَھُمْ مَّکْرٌ فِیْٓ اٰیَاتِنَا: اچانک وہ ہماری آیات کے باطل کرنے میں چالیں کھیلتے ہیں، چالیں چلتے ہیں، خفیہ تدبیریں کرتے ہیں، قُلِ اللّٰہُ اَسْرَعُ مَکْرًا: آپ کہہ دیجئے کہ اللہ زیادہ تیز ہے، زیادہ جلدی کرنے والا از روئے مکر کے، یعنی اللہ کی تدبیر بہت تیز ہے، اِنَّ رُسُلَنَا: بے شک ہمارے رسول، یَکْتُبُوْنَ مَا تَمْکُرُوْنَ: لکھتے ہیں تمہارے مکر کرنے کو، اگر ''مَا'' مصدریہ ہو جائے، تمہارے مکر کو تمہارے خفیہ تدبیر کرنے کو ہمارے رسول لکھتے ہیں، ''ہمارے رسول لکھتے ہیں اس چیز کو جو تم خفیہ تدبیر کرتے ہو'' اس طرح سے بھی (مَا کو موصولہ بنا کر) اس مفہوم کو ادا کر سکتے ہیں۔ ھُوَ الَّذِیْ یُسَیِّرُکُمْ: اللہ وہ ہے جو تمہیں چلاتا ہے۔ سَارَ یَسِیْرُ: چلنا۔ سَیَّرَ تَسْیِیْرٌ: چلانا۔ اللہ وہ ہے جو تمہیں چلاتا ہے فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ: خشکی میں اور سمندر میں۔ بحر: سمندر، دریا، دونوں معنوں کے لئے استعمال ہوتا رہتا ہے۔ حَتّٰٓی اِذَا کُنْتُمْ فِی الْفُلْکِ: فلک کا لفظ واحد اور جمع، مذکر، مؤنث سب کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ ''حتیٰ کہ جس وقت تم کشتیوں میں ہوتے ہو یا کشتی میں ہوتے ہو'' وَجَرَیْنَ: یہ جمع کا صیغہ آ گیا اس لیے فلک کا مصداق جمع کو بنانا بہتر ہے، واحد جمع دونوں کے لئے لفظ استعمال ہوتا رہتا ہے، مذکر بھی استعمال ہوتا ہے مؤنث بھی، ''جس وقت تم کشتی میں ہوتے ہو یا کشتیوں میں ہوتے ہو اور وہ کشتیاں ان لوگوں کو لے کر چلتی ہیں'' بِرِیْحٍ طَیِّبَۃٍ: عمدہ ہوا کے ساتھ، عمدہ ہوا سے مراد جو موافق ہوا ہے اور اس میں وہ تیزی اور جھکڑ نہیں ہے، مناسب رفتار کے ساتھ چلتی ہے، خوشگوار ہے، ''وہ کشتیاں لوگوں کو لے کر چلتی ہیں عمدہ ہوا کے ساتھ'' وَفَرِحُوْا بِھَا: اور وہ لوگ ان کشتیوں کے ساتھ خوش ہوتے ہیں، یا اس ہوا کی وجہ سے خوش ہیں، جَآءَتْھَا رِیْحٌ عَاصِفٌ: پھر ان کشتیوں کے پاس آ جاتی ہے توڑنے پھوڑنے والی ہوا، جھکڑ والی ہوا۔ عصف: چورا چورا کر دینا، کَعَصْفٍ مَّاْکُوْلٍ سورۂ فیل کے اندر بھی یہ لفظ آئے گا۔ ''آ جاتی ہے ان کے پاس ہوا

توڑ پھوڑ کرنے والی" یعنی تند ہوا، جھکڑ، ناموافق، وَجَآءَهُمُ الْمَوْجُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ: اور آتی ہیں ان کے پاس موجیں۔ موج اسم جمع ہے، موجۃٌ واحد آئے گا، اور تمرۃٌ تمرٌ کی طرح اس میں فرق آجائے گا،" آجاتی ہیں ان کے اوپر موجیں ہر طرف سے" وَّظَنُّوْٓا: اور وہ گمان کرتے ہیں اَنَّهُمْ اُحِيْطَ بِهِمْ: کہ ان کا احاطہ کرلیا گیا، یعنی اسبابِ ہلاکت نے انہیں گھیر لیا، دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ: پکارتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کو اس حال میں کہ اس کے لئے خالص کرنے والے ہوتے ہیں عقیدہ، اپنے دین کو اس کے لئے خالص کرنے والے ہوتے ہیں، اور پکارتے ہوئے یوں کہتے ہیں یہ آگے ان کے پکار کی تفصیل ہے لَئِنْ اَنْجَيْتَنَا مِنْ هٰذِهٖ: اگر تُو نے ہمیں نجات دے دی اس مصیبت سے لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ: البتہ ضرور ہو جائیں گے ہم شکر گزاروں میں سے۔ فَلَمَّآ اَنْجٰهُمْ: جس وقت اللہ تعالیٰ انہیں نجات دے دیتا ہے، اِذَا هُمْ يَبْغُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ: اچانک وہ زمین میں سرکشی کرنے لگ جاتے ہیں، بغاوت پھیلاتے ہیں، شرارت کرتے ہیں ناحق۔ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ: اے لوگو! اِنَّمَا بَغْيُكُمْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ: تمہاری یہ شرارت تمہارے ہی نقصان میں ہے۔ علیٰ ضرر کے لئے ہوتا ہے۔ تمہاری یہ بغاوت، تمہاری یہ شرارت تم پر ہی پڑنے والی ہے، اس کا وبال تم پر ہی پڑے گا، یہ شرارت تمہارے اپنے نقصان میں ہے، مَّتَاعَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا: یہ منصوب ہے فعل محذوف کی وجہ سے، تَمَتَّعُوْا مَتَاعَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا، فائدہ اٹھالو دنیوی زندگی کا فائدہ، ثُمَّ اِلَيْنَا مَرْجِعُكُمْ: پھر تمہارا لوٹنا ہماری طرف ہے فَنُنَبِّئُكُمْ: پھر ہم تمہیں خبردار کریں گے بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ: ان کاموں کے ساتھ جو تم کرتے تھے، جو تم کرتے تھے پھر ہم تمہیں خبر دیں گے ان کاموں کی، وہ سارے کے سارے کئے ہوئے کام تمہارے سامنے آجائیں گے۔ اِنَّمَا مَثَلُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا: سوائے اس کے نہیں کہ دنیوی زندگی کی حالت، كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ: ایسے ہے (یہ مرکب تشبیہ ہے دنیوی زندگی کے ساتھ، کاف کا مدخول ہی دنیوی زندگی کی مثال نہیں، بلکہ یہ آگے مرکب مثال پیش کی جارہی ہے) دُنیوی زندگی کا حال ایسے ہے جیسے کہ ہم نے پانی اتارا آسمان سے، فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ: پھر اس پانی کی وجہ سے زمین کی انگوریاں خلط ملط ہوگئیں، گھنی ہوگئیں، مِمَّا يَاْكُلُ النَّاسُ وَالْاَنْعَامُ: ان میں سے جس کو کہ انسان کھاتے ہیں اور جانور، جن انگوریوں کو انسان اور جانور کھاتے ہیں وہ سب آپس میں خلط ملط ہو کے بہت گھنی پیدا ہوئیں، حَتّٰٓى اِذَآ اَخَذَتِ الْاَرْضُ زُخْرُفَهَا: حتّٰی کہ جب زمین نے اپنی رونق اختیار کرلی، وَازَّيَّنَتْ: اور وہ خوب اچھی طرح سے مزین ہوگئی۔ اِزَّيَّنَتْ اصل میں تَزَيَّنَتْ تھا، جیسے اِطَّهَّرَ اور تَطَهَّرَ، بابِ اِفَّعُّل اصل میں تفعل سے ہی بنا ہوتا ہے، اِطَّهُّر تَطَهُّر ایک ہی چیز ہے، اسی طرح سے اِزَّيُّن تَزَيُّن۔ "اس نے اپنی زینت اختیار کرلی اور خوب اچھی طرح سے مزین ہوگئی، آراستہ ہوگئی" وَظَنَّ اَهْلُهَآ: اور اس زمین والوں نے سمجھ لیا اَنَّهُمْ قٰدِرُوْنَ عَلَيْهَآ: کہ وہ اس زمین پر قادر ہیں، یعنی زمین کی نباتات پر، اس کی پیداوار پر قدرت پانے والے ہیں، اَتٰىهَآ اَمْرُنَا لَيْلًا اَوْ نَهَارًا: آگیا اس زمین کے پاس ہمارا حکم رات کو یا دن کو، امر سے اَمرِ عذاب مراد ہے، فَجَعَلْنٰهَا حَصِيْدًا: بنادیا ہم نے اس زمین کو حصید، یعنی ایسی کہ جس کے اوپر کی فصل کٹی ہوئی ہو، یا، بنادیا ہم نے اس نباتات کو جو کہ زمین کے اوپر تھی کٹی ہوئی، كَاَنْ لَّمْ تَغْنَ بِالْاَمْسِ: گویا کہ وہ کل یہاں تھی ہی نہیں۔ غَنِيَ بِالْمَكَانِ اَقَامَ کے معنی میں ہے، حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم کے قصہ میں یہ لفظ آیا تھا،" گویا کہ کل وہ یہاں تھی ہی نہیں" کل سے گزشتہ زمانہ مراد ہے، یعنی اس طرح سے اس کو کاٹ کے برباد کر کے رکھ دیا کہ ایسے معلوم ہوتا ہے جیسے کل یہاں کوئی سرسبز فصل کھڑی ہی نہیں تھی، كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ: اسی طرح سے کھول کھول کر بیان کرتے ہیں ہم

نشانیاں ان لوگوں کے لئے جو کہ سوچتے ہیں۔ وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلٰى دَارِ السَّلٰمِ: اللہ تعالیٰ دعوت دیتا ہے سلامتی کے گھر کی طرف، وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ: اور جس کو چاہتا ہے صراطِ مستقیم کی طرف ہدایت دیتا ہے۔ دعوت تو سب کے لئے عام ہے لیکن توفیق کسی کسی کو ہوتی ہے جس کے متعلق اللہ کی مشیت ہو جائے، اور اللہ کی مشیت کس کے متعلق ہوتی ہے اس کا ذکر آپ کے سامنے بارہا ہو چکا، جو اپنے اختیار کو اپنے ارادے کو اپنے علم کو استعمال کرتے ہیں اور ان کے دل کے اندر حق کی طلب ہوتی ہے، جس وقت وہ اپنی وسعت کے مطابق کوشش کرتے ہیں تو پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کی مزید راہنمائی ہوتی ہے دستگیری ہوتی ہے، اور اگر کوئی شخص پہلے ہی ضد باندھ کر بیٹھ جائے کہ میں نے سمجھنا ہی نہیں ہے اور ہر بات میں وہ تکذیب پر ہی آمادہ ہو تو ایسے شخص کو اللہ تعالیٰ ہدایت نہیں دیتے، زبردستی اٹھا کے کسی منزل پر نہیں پہنچاتے، تو اللہ کا چاہنا اس کے عدل اور حکمت کے تحت ہے، جس کو اللہ تعالیٰ کی حکمت کا تقاضا ہوتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو سیدھے راستے کی طرف ہدایت دے دیتے ہیں، اور حکمت متعلق اسی شخص سے ہوتی ہے جو اپنے اندر کچھ اخلاص رکھتا ہو، حق کو سمجھنے کا ارادہ رکھتا ہو اور اپنی وسعت کے مطابق طلب حق کی کوشش کرتا ہو، تو اللہ تعالیٰ ایسے شخص کو صراطِ مستقیم پر چلا دیتے ہیں۔ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا: ان لوگوں کے لئے جو کہ بھلائی کرتے ہیں اچھے کام کرتے ہیں، الْحُسْنٰى: بھلائی ہے وَزِيَادَةٌ: اور زیادتی ہے، یعنی اس بھلائی سے مراد ہو جائے گا اس بھلائی کے برابر جو انہوں نے کی، اس کے برابر ان کو اجر ملے گا اور زیادہ بھی، وَلَا يَرْهَقُ وُجُوْهَهُمْ قَتَرٌ وَّلَا ذِلَّةٌ: قتر کہتے ہیں تاریکی کو، سیاہی جو مایوسی کے وقت میں انسان کے چہرے کے اوپر طاری ہو جایا کرتی ہے، ''نہیں ڈھانپے گی ان کے چہروں کو سیاہی اور نہ ذلت'' اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ: یہی لوگ جنت والے ہیں، هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ: اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں، وَالَّذِيْنَ كَسَبُوا السَّيِّاٰتِ: یہ اَلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا کے مقابلے میں آ گیا، اور وہ لوگ جو بُرے کام کرتے ہیں، السَّيِّاٰتِ یہ اعمال کی صفت ہے، جو لوگ بُرے کام کرتے ہیں، جَزَآءُ سَيِّئَةٍۢ بِمِثْلِهَا: ان کے لئے ان کی بُرائی کا بدلہ ہوگا اس بُرائی کے برابر ہو، وَتَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ: اور ان کے اُوپر ذلت طاری ہوگی، پیچھے دو باتیں آئی تھیں کہ قتر اور ذلۃ ان کے چہروں پر چڑھی ہوئی ہوگی، قتر سیاہی کو کہتے ہیں، تو یہاں ذلۃ کا اثبات ان الفاظ میں کر دیا وَتَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ، اور قتر کا ذکر آگے آ رہا ہے۔ كَاَنَّمَآ اُغْشِيَتْ وُجُوْهُهُمْ قِطَعًا مِّنَ الَّيْلِ مُظْلِمًا، تو تاریکی کا ذکر وہاں آ جائے گا، ''ان کو ذلت نے ڈھانپا ہوا ہوگا'' مَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ عَاصِمٍ: اللہ کے عذاب سے ان کو کوئی بچانے والا نہیں ہوگا، مَا لَهُمْ مِنْ عذابِ اللہِ مِنْ عاصِمٍ، اللہ کے عذاب سے ان کو کوئی بچانے والا نہیں ہوگا، عاصم: بچانے والا، ''اللہ سے کوئی بچانے والا نہیں ہوگا'' یعنی اللہ کی پکڑ سے اور اللہ کے عذاب سے ان کو کوئی بچانے والا نہیں ہوگا۔ ''گویا کہ طاری کر دیے گئے ان کے چہروں پر رات کے تاریک ٹکڑے'' اَظْلَمَ: تاریک ہونا، تاریک کرنا، دونوں طرح سے آتا ہے، لازم بھی اور متعدی بھی، اور یہاں لازم کے معنی میں ہے، ''رات کے تاریک ٹکڑے، یا، رات کے ٹکڑے اس حال میں کہ رات تاریک ہو'' اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ: یہی لوگ جہنم والے ہیں، هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ: اس میں ہمیشہ رہنے والے ہوں گے۔ وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا: اور جس دن ہم ان سب کو اکٹھا کریں گے، ثُمَّ نَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا: پھر کہیں گے ہم ان لوگوں کو جنہوں نے شرک کیا تھا، مَكَانَكُمْ: قِفُوا مَكَانَكُمْ، اِلْزَمُوا مَكَانَكُمْ، اپنی جگہ ٹھہرے رہو، اپنی جگہ کو لازم پکڑو، کھڑے رہو اپنی جگہ، اَنْتُمْ وَشُرَكَآؤُكُمْ: تم بھی اور تمہارے شرکاء بھی، فَزَيَّلْنَا بَيْنَهُمْ: پھر ہم پھوٹ ڈال دیں گے ان کے درمیان، ان کو آپس میں لڑا دیں گے، وَقَالَ شُرَكَآؤُهُمْ:

اور کہیں گے ان کے شرکاء، مَّا كُنْتُمْ اِيَّانَا تَعْبُدُوْنَ: تم ہماری پوجا نہیں کرتے تھے، فَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا: کافی ہے اللہ گواہ۔ باللہ فاعل ہے، فاعل کے اوپر باء زائدہ ہے، کفی کے فاعل پر اکثر باء زائدہ آجایا کرتی ہے،''اللہ کافی گواہ ہے''، اور یہ کلام قسم کی جگہ ہے، ''اللہ کافی گواہ ہے ہمارے درمیان اور تمہارے درمیان'' اِنْ كُنَّا عَنْ عِبَادَتِكُمْ لَغٰفِلِيْنَ: یہ اِنْ مخففہ من المثقلہ ہے، بے شک بات یہ ہے کہ ہم تمہاری عبادت سے بے خبر تھے، هُنَالِكَ تَبْلُوْا كُلُّ نَفْسٍ مَّاۤ اَسْلَفَتْ: وہاں (اگر مکان کے طور پر ترجمہ کیا جائے) وہاں آزمالے گا ہر نفس اس چیز کو جو اس نے آگے بھیجی۔ اور هُنَالِكَ کا اشارہ زمان کی طرف بھی ہو سکتا ہے،''اس موقع پر آزمالے گا ہر نفس''، ''اس موقع پر'' اس میں مکان کی طرف بھی اشارہ ہے،''اس موقع پر آزمالے گا ہر نفس ان اعمال کو جو اس نے آگے بھیجے، یعنی اس کے سامنے آجائیں گے وہ اعمال، کہ کیا حقیقت تھی، وَرُدُّوْۤا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ: اور لوٹائے جائیں گے یہ لوگ اللہ کی طرف جو ان کا مولیٰ حقیقی ہے، مولیٰ بمعنی مالک ہے، وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ: گم ہو جائیں گی ان سے وہ سب باتیں جو یہ تراشا کرتے تھے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

تفسیر

ماقبل سے ربط اور مشرکین کو تنبیہ

اثباتِ توحید اور ردِ شرک پر گفتگو مختلف انداز سے چلی آرہی ہے، اور مشرکین کی دلی کیفیت اللہ تعالیٰ سے لاتعلقی کی اور احسان فراموشی کی اس کو بھی مختلف عنوانات سے واضح کیا جا رہا ہے، پچھلی آیت میں یہ ذکر کیا گیا تھا کہ یہ خود مطالبہ کرتے ہیں کہ ہمارے اوپر اس کے رب کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نہیں آجاتی؟ اس نشانی سے ان کی مراد ہوتی تھی منہ مانگا معجزہ، کہ جیسے ہم کہتے ہیں ویسی نشانی دکھاؤ، تو نبی کی طرف سے جواب دلایا گیا کہ کس قسم کی نشانی پیش آنے والی ہے؟ کب پیش آنے والی ہے؟ اس کا تعلق غیب سے ہے اور غیب کا مالک اللہ ہے، اور تمہیں شوق ہے جلدی جلدی نشانیاں دیکھنے کا، تم بھی انتظار کرو میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والا ہوں، مستقبل میں جو کچھ آنے والا ہے وہ تمہارے سامنے آجائے گا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کی حکمت نہیں تھی کہ اس امت کے سامنے ان کا منہ سے مانگا ہوا معجزہ نمایاں کیا جائے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی عادت یہی ہے کہ جس وقت کوئی اللہ تعالیٰ سے معجزہ طلب کرتا ہے کہ فلاں قسم کا معجزہ دکھاؤ تو ہم مان جائیں گے، اور وہ معجزہ ظاہر ہو جائے اور پھر وہ نہ مانیں، تو ایسے وقت میں ان کو ہلاک کر دیا جاتا ہے، پھر باقی نہیں رکھا جاتا، اور سرورِ کائنات ﷺ کے مخاطبین جو آپ کی اُمتِ دعوت تھی ان کو اس طرح ہلاک برباد کرنا یہ اللہ کی حکمت نہیں تھی، اس لیے چھوٹی موٹی نشانیاں معجزات اللہ تعالیٰ ظاہر کرتے رہے، اور اس قسم کی آیات بھی ظاہر کرتے رہے جن کے اندر ان کے لئے ایک تنبیہ پائی جاتی ہے، تو سعادت مندی تو یہ ہے کہ یہ چھوٹی چھوٹی تنبیہات کو سمجھیں، اور سمجھنے کے بعد بڑے عذاب سے بچ جائیں، لیکن ان کا حال یہ ہے کہ جس وقت ہم ان پر کوئی تنبیہ اتارتے ہیں اور تنبیہ کے طور پر کوئی مصیبت نازل کر دیتے ہیں اس وقت تو یہ اللہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور کچھ ان کی اکڑ نکلتی ہے، اور جہاں اس

تکلیف کو زائل کرنے کے بعد ہم ان کو اپنی رحمت کا مصداق بنا دیتے ہیں، ان کے اوپر کوئی رحم اور فضل فرما دیتے ہیں تو ایسے وقت میں پھر شرارتیں کرنے لگ جاتے ہیں، تو ان کو سمجھ لینا چاہیے کہ ان کی شراتوں کا نقصان انہیں ہی پہنچے گا، ہمارا یہ کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔

مشرکین کی شرارتوں، مکاریوں اور غلط طرزِ عمل پر تنبیہ

جیسے درمیان میں ایک واقعہ ذکر کر دیا گیا جو عام طور پر پیش آتا تھا، وہ لوگ تجارت کی غرض سے سمندر میں سفر کرتے تھے، کشتیوں میں جاتے تھے، تو کشتیوں میں اس قسم کے حالات پیش آتے ہیں کہ کبھی تو ہوا موافق ہوتی ہے اور نرم رفتاری کے ساتھ چلتی ہے تو کشتیاں بہت سکون کے ساتھ چلتی ہیں اپنی سواریوں کو اور سامان کو لے کر، اور وہ لوگ خوش ہوتے ہیں، سمجھتے ہیں کہ ہمارا سفر بڑا اچھا کٹ رہا ہے، بےفکر ہوتے ہیں، لیکن ایسا ہوتا ہے کہ پھر کوئی طوفان آ گیا، طوفانی ہوا آ گئی، جس میں جھکڑ ہوتا ہے، تو ایسے موقع پر سمندر میں بہت بڑی بڑی موجیں اٹھتی ہیں، ہر طرف سے ہلاکت کے اسباب آ جاتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ اب ہم غرق ہو جائیں گے، ہمیں گھیر لیا گیا، تو ایسے موقع پر پھر یہ اللہ کو پکارتے ہیں، اور جو انہوں نے اللہ کے ساتھ شرکاء بنا رکھے ہیں ان کو اکثر و بیشتر یہ بھول جاتے ہیں، قرآنِ کریم میں دوسری جگہ یہ لفظ آئے گا: وَتَنْسَوْنَ مَا تُشْرِكُوْنَ (سورۂ انعام: ۴۱) کہ جب اس قسم کی مصیبت تمہارے اردگرد آ جاتی ہے تو پھر جن کو تم شریک ٹھہراتے ہو سب کو بھول جاتے ہو، پھر تم اللہ ہی کو پکارتے ہو، تو جب مصیبت آئی تو تمہارا حال یہ ہوا، جس وقت مصیبت دُور ہو جاتی ہے تو تم پھر اسی قسم کی شرارتوں پہ اتر آتے ہو، یہ ان کو ان کا حال ذکر کر کے متنبہ کیا جا رہا ہے کہ یہ تمہارا طرزِ عمل جتنا بھی ہے، آخر کب تک تمہیں ڈھیل دی جائے گی؟ کب تک تمہاری یہ شرارتیں برداشت کی جائیں گی؟ تمہاری یہ مکاریاں کب تک چلیں گی؟ آخر ایک وقت آئے گا کہ اللہ کے سامنے تم نے پیش ہونا ہے اور دنیا کے اندر بھی تمہیں برباد کیا جا سکتا ہے۔

مشرکین کو سمجھانے کے لئے دُنیوی زندگی کی مثال

پھر ان کو سمجھانے کے لئے ایک دنیوی زندگی کی مثال دے دی کہ جس دنیا کے اوپر تم فریفتہ ہو، رچے ہوئے ہو، اس کا حال تو ایسے ہے کہ بارش ہوتی ہے، زمین سرسبز ہو جاتی ہے، پر رونق ہو جاتی ہے، زمیندار کاشتکار سمجھتے ہیں کہ بڑی اچھی فصل آئے گی، اپنے دل کے اندر وہ منصوبے گانٹھتے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی عذاب ایسا آتا ہے، اولے پڑ جاتے ہیں، سیلاب آ جاتا ہے، کوئی پالا اور کورا اس طرح سے پڑ جاتا ہے کہ وہ فصل سوکھ جاتی ہے اور اس کا ایسا حال ہو جاتا ہے جیسے یہ کبھی پیدا ہی نہیں ہوئی تھی، تو جس طرح سے دُنیا کے اندر یہ انقلابات تم دیکھتے رہتے ہو، کہ رات کو کچھ ہوتا ہے، صبح کچھ ہوتا ہے، تو اس قسم کی فانی دُنیا کے اوپر تمہارا مست ہو جانا اور اس میں مشغول ہو کے ہماری آیات کی پروا نہ کرنا یہ عقل مندی نہیں ہے، اسی انداز کے ساتھ ان کو ان آیات کے اندر سمجھایا جا رہا ہے۔

مشرکین کی چالیں اور تاویلیں

''جب ہم انسان کو اپنی رحمت کا مزہ چکھاتے ہیں'' یعنی اس کو رحمت دیتے ہیں، اپنا فضل فرماتے ہیں، عافیت دیتے ہیں ''بعد اس تکلیف کے جو اس کو پہنچی'' النّاس کے متعلق جیسے میں نے کل عرض کیا تھا، یہ قضیہ مہملہ کے انداز میں ہے کہ نہ تو سارے ہی افراد ایسے ہوتے ہیں اور نہ انسانوں کی جماعت اس قسم کے افراد سے خالی ہے، جتنے افراد بھی ہوجائیں، بہر حال ہوتے ہیں، تعداد متعین نہیں کی گئی، ''جس وقت ہم لوگوں کو رحمت چکھاتے ہیں اس تکلیف کے بعد جو ان کو پہنچی، اچانک وہ ہماری آیات میں مکر کرنے لگ جاتے ہیں، ہماری آیات میں مختلف قسم کی تاویلیں کر کے ان کو باطل کرتے ہیں، مقابلہ کرتے ہیں، آیات کے باطل کرنے کے لئے چالیں چلنے لگ جاتے ہیں، اس میں خاص طور پر اس بات کی طرف بھی اشارہ ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی تکلیف پہنچی، تکلیف پہنچی تو اس لیے تھی تا کہ یہ متنبہ ہوں، پھر اللہ نے کچھ ڈھیل دے دی، ڈھیل دینے کے بعد ان کو کچھ خوش حالی ہوگئی، اب چاہیے تو یہ تھا کہ یہ اس گرفت سے متاثر ہوتے، اور اس خوش حالی کے اوپر اللہ کا شکر ادا کرتے، لیکن یہ یوں تاویلیں کرتے ہیں، تو یہ تو ایسے واقعات ہوتے رہتے ہیں، قوموں کے ساتھ بھی ہوتے ہیں، جماعتوں کے ساتھ بھی ہوتے ہیں، کبھی بُرے حال آگئے، کبھی اچھے حال آگئے، تو اس لیے یہ جو کہتے ہیں کہ عقیدے کی خرابی کی بناء پر یا کردار کی خرابی کی بنا پر اس قسم کے حالات آتے ہیں، یہ بات صحیح نہیں، ہمارے بڑوں کو بھی ایسے حالات پیش آیا کرتے تھے، زمانے کے تغیرات کے ساتھ کبھی اچھائی ہوتی ہے، کبھی بُرائی ہوتی ہے، اس قسم کی باتیں کر کے ہماری وہ آیات جو ان کو بطور تنبیہ کے بھیجی گئی تھیں، ہم نے جو نشانیاں بھیجی تھیں اس قسم کی تاویلات کر کے ان کو بے اثر کر دیتے ہیں، جیسے کہ فرعونیوں کے قصے کے اندر آپ کے سامنے سورۂ اعراف میں یہ باتیں وضاحت کیساتھ گزر چکیں، تو ابطال آیات اس طرح سے کیا کہ اُن آیات کی اس قسم کی توجیہات کر دیتے ہیں، تاویلات کر دیتے ہیں کہ جس کے بعد اُن آیات کا اثر ختم ہو جاتا ہے، یہ نہیں سمجھتے کہ اللہ کی طرف سے یہ ہمیں کوئی ڈنڈا لگا ہے، یا کوئی تنبیہ ہوئی ہے، بلکہ ان کی اتفاقی واقعات کے ساتھ تاویل کر کے ان کا بوجھ اپنے سر سے بوجھ اتار دیتے ہیں۔'' آپ کہہ دیجیے کہ اللہ بہت جلدی تدبیر کرنے والا ہے'' اللہ کی تدبیر کا پھر توڑ کوئی نہیں، جس کا مطلب یہ بھی ہے کہ تمہاری اس قسم کی چالبازیوں کی اللہ تعالیٰ جلدی سزا دینے والا ہے، اور جزاء بصورت عمل ذکر ہوتی رہتی ہے۔ اور تمہاری یہ چالبازیاں ہم سے مخفی بھی نہیں، ہم بھی جانتے ہیں اور یہ سارے کا سارا ریکارڈ ہمارے فرشتے بھی مرتب کر رہے ہیں، رُسُلَنَا کا مصداق یہاں فرشتے ہیں، ہمارے فرشتے تمہاری شرارتوں کو لکھتے ہیں، جو تم چالبازیاں کرتے ہو وہ لکھتے جا رہے ہیں۔

خوشی اور مصیبت میں مشرکین کا حال

''اللہ وہ ہے کہ تمہیں چلاتا ہے'' چلانے کی نسبت اللہ نے اپنی طرف کی، کیونکہ جتنے اسباب ہیں جن کے ساتھ چلنے کا سامان مہیا ہوتا ہے وہ سب اللہ کے پیدا کردہ ہیں، کشتیاں اگر بنائی ہیں تو لکڑی سے بنائی ہیں، اور اس میں لوہا استعمال ہوا ہے، تو لکڑی کو پیدا کرنے والا اللہ، لوہے کو پیدا کرنے والا اللہ، پھر انسان کو اتنی عقل اور سمجھ دینے والا اللہ ہے کہ اس طرح سے لکڑی کو چیرا

جائے، اس طرح سے اس کولوہے کے ساتھ جوڑ لیا جائے تو یہ پانی کے اوپر تیرے گی اور اس طرح سے بوجھ اٹھالے گی، تو انسان کو عقل فہم بھی اللہ نے دیا، اور جن چیزوں کے ذریعے سے یہ چلتا ہے وہ ساری کی ساری چیزیں اللہ کی پیدا کردہ ہیں، تو اس لیے چلنے کا سامان سارے کا سارا اللہ نے دیا، اور انسان کو اللہ ہی چلاتا ہے خشکی میں بھی اور سمندروں میں بھی، اس لیے چلانے کی نسبت اللہ کی طرف کردی۔ ''اللہ ان کو چلاتا ہے سفر کراتا ہے خشکی میں اور سمندر میں''۔ اور پھر اس میں یہ حال بھی پیش آجاتا ہے کہ جب یہ کشتیوں میں ہوتے ہیں، اِذَا كُنْتُمْ میں تو خطاب ہے اور جَرَيْنَ بِهِمْ میں انتقال ہے غائب کی طرف۔ کہ ''اے لوگو! جس وقت تم کشتیوں میں ہوتے ہو'' پھر آگے غائب کی طرف انتقال ہوگیا کہ پھر وہ کشتیاں اِن لوگوں کو لے کر عمدہ ہوا کے ساتھ چلتی ہیں، اور وہ خوش ہوتے ہیں اس ہوا کے ذریعے سے، یا کشتیوں کی اس رفتار پر خوش ہوتے ہیں، پھر ان کشتیوں کے پاس توڑنے پھوڑنے والی ہوا آجاتی ہے، جھکڑ آگئے، اور ہر طرف سے ان کے پاس موجیں آنے لگ جاتی ہیں (موج مَوجۃٌ کی جمع)، اور ان کو خیال گزرنے لگتا ہے، ان کے دل میں یہ وہم آنے لگ جاتا ہے کہ اب یہ گھیر لیے گئے، اور اس عذاب سے چھوٹنے کا کوئی راستہ نہیں، سمندر کے وسط میں موجوں کے اندر جس وقت کشتیوں کو ہچکولے لگتے ہیں تو پھر وہ یہی سمجھنے لگتے ہیں کہ اب کوئی بچانے والا نہیں، جب یہ حال ہوتا ہے تو دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ پھر اللہ کے متعلق اپنے عقیدے کو خالص کر کے اللہ کو پکارنے لگ جاتے ہیں، اور دوسری جگہ وہی الفاظ ہیں جیسے میں نے پہلے عرض کیا کہ تَنْسَوْنَ مَا تُشْرِكُوْنَ پھر تم لوگ ان چیزوں کو بھول جاتے ہو جن کو تم شریک ٹھہراتے ہو، وہاں یہ تمہارے ذہن سے نکل جاتے ہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مصیبت کے وقت میں فطرت سامنے آجاتی ہے، اور دل کی گہرائی میں اگر عقیدہ ہے کہ کوئی مدد کو پہنچ سکتا ہے مشکل کشائی کرسکتا ہے، تو یہ صرف اللہ کے متعلق ہے دوسروں کے متعلق نہیں ہے، ان مصیبتوں کے اندر آکے یہ فطری آواز اجاگر ہوجاتی ہے، ''پکارنے لگ جاتے ہیں اللہ کو اس حال میں کہ خالص کرنے والے ہوتے ہیں اس کے لئے عقیدے کو'' اور پکارتے ہوئے یوں کہتے ہیں ''اگر تُو نے ہمیں نجات دے دی اس مصیبت سے البتہ ضرور ہوجائیں گے ہم شکرگزاروں میں سے'' تیرا شکر کریں گے، تیرے شکرگزار رہیں گے اگر اس مصیبت سے تو نجات دے دے۔ ''پھر جب اللہ تعالیٰ انہیں نجات دے دیتا ہے تو زمین میں آکے، خشکی میں آکے، سمندر سے باہر نکل کے پھر اسی طرح سے بغاوت اور شرارتیں کرنے لگ جاتے ہیں ناحق'' جس کا حق ان کو کوئی نہیں پہنچتا، بِغَيْرِ الْحَقِّ کا ذکر یہاں اتفاقی ہے بیان واقعہ کے طور پر، کہ ان کی بغاوت اور سرکشی ایسی ہوتی ہے جس کا ان کو حق کوئی نہیں۔ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّمَا بَغْيُكُمْ عَلٰۤى اَنْفُسِكُمْ: اے لوگو! تمہاری یہ بغاوت تمہارے ہی نقصان میں ہے (علیٰ ضرر کے لئے آگیا) اس سے ہمارا کچھ نہیں بگڑے گا، تم اپنے آپ کا نقصان کرتے ہو، ''فائدہ اٹھالو دنیوی زندگی کا'' دنیوی زندگی میں کچھ مزے اُڑالو، مَّتَاعَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ثُمَّ اِلَيْنَا مَرْجِعُكُمْ جس طرح سے کہا کرتے ہیں کہ کرلو جو تم سے ہوتا ہے آخر پانی انہی پلوں کے نیچے سے گزرنا ہے، آؤ گے تو ہمارے ہی سامنے، جتنی شرارت ہوتی ہے کرلو، دنیوی زندگی میں جو مزے اُڑا سکتے ہو اُڑالو، جو نفع اُٹھا سکتے ہو اُٹھالو، پھر آنا تو ہماری طرف ہی ہے، ثُمَّ اِلَيْنَا مَرْجِعُكُمْ: پھر ہماری طرف ہی تمہارا لوٹنا ہے، پھر ہم خبر دیں گے تمہیں (یعنی تمہیں جتلائیں گے کہ تم یہ کیا کرتے تھے، ایک ایک کر کے گن کے تمہارے سامنے رکھ دیں گے) خبر دیں گے تمہیں ان کاموں کی جو تم کیا کرتے تھے۔

اِنسان اپنے اللہ کا نافرمان کیوں ہو جاتا ہے؟

اب یہ دنیوی محبت اور دنیوی زندگی کے مزوں کے اندر مبتلا ہو کر ہی انسان اللہ کا نافرمان ہوتا ہے، ''حُبُّ الدُّنْیَا رَأْسُ کُلِّ خَطِیْئَۃٍ''(۱) تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں یہ تو فانی چیز ہے، بہت جلدی منقلب ہونے والی ہے، بدلنے والی ہے، اس کے ساتھ دل کیا لگاتے ہو، اس کی مثال تو ایسی ہے کہ صبح کچھ ہے شام کچھ ہے، دن کو کیسی ہوتی ہے رات کو کچھ ہو جاتی ہے۔ سوائے اس کے نہیں کہ دنیوی زندگی کا حال تو ایسے ہے جیسے ہم نے پانی اتارا آسمان سے، اور اس کے ذریعے سے ایسی نباتات جو انسان کے کام کی ہیں، حیوان کے کام کی ہیں، خلط ملط ہو کے نکلتی ہیں اور خوب اچھی طرح سے گھنی فصل اگتی ہے، حتیٰ کہ جس وقت زمین پوری طرح سے اپنی زینت اختیار کر لیتی ہے، مزین ہو جاتی ہے، آراستہ ہو جاتی ہے، کھیت لہلہاتے ہیں، باغ پھل جاتے ہیں، اور مالک ان کو دیکھ دیکھ کے خوش ہوتا ہے، زمین والے خوش ہوتے ہیں کہ اب وہ قادر اس زمین پر، یعنی اس کی نباتات پر، اس کی پیداوار پہ قادر ہیں، اب اس کی پیداوار ہم حاصل کریں گے، ''آجاتا ہے اس کے پاس ہمارا حکم رات کو یا دن کو''، ''حکم'' سے حکمِ عذاب مراد ہے، کوئی آندھی اس قسم کی آئی جو سارے پھل گرا گئی، اولے پڑ گئے، ژالہ باری ہو گئی، سیلاب آ گیا، اس قسم کی کوئی آفت آجاتی ہے، بسا اوقات ٹڈی دل ہی آجاتا ہے، وہی سارے کھیتوں کو چاٹ جاتا ہے، فَجَعَلْنٰهَا حَصِیْدًا: حصید کہتے ہیں کٹی ہوئی کھیتی کو۔ بنا دیا ہم نے اس زمین کو حصید یعنی جس کی فصل کٹی ہوئی تھی، ایسی کر دی جس کی فصل کاٹ دی گئی ہو، یا ہم نے ان نباتات کو جو کہ زمین کے اوپر کھڑی تھیں جن کے ساتھ زمین پر رونق ہوئی تھی، ہم اس کو کٹی ہوئی کر دیتے ہیں، ریزہ ریزہ کر دیتے ہیں، کَاَنْ لَّمْ تَغْنَ بِالْاَمْسِ: گویا کہ وہ نباتات کل تھی ہی نہیں، یعنی اس طرح سے ویرانی آجاتی ہے کہ وہاں کھڑے ہو کے پھر آپ سوچ نہیں سکتے کہ کل یہی کھیت تھے جو لہلہا رہے تھے اور جن کو دیکھ کر کسان خوش ہو رہا تھا، ایسے ہو گئے کہ گویا کہ کل تھے ہی نہیں، ''ایسے ہی ہم کھول کھول کے بیان کرتے ہیں نشانیاں ان لوگوں کے لئے جو کہ سوچتے ہیں۔''

اس مثال کو اگر آپ سامنے رکھیں گے تو دنیا کا حال آپ کو ایسے ہی نظر آئے گا جس طرح سے یہ نباتات کی مثال ہے (ذرا توجہ فرمائیے!) دنیا کے اندر انسان جس محبت کے اندر مبتلا ہوتا ہے وہ یا مال ہے یا اولاد ہے، مال میں بھی یہی مثال پیش آتی ہے کہ پتا ہی نہیں چلتا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف کس وقت کوئی ایسا واقعہ پیش آجائے گا کہ انسان فوراً ہی تہی دست ہو جاتا ہے، اور اولاد کے بارے میں ایسے ہی ہوتا ہے، بچہ پیدا ہوتا ہے اسی صورت میں، جس طرح سے اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے نزولِ ماء ہوا تھا تو زمین سے نباتات پیدا ہوئی تھی، تو نسل بھی اسی انداز سے چلتی ہے، بچہ پیدا ہوتا ہے، بڑھتا جاتا ہے، بڑھتا جاتا ہے، آپ اپنے خیال کے مطابق اس کو علم وفن سکھائیں گے، ہنر سکھائیں گے، جوان ہو گیا، سند یافتہ ہو گیا، انجینئر بن گیا، ڈاکٹر بن گیا، بہت بڑا عہدے دار بن گیا، تو ماں باپ خوش ہوتے ہیں کہ اب اس بچے کی ہم کمائی کھائیں گے، یہ ہمارے لیے باعثِ راحت ہوگا، کتنی کتنی اُمیدیں باندھ لیتے ہیں، صبح شام رات دن اس قسم کے واقعات پیش آتے ہیں کہ اس قسم کا جوان بچہ جس کے متعلق

(۱) مشکوۃ ج۲ ص۴۴۴، کتاب الرقاق، فصل ثالث/ حلیۃ الاولیاء ج۶ ص۳۸۸۔

والدین نے اس قسم کی اُمیدیں لگائی ہوئی ہیں، پتا ہی نہیں چلتا ایک منٹ کے اندر آنکھوں سے غائب ہوجاتا ہے، کسی حادثے کا شکار ہوگیا، طبعی موت سے مرگیا، کیا ایسے واقعات پیش نہیں آتے؟ یقیناً پیش آتے ہیں، تو جس طرح سے نباتات کی حالت ناپائیدار ہے کہ معلوم نہیں اللہ کی طرف سے کس وقت عذاب آجائے اور اس کو صاف کر کے رکھ دے، اسی طرح سے اولاد کے بارے میں یہی بات ہے، اور خود اپنے بارے میں بھی تم سوچ لو، ایسے ہی ہے، کہ بڑھتے جارہے ہو، عروج کی طرف جارہے ہو، کمال کی طرف تم جارہے ہو، تم سمجھتے ہو کہ اب ہم نے اس قسم کے فنون حاصل کر لیے، اس قسم کے اسباب پیدا کر لیے، کہ اب اگلی زندگی ہم بہت راحت اور آرام کے ساتھ گزاریں گے، پتا ہی نہیں چلتا جس وقت اللہ تعالیٰ ٹانگیں توڑ کے رکھ دیتا ہے، بازو توڑ کے رکھ دیتا ہے، آنکھوں سے اندھا کر دیتا ہے، ساری صلاحیتیں ختم کر دیتا ہے، انسان بالکل مٹی کا ایک ڈھیر ہوجاتا ہے، کوئی چیز اس میں باقی نہیں رہتی، تو دنیا کی کونسی چیز ایسی ہے جس کے اندر یہ انقلابات ہم صبح شام نہیں دیکھتے، یہ نشانیاں کھل کھل کے تمہارے سامنے آرہی ہیں تو پھر اس قسم کی فانی اور اس طرح سے زائل ہونے والی چیز جس پر ایک لمحے کے لئے اعتماد نہیں کیا جاسکتا، اس کے ساتھ محبت لگا کے تم اللہ کے مقابلے میں بغاوت کرتے ہو، یا اس کے مزے کے اندر مبتلا ہو کے تم آخری اور دائمی زندگی سے غفلت برتتے ہو، یہ کونسی عقل مندی ہے؟ اس لیے یہ مثالیں دے دے کے سمجھایا جارہا ہے کہ اگر غور کرو تو صبح شام رات دن اس قسم کے حادثات اور واقعات آپ کے سامنے آتے ہیں جو انسان کے چونکا دینے کے لئے کافی ہیں، لیکن ان سے فائدہ وہی لوگ حاصل کریں گے جن کو تفکر کی عادت ہے، جو سوچتے ہیں، غور و خوض کرتے ہیں، اس قسم کی مثالوں میں غور و خوض کریں گے تو پھر ان کو فنائے دنیا کا یقین آجاتا ہے، پھر اس دنیا کی محبت کے اندر مبتلا ہو کے انسان اس قسم کی شرارتوں میں مبتلا نہیں ہوتا۔

صدقِ دِل اور طلبِ حق ہو تو اللہ توفیق عطا فرماتا ہے

وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلٰى دَارِ السَّلٰمِ: دنیا تو حوادثات کی جگہ ہے، مصیبت ہے، کہ معلوم نہیں کس وقت انسان لٹ پٹ جاتا ہے، لیکن جس زندگی کی نشاندہی اللہ تعالیٰ تمہیں کر رہا ہے کہ اس راستے پر چلو تو تم دار السلام میں پہنچ جاؤ گے، وہاں امن ہی امن اور سلامتی ہی سلامتی ہے، کوئی کسی قسم کی مصیبت آنے کا اندیشہ بھی نہیں ہے، دار السلام سے مراد ہے جنت، سلامتی کا گھر، جس میں ہر طرح سے سلامتی ہی سلامتی ہوگی، اوپر والی آفات مصیبتیں وہاں نہیں ہوں گی، اس قسم کا اندیشہ نہیں ہوگا، نہ ماضی کا غم نہ مستقبل کے متعلق فکر، سلامتی کا حاصل یہی ہوتا ہے، کہ انسان کا دل دماغ ہر طرح سے مطمئن ہے، کسی مصیبت کے آنے کا کھٹکا خطرہ نہیں ہے، ''اور اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے صراطِ مستقیم پہ چلاتا ہے'' اور اللہ تعالیٰ کا چاہنا اس کی حکمت کے تحت ہوتا ہے، اُس نے وضاحت کر دی کہ جو اپنی طرف سے اخلاص برتیں گے، صفتِ احسان اپنانے کی کوشش کریں گے، صدقِ دل کے ساتھ طلبِ حق کریں گے، اللہ تعالیٰ انہیں توفیق دے دیتا ہے۔ اللہ کا مشیت اور اس کا چاہنا حکمت کے تحت ہے، ایسے نہیں کہ جس کو پکڑا اِدھر کو کر دیا، جس کو پکڑا اُدھر کو کر دیا، بلکہ اللہ نے اپنی حکمت کے تحت جو قاعدہ اور ضابطہ بنایا ہے جو اس پر چلے گا گویا کہ اللہ نے اس کی ہدایت چاہ لی، اس کو اللہ تعالیٰ منزلِ مقصود تک پہنچا دیتا ہے۔

مؤمنین اور منکرین کے انجام کا بیان

لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَزِيَادَةٌ: اب یہ دونوں فریقوں کا انجام بیان کیا جارہا ہے، ''جو لوگ اچھے کام کرتے ہیں'' اِحسان: احسان فی العبادت اور احسان فی المعاملات، ہر معاملے کو اچھے انداز سے ادا کرنا، اللہ تعالیٰ کی عبادت اس طرح سے کرنا گویا کہ انسان اللہ کے سامنے ہے، یا اللہ کو دیکھ رہا ہے، ''ان کے لئے اچھی حالت ہے اور اس کے اوپر زیادتی بھی ہے'' اچھی حالت سے تو مراد ہو گیا کہ نیکیوں کے برابر اللہ بدلہ دیں گے، پھر اس پر زیادتی بھی دیں گے مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا (سورۂ اعراف: ۱۶۰) اور پھر عَشْرُ اَمْثَالِهَا پر بند نہیں، سات سو گنا تک بھی بدلہ دیں گے، اس سے بھی زائد دیں گے۔ اور زیادت کا مصداق بعض روایات میں سرورِ کائنات ﷺ نے یہ بھی بیان فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی زیارت نصیب ہوگی، یہ گویا کہ اس انعام کے اوپر اضافہ ہے جو اللہ تعالیٰ جنت میں ثواب دیں گے نعمتیں دیں گے، اس کے اوپر اضافہ یہ فرمائیں گے کہ اللہ کی زیارت نصیب ہوگی۔ آبرو والے ہوں گے، چہرے کے اوپر رونق ہوگی، کوئی ذِلّت ان کے اوپر نمایاں نہیں ہوگی، ''نہیں ڈھانپے گی ان کے چہروں کو تاریکی'' اس تاریکی سے مراد مایوسی والی تاریکی ہے، آپ نے دیکھا ہوگا کہ انسان جس وقت خوش ہوتا ہے تو اس کا چہرہ چمکتا ہے دمکتا ہے خوشی کے آثار اس کے اوپر ہوتے ہیں وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ مُّسْفِرَةٌ ۞ ضَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ (سورۂ عبس) چمکدار ہوں گے، ہنستے ہوں گے، خوش ہوں گے، بعض چہرے اس قسم کے ہوتے ہیں، جس وقت انسان کے دل میں خوشی ہوتی ہے تو چہروں کے اوپر رونق آجاتی ہے، اور جب کوئی مایوسی طاری ہو جائے کوئی غم طاری ہو جائے تو چہرے کی رونق ختم ہو جاتی ہے، منہ سیاہ سا ہو جاتا ہے، یہاں وہی سیاہی مراد ہے، ''نہیں ڈھانپے گی ان کے چہروں کو تاریکی اور نہ کوئی ذلت'' اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ: یہی جنت والے ہیں، هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ: اس میں ہمیشہ رہنے والے ہوں گے۔ اب مقابلے میں دوسرے لوگوں کا انجام آگیا، بِضِدِّهَا تَتَبَيَّنُ الْاَشْيَاءُ، ضد کے ذکر کے ساتھ چیز اچھی واضح ہو جاتی ہے، تو اس لیے دوسروں کا ذکر آگیا، ''جو لوگ برائیاں کرتے ہیں'' وَالَّذِيْنَ كَسَبُوا السَّيِّاٰتِ: اس کا عطف اگر آپ ڈال لیں الذین احسنوا پر، تو یہ بھی لام کا مدخول ہو جائے گا، ''ان لوگوں کے لئے جو کہ بُرائیوں کا ارتکاب کرتے ہیں بُرائی کا بدلہ ہے اس کے برابر'' وہاں اللہ زیادتی نہیں کرے گا، وہاں بُرائی کا بدلہ برائی کے برابر دے گا، وَتَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ: اور ان کو ذلت ڈھانپ لے گی، یعنی دیکھ کر ہی معلوم ہو جائے گا کہ بڑے ذلیل لوگ ہیں، کس طرح سے ان کے اُوپر ذِلّت طاری ہے، اللہ کے عذاب سے اللہ کی گرفت سے ان کو کوئی بچانے والا نہیں ہوگا، اور ان کے اوپر سیاہی اس طرح سے چڑھی ہوئی ہوگی گویا کہ ان کے چہروں کو رات کے ٹکڑوں نے ڈھانپ لیا، تہہ بہ تہہ ان کے اوپر تاریکی ڈال دی گئی، (مُظْلِمًا یہ الَّيْلِ سے حال واقع ہو جائے گا) اس حال میں رات تاریک ہو، یعنی تاریک رات کے ٹکڑے ان کے چہروں کے اوپر ڈال دیے گئے، اس طرح سے ان کا منہ کالا ہوگا، سیاہ ہوگا، یہ سیاہی وہی مایوسی والی سیاہی ہے، غم والی سیاہی ہے، ''یہی لوگ جہنم والے ہیں اور اس میں ہمیشہ رہنے والے ہوں گے۔''

مشرکین کے سہاروں کا حال

اور دنیا میں انہوں نے جو سہارے تلاش کر رکھے ہیں جیسے سورۂ عنکبوت کے اندر آئے گا، یہ وہاں جا کے نہایت بودے اور

کمزور ثابت ہوں گے، یہ کچھ کام نہیں آئیں گے، وہاں مثال آئے گی کہ انہوں نے جو سہارے بنا رکھے ہیں یہ تو ایسے ہی ہے جیسے مکڑی کا جالا، مکڑی بھی اپنا گھر بناتی ہے لیکن اوھن البیوت مکڑی کا گھر ہے اِنَّ اَوْهَنَ الْبُيُوْتِ لَبَيْتُ الْعَنْكَبُوْتِ، کہ تمام گھروں سے کمزور ترین گھر مکڑی کا جالا ہے، مکڑی کا گھر ہے، تو اسی طرح سے انہوں نے جو سہارے تلاش کر رکھے ہیں یہی ان کے لئے وہاں جا کے مصیبت بن جائیں گے۔ وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا: جس دن ہم ان سب کو اکٹھا کریں گے، یعنی ان مشرکین کو بھی اور ان کے شرکاء کو بھی اکٹھا کرلیں گے، ثُمَّ نَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا: پھر ہم کہیں گے مشرکوں سے کہ اپنی جگہ ٹھہرے رہو تم بھی اور تمہارے شرکاء بھی، پھر ہم ان کے درمیان میں پھوٹ ڈال دیں گے، یعنی ان کی آپس میں لڑائی کرا دیں گے، پُوجنے والے کہیں گے کہ ہم تمہیں پُوجتے تھے آج ہمیں اللہ کے عذاب سے بچاؤ، ہم تمہاری ہی پُوجا کرتے تھے، قرآنِ کریم کی بہت ساری آیات میں یہ چیز ذکر کی گئی ہے کہ اَتباع اپنے متبوعین سے جھگڑیں گے، اور اسی طرح شرکاء کے ساتھ ان کے پوجنے والے جھگڑا کریں گے، ''ہم ان کے درمیان میں پھوٹ ڈال دیں گے'' ان کے تعلقات قطع کردیں گے، کہیں گے شرکاء مَا كُنْتُمْ اِيَّانَا تَعْبُدُوْنَ: تم ہماری پُوجا نہیں کیا کرتے تھے، وہ ان کی عبادت کا سرے سے انکار ہی کردیں گے۔ فَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ: یہ لفظ بطور قسم کے ہیں کہ اللہ ہی گواہ کافی ہے ہمارے اور تمہارے درمیان، کہ ہم تو تمہاری عبادت سے ویسے ہی بے خبر تھے، ہمیں تو پتا ہی نہیں تھا کہ تم ہماری عبادت کرتے ہو، اِنْ كُنَّا عَنْ عِبَادَتِكُمْ لَغٰفِلِيْنَ: ہم تمہاری عبادت سے بے خبر تھے۔

آیتِ مذکورہ میں ''شرکاء'' کا مصداق اور اس کی مختلف صورتیں

اب یہاں شرکاء کا مصداق کیا ہے؟ قرآنِ کریم کی آیات کو اگر تفصیل کے ساتھ دیکھا جائے تو یہ بات واقعی سامنے آتی ہے کہ مشرک قوموں نے صالحین کو پُوجا، انبیاء ﷤ کی عبادت کی، جس طرح سے عیسائیوں نے مسیح ﷤ کو پُوجا، یہودیوں نے عزیر ﷤ کو معبود بنایا، تو انبیاء ﷤ کو پُوجا، صالحین کو پُوجا، جس طرح سے نوح ﷤ کے پانچ بتوں کا ذکر جو آتا ہے تو ''بخاری شریف'' میں روایت موجود ہے ابن عباس ﷠ کی، وہ فرماتے ہیں یہ قومِ نوح کے صالحین تھے، جن کے مرنے کے بعد ان کی تصویریں بنا کے رکھ لی گئیں اور ان کو پُوجنا شروع کردیا، اور اسی طرح سے ملائکہ کو بھی معبود بنایا، ملائکہ کی پُوجا بھی لوگ کرتے تھے، جنات کی پُوجا بھی کرتے تھے جس طرح سے سورۂ جن کے اندر اس کا ذکر آئے گا، تو اس قسم کی چیزیں بھی تھیں، لوگوں نے درختوں کو پُوجا، سورج اور چاند کو پُوجا، اور پتھر کی مورتیوں کو پُوجا، جن کے متعلق آپ کے سامنے ایک دفعہ وضاحت کی تھی کہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب ﷫ کی جو اُصولِ تفسیر پر کتاب ہے ''الفوز الکبیر''، اس میں یہ بات لکھی ہے کہ شرک کی بنیاد اگرچہ اشخاص پرستی سے شروع ہوئی تھی، اور وہ تصویریں جو بناتے تھے تو انہی اشخاص کی یاددہانی کے لئے بناتے تھے، لیکن بعد میں جہالت کی وجہ سے معاملہ اتنا خلط ملط ہوا کہ پھر وہ شخصیات نظروں سے اوجھل ہوگئیں اور یہ مورتیاں ہی سامنے رہ گئیں، اور ان مورتیوں کے ساتھ ہی وہ اس قسم کا برتاؤ کرتے تھے جس طرح کسی شخصیت کے ساتھ کیا جاتا ہے، پھر ان کے سامنے وہ شخصیات نہیں، بلکہ یہی بت جو پتھر کے بنے

ہوئے تھے، یہی ان کے معبود قرار پاگئے اور ان کے ساتھ اس قسم کا معاملہ کرتے تھے جس قسم کا معاملہ شخصیات کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ تو عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ بے جان چیزوں کو بھی پُوجتے تھے اور جاندار چیزوں کو بھی پُوجتے تھے، جاندار چیزوں میں سے مقبولین کو بھی پُوجتے تھے غیر مقبولین کو بھی پُوجتے تھے، روایات کے اندر ہر قسم کا ذکر آتا ہے۔ تو اگر تو یہاں شرکاء سے بے جان چیزیں مراد لی جائیں تو پھر ان کا یہ کہنا کہ تم ہمیں نہیں پُوجتے تھے، ان کا یہ بولنا اللہ کی قدرت کے تحت ہوگا کہ اللہ تعالیٰ ان کو بولنے کی طاقت دے دے گا، کہ یہ اینٹ پتھر یہ پیتل تانبا لکڑی وغیرہ جن کی یہ تصویریں بنایا کرتے تھے، ان کو اللہ زبان دے یہ آگے سے بولیں گے، اور بول کے کہیں گے کہ تم ہماری پُوجا نہیں کیا کرتے تھے، ہماری پُوجا یہ کیسے ہوگئی؟ ہم نے تمہیں کہا تھا؟ ہم تمہاری اس عبادت پہ راضی تھے؟ ہمیں تو سرے سے خبر ہی نہیں تھی کہ تم ہمیں پُوج رہے ہو، پھر یہ ان کا کہنا اللہ کی قدرت کے تحت ہے کہ ان کو گویائی دی جائے گی، وہ بولیں گے، مقصد اس سے صرف ہوگا مشرکین کی حسرت کو بڑھانا کہ جن چیزوں کے ساتھ ہم نے عقیدت لگائی تھی آج ان کی طرف سے ہمارے سامنے یہ بات آگئی۔ اور اگر وہ جاندار چیزیں تھی، مثال کے طور پر ملائکہ تھے، انبیاء تھے، صالحین تھے، وہ بھی آگے سے اسی طرح سے کہیں گے کہ تم ہماری پُوجا نہیں کیا کرتے تھے، ہماری پُوجا تو تب سمجھی جائے کہ ہم اس پر راضی ہوتے، ہماری پُوجا تب سمجھی جائے کہ ہم نے تمہیں کہا ہوتا کہ تم ہمیں پُوجو، اپنے طور پر تم نے ہمارے متعلق عقیدے بنائے اور عقیدے بنا کر اپنے خیال کے مطابق تم نے ہمیں پُوجنا شروع کردیا، اس کی ذمہ داری ہم پر تو نہیں ہے، یہ تو سارے کا سارا شیطانی سلسلہ تھا، شیطان نے تمہیں اکسایا، تو چاہے تم نام ہمارا لیتے تھے، پُوجا ہماری کرتے تھے، یہ پُوجا ہماری نہیں تھی، حقیقت کے اعتبار سے شیطان کی پُوجا تھی، فرشتوں کی طرف سے بھی یہی جواب ہوگا، انبیاء کی طرف سے اور صالحین کی طرف سے بھی یہی جواب ہوگا، جس طرح سے بائیسویں پارے میں آیت موجود ہے کہ ایسے ہی موقع پر وہ کہیں گے وَيَوۡمَ يَحۡشُرُهُمۡ جَمِيۡعًا ثُمَّ يَقُوۡلُ لِلۡمَلٰٓئِكَةِ، خصوصیت کے ساتھ ملائکہ کو خطاب ہے اَهٰٓؤُلَآءِ اِيَّاكُمۡ كَانُوۡا يَعۡبُدُوۡنَ، یہ اس موقع پر اللہ تعالیٰ اُن لوگوں کے سامنے کہیں گے جو کہ فرشتوں کی پُوجا کرتے تھے، شرکاء بھی سامنے کھڑے ہوں گے اور پُوجنے والے بھی، سب موجود ہوں گے، مشرکین کہہ رہے ہوں گے کہ ہم ان کی پُوجا کرتے تھے، گویا کہ فرشتے ان کے معبود تھے، تو اللہ تعالیٰ خطاب فرشتوں کو کریں گے (يَقُوۡلُ لِلۡمَلٰٓئِكَةِ)، اَهٰٓؤُلَآءِ اِيَّاكُمۡ كَانُوۡا يَعۡبُدُوۡنَ: یہ لوگ تمہاری پُوجا کیا کرتے تھے؟ قَالُوۡا سُبۡحٰنَكَ اَنۡتَ وَلِيُّنَا مِنۡ دُوۡنِهِمۡ: ہمارا تعلق تو تیرے ساتھ ہے، اِن سے ہمارا کوئی تعلق نہیں، بَلۡ كَانُوۡا يَعۡبُدُوۡنَ الۡجِنَّ: یہ تو جنوں کی پُوجا کرتے تھے، اَكۡثَرُهُمۡ بِهِمۡ مُّؤۡمِنُوۡنَ (سورۂ سبا: ۴۰-۴۱) اور اُنہی کے ساتھ ہی اِن کا ایمان تھا، ہم نے نہ انہیں بلایا نہ ہم نے انہیں ترغیب دی، تو اِن کی یہ عبادت ہماری عبادت کس طرح سے قرار پاگئی؟ ہم ان کے معبود کیسے ہوگئے؟ نہ ہم نے اپنے آپ کو اس حیثیت سے پیش کیا، نہ ہم نے ان کو ترغیب دی، نہ انہیں بلایا، نہ ان کے اس کام کے اوپر ہم راضی ہیں، یہ تو شیاطین نے ان کو بہکایا تھا، چاہے نام لیتے تھے لیکن حقیقت کے اعتبار سے یہ اتباع بھی شیطان کی تھی اور پُوجا بھی شیطان کی تھی، اس لیے وہ قسمیں کھا کے کہہ لیں گے کہ تم ہماری پُوجا نہیں کرتے تھے، ہمیں تو تمہاری پُوجا کا اور تمہاری عبادت کا پتا بھی نہیں تھا کہ تم ہماری پُوجا کرتے ہو۔ ''پتا بھی نہیں تھا'' کیونکہ

فرشتے اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے جن کاموں پہ متعین ہیں وہ اپنے کاموں میں لگے ہوئے ہیں، انہیں کیا پتا کہ کون پکار رہا ہے کون نہیں پکار رہا، اور اسی طرح سے انبیاء علیہم السلام ہوں یا صالحین ہوں ان کے متعلق یہ کوئی ثبوت نہیں کہ ان کو جہاں سے پکارو، جب پکارو، جو کہو، وہ سنتے ہیں اور تمام لوگوں کی تفصیلات ان کے سامنے ہوں کہ فلاں شخص ہماری عبادت کر رہا ہے، فلاں شخص ہماری عبادت کر رہا ہے، اس قسم کی تفصیل کا انبیاء علیہم السلام کے سامنے پیش ہونے کا بھی کوئی ثبوت نہیں ہے، اپنے طور پر لوگوں نے اوہام پرستی کر لی، نام انبیاء علیہم السلام کا لے لیا، ملائکہ کا لے لیا، اولیاء کا لے لیا، پوجا شیطان کی ہے، تو یہ کوئی بات نہیں، نہ اس کا کوئی ثبوت ہے کہ اس قسم کی تمام کی تمام تفصیلات ان کے سامنے جاتی ہوں، اس لیے اگر وہ قسم کھا کے بھی کہہ دیں کہ ہمیں تمہاری عبادت کی کوئی خبر نہیں تھی کہ تم ہماری عبادت کر رہے ہو تو یہ بات بھی اپنی جگہ بالکل صحیح ہے، کیونکہ وہ عبادت ان کی تھی ہی نہیں، وہ تھی ہی شیاطین کی...... اور اس کا ایک مطلب یہ بھی ذکر کیا گیا ہے اگر اس سے مراد مسیح علیہ السلام اور انبیاء علیہم السلام ہوں تو ان کی طرف سے یہ جواب بھی ملے گا کہ ہمیں کیا خبر تھی کہ تم ہماری عبادت کرنے لگ جاؤ گے، ہم تو اپنی زندگی میں جس وقت تمہارے پاس رہتے تھے تمہارے اندر موجود ہوتے تھے اس بات سے بے خبر تھے کہ تم ہماری عبادت کیا کرو گے، ہم نے کس وقت تم سے راضی تھے اور کس وقت تمہیں کہا تھا کہ تم ہماری عبادت کرنا؟ یعنی اپنی زندگی میں ہم یہ جانتے نہیں تھے کہ تم ہمارے بعد ہمارا یہ حال کرنے لگ جاؤ گے، ہم تمہاری عبادت سے جو تم نے ہماری کی ہے اپنی زندگی میں جس وقت دنیا میں موجود تھے ویسے ہی بے خبر تھے، ترغیب تو ہم نے کیا دینی تھی، اس قسم کا مفہوم اس آیت کا ہے، ذرا سنیے! حضرت شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ نے یہ ساری کی ساری صورتیں ذکر کی ہیں: ''یعنی اسی وقت عجیب افراتفری اور نفسی نفسی ہوگی، عابدین ومعبودین میں جدائی پڑ جائے گی، اور دنیا میں اپنے اوہام وخیالات کے موافق جو رشتے جوڑ رکھے تھے سب توڑ دیے جائیں گے، اس ہولناک وقت میں جبکہ مشرکین کو اپنے فرضی معبودوں سے بہت کچھ توقعات تھیں، وہ صاف جواب دے دیں گے کہ تمہارا ہم سے کیا تعلق، تم جھوٹ بکتے ہو کہ ہماری بندگی کرتے تھے، تم اپنے عقیدہ کے موافق جس چیز کو پوجتے تھے اس کے لئے وہ خدائی صفات تجویز کرتے تھے جو فی الواقع اس میں موجود نہیں تھیں، تو حقیقت میں وہ عبادت اور بندگی واقعی مسیح یا ملائکہ کی نہ ہوئی اور نہ حقیقت میں بے جان مورتیوں کی پوجا تھی، محض اپنے خیال اور وہم یا شیطان لعین کی پرستش کو فرشتے یا نبی یا نیک انسان یا کسی تصویر وغیرہ کے نامزد کر دیتے تھے، خدا گواہ ہے کہ ہماری رضا یا اذن سے تم نے یہ حرکت نہیں کی، ہم کو کیا خبر تھی کہ انتہائی حماقت وسفاہت سے خدا کے مقابلے میں ہمیں معبود بنا ڈالو گے؟ یعنی جس وقت ہم تمہارے اندر موجود تھے اس وقت ہمیں پتا ہی نہیں تھا کہ تم نے ہمارے ساتھ یہ معاملہ کرنا ہے، ہمیں معبود بنا کے رکھ لو گے۔ یہ گفتگو اگر حضرت مسیح وغیرہ ذوی العقول مخلوق کی طرف سے مانی جائے تو کوئی اشکال نہیں۔ اور اصنام کی جانب سے ہو تو کچھ بعید نہیں کہ حق تعالیٰ مشرکین کی انتہائی مایوسی اور حسرت ناک درماندگی کے اظہار کے لئے اپنی قدرت کاملہ سے پتھر کی مورتیوں کو گویا کر دے قَالُوٓا اَنۡطَقَنَا اللّٰہُ الَّذِیۡۤ اَنۡطَقَ کُلَّ شَیۡءٍ '' (تفسیر عثمانی)۔ ہر چیز کو اللہ بلا سکتا ہے، وہ ان کو بھی بلا لے گا۔ تو اس سے معلوم ہو گیا کہ اس کا مصداق بے جان چیزیں بھی ہو سکتی ہیں۔

آیتِ بالا سے عدمِ سماعِ موتیٰ پر اِستدلال موجودہ دور کے متشدِّدین کا اپنا اِجتہاد ہے

اس تفصیل کے عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ایک مسئلہ ہے سماعِ موتیٰ، جس کا اِجمالی ذکر آپ کے سامنے پہلے کیا تھا، اس کا تفصیلی ذکر آگے اِن شاء اللہ! سورۂ رُوم میں یا سورۂ نمل میں آئے گا جہاں یہ آیت آئے گی کہ اِنَّكَ لَا تُسۡمِعُ الۡمَوۡتٰی، وہاں ذکر کریں گے۔ اِجمالاً پہلے بھی آپ کے سامنے ذکر کیا تھا، تو یہ مسئلہ اُمّت کے اندر مختلف فیہ چلا آرہا ہے، قطعیات کے ساتھ کوئی جانب متعین نہیں کہ سماع کا ثبوت ہے یا نہیں؟ سماع کا قول کرنے والے بھی ہیں اور سماع کا انکار کرنے والے بھی ہیں، مجتہد فیہ مسئلہ ہے، دونوں طرف گنجائش ہے، اور آج کل جو متشدِّد قسم کے لوگ ہیں اور وہ عدمِ سماع کو قطعی قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ سماع کا قول کرنے والے مشرک ہیں، قرآنِ کریم کی پتا نہیں چالیس آیتیں نکالے پھر رہے جن سے کہتے ہیں عدمِ سماع ثابت ہوتا ہے، وہ اپنی دلیل کے اندر اس آیت کو بھی لاتے ہیں، کہ دیکھو! وہ قسمیں کھا کے کہیں گے کہ ہمیں تو تمہاری عبادت کی خبر ہی نہیں تھی، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگ ان کو پُکارتے ہیں تو وہ بالکل نہیں سنتے، لوگ ان کے اُوپر چڑھاوے چڑھاتے ہیں تو ان کو کچھ خبر نہیں ہے، یہ تفصیل میں نے آپ کی خدمت میں اس لیے عرض کر دی کہ اُن کا یہ استدلال صحیح نہیں، اور اسلاف نے جہاں بھی اس سماعِ موتیٰ کے مسئلے کو ذکر کیا ہے کسی نے بھی اس آیت سے استدلال نہیں کیا، وہ ساری کی ساری بحث ان آیات کے تحت آتی ہے اِنَّكَ لَا تُسۡمِعُ الۡمَوۡتٰی (سورۂ نمل: ۸۰، سورۂ رُوم: ۵۲)، مَاۤ اَنۡتَ بِمُسۡمِعٍ مَّنۡ فِی الۡقُبُوۡرِ (سورۂ فاطر: ۲۲)، ان آیات پر تو یہ بحث کرتے ہیں، کہ سماع کی کیا صورت ہے، کیا صورت نہیں، اِن آیات کو اس طرح سے سماع کے انکار کے لئے قطعی قرار دینا یہ اسلاف کا مسلک نہیں ہے۔ اور یہ بات متعین ہے کہ کسی کے متعلق یہ عقیدہ رکھنا کہ وہ ہر بات سنتا ہے، ہر وقت سنتا ہے، ہر جگہ سے سنتا ہے، ہر کسی کی سنتا ہے، یہ بالکل شرک ہے اور مشرکین کا اپنے معبودوں کے متعلق ایسا ہی نظریہ تھا۔ اور سماع کا قول کرنے والوں کا یہ نظریہ قطعاً نہیں کہ اللہ کے علاوہ کسی اور کے متعلق وہ عقیدہ رکھیں کہ وہ ہر وقت سنتا ہے، ہر جگہ سے سنتا ہے، ہر بات سنتا ہے، ہر کسی کی سنتا ہے، یہ صفت اللہ کے ساتھ خاص ہے، اگر اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی دوسرے کے ساتھ لگائی جائے گی تو یقیناً ایسا عقیدہ رکھنے والا مشرک ہے، مشرکین کا ایسا ہی عقیدہ تھا۔ اور جو علمائے حق سماع کا قول کرتے ہیں ان کا یہ مسلک نہیں، وہ سماع فی الجملہ کے قائل ہیں، اس لیے کسی متعین بات کے متعلق ہم نہیں کہہ سکتے سوائے ان چند باتوں کے جو صراحتاً حدیث شریف میں آگئیں ان کے علاوہ ہم کسی بات کے متعلق یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ یہ بھی انہوں نے سن لی، جن کی صراحت ہے ان کے متعلق ہم سماع کا قول کرتے ہیں، جس طرح سے سلام، یا پاؤں کی آہٹ، جن کا ذکر روایات میں آگیا، اس کے علاوہ باقی چیزیں اللہ کی مشیت کے تحت ہیں کہ اللہ چاہے تو سنا دے اور وہ سن لیں، اگر اللہ نہ چاہے تو وہ نہیں سنیں گے، یہ اللہ کی مشیت کے تحت ہے، ضابطہ نہ سننے کا ہے، نہ سننے کا ہے، امکان کے درجے میں اس بات کو مانتے ہیں، امتناع کے درجے میں یہ بات نہیں ہے کہ ان کا سننا ممتنع ہے، یہ ہے اہلِ حق کا عقیدہ اس مسئلے میں،

وضاحت اس کی اِن شاء اللہ! کسی دوسرے موقع پر کریں گے کسی دوسری آیت کے تحت، بہرحال اِس آیت کو اسلاف نے پیش کر کے عدمِ سماع کو قطعی ثابت نہیں کیا، یہ موجودہ دور کے متشددین کا اپنا اِجتہاد ہے، اس میں یہ ساری صورتیں آگئیں جو میں نے آپ کی خدمت میں عرض کر دیں کہ جب انہوں نے کہا نہیں، وہ اس عبادت پہ خوش نہیں، وہ اِن کی طرف متوجہ نہیں، کہاں کہاں سے، کون ان کو پکارتا ہے، وہ تفصیل یقیناً نہیں جانتے، تو وہ کہہ سکتے ہیں کہ نہ تم ہماری پُوجا کرتے تھے، نہ ہمیں تمہاری عبادت کی خبر تھی کہ تم ہماری عبادت کرتے ہو، نہ زندگی میں ہمیں پتا تھا کہ ہمارے بعد تم ہماری عبادت کرنے لگ جاؤ گے، اس آیت کا یہ مفہوم ہوگا، اور عدمِ سماع کے بارے میں اس آیت کو قطعی قرار دینا یہ اسلاف کی رائے کے خلاف ہے۔ باقی! وہ مسئلہ ان شاء اللہ! پھر کسی وقت وضاحت سے ذکر کریں گے۔

آخری آیت کا مفہوم

هُنَالِكَ تَبْلُوْا كُلُّ نَفْسٍ مَّآ اَسْلَفَتْ: ہر نفس اس وقت آزمالے گا جو کچھ اس نے آگے بھیجا، آزمانے کا مطلب یہ ہے کہ اس کا نتیجہ اس کے سامنے آجائے گا کہ ہمارے اعمال کی کیا حقیقت تھی، وَرُدُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ: اور یہ اللہ کی طرف لوٹا دیے جائیں گے جو ان کا مولیٰ حقیقی ہے، "لوٹا دیے گئے یہ اللہ کی طرف" یعنی لوٹا دیے جائیں گے اللہ کی طرف جو ان کا مولیٰ حقیقی ہے، اور جس قسم کی یہ جھوٹی باتیں بنایا کرتے تھے کہ فلاں ہمیں چھڑا لے گا، آخرت نہیں آئے گی، آئے گی بھی تو فلاں ہمارے کام آجائے گا، وہ سب باتیں ان سے گم ہوگئیں، کوئی بات ان کے سامنے ثابت نہ ہوئی۔

"کشف" سے اہلِ حق کے مسلک کی تائید

حضرت فضل علی شاہ صاحب قریشی رحمۃ اللہ علیہ مسکین پور والے، ان کی سوانح میں ایک واقعہ لکھا ہے،[1] پچھلے دنوں میں حضرت سیّد زوّار حسین شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں جانے کا اتفاق ہوا تو انہوں نے عنایت فرمائی، کتاب یہاں موجود ہے، فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ وہ اُوچ شریف (ضلع بہاولپور) گئے، اور وہاں وہ بزرگ (حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت رحمۃ اللہ علیہ) جن کی قبر پر لوگ جا کر زیادہ شرک کرتے ہیں، وہاں جا کر انہوں نے مراقبہ کیا، جب مراقبہ کیا تو دیکھا کہ قبر خالی ہے اور وہاں کچھ بھی نہیں اور تاریکی ہے، تھوڑی دیر کے بعد روشنی ہوئی اور وہ بزرگ قبر میں تشریف لے آئے، کہتے ہیں میں نے پوچھا کہ یہ کیا بات ہے؟ پہلے کہاں چلے گئے تھے؟ تو انہوں نے فرمایا کہ جب عُرس کے دن ہوتے ہیں، لوگ کثرت کے ساتھ آتے ہیں اور یہاں آ کے بہت بُری بُری حرکتیں کرتے ہیں جن سے مجھے بڑی تکلیف ہوتی ہے تو میں یہاں نہیں رہتا میں مدینہ منورہ چلا جاتا ہوں، اب جس وقت آپ نے مراقبہ کیا تو مجھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اطلاع فرمائی کہ ہمارا ایک ولی آپ سے ملاقات کرنا چاہتا ہے تو میں وہاں سے بھیجا گیا

---

(۱) "مقاماتِ فضلیہ" مؤلفہ سیّد زوار حسین شاہ، ص ۴۳، عنوان: "الہامات ومنامات صادقہ" کا آخر/ نیز "تجلیات" مؤلفہ خواجہ عبدالمالک، ص ۲۳۔

ہوں۔تو یہ ان کا کشف ہے، یہ نیک لوگوں میں سے تھے، قابلِ اعتماد لوگوں میں سے تھے، اہلِ حق میں سے تھے، بڑی ہدایت ان لوگوں کی وساطت سے پھیلی، تو ان کے کشف کا بھی اگر اعتبار کیا جائے تو کشف سے بھی معلوم یہی ہوتا ہے کہ یہ پچھلوں کے حالات سے اس طرح بے خبر رہتے ہیں، مشرکین کے اور دوسروں تیسروں کے، کہ یہ کیا کرتے ہیں کیا نہیں کرتے، جب ان کو دلچسپی ہی نہیں، وہ ان کی حرکات پر خوش نہیں، ان کی طرف متوجہ نہیں، تو یہ بھڑوے جو چاہیں حرکتیں کرتے رہیں ان کو کیا پتا کہ یہ کیا کرتے ہیں کیا نہیں کرتے؟ لیکن اسی کشف سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ ان کا حال تو ان کو پتا چل گیا اللہ کے اطلاع دینے کے ساتھ، اور وہ آ بھی گئے، اور آپس میں روحانی طور پر ملاقات ہو کے گفتگو بھی ہوگئی، تو کشف میں یہ حصہ بھی تو ہوا نا؟ اور ساتھ اس کشف کے اندر یہ حصہ بھی ہوا کہ عام لوگوں کے حالات کی ان کو کوئی خبر نہیں، وہ اپنی توجہ اللہ کی طرف رکھتے ہیں، ادھر مشغول رہتے ہیں، مشرک جو چاہیں کرتے رہیں، ان کی کوئی توجہ نہیں ہے، نہ وہ اس حال پہ خوش ہیں، اس لیے کہہ سکتے ہیں ہمیں کیا پتا یہ کیا کر رہے ہیں، نہ ہماری مرضی کے مطابق کر رہے ہیں نہ ہم ان کے اوپر خوش ہیں، نہ ہم نے ان کو دعوت دی، لیکن اس کے ساتھ دوسرا پہلو بھی نمایاں ہوگیا کہ جب اللہ تعالیٰ چاہتا ہے ان کی روحوں کو متوجہ کر دیتا ہے، متوجہ کرنے کے ساتھ اہلِ کشف رابطہ بھی قائم کر لیتے ہیں، اور ایک دوسرے کے حال سے اطلاع بھی ہو جاتی ہے۔ان کے سوانح کے اندر یہ واقعہ چھپا ہوا ہے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اَمَّنْ يَّمْلِكُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَمَنْ

آپ پوچھیے کون ہے جو تمہیں روزی دیتا ہے آسمان سے اور زمین سے؟ یا کون ہے جو مالک ہے کانوں کا اور آنکھوں کا؟ اور کون ہے

يُّخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَمَنْ يُّدَبِّرُ الْاَمْرَ ۭ فَسَيَقُوْلُوْنَ

جو نکالتا ہے جاندار کو بے جان سے، اور نکالتا ہے بے جان کو جاندار سے؟ اور کون ہے جو اُمر کی تدبیر کرتا ہے؟ پھر وہ ضرور کہیں گے

اللّٰهُ ۚ فَقُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ۝۳۱ فَذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ ۚ فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ ۚۖ

اللہ! تو پھر آپ انہیں کہیے کہ پھر تم شرک سے بچتے کیوں نہیں؟ (۳۱) یہی اللہ تمہارا ربِ حقیقی ہے، کیا ہے حق کے بعد سوائے گمراہی کے،

فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ ۝۳۲ كَذٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ عَلَى الَّذِيْنَ فَسَقُوْٓا اَنَّهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝۳۳

پھر تم کدھر پھیرے جاتے ہو؟ (۳۲) ایسے ہی ثابت ہوگئی تیرے رَبّ کی بات ان لوگوں پر جو نافرمان ہیں کہ وہ ایمان نہیں لائیں گے (۳۳)

قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَآئِكُمْ مَّنْ يَّبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ ۭ قُلِ

آپ ان سے پوچھیں کہ تمہارے شرکاء میں سے کوئی ہے جو ابتدا کرتا ہو پیدا کرنے کی پھر لوٹاتا ہو پیدا کرنے کو؟ آپ کہہ دیجیے کہ

اللّٰهُ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ﴿۳۴﴾ قُلْ هَلْ

اللہ ہی شروع کرتا ہے پیدا کرنے کو پھر وہی اس کا اعادہ کرے گا پھر تم کدھر لوٹائے جاتے ہو؟ ﴿۳۴﴾ آپ ان سے پوچھئے کہ کیا

مِنْ شُرَكَآىِٕكُمْ مَّنْ يَّهْدِيْۤ اِلَى الْحَقِّ ؕ قُلِ اللّٰهُ يَهْدِيْ لِلْحَقِّ ؕ

تمہارے شرکاء میں سے کوئی ہے جو حق کی طرف راہنمائی کرتا ہو؟ آپ کہہ دیجئے کہ اللہ تعالیٰ حق کی طرف راہنمائی کرتا ہے،

اَفَمَنْ يَّهْدِيْۤ اِلَى الْحَقِّ اَحَقُّ اَنْ يُّتَّبَعَ اَمَّنْ لَّا يَهِدِّيْۤ اِلَّاۤ اَنْ

کیا پھر جو راہنمائی کرے حق کی طرف وہ زیادہ حق رکھتا ہے کہ اس کی اتباع کی جائے یا وہ شخص جو ہدایت نہیں پاتا مگر یہ کہ

يُّهْدٰى ۚ فَمَا لَكُمْ ۫ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ﴿۳۵﴾ وَمَا يَتَّبِعُ اَكْثَرُهُمْ اِلَّا ظَنًّا ؕ اِنَّ

اس کو ہدایت دی جائے؟ پھر تمہیں کیا ہو گیا تم کیسا فیصلہ کرتے ہو؟ ﴿۳۵﴾ نہیں پیروی کرتے ان کے اکثر مگر بے بنیاد خیالات کی، بے شک

الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْـًٔا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَفْعَلُوْنَ ﴿۳۶﴾

بے بنیاد خیالات حق کے ثابت کرنے میں کچھ مفید نہیں ہوتے، بے شک اللہ تعالیٰ جاننے والا ہے ان کاموں کو جو یہ کرتے ہیں ﴿۳۶﴾

وَمَا كَانَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ اَنْ يُّفْتَرٰى مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ

نہیں ہے یہ قرآن کہ گھڑا جائے اللہ کے علاوہ کسی اور کی طرف سے لیکن یہ قرآن تصدیق ہے اس کتاب کی جو اس سے پہلے گزری

وَتَفْصِيْلَ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۳۷﴾ اَمْ

اور یہ لکھے ہوئے اَحکام کی تفصیل ہے، اس کے منجانب اللہ ہونے میں کوئی شک نہیں، یہ رَبّ العالمین کی طرف سے ہے ﴿۳۷﴾ کیا

يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ

یہ کہتے ہیں کہ اس رسول نے اس کو گھڑ لیا؟ آپ کہہ دیجئے کہ لے آؤ اس جیسی سورت، اور بلا لو ان سب کو جن کی تم طاقت رکھتے ہو

مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۳۸﴾ بَلْ كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ يُحِيْطُوْا بِعِلْمِهٖ وَلَمَّا يَاْتِهِمْ

اللہ کے علاوہ اگر تم سچے ہو ﴿۳۸﴾ بلکہ انہوں نے جھٹلایا اس چیز کو کہ نہیں احاطہ انہوں نے اُس کے علم کا، اور نہیں آیا ان کے پاس

تَاْوِيْلُهٗ ؕ كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۳۹﴾ وَ

اس کا انجام، اسی طرح سے جھٹلایا تھا ان لوگوں نے جو ان سے پہلے گزرے ہیں، پس آپ دیکھئے کہ کیسا انجام ہوا ظالموں کا ﴿۳۹﴾ اور

وَمِنْهُمْ مَّنْ يُّؤْمِنُ بِهٖ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّا يُؤْمِنُ بِهٖ ؕ وَرَبُّكَ اَعْلَمُ بِالْمُفْسِدِيْنَ ﴿۴۰﴾

ان میں سے بعض وہ ہیں جو اس قرآن کے ساتھ ایمان لائیں گے اور بعض وہ ہیں جو اس کے ساتھ ایمان نہیں لائیں گے، اور آپ کا رَبّ خوب جانتا ہے فساد کرنے والوں کو ﴿۴۰﴾

خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ آپ کہہ دیں، اور یہ کہنا یہاں سوال کے قائم مقام ہے، جس کا مفہوم ایسا ہے کہ اِن سے یہ پوچھئے، اِن کے سامنے یہ سوال ذکر کیجئے، اسی موقع محل کی مناسبت سے حضرت شیخ الہند ؒ ''قُلْ'' کا ترجمہ کرتے ہیں ''تو پوچھ!'' یعنی یہ قُلْ کہنے کے طور پر نہیں، یعنی جیسے کسی کو کوئی اطلاع دی جاتی ہے، کسی کے سامنے کوئی بات کر دی جاتی ہے، بلکہ قُلْ کا معنی یہ ہے کہ آپ یہ سوال ان کے سامنے ذکر کیجئے اور اُن سے اس کا جواب مانگئے، ان کے سامنے یہ بات کہیں تا کہ وہ اس کا کوئی جواب دیں، تو یہ قُلْ، اِسْئَلْ کے مقام میں ہے، تو حضرت شیخ (الہندؒ) کا ترجمہ اسی محاورے کے مطابق ہے، ''آپ پوچھیں، آپ اِن کے سامنے بات کریں'' مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ: تمہیں آسمان سے رزق کون دیتا ہے، اور زمین سے؟ آسمان سے اور زمین سے تمہیں رزق کون دیتا ہے؟ آسمان سے رزق دینا! کیونکہ یہ رزق جو آپ کے سامنے مہیا ہوتا ہے، اس کی تدبیر آسمان کی طرف سے ہوتی ہے کہ بارش اوپر سے آئی، گرمی سورج کی طرف سے آئی، یہ ساری کی ساری چیزیں، اور اللہ تعالیٰ نے مختلف ستاروں میں مختلف قسم کے اثرات رکھے ہیں جو فصلوں پر پھلوں پر پھولوں پر پڑتے ہیں، اور زمین سے تو یہ اُگتا ہوا آپ کو نظر آتا ہی ہے، ''کون ہے جو تمہیں روزی دیتا ہے آسمان سے اور زمین سے؟'' اَمَّنْ يَّمْلِكُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ: یا کون ہے جو مالک ہے کانوں کا اور آنکھوں کا؟ وَمَنْ يُّخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ: یا کون ہے جو نکالتا ہے جاندار کو بے جان سے؟ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ: اور نکالتا ہے بے جان کو جاندار سے، وَمَنْ يُّدَبِّرُ الْاَمْرَ: اور کون ہے جو اِس کائنات کے امر کی تدبیر کرتا ہے؟ فَسَيَقُوْلُوْنَ: پھر وہ ضرور کہیں گے: اللهُ: یعنی ان سب سوالوں کے جواب میں وہ کہیں گے: اللہ! کیونکہ بنیادی طور پر ان کا عقیدہ یہی ہے، فَقُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ: تو پھر آپ انہیں کہئے کہ پھر تم شرک کرنے سے بچتے کیوں نہیں ہو، یا، شرک کے انجام سے ڈرتے کیوں نہیں ہو، اِتِّقاء: بچنا، ڈرنا، دونوں طرح سے اس کا مفہوم ذکر کر دیا جاتا ہے کہ پھر تم شرک کرنے سے بچتے کیوں نہیں؟ یا تم شرک کے انجام سے ڈرتے کیوں نہیں؟ فَذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ: یہی اللہ تمہارا رَبِّ حقیقی ہے، فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ: پس کیا ہے حق کے بعد سوائے گمراہی کے؟ مَا اِستفہامیہ ہے، کیا ہے حق کے بعد سوائے گمراہی کے؟ یعنی کچھ نہیں، سوائے گمراہی کے کوئی چیز نہیں، فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ: پھر تم کدھر پھیرے جاتے ہو؟ كَذٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ: ایسے ہی ثابت ہوگئی تیرے رَبّ کی بات، عَلَى الَّذِيْنَ فَسَقُوْٓا: ان لوگوں پر جو نافرمان ہیں، اَنَّهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ: کہ وہ ایمان نہیں لائیں گے، یہ كَلِمَتُ رَبِّكَ کی تفصیل ہے، اللہ کی یہ بات اِن فاسقوں پر ثابت ہوگئی کہ وہ ایمان نہیں لائیں گے، قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَآئِكُمْ مَّنْ يَّبْدَؤُا الْخَلْقَ: آپ ان سے پوچھیں، ان کے سامنے یہ بات کریں کہ ان کے شرکاء میں سے کوئی ہے جو ابتدا کرتا ہو پیدا کرنے کی، اور پھر لوٹاتا ہو پیدا کرنے کو، يَبْدَؤُا الْخَلْقَ: جو پیدا کرنے کی ابتدا کرتا ہو، یعنی مخلوق کو پہلی دفعہ

بناتا ہو، ثُمَّ يُعِيدُهُ: ثم یعید الخلق، پھر وہ خلق کا اعادہ کرے، پیدا کرنے کا اعادہ کرے، یعنی مخلوق کو دوبارہ لائے، قُلِ اللّٰهُ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ: آپ کہہ دیجئے کہ اللہ ہی شروع کرتا پیدا کرنے کو، ابتداءً اللہ ہی پیدا کرتا ہے، ثُمَّ يُعِيدُهُ: پھر وہی اس خلق کا اعادہ کرے گا، فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ: پھر تم کدھر لوٹائے جاتے ہو۔ قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَآئِكُمْ مَّنْ يَّهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ: آپ ان سے پوچھئے، آپ ان کے سامنے یہ بات کریں کہ کیا تمہارے شرکاء میں سے کوئی ہے جو حق کی طرف راہنمائی کرتا ہو؟ آپ کہہ دیجئے، اللّٰهُ يَهْدِيْ لِلْحَقِّ: جواب میں بھی آپ ہی کہہ دیجئے کہ اللہ تعالیٰ حق کی طرف راہنمائی کرتا ہے، اَفَمَنْ يَّهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ: کیا پھر جو راہنمائی کرے حق کی طرف، اَحَقُّ اَنْ يُّتَّبَعَ: وہ زیادہ حق رکھتا ہے کہ اس کی اتباع کی جائے اَمَّنْ لَّا يَهِدِّيْٓ اِلَّآ اَنْ يُّهْدٰى: یا وہ شخص؟ جو ہدایت نہیں پاتا مگر اس کے کہ اس کو ہدایت دی جائے، لَا يَهِدِّيْ اصل میں لا یَهْتَدِیْ تھا، تاء کو دال سے بدل کر دال میں ادغام کیا ہوا ہے، ''یا وہ شخص جو ہدایت نہیں پاتا مگر یہ کہ اس کو ہدایت دی جائے'' فَمَا لَكُمْ ۣ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ: پھر تمہیں کیا ہو گیا تم کیسا فیصلہ کرتے ہو؟ وَمَا يَتَّبِعُ اَكْثَرُهُمْ اِلَّا ظَنًّا: نہیں پیروی کرتے ان کے اکثر مگر ظن کی، بے بنیاد خیالات، اِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْـًٔا: بے شک بے بنیاد خیالات، بے شک انکل باتیں حق کے ثابت کرنے میں کچھ مفید نہیں ہوتیں، اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَفْعَلُوْنَ: بے شک اللہ تعالیٰ جاننے والا ہے ان کاموں کو جو یہ کرتے ہیں، وَمَا كَانَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ اَنْ يُّفْتَرٰى مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ: نہیں ہے یہ قرآن کہ گھڑا جائے تراشا جائے اللہ کے علاوہ کسی اور کی طرف سے، وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ: لیکن یہ قرآن تصدیق ہے اس کتاب کی جو اس سے پہلے گزری، تصدیق مصدِّق کے معنی میں، یہ قرآن مصدق ہے تصدیق کرنے والا ہے، وَتَفْصِيْلَ الْكِتٰبِ: الکتاب یہ المکتوب کے معنی میں ہے، ''اور یہ لکھے ہوئے احکام کی تفصیل ہے'' یعنی مخلوق پر اللہ نے جو باتیں فرض کی ہیں، لکھی ہیں، یہ کتاب اس کی تفصیل کرنے والی ہے، لَا رَيْبَ فِيْهِ: اس کے منجانب اللہ ہونے میں کوئی شک نہیں، مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ: یہ رب العالمین کی طرف سے ہے۔ اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ: کیا یہ کہتے ہیں کہ اِس رسول نے اِس کو گھڑ لیا، قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ: آپ کہہ دیجئے کہ لے آؤ اس جیسی سورت، وَادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ: اور بلا لو اُن سب کو جن کو تم طاقت رکھتے ہو اللہ کے علاوہ، اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ: اگر تم سچے ہو، بَلْ كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ يُحِيْطُوْا بِعِلْمِهٖ: بلکہ انہوں نے جھٹلایا اس چیز کو جس کو یہ اپنے علمی احاطے میں نہیں لا سکے، لَمْ يُحِيْطُوْا بِعِلْمِهٖ: نہیں احاطہ کیا انہوں نے اس کے علم کا، یعنی اس کے علم کو اپنے احاطے میں نہیں لا سکے، خود اس کا علمی احاطہ نہیں کر سکے، اس کی معلومات سے یہ واقفیت نہیں حاصل کر سکے، ''نہیں احاطہ کیا انہوں نے اس کے علم کا''، وَلَمَّا يَاْتِهِمْ تَاْوِيْلُهٗ: تاویل کا معنی انجام، اور نہیں آیا ان کے پاس اس کا انجام، اس کی آخری مراد بھی اِن کے سامنے نہیں آئی، جس قسم کی خبریں اس کتاب میں دی ہیں ان کا وقوع ابھی اِن کے سامنے نہیں ہوا، كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ: اس طرح سے جھٹلایا تھا ان لوگوں نے جو ان سے پہلے گزرے ہیں، فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِيْنَ: تو آپ خیال کیجئے، دیکھئے کہ کیسا انجام ہوا ظالموں کا، وَمِنْهُمْ مَّنْ يُّؤْمِنُ بِهٖ: اور اِن میں سے بعض وہ ہیں جو اس قرآن کے ساتھ ایمان لائیں گے، وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّا يُؤْمِنُ بِهٖ: اور بعض وہ ہیں جو اس کے ساتھ ایمان نہیں لائیں گے، وَرَبُّكَ اَعْلَمُ بِالْمُفْسِدِيْنَ: اور آپ کا رب خوب جانتا ہے فساد کرنے والوں کو۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

تفسیر

ماقبل سے ربط

رَدِّ شرک کا مضمون چلا آ رہا تھا، اور یہ ساری کی ساری آیات اسی سے ہی متعلق ہیں۔

رَدِّ شرک کے لئے مشرکین سے سوالات

پہلے تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ فرمایا، اور ان کے مُسلّمات سے استدلال کیا، یہ پہلے آپ کی خدمت میں ذکر کیا گیا تھا کہ ساری کائنات کا خالق مشرک بھی اللہ کو مانتے تھے، اور بڑا منتظم حاکم اعلیٰ بھی اللہ کو ہی مانتے تھے، لیکن اس کے نیچے نیچے انہوں نے کچھ شفعاء بنا رکھے تھے، جن کے متعلق ان کا عقیدہ یہ تھا کہ یہ بنائے اگرچہ اللہ نے ہیں، لیکن اب ان کی حیثیت یہ ہے کہ جو جو معاملات ان کے اختیار میں دے دیے گئے اب وہ انہی سے مانگنے چاہئیں، یہی اس کو دینے کے مختار ہیں، اب ان چیزوں کے لئے اللہ تعالیٰ کے سامنے ہاتھ پھیلانے کی کوئی ضرورت نہیں، جس طرح سے میں نے آپ کے سامنے پوری وضاحت حکومت کی مثال کے ساتھ کر دی تھی۔ تو اللہ تبارک وتعالیٰ ان آیات میں یہی ظاہر فرماتے ہیں کہ ہر قسم کا انتظام اسی کے ہاتھ میں ہے، تمہاری ہر ضرورت وہی پوری کرتا ہے، اللہ نے اپنا اس قسم کا کوئی شفیع اور نائب نہیں بنایا کہ جس کو اس قسم کے اختیارات دے دیے ہوں کہ جو چاہے کرے، جس کو چاہے دے جس کو چاہے نہ دے، یہ تمہاری غلط بیانی ہے، جب تم اللہ کی قدرت کو مانتے ہو، اس کے خلق کو مانتے ہو تو پھر سارے کا سارا عبادت کا تعلق، عقیدت کا تعلق اسی کے ساتھ ہی ہونا چاہیے، شرک کے متعلق مضمون کہ ان کا نظریہ اپنے معبودوں کے متعلق کس قسم کا تھا، وہ اسی سورت میں آپ کے سامنے اچھی طرح سے واضح کیا جا چکا ہے۔ تو آپ ان سے پوچھئے، پوچھ کر ان کو متوجہ کرنا مقصود ہے، ''تمہیں کون رزق دیتا ہے آسمان سے اور زمین سے؟'' یہ رزق جو تمہیں ملتا ہے یہ زمین و آسمان دونوں کی طرف سے ہے، بعض چیزیں ایسی ہیں جو اس رزق مہیا کرنے کے لئے آسمان کی طرف سے اثر انداز ہوتی ہیں، نمایاں قسم کا اثر بارش کا ہے جو آسمان کی طرف سے آتی ہے، اور اسی طرح سے سورج کی گرمی چاند کی چاندنی، اور بعض ستاروں کے اندر اللہ تعالیٰ نے جو اثرات رکھے ہیں، جس سے بعض پھل پکتے ہیں، مٹھاس پیدا ہوتی ہے، پھولوں کے اندر رنگت آتی ہے، اور یہ فصل جو ہے وہ سورج کی گرمی کے ساتھ پکتی ہے، یہ اثرات تو سارے کے سارے آسمان کی طرف سے آتے ہیں، اللہ تعالیٰ بھیجتا ہے۔ اور زمین سے انگوری اُگتی ہے، فصل بڑھتی ہے، تو یہ ساری کی ساری چیزیں کس کے اختیار میں ہیں؟ تمہیں زمین اور آسمان سے رزق کون دیتا ہے؟ یعنی رزق کے اسباب زمین کی طرف سے اور آسمان کی طرف سے کون مہیا کرتا ہے؟

''یا تمہارے کانوں اور آنکھوں کا مالک کون ہے؟'' تمہارے کانوں اور آنکھوں پر زور کس کا چلتا ہے؟ یہ بات بھی ایسی ہے کہ جس کا جواب ان کی طرف سے متعین ہی ہوگا، جس طرح سے پہلی بات کا جواب متعین ہے، کیونکہ یہ روزمرہ کے واقعات ہیں کہ اگر ایک بچہ ماں کے پیٹ سے اندھا پیدا ہو جائے تو دنیا کی کوئی طاقت اس کو سوا کھا نہیں کر سکتی، بہرا پیدا ہو جائے تو اس کو کوئی

شنوائی نہیں دے سکتا، اور سننے والا پیدا ہونے کے بعد، دیکھنے والا پیدا ہونے کے بعد مختلف حالات کے تحت پھر بینائی واپس لے لی جاتی ہے، ساری کائنات اس کے مقابلے میں عاجز رہتی ہے، کوئی دوبارہ اس کو بینائی نہیں دلوا سکتا، یہ واقعات روزمرہ سامنے آتے ہیں، تو انسان یہ کہنے پر مجبور ہے کہ ان چیزوں پر اختیار کسی دوسرے کا نہیں، یہ کوئی غیبی طاقت ہے جس کے کنٹرول میں یہ ساری کی ساری چیز ہے، جب چاہے کسی کو آنکھ دے، جب چاہے چھین لے، جب چاہے کسی کو سننے والا کان دے، جب چاہے چھین لے، ان کے اوپر بھی اختیار سوائے اللہ کے کسی کا نہیں ہے، تو ان سے پوچھو کہ تمہاری آنکھوں کا اور کانوں کا کون مالک ہے؟ کس کا زور چلتا ہے؟ کس کا اختیار چلتا ہے؟

''اور ان سے یہ پوچھو کہ زندہ چیز کو بے جان چیز سے کون نکالتا ہے؟'' اس کے بھی واضح مشاہدے ہیں، بے جان چیز جس طرح سے انڈا ہے اس میں سے بچہ نکل آتا ہے، یا بے جان چیز جس طرح سے پانی کا ایک قطرہ ہے جس سے انسان بن جاتا ہے، ''اور کون نکالتا ہے بے جان چیز کو جاندار چیز سے؟'' جیسے مرغی سے انڈا پیدا ہو گیا، انسان سے پانی جو ٹپکا تو وہ بھی بے جان ہوتا ہے، تو یہ تصرف کہ بے جان سے جاندار نکال لینا، جاندار سے بے جان نکال لینا، یہ اللہ تعالیٰ کی ایک عظیم قدرت ہے جس پر اگر انسان غور کرے تو معلوم ہوگا کہ اللہ اضداد پر کس طرح سے قدرت رکھتا ہے، کہ جب چاہے کسی چیز پہ موت طاری کردے، جب چاہے اس کو زندگی دے دے، زندگی والی چیز میں سے ایسی چیز نکال لے جس پر موت کے آثار ہیں، موت والی چیز سے ایسی چیز نکال لے جس میں زندگی کے آثار ہیں، تو جب اللہ تعالیٰ کی قدرت سمجھ میں آئے گی تو وہ لوگ جو معاد کے بارے میں شک کرتے تھے کہ ان ہڈیوں کے بوسیدہ ہو جانے کے بعد بے جان ہونے کے بعد ان میں جان کون ڈال سکتا ہے؟ اس قسم کے واقعات میں غور کرنے کے ساتھ انسان کا ذہن ہموار ہوتا ہے اس عقیدے کو قبول کرنے کے لئے، کہ یہ کوئی مشکل بات نہیں کہ بے جان چیز میں اللہ تعالیٰ جان ڈال دے، بے جان چیزوں سے جاندار کو نکال لینا، جاندار سے بے جان کو نکال لینا، یہ ضد کا خروج ضد سے ہو رہا ہے، ایک ضد کو دوسری ضد سے نکالا جا رہا ہے، تو اس سے اللہ تعالیٰ کی قدرت بہت اچھے طریقے سے سمجھ میں آتی ہے۔

وَمَنْ يُّدَبِّرُ الْاَمْرَ: اور اَمر کی تدبیر کون کرتا ہے؟ یعنی اس کائنات کے اندر مدبر کون ہے؟ اس کائنات کی تدبیر کرنے والا کون ہے؟ تو ان سب کے جواب میں وہ کہیں گے ''اللہ''، کیونکہ ان چیزوں پر تو ان کا اتفاق ہے، ان چیزوں کو تو وہ مانتے ہیں، تو جب ان چیزوں کو مانتے ہو تو پھر کونسی ضرورت پیش آ گئی کہ جس کے لئے تم اللہ کے ساتھ شریک بنانے لگ گئے؟ جب ساری قدرتیں سارے اختیار اور تمہاری ساری ضرورتیں اسی سے متعلق ہیں تو پھر ضرورت کیا ہے کہ تم کسی دوسرے کو شریک مانو؟ تو پھر تم شرک کرنے سے بچتے نہیں؟ تمہیں اس بات سے بچنا چاہیے کہ تم کسی دوسرے کو اس کے ساتھ شریک ٹھہراؤ عبادت میں اور اپنی فریاد رسی میں، اپنی مشکل کشائی میں۔ کیا ضرورت پیش آ گئی؟۔ یا پھر ان سب مقدمات کو ماننے کے بعد ان کا نتیجہ تو بالکل واضح ہے اور اس نتیجے کو تسلیم کرنا چاہیے، جب کوئی شخص مقدمات کو تسلیم کرتا ہے تو نتیجہ اس کو ماننا ہی پڑتا ہے، تو اپنے مُسلّمات کے خلاف تم ایک عقیدہ تجویز کرتے ہو اور ایک نظریہ رکھتے ہو، تو تم اس کے انجام سے ڈرتے نہیں؟ کہ اس قسم کی بے ڈھنگے پن کی بات جس کے لئے کوئی بنیاد موجود نہیں، بلکہ یہ بات تمہارے مُسلّمات کے ہی نتیجے کے خلاف ہے، تو تم شرک کرنے سے ڈرتے نہیں؟ اس کے انجام

سے ڈرتے نہیں؟ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ: یہ اس کے اوپر تنبیہ ہے، کہ ساری بنیادی باتیں تم مانے بیٹھے ہو پھر اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اللہ کے ساتھ کسی دوسرے کو عبادت میں شریک نہیں کرنا چاہیے، تو ان باتوں کو تسلیم کرنے کے بعد تو تمہیں شرک والی بات سے بچنا چاہیے اور شرک کے انجام سے ڈرنا چاہیے۔

ہماری ہر ضرورت اللہ سے متعلق ہے

''یہی اللہ جس کے یہ سارے کے سارے اختیار ذکر کیے ہیں یہی تمہارا ربِ حقیقی ہے'' تو جب حق یہی ہوا کہ یہی تمہارا رَبّ ہے تمہاری ضرورتیں پوری کرنے والا ہے، تمہاری چھوٹی سے چھوٹی ضرورت بھی اسی سے متعلق ہے، جیسے سرورِ کائنات ﷺ نے بیان فرمایا کہ اگر کسی کی جوتی کا تسمہ ٹوٹ جائے وہ بھی اللہ سے مانگو، اگر تمہیں نمک کی ضرورت ہے تو وہ بھی اللہ سے مانگو،[1] مشرکین کے ذہن کے اندر ایک یہ بات بھی تھی، وہ کہتے تھے اللہ تو بہت بڑا ہے، اب اس کے سامنے چھوٹی چھوٹی چیزوں کی درخواست دے دیں یہ تو اللہ تعالیٰ کی شان کے خلاف ہے، اس سے اگر مانگا جائے یا اس کو پکارا جائے تو کسی بہت بڑی مصیبت میں جو کسی دوسرے کے بس کی نہ ہو، یا اس سے کوئی چیز مانگنی ہو تو کوئی اتنی بڑی چیز مانگنی چاہیے جو اس کی شان کے لائق ہے، چھوٹی چھوٹی چیزوں کے لئے معمولی معمولی باتوں کے لئے، کہ نزلہ ہو گیا جی! اس کو ٹھیک کر دو، بخار چڑھ گیا، جی! اس کو اُتار دو، اس قسم کی چھوٹی چھوٹی چیزیں یہ اللہ تعالیٰ سے کہنا یہ تو اللہ کے ادب کے خلاف ہے، اسی لیے حضور ﷺ نے دُعاؤں کے اندر یہ تاکید کی ہے کہ اللہ تعالیٰ سے تو تم سونے کا پہاڑ مانگو یا جوتی کا تسمہ مانگو اللہ کی قدرت کے سامنے دونوں برابر ہیں، یہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے لئے سونے کا پہاڑ دینا مشکل ہے اور جوتی کا تسمہ دینا آسان ہے، اس کے لئے تو جیسے نمک کی ایک ڈلی تمہیں دینی آسان ہے اسی طرح سے اگر تم ہمالیہ پہاڑ کو سونا بنانے کا مطالبہ کرو تو اس کی قدرت کے سامنے کوئی بات نہیں ہے، یہ علیحدہ بات ہے کہ تمہیں دے گا وہی جس میں اس کی حکمت ہوگی، اور جس کا دینا تمہارے لیے اس کی رحمت کا تقاضا ہوگا، ورنہ اللہ تعالیٰ کے سامنے کوئی چیز چھوٹی نہیں، کوئی چیز بڑی بڑی نہیں، اس کے سامنے تو سب ایک ہیں، تو یہ ذہن کہ اللہ تعالیٰ سے کوئی بڑی چیز مانگنی چاہیے چھوٹی چھوٹی چیزوں کا سوال کیا کرنا ہے، اس کی بنیاد میں یہ بات موجود ہے گویا کہ اللہ کے نزدیک کوئی چیز حقیر ہے کوئی چیز عظیم ہے، کسی کا دینا اس کی شان کے لائق ہے، کسی کا دینا اس کی شان کے لائق نہیں، اور یہ بات غلط ہے، اللہ تعالیٰ کے لئے ہر چیز برابر ہے، بڑی سے بڑی مانگو اس کے لئے ایسے ہی ہے جیسے چھوٹی سے چھوٹی، تو یہ تفریق کرنے کی کوئی ضرورت نہیں، اس لیے خصوصیت کے ساتھ حضور ﷺ نے متوجہ کیا ہے کہ نمک کی ضرورت ہو تو بھی اللہ سے کہو، جوتی کا تسمہ ٹوٹ جائے تو بھی اللہ سے کہو، تاکہ یہ ذہن ختم ہو کہ اللہ سے بڑی چیز مانگی جا سکتی ہے چھوٹی کے لئے چھوٹے چھوٹے لوگ ہونے چاہئیں، ایسی کوئی بات نہیں۔ جب رَبّ تمہارا یہی ہے اور یہی حق ہے کہ اس کو رَبّ قرار دیا جائے، فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ: تو پھر حق کے بعد سوائے گمراہی کے کیا بچ گیا، اگر اس کے علاوہ کسی

(۱) ترمذی ۲/ ۲۰۱ باب لیسأل حاجتہ ا لخ مشکوٰۃ ۱/ ۱۹۶، کتاب الدعوات، فصل ثالث۔ ولفظہ: حَتّٰی یَسْاَلَہُ الْمِلْحَ وَحَتّٰی یَسْاَلَہُ شِسْعَ نَعْلِہٖ اِذَا انْقَطَعَ

دوسرے کو ربّ مانو گے، کسی دوسرے کو ضرورتیں پوری کرنے والا سمجھو گے تو سوائے گمراہی کے اور کچھ نہیں، فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ: تم کدھر پھیرے جاتے ہو؟ یہ سیدھی بات تمہاری عقل میں کیوں نہیں آتی؟

سَروَرِ کائنات ﷺ کو تسلی

كَذٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ عَلَى الَّذِيْنَ فَسَقُوْٓا اَنَّهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ: اس آیت کا تعلق سرورِ کائنات ﷺ کی تسلی کے ساتھ ہے کہ آپ اپنی طرف سے کوشش کرتے ہیں یہ نہیں مانتے تو اس کے اوپر آپ زیادہ غم نہ کریں، یہ فاسق ہیں نافرمان ہیں، فسق و فجور ان کی طبیعتِ ثانیہ بن چکا ہے، اور جو بھی فاسق لوگ ہوتے ہیں ان کے بارے میں تو اللہ کا فیصلہ ہوتا ہے کہ یہ مانیں گے نہیں، مانے گا وہی جس کے اندر کچھ اطاعت کا جذبہ ابھرے، جس کے دل کے اندر یہ قصد ہو کہ میں کسی کی بات مان لوں، وہی کسی کی بات تسلیم کرسکتا ہے، اور جس کی فطرت ہی باغی ہوگئی، نافرمانی اس کی طبیعتِ ثانیہ بن گئی، اس کو تو جتنا چاہو سمجھاؤ وہ کسی صورت میں ماننے والا نہیں، ''ایسے ہی ثابت ہوگیا تیرے رَبّ کا کلمہ یعنی تیرے رَبّ کی بات ان لوگوں پر جو نافرمان ہیں کہ وہ ایمان نہیں لائیں گے''، ''ایسے ہی'' یعنی جس طرح سے یہ سرکش پھرتے ہیں اس قسم کے فاسقوں پر ایسے ہی اللہ کی بات ثابت ہے۔

مسلّمات کو ذِکر کر کے شرک کی تردید

آپ ان سے پوچھئے (وہی بات! جس طرح سے پہلے دوہرائی گئی، ان کے مسلمات کو ذکر کیا جارہا ہے) کہ تمہارے شرکاء میں سے کوئی ہے جو ابتداءً پیدا کرتا ہو، کسی کے متعلق تمہارا عقیدہ ہے؟ جب ابتداءً پیدا کرنے والا کوئی نہیں تو لوٹانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، ''کوئی ہے جو اِبتداءً پیدا کرتا ہو پھر اس کا اعادہ کرے؟ آپ کہہ دیجیے کہ اللہ ہی اِبتداءً پیدا کرتا ہے، اللہ ہی اس کا اعادہ کرے گا'' جس کے اختیار میں پہلے پیدا کرنا ہے اسی کے اختیار میں دوبارہ اعادہ کرنا ہے، فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ: پھر تم کدھر لوٹائے جاتے ہو؟ قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَآئِكُمْ مَّنْ يَّهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ: اس میں یہ بات کہی جارہی ہے کہ اگر کوئی شخص کسی کو رَبّ مانتا ہے یا اِلٰہ مانتا ہے تو یہ محض کوئی دل بہلاوے کی چیز نہیں، بلکہ کسی کو رَبّ ماننا، اِلٰہ ماننا یہ انسان کی ایک بنیادی ضرورت ہے، باقی ضروریات بھی اس سے پوری ہوتی ہیں اور ایک سب سے بڑی بات کہ زندگی کے اندر انسان کی راہنمائی کرے، اس کو اچھائی بُرائی کی تمیز دے، یہ بتائے کہ یہ چیز تمہارے لیے نفع مند ہے اور یہ چیز تمہارے لیے نقصان دِہ ہے یہ بھی ایک ضرورت ہے اِلٰہ ماننے کی، تو یہ ضرورت کہ انسان کی زندگی کے اندر اس کے لئے وہ راہنمائی کا باعث بنے، کیا تمہارے ان معبودوں میں سے کوئی معبود ہے جو تمہاری یہ ضرورت پوری کرتا ہو؟ ''کیا تمہارے شرکاء میں سے کوئی ہے جو حق کی طرف ہدایت کرے؟ آپ کہہ دیجیے کہ اللہ ہی حق کی طرف ہدایت کرتا ہے، اَفَمَنْ يَّهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ اَحَقُّ: کیا پھر وہ جو حق کی طرف ہدایت کرے زیادہ حق دار ہے کہ اس کی اتباع کی جائے، یا وہ جو راستہ پاتا ہی نہیں مگر یہ کہ اس کو راستہ دکھایا جائے؟ یعنی وہ خود راہنمائی کا محتاج ہے، جس وقت تک اس کو ہدایت نہ دی جائے اس وقت تک وہ ہدایت پاتا ہی نہیں۔ اور اس سے آگے گری ہوئی بات! کہ اگر وہ اس قسم کا بے استعداد ہے بے جان ہے کہ کوئی راہنمائی کرنا بھی چاہے تو اس کی راہنمائی نہیں کرسکتا، اور وہ کسی کے راہنمائی کرنے پر بھی سیدھا راستہ اختیار نہیں کرسکتا، تو اس کی

اتباع کا کیا حق ہوا؟ لَا یَهِدِّیْ: یا وہ شخص جو راستہ نہیں پاتا مگر یہ کہ اس کو ہدایت دی جائے۔ فَمَا لَكُمْ ۔ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ: پھر تمہیں کیا ہو گیا تم کیسے فیصلے کرتے ہو؟ یعنی یہ ضرورت جو اللہ سے متعلق ہے وہ بھی ان سے پوری نہیں ہوتی، بلکہ وہ بھی اللہ تبارک وتعالیٰ سے ہی پوری ہوتی ہے کہ تمہیں نفع نقصان کی بات وہی بتاتا ہے۔

مشرکین کے پاس اپنے عقیدوں پر نہ نقلی دلیل ہے، نہ عقلی دلیل ہے!

وَمَا يَتَّبِعُ اَكْثَرُهُمْ اِلَّا ظَنًّا: باقی رہی یہ بات کہ یہ بھی تو کچھ عقیدے بنائے بیٹھے ہیں، ان کے عقیدوں کی بنیاد کسی دلیل پر نہیں، نہ عقلی دلیل پر اور نہ نقلی دلیل پر، مَّاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ (سورۂ نجم: ۲۳) جس طرح سے بار بار قرآنِ کریم میں اس قسم کے الفاظ ذکر کیے گئے ہیں، کہ تعالیٰ اللہ نے اس کے متعلق کوئی دلیل نہیں اُتاری، هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (سورۂ نمل: ۶۴) اگر تم اپنے اس دعوے کے اندر سچے ہو تو کوئی برہان لے آؤ، کوئی دلیل لے آؤ۔ تو جو بات بے بنیاد ہو، جس کے لئے کوئی صحیح دلیل موجود نہیں، نہ عقلی نہ نقلی، اسے کہا جاتا ہے ظن، جس کا مفہوم ہے اٹکل کی بات، رجم بالغیب جسے کہہ سکتے ہیں، کہ بن دیکھے نشانے پر چیز ماری جارہی ہے، سامنے کوئی چیز نہیں ہے، تو بے بنیاد خیالات اٹکل کی باتیں یہ ظن کہلاتی ہیں، تو ان میں سے اکثر ایسے ہیں جو کہ ظن کی اتباع کرتے ہیں، ان کی باتیں صرف توہمات ہیں جو انہوں نے اپنے دماغ سے بنالیں، خارج کے اندر ان کا کوئی ثبوت نہیں، کوئی کسی قسم کی اس کے اوپر دلیل مہیا نہیں، نہ عقلی نہ نقلی، ان کے خیالات اس قسم کے ہیں، اور حق کے ثابت کرنے میں اس قسم کی اٹکل باتیں کوئی مفید نہیں ہوتیں، ایسے اٹکل کے ساتھ زٹلیات کے ساتھ تو تم کسی حق کو نہیں پا سکتے، حق تو جب ثابت ہوگا یا دلیل عقلی سے ثابت ہوگا یا دلیل نقلی سے ثابت ہوگا، اور بے بنیاد خیالات حق کے ثابت کرنے میں کچھ مفید نہیں ہوتے، یہاں ظن کا معنی یہی ہے۔

لفظِ ''ظن'' کے دو مفہوم اور اس بارے میں ہونے والے مغالطوں کا جواب

لفظِ ''ظن'' اصل میں دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے، ایک تو یہی مفہوم ہے جو آپ کی خدمت میں ذکر کیا گیا، کہ بے بنیاد خیالات دماغ میں آگئے، نہ اس کے لئے کوئی عقلی بنیاد موجود ہے نہ اس کے لئے کوئی نقلی بنیاد موجود ہے، دلیل اس کے اوپر نہ عقلی ہے نہ نقلی، زٹلیات، اٹکلیات، توہمات جنہیں آپ کہہ سکتے ہیں۔ اور ''ظن'' کا ایک مطلب یہ ہوتا ہے کہ دلیل تو موجود ہے لیکن اس کے اندر کسی اعتبار سے کچھ شبہ آگیا کہ وہ یقین کے لئے بنیاد مہیا نہیں کرتی کہ جس میں جانب مخالف کا بالکل احتمال نہ رہے، اس قسم کا ظن جو کہ یقین کے قریب قریب ہوتا ہے لیکن جانب مخالف کا احتمال ہونے کی بنا پر اس کے لئے یقین کا لفظ نہیں بولا جاتا، یقین اس کو کہتے ہیں جس میں جانب مخالف کا احتمال ہی باقی نہ رہے، اور ایک اس سے نچلے درجے کی بات ہوتی ہے کہ جس کی بنیاد تو دلیل پر ہے، عقلی پر ہے یا نقلی پر ہے، لیکن اس میں کسی وجہ سے جانب مخالف کا کچھ احتمال باقی ہے، جس کو ہم غالب رائے کے ساتھ تعبیر کرتے ہیں، یہ ظن حق کی قسم ہے، یہ ناحق نہیں ہے، یہ ظن کا جو اصطلاحی معنی ہے یہ حق کی قسم ہے، اس قسم کے ظن کی اتباع تو ضروری ہے کہ جب دلائل کے ساتھ ایک جانب راجح ثابت ہو جائے اگرچہ اس میں کسی درجے میں اس کے خلاف کا احتمال بھی ہے اس کے مطابق عمل کرنا واجب ہوتا ہے، اس کا ترک کرنا جائز نہیں، جس طرح سے کہ مجتہد فیہ مسائل جتنے ہیں ان سب کو کہتے ہیں کہ یہ ظنی

مسائل ہیں، تو ظن کا یہ معنی نہیں کہ اٹکل کی باتیں ہیں، غیر مقلد اکثر آپ کو اس بارے میں مغالطہ دیں گے، وہ کہیں گے کہ خود ہی تو کہتے ہو کہ فقہ ظنی ہے، اور فقہ کے جتنے مسئلے ہیں وہ سارے کے سارے ظن کے طور پر ہی ثابت ہیں، اور اللہ تعالیٰ ظن کی اتباع کرنے والوں کی مذمت کرتا ہے، وہ کہتا ہے کہ یہ سارے کے سارے لوگ ظن کے پیچھے لگے ہوئے ہیں، اور ظن حق کے ثابت کرنے میں کچھ مفید نہیں، تو جن مسائل کو آپ خود ظنی مسائل کہتے ہیں تو ان کی اتباع کی مذمت تو قرآنِ کریم سے نکلتی ہے، تو پھر تم ان کے پیچھے کیوں لگتے ہو؟ یہ ایک مغالطہ ہے لفظ ظن کے اعتبار سے، کہ لفظ ظن دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے، ایک تو یہی جیسے یہاں ذکر کیا، دوسرا ظن حق ہی ہوتا ہے، اس کی بنیاد دلیل پہ ہوتی ہے، چاہے وہ عقلی ہو چاہے وہ نقلی ہو، لیکن اس میں جانب ثانی کا کسی درجے میں احتمال باقی رہتا ہے، جس کی بناء پر ہم اس کے لئے یقین کا لفظ استعمال نہیں کرتے، جو دلیل یقین کا فائدہ دے کہ اس میں جانب مخالف کا بالکل احتمال باقی نہ رہے اس کا انکار تو کفر ہوتا ہے، عمل کرنا اس پر فرض ہوتا ہے، لیکن اگر دلیل میں کسی اعتبار سے کوئی سقم آ گیا جس کی وجہ سے اس میں جانب ثانی کا احتمال باقی رہ گیا تو اس کے لئے یقین کا لفظ استعمال نہیں کیا جاتا بلکہ ''ظن'' کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے، اس میں غالب حیثیت صحیح ہونے کی ہوتی ہے، عمل کرنا اس کے اوپر واجب ہوتا ہے لیکن انکار کفر نہیں۔

اور اس میں صرف فقہ کی بات ہی نہیں کہ فقہ کی باتیں ظنی ہیں، قرآنِ کریم کی بہت ساری باتیں ایسی ہیں جن کو ہم اِصطلاحاً ''ظنی'' کہتے ہیں، کیوں؟ کہ یقین کا فائدہ وہ دلیل دیا کرتی ہے جو قطعی الثبوت بھی ہو اور قطعی الدلالۃ بھی ہو، اصول فقہ میں جس طرح سے آپ پڑھتے ہیں، قطعی الثبوت کا مطلب یہ ہے کہ اس کا ثبوت ایسی حیثیت میں ہے کہ جس میں جانب مخالف کا بالکل احتمال نہیں ہے، عدمِ ثبوت کا احتمال اس میں بالکل نہیں ہے، قرآنِ کریم سارے کا سارا ثبوت کے اعتبار سے قطعی ہے کہ یہ منجانب اللہ ہے، تواتر کے ساتھ ثابت ہے، ہر قسم کی عقلی نقلی دلیل اس کے اوپر قائم ہے، قطعی الثبوت تو یہ ہے۔ قطعی الدلالۃ کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کا مطلب بھی ایک ہی متعین ہو، دوسرے مطلب کی طرف کوئی کسی قسم کا اشارہ نہ نکلتا ہو، اگر اس کا مطلب بھی ایک ہی متعین ہے اور دوسرا احتمال اس میں بالکل نہیں تو وہ قطعی الدلالۃ بھی ہو گیا تو ایسی صورت میں اس کے مطابق عقیدہ رکھنا بھی فرض اور اس کے اوپر عمل کرنا بھی فرض، اگر کوئی انکار کرے گا تو کافر ہو گا، عملاً اس کو ترک کرے گا تو ایسی صورت میں وہ فاسق کہلائے گا، جس طرح سے اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ یہ قرآنِ کریم کی ایک آیت ہے قطعی الثبوت بھی ہے کہ قرآنِ کریم میں آ گئی، قطعی الدلالۃ بھی ہے کہ تواتر کے ساتھ اس کا مفہوم متعین ہو گیا کہ اس سے یہی پانچ وقتی نماز مراد ہے، یہ قطعی الثبوت اور قطعی الدلالۃ ہے، اس کے متعلق تو عقیدہ بھی فرض، اور اس کے مطابق عمل بھی فرض، اگر کوئی انکار کرے گا کہ نماز فرض نہیں ہے تو کافر، اگر کوئی عقیدہ تو رکھتا ہے کہ فرض ہے لیکن پڑھتا نہیں تو فاسق، یہ تو ہے یقین کی بات۔ اور بعض آیات اس قسم کی ہوتی ہیں جو قطعی الثبوت تو ہیں جیسے آپ نے ''اُصول الشاشی'' میں پہلی پہلی مثال پڑھی تھی وَالْمُطَلَّقٰتُ یَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ (سورۂ بقرہ: ۲۲۸) یہ آیت قطعی الثبوت ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ اللہ کا فرمان ہے اللہ کی طرف سے آیا ہے، لیکن ''قُرُوْٓءٍ'' کا لفظ جس وقت ہم دیکھتے ہیں تو یہ لغت عرب کے اندر برابر سرابر دو معنی میں استعمال ہوتا ہے، یہ ''طہر'' کو بھی کہتے ہیں اور ''حیض'' کو بھی کہتے ہیں، تو یہ لفظ ایک معنی کے اندر قطعی نہ رہا، ہو سکتا ہے کہ اس سے ''حیض'' مراد ہو، ہو سکتا ہے کہ اس سے ''طہر'' مراد ہو، اگر ''طہر'' مراد لیں گے تو عدت تین طہر قرار پائے گی کہ یہ عورتیں اپنے

آپ کو تین طہر تک روک کے رکھیں، اور اگر ''حیض'' مراد لے لیا جائے تو عدّت تین حیض قرار پائے گی کہ یہ عورتیں تین حیض تک اپنے آپ کو روک رکھیں طلاق کے بعد، اب ان دونوں معنوں میں سے کون سا معنی اللہ کی مراد ہے؟ یہ قرائن کے ساتھ متعین کیا جائے گا، اگر شوافع نے ''طہر'' مراد لے لیا تو وہ کہیں گے کہ ''طہر'' کے ساتھ عدّت ہے لیکن ہوسکتا ہے کہ ہمارے سمجھنے کے اندر کوئی غلطی ہوگئی ہو، اس میں خطا کا احتمال موجود ہے، جس کی بنا پر عمل تو وہ اس کے اوپر کریں گے راجح ہونے کی حیثیت سے کہ انہوں نے اپنے طور پر تحقیق کر لی، لیکن اس کے خلاف کرنے والے کو نہ فاسق کہیں گے نہ کافر کہیں گے، اسی طرح سے اگر ہم ''حیض'' والا معنی لیتے ہیں تو قرائن کے ساتھ متعین کرتے ہیں تو ''حیض'' والا معنی لے کر ہم نے غالب رائے کے ساتھ متعین کر دیا کہ اس سے ''حیض'' مراد ہے، تو ہم جس وقت مسئلہ بتائیں گے یہی بتائیں گے کہ عدّت تین حیض ہے، لیکن اگر کوئی شخص اپنے مسلک کے اعتبار سے تین طہر کا قول کرتا ہے عدّت گزارنے کا، تو ہم اس پر بھی کوئی کسی قسم کوئی فتویٰ نہیں لگائیں گے، تو یہ مسئلہ ظنی ہوگیا کہ عدّت طہر کے ساتھ ہے یا عدّت حیض کے ساتھ ہے، قرآنِ کریم کے ان الفاظ کی دلالت واضح نہ ہونے کے اعتبار سے۔ تو قرآنِ کریم سے ثابت ہونے والے مسائل بھی اسی طرح سے بعضے ظنی ہیں کہ جن کے دو دو مطلب بن سکتے ہیں، مفہوم ان کا مختلف ہوسکتا ہے، اسی طرح سے روایات بعض قطعی الثبوت ہوں گی جو تواتر کے طور پر آئیں گی، مفہوم اگر ان کا متعین ہو تو قطعی الدلالۃ بھی ہوسکتی ہیں مثلاً حضور ﷺ نے ظہر کی چار رکعتیں پڑھیں قطعی الثبوت بھی ہے قطعی الدلالت بھی ہے، لیکن بعض روایات ایسی بھی ہوں گی کہ جن کے ثبوت میں شبہ ہوسکتا ہے جیسے خبرِ واحد کے درجے کی باتیں ہوتیں ہیں، یا ان کی دلالت میں شبہ ہوسکتا ہے کہ اس کا مطلب کیا نکلتا ہے، تو وہاں جانبین کی گنجائش ہوا کرتی ہے، ان مسائل کو اصطلاحِ فقہ کے اندر ظن سے تعبیر کرتے ہیں، یہ صحیح ہوتے ہیں، ان کی بنیاد دلیل پہ ہوا کرتی ہے، ان کی اتباع مذموم نہیں، بلکہ یہ دین کے فرائض میں سے ہے کہ ان ظنی مسائل کی بھی اتباع کی جاتی ہے، کیونکہ اگر اس قسم کی باتوں کو چھوڑ دیا جائے جن کے ثبوت میں کسی درجے میں شبہ آجائے، یا جن کی دلالت میں کسی درجے میں شبہ آجائے تو متواترات اور یقینیات تو سوائے چند باتوں کے اور کچھ ہے ہی نہیں، پھر سارے کا سارا دین ہی ہاتھ سے چھوٹ جائے گا۔ تو لفظ کے مفہوم میں اِصطلاحاً فرق ہونے کی وجہ سے لوگ مغالطہ دے دیتے ہیں کہ فقہ ظنی ہے اور لوگ فقہ کے پیچھے لگے ہوئے ہیں، بعض مسائل ظنی ہیں، اور یہ ظن کو مانے ہوئے ہیں، حالانکہ قرآنِ کریم سے ظن کی مذمت نکلتی ہے، اور ظن کی اتباع کرنے والوں کو قرآنِ کریم اچھا نہیں سمجھتا، ان کے اوپر تنقید کرتا ہے، تو یہ مغالطہ صرف لفظی مشارکت کی وجہ سے آجاتا ہے، ورنہ وہاں جو ظن کا لفظ ہے اس کا مفہوم اور ہے، اور یہاں جو ظن کا لفظ ہے اِس کا مفہوم اور ہے، اس سے مراد ہیں بے اصل خیالات جن کے لئے کوئی دلیل نہیں ہے نہ عقلی نہ نقلی، اور فقہ کے مسائل جتنے ہیں ان سب میں دلیل ہے، لیکن درجات کا فرق کرنے کے لئے بعض کو یقینی اور بعض کو ظنی کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَفْعَلُوْنَ: اللہ تعالیٰ ان کے کاموں کا علم رکھنے والا ہے۔

اِثباتِ توحید اور رَدِّ شرک کی سب سے بڑی دلیل

وَمَا كَانَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ اَنْ يُّفْتَرٰى مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ: اثباتِ توحید اور ردِ شرک کے لئے یہ کتاب اللہ سب سے بڑی دلیل ہے، جس

طرح سے پہلے ان کے سامنے جب ذکر کیا گیا تو وہ کہتے تھے کہ اس کو تبدیل کر دو یا کوئی اور قرآن لے آؤ، یہ اس لیے کہتے تھے کہ اُن کے نظریات کی اِس میں تردید کی گئی ہے، شرک کے اوپر تنقید ہے، تو اللہ تعالیٰ اسی کی حقانیت ثابت کرتے ہیں کہ جب کتاب اللہ کی حقانیت ثابت ہو جائے گی تو جتنے مسئلے اس کے اندر ذکر کیے گئے ہیں سب کی دلیل مہیا ہو جائے گی۔ ''یہ قرآن ایسا نہیں کہ اس کو غیر اللہ کی طرف سے گھڑا جائے، اللہ کے غیر کی طرف سے یہ گھڑا نہیں جا سکتا، بلکہ یہ تصدیق ہے اس کتاب کی جو اس سے پہلے اتری'' یعنی توراۃ انجیل سب کی یہ تصدیق کرتا ہے، ان کے لئے مصدِّق ہے، مصدِّق ہونے کا مفہوم آپ کے سامنے کئی دفعہ ذکر کیا جا چکا، ایک تو مصدق کا مفہوم یہ ہے کہ یہ اُن کتابوں کو سچا بتلاتا ہے جس سے معلوم ہو گیا کہ یہ کتاب بھی انہی کے ساتھ ہی تعلق رکھنے والی ہے ان کا آپس میں کوئی تعارض نہیں ہے، جیسی وہ سچیں ویسی یہ سچی، یہ ان کو سچی بتاتا ہے، ان کے ساتھ کوئی مخالفت نہیں، یا یہ ہے کہ ان کتابوں کے اندر جو پیش گوئیاں ذکر کی گئی ہیں یہ قرآن ان پیش گوئیوں کا مصداق بنتا ہے، لہٰذا اس قرآن کا آنا ہی ان کتابوں کی تصدیق ہے، اگر یہ کتاب نہ اترتی اور یہ رسول نہ آتا تو ان کتابوں کی پیش گوئیوں کا مصداق مہیا نہ ہوتا، جب ان پیش گوئیوں کا مصداق مہیا نہ ہوتا تو وہ کتابیں جھوٹی ہو جاتیں، تو اس کا ماننا اور اس کا آنا یہ اُن کتابوں کے لئے مصدِّق ہے، ''اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے لکھی ہوئی باتوں کی یہ تفصیل ہے'' لَا رَیْبَ فِیْهِ: اس کے حق ہونے میں کوئی کسی قسم کا شبہ نہیں، یہ رَبّ العالمین کی طرف سے ہے۔

قرآنِ کریم کا چیلنج

''کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس کو اس رسول نے خود گھڑ لیا، آپ کہہ دیجیے کہ اگر میں نے گھڑ لیا ہے تو میں ایک انسان ہوں، کوئی مشاق بھی نہیں، شاعر نہیں، خطیب نہیں، کسی مدرسے میں پڑھا نہیں، کسی استاذ کے سامنے بیٹھ کے مشق نہیں کی، اور یہ ساری کی ساری چیزیں تمہیں حاصل ہیں، تو تم آؤ مقابلے میں، اگر ایک سورت بھی ایسی بنا کے لے آؤ تو سمجھیں گے کہ واقعی یہ قرآن کسی انسان کا بنایا ہوا ہے، اس مضمون کی تفصیل بھی پہلے آپ کی خدمت میں عرض کی تھی، کہ یہ ایک بدیہی چیز ہے، اور تجربے کے ساتھ خوب اچھی طرح سے یقین کے درجے کی ہے، کہ اگر کوئی چیز ایک انسان بناتا ہے، کتنی ہی عجیب و غریب کیوں نہ بنا لے، اور اس کی صنعت کے اندر کتنی ہی باریکی کی رعایت کیوں نہ رکھے، دوسرا انسان اس جیسی بنا سکتا ہے، اس کی نقل اتارنا یا اس جیسی چیز بنا لینا ممتنع نہیں ہے، ایک انسان دوسرے جیسی چیز بنا لیتا ہے، آئے دن آپ کے سامنے یہ جنگی ہتھیار بنتے رہتے ہیں، اگر ایک ملک والے نے ایک قسم کا بم بنایا تو دوسرے نے کوشش کر کے ویسے کا ویسے بنا لیا، ایک نے اگر ہوائی جہاز بنایا کسی قسم کا تو دوسرے نے نقل اتار کے ویسے کا ویسے بنا لیا، جو چیز بھی دنیا کے اندر بنتی ہے دوسرا اس کی نقل اتار لیتا ہے، تو نقل اتارنے پر قادر ہونا یہ علامت ہے اس بات کی کہ ہمارے جیسی مخلوق کی بنائی ہوئی ہے، لیکن بعض چیزیں ایسی ہیں کہ جن کو آپ یقین کے درجے میں کہہ سکتے ہیں کہ یہ اللہ کی بنائی ہوئی ہیں، کسی مخلوق کا اس میں کوئی دخل نہیں، مثلاً سورج ہے، تو کسی کو بھی وہم بھی نہیں گزرتا کہ یہ کسی انسان کا بنایا ہوا ہے، چاند ہے کسی کو بھی وہم نہیں گزرتا کہ کسی انسان کا بنایا ہوا ہے، تو آج نہیں، جب سے دنیا بنی ہے اس وقت سے لے کے آج تک اور آج سے لے

کے قیامت تک انسان کبھی سوچ بھی نہیں سکتا کہ ہم اس کی مثل تیار کر سکتے ہیں، تو جس کی مثل تیار کرنے سے انسان عاجز آ جائے یہ علامت ہے اس بات کی کہ یہ انسان کی قدرت سے باہر ہے، بلکہ کسی دوسری طاقت نے اس کو جنم دیا ہے اور دوسری طاقت نے اس کو بنایا ہے، اور اگر انسان کا بنایا ہوا ہو تو مقابلے بازی کا جذبہ انسان میں ابھرتا ہے اور سال کے بعد دو سال کے بعد کتنی ہی کوشش کرنے کے بعد آخر اس جیسی چیز انسان وجود میں لے آتا ہے، دنیا کے اندر مقابلہ اسی طرح سے چلا آ رہا ہے، تو یہ ایک بہت بدیہی اور بہت پختہ دلیل ہے کہ انسان کی بنائی ہوئی جو چیز بھی ہوگی دوسرا انسان اس جیسی بنا سکتا ہے، بلکہ اگر دوسرا زیادہ تجربہ کار ہو اور اس سے زیادہ سمجھ رکھنے والا ہو تو اس سے اچھی بھی بنا سکتا ہے۔ اور یہاں یہ کہہ دیا گیا کہ تم سارے اکٹھے ہو جاؤ اور پھر سورۂ بقرہ کے اندر یہ تفصیل کر دی گئی تھی کہ قیامت تک کے لئے چیلنج دے دیا گیا کہ تم ایسا کر سکتے ہی نہیں، آنے والے حالات کے اعتبار سے بھی فیصلہ دے دیا گیا، تو یہ بات کھل کے سامنے آ گئی کہ قرآنِ کریم کا وجود کسی انسان کی تخلیق نہیں ہے، انسانی قوت سے اس کا تعلق نہیں، ورنہ ایک نہیں تو چند مل کے ہی بنا لیں، نہ اب بنا سکتے ہو نہ قیامت تک اس پر کوئی قادر ہوگا، تو یہ بالکل بدیہی دلیل ہو گئی کہ جیسے اللہ کے سورج کی مثل دوسرا سورج نہیں بنایا جا سکتا، اللہ کے بنائے ہوئے چاند کی مثل دوسرا چاند نہیں بنایا جا سکتا، اسی طرح سے اس کتاب کی مثل نہیں لائی جا سکتی، نہ لفظی حیثیت میں نہ معنوی حیثیت میں، جس قسم کی فصاحت بلاغت وغیرہ کی رعایت اس کی لفظی حیثیت میں ہے ایسی رعایت لفظی حیثیت میں بھی نہیں رکھی جا سکتی، اور جو اس کے معنی میں اعتدال ہے اور اس کے واقعات میں سچائی ہے اس قسم کی بھی کوئی دوسری کتاب مہیا نہیں کی جا سکتی، ''آپ کہہ دیجیے کہ لے آؤ تم ایک سورت، اور بلا لو تم جن کو طاقت رکھتے ہو اللہ کے علاوہ اگر تم سچے ہو۔''

مشرکین کے قرآن کی تکذیب کرنے کی وجہ

بَلْ كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ يُحِيْطُوْا بِعِلْمِهٖ: دلیل لانے سے تو یہ عاجز ہیں اور قرآنِ کریم کو یہ جھٹلا رہے ہیں، اصل بات یہ ہے کہ اس کے علم کا ابھی انہوں نے احاطہ نہیں کیا، قرآنِ کریم کے علم کے اوپر ابھی یہ قادر نہیں ہوئے کہ قرآنِ کریم کو علمی حیثیت میں یہ سمجھ لیتے اور اس کی معلومات کا احاطہ کر لیتے، معلومات ان کے علم میں آ جاتیں، اور جس قسم کی پیش گوئیاں قرآنِ کریم نے کی ہیں ان کی حقیقت ابھی ان کے سامنے آئی نہیں، اور جس وقت اس کی پیش گوئیوں کی حقیقت ان کے سامنے آئے گی اس وقت بھی ان کو پتا چل جائے گا کہ کتنی سچی کتاب تھی، اور اگر اس کو علمی انداز میں سمجھنے کی کوشش کرتے اس کا احاطہ کرنے کی کوشش کرتے تو بھی سمجھتے کہ اس میں اتنا علم بھر دیا گیا ہے، اس میں اتنی معلومات دے دی گئی ہیں کہ کسی انسان کے بس میں ہی نہیں کہ چند لفظوں کے اندر اتنا معلومات کا سمندر بند کر دے، ''نہیں احاطہ کیا انہوں نے اس کے علم کا'' اس کے علم کو یہ قابو نہیں پا سکے، ''اور ابھی اس کی حقیقت ان کے سامنے آئی نہیں'' یعنی اس کی پیش گوئیوں کا مصداق مہیا نہیں ہوا، ''ایسے ہی جھٹلایا ان لوگوں نے جو ان سے پہلے تھے، پھر دیکھ تو کہ کیسا انجام ہوا ظالم لوگوں کا۔''

''ان میں سے بعض ایسے ہیں جو ایمان لائیں گے'' اسی لیے ہم ان کو مہلت دیتے جا رہے ہیں تاکہ ان میں سے جو صالح

عنصر ہے وہ علیحدہ ہو جائے، جن میں کسی قسم کی کوئی صلاحیت ہے، حق طلبی ہے، وہ سارے کے سارے علیحدہ ہو جائیں، جس وقت باقی ایسے رہ جائیں گے جس طرح سے دُودھ میں سے مکھن نکال لیا جائے تو باقی لسی رہ جاتی ہے، چھاچھ رہ جاتی ہے، پھر ان کو باقی رکھنے کی کوئی ضرورت نہیں ہوگی، اللہ تبارک وتعالیٰ پھر انہیں برباد کردے گا، ابھی ان کو موقع دیا جارہا ہے تاکہ سمجھنے والے لوگ سمجھ جائیں، ''ان میں سے بعض ہیں جو اس کے اوپر ایمان لائیں گے، اور ان میں سے بعض ہیں جو اس پر ایمان نہیں لائیں گے، اور تیرا رب خوب اچھی طرح سے جاننے والا ہے مفسدین کو۔''

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ أَسْتَغْفِرُكَ وَأَتُوْبُ إِلَيْكَ

وَإِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ لِّيْ عَمَلِيْ وَلَكُمْ عَمَلُكُمْ ۚ أَنْتُمْ بَرِيْٓـُٔوْنَ

اگر یہ لوگ آپ کی تکذیب کرتے رہیں تو آپ انہیں کہہ دیجیے کہ میرے لیے میرا عمل ہے اور تمہارے لیے تمہارا عمل ہے، تم لاتعلق ہو

مِمَّآ أَعْمَلُ وَأَنَا بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۴۱﴾ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُوْنَ

اس چیز سے جو میں کرتا ہوں اور میں لاتعلق ہوں اس چیز سے جو تم کرتے ہو﴿۴۱﴾ اور ان میں سے بعض وہ ہیں جو آپ کی طرف کان

إِلَيْكَ ۭ أَفَأَنْتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ وَلَوْ كَانُوْا لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿۴۲﴾ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْظُرُ إِلَيْكَ ۭ أَفَأَنْتَ

لگاتے ہیں، کیا آپ سُنا سکتے ہیں بہروں کو اگرچہ وہ کچھ سمجھتے نہ ہوں؟﴿۴۲﴾ اور ان میں سے بعض وہ ہیں جو آپ کی طرف دیکھتے ہیں، کیا

تَهْدِي الْعُمْيَ وَلَوْ كَانُوْا لَا يُبْصِرُوْنَ ﴿۴۳﴾ إِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْـًٔا وَّلٰكِنَّ النَّاسَ

آپ راستہ دِکھا سکتے ہیں اندھوں کو اگرچہ وہ بصیرت نہ رکھتے ہوں؟﴿۴۳﴾ بے شک اللہ تعالیٰ لوگوں کے اُوپر کچھ ظلم نہیں کرتا، لیکن لوگ ہی

أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۴۴﴾ وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ كَأَنْ لَّمْ يَلْبَثُوْٓا

اپنے نفسوں پہ ظلم کرتے ہیں﴿۴۴﴾ ذِکر کیجیے اس دِن کا جس دِن اللہ تعالیٰ انہیں جمع کرے گا، حال یہ ہوگا گویا کہ وہ لوگ نہیں ٹھہرے

إِلَّا سَاعَةً مِّنَ النَّهَارِ يَتَعَارَفُوْنَ بَيْنَهُمْ ۭ قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِلِقَآءِ اللّٰهِ

مگر دِن کی ایک گھڑی، آپس میں ایک دوسرے کو پہچانتے ہوں گے، تحقیق خسارے میں پڑ گئے وہ لوگ جنہوں نے اللہ کی ملاقات کو جھٹلایا

وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ﴿۴۵﴾ وَإِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُهُمْ أَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ

اور وہ راستہ پانے والے نہیں تھے﴿۴۵﴾ اگر دِکھا دیں ہم آپ کو اس چیز کا کچھ حصہ جس کا ہم ان سے وعدہ کرتے ہیں یا ہم آپ کو وفات دے دیں

فَاِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ اللّٰهُ شَهِيْدٌ عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ ﴿۴۶﴾ وَلِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ ۚ فَاِذَا

پھر ہماری طرف ہی ان کا لوٹنا ہے، پھر اللہ نگہبان ہے ان کاموں پر جو یہ کرتے ہیں ﴿۴۶﴾ ہر جماعت کے لئے رسول ہے، جس وقت

جَآءَ رَسُوْلُهُمْ قُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۴۷﴾ وَيَقُوْلُوْنَ

ان کا رسول آجاتا ہے تو ان کے درمیان انصاف سے فیصلہ کر دیا جاتا ہے اور وہ ظلم نہیں کیے جاتے ﴿۴۷﴾ اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ

مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۴۸﴾ قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا

یہ وعدہ کب ہوگا اگر تم سچے ہو ﴿۴۸﴾ آپ کہہ دیجیے کہ میں نہیں اختیار رکھتا اپنے نفس کے لئے نقصان کو دُور ہٹانے کا اور نہ نفع کو حاصل کرنے کا

اِلَّا مَاشَآءَ اللّٰهُ ؕ لِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ ؕ اِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ فَلَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا

مگر جو اللہ چاہے، ہر جماعت کے لئے ایک وقت معین ہے، جس وقت ان کا وہ وقت آجائے گا پھر نہیں پیچھے ہٹیں گے ایک گھڑی، نہ وہ

يَسْتَقْدِمُوْنَ ﴿۴۹﴾ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُهٗ بَيَاتًا اَوْ نَهَارًا مَّاذَا

آگے بڑھیں گے ﴿۴۹﴾ آپ کہہ دیجئے کہ بتلاؤ تم، اگر آجائے تمہارے پاس اس کا عذاب رات کے وقت یا دن کے وقت، کون سی چیز

يَسْتَعْجِلُ مِنْهُ الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۵۰﴾ اَثُمَّ اِذَا مَا وَقَعَ اٰمَنْتُمْ بِهٖ ؕ

ہے جس کو جلدی طلب کرتے ہیں اُس عذاب سے مجرمون ﴿۵۰﴾ کیا پھر جس وقت وہ عذاب واقع ہو جائے گا تم اس عذاب پہ ایمان لے آؤ گے؟،

آٰلْـٰٔنَ وَقَدْ كُنْتُمْ بِهٖ تَسْتَعْجِلُوْنَ ﴿۵۱﴾ ثُمَّ قِيْلَ لِلَّذِيْنَ

(اس وقت کہا جائے گا) اب تم ایمان لاتے ہو؟ حالانکہ تم اس عذاب کو پہلے جلدی طلب کرتے تھے ﴿۵۱﴾ پھر کہا جائے گا ان لوگوں کو

ظَلَمُوْا ذُوْقُوْا عَذَابَ الْخُلْدِ ۚ هَلْ تُجْزَوْنَ اِلَّا بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ ﴿۵۲﴾ وَيَسْتَنْۢبِئُوْنَكَ

جنہوں نے ظلم کیا مزہ چکھو ہمیشگی کے عذاب کا، نہیں بدلہ دیے جاتے تم مگر اسی چیز کا جو تم کیا کرتے تھے ﴿۵۲﴾ اور آپ سے خبر طلب کرتے ہیں

اَحَقٌّ هُوَ ؕ قُلْ اِيْ وَرَبِّيْٓ اِنَّهٗ لَحَقٌّ ۚؔ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ﴿۵۳﴾ وَلَوْ اَنَّ لِكُلِّ نَفْسٍ

کیا یہ عذاب حق ہے؟ آپ کہہ دیجیے ہاں میرے رَبّ کی قسم! بے شک یہ حق ہے، اور تم عاجز کرنے والے نہیں ہو ﴿۵۳﴾ اور اگر ہر نفس کے لئے

ظَلَمَتْ مَا فِي الْاَرْضِ لَافْتَدَتْ بِهٖ ؕ وَ

جس نے کہ ظلم کیا وہ سب کچھ ہو جو زمین میں ہے تو وہ چھڑانے کی کوشش کرے گا اس کے بدلے میں اپنے آپ کو، اور

أَسَرُّوا النَّدَامَةَ لَمَّا رَأَوُا الْعَذَابَ ۚ وَقُضِيَ بَيْنَهُم بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ﴿۵۴﴾

وہ پشیمانی کو چھپائیں گے جب عذاب کو دیکھیں گے، اور ان کے درمیان انصاف سے فیصلہ کر دیا جائے گا اور ان پہ ظلم نہیں کیا جائے گا ﴿۵۴﴾

أَلَا إِنَّ لِلَّهِ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۗ أَلَا إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ

خبردار! اللہ ہی کے لئے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور زمین میں ہے، خبردار! بے شک اللہ کا وعدہ سچا ہے لیکن اکثر لوگ

لَا يَعْلَمُونَ ﴿۵۵﴾ هُوَ يُحْيِي وَيُمِيتُ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴿۵۶﴾

جانتے نہیں ہیں ﴿۵۵﴾ وہ زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے ﴿۵۶﴾

خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ وَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ لِّيْ عَمَلِيْ: اور اگر یہ لوگ آپ کی تکذیب کرتے رہیں، ''کرتے رہیں'' یہ دوام کی طرف اشارہ ہے، کیونکہ تکذیب تو واقع تھی اور اِنْ داخل ہوا کرتا ہے ایسی چیز پر کہ جس کے ہونے متعلق یقین نہ ہو، یقین کے ساتھ اس کو ذکر نہ کیا جائے، جس طرح سے آپ نحو کے اندر پڑھتے رہتے ہیں، تو اس کا مفہوم ان الفاظ میں ادا کیا جائے گا ''اگر وہ آپ کی تکذیب کرتے رہیں'' یعنی آپ کی تکذیب سے باز نہ آئیں، ''تو آپ انہیں کہہ دیجئے کہ'' لِّيْ عَمَلِيْ: میرے لیے میرا عمل ہے، وَلَكُمْ عَمَلُكُمْ: اور تمہارے لئے تمہارا عمل ہے، اَنْتُمْ بَرِيْٓــُٔوْنَ مِمَّآ اَعْمَلُ: تم لاتعلق ہو اس چیز سے جو میں کرتا ہوں، وَاَنَا بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ: اور میں لاتعلق ہوں اس چیز سے جو تم کرتے ہو، وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُوْنَ اِلَيْكَ: اور اِن میں سے بعض وہ ہیں (مَن چونکہ معنی جمع ہے اس لئے يَسْتَمِعُوْنَ کی ضمیر جمع لوٹ رہی ہے) جو آپ کی طرف کان لگاتے ہیں، اَفَاَنْتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ: صُمّ اَصَمّ کی جمع ہے، کیا آپ سنا سکتے ہیں بہروں کو؟ وَلَوْ كَانُوْا لَا يَعْقِلُوْنَ: اگرچہ وہ کچھ سمجھتے نہ ہوں، عقل نہ رکھتے ہوں، عَقَلَ يَعْقِلُ: سوچنا، مفعول آگے ذکر نہیں، اور فعل متعدی کا جس وقت مفعول ذکر نہ کیا جائے تو بسا اوقات اُس حدثی معنی کی ہی نفی کرنی مقصود ہوتی ہے، تو یہاں چونکہ لَا يَعْقِلُوْنَ کا مفعول مذکور نہیں تو اس کا معنی ہوگا کہ عقل کی اُن سے نفی کی جا رہی ہے، ''اگرچہ وہ عقل نہ رکھتے ہوں''، وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْظُرُ اِلَيْكَ: اور اِن میں سے بعض وہ ہیں جو آپ کی طرف جھانکتے ہیں، دیکھتے ہیں، اَفَاَنْتَ تَهْدِي الْعُمْيَ: اَلْعُمْيَ اَعْمٰی کی جمع ہے، کیا آپ راستہ دکھا سکتے ہیں اندھوں کو؟ وَلَوْ كَانُوْا لَا يُبْصِرُوْنَ: اگرچہ وہ بصیرت نہ رکھتے ہوں، لَا يُبْصِرُوْنَ کا یہی معنی ہے، یہاں اس سے بصیرتِ قلبی مراد ہے، ''اگرچہ وہ کچھ دیکھتے نہ ہوں'' یعنی قلبی بصیرت نہ رکھتے ہوں، ورنہ اعمیٰ جس وقت آ گیا تو آنکھوں کی بینائی تو اسی میں ختم ہوگئی، ''کیا آپ اندھوں کو راستہ دکھا سکتے ہیں اگرچہ وہ دل کی سوجھ بوجھ نہ رکھتے ہوں؟'' اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْــًٔا: بے شک اللہ تعالیٰ لوگوں کے اوپر کچھ ظلم نہیں کرتا، وَّلٰكِنَّ النَّاسَ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ: لیکن لوگ ہی اپنے نفسوں پہ ظلم کرتے ہیں، وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ: یاد کیجئے، یا، ان کو یاد دلایئے وہ دن، ذکر کیجئے اس دن کا جس دن اللہ تعالیٰ انہیں جمع کرے گا، كَاَنْ لَّمْ يَلْبَثُوْٓا اِلَّا سَاعَةً مِّنَ

النَّهَارِ: حال یہ ہوگا گویا کہ وہ لوگ نہیں ٹھہرے مگر دن کی ایک گھڑی، يَتَعَارَفُوْنَ بَيْنَهُمْ: آپس میں ایک دوسرے کو پہچانتے ہوں گے، قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِلِقَآءِ اللّٰهِ: تحقیق خسارے میں پڑ گئے وہ لوگ جنہوں نے اللہ کی ملاقات کو جھٹلایا، وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ: اور وہ راستہ پانے والے نہیں تھے۔ وَاِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُهُمْ: اِمَّا یہ ''اِنْ مَا'' ہے، ''مَا'' زائدہ، ''اِنْ'' شرطیہ، ''اگر دکھا دیں ہم آپ کو بعض اس چیز کا جس کا ہم اِن سے وعدہ کرتے ہیں، الَّذِيْ نَعِدُهُمْ سے عذاب مراد ہے، ''اگر دکھا دیں ہم آپ کو بعض اس چیز کا، اس چیز کا کچھ حصہ جس کا ہم ان سے وعدہ کرتے ہیں'' اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ: یا ہم آپ کو وفات دے دیں، فَاِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ: پھر ہماری طرف ہی اِن کا لوٹنا ہے، ثُمَّ اللّٰهُ شَهِيْدٌ عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ: پھر اللہ تعالیٰ نگہبان ہے، شاہد ہے ان کاموں پر جو یہ کرتے ہیں، گواہ ہے ان کاموں پر جو یہ کرتے ہیں، وَلِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ: ہر جماعت کے لئے رسول ہے، رسول: بھیجا ہوا، اللہ کی طرف سے احکام پہنچانے والا، فَاِذَا جَآءَ رَسُوْلُهُمْ: جس وقت ان کا رسول آ جاتا ہے، قُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ: ان کے درمیان انصاف سے فیصلہ کر دیا جاتا ہے، وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ: اور وہ ظلم نہیں کئے جاتے۔ وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ: اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ وعدہ کب ہوگا، اس وعدے کا وقت کیا ہے، اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ: اگر تم سچے ہو، كُنْتُمْ جمع کا خطاب آ گیا، نبی کو بمع مسلمانوں کے گویا کہ خطاب کر کے وہ کہتے تھے، ساری جماعت کو خطاب کر کے، ''اگر تم سچے ہو''۔ قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ: آپ جواب میں کہہ دیجئے کہ میں نہیں اختیار رکھتا اپنے نفس کے لئے، ضَرًّا: نقصان، یعنی دَفْعَ ضَرٍّ، اپنے نفس سے نقصان کو دُور ہٹانے کا اور نفع کو حاصل کرنے کا، لَآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ دفعَ ضَرٍّ وَلا حصولَ نفعٍ، ''نہ میں اپنے نفس سے نقصان دور ہٹانے کا اختیار رکھتا ہوں، نہ نفع کے حاصل کرنے کا مگر جو اللہ چاہے وہی ہوتا ہے'' لِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ: ہر اُمت کے لئے، ہر جماعت کے لئے ایک وقت معین ہے، اِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ فَلَا يَسْتَاْخِرُوْنَ: جس وقت ان کا وہ وقت آ جائے گا، فَلَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً: پھر نہیں پیچھے ہٹیں گے ایک گھڑی، وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ: نہ وہ آگے بڑھیں گے۔ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُهٗ بَيَاتًا اَوْ نَهَارًا: بیات، باتَ يَبِيْتُ: رات گزارنا، وقتَ بَيَاتٍ، یا بَائِتِيْنَ، ''آپ کہہ دیجئے کہ بتلاؤ تم، اگر آ جائے تمہارے پاس اس کا عذاب رات کے وقت یا اس حال میں کہ تم رات گزار رہے ہو''۔ اَوْ نَهَارًا: یا دِن کے وقت آ جائے، نہار کے اوپر وقت نکالنے کی ضرورت نہیں کیونکہ نہار خود وقت پر دلالت کرتا ہے، بیات تو چونکہ مصدر ہے اس لیے وہاں وقت کا لفظ نکالنے کی ضرورت ہے، ''آ جائے تمہارے پاس اس کا عذاب دن کے وقت'' مَّاذَا يَسْتَعْجِلُ مِنْهُ الْمُجْرِمُوْنَ: مَاذَا یہ اَيُّ شَيْءٍ کے معنی میں ہے، کونسی چیز ہے جس کو جلد طلب کرتے ہیں اُس عذاب سے مجرمون، اَثُمَّ اِذَا مَا وَقَعَ اٰمَنْتُمْ بِهٖ: کیا پھر جس وقت وہ عذاب واقع ہو جائے گا تم اس عذاب پہ ایمان لے آؤ گے؟ یا، اللہ تعالیٰ پہ ایمان لے آؤ گے؟، آٰلْئٰنَ: اُس وقت کہا جائے گا کہ تم اب ایمان لاتے ہو؟ وَقَدْ كُنْتُمْ بِهٖ تَسْتَعْجِلُوْنَ: اٰمَنْتُمْ بِهٖ کی ضمیر کو عذاب کی طرف ہی راجع کرنا اولیٰ ہے تا کہ انتشارِ ضمائر نہ ہو، وَقَدْ كُنْتُمْ بِهٖ تَسْتَعْجِلُوْنَ: اس بِهٖ کی ضمیر بھی عذاب کی طرف لوٹ رہی ہے، ''اب تم ایمان لاتے ہو؟ حالانکہ تم اُس عذاب کو پہلے جلدی طلب کرتے تھے'' ثُمَّ قِيْلَ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا: پھر کہا جائے گا ان لوگوں کو جنہوں نے ظلم کیا، ذُوْقُوْا عَذَابَ الْخُلْدِ: مزہ چکھو ہمیشگی کے عذاب کا، هَلْ تُجْزَوْنَ اِلَّا بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ: نہیں بدلہ دیے جاتے تم مگر اسی چیز کا جو تم کیا کرتے تھے۔ وَيَسْتَنْبِـُٔوْنَكَ: اور آپ سے خبر طلب کرتے ہیں، اِسْتِنْبَاء: خبر

طلب کرنا، پوچھنا، اور آپ سے خبر پوچھتے ہیں، اَحَقٌّ هُوَ: کیا یہ عذاب حق ہے، قُلْ اِیْ وَرَبِّیْٓ: آپ کہہ دیجئے ہاں میرے رَبّ کی قسم، اِنَّهٗ لَحَقٌّ: بے شک یہ حق ہے، وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ: اور تم عاجز کرنے والے نہیں ہو۔ وَلَوْ اَنَّ لِكُلِّ نَفْسٍ ظَلَمَتْ مَا فِي الْاَرْضِ: اور اگر ہر نفس کے لئے جس نے کہ ظلم کیا وہ سب کچھ ہو جو زمین میں ہے، لَافْتَدَتْ بِهٖ: لَافْتَدَتْ بِهٖ نَفْسَهَا، تو وہ اپنے آپ کو اس کے بدلے میں چھڑانے کی کوشش کرے گا، "البتہ چھڑائے گا" یعنی چھڑانے کی کوشش کرے گا "اس کے بدلے میں اپنے آپ کو" وَاَسَرُّوا النَّدَامَةَ: اور وہ پشیمانی کو چھپائیں گے یعنی دل میں نادم ہوں گے، لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ: جب عذاب کو دیکھیں گے، وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ: اور ان کے درمیان انصاف سے فیصلہ کر دیا جائے گا، وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ: اور ان پہ ظلم نہیں کیا جائے گا۔ اَلَآ اِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ: خبردار! اللہ ہی کے لئے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور زمین میں ہے، اَلَآ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ: خبردار! بے شک اللہ کا وعدہ سچا ہے، وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ: لیکن اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں، هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ: وہ زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے، وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ: اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

تفسیر

ماقبل سے ربط

سورۂ یونس چونکہ مکی ہے اور مکہ معظمہ میں ابتداءً اترنے والی سورتوں میں سے ہے، اس لیے اس میں مشرکین کے ساتھ گفتگو ابتدائی انداز کی ہے، پیچھے ذکر آیا تھا باربار ان کے سامنے عذاب کی دھمکی ذکر کی جارہی تھی، اور اس پر وہ استہزا کرتے تھے، مذاق اُڑاتے تھے، جیسے کہ گزشتہ آیات میں آپ کے سامنے آگیا۔ توحید، رسالت، معاد کے مسائل کو مختلف انداز کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے، اب اللہ تعالیٰ سرورِ کائنات ﷺ کو ایک قسم کی تسلی دیتے ہیں۔

سرورِ کائنات ﷺ کو تسلی

تسلی کا حاصل یہ ہے کہ اگر یہ سمجھانے کے باوجود سمجھتے نہیں اور آپ کی تکذیب میں اسی طرح سے لگے رہیں، آپ کی تکذیب سے باز نہ آئیں، تو آپ انہیں کہہ دیں، (یہ ایک قسم کی قطعِ حجت کا ذریعہ ہے، جھگڑے کو ختم کرنے والی بات ہے) کہ بہت اچھا! تم اپنے طریقے پہ لگے رہو، میں اپنے طریقے پہ لگا ہوا ہوں، تمہارے اعمال کی ذمہ داری میرے پر نہیں، میرے اعمال کی ذمہ داری تم پر نہیں ہے، اس عمل کا جو نتیجہ ہوگا ہر شخص کے سامنے آجائے گا، یہ جھگڑے کو ختم کرنے والی ایک بات ہوتی ہے، کہ ہم نے تو جو کچھ کہنا تھا کہہ لیا، جتنا سمجھانا تھا سمجھا لیا، اب اگر تم سمجھتے نہیں تو بہت اچھا! انتظار کرو، ہر کسی کے سامنے اس کے اعمال کا نتیجہ آجائے گا: "اگر وہ آپ کی تکذیب کرتے رہیں تو آپ کہہ دیجیے میرے لیے میرا عمل ہے" یعنی میرے عمل کی ذمہ داری تم پر نہیں، وَلَكُمْ عَمَلُكُمْ: تمہارے لیے تمہارا عمل ہے، اَنْتُمْ بَرِيْٓـُٔوْنَ مِمَّآ اَعْمَلُ: تم لاتعلق ہو اس چیز سے جو میں کرتا ہوں اور میں لاتعلق اس چیز

سے جو تم کرتے ہو، مطلب یہ ہے کہ اپنے اپنے طریقے پہ لگے رہو، میں اپنے طریقے پہ ہوں تم اپنے طریقے پہ ہو، انجام جس وقت سامنے آجائے گا پھر پتا چل جائے گا کہ کون صحیح ہے کون غلط؟

سَرورِ کائنات کو تسلی کہ منکرین کا نہ سمجھنا ان کو برباد کردے گا

اگلے الفاظ بھی سرورِ کائنات ﷺ کی تسلی کے ہیں، کہ بعضے لوگ آپ کی طرف کان لگاتے ہیں، بظاہر ایسے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سن رہے ہیں لیکن چونکہ ان کا سننا عقیدت کے ساتھ نہیں، سمجھنے کے لئے نہیں، طلب حق کے لئے نہیں، یہ انسان کی ایک فطرت ہے کہ اس کے اپنے جذبات کا اس کے فہم پر بہت اثر پڑتا ہے، اگر عقیدت مندی کے ساتھ کوئی بات سنی جائے تو سمجھ بھی آتی ہے دل میں اترتی ہے، اور اگر اِبتدا سے ہی سوچ لیا جائے کہ ہم نے اس پر اعتراض ہی کرنا ہے اور اس کو جھٹلانا ہی ہے تو سمجھانے والا کتنے ہی اچھے انداز کے ساتھ کیوں نہ سمجھائے کتنے ہی مدلل طریقے سے کیوں نہ بیان کرے لیکن وہ بات دل میں اترتی ہی نہیں، تو جس وقت دل سے طلب حق کی استعداد ختم ہو جاتی ہے تو اس وقت نہ آنکھیں حق کو دیکھا کرتی ہیں اور نہ کان حق کو سنا کرتے ہیں اور نہ ہی بات سمجھ میں آیا کرتی ہے۔ حضرت شعیب علیہ السلام انبیاء علیہم السلام کے سلسلے میں ''خطیب الانبیاء'' کہلاتے ہیں، کتنے واضح طور پر انہوں نے اپنی قوم کے سامنے تبلیغ کی تھی، لیکن قوم آگے سے کہتی تھی مَا نَفْقَهُ كَثِيرًا مِّمَّا تَقُولُ (سورۂ ہود: ۹۱) کہ تو جو باتیں کرتا ہے ان میں سے اکثر تو ہماری سمجھ میں نہیں آتیں کہ تو کیا کہتا ہے، وہ اصل میں سمجھ اسی لیے نہیں آتی تھیں کہ دل سے ماننے کا ارادہ ہی نہیں تھا، عقیدت کے ساتھ اور طلب حق کے جذبے کے ساتھ اگر سنا جائے تب بات سمجھ میں آیا کرتی ہے، ورنہ اگر دل کے دروازے بند کر لیے جائیں اور پہلے ہی تہیہ کر لیا جائے کہ ہم نے ماننا نہیں بلکہ انکار ہی کرنا ہے، تو کتنی صاف بات کیوں نہ ہو انسان کے دل دماغ میں آتی ہی نہیں۔ ''تو ان میں سے بعض آپ کی طرف کان لگاتے ہیں، لیکن کیا آپ بہروں کو سنا سکتے ہیں اگرچہ وہ عقل بھی نہ رکھتے ہوں؟'' یعنی اگر عقل ہو تو پھر بھی کچھ اشارے سے انسان بہرے کو بات سمجھا لیتا ہے، اگر الفاظ کان میں نہ ڈال سکے تو اشاروں کے ساتھ ہی کچھ نہ کچھ ذکر کر دیتا ہے، جب عقل بھی نہیں ہے تو پھر وہ کس طرح سے بات کو معلوم کر سکتا ہے۔ ''اور ان میں سے بعض ایسے ہیں جو آپ کی طرف دیکھتے ہیں، کیا آپ اندھوں کو راستہ دکھا سکتے ہیں اگرچہ وہ سمجھ بھی نہ رکھتے ہوں؟'' یعنی اندھا آدمی اگر سمجھ دار ہو تو بصیرتِ قلبی کے ساتھ ہی کچھ نہ کچھ وہ راستہ پالیتا ہے، لیکن اگر بصیرتِ قلبی سے بھی محروم ہو گیا اور آنکھوں میں بھی بینائی نہیں ہے پھر راستہ دیکھنے کی کوئی صورت نہیں ہوتی۔ تو یہ لوگ چاہے آپ کی باتیں سنتے ہیں لیکن چونکہ طلب حق نہیں اس لیے کانوں سے بہرے ہیں اور عقل سے بھی کام نہیں لیتے، آنکھوں سے اندھے ہیں اور دل میں بھی بصیرت نہیں ہے، ان لوگوں کے متعلق توقع نہ رکھیے کہ یہ سمجھ جائیں گے، اس سے آپ ﷺ کو تسلی دینی مقصود ہے کہ اگر یہ نہیں سمجھتے تو اصل بات یہی ہے کہ اپنے آپ کو برباد کیے بیٹھے ہیں۔ اور یہ جو ان کے اوپر بربادی آگئی تو یہ بھی اللہ تعالیٰ نے ان کے اوپر کوئی زیادتی نہیں کی، بلکہ اللہ تعالیٰ ہر انسان کو جو پیدا کرتا ہے تو اس میں سمجھنے کی، دیکھنے کی، ہر قسم کی صلاحیتیں رکھتا ہے، لیکن جس وقت کوئی شخص اُن صلاحیتوں سے کام نہ لے تو آہستہ آہستہ وہ

استعداد ختم ہو جاتی ہے، تو یہ زیادتی انسان خود اپنے اوپر کرتا ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی زیادتی نہیں ہے۔'' بے شک اللہ تعالیٰ نہیں ظلم کرتا لوگوں پر کچھ بھی، لیکن لوگ ہی اپنے نفسوں کے اوپر ظلم کرتے ہیں۔''

یومِ قیامت کن کے لئے حسرت و افسوس کا ہوگا؟

جس دن اللہ انہیں اکٹھا کرے گا تو یہ زندگیاں جو آج ان کو لمبی معلوم ہوتی ہیں اور جس کے متعلق یہ سمجھتے ہیں کہ ہم نے یہاں دنیا سے جانا ہی نہیں، جیسے غالباً سورۂ ابراہیم کے آخر میں آئے گا اَوَلَمْ تَكُوْنُوْٓا اَقْسَمْتُمْ مِّنْ قَبْلُ مَا لَكُمْ مِّنْ زَوَالٍ: کہ تم قسمیں کھایا کرتے تھے کہ ہمارے لیے زوال نہیں ہے، اور تم سمجھتے تھے کہ اس دنیا کے اندر ہم نے کھونٹے گاڑ لیے، یہاں سے کہیں نہیں جانا، لیکن جس وقت اللہ تعالیٰ تمہیں اپنے سامنے حاضر کرے گا تو تمہیں دنیا کی زندگی ایسے معلوم ہوگی جیسے چند لمحوں میں گزر گئی، قیامت کے دِن کا اِمتداد اور اس کا اِشتداد، کہ وہ دن لمبا بھی ہوگا اس میں سختیاں بھی ہوں گی، تو کتنے ہی برس تم نے دنیا کے اندر گزارے ہیں لیکن ایسے معلوم ہوگا جیسے کہ دن کے ایک دو گھنٹے تھے جو گپ شپ میں گزر گئے، اتنا سا وقت معلوم ہوگا، ''گویا کہ نہیں ٹھہرے وہ مگر دن کا ایک حصہ، دن کی ایک ساعت'' دنیوی زندگی کے متعلق بھی ایسا خیال ہوگا اور خود برزخی زندگی کے متعلق بھی ایسا ہی خیال ہوگا کیونکہ آخرت کے مقابلے میں برزخ بھی ایسے ہی معلوم ہوگا جیسے صبح شام کا قصہ تھا اور گزر گیا، اور آپس میں یہ ایک دوسرے کو پہچانیں گے بھی، لیکن ایک دوسرے کی مدد نہیں کرسکیں گے، اور یہ زیادہ حسرت اور افسوس کی بات ہوگی، ''تحقیق خسارے میں پڑ گئے وہ لوگ جنہوں نے اللہ کی ملاقات کو جھٹلایا، اور وہ سیدھا راستہ پانے والے نہیں تھے'' جس دن اللہ تعالیٰ ان کو جمع کرے گا اس دن ان کا خسارہ نمایاں ہو جائے گا۔

خسارہ کس کو کہتے ہیں؟

خسارے کا مطلب آپ کے سامنے کئی دفعہ ذکر ہو چکا، خسارہ یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنی طرف سے کوئی قیمتی چیز دے بیٹھے اور مقابلے کے اندر گھٹیا چیز لے لے، سرمایہ ضائع ہو گیا، اسی طرح سے اللہ تعالیٰ نے دنیا کے اندر انسان کو جو بھیجا ہے تو مختلف قسم کی استعداد بھی بطور سرمائے کے دی ہے، اس سرمائے کو خرچ کر کے اگر تو آخرت کی نجات حاصل کر لی، اللہ کی رضا حاصل کر لی اور آخرت کی نعمتیں حاصل کر لیں، تو یہ تجارت نفع کی ہے، اور اگر یہ ساری کی ساری ضائع کر لیں، کچھ بھی نہ کمایا، یا الٹا عذاب کما لیا تو اس سے بڑھ کے اور کیا خسارہ ہو سکتا ہے؟ تو اللہ تعالیٰ کی ملاقات کا یقین کرنا یہ کامیابی کی بنیاد ہے، کہ اس سے پھر انسان کوشش کرتا ہے کہ اچھے کام کرے جو اللہ تعالیٰ کی ملاقات کے وقت اللہ کی رضا کا باعث بنیں، اور جب اللہ کی ملاقات کو جھٹلایا تو اس نے تو ساری نیکیوں کی بنیاد کو منہدم کر دیا، اس کے بعد پھر اس کے عمل کا رخ کبھی صحیح ہو ہی نہیں سکتا۔

منکرین کی کارروائیاں اور ان کے کرتوت اللہ کے سامنے ہیں

آگے یہ بتایا جا رہا ہے کہ عذاب ان پر آئے گا ضرور، چاہے ہم آپ کی زندگی میں کچھ حصہ لے آئیں اور چاہے آپ کو

وفات دے دیں، آخر آنا انہوں نے ہمارے پاس ہے، ہمارے پاس سے بچ کے کہیں جا نہیں سکتے، ''اگر دکھادیں ہم آپ کو بعض اس چیز کا جس کا ہم اِن سے وعدہ کرتے ہیں'' یعنی اس عذاب کا کچھ حصہ آپ کی زندگی میں واقع کردیں، ''یا ہم آپ کو وفات دے دیں'' کسی صورت میں بھی یہ بچیں گے نہیں، صورتیں دونوں ہوسکتی ہیں کہ آپ کی زندگی میں عذاب دے دیا جائے یا آپ کو وفات دے دی جائے، ان کا لوٹنا ہماری طرف ہی ہے، پھر اللہ تعالیٰ گواہ ہے ان سب کاموں پر جو یہ کرتے ہیں، ان کی کاروائیاں اوران کے کام بھی اللہ کے سامنے ہیں۔

اللہ کا رسول اِنسانوں کے لئے آخری حُجّت ہوتا ہے

وَلِكُلِّ أُمَّةٍ رَّسُوْلٌ: ہر جماعت کے لئے ایک رسول ہے، بھیجا ہوا، چاہے براہِ راست اللہ کی طرف سے آیا ہو، چاہے اللہ کے رسول کی طرف سے آگے بھیجا ہوا ہو، تبلیغ اَحکام بہرحال ہوتی ہے، اور جس وقت کسی جماعت کی طرف اللہ کا رسول آجاتا ہے اور آکر اللہ کی طرف سے وہ اَحکام کو واضح کردیتا ہے اور لوگ نہیں مانتے تو پھر اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے فیصلے کے دن آجاتے ہیں، جہالت تو کسی درجے میں عذر رہ سکتی ہے اگر اللہ کا رسول نہ آیا ہو، لیکن اللہ کے رسول کے آجانے کے بعد پھر فیصلہ بہت جلدی ہوجاتا ہے، ''جب ان کا رسول آجاتا ہے تو ان کے درمیان انصاف سے فیصلہ کردیا جاتا ہے اور وہ ظلم نہیں کیے جاتے۔''

ہر چیز کا علم، اِختیار اور وقت کی تعیین اللہ کے پاس ہے

''اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ وعدہ کب ہوگا؟'' یعنی یہ جو تم آئے دن عذاب کی بات کرتے ہو یا قیامت کی بات کرتے ہو، اس کے وقوع کا وقت کیا ہے؟ یہ بتاؤ اگر تم سچے ہو، آپ کہہ دیجیے کہ یہ میرے بس کی بات نہیں ہے۔ وہ چاہے خطاب کرتے تھے نبی کو اوران کے ساتھیوں کو، لیکن جواب نبی کی طرف سے دلایا گیا، کہ کسی نقصان کا ہٹادینا کسی نفع کا حاصل کرلینا یہ تو ہم اپنی ذات پر بھی اختیار نہیں رکھتے، یہ تو اللہ کے علم میں ہے کہ کیا نقصان پہنچنے والا ہے کیا نفع پہنچنے والا ہے؟ نفع نقصان اسی کے اختیار میں ہے، اللہ ہی جانتا ہے کہ تمہارے لیے کیا ہونے والا ہے اور ہمارے لیے کیا ہونے والا ہے، ہم اس کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتے، ''نہیں اختیار رکھتا میں اپنے نفس کے لئے نقصان کے دور ہٹانے کا نہ نفع کے حاصل کرنے کا مگر جو اللہ چاہے وہی ہوتا ہے'' ہر اُمت کے لئے ہر جماعت کے لئے ایک وقت متعین ہے اللہ کے علم میں، جب ان کا وہ وقت آجائے گا تو نہ یہ پیچھے ہٹیں گے ایک گھڑی اور نہ آگے بڑھیں گے۔'' یہی ترکیب آپ کے سامنے غالباً سورۂ اَعراف میں آئی تھی وہاں ذکر کیا تھا۔ إِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ: جب ان کا وقت معین آجاتا ہے فَلَا يَسْتَأْخِرُوْنَ سَاعَةً: یہ تو ظاہر کے مطابق ہے، کہ وہ اس سے پیچھے نہیں ہٹ سکتے، مثال کے طور پر اگر کسی جماعت کے متعلق یہ مقدر ہے کہ انہوں نے فلاں مہینے کی گیارہ تاریخ کو ہلاک ہونا ہے تو جب گیارہ تاریخ آجائے گی تو وہ پیچھے نہیں ہٹیں گے یعنی بارہ تاریخ ان پہ نہیں آسکتی، اور لَا يَسْتَقْدِمُوْنَ کا یہ معنی ہے کہ وہ آگے نہیں بڑھ سکتے، یعنی گیارہ کی بجائے وہ دس کو ہلاک نہیں ہوسکتے، جو وقت متعین ہے اسی وقت ہی ہلاک ہوں گے۔ لیکن اس میں بظاہر اِشکال ہے کہ جب ان کا وقت آگیا یعنی گیارہ تاریخ آگئی تو نہ تو پیچھے ہٹیں گے کہ بارہ تاریخ کو ہلاک ہوں، نہ یہ آگے بڑھیں گے کہ دس کو ہلاک ہوجائیں۔ گیارہ تاریخ

کے آجانے کے بعد دس کے آنے کا تو احتمال ہی نہیں، یہ تو ہوسکتا ہے کہ گیارہ کی بجائے بارہ کو عذاب کو آجائے، لیکن یہ تو نہیں ہوسکتا کہ گیارہ تاریخ آنے کے بعد دس تاریخ میں وہ ہلاک ہو جائیں۔ تو لَا يَسْتَقْدِمُوْنَ میں جو نفی کی جا رہی ہے یہ محض تاکید کے طور پر ہے، اگرچہ شق ایک منفی ہے، دوسری شق کو منفی کر دیا جاتا ہے بطور تاکید کے، کہ بارہ تاریخ تک مؤخر ہونا ایسے ہی محال ہے کہ جس طرح سے گیارہ تاریخ آجانے کے بعد دس تاریخ کو ان کا ہلاک ہونا محال ہے، یعنی یقینی طور پر وہ اسی تاریخ کو ہلاک ہوں گے جس تاریخ کا اللہ تعالیٰ نے اپنے علم کے اندر تعین کیا ہوا ہے۔ جس طرح سے آپ کسی چیز کو خریدتے وقت دُکان دار سے اس کی قیمت کے متعلق پوچھتے ہیں، تو دُکان دار کہے کہ پانچ روپے، تو آپ اس سے پوچھا کرتے ہیں کہ گھٹ ودھ؟ (کمی بیشی؟) حالانکہ پوچھنا گھٹ کا مقصود ہوتا ہے کہ اس سے کچھ کمی ہے، تو کمی بیشی کا لفظ آپ بولتے ہیں، حالانکہ دریافت کرنا ہے کمی کو، ساتھ محاورۃً بیشی کا لفظ بھی بول دیتے ہیں، اور وہ آگے سے کہتا ہے نہ گھٹ نہ وَدھ، نہ کم نہ بیش، مطلب یہ ہوتا ہے کہ جیسے میں پانچ کی بجائے آپ سے اب چھ نہیں مانگ سکتا اسی طرح سے پانچ کی بجائے میں چار بھی نہیں کہتا۔ تو نفی تو اصل میں کرنی ہوتی ہے چار کی، کہ پانچ ہی اس کی قیمت ہے چار نہیں، لیکن وہ کہتا ہے نہ گھٹ نہ ودھ، نہ کم نہ بیش، تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ بیش تو یقیناً منفی ہے، کہ جب میں پانچ کہہ رہا ہوں تو پانچ کی بجائے چھ نہیں لوں گا، اسی طرح سے پانچ کی بجائے میں چار بھی نہیں لوں گا، تو ایک شق کی نفی کرنی ہوتی ہے تو دوسری شق کا ذکر بطور تاکید کے آجاتا ہے، یہاں اصل تو استئخار کی نفی کرنی ہے کہ وہ اپنے وقت سے ایک گھڑی پیچھے نہیں ہٹ سکتے، تو اِستقدام کی نفی بطور تاکید کے کر دی۔ یا لَا يَسْتَقْدِمُوْنَ کا عطف اِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ کے اوپر کیجیے، یہ اِذَا کے نیچے داخل نہیں ہے، (اب مفہوم یوں ہوگا) لَا يَسْتَقْدِمُوْنَ: اپنے وقت سے مقدم نہیں ہو سکتے، جب وقت آجائے گا تو مؤخر بھی نہیں ہوسکیں گے۔ لیکن پہلی تقریر زیادہ اچھی ہے۔

کفّار کو مختلف انداز سے عذاب کی وعید

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُهٗ بَيَاتًا اَوْ نَهَارًا: آپ ان سے پوچھیے کہ بتلاؤ تم، اگر تمہارے پاس اللہ کا عذاب رات کے وقت آجائے جبکہ تم غفلت میں سوئے ہوتے ہو، یا دِن کے وقت آجائے، ڈنکے کی چوٹ سے، علی الاعلان، جس وقت کہ اس کے آثار نمایاں ہوں، دونوں صورتوں میں تمہارے پاس بچنے کی کیا تدبیر ہے؟ رات کو آجائے تو بھی تم نہیں بچ سکتے، دِن کو آجائے تو بھی تم نہیں بچ سکتے، تو کونسی چیز اس عذاب میں ایسی ہے جس کو تم جلدی طلب کر رہے ہو؟ وہ کون سا مرغوب فیہ ہے کہ جس کی وجہ سے تم یہ سمجھتے ہو کہ جلدی جلدی آجائے، اس کو جلدی طلب نہ کرو، دن کو آجائے یا رات کو آجائے تم اس کو دور نہیں ہٹا سکو گے، اور وہ تلخ چیز ہے، کوئی مزیدار چیز نہیں کہ جس کو تم شوق کے ساتھ طلب کر رہے ہو، جلدی طلب کرنے کی چیز نہیں ہے، ''کیا چیز ہے اس عذاب میں سے جس کو یہ جلدی طلب کرتے ہیں؟'' یعنی اِن کی حماقت ہے یہ جو اپنے لیے مصیبت مانگتے ہیں۔ ''کیا پھر جس وقت وہ عذاب واقع ہو جائے گا پھر ان کو یقین آجائے گا؟ کہ اللہ کی طرف سے عذاب کی خبر سچی تھی، پھر یہ ایمان لے آئیں گے؟ اٰمَنْتُمْ بِهٖ: پھر تم اس عذاب پہ ایمان لے آؤ گے، بایں معنی کہ اللہ کی طرف سے یہ خبر سچی تھی، لیکن پھر اس کو سچی سمجھنے کا فائدہ کیا ہوگا؟ پھر اللہ تعالیٰ کی

طرف سے کہا جائے گا کہ ''اب ایمان لاتے ہو؟ حالانکہ تم پہلے اس عذاب کو جلدی طلب کرتے تھے'' مطلب یہ ہے کہ پہلے تمہارا جلدی طلب کرنا تکذیب کی بنا پر تھا، اب عذاب کے آجانے کے بعد اگر مان ہی لوگے کہ اللہ کی طرف سے یہ خبر سچی تھی، اللہ پر ایمان لے آؤ گے یا اس عذاب کے متعلق یقین کر لوگے کہ خبر صحیح تھی، تو اب اس کے یقین کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ ''پھر کہا جائے گا ان لوگوں کو جنھوں نے ظلم کیا کہ چکھو ہمیشگی کا عذاب، نہیں بدلہ دیے جاتے تم مگر انہی کاموں کا جو تم کیا کرتے تھے۔'' اسی طرح سے آپ سے یہ بار بار پوچھتے ہیں استہزا کے طور پر تنگ کرنے کے لئے، کہ ''کیا یہ عذاب کی خبر سچی ہے؟ آپ کہہ دیجیے ہاں میرے ربّ کی قسم!'' اِیْ: یہ حروف ایجاب میں سے ہے یہ نَعَمْ کی طرح ہوتا ہے لیکن ہمیشہ قسم کے ساتھ استعمال ہوتا ہے، ''آپ کہہ دیجیے کہ ہاں میرے ربّ کی قسم!'' اِنَّهٗ لَحَقٌّ: یہ خبر بالکل سچی ہے، لیکن جس وقت اللہ کا عذاب آجائے گا تو تم اللہ کو عاجز نہیں کر سکو گے، اللہ کے عذاب سے بچ نہیں سکو گے، اس لیے اپنے انجام کی فکر کرو، بار بار اس قسم کی باتیں کرنا تمہارے لیے مفید نہیں، جب ایک خطرے سے آگاہ کیا جا رہا ہے تو اس خطرے سے اپنے آپ کو بچانے کی فکر کرو، جب عذاب آجائے گا تو پھر تم بچ نہیں سکو گے۔ اور پھر کیفیت یہ ہوگی کہ اگر ہر اس نفس کے لئے جس نے ظلم کیا، کفر و شرک کے اندر مبتلا ہوا، سب چیزیں ہوں جو زمین میں ہیں، تمام کے تمام خزانے اس کے پاس ہوں، تو وہ سارے خزانے دے کر اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کرے گا، آج تم اپنے ذرا سے مفاد کو تلف ہوتا ہوا دیکھتے ہو، چڑ جاتے ہو، ضد میں آجاتے ہو، تھوڑا سا نقصان برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں لیکن جب وہ عذاب سامنے آجائے گا، اللہ کی گرفت ہو جائے گی، پھر زمین کے سارے خزانے ہوں گے تو کہو گے کہ یہ لے لو اور ہماری جان چھوڑ دو۔ اس کو فدیہ میں دے کے اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کرے گا، وَاَسَرُّوا النَّدَامَةَ: اور دل کے اندر نادم ہوں گے، لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ: جس وقت کہ عذاب کو دیکھیں گے۔ ''دل میں نادم ہوں گے'' یعنی ندامت ہی ندامت ہوگی، پھر پشیمان ہوں گے، پچھتائیں گے کہ ہم نے یہ کیا کر لیا۔ ''اور ان کے درمیان انصاف کے ساتھ فیصلہ کر دیا جائے گا اور وہ ظلم نہیں کیے جائیں گے''۔

اِنَّ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ: یہ پھر توحید کا اثبات ہے، کہ خبردار! بے شک اللہ ہی کے لئے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور زمین میں ہے، خبردار! اللہ کا وعدہ سچا ہے، لیکن اکثر لوگ جانتے نہیں۔ هُوَ یُحْیٖ وَیُمِیْتُ: زندگی دینا اسی کے اختیار میں ہے، موت دینا اسی کے اختیار میں ہے، وہی زندہ کرتا ہے وہی مارتا ہے، وَاِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ: اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔ یہ پیچھے جو لفظ ذکر کیے گئے کہ ظلم کرنے والا نفس، آخرت میں اگر اس کے پاس زمین کے سارے خزانے موجود ہوں گے تو ان کو پیش کر کے وہ اپنے آپ کو چھڑانا چاہے گا۔ اس کے ساتھ آپ ایمان کی قدر و قیمت معلوم کر لیجیے، کہ آج جو چند ٹکوں کی خاطر انسان بے ایمان ہو جاتا ہے، ایمان کے تقاضوں کے خلاف کرنے لگ جاتا ہے، لیکن اس وقت پتا چلے گا کہ ایمان کتنی قیمتی چیز ہے، کہ اللہ تعالیٰ کی طرف نجات حاصل کرنے کے لئے ایمان اگر ہوگا تو نجات حاصل ہو جائے گی، ایمان گویا کہ بدلہ اُس نجات کا، اور اگر ایمان نہ ہوا تو سونے کے پہاڑ ہوں، اور سونا اتنا اکٹھا کر دیا جائے کہ زمین اور آسمان کا مابین بھر جائے، اتنی دولت اگر اُس وقت موجود ہوگی تو بھی اس دولت کو پیش کر کے انسان نجات حاصل نہیں کر سکے گا، تو اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کے ہاں ایمان کی کتنی قدر

وقیمت ہے، اور دنیا کے اندر رہتا ہوا انسان کتنا غافل ہے اس کی قدر و قیمت سے کہ معمولی معمولی چیز کی خاطر، رشتے داروں کی[1] ناراضگی سے بچنے کے لئے ایمان کی پروانہیں کرتا۔

يَآيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ ۙ وَهُدًى
اے لوگو! تحقیق آ گئی تمہارے پاس تمہارے رَبّ کی طرف سے نصیحت اور شفا اُن چیزوں کے لئے جو سینوں میں ہیں اور ہدایت
وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۝٥٧ قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ
اور رحمت مؤمنین کے لئے ۝٥٧ آپ کہہ دیجئے کہ یہ اللہ کے فضل اور اللہ کی رحمت کے ساتھ حاصل ہوئی، اور لوگوں کو چاہیے کہ اس کے ساتھ
فَلْيَفْرَحُوْا ۭ هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ۝٥٨ قُلْ اَرَءَيْتُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ لَكُمْ مِّنْ رِّزْقٍ
خوش ہوں، جو کچھ لوگ جمع کرتے ہیں اس کے مقابلے میں یہ بہتر ہے ۝٥٨ آپ کہہ دیجیے کہ بتلاؤ تم، جو رزق اللہ نے تمہارے لیے اُتارا
فَجَعَلْتُمْ مِّنْهُ حَرَامًا وَّحَلٰلًا ۭ قُلْ آٰللّٰهُ اَذِنَ لَكُمْ اَمْ عَلَى اللّٰهِ تَفْتَرُوْنَ ۝٥٩
پھر تم نے اس میں سے حرام اور حلال بنالیا، آپ اِن سے پوچھئے کیا اللہ نے تمہیں اجازت دی ہے یا تم اللہ کے اُوپر جھوٹ گھڑتے ہو؟ ۝٥٩
وَمَا ظَنُّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ
جو لوگ اللہ پر جھوٹ گھڑتے ہیں ان کا قیامت کے دِن کے متعلق کیا خیال ہے، بے شک اللہ تعالیٰ لوگوں پر
عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَشْكُرُوْنَ ۝٦٠ وَمَا تَكُوْنُ فِيْ شَاْنٍ وَّمَا تَتْلُوْا مِنْهُ مِنْ
فضل والا ہے لیکن ان میں سے اکثر شکر گزار نہیں ۝٦٠ اور نہیں ہوتے آپ کسی حال میں اور نہیں پڑھتے آپ کتاب اللہ میں سے کچھ
قُرْاٰنٍ وَّلَا تَعْمَلُوْنَ مِنْ عَمَلٍ اِلَّا كُنَّا عَلَيْكُمْ شُهُوْدًا اِذْ تُفِيْضُوْنَ فِيْهِ ۭ وَمَا يَعْزُبُ
قرآن، اور نہیں کرتے ہو تم کوئی عمل مگر ہم تم پر حاضر ہوتے ہیں جس وقت کہ تم اس کام میں لگتے ہو، اور نہیں چھپتا
عَنْ رَّبِّكَ مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ وَلَآ اَصْغَرَ مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْبَرَ
تیرے رَبّ سے ذرّے کا وزن زمین میں اور نہ آسمان میں، اور نہ اس سے چھوٹا نہ اس سے بڑا

(۱) اس کے بعد ریکارڈنگ نہ ملنے کی وجہ سے بات درمیان میں رہ گئی۔

إِلَّا فِي كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ﴿٦١﴾ أَلَآ إِنَّ أَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿٦٢﴾

مگر یہ سب کچھ ایک واضح کتاب میں ہے ﴿۶۱﴾ خبردار! بے شک اللہ کے دوست نہ ان پر کوئی خوف ہے اور نہ وہ غم زدہ ہوتے ہیں ﴿۶۲﴾

الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ﴿٦٣﴾ لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ

جو ایمان لاتے ہیں اور تقویٰ اختیار کرتے ہیں ﴿۶۳﴾ ان کے لئے بشارت ہے دُنیوی زندگی میں اور آخرت میں،

لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿٦٤﴾ وَلَا يَحْزُنْكَ قَوْلُهُمْ إِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ

اللہ کے کلمات کے لئے تبدیلی نہیں، یہ بہت بڑی کامیابی ہے ﴿۶۴﴾ آپ کو ان کی بات غم میں نہ ڈالے، بے شک غلبہ اللہ ہی کے لئے ہے

جَمِيْعًا هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿٦٥﴾

سارے کا سارا، وہ سننے والا ہے جاننے والا ہے ﴿۶۵﴾

خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ: اے لوگو!، قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ: تحقیق آ گئی تمہارے پاس تمہارے ربّ کی طرف سے نصیحت، مَّوْعِظَةٌ یہ مصدر میمی ہے، وَعَظَ يَعِظُ وَعْظ: نصیحت کرنا، اس کے مفہوم میں یہ داخل ہوتا ہے کہ ایسی باتیں کسی کے سامنے کرنا جس کے ساتھ اس کے اوپر رِقّت طاری ہو، وَشِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ: اور آ گئی تمہارے پاس شفاء اُن چیزوں کے لئے جو سینوں میں ہیں، صدور صدر کی جمع، صدر بول کر دِل مراد ہوتا ہے، ما فی الصدور سے مراد دِل کے روگ، سینے کی بیماریاں، وَهُدًى: اور آ گئی تمہارے پاس ہدایت، هدیٰ اور هدایت مصدر ہیں، راہنمائی کرنا، وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ: اور آ گئی تمہارے پاس رحمت مؤمنین کے لئے۔ قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ: بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ اس کا متعلق محذوف ہے، آپ کہہ دیجئے یہ نعمت جس کا ذکر پیچھے آیا، جس کا مصداق قرآنِ کریم ہے یہ اللہ کے فضل اور اللہ کی رحمت کے ساتھ حاصل ہوئی، فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا: اور لوگوں کو چاہیے کہ اِس کے ساتھ خوش ہوں، هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ: وہ بہتر ہے مَا يَجْمَعُوْنَ سے، ''مَا'' عام ہے، ہر وہ چیز جس کو لوگ جمع کرتے ہیں، جو کچھ لوگ جمع کرتے ہیں اس کے مقابلے میں یہ بہتر ہے۔ قُلْ اَرَءَيْتُمْ: آپ کہہ دیجئے کہ بتلاؤ تم، مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ لَكُمْ مِّنْ رِّزْقٍ: جو اللہ نے رزق تمہارے لئے اُتارا، مِّنْ رِّزْقٍ مَا کا بیان ہے، جو رزق اللہ نے تمہارے لئے اُتارا، فَجَعَلْتُمْ مِّنْهُ حَرَامًا وَّحَلٰلًا: پھر تم نے اس میں سے حرام اور حلال بنالیا، یعنی کسی کو حرام ٹھہرا دیا، کسی کو حلال ٹھہرا دیا، قُلْ آٰللّٰهُ اَذِنَ لَكُمْ: آپ ان سے پوچھئے، یہ قُلْ وہی ''اِسْئَلْ'' کے مقام میں ہے، ان سے آپ پوچھئے کیا اللہ نے تمہیں اجازت دی ہے؟ اَمْ عَلَى اللّٰهِ تَفْتَرُوْنَ: یا تم اللہ کے اوپر جھوٹ گھڑتے ہو، افترا کرتے ہو؟ وَمَا ظَنُّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ: یہ ''مَا'' اِستفہامیہ ہے، جو لوگ اللہ پر جھوٹ

گھڑتے ہیں اُن کا قیامت کے متعلق کیا خیال ہے؟ اس اِستفہام کے اندر تنبیہ ہے، انہوں نے کیا سمجھ رکھا ہے قیامت کے دن کو؟ اس اِستفہام میں تنبیہ ہوتی ہے، ''کیا خیال ہے ان لوگوں کا جو اللہ پر جھوٹ گھڑتے ہیں قیامت کے دن کے متعلق؟'' اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ: بے شک اللہ تعالیٰ لوگوں پر فضل والا ہے، وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَشْكُرُوْنَ: لیکن ان میں سے اکثر شکرگزار نہیں، قدر نہیں کرتے اللہ کے فضل کی۔ وَمَا تَكُوْنُ فِيْ شَاْنٍ: شان حال کو کہتے ہیں، اور نہیں ہوتے آپ کسی حال میں، وَّمَا تَتْلُوْا مِنْهُ مِنْ قُرْاٰنٍ: یہ مِنْهُ کی ضمیر کا مرجع کیا ہے؟ بیان القرآن میں حضرت تھانوی ؒ نے مِنْهُ کی ضمیر کا مرجع شان کو بنایا ہے، ''آپ کسی شان میں ہوں، خصوصیت کے ساتھ اُس شان میں سے ایک یہ شان ہے کہ آپ قرآن پڑھتے ہوں''، آپ کے قرآن پڑھنے کا حال، جو کہ آپ کا تبلیغ کا حال ہے، لوگوں کے سامنے اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے پیش کرنے کا حال ہے، اِس کو خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا جارہا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس حال کو بھی جانتے ہیں، چونکہ ایسے وقت میں دشمن آپ پر ٹوٹ پڑتے تھے، تکلیف پہنچانے کی کوشش کرتے تھے، تو اللہ تعالیٰ اُس حال کے متعلق اپنے علم کا ذکر فرما کر حفاظت کا وعدہ فرماتے ہیں کہ آپ کا یہ حال اللہ سے مخفی نہیں، جس طرح سے آگے الفاظ آرہے ہیں، تو عام حالات میں سے خصوصیت کے ساتھ اُس حال کا ذکر کردیا جس وقت آپ قرآن پڑھتے ہیں، تو مِنْهُ کی ضمیر شان کی طرف لوٹ گئی، ''اُس شان میں سے ایک یہ واقعہ ہے کہ نہیں پڑھتے آپ قرآن۔'' اور بعض تفاسیر کے اندر مِنْهُ کی ضمیر کتاب اللہ کی طرف لوٹائی گئی ہے جس کا ذکر پیچھے آیا ہے، اور پھر قرآن سے اس کا کچھ حصہ مراد ہے، ''نہیں پڑھتے آپ اس کتاب اللہ میں سے کچھ حصہ'' یعنی جس وقت بھی آپ کچھ آیات تلاوت فرماتے ہیں لوگوں کے سامنے، تو مِنْهُ کی ضمیر چلی جائے گی کتاب اللہ کی طرف، اور مِنْ قُرْاٰنٍ سے اس کا کچھ حصہ مراد ہوجائے گا، ''نہیں پڑھتے آپ کتاب اللہ میں سے کچھ قرآن'' وَلَا تَعْمَلُوْنَ مِنْ عَمَلٍ: اور نہیں عمل کرتے تم، یہ جمع کے صیغے کے طور پر آگیا جس میں صحابہ بھی ساتھ شامل ہیں، ''اور نہیں کرتے ہو تم کوئی عمل'' اِلَّا كُنَّا عَلَيْكُمْ شُهُوْدًا: مگر ہم تم پر حاضر ہوتے ہیں، دیکھنے والے ہوتے ہیں، شہود شاھد کی جمع، گواہ ہوتے ہیں، مشاہدہ کرنے والے ہوتے ہیں، اِذْ تُفِيْضُوْنَ فِيْهِ: جس وقت کہ تم اس کام میں لگتے ہو، اَفَاضَ فِيْهِ: کسی کام میں شروع ہونا، یعنی شروع ہونے سے ہی ہم اُس کو دیکھنے والے ہوتے ہیں، اُس کا مشاہدہ کرنے والے ہوتے ہیں، وَمَا يَعْزُبُ عَنْ رَّبِّكَ مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ: اور نہیں چھپتا تیرے رَبّ سے ذرّے کا وزن زمین میں اور نہ آسمان میں، اور نہ اُس سے چھوٹا نہ اس سے بڑا، اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ: مگر یہ سب کچھ ایک واضح کتاب میں ہے، اَلَاۤ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ: خبردار! بے شک اللہ کے دوست، اولیاء ولی کی جمع ہے، اللہ سے قرب رکھنے والے، وَلِيَ قریب ہونے کو کہتے ہیں، دوستی لگانے کو بھی کہتے ہیں، ''بے شک اللہ سے قرب رکھنے والے، اللہ کے دوست'' لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ: نہ ان پر کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمزدہ ہوتے ہیں، اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا: وہ اولیاء اللہ کون ہیں؟ جو ایمان لاتے ہیں، وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ: اور تقویٰ اختیار کرتے ہیں، لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا: ان کے لئے بشارت ہے دُنیوی زندگی میں، وَفِي الْاٰخِرَةِ: اور آخرت میں، دُنیوی زندگی میں اور آخرت میں ان کے لئے بشارت ہے، لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ: اللہ کے کلمات کے لئے تبدیلی نہیں، کلمات سے یہاں اللہ کے وعدے مراد ہیں، ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ: یہ بہت بڑی کامیابی ہے، وَلَا يَحْزُنْكَ قَوْلُهُمْ: آپ

کو ان کی بات غم میں نہ ڈالے، اِنَّ الْعِزَّۃَ لِلّٰہِ جَمِیْعًا: بے شک عزت، غلبہ اللہ ہی کے لئے ہے سارے کا سارا، هُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ: وہ سننے والا ہے جاننے والا ہے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

تفسیر

ماقبل سے ربط

کچھ آیات پہلے قرآنِ کریم کا تذکرہ آیا تھا: وَمَا كَانَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ اَنْ يُّفْتَرٰى مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ، قرآنِ کریم کی عظمت اس میں بھی بیان کی گئی تھی اور لوگوں کو متوجہ کیا گیا تھا کہ اس کو اللہ کی کتاب سمجھو اور اللہ کی طرف سے آیا ہوا سمجھو اور اس سے ہدایت حاصل کرنے کی کوشش کرو، یہ کسی انسان کا بنایا ہوا نہیں، انسان کا گھڑا ہوا نہیں، اور ''یہ اللہ کی جانب سے ہے، انسان کی طرف سے بنایا ہوا نہیں'' اس کے لئے واضح دلیل بیان کی گئی تھی کہ اگر یہ انسان کی طرف سے بنایا ہوا ہوتا تو تم اس کی مثل بنانے پر قادر ہوتے، ایک آدمی اکیلا اس کی مثل تیار نہیں کرسکتا تو سارے مل کر کر لیتے، پورے کے پورے قرآن کی نقل نہ اُتار سکتے تو چلو اس کے مقابلے میں ایک سورت ہی بنا کے لے آتے، جب تم اس جیسی ایک سورت بھی نہیں بنا سکے تو پھر سمجھ لو کہ یہ انسان کی قدرت سے باہر ہے۔ قرآنِ کریم کی حقانیت کا اعتقاد انسان کے لئے ہدایت کا دروازہ کھولتا ہے، کہ جب اس کو سمجھ لیا جائے کہ یہ اللہ کی جانب سے ہے تو پھر اس میں جو باتیں ذکر کی ہوئی ہوں گی ان کو انسان تسلیم کرے گا، جن باتوں سے روکا ہوا ہوگا ان سے رکے گا، عقیدہ اس کے مطابق رکھے گا۔ تو پھر وہاں سے آگے کلام منتقل ہوگئی تھی ان کے شرک کے رد کی طرف کہ جو باتیں ان کے لئے مانع بنتی تھیں اس قرآنِ کریم سے ہدایت حاصل کرنے سے، وہ ان کا اس کی باتوں کے ساتھ استہزاء تھا، آخرت کا انکار تھا، شفعاء پر اعتماد تھا، تو مختلف آیات کے اندر اس سورت میں اُن کے اِن نظریات کی تغلیط کی گئی ہے۔ اب یہ آیتیں جو آپ کے سامنے پڑھی گئیں ان میں بھی پہلے اللہ تبارک وتعالیٰ نے اسی قرآنِ کریم کی عظمت کو بیان فرمایا ہے۔

''موعظہ''، ''شفاء''، ''ھدیٰ'' اور ''رحمت'' میں فرق

سب لوگوں کو خطاب کیا، اگرچہ براہِ راست مخاطب وہی تھے جو نزولِ قرآن کے وقت موجود تھے لیکن ہے یہ خطاب عام۔ ''تمہارے پاس نصیحت آگئی'' قرآنِ کریم کے لئے یہاں چار لفظ استعمال کیے گئے، موعظہ، شفاء، ھدیٰ اور رحمت، کہ یہ قرآنِ کریم موعظہ بھی ہے، شفا بھی ہے، ہدایت بھی ہے اور رحمت بھی ہے، ان چاروں لفظوں کے درمیان میں فرق یوں سمجھ لیجئے کہ ''موعظہ'' کا تعلق اس بات سے ہے کہ قرآنِ کریم تمہیں منہیات سے روکتا ہے، بُرے کاموں سے روکتا ہے، اللہ تعالیٰ کی نافرمانیوں سے روکتا ہے، اس اعتبار سے یہ موعظہ ہے، اور اگر کوئی شخص اس کی وعظ سے متاثر ہو کر ان کاموں سے باز آجائے تو پھر نتیجۃً یہ شِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ ثابت ہوگا، کہ اللہ تعالیٰ کی آیات سے متاثر ہو کر اگر ان بداعمالیوں سے باز آجاؤ گے تو سینے کے روگ

دُور ہوتے ہیں، اور نیکیاں کرنے کے لئے یہ راہنمائی ہے، "هُدًى" کا مطلب ہو جائے گا کہ ایسے کاموں کی راہنمائی کرتا ہے کہ جن کاموں کے ساتھ انسان کو سعادت حاصل ہوتی ہے، اللہ راضی ہوتا ہے، دنیا اور آخرت میں انسان نیک بختی حاصل کرتا ہے، کامیابی حاصل کرتا ہے، اس اعتبار سے یہ هُدًى کا مصداق ہے، ہدایت ہے، اور جس وقت کوئی شخص اس بات سے متاثر ہو کر ایسے اعمال کو اختیار کر لے جو ہدایت کا مصداق ہیں جو اللہ تعالیٰ کی مرضیات کی طرف راہنمائی کرتے ہیں، جس وقت کوئی شخص ان باتوں پہ عمل کرے گا تو نتیجۃً اس کو رحمت حاصل ہوگی۔ لیکن یہ ساری کی ساری چیزیں حاصل انہی کو ہوں گی جو پہلے ایمان لائیں کہ واقعی یہ اللہ کی کتاب ہے اور یہ اللہ کے رسول پر اتری ہے، اگر کوئی شخص ایمان نہیں لاتا تو اس کے لئے نہ یہ موعظہ ثابت ہو سکتی ہے، نہ شفا ثابت ہو سکتی ہے، نہ ہدایت نہ رحمت، اس نعمت سے فائدہ وہی لوگ اٹھائیں گے جو کہ ایمان لاتے ہیں۔ تو چاروں لفظوں میں اس طرح سے فرق ہو گیا۔

"قلب" خیر اور شر کا منبع ہے

شِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ، مافی الصدور سے کیا مراد ہے؟ جس کے لئے قرآنِ کریم شفا بنتا ہے، روح کے لئے یہ شفا کا باعث ہے، روح کی بیماریوں کو دُور کرنے کا ذریعہ ہے، اور روح ہی اصل کے اعتبار سے انسان ہے، جس کی نسبت انسان کے قلب کی طرف ہوتی ہے، روح کا مرکزی تعلق قلب کے ساتھ ہی ہوتا ہے، قلب کی حیات کے ساتھ ہی انسان کی حیات ہے، قلب کے مرنے کے ساتھ ہی انسان کی موت ہے، حسی طور پر بھی اور روحانی طور پر بھی، حسی طور پر بھی دل اگر ٹھہر جائے، یہ جو دھڑکتا ہے، اس کا دھڑکنا بند ہو جائے تو انسان مر جاتا ہے، اور جس وقت تک یہ دل دھڑکتا رہے یہ بدن کی زندگی کی نشانی ہے، انسان اس وقت تک زندہ ہے جس وقت تک قلب حرکت کر رہا ہے اور زندہ ہے، اور جس وقت یہ قلب ٹھہر جائے تو اس وقت انسان کی موت ہوتی ہے، تو ظاہری بدن کی حیات اور موت کا تعلق بھی اسی قلب کے ساتھ ہے، اور اسی طرح سے روحانی صحت مرض، روحانی حیات موت، اس کی نسبت بھی قلب کی طرف کی گئی ہے، سرورِ کائنات ﷺ نے فرمایا: "اَلَا اِنَّ فِي الْجَسَدِ لَمُضْغَةً" خبردار! بدن کے اندر گوشت کا ایک ٹکڑا ہے، "اِنْ صَلُحَتْ صَلُحَ الْجَسَدُ كُلُّهٗ وَاِنْ فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهٗ" اگر وہ دُرست ہو جائے تو سارا بدن درست ہوتا ہے، اور اگر وہ خراب ہو جائے تو سارا ہی بدن خراب ہوتا ہے، "اَلَا وَهِيَ الْقَلْبُ!" بے شک وہ گوشت کا مضغہ قلب ہے۔[1] اس کے درست ہونے کے ساتھ سارے بدن کی درستی ہے، اگر قلب کی اصلاح ہو جائے تو سارے بدن کی اصلاح ہو جاتی ہے، اور اگر قلب کے اندر فساد ہو تو سارے بدن کے اندر فساد ہوتا ہے، تو خیر اور شر کا منبع بھی قلب ہے۔

قرآنِ کریم اصل کے اعتبار سے رُوحانی بیماریوں کے لئے شفا ہے

قرآنِ کریم کا براہِ راست تعلق تو انہی امراض کے ساتھ ہے جو روحانی ہیں، اور دنیا کے اندر فساد اور امن اسی روحانی صحت اور انہی روحانی امراض کی بناء پر ہی ہوتا ہے، قلب کے اندر کفر ہے، شرک کا جذبہ ہے، حسد، بغض، عناد، حب دنیا، غفلت، تکبر،

---

(۱) بخاری ج ۱ ص ۱۳ باب فضل من استبرأ لدینہ / مسلم ج ۲ ص ۲۸ باب اخذ الحلال / مشکوٰۃ ج ۱ ص ۲۴۱ باب الکسب، فصل اول، عن النعمان رضی اللہ عنہ

عُجب، تصوف کے اندر اس قسم کی چیزوں کی تفصیل آپ کے سامنے ذکر کی جاتی ہے، یہ سب بیماریاں ہیں، جو شخص ان بیماریوں سے بیمار ہوتا ہے اور ان امراض کا مریض ہوتا ہے وہ لوگوں کے لئے کبھی باعث راحت نہیں ہوسکتا، ظاہری دنیا کے اندر بھی وہ فساد کا باعث بنتا ہے، آخرت کے معاملے کو چھوڑیے! دنیا کے اندر بھی اس قسم کے لوگ جن میں تکبر ہے حسد ہے بغض ہے حبِ دنیا ہے غفلت ہے، وہ لوگوں کے لئے بھی مصیبت کا باعث بنتے ہیں، ان کی وجہ سے دنیا کا امن بھی برباد ہوتا ہے، اور جس وقت یہ بیماریاں دُور ہوجاتی ہیں اور قلب کے اندر صلاحیت پیدا ہوجاتی ہے تو اس میں ایثار آتا ہے، ہمدردی آتی ہے، محبت آتی ہے، مخلوقِ خدا پہ شفقت آتی ہے، خدمتِ خلق کا جذبہ ابھرتا ہے، اور ایک دوسرے کے دکھ درد میں شرکت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، تو اس کے ساتھ ظاہری دنیا کے اندر بھی امن قائم ہوتا ہے۔ تو "مافی الصدور" سے یہی بیماریاں مراد ہیں جو دل کو لگتی ہیں، سینے کو لگتی ہیں، اصل کے اعتبار سے انسانیت کی بیماریاں یہی ہیں، تو جب قرآنِ کریم کی تعلیمات پر عمل کیا جائے گا تو اللہ تعالیٰ ان کو دُور کردیتا ہے۔

قرآنِ کریم بدنی بیماریوں کے لئے بھی باعثِ شفا ہے

اور بعض بیماریاں ایسی بھی ہیں کہ جو انسان کے بدن سے تعلق رکھتی ہیں جیسے بخار چڑھ گیا، دانت میں درد ہوگیا، سر میں درد ہوگیا، ایسی بہت ساری تکلیفیں ہیں جو انسان کے بدن کو عارض ہوتی ہیں، اس دنیوی زندگی میں تکلیف دِہ ہوتی ہیں اور وہ بھی شخصی طور پر، (روحانی بیماریاں صرف شخصی طور پر ہی تکلیف دِہ نہیں ہوتیں، وہ امنِ عالم کے لئے بھی خطرہ ہوتی ہیں، دوسروں کی طرف بھی وہ متعدی ہوتی ہیں، ان کو نقصان پہنچاتی ہیں) تو بعض بدنی تکلیفیں ہیں جیسے اگر آپ کے دانت میں درد ہے سر میں درد ہے آنکھوں میں درد ہے، یا اور اس قسم کی کوئی تکلیف ہوگئی تو یہ آپ کے لئے مصیبت ہے، تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنی اس کلام کو ان کے لئے بھی باعثِ شفا بنایا ہے، اگرچہ ان الفاظ کا تعلق تو انہی روحانی امراض کے ساتھ ہی ہے، لیکن تجربہ کے ساتھ بھی یہ بات ثابت، اور سرورِ کائنات ﷺ کے عمل اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے عمل سے بھی ثابت، کہ قرآنِ کریم کے الفاظ بدنی بیماریوں کے لئے بھی شفا بنتے ہیں، اگرچہ وہ اس آیت کا مصداق نہیں، یعنی شفا کی مناسبت سے یہ بات ذکر کر رہا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم کے الفاظ کو بدنی تکلیفوں کے لئے بھی شفا بنایا ہے، یہ ایک مزید بات ہے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے زمانے میں بھی ایسے ہی تھا کہ کوئی تکلیف ہوجاتی تو بعض آیات پڑھ کے پھونک دیا جاتا تو آرام آجاتا تھا، حتیٰ کہ حدیث شریف میں صحابہ رضی اللہ عنہم کے ایک گروہ کا ذکر آتا ہے کہ کہیں جارہے تھے اور کسی قبیلے کے سردار کو سانپ نے کاٹ لیا تھا، اور انہوں نے ان سے کہا کہ کوئی دَم وغیرہ کرو (پہلے انہوں نے اُن سے مہمانی کا مطالبہ کیا تھا انہوں نے مہمانی نہیں کی) تو یہ کہنے لگے کہ ہم دم کریں گے لیکن اتنی بکریاں لیں گے، تو انہوں نے بکریاں دینے کا وعدہ کرلیا، تو سورۂ فاتحہ پڑھ کے دم کیا وہ ٹھیک ہوگیا، جب بکریاں لے لیں تو پھر شبہ ہوا کہ یہ تو اللہ تعالیٰ کی کتاب پر ہم نے اجرت حاصل کرلی، حضور ﷺ کے سامنے مسئلہ بیان ہوا، آپ ﷺ نے فرمایا کہ جائز ہے۔[1] اس لیے مسئلہ یہی ہے کہ دم جو کیا جاتا ہے اور تعویذ جو دیا جاتا ہے ظاہری امراض کے لئے تو اس کے اوپر اجرت لی جاسکتی ہے، بہرحال سورۂ فاتحہ پڑھنے سے اس

(۱) بخاری ۱/۳۰۴ باب ما یعطی فی الرقیہ۔ نیز ۲/۷۴۹۔ ۲/۸۵۴۔ ۲/۸۵۵۔ مشکوٰۃ ۱/۲۵۸ باب الاجارۃ، فصل اول، عن ابن عباس۔

کو آرام آ گیا، کسی کو جنون تھا سورۂ فاتحہ پڑھ کے دم کیا تو اس کو آرام آ گیا، تو علمائے اُمّت نے بھی اپنے تجربے کے طور پر آیات کے خواص لکھے ہیں کہ فلاں آیت پڑھنے سے فلاں مرض کو شفا ہوتی ہے، فلاں آیت پڑھنے سے فلاں مرض کو شفا ہوتی ہے تو اس قسم کی شفا بدنی امراض کے لئے بھی ہے اس میں کوئی شک نہیں لیکن قرآنِ کریم کا نزول اس لیے نہیں، یہ مزید اللہ تعالیٰ کا ایک فضل ہے رحمت ہے جو قرآنِ کریم کی برکت سے حاصل ہوتی ہے، کہ دُنیوی مصیبتیں، دُنیوی تکلیفیں، بدنی تکلیفیں بھی قرآنِ کریم کے الفاظ کی برکت سے اور ان کے پڑھنے سے دُور ہو جاتی ہیں، لیکن اس کے نزول کا جو اصل مقصد ہے وہ ہے رُوحانی شفا حاصل کرنا، کہ قلبی بیماریوں سے انسان نجات پائے، اگر کوئی شخص اس کو صرف تعویذ گنڈے کے لئے ہی رکھ لے تو ٹھیک ہے کہ بدنی فائدہ اس کو پہنچ جائے گا، دُنیوی طور پر اس کو نفع حاصل ہو جائے گا، لیکن قرآنِ کریم کے نزول کا جو اصل مقصد تھا اس سے وہ دُور ہٹ گیا، اصل مقصد اس سے یہی ہے کہ اس سے روحانی شفا حاصل کی جائے، دل کی بیماریوں کا علاج کیا جائے، اور دل کی بیماریوں سے وہی بیماریاں مراد ہیں جن کی تفصیل تصوف میں کی جاتی ہے، جو صوفیہ کے زیرِ بحث آتی ہیں، اور قرآنِ کریم کے احکام پر عمل کرنے کے ساتھ قلب کو شفا حاصل ہوتی ہے، پھر انسان صحیح طور پر صحت مند ہو جاتا ہے۔

قرآنِ کریم تکمیلِ انسانیت کے لئے نسخۂ کامل ہے

''ہدیٰ'' اور ''رحمت'' کا فرق بھی آپ کے سامنے ذکر کر دیا، کہ ''ہدیٰ'' کا مصداق ہو جائے گا کہ نیکی کے کاموں کی طرف یہ راہنمائی کرتا ہے جس طرح سے ''موعظۃ'' کا مصداق بنا دیا تھا کہ بُرے کاموں سے روکتا ہے، اور جس وقت نیکی کے کاموں کو آپ اپنائیں گے تو ان کے اپنانے کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی رحمت حاصل ہوگی، آپ کو فوائد پہنچیں گے، آخرت آپ کی آباد ہوگی، روحانی فوائد حاصل ہوں گے، گویا کہ ''ہدیٰ'' یہ غذا کے درجے میں ہے، اور ''رحمت'' کا مصداق ہوگا جو غذا کھانے سے قوت حاصل ہوتی ہے، اور اچھے نتائج سامنے آتے ہیں، اور ''موعظۃ'' ایک قسم کی پرہیز کے درجے میں تھی جس پرہیز کے اختیار کرنے کے ساتھ بیماری سے شفا حاصل ہوتی ہے، تو مثبت اور منفی دونوں پہلو آ گئے، تو قرآنِ کریم انسانیت کی تکمیل کے لئے ایک کامل نسخہ ہو گیا، کہ اس کو اگر پڑھا جائے اور اس کے تمام اَحکام پر عمل کیا جائے تو انسانیت کو کمال حاصل ہوتا ہے، لِلْمُؤْمِنِيْنَ کا مطلب یہ ہوا کہ فائدہ اس سے وہ ہی اٹھائیں گے جو کہ ایمان لائیں گے اور اگر اس کے ساتھ کوئی عقیدت نہیں لاتا، ایمان نہیں لاتا تو وہ شخص اس سے فائدہ نہیں اُٹھا سکتا۔

سوال:- انگریز نے اس قرآن سے فائدہ اُٹھایا، اسی سے اُصول لیے، حالانکہ وہ مؤمن نہیں ہیں، تو فائدہ تو انہوں نے اُٹھایا ہے۔

جواب:- میں نے عرض جو کیا ہے کہ اصل کے اعتبار سے قرآنِ کریم کا نزول روحانی شفا کے ساتھ ساتھ آخرت کی آبادی کے لئے ہے، دُنیوی فائدہ بھی اس سے اُٹھا سکتے ہیں، جس طرح سے اللہ تعالیٰ کی باقی نعمتیں ہیں ان سے دنیوی طور پر فائدہ اُٹھایا جاتا ہے، لیکن قرآنِ کریم کا اصل موضوع ہے آخرت کی فلاح، یہ فائدہ ایمان کے بغیر حاصل نہیں جا سکتا، حقیقی فائدہ وہی ہے،

باقی اعارضی فائدہ اگر دنیا کے اندر اس سے کافر بھی اُٹھالے تو ٹھیک ہے، کہ قرآنِ کریم نے ایک اصول بیان کیا، اس کو اگر دُنیوی طور پر مؤمن استعمال کرے گا تو دُنیوی طور پر وہ فائدہ اُٹھائے گا، کافر استعمال کرے گا تو کافر فائدہ اُٹھائے گا، دُنیا کی بات زیر بحث نہیں ہے، اللہ تعالیٰ نے مکھن بنایا، گھی بنایا، دُودھ بنایا، اس میں یہ تاثیر رکھی ہے کہ جو اس کو کھائے اس کو قوت حاصل ہوگی، دنیا کے اعتبار سے ٹھیک ہے کہ کافر کھائے گا تو اس کو قوت حاصل ہوجائے گی، مؤمن کھائے گا تو اس کو قوت حاصل ہوجائے گی۔ زہر اللہ نے پیدا کردی، اس میں تاثیر رکھی ہے کہ جو اس کو کھائے گا مرجائے گا، مؤمن کھائے گا تو مرجائے گا، کافر کھائے گا تو مرجائے گا، دُنیوی طور پر تو اللہ تعالیٰ نے ان قوانین کو برابر ہی رکھا ہے، اس میں کافر اور مؤمن کا کوئی فرق نہیں، مثلاً قرآنِ کریم نے بتادیا کہ تجارت کے اندر دیانت داری رزق میں برکت کا باعث ہے، اور تجارت کے اندر بددیانتی رزق میں بے برکتی کا باعث ہے، جس طرح سے حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی قوم کے سامنے تقریر کی تھی، وہ تجارت کے اندر خیانت کے عادی تھے، کم تولتے تھے، کم ماپتے تھے، اب اگر کوئی شخص اس اُصول کو اپناتا ہے، تو مؤمن ہے تو بھی وہ دُنیوی طور پر برکات حاصل کرلے گا، اور اگر کافر ہے تو بھی برکات حاصل کرلے گا، اور اگر کوئی خیانت کرے گا تو مؤمن ہوگا تو بھی خیانت کرنے کے ساتھ اس کی تجارت برباد ہوجائے گی، اور اگر کافر خیانت کرے گا تو اس کی تجارت بھی برباد ہوجائے گی۔ دنیا کے اعتبار سے تو یہ قوانین برابر کی سطح کے ہیں، لیکن قرآنِ کریم جو اصل مقصد ہے آخرت میں اللہ تعالیٰ کی رضا کا حاصل کرلینا اور نجات پالینا، اصلاحِ آخرت، وہ بغیر مؤمن کے اور کسی کے لئے نہیں ہے۔

"قرآنِ کریم" فضل ورحمتِ خداوندی ہے، اس پر شکر اَدا کرنا چاہیے

قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ: بِفَضْلِ اللّٰهِ کا متعلق آپ کے سامنے ظاہر کردیا کہ آپ کہہ دیجیے کہ یہ کتاب اللہ کے فضل اور اللہ کی رحمت کے ساتھ حاصل ہوئی، اور اس کے ساتھ لوگوں کو خوش ہونا چاہیے، اس کے حصول پر خوشی منانی چاہیے کہ اللہ نے یہ کتاب اُتاردی اور اس کو تسلیم کرنے کی توفیق دے دی، یہ بہت بڑی خوشی کی بات ہے، فرح کہتے ہیں خوش ہونے کو، لیکن خوش ہونا دو طرح کا ہوتا ہے، ایک خوش ہونا ہوتا ہے شکر کا، شکر والی خوشی، جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کسی نعمت کے حاصل ہوجانے کے بعد یہ تصور باقی رہے کہ یہ اللہ کے فضل اور اللہ کی رحمت سے حاصل ہوئی ہے، اس اعتبار سے خوش ہوا جائے تو یہ فرحِ شکر ہے، یہ محمود ہے، اس کا حکم ہے کہ اللہ کی نعمتوں کے اوپر خوش ہوؤ، یعنی شکر والی خوشی کہ اس نسبت کو باقی رکھو کہ یہ نعمت ہمیں اللہ کے فضل اور اللہ کی رحمت سے حاصل ہوئی، یہ مطلوب ہے۔ اور ایک ہے فرحِ بطر، اِترانا اور اکڑنا، وہ نعمت فخر اور غرور کا باعث بن جائے، یہ ممنوع ہے، جیسا کہ قرآنِ کریم میں دوسری جگہ آیا قارون کو خطاب کرتے ہوئے لَا تَفْرَحْ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْفَرِحِیْنَ قارون کا قصہ آپ کے سامنے سورۂ قصص کے آخر میں آئے گا، وہاں اللہ تعالیٰ قارون کا کچھ حال بیان فرماتے ہیں اِنَّ قَارُوْنَ كَانَ مِنْ قَوْمِ مُوْسٰی قارون موسیٰ علیہ السلام کی قوم سے ہی تھا، اور آگے اس کے خزانوں کی تعریف کی ہے وَاٰتَیْنٰهُ مِنَ الْكُنُوْزِ مَاۤ اِنَّ مَفَاتِحَهٗ لَتَنُوْٓاُ بِالْعُصْبَةِ اُولِی الْقُوَّةِ ہم نے اس کو اتنے خزانے دیے تھے کہ اس کے خزانوں کی چابیوں کو اٹھاکے اگر ایک جماعت چلتی تھی تو وہ بوجھ محسوس کرتی تھی، اس کے خزانوں کی اتنی چابیاں تھیں، تو خود خزانے کتنے ہوں گے اور مال ودولت کتنا ہوگا، کہ اس کی چابیاں بھی ایک جماعت کو بوجھ میں ڈال دیتی تھیں،

جماعت بوجھ محسوس کرتی تھی، اتنے خزانوں کا مالک ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے اچھے لوگوں کی وساطت سے جو پیغام ملا وہ یہی تھا کہ جو نعمتیں اللہ نے تجھے دی ہیں ان کو اللہ کا مال سمجھ، اللہ کے دیے ہوئے سمجھ، اور ان کے اُو پر تُو اترانہ، لَا تَفْرَحْ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْفَرِحِیْنَ: اترانہ، خوشی نہ کر، اللہ تعالیٰ خوش ہونے والوں کو پسند نہیں فرماتے، یہاں جو فرح ہے جس سے ممانعت آئی ہے کہ خوشی نہ کر، یہ فرح فرحِ بطر ہے، یہ فرحِ شکر نہیں ہے، اس کا حاصل یہ ہوتا ہے کہ انسان یہ سمجھے کہ مجھے قابلیت سے حاصل ہوئی ہے، اور اللہ کی طرف اس کی نسبت باقی نہ رہے، جیسے کہ اسی قارون کے قول میں آگے نقل کیا گیا ہے کہ اِنَّمَآ اُوْتِیْتُهٗ عَلٰی عِلْمٍ عِنْدِیْ کہ یہ مال و دولت جو مجھے دیا گیا یہ اس قابلیت کی وجہ سے دیا گیا ہے جو مجھے حاصل ہے، میں نے اس کو اپنی قابلیت کے ساتھ کمایا ہے، اپنے علم کے ساتھ اور اپنے ہنر کے ساتھ کمایا ہے، گویا کہ اس کو اللہ تعالیٰ کے فضل اور رحمت کا عطیہ نہیں سمجھتا تھا کہ اللہ کے فضل اور اللہ کی رحمت سے چیز حاصل ہوئی، ایسے طور پر جو فرح ہوتی ہے اس کو فرحِ بطر کہتے ہیں، اِترانا، اس کی ممانعت ہے۔

اللہ تعالیٰ کا شکر کیسے اَدا ہوسکتا ہے؟

بعض روایات میں ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے پوچھا تھا کہ یا اللہ! تیری نعمتوں کا شکر ادا کرنے کا کیا طریقہ ہے؟ تیری نعمتیں تو اتنی ہیں جو شمار میں نہیں آسکتیں، ہم ان کا شکر کس طرح سے ادا کر سکتے ہیں، اور اگر تیرا شکر ادا کرنے کی توفیق ہو ہی جائے تو یہ توفیقِ شکر ایک مستقل نعمت ہے، اس پر بھی شکر ادا ہونا چاہیے، تو کوئی طریقہ ہے کہ ہم تیرا شکر ادا کرسکیں؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ اللہ تعالیٰ سے سوال کیا اور بہت اہم سوال ہے، کہ اول تو تیری نعمتیں ہی شمار میں نہیں آتیں کہ جن کا ہم شکر ادا کریں، اور اگر شکر کی توفیق ہو جائے تو یہ توفیقِ شکر مستقل نعمت ہے، تو اس پر بھی پھر شکر ادا کرنا چاہیے، تو آپ کی منطقی اصطلاح میں یہ تو تسلسل لازم آرہا ہے کہ کسی وقت بھی جا کے یہ سلسلہ ختم نہیں ہوگا۔ تو اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے یہ جواب دیا گیا کہ اے موسیٰ! یہ بات جان لینا کہ جو کچھ تمہارے پاس ہے وہ میرا ہی دیا ہوا ہے بس یہ میرے شکر کے لئے کافی ہے، یعنی جس بندے کے تصور میں یہ بات رہتی ہے کہ میرے پاس جو کچھ ہے سب اللہ کا دیا ہوا ہے، اس میں میرے کمال کا دخل نہیں، میری استعداد کا دخل نہیں، اور یہ جذبات اس کے دل میں ابھرتے ہیں دماغ میں یہ خیالات آتے ہیں کہ جو کچھ ہے اللہ کا دیا ہوا ہے، ہماری قابلیت کا اس میں کوئی دخل نہیں، یہی بنیاد ہے اصل کے اعتبار سے شکر کی، وہ آدمی اللہ کا شکر گزار ہے جو ہر نعمت کی نسبت اللہ کی طرف کرتا ہے، دل دماغ کے اندر یہ جذبہ ہو تو پھر صحیح طور پر شکر ادا ہوتا ہے، تو یہاں بھی وہی بات ہے کہ اللہ کے فضل ورحمت کے ساتھ یہ نعمت حاصل ہوئی، اور اس کے اوپر خوشی مناؤ کہ اللہ نے یہ فضل فرمایا اور یہ رحمت تمہیں دے دی، اس کے اوپر خوش ہو جاؤ، تو یہ فرح شکر والی فرح ہے۔

''قرآنِ کریم'' سب سے عظیم دولت ہے

هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ: جو کچھ تم جمع کرتے ہو، جو کچھ تم اکٹھا کرتے ہو اس کے مقابلے میں یہ بہتر ہے مما یجمعون میں 'مَا'' عام ہے، جو کچھ لوگ اکٹھا کرتے ہیں۔ لوگ کیا اکٹھا کرتے ہیں، کیا جمع کرتے ہیں، سونا جمع کرتے ہیں، چاندی جمع کرتے ہیں، کپڑے جمع کرتے ہیں، اور باقی ضرورت کی جتنی چیزیں ہیں جن کو دنیا کے اندر لوگ اکٹھا کرتے ہیں سمیٹتے ہیں، خزانے بھرتے

ہیں، ہر چیز کے مقابلے میں یہ قرآنِ کریم بہتر ہے، کتنا قطعی طور پر یہ اعلان کر دیا گیا ھُوَ خَیْرٌ مِّمَّا یَجْمَعُوْنَ، مَا کو عام رکھا گیا، کسی ایک چیز کے ساتھ اس کا مقابلہ نہیں کیا گیا، جو کچھ لوگ جمع کرتے ہیں اس کے مقابلے یہ قرآنِ کریم بہتر ہے۔ یہ مقابلہ بھی کچھ یہاں سے بھی ظاہر ہو گیا جو میں نے آپ کے سامنے قارون کی بات کی ہے، کہ قارون اتنے خزانوں کا مالک تھا اسے کہا جا رہا ہے کہ لَا تَفْرَحْ یہ کوئی خوشی کی بات نہیں، دنیا کی دولت پر اس طرح سے خوش ہونا کہ ہمیں یہ حاصل ہو گئی یا ہم نے یہ کمالی، اور اس کے اوپر اکڑنا اترانا یہ بری بات ہے، اور قرآنِ کریم کے اوپر خوش ہونے کا حکم دیا جا رہا ہے، تو دنیا کتنی ہی اکٹھی کیوں نہ کر لے اس کے اوپر خوش ہونا مطلوب نہیں اور قرآنِ کریم کے اوپر خوشی مطلوب ہے، تو یہاں سے بھی مقابلہ ظاہر ہو گیا، اور ما یجمعون یہ عموم پر دلالت کرتا ہے، جس میں یہ بات آپ کے سامنے کہہ دی گئی کہ دنیا کے ساز و سامان کے مقابلے میں بہر حال قرآنِ کریم بہتر ہے۔

اِنسان کا مال حقیقت کے اعتبار سے کون سا ہے؟

اب اس کو یوں سمجھ لیجیے کہ ایک شخص کو تو اللہ تعالیٰ ہفت اقلیم کی بادشاہت دے دے، ساری دنیا کا اس کو بادشاہ بنا دیا، جو کچھ دنیا میں حاصل ہو سکتا ہے وہ اس شخص کو حاصل ہے، لیکن وہ قرآنِ کریم کی دولت سے محروم ہے، اس کے پاس ایمان نہیں، وہ اللہ کا اعتقاد نہیں رکھتا، کیونکہ یہ چیزیں تو قرآنِ کریم ہی بتائے گا، مقابلے کی صورت تو یہ ہوگی کہ وہ شخص قرآنِ کریم اور اس کی تعلیمات سے غافل ہے، ہفت اقلیم کا وہ بادشاہ ہو گیا، دنیا کی ہر نعمت اس کو حاصل ہے، لیکن قرآنِ کریم اس کو حاصل نہیں ہے، اور ایک شخص ایسا ہے جو اگرچہ دنیا کی ہر نعمت سے محروم ہے لیکن قرآنِ کریم کی دولت اس کو حاصل ہے، ان دونوں کا اگر آپ مقابلہ کریں حقیقت پسندی کے ساتھ، تو آپ ایک نتیجے پر پہنچیں گے کہ جہاں تک تو دنیا کے اکٹھا کرنے کا تعلق ہے، انسان کے دماغ میں اس کی کمزوری کی بناء پر ایک بات آتی ہے کہ جب وہ اپنے پاس کسی چیز کا ڈھیر لگا ہوا دیکھتا ہے تو دیکھ کے خوش ہوتا ہے، حالانکہ جو کچھ یہ اکٹھا کرنے وہ اِس کا نہیں، وہم ہے کہ یہ میرا ہے، اِس کا اس میں سے کتنا ہے؟ جتنا یہ کھالے اور اس کے ساتھ اپنی زندگی کو بچانے کا کوئی ذریعہ بنا لے پیٹ بھر لے، یا گرمی سردی سے بچنے کے لئے لباس پہن لے، یہ ہے جو اس نے اس دنیا میں سے استعمال کر لیا، یہ اصل کے اعتبار سے اس کا ہے، اور باقی جو کچھ بھی ہے وہ اس کا نہیں ہے چاہے اس نے اپنی طرف نسبت کر رکھی ہے کہ یہ میرا ہے، میں اس کا مالک ہوں، لیکن حقیقت کے اعتبار سے آپ دیکھیں تو اس کا نہیں ہے، اور یہ بات اتنی واضح ہے کہ اس پر تو کوئی دلیل دینے کی ضرورت ہی نہیں، اب ایک بینک کا منیجر ہے، اس کے پاس الماری کی چابیاں ہیں، اور کروڑ ہا روپیہ بینک کے اندر پڑا ہوا ہے، وہ سمجھتا ہے کہ یہ روپے میرے نہیں ہیں، کیوں؟ اس لیے کہ میں ان کا محافظ ہوں، جس وقت ان کا مالک آئے گا اس کے سپرد کرنے ضروری ہیں، وہ لے جائے گا، میرا تو اس میں سے وہی ہے جو مہینے کے بعد مجھے تنخواہ ملے گی، اب ایک آدمی اگر سونے کے ڈھیر لگا لے، خزانے بھر لے، تالے لگا کے چابیاں اپنے پاس رکھ لے، تو حقیقت کے اعتبار سے اس میں اور بینک کے منیجر میں کیا فرق ہے؟ یہ مر جائے گا، مرنے کے بعد یہ مال جس کا ہے وہ اٹھا کے لے جائے گا، ورثاء میں تقسیم ہو جائے گا، یہ سمجھتا ہے کہ یہ میرا ہے، حقیقت میں اس کا نہیں ہے، اس کا وہی ہے جو اس نے استعمال کر لیا کھا لیا یا پہن لیا، تو مطلب یہ ہوا کہ دنیا کتنی ہی اکٹھی

کیوں نہ ہوجائے اس میں انسان کا حصہ اتنا ہی ہے جتنا اس نے کھالیا اور جتنا پہن لیا، اس میں انسان کا حصہ اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے، اور دوسرا شخص! اس کے پاس خزانے بھرے ہوئے نہیں، چاہے محنت مشقت یا کسی ذریعے کے ساتھ اس کو روٹی ملتی ہے اور وہ بھوکا نہیں مرتا، کھانے کو اس کو ملتا ہے، پیٹ اس نے بھر لیا، اور سردی گرمی سے بچنے کے لئے اس کے پاس کپڑا ہے۔

اعلیٰ اور گھٹیا کھانے کا فرق صرف زبان تک ہی ہے

اچھے بُرے کی بھی بات اتنی سی ہوتی ہے، وقتی طور پر یہ بھی ایک تو ہم کا درجہ ہی ہے، ایک آدمی نے اچھا کھالیا اور ایک آدمی بظاہر سمجھتا ہے کہ میں نے گھٹیا کھالیا، یہ اچھے اور گھٹیے کا فرق صرف زبان تک ہے، اس بات کا یقین کرلینا، یہ لذیذ ہے یا لذیذ نہیں اس کا تعلق صرف زبان تک ہے، اور حلق سے اُتر جانے کے بعد سب ایک ہوجاتا ہے، اگر وہ جا کے صحیح ہضم ہوگیا اور قوت کا باعث بن گیا تو جس نے صرف چنے چبائے ہیں اس کے لئے بھی یہ نعمت ہیں کہ صحیح طور پر ہضم ہوگئے اور بدن کو قوت حاصل ہوگئی، اور اگر کسی نے اعلیٰ سے اعلیٰ لذیذ سے لذیذ چیزیں کھائی ہیں تو اس کی زبان نے تو مزہ لے لیا لیکن اندر اترتے ہی اگر وہ صحت کے لئے مضر ثابت ہوگئیں تو یہ نعمت نہیں ہیں، یہ انسان کے لئے مفید نہیں، قبض کا باعث بن گیا، اِسہال کا باعث بن گیا، پیٹ میں درد کا باعث بن گیا، کوئی اور بیماری پیدا کرنے کا باعث بن گیا، تو چاہے کھاتے وقت کتنی ہی لذت کیوں نہیں لی، لیکن وہ غذا اس کے لئے نعمت نہیں، مصیبت ہے، اور اگر آپ نے خشک ٹکڑے چبائے ہیں پانی کے ساتھ لگا لگا کے، پانی کے گھونٹ کے ساتھ ان کو نگلا ہے، یا آپ نے چنے چبائے ہیں، یا کوئی اور چیز کھا کے آپ نے اپنے پیٹ کو بھرا ہے لیکن وہ صحیح طور پر ہضم ہو کر جزو بدن بن گئی تو یہ آپ کے لئے نعمت ہے، لذت کا تعلق زبان تک ہی ہے حلق سے اترنے کے بعد کوئی لذت نہیں ہے۔

امیر و غریب مالی طور پر نتیجۃً دُنیا میں بھی اور مرنے کے بعد بھی برابر ہیں

گرمی سردی سے اپنا بچاؤ حاصل کرلیا تو آپ کو مقصد حاصل ہوگیا چاہے ریشمی کپڑوں سے حاصل کرلیا چاہے سوتی کپڑوں سے حاصل کرلیا، میں حقیقت کی بات کر رہا ہوں، باقی جو کچھ ہیں انسان کے توہمات ہیں، دنیا میں ان دونوں کو برابر کا حصہ مل گیا، جس کے پاس زیادہ جمع رکھا ہوا ہے وہ حقیقت کے اعتبار سے اس کا نہیں ہے، اس کا وہی ہے جتنا اس نے استعمال کرلیا، اور آپ کو اتنا مل گیا جتنی ضرورت تھی، نتیجے کے اعتبار سے دونوں آپس میں برابر ہیں، نتیجہ کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں، بھائی! یوں سمجھئے کہ پیاس لگنے بعد انسان کو پانی چاہیے، پانی چوبیس گھنٹے میں آپ کتنا پیتے ہیں؟ زیادہ سے زیادہ آپ چھ گلاس پی لیں گے، انسان کو چھ گلاس پانی کی ضرورت ہے چوبیس گھنٹے کے لئے، اب ایک آدمی تو بیٹھا ہے اس کے پاس کوئی نلکا نہیں، ٹیوب ویل نہیں، اور اس کے کوئی کنویں نہیں چلتے، لیکن اس کو چوبیس گھنٹے میں چھ گلاس پانی کے مل جاتے ہیں وہ پی لیتا ہے، اور ایک آدمی کو سارے سمندر کا مالک بنا دیا گیا، سارے دریاؤں کا مالک بنا دیا گیا، سارے ٹیوب ویل اس کے ہیں سارے نلکے اس کے ہیں، لیکن پانی تو اس نے بھی چوبیس گھنٹے میں وہی چھ گلاس ہی پینا ہے، یہ سمجھتے ہوئے بھی کہ یہ سارا پانی میرا ہے اس نے بھی چھ گلاس ہی پینے ہیں، اور آپ نے یہ سمجھتے ہوئے کہ ہمارے پاس کوئی کنواں نہیں، کوئی ٹیوب ویل نہیں، آپ نے بھی چھ گلاس ہی پینے ہیں، تو دنیا کے اندر حصہ تو

دونوں کا برابر ہے۔جس وقت آپ اس دنیا کو چھوڑیں گے، وہ بھی چھوڑے گا جو ہفت اقلیم کا مالک ہے، اور آپ بھی چھوڑیں گے جن کے لئے ہفت اقلیم میں سے کوئی حصہ نہیں اور آپ غریب فقیر کہلاتے ہیں، مرنے کے بعد دونوں خالی ہاتھ اس دنیا سے رخصت ہوجائیں گے، جیسے کہ فارسی شاعر کہتا ہے:

گر کسے خاک مردہ باز کند　　　　نتواند شناخت شاہ از درویش

کہ اس زمین میں دفن ہونے کے بعد اگر کوئی شخص قبر کھول کے دیکھے تو شاہ اور درویش میں فرق نہیں کرسکتا، یہ آنکھوں کے سامنے ہے کہ انجام دونوں کا برابر ہے، اس پر کسی دلیل کی ضرورت نہیں، یہ تو ایسے ہی میں آپ کو متوجہ کرنے کے لئے آپ کے سامنے وضاحت کررہا ہوں، ورنہ یہ تو روزمرہ کے قصے ہیں، روزمرہ کے قصوں کا آپ کو علم ہے، یہ اسی طرح سے ہوتا ہے، اس کی کوئی دلیل دینے کی ضرورت نہیں کہ مرنے کے بعد دونوں برابر ہیں، اور زندگی میں حصہ دونوں نے برابر پایا، کھانے کی ضرورت تھی تو اس کو بھی ملا جس کو آپ فقیر درویش کہتے ہیں اور دوسرے کو بھی ملا، ظاہری طور پر دونوں اپنا وقت گزار گئے، گزارنے کے بعد دونوں برابر ہوگئے۔

”قرآنِ کریم“ مال و دولت سے بہتر کیسے ہے؟

لیکن یہ دنیا کا مال دولت یہیں رہ گیا، اور وہ انسان کے لئے آنے والی زندگی کے اندر مصیبت تو بن سکتا ہے مفید نہیں ہے، اور ایک شخص کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآنِ کریم کی دولت دے دی، یہ دولت ایسی ہے کہ جس کو اپنانے کے ساتھ دنیا کے اندر بھی راحت اور آرام کی زندگی نصیب ہوتی ہے، بایں معنی جس کی تفصیل آپ کے سامنے اَلَاۤ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ میں آرہی ہے، وہ باطنی اعتبار سے فرق ہے کہ اولیاء اللہ میں اور اعداء اللہ میں، قرآنِ کریم کی تعلیمات حاصل کرنے والے اور ان تعلیمات پر عمل کرنے والے اور قرآنِ کریم سے غافل رہنے والے، باطنی طور پر ان کی زندگیوں میں کیا فرق ہے، یہ بات وہاں آرہی ہے، تو دنیا کے اندر بھی یہی قرآنِ کریم کے پڑھنے والے راحت اور آرام کے ساتھ رہتے ہیں، خوف وحزن سے بچتے ہیں، جیسے تفصیل آپ کے سامنے آرہی ہے، اور دوسرا شخص خوف وحزن کے اندر گھرا ہوا ہوتا ہے، اس کو کسی وقت بھی چین نہیں آتی، تو باطنی طور پر بھی دونوں کے درمیان زمین آسمان کا فرق، قرآنِ کریم کی تعلیمات حاصل کرنے والے یہاں دنیا کے اندر بھی خوش حال، خوف وحزن سے بچے ہوئے، اور مرنے کے بعد جو آخرت کی زندگی ہے وہ تو ہے ہی قرآنِ کریم والوں کی۔ اس طرح سے اگر آپ موازنہ کرکے دیکھیں گے تو آپ کے سامنے یہ بات آئے گی کہ واقعی قرآنِ کریم ایک ایسی نعمت اور ایک ایسی دولت ہے کہ اس کے مقابلے میں دنیا کی کوئی دولت دولت نہیں ہے، قدر ہونی چاہیے اور انسان اس حقیقت کو اپنے دل کے اندر ڈال لے، اور دل کے اندر یہ بات اتر جائے تو پھر انسان کے اوپر یہی کیفیت طاری ہوتی ہے کہ اس کے مقابلے میں دنیا کی کوئی دولت، دولت نہیں ہے۔

قرآن کی دولت کس کو نظر آتی ہے؟ مثال سے وضاحت

سمجھانے کے لئے ایک مثال دوں، یہ زمین جو ہے کائنات ارضی، یہ ہمارے لیے بدن کی ضروریات مہیا کرنے کا ایک

ذریعہ ہے، بدن کی جتنی ضروریات ہیں وہ ساری کی ساری اسی ارضی کائنات سے حاصل ہوتی ہیں، آپ کا لباس اسی سے پیدا ہوتا ہے، آپ کی خوراک اسی سے پیدا ہوتی ہے، آپ کی ادویات اسی سے پیدا ہوتی ہیں، آرائش زیبائش کا جتنا سامان ہے وہ سارے کا سارا اسی زمین سے حاصل ہوتا ہے، ضرورت کی کوئی چیز آپ کی اس دنیا میں ایسی نہیں جو آپ کو اس زمین سے حاصل نہ ہوتی ہو، آپ کی عینک گھڑی جو کچھ ہے سب زمین سے نکلتا ہے، اب اس زمین کو اگر آپ دیکھیں، نا تجربہ کار آدمی جس کو زمین کی کوئی قدر و قیمت نہیں، اس کو لے جاکے کہیں کسی ایسی زمین کے کنارے پہ کھڑا کر دیا جائے کہ جس میں ابھی کوئی نباتات اگی ہوئی نہیں ہے، ایسے ہی خالی اور خشک زمین پڑی ہے، اور اسے کہا جائے کہ دنیا کی ساری نعمتیں اسی میں ہیں، وہ کہے گا کہ ایسے ہی خواہ مخواہ بکواس کرتے ہیں، ڈھیلے پڑے ہیں، مٹی پڑی ہے، چاٹ کے دیکھو تو کوئی ذائقہ نہیں، منہ خراب ہوتا ہے، بیٹھ جاؤ تو کپڑے خراب ہوتے ہیں، یہ بھی کوئی قابل قدر چیز ہے؟ وہ یہی کہے گا نا؟ آنکھوں میں مٹی پڑ جائے تو آدمی اندھا ہو جاتا ہے، منہ میں پڑ جائے منہ خراب ہو جاتا ہے، بیٹھو تو کپڑے خراب ہو جاتے ہیں، ذائقہ اس کا کوئی نہیں، بیٹھنے کے یہ قابل نہیں، چاٹنے کے یہ قابل نہیں، اور یہ کہتے ہیں کہ ساری نعمتیں اسی زمین میں ہیں، اب جو غافل ہے جو حقیقت نہیں جانتا وہ تو یہی تصور کرے گا، جس کو زمین کو قدر نہیں اور اس کو پتا نہیں کہ زمین کیا چیز ہے، اس کے باپ دادے نے کبھی نہیں دیکھا کہ زمین سے کیا کچھ پیدا ہوتا ہے، آپ اس کو لے جاکے زمین کے ایسے قطعے پر کھڑا کر دو جو بظاہر خشک ہے، جس طرح سے فصل کے بونے سے پہلے ہل جوتا ہوا ہوتا ہے، اور زمین میں سارے ڈھیلے ہی ڈھیلے پڑے ہوتے ہیں، وہاں لے جاکے اس کو کھڑا کر دو اور کہہ دو کہ یوں سمجھو کہ یہ اللہ بٹوہ ہے، بس جس کے پاس یہ آگیا اس کو دنیا کی ہر نعمت حاصل ہوگئی، وہ کہے گا دھوکے دیتے ہو، ہم تو یہاں چھلنیاں لے کر چھاننا شروع کر دیں تو اس میں سے ایک پیسہ نہیں نکلے گا، آپ کہتے ہیں کہ دنیا کی ساری نعمتیں اسی میں ہیں، ہم کیلا کھایا کرتے ہیں، تم کہتے ہو کہ یہاں سے نکلتا ہے، غلط کہتے ہو، ہم تو دوربینیں لگا لگا کے دیکھتے ہیں، اس میں تو کوئی کیلا نظر نہیں آرہا، کچھ نظر نہیں آرہا، اب وہ جھٹلائے گا ہی، اور کیا کرے گا، لیکن یہ اس کی اپنی جہالت ہے، اپنی غفلت ہے، اور اس کو پتا نہیں کہ واقعہ یہی ہے کہ انہی ریت کے ٹیلوں میں اور مٹی کے انہی ڈھیلوں کے اندر ہی اللہ نے ہر نعمت رکھی ہے، اور جس کو اللہ نے زمین کی قدر دی ہے، جو ''طبقات الارض'' سے واقفیت رکھتا ہے، کاشتکار ہے، کاشت کار کا بیٹا ہے، خاندانی طور پر زمین دار چلے آرہے ہیں، ان کو پتا ہے کہ ہماری ساری خاندانی خوش حالی جتنی ہے وہ سب انہی ڈھیلوں کی برکت سے ہے، اور ایک ایک انچ کے اوپر وہ اپنی جان دیتے ہیں اور آپس میں لڑتے ہیں مرتے ہیں، ایک ایک فٹ کے لئے وہ اپنی پوری کی پوری قربانی دیتے ہیں کہ یہ کہیں ہمارے ہاتھ سے نکل نہ جائے، ان کو پتا ہے کہ ایک ایک انچ سے کتنی دولت نکلتی ہے، وہ اس کا قدردان ہے، جب اس کے سامنے آپ کہیں گے کہ بھئی! گندم بھی اسی میں ہے، وہ کہے گا کہ بالکل صحیح ہے، کہیں گے کہ لباس بھی سارے کا سارا اسی سے نکلتا ہے، وہ کہے گا بالکل ٹھیک ہے، جتنے فروٹ جتنے پھل جتنی نعمتیں ہیں چینی گڑ شکر اور اسی طرح جو آپ کی زندگی کی مٹھاس ہے، جتنی بھی دنیا کے اندر نعمتیں ہیں وہ ساری کی ساری اس زمین کے اندر موجود ہیں، وہ کہے گا بالکل صحیح ہے، یہ قدردان ہے، اور وہ کہے گا ٹھیک ہے یہ زمین مجھے دے دو، اور جس وقت اس کو زمین مل جائے گی وہ خوش ہو جائے گا کہ آج ہم نے چھ ایکڑ آٹھ ایکڑ زمین حاصل کر لی، یوں سمجھے گا جیسے دنیا کی بہت بڑی نعمت

حاصل کرلی، اس کے بعد ہماری زندگی خوش حال گزرے گی۔ ان دونوں کے درمیان میں نظر کا کتنا فرق ہے؟ کہ جو زمین کی قدر وقیمت نہیں جانتا وہ زمین کے متعلق کیا تصور رکھتا ہے، وہ سمجھتا ہے کہ شاید یہ صرف ہگنے موتنے کے لئے ہی ہے، باقی! اور کچھ اس میں ہے ہی نہیں، اور جس کو زمین کی قدر معلوم ہے تو وہ سمجھتا ہے کہ جس کو زمین مل گئی اس کو سب کچھ ہی مل گیا، تو اس دنیا کے اندر رہتے ہوئے انسان کے ذہن کے اندر کتنا فرق ہے؟ بالکل اسی طرح سے یہ کتاب اللہ تعالیٰ نے کائناتِ روحانی بنائی ہے، انسانیت کی اصل اس کی روح ہے، تو روح کے لئے سکون، روح کے لئے اطمینان، روح کے لئے غذا، روح کے لئے دوا، روح کے لئے زیبائش، روح کے لئے آرائش جتنی ہے وہ سارے کا سارا سامان اللہ نے اس کتاب کے اندر رکھا ہے، لیکن جس وقت آپ کسی ناقدرے کے سامنے اس کو پیش کریں گے تو وہ کہے گا کیا ہے؟ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ (نحل: ۲۴ وغیرہ) لوگوں کے قصے کہانیاں اکٹھی کر رکھی ہیں، اس میں کیا چیز رکھی ہے؟ اَيُّكُمْ زَادَتْهُ هٰذِهٖۤ اِيْمَانًا (سورۂ توبہ: ۱۲۴) اس میں کونسی ایمان کی بات ہے، اس سے کیا ایمان بڑھتا ہے، اس میں کیا فائدہ ہوتا ہے، اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ کہتے تھے، اور کہتے تھے لَوْ نَشَآءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَآ (انفال: ۳۱) یہ بھی کوئی بات ہے؟ اگر ہم چاہیں تو ہم بھی ایسی بنالیں، تو مشرکوں کے کافروں کے منافقوں کے جذبات اس کتاب اللہ کے متعلق ایسے ہی ذکر کیے گئے ہیں، لیکن جس وقت کسی قدردان کے ہاتھ میں یہ آتی ہے تو وہ سمجھتا ہے کہ واقعی اصل انسانیت کی غذا اور دوا یہی کتاب ہے۔ اسی طرح سے اس فرق کو سمجھ لیجیے کہ ایمان لا کر جس وقت انسان اس کو استعمال کرتا ہے تو استعمال کرنے کے بعد اس کو معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتنی بڑی نعمتوں کا مجموعہ ہے، اس کے مقابلے میں دنیا کی نعمتیں نعمتیں نہیں ہیں، اگر ہمیں اس کی قدر معلوم نہیں ہو رہی تو اس لیے نہیں ہو رہی کہ ہم نے اس کو استعمال کر کے نہیں دیکھا، اس کی ہدایات پر عمل کر کے نہیں دیکھا، اگر ہم اس کی ہدایات پر عمل کرتے اور اس کا بتایا ہوا پرہیز اختیار کرتے پھر ہمیں پتا چلتا کہ انسان کے باطن میں کیا باغ و بہار ہوتی ہے، اور کیسی کیسی رحمتیں اور کیسی کیسی نعمتیں انسان کو حاصل ہوتی ہیں، جن کے مقابلے میں دنیا کی کوئی نعمت نعمت نہیں ہے، تو یہ اپنے اپنے نقطہ نظر کا فرق ہے اور اپنا اپنا تجربہ ہے، جتنا تجربہ اس کے متعلق ہوتا جائے گا اس کی ہدایات پر عمل کرنے کے بعد، اتنی ہی اس کتاب کی عظمت دل میں بیٹھتی چلی جاتی ہے، اور اگر آج آپ کو معلوم نہیں ہو رہی تو یوں ہی سمجھئے کہ کبھی آپ کے باپ دادے نے زمین نہ دیکھی ہو اور زمین کی پیداوار نہ دیکھی ہو، تو جس طرح سے مٹی کے ڈھیلوں کو آپ کچھ نہیں سمجھ سکتے، اسی طرح سے آج اس کتاب کی قدر بھی آپ کے نزدیک نہیں، اور جتنا اس سے تعلق پیدا کرتے چلے جاؤ گے اور اس کو پڑھتے چلے جاؤ گے اس کو سمجھتے چلے جاؤ گے اس کی ہدایات پہ عمل کرتے چلے جاؤ گے تو اس کی نعمتیں اس کی رحمتیں اتنی ہی کھلتی چلی جائیں گی تو پھر انسان کو صحیح طور پر اس کی قدر ہوتی ہے۔

''قرآن'' کے مقابلے میں کسی اور چیز کو بہتر سمجھنا بے عقلی اور حماقت ہے

فیصلہ قطعی ہے خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ کہ یہ اللہ کے فضل سے حاصل ہونے والی چیز، اللہ کی رحمت سے حاصل ہونے والی چیز جس کا ذکر اوپر آیا، یعنی اللہ کی کتاب، دنیا میں انسان جو کچھ اکٹھا کرتا ہے، جو کچھ سمیٹتا ہے اس کے مقابلے میں یہ بہتر ہے، تو جس کو یہ مل گئی تو یوں سمجھو کہ اس کو دنیا کی ہر چیز ہی مل گئی، اور اس کے مل جانے کے بعد اس کے مقابلے میں کسی دوسری چیز کو اپنے خاطر میں

لانا کہ یہ نہ ہوتی وہ ہوتی، اس سے بڑھ کر انسان کی حماقت اور بے قدری کوئی نہیں، آپ بالکل اسی طرح سے سمجھ لیجئے! کہ ایک بچہ ہے، اس کے ہاتھ میں آپ سو کا نوٹ دے دیں، اس کے نزدیک کاغذ میں اور اس میں کوئی فرق نہیں ہے، اس کے ہاتھ میں سو کا نوٹ دے دیں تو وہی بات ہے، اخبار کا ایک پھٹا ہوا ٹکڑا جس میں سینے کے تصویروں والے اشتہار ہوں وہ اس کے ہاتھ میں دے دو تو وہی بات ہے، وہ بچہ ان دونوں میں فرق نہیں کر سکتا، جیسے کاغذ وہ ہے ویسے کاغذ یہ ہے، اور اگر دوسرا کوئی شخص اس کو بسکٹ دکھا دے، اور بسکٹ دکھا کے کہے کہ یہ لیتے ہو یا یہ لیتے ہو؟ تو وہ فوراً کاغذ کو پھینک دے گا اور آپ سے بسکٹ لے لے گا، اور بسکٹ کے مقابلے میں سو روپے کے نوٹ کی اس کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں، اس کی عقل کا یہی تقاضا ہے، وہ سمجھتا ہے یہ بسکٹ تو کھانے کی چیز ہے اور کاغذ کا میں نے کیا کرنا ہے، اس کو اتنی سمجھ ہی نہیں، وہ بسکٹ کو سمجھتا ہے کہ یہ لذیذ ہے، یہ کھانے کی چیز ہے، اور یہ کاغذ تو کھانے کی چیز ہی نہیں، لیکن آپ جیسے سمجھدار جس وقت پاس بیٹھے ہوں گے تو کہیں گے کہ دیکھو! اس کا بچپنا، اس کی حماقت، اس کو عقل نہیں ہے، کہ یہ نوٹ!!! اس کے ساتھ تو پیٹیوں کی پیٹیاں ایسے بسکٹ خریدے جا سکتے ہیں جس ایک بسکٹ کے بدلے میں یہ نوٹ پھینک رہا ہے، یہ اپنی اپنی سمجھ کی بات ہے، صحیح موازنہ دو چیزوں میں وہی کر سکتا ہے جتنا انسان حقیقت سے واقف ہو، اور جتنا حقیقت سے غافل ہوگا تو غافل ہونے کی صورت میں ایک بسکٹ کے مقابلے میں سو تو کیا، میں کہتا ہوں کہ پانچ سو روپے کا نوٹ دو، وہ بھی بچہ پھینک دے گا، یہ حقیقت ناشناسی ہے، ورنہ اللہ تعالیٰ کی اس کلام کے اندر شبہ کی گنجائش نہیں کہ واقعی دنیا کی ہر نعمت کے مقابلے میں قرآنِ کریم کی نعمت فائق ہے، بس قدر چاہیے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

کسی چیز کو حرام یا حلال ٹھہرانے کا حق صرف اللہ کے پاس ہے

قرآنِ کریم کی عظمت بیان فرمانے کے بعد اگلی آیت میں یہ واضح کیا جا رہا ہے کہ کسی چیز کو حرام ٹھہرانے یا کسی چیز کو حلال ٹھہرانے کا حق صرف اللہ کا ہے، اور وہ اس کی کتاب سے واضح ہوگا، مشرکین کی یہ عادت تھی کہ بعض چیزوں کو وہ اپنے بتوں کی طرف منسوب کر کے حرام ٹھہرا لیتے تھے اور اس کے اندر کسی قسم کا تصرف کرنا جائز نہیں سمجھتے تھے، جیسا کہ آپ کے سامنے سورۂ مائدہ میں بحیرہ، سائبہ، وصیلہ اور حام کی تفصیل کے تحت گزرا ہے، اور پھر ان کی یہ جو تحریم تھی، یہ جو حرام ٹھہراتے تھے اس کو یہ کہتے تھے کہ یہ بتایا ہوا اللہ کا ہے، اللہ کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق ہم ایسا کرتے ہیں، جس طرح سے ایک جگہ یہ الفاظ بھی آتے ہیں وَاللّٰهُ اَمَرَنَا بِهَا (اعراف: ۲۸) کہ اللہ نے ہمیں یہ حکم دیا ہے، تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ میرے اُوپر اِفترا ہے اور جھوٹ ہے، میں نے اس قسم کی تحریم کا ان کو کوئی حق نہیں دیا، یہ میرا بتایا ہوا طریقہ نہیں ہے، اپنی طرف سے باتیں بناتے ہیں پھر اللہ پہ لگاتے ہیں، مسئلہ ان کے بارے میں سورۂ مائدہ میں ذکر کر دیا گیا تھا کہ اس قسم کی تحریم کا شرعی طور پر کیا حکم ہے؟ کہ یہ جانور جو غیر اللہ کے نام پر زندہ چھوڑ دیے جاتے ہیں وہ چھوڑنے والے کی ملکیت میں باقی رہتے ہیں، جس مرنے والے کی طرف نسبت کر کے وہ جانور چھوڑے

جاتے ہیں اس کی ملکیت میں نہیں جاتے، کیونکہ مرنے کے بعد انسان میں مالک بننے کی صلاحیت نہیں رہتی، مالک کی اجازت لے کر ان کو جو شخص بھی بسم اللہ پڑھ کے ذبح کر کے کھالے وہ کھا سکتا ہے، اور مالک خود بھی ان کو ذبح کر کے کھا سکتا ہے، وہ جانور حرام نہیں ہوتے، اس طرح سے چھوڑنے کے ساتھ جانور میں حرمت نہیں آتی، یہاں اللہ تعالیٰ نے یہی تنبیہ فرمائی ہے کہ آپ ان سے پوچھئے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے جو رزق اتارا ہے...... چونکہ آسمان کی طرف سے رزق کے اسباب پیدا ہوتے ہیں اس لیے اس کو اِنزال سے تعبیر کیا، یا پردۂ غیب سے جو چیز بھی ظاہر ہوتی ہے وہ چونکہ عرشِ الٰہی کی طرف سے تکوینی اُحکام آنے کے ساتھ ہی ظاہر ہوتی ہے تو اس کو اِنزال کے لفظ سے تعبیر کر دیا جاتا ہے، جیسے وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ (سورۂ حدید: ۲۵) ہم نے لوہا اتارا، تو وہاں حدید کے متعلق بھی اتارنے کا لفظ ہے، چونکہ اللہ کے تکوینی احکام عرشِ الٰہی کی طرف سے آتے ہیں تو یہ چیزیں وجود پکڑتی ہیں اور ظاہر ہوتی ہیں، تو ان کو بھی اِنزال سے تعبیر کر دیا جاتا ہے، اسی طرح اَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ الْاَنْعَامِ ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ (سورۂ زُمر: ۶) اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے حیوانات کی آٹھ قسمیں اتاریں، تو وہاں اتارنا پیدا کرنے اور ظاہر کرنے کے مفہوم میں ہی ہے...... جو رزق اللہ نے اتارا پھر تم نے اس میں سے کچھ حرام بنالیا، کچھ حلال بنالیا، یہ چیزیں پیدا تو اللہ تعالیٰ نے کیں، اور تم نے اس میں سے بعض کو حرام ٹھہرایا بعض کو حلال ٹھہرایا، تو ان سے پوچھئے کہ کیا اللہ نے تمہیں اس بات کی اجازت دی ہے؟ کہ تم اس طرح سے کرلیا کرو، یا تم اللہ پر جھوٹ ہی گھڑتے ہو؟ اب یہ سیدھی بات ہے کہ اللہ نے تو اجازت دی نہیں، اللہ تعالیٰ کی اجازت کا پتا چلے گا اس کی کتاب سے، تو جس چیز کو اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں حرام ٹھہرائے وہ حرام ہے، جس کو اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں حلال ٹھہرائے وہ حلال ہے، کسی دوسرے کو حق نہیں پہنچتا کہ اللہ کے پیدا کردہ رزق کو حرام یا حلال ٹھہرائے۔

فقہاء کو اُحبار و رُہبان کی طرح قرار دینا جہالت ہے

یہ بات بھی آپ کے سامنے سورۂ براءت میں آئی تھی اِتَّخَذُوْۤا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (آیت: ۳۱) وہاں یہ تفصیل آپ کی خدمت میں ذکر کی گئی تھی کہ ان کے اتخاذِ رَبّ کا مفہوم حدیث میں یہ ذکر کیا گیا ہے کہ انہوں نے تحلیل اور تحریم کے اختیارات اپنے علماء اور مشائخ کو دے رکھے ہیں، جو کچھ ان کے علماء اور مشائخ کہہ دیں کہ یہ حلال ہے اس کو وہ حلال جان لیتے ہیں، جس کو وہ کہہ دیں کہ حرام ہے اس کو حرام جان لیتے ہیں، چاہے ان کی یہ ہدایات اللہ تعالیٰ کے احکام کے خلاف ہی کیوں نہ ہوں، اس منصب پر انہوں نے اپنے علماء اور مشائخ کو بٹھا دیا، اسی کو سرورِ کائنات ﷺ نے فرمایا کہ یہ اتخاذِ رَبّ ہے، کسی کو رَبّ بنالینا یہی ہے کہ اس کو تحلیل اور تحریم کے اختیارات دے دیے گئے۔ ہمارے فقہاء رحمہم اللہ بھی بعض چیزوں کو حرام ٹھہراتے ہیں اور ان کے حرام قرار دینے کے ساتھ ہم ان کو حرام کہتے ہیں، نسبت کرتے ہیں کہ ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک یہ حرام ہے، امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک یہ حرام ہے، یہاں اہلِ کتاب والی بات نہیں ہے، کیونکہ فقہاء رحمہم اللہ کے اقوال کہاں آتے ہیں؟ جن جزئیات کے متعلق کتاب اللہ میں یا سُنّت رسول اللہ ﷺ میں کوئی حکم صراحتاً نہیں لگا ہوا، جو کتاب اللہ میں آگیا سُنّت رسول اللہ میں آگیا وہاں کوئی فقیہ زبان نہیں ہلا سکتا، وہ وہی حکم ہے جو اللہ کی کتاب میں آگیا اور سُنّت رسول اللہ میں آگیا، اور جو جزئیات کتاب اللہ میں اور سُنّت

رسول اللہ میں مذکور نہیں ان کا حکم معلوم کرنے کے لئے یہ لوگ قرآن اور حدیث کی روشنی میں غور کرتے ہیں، تحریمات کے اصول کتاب اللہ اور سنّتِ رسول اللہ ﷺ سے سمجھتے ہیں کہ کسی چیز کے حرام قرار دینے کا کیا اصول ہے، کسی کو حلال ٹھہرانے کا کیا اصول ہے، تو پھر کتاب اللہ اور سنّتِ رسول اللہ سے مستنبط اصولوں کے تحت کسی چیز کا حکم یہ واضح کرتے ہیں، تو (درحقیقت) اس حکم کی نسبت اللہ کی طرف ہی ہوتی ہے، مثال کے طور پر قرآنِ کریم نے ذکر کیا یُحَرِّمُ عَلَیْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ کہ یہ نبی ایسا ہے کہ جو لوگوں کے اوپر خبائث کو حرام ٹھہراتا ہے، تو تحریم خبائث یہ ایک اصول قرآنِ کریم سے نکل آیا، کہ جو خبیث چیز ہے وہ حرام ہے، نبی اس کو حرام ٹھہراتا ہے، اب ہمارے سامنے ایک چیز ایسی آ گئی کہ جس کا ذکر ہی نہیں ہے نہ قرآن میں نہ حدیث میں کہ یہ حلال ہے یا حرام، اب ایک فقیہ جو ہے، سمجھ دار، جس کو قرآن اور حدیث کے کثرتِ مطالعہ کی بنا پر ایک روشنی حاصل ہے، وہ غور کرے گا کہ یہ چیز جس کا حکم دریافت کرنا مقصود ہے اس میں کسی قسم کا خبث ظاہری اور باطنی ہے یا نہیں؟ اگر معلوم ہو جائے کہ ہاں واقعی اس میں خبث ہے تو جس وقت اس میں خبث معلوم ہو جائے گا تو اب اس چیز کو حرام ٹھہرا دیا جائے گا، اب اس کو حرام یہ فقیہ نہیں قرار دے رہا کہ فقیہ نے اس کو حرام قرار دے دیا ہو، بلکہ تحریم خبائث کا اُصول جو قرآنِ کریم سے نکلا، اس اُصول کے تحت اس کو داخل کر کے قرآنِ کریم سے اس کا حکم نکال لیا کہ یہ بھی اللہ کے نزدیک حرام ہے اور رسول اللہ ﷺ بھی اس کو حرام ٹھہراتے ہیں۔ یا حدیث شریف میں آ گیا سرورِ کائنات ﷺ نے فرمایا: ''کل ذی ناب من السباع''، یا: ''کل ذی مخلب من الطیر'' کہ ہر چوپایہ درندہ جو اپنے دانتوں کے ساتھ شکار کر کے کھاتا ہے، ذی ناب ہے اس کو حضور ﷺ نے حرام ٹھہرایا،[1] اب ایک جانور ہمارے سامنے ایسا آ گیا کہ جس کا ذکر قرآن اور حدیث میں صراحتاً نہیں کہ یہ حرام ہے، تو فقیہ غور کرے گا کہ یہ چوپایہ ذی ناب تو نہیں ہے؟ منہ کے ساتھ یہ شکار تو نہیں کرتا؟ اس کے وہ دانت ہیں جس طرح سے شکاری جانوروں کے ہوتے ہیں، اگر اس کو معلوم ہو جائے کہ اس کے دانت ویسے ہی ہیں جیسے شکاری جانوروں کے ہوتے ہیں اور یہ بھی منہ کے ساتھ شکار مارتا ہے اور شکار پکڑ کے کھاتا ہے تو ''کل ذی ناب من السباع'' کے تحت داخل ہو کے اس کا حکم واضح ہو جائے گا کہ یہ بھی حرام ہے۔ تو فقیہ کا کام صرف یہ ہوتا ہے کہ قرآن اور حدیث سے جو اُصول مستنبط ہوتے ہیں ان کے ساتھ ایسی چیزوں کا حکم واضح کرے جن کی صراحت قرآن اور حدیث میں نہیں ہے، ایک پرندے کا ذکر آ گیا کہ یہ پرندہ حلال ہے یا حرام، قرآن اور حدیث میں صراحتاً اس کا ذکر نہیں، تو فقیہ دیکھے گا کہ یہ ذی مخلب ہے یا نہیں؟ کیا یہ پنجے سے شکار کرتا ہے؟ اگر پنجے سے شکار کرتا ہے تو فقیہ کہہ دے گا کہ یہ حرام ہے، تو اس کی حرمت اس حدیث کی طرف منسوب ہو گی جس میں ''کُلُّ ذِی مِخْلَبٍ مِنَ الطَّیْرِ'' کو حرام ٹھہرایا گیا ہے، تو فقیہ اپنی طرف سے حکم نہیں لگایا کرتے۔ آگے جا کے جو ان کا آپس میں اختلاف ہوتا ہے اس کی حیثیت بھی یہی ہے کہ ایک آدمی کی تحقیق دیانت داری کے ساتھ، اپنی معلومات کے طور پر یہ ہوئی کہ اس میں خبث نہیں، اور ایک کی تحقیق ہے کہ خبث ہے، تو اس قسم کی چیزیں پھر مجتہد فیہ ہو جاتی ہیں، تو ان کا حکم اُن سے اَدوَن (ہلکا) ہو جاتا ہے جن کے متعلق قرآن اور حدیث میں صراحت آئی ہوئی ہو، جن کے حلال ہونے کی صراحت آ گئی وہ تو قطعی طور پر حلال ہو گئے، جن کے حرام ہونے کی صراحت آ گئی وہ قطعی طور پر حرام ہو گئے، اور جن کا ذکر صراحت کے ساتھ نہیں آیا وہ مجتہدین

---

(۱) مسلم ۲/ ۱۴۷ باب تحریم اکل کل ذی ناب۔ مشکوٰۃ ۲/ ۳۵۹۔ ولفظ الحدیث: نَهٰی عَنْ کُلِّ ذِی نَابٍ مِنَ السِّبَاعِ وَعَنْ کُلِّ ذِی مِخْلَبٍ مِنَ الطَّیْرِ.

اپنے اجتہاد سے اس کو کسی اصول کے نیچے داخل کریں گے، تو یہاں آ کے اختلاف ہو سکتا ہے، کہ ایک آدمی کے نزدیک اس حیوان کی حیثیت اور متعین ہے، دوسرے کے نزدیک اور متعین ہے، یہاں اختلاف ہو سکتا ہے، تو اس قسم کے اختلافات کے ساتھ اس چیز کا حکم پہلے کے مقابلے میں ادون ہو جاتا ہے، اس کا انکار کفر نہیں ہوگا، جس کے نزدیک حلال ہے اس کے نزدیک اس کو حلال جاننا ضروری ہوگا، اس کی مخالفت کی جائے گی تو کراہت یا اس قسم کے ہلکے قسم کے اقوال آئیں گے، وہ بات نہیں رہے گی جو قرآن اور حدیث کے اندر صراحتاً مذکور جزئیات کی ہوا کرتی ہے، اس لیے ہم فقہاء ﷭ کو یہ حق نہیں دیتے کہ اپنی جانب سے کسی چیز کو حلال یا حرام ٹھہرالیں، ہاں البتہ مسکوت عنہ چیز کے متعلق وہ قرآن اور حدیث کی روشنی میں جو حکم واضح کیا کرتے ہیں وہ اصل کے اعتبار سے اللہ اور اللہ کے رسول کا ہی حکم ہوتا ہے، اس لیے اَحبار و رُہبان کا طریقہ اور تھا اور ہمارے فقہاء ﷭ کا طریقہ اور ہے، ان فقہاء ﷭ کو اَحبار اور رُہبان کی طرح قرار دے دینا جہالت ہے۔ آٰللّٰہُ اَذِنَ لَکُمْ کیا اللہ نے تمہیں اجازت دی ہے؟ اَمْ عَلَى اللّٰهِ تَفْتَرُوْنَ: یا تم اللہ پر جھوٹ گھڑتے ہو؟ تو شق تو متعین ہوگئی کہ یہ اللہ پر جھوٹ ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے احکام کا پتا تو اس کی کتاب سے لگے گا، جس طرح پیچھے ذکر آ گیا۔

کافروں کو دھمکی، اور شکوۂ اِلٰہی

آگے ان کے لئے دھمکی اور وعید ہے وَمَا ظَنُّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ: اس اِستفہام کے اندر تہدید ہے۔ کیا خیال ہے ان لوگوں کا جو اللہ کے اوپر جھوٹ گھڑتے ہیں قیامت کے دن کے متعلق؟ انہوں نے قیامت کے دن کو کیا سمجھ رکھا ہے؟ کیا قیامت کے دن جب اللہ کے سامنے پیشی ہوگی تو اللہ تعالیٰ پوچھے گا نہیں کہ تم نے اس کو حرام کیوں ٹھہرایا تھا؟، اپنے طور پر تم نے یہ حکم کیوں لگا لیا تھا؟ یہ کیا سمجھتے ہیں قیامت کے دن کو؟ انہیں کوئی پوچھے گا نہیں؟ اُس دن اِن کو جواب دہی نہیں کرنی پڑے گی؟ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ: اللہ تعالیٰ لوگوں پر بہت مہربانی کرنے والا ہے کہ ان کے نفع نقصان کی چیزیں ان کے سامنے واضح کرتا ہے، آنے والے خطرات کی ان کو اطلاع دیتا ہے، وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَشْكُرُوْنَ: لیکن اکثر لوگ قدردان نہیں، اللہ تعالیٰ کی ان باتوں کی، اللہ کے ان احکام کی قدر نہیں کرتے، قدر کرنے کا معنی یہی ہوتا ہے کہ اس کو اپنے لیے مفید سمجھتے ہوئے اس کو اپنائیں، شکر کا یہی معنی ہے، شکر اصل میں اطاعت کا ہی دوسرا عنوان ہے کہ کسی کی بات کی دل میں قدر کرنا پھر اس کو اپنا لینا یہی اس کی قدردانی ہوتی ہے، تو اللہ کی باتوں کی اکثر لوگ قدردانی نہیں کرتے، حالانکہ اللہ تعالیٰ کی سب باتیں اللہ کی طرف سے انسانوں کے اوپر مہربانی ہے، جس میں ان کو ان کے نفع نقصان کی اطلاع دی جاتی ہے، آنے والے خطرات سے آگاہ کیا جاتا ہے، لیکن اکثر لوگ قدر نہیں کرتے۔

ترغیب وترہیب کے لئے "علمی اِحاطے" کا ذِکر

آگے اللہ تعالیٰ نے اپنے علمی اِحاطے کو ذکر فرمایا ہے، علمی احاطہ جہاں بھی اللہ تعالیٰ ذکر فرمائیں اس میں بھی ترغیب اور ترہیب ہوتی ہے، بایں معنی کہ بدکاروں کو تو یہ کہا جا رہا ہے کہ تمہارا کوئی عمل مخفی نہیں، ہر عمل ہمارے سامنے ہے، اس لیے جب موقع ہوگا تمہیں سزا ملے گی اس کا محاسبہ کیا جائے گا، اور جو فرمانبردار ہیں ان کو یہ کہا جا رہا ہے کہ تمہاری فرمانبرداریاں وفاداریاں تمہاری

نیکیاں، یہ بھی ہم سے مخفی نہیں، ہم جانتے ہیں کہ تم کیا کیا مصیبتیں ہمارے لیے اٹھار ہے ہو، کیا کیا تکلیفیں اٹھار ہے ہو، تو ہم اس کی قدر کریں گے اور تمہیں ان اعمال کی جزا دیں گے، اس اعتبار سے نیکوں کے لئے اللہ کا علم ایک ترغیب ہے مزید نیکی کے لئے، حوصلہ افزائی ہے، کیونکہ اگر کوئی شخص کسی کے لئے وفاداری کرتا رہے، جان دیتا رہے، اور جس کے لئے دے رہا ہے اس کو پتا ہی نہ ہو کہ میرے لیے فلاں شخص قربانی دے رہا ہے تو بسا اوقات اس قسم کی قربانی دینے والے کا حوصلہ ٹوٹ جاتا ہے کہ میں نے تو اپنی جان دے دی، اپنا سب کچھ کھپا دیا اور ان کو پتا ہی نہیں کہ میں ان کے لئے کیا کر رہا ہوں، اور جب یہ بات آ جائے کہ نہیں! وفاداروں کی وفاداریاں ہمارے سامنے ہیں، ہم ایک ایک بات کو جانتے ہیں، کوئی حال ہم سے مخفی نہیں، اس سے پھر قربانی دینے والوں کی وفاداری کرنے والوں کی حوصلہ افزائی بھی ہوتی ہے، اور وہ یہ خیال کرتے ہوئے کہ جس کے لئے ہم کر رہے ہیں وہ دیکھ رہا ہے وہ جان رہا ہے تو ان کے حوصلے بڑھتے ہیں اور مزید نیکی کی کوشش کرتے ہیں تا کہ اللہ تعالیٰ خوش ہو جائے، اور وقت پر ہم اس سے ثواب لیں گے، اللہ تعالیٰ ہم پہ راضی ہوگا، تو اُن کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے اور بدکرداروں کے لئے ایک قسم کی ترہیب ہوتی ہے کہ تمہاری کوئی حرکت ہم سے مخفی نہیں ہم وقت پر پوچھیں گے اور ہر ہر بات کی سزا دیں گے۔ وَمَا تَكُوْنُ فِي شَاْنٍ: آپ کسی حال میں نہیں ہوتے، اس کا مطلب یہ ہے کہ جس حال میں بھی ہوں، یہ نکرہ عموم کے لئے ہے، آگے جا کے جس طرح سے اِلَّا کے ساتھ اثبات والا معنی پیدا ہو جائے گا۔'' آپ کسی حال میں نہیں ہوتے اور اس حال میں سے خصوصیت سے، آپ قرآن نہیں پڑھتے اور نہ آپ کوئی عمل کرتے ہیں آپ اور آپ کے ساتھی'' اِلَّا كُنَّا عَلَيْكُمْ شُهُوْدًا: مگر ہم تم پر شاہد ہوتے ہیں، گواہ ہوتے ہیں، مشاہدہ کرنے والے ہوتے ہیں، تو آپ کا کوئی حال ہم سے مخفی نہیں، خصوصیت کے ساتھ آپ کا تبلیغ والا حال، کیونکہ تبلیغ والے حال میں حضور ﷺ کو تکلیف زیادہ ہوتی تھی، مشقت زیادہ برداشت کرنی پڑتی تھی، منکرین کافرین اسی وقت میں آپ کو تکلیف پہنچاتے تھے تو اُس کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کر دیا، تَعْمَلُوْنَ میں عموم کر دیا کہ آپ بھی اور آپ کے رفقاء بھی جو کام بھی کرتے ہیں، آپ کوئی کام نہیں کرتے مگر ہم اوپر موجود ہوتے ہیں، اس کا مشاہدہ کرنے والے ہوتے ہیں، دیکھنے والے ہوتے ہیں، اِذْ تُفِيْضُوْنَ فِيْهِ: جس وقت کہ تم اس کام میں لگتے ہو، کام میں شروع ہوتے ہو، یعنی شروع سے لے کر آخر تک ہم اس کام کا مشاہدہ کرنے والے ہوتے ہیں، وَمَا يَعْزُبُ: یہ صرف آپ لوگوں کے عمل ہی نہیں کہ وہ اللہ کے سامنے حاضر ہیں اور اللہ ان کو دیکھنے والا ہے، بلکہ کائنات کے اندر کوئی ذرہ نہیں جو اللہ کے علم سے مخفی ہو، ''نہیں چھپتا تیرے ربّ سے ذرے کا وزن'' مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ: یعنی اتنی چیز بھی جو ذرّے کے وزن کے برابر ہوتی ہے، ذرۃ کسے کہتے ہیں؟ یہ یا تو واحد ہے ذَرّ کا، حدیث شریف میں آپ نے باب القدر کے اندر روایات پڑھی تھیں، جس میں كَاَمْثَالِ الذَّرِّ کا لفظ آیا تھا، کہ اللہ تعالیٰ نے انسان موجود کیے تھے چیونٹیوں کے بچوں کی طرح، اور ذَرَّةٌ اسی کا واحد ہے، تو چیونٹی کے بچے کے برابر بھی کوئی چیز اللہ تعالیٰ سے چھپتی نہیں، یا ذرّے کا مفہوم یہ ادا کر دیا جاتا ہے کہ روشن دان میں سے جو دھوپ اندر آتی ہے تو اس میں آپ دیکھیں گے تو بہت نامعلوم سی چھوٹی چھوٹی چیزیں حرکت کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں، کہ اگر آپ ان کو ہاتھ سے پکڑنا چاہیں تو پکڑ نہیں سکتے، وہ اتنی چھوٹی چھوٹی ہوتی ہیں، ان کو ذرات کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے، مطلب یہ ہے کہ چھوٹی سے چھوٹی چیز، اس کے برابر بھی کوئی چیز اللہ تعالیٰ کے علم سے چھپتی نہیں، ''نہیں غائب ہوتا تیرے ربّ سے ایک ذرّے کا وزن

زمین میں اور نہ آسمان میں، اور نہ کوئی چیز اس سے چھوٹی ہے اور نہ کوئی چیز اس سے بڑی ہے مگر وہ کتاب مبین میں ہے" کتاب مبین یہ بھی اللہ کے علم کا ایک صحیفہ ہے جس کو لوحِ محفوظ سے تعبیر کیا جاتا ہے، یعنی یہ چیزیں اللہ کے علم میں بھی ہیں اور پھر اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت کے تحت ان کو کتابِ مبین میں بھی ضبط کر رکھا ہے۔

"اولیاء اللہ" کون ہیں؟ ان کی علامات اور ان کے لئے اِنعامات

اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ: یہاں سے اللہ تعالیٰ نے اپنے دوستوں کے لئے خصوصیت کے ساتھ بشارت دی ہے۔ اولیاء اللہ: اللہ کے دوست۔ اولیاء ولی کی جمع ہے۔ وَلِیَ: قریب ہونا۔ یعنی وہ لوگ جو اللہ سے قرب رکھتے ہیں لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ: ان پر نہ کسی قسم کا خوف ہوگا نہ وہ غمزدہ ہوں گے، اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ: یہ اولیاء اللہ کی پہچان ذکر کی ہے، کہ جو ایمان لاتے ہیں اور تقویٰ اختیار کرتے ہیں۔ "ان کے لئے بشارت ہے دنیوی زندگی میں اور آخرت میں، اللہ کے وعدوں کے لئے تبدیلی نہیں، یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔" پہلی بات تو اس میں یہ ہے کہ "اولیاء اللہ" کسے کہتے ہیں؟ لفظی معنی تو اس کا بھی ہے کہ جو اللہ سے قرب کا تعلق رکھنے والے ہیں، اب ایک قرب تو اللہ کا اپنی مخلوق کے ساتھ ہے ہی، جس کی وجہ سے اِس مخلوق کو وجود ملا، اُس کی کوئی کیفیت متعین نہیں کی جاسکتی کہ اللہ تعالیٰ کا اپنی مخلوق کے ساتھ ربط کس طرح سے ہے، ربط بین الخالق والمخلوق، اس کی کوئی کیفیت متعین نہیں کی جاسکتی، بغیر کیفیت متعین کرنے کے ہم جانتے ہیں کہ ربط ہے، اسی ربط کی بنا پر یہ مخلوق موجود ہے اور کائنات کا سارے کا سارا نظام چل رہا ہے، اگر خالق کی طرف سے مخلوق کے ساتھ ربط نہ ہو تو مخلوق سنبھل نہیں سکتی اور اپنے وجود کو باقی نہیں رکھ سکتی، جس وقت تک اللہ تعالیٰ کی توجہ ہے اس وقت تک یہ موجود ہیں، جب اللہ کی توجہ ختم ہوجائے گی تو ساری کائنات ختم ہوجائے گی، اس کا وجود ہی اللہ تعالیٰ کی توجہ کے ساتھ ہے، تو اس کی کیفیت متعین نہیں کی جاسکتی۔ اور ایک قرب اس سے بڑھ کے ہے جس کو قربِ محبت کہہ سکتے ہیں جیسا کہ حدیث شریف میں آتا ہے سرورِ کائنات ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ایک بندہ کثرت نوافل کے ساتھ میرا قرب حاصل کرتا رہتا ہے، حتیٰ کہ میں اس سے محبت کرنے لگ جاتا ہوں، جس وقت میں اس سے محبت کرنے لگ جاتا ہوں تو پھر میں اس کے کان بن جاتا ہوں جن کے ذریعے سے وہ سنتا ہے، میں اس کی آنکھیں بن جاتا ہوں جن کے ذریعے سے وہ دیکھتا ہے، میں اس کے ہاتھ بن جاتا ہوں جن کے ذریعے سے وہ پکڑتا ہے، میں اس کے پاؤں بن جاتا ہوں جن کے ذریعے سے وہ چلتا ہے۔[1] اس کو قربِ نوافل سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے اور قربِ محبت سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔ "اللہ تعالیٰ کا آنکھ کان بن جاتا ہے" اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ میری رضا میں بالکل فنا ہوجاتا ہے، اس کے کان وہی سنتے ہیں جس کو میں پسند کروں، اس کی آنکھ وہی دیکھتی ہے جس کو میں پسند کروں، زبان سے وہی بولتا ہے جس کو میں پسند کروں، تو جب اس کے سارے کے سارے اعضا میرے اَحکام کے تابع ہوگئے تو یوں سمجھو کہ اس کے کان میں ہی ہوں، اور اس کی آنکھیں میں ہی ہوں، یہ اطاعت میں مستغرق ہوجانے کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ کی مرضی کے بغیر پھر اس کے کان آنکھ زبان ہاتھ پاؤں کوئی دوسرا کام نہیں

---

(۱) بخاری ۲ر ۹۶۳، کتاب الرقاق، باب التواضع/ مشکوۃ ج ۱ ص ۱۹۷ باب ذکر اللہ، فصل اول، عن ابی ھریرۃؓ۔

کرتے، وہی کام کریں گے جو اللہ کو پسندیدہ ہیں، جس کو یہ قرب نوافل حاصل ہو جائے اس کو اصطلاحاً ولی اللہ کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے، کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے اندر انسان اس طرح سے فنا ہو گیا کہ اس فنا ہونے کے بعد انسان کی اپنی خواہشات اللہ تعالیٰ کی خواہشات میں ساری کی ساری فنا ہو گئیں، اور ہر وقت اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا ہی اس کو دھیان رہتا ہے، تو جس کو یہ قرب نصیب ہوتا ہے اس کو کہتے ہیں کہ اس کو ولایت مل گئی، اور یہ شخص اللہ کا ولی ہو گیا۔ اور اس کے بھی متعدد درجات ہیں، ایک درجہ تو متعین نہیں کیا جا سکتا، جیسے کہ آگے اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنی کتاب میں خود واضح فرمایا کہ اولیاء اللہ وہ ہیں جو ایمان لاتے ہیں اور تقویٰ اختیار کرتے ہیں، اب یہ دو چیزیں ہیں ایمان اور تقویٰ، ایمان تو آپ جانتے ہی ہیں کہ عقائد کی صحت کو کہتے ہیں، صحیح طور پر عقیدے اختیار کر لیے اور اس کے مقتضیات پر عمل شروع کر دیا، اس میں بھی قوت اور ضعف کے اعتبار سے درجات بنتے چلیں جائیں گے کہ کسی کا ایمان کمزور ہوتا ہے کسی کا ایمان قوی ہوتا ہے، اس کے بھی بے شمار درجات ہیں۔ اور تقویٰ کا مفہوم ہے اللہ تعالیٰ سے ڈرنا یعنی بچ بچ کے چلنا جیسا کہ ایک اثر میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے پوچھا تھا کہ تقویٰ کیا چیز ہے؟ انہوں نے پوچھا کہ آپ کسی ایسی وادی میں چلے ہیں کہ جس میں خاردار جھاڑیاں ہوں، کانٹے بکھرے ہوئے ہوں؟ تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہاں، انہوں نے پوچھا کہ چلنے کا کیا طریقہ ہے؟ کہا کہ چلنے کا طریقہ یہ ہے کہ انسان دیکھ دیکھ کر پاؤں رکھتا ہے اپنے دامن کو بچا کے رکھتا ہے کہ ادھر ادھر پھنس نہ جائے، وہ (ابی بن کعب) کہنے لگے بس یہی تقویٰ ہے کہ انسان زندگی اسی طرح سے سوچ سوچ کے گزارے، سوچ سوچ کے کام کرے، سوچ سمجھ کے بات کرے، اور ہر وقت اس خیال میں رہے کہ کہیں میرا دامن کسی طرف الجھ نہ جائے، کہیں میرا پاؤں کسی طرف پھسل نہ جائے، کسی قسم کا کوئی کانٹا چبھ نہ جائے، اس طرح فکر کے ساتھ چلنا اور بچ بچ کے چلنا یہی تقویٰ ہے۔[1] تو جب انسان ایمان صحیح حاصل کر لے اور پھر اس کے اندر تقویٰ کی صفت پیدا ہو جائے، اور تقویٰ اور ایمان بھی ایک معتد بہ درجے میں، صرف ایمان لانے کے ساتھ ہی یا اپنے دل میں یہ خیال لانے کے ساتھ کہ میں اب اللہ کے احکام کی پابندی کروں گا، یہ ایک ادنیٰ درجہ ہے، ادنیٰ درجہ کی ولایت انسان کو حاصل ہو جاتی ہے، اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (سورۂ بقرہ: ۲۵۷) جو بھی ایمان لے آئے اللہ تعالیٰ کا اس کے ساتھ تعلق ہو جاتا ہے، لیکن جیسے میں عرض کر رہا ہوں کہ درجات کا تفاوت ہے تو درجات کے تفاوت کے تحت اس میں بے شمار درجات نکل آئیں گے، مثلاً دس روپے یا بیس روپے بھی مال کا مصداق ہے لیکن اگر کسی شخص کے پاس دس یا بیس روپے ہوں تو اس کو اصطلاحاً مال دار نہیں کہا جاتا، مال دار اسے کہا جاتا ہے کہ جس کے پاس مال کی اتنی مقدار ہو جو عام طور دوسرے لوگوں کے پاس موجود نہیں ہے، تب اس کو کہیں گے کہ یہ شخص مال دار ہو گیا، اسی طرح سے ایمان اور تقویٰ ابتدائی درجے کے اعتبار سے اگرچہ ہر مؤمن کو حاصل ہو سکتا ہے، لیکن اس کو اصطلاحاً متقی نہیں کہتے، مؤمن کامل نہیں کہتے، جس وقت تک کہ معتد بہ درجے کا تقویٰ اور ایمان اس کے اندر نہ آ جائے، تو یہ درجات متعین نہیں کیے جا سکتے کہ ایمان کے کتنے درجات ہیں، تقویٰ کے کتنے درجات ہیں، یہ کیفیت جتنی راسخ ہوتی چلی جائے گی اتنا ہی اللہ تعالیٰ کا قرب انسان کو حاصل ہوتا چلا جائے گا، جس کی

---

(۱) دیکھئے: تفسیر ابن کثیر، سورۃ البقرۃ، آیت ۳ کے تحت۔

علامت یہی ہے کہ انسان کثرت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو یاد کرے، اور دوامِ طاعت، کہ ہر وقت اللہ تعالیٰ کے اَحکام کا دھیان رکھے، اور سوچ سوچ کے چلے، کہ کبھی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہ ہونے پائے، جب یہ کیفیت پیدا ہو جاتی ہے تو یہی ہے قرب جو انسان کو اللہ کے ساتھ حاصل ہوتا ہے، اس کو قربِ محبت سے تعبیر کیجئے، اور اس کو اِصطلاحاً ''ولی اللہ'' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے، ''مشکوٰۃ شریف'' میں ''باب الحب'' کے اندر ایک روایت ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نقل کرتے ہیں کہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''إِنَّ مِنْ عِبَادِ اللهِ لَأُنَاسًا مَا هُمْ بِأَنْبِيَاءَ وَلَا شُهَدَاءَ يَغْبِطُهُمُ الْأَنْبِيَاءُ وَالشُّهَدَاءُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ بِمَكَانِهِمْ مِنَ اللهِ. قَالُوا: يَا رَسُولَ اللهِ! تُخْبِرُنَا مَنْ هُمْ، قَالَ: هُمْ قَوْمٌ تَحَابُّوا بِرُوحِ اللهِ عَلَى غَيْرِ أَرْحَامٍ بَيْنَهُمْ وَلَا أَمْوَالٍ يَتَعَاطَوْنَهَا. فَوَاللهِ إِنَّ وُجُوهَهُمْ لَنُورٌ وَإِنَّهُمْ عَلَى نُورٍ. لَا يَخَافُونَ إِذَا خَافَ النَّاسُ، وَلَا يَحْزَنُونَ إِذَا حَزِنَ النَّاسُ. وَقَرَأَ هٰذِهِ الْآيَةَ: أَلَآ إِنَّ أَوْلِيَآءَ اللهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ''[1] حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ کے کچھ بندے ایسے ہیں کہ نہ تو وہ نبی ہیں نہ شہداء، لیکن انبیاء اور شہداء ان کے حال کو دیکھ دیکھ کے غبطہ کریں گے ان کے مرتبے کی وجہ سے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو حاصل ہوگا، صحابہ رضی اللہ عنہم نے کہا کہ یا رسول اللہ! آپ ہمیں بتائیے کہ وہ کون لوگ ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو قرآنِ کریم کی بنا پر آپس میں (قرآنِ کریم ان کے درمیان ایک مشترکہ چیز ہے، اس کی وجہ سے یہ آپس میں) محبت رکھتے ہیں، درمیان میں کوئی رشتہ داریاں نہیں، درمیان میں کوئی مالی معاملات نہیں جو ایک دوسرے سے لینا دینا ہو، خدا کی قسم! ان کے چہرے البتہ نُور ہوں گے، اور وہ بے شک وہ البتہ نُور پہ ہوں گے، نہیں ڈریں گے جس وقت لوگوں کو خوف ہوگا، نہیں حزن کریں گے جس وقت لوگوں کو حزن ہوگا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی أَلَآ إِنَّ أَوْلِيَآءَ اللهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ۔[2] سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا اس آیت کو تلاوت کرنا یہ اس بات کی علامت ہے کہ آپ نے ان لوگوں کو اولیاء اللہ قرار دیا، گویا کہ اولیاء اللہ کی علامات میں سے یہ ایک واضح بات آ گئی کہ اللہ کے لئے وہ آپس میں محبت کرتے ہیں، اللہ کے لئے ان کا آپس میں تعلق ہوتا ہے، اور ان کو پھر یہ حالت ملے گی، قیامت کے دن اتنے اعلیٰ درجے کے ہوں گے کہ انبیاء اور شہداء بھی ان کی حالت کو دیکھ دیکھ کے غبطہ کریں گے، خوش ہوں گے کہ دیکھو! ان کو اللہ کی طرف سے کیسا مرتبہ مل گیا، تو اولیاء اللہ کی علامت کے طور پر ایک بات یہ ذکر کی گئی کہ آپس میں اللہ کے لئے تعلق ہو، مخلوق کے ساتھ ہمدردی خالص معنی میں ہو، کسی مالی لین دین کے طور پر یا رشتہ داریوں کے طور پر تعلق نہیں بلکہ محض اللہ تعالیٰ کے ساتھ نسبت کے طور پر آپس میں وہ تعلق رکھتے ہیں، اور تلاوت یہ آیت فرمائی جو اس وقت آپ کے سامنے قرآنِ کریم میں ہے، تو یہ علامت ہے اس بات کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اولیاء کا مصداق انہی لوگوں کو قرار دیا ہے۔ بہر حال کثرتِ ذکر، دوامِ طاعت اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ مضبوط تعلق ہونے کی بناء پر اللہ والوں کے ساتھ محبت، یہ علامات کے طور پر ذکر کی جاتی ہیں کہ اس سے اولیاء اللہ پہچانے جاتے ہیں، ایک روایت میں یہ بھی ہے، وہ بھی آخر اسی کی شرح ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

---

(۱) ابوداؤد ج ۲ ص ۱۴۱، باب فی الرھن/ مشکوٰۃ ج ۲ ص ۴۲۶، باب الحب فی اللہ، فصل ثانی۔

(۲) سنن ابی داؤد ج ۲ ص ۱۴۱، باب فی الرھن/ مشکوٰۃ ۲/ ۴۲۶، باب الحب فی اللہ، فصل ثانی، عن عمرؓ

فرمایا کہ اللہ کے بہترین بندے وہ ہیں کہ "إِذَا رُؤُوْا ذُكِرَ اللّٰهُ" جب ان کو دیکھا جائے تو اللہ یاد آ جائے۔[1] یہ بھی اولیاء اللہ کی اور بہترین لوگ ہونے کی علامت ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ ان کا ظاہری حال اس قسم کا ہوتا ہے کہ ان کے پاس جا کے بیٹھو گے تو بات بات سے اور ان کے ہر عمل سے اللہ کی یاد تازہ ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف خوف وخشیت ان کے اوپر طاری ہوتا ہے کہ بیٹھنے والا سمجھتا ہے کہ واقعی یہ اللہ کے بندے ہیں، اور دیکھو! کس طرح سے اللہ تعالیٰ کا خوف ان پہ طاری ہے، ان کی باتیں ہوں گی تو اللہ کے ذکر پہ مشتمل ہوں گی، ان کا جو کام بھی انسان کے سامنے آئے گا وہ اللہ کے احکام کی یاد دہانی کراتا ہے، ظاہری طور پر ایک یہ مطلب بھی ہے، اور ویسے اس کا یہ مطلب بھی ہے کہ بہترین لوگ وہ ہوتے ہیں کہ جن کے پاس تم جا کے بیٹھو تو ان کی صحبت کے اثر سے دل کی غفلت دُور ہوتی ہے اور اللہ یاد آتا ہے، کہ عام حالات میں انسان کا اللہ کی طرف دھیان نہیں رہتا، دوسری چیزوں کی طرف دھیان ہوتا ہے، اور ان کے پاس جا کے بیٹھو گے تو بیٹھنے کے ساتھ باقی طرف سے توجہ ہٹتی ہے اور دل کے اندر ایک نورانیت سی پیدا ہوتی ہے اور اللہ کی طرف دھیان ہوتا ہے، تو جس مجلس میں جا کے انسان کو اللہ یاد آئے، دنیا کی محبت میں کمی آئے، آخرت کی طرف توجہ ہو اور اللہ تعالیٰ کی یاد تازہ ہو تو یہ بھی علامت ہوتی ہے کہ یہ اللہ کے نیک بندے ہیں اور اللہ کے ولی ہیں۔ تو یہ علامات ہیں جو حدیث شریف سے معلوم ہوتی ہیں کہ اللہ کے اچھے بندوں کی یہ نشانیاں ہیں، باقی کشف وکرامت کو جو عام طور پر لوگوں نے ولیوں کی علامت بنالیا ہے، یہ کوئی بات نہیں ہے، ولی کے لئے کشف یا کرامت کا ظاہر ہونا کوئی ضروری نہیں، یہ محض اللہ تعالیٰ کا ایک عطیہ ہے اگر کسی کو دے دیں، غیر اختیاری طور پر کسی کو مل جائے تو ٹھیک ہے، ورنہ اللہ کا مقبول بندہ ہونے کے لئے یہ کوئی ضروری نہیں کہ اس سے کوئی کسی قسم کا کشف یا کوئی کرامت ظاہر ہو، یہ معیار عوام کا معیار ہے، جہلاء کا معیار ہے، ولی کے لئے یہ کوئی ضروری نہیں، تو الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ یہ گویا کہ ولی کی ایک علامت کے طور پر ذکر کر دیا گیا۔

"خوف" اور "حزن" میں فرق

باقی ان کی یہ شان ذکر کی گئی کہ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ، اور ان کے لئے بشارت ذکر کی گئی لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ، اس کا کیا مطلب؟ "ان پر کوئی خوف نہیں ہوگا اور وہ غمزدہ نہیں ہوں گے" دنیا کے اندر رہتے ہوئے آپ دیکھتے ہیں کہ انسان کے لئے پریشانی کے دو ہی پہلو ہیں، دل میں جو ایک دکھ پیدا ہوتا ہے انسان پریشان ہوتا ہے تو اس کے دو ہی پہلو ہیں، یا تو کوئی چیز فوت ہو گئی، آپ کے ہاتھوں سے نکل گئی اس کی وجہ سے آپ کے دل میں ایک دکھ ہے اس کو "حزن" سے تعبیر کیا جاتا ہے، کسی فوت شدہ چیز پر جو غم ہوتا ہے اس کو "حزن" سے تعبیر کرتے ہیں، اور آنے والے حالات کا جو خطرہ پیدا ہو جاتا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو جائے اس کو "خوف" سے تعبیر کیا جاتا ہے، "خوف" کا تعلق مستقبل سے ہے، اور "حزن" کا تعلق ماضی سے ہے، جیسے کسی کا بچہ بیمار ہے، اس کو یہ اندیشہ ہے کہ کہیں مر نہ جائے، تو اس کے ساتھ جو طبیعت پر ایک غم سا طاری ہوتا ہے اس کو "خوف" سے تعبیر کریں گے، اور جب بچہ مر چکا تو مرنے کے بعد اس کے اوپر جو غم آتا ہے اس کو "حزن" سے تعبیر کریں گے۔

(۱) مشکوۃ ج ۲ ص ۴۱۵، باب حفظ اللسان، فصل ثالث/ مسند احمد، رقم الحدیث ۱۷۹۹۸/ نیز ابن ماجہ ص ۳۰۳، کتاب الزھد، باب من لا یؤبہ لہ

جنّت میں تمام جنّتی ''خوف وحزن'' سے محفوظ ہوں گے

تو اولیاء اللہ پر نہ حزن ہوتا ہے نہ خوف، اگر تو اس کا تعلق آخرت کے ساتھ ہو تو بات بالکل واضح ہے کہ جس وقت یہ جنّت میں چلے جائیں گے، آخرت میں سارے حساب کتاب کی وادیاں طے کرتے ہوئے جنّت میں پہنچ جائیں گے تو جنّت میں پہنچنے کے بعد یہی بشارت ہوگی کہ نہ حزن نہ خوف، اتنی کامیابی اللہ تعالیٰ انہیں دے دے گا کہ دنیا کے چھوٹ جانے کا یا دنیا کے کسی دوسرے معاملے کا ان کو کوئی حزن نہیں ہوگا، اور آنے والے خطرات سے بالکل محفوظ ہو جائیں گے، آنے والا کسی قسم کا کوئی خوف نہیں ہوگا کسی معاملے میں بھی، تو جنّت میں جانے کے بعد یہ کیفیت ہو جائے گی، یہ مطلب اگر لیا جائے تو پھر اس کا مطلب یہ ہوگا کہ جتنے بھی جنّت میں چلے جائیں گے سب اولیاء اللہ کا مصداق ہیں، چاہے پہلے ان کی زندگی کیسے ہی گزری ہو، لیکن وہاں جانے کے بعد وہ اولیاء اللہ کا ہی مصداق ہو گئے اپنے مختلف درجات کے اعتبار سے، اور یہ چیز ان کو وہاں جا کے حاصل ہو جائے گی، اس میں تو کوئی شک شبہ ہے ہی نہیں۔

اولیاء اللہ پر برزخ اور میدانِ قیامت میں کوئی ''خوف وحزن'' نہیں ہوگا

لیکن اس سے پیچھے ہٹئے! میدانِ قیامت میں بھی اور برزخ میں بھی ان کو اسی قسم کی بشارتیں دی جائیں گی، جس طرح سے لوگوں پر حزن اور خوف طاری ہوگا، اِن پر حزن اور خوف برزخ میں بھی نہیں ہوگا اور میدانِ قیامت میں بھی نہیں ہوگا، اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو بشارتیں حاصل ہوں گی جن کی بناء پر ان کو روحانی سرور ہوگا، اللہ تعالیٰ کی عظمت کی بنا پر اگر کوئی خوف ہو تو وہ اس کے منافی نہیں، بہر حال اس بارے میں وہ مطمئن ہوں گے کہ جو زندگی ہم گزار آئے ٹھیک گزار آئے، اور آنے والے میں بھی وہ خطرات سے مطمئن ہوں گے، برزخ کے اندر بھی ان کو اس قسم کی بشارتیں ملیں گی، اور آخرت میں بھی ان کو اس قسم کی بشارتیں دے کر مطمئن کر دیا جائے گا، جیسے کہ بعض آیات میں ہے تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا (سورۂ فصلت: ۳۰)، لَا يَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْاَكْبَرُ وَتَتَلَقّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ (سورۂ انبیاء: ۱۰۳)، اس قسم کے الفاظ قرآنِ کریم میں جو ذکر کیے گئے ہیں ان میں اسی معنی کی طرف ہی اشارہ ہے کہ جگہ بجگہ فرشتے ان کو بشارتیں دیں گے کہ کوئی غم نہ کرو، کوئی خوف نہیں ہے، اس طرح سے ان کو مطمئن کیا جائے گا، تو برزخ میں ہو، میدانِ قیامت میں ہو، جنّت میں ہو، یہ ساری چیزیں واقع ہیں۔

اولیاء اللہ دُنیا میں بھی ''خوف وحزن'' سے محفوظ ہوتے ہیں

اور اس سے آگے بڑھئے! اس دنیا کے اندر رہتے ہوئے بھی اولیاء اللہ کی شان یہی ہوتی ہے باقی لوگوں کے مقابلے میں، کہ ان کو نہ کسی قسم کا حزن ہوتا ہے نہ خوف ہوتا ہے، اس میں ایک ہے طبعی چیز کہ کوئی چیز فوت ہو گئی، طبعاً صدمہ ہو گیا یہ طبعیات جو ہوتی ہیں یہ بہت عارضی سی کیفیت ہوتی ہے جو جلدی سے زائل ہو جاتی ہے، اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق ہونے کی بناء پر ان کے قلب میں اتنا اطمینان ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ کے علم وحکمت کے اوپر اتنا اعتماد ہوتا ہے کہ جو واقعہ پیش آ جائے ظاہری طور پر ان کی مرضی کے

خلاف ہی کیوں نہ ہو لیکن وہ ان کے لئے حزن کا باعث نہیں بنتا اور اپنے مستقبل کے بارے میں بھی اس طرح سے قلوب کے اندر چین ہوتا ہے کہ وہ کسی قسم کے خطرات کے ساتھ پریشان نہیں ہوتے، وہ سمجھتے ہیں کہ جو کچھ ہوتا ہے اللہ تعالیٰ کے علم وحکمت کے تحت ہوتا ہے اور جو کچھ ہوگا سب اللہ کے علم وحکمت کے تحت ہوگا، اس کے اوپر ان کے دلوں کو اتنا قرار ہوتا ہے کہ جو واقعہ پیش آ گیا اس پر بھی کوئی غم نہیں، اور آنے والے خطرات سے بھی دل نہیں دھڑکتا اور دل کے اندر کوئی خوف وہراس اس قسم کا پیدا نہیں ہوتا، دنیا کے اندر بھی کیفیت یہی ہوتی ہے، جیسے کہ قرآنِ کریم میں دوسری جگہ ذکر کیا گیا اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ مؤمنوں کا دل اللہ کے ذکر کی وجہ سے مطمئن رہتا ہے، ان کو اللہ کے ذکر کے ساتھ اطمینان حاصل ہوتا ہے اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ (سورۂ رعد:۲۸) خبردار! اللہ کے ذکر کے ساتھ ہی اطمینان حاصل ہوا کرتا ہے۔ اطمینان کی کیفیت حزن وخوف کے خلاف ہے، جس کو اطمینان کی کیفیت حاصل ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ حزن وخوف سے بچا ہوا ہے، تو ان لوگوں کو اللہ کے ذکر کے ساتھ اطمینان حاصل ہوتا ہے، اور جب اطمینان حاصل ہے تو ماضی اور مستقبل کے متعلق کوئی کسی قسم کا ان کو غم اور فکر نہیں ہوا کرتا۔

ولی اور غیر ولی کے لئے مصیبت کی صورت ایک ہوتی ہے، لیکن حقیقتاً بڑا فرق ہوتا ہے

لیکن دنیا کے اندر رہتے ہوئے آپ دیکھیں گے بظاہر، ان کے اوپر واقعات پیش آتے ہیں، تو معلوم ایسے ہوتا ہے جیسے ان کو حزن بھی ہے اور خوف بھی ہے، حالت ظاہری طور پر ایک جیسی ہوتی ہے لیکن حقیقت کے اعتبار سے بڑا فرق ہوتا ہے، دنیادار کا صدمہ اور طرح کا ہے، اور اولیاء اللہ کو اگر بظاہر صدمہ پہنچتا بھی ہے تو اس کی کیفیت اور ہوتی ہے، دل پریشان نہیں ہوتا، اگرچہ ظاہری طور پر آپ ان کو دیکھیں گے کہ ان کے اوپر صدمے کی کیفیت ہے لیکن ان کے دل کے اندر ایک قسم کی لذت ہوتی ہے، یہ بھی کیفیت ہے جس وقت نہ گزرے اس وقت تک انسان اس کا صحیح ادراک نہیں کر سکتا، لیکن سمجھانے کے لئے ایک بات کہی جا سکتی ہے، کہ ایک آدمی ہے، اس کو کسی دوسرے کے ساتھ محبت ہے، اور محبت کی وجہ سے اس کی ملاقات کے لئے وہ تڑپتا پھر رہا ہے، اس کو جدائی کا صدمہ ہے، متلاشی ہے کہ کہیں وہ دوست مل جائے، دل کو سکون اور قرار حاصل ہو، اسی غم میں وہ بیچارہ کمزور بھی ہو گیا، لاغر بھی ہو گیا، جیسے کہ یہ کیفیت ہو جایا کرتی ہے، عشق انسان کو پگھلا دیتا ہے، اب وہ کہیں جا رہا تھا تو اتفاق سے اس کا وہ دوست اور اس کا محبوب سامنے آ گیا، اور وہ ماشاء اللہ طاقتور ہے، ہٹا کٹا ہے، اور وہ آ کے اپنے اس دوست کو دبوچ لیتا ہے، اور اتنا اس کو دباتا ہے کہ اس کی پسلیاں چڑ چڑ کرنے لگ جاتی ہیں، زور کے ساتھ جو اس کو دبایا، لیکن جس کو دبایا جا رہا ہے اس نے دیکھا نہیں کہ یہ کون ہے، جیسے پیچھے سے آ کے دبا لیا، اب جس وقت تک اس کو پتا نہ چلے کہ مجھے دبانے والا کون ہے تو اس کے دل کی کیفیت اور ہوگی، یہ دکھ محسوس کرے گا تکلیف محسوس کرے گا، ہائے کہے گا، چیخے گا، اور اس مصیبت سے چھٹکارا چاہے گا، یہی کیفیت ہوگی نا؟ (جی) لیکن جس وقت وہ دیکھ لے اور پہچان لے کہ یہ تو وہی ہے کہ جس کے لئے میں تڑپتا پھرتا ہوں، اگرچہ پسلیاں تو اس کی اب بھی ٹوٹ رہی ہوں گی، لیکن آپ بتلائیں کہ ان دونوں کیفیتوں کے درمیان میں فرق ہے یا نہیں ہے؟ اس دوسری کیفیت میں اگرچہ زبان سے ہائے نکلے گی لیکن دل میں جو لذت ہے اس کا ادراک آپ نہیں کر سکتے، اب اگر وہی کہے کہ اچھا! تجھے چھوڑ دوں؟ اور کسی

دوسرے کو بغل میں لے لوں؟ تو وہ کہے گا کہ نہیں، جیسے حضرت تھانوی رحمہ اللہ اس بات کو سمجھانے کے لئے شعر اکثر پڑھا کرتے ہیں:

نہ شود نصیبِ دشمن کہ شود ہلاکِ تیغت سرِ دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

دشمن کو یہ بات نصیب نہ ہو کہ تیری تلوار سے وہ ہلاک ہو جائے، تیری خنجر آزمائی کے لئے دوستوں کے سر موجود ہیں۔ ان دونوں کیفیتوں میں فرق سمجھ لیجئے! ایک ہے دشمن کا دبانا، یا ایسی صورت میں دب جانا کہ جب دبانے والے کا پتا نہ ہو، اس میں انسان کے قلب میں کیا پریشانی ہوتی ہے اور اس مصیبت سے چھوٹنے کے لئے کس طرح سے بے چین ہوتا ہے، اور ایک ہے اپنے محبوب کا اور دوست کا دبا لینا، پتا چل گیا کہ دبانے والا وہی ہے جس کے لئے میں تڑپتا پھر رہا تھا، اس وقت قلب کی کیفیت کیا ہوا کرتی ہے، گویا کہ محبت کی چوٹ اور ہے اور دشمنی کی مار جو ہوا کرتی ہے وہ اور ہے، ان دونوں کے درمیان میں اتنا فرق ہے کہ جس کو ہر باذوق آدمی سمجھ سکتا ہے، اس میں کسی قسم کا کوئی خفاء نہیں، اسی طرح سے سمجھ لیجئے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مصیبت یا خلافِ مزاج واقعہ دنیادار کے ساتھ بھی پیش آتا ہے، یہ تو ایسا ہے جیسے انسان کسی دشمن کے گھٹنے کے نیچے آ جائے، اور اس قسم کے مرضی کے خلاف واقعات اولیاء اللہ کو بھی پیش آتے ہیں لیکن ان کے قلب کی کیفیت ایسے ہوتی ہے جیسے کسی محبوب کی طرف سے انسان کو دبوچا جاتا ہے یا دبایا جاتا ہے یا اس کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کی جاتی ہے، ان دونوں باتوں کے اندر جو فرق ہے اسی قسم کا فرق یہاں آپ سمجھ لیجئے۔

یا آپ اس طرح سمجھ لیں کہ ایک آدمی تو کسی مصیبت کا مارا ہوا بیٹھا روتا ہے، اس کا بھی روتے ہوئے ناک سے پانی بہتا ہے اور آنکھوں سے آنسو ٹپکتے ہیں، اور ایک ہے کہ بہت شاندار گوشت بھنا ہوا ہو، مسالے دار ہو، تو انسان جس وقت بیٹھا کھاتا ہے، تو اس وقت بھی اس کے ناک سے پانی بھی ٹپکتا ہے اور آنکھوں سے آنسو بھی نکلتے ہیں، ایسا بھی ہوتا ہے کہ نہیں ہوتا؟ (جی)۔ جس وقت آپ مسالے دار شاندار قسم کا بھنا ہوا گوشت کھائیں تو اس وقت بھی ناک سے پانی بھی ٹپکتا ہے آنکھوں سے آنسو بھی بہتے ہیں، شکل تو دونوں کی ایک جیسی ہے، جیسے وہ بھی بیٹھا رو رہا ہے اور وہ بھی بیٹھا رو رہا ہے، لیکن کیا باطن کی کیفیت ایک جیسی ہے؟ باطن کی کیفیت ایک جیسی نہیں ہے۔ اس لیے اولیاء اللہ کو جو واقعات پیش آیا کرتے ہیں ظاہری صورت ان کی اگرچہ دوسروں کے ساتھ ملتی جلتی ہوا کرتی ہے لیکن حقیقت کے اعتبار سے زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں رہتے ہوئے بھی ان کی کیفیت یہی ہوتی ہے کہ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ، آنے والے حالات پر بھی ان کو ایک اطمینانِ قلبی ہوتا ہے، اور گزرے ہوئے واقعات پر بھی ان کے دل میں کسی درجے میں لذت ہی ہو گی، جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے واقعات پیش آ جاتے ہیں، چاہے ظاہری طور پر ان سے ہائے بھی نکلے گا، چاہے ظاہری طور پر ان کی آنکھوں سے آنسو بھی ٹپکیں گے لیکن قلبی طور پر پریشانی نہیں ہو گی، اور دنیادار آدمی وہمی خطرات سے بھی بدکتا رہتا ہے دل پریشان رہتا ہے، اور کوئی واقعہ پیش آ جائے تو اس کو بھی کسی صورت میں بھولتا نہیں، اور اس کو بھی اسی طرح سے یاد کر کر کے اس پر بھی پریشان ہوتا رہتا ہے۔

اہلِ یورپ پریشان کیوں؟ اور اہل اللہ پُرسکون کیوں؟

آج یورپ کو اگرچہ ہر قسم کی آسائش حاصل ہے، دیکھنے میں کوئی ایسی راحت کی چیز نہیں جو ان کو حاصل نہ ہو، لیکن ان

کے قلوب انتہائی پریشان ہیں، اور یہ واقعہ ہے، اس درجہ پریشان ہیں کہ وہ لوگ جانتے ہی نہیں کہ اطمینان اور چین ہوتا کیا ہے؟ اس لیے اکثر وبیشتر بڑے بڑے لوگ خودکشیاں کرتے ہیں، وہ سمجھتے ہیں کہ شاید موت کے ساتھ ہی چین اور سکون آجائے گا، اور ان کی پریشانی کی دو ہی باتیں ہیں، ایک تو آنے والے خطرات ان کو چین نہیں لینے دیتے کہ جنگ لگ گئی تو کیا ہوگا، یہ کاروبار خراب ہوگیا تو کیا ہوگا؟ فلاں چیز اگر ایسے ہوگئی تو کیا ہوگا؟ یہ فکر ہی پریشان کیے ہوئے ہے، دوسرے موجودہ حالت میں جو ایک دوسرے کے ساتھ ہمدردی نہیں رہی، ایک دوسرے کے ساتھ محبت نہیں رہی، اس نے بھی ان کے دلوں کو ویران کر دیا ہے۔ اور اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے اس کے جو نیک بندے ہوا کرتے ہیں ان کو یہ نعمت نصیب ہوتی ہے کہ آنے والے خطرات سے بھی یہ مطمئن ہوتے ہیں، اور دل کے اندر سکون اور اطمینان کی ایک وجہ یہ بھی ہوتی ہے، جیسے اس روایت کے اندر ذکر کیا گیا کہ آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ محبت الفت تعلق یہ مستقل ایک چین کی چیز ہے، اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت ہوگی تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیش آمدہ واقعات پریشان نہیں کریں گے، اور مخلوق کے ساتھ محبت ہوگی مخلوق کو ان کے ساتھ محبت ہوگی تو ایسی صورت میں بھی انسان کو راحت اور چین نصیب ہوتا ہے، سورۂ مریم کے آخر میں ایک آیت آئے گی اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا: کہ جو لوگ ایمان لاتے ہیں نیک عمل کرتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کے لئے محبت قرار دیتا ہے، محبت بنا دیتا ہے، تو اس وُدّ کا کیا مصداق ہے؟ اللہ تعالیٰ ان سے محبت کرنے لگ جاتا ہے جیسے حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب ایک آدمی نیکی کرتا ہے تو اللہ کو اس سے محبت ہوجاتی ہے تو پھر اللہ تعالیٰ جبریل علیہ السلام کو بتاتے ہیں اور جبریل آگے آسمانوں میں اعلان کرتے ہیں، پھر وہی محبت زمین پہ اتاردی جاتی ہے،[1] یہ ایک روایت ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کی محبت بھی اس کو نصیب ہوگئی، ملائکہ کی محبت بھی اس کو نصیب ہوگئی اور مخلوق کی محبت بھی اس کے لئے ہوجاتی ہے، تو یہ بن جائے گا محبوبِ کائنات، تو جس وقت محبوب بن جائے گا تو پھر راحت ہی راحت ہے، دوسروں کی طرف سے بھی راحت پہنچتی ہے، جس وقت انسان یہ دیکھتا ہے کہ سارے میرے ساتھ محبت کرتے ہیں تو انسان کو راحت پہنچتی ہے، اسی طرح سے اللہ تعالیٰ اِن (اولیاء) کے دل میں اپنی محبت بھی ڈال دیتا ہے، جب اپنی محبت ڈال دیتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو واقعات پیش آئیں گے سب لذیذ بن جاتے ہیں، اور اِن کے دل میں اللہ تعالیٰ مخلوق کی محبت بھی ڈال دیتا ہے کہ یہ مخلوق کے ساتھ صحیح معنی میں محبت کرتے ہیں، اور مخلوق ان کے ساتھ صحیح معنی میں محبت کرتی ہے، تو ایک دوسرے کی طرف سے راحت اور لذت انسان کو پہنچتی ہے، کیونکہ ''از محبت تلخہا شیریں شود'' محبت کے ساتھ تلخیاں بھی شیریں ہوجایا کرتی ہیں، تو اس طرح سے انسان کے دل میں ایک لذت کی کیفیت پیدا ہوتی ہے اسی محبت کی کیفیت پر، جو کہ خوف اور حزن کے خلاف ہے۔ کچھ اس کیفیت کو میں سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں، ایک ناکام سی کوشش، اس پر توجہ فرمایئے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ جس وقت تک انسان پر یہ درجہ نہ آجائے اس وقت تک ان کیفیات کو سمجھنا مشکل ہے، اللہ تعالیٰ کے ساتھ صحیح تعلق ہوجانے کے بعد انسان خوف اور حزن سے دنیا کے اندر بھی محفوظ ہوجاتا ہے، باقی! اللہ تعالیٰ کا خوف اور اس کی خشیت وہ تو بہت لذیذ اور بہت عظیم نعمت ہے اس کی نفی کرنی مقصود نہیں، اللہ تعالیٰ کا خوف اور اس سے ڈر یہ پریشانی کا باعث نہیں ہوتا، وہ تو انسان کے لئے ایک بہت ہی لذیذ

(۱) بخاری ۱/۴۵۶، باب ذکر الملائکۃ/ مسلم ۲/۳۳۱، باب اذا احب اللہ عبدا الخ/ مشکوٰۃ ۲/۴۲۵، باب الحب فی اللہ، فصل اول۔

چیز ہے اور روحانی ترقیات کا باعث ہے، جس طرح سے دنیادار پریشان ہوتا ہے اور اس کے اوپر غم طاری ہوتی ہے غم کی کیفیت ہوتی ہے وہ کیفیت اہل اللہ کی نہیں ہوتی۔

دُنیاوآخرت میں بشارت کے مختلف مصداق

لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ فِي الْاٰخِرَةِ: ان کو دنیا اور آخرت میں بشارتیں ملتی ہیں، بشارت کا ایک مصداق تو یہ ہے جیسے سرورِ کائنات ﷺ نے اپنی زندگی میں بشارت دے دی: "ابوبکر فی الجنة، عمر فی الجنة، عثمان فی الجنة، علی فی الجنة"(١) صحابہ کرام کو بشارتیں دے دیں، اہلِ بیت کے لئے بشارتیں ہوگئیں، عام صحابہ کے لئے بشارتیں ہوگئیں، یہ دنیوی زندگی میں بشارتیں ہیں اور آخرت کی بشارتیں تو ہیں ہی، کہ آخرت میں یہ ہوگا، اور جس وقت آخرت میں جائیں گے تو جگہ جگہ فرشتے ان کو بشارتیں دیں گے، لَهُمُ الْبُشْرٰى کا ایک مصداق یہ بھی ہے کہ اللہ اور اللہ کے رسول کی طرف سے اولیاء اللہ کو بشارتیں مل گئیں، نام بنام بھی ملیں اور بعض کلی ضابطوں کے تحت بھی ملیں۔ اور پھر حدیث شریف میں اس بشریٰ کا مصداق یہ بھی آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے خواب میں انسان کو اس کے اچھے انجام کی اطلاع ملتی ہے، کوئی شخص اپنے متعلق اچھا خواب دیکھتا ہے یہ بھی اس کے لئے بشریٰ من اللہ ہے، اور یا اس کے متعلق کوئی دوسرا مؤمن اچھا خواب دیکھتا ہے تو یہ بھی بشریٰ من اللہ ہے، ایک ہے کہ آپ خود اپنے متعلق ایسا خواب دیکھیں جس سے معلوم ہو کہ آپ کا انجام اچھا ہونے والا ہے اور آپ اللہ کے نزدیک مقبول ہیں یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بشارت ہے، اور ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ آپ کے متعلق کوئی دوسرا آدمی خواب دیکھ لے، جس میں یہ ظاہر کیا گیا ہو کہ آپ کا یہ مرتبہ ہے یہ مقام ہے، اور آپ اللہ کے مقبول بندے ہیں، تو یہ بھی ایک بشریٰ ہے۔ تو رؤیائے صالحہ، نیک خواب، اس کو بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے بشارت قرار دیا گیا ہے، لیکن اس کا پہچاننا بہت مشکل ہوتا ہے کہ یہ اپنے ہی خیالات ہیں جو دماغ کے اندر آجاتے ہیں، یا یہ واقعی اللہ تعالیٰ کی طرف سے اِلقاء ہے، اس لیے ہر خواب قابلِ اعتماد نہیں ہوا کرتا، خواب اللہ کی جانب سے بھی ہوتا ہے، شیطان کی طرف سے وسوسہ بھی ہوتا ہے، اور اپنے نفسانی خیالات بھی ہوتے ہیں، جب انسان کو تبخیر ہو یا معدہ خراب ہو تو پھر رات کو خیالات بہت آیا کرتے ہیں، تو فرق کرنا مشکل ہوتا ہے، سچا خواب اللہ کی طرف سے بشارت ہے چاہے مؤمن اپنے متعلق خود دیکھے، یا اس کے متعلق کوئی دوسرا دیکھ لے، تو لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ فِي الْاٰخِرَةِ کا مصداق حدیث شریف میں ان خوابوں کو بھی قرار دیا گیا ہے۔(٢)

لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ میں ان سب چیزوں کو گویا کہ رجسٹرڈ کردیا، کہ اللہ تعالیٰ جس قسم کے وعدے کرتا ہے ان کے اندر کوئی کسی قسم کی تبدیلی نہیں، اللہ تعالیٰ کے کیے ہوئے وعدے پورے ہو کے رہیں گے، لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ: کلمات اللہ سے یہاں وعدے مراد ہیں، اللہ تعالیٰ کے وعدوں کے لئے کوئی تبدیلی نہیں، کوئی دوسرا بھی ان کو نہیں بدل سکتا، اور اللہ بھی اپنے طور پر ان کو نہیں

---

(١) ترمذی ۲/۲۱۵ باب مناقب عبد الرحمن بن عوف/ ابوداؤد ۲/۲۸۳ باب فی الخلفاء/ مشکوٰۃ ۲/۵۶۶ باب مناقب العشرۃ فصل ثانی۔

(٢) ترمذی ۲/۱۳۲، ابواب التفسیر، تفسیر سورۃ یونس۔ نیز ۲/۵۳/ ابن ماجہ ص۲۷۸، کتاب تعبیر الرؤیا۔

بدلے گا، جو وعدے اولیاء اللہ کے ساتھ کیے جا رہے ہیں وہ پورے ہوں گے، ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ: اور یہ مرتبہ حاصل ہو جانا بہت بڑی کامیابی ہے، کہ اللہ تعالیٰ کا قرب کسی کو حاصل ہو جائے جس کے نتیجے میں خوف اور حزن سے محفوظ ہو جائے، دنیا میں بھی، برزخ میں بھی، قیامت میں بھی، جنت میں جانے کے بعد بھی، اور دنیا اور آخرت کے اندر اس کو بشارتیں ملنے لگ جائیں، ایمان و تقویٰ کی دولت سے کوئی مالا مال ہو جائے، اصل کامیابی یہ ہے، ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ: یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔ وَلَا یَحْزُنْكَ قَوْلُهُمْ: ان لوگوں کی باتیں آپ کو کسی قسم کے غم میں نہ ڈالیں، اِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِیْعًا: غلبہ سارا اللہ ہی کے لئے ہے، اللہ خود غالب ہے، اور اسی طرح سے اللہ اپنے اولیاء کو بھی غالب کرے گا، ان کو عزت دے گا، جس طرح سے سورۂ منافقون میں آیت آئے گی،[1] وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ کہ غلبہ اللہ کے لئے اور اس کے رسول کے لئے اور مؤمنین کے لئے ہے۔ هُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ: وہ سننے والا جاننے والا ہے۔

وَلَا یَحْزُنْكَ قَوْلُهُمْ ۘ اِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِیْعًا ؕ هُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ﴿۶۵﴾ اَلَاۤ اِنَّ لِلّٰهِ

غم میں نہ ڈالے آپ کو ان کی بات، بے شک غلبہ اللہ ہی کے لئے ہے سارے کا سارا وہ سننے والا ہے جاننے والا ہے ﴿۶۵﴾ خبردار! اللہ ہی

مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِی الْاَرْضِ ؕ وَمَا یَتَّبِعُ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُرَكَآءَ ؕ

کے لئے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے، کس چیز کی اتباع کرتے ہیں وہ لوگ جو اللہ کے علاوہ پکارتے ہیں شرکاء کو،

اِنْ یَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا یَخْرُصُوْنَ ﴿۶۶﴾ هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الَّیْلَ لِتَسْكُنُوْا

وہ نہیں اتباع کرتے مگر وہم کی اور نہیں وہ مگر اٹکل چلاتے ﴿۶۶﴾ اللہ وہ ہے جس نے بنایا تمہارے لیے رات کو تاریک تا کہ تم اس میں

فِیْهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّسْمَعُوْنَ ﴿۶۷﴾ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا

سکون حاصل کرو اور دن کو روشن، اس میں البتہ نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو سنتے ہیں ﴿۶۷﴾ یہ لوگ کہتے ہیں اختیار کر لی اللہ نے اولاد،

سُبْحٰنَهٗ ؕ هُوَ الْغَنِیُّ ؕ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ؕ اِنْ عِنْدَكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ

اللہ پاک ہے وہ بے نیاز ہے، اسی کے لئے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے، نہیں ہے تمہارے پاس کوئی دلیل

بِهٰذَا ؕ اَتَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۶۸﴾ قُلْ اِنَّ الَّذِیْنَ یَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ

اس بات کی، کیا تم بولتے ہو اللہ پر ایسی بات جو تم نہیں جانتے؟ ﴿۶۸﴾ آپ کہہ دیجیے کہ جو لوگ اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں

(۱) آخری آیت کی مزید تفسیر اگلے درس میں ملاحظہ فرمائیں۔

الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُونَ ﴿٦٩﴾ مَتَاعٌ فِي الدُّنْيَا ثُمَّ إِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ نُذِيقُهُمُ الْعَذَابَ

وہ لوگ کامیاب نہیں ہوں گے ﴿۶۹﴾ تھوڑا سا سامان ہے دُنیا میں پھر ہماری طرف ان کا لوٹنا ہے پھر ہم چکھائیں گے ان کو سخت

الشَّدِيدَ بِمَا كَانُوا يَكْفُرُونَ ﴿٧٠﴾ وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ نُوحٍ إِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ يَا قَوْمِ

عذاب بسبب اس کے کہ وہ کُفر کرتے تھے ﴿۷۰﴾ تلاوت کیجیے ان پر نوح علیہ السلام کے واقعے کی جبکہ کہا انہوں نے اپنی قوم سے اے میری قوم!

إِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكُمْ مَقَامِي وَتَذْكِيرِي بِآيَاتِ اللَّهِ فَعَلَى اللَّهِ تَوَكَّلْتُ فَأَجْمِعُوا

اگر گراں گزرتا ہے تم پر میرا کھڑا ہونا اور میرا نصیحت کرنا اللہ کی آیات کے ساتھ تو میرا اللہ پر بھروسا ہے پس تم پختہ کرلو

أَمْرَكُمْ وَشُرَكَاءَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُنْ أَمْرُكُمْ عَلَيْكُمْ غُمَّةً ثُمَّ اقْضُوا إِلَيَّ وَ

اپنی تدبیر کو اپنے شرکاء کے ساتھ مل کر، پھر نہ ہو تمہارا اَمر تمہارے لیے تردّد کا باعث، پھر تم جاری کردو اس کو میری طرف اور

لَا تُنْظِرُونِ ﴿٧١﴾ فَإِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَمَا سَأَلْتُكُمْ مِنْ أَجْرٍ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَى اللَّهِ وَ

تم مجھے مہلت نہ دو ﴿۷۱﴾ پھر اگر تم نے پیٹھ پھیری تو نہیں میں نے مانگی تم سے کوئی اُجرت، نہیں ہے میرا اَجر مگر اللہ کے ذِمّے، اور

أُمِرْتُ أَنْ أَكُونَ مِنَ الْمُسْلِمِينَ ﴿٧٢﴾ فَكَذَّبُوهُ فَنَجَّيْنَاهُ وَمَنْ مَعَهُ

میں حکم دیا گیا ہوں کہ میں ہوجاؤں فرمانبرداروں میں سے ﴿۷۲﴾ پس انہوں نے اس کو جھٹلایا، پھر ہم نے نجات دی ان کو اور جو کشتی میں

فِي الْفُلْكِ وَجَعَلْنَاهُمْ خَلَائِفَ وَأَغْرَقْنَا الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ

اس کے ساتھ تھے، اور بنادیا ہم نے ان کو جانشین اور ڈبو دیا ہم نے ان کو جنہوں نے جھٹلایا تھا ہماری آیات کو، پھر تُو دیکھ کیسے انجام

الْمُنْذَرِينَ ﴿٧٣﴾ ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْ بَعْدِهِ رُسُلًا إِلَى قَوْمِهِمْ فَجَاءُوهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ فَمَا كَانُوا

ہوا ڈرائے ہوؤں کا! ﴿۷۳﴾ پھر ہم نے بھیجے ان کے بعد کئی رسول ان کی قوم کی طرف پھر وہ ان کے پاس واضح دلائل لے کے آئے، نہیں

لِيُؤْمِنُوا بِمَا كَذَّبُوا بِهِ مِنْ قَبْلُ كَذَلِكَ نَطْبَعُ عَلَى قُلُوبِ

تھے وہ لوگ کہ ایمان لے آئیں اس چیز کے ساتھ جس کو انہوں نے پہلی بار جھٹلا دیا، اسی طرح ہم مُہر کردیتے ہیں حد سے گزرنے

الْمُعْتَدِينَ ﴿٧٤﴾ ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْ بَعْدِهِمْ مُوسَى وَهَارُونَ إِلَى فِرْعَوْنَ وَمَلَئِهِ بِآيَاتِنَا

والوں کے قلوب پر ﴿۷۴﴾ پھر ہم نے بھیجا موسیٰ اور ہارون کو ان کے بعد فرعون اور اس کے سرداروں کی طرف اپنی نشانیوں کے ساتھ

فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ ۝۷۵ فَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوْٓا

پس انہوں نے بھی تکبر کیا اور تھے وہ لوگ جرم کرنے والے ۝۷۵ پھر جب آ گئی ان کے پاس سچی بات ہماری طرف سے تو کہنے لگے

اِنَّ هٰذَا لَسِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝۷۶ قَالَ مُوْسٰٓى اَتَقُوْلُوْنَ لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَكُمْ ؕ اَسِحْرٌ هٰذَا ؕ وَلَا

کہ یہ تو صریح جادو ہے ۝۷۶ موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ کیا تم حق کے بارے میں کہتے ہو جب وہ تمہارے پاس آ گیا؟ کیا یہ جادو ہے؟ نہیں

يُفْلِحُ السّٰحِرُوْنَ ۝۷۷ قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِتَلْفِتَنَا عَمَّا وَجَدْنَا عَلَيْهِ

فلاح پاتے جادوگر ۝۷۷ انہوں نے کہا کہ کیا تُو آیا ہے ہمارے پاس اس لیے تاکہ تُو ہٹا دے ہمیں اس چیز سے جس پر پایا ہم نے

اٰبَآءَنَا وَتَكُوْنَ لَكُمَا الْكِبْرِيَآءُ فِى الْاَرْضِ ؕ وَمَا نَحْنُ لَكُمَا بِمُؤْمِنِيْنَ ۝۷۸ وَقَالَ

اپنے آباء واجداد کو اور تاکہ ہو جائے بڑائی تم دونوں کی زمین میں، نہیں ہیں ہم تمہارے لیے ایمان لانے والے ۝۷۸ فرعون

فِرْعَوْنُ ائْتُوْنِىْ بِكُلِّ سٰحِرٍ عَلِيْمٍ ۝۷۹ فَلَمَّا جَآءَ السَّحَرَةُ قَالَ لَهُمْ مُّوْسٰٓى اَلْقُوْا مَآ اَنْتُمْ

نے کہا کہ لے آؤ میرے پاس ہر علم والا جادوگر ۝۷۹ جس وقت جادوگر آ گئے تو کہا موسیٰ علیہ السلام نے جادوگروں سے کہ ڈالو جو تم ڈالنے

مُّلْقُوْنَ ۝۸۰ فَلَمَّآ اَلْقَوْا قَالَ مُوْسٰى مَا جِئْتُمْ بِهِ ۙ السِّحْرُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَيُبْطِلُهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ

والے ہو ۝۸۰ جب انہوں نے ڈال دیا تو کہا موسیٰ علیہ السلام نے: جو تم لائے ہو یہ تو جادو ہے بے شک اللہ اس کو جلد ہی باطل کر دے گا بے شک اللہ

لَا يُصْلِحُ عَمَلَ الْمُفْسِدِيْنَ ۝۸۱ وَيُحِقُّ اللّٰهُ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ ۝۸۲ ع

نہیں درست کرتا فسادیوں کے عمل کو ۝۸۱ اور ثابت کرتا ہے اللہ حق کو اپنے احکام کے ساتھ اگرچہ مجرموں کو یہ بات ناگوار ہی گزرے ۝۸۲

تفسیر

سَرورِ کائنات ﷺ کو تسلی

پہلی آیت کا تعلق حضور ﷺ کی تسلی کے ساتھ ہے کہ آپ پر جو یہ آوازیں کستے ہیں یہ آپ کو غم میں نہ ڈالیں، یہ آوازیں ایسی باتوں پر کستے تھے جن میں رسول اللہ ﷺ مسلمانوں کے لئے غلبہ کی بات کرتے تھے اور اپنے ماننے والوں کو بشارتیں سناتے تھے کہ انجام تمہارا ہی اچھا ہے، یہ (کافر) لوگ آخر کار خسارے میں جائیں گے، دنیا میں شکست کھائیں گے، ذلیل ہوں گے، اللہ تعالیٰ تمہیں عزت دے گا، یہ بشارتیں رسول اللہ ﷺ سناتے تھے تو وہ آگے سے مذاق اڑاتے تھے کہ یہ لوگ عجیب قسم کی باتیں

کرتے ہیں، کھانے کو روٹی نہیں اور تن ڈھانپنے کو کپڑا میسر نہیں، ہر طرف سے دھکے پڑتے ہیں، اور یہ خواب دیکھتے ہیں کہ ایک وقت میں ہم سب پر غالب آ جائیں گے، اس قسم کی باتیں وہ استہزا کے طور پر کرتے تھے۔ اللہ فرماتے ہیں اس قسم کی باتیں آپ کے لئے غم کا باعث نہ ہوں، اِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا: غلبہ سب اللہ کے لئے ہے، اور جب غلبہ اللہ کے لئے ہے تو ساری کی ساری عزت بھی اللہ کے لئے ہے، اللہ جسے چاہے گا دے گا وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ (آل عمران:۲۶) عزت دینا بھی اس کے ہاتھ میں ہے اور ذلت دینا بھی اس کے ہاتھ میں ہے، تو عزت ساری کی ساری اللہ کے ہاتھ میں ہے جسے چاہے گا اسے ملے گی، اور سورۂ منافقون میں ہے وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ کہ عزت اللہ کے لئے ہے اور اللہ کے رسول کے لئے ہے اور مؤمنین کے لئے ہے، یعنی اصل اللہ کے لئے ہے اور اللہ کی طرف سے پھر رسول کے لئے ہے پھر اس کے ساتھ تعلق ہونے کی وجہ سے مؤمنین کے لئے ہے لیکن یہ کافر اور منافق لوگ اس بات کو سمجھتے نہیں، یہ تسلی ہے سرورِ کائنات ﷺ کے لئے، هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ: اللہ تعالیٰ سب کی باتوں کو سنتا ہے اور سب کے حالات کو جانتا ہے۔

اِثباتِ توحید اور ردِّ شرک

آگے پھر وہی اثباتِ توحید اور ردِ شرک ہے کہ جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے سب اللہ کے لئے ہے، یہ جو لوگ شرکاء بنائے بیٹھے ہیں یہ شرکاء کی اتباع نہیں کرتے، شرکاء کی اتباع کرنا تو تب سمجھا جائے گا کہ جب واقعتاً شرکاء کا وجود بھی ہو، جب شرکاء کا وجود ہی نہیں تو پھر یہ لوگ شرکاء کے متبع کیسے ہوئے؟ اپنے خیالات اور توہمات میں لگے ہوئے ہیں، اٹکل کے تیر چلاتے ہیں، کوئی ان کے پاس دلیل اور ثبوت نہیں۔ دوسرا اس کا مفہوم یہ ہے کہ جو شرکاء کو پکارتے ہیں خدا جانے کس چیز کو پکارتے ہیں، اللہ جانے کس چیز کے پیچھے لگے ہوئے ہیں، یعنی کوئی اس قسم کی چیز تو نہیں کہ جس کو یہ اپنا متبوع قرار دے کے اس کے پیچھے لگے ہیں، پس محض ان کے دماغی خیالات ہیں، اٹکل کے تیر ہیں جو انہوں نے بنا رکھے ہیں اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ۔ آگے جو الفاظ آ رہے ہیں ان کو دلیل توحید کہہ لیجیے یا انعام واحسان کہہ لیجیے، کہ اللہ نے رات کو بنایا تاریک تا کہ تم اس میں آرام کر سکو، اور دن کو بنایا روشن تا کہ تم اس میں کام کر سکو، جس میں اللہ کی قدرت نمایاں ہے، اس میں البتہ نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو سنتے ہیں، اللہ تعالیٰ کے ان تصرفات کو دیکھ کے اللہ تعالیٰ کی توحید اختیار کرتے ہیں۔

نظریۂ اِتخاذِ ولد کی تردید

قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا: اور یہ لوگ کہتے ہیں اللہ نے اولاد اختیار کی ہے، یہود ونصاریٰ نے اللہ کی طرف ابن کی نسبت کی، اور مشرکین نے ملائکہ کو بنات اللہ کہا، سب کے لئے ہی یہ تردید ہے، سُبْحٰنَهٗ: اللہ پاک ہے اولاد کے اختیار کرنے سے، اللہ کی طرف اولاد کی نسبت عیب ہے، عیب کیوں ہے؟ جب اس بات کو سوچیں گے کہ اولاد کے جتنے بھی فوائد ہیں سب کے اندر یہ بات پائی جاتی ہے کہ انسان کے اندر احتیاج ہے، اور یہ اس احتیاج کی وجہ سے اولاد چاہتا ہے، احتیاج کیسے ہے؟ مثلاً ایک شخص کا کاروبار وسیع

ہے اس کو کام کرنے کے لئے کارکنوں کی ضرورت ہوتی ہے، تو وہ اس بات پر خوش ہوتا ہے کہ پرایوں پر اعتماد کرنے کی بجائے میرا بیٹا ہی ایسا ہو جائے کہ جو اس کاروبار میں میرا ہاتھ بٹائے، تو اس میں بھی احتیاج ہے۔ اور اگر اس کا خیال یہ ہے کہ میں نے تو ایک دن مرجانا ہے، اگر میری اولاد نہ ہوئی تو پرائے میری جائیداد کے وارث بن جائیں گے اس میں بھی احتیاج کا مفہوم ہے۔ اور اگر اس کے دل میں یہ خیال آتا ہے کہ آج تو میں صحت مند ہوں، تندرست ہوں، کماتا ہوں اور کھاتا ہوں، اور آخر ایک وقت ایسا آئے گا اگر عمر طویل ہوئی بوڑھا ہو جاؤں گا، اٹھنے بیٹھنے سے عاجز آ جاؤں گا، اولاد ہو گی تو سنبھالے گی، اولاد نہیں ہو گی تو کون خدمت کرے گا، اس میں بھی سراسر احتیاج ہے۔ جس پہلو سے بھی دیکھیں اولاد کی طرف انسان کا دھیان احتیاج کی بناء پر ہے، اور هُوَ الْغَنِيُّ میں سب چیزوں کو ختم کر دیا کہ وہ بے نیاز ہے، وہ تو محتاج نہیں ہے، نہ اس کو یہ ضرورت کہ اس کے کاروبار میں کوئی ہاتھ بٹائے، اکیلے سے اتنی بڑی خدائی سنبھالی نہیں جاتی، نہ اس کو یہ احتمال کہ میرے بعد کون اس کو سنبھالے گا، اس لیے کوئی اپنا ہونا چاہیے جو اس کا مالک بنے، اور نہ آنے والے وقت میں بڑھاپے کا احتمال، نہ کوئی کسی قسم کی کمزوری کا احتمال کہ جس کی وجہ سے خدمت گار کی ضرورت ہو، تو پھر اللہ اولاد کیوں بنائے؟ اولاد کا ہونا تو عیب ہے، ہم جنس آئے گی تو یہ شریک ہے، اور جنس کے خلاف آئے گی تو یہ عیب ہے، تو کسی صورت میں بھی اللہ کی طرف اولاد کی نسبت نہیں ہے، اولاد کا نظریہ اللہ تعالیٰ کے اوپر عیب لگانے والی بات ہے، اور اللہ ہر عیب سے پاک ہے، وہ بے نیاز ہے اور وہ کسی کا محتاج نہیں، ساری کی ساری چیزیں جو آسمان اور زمین میں موجود ہیں سب اللہ کی مخلوق ہیں، وہ سب کا مالک ہے، تمہارے پاس تمہارے اس نظریہ کی کوئی دلیل نہیں ہے، کیا تم اللہ پر ایسی باتیں بناتے ہو جن کو تم خود بھی نہیں جانتے۔

کافروں کی خوش حالی چند روزہ ہے

آپ کہہ دیجیے کہ جو اللہ پر جھوٹ گھڑتے ہیں وہ کبھی فلاح نہیں پائیں گے، جب یہ آ گیا کہ فلاح نہیں پائیں گے، تو یہ لوگ کہتے ہیں کہ فلاح کیوں نہیں پائیں گے؟ وہ تو بڑے ٹھاٹھ باٹھ کے ساتھ اپنا وقت گزارتے ہیں، اس قسم کے خیالات اختیار کرنے والے بظاہر خوش نظر آتے ہیں، کاریں ہیں، موٹریں ہیں، کوٹھیاں ہیں، آپ کہتے ہیں کہ یہ فلاح نہیں پائیں گے، یہ کہتے ہیں ہم کامیاب ہیں دوسرا کوئی کامیاب نہیں ہے، تو ساتھ ہی اس کا جواب آ گیا مَتَاعٌ فِي الدُّنْيَا: یہ تو تھوڑا سا دنیا کے اندر برتنے کا سامان ہے ثُمَّ إِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ: پھر ان سب نے ہماری طرف لوٹ کر آنا ہے ثُمَّ نُذِيقُهُمُ الْعَذَابَ الشَّدِيدَ بِمَا كَانُوا يَكْفُرُونَ: پھر ہم انہیں سخت عذاب چکھائیں گے ان کے کُفر کے سبب سے۔

قوموں کے سلسلے میں پہلا تذکرہ قومِ نوح کا کیوں؟

آگے کچھ واقعات کا سلسلہ آ گیا، یہ واقعات آپ کے سامنے بالتفصیل سورۂ اعراف میں گزر چکے ہیں، اس لیے ان سب باتوں کو دوہرانے کی کوئی ضرورت نہیں، اور آگے سورۂ ہود کے اندر بھی مفصل آ رہے ہیں۔ قوموں کی تاریخ میں سب سے پہلے

عذاب کا نشانہ قومِ نوح بنی، اور حضرت نوح علیہ السلام ہی پہلے پیغمبر ہیں جو سب سے پہلے اللہ کی طرف سے جہاد کرنے کے لئے کفر اور رَدِّ شرک کے مقابلے میں آئے ہیں، اس سے پہلے کفر و شرک موجود نہیں تھا، حضرت آدم علیہ السلام کے بعد سارے کے سارے لوگ ایک ہی نظریے کے تھے، یہ نوح علیہ السلام کی قوم ہے جس میں سب سے پہلے شرک نے جنم لیا ہے، اور شرک مٹانے کے لئے حضرت نوح علیہ السلام ہی سب سے پہلے مامور ہوئے، اس لیے قوموں کے سلسلے میں پہلا تذکرہ انہی کا ہی کیا جاتا ہے۔

اُمم سابقہ کے واقعات ذِکر کرنے کا مقصد

ان کو نوح علیہ السلام کا واقعہ سنایئے، جب نوح علیہ السلام کا واقعہ ان کے سامنے آئے گا اور یہ اپنے حال کو ان پر منطبق کر کے دیکھیں گے تو سوائے اس کے کہ رسول کا نام ہے وہاں نوح علیہ السلام ہے اور یہاں محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہے، اور محلِ وقوع ان کا اور تھا اور ان کا محلِ وقوع اور ہے، لیکن جہاں تک نظریات اور خیالات کا تعلق ہے ان میں سو فیصد مطابقت ہے، جب خیالات میں مطابقت ہے تو پھر انجام میں بھی مطابقت ہوگی، اور جو مانیں گے وہ کامیاب ہوں گے اور جو نہیں مانیں گے وہ اللہ کی گرفت میں آجائیں گے، واقعات ذکر کرنے کا مقصد یہی ہوتا ہے، چونکہ سب انبیاء علیہم السلام نے توحید ہی پیش کی تو ان کے ذکر کے ساتھ توحید کی دلیل بھی سامنے آئے گی کہ نقلی طور پر اِبتدا سے یہی بات چلی آرہی ہے، اور انہوں نے شرک کی تردید کی، آخرت کی یاد دلائی یہ سب باتیں انبیاء علیہم السلام میں مشترک ہیں، تو واقعات بیان کر کے اسی چیز کو قوت پہنچانا مقصود ہے، ترغیب اور ترہیب کا پہلو تو اس میں ہوتا ہی ہے۔

لالچ اور دباؤ سے متأثر نہ ہونا انبیاء علیہم السلام کا مستقل معجزہ ہے

قابلِ ذکر ہے وہ وقت جب انہوں نے اپنی قوم کو کہا کہ میرا یہاں ٹھہرنا وعظ و نصیحت کے لئے اگر تمہیں ناگوار گزرتا ہے تو گزرتا رہے، میں تو اپنا فرضِ منصبی ادا کروں گا، باقی رہی یہ بات کہ میں اس سے باز کیوں نہیں آتا؟ دو چیزیں ہوتی ہیں جس سے انسان دبتا ہے، ایک یہ ہے کہ میں ڈر کے یہ کام چھوڑ دوں، اور ایک یہ ہے کہ میں کسی لالچ کی بنا پر نیچا پڑ جاؤں، دونوں باتیں میرے اندر نہیں ہیں، میرا اللہ پر بھروسہ ہے اور اللہ پر اعتماد ہے، تم سے جو ہوسکتا ہے تم کرلو، تم ہی نہیں بلکہ سارے خداؤں کو بھی ملالو، اب ایک شخص اکیلا اپنی قوم کے سامنے کھڑا ہو جائے اور اس طرح کلام کرے کہ تم سب اکٹھے ہو جاؤ اور جن کو تم نے اپنا کارساز بنا رکھا ہے ان سب کو ساتھ لے لو اور پھر آپس میں مشورہ کرو کہ نوح کے ساتھ یوں کرنا ہے اور اس کو اس طرح ہلاک کرنا ہے، اس کو اس طرح تکلیف پہنچانی ہے اور اپنے امر کو پختہ کرلو اور اس طرح مطمئن کرلو کہ اس بارے میں تمہیں کوئی تردد نہ رہے، اس طرح ایک تدبیر کرلو، اور پھر یہ نہیں کہ پہلے مجھے چیلنج دو، مجھے مہلت بھی نہ دو، اپنی طرف سے پوری کارروائی تم میرے اوپر جاری کردو، پھر تم دیکھ لو کہ تم میرا کیا بگاڑ لو گے، میں پھر بھی نصیحت کروں گا، نصیحت سے باز نہیں آؤں گا، اس کا مطلب یہ ہے میں تم سے ڈرتا نہیں ہوں، میں پھر بھی اسی طرح اللہ کا پیغام پہنچاتا رہوں گا، میں تم سے ڈر کے اس بات کو چھوڑ نہیں سکتا۔ اور یہ بات کہ میری باتیں تمہیں ناگوار گزرتی ہیں تو میرا کھانا پینا بند کر دو گے، یہ بات بھی نہیں ہے، میں تم سے کوئی تنخواہ نہیں مانگتا، کوئی روٹی نہیں مانگتا، کوئی وظیفہ نہیں مانگتا، تو مجھے کیا لالچ ہے کہ میں تمہاری رعایت رکھوں، میں تو اللہ کی طرف سے مامور ہوں اور اللہ کا رسول ہوں، جو اس کی طرف سے

حکم ہے اس کو کرتا رہوں گا، نہ مجھے کوئی لالچ ہے نہ کوئی خوف ہے، سمجھانے کے لئے آیا ہوں اور سمجھ جاؤ گے تو تمہارے لیے فائدہ ہے، ورنہ میں اپنا فرض ادا کر رہا ہوں، تم سے جو ہوتا ہے تم کرلو، گویا کہ نہ مجھے کوئی خوف ہے نہ مجھے کوئی لالچ ہے، میں تمہارے سامنے کیوں دبوں؟ اس بارے میں تمام انبیاء ﷺ کا طرزِ کلام ایک ہے، انبیاء ﷺ کے وعظ میں جو یہ بات آتی ہے اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ میں تمہاری رعایت کیوں رکھوں؟ میں نے کوئی تم سے وظیفہ لینا ہے یا مجھے تمہاری طرف سے کوئی خوف اور اندیشہ ہے؟ ہم تو اللہ کی طرف سے آئے ہیں، اللہ ہمارا محافظ ہے، اللہ پر ہمارا اعتماد ہے، جو اس کا حکم ہوگا ہم تو اس کو کہتے رہیں گے، تم ڈراؤ یا دھمکاؤ تب بھی ہم نہیں ہٹیں گے، اور تم کسی چیز کا لالچ دو تب بھی ہم نہیں ہٹیں گے، نہ لالچ سے متاثر ہوں نہ خوف سے متاثر ہوں، اس لیے ہم اپنی کارروائی جاری رکھیں گے، تم سے جو ہوتا ہے کرلو، یہ طرزِ عمل انبیاء ﷺ کا ایک معجزہ ہوتا ہے کہ ایک شخص پوری قوم کے سامنے ڈٹ کے کھڑا ہو جاتا ہے، حق کے اوپر جم جاتا ہے کہ نہ خوف سے متاثر ہوتا ہے نہ لالچ سے، انبیاء ﷺ کا یہ طرزِ عمل ایک مستقل معجزہ ہوتا ہے۔ فَكَذَّبُوْهُ: ان لوگوں نے اس کی تکذیب کی اور ہم نے نجات دی اس کو اور اس کے ساتھیوں کو کشتی میں، اور بنادیا جانشین، اور ہم نے غرق کردیا ان لوگوں کو جنہوں نے ہماری آیات کی تکذیب کی تھی، دیکھو تو، کیسا ہوا انجام ڈرائے ہوؤں کا، جن کو اللہ کی طرف سے ڈرایا گیا اور وہ انذار سے متاثر نہیں ہوئے تو دیکھ لو ان کا کیسا انجام ہوا؟۔ یہ اس قوم کو سنانا مقصود ہے کہ تم بھی کان کھول کے سن لو، تم بھی اب منذرین ہو، اب اللہ کی طرف سے تمہیں بھی انذار ہو گیا، اب اگر تم باز نہیں آؤ گے تو تمہارا انجام بھی وہی ہوگا جو حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کا ہوا تھا۔

قلوب میں ماننے کی صلاحیت کب نہیں رہتی؟

''پھر ان کے بعد ہم نے بہت سارے رسول بھیجے'' جن کے واقعات سورۂ اعراف میں آپ کے سامنے آئے ہیں، حضرت صالح علیہ السلام، حضرت شعیب علیہ السلام، حضرت ہود علیہ السلام اور آگے سورۂ ہود کے اندر بھی واقعات آرہے ہیں، ''اور وہ واضح دلائل لے کے آئے، وہ لوگ جس کو پہلی مرتبہ جھٹلا چکے پھر اس پر ایمان نہ لائے'' بس ایک دفعہ تکذیب جو کردی، ایک دفعہ نہ جو کردی وہ اپنی جگہ سے نہیں بدلی، ''ایسے ہی ہم مہر کردیا کرتے ہیں حد سے نکلنے والے لوگوں کے دلوں پر'' جو اعتدا کی عادت ڈال لیں، حد سے نکلنے کی عادت پڑ جائے تو ان کے قلوب میں ماننے کی صلاحیت ہی نہیں رہتی، اس طرح انہوں نے بھی مخالفت کر کے یہ صلاحیت ختم کرلی۔

موسیٰ علیہ السلام کی دربارِ فرعون میں آمد، قبطیوں کی پریشانی، جادوگروں سے مقابلہ اور موسیٰ علیہ السلام کی فتح

''پھر اس کے بعد ہم نے موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام کو بھیجا فرعون اور اس کے معززین کی طرف اپنی آیات دے کر''، آیات سے معجزات مراد ہیں، ان لوگوں نے بھی تکبر کیا اور اللہ کی آیات کو قبول نہیں کیا، اپنے آپ کو بڑا سمجھنے لگ گئے، یہ لوگ مجرم تھے، جرم کرنے کے عادی تھے، جب ان کے سامنے حق آگیا، واضح بات آگئی، ثابت شدہ حقیقت آگئی تو کہنے لگے یہ تو صریح جادو ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا کیا تم حق کے متعلق کہتے ہو جب وہ تمہارے پاس آگیا کہ یہ جادو ہے، وَلَا يُفْلِحُ السّٰحِرُوْنَ: جادوگر تو فلاح نہیں پایا کرتے، کامیاب نہیں ہوتے، وہ تو وقتی طور پر شعبدہ بازی ہوتی ہے، ان سے کوئی پائیدار نتائج نہیں نکلا کرتا۔ تو فرعونی

جس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ میں مرعوب ہوئے تو ذہنی طور پر ان کی اسرائیلیوں کے ساتھ کشاکشی تو پہلے ہی سے تھی بایں معنی کہ حکومت قبطیوں کی تھی جو کہ اصل باشندے تھے، اور بنی اسرائیل جو حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانہ میں وہاں جا کے آباد ہوئے تھے یہ سبطی کہلاتے تھے، گویا کہ مصر کے اندر دو قومیں آباد تھیں ایک قبطی جو حاکم تھے اور دوسرے سبطی جو محکوم تھے، خطرہ ان کو یہ رہتا تھا کہ کہیں یہ سبطی زور نہ پکڑ لیں، ان کی تعداد بڑھ نہ جائے، تو تعداد کے بڑھ جانے کی صورت میں یہ قبطیوں پر غالب آجائیں گے اور حکومت قبطیوں سے چھن جائے گی اور سبطی لے جائیں گے، اور یہ بنی اسرائیل ان کے لئے زوال کا باعث بن جائیں گے، اس طرح حکومت کے معاملے میں ایک دوسرے کے رقیب تھے، اور فرعون نے جو اسرائیلیوں کے بچوں کو قتل کرنے کی سکیم چلائی تھی وہ بھی اسی لیے تھی کہ ان کی قوت پیدا نہ ہو، یہ کمزور رہیں اور ہمارے تابع ہو کر رہیں، ہم ان کو غلام بنا کر رکھیں، اس لیے اس نے یہ سارا سلسلہ شروع کیا تھا، تو یہ ذہنی تقابل چلا آ رہا تھا، اب فرعونیوں کو اس بات کی ضرورت تھی کہ اپنی قوم کی عصبیت کو بھڑکائیں تاکہ وہ کہیں ان سے متاثر نہ ہو جائیں، یہ اسرائیلی تو ایک طرف اکٹھے ہو ہی جائیں گے اور اگر اپنی قوم میں بھی پھوٹ پڑ گئی اور اپنے لوگ بھی ان سے متاثر ہو گئے تو اکثریت ان کی ہو جائے گی اور پھر ہماری کرسی گئی، تو یہ کرسی کا مزاج بھی ابتدا ہی سے ایسے ہی کچھ چلا آ رہا ہے کہ اگر کوئی شخص حق بات کہتا ہے تو صاحب اقتدار لوگ اس کو فوراً سیاسی رنگ دے دیتے ہیں۔ کہنے لگے ہاں! ہم سمجھ گئے، تم اس لیے آئے ہو کہ ایک تو ہمارے آباء و اجداد کا طریقہ بدل دو، اور دوسری بات یہ ہے کہ تم ملک پر قبضہ کرنا چاہتے ہو، بڑا بننا چاہتے ہو، تمہاری یہ ساری تحریک بڑا بننے کے لئے ہے، اقتدار پر قبضہ کرنے کے لئے ہے، اور یہ دو ہی باتیں تھیں جن پر فرعون نے اپنی قوم کو بھڑکایا تھا کہ ایک تو تمہارا دین بدل کے رکھ دے گا، تمہارا طریقہ بدل دے گا، اور دوسرا یہ ہے کہ تمہیں ملک سے باہر نکال دے گا اور اقتدار خود لے لے گا اور تم محکوم بن جاؤ گے، تو پھر جس طرح تم نے ان کے اوپر زیادتیاں کی ہیں یہ تم سے انتقام لیں گے، اس طرح اپنی قوم کو اکٹھا کیا، اپنے اقتدار کو بچانے کے لئے انہوں نے یہ چال چلی، کہنے لگے کیا تو آیا ہے ہمارے پاس (یہ خطاب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ہے کیونکہ گفتگو میں اصل موسیٰ علیہ السلام ہی تھے حضرت ہارون علیہ السلام ان کے وزیر تھے) تاکہ تو ہمیں ہٹا دے اس طریقہ سے جس پر ہم نے اپنے آباء و اجداد کو پایا اور تاکہ ہو جائے تمہارے لیے کبریائی اس علاقہ میں، ہم تمہاری بات ماننے والے نہیں ہیں۔ فرعون نے اپنے درباریوں سے کہا کہ چونکہ یہ جادوگر ہے اس لیے اس کا مقابلہ جادوگروں سے کرواؤ، اب اگرچہ جادوگر اور نبی میں دن اور رات کا فرق ہوتا ہے، اخلاق میں، کردار میں، حالات میں، گفتگو کے زور سے، ایک پیشہ ور آدمی روٹی کمانے کے لئے کس قسم کی کمینی اور ذلیل حرکتیں کرتا ہے اور کس طرح بڑے لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتا ہے، ان میں کوئی کسی قسم کی شرافت نمایاں نہیں ہوتی، اور انبیاء علیہم السلام کی ایک ایک بات معجزہ ہوتی ہے، لیکن جس وقت آدمی ارادہ کر لے کہ میں نے ایک حقیقت کو نہیں ماننا تو پھر اس کو ہزار حیلے اور بہانے کرنے پڑتے ہیں، جھوٹی تدبیریں کرنی پڑتی ہیں، یہاں فرعون کی عقل پر بھی پردہ پڑا، مقصد یہ تھا کہ قوم کو الو بنانے کے لئے جادوگروں سے ان کا مقابلہ کرواؤ، کچھ کرتب وہ دکھائیں گے کچھ کرتب یہ دکھائے گا، تو یہاں بات چلانی آسان ہو جائے گی کہ جیسے وہ جادوگر ہیں ایسے یہ بھی جادوگر ہے، یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جادوگروں کی صف میں کھڑا

کرنے کے لئے یہ سارا طریقہ اختیار کیا کہ جادگروں کو اکٹھا کرو، وہ بھی آجائیں گے یہ بھی آجائے گا، یہ بھی کرتب دکھائے گا وہ بھی کرتب دکھائیں گے، حقیقت خلط ملط ہو جائے گی، لوگ سمجھیں گے جیسے یہ ہیں وہ بھی ویسا ہی ہے، تو اس کے پیچھے نہیں لگیں گے، حقیقت کو خلط ملط کرنے کے لئے یہ سکیم بنالی، لے آؤ میرے پاس ہر علم والا جادوگر۔ جادوگر آگئے تو انہوں نے آتے ہی سوال کیا تھا: اَىِٕنَّ لَنَا لَاَجْرًا اِنْ كُنَّا نَحْنُ الْغٰلِبِيْنَ (سورۂ شعراء:۴۱) تو پہلے قدم پر ہی فیصلہ ہو گیا کہ جادوگر کون ہے اور نبی کون ہے؟ آتے ہی کہتے ہیں پہلے یہ تو بتاؤ کہ اگر ہم جیت گئے تو کچھ انعام بھی ملے گا؟ نبی پہلے قدم پر اعلان کرتا ہے کہ میں نے لینا دینا کچھ نہیں ہے، میرا اجر تو اللہ کے ذمہ ہے، اور اس (فرعون) نے آگے لالچ بھی یہی دی کہ انعام بھی ملے گا اور دربار میں کرسی بھی ملے گی، تم میرے مقرب بن جاؤ گے یہ بھی ساتھ ہی ہوس دلادی تاکہ خوب اچھی طرح شوق سے کام کریں، جب جادوگر آگئے تو موسیٰ علیہ السلام نے انہیں کہا کہ تم ڈالو جو تم ڈالتے ہو، یہ بھی ایک قسم کا استغناء ہے کہ مجھے کوئی خوف نہیں ہے کہ ان کا وار چل جائے گا، ورنہ ہر شخص یہ چاہا کرتا ہے کہ میرا وار پہلے چلے کہ دوسرے کو میں سنبھلنے کا موقع ہی نہ دوں اور اس کو جلدی چت کردوں، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو چونکہ اللہ پر اعتماد تھا تو ان کو اس جیسے ڈھنگ استعمال کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی، اس لیے پورے اعتماد کے ساتھ کہا کہ جو وار کرنا ہے کرلو اور اَلْقُوْا کا لفظ اس لیے بولا کہ موسیٰ علیہ السلام دیکھ رہے تھے کہ یہ بھی وہی لاٹھیاں لیے کھڑے ہیں، اور انہوں نے سنا ہوا تھا کہ موسیٰ علیہ السلام لاٹھی کا سانپ بناتے ہیں تو انہوں نے اس پر ایک اضافہ اور بھی کیا کہ ساتھ رسی بھی لے آئے کہ وہ صرف لاٹھی کو سانپ بنائے گا اور ہم دونوں کو سانپ بنائیں گے تو لوگ کہیں گے یہ تو اس سے بھی بڑے جادوگر ہیں، یوں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی حیثیت خلط ملط سی ہو جائے گی۔ فَلَمَّاۤ اَلْقَوْا: جب انہوں نے ڈال دیا تو موسیٰ علیہ السلام نے کہا مَا جِئْتُمْ بِهِ ۙ السِّحْرُ: جو تم لائے ہو یہ جادو ہے، جو میرے پاس ہے وہ جادو نہیں ہے، اِنَّ اللّٰهَ سَيُبْطِلُهٗ: بے شک اللہ جلد ہی اس کو بے اثر کردے گا، اللہ تعالیٰ مفسدین کے عمل کی اصلاح نہیں کرتا، اور اللہ تعالیٰ ثابت کرے گا حق کو اپنے کلمات کے ساتھ، کلمات سے وعدے مراد ہیں جو حق کو غالب کرنے کے لئے اللہ نے کر رکھے ہیں، اگرچہ مجرموں کو یہ بات ناگوار ہی گزرے۔

فَمَاۤ اٰمَنَ لِمُوْسٰۤى اِلَّا ذُرِّيَّةٌ مِّنْ قَوْمِهٖ عَلٰى خَوْفٍ مِّنْ فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ىِٕهِمْ اَنْ
پھر ایمان نہ لائے موسیٰ علیہ السلام کے لئے مگر چند جوان موسیٰ علیہ السلام کی قوم میں سے باوجود فرعون اور اس کے سرداروں سے خوف کے کہ
يَّفْتِنَهُمْ ؕ وَاِنَّ فِرْعَوْنَ لَعَالٍ فِى الْاَرْضِ ۚ وَاِنَّهٗ لَمِنَ الْمُسْرِفِيْنَ ۝
وہ ان کو فتنے میں ڈالے گا اور بے شک فرعون بلندی والا تھا ملک میں اور بے شک وہ حد سے تجاوز کرنے والوں میں سے تھا ۝

وَقَالَ مُوْسٰى يٰقَوْمِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ فَعَلَيْهِ تَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّسْلِمِيْنَ ﴿٨٤﴾

موسیٰ علیہ السلام نے کہا اے میری قوم! اگر تم ایمان رکھتے ہو اللہ پر تو اسی پر بھروسا کرو اگر تم فرمانبردار ہو ﴿۸۴﴾

فَقَالُوْا عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا ۚ رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿٨٥﴾ وَنَجِّنَا بِرَحْمَتِكَ

انہوں نے کہا کہ ہم نے اللہ پر بھروسا کیا، اے ہمارے رَبّ! ہمیں نہ بنا فتنہ ظالم لوگوں کے لئے ﴿۸۵﴾ اور ہمیں نجات دے اپنی رحمت

مِنَ الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿٨٦﴾ وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰى وَاَخِيْهِ اَنْ تَبَوَّاٰ لِقَوْمِكُمَا بِمِصْرَ بُيُوْتًا وَّ

کے ساتھ کافر لوگوں سے ﴿۸۶﴾ اور ہم نے وحی کی موسیٰ علیہ السلام اور اس کے بھائی کی طرف کہ تیار کرو تم دونوں مصر میں اپنی قوم کے لئے گھر اور

اجْعَلُوْا بُيُوْتَكُمْ قِبْلَةً وَّاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ۗ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٨٧﴾ وَقَالَ مُوْسٰى رَبَّنَآ اِنَّكَ

بنالو اپنے گھروں کو قبلہ اور نماز قائم کرو اور مؤمنین کو بشارت دو ﴿۸۷﴾ اور کہا موسیٰ علیہ السلام نے اے ہمارے رَبّ! بے شک

اٰتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَمَلَاَهٗ زِيْنَةً وَّاَمْوَالًا فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۙ رَبَّنَا لِيُضِلُّوْا

دی تُو نے فرعون اور اس کے سرداروں کو زینت اور اموالِ کثیرہ دُنیوی زندگی میں، اے ہمارے پروردگار! تاکہ یہ گمراہ کریں

عَنْ سَبِيْلِكَ ۚ رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰٓى اَمْوَالِهِمْ وَاشْدُدْ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْا

تیرے راستے سے، اے ہمارے رَبّ! اب تو مٹا دے ان کے مالوں کو اور سخت کردے ان کے دِلوں کو پھر وہ ایمان نہ لائیں

حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ﴿٨٨﴾ قَالَ قَدْ اُجِيْبَتْ دَّعْوَتُكُمَا فَاسْتَقِيْمَا وَ

جب تک وہ نہ دیکھ لیں دردناک عذاب ﴿۸۸﴾ اللہ نے فرمایا کہ تحقیق قبول کرلی گئی تم دونوں کی دُعا، پس تم استقامت اختیار کیے رہو اور

لَا تَتَّبِعٰٓنِّ سَبِيْلَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿٨٩﴾ وَجٰوَزْنَا بِبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ الْبَحْرَ فَاَتْبَعَهُمْ

پیروی نہ کرو ان لوگوں کے راستے کی جو جانتے نہیں ہیں ﴿۸۹﴾ ہم نے گزار دیا بنی اسرائیل کو سمندر سے پھر ان کا پیچھا کیا

فِرْعَوْنُ وَجُنُوْدُهٗ بَغْيًا وَّعَدْوًا ۗ حَتّٰٓى اِذَآ اَدْرَكَهُ الْغَرَقُ ۙ قَالَ اٰمَنْتُ

فرعون نے اور اس کے لشکر نے ظلم اور تعدی کرتے ہوئے حتیٰ کہ جب پالیا فرعون کو غرق ہونے نے تو کہا فرعون نے میں ایمان لایا

اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِيْٓ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْٓا اِسْرَآءِيْلَ وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿٩٠﴾ آٰلْـٰٔنَ وَقَدْ

اس بات پر کہ کوئی معبود نہیں مگر وہی جس پر ایمان لائے بنی اسرائیل اور میں فرمانبرداروں میں سے ہوں ﴿۹۰﴾ اب؟ حالانکہ

عَصَيْتَ قَبْلُ وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ ۝ فَالْيَوْمَ نُنَجِّيْكَ بِبَدَنِكَ

تُو نے نافرمانی کی ہے اس سے پہلے اور تُو فسادیوں میں سے تھا۔ آج ہم نجات دیں گے تجھے تیرے بدن کے ساتھ

لِتَكُوْنَ لِمَنْ خَلْفَكَ اٰيَةً ۭ وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ عَنْ اٰيٰتِنَا لَغٰفِلُوْنَ ۝ وَلَقَدْ

تا کہ ہو جائے تو آنے والے لوگوں کے لئے نشانی اور بے شک البتہ بہت سارے لوگ ہماری نشانیوں سے بے خبر ہیں۔ اور البتہ تحقیق

بَوَّاْنَا بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ مُبَوَّاَ صِدْقٍ وَّرَزَقْنٰھُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ ۚ فَمَا اخْتَلَفُوْا حَتّٰى

ہم نے ٹھکانا دیا بنی اسرائیل کو بہترین ٹھکانا اور ہم نے ان کو دیا رزق پاکیزہ چیزوں سے، پھر انہوں نے اختلاف کیا یہاں تک کہ

جَاۗءَھُمُ الْعِلْمُ ۭ اِنَّ رَبَّكَ يَقْضِيْ بَيْنَھُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ۝

ان کے پاس علم آ گیا بے شک تیرا رب فیصلہ کرے گا ان کے درمیان قیامت کے دن ان باتوں میں جن میں یہ اختلاف کرتے ہیں۔

تفسیر

موسیٰ علیہ السلام کی دعوت...... غلام ومحکوم کی حالت

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ چلا آرہا ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون اور اس کی قوم کو دعوت دی اور جادوگروں کے ساتھ مقابلہ کیا جس کا ذکر پچھلی آیات میں آ گیا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوت پر آپ کی قوم میں سے کچھ لوگ متبع ہو گئے، ذُرِّيَّةٌ مِّنْ قَوْمِهٖ کا مطلب یہ ہے کہ چونکہ بنی اسرائیل سارے غلام تھے اور فرعونیوں کا ان کے اوپر رعب بہت زیادہ تھا، اور پھر جو غلام قوم ہوتی ہے اس کے حالات بھی کچھ عجیب قسم کے ہو جاتے ہیں، حاکم قوم ہمیشہ غلام قوم کے افراد میں سے ہی منتخب کر کے کچھ لوگوں کو قوم پر مسلط کرتے ہیں، اور ان کو ذریعہ بناتے ہیں غلام قوم کو تکلیف پہنچانے کا، اور کچھ غدار اور کچھ لالچی قسم کے لوگ حکومت کے ہاتھ آ جایا کرتے ہیں، جس طرح جب انگریزوں کی ہندوستان پر حکومت تھی تو حاکم سارے کے سارے انگریز ہی نہیں تھے بلکہ ہندوؤں میں سے، سکھوں میں سے اور مسلمانوں میں سے بہت سارے لوگ ایسے تھے جو انگریز کے حامی تھے، اور ان کی حکومت کی مضبوطی کے لئے اپنی ہر قسم کی قربانیاں دیئے ہوئے تھے، اور ان کے اوپر انگریزوں کی نوازشات تھیں، ان کو جاگیریں دے رکھی تھیں، ان کو بڑے بڑے عہدے دے رکھے تھے، تو یہ ہوتے غلام قوم کے ہی ہیں لیکن اس قوم کے اوپر ان آقاؤں کی حکومت کو مضبوط کرنے کا ذریعہ بنتے ہیں، قوم کو عذاب میں مبتلا رکھنے کا باعث بنتے ہیں، اس قسم کے لوگ بھی درمیان سے منتخب ہو جایا کرتے ہیں، اور اگر اس قسم کے لوگ منتخب نہ بھی ہوں تو ویسے بھی کچھ لوگ بزدل ہو جاتے ہیں، جن میں اتنی ہمت نہیں ہوتی کہ حاکم قوم کا مقابلہ کیا جائے اور ان کے ساتھ آنکھ لڑائی جائے، ان کا خیال یہ ہوتا ہے کہ اپنا وقت گزارو اور حکومت کی مخالفت مول نہ لو، اگر حکومت کی مخالفت کرو

گے تو حکومت سزا دے گی، جیلوں میں ڈال دے گی اور تمہیں تکلیفیں پہنچائے گی، اور تکلیفیں برداشت کرنا یہ تمہارے بس کی بات نہیں ہے، اس لیے عافیت اسی میں ہے کہ جس طرح زندگی گزرتی ہے گزارتے چلے جاؤ، حکومت کے خلاف کوئی آواز نہ اٹھاؤ، کچھ اس قسم کے بزدل لوگ بھی ہوتے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جس وقت فرعون کے مقابلہ میں یہ نعرہ بلند کیا تو اس قوم کی آزادی بھی طلب کی تھی اَنْ اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ (شعراء: ۱۷) میرے ساتھ بنی اسرائیل کو چھوڑ دے، ان کو لے کے میں کسی دوسرے ملک میں چلا جاؤں گا، ایمان کی دعوت بھی تھی، توحید کی دعوت بھی تھی اور اپنی قوم کو غلامی سے چھڑانا بھی مقصود تھا، تو ان لفظوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مقابلہ میں لوگ چاہے دلی طور پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ہی ہوں کیونکہ اس قسم کے فرد تھے اور اس قسم کی آزادی چاہتے تھے، یعنی اکثریت ان لوگوں کی ہو جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ہی ہمدردی رکھتے ہوں اور ان کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوں، ان کے حق میں آواز بلند کرتے ہوں وہ کچھ نوجوان ہی تھے جنہوں نے یہ جرأت کی، فرعون سے ڈرنے کے باوجود یعنی فرعون کا خوف بھی تھا کہ وہ سزا نہ دے دے لیکن اس کے باوجود کچھ نوجوانوں نے جرأت کر لی، اور وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ارد گرد جمع ہو گئے اور نمایاں ہو گئے کہ یہ بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھی ہیں، جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون سے باغی ہیں اور اس کی حکومت کو تسلیم نہیں کرتے، قوم کی آزادی چاہتے ہیں تو یہ نوجوان بھی اس طرح نمایاں ہو گئے۔ اس تقریر سے مَلَاۡئِهِمْ میں جو ''هم'' کی طرف ''ملأ'' کی نسبت کی گئی ہے اس کا مصداق بھی آسانی سے سمجھ میں آ گیا کہ اس کا مصداق وہ اسرائیلی بھی ہو سکتے ہیں کہ جن کو حکومت نے اپنے کام کے لئے استعمال کرتے ہوئے بعض علاقوں کی اور جگہوں کی سرداری دے رکھی ہو، جس طرح انگریز کی حکومت میں مسلمان بڑے بڑے عہدوں پر تھے، جب وہ عہدوں پر ہوتے ہیں تو وہ بھی اس طرح حکومت کی منشا کے مطابق قوم کو قابو رکھنے کی کوشش کرتے ہیں، اور اگر کوئی باشندہ حکومت کا باغی ہوتا ہے تو وہ بھی اس کو اسی طرح سزا دیتے ہیں جس طرح حاکم قوم ہوتی ہے، تو مَلَاۡئِهِمْ سے مراد اسرائیلی سردار ہو سکتے ہیں، اور ''هم'' کی طرف نسبت اس طرح ہوگی کہ چونکہ وہ حاکم تھے اور ان کے اوپر مسلط تھے، فرعون اور اپنے سرداروں سے ڈرنے کے باوجود نوجوانوں کا ایک طبقہ موسیٰ علیہ السلام کے پیچھے لگ گیا، اور انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بات مان لی۔ وَاِنَّ فِرْعَوْنَ لَعَالٍ فِی الْاَرْضِ: ان لفظوں کا مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کا ڈرنا بھی بجا تھا اگر ان کے اوپر خوف مسلط تھا تو یہ خوف بھی بے معنی نہیں تھا، فرعون بہت سر چڑھا ہوا تھا، اس کو اس علاقے کے اندر بہت برتری حاصل تھی، اور پھر وہ کسی کے حق کی رعایت رکھنے والا نہیں تھا، مسرفین میں سے تھا اپنی خواہش کے مطابق حد سے نکل جاتا تھا، کسی کے حقوق کی پروا نہیں کرتا تھا، تو جب حاکم ایسا ظالم ہو تو ایسے وقت میں خوف کا مسلط ہو جانا کوئی بڑی بات نہیں ہے، ''بے شک فرعون البتہ علاقہ میں عالی تھا، اس کو علو حاصل تھا اور وہ سر چڑھا تھا اور مسرفین میں سے تھا۔''

موسیٰ علیہ السلام کا اپنی قوم کو توکل علی اللہ کی ترغیب دینا

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا کہ اگر تم اللہ پر ایمان رکھتے ہو، کیونکہ یہ سارے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں

سے تھے، حضرت اسحاق علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے اور انہی میں حضرت یوسف علیہ السلام بھی پہلے آچکے تھے اور علم کا چرچا کسی نہ کسی درجے میں ان میں تھا، اس لیے اللہ کو یہ لوگ مانتے تھے، اس میں کوئی شک نہیں کہ فرعون سے متاثر ہو کر بعض لوگ فرعون کو بھی رب کہتے تھے، لیکن عمومی طور پر اس قوم کے اندر ایمان کی تحریک تھی، یہ سارے کے سارے لوگ کافر نہیں ہو گئے تھے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد ہونے کے وجہ سے ان کے اندر توحید کا چرچا تھا، اگر چہ غلام ہونے کی وجہ سے کچھ اپنی قوم سے متاثر ہو گئے ہوں گے، تو موسیٰ علیہ السلام ان کو یاد دلاتے ہیں کہ اگر اللہ پر تمہارا ایمان ہے تو تمہیں اللہ پر ہی توکل کرنا چاہیے، اگر تمہارا دعویٰ یہ ہے کہ ہم اللہ کے فرمانبردار ہیں تو اللہ پر ہی بھروسہ کرنا چاہیے۔

قومِ موسیٰ کا اللہ پر بھروسا اور ظالموں سے نجات کی دُعا

وہ کہنے لگے کہ ہمارا اللہ پر ہی بھروسا ہے اور وہ پھر یہ دُعا کرتے تھے کہ یا اللہ! ہمیں ظالم لوگوں کے لئے فتنہ نہ بنا، اس کا ایک مفہوم تو یہ ہے کہ فتنہ بمعنی آزمائش، یعنی ہمیں ظالم لوگوں کے لئے آزمائش نہ بنا، کہ اگر ہم ان کے سامنے دبے رہے اور غلبہ انہی کو حاصل رہا، ہمیں غلبہ نہ ہوا یا وہ اسی طرح ہمیں سزا دیتے رہے تو وہ لوگ فتنہ میں پڑ جائیں گے کہ دیکھو! اگر یہ حق والے ہوتے تو یہ ہمیشہ ہمارے سامنے ذلیل کیوں ہوتے؟ ہمیں ان کے اوپر غلبہ کیوں حاصل ہوتا؟ تو یہ بات ان کے لئے مزید آزمائش کا باعث بن جائے گی اور وہ مزید فتنے میں پڑیں گے، ہمیں ان لوگوں کے لئے آزمائش گاہ نہ بنا۔ اور اگر فتنہ کا معنی عذاب لے لیا جائے تو پھر معنی ہوگا کہ موقع فتنہ جس کا ترجمہ مفسرین نے عام طور پر کیا ہے کہ ہمیں ان کے لیے تختہ مشق نہ بنا، ہمیں ان کے عذاب کا نشانہ نہ بنا۔

بنی اسرائیل کو عبادت خانے بنانے کا حکم اور اُمّتِ محمدیہ کی خصوصیت

وَاَوْحَيْنَاۤ اِلٰى مُوْسٰى وَاَخِيْهِ: یہ اسی کشمکش کے دور کی باتیں ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام کی طرف ہم نے وحی کی، اس کا حاصل یہ ہے کہ اللہ کی طرف سے آسمانی دین جتنے بھی آئے ہیں ان کے اندر نماز کی صورت موجود تھی کہ اللہ کی عبادت کی جائے جس کو صلوٰۃ کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے، اور پہلی قوموں میں یہ خصوصیت تھی کہ ان کی عبادت صرف عبادت خانوں میں ہوتی تھی، گھروں میں وہ نماز نہیں پڑھ سکتے تھے، جو عبادت خانہ وہ اپنے لیے بنا لیتے، اس میں وہ عبادت کرتے تھے، جیسے کہ روایات صحیحہ سے معلوم ہوتا ہے سرورِ کائنات ﷺ نے فرمایا کہ جو مجھے اللہ تعالیٰ نے خصوصیات عطا کی ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اللہ نے ہمارے لیے اس زمین کو مسجد اور طہور بنا دیا: ''جُعِلَتْ لِيَ الْاَرْضُ مَسْجِدًا وَّطَهُوْرًا''[1] زمین کو میرے لیے طہور بھی بنا دیا گیا کہ جس وقت پانی موجود نہ ہو تو اس زمین سے ہم طہارت بھی حاصل کر سکتے ہیں جیسے تیمم کیا جاتا ہے، اور مسجد بھی بنا دیا گیا کہ جہاں بھی نماز کا موقع آجائے نماز پڑھ لی جائے تو نماز ادا ہو جاتی ہے، جگہ پاک ہونی چاہیے اور دوسرے عوارض نہیں ہونے چاہئیں جن کی تفصیل فقہ اور حدیث شریف میں ہے پاک صاف ماحول ہو، اچھا ماحول ہو، جہاں بھی نماز کا وقت آجائے وہاں نماز پڑھی جا سکتی ہے، مسجد کی

(۱) بخاری ج ۱ ص ۴۸، کتاب التیمم / مشکوٰۃ ۲/ ۵۱۲، باب فضائل سید المرسلین، فصل اول، عن جابر

حاضری ادائیگی نماز کے لئے شرط نہیں ہے، یہ علیحدہ بات ہے کہ جن کو کوئی عذر نہ ہو جیسے جب کوئی آدمی بیمار نہیں ہے، مسافر نہیں ہے، آبادی میں رہتا ہے تو پھر مسجد میں جا کر باجماعت نماز سنتِ مؤکدہ ہے بعض کے نزدیک واجب ہے، بہرحال بلا عذر ترک کرنے پر حدیث شریف میں بہت وعیدیں ہیں لیکن اگر کوئی عذر ہے تو آبادی میں بھی انسان گھر کے اندر نماز پڑھ سکتا ہے، یہ اس اُمت کی خصوصیت میں سے ہے، اور پہلے لوگ صرف اپنے عبادت خانہ میں ہی نماز پڑھتے تھے۔ اب جس وقت فرعونیوں کی اور بنی اسرائیلیوں کی آپس میں کشاکشی شروع ہوئی تو مفسرین لکھتے ہیں کہ فرعونیوں نے ان کی مسجدیں گرادیں، ان کی عبادت گاہیں ویران کردیں، اور جو لوگ جمع ہوتے تھے ان کو سزا دیتے تھے پکڑ دھکڑ ہوتی تھی، تو علی الاعلان جمع ہو کر نماز پڑھنے کی گنجائش نہ رہی، تو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام کو ہدایت دی کہ مصر کے اندر اپنے گھروں کو ٹھکانہ بناؤ، اور اپنے گھروں کو ہی قبلے کی طرف کرلو، یعنی گھروں کو مصلیٰ بنالو، اور انہی کے اندر قبلہ رو ہو کے نماز پڑھ لیا کرو جس وقت تک حالات ساز گار نہیں ہوتے، تو اس مجبوری کی بنا پر نمازیں گھروں میں ادا کرنے کی تلقین کردی گئی، اور پھر ایسا ہوگا کہ جو جگہ گھروں میں متعین کی ہوگی اس میں پڑھنی پڑتی ہوگی، ہر جگہ پھر بھی نہیں پڑھتے ہوں گے، ”وحی کی ہم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام کی طرف کہ بنائے رکھو تم مصر میں اپنی قوم کے لئے گھر، اور بنالو اپنے گھروں کو قبلہ اور نماز کو قائم کرو“ یعنی ان ناساز گار حالات میں بھی نماز کو چھوڑنا نہیں، کیونکہ نماز ہی ایک ایسی چیز ہے جو اہلِ حق کے لئے اللہ کی نصرت حاصل کرنے کا ذریعہ بنتی ہے، اسی سے دل اور دماغ کو سکون حاصل ہوتا ہے، قلوب میں قوت پیدا ہوتی ہے، اللہ کی نصرت آتی ہے، جیسے ہمارے ہاں بھی وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ (البقرۃ:۴۵) خصوصیت کے ساتھ استعانت کا ذکر ہے۔ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ: اور جو لوگ ایمان لانے والے ہیں ان کو خوشخبریاں سناؤ، اچھے انجام کی اطلاعات دے کر ان کو مطمئن رکھو، تاکہ ان کا حوصلہ ٹوٹنے نہ پائے، مؤمنین کو بشارتیں دو کہ یہ تکلیفیں عنقریب دور ہو جائیں گی اور اللہ تعالیٰ نجات دے گا۔

فرعونیوں سے مایوسی کے بعد موسیٰ علیہ السلام کی بددُعا

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ کے سامنے دُعا کی، اس کا حاصل یہ ہے کہ اے اللہ! تُو نے ان کو زیب وزینت بہت دی، اموال بہت دیئے ہیں، اور ہوسکتا ہے کہ تو نے یہ زیب وزینت اس لیے دی ہو کہ جس طرح کافروں کی رسی ڈھیلی کی جاتی ہے تاکہ یہ گمراہی میں پڑیں اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں، اب یہ مقصد پورا ہو گیا، یہ پورا زور لگا کے لوگوں کو گمراہ کر چکے، اب ان کے پاس مال ودولت کو باقی رکھنے کی کوئی وجہ نہیں ہے، اس لیے ان کے مال مٹادے اور ان کو بے سروسامان کردے، پھر بددُعا کا حاصل یہ ہوگا کہ تُو نے دیے اس لیے تھے جس طرح کافروں کو ڈھیل دی جاتی ہے تاکہ وہ خود گمراہ ہوں اور دوسروں کو گمراہ کریں اور وہ یہ کام کر چکے، خود گمراہ ہیں اور دوسروں کو گمراہ کر چکے، اب ان کی ہدایت کی توقع نہیں رہی، اس لیے اب ان سے یہ نعمتیں چھین لے اور ان کے اموال کو مٹادے۔ اور اگر اس کو لامِ عاقبت بنائیں تو پھر مطلب یہ ہوگا کہ دیے تو اس لیے تھے کہ تیرے شکرگزار ہوں اور

تیری نعمتوں سے متاثر ہو کے تیرے عبادت گزار بنیں لیکن نتیجہ یہ نکلا کہ یہی مال ان کے لئے گمراہی کا سبب بن گیا اور دوسروں کو بھی گمراہ کرنے کا سبب بن گیا، اس لیے اب ان کے مال تلف کر دے، ان کی خوش حالی ختم ہونی چاہیے، اور ان کے دلوں کو سخت کر دے، دلوں کے سخت ہونے کا مطلب یہ ہے کہ جس وقت معجزہ کے طور پر کوئی عذاب رونما ہوتا تو یہ فوراً ڈھیلے ہو جاتے، کہتے تھے موسیٰ! دُعا کر، یہ عذاب ٹل جائے، ہم فوراً تجھ پہ ایمان لے آئیں گے، اور نرمی دکھانے لگ جاتے، تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دُعا سے عذاب ٹل جاتا، تو پھر اسی طرح اَڑ جاتے، ''ان کے دلوں کو سخت کر دے'' کہ صورۃً بھی ایمان نہ لائیں جو عذاب کے ٹلنے کا باعث بن جائے، اس لیے عذابِ الیم ان کے سامنے آجائے، جب عذابِ الیم آجائے گا پھر یہ مانیں، اور یہ ماننا نہ ماننے کے برابر ہوگا، اس ماننے کا پھر کوئی فائدہ نہیں ہوگا، جیسا کہ اس دُعا کا نتیجہ ظاہر ہوا کہ فرعون جب غرق ہوا تو وہ ایمان لایا لیکن اس کا ایمان لانا کوئی معتبر نہ ہوا۔ یہ ہدایت سے مایوس ہونے کے بعد کی دُعا ہے، جس طرح حضرت نوح علیہ السلام نے بھی اپنی قوم کے لئے دُعا کی تھی جب وہ اپنی قوم سے مایوس ہو گئے تھے، جنہوں نے ماننا تھا انہوں نے مان لیا، اب اور ماننے والے نہیں ہیں تو پھر اللہ سے درخواست کی کہ اب ان کو ختم کر دیا جائے کہ اب یہ فاسق اور فاجر ہوں گے، ان سے اچھائی کی کوئی توقع نہیں ہے۔

اللہ کی طرف سے دُعا کی قبولیت

اللہ نے جواب دیا کہ تمہاری دُعا قبول ہوگئی، اب ان کے اوپر بربادی آجائے گی، تم استقامت اختیار کرو، جس حال پہ لگے ہوئے اس حال پہ لگے رہو، استقامت کا معنی یہ ہوتا ہے کہ ناسازگار حالات کو دیکھ کر ہمت نہ ہارنا، ڈٹے رہو اپنے مسلک پر، اسی طرح تبلیغ کرتے رہو، اور ان لوگوں کے راستے کی پیروی نہ کرو جو جانتے نہیں ہیں، بے علموں کے راستے پہ نہ چلنا، جن کو یہ پتا نہیں کہ اللہ کی طرف سے کافروں کو ڈھیل دی جاتی ہے، دُعا کی قبولیت پر فوراً اثر مرتب ہو جانا کوئی ضروری نہیں، جو اس قسم کی حکمتیں نہیں جانتے ان لوگوں کے راستے پر نہ چلنا کہ جلدی مچانے لگ جائیں کہ ان کے اوپر تباہی جلدی کیوں نہیں آتی، بلکہ علم والے لوگوں کے راستے پر چلو جو سمجھتے ہیں کہ اللہ کی طرف سے جو واقعہ پیش آتا ہے وہ حکمت پر مبنی ہوتا ہے، اللہ کی حکمت کے تحت جتنی ڈھیل ان کو ملنی چاہیے وہ ان کو مل کے ہی رہے گی، اور جب اللہ کی حکمت ہوگی اس وقت آثار نمایاں ہو جائیں گے، جلدی نمایاں ہونا کوئی ضروری نہیں تمہارے جذبات اس قسم کے ہونے چاہئیں۔

فرعون کی بمع لاؤ لشکر کے بربادی

آخر ایک وقت آیا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کو لے کر چل پڑے، آگے پھر سمندر آ گیا، تو ہم نے گزار دیا بنی اسرائیل کو سمندر سے اور ان کے پیچھے لگ گئے فرعون اور اس کے لشکر ظلم اور زیادتی کے ساتھ، ظلم اور زیادتی کرنی مقصود تھی، شرارت اور زیادتی کرتے ہوئے ان کے پیچھے لگ گئے، حتیٰ کہ جب فرعون کو غرق ہونے نے پا لیا یعنی وہ اسرائیلی تو آگے نکل گئے اور یہ ان کے پیچھے

لگا جا رہا تھا، جب سمندر کے وسط میں گیا تو پانی مل گیا، جب ڈوبنے لگا تو کہنے لگا: میں ایمان لایا اس بات پر کہ کوئی معبود نہیں مگر وہی جس پر بنی اسرئیل ایمان لائے ہیں اور میں فرمانبرداروں میں سے ہوں۔ جب ناک میں پانی پڑا تو سارا نشہ اُتر گیا اور فوراً ڈھیلا ہوگیا، لگا کلمہ پڑھنے، اور اللہ کی طرف سے تنبیہ ہوئی کہ اب ایمان لاتے ہو؟ یا اب چھوٹنے کی تمنا کرتے ہو؟ حالانکہ تُو نے نافرمانی کی اس سے قبل اور تو فسادیوں میں سے تھا، ساری زندگی تو عصیان میں گزاردی، مفسد رہا اور اب ڈھیلے ہو رہے ہو، اب کلمہ پڑھتے ہو، یا اب نجات چاہتے ہو، ''آج ہم تجھے نجات دیں گے تیرے بدن کے ساتھ'' تیری لاش بچ جائے گی'' تاکہ تُو ہو جائے اپنے پچھلوں کے لئے نشانی۔'' تفاسیر میں لکھا ہے کہ فرعون کی لاش تیرتی ہوئی سمندر کے کنارے پہ آگئی اور اس کو دیکھ کر اسرائیلیوں نے یقین کرلیا کہ اب یہ غرق ہوگیا ہے، ورنہ اس کی ہیبت اتنی تھی کہ لوگوں کو یقین نہیں آتا تھا کہ فرعون بھی ڈوب گیا ہے، پھر وہ لاش وہاں سے پکڑی گئی، کہتے ہیں اس وقت بھی مصر میں قاہرہ کے عجائب گھر میں موجود ہے، اگرچہ یہ قطعی بات نہیں ہے کہ یہ اس فرعون کی لاش ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مدمقابل تھا، تو آج تک وہ محفوظ ہے تاکہ تو پچھلوں کے لئے نشانی بن جائے، نشانی بننے کا مطلب یہ ہے تاکہ ان کو پتا چل جائے کہ اللہ کی مخالفت مہنگی پڑتی ہے، اور دُنیا میں کتنا ہی جاہ وجلال حاصل کیوں نہ ہو لیکن جب اللہ کی طرف سے پکڑ آجاتی ہے تو پھر کوئی چھوٹ نہیں سکتا، وَ اِنَّ كَثِيۡرًا مِّنَ النَّاسِ عَنۡ اٰيٰتِنَا لَغٰفِلُوۡنَ: اور ہماری آیات سے بہت سارے لوگ غافل ہیں، وہ اس قسم کی چیزوں کو دیکھ عبرت حاصل نہیں کرتے۔

بنی اسرائیل کا آپس میں اختلاف اور اس کی سزا

''اور ہم نے ٹھکانا دیا بنی اسرئیل کو بہت اچھا'' اس ٹھکانے سے شام اور اردگرد کا علاقہ مراد ہے جہاں جا کے یہ لوگ آباد ہوئے تھے، ''پاکیزہ چیزوں سے ہم نے ان کو رزق دیا'' وسعت دی، ''پھر انہوں نے اختلاف نہ کیا حتیٰ کہ ان کے پاس علم آ گیا'' یعنی علم کے باوجود انہوں نے دینی راستے میں اختلاف کیا کہ اللہ کی طرف سے آئی ہوئی کتاب ان کے پاس موجود تھی اور اس میں ہدایت تھی لیکن پھر انہوں نے اختلاف کیا، ''بے شک تیرا رَبّ ان کے درمیان فیصلہ کرے گا قیامت کے دن ان باتوں میں جن میں یہ اختلاف کرتے ہیں۔''

فَاِنۡ كُنۡتَ فِىۡ شَكٍّ مِّمَّاۤ اَنۡزَلۡنَاۤ اِلَيۡكَ فَسۡئَلِ الَّذِيۡنَ يَقۡرَءُوۡنَ الۡكِتٰبَ

پس اگر آپ شک میں ہیں اس چیز میں جو ہم نے اُتاری آپ کی طرف تو پوچھ لیجیے ان لوگوں سے جو پڑھتے ہیں ایسی کتاب جو

مِنۡ قَبۡلِكَ‌ۚ لَقَدۡ جَآءَكَ الۡحَـقُّ مِنۡ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوۡنَنَّ مِنَ الۡمُمۡتَرِيۡنَ ۙ‏ ﴿۹۴﴾

آپ سے پہلے اُتاری گئی، تحقیق آ گیا آپ کے پاس آپ کے رَبّ کی طرف سے حق، تو ہرگز نہ ہو شک کرنے والوں میں سے ﴿۹۴﴾

وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِ اللّٰهِ فَتَكُوْنَ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ ﴿۹۵﴾ اِنَّ الَّذِیْنَ

اور ہرگز نہ ہوتو ان لوگوں میں سے جو جھٹلاتے ہیں اللہ کی آیات کو پس ہو جائے گا تو خسارہ پانے والوں میں سے ﴿۹۵﴾ بے شک وہ لوگ

حَقَّتْ عَلَیْهِمْ كَلِمَتُ رَبِّكَ لَا یُؤْمِنُوْنَ ﴿۹۶﴾ وَلَوْ جَآءَتْهُمْ كُلُّ اٰیَةٍ حَتّٰى یَرَوُا

جن پر ثابت ہوگئی تیرے رَبّ کی بات وہ ایمان نہیں لائیں گے ﴿۹۶﴾ اگرچہ آجائے ان کے پاس نشانی جب تک وہ نہ دیکھ لیں

الْعَذَابَ الْاَلِیْمَ ﴿۹۷﴾ فَلَوْلَا كَانَتْ قَرْیَةٌ اٰمَنَتْ فَنَفَعَهَآ اِیْمَانُهَآ اِلَّا قَوْمَ یُوْنُسَ ؕ لَمَّآ

عذابِ الیم کو ﴿۹۷﴾ کوئی بستی ایمان نہ لائی کہ ایمان لانا اس کو نفع دیتا مگر یونس علیہ السلام کی قوم، جب

اٰمَنُوْا كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ الْخِزْیِ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِیْنٍ ﴿۹۸﴾ وَلَوْ شَآءَ

یہ لوگ ایمان لائے ہم نے دُور ہٹا دیا ان سے رُسوائی کا عذاب دُنیوی زندگی میں اور ہم نے ان کو نفع دیا ایک وقت تک ﴿۹۸﴾ اگر چاہتا

رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِی الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِیْعًا ؕ اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى یَكُوْنُوْا مُؤْمِنِیْنَ ﴿۹۹﴾

آپ کا رَبّ تو ایمان لے آتے سارے لوگ جو زمین میں ہیں، کیا آپ مجبور کر سکتے ہیں لوگوں کو حتّٰی کہ وہ ایمان لانے والے ہو جائیں ﴿۹۹﴾

وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تُؤْمِنَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَیَجْعَلُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِیْنَ

کسی نفس کے لئے نہیں ہے کہ وہ ایمان لے آئے مگر اللہ کی اجازت کے ساتھ اور وہ کر دیتا ہے پلیدی کو ان لوگوں پر جو

لَا یَعْقِلُوْنَ ﴿۱۰۰﴾ قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَمَا تُغْنِی الْاٰیٰتُ وَالنُّذُرُ

سوچتے نہیں ﴿۱۰۰﴾ آپ کہہ دیجیے کہ دیکھو کیا کچھ ہے آسمانوں میں اور زمین میں، نہیں فائدہ دیتیں نشانیاں اور ڈراوے

عَنْ قَوْمٍ لَّا یُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۰۱﴾ فَهَلْ یَنْتَظِرُوْنَ اِلَّا مِثْلَ اَیَّامِ الَّذِیْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ قُلْ

ان لوگوں کو جو ایمان نہیں لاتے ﴿۱۰۱﴾ پس وہ نہیں انتظار کرتے مگر ان دِنوں کی مثل جو گزرے ہیں ان سے پہلوں پر آپ کہہ دیجیے

فَانْتَظِرُوْٓا اِنِّیْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِیْنَ ﴿۱۰۲﴾ ثُمَّ نُنَجِّیْ رُسُلَنَا وَالَّذِیْنَ

پس تم انتظار کرو میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں سے ہوں ﴿۱۰۲﴾ پھر ہم نجات دیتے ہیں اپنے رسولوں کو اور ان لوگوں کو

اٰمَنُوْا كَذٰلِكَ ۚ حَقًّا عَلَیْنَا نُنْجِ الْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۱۰۳﴾ ع

جو ایمان لاتے ہیں ایسے ہی، حق ہے ہم پر کہ ہم نجات دیتے ہیں مؤمنین کو ﴿۱۰۳﴾

تفسیر

قرآن کی صداقت معلوم کرنے کا ایک طریقہ

ان آیات میں زیادہ تر حضور ﷺ کے لئے تسلی ہے اور مخالفین کے لئے کچھ تہدید ہے، پہلے تو آپ پر اتارے گئے دین کی حقانیت کو بیان کیا گیا ہے، اور بیان کرنے کے لئے طرز ایسا اپنایا گیا جو بہت ہی واضح ہے، سرور کائنات ﷺ جن پر یہ کتاب اتری تھی آپ کو اس کتاب میں کوئی شک نہیں ہوسکتا کہ یہ اللہ کی جانب سے نہیں ہے، سرور کائنات ﷺ یقین سے جانتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے، اور ایسا خیال بھی نہیں آسکتا کہ اللہ کی طرف سے نہ ہو، لیکن دوسرے لوگ اس قسم کے شک اور شبہ میں مبتلا تھے کہ یہ کتاب اللہ کی جانب سے نہیں ہے، تو اللہ سرور کائنات ﷺ کو خطاب کر کے اس شک کے ازالہ کا طریقہ بیان فرماتے ہیں، اور سنانا دوسروں کو مقصود ہے، یہی وجہ ہے کہ جب یہ آیات اتریں تو فرمایا کہ مجھے تو اس بارے میں کوئی شک نہیں ہے اور نہ کسی سے پوچھنے کی ضرورت ہے، آپ ﷺ نے تو اپنے اطمینان کو اس طرح واضح فرما دیا، لیکن آپ ﷺ کو خطاب کر کے جو طریقہ بیان کیا گیا ہے دوسرے لوگ اچھی طرح اس طریقہ کے ساتھ اپنے شک کو دور کر سکتے ہیں، آپ ﷺ کو خطاب کر کر کہا جارہا ہے کہ اگر آپ کو کوئی شک ہے جو ہم نے آپ پر اتارا ہے، شک بایں معنی کہ یہ اللہ کی جانب سے نہیں آئی، تو آپ ان لوگوں سے پوچھ لیجیے جو آپ سے پہلے اتاری ہوئی کتابوں کو پڑھتے ہیں، اب ان لوگوں کا مصداق ہیں اہل کتاب جو توراۃ اور انجیل کو پڑھتے تھے ان سے پوچھو گے تو وہ تائید کر دیں گے، اس آیت سے یہ معلوم ہوا لیکن یہ واقعہ ہے کہ توراۃ انجیل پڑھنے والے لوگ دو قسم کے تھے بعض منصف مزاج اور حق پرست تھے، جس وقت ان کے سامنے آپ کی نبوت کا تذکرہ ہوا اور اس کتاب کا تذکرہ ہوا تو انہوں نے فوراً تصدیق کر دی کہ واقعی یہ اللہ کی طرف سے آئی ہوئی کتاب ہے اور ہماری کتاب میں اس کے متعلق پیش گوئیاں موجود ہیں، اور ایک طبقہ ایسا تھا کہ جو انکار کرنے والا تھا، باوجود توراۃ پڑھنے کے آپ کا مکذب تھا، اور باوجود انجیل پڑھنے کے آپ کا مکذب تھا، الَّذِيْنَ يَقْرَءُوْنَ الْكِتٰبَ کا مطلب یہ ہے کہ جو توراۃ کو پڑھتے ہیں اور اس میں تحریف نہیں کرتے یقرءون حق تلاوته اپنی جانب سے اس میں کوئی تحریف نہیں کرتے، غلط بیانی نہیں کرتے، اور اس کو مسخ کرنے کی کوشش نہیں کرتے، وہ لوگ اللہ کی کتاب کو اللہ کی کتاب ہونے کی حیثیت سے پڑھ لیں، تو اس سے یہ بات واقعی ثابت ہو جائے گی کہ آخر وقت میں ایک نبی آنے والا ہے اور اس کا ذکر اس کتاب میں موجود ہے اور اس کے اوپر اس قسم کی کتاب اتاری جائے گی اور اس کے ساتھ آپ کی تائید ہو جائے گی، تو جو اہل کتاب آپ کے مکذب ہیں یوں سمجھو کہ وہ کتاب کو نہیں پڑھتے جو اللہ کی طرف سے اتری ہے، بلکہ وہ اپنے خیالات اس میں شامل کر کے ان خیالات کو پڑھتے ہیں، اس کتاب میں غلط مضامین شامل کر کے اس کی تحریف کرتے ہیں، وہ مصداق نہیں ہیں، اور جو کتاب کو صحیح طور پر پڑھتے ہیں جس کو دوسری جگہ يَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے (البقرۃ:۱۲۱) اور اس میں اپنے خیالات کو شامل نہیں کرتے، تحریف نہیں کرتے، حق پوشی نہیں کرتے، جس وقت بھی آپ کا نام سنیں گے تو فوراً تائید کر دیں گے، ایسے ہی ہوا، شاہ نجاشی انجیل پڑھنے والوں میں سے تھا جب اس نے حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کی زبان سے حضور ﷺ کے حالات سنے تو فوراً

تائید کردی، اور اس کے ساتھ اور بھی اہلِ حق کا گروہ تھا جس کا ذکر آپ کے سامنے ساتویں پارے کی ابتدا میں آیا تھا، اور مدینہ منورہ میں یہود میں سے حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ اور ان کے رُفقاء کا سامنا جب رسول اللہ ﷺ سے ہوا اور تذکرہ سنا تو فوراً تائید کردی اور مان گئے، یہ لوگ تھے جو اللہ کی کتاب کو صحیح طور پر پڑھتے تھے۔ یہاں اللہ تعالیٰ یہی کہتے ہیں اگر آپ کو کوئی شک ہو تو ان لوگوں سے پوچھ لو، وہ اہلِ علم لوگ ہیں، وہ جانتے ہیں کہ اللہ کی کتاب کا مزاج کیسا ہے، اور اللہ کی کتاب میں کیسی باتیں آیا کرتی ہیں، وہ ان مضامین کی بھی تائید کریں گے جو توحید کے بارے میں ذکر کیے گئے ہیں اور شرک کی تردید میں ذکر کیے گئے ہیں، مسئلۂ رسالت کی بھی تائید کریں گے کہ پہلے بھی اس طرح کے رسول آتے رہے ہیں، اور وہ خود بھی رسولوں کو ماننے والے ہیں، نزولِ کتاب کی بھی تصدیق کریں گے کہ اللہ کی طرف سے کتاب اترتی رہتی ہے، اور پھر خصوصیت کے ساتھ اس پیغمبر کے متعلق بھی بتا سکتے ہیں کہ ہماری کتابوں میں ایسی پیش گوئیاں موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے پیغمبر ہیں اور یہ کتاب اللہ کی جانب سے آئی ہے، تو ان اہلِ علم سے پوچھنے کے ساتھ تمہارا تردد اور شک دور ہو جائے گا، یہ طریقہ بتایا جا رہا ہے رسول اللہ ﷺ کو خطاب کر کے لیکن مقصود دوسروں کو سنانا ہے کہ اگر تمہیں اس بارے میں شک ہے تو ان اہلِ علم سے پوچھ لو، پوچھنے کے ساتھ تمہارا ہر قسم کا تردّد دُور ہو جائے گا۔ لَقَدْ جَآءَكَ الْحَقُّ: یہ بات بالکل صحیح ہے، یہ پکی بات ہے کہ آپ کے پاس حق آیا آپ کے رَبّ کی طرف سے، یہ سچی باتیں ہیں، واقع کے مطابق ہیں، فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِينَ: آپ شک کرنے والوں میں سے بالکل نہ ہوں، جب شک کرنے والوں میں سے نہ ہوں تو تکذیب کرنا تو اس سے بڑھ کے ہے، ''اور آپ ہرگز نہ ہونا ان لوگوں میں سے جو اللہ کی آیات کی تکذیب کرتے ہیں پھر ہو جائیں گے آپ خسارہ پانے والوں میں سے'' تو معلوم ہوا کہ اللہ کی آیات کی تکذیب خسارہ کا باعث بنتی ہے، آپ ﷺ کو خطاب کر کے سنایا دوسروں کو جا رہا ہے کہ یہ بات سچ اور حق ہے جو آپ پر اتاری گئی اب جو لوگ مانتے نہیں آپ ان کے پیچھے زیادہ نہ پڑیں، ''وہ لوگ جن کے اوپر تیرے رَبّ کی بات ثابت ہوگئی'' یعنی ان کی قسمت کا یوں ہی فیصلہ ہوا کہ یہ جہنم میں جائیں گے ''وہ ایمان نہیں لائیں گے'' یعنی اس وقت جو ضد کر رہے ہیں وہ جہنم میں جانے والے ہیں۔

مخالفین کے مطالبات محض ضد کے طور پر ہیں

وَلَوْ جَآءَتْهُمْ كُلُّ اٰيَةٍ: یہ ایمان نہیں لائیں گے اگرچہ آجائے ان کے پاس ہر قسم کی نشانی، یہ جو آئے دن مطالبہ کرتے رہتے ہیں کہ ہمیں فلاں چیز دکھا دو، ہمیں فلاں معجزہ دکھا دو تو ہم مان جائیں گے، تو ان کی اس قسم کی باتیں بھی محض ضد کے طور پر ہیں، ورنہ یہ ماننے والے نہیں ہیں، ہاں ایک صورت ہوگی کہ جب دردناک عذاب ان کے سامنے آجائے گا، حقیقت منکشف ہو جائے گی جیسے موت کے وقت غرغرہ کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے تو عالمِ آخرت منکشف ہو جاتا ہے، یا اللہ کی طرف سے عذاب آگیا اور اس میں مبتلا ہو گئے ایسے وقت میں پھر یہ ایمان لائیں گے اور وہ ایمان لانا نفع نہیں دے گا، جیسے فرعون ساری زندگی تو اڑا رہا، جس وقت ناک میں پانی پڑا اور عالمِ آخرت منکشف ہوا تو ایمان لایا لیکن ایمان لانے کا کوئی فائدہ نہیں ہوا، یہ بھی جس وقت تک عذابِ الیم نہیں دیکھیں گے اس وقت تک نہیں مانیں گے، اور عذابِ الیم کے دیکھنے کے بعد اب ماننے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔

قومِ یونس کی خصوصیت

فَلَوْلَا كَانَتْ قَرْيَةٌ اٰمَنَتْ فَنَفَعَهَاۤ اِيْمَانُهَاۤ اِلَّا قَوْمَ يُوْنُسَ: قریہ سے ایسی بستیاں مراد ہیں جو پہلے عذاب میں ہلاک ہو چکیں، جن کا ذکر قرآن مجید میں متعدد بار آیا، ان بستیوں میں سے کوئی بستی یعنی جو پہلے ہلاک ہوئیں ان بستیوں میں سے کوئی ایمان نہ لائی یعنی نہیں نفع دیا ان کو ایمان لانے نے، آخر وقت تک پیغمبر سمجھاتے رہے لیکن وہ نہیں مانے، برباد ہو گئے، ہاں قومِ یونس البتہ ایسی تھی کہ ایمان لائی اور ایمان لانا نافع ہوا۔ ''جب وہ ایمان لائے تو ہم نے ان سے رسوائی کا عذاب ہٹا دیا دنیوی زندگی میں اور ہم نے ان کو نفع دیا ایک وقت تک'' اس وقت سے موت کا وقت مراد ہے کہ عافیت اور خیر وخوبی کے ساتھ ہم نے ان کو زندہ رکھا یعنی ان کو ایسی ڈھیل نہیں دی تھی جیسے کافروں کو دی جاتی ہے تا کہ مزید شرارت کریں اور عذاب کے مستحق ہو جائیں بلکہ یہ فائدہ اٹھانا ایسے تھا کہ جیسے مؤمنین وصالحین کو برکات عطا کر کے دنیا میں زندہ رکھا جاتا ہے، ہم نے پھر انہیں اس طرح زندہ رکھا۔

زبردستی کسی کو ایمان پر لانا اللہ کی مشیت وحکمت نہیں

وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِى الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا ۗ اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ: اگر آپ کا ربّ چاہتا ان کو زبردستی مؤمن بنانا، اگر اللہ کی مشیت یہی ہوتی کہ سارے کے سارے لوگ مؤمن ہو جائیں تو سارے کے سارے لوگ ہی ایمان لاتے، اللہ کی مشیت اگر یوں متعلق ہو جاتی کہ سارے کے سارے لوگ ٹھیک ہو جائیں تو ایسا ہو سکتا ہے کہ لوگ ٹھیک نہ ہوں؟ لیکن اللہ تعالیٰ ایسا چاہتا نہیں کہ لوگوں کو زبردستی ایک طریقے پر چلائے، بلکہ اللہ کی مشیت یہی ہے کہ لوگوں کو ابتلا میں ڈال دیا جائے، عقل، سمجھ، فکر اور ارادہ دے دیا، اب جو لوگ طلبِ حق کے ساتھ صحیح طور پر کوشش کرتے ہیں اللہ تعالیٰ انہیں ایمان لانے کی توفیق دے دیتا ہے، اور جو سوچنے سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے وہ شرک اور کفر کی گندگی میں پڑے رہتے ہیں، اس دنیا میں رہتے ہوئے اللہ تعالیٰ زبردستی کسی کو سیدھے راستے پہ نہیں لاتا، تو جب اللہ تعالیٰ کی مشیت نہیں ہوئی کہ سب کو سیدھے راستے پر لے آئے تو آپ کیسے مجبور کر سکتے ہیں کہ سب مان جائیں، یہ بھی بظاہر خطاب آپ ﷺ کی طرف ہے لیکن اصل میں ناراضگی انہی پر کرنی مقصود ہے جو مانتے نہیں ہیں، جیسے ایک آدمی دوسرے کو نصیحت کرتا ہے، بار بار نصیحت کرتا ہے، اب نصیحت کرنے والے کی طرف رخ کر کے ایک آدمی کہتا ہے کہ چھوڑ، تجھے کیا پڑی، تو جو ہر وقت اس کے پیچھے پڑا ہے، تو اس کو زبردستی صحیح راستے کی طرف لے آئے گا؟ تو یہ بظاہر عتاب تو اس پر ہو رہا ہے جو اس کے پیچھے پڑا ہوا ہے لیکن حقیقت میں ڈانٹنا اسے مقصود ہے جو بار بار کہنے کے باوجود سمجھتا نہیں ہے، تو ''آپ ان کو مجبور کر سکتے ہیں'' اگر مجبور کرنا ہوتا، اللہ کی مشیت ایسے ہوتی تو یہ سارے کے سارے لوگ مؤمن ہو جاتے لیکن اللہ نے اس دنیا کو دار الابتلاء بنایا ہے، جو عقل سے کام لیتے ہیں، طلبِ حق ان میں ہوتی ہے اور اپنی استعداد کو استعمال کرتے ہیں تو اللہ کے اذن کے ساتھ اور اللہ کی توفیق کے ساتھ وہ لوگ ایمان لے آتے ہیں، اور جو عقل سے کام نہیں لیتے شہوات کے پیچھے پڑے رہتے ہیں، اپنی اغراض کے پیچھے مرتے ہیں، ضد میں آ جاتے ہیں تو کفر وشرک کی نجاست میں پڑے رہتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کے اوپر کفر کی نجاست ڈال دیتا ہے۔ آپ کا فرض تو سمجھانا ہے، جس وقت آپ نے سمجھا لیا تو اب ان کے پیچھے پڑنے کی

ضرورت نہیں ہے، اور اس غم میں مبتلا نہ ہوں کہ یہ لوگ مانتے کیوں نہیں، ''اگر تیرا رَبّ چاہتا تو ایمان لے آتے وہ سب لوگ جو زمین میں ہیں، کیا تو مجبور کر سکتا ہے لوگوں کو تا کہ وہ ایمان لانے والے ہو جائیں؟ کسی نفس کے لئے ممکن نہیں کہ وہ ایمان لے آئے مگر اللہ کی توفیق کے ساتھ، اللہ کے اذن کے ساتھ'' اور اللہ کا اذن ہوتا ہے سوچنے سمجھنے والوں پر، طلب حق کرنے والوں پر، ''اور ڈال دیتا ہے اللہ پلیدی ان لوگوں پر جو عقل سے کام نہیں لیتے'' جو سوچتے نہیں ہیں سمجھتے نہیں ہیں بلکہ شہوات کے پیچھے پڑے ہوئے ہوتے ہیں، اغراض کے بندے ہوتے ہیں وہ حق کو کبھی نہیں پاتے، جو عقل سے کام نہیں لیتے۔

مؤمنین کے لئے اِنعام، کُفّار کے لئے وعید

''آپ فرمادیں کہ دیکھو کیا کچھ ہے آسمانوں میں اور زمین میں'' یعنی اس میں بہت ساری نشانیاں اللہ کی قدرت کی اور اللہ کی وحدانیت کی موجود ہیں، لیکن جو لوگ ایمان نہیں لاتے، جنہوں نے قصد ہی کر لیا ہے کہ ہم مانیں گے نہیں، ان کو نہ تو نشانیاں فائدہ پہنچا سکتی ہیں نہ کوئی ڈراوے اور دھمکیاں فائدہ پہنچا سکتی ہیں، نہ ڈراوؤں اور دھمکیوں سے متاثر ہوں نہ نشانیوں سے متاثر ہوں۔ یا نہ ان کو زمین وآسمان کی آیات فائدہ پہنچا سکتی ہیں نہ ہی وہ رسولوں سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ نُذُر. نذیر کی جمع، ڈرانے والے، ڈرانے والے بھی ان کو فائدہ نہیں پہنچا سکتے اور اسی طرح سے دوسری نشانیاں اور آیات بھی ان کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتیں۔ ''پھر نہیں انتظار کرتے یہ لوگ مگر انہی لوگوں کے دنوں کی مثل کا جو ان سے پہلے گزر گئے'' جیسے دن ان پر آئے اور ان دنوں میں اللہ کا عذاب ان کے اوپر آیا ایسے ہی دنوں کے انتظار میں یہ لگے ہوئے ہیں، یعنی ان کے حال سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے، یہ نہیں کہ واقعی وہ چاہتے تھے کہ اس قسم کے دن آجائیں، یعنی ان کا حال ایسا ہے، جو دلائل سے سمجھتے نہیں گویا کہ وہ اسی قسم کے دنوں کے منتظر ہیں جس قسم کے دن پہلی امتوں کے اوپر آئے تھے۔ ''آپ کہہ دیجیے کہ تم بھی انتظار کرو، میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں سے ہوں'' اگر اس دنیا کے اندر تمہارے اوپر عذاب ڈالنا اللہ کی حکمت ہوگی تو وہ دن بھی آجائیں گے، اور جب وہ دن آجاتے ہیں تو پھر ہم کافروں کو ہلاک کرتے ہیں اور اپنے رسولوں کو نجات دے دیتے ہیں، یہ ماضی کے واقعہ کو حال کے انداز میں ذکر کیا جا رہا ہے، ''پھر ہم نجات دیتے ہیں اپنے رسولوں کو اور ان لوگوں کو جو ایمان لے آئے، ایسے ہی نجات دیا کرتے ہیں ہم مؤمنین کو، اور مؤمنین کو نجات دینا ہمارے ذمے حق ہے لازم ہے'' یعنی ہم نے اپنی مہربانی کے ساتھ اپنے ذمے یہ لازم کر لیا کہ جب کُفر کی سزا کے طور پر ایسا ہلاک کرنے والا عذاب آتا ہے تو ہم اپنے رسولوں کو بھی نجات دیتے ہیں اور مؤمنین کو بھی نجات دے دیا کرتے ہیں، ''ایسے ہی نجات دیتے ہیں ہم مؤمنین کو، اور یہ نجات دینا ہمارے ذمے لازم ہے'' یعنی ہم نے اپنی رحمت کے ساتھ اپنے ذمّے یہ بات لازم کر لی، ورنہ مخلوق کا حق وجوبی اللہ تعالیٰ پر نہیں آتا، اس کو حق تفضلی کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے کہ مہربانی کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے اپنے ذِمّے یہ بات لگالی کہ جس وقت عذاب آئے گا تو ہم ایمان والوں کو نجات دیتے ہیں۔

قومِ یونس کا علاقہ، محلِ وقوع، اور آبادی کی تعداد

ان آیات میں یونس علیہ السلام کی قوم کے واقعے کی طرف اشارہ ہے، اس سورت میں اس واقعے کی تفصیل نہیں ذکر کی گئی،

صرف اتنا ہی ظاہر کیا گیا کہ قومِ یونس ایمان لے آئی تھی اور ان کو ایمان لانے سے فائدہ ہوا، اور وہ عذاب ان سے دُور ہٹ گیا۔ اس قوم کے حالات کیا تھے اور حضرت یونس علیہ السلام کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا؟ اس کی زیادہ تر تفصیل تو آگے سورۂ صافات میں ہے، لیکن مفسرین نے چونکہ یہاں بھی کچھ اس واقعے کو ذکر کیا ہے تو میں بھی تھوڑا سا عرض کر دوں۔ عراق کے علاقے میں ایک شہر تھا جس کا نام لکھا ہے نِیْنَوٰی، اور یہ شہر دریائے دجلہ کے کنارے پر موجودہ موصل شہر سے مشرقی جانب میں دریا کے پار آباد تھا اور اب اس کے کھنڈرات ہیں، اور کھنڈرات کی طرف دیکھ کے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے دور کا بہت بڑا شہر تھا، حضرت مفتی شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ اس کے آثار تقریباً ساٹھ میل کے ایریے میں پھیلے ہوئے ہیں، تو اندازہ کیجیے کہ اس وقت وہ کتنا بڑا شہر ہوگا، اور اس شہر کی آبادی کے بارے میں قرآنِ کریم میں ایک جگہ اشارہ موجود ہے وَاَرْسَلْنٰهُ اِلٰى مِائَةِ اَلْفٍ اَوْ يَزِيْدُوْنَ (سورۂ صافات: ۱۴۷) ایک لاکھ افراد یا اس سے کچھ زیادہ،'' یا اس سے کچھ زیادہ'' یہ محاورے کے طور پر کہہ دیا جاتا ہے جیسے لاکھ سوا لاکھ، یا یہ ہے کہ غیر مکلّفین کو بھی ساتھ شامل کر لیا جائے تو لاکھ سے بڑھ جاتے ہیں، مکلّفین ایک لاکھ کے برابر ہوں، بہرحال یہ کلام کا ایک محاورہ ہے کہ کسی عدد کو نقل کرتے ہوئے یوں نقل کر دیا جاتا ہے کہ لاکھ سوا لاکھ لوگ تھے جن کی طرف ہم نے ان کو بھیجا تھا، آبادی اس شہر کی اتنی تھی۔

یونس علیہ السلام کا زمانۂ تبلیغ، قوم کو عذاب کی خبر دینا، قوم کی توبۂ عام، عذاب کا ٹل جانا

اور ان کا زمانہ لکھا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے تقریباً سات آٹھ سو سال قبل یہ قوم ہوئی ہے، تو یونس علیہ السلام بھی انبیائے بنی اسرائیل میں سے ہی تھے، اس شہر کی طرف یہ مبعوث ہوئے ہیں، تو یہاں سات سال تک تقریباً مسلسل حضرت یونس علیہ السلام نے تبلیغ کی لیکن وہ لوگ نہ مانے، تو پھر جس طرح سے اللہ تبارک وتعالیٰ کی عادت ہے کہ آخر آخر عذاب کی دھمکی دی جاتی ہے تو حضرت یونس علیہ السلام کی زبان سے بھی اس قوم کو یہ دھمکی دی گئی کہ اگر تم نہیں مانو گے تو تین دن کے بعد تم پر عذاب آجائے گا، اور اللہ تبارک وتعالیٰ کی یہ عادت ہے جیسے کہ حضرت لوط علیہ السلام کا واقعہ صراحتاً مذکور ہے، کہ جس وقت عذاب آنے والا ہوتا ہے تو نبی کو حکم دے دیا جاتا ہے کہ یہاں سے ایک طرف ہٹ جاؤ تاکہ بستی جس وقت برباد ہوگی تو اللہ کا رسول اور جو اس کے ساتھ ماننے والا ہوگا (یہاں کسی دوسرے ساتھی کا ذکر نہیں آیا، یونس علیہ السلام کا ہی ذکر ہے) تو وہ وہاں سے نکل جاتے ہیں، اس کے بعد باقی بستی برباد ہو جایا کرتی ہے۔ تو حضرت یونس علیہ السلام بھی اسی قسم کی دھمکی دے کر اس شہر سے نکل گئے، باہر چلے گئے، دُور چلے گئے، اور وہ قوم متنبہ ہوگئی، وہ آپس میں سوچنے لگے کہ یونس علیہ السلام نے آج تک کبھی جھوٹ نہیں بولا اور ان کا جھوٹ ہم نے کبھی آزمایا نہیں، اور ایسا نہ ہو کہ ان کی یہ بات سچی نکل آئے، تو پھر ان کے سمجھدار لوگ کہنے لگے کہ تین دن کے بعد آخری رات جو آئے گی تو اس میں دیکھنا، اگر تو یونس علیہ السلام اس بستی میں موجود ہوئے پھر تو سمجھ لینا کہ عذاب نہیں آئے گا، یہ ایسے ہی ان کی دھمکیاں ہیں، اگر وہ یہاں موجود نہ ہوئے تو پھر واقعی عذاب آجائے گا، پھر محتاط ہو جاؤ، رات کے وقت تلاش کیا گیا تو یونس علیہ السلام وہاں موجود نہیں تھے، اور کچھ آثار اس قسم کے نمایاں ہوئے، کوئی دھواں سا اُٹھنے لگا، جس سے وہ سمجھے کہ یہ تو واقعی اس بات کے مطابق اب عذاب آجائے گا، علامات کچھ نمایاں ہوئیں، تو یونس علیہ السلام تو نہ ملے جن کے ہاتھ پر جا کے وہ توبہ کر لیتے، تو سارے بوڑھے، عورتیں جتنے تھے وہ سب باہر نکلے اور بہت اللہ کے

سامنے گڑگڑائے، چونکہ حضرت یونس علیہ السلام کی وعظ تو بار بارسنی ہوئی تھی، وہ جانتے تو تھے کہ کس چیز پر ایمان لانا ہے اور کس طرح ایمان لانا ہے، یہ باتیں تو ان کے سامنے تھیں اگر چہ مانتے نہیں تھے، اب وہ اُسی طرح سے اللہ کے سامنے گڑگڑائے، اپنے کفر وشرک سے توبہ کی، تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کا ایمان قبول کرلیا، کیونکہ ابھی وہ عذاب میں مبتلا نہیں ہوئے تھے، جب عذاب واقع ہوجاتا ہے اور آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے، قوم مبتلا ہوجاتی ہے، ایسے وقت میں پھر ایمان لانا معتبر نہیں ہوتا جس طرح سے فرعون ڈوب رہا تھا اور عذاب میں مبتلا ہوگیا، ایسے وقت پھر توبہ قبول نہیں ہوتی، قومِ یونس عذاب میں مبتلا نہیں ہوئی تھی، آثار نمایاں ہوئے تھے اور آثار کے نمایاں ہونے کے ساتھ ہی وہ متنبہ ہوگئے اور انہوں نے توبہ استغفار کرلی، اللہ تعالیٰ نے ان کا ایمان قبول کرلیا اور وہ عذاب ٹل گیا جس کے آثار نمایاں ہوئے تھے۔

یونس علیہ السلام کا قوم کی طرف واپس نہ آنا اور اللہ کی طرف سے ان کو تنبیہ

حضرت یونس علیہ السلام شہر سے دُور تھے، ان کے سامنے اپنی قوم کے ایمان کا تذکرہ نہیں ہوا کہ وہ قوم ایمان لے آئی، اور ان سے عذاب ٹل گیا، انہوں نے سمجھا کہ تین دِن گزر گئے اور عذاب آیا نہیں، اب اگر میں قوم کی طرف جاؤں گا تو قوم مجھے جھٹلائے گی، اور جیسے روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قوم کا دستور یہ تھا کہ اگر کوئی شخص جھوٹ بولے اور اپنی بات کے اوپر کوئی واضح ثبوت نہ دے سکے تو اس کو قتل کردیتے تھے، حضرت یونس علیہ السلام کے سامنے اللہ تعالیٰ کی حکمت کے تحت وحی کے ساتھ بھی کوئی تفصیل نہ آئی، اور انہوں نے یہ خیال کیا کہ یہ کیا وجہ ہوگئی؟ عذاب کیوں نہیں آیا؟ اب اگر میں واپس جاؤں گا تو وہ لوگ مجھے جھٹلائیں گے، جھوٹا کہیں گے، تو ایسی صورت میں انہوں نے سوچ لیا کہ میں اب بستی میں نہیں جاتا، میں اس علاقے سے ہجرت کرکے کسی دوسرے علاقے میں چلا جاتا ہوں، نہ قوم کے سامنے جاؤں نہ قوم مجھے جھٹلائے۔ یہاں سے حضرت یونس علیہ السلام کی وہ لغزش ہے جس کے اوپر اللہ تبارک تعالیٰ کی طرف سے گرفت ہوئی کہ آپ نے اِذن کے بغیر اس علاقے سے ہجرت کی، وہاں سے چل دیے، آگے دریا آگیا، دریا کے کنارے کشتی کھڑی تھی جس میں لوگ سوار ہورہے تھے دوسری طرف جانے کے لئے، یونس علیہ السلام بھی اس کشتی میں سوار ہوگئے، اور ان لوگوں نے بزرگ شخصیت دیکھ کے سوار کرالیا اور کرایہ بھی نہ لیا، جب وہ کشتی وسط دریا میں گئی، تو وہاں جا کے کچھ پھنس گئی، ٹھہر گئی کہ چلتی ہی نہیں، یا ہچکولوں میں آگئی، تو وہ لوگ کہنے لگے کہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کشتی کے اندر کوئی بھاگا ہوا نافرمان غلام ہے کہ اگر اس کو یہاں سے نہ اُتارا گیا، دریا میں نہ پھینکا گیا تو سارے ہی ڈوبیں گے تو حضرت یونس علیہ السلام کو تنبہ ہوا اور فوراً بول پڑے کہ میں ہی اپنے آقا کی اجازت کے بغیر آیا ہوں اور میں ہی بھاگا ہوا ہوں، مجھے دریا میں اُتاردو تاکہ باقی لوگ بچ جائیں، اب ان کی شکل صورت دیکھ کر دوسرے لوگ کس طرح سے یقین کریں کہ یہ شخص گنہگار ہے یا نافرمان ہے جس کی وجہ سے ہم پر یہ مصیبت آرہی ہے، تو وہ مانتے ہی نہیں، اور کسی کے متعلق تحقیق نہیں ہوتی، تو پھر یہ انداز اختیار کیا گیا کہ قرعہ ڈالو، جس کے نام کا قرعہ نکلے گا اسے اُٹھا کے دریا میں پھینک دیا جائے گا، آگے آپ کے سامنے ذکر آئے گا فَسَاهَمَ فَكَانَ مِنَ الْمُدْحَضِيْنَ (سورۂ صافات: ۱۴۱)

پھر قرعہ اندازی میں شریک ہو گئے، قرعہ اندازی میں بھی نام آپ کا ہی نکل آیا، تو پھر آپ کو دریا کے اندر اتار دیا گیا، اور اللہ تعالیٰ کی حکمت کے تحت نیچے مچھلی منتظر تھی، فَالْتَقَمَهُ الْحُوْتُ (سورۂ صافات) فوراً اس مچھلی نے ان کو اپنا لقمہ بنالیا اور ان کو پیٹ میں لیکر دریا کی تہہ میں چلی گئی۔ حضرت یونس علیہ السلام کو تنبہ ہو ہی گیا تھا تو وہ مچھلی کے پیٹ میں استغفار کرتے رہے لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۖ اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ (سورۂ انبیاء: ۸۷) حضرت یونس علیہ السلام کا استغفار یہی کلمہ ہے، کہ ''تیرے بغیر کوئی معبود نہیں، تُو ہر چیز سے پاک ہے، اور میں ہی قصورواروں میں سے ہوں'' یہ ان کے استغفار کا کلمہ ہے، فَنَادٰی فِی الظُّلُمٰتِ، تاریکیوں میں پکارا، دریا کی تہہ میں چلے گئے، مچھلی کے پیٹ میں چلے گئے، رات کی تاریکی، تو تاریکی در تاریکی میں اپنے اللہ کو پکارا، لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۖ اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ، اللہ تعالیٰ نے یہ توبہ قبول کی اور اس مچھلی کو حکم دیا تو مچھلی آ کے دریا کے کنارے پر ان کو اُگل گئی، اب مچھلی کے پیٹ میں گرمی اور اس قسم کی چیزیں جس سے بدن میں بڑا ضعف آ گیا، تو اللہ تعالیٰ نے آپ کی حفاظت کے لئے وہاں کدو کی بڑی ساری بیل اُگائی جس کے پتوں کا سایہ آپ پر ہوا، اور کدو کی بیل کی یہ خاصیت بھی بتاتے ہیں کہ اس پر مکھی نہیں آتی، اور کوئی پہاڑی بکری یا کوئی پہاڑی ہرنی آ کے دُودھ پلا جاتی تھی، صحت مند ہو گئے، پھر اپنی قوم کی طرف آئے تو معلوم ہوا کہ قوم تو ساری کی ساری ایمان لا چکی، یہ واقعہ ہے جو قرآنِ کریم کے اشارات اور روایات کی طرف دیکھتے ہوئے حضرت یونس علیہ السلام کے ساتھ پیش آیا۔

واقعۂ یونس کے متعلق مودودی صاحب کی بے احتیاطی اور اکابرین کی گرفت

اب اس واقعے کو ذکر کرتے ہوئے اسی مقام پر مودودی صاحب کچھ زیادہ تیز ہو گئے، اسی لیے آپ کے سامنے ''تفہیم القرآن'' لایا ہوں کہ یہ مقام ایسا ہے کہ جس میں علماء نے مودودی صاحب کے بیان پر گرفت کی ہے، مودودی صاحب لکھتے ہیں کہ ''تاہم قرآن کے اشارات اور صحیفۂ یونس کی تفصیلات پر غور کرنے سے وہی بات صحیح معلوم ہوتی ہے جو مفسرینِ قرآن نے بیان کی ہے، کہ حضرت یونس علیہ السلام چونکہ عذاب کی اطلاع دینے کے بعد اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر اپنا مستقر چھوڑ کر چلے گئے تھے، اس لیے جب آثارِ عذاب دیکھ کر عاشوریوں نے توبہ اور استغفار کی تو اللہ تعالیٰ نے انہیں معاف کر دیا، قرآنِ مجید میں خدائی دستور کے جو اُصول وکلیات بیان کیے گئے ہیں، ان میں ایک مستقل دفعہ یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی قوم کو اس وقت تک عذاب نہیں دیتا جب تک کہ اس پر اپنی حجت پوری نہیں کر لیتا، پس جب نبی نے اس قوم کی مہلت کے آخری لمحے تک نصیحت کا سلسلہ جاری نہ رکھا اور اللہ کے مقرر کردہ وقت سے پہلے بطورِ خود ہی وہ ہجرت کر گیا تو اللہ تعالیٰ کے انصاف نے اس قوم کو عذاب دینا گوارہ نہ کیا، کیونکہ اس پر اتمامِ حجت کی قانونی شرائط پوری نہیں ہوئیں تھیں'' یہ عبارت ہے اس کتاب میں۔ لیکن اعتراض کرنے والے مودودی صاحب کی جو عبارت نقل کرتے ہیں وہ کچھ اور طرح سے ہے، ''معارف القرآن'' میں حضرت مفتی صاحب نے جو عبارت نقل کی ہے وہ یہ ہے، اب ان دونوں عبارتوں کا فرق دیکھیے، مفتی صاحب نقل کرتے ہیں: (اگرچہ انہوں نے جو کتاب کا حوالہ دیا ہے وہ ہے ''تفہیم القرآن'' مولانا مودودی جلد دوم، ص: ۳۱۲، اور یہی صفحہ ہی میں کھولے بیٹھا ہوں) ''قرآن کے اشارات اور صحیفۂ یونس کی

تفصیلات پر غور کرنے سے اتنی بات صاف معلوم ہوتی ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام سے فریضۂ رسالت ادا کرنے میں کچھ کوتاہیاں ہوگئی تھیں (یہ عبارت یہاں اب ''تفہیم'' میں موجود نہیں، یہ فرق دکھانے کے لئے دونوں کتابوں کی عبارت آپ کے سامنے پڑھ رہا ہوں) اور غالباً انہوں نے بے صبر ہو کر قبل اَز وقت اپنا مستقر چھوڑ دیا (بے صبر ہو کر!!)، اس لیے جب آثار عذاب دیکھ کر عاشوریوں نے توبہ اور اِستغفار کی تو اللہ تعالیٰ نے انہیں معاف کر دیا، قرآن میں خدائی دستور کے جو اُصول وکلیات بیان کیے گئے ہیں ان میں ایک مستقل دفعہ یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی قوم کو اس وقت تک عذاب نہیں دیتا جب تک کہ اس پر اپنی حجت پوری نہیں کر دیتا، ''پس جب نبی اَدائے رِسالت میں کوتاہی کر گیا'' اور اللہ کے مقرر کردہ وقت سے پہلے ہی اپنی جگہ سے ہٹ گیا تو اللہ تعالیٰ کے انصاف نے اس قوم کو عذاب دینا گوارہ نہ کیا۔'' (''تفہیم القرآن'' مولانا مودودی، ص: ۳۱۲، جلد: ۲)...... اور یہ کتاب جو میں آپ کے سامنے لیے بیٹھا ہوں یہ بھی ''تفہیم القرآن'' ص: ۳۱۲، جلد دوم ہے، دونوں عبارتوں کے درمیان فرق دیکھو کتنا ہے! اور اصل بات یہ ہے کہ جو مفتی صاحب نے عبارت نقل کی ہے یہی عبارت اصل ہے، جس وقت ''تفہیم القرآن'' پر گرفت کی گئی تھی تو یہی عبارت تھی، اب جو نسخہ میرے سامنے رکھا ہے یہ اس کتاب کا دسواں ایڈیشن ہے، پہلے ایڈیشنوں میں عبارت وہی ہے، اور نئے ایڈیشن میں خاموشی کے ساتھ عبارت بدل دی، یعنی یہ ذکر نہیں کیا، تنبیہ نہیں کی کہ پہلے الفاظ اس قسم کے تھے اور اب وہ اعتراض کی بنا پر تبدیل کیے جا رہے ہیں، اب اس کا اثر یہ پڑے گا کہ آنے والی نسل جو نیا ایڈیشن خریدے گی وہ دیکھے گی کہ جس قسم کے حوالے دے کے مودودی صاحب پر اعتراض کیا جا رہا ہے وہ حوالہ تو ان کی کتاب میں موجود ہی نہیں، اور اس طرح دوسرے بزرگوں کے اُوپر وہ کیچڑ اُچھالیں گے، کہیں گے کہ غلط بیانی کر کے غلط باتوں کی نسبت کر کے وہ اِعتراضات کرتے ہیں جو حقیقت کے خلاف ہیں، اور یہی ان لوگوں کی چال بازی ہے چالاکی ہے کہ جس عبارت کے اُوپر اِعتراض ہوتا ہے، دوسرے ایڈیشن میں وہ عبارت ہی غائب کر دیتے ہیں۔ اب ہمارے بزرگوں نے ان پر جو گرفت کی تھی وہ اس بات پر کی تھی کہ ''حضرت یونس علیہ السلام سے فریضۂ رِسالت ادا کرنے میں کچھ کوتاہیاں ہوگئی تھیں...... بے صبر ہو کر وقت سے پہلے یہ نکل گئے تھے...... جب نبی ادائے رِسالت میں کوتاہی کر گیا اور اللہ کے مقرر کردہ وقت سے پہلے خود ہی اپنی جگہ سے ہٹ گیا تو اللہ تعالیٰ کے انصاف نے اس قوم کو عذاب دینا گوارہ نہیں کیا۔'' یہ جو ''کوتاہیاں، کوتاہیاں'' کا لفظ تھا، کہ ''فریضۂ رِسالت ادا کرنے میں کوتاہیاں ہوگئی تھیں، کوتاہی کر گیا'' اس قسم کے لفظ نئے ایڈیشن کے اندر اُڑا دیے گئے، یہاں سے غائب کر دیے گئے، اب دونوں کتابوں کو ملا کے دیکھو گے تو جو قابلِ اعتراض الفاظ تھے وہ اس عبارت میں موجود نہیں، یہی بتلانا میرا مقصود ہے کہ آپ ہمارے بزرگوں کی کتابوں میں یہ الفاظ دیکھیں گے، جو ان کے اُوپر اِعتراض کرتے ہوئے نقل کیے ہوئے ہیں، کہ ''یونس علیہ السلام سے کوتاہیاں ہوئیں اور وہ فریضۂ رِسالت کے ادا کرنے میں کوتاہ ثابت ہوئے، اور بے صبر ہو کر وقت سے پہلے نکل گئے'' ان الفاظ پر اِعتراض کیا گیا ہے اور وہ الفاظ اب ''تفہیم'' میں موجود نہیں ہیں، تو یہ حقیقت آپ کے سامنے نمایاں کرنا مقصود ہے کہ یہ پہلے ایڈیشن کی عبارت ہے اور یہ جواب پڑھ رہا ہوں یہ نیا ایڈیشن ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ یہاں جو کچھ مودودی صاحب نے لکھا ہے، وہ سارے مفروضے ہیں، قرآنِ کریم میں کوئی ایسا اشارہ نہیں جس سے معلوم ہو کہ یہ فریضۂ رسالت کے ادا کرنے میں کوتاہی کر گئے تھے، قرآنِ کریم میں ایسا کوئی لفظ نہیں جس میں بتایا گیا ہو کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے نکلنے کا کوئی وقت متعین کیا ہوا تھا اور یہ پہلے نکل گئے تھے، اور نہ قرآنِ کریم میں یہ لفظ ہے کہ یونس علیہ السلام کی قوم سے عذاب اس لیے ٹلا تھا کہ چونکہ نبی نے پوری طرح سے ان کو اِنذار نہیں کیا تھا اور ان کے اُوپر اِتمامِ حجت نہیں کی تھی تو اللہ کے انصاف سے یہ بات بعید تھی کہ ان کو عذاب دیتا۔ قرانِ کریم نے تو ظاہری طور پر وجہ یہی بیان کی ہے کہ ان پر عذاب آنے لگا تھا اور وہ ایمان لے آئے، لَمَّآ اٰمَنُوْا كَشَفْنَا جب وہ ایمان لے آئے تو ایمان لانے کی وجہ سے ہم نے وہ عذاب ان سے دُور ہٹا دیا، باقی یونس علیہ السلام کی کونسی ایسی بات تھی جس کی بنا پر اللہ نے ان پر گرفت کی؟ وہ ان کی شان کے مطابق (چونکہ بڑے آدمی کی تھوڑی سی لغزش پر بھی گرفت زیادہ ہوتی ہے) اس کا ذِکر آگے سورۂ انبیاء میں آئے گا: وَذَا النُّوْنِ اِذْ ذَّهَبَ مُغَاضِبًا، ذوالنون جس وقت ناراض ہو کے چلے گئے، یا سورۂ صافات میں لفظ ہے: اَبَقَ اِلَى الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ، وہ ایک بھری ہوئی کشتی کی طرف بھاگ گئے، یہ اللہ تعالیٰ نے جو انداز اختیار کیا ہے یہ اُن کا قبل از وقت ہجرت کرنا ہے، شہر سے جدا تو وہ ہو گئے تھے عذاب کی دھمکی آجانے کے بعد، جس طرح انبیاء علیہم السلام کا دستور ہے کہ قوم پر جب عذاب آنے لگتا ہے تو ان کو علیحدہ کر لیا جاتا ہے، جس طرح سے حضرت لوط علیہ السلام کا واقعہ قرآنِ کریم میں صراحتاً مذکور ہے، لیکن آگے اس علاقے کو چھوڑ کے بایں طور چلے جانا کہ اس علاقے سے ہی نکل جائیں اور ہجرت کر جائیں، اس کی صراحتاً ان کو اجازت نہیں ملی تھی، ورنہ عذاب کی دھمکی اللہ کی اطلاع کے ساتھ دی گئی اور جو واقعات بھی ہوئے ان میں یونس علیہ السلام حق پر تھے، ٹھیک تھے، اپنا فریضہ انہوں نے پوری طرح سے ادا کر لیا تھا، اس میں کوئی کسی قسم کی کوتاہی نہیں ہوئی، انبیاء علیہم السلام کے متعلق یہ مستقل عقیدہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام گناہوں سے معصوم ہوتے ہیں، اور گناہ کبیرہ ہو یا صغیرہ، اس کی تفصیلات میں تو کچھ اختلاف ہوں گے کہ کبیرہ اور صغیرہ دونوں سے معصوم ہیں، یا صرف کبیرہ سے معصوم ہیں، اور رسول بن جانے کے بعد معصوم ہیں یا رسول بن جانے سے پہلے بھی، اس قسم کے کچھ نہ کچھ اختلافات تو علماء کے درمیان میں موجود ہوں گے صغیرہ کے بارے میں کہ قبل از نبوّت معصوم ہونا ضروری ہے یا نہیں، بعد از نبوّت صغیرہ سے کبیرہ سے اور کس کس چیز سے وہ معصوم ہوتے ہیں، اس میں کچھ اختلافی اقوال آپ کو مل جائیں گے، لیکن جہاں تک رسالت کی ذمہ داریوں کے ادا کرنے کی بات ہے اس کے اندر نبی قطعاً کوتاہی نہیں کر سکتا، ورنہ تو اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے انتخاب ہی غلط ہو گیا، نعوذ باللہ! کہ ایسے آدمی کے ذِمّے ایک امانت سپرد کر دی گئی جس کو ادا کرنے کا وہ اہل ہی نہیں، تو ان کا جو اپنا فریضہ ہے منصبِ رسالت، اس میں کوتاہی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، اس بات پر اُمّت کا اجماع ہے کہ نبی اَدائے رسالت میں کوتاہی نہیں کر سکتا، یونس علیہ السلام کی طرف یہ جو نسبت کی گئی ہے یہ ان کی شان کے خلاف ہے اور یہ گستاخی ہے، جس کے اوپر ہمارے حضرات نے یہ گرفت کی تھی، فریضۂ رسالت صحیح ادا کیا، سات سال تک جس طرح سے بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ قوم کو سمجھاتے رہے، اب کونسی کسر باقی رہ گئی تھی جو اور سمجھاتے، اور پھر عذاب کی دھمکی اگر دی گئی تھی تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اطلاع کے ساتھ ہی دی گئی تھی، اور پھر ان لوگوں سے عذاب جو ٹلا تھا تو ان کو یوں معذور

قرار دے کے نہیں گیا کہ ان کو پوری طرح سے انذار نہیں کیا گیا، یونس علیہ السلام نے ان کو صحیح طور پر سمجھایا نہیں، گویا کہ کوتاہی یونس علیہ السلام کی تھی، قوم کی کوئی کوتاہی نہیں تھی، تو قوم معذور قرار پائی، ایسی بات نہیں ہے، یونس علیہ السلام کی کوتاہی نہیں، کوتاہی اس قوم کی تھی جس کی بنا پر عذاب آنے لگا تھا، جب انہوں نے اپنی اس کوتاہی کی تلافی کر لی تو عذاب ٹل گیا، تو مودودی صاحب کا یہ بیان حضرت یونس علیہ السلام کی شان کے خلاف ہے جو کچھ انہوں نے لکھا، باقی! یہ کہ وہ الفاظ جن پر ہمارے حضرات اعتراض کرتے ہیں یہ پرانے ایڈیشن کے الفاظ ہیں، اور موجودہ ایڈیشن سے ان الفاظ کو غائب کر دیا گیا ہے، اس لیے کبھی ان پرانی تفسیروں کا حوالہ دیکھتے ہوئے یا دوسرے حضرات جنہوں نے مودودی صاحب پر گرفت کی ہے اُن کی کتابیں دیکھتے ہوئے آپ اِس وقت ''تفہیم القرآن'' کو اُٹھا کے دیکھیں گے تو آپ کو یہ الفاظ نہیں ملیں گے جن کے اوپر اعتراض کیا گیا ہے، اور یہ ان کی چابک دستی ہے کہ خاموشی کے ساتھ وہ عبارتیں نئے ایڈیشنوں میں غائب کر دیتے ہیں، جس کا اثر یہ پڑے گا کہ آنے والی نسل جب ان کتابوں کو دیکھے گی، اور ہمارے بزرگوں کے اعتراضات کو دیکھے گی، تو اس بدگمانی میں مبتلا ہو جائیں گے کہ دیکھو! بلاوجہ الفاظ ان کی طرف منسوب کر کر کے ان کے اوپر گرفت کر رہے ہیں حالانکہ ان کی کتاب میں یہ الفاظ ہیں ہی نہیں۔ تو پرانے ایڈیشن میں یہ الفاظ تھے جس کا حوالہ حضرت مفتی صاحب نے دیا ہے اور اپنی کتاب کے اندر وہ الفاظ نقل کیے ہیں، موجودہ ایڈیشن کے اندر یہ الفاظ نہیں ہیں۔ اور باقی اعتراضات کے بارے میں بھی یہی صورت حال آپ کے سامنے پیش آئے گی، کہ ان کے جو نئے ایڈیشن آتے ہیں ان کے اندر عبارتوں میں تغیر تبدل کر دیتے ہیں، تو کہیں کوئی ایسا حوالہ آ جائے جو اپنے بزرگوں نے لکھا ہو (ہمارے بزرگ الحمدللہ! اتنے دیانت دار ہیں کہ اس قسم کا حوالہ دینے میں وہ کوئی غلط بیانی نہیں کرتے، نہ کسی کے اوپر اتہام کرتے ہیں) ان کی بتائی ہوئی عبارت اگر کسی کتاب کے اندر نہیں ملتی تو ایڈیشن دیکھو کہ کون سا ہے، وہ ایڈیشن بدلا ہوا ہوگا، اور جب پہلے ایڈیشن کو دیکھیں گے تو ان شاء اللہ! اس میں وہ بات آپ کو مل جائے گی۔ تو ''تفہیم القرآن'' کے جن مقامات پر گرفت کی گئی ہے، اور اس تفسیر کے اُوپر مودودی صاحب کی غلطیاں نکالی گئی ہیں ان میں سے یہ مقام بھی ہے۔ باقی! یونس علیہ السلام کے واقعے کی تفصیل قرآنِ کریم کے الفاظ کے تحت، وہ زیادہ تر سورۂ صافات میں آئے گی۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْ دِيْنِيْ فَلَاۤ اَعْبُدُ الَّذِيْنَ
آپ کہہ دیجیے کہ اے لوگو! اگر تم کسی تردد میں ہو میرے دین کے بارے میں تو میں تمہیں بتلاتا ہوں، نہیں میں عبادت کرتا ان کی
تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ اَعْبُدُ اللّٰهَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰىكُمْ ۖۚ وَاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ
جن کو تم پوجتے ہو اللہ کے علاوہ اور لیکن میں عبادت کرتا ہوں اس کی جو تم کو موت دیتا ہے اور میں حکم دیا گیا ہوں کہ میں ہو جاؤں

مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۰۴﴾ وَاَنْ اَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ۚ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۰۵﴾

مؤمنین میں سے ﴿۱۰۴﴾ اور یہ کہ تُو سیدھا رکھ اپنا چہرہ دین کے لئے اس حال میں کہ یکسوئی اختیار کرنے والا ہو اور نہ ہو تُو مشرکین میں سے ﴿۱۰۵﴾

وَلَا تَدْعُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكَ وَلَا يَضُرُّكَ ۚ فَاِنْ فَعَلْتَ فَاِنَّكَ اِذًا مِّنَ

اور نہ تُو پکار اللہ کے علاوہ ان چیزوں کو جو تجھے نفع نہیں دے سکتیں اور نہ تجھے نقصان پہنچا سکتی ہیں، پھر اگر تُو ایسا کرے گا تب تُو ہو جائے

الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۰۶﴾ وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗۤ اِلَّا هُوَ ۚ وَاِنْ

گا ظالموں میں سے ﴿۱۰۶﴾ اگر پہنچا دے تجھے اللہ کوئی تکلیف تو اس کو کوئی دُور ہٹانے والا نہیں سوائے اس کے، اور اگر

يُّرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِهٖ ؕ يُصِيْبُ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ

وہ تیرے ساتھ ارادہ کرے بھلائی کا تو کوئی رَدّ کرنے والا نہیں اس کے فضل کو، وہ پہنچاتا ہے اپنا فضل جس کو وہ چاہتا ہے اپنے بندوں

وَهُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۰۷﴾ قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ ۚ

میں سے، وہ بخشنے والا ہے رحم کرنے والا ہے ﴿۱۰۷﴾ آپ کہہ دیجیے اے لوگو! تحقیق آ گیا تمہارے پاس حق تمہارے رَبّ کی طرف سے

فَمَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ

پس جو ہدایت حاصل کرے گا سوائے اس کے نہیں کہ وہ ہدایت حاصل کرے گا اپنے ہی نفع کے لئے اور جو بھٹک جائے گا

فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ۚ وَمَاۤ اَنَا عَلَيْكُمْ بِوَكِيْلٍ ﴿۱۰۸﴾ وَاتَّبِعْ مَا يُوْحٰۤى اِلَيْكَ وَ

تو سوائے اس کے نہیں وہ بھٹکے گا اپنے نقصان پر، اور نہیں ہوں میں تم پر نگران ﴿۱۰۸﴾ تُو پیروی کر اس چیز کی جو وحی کی گئی تیری طرف اور

اصْبِرْ حَتّٰى يَحْكُمَ اللّٰهُ ۚۖ وَهُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ ﴿۱۰۹﴾

ثابت قدم رہ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ فیصلہ کر دے اور وہ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے ﴿۱۰۹﴾

خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ: آپ فرما دیجئے اے لوگو! اِنْ كُنْتُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْ دِيْنِيْ: اگر تم کسی قسم کے تردّد میں ہو میرے دین کی طرف سے، فَلَاۤ اَعْبُدُ: اِنْ کی جزاء محذوف ہے فَاُخْبِرُكُمْ۔ ''اگر تم میرے دین کی طرف سے کسی شک میں ہو تو میں تمہیں بتلاتا ہوں'' کہ میرا دین یہ ہے: ''نہیں عبادت کرتا میں اُن چیزوں کی جن کو تم پُوجتے ہو اللہ کے علاوہ'' وَلٰكِنْ اَعْبُدُ

اللّٰهَ الَّذِیْ یَتَوَفّٰىكُمْ: لیکن میں عبادت کرتا ہوں اُس اللہ کی جو تمہیں وفات دیتا ہے، وَاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ: اور میں حکم دیا گیا ہوں کہ مؤمنین میں سے ہو جاؤں، وَاَنْ اَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّیْنِ حَنِیْفًا: یہ ''اَن'' بھی مصدریہ ہے، اَمر پر بھی آجایا کرتا ہے، نہی پر بھی آجایا کرتا ہے، مضارع پر بھی آتا ہے، اَنْ اَكُوْنَ میں یہ مضارع پر آیا ہوا ہے، اَنْ اَقِمْ میں اَمر پر آیا ہوا ہے، اور آگے وَلَا تَكُوْنَنَّ یہ بھی اَن کے نیچے داخل ہے، وہ نہی ہے، ''سیدھا رکھ تو اپنا چہرہ دین کے لئے'' حَنِیْفًا: اس حال میں کہ تو یکسو ہو کر ایک دین کی طرف متوجہ ہے، حنیف کا مفہوم جس طرح سے بارہا آپ کے سامنے ذکر کیا گیا، وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ: اور ہرگز نہ ہو تو مشرکین میں سے۔ یہ ساری باتیں اُمِرْتُ کے نیچے داخل ہیں۔ ''مجھے حکم دیا گیا ہے کہ تو اپنے چہرے کو مخلص یکسو ہو کر دین کی طرف قائم رکھ، اور مشرکین میں سے ہرگز مت ہو'' وَلَا تَدْعُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا یَنْفَعُكَ وَلَا یَضُرُّكَ: اور نہ پکار اللہ کے علاوہ ان چیزوں کو جو تجھے نفع نہیں دے سکتیں اور نہ تجھے نقصان پہنچا سکتی ہیں، فَاِنْ فَعَلْتَ: پھر اگر تو ایسا کرے گا، فَاِنَّكَ اِذًا مِّنَ الظّٰلِمِیْنَ: پھر بے شک تو تب ہو جائے گا ظالموں میں سے، اِذًا کے اوپر جو تنوین ہے یہ مضاف الیہ کے عوض میں ہے، اِذَا فَعَلْتَ ذٰلِكَ، تب، تب کا مفہوم یہ ہوتا ہے، ''تب'' یعنی جس وقت ایسا ہو جائے گا تو قصورواروں میں سے ہو جائے گا، اپنے آپ پر ظلم کرنے والوں میں سے ہو جائے گا، مشرکوں میں سے ہو جائے گا، ظلم کا مصداق شرک بھی ہوتا ہے۔ وَاِنْ یَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ: اور اگر اللہ تعالیٰ تجھے کوئی تکلیف پہنچا دے، فَلَا كَاشِفَ لَهٗۤ اِلَّا هُوَ: اس تکلیف کو کوئی دُور ہٹانے والا نہیں سوائے اُس کے، اس کے سوا اُس تکلیف کو دُور ہٹانے والا کوئی نہیں، وَاِنْ یُّرِدْكَ بِخَیْرٍ: اور اگر وہ اللہ تیرے ساتھ کسی بھلائی کا ارادہ کرلے، فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِهٖ: تو اُس کے فضل کو کوئی رَدّ کرنے والا نہیں، یُصِیْبُ بِهٖ مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ: پہنچاتا ہے اپنا فضل جس کو چاہتا ہے اپنے بندوں میں سے، وَهُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ: وہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔ قُلْ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ: آپ کہہ دیجئے کہ اے لوگو! قَدْ جَآءَكُمُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ: تمہارے پاس تمہارے رَبّ کی طرف سے حق آ گیا، صحیح سچی واقعے کے مطابق بات آ گئی، فَمَنِ اهْتَدٰی: جو کوئی ہدایت پائے گا، اِهتداء: ہدایت پانا، جو کوئی راہ پر آجائے گا، ہدایت حاصل کرلے گا، فَاِنَّمَا یَهْتَدِیْ لِنَفْسِهٖ: پس اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ ہدایت حاصل کرے گا اپنے ہی نفع کے لئے، وَمَنْ ضَلَّ: اور جو کوئی بھٹک جائے گا، ضَلَّ یہ ہدایت کے مقابلے میں ضلالت آ گئی، جو کوئی ضلالت میں جا پڑے گا، ہدایت حاصل نہیں کرے گا، فَاِنَّمَا یَضِلُّ عَلَیْهَا: اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ بھٹکے گا اپنے ہی نقصان پر، اُس کا یہ بھٹکنا اُسی کے لئے نقصان دِہ ہوگا، علیٰ ضرر کے لئے آیا کرتا ہے، وَمَاۤ اَنَا عَلَیْكُمْ بِوَكِیْلٍ: وکیل: ذمہ دار، وکیل کا مفہوم ہوتا ہے موکول الیہ الأمر، جس کے سپرد کام کردیا گیا، محافظ کے معنی میں بھی آتا ہے، ذمہ دار کے معنی میں بھی آتا ہے، نگران کے معنی میں بھی آتا ہے، اصل بات یہ ہے کہ تمہارا معاملہ کوئی میرے ہی سپرد نہیں کردیا گیا، کہ تمہاری ذمہ داری میرے پہ آ گئی، اگر تم نہیں مانو گے تو مجھے کوئی جوابدہی کرنی پڑے گی، ایسی بات نہیں، ''میں تم پر کوئی نگران نہیں ہوں''، وَاتَّبِعْ مَا یُوْحٰۤی اِلَیْكَ: پیروی کر اُس چیز کی جو وحی کی گئی تیری طرف، وَاصْبِرْ: اور ثابت قدم رہ، حَتّٰی یَحْكُمَ اللّٰهُ: یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ فیصلہ کردے، وَهُوَ خَیْرُ الْحٰكِمِیْنَ: اور وہ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَیْكَ

تفسیر

ماقبل سے ربط

اِبتدا سے اس سورت کے مضامین پر آپ کو کچھ تھوڑی سی نظر ہوگی، کہ اس میں اصول کا ہی اثبات کیا گیا تھا، خاص طور پر مسئلۂ رسالت کا، اور توحید کا، اِثباتِ توحید، رَدِّ شرک، اِثباتِ رِسالت، قرآنِ کریم کی حقانیت، اِثباتِ معاد یہی اُصولی باتیں ہیں جو کہ اس سورت کے اندر مختلف پیرائیوں سے ذکر کی گئی ہیں، اب یہ سورت اختتام پر پہنچ گئی تو آخر آخر میں دِین کے خلاصے کے طور پر چند ایک باتوں کا اعلان کر دیا گیا۔

''عبادت'' کا مفہوم، اور اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کا ذِکر کر کے رَدِّ شرک

جیسا کہ بات ترجمے سے ہی واضح ہے کہ واضح طور پر کہہ دو، اپنے دِین کو ستھرا کر کے نکھار کے ان کے سامنے رکھ دو، کسی کو یہ اشتباہ نہ رہے کہ جس دِین کی طرف یہ بلا رہے ہیں وہ ہے کیا چیز؟ اے لوگو! اگر تمہیں میرے دِین کے بارے میں کوئی شک ہے تردّد ہے کہ میرا طریقہ کیا ہے؟ میرا دِین کیا ہے؟ میرا مذہب کیا ہے؟ میرا عقیدہ کیا ہے؟ تو سُن لو، میں تمہارے سامنے وضاحت کر دیتا ہوں، اس میں تمہیں کوئی شک اور شبہ نہیں رہنا چاہیے، میرے طریقے کا حاصل یہی ہے کہ جن چیزوں کو تم پُوجتے ہو اللہ کے علاوہ، جن چیزوں کی تم عبادت کرتے ہو اللہ کے علاوہ، میں ان کی عبادت نہیں کرتا، لفظ عبادت آپ کے سامنے بارہا گزر چکا، کہ عبادت اسی تعظیم کو کہا جاتا ہے کہ جو کسی کے متعلق اس قسم کا عقیدہ رکھ کے کی جائے کہ اس کو مافوق الاسباب ہمارے نفع نقصان پہ قدرت ہے، اور وہ لوگ جن کو شرکاء اور شفعاء بنائے ہوئے تھے ان کے اندر وہ اُلوہیت کا معنی مانے ہوئے تھے، اور اُلوہیت کا معنی مان کر جو تعظیم کی جاتی ہے وہ ''عبادت'' ہے، تو میں ان کی عبادت نہیں کرتا، میں ان کو نہیں پُوجتا، نہ میں ان کو ایسا سمجھتا ہوں، کیونکہ جس وقت تک اُن کو اِلٰہ سمجھا نہیں جائے گا تو ان کی تعظیم عبادت نہیں کہلائے گی، ''میں پُوجا نہیں کرتا ان چیزوں کی جن کی تم پُوجا کرتے ہو اللہ کے علاوہ، لیکن میں تو عبادت کرتا ہوں اسی کی جو تمہیں وفات دیتا ہے'' ، اَلَّذِیْ یَتَوَفّٰىكُمْ میں وفات کا ذکر کر دیا، اس میں اللہ تبارک وتعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کا اظہار ہے، کیونکہ وفات اور موت ایک ایسی چیز ہے جو ہر انسان کو آنے والی ہے، جن کے متعلق وہ عقیدہ رکھتے تھے کہ فلاں بھی اللہ کا شریک ہے، فلاں بھی اللہ کا شریک ہے، ان کے متعلق بھی مانتے تھے کہ ان کو بھی موت آئی، وفات وہ بھی پا گئے تھے، تو اس طرح سے اللہ کی قدرت تمام انسانوں کے اوپر حاوی معلوم ہوتی ہے کہ اسی کے ہاتھ میں حیات ہے اور اسی کے ہاتھ میں وفات ہے، اور جو شخص اپنے آپ کو بچا نہیں سکتا، اپنی زندگی اس کے اپنے اختیار میں نہیں ہے تو کون سا دوسرا کمال ہے جو اس کے اپنے اختیار میں ہوگا، کیونکہ حیات منبع کمالات ہے، سب سے پہلے زندگی حاصل ہوتی ہے اس کے بعد دیگر کمالات ثابت ہوتے ہیں، اور اگر کسی چیز کے اندر حیات ہی نہیں تو اس کے لئے دیگر کمالات کیا ہوں گے، تو جب کسی کی حیات اس کے اپنے اختیار میں نہیں تو اس کے دیگر کمالات اس کے اپنے اختیار میں کس طرح سے ہوں گے، تو موت وحیات اللہ کے ہاتھ میں

ہے جس سے معلوم ہوگیا کہ سارے کے سارے اللہ کے سامنے بے بس ہیں، جس کو چاہے وہ زندگی دے جس سے چاہے زندگی چھین لے، اور یہ زندگی ہی کمالات کی اصل ہے، تو کسی کے اندر کوئی ایسا کمال نہیں جس کو آپ کہیں کہ یہ اللہ کے مقابلے میں ہے، یا یہ اللہ سے اس بارے میں مستغنی ہے، کسی کے اندر ایسا کمال نہیں، تو وفات کا تذکرہ کر کے اللہ تعالیٰ کی قدرتِ قاہرہ کا ذکر کر دیا کہ میں تو اسی کو پوجتا ہوں اور اسی کو اپنے اوپر مختار اور مالک مانتا ہوں جو تمہیں وفات دیتا ہے، اور مجھے یہ حکم دیا گیا ہے کہ میں مؤمنین میں سے ہو جاؤں، ایمان لانے والوں میں سے ہو جاؤں۔

دِینِ حق پر اِستقامت کا اور شرک سے دُور رہنے کا حکم

اور اسی طرح سے مجھے یہ بھی حکم دیا گیا ہے کہ تو اپنے چہرے کو دِین کی طرف سیدھا رکھ، دِین سے وہی دِین مراد ہے جس کی وضاحت پیچھے سے آ رہی ہے کہ اللہ کی عبادت کی جائے، غیر اللہ کی عبادت نہ کی جائے، اس کے اوپر بالکل مستقیم رہو، اس میں اِفراط وتفریط نہ آنے پائے اور اَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ میں جو مفہوم تھا حَنِيْفًا ایک قسم کی اسی کی تاکید ہے، کیونکہ حنیف کا مفہوم بھی یہی ہے کہ ہر غیر طریقے سے ہٹ کر ایک حق طریقے کی طرف متوجہ ہو جاؤ، یکسو ہو کر اخلاص کے ساتھ ایک طریقے کی طرف ہو جاؤ، اور دوسرے طریقوں کی طرف آپ کا کوئی کسی قسم کا رجحان نہ رہے، تو یہ اسی مفہوم کی تاکید ہے، اور اس کی مزید وضاحت کر دی کہ مشرکوں میں سے ہرگز نہ ہونا، یعنی جب غیر اللہ کی عبادت نہیں کرنی تو شرک بھی نہیں ہوگا، اس کی تاکید آ گئی کہ مشرکوں میں سے نہ ہونا، جو کسی بھی قسم کا شرک کرتے ہیں چاہے وہ ذات میں کریں چاہے صفات میں کریں چاہے تصرف میں کریں، اور اسی طرح شرکِ جلی شرکِ خفی سب اس کے اندر آ گیا، موحد بن کے رہو، مشرکوں میں سے نہ ہونا، جو شرک کرنے والے ہیں ان کے ساتھ تمہارا کسی قسم کا کوئی ربط نہیں ہونا چاہیے، ان کے ساتھ کسی کام میں تمہاری شمولیت نہیں ہونی چاہیے، تو مجھے یہ حکم دیا گیا ہے۔

شرک کا باعث بننے والے دو جذبے اور ان کی تردید

وَلَا تَدْعُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكَ وَلَا يَضُرُّكَ: یہ بھی اسی کی تاکید ہے دوسرے انداز سے، کہ جو چیز تمہیں نفع نہیں پہنچا سکتی، یعنی اگر تم اس کی عبادت کرو تو تمہیں فائدہ نہیں پہنچا سکتی، عبادت نہ کرو تو تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکتی، تو اس کو مت پکارو، اس کے سامنے فریاد نہ کرو، دُعا نہ کرو، ان کے اختیار میں کچھ نہیں، نہ نفع پہنچا سکتے ہیں نہ نقصان پہنچا سکتے ہیں، اور آپ کی خدمت یہ بارہا وضاحت کی جا چکی کہ شرک اصل میں انہی دونوں دروازوں سے آتا ہے، یا انسان کسی سے اُمید متعلق کر لیتا ہے کہ اس سے میرا نفع متعلق ہے، اس لیے اس کے سامنے عاجزی، نیازمندی اختیار کرتا ہے کسی فائدے کے حاصل کرنے کے لئے، یا انسان کسی نقصان سے ڈرتا ہے اس لیے کسی کے سامنے دبتا ہے کہ اگر میں اس کی تعظیم نہیں کروں گا اور اس کے سامنے ماتھا نہیں ٹیکوں گا تو یہ مجھے نقصان پہنچا دے گا، آج بھی لوگ اگر قبروں پہ جاتے ہیں تو یا اولاد حاصل کرنے کے لئے جاتے ہیں یا حاصل شدہ اولاد کی صحت وعافیت بحال رکھنے کے لئے جاتے ہیں، یہ خطرہ ہوتا ہے کہ اگر ہم نے ایسا نہ کیا تو ہمارا بچہ مر جائے گا، ہماری بھینس دُودھ نہیں دے گی، اور اگر ہم ایسا کریں گے تو ہمیں یہ فائدہ ہو جائے گا، یہ دو ہی جذبے ہیں جو انسان کو کسی کے دروازے پر لے جاتے ہیں، اور قرآنِ کریم

میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہی بار بار وضاحت کی ہے کہ نفع ہو یا نقصان، یہ اللہ تعالیٰ کے کنٹرول میں ہے، کسی دوسرے کے کنٹرول میں نہیں، یہ کسی دوسرے کے بس میں نہیں کہ تمہارا کچھ بگاڑ سکے، اور نہ کسی کے اختیار میں ہے کہ تمہارا کچھ بنا سکے، تو جب یہ بنانا، بگاڑنا کسی کے اختیار میں ہے ہی نہیں تو نہ ڈر کے کسی کے سامنے جھکو اور ہاتھ پھیلاؤ نقصان سے بچنے کے لئے، اور نہ کسی لالچ کے تحت اور کسی سے نفع اٹھانے کے لئے اس کے سامنے فریاد کرو، تو مَالَا یَنْفَعُكَ وَلَا یَضُرُّكَ یہ شرک کی تردید کے لئے ایک واضح دلیل بھی ہے، کہ انسان اگر کسی کے سامنے جھکتا، دبتا ہے تو یا نفع کے حصول کے لئے یا نقصان سے بچنے کے لئے، جب اس کے علاوہ دوسرا کوئی ایسا ہے ہی نہیں تو ہم کسی کو کیوں پکاریں۔ ''اگر تُو نے ایسا کیا'' یہ حضور ﷺ کو خطاب کر کے کہا جا رہا ہے، اور سنایا جا رہا ہے دوسروں کو، یعنی اگر تم ایسی بے اختیار چیزوں کو جو نفع نقصان کا اختیار نہیں رکھتیں، اگر تم ان کو پکارو گے تو ظالموں میں سے ہو جاؤ گے، اور قرآنِ کریم میں یہ بھی ہے کہ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ (سورۂ لقمان) سب سے بڑھ کر ظلم تو شرک ہے، تو مشرک ہو جاؤ گے، اللہ کے حقوق تلف کرنے والے ہو جاؤ گے، ''ظلم'' حقوق کے تلف کرنے کو کہتے ہیں، اپنا نقصان کرنے والے ہو جاؤ گے، اس طریقے پر چلو گے تو اپنے آپ پہ ظلم کرو گے، اپنا نقصان کرو گے کسی کا کیا بگاڑو گے؟ فَاِنَّكَ اِذًا مِّنَ الظّٰلِمِیْنَ کے اندر یہ سارے مفہوم ہیں۔

یہ مَالَا یَنْفَعُكَ وَلَا یَضُرُّكَ تو غیر کے متعلق آ گیا کہ وہ نفع نقصان کا اختیار نہیں رکھتے، اب دوسرے پہلو کو واضح کیا جا رہا ہے کہ نفع ہو یا نقصان یہ اللہ ہی کے اختیار میں ہے، آتا بھی اسی کی طرف سے ہے اور جاتا بھی اسی کی طرف سے ہی ہے، تو یوں سمجھو کہ اسی مضمون کی دوسرے انداز میں وضاحت ہے، کہ اگر اللہ تعالیٰ تجھے کوئی تکلیف پہنچا دے تو اس کو اس کے علاوہ کوئی دوسرا ہٹانے والا نہیں، تکلیف آئے گی بھی اس کی طرف سے اور زائل بھی وہی کرے گا، یہ نہیں کہ اللہ تکلیف پہنچا دے اور کوئی دوسرا ہٹا دے، ایسا نہیں ہو سکتا، ''اگر اللہ تجھے کوئی نقصان پہنچا دے تکلیف پہنچا دے تو نہیں کوئی دُور ہٹانے والا اس کو مگر وہی، اور اگر وہ تجھے کوئی بھلائی پہنچا دے فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِهٖ: تو کوئی شخص اس کے فضل کو رَدّ کرنے والا نہیں، اللہ کسی کو فائدہ پہنچانا چاہے تو ساری مخلوق مل کے اس سے روک نہیں سکتی، اور اگر اللہ تعالیٰ کسی کو مصیبت میں مبتلا کر دے تو ساری مخلوق مل کے اس مصیبت سے چھڑا نہیں سکتی، یُصِیْبُ بِهٖ مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ: پہنچاتا ہے وہ فضل جس کو چاہتا ہے اپنے بندوں میں سے، اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا فضل پہنچاتا ہے، اور جس کو پہنچائے کوئی دوسرا روک نہیں سکتا ہے، وَهُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ: اور وہی بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی شانِ اِستغناء

اور لوگوں کے سامنے یہ بھی اعلان کر دیجیے یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ: اے لوگو! قَدْ جَآءَكُمُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ: تمہارے پاس تمہارے رَبّ کی طرف سے حق بات آ گئی، حق: واقع کے مطابق بات، سچی بات آ گئی، قرآنِ کریم کی شکل میں حق کا مجموعہ آ گیا، اس کو قرآنِ کریم کے اثبات کے لئے بھی آپ کہہ سکتے ہیں، فَمَنِ اهْتَدٰی: جو کوئی راہ پالے گا، اس حق کو قبول کر لے گا، سیدھے راستے پر آ جائے گا تو اس کا اپنا فائدہ ہے فَاِنَّمَا یَهْتَدِیْ لِنَفْسِهٖ: وہ اپنے ہی فائدے کے لئے کرے گا، اور جو کوئی بھٹک گیا، اور اس ہدایت سے فائدہ حاصل نہیں کرتا، راہ حاصل نہیں کرتا، تو اس کی ضلالت کا نقصان اسی پر پڑے گا، گمراہ ہونے کا نقصان اسی کو ہی ہوگا،

فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا: وہ اپنے ہی نقصان میں اور اپنے ہی ضرر میں بھٹکے گا، وَمَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِوَكِيْلٍ: میں تم پر کوئی متعین کیا ہوا نہیں ہوں، ذمہ دار ٹھہرایا ہوا نہیں ہوں کہ تمہاری ضلالت سے مجھے نقصان پہنچے، ایسی کوئی بات نہیں ہے، میں نے سمجھا دیا، تمہارے سامنے ہدایت واضح کردی، اگر سمجھو گے تو تمہارا فائدہ ہے اور نہیں سمجھو گے تو تمہارا نقصان ہے، تمہارے گمراہ رہنے سے میرا کوئی نقصان نہیں ہے، میں تم پر کوئی ذمہ دار ٹھہرایا ہوا نہیں ہوں۔

سَرورِ کائنات ﷺ کو تسلی

اور آخر میں سرورِ کائنات ﷺ کے لئے ایک قسم کی تسلی ہے کہ آپ کی طرف جو طریقہ آ گیا بس اسی کی آپ اتباع کیجئے، لوگ بہکانے کی کوشش کریں، بھٹکانے کی کوشش کریں آپ ان کی بات بالکل نہ مانیے، وَاصْبِرْ: صبر و استقلال سے رہیے، صبر کا معنی ہوا کرتا ہے کہ اس راستے میں مشکلات برداشت کرو، جو طریقہ آپ کو بتا دیا گیا ہے اسی طریقے کے اوپر جمے رہو، صبر کا مفہوم آپ بیان کیا کرتے ہیں: ''حَبْسُ النَّفْسِ عَلٰى مَا تَكْرَهُ'': نفس کے سامنے جو چیزیں ناگوار ہیں ان کے اوپر نفس کو پابند رکھنا، یعنی آپ کو اس راستے میں تکلیفیں پیش آئیں رکاوٹیں پیش آئیں، آپ اس پر مستقیم رہیے، سب تکلیفیں برداشت کیجیے، حَتّٰى يَحْكُمَ اللّٰهُ: یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ فیصلہ کردے، اللہ کا فیصلہ سامنے آ جائے گا تو پتا چل جائے گا کون گمراہ ہے اور کون صحیح راستے پر چلنے والا ہے، وَهُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ: وہ سب فیصلہ کرنے والوں میں سے بہترین فیصلہ کرنے والا ہے، گویا کہ توحید اور رسالت کا خلاصہ ان آخری آیات کے اندر بیان کردیا گیا، اور دینِ اسلام کو واضح طور پر ذکر کردیا گیا کہ اصل اس کا یہی ہے، توحید کو اختیار کیا جائے، شرک سے بچا جائے، نفع نقصان کا مالک اللہ کو سمجھا جائے اور مصیبت کا دور کرنے والا اسی کو سمجھا جائے، اور اللہ کی طرف سے جو فیصلہ آ جائے مخلوق میں کسی کو ہمت اور طاقت نہیں کہ اس فیصلے کو رد کر سکے، اس لیے ہر قسم کی نیازمندی اور عبادت کا تعلق اللہ تعالیٰ سے ہونا چاہیے، غیر اللہ کے ساتھ نہیں، بس یہ ہے اس دین کا خلاصہ جو اس سورت میں آپ کے سامنے پیش کیا گیا۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۝
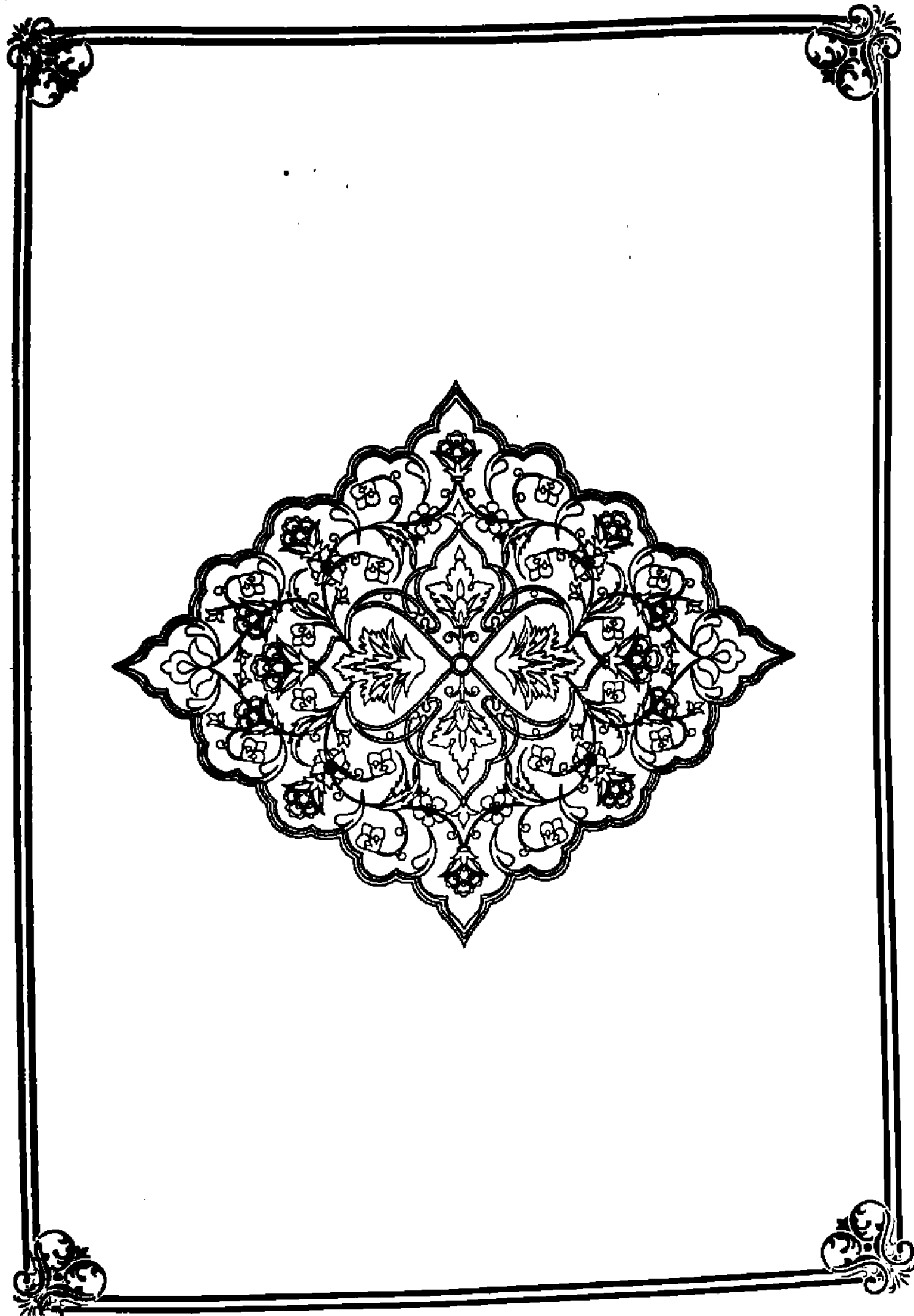
سورة هود

اٰيَاتُهَا ۱۲۳ ۱۱ سُوْرَةُ هُوْدٍ مَكِّيَّةٌ ۵۲ رُكُوْعَاتُهَا ۱۰

سورۂ ہود مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی ایک سو تئیس آیتیں ہیں، دس رُکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

الٓرٰ كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ ۝۱ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا

الٓرٰ۔ یہ کتاب ہے پختہ کی گئی ہیں اس کی آیتیں پھر تفصیل کی گئی ہیں حکمت والے خبر دینے والے کی طرف سے ① کہ تم اللہ کے علاوہ

اِلَّا اللّٰهَ ؕ اِنَّنِيْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ ۝۲ وَّاَنِ

کسی کی عبادت نہ کرو، بے شک میں تمہارے لیے اللہ کی طرف سے ڈرانے والا ہوں اور بشارت دینے والا ہوں ② اور یہ کہ تم

اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ يُمَتِّعْكُمْ مَّتَاعًا حَسَنًا اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى وَّيُؤْتِ كُلَّ

اِستغفار کرو اپنے رَبّ سے پھر اس کی طرف متوجہ رہو، اللہ تمہیں فائدہ پہنچائے گا اچھا فائدہ ایک وقت معین تک اور دے گا ہر

ذِيْ فَضْلٍ فَضْلَهٗ ؕ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ كَبِيْرٍ ۝۳ اِلَى اللّٰهِ

فضل والے کو اپنا فضل، اور اگر تم روگردانی کرو پس بیشک میں اندیشہ کرتا ہوں تم پر بڑے دِن کے عذاب کا ③ اللہ ہی کی طرف

مَرْجِعُكُمْ ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝۴ اَلَآ اِنَّهُمْ يَثْنُوْنَ صُدُوْرَهُمْ لِيَسْتَخْفُوْا

تم سب کا لوٹنا ہے اور وہ ہر چیز کے اوپر قدرت رکھنے والا ہے ④ خبردار! بیشک وہ لوگ موڑتے ہیں اپنے سینوں کو تا کہ اللہ تعالیٰ

مِنْهُ ؕ اَلَا حِيْنَ يَسْتَغْشُوْنَ ثِيَابَهُمْ ۙ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ

سے چھپ جائیں، خبردار! جس وقت وہ لپیٹتے ہیں اپنے اُوپر اپنے کپڑے جانتا ہے اللہ تعالیٰ ان باتوں کو جن کو وہ چھپاتے ہیں

وَمَا يُعْلِنُوْنَ ۚ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝۵

اور جن کو وہ ظاہر کرتے ہیں، بے شک وہ اللہ جاننے والا ہے دِلوں کی باتوں کو ⑤

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا

نہیں ہے کوئی چلنے پھرنے والی چیز زمین میں مگر اللہ کے ذِمّے ہے اس کی روزی، اور جانتا ہے اللہ اس کے مستقل ٹھکانے کو بھی

وَمُسْتَوْدَعَهَا ۚ كُلٌّ فِي كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ۞ وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ

اور عارضی ٹھکانے کو بھی، سب کچھ کتابِ مبین میں ہے ۞ اور اللہ وہ ہے جس نے پیدا کیا آسمانوں کو اور زمین کو چھ

اَيَّامٍ وَّكَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ۗ وَلَئِنْ قُلْتَ اِنَّكُمْ

دِن میں اور اس کا عرش پانی پر تھا تاکہ آزمائے تمہیں کہ تم میں سے کون اچھا عمل کرنے والا ہے، اور اگر آپ کہیں کہ بیشک تم لوگ

مَّبْعُوْثُوْنَ مِنْۢ بَعْدِ الْمَوْتِ لَيَقُوْلَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۞ وَلَئِنْ

اُٹھائے جاؤ گے موت کے بعد تو البتہ ضرور کہیں گے وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا نہیں ہے یہ مگر صریح جادو ۞ اور اگر

اَخَّرْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ اِلٰٓى اُمَّةٍ مَّعْدُوْدَةٍ لَّيَقُوْلُنَّ مَا يَحْبِسُهٗ ۗ اَلَا

ہم ان سے دُور ہٹادیں عذاب کو معلوم مدت تک تو البتہ ضرور کہیں گے وہ لوگ کون سی چیز اس عذاب کو روکے ہوئے ہے؟ خبردار! جس

يَوْمَ يَاْتِيْهِمْ لَيْسَ مَصْرُوْفًا عَنْهُمْ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۞

دِن وہ عذاب ان کے پاس آجائے گا وہ ان سے ہٹایا ہوا نہیں ہوگا اور گھیر لے گی ان کو وہ چیز جس کا یہ مذاق اُڑایا کرتے تھے ۞

خلاصہ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ الٓرٰ: یہ حروفِ مقطعات ہیں، اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِمُرَادِهٖ بِذٰلِكَ، اور بعض حضرات کے نزدیک یہ سورت کا نام ہوتا ہے، كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ: هٰذَا كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ "هٰذَا" مبتدا، "كِتٰبٌ" خبر، یہ کتاب ہے، اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ: پختہ کی گئی ہیں اس کی آیتیں، اُحْكِمَتْ اِحکام سے، پختہ کرنا۔ ثُمَّ فُصِّلَتْ: پھر تفصیل کی گئی ہیں، مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ: حکمت والے خبردار کی طرف سے۔هٰذَا كِتٰبٌ مِّنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ یوں بھی ترجمہ ہوسکتا ہے، کہ یہ کتاب حکمت والے خبردار کی طرف سے ہے، اور مِنْ لَّدُنْ کو اُحْكِمَتْ کے متعلق بھی کرسکتے ہیں کہ حکیم خبیر کی طرف سے اس کی آیات کو پختہ کیا گیا ہے، اور فُصِّلَتْ کے متعلق بھی کرسکتے ہیں کہ حکیم خبیر کی طرف سے اس کی آیات کی تفصیل کی گئی ہے۔ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ: اس کے شروع میں "اَنْ" تفسیر یہ ہے، اور فُصِّلَتْ کے اندر قول والا معنی ہے جس کی یہ تفسیر کررہا ہے، یعنی ان آیات میں کیا چیز کھول کھول کے بیان کی گئی، ان آیات کے ضمن میں کیا کہا گیا، تو "اَنْ" سے اُس کی تفسیر ہے اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ: یعنی ان باتوں میں اہم بات، سب سے بنیادی بات یہ ہے کہ تم اللہ کے علاوہ کسی کی عبادت نہ کرو۔ اور اگر لام کو مقدر کرلیا جائے تو بھی ترجمہ ہوسکتا ہے "لِاَنْ لَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ" یہ کتاب جس کی آیات کو پختہ کیا گیا، کھول کھول کے بیان کیا گیا، یہ حکیم خبیر کی طرف سے ہے تاکہ تم اللہ کے علاوہ کسی کی عبادت نہ کرو، اِنَّنِيْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ: بے شک میں تمہارے لیے اس اللہ کی طرف سے ڈرانے والا ہوں اور بشارت دینے والا ہوں، انذار اس ڈرانے کو

کہتے ہیں جو شفقت پر مشتمل ہوتا ہے جس طرح والدین اپنی اولاد کو کسی بری عادت کا برا نتیجہ ذکر کر کے ڈراتے ہیں کہ اس عادت کو چھوڑ دو، ورنہ نقصان اٹھاؤ گے، تو یہ ڈرانا شفقت کے معنی پر مشتمل ہے۔ وَّاَنِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ: اس کا عطف اَلَّا تَعْبُدُوْٓا کے اوپر ہوگیا، یہ ''اَنْ'' بھی اسی طرح سے تفسیر یہ ہوگا۔ اس کتاب میں یہ بات بھی کہی گئی ہے کہ تم استغفار کرو اپنے رب سے۔ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ: پھر اسی کی طرف تم متوجہ رہو۔ استغفار: مغفرت طلب کرنا، بخشش طلب کرنا۔ اور تُوْبُوْٓا توبہ سے ہے، رجوع کرنا ''اللہ کی طرف متوجہ رہو، اللہ کی طرف رجوع کرو۔'' توبہ اور استغفار کے درمیان فرق اس طرح سے کردیا جاتا ہے کہ زبان سے اپنی غلطی کا اقرار کر کر کے معافی مانگنا یہ تو ''استغفار'' ہے، اور دل کے اندر ندامت محسوس کرنا یہ توبہ ہے، تو توبہ و استغفار دونوں اس طرح سے ہیں جس طرح سے ایمان میں اقرار اور تصدیق بالقلب، زبان سے اقرار کیا جاتا ہے، دل سے تصدیق کی جاتی ہے، اسی طرح سے یہاں بھی دل نے ندامت کا اظہار ہوا اور زبان سے غلطی کا اعتراف کر کے معافی مانگی جائے تو توبہ اور استغفار کی حقیقت متحقق ہوگئی۔ یا یوں فرق کردیا گیا ہے کہ استغفار تو ہوگیا گزشتہ گناہ پر، جو غلطی ہوگئی اس پر اللہ کے سامنے معافی مانگو، اور تُوْبُوْٓا کا مطلب یہ ہوگا کہ آئندہ طاعت کے ساتھ اللہ کی طرف رجوع رکھو، کیونکہ گناہ کے معاف ہونے کے لئے یہ دو باتیں ہی ہوتی ہیں، ایک تو اپنی گزشتہ غلطی سے معافی مانگی جائے، اور آئندہ کے لئے یہ قصد کیا جائے کہ میں یہ غلطی نہیں کروں گا، جس وقت تک آئندہ کے لئے اس سے بچنے کا عزم نہ ہو اس وقت تک توبہ کی حقیقت متحقق نہیں ہوتی، اگر انسان کے دل میں یہی ہے کہ میں توبہ تو کر رہا ہوں استغفار تو کر رہا ہوں لیکن میں نے آئندہ یہ کام چھوڑنا تو ہے نہیں، پھر اسی طرح سے کروں گا، تو یہ کوئی توبہ نہیں ہے، اس کے اندر توبہ کی حقیقت نہیں پائی گئی، نہ یہ گناہ معاف ہونے کے لئے کافی ہے، آئندہ کے لئے عزم ہو کہ میں اللہ کی اطاعت کروں گا، نافرمانی نہیں کروں گا، اور پچھلے کے اوپر معافی مانگی جائے کہ مجھ سے غلطی ہوگئی مجھے معاف کردیا جائے، تو یہ دو پہلو ہوگئے، پچھلے پر ندامت کا اظہار اور زبان سے معافی، اور آئندہ کے لئے اللہ کی طرف متوجہ ہونا اللہ کی طاعت کے ساتھ، یہ دونوں باتیں پائی جائیں گی تو توبہ اور استغفار متحقق ہوگیا۔ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ: اس کی طرف متوجہ رہو، يُمَتِّعْكُمْ مَّتَاعًا حَسَنًا: یہ جواب امر کی بنا پر مجزوم ہے، یعنی اگر تم توبہ استغفار کرو گے تو اللہ تعالیٰ تمہیں فائدہ پہنچائے گا اچھا فائدہ وقت معین تک۔ مَّتَاعًا یہ يُمَتِّعْكُمْ کا مفعول مطلق ہوجائے گا يُمَتِّعْكُمْ تَمْتِيْعًا حَسَنًا، فائدہ پہنچائے گا تمہیں اچھا فائدہ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى: ایک وقت معین تک، وَّيُؤْتِ كُلَّ ذِيْ فَضْلٍ فَضْلَهٗ: فضل زیادتی کے معنی میں ہے۔ اور دے گا ہر زیادتی والے کو اس کی زیادتی، یعنی جو زیادہ عمل کرے گا اس کو زیادہ ثواب ملے گا، یا ''ہر زیادتی والے کو اپنا فضل دے گا'' مفہوم پھر بھی وہی ہے، ہٗ ضمیر كُلَّ ذِيْ فَضْلٍ کی طرف لوٹا دو، یا اللہ کی طرف لوٹا دو ''دے گا ہر فضل والے کو اپنا فضل'' یعنی جو عبادت میں زیادتی اختیار کرے گا اللہ تعالیٰ اسے اپنا فضل دے گا، وَاِنْ تَوَلَّوْا: اور اگر تم نے پیٹھ پھیری، روگردانی کرو، فَاِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ كَبِيْرٍ: پس بیشک میں اندیشہ کرتا ہوں تم پر بڑے دن کے عذاب کا، اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ: اللہ ہی کی طرف تم سب کا لوٹنا ہے۔ مرجع مصدر میمی ہے۔ وَهُوَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ: اور وہ ہر چیز کے اوپر قدرت رکھنے والا ہے۔ اَلَآ: حرف تنبیہ ہے۔ خبردار! توجہ سے سن لو! حضرت شیخ (الہندؒ) اسی محاورے کے مطابق ترجمہ کرتے ہیں ''سنتا ہے''، یہ اسی پر تنبیہ کرنا مقصود ہے، کہ

سنو، ذرا توجہ سے سنو، سنتے ہو میری بات؟ خبردار! اِنَّهُمْ يَثْنُوْنَ صُدُوْرَهُمْ: ثَنَا يَثْنِيْ: موڑنا۔ بے شک وہ لوگ موڑتے ہیں، دُوہرا کرتے ہیں اپنے سینوں کو، لِيَسْتَخْفُوْا مِنْهُ: تا کہ اللہ تعالیٰ سے چھپ جائیں، اَلَا حِيْنَ يَسْتَغْشُوْنَ ثِيَابَهُمْ: خبردار! جس وقت وہ لپیٹتے ہیں اپنے اوپر اپنے کپڑے يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ: جانتا ہے اللہ تعالیٰ ان باتوں کو جن کو وہ چھپاتے ہیں اور جن کو وہ ظاہر کرتے ہیں، اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ: بے شک وہ اللہ جاننے والا ہے دلوں کی باتوں کو۔ صدور، صدر کی جمع ہے اور سینہ بول کر مراد دِل ہوتا ہے، سینے کا راز، دِل کا بھید دونوں کا مصداق ایک ہی ہے باقوالِ ذاتِ الصدور، یا بامورِ ذاتِ الصدور اللہ تعالیٰ جانتا ہے دلوں کی باتوں کو۔

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا: نہیں ہے کوئی دابہ زمین میں۔ دابہ: چلنے پھرنے والی چیز۔ دَبَّ يَدِبُّ سے ہے۔ نہیں ہے کوئی چیز چلنے پھرنے والی زمین میں، اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا: علیٰ وجوب کے لئے ہوتا ہے۔ مگر اللہ کے ذِمّے ہے اس کی روزی، یعنی اللہ تعالیٰ نے فضل ومہربانی کے ساتھ اپنے ذِمّے لگا رکھی ہے جس طرح سے کسی کے ذِمّے کوئی حق لگ جاتا ہے۔ وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا: اور جانتا ہے اللہ اس دابہ کے مستقر کو اور مستودع کو۔ مستقر: ٹھہرنے کی جگہ۔ مستودَع: ودیعت رکھے جانے کی جگہ۔ مستقر سے مراد دنیوی زندگی، جہاں دنیا میں انسان اپنا وقت گزارتا ہے۔ مستودع سے مراد برزخ کی زندگی، قبر میں جہاں جا کے ٹھہرے گا۔ یا مستقر سے مراد رحم مادر اور مستودع سے مراد باپ کی پشت۔ یا مستقر سے مراد ہے جہاں انسان مستقل ٹھکانا رکھتا ہے، اور مستودع سے مراد ہے جہاں عارضی طور پر ٹھہرتا ہے۔ بہر حال اس میں علم کا احاطہ ذکر کرنا مقصود ہے کہ وہ دابہ کہیں بھی ٹھہرا ہوا ہو تھوڑی دیر کے لئے ٹھہرا ہوا ہو، زیادہ دیر کے لئے ٹھہرا ہوا ہو، باپ کی پشت میں ہو، ماں کے رحم میں ہو، زمین کے اوپر ہو، زمین کے اندر ہو، اللہ تعالیٰ ہر چیز کو جانتا ہے، مستقر کو بھی جانتا ہے، مستودع کو بھی جانتا ہے۔ كُلٌّ فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ: ہر ایک کتابِ مبین میں ہے، سب کچھ کتابِ مبین میں ہے۔ وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ: اور اللہ وہ ہے جس نے پیدا کیا آسمانوں کو اور زمین کو چھ دِن میں، وَّكَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ: اور اس کا عرش پانی پر تھا، لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا: تا کہ آزمائے تمہیں کہ تم میں سے کون اچھا عمل کرنے والا ہے، کون اَحسن ہے از روئے عمل کے، وَلَئِنْ قُلْتَ اِنَّكُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ: اور اگر آپ کہیں کہ بیشک تم لوگ اُٹھائے جاؤ گے مِنْۢ بَعْدِ الْمَوْتِ: موت کے بعد، لَيَقُوْلَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا: البتہ ضرور کہیں گے وہ لوگ جنہوں نے کُفر کیا، اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ: نہیں ہے یہ مگر صریح جادو۔ هٰذَآ کا اشارہ اس کتاب کی طرف ہے جس میں باتیں مذکور ہیں، یہ تو صریح جادو ہے، یا آپ کی باتوں کو وہ کہتے ہیں کہ یہ باتیں صریح جادو ہیں، یعنی جس طرح سے جادو میں حقیقت نہیں ہوتی صرف اس میں ایک اثر سا پیدا ہو جاتا ہے تو وہ بھی آپ کی باتوں کو بے حقیقت سمجھتے ہیں، لیکن چونکہ وہ باتیں اثر انداز ہوتی ہیں اس لیے کہتے ہیں کہ ان میں جادو جیسا اثر ہے۔ وَلَئِنْ اَخَّرْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ: اور اگر ہم ان سے دُور ہٹا دیں عذاب کو، اِلٰٓى اُمَّةٍ مَّعْدُوْدَةٍ: امۃ سے مدّت مراد ہے یعنی جماعۃٌ مِنَ الاوقاتِ، وقت کا ایک حصہ۔ معدودہ: شمار کیا ہوا، یعنی تھوڑی سی، جو شمار کی ہوئی مدّت ہوتی ہے وہ معلوم ہوتی ہے اس لیے معدودہ کا ترجمہ معلومۃ کے ساتھ کر دیا گیا ہے۔ اگر ہم کچھ دنوں تک جو گنے ہوئے ہیں، کچھ مدّت تک جو

کہ معلوم ہے اس عذاب کو ان سے مؤخر کردیں، لَیَقُوْلُنَّ: البتہ ضرور کہیں گے یہی لوگ۔ پیچھے لَیَقُوْلَنَّ واحد کا صیغہ آیا تھا، چونکہ الَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا فاعل ظاہر تھا، جس وقت فاعل ظاہر ہو چاہے جمع ہو فعل کا صیغہ مفرد آیا کرتا ہے، اور لَیَقُوْلُنَّ میں فاعل ضمیر ہے، اس لیے صیغہ جمع کا آگیا۔ البتہ ضرور کہیں گے وہ لوگ مَا یَحْبِسُہٗ: کونسی چیز اس عذاب کو روکے ہوئے ہے؟ حَبَسَ یَحْبِسُ: روکنا۔ کون سی چیز روکتی ہے اس عذاب کو؟ اَلَا یَوْمَ یَاْتِیْہِمْ: خبردار! جس دن وہ عذاب ان کے پاس آجائے گا، لَیْسَ مَصْرُوْفًا عَنْہُمْ: وہ ان سے ہٹایا ہوا نہیں ہوگا، وَحَاقَ بِہِمْ مَّا کَانُوْا بِہٖ یَسْتَہْزِءُوْنَ: جس چیز کے ساتھ یہ استہزا کرتے تھے وہ چیز ان کو گھیر لے گی۔ مراد وہی عذاب ہے۔ گھیر لے گی ان کو وہ چیز جس کا یہ مذاق اُڑایا کرتے تھے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

تفسیر

ماقبل سورت سے ربط

سورۂ ہود سورۂ یونس کی طرح مکی ہے، اور مکی سورتوں کے متعلق آپ کی خدمت میں بارہا عرض کردیا گیا کہ ان میں زیادہ تر اُصول کا ذکر ہے، احکام ان میں برائے نام ہیں، چونکہ اس وقت لوگوں کو عقائد سکھائے جاتے تھے، عقائد کی تصحیح کی جاتی تھی، تو ان کے اندر زیادہ تر عقیدے ہی مذکور ہیں، اور ان عقیدوں میں بنیادی عقیدہ توحید کا ہے، رسالت کا ہے، معاد کا ہے، اور ان سب چیزوں کی تعلیم چونکہ قرآن کریم دیتا ہے تو قرآنِ کریم کی حقانیت کو بھی ان سورتوں کے اندر مختلف انداز سے واضح کیا گیا، اس کی عظمت بیان کی گئی، اور پھر ترغیب وترہیب کے مضمون بھی ہیں، آخرت کے عذاب اور آخرت کی بشارت کے ساتھ، جنت دوزخ کے تذکرے کے ساتھ آخرت کی ترغیب وترہیب بھی کی گئی ہے، دنیوی ترہیب بھی ہے دنیا کے عذابوں کے ساتھ، اور ترغیب بھی ہے دنیا کی کامیابی ذکر کرکے۔ سورۂ یونس کے مقابلے میں اس سورت میں امم سابقہ کے واقعات بہت تفصیل کے ساتھ ذکر کیے گئے ہیں، سورۂ یونس میں ذکر اجمالی تھا، حضرت نوح علیہ السلام کا کچھ مختصر سا ذکر کردیا گیا تھا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کا کچھ تھوڑا سا مفصل ذکر تھا، اور باقیوں کا حوالہ سا دے دیا گیا تھا کہ ایسے ایسے واقعات پیش آئے ہیں، اور اس سورت کے اندر تفصیل ہے۔

”مجھے سورۂ ہود نے بوڑھا کردیا!“

چونکہ پہلی اُمتوں کی ہلاکت اس میں بہت ذکر کی گئی ہے اسی لیے حدیث شریف میں آتا ہے کہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی ریش مبارک میں جس وقت چند ایک بال سفید نمایاں ہوئے تو بعض صحابہ نے عرض کیا کہ ”یارسول اللہ! قَدْ شِبْتَ“ آپ تو بوڑھے ہوگئے! تو آپ نے فرمایا کہ ”شَیَّبَتْنِیْ سُوْرَۃُ ھُوْدٍ“ ”مجھے سورۂ ہود نے بوڑھا کردیا“[1] تو سورۂ ہود کی طرف جو نسبت کی اس کی وجہ یہی ہے کہ اُمتوں کی ہلاکت کا ذکر چونکہ اس میں بہت آیا تھا تو سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی اُمت کی فکر رہتی تھی، اپنی اُمت کا غم تھا کہ

(۱) مشکوٰۃ ج۲ ص۴۵۸ باب البکاء فصل ثانی، واللفظ لہ/ ترمذی ۱۶۵/۲، ابواب التفسیر، باب سورۃ الواقعۃ۔

کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ بھی نافرمانی میں مبتلا ہو جائے اور ان پر بھی ایسا ہی عذاب آجائے جس قسم کا عذاب پہلی اُمتوں پر آیا تھا، تو اس فکر نے رسول اللہ ﷺ پر ضعف کو طاری کر دیا، کیونکہ ضعف اور کمزوری جتنی غم اور فکر کے ساتھ آیا کرتی ہے اتنی کسی دوسری چیز سے نہیں آتی، تو اس سورت کے اندر واقعات بہت تفصیل کے ساتھ آئیں گے۔

قرآنِ کریم کا ہر حیثیت سے محکم ہونا

یہ ابتدائی آیات جو آپ کے سامنے پڑھی گئی ہیں ان کے اندر وہی بنیادی چیزیں ہیں، سب سے پہلے تو قرآن کریم کی عظمت کو ذکر کر دیا اور قرآنِ کریم کی عظمت اگر ذہن کے اندر آجائے اور انسان کو سمجھ میں آجائے کہ واقعی یہ اللہ کی کتاب ہے تو پھر ہر چیز اس کی سمجھ میں آسکتی ہے، اگلے رکوع کے اندر اُسی طرح سے چیلنج دیا جائے گا جس طرح سے سورہ یونس کے اندر بھی آیا تھا، کہ اگر قرآنِ کریم کے بارے میں تمہیں شک ہے کہ یہ اللہ کی کتاب نہیں تو پھر تم اس جیسی دس سورتیں بنا کے لے آؤ، پوری کتاب نہیں لا سکتے دس سورتیں لے آؤ، اور سورہ بقرہ میں آیا تھا کہ دس سورتیں نہیں تو ایک ہی سورت بنا کے لے آؤ، اور کہہ دیا گیا تھا کہ تم ہرگز ایسا نہیں کر سکتے، تو قرآنِ کریم کو اگر اللہ تعالیٰ کی کلام سمجھ لیا جائے کہ یہ اللہ کی طرف سے اتری ہوئی ہے تو پھر توحید رسالت معاد یا جو کچھ اس میں ذکر کیا گیا ہے اس کا قبول کرنا آسان ہو جائے گا، اس لیے سب سے پہلے تو اس کی عظمت مذکور ہے۔ ''اس کی آیات کو محکم کیا گیا ہے، پختہ کیا گیا ہے'' پختہ لفظی حیثیت میں بھی ہیں کہ فصاحت بلاغت کے پورے معیار پر ہیں، ان میں کسی قسم کا لفظی طور پر خلل نہیں، معنوی حیثیت بھی ان میں مضبوط ہے کہ معنی میں کسی قسم کا فساد نہیں، واقعات کی حیثیت سے بھی مضبوط ہے کہ واقعات بالکل سچے پکے ہیں، کوئی واقعہ خلافِ حقیقت نہیں، اس میں کوئی کذب شامل نہیں، اس کے احکام بھی پختہ ہیں کہ منسوخ نہیں ہوں گے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ محکم ہو گئے، اور جچے تلے ہیں، عدل وانصاف پر مبنی ہیں کوئی کسی قسم کی کمزوری ان میں نہیں، تو ہر حیثیت سے یہ کتاب محکم ہے۔ پھر عام طور پر جو کلام محکم ہوگی اس میں پیچیدگی آجاتی ہے، سمجھنا آسان نہیں ہوتا، لیکن یہ اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے کہ محکم ہونے کے ساتھ ساتھ مفصل بھی ہے، بہت کھلی کھلی باتیں ہیں جن کا سمجھنا بھی آسان ہے۔ اور حکیم وخبیر کی طرف سے ہے، اس کا اِحکام بھی حکیم خبیر کی طرف سے، اس کی تفصیل بھی حکیم خبیر کی طرف سے ہے، اور اگر یوں کہہ دیا جائے کہ یہ کتاب حکیم خبیر کی طرف سے ہے تو بھی بات اپنی جگہ ٹھیک ہے، وہ حکمت والا ہے اس لیے اس کی کتاب پُر حکمت ہے، خبردار ہے اس لیے اس میں معلومات جتنی دی گئی ہیں وہ سب کی سب صحیح معلومات ہیں جن کے اندر کوئی کسی قسم کا خلل نہیں۔

قرآنِ کریم کا بڑا مقصد

اور کتاب کے مقاصد میں سے بڑا مقصد توحید کی تعلیم ہے، یہ کہہ دیا گیا کہ اللہ کے علاوہ کسی دوسرے کی عبادت نہ کرو، اس کتاب کے اندر یہ بات کہی گئی ہے، تو فُصِّلَتْ کے اندر جو قول والا معنی ہے یہ اَنْ اس کی تفصیل ہے، مقاصد میں سے بڑا مقصد ہے کہ اللہ کے علاوہ کسی دوسری چیز کی عبادت نہ کرو، مخلوق سے توڑ کے خالق سے ملانے کے لئے گویا کہ یہ کتاب اتاری گئی ہے۔ اور

آگے سرورِ کائنات ﷺ کی رسالت کا ذکر آ گیا کہ جب کتاب آپ پر اتاری گئی تو آپ اللہ کے رسول ہیں، آپ کی حیثیت نذیر وبشیر کی ہے، بُرے انجام سے تمہیں ڈراتے ہیں، اچھے انجام کی خوشخبری دیتے ہیں۔

توبہ اور اِستغفار کی اہمیت

اور کتاب کے مقاصد میں سے یہ بھی ہے کہ تم اپنی غلطیوں کی تلافی کرو اور آئندہ کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف عبادت کے ساتھ متوجہ رہو، پہلے جو کچھ ہو گیا اس سے استغفار کرو، آئندہ کے لئے اللہ کی طاعت کرتے ہوئے اللہ کی طرف متوجہ رہو۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ دُنیا کے اندر اللہ تعالیٰ خیریت اور عافیت کی زندگی دے گا۔ متاعِ حسن: جس میں کوئی ابتلاء کا پہلو نہ ہو۔ کافر کو بھی دُنیا میں دولت ملتی ہے، صحت ملتی ہے، کھاتا پیتا ہے لیکن اس کو متاعِ حسن نہیں کہہ سکتے، وہ اس کے لئے عذاب ہے، آج کا کھایا ہوا کل کو ناک کے راستے نکلے گا، اور آئے دن جو اس کو عیش اور عشرت ملتی ہے وہ اس کے لئے عذاب کے اضافے کا باعث بنتی ہے، لیکن توبہ اِستغفار کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ اگر دنیا میں راحت دیں گے تو یہ متاعِ حسن کا مصداق ہے، جس کا انجام برا نہیں نکلے گا، جس طرح سے قرآنِ کریم میں آیا ہے: فَلَنُحْیِیَنَّهٗ حَیٰوةً طَیِّبَةً (سورۂ نحل: ۹۷) کہ ہم ان کو پاکیزہ زندگی دیں گے تو پاکیزہ زندگی یہاں بھی پُرسکون، امن اور اطمینان کو لیے ہوئے، اور اس کا انجام آخرت میں بھی اچھا، تو اس لیے اس کو متاعِ حسن کے ساتھ تعبیر کیا، ورنہ موت تک کافر بھی کھاتا پیتا ہے، دنیا میں عیش کرتا ہے لیکن اس کی عیش وعشرت کو متاعِ حسن کے ساتھ تعبیر نہیں کیا جا سکتا، وہ پُرخطر ہے، ظاہری طور پر وہ اگرچہ اس کے لئے عیش ہے لیکن حقیقت کے اعتبار سے عذاب ہے۔ وَّیُؤْتِ كُلَّ ذِیْ فَضْلٍ فَضْلَهٗ: اور ہر فضل والے کو اللہ اپنا فضل دے گا، یعنی جو عبادت زیادہ کرے گا اللہ اسے اتنا ہی زیادہ ثواب عطا فرمائیں گے، یہ بھی ایمان اور توبہ استغفار کے نتیجے میں ہوگا، کیونکہ اگر کُفر وشرک سے کوئی شخص توبہ نہیں کرتا، استغفار نہیں کرتا، ایمان نہیں لاتا تو اس کی عملی زندگی کا اللہ تعالیٰ کے ہاں کوئی اعتبار نہیں، کتنے ہی اچھے عمل کرتا جائے اللہ تعالیٰ اس کے اوپر ثواب نہیں دیں گے، حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ (سورۂ بقرہ: ۲۱۷ وغیرہ) ان لوگوں کے اعمال ضائع ہیں، عملی زندگی کے اوپر ثواب کا مرتب ہونا یہ بھی کُفر وشرک سے توبہ اور اِستغفار کے نتیجے میں ہی ہوتا ہے، ایمان لاؤ گے، توبہ اور اِستغفار کرو گے پھر جتنا کام کرو گے اللہ تعالیٰ اتنا ہی زیادہ ثواب دیتے چلے جائیں گے۔ ''اور اگر تم پیٹھ پھیرو'' یعنی غیر اللہ کی عبادت نہ چھوڑو اور اسی طرح سے توبہ اور استغفار نہ کرو پھر اس میں میرا کوئی نقصان نہیں، میں تمہیں آگاہ کرتا ہوں فَاِنِّیْۤ اَخَافُ عَلَیْكُمْ عَذَابَ یَوْمٍ كَبِیْرٍ، جس میں اشارہ اس بات کی طرف کر دیا کہ اِنْ تَوَلَّوْا تُعَذَّبُوْا، اگر تم پیٹھ پھیرو گے تو عذاب میں مبتلا ہو جاؤ گے، بے شک میں اندیشہ کرتا ہوں تمہارے اوپر بڑے دِن کے عذاب کا، بڑے دن سے وہی قیامت کا دن مراد ہے، اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ: تم چھوٹ نہیں سکتے۔

اللہ تعالیٰ کی قدرت اور علمی اِحاطے کا ذِکر اور اس کا مقصد

یعنی ایک آدمی اگر جرم کرتا ہے تو اس کے بچنے کی دو ہی صورتیں ہیں، یا تو حاکم کو پتا نہیں کہ اس نے کوئی جرم کیا ہے، یا پتا تو

ہے لیکن مجرم کہیں بھاگ کر چھپ چھپا سکتا ہے، اور حاکم اس کو پکڑنے پر قادر نہیں، یا جو سزا اس نے اپنے قانون کے اندر متعین کر رکھی ہے اس میں مختلف قسم کی رکاوٹیں ہیں وہ سزا جاری نہیں کر سکتا، ایسا بھی ہوتا ہے کہ قانون کے اندر سزا لکھی ہوئی ہے لیکن مجرم زور آور ہے اور حاکم اس کو سزا دینے پر قادر نہیں، یا وہ پکڑا نہیں جا سکتا، کہیں بھاگ گیا چھپ گیا، یا اس کے جرم کی تفصیل حاکم کے سامنے نہیں، یہی باتیں ہوتی ہیں جن کی بنا پر کوئی مجرم کسی سزا سے بچ سکتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کا مجرم ان سب باتوں میں سے کسی بات کے ذریعے سے نہیں بچ سکتا، نہ تو ایسا ہے کہ وہ پکڑا نہ جائے اِلَی اللّٰہِ مَرْجِعُکُمْ، نہ تو ایسی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو قانون بنا دیا اس کے مطابق سزا نہیں دے سکتا وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ، اور نہ کوئی ایسی بات ہے کہ مجرم کے جرم کی تفصیل معلوم نہیں، اس لیے آگے علمی احاطہ ذکر کیا ہوا ہے کہ یہ لوگ اگرچہ کتنے ہی جھک جھک کے، سینے موڑ موڑ کے، اپنے اوپر کپڑے کے پردے کر کر کے اسلام کے خلاف اور اللہ کے رسول کے خلاف باتیں کریں لیکن اللہ سب جانتا ہے، یہ اگرچہ کسی خاص واقعہ کی طرف اشارہ ہے جو اس موقع پر ہوگا جیسے منافقین کی عادت تھی کہ ایک دوسرے کے ساتھ سرگوشی کرتے تھے، مسلمانوں کے خلاف کوئی بات کرنی ہوتی، اللہ کے رسول کے خلاف کوئی بات کرنی ہوتی تو جیسے پردے کے ساتھ انسان یوں جھک کے ایک دوسرے کے کان میں لگ کے بات کرتا ہے منافق اس طرح کرتے تھے، تو اگرچہ ان کا مقصد اللہ سے چھپانا نہیں لیکن اللہ کے رسول کے خلاف سازشیں کرنا یہ تبھی ممکن ہے جبکہ وہ سمجھیں کہ اللہ اطلاع نہیں دے گا، یا اللہ کو ہماری سازشوں کا پتا نہیں ہے، ورنہ اگر ان کا خیال یہ ہو کہ اللہ کو سب پتا ہے اور اللہ اپنے رسول کو اطلاع دیتا ہے تو پھر اس طرح سے چھپ چھپ کر باتیں کرنے کی کیا ضرورت ہے، پھر تو جو بات علی الاعلان نہ کر سکیں وہ چھپ کر بھی نہیں کر سکیں گے، جب ان کو پتا ہے کہ اللہ کے علم میں ہے اور اللہ اطلاع دے دے گا۔ تو یہ ایک ان کی ایک حالت کے اوپر انکار ہے، اور اس انکار کے ضمن میں اللہ تعالیٰ کے علمی احاطہ کو ذکر کیا جا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا علم اس طرح سے محیط ہے۔

''خبردار! بے شک وہ لوگ موڑتے ہیں اپنے سینوں کو اور اوڑھتے ہیں اپنے اوپر کپڑے'' یہ بات مقابلۃً سمجھ میں آئے گی جیسے آگے الفاظ آ رہے ہیں، سینوں کو موڑ موڑ کے، کپڑے اوڑھ اوڑھ کے باتیں کرتے ہیں لِیَسْتَخْفُوْا مِنْہُ: تاکہ اللہ سے چھپ جائیں۔

''خبردار! جس وقت وہ اپنے اوپر کپڑے اوڑھتے ہیں اور سینے موڑتے ہیں'' یہاں وہ مفہوم ساتھ ذکر کیا جائے گا۔ ''جس وقت کپڑوں میں چھپتے ہیں، کپڑے اپنے اوپر ڈالتے ہیں، کپڑے اوڑھتے ہیں اور سینے موڑتے ہیں، جانتا ہے اللہ تعالیٰ اس چیز کو جس کو یہ چھپاتے ہیں اور جس چیز کو یہ ظاہر کرتے ہیں'' تو ایسے وقت بھی اللہ تعالیٰ جانتا ہے، اسی طرح سے یہ اللہ تعالیٰ سے کوئی باتیں چھپا نہیں سکتے، ''وہ تو جاننے والا ہے سینوں کی باتوں کو بھی'' جو کہی نہیں، جو زبان پر نہیں آئیں، جو دل کے اندر خیالات گزرتے ہیں اللہ تعالیٰ تو ان کو بھی جانتا ہے، تو پھر اگر تم پردے کر کر کے جھک جھک کے ایک دوسرے کے کانوں سے لگ کے باتیں کرو گے اس کا پتا کیسے نہیں چلے گا؟ وہ تو دل کی اور سینے کی باتوں کو جاننے والا ہے۔

رزق جتنا مقدر ہے اتنا ہی ملتا ہے اور ضرور ملتا ہے

اگلی آیت بھی اللہ تعالیٰ کے علمی احاطے پر بھی دلالت کرتی ہے اور اس میں اللہ تعالیٰ کا ایک بہت بڑا احسان بھی مذکور ہے،

کہ دُنیا کے اندر رہتے ہوئے سب سے زیادہ فکر انسان کو اپنی روزی کی ہی ہے، اپنے پیٹ کی فکر سب سے زیادہ ہے، اور بسا اوقات انسان غلط راستہ اسی پیٹ کی وجہ سے ہی اختیار کرتا ہے، کہ آخر کھائیں گے کہاں سے؟ یہ ایک بہت بڑا سوال ہے جو انسانی زندگی میں آتا ہے اور اسی کھانے کے لئے ہی انسان مختلف قسم کے راستے اختیار کر لیتا ہے، تو اللہ تعالیٰ اسی بارے میں سب سے زیادہ اطمینان دلاتا ہے، دنیا میں رہتے ہوئے دو ہی چیزیں جو اصل کے اعتبار سے انسان کو فکرمند کرتی ہیں، ایک زندگی، کہ موت سے بچنے کے لئے انسان ہزار جتن کرتا ہے، اور دوسرا روزی کمانے کے لئے، اور اللہ تعالیٰ نے ان دونوں باتوں کو اپنی کتاب میں کھول کے بیان کیا، کہ نہ تو کوئی شخص موت سے بچ سکتا ہے چاہے کتنے ہی جتن کر لے، اَیْنَ مَا تَكُوْنُوْا یُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنْتُمْ فِیْ بُرُوْجٍ مُّشَیَّدَةٍ (سورۂ نساء:۷۸) جہاں بھی تم ہو گے موت تمہیں پا لے گی اگرچہ تم کتنے ہی مضبوط قلعوں میں چلے جاؤ، قلعوں کے اندر چھپ کے بھی تم موت سے نہیں بچ سکتے، اور یہ واقعہ ہے کہ جس طرح سے جھونپڑیوں سے جنازے اٹھتے ہیں قلعوں سے بھی نکلتے ہیں، جس طرح سے فقیروں کی کٹیوں سے جنازے نکلتے ہیں بادشاہوں کے محلات سے بھی نکلتے ہیں، تو جس طرح سے موت یقینی ہے اور براہِ راست اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے آتی ہے، نہ کوئی شخص اس کا فوجوں سے دفاع کر سکتا ہے نہ خزانوں سے دفاع کر سکتا ہے، نہ کسی فن اور ہنر سے دفاع کر سکتا ہے، نہ مضبوط سے مضبوط تر عمارتوں کے ذریعے سے دفاع کر سکتا ہے، یہ بہرحال اپنے وقت پہ آتی ہے، اسی طرح سے اللہ فرماتے ہیں کہ رزق جو مقدر ہے اتنا ہی ملے گا اس میں کوئی کمی بیشی نہیں ہوتی، ''اِنَّ نَفْسًا لَنْ تَمُوْتَ حَتّٰى تَسْتَكْمِلَ رِزْقَهَا''[1] کسی نفس کو موت آتی ہی نہیں جب تک کہ وہ اپنا رزقِ مقدر پورا نہ کر لے، رزقِ مقدر اس کو ملتا ہے، ہر حال میں ملتا ہے۔ تو یہ دو ہی باتیں ہیں جس کا انسان سب سے زیادہ فکر کرتا ہے اور دونوں کے متعلق ہی اللہ تبارک وتعالیٰ نے قطعی فیصلہ اپنی کتاب کے اندر سنا دیا، لیکن یقین نہ ہونے کی وجہ سے انسان پھر پریشان رہتا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ''کوئی دابہ نہیں زمین میں'' جو پانی میں ہیں وہ بھی ایک قسم کے زمین پر ہیں، اور جو ہوا میں اڑتے ہیں آخرکار ان کا قرار بھی زمین پر ہی ہے، پرندے ہوں، چیونٹیاں ہوں، دریاؤں کے اندر مچھلیاں ہوں یا اور ہزاروں قسم کے جانور ہوں، خشکی کے اوپر چلنے والے حیوانات ہیں، درندے ہیں، چرندے ہیں، اور انسان ہے، یہ سب دابہ کا مصداق ہیں، ''کوئی دابہ نہیں زمین میں مگر اللہ کے ذمے ہے اس کی روزی'' روزی سے مراد اس کی ضروریات کا پورا کرنا، اس کی روزی اللہ کے ذمے ہے اور اللہ نے اپنے ذمے لے رکھی ہے، اس لیے جتنی روزی اللہ نے ذمے لے لی جس کے لئے لے لی اتنی ہی اس کو ملے گی اور ضرور ملے گی، ایسا نہیں ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے جتنا رزق اس کے لئے مقدر کیا ہے وہ نہ ملے یا انسان اپنی کوشش کے ساتھ اس سے زیادہ کما لے، ایسی بات نہیں ہے۔ ''اللہ اس کے مستقر کو بھی جانتا ہے مستودع کو بھی جانتا ہے'' جو حیوان جہاں کہیں ٹھہرتا ہے عارضی طور پر یا مستقل طور پر اللہ تعالیٰ کے سامنے سب کچھ ہے، كُلٌّ فِیْ كِتٰبٍ مُّبِیْنٍ: اور ہر چیز کتابِ مبین میں بھی لکھی ہوئی ہے، اللہ تعالیٰ کے دفتر میں بھی ضبط ہے۔

---

(۱) مشکوٰۃ ۲/ ۴۵۲ باب التوکل، فصل ثانی، عن ابن مسعود/ مسند الشهاب القضاعی ج ۲ ص ۱۸۵، مطبوعہ بیروت۔

جن ذرائع سے رِزق حاصل کیا جاتا ہے وہ سب اللہ کے عطا کردہ ہیں

اب آگے اللہ تعالیٰ کے روزی دینے کے طریقے مختلف ہیں کہ اپنے اس وعدے کو اللہ تعالیٰ وفاء کس طرح سے کرتا ہے؟ بس یہی نکتہ سمجھنے کا ہے، کسی کو تو اللہ تعالیٰ نے روزی دی اور اپنے اس وعدے کو پورا کرلیا، کہ اس کو زمین دے دی کہ لو، اس کے اوپر محنت کرو، اور اس میں سے نکالو اور کھاؤ، کسی کو اللہ تعالیٰ نے دکان دے دی کہ اس میں بیٹھو، تجارت کرو اور کھاؤ، کسی کو اللہ تعالیٰ نے صنعت دے دی کہ دستکاری اور صنعت کے ذریعے سے کماتے رہو کھاتے رہو، یہ مختلف انداز ہیں، کسی کو کسی جگہ ملازمت دے دی اور اس ملازمت کے عوض اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف رزق حاصل ہوتا ہے، کیونکہ کام سارے کے سارے جتنے بھی انسان کرتا ہے اس میں جو کچھ استعمال ہوتا ہے وہ سب اللہ کی طرف سے دیا ہوا ہے۔ ایک آدمی کسی انداز سے کمائے چاہے وہ کاشت کاری کے ذریعے سے کمائے، چاہے تجارت کے ذریعے سے کمائے، چاہے صنعت سے کمائے، چاہے ملازمت سے کمائے، کمانے کے جو ذرائع ہیں وہ سب اللہ کے دیے ہوئے ہیں، کمانے میں آپ اپنی آنکھوں کو استعمال کریں گے، بعض کام ایسے ہیں کہ اگر آنکھ نہ ہوتی تو انسان وہ کام نہ کرسکتا، ٹانگوں کو استعمال کریں گے کہ بعض کام ایسے ہیں کہ اگر ٹانگیں نہ ہوتیں تو آپ وہ کام نہیں کرسکتے، ہاتھوں سے کمائیں گے بعض کام ایسے ہیں کہ اگر ہاتھ نہ ہوتے تو آپ کما نہ سکتے، زبان سے کمائیں گے کہ بعض کام ایسے ہیں کہ اگر زبان بولنے کے لئے نہ ہوتی تو آپ نہ کما سکتے، اور عقل کے ذریعے سے کمائیں گے کہ اگر دماغ میں عقل نہ ہو اور اللہ تعالیٰ پاگل کردے عقل چھین لے تو سب کچھ ہی بے کار ہے پھر انسان کمائی نہیں کرسکتا، تو کمانے کے لئے ہاتھ استعمال ہوں گے، ٹانگیں استعمال ہوں گی، آنکھیں استعمال ہوں گی، زبان استعمال ہوگی، سب سے بڑی بات یہ ہے کہ عقل ہوگی ہمت ہوگی، سوال یہ ہے کہ یہ ساری کی ساری چیزیں کس کی دی ہوئی ہیں؟ یہ آپ اپنے گھر سے لائے ہیں یا اللہ تعالیٰ نے آپ کو دی ہیں؟ اللہ تعالیٰ نے دی ہیں، ہمارے بس میں کچھ نہیں، اس لیے بعض بچے ماں کے بطن سے ٹانگوں کے بغیر آجاتے ہیں وہ ٹانگ کسی قیمت پہ حاصل نہیں کرسکتے، بعض بے آنکھ پیدا ہوجاتے ہیں، آنکھوں والے پیدا ہوکے نابینے ہوجاتے ہیں، بعض بچے اس طرح سے آتے ہیں کہ زبان سے گونگے ہوتے ہیں کانوں سے بہرے ہوتے ہیں، اور بعض بچے آتے ہیں تو ان کے پاس عقل نہیں ہوتی دماغ نہیں ہوتا پاگل پیدا ہوجاتے ہیں، بعض صحیح سالم پیدا ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ بعد میں یہ نعمتیں چھین لیتا ہے، ان باتوں پر اگر آپ غور کریں گے تو آپ کی سمجھ میں یہ چیز آجائے گی کہ واقعی یہ براہِ راست اللہ تبارک وتعالیٰ کا عطیہ ہے، انسان اپنے طور پر نہ آنکھ حاصل کرسکتا ہے، نہ ٹانگیں، نہ بازو، نہ عقل، نہ دماغ، کوئی چیز حاصل نہیں کرسکتا، جب کمانے کے ذرائع سارے کے سارے یہی ہیں اور یہ سب اللہ نے آپ کو دیے ہیں تو پھر کیسے کہہ سکتے ہیں کہ روزی آپ کو اللہ نے نہیں دی، آپ نے خود کمائی ہے۔

مثال سے وضاحت

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ بانی دارالعلوم دیوبند اس کو ایک مثال سے سمجھایا کرتے تھے کہ ایک کھیت سے گندم پیدا ہوئی، کھیت والا اپنے کھیت کے متعلق کسی سے پوچھے کہ یہ کھیت کس کا ہے؟، وہ کہے کہ آپ کا، اس کو پانی کس نے دیا؟ تو وہ کہے

آپ نے، کاٹا کس نے؟ آپ نے، گاہا کس نے؟ آپ نے، پیداوار کس کے لئے؟ وہ کہے کہ میرے لیے۔ اب اس سے زیادہ حماقت اور کیا ہوسکتی ہے کہ ہر چیز کی نسبت دوسرے کی طرف اور پیداوار اپنے لیے، تو سیدھی بات ہے کہ جس کے لئے سب کچھ ہے پیداوار بھی اسی کے لئے ہی ہے، تو اسی طرح سے اگر آپ ان اعضاء کے ساتھ کماتے ہیں اور ان صلاحیتوں کے ساتھ کماتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے دی ہیں اور آپ اقرار بھی کرتے ہیں کہ ہم نے ان کو اپنی کوشش کے ساتھ حاصل نہیں کیا تو پھر ان کے ذریعے سے جو کچھ حاصل ہوتا ہے وہ آپ کا کیسے؟ وہ بھی تو اللہ کا ہی ہے۔ اس لیے دکاندار کھاتا ہے تو وہ بھی اللہ کا دیا ہوا کھاتا ہے، کاشت کار کھاتا ہے وہ بھی اللہ کا دیا ہوا کھاتا ہے، صنعت کار کھاتا ہے تو وہ بھی اللہ کا دیا ہوا کھاتا ہے، کیونکہ جن ذرائع سے یہ دولت کمائی جاتی ہے وہ سب اللہ کے دیے ہوئے ہیں۔

اللہ کی طرف سے معذورین کو روزی دینے کا طریقہ

اور پھر ایک شخص ایسا بھی ہے کہ جس کو اللہ تعالیٰ نے ان صلاحیتوں سے محروم کر دیا، زمین نہیں دی، دکان نہیں دی، کوئی دوسری چیز نہیں دی، یا وہ معذور ہے، اب اس کو اللہ تعالیٰ کس طرح سے روزی پہنچاتے ہیں؟ روزی دینے کا وعدہ تو اس کے ساتھ بھی ہے، اس کو کس طرح سے پہنچاتے ہیں؟ اس کو پہنچانے کے لئے یہ سلسلہ شروع کر دیا کہ جن کو دیا، اپنی حکمت کے طور پر ان کے اوپر اپنا ایک حصہ متعین کر دیا کہ تمہارے مال میں میرا اتنا حصہ ہے، اپنا حصہ رکھ لیا، چالیسواں رکھ لیا، دسواں رکھ لیا، خراج کی صورت میں رکھ لیا، صدقۃ الفطر کی صورت میں رکھ لیا، قربانی کی صورت میں رکھ لیا، یہ اپنے حصے اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان مال داروں کے مال میں متعین کر لیے، کہ یہ میں دے تمہیں رہا ہوں، یہ میرا دیا ہوا ہے، لیکن اس میں سے اتنا تمہیں استعمال کرنے کی اجازت ہے اور اتنا میرے لیے ہے، اور یہ تم نے اپنے ہاتھ کے ساتھ جن کو میں کہوں گا ان کو دینا ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے ان کو یہ حکم ہوگا کہ میں نے جو کچھ تمہیں دیا ہے یہ سارا تمہارے لیے نہیں ہے، اس میں سے اتنا تم استعمال کر سکتے ہو اور اس میں سے اتنا ایسا ہے کہ جس کو میں کہوں گا میرے بندوں میں سے، ان کو دینا ہے، تو پھر اللہ تعالیٰ مساکین فقراء محتاج جو براہِ راست کسی چیز کو ان اسباب سے حاصل نہیں کر سکتے تو اللہ تعالیٰ پھر ان کے ذریعے سے اُن کو روزی پہنچاتا ہے۔

مال دار کا فقیر پر خرچ کرنا یہ اُس کا فقیر پر کوئی اِحسان نہیں

یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ جو دیتے ہیں یہ فقیر پر احسان نہیں کرتے، یہ مسکین پر احسان نہیں کرتے، یہ تو اللہ کے نام پہ دیتے ہیں، آپ جانتے ہیں کہ احسان جتلانے کے ساتھ تو الٹا سارا ثواب ہی ضائع ہو جاتا ہے، ثواب ضائع ہونے کی وجہ بھی یہی ہے کہ ثواب تمہیں اس لیے ملے گا کہ تم نے اللہ کو دیا اور اللہ تمہیں اجر دے گا، اور احسان جتلانے کا مطلب یہ ہے کہ تم نے اس فقیر کو دیا، جب تم نے اس فقیر کو دیا تو اجر بھی اسی سے لینا، احسان جتلانے کا مطلب تو یہ ہوا کہ تم نے اس فقیر کو دیا ہے، احسان تو تب ہی جتلاؤ گے جب تم سمجھو گے کہ میں نے اس کو دیا ہے، تو جب احسان جتلا دیا کہ اس کو دیا ہے تو اجر بھی اسی سے لے لیجیو، پھر اللہ کیوں

ثواب دے گا، اور اللہ تعالیٰ تو تبھی ثواب دے گا جب تمہارا ذہن یہ ہوگا کہ ہم نے اللہ کو دیا ہے، تو تم نے اللہ کا مال اللہ کے حکم کے تحت ان لوگوں کو پہنچا دیا جن کو اللہ تعالیٰ نے رزق کمانے کے دوسرے ذرائع نہیں دیے، تو یہ بھی اللہ کی طرف سے اس وعدے کا ایفا ہے، یہ علیحدہ بات ہے کہ اللہ نے تمہیں مال دیا تھا کہ تم نے اس مال میں سے اتنا مال میرے فلاں فلاں بندوں کو پہنچانا ہے، اور تم اس کو بھی دبا کے کھا جاؤ تو پھر تم ہو گے غاصب، پھر یہ حساب تم سے قیامت کے دن لے لیا جائے گا کہ جتنا میں نے تمہارے لیے دیا تھا وہ تو خیر تمہارا ہوا، تم نے کھالیا، اور جو میں نے تمہیں امانت دی تھی کہ اتنا تم نے آگے منتقل کرنا ہے، دوسروں کو دینا ہے، وہ تم نے کیوں نہیں دیا؟ اگر تم وہ بھی کھا گئے تو یہ دوسرے کا حق کھانے والی بات ہے، اللہ تعالیٰ اس کے اوپر تمہیں پوچھ لے گا، اور اگر اللہ تعالیٰ کے حکم کے تحت وہ مال آگے چلتا کرتے رہو اور اس قسم کے مستحقین کو دیتے رہو تو ایسی صورت میں تم نے وہ حق ادا کر دیا، اس طرح سے اللہ تعالیٰ دوسروں کو روزی پہنچا دیتا ہے۔

کیا علماء اور طلبہ مفت میں بیٹھے کھاتے ہیں؟

آپ حضرات یا آپ کی طرح دوسرے ہزاروں لوگ جو دین کے کام کے لئے لگے ہوئے ہوتے ہیں، روزی ان کی بھی اللہ کے ذِمّے ہے، بے وقوفی کے ساتھ لوگ ان حضرات کی حیثیت کو صحیح نہیں سمجھتے، کہتے ہیں کہ یہ فارغ بیٹھے ہیں مفت میں کھاتے ہیں، عام طور پر لوگوں کے دماغ میں یہ آتا ہے، اور ہم لوگ بھی بسا اوقات غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ شاید ہم واقعی مفت ہی کھاتے ہیں یا شاید ہماری روزی پاکیزہ روزی نہیں ہے، اور گھٹیا قسم کی روزی ہے جو ہمیں ملتی ہے، اس قسم کی حماقتیں اور شیطانی وسوسے ہمارے دماغ میں بھی آجاتے ہیں، جبکہ یہ بہت بڑی غلطی ہے، طالب علم یا علماء جس کام میں لگے ہوئے ہیں سب سے پہلے تو سوچنے کی بات یہ ہے، ان عقل مندوں سے کوئی پوچھے جن کو یہ خیال ہوتا ہے کہ یہ مولوی اور یہ طالب علم مفت میں بیٹھے کھاتے ہیں، کہ مذہب ایک قومی ضرورت ہے یا نہیں؟ اگر وہ کہیں کہ ضرورت ہی نہیں تو وہ کافر ٹھہرے، ان کے ساتھ تو ہماری گفتگو ہی نہیں، ان کو کیا ضرورت ہے ہم پر اعتراض کرنے کی، اور ہم کیوں متاثر ہوں ان کے اعتراض سے اگر وہ کہیں کہ مذہب کوئی ضرورت نہیں ہے، مذہب کوئی ضرورت نہیں ہے تو ایسا کہنے والا تو کافر ہوگا اس کے ساتھ تو ہمارا جھگڑا نہیں، اور اگر وہ کہیں کہ ایک ضرورت ہے اور بہت اہم ضرورت ہے، مسلمان قوم کا تشخص اسی مذہب کے ساتھ ہی ہے، مسلم تو بنتا تب ہی ہے جب اسلام ہو، تو جس طرح سے باقی قومی ضرورتیں ہیں ان سے بھی زیادہ اہم ضرورت یہ ٹھہری، تو اگر باقی قومی ضرورتوں میں لگے ہوئے لوگ جس طرح سے سکولوں کے اندر حساب جیومیٹری سکھانے والے، جغرافیہ تاریخ پڑھانے والے، سائنس پڑھانے والے، انگریزی زبان سکھانے والے اور اس قسم کی دوسری ضرورتیں پوری کرنے والے، یا حکام جو ایک قومی ضرورت کے تحت اپنے اوقات دیے ہوئے ہیں، اگر وہ سارے کے سارے اس قوم کے خزانے سے کھانے کے مستحق ہیں تو پھر کیا وجہ ہے کہ جو مذہبی ضرورت کو پورا کر رہا ہے، مذہب کو محفوظ رکھے ہوئے ہے، مذہب کی اشاعت کر رہا ہے، تمہارے لیے تمہارے مسلمان ہونے کی ایک ضمانت

مہیا کیے ہوئے ہے تو وہ قومی خزانے میں سے کھانے کا کیوں مستحق نہیں؟ یہ تو اس قوم کے ذمے فرض ہے کہ ان کی ضروریات کو وہ پورا کریں جس طرح سے باقی لوگ جو ان کی ضروریات میں لگے ہوئے ہیں اُن کے اخراجات یہ پورے کرتے ہیں تو ان کے اخراجات پورا کرنا بھی ان کے ذمے ہے۔

حکومتی عہدیداران اور اہلِ مدارس کے رزق میں فرق

لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہمیں کس طرح سے پاکیزہ روزی دی، کہ اُن کو اگر حکومت کے خزانے سے تنخواہ ملتی ہے وہ بھی اسی قوم کا سرمایہ ہے، انہی کے ٹیکسوں سے اور انہی کے مالیوں وغیرہ سے یہ سب کچھ جمع ہوتا ہے، انکم ٹیکس ہوگیا، سیل ٹیکس ہوگیا، زمین کا مالیہ ہوگیا، اور اس قسم کی دوسری چیزیں، تو یہ سارے کا سارا قوم کا ہی سرمایہ ہے جس میں سے لے کے وہ کھاتے ہیں چاہے کوئی بڑا افسر ہے چاہے کوئی چھوٹا ہے، افسر بھی سارے کے سارے اسی خزانے سے لیتے ہیں، ماسٹر کیا، اور جتنے بھی قومی عہدوں کے اوپر ہیں سارے کے سارے بمع صدر مملکت اسی قوم کے خزانے میں سے کھاتے ہیں، لیکن یہ جو خزانہ ہے اس میں حلال حرام سارے ہی جمع ہیں، رنڈیوں کا ٹیکس اس میں جاتا ہے، سینموں کا ٹیکس اس میں جاتا ہے، شراب کا ٹیکس اس میں جاتا ہے، اور اسی طرح سے ظلم تعدی کے ساتھ جو کچھ لوگ وصول کرتے ہیں وہ سب اس میں جاتا ہے، اُس میں سے حصہ ان کو پہنچتا ہے تو یہ سمجھتے ہیں کہ ہم حلال کھا رہے ہیں، اور ان کی گردن اونچی ہے اور کہتے ہیں کہ ہم جو کچھ کھا رہے ہیں بالکل اپنی محنت کا عوض کھا رہے ہیں۔ اور ہم نے اپنا معاملہ براہِ راست اللہ کے ساتھ رکھا، ہمیں ''ضیاء الحق'' وصول کر کے نہیں دیتا، اور نہ ہمیں کوئی تھانیدار وصول کر کے دیتا ہے، اور نہ ہم کسی متعین آدمی کے سامنے اپنی ضرورت کو پیش کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے اپنا حصہ جو لوگوں پر متعین کیا تو اللہ تعالیٰ کے حکم تکوینی کے تحت وہ لوگ چل کے آتے ہیں، از خود پہنچا کے جاتے ہیں، یہ ہمارا حصہ ہے جو ان کے مالوں میں پڑا ہوا ہے، قوم کے بچوں کی خدمت کی جاتی ہے، قوم کی ضرورت پوری کی جاتی ہے تو یہ اخراجات مہیا کرنا بھی قوم کے ذمے ہی ہے، لیکن یہاں درمیان میں حکومت کے ڈنڈے کا واسطہ نہیں ہے، یہاں لوگ خوش دلی کے ساتھ آ کے دیتے ہیں، تو جس کو حکومت کے ڈنڈے کے ساتھ وصول کیا جائے وہ تو ان کے لئے حلال، اور جو کچھ لوگ خوش دلی کے ساتھ آ کے دیں یہ حلال نہیں، یہ کتنی بڑی بے وقوفی والی بات ہے، اگر حرام کا شبہ ہوسکتا ہے تو اس میں ہوسکتا ہے جو کچھ وہ ملازمین حکومت کے خزانے سے لیتے ہیں، ہمارے پاس تو جو کچھ آتا ہے لوگ خوش دلی سے دیتے ہیں، خوشی کے ساتھ دیتے ہیں اور اس تصور سے دیتے ہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ کو دے رہے ہیں۔ باقی! اگر تمہارا خیال یہ ہو کہ یہ گند پھند ہے، یہ ہے وہ ہے، تو پھر اللہ کے نام پہ اگر گند پھند ہی دے دو تو بھی! اللہ کی طرف سے ہمیں تو جو پہنچے گا ہم تو اس کو کھانے کے لئے تیار ہیں، لوگ کہتے ہیں کہ میل کچیل وغیرہ سب کچھ اکٹھا ہو کے آتا ہے تو ان کے تصور کے مطابق مدرسہ کیا ہے، گویا کہ شہر کا ایک گندا تالاب ہے کہ جس میں لوگوں کی میل کچیل ساری کی ساری یہاں جمع ہوتی ہے، اور اس کو کھا کے پڑھنے والے حافظ اور مولوی بننے والے فرشتوں سے افضل ہیں، فرشتے ان کے پاؤں کے نیچے پر بچھاتے ہیں، یعنی اس قسم کی گندی چیزوں کو گری ہوئی چیزوں کو کھا کے یہ بن گئے فرشتوں سے افضل، جوڑ دیکھو کیسا لگاتے ہیں، ہم تو سمجھتے ہیں کہ ''اِنَّ اللّٰهَ طَيِّبٌ لَا يَقْبَلُ اِلَّا

طَيِّبًا" اللہ خود پاکیزہ ہے اور اللہ کے نام پہ جو دیا جائے اللہ پاکیزہ چیز کو قبول کرتے ہیں، گندی چیز کو قبول ہی نہیں کرتے،[1] اس لیے اللہ تعالیٰ جو کچھ وصول کریں گے اگر اس کو تم دھوکا دیتے ہو، اس کو حرام دیتے ہو تو یہ تمہارا معاملہ اللہ کے ساتھ ہے، ہمارا رزق تو اللہ کے ذِمّے ہے، اللہ تعالیٰ جس طرح سے پہنچاتا ہے ہم کھاتے ہیں، اس لیے ہمارا تصور تو یہ ہے کہ سب سے زیادہ پاکیزہ روزی ہماری ہے، اور براہِ راست اللہ کی طرف سے آنے والی ہے، کہ ہم کسی بندے کے زیرِ احسان نہیں ہیں کہ کوئی کہے کہ ہم نے تمہیں روزی دی ہے، ہم کہتے ہیں نہ دو، اللہ تعالیٰ نے جو حصہ متعین کیا ہے تم نے اللہ کو دینا ہے، اللہ نے ہمارے پاس پہنچادیا، کوئی متعین آدمی ہم پر احسان نہیں جتلا سکتا، نہ ہم کسی کے زیرِ احسان ہیں، اور قوم کے کام میں لگے ہوئے ہیں، قومی ضرورت میں لگے ہوئے ہیں اور ایسی ضرورت میں لگے ہوئے ہیں جو براہِ راست اللہ تعالیٰ کی طرف سے ڈیوٹی سپرد کی گئی ہے، اور یہ کام یعنی اللہ کے دین کی حفاظت اور اس کی اشاعت یہ براہِ راست اللہ تعالیٰ سے تعلق رکھنے والا ہے، اس لیے قوم کے ذِمّے فرض ہے کہ طالب علموں اور دوسروں کے لئے اخراجات مہیا کریں، اگر نہیں کریں گے تو اللہ کے ہاں یہ مار کھائیں گے، جس طرح سے حکومت کا خزانہ خالی ہوجائے تو حکومت ڈنڈے سے اس کو بھرتی ہے تاکہ اس کے ملازمین کی ضرورت پوری ہو، تو یہ کبھی ذہن میں نہیں آنا چاہیے کہ ہم مفت کھاتے ہیں یا گھٹیا کھاتے ہیں، ایسی بات نہیں، سب سے اچھے لوگ آپ حضرات ہیں، اور اللہ تعالیٰ نے آپ کے رزق کا انتظام بھی اپنے ذمے لیا ہوا ہے، اور اس کی صورت یہی ہے کہ بغیر کسی کدوکاوش کے لوگ آتے ہیں اور خوشی کے ساتھ دے کے جاتے ہیں، اور حکومت کے خزانوں میں جو کچھ جاتا ہے اس میں جبر اِکراہ سب کچھ ہوتا ہے، اس لیے اگر شبہ ہوسکتا ہے تو ان کے مال پر تو شبہ ہوسکتا ہے، جو مال ہمارے پاس ہے اس پہ کوئی شبہ کی بات نہیں، احساسِ کہتری میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے، صدرِ مملکت سے لے کر چھوٹے سے چھوٹا ملازم جو بھی حکومت کا ہے، چاہے کالج میں ہے، چاہے سکول میں ہے، چاہے عدالتوں میں ہے، مجسٹریٹ ہیں، بڑے بڑے حکام ہیں، ڈی سی ہے، کمشنر ہے، گورنر ہے، جو کچھ ہے، جتنی فوج ہے، جتنی پولیس ہے، حکومت کے خزانے سے جو بھی کھاتے ہیں، سب قوم کا کھاتے ہیں، اور اسی دلیل سے کھاتے ہیں کہ وہ قوم کے کام میں لگے ہوئے ہیں، تو ہم بھی تو آخر قوم کا کام ہی کر رہے ہیں، مسلم قوم کے لئے دین سب سے بڑی ضرورت کی چیز ہے، اسلام سب سے بڑی ضرورت ہے، تو جو شخص اس خدمت میں لگا ہوا ہے وہ تو سب سے زیادہ مستحق ہے کہ قوم اس کی خدمت کرے۔

دلیلِ قدرت اور معاد کا ذِکر

وَهُوَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ: یہ آگے دلیلِ قدرت ہے، اور یہ مضمون آپ کے سامنے بارہا گزر چکا۔ اللہ تعالیٰ نے زمین اور آسمان کو چھ دن میں پیدا کیا، اور اس کا عرش پانی پر تھا، یعنی زمین آسمان بنانے سے پہلے اللہ نے پانی کو پیدا کیا، اور پانی پر عرش تھا، اور پھر آگے اللہ کی قدرت کے تحت تصرف ہو کے یہ ساری کی ساری صورت بن گئی کائنات کی۔ اور ان کو پیدا کرنے سے مقصد یہ ہے کہ تاکہ تمہیں دیکھے، آزمائے کہ تم میں سے اچھا عمل کون کرنے والا ہے، اچھا عمل وہی ہوتا ہے جس میں اللہ کے لئے

---

(۱) صحیح مسلم ۱/۳۲۶ باب قبول الصدقة/ترمذی ۲/۱۲۸، تفسیر سورة البقرة کا آخر/مشکوٰۃ ۱/۲۴۱ باب الکسب، فصل اول، عن ابی ہریرةؓ

اخلاص ہو، یہاں حُسنِ عمل کا ذکر ہے، عمل کے اندر کثرت اتنی مطلوب نہیں جتنا کہ اس میں حسن مطلوب ہے، ایک آدمی اگر اخلاص کے ساتھ دو رکعتیں پڑھتا ہے تو وہ اس کے مقابلے میں بہت زیادہ افضل ہے جو پڑھتا تو سو رکعت ہے لیکن اس میں اخلاص نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کے ہاں حسن عمل کی قدر ہے، احسان کی قدر ہے، اور احسان یہی ہے کہ ''اَنْ تَعْبُدَ اللهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ''[1] اس طرح سے عبادت کرو گویا کہ اللہ آنکھوں کے سامنے ہے۔ وَلَئِنْ قُلْتَ اِنَّكُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ: یہ معاد کا ذکر آ گیا کہ اگر آپ ان کو کہتے ہیں کہ تم موت کے بعد اٹھائے جاؤ گے تو البتہ ضرور کہیں گے وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا کہ یہ تو جادو کی باتیں ہیں، یہ تو بات کیا ہے جادو ہے، یعنی اثر انداز ہوتی ہے، لوگ اس سے متاثر ہوتے ہیں لیکن حقیقت اس میں کچھ نہیں، یا یہ کتاب کو کہیں گے کہ یہ سحر مبین ہے۔ وَلَئِنْ اَخَّرْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ اِلٰٓى اُمَّةٍ مَّعْدُوْدَةٍ: اور اگر ہم کچھ دنوں تک ان سے عذاب کو مؤخر کر دیتے ہیں (اُمَّةٍ مَّعْدُوْدَةٍ: گنے ہوئے دن۔ امة مدت کے معنی میں ہے، جماعة من الاوقات) اگر ہم کچھ دنوں تک، معلوم مدت تک عذاب کو مؤخر کر دیتے ہیں اپنی حکمت کی وجہ سے، تو یہ مذاق اڑاتے ہیں، البتہ ضرور کہیں گے کہ کس چیز نے روک رکھا ہے اس عذاب کو، وہ آتا کیوں نہیں؟ خبردار! جب وہ عذاب ان کے پاس آجائے گا تو ان سے ہٹایا نہیں جائے گا، وَحَاقَ بِهِمْ: اور گھیر لے گی ان کو وہ چیز جس کا وہ مذاق اُڑاتے تھے، اس سے وہی عذاب مراد ہے، کہ جس کا یہ استہزا اُڑایا کرتے تھے وہ ان کو اس طرح سے گھیر لے گا کہ پھر یہ اس کے گھیرے سے نکل نہیں سکیں گے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

وَلَئِنْ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً ثُمَّ نَزَعْنٰهَا مِنْهُ ۚ اِنَّهٗ لَيَـُٔوْسٌ كَفُوْرٌ ﴿۹﴾

اگر ہم انسان کو اپنی طرف سے رحمت چکھا دیں پھر اس رحمت کو اس سے چھین لیں، بیشک وہ بہت مایوس اور بہت ناشکرا ہو جاتا ہے ﴿۹﴾

وَلَئِنْ اَذَقْنٰهُ نَعْمَآءَ بَعْدَ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُ لَيَقُوْلَنَّ ذَهَبَ السَّيِّاٰتُ عَنِّيْ ؕ اِنَّهٗ

اور اگر ہم اس کو چکھا دیں خوش حالی اس تکلیف کے بعد جو اسے پہنچی ہو البتہ ضرور کہے گا مجھ سے سختیاں دُور ہو گئیں، بے شک وہ

لَفَرِحٌ فَخُوْرٌ ﴿۱۰﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ

البتہ اترانے والا ہے اور فخر کرنے والا ہے ﴿۱۰﴾ مگر وہ لوگ جنہوں نے صبر کیا اور نیک اعمال کیے یہی لوگ ہیں کہ ان کے لئے مغفرت ہے

وَّاَجْرٌ كَبِيْرٌ ﴿۱۱﴾ فَلَعَلَّكَ تَارِكٌۢ بَعْضَ مَا يُوْحٰٓى اِلَيْكَ وَضَآئِقٌۢ بِهٖ صَدْرُكَ

اور بڑا اجر ہے ﴿۱۱﴾ پس شاید کہ آپ چھوڑنے والے ہیں اس چیز کا بعض جو آپ کی طرف وحی کی گئی اور تنگ ہونے والا ہے آپ کا سینہ

(۱) بخاری ج۱ ص ۱۲ باب سوال جبریل/مسلم ۲۷/۱ باب بیان الایمان والاسلام الخ/مشکوٰۃ ص ۱۱، کتاب الایمان فصل اول۔

اَنْ يَّقُوْلُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ كَنْزٌ اَوْ جَآءَ مَعَهٗ مَلَكٌ ؕ اِنَّمَآ

اس بات سے کہ وہ کہتے ہیں کیوں نہیں اتارا گیا اس پر کوئی خزانہ یا کیوں نہیں آیا اس کے ساتھ کوئی فرشتہ؟ سوائے اس کے کچھ نہیں

اَنْتَ نَذِيْرٌ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ وَّكِيْلٌ ﴿۱۲﴾ اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ

کہ آپ تو صرف ڈرانے والے ہیں اور اللہ ہر چیز کے اوپر ذمہ دار ہے ﴿۱۲﴾ یا یہ کہتے ہیں اس رسول نے اس کتاب کو گھڑ لیا، آپ کہہ دیجیے

فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَيٰتٍ وَّادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ

کہ لے آؤ تم اس جیسی دس سورتیں جو گھڑی ہوئی ہوں اور بلاؤ ان سب کو جن کو تم بلانے کی طاقت رکھتے ہو اللہ کے علاوہ اگر تم

صٰدِقِيْنَ ﴿۱۳﴾ فَاِلَّمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَكُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ اُنْزِلَ بِعِلْمِ اللّٰهِ

سچے ہو ﴿۱۳﴾ پھر اگر وہ تمہاری بات نہ مانیں پھر (انہیں کہہ دیجیے کہ) تم یقین کر لو کہ یہ قرآنِ کریم اُتارا گیا ہے اللہ کے علم کے ساتھ

وَاَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۴﴾ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا

اور (یقین کر لو کہ) اس کے بغیر کوئی معبود نہیں، پھر کیا تم فرمانبردار ہو؟ ﴿۱۴﴾ جو شخص ارادہ کرتا ہے دُنیوی زندگی کا اور اس کی زینت کا،

نُوَفِّ اِلَيْهِمْ اَعْمَالَهُمْ فِيْهَا وَهُمْ فِيْهَا لَا يُبْخَسُوْنَ ﴿۱۵﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَيْسَ لَهُمْ

پورا کر دیتے ہیں ہم ان کی طرف ان کے اعمال اسی دُنیا میں اور وہ اس دُنیا میں کمی نہیں کیے جاتے ﴿۱۵﴾ یہی لوگ ہیں کہ نہیں ہے ان کے لئے

فِى الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ ۖ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوْا فِيْهَا وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۶﴾

آخرت میں کچھ بھی سوائے آگ کے، جو کچھ انہوں نے کیا آخرت میں ضائع ہو جائے گا، اور جو کچھ یہ کرتے ہیں وہ باطل ہے ﴿۱۶﴾

اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ وَيَتْلُوْهُ شَاهِدٌ

کیا پھر وہ شخص جو واضح دلیل (قرآن) پر قائم ہے جو اس کے رَبّ کی طرف سے آیا ہے، اور اس (قرآن) کے پیچھے گواہ ہو

مِّنْهُ وَمِنْ قَبْلِهٖ كِتٰبُ مُوْسٰٓى اِمَامًا وَّرَحْمَةً ؕ اُولٰٓئِكَ

اسی سے، اور اس سے پہلے موسیٰ علیہ السلام کی کتاب (گواہ ہے) اس حال میں کہ وہ امام اور رحمت ہے، یہی

يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ؕ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ مِنَ الْاَحْزَابِ فَالنَّارُ مَوْعِدُهٗ ۚ

اس قرآن پر ایمان لاتے ہیں، اور جو کوئی شخص اس (قرآن) کا انکار کرے گروہوں میں سے پس جہنم اس کے وعدے کی جگہ ہے،

فَلَا تَكُ فِي مِرْيَةٍ مِّنْهُ ۚ إِنَّهُ الْحَقُّ مِن رَّبِّكَ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿١٧﴾

پس آپ شک میں نہ ہوں اس (قرآن) کی طرف سے، بیشک یہ حق ہے آپ کے رب کی جانب سے لیکن اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے (۱۷)

وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا ۚ أُولَٰئِكَ يُعْرَضُونَ عَلَىٰ رَبِّهِمْ وَيَقُولُ

کون بڑا ظالم ہے اس شخص سے جو اللہ پر جھوٹ گھڑے، یہی لوگ پیش کیے جائیں گے اپنے رب پر اور گواہ

الْأَشْهَادُ هَٰؤُلَاءِ الَّذِينَ كَذَبُوا عَلَىٰ رَبِّهِمْ ۚ أَلَا لَعْنَةُ اللَّهِ عَلَى الظَّالِمِينَ ﴿١٨﴾ الَّذِينَ

کہیں گے کہ یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب پر جھوٹ بولا، خبردار! اللہ کی لعنت ظالموں پر (۱۸) جو

يَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ وَيَبْغُونَهَا عِوَجًا وَهُم بِالْآخِرَةِ هُمْ كَافِرُونَ ﴿١٩﴾ أُولَٰئِكَ

اللہ کے راستے سے روکتے ہیں اور اس راستے میں کجیاں تلاش کرتے ہیں اور وہ آخرت کا انکار کرنے والے ہیں (۱۹) یہی لوگ ہیں

لَمْ يَكُونُوا مُعْجِزِينَ فِي الْأَرْضِ وَمَا كَانَ لَهُم مِّن دُونِ اللَّهِ مِنْ أَوْلِيَاءَ ۘ يُضَاعَفُ لَهُمُ

جو زمین میں عاجز کرنے والے نہیں اور نہیں ان کے لیے اللہ کے علاوہ کوئی کارساز، بڑھایا جائے گا ان کے لیے

الْعَذَابُ ۚ مَا كَانُوا يَسْتَطِيعُونَ السَّمْعَ وَمَا كَانُوا يُبْصِرُونَ ﴿٢٠﴾ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ خَسِرُوا

عذاب، نہ یہ طاقت رکھتے تھے سننے کی اور نہ یہ دیکھتے تھے (۲۰) یہی لوگ ہیں جنہوں نے اپنے آپ کو خسارے

أَنفُسَهُمْ وَضَلَّ عَنْهُم مَّا كَانُوا يَفْتَرُونَ ﴿٢١﴾ لَا جَرَمَ أَنَّهُمْ فِي الْآخِرَةِ هُمُ

میں ڈال دیا اور گم ہو گئیں ان سے وہ باتیں جو تراشا کرتے تھے (۲۱) یہ بات قطعی ہے کہ یہی لوگ آخرت میں سب سے

الْأَخْسَرُونَ ﴿٢٢﴾ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَأَخْبَتُوا إِلَىٰ

زیادہ خسارہ پانے والے ہیں (۲۲) بے شک وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے اور عاجزی کی انہوں نے اپنے رب

رَبِّهِمْ أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿٢٣﴾ مَثَلُ الْفَرِيقَيْنِ كَالْأَعْمَىٰ

کے سامنے یہی جنت والے ہیں، اس میں ہمیشہ رہنے والے ہوں گے (۲۳) دونوں گروہوں کی مثال ایسے ہے جیسے کہ اندھا

وَالْأَصَمِّ وَالْبَصِيرِ وَالسَّمِيعِ ۚ هَلْ يَسْتَوِيَانِ مَثَلًا ۚ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ ﴿٢٤﴾

اور بہرہ اور دیکھنے والا اور سننے والا، کیا یہ دونوں فریق آپس میں حال کے اعتبار سے برابر ہیں؟ کیا پھر تم نصیحت حاصل نہیں کرتے (۲۴)

خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ وَلَئِنْ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً ثُمَّ نَزَعْنٰهَا مِنْهُ: اگر ہم انسان کو اپنی طرف سے رحمت چکھادیں پھر اس رحمت کو اس سے چھین لیں۔ نَزَعْنٰهَا کی "ھا" ضمیر رحمت کی طرف لوٹ رہی ہے۔ پھر ہم چھین لیں اس رحمت کو اس سے، اِنَّهٗ لَيَئُوْسٌ كَفُوْرٌ: یؤس یأس سے لیا گیا ہے مبالغے کا صیغہ ہے، بہت مایوس ہونے والا۔ کفور یہ بھی مبالغے کا صیغہ ہے کُفران سے، بہت ناشکرا، "بیشک وہ بہت مایوس اور بہت ناشکرا ہو جاتا ہے" وَلَئِنْ اَذَقْنٰهُ نَعْمَآءَ: اور اگر ہم اس کو چکھادیں خوشحالی بَعْدَ ضَرَّآءَ: تکلیف کے بعد، مَسَّتْهُ یہ ضَرَّآءَ کی صفت ہے، "جو تکلیف اسے پہنچی ہو" لَيَقُوْلَنَّ: البتہ ضرور کہے گا، ذَهَبَ السَّيِّاٰتُ عَنِّيْ: مجھ سے سختیاں دُور ہوگئیں، سیئات سے یہاں سختیاں مراد ہیں، برائیاں جو ضراء کا مصداق ہے، "مجھ سے سختیاں دُور ہوگئیں" اِنَّهٗ لَفَرِحٌ فَخُوْرٌ: تو بیشک وہ البتہ اِترانے والا ہے اور فخر کرنے والا ہے، اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا: مگر وہ لوگ جنہوں نے صبر کیا، وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ: اور نیک اعمال کئے، اُولٰٓئِكَ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ كَبِيْرٌ: یہی لوگ ہیں کہ ان کے لئے مغفرت ہے اور بڑا اَجر ہے۔ فَلَعَلَّكَ تَارِكٌ بَعْضَ مَا يُوْحٰٓى اِلَيْكَ: پس شاید کہ آپ چھوڑنے والے ہیں، بَعْضَ مَا يُوْحٰٓى اِلَيْكَ...... مَا يُوْحٰٓى اِلَيْكَ: جو چیز آپ کی طرف وحی کی گئی اس کے بعض کو، شاید کہ آپ چھوڑنے والے ہیں اس چیز کا بعض جو آپ کی طرف وحی کی گئی"، وَضَآئِقٌۢ بِهٖ صَدْرُكَ: اور تنگ ہونے والا ہے آپ کا سینہ اس بات سے (بِهٖ کی "ہ" ضمیر مبہم ہے اور اَنْ يَّقُوْلُوْا اسی کا بیان ہے) اور تنگ ہونے والا ہے آپ کا سینہ اس بات سے کہ وہ کہتے ہیں کیوں نہیں اتارا گیا اس پر کوئی خزانہ یا کیوں نہیں آیا اس کے ساتھ کوئی فرشتہ؟ جَآءَ کا عطف بھی اُنْزِلَ پر ہے اور لَوْلَا کے نیچے داخل ہے۔ "کیوں نہیں اتارا گیا اس پر کوئی خزانہ یا کیوں نہیں آیا اس کے ساتھ کوئی فرشتہ؟" اِنَّمَآ اَنْتَ نَذِيْرٌ: سوائے اس کے کچھ نہیں کہ آپ تو ڈرانے والے ہیں، آپ تو صرف ڈرانے والے ہیں" اور اللہ ہر چیز کے اوپر وکیل ہے، ذمہ دار ہے۔" اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ: یا یہ کہتے ہیں کہ اس رسول نے اس کتاب کو گھڑ لیا، اس قرآن کو گھڑ لیا، جھوٹ بنالیا، قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ: آپ کہہ دیجئے کہ لے آؤ تم اس جیسی دس سورتیں، مُفْتَرَيٰتٍ: جو تراشی ہوئی ہوں بنائی ہوئی ہوں گھڑی ہوئی ہوں، وَّادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ: اور بلاؤ ان سب کو جن کو تم بلانے کی طاقت رکھتے ہو اللہ کے علاوہ، اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ: اگر تم سچے ہو۔ فَاِلَّمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَكُمْ: پھر اگر وہ تمہاری بات نہ مانیں، تمہارا کہنا پورا نہ کریں، فَاعْلَمُوْٓا: پھر انہیں کہہ دیجئے، فَقُوْلُوْا لَهُمْ اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ اُنْزِلَ بِعِلْمِ اللّٰهِ: انہیں کہہ دیجئے کہ تم یقین کرلو کہ یہ قرآنِ کریم اتارا گیا ہے اللہ کے علم کے ساتھ،" اور یقین کرلو اس بات کا کہ اس کے بغیر کوئی معبود نہیں" فَهَلْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ: پھر کیا تم فرمانبردار ہو، اسلام لاتے ہو؟ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا: جو شخص ارادہ کرتا ہے دنیوی زندگی کا، وَزِيْنَتَهَا: اور اس کی زینت کا، زیب وزینت کا، نُوَفِّ اِلَيْهِمْ اَعْمَالَهُمْ فِيْهَا: پورا کردیتے ہیں ہم ان کی طرف ان کے اعمال اسی دنیا میں، وَهُمْ فِيْهَا لَا يُبْخَسُوْنَ: اور وہ اس دنیا میں کمی نہیں کئے جاتے، نقصان نہیں دیے جاتے۔ بخس: کمی کرنا۔ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ: یہی لوگ ہیں کہ نہیں ہے ان کے لئے آخرت میں کچھ بھی سوائے آگ کے، وَحَبِطَ مَا صَنَعُوْا فِيْهَا: جو کچھ

انہوں نے کیا آخرت میں ضائع ہو جائے گا، وَ بٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ: اور جو کچھ یہ کرتے ہیں وہ باطل ہے۔ اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ: کیا پھر وہ شخص جو واضح دلیل پر ہو۔ بَيِّنَةٍ سے بیان القرآن کے بیان کے مطابق خود قرآنِ کریم مراد ہے کہ جو شخص قرآنِ کریم پہ قائم ہے، ایسا قرآن جو کہ اس کے ربّ کی طرف سے آیا ہے، وَ يَتْلُوْهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ: مِنْهُ کی ضمیر بھی اسی بینہ کی طرف لوٹ رہی ہے، يَتْلُوْهُ کی ہٗ ضمیر بھی اسی بینہ کی طرف لوٹ رہی ہے، چونکہ بینہ کا مصداق قرآنِ کریم کو جب بنالیا گیا تو مذکر کی ضمیر اس کی طرف لوٹ سکتی ہے، ''اُس قرآنِ کریم کے پیچھے گواہ ہو اُسی قرآنِ کریم سے'' یعنی قرآنِ کریم کی حقانیت کے اوپر گواہ قرآنِ کریم سے ہی قائم ہے، یعنی اس کا اعجاز، معجز ہونا۔ وَ مِنْ قَبْلِهٖ كِتٰبُ مُوْسٰٓى: اور اُس قرآنِ کریم سے پہلے موسیٰ علیہ السلام کی کتاب بھی گواہ ہے، ایسی کتاب جو کہ امام اور رحمت ہے۔ امام یہ ھدیٰ کے معنی میں ہے، اَحکام بیان کرنے کے اعتبار سے اِمام، اور اَحکام پر عمل کرنے کے بعد رحمت یعنی اللہ کی رحمت حاصل کرنے کا ذریعہ، ''اور اس قرآنِ کریم سے قبل موسیٰ کی کتاب اس حال میں کہ وہ اِمام اور رحمت ہے'' یعنی وہ بھی شاہد ہے، اُولٰٓئِكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ: یہی صحیح طور پر اِس قرآن پر ایمان لاتے ہیں، وَ مَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ: اور جو کوئی شخص اس قرآنِ کریم کا انکار کرے مِنَ الْاَحْزَابِ: گروہوں میں سے فَالنَّارُ مَوْعِدُهٗ: پس جہنم اس کے وعدے کی جگہ ہے۔ فَلَا تَكُ فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْهُ پس تو شک میں نہ ہو اس قرآنِ کریم کی طرف سے، اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ: بیشک یہ حق ہے تیرے ربّ کی جانب سے، وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ: لیکن اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے۔ اور بَيِّنَةٍ کا مصداق یہاں فطرتِ صحیحہ کو بھی بنایا گیا ہے پھر معنی یوں ہو جائے گا کہ ''جو شخص واضح راستے پر ہے جو اس کے ربّ کی طرف سے ہے'' یہ راستہ وہ ہوگا جو کہ فطرتِ صحیحہ کے طور پر ثابت ہے وَ يَتْلُوْهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ: اور تَلَا يَتْلُو پیچھے آنے کے معنی میں ہے، ''اور اس کے پیچھے ہو ایک گواہ اللہ کی جانب سے، اللہ کی جانب سے اس پر ایک اور گواہ آیا'' اس کا مصداق بنایا گیا قرآنِ کریم کو، کہ جو راستہ فطرت کے تقاضے سے ثابت ہے اسی کے اوپر شاہد قرآنِ کریم بھی آ گیا اللہ کی جانب سے، وَ مِنْ قَبْلِهٖ كِتٰبُ مُوْسٰٓى: اور اس قرآنِ کریم سے پہلے کتابِ موسیٰ وہ بھی اسی صحیح راستے کے اوپر دال ہے، اس کے لئے گواہ ہے۔ اور اس کتاب کی حیثیت ایسی تھی کہ وہ امام اور رحمت ہے، یعنی احکام کے بیان کرنے کے لئے امام ہے اور اللہ کی رحمت حاصل ہونے کا ذریعہ ہے جب ان احکام کے اوپر عمل کیا جائے، ''یہی لوگ ہیں جو کہ اس قرآنِ کریم کے اوپر صحیح ایمان لاتے ہیں'' یعنی جو فطرتِ صحیحہ پر ثابت ہیں قرانِ کریم کی شہادت کو سمجھتے ہیں، موسیٰ کی کتاب جو اس سے پہلے اتری ہوئی ہے اس کی شہادت کو سمجھتے ہیں، یہی لوگ ہیں صحیح طور پر اس پر ایمان لانے والے، ''اور جو کوئی اس قرآنِ کریم کا انکار کرے گا مختلف گروہوں سے'' چاہے وہ یہود سے ہو، نصاریٰ سے ہو، مشرکین سے ہو، مجوسیوں سے ہو، احزاب کا لفظ سب کو شامل ہے، ان میں سے جو بھی اس کا انکار کرے گا، فَالنَّارُ مَوْعِدُهٗ: جہنم اس کے وعدے کی جگہ ہے، پس آپ شک میں نہ ہوں اِس قرآنِ کریم کی طرف سے، بیشک یہ حق ہے آپ کے ربّ کی جانب سے، لیکن اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے۔ وَ مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا: کون بڑا ظالم ہے اس شخص سے جو اللہ پر جھوٹ گھڑے، اُولٰٓئِكَ يُعْرَضُوْنَ عَلٰى رَبِّهِمْ: یہی لوگ پیش کئے جائیں گے اپنے ربّ پر، وَ يَقُوْلُ الْاَشْهَادُ: اَشْهاد شاهد کی جمع، ''اور گواہ کہیں گے'' اس کا مصداق انبیاء علیہم السلام بھی ہو سکتے ہیں اور ملائکہ بھی جو اعمال کے لکھنے کے اوپر متعین ہیں، ''کہیں گے گواہ،

گواہی دینے والے" هٰٓؤُلَآءِ الَّذِيْنَ كَذَبُوْا عَلٰى رَبِّهِمْ: یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رَبّ پر جھوٹ بولا، اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ: خبردار! اللہ کی لعنت ظالموں پر، الَّذِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ: یہ ظالم وہ لوگ ہیں جو اللہ کے راستے سے روکتے ہیں، وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجًا: اور طلب کرتے ہیں اس راستے کو کج، اس راستے میں کجیاں تلاش کرتے ہیں۔ عِوَج: ٹیڑھ، کجی۔ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ: اور وہ آخرت کا انکار کرنے والے ہیں، اُولٰٓئِكَ لَمْ يَكُوْنُوْا مُعْجِزِيْنَ فِى الْاَرْضِ وَمَا كَانَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَآءَ: یہی لوگ ہیں جو زمین میں عاجز کرنے والے نہیں، اور نہیں ان کے لئے اللہ کے علاوہ کوئی کارساز۔ اَوْلِيَآءَ ولی کی جمع۔ کوئی حمائتی، کوئی مددگار، کوئی نہیں۔ يُضٰعَفُ لَهُمُ الْعَذَابُ: ان کے لئے عذاب دگنا کیا جائے گا، بڑھایا جائے گا ان کے لئے عذاب، مَا كَانُوْا يَسْتَطِيْعُوْنَ السَّمْعَ وَمَا كَانُوْا يُبْصِرُوْنَ: نہ یہ طاقت رکھتے تھے سننے کی اور نہ یہ دیکھتے تھے، اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ: یہی لوگ ہیں جنہوں نے اپنے آپ کو خسارے میں ڈال دیا، وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ: اور گم ہوگئیں ان سے وہ باتیں جو تراشا کرتے تھے۔ لَا جَرَمَ: یہ لامحالہ کے معنی میں ہوتا ہے، یہ بات قطعی ہے، اس بات میں کوئی شک نہیں، ثابت شدہ ہے، اَنَّهُمْ فِى الْاٰخِرَةِ هُمُ الْاَخْسَرُوْنَ: کہ یہی لوگ آخرت میں سب سے زیادہ خسارہ پانے والے ہیں۔ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ: بیشک وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کئے، وَاَخْبَتُوْٓا اِلٰى رَبِّهِمْ: اور عاجزی کی انہوں نے اپنے رَبّ کی طرف، جھکے وہ اپنے رَبّ کی طرف، میلان کیا انہوں نے اپنے رَبّ کی طرف، یہ دل کے خلوص کی طرف اشارہ ہے، اخلاص کی طرف، "عاجزی کی انہوں نے اپنے رَبّ کے سامنے" اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ: یہی جنّت والے ہیں، هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ: اس میں ہمیشہ رہنے والے ہوں گے۔ مَثَلُ الْفَرِيْقَيْنِ كَالْاَعْمٰى وَالْاَصَمِّ: دونوں گروہوں کی مثال ایسے ہے جیسے کہ اندھا اور بہرہ اور دیکھنے والا اور سننے والا، بصیر اور سمیع یہ مؤمنوں کی مثال ہے، اعمٰی اور اصم یہ کافروں کی مثال ہے۔ هَلْ يَسْتَوِيٰنِ مَثَلًا: کیا یہ دونوں فریق آپس میں مثال کے اعتبار سے برابر ہیں؟ حال کے اعتبار سے برابر ہیں؟ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ: کیا پھر تم نصیحت نہیں حاصل کرتے؟

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

تفسیر

ماقبل رُکوع سے ربط

پچھلے رکوع کی آخری آیت میں ذکر کیا گیا تھا کہ یہ کافر لوگ جو اپنے کُفر اور بدکرداریوں کی وجہ سے عذاب کے مستحق ہیں اگر اللہ تعالیٰ اپنی حکمت کے تحت کچھ دنوں تک عذاب کو مؤخر کردیتا ہے تو یہ اس کا اِستہزا کرتے ہیں، مذاق اڑاتے ہیں، کہ عذاب آیا کیوں نہیں؟ اس کو کون سی چیز روکتی ہے؟ تو اللہ تعالیٰ نے تنبیہ فرمائی تھی کہ جتنے دن ڈھیل ملی ہوئی ہے اس کو غنیمت سمجھو، جب وہ عذاب آجائے گا پھر وہ ہٹایا نہیں جاسکے گا، اور جس چیز کا یہ لوگ اِستہزا کرتے ہیں وہ ان کو گھیر لے گی، عذاب ان کو محیط ہوجائے گا۔ آگے انسان کے متعلق اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ وضاحت فرمائی ہے کہ عام طور پر یہ بہت عجلت پسند اور بہت موجود پرست اور موجودہ

حال میں مست رہنے والا ہے، نہ یہ ماضی کو یاد رکھتا ہے اور نہ یہ مستقبل کے متعلق کبھی سوچتا ہے، عام طور پر انسان کا حال ایسے ہی ہے، البتہ جن کو اللہ تعالیٰ صبر و استقامت دیتے ہیں وہ ایمان لے آتے ہیں، نیک عمل کرتے ہیں، ان کا حال ایسا نہیں ہوتا۔

انسان کا تعلق اللہ کے ساتھ کس طرح باقی رہتا ہے؟

انسان کی موجود پرستی اس طرح سے ہے کہ اگر ہم اس کو اپنی طرف سے کوئی رحمت چکھادیتے ہیں، رحمت سے مراد ایسے حالات جو اس کی منشا اور مرضی کے مطابق ہیں، مثلاً اس کو صحت دے دی، دولت دے دی، اولاد دے دی، عزت اور جاہ حاصل ہوگیا، اور حالات اس کی مرضی کے مطابق ہوگئے، یہ رحمت کا مصداق ہیں، اَذَقْنَا کا مطلب یہ ہے کہ مزہ چکھادیا، تھوڑے وقت کے لئے، عارضی طور پر جیسے کوئی چیز دے دی جاتی ہے۔ ''اگر ہم انسان کو مزہ چکھادیں اپنی طرف سے رحمت کا پھر ہم وہ رحمت اس سے چھین لیں''، کچھ دن جھلک دکھائی پھر وہ واپس لے لی، تو اِنَّهٗ لَيَئُوْسٌ كَفُوْرٌ: پھر یہ مایوس ہوجاتا ہے اور انتہائی ناشکرا ہوجاتا ہے، یعنی مستقبل سے مایوس، اور جو نعمت پہلے حاصل تھی اس کے متعلق ناشکرا۔ حالات کی ناسازگاری سے دل اتنا توڑ بیٹھتا ہے، اتنی ہمت ہار بیٹھتا ہے کہ بس کہتا ہے کہ اب میں تو برباد ہوگیا، اب سنبھلنے سدھرنے کی کوئی توقع ہی نہیں، پھر وہ اللہ کی رحمت کی امید نہیں رکھتا، اللہ کے اوپر بھروسا نہیں کرتا، بلکہ ایسے ہے جیسے آس ہی توڑ کے بیٹھ گیا، اور جتنی نعمت اس کو ہم نے دی تھی وہ اس کو یاد ہی نہیں رہی کہ اللہ تعالیٰ کا میرے اوپر کبھی کوئی احسان بھی ہوا تھا، اس لیے انتہائی درجے کا ناشکرا ہوجاتا ہے، پچھلے جو اس کو فوائد پہنچے تھے، اللہ کی طرف سے جو رحمت ہوئی تھی، اس کے اوپر شکرگزار نہیں ہوتا۔ اور اگر ایسا ہوجائے کہ ہم اس کو تکلیف کے بعد خوش حالی دے دیں، یہاں بھی اَذَقْنَا کا لفظ ہے کہ پہلے وہ تکلیف میں مبتلا تھا جیسے بدنی تکلیف ہے، مالی تنگی ہے، حالات ناسازگار ہیں، ضراء کا مصداق سارے ہوسکتے ہیں، اس کے بعد ہم نے اس کو خوش حالی دے دی، لَيَقُوْلَنَّ ذَهَبَ السَّيِّاٰتُ عَنِّيْ: تو پھر وہ یہ نہیں سوچتا کہ پہلے جو تکلیف اللہ کی طرف سے آئی تھی اور اب اللہ کی رحمت سے خوش حالی حاصل ہوگئی تو اللہ کی قدرت باقی ہے، تکلیف دوبارہ بھی آسکتی ہے، اللہ کی گرفت پھر بھی ہوسکتی ہے، اللہ کی قدرتیں ختم نہیں ہوگئیں، لیکن اس کو یہ بات یاد نہیں رہتی، وہ یہ سمجھتا ہے کہ مجھ سے سختیاں ختم ہوگئیں، پھر وہ اترانے لگ جاتا ہے، اکڑنے لگ جاتا ہے، شیخیاں مارنے لگ جاتا ہے، فخر کرنے لگ جاتا ہے، اس کو یہ یاد ہی نہیں رہتا کہ پہلے جس کی طرف سے مصیبت آئی تھی دوبارہ پھر بھی آسکتی ہے، یہ خوشحالی جو اللہ نے دی ہے یہ پھر بھی زائل ہوسکتی ہے، یہ باتیں اس کو یاد نہیں رہتیں، یہی ہے کہ نہ ماضی کو یاد رکھا نہ مستقبل کے متعلق کوئی فکر کیا، جو حال موجود ہے بس اسی پر ہی اپنی توجہ کو مرکوز کرکے یہ بےصبرا ہوجاتا ہے اور ناشکرا ہوجاتا ہے، اور اصل کامیاب انسان وہی ہوا کرتا ہے جو حال کو ہی مدنظر نہیں رکھتا بلکہ اپنے ماضی کو بھی یاد رکھتا ہے اور مستقبل کے متعلق بھی فکر کرتا ہے۔ اگر فی الحال موجودہ وقت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی کو رحمت حاصل ہے، اس کی مرضی کے مطابق عزت ہے، دولت ہے، اولاد ہے، جاہ ہے، خوشحالی کے حالات ہیں تو انسان کو اس پر تو اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے، اور اللہ تعالیٰ سے ہمیشہ ڈرتے رہنا چاہیے کہ کہیں اللہ کی گرفت میں آکر یہ چیزیں زائل نہ ہوجائیں، تو جس وقت وہ اس فکر میں رہے گا کہ یہ اللہ کی طرف سے زائل نہ ہوجائیں تو پھر وہ اترائے گا نہیں اکڑے گا نہیں، بلکہ اللہ کا شکرگزار رہے گا اور

اللہ تعالیٰ کی طرف نیاز مندی سے پیش آئے گا۔ اور ایسے ہی اگر تکلیف پہنچ گئی تو اس میں یہ توقع رکھنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ اس کو زائل کر دے گا، اللہ کی طرف سے یہ آزمائش ہے، تو صبر کے ساتھ وقت گزارنا چاہیے، تو ماضی اور مستقبل کے متعلق اگر اس قسم کے جذبات ہوں تو پھر انسان کا تعلق ہر وقت اللہ تعالیٰ کے ساتھ قائم رہ جاتا ہے، اور ماضی کو یاد نہ رکھنا کہ پہلے کوئی تکلیف پہنچی تھی اب اس کو بھول گئے کہ اب دوبارہ آ ہی نہیں سکتی، اسی طرح سے مستقبل کے متعلق مایوس ہو جانا اور وقتی حالات سے متاثر رہنا یہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ عدمِ تعلق کی علامت ہے، اور اللہ تعالیٰ یہاں یہی شکایت کرتے ہیں۔

آگے مستثنیٰ کیا ہے، اِلَّا الَّذِیْنَ صَبَرُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ: ہاں البتہ جو صبر کرتے ہیں، جنہوں نے صبر کی خصلت حاصل کر لی، صبر کا مفہوم آپ کے سامنے کئی دفعہ ذکر کیا گیا، کہ اصل اس کا مطلب ہوتا ہے "حَبْسُ النَّفْسِ عَلٰی مَا تَکْرَہُ" کہ نفس کو اس کی ناگواریوں پر پابند کرنا، یہ بہت عام مفہوم ہے، گناہ کی طرف نفس رغبت کرتا ہے اور اس کو چھوڑنا ناگوار ہوتا ہے تو اس کو پابند کر کے رکھو کہ وہ گناہ نہ کرنے پائے، نیکیوں کا کرنا ناگوار ہوتا ہے تو اس کو پابند کر کے رکھو کہ وہ نیکیاں کرے، مصیبت کا سہنا ناگوار ہوتا ہے شکوہ شکایت کرنے کو دل چاہتا ہے تو اس کو پابند کر کے رکھو کہ شکوہ شکایت نہ کرے، اتنے عام مفہوم کے تحت جس وقت آپ سوچیں گے تو صبر شریعت کے سارے احکام کو شامل ہو جاتا ہے، تو جن کو یہ صبر کی خصلت حاصل ہو گئی اور جو نیک عمل کرتے ہیں یہ ایسے نہیں، یہ نہ تو یئوس کفور کا مصداق ہیں، اور نہ ہی یہ فرحٌ فخور کا مصداق ہیں، مایوس بھی نہیں ہوتے ناشکرے بھی نہیں ہوتے، اور اللہ کی رحمت حاصل ہونے کے بعد اکڑتے اتراتے بھی نہیں، شیخیاں بھی نہیں مارتے، بلکہ ان کی کیفیت صبر اور شکر والی ہے کہ تکلیف آ گئی تو صبر کرتے ہیں اور اگر راحت حاصل ہو گئی تو اس کے اوپر اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں، دونوں صورتوں میں ہی اللہ تعالیٰ کے ساتھ امید کا تعلق رکھتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئندہ بھی رحمت حاصل ہوتی رہے گی، اور جو تکلیف ہے وہ دُور ہو جائے گی، اس طرح سے اللہ کے ساتھ اپنے تعلق کو لگائے رکھتے ہیں، یہ ہیں اَلَّذِیْنَ صَبَرُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ کا مصداق، انہی کے لئے مغفرت ہے اور انہی کے لئے اَجرِ کبیر ہے۔

سرورِ کائنات ﷺ کو تسلی

اگلی آیات کا تعلق سرورِ کائنات ﷺ کی تسلی کے ساتھ ہے، بایں معنیٰ کہ مکہ معظمہ میں رہتے ہوئے آپ کے سامنے وہ ماحول ہے کہ ساری دنیا باطل پہ ڈٹی ہوئی تھی اور سرورِ کائنات ﷺ بظاہر بے یار و مددگار اللہ کی آواز کو بلند کیے ہوئے تھے، سہارا اگر تھا تو اسی باطنی قوت کا تھا اللہ تعالیٰ کی جانب سے، باقی ظاہری طور کوئی اسباب موافق نہیں تھے، اور مشرکین کی طرف سے انتہائی تکلیفیں پہنچائی جاتی تھیں، ایسے وقت میں کبھی دل میں یہ خیال آ سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اگر ان کے بتوں کی اتنی مذمت نہ آئے یا یہ جس قسم کے معجزات مانگتے ہیں اور فرمائشیں کر کر کے مجھے پریشان کرتے ہیں اگر اس قسم کی فرمائشیں پوری کر دی جائیں تو شاید یہ لوگ کچھ سیدھے ہو ہی جائیں، ایسا خیال آ سکتا ہے، تو اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کو یہ تاکید کی ہے کہ آپ اپنے مسلک میں ڈھیلے نہ ہوں، یعنی ڈھیلے ہونے کا اندیشہ نہیں، پھر بھی تاکید کی، جس میں دوسروں کو مایوس کرنا مقصود ہے کہ تم یہ توقع ہی نہ رکھو کہ یہ

میرا رسول ڈھیلا ہو جائے گا، جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے قبل از وقت ہی اس قسم کی تاکید آجائے گی تو دوسروں کی امید قطع ہو جاتی ہے۔''شاید کہ آپ چھوڑنے والے ہیں مَا یُوْحٰۤی اِلَیْكَ کے بعض کو'' یعنی جو احکام آپ کی طرف بھیجے گئے ہیں، جن میں سے ایک بڑا حکم تبلیغِ توحید بھی ہے کہ توحید کی تبلیغ کیجیے، ایسا تو نہیں کہ آپ اس کو کسی وقت چھوڑ ہی بیٹھیں گے؟ اور اس کی وجہ سے آپ کا دل ہی تنگ ہو جائے گا؟ ضَآئِقٌۢ بِهٖ کی ہ ضمیر مَا یُوْحٰۤی کی طرف بھی لوٹ سکتی ہے، کہ اس قسم کے تاکیدی احکام جو آئے ہوئے ہیں تو کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ کا دل ان کی وجہ سے تنگ ہو جائے، کہ اتنی شدت کے ساتھ ان کے معبودوں کی مذمت جو آرہی ہے، اور ان کے آباؤ اجداد کو اس طرح سے جو گمراہ ٹھہرایا جا رہا ہے، اس کے ساتھ حالات ساز گار نہیں ہیں، تو تھوڑی دیر کے لئے اس کو مؤخر کر دیا جائے، یا اس میں کچھ نرمی اختیار کر لی جائے، کہیں آپ کے دل میں ایسے خیال تو نہیں آنے لگ جائیں گے؟ یہ استفہام کر کے گویا کہ روکنا ہی مقصود ہے کہ ایسا نہ ہونے پائے،''شاید کہ آپ چھوڑنے والے ہیں مَا یُوْحٰۤی اِلَیْكَ جو چیز آپ کی طرف وحی کی گئی اس کے بعض کو'' اس بعض کا مصداق وہی تبلیغِ توحید ہے،''اور تنگ ہونے والا ہے اِس مَا یُوْحٰۤی کی وجہ سے آپ کا سینہ'' کہ یہ آیات آپ کو ناگوار گزریں بایں معنی کہ ان کی وجہ سے سختی زیادہ ہوتی ہے، مخالفت زیادہ مول لینی پڑتی ہے۔ یہ تو بِهٖ کی ضمیر ہم نے مَا یُوْحٰۤی کی طرف لوٹا دی، مطلب اس طرح سے بھی صحیح ہے۔ اور اگر بِهٖ کی ضمیر کو مبہم رکھا جائے اور اَنْ یَّقُوْلُوْا کو اس کا بیان بنا لیا جائے تو یہ ترجمہ پہلے بھی کیا تھا''تنگ ہونے والا ہے آپ کا سینہ اس بات سے کہ وہ لوگ کہتے ہیں'' یعنی اس قسم کے طعنے سن سن کے آپ کا سینہ تنگ ہونے والا ہے، آپ کے دل کو تکلیف پہنچتی ہے، دل میں تنگی آتی ہے، کہ وہ لوگ کہتے ہیں کہ''ان کے اوپر کوئی خزانہ کیوں نہیں اتارا گیا؟ یا ان کے ساتھ کوئی فرشتہ کیوں نہیں آتا؟'' وہ سمجھتے تھے کہ جس طرح سے دنیا کے اندر کوئی بادشاہ ہوتا ہے وہ اپنی سکیمیں تبھی کامیاب کر سکتا ہے کہ اس کے پاس خرچ کرنے کے لئے خزانہ ہو، تو یہ اگر اللہ کی طرف سے نمائندہ بن کے آئے ہیں تو ان کے پاس بھی بہت بڑا خزانہ ہونا چاہیے کہ لوگوں کو دھڑا دھڑ دیں، خرچ کریں اور اس طرح سے اپنی جماعت کو منظم کریں، یا کوئی باطنی قوت ان کے ساتھ ہو کہ فرشتہ آئے اور لوگوں کو ڈرائے دھمکائے، لوگوں کے سامنے شہادت دے اور یہ کہے کہ اگر تم نہیں مانو گے تو یہ عذاب آجائے گا، تو ان کے ساتھ یہ فرشتہ کیوں نہیں آیا؟ ان کے اوپر یہ خزانہ کیوں نہیں اتارا گیا؟ یہ باتیں بھی کہیں آپ کے لئے دل کی تنگی کا باعث نہ بن جائیں، پھر یہ ہ ضمیر کی وضاحت ہو جائے گی اور ہ ضمیر مبہم ہوگی، ترجمہ دونوں طرح سے ٹھیک ہے، یعنی ضَآئِقٌۢ بِهٖ صَدْرُكَ کو ماقبل کے ساتھ لگا لیجئے کہ بِهٖ کی مَا یُوْحٰۤی کی طرف لوٹ رہی ہے، تو پھر ترجمہ یوں ہو جائے گا''شاید کہ آپ چھوڑنے والے ہیں جو کچھ آپ کی طرف وحی کیا گیا اس کے بعض کو، اور اس بعض کے ذریعے سے آپ کا دل تنگ ہونے والا ہے۔ یا ''آپ کا دل تنگ ہونے والا ہے اس بات کے سبب سے کہ لوگ کہتے ہیں کہ کیوں نہیں اتارا گیا اس کے اوپر خزانہ، یا کیوں نہیں آیا اس کے ساتھ کوئی فرشتہ؟ آپ تو نذیر ہیں، آپ کا منصب یہ ہے کہ ڈراتے رہیے، اللہ کی طرف سے جو احکام آئیں وہ پہنچاتے رہیے، ہر چیز کے اوپر ذمہ دار تو اللہ ہے، آپ متعین کیے ہوئے وکیل نہیں کہ اگر یہ لوگ نہیں مانیں گے تو آپ کے اوپر گرفت ہو جائے یا ان کو سیدھے راستے پر لانا زبردستی آپ کے ذمہ ٹھہرا دیا گیا ہو، ایسی بات نہیں۔

سَروَرِ کائنات ﷺ کا سب سے بڑا معجزہ قرآنِ کریم......اور اس کا کھلا چیلنج

اور آگے قرآنِ کریم جو رسول اللہ ﷺ کا سب سے بڑا معجزہ ہے اسی کی حقانیت بیان کی گئی، کئی دفعہ یہ مضمون آپ کے سامنے آگیا، کہ یہ لوگ کہتے ہیں کہ قرآنِ کریم کو اس نے خود گھڑ لیا، آپ فرما دیجیے کہ اگر یہ گھڑا ہوا ہے تو تم بھی تو گھڑ سکتے ہو، لے آؤ دس سورتیں اس جیسی، جو بنائی ہوئی ہوں، تراشی ہوئی ہوں، اکیلے تم نہیں، بلا لو ان سب کو اللہ کے علاوہ جن کو تم بلانے کی طاقت رکھتے ہو، یعنی اپنے معبودوں کو، اپنے شرکاء کو، اپنے شفعاء کو، جن کو تم نے اپنا فریادرس، مشکل کشا سمجھا ہوا ہے ان کو بھی بلا لو، اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ: اس کا مفہوم دو طرح سے ہوسکتا ہے، اگر تم اس بات میں سچے ہو کہ یہ قرآن میں نے بنایا ہے تو اس جیسی دس سورتیں لے آؤ، یا (مطلب ہے کہ) اگر تم اس بات میں سچے ہو کہ یہ شفعاء، شرکاء تمہارے کام آسکتے ہیں مشکل کے وقت میں تمہارا ہاتھ بٹا سکتے ہیں، اگر تم اس دعوے میں سچے ہو تو ان کو بھی ساتھ شامل کر لو، اور ان کو ساتھ شامل ہونا چاہیے، کیونکہ اس قرآنِ کریم کے آنے کے ساتھ سب سے زیادہ خطرہ تو انہی معبودوں اور شرکاء شفعاء کو ہے کہ ان کی خدائی بھی ختم ہو جائے گی اور ان پر بھی زوال آجائے گا، تو جس طرح سے تم زور لگا رہے ہو مقابلہ کرنے کے لئے تو ان کو بھی اپنے ساتھ شامل کر لو، وہ بھی تمہارے ساتھ شامل ہو جائیں۔ فَاِلَّمْ یَسْتَجِیْبُوْا لَكُمْ: اگر یہ تمہاری اس بات کو قبول نہ کریں، یعنی تمہارے کہنے کے مطابق یہ سورتیں بنا کے نہ لائیں تو فَاعْلَمُوْٓا: فقولوا لھم فاعلموا پھر تم انہیں کہہ دو، پھر انہیں کہہ دیجئے کہ یقین کر لو کہ یہ اللہ کے علم کے ساتھ اتارا گیا ہے، اس قرآن کے اندر کسی انسان کے علم یا انسان کی قدرت کا دخل نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کے علم اور قدرت کے ساتھ اتارا گیا ہے، اور اس بات کا بھی یقین کر لو کہ اللہ کے علاوہ کوئی دوسرا معبود نہیں، فَهَلْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ: یہ بھی تنبیہ کے لئے ہے۔ تو کیا پھر تم فرمانبردار بنتے ہو؟ یعنی اتنی واضح دلیل آجانے کے بعد بھی کیا تم فرمانبرداری اختیار کرتے ہو یا نہیں کرتے؟

عمل میں جان خلوص اور نیک نیّتی سے پڑتی ہے

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا: جو کوئی شخص دُنیوی زندگی کا ارادہ کرتا ہے اور دُنیوی زیب و زینت چاہتا ہے، یعنی اس کی دُنیا کی ساری کارروائی اور اس کی ساری کی ساری کوشش اس لیے ہے تا کہ دُنیوی زندگی میں اس کو زیب و زینت حاصل ہو جائے، دُنیا کا سامان حاصل ہو جائے نُوَفِّ اِلَيْهِمْ اَعْمَالَهُمْ فِيْهَا: تو ہم ان کو ان کے اعمال پورے ہی دے دیتے ہیں اسی دُنیا میں، یعنی جو کچھ وہ کرتے ہیں اس کا ثمرہ ان کو دُنیا میں ہی مل جاتا ہے، اور اس میں وہ کمی نہیں کیے جاتے، اللہ کی حکمت کے تحت جو جزا ان کے لئے ہوتی ہے، دُنیا میں عزت رزق کی صورت میں اللہ تعالیٰ دے دیتے ہیں، اور ان کے لئے آخرت میں پھر سوائے آگ کے کچھ نہیں، اور جو کارروائیاں یہ کرتے ہیں آخرت میں سب ضائع ہوں گی، یعنی صورۃً نیک اعمال جو کرتے ہیں وہ سب آخرت میں ضائع ہو جائیں گے، اور اس وقت بھی وہ باطل اور بے اثر ہیں، ان کے اندر کوئی چیز نہیں، چونکہ خلوص نہیں، نیک نیتی نہیں، عمل کے اندر جان اگر پڑتی ہے تو خلوص اور نیک نیتی کے ساتھ پڑتی ہے، اللہ کی رضا کے جذبے سے پڑتی ہے جب اللہ کے رضا کا جذبہ نہیں

خلوص نہیں تو ایسی صورت میں وہ اعمال فی الحال بھی حق نہیں بلکہ باطل ہی ہیں۔ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا سے مراد کفار بھی ہیں جو آخرت کے قائل ہی نہیں، کفار بھی بعض نیکیاں کرتے ہیں، یتیم پروری، غریب پروری، صلہ رحمی اور اس قسم کے دوسرے نیک کام، اور اس سے ان کا مقصد ہوتا ہے دنیا کے اندر عزت حاصل کرنا جاہ حاصل کرنا اور دنیا کے اندر دوسری راحتیں حاصل کرنا، تو اللہ فرماتے ہیں کہ ان کے یہ اعمال جو بے جان قسم کے اعمال ہیں تو ان کے اعمال دنیا میں پورے کر دیے جاتے ہیں اور آخرت میں یہ سارے کے سارے ضائع ہوں گے، اور دنیا میں جو کچھ دینا ہے اللہ تعالیٰ ان کو دے دیتے ہیں اور اس میں کمی نہیں کرتے، جو ان کے لئے مقدر ہوتا ہے وہ پورا پورا ان کو ادا کر دیا جاتا ہے، تو اس کا مصداق کافر بھی ہو سکتے ہیں۔ اور اس کا مصداق ریا کار مسلمان بھی ہو سکتے ہیں، تفسیروں کے اندر یہ قول بھی نقل کیا گیا ہے، ریا کار مسلمان! کہ کرتا ہو ہے نیکی لیکن اس سے اللہ کی رضا مطلوب نہیں بلکہ وہ دُنیا کے فوائد حاصل کرنا چاہتا ہے، جس طرح سے حدیث شریف میں آتا ہے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ سرورِ کائنات ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے تین آدمی پیش ہوں گے جن میں سے ایک مجاہد ہے اور ایک قاریٔ قرآن اور ایک سخی، مال خرچ کرنے والا، تو اللہ تعالیٰ مجاہد سے پوچھیں گے کہ میں نے تجھے اتنی نعمتیں دی تھیں تُو نے میرے لیے کیا عمل کیا؟ تو وہ کہے گا کہ میں نے تیرے راستے میں جہاد کیا حتیٰ کہ میں شہید کر دیا گیا، اللہ تعالیٰ فرمائیں گے تُو جھوٹ کہتا ہے، غلط کہتا ہے، تُو تو اس لیے لڑتا تھا تا کہ لوگوں میں تیری بہادری کا چرچا ہو، اور بہادری کا چرچا ہو گیا، جو تیرا مقصد تھا تجھے دُنیا میں حاصل ہو گیا، تُو شہرت چاہتا تھا شہرت حاصل ہو گئی، اب تیرے لیے یہاں کچھ نہیں، اور حکم دیا جائے گا، اس کو اُٹھا کے جہنم میں پھینک دیں گے۔ قاریٔ قرآن سے پوچھا جائے گا کہ تجھے اتنی نعمتیں دی تھیں، تُو نے کیا کیا؟ وہ کہے گا: یا اللہ! میں نے تیرا قرآن پڑھا، پڑھایا، دین سیکھا اور سکھایا، اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ نہیں، میرے لیے تو تُو نے کچھ نہیں کیا، تُو تو قاری مشہور ہونا چاہتا تھا، عالم مشہور ہونا چاہتا تھا، یہ شہرت چاہتا تھا تجھے شہرت مل گئی، جو تیرا مقصود تھا تجھے دے دیا گیا، پھر اس کو بھی جہنم میں پھینک دیا جائے گا۔ اور یہی صورت سخی کے ساتھ پیش آئے گی وہ کہے گا کہ میں نے تیرے راستے میں خرچ کیا، جہاں مجھے پتا چلتا تھا کہ تجھے خرچ کرنا پسند ہے میں وہیں خرچ کرتا تھا، تو اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ نہیں، تُو نے مجھے خوش کرنا تو چاہا ہی نہیں، تُو تو یہ مشہور ہونا چاہتا تھا کہ فلاں بڑا سخی ہے، شہرت چاہتا تھا شہرت تجھے مل گئی، پھر اس کو بھی جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔[1] اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر نیت کے اندر خلوص نہیں تو ظاہری صورت میں کتنا ہی اچھا عمل کیوں نہ ہو، آخرت میں اس کے اوپر ثواب مرتب نہیں ہوگا، بلکہ وہ عمل ضائع ہو جائے گا، جیسا کہ متفق علیہ روایت ''مشکوٰۃ شریف'' میں پہلے نمبر پر ہی آپ نے پڑھی ''اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ''، اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ اعمال کا مدار نیت پر ہے، نیت اچھی ہوگی تو اللہ تعالیٰ کے ہاں اجر و ثواب ملے گا، اگر نیت اچھی نہیں تو اجر و ثواب نہیں ملے گا، تو مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا کے اندر ریا کار مسلمان کے لئے بھی مذمت آسکتی ہے، ہاں! البتہ فرق یہ ہوگا کہ یہاں آیا اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ، کافروں کے لئے یہ نار دائمی ہوگی، اور ریا کار کے لئے نار ہوگی تو سہی لیکن اگر اللہ اپنی رحمت سے معاف کر دیں

---

(۱) مسلم ۲/ ۱۴۰ باب من قاتل للریاء/ ترمذی ۲/ ۶۳ باب ما جاء فی الریاء/ مشکوٰۃ ص ۳۳، کتاب العلم فصل اول۔

ایسا بھی ہوسکتا ہے، اور اگر معاف نہ کیا، جہنم میں جانا پڑ ہی گیا، تو کچھ عرصے کے بعد نجات ہو جائے گی، جیسے کہ قرآن کریم کی بہت ساری آیات اور بہت ساری روایات اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ مؤمن آخر کار نجات پا جائے گا، کافر کے لئے آگ دائمی ہوگی۔

’’بَیِّنَۃٍ‘‘ اور ’’شَاہِدٌ‘‘ کا مصداق کیا ہے؟

اَفَمَنْ کَانَ عَلٰی بَیِّنَۃٍ: اب یہاں دونوں فریقوں کا فرق بیان کیا جا رہا ہے کہ بعض لوگ تو ہیں جنہوں نے صحیح راستہ پالیا، اور بعض ایسے ہیں جو صحیح راستے پر نہیں ہیں، تو اَفَمَنْ کَانَ کا مدمقابل دوسرا محذوف نکال لیا جائے گا۔ ’’کیا یہ شخص اس شخص کی طرح ہے جو ایسا نہیں؟‘‘ یعنی دونوں کا حال ایک جیسا نہیں، جیسے کہ رکوع کے آخر میں بھی آئے گا۔ بَیِّنَۃٍ کے دو مصداق آپ کے سامنے ذکر کردیے گئے، کہ یا تو بینہ سے وہ صاف اور واضح راستہ مراد ہے جو فطرتِ صحیحہ کی دلالت سے انسان معلوم کرتا ہے، اور اس کے اوپر اللہ کی طرف سے گواہ آگیا قرآنِ کریم، اور اس کے اوپر اس سے پہلے کتابِ موسیٰ بھی دال ہے، تو جو اس فطری راستے پر ہیں، پھر قرآنِ کریم سے استدلال کرتے ہیں اور موسیٰ علیہ السلام کی کتاب سے تائید حاصل کرتے ہیں ان کی شہادت کا اعتبار کرتے ہیں تو یہی ہیں صحیح معنی میں اس قرآنِ کریم پر ایمان لانے والے۔ اور بَیِّنَۃٍ کا مصداق قرآنِ کریم بھی ہوسکتا ہے پھر شَاہِدٌ مِّنْہُ کا معنی ہوگا خود قرآنِ کریم سے ہی گواہ موجود ہے، یعنی اس کے حق ہونے کی گواہی ایک تو خود اس میں موجود ہے جس طرح سے کہتے ہیں کہ ’’آفتاب آمد دلیلِ آفتاب‘‘ کہ سورج خود اپنی دلیل آپ ہے، تو یہ قرآنِ کریم بھی اپنے حق ہونے کی دلیل آپ ہے، اس کے اندر اللہ نے جو اعجاز کی صفت رکھی ہے اس اعجاز کی صفت کے ساتھ ثابت ہوتا ہے کہ واقعی یہ اللہ کی کتاب ہے، اور جس راستے پر یہ دلالت کرتی ہے وہ واضح راستہ ہے، اور اس سے پہلے موسیٰ علیہ السلام کی کتاب جو اِمام اور رحمت کا مصداق ہے وہ بھی اس کتاب اللہ کے حق ہونے کی دلیل ہے، تو جو لوگ اس بینہ پر قائم ہیں یہی اس پر صحیح طور پر ایمان رکھتے ہیں، ’’اور اَحزاب میں سے جو کوئی اس قرآن کا انکار کرے گا تو جہنم اس کا ٹھکانا ہے‘‘ اَحزاب کو یہاں عام ذکر کردیا، جس میں اس بات کی طرف اشارہ کردیا کہ سرورِ کائنات ﷺ کے تشریف لے آنے کے بعد اور اس کتاب کے نازل ہوجانے کے بعد اب دوسرا کوئی طریقِ نجات نہیں، اب چاہے کوئی موسیٰ علیہ السلام کو ماننے والا ہو چاہے کوئی عیسیٰ علیہ السلام کو ماننے والا ہو یا کوئی دِین کا دوسرا طریقہ اختیار کرنے والا ہو جتنے یہ احزاب ہیں جب تک یہ اس قرآنِ کریم پر ایمان نہیں لائیں گے اور اس موجودہ رسول کو نہیں مانیں گے ان کے لئے نجات نہیں ہے، احادیث کے اندر اس مضمون کو صراحت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ فَلَا تَکُ فِیْ مِرْیَۃٍ مِّنْہُ: تَکُ کا خطاب حضور ﷺ کو ہے، سنانا باقیوں کو مقصود ہے۔ آپ اس قرآنِ کریم کی طرف سے شک میں نہ ہوں، یہ بالکل سچی بات ہے، آپ کے رَبّ کی طرف سے آئی ہے، لیکن اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے۔

اہلِ جہنم کے کچھ اَحوال

’’کون بڑا ظالم ہے اس سے جو اللہ پر جھوٹ گھڑے‘‘ کہ اللہ کی بات نہ ہو اور اس کی طرف منسوب کردے، یہی لوگ جو اللہ کے اوپر اِفترا کرتے ہیں، قرآنِ کریم کو مانتے نہیں، ’’پیش کیے جائیں گے اپنے رَبّ کے سامنے اور گواہ کہیں گے‘‘ گواہی

دینے والوں سے انبیاء علیہم السلام بھی مراد ہو سکتے ہیں، کاتب اعمال فرشتے بھی مراد ہو سکتے ہیں، ''وہ کہیں گے کہ یہی لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رَبّ پر جھوٹ بولا تھا، خبردار! اللہ کی لعنت ظالموں پر، اور یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ کے راستے سے روکتے ہیں اور اللہ کے راستے میں کجیاں تلاش کرتے ہیں'' اعتراض پیدا کرتے ہیں، لوگوں کے سامنے ٹیڑھ پیدا کرتے ہیں، یعنی اعتراض کی باتیں تلاش کر کر کے لوگوں کے سامنے ذکر کرتے ہیں کہ دیکھو! اس میں یہ غلطی ہے، یہ غلطی ہے، اس طرح سے گمراہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں، ''طلب کرتے اس راستے کے اندر کجی، اور وہ آخرت کا انکار کرنے والے ہیں، یہ لوگ عاجز کرنے والے نہیں زمین میں، اور نہیں ہے ان کے لئے اللہ کے علاوہ کوئی مددگار'' اولیاء ولی کی جمع ہے، ''ان کے لئے عذاب کو بڑھایا جائے گا'' یعنی ایک تو کفر کا عذاب اور دوسرے صدعن سبیل اللہ، اللہ کے راستے سے روکنے کا عذاب، جیسے جیسے ان کا یہ گمراہ کرنے کا سلسلہ جاری رہے گا اسی طرح سے عذاب میں اضافہ ہوگا، ''یہ سننے کی طاقت نہیں رکھتے تھے نہ یہ دیکھتے تھے'' یعنی ضد اور عناد ان کے دل میں اتنا تھا کہ حق بات سننے کی ان میں طاقت نہیں تھی، استعداد کو یوں ضائع کر بیٹھے، اور نہ یہ حق دیکھتے تھے، ''یہی لوگ ہیں جنہوں نے اپنے آپ کو خسارے میں ڈال دیا، اور گم ہوگئیں ان سے وہ باتیں جو تراشا کرتے تھے'' جو اپنی حقانیت کی بڑی دلیلیں دیا کرتے تھے کہ آخرت نہیں ہوگی، یہ اللہ کے شرکاء ہیں، شفعاء ہیں، مشکل کے وقت میں ہمارے کام آتے ہیں، جتنی باتیں اس قسم کی کیا کرتے تھے سب ان سے گم ہوگئیں۔ لَا جَرَمَ: اَیْ لَا مَحَالَۃَ یہ پکی بات ہے جس میں کوئی کسی قسم کی شک نہیں، کہ یہ لوگ آخرت میں سب سے زیادہ خسارہ پانے والے ہیں۔

اہلِ اِیمان کا ذِکر

آگے فریق ثانی کا ذکر کر دیا، جیسا کہ کتاب اللہ کی عادت ہے کہ جب ایک فریق کا ذکر ہوتا ہے تو ساتھ دوسرے کا ذکر بھی کر دیا جاتا ہے، کیونکہ ضد کے سامنے آنے کے ساتھ چیز کی حقیقت کھلتی ہے، بِضِدِّهَا تَتَبَيَّنُ الْاَشْيَاءُ، تُعْرَفُ الْاَشْيَاءُ بِأَضْدَادِهَا۔ ''بیشک وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے اور وہ اپنے رَبّ کی طرف جھک گئے'' رَبّ کی طرف مائل ہوگئے، ایمان بھی ہوگیا، عمل صالح بھی ہوگیا، پھر اخلاص بھی حاصل کر لیا، اِخبات کے اندر اسی اخلاص کی طرف اشارہ ہے۔ ''یہی لوگ جنت والے ہیں، اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں۔''

دونوں فریقوں کی مثال

''دونوں فریقوں کی مثال ایسے ہے جیسے ایک شخص تو اندھا اور بہرہ ہو جو نہ دیکھتا ہے اور نہ سنتا ہے اور دوسرا بصیر اور سمیع ہو'' جس نے حق کو پا لیا، صحیح راستے پر آ گیا وہ تو بصیر اور سمیع کی طرح ہے، اور جس نے حق کو نہیں پایا وہ اندھے اور بہرے کی طرح ہے، دونوں کا حال ایسا ہے، ''تو کیا حال کے اعتبار سے دونوں فریق برابر ہو سکتے ہیں'' یعنی نہیں ہو سکتے، اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ: کیا تم نصیحت حاصل نہیں کرتے؟

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖۤ ۚ اِنِّیْ لَكُمْ نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ ﴿۲۵﴾ اَنْ

البتہ تحقیق ہم نے بھیجا نوح علیہ السلام کو ان کی قوم کی طرف، بے شک میں تمہارے لیے کھلم کھلا ڈرانے والا ہوں ﴿۲۵﴾ یہ (پیغام دے کر

لَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّا اللّٰهَ ؕ اِنِّیْۤ اَخَافُ عَلَیْكُمْ عَذَابَ یَوْمٍ اَلِیْمٍ ﴿۲۶﴾ فَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ

بھیجا) کہ نہ عبادت کرو تم مگر اللہ کی، بے شک میں تم پر خوف کرتا ہوں دردناک دن عذاب کا ﴿۲۶﴾ کہا ان سرداروں نے جنہوں نے

كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا وَ مَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِیْنَ هُمْ

کفر کیا تھا نوح علیہ السلام کی قوم میں سے، نہیں دیکھتے ہم تجھے مگر اپنے جیسا بشر اور نہیں دیکھتے ہم تجھے کہ تیری پیروی کی ہو مگر ان لوگوں نے

اَرَاذِلُنَا بَادِیَ الرَّاْیِ ۚ وَ مَا نَرٰى لَكُمْ عَلَیْنَا مِنْ فَضْلٍۭ بَلْ نَظُنُّكُمْ كٰذِبِیْنَ ﴿۲۷﴾

جو ہم میں سے گھٹیا ہیں (پیروی کی) سرسری رائے میں، اور نہیں دیکھتے ہم تمہارے لیے اپنے پر کوئی فضیلت، بلکہ ہم تمہیں جھوٹا سمجھتے ہیں ﴿۲۷﴾

قَالَ یٰقَوْمِ اَرَءَیْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَیِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّیْ وَ اٰتٰىنِیْ

نوح علیہ السلام نے کہا اے میری قوم! تم یہ بتلاؤ اگر میں اپنے رَبّ کی طرف سے ایک واضح دلیل پر قائم ہوں اور اس نے اپنے پاس سے

رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِهٖ فَعُمِّیَتْ عَلَیْكُمْ ؕ اَنُلْزِمُكُمُوْهَا وَ اَنْتُمْ لَهَا كٰرِهُوْنَ ﴿۲۸﴾

مجھے رحمت عطا کی ہو اور وہ تم پر مخفی رکھی گئی ہو، کیا وہ رحمت ہم تمہیں چمٹا دیں؟ حالانکہ تم اس سے نفرت کرنے والے ہو ﴿۲۸﴾

وَ یٰقَوْمِ لَاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَیْهِ مَالًا ؕ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ وَ مَاۤ اَنَا بِطَارِدِ الَّذِیْنَ

اے میری قوم! میں تم سے اس تبلیغ پر مال کا مطالبہ نہیں کرتا، نہیں ہے میرا اُجر مگر اللہ کے ذِمّے، اور نہیں ہوں میں دُور ہٹانے والا ان

اٰمَنُوْا ؕ اِنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَ لٰكِنِّیْۤ اَرٰىكُمْ قَوْمًا

لوگوں کو جو ایمان لے آئے، بے شک وہ اپنے رَبّ سے ملاقات کرنے والے ہیں، لیکن میں دیکھتا ہوں تم کو ایسے لوگ جو

تَجْهَلُوْنَ ﴿۲۹﴾ وَ یٰقَوْمِ مَنْ یَّنْصُرُنِیْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ طَرَدْتُّهُمْ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۳۰﴾

جہالتیں کرتے ہیں ﴿۲۹﴾ اے میری قوم! اللہ کے مقابلے میں میری کون مدد کرے گا اگر میں نے ان کو دُور ہٹا دیا، کیا تم سوچتے نہیں ہو؟ ﴿۳۰﴾

وَ لَاۤ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِیْ خَزَآىِٕنُ اللّٰهِ وَ لَاۤ اَعْلَمُ الْغَیْبَ وَ لَاۤ اَقُوْلُ اِنِّیْ مَلَكٌ وَّ لَاۤ اَقُوْلُ

اور میں نہیں کہتا تمہیں کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں اور نہ میں غیب جانتا ہوں اور نہ میں کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں، اور نہیں کہتا

لِلَّذِيْنَ تَزْدَرِيْٓ اَعْيُنُكُمْ لَنْ يُّؤْتِيَهُمُ اللّٰهُ خَيْرًا ؕ اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا

میں ان لوگوں کے متعلق جن کو تمہاری آنکھیں حقیر سمجھتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کو ہرگز کوئی بھلائی نہیں دے گا، اللہ بہتر جانتا ہے اس چیز کو

فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ ۚۖ اِنِّيْٓ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۳۱﴾ قَالُوْا يٰنُوْحُ قَدْ جٰدَلْتَنَا

جو ان کے دلوں میں ہے، بیشک میں تب ظالموں میں سے ہو جاؤں گا ﴿۳۱﴾ وہ کہنے لگے اے نوح! بے شک تو نے ہمارے ساتھ جھگڑا کیا

فَاَكْثَرْتَ جِدَالَنَا فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۳۲﴾ قَالَ

پھر بہت جھگڑا کیا، لے آ تو ہمارے پاس وہ چیز جس سے تو ہمیں ڈراتا ہے اگر تو سچوں میں سے ہے ﴿۳۲﴾ نوح علیہ السلام نے کہا کہ

اِنَّمَا يَاْتِيْكُمْ بِهِ اللّٰهُ اِنْ شَآءَ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ﴿۳۳﴾ وَلَا يَنْفَعُكُمْ

سوائے اس کے نہیں کہ لائے گا اس عذاب کو تمہارے پاس اللہ اگر چاہے گا تو اور تم عاجز کرنے والے نہیں ہو ﴿۳۳﴾ اور نہیں نفع دے گی تمہیں

نُصْحِيْٓ اِنْ اَرَدْتُّ اَنْ اَنْصَحَ لَكُمْ اِنْ كَانَ اللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يُّغْوِيَكُمْ ؕ هُوَ رَبُّكُمْ ۫

میری خیر خواہی اگر میں ارادہ کروں کہ تم سے خیر خواہی کروں اگر اللہ تعالیٰ کا ارادہ یہ ہو کہ تمہیں گمراہی میں ڈال دے، وہ تمہارا رب ہے،

وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۳۴﴾ اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ اِنِ افْتَرَيْتُهٗ فَعَلَيَّ

اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے ﴿۳۴﴾ یا یہ لوگ کہتے ہیں اس نے اس کو گھڑ لیا؟ آپ کہہ دیجیے کہ اگر میں نے اس کو گھڑ لیا ہے تو میرا جرم کرنا

اِجْرَامِيْ وَاَنَا بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُجْرِمُوْنَ ﴿۳۵﴾ وَاُوْحِيَ اِلٰى نُوْحٍ اَنَّهٗ

میرے پر واقع ہوگا اور میں لاتعلق ہوں تمہارے جرم کرنے سے ﴿۳۵﴾ نوح علیہ السلام کی طرف وحی کر دی گئی کہ بے شک بات یہ ہے کہ

لَنْ يُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ﴿۳۶﴾ وَاصْنَعِ الْفُلْكَ

ہرگز ایمان نہیں لائے گا تیری قوم میں سے مگر جو ایمان لا چکا، پس تو غمگین نہ ہو ان کاموں کی وجہ سے جو وہ کرتے ہیں ﴿۳۶﴾ کشتی بنا لے

بِاَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا وَلَا تُخَاطِبْنِيْ فِي الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۚ اِنَّهُمْ

ہماری آنکھوں کے سامنے اور ہماری وحی کے مطابق اور مجھے خطاب نہ کرنا ان لوگوں کے بارے میں جنہوں نے ظلم کیا، بے شک وہ

مُّغْرَقُوْنَ ﴿۳۷﴾ وَيَصْنَعُ الْفُلْكَ ۫ وَكُلَّمَا مَرَّ عَلَيْهِ مَلَاٌ مِّنْ قَوْمِهٖ سَخِرُوْا مِنْهُ ؕ

غرق کیے جائیں گے ﴿۳۷﴾ نوح علیہ السلام کشتی بناتے تھے اور جب بھی گزرتے ان پر ان کی قوم کے وڈیرے تو وہ نوح علیہ السلام سے ٹھٹھا کرتے،

قَالَ اِنْ تَسْخَرُوْا مِنَّا فَاِنَّا نَسْخَرُ مِنْكُمْ كَمَا تَسْخَرُوْنَ ﴿۳۸﴾ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ

نوح علیہ السلام فرماتے کہ اگر تم ہم سے ٹھٹھا کرتے ہو تو ہم تم سے ٹھٹھا کرتے ہیں جیسے تم ٹھٹھا کرتے ہو ﴿۳۸﴾ تم عنقریب جان لوگے کون ہے

يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ وَيَحِلُّ عَلَيْهِ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ﴿۳۹﴾

وہ شخص کہ جس کے پاس عذاب آجاتا ہے جو اس کو رُسوا کر کے رکھ دے گا اور اُتر پڑے گا اس کے اوپر ٹھہرنے والا عذاب ﴿۳۹﴾

حَتّٰۤى اِذَا جَآءَ اَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُّوْرُ ۙ قُلْنَا احْمِلْ فِيْهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ

(یونہی حالات چلتے رہے) حتیٰ کہ جب ہمارا حکم آ گیا اور تنور نے جوش مارا ہم نے کہا کہ اُٹھالے اس کشتی میں ہر چیز سے نَر اور مادہ یعنی دو دو فرد

وَاَهْلَكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ وَمَنْ اٰمَنَ ؕ وَمَاۤ

اور اپنے گھر والوں کو اُٹھالے سوائے اس شخص کے جس کے اُوپر بات سبقت لے گئی اور اُٹھالے ان لوگوں کو جو ایمان لائے، اور نہیں

اٰمَنَ مَعَهٗۤ اِلَّا قَلِيْلٌ ﴿۴۰﴾ وَقَالَ ارْكَبُوْا فِيْهَا بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا

ایمان لائے نوح علیہ السلام پر مگر تھوڑے سے لوگ ﴿۴۰﴾ اور نوح علیہ السلام نے کہا کہ سوار ہو جاؤ اس کشتی میں، اللہ کے نام کے ساتھ ہی اس کا چلنا ہے

وَمُرْسٰىهَا ؕ اِنَّ رَبِّيْ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۴۱﴾ وَهِيَ تَجْرِيْ بِهِمْ فِيْ مَوْجٍ

اور اس کا ٹھہرنا ہے، بے شک میرا رَبّ البتہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے ﴿۴۱﴾ وہ کشتی چلتی تھی ان لوگوں کے ساتھ ایسی موجوں میں جو

كَالْجِبَالِ ۟ وَنَادٰى نُوْحُ ا۟بْنَهٗ وَكَانَ فِيْ مَعْزِلٍ يّٰبُنَيَّ ارْكَبْ مَّعَنَا

پہاڑوں کی طرح تھیں، آواز دی نوح علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو اور وہ ایک جدا جگہ میں تھے اے میرے بیٹے! ہمارے ساتھ سوار ہو جا

وَلَا تَكُنْ مَّعَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۴۲﴾ قَالَ سَاٰوِيْۤ اِلٰى جَبَلٍ يَّعْصِمُنِيْ مِنَ الْمَآءِ ؕ قَالَ

اور تو کافروں کے ساتھ نہ رہ ﴿۴۲﴾ وہ بولا کہ میں عنقریب ٹھکانا لے لوں گا پہاڑ کی طرف وہ مجھے پانی سے بچالے گا، نوح علیہ السلام نے کہا کہ

لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ ۚ وَحَالَ بَيْنَهُمَا الْمَوْجُ

آج کوئی بچانے والا نہیں اللہ کے حکم سے مگر وہی بچے گا جس پر اللہ رحم کرے گا، اور حائل ہوگئی ان دونوں کے درمیان میں موج،

فَكَانَ مِنَ الْمُغْرَقِيْنَ ﴿۴۳﴾ وَقِيْلَ يٰۤاَرْضُ ابْلَعِيْ مَآءَكِ وَيٰسَمَآءُ اَقْلِعِيْ وَغِيْضَ

پس وہ بیٹا بھی ڈبوئے ہوئے لوگوں میں سے ہو گیا ﴿۴۳﴾ کہہ دیا گیا اے زمین! نگل لے اپنا پانی اور اے آسمان! رُک جا، پانی

الْمَآءُ وَقُضِيَ الْاَمْرُ وَاسْتَوَتْ عَلَى الْجُوْدِيِّ وَقِيْلَ بُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۴﴾

خشک کر دیا گیا، معاملہ طے ہو گیا، اور وہ کشتی جودی پہاڑ پر جا ٹھہری، اور کہہ دیا گیا ظالم لوگوں کے لئے دُوری ہے ﴿۴۴﴾

وَنَادٰى نُوْحٌ رَّبَّهٗ فَقَالَ رَبِّ اِنَّ ابْنِيْ مِنْ اَهْلِيْ وَاِنَّ وَعْدَكَ الْحَقُّ وَاَنْتَ

نوح علیہ السلام نے اپنے رَبّ کو پکارا، پس کہا اے میرے رَبّ! بیشک میرا بیٹا میرے اہل سے ہے اور بے شک تیرا وعدہ سچا ہے اور تو

اَحْكَمُ الْحٰكِمِيْنَ ﴿۴۵﴾ قَالَ يٰنُوْحُ اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ ۚ اِنَّهٗ

تمام حکم دینے والوں میں سے بڑا حکم دینے والا ہے ﴿۴۵﴾ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے نوح! وہ تیرے اہل میں سے نہیں، بے شک اس

عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ ۖ فَلَا تَسْـَٔلْنِ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۗ اِنِّيْۤ اَعِظُكَ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ

کا کردار اچھا نہیں ہے، مجھ سے سوال نہ کر ایسی چیز کا جس کی حقیقت تجھے معلوم نہیں، بے شک میں تجھے نصیحت کرتا ہوں کہ تُو نادانوں

الْجٰهِلِيْنَ ﴿۴۶﴾ قَالَ رَبِّ اِنِّيْۤ اَعُوْذُ بِكَ اَنْ اَسْـَٔلَكَ مَا لَيْسَ

میں سے نہ ہونا ﴿۴۶﴾ نوح علیہ السلام نے کہا کہ اے میرے رَبّ! بیشک میں پناہ پکڑتا ہوں تیری کہ میں پوچھوں تجھ سے ایسی چیز جس کے

لِيْ بِهٖ عِلْمٌ ۗ وَاِلَّا تَغْفِرْ لِيْ وَتَرْحَمْنِيْۤ اَكُنْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۴۷﴾ قِيْلَ

متعلق مجھے علم نہیں، اگر تُو مجھے نہیں بخشے گا اور تُو میرے پہ رحم نہیں کرے گا تو میں خسارہ پانے والوں میں سے ہو جاؤں گا ﴿۴۷﴾ کہہ دیا گیا

يٰنُوْحُ اهْبِطْ بِسَلٰمٍ مِّنَّا وَبَرَكٰتٍ عَلَيْكَ وَعَلٰۤى اُمَمٍ مِّمَّنْ

کہ اے نوح! اُتر جا ہماری طرف سے سلامتی اور برکات کے ساتھ تجھ پر بھی اور ان جماعتوں پر بھی جو ان لوگوں میں سے ہیں جو

مَّعَكَ ۗ وَاُمَمٌ سَنُمَتِّعُهُمْ ثُمَّ يَمَسُّهُمْ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۴۸﴾

تیرے ساتھ ہیں، اور کچھ جماعتیں ایسی ہوں گی کہ ہم انہیں کچھ فائدہ پہنچائیں گے پھر انہیں ہماری طرف سے دردناک عذاب پہنچے گا ﴿۴۸﴾

تِلْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهَاۤ اِلَيْكَ ۚ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَاۤ اَنْتَ

یہ غیب کی خبروں میں سے ہے، ہم ان خبروں کو آپ کی طرف وحی کرتے ہیں، نہیں جانتے تھے آپ ان خبروں کو نہیں جانتے تھے

وَلَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا ۛ فَاصْبِرْ ۛ اِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿۴۹﴾ ع

اور نہ آپ کی قوم جانتی تھی اس سے قبل، آپ بھی مستقل مزاج رہیے، بیشک اچھا انجام متقین کے لئے ہی ہے ﴿۴۹﴾

خلاصہ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰی قَوْمِہٖٓ: وَلَقَدْ: البتہ تحقیق، یعنی یہ بات جو ذکر کی جارہی ہے یہ مؤکد ہے، پختہ ہے، جس میں کوئی شک شبہ کی گنجائش نہیں، یہ لام دال برقسم ہوتا ہے، ''ہم نے بھیجا نوح علیہ السلام کو ان کی قوم کی طرف'' اِنِّیْ لَکُمْ نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ اور اِنِّیْٓ اَخَافُ عَلَیْکُمْ عَذَابَ یَوْمٍ اَلِیْمٍ یہ حضرت نوح علیہ السلام کا قول ہے، اور اَنْ لَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰہَ اس کے اوپر باء حرف جار مقدر ہے، یہ اَرْسَلْنَا کے متعلق ہے، اَرْسَلْنَا بِاَنْ لَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰہَ، یہ پیغام دے کر بھیجا کہ تم اللہ کے علاوہ کسی دوسرے کی عبادت نہ کرو، نہ عبادت کرو تم مگر اللہ کی، اور نوح علیہ السلام نے کہا اِنِّیْ لَکُمْ نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ: بیشک میں تمہارے لئے کھلم کھلا ڈرانے والا ہوں، اِنِّیْٓ اَخَافُ عَلَیْکُمْ عَذَابَ یَوْمٍ اَلِیْمٍ: بیشک میں تم پر دردناک دن کے عذاب کا اندیشہ کرتا ہوں، خوف کرتا ہوں دردناک دن کے عذاب کا، یا یوں ترجمہ کرلیجئے ''البتہ تحقیق بھیجا ہم نے نوح علیہ السلام کو ان کی قوم کی طرف، اور نوح علیہ السلام نے اپنی قوم سے یہ کہا'' اور اس کے تحت یہ تینوں جملے آجائیں گے، لیکن چونکہ اَنْ لَّا تَعْبُدُوْٓا کے اوپر ''اَنْ'' آیا ہوا ہے اس لئے ''بیان القرآن'' میں اسی ترکیب کو ترجیح دی گئی ہے کہ یہ باء کا مجرور ہو کر اَرْسَلْنَا کے متعلق ہے کہ ہم نے یہ پیغام دے کر بھیجا کہ لَا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰہَ۔ فَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا: مَلَا کا لفظ آپ کے سامنے پہلے کئی دفعہ گزر گیا، یہ قوم کے چوہدری، وڈیرے، لیڈر قسم کے لوگ، قائد قسم کے لوگوں پر بولا جاتا ہے، صاحب اقتدار طبقہ، قوم کے اندر برادری کے اندر جو بڑے لوگ ہوتے ہیں جن کا عام طور پر حکم چلتا ہے اور لوگ ان کے احکام پر عمل کیا کرتے ہیں، وہ مَلَا کا مصداق ہیں، ''کہا ان سرداروں نے، ان وڈیروں نے جنہوں نے کفر کیا تھا نوح علیہ السلام کی قوم میں سے'' مَا نَرٰىکَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا: نہیں دیکھتے ہم تجھے مگر اپنے جیسا انسان، اپنے جیسا بشر، وَمَا نَرٰىکَ اتَّبَعَکَ: اور نہیں دیکھتے ہم تجھے کہ تیری پیروی کی ہو مگر ان لوگوں نے جو ہم میں سے گھٹیا ہیں، ھُمْ اَرَاذِلُنَا: اراذل ارذل کی جمع ہے، رذیل جس کو آپ کمینہ کہتے ہیں، کمینے کا بھی یہی معنی ہوتا ہے، کمین: چھوٹا، چھوٹے قسم کے لوگ، معاشرے کے اندر جو پست درجے کے سمجھے جاتے ہیں، محنت مزدوری کرنے والے، اراذل سے وہی گھٹیا لوگ مراد ہیں، ''نہیں دیکھتے ہم تجھے کہ پیروی کی ہو تیری مگر ان لوگوں نے جو ہم میں سے گھٹیا ہیں'' بَادِیَ الرَّاْیِ: سرسری رائے میں۔ بَادِیَ، بَدَا یَبْدُوْ: ظاہر ہونا، یعنی فِیْ اَوَّلِ ظُھُوْرِ الرَّاْیِ، وہ بھی انہوں نے کوئی غور وفکر نہیں کیا، سرسری رائے میں، بس ان کے دل میں بات آگئی اور تیرے پیچھے لگ گئے، تو یہ جو گھٹیا درجے کے لوگ ہیں ان کو معاملات کی ویسے ہی سمجھ نہیں ہوتی کہ یہ غور وفکر کر کے بھی کسی چیز کی حقیقت کو پا نہیں سکتے، چہ جائیکہ سرسری رائے کے ساتھ وہ تیرے پیچھے لگ گئے، فی اول ظہور الرأی، رائے کے ظاہر ہوتے ہی، جس کو ہم محاورے کے طور پر کہیں گے بلا تامل، بغیر سوچے سمجھے۔ وَمَا نَرٰی لَکُمْ عَلَیْنَا مِنْ فَضْلٍ: اور نہیں دیکھتے ہم تمہارے لئے اپنے پر کوئی فضیلت، بَلْ نَظُنُّکُمْ کٰذِبِیْنَ: بلکہ ہم تمہیں جھوٹا سمجھتے ہیں، قَالَ: نوح علیہ السلام نے کہا، یٰقَوْمِ: اے میری قوم! اَرَءَیْتُمْ: تم یہ بتلاؤ، اِنْ کُنْتُ عَلٰی بَیِّنَۃٍ مِّنْ رَّبِّیْ: اگر میں اپنے رَبّ کی طرف سے ایک واضح دلیل پر قائم ہوں، وَاٰتٰىنِیْ رَحْمَۃً مِّنْ عِنْدِہٖ: اور اس نے اپنے پاس سے مجھے رحمت عطا کی ہو، رحمت سے مراد نبوت، ''بینہ پر قائم ہوں اپنے رَبّ کی طرف سے'' بینہ سے وہی بینہ مراد ہے جو دلیل نبوت ہوتی ہے جس کو ''معجزہ'' کہہ سکتے ہیں، ''میں

رب کی طرف سے دلیل پر قائم ہوں اور مجھے اللہ نے اپنی طرف سے رحمت عطا فرمائی ہے'' رحمت سے نبوّت، علومِ نبوّت مراد ہیں۔ اور اگر بینہ سے واضح راستہ مراد لے لیا جائے جو فطری واضح راستہ ہے، فطرتِ سلیمہ کا تقاضا ہے، اور اٰتٰىنِیْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِهٖ: وحی کے ذریعے سے اللہ نے اسی کی تائید کر دی، اس میں مزید وضاحت پیدا فرما دی، بینہ سے مراد سیدھا راستہ، واضح راستہ، جو سلیم الفطرت انسان اپنی صحیح فطرت کے طور پر اختیار کرتا ہے، اور پھر اللہ کی طرف سے علوم نازل ہو کر اس کی تائید کر دیتے ہیں کہ یہی سیدھا راستہ ہے۔ ''بیان القرآن'' میں بینہ سے مراد معجزہ لیا گیا ہے اور رحمت سے مراد نبوّت لی گئی ہے۔ فَعُمِّیَتْ عَلَیْكُمْ: اور وہ بینہ تم پر مخفی رکھی گئی ہو تم اس کو سمجھ نہیں پائے، یا اللہ نے جو رحمت مجھے عطا فرمائی ہے وہ رحمت تم پر مخفی رکھی گئی، تم اس کا ادراک نہیں کر سکے، اَنُلْزِمُكُمُوْهَا کیا وہ رحمت میں تمہیں چمٹا دوں؟ یا کیا وہ بینہ میں تمہیں چمٹا دوں؟ وَاَنْتُمْ لَهَا كٰرِهُوْنَ: حالانکہ تم اس سے کراہت کرنے والے ہو، نفرت کرنے والے ہو، یعنی جس وقت تک تم رغبت کے ساتھ سمجھنے کی کوشش نہیں کرو گے اس وقت تک نہ وہ بینہ سمجھ میں آسکتی ہے نہ وہ رحمت حاصل ہو سکتی ہے، زبردستی تم پر چمٹائی نہیں جا سکتی، وَیٰقَوْمِ لَاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَیْهِ مَالًا: اے میری قوم! میں تم سے اس تبلیغ پر مال کا مطالبہ نہیں کرتا، اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ: نہیں ہے میرا اجر مگر اللہ کے ذمے، وَمَاۤ اَنَا بِطَارِدِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا: طَرَدَ یَطْرُدُ: دھتکارنا، ٹھکرا دینا۔ نہیں ہوں میں دھتکارنے والا، ہٹانے والا یعنی اپنی مجلس سے اٹھانے والا ان لوگوں کو جو کہ ایمان لے آئے، نہیں ہوں میں دُور ہٹانے والا ان لوگوں کو جو ایمان لے آئے، اِنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ: بیشک وہ اپنے ربّ سے ملاقات کرنے والے ہیں، وَلٰكِنِّیْۤ اَرٰىكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُوْنَ: لیکن میں دیکھتا ہوں تم کو ایسے لوگ جو جہالتیں کرتے ہیں، نادان بنتے ہیں، میں تمہیں جاہل لوگ دیکھتا ہوں، وَیٰقَوْمِ مَنْ یَّنْصُرُنِیْ مِنَ اللّٰهِ: اے میری قوم! اللہ کے مقابلے میں میری کون مدد کرے گا؟ اِنْ طَرَدْتُّهُمْ: اگر میں نے ان کو دُور ہٹا دیا، مَنْ یَّنْصُرُنِیْ یَمْنَعُنِیْ مِنْ عذابِ اللّٰهِ، کون مدد کرے گا میری اس حال میں کہ وہ مجھے بچاتا ہو اللہ کی عذاب سے۔ یہ ''مِنْ'' صلہ کے ساتھ منع والا معنی پیدا ہو جائے گا، ''کون مدد کرے گا میری اللہ کے عذاب سے مجھے بچاتا ہوا، اگر میں نے ان کو دُور ہٹا دیا'' اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ: کیا تم سوچتے نہیں ہو؟ وَلَاۤ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِیْ خَزَآىِٕنُ اللّٰهِ: اور میں نہیں کہتا تمہیں کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں، وَلَاۤ اَعْلَمُ الْغَیْبَ: اور نہ میں غیب جانتا ہوں، وَلَاۤ اَقُوْلُ اِنِّیْ مَلَكٌ: اور نہ میں کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں، وَّلَاۤ اَقُوْلُ لِلَّذِیْنَ تَزْدَرِیْۤ اَعْیُنُكُمْ: اور نہیں کہتا میں ان لوگوں کے متعلق جن کو تمہاری آنکھیں حقیر سمجھتی ہیں، حقیر دیکھتی ہیں۔ اِزْدِراء: حقیر جاننا۔ جن کو تمہاری آنکھیں حقیر دیکھتی ہیں میں ان کے متعلق نہیں کہتا: لَنْ یُّؤْتِیَهُمُ اللّٰهُ خَیْرًا: کہ اللہ تعالیٰ ان کو ہرگز کوئی بھلائی نہیں دے گا۔ لَنْ یُّؤْتِیَهُمُ اللّٰهُ خَیْرًا یہ لَاۤ اَقُوْلُ کا مقولہ ہے۔ اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا فِیْۤ اَنْفُسِهِمْ: اللہ بہتر جانتا ہے اس چیز کو جو ان کے دلوں میں ہے، اِنِّیْۤ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِیْنَ: اِذًا کے اوپر جو تنوین ہے وہ عوضِ مضاف الیہ ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ ''بیشک میں تب'' یعنی جب ان کو دھتکار دوں گا، اپنی مجلس سے ہٹاؤں گا، میں بھی ان کو حقیر جاننے لگ جاؤں، یا میں بھی ان کے متعلق جن کو تم اراذل کہتے ہو یہ کہنے لگ جاؤں کہ اللہ ان کو کوئی بھلائی نہیں دے گا، ''میں تو تب ظالموں میں سے ہو جاؤں گا، ناانصافوں میں سے ہو جاؤں گا'' قَالُوْا: وہ کہنے لگے: یٰنُوْحُ: اے نوح! قَدْ جٰدَلْتَنَا: بیشک تُو نے ہمارے ساتھ جھگڑا کیا، فَاَكْثَرْتَ جِدَالَنَا: پھر بہت جھگڑا کیا، فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَاۤ: لے آ تُو ہمارے پاس وہ چیز جس سے تُو ہمیں ڈراتا ہے۔ وَعَدَ، یَعِدُ، وَعِیْد سے۔ لے آ تُو ہمارے پاس وہ چیز جس سے تُو ہمیں ڈراتا ہے، اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِیْنَ:

اگر تو سچوں میں سے ہے۔ قَالَ اِنَّمَا یَاْتِیْكُمْ بِهِ اللّٰهُ: نوح علیہ السلام نے کہا کہ سوائے اس کے نہیں کہ لائے گا اس عذاب کو تمہارے پاس اللہ اگر چاہے گا، وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِیْنَ: اور تم عاجز کرنے والے نہیں ہو۔ وَلَا یَنْفَعُكُمْ نُصْحِیْٓ: اور نہیں نفع دے گی تمہیں میری خیر خواہی اِنْ اَرَدْتُّ اَنْ اَنْصَحَ لَكُمْ: اگر میں ارادہ کروں کہ تم سے خیر خواہی کروں، اِنْ كَانَ اللّٰهُ یُرِیْدُ اَنْ یُّغْوِیَكُمْ: اگر اللہ تعالیٰ کا ارادہ یہ ہو کہ تمہیں گمراہی میں ڈال دے، هُوَ رَبُّكُمْ: وہ تمہارا رب ہے، وَاِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ: اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔ اَمْ یَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ: یا یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس نے اس کو گھڑ لیا؟ یہ آیت یا تو سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ہے کہ آپ جو یہ واقعات بیان کرتے ہیں، کتاب اللہ کے اندر جو یہ باتیں اُترتی ہیں، تو کیا مشرک کہتے ہیں کہ اس نے ان باتوں کو خود گھڑ لیا ہے؟ ''آپ کہہ دیجئے کہ اگر میں نے اس کو گھڑ لیا ہے'' فَعَلَیَّ اِجْرَامِیْ: تو میرا جرم کرنا میرے پہ واقع ہوگا، وَاَنَا بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُجْرِمُوْنَ: اور میں لاتعلق ہوں تمہارے جرم کرنے سے، میں لاتعلق ہوں اس چیز سے جو تم جرم کرتے ہو، تو سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بھی یہ آیت درمیان میں آسکتی ہے کہ آپ یہ جو واقعات بیان کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے اترے ہیں، تو کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس کو آپ نے خود گھڑ لیا، اس کتاب کو، اس قرآن کو۔ آپ کہہ دیجئے کہ اچھا! میں نے گھڑ لیا ہے تو میرے پہ اس کا وبال آجائے گا، اور جو تم کرتے ہو اس سے میرا کوئی تعلق نہیں۔ اور اگر حضرت نوح علیہ السلام کے متعلق بھی ہو تو پھر یہ بات بھی ہو سکتی ہے کہ نوح علیہ السلام نے جو ان سے باتیں کہی تھیں تو کیا یہ لوگ یہ خیال کرتے تھے، کیا یہ لوگ کہتے تھے کہ نوح علیہ السلام نے ان باتوں کو خود تراش لیا؟ یعنی جو بات کرتے تھے، افْتَرٰىهُ کی ''ہٗ'' ضمیر اسی قول کی طرف چلی جائے گی جو نوح علیہ السلام نے ان لوگوں کے سامنے پیش کیا تھا، تو یہ نوح علیہ السلام کو ہی حکم ہے کہ آپ کہہ دیجئے کہ اگر میں نے اس کو گھڑا ہے فَعَلَیَّ اِجْرَامِیْ: تو میرا جرم کرنا میرے پہ واقع ہوگا، وَاَنَا بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُجْرِمُوْنَ: اور جو تم جرم کرتے ہو اس سے میں لاتعلق ہوں۔ ترجمے کے لحاظ سے راجح یہی معلوم ہوتا ہے کہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہی اس آیت کو لگایا جائے، گویا کہ واقعہ کے درمیان میں آپ کی نبوت کا اثبات ہو گیا قرآنِ کریم کی حقانیت کو ثابت کر کے۔ وَاُوْحِیَ اِلٰى نُوْحٍ: نوح کی طرف وحی کر دی گئی، اَنَّهٗ لَنْ یُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ: کہ بیشک بات یہ ہے (اَنَّهٗ میں ''ہٗ'' ضمیر شان) ہرگز نہیں ایمان لائے گا تیری قوم میں سے اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ: مگر جو ایمان لا چکا، یعنی جو ایمان لا چکا اس کے علاوہ تیری قوم میں سے کوئی شخص ایمان نہیں لائے گا، فَلَا تَبْتَىِٕسْ بِمَا كَانُوْا یَفْعَلُوْنَ: پس تو غمگین نہ ہو ان کاموں کی وجہ سے جو وہ کرتے ہیں، وَاصْنَعِ الْفُلْكَ: کشتی بنا لے بِاَعْیُنِنَا: ہماری آنکھوں کے سامنے وَوَحْیِنَا: ہماری وحی کے مطابق، وَلَا تُخَاطِبْنِیْ فِی الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا: اور مجھے خطاب نہ کرنا ان لوگوں کے بارے میں جنہوں نے ظلم کیا، مجھ سے کوئی بات نہ کرنا، مجھ سے خطاب نہ کرنا ان لوگوں کے بارے میں جنہوں نے ظلم کیا، اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ: بیشک وہ ڈبوئے جائیں گے، غرق کیے جائیں گے۔ وَیَصْنَعُ الْفُلْكَ: نوح علیہ السلام کشتی بناتے تھے، وَكُلَّمَا مَرَّ عَلَیْهِ مَلَاٌ مِّنْ قَوْمِهٖ: اور جب بھی گزرتے ان پر ان کی قوم کے وڈیرے، بڑے لوگ۔ مَلَاٌ یہ مَرَّ کا فاعل ہے۔ سَخِرُوْا مِنْهُ: جب بھی گزرتے مذاق کرتے، سَخِرُوْا مِنْهُ: نوح علیہ السلام سے ٹھٹھا کرتے، جب بھی گزرتے ٹھٹھا کرتے۔ كُلَّمَا مَرَّ سَخِرُوْا۔ قَالَ اِنْ تَسْخَرُوْا مِنَّا: نوح علیہ السلام فرماتے کہ اگر تم ہم سے ٹھٹھا کرتے ہو، فَاِنَّا نَسْخَرُ مِنْكُمْ: ہم تم سے ٹھٹھا کرتے ہیں، ہم تمہارا مذاق اُڑاتے ہیں، تم سے ہنسی کرتے ہیں، كَمَا تَسْخَرُوْنَ: جس طرح سے کہ تم ہمارے ساتھ مذاق کرتے ہو۔ اِنَّا نَسْخَرُ کا یہ معنی بھی ہو سکتا ہے کہ ہم اسی وقت ہی، یعنی تم ہم سے ہمارے ان حالتوں پر ہنستے ہو اور

ہمیں سمجھتے ہو کہ ان کے دماغ میں کیا نقص آ گیا کہ پانی کہیں ملتا نہیں اور یہ کشتی بنانے لگ گئے، اور ہم تم سے ہنستے ہیں کہ عذاب سر پر آ گیا اور تمہیں اپنے انجام کا فکر ہی نہیں، یا یہ (مطلب) ہے کہ ایک وقت آ جائے گا جب تمہاری حالت ہمارے لئے مضحکہ خیز ہو گی جس طرح سے آج تم ہم پر ہنستے ہو، فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ: تم عنقریب جان لو گے، مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ: کون ہے وہ شخص کہ جس کے پاس عذاب آ جاتا ہے جو اس کو رُسوا کر کے رکھ دے گا، وَيَحِلُّ عَلَيْهِ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ: اور اُتر پڑے گا اس کے اوپر دائمی عذاب، عَذَابٌ مُّقِيْمٌ: ٹھہرنے والا عذاب جو آیا ہوا زائل نہیں ہو گا، حَتّٰۤى اِذَا جَآءَ اَمْرُنَا: یونہی حالات چلتے رہے (حَتّٰى کا مغیا محذوف) یونہی حالات چلتے رہے حتی کہ جب ہمارا حکم آ گیا، وَفَارَ التَّنُّوْرُ: تنور سے یہ تنور بھی مراد ہو سکتا ہے جو روٹیاں پکانے والا ہے، ''تنور نے جوش مارا'' یعنی تنور سے پانی نکلنا شروع ہوا، یہ عذاب کے شروع ہونے کی علامت تھی۔ اور تنور زمین کی سطح کو بھی کہتے ہیں ''زمین کی سطح نے جوش مارا'' یعنی زمین سے پانی پھوٹنا شروع ہو گیا، قُلْنَا احْمِلْ فِيْهَا مِنْ كُلٍّ: ہم نے کہا کہ اٹھا لے اس کشتی میں ہر چیز سے زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ: زوجین کا مصداق نر، مادہ۔ اثْنَيْنِ: دو ''ہر چیز سے نر مادہ یعنی دو چیزیں اٹھا لے، جوڑا اٹھا لے، اٹھا لے اس کشتی میں ہر چیز سے زوجین یعنی نر اور مادہ، دو دو فرد'' وَاَهْلَكَ: اور اپنے گھر والوں کو اُٹھا لے، اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ: سوائے اس شخص کے جس کے اوپر بات سبقت لے گئی، وَمَنْ اٰمَنَ: اور اُٹھا لے ان لوگوں کو جو ایمان لے آئے، وَمَاۤ اٰمَنَ مَعَهٗۤ اِلَّا قَلِيْلٌ: اور نہیں ایمان لائے نوح علیہ السلام کے ساتھ مگر تھوڑے سے لوگ۔ وَقَالَ ارْكَبُوْا: اور نوح علیہ السلام نے کہا کہ سوار ہو جاؤ، فِيْهَا: اس کشتی میں، بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا: اللہ کے نام کے ساتھ ہی اس کا چلنا ہے وَمُرْسٰىهَا: اور اس کا ٹھہرنا ہے، مَجْرٰى یہ بھی مصدر میمی، مُرْسٰى یہ بھی مصدر میمی، ''اللہ کے نام کے ساتھ ہی اسکا چلنا ہے اور اللہ کے نام کے ساتھ ہی اس کا ٹھہرنا ہے'' یعنی اس کا چلنا ٹھہرنا سب اللہ کے اختیار میں ہے، اِنَّ رَبِّیْ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ: بیشک میرا رب البتہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے، وَهِىَ تَجْرِىْ بِهِمْ: وہ کشتی چلتی تھی ان لوگوں کے ساتھ، فِىْ مَوْجٍ كَالْجِبَالِ: ایسی موجوں میں جو کہ پہاڑوں کی طرح تھیں، موج یہ جمع ہے مَوْجَةٌ کی، وَنَادٰى نُوْحُ ۨابْنَهٗ: آواز دی نوح علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو، وَكَانَ فِىْ مَعْزِلٍ: اور وہ ایک جدا جگہ میں تھے، معزل: جدا جگہ، کنارہ۔ ''وہ ایک جدا جگہ میں تھے''، آواز دی، يّٰبُنَىَّ: اے میرے بیٹے! ارْكَبْ مَّعَنَا: ہمارے ساتھ سوار ہو جا، وَلَا تَكُنْ مَّعَ الْكٰفِرِيْنَ: اور تو کافروں کے ساتھ نہ رہ، کافروں کی رفاقت اختیار نہ کر، قَالَ سَاٰوِىْۤ اِلٰى جَبَلٍ: وہ بولا کہ میں عنقریب ٹھکانا لے لوں گا پہاڑ کی طرف يَّعْصِمُنِىْ مِنَ الْمَآءِ: وہ مجھے پانی سے بچا لے گا، قَالَ لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ: نوح علیہ السلام نے کہا کہ آج کوئی بچانے والا نہیں اللہ کے حکم سے، یہ اللہ کا حکم جو عذاب کا آ گیا ہے آج اس سے کوئی بچانے والا نہیں، اِلَّا مَنْ رَّحِمَ: مگر وہی بچے گا جس کے اوپر اللہ رحم کرے گا، وَحَالَ بَيْنَهُمَا الْمَوْجُ: اور حائل ہو گئی ان دونوں کے درمیان میں موج، موجیں دونوں کے درمیان میں حائل ہو گئیں، فَكَانَ مِنَ الْمُغْرَقِيْنَ: پس وہ بیٹا بھی ڈبوئے ہوئے لوگوں میں سے ہو گیا، وَقِيْلَ يٰۤاَرْضُ ابْلَعِىْ مَآءَكِ: کہہ دیا گیا، حکم دے دیا گیا، اے زمین! نگل لے اپنا پانی۔ بَلَعَ يَبْلَعُ نگلنے کے معنی میں۔ اپنا پانی نگل جا یعنی تیرے اوپر جو پانی کھڑا ہے چوس لے، وَيٰسَمَآءُ اَقْلِعِىْ: اور اے آسمان! رُک جا، وَغِيْضَ الْمَآءُ: پانی خشک کر دیا گیا، وَقُضِىَ الْاَمْرُ: معاملہ طے ہو گیا، وَاسْتَوَتْ عَلَى الْجُوْدِىِّ: اور وہ کشتی جودی پہاڑ پر جا ٹھہری، وَقِيْلَ: اور کہہ دیا گیا، بُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ: ظالم لوگوں کے لئے دُوری ہے، رحمت سے دُوری ہے، یہ ایسے ہی ہے جیسے کہیں کہ اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ۔ وَنَادٰى نُوْحٌ رَّبَّهٗ: نوح علیہ السلام نے

اپنے رَبّ کو آواز دی، اپنے رَبّ کو پکارا، فَقَالَ: نوح علیہ السلام نے کہا، رَبِّ إِنَّ ابْنِي مِنْ أَهْلِي: اے میرے رَبّ! بیشک میرا بیٹا میرے اہل سے ہے، وَإِنَّ وَعْدَكَ الْحَقُّ: اور بیشک تیرا وعدہ سچا ہے، وَأَنْتَ أَحْكَمُ الْحٰكِمِيْنَ: اور تو تمام حکم دینے والوں میں سے بڑا حکم دینے والا ہے، قَالَ: اللہ تعالیٰ نے فرمایا، يٰنُوْحُ: اے نوح!، إِنَّهُ لَيْسَ مِنْ أَهْلِكَ: وہ تیرے اہل میں سے نہیں، یعنی اس اہل میں سے نہیں جس کو نجات دینے کا وعدہ ہے، إِنَّهُ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ: بیشک وہ بیٹا عمل غیر صالح ہے، عمل سے مراد عامل، جیسے ''زیدٌ عدلٌ'' میں آپ حمل کیا کرتے ہیں کہ ''زیدٌ عدلٌ'' بول کر ''زیدٌ عادلٌ'' مراد ہوتا ہے، تو اسی طرح سے یہاں ہوگیا ''بیشک وہ بیٹا اچھے کردار کا نہیں'' یہ اس کا مفہوم ہے، اس کا کردار اچھا نہیں ہے، فَلَا تَسْأَلْنِ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ: مجھ سے سوال نہ کر ایسی چیز کا جس کی حقیقت تجھے معلوم نہیں، إِنِّيْ أَعِظُكَ: بیشک میں تجھے نصیحت کرتا ہوں، أَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ: کہ تُو ہو جائے نادانوں میں سے۔ جہل جس طرح سے ''علم'' کے مقابلے میں آتا ہے اسی طرح سے ''حلم'' کے مقابلے میں بھی آتا ہے، ''حلم'' بُردباری کو کہتے ہیں اور ''جہل'' کہتے ہیں جذبات میں آجانا، اس لئے یہ ترجمہ یوں بھی ہوسکتا ہے کہ میں تجھے نصیحت کرتا ہوں کہ تو ان لوگوں میں سے ہو جائے جو کہ جذبات سے مغلوب ہو جاتے ہیں، جذبات سے مغلوب ہونے والے لوگوں میں سے نہ ہونا، جیسے بیٹے کی محبت کی وجہ سے بے سوچے سمجھے سوال کردیا کہ یہ کیوں ڈُوب گیا، اس کو بچنا چاہیے تھا، یہ میرے اہل میں سے ہے، تجھے کیا پتا تیرے بیٹے کی کیا حالت ہے اور یہ ان اہل میں شامل ہے یا نہیں جن کے متعلق فیصلہ نجات کا ہوا، یا یہ ان میں شامل ہے جن کے متعلق فیصلہ ہلاکت کا ہوا، ایسے بے سوچے سمجھے سوال نہیں کرنا چاہیے، ''نہ پوچھ مجھ سے وہ چیز جس کا تجھے علم نہیں، بیشک میں تجھے نصیحت کرتا ہوں کہ تُو نادانوں میں سے ہوجائے'' یعنی لِئَلَّا تَكُوْنَ مِنَ الجاهلين، ان لوگوں میں سے ہو جائے جو جذبات سے متاثر ہو جاتے ہیں، جذبات سے مغلوب ہوجاتے ہیں ایسے لوگوں میں سے نہ ہونا، قَالَ رَبِّ إِنِّيْ أَعُوْذُ بِكَ أَنْ أَسْأَلَكَ: نوح علیہ السلام نے کہا کہ اے میرے رَبّ! بیشک میں پناہ پکڑتا ہوں تیری کہ میں پوچھوں تجھ سے ایسی چیز جس کے متعلق مجھے علم نہیں، وَإِلَّا تَغْفِرْ لِيْ: اگر تُو مجھے نہیں بخشے گا، وَتَرْحَمْنِيْ: اور تُو میرے پہ رحم نہیں کرے گا، أَكُنْ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ: تو میں خسارہ پانے والوں میں سے ہوجاؤں گا۔ قِيْلَ يٰنُوْحُ اهْبِطْ بِسَلٰمٍ مِّنَّا وَبَرَكٰتٍ: کہہ دیا گیا کہ اے نوح! اُتر جا، یعنی زمین پر اُترو، ہماری طرف سے سلامتی اور برکات کے ساتھ، عَلَيْكَ وَعَلٰى أُمَمٍ مِّمَّنْ مَّعَكَ: تجھ پر بھی اور ان جماعتوں پر بھی جو ان لوگوں میں سے ہیں جو تیرے ساتھ ہیں، یعنی تیرے ساتھ جو لوگ ہیں ان سے مختلف جماعتیں پیدا ہوں گی، اُمتیں بنیں گی، قومیں بنیں گی، ان پر بھی ہماری سلامتی اور برکتیں۔ لیکن کچھ جماعتیں ایسی ہوں گی وَأُمَمٌ سَنُمَتِّعُهُمْ: کہ ہم انہیں کچھ فائدہ پہنچائیں گے، ثُمَّ يَمَسُّهُمْ مِّنَّا عَذَابٌ أَلِيْمٌ: پھر انہیں ہماری طرف سے عذابِ الیم پہنچے گا، یعنی تیرے ساتھ والوں میں سے کچھ اُمتیں تو ایسی ہوں گی جن کے اوپر سلامت اور برکت ہوگی، یہ وہی ہوں گے راہِ راست پر رہنے والے، اور انہی میں سے آگے جاکے کچھ ایسے لوگ بھی پیدا ہوں گے جو کافر ہوں گے، ان کو ہم دُنیا کے اندر کچھ فائدہ پہنچائیں گے پھر ان کو ہماری طرف سے عذابِ الیم پہنچے گا۔ تِلْكَ مِنْ أَنْبَآءِ الْغَيْبِ: یہ جو کچھ آپ کے سامنے ذکر کیا گیا یہ غیب کی خبروں میں سے ہے، یعنی ان خبروں میں سے ہے جن کو آپ بھی نہیں جانتے تھے اور آپ کی قوم بھی نہیں جانتی تھی جیسے الفاظ آگے آرہے ہیں، ''ہم ان خبروں کو آپ کی طرف وحی کرتے ہیں''، مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَا أَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ: آپ ان خبروں کو نہیں جانتے تھے اور نہ آپ کی قوم جانتی تھی، مِنْ

قَبْلِ هٰذَا: ہمارے بیان کرنے سے قبل ان واقعات کو نہ تو جانتا تھا نہ تیری قوم جانتی تھی، فَاصْبِرْ: آپ بھی مستقل مزاج رہیے، اِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِيْنَ: بیشک اچھا انجام متقین کے لئے ہی ہے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

تفسیر

گزشتہ اُمتوں کے واقعات ذِکر کرنے کا مقصد

یہ دو رُکوع حضرت نوح علیہ السلام کے واقعے پر مشتمل ہیں، اور اسی سورت میں آگے جو رکوع آرہے ہیں ان کے اندر بھی مختلف قوموں کے واقعات ہی بیان کیے گئے ہیں جو انبیاء علیہم السلام کے ساتھ پیش آئے، اور ان واقعات کو پیش کرنے سے مقصود ہے قرآنِ کریم کے مخاطبین کو تنبیہ کرنا اور موافقین کے لئے ایک تسلی، ہمت افزائی، کیونکہ انبیاء علیہم السلام جو آئے اور کافر قوموں کے ساتھ ان کا واسطہ پڑا تو جس قسم کے حالات پیش آئے تھے بعینہٖ اسی قسم کے حالات سے اِس وقت سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو سامنا تھا، تو جب ایک واقعہ ذکر کیا جائے اور اسی قسم کے حالات اِس موجودہ دور میں موجود ہوں تو اس واقعہ سے عبرت حاصل کی جاسکتی ہے، مخالفین کے لئے اس واقعے سے تنبیہ ہوجائے گی، اور موافقین کے لئے وہی واقعہ ہمت افزائی کا ذریعہ بن جائے گا۔

تمام انبیاء علیہم السلام کی بنیادی تعلیم کا نکتہ

سب سے پہلے تو یہ بات سامنے آئے گی کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے جس طرح سے اِس وقت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو پیغمبر اور رسول بنایا ہے، یہ صرف یہی نہیں، اس سے پہلے بھی رسولوں کا سلسلہ چلا آرہا ہے، جیسے کہ آپ کے سامنے سورۂ احقاف میں آئے گا مَا كُنْتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ میں کوئی انوکھا رسول نہیں ہوں، مجھ سے پہلے بھی رسول آئے ہیں، یہ سلسلہ اللہ کی طرف سے جاری ہے، تو اَرْسَلْنَا نُوْحًا کے اندر تو اسی سلسلۂ رسالت کا ذکر ہوجائے گا، پھر ہر آنے والے پیغمبر نے چونکہ قوم کے سامنے توحید کی ہی دعوت دی تو عقیدۂ توحید کے متعلق پتا چل جائے گا کہ یہ مسلسل ہے، یہ نہیں کہ یہ کوئی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تحقیق ہے یا یہ کوئی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ ہے، جیسے کہ سورۂ انبیاء کے اندر یہ لفظ آئیں گے وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ (آیت:۲۵) جس میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ بات ذکر کردی کہ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ یہ تمام انبیاء علیہم السلام کا متفق علیہ فتویٰ ہے، یہ کسی ایک کی بات نہیں ہے، ایک مولوی کا فتویٰ ہو، دو مولویوں کا فتویٰ ہو، ایسی بات نہیں ہے، تمام انبیاء علیہم السلام کی تعلیم کا بنیادی نکتہ یہی تھا کہ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ، ان کے پاس یہی چیز وحی کی گئی تھی، تو اس سے مسئلہ توحید کی اہمیت بھی واضح ہوتی ہے اور اس عقیدے کا تسلسل واضح ہوتا ہے، کہ انبیاء علیہم السلام چاہے کسی علاقے میں آئے، کسی قوم کی طرف آئے، کسی زبان میں آئے، یہ مضمون ان کے درمیان مشترک ہے کہ اللہ کے علاوہ کوئی معبود نہیں، عبادت صرف اسی کی کرنی چاہیے، تو سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم بھی یہی بات کہہ رہے ہیں تو آپ بھی اسی سلسلے کے ایک فرد ہیں اور وہی آپ کی تبلیغ ہے، اس سے آپ کی تبلیغ کی اہمیت اور اس عقیدے کا تسلسل معلوم ہوگا، تو واقعے کے ضمن

میں یہ بات بھی آجائے گی۔اور پھر ہر نبی نے اپنی قوم کو بُرے انجام سے ڈرایا کہ اگر یہ عقیدہ نہیں اپناؤ گے اور اس قسم کی تعلیم حاصل نہیں کرو گے جو آپ کو دی جارہی ہے تو اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے عذاب آنے کا اندیشہ ہے، بالکل بعینہٖ اسی قسم کی گفتگو حضور ﷺ فرماتے تھے، جیسے ''مشکوۃ شریف'' میں کتاب الایمان میں آپ نے پڑھا کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اِنِّی اَنَا النَّذِیْرُ الْعُرْیَانُ''(۱) میں بالکل ننگا ڈرانے والا ہوں، جس طرح سے اس زمانے میں عادت ہوتی تھی کہ خوف وخطرے کے وقت میں لوگ بہت شدت کے ساتھ اپنی قوم کو ڈراتے تھے کہ کپڑے اُتار کے یوں یوں کرنے لگ جاتے (یعنی ہوا میں لہرانے لگ جاتے) تو اسی طرح سے میں بھی واضح طور پر تمہیں ڈرانے والا ہوں، تو ''نذیرِ عریان'' کا لفظ اس روایت میں جو آیا ہے تو اس میں اسی شدت کی طرف اشارہ ہے کہ کتنا شدید خطرہ ہے جس کا انبیاء علیہم السلام احساس کرتے ہیں گویا کہ آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ عذاب آرہا ہے، جس طرح سے کوئی شخص اپنی قوم کے اوپر کسی طرف سے حملہ ہوتا ہوا اپنی آنکھوں سے دیکھے تو بے چینی کے ساتھ وہ ڈراتا ہے، اپنے کپڑے اُتار اُتار کے ہلاتا ہے لوگوں کو خطرے سے آگاہ کرنے کے لئے، تو انبیاء علیہم السلام بھی اُس آنے والے عذاب کو گویا کہ آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں، اور اسی طرح سے بے چینی کے ساتھ اپنی قوم کو ڈراتے ہیں، ان حالات کے اندر بالکل تسلسل ہے، جیسے حضور ﷺ کے ساتھ حالات پیش آرہے تھے کچھ ایسے ہی پہلے انبیاء علیہم السلام کے حالات ہیں، اور قوم نے آگے سے جو کچھ کہا وہ بھی کوئی نئی بات نہیں، اور آج بھی یہی حالات تھے۔

انبیاء علیہم السلام کی مخالفت سب سے پہلے کون کرتے ہیں اور کیوں کرتے ہیں؟

(فَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ) یہ آگے اِشکال ہے جو قوم کو وڈیروں کی طرف سے پیش آیا، جس کا مطلب یہ ہے کہ سب سے پہلے انبیاء علیہم السلام کی تعلیم کی مخالفت کرنے والے یہی لوگ ہوتے ہیں جو وقت کے چوہدری اور وقت کے وڈیرے ہوتے ہیں، انبیاء علیہم السلام کی تبلیغ کا رخ بھی پہلے انہی کی طرف ہی ہوتا ہے، اور سب سے زیادہ ٹکراتے بھی یہی ہیں، اور ان کے ٹکرانے کی وجہ کیا ہوتی ہے؟ کہ یہ اقتدار پہ ہوتے ہیں، مالی وسعت ان کو حاصل ہوتی ہے، خواہشات کے بندے ہوتے ہیں، اور انبیاء علیہم السلام کی تعلیم بالکل اس کے برعکس آتی ہے، ان کو یہ خطرہ ہوتا ہے کہ اگر یہ بات ہم مانتے ہیں تو ہماری خواہشات ختم ہوتی ہیں، جس قسم کی لذتیں اور مزے ہم اڑا رہے ہیں ان کے اوپر پابندی لگتی ہے، آج ہم سردار ہیں اگر ہم اس کا کلمہ پڑھ لیں گے تو سردار یہ بن جائے گا، ہمارا اقتدار چھن جائے گا، تو اقتدار جاتا ہوا نظر آتا ہے، خواہشات کے اوپر پابندی لگتی ہے، عیش وعشرت جس قسم کی حاصل ہوتی ہے وہ سمجھتے ہیں کہ یہ سب کچھ چھوڑنا پڑے گا، اور یہی مشکل ہے جس کی بنا پر وہ انکار کرتے ہیں۔اور ان کے مقابلے میں جو غرباء اور مساکین کا طبقہ ہوتا ہے ایک تو ان کو اسبابِ عیش اتنے حاصل نہیں ہوتے کہ دعوتِ حق قبول کرنے کی بنا پر ان کے چھوٹنے کا اندیشہ ہو، پھر ان کو کوئی اقتدار حاصل نہیں ہوتا، وہ کوئی سردار نہیں ہوتے صاحبِ اقتدار نہیں ہوتے کہ ان کو یہ خطرہ ہو کہ ہمارا اقتدار زائل ہو جائے گا، اس لیے یہ جو موانع ہیں ان میں نہیں پائے جایا کرتے، اس لیے حق بات جب ان کے سامنے آتی ہے تو رکاوٹیں موجود

---

(۱) بخاری ۹۶۰/۲ باب الانتہاء عن المعاصی/ مسلم ۲۴۸/۲ باب شفقتہ علی امتہ/ مشکوۃ ص ۲۸ باب الاعتصام فصل اول۔

نہ ہونے کی وجہ سے، پھر فطری طور پر وہ متواضع ہوتے ہیں، ان کے اندر تکبر نہیں ہوتا، تو اس حقیقت کو قبول کر لیتے ہیں۔ معلوم یوں ہوتا ہے کہ ابتدا سے انبیاء علیہم السلام کے ساتھ معاملہ ایسا ہی ہوا ہے کہ انہوں نے خطاب سب سے پہلے سرداروں اور وڈیروں کو کیا، اور وہی سردار اور وڈیرے ٹکرائے، اور ان کی تعلیمات کو قبول کرنے والا سب سے پہلے ضعفاء اور مساکین کا ہوتا ہے، وہ کثرت کے ساتھ اس دعوت کے اوپر لبیک کہتے ہیں، چونکہ ان کے سامنے کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی، چنانچہ حدیث شریف میں آپ پڑھیں گے، ایک لمبی روایت آئے گی ہرقل قیصر روم کی، جب اس نے ابوسفیان رضی اللہ عنہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کچھ حالات کی تحقیق کرنا چاہی تھی، تو اس میں سے اس نے ایک سوال یہ بھی کیا تھا کہ اس پر ایمان کیسے لوگ لائے ہیں، شرفاء لوگ اَشراف ایمان لائے ہیں یا ضعفاء؟ تو ابوسفیان نے جواب دیا تھا کہ ضعفاء قسم کے لوگ ایمان لائے ہیں جو کہ کمزور سمجھے جاتے ہیں، اُن کی حالت پتلی ہے، تو ہرقل نے اس جواب پر تبصرہ یہی کیا تھا کہ ''هُمْ اَتْبَاعُ الرُّسُلِ'' کہ تاریخ یہی بتاتی ہے، پہلی کتابیں یہی بتاتی ہیں کہ انبیاء علیہم السلام کی اتباع کرنے والے اکثر و بیشتر ایسے ہی لوگ ہوتے ہیں۔

مشرکین کے سرداروں کی طرف سے اِشکالات

اور پھر مساکین ماننے والے تھے اور رُؤسائے مشرکین سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بھی آپ کے سامنے یہی اِشکال کرتے تھے کہ یہ مجلس میں بیٹھے ہوں تو ہم ان کے ساتھ آ کے بیٹھ نہیں سکتے، اگر ہم آپ کو مانتے ہیں تو ہمیں ان لوگوں میں شامل ہونا پڑے گا، ان کے ساتھ شامل ہونا اور ان کے ساتھ مل کے بیٹھنا ہم اپنی توہین سمجھتے ہیں، اس لیے جس وقت ہم آئیں تو انہیں اپنی مجلس سے اٹھا دیا کرو تب ہم آپ کی بات سن سکتے ہیں، ورنہ جہاں یہ مساکین بیٹھے ہوں گے تو ہم ان کے ساتھ شامل ہو کے نہیں بیٹھ سکتے، ان پر ہمارا رعب ختم ہو جائے گا، یہ ہماری حیثیت کے خلاف ہے کہ ہم ان کے ساتھ شامل ہو کے بیٹھیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی اس قسم کا مطالبہ مشرکین نے کیا تھا، جیسے قرآنِ کریم کی بہت ساری آیات میں اس مضمون کو ذکر کیا گیا ہے وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ (سورۂ کہف: ۲۸) اور اسی طرح سے سورۂ اَنعام کے اندر بھی ایسی ہی آیات آئی تھیں وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ (آیت: ۵۲) کہ جو اپنے رَبّ کو پکارتے ہیں ان کو اپنی مجلس سے نہ اٹھائیں، اور اگر آپ نے ایسا کیا تو آپ بھی ظالمین میں سے ہو جائیں گے، تو وہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ اِس وقت کے مشرکین رُؤساء حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی اسی قسم کا مطالبہ کرتے تھے۔ اور ان کے اِشکالات میں یہ اِشکال بھی عام ذکر کیا گیا ہے اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا (سورۂ بنی اسرائیل: ۹۴) کیا بشر کو اللہ نے رسول بنا کر بھیج دیا؟ اس بشر کو ہم مان لیں؟ اس میں کیا خصوصیت ہے جس کی بنا پر اس کو اللہ کا رسول بنا دیا گیا؟ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے مخاطبین جو مشرک تھے بالکل اسی قسم کے اعتراض کرتے تھے، اور معلوم ہوتا ہے کہ وہی اعتراضات یہاں قومِ نوح نے کیے تھے اور نوح علیہ السلام نے ان کو جواب دیا تھا، تو قومِ نوح کی طرف سے اعتراضات کا نقل کرنا پھر نوح علیہ السلام کی طرف سے جوابات کا آنا گویا کہ ان واقعات کے مطابق بھی سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی تائید ہے کہ پہلے کافروں مشرکوں نے بھی ایسے اشکالات کیے تھے اور ان انبیاء علیہم السلام نے یہ جواب دیے تھے، میری طرف سے بھی یہی جواب ہے، اگلی آیات کے اندر اسی قسم کے

اِشکالات کا ذکر آیا ہوا ہے۔ کہ ''ان وڈیروں نے جو کافر تھے اس کی قوم میں سے، کہا کہ نہیں دیکھتے ہم تجھے مگر اپنے جیسا ہی بشر'' تو بشر اللہ کا رسول کیسے ہوگیا؟ یعنی وہ نوح علیہ السلام کو بشر مانتے تھے اور رسالت کا انکار کرتے تھے کہ بشر رسول نہیں ہوسکتا، گویا کہ ان کے ذہن میں منافات تھی، اب اگر کوئی کہے کہ رسول تو ہیں لیکن بشر نہیں، چاہے یہ معاملہ الٹ کر دیا کہ وہ کہتے تھے کہ بشر ہے رسول نہیں، اور اگر اب کوئی کہے کہ رسول ہیں بشر نہیں، بظاہر تو یہ معاملہ مشرکین سے برعکس معلوم ہوتا ہے لیکن ذہن ایک ہے، کہ جس طرح سے وہ بشر اور رسالت میں منافات سمجھتے تھے تو یہ بھی بشر اور رسالت میں منافات سمجھتے ہیں، کہ اللہ کا رسول ہو اور بشر ہو یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ وہ کہتے تھے کہ بشر ہو اور اللہ کا رسول ہو یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ چاہے اِدھر سے بات کرلو چاہے اُدھر سے بات کرلو، منافات ایک جیسی ہے دونوں کے ذہن میں، کہ جیسے وہ سمجھتے تھے کہ بشر ہو کے اللہ کا رسول نہیں ہوسکتا، اسی طرح سے یہ سمجھتے ہیں کہ جو رسول ہوگا وہ بشر نہیں ہوسکتا، یعنی درمیان میں مرکزی بات ایک ہی ہے کہ دونوں کے درمیان میں وہ منافات سمجھتے ہیں، تو انہوں نے یہ اِشکال کیا کہ ہم تو تجھے اپنے جیسا بشر دیکھتے ہیں۔ اور پھر جو تیرے پیچھے لگنے والے ہیں وہ سارے کے سارے ایسے لوگ ہیں جو ہم میں سے گھٹیا سمجھے جاتے ہیں، محنت مزدوری کرنے والے، جو ہمارے گھروں میں کام کرتے ہیں، جن کو ڈھنگ کا کھانا میسر نہیں، پہننا میسر نہیں، رہنے کے لئے ان کے پاس محلات نہیں، دنیا کی کوئی اور عیش وعشرت حاصل نہیں، اس قسم کے چار آدمی اگر پیچھے لگ گئے تو یہ بھی کوئی صداقت کی دلیل نہیں ہے کہ تو اچھا ہے، کیونکہ یہ لوگ تو ایسے ہیں جن کو دنیا کے معاملات کی سوجھ بوجھ نہیں ہوتی، غور وفکر کریں تو بھی یہ صحیح بات معلوم نہیں کرسکتے، چہ جائے کہ انہوں نے غور وفکر نہیں کیا، بس بلا تامل بے سوچے سمجھے جو دل میں آ گیا بس ایسے ہی پیچھے لگ گئے۔ تو ایک آدمی نے دعوی کیا اور اس قسم کے چار آدمیوں نے تائید کردی تو اس سے آپ کی حقانیت کس طرح ثابت ہوتی ہے؟ یعنی ان آیات میں آپ یہ بات دیکھئے! کہ انبیاء علیہم السلام کے ماننے والے اور ان کے دین کے قبول کرنے والے معلوم ہوتا ہے کہ اوّل دنیا سے ہی ایسے لوگ ہوتے ہیں جن کو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ حقیر قسم کے، گھٹیا قسم کے، کمی قسم کے لوگ ہیں، پہلے ہی سے اسی قسم کا ذہن چلا آ رہا ہے، اور آج بھی حالات اسی قسم کے ہی ہیں کہ اللہ کا دین صحیح معنی میں موجود ہے اور اس کو قبول کرنے والے اکثر وبیشتر ضعفاء مساکین، اسی قسم کے لوگ ہوتے ہیں، یہ دولت اللہ تعالی نے انہی کے حصے میں رکھی ہے، تو اس میں کوئی غم فکر کی بات نہیں، پہلے سے رواج اسی طرح سے چلا آتا ہے، اور کافر لوگ جن کے دل میں نبی کی قدر نہیں ہوتی، نبی کے دین کی قدر نہیں ہوتی، وہ ہمیشہ اسی طرح سے تحقیر کے ساتھ ذکر کرتے ہیں، اور آج بھی اگر تحقیر کریں تو عین تاریخ کے مطابق ہے، کوئی نیا واقعہ نہیں ہے، کہ اس دین کو قبول کرنے والے اکثر وبیشتر مساکین ہیں، اور سردار قسم کے لوگ اس دین سے دور ہیں، اور دِین داروں کا مذاق اُڑانا اور ان کے اوپر پھبتیاں کسنا آج بھی اس طرح سے ہے، تو اس میں یہ تاریخی تسلسل ہے، اس لیے اگر اللہ تعالی نے کسی کو دِین قبول کرنے کی توفیق دے دی تو لوگوں کے طعن وتشنیع سے گھبرانے کی کوئی بات نہیں، یہ دیکھو! کب سے دُنیا بنی اور کب سے اسی قسم کے حالات چلے آ رہے ہیں۔ وَمَا نَرٰى لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ: ہم تمہارے لیے اپنے اوپر کوئی فضیلت نہیں دیکھتے، تو ہم تجھے اللہ کا رسول کس طرح سے مان لیں؟ کیوں مان لیں؟ بَلْ نَظُنُّكُمْ كٰذِبِيْنَ: بلکہ ہم تو تمہیں جھوٹا سمجھتے ہیں، کہ ایسے ہی خواہ مخواہ دھونس جمانے کے لئے اس قسم کے دعوے کر رہے ہو، بڑا بننا چاہتے ہو، اقتدار حاصل کرنا چاہتے ہو، اس لیے اس قسم کی باتیں کرنی شروع کردیں۔

حضرت نوح علیہ السلام کی طرف سے مخالفین کو جوابات

نوح علیہ السلام کہتے ہیں کہ اے میری قوم! مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے بینہ حاصل ہے، میں اپنے دعوے پر دلیل رکھتا ہوں، میرے پاس بینہ ہے معجزہ ہے، اور اللہ تعالیٰ نے مجھے نبوت عطا کر دی، تم یہ سوچو کہ اگر یہ چیزیں میرے پاس موجود ہوں کہ میں واضح راستے پر ہوں، میرے پاس اپنے مسلک کو ثابت کرنے کے لئے واضح دلیل ہے، اور اللہ تعالیٰ کی رحمت مجھے حاصل ہے لیکن تم ہی اندھے ہو گئے اور یہ چیزیں تم پر مخفی ہو گئیں، تم ان کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کرتے، تو میں زبردستی تم پر کیسے مسلط کر دوں؟ تم ذرا دھیان کر کے آنکھیں کھول کے آؤ تو سہی، ذرا باتوں کو سمجھنے کی کوشش تو کرو، طلب حق تمہارے اندر ہو تو اللہ تعالیٰ تمہیں سب کچھ سمجھا دے گا، لیکن اگر تم ہی آنکھیں بند کر لو، نہ دلیل کو سنتے ہو نہ توجہ کرتے ہو، بس یہ بات ہے کہ جی! گھٹیا لوگوں نے مان لیا، اور یہ بات ہے کہ جی! تم تو انسان ہو، بھئی! جو بات میں کہہ رہا ہوں یا جس منصب کا میں دعویٰ کر رہا ہوں نہ بشریت اس کے منافی ہے اور نہ گھٹیا قسم کے لوگوں کا ماننا اس کے منافی ہے اور نہ ہمارے اندر کوئی اس قسم کی فضلیت کا ہونا ضروری ہے جس قسم کی تم سمجھتے ہو کہ فرشتے ہوتے یا تمہارے پاس خزانے ہوتے، یہ سب باتیں غیر ضروری ہیں، دلیل کے ساتھ بات سمجھنے کی کوشش کرو، توجہ کرو گے تو تمہیں بات سمجھ میں آجائے گی، اگر تم توجہ نہیں کرو گے تو میں تم پہ زبردستی چمٹا نہیں سکتا۔ ''اے میری قوم! اگر ہوں میں واضح دلیل پر اپنے رَبّ کی طرف سے، اور اللہ نے مجھے اپنے پاس سے رحمت دی ہو، پھر وہ تم پہ مخفی کر دی گئی، تو کیا میں تمہیں چمٹا سکتا ہوں وہ رحمت یا وہ بینہ؟ اس حال میں کہ تم نفرت کرنے والے ہو۔ پھر یہ تو سوچو کہ آخر میں نے جو ایسی باتیں کرنی شروع کر دیں، میرا مقصد کیا ہے؟ تم یہی خیال کرو گے کہ میں کوئی مال کمانا چاہتا ہوں، تو میں تم سے کوئی کسی قسم کی اجرت نہیں مانگتا کہ میں تمہاری خدمت کرتا ہوں تبلیغ کرتا ہوں تم مجھے پیسے دو، ''اے میری قوم! نہیں سوال کرتا میں اس پر تم سے کسی قسم کے مال کا، میرا اجر اللہ کے ذمے ہے'' یہ میرے اخلاص کی علامت ہے کہ مجھے پیسے نہیں چاہئیں، میں تم سے کوئی اجرت نہیں مانگتا، جو بات کر رہا ہوں خیر خواہی سے کر رہا ہوں، اور اگر میرا کوئی درمیان میں مطلب ہوتا کہ میں اس کا معاوضہ لینا چاہتا ہوں تو تم کہہ سکتے تھے کہ دولت اکٹھی کرنے کے لالچ میں سب کچھ کرنا شروع کر دیا۔ باقی رہی یہ بات یہ کہ گھٹیا قسم کے لوگ ہیں، اگلے لفظوں سے معلوم یہ ہوتا ہے کہ ان کا مطالبہ تھا کہ ان کو پاس نہ بیٹھنے دیا کرو، یا جس وقت ہم آئیں تو یہ لوگ مجلس میں نہ بیٹھیں، اُس کا جواب اگلے الفاظ میں دیا گیا ہے کہ یہ ایمان لانے والے لوگ ہیں، میں ان کو دور نہیں ہٹا سکتا، میرے ہاں برتری ایمان اور نیکی کی وجہ سے ہے، میں کسی کے مال و دولت سے متاثر ہو کر کسی کو برتر سمجھنے کے لئے تیار نہیں، میں تو اپنے پاس انہی کو ہی بٹھاؤں گا جو کہ ایمان لائے ہیں، میں ان کو دور ہٹانے والا نہیں، یہ اپنے رَبّ سے ملاقات کرنے والے ہیں، یہ تو شاہی لوگ ہیں، جس وقت یہ شاہی دربار کے لوگ ہیں اپنے رَبّ کے پاس جائیں گے، اگر میں نے ان کے ساتھ کوئی اس قسم کا برا برتاؤ کیا تو وہاں جا کے یہ میری شکایت کریں گے، تم جاہل لوگ ہو، تم یہ سمجھتے ہو کہ شاید مال و دولت برتری کی علامت ہے، حالانکہ اللہ کے ہاں برتری کی علامت ایمان ہے، جو ایمان لائے گا وہ اللہ کے ہاں اشرف سمجھا جاتا ہے، یہ دنیا کے چار کوڑیوں پر غرور کرنا فخر کرنا اور اپنے آپ کو برتر سمجھنا یہ تمہاری جہالت ہے، میں تمہیں دیکھتا ہوں کہ تم جاہلانہ باتیں

کرتے ہو، جہالت کی حرکتیں کرتے ہو، بھلا یہ کوئی بات ہے کہ غریب آدمی جس مجلس میں بیٹھا ہو ہم بیٹھنے کے لئے تیار نہیں، اتنا غرور! اتنا تکبر! یہ سب جاہلیت ہے، اور اگر میں ان کو ہٹاؤں جس طرح سے تمہارا مطالبہ ہے (معلوم ہوتا ہے شدت کے ساتھ وہ یہ مطالبہ کرتے تھے کہ ان لوگوں کے اپنے پاس نہ بیٹھنے دیا کرو، اور چونکہ آپ ان کے پاس بیٹھتے اٹھتے ہیں لہٰذا ہم آپ کی مجلس میں نہیں آسکتے) اِنْ طَرَدْتُّهُمْ: اگر میں نے ان کو دھتکار دیا جس طرح سے تم کہتے ہو، تو میں اللہ کی گرفت میں آ جاؤں گا تو اللہ کے عذاب سے بچاتا ہوا میری مدد کون کرے گا؟ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ: کیا تم اس بات کو سوچتے نہیں ہو؟'' اور میں تمہیں یہ بھی نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں'' جو تم یہ کہو کہ یہ خزانے تیرے پاس کیوں نہیں، تو میرا دعویٰ کب ہے کہ میں خزانوں کا مالک ہوں اور اللہ کی قدرت کے خزانے میرے پاس ہیں کہ جو چاہوں کر کے دکھادوں، جس کو چاہوں جتنا چاہوں دے دوں، یہ اللہ کے خزانے میرے پاس نہیں، ''اور نہ میں غیب جانتا ہوں'' کہ تمہیں کہوں جو پوچھو بتادوں گا، کب عذاب آئے گا، اس قسم کے دعوے میں نہیں کرتا، ''اور نہ میں یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں'' میں تو واقعی میں ایک بشر ہوں جس طرح سے تم سمجھتے ہو، ''اور نہ میں ان لوگوں کے متعلق کہتا ہوں جن کو تمہاری آنکھیں حقیر سمجھتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ انہیں دنیا اور آخرت میں کوئی بھلائی نہیں دے گا'' جیسے وہ سمجھتے تھے، قرآنِ کریم میں ایک جگہ یہ لفظ آئیں گے کہ لَوْ كَانَ خَيْرًا مَّا سَبَقُوْنَآ اِلَيْهِ (سورۂ احقاف: ۱۱) اگر یہ دین اچھا ہوتا تو یہ لوگ ہم سے سبقت نہ لے جاتے، جس طرح سے دُنیا کا خیر برکت مال دولت ہمیں دیا ہے، دِین اچھا ہوتا تو اس کو بھی ہم ہی حاصل کرتے، اور جب ہم اس کو حاصل نہیں کر رہے تو معلوم ہوتا ہے یہ اچھی چیز نہیں ہے، تو نوح علیہ السلام کہتے ہیں میں یہ بات نہیں کہہ سکتا کہ اللہ تعالیٰ انہیں بھلائی نہیں دے گا، ''اللہ تعالیٰ جانتا ہے ان کے دلوں میں جو کچھ ہے، اگر میں ان کے متعلق اس قسم کی باتیں کروں گا یا تمہارے کہنے کی وجہ میں ان کو اپنی مجلس سے اٹھادوں گا تو میں بے انصاف لوگوں میں سے ہو جاؤں گا'' میں تو ظالم بن جاؤں گا، میں ایسی حرکتیں نہیں کرسکتا۔

قومِ نوح کی ہٹ دھرمی کی اِنتہا

دلیل کے ساتھ تو ان لوگوں کے پاس جواب کوئی نہیں تھا، آخر وہی جاہلیت، ''کہنے لگے اے نوح! تو نے ہم سے جھگڑا کرلیا اور بہت جھگڑا کرلیا'' مدت گزر گئی ہمارے ساتھ جھگڑے کرتے ہوئے، فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ: لے آ ہمارے پاس وہ چیز جس سے تُو ہمیں ڈراتا ہے اگر تُو سچوں میں سے ہے، بس فیصلہ کر، آئے دن جو ڈراتے ہو کہ عذاب آجائے گا عذاب آجائے گا، اگر تُو سچا ہے تو لے آ اس عذاب کو۔ جب کوئی قوم اس حد تک پہنچ جائے تو پھر اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اب یہ ماننے والی نہیں، اب یہ لوگ اللہ کی گرفت میں آہی جائیں گے، لیکن نوح علیہ السلام نے پھر یہی جواب دیا کہ تم جو کہتے ہو کہ لے آ، تو لانا کوئی میرے اختیار میں نہیں، میں تو وہی بات کہتا ہوں کہ جو اللہ کی طرف سے معلوم ہوتی ہے، اگر اللہ چاہے گا تو عذاب کو لے آئے گا، ''سوائے اس کے نہیں کہ اس عذاب کو اللہ تمہارے پاس لائے گا اگر چاہے گا، اور پھر تم عاجز نہیں کرسکو گے۔'' اور میں تمہارے ساتھ خیر خواہی کر رہا ہوں، لیکن میری خیر خواہی تمہیں کوئی نفع نہیں دے گی اگر میں ارادہ کروں تم سے خیر خواہی کرنے کا، کتنا ہی خیر خواہ بنوں، اگر اللہ تعالیٰ کا ارادہ یہی ہے کہ تمہیں گمراہی میں ڈالے، ''وہ تمہارا رَبّ ہے اور اسی کی طرف تم لوٹ کے جاؤ گے'' تمہارا یہ معاملہ اللہ کے ساتھ ہے، میں

اپنے طور پر خیرخواہی میں کمی نہیں کر رہا، لیکن میری خیرخواہی تمہارے کس کام آئے گی جب تم اللہ کے سامنے تواضع نہیں اختیار کرتے، اللہ کے سامنے جھکتے نہیں اور تمہاری اکڑ کے نتیجے میں اللہ کا ارادہ یہی ہے کہ تمہیں گمراہی میں ڈال دے تو میں جتنا چاہوں تمہارے سامنے جگرسوزی کروں، جتنا چاہوں میں تمہارے ساتھ خیرخواہی کروں یہ تمہارے کسی کام نہیں آئے گی۔

''اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ'' کے متعلق دو اِحتمال

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ: اس کے متعلق دونوں احتمال آپ کی خدمت میں ذکر کر دیے، کہ یہ سرورِ کائنات ﷺ کے متعلق ہے، یا نوح علیہ السلام کے متعلق۔ ''کیا یہ کہتے ہیں اس قرآن کو اس رسول نے خود گھڑ لیا، آپ کہہ دیجیے کہ اگر اس کو میں نے گھڑ لیا ہے تو میرا جرم کرنا میرے پہ واقع ہوگا، اور میں لاتعلق ہوں ان جرموں سے جو تم کرتے ہو'' تمہارا جرم میرے پہ واقع ہونے والا نہیں۔ یا یہ نوح علیہ السلام کے متعلق ہے، وہ لوگ کہتے تھے کہ یہ باتیں اس نے خود تراش لی ہیں، جو کچھ یہ کہتا ہے یہ اس کی اپنی گھڑی ہوئی بات ہے، تو نوح علیہ السلام سے کہا جا رہا ہے کہ آپ انہیں کہہ دیجیے کہ اگر میں نے گھڑی ہے تو یہ وبال میرے پہ آئے گا، اور جو کچھ تم کرتے ہو اس سے میرا کوئی تعلق نہیں۔

حضرت نوح علیہ السلام اپنی قوم میں پیغمبر ہونے کی حیثیت سے ساڑھے نو سو سال ٹھہرے، قرآنِ کریم میں جس طرح سے ذکر کیا گیا فَلَبِثَ فِيْهِمْ اَلْفَ سَنَةٍ اِلَّا خَمْسِيْنَ عَامًا (سورۂ عنکبوت: ۱۴) ہزار میں سے پچاس نکال کر ساڑھے نو سو سال حضرت نوح علیہ السلام اپنی قوم میں ٹھہرے، اور سمجھانے کے جتنے طریقے بھی عقلاً ممکن تھے ان طریقوں پر اپنی قوم کو سمجھایا، جس کی تفصیل آپ کے سامنے انتیسویں پارے میں سورۂ نوح کے اندر آئے گی، لیکن قوم مقابلے میں ڈٹی رہی، اور ان کے پانچ معبود تھے جن کا ذکر اُسی سورت میں ہے لَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَّلَا سُوَاعًا ۙ وَّلَا يَغُوْثَ وَيَعُوْقَ وَنَسْرًا، ان کے بڑے اپنی قوم کو کہتے تھے کہ اپنے ان پانچ بتوں کو نوح علیہ السلام کے کہنے کی وجہ سے چھوڑنا نہیں ہے، انہوں نے تہیہ کر لیا کہ ان پانچ کو ترک نہیں کرنا، یہ پانچ ان کے معبود تھے جن کے بارے میں ''بخاری شریف'' کے اندر ابنِ عباس رضی اللہ عنہ کا قول آتا ہے کہ یہ اصل کے اعتبار سے نیک آدمی تھے، جس وقت یہ مر گئے تو لوگوں نے ان کی یادداشت کے طور پر ان کی تصویریں بتوں پہ تراش کے رکھ لیں، اور پھر آہستہ آہستہ انہی کو ہی معبود بنا لیا، اسماء الصالحین، یہ پانچ جو ہیں یہ نیک لوگوں کے نام ہیں، یعنی اس قوم کے اندر پہلے یہ نیک لوگ گزرے تھے، قوم کو ان کے ساتھ عقیدت اور محبت تھی، ان کی یادداشت کے طور پر ان کی تصویریں بنالیں، پتھروں پر تراش لیں، اور آہستہ آہستہ انہی کے متعلق ہی اُلوہیت کا عقیدہ ہو گیا۔[1]

بدبختوں کے اِیمان نہ لانے کی اطلاعِ خداوندی اور نوح علیہ السلام کا ان کے لئے بددُعا کرنا

تو حضرت نوح علیہ السلام نے بہت تبلیغ کی لیکن آخر اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے حضرت نوح علیہ السلام کو یہ اطلاع دے دی گئی جیسے کہ اس پہلی آیت میں ہے کہ ''نوح علیہ السلام کی طرف وحی کر دی گئی کہ ہرگز نہیں ایمان لائے گا تیری قوم میں سے مگر وہی جو ایمان

---

(۱) بخاری ۲/۷۳۲، کتاب التفسیر، سورۃ نوح۔ ولفظہ: اَسْمَاءُ رِجَالٍ صَالِحِيْنَ مِنْ قَوْمِ نُوْحٍ الخ

لا چکا'' یعنی مَنْ قَدْ اٰمَنَ جو ایمان لا چکے ان کے علاوہ کوئی اور شخص اب ایمان لانے والا نہیں، جب یہ اطلاع ہوگئی کہ اب اس قوم میں سے جتنے کام کے لوگ تھے وہ منتخب ہوگئے ایمان لے آئے، اور باقی قوم سے اب توقع نہیں، تب حضرت نوح علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی قوم کے لئے بددعا کے طور پر ہاتھ اٹھائے تھے، اور اس بددعا کا ذکر بھی اُسی سورت (سورۂ نوح) میں ہے رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا ۞ اِنَّكَ اِنْ تَذَرْهُمْ يُضِلُّوْا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوْٓا اِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا، اے میرے رب! نہ چھوڑ زمین پر کافروں میں سے کوئی چلنے پھرنے والا، زمین کے اوپر کوئی کافر چلتا پھرتا نہ رہے، کیونکہ اگر تو انہیں چھوڑے گا تو آئندہ یہ کافر اور فاجر ہی جنیں گے، جب اللہ کی طرف سے اطلاع آگئی کہ اب اس قوم میں سے اور کوئی ایمان لانے والا نہیں ہے تو آئندہ جو ان کی نسل چلے گی تو سب اس میں فاسق فاجر ہی ہوں گے، تو اس قسم کے گندے عنصر کو باقی رکھنے کی کیا ضرورت ہے، اب انہیں ختم کردے، اور ایسے ہی حضرت نوح علیہ السلام کا بدُعائیہ جملہ غالباً سورۂ قمر میں ہے اَنِّيْ مَغْلُوْبٌ فَانْتَصِرْ، اے اللہ! میں ان کے سامنے مغلوب ہوگیا، میں ان کے مقابلے میں ہار گیا، اب تو ہی انتقام لے، تو ہی ان سے بدلہ لے لے، تو جس وقت نوح علیہ السلام نے یہ بدُعائیں کیں اور یہ بدُعا کرنے کی نوبت اس اطلاع کے بعد آئی جب اللہ تعالیٰ نے اطلاع دے دی کہ اب تیری قوم میں سے اور کوئی ایمان لانے والا نہیں ہے، تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نوح علیہ السلام کو یہ کہا گیا کہ اب آپ غم نہ کیجیے، اپنے کام میں لگے رہیے، ظالموں کے غرق ہونے کا وقت آگیا ہے، اس لیے جس وقت یہ غرق ہونے لگیں پھر مجھے ان کے بارے میں کوئی خطاب نہ کرنا، یعنی پھر ان کے متعلق کچھ نہ کہنا، اب ان کا معاملہ طے ہوگیا، ان کا پتا کٹ گیا، اب یہ ڈبو دیے جائیں گے۔

اِنسانی ضروریات کے لئے اِبتدائی طور پر ہدایات وحی کے ذریعے ہوئی ہیں

اور جس وقت پانی کا طوفان آئے گا، مغرقون میں جس طرح سے بتا دیا گیا کہ یہ ڈوبیں گے، تو حضرت نوح علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کو بچانے کے لئے اللہ تبارک وتعالیٰ نے ظاہری سبب کی یہ تلقین فرمائی کہ کشتی بنالو ہماری حفاظت میں، ہماری آنکھوں کے سامنے، ہماری ہدایات کے مطابق، کہتے ہیں کہ یہ پہلی کشتی ہے جو حضرت نوح علیہ السلام نے بنائی تھی، کشتی کی صنعت کی اِبتدا حضرت نوح علیہ السلام سے ہوئی ہے، وہ کشتی لمبی چوڑی تھی، اس کی دو تین منزلیں تھیں، جس طرح سے تفاسیر کے اندر ذکر کیا ہوا ہے، اس لیے اس میں حیوانات بھی سوار کر لیے، جتنے مؤمنین تھے حضرت نوح علیہ السلام کے ساتھ وہ بھی سارے کے سارے سوار کر لیے، تو یہ صنعت حضرت نوح علیہ السلام سے شروع ہوئی، جیسے کہ حضرت مفتی محمد شفیع صاحب نے لکھا کہ یہ گاڑیاں جتنی بھی ہیں ان سب کا دارومدار پہیے پر اور دُھرے پر ہے، کہ ایک دُھرا ڈال کے اس میں پہیے چلتے ہیں، چاہے وہ کار ہے، بس ہے، ٹرک ہے، موٹر ہے، ریل گاڑی ہے، سائیکل ہے، موٹر سائیکل ہے ان سب کا دارومدار پہیے پر اور دُھرے پر ہے، کہتے ہیں کہ کمال تو اس شخص کا ہے جس نے سب سے پہلے دُھرا اور پہیا ایجاد کیا، جس سے آگے ترقی کرتے ہوئے چاہے کتنی ہی بڑی بڑی سواریاں بن گئیں لیکن اس سے استغناء نہیں ہوا، حتیٰ کہ آپ کے ہوائی جہاز بھی ابتداءً پہیے پر ہی چلتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ یہ پہیا اور دُھرا حضرت آدم علیہ السلام کی ایجاد ہے، کہ حضرت آدم علیہ السلام نے بوجھ کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے کے لئے اس کو ایجاد کیا، جس کے ساتھ بوجھ کا منتقل کرنا آسان

ہوگیا۔ تو اسی طرح سے یہ کشتی والی صنعت حضرت نوح علیہ السلام سے شروع ہوئی، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسان کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے اِبتداءً ہدایات وحی کے ذریعے سے دی ہیں، یہاں بھی وحی کے ذریعے سے کشتی کی تلقین کی اور فرمایا کہ ہماری حفاظت میں ہماری ہدایات کے مطابق کشتی کو بنائیے۔

نوح علیہ السلام کا کشتی کی تیاری میں مصروف ہونا اور مخالفین کا اِستہزا کرنا

نوح علیہ السلام نے کشتی بنانی شروع کردی، خود بنانے لگ گئے یا بنوانے لگ گئے مفسرین نے دونوں باتیں ہی لکھی ہیں، خود بناتے ہوں محنت کرتے ہوں تو بھی ٹھیک ہے، کہ لکڑیاں کاٹیں، کاٹنے کے بعد ان کو تراشا، تراشنے کے بعد ان کو جوڑا، کیونکہ قرآنِ کریم میں کشتی کو جو ہیئت ذکر کی گئی ہے وہ ہے ذَاتِ اَلْوَاحٍ وَّدُسُرٍ، یہ لفظ سورۂ قمر کے اندر موجود ہے، وہ کشتی تختیوں والی تھی اور میخوں والی تھی، جس سے معلوم ہوا کہ اس وقت میخوں کا تصور بھی آ گیا تھا، لوہے کا کام بھی شروع ہو گیا تھا، اور پھر لکڑی کی تختیاں بنانے کے لئے بھی جس قسم کے اوزار کی ضرورت ہوتی ہے وہ بھی اس وقت تک بن گئے تھے، لکڑیاں چیر چیر کے جوڑ جوڑ کے میخیں لگا لگا کے کشتی بنالی۔ جس وقت حضرت نوح علیہ السلام نے کشتی بنانی شروع کی یا اپنی نگرانی میں بنوانی شروع کردی تو وہ لوگ جس وقت بھی پاس سے گزرتے مذاق کرتے کہ لوجی! پیغمبری کرتے کرتے اب لگ گئے یہ درکھانہ کرنے، اب ان کے دماغ میں خشکی آ گئی، پانی کہیں ملتا نہیں، پینے کو ترس رہے ہیں، بارش ہو نہیں رہی، اور ان کو ڈوبنے کا اندیشہ ہوگیا، لوجی! یہ کشتی بنا رہے ہیں، اب ریت کے ٹیلوں میں کشتی چلے گی، اسی قسم کے فقرے چست کرتے ہوں گے حضرت نوح علیہ السلام کو، سناؤ جی! کہاں چلاؤ گے یہ کشتی؟ اب پیغمبری چھوڑ کے یہ کام شروع کرلیا؟ اس قسم کی باتیں کرکے جب بھی پاس سے گزرتے تھے مذاق اڑاتے تھے، حضرت نوح علیہ السلام کی طرف سے جواب ملتا کہ آج تم ہنس لو، بہت قریب وقت آ رہا ہے کہ جس وقت تمہاری حالت ہمارے لیے مضحکہ خیز ہوگی، یا یہ ہے کہ تم ہم پر ہنس رہے ہو اور ہم تم پر ہنس رہے ہیں کہ کیسے بیوقوف لوگ ہیں، اللہ کا عذاب سر پہ آ گیا اور ان کو مستیاں سوجھ رہی ہیں، نَسْخَرُ مِنْكُمْ کا آپ کے سامنے دونوں طرح سے ترجمہ کیا گیا تھا، مستقبل کے طور پر بھی کیا جاسکتا ہے کہ ہم تم سے ہنسیں گے، تمہاری حالت ہمارے لیے مضحکہ خیز ہوگی، تمہارے تحریہ کا اس وقت نتیجہ سامنے آجائے گا، یا یہ ہے کہ تم ہم سے ٹھٹھا کرتے ہو اور ہم یہ ہنستے ہو، اور ہمیں تمہاری حالت ہنسی آ رہی ہے، کہ اللہ کا عذاب سر پہ کھڑا ہے اور تمہیں کوئی کسی قسم کی فکر ہی نہیں۔

عذاب سے قبل نوح علیہ السلام کو اللہ کی طرف سے ہدایات

تو کشتی تیار ہوگئی، تیار ہونے کے بعد پھر اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے یہ اطلاع آ گئی کہ جس وقت سیلاب کی اِبتدا ہوگی اور تنور میں سے پانی نکلے گا، ''تنور'' کا مفہوم آپ کے سامنے ذکر کردیا گیا تھا، کہ یا تو یہی روٹیاں پکانے والا تندور مراد ہے، مطلب یہ ہے کہ جب یہاں سے پانی اُبلنے لگے تو سمجھ لینا کہ اب عذاب آ رہا ہے، تو اسی وقت اپنے گھر والوں کو اور جو لوگ ایمان لے آئے ہیں ان کو، اور جتنے تمہاری ضرورت کے حیوانات ہیں ان میں سے دو دو یعنی ایک مذکر اور ایک مؤنث، جوڑا، زَوْجَیْنِ سے مراد مذکر مؤنث، اثْنَیْنِ اسی کی تاکید ہے، یعنی دو دو فرد، ایک مذکر اور ایک مؤنث کشتی کے اندر سوار کرلینا، اور مؤمنوں کو سوار کرلینا، اپنے اہل

کوسوار کرلینا،لیکن ''اہل'' کے ساتھ یہ لفظ آگیا کہ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ جس کے اوپر قول سبقت لے گیا، اس قول سے مراد یہی ہے اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ، جن کے متعلق غرق ہونا مقدر ہوگیا اُن کو چھوڑ کے باقیوں کو سوار کرلینا۔

قومِ نوح میں سے منکرین پر عذابِ خداوندی

وقت آگیا، عذاب کی ابتدائی ہوئی، حضرت نوح علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق ان سب کو کشتی میں سوار کرالیا، آسمان کی طرف سے کثرت کے ساتھ بارش شروع ہوئی، ایسے تھا جیسے کہ دہانے کھل گئے ہیں، جس کو ہماری اصطلاح میں کہتے ہیں کہ چھاجوں پانی برسنے لگا، تو آسمان کی طرف سے بھی پانی برسنے لگا، اور ادھر زمین کی طرف سے بھی پھوٹنے لگا، نیچے سے بھی پانی اور اوپر سے بھی پانی، سیلاب دونوں طرف سے آگیا، جس وقت سیلاب دونوں طرف سے آگیا تو نوح علیہ السلام کی کشتی تو تیرنے لگ گئی، اور باقی قوم درجہ بدرجہ ڈبکیاں کھانے لگ گئی، باقی بھی ڈوبے لیکن ان کی ڈوبنے کی یہاں کوئی تفصیل ذکر نہیں کی گئی، خصوصیت کے ساتھ حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے کا ذکر کیا گیا ہے، کہ جب یہ کشتی پانی میں تیرنے لگی تو بیٹا سامنے کہیں کھڑا تھا، تو حضرت نوح علیہ السلام نے اس آخر وقت میں بھی اپنے بیٹے کو یہ دعوت دی کہ بیٹا آجا! کافروں کے ساتھ نہ رہ، کافروں کی معیت اختیار نہ کر، میرے ساتھ سوار ہوجا، لیکن وہ بیٹا سمجھا نہیں کہ عذاب کی کیا نوعیت ہے، وہ سمجھا کہ ایسے ہوتا ہے، بارش ہوتی ہے، پانی آگیا، کوئی بات نہیں، آس پاس ہمارا پہاڑی علاقہ ہے، کسی پہاڑ کے اوپر چڑھ جاؤں گا، آخر کتنا پانی آجائے گا، پہاڑ کے اوپر سے تو گزرنے سے رہا، سَاٰوِيْۤ اِلٰى جَبَلٍ يَّعْصِمُنِيْ مِنَ الْمَآءِ: میں کسی پہاڑ پر ٹھکانا لے لوں گا جو مجھے پانی سے بچالے گا، لیکن حضرت نوح علیہ السلام نے متنبہ کیا کہ یہ اللہ کا عذاب ہے یہ معمول کے مطابق بارش نہیں ہے، جب یہ اللہ کا عذاب ہے تو آج پہاڑ اس سے نہیں بچاسکیں گے، بچے گا وہی جس کو اللہ بچائے گا، تو یہ گفتگو ابھی آپس میں ہو ہی رہی تھی کہ وہ جو پہاڑوں کے برابر پانی کی موجیں اٹھ رہی تھیں وہ باپ اور بیٹے کے درمیان میں حائل ہوگئیں، اور وہ بیٹا بھی مغرقین میں سے ہوگیا، وہ بھی ڈوب گیا۔ پھر حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی، اس کے متعلق قرآنِ کریم میں ذکر کیا گیا کہ وہ جُودی پہ جاکے ٹھہر گئی، آج کے جغرافیہ کی حیثیت سے بھی ایک پہاڑ ہے جس کا نام ''جُودی'' ہے، عراق کے علاقے میں ہے، جس کا ذکر آپ کے سامنے پہلے آیا تھا کہ موصل کے علاقے کے آس پاس ایک علاقہ ہے جس کو ''جزیرہ ابنِ عمر'' کہتے ہیں، اور فرات اور دجلہ یہ دو دریا جو عراق کے اندر بہتے ہیں یہ ایک پہاڑی سلسلے سے نکلتے ہیں جو آرمینیا کے علاقے کے ساتھ تعلق رکھتا ہے، اور توراۃ میں اُن پہاڑوں کا نام ''اَرارات'' آیا ہے، ''ارارات'' پہاڑی سلسلہ ہے، اور اس پہاڑی سلسلے میں ایک پہاڑ کی چوٹی ہے جس کو ''جُودی'' کہتے ہیں، تو ''ارارات'' کے پہاڑوں میں جودی چوٹی کے اوپر حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی ٹھہر گئی، جب آسمان کی طرف سے پانی برسنا بند ہوگیا، زمین نے پانی چوسنا شروع کردیا، تو وہ پانی اُترتے اُترتے جس وقت نیچے گیا تو وہ کشتی پہاڑ کی چوٹی کے اوپر آگئی۔ ''بخاری شریف'' میں بھی ایک روایت موجود ہے کہ اس اُمت کے اوائل نے یعنی پہلے لوگوں نے اس کشتی کے بعض آثار دیکھے ہیں۔[1] اور کہتے ہیں کہ آٹھویں صدی عیسوی تک تو اس پہاڑ پر ایک معبد یعنی عبادت خانہ بھی

---

(۱) بخاری ۲/۷۲۲، کتاب التفسیر، سورۃ القمر۔ قَالَ قَتَادَةُ أَبْقَى اللّٰهُ سَفِينَةَ نُوحٍ حَتّٰى أَدْرَكَهَا أَوَائِلُ هٰذِهِ الْأُمَّةِ.

بنا ہوا تھا، بہر حال لوگوں کے اندر قدیم زمانے سے یہ روایت چلی آتی تھی کہ نوح علیہ السلام کی کشتی اس پہاڑ کے اوپر آ کے ٹھہری...... وہاں سے پھر اللہ تبارک وتعالیٰ کا حکم ہوا نیچے اُترنے کے متعلق، اللہ نے اپنی رحمتوں اور برکتوں کا ذکر کیا کہ آپ پر بھی اور آپ کے ساتھیوں پر بھی، لیکن ان کی نسل میں آگے جا کے کچھ ایسی جماعتیں پیدا ہوں گی جو کہ کافر ہوں گی، اور میں انہیں تھوڑی دیر تک فائدہ پہنچاؤں گا، آخر وہ عذابِ الیم کی طرف گھسیٹ لیے جائیں گے۔ اس پر حضرت نوح علیہ السلام کے واقعے کا اختتام ہے۔

نوح علیہ السلام کا اپنے بیٹے کے متعلق دُعا کرنا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے تنبیہ

درمیان میں ایک اہم چیز ذکر کی گئی ہے، کہ حضرت نوح علیہ السلام نے اللہ تبارک وتعالیٰ سے اپنے بیٹے کے متعلق درخواست کی، یہ درخواست کب کی تھی؟ غرق ہونے سے پہلے یا غرق ہونے کے بعد؟ اور یہ درخواست جو کی تھی تو بیٹے کو مؤمن سمجھتے ہوئے کی تھی یا اس کو کافر سمجھتے ہوئے کی تھی؟ مفسرین نے یہ سارے احتمالات لکھے ہیں، بہر حال اتنی بات ضرور ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام نے اَهْلَكَ کے لفظ سے فائدہ اٹھانا چاہا کہ جب اللہ تعالیٰ نے کہا کہ اپنے اہل کو سوار کر لے جس میں اشارہ اس بات کی طرف تھا کہ تیرا اہل بچ جائے گا اور سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ یہ ایک مجمل سی بات تھی کہ اللہ کے علم میں کس کے بارے میں غرق ہونا طے ہو گیا اور کس بارے میں طے نہیں ہوا، اور مَنْ اٰمَنَ کو علیحدہ کر کے ذکر کیا ہوا تھا، جو اہل میں نہیں تھے مَنْ اٰمَنَ وہ ہوئے، جو آپ کے اہل میں نہیں ہیں ان کو بھی سوار کر لو وہ مَنْ اٰمَنَ وہ ہوئے میں آ گئے، اور اَهْلَكَ کا ذکر مستقل کیا ہوا ہے، اور مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ میں اجمال ہے، کہ اللہ کے علم کس کے متعلق قول سبقت لے گیا کہ یہ بھی ڈبو یا جائے گا اس کے بارے میں کوئی صراحت نہیں تھی، اور اس کے اطوار کی طرف دیکھتے ہوئے، (اس بیٹے کا نام کنعان ذکر کیا گیا ہے) اس کے اطوار کی طرف دیکھتے ہوئے یا تو حضرت نوح علیہ السلام کا خیال ہو گا کہ یہ مؤمن ہے جس طرح سے منافقانہ اطوار ہوتے ہیں، باپ کے سامنے آتا ہو گا تو ایسی باتیں کرتا ہو گا کہ جس سے نوح علیہ السلام کو خیال ہو گا کہ اس کا عقیدہ صحیح ہے، اگرچہ اپنی یاری باشی کے طور پر کافروں کے ساتھ ملتا جلتا رہتا ہے، اس قسم کے حالات سے حضرت نوح علیہ السلام اسے مؤمن سمجھ رہے تھے، یا نوح علیہ السلام نے درخواست بایں معنی کی کہ یا اللہ! اس کو ایمان دے دے اور ایمان دے کے اس کو کشتی میں سوار ہونے کی توفیق دے دے، اور وہ جو کہا تھا کہ تیری قوم میں سے کوئی شخص ایمان نہیں لائے گا، تو اَهْلَكَ کو ممکن ہے جس طرح سے ایک محبت ہوتی ہے تو محبت اور شفقت کے طور پر سمجھتے ہوں کہ شاید ان کی کوئی خصوصیت ہے، اور بعد میں بھی ان میں سے کسی کو ایمان مل سکتا ہے، اس قسم کی باتوں سے متاثر ہو کر حضرت نوح علیہ السلام نے اللہ سے درخواست کر دی کہ یا اللہ! میرا یہ بیٹا میرے اہل میں سے ہے۔ ڈوبنے سے پہلے اگر ہو تو مفہوم یوں ہو گا کہ میرا یہ بیٹا میرے اہل میں سے ہے اور تیرا وعدہ سچا ہے کہ تیرے اہل کو نجات دوں گا اور تو احکم الحاکمین ہے، تو میرے بیٹے کو بچا۔ اگر ڈوبنے سے پہلے یہ درخواست کی ہو پھر تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ یہ ڈوبتا جا رہا ہے، یہ دُور ہے، اس کو بچا، کہیں ڈوب نہ جائے۔ یا یہ ہے کہ اس کو ایمان کی توفیق دے کے میرے ساتھ سوار کرا دے اور اس کو سوار ہونے کی توفیق دے دے۔ بہر حال یہ ایک بے چینی کا اظہار ہے جو بیٹے کے متعلق حضرت نوح علیہ السلام کے اُوپر طاری ہوئی۔ اور اگر ڈوب گیا تو پھر دُعا کرنے کا مطلب یہ ہو گا جس طرح سے بچے کے ساتھ ایک محبت ہوتی ہے، اس کو اپنی

آنکھوں کے سامنے ڈوبتا ہوا دیکھا، تو اللہ تعالیٰ سے کہا کہ یا اللہ! وہ تو میرے اہل میں سے تھا، اور تیرا وعدہ بھی سچا ہے جو تُو نے میرے اہل کے متعلق کیا تھا، تو احکم الحاکمین ہے، تو جیسے ایک حقیقت سمجھنے کے لئے سوال کیا جاتا ہے کہ وہ کیوں ڈوب گیا، یہ بچے کے ساتھ محبت کی بنا پر ایک دُکھ کا اظہار ہے کہ یہ کیوں ڈوب گیا، تیرا وعدہ تھا میرے اہل کے متعلق، اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ کا لفظ جو آیا ہوا ہے تو وہ مجمل ہے کہ اللہ کے علم میں کس کے بارے میں قول سبقت لے گیا، کس کے بارے میں سبقت نہیں لے گیا، بہر حال اتنا سا ذہول حضرت نوح علیہ السلام سے ہوا جس کی بنا پر آگے جا کے ڈانٹ پڑی کہ اللہ تعالیٰ نے کہا کہ جب تجھے حقیقت معلوم نہیں ہے کہ مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ میں کون داخل ہے کون نہیں، اور اس کنعان کے صحیح حالات کیا ہیں کہ یہ منافق ہے کافر ہے؟ کافروں کے ساتھ اس کی دوستی ہے، اس میں ماننے کی صلاحیت نہیں، جب ان چیزوں کا تجھے پتا نہیں تو ایسے انداز میں سوال کیوں کر دیا؟ میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں کہ آئندہ کے لئے بلا تحقیق اس قسم کی بات نہ کیا کرو۔ جس کو ہم اپنے انداز میں کہتے ہیں کہ سوچا نہیں، سمجھا نہیں اور سوال کر دیا، ورنہ اگر آپ سوچتے اور سمجھنے کی کوشش کرتے تو اشارے تو اس میں موجود ہیں جس میں تیرے سوال کا جواب موجود ہے! اور مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ سے مراد یہی ہے کہ جو فی الواقع مؤمن ہیں، مخلص ہیں، جو تیرے ساتھ تعلق رکھتے ہیں انہی کو بچانے کا وعدہ ہے، دوسروں کو تو بچانے کا وعدہ ہی نہیں ہے، تو بغیر سوچے سمجھے سوال کر دیا؟ اور ان باتوں کے اندر غور نہیں کیا؟ تو جس چیز کا تمہیں پتا نہیں اس کے متعلق سوال کیوں کر رہے ہو؟ میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں کہ ایسا نہ کیا کرو۔ اَعِظُكَ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ: جاهلین کے لفظ کی وضاحت کل آپ کے سامنے کی تھی، کہ جہل جس طرح سے علم کے مقابلے میں آتا ہے، ''بے علمی کے ساتھ کوئی بات نہ پوچھا کرو'' پھر اس کا مفہوم یہ ہو جائے گا، ''میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں کہ نادانوں میں سے نہ ہونا، کہ جس طرح سے نادان بے سوچے سمجھے بات کر دیا کرتے ہیں، تم بھی بات میں غور نہ کرو، سوچو نہیں، اور ایسے ہی سوال کر دو، اُن لوگوں میں سے نہ ہو جانا۔ اور اسی طرح سے ''جہل'' جو ہے یہ ''حلم'' کے مقابلے میں بھی آتا ہے، ''حلم'' کہتے ہیں ''بُردباری'' کو، اور ''جہل'' کا معنی ہوتا ہے ''جذبات میں آجانا''، ''میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں کہ ان لوگوں میں سے نہ ہونا جو کہ جذبات سے متاثر ہو جایا کرتے ہیں''، تم بھی بچّے کی محبت سے متاثر ہو کے ان باتوں کو سوچا نہیں، اور اس طرح سے سوال کر دیا، یہ مناسب نہیں ہے ''میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں کہ ان لوگوں میں سے نہ ہو جانا جو کہ جذبات سے متاثر ہو جایا کرتے ہیں۔''

نوح علیہ السلام کی اللہ کے سامنے لجاجت

تو حضرت نوح علیہ السلام کو فوراً تنبہ ہوا، تنبہ ہونے کے بعد فوراً اللہ تعالیٰ کے سامنے لجاجت کی کہ یا اللہ! مجھ سے یہ غلطی ہوگئی کہ میں نے بے سوچے سمجھے، بغیر جانے بوجھے تیرے سامنے سوال کر دیا، ''اگر تُو مجھے نہیں بخشے گا، تو میرے پہ رحم نہیں کرے گا تو میں خسارہ پانے والوں میں سے ہو جاؤں گا''، حضرت نوح علیہ السلام نے فوراً اپنی اس لغزش کا اعتراف کیا، اعتراف کرنے کے بعد معافی مانگ لی، اور انبیاء علیہم السلام کی شان یہی ہوا کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کا تحفظ کرتے ہیں اور اگر کہیں بلا قصد کسی وجہ سے قدم ذرا پھسلنے لگتا

ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے فوراً تنبیہ جو کی جاتی ہے تو انبیاء علیہم السلام فوراً اس تنبیہ سے متاثر ہو کے بیدار ہو جاتے ہیں متنبہ ہو جاتے ہیں، اور اپنی اس لغزش کی تلافی کر لیتے ہیں۔

نوح علیہ السلام پر اس لغزش کا اثر اور انبیاء کی فطرتِ سلیمہ

اب ساڑھے نوسو سال یا ہزار سال کی زندگی جو نوح علیہ السلام کی گزری تو یہ ایک لغزش ہے جس کی نشاندہی قرآنِ کریم نے کی، اور نوح علیہ السلام اس کو اتنا محسوس کر گئے کہ قیامت کے میدان میں جس وقت مخلوق نوح علیہ السلام کے پاس جائے گی اور درخواست کرے گی کہ آپ اللہ کے دربار میں ہماری سفارش کیجیے کہ ہمارا حساب کتاب شروع ہو جائے تو نوح علیہ السلام اس وقت بھی اپنی اس لغزش کو محسوس کریں گے، اور کہیں گے تو بہ تو بہ، میں تو نہیں جاسکتا، آج تو اللہ تعالیٰ اتنا غصے میں ہے کہ اتنا غصے میں کبھی نہیں دیکھا، اور میں ایک دفعہ ایک ایسی بات پوچھ بیٹھا تھا جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے مجھے تنبیہ کی تھی، میں تو آج سامنے نہیں جاسکتا،[1] یعنی اس وقت تک یہ بات نوح علیہ السلام کے دل دماغ میں گویا کہ موجود رہے گی، اس سے اندازہ کیجیے کہ حضراتِ انبیاء علیہم السلام کی فطرت کتنی سلیم ہوتی ہے، وہ کتنے اعلیٰ معیار کے ہوتے ہیں، اور ان کی زندگی کتنی اللہ کی فرمانبرداری میں گزری ہوتی ہے کہ اس قسم کی لغزش کو بھی وہ قیامت تک نہیں بھولتے۔

اپنے خاندان پر ناز کرنے والوں کو تنبیہ

یہ درمیان میں بیٹے کا ذکر آ گیا، بیٹے کے غرق ہونے کی صراحت کرنے سے مقصود یہ ہے کہ لوگوں کے سامنے ظاہر کر دیا جائے کہ نسب پر غرور نہیں کرنا چاہیے، دیکھو! براہِ راست پیغمبر کا بیٹا ہے، یعنی مشرکینِ مکہ تو اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں تھے، ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں تھے اور سینکڑوں برس پہلے ان کے یہ اجداد گزر گئے، اور یہ سینکڑوں برسوں سے شرک اور کفر میں مبتلا ہیں، اور نسب پر فخر کرتے ہیں کہ ہم اُن کی اولاد میں سے ہیں، تو یہ کوئی فخر کرنے کی بات نہیں، اگر حقیقی بیٹا نبی کے راستے پر چلنے والا نہ ہو اور ایمان لانے والا نہ ہو تو اس نبی کی آنکھوں کے سامنے ڈبو دیا جاتا ہے اور نبی دَم نہیں مار سکتا، تو تم کسی کے خاندان میں ہونے پر کیسے فخر کرتے ہو، کہ اگر اچھے خاندان میں ہو تو اللہ تعالیٰ پکڑے گا نہیں، یا پکڑ لے گا تو یہ چھڑا لیں گے، جس قسم کے لوگوں کے تصورات ہوا کرتے ہیں، ایسی بات نہیں، اور ہمارے شیخ سعدیؒ نے بھی اسی بات کی طرف اشارہ کیا کہ:

پسرِ نوح با بداں بنشست   خاندانِ نبوتش گم شد[2]

کہ بیٹا اگرچہ نوح علیہ السلام کا تھا، باپ پیغمبر ہے، لیکن جس وقت رفاقت بُروں کی اختیار کر لی، بُروں کے ساتھ بیٹھ گیا، تو اپنی نبوّت کا خاندان ضائع کر بیٹھا۔ تو صراحت کے ساتھ اس کو ذکر کرنے میں انہی لوگوں کو تنبیہ کرنا مقصود ہے جو کہ اپنے خاندان کے اوپر فخر کرتے ہوئے ایمان لانے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

---

(۱) بخاری ۲/ ۶۴۲، کتاب التفسیر، سورۃ البقرۃ/ مشکوٰۃ ۲/ ۴۸۸، باب الحوض، فصل اول، عن انسؓ۔

(۲) گلستان، باب اول، حکایت ۴۔

وَاِلٰى عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا ؕ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ

بھیجا ہم نے عاد کی طرف ان کے بھائی ہود علیہ السلام کو، کہا ہود نے اے میری قوم! عبادت کرو اللہ کی، نہیں ہے تمہارے لیے اس کے علاوہ

غَيْرُهٗ ؕ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا مُفْتَرُوْنَ ۝۵۰ يٰقَوْمِ لَاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا ؕ اِنْ اَجْرِيَ

کوئی معبود، نہیں ہو تم مگر جھوٹ گھڑنے والے ۝۵۰ اے میری قوم! میں نہیں سوال کرتا تم سے اس تبلیغ پر اُجرت کا، نہیں ہے میری اُجرت

اِلَّا عَلَى الَّذِيْ فَطَرَنِيْ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝۵۱ وَيٰقَوْمِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ

مگر اس اللہ کے ذِمّے جس نے مجھے پیدا کیا، کیا تم سوچتے نہیں ہو؟ ۝۵۱ اے میری قوم! اپنے رَبّ سے مغفرت طلب کرو، پھر

تُوْبُوْۤا اِلَيْهِ يُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا وَّيَزِدْكُمْ قُوَّةً اِلٰى قُوَّتِكُمْ

اسی کی طرف متوجہ رہو، بھیجے گا تم پر بادل بہت برسنے والا اور زیادہ کرے گا تمہیں از روئے قوت کے تمہاری قوت کے ساتھ،

وَلَا تَتَوَلَّوْا مُجْرِمِيْنَ ۝۵۲ قَالُوْا يٰهُوْدُ مَا جِئْتَنَا بِبَيِّنَةٍ وَّمَا نَحْنُ بِتَارِكِيْۤ

اور مجرم ہونے کی حالت میں پیٹھ نہ پھیرو ۝۵۲ وہ کہنے لگے اے ہود! تُو ہمارے سامنے کوئی واضح دلیل نہیں لایا، ہم اپنے معبودوں کو

اٰلِهَتِنَا عَنْ قَوْلِكَ وَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِيْنَ ۝۵۳ اِنْ نَّقُوْلُ اِلَّا

چھوڑنے والے نہیں تیرے کہنے کی وجہ سے، اور نہ ہم تیری بات کا یقین کرنے والے ہیں ۝۵۳ نہیں کہتے ہم مگر یہ بات کہ

اعْتَرٰىكَ بَعْضُ اٰلِهَتِنَا بِسُوْٓءٍ ؕ قَالَ اِنِّيْۤ اُشْهِدُ اللّٰهَ وَاشْهَدُوْۤا اَنِّيْ

ہمارے معبودوں میں سے کسی نے تجھے کوئی بُرائی پہنچادی، ہود علیہ السلام نے کہا کہ بیشک میں اللہ کو گواہ کرتا ہوں اور تم بھی گواہ ہو جاؤ کہ

بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ۝۵۴ مِنْ دُوْنِهٖ فَكِيْدُوْنِيْ جَمِيْعًا

میں لاتعلق ہوں ان چیزوں سے جن کو تم شریک ٹھہراتے ہو ۝۵۴ اللہ کے علاوہ، پس کوئی تدبیر کر لو میرے خلاف تم سب اکٹھے ہو کر،

ثُمَّ لَا تُنْظِرُوْنِ ۝۵۵ اِنِّيْ تَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ رَبِّيْ وَرَبِّكُمْ ؕ مَا مِنْ دَآبَّةٍ

پھر تم مجھے مہلت بھی نہ دو ۝۵۵ بیشک میں نے بھروسا کیا اللہ پر جو میرا رَبّ ہے اور تمہارا بھی رَبّ ہے، نہیں ہے کوئی زمین پر چلنے والی چیز

اِلَّا هُوَ اٰخِذٌۢ بِنَاصِيَتِهَا ؕ اِنَّ رَبِّيْ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝۵۶ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ

مگر وہ اللہ پکڑنے والا ہے اس کو اس کی چوٹی سے، بیشک میرا رَبّ سیدھے راستہ پر ہے ۝۵۶ پھر اگر تم نے پیٹھ پھیری تو تحقیق میں پہنچا

مَّآ اُرْسِلْتُ بِهٖٓ اِلَیْكُمْ ؕ وَیَسْتَخْلِفُ رَبِّیْ قَوْمًا غَیْرَكُمْ ۚ

چکا ہوں تمہیں وہ پیغام جس کے ساتھ میں بھیجا گیا ہوں تمہاری طرف، اور خلیفہ بنائے گا میرا رَبّ تمہارے علاوہ کسی اور قوم کو،

وَلَا تَضُرُّوْنَهٗ شَیْـًٔا ؕ اِنَّ رَبِّیْ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ حَفِیْظٌ ﴿۵۷﴾ وَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّیْنَا

اور تم اس اللہ کو کچھ بھی نقصان نہیں پہنچا سکو گے، بے شک میرا رَبّ ہر چیز پر نگہبان ہے ﴿۵۷﴾ اور جب ہمارا حکم آ گیا تو ہم نے نجات دی

هُوْدًا وَّالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا ۚ وَنَجَّیْنٰهُمْ

ہود علیہ السلام کو اور ان لوگوں کو جو اس کے ساتھ ایمان لائے تھے (نجات دی) اپنی طرف سے رحمت کے ساتھ، اور ہم نے انہیں سخت

مِّنْ عَذَابٍ غَلِیْظٍ ﴿۵۸﴾ وَتِلْكَ عَادٌ ۙۗ جَحَدُوْا بِاٰیٰتِ رَبِّهِمْ وَعَصَوْا رُسُلَهٗ

عذاب سے نجات دی ﴿۵۸﴾ اور یہ عاد ہے جنہوں نے اپنے رَبّ کی آیات کا انکار کیا اور نافرمانی کی اللہ کے رسولوں کی،

وَاتَّبَعُوْٓا اَمْرَ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِیْدٍ ﴿۵۹﴾ وَاُتْبِعُوْا فِیْ هٰذِهِ الدُّنْیَا لَعْنَةً وَّیَوْمَ الْقِیٰمَةِ ؕ اَلَآ اِنَّ

اور انہوں نے اتباع کی ہر سرکش ضدی کے حکم کی ﴿۵۹﴾ پیچھے لگا دیے گئے وہ اس دُنیا کے اندر لعنت اور قیامت کے دِن بھی، خبردار! بیشک

عَادًا كَفَرُوْا رَبَّهُمْ ؕ اَلَا بُعْدًا لِّعَادٍ قَوْمِ هُوْدٍ ﴿۶۰﴾ وَاِلٰی ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا ۘ

عاد نے کُفر کیا اپنے رَبّ کا، خبردار! دُوری ہے عاد کے لئے جو کہ ہود کی قوم ہے ﴿۶۰﴾ اور بھیجا ہم نے ثمود کی طرف ان کے بھائی صالح علیہ السلام کو،

قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ ؕ هُوَ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ

کہا صالح نے اے میری قوم! عبادت کرو اللہ کی، نہیں ہے تمہارے لیے کوئی معبود اس کے علاوہ، اس نے پیدا کیا تمہیں زمین سے

وَاسْتَعْمَرَكُمْ فِیْهَا فَاسْتَغْفِرُوْهُ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَیْهِ ؕ اِنَّ رَبِّیْ قَرِیْبٌ مُّجِیْبٌ ﴿۶۱﴾

اور آباد کیا تمہیں اس زمین میں، اسی سے اِستغفار کرو پھر اس کی طرف متوجہ رہو، بیشک میرا رَبّ قریب ہے اور جواب دینے والا ہے ﴿۶۱﴾

قَالُوْا یٰصٰلِحُ قَدْ كُنْتَ فِیْنَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هٰذَآ اَتَنْهٰنَآ اَنْ نَّعْبُدَ

وہ کہنے لگے کہ اے صالح! تحقیق تُو ہمارے اندر اُمید کیا ہوا تھا اس سے پہلے، کیا تُو روکتا ہے ہمیں اس بات سے کہ ہم عبادت کریں

مَا یَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا وَاِنَّنَا لَفِیْ شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَیْهِ

اس چیز کی جس کی عبادت کرتے تھے ہمارے آباء، بیشک ہم البتہ شک میں ہیں اس چیز سے جس کی طرف تُو ہمیں بلاتا ہے ایسا شک

مُرِيبٍ ﴿٦٢﴾ قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ

جس نے ہمیں تردّد میں ڈال رکھا ہے ﴿۶۲﴾ صالح علیہ السلام نے کہا کہ اے میری قوم! تم بتلاؤ اگر میں اپنے رب کی طرف سے واضح دلیل پر ہوں

وَاٰتٰىنِيْ مِنْهُ رَحْمَةً فَمَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ عَصَيْتُهٗ

اور اس نے مجھے اپنی طرف سے رحمت دی ہو، تو کون مدد کرے گا میری اللہ کے عذاب سے بچاتا ہوا اگر میں اس اللہ کی نافرمانی کروں،

فَمَا تَزِيْدُوْنَنِيْ غَيْرَ تَخْسِيْرٍ ﴿٦٣﴾ وَيٰقَوْمِ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً فَذَرُوْهَا

نہیں بڑھاتے ہو تم مجھے سوائے خسارے میں ڈالنے کے ﴿۶۳﴾ اے میری قوم! یہ اللہ کی اُونٹنی ہے تمہارے لیے نشانی ہے پس چھوڑ دو اس کو،

تَاْكُلْ فِيْٓ اَرْضِ اللّٰهِ وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابٌ قَرِيْبٌ ﴿٦٤﴾ فَعَقَرُوْهَا

کھاتی پھرے اللہ کی زمین میں، اور اس کو کوئی تکلیف نہ پہنچانا، ورنہ پکڑ لے گا تمہیں جلدی آنے والا عذاب ﴿۶۴﴾ ان لوگوں نے اس

فَقَالَ تَمَتَّعُوْا فِيْ دَارِكُمْ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ ذٰلِكَ وَعْدٌ غَيْرُ

اُونٹنی کی کونچیں کاٹ دیں پس کہا صالح علیہ السلام نے فائدہ اُٹھاؤ تم اپنے گھروں میں تین دِن تک، یہ ایک ایسا وعدہ ہے جس میں

مَكْذُوْبٍ ﴿٦٥﴾ فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا صٰلِحًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ

جھوٹ نہیں بولا گیا ﴿۶۵﴾ جس وقت ہمارا حکم آ گیا ہم نے نجات دی صالح علیہ السلام کو اور ان لوگوں کو جو صالح کے ساتھ ایمان لائے تھے

بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَمِنْ خِزْيِ يَوْمِئِذٍ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْقَوِيُّ الْعَزِيْزُ ﴿٦٦﴾

(نجات دی) اپنی طرف سے رحمت کے ساتھ اور اس دِن کی رُسوائی سے نجات دی، بیشک تیرا رَبّ قوت والا ہے زبردست ہے ﴿۶۶﴾

وَاَخَذَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دِيَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ﴿٦٧﴾

پکڑ لیا ان لوگوں کو جنہوں نے ظلم کیا ہولناک آواز نے پس وہ ہو گئے اپنے گھروں کے اندر گھٹنوں کے بل گرے ہوئے ﴿۶۷﴾

كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا اَلَآ اِنَّ ثَمُوْدَا۟ كَفَرُوْا رَبَّهُمْ اَلَا بُعْدًا لِّثَمُوْدَ ﴿٦٨﴾

گویا کہ وہ لوگ اس بستی میں آباد ہی نہیں ہوئے تھے، خبردار! بیشک ثمود نے کفر کیا اپنے رَبّ کا، خبردار! دُوری ہے ثمود کے لئے ﴿۶۸﴾

خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ وَاِلٰى عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا: اِلٰى عَادٍ یہ اَرْسَلْنَا کے متعلق ہے، اَرْسَلْنَا اِلٰى عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا، بھیجا ہم

نے عاد کی طرف ان کے بھائی ہود کو۔ ہود علیہ السلام چونکہ اسی قومِ عاد کے فرد تھے اس لئے ان کا بھائی قرار دیا۔ قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰہَ مَا لَکُمْ مِّنْ اِلٰہٍ غَیْرُہٗ: کہا ہود علیہ السلام نے اے میری قوم! عبادت کرو اللہ کی نہیں تمہارے لئے اس کے علاوہ کوئی معبود، اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا مُفْتَرُوْنَ: نہیں ہو تم مگر جھوٹ گھڑنے والے۔ افتراء: جھوٹی بات بنا لینا۔ یعنی تم جو اللہ کے علاوہ اور چیزوں کو آلہہ قرار دیتے ہو تو یہ تمہارا افتراء ہے، یہ تم نے جھوٹی باتیں گھڑ لیں جن میں واقعہ کچھ نہیں۔ یٰقَوْمِ لَآ اَسْئَلُکُمْ عَلَیْہِ اَجْرًا: اے میری قوم! میں نہیں سوال کرتا تم سے اس تبلیغ پر اُجرت کا، اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَی الَّذِیْ فَطَرَنِیْ: نہیں میری اُجرت مگر اس اللہ کے ذِمّے جس نے مجھے پیدا کیا، الَّذِیْ فَطَرَنِیْ: جس نے مجھے پیدا کیا، اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ: کیا تم سوچتے نہیں ہو؟ وَیٰقَوْمِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّکُمْ: اے میری قوم! اپنے گزشتہ گناہوں سے معافی مانگو اپنے رَبّ سے۔ اِستغفار اور توبہ کا فرق جس طرح سے سورۂ ہود کی اِبتدا میں بتایا تھا۔ ''اپنے رَبّ سے مغفرت طلب کرو'' ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَیْہِ: پھر طاعت اور عبادت کے ساتھ اسی کی طرف متوجہ رہو، یُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَیْکُمْ مِّدْرَارًا: مدرار یہ مبالغے کا صیغہ ہے۔ بھیجے گا بادل تم پر بہت برسنے والا، اس حال میں کہ وہ بہت برسنے والا ہوگا، وَّیَزِدْکُمْ قُوَّۃً اِلٰی قُوَّتِکُمْ: اور زیادہ کرے گا تمہیں ازروئے قوت کے تمہاری قوت کے ساتھ، یعنی موجودہ قوت میں اور اضافہ کرے گا، جو اس وقت تمہیں قوت اور زور حاصل ہے اس قوت کے ساتھ تمہاری قوت اور بڑھائے گا، ''زیادہ کرے گا تمہیں ازروئے قوت کے تمہاری قوت کے ساتھ'' وَلَا تَتَوَلَّوْا مُجْرِمِیْنَ: مجرم ہونے کی حالت میں پیٹھ نہ پھیرو۔ قَالُوْا یٰہُوْدُ: وہ کہنے لگے اے ہود! مَا جِئْتَنَا بِبَیِّنَۃٍ: تو ہمارے سامنے کوئی واضح دلیل نہیں لایا، وَّمَا نَحْنُ بِتَارِکِیْٓ اٰلِہَتِنَا: تارِکی اصل میں تارکین تھا، نون اضافت کی وجہ سے گر گیا۔ نہیں ہیں ہم چھوڑنے والے اپنے آلہہ کو۔ آلهہ الٰہ کی جمع۔ ہم اپنے معبودوں کو چھوڑنے والے نہیں، عَنْ قَوْلِکَ: تیرے کہنے کی وجہ سے۔ عن سببیہ۔ ''تیرے کہنے کی وجہ سے ہم اپنے معبودوں کو چھوڑنے والے نہیں'' وَمَا نَحْنُ لَکَ بِمُؤْمِنِیْنَ: اور نہ ہم تیری بات کا یقین کرنے والے ہیں، اِنْ نَّقُوْلُ اِلَّا اعْتَرٰىکَ بَعْضُ اٰلِہَتِنَا بِسُوْٓءٍ: نہیں کہتے ہم مگر یہ بات کہ ہمارے آلہہ میں سے کسی نے تجھے بُرائی پہنچا دی۔ سوء کا معنی بُرائی، اور اعْتَرٰىکَ: تجھے پہنچا دی۔ ''پہنچا دی تجھے بُرائی ہمارے آلہہ میں سے کسی نے'' یعنی تو چونکہ گستاخ ہے، گستاخی کرتا ہے، تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے معبودوں میں سے تجھے کسی نے بیمار کر دیا، تیری عقل میں خرابی آگئی، ہمارے کسی معبود کی تجھ پر پھٹکار پڑ گئی جس کی وجہ سے تو ایسی بہکی بہکی باتیں کرتا ہے۔ ''ہمارے معبودوں میں سے کسی نے تجھے کوئی برائی پہنچا دی'' قَالَ اِنِّیْٓ اُشْہِدُ اللّٰہَ: ہود علیہ السلام نے کہا کہ بیشک میں اللہ کو گواہ کرتا ہوں، وَاشْہَدُوْٓا: اور تم بھی گواہ ہو جاؤ، اَنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِکُوْنَ ۝ مِنْ دُوْنِہٖ: کہ میں لاتعلق ہوں ان چیزوں سے جن کو تم شریک ٹھہراتے ہو اللہ کے علاوہ، فَکِیْدُوْنِیْ: کِیْدُوا: اَمر کا صیغہ۔ فَکِیْدُوْنِیْ جَمِیْعًا: تم سب اکٹھے ہو کر میرے خلاف کوئی تدبیر کرلو، کوئی تدبیر کرلو میرے خلاف تم سب اکٹھے ہو کر، ثُمَّ لَا تُنْظِرُوْنِ: پھر تم مجھے مہلت بھی نہ دو۔ نون کے اوپر جو کسرہ ہے وہ دال ہے یائے متکلم پر، لا تنظرونی، پھر تم مجھے مہلت بھی نہ دو۔ تم بھی آجاؤ اور تمہارے معبود بھی آجائیں، سارے اکٹھے ہو کر میرے خلاف کوئی سکیم بناؤ، اور پھر مجھے سنبھلنے بھی نہ دو، بغیر کسی قسم کی اطلاع دینے کے میرے اوپر اپنی وہ تدبیر جاری کردو، اِنِّیْ تَوَکَّلْتُ عَلَی اللّٰہِ رَبِّیْ وَرَبِّکُمْ: بے شک میں نے بھروسا کیا اللہ پر جو میرا رَبّ ہے اور تمہارا بھی رَبّ ہے، مَا مِنْ دَآبَّۃٍ اِلَّا ہُوَ اٰخِذٌۢ بِنَاصِیَتِہَا: نہیں کوئی دابہ۔ دابہ: زمین پر چلنے والی چیز۔ مگر وہ اللہ پکڑنے والا ہے اس کو پیشانی سے۔ ناصیہ سر کے اگلے حصے کے

بالوں کو کہتے ہیں، اور جس چیز کو یہاں سے پکڑ لیا جائے وہ چیز قابو آ جاتی ہے، مطلب یہ ہے کہ کوئی دابہ نہیں مگر میرا اللہ اس کے اوپر پوری طرح سے قابو پانے والا ہے، "مگر وہ پکڑنے والا ہے اس کو اس کی ناصیہ سے، چوٹی سے" اِنَّ رَبِّیْ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ: بیشک میرا رب سیدھے راستے پر ہے، یعنی عدل و انصاف پر قائم ہے، صراطِ مستقیم عدل انصاف کا راستہ ہے، وہ برا کرنے والوں کو برا بدلہ دے گا اور اچھا کرنے والوں کو اچھا بدلہ دے گا، یا، میرا رب سیدھے راستے پر قائم ہے، کوئی ٹیڑھا راستہ نہیں، جس طرح سے تم نے تجویز کر رکھے ہیں ٹیڑھے راستے کہ جب تک فلاں کو نہیں پوجو گے فلاں کو نہیں پوجو گے اللہ راضی نہیں ہوگا، ایسا نہیں، بلکہ سیدھے راستے پر چلتے رہو میرا رب مل جاتا ہے، اِنَّ رَبِّیْ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ: بیشک میرا رب سیدھے راستے پر ہے۔ فَاِنْ تَوَلَّوْا: پھر اگر تم نے پیٹھ پھیری، فَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ مَّاۤ اُرْسِلْتُ بِهٖۤ اِلَیْكُمْ: اِنْ کی جزاء محذوف ہوگی۔ "اگر تم نے پیٹھ پھیری تو میرا کوئی نقصان نہیں، تحقیق میں پہنچا چکا تمہیں وہ پیغام جس کے ساتھ میں بھیجا گیا ہوں تمہاری طرف، جس پیغام کے ساتھ میں تمہاری طرف بھیجا گیا ہوں میں نے وہ پیغام پہنچا دیا"، وَیَسْتَخْلِفُ رَبِّیْ قَوْمًا غَیْرَكُمْ: اور خلیفہ بنائے گا میرا ربّ تمہارے علاوہ کسی اور قوم کو، یعنی تمہیں تباہ کر دے گا، تمہاری جگہ کسی اور کو خلیفہ بنا دے گا، قائم مقام کر دے گا کسی اور قوم کو، وَلَا تَضُرُّوْنَهٗ شَیْـًٔا: اور تم اس اللہ کو کچھ بھی نقصان نہیں پہنچا سکو گے، اِنَّ رَبِّیْ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ حَفِیْظٌ: بیشک میرا ربّ ہر چیز کے اوپر نگہبان ہے۔ وَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا: اور جب ہمارا حکم آ گیا۔ اس حکم سے حکمِ عذاب مراد ہے۔ نَجَّیْنَا هُوْدًا: ہم نے ہود کو نجات دی، وَّالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ: اور ان لوگوں کو نجات دی جو اس کے ساتھ ایمان لائے تھے، بِرَحْمَةٍ مِّنَّا: اپنی طرف سے رحمت کے ساتھ، وَنَجَّیْنٰهُمْ مِّنْ عَذَابٍ غَلِیْظٍ: اور ہم نے انہیں سخت عذاب سے نجات دی، وَتِلْكَ عَادٌ ﳜ جَحَدُوْا بِاٰیٰتِ رَبِّهِمْ: اور یہ عاد ہے جنہوں نے اپنے رَبّ کی آیات کا انکار کیا، وَعَصَوْا رُسُلَهٗ: اور اللہ کے رسولوں کا انکار کیا۔ انکار انہوں نے بظاہر اگرچہ ہود علیہ السلام کا کیا تھا لیکن چونکہ رسول دعوت و تبلیغ میں سب ایک جیسے ہیں تو ایک رسول کا انکار سب کا انکار ہے۔ وَعَصَوْا رُسُلَهٗ: انہوں نے اللہ کے رسولوں کی نافرمانی کی، عصیان کیا، نافرمانی کی اللہ کے رسولوں کی، وَاتَّبَعُوْا: اور پیروی کی، اَمْرَ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِیْدٍ: عنید کہتے ہیں ضدی کو۔ ہر جابر ضدی، ہر سرکش ضدی کے حکم کی اتباع کی۔ "رسولوں کی نافرمانی کی، اور اتباع کی انہوں نے ہر جابر ضدی، سرکش ضدی کے حکم کی" وَاُتْبِعُوْا فِیْ هٰذِهِ الدُّنْیَا لَعْنَةً: پیچھے لگا دیے گئے وہ اس دُنیا کے اندر لعنت، وَّیَوْمَ الْقِیٰمَةِ: اور قیامت کے دن بھی۔ اَلَاۤ اِنَّ عَادًا كَفَرُوْا رَبَّهُمْ: خبردار! بیشک عاد نے کفر کیا اپنے رَبّ کا، اَلَا بُعْدًا لِّعَادٍ قَوْمِ هُوْدٍ: قَوْمِ هُوْدٍ یہ عاد کا بیان ہے۔ خبردار! دُوری ہے عاد کے لئے، "دُوری ہے عاد کے لئے" یہ لعنت کے مترادف ہے۔ اللہ کی رحمت سے دُوری ہے عاد کے لئے، ایسی عاد جو کہ قوم ہود ہے...... وَاِلٰى ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا: اور بھیجا ہم نے ثمود کی طرف ان کے بھائی صالح کو، قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ: کہا صالح علیہ السلام نے اے میری قوم! عبادت کرو اللہ کی نہیں ہے تمہارے لئے کوئی معبود اس کے علاوہ، هُوَ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ: اس نے پیدا کیا تمہیں زمین سے، وَاسْتَعْمَرَكُمْ فِیْهَا: اور آباد کیا تمہیں اس زمین میں، فَاسْتَغْفِرُوْهُ ثُمَّ تُوْبُوْۤا اِلَیْهِ: اسی سے اِستغفار کرو، اسی سے اپنے گناہ بخشواؤ، پھر طاعت اور عبادت کے ساتھ اس کی طرف متوجہ رہو، اِنَّ رَبِّیْ قَرِیْبٌ مُّجِیْبٌ: بیشک میرا رَبّ قریب ہے اور جواب دینے والا ہے، ہر کسی کے ساتھ اللہ تعالیٰ قریب ہے اور ہر کسی کی بات سنتا ہے اور قبول کرتا ہے۔ اس میں بھی ان کی وہی شرک کی رگ پر ضرب لگانی مقصود ہے جو کہتے تھے کہ بندے کی اللہ تک رسائی نہیں ہو سکتی

جب تک کہ درمیان میں یہ واسطے نہ بنائے جائیں، اور اللہ تعالیٰ ہماری فریاد سنتا نہیں، اللہ تعالیٰ انہی کی سنتا ہے اور انہی کی مانتا ہے، اس لئے ہمیں انہی کے ساتھ تعلق رکھنا چاہئے جو چھوٹے چھوٹے شفعاء شرکاء نیچے بنا لئے ہیں، تو حضرت صالح علیہ السلام کی بات کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر ایک سے قرب رکھتا ہے، ہر ایک کے نزدیک ہے، ہر ایک کی بات سنتا ہے اور دُعا قبول کرتا ہے، کوئی ضرورت نہیں اس قسم کے شرکاء شفعاء کی۔ قَالُوْا يٰصٰلِحُ قَدْ كُنْتَ فِيْنَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هٰذَآ: وہ کہنے لگے کہ اے صالح! تحقیق تو ہمارے اندر مرجو تھا۔ مرجو: اُمید کیا ہوا۔ یعنی تو اتنا سمجھ دار بچہ تھا کہ ہم سب تیرے متعلق امیدیں لگائے ہوئے تھے کہ بڑا ہو کر تو قوم کا نام روشن کرے گا، باپ دادے کا نام روشن کرے گا، تیری وجہ سے ہمیں کوئی ترقی حاصل ہوگی، بڑی تیرے سے امیدیں لگا رکھی تھیں، لیکن تُو نے تو ہماری سب امیدوں پر پانی پھیر دیا، اپنے بڑوں کو گمراہ کہتا ہے، اور اپنے دِین کو تو بدلنا چاہتا ہے، اپنے قومی آلہہ جتنے ہیں ان سب کی مخالفت کرتا ہے، ہم نے تو بڑی بڑی تیرے سے اُمیدیں لگا رکھی تھیں، یعنی اس لفظ میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ نبوّت کے اظہار سے قبل انبیاء علیہم السلام اپنی قوم کے نزدیک کتنے معتمد علیہ ہوتے ہیں، قوم ان کو امین سمجھتی ہے، صادق سمجھتی ہے، اور ہر لحاظ سے اچھی استعداد والا سمجھتی ہے، جس طرح سے سرورِ کائنات ﷺ کے متعلق بھی مشرکینِ مکہ کے ایسے ہی خیالات تھے، لیکن جب دِینِ حق کی تبلیغ شروع کرتے ہیں تو ان کا سارا اعتماد ختم ہو جاتا ہے۔ ''کہنے لگے اے صالح! تحقیق تھا تو ہمارے اندر اُمید کیا ہوا'' یعنی ہماری تیرے ساتھ بڑی اُمیدیں وابستہ تھیں، ''اس سے قبل'' اَتَنْهٰىنَآ اَنْ نَّعْبُدَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا: کیا تو روکتا ہے ہمیں اس بات سے کہ ہم عبادت کریں اس چیز کی جس کی عبادت کرتے تھے ہمارے آباء؟ جس کی عبادت ہمارے آباء کرتے تھے تو ہمیں اس کی عبادت کرنے سے روکتا ہے؟ وَاِنَّنَا لَفِيْ شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَيْهِ مُرِيْبٍ: بیشک ہم البتہ شک میں ہیں اس چیز سے جس کی طرف تو ہمیں بلاتا ہے۔ مُرِيْبٍ یہ شَكٍّ کی صفت ہے۔ ایسا شک جس نے ہمیں بے چین کر رکھا ہے، جس نے ہمیں تردّد میں ڈال رکھا ہے، تیری باتوں پر ہمارا دل نہیں جمتا، تو باتیں جس قسم کی کرتا ہے اس نے تو ہمارے دل کے اندر بہت تردّد پیدا کر دیا، بڑی بے چینی پیدا کر دی۔ قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ صالح علیہ السلام نے کہا کہ اے میری قوم! تم بتلاؤ، اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ: اگر میں اپنے ربّ کی طرف سے واضح دلیل پر ہوں، وَاٰتٰىنِيْ مِنْهُ رَحْمَةً: اور اس نے مجھے اپنی طرف سے رحمت دی ہو، یعنی نبوّت دی ہو، فَمَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ عَصَيْتُهٗ: اگر میں تمہارے کہنے میں آ کے تمہارے باپ دادے کے طریقے کو اپنا لوں، اور اس اللہ کے پیغام کی نافرمانی کر لوں، اِنْ عَصَيْتُهٗ: اگر میں اس اللہ کی نافرمانی کروں، فَمَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ: کون مدد کرے گا میری اللہ کے عذاب سے بچاتا ہوا، يَّنْصُرُنِيْ مِنْ عَذَابِ اللّٰهِ، نصرت کے اندر منع والا معنی مضمن ہے۔ ''کون مدد کرے گا میری اللہ کے عذاب سے بچاتے ہوئے'' فَمَا تَزِيْدُوْنَنِيْ غَيْرَ تَخْسِيْرٍ: تخسیر: خسارے میں ڈالنا۔ نہیں بڑھاتے ہو تم مجھے سوائے خسارے میں ڈالنے کے، یعنی تم تو میری بربادی میں اضافہ کرنا چاہتے ہو، برباد کرنا چاہتے ہو مجھے، ''نہیں زیادہ کرتے تم مجھے سوائے نقصان میں ڈالنے کے'' وَيٰقَوْمِ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ: اے میری قوم! یہ اللہ کی اُونٹنی ہے، لَكُمْ اٰيَةً: تمہارے لئے نشانی ہے، فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِيْٓ اَرْضِ اللّٰهِ: پس چھوڑو اس اُونٹنی کو، کھاتی پھرے اللہ کی زمین میں، اس کے سامنے رکاوٹ نہ ڈالا کرو، وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ: اور اس کو بُرائی نہ پہنچانا، کوئی تکلیف نہ پہنچانا، لَا تَمَسُّوْهَا: نہ مس کرنا اس اُونٹنی کو، بِسُوْٓءٍ: بُرائی کے ساتھ، یعنی اس کو کوئی بُرائی نہ پہنچانا، فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابٌ قَرِيْبٌ: پھر تمہیں جلدی ہی کوئی عذاب پکڑ لے گا، ایسا

عذاب جو جلدی آنے والا ہوگا، پکڑ لے گا تمہیں جلدی آنے والا عذاب۔ ''فاء'' کا مطلب ہوگا ''ورنہ پکڑ لے گا تمہیں'' اس کو کوئی تکلیف نہ پہنچائیو ورنہ جلدی آنے والا عذاب پکڑ لے گا، فَعَقَرُوْهَا: ان لوگوں نے اس اُونٹنی کی کونچیں کاٹ دیں، یعنی ہلاک کر دیا، فَقَالَ: پس کہا صالح علیہ السلام نے، تَمَتَّعُوْا فِيْ دَارِكُمْ: فائدہ اُٹھاؤ تم اپنے گھروں میں ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ: تین دن تک۔ اب تین دن تک تم اس اپنی دُنیوی زندگی سے فائدہ اُٹھا سکتے ہو، ذٰلِكَ وَعْدٌ: یہ ایک ایسا وعدہ ہے غَيْرُ مَكْذُوْبٍ: جس میں جھوٹ نہیں بولا گیا، یہ غیر مکذوب ہے، بالکل سچا وعدہ ہے، اس کے اندر کوئی جھوٹ کی ملاوٹ نہیں ہے، فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا صٰلِحًا: جس وقت ہمارا امر آ گیا ہم نے صالح کو نجات دے دی، وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ: اور ان لوگوں کو نجات دے دی جو صالح علیہ السلام کے ساتھ ایمان لائے تھے، بِرَحْمَةٍ مِّنَّا: اپنی طرف سے رحمت کے ساتھ، وَمِنْ خِزْيِ يَوْمِئِذٍ: اور اس دن کی رُسوائی سے نجات دے دی۔ خِزی: رُسوائی۔ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْقَوِيُّ الْعَزِيْزُ: بیشک تیرا رَبّ قوت والا ہے زبردست ہے۔ وَاَخَذَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ: پکڑ لیا ان لوگوں کو جنہوں نے ظلم کیا، الصَّيْحَةُ: چیخ نے۔ صاحَ يَصِيحُ: چیخنا۔ ''ہولناک آواز نے'' فَاَصْبَحُوْا فِيْ دِيَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ: پس وہ ہو گئے اپنے گھروں کے اندر اوندھے منہ گرے ہوئے، گھٹنوں کے بل گرے ہوئے، اُلٹے گرے ہوئے، یعنی جیسے اُٹھنے کی طاقت نہیں رہتی، انسان کھڑا ہوتا ہے اور گھٹنوں کے بل گر جاتا ہے، منہ کے بل گر جاتا ہے، تو جاثمین کا یہی معنی ہے، كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا: غَنِيَ بالمكانِ: اَقَامَ کے معنی میں۔ گویا کہ وہ لوگ اس بستی میں آباد ہی نہیں ہوئے تھے، اس طرح سے ان کو بے نام ونشان کر دیا، گویا کہ نہیں اِقامت اختیار کی تھی انہوں نے اس بستی میں، اَلَآ اِنَّ ثَمُوْدَا۟ كَفَرُوْا رَبَّهُمْ: خبردار! بیشک ثمود نے کُفر کیا اپنے رَبّ کا، اَلَا بُعْدًا لِّثَمُوْدَ: خبردار! دُوری ہے ثمود کے لئے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

تفسیر

ماقبل سے ربط

واقعات کے سلسلے میں حضرت نوح علیہ السلام کے بعد حضرت ہود علیہ السلام کا واقعہ ہے، قومِ عاد کا، اور اگلے رُکوع کے اندر حضرت صالح علیہ السلام کا واقعہ ہے یعنی قومِ ثمود کا، یہ واقعات اپنی تفصیل کے ساتھ سورۂ اعراف میں گزر چکے ہیں، اس لیے ان کے اندر کوئی نئی بات نہیں جس کی مزید وضاحت کی ضرورت ہو، اللہ تبارک وتعالیٰ ان کے واقعات کو دوہرا رہے ہیں چونکہ یہی حال تھا اس وقت مشرکینِ مکہ کا جو سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے مخاطب تھے، اِن واقعات کے ساتھ اُن کو نصیحت کرنا مقصود ہے کہ جیسا حال ان کا تھا آج تمہارا بھی ویسے ہی ہے، اس لیے تم سنبھل جاؤ ورنہ تمہارے ساتھ بھی ویسے ہی ہوگا جیسے اُن کے ساتھ ہوا تھا، اور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم یہ صحیح اور سچے واقعات تفصیل کے ساتھ بیان کرتے تھے جبکہ آپ نے کسی کتاب میں بھی نہیں پڑھے، تو یہ آپ کے لئے دلیلِ نبوت بھی بنتے تھے، اور انبیاء علیہم السلام کی طرف سے دعوتِ توحید کا تسلسل بھی یہاں سے معلوم ہوتا ہے، اور انبیاء علیہم السلام کے مخالفین مخاطبین جس قسم کے اِشکالات کرتے تھے ان کا ذکر بھی آ جاتا ہے جس سے مشرک عبرت حاصل کر سکتے ہیں کہ ایسے ہی خیالات اُن کے تھے، تو سمجھانے کے لئے ترغیب وترہیب کے طور پر ان واقعات کو بار بار دوہرایا جاتا ہے۔

قومِ عاد کا مختصر تعارف

اور یہ دونوں قومیں عرب کے اندر ہی تھیں قومِ عاد بھی اور ثمود بھی، بلکہ ثمود بھی عاد کی ہی کوئی شاخ ہے جس طرح سے مفسرین لکھتے ہیں، اور قرآنِ کریم میں متعدد جگہ ان کے حالات بیان کیے گئے ہیں، قوم عاد بہت ہی ڈیل وڈول والے، بڑے جسیم، بہت قوت والے لوگ تھے، ان کا یہ نعرہ تھا مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً (سورۂ حم سجدہ:۱۵) کہ ہم سے زیادہ قوت والا کون ہے جس سے ہم ڈریں یا ہم دبیں، یعنی ان کا دماغ اتنا چڑھا ہوا تھا کہ اپنے مقابلے میں کسی دوسرے کو کوئی اہمیت ہی نہیں دیتے تھے، تو ان کی طرف اللہ تبارک وتعالیٰ نے انہی کے بھائی ہود کو بھیجا، یعنی اس قوم کی طرف انہی میں سے ایک فرد کو بھیجا جس کے حالات اور عادات سے ہر طرح سے واقف تھے، مزاج اور لسان کی کوئی اجنبیت نہیں تھی، اور جس طرح سے اپنی قوم کا فرد قوم کو سمجھا سکتا ہے پرایا آدمی آجائے تو کئی سارے اِشکالات درمیان میں پیش آجاتے ہیں، تو اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے یہ بھی ایک اتمامِ حجت کی شکل ہے کہ ہر قوم کی طرف انہی میں سے ہی ایک رسول اُٹھایا۔

حضرت ہود علیہ السلام کا اپنی قوم کو دعوت دینا

تو ہود علیہ السلام نے آ کے وہی دعوت دی کہ جو انبیاء علیہم السلام کی مشترکہ دعوت ہے اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ، اور اس کے خلاف تم نے جتنے عقیدے بنا رکھے ہیں سب اِفترا ہے، سب جھوٹ گھڑ رکھا ہے، اور پھر اپنے خلوص کو ثابت کرنے کے لئے انبیاء علیہم السلام ہمیشہ یہ اعلان کرتے ہیں کہ دیکھو! اس میں ہماری کوئی غرض نہیں، ہم تمہارے ساتھ خیر خواہی کرتے ہیں، تمہارے نفع کے لئے ہم یہ جان مار رہے ہیں، ورنہ ہم تم سے کوئی اجرت نہیں مانگتے تم سے کوئی معاوضہ نہیں لیتے، یہ خلوص کی علامت ہوتی ہے، ورنہ اگر انسان پیسے مانگے یا ان سے فیس وصول کرے تو یہ خیال ہوسکتا ہے کہ شاید اس نے اپنا کوئی ذریعہ گزران بنالیا، اپنے گزارے کی کوئی صورت بنالی، ایسی کوئی بات نہیں، یہ انبیاء علیہم السلام کی صداقت کی ایک مستقل دلیل ہے کہ بے غرض ہوکر بے لالچ ہوکر قوم کو سمجھاتے ہیں، اس لیے یہ بات ہر نبی نے اپنی قوم کے سامنے اپنی زبان سے ادا کی، ''اے میری قوم! نہیں سوال کرتا میں تم سے اس پر کسی قسم کی اُجرت کا، میرا اجر تو صرف اسی کے ذمے ہے جس نے مجھے پیدا کیا، تم سوچتے نہیں ہو؟'' کہ باوجود اس بات کے میرا تم سے کوئی نفع متعلق نہیں، میں کوئی لالچ نہیں کرتا، تو پھر میں جو باتیں کہہ رہا ہوں اس میں تمہاری خیر خواہی ہے، ''اپنے پچھلے گناہوں سے معافی مانگو اور آئندہ کے لئے طاعت اور عبادت کے ساتھ اللہ کی طرف متوجہ رہو'' جس وقت توبہ استغفار کروگے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے تم پر رحمتیں نازل ہوں گی، بارش کی کمی وجہ سے تم جو قحط میں مبتلا ہو تو ''اللہ تعالیٰ خوب برسنے والا بادل بھیجے گا اور تمہاری موجودہ قوت میں اضافہ کرے گا'' وَيَزِدْكُمْ قُوَّةً اِلٰى قُوَّتِكُمْ: تمہاری سیاسی قوت، تمہاری خاندانی قوت ہر لحاظ سے بڑھے گی اگر تم توبہ اور استغفار کرنے لگ جاؤ گے، ''مجرم بن کے پیٹھ نہ پھیرو'' یہ تمہارے لیے نقصان دہ ہے۔

قوم کا حضرت ہود علیہ السلام کو جواب

تو اتنی پر خلوص دعوت کے بعد قوم کا وہی جواب جس طرح سے عام طور پر مشرک قوموں کی طرف سے قرآنِ کریم

میں ذکر کیا گیا، ''کہنے لگے کہ اے ہود! تو ہمارے سامنے کوئی ایسی واضح دلیل تو لایا نہیں'' جس کے سامنے ہم ماننے کے لئے مجبور ہو جائیں، جس قسم کے معجزات وہ طلب کرتے تھے ایسا کوئی معجزہ نہیں دکھایا ہوگا، ورنہ ہر نبی اپنی نبوّت کے ثبوت کے لئے معجزہ تو پیش کیا ہی کرتا ہے، ''باقی! تیرے کہنے کی وجہ سے ہم اپنے معبودوں کو نہیں چھوڑ سکتے'' عَنْ قَوْلِكَ میں عن سببیہ ہے، یعنی تیری بات کی وجہ سے ہم اپنے معبودوں کو نہیں چھوڑ سکتے، دیکھو اجن کی وہ پوجا کرتے تھے ان کے لئے وہ ''اِلٰہ'' کا لفظ استعمال کرتے ہیں اور اپنے عمل کو ''عبادت'' کہتے ہیں، ''عبادت'' اور ''اِلٰہ'' یہ دو لفظ قرآنِ کریم میں جو آئے ہیں انہی سے اُن کے شرک کا مزاج پوری طرح سے سمجھ میں آتا ہے، کہ وہ ایسے استقلال کا عقیدہ رکھتے تھے کہ ان کے جو اختیارات اللہ تعالیٰ کی طرف سے مل گئے ہیں ان کو آئندہ استعمال کرنے کے لئے یہ مستقل ہیں، اور اپنی جو تعظیم کی حرکات اُن کے ساتھ کرتے تھے ان کو عبادت قرار دیتے تھے، ''ہم تیری بات کا یقین کرنے والے نہیں''، یہ فیصلہ سنا دیا۔ باقی! تو اچھا بھلا سمجھ دار تھا، تو معلوم ایسے ہوتا ہے کہ تُو نے ہمارے معبودوں کی جو گستاخی کی ہے تو کسی معبود نے غصّے میں آ کے تیری عقل خراب کر دی ہے، تیرے اوپر کسی معبود کی مار پڑی ہے، یعنی اُن کے خیال کے مطابق، اور عقل خراب ہوگئی جس کی وجہ سے تُو ساری قوم کے خلاف ہو گیا ہے، پہلے ساری قوم تیری عزت کرتی تھی اور اب تو جدھر کو جاتا ہے تجھے پتھر پڑتے ہیں، کوئی تیری عزت نہیں کرتا کوئی احترام نہیں کرتا، یہ انقلاب جو تیرے اندر آیا ہے کسی معبود نے یہ چکر دے دیا ہے ''نہیں کہتے ہم مگر یہی بات کہ ہمارے معبودوں میں سے کسی نے تجھے کوئی بُرائی پہنچا دی۔''

حضرت ہود علیہ السلام کا اِظہارِ بے زاری، اور انبیاء کی صداقت پر ایک مستقل دلیل

تو حضرت ہود علیہ السلام نے فوراً کہا کہ کیا معبود لیے پھرتے ہو، میں اللہ کو گواہ کر کے کہتا ہوں اور تم بھی گواہ ہو جاؤ کہ میرا ان سے کوئی تعلق نہیں، اور میں تو ان سے اتنا بیزار ہوں کہ تم سارے کے سارے تم بھی اور تمہارے معبود بھی اکٹھے ہو جاؤ پھر مجھے نقصان پہنچانے کے لئے کوئی تدبیر کر دو اور پھر سارے مل کے اس تدبیر کو چالو کر دو اور مجھے مہلت بھی نہ دو، تو دیکھو! تم میرا کیا بگاڑ لوگے، انبیاء علیہم السلام کی قوم کے سامنے یہ جو کیفیت ہوا کرتی ہے کہ اکیلے ہو کر ساری قوم کے سامنے ڈٹ جاتے ہیں اور ان کے اوپر کسی قسم کا خوف و ہراس طاری نہیں ہوتا یہ مستقل ان کی صداقت کی دلیل ہوتی ہے، یعنی لَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا میں لالچی ہونے کی نفی ہوگئی کہ ہمیں تم سے کوئی لالچ نہیں ہے، اور اِن الفاظ میں خوف کی نفی ہوگئی کہ ہمیں تم سے کوئی خوف نہیں ہے، جیسے بارہا آپ کی خدمت میں عرض کیا گیا کہ یہی چیز ہے جو انسان کی حیثیت کو نمایاں کرتی ہے کہ ہمیں نہ کوئی غرض ہے نہ کسی قسم کا خوف ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہمارا تعلق ہے، تم جو کر سکتے ہو کر لو، تمہارے معبود اور تم مل کے بھی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے، ''میں نے بھروسا کر لیا اللہ پر جو میرا رَبّ ہے اور تمہارا بھی رَبّ ہے، کوئی دابہ نہیں مگر اللہ تعالیٰ اس کو چوٹی سے پکڑنے والا ہے'' یعنی زمین کے اندر جتنی چلنے پھرنے والی چیزیں ہیں سب میرے اللہ کے قبضے میں ہیں، اللہ کی قدرت سے باہر کوئی نہیں، ''میرا رَبّ صراطِ مستقیم پر ہے'' عدل و انصاف کی راہ پر قائم ہے، وہ مجرم کے ساتھ برتاؤ ایسا ہی کرے گا جس کا مجرم مستحق ہے، اور نیکی کرنے والوں کو عدل و انصاف کے ساتھ اجر و ثواب دے گا، یا (یہ مطلب ہے کہ) تم نے راستے ٹیڑھے بنا رکھے ہیں، اللہ تعالیٰ تک پہنچنے میں پیچیدگی پیدا کر لی، مجھے

ہو کہ جب تک یہ طویل عریض راستہ اختیار نہیں کریں گے، فلاں کو راضی نہیں کریں گے، فلاں کو سجدہ نہیں کریں گے، فلاں کو پکاریں گے نہیں، اس وقت تک ہم اللہ تعالیٰ تک نہیں پہنچ سکتے، ایسی بات نہیں ہے، اللہ تو بالکل سیدھے راستے پر ہے، اس میں کوئی پیچ نہیں، کوئی مشکل نہیں، فطرت کے مطابق صحیح راستے کو اختیار کرو، سیدھا اللہ تک جاتا ہے۔ اور اگر تم نے پیٹھ پھیری تو میرا کوئی نقصان نہیں، میں تمہیں وہ پیغام پہنچا چکا جو میں دے کے تمہاری طرف بھیجا گیا ہوں، اور اللہ تمہیں تباہ کر دے گا، تمہاری جگہ اور خلیفے بنا دے گا، تمہارے تباہ کرنے سے اللہ کی زمین ویران نہیں ہو جائے گی، اللہ کا تم کچھ نہیں بگاڑ سکو گے، "بے شک میرا اللہ ہر چیز پر نگہبان ہے۔"

قومِ عاد پر سخت عذاب کا نقشہ

قوم جس وقت نہ مانی تو آخر اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم عذاب آ گیا، قرآنِ کریم میں دوسری جگہ ذکر کیا گیا ہے کہ اس قوم کے اُوپر ریحِ صرصر کا عذاب آیا تھا، اَمَّا عَادٌ فَاُهْلِكُوْا بِرِيْحٍ صَرْصَرٍ (سورۂ حاقہ) تیز تند ہوا، سرد خشک، اور وہ سَبْعَ لَيَالٍ وَّثَمٰنِيَةَ اَيَّامٍ (سورۂ حاقہ) سات راتیں اور آٹھ دِن تک ان کے اوپر آندھی کی شکل میں چلی، اور اس کے اندر بجلی کی کڑک بھی تھی جس طرح سے بعض آیات میں صاعقہ کا ذکر کیا گیا ہے (سورۂ حم سجدہ: ۱۳)، کہ ان کے اوپر صاعقہ کا عذاب آیا، یعنی کڑک، جس طرح سے بادل آتا ہے اور تیز کڑک اس میں ہوتی ہے، اور سخت ہوا آئی جس نے اٹھا اٹھا کے ان کو اس طرح سے پٹخ پٹخ کے مارا، قرآنِ کریم نے ان کا نقشہ ذکر کیا ہے کہ جب یہ گرے پڑے تھے تو ایسے معلوم ہوتے تھے كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِيَةٍ (سورۂ حاقہ) جیسے کھجور کے کھوکھلے تنے گرے پڑے ہوں، اس طرح سے یہ گرے پڑے تھے، ساری کی ساری قوم اس طرح تباہ ہو گئی۔

قومِ عاد پر عذاب اِتفاقی حادثہ نہیں بلکہ عذابِ خداوندی تھا

اب یہ جو عذاب ان کے اوپر آیا تو اس کو اتفاقی نہیں کہہ سکتے، کہ جس طرح سے اتفاقاً آندھی آتی ہے بادل آ جاتا ہے، کیونکہ ایک تو نبی کی پیش گوئی کے مطابق آیا کہ نبی نے پہلے ہی کہہ دیا کہ یہ آئے گا اور عین اس کے مطابق آیا، پھر سب سے بڑی بات کہ یہ جو واقعہ ہوا ہے یہ کُفر کی سزا کے طور پر ہوا ہے کہ اسی بستی میں ہود علیہ السلام بھی موجود ہیں، اور ہود علیہ السلام کے ساتھ ایمان لانے والے بھی موجود ہیں، جتنے ہود علیہ السلام کے ساتھ ایمان لانے والے کلمہ پڑھنے والے تھے وہ سارے کے سارے بچ گئے اور جتنے مخالف تھے وہ سارے کے سارے مر گئے، یہ اس بات کی علامت ہے کہ یہ اتفاقی حادثہ نہیں ہے، اگر یہ اتفاقی حادثہ ہوتا تو جیسے ایک سیلاب آتا ہے تو اس میں نیک بھی بہہ جاتے ہیں، بد بھی بہہ جاتے ہیں، اور کوئی واقعہ پیش آتا ہے تو اس میں کوئی بُرا بچ جاتا ہے نیک مر جاتا ہے، ایسے واقعات ہوتے ہیں جس میں حساب خلط ملط سا ہو جاتا ہے، بس کا ایکسیڈنٹ ہوا، اس میں کوئی نیک آدمی تھا مر گیا، بُرا بیٹھا تھا وہ بچ گیا، اور کبھی ایسا ہو گا کہ اچھے بھی مر گئے، بُرے بھی مر گئے، اس کو آپ کہہ سکتے ہیں یہ اتفاقی حادثہ ہے، یہ عذاب کی شکل نہیں، آخرت میں اللہ تعالیٰ اعمال کے مطابق فیصلہ کرے گا جو ہو گا، دنیا میں واقعات کی لپیٹ میں ہر طرح کے انسان آ جاتے ہیں، لیکن یہ جو واقعہ ہے یہ عذاب ہے جو کُفر کی سزا کے طور پر آیا ہے، اس کی بڑی علامت یہی ہے کہ اس بستی میں جو ایمان

والے بستے تھے ان کا بال بھی بیکا نہیں ہوا، وہ سارے کے سارے محفوظ، اور جتنے کافر تھے ان میں سے کوئی نہیں بچا، وہ سارے کے سارے برباد ہوگئے، اور پھر قبل از وقت پیغمبر نے اطلاع دی کہ یہ آنے والا ہے، اور اس کے کہنے کے مطابق آیا، اس لیے یہ عذاب ہی ہے، اس کے اندر یہ حیثیت نہیں کہ جس طرح سے دُنیا میں اتفاقی واقعات ہوجایا کرتے ہیں یہ بھی کوئی ایسا ہی اتفاقی واقعہ ہے، ''جب ہمارا حکم عذاب آگیا تو ہم نے نجات دی ہود کو اور ان لوگوں کو جو ان کے ساتھ تھے، نجات دی اپنی طرف سے رحمت کے ساتھ، اور ہم نے ان کو نجات دی سخت عذاب سے، یہی عاد، انہوں نے انکار کیا اپنے ربّ کی آیات کا اور رسولوں کی نافرمانی کی'' یعنی ایک رسول کی نافرمانی سب کی نافرمانی ہے چونکہ دعوتِ توحید میں سب مشترک ہیں، ''رسولوں کی نافرمانی کی، اور جو لوگ ضدی تھے اور سرکش تھے'' یعنی اسی قوم کے سردار، جو ضدی تھے جبار تھے، سرکش تھے، انبیاء علیہم السلام کے متبع نہیں تھے، اُنہی کی اِتباع اِنہوں نے کرلی، تو جو انجام اُن کا ہوا وہی اِن کا ہوا، ''اس دُنیا میں بھی ان کے پیچھے لعنت لگادی گئی اور قیامت کے دن بھی یہ ملعون ہوں گے'' اللہ کی رحمت سے ان کو کوئی حصہ نہیں ملے گا، ''خبردار! عاد نے کُفر کیا اپنے ربّ کے ساتھ، خبردار! دُوری ہے عاد کے لئے (یہ لعنت کے الفاظ ہیں) یعنی قومِ ہود۔''

حضرت صالح علیہ السلام کی قومِ ثمود کو دعوت اور قوم کا جواب

دوسرا واقعہ حضرت صالح علیہ السلام کا ہے۔ ہم نے ثمود کی طرف ان کے بھائی صالح علیہ السلام کو بھیجا، انہوں نے بھی وہی دعوت دی کہ اے قوم! اللہ کی عبادت کرو، تمہارے لیے اس کے علاوہ کوئی معبود نہیں، اسی نے تمہیں زمین سے پیدا کیا اسی نے تمہیں زمین میں آباد کیا، اسی سے اِستغفار کرو، اور طاعت کے ساتھ اس کی طرف متوجہ رہو، یہ واسطے جو تم نے بنا رکھے ہیں شرکاء جو اختیار کر رکھے ہیں شفعاء جو بنا رکھے ہیں، یہ غلط ہے، میرا ربّ ہر کسی کے قریب ہے، ہر کسی کی دُعا کو سنتا ہے، جواب دیتا ہے، یہ نظریہ جو تم نے اختیار کرلیا کہ دُنیا کے بادشاہ جس طرح سے ہیں ان تک درخواست نہیں پہنچائی جاسکتی جب تک کہ مقربانِ شاہی کی دِل جوئی نہ کی جائے، اور پھر بادشاہ لوگ خود جواب نہیں دیتے بلکہ اپنے کارندوں کے سپرد کردیتے ہیں کہ اس کو جواب دے دو اور اس کا یہ کام کردو، پھر کارندے خوش ہوں گے تو کریں گے، اگر خوش نہیں ہوں گے تو کام کو بگاڑ دیتے ہیں، ایسی بات نہیں، اللہ تعالیٰ تو ہر ایک کے قریب ہے اور ہر کسی کی دُعا کو سنتا ہے اور قبول کرتا ہے، ان واسطوں کی، شرکاء شفعاء کی کوئی ضرورت نہیں۔ وہ کہنے لگے کہ اے صالح! اس سے قبل تُو ہم میں بڑا ''مرجوّ'' تھا، تیرے متعلق ہم نے بڑی اُمیدیں لگا رکھی تھیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اظہارِ نبوّت سے قبل کس طرح سے قابلِ اعتماد تھے، اخلاق کے لحاظ سے، معاملات کے لحاظ سے، عقل وفہم کے لحاظ سے یہ افرادِ قوم میں ممتاز ہوتے ہیں، تو ''بڑی اُمیدیں لگا رکھی تھیں، کیا تُو ہمیں روکتا ہے؟'' یعنی اب تُو نے الٹی پلٹی باتیں کرنی شروع کردیں، ''کیا تُو منع کرتا ہے ہمیں اس بات سے، ''اَتَنْھٰنَا اَنْ نَّعْبُدَ'' یہاں ''مِن'' محذوف ہوگا۔ ''ہمیں تُو روکتا ہے؟ اس بات سے کہ ہم عبادت کریں ان چیزوں کی جن کی عبادت کرتے تھے ہمارے آباء'' بس دلیل یہی تھی کہ چونکہ ہمارے آباء پُوجتے آرہے تھے تو ان کی ہمیں بھی عبادت کرنی چاہیے، تُو ایسے طریقے سے روکتا ہے؟ باقی! دلیل ان کے پاس کوئی نہیں سوائے اس کے کہ ہمارے باپ دادے ان کو

پُوجتے چلے آئے،''اور جس چیز کی طرف تُو ہمیں دعوت دیتا ہے'' یعنی یہ توحید کہ باقی سب کو چھوڑ دیا جائے،صرف اللہ کو اختیار کیا جائے''ہم تو اس کے بارے میں بہت شک میں ہیں جو ہمیں چین نہیں لینے دیتا'' مُرِیْبٍ یہ شَكٍّ کی صفت ہے،''بیشک ہم البتہ شک میں ہیں اس چیز سے جس کی طرف تو ہمیں بُلاتا ہے'' مُرِیْبٍ: تردّد میں ڈالنے والا، بے چینی میں ڈالنے والا شک،یعنی اس شک کی بنا پر ہمیں بے چینی ہو رہی ہے، تیری باتوں پر ہمارے دِل نہیں جمتے جو تُو باتیں کرتا ہے۔''صالح علیہ السلام نے کہا کہ اے میری قوم! تم بتلاؤ کہ اگر میں کسی واضح دلیل پر ہوں اپنے رَبّ کی طرف سے''اس دلیل سے وہی معجزہ مراد ہوگا''اور اللہ نے مجھے اپنی طرف سے نبوّت عطا کی ہو'' تو پھر میں اگر تمہارے پیچھے لگ کے انہی چیزوں کی پُوجا کرنے لگ جاؤں جن کی تمہارے آباء پُوجا کرتے تھے، اور میں اللہ کی نافرمانی کروں''تو اللہ کے عذاب سے مجھے کون بچائے گا؟'' فَمَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ: کون مدد کرے گا میری اللہ کے عذاب سے بچاتے ہوئے اگر میں نے اللہ کی نافرمانی کی،''تم تو میری بربادی ہی چاہتے ہو'' مجھے بربادی میں ہی ڈالنا چاہتے ہو جو اس قسم کے مشورے دیتے ہو،''نہیں بڑھاتے ہو تم مجھے سوائے خسارے میں ڈالنے کے۔''

منہ مانگے معجزے کے ساتھ قومِ ثمود کی بدسلوکی

کہتے ہیں کہ انہوں نے حضرت صالح علیہ السلام سے معجزہ طلب کیا تھا کہ پہاڑ میں سے ایک اُونٹنی نکال دو، پتھر میں سے، چٹان میں سے ایک اُونٹنی نکال دو۔ اب قرآنِ کریم کی آیات سے اتنا تو معلوم ہوتا ہے کہ کوئی اُونٹنی معجزے کے طور پر ظاہر ہوئی تھی اور اس کی کیفیات عام اُونٹنیوں کی طرح نہیں تھیں، اس کو کھلا چھوڑ دیا گیا کہ جہاں چاہے کھائے پیئے، ایک دِن پانی کی باری اس کی ہوتی اور ایک دِن باقی سارے جانور پانی پیتے تھے، اور اس میں کچھ اس قسم کی ہیبت تھی کہ قوم اس کے سامنے کسی قسم کا تعرض نہیں کرسکتی تھی، اس قسم کی باتیں تو ساری کی ساری قرآنِ کریم سے ظاہر ہوتی ہیں، تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ اُونٹنی کسی ممتاز شان کی تھی، باقی یہ بات کہ وہ پتھر سے نکلی تھی پتھر سے پیدا ہوئی تھی اس کا ذکر قرآنِ کریم میں نہیں، نہ کسی صحیح روایت میں ہے، آثار کے اندر یہ بات مذکور ہے کہ اس کے معجزہ ہونے کی حیثیت یہ تھی کہ ان کے کہنے کے مطابق یہ اُونٹنی پتھر سے نکلی تھی، پتھر سے پیدا ہوئی تھی، اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کے ساتھ اس کو نکال دیا، اور ایسے ہی انہوں نے مطالبہ کیا تھا۔''اے میری قوم! یہ اُونٹنی ہے تمہارے لیے نشانی، پس چھوڑ دو اسے، کھاتی پھرے اللہ کی زمین میں'' یعنی اس کے سامنے کسی قسم کی کوئی رُکاوٹ نہ ڈالا کرو، فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِيْۤ اَرْضِ اللّٰهِ: یعنی کہیں بھی یہ چَرے، اس کے سامنے رُکاوٹ نہ ڈالا کرو، اسے چھوڑ دو، اللہ کی زمین کھاتی پھرے، اور اسی طرح سے پانی کی باری بھی باندھ دی گئی۔''اور اسے کوئی بُرائی نہ پہنچانا ورنہ تمہیں جلدی آنے والا عذاب پکڑ لے گا۔'' فَعَقَرُوْهَا: انہوں نے تھوڑے دِن تو صبر کیا لیکن بعد میں کہنے لگے کہ یہ کیا ہے، ایک اُونٹنی ہر طرف پھرتی رہتی ہے، ہماری فصلوں کا نقصان کرتی ہے، اور ایک دِن اس کے پانی کے لئے خاص ہوگیا، اس دِن ہم اپنے جانوروں کو پانی نہیں پلاسکتے، آخر وہ اس اُونٹنی کا یہ امتیاز برداشت نہ کرسکے، اور انبیاء علیہم السلام کی باتیں جو ہوا کرتی ہیں ان پر تو ان کے دِلوں کو یقین نہیں تھا، صالح علیہ السلام کی باتوں کا یقین نہ کیا، تو سکیم بنا کے ایک آدمی ان میں سے

اُٹھا جس کا نام "قذار" لکھا ہے، اور اس نے حملہ کر کے اس اُونٹنی کو ہلاک کر دیا، سورۂ والشمس کے اندر آئے گا اِذِ انۢبَعَثَ اَشْقٰىهَا جبکہ اُٹھا ان میں سے ایک بدبخت۔ باقیوں کو اس کی تائید حاصل تھی اور اُس بدبخت نے حملہ کر کے اس اُونٹنی کو ہلاک کر دیا۔

قومِ ثمود کا عبرت ناک انجام!

جب یہ واقعہ پیش آ گیا تو حضرت صالح علیہ السلام نے کہا کہ بس اب تین دن کی مہلت ہے، تین دن کے اندر جو کچھ کھانا پینا ہے، جو کچھ نفع اُٹھانا ہے اُٹھالو، تین دن کے بعد عذاب آ جائے گا، دیکھو! یہ پیش گوئی کر دی اور عین پیش گوئی کے مطابق عذاب آیا، اور جب عذاب آیا تو اس میں صرف کافر ہلاک ہوئے مؤمن ہلاک نہیں ہوئے، تو یہ ایک واضح دلیل ہے کہ یہ واقعہ جو پیش آیا تھا تو اللہ کے عذاب کے طور پر ہی پیش آیا تھا یہ کوئی اتفاقی واقعی نہیں تھا، پیش گوئی کے مطابق آیا اور آیا تو اس نے دونوں جماعتوں کو ممتاز کر دیا کہ اس میں کافر ہلاک ہوئے، مؤمن سارے کے سارے بچ گئے، "یہ ایسا وعدہ ہے کہ جس میں جھوٹ نہیں بولا گیا، اور جب ہمارا حکم آ گیا تو ہم نے نجات دے دی صالح کو اور ان لوگوں کو جو صالح کے ساتھ ایمان لائے تھے اپنی طرف سے رحمت کے ساتھ، اور اس دن کی رُسوائی سے ہم نے ان کو نجات دی، بے شک تیرا ربّ قوت والا ہے اور زبردست ہے، اور پکڑ لیا ظالموں کو صیحہ نے" صیحۃ: تیز آواز، چیخ، یہ بھی اسی طرح سے ہے جس طرح سے کڑک ہوتی ہے، تو آسمان کی طرف سے کڑک آئی، اور بعض جگہ رَجفہ ذکر کیا گیا ہے (سورۂ اَعراف: ۷۸) رَجفہ زلزلے کو کہتے ہیں، تو زلزلہ بھی ہوا ہوگا اور اوپر سے کوئی کڑک، جس طرح سے تیز بجلی کی ہوا کرتی ہے وہ بھی ہوئی ہوگی، فَاَصْبَحُوْا فِیْ دِیَارِهِمْ جٰثِمِیْنَ: ہو گئے یہ اپنے گھروں کے اندر منہ کے بل گرے ہوئے، اور اس طرح سے وہ نیست و نابود ہو گئے كَاَنْ لَّمْ یَغْنَوْا فِیْهَا گویا کہ ان گھروں میں کبھی آباد ہی نہیں ہوئے تھے۔ فِیْهَا کی ضمیر دیار کی طرف لوٹ جائے گی، "گویا کہ وہ نہیں ٹھہرے تھے ان گھروں میں۔" اَلَاۤ اِنَّ ثَمُوْدَا۟ كَفَرُوْا رَبَّهُمْ: خبردار! ثمود نے کفر کیا اپنے ربّ کا، اَلَا بُعْدًا لِّثَمُوْدَ: خبردار! دُوری ہے ثمود کے لئے، یعنی ثمود پھٹکارے گئے، ان کے اوپر اللہ کی لعنت ہوئی، اور یہی کُفر اور یہی عصیان اگر مشرکینِ مکہ اختیار کرتے ہیں تو ان کو متنبہ کیا جا رہا ہے کہ ان واقعات سے عبرت حاصل کرو، اگر تمہارے حالات بھی ایسے رہے تو جس طرح سے مختلف عذابوں کے ساتھ یہ قومیں ہلاک کر دی گئیں تم بھی اسی طرح سے ہلاک کر دیے جاؤ گے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

وَلَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُنَاۤ اِبْرٰهِیْمَ بِالْبُشْرٰى قَالُوْا سَلٰمًا ؕ قَالَ

البتہ تحقیق آئے ہمارے بھیجے ہوئے ابراہیم کے پاس بشارت لے کر، انہوں نے کہا ہم آپ کو سلام کرتے ہیں، ابراہیم نے بھی کہا

سَلٰمٌ فَمَا لَبِثَ اَنْ جَآءَ بِعِجْلٍ حَنِیْذٍ ﴿۶۹﴾ فَلَمَّا رَاٰۤ اَیْدِیَهُمْ لَا تَصِلُ

وعلیکم سلام، پس ابراہیم نے دیر نہ کی کہ لے آئے ایک بھنا ہوا بچھڑا ﴿۶۹﴾ پھر جب دیکھا ابراہیم علیہ السلام نے کہ ان کے ہاتھ نہیں پہنچتے

اِلَيْهِ نَكِرَهُمْ وَاَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً ۚ قَالُوْا لَا تَخَفْ اِنَّآ اُرْسِلْنَآ اِلٰى قَوْمِ

اس بچھڑے کی طرف تو انہیں اوپرا جانا اور دل میں محسوس کیا ان کی طرف سے ڈر، وہ کہنے لگے خوف نہ کر بیشک ہم بھیجے گئے ہیں لُوط

لُوْطٍ ﴿۷۰﴾ وَامْرَاَتُهٗ قَآئِمَةٌ فَضَحِكَتْ فَبَشَّرْنٰهَا بِاِسْحٰقَ ۙ وَمِنْ وَّرَآءِ اِسْحٰقَ

کی قوم کی طرف ﴿۷۰﴾ اور ابراہیم کی بیوی کھڑی تھی پھر وہ ہنس پڑی پھر ہم نے اس کو بشارت دی اسحاق کی اور اسحاق کے پیچھے

يَعْقُوْبَ ﴿۷۱﴾ قَالَتْ يٰوَيْلَتٰٓى ءَاَلِدُ وَاَنَا عَجُوْزٌ وَّهٰذَا بَعْلِىْ شَيْخًا ۚ اِنَّ هٰذَا لَشَىْءٌ

یعقوب کی ﴿۷۱﴾ وہ کہنے لگی ہائے میری خرابی! کیا میں بچہ جنوں گی حالانکہ میں بوڑھی ہوں اور یہ میرا شوہر بوڑھا ہے، بیشک یہ عجیب

عَجِيْبٌ ﴿۷۲﴾ قَالُوْٓا اَتَعْجَبِيْنَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ رَحْمَتُ اللّٰهِ وَبَرَكٰتُهٗ عَلَيْكُمْ اَهْلَ الْبَيْتِ ۚ

چیز ہے ﴿۷۲﴾ وہ کہنے لگے کیا تو تعجب کرتی ہے اللہ کے حکم سے؟ اللہ کی رحمت اور اس کی برکتیں ہیں تم پر اے گھر والو!

اِنَّهٗ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ ﴿۷۳﴾ فَلَمَّا ذَهَبَ عَنْ اِبْرٰهِيْمَ الرَّوْعُ وَجَآءَتْهُ الْبُشْرٰى

بے شک وہ تعریف کیا ہوا ہے بزرگی والا ہے ﴿۷۳﴾ جس وقت ابراہیم سے ڈر دُور ہوگیا اور اس کے پاس بشارت آ گئی تو

يُجَادِلُنَا فِىْ قَوْمِ لُوْطٍ ﴿۷۴﴾ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَحَلِيْمٌ اَوَّاهٌ

ہمارے ساتھ جھگڑا کرنے لگ گیا لُوط کی قوم کے بارے میں ﴿۷۴﴾ بیشک ابراہیم بُردبار، آہیں بھرنے والا، اللہ کی طرف رُجوع

مُّنِيْبٌ ﴿۷۵﴾ يٰٓاِبْرٰهِيْمُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا ۚ اِنَّهٗ قَدْ جَآءَ اَمْرُ رَبِّكَ ۚ وَاِنَّهُمْ اٰتِيْهِمْ

کرنے والا ہے ﴿۷۵﴾ اے ابراہیم! اس بات سے اعراض کر جا، بے شک تیرے رَبّ کا حکم آ گیا اور بیشک وہ لوگ، ان کے پاس

عَذَابٌ غَيْرُ مَرْدُوْدٍ ﴿۷۶﴾ وَلَمَّا جَآءَتْ رُسُلُنَا لُوْطًا سِىْٓءَ بِهِمْ

آنے والا ہے ایسا عذاب جو رَدّ کیا ہوا نہیں ہے ﴿۷۶﴾ جب ہمارے بھیجے ہوئے لُوط کے پاس آ گئے تو غم میں ڈال دیے گئے وہ ان کی وجہ سے

وَضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا وَّقَالَ هٰذَا يَوْمٌ عَصِيْبٌ ﴿۷۷﴾ وَجَآءَهٗ قَوْمُهٗ

اور دل تنگ ہوئے ان کی وجہ سے، اور کہا لُوط علیہ السلام نے یہ بہت سخت دِن ہے ﴿۷۷﴾ آ گئی ان کے پاس ان کی قوم

يُهْرَعُوْنَ اِلَيْهِ ۚ وَمِنْ قَبْلُ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ ۚ قَالَ يٰقَوْمِ هٰٓؤُلَآءِ

بھاگے جاتے تھے وہ ان کی طرف، اور اس سے قبل بھی وہ بدکاریاں کیا کرتے تھے، لوط علیہ السلام نے کہا کہ اے میری قوم! یہ

بَنَاتِیْ هُنَّ اَطْهَرُ لَكُمْ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخْزُوْنِ فِیْ ضَیْفِیْ ؕ

میری بیٹیاں ہیں یہ تمہارے لیے زیادہ پاکیزگی کا باعث ہیں، پس تم اللہ سے ڈرو اور مجھے میرے مہمانوں کی نظر میں رُسوا نہ کرو،

اَلَیْسَ مِنْكُمْ رَجُلٌ رَّشِیْدٌ ﴿۷۸﴾ قَالُوْا لَقَدْ عَلِمْتَ مَا لَنَا فِیْ بَنٰتِكَ مِنْ حَقٍّ ۚ

کیا تم میں سے کوئی بھی نیک چلن آدمی نہیں ہے؟ ﴿۷۸﴾ وہ کہنے لگے تو ضرور جانتا ہے کہ ہمیں تیری بیٹیوں میں کوئی رغبت نہیں،

وَاِنَّكَ لَتَعْلَمُ مَا نُرِیْدُ ﴿۷۹﴾ قَالَ لَوْ اَنَّ لِیْ بِكُمْ قُوَّةً اَوْ اٰوِیْۤ

تو البتہ جانتا ہے جو ہم چاہتے ہیں ﴿۷۹﴾ لُوط علیہ السلام نے کہا کہ کاش! میرے لیے تمہارے مقابلے کی طاقت ہوتی یا میں ٹھکانا لیتا

اِلٰی رُكْنٍ شَدِیْدٍ ﴿۸۰﴾ قَالُوْا یٰلُوْطُ اِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ لَنْ یَّصِلُوْۤا

کسی مضبوط سہارے کی طرف ﴿۸۰﴾ وہ آنے والے مہمان بولے اے لُوط! ہم تیرے رَبّ کے بھیجے ہوئے ہیں، یہ لوگ تیری طرف

اِلَیْكَ فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ الَّیْلِ وَلَا یَلْتَفِتْ مِنْكُمْ اَحَدٌ اِلَّا امْرَاَتَكَ ؕ

نہیں پہنچ سکتے پس چل تو اپنے اہل وعیال کے ساتھ رات کے ایک حصے میں، اور کوئی تم میں سے مڑ کر نہ دیکھے، سوائے تیری بیوی کے،

اِنَّهٗ مُصِیْبُهَا مَاۤ اَصَابَهُمْ ؕ اِنَّ مَوْعِدَهُمُ الصُّبْحُ ؕ

بے شک بات یہ ہے کہ اس عورت کو پہنچنے والا ہے وہی عذاب جو ان لوگوں کو پہنچے گا، بیشک ان لوگوں کے وعدے کا وقت صبح ہے،

اَلَیْسَ الصُّبْحُ بِقَرِیْبٍ ﴿۸۱﴾ فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا جَعَلْنَا عَالِیَهَا سَافِلَهَا وَاَمْطَرْنَا عَلَیْهَا

کیا صبح قریب نہیں؟ ﴿۸۱﴾ جس وقت ہمارا حکم آ گیا تو ہم نے ان بستیوں کے اُوپر کے حصے کو نیچے کر دیا اور ہم نے ان کے اُوپر پتھر

حِجَارَةً مِّنْ سِجِّیْلٍ ۙ۬ مَّنْضُوْدٍ ﴿۸۲﴾ مُّسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ ؕ وَمَا هِیَ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ بِبَعِیْدٍ ﴿۸۳﴾

برسائے تہہ بہ تہہ کھنگر کے ﴿۸۲﴾ جو نشان زدہ تھے تیرے رَبّ کے نزدیک، وہ بستیاں ان ظالموں سے دُور نہیں ﴿۸۳﴾

خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ وَلَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُنَآ اِبْرٰهِیْمَ بِالْبُشْرٰی: البتہ تحقیق آئے ہمارے بھیجے ہوئے۔ رُسُل، رسول کی جمع۔ اور یہاں رُسل کا مصداق فرشتے ہیں۔ ''آئے ہمارے بھیجے ہوئے ابراہیم علیہ السلام کے پاس بشارت لے کر'' قَالُوْا سَلٰمًا: انہوں نے کہا: سلامًا: فعل اس کا محذوف ہے۔ نُسَلِّمُ عَلَیْكَ سَلَامًا، ہم آپ کو سلام کرتے ہیں، جیسے ملاقات کے وقت

طریقہ ہے السلام علیکم کا۔ قَالَ سَلٰمٌ: ابراہیم علیہ السلام نے بھی کہا: وعلیکم سلام ۔ فَمَا لَبِثَ اَنْ جَآءَ بِعِجْلٍ حَنِیْذٍ: پس ابراہیم نے دیر نہ کی کہ لے آئے ایک بھنا ہوا بچھڑا۔ عِجل: بچھڑا، حنیذ: تلا ہوا، بھنا ہوا۔ فَلَمَّا رَآٰ اَیْدِیَھُمْ لَا تَصِلُ اِلَیْہِ: پھر جب دیکھا ابراہیم علیہ السلام نے کہ ان کے ہاتھ نہیں پہنچتے اس عِجل کی طرف، بچھڑے کی طرف۔ نَکِرَھُمْ: تو انہیں اوپرا جانا، اجنبیت محسوس کی۔ نَکِرَ کی ضمیر ابراہیم کی طرف، اور ھُمْ ضمیر رُسل کی طرف۔ ''ابراہیم علیہ السلام نے ان آنے والوں کو اوپرا جانا، ان سے اجنبیت محسوس کی'' وَاَوْجَسَ مِنْھُمْ خِیْفَۃً: خِیفۃ خوف کے معنی میں۔ اور دِل میں محسوس کیا ان کی طرف سے ڈر۔ قَالُوْا لَا تَخَفْ: وہ کہنے لگے خوف نہ کر، ڈرمت، اِنَّآ اُرْسِلْنَآ اِلٰی قَوْمِ لُوْطٍ: بیشک ہم بھیجے گئے ہیں لُوط علیہ السلام کی قوم کی طرف، وَامْرَاَتُہٗ قَآئِمَۃٌ: اور ابراہیم کی بیوی کھڑی تھی، فَضَحِکَتْ: پھر وہ ہنس پڑی، فَبَشَّرْنٰھَا بِاِسْحٰقَ ' وَمِنْ وَّرَآءِ اِسْحٰقَ یَعْقُوْبَ: پھر ہم نے اس کو بشارت دی اسحاق کی، اور اسحاق کے پیچھے یعقوب کی، قَالَتْ: وہ کہنے لگی، یٰوَیْلَتٰٓی: یہ لفظ عورتوں کی زبان پر اس طرح سے جاری ہو جایا کرتا ہے، اس کا حقیقی معنی مراد نہیں ہوتا، لفظی مفہوم اس کا یہ ہے کہ ''ہائے میری خرابی!'' ءَاَلِدُ: کیا میں بچہ جنوں گی؟ وَاَنَا عَجُوْزٌ: حالانکہ میں بوڑھی ہوں، وَّھٰذَا بَعْلِیْ شَیْخًا: بعل: شوہر، خاوند۔ اور یہ میرا شوہر بوڑھا ہے۔ شَیْخًا یہ منصوب ہے حال ہونے کے اعتبار سے، اور اس کا عامل ہے ھٰذَا میں اشارہ کا معنی، ھٰذَا کے اندر معنی فعل ہے اُشِیْرُ۔ ھٰذَا بَعْلِیْ: یہ میرا خاوند جس کی طرف میں اشارہ کر رہی ہوں بوڑھا ہے، اِنَّ ھٰذَا لَشَیْءٌ عَجِیْبٌ: بیشک یہ عجیب چیز ہے، یعنی اس عمر میں اس حال میں بچہ جننا عجیب چیز ہے، قَالُوْٓا: وہ کہنے لگے، اَتَعْجَبِیْنَ مِنْ اَمْرِ اللّٰہِ: کیا تُو تعجب کرتی ہے؟ واحد مؤنث مخاطبہ کا صیغہ ہے۔ کیا تُو تعجب کرتی ہے اللہ کے حکم سے؟ رَحْمَتُ اللّٰہِ وَبَرَکٰتُہٗ عَلَیْکُمْ اَھْلَ الْبَیْتِ: اللہ کی رحمت اور اس کی برکتیں ہیں تم پر اے گھر والو! اے نبی کے گھر والو! اِنَّہٗ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ: بے شک وہ اللہ حمید ہے تعریف کیا ہوا ہے، مجید ہے بزرگ ہے۔ مجد بزرگی کو کہتے ہیں، حمد تعریف کرنے کو کہتے ہیں۔ فَلَمَّا ذَھَبَ عَنْ اِبْرٰھِیْمَ الرَّوْعُ: جس وقت ابراہیم سے وہ ڈر دُور ہو گیا، وَجَآءَتْہُ الْبُشْرٰی: اور اس کے پاس بشارت آ گئی، یُجَادِلُنَا فِیْ قَوْمِ لُوْطٍ: ہمارے ساتھ جھگڑا کرنے لگ گیا لُوط علیہ السلام کی قوم کے بارے میں، اِنَّ اِبْرٰھِیْمَ لَحَلِیْمٌ: بیشک ابراہیم البتہ بُردبار، اَوَّاہٌ: نرم دِل، بہت آہ آہ کرنے والا، آہیں بھرنے والا، مُّنِیْبٌ: اللہ کی طرف رُجوع کرنے والا ہے، یٰٓاِبْرٰھِیْمُ اَعْرِضْ عَنْ ھٰذَا: اے ابراہیم! اس بات کو چھوڑ دے، اس چیز سے اعراض کر جا، یہ جھگڑا چھوڑ دے، اِنَّہٗ قَدْ جَآءَ اَمْرُ رَبِّکَ: بیشک تیرے رَبّ کا حکم آ گیا، وَاِنَّھُمْ اٰتِیْھِمْ: اور بیشک وہ قوم لُوط۔ ھُمْ ضمیر لوٹ گئی افراد کے اعتبار سے۔ بیشک وہ لوگ ان کے پاس آنے والا ہے عَذَابٌ غَیْرُ مَرْدُوْدٍ: ایسا عذاب جو رَدّ کیا ہوا نہیں ہے۔ وَلَمَّا جَآءَتْ رُسُلُنَا لُوْطًا: جب ہمارے بھیجے ہوئے لُوط علیہ السلام کے پاس آ گئے، سِیْٓءَ بِھِمْ: غم میں ڈال دیے گئے لوط علیہ السلام ان کی وجہ سے۔ سِیْٓءَ فعل مجہول ہے قِیْلَ کی طرح، سِیْٓءَ بِھِمْ: غم میں ڈال دیے گئے لُوط علیہ السلام ان کی وجہ سے، وَضَاقَ بِھِمْ ذَرْعًا: ضَاقَ یَضِیْقُ: تنگ ہونا۔ ذرع بازو کو کہتے ہیں۔ اور یہاں ''ضَاقَ بِھِمْ ذَرْعًا'' ایک محاورہ ہے، ضَاقَ ذَرْعُہٗ: اس کا دل تنگ ہو گیا، سینہ تنگ ہو گیا، دل میں انقباض پیدا ہو گیا۔ ''اور دل تنگ ہوئے ان کی وجہ سے'' وَقَالَ ھٰذَا یَوْمٌ عَصِیْبٌ: اور کہا لُوط علیہ السلام نے یعنی اپنے دِل میں ھٰذَا یَوْمٌ عَصِیْبٌ: یہ بہت سخت دن ہے، وَجَآءَہٗ قَوْمُہٗ یُھْرَعُوْنَ اِلَیْہِ: آ گئی لُوط کے پاس اس کی قوم، یُھْرَعُوْنَ اِلَیْہِ: بھگائے جاتے تھے وہ لُوط کی طرف، بے تحاشا بھاگے ہوئے آ گئے، وَمِنْ قَبْلُ کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ السَّیِّاٰتِ: اور اس سے قبل بھی وہ بدکاریاں کیا کرتے تھے، یعنی ان کو پہلے سے

بدکاریوں کی عادت تھی، اسی عادت کی وجہ سے یہ دوڑے ہوئے آئے، قَالَ یٰقَوۡمِ ہٰۤؤُلَآءِ بَنَاتِیۡ: لوط علیہ السلام نے کہا کہ اے میری قوم!
یہ میری بیٹیاں ہیں، ہُنَّ اَطۡہَرُ لَکُمۡ: وہ تمہارے لئے زیادہ پاکیزگی کا باعث ہیں، فَاتَّقُوا اللّٰہَ: پس تم اللہ سے ڈرو، وَلَا تُخۡزُوۡنِ فِیۡ ضَیۡفِیۡ:
اور مجھے میرے مہمانوں کے بارے میں رُسوا نہ کرو، "مجھے میرے مہمانوں میں رُسوا نہ کرو" یعنی مہمانوں کی نظر میں رُسوا نہ کرو،
اَلَیۡسَ مِنۡکُمۡ رَجُلٌ رَّشِیۡدٌ: کیا تم میں سے کوئی بھی صاحب ہدایت آدمی نہیں؟ کوئی سمجھدار آدمی نہیں جو بات کو سمجھ سکے؟ رشید: رُشد
والا۔ رُشد، ہدایت کے معنی میں، "کیا تم میں سے کوئی بھی نیک چلن آدمی نہیں ہے؟، کوئی اچھے طریقے کو پالینے والا آدمی تم میں سے
کوئی بھی نہیں؟" قَالُوۡا: وہ کہنے لگے۔ لَقَدۡ عَلِمۡتَ: تُو ضرور جانتا ہے۔ "لقد" تاکید کے لئے ہوتا ہے۔ تجھے معلوم ہے مَا لَنَا فِیۡ بَنٰتِکَ
مِنۡ حَقٍّ: ہمیں تیری بیٹیوں میں کوئی حق نہیں۔ حق سے یہاں رغبت مراد ہے، حاجت۔ "ہمیں تیری بیٹیوں کی کوئی ضرورت نہیں،
ہمیں تیری بیٹیوں میں کوئی رغبت نہیں" وَاِنَّکَ لَتَعۡلَمُ مَا نُرِیۡدُ: تُو البتہ جانتا ہے جو ہم چاہتے ہیں، قَالَ لَوۡ اَنَّ لِیۡ بِکُمۡ قُوَّۃً: لُوط علیہ السلام نے کہا
کہ کاش! میرے لیے تمہارے مقابلے کی طاقت ہوتی، اَوۡ اٰوِیۡۤ اِلٰی رُکۡنٍ شَدِیۡدٍ: یا میں کسی مضبوط سہارے کی طرف سہارا لیتا، ٹھکانا
لیتا میں کسی مضبوط سہارے کی طرف، "مضبوط سہارے" سے یہاں مراد بظاہر کوئی اپنا جتھا، کوئی اپنی پارٹی، کوئی اپنا خاندان، کہ میرا
یہاں کوئی خاندان ہوتا، میری کوئی مضبوط پارٹی ہوتی، تو آج میں قوت اور طاقت کے ساتھ تمہیں اس بُرائی سے روکتا۔ قَالُوۡا: وہ
آنے والے مہمان بولے، یٰلُوۡطُ: اے لُوط! اِنَّا رُسُلُ رَبِّکَ: ہم تیرے رَبّ کے بھیجے ہوئے ہیں، لَنۡ یَّصِلُوۡۤا اِلَیۡکَ: یہ لوگ تیری
طرف نہیں پہنچ سکتے، ہرگز نہیں پہنچیں گے یہ تیری طرف، فَاَسۡرِ بِاَہۡلِکَ بِقِطۡعٍ مِّنَ الَّیۡلِ: سَرٰی یَسۡرِیۡ: رات کو چلنا۔ پس تو اپنے اہل
وعیال کو لے کر چل پڑ رات کے ایک حصے میں، چل تو اپنے اہل وعیال کے ساتھ رات کے حصے میں، وَلَا یَلۡتَفِتۡ مِنۡکُمۡ اَحَدٌ: اور کوئی
تم میں سے مُڑ کر نہ دیکھے، نہ اِلتفات کرے تم میں سے کوئی بھی، اِلَّا امۡرَاَتَکَ: سوائے تیری بیوی کے۔ اِلَّا امۡرَاَتَکَ یہ بِاَہۡلِکَ کے
ساتھ بھی لگ سکتا ہے، اپنی بیوی کے علاوہ باقیوں کو لے کر چل، اِنَّہٗ مُصِیۡبُہَا مَاۤ اَصَابَہُمۡ: بیشک بات یہ ہے کہ اس عورت کو پہنچنے والا
ہے وہی عذاب جو ان لوگوں کو پہنچے گا، مُصِیۡبُہَا میں "ھا" ضمیر اس عورت کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اِنَّ مَوۡعِدَہُمُ الصُّبۡحُ: بیشک ان
لوگوں کے وعدے کا وقت صبح ہے، اَلَیۡسَ الصُّبۡحُ بِقَرِیۡبٍ: کیا صبح قریب نہیں؟ یعنی قریب ہی ہے، کچھ زیادہ دُور نہیں ہے، فَلَمَّا جَآءَ
اَمۡرُنَا: جس وقت ہمارا حکم آ گیا۔ "حکم" سے حکم عذاب مراد ہے۔ جَعَلۡنَا عَالِیَہَا سَافِلَہَا: ہم نے ان بستیوں کے اوپر کے حصے کو ان کا
نچلا حصہ کر دیا۔ عَالِیَہَا سَافِلَہَا: اس کے عالی کو سافل بنا دیا، اوپر کے حصے کو نیچے کر دیا، جس طرح ہمارے ہاں یہ محاورہ بولا جاتا ہے،
تہہ و بالا کر دیا، تہہ و بالا کا بھی یہی معنی ہوتا ہے، "تہہ" نیچے کو کہتے ہیں، "بالا" اُوپر کو کہتے ہیں، نیست و نابود کر دیے، تہہ و بالا
کر دیے۔ وَاَمۡطَرۡنَا عَلَیۡہَا حِجَارَۃً: اور ہم نے ان کے اوپر پتھر برسائے، مِّنۡ سِجِّیۡلٍ: یہ پتھروں کا بیان ہے، سِجِّیۡل یہ معرّب ہے
"سنگ گل" سے۔ سنگ: پتھر۔ گل: گارہ۔ سنگ گل: مٹی جو سخت ہو کر پتھر جیسی ہو جاتی ہے، جس کو ہم کھنگر بولتے ہیں، بھٹے پر بھی
دیکھا کرو، سنگ گل۔ "ہم نے ان کے اوپر پتھر برسائے کھنگر" مَّنۡضُوۡدٍ: مسلسل آنے والے، تہہ بہ تہہ، جیسے دوسری جگہ "منضود" کا
لفظ آیا ہوا ہے، طَلۡحٍ مَّنۡضُوۡدٍ (سورۂ واقعہ) کیلا جو کہ تہہ بہ تہہ رکھا ہوا ہو۔ "مسلسل ان کے اوپر پتھر برسائے" مُّسَوَّمَۃً عِنۡدَ رَبِّکَ:
ایسے حجارہ جو کہ نشان زدہ تھے تیرے رَبّ کے نزدیک، یعنی ان کے اوپر علامات تھیں کہ یہ عذاب کے پتھر ہیں، وَمَا ہِیَ مِنَ

الظّٰلِمِيْنَ بِبَعِيْدٍ: وہ بستیاں ان ظالموں سے دُور نہیں۔ هِيَ ضمیر ان بستیوں کی طرف جن کا ذکر عَالِيَهَا سَافِلَهَا اور اَمْطَرْنَا عَلَيْهَا کے اندر آیا ہے، ان سے وہی ان کی بستیاں مراد ہیں۔ اور هِيَ کی ضمیر ان حِجَارَةً کی طرف بھی لوٹ سکتی ہے جس کا مصداق عذاب ہے۔ ظالمین سے مراد تو بہر حال مشرک ہیں، مشرکینِ مکہ۔ یہ بستیاں ان مشرکوں سے دُور نہیں، یہ آتے جاتے ان بستیوں کو دیکھتے رہتے ہیں، عذاب کی علامامات جہاں نمایاں ہیں، وہ جگہ جہاں یہ عذاب آیا تھا، قومِ لُوط جہاں بستی تھی، وہ ان سے کوئی دُور نہیں ہے۔ اور اگر حِجَارَةً طرف لوٹا دیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ان ظالموں سے بھی یہ عذاب دُور نہیں، اگر یہ اپنے ظلم سے باز نہیں آئیں گے تو اس قسم کا عذاب ان سے بھی دُور نہیں ہے، ان پر بھی آ سکتا ہے، بعید از امکان نہیں، اللہ چاہے تو ان پر بھی اسی قسم کی پتھر کی بارش کر سکتا ہے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

تفسیر

حضرت اِبراہیم علیہ السلام اور حضرت لُوط علیہ السلام کا مختصر تعارف

واقعات کے سلسلے میں پہلے تو مختصر سا واقعہ ذکر کیا حضرت ابراہیم علیہ السلام کا، اور اس کے متصل لُوط علیہ السلام کا واقعہ آ رہا ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام اور لُوط علیہ السلام یہ دونوں قریبی رشتہ دار ہیں، جیسا کہ مفسرین نے لکھا کہ لُوط علیہ السلام بھتیجے ہیں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے، اور جس وقت عراق کے علاقے سے ہجرت کی ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تو حضرت لُوط علیہ السلام بھی ساتھ ہی آئے تھے، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت لُوط علیہ السلام کو اپنی بستی سے تقریباً بارہ میل دُور ایک مرکز بنا دیا، جہاں ابراہیم علیہ السلام ٹھہرے ہوئے تھے وہاں سے بارہ میل دُور ایک مرکز تھا جس کا نام تھا ''سدوم''، یہ بڑا شہر تھا، اور اس کے ساتھ آس پاس کچھ اور بستیاں بھی تھیں جن کو قرآنِ کریم میں ''مُؤتفِکات'' کے لفظ سے ذکر کیا ہے اُلٹی جانے والی بستیاں، پلٹا کھانے ولی بستیاں، وہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ کئی بستیاں تھیں، جن کا مرکزی صدر مقام سدوم تھا، وہاں کوئی دوسری قوم آباد تھی، تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت لُوط علیہ السلام کو وہاں پہنچا دیا کہ تو وہاں تبلیغ کیا کر اور ان لوگوں کی اصلاح کر، اور جس جگہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ٹھہرے ہوئے تھے آج کل وہ ''قریہ خلیل'' کہلاتی ہے، پہلے وہ اُردن کے علاقے میں تھی، اور سن ۱۹۶۷ء کی جنگ میں وہ علاقہ اسرائیل کے قبضے میں چلا گیا، اب ''قریہ خلیل'' بھی اسرائیلیوں کے قبضے میں ہے، اور جہاں لُوط علیہ السلام آباد تھے وہ علاقہ اِس وقت پانی کی جھیل کی شکل اختیار کیے ہوئے ہے جس کو ''بحرِ لُوط'' یا ''بحرِ میّت'' کہتے ہیں، ''بحرِ میّت'' کہنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ کچھ ایسا زہریلا پانی ہے کہ اس میں کوئی جاندار چیز نہیں زندہ رہتی، اور ''بحرِ لُوط'' اس لیے کہتے ہیں کہ تاریخی طور پر وہی جگہ ہے جہاں لُوط علیہ السلام کی یہ قوم آباد تھی، جہاں لُوط علیہ السلام مبعوث ہوئے تھے، یعنی اب وہ علاقہ ایک جھیل کی شکل میں ہے جس میں وہ عذاب والا پانی ہے، کوئی چیز اس میں زندہ نہیں رہتی، ''قصص القرآن'' والوں نے لکھا ہے کہ جب یہ کتاب لکھی جا رہی تھی تو کہتے ہیں کہ دو سال قبل وہاں ارد گرد کھدائی وغیرہ کی ہے، تو وہاں آبادیوں کے باقاعدہ آثار ملے

ہیں، اور تقریباً قرائن کے ساتھ تعین کر لیا گیا ہے کہ وہی علاقہ جس کو ''بحرِ لوط'' یا ''بحرِ میت'' کہا جاتا ہے یہی جگہ ہے جہاں یہ لوگ آباد تھے، اور اب ان کا نام ونشان نہیں ہے، بس کھدائی کرنے سے کچھ آثار معلوم ہوئے ہیں، اور وہ علاقہ ایک جھیل کی شکل میں ہے۔

حضرت اِبراہیم علیہ السلام کے پاس فرشتوں کی آمد اور آپ کی بے مثال مہمان نوازی

اللہ تعالیٰ نے پہلے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس فرشتوں کو بھیجا، حضرت ابراہیم علیہ السلام ہجرت کر کے آئے تھے، ان کے ساتھ ان کی بیوی تھی، لُوط علیہ السلام بھی تھے، خاندان سارے کا سارا عراق میں رہ گیا تھا، اور یہاں اکیلے تھے تنہا تھے، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اولاد نہیں تھی، تفاسیر میں لکھا ہے کہ اس وقت آپ کی عمر سو سال ہو چکی تھی، اور آپ کی بیوی سارہ کی عمر تقریباً نوّے سال تھی، اس وقت تک اولاد نہیں ہوئی تھی، وہ فرشتے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس بشارت لے کر آئے، وہاں بشارت دینی مقصود تھی، جب آئے تو انسانی شکل میں آئے، آتے ہی قاعدے کے مطابق جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو طریقہ سکھایا تھا اور آدم علیہ السلام کی اولاد کے اندر جو طریقہ چل نکلا، کہ ملاقات کے وقت ''السلام علیکم'' کہا جاتا ہے، تو ان فرشتوں نے آ کے اسی رواج کے مطابق سلام کہا، حضرت ابراہیم نے بھی قاعدے کے مطابق جواب دیا ''وعلیکم السلام''، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام یہ سمجھے کہ یہ کوئی مسافر لوگ ہیں، ملنے کے لئے آگئے ہیں، راہ گیر ہیں، ان کو بٹھایا، بٹھانے کے بعد فوراً گھر گئے، اور بچھڑا ذبح کیا، ذبح کر کے اس کا گوشت بھون کے لے آئے، بچھڑا لے آنے کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ پورے کا پورا بچھڑا ہی لے آئے، جس طرح سے آپ سے کوئی کہتا ہے کہ ہم آپ کو مُرغ کھلائیں گے تو اس کا یہ معنی نہیں ہوتا کہ دونوں ٹانگوں سمیت ہی آپ کے حلق سے اُتار دیا جائے گا، یعنی ذبح کرنے کے بعد گوشت جو بھونا جاتا ہے کھایا جاتا ہے اس کو مُرغ کھانا ہی کہتے ہیں کہ وہ مُرغ پکا کے لے آیا، مراد گوشت ہوتا ہے، تو اسی طرح سے ابراہیم علیہ السلام چونکہ بہت مہمان نواز تھے، اتنے مہمان نواز تھے کہ جس وقت تک کوئی شخص آپ کے پاس مہمان کے طور پر نہ آ جاتا روایات میں آتا ہے کہ آپ کھانا نہیں کھاتے تھے، کھانے کا وقت آ جائے اور کوئی مہمان نہ آیا ہو تو باہر سے لوگوں کو تلاش کر کر کے لاتے، تو اسی مہمانی کے جذبے سے بہترین سے بہترین مہمانی کی، گھر کے اندر بچھڑا ہوگا، وہ ذبح کیا، ذبح کرنے کے بعد اس کو تل کے بھون کے لے آئے، لا کے ان مہمانوں کے سامنے رکھ دیا۔

فرشتوں کا مہمانی سے اِنکار اور اس کی وجہ

اب آپ دیکھ رہے ہیں کہ مہمانوں کے ہاتھ ہی اس کی طرف نہیں بڑھتے، کیونکہ یہ تو فرشتے تھے، انسان تو تھے ہی نہیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام کو پہلے احساس نہیں ہوا کہ یہ فرشتے ہیں، انہوں نے ان کو اِنسان سمجھا تھا اور اِنسان سمجھ کے مہمانی کا انتظام کیا، جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں بھی ایک دفعہ حضرت جبریل تشریف لے آئے تھے تو صحابہ نے نہیں پہچانا، وہ بیٹھ کے سوالات کرتے رہے، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم جواب دیتے رہے، جس وقت اُٹھ کر چلے گئے تو بعد میں صحابہ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا کہ یہ تو جبریل تھے، ''اَتَاکُمْ یُعَلِّمُکُمْ دِیْنَکُمْ''، یہ حدیثِ جبریل میں ہے جو ''مشکوٰۃ'' میں آپ نے اِبتدا اِبتدا کے اندر پڑھی تھی۔ تو یہاں بھی انہوں نے نہیں پہچانا، تو جس وقت انہوں نے کھانے کی طرف ہاتھ نہ بڑھایا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو کچھ اجنبیت سی محسوس ہوئی اور دِل میں کچھ

خوف سا محسوس ہوا کہ یہ کون لوگ ہیں جو اس طرح سے اکٹھے ہو کے آ گئے، اور میں ان کے سامنے کھانے کی چیز رکھ رہا ہوں اور یہ کھانے کی طرف ہاتھ نہیں بڑھا رہے، تو ہو سکتا ہے کہ اس زمانے میں کچھ اس قسم کا رواج ہو کہ جس کی کسی کے ساتھ دشمنی ہو یا کوئی دشمنی نکالنے کے لئے آئے نقصان پہنچانے کے لئے آئے تو وہ دوسرے کے گھر میں کھاتا نہیں تھا، ایسا ممکن ہے، تو انہوں نے بھی محسوس کیا کہ کہیں یہ کوئی دشمن نہ ہوں، دشمنی کے ارادے سے نہ آئے ہوں، تو دل میں کچھ خوف سا محسوس ہوا، اور بعض آیات سے کچھ اشارہ ایسا بھی نکلتا ہے کہ اس بات کو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ظاہر بھی کر دیا اِنَّا مِنۡکُمۡ وَجِلُوۡنَ (سورۂ حجر: ۵۲) ہمیں تو تم سے ڈر سا لگ رہا ہے، کہ تم کیسے لوگ ہو، اور ہیبت محسوس کرنے کی یہ وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ چونکہ یہ اللہ کے عذاب کے بھی حامل بن کے آئے تھے جو قوم لُوط پر آنا تھا، تو اس لیے ان کے اندر کچھ جلال کی سی شان بھی تھی، اس کا اثر بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قلب پر پڑا، تو دِل میں خوف محسوس کیا اور کہہ بھی دیا: اِنَّا مِنۡکُمۡ وَجِلُوۡنَ۔

حضرت اِبراہیم علیہ السلام کو بیٹے کی بشارت

انہوں نے کہا لَا تَوۡجَلۡ (سورۂ حجر: ۵۳)، لَا تَخَفۡ ڈرنے کی کوئی بات نہیں، ہم اصل میں فرشتے ہیں انسان نہیں، اور آپ کے پاس ہم ایک بشارت لے کے آئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اولاد دے گا، پہلے بشارت حضرت ابراہیم کے پاس ذکر کی، تو جس وقت انہوں نے اس بشارت کا تذکرہ کیا کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اولاد دے گا تو پہلے حضرت ابراہیم کی بیوی ایک طرف کھڑی تھی، جس طرح سے گھر میں مہمان آئے ہوئے ہوں تو گھر کے دیگر افراد جو ہیں وہ بھی اردگرد ہی ہوتے ہیں، تو یہ کھڑی تھی اس نے جس وقت بشارت سنی اور پتا چلا کہ یہ تو فرشتے ہیں تو وہ بھی آگے بڑھی ہنستی ہوئی، ہنستی ہوئی آگے آ گئی، یہ ہنسنا تعجب اور خوشی دونوں سے ناشی ہے، اولاد کی بشارت سے خوشی بھی ہوئی اور اندریں حالات تعجب بھی ہوا، تو یہ جو آگے گفتگو ہے وہ اگرچہ بظاہر اس طرح سے ہے جس طرح سے تعجب ہی تعجب ہوتا ہے، لیکن اس قسم کی گفتگو انسان خوشی کی بنا پر بھی کیا کرتا ہے، ظاہری اسباب کے خلاف اگر کوئی خوشی کی خبر مل جائے تو انسان اس کے اُوپر اِستفہام ایسا کرتا ہے جس سے بظاہر تو تعجب ہی تعجب معلوم ہوتا ہے لیکن حقیقت کے اعتبار سے قلب میں خوشی بھی ہوتی ہے، جس طرح سے آپ سے کوئی کہہ دے کہ آپ کے لئے انتظام ہو گیا، مدینہ یونیورسٹی میں آپ کو داخلہ مل رہا ہے، تو ایک خوشی کی سی لہر دل میں آئے گی اور ساتھ کہیں گے کہ ہیں جی؟ ہمارے لیے؟ کس طرح سے؟ ہم نے ابھی درخواست ہی نہیں بھیجی، ہم نے تو ابھی امتحان بھی پاس نہیں کیا، تو اس قسم کے لفظ آپ بولیں گے جس میں تعجب کا اظہار بھی ہو گا لیکن اندر سے خوشی بھی ہے جو اس قسم کی باتیں کروا رہی ہے، تو حضرت سارہ کہنے لگیں: ہیں! میں بچہ جنوں گی؟ میں تو بوڑھی ہو چکی ہوں۔ اور جیسے دوسری جگہ لفظ آتا ہے کہ عقیم ہوں، بانجھ ہوں، اولاد کے قابل نہیں ہوں، اور یہ میرا شوہر بھی بوڑھا بیٹھا ہے، میں بچہ جنوں گی؟ تو فرشتوں نے کہا کہ تم تو اہلِ بیت ہو، نبوّت کے گھر والے ہو، تمہیں اس پر کیا تعجب ہے، بیٹے کی بشارت تھی اور پوتے کی بشارت تھی، اللہ کی قدرت سے یہ کوئی بعید نہیں ہے، اور آئے دِن تم کرامات دیکھ رہے ہو، اللہ تعالیٰ کی طرف سے جیسی رحمتیں اور برکتیں تم پر نازل ہوتی ہیں، کوئی تعجب کی بات نہیں، تو اس طرح سے ان کا تعجب دُور کر دیا گیا، اور حضرت سارہ کے اس سوال کے

نتیجے میں یہ بات بھی سامنے آ گئی کہ اللہ تعالیٰ تمہیں ہی بوڑھے اور بوڑھی کو بچہ دے گا، اور کوئی کسی قسم کے حالات نئے نہیں ہوں گے۔ اندریں حالات اللہ بچہ دے گا، وہ بچہ زندہ رہے گا، آگے صاحبِ اولاد ہوگا، اسحاق کے بعد یعقوب بھی پیدا ہوگا، جس سے اس کی عمر کی درازی کی طرف اشارہ کر دیا کہ وہ بھی آگے صاحبِ اولاد ہوگا، تو ہر قسم کا اطمینان حاصل ہو گیا۔

مشرکینِ مکہ کے لئے مذکورہ واقعے میں سبق

جب ہر قسم کا اطمینان حاصل ہو گیا تو پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام متوجہ ہوئے، وہ سمجھے کہ بشارت دینے کے لئے تو جماعت کی جماعت کو آنے کی ضرورت نہیں تھی، معلوم ہوتا ہے کوئی اور مہم درپیش ہے، اس لیے سوال کیا فَمَا خَطْبُكُمْ اَيُّهَا الْمُرْسَلُوْنَ ستائیسویں پارے کی ابتدا میں آئے گا، کہ اے بھیجے ہوؤ! تمہیں کون سا واقعہ درپیش ہے؟ یعنی معلوم ہوتا ہے کہ صرف بشارت دینے کے لئے تو نہیں آئے، تمہاری شکل وصورت اور تمہاری ہیئت بتاتی ہے کہ ساتھ کوئی جلال کی شان بھی ہے، کوئی اہم واقعہ تمہیں درپیش ہے، وہ کیا واقعہ درپیش ہے؟ پھر انہوں نے بتایا کہ ہم لُوط علیہ السلام کی قوم کی طرف بھیجے گئے ہیں اور اصل میں انہی کا رگڑا نکالنا ہے، اور یہ اللہ تعالیٰ نے اپنی شان دکھائی کہ جو فرشتے لُوط علیہ السلام کی قوم کے لئے عذاب لے کے آئے تھے وہی حضرت ابراہیم کے لئے بشارت لے کے آئے، جس میں دونوں باتیں آ گئیں کہ نیکوکاروں کے لئے اللہ تبارک وتعالیٰ کی رحمت کس طرح سے ہوتی ہے اور بدکاروں کے لئے عذاب کس طرح سے ہوتا ہے، ایک ہی وقت میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد سے ایک بہت بڑی اُمت اور بہت بڑی جماعت اُٹھانے کی بنیاد رکھی جا رہی ہے، یہ بے سروسامان تھے، اپنے علاقے کو چھوڑ کے آئے تھے، خاندان کو چھوڑ کے آئے تھے، تو ان سے ایک بڑی اُمت اُٹھائی جا رہی ہے کہ حضرت اسحاق پیدا ہوں گے، اسحاق سے یعقوب پیدا ہوں گے، یعقوب کے بارہ بیٹے ہوں گے، اسرائیلیوں کے بارہ خاندان، کتنی بڑی اُمت اور کتنی بڑی جماعت پیدا ہوئی، اور یہ شخص جو تن تنہا آیا تھا تو کس طرح سے ایک جہان کا جدِّ اعلیٰ بن گیا، شان وشوکت نصیب ہوئی، علمی سلطنت بھی اور ظاہری سلطنت بھی اس نسل کو ملنے والی تھی، تو بے سروسامان کو سرسبز وشاداب کرنے کے کا انتظام کیا جا رہا ہے، اور اس کے ساتھ ہی قومِ لُوط جو کہ انتہائی درجے کی خوش حال تھی، جن کو دُور دُور تک اپنی بدبختی کے کوئی آثار نظر نہیں آتے تھے ان کو برباد کرنے کا فیصلہ بھی ساتھ ساتھ ہی چلا آ رہا ہے، تو اللہ تعالیٰ کی دونوں شانیں نظر آ رہی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نیکوں پر رحمت کس طرح سے کرتا ہے اور اس کی برکتیں کس طرح سے نازل ہوتی ہیں اور بدکاروں کے لئے اس کا عذاب کس طرح سے آتا ہے، دونوں پہلو یہاں دکھائے جا رہے ہیں، اور پھر ساتھ ساتھ یہ بات بھی ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کے واقعے میں جس طرح سے آیا تھا کہ نوح علیہ السلام نے اپنے بیٹے کے لئے اللہ کے سامنے سوال کیا، تو اللہ تعالیٰ نے وہ بات مانی تو کیا تھی نوح علیہ السلام کو جھڑک دیا، جس سے مشرکوں کے اس ذہن پر بھی اثر ڈالنا مقصود ہے کہ جو اللہ کی گرفت میں آ جائے اس کو پھر کوئی بچا نہیں سکتا، چاہے باپ نبی ہے لیکن بیٹا اللہ کی گرفت میں آ گیا تو باپ کو بھی زبان ہلانے کی اجازت نہ ہوئی، اور اگر انہوں نے محبت کی وجہ سے کوئی بات کی بھی تو اللہ نے ان کو ڈانٹ دیا، بیٹا عذاب سے بچا نہیں۔ اور اسی طرح سے یہاں حضرت

ابراہیم علیہ السلام ہیں جو مشرکین کے جدِ اعلیٰ تھے اور مشرکین ان کی طرف نسبت پہ فخر کرتے تھے اب ان کی سفارش بھی ہے قومِ لُوط کے بارے میں، بہت جھگڑا کیا، بہت اِصرار کیا، یہاں جھگڑا ''جدالِ حسن'' کے معنی میں ہے جس طرح سے کوئی بات منوانے کے لئے ناز اور محبت کے ساتھ کوئی اصرار کیا کرتا ہے، کہ تھوڑی سی مہلت دے دو، وہاں لُوط علیہ السلام موجود ہیں، ان کی موجودگی میں یہ عذاب آئے گا، کہیں ان کو کوئی تکلیف نہ پہنچے، مقصد یہ تھا کہ لُوط علیہ السلام کا وجود ان لوگوں کے لئے کچھ تحفظ کا باعث بن جائے، کچھ اور مہلت مل جائے، جلدی ان کے اوپر عذاب نہ آئے، بہت حلم والے تھے، بہت بُرد بار تھے، ان کو پتا تھا کہ وہ قوم لُوط علیہ السلام کے اوپر کیا سختیاں کرتی ہے لیکن اس کے باوجود انہوں نے حلم کا مظاہرہ کیا، بہت نرم دل تھے، عذاب کی خبر کے ساتھ ان کو دل میں تکلیف محسوس ہوئی کہ یہ قوم برباد ہو جائے گی، تو جس طرح سے اصرار کے ساتھ سفارش کی جاتی ہے اللہ تعالیٰ سے ایسی سفارش کی جو ظاہری طور پر ایسے معلوم ہوتا تھا جیسے جھگڑا کر رہے ہیں، کہ نہیں، ان کو چھوڑ دو، تھوڑی دیر اور ان کو مہلت دے دو، وہاں لُوط علیہ السلام موجود ہیں، ہو سکتا ہے کہ وہ سمجھ جائیں، اس طرح سے باتیں کر کے ان کو بچانے کی کوشش کی، لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہاں بھی پابندی لگ گئی کہ اس بات کو چھوڑ دیجئے، یہ بات نہ کیجیے، اب فیصلہ ہو چکا، تو یہاں بھی وہی بات ثابت ہوگئی کہ جب اللہ کی گرفت آتی ہے تو حضرت ابراہیم بھی اگر سفارشی بن جائیں اور وہ بھی اللہ کے ساتھ جھگڑا کرنے لگ جائیں تو اللہ تعالیٰ کے عدل و انصاف کے تقاضے سے جس قوم کا برباد ہونا مقدر ہو گیا وہ پھر کسی کے چھڑائے ہوئے چھوٹتے نہیں ہیں، کسی کے بچائے ہوئے بچتے نہیں ہیں، تو مشرکین کے ذہن کے اوپر یہ اثر ڈالنا مقصود ہے کہ تم کن کی سفارشوں پہ اعتماد کیے بیٹھے ہو، تم نے کون سے سہارے تلاش کر رکھے ہیں، یہاں تو انبیاء علیہم السلام اللہ کے سامنے دَم نہیں مار سکتے، اور اللہ تعالیٰ کا فیصلہ جو آجاتا ہے تو اس کو کوئی ٹال نہیں سکتا، تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو چپ کرا دیا گیا کہ اس واقعے کو چھوڑ دیجئے، آپ اس سلسلے میں بات نہ کیجیے۔

فرشتوں کی آمد پر لُوط علیہ السلام پریشان کیوں ہوئے؟

اور وہ فرشتے نوجوان لڑکوں کی صورت میں لُوط علیہ السلام کے گھر چلے گئے، لُوط علیہ السلام نے جب اپنے دروازے پر اس قسم کے خوبرو اور نوجوان لڑکوں کو دیکھا تو انبیاء علیہم السلام تو بہت اعلیٰ اخلاق کے ہوتے ہیں، مہمان کے آنے پہ خوشی ہوتی ہے، مہمان کو خوش آمدید کہتے ہیں، اھلاً و سھلاً و مرحبًا کہہ کے مہمان کی دِل جوئی کی جاتی ہے، لیکن ان مہمانوں کو دیکھ کے حضرت لُوط علیہ السلام کے دِل میں انقباض آگیا اور غم میں مبتلا ہو گئے کہ یہ کیا ہوا؟ اس قسم کے لوگ میرے ہاں کیوں آگئے؟ پتا تھا کہ جب قوم کو پتا چلے گا کہ اس قسم کے خوبرو نوجوان لڑکے آئے ہیں تو وہ اس قسم کے بدمعاش لُچے ہیں، وہ ان کو چھیڑیں گے، ان کو بے عزت کریں گے، مجھ سے چھیننے کی کوشش کریں گے، جیسے وہ آنے جانے والے مسافروں سے بھی اس قسم کی حرکتیں کرتے رہتے تھے، تو میرے گھر مہمان آنے کے بعد قوم کی شہوات کا نشانہ نہ بن جائے یا قوم اس کے اوپر ظلم و ستم کرے یہ کتنی بری بات ہے، یہ سارا آنے والا واقعہ حضرت لُوط علیہ السلام کی آنکھوں کے سامنے پھر گیا، اس لیے آپ غمزدہ ہو گئے اور دل میں کہا کہ یہ تو بڑا سخت دِن آگیا، لیکن جواب بھی نہیں دے سکتے تھے کہ میں تمہیں نہیں بٹھاتا، گھر میں ٹھہرا تو لیا۔

''هٰٓؤُلَآءِ بَنَاتِيْ هُنَّ اَطْهَرُ لَكُمْ'' کے دو مفہوم

ہوا وہی، کہ قوم کو جس وقت اطلاع ہوئی تو شہر کے غنڈے، مشنڈے، لُچے، لفنگے جتنے تھے وہ سارے کے سارے دوڑ کے آگئے اور آ کے حضرت لُوط علیہ السلام کے مکان کا محاصرہ کرلیا، اور مطالبہ کیا کہ یہ لڑکے ہمارے سپرد کرو، اب حضرت لُوط علیہ السلام پریشان کہ اپنے مہمانوں کو میں ان بدکاروں کے سپرد کس طرح سے کردوں، بہت سمجھایا لیکن وہ کسی طرح سے سمجھتے نہیں، آخر لُوط علیہ السلام کی زبان سے ایک بات نکلی کہ هٰٓؤُلَآءِ بَنَاتِيْ هُنَّ اَطْهَرُ لَكُمْ، اس کا مطلب دو طرح سے ذکر کیا گیا ہے یا تو یہ آپ کے وعظ کا حصہ ہے کہ بدبختو! اللہ تعالیٰ نے تمہاری شہوت رانی کے لئے، تمہاری قضائے شہوت کے لئے تمہیں بیویاں دی ہیں، اس قوم کی لڑکیاں ہیں جو تمہارے گھروں میں آباد ہیں، تم جا کے اپنی شہوت انہی پہ پوری کرو، اس قسم کے جذبات کا سکون تم وہیں جا کے حاصل کرو، تو ''هٰٓؤُلَآءِ بَنَاتِيْ'' سے وہی قوم کی بیٹیاں مراد ہیں، اور جس قوم کے اندر کوئی بزرگ شخص موجود ہو بوڑھا ہو تو ساری قوم کی بیٹیوں کو اپنی بیٹیاں ہی کہا کرتا ہے، میری یہ بیٹیاں تمہارے گھروں کے اندر آباد ہیں یہ لڑکیاں آخر کس لیے ہیں؟ اللہ تعالیٰ نے تمہارے سکون کے لئے یہی بنائی ہیں، تم ان کے پاس جاؤ، وہ تمہارے لیے پاکیزگی کا باعث ہیں، فطری طریقہ ہے، اور قانون شریعت کے اعتبار سے جائز ہے، تمہیں ادھر متوجہ ہونا چاہیے، تم لڑکوں کے پیچھے کیوں لگے ہوئے ہو۔ انہوں نے آگے سے جواب دیا کہ نہیں! تمہیں پتا ہے کہ ہمیں ان کی طرف کوئی رغبت نہیں، ہمیں ان کی کوئی ضرورت نہیں، ڈھیٹ ہو کے اس طرح سے جواب دیا یعنی ان کی بے غیرتی اور بے حیائی اس حد تک آئی ہوئی تھی کہ وہ اس جرم کو نہ صرف یہ کہ کرتے تھے بلکہ علی الاعلان کرتے تھے اور اس کو کوئی عیب بھی نہیں سمجھتے تھے، سمجھانے والے کے سامنے پوری ڈھٹائی سے کہتے ہیں کہ ہمیں کوئی ضرورت نہیں، ہمیں کوئی رغبت نہیں، تمہیں پتا ہے کہ ہم کیا چاہتے ہیں، اس لیے یہ نصیحت ہمیں نہ کیجیے، تو بنات سے مراد قوم کی بیٹیاں ہیں کہ یہ تمہارے لیے پاکیزگی کا باعث ہیں، اپنی بیویوں کی طرف جا کے متوجہ ہوؤ، لڑکیوں سے نکاح کرو، جا کے قاعدے کے مطابق اپنا گزارہ کرو، اس بدمعاشی کو چھوڑ دو۔ یا اس کا مطلب یہ ذکر کیا گیا ہے کہ ''بنات'' سے لُوط علیہ السلام کی بیٹیاں مراد ہیں، لُوط علیہ السلام نے اپنی بیٹیوں کے متعلق کہا کہ میرے مہمانوں کو چھوڑو، یہ میری بیٹیاں موجود ہیں یہ لے لو، جس کا پھر دو طرح سے مطلب ہوگا، یا تو ان غنڈوں کے جو قائدین تھے دو تھے یا تین تھے، جتنی لُوط علیہ السلام کی بیٹیاں تھیں، تو آپ نے ایک عاجزانہ انداز کے ساتھ کہا کہ دیکھو! میں تمہیں اپنی بیٹیاں دینے کے لئے تیار ہوں، ان سے نکاح کرلو، یہ تمہارے لیے پاکیزگی کا باعث ہیں، ''پاکیزگی کا باعث'' تبھی ہوں گی جب جائز طریقے کے ساتھ تعلق قائم کیا جائے گا، تو یہ تمہارے لیے پاکیزگی کا باعث ہیں، تم یہ میری بیٹیاں لے لو، میں تمہیں بیٹیاں دینے کے لئے تیار ہوں، مہمانوں کے سلسلے میں مجھے رُسوا نہ کرو، تو نکاح کے لئے پیش کیں، یا نکاح کے لئے بھی پیش نہ کی ہوں تو یہ ایک بہت ہی ہارے جی سے بات ہوتی ہے، کسی کو شرمسار کرنے کے لئے اس کے سامنے اس انداز سے بات ہوتی ہے کہ وہاں کلام کی حقیقت مقصود نہیں ہوتی، دوسرے کو متاثر کرنا مقصود ہوتا ہے، جیسے دو لڑ کے لڑ رہے ہوں اور ایک کو غصہ چڑھا ہوا ہے وہ کسی طرح سے غصہ نہیں چھوڑتا اور جوتا اٹھا کے دوسرے کو مارنے کے لئے جاتا ہے تو کوئی بزرگ، آپ کا کوئی بڑا سامنے آجائے اور کہے کہ بھئی! اگر تُو مارے بغیر

نہیں رہ سکتا تو لو میرا سر موجود ہے، تُو مجھے جوتے لگا لے، اب یہ بات جو کہی جایا کرتی ہے تو اس کا یہ معنی نہیں ہوتا کہ حقیقتاً وہ سر پیش کر رہا ہے کہ تم مجھے جوتے لگالو، بلکہ شرمسار کر کے اس کا غصہ ٹھنڈا کرنا مقصود ہوتا ہے، کہ بدبختو! اگر تم کسی طرح سے باز نہیں آ سکتے تو میری بیٹیاں لے لو، اب کون شریف آدمی ہے جو اس بات کو سننے کے بعد شرمسار نہیں ہو جائے گا کہ دیکھو! ان کو اپنے مہمانوں کی عزت کتنی پیاری ہے، کہ بیٹیاں قربان کرنے کے لئے تیار ہیں لیکن مہمان دینے کے لئے تیار نہیں، تو ایسے وقت میں اگر ان کے اندر کچھ حیا کا ذرہ ہوتا، کچھ مروّت یا رواداری ہوتی تو شرمسار ہو جاتے، کہ ہم اتنا مجبور کیوں کر رہے ہیں کہ لُوط علیہ السلام مجبور ہو کے یہ لفظ بھی کہہ رہے ہیں کہ میری بیٹیاں لے جاتے ہو تو لے جاؤ، میں مہمان دینے کے لئے تیار نہیں، لیکن وہ کہاں ماننے کو تھے۔

لُوط علیہ السلام کی بےبسی کا عالم

جب کسی طرح سے نہ سمجھے تو آخر حضرت لُوط علیہ السلام کی زبان سے ایک بات نکلی کہ ہائے کاش! میرے اندر طاقت ہوتی کہ میں تم سے مقابلہ کر سکتا تو میں اکیلا مقابلہ کرتا، یا میرے ساتھ رُکنِ شدید ہوتا جس کی میں اوٹ لے لیتا، کوئی مضبوط سہارا ہوتا، میرا کوئی جتھا ہوتا، میری کوئی جماعت ہوتی، کوئی خاندان ہوتا، جس کے ساتھ مل کر میں تمہاری مدافعت کرتا، میں کیا کروں میرے پاس تو اپنی قوت بھی نہیں ہے، اور ظاہری طور پر میرے پاس کوئی جتھا اور جماعت بھی نہیں ہے، اس بات کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا کہ اللہ لُوط علیہ السلام پر رحم کرے کہ قوم کے سامنے کتنے عاجز آ گئے تھے کہ ان کے منہ سے یہ بات بھی نکل گئی، حالانکہ رُکنِ شدید تو ان کو حاصل تھا،[1] یعنی اللہ تعالیٰ کی پناہ ان کو حاصل تھی، اور اللہ کی طرف سے ان کو مدد آئی اور مدد آنے کے ساتھ وہ قوم تباہ ہو گئی۔

فرشتوں کا لُوط علیہ السلام کو تسلی دینا اور قومِ لُوط پر عذاب کا حال

جب ان کی اتنی عاجزی دیکھی تو اب فرشتے بول پڑے، کہنے لگے جی! آپ ہمیں کیا سمجھ رہے ہیں، ہم کوئی لونڈے ہیں؟ نہیں، ہم تو فرشتے ہیں اللہ کے بھیجے ہوئے، اور اس قوم کو برباد کرنے کے لئے آئے ہیں، اب آپ فکر نہ کیجیے، یہ آپ تک نہیں پہنچ سکتے، چنانچہ بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اسی وقت فرشتوں کے تصرف سے جتنے دنگا کرنے والے تھے سب اندھے ہو گئے، سورۂ قمر کے اندر اس قسم کے الفاظ آئیں گے جہاں سے یہ بات نکلتی ہے۔ اور لُوط علیہ السلام سے انہوں نے کہا کہ بس رات کے حصے میں آپ اپنے گھر والوں کو لے کے چلے جاؤ، بیوی کو ساتھ نہ لے جانا، وہ بیوی کافرہ تھی مشرکہ تھی جس کا ذکر سورۂ تحریم کے اندر موجود ہے: ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوا امْرَاَتَ نُوْحٍ وَّامْرَاَتَ لُوْطٍ، نوح علیہ السلام کی بیوی بھی کافر تھی اور لُوط علیہ السلام کی بیوی بھی کافر تھی، لُوط علیہ السلام کی بیوی بھی عذاب کی لپیٹ میں آئی اور نوح علیہ السلام کی بیوی بھی عذاب کی لپیٹ میں آئی، تو یہ رشتے ناطے کوئی کام نہیں آتے جس وقت کہ اپنا کردار صحیح نہ ہو، اور اپنا عقیدہ صحیح نہ ہو، ان مثالوں کے ساتھ یہ بات بھی واضح کرنی مقصود ہے۔ (فرشتوں نے کہا) صبح کے وقت ان پر عذاب آ جائے گا اور صبح کوئی دُور نہیں ہے صبح قریب ہی ہے، چنانچہ رات کو حضرت لُوط علیہ السلام اپنے گھر والوں کو لے کر نکل گئے، جس وقت نکل گئے تو پیچھے پھر ان کے اوپر عذاب آیا، عذاب کی حسی طور پر تو صورت یہ پیش آئی کہ یوں زلزلہ آیا، یوں

---

(۱) بخاری ۲/۶۸۰، کتاب التفسیر۔ سورۃ یوسف/ مشکوٰۃ ۲/۵۰۶ باب بدء الخلق۔ فصل اول۔

زمین پھٹی کہ مکانوں کی چھتیں گر گئیں اور بالکل تہہ وبالا ہو گئے کہ جیسے نچلے حصے اوپر آ گئے، جیسے زمین کے نیچے سے جوش دے کے کوئی چیز اٹھتی ہے تو نچلا حصہ اوپر آ گیا اور اوپر کا حصہ نیچے آ گیا، آسمان کی طرف سے پتھروں کی بارش ہوئی، آندھی آئی ہو گی جس میں پتھر بھی آئے ہوں گے اور اس طرح سے بستیاں الٹی گئیں، لیکن حقیقت کے اعتبار سے جس طرح سے بعض تفاسیر کے اندر آثار موجود ہیں کہ جبریل علیہ السلام نے ان بستیوں کو اُٹھایا اور اُٹھا کے پلٹ دیا، اب جبریل کا اُٹھانا اور پلٹنا چونکہ ظاہری آنکھوں سے تو نظر نہیں آتا، تو ظاہری طور پر تو صورت یہ پیش آئی کہ جس طرح سے زلزلہ آتا ہے یا زمین نیچے سے پھٹتی ہے جس طرح سے آتش فشاں پہاڑ پھٹا کرتے ہیں، پھٹنے کے ساتھ نچلا حصہ بم دھماکے کی طرح اُٹھا اور اُوپر گیا، اور اُوپر جا کے پھر اسی طرح سے پلٹا کھا گیا کہ بستیوں کا نچلا حصہ اوپر آ گیا اور اوپر کا حصہ نیچے آ گیا، اور سخت آندھی آئی جس میں پتھر برسے اور کنکریاں برسیں، اس قسم کا عذاب اس قوم کے اوپر آیا اور اس کو برباد کر دیا گیا، یعنی اتنا سخت عذاب ان کے اوپر آیا، چونکہ ان کا گناہ اور غلطی عام معاشرے کے لحاظ سے انتہائی سخت تھی، اور ان کی غلطی کی تفصیل آپ کے سامنے سورۂ اعراف میں آ چکی، کہ یہ بدکاری کے عادی تھے، لڑکوں کے ساتھ شہوت رانی کرتے تھے، علی الاعلان کرتے تھے، مجلسوں میں کرتے تھے، آنے جانے والوں کو پکڑ کے بھی اس کا نشانہ بناتے تھے، اور لُوط علیہ السلام کی تقریر میں جس طرح سے یہ بات آپ کے سامنے وضاحت سے آ گئی تھی کہ وہ اس گناہ کے موجد تھے، اس سے پہلے یہ گناہ دُنیا کے اندر نہیں تھا، شیطان کی تعلیم کے ساتھ ان کے اندر یہ جاری ہوا، تو اس طرح سے یہ قوم ساری کی ساری برباد کر دی گئی۔ یہ بستیاں شام کے علاقے میں تھیں، پُرانی جغرافیائی جو تقسیم تھی اس میں یہ سارے کا سارا شام کا علاقہ کہلاتا تھا، اور مشرکینِ مکہ کی آمدورفت چونکہ اُدھر ہوتی تھی تجارت کے سلسلے میں، تو آتے جاتے وہ آثار محسوس کرتے تھے، اور حکایات لوگوں کی زبان پر تھیں کہ یہاں قوم آباد تھی جو برباد ہو گئی، یہاں قوم آباد تھی جو برباد ہو گئی، تو قومِ صالح، قومِ ہود، قومِ لُوط، اس قسم آثار اُس وقت نمایاں تھے اور ان کی حکایات لوگوں کی زبان پہ تھیں، تو وہ اِن کو یاد دلائی جا رہی ہیں کہ وہ بستیاں اے ظالمو! تم سے دُور نہیں ہیں، آتے جاتے تم دیکھتے ہو۔ یا اگر اُن پر بدکرداریوں کے نتیجے میں، کُفر وشرک کے نتیجے میں، بداخلاقی کے نتیجے میں عذاب آ سکتا ہے تو تم بھی اِس عذاب کو اپنے آپ سے دُور نہ سمجھو، اگر تم باز نہیں آؤ گے تو تم بھی اِس کا نشانہ بن سکتے ہو، یہ حاصل ہے اس رُکوع کا، ترجمہ دیکھ لیجئے۔

خلاصۂ آیات

یہ پختہ بات ہے (لَقَدْ تاکید کے لئے ہے) کہ ہمارے بھیجے ہوئے ابراہیم کے پاس بشارت لے کے آئے اور انہوں نے آ کے سلام کہا اور ابراہیم علیہ السلام نے سلام کا جواب دیا پھر ابراہیم علیہ السلام نے دیر نہ کی کہ ایک بھنا ہوا، تلا ہوا بچھڑا لے آئے اور جب دیکھا ان کے ہاتھوں کو کہ اس کی طرف نہیں پہنچتے ان کو اجنبی جانا، اوپرا جانا اور ان کی طرف سے خوف محسوس کیا، کہنے لگے: آپ خوف نہ کریں ہم بھیجے گئے ہیں قومِ لُوط کی طرف اور ابراہیم علیہ السلام کی بیوی کھڑی تھی پس وہ ہنس دی ہم نے اس کو بشارت دی اسحاق کی اور اسحاق کے پیچھے یعقوب کی یعنی پوتے کی بشارت دی وہ کہنے لگی کہ ہائے میری خرابی (یہ ''بیان القرآن'' میں جیسے ترجمہ کیا گیا ہے)، ہائے خاک پڑے، میں بچے جنوں گی؟ اس قسم کے لفظ تعجب کے وقت میں عورتوں کی زبان پر جاری ہوا کرتے ہیں، ءَاَلِدُ،

میں بچہ جنوں گی، حالانکہ میں بوڑھی ہوں اور یہ میرا شوہر بھی بوڑھا ہے یہ تو عجیب بات ہے، عجیب شیٔ ہے، وہ کہنے لگے: کیا تُو تعجب کرتی ہے اللہ کے حکم سے، اللہ کی رحمت اور اس کی برکتیں تم پر ہیں اے اہل بیت، مخاطب یہاں، اَتَعْجَبِیْنَ، یہ دیکھو ایک عورت ہے، اور ہو کَتُہٗ عَلَیْکُمْ کم کا صیغہ یہ جمع مذکر کا ہے تو تعظیم کے وقت میں عورت کو خطاب کرتے ہوئے بھی جمع مذکر کا صیغہ بولا جاسکتا ہے اور اسی قسم کا لفظ آئے گا آپ کے سامنے سورۂ اُحزاب میں بائیسویں پارے کے پہلے رکوع میں، یُرِیْدُ اللّٰہُ لِیُذْھِبَ عَنْکُمُ الرِّجْسَ اَھْلَ الْبَیْتِ وَیُطَھِّرَکُمْ تَطْھِیْرًا، تو وہاں بھی پیچھے ذکر ہے حضور ﷺ کی ازواج کا اور ان کی طرف بھی ''کم'' کی ضمیر لوٹائی گئی تو عورتوں کی طرف ''کم'' کی ضمیر لوٹایا جانا یہ عرب کے اندر دستور تھا یہ عظمت سے ناشی ہوتا ہے اُردو میں بھی اس قسم کی باتیں ہیں کہ ایک سے گفتگو کرتے ہیں صیغے جمع کے بولتے ہیں اور عورت کا تذکرہ کرتے ہیں اور صیغے اس طرح سے بول دیے جاتے ہیں جیسے کہ مردوں کے لئے بولے جاتے ہیں یہ کلام کا ایک اُسلوب ہوتا ہے یہاں بھی، ''کم''، یہ خطاب، اَتَعْجَبِیْنَ، کے اندر جس طرح سے ایک متعین عورت کو ہے لیکن ضمیر جمع مذکر کی لوٹائی جارہی ہے اے اہل بیت، یہ صراحت ہے اس بات کی کہ بیوی جو ہے وہ بھی ''اہل بیت'' میں شامل ہوتی ہے تو رسول اللہ ﷺ کے ''اہل بیت'' کے اندر بھی آپ کی ازواج شامل ہیں جس طرح سے یہاں ''سارہ'' کو ''اہلِ بیت'' کے اندر شامل کیا جارہا ہے بیشک وہ اللہ تعالیٰ تعریف کیا ہوا ہے اس کے لئے ہر قسم کے کمال ثابت ہیں، ہر قسم کی عظمت ثابت ہے، بڑائی والا ہے۔ جس وقت ابراہیم سے ڈر دُور ہوگیا اور بشارت آگئی تو ہم سے جھگڑا کرنے لگ گئے قومِ لُوط کے بارے میں، بیشک ابراہیم البتہ بہت حلم والے، بہت نرم دل اور بہت اللہ کی طرف رُجوع کرنے والے تھے۔ قُلْنَا یٰٓاِبْرٰھِیْمُ: ہم نے کہا کہ اے ابراہیم اس بات کو چھوڑ دیجیے، یا فرشتوں نے کہا کہ اے ابراہیم اس بات کو چھوڑ دیجیے، اس سے اِعراض کر جائیے بیشک آپ کے رَبّ کا حکم آگیا اور ان کے پاس ایسا عذاب آنے والا ہے جو رَدّ نہیں کیا جائے گا۔ اور جب ہمارے بھیجے ہوئے لُوط علیہ السلام کے پاس آگئے تو وہ ان کی وجہ سے غم میں ڈال دیے گئے اور ان کی وجہ سے دل تنگ ہوگئے اور کہا کہ یہ دِن بہت سخت ہے۔ آئی آپ کے پاس آپ کی قوم اس حال میں بھگائی جاتی تھی آپ کی طرف، یعنی ایسے بے اختیار بھاگے ہوئے آرہے تھے جیسے پیچھے سے کوئی دھکے دے کے بھگائے لارہا ہو، اور اس سے پہلے سے بدکاریاں کرتے تھے، بدکاریوں کے عادی تھے۔ لُوط علیہ السلام بولے کہ اے میری قوم! یہ میری بیٹیاں ہیں یہ تمہارے لیے پاکیزہ ہیں، تم اللہ سے ڈرو اور مہمانوں کے بارے میں مجھے رُسوا نہ کرو کیا تم میں کوئی سمجھدار آدمی بھی نہیں؟ جو اس بات کو سمجھے اور باقیوں کو سمجھائے، وہ کہنے لگے کہ تو جانتا ہے کہ ہمیں تیری بیٹیوں میں کوئی رغبت نہیں ہے، کوئی حاجت نہیں ہے، حَقٍّ، یہ حاجت اور رغبت کے معنی میں، اور تجھے پتا ہے کہ ہم کیا چاہتے ہیں، تو لُوط علیہ السلام نے کہا کہ ہائے کاش! میرے لیے کوئی قوت ہوتی یا میں سہارا لیتا رُکنِ شدید کی طرف، وہ کہنے لگے، فرشتے کہنے لگے، جو آئے ہوئے تھے وہ کہنے لگے کہ اے لُوط! ہم تیرے رَبّ کے بھیجے ہوئے ہیں ہرگز یہ تیری طرف نہیں پہنچیں گے تو اپنے گھر والوں کو لے کے رات کے کسی حصے میں چلا جا اور نہ مڑ کے دیکھے تم میں سے کوئی، یعنی جلدی جلدی چلے جانا، پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھنا کہ کیا ہوتا ہے، ایسا نہ ہو کہ سستی کرنے کی بنا پر اس علاقے کی حدود میں رہ جاؤ جو کہ عذاب کی زد میں آنے والا ہے، تو، لَا یَلْتَفِتْ، کا یہی معنی ہے کہ جلدی جلدی چلے جائیو، پیچھے مڑ کے بھی نہ دیکھیو، تاکہ عذاب کی حدود سے آپ نکل جائیں، سوائے آپ کی بیوی

کے، پس بیشک اس کو پہنچنے والی ہے وہی چیز جو ان لوگوں کو پہنچے گی اور ان کے وعدے کا وقت صبح ہے، کیا صبح قریب نہیں؟ یعنی قریب ہی ہے! جب ہمارا حکم آ گیا تو ہم نے ان بستیوں کے عالی کو سافل بنا دیا، اوپر کے حصے کو نچلا حصہ بنا دیا یعنی تہہ و بالا کر دیا اور برسائے ہم نے ان کے اُوپر پتھر ''سنگ گِل'' کے، کھنگر کے مسلسل۔ مُسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ: تیرے رَبّ کی طرف سے نشان زدہ تھے جن کو دیکھ کے معلوم ہوتا تھا کہ عذاب کے پتھر ہیں عام پتھر نہیں ہیں، اور یہ بستیاں ان ظالموں سے دُور نہیں، یا یہ چارہ، یہ پتھروں کی بارش جس کا مصداق عذاب ہے، یہ ان ظالموں سے دُور نہیں، بعید از امکان نہیں۔ اگر یہ جرم سے باز نہیں آئیں گے تو یہ بھی اس کا نشانہ بن سکتے ہیں۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

وَاِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا ؕ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ

اور بھیجا ہم نے مدین کی طرف ان کے بھائی شعیب علیہ السلام کو، انہوں نے کہا کہ اے میری قوم! عبادت کرو اللہ کی نہیں ہے تمہارے لیے

مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ وَلَا تَنْقُصُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ اِنِّيْٓ اَرٰىكُمْ بِخَيْرٍ وَّاِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ

کوئی معبود اس کے علاوہ، کمی نہ کیا کرو کیل اور وزن میں، بیشک میں تمہیں خوش حالی میں دیکھتا ہوں اور بیشک میں اندیشہ کرتا ہوں تم پر

عَذَابَ يَوْمٍ مُّحِيْطٍ ﴿۸۴﴾ وَيٰقَوْمِ اَوْفُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ

محیط دِن کے عذاب کا ﴿۸۴﴾ اور اے میری قوم! پورا کیا کرو تم کیل اور وزن کو انصاف کے ساتھ اور گھٹا کر نہ دیا کرو لوگوں کو

اَشْيَآءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ﴿۸۵﴾ بَقِيَّتُ اللّٰهِ خَيْرٌ

ان کی چیزیں اور زمین کے اندر فساد مچاتے ہوئے نہ پھرو ﴿۸۵﴾ اللہ کے حکم کے مطابق تمہارے پاس جو بچ رہے وہ بہتر ہے

لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۚ وَمَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيْظٍ ﴿۸۶﴾ قَالُوْا يٰشُعَيْبُ اَصَلٰوتُكَ

تمہارے لیے اگر تم یقین کرنے والے ہو اور میں تم پر کوئی نگہبان نہیں ہوں ﴿۸۶﴾ وہ کہنے لگے کہ اے شعیب! کیا تیری نماز

تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِيْٓ اَمْوَالِنَا

تجھے یہی حکم دیتی ہے کہ چھوڑ دیں ہم ان چیزوں کو جن کو پوجتے تھے ہمارے آباء یا (چھوڑ دیں اس بات کو کہ) کریں ہم اپنے مالوں میں

مَا نَشٰٓؤُا ؕ اِنَّكَ لَاَنْتَ الْحَلِيْمُ الرَّشِيْدُ ﴿۸۷﴾ قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ

جو چاہیں، بے شک تو البتہ بُردبار ہے، نیک چلن ہے ﴿۸۷﴾ شعیب علیہ السلام نے کہا کہ اے میری قوم! بتلاؤ تم، اگر میں اپنے رَبّ کی طرف

مِّنْ رَّبِّيْ وَرَزَقَنِيْ مِنْهُ رِزْقًا حَسَنًا ۭ وَمَآ اُرِيْدُ اَنْ اُخَالِفَكُمْ

سے ایک واضح دلیل پر ہوں اور اس نے مجھے اپنی طرف سے رزقِ حسن دیا ہے، اور نہیں ارادہ کرتا میں کہ مخالفت کروں تمہاری

اِلٰي مَآ اَنْهٰىكُمْ عَنْهُ ۭ اِنْ اُرِيْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ ۭ

مائل ہوتا ہوا اس کام کی طرف جس سے تمہیں روکتا ہوں، نہیں ارادہ کرتا میں مگر حالات کو درست کرنے کا جہاں تک مجھ میں طاقت ہے،

وَمَا تَوْفِيْقِيْٓ اِلَّا بِاللّٰهِ ۭ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ ۝۸۸ وَيٰقَوْمِ لَا

اور نہیں ہے میری توفیق مگر اللہ کے ساتھ، اسی پر میں نے بھروسا کیا اور اسی کی طرف میں رُجوع کرتا ہوں ۸۸ اے میری قوم! نہ

يَجْرِمَنَّكُمْ شِقَاقِيْٓ اَنْ يُّصِيْبَكُمْ مِّثْلُ مَآ اَصَابَ قَوْمَ نُوْحٍ اَوْ قَوْمَ هُوْدٍ اَوْ قَوْمَ صٰلِحٍ ۭ

برانگیختہ کرے تمہیں میری ضد اس بات پر کہ پہنچ جائے تمہیں مثل اس چیز کے جو پہنچا قوم نوح کو، قوم ہود کو اور قوم صالح کو،

وَمَا قَوْمُ لُوْطٍ مِّنْكُمْ بِبَعِيْدٍ ۝۸۹ وَاسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ ۭ اِنَّ رَبِّيْ رَحِيْمٌ

اور لوط کی قوم تو تم سے کوئی دُور نہیں ۸۹ اپنے ربّ سے استغفار کرو پھر اسی کی طرف متوجہ رہو، بیشک میرا ربّ مہربان ہے اور

وَّدُوْدٌ ۝۹۰ قَالُوْا يٰشُعَيْبُ مَا نَفْقَهُ كَثِيْرًا مِّمَّا تَقُوْلُ وَاِنَّا

محبت کرنے والا ہے ۹۰ وہ کہنے لگے کہ او شعیب! نہیں سمجھتے ہم بہت ساری باتیں ان باتوں میں سے جو تُو کہتا ہے، اور بیشک ہم

لَنَرٰىكَ فِيْنَا ضَعِيْفًا ۚ وَلَوْلَا رَهْطُكَ لَرَجَمْنٰكَ ۡ وَمَآ اَنْتَ عَلَيْنَا بِعَزِيْزٍ ۝۹۱

البتہ دیکھتے ہیں تجھے اپنے اندر کمزور، اگر تیرے خاندان کی رعایت نہ ہوتی تو البتہ ہم تجھے رجم کر دیتے، تُو ہم پر کوئی غالب نہیں ہے ۹۱

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَهْطِيْٓ اَعَزُّ عَلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ ۭ وَاتَّخَذْتُمُوْهُ وَرَاۗءَكُمْ ظِهْرِيًّا ۭ

شعیب علیہ السلام نے کہا کہ اے میری قوم! کیا میرا خاندان زیادہ عزیز ہے تم پر اللہ کے مقابلے میں؟ اور بنایا تم نے اس اللہ کو پس پشت ڈالا ہوا،

اِنَّ رَبِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ۝۹۲ وَيٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰي مَكَانَتِكُمْ اِنِّىْ عَامِلٌ ۭ

بیشک میرا ربّ اِحاطہ کرنے والا ہے ان کاموں کا جو تم کرتے ہو ۹۲ اے میری قوم! عمل کرو تم اپنی جگہ پر، میں بھی عمل کرنے والا ہوں،

سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ وَمَنْ هُوَ كَاذِبٌ ۭ

عنقریب جان لو گے کہ کون ہے وہ شخص کہ آئے گا اس کے پاس عذاب جو اس کو رُسوا کر دے گا، اور کون ہے وہ شخص جو جھوٹا ہے،

وَارْتَقِبُوْٓا اِنِّيْ مَعَكُمْ رَقِيْبٌ ﴿۹۳﴾ وَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا شُعَيْبًا وَّالَّذِيْنَ

تم انتظار کرو، میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والا ہوں ﴿۹۳﴾ اور جب ہمارا حکم آ گیا تو نجات دی ہم نے شعیب کو اور ان لوگوں کو جو

اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَاَخَذَتِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ فَاَصْبَحُوْا

ان کے ساتھ ایمان لائے تھے اپنی طرف سے رحمت کے ساتھ اور پکڑ لیا ان لوگوں کو جنہوں نے ظلم کیا کڑک نے پس وہ ہو گئے

فِيْ دِيَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ﴿۹۴﴾ كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا ۗ اَلَا بُعْدًا لِّمَدْيَنَ كَمَا بَعِدَتْ ثَمُوْدُ ﴿۹۵﴾

اپنے گھروں کے اندر منہ کے بل گرے ہوئے ﴿۹۴﴾ گویا کہ کبھی وہ ان گھروں میں رہے ہی نہیں تھے، خبردار! دُوری ہے مدین کے لئے جیسے کہ دُور ہوئے ثمود ﴿۹۵﴾

خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ وَاِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا: اور بھیجا ہم نے مدین کی طرف ان کے بھائی شعیب علیہ السلام کو۔ اِلٰى مَدْيَنَ یہ اَرْسَلْنَا کے متعلق ہے۔ اور ''مدین'' حضرت ابراہیم علیہ السلام کے صاحبزادے کا نام ہے، اور پھر ان کی اولاد میں جو قبیلہ بنا اس قبیلے کا نام بھی ''مدین'' ہے، اور جس شہر کے اندر یہ آباد تھے اس شہر کا نام بھی ''مدین'' تھا، تو اس لیے یہاں ''مدین'' سے اگر قبیلہ مراد لیا جائے تو اَخَاهُمْ کی ''ھم'' ضمیر کا مرجع واضح ہے کہ ''مدین'' قبیلے کی طرف ہم نے ان کے بھائی شعیب کو بھیجا، اور اگر ''مدین'' سے شہر مراد لیا جائے تو پھر تاویل کرنی پڑے گی: الی اھل مدین۔ شعیب علیہ السلام انہی کے نسبی بھائی تھے، قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ: شعیب علیہ السلام نے کہا کہ اے میری قوم! عبادت کرو اللہ کی نہیں تمہارے لئے کوئی معبود اس کے علاوہ، وَلَا تَنْقُصُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ: مکیال: کیل کرنے کا آلہ۔ اور میزان: وزن کرنے کا آلہ، ''میزان'' ترازو کو کہتے ہیں، اور ''مکیال'' اس ٹوپے کو کہتے ہیں جس کے ساتھ کسی چیز کا اندازہ کیا جاتا ہے، کسی چیز کو ماپا جاتا ہے، اور یہ دونوں لفظ بول کر کیل و وزن مراد ہیں۔ ''کمی نہ کیا کرو کیل اور وزن میں، گھٹایا نہ کرو کیل کو اور وزن کو'' اِنِّيْٓ اَرٰىكُمْ بِخَيْرٍ: بیشک میں تمہیں خوش حالی میں دیکھتا ہوں، وَاِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ مُّحِيْطٍ: اور بیشک میں اندیشہ کرتا ہوں تم پر محیط دن کے عذاب کا۔ مُحِيْطٍ یہ یوم کی صفت ہے۔ یوم محیط: ایسا دن جو مختلف قسم کے عذابوں کو جمع کرنے والا ہوگا، جس میں کئی قسم کی تکلیفیں اور عذاب جمع ہوں گے۔ محیط: جامع لأنواع المصائب، جو مختلف قسم کی مصیبتوں کو جمع کرنے والا ہوگا، ایسے دن کے عذاب سے میں تمہارے متعلق ڈرتا ہوں، وَيٰقَوْمِ اَوْفُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ: اور اے میری قوم! پورا کیا کرو تم کیل و وزن، بِالْقِسْطِ: انصاف کے ساتھ، وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ: بخس: کم کرنا، گھٹانا۔ اور گھٹا کر نہ دیا کرو لوگوں کو ان کی چیزیں، لوگوں کا نقصان نہ کیا کرو ان کی اشیاء میں، وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ: اور زمین کے اندر فساد مچاتے ہوئے نہ پھرو، بَقِيَّتُ اللّٰهِ خَيْرٌ لَّكُمْ: بَقِيَّتُ اللّٰهِ: اللہ کا بقیہ۔ اللہ کے بقیہ سے مراد یہ ہے کہ اللہ کے احکام کے

مطابق بچا ہوا، جو نفع تم اللہ کے اَحکام کے مطابق حاصل کرو، اس کی نسبت اللہ کی طرف کر دی۔ ''اللہ کے حکم کے مطابق تمہارے پاس جو بچ رہے وہ بہتر ہے تمہارے لئے'' اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ: اگر تم یقین کرنے والے ہو، وَمَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيْظٍ: اور میں تم پر کوئی نگہبان نہیں ہوں۔ قَالُوْا يٰشُعَيْبُ: وہ کہنے لگے کہ اے شعیب! اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ: کیا تیری نماز تجھے حکم دیتی ہے، اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ: کہ چھوڑ دیں ہم ان چیزوں کو جن کو پُوجتے تھے ہمارے آباء، اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِيْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا: یا چھوڑ دیں اس بات کو کہ کریں ہم اپنے مالوں میں جو ہم چاہیں۔ اَنْ نَّفْعَلَ کا عطف مَا يَعْبُدُ پر ہے۔ اِنَّكَ لَاَنْتَ الْحَلِيْمُ الرَّشِيْدُ: بیشک تو البتہ حلیم ہے، حلم والا ہے، بُردبار ہے۔ رشید: ہدایت یافتہ، نیک چلن ہے۔ صلوٰۃ بول کر یا تو نماز ہی مراد ہے، اور یہ اِستہزا کرتے ہیں شعیب علیہ السلام سے، خاص طور پر ان کی نماز کو نشانہ بناتے ہیں، کہ تیری نماز تجھے یہی سکھاتی ہے۔ تَاْمُرُكَ کا معنی ''تجھے یہی سکھاتی ہے؟'' اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ: اَنْ نَّتْرُكَ میں ترک والا فعل ان کا قرار دیا گیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ نماز تجھے یہی سکھاتی ہے کہ ہم چھوڑ دیں؟ ان دونوں باتوں میں جوڑ سا نہیں معلوم ہوتا۔ ''تجھے یہ سکھاتی ہے کہ ہم چھوڑ دیں؟'' تو نماز شعیب علیہ السلام کو ان کے فعل کے متعلق کیسے حکم دیتی ہے؟ اس لئے یہاں ایک لفظ محذوف مانا جائے گا جس طرح سے ''بیان القرآن'' میں تقدیر عبارت نکالی گئی ہے اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ تَاْمُرَنَا اَنْ نَّتْرُكَ، کیا تیری نماز تجھے یہ حکم دیتی ہے کہ تو ہمیں کہے کہ ہم چھوڑ دیں، تیری نماز تجھے یہی سکھاتی ہے؟ دو باتیں حضرت شعیب علیہ السلام نے کہی تھیں کہ ایک تو شرک چھوڑ دو کہ اللہ کے علاوہ کوئی دوسرا معبود نہیں، اس کا ذکر تو پہلے آ گیا مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ، اور دوسرا کہا تھا کہ کیل اور وزن کو ٹھیک کرو، لوگوں کو چیزیں گھٹا کے نہ دیا کرو، تو اس کا ذکر دوسرے الفاظ میں آ گیا اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِيْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا: ہم اپنے مالوں میں اپنی مرضی کے مطابق تصرف کرنا چھوڑ دیں، اور اپنے باپ دادا کے معبودوں کو چھوڑ دیں، کیا تیری نماز تجھے یہی سکھاتی ہے کہ تُو ہمیں یہ دو باتیں کہے؟ مطلب یہ ہے کہ دونوں باتیں ہمارے نزدیک خلاف عقل ہیں، نہ تو آباؤ اجداد کا طریقہ چھوڑنے کے قابل ہے، اور نہ یہ بات ماننے کے قابل ہے کہ ہم اپنے مالوں میں اپنی مرضی کا تصرف نہ کریں، بلکہ تجھ سے پوچھ پوچھ کر کریں کہ ہم کیسے بیچیں، کیسے تولیں۔ تو صلوٰۃ سے صلوٰۃ ہی مراد ہو تو انہوں نے صلوٰۃ کا مذاق اُڑایا، یا صلوٰۃ بول کر دِین اور تقدس مراد ہے کہ تیرا دِین، تیرا تقدس تجھے یہی سکھاتا ہے؟ نماز عنوان ہے دِین کا، تیرا دِین تجھے یہی سکھاتا ہے کہ تُو ہمیں کہے کہ چھوڑ دیں ہم اس چیز کو جس کی پُوجا کیا کرتے تھے ہمارے آباء، یا چھوڑ دیں ہم اس بات کو کہ ہم اپنی مرضی کے مطابق اپنے مالوں میں تصرف کریں؟ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِيْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا کا مفہوم سمجھ گئے؟ ''ہمارا اپنے مالوں میں جو کچھ ہم چاہیں وہ کرنا ترک کر دیں؟'' یہ بھی نَّتْرُكَ کا مفعول ہے، اِنَّكَ لَاَنْتَ الْحَلِيْمُ الرَّشِيْدُ: یہ بات بھی بطور اِستہزا ہے، کہ بڑا سمجھ دار ہے تُو، بڑا نیک چلن ہے، یعنی تیرے نیک ہونے کا اور تیرے سمجھ دار ہونے کا یہ مطلب ہے؟ کہ تُو ہمیں کہے کہ یوں نہ کرو، یوں نہ کرو، ہم اپنے آباؤ اجداد کے طریقوں کو چھوڑ دیں اور اپنے مال کے اندر اپنی مرضی کا تصرف نہ کریں، بڑا سمجھ دار ہے تو جو ایسی باتیں کرتا ہے، یہ بطور اِستہزا کے ہے۔ قَالَ يٰقَوْمِ: شعیب علیہ السلام نے کہا کہ اے میری قوم! اَرَءَيْتُمْ: بتلاؤ تم اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ: اگر میں اپنے رَبّ کی طرف سے ایک واضح راستے پر ہوں، واضح دلیل پر ہوں، وَرَزَقَنِيْ مِنْهُ رِزْقًا حَسَنًا: اور اس نے مجھے اپنی طرف سے رزقِ حسن دیا ہے۔ ''رزقِ حسن'' سے مراد نبوّت، جس کی تعبیر پہلے واقعات میں رحمت کے ساتھ آئی ہے۔ ''واضح دلیل پر ہوں اللہ کی طرف سے، اور مجھے رزقِ حسن

یعنی رُوحانی رزق ملا ہے۔'' اور اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ کا جواب آگے محذوف ہوگا، جو پچھلے واقعات میں صراحت کے ساتھ ذکر کیا گیا کہ میں واضح دلیل پر ہوں اپنے رَبّ کی طرف سے اور مجھے اپنے رَبّ کی طرف سے رزقِ حسن ملا ہے تو پھر میں اگر اللہ کی نافرمانی کروں گا تو مجھے اللہ کے عذاب سے کون بچائے گا؟ تمہاری باتیں مان کر اگر میں اللہ کی نافرمانی کرلوں تو پھر اللہ کے عذاب سے مجھے کون بچائے گا؟ وَمَآ اُرِيْدُ اَنْ اُخَالِفَكُمْ اِلٰى مَآ اَنْهٰكُمْ عَنْهُ: اور نہیں ارادہ کرتا میں کہ مخالفت کروں تمہاری مائل ہوتا ہوا اس کام کی طرف جس سے تمہیں روکتا ہوں، یعنی صرف یہ نہیں کہ تمہیں ان کی پابندی کے لئے کہتا ہوں، خود بھی تو ان کی پابندی کرتا ہوں، یہ تو نہیں کہ تمہیں کہوں کہ پورا تولو اور خود کم تولوں، تمہیں کہوں کہ پورا ماپو اور خود پورا نہ ماپوں، ایسی بات تو نہیں، جو کہتا ہوں اس کے مطابق عمل کرتا ہوں، ''نہیں ارادہ کرتا میں کہ مخالفت کروں تمہاری مَائِلًا اِلٰى مَآ اَنْهٰكُمْ عَنْهُ مائل ہوتا ہوا اس بات کی طرف جس سے میں تمہیں روکتا ہوں۔'' اِنْ اُرِيْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ: نہیں ارادہ کرتا میں مگر حالات کو درست کرنے کا، نہیں ارادہ کرتا میں مگر اصلاح کا، یعنی میں اصلاح کے علاوہ کچھ نہیں چاہتا، مَا اسْتَطَعْتُ: جہاں تک مجھ میں طاقت ہے، وَمَا تَوْفِيْقِيْٓ اِلَّا بِاللّٰهِ: اور نہیں ہے میری توفیق مگر اللہ کے ساتھ، عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ: اسی پر میں نے بھروسا کیا اور اسی کی طرف میں رجوع کرتا ہوں۔ وَيٰقَوْمِ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شِقَاقِيْٓ: شقاق مصدر ہے، ضد کرنا۔ اور ''یَ'' ضمیر کی طرف اضافت یہ مصدر کی اضافت مفعول کی طرف ہے، یعنی تم نے جو میرے ساتھ ضد باندھ لی۔ ''اے میری قوم! نہ برانگیختہ کرے تمہیں میری ضد اس بات پر کہ پہنچ جائے تمہیں مثل اس چیز کے جو پہنچا قومِ نوح کو، قومِ ہود کو، اور قومِ صالح کو'' وَمَا قَوْمُ لُوْطٍ مِّنْكُمْ بِبَعِيْدٍ: اور لوط علیہ السلام کی قوم تو تم سے کوئی دُور نہیں۔ زمان کے اعتبار سے بھی قریب، مکان کے اعتبار سے بھی قریب۔ وَاسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ: اپنے رَبّ سے استغفار کرو، ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ: پھر اسی کی طرف متوجہ رہو، اِنَّ رَبِّيْ رَحِيْمٌ وَّدُوْدٌ: بیشک میرا رَبّ مہربان ہے اور محبت کرنے والا ہے۔ قَالُوْا يٰشُعَيْبُ: وہ کہنے لگے کہ او شعیب! مَا نَفْقَهُ كَثِيْرًا مِّمَّا تَقُوْلُ: جو باتیں تُو کرتا ہے ان میں سے بہت سی باتیں تو ہماری سمجھ میں نہیں آتیں۔ مَا نَفْقَهُ: نہیں سمجھتے ہم بہت ساری باتیں ان باتوں میں سے جو تُو کہتا ہے، وَاِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْنَا ضَعِيْفًا: اور بے شک ہم البتہ دیکھتے ہیں تجھے اپنے اندر کمزور، وَلَوْلَا رَهْطُكَ: لَوْلَا مُرَاعَاةُ رَهْطِكَ اگر تیری جماعت، تیرے خاندان کی رعایت نہ ہوتی لَرَجَمْنٰكَ: تو البتہ ہم تجھے رجم کردیتے، پتھر مار مار کر مار دیتے۔ وَمَآ اَنْتَ عَلَيْنَا بِعَزِيْزٍ: تُو ہم پر کوئی غالب نہیں ہے، قَالَ يٰقَوْمِ: شعیب علیہ السلام نے کہا کہ اے میری قوم! اَرَهْطِيْٓ اَعَزُّ عَلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ: کیا میرا خاندان تم پر اللہ کے مقابلے میں زیادہ عزیز ہے؟ زیادہ عزیز ہے اللہ کے مقابلے میں تمہارے نزدیک، کیا میرا خاندان زیادہ عزیز ہے تم پر اللہ کے مقابلے میں؟ وَاتَّخَذْتُمُوْهُ وَرَآءَكُمْ ظِهْرِيًّا: اور اختیار کیا تم نے اس اللہ کو پشت کے پیچھے پھینکا ہوا، یعنی اللہ کو تو ایسا کرلیا جیسے پس پشت ڈال لیا، اس کا تو تم خیال ہی نہیں کرتے، نسیا منسیا کردیا، اور میرے قبیلے کی رعایت کرتے ہو۔'' بنایا تم نے اس اللہ کو پس پشت ڈالا ہوا'' ظِهْرِيّ اسے کہتے ہیں جو پشت کے پیچھے ڈال دیا جائے، اِنَّ رَبِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ: بیشک میرا رَبّ احاطہ کرنے والا ہے ان کاموں کا جو تم کرتے ہو، وَيٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ: اے میری قوم! عمل کرو تم اپنی جگہ پر، اِنِّيْ عَامِلٌ: میں بھی عمل کرنے والا ہوں، سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ: عنقریب جان لوگے تم اس شخص کو جس کے پاس آجائے گا عذاب جو اسے رُسوا کردے گا، عنقریب جان لوگے مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ: استفہام کے طور پر ترجمہ کرنا ہو تو ''عنقریب جان لوگے کون

ہے وہ شخص کہ آئے گا اس کے پاس عذاب جو اس کو رُسوا کر دے گا" وَمَنْ هُوَ كَاذِبٌ: اور کون ہے وہ شخص جو جھوٹا ہے، یعنی جس پر عذاب آئے گا جو جھوٹا ہے تمہارے سامنے پتا چل جائے گا، وَارْتَقِبُوْٓا: تم انتظار کرو اِنِّيْ مَعَكُمْ رَقِيْبٌ: میں تمہارے ساتھ انتظار کرنے والا ہوں۔ وَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا: اور جب ہمارا اَمر آ گیا، حکم عذاب آ گیا، نَجَّيْنَا شُعَيْبًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ: نجات دی ہم نے شعیب علیہ السلام کو اور اور ان لوگوں کو جو ان کے ساتھ ایمان لائے تھے بِرَحْمَةٍ مِّنَّا: اپنی طرف سے رحمت کے ساتھ، "جب ہمارا حکم آ گیا تو ہم نے نجات دی شعیب علیہ السلام کو اور ان لوگوں کو جو اس کے ساتھ ایمان لائے تھے، نجات دی ہم نے اپنی طرف سے رحمت کے سبب سے" وَاَخَذَتِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ: اور پکڑ لیا ان لوگوں کو جنہوں نے ظلم کیا کڑک نے، فَاَصْبَحُوْا فِيْ دِيَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ: پس وہ ہو گئے اپنے گھروں کے اندر منہ کے بل گرے ہوئے، كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا: گویا کہ کبھی وہ ان گھروں میں رہے ہی نہیں تھے، اَلَا بُعْدًا لِّمَدْيَنَ كَمَا بَعِدَتْ ثَمُوْدُ: خبردار! دُوری ہے مدین کے لئے جیسے کہ دُور ہوئے ثمود، جیسے اللہ کی رحمت سے وہ دُور ہوئے ایسے ہی اللہ کی رحمت سے یہ دُور ہو گئے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

تفسیر

ماقبل سے ربط

واقعات کے سلسلے میں یہ حضرت شعیب علیہ السلام کا واقعہ ہے اور سورۂ اَعراف میں یہ مفصل آپ کے سامنے گزر چکا، ان واقعات کے بہت سارے اجزاء تو آپس میں ملتے جلتے ہیں، جیسے توحید کی دعوت دی تمام انبیاء علیہم السلام نے اسی انداز سے دی اور عذاب سے بھی ڈرایا اور قوم کی طرف سے مخالفت بھی ایک ہی انداز سے ہوئی، اور اس مخالفت کے نتیجے میں دنیا کے عذاب کے اندر گرفتار بھی ہوئے، اور بعض بعض چیزیں بعض قوموں کے اندر خصوصیت سے ذکر کی گئی ہیں جیسا کہ گزشتہ رکوع میں قومِ لُوط کا ذکر آیا تھا تو ان کے کُفر و شرک کے ساتھ ان کی بداخلاقی کو واضح کیا گیا تھا جس میں وہ مبتلا تھے، اور اسی طرح سے اس رکوع میں قومِ شعیب کا ذکر ہے تو ان کے اندر بھی ایک بدمعاملگی تھی جس کا ذکر یہاں کیا گیا ہے۔

ماپ تول میں کمی قومِ شعیب کی خصوصی بیماری

شرک کے اندر مبتلا ہونے کے ساتھ ساتھ، یہ لوگ چونکہ تاجر پیشہ تھے تو تاجر پیشہ ہونے کی وجہ سے یہ تجارت میں بددیانتی کرتے تھے، کم تولتے تھے اور کم ماپتے تھے، اس طرح سے انہوں نے عدل و انصاف کا ستیاناس کر دیا تھا اور لوگوں کے حقوق کو غصب کرتے تھے، جو چیز ماپ کے دی جاتی اس کے اندر بھی کمی کرتے، جو تول کی دی جاتی اس کے اندر بھی کمی کرتے، کم تولنا کم ماپنا اس قوم کی خصوصی بیماری تھی جس کا ذکر حضرت شعیب علیہ السلام نے یہاں کیا ہے، اور اس کم تولنے اور کم ماپنے کو "تطفیف" کے لفظ سے ادا کیا جاتا ہے، تیسویں پارہ میں سورۂ مطففین ہے اس کا بھی یہی معنی ہے، "کمی کرنے والوں کے لئے ہلاکت ہے"

جس کی تفصیل آگے یہی کی گئی کہ جب یہ دوسروں سے لیتے ہیں تو پورا پورا تول کے لیتے ہیں، پورا پورا ماپ کے لیتے ہیں، جب دوسروں کو دیتے ہیں تو اس کے اندر نقص ڈالتے ہیں، تو قومِ شعیب کے اندر یہ بیماری تھی جس کے اوپر خصوصیت کے ساتھ حضرت شعیب علیہ السلام نے متنبہ کیا ہے کہ تمہارا یہ طریقہ ٹھیک نہیں ہے، ٹھیک ٹھیک تولا کرو، ٹھیک ٹھیک ماپا کرو، لوگوں کو ان کی چیزیں کم کر کے نہ دیا کرو، اس طرح سے ان کے حقوق کو غصب نہ کرو، اس وقت تم بہت خوش حال ہو اللہ تعالیٰ نے تمہیں بہت کچھ دے رکھا ہے، اور اس خوش حالی کے اوپر اللہ کا احسان مانو اور اللہ کی فرمانبرداری کرو، اور اگر تم نے اس بدکرداری کو نہ چھوڑا اور اسی طرح سے کفر و شرک سے باز نہ آئے تو پھر یاد رکھو! تم پر ایک دن ایسا بھی آجائے گا جو مختلف قسم کی مصیبتوں کا جامع ہوگا، اور اس دن تم پھر عذاب میں مبتلا ہو جاؤ گے، یہ ترہیب ہے۔ اور آگے پھر اسی لفظ کے ساتھ ترغیب دی گئی کہ اللہ کے احکام کے مطابق تجارت کرو، اللہ کے اَحکام کے مطابق تجارت کرو گے تو جو بچ جائے چاہے بظاہر دیکھنے میں تھوڑا ہو وہ تمہارے لیے بہتر ہے اس مال کے مقابلے میں جو اللہ کے حکم کی مخالفت کرتے ہوئے تم کماؤ، بَقِيَّتُ اللّٰهِ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ: بَقِيَّتُ اللّٰهِ کا مفہوم یہی ہے جو ترجمے کے اندر میں نے آپ کے سامنے واضح کیا، کہ اللہ کے حکم کے مطابق تجارت کرتے ہوئے جو تمہارے لیے بچ جائے وہ بظاہر اگرچہ کم ہوگا لیکن اس حرام کے مقابلے میں وہ ہزار درجے بہتر ہے جو اللہ کے حکم کی مخالفت کرتے ہوئے تم کماؤ گے۔ باقی میں تم پر کوئی نگہبان نگران بنا کر تو بھیجا نہیں گیا، میں تو اللہ کی طرف سے رسول بن کے آیا ہوں، ترغیب ترہیب میں نے کر دی، اللہ کے احکام میں نے پہنچا دیے، قبول کر لو گے تو اس میں تمہارا نفع ہے، اور نہیں قبول کرو گے تو اس میں تمہارا ہی نقصان ہے۔

''خطیب الانبیاء'' کے ساتھ ان کی قوم کا اِستہزا

حضرت شعیب علیہ السلام کا وعظ سورۂ اَعراف میں بھی آپ کے سامنے نقل کیا گیا اور کافی تفصیل کے ساتھ، اور یہاں بھی ان کا ذکر دوسروں کے مقابلے میں تفصیل سے ہی آیا ہے، حضرت شعیب علیہ السلام اپنے اسی تفصیلی وعظ کے لحاظ سے انبیاء علیہم السلام کے سلسلے میں ''خطیب الانبیاء'' کہلاتے ہیں، ''خطیب الانبیاء'' کا معنی ہے کہ انبیاء علیہم السلام میں خطبہ اور تقریر کے لحاظ سے ان کو امتیازی شان حاصل ہے۔ جتنی انہوں نے جگر سوزی کی، جتنا اچھے سے اچھے انداز کے ساتھ سمجھایا قوم آگے سے ان کا مذاق اُڑاتی ہے، مذاق اس طرح سے اُڑاتی ہے جس طرح سے بددین لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ منہ پہ داڑھی ہے تو داڑھی کا مذاق اڑا دیں گے، کوئی شخص نماز پڑھتا ہے تو نماز پڑھنے کی وجہ سے اس کی نماز کا مذاق اڑا دیں گے، اب وہ کہتے ہیں کہ دیکھو! یہ کتنے معقول طریقے ہیں جن پر ہم لگے ہوئے ہیں (یعنی بالفاظ ان کے) کہ ایک تو ہمارا نسلاً طریقہ چلا آرہا ہے کہ ہمارے باپ دادا بھی پُوجتے آئے ہیں جن چیزوں کی ہم عبادت کر رہے ہیں، تو ہم اپنے آباؤ اجداد کے طریقے کو کیسے چھوڑ دیں، دوسرے یہ ہے کہ جب دکانوں میں پڑا ہوا مال ہمارا ہے ہم جس طرح سے چاہیں بیچیں جس طرح سے چاہیں خریدیں، تمہارا اس میں کیا دخل؟ مطلب یہ ہے کہ دِین کو معاملات کے ساتھ کیا تعلق؟ تو جو نماز پڑھتا ہے تو تیری نماز تجھے یہی سکھاتی ہے کہ تو آ کے ہمارے معاملات میں ٹانگ اُڑائے؟ اور ہمیں یہ کہے کہ ہم اپنے مالوں کے اندر اپنی مرضی کے مطابق تصرف نہ کریں؟ اور تیرا دین یہی سکھاتا ہے کہ ہم اپنے آباؤ اجداد کے طریقہ کو چھوڑ

دیں؟ یعنی ''صلوٰۃ'' کے لفظ کے ساتھ اِستہزا کیا، تیری نماز تجھے یہی سکھاتی ہے کہ تُو ہمیں یوں کہنا شروع کردے؟ اور اگر ''صلوٰۃ'' بول کر دِین ہی مراد لیا جائے جس طرح سے ''بیان القرآن'' میں لیا گیا ہے تو پھر مفہوم اپنی جگہ واضح ہے کہ کیا تیرا دِین تجھے یہی سکھاتا ہے؟ مطلب یہ ہے کہ ان دونوں باتوں کا چھوڑنا ہمارے لیے مشکل ہے، ہم سمجھتے ہیں کہ اسی کے اندر ہماری کامیابی ہے، اسی کی وجہ سے ہماری ترقی ہے، اور اگر تیری بات مان لیں گے تو ہمارے اوپر زوال آجائے گا، ہم اس طرح سے نفع نہیں کما سکیں گے، اور آباؤاجداد کے طریقے کو چھوڑ کر ہم نے کدھر جانا ہے، تُو بڑا سمجھدار آدمی ہے جو تُو نے ایسی باتیں کرنی شروع کردیں، بڑا نیک چلن ہے، یہ ''اَلْحَلِیْمُ الرَّشِیْدُ'' کا لفظ بھی بطورِ اِستہزا کے ہے۔

قوم کے اِستہزا کا حضرت شعیب علیہ السلام کی طرف سے معقول انداز میں جواب

تو حضرت شعیب علیہ السلام نے پھر بھی آگے سے کوئی اشتعال کی بات نہیں کی، بلکہ اسی معقول انداز کے ساتھ سمجھایا کہ اے میری قوم! میں اللہ کی طرف سے ایک واضح دلیل پر ہوں اور یہ عین فطرت کے مطابق ہے، یہ راستہ جو میں نے اختیار کیا ہے یہ فطرت کا واضح راستہ ہے، اور میرے مدعا پر دلیل بھی قائم ہے، اور اللہ نے مجھے اپنی طرف سے رزقِ حسن دیا ہو، جیسا کہ واقع ہے، تو اگر ایسا ہو تو پھر میں تمہاری باتیں مان کے تمہارا طریقہ اپنالوں اور اپنے اس طریقے کو چھوڑ دوں، تبلیغ کو چھوڑ دوں، تو پھر اللہ تعالیٰ کی گرفت سے مجھے کون بچائے گا؟ پھر تم میرا اخلاص دیکھو کہ میں تمہیں جو کہتا ہوں اس کے مطابق خود بھی کرتا ہوں، یہ تو نہیں کہ تمہیں یہ اندیشہ ہو کہ ہمیں تو روکتا ہے کہ یہ زیادہ نفع نہ کماؤ، جعل سازی نہ کرو، دھوکا بازی نہ کرو، کم نہ تولو، کم نہ ماپو، اور خود اسی انداز کے ساتھ یہ کمارہا ہے اور خود یہی طریقہ اپنائے ہوئے ہے، ہمیں نصیحت کررہا ہے اور خود اس کے اوپر عمل نہیں کرتا، یہ اشکال بھی بسااوقات واعظ کی بات ماننے سے مانع ہوجایا کرتا ہے، کہ اس کا اپنا کردار وعظ کے مطابق نہیں، اور یہاں شعیب علیہ السلام اپنے کردار کو وعظ کے مطابق واضح کرتے ہیں کہ میں جو تمہیں کہتا ہوں خود بھی تو کرتا ہوں، جن باتوں سے میں تمہیں روکتا ہوں ان سے خود بھی تو رُکتا ہوں، میرا یہ ارادہ تو نہیں ہے کہ تمہیں روک دُوں اور خود ان کاموں کی طرف مائل ہوجاؤں، بلکہ میرا عمل بھی اسی طرح سے ہے جس طرح سے میں تمہیں کہتا ہوں، وَمَآ اُرِیْدُ اَنْ اُخَالِفَكُمْ اِلٰى مَآ اَنْهٰىكُمْ عَنْهُ: میں یہ ارادہ نہیں کرتا کہ تمہارے برخلاف ان کاموں کو اختیار کرلوں جن سے تمہیں روکتا ہوں، مخالفت کروں میں تمہاری مائل ہوتا ہوا ان کاموں کی طرف جن سے تمہیں روکتا ہوں، میں تو اصلاح کا ارادہ کیے ہوئے ہوں، جتنی میرے اندر طاقت میں تمہیں سمجھاؤں گا، حالات کو درست ہی کرنا چاہتا ہوں، اس میں دِین اور دُنیا دونوں کی درستی ہے، باقی اللہ کی طرف سے جتنی توفیق ہوگی کوشش کرتا رہوں گا، ''نہیں میری توفیق مگر اللہ کے ساتھ، اسی پہ میں نے بھروسا کیا اور اس کی طرف میں رجوع کرتا ہوں۔'' پھر ایک اور انداز سے سمجھایا، بسااوقات ایک آدمی جب دوسرے کو سمجھاتا ہے تو دوسرے کے اندر ضد کا جذبہ اُبھر جاتا ہے، جب ضد کا جذبہ اُبھر جاتا ہے تو پھر یہ نہیں دیکھا کرتا کہ سمجھانے والے کی بات معقول ہے یا غیر معقول، وہ تہیہ کرلیتا ہے کہ جو کچھ یہ کہے گا میں نے اس کے اُلٹ ہی چلنا ہے، یوں بسااوقات ضد پیدا ہوجاتی ہے تو ضد پیدا ہونے کے ساتھ انسان سمجھانے والے کی مخالف سمت کو اختیار کرتا ہے اور بڑی تیزی کے ساتھ مخالف سمت کی طرف نکل

جاتا ہے، سوچنے کی کوشش ہی نہیں کرتا کہ اس کی بات معقول ہے یا غیر معقول، حضرت شعیب علیہ السلام یہی کہتے ہیں کہ اے میری قوم! تم جو میرے ساتھ ضد کرنے لگ گئے تو یہ ضد کہیں تمہیں انہی حالات تک نہ پہنچا دے جس قسم کے حالات قومِ نوح پہ گزرے، قومِ ہود پہ گزرے، قومِ صالح پہ گزرے، میری ضد کہیں تمہیں وہاں تک ہی نہ پہنچا دے، (میری ضد کا معنی ہے کہ میرے ساتھ جو تم ضد کر رہے ہو) جو میں کہتا ہوں تم اس کا اُلٹ کرنے کی کوشش کرتے ہو، کہیں اسے کے نتیجے میں اسی قسم کے حالات میں مبتلا نہ ہو جانا۔ پھر یہ قومیں تو تم سے کچھ دُور ہوں گی لیکن قومِ لُوط تو دُور نہیں ہے، کہتے ہیں کہ ان کی جگہ بھی آپس میں قریب قریب ہے، حضرت شعیب علیہ السلام کا علاقہ قومِ لُوط کے علاقے کے قریب ہے، اور وقت کے لحاظ سے بھی کچھ زیادہ دُور نہیں تھے، زمانہ بھی قریب ہی گزرا تھا اور وہ حالات وغیرہ سنے بیٹھے ہوں گے۔ آگے وہی تلقین کی جو عام انبیاء علیہم السلام نے کی ہے کہ اپنی پچھلی غلطیوں سے معافی مانگو اور آئندہ اللہ تعالیٰ کی طرف عبادت کے ساتھ متوجہ رہو، میرا ربّ بہت رحم کرنے والا بہت محبت کرنے والا ہے، جب تم پچھلی غلطیوں سے معافی مانگو گے تو اللہ تعالیٰ تم پر رحم کرتا ہوا غلطیاں معاف کر دے گا، اور جب تم نیکی کر کے اس کی طرف متوجہ رہو گے تو اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرے گا۔

حضرت شعیب علیہ السلام کی معقول تقریر کا قوم کی طرف سے غیر معقول جواب

انہوں نے آگے سے آخری فیصلہ سنا دیا کہ اے شعیب! جو کچھ تو کہتا ہے اس میں سے بہت ساری باتیں تو ہماری سمجھ میں نہیں آتیں۔ ''سمجھ میں نہیں آتیں'' کا مطلب یہ ہے کہ اپنی خواہش کے مطابق نہیں تھیں، تو جہ وہ دیتے نہیں تھے، اور جب خواہشات کا غلبہ ہو جائے تو خواہشات کے خلاف جب بھی کوئی بات کہی جاتی ہے تو عقل میں کہاں بیٹھتی ہے! یا ان کا مطلب یہ تھا کہ ہم ان کی طرف توجہ ہی نہیں کرتے، یہ سمجھنے کی ہیں ہی نہیں، جس قسم کی باتیں تُو ہمیں سمجھاتا ہے، باقی یہ کہ زیادہ باتیں نہ کیا کر، ہمارے ساتھ ہر معاملے میں اُلجھا نہ کر، ہمارے مقابلے میں تو کوئی طاقتور آدمی نہیں ہے، ہم تمہیں بے زور دیکھتے ہیں، ضعیف ہو، کوئی قوت حاصل نہیں ہے، آج تک ہم نے جو تجھے چھوڑ رکھا ہے یا تجھے اپنی بستی میں برداشت کیے ہوئے ہیں یہ محض تیرے خاندان کا منہ ہم دیکھ رہے ہیں جو ہمارے ہم مسلک ہیں، کیونکہ خاندان کے افراد اُن کے ہم مسلک تھے، ''تیرے خاندان کی اگر رعایت نہ ہوتی تو ہم اِس وقت تک تجھے پتھر مار مار کے سنگسار بھی کر دیتے، ہم تجھے رجم کر دیتے!'' یہ تیرے بھائیوں کا تیرے خاندان کا لحاظ ہے جو ہم تجھے کچھ نہیں کہتے۔ حضرت شعیب علیہ السلام کہنے لگے کہ دیکھو! میری دو نسبتیں ہیں ایک تو یہ ہے کہ ٹھیک ہے کہ میں اس خاندان کا فرد ہوں، اور ایک یہ ہے کہ میں اللہ کی طرف سے آیا ہوا ہوں، اللہ کا رسول ہوں، تو تمہیں میرے خاندان کا لحاظ ہے، میرے اللہ کا کوئی لحاظ نہیں؟ کیا تمہارے نزدیک اللہ کی اتنی بھی عزت نہیں جتنی میرے خاندان کی ہے؟ تو تم میری اس نسبت کا خیال کیوں نہیں کرتے کہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے آیا ہوا ہوں، اور اس کو تم نے بالکل ہی پس پشت ڈال دیا، اور اس کی طرف کوئی کسی قسم کی کوئی توجہ ہی نہیں ہے، اور میرا ربّ تمہارے عملوں کا احاطہ کرنے والا ہے، اگر تم نے یہ ٹھان ہی لی ہے کہ نہیں ماننی، تو بہت اچھا! تم اپنی جگہ پہ عمل کرتے رہو، میں اپنی جگہ پہ عمل کرتا ہوں، اور بہت جلد اس قسم کے حالات سامنے آ جائیں گے، تمہیں پتا

چل جائے گا کہ کون وہ شخص ہے جس کے پاس عذاب آئے گا جو اس کو رُسوا کر کے رکھ دے گا اور کون وہ شخص ہے جو کہ جھوٹا ہے۔ آخر بات یہی ہوا کرتی ہے کہ اچھا بھئی! تم اپنے کام میں لگے رہو میں اپنے کام میں لگا ہوا ہوں، آنے والے حالات واضح کر دیں گے کہ جھوٹا کون ہے، اور آنے والے حالات واضح کر دیں گے کہ عزت کس کو ملتی ہے اور ذلت کس کے لئے مقدر ہے، تم بھی انتظار کرو میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والا ہوں۔

قومِ شعیب کا انجام

وَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا: جس وقت ہمارا حکمِ عذاب آ گیا نَجَّیْنَا شُعَیْبًا وَّالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ: ہم نے شعیب علیہ السلام کو نجات دی اور ان لوگوں کو نجات دی جو ان کے ساتھ ایمان لائے تھے، بِرَحْمَةٍ مِّنَّا: اپنی طرف سے رحمت کے سبب سے، ''اور پکڑ لیا ان لوگوں کو جنہوں نے ظلم کیا تھا کڑک نے'' تو کڑک کا عذاب ان کے اوپر بھیجا، جس طرح سے بجلی کڑکا کرتی ہے اس طرح سے کوئی ہیبت ناک حالات پیدا ہوئے جس کے ساتھ وہ منہ کے بل گر گئے اور سارے کے سارے اپنی بستی میں ہلاک ہو گئے، جو بہت زور دکھایا کرتے تھے، جوش دکھایا کرتے تھے، آج اس طرح سے بے نام ونشان ہو گئے کَاَنْ لَّمْ یَغْنَوْا فِیْهَا گویا کہ کبھی وہ ان گھروں میں آباد ہی نہیں تھے، اس طرح سے بے نام ونشان ہو گئے، اَلَا بُعْدًا لِّمَدْیَنَ: خبردار! دُوری ہے مدین کے لئے، پھٹکار ہے مدین کے لئے، لعنت ہے مدین پر، ملعون ہو گئے مدین، ''بُعد'' سے یہاں بُعد من رحمۃ اللہ مراد ہے، ملعون ہو گئے مدین جس طرح سے ثمود ملعون ہوئے تھے، جس طرح سے وہ رحمت سے دُور ہوئے تھے ایسے یہ بھی رحمت سے دُور ہو گئے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَیْكَ

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰی بِاٰیٰتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ ﴿۹۶﴾ اِلٰی فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ

البتہ تحقیق ضرور بھیجا ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو اپنی نشانیوں کے ساتھ اور واضح دلیل کے ساتھ ﴿۹۶﴾ فرعون کی طرف اور اس کے سرداروں کی طرف،

فَاتَّبَعُوْٓا اَمْرَ فِرْعَوْنَ ۚ وَمَآ اَمْرُ فِرْعَوْنَ بِرَشِیْدٍ ﴿۹۷﴾ یَقْدُمُ قَوْمَهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ

ان لوگوں نے اتباع کی فرعون کے حکم کی اور فرعون کا حکم دُرست نہیں تھا ﴿۹۷﴾ وہ فرعون اپنی قوم کے آگے آگے چلے گا قیامت کے دن،

فَاَوْرَدَهُمُ النَّارَ ۭ وَبِئْسَ الْوِرْدُ الْمَوْرُوْدُ ﴿۹۸﴾ وَاُتْبِعُوْا فِیْ هٰذِهٖ لَعْنَةً وَّیَوْمَ

پھر ان کو آگ میں جھونک دے گا، جہنم بری گھاٹ ہے جس پر وارد ہوا ﴿۹۸﴾ پیچھے لگا دیے گئے وہ اس دُنیا میں بھی لعنت اور قیامت

الْقِیٰمَةِ ۭ بِئْسَ الرِّفْدُ الْمَرْفُوْدُ ﴿۹۹﴾ ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْقُرٰی نَقُصُّهٗ عَلَیْكَ مِنْهَا

کے دن بھی، جہنم برا عطیہ ہے جو دیا گیا ﴿۹۹﴾ یہ بستیوں کے خبروں سے ہے ہم اس کو پڑھتے ہیں آپ پر، ان بستیوں میں سے بعض

قَآئِمٌ وَّحَصِيْدٌ ﴿۱۰۰﴾ وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ وَلٰكِنْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ

قائم ہیں اور بعض ان میں سے کٹ چکی ہیں ﴿۱۰۰﴾ اور ہم نے ان لوگوں پر ظلم نہیں کیا، لیکن ان لوگوں نے خود اپنے نفسوں پر ظلم کیا،

فَمَآ اَغْنَتْ عَنْهُمْ اٰلِهَتُهُمُ الَّتِيْ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ لَّمَّا جَآءَ اَمْرُ رَبِّكَ ؕ وَمَا

پس کچھ بھی فائدہ نہ پہنچایا انہیں ان کے معبودوں نے جن کو اللہ کے علاوہ یہ پکارا کرتے تھے جب تیرے رب کا حکم آ گیا، اور نہ

زَادُوْهُمْ غَيْرَ تَتْبِيْبٍ ﴿۱۰۱﴾ وَكَذٰلِكَ اَخْذُ رَبِّكَ اِذَآ اَخَذَ الْقُرٰى

بڑھایا اُن معبودوں نے اِن کو سوائے ہلاک میں ڈالنے کے ﴿۱۰۱﴾ اور ایسے ہی ہے تیرے رَبّ کا پکڑنا جس وقت کہ وہ بستیوں کو پکڑتا ہے

وَهِيَ ظَالِمَةٌ ؕ اِنَّ اَخْذَهٗٓ اَلِيْمٌ شَدِيْدٌ ﴿۱۰۲﴾ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّمَنْ

اس حال میں کہ وہ ظالم ہوں، بیشک اس کا پکڑنا بڑا دردناک اور سخت ہے ﴿۱۰۲﴾ بے شک اس میں البتہ نشانی ہے اس شخص کے لئے جو کہ

خَافَ عَذَابَ الْاٰخِرَةِ ؕ ذٰلِكَ يَوْمٌ مَّجْمُوْعٌ ۙ لَّهُ النَّاسُ وَذٰلِكَ يَوْمٌ

آخرت کے عذاب سے ڈرتا ہے، وہ (آخرت) ایک ایسا دِن ہے جس کے لئے لوگوں کو اکٹھا کیا جائے گا، اور وہ ایسا دِن ہے

مَّشْهُوْدٌ ﴿۱۰۳﴾ وَمَا نُؤَخِّرُهٗٓ اِلَّا لِاَجَلٍ مَّعْدُوْدٍ ﴿۱۰۴﴾ؕ يَوْمَ يَاْتِ لَا تَكَلَّمُ

جس میں حاضری ہوگی ﴿۱۰۳﴾ اور نہیں مؤخر کرتے ہم اس دِن کو مگر ایک معلوم مدت کے لئے ﴿۱۰۴﴾ جس دِن وہ دِن آ جائے گا کوئی نفس بات

نَفْسٌ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ۚ فَمِنْهُمْ شَقِيٌّ وَّسَعِيْدٌ ﴿۱۰۵﴾ فَاَمَّا الَّذِيْنَ

نہیں کر سکے گا مگر اللہ کی اجازت کے ساتھ، پس ان میں سے بعض بد بخت ہوں گے اور بعض نیک بخت ہوں گے ﴿۱۰۵﴾ پھر وہ لوگ جو

شَقُوْا فَفِي النَّارِ لَهُمْ فِيْهَا زَفِيْرٌ وَّشَهِيْقٌ ﴿۱۰۶﴾ۙ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا

بد بخت ہو گئے وہ جہنم میں ہوں گے، ان کے لئے اس جہنم میں چیخنا اور دھاڑنا ہوگا ﴿۱۰۶﴾ ہمیشہ رہنے والے ہوں گے اس جہنم میں جب

دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ ؕ اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ ﴿۱۰۷﴾ وَاَمَّا

تک کہ زمین و آسمان رہیں گے مگر جو تیرا رَبّ چاہے، بیشک تیرا رَبّ کرنے والا ہے اس کام کو جس کا وہ ارادہ کر لے ﴿۱۰۷﴾ اور

الَّذِيْنَ سُعِدُوْا فَفِي الْجَنَّةِ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا

وہ لوگ جو نیک بخت ہوئے وہ جنت میں ہوں گے، ہمیشہ رہنے والے ہوں گے اس جنت میں جب تک کہ زمین آسمان رہیں گے مگر

مَا شَآءَ رَبُّكَ ؕ عَطَآءً غَيْرَ مَجْذُوْذٍ ﴿۱۰۸﴾ فَلَا تَكُ فِيْ مِرْيَةٍ مِّمَّا

جو تیرا رب چاہے، دے دیے گئے وہ ایسی عطا جو منقطع ہونے والی نہیں ہے ﴿۱۰۸﴾ پس نہ ہوں آپ شک میں اس چیز کی طرف سے جس کو

يَعْبُدُ هٰٓؤُلَآءِ ؕ مَا يَعْبُدُوْنَ اِلَّا كَمَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُهُمْ مِّنْ قَبْلُ ؕ وَاِنَّا لَمُوَفُّوْهُمْ

پوجتے ہیں یہ لوگ، نہیں پوجتے مگر جیسا کہ پوجا تھا ان کے آباء نے اس سے قبل، اور بے شک ہم البتہ ان کو پورا پورا دینے والے ہیں

نَصِيْبَهُمْ غَيْرَ مَنْقُوْصٍ ﴿۱۰۹﴾

ان کا حصہ اس حال میں کہ وہ کم کیا ہوا نہیں ہوگا ﴿۱۰۹﴾

خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَا: البتہ تحقیق بھیجا ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو اپنی نشانیوں کے ساتھ، وَسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ: ''سلطان'' اصل کے اعتبار سے ''غلبے'' کو کہتے ہیں، اور یہ جو بادشاہ کے لئے ''سلطان'' کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے یہ ''ذوسلطان'' کے معنی میں ہوتا ہے غلبے والا، اور ''دلیل'' بھی چونکہ غلبے کا ذریعہ ہوا کرتی ہے اس لئے ''دلیل'' کو بھی ''سلطان'' کہہ دیتے ہیں، تو ''سلطانِ مبین'' سے مراد ہو جائے گا واضح غلبہ، یعنی واضح دلیل جس کے ذریعے سے غلبہ پایا جاتا ہے، تو آیات سے مراد عام معجزات مراد ہو گئے، اور ''سلطانِ مبین'' سے خاص معجزہ مراد ہو گیا عصائے موسیٰ والا، جو ہر میدان میں آپ کے لئے غلبے کا باعث بنا۔ ''لقد'' تاکید کے لئے ہوتا ہے۔ ''البتہ ضرور بھیجا ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو اپنی نشانیوں کے ساتھ اور واضح دلیل کے ساتھ'' اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ: کوئی لفظ ان میں نیا نہیں ہے۔ ''فرعون کی طرف اور فرعون کے دربار کے سرداروں کی طرف'' فَاتَّبَعُوْٓا اَمْرَ فِرْعَوْنَ: اُن لوگوں نے اتباع کی فرعون کے حکم کی وَمَآ اَمْرُ فِرْعَوْنَ بِرَشِيْدٍ: اور فرعون کا حکم درست نہیں تھا۔ يَقْدُمُ قَوْمَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ: قَدِمَ يَقْدَمُ یہ ہوتا ہے آنے کے معنی میں، اور قَدَمَ يَقْدُمُ باب نصر سے اگر آئے تو اس کا معنی ہوتا ہے آگے آگے چلنا۔ ''وہ فرعون اپنی قوم کے آگے آگے چلے گا قیامت کے دن'' فَاَوْرَدَهُمُ النَّارَ: اس کو ماضی کے ساتھ تعبیر کیا تحققِ وقوع کے طور پر۔ پھر ان کو آگ میں جھونک دے گا، وارد کر دے گا ان کو آگ پر، اُتار دے گا ان کو جہنم میں، یعنی آگے آگے چلے گا اور ساری قوم کو لے کر آگ میں جھونک دے گا، پہنچا دے گا انہیں آگ میں۔ اَوْرَدَ: وارد کر دے گا۔ ماضی کا صیغہ ہے، ترجمہ مضارع کا ہوگا۔ وَبِئْسَ الْوِرْدُ الْمَوْرُوْدُ: وِرد کہتے ہیں اصل کے اعتبار سے پانی کی گھاٹ کو جہاں سے جا کے لوگ پانی لیا کرتے ہیں، وارد ہونے کی جگہ، جیسے نہروں پر دریاؤں پر کھالوں پر ایسی جگہ بنی ہوئی ہوتی ہے جہاں لوگ اترتے ہیں پانی پر، اور وہاں سے پانی لیا کرتے ہیں، تو ''وِرد'' اس جگہ کو کہتے ہیں، گھاٹ۔ مورود: جس کے اوپر ورود کیا گیا ہو۔ ''بُری ہے وہ گھاٹ جس پر وُرود کیا گیا'' یعنی جس پر ان کو اتار گیا، گھاٹ پر ورود کیا گیا یعنی جس گھاٹ پر وہ پہنچے وہ بہت بُری گھاٹ ہے۔ وَاُتْبِعُوْا فِيْ هٰذِهٖ لَعْنَةً: پیچھے لگا دیے گئے وہ اس دُنیا

میں بھی لعنت، وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ: اور قیامت کے دن بھی، یعنی اس دُنیا پر بھی ان پر لعنت ہوئی اور آخرت میں بھی لعنت ہوگی، بِئْسَ الرِّفْدُ الْمَرْفُوْدُ: رِفد کہتے ہیں عطیہ کو۔ مرفود: جو عطیہ دیا گیا۔ بہت بُرا عطیہ ہے جو دیا گیا۔ الرِّفْدُ الْمَرْفُوْدُ یہ بِئْسَ کا فاعل ہے، اور مخصوص بالذم ہے، نار ہے جس کا ذکر پیچھے آیا فَاَوْرَدَهُمُ النَّارَ میں۔ اسی طرح سے الْوِرْدُ الْمَوْرُوْدُ یہ بِئْسَ کا فاعل ہے اور مخصوص بالذم وہی نار ہے، ''وہ جہنم بُری گھاٹ ہے جس کے اوپر وُرود ہوا، وہ جہنم بُرا عطیہ ہے جو دیا گیا۔'' ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْقُرٰى: قریٰ قریہ کی جمع ہوگئی۔ اور انباء یہ (نَبَأٌ) کی جمع ہوگئی۔ نَبَأٌ: عظیم الشان خبر کو کہتے ہیں۔ ''یہ بستیوں کی خبریں ہیں'' یہ جو کچھ بیان ہوا، ذٰلِكَ کا اشارہ مذکور کی طرف ہے، جو واقعات پیچھے گزرے، یہ جو کچھ ذکر کیا گیا یہ بستیوں کے واقعات سے ہے، بستیوں کی خبروں سے ہے، نَقُصُّهٗ عَلَيْكَ: ہم اس کو پڑھتے ہیں آپ پر، مِنْهَا قَآئِمٌ: ان بستیوں میں سے بعض بستیاں قائم ہیں، وَّحَصِيْدٌ: اور بعض ان میں سے کٹ چکی ہیں، نیست و نابود ہو چکی ہیں۔ حصید اصل کے اعتبار سے کٹی ہوئی فصل کو کہتے ہیں، بمعنی محصود۔ حَصَدَ: کاٹنا۔ تو فصل جس طرح سے کٹ جاتی ہے تو بے نام و نشان ہو جاتی ہے، تو ''بعضی بستیاں تو اپنی حالت پر قائم ہیں، اور بعضی بستیاں نیست و نابود ہو چکی ہیں۔'' وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ: اور ہم نے ان لوگوں پہ ظلم نہیں کیا، وَلٰكِنْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ: لیکن ان لوگوں نے اپنے نفسوں پہ ظلم کیا، فَمَآ اَغْنَتْ عَنْهُمْ اٰلِهَتُهُمُ الَّتِيْ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ: پس نہ فائدہ پہنچایا انہیں ان کے ان معبودوں نے جن کو اللہ کے علاوہ یہ پکارا کرتے تھے، مِنْ شَيْءٍ: کچھ بھی۔ کچھ بھی فائدہ نہ پہنچایا۔ اَغْنٰى عَنْهُ کا ترجمہ آپ کے سامنے کئی دفعہ ذکر کیا گیا، کام آنا، فائدہ پہنچانا، دُور ہٹانا۔ ''جن آلہہ کو یہ اللہ کے علاوہ پکارتے تھے انہوں نے اِن سے کچھ بھی عذاب دُور نہ ہٹایا، وہ اِن کے کچھ بھی کام نہ آئے، انہوں نے اِن کو کچھ بھی فائدہ نہ پہنچایا'' مفہوم ہر طرح سے واضح ہے۔ لَمَّا جَآءَ اَمْرُ رَبِّكَ: جب تیرے رَبّ کا حکم آ گیا، وَمَا زَادُوْهُمْ غَيْرَ تَتْبِيْبٍ: تَبَّ: ہلاک ہونا، برباد ہونا۔ تَتْبِيْب: ہلاکت میں ڈالنا۔ تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ وَّتَبَّ، وہاں یہ لفظ مجرد سے آیا ہوا ہے۔ تباب ہلاکت کو کہتے ہیں۔ ''نہ بڑھایا اُن معبودوں نے اِن کو سوائے ہلاکت میں ڈالنے کے'' یعنی سوائے ہلاکت میں ڈالنے کے اور کسی چیز کا اضافہ نہ کیا، ان کی بربادی ہی بڑھائی، وَكَذٰلِكَ اَخْذُ رَبِّكَ: اور ایسے ہی ہے تیرے رَبّ کا پکڑنا، اِذَآ اَخَذَ الْقُرٰى: جس وقت کہ وہ بستیوں کو پکڑتا ہے، وَهِيَ ظَالِمَةٌ: اس حال میں کہ وہ ظالم ہوں، اِنَّ اَخْذَهٗٓ اَلِيْمٌ شَدِيْدٌ: بیشک اس رَبّ کا پکڑنا بہت ہی دردناک اور سخت ہے۔ الیم: دردناک، تکلیف پہنچانے والا، اَلم رساں، مصیبت پہنچانے والا، دُکھ پہنچانے والا۔ ''بیشک اس کا پکڑنا بڑا دردناک اور سخت ہے'' اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّمَنْ خَافَ عَذَابَ الْاٰخِرَةِ: بیشک اس مذکور میں، جو کچھ پیچھے واقعات ذکر کئے گئے البتہ نشانی ہے اس شخص کے لئے جو کہ آخرت کے عذاب سے ڈرتا ہے، ذٰلِكَ يَوْمٌ مَّجْمُوْعٌ ۙ لَّهُ النَّاسُ: یہ آخرت ایک ایسا دن ہے جس کے لئے لوگوں کو اکٹھا کیا جائے گا، وَذٰلِكَ يَوْمٌ مَّشْهُوْدٌ: اور وہ ایسا دن ہے جس میں حاضری ہوگی۔ مشہود: یعنی لوگ اس میں حاضر کئے جائیں گے۔ شاهد حاضر ہونے والے کو کہتے ہیں اور مشہود: جو حاضر کیا گیا ہو یعنی جس میں حاضری ہو۔ مَّشْهُوْدٌ یہ یوم کی صفت ہے بحالِ متعلقہ۔ لوگ اس میں حاضر کیے جائیں گے، اس لئے اس یوم کو یومِ مشہود کہہ دیا گیا۔ وَمَا نُؤَخِّرُهٗٓ: اور نہیں پیچھے ہٹاتے ہم اس کو، نہیں مؤخر کرتے ہم اس دن کو اِلَّا لِاَجَلٍ مَّعْدُوْدٍ: مگر ایک معلوم مدت کے لئے۔ اجل: مدت۔ اور معدود: شمار کی ہوئی۔ شمار کی ہوئی چیز معلوم ہوتی ہے۔ ''مگر ایک مقرر مدت کے لئے، ایک معلوم مدت کے لئے'' يَوْمَ يَاْتِ: جس دن وہ دن آ جائے گا، لَا تَكَلَّمُ

نَفْسٌ اِلَّا بِاِذْنِهٖ: کوئی نفس بات نہیں کر سکے گا مگر اللہ کی اجازت کے ساتھ، فَمِنْهُمْ شَقِیٌّ وَّ سَعِیْدٌ: پس لوگوں میں سے بعض بد بخت ہوں گے اور بعض نیک بخت ہوں گے، مِنْهُمْ شَقِیٌّ وَمِنْهُمْ سعیدٌ، ان میں سے بعض بد بخت ہوں گے اور بعض نیک بخت ہوں گے، فَاَمَّا الَّذِیْنَ شَقُوْا: پھر وہ لوگ جو بد بخت ہو گئے فَفِی النَّارِ: وہ جہنم میں ہوں گے، لَهُمْ فِیْهَا زَفِیْرٌ وَّ شَهِیْقٌ: ان کے لئے اس جہنم میں زفیر اور شہیق ہوگا۔ زفیر اور شہیق یہ دونوں ہی گدھے کی آوازیں ہیں، جس وقت یہ سانس باہر کو نکالتا ہے تو جو آواز پیدا ہوتی ہے اس کو ''زفیر'' کہتے ہیں، اور جب سانس اندر کو کھینچتا ہے تو اس آواز کو ''شہیق'' کہتے ہیں، اس کی آواز دونوں طرح سے ہی آتی ہے، اندر کو سانس کھینچتا ہے تو بھی آواز پیدا ہوتی ہے، باہر کو سانس نکالتا ہے تو بھی آواز پیدا ہوتی ہے، تو مطلب یہ ہوگا کہ جس طرح سے گدھا چیختا ہے اسی طرح سے وہ جہنم کے اندر چیخیں گے، اور ان کے چیخنے کو گدھے کی آواز کے ساتھ تشبیہ دینے میں آپ دیکھ رہے ہیں کہ کس قسم کی تحقیر ہے، یعنی جس طرح سے گدھا ہینگتا ہے، چیختا ہے، اسی طرح سے جہنم کے اندر پڑے ہوئے یہ لوگ چیخیں ماریں گے۔ چیخنا، چنگھاڑنا۔ حضرتِ شیخ (الہندؒ) ترجمہ کرتے ہیں کہ ''ان کے لئے اس میں چیخنا ہے اور دھاڑنا'' دھاڑیں ماریں گے چیخیں گے، اور ان کی اس طرح سے بھدی آواز نکلے گی جس طرح سے کہ گدھے کی آواز ہوتی ہے۔ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا: ہمیشہ رہنے والے ہوں گے اس جہنم میں، آگ میں، مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ: جب تک کہ زمین و آسمان رہیں گے۔ یہ محاورہ ہے دوام سے، یعنی ہمیشہ رہیں گے، کیونکہ آخرت کے زمین اور آسمان مراد ہیں، اور آخرت کے زمین اور آسمان ختم نہیں ہوں گے، ''جب تک کہ زمین و آسمان رہیں گے'' اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ: مگر جو تیرا رب چاہے وہ ہو کے رہے گا، مگر جو تیرا رب چاہے، اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ: بیشک تیرا رب کرنے والا ہے اس کام کو جس کا وہ ارادہ کرلے، جو ارادہ کرلے تیرا رب اس کو کر گزرتا ہے۔ وَاَمَّا الَّذِیْنَ سُعِدُوْا: اور وہ لوگ جو نیک بخت ہوئے فَفِی الْجَنَّةِ: وہ جنت میں ہوں گے خٰلِدِیْنَ فِیْهَا: ہمیشہ رہنے والے ہوں گے اس جنت میں مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ: جب تک کہ زمین و آسمان رہیں گے اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ: مگر جو تیرا رب چاہے، عَطَآءً غَیْرَ مَجْذُوْذٍ: اُعْطُوْا عطاءً غَیْرَ مَجْذُوْذٍ۔ دے دیے گئے وہ ایسی عطا جو منقطع ہونے والی نہیں ہے، غیر مجذوذ ہے، جو منقطع نہیں ہوگی، فَلَا تَكُ فِیْ مِرْیَةٍ مِّمَّا یَعْبُدُ هٰۤؤُلَآءِ: پس نہ ہوں آپ شک میں اس چیز کی طرف سے جس کو پوجتے ہیں یہ لوگ، مَا یَعْبُدُوْنَ اِلَّا كَمَا یَعْبُدُ اٰبَآؤُهُمْ مِّنْ قَبْلُ: نہیں پوجتے مگر جیسا کہ پوجا تھا ان کے آباء نے اس سے قبل، وَاِنَّا لَمُوَفُّوْهُمْ: اور بیشک ہم البتہ ان کو پورا پورا دینے والے ہیں، نَصِیْبَهُمْ: ان کا حصہ، غَیْرَ مَنْقُوْصٍ: اس حال میں کہ وہ کم کیا ہوا نہیں ہوگا، پورا پورا ہم ان کو ان کا حصہ دیں گے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَیْكَ

تفسیر

ماقبل سے ربط اور رکوع میں مذکور مضامین

واقعات کے سلسلے میں اس رکوع کی ابتدائی آیات میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ بالاختصار ذکر کیا گیا ہے، سورۂ یونس میں آپ کے سامنے باقی انبیاء علیہم السلام کے واقعات کا ذکر اجمالاً آیا تھا اور موسیٰ علیہ السلام کے واقعے کو کچھ مفصل ذکر کیا گیا تھا، اور اس سورت کے

اندر معاملہ برعکس ہوگیا کہ دوسرے واقعات کچھ تفصیل سے ذکر کیے گئے ہیں اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعے کی طرف بالاجمال اشارہ کیا گیا ہے۔ اور اگلی آیات میں پیش کردہ واقعات کے اوپر کچھ تبصرہ ہے کہ ان سے عبرت حاصل کرنی چاہیے، مؤمن بھی اس سے فائدہ اٹھاسکتے ہیں اور اِن کافروں کو بھی ان واقعات سے تنبیہ ہوجانی چاہیے۔ اور پھر آخرت کی یاددہانی ہے کہ یہ دُنیا کے عذاب ہیں جو کہ دارالجزا نہیں، اللہ تبارک وتعالیٰ جب پکڑلیں تو دُنیا میں بھی اس قسم کا سخت عذاب دیتے ہیں تو آخرت کا عذاب تو پھر کیا ہی ہوگا جو ہے ہی عذاب کی جگہ، وہ تو دارالجزا ہے، تو ان دُنیا کی سزاؤں کو دیکھ کے آخرت کی سزا کا تصور کرنا چاہیے۔ اور پھر اس ضمن میں کچھ آخرت کا تذکرہ ہوگا، رکوع کے آخر تک یہی مضمون ہوگا۔

فرعون اور ان کے متبعین کا حال

''موسیٰ علیہ السلام کو ہم نے بہت سی نشانیاں دے کے بھیجا، اور خاص طور پر ایک واضح دلیل دی'' اس ''واضح دلیل'' کا مصداق ہوجائے گا ''عصائے موسیٰ''، جیسے ترجمے میں، میں نے ذکر کردیا۔ ''بھیجا فرعون کی طرف اور اس کے سرداروں کی طرف، وہ لوگ فرعون کے حکم کے پیچھے لگ گئے'' موسیٰ علیہ السلام کی بات انہوں نے نہیں مانی، اللہ تعالیٰ کا حکم انہوں نے نہ مانا، فرعون کے حکم کے پیچھے لگ گئے، ''اور فرعون کا اَمر دُرست نہیں تھا'' صاحبِ رُشد نہیں تھا، فرعون کا حکم دُرستی والا نہیں تھا، تو جب یہ دُنیا کے اندر فرعون کے پیچھے لگے، فرعون کو اپنا قائد بنالیا، اب آخرت میں بھی اب فرعون کی قیادت ہی نصیب ہوگی، آخرت میں بھی وہ قائد ہوگا، آگے آگے چلے گا اور ان سب کو لے کے جہنم میں جھونک دے گا، خود بھی جہنم میں جائے گا اور اپنے متبعین کو بھی لے جائے گا، جن کا جیسا قائد ہوگا وہ اپنے قائد کے ساتھ ہی جائیں گے، ''قیامت کے دِن وہ آگے آگے جائے گا اور ان سب کو جہنم میں وارد کردے گا، اور وہ بہت بُری گھاٹ ہے جس کے اُوپر ان کا ورود ہوگا'' تو ان کے عمل اور کردار کے نتیجے میں ''دُنیا میں بھی ان کو لعنت ملی'' یہاں بھی ان کے پیچھے لعنت لگادی گئی، ''قیامت میں بھی ان کے پیچھے لعنت ہوگی، اور یہ بہت بُرا عطیہ ہے جو ان کو دیا گیا'' تو یہ کردار جو انہوں نے اپنایا اس کے نتیجے میں ان کو یہی حاصل ہوا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ ختم ہوا۔

ماضی کے واقعات سے عبرت حاصل کرنے کا حکم

اب ان واقعات پر تبصرہ ہے بایں طور کہ اس کو دیکھ کے ہر کسی کو عبرت حاصل کرنی چاہیے، اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ واقعات جو سنائے ہیں اسی لیے سنائے ہیں تاکہ ان کو سامنے رکھا جائے اور ہر شخص اپنے کردار کا جائزہ لے، مشرکینِ مکہ کو خصوصیت کے ساتھ تنبیہ کرنا مقصود ہے، ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْقُرٰى: بستیوں کے واقعات ہیں، ان میں سے کچھ ہم نے آپ کو سنائے ہیں، پڑھتے ہیں ہم اس کو آپ پر، ان میں سے بعض بستیاں تو قائم ہیں، مثلاً جو واقعات ذکر کیے گئے ان میں فرعون کا واقعہ بھی آیا ہے، تو فرعون کے غرق ہونے کے بعد اس کا شہر قائم رہا، اس کے شہر میں کوئی کسی قسم کی بربادی نہیں آئی تھی، اور بعض ان میں بالکل نیست ونابود ہوگئے جس طرح سے قومِ لُوط کی بستیاں ہوگئیں، اور اسی طرح سے دوسرے بعض انبیاء علیہم السلام کی قومیں جن کے گھر برباد ہوگئے، تو بعض ان میں قائم ہیں اور بعض ان میں کٹ چکی ہیں، یعنی نیست ونابود ہوچکی ہیں۔ واقعات کی تفصیل آپ کے سامنے آگئی، کہ ہم

نے ان کے اوپر کوئی زیادتی نہیں کی، انہوں نے اپنے آپ پہ زیادتی کی کہ سیدھا راستہ اختیار نہیں کیا، بداخلاقیاں اختیار کیں، بدکردار ہوئے، کفر و شرک کے اندر مبتلا ہوئے، تو اس کے نتیجے میں وہ برباد ہو گئے، اور جن کا وہ سہارا لیے بیٹھے تھے، جس وقت مشکل وقت آیا تو وہ کچھ کام نہ آئے، فَمَآ اَغْنَتْ عَنْهُمْ اٰلِهَتُهُمُ: وہ معبود جو انہوں نے بنا رکھے تھے جن کے اوپر ان کا سہارا تھا جن کو وہ اللہ کے علاوہ پکارتے تھے، جب اللہ کا حکم آ گیا تو ایسے وقت میں وہ ان کے کچھ کام نہ آئے، کوئی عذاب دُور نہ ہٹا سکے، بلکہ الٹا ان کے لئے نقصان کا باعث ہی بنے، کیونکہ ان کو پُوجنا یہی شرک ہے، اور اسی شرک کی بنا پر اللہ کا غضب آیا، تو ''نہیں بڑھایا انہوں نے ان کو سوائے ہلاکت میں ڈالنے کے'' یعنی جن سے یہ فائدے کی اُمید رکھے ہوئے تھے وہی ان کے لئے بربادی کا باعث بنے۔ یہ نمونہ دکھایا گیا ہے، ''اسی طرح سے ہے تیرے رَبّ کا پکڑنا جب بستیوں کو پکڑتا ہے جبکہ وہ شرک میں مبتلا ہوں'' وَهِيَ ظَالِمَةٌ: جب وہ بستیاں ظالم ہو جاتی ہیں تو اللہ ان کو ایسے ہی پکڑتے ہیں، اور ان کا پکڑنا بہت دردناک اور سخت ہوتا ہے۔ ''ان واقعات میں نشانی ہے ان لوگوں کے لئے جو آخرت کے عذاب سے ڈرتے ہیں'' نشانی اسی اعتبار سے ہے کہ دُنیا دار الجزا نہیں، لیکن پھر بھی جب اللہ کی پکڑ آئی تو کیسی پکڑ آئی، اور آخرت تو دارِ جزا ہے وہاں تو اعمال کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا تو وہ عذاب پھر کتنا سخت ہوگا۔ تو یہاں سے کلام منتقل ہو گئی آخرت کے حالات کی طرف، کہ آخرت ایک ایسا دن ہے جس کے لئے لوگوں کو اکٹھا کیا جائے گا وَذٰلِكَ يَوْمٌ مَّشْهُوْدٌ: اور اس دِن میں سب کو حاضر کیا جائے گا۔ اور ہم اس کو پیچھے ہٹا رہے ہیں ایک مدّتِ معلوم کے لئے، مہلت دیے ہوئے ہیں، یعنی اس کو ایسا نہ سمجھو کہ ہمیں معلوم نہیں کہ کتنی مدّت کے بعد آنے والی ہے، سب کچھ اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے، وہ اَجلِ معدود ہے، شمار کی ہوئی ہے، سب کچھ اللہ کے شمار میں ہے، ویسے بھی آپ جانتے ہیں کہ بڑی قیامت جس میں یہ سارے کا سارا جہان فنا ہو جائے گا وہ تو جب آئے گی آئے گی، اور ہر شخص کے لئے قیامتِ صغریٰ اس کی موت ہے، اور وہ زندگی کے دِن گنے ہوئے ہیں، ''مَنْ مَاتَ فَقَدْ قَامَتْ قِيَامَتُهٗ'' جو مر گیا اس کی قیامت تو آ گئی، کیونکہ اسی سے سارے کے سارے حالات شروع ہو جاتے ہیں، اور وہ زندگی کتنی ہے؟ چند سال ہے، چند مہینے ہیں، چند دِن ہیں، جیسے بھی ہے وہ گنے چنے دِن ہیں، اس کے بعد یوں سمجھئے کہ قیامت کے حالات شروع ہو گئے، ہر شخص کے لئے ایسے ہی ہے۔ تو ''جس دِن وہ آخرت کا دن آ جائے گا تو کوئی نفس بول نہیں سکے گا مگر اس کی اجازت کے ساتھ'' یہ بھی مشرکین کے ذہن پر چوٹ لگانی مقصود ہے جو سمجھتے تھے کہ ہمارے معبود ہمارے شفعاء ہیں، اور یہ فرشتے اللہ کی چہیتی بیٹیاں ہیں، جس طرح سے چہیتے بیٹے بیٹیاں ناز نخرے کے ساتھ ضد کر کے بات منوا لیتے ہیں تو یہ ہمارے شفعاء ہیں یہ بھی اسی طرح سے ہمارے لیے اللہ تعالیٰ سے باتیں منوا لیں گے، اوّل تو قیامت آئے گی نہیں، اور اگر آ ہی گئی تو یہ ہمیں چھڑا لیں گے، چونکہ ہم نے ان کو نذریں دے دے کر، نیازیں دے دے کر، سجدے کر کر کے، ان کے نام کے وظیفے پڑھ پڑھ کے ان کو خوش کر رکھا ہے، اس لیے یہ چھڑا لیں گے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ کوئی بول نہیں سکے گا، وہاں کوئی بھی دَم نہیں مار سکے گا۔

بعض بد بخت اور بعض نیک بخت

پھر لوگ دو حصوں میں ہوں گے، بعض بد بخت بعض نیک بخت، بد بخت جہنم میں جائیں گے اور اس کے اندر چیخیں گے،

چنگھاڑیں گے، دھاڑیں گے، گدھے کی طرح وہاں آوازیں نکالیں گے، لیکن کوئی ان کی چیخ اور پکار کو وہاں سننے والا نہیں ہوگا، اور اس چیخ وپکار کے نتیجے میں ان پر کوئی رحم نہیں کیا جائے گا، ہمیشہ رہنے والے ہوں گے اس جہنم میں جب تک زمین وآسمان قائم ہیں، زمین وآسمان سے آخرت کے زمین وآسمان مراد ہیں، دوام کی طرف اشارہ ہے، ''ہاں! جو اللہ چاہے گا وہ ہو رہے گا'' اس میں اللہ تعالیٰ محض اپنی قدرت کا اظہار کرنا چاہتے ہیں، یعنی جہنم کے اندر ان کا دوام بھی اللہ کی مشیت کے تحت ہے، ورنہ یہ نہیں کہ ان کا دوام ذاتی ہے، بلکہ اللہ چاہے گا تو دوام ہوگا، نہیں چاہے گا تو نہیں ہوگا، اگر اللہ نکالنا چاہے تو کون روک سکتا ہے، لیکن دوسری آیات میں خبر دے دی گئی کہ اللہ چاہے گا نہیں، لیکن قدرت اس کو ہے، جو اس کی مشیت ہوگی اس کے مطابق ہو کے رہے گا، تو اللہ تعالیٰ نے اس میں اپنی قدرت کا اظہار کیا ہے، ورنہ اس کا یہ معنی نہیں کہ جہنم ختم ہو جائے گی یا یہ لوگ جہنم سے نکال لیے جائیں گے، یہ مقصد نہیں ہے، جیسے کہ دوسری آیات میں ابدیت صراحت آئی ہے۔ ''بے شک تیرا رب کرنے والا ہے جس چیز کا ارادہ کرلے'' جو وہ ارادہ کرلے، کر گزرتا ہے، اللہ کے سامنے رُکاوٹ پیدا کرنے والا کوئی نہیں۔ ''اور جو لوگ نیک بخت ہیں، سعادت مند ہیں، وہ جنت میں چلے جائیں گے، ہمیشہ رہنے والے ہوں گے اس میں جب تک زمین وآسمان قائم ہیں'' یہاں بھی وہی دوام مراد ہے، اِلَّا مَاشَآءَ رَبُّكَ: مگر جو تیرا ربّ چاہے، یعنی جنت میں جانا اور وہاں دوام اختیار کرنا یہ دوام بھی ان کا ذاتی نہیں ہے، یہ بھی اللہ کی مشیت کے تحت ہے، اللہ ختم کرنا چاہے تو ختم بھی ہو جائیں گے، جنت بھی ختم ہوسکتی ہے جہنم بھی ختم ہوسکتی ہے، جنتی جنت سے نکل سکتے ہیں جہنمی جہنم سے نکل سکتے ہیں، سب اللہ کی قدرت کے تحت ہے، لیکن ان کے لئے جو دوام ہے اللہ نے اپنے اختیار اور اپنی مشیت کے تحت رکھا ہے، تو یہ محض قدرت کا اظہار ہے، ورنہ یہ نہیں کہ کبھی جنت والے جنت سے نکال دیے جائیں گے، جیسے کہ آگے اشارہ دے دیا گیا عَطَآءً غَيْرَ مَجْذُوْذٍ: کہ ان کو ایسی عطا دے دی گئی جو منقطع نہیں ہوگی، ان کو اس قسم کی بخشش دے دی گئی جو ختم نہیں ہوگی۔

آگے خطاب اگرچہ سرورِ کائنات ﷺ کو ہے لیکن سنانا دوسروں کا مقصود ہے، کہ کبھی اس انداز کے ساتھ نہ سوچیو کہ اتنے سمجھدار لوگ، اتنے سرمایہ دار اور اتنے مال دار، اتنے ترقی یافتہ جو غیر اللہ کو پُوجنے میں لگے ہوئے ہیں تو شاید یہ طریقہ ٹھیک ہی ہو، کبھی اس طرح سے ہوتا ہے کہ انسان جب دوسروں کو دیکھتا ہے کہ سارے جو اس راستے پہ دوڑے چلے جارہے ہیں تو کبھی دل میں خیال آجاتا ہے کہ کہیں یہ ٹھیک ہی نہ ہو، انسان اس طرح سے تردّد میں پڑ جاتا ہے، تو اللہ تعالیٰ حضور ﷺ کو خطاب کرکے سناتے دوسرے لوگوں کو ہیں کہ ایسا کبھی نہ سوچیو، ان کے بارے میں تمہیں کوئی شک اور تردّد نہیں ہونا چاہیے، کہ یہ جو پُوج رہے ہیں غیر اللہ کی عبادت کررہے ہیں ان کے بارے میں کبھی تردّد میں نہ پڑیو، ان کا معاملہ ایسے ہی بے دلیل ہے، جیسے ان کے آباء واجداد کا معاملہ بے دلیل تھا، یہ پُرانی لکیر کو پیٹتے جارہے ہیں، جس طرح سے ان کے آباء کرتے گئے یہ بھی ویسے ہی ہیں، وہ بھی بے دلیل اور جہالت کے ساتھ کرتے تھے یہ بھی بے دلیل کررہے ہیں، تو ان کے معاملے میں کبھی شک میں نہ رہیے، ان کا طریقہ بالکل غلط ہے، کبھی اس بارے میں تردّد نہیں آنا چاہیے، ''نہ ہوں آپ شک میں اس چیز سے جس کو پُوجتے ہیں یہ لوگ، نہیں پُوجتے مگر جیسے کہ پُوجتے تھے ان کے آباء اس سے قبل'' یعنی یہ محض ایک خاندانی رسم ہے جس کو یہ نبھاتے جارہے ہیں، ان کے آباء کے پاس بھی اس

سلسلے میں کوئی دلیل نہیں تھی ان کے پاس بھی کوئی دلیل نہیں ہے، اس لیے اپنے دل کو پختہ رکھیے، کبھی یہ وسوسہ نہ آئے کہ شاید یہ ٹھیک ہی کر رہے ہوں، شاید یہ طریقہ درست ہی ہو، یہ بالکل غلط ہے، اور یہ بے دلیل چل رہے ہیں، محض اپنے آباؤ اجداد کی تقلید کے اندر پوجتے جا رہے ہیں، وہ بھی بے دلیل تھے یہ بھی بے دلیل ہیں۔ وَاِنَّا لَمُوَفُّوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ غَيْرَ مَنْقُوْصٍ: اور بے شک ہم ان کو ان کا حصہ پورا پورا دیں گے اس حال میں کہ اس میں نقص واقع کیا ہوا نہیں ہوگا، یعنی کسی قسم کی کمی نہیں ہوگی، ان کا پورا پورا حصہ ان کو ادا کر دیا جائے گا۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ فَاخْتُلِفَ فِيْهِ ۗ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ

البتہ تحقیق ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب دی پھر اس میں اختلاف کیا گیا، اگر ایک بات نہ ہوتی جو سبقت لے گئی تیرے رب کی طرف سے

لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ ۗ وَاِنَّهُمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ ﴿۱۱۰﴾

البتہ فیصلہ کر دیا جاتا ان کے درمیان، اور بیشک یہ لوگ البتہ شک میں ہیں اس عذاب کی طرف سے ایسا شک جو تردد میں ڈالنے والا ہے ﴿۱۱۰﴾

وَاِنَّ كُلًّا لَّمَّا لَيُوَفِّيَنَّهُمْ رَبُّكَ اَعْمَالَهُمْ ۗ اِنَّهٗ بِمَا يَعْمَلُوْنَ

اور بیشک سارے کے سارے البتہ ایسے ہیں جن کو تیرا رب ان کے اعمال پورے پورے دے دے گا، بیشک وہ خبر رکھنے والا ہے

خَبِيْرٌ ﴿۱۱۱﴾ فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ وَمَنْ

ان کاموں کی جو یہ کرتے ہیں ﴿۱۱۱﴾ پس آپ استقامت اختیار کیجئے جس طرح سے آپ کو حکم دیا گیا ہے اور وہ لوگ بھی (استقامت

تَابَ مَعَكَ وَلَا تَطْغَوْا ۗ اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ

اختیار کریں) جو آپ کے ساتھ مل کر (اللہ کی طرف) متوجہ ہیں، اور تم حد سے نہ بڑھو، بیشک وہ دیکھنے والا ہے ان کاموں کو

بَصِيْرٌ ﴿۱۱۲﴾ وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ ۙ وَمَا لَكُمْ

جو تم کرتے ہو ﴿۱۱۲﴾ اور نہ مائل ہو تم ان لوگوں کی طرف جنہوں نے ظلم کیا پھر تمہیں بھی آگ چھو لے گی اور نہیں ہوگا تمہارے لیے

مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَآءَ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ ﴿۱۱۳﴾ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ

اللہ کے علاوہ کوئی حمایتی پھر تم مدد بھی نہیں کیے جاؤ گے ﴿۱۱۳﴾ اور قائم کر تو نماز کو دن کے دونوں کناروں میں اور رات کے مختلف

الَّيْلِ ؕ اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ ؕ ذٰلِكَ ذِكْرٰى لِلذّٰكِرِيْنَ ۝١١٤ وَاصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ

حصوں میں، بیشک نیکیاں لے جاتی ہیں برائیوں کو، یہ بات یاد دہانی ہے یاد رکھنے والوں کے لئے ۝١١٤ آپ صبر اختیار کریں، بیشک اللہ تعالیٰ

لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝١١٥ فَلَوْلَا كَانَ مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْ قَبْلِكُمْ اُولُوْا بَقِيَّةٍ يَّنْهَوْنَ

نہیں ضائع کرتا محسنین کے اجر کو ۝١١٥ کیوں نہ ہوئے ان جماعتوں میں سے جو تم سے پہلے گزری ہیں سمجھ دار لوگ جو روکتے

عَنِ الْفَسَادِ فِي الْاَرْضِ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّنْ اَنْجَيْنَا مِنْهُمْ ۚ وَاتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَاۤ

زمین میں فساد کرنے سے، سوائے کچھ لوگوں جن کو ہم نے بچالیا ان میں سے، اور پیروی کی ان لوگوں نے جنہوں نے ظلم کیا اس چیز

اُتْرِفُوْا فِيْهِ وَكَانُوْا مُجْرِمِيْنَ ۝١١٦ وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ

کی جس میں وہ خوش حالی دیے گئے تھے اور وہ جرم کرنے والے تھے ۝١١٦ اور نہیں ہے تیرا رب کہ ہلاک کرے بستیوں کو ظلم کے ساتھ

وَّاَهْلُهَا مُصْلِحُوْنَ ۝١١٧ وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلَا يَزَالُوْنَ

اس حال میں کہ ان کے اہل اصلاح کرنے والے ہوں ۝١١٧ اگر تیرا رب چاہتا تو بنا دیتا سب لوگوں کو ایک ہی جماعت اور ہمیشہ

مُخْتَلِفِيْنَ ۝١١٨ ۙ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ ؕ وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ ؕ

رہیں گے یہ لوگ اختلاف کرنے والے ۝١١٨ مگر وہ شخص جس پہ تیرا رب رحم کرے، اور اللہ نے ان کو انہی حالات کے لئے پیدا کیا ہے،

وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ۝١١٩ وَكُلًّا

اور تیرے رب کی بات پوری ہوگئی کہ البتہ ضرور بھروں گا میں جہنم کو جنوں اور انسانوں کو اکٹھا کر کے ۝١١٩ رسولوں کے واقعات میں

نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَكَ ۚ وَجَآءَكَ فِيْ هٰذِهِ

سے ہر واقعہ ہم تیرے اوپر بیان کرتے ہیں، جن کے ذریعے سے ہم آپ کے دل کو مضبوط کرتے ہیں، آ گیا تیرے پاس اس میں

الْحَقُّ وَمَوْعِظَةٌ وَّذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ۝١٢٠ وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ اعْمَلُوْا عَلٰى

حق اور وعظ اور نصیحت مؤمنین کے لئے ۝١٢٠ آپ کہہ دیجئے ان لوگوں کو جو ایمان نہیں لاتے، عمل کرو تم اپنی

مَكَانَتِكُمْ ؕ اِنَّا عٰمِلُوْنَ ۝١٢١ ۙ وَانْتَظِرُوْا ۚ اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ ۝١٢٢ وَلِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ

حالت پر، ہم بھی عمل کرنے والے ہیں ۝١٢١ تم انتظار کرو، ہم بھی انتظار کرنے والے ہیں ۝١٢٢ اللہ ہی کے لئے ہیں آسمانوں اور زمین

وَالْاَرْضِ وَاِلَيْهِ يُرْجَعُ الْاَمْرُ كُلُّهٗ فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ ؕ
کی چھپی ہوئی چیزیں، اور تمام اَمر اسی کی طرف ہی لوٹایا جاتا ہے، پس تُو اسی کی عبادت کر، اور اسی پر بھروسا کر،
وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲۳﴾
اور تیرا رَبّ بے خبر نہیں ہے ان کاموں سے جو تم کرتے ہو ﴿۱۲۳﴾

خلاصہ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ: لقد: البتہ تحقیق، یعنی یہ بات پختہ ہے جس میں کوئی شک وشبہ نہیں، ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب دی۔ کتاب کا مصداق توراۃ ہے۔ فَاخْتُلِفَ فِيْهِ: پھر اس میں اختلاف کیا گیا، بعض نے مانا بعض نے نہ مانا۔ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ: اگر ایک بات نہ ہوتی جو سبقت لے گئی تیرے رَبّ کی طرف سے لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ: البتہ فیصلہ کر دیا جاتا ان کے درمیان، وَاِنَّهُمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ: اور بے شک یہ لوگ البتہ شک میں ہیں اس عذاب کی طرف سے۔ مِّنْهُ کی ضمیر عذاب کی طرف راجع ہے۔ ''ایسا شک جو کہ تردّد میں ڈالنے والا ہے'' وَاِنَّ كُلًّا لَّمَّا لَيُوَفِّيَنَّهُمْ رَبُّكَ اَعْمَالَهُمْ: اور بے شک سارے کے سارے لوگ۔ لَمَّا یہ اصل میں ''لَمَنْ مَا'' ہے، ''ما'' زائدہ ہے، اور ''مَن'' موصولہ ہے، پھر نون میم میں ادغام کر گیا، تو ''لَمَّا'' بن گیا، پھر تخفیف کے طور پر ایک میم کو گرا دیا گیا۔ بیشک یہ سارے کے سارے لوگ البتہ ایسے ہیں جن کو تیرا رَبّ ان کے اعمال پورے پورے دے گا۔ لَيُوَفِّيَنَّهُمْ: البتہ پورے پورے ادا کرے گا ان کو تیرا رَبّ، اَعْمَالَهُمْ: ان کے اعمال۔ ''بیشک یہ سارے کے سارے لوگ البتہ ایسے ہیں جن کو پورا پورا دے گا تیرا رَبّ ان کے اعمال'' اِنَّهٗ بِمَا يَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ: بیشک وہ خبر رکھنے والا ہے ان کاموں کی جو یہ کرتے ہیں۔ فَاسْتَقِمْ كَمَاۤ اُمِرْتَ: پس تو اِستقامت اختیار کر، سیدھا رہ۔ كَمَاۤ اُمِرْتَ: جس طرح سے تجھے حکم دیا گیا ہے۔ اِستقامت کا معنی راہِ اعتدال پر قائم رہنا، اِفراط تفریط سے بچنا۔ ''تو سیدھا رہ جس طرح سے تجھے حکم دیا گیا ہے'' وَمَنْ تَابَ مَعَكَ: اس کا عطف ہو گیا فَاسْتَقِمْ کی ضمیر مستتر پر۔ ضمیر مرفوع متصل جو ہوا کرتی ہے نحو کے اندر آپ پڑھتے رہتے ہیں کہ اس پر اسم ظاہر کا عطف کرنے کے لئے یا تو منفصل کے ساتھ اس کا اعادہ کیا جاتا ہے، یا درمیان میں فصل آ جانا چاہئے، یہاں منفصل کے ساتھ اعادہ تو نہیں کیا گیا، جس طرح سے اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ (سورہ بقرہ: ۳۵)، وہاں اَنْتَ کے ساتھ تاکید لائی گئی، لیکن یہاں كَمَاۤ اُمِرْتَ کا فاصلہ آ گیا جس کی بناء پر ضمیر منفصل کے ساتھ تاکید لانے کی ضرورت نہیں رہی۔ ''آپ اِستقامت اختیار کیجئے جس طرح سے آپ کو حکم دیا گیا اور وہ لوگ بھی جو آپ کے ساتھ مل کر اللہ کی طرف متوجہ ہیں'' وَمَنْ تَابَ مَعَكَ: جو توبہ کرتے ہیں آپ کے ساتھ، یعنی توبہ کر کے آپ کے ساتھ شامل ہو گئے، یا آپ کے ساتھ مل کر آپ کی رفاقت میں اللہ کی طرف متوجہ ہیں، یعنی مؤمنین، وہ بھی اِستقامت اختیار کریں، وہ بھی راہِ اعتدال پر پکے رہیں، وَلَا تَطْغَوْا: یہ طغیان سے ہے۔ اور تم حد سے نہ بڑھو، طغیانی اختیار نہ

کرو۔ طغیان، سرکشی اختیار نہ کرو، حد سے تجاوز نہ کرو۔ اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ: بیشک وہ دیکھنے والا ہے ان کاموں کو جو تم کرتے ہو۔ وَلَا تَرْكَنُوْۤا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا: رکون کہتے ہیں میلان کو۔ اور نہ میلان کرو، نہ مائل ہوؤ تم ان لوگوں کی طرف جنہوں نے ظلم کیا، فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ: پھر تمہیں بھی آگ چھولے گی، یعنی اگر تم ظالموں کی طرف میلان کرو گے تو جو آگ ان کے لئے ہے وہ تمہیں بھی مس کرے گی، وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَآءَ: اور نہیں ہوگا تمہارے لئے اللہ کے علاوہ کوئی مددگار، ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ: اور پھر مدد بھی نہیں کئے جاؤ گے، کوئی ولی نہیں ہوگا کوئی تمہارا حمایتی نہیں ہوگا، پھر تم مدد بھی نہیں کئے جاؤ گے۔ اولیاء ولی کی جمع ہے، تعلق رکھنے والا، حمایتی۔
وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ: اور قائم کر تو نماز کو۔ نماز قائم کرنے کا مطلب ہوتا ہے کہ اس کو اس کے آداب کے ساتھ اس کے ارکان کی رعایت رکھتے ہوئے پڑھا جائے، افضل وقت میں پڑھا جائے، پورے آداب کی رعایت رکھی جائے، پابندی سے پڑھا جائے، یہ اِقامت ہے، ''قائم کر تو نماز'' طَرَفَيِ النَّهَارِ: دِن کے دونوں کناروں میں، وَزُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ: زُلَفًا زُلْفَة کی جمع۔ اور رات کے مختلف حصوں میں، طَرَفَيِ النَّهَارِ: دِن کی دونوں طرفیں۔ دِن کی دونوں طرفوں سے یہ بھی مراد ہوسکتا ہے کہ ایک تو فجر ہوگئی جو دِن کے اِبتدائی حصے میں ہے، اور دِن کی دوسری طرف میں بعض نے مغرب کو داخل کیا ہے، کیونکہ مغرب بالکل دِن کے آخری کنارے پر ہے، جب سورج غروب ہوتا ہے اس وقت مغرب پڑھی جاتی ہے، اس لئے ''مشکوۃ شریف'' میں آپ ''باب صلاۃ المسافر'' میں صلوٰۃِ مغرب کے متعلق پڑھیں گے کہ ''هِيَ وِتْرُ النَّهَارِ'' یعنی مغرب کی نماز دِن کے وِتر ہیں، جس طرح سے رات کو وِتر پڑھے جاتے ہیں تو یہ دِن کے وِتر ہیں، تو ان کی نسبت دِن کی طرف آئی ہے، چونکہ بالکل دِن کے اِختتام پر ہے تو قرب کی وجہ سے اس کو دِن کی نماز ہی قرار دے دیا گیا، بعض روایات میں مغرب ہی اس کا مصداق بنائی گئی ہے، لیکن ظاہر کے مطابق زیادہ عصر کی نماز ہے جو دِن کے آخری حصے میں پڑھی جاتی ہے، اور دِن حقیقتاً موجود ہوتا ہے، اور طَرَفَيِ النَّهَارِ کے اندر فجر اور عصر یہ دونوں آجائیں گی۔ وَزُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ: اور رات کے مختلف حصوں میں، تو رات کے مختلف حصوں میں مغرب اور عشاء آگئی، تو یہ چار نمازوں کا ذکر اس میں آگیا، اور ظہر کے وقت کا اس میں اشارہ نہیں ہے، اور اس کا ذکر سورۂ بنی اسرائیل کے اندر آئے گا اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ (آیت:۷۸) قائم کر تو نماز کو دن کے ڈھلنے کے وقت، تو وہ آیت صراحت ہے ظہر کے وقت کے لئے، اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ: بیشک نیکیاں لے جاتی ہیں برائیوں کو، ذٰلِكَ ذِكْرٰى لِلذّٰكِرِيْنَ: یہ بات یادداشت ہے، یاددہانی ہے یاد رکھنے والوں کے لئے، یہ نصیحت ہے نصیحت حاصل کرنے والوں کے لئے، وَاصْبِرْ: آپ صبر اختیار کریں، فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ: بیشک اللہ تعالیٰ نہیں ضائع کرتا محسنین کے اجر کو، فَلَوْلَا كَانَ مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْ قَبْلِكُمْ اُولُوْا بَقِيَّةٍ: بقیہ کا معنی یہاں ہے عقل فہم بصیرت صلاحیت، کیونکہ بقیہ کا مفہوم ہوا کرتا ہے جو چیز بچا کے رکھی جائے، اور جو چیز بچا کے انسان رکھتا ہے وہ اکثر و بیشتر عمدہ ہوتی ہے، اس کے نزدیک پسندیدہ ہوتی ہے، تو عقل و فہم کے لئے بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے: ''فلانٌ بقيّةُ قومه'': فلاں شخص اپنی قوم کا بقیہ ہے، تو اس سے مراد ہوتا ہے بہتر آدمی، جو خیر و اصلاح والا ہو۔ تو اُولُوْا بَقِيَّةٍ سے سمجھدار مراد ہوگئے۔ قرون قرن کی جمع ہے۔ ''تم سے پہلے جو جماعتیں گزری ہیں ان میں سے کچھ سمجھدار لوگ کیوں نہ ہوئے؟'' يَّنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ فِي الْاَرْضِ: جو روکتے فساد سے زمین میں، جو زمین

میں فساد کرنے سے روکتے، اِلَّا قَلِیۡلًا مِّمَّنۡ اَنۡجَیۡنَا مِنۡهُمۡ: سوائے کچھ لوگوں کے ان میں سے جن کو ہم نے نجات دے دی۔ مِّمَّنۡ اَنۡجَیۡنَا مِنۡهُمۡ یہ قَلِیۡلًا کا بیان ہے، یعنی پہلی جماعتیں جتنی برباد کی گئی ہیں ان میں ایسے سمجھ دار لوگ موجود نہیں تھے جو فساد سے روکتے، بلکہ ساری کی ساری قوم فساد کو پسند کرنے لگ گئی، سارا عنصر خراب ہوگیا، ہاں البتہ کچھ تھے جن کو ہم نے بچالیا وہ اتنے تھوڑے تھے کہ نہ ہونے کے برابر، تو اگر ان کے اندر اکثریت اولو بقیۃ کی ہوتی، سمجھ داروں کی، جو ان کو فساد سے روکتے تو ان کی برکت سے ساری کی ساری قوم بچی رہتی، لیکن جب سارے فساد کی طرف چلے گئے، روکنے والا کوئی نہ رہا، برائے نام چند افراد تھے، تو پھر اکثریت کی وجہ سے ان کو برباد کر دیا گیا، اور وہ جو تھوڑے سے تھے ان کو ہم نے بچالیا، ’’کیوں نہ ہوئے ان جماعتوں میں سے جو تم سے پہلے گزری ہیں سمجھ دار لوگ جو روکتے زمین میں فساد کرنے سے، سوائے کچھ لوگوں کے جن کو ہم نے بچالیا ان میں سے‘‘ وَاتَّبَعَ الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا: اور پیروی کی ان لوگوں کی جنہوں نے ظلم کیا، مَاۤ اُتۡرِفُوۡا فِیۡهِ: اس چیز کی جس میں وہ خوش حالی دیے گئے تھے، یعنی جس عیش وعشرت کے اندر ان کو مبتلا کیا گیا تھا اسی عیش وعشرت میں پڑے رہے ہیں، انہوں نے صحیح راستہ معلوم کرنے کوشش نہیں کی۔ مَاۤ اُتۡرِفُوۡا فِیۡهِ: جس میں وہ عیش دیے گئے، جو خوش حالی وہ دیے گئے تھے اسی خوش حالی میں وہ پڑے رہے، وَکَانُوۡا مُجۡرِمِیۡنَ: اور وہ جرم کرنے والے تھے۔ وَمَا کَانَ رَبُّكَ لِیُهۡلِكَ الۡقُرٰی بِظُلۡمٍ: اور نہیں ہے تیرا رَبّ کہ ہلاک کرے بستیوں کو ظلم کے سبب سے۔ ظلم یہ مصدر ہے، یعنی ان بستیوں کا ظلم۔ اور ظلم کا مصداق کفر شرک۔ تیرا رَبّ بستیوں کو ان کے کفر وشرک کی بنا پر ہلاک نہیں کرتا، وَّاَهۡلُهَا مُصۡلِحُوۡنَ: اس حال میں کہ ان کے اہل اصلاح کرنے والے ہوں، یعنی چاہے وہ کفر میں مبتلا ہیں شرک میں مبتلا ہیں لیکن اگر ان کا رجحان اصلاح کی طرف ہے، فساد نہیں مچاتے، حالات کو ٹھیک کرنے کی وہ کوشش کر رہے ہیں، پھر اللہ تعالیٰ ان کو ڈھیل دیتا ہے، پھر فوراً کفر وشرک کی وجہ سے ان کو برباد نہیں کر دیتا، اس کا مطلب یہ ہوا کہ قومیں برباد اسی وقت ہوتی ہیں جب کفر شرک کے ساتھ ساتھ ان کا رجحان سارا فساد کی طرف ہوجائے، اصلاح کی طرف ان کا رجحان نہیں رہتا، انبیاء ﷺ کی ڈٹ کے مخالفت کرتے ہیں اور ہر نیکی کی تلقین کرنے والے کو قتل کرنے پہ آمادہ ہوجاتے ہیں، کسی کی بات سننے پہ آمادہ نہیں ہوتے، معاملات ان کے خراب ہوجاتے ہیں، اخلاق ان کے برباد ہوجاتے ہیں، شر وفساد ایک انکا مزاج بن جاتا ہے، اس لئے کفر وشرک کے ساتھ تو کچھ آبادی رہ سکتی ہے، لیکن جب اس قسم کا فساد ظلم وستم حقوق کی تلفی، اس قسم کے حالات ہوجاتے ہیں تو پھر کوئی قوم بچا نہیں کرتی۔ تو ظلم سے مراد ہوگیا ظلمِ قریٰ، گویا کہ فاعل اس ظلم کا خود وہ بستیاں اور بستیوں والے ہیں، ’’نہیں ہے تیرا رَبّ کہ ہلاک کرے بستیوں کو ان کے کفر وشرک کے سبب سے اس حال میں کہ وہ اصلاح کرنے والے ہوں‘‘ یعنی ان کا رجحان اصلاح کی طرف ہو، حالات کو درست کریں، اخلاق کو درست رکھیں، معاشرت ان کی صحیح ہو، کردار ان کا صحیح ہو، تو کفر وشرک کے باوجود اللہ تعالیٰ ان کو برباد نہیں کرتا بلکہ ان کو ڈھیل دے دیتا ہے، اور جس وقت وہ مفسد ہوجاتے ہیں، فسادی ہوجاتے ہیں، دنیا کے اندر فساد مچانے لگ جاتے ہیں، خیر کو مٹانے کی کوشش کرنے لگ جاتے ہیں، معاملات ان کے برباد ہوجاتے ہیں، اخلاق ان کا برباد ہوجاتا ہے، جس طرح سے قومِ لُوط اور قومِ شعیب کے واقعات آپ کے سامنے گزرے، تب اللہ تعالیٰ پھر انہیں برباد کرتا ہے۔ اور ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ ظلم کا

فاعل اللہ تعالیٰ کو بنالیں، یعنی اللہ تعالیٰ بستیوں کو ظلم کرتا ہوا ہلاک نہیں کرتا اس حال میں کہ وہ تو ٹھیک کام کرنے والے تھے گویا کہ اگر وہ بستی والے مصلح ہوں اور حالات ٹھیک کرنے والے ہوں اور اللہ تعالیٰ انہیں برباد کردے تو اس میں صورۃً اللہ تعالیٰ کی طرف سے زیادتی ہوگی، اللہ تعالیٰ ایسا نہیں کرتا۔ تو پھر ظلم کا فاعل اللہ بن جائے گا۔ ''نہیں ہے تیرا رَبّ کہ ہلاک کرے بستیوں کو ظلم کے ساتھ، یعنی خود زیادتی کرتا ہوا، اس حال میں کہ بستیوں والے اصلاح کرنے والے ہوں'' وَلَوْشَآءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ أُمَّةً وَّاحِدَةً: اگر تیرا رَبّ چاہتا تو بنا دیتا سب لوگوں کو ایک ہی جماعت، وَّلَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ: اور ہمیشہ رہیں گے یہ لوگ اختلاف کرنے والے، إِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ: مگر وہ شخص جس پہ تیرا رَبّ رحم کرے، وہ حق کو قبول کرے گا، حق سے اختلاف نہیں کرے گا، وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ: اور اللہ تعالیٰ نے ان کو انہی حالات کے لئے پیدا کیا ہے، وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ: اور تیرے رَبّ کی بات پوری ہوگئی، لَأَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِيْنَ: وہ بات یہ ہے اللہ تعالیٰ کی۔ البتہ ضرور بھروں گا میں جہنّم کو انسانوں اور جنوں کو اکٹھا کر کے۔ أَجْمَعِيْنَ اس مجموعے کی تاکید ہے۔ ''انسانوں اور جنوں کو اکٹھا کر کے میں جہنّم کو ضرور بھروں گا'' وَكُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ أَنْۢبَآءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَكَ: كُلًّا یہ نَقُصُّ کا مفعول بہ ہے۔ اس کے اوپر تنوین مضاف الیہ کے عوض ہے۔ ''كُلَّ نَبَإٍ مِنْ أَنْبَاءِ الرُّسُلِ نَقُصُّ عَلَيْكَ'' رسولوں کے واقعات میں سے ہر واقعہ ہم تیرے اوپر بیان کرتے ہیں، مَا نُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَكَ: یہ اس سے بدل ہے۔ بیان کرتے ہیں آپ پر ایسی چیزیں جن کے ذریعے سے آپ کے دل کو مضبوط کرتے ہیں، یعنی ''كُلَّ نَبَإٍ'' جو ہے وہ مَا نُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَكَ کا مصداق ہے۔ ہم آپ کے سامنے ایسی چیزیں بیان کرتے ہیں جن کے ذریعے سے ہم آپ کے دل کو مضبوط کرتے ہیں۔ وَجَآءَكَ فِيْ هٰذِهِ الْحَقُّ: اور آ گیا تیرے پاس اس میں حق، یعنی واقعات کے اندر آپ کے پاس حق بات بھی آ گئی، واقعات کے ساتھ ثابت ہو گیا کہ حق طریقہ کیا ہے، وَمَوْعِظَةٌ: اور آ گئی آپ کے پاس موعظہ۔ وَّذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ: مؤمنین کے لئے وعظ نصیحت بھی آ گئی۔ مَوْعِظَةٌ مصدر میمی ہے وعظ کے معنی میں۔ ''موعظہ'' اور ''ذکریٰ'' کے درمیان فرق یوں کرلیں گے کہ آپ کو گناہوں سے روکنے کے اعتبار سے یہ باتیں موعظہ ہیں، نیکی کی ترغیب کے اعتبار سے ذکریٰ ہیں۔ تو ان واقعات کے اندر گویا کہ حکمت واضح کر دی گئی کہ یہ واقعات آپ کے لئے دل کی مضبوطی کا ذریعہ بھی بنتے ہیں، دل کی مضبوطی کا ذریعہ اس طرح سے کہ جب آپ دیکھیں گے کہ نوح علیہ السلام کے ساتھ یہ ہوا، فلاں کے ساتھ یہ ہوا، ایسے ایسے واقعات ہوئے تو آپ کا دل بھی سہارا پکڑے گا، اور ان واقعات کے ذریعے سے حق اور باطل کا امتیاز بھی ہوتا ہے کہ حق نظریہ کیا ہے باطل کیا ہے، اچھا طرزِ عمل کون سا ہے برا طرزِ عمل کون سا ہے، واقعات کے ساتھ یوں حق کی تعیین ہوتی ہے، اور انہی واقعات کے اندر نیکی کی ترغیب اور گناہوں سے روکنے کی بات پائی جاتی ہے، تو لِلْمُؤْمِنِيْنَ کا مطلب یہ ہوا کہ مؤمنین فائدہ اٹھاتے ہیں، اور جو ایمان نہیں لائے گا وہ فائدہ نہیں اٹھائے گا۔ وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ: آپ کہہ دیجئے ان لوگوں کو جو ایمان نہیں لاتے، عمل کرو تم اپنی حالت پر، اپنی جگہ پر ٹھہرے ہوئے تم بھی عمل کرتے رہو، إِنَّا عٰمِلُوْنَ: ہم بھی عمل کرنے والے ہیں، وَانْتَظِرُوْا ۚ إِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ: تم انتظار کرو، ہم بھی انتظار کرنے والے ہیں، وَلِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ: اللہ ہی کے لئے ہیں زمین و آسمان کی چھپی ہوئی چیزیں۔ غیب مغیبات کے معنی میں۔ یا لِلّٰهِ عِلْمُ غَيْبِ السَّمٰوٰتِ

والارض زمین وآسمان کی چھپی ہوئی چیزوں کا علم اللہ ہی کے پاس ہے۔''زمین وآسمان کی سب چھپی ہوئی چیزیں اللہ ہی کے لئے ہیں'' وَاِلَیْهِ یُرْجَعُ الْاَمْرُ كُلُّهٗ: تمام امر اسی کی طرف ہی لوٹایا جاتا ہے، ہر قسم کے کام کا مرجع وہی ہے، ہر کام اسی کی طرف لوٹتا ہے، فَاعْبُدْهُ: پس تو اسی کی عبادت کر، وَتَوَكَّلْ عَلَیْهِ: اور اسی پر بھروسا کر، وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ: اور تیرا رَب بے خبر نہیں ہے ان کاموں سے جو تم کرتے ہو۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَیْكَ

تفسیر

مذکورہ رُکوع میں بیان کردہ مضمون

اس رکوع میں سرورِ کائنات ﷺ کے لئے کچھ تسلی بھی ہے، اور آپ ﷺ کو اور آپ کی وساطت سے آپ کی اُمت کو کچھ ہدایات بھی دی گئی ہیں، ترجمے سے بات واضح ہوگئی، زیادہ مفصل مضمون اس میں کوئی نہیں، اکثر باتیں گزری ہوئی ہیں۔

گزشتہ اُمتوں کے واقعات سے سرورِ کائنات ﷺ کو تسلی

پہلی آیت میں تو سرورِ کائنات ﷺ کے لئے تسلی ہے کہ آپ پر جو کتاب اتاری گئی اگر یہ اس کو قبول نہیں کرتے تو یہ کوئی نئی بات نہیں، موسیٰ علیہ السلام کو بھی ہم نے کتاب دی تھی اس میں بھی اختلاف کیا گیا تھا، یہ واقعات تسلی کا باعث بنا کرتے ہیں کہ صرف ہمارے ساتھ ہی ایسا معاملہ نہیں ہوا، پہلے سے ہی ایسے ہوتا آیا ہے۔ باقی ان کے اختلاف کرنے کی وجہ سے کہ کسی نے قبول کیا، کسی نے قبول نہیں کیا، چاہیے تو یہ تھا کہ جو قبول کرنے والے نہیں، جو حق بات کی مخالفت کرتے ہیں، اللہ کی بات کو قبول نہیں کرتے ان کو فوراً ہلاک کر دیا جائے، لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک بات طے شدہ ہے کہ ان کو پورا پورا عذاب آخرت میں ہوگا، دُنیا دار الابتلا ہے، اس لیے کسی درجے میں یہاں رَسّی ڈھیلی چھوڑی جاتی ہے، تو یہ باتیں اللہ کی طرف سے اگر پہلے سے طے شدہ نہ ہوتیں تو ان کے درمیان عملاً فیصلہ کر دیا جاتا کہ باطل پرستوں کو فوراً برباد کر دیا جاتا، جس کی وجہ سے پھر آگے گنجائش ہی نہ رہتی حق کے ساتھ اختلاف کرنے کی، لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف سے طے شدہ امر ہے کہ آخرت میں پورا پورا عذاب ہوگا، اور دنیا کے اندر انسان کو کسی درجے میں ڈھیل دی جاتی ہے جس کی بناء پر فوراً سزا نہیں ہوتی، تو آپ کے ساتھ جو اختلاف کرنے والے ہیں ان کی رَسّی بھی اس لیے ڈھیلی چھوڑی گئی ہے کہ اللہ نے عادت یہی اختیار کر رکھی ہے، اور یہ لوگ اس عذاب پر یقین نہیں لاتے، جو باطل پرستی کی بنا پر اور حق کے ساتھ اختلاف کی بنا پر آتا ہے یہ اس کی طرف سے شک میں ہیں جو شک ان کو چین نہیں لینے دیتی، یہ تردد میں پڑے ہوئے ہیں، یعنی ان کو یقین نہیں آتا، لیکن ایک وقت آئے گا جب اللہ کی طرف سے حق فیصلہ ہو جائے گا، اور یہ جتنے لوگ ہیں ان سب کو ان کے اعمال پورے پورے ادا کر دیے جائیں گے، لَیُوَفِّیَنَّهُمْ: پورے پورے ادا کرے گا ان کو تیرا رَب ان کے اعمال۔

لَمَّا کا ترجمہ آپ کے سامنے کر دیا گیا لمن ما، یہ سارے کے سارے لوگ ایسے ہیں جن کو تیرا رَبّ ان کے پورے پورے اعمال ادا کر دے گا، اور وہ سب عملوں کی خبر رکھنے والا ہے، کوئی کام ایسا نہیں کہ جس کی اللہ کو خبر نہ ہو۔

راہِ اعتدال پر اِستقامت کا حکم

آپ اِستقامت اختیار کیجیے، استقامت کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو اَحکام دیے جا رہے ہیں ان کے اندر اِفراط وتفریط نہ ہونے پائے، اعتدال کے ساتھ آپ چلتے رہیے، عدل کو اختیار کیجئے، اور کمال یہی ہے اِستقامت، اولیاء اللہ کے ہاں ایک فقرہ مشہور ہے: ''الإستقامۃُ فوقَ الکرامۃِ'' کہ اگر کسی شخص سے کرامت صادر نہیں ہوتی لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کو زندگی میں اعتدال دیا ہوا ہے، افراط وتفریط سے بچتا ہوا وہ ہر معاملے کو اختیار کرتا ہے، تو یہ بات کرامت سے بڑھ کے ہے، عقائد میں اعتدال کہ جس طرح اللہ کی طرف سے تعلیم ہوگی اسی کے مطابق عقیدہ رکھو، اگر اس میں بے اعتدالی آ گئی تو کفر، شرک، اس قسم کے کاموں کے اندر انسان مبتلا ہو جاتا ہے، انبیاء اور اولیاء اللہ کے متعلق جو بھی عقیدہ ہے اس میں بھی اعتدال رکھو، ان کی عظمت محسوس کرو، نہ عظمت کے اندر غلو ہو، نہ ان کے ساتھ کسی قسم کی اہانت کا معاملہ ہو، اعمال کے اندر اعتدال ہو، افراط تفریط سے بچو، اللہ تبارک وتعالیٰ نے جو سیدھا راستہ بتایا ہے اسی پر ڈٹے رہو، نہ بدعات کے اندر مبتلا ہوؤ، نہ فرض وغیرہ کو چھوڑ کے اور گناہوں کا ارتکاب کر کے فاسق وفاجر بنو، جو طریقہ بتا دیا گیا اسی کے اوپر مستقیم رہئے، اعتدال کے ساتھ چلیے، اِفراط تفریط سے بچئے، جیسے کہ آپ کو حکم دے دیا گیا، اور جو آپ کے ساتھ ہیں، جو توبہ کر کے آپ کے ساتھ شامل ہو گئے ہیں یا آپ کے ساتھ مل کر جو اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہیں ان کو بھی چاہیے کہ اللہ کے اَحکام کے اُوپر جمے رہیں اور اِدھر اُدھر نہ ہٹیں، لَا تَطْغَوْا میں سلبی جانب ذکر کر دی کہ حد سے تجاوز نہیں کرنا چاہیے، نہ اِفراط کی طرف نہ تفریط کی طرف، بس اللہ کے بتائے ہوئے طریقے کے اُوپر ڈٹے رہو، نہ کسی کی مخالفت سے متأثر ہوؤ، نہ کسی خوف اور لالچ کی بنا پر اپنے راستے سے کسی طرف ہٹنے کی کوشش کرو، اللہ تعالیٰ تمہارے عملوں کو دیکھنے والا ہے، ہر عمل اس کے سامنے ہے، وقت پر اللہ تعالیٰ تمہیں جزا دے گا۔

ظالموں کی طرف میلانِ قلبی سے اِجتناب کا حکم، اور قلبی میلان کی علامات

''اور مائل نہ ہوؤ ان لوگوں کی طرف جنہوں نے ظلم کیا'' یہ مزید تاکید ہے، ایک تو ہے کہ ظالموں کا طریقہ ہی اختیار کر لیا، وہ تو پھر صراحت کے ساتھ ظالموں میں شامل ہو گئے، اور ایک ہے کہ ظالموں کی طرف قلبی میلان ہی ہو گیا، کہ ان کے ساتھ محبت رکھنے لگ گئے، ان کے طریقے کو دل سے اچھا سمجھنے لگ گئے، یہ ہے رکونِ قلبی، دل کا میلان، کہ ان کا طریقہ اپنے طریقے کے مقابلے میں اچھا لگنے لگ جائے، یا ان ظالموں کے ساتھ دلی طور پر محبت ہو جائے، ان کی صحبت اختیار کی جائے، ان کے ساتھ دوستی لگائی جائے، یہ سب رُکون ہیں، چاہے عملاً انسان ویسا کام نہ ہی کرے لیکن ان کے ساتھ محبت رکھنا، ان کی صحبت میں بیٹھنا، ان کے طریقے کو اچھا سمجھنا یہ قلبی میلان ہے جس کے نتیجے میں اسی قسم کا عذاب آ سکتا ہے جس قسم کا عذاب ظالموں پہ آیا کرتا ہے، اس لیے

علماء نے لکھا ہے کہ یہ جو حدیث شریف میں آتا ہے ''مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ ''[1] وہ اسی مضمون کی تفصیل ہے، کہ دوسرے لوگوں کے ساتھ تشبہ اختیار کرنا یعنی ان جیسی بود و باش اور ان جیسی معاشرت اختیار کرنے کی کوشش کرنا یہ بغیر رکونِ قلبی کے نہیں ہوتا، جب تک انسان کا دل اُدھر مائل نہ ہو اُس وقت تک انسان ان کے طور طریقے کو اپنانے کی کوشش نہیں کرتا۔ ایک طریقہ آپ کے سامنے آ گیا جو سُنّت کے مطابق ہے، یا وہ طریقہ ایسا ہے جو اہلِ صلاح کا ہے، چاہے وہ لباس سے متعلق ہے، اُٹھنے بیٹھنے سے متعلق ہے، کھانے پینے سے متعلق ہے، چلنے پھرنے سے متعلق ہے، ایک طریقہ تو مروّج ہے جو اہلِ صلاح کا طریقہ کہلاتا ہے، اولیاء اللہ کا، نیک لوگوں کا، اہلِ علم کا، اور ایک طریقہ فساق اور فجار کا ہے، عملاً دونوں جماعتیں آپس میں ممتاز ہیں، اب آپ کھڑے ہیں اسی کام کے کرنے کے لئے، کام آپ کو پیش آ گیا، مثال کے طور پر آپ نے کپڑے سلانے ہیں، یا کوئی دوسرا کام کرنا ہے، دونوں نمونے آپ کے سامنے ہیں، اب اگر آپ فُساق اور فجار کا طریقہ اختیار کریں گے تو اس کا مطلب یہی ہے کہ آپ کے قلب کا میلان اُدھر ہے، اگر آپ کے قلب کا میلان اولیاء اللہ کی طرف ہو تو انہی کا لباس، انہی کا اُٹھنا بیٹھنا، انہی کا طرز و طریق آپ کو پسند ہوگا، انسان کے دل کے جذبات ہمیشہ ظاہری اعمال سے پہچانے جایا کرتے ہیں، یہ دُنیا کا ایک اُصول ہے، اور بعض معمولی معمولی چیزیں ایسی ہوا کرتی ہیں جس سے انسان کے قلبی جذبات کا پتا چلتا ہے، جیسے کہا کرتے ہیں کہ خاک کی ایک چٹکی اپنی حیثیت میں کچھ نہیں لیکن یہ ہوا کا رُخ معلوم کرنے کے لئے کافی ہے، کہ اس کو یوں کر کے (اُوپر اُٹھا کر) چھوڑیں گے تو ہوا کا رُخ معلوم ہو جاتا ہے کہ ہوا کدھر کو جا رہی ہے، تو اسی طرح سے بعض معمولی معمولی عادتیں ہیں، مثال کے طور پر داڑھی کا رکھنا ہی ہے، چلو اگر آپ اس کو فرضِ قطعی قرار نہیں دیتے اور اس کا منڈانا کفر نہیں ہے، لیکن جب دُنیا کے اندر دو طرح کا معاملہ چل رہا ہے، بعض منڈاتے ہیں اور بعض رکھتے ہیں، اور رکھنے والے وہ ہیں جن کو دُنیا نیک سمجھتی ہے وہ اولیاء اللہ ہیں، سُنّت کے مطابق اُن کا عمل ہے، دلیل کے ساتھ ثابت ہے کہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ طرزِ عمل تھا، اب ایک آدمی اس دوراہے پر کھڑا ہے، ایک طرف فساق فجار ہیں، کفار کا طریقہ ہے، مغربی تہذیب ہے، اور ایک طرف اسلامی طریقہ ہے، اور وہ پھر اختیار اِس طریقے کو کرتا ہے یعنی داڑھی منڈانے کو، جس میں موافقت اُن کے ساتھ ہو گئی جو کہ یورپ زدہ ہیں، یورپ کے پرستار، نئی تہذیب کے دلدادہ ہیں، سُنّت کے متبع نہیں ہیں، جب عملاً وہ اس چیز کو اختیار کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے دل میں ان لوگوں کی عظمت اور محبت ہے، اس لیے تو ان کے طریقے کو اچھا سمجھتا ہے، تو قلب کے رجحان کا پتا چل گیا کہ دل کا رجحان غلط ہے، اس کے دل کا رجحان صحیح نہیں، اگر اس کے دل کا رجحان اولیاء اللہ کی طرف ہوتا، نیکی کی طرف ہوتا، اتباعِ سنت کی طرف ہوتا تو یہ ان کے طریقے کو اختیار نہ کرتا۔ تو ان چھوٹی چھوٹی حرکتوں سے پتا چلتا ہے کہ انسان کے دل میں عظمت کس فعل کی ہے کس فعل کی نہیں ہے۔ بالکل اسی طرح سے آپ سر کے بال بنوانے لگیں، کپڑے سلانے لگیں، جوتا خریدنے لگیں، اور کوئی آپ کے اُٹھنے بیٹھنے کا طریقہ ہے، تو اس میں دو قسم کی تہذیبیں چل رہی ہیں ایک یورپی تہذیب ہے، نئے فیشن کے لوگ ہیں، اور ایک اولیاء اللہ کا اور نیک لوگوں کا طریقہ ہے، تو آپ کے دل کا میلان کدھر جاتا ہے، اگر

(۱) ابوداؤد ج ۲ ص ۲۰۳ باب فی لبس الشهرة/ مشکوٰۃ ج ۲ ص ۳۷۵، کتاب اللباس، فصل ثانی۔

آپ کے دل کا میلان اُدھر کو ہو جدھر فساق اور فجار کا طریقہ جارہا ہے بازاری لوگوں کا طریقہ جارہا ہے فیشن ایبل لوگوں کا طریقہ جارہا ہے تو یہ دل کے فساد کی علامت ہے کہ آپ کے دل میں ابھی تک اُن لوگوں کی محبت باقی ہے، اور آپ کے دل میں ان کی عظمت ہے، اور اِن نیک لوگوں کی، اساتذہ کی، مشائخ کی، صلحاء کی، علماء کی، اولیاء کی عظمت دل میں نہیں، اگر ان کی عظمت دل کے اندر ہو تو پھر انسان ہر طریقہ انہی کا پسند کرتا ہے، دوسرے طریقے سے اس کو نفرت ہو جائے گی، تو ان چھوٹی چھوٹی عادتوں کے ساتھ پتا چلتا ہے کہ دل کا میلان کدھر ہے؟ دل کی عقیدت اور محبت کن کے ساتھ ہے؟ تو اس لیے ان چیزوں سے بچنا چاہیے، یہ اچھی علامت نہیں ہے کہ انسان اپنی عادات اور طور طریقے کے اندر فساق اور فجار کے طریقے کو اپنائے، یہ دل کے فساد کی علامت ہے، اور ''مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ'' کے اندر یہی بات ذکر کی گئی ہے کہ جو دوسرے جیسا بننے کی کوشش کرتا ہے وہ انہی میں شامل سمجھا جاتا ہے، اس کا انجام انہی کے ساتھ ہی ہوگا، اس لیے ہمیشہ نیکوں کے ساتھ تشبہ پیدا کرنے کی کوشش کرو، یہ ظاہری صورت کی اصلاح بسا اوقات باطن کی اصلاح کا سبب بن جاتی ہے، دونوں طرح سے بات چلتی رہتی ہے، کبھی تو ہوتا ہے کہ دل میں صلاحیت پیدا ہوتی ہے تو ظاہر سنورتا ہے، اور کبھی یہ ہوتا ہے کہ تم ظاہر کو سنوارنے کی کوشش کرو تو ظاہر کے سنوارنے کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ باطن کی اصلاح بھی کر دیتے ہیں، تو بات دونوں طرف سے چلتی ہے، نہ ظاہر بے کار اور نہ باطن سے اِستغناء، کبھی تو خیر باطن سے اُٹھتی ہے کہ دل پہلے سدھرتا ہے اور ظاہری اعمال بعد میں سدھرتے ہیں، اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آپ بہ تکلف ظاہر کو سنواریں، جس وقت آپ بہ تکلف ظاہر کو سنواریں گے تو ظاہر کا اثر باطن پہ پڑے گا باطن بھی سدھر جائے گا، اور اگر آپ ظاہر کو بگاڑنے کی کوشش کریں گے اور آپ یہ کہیں گے کہ جی! چاہے شکل فاسقوں جیسی ہو، چاہے لباس فاسقوں جیسا ہو، چاہے ہمارا چلنا پھرنا اُٹھنا بیٹھنا فاسقوں کی طرح ہے لیکن ہمارے دل میں خیر اور صلاحیت ہے، یہ غلط فہمی ہے، اپنے آپ کو بھی دھوکا دیتے ہو اور دوسروں کو بھی دھوکا دیتے ہو، اللہ تعالیٰ کی عادت اسی طرح سے ہے کہ ہر چیز کے لئے اس نے ایک ہیئت مخصوص کی ہے، اور اس ہیئت مخصوصہ کے اندر ہی وہ چیز پیدا ہوا کرتی ہے، عادت یہی ہے، اگرچہ اس کو اس کے خلاف کرنے پر بھی قدرت ہے، اگر آپ کو آم کا رَس چاہیے تو ایک خاص شکل ہے جس کے اندر آم کا رَس آپ کو میسر آئے گا، اور اگر آپ کو مالٹے کا رَس چاہیے تو اس کی بھی ایک خاص ہیئت ہے جس میں آپ کو مالٹے کا رَس میسر آئے گا، اب اللہ تعالیٰ کو قدرت ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ آم کا رَس مالٹے میں پیدا کر دے اور مالٹے کا رَس آم میں ڈال دے، آم کی تاثیر تربوز میں ڈال دے، اور تربوز کا گودا آپ کو آم کے درختوں سے ملنے لگ جائے، یہ قدرت ہے لیکن عادت نہیں ہے، کیکر کو آم لگ سکتے ہیں لیکن اللہ کی عادت نہیں، اس طرح سے اللہ تبارک وتعالیٰ نے عادت بنائی ہوئی ہے کہ ایک حقیقت کو وہ ایک خاص جامے کے اندر نمایاں کرتا ہے۔ بالکل اسی طرح سے آپ یقین کر لیجیے کہ اگر آپ نیک بننا چاہتے ہیں تو اس کے لئے ضروری ہے کہ اپنی شکل صورت، اپنا اُٹھنا بیٹھنا، بود و باش، یہ بھی نیکوں جیسی بناؤ تو اس میں پھر صلاحیت بہت جلدی آتی ہے، اور اگر صورت فساق فجار جیسی بناؤ گے تو اس کے اندر حقیقت اسی قسم کی آئے گی، جس قسم کی صورت اس کے ساتھ مناسبت رکھتی ہے اور صلاحیت رکھتی ہے اسی قسم کے حالات اس میں پیدا ہوتے چلے جائیں گے، جب چاہیں اس کا آپ

تجربہ کر سکتے ہیں، فاسقوں جیسا لباس پہنو گے تو اکڑ کے چلنے کو جی چاہے گا، نیک لوگوں جیسا لباس پہنو گے تو خود بخود تواضع کی طرف طبیعت جائے گی، تو یہ تشبہ رُکونِ قلبی سے پیدا ہوتا ہے، اگر نیکوں کی طرف قلب کا میلان ہو تو نیکوں جیسی شکل صورت بنانی شروع کر دو گے، فساق فجار کی طرف قلب کا میلان ہوگا تو ویسی شکل صورت بنانے لگ جاؤ گے۔ تو ''مائل نہ ہو ؤان لوگوں کی طرف جنہوں نے ظلم کیا، پھر چھوئے گی تمہیں بھی آگ، اور نہیں ہوگا تمہارے لیے اللہ کے علاوہ کوئی حمایتی، اور پھر تم مدد نہیں کیے جاؤ گے۔''

نیکیوں کی عادت ڈالنے سے بُرائیوں کی عادت چھوٹ جاتی ہے

''اور نماز کو قائم رکھیے'' اِستقامت کے لئے یہ بھی ضروری ہے، نماز کی جتنی پابندی کریں گے اور صبر جتنا اختیار کریں گے اتنی مزید اِستقامت ملے گی، اور مخالف ماحول کا مقابلہ کرنے کی انسان کے اندر قوت اور طاقت پیدا ہوتی ہے، ''نماز قائم کیجئے''، قائم کرنے کا مفہوم آپ کے سامنے ذکر کر دیا کہ اس کے حقوق اور آداب کی رعایت رکھتے ہوئے اس کو پڑھیے، ''دن کی دو طرفوں میں اور رات کے حصوں میں'' اس کی تفصیل بھی آپ کے سامنے آگئی۔ ''نیکیاں بُرائیوں کو لے جاتی ہیں'' جب تم نیکی کی عادت ڈالو گے خاص طور پر نماز کی تو اس کے ذریعے سے گناہ معاف ہوں گے۔ ''گناہ معاف ہوں گے'' یہ بھی ایک مطلب ہے اس کا کہ نیکیاں گناہوں کو لے جاتی ہیں، جس طرح سے روایات کے اندر صراحت کے ساتھ آتا ہے کہ وضو کیا جاتا ہے تو وضو سے گناہ معاف ہوتے ہیں، نماز پڑھی جاتی ہے تو نماز سے گناہ معاف ہوتے ہیں، وہ سارے فضائل بیان کرنا تو مقصود نہیں ہے، ''فضائلِ نماز'' میں آپ پڑھتے رہتے ہیں، حضور ﷺ نے فرمایا کہ ایک نماز سے لے کے دوسری نماز تک درمیان میں جتنا وقفہ ہے دوسری نماز پڑھیں گے تو یہ اس کے لئے کفارہ ہو جاتی ہے، اسی طرح جمعہ جمعہ تک کے لئے، رمضان رمضان تک کے لئے کفارہ ہیں،[1] اگرچہ علماء اس کے اندر تعیین کرتے ہیں کہ صغائر معاف ہوتے ہیں کبائر نہیں ہوتے، کبائر کے لئے توبہ کی ضرورت ہے۔ لیکن یہ کبائر بغیر توبہ کے معاف نہیں ہوتے (اور اکثر و بیشتر جن گناہوں کی معافی کا ذکر آتا ہے وہ صغائر ہی ہیں جیسے کہ قرآنِ کریم کی بعض آیات سے بھی اشارہ نکلتا ہے) زیادہ تر اس کی وجہ یہ ہے کہ مؤمن کے ذِمّے اوّل تو کبیرہ ہوتا ہی نہیں، ہوتے ہی صغائر ہیں، اس لیے ان چیزوں کی برکت سے صغائر معاف ہو جاتے ہیں اور مؤمن صاف ستھرا ہو جاتا ہے، اور اگر وہ کوئی کبیرہ کر ہی لے تو اس کو توبہ کے بغیر چین نہیں آتا، اور پھر یہ عبادات ایسی ہیں جو اِستغفار کے کلمات پر بھی مشتمل ہوتی ہیں، تو حاصل یہی ہے کہ اگر کوئی شخص نماز کا پابند ہو جائے تو اس کے ذِمّے نہ کبیرہ رہے نہ صغیرہ رہے، اگر صحیح معنی میں اِقامتِ صلوٰۃ کی توفیق ہو جائے تو آدمی کبائر، صغائر سب سے صاف ہو جاتا ہے، اوّل تو کبیرہ کی طرف طبیعت ہی نہیں جائے گی، اور اگر کبھی کبیرہ سرزد ہو بھی گیا تو بغیر توبہ کے انسان رہتا نہیں، پھر جو پابندی کے ساتھ نماز کا عادی ہوتا ہے حقوق اور آداب کے ساتھ ادا کرنے والا ہوتا ہے اس کو توبہ اِستغفار کی عادت بھی ساتھ ہی پڑ جاتی ہے جس سے گناہ کبیرہ بھی معاف ہو سکتا ہے، تو يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ کا یہ معنی بھی ہے کہ کیے ہوئے گناہ ان نیکیوں کی برکت سے معاف ہو جاتے ہیں۔ اور یہ معنی بھی ہے کہ جب نیکیوں کی عادت ڈالو گے تو بُرائیوں کی عادت چھوٹ جائے گی، نیکیاں

---

(۱) مسلم ۱/ ۱۲۲ باب الصلوات الخمس الخ/ مشکوٰۃ ۱/ ۵۷، کتاب الصلوٰۃ کی پہلی حدیث۔

بُرائیوں کو لے جاتی ہیں، کیونکہ نیکی اور بُرائی دونوں آپس میں اس طرح سے ہیں جس طرح سے اندھیرا اور اجالا ہوتا ہے، روشنی اور تاریکی ہوتی ہے، جتنی جتنی روشنی بڑھتی چلی جائے گی اتنی اتنی تاریکی چھٹتی چلی جائے گی، اور جتنی روشنی مدہم ہوتی چلی جائے گی تاریکی آتی چلی جائے گی، گناہوں کے اندر مبتلا رہو گے تو نیکیوں کی توفیق سلب ہوتی چلی جائے گی، ایک گناہ کرنے لگ جاؤ تو اس کے ساتھ بیسیوں گناہ اور پیدا ہوتے چلے جائیں گے، آہستہ آہستہ نیکیوں کا میدان سمٹتا چلا جائے گا، جس طرح سے رات کے آنے کے ساتھ دِن ختم ہوتا چلا جاتا ہے تاریکی بڑھتی چلی جاتی ہے، اور اگر نیکیوں کی عادت ڈالنے کی کوشش کرو گے تو دن بہ دِن گناہوں کی عادت چھوٹتی چلی جائے گی، حتیٰ کہ ایک وقت ایسا آئے گا کہ گناہ کی طرف طبیعت کا رجحان ہی نہیں ہوگا، دل کا ذوق ہی بدل جائے گا، تو اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ کے اندر یہ بات بھی شامل ہے کہ نیکیوں کی عادت ڈالو تاکہ بُرائیاں ختم ہو جائیں، "بیشک نیکیاں بُرائیوں کو لے جاتی ہیں" بُرائیوں کا ارتکاب ہوگیا تو وہ بھی نیکیوں کی برکت سے معاف ہو جاتی ہیں اور اسی طرح سے جب نیکیوں کی عادت پڑتی ہے تو بُرائیوں کی عادت چھوٹ جاتی ہے، جب نیکیوں کی عادت ڈال لی جاتی ہے تو پھر بُرائیاں انسان کے وجود میں رہتی ہی نہیں، "یہ بات یاد رکھنے کی ہے یاد رکھنے والوں کے لئے" ذٰلِكَ ذِكْرٰى لِلذّٰكِرِيْنَ: یہ یادداشت ہے یاد رکھنے والوں کے لئے، یہ نصیحت ہے نصیحت حاصل کرنے والوں کے لئے۔"

مشکلاتِ زندگی سے مقابلہ کرنے کے لئے مؤمن کے پاس دو ہتھیار

وَاصْبِرْ: اور صبر کیجیے۔ اَقِمِ الصَّلٰوةَ اور وَاصْبِرْ ان دونوں باتوں کو ایسے ہی سمجھئے جیسے دوسری جگہ آیا وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ (سورۂ بقرہ: ۴۵) کہ زندگی کی مشکلات کے مقابلے کے لئے مؤمن کے پاس دو ہی ہتھیار ہیں، نماز کی پابندی اور صبر، صبر اور نماز کی پابندی انسان کو روح کو قوت پہنچاتی ہے جس سے ہر قسم کے فتنوں سے مقابلہ کرنے کی صلاحیت انسان میں پیدا ہوتی ہے، صبر کا مفہوم آپ کے سامنے کئی دفعہ ذکر کر دیا گیا، کہ اس میں بہت جامع مفہوم ہے، اصل میں یہ مجاہدہ ہے کہ اپنے نفس کو روک کے رکھو، ایسی باتوں پر نفس کو پابند بناؤ جو اس کو ناگوار ہیں، برداشت کی عادت ڈالو، نیکی کو طبیعت نہیں چاہتی نیکی کرنے کی عادت ڈالو، گناہ چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا چھوڑنے کی عادت ڈالو، مشکلات کو برداشت کرنے کی عادت ڈالو، وَاصْبِرْ کے اندر سب کچھ آگیا، "بے شک اللہ تعالیٰ محسنین کے اجر کو ضائع نہیں کرتے" اس سے معلوم ہوگیا کہ صبر جو مفید ہے جس کی فضیلت ہے وہ وہی ہے جو محسنین کا صبر ہے، بھئی! ایک صبر یہ ہوتا ہے کہ آپ نے شکوہ شکایت کر لی، رو لیا، چلّا لیا، سب کچھ کر لیا، آخر تھک ہار کے صبر کر کے بیٹھ گئے، اس کو صبر نہیں کہتے، صبر وہی ہے کہ جس وقت کوئی تکلیف پیش آئے اس وقت یہ سوچ کے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئی ہے، اسی کے اندر حکمت ہے، اسی کے اندر مصلحت ہے اس کو برداشت کرنے کی کوشش کرو، یہ محسنین کا صبر ہے۔

قومیں کیوں تباہ ہوتی ہیں؟

فَلَوْلَا كَانَ مِنَ الْقُرُوْنِ: اس میں پہلی بستیوں کے بربادی کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ان کے اوپر بربادی کیوں آئی؟ اس

لیے آئی کہ ان میں فساد عام ہو گیا تھا، فساد کو مٹانے والے روکنے والے رہے نہیں تھے، اگر ان میں اتنے نیک لوگ موجود ہوتے جو ان کو فساد سے روکتے رہتے تو ان نیکوں کے برکت سے بُرے بھی بچے رہتے، لیکن جب سارے فساد کرنے والے ہی ہو گئے اور ان میں اتنے سمجھدار لوگ رہے ہی نہیں جو ماحول پر اثر انداز ہوں، اور عام طور پر ماحول فاسد ہو گیا، تو پھر جو قدرے قلیل، تھوڑے سے اچھے ہوتے ہیں ہم ان کو بچا لیتے ہیں، باقی اکثریت برباد ہو جاتی ہے، جب کسی معصیت کے متعلق جمہوری فیصلے ہو جاتے ہیں پھر تو گویا کہ ماحول پر معصیت ہی طاری ہو گئی، جب معصیت طاری ہو گئی تو پھر اس قسم کا فاسد ماحول اللہ تعالیٰ باقی نہیں رکھتے، ہاں! البتہ اگر اس میں کچھ نیک لوگ باقی رہیں جو کہ نیکی کی تلقین کرتے رہیں بُرائی کے سامنے رکاوٹ بنے رہیں تو پھر ان کی برکت سے بچاؤ ہو جاتا ہے، تو ''پہلی جماعتیں جتنی گزری ہیں ان کے اندر ایسے سمجھدار لوگ نہ ہوئے جو فساد فی الارض سے روکتے سوائے کچھ لوگوں کے جن کو ہم نے ان میں سے بچا لیا'' یعنی وہ اتنی قلیل مقدار تھی جو نہ ہونے کے برابر تھی، اور عام ماحول فاسد ہو گیا، جس سے معلوم ہو گیا کہ انفرادی غلطی عذاب کا باعث بہت کم بنتی ہے، قومیں جو برباد ہوتی ہیں تو انفرادی غلطی سے نہیں ہوتیں، ایسے گناہوں سے برباد ہوتی ہیں جن کا اثر سارے معاشرے پر پڑ جاتا ہے، جس طرح سے ہمارے ہاں آج کل آپ دیکھتے ہیں کہ ایک ہے انفرادی عمل کہ کسی نے چوری چھپے رشوت لے لی یہ اس کا انفرادی عمل ہے، اس قسم کے انفرادی عمل کے ساتھ عموماً قومیں مشکلات میں مبتلا نہیں ہوا کرتیں، اور ایک ہے کہ عام ذوق ہی بن گیا کہ اب رشوت کو اپنا حق سمجھنے لگ گئے اور علی الاعلان لیتے ہیں، نہ کسی چھوٹے سے شرم نہ کسی بڑے سے شرم، اور نیچے سے لے کر اوپر تک سارے کے سارے افسر اس میں شریک ہیں، سب کے اس میں حصے ہیں، تو یہ فساد جو تھا ساری قوم میں سرایت کر گیا، جب اس قسم کا فساد ساری قوم میں سرایت کر جاتا ہے پھر اس کی نحوست ساری قوم پر پڑتی ہے، اور اگر قوم کا اجتماعی ماحول تو اچھا رہے اور کوئی انفرادی طور پر غلطی کرنے والا ہو تو اس کی سزا میں ساری قوم مبتلا نہیں ہوا کرتی، جب ساری قوم کا مزاج فاسد ہو جاتا ہے کہ گناہ کو گناہ نہ سمجھیں، بلکہ گناہ سے روکنے والے ان کو بُرے لگنے لگ جائیں اور سب کا ذوق ہی فساد کی طرف چلا جائے ایسے وقت میں پھر قوم پر تباہی آیا کرتی ہے۔ وَاتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَآ اُتْرِفُوْا فِيْهِ: ظالموں نے اتباع کی اسی خوش حالی کی جو انہیں دی گئی تھی، مَآ اُتْرِفُوْا فِيْهِ یعنی جو عیش دیے گئے تھے اسی کی انہوں نے اتباع کی، اور وہ جرم کرنے والے تھے۔ ''تیرا ربّ ایسا نہیں کہ بستیوں کو ہلاک کر دے ظلم کے سبب سے'' اس کا مفہوم دونوں طرح سے آپ کے سامنے واضح کر دیا گیا، ''اس حال میں کہ اس کے اہل مصلح ہوں'' یعنی اگرچہ وہ کفر و شرک میں مبتلا ہیں لیکن رجحان ان کا اصلاحِ احوال کی طرف ہے تو ایسے وقت میں اللہ مہلت دیتا ہے، ایسے وقت میں کفر و شرک کی وجہ سے برباد نہیں کرتا، ہاں البتہ جس وقت وہ مفسد بن جائیں، فساد مچانے لگ جائیں، صلاح کی طرف ان کی توجہ ہی نہ ہو، وہ درست ہونا ہی نہ چاہیں، ان میں فساد ہی فساد آ جائے، تو پھر ایسے معاشرے کو باقی رکھنے کی ضرورت نہیں ہوتی، پھر اللہ برباد کر دیتا ہے۔

آپس کا اختلاف اللہ کی حکمت کا تقاضا کیوں ہے؟

اگلی آیت پھر حضور ﷺ کی تسلی کے لئے ہی ہے، کہ اگر اللہ چاہتا تو سب کو ایک ہی طریقے پر بنا دیتا، لیکن اللہ کی حکمت یہی ہے کہ انسان کو اختیار اور عقل و ہوش دے کر چھوڑ دیا ہے جس کے نتیجے میں یہ آپس میں اختلاف بھی کریں گے، بعض حق کو قبول کریں گے بعض قبول نہیں کریں گے، ہاں! البتہ جس پر تیرے رَبّ کا رحم ہو گیا، اللہ کی رحمت جس کو شامل ہو گئی وہ حق کو قبول کرے گا، وہ حق سے اختلاف نہیں کرے گا۔ اور اسی قسم کے مختلف احوال کے لئے اللہ نے انہیں پیدا کیا ہے، تکوین اسی لیے ہے، اگرچہ اللہ تعالیٰ کا تشریعی ارادہ سب بندوں سے یہی ہے کہ وہ عبادت کریں اور نیکی کی طرف آئیں، لیکن اختیار دے کے، ہوش اور عقل دے کے جب ان کو چھوڑ دیا گیا تو خلقی طور پر ہی ان کے اندر گویا کہ یہ صلاحیت رکھی گئی ہے کہ یہ سارے ایک طریقے پر نہیں رہیں گے، کسی کا ذوق کسی طرف کو جائے، کسی کی عقل فہم اس کو کسی طرف لے جائے گی، اختلافات ہوں گے، اور اللہ تعالیٰ کی اس میں کچھ حکمت بھی ہے تاکہ ہر قسم کی صفات کا ظہور ہو جائے، جیسے غالباً حافظ شیرازی کا شعر ہے وہ فرماتے ہیں کہ:

در کارخانۂ عالَم از کُفر ناگزیر است دوزخ کرا بسوزد گر بولہب نباشد

جب اللہ تعالیٰ نے اپنی صفات کا ظہور کرنا ہے تو آخر اس میں بُرے بھی ہوں گے جن کے اوپر اللہ تعالیٰ کی ان صفات کا ظہور ہو گا جو کہ جلالی ہیں، اور اچھے بھی ہوں گے جن کے اوپر اللہ کی ان صفات کا ظہور ہو گا جو کہ جمالی ہیں، ہر قسم کی صفات کا ظہور ہو جائے گا، اور اسی اختلاف کے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں رونق بنا رکھی ہے، جیسے ذَوق کا شعر ہے:

گلہائے رنگا رنگ سے ہے رونقِ چمن اے ذوق! اس جہاں کو ہے زیب اختلاف سے

اگر سارے کے سارے انسان ایک ہی طرح کے ہوتے، شکلوں کا اختلاف نہ ہوتا، قد و قامت کا اختلاف نہ ہوتا، رنگ رُوپ کا اختلاف نہ ہوتا، تو کہاں رونق معلوم ہوتی؟ ایک باغ کے اندر مختلف قسم کے پھول ہوتے ہیں تو باغ اچھا لگتا ہے، اور ایسے ہی مختلف احوال ہیں کوئی کچھ کرتا ہے، کوئی کسی کام کو پسند کرتا ہے، کوئی کسی کام کو پسند کرتا ہے، جس طرح سے اللہ تعالیٰ نے اخلاق میں عادات میں حالات میں اختلاف رکھا ہے، باطنی صلاحیتوں میں بھی اسی طرح سے اختلاف ہے، کوئی کوئی راستہ اختیار کرے گا، کوئی کوئی راستہ اختیار کرے گا، ہاں جو البتہ کُفر کو اختیار کریں گے حق سے اختلاف کرتے ہوئے، اللہ تعالیٰ ان سب کو لے کر چاہے وہ جنوں میں سے ہوں چاہے انسانوں میں سے ہوں، ان کے ساتھ جہنّم کو بھر دے گا۔ لَاَمْلَـَٔنَّ جَهَنَّمَ: البتہ ضرور بھروں گا میں جہنّم کو جنوں اور انسانوں کو اکٹھا کر کے، یعنی جو شیطان کے متبع ہوں گے، حق سے اختلاف کریں گے۔

باقی! ان واقعات کے اندر حکمت واضح کر دی کہ یہ واقعات جو ہم آپ کے سامنے بیان کرتے ہیں انبیاء ؊ کے، یہ آپ کے لئے دل کی تثبیت کا ذریعہ ہیں، اس سے دل مضبوط ہوتا ہے، دل مضبوط ہونے کا طریقہ وہی جو میں نے آپ کی خدمت میں عرض کیا کہ جب انبیاء ؊ کے حالات سنیں گے کہ انہوں نے کس طرح سے حق کے لئے تکلیفیں اٹھائیں، قوم نے ان کی کس

طرح سے مخالفت کی، تو اپنا حوصلہ بھی بڑھتا ہے، اوران واقعات کے ساتھ حق بھی نمایاں ہوتا ہے، کہ اس سے پتا چل گیا کہ توحید کا نظریہ حق ہے اور شرک غلط ہے، اور کس قسم کا کردار اچھا ہے کس قسم کا کردار بُرا ہے، کون سے کردار کے نتیجے میں نجات ہوتی ہے کون سے کردار کے نتیجے میں بربادی آتی ہے، واقعات کے ساتھ یہ حق بالکل نمایاں ہوجاتا ہے۔ اوران میں بُرائی سے روکنے کا سامان موجود ہے، نیکی کی ترغیب موجود ہے لیکن فائدہ مؤمنین اُٹھاتے ہیں۔ آگے آخری فیصلے کی بات کہہ دی کہ جو ایمان نہیں لاتے ہر طرح سے سمجھانے کے باوجود، انہیں کہہ دیجیے کہ بہت اچھا، تم اپنی جگہ کام کرتے رہو، میں اپنی جگہ عمل کرنے والا ہوں، تم بھی انجام کا انتظار کرو، ہم بھی انتظار کرنے والا ہیں، ہر کسی کے سامنے اس کا انجام آجائے گا۔ ''اورزمین وآسمان کی مغیبات سب اللہ کے لئے ہیں، ان کا علم بھی اللہ کے پاس ہے، اسی کی طرف ہر اُمر لوٹایا جاتا ہے، پس تو اسی کی عبادت کر اور اسی پہ بھروسا کر'' آپ تو اسی کی عبادت پر جمے رہیے، اوراسی کے اوپر بھروسا کیجئے، ''تیرا رَبّ بے خبر نہیں ان کاموں سے جو تم کرتے ہو۔''

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

سورۃ یوسف
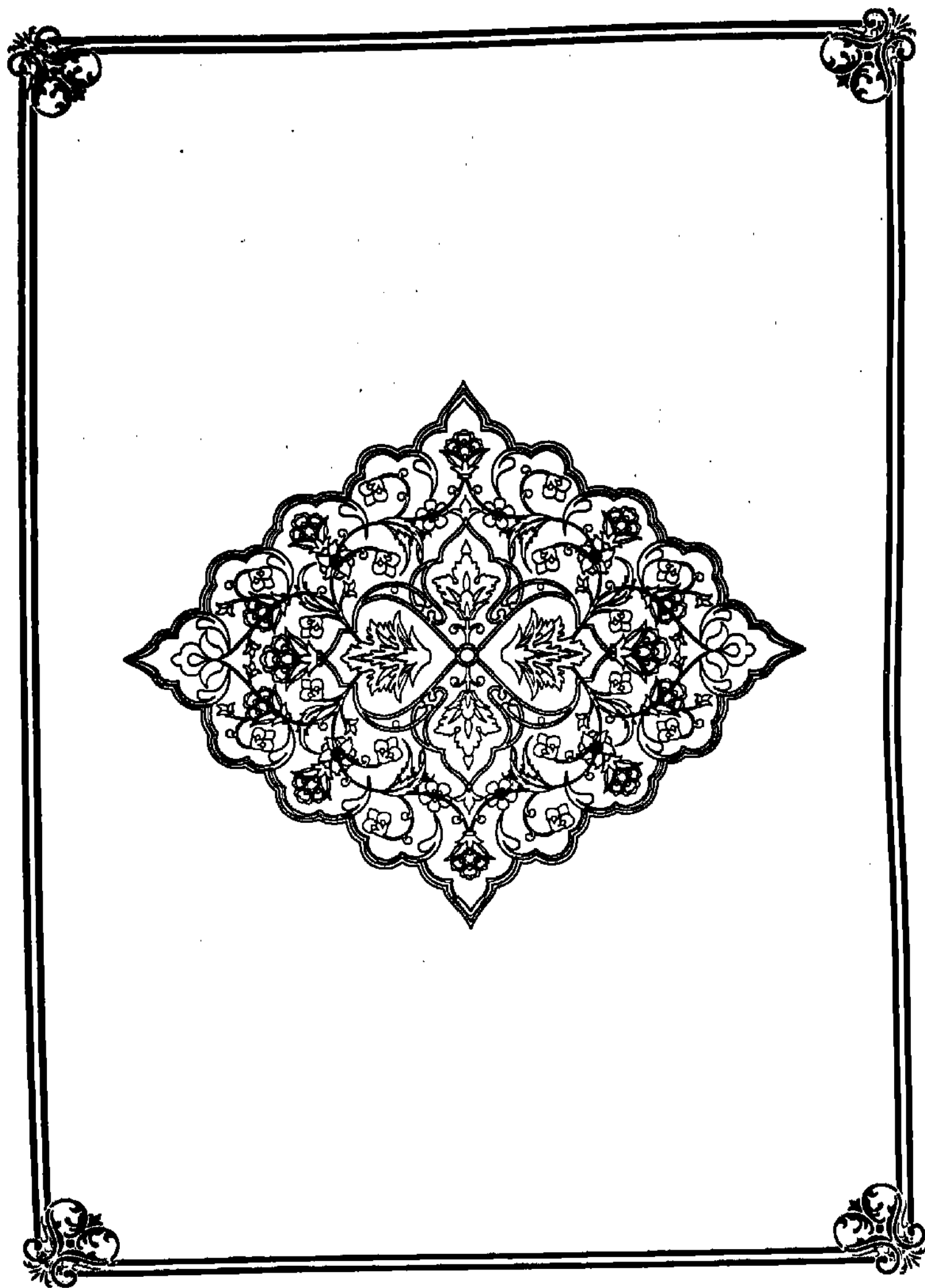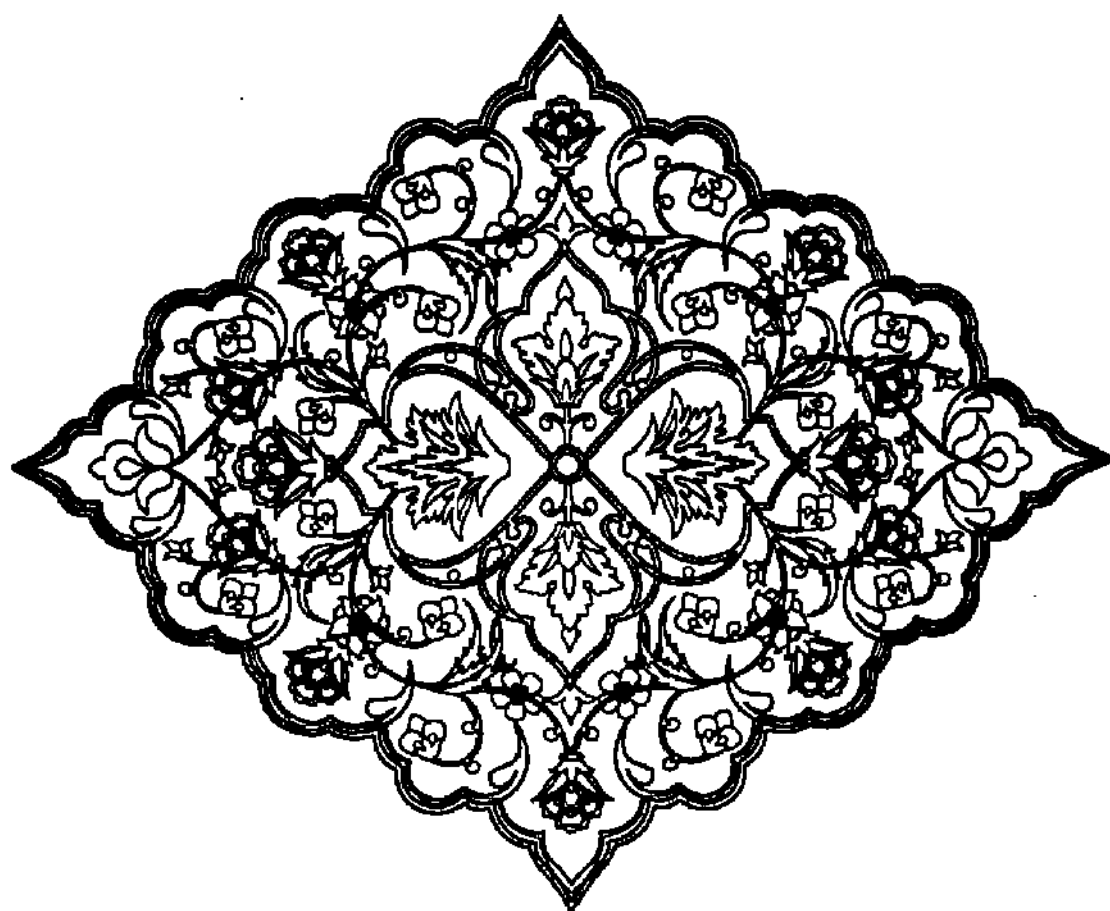
آيَاتُهَا ۱۱۱ ۱۲ سُوْرَةُ يُوْسُف مَكِّيَّةٌ ۵۳ رُكُوْعَاتُهَا ۱۲

سورۂ یوسف مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی ایک سو گیارہ آیتیں ہیں اور بارہ رُکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

الٓرٰ ۚ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ۞ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۞ نَحْنُ

الٓرٰ- یہ واضح کتاب کی آیتیں ہیں ① بیشک اُتارا ہم نے اس کتاب کو اس حال میں کہ یہ عربی قرآن ہے تاکہ تم سمجھو ② ہم

نَقُصُّ عَلَيْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ هٰذَا الْقُرْاٰنَ ۖ وَاِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهٖ

بیان کرتے ہیں آپ پر بہترین واقعہ بسبب ہمارے وحی کرنے کے آپ کی طرف یہ قرآن، اور بیشک تھے آپ اس سے قبل

لَمِنَ الْغٰفِلِيْنَ ۞ اِذْ قَالَ يُوْسُفُ لِاَبِيْهِ يٰۤاَبَتِ اِنِّيْ رَاَيْتُ اَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا

البتہ بے خبروں میں سے ③ جس وقت کہ یوسف نے اپنے باپ سے کہا اے اَبا جان! بیشک دیکھا میں نے گیارہ ستاروں کو

وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ رَاَيْتُهُمْ لِيْ سٰجِدِيْنَ ۞ قَالَ يٰبُنَيَّ لَا تَقْصُصْ رُءْيَاكَ

اور سورج اور چاند کو میں نے دیکھا ان کو اپنے لیے سجدہ کرنے والے ④ یوسف کے باپ نے کہا: اے بیٹے! مت بیان کر اپنا خواب

عَلٰۤى اِخْوَتِكَ فَيَكِيْدُوْا لَكَ كَيْدًا ۭ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۞ وَكَذٰلِكَ

اپنے بھائیوں پر، پھر وہ کوئی سازش کریں گے تیرے لیے سازش کرنا، بیشک شیطان انسان کے لئے واضح دشمن ہے ⑤ اور ایسے ہی

يَجْتَبِيْكَ رَبُّكَ وَيُعَلِّمُكَ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ وَيُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ وَعَلٰۤى اٰلِ يَعْقُوْبَ

چُنے گا تجھے تیرا رَبّ، اور سکھائے گا تجھے باتوں کا ٹھکانے لگانا، اور پوری کرے گا اپنی نعمت تجھ پر اور آلِ یعقوب پر

كَمَآ اَتَمَّهَا عَلٰۤى اَبَوَيْكَ مِنْ قَبْلُ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ ۭ اِنَّ رَبَّكَ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۞ ع

جس طرح سے پوری کی وہ نعمت تیرے باپ دادے پر اس سے قبل یعنی ابراہیم اور اسحاق پر، بیشک تیرا رَبّ علم والا ہے حکمت والا ہے ⑥

خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ سورۂ یوسف مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی ایک سو گیارہ آیتیں اور اور بارہ رُکوع ہیں۔

الٓرٰ: حروف مقطعات، اللهُ اَعْلَمُ بِمُرَادِهٖ بِذٰلِكَ، ان حروف سے اللہ کی جو مراد ہے وہ اللہ ہی بہتر جانتے ہیں، تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ: یہ واضح کتاب کی آیتیں ہیں، اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا: بے شک اتارا ہم نے اس کتاب کو اس حال میں کہ یہ عربی قرآن ہے، لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ: تاکہ تم سوچو، سمجھو، نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ: ہم بیان کرتے ہیں آپ پر احسن القصص۔ قصص مصدر ہے مقصوص کے معنی میں۔ احسن القصص: بہترین واقعہ، بہترین قصہ۔ ''ہم بیان کرتے ہیں آپ پر بہترین واقعہ'' بِمَآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ هٰذَا الْقُرْاٰنَ: مَا مصدر یہ۔ بسبب ہمارے وحی کرنے کے آپ کی طرف یہ قرآن، یعنی یہ قرآن ہم آپ کی طرف جو وحی کر رہے ہیں تو اسی وحی کے سبب سے، وحی کے ذریعے سے ہم آپ پر بہترین سرگزشت، بہترین واقعہ بیان کرتے ہیں، وَاِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الْغٰفِلِيْنَ: اِنْ یہ مخففہ ہے من المثقلہ، اور بیشک تھے آپ اس سے قبل البتہ بے خبروں میں سے، اس سے پہلے یعنی ہمارے وحی کے ذریعے سے اس واقعہ کو بیان کرنے سے قبل آپ بے خبروں میں سے تھے، آپ کو اس واقعہ کی کوئی خبر نہیں تھی، اِذْ قَالَ يُوْسُفُ لِاَبِيْهِ: قابل ذکر ہے وہ وقت جس وقت کہ یوسفؑ نے اپنے باپ سے کہا، يٰٓاَبَتِ: اے اَبّا جان! اِنِّيْ رَاَيْتُ اَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا: بیشک دیکھا میں نے گیارہ ستاروں کو، وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ: سورج اور چاند کو، رَاَيْتُهُمْ لِيْ سٰجِدِيْنَ: میں نے دیکھا ان کو اپنے لئے سجدہ کرنے والے، قَالَ يٰبُنَيَّ: یوسف کے باپ نے کہا، يٰبُنَيَّ: اے بیٹے! لَا تَقْصُصْ رُءْيَاكَ: مت بیان کر اپنا خواب، عَلٰٓى اِخْوَتِكَ: اپنے بھائیوں پر، اخوة اخ کی جمع ہے، فَيَكِيْدُوْا لَكَ كَيْدًا: پھر وہ کوئی مکر کریں گے تیرے لئے مکر کرنا، کوئی سازش کریں گے تیرے لئے سازش کرنا، کید خفیہ تدبیر کو کہتے ہیں، اِنَّ الشَّيْطٰنَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ: بیشک شیطان انسان کے لئے واضح دشمن ہے، وَكَذٰلِكَ يَجْتَبِيْكَ رَبُّكَ: اور ایسے ہی چُنے گا تجھے تیرا رب، وَيُعَلِّمُكَ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ: اور سکھائے گا تجھے باتوں کو ٹھکانے لگانا، تاویل الاحادیث: باتوں کو ٹھکانے لگانا، احادیث کا مصداق خواب بھی ہو سکتے ہیں کہ خوابوں کی تعبیر اللہ تعالیٰ تجھے بتائے گا، کہ آپ خواب سنیں گے تو اس کے بعد اس کے ہر جزء کو اس کے واقعے پر محمول کر لیا کریں گے، اور تاویل الاحادیث کا مفہوم اس سے عام ہے اللہ تعالیٰ اس قسم کی فہم سمجھ بصیرت دے گا کہ جو بات بھی آپ کے سامنے آئے گی آپ اس کی حقیقت تک پہنچ جایا کریں گے، واقعات سے حقائق اخذ کر لینا، باتوں سے حقیقت تک پہنچ جانا، باتوں کا ٹھکانے لگا دینا، یہ مفہوم عام ہے جس کے اندر تعبیر رؤیا بھی آجائے گی، خواب سُن کے اس کو صحیح موقع پر محمول کر لینا اور اس کی صحیح تعبیر دے دینا وہ بھی اس کے مفہوم میں شامل ہے ''سکھائے گا اللہ تعالیٰ تجھے باتوں کا ٹھکانے لگانا'' وَيُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ: اور پوری کرے گا اللہ تعالیٰ اپنی نعمت تجھ پر، وَعَلٰٓى اٰلِ يَعْقُوْبَ: اور آلِ یعقوب پر، كَمَآ اَتَمَّهَا عَلٰٓى اَبَوَيْكَ مِنْ قَبْلُ: جس طرح سے پوری کی وہ نعمت اللہ تعالیٰ نے تیرے ابوین پر، باپ دادے پر اس سے قبل، اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ: یعنی ابراہیم اور اسحاق پر، یہ ابوین کا مصداق آگئے، اسحاق دادا ہیں اور ابراہیم پردادا ہیں، کیونکہ یوسف علیہ السلام کے والد کا نام یعقوب، اور ان کے والد کا نام اسحاق، اور ان کے والد کا نام ابراہیم علیہم السلام۔ یوسف بن یعقوب بن اسحاق بن ابراہیم۔ اِنَّ رَبَّكَ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ: بیشک تیرا رب علم والا ہے حکمت والا ہے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

تفسیر

ماقبل سورۃ سے ربط

سورۂ ہود کے اندر بہت سارے واقعات تفصیل سے نقل کیے گئے، ان واقعات میں جس قسم کی حکمتیں تھی ان کو آخری رُکوع میں ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا گیا تھا وَکُلًّا نَّقُصُّ عَلَیْکَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِہٖ فُؤَادَکَ ۚ وَجَآءَکَ فِیْ ھٰذِہِ الْحَقُّ وَمَوْعِظَۃٌ وَّذِکْرٰی لِلْمُؤْمِنِیْنَ جس کا حاصل یہ تھا کہ یہ واقعات تثبیتِ قلب کا ذریعہ بھی بنتے ہیں، اور ان واقعات کے ساتھ حق بھی نمایاں ہوتا ہے، اور یہ واقعات موعظہ اور ذکریٰ بھی ہیں، گناہوں سے بچنے کے لئے یہ وعظ ہیں، اور اور نیکی کی ترغیب کے لئے ذکریٰ ہیں، اور ان سب واقعات میں یہ چیز دکھائی گئی تھی کہ حق و باطل کا تصادم جب ہوتا ہے تو اللہ تبارک وتعالیٰ حق کا ساتھ دیتے ہیں اور حق والے کامیاب ہوتے ہیں، دنیا اور آخرت کے اندر سرخروئی حق والوں کو ہی حاصل ہوتی ہے اور باطل پرست دنیا کے اندر بھی ذلیل ہوتے ہیں، اور ان کی آخرت بھی برباد ہوتی ہے۔ اور پچھلے واقعات نقل کرنے کے بعد اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ سبق بھی دیا تھا کہ وَاصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰہَ لَا یُضِیْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِیْنَ آپ بھی اپنے طریقے پہ جمے رہیے، صبر کے ساتھ ان حالات کا مقابلہ کیجیے، بیشک اللہ تعالیٰ محسنین کے اجر کو ضائع نہیں کرتے۔ اگلی سورت کے اندر بھی ایک واقعہ ہی تفصیل کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے، یہ وہ واقعہ ہے جس کو ''داستانِ یوسف'' کہتے ہیں، علیہ السلام، اس میں بھی اللہ تبارک وتعالیٰ اسی قسم کی حقیقت کو نمایاں کرنا چاہتے ہیں کہ جو شخص اللہ کا مقبول ہوتا ہے اور اللہ کی نصرت اس کے ساتھ ہوتی ہے ظاہری طور پر حالات اس کے خلاف کتنے ہی کیوں نہ ہوجائیں لیکن آخرکار کامیاب وہی ہوتا ہے، حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ بھائیوں نے عداوت کی، باپ سے ان کو جدا کیا، کنویں کے اندر پھینکا، غلام بنا کے بیچا، اور پھر اخلاقی طور پر متہم کرکے جیل کے اندر ڈالا گیا، سارے کے سارے حادثات ہیں جو حضرت یوسف علیہ السلام کی زندگی میں درجہ بدرجہ پیش آئے، لیکن چونکہ اللہ کے نیک بندے تھے، اللہ کے ساتھ تعلق تھا، صبر واستقامت کے ساتھ ان حالات کا مقابلہ کیا، تو یہ واقعات جو بظاہر ان کے ساتھ دشمنی کے طور پر پیش آرہے تھے حقیقت کے اعتبار سے یہی ترقی کا زینہ بن گئے، اور آخرکار اللہ تعالیٰ نے ان کو بادشاہت تک پہنچایا، دنیا کی عزت بھی دی اور آخرت کی عزت تو ہے ہی، اور مخالفین کس طرح سے نادم اور شرمسار ہو کے آخر سرجھکا کے سامنے آگئے۔

واقعۂ یوسف کے ضمن میں سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے مستقبل کا نقشہ

تو اس میں سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی حقیقت کے اعتبار سے مستقبل کا نقشہ دکھایا جا رہا ہے، چنانچہ آنے والے حالات نے تصدیق کردی کہ حضرت یوسف علیہ السلام کا واقعہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعے کے ساتھ کس طرح سے مطابقت رکھتا ہے، آپ کے متعلق بھی دار الندوہ میں قتل کا مشورہ ہوا، مشورہ کرنے والے سارے بھائی بند ہی تھے، برادری کے لوگ ہی تھے، کوئی پرائے نہیں تھے، اجنبی نہیں تھے، اور پھر آپ وہاں سے نکلے تو غارِ ثور کے اندر جا کے چھپے، یہ بھی ایسے ہی تھا جس طرح سے اندھیرے کنویں میں

یوسف علیہ السلام کو ڈال دیا گیا، پھر وہاں سے آپ نکلے، مدینہ منورہ میں پہنچے، اور مدینہ منورہ میں جانے کے بعد اللہ تبارک وتعالیٰ نے آپ کو ظاہری طور پر بھی سلطنت دی، بادشاہت دی اور غلبہ دیا، اور ایک وقت آیا کہ یہی لوگ جو قتل کے مشورے کرنے والے اور آپ کو شہر سے نکالنے والے تھے یا نکالنے کا ذریعہ بننے والے تھے، ایک وقت آیا کہ سرورِ کائنات ﷺ کے سامنے اسی طرح سے شرمسار اور نادم ہوئے سر جھکائے کھڑے ہیں، چنانچہ اُس موقع پر حضور ﷺ نے ان سے پوچھا تھا، یعنی فتح مکہ کے موقع پر جب یہ سارے کے سارے لوگ مجرمانہ حیثیت سے سامنے آگئے، تو آپ ﷺ نے پوچھا تھا کہ بتلاؤ آج میں تمہارے ساتھ کیا برتاؤ کروں؟ تو انہوں نے کہا کہ ''اخ کریمٌ، ابنُ اخٍ کریمٍ'' کہ آپ ہمارے بہت بھلے بھائی ہیں، بہت بھلے بھائی کے بیٹے ہیں، مطلب یہ ہے کہ ہم آپ سے کرم کی ہی اُمید رکھتے ہیں، تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں تمہیں آج وہی بات کہتا ہوں جو یوسف نے اپنے بھائیوں سے کہی تھی لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ آج تم پر کوئی کسی قسم کی ملامت نہیں، اِذْهَبُوْا فَاَنْتُمُ الطُّلَقَاءُ: جاؤ، اب تم سب آزاد ہو، کسی کے اوپر کوئی کسی قسم کی گرفت نہیں ہے۔[1] تو انجام کار جیسے اللہ تعالیٰ نے یوسف علیہ السلام کو ان کے بھائیوں پہ غلبہ دیا اور بھائی نادم اور شرمسار ہوئے، تو اسی طرح سے سرورِ کائنات ﷺ کے مخالفین جو تھے وہ بھی آپ کے سامنے نادم اور شرمسار ہوئے، تو اس واقعے کے ضمن میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے سرورِ کائنات ﷺ کو آپ کے مستقبل کا گویا کہ مطالعہ کروا دیا کہ آپ کے ساتھ بھی ایسے ہی ہونے والا ہے، اور اسی طرح سے اللہ تعالیٰ آپ کو عزت سے نوازے گا جس طرح سے یوسف علیہ السلام کو نوازا۔

سورۃ یوسف کا شانِ نزول

اس سورۃ کے شانِ نزول میں مختلف روایات ذکر کی گئی ہیں لیکن حاصل سب کا تقریباً ایک سا ہی ہے، کہ مشرکینِ مکہ نے یہود سے سیکھ کر سرورِ کائنات ﷺ پر ایک تاریخی سوال کیا تھا، کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے علاقے سے ہجرت کر کے گئے تو شام میں آباد ہوئے تھے، اور آپ کی اولاد شام کے علاقے میں ہی پھیلی تھی، تو پھر یہ اسرائیلی مصر میں کس طرح سے چلے گئے، اور مصر میں ان کے جانے کا کیا سبب تھا؟ عام سورتوں میں جو یہ ذکر کیا جارہا ہے کہ یہ فرعون کے غلام بنے، فرعون ان کے اوپر زیادتیاں کرتا تھا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کو آزادی دلائی، تو یہ مصر کے اندر کس طرح سے چلے گئے، وہاں جا کے یہ کیونکر آباد ہوئے؟ یہ ایک تاریخی سوال تھا، اور آپ جانتے ہیں کہ سرورِ کائنات ﷺ نے تو کوئی تاریخ نہیں پڑھی تھی، نہ کوئی گزشتہ کتابوں کا مطالعہ کیا تھا، اور نہ مکہ معظمہ کے رہنے والے لوگ ہی اس قسم کے واقعات کو جانتے تھے، اگر رسول اللہ ﷺ نے یہ بات پہلے سے کچھ سنی ہوتی، یا پہلے آپ کے علم میں ہوتی تو کبھی آپ کی زبان پر پہلے بھی اس قسم کے واقعات آتے، قوم بھی غافل تھی، مکہ کے رہنے والے لوگ اُمّی تھے، وہ کوئی تعلیم یافتہ نہیں تھے، ان کو بھی کوئی واقفیت نہیں تھی اور آپ کو بھی کوئی کسی قسم کی واقفیت نہیں تھی، تو اس سوال کا جواب سرورِ کائنات ﷺ نے اللہ کی تلقین کے ساتھ اتنا واضح دیا کہ جس میں کہیں اُنگلی رکھنے کی جگہ نہ رہی، تو یہ دلیل بن جائے گی سرورِ کائنات ﷺ کی نبوّت کی، جس میں یہ ساری کی ساری حقیقت نمایاں ہوگئی کہ وحی کے ذریعے سے آپ کو یہ حالات بتائے

---

(۱) السنن الکبریٰ للبیہقی ج۹ ص۱۹۹، باب فتح مکہ/ نیز دیکھیں تفسیر مظہری، تفسیر رازی وغیرہ، سورۃ النصر کے تحت۔

گئے ہیں، اور اتنے صاف ستھرے اور اتنے مرتبط، اور سبق آموز! کہ توراۃ میں اور یہود کی دوسری کتابوں میں بھی اتنی تفصیل کے ساتھ یہ واقعہ مذکور نہیں، اگر ہیں تو کچھ منتشر اجزا ہیں، جن کے اندر ربط پیدا کرنا بھی مشکل ہو جاتا ہے ایک داستان سرائی جس طرح سے ہوتی ہے، تو اس میں بہت سارے حقائق مخفی رہ گئے، قرآنِ کریم نے اس واقعہ کے اہم اہم اجزا کو ترتیب وار ذکر کیا ہے، جس سے ایک حقیقت نکھر کے سامنے آ گئی کہ حضرت یوسف علیہ السلام کا کیا واقعہ تھا، اور اسرائیلی شام سے مصر کی طرف کس طرح سے منتقل ہوئے، تو اس تاریخی سوال کا جواب بھی آ گیا، اور سوال کرنے والوں کے لئے یہی اس میں نشانی تھی کہ اگر وہ چاہتے تو حضور ﷺ کی حقانیت اور آپ کی نبوت کو سمجھ جاتے، کہ بغیر وحی کی تلقین کے اس قسم کے واقعات کو ذکر نہیں کیا جا سکتا۔

قصۂ یوسف کو ''احسن القصص'' کہنے کی مختلف وجوہات

اور یہی چیزیں ہیں جن کی بنا پر اس واقعے کو ''احسن القصص'' کے ساتھ تعبیر کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ایک بہترین واقعہ، ایک بہترین سرگزشت ہم آپ کو سناتے ہیں، اور یہ سرگزشت بہترین اسی طرح سے ہے کہ ایک تو اس میں آپ ﷺ کی نبوت کی دلیل بہت واضح ہوگئی، اور آپ کے مخالفین کے سامنے بھی ایک آئینہ رکھ دیا گیا کہ تم بھی یوسف علیہ السلام کے بھائیوں اور یوسف علیہ السلام کے واقعہ میں غور کرو، آخر دیکھ لینا تمہارے ساتھ بھی اسی طرح سے ہوگا اگر تم اپنے اس بھائی کی قدر نہیں کرو گے جو اللہ تبارک وتعالیٰ نے تمہاری برادری میں سے ہی اٹھایا ہے اور اُس کو نبی بنایا ہے، اگر بے قدری کرو گے جس طرح سے یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے بے قدری کی تھی تو یہ تمہارے لیے ذلت ورسوائی کا باعث بنے گی، تو مشرکین مکہ کے لئے بھی اس میں ہدایت تھی، اور حضور ﷺ کے صحابہ کے لئے بھی اس میں دل کی قوت تھی کہ جب اللہ تعالیٰ کی نصرت شاملِ حال ہوتی ہے تو مخالف حالات میں بھی کس طرح سے انسان کو کامیابی سے ہمکنار کر دیا جاتا ہے۔ اور اس میں یہ حقیقت بھی آ جائے گی کہ اللہ کی تقدیر کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا، اور جو لوگ بھی اللہ کی تقدیر کے ساتھ ٹکرایا کرتے ہیں آخر رُسوا ہوتے ہیں، وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰٓى اَمْرِهٖ یہ معاملہ بالکل کھل کے آ جائے گا کہ اللہ تعالیٰ جب کسی بات کا قصد کر لیتے ہیں تو پھر وہی غالب رہتے ہیں اور ان کے کسی فیصلے کو روکا نہیں جا سکتا۔ حسد کرنے والے، کسی دوسرے کے کمال پہ جلنے والے، سارے کے سارے خود رُسوا ہوتے ہیں، ان کو خود شرمساری ہوتی ہے، حسد کے ساتھ محسود کو کوئی کسی قسم کا نقصان نہیں ہوا کرتا بلکہ حاسد ہی نقصان میں رہتا ہے، اس واقعے کے اندر یہ پہلو ہیں جو نمایاں کیے جا رہے ہیں۔ اور پھر عام طور پر لوگ ایسے واقعات میں زیادہ لطف محسوس کیا کرتے ہیں جن کے اندر حسن، جمال، عاشق، معشوق وغیرہ کا تذکرہ ہو، اس قسم کی داستانیں لذیذ سمجھی جاتی ہیں، ہمیشہ ہر دور میں اس قسم کی باتوں کو لوگ زیادہ لطف کے ساتھ سنا کرتے ہیں، لیکن جو واقعات بھی ایسے ہوں جن کے اندر حسن، جمال اور عاشق، معشوق اور اس قسم کی چیزیں ذکر کی جائیں عموماً لوگوں کی بداخلاقی کو بھڑکانے والے اور بداخلاقی کی طرف ابھارنے والے واقعات ثابت ہوتے ہیں، چنانچہ عاشقانہ ناول اور عاشقانہ قصے جتنے ذکر کیے جاتے ہیں، پڑھتے جائیں گے تو ان کا اخلاق کے اوپر بُرا اثر پڑتا ہے، اسی قسم کے جذبات انسان کے اندر بھڑکتے ہیں، تو اللہ تعالیٰ نے اس واقعے کے اندر حسن وجمال کی داستان کو بھی پیش کیا ہے، عاشق معشوق کے قصے بھی اس میں

آئے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت کے تحت ان کو اس طرح سے بیان کیا ہے کہ جس میں انسان کو پاک دامنی اور پاکیزگی کی تلقین ہوتی ہے، اور اس بات کی اہمیت سمجھ میں آتی ہے کہ اپنی شہوات کے پیچھے چلنے والے اچھے نہیں ہوتے، اور جو اپنی شہوات کے اوپر کنٹرول کرتے ہیں اور سخت سے سخت امتحان میں ثابت قدم رہتے ہیں، یہ ثابت قدمی ان کے لئے عزت کا باعث بنتی ہے، دنیا اور آخرت کے اندر سرخروئی کا باعث بنتی ہے، تو یہ واقعہ اس انداز سے بیان کیا جائے گا کہ اخلاق کی پاکیزگی کی اہمیت انسان کے سامنے آئے گی، یہ نہیں کہ اس قسم کے واقعات کو سن کر انسان کے اندر کوئی فسق و فجور حرکت میں آئے، حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعے میں اس چیز کو خاص طور پر ذکر کیا جائے گا کہ دیکھو! پاک دامن رہنا اور دوسرے کی عزت کا خیال کرنا اور خلوت میں بھی اللہ تعالیٰ سے ڈرنا اور گناہ کے اسباب مہیا ہو جانے کے باوجود اس گناہ سے بچنا یہ کس قدر قابلِ تعریف فعل ہے، اللہ تعالیٰ کی اس کے اوپر بڑی نوازشیں ہوتی ہیں، تو حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعے کے اندر اس بات کو نمایاں کیا جائے گا، تو باوجود اس بات کے اس میں عشق کا ذکر ہے، حسن و جمال کا ذکر ہے، لیکن یہ واقعہ انسان کے اندر اخلاق کی پاکیزگی کو بڑھاتا ہے، اخلاق کے اندر کسی قسم کا سقم پیدا نہیں کرتا، یہ بھی اس واقعے کی ایک خوبی ہے۔ [ایک خصوصیت چند سطر بعد دیکھیں۔ ناقل]

حقانیتِ قرآنِ کریم

ابتدائی آیت تو قرآنِ کریم کی حقانیت پر دلالت کرتی ہے، جس طرح سے اکثر سورتوں کی ابتدا میں ذکر کر دیا جاتا ہے، ''یہ واضح کتاب کی آیتیں ہیں'' اس کے دلائل واضح ہیں، اس کے مطالب واضح ہیں، اگر کوئی شخص اس سے عبرت اور نصیحت حاصل کرنا چاہے تو اس میں کوئی پیچیدگی نہیں، ''بیشک ہم نے اس کتاب کو قرآنِ عربی بنا کر اتارا ہے'' چونکہ اس کے اوّلین مخاطب عربی ہیں، آخر نبی جس وقت آتا ہے تو سب سے پہلے اپنے مخاطبین کو انہی کی زبان میں سمجھاتا ہے، بعد میں وہ لوگ آگے دوسروں تک بات کو پہنچاتے ہیں، تو یہاں بھی آپ کے اول مخاطبین چونکہ عرب تھے تو اسی فطری قاعدے کے مطابق آپ پر جو کتاب اتاری گئی تو وہ بھی عربی زبان میں ہی تھی، لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ: تاکہ تم اس کو سمجھو، اپنی زبان میں ہونے کی وجہ سے تمہارے لیے سمجھنا آسان ہو جائے۔ ''ہم بیان کرتے ہیں آپ پر بہترین واقعہ'' بہترین سرگزشت، اس کو بہترین انہی پہلوؤں کی بناء قرار دیا گیا جو میں نے آپ کے سامنے ذکر کیے ہیں، بِمَآ اَوْحَیْنَآ اِلَیْكَ هٰذَا الْقُرْاٰنَ: اس قرآن کو آپ کی طرف وحی کرنے کے سبب سے، یعنی اس سبب سے کہ ہم آپ کی طرف یہ قرآنِ کریم وحی کرتے ہیں تو اسی وحی کرنے کی وجہ سے ہم آپ کے سامنے ایک سرگزشت ذکر کرتے ہیں، بہترین واقعہ ذکر کرتے ہیں، اور اس واقعہ کی ایک یہ خصوصیت بھی ہے کہ قرآنِ کریم میں ایک ہی سورۃ کے اندر اس کو مفصل کر کے پیش کر دیا گیا، یہی وجہ ہے کہ باقی سورتوں کے اندر اس کے اجزاء دوہرائے نہیں گئے، بخلاف باقی واقعات کے کہ کسی سورۃ کے اندر ان کو پوری طرح سے مکمل طور پر پیش نہیں کیا گیا بلکہ موقع محل کے مطابق کچھ اجزاء کسی سورۃ میں کچھ اجزاء کسی سورۃ میں نقل کیے گئے ہیں، تو یہ چونکہ مفصل طور پر ایک ہی سورۃ میں آ گیا اس لیے باقی سورتوں کے اندر اس کے اجزا پھیلے ہوئے نہیں، قرآنِ کریم کی کسی دوسری سورت میں ان واقعات کی طرف کوئی اشارہ نہیں جو حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ گزر رہے ہیں، ایک ہی سورۃ کے اندر

ان کو تفصیل سے پیش کر دیا گیا۔ وَاِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الْغٰفِلِيْنَ: اور بیشک آپ ہمارے اس وحی کرنے سے قبل، قَبْلِهٖ ہمارے اس وحی کے ذریعے سے بیان کرنے سے قبل آپ بے خبروں میں سے تھے، آپ کو خبر نہیں تھی، اور آپ کی قوم کو بھی خبر نہیں تھی، تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو وحی سے ہی یہ بات پہنچائی جا رہی ہے، ورنہ پہلے سے آپ ان واقعات کو نہ سنے ہوئے تھے نہ کبھی ان واقعات کو آپ نے بیان کیا تھا، اور نہ آپ کی قوم ہی اتنی تفصیل کے ساتھ اس واقعہ کو جانتی تھی۔

حضرت یوسف علیہ السلام کا خاندانی تعارف

اب آگے وہ واقعہ شروع ہو رہا ہے، حاصل اس کا یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے جو دو بیٹے تھے اسماعیل علیہ السلام اور اسحاق علیہ السلام، تو اسماعیل علیہ السلام کو تو مکہ معظمہ میں کے علاقے میں لا کے آباد کر دیا گیا تھا ان کی اولاد تو یہاں پھیلی، اور شام کے علاقے میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس رہے حضرت اسحاق علیہ السلام وہ بھی پیغمبر ہوئے اور ان کی اولاد میں یعقوب علیہ السلام ہوئے وہ بھی پیغمبر ہوئے، ان کا واقعہ آپ کے سامنے سورۂ ہود میں گزرا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بشارت دی گئی تھی اسحاق علیہ السلام کے پیدا ہونے کی اور اسحاق علیہ السلام کے پیچھے یعقوب علیہ السلام کے پیدا ہونے کی، تو یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پوتے ہیں، پھر یعقوب علیہ السلام نے متعدد شادیاں کیں، اور مختلف بیویوں سے آپ کے بارہ بیٹے ہوئے، اور یہ بارہ بیٹے یہی بنی اسرائیل کے بارہ خاندان بنے، جیسے کہ دوسری جگہ تفصیل موجود ہے، ان میں سے حضرت یوسف علیہ السلام اور ایک بھائی جن کا نام بنیامین لکھا ہے، یہ دونوں ایک والدہ سے ہیں، یہ دونوں حقیقی بھائی ہیں یعنی باپ بھی ایک اور ماں بھی ایک، اور ان کے علاوہ باقی دس بھائی دوسری مختلف ماؤں سے ہیں تو ان کے وہ علاتی بھائی ہیں، باپ کی جانب سے حقیقی ہیں ماں کی طرف سے حقیقی نہیں، اگرچہ وہ آپس میں بھی ماں کی طرف سے حقیقی نہیں تھے، بلکہ وہ تین بیویوں کی اولاد ہیں، لیکن حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ حسد کی بنا پر وہ سارے کے سارے ایک ہی پارٹی نظر آ رہے ہیں، گویا کہ ان کا آپس میں اتفاق ہے اور حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ وہ چھبتے ہیں، اور یوسف علیہ السلام اور بنیامین یہ دونوں حقیقی بھائی ہیں۔

دیگر بیٹوں کے مقابلے میں یوسف علیہ السلام اپنے باپ کے لئے زیادہ قابلِ اِلتفات کیوں تھے؟

حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ حضرت یعقوب علیہ السلام کو بہت زیادہ نمایاں قسم کی محبت تھی، بیٹے بھی دیکھ رہے تھے کہ جتنا اس کے ساتھ پیار کرتے ہیں ہمارے ساتھ اتنا پیار نہیں، اور حضرت یعقوب علیہ السلام کو حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ محبت کیوں تھی؟ وہ اللہ کے نبی تھے، صاحبِ بصیرت تھے، وہ دیکھ رہے تھے کہ ہمارا جو نبوّت کا خاندان ہے اس کی وراثت یوسف علیہ السلام کی طرف منتقل ہونے والی ہے، کہا کرتے ہیں کہ "ہونہار بروے کے چکنے چکنے پات!" کہ جو درخت بہت بڑا بننے والا ہوتا ہے، جس وقت پھوٹتا ہے تو اس کے پتے چکنے چکنے سے ہوتے ہیں، اور جو پودا پھوٹے اور پھوٹتے ہی اس کے پتے سوکھ سے جائیں، کھردرے سے ہو جائیں، تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کی جڑ کمزور ہے، یہ آگے مضبوط نہیں چلے گا، یہ تن آور نہیں ہوگا، پھل نہیں دے گا، اور جس کے پتے چکنے چکنے ہوتے ہیں انسان سمجھتا ہے کہ بڑا صحت مند ہے، اس کی جڑ ٹھیک ہے، یہ پھلے گا پھولے گا، تو حضرت یوسف علیہ السلام پر بھی بچپن سے ہی اس قسم کے آثار نمایاں تھے، یعقوب علیہ السلام اپنی بصیرت کے ساتھ دیکھ رہے تھے کہ علم نبوّت کا وارث

یہی بننے والا ہے، اس لیے باقی بچوں کے مقابلے میں ان کے ساتھ یعقوب علیہ السلام کو دلی تعلق زیادہ تھا، ان کی تربیت کا بھی زیادہ خیال تھا، ان کے اوپر نظر بھی زیادہ رہتی تھی، اور دوسروں کے مقابلے میں یہ چھوٹے بھی تھے، اگر چہ بنیامین ان سے بھی چھوٹا ہے لیکن دوسروں کے مقابلے میں یہ چھوٹے تھے، اور پھر بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ بچپن میں ان کی والدہ بھی فوت ہوگئیں، اور باقیوں کی والدہ زندہ ہوگی تو ایسے وقت میں بھی باپ کا رجحان اس بچے کی طرف زیادہ ہو جایا کرتا ہے جس کی والدہ کا سایہ اس کے سر سے اٹھ گیا ہو، کچھ اس لحاظ سے بھی خیال کرتے تھے، اللہ تعالیٰ نے حسن ظاہری کے ساتھ بھی نوازا تھا حسن باطنی کے ساتھ بھی نوازا تھا، باادب تھے شائستہ تھے، اور ایسا بچہ یقیناً اپنے والد کی توجہات اپنی طرف مبذول کر لیتا ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کا خواب

پھر بچپن کے اندر حضرت یوسف علیہ السلام نے خواب دیکھ لیا، اور خواب یہ دیکھا کہ گیارہ ستارے ہیں اور ایک سورج ہے اور ایک چاند ہے، اور وہ یوسف علیہ السلام کے سامنے جھک رہے ہیں اور انہیں سجدہ کر رہے ہیں، یہ خواب دیکھا، اور یہ خواب اپنے باپ کے سامنے پیش کیا، تو خواب اگر چہ کبھی اپنے نفسانی خیالات بھی ہوتے ہیں، کبھی تسویل شیطانی بھی ہوتی ہے، تفصیل اس واقعے میں ذکر کریں گے جو آگے جیل میں حضرت یوسف علیہ السلام کو پیش آئے گا، خواب کے متعلق تفصیل وہاں عرض کریں گے۔ اور بعض خواب اللہ تعالیٰ کی طرف سے مبشرات ہوتے ہیں، یعنی جس میں کسی آنے والی اچھی حالت کی خبر دی جاتی ہے، مستقبل کے متعلق اس میں نشاندہی ہوتی ہے، تو حضرت یعقوب علیہ السلام اپنی فراست اور بصیرت کے ساتھ سمجھ گئے کہ یہ خواب مبشرات میں سے ہے، یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بشریٰ ہے، یوسف علیہ السلام کا مستقبل اچھا ہونے والا ہے، اللہ تعالیٰ خاندان کے اندر ان کو برتری دے گا، اور گیارہ ستاروں سے گیارہ بھائیوں کی طرف اشارہ ہے، اور شمس و قمر سے یعقوب علیہ السلام اور ان کی بیوی، یعنی جو حضرت یوسف علیہ السلام کی سوتیلی والدہ تھی، تو شمس و قمر سے اشارہ ہے ماں باپ کی طرف، چاہے شمس سے یعقوب علیہ السلام اور قمر سے بیوی مراد لے لیجئے، اس لحاظ سے کہ شمس غالب ہے اور اس کی روشنی فیض پہنچاتی ہے، اور قمر مستفیض ہے اور ظاہری طور پر وہ سورج کے سامنے مغلوب ہے، اور اگر یوں کر لیا جائے کہ شمس عربی میں مؤنث ہے اور قمر مذکر ہے تو جس طرح سے ہم ماں باپ کہتے ہیں، تو شمس سے ماں مراد ہو جائے اور قمر سے باپ مراد ہو جائے، بہر حال جس لفظ سے بھی جس بات کی طرف اشارہ سمجھا گیا تو شمس و قمر سے والدین مراد ہیں، تو گیارہ بیٹے اور ماں باپ یہ سارے کے سارے حضرت یوسف علیہ السلام کے لئے عظمت کا اعتراف کریں گے، ایک وقت ایسا آئے گا کہ ان کو برتری نصیب ہوگی اور سارے کے سارے ان کی عظمت کا اعتراف کریں گے، خواب کے اندر یہ ایک واضح اشارہ تھا۔

خواب کے متعلق یعقوب علیہ السلام کی یوسف علیہ السلام کو ہدایات

حضرت یعقوب علیہ السلام اس کو سمجھ گئے، تو چونکہ وہ دیکھ رہے تھے کہ باقی بچے ان کے ساتھ کچھ ضدی رکھتے ہیں، جیسے گھروں میں آخر بچوں کے حالات والدین کے سامنے ہوا ہی کرتے ہیں تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے احتیاطاً ان کو منع کر دیا کہ دیکھنا! یہ خواب

کہیں اپنے بھائیوں کے سامنے نہ ذکر کر دینا، اصل تو روکنا انہی دس سے ہوگا جوان کے ساتھ کچھ کِدر رکھتے تھے اور کچھ کھچے رہتے تھے، حاسدانہ معاملہ کرتے تھے، لیکن بنیامین سے بھی منع کر دیا ہو کہ اس کے سامنے بھی ذکر نہ کرنا، کیونکہ جب ایک کے سامنے ذکر ہو جائے تو پھر کسی نہ کسی اعتبار سے بات نکل ہی جایا کرتی ہے، تو کہیں ایسا نہ ہو کہ بھائی سن پائیں اور یہ خواب ان کے لئے مزید حسد کا باعث نہ بن جائے اور مزید ضد کے اندر آ جائیں اور تیرے خلاف کوئی سازشیں کرنے لگ جائیں، اس لیے اس خواب کا ذکر ان کے سامنے نہ کرنا، باقی اس خواب میں اس طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تجھے عزت دے گا اور تیرے ذریعے سے اس خاندان کے اوپر دینی نعمت کو کامل کرے گا، جس طرح سے اللہ تعالیٰ نے تیرے آباؤ اجداد کے اوپر نعمت کی ہے، اسحاق علیہ السلام اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو نبوت عطا کی، یہ دینی نعمت کمال کو پہنچائی، اسی طرح سے اللہ تعالیٰ تجھے بھی یہ نعمت دے گا، یعنی اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ دُنیوی عظمت کے ساتھ ساتھ تجھے دینی عظمت بھی دے گا، اور تُو اس خاندان کے لئے بہت عزت کا باعث بنے گا اور اس خاندان کے مستقبل کے لئے بہت مفید ثابت ہوگا، خواب میں اس بات کی طرف اشارہ ہے۔ تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے یوسف علیہ السلام کے سامنے وضاحت سے ذکر کر دیا اور منع کر دیا کہ بھائیوں سامنے اس بات کو ذکر نہ کرنا۔

اِذْ قَالَ یُوْسُفُ لِاَبِیْهِ: یاد کیجئے جس وقت کہ یوسف نے اپنے باپ سے کہا، یٰۤاَبَتِ اِنِّیْ رَاَیْتُ اَحَدَ عَشَرَ کَوْکَبًا: اے باپ! میں نے گیارہ ستارے، سورج اور چاند دیکھے، رَاَیْتُهُمْ لِیْ سٰجِدِیْنَ: دیکھا میں نے ان کو اپنے لیے سجدہ کرتے ہوئے، اس سجدے کا ذکر بھی واقعے کے آخر میں آئے گا، قَالَ یٰبُنَیَّ: یعقوب علیہ السلام نے کہا کہ اے بیٹے! لَا تَقْصُصْ رُءْیَاكَ: اپنا خواب بیان نہ کرنا عَلٰۤى اِخْوَتِكَ: اپنے بھائیوں پر، فَیَكِیْدُوْا لَكَ كَیْدًا: تیرے لیے وہ کوئی سازش کریں گے، تجھے کوئی نقصان پہنچانے کی کوشش کریں گے، کیونکہ خواب بہت واضح ہے، جب ان کے سامنے آئے گا تو وہ ضرور محسوس کریں گے کہ اس کا مطلب تو یہ ہے کہ ایسے خواب دیکھ رہا ہے کہ آنے والے وقت میں یہ ہم سب پہ غالب آ جائے گا، اور ہم سب اس کے ماتحت ہو جائیں گے، اس قسم کی باتوں کے ساتھ ان کی حسد کی آگ اور زیادہ بھڑکے گی، اور تجھے کوئی تکلیف پہنچانے کی کوشش کریں گے، اِنَّ الشَّیْطٰنَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ: شیطان انسان کے لئے بہت صریح دشمن ہے، تو شیطان ان کو بہکائے گا اکسائے گا، اور ان کے دل کے اندر اس قسم کی باتیں ڈالے گا جو تیرے لیے باعث تکلیف ہوں گی۔ جیسے اللہ نے تجھے یہ خواب دکھایا ہے ''ایسے ہی اللہ تعالیٰ تجھے چنے گا، برتری دے گا، اور سکھائے گا تجھے باتوں کو ٹھکانے لگانا'' بہت سمجھ بصیرت تجھے حاصل ہو جائے گی جس سے تو ہر بات کو سننے کے بعد اس کو صحیح مقام پر محمول کر لیا کرے گا، صحیح موقع پر اس کو بٹھالے گا، باتوں کو ٹھکانے لگانا اللہ تعالیٰ تجھے سکھائے گا، وَیُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَیْكَ: اور اپنی نعمت تیرے اوپر تام کرے گا، اس نعمت سے نعمت نبوّت مراد ہے، دینی نعمت، ''اور آلِ یعقوب پر بھی نعمت کو تام کرے گا'' تیری وساطت سے اللہ تعالیٰ دین و دُنیا میں ان کو نوازے گا، ''جیسے کہ یہ نعمت تام کی تھی اللہ تعالیٰ نے تیرے اَبوین پر اس سے قبل یعنی ابراہیم اور اسحاق پر'' اپنا ذکر بطور تواضع کے نہیں کیا، اِنَّ رَبَّكَ عَلِیْمٌ حَكِیْمٌ: بیشک تیرا رَبّ علم والا ہے حکمت والا ہے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَیْكَ

لَقَدْ كَانَ فِيْ يُوْسُفَ وَاِخْوَتِهٖٓ اٰيٰتٌ لِّلسَّآئِلِيْنَ ۝ اِذْ قَالُوْا لَيُوْسُفُ

البتہ ضرور یوسف اور اس کے بھائیوں کے واقعے میں نشانیاں ہیں سوال کرنے والوں کے لئے ۞ جبکہ کہا انہوں نے کہ البتہ یوسف

وَاَخُوْهُ اَحَبُّ اِلٰٓى اَبِيْنَا مِنَّا وَنَحْنُ عُصْبَةٌ ؕ اِنَّ اَبَانَا لَفِيْ ضَلٰلٍ

اور اس کا بھائی زیادہ محبوب ہیں ہمارے باپ کو ہمارے مقابلے میں حالانکہ ہم ایک قوت والی جماعت ہیں بیشک ہمارا باپ البتہ صریح

مُّبِيْنِۨ ۝ ۚۖ اقْتُلُوْا يُوْسُفَ اَوِ اطْرَحُوْهُ اَرْضًا يَّخْلُ لَكُمْ وَجْهُ اَبِيْكُمْ

غلطی میں ہے ۞ قتل کردو یوسف کو یا پھینک دو اسے کسی علاقے میں، خالی ہو جائے گا تمہارے لیے تمہارے باپ کا چہرہ

وَتَكُوْنُوْا مِنْۢ بَعْدِهٖ قَوْمًا صٰلِحِيْنَ ۝ قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ لَا تَقْتُلُوْا يُوْسُفَ

اور ہو جاؤ گے تم اس کے بعد ایسے لوگ جن کے سب کام ٹھیک ہیں ۞ ان بھائیوں میں سے ایک بولنے والا بولا یوسف کو قتل نہ کرو

وَاَلْقُوْهُ فِيْ غَيٰبَتِ الْجُبِّ يَلْتَقِطْهُ بَعْضُ السَّيَّارَةِ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ ۝ قَالُوْا يٰٓاَبَانَا

اور ڈال دو اس کو کسی کنویں کی گہرائی میں، اُٹھا لے گا اس کو کوئی مسافر اگر تم کرنے والے ہو ۞ کہنے لگے کہ اے ہمارے اَبّا!

مَا لَكَ لَا تَاْمَنَّا عَلٰى يُوْسُفَ وَاِنَّا لَهٗ لَنٰصِحُوْنَ ۝ اَرْسِلْهُ مَعَنَا

تجھے کیا ہو گیا کہ تُو ہمارا اعتبار نہیں کرتا یوسف کے بارے میں اور بیشک ہم اس کے لئے البتہ بہت خیر خواہ ہیں ۞ بھیج اس کو ہمارے ساتھ

غَدًا يَّرْتَعْ وَيَلْعَبْ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝ قَالَ اِنِّيْ

کل کو، کھائے پیئے گا اور کھیلے گا، اور بیشک ہم اس کے لئے البتہ حفاظت کرنے والے ہیں ۞ یعقوب علیہ السلام نے کہا بیشک میں،

لَيَحْزُنُنِيْٓ اَنْ تَذْهَبُوْا بِهٖ وَاَخَافُ اَنْ يَّاْكُلَهُ الذِّئْبُ وَاَنْتُمْ عَنْهُ غٰفِلُوْنَ ۝

البتہ غم میں ڈالتی ہے مجھے یہ بات کہ تم اس کو لے جاؤ اور میں اندیشہ کرتا ہوں کہ اس کو کوئی بھیڑیا کھا جائے گا اور تم اس سے بے خبر ہو گے ۞

قَالُوْا لَئِنْ اَكَلَهُ الذِّئْبُ وَنَحْنُ عُصْبَةٌ اِنَّآ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ۝

وہ کہنے لگے اگر اس کو بھیڑیا کھا گیا حالانکہ ہم جماعت ہیں، بیشک ہم اس وقت البتہ خسارے میں پڑنے والے ہوں گے ۞

فَلَمَّا ذَهَبُوْا بِهٖ وَاَجْمَعُوْٓا اَنْ يَّجْعَلُوْهُ فِيْ غَيٰبَتِ الْجُبِّ ۚ وَاَوْحَيْنَآ

پس جس وقت لے گئے وہ اس یوسف کو اور انہوں نے پختہ ارادہ کر لیا کہ ڈال دیں اس کو کسی کنویں کی گہرائی میں اور ہم نے وحی بھیجی

اِلَیۡہِ لَتُنَبِّئَنَّہُمۡ بِاَمۡرِہِمۡ ہٰذَا وَ ہُمۡ لَا یَشۡعُرُوۡنَ ﴿۱۵﴾ وَ جَآءُوۡۤ اَبَاہُمۡ

یوسف کی طرف البتہ ضرور خبر دے گا تو انہیں ان کے اس معاملے کی اور انہیں پتا بھی نہیں ہوگا﴿۱۵﴾ اور آئے وہ اپنے باپ کے پاس

عِشَآءً یَّبۡکُوۡنَ ﴿ؕ۱۶﴾ قَالُوۡا یٰۤاَبَانَاۤ اِنَّا ذَہَبۡنَا نَسۡتَبِقُ وَ تَرَکۡنَا

عشاء کے وقت روتے ہوئے﴿۱۶﴾ کہنے لگے: اے ہمارے ابا! ہم گئے تھے ایک دوسرے سے آگے نکلتے ہوئے اور ہم چھوڑ گئے تھے

یُوۡسُفَ عِنۡدَ مَتَاعِنَا فَاَکَلَہُ الذِّئۡبُ ۚ وَ مَاۤ اَنۡتَ بِمُؤۡمِنٍ لَّنَا وَ لَوۡ کُنَّا صٰدِقِیۡنَ ﴿۱۷﴾

یوسف کو اپنے سامان کے پاس پس اس کو بھیڑیا کھا گیا، اور نہیں ہے تو ہماری تصدیق کرنے والا اگرچہ ہم سچے ہی ہوں﴿۱۷﴾

وَ جَآءُوۡ عَلٰی قَمِیۡصِہٖ بِدَمٍ کَذِبٍ ؕ قَالَ بَلۡ سَوَّلَتۡ لَکُمۡ اَنۡفُسُکُمۡ اَمۡرًا ؕ

لگا یا انہوں نے یوسف کی قمیص پر جھوٹ موٹ کا خون، یعقوب علیہ السلام نے کہا: بلکہ تمہارے لیے تمہارے نفسوں نے کوئی بات بنالی

فَصَبۡرٌ جَمِیۡلٌ ؕ وَ اللّٰہُ الۡمُسۡتَعَانُ عَلٰی مَا تَصِفُوۡنَ ﴿۱۸﴾ وَ جَآءَتۡ سَیَّارَۃٌ فَاَرۡسَلُوۡا

پس اچھا صبر میرا کام ہے اور اللہ تعالیٰ مدد طلب کیا ہوا ہے اس چیز پر جو تم بیان کررہے ہو﴿۱۸﴾ اور آگیا ایک قافلہ، پس بھیجا انہوں نے

وَارِدَہُمۡ فَاَدۡلٰی دَلۡوَہٗ ؕ قَالَ یٰبُشۡرٰی ہٰذَا غُلٰمٌ ؕ وَ اَسَرُّوۡہُ بِضَاعَۃً ؕ

اپنے پانی لانے والے کو، لٹکا یا اس نے اپنا ڈول، کہنے لگا کہ ہائے خوشی! یہ تو لڑکا ہے، اور چھپالیا انہوں نے اس لڑکے کو سامان بنا کر،

وَ اللّٰہُ عَلِیۡمٌۢ بِمَا یَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۹﴾ وَ شَرَوۡہُ بِثَمَنٍۭ بَخۡسٍ دَرَاہِمَ مَعۡدُوۡدَۃٍ ۚ

اللہ تعالیٰ جاننے والا ہے ان کاموں کو جو وہ کرتے تھے﴿۱۹﴾ اور بیچ دیا اس کو بھائیوں نے گھٹیا قیمت کے بدلے جو چند گنتی کے درہم تھے

وَ کَانُوۡا فِیۡہِ مِنَ الزّٰہِدِیۡنَ ﴿٪۲۰﴾

اور وہ اس کے بارے میں رغبت کرنے والے نہیں تھے﴿۲۰﴾

خلاصہ آیات مع تحقیق الالفاظ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ لَقَدۡ کَانَ فِیۡ یُوۡسُفَ وَ اِخۡوَتِہٖۤ اٰیٰتٌ لِّلسَّآئِلِیۡنَ: فِیۡ یُوۡسُفَ: فی قصۃ یوسف، البتہ ضرور یوسف اور اس کے بھائیوں کے واقعے میں نشانیاں ہیں سوال کرنے والوں کے لئے، اِذۡ قَالُوۡا لَیُوۡسُفُ وَ اَخُوۡہُ اَحَبُّ اِلٰۤی اَبِیۡنَا: قابل ذکر ہے وہ وقت جبکہ کہا انہوں نے البتہ یوسف اور اس کا بھائی زیادہ محبوب ہیں ہمارے باپ کو، مِنَّا: ہمارے مقابلے میں، وَ نَحۡنُ عُصۡبَۃٌ:

حالانکہ ہم ایک قوت والی جماعت ہیں، اِنَّ اَبَانَا لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ: بیشک ہمارا باپ البتہ صریح غلطی میں ہے۔ ضلال: ضَلَّ يَضِلُّ ضَلَالَةً: بھٹک جانا، گمراہ ہو جانا، اُردو میں تو جس وقت ہم ''گمراہ'' کا لفظ بولتے ہیں تو اس سے عام طور پر دینی گمراہی مراد لی جاتی ہے، جو شخص دینی طور پر بھٹکا ہوا ہو، لیکن عربی میں اس لفظ کا یہی مفہوم نہیں، بلکہ ضَلَّ: بھٹک جانا۔ ضَلَّ الطریقَ: راستے سے بھٹک گیا، اس کی دونوں مرادیں ہوتی ہیں، دینی راستے بھٹک گیا ہو تو اس کے اوپر بھی یہ بات صادق آتی ہے، اور کسی دُنیوی کام کے بارے میں اس نے کوئی غلط راستہ اختیار کر لیا تو اس کو بھی ضَلَّ الطریقَ کے ساتھ تعبیر کر دیا جاتا ہے، تو یہاں ضلال سے بھی دُنیوی ضلال مراد ہے دینی ضلال نہیں، کیونکہ یعقوب علیہ السلام تو نبی تھے، تو نبی کی نسبت ضلال کی طرف کرنا یعنی دینی گمراہی کی طرف کرنا یہ تو کفر ہے، اور یوسف علیہ السلام کے بھائی کافر نہیں تھے، تو یہاں مطلب یہ ہوگا کہ اولاد کی محبت کے بارے میں ہمارے باپ نے ایک غلط راہ اختیار کر رکھی ہے، کہ جو محبت کے قابل ہیں ان سے محبت کرتے نہیں اور جو محبت کے قابل نہیں ہیں ان سے محبت کرتے ہیں، کتنی بڑی غلطی ہے، یہاں ضلال سے یہی غلطی مراد ہے کہ اولاد کے ساتھ معاملے کے بارے میں یہ صریح غلطی پر ہیں، اُقْتُلُوْا يُوْسُفَ اَوِ اطْرَحُوْهُ اَرْضًا يَّخْلُ لَكُمْ وَجْهُ اَبِيْكُمْ: قتل کر دو یوسف کو یا پھینک دو اسے کسی علاقے میں، يَخْلُ لَكُمْ: خَلَا يَخْلُوْ: تنہا ہو جانا، خالی ہو جانا۔ ''خالص ہو جائے گا تمہارے لئے، خالی ہو جائے گا تمہارے لئے تمہارے باپ کا چہرہ'' وَتَكُوْنُوْا مِنْۢ بَعْدِهٖ قَوْمًا صٰلِحِيْنَ: اور ہو جاؤ گے تم اس قتلِ یوسف کے بعد، قَوْمًا صٰلِحِيْنَ: صلاح کا معنی بھی اسی طرح سے دو طرح سے ہے جیسے پیچھے ضلال کا ترجمہ ذکر کیا گیا، ایک تو صلاحیت، صالحیت، نیکی دینی اعتبار سے، (جیسے کہتے ہیں) فلاں شخص صالح ہے یعنی نیک ہے، دینی اعتبار سے وہ نیکی کا کام کرنے والا ہے، بُرائی کرنے والا نہیں، تو پھر تو قَوْمًا صٰلِحِيْنَ کا معنی ہوگا نیک لوگ، ''بن جاؤ گے تم اس کے بعد نیک لوگ'' جس کا مفہوم یہ ہوگا کہ ایک دفعہ قتل کر لو، یہ گناہ کر لو، گناہ کرنے کے بعد پھر توبہ کر کے نیک ہو جانا، مقصد بھی حاصل ہو جائے گا اور نیکی بھی ہاتھ سے نہیں جائے گی، اس کے بعد توبہ کر لیجیو، توبہ کر کے نیک لوگ بن جائیو، یہ گناہ کے اوپر جرأت کر رہے ہیں، اور توبہ کو گویا کہ سہارا بنا رہے ہیں کہ اگر دل میں یہ خیال آئے کہ قتل تو گناہ ہے، تو کہتے ہیں کوئی حرج نہیں، بعد میں توبہ کر کے نیک لوگ بن جائیں گے، بعد میں نیکی کر لیں گے، پھر مفہوم یہ ہوگا، اور حضرت شیخ (الہندؒ) کا ترجمہ اسی کے مطابق ہے ''ہو رہنا اس کے بعد نیک لوگ'' حضرت شیخ الہندؒ ترجمہ اسی طرح سے کرتے ہیں وہ اسی مفہوم کے اعتبار سے ہے۔ اور ایک صالح ہونا ہوتا ہے دُنیوی اعتبار سے کہ اس کے امور سارے کے سارے ٹھیک ہیں، صَلَحَ اَمْرُهٗ: اس کا معاملہ ٹھیک ہو گیا، جس آدمی کے حالات سارے کے سارے درست ہو جائیں تو وہ بھی گویا کہ اپنے معاملات کے اعتبار سے صالح ہو گیا، تو پھر اسکا مطلب یہ ہوگا کہ اُقْتُلُوْا تَكُوْنُوْا، (تَكُوْنُوْا جوابِ اَمر ہے) اور یہی ترجمہ زیادہ واضح ہے نحوی ترکیب کے اعتبار سے، ''قتل کر دو اور جب تم قتل کر لو گے تو ہو جاؤ گے تم اس کے قتل کے بعد ایسے لوگ جن کے سب کام ٹھیک ہیں'' جتنی یہ آئے دن کی خلش رہتی ہے سب ختم ہو جائے گی، سارے معاملات ٹھیک ہو جائیں گے، بس اس کو راستے سے ہٹا دو، پھر اس کا معنی یہ ہو جائے گا ''قتل کر دو، جب تم اس کو قتل کر دو گے تو ہو جاؤ گے تم اس کے بعد ایسے لوگ جن کے سارے معاملات ٹھیک ہیں'' یعنی اس روڑے کو راستے سے ہٹا دینے کے بعد سارے حالات ٹھیک ہو جائیں گے،

پھر تَكُونُوْا صٰلِحِيْنَ کا ترجمہ ہو جائے گا وہ لوگ جن کے معاملات سارے کے سارے ٹھیک ہیں، کام درست ہیں، کسی کام میں فساد نہیں، اور حضرت تھانویؒ نے ترجمہ یہی کیا ہے، اور ترکیب کے لحاظ سے یہی زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے، کیونکہ اُقْتُلُوْا امر کا صیغہ ہے اور تَكُوْنُوْا جواب امر کی وجہ سے مجزوم ہے، تو معنی واضح یوں ہو جائے گا کہ "قتل کر دو یا کسی دُور کے علاقے میں پھینک دو، اس کے بعد تمہارے کام سب ٹھیک ہو جائیں گے" قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ: ایک کہنے والے نے کہا ان میں سے، ان بھائیوں میں سے ایک بولنے والا بولا، لَا تَقْتُلُوْا يُوْسُفَ: یوسف کو قتل نہ کرو، وَاَلْقُوْهُ فِيْ غَيٰبَتِ الْجُبِّ: غَیَابَۃ ہر ایسی چیز کو کہتے ہیں جو دوسری کو چھپا لے، اس لئے بادل کو بھی غیابہ کہا جاتا ہے کہ وہ سورج کو چھپا لیتا ہے ستاروں کو چھپا لیتا ہے، اور یہاں گہرائی مراد ہے، اور جُبّ کہتے ہیں ایسے کنویں کو جس کے اوپر مَن پختہ نہ بنی ہو، جیسے گڑھے کی صورت ہوتی ہے، تو غَيٰبَتِ الْجُبِّ سے مراد ہو جائے گا گڑھے کی گہرائی جس میں اس کے پھینک دینے کے بعد یہ اوپر سے نظر نہ آئے، گہرا کنواں، "ڈال دو اس کو کسی کنویں کی گہرائی میں" گہرائی سے اتنی گہرائی مراد ہوگی جس میں گر جانے کے بعد یہ چھپ جائے نظر نہ آئے، "کسی گہرے کنویں میں ڈال دو" يَلْتَقِطْهُ بَعْضُ السَّيَّارَةِ: يَلْتَقِطْ اِلتِقَاط سے لیا گیا ہے۔ اِلتِقَاط: اُچک لینا، اُٹھا لینا۔ لُقطَۃ کا لفظ اسی سے ہے، گری پڑی چیز جو اٹھالی جاتی ہے، بے جان چیز کے لئے فقہاء لُقطَۃ کا لفظ استعمال کرتے ہیں، اور اگر انسان کا بچہ کہیں گرا ہوا اٹھا لیا جائے تو اس کو لقیط کہتے ہیں، بہر حال لقطہ یا لقیط یہ دونوں لفظ ایک ہی مادے سے ہیں، اور اِلتِقَاط کے معنی اٹھا لینا، "اٹھا لے گا اس کو کوئی مسافر" بَعْضُ السَّيَّارَةِ: سیارہ کہتے ہیں قافلے کو۔ سَارَ يَسِيْرُ: چلنا۔ بَعْضُ السَّيَّارَةِ: قافلے میں سے کوئی آدمی، چلنے والوں میں سے کوئی اس کو اٹھا لے گا، اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ: اگر تم کرنے والے ہو، یعنی اگر تم کرنے والے ہو تو یہ کرو۔ قَالُوْا يٰۤاَبَانَا: کہنے لگے کہ اے ہمارے اَبا! مَا لَكَ لَا تَاْمَنَّا عَلٰى يُوْسُفَ: تجھے کیا ہو گیا کہ تو ہمارا اعتبار نہیں کرتا یوسف کے بارے میں، وَاِنَّا لَهٗ لَنٰصِحُوْنَ: بیشک ہم اس کے لئے البتہ بہت خیر خواہ ہیں، اَرْسِلْهُ مَعَنَا غَدًا يَّرْتَعْ وَيَلْعَبْ: بھیج اس کو ہمارے ساتھ، غَدًا: کل کو، يَرْتَعْ وَيَلْعَبْ: رَتَعَ: خوب اچھی طرح سے کھانا پینا، اور يَلْعَبْ لعب سے ہو گیا کھیلنا، "کھائے پیے گا اور کھیلے گا" یعنی جنگل کے میوے کھائے گا اور کھیلے کودے گا، وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ: اور بیشک ہم اس کے لئے البتہ حفاظت کرنے والے ہیں، قَالَ: یعقوب علیہ السلام نے کہا، اِنِّيْ لَيَحْزُنُنِيْۤ اَنْ تَذْهَبُوْا بِهٖ: بیشک میں، البتہ غم میں ڈالتی ہے مجھے یہ بات کہ تم اس کو لے جاؤ، اَنْ تَذْهَبُوْا بِهٖ: تمہارا اس کو لے جانا مجھے غم میں ڈالتا ہے، وَاَخَافُ: اور میں اندیشہ کرتا ہوں اَنْ يَّاْكُلَهُ الذِّئْبُ: کہ اس کو کوئی بھیڑیا کھا جائے گا، وَاَنْتُمْ عَنْهُ غٰفِلُوْنَ: اور تم اس سے بے خبر ہو گے، تمہاری بے خبری میں اس کو کوئی بھیڑیا کھا جائے گا مجھے یہ ڈر لگتا ہے، قَالُوْا: وہ کہنے لگے، لَئِنْ اَكَلَهُ الذِّئْبُ: اگر اس کو بھیڑیا کھا گیا وَنَحْنُ عُصْبَةٌ: حالانکہ ہم جماعت کی جماعت ہیں، اِنَّاۤ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ: بے شک ہم اس وقت البتہ خسارے میں پڑنے والے ہوں گے، اس سے بڑھ کر ہمارا نقصان کیا ہوگا کہ ہمارے بھائی کو بھیڑیا کھا جائے اور ہماری موجودگی میں!، ہم تو کسی کام کے نہیں رہیں گے، ہم نے تو اپنا سب کچھ ہی گنوا دیا اگر ایسا واقعہ پیش آ گیا، فَلَمَّا ذَهَبُوْا بِهٖ: پس جس وقت لے گئے وہ اس یوسف کو، وَاَجْمَعُوْۤا اَنْ يَّجْعَلُوْهُ فِيْ غَيٰبَتِ الْجُبِّ: اور انہوں نے پختہ ارادہ کر لیا۔ اَجْمَعُوْا: اجماع کر لیا، آپس میں اتفاق کر لیا، "اور انہوں نے اتفاق کر لیا، رائے پختہ کر لی کہ ڈال دیں

اس کو کسی کنویں کی گہرائی میں" وَاَوْحَیْنَآ اِلَیْهِ: اور ہم نے وحی بھیجی یوسف کی طرف، لَتُنَبِّئَنَّهُمْ: البتہ ضرور ضرور خبر دے گا تو انہیں، بِاَمْرِهِمْ هٰذَا: ان کے اس معاملے کی، ان کے اس معاملے کی تو انہیں ضرور خبر دے گا، وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ: اور انہیں پتا بھی نہیں ہوگا، یعنی یہ پہچانیں گے بھی نہیں تجھے کہ تو کون ہے، وَجَآءُوْٓا اَبَاهُمْ عِشَآءً يَّبْكُوْنَ: اور آئے وہ اپنے باپ کے پاس عشاء کے وقت روتے ہوئے، قَالُوْا يٰٓاَبَانَآ: کہنے لگے اے ہمارے ابا! اِنَّا ذَهَبْنَا نَسْتَبِقُ: نَسْتَبِقُ، اِسْتِبَاق: ایک دوسرے سے آگے نکلنے کے لئے دوڑ لگانا، ذَهَبْنَا نَسْتَبِقُ: ہم گئے تھے بھاگتے ہوئے، ایک دوسرے سے آگے نکلتے ہوئے، یعنی ہم نے دوڑ لگائی تھی کہ دیکھیں آگے کون نکلتا ہے، وَتَرَكْنَا يُوْسُفَ: اور ہم چھوڑ گئے تھے یوسف کو، عِنْدَ مَتَاعِنَا: اپنے سامان کے پاس، ان کو ہم نے اپنے لیرے لدے کے پاس بٹھا دیا، سامان کے پاس بٹھا دیا، اور خود ہم نے دوڑ لگائی کہ دیکھو! ایک دوسرے سے آگے کون نکلتا ہے، فَاَكَلَهُ الذِّئْبُ: پس اس یوسف کو بھیڑیا کھا گیا، وَمَآ اَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا: اور نہیں ہے تو ہمارے تصدیق کرنے والا، وَلَوْ كُنَّا صٰدِقِيْنَ: اگرچہ ہم سچے ہی ہوں، اگرچہ ہم سچے ہی ہوں کا یہ مطلب نہیں کہ ہم ہیں تو جھوٹے تو تو نے تصدیق کیا کرنی ہے، سچے ہوتے تو تو تب بھی بات نہ مانتا، یہ مطلب نہیں، وَلَوْ كُنَّا صٰدِقِيْنَ کا مطلب یہ ہے کہ عام حالات میں ہم کتنے ہی سچے کیوں نہ ہوں اس معاملے میں تو ہمیں سچا نہیں سمجھے گا، چہ جائیکہ پہلے ہی تجھے ہم پہ بداعتمادی ہے، پہلے ہی تو ہمارے ساتھ کوئی اچھا عقیدہ نہیں رکھتا، اگر پہلے ہر معاملے میں ہم تیرے نزدیک سچے ہی ہوتے، اور کبھی تُو نے ہمارا جھوٹ نہ آزمایا ہوتا، ہم پر تجھے پوری طرح سے اعتماد ہوتا تو بھی اس معاملے میں تو ہماری تصدیق نہیں کرے گا، اور چہ جائیکہ پہلے ہی تجھے اعتماد نہیں، تو ایسی صورت میں تو نے ہماری بات کیا ماننی ہے، یہ مطلب ہے اس کا، کہ اگرچہ ہم موصوف بالصدق ہوں یعنی پہلے سے ہی سچے ہوں، صدق کے ساتھ موصوف ہوں، ہمیشہ سچ بولتے ہوں تو بھی تو ہماری بات نہیں مانے گا، اِس بات میں ہماری تصدیق نہیں کرے گا۔ وَجَآءُوْ عَلٰى قَمِيْصِهٖ بِدَمٍ كَذِبٍ: بِدَمٍ كَذِبٍ کے اندر جو باء ہے یہ تعدیہ کی ہے، "لگایا انہوں نے یوسف کی قمیص پر جھوٹ موٹ کا خون" جس میں واقعہ کچھ نہیں تھا، کسی جانور کو ذبح کر کے اس کا خون اس کی قمیص کو لگا دیا، قَالَ: یعقوب علیہ السلام نے کہا، بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا: بل کا مطلب ہے اِضراب، کہ بھیڑیے نے نہیں کھایا، مَآ اَكَلَهُ الذِّئْبُ اس کو بھیڑیے نے نہیں کھایا بلکہ تمہارے نفسوں نے تمہارے لئے کوئی بات بنالی، تسویل کا معنی ہوتا ہے کہ کوئی بات بنالینا، کسی بات کو مزین کر کے دکھا دینا، "بلکہ تمہارے لئے تمہارے نفسوں نے کوئی بات بنالی" فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ: پس اچھا صبر میرا کام ہے، صبر جمیل میرا کام ہے، صبر جمیل میرا مطلوب ہے، میں صبر جمیل اللہ سے مانگتا ہوں، اس طرح سے اس کا مطلب ادا کر دیا جائے گا، وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ: اور اللہ تعالیٰ مدد طلب کیا ہوا ہے اس چیز پر جو تم بیان کرتے ہو، وَجَآءَتْ سَيَّارَةٌ: اور آ گیا ایک قافلہ، فَاَرْسَلُوْا وَارِدَهُمْ: بھیجا انہوں نے اپنے پانی لانے والے کو۔ وَرَدَ يَرِدُ: پانی پر وارد ہونا۔ وارد: پانی پہ وارد ہونے والا، یعنی جس کے ذِمے تھا پانی لانا، "اپنے وارد کو بھیجا" فَاَدْلٰى دَلْوَهٗ: لٹکایا اس نے اپنا ڈول، قَالَ يٰبُشْرٰى: کہنے لگا کہ ہائے بشارت! ہائے خوشی! کیا خوشی کی بات ہے! ایسے موقع پر جیسے لفظ بولے جایا کرتے ہیں، "کیا خوشی کی بات ہے" هٰذَا غُلٰمٌ: یہ تو لڑکا ہے، وَاَسَرُّوْهُ بِضَاعَةً: اور چھپا لیا انہوں نے اس لڑکے کو سامان بنا کر، بضاعة کہتے ہیں تجارت کے سامان کو، سامانِ تجارت بنا کر اس کو

چھپالیا، وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ: اللہ تعالیٰ جاننے والا ہے ان کاموں کو جو وہ کرتے تھے، وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍۭ بَخْسٍ دَرَاهِمَ مَعْدُوْدَةٍ: شَرٰی يَشْرِي خریدنے بیچنے دونوں معنوں میں آیا کرتا ہے۔ اب یہ شَرَوْ کی ضمیر کدھر لوٹ رہی ہے؟ بعض مفسرین نے تو توراۃ وغیرہ کی عبارات کی طرف دیکھتے ہوئے مطلب یوں ذکر کیا کہ یوسف علیہ السلام کے بھائی نگرانی تو رکھتے تھے یوسف علیہ السلام کی، تو جس دن یہ قافلے والوں نے نکال لیا تو وہ دیکھنے گئے تو وہ کنویں میں موجود نہیں تھے، انہوں نے اردگرد دیکھا تو قافلہ اترا ہوا تھا، اور قافلے والوں سے پوچھا تو وہاں یہ مل گئے، ان کے پاس تھے، تو انہیں کہا کہ یہ ہمارا غلام ہے، اور اس کو بھاگنے کی عادت ہے ہم اس کو رکھنا نہیں چاہتے، اس لئے تم اس کو خریدلو اگر خریدنا چاہتے ہو تو، تو قافلے والے خریدنے پر تیار ہو گئے، تو پھر شَرَوْ کی ضمیر بھائیوں کی طرف لوٹے گی کہ بھائیوں نے بیچ دیا اس یوسف کو، بِثَمَنٍۭ بَخْسٍ: گھٹیا قیمت کے بدلے، بخس کہتے ہیں کم قیمت کو، ''گھٹیا قیمت کے بدلے، کم قیمت کے بدلے بھائیوں نے یوسف کو بیچ دیا'' اور وہ ثمن بخس کیا تھی؟ دَرَاهِمَ مَعْدُوْدَةٍ: چند گنتی کے درہم تھے، جن کی تعداد بیس تک ذکر کی ہے، بیس دراہم کے بدلے یوسف کو بیچ دیا، ''بیچ دیا اس یوسف کو بھائیوں نے'' بِثَمَنٍۭ بَخْسٍ: ناقص قیمت کے بدلے، گھٹیا قیمت کے بدلے جو چند گنتی کے درہم تھے۔ اور اگر اس واقعے کی تفصیل کو یوں نہ مانا جائے جس طرح سے یہ مفسرین توراۃ سے نقل کرتے ہیں تو پھر مطلب یہ ہوگا کہ ان اہل قافلہ نے بیچ دیا یوسف کو مصر میں جاکے، تو پھر یہ بیع جس کا یہاں ذکر ہے یہ بیع وہی ہے جو مصر میں ہوئی تھی جس کا آگے ذکر آئے گا، وَقَالَ الَّذِي اشْتَرٰىهُ مِنْ مِّصْرَ، انہوں نے بیچ دیا گھٹیا قیمت کے بدلے اور جس نے خریدا تھا اس نے آگے جاکے اپنی بیوی سے یہ بات کی، پھر یہ بیع ایک ہی ہوگی، اور پہلی تفسیر کے مطابق بیع دو ہو جائیں گی، کہ پہلے بھائیوں نے بیچا اہل قافلہ کے پاس، پھر اہل قافلہ نے جاکے بیچا مصر میں عزیز مصر کے پاس، ''بیچ دیا قافلے والوں نے اس کو ناقص قیمت کے ساتھ جو چند دراہم تھے'' وَكَانُوْا فِيْهِ مِنَ الزّٰهِدِيْنَ: زاھد کا لفظ زُھد سے لیا گیا ہے۔ زُھد: بے رغبت ہونا۔ زاھد فی الدنیا: جو دُنیا کی طرف سے بے رغبت ہو۔ ''ان قافلوں والوں کو یوسف میں کوئی رغبت نہیں تھی، یہ اس میں کوئی رغبت کرنے والے نہیں تھے، یا، بھائی اس کے بارے میں کوئی رغبت کرنے والے نہیں تھے'' اس لئے اس کو ناقص قیمت کے بدلے بیچ دیا، ان کو کوئی قدر نہیں تھی یوسف کی، یوسف کے بارے میں وہ زاہد تھے، بے قدری کرنے والے تھے، ان کو ادھر کوئی رغبت نہیں تھی۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

تفسیر

واقعۂ یوسف بہت سارے اَسباق اور عبرتوں کا مجموعہ ہے

پہلی آیت میں تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس بات کی طرف متوجہ کیا کہ یوسف اور یوسف کے بھائیوں کے واقعے کو محض ایک تاریخی واقعے کے طور نہ پڑھو، بلکہ اس میں بہت سارے اسباق ہیں بہت ساری عبرتیں ہیں، بہت ساری نشانیاں ہیں سوال کرنے والوں کے لئے، اگر تو سوال کرنے والے یہود تھے تو بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حقانیت کی ایک بہت بڑی دلیل موجود ہے، اگر

مشرکینِ مکہ تھے تو ان کو تنبیہ کرنا مقصود ہے کہ اس واقعہ کے آئینے میں تم اپنا بھی انجام دیکھو، اور جن کی تم مخالفت کر رہے ہو اس کا بھی انجام دیکھ لو، اس واقعے کے آئینے میں تمہیں سب کچھ نظر آ جائے گا، اور اگر یہ شوق صحابہ نے ظاہر کیا تھا کہ یا رسول اللہ! ہمیں کوئی اچھا سا واقعہ سنائیے اور ان کے سوال کے جواب میں یہ آیات اتریں، جیسے شانِ نزول میں ایک روایت یہ بھی موجود ہے، تو اگر سائلین سے مراد صحابہ ہو جائیں تو پھر بھی آیات (نشانیاں) اس میں موجود ہیں، کہ صحابہ کے لئے بہت ساری تسلیاں اور بہت ساری بشارتیں اس واقعے کے اندر موجود تھیں، کہ آج اگر یہ لوگ آپ پر ظلم و ستم کر رہے ہیں اور یہ زمین انہوں نے آپ کے لئے تنگ کر رکھی ہے تو کوئی بات نہیں، جس طرح سے اللہ تبارک و تعالیٰ نے یوسف علیہ السلام کو ان مظالم سے نجات دی اور اعلیٰ منصب تک پہنچایا اسی طرح سے آپ حضرات کا مستقبل بھی اچھا ہے، تو وہ (صحابہ) بھی اس انداز سے سوچ سکتے ہیں۔ تو یہ تنبیہ کر دی کہ اس واقعے کو محض ایک قصہ کہانی کے طور پر ہی نہ سنو، بلکہ اس کے واقعات کو دیکھ کر اس سے عبرت حاصل کرو، اس میں بہت ساری نشانیاں ہیں، مشرکوں کے لئے بھی یہ واقعہ ایمان کا باعث بن سکتا ہے اور ان آیات کے ضمن میں اپنا انجام ان کے سامنے آ سکتا ہے، اور یہود کے لئے بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حقانیت کے دلائل اس میں مہیا ہو سکتے ہیں۔

برادرانِ یوسف کا یوسف علیہ السلام کے متعلق باہم مشورہ

اب آگے اس واقعے کا ذکر ہے۔ بھائی اس بات کو محسوس کرتے ہی تھے جیسے کہ آگے صراحتاً آ رہا ہے کہ یوسف علیہ السلام کے ساتھ یعقوب علیہ السلام کو بہت محبت ہے، اتنی محبت ہم سے نہیں کرتے، اس کی وجہ آپ کی خدمت میں پہلے عرض کر دی گئی تھی کہ محبت کی وجہ کیا تھی، اور وہ اس بارے میں حسد کرتے تھے، اور ہو سکتا ہے کہ کسی طرح سے ان کو حضرت یوسف علیہ السلام کے خواب کا بھی پتا چل گیا ہو کہ یہ اس قسم کے خواب بھی دیکھتا ہے، آخر وہ بھی علمی خاندان کے فرد تھے، انبیاء کی اولاد تھے، اتنا سا فہم وہ بھی رکھتے ہوں گے کہ اس میں کچھ اشارہ ہے کہ آنے والے وقت میں ہم سب اس کے نیچے دب جائیں گے اور یہ ہم پر غالب آئے گا، تو یہ وجہ بھی ان کے حسد کے لئے مزید ترقی کا باعث ہوئی، تو آپس میں وہ مشورہ کرنے لگے کہ یہ تو بڑی بری بات ہے کہ ہمارے ابا، ہمارے والد ہمارے ساتھ اتنی محبت نہیں رکھتے جتنی یوسف کے ساتھ کرتے ہیں، ہر معاملے میں اس کو ترجیح دیتے ہیں، اب کیا کیا جائے، اس کے بغیر کوئی چارہ نہیں کہ اس کو گھر سے نکالو، اس کو قتل کر دو یا اس کو کسی دُور علاقے میں پھینک دو، جب یہ آنکھوں کے سامنے نہیں ہوگا آہستہ آہستہ صبر تو آ ہی جائے گا تو پھر والد کی ساری کی ساری توجہ ہماری طرف ہی ہو جائے گی، اور آئے دن جو ہمارے درمیان میں جو کشاکشی سی رہتی ہے بدمزگی سی رہتی ہے، ہم والد کا برتاؤ دیکھ کے تکلیف میں رہتے ہیں، یہ سارے کام درست ہو جائیں گے، یعنی اگر ویسے سمجھانے کی کوشش کریں مطالبہ کریں احتجاج کریں تو توقع نہیں ہے کہ ہمارا باپ اس کی طرف سے توجہ ہٹا کے ہماری طرف کرنے لگ جائے گا، اگرچہ عقل کا تقاضا یہی ہے بقول ان کے، کہ ہم ایک پوری جماعت کی جماعت ہیں، گھر کے جتنے کام ہیں وہ سارے ہم کرتے ہیں، جانور ہم چرا کے لاتے ہیں، دشمن کا خطرہ ہو جائے تو مقابلہ ہم کریں گے، خدمت ہر قسم کی ہم سرانجام دیتے ہیں، تو چاہیے تو یہ تھا کہ ہماری قدر کرتا اور ہمارے ساتھ محبت کرتا، لیکن یہ عجیب بات ہے کہ جو بچہ ہے گھر میں رہتا ہے اور کسی کا کام

بھی نہیں، دشمن کی مدافعت بھی نہیں کرسکتا، کوئی خدمت نہیں سرانجام دے سکتا، شفقتیں ساری کی ساری اس پر ہیں، اس سے بڑھ کر ہمارے باپ کی اور کیا غلطی ہوسکتی ہے، اب اگر ہم ویسے کہیں گے تو یہ چھوڑنے والے نہیں، تو اس کا طریقہ یہی ہے کہ اس روڑے کو راستے سے ہٹا دو۔ اب یوسف علیہ السلام اپنی ذات میں کتنے پیارے تھے شکل وصورت کے اعتبار سے کتنے حسین تھے اور کس قسم کی عادات اور آداب سے مزین تھے، لیکن حسد ایک ایسی چیز ہے کہ جب انسان دوسرے کے کمال کو برداشت نہیں کرسکتا تو پھر وہی باکمال شخصیت آنکھوں میں کانٹے کی طرح رڑکنے لگ جاتی ہے، جس طرح سے ہمارا شیخ سعدیؒ کہتا ہے کہ:

گل است سعدی، ودر چشم دشمناں خار است[1]

اپنے متعلق کہتے ہیں، کہ سعدی ہے تو پھول کی طرح، لیکن دشمنوں کی آنکھوں میں اس طرح سے رڑکتا ہے جس طرح سے کانٹا رڑکتا ہے۔ تو اسی طرح سے یوسف سے بڑھ کے اور پھول کیا ہوگا، لیکن ان کی آنکھ میں اس طرح سے تھا جس طرح سے کانٹا ہوتا ہے۔ تو آپس میں بیٹھ کے اسکیم لڑائی کہ یا تو اس کو قتل کر دو یا اس کو کسی دُور علاقے میں پھینک آؤ، پھر تمہارے باپ کی توجہ ساری کی ساری تمہاری طرف ہو جائے گی، اور تمہارے سارے کے سارے معاملات اور کام ٹھیک ہو جائیں گے، آئے دن ہم جو جلتے بھنتے رہتے ہیں تو اس کا علاج یہی ہے۔

انبیائے کرام علیہم السلام کے عالم الغیب نہ ہونے پر دلیل

اب اس میں اتنی بات تو آپ کو معلوم ہو جانی چاہیے کہ یوسف علیہ السلام کے بھائی جو کہ مؤمن تھے اور خاندانِ نبوت سے تعلق رکھتے تھے ان کا عقیدہ بہر حال اپنے باپ کے متعلق یہی تھا کہ یہ عالم الغیب نہیں ہیں، کیونکہ اگر وہ ان کو عالم الغیب سمجھتے تو کم از کم پس پشت بیٹھ کے ایسی سکیمیں تو نہ بناتے، جو سازشیں کیا کرتا ہے تو اس کا ذہن یہی ہوتا ہے کہ ہم جس کے خلاف سازش کر رہے ہیں اس کو اس بات کی خبر نہیں ہے، تو ان کے خیال میں یعقوب علیہ السلام عالم الغیب نہیں تھے، اپنے باپ کے متعلق ان کا عقیدہ یہی تھا، جس طرح سے سورۂ تحریم میں آپ کے سامنے آئے گا کہ ایک دفعہ حضرت عائشہ صدیقہ اور حضرت حفصہ رضی اللہ عنہما انہوں نے بھی حضور ﷺ کے متعلق ایک اسکیم بنائی تھی، تو جس وقت وہ سکیم کھل گئی اور سرورِ کائنات ﷺ کو اطلاع ہوئی تو انہوں نے پوچھا تھا مَنْ اَنْۢبَاَكَ هٰذَا: آپ کو یہ بات کس نے بتادی؟ تو رسول اللہ ﷺ نے یہ نہیں کہا کہ میں عالم الغیب ہوں، تمہیں پتا نہیں؟ اور تم مجھے عالم الغیب نہیں سمجھتیں؟ عالم الغیب سمجھے بغیر تو تمہارا ایمان ہی ٹھیک نہیں، رسول اللہ ﷺ نے یہ تقریر نہیں فرمائی، بلکہ فرمایا کہ نَبَّاَنِيَ الْعَلِيْمُ الْخَبِيْرُ مجھے علیم وخبیر نے بتا دیا ہے۔ تو وہاں سے جیسے صراحتاً ثابت ہوتا ہے کہ عائشہ اور حفصہ رضی اللہ عنہما بھی رسول اللہ ﷺ کو عالم الغیب نہیں سمجھتی تھیں، ورنہ پس پشت اس قسم کے مشورے کیوں کرتیں؟ اور جس وقت بات کھلی تو آپ ﷺ نے یہی کہا کہ مجھے اللہ نے اطلاع دی ہے، تو اسی طرح سے ان کا بھی اپنے باپ کے متعلق ایسے ہی عقیدہ تھا، اگر یہ علم غیب کا عقیدہ رکھتے تو پس پشت سازشیں نہ بناتے۔

---

(۱) گلستاں باب چہارم، حکایت نمبر ا۔

برادرانِ یوسف کا ایک رائے پر متفق ہونا

سازش تیار کرلی، جب یہ قتل کی بات آئی تو ان بھائیوں میں سے ایک بھائی ایسا تھا جس کے دل میں یوسف علیہ السلام کے لئے کچھ نرم گوشہ تھا، وہ کہنے لگا کہ بھئی! قتل تو نہ کرو، قتل کرنا تو بہت بڑا جرم ہے، تمہارا مقصد ہے اس کو باپ کی نظروں سے دُور ہٹانا تو اس کا ایک آسان طریقہ یہ ہے کہ یہ جو شاہراہ ہے جہاں سے قافلے گزرتے ہیں، تو ان شاہراہوں کے اُوپر مختلف کنویں ہوتے ہیں جہاں سے لوگ پانی نکالتے ہیں، تو اس کو لے جاؤ، کسی کنویں میں ڈال آؤ، اور کوئی قافلہ پانی نکالنے کے لئے آئے گا، تو جس وقت دیکھے گا کوئی لڑکا ہے، اور اس زمانے میں بردہ فروشی عام ہوتی تھی، لوگ غلام بناتے تھے اور غلاموں کو ادھر اُدھر لے جا کے بیچتے رہتے تھے، تو کوئی اس کو نکال لے گا، نکال کے غلام بنا کے لے جائے گا، اور ہمارا مقصد حاصل ہو جائے گا کہ ہم تو اس کو باپ کی نظروں سے دُور ہٹانا چاہتے ہیں، خواہ مخواہ اس کے خون سے ہاتھ رنگنے کی کیا ضرورت ہے؟ تو ایک نے مشورہ یہ دے دیا، بہرحال یہ دونوں رائیں سامنے آگئیں کہ قتل کرنا ہے یا اس کو کسی کنویں میں ڈالنا ہے، کسی دُور علاقے میں پھینک دینا ہے، یہ چیزیں ساری کی ساری سامنے آگئیں، اس بات پر تو بہرحال اتفاق ہوگیا کہ اس کو باپ کی آنکھوں سے دُور کرنا ہے، گھر میں اس کو برداشت نہیں کیا جاسکتا، اور جب تک یہ گھر میں رہے گا اس وقت تک ہماری دال نہیں گلے گی، اس پر تو دسوں کا اتفاق ہوگیا۔

برادرانِ یوسف کی بدخواہی کا منافقانہ انداز

جب اتفاق ہوگیا، سکیم بنالی، اب باپ سے اس کو لیا کس طرح سے جائے، گھر سے اس کو کس طرح سے لے کے جائیں، تو اب باپ کو بہلانے پھسلانے کے لئے آگئے، مکار آدمی ہمیشہ اسی قسم کی باتیں کیا کرتا ہے، اپنے آپ کو خیر خواہ بنا کے پیش کرتا ہے، اور یوں دوسرے کو اپنے شیشے میں اتار لیتا ہے، جیسے آپ کے سامنے سورۂ اعراف میں اور اسی طرح سے سورۂ بقرہ میں یہ واقعہ گزرا تھا کہ ابلیس نے آدم علیہ السلام اور حوا کو کس طرح سے اپنی طرف مائل کیا، وہاں اسے نے بھی یہی کہا تھا کہ اِنِّیْ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِیْنَ (الاعراف:٢١) کہ ان کے لئے قسمیں کھا گیا، کہنے لگا میں تمہارا بڑا خیر خواہ ہوں، یہ بیٹو! یاد رکھنے کی بات ہے، اس عمر میں انسان اکثر و بیشتر یوں ہی دھوکا کھاتا ہے، جب کوئی دشمن دشمنی کرنے کے لئے آتا ہے ہمیشہ خیر خواہی کا لبادہ اوڑھ کے آیا کرتا ہے، کوئی آپ کو یہ کہے کہ میں تیرا دشمن ہوں، میں تیرا بدخواہ ہوں، تُو میری یہ بات مان لے، تو پھر آپ کبھی اس کی بات نہیں مانیں گے، اگر وہ بدخواہ بن کے آتا ہے آپ کا دشمن بن کے آتا ہے اور کہتا ہے کہ میں تیرا بدخواہ ہوں میں تیرے لیے بُرا چاہتا ہوں، پھر آپ کو کسی چیز کا مشورہ بھی دے تو آپ کبھی اس کا مشورہ نہیں مانیں گے، وہ آپ کو کرنا تو چاہتا ہے برباد اور تباہ، لیکن آ کے ظاہر یہ کرے گا کہ میں تیرا خیر خواہ ہوں، مجھے تیرے ساتھ اللہ واسطے تعلق ہے، میں تیرا بھلا چاہتا ہوں، اس لیے میری بات ماننے میں تیرا نفع ہے، یوں کر کے آپ کو بہکائے گا اور انگلی پر لگا کے کسی ایسی ذلت کے گڑھے میں گرائے گا کہ پھر آپ پڑے ہوئے جھانکتے رہ جائیں گے، تو اس زندگی کے اندر رہتے ہوئے سب سے بڑا مشکل کام جو انسان کے سامنے ہوتا ہے وہ خیر خواہ اور بدخواہ میں فرق کرنا ہے، کیونکہ بدخواہ کبھی بدخواہ بن کے نہیں آتا، جب بھی آتا ہے خیر خواہ بن کے آتا ہے، اور خیر خواہ بن کے اعتماد میں لیتا ہے، اعتماد میں لے کے اپنا

مقصد نکالنا ہے، تو سب سے بڑا مشکل کام، خصوصیت سے اس عمر میں جس عمر میں آپ گزر رہے ہیں، دوست اور دشمن کی تمیز سب سے مشکل کام ہے، کہ انسان یہ دیکھ لے کہ میرا خیر خواہ کون ہے بدخواہ کون ہے، یہ پہچان بہت مشکل ہوتی ہے۔ تو اب یہ تھے تو انتہائی درجے کے بدخواہ اپنے باپ کے بھی اور یوسف کے بھی، لیکن دیکھو! کس طرح سے خیر خواہ بن کے آئے ہیں، آکے باتیں کی ہوں گی، پہلے بھی ممکن ہے کبھی کہا ہوگا کہ ہم جو بکریاں چرانے کے لئے جاتے ہیں، ڈنگر چرانے کے لئے جنگل کی طرف جاتے ہیں، تو کبھی ہمارے ساتھ یوسف کو بھی بھیج دو، تو ابا نے کئی دفعہ انکار کر دیا ہوگا کہ نہیں نہیں، یہ نہیں جائے گا، یہ ہمارے پاس گھر میں ہی رہے گا، یہ بداعتمادی سی پہلے کچھ نمایاں تھی، اب آ گئے دسوں کے دسوں ہی، بہت نرم لب ولہجہ کے ساتھ کہنے لگے اَبا جی! کیا بات ہے، یوسف کے بارے میں آپ ہمارا اعتبار کیوں نہیں کرتے؟ ہمارے ساتھ اس کو جنگل میں کیوں نہیں بھیجتے؟ آپ کا کیا خیال ہے کہ ہم اس کی راحت اور آرام کا خیال نہیں کریں گے؟ ہم اس کی حفاظت نہیں کریں گے؟ ہمیں تو خود اس کے ساتھ محبت ہے، ہمارے بھائی کو ہمارے ساتھ بھیجو، ہم جنگل میں جاتے ہیں یہ گھر میں بیٹھا رہ جاتا ہے، اور جب یہ ہر وقت گھر ہی بیٹھا رہے گا تو اس کی صحت خراب ہو جائے گی، اس کی نشوونما کس طرح سے ہوگی، اس کو ہمارے ساتھ بھیجا کرو، جنگل کے پھل کھائے گا، کھیلے گا کودے گا اچھلے گا، اس کی صحت اچھی ہوگی، نشوونما پائے گا، چست چالاک رہے گا۔ تو اس قسم کی سکیمیں بنا کے گویا کہ یوسف علیہ السلام کے ساتھ بھی ہمدردی کا اظہار کیا اور اپنے باپ کے ساتھ بھی عقیدت مندی، یوں سامنے بیٹھ کے باتیں کرنی شروع کر دیں، ہم پوری طرح سے اس کی حفاظت کریں گے، آپ ذرا بھی خیال نہ کیجئے، اس کو کھیلنے کا بھی موقع دیا کرو، اس کے ہاتھ پاؤں میں قوت آئے، چلنے پھرنے کا عادی ہو، اس کی صحت اچھی ہو، نشوونما پائے، ہمارے ساتھ بھیجو، ہم وہاں کھیلیں گے اور اس کو بھی ساتھ کھلائیں گے، اور وہاں ہم جنگلی پھل کھاتے ہیں اس کو بھی کھلائیں گے، تو یہ خوش رہے گا، ''اے ہمارے اَبا! تو ہمارا اعتبار کیوں نہیں کرتا یوسف کے بارے میں؟ حالانکہ ہم اس کے لئے بالکل بہت خیر خواہ ہیں'' یہ ہمارا چھوٹا بھائی ہے، جس طرح سے بڑے بھائیوں کو چھوٹے بھائیوں سے شفقت ہوتی ہے خیر خواہی ہوتی ہے، ہم بھی تو اس کے اسی طرح سے خیر خواہ ہیں، اس کا بھلا ہی چاہتے ہیں، ہم کوئی اس کے دشمن تو نہیں ہیں، کل کو ہمارے ساتھ اس کو بھیجنا، ہمارے ساتھ جائے گا تو وہاں جنگل کے میوے کھائے گا، کھیلے گا، اور ہم اس کی نگرانی کریں گے، پوری طرح سے حفاظت کریں گے، آپ کوئی خطرہ محسوس نہ کریں۔

یوسف علیہ السلام کے متعلق یعقوب علیہ السلام کے خدشات اور برادرانِ یوسف کا ان کو اِعتماد میں لینا

اب حضرت یعقوب علیہ السلام نے جو آگے سے بات کہی وہ یہ نہیں ہے کہ بیٹا! دیکھو! کھیلنا اچھی بات نہیں، یا جنگل کے میوے کھانا اچھی بات نہیں ہے، فضول حرکتیں نہ کیا کرو، نہیں! چھوٹی عمر کے اندر بچے کے لئے کھیلنا برداشت کر لیا جاتا ہے، اور خاص طور پر ایسا کھیل جو ورزش کا کام دے اور اُس وقت میں جس طرح سے جنگیں ہوتی تھیں دشمنوں کے ساتھ مقابلے ہوتے تھے اُس میں وہ کام آئے، تیراندازی ہوگئی، بھاگ دوڑ ہوگئی، آخر اُس وقت جنگیں ایسے ہی ہوتی تھیں، اس لیے وہ لوگ اپنی بدویانہ زندگی میں اس قسم کی مشقیں کر کے رکھتے تھے تا کہ دشمن کا مقابلہ کیا جا سکے، تو یہاں کھیل سے اسی قسم کا کھیل مراد ہے، اور بچوں کے لئے کھیل ویسے

بھی قابلِ برداشت ہے، اس سے طبیعت میں نشاط پیدا ہوتا ہے، چستی آتی ہے، ان کی بدنی صحت بنتی ہے، تو یہ مصلحت سے خالی نہیں، اس لیے حضرت یعقوب علیہ السلام نے اس پر انکار نہیں کیا کہ تم کھیلنے کا مطالبہ کیوں کرتے ہو، کھیلنا نہیں چاہیے، جنگل کے میوے نہیں کھانے چاہئیں، بلکہ آگے سے ایک اور بات کہی، کہ پہلی بات تو یہ ہے کہ اس کا جانا ہی میرے لیے باعثِ غم ہے، میری آنکھوں کے سامنے رہتا ہے تو مجھے اطمینان رہتا ہے، طبیعت خوش رہتی ہے، تم اس کو لے جاؤ گے تو یہ جدائی میرے واسطے باعثِ حزن ہے، پہلی بات تو یہ ہے، اور دوسری بات یہ ہے کہ اس جنگل کے اندر بھیڑیے بہت ہیں، اور مجھے یہ اندیشہ ہے کہ تم اس کی طرف سے غفلت برتو گے، اور غفلت برتنے کے نتیجے میں اس کو کہیں بھیڑیا نہ کھا جائے، مجھے یہ خوف بھی ہے۔ اب آپ خیال کیجیے کہ وہ بھی تو آخر بیٹے ہی تھے جو جنگل میں بکریاں چرانے کے لئے جاتے تھے، اور یہ جانور بھی جنگل میں پھرتے تھے تو بھیڑیے واقعی موجود ہوں گے، اور کبھی ایسی وارداتیں بھی ہو جاتی ہوں گی، لیکن ان بیٹوں کے بارے میں تو ایسا خطرہ محسوس نہ کیا جس قسم کا خطرہ یوسف علیہ السلام کے بارے میں محسوس ہو رہا ہے، یہ بھی اسی محبت سے ناشی ہے جس کو کہتے ہیں کہ ''عشق است ہزار بدگمانی'':

با سایۂ تو را نمی پسندم عشق است ہزار بدگمانی

کہ تیرے ساتھ اگر سایہ بھی چلتا ہے تو مجھے پسند نہیں، کیونکہ جہاں عشق آجاتا ہے پھر وہاں ہزاروں بدگمانیاں ہوتی ہیں۔ تو یہ محبت کا نتیجہ ہے کہ باقیوں کے متعلق تو اس قسم کے خطرات محسوس نہ ہوئے، یوسف علیہ السلام کے متعلق یہ خطرہ محسوس ہو گیا کہ کہیں بھیڑیا نہ کھا جائے، تو یہ محبت کی بات ہے دوسری بات یہ ہے کہ یہ چھوٹے تھے اور وہ بڑے تھے، بڑے اس قسم کے خطرات کا مقابلہ کر لیتے ہیں، اگر وہ تنہا بھی ہو جائیں یعنی نو ایک طرف ہو جائیں اور دسواں ایک طرف ہو وہ اکیلا ہونے کی صورت میں بھی بھیڑیے کا مقابلہ کر سکتا ہے بڑا ہونے کی وجہ سے، اور یہ ہیں چھوٹے، تو کہیں ایسا نہ ہو کہ تم سارے ایک طرف ہو جاؤ اور اس کو کسی ایک طرف چھوڑ دو تو یہ مقابلہ نہیں کر سکے گا، تو چھوٹا ہونے کی وجہ سے بھی یہ خطرہ ہو سکتا ہے، ''تم غفلت برت جاؤ گے اور اس کو بھیڑیا کھا جائے گا'' وہ آگے سے اس قسم کی بات سن کے پھر جیسے انسان اعتماد دلایا کرتا ہے، تو انہوں نے اعتماد دلایا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے، ہم جماعت کی جماعت ہیں قوت والے ہیں، اگر اس کو ہماری موجودگی میں بھیڑیا کھا گیا تو اس سے بڑھ کے ہمارا خسارہ کیا ہو گا کہ ہمارا یوسف جیسا بھائی، اس کو بھیڑیا کھا جائے؟ پھر ہمارا بچے گا کیا؟ ہم تو کسی کام کے نہیں رہیں گے، ہم تو بہت نقصان میں چلے جائیں گے، ہم تو سب کچھ ہی گنوا بیٹھیں گے اگر ہمارا یہ بھائی ہمارے ہاتھ سے ضائع ہو گیا، آپ اس قسم کا خیال نہ کریں، تو پوری طرح سے اعتماد دلا دیا، جب اعتماد دلا دیا تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے بھی کہا کہ ٹھیک ہے، لے جانا، آخر تمہارا بھائی ہے، یہ بھی کھیل آئے گا، جنگل میں چکر لگا آئے گا، اجازت دے دی۔

یوسف علیہ السلام کو کنویں میں پھینکنا...... اللہ کی طرف سے وحی کا آنا

جب اجازت دے تو اب اس بھائی کو ساتھ لے گئے، لے جانے کے بعد اب (پہلے دو تین رائیں سامنے تھیں کہ قتل کر دیا جائے، کسی دُور علاقے میں پھینک دیا جائے، کنویں میں پھینک دیا جائے) لیکن پھر بعد میں مشورہ کر کے یہ بات طے ہو گئی

کہ اس کو کنویں کی گہرائی میں پھینک دو، جب کنویں کی گہرائی میں پھینک دو گے تو کوئی آ کے لے جائے گا، لے جا کے جس وقت کنویں میں پھینکنے لگے تو یوسف علیہ السلام کی قمیص اُتار لی کیونکہ یہ بھی اس سازش کا حصہ تھا جس طرح سے آگے بات آ رہی ہے، تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم نے یوسف علیہ السلام کے دل میں یہ بات ڈال دی، وحی کر دی، اور اس وحی کے ساتھ دل میں اطمینان پیدا ہو گیا، چونکہ آنے والے وقت میں یہ نبی بننے والے تھے، اور نبی کے قلب میں صلاحیتیں پہلے سے ہی ہر طرح سے کامل ہوتی ہیں، تو وہ القاء فی القلب جو کیا گیا تو یوسف علیہ السلام کے لئے پورا اطمینان میسر آ گیا، اُس میں یہ بات ڈال دی گئی کہ فکر نہ کیجیے، آپ اس واقعے میں محفوظ رہیں گے، اور ایک وقت آئے گا کہ آپ کو اللہ تعالیٰ شان وشوکت دے گا، اور پھر آپ ان کو ان کی یہ بات جتائیں گے کہ تم نے ایسے کیا تھا، اور وہ وقت ایسا ہو گا کہ ان کو شعور بھی نہیں ہو گا، یہ سمجھیں گے بھی نہیں، ان کے خیال میں بھی نہیں ہو گا کہ تجھے اتنی عظمت نصیب ہو گئی، تو یہ اپنے انجام کی طرف سے مطمئن کر دیا گیا اور تسلی دے دی گئی، جس سے حضرت یوسف علیہ السلام کو پوری طرح سے اطمینان مہیا ہو گیا۔ فَلَمَّا ذَهَبُوْا بِهٖ: لَمَّا کا جواب کیا ہے؟ ''جب لے گئے اس کو، اور جب انہوں نے پختہ ارادہ کر لیا کنویں کی گہرائی میں اس کو ڈالنے کا، اور جب ہم نے وحی کر دی اس کی طرف کہ تو ان کو ضرور خبر دے گا ان کے معاملے کی ایسے حال میں کہ ان کو پتا بھی نہیں ہو گا۔ اور جب آئے وہ اپنے باپ کے پاس عشاء کے وقت روتے ہوئے، تو کہا انہوں نے'' تو ''لَمَّا'' کا جواب آ جائے گا قَالُوْا يٰۤاَبَانَاۤ، اور سب واقعات اسی اختصار کے ساتھ اس کے درمیان میں لپیٹ دیے گئے۔ یعنی لے جانے کے بعد پھر آ کے انہوں نے اپنے اَبا سے یہ کہا، درمیان میں یہ سارے واقعات ہوئے، کہ انہوں نے پختہ ارادہ کیا، ہم نے اس کی طرف وحی کی، پھر وہ اپنے باپ کے پاس آئے اور آنے کے بعد پھر انہوں نے اپنے اَبا سے یوں کہا، تو بعض تفسیروں میں لَمَّا ذَهَبُوْا کا جواب اسی قَالُوْا يٰۤاَبَانَاۤ کو بنایا گیا ہے (قرطبی)، اور درمیان میں بہت سارے واقعات سمیٹ لیے گئے۔ اور بعض تفسیروں میں وَاَوْحَيْنَاۤ اِلَيْهِ کو جواب کو بنایا گیا ہے اور واؤ کو زائدہ قرار دیا گیا ہے (قرطبی)، ''جب وہ اس کو لے گئے اور انہوں نے پختہ ارادہ کیا اس کو کنویں کی گہرائی میں ڈالنے کا، ہم نے وحی کی اس کی طرف'' پھر جواب یہ ہو جائے گا، اور واؤ کو زائدہ قرار دینا پڑے گا۔

برادرانِ یوسف روتے ہوئے رات کے وقت کیوں آئے؟

وَجَآءُوْۤ اَبَاهُمْ عِشَآءً يَّبْكُوْنَ: اب یہ کرتو لیا کہ یوسف علیہ السلام کو کنویں میں ڈال دیا، اپنی سکیم گویا کہ انہوں نے سرے چڑھا لی، اب عام طور پر تو دِن کو ذرا سورج کھڑے واپس آ جاتے ہوں گے عصر کے بعد، اور آ کے گھر کا نظام کرنا، جانوروں کو سنبھالنا ہے، دوسرے کام کرنے ہیں، اُس دن قصداً دیر کر دی، عشاء کے وقت آئے رات کی تاریکی میں، رات کی تاریکی میں آنے کی کیا حکمت تھی؟ اس میں دو باتیں ہو سکتی ہیں، ان کے دل میں یہ خیال ہو گا کہ اتنا اندھیرا کر کے جاؤ تاکہ ہمارا اَبا جنگل کی طرف اس کو دیکھنے اور تلاش کرنے کے لئے آ نہ سکے، کہ رات بہت ہو گئی، اب اس کو کہاں دیکھتے پھریں، جنگل ہے جھاڑ ہیں خطرات ہیں، اب کہاں تلاش کریں گے، تو دوبارہ تلاش کرنے کے لئے نہ آ سکے، ایک یہ بات، دوسری بات یہ ہے کہ ایک تو ہوتا ہے کہ واقعی دل کو صدمہ پہنچا ہوا ہو، اور اس صدمے کی وجہ سے انسان روتا ہے، اور ایک کرنی ہوتی ہے بناوٹ، اور بناوٹ میں چہرے کے اوپر آپ جانتے ہیں

کہ وہ اثرات تو ہوتے نہیں جو حقیقتاً رونے کے ہوا کرتے ہیں، تو رات کی تاریکی میں تو منہ چھپا رہے گا اور دن کی روشنی میں جائیں گے تو باپ کو منہ جو دکھائیں گے تو آخر بناوٹ کا رونا اور حقیقتاً رونا، ان دونوں کے درمیان فرق تو ہوتا ہے، وہ تو ہمارے چہرے دیکھ کے سمجھ جائے گا کہ یہ ایسے ہی بناوٹ کررہے ہیں، تو رات کی تاریکی میں جاؤ تا کہ منہ ہی نظر نہ آئے، بس ایک آواز ہی سننے میں آئے کہ ہم رو رہے ہیں، باقی! ہماری شکلیں نظر نہ آئیں کہ ہماری شکلوں کے اوپر کس قسم کے آثار طاری ہیں، تو یہ فرق ہوتا ہے، کہ دل کے اندر ایک جذبہ ہو اور اس جذبے کے تحت رویا جائے، اور ایک ہے کہ ظاہری صورت رونے کی بنالی جائے، تو دونوں کے درمیان میں آثار کا فرق ہوتا ہے، ان آثار کو چھپانے کے لئے وہ رات کی تاریکی میں آئے، اور روتے ہوئے آئے۔

ہر رونے والا سچا نہیں ہوتا!

ان کے اس واقعے کی طرف دیکھتے ہوئے حضرت اعمش رحمۃ اللہ علیہ ایک محدث ہیں، تابعی ہیں، وہ فرمایا کرتے تھے کہ جب سے ہم نے یوسف کے بھائیوں کا واقعہ سنا اس وقت سے ہم رونے والوں کا بھی اعتبار نہیں کرتے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض لوگ اندر سے گڑبڑ ہوتے ہیں اور آ کے رو رو کے یقین دلانا چاہتے ہیں، خود ہی سب کچھ کرلیا اور خود ہی رو کے ثبوت دینا چاہتے ہیں کہ ہم سچے ہیں، تو رونے کا پردہ بھی لوگ ڈالتے ہیں، اس لیے ہر رونے والا بھی سچا نہیں ہوتا، جیسے ہمارے اکابر کی تحقیق یہی ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو قتل کرنے والے اصل کے اعتبار سے وہی محبین ہیں جنہوں نے خط لکھ لکھ کے ان کو بلایا تھا، ''قاتلانِ حسین'' حضرت مولانا عبدالشکور صاحب لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ کا مستقل رسالہ ہے، انہوں نے اہلِ کوفہ کو قاتل ثابت کیا ہے، کہ یہی جو ظاہراً محبین تھے یہی اصل کے اعتبار سے قاتل ہیں، تو خود ہی قتل کرلیا خود ہی تعزیے اُٹھالیے۔ اور اب تو واقعی ایسا کرتے ہیں کہ گھوڑے کو خود ہی بنائیں گے، تیر لٹکائیں گے، اس کی آنکھوں میں مرچیں ڈال کے آنسو بہائیں گے، سب کچھ کریں گے، تو بناتے بھی سب کچھ خود ہی ہیں، تعزیہ بھی خود ہی بنایا، اور خود ہی توڑا، خود ہی رو لیا، خود ہی پیٹ لیا۔ تو حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے بھی ایسے ہی کیا کہ کنویں میں تو خود پھینک دیا اور جھوٹ موٹ کا خون بھی قمیص پر لگالیا اور بعد میں تعزیہ اٹھا کے آگئے، رو رہے ہیں۔

برادرانِ یوسف کا مکروفریب

عشاء کے وقت روتے ہوئے آگئے، وہ کہتے ہیں اے اَبا! کیا کریں، یہ تو عجیب واقعہ پیش آگیا، (اور دیکھو! انہوں نے جو اپنی سکیم بنائی تو حضرت یعقوب علیہ السلام کے اس خیال سے ہی اس کا تانا بانا لیا، انہوں نے سوچا کہ اَبا کے ذہن میں یہ تو ہے ہی کہ کہیں بھیڑیا نہ کھا جائے تو ہم کہیں گے لو! جو خطرہ تھا پیش آگیا، آپ تو پہلے ہی کہہ رہے تھے کہ مجھے خطرہ ہے کہیں بھیڑیا نہ کھا جائے، لو! ایسے ہی ہوگیا، مطلب ہے کہ انہوں نے سوچا کہ یہ بات ان کے ذہن میں ہے کہ اگر ہم یہ بات بنائیں گے تو ان کا ذہن قبول کرنے کے لئے تیار ہے، کیونکہ ان کو پہلے ہی خطرہ ہے کہ کہیں بھیڑیا نہ کھا جائے، اور جب ہم جاکے کہیں گے کہ اَبا! تیرا خیال ٹھیک نکلا، کہ تو کہتا تھا کہ کہیں اس کو بھیڑیا نہ کھا جائے، لو! بھیڑیا کھا گیا، تو گویا کہ اَبا کے خیال پر ہی بنیاد رکھ کے سکیم بنالی) کہنے لگے اے اَبا! اِنَّا ذَهَبْنَا نَسْتَبِقُ: تو چونکہ کھیلنے کا تو کہہ کے گئے تھے کہ ہم کھیلیں گے، تو کھیل کے اندر کے یہ دوڑ لگانا آگیا، کہ ہم

نے ایک جگہ کپڑے اُتار کے رکھے، یہ تو ہمارے ساتھ دوڑ میں شریک نہیں ہوسکتا تھا چونکہ چھوٹا تھا، تو ہم نے اس سے کہا کہ بھئی! تُو تو یہاں بیٹھ، تو اس کو کپڑوں اور سامان کے پاس بٹھا دیا اور خود ہم نے دوڑ لگائی کہ دیکھیں ایک دوسرے سے آگے کون نکلتا ہے، تو جس وقت ہم بھاگتے ہوئے دُور چلے گئے یوسف علیہ السلام پیچھے اکیلا رہ گیا، پیچھے سے بھیڑیا آیا اور اس کو کھا گیا، تو بات تو یہی ہے جو ہم کہہ رہے ہیں لیکن اس بات کو تُو نہیں مانے گا، تُو تصدیق نہیں کرے گا اگرچہ ہم کتنے ہی سچے کیوں نہ ہوں، یعنی تیرے نزدیک ہم پہلے سے صادقین میں شمار ہوں تو بھی اس واقعے میں تیرا دل ہماری بات پہ نہیں جچے گا، تو یہ انہوں نے آ کے خبر سنا دی اور قمیص پیش کر دی جس کے اوپر خون لگا ہوا تھا۔

برادرانِ یوسف کے جھوٹ کا نمایاں ہونا...... پدرِ یوسف کا صبر

اور یہاں بھی مفسرین نے وہ روایات لی ہیں، جو اسرائیلیات سے ہی ماخوذ ہیں، کہ وہ قمیص جو لے کے آئے تھے، کہتے ہیں ''دروغ گو را حافظہ نباشد'' جھوٹ بولنے والے کا حافظہ بہت کم ہوتا ہے، اسے پتا ہی نہیں ہوتا کہ پہلے میں کیا بات کر چکا ہوں، اور اس کے ساتھ کیا کچھ اور کہنا چاہیے، بعض باتیں اس سے چھوٹ جاتی ہیں، ''دروغ گو را حافظہ نباشد'' جھوٹ بولنے والے کا حافظہ نہیں ہوتا، اسے پتا ہی نہیں ہوتا کہ کیا کہہ لیا ہے، بعد میں کیا کہنا ہے، یا اس جھوٹ کو نبھانے کے لئے اور کیا کیا کرنا پڑے گا، یہ اسے یاد نہیں رہتا۔ کہتے ہیں کہ وہ قمیص اُتار کے اس کے اُوپر خون تو لگا لیا لیکن پھاڑنی یاد نہ رہی، تو صحیح سالم قمیص تھی، جب صحیح سالم قمیص پیش کی اور اس کے اوپر خون لگا ہوا دیکھا، تو پہلے تو یہ بھی ممکن ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے انسان کے خون میں اور جانور کے خون میں امتیاز کر لیا ہو، کہ یہ یوسف علیہ السلام کا خون نہیں بلکہ کسی جانور کا خون ہے، دوسرے بعض روایات سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ کہنے لگے کہ بھئی! وہ بھیڑیا تو بہت سمجھ دار ہوگا جس نے قمیص نہیں پھٹنے دی اور یوسف علیہ السلام کو کھا لیا، تو اس سے بھی وہ استدلال کر گئے کہ یہ ان کی بنائی ہوئی کوئی سکیم ہے، انہوں نے اپنا حسد نکالا ہے، باقی! یوسف علیہ السلام کو بھیڑیے نے نہیں کھایا، ان کو دِلی اطمینان تھا، اطمینان کی وجہ یہ بھی تھی کہ وہ سمجھے بیٹھے تھے کہ یوسف علیہ السلام نے جو خواب دیکھا ہے وہ خواب سچا ہے، بشریٰ من اللہ ہے، اور ایسا واقعہ پیش آئے گا کہ اللہ تعالیٰ اِس کو عظمت دے گا اور بھائیوں اور ماں باپ کے سامنے وہ ایک عظیم شخصیت بن کے آئے گا، اور سارے کے سارے اس کی عظمت کا اعتراف کریں گے، یہ خواب سچا ہے، بہر حال وہ یہ سمجھ گئے یہ بھائیوں کی بنائی ہوئی سکیم ہے، تو کہا: بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا: تمہارے دلوں نے کوئی بات بنا لی ہے، واقعہ اس طرح سے نہیں ہے۔ اور آپ دیکھیں گے کہ جب مصر میں بنیامین کو چوری کے الزام میں پکڑ لیا جائے گا، اور بھائی پھر اسی طرح سے غمزدہ افسردہ ہو کے باپ کو آ کے اطلاع دیں گے کہ تیرے بیٹے نے تو چوری کر لی اور وہ وہاں پکڑ لیا گیا، جب اطلاع دی تو یعقوب علیہ السلام نے وہاں بھی یہی بات کہی: بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا، نہیں! تمہارے دلوں نے کوئی بات بنالی، میرے بیٹے نے چوری نہیں کی، وہاں وہ (بھائی) سچے تھے، لیکن اسی قسم کی بداعتمادی کا اظہار وہاں بھی حضرت یعقوب علیہ السلام نے کر دیا، اس لیے مفسرین نے لکھا ہے کہ نبی جس وقت کوئی بات اجتہاد سے کہے تو اس میں یہ امکان ہوتا ہے کہ اس میں لغزش ہو جائے لیکن اللہ تعالیٰ اس لغزش کے اوپر اس کو برقرار نہیں رکھتے، اس لیے یہاں قرائن

کے جو بات حضرت یعقوب علیہ السلام نے سمجھی تھی وہ تو بالکل صحیح تھی، اور وہاں جو قرائن کے ساتھ بات سمجھی وہ خلاف واقع تھی، وہاں ان کی بنائی ہوئی سکیم نہیں تھی بلکہ اِن کے خیال میں واقعہ تھا کہ اُس نے چوری کی اور چوری کے الزام میں وہ پکڑا گیا، اس لیے وہاں حضرت یعقوب علیہ السلام کا ظن ٹھیک نہیں نکلا، جو انہوں نے قرائن کے ساتھ بات سمجھی تھی وہ ٹھیک نہیں تھی، عام مفسرین نے یہی لکھا ہے، لیکن اگر حقیقت دیکھی جائے تو اُن کا خیال وہاں بھی ٹھیک تھا، کہ وہ قرائن کے ساتھ یہ سمجھے کہ یہ میرے بیٹوں کی کوئی سکیم ہے، اور جنہوں نے سکیم بنائی تھی وہ بھی تو بیٹے ہی تھے، اس میں کیا شک ہے، کیا سکیم بنانے والے بیٹے نہیں تھے؟ وہاں یوسف علیہ السلام نے سکیم بنائی تھی وہ بھی تو بیٹوں میں ہی شامل ہیں، اس لیے ان کو اتنا تو یقین تھا کہ چوری نہیں کی، بہرحال یہ کوئی بیٹوں کی سکیم ہے تو جن بیٹوں کی طرف خیال گیا تھا وہ بیٹے تو نہیں تھے بہرحال جس نے سکیم بنائی تھی وہ بیٹا ہی تھا، اس اعتبار سے اتنی بات تو ٹھیک تھی کہ بنیامین نے چوری نہیں کی، یہ خیال ٹھیک ہے، اور یہ بیٹوں کی کوئی سازش ہے، تو وہ بات بھی اپنی جگہ صحیح ہے۔ فَصَبْرٌ جَمِیْلٌ: حضرت یعقوب علیہ السلام سمجھ گئے ہوں گے کہ یہ اللہ کی طرف سے کوئی امتحان ہے، تو کہا صبر کرنا ہی بہتر ہے، میں صبرِ جمیل اختیار کرتا ہوں، صبرِ جمیل: جس میں کوئی شکوہ شکایت نہ ہو۔ وَاللّٰہُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰی مَا تَصِفُوْنَ: جو کچھ تم کہتے ہو اس کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ ہی مستعان ہے، اللہ سے ہی مدد طلب کرتا ہوں کہ ان حالات میں وہ میری مدد کرے اور مجھے صبر کی توفیق دے۔ یہ بات تو یہاں تک پہنچ گئی۔

قافلے والوں کے ہاتھوں یوسف علیہ السلام کا فروخت ہونا

اُدھر سے ایک قافلہ آ گیا، وہ وہاں قریب آ کے اترا ہوگا، تو انہوں نے اپنے آدمی کو جو پانی لانے پر متعین تھا اسے بھیجا اور وہ اسی کنویں پر گیا اور جا کے اپنا ڈول لٹکایا، جب ڈول لٹکایا تو یوسف علیہ السلام نے وہ ڈول پکڑ لیا، اور جب اس نے کھینچا ہوگا تو پانی کی بجائے یوسف باہر آ گیا، تو وہ دیکھتے ہی خوشی کے ساتھ نعرہ لگاتا ہے، یٰبُشْرٰی هٰذَا غُلٰمٌ: کیا خوشی کی بات ہے، اے خوشی! حاضر ہو جا، یہ تیرے حاضر ہونے کا وقت ہے، ترکیبی طور اس کا مفہوم یہ ہوتا ہے، خوشی کا وقت ہے کہ یہ لڑکا مل گیا، لڑکے کو دیکھ کے خوش اس لیے ہوئے کہ اتنا ہونہار، اتنا شریف، اتنا خوبصورت بچہ، یہ تو بڑی اچھی قیمت پر بکے گا اگر ہم اس کو بیچنا چاہیں گے، تو گویا کہ بردہ فروشی کے دور میں اس طرح سے کسی لڑکے کا مل جانا خوشی کا باعث تھا، کہ یہ بھی ایک سامانِ تجارت ہے، ٹھیک ہے، تجارت کریں گے، بیچیں گے، اس سے نفع اٹھائیں گے، تو اس کو سامان بنا کے چھپا لیا تاکہ کسی دوسرے کو پتا نہ چلے اور وہ ہم سے اس کو چھیننے کی کوشش نہ کرے، جو کچھ وہ کر رہے تھے اللہ تعالیٰ سب دیکھ رہا تھا، سب جانتا تھا کہ یہ کیا کر رہے ہیں، ان کی اپنی سکیمیں تھیں اور اللہ تعالیٰ کی اپنی سکیم تھی۔ وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍ بَخْسٍ: اس کے دونوں مطلب آپ کی خدمت میں ذکر کر دیے کہ یوسف علیہ السلام کو گھٹیا قیمت پر بیچ دیا ان قافلے والوں نے مصر میں لے جا کر، یعنی جتنے بھی پیسے لیے چاہے اس کے مقابلے میں تول کر سونا لیا ہو لیکن یوسف کے مقابلے میں تو گھٹیا ہی تھا، لیکن یہاں تو انہوں نے لیے بھی چند گنتی کے ہی تھے، اس لیے کہ مفت کا مال تھا، جس طرح سے کہتے ہیں "مال مفت دلِ بے رحم"، کون سے کوئی پیسے خرچ کر کے آئے تھے کہ انہوں نے یہ سوچنا تھا کہ جتنے ہم نے پیسے خرچ کیے ہیں اتنے ملیں اور اس پر نفع

ملے ،مفت کا مال تھا اس لیے چند گنتی کے درہم کے عوض بیچ دیا ، وَكَانُوْا فِيْهِ مِنَ الزّٰهِدِيْنَ: اور وہ اس کے بارے میں رغبت کرنے والے نہیں تھے، زاھدین میں سے تھے، یعنی ان کو اس کے بارے میں کوئی رغبت نہیں تھی۔ یا (مطلب یہ ہے کہ) بھائیوں نے اس کو ناقص سی قیمت پر بیچ دیا کہ ان کو بھی کوئی قدر نہیں تھی ، وہ تو اپنے راستے سے اس کو دُور ہٹانا چاہتے تھے، تو جیسے کیسے بھی تھا چند درہموں کے بدلے میں اس کو بیچ دیا ، وَكَانُوْا فِيْهِ مِنَ الزّٰهِدِيْنَ کی بات ان پر بھی صادق آتی تھی ، کہ وہ یوسف علیہ السلام کے بارے میں زاھدین سے تھے، یعنی اُن کو اِن کے بارے میں کوئی رغبت نہیں تھی ، کوئی قدر نہیں تھی ، اس لیے زیادہ قیمت لینے کی کوشش نہیں کی۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

وَقَالَ الَّذِى اشْتَرٰىهُ مِنْ مِّصْرَ لِامْرَاَتِهٖٓ اَكْرِمِىْ مَثْوٰىهُ عَسٰٓى اَنْ يَّنْفَعَنَآ
اور کہا اس شخص نے جس نے یوسف کو خریدا تھا مصر سے (کہا) اپنی بیوی کو کہ تو اس کے ٹھکانے کو اچھا کر، ہوسکتا ہے کہ یہ ہمیں نفع پہنچائے
اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا ؕ وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِى الْاَرْضِ ۫ وَلِنُعَلِّمَهٗ مِنْ تَاْوِيْلِ
یا ہم اس کو بیٹا ہی بنالیں، اور ایسے ہی ٹھکانا دیا ہم نے یوسف کو مُلک میں اور تاکہ ہم اس کو سکھائیں باتوں کو
الْاَحَادِيْثِ ؕ وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰٓى اَمْرِهٖ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝۲۱ وَلَمَّا بَلَغَ
ٹھکانے لگانا، اللہ تعالیٰ غالب ہے اپنے اَمر پر لیکن اکثر لوگ جانتے نہیں ۝۲۱ اور جب یوسف علیہ السلام پہنچ گئے
اَشُدَّهٗٓ اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا ؕ وَكَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ ۝۲۲ وَرَاوَدَتْهُ الَّتِىْ هُوَ فِىْ
اپنی جوانی کو تو ہم نے ان کو علم وحکمت سے نوازا، اور ہم ایسے ہی بدلہ دیتے ہیں محسنین کو ۝۲۲ وہ عورت جس کے گھر میں یوسف تھے
بَيْتِهَا عَنْ نَّفْسِهٖ وَغَلَّقَتِ الْاَبْوَابَ وَقَالَتْ هَيْتَ لَكَ ؕ
اس نے یوسف کو بہلایا پھسلایا یوسف کے نفس سے اور اس نے دروازے بند کر لیے اور کہنے لگی کہ آ جا، میں تجھے کہتی ہوں،
قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اِنَّهٗ رَبِّىْٓ اَحْسَنَ مَثْوَاىَ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ
یوسف علیہ السلام نے کہا کہ اللہ کی پناہ، بیشک یہ (عزیزِ مصر) میرا مالک ہے اس نے میرا ٹھکانا بڑا اچھا کیا ہے، بیشک بات یہ ہے کہ ظالم لوگ
الظّٰلِمُوْنَ ۝۲۳ وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ ۚ وَهَمَّ بِهَا
فلاح نہیں پایا کرتے ۝۲۳ اور البتہ ضرور اس عورت نے یوسف کے متعلق ارادہ کیا اور یوسف نے اس عورت کے متعلق ارادہ کیا،

لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ ؕ كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ

اگر نہ دیکھ لیتا یوسف اپنے رب کی برہان (تو معاملہ آگے بڑھ جاتا)، ہم نے اس کو ایسے ہی ثابت قدم رکھا تا کہ دور ہٹا دیں ہم اس سے

السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَآءَ ؕ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِیْنَ ۝۲۴ وَاسْتَبَقَا الْبَابَ وَقَدَّتْ

برائی اور بے حیائی کو، بیشک وہ ہمارے مخلص بندوں میں سے تھا ۲۴ وہ دونوں بھاگے دروازے کی طرف، اس عورت نے یوسف

قَمِیْصَهٗ مِنْ دُبُرٍ وَّاَلْفَیَا سَیِّدَهَا لَدَا الْبَابِ ؕ قَالَتْ مَا جَزَآءُ مَنْ

کی قمیص پھاڑ دی پیچھے سے، اور پایا ان دونوں نے عورت کے سردار (خاوند) کو دروازے کے پاس، عورت بولی کیا بدلہ ہے اس

اَرَادَ بِاَهْلِكَ سُوْٓءًا اِلَّآ اَنْ یُّسْجَنَ اَوْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ۝۲۵ قَالَ هِیَ

شخص کا جو ارادہ کرے تیری بیوی کے ساتھ برائی کا مگر یہ کہ اس کو قید کر دیا جائے یا دردناک سزا دی جائے ۲۵ یوسف نے کہا: اسی

رَاوَدَتْنِیْ عَنْ نَّفْسِیْ وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ اَهْلِهَا ۚ اِنْ كَانَ قَمِیْصُهٗ قُدَّ

عورت نے مجھے پھسلایا ہے میرے نفس سے، اور گواہی دے دی ایک گواہ نے عورت کے گھر والوں میں سے اگر اس کی قمیص پھٹی ہے

مِنْ قُبُلٍ فَصَدَقَتْ وَهُوَ مِنَ الْكٰذِبِیْنَ ۝۲۶ وَاِنْ كَانَ قَمِیْصُهٗ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ فَكَذَبَتْ

آگے سے تو پھر عورت سچی ہے اور یہ مرد جھوٹوں میں سے ہے ۲۶ اور اگر اس کی قمیص پھٹی ہے پیچھے سے تو پھر عورت جھوٹی ہے

وَهُوَ مِنَ الصّٰدِقِیْنَ ۝۲۷ فَلَمَّا رَاٰ قَمِیْصَهٗ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ

اور یہ سچوں میں سے ہے ۲۷ پس جس وقت عزیز مصر نے یوسف کی قمیص کو دیکھا کہ وہ پھاڑی گئی تھی پیچھے سے

قَالَ اِنَّهٗ مِنْ كَیْدِكُنَّ ؕ اِنَّ كَیْدَكُنَّ عَظِیْمٌ ۝۲۸ یُوْسُفُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا ٚ

تو اس نے (اس عورت کو) کہا کہ یہ بات تمہارے مکر سے ہے، بیشک تمہارا مکر بہت بڑا ہے ۲۸ اے یوسف! اس بات سے اعراض کر جاؤ

وَاسْتَغْفِرِیْ لِذَنْۢبِكِ ۚۖ اِنَّكِ كُنْتِ مِنَ الْخٰطِـِٕیْنَ ۝۲۹ ع

(اور اس عورت سے کہا کہ) تو معافی مانگ اپنے گناہ کی، بیشک تو خطا کاروں میں سے ہے ۲۹

خلاصہ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۔ وَقَالَ الَّذِی اشْتَرٰىهُ مِنْ مِّصْرَ: اور کہا اس شخص نے جس نے کہ خریدا تھا اس کو مصر سے، اشْتَرٰىهُ

کی ''ہٗ'' ضمیر یوسف علیہ السلام کی طرف لوٹ رہی ہے، اور لِامْرَاَتِہٖٓ یہ قَالَ کے متعلق ہے قَالَ لِامْرَاَتِہٖٓ- ''کہا اس شخص نے جس نے یوسف علیہ السلام کو خریدا مصر سے اپنی بیوی کو'' اَکْرِمِیْ مَثْوٰىهُ: مَثْوٰی ٹھکانے کو کہتے ہیں، ''اس کے ٹھکانے کو اچھا کر'' یعنی اسے آبرو کے ساتھ رکھنا اچھے طریقے سے رکھنا، عَسٰٓی اَنْ یَّنْفَعَنَآ: ہوسکتا ہے کہ یہ ہمیں نفع پہنچائے، اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا: یا یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ہم اس کو لڑکا ہی بنالیں، اَوْ نَتَّخِذَهٗ کا عطف ینفعَ کے اوپر ہے، یہ بھی عَسٰی کے نیچے داخل ہے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ ہمیں نفع پہنچائے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ہم اس کو بیٹا ہی بنالیں، ''یا بنالیں ہم اس کو بیٹا'' وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِي الْاَرْضِ: اور ایسے ہی ٹھکانا دیا ہم نے یوسف کو زمین میں۔ ارض سے ارضِ مصر مراد ہے۔ ایسے ہی ٹھکانا دیا ہم نے یوسف کو مُلک میں۔ وَلِنُعَلِّمَهٗ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ: وَلِنُعَلِّمَهٗ کا معطوف علیہ محذوف نکال لیجئے، ''تاکہ ہم اس کی اچھی طرح سے تربیت کریں اور تاکہ ہم اس کو سکھائیں باتوں کو ٹھکانے لگانا''۔ ''تاکہ ہم اسے راحت و آرام پہنچائیں، عزت سے نوازیں، اور تاکہ ہم اس کو سکھائیں باتوں کو ٹھکانے لگانا'' وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰٓى اَمْرِهٖ: اللہ تعالیٰ غالب ہے اپنے اَمر پر، وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ: لیکن اکثر لوگ جانتے نہیں۔ وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗٓ: اور جب حضرت یوسف علیہ السلام پہنچ گئے اپنی جوانی کو، اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا: تو ہم نے ان کو علم و حکمت سے نوازا۔ حکم: فیصلے کی قوت، اور علم سے علمِ نبوّت مراد ہے۔ تو علم و حکمت مل جانے کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے ان کو نبوّت عطا کی، جس کی وجہ سے ان کو فیصلے کی قوت بھی حاصل ہوئی اور اللہ تعالیٰ کی مرضیات کا علم بھی حاصل ہوا، وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ: اور ہم ایسے ہی بدلہ دیتے ہیں محسنین کو، محسنین کو ہم ایسے ہی بدلہ دیتے ہیں جیسے ہم نے یوسف علیہ السلام کو بدلہ دیا، تو جس سے معلوم ہوگیا کہ یوسف علیہ السلام بھی محسنین میں سے ہیں، اور محسن وہی شخص ہوا کرتا ہے جو اپنے خیالات میں بھی پاکیزہ ہو، کردار میں بھی ستھرا ہو، اور ہر وقت وہ اس طرح سے ہو گویا کہ وہ اللہ کے سامنے ہے اور اللہ اس کے سامنے ہے، تو ایسے شخص سے معصیت کا صدور ممکن نہیں، تو یہی صفت احسان ہے جو ان کے لئے علم وحکمت کا ذریعہ بنی، وَرَاوَدَتْهُ الَّتِيْ هُوَ فِيْ بَيْتِهَا: رَاوَدَ مُرَاوَدَۃً: کسی کو مختلف حیلوں بہانوں کے ساتھ اپنے مقصد میں استعمال کرنے کی کوشش کرنا، یعنی آپ ایک کام کرتے ہیں اور اس کام کے لئے دوسرے کو استعمال کرنا چاہتے ہیں تو بہلا پھسلا کر اس کو اپنے ارادے کے مطابق آپ کرلیں اس کو مراوَدت کہتے ہیں، چنانچہ سورۃ کے آخری حصے میں پھر یہ لفظ آئے گا جبکہ یوسف علیہ السلام اپنے بھائیوں سے مطالبہ کریں گے کہ اپنے اُس دوسرے بھائی کو لے کر آئیو جس کا ذکر تم نے کیا ہے کہ ہمارا ایک اور بھائی بھی ہے جس کے حصے کا تم نے غلہ مانگا ہے اس کو لے کر آئیو، ورنہ آئندہ تمہیں کوئی غلہ نہیں ملے گا، تو ان بھائیوں نے وہاں یہ کہا تھا کہ نُرَاوِدُ عَنْهُ اَبَاهُ: ہم اس کے متعلق اس کے باپ کو بہلائیں گے پھسلائیں گے، یعنی کوشش تو کریں گے کہ اپنے اَبّا کو اس بھائی کے متعلق ہم اپنی مرضی کے مطابق ڈھال لیں، اور اس کو لانے کے لئے اسباب مہیا ہو جائیں، تو وہاں بھی مراودت کا لفظ آیا ہوا ہے، تو مراودت کا مفہوم یہی ہے کہ کسی کو بہلا پھسلا کر اپنے مقصد کے مطابق استعمال کرلینا، وَرَاوَدَتْهُ الَّتِيْ هُوَ فِيْ بَيْتِهَا عَنْ نَّفْسِهٖ: وہ عورت جس کے گھر میں یوسف تھے اس نے یوسف کو بہلایا پھسلایا یوسف کے نفس سے، اس میں اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ اس نے کوشش کی کہ یوسف علیہ السلام کو بداخلاقی میں مبتلا کرلے اپنے ساتھ، وَغَلَّقَتِ الْاَبْوَابَ: اور اس نے دروازے بند کرلئے۔ ابواب یہ باب کی جمع ہے۔ دروازے بند کرلئے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ متعدد دروازے تھے، تو یہ متعدد دروازے بالترتیب بھی ہوسکتے ہیں جس

طرح سے کمرے کے پیچھے کمرہ ہوتا ہے، پہلے اس کمرے کا دروازہ بند کیا پھر اگلا دروازہ بند کرلیا پھر اگلا دروازہ بند کرلیا، اس طرح سے پچھلے کمرے میں ان کو لے گئی اور سارے دروازے بند کر دیے، تو یہ دروازے بالترتیب بھی ہو سکتے ہیں جیسے کہ گھروں کے اندر کمرے کے پیچھے کمرے ہوتے ہیں، اور اس طرح سے بالترتیب دروازے بند کر لینے کے ساتھ انسان انتہائی درجے کا مخفی ہوجاتا ہے۔ اور یوں بھی ہوسکتا ہے کہ ایک ہی کمرے کے متعدد دروازے ہوں جس طرح سے یہی کمرہ جس میں آپ بیٹھے ہیں اس میں دو دروازے ہیں، اور کوٹھیوں میں اور بڑے کمروں کے اندر کئی کئی دروازے بھی ہوتے ہیں، ایک ہی کمرے کے جتنے دروازے تھے مکان کے جتنے دروازے تھے وہ سب اس نے بند کر دیے، تو اس میں بالترتیب ہونا ضروری نہیں، اگرچہ عام طور پر قصے کہانیوں کی کتابوں میں تو یہی لکھا ہوا ہے کہ وہ سات دروازے تھے اور بالترتیب تھے، یعنی ساتویں کمرے میں پیچھے لے گئی، لیکن اس کا کوئی ایسا واضح ثبوت نہیں ہے، بیان کرنے والے ابواب کے لفظ سے ہی اس بات کو سمجھتے ہیں، لیکن ابواب میں دونوں باتیں آجاتی ہیں، ''مکان کے سارے دروازے بند کر لئے'' اصل مفہوم اس کا یہ ہے، تو ان کا بالترتیب پیچھے ہونا ضروری نہیں۔
وَقَالَتْ هَيْتَ لَكَ: اور کہنے لگی کہ آجا، میں تجھے کہتی ہوں، هَيْتَ: آجا، لَكَ: یعنی اَقُوْلُ لَكَ میں تجھے کہتی ہوں آجا، قَالَ مَعَاذَ اللهِ: یوسف علیہ السلام نے کہا کہ اللہ کی پناہ، یعنی اَعُوْذُ بِاللهِ مَعَاذًا میں تو اللہ کی پناہ پکڑتا ہوں، میں تو اللہ کی پناہ میں آتا ہوں، اِنَّهٗ رَبِّيْٓ اَحْسَنَ مَثْوَايَ: اِنَّهٗ کی ضمیر ظاہر یہی ہے کہ عزیزِ مصر کی طرف لوٹ رہی ہے، بیشک یہ عزیزِ مصر، تیرا شوہر، یہ میرا رَبّ ہے، میرا مالک ہے، میرا آقا ہے۔ ''رَبّ'' کا لفظ صرف اللہ تعالیٰ کے لئے استعمال نہیں ہوتا، اضافت کے ساتھ یہ دوسروں کے لئے بھی استعمال ہوتا رہتا ہے، فقہ کی کتابوں میں آپ پڑھتے رہتے ہیں ربُّ الدار، ربُّ المال، ربُّ الفرس، تو مالک اور آقا کے معنی میں یہ لفظ استعمال ہوتا رہتا ہے، جس طرح سے آگے حضرت یوسف علیہ السلام قیدیوں کے ساتھ جو گفتگو کریں گے تو جس کے متعلق چھوٹ جانے کی توقع تھی اس کو یہ کہیں گے اذْكُرْنِيْ عِنْدَ رَبِّكَ: اپنے مالک کے سامنے جاکے میرا تذکرہ کرنا، تو وہاں بھی رَبّ سے مالک مراد ہے، فَاَنْسٰىهُ الشَّيْطٰنُ ذِكْرَ رَبِّهٖ: اپنے مالک کے سامنے ذکر کرنے کو شیطان بھلا دیا، تو رَبّ کا لفظ مالک کے معنی میں آتا رہتا ہے، فقہ کی روایتوں میں کتاب البیوع کے اندر آپ ربُّ المال، ربُّ البیع، ربُّ الفرس، ربُّ الدار، اس قسم کے لفظ عام طور پر پڑھیں گے۔ تو ''رَبّ'' بمعنی آقا۔ ''بیشک یہ عزیزِ مصر'' یعنی تیرا شوہر میرا آقا ہے، میرا مالک ہے'' اَحْسَنَ مَثْوَايَ: اس نے میرا ٹھکانا بڑا اچھا کیا ہے، یعنی اس نے مجھے بیٹوں کی طرح رکھا، میری عزت کی، مجھے اچھا ٹھکانا دیا، میں اس کے حق میں خیانت نہیں کرسکتا۔ اور اگر اس ضمیر کو اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹایا جائے معاملہ تو بھی صاف ہے کہ اللہ میرا رَبّ ہے، اس نے مجھے کتنی عزت سے نوازا ہے، تو میں اس کی نافرمانی کس طرح سے کروں۔ لیکن پہلا مطلب زیادہ اوفق ہے سیاق وسباق کے ساتھ، کیونکہ اس عورت کے سامنے یہی بات ذکر کی جاسکتی تھی جو اس کے فہم کے مطابق ہوتی، اور اللہ تعالیٰ کا تذکرہ کر کے کسی کو گناہ سے روکنا یہ عام طور پر اہلِ علم کے لئے، مؤمنوں کے لئے تو مؤثر ہوسکتا ہے، مشرکوں کے لئے، کافروں کے لئے، جاہلوں کے لئے اس قسم کی بات زیادہ تر مؤثر نہیں ہوتی، ان کے ہاں یہ بات زیادہ سمجھ میں آنے والی ہے کہ جس کے گھر میں ہوں، جس کا نمک کھاتا ہوں، جس نے مجھے عزت سے رکھا ہے، پیار سے رکھا ہے، بیٹوں کی طرح رکھا ہے، میں اس کے حق میں خیانت کیسے کرلوں؟ یہ بہت ایک سیدھی سی دلیل ہے سادی سی، جس کو ہر

کوئی سمجھتا ہے، اِنَّهٗ لَا یُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ: بیشک بات یہ ہے کہ ظالم لوگ فلاح نہیں پایا کرتے۔ وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ: لقد تاکید کے لئے آ گیا۔ البتہ ضرور، پکی بات ہے، اس عورت نے اس یوسف کا ارادہ کیا، اس کے متعلق ارادہ کیا، کہ اس کو اپنے ساتھ مبتلا کر لے، وَهَمَّ بِهَا لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ: ان لفظوں کی ترکیب دو طرح سے کی گئی ہے، یا تو ''هَمَّ بِهَا'' علیحدہ ہے، اور لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ کا جواب محذوف ہے، وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ: اس زلیخا نے یوسف کا ارادہ کیا، اس عورت نے یوسف کے متعلق ارادہ کیا، اور یوسف نے اس کے متعلق ارادہ کیا، لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ: اگر نہ دیکھ لیتا یوسف اپنے رَبّ کی بُرہان تو معاملہ آگے بڑھ جاتا، مبتلا ہو جاتے، لغزش میں واقع ہو جاتے اگر اپنے رَبّ کی بُرہان نہ دیکھتے، تو جس کا مطلب یہ ہوا کہ هَمّ کی نسبت یوسف علیہ السلام کی طرف بھی ہوگئی، اگر چہ اس درجے کا هَمّ نہیں جس درجے کا هَمّ زلیخا کے ساتھ تھا، وہ لَقَدْ کے ساتھ پختہ کیا ہے اور اس کے اوپر لَقَدْ داخل نہیں ہے، اور اگر یہ دونوں هَمّ ایک ہی طرح کے ہوتے تو پھر اتنی لمبی عبارت بولنے کی بجائے ''لَقَدْ هَمَّا'' تثنیہ کا صیغہ آ جاتا کہ دونوں نے قصد کر لیا، یا ''لَقَدْ هَمَّ کلُّ واحدٍ مِنْهُمَا'' اس طرح سے آتا کہ دونوں نے ایک دوسرے کا ارادہ کر لیا، تو معلوم ہوتا ہے کہ دونوں کے درمیان فرق ہے (اس فرق کی وضاحت کروں گا آپ کے سامنے) تو خیال یوسف کو بھی آیا اگر چہ اس درجے کا نہیں جس درجے کا اس عورت کو تھا، اور اگر اپنے رَبّ کی بُرہان کو نہ دیکھ لیتے تو معاملہ آگے بڑھ جاتا، مبتلا ہو جاتے، پھسل جاتے، اور ''لَوْلَآ'' یہ نحو کے اندر آپ پڑھتے رہتے ہیں کہ یہ وجودِ اوّل کی بنا پر انتفاءِ ثانی کے لئے ہوتا ہے، کہ چونکہ پہلی چیز موجود تھی اس لئے دوسری چیز کا وقوع نہیں ہوا، ''لَوْلَا عَلِیٌّ لَهَلَكَ عُمَرُ'' نحو کے اندر آپ اس کی یہ مثال پڑھا کرتے ہیں، ''اگر علی نہ ہوتا تو عمر ہلاک ہو جاتے'' تو علی چونکہ موجود تھے اس لئے عمر بچ گئے، یہ مثال جو ''نحو'' میں پڑھتے ہیں وہاں، یہاں بھی وہی بات آئے گی، اگر بُرہانِ رَبّ کو نہ دیکھتے تو مبتلا ہو جاتے، لیکن چونکہ بُرہانِ رَبّ کو دیکھ لیا، رُؤیتِ بُرہان موجود تھی اس لئے آگے مبتلا نہیں ہوئے۔ اور بعض حضرات نے ''هَمَّ بِهَا'' کو مقید کیا ہے ''لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ'' کے ساتھ، تو جس کا مطلب یہ ہوا کہ پختہ طریقے سے قصد کیا عورت نے یوسف کا، اور وہ یوسف بھی اس عورت کا قصد کر لیتا اگر اپنے رَبّ کی بُرہان کو نہ دیکھتا، لیکن چونکہ رَبّ کی بُرہان دیکھ لی اس لئے قصد ہی نہیں کیا، تو یہ سرے سے ''هَمّ'' کی نفی ہو جائے گی۔ لیکن نحوی ترکیب کے اعتبار سے اور ''لَوْلَآ'' کے قواعد کے اعتبار سے پہلا مطلب زیادہ اچھا ہے، کیونکہ ''لَوْلَآ'' کا جواب ''لَوْلَآ'' پر مقدم نہیں ہوتا، اس لیے ''هَمَّ بِهَا'' کو ''لَوْلَآ'' کا جواب قرار دینا یہ نحوی قاعدے کے خلاف ہے۔ كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَآءَ: ہم نے اس کو ایسے ہی ثابت قدم رکھا، یا، ہم نے اس کو ایسے ہی بُرہان دکھائی تاکہ دُور ہٹا دیں ہم اس سے سوء کو اور فحشاء کو۔ سوء: بُرائی۔ فحشاء: بے حیائی۔ ہر قسم کی بُرائی اور بے حیائی کو ہم یوسف سے دُور ہٹا دیں اس لئے ہم نے ان کو بُرہان دکھا دی، ''ایسے ہی ہم نے اس کو ثابت قدم رکھا، یا، ایسے ہی ہم نے اس کو علم وحکمت دی، ایسے ہی ہم نے اس کو بُرہان دکھائی تاکہ ہم اس سے دُور ہٹا دیں بُرائی کو اور بے حیائی کو'' اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِیْنَ: بیشک وہ ہمارے مخلص بندوں میں سے تھا۔ وَاسْتَبَقَا الْبَابَ: اسْتَبَقَا استباق سے ہے، یہ کل بھی لفظ گزرا: ذَهَبْنَا نَسْتَبِقُ، جس کا مطلب میں نے آپ کے سامنے ذکر کیا تھا کہ بھاگتے ہوئے ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کرنا اس کو استباق کہتے ہیں، بازی لے جانا، جیتنے کی کوشش کرنا، وَاسْتَبَقَا الْبَابَ: وہ دونوں ہی عورت اور مرد یعنی عزیزِ مصر کی بیوی بھی اور یوسف علیہ السلام بھی دونوں

بھاگے دروازے کی طرف، یعنی ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کی، ''دونوں بھاگے دروازے کی طرف'' وَقَدَّتْ قَمِيصَهُ: اس عورت نے یوسف کی قمیص پھاڑ دی، مِنْ دُبُرٍ: پیچھے سے، وَأَلْفَيَا سَيِّدَهَا لَدَا الْبَابِ: اور پایا ان دونوں نے عورت کے سید کو دروازے کے پاس۔ لَدَا: یہ اِتصال کو جاتا ہے بالکل دروازے پر، وَأَلْفَيَا سَيِّدَهَا لَدَا الْبَابِ: پایا ان دونوں نے اس عورت کے سیّد کو دروازے کے پاس، اس کا مطلب یہ ہے کہ بسا اوقات ایسے ہوتا ہے کہ ایک آدمی باہر سے اندر آنے کے لئے بالکل دروازے کے پاس پہنچ گیا، اور آپ اندر سے باہر نکلنے کے لئے دروازے پر پہنچ گئے، دروازہ کھولا ہی تو وہ سامنے کھڑا ہے، یہ کبھی کبھی گھر سے نکلتے ہوئے ایسی صورت پیش آ جایا کرتی ہے نا؟ یعنی وہ باہر والا آیا اور دروازے کو ہاتھ لگانے ہی لگا تھا کہ اندر سے آپ نے دروازہ کھول لیا، تو بالکل آمنا سامنا ہو گیا، اسی طرح سے عزیزِ مصر باہر سے آیا تھا اور مکان میں داخل ہونا چاہتا تھا، دروازے پر پہنچا ہی تھا کہ اندر سے انہوں نے دروازہ کھول لیا، یہ دروازہ کھولا تو بالکل متصل ایک دوسرے سے آمنا سامنا ہو گیا، دروازے کے متصل وہ کھڑا تھا جیسے دستک دینے ہی لگا ہو دروازہ کھلوانے کے لئے، اس طرح سے وہ دروازے پر پہنچا ہوا تھا اور دروازہ کھل گیا، وَأَلْفَيَا سَيِّدَهَا لَدَا الْبَابِ: پایا دونوں نے اس عورت کے سردار کو دروازے کے پاس، عورت کے خاوند کو دروازے کے پاس، قَالَتْ مَا جَزَآءُ مَنْ أَرَادَ بِأَهْلِكَ سُوٓءًا: عورت بولی اپنے خاوند کو خطاب کرتی ہوئی، کیا بدلہ ہے اس شخص کا جو ارادہ کرے تیری بیوی کے ساتھ بُرائی کا؟ إِلَّآ أَنْ يُسْجَنَ: مگر یہ کہ اس کو قید کر دیا جائے أَوْ عَذَابٌ أَلِيمٌ: یا دردناک سزا دی جائے۔ أَنْ يُسْجَنَ میں اَن مصدریہ ہے، یعنی اس کے بغیر کوئی سزا نہیں کہ اس کو جیل میں بھیجا جائے یا عذابِ الیم اس کو پہنچایا جائے جو تیری بیوی کے متعلق بُرائی کا ارادہ کرے، یعنی فوراً اس نے یہ مکر اختیار کر لیا کہ گویا کہ یہ میرے ساتھ چھیڑ چھاڑ کر رہا تھا اور اس نے میرے ساتھ بُرائی کا ارادہ کیا، اس کو سزا دو یا اس کو جیل میں بھیج دو، فوراً مدعی بن کر کھڑی ہو گئی۔ قَالَ هِيَ رَاوَدَتْنِي عَنْ نَّفْسِي: یوسف علیہ السلام نے کہا: اسی عورت نے مجھے پھسلایا ہے میرے نفس سے، وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ أَهْلِهَا: گواہی دے دی ایک گواہ نے عورت کے گھر والوں میں سے، عورت کے اہل میں سے ایک شاہد نے شہادت دے دی، إِنْ كَانَ قَمِيصُهُ قُدَّ مِنْ قُبُلٍ: اگر اس کی قمیص پھٹی ہے آگے سے فَصَدَقَتْ: پھر عورت سچی ہے وَهُوَ مِنَ الْكٰذِبِينَ: اور یہ مرد جھوٹوں میں سے ہے، وَإِنْ كَانَ قَمِيصُهُ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ: اور اگر اس کی قمیص پھٹی ہے پیچھے سے فَكَذَبَتْ: پھر عورت جھوٹی ہے وَهُوَ مِنَ الصّٰدِقِينَ: اور یہ سچوں میں سے ہے۔ فَلَمَّا رَاٰ قَمِيصَهُ: جس وقت عزیزِ مصر نے یوسف کی قمیص کو دیکھا، قُدَّ مِنْ دُبُرٍ: کہ وہ پھاڑی گئی تھی پیچھے سے، قَالَ إِنَّهُ مِنْ كَيْدِكُنَّ: تو عزیزِ مصر نے اس عورت کو کہا کہ بیشک یہ بات عورتوں کے مکر سے ہے، یہ تمہارے مکر سے ہے، إِنَّ كَيْدَكُنَّ عَظِيمٌ: بیشک تمہارا مکر بہت بڑا ہے، يُوسُفُ أَعْرِضْ عَنْ هٰذَا: يُوسُفُ یہ منادیٰ ہے حرفِ نداء محذوف ہے، اے یوسف! اس بات سے منہ موڑ جاؤ، اس بات سے اعراض کر جاؤ، وَاسْتَغْفِرِي لِذَنْۢبِكِ: اور اس عورت سے کہا کہ تو استغفار کر اپنے گناہ کا، معافی مانگ اپنے گناہ کی، إِنَّكِ كُنْتِ مِنَ الْخٰطِئِينَ: بیشک تو خطاکاروں میں سے ہے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ أَشْهَدُ أَنْ لَّآ إِلٰهَ إِلَّآ أَنْتَ أَسْتَغْفِرُكَ وَأَتُوبُ إِلَيْكَ. أَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ

تفسیر

واقعات کے بیان کرنے میں قرآنِ کریم کا اُسلوب

واقعہ اس حد تک پہنچا کہ وہ قافلہ جو یوسف علیہ السلام کو کنویں سے نکال کے لایا تھا وہ مصر میں آ گئے، اور مصر میں آ کے انہوں نے اس غلام کو بیچنا چاہا، اور بھی خریدار بھی آئے ہوں گے، جس طرح سے جب کوئی باہر سے قافلہ سامان لے کے آتا ہے، تو جو سامان کو طلب کرنے والے خریدار ہوا کرتے ہیں وہاں اکٹھے ہو ہی جایا کرتے ہیں، تو وہاں لوگ اکٹھے ہو گئے ہوں گے، قرآنِ کریم غیر ضروری باتوں کے پیچھے نہیں پڑتا، اور تاریخ میں اور اسرئیلی روایات میں اس قسم کے واقعات لکھے ہوئے ہوتے ہیں جیسے آپ سنتے رہتے ہیں کہ ایک بڑھیا بھی (سوت کی) ایک اَٹی لے کے آ گئی یوسف علیہ السلام کو خریدنے کے لئے، اور لوگ آ گئے بولی دینے کے لئے، لوگوں کو دلچسپی ہو گئی، کسی نے کچھ بولا، کسی نے کچھ بولا، آخر یوسف کے برابر سونا تولا گیا، ریشم کے کپڑے تولے گئے، مشک اور کافور تولا گیا اور اتنی قیمت ادا کر کے عزیزِ مصر نے اس کو خرید لیا، یہ تاریخی روایتیں ہیں، اسرائیلیات میں داخل ہیں، افسانہ نگاری کے طور پر لوگ ان باتوں کو بیان کرتے رہتے ہیں، قرآنِ کریم اس قسم کی غیر ضروری باتوں کے پیچھے نہیں پڑتا، بہر حال مطلب کی بات سامنے آ گئی کہ وہاں جا کے یہ بکے اور عزیزِ مصر نے اِن کو خریدا۔

عزیزِ مصر اور بادشاہِ مصر کا تعارف

آگے جا کے "عزیز" کا لفظ ہی بولا جائے گا، جیسے اِمْرَاَتُ الْعَزِیْزِ: عزیزِ مصر کی بیوی، تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ عزیز حکومت کا کوئی بڑا عہدیدار ہے، لکھا ہے کہ شاہی باڈی گارڈز کا افسر تھا، کسی نے لکھا ہے کہ یہ وزیرِ خزانہ تھا، بہر حال یہ کوئی مَدارُ المَہام تھا، یعنی جس کے اوپر بڑے بڑے واقعات کا دارومدار ہوا کرتا ہے، کارمختار، اور آج کل کی اصطلاح میں وزیرِ اعظم سمجھ لیجئے، یہ شخص مصر کے اندر اس قسم کا عہدیدار تھا، اور اس وقت جو بادشاہ تھا اس کا نام ریان لکھا ہے، عمالقہ قوم سے وہ تعلق رکھتا تھا، مصر کی جو آبادی ہے قبطی، ان میں سے وہ نہیں تھا، جس طرح سے غیر ملکی طاقت مسلط ہو، تو یہ باہر سے کچھ لوگ آ کے اس ملک کے اوپر مسلط ہوئے ہوئے تھے، ان میں سے ہی یہ بادشاہ تھا، اس لیے اس کا لقب کسی روایت کے اندر فرعون نہیں آیا، یہ جو "فراعینِ مصر" کا لفظ ہے، مصر کے بادشاہ جو "فرعون" کہلاتے تھے یہ لقب اس وقت اختیار کیا گیا ہے جس وقت اس غیر ملکی حکومت سے نجات حاصل کر کے ملکی باشندوں کی حکومت قائم ہو گئی تھی، تو اس وقت کے جو بادشاہ تھے وہ "فرعون" کہلاتے تھے، تو گویا کہ "فرعون" کا لقب حضرت یوسف کے واقعے کے بعد کا ہے جب قبطی لوگ اس مصر کے اوپر مسلط ہوئے تو ان کا بادشاہ "فرعون" کہلاتا تھا، حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعے میں کسی جگہ بھی لفظ "فرعون" نہیں آیا۔ تو اُس عزیز نے یوسف علیہ السلام کو خرید لیا، اور بعد میں حضرت یوسف علیہ السلام کو بھی اس بادشاہ کے ہاں یہی عہدہ ملا تھا، اس لیے جب ان کے بھائی غلہ خریدنے کے لئے گئے ہیں تو انہوں نے جا کے یوسف علیہ السلام کو بھی خطاب اسی لفظ سے کیا تھا یٰٓاَیُّھَا الْعَزِیْزُ، جس سے معلوم ہو گیا کہ اس عزیزِ مصر کے وفات پا جانے کے بعد یا اس عہدے سے

اُتر جانے کے بعد یوسف علیہ السلام کو وہی عہدہ دیا گیا تھا۔ اور قرآنِ کریم کی صراحت سے معلوم ہو گیا کہ یوسف علیہ السلام نے خزانے لیے تھے کہ مجھے وزیرِ خزانہ بنا دو، میں خزانوں کا حساب اچھا رکھوں گا، تیرہویں پارے کی ابتدا کے اندر یہ بات آئے گی، تو اُس سے کچھ اس روایت کی تائید ہوتی ہے کہ یہ کوئی وزیرِ خزانہ تھا، مالیات کا شعبہ اس کے سپرد ہوگا، تو عزیزِ مصر کا عہدہ جو ہے یہ وزیرِ خزانہ کی طرح تھا، مالیات کا شعبہ اس کے سپرد ہوگا، اگلی آیات سے کچھ اسی قسم کا اشارہ نکلتا ہے،

عزیزِ مصر کا اپنی بیوی کو یوسف علیہ السلام سے حُسنِ سلوک کی تاکید کرنا

جس وقت اس نے خریدا تو بظاہر معلوم یہ ہوتا ہے کہ اس نے اس بچّے کی شکل صورت کو دیکھ کر، اس کی صفائی ستھرائی پاکیزگی دیکھ کر اندازہ کر لیا کہ یہ کوئی غلام نہیں ہے، بلکہ معلوم یہ ہوتا ہے کہ یہ کوئی خاندانی بچّہ ہے، کسی اچھے خاندان کا چشم و چراغ ہے، اور یہ لوگ کہیں سے اس کو اِغوا کر کے لے آئے ہیں، چُرا کے لے آئے ہیں، بہر حال اس کی حیثیت عام بچوں جیسی نہیں، تو گھر لے گیا، جاتے ہی اپنی بیوی کے سپرد کرتے ہوئے کہتا ہے کہ دیکھو! اس کے ساتھ عام غلاموں جیسا برتاؤ نہ کرنا، اس کو بہت عزت کے ساتھ رکھیو، اس کو اچھا ٹھکانا دیجیو، آرام کے ساتھ اس کو رکھنا، احترام کے ساتھ رکھنا، بچّہ بڑا ہونہار ہے، شریف معلوم ہوتا ہے، یہ آئندہ زندگی میں ہمیں فائدہ پہنچائے گا، اور ہو سکتا ہے تجربے کے ساتھ جس وقت قابلِ اعتماد ثابت ہوگا تو ہم اس کو بیٹا ہی بنا لیں، اب اس لفظ سے کچھ اس بات کی طرف اشارہ نکلتا ہے کہ اس عزیزِ مصر کی اولاد نہیں تھی، ورنہ جس کے گھر میں اپنے بچّے ہوا کرتے ہیں وہ پرائے بچّے کے متعلق نہیں سوچا کرتا کہ ہم اس کو بیٹا بنا لیں، تو جس طرح سے تاریخی روایات میں آیا ہے کہ عزیزِ مصر بے اولاد تھا، اس کے اولاد نہیں تھی، تو کہا کہ اس بچّے کو گھر میں بیٹوں کی طرح رکھو، اور اُمید یہی ہے کہ اچھا قابلِ اعتماد ثابت ہوگا، تو ہو سکتا ہے ہم اس کو بعد میں جا کے اپنا بیٹا ہی بنا لیں، پُرانے زمانے میں جس طرح سے متبنّیٰ بنانے کا رواج تھا، تو ہم اس کو متبنّیٰ بنا لیں گے، چنانچہ روایات میں تفصیل کچھ اسی طرح سے آئی ہے کہ اس کو گھر کے اندر رکھ کے گھر کے کل کا اس کو مختار بنا دیا، جس طرح سے قابلِ اعتماد بیٹا ہوا کرتا ہے، اسی طرح سے یوسف علیہ السلام نے اس گھر کے اندر وقت گزارنا شروع کر دیا۔

یوسف علیہ السلام کو اچھا ٹھکانا دینے میں اللہ تعالیٰ کی قدرت اور حکمت

اللہ تعالیٰ یہاں درمیان میں اپنی ایک قدرت کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ ہم نے یوسف علیہ السلام کو بڑا اچھا ٹھکانا دیا، عزت و احترام کے ساتھ وہاں رہنے بسنے لگ گئے، اور ہمارا مقصد یہ بھی تھا کہ جہاں ان کو راحت پہنچے عزت ملے، وہاں یہ باتوں کو ٹھکانے لگانا بھی سیکھیں، اس کا مطلب یہ ہے یوسف علیہ السلام پہلے جس علاقے میں رہتے تھے جہاں حضرت یعقوب علیہ السلام کی سکونت تھی جو ان کا اپنا آبائی وطن تھا وہاں کی بود و باش کوئی منظم سلطنت کی نہیں تھی، اُس علاقے میں لوگوں کی بود و باش اس طرح سے تھی جس طرح سے آزاد قبائل ہوتے ہیں کہ ہر خاندان اپنی اپنی جگہ آزاد ہے، ان کا اپنا نظم و نسق ہے، کوئی ریاست سلطنت اور بادشاہت کی صورت نہیں تھی، اب ایک بچّے کو آگے جا کے جب ایک سلطنت کا وارث بنانا ہے، اس نے ایک سلطنت کا انتظام کرنا ہے تو اللہ تعالیٰ کی قدرت کے تحت ان کو ایک ایسے ماحول میں پہنچا دیا گیا ایسے گھر میں پہنچا دیا گیا کہ جہاں رہ کر ان کی تربیت اس انداز سے ہوگی

کہ وہ اُمورِ سلطنت کو سمجھیں گے، اور اُمورِ سلطنت کو سمجھنے کے ساتھ پھر آگے سنبھالنا آسان ہو جائے گا، ایسے گھر میں پہنچ گئے جو ایک بہت بڑے عہدیدار کا تھا، تو وہاں بیٹھیں گے حکومت کی باتیں سنیں گے، انتظام کا طریقہ دیکھیں گے تو آہستہ آہستہ سلیقہ آ جائے گا، اس گھر کا انتظام سنبھالا، باتوں سے دلچسپی لی، اس طرح سے تربیت ہوتی چلی گئی، تاکہ یہ ایک بہت بڑی سلطنت کو سنبھالنے کے اہل بن جائیں، اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ ہم نے اس لیے اس کو اس علاقے کے اندر ٹھکانا دے دیا۔ اب دیکھنے والے تو یہ دیکھ رہے تھے کہ یوسف کے اوپر ظلم ہی ظلم ہوتا چلا جا رہا ہے، پہلے بھائیوں نے اٹھا کے کنویں میں پھینک دیا، باپ سے جدا کر دیا، وہ سمجھے کہ ہم نے بدلہ لے لیا، اور پھر وہاں سے نکالا تو غلام بنا کے بیچ دیا، پھر قافلے والوں نے آگے جا کے بیچ دیا، اب ایک گھر میں غلامی کے طور پر چلے گئے، بظاہر دیکھنے والے تو یہ دیکھ رہے تھے، لیکن اللہ تعالیٰ کی قدرت ان کو درجہ بدرجہ ایک بہت بڑی ترقی کی طرف لے جا رہی تھی، یعنی کنویں میں پھینکنا ان کے لئے آگے مصر میں پہنچنے کا ذریعہ بنا، مصر کے اندر ان کا جا کے بکنا، عزیزِ مصر کے گھر پہنچنے کا ذریعہ بنا، اور عزیزِ مصر کے گھر جا کے جو کچھ پیش آیا وہاں سے ان کو جیل کے اندر پھینکا گیا تو یہ بادشاہ تک پہنچنے کا ذریعہ بنا، اور بادشاہ تک پہنچنا تھا کہ آگے سلطنت کے مالک بن گئے، تو ظاہر کیا ہے اور باطن کیا ہے، ظاہری طور پر تو ان کے اوپر سختیاں ہوتی چلی جا رہی ہیں، ظلم کا نشانہ بنتے چلے جا رہے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ اپنی لطیف قدرت کے ساتھ ان کو کس طرح سے اعلیٰ سے اعلیٰ معیار کی طرف لے جا رہا ہے، یہی اللہ کی قدرت ہے جس کو اللہ نے ان الفاظ کے اندر ذکر کیا کہ وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰٓى اَمْرِهٖ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ، لوگ تو صرف ظاہر کو دیکھتے ہیں، اور باطن میں کیا کچھ ہے یہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے، اللہ تعالیٰ نے جو کچھ کرنا ہوتا ہے اس کو کر کے رہتا ہے، اور اس انداز سے کرتا ہے کہ ظاہر کچھ ہوتا ہے باطن سے نتیجہ کچھ نکل آتا ہے۔ تو ہم نے اس کو ٹھکانا اس لیے دیا تاکہ اس کو عزت اور آرام کے ساتھ رکھیں، اس کو راحت نصیب ہو اور تاکہ اس کو باتوں کا ٹھکانے لگانا سکھا دیں، ''باتوں کے ٹھکانے لگانے'' کا مطلب یہ ہے کہ ہر بات کو سمجھیں، اس سے صحیح نتیجہ اخذ کریں، ہر معاملے کو سمجھیں، اس کا صحیح طریقے سے فیصلہ کریں، اس قسم کی باتیں وہ سیکھ جائیں، ہم نے اس لیے ان کو ایک بہت بڑے گھر کے اندر پہنچا دیا، جس کا تعلق ہی حکومت اور سلطنت کے ساتھ تھا، وہاں جا کے اس قسم کے معاملات کا ان کو تجربہ کرانا مقصود تھا۔

یوسف علیہ السلام کو اعطائے نبوّت کا ذکر

وہاں پہنچ گئے، جوانی کی عمر کو پہنچے، اللہ تعالیٰ نے علم و حکمت سے نوازا، اس علم و حکمت سے مراد یہ ہے کہ اللہ نے ان کو نبوّت عطا فرمائی، جس سے معلوم ہو گیا کہ کنویں کے اندر پھینکتے وقت جس وحی کا ذکر آیا تھا اس وحی سے وحیِ نبوّت مراد نہیں، وہ تو اسی طرح سے القاء فی القلب ہے، دل کے اندر کسی بات کو ڈال دینا، جس طرح سے موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کا تذکرہ کرتے ہوئے بھی اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا اَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّ مُوْسٰٓى (القصص: ۷) ہم نے موسیٰ علیہ السلام کی ماں کی طرف وحی کی کہ اس کو تابوت میں رکھو، تابوت میں رکھ کے دریا میں ڈال دو، جس طرح سے دل میں بات ڈالتے گئے سمجھاتے گئے ماں اسی طرح سے کرتی چلی گئی، اسی قسم کا القاء فی القلب ہے جو کہ یوسف علیہ السلام کے ساتھ کنویں میں ہوا تھا، وہ وحیِ نبوّت نہیں تھی، جوانی کی عمر کو پہنچنے کے بعد، قوت اور کمال کو

پہنچنے کے بعد پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو علم وحکمت عطا ہوا، فیصلے کی قوت حاصل ہوئی، اور عقدہ کشائی، مشکل سے مشکل معاملات کو چٹکیوں میں سلجھا دینا، اور اچھی راہ اس میں سے نکال دینا، اس قسم کا سلیقہ پیدا ہو گیا، اور ''ہم نے علم سے نوازا'' جس قسم کا علم انبیاء علیہم السلام کو ہوا کرتا ہے اللہ تعالیٰ کی مرضیات کا، یہ نعمت بھی یوسف علیہ السلام کو مل گئی۔

بغض کے اِبتلا میں کامیابی کے بعد محبت کا اِبتلا

اب ایک اور دور حضرت یوسف علیہ السلام کے اوپر اِبتلا کا آیا، پہلے یوسف علیہ السلام نشانہ بنے تھے لوگوں کے بغض کا اور حسد کا، کہ حسد اور بغض کی بنا پر لوگوں نے ان کے ساتھ دشمنی کی، تو دشمنی کا دور بھی انہوں نے دیکھ لیا کہ لوگ جب دشمنی کرتے ہیں تو کیسے واقعات آیا کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کے اندر ان کو ثابت قدم رکھا۔ اب دُوسرا دور ان کے اوپر محبت کے اِبتلا کا آ گیا، کہ ماحول نے ان کے ساتھ محبت کی، اور اس محبت کی بنا پر یہ ایک آزمائش میں پڑے، اور اللہ تبارک وتعالیٰ نے وہاں بھی ان کو ثابت قدم رکھا، اور اس ثابت قدم رہنے کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے ان کو کس طرح سے دُنیا اور آخرت کے اندر نوازا، یہ امتحان، یہ اِبتلا جو آگے پیش آ رہا ہے یہ محبت کا اِبتلا ہے، عشق کا اِبتلا ہے۔

حُسنِ یوسف اور اِبتلائے یوسف کا اِجمالی واقعہ

اللہ تعالیٰ نے حُسن تو دیا ہی تھا، خوبصورت بے انتہا تھے، سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم جس وقت معراج پر تشریف لے گئے ہیں تو واپس آ کے جو واقعات سنائے ہیں، تو ان میں سے ایک واقعہ یہ بھی سنایا کہ میری ملاقات یوسف علیہ السلام سے ہوئی، ''قَدْ أُعْطِيَ شَطْرَ الْحُسْنِ ''(۱) ''شطر'' کا معنی نصف کر لیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ دُنیا میں جتنا حُسن ہے اللہ تعالیٰ نے اس کا نصف حُسن یوسف علیہ السلام کو دیا ہے، اور شطر مطلق حصے کو بھی کہتے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے حُسن میں سے ایک وافر حصہ یوسف علیہ السلام کو دیا ہے، یعنی سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے یوسف علیہ السلام کے حُسن کی خاص طور پر تعریف فرمائی، بہت حسین تھے اور پھر جوان، پوری طرح سے، جس کو کہتے ہیں کڑیل جوان ہو گئے، اب وہ عورت جس کے گھر میں رہتے تھے وہ مؤمنہ نہیں تھی، آخرت کی قائل نہیں تھی، مشرکہ تھی جس طرح سے بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے، اب جو اللہ کا قائل نہ ہو آخرت کا قائل نہ ہو آپ جانتے ہیں کہ اس کے دل کے اوپر اس قسم کی گرفت نہیں ہوا کرتی کہ وہ معصیت سے بچے، آخرت کا خوف بہت بڑی چیز ہے جو انسان کو گناہ سے بچاتا ہے، جب آخرت کا خوف بھی نہ ہو، اور پھر ہر وقت کی تنہائی، کہ یوسف علیہ السلام گھر میں رہتے ہیں، خادموں کی طرح ہر وقت سامنے چلتے پھرتے ہیں، اُدھر وہ عورت بھی بڑے خاندان کی عورت، اچھا کھانے والی، اچھا پہننے والی، اچھے حالات میں رہنے والی، اور ان حالات کے اندر محبت اور شہوت کے جذبات ابھرا ہی کرتے ہیں، اور پھر جس طرح سے بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے، ہیں تو یہ اسرائیلی روایات، لیکن نبی بھی تو آخر اسرائیلی ہیں جن کے حالات سامنے آ رہے ہیں، تو ایک واقعے کو مکمل کرنے کے لئے اس قسم کی روایات کا سہارا لیا جا سکتا ہے، تو بعض

(۱) صحیح مسلم ج۱ ص۹۱ باب الاسراء/مشکوٰۃ ج۲ ص۵۲۸ باب فی المعراج، فصل اول۔

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ عزیزِ مصر ویسے بھی عنین تھا، یعنی عورت کے قابل نہیں تھا، اب ان سب چیزوں کو سامنے رکھو، سامنے رکھ کے اس ماحول کو آپ سوچیں کہ ایک عورت اچھے خاندان کی ہو، خود بھی انتہائی درجے کی خوبصورت ہو، اچھا کھاتی ہو، اچھا پہنتی ہو، اور اس کے سامنے ایک جوان جو انتہائی درجے کا خوبصورت، اتنا خوبصورت کہ جس کی مثال موجود نہیں، اور پوری طرح سے جوان، ہر وقت کی خلوت، تو ایسے وقت میں عورت کا دل اس جوان پر آ گیا اور اس کے دل کے اندر بُرے بُرے خیال آنے لگ گئے، جب بُرے بُرے خیال آنے لگ گئے تو اس نے یوسف علیہ السلام کو مختلف طریقوں کے ساتھ اُکسانے بہکانے کی کوشش کی ہوگی، آخر ایک دِن جب اس سے صبر نہ ہو سکا تو یوسف علیہ السلام کو اندر لے گئی، چونکہ وہ خادم تو تھے ہی، تو خادم ہونے کی حیثیت سے اندر بُلا لیا، اندر بُلا کے دروازے جتنے تھے سارے کے سارے بند کر لیے، اپنی طرف سے اس نے انتظام کر لیا کہ اب دیکھنے والا کوئی نہیں، اور خلوت میں جا کے اس نے یوسف علیہ السلام کو اپنی طرف بُلایا اور دعوت دی، کہ آؤ، جلدی کرو، میں تمہیں کہہ رہی ہوں، اس طرح سے دعوت دی، جیسے قرآنِ کریم نے اپنے معیار کے مطابق بہت پاکیزہ الفاظ کے ساتھ اس مفہوم کو ادا کیا ہے، اور اس ماحول کو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ کس قسم کی گفتگو ہوا کرتی ہے اور کس قسم کی باتیں کر کے بہکایا ہوگا بہلایا ہوگا، تو آخر اس نے اپنا مطالبہ صراحت کے ساتھ یوسف علیہ السلام کے سامنے ذکر کر دیا۔ اب ان حالات میں یوسف علیہ السلام ایک بہت بڑے امتحان میں پڑ گئے، خاندانِ نبوّت کے چشم و چراغ تھے، اللہ تعالیٰ نے علم وحکمت سے نوازا تھا، آخرت کے قائل تھے، اللہ کے قائل تھے، اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دہی کا اندیشہ تھا، یہ ساری کی ساری صفتیں یوسف علیہ السلام کو حاصل تھیں، لیکن جب وہ عورت کھینچا تانی کر رہی ہے اور اس قسم کی باتیں کر رہی ہے تو عورت کا تو پختہ ارادہ تھا اس فعل میں مبتلا ہونے کا، لیکن اِس وقت یوسف علیہ السلام کے دل میں بھی خیال آیا، یہ خیال جس کے اُوپر تَقَدُّ داخل نہیں ہے یہ خیال ایسے ہی ہے جیسے ایک صحت مند آدمی کے دل میں ان حالات کے اندر غیر اِختیاری طور پر آ سکتا ہے، یہ خیال وہ ہے، یعنی جس سے حضرت یوسف علیہ السلام کی قوت کا اور ایسے کاموں کے لئے مرد اور عورت کو جس قسم کی قوت کی ضرورت ہوتی ہے اس کی موجودگی کی نشاندہی ہوتی ہے، اس قسم کا وسوسہ جوان کے دل میں آ جانا یہ غیر اختیاری ہوتا ہے، اس کو اگر آپ مثال کے ساتھ سمجھنا چاہیں تو اس کی ایک بہت واضح مثال ہے، کہ آپ نے روزہ رکھا ہوا ہو، اور انتہائی گرمی کا زمانہ ہو، پیاس آپ کو شدّت سے لگی ہوئی ہو، ٹھنڈے پانی کے پاس آپ بیٹھے ہوں یا نہا رہے ہوں، تو دل میں پانی پینے کی خواہش اُبھرتی ہے غیر اِختیاری طور پر، اگرچہ آپ کا پانی پینے کا ارادہ نہیں ہوتا، اور نہ آپ اس پانی کو پیتے ہیں، یعنی علمی انداز میں اور عقیدے کے طور پر تو آپ اس پانی کو اپنے لیے ممنوع سمجھتے ہیں، لیکن غیر اختیاری طور پر ایک خواہش ابھرتی ہے، یہ خواہش کا ابھرنا اس بات کی علامت ہے کہ قلب کے اندر صلاحیت ہے، صحت آپ کی ٹھیک ہے کہ پیاس لگنے کی بنا پر پانی کی خواہش ہو رہی ہے، تو یوسف علیہ السلام کے دل میں بھی اسی قسم کا خیال آیا لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ کی بُرہان نمایاں ہوئی جس کی بنا پر اس خیال میں آگے ترقی نہ ہوئی اور یوسف علیہ السلام اس طرح سے اس کی طرف متوجہ نہ ہوئے جس طرح سے عورت یوسف علیہ السلام کی طرف متوجہ تھی۔

یوسف علیہ السلام کے سامنے نمایاں ہونے والی بُرہان کا مصداق کیا ہے؟

اللہ تعالیٰ کی طرف سے وہ کیا برہان نمایاں ہوئی؟ یا تو یہی مضمون ہے جو یوسف علیہ السلام نے ادا کیا کہ اِنَّهٗ رَبِّيْٓ اَحْسَنَ مَثْوَايَ، یہ بات ان کے سامنے حق الیقین کے درجے میں آ گئی، بالکل مشاہدے کے درجے میں آ گئی، کہ یہ تو بڑی نمک حرامی ہے کہ ایک شخص مجھے اپنے گھر مین لاتا ہے، بچوں کی طرح رکھتا ہے، بیٹوں کی طرح کھلاتا ہے، میری عزت کرتا ہے احترام کرتا ہے، تو یہ کون سی عقل مندی ہے کہ میں اسی کی عزت کو ہاتھ ڈالوں، یہ مضمون حضرت یوسف علیہ السلام کے سامنے اتنا نمایاں ہو کے آیا گویا کہ آنکھوں سے دیکھ لیا، تو جب یہ بات سامنے آ گئی تو سارے جذبات شکر گزاری کی طرف ہو گئے، اور کوئی وسوسہ اگر دل میں آیا بھی تھا تو وہ بھی کافور ہو گیا، یہی مضمون سامنے آ جانا اور اس طرح سے سامنے آ جانا گویا کہ یہ آنکھوں کی دیکھی ہوئی حقیقت ہے اس نے یوسف علیہ السلام کے خیال کو بالکل بدل کے رکھ دیا اور عورت کی طرف ان کو متوجہ ہی نہیں ہونے دیا۔ اتنا تو قرآنِ کریم سے معلوم ہو گیا کہ کوئی رَبّ کی بُرہان سامنے آئی تھی، باقی وہ بُرہان کیا تھی؟ اس کو مفسرین نے مختلف انداز کے ساتھ بیان کیا ہے، یا تو اسی مضمون کا اِستحضار ہے، اور بعض نے کہا ہے کہ نہیں! یعقوب علیہ السلام کی شکل کے سامنے آ گئی تھی، اور وہ تعجب کے ساتھ یوں منہ میں اُنگلی لیے کھڑے تھے اور یہ کہہ رہے تھے: ''اَتَفْعَلُ فِعْلَ السُّفَهَاءِ وَاَنْتَ مَكْتُوْبٌ فِي الْاَنْبِيَاءِ'' یوسف! تُو نادانوں جیسا کام کرنے لگا ہے؟ تیرا نام تو انبیاء میں درج ہے۔ تو اس کو دیکھتے ہی خیال بدل گیا اور طبیعت بالکل صاف ہو گئی، تو وہ جو وسوسہ تھا وہ بھی دُور ہو گیا۔ بعض کہتے ہیں کہ اوپر کی طرف دیکھا تو یہ آیت لکھی ہوئی نمایاں ہوئی لَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً، اس قسم کے الفاظ دیکھے گئے۔ بعض کہتے ہیں کہ نہیں! کوئی ایسی صورت تھی کہ اسی کمرے میں ایک طرف بت رکھا ہوا تھا اور زلیخا نے اس کے اوپر کپڑا ڈال دیا، تو یوسف علیہ السلام نے پوچھا کہ کپڑا کیوں ڈال رہی ہو؟ تو زلیخا نے کہنے لگی یہ ہمارا خدا ہے، میں اس سے حیا کرتی ہوں، اس لیے اس کے اوپر کپڑا ڈال رہی ہوں، تو یوسف علیہ السلام کی فوراً آنکھیں کھلیں کہ اس کا خدا تو پتھر کا ہے اس نے اس کے اوپر تو کپڑا ڈال دیا اور اس سے حیا کرتی ہوئی اس کو چھپا دیا اور سمجھتی ہے کہ یہ ہمیں دیکھے گا نہیں، لیکن میرا خدا تو نعوذ باللہ! پتھر کا خدا نہیں، وہ تو ہر وقت دیکھتا ہے، ہر حال میں دیکھتا ہے، مکانوں کے اندر دیکھتا ہے تاریکی میں دیکھتا ہے، میں اُس سے کیسے چھپ سکتا ہوں، اگر یہ اپنے خدا سے حیا کرتی ہے تو میں اپنے خدا سے حیا نہ کروں؟ اس قسم کی بات سامنے آ گئی۔ جو بھی ہو بہر حال اتنی بات یقینی ہے کہ کوئی رَبّ کی بُرہان نمایاں ہوئی تھی اور اس بُرہان کے نمایاں ہونے کے ساتھ حضرت یوسف علیہ السلام کے دل سے وہ وسوسہ بھی ختم ہو گیا، اور اگر یہ بُرہان نمایاں نہ ہوتی تو ہو سکتا ہے کہ قدم پھسل جاتا، آگے بڑھ جاتا، لیکن اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی وقت پر امداد کرتے ہیں، چونکہ یہ محسنین میں سے تھے، مخلَصین میں سے تھے، تو بُرہان نمایاں کر دی تاکہ اس سوء اور فحشاء کو دُور ہٹا دیں، اور کسی قسم کی بے حیائی یا بُرائی کی حرکت یوسف علیہ السلام سے صادر نہ ہو، اور اس بُرائی کو دُور ہٹا دیں، یوسف علیہ السلام کے قریب نہ آنے پائے، ہم نے حالات ایسے پیدا کر دیے۔

زلیخا کی چال بازی اور یوسف علیہ السلام پر اِلزام

جب یہ بات ہوئی کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے انکار کیا اور اس نے کھینچا تانی کی، تو پھر یوسف علیہ السلام نے اس سے جان چھڑانے کے لئے مکان سے باہر نکلنا چاہا، وہ آگے آگے بھاگے تاکہ میں باہر نکلوں، اور وہ پیچھے سے بھاگی روکنے کے لئے، تاکہ اسے روکوں، وہ تو اپنی شہوات کے اندر اندھی ہوئی جارہی تھی، اس کے جذبات انتہائی بھڑکے ہوئے تھے، اور وہ چاہتی تھی کہ میں اس سے زبردستی کروں، تو یوسف علیہ السلام جب بھاگے تو وہ بھی پیچھے سے بھاگی، کوشش دونوں کی تھی، زلیخا کی کوشش تھی کہ میں آگے جاکے دروازے کی طرف سے اس کو روک لوں، اور یوسف علیہ السلام کی کوشش تھی کہ میں پہلے دروازے پر پہنچ کر باہر نکل جاؤں، اِسْتَبَقَ: ایک دوسرے سے آگے نکلنا، آگے نکلنے کا مطلب ہے آگے سے گھیرا دے کے اس کو دروازے کی طرف سے روکنا چاہتی تھی، اور یہ جلدی سے دروازے سے جاکے باہر نکلنا چاہتے تھے، تو معلوم یوں ہوتا ہے کہ یوسف علیہ السلام آگے تھے زلیخا پیچھے تھی، تو پیچھے سے قمیص کا دامن زلیخا کے ہاتھ میں آ گیا، تو روکنے کے لئے اس نے جھٹکا جو دیا تو پیچھے سے قمیص پھٹ گئی، لیکن اتنے میں وہ دروازے تک بھی پہنچ گئے، جب دروازے تک پہنچ گئے تو صورت یہ پیش آئی کہ دروازے پہ پہنچ کے کنڈی جو جلدی سے کھولی تو باہر عزیزِ مصر عورت کا خاوند کھڑا تھا، وہ گویا کہ باہر سے گھر آرہا تھا دروازے پہ پہنچا، اور ادھر سے یہ اس حالت میں دروازے پہ پہنچ گئے، اور دونوں کا بالکل آمنا سامنا ہو گیا، جس وقت بالکل آمنا سامنا ہو گیا تو اس آدمی نے دیکھا کہ یہ تو دونوں آپس میں گتھم گتھا ہیں اور ایک دوسرے کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کر رہے ہیں تو فوراً خیال آتا ہے کہ یہ کیا قصہ ہے، اس کے ذہن نے ابھی سوچا ہو یا نہ سوچا ہو، عورت فوراً تاڑ گئی، کیونکہ عورت اس قسم کے معاملات میں بڑی ہوشیار ہوتی ہے، تاڑ کے فوراً اس نے پینترا بدل لیا، غصے کے آثار چہرے پر آ گئے، ناراضگی کے آثار چہرے پر آ گئے، جس طرح سے ایسے موقع پر عورتیں کرتی ہیں، کہ اچھا خادم لا کے دیا، جس کے متعلق کہا کہ اس کو بیٹا بنا کے رکھنا، بیٹے ایسے ہوا کرتے ہیں؟ میں نے اس کو بیٹوں کی طرح رکھا، میں نے اس کو اپنے پُتروں (بیٹوں) کی طرح پالا، اس کی میں نے عزت کی اور آج یہ میرے اوپر ڈورے ڈال رہا ہے! مجھے اس نے ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی! اب اس کو یا تو سخت سزا دو، یا اس کو جیل میں بھیج دو، یہ گھر رکھنے کے قابل نہیں ہے، اس طرح اس نے تقریر جھاڑ کے الزام سارے کا سارا یوسف علیہ السلام کو دے دیا، فوراً پینترا بدلا۔

عزیزِ مصر کا گھر فحاشی وعریانی سے پاک تھا

لیکن اس بات سے ایک بات آپ اپنے ذہن میں لے آیئے، قرآنِ کریم سے یہ بات ایک حقیقت کی طرح اُبھرتی ہوئی نظر آرہی ہے، اس بات کو ذرا سوچ لیجئے!!! کہ عورت کو اس قسم کی بات کرنے کی نوبت اسی لیے آئی، یہ بہانے بنانے کی اس کو اس لیے سوجھی کہ وہ سمجھتی تھی کہ اگر میرے خاوند کو پتا چل گیا کہ خیانت میں نے کی ہے میں بداخلاق ہوں تو میرا خاوند مجھے برداشت نہیں کرے گا اور مجھے گھر سے نکال دے گا ناراض ہوگا، اس لیے اس نے تہمت فوراً یوسف علیہ السلام کی طرف منسوب کر دی، اس سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ اس گھر کے اندر فسق و فجور نہیں تھا، اگر فسق و فجور ہوتا اور آج کی مغربی تہذیب کی طرح لوگ ایک دوسرے

کے ساتھ مزے لینے کے عادی ہوتے تو نہ زلیخا کو اپنے خاوند کا اتنا ڈر ہوتا اور نہ وہ خاوند کے سامنے صفائیاں دینے کی ضرورت محسوس کرتی، یہ صفائی دینے کی ضرورت تو اس نے اسی لیے محسوس کی ہے کہ وہ خاوند کی نظر میں پاک دامن ہے، اور اس ماحول کے اندر اس قسم کی حرکتوں کو بُرا سمجھا جاتا ہے، یہ حرکت گھروں کے اندر گوارہ نہیں، یہ بات تو سمجھ میں آرہی ہے کہ نہیں آرہی؟ (جی) یعنی لوگوں کا کہنا کہ ''معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت مغربی تہذیب ایسی تھی کہ اس میں عیش وعشرت تھی، جس طرح سے آج یورپی لوگ فحش کے اندر مبتلا ہوتے ہیں'' یہ بات غلط ہے، اگر اس قسم کی بات ہوتی تو نہ تو دروازے بند کرنے کی ضرورت تھی اور نہ عورت کو اتنی جلدی اپنے خاوند کے سامنے یہ تیور بدلنے کی اور صفائی دینے کی ضرورت تھی، عورت کا اتنی جلدی صفائی دینے پہ آمادہ ہوجانا اور جلدی سے بھڑک اٹھنا یہ اس بات کی علامت ہے کہ اس معاشرے کے اندر، خاص طور پر اس گھر میں اس فسق وفجور کی گنجائش نہیں تھی، ورنہ عورت اتنی جلدی محسوس کیوں کرتی اور اتنی جلدی اپنی صفائی دینے کی کوشش کیوں کرتی، یہ سب اس بات کی علامت ہے کہ گھر کے اندر اس فسق وفجور کی گنجائش نہیں تھی۔ بہرحال اس نے جلدی سے فٹ یہ الزام حضرت یوسف علیہ السلام پہ دھر دیا اور اپنے خاوند کے سامنے خود سچی ثابت ہونے کی کوشش کی۔

تہمت زدہ آدمی کو اپنی صفائی ضرور دینی چاہیے

اب یوسف علیہ السلام چاہے جتنے شریف تھے لیکن شرافت کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ کوئی شخص تہمت لگائے تو اس کو چپ کر کے برداشت کرلیا جائے اور لوگوں کی نظر میں مجرم بن جائیں، اور دوسرے کی اتنی رعایت رکھیں کہ میں اس کو کیا جھوٹا کروں، چلو ٹھیک ہے، جو اس نے کہہ دیا کہہ دیا، یہ بات غلط ہے، تہمت کو برداشت نہیں کیا جاسکتا، اگر کسی کے اوپر تہمت لگائی جائے تو اخلاقی طور پر ضروری ہے کہ اس کی صفائی دی جائے، تاکہ آئندہ کے لئے کوئی شخص کسی قسم کا طعنہ نہ دے سکے، اور پھر حضرت یوسف علیہ السلام کو تو آئندہ جا کے بننا بھی نبی تھا، تو نبی کے متعلق اس قسم کی بات اگر لوگوں کے درمیان چل نکلے تو آئندہ کے لئے وعظ اور تبلیغ کا کیا اثر ہوگا، لوگ کہیں گے آج ہمیں یہ سمجھاتے ہیں کل خود کیا کرتے تھے؟ اس لیے حضرت یوسف علیہ السلام بھی وہاں خاموش نہ رہ سکے، بلکہ اس کو کہنے لگے کہ نہیں! میری غلطی نہیں ہے، بلکہ یہ مجھے میرے نفس سے بہلا رہی ہے، یہ پھسلا رہی ہے، اس نے مجھے پھسلانے کی کوشش کی ہے، میں نے اس کو کچھ نہیں کہا، غلطی اس کی ہے۔ اب اندر یہ دو ہی فرد ہیں،[1] اور ان کے علاوہ کوئی دوسرا شخص نہیں ہے جو ان کو دیکھ رہا ہو، اور ماجرا یہ ہے کہ عورت یوسف علیہ السلام کو الزام دے رہی ہے اور حضرت یوسف علیہ السلام اپنی صفائی دے رہے ہیں، معاملہ بڑا نازک تھا اور عزیز مصر کے لئے فیصلہ کرنا مشکل ہوگیا کہ کس کی بات کا اعتبار کرے اور کس کو جھوٹا قرار دے؟ اللہ تعالیٰ اپنی قدرت اور حکمت کے تحت جیسے اپنے برگزیدہ بندوں کو گناہوں سے بچاتے ہیں، اس طرح سے دنیا میں بھی ان کو ہر قسم کی رُسوائی سے بچانے کا مکمل انتظام اور اور انصرام فرماتے ہیں، جیسے جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بغیر باپ کے معجزانہ پیدائش ہوئی تو لوگوں نے آپ کی والدہ پہ الزامات لگانے شروع کردیئے، اور نعوذ باللہ! آپ کو بدچلنی کا نتیجہ قرار دے دیا، تو اللہ تعالیٰ نے حضرت مریم کی

(۱) اس کے بعد ریکارڈنگ دستیاب نہ تھی۔ اور یہاں سے مزید چند آیات تک تفسیر بھی غالباً ''معارف القرآن'' وغیرہ سے ماخوذ ہے۔

پاک دامنی کو ثابت کرنے کے لئے صرف ایک دن کے بچّے یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قوتِ گویائی عطا کی، اور آپ نے ماں کی گود میں کلام کرکے اپنی والدہ کی پاک دامنی کو ثابت کیا۔ اسی طرح جب حضرت یوسف علیہ السلام پہ الزام لگایا گیا تو روایات میں آتا ہے کہ ایک چھوٹا بچّہ جو اس کے گھر کے اندر گھوارے میں پڑا تھا، غالباً یہ کسی ملازم کا ہوگا کیونکہ عزیزِ مصر تو بے اولاد تھا، اس بچّے کو اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کی پاک دامنی ثابت کرنے کے لئے بولنے کی قوت عطا کی اور اس نے گھوارے میں بول کر حضرت یوسف علیہ السلام کی پاک دامنی کو ثابت کیا۔

یوسف علیہ السلام کی پاک دامنی کی گواہی ایک بچّے کے ذریعے

وہ بچّہ صرف اتنا ہی کہہ دیتا کہ اس قصہ میں قصوروار زلیخا ہے اور حضرت یوسف علیہ السلام کا اس میں کوئی قصور نہیں تو حضرت یوسف علیہ السلام کی پاک دامنی کے لئے یہ بات کافی تھی، کیونکہ یہ پاک دامنی معجزانہ طور پر ثابت ہو رہی تھی لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنی حکمت کے تحت نہایت حکیمانہ بات اس بچّے کی زبان پر جاری کر دی، جس سے ہر شخص کے لئے خارجی قرائن سے بھی سمجھنا آسان ہوگیا کہ یوسف علیہ السلام بے قصور ہیں، اس نے کہا کہ یوسف علیہ السلام کی قمیص کو دیکھ لو، اگر قمیص آگے سے پھٹی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ پیش قدمی یوسف علیہ السلام کی طرف سے ہوئی ہے، اور عورت نے جب دفاع کیا تو اس کھینچا تانی میں آگے سے یوسف علیہ السلام کی قمیص پھٹ گئی، تو صاف بات ہے کہ ایسی صورت میں پھر عورت ہی سچی ہوگی اور یوسف علیہ السلام جھوٹے ہوں گے۔ اور اگر قمیص پیچھے سے پھٹی ہوئی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ پیش قدمی عورت کی طرف سے ہوئی تھی اور حضرت یوسف علیہ السلام اس سے بچ کر بھاگنے لگے تو اس نے پیچھے سے قمیص پکڑ کر کھینچی جس سے حضرت یوسف علیہ السلام کی قمیص پیچھے سے پھٹ گئی، تو اس بچّے نے ایک خارجی قرینے کی طرف متوجہ کر دیا، کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی قمیص جو اس کھینچا تانی میں پھٹ چکی ہے، اس کو دیکھو گے تو فیصلہ کرنا آسان ہو جائے گا، اللہ تعالیٰ نے اس طرح سے عزیزِ مصر کی پریشانی بھی ختم کر دی، جو وہ پریشان تھا کہ کس پہ اعتماد کرے اور کس پہ اعتماد نہ کرے؟ اور حضرت یوسف علیہ السلام کو جس طرح گناہ سے بچایا تھا اپنی نشانی دکھا کر، اسی طرح ایک بچّے کو گھوارے کے اندر قوتِ گویائی عطا کر کے حضرت یوسف علیہ السلام کی پاک دامنی کو بھی واضح کر دیا۔

یوسف علیہ السلام کے بے قصور ثابت ہونے پر عزیزِ مصر کا زلیخا کو تنبیہ کرنا

اب عزیزِ مصر نے جو حضرت یوسف علیہ السلام کی قمیص کو دیکھا تو واقعے کے مطابق پیچھے سے پھٹی ہوئی تھی تو وہ سمجھ گیا کہ اس میں قصوروار تو زلیخا ہے اور حضرت یوسف علیہ السلام بے قصور ہیں، اور وہ سمجھا اسی قرینے سے جو ابھی میں نے آپ کے سامنے بیان کیا، جب حضرت یوسف علیہ السلام کا پاک دامن اور اپنی بیوی کا قصوروار ہونا واضح ہوگیا تو حضرت یوسف علیہ السلام کو خطاب کر کے کہا کہ تو اس واقعے سے درگزر کر جا، کسی کے سامنے اس کو بیان نہ کرنا، جیسے بڑے لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ جب کوئی اس قسم کی بدنامی کی بات ہوتی ہے جو اپنے ہی گھر سے ہو تو اس کو ہر ممکن کوشش دبانے اور چھپانے کی کرتے ہیں، تو حضرت یوسف علیہ السلام کو کہا کہ اس سے

اِعراض کر جا، اور پھر اپنی بیوی کی طرف دوبارہ متوجہ ہوا اور کہنے لگا کہ وَاسْتَغْفِرِیْ لِذَنْۢبِكِ ۚ اِنَّكِ كُنْتِ مِنَ الْخٰطِـِٕیْنَ یعنی غلطی تو سراسر تیری ہی ہے، اپنی غلطی کی معافی مانگ، بظاہر اس کا مطلب یہ ہے کہ اپنے شوہر سے معافی مانگ، کیونکہ ایک تو اس کے حق میں خیانت کی ہے اور دوسرا الزام بھی بے گناہ آدمی پر لگانے کی کوشش کی ہے، یا یہ مطلب ہے کہ غلطی تیری ہے، تُو نے یوسف کو غلطی میں مبتلا کرنا چاہا اور پھر اس پر الزام لگایا، اس لیے اس سے اپنی غلطی کی معافی مانگ، مطلب دونوں طرح درست ہے۔ پہلے وہ اپنی بیوی کی طرف متوجہ ہوا اور کہنے لگا کہ یہ تم عورتوں کا ہی مکر ہے اور فریب ہے، بیشک تمہارا مکر بہت بڑا ہے کہ خود ہی غلطی کی اور خود ہی الزام لگانے شروع کر دیے۔

وَقَالَ نِسْوَةٌ فِی الْمَدِیْنَةِ امْرَاَتُ الْعَزِیْزِ تُرَاوِدُ فَتٰىهَا عَنْ نَّفْسِهٖ ۚ قَدْ شَغَفَهَا حُبًّا ؕ
اور کہنے لگیں عورتیں شہر میں عزیز کی بیوی پھسلاتی ہے اپنے غلام کو اس کے نفس سے، فریفتہ ہو گیا ہے اس کا دل اس کی محبت میں،
اِنَّا لَنَرٰىهَا فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ﴿۳۰﴾ فَلَمَّا سَمِعَتْ بِمَكْرِهِنَّ اَرْسَلَتْ اِلَیْهِنَّ وَاَعْتَدَتْ
ہم دیکھتی ہیں اس کو واضح غلطی میں ﴿۳۰﴾ پس جب سُنا اس نے ان کے فریب کو تو بُلاوا بھیجا ان کی طرف اور تیار کی
لَهُنَّ مُتَّكَاً وَّاٰتَتْ كُلَّ وَاحِدَةٍ مِّنْهُنَّ سِكِّیْنًا وَّقَالَتِ اخْرُجْ عَلَیْهِنَّ ۚ فَلَمَّا رَاَیْنَهٗۤ
ان کے لئے ایک مجلس تکیہ لگائی ہوئی اور دے دی ان میں سے ہر ایک کو چھری اور کہا یوسف! تُو نکل ان پر، پس جب انہوں نے اس کو دیکھا
اَكْبَرْنَهٗ وَقَطَّعْنَ اَیْدِیَهُنَّ وَقُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا هٰذَا بَشَرًا ؕ اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا مَلَكٌ
تو انہوں نے اس کو بڑا جانا اور کاٹ ڈالے اپنے ہاتھ اور کہنے لگیں اللہ کی پناہ، نہیں ہے یہ انسان، نہیں ہے یہ شخص مگر بزرگ
كَرِیْمٌ ﴿۳۱﴾ قَالَتْ فَذٰلِكُنَّ الَّذِیْ لُمْتُنَّنِیْ فِیْهِ ؕ وَلَقَدْ رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ
فرشتہ ﴿۳۱﴾ اس نے کہا: یہ وہی ہے جس کے بارے میں تم مجھے ملامت کرتی ہو، البتہ تحقیق میں نے ہی پھسلایا تھا اس کو اس کے نفس سے
فَاسْتَعْصَمَ ؕ وَلَىِٕنْ لَّمْ یَفْعَلْ مَاۤ اٰمُرُهٗ لَیُسْجَنَنَّ وَلَیَكُوْنًا مِّنَ الصّٰغِرِیْنَ ﴿۳۲﴾
پس یہ محفوظ رہا، اب اگر یہ نہیں کرے گا وہ جو میں اس کو کہتی ہوں تو قید کر دیا جائے گا اور ہو جائے گا بے عزت لوگوں میں سے ﴿۳۲﴾
قَالَ رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَیَّ مِمَّا یَدْعُوْنَنِیْۤ اِلَیْهِ ۚ وَاِلَّا تَصْرِفْ عَنِّیْ
یوسف نے کہا: اے میرے رَبّ! قید مجھے زیادہ پسند ہے اس بات سے جس کی طرف یہ مجھے بُلاتی ہیں اور اگر تُو نہ پھیرے مجھ سے

كَيْدَهُنَّ أَصْبُ إِلَيْهِنَّ وَأَكُنْ مِّنَ الْجٰهِلِيْنَ ۝٣٣ فَاسْتَجَابَ لَهٗ رَبُّهٗ
ان کا مکر تو میں مائل ہو جاؤں گا ان کی طرف اور ہو جاؤں گا نادانوں میں سے ۞ پس قبول کر لی دُعا اس کی اس کے رَبّ نے
فَصَرَفَ عَنْهُ كَيْدَهُنَّ ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝٣٤ ثُمَّ بَدَا لَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا رَاَوُا
اور پھیر دیا اس سے ان کا مکر بیشک وہی سننے والا ہے جاننے والا ہے ۞ پھر ظاہر ہوا ان کے لئے بعد اس کے کہ انہوں نے دیکھ لیں
الْاٰيٰتِ لَيَسْجُنُنَّهٗ حَتّٰى حِيْنٍ ۝٣٥
نشانیاں کہ اس کو قید کر دیا جائے ایک مدّت تک ۞

تفسیر

دیگر اَفسرانِ بالا کی بیویوں کا زلیخا پر تبصرہ

حضرت یوسف علیہ السلام کا قصہ یہاں تک پہنچا تھا کہ عزیزِ مصر کی بیوی نے حضرت یوسف علیہ السلام کو پھسلا کر اپنی طرف مائل کرنا چاہا لیکن حضرت یوسف علیہ السلام محفوظ رہے اور آپ کی پاک دامنی کی گواہی اس عورت کے گھر والوں میں سے کسی نے دی تو عزیزِ مصر کے سامنے حضرت یوسف علیہ السلام کا پاک دامن ہونا بھی ثابت ہو گیا اور عزیزِ مصر نے تاکید کر دی تھی کہ اب اس بات کو یہاں ختم کر دو تا کہ دوسروں کو پتا نہ چلے، لیکن ہوا یوں کہ وہ بات اب عزیزِ مصر کے گھر تک محدود نہ رہی بلکہ اِرد گرد جو دُوسرے افسران رہتے تھے ان کے گھر تک بھی یہ بات پہنچ گئی، اور ان کی بیویاں آپس میں بیٹھ کر عزیزِ مصر کی بیوی کے بارے میں گفتگو کرنے لگیں کہ یہ کتنے افسوس اور شرم کی بات ہے کہ عزیزِ مصر کی بیوی اپنے ہی غلام پر فریفتہ ہو گئی، اس کی محبت میں مبتلا ہو گئی، اس نے اس کو پھسلانے اور بہلانے کی کوشش کی ہے، اتنے بڑے مرتبے پر فائز ہو کر ایک غلام کی محبت میں مبتلا ہونا نہایت افسوس اور شرم کی بات ہے، انہوں نے آپس میں اس قسم کی گفتگو کی اور عزیزِ مصر کی بیوی کو مطعون کیا کہ ہم تو اسے واضح غلطی پر خیال کرتی ہیں، یہ شاہی خاندان اور عزّت کے خلاف ہے۔

حُسنِ یوسف کو دیکھ کر اَفسران کی بیویاں ہوش کھو بیٹھیں

فَلَمَّا سَمِعَتْ بِمَكْرِهِنَّ: جب عزیزِ مصر کی بیوی نے ان عورتوں کے مکر کو سُنا تو ان کو کھانے پر بلایا اور ان کے لئے گاؤ تکیوں سے مزین ایک مجلس کا اہتمام کیا، جب وہ عورتیں آ گئیں تو اس میں ان کے سامنے کچھ ایسی چیزیں بھی رکھی ہوں گی جو چھری سے کاٹنے کی ہوں گی، اور ان کو کاٹنے کے لئے ہر ایک کو ایک ایک چھری بھی دے دی، تا کہ کھانے میں کسی کو تکلیف نہ اُٹھانی پڑے، یہ سب سامان دُرست کر کے اپنے پلان کے مطابق اس نے حضرت یوسف علیہ السلام کو آواز دی اور ان عورتوں کی طرح حضرت

یوسف علیہ السلام بھی اس کی سازش سے بے خبر تھے، اس کے بلانے پر آپ جیسے ہی کمرے میں داخل ہوئے تو ان عورتوں کی نظر جیسے ہی اچانک حضرت یوسف علیہ السلام پر پڑی تو وہ حضرت یوسف علیہ السلام کے حُسن اور خوب صورتی کو دیکھ کر اپنے ہوش ہی کھو بیٹھیں، اور اس مدہوشی کے عالم میں ہی اپنے ہاتھ کاٹ لیے، اور زبان سے کہنے لگیں کہ خدا کی پناہ! یہ تو انسان نہیں، یہ تو کوئی معزز فرشتہ معلوم ہوتا ہے۔

عزیزِ مصر کی بیوی کی ان عورتوں پر چوٹ

اب عزیزِ مصر کی بیوی نے ان کو اس حالت میں دیکھ کر ان پر چوٹ لگائی کہ تم میرے بارے میں باتیں کر رہی تھیں اور اپنا حال یہ ہے کہ ایک ہی نظر میں مبہوت ہو کر اپنے ہاتھ کاٹ لیے ہیں، تم جو میرے بارے میں باتیں کرتی ہو، تو دیکھو! یہ وہی شخص ہے جس کے بارے میں تم مجھے ملامت کر رہی تھیں، اور واقعی میں نے اس کو اپنی طرف مائل کرنا چاہا تھا، لیکن یہ اس وقت بچ نکلا، اور اگر اس نے میری بات نہ مانی تو میں اسے جیل بھیج دوں گی، اور اسے ذلت و رُسوائی اُٹھانی پڑے گی، ان عورتوں کے سامنے ہی حضرت یوسف علیہ السلام کو ڈرانا دھمکانا شروع کر دیا، اور ان عورتوں نے بھی حضرت یوسف علیہ السلام کو کہا کہ یہ عورت تیری محسن ہے، اس کی مخالفت کرنا اور اس کی بات نہ ماننا اچھی بات نہیں ہے، اس طرح سے ان عورتوں نے زلیخا کی موافقت کرنی شروع کر دی۔

یوسف علیہ السلام کی دُعا اور اس کی قبولیت کی صورت

حضرت یوسف علیہ السلام نے جب یہ دیکھا کہ یہ عورتیں بھی اس کی حمایت میں بول رہی ہیں تو ان سب کے مکر سے بچنے کے لئے اللہ سے دُعا کی کہ اے میرے پروردگار! یہ عورتیں جس کام کی طرف مجھے بلاتی ہیں اس کام کے مقابلے میں تو مجھے قید پسند ہے، قید میں جانا قبول ہے لیکن ان عورتوں کی دعوت قبول نہیں ہے، اور اگر تُو نے مجھے ان کے مکر سے نہ بچایا تو کوئی بعید نہیں کہ میں بھی ان کی طرف مائل ہو جاؤں، اور پھر نادانوں میں سے ہو جاؤں گا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس کے رَبّ نے اس کی دُعا قبول کر لی اور اسے ان عورتوں کے مکر سے دُور رکھا، قبولیتِ دُعا کی صورت اس طرح ظاہر ہوئی کہ ان لوگوں کے سامنے حضرت یوسف علیہ السلام کا پاک دامن ہونا اور بے قصور ہونا اور آپ کی بزرگی اور طہارت بالکل واضح ہو چکی تھی، اور وہ سمجھتے تھے کہ اس پورے واقعے میں حضرت یوسف علیہ السلام نے کوئی خیانت نہیں کی، جو کچھ بھی ہوا وہ اِمرأۃِ عزیز اور دوسری عورتوں کی وجہ سے ہوا ہے، لیکن شہر میں اس واقعے کا چرچا ہونے لگا تھا اور لوگ اس بارے میں باتیں کرنے لگے تھے تو انہوں نے مصلحت یہی سمجھی کہ اگر عورتوں کو سزا دی جاتی ہے تو اس میں شاہی خاندان کی رُسوائی ہے، اس لیے بہتر یہی ہے کہ یوسف کو قید کر دیا جائے، جب یہ لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہو جائے گا تو اس واقعے کا چرچا بھی کم ہوگا، اور اس کو قید کرنے میں شاہی خاندان کی رُسوائی بھی نہیں ہے، کیونکہ ویسے بھی ایک غلام کی حیثیت سے زندگی گزار رہے تھے، تو اس مصلحت کے پیشِ نظر ایک مدت کے لئے حضرت یوسف علیہ السلام کو جیل میں بھیج دیا، جس سے حضرت یوسف علیہ السلام کی دُعا کا قبول ہونا بھی ظاہر ہو گیا کہ آپ ان کے مکر سے بچنا چاہتے تھے، چاہے اس کے مقابلے میں قید کی مشقتیں ہی کیوں نہ برداشت کرنی پڑیں، اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو ان کے مکر سے محفوظ رکھنے کے لئے اور آپ کو مزید ترقی دینے

کے لئے ان کے ذہن میں یہ بات ڈال دی کہ اسے قید کر دیا جائے، اس طرح حضرت یوسف علیہ السلام عزیز مصر کے گھر سے جیل میں چلے گئے، یہ حاصل ہے اس واقعے کا جو ان آیات میں بیان ہوا ہے جو آپ کے سامنے پڑھی گئی ہیں۔

ابتداءً حضرت یوسف علیہ السلام کو پھسلانے والی ایک عورت تھی جس کے گھر میں آپ رہتے تھے جس کا مفصل قصہ کل کے سبق میں گزر چکا ہے، اور پھر جب دوسرے افسران کی بیویوں کو پتا چلا کہ عزیز مصر کی بیوی نے اپنے ایک غلام کو بہکانے کی کوشش کی ہے تو انہوں نے عزیز کی بیوی مطعون کرنا شروع کیا، اور پھر جب زلیخا کی دعوت پر حضرت یوسف علیہ السلام کے حسن و جمال کا مشاہدہ کیا تو عورتیں بھی اس سلسلے میں زلیخا کی ہم نوا بن گئیں، اور یوسف علیہ السلام کو مشورے دینے لگیں کہ اس سے مخالفت مول لینا ٹھیک نہیں ہے، جس سے حضرت یوسف علیہ السلام سمجھ گئے کہ یہ بھی اس کی طرف داری کر رہی ہیں، اس لیے حضرت یوسف علیہ السلام نے اللہ کے سامنے دُعا کرتے ہوئے جمع کا لفظ استعمال کیا قَالَ رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَیَّ مِمَّا یَدْعُوْنَنِیْۤ اِلَیْهِ ۚ وَ اِلَّا تَصْرِفْ عَنِّیْ كَیْدَهُنَّ اَصْبُ اِلَیْهِنَّ وَ اَكُنْ مِّنَ الْجٰهِلِیْنَ: کہ مجھے ان سب کے مکر سے بچا، اسی حکمت کے پیش نظر یَدْعُوْنَنِیْۤ، كَیْدَهُنَّ، جمع کے لفظ استعمال کیے گئے ہیں۔

حضرت یوسف علیہ السلام نے ان عورتوں کے فریب سے بچنے کے لئے جو دُعا کی ہے کہ اے پروردگار! جس چیز کی طرف یہ مجھے بلاتی ہیں اس کے مقابلے میں مجھے قید زیادہ پسند ہے، تو اس بات کو سمجھ لیجیے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کا یہ دُعا فرمانا قید کی طلب یا خواہش نہیں ہے، بلکہ گناہ کے مقابلے میں اس دنیا کی تکلیف کو آسان سمجھنے کا اظہار ہے، یعنی حضرت یوسف علیہ السلام کے ذہن میں یہ بات تھی کہ گناہ کرنے کے بعد جو اللہ کی ناراضگی آتی ہے یا آخرت میں اس پر گرفت ہوگی اس آخرت کی سزا کے مقابلے میں یہ میرے لیے زیادہ سہل ہے اور آسان ہے کہ میں دنیا کی تھوڑی سی مشقت اور تکلیف کو برداشت کرلوں آخرت کے عذاب اور اللہ کی ناراضگی کے مقابلے میں۔ تو اس سے یہ نہیں سمجھ لینا چاہیے کہ مشقت اور تکلیف کی دُعا کرنا صحیح ہے جیسے حضرت یوسف علیہ السلام نے کی تھی، ان کا منشا یہ تھا جو میں ظاہر کر رہا ہوں۔ باقی جہاں تک اللہ تعالیٰ سے دُعا کرنے کا سوال ہے تو اللہ تعالیٰ سے مشقت اور تکلیف کی دُعا کرنا مناسب نہیں ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ سے ہر وقت عافیت ہی مانگنی چاہیے، جیسے ایک روایت میں آتا ہے کہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو دُعا کرتے ہوئے سُنا کہ وہ اللہ تعالیٰ سے صبر کی دُعا مانگ رہا تھا کہ مجھے صبر کرنے کی توفیق عطا فرما، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو صبر کرنے کی دُعا مانگنے سے منع کر دیا، اور فرمایا کہ صبر تو تکلیف اور مصیبت پر ہوتا ہے، جب تم اللہ سے صبر مانگ رہے ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے ضمن میں پہلے سے مصیبت مانگ رہے ہو، اور پھر اسی پر صبر مانگ رہے ہو، اور آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ سے جب بھی مانگو تو عافیت ہی مانگو۔[1] اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ سے مشقت اور تکلیف کی دُعا کرنا ٹھیک نہیں ہے، اور حضرت یوسف علیہ السلام نے جو دُعا کی تھی وہ مشقت کی دُعا نہیں تھی، آپ کی دُعا تو صرف عورتوں کے مکر کو دُور کرنے کے متعلق تھی اور اللہ تعالیٰ نے اسے قبول کیا، باقی قید تو قسمت میں تھی اور وہ اللہ کی حکمت کے تحت آپ کے مقام کو اُونچا کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت

(۱) ترمذی ۲/ ۱۹۲، باب فی فضل التوبة سے کچھ پہلے/ مشکوٰۃ ۱/ ۲۱۴، باب الدعوات، فصل ثانی۔ ولفظ الحدیث: سألت الله البلاء فاسأله العافية

کے تحت دے دی، اس لیے فَاسْتَجَابَ لَهٗ رَبُّهٗ فَصَرَفَ عَنْهُ كَيْدَهُنَّ کے اندر جو دُعا کی قبولیت کا ذکر ہے تو اس میں قید کا ذکر نہیں ہے، یہ نہیں ہے کہ ہم نے آپ کی دُعا کو قبول کیا اور آپ کو جیل دی اور عورتوں کے مکر کو آپ سے دُور کیا، بلکہ صرف ایک چیز کا ذکر ہے کہ آپ کے رَبّ نے آپ کی دُعا کو قبول کیا اور عورتوں کے مکر کو آپ سے دُور کیا، جس سے اس بات کی طرف اشارہ نکلتا ہے کہ اصل مقصود تو عورتوں کے مکر سے بچانا تھا اور تقدیر کے فیصلے کے تحت اس کی صورت یہ بن گئی۔

وَدَخَلَ مَعَهُ السِّجْنَ فَتَيٰنِ ؕ قَالَ اَحَدُهُمَآ اِنِّيْٓ اَرٰىنِيْٓ اَعْصِرُ خَمْرًا ۚ وَقَالَ الْاٰخَرُ

اور داخل ہوئے اس کے ساتھ قید خانے میں دو جوان، کہا ان میں سے ایک نے: میں دیکھتا ہوں کہ میں نچوڑتا ہوں شراب اور دوسرے نے کہا

اِنِّيْٓ اَرٰىنِيْٓ اَحْمِلُ فَوْقَ رَاْسِيْ خُبْزًا تَاْكُلُ الطَّيْرُ مِنْهُ ؕ نَبِّئْنَا بِتَاْوِيْلِهٖ ۚ اِنَّا نَرٰىكَ

میں دیکھتا ہوں کہ میں اُٹھا رہا ہوں اپنے سر پر روٹی، کھاتے ہیں پرندے اس میں سے، تُو بتلا ہم کو اس کی تعبیر بیشک ہم دیکھتے ہیں تجھے

مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝۳۶ قَالَ لَا يَاْتِيْكُمَا طَعَامٌ تُرْزَقٰنِهٖٓ اِلَّا نَبَّاْتُكُمَا بِتَاْوِيْلِهٖ قَبْلَ اَنْ

نیکوکاروں میں سے ۳۶ آپ نے کہا کہ نہ آئے گا تمہارا کھانا جو تمہیں دیا جاتا ہے مگر میں بتا دوں گا اس کی تعبیر قبل اس کے کہ وہ

يَّاْتِيَكُمَا ؕ ذٰلِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِيْ رَبِّيْ ؕ اِنِّيْ تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ

تمہارے پاس آئے، یہ وہ علم ہے جو سکھایا ہے مجھے میرے رَبّ نے بیشک میں نے چھوڑ دیا اس قوم کے دِین کو جو ایمان نہیں لاتے

بِاللّٰهِ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ۝۳۷ وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَآءِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ

اللہ پر اور آخرت کا انکار کرنے والے ہیں ۳۷ میں نے پیروی کی ہے اپنے آباء ابراہیم، اسحاق اور

وَيَعْقُوْبَ ؕ مَا كَانَ لَنَآ اَنْ نُّشْرِكَ بِاللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ؕ ذٰلِكَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ عَلَيْنَا

یعقوب کے دِین کی، نہیں ہمارے لیے مناسب کہ ہم شریک ٹھہرائیں اللہ کے ساتھ کسی چیز کو، یہ اللہ کا فضل ہے ہم پر

وَعَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ ۝۳۸ يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ

اور لوگوں پر لیکن اکثر لوگ شکر ادا نہیں کرتے ۳۸ اے میرے قیدخانے کے ساتھیو! کیا خدا متفرق

خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ۝۳۹ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اَسْمَآءً سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ

بہتر ہیں یا اکیلا خدا جو زبردست ہے؟ ۳۹ نہیں پوجتے ہو تم اس کے علاوہ مگر چند ناموں کو جو رکھ لیے ہیں تم نے

وَاٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ؕ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ اَمَرَ اَلَّا

اور تمہارے آباء نے نہیں اُتاری اللہ نے اس کے ساتھ کوئی دلیل نہیں ہے حکومت کسی کی سوائے اللہ کے، اس نے حکم دیا ہے کہ تم نہ

تَعْبُدُوْۤا اِلَّاۤ اِيَّاهُ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝۴۰ يٰصَاحِبَيِ

عبادت کرو مگر اس کی، یہی سیدھا دِین ہے لیکن اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں ۝۴۰ اے میرے قیدخانے

السِّجْنِ اَمَّاۤ اَحَدُكُمَا فَيَسْقِيْ رَبَّهٗ خَمْرًا ۚ وَاَمَّا الْاٰخَرُ فَيُصْلَبُ فَتَاْكُلُ الطَّيْرُ مِنْ

کے ساتھیو! تم دونوں میں سے ایک پلائے گا اپنے مالک کو شراب، اور لیکن دُوسرا سُولی پر لٹکایا جائے گا پھر کھائیں گے پرندے اس

رَّاْسِهٖ ؕ قُضِيَ الْاَمْرُ الَّذِيْ فِيْهِ تَسْتَفْتِيٰنِ ۝۴۱ وَقَالَ لِلَّذِيْ ظَنَّ

کے سر میں سے، فیصلہ کر دیا گیا اس کام کا جس کے بارے میں تم پوچھتے ہو ۝۴۱ اور کہا یوسف نے اس کو جس کے بارے میں گمان تھا

اَنَّهٗ نَاجٍ مِّنْهُمَا اذْكُرْنِيْ عِنْدَ رَبِّكَ ۫ فَاَنْسٰىهُ الشَّيْطٰنُ ذِكْرَ رَبِّهٖ

کہ ان میں سے نجات پانے والا ہے کہ تُو میرا تذکرہ کرنا اپنے بادشاہ کے پاس، بھلا دیا اس کو شیطان نے تذکرہ کرنا اپنے بادشاہ سے،

فَلَبِثَ فِي السِّجْنِ بِضْعَ سِنِيْنَ ۝۴۲

پھر آپ ٹھہرے رہے قید میں چند سال ۝۴۲

تفسیر

ماقبل سے ربط

حضرت یوسف علیہ السلام کا واقعہ آپ کے سامنے تفصیل کے ساتھ آ رہا ہے، اور بات یہاں تک پہنچی تھی کہ ان لوگوں نے مصلحت اس بات میں سمجھی تھی کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو کچھ مدت کے لئے قید کر دیا جائے، جب یہ لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہو جائیں گے تو آہستہ آہستہ اس واقعے کا چرچا بھی ختم ہو جائے گا اور لوگ اس بات کو بھول جائیں گے، اس مصلحت کے پیش نظر حضرت یوسف علیہ السلام کو جیل میں بھیج دیا گیا، اب یہاں سے حضرت یوسف علیہ السلام کی زندگی کا ایک اور دور شروع ہوتا ہے، جیل جانے کے بعد وہاں بھی ایک واقعہ پیش آیا جس کو ان آیات میں بیان کیا گیا جو ابھی آپ کے سامنے پڑھی گئی ہیں۔

جیل میں دو قیدیوں کا یوسف علیہ السلام سے اپنے اپنے خواب کی تعبیر پوچھنا

جب حضرت یوسف علیہ السلام جیل میں پہنچے تو ان کے ساتھ اور بھی دو قیدی جیل میں داخل ہوئے، ان میں سے ایک بادشاہ کا

ساقی تھا اور دُوسرا اس کا باورچی تھا، اور ان دونوں پر بادشاہ کو زہر دینے کا الزام تھا، تو یہ بھی حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ جیل میں ڈال دیے گئے، اور حضرت یوسف علیہ السلام کی جیل میں بھی یہ عادت مبارکہ تھی کہ اپنے ساتھ رہنے والوں کا بہت خیال رکھتے تھے، ہر ایک کے ساتھ بہت پیار اور محبت کے ساتھ پیش آتے، کوئی پریشان یا کوئی غمگین ہوتا تو اس کو تسلی دیتے، کوئی بیمار ہوتا اس کی تیمارداری کرتے، اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مصروف رہتے، آپ کے اچھے اخلاق سے متاثر ہو کر جیل کے سارے ساتھی آپ سے محبت کرتے، آپ کا احترام کرتے اور یہاں تک کہ جیل خانے کا افسر بھی آپ کے اخلاق سے بہت متاثر ہوا۔ ہوا یہ کہ ایک دن وہ دونوں قیدی حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس آئے اور ہر ایک نے اپنا اپنا خواب بیان کر کے حضرت یوسف علیہ السلام سے اس کی تعبیر پوچھی، خواب یہ تھا کہ جو بادشاہ کا ساقی تھا اس نے کہا میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں بادشاہ کی شراب نچوڑ رہا ہوں، اور جو بادشاہ کا باورچی تھا اس نے کہا میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں اپنے سر کے اوپر روٹیوں کا ٹوکرا اٹھائے ہوئے ہوں اور پرندے اس میں سے اچک اچک کر کھا رہے ہیں، ان دونوں نے اپنے یہ خواب بیان کیے، اور حضرت یوسف علیہ السلام کو کہا کہ آپ نیکوکاروں میں سے ہیں آپ ان خوابوں کی تعبیر بتائیے۔

”لَا یَاْتِیْكُمَا طَعَامٌ تُرْزَقٰنِهٖۤ اِلَّا نَبَّاْتُكُمَا بِتَاْوِیْلِهٖ“ کے دو مفہوم

قَالَ لَا یَاْتِیْكُمَا طَعَامٌ تُرْزَقٰنِهٖۤ اِلَّا نَبَّاْتُكُمَا بِتَاْوِیْلِهٖ: اس کا مفہوم دو طرح سے ادا کیا گیا ہے، ایک تو یہ ہے کہ یہ الفاظ حضرت یوسف علیہ السلام نے ان کو تسلی دینے کے لئے کہے کہ گھبراؤ نہیں، ان خوابوں کی تعبیر بہت جلد میں دوں گا، تمہیں کھانے کے لئے جو ہر روز کھانا دیا جاتا ہے اس کھانے کے آنے سے پہلے ہی میں تمہیں اس کی تعبیر بتا دوں گا، لیکن اس سے بھی زیادہ ضروری بات ہے پہلے اس بات کو سُن لو پھر اس کی تعبیر بتاؤں گا، یعنی یہ وعدہ کر لیا کہ کھانا آنے سے پہلے تعبیر بتاؤں گا۔ اور دوسرا مفہوم یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے ان الفاظ سے اپنے ایک معجزے کی طرف اشارہ کیا ہے کہ تمہیں ہر روز جو کھانا دیا جاتا ہے اس کھانے کے آنے سے پہلے ہی میں تمہیں اس کھانے کی نوعیت تمہیں پہلے ہی بتا دیتا ہوں اور وہ بات صحیح ہوتی ہے، اسی طرح خواب کی تعبیر بھی صحیح صحیح بتاؤں گا، لیکن اس سے پہلے ایک ضروری بات سُن لیجیے، دونوں طرح سے اس کا مفہوم ادا کیا جا سکتا ہے، تو یہ تسلی دے دی کہ میں تمہیں بہت ہی جلد تمہارے خوابوں کی تعبیر بتا دوں گا۔

یوسف علیہ السلام کی قیدیوں کو دعوت و تبلیغ

اور پھر خوابوں کی تعبیر بتانے سے پہلے توحید کا پیغام ان کے سامنے رکھا، سب سے پہلے تو ان کو بتایا کہ میں کوئی کاہن نہیں ہوں جو کہانت کے ساتھ اس قسم کی باتیں کرتا ہوں اور تمہیں غیب کی خبریں دیتا ہوں، یہ علم مجھے میرے رَبّ نے دیا ہے، وحی کے ساتھ مجھے بتا دیا اور میں آگے بتا دیتا ہوں۔ اور پھر کُفر سے اپنی بیزاری کا اظہار کیا کہ میں نے ایسی قوم کے دِین کو چھوڑ رکھا ہے جو اللہ پر بھی ایمان لاتی اور آخرت کا بھی انکار کرتی ہے، یعنی میں تو اللہ پر ایمان رکھتا ہوں اور آخرت پر بھی میرا ایمان پختہ ہے، اور پھر کہا کہ میں خاندانِ نبوّت کا ہی ایک فرد ہوں، اور میں اپنے باپ دادوں یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسحاق علیہ السلام اور حضرت

یعقوب علیہ السلام کے دِین کی پیروی کرتا ہوں، اور یہ ہمارے لیے کسی طرح بھی مناسب نہیں کہ ہم اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرائیں، اور اس دِین پر قائم رہنا اور اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرانا یہ اللہ کا ہم پر اور ان لوگوں بہت بڑا فضل ہے، یہ اس کی مہربانی اور اس کی توفیق سے ہے کہ ہم اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہراتے، لیکن لوگوں میں اکثریت ایسوں کی ہے جو اس نعمت کی قدر نہیں کرتے۔ اور پھر انہی پر ایک سوال ڈال دیا کہ اے میرے قید خانے کے ساتھیو! کیا متفرق خدا بہتر ہیں یا ایک اللہ بہتر ہے جو اکیلا بھی ہے اور زبردست بھی ہے؟ اس میں شرک کی مذمت کردی کہ جو شخص شرک میں مبتلا ہوتا ہے پھر اس کا سر ایک کے سامنے نہیں جھکتا بلکہ کبھی وہ درخت کو سجدہ کرتا ہے، کبھی پتھر کو مشکل کشا سمجھ کے اس کے سامنے ناک رگڑتا ہے، کبھی چاند تاروں کے سامنے سر جھکاتا ہے، پھر دنیا کی کونسی چیز ایسی ہے جس کے سامنے انسان نہیں جھکتا، تو یہ ذِلّت ہی ذِلّت ہے، اس کے مقابلے میں جب اللہ سے عقیدہ پختہ ہوگیا تو پھر ہر چیز سے بے نیاز ہوکر صرف اور صرف اس کے سامنے پیشانی ٹیکتا ہے، تو جتنی ذِلّت شرک میں ہے اتنی ذِلّت کسی اور چیز میں نہیں ہے، جتنی عزّت توحید کو اپنانے میں ہے اتنی عزّت کسی اور چیز میں نہیں ہے، سب سے زیادہ عزّت توحید کو اپنانے میں ہے، اور انسان سب سے زیادہ ذِلّت کا شکار اس وقت ہوتا ہے جب وہ توحید کو چھوڑتا ہے اور غیر کو اختیار کرتا ہے، پھر وہ کسی ایک در کا نہیں رہتا، بلکہ جہاں سے بھی اس کو تھوڑا سا بھی فائدہ حاصل ہوتا ہوا محسوس ہوتا ہے وہ فوراً اس کے سامنے ناک رگڑنے لگ جاتا ہے، اور اسی بات کو حضرت یوسف علیہ السلام نے کہا کہ بتاؤ کیا متفرق خدا بہتر ہیں یا ایک اللہ بہتر ہے جو اکیلا بھی ہے کہ اس کا کوئی شریک نہیں، جو کچھ کرتا ہے وہ اکیلا کرتا ہے اور زبردست بھی ہے، غالب بھی ہے، کسی کا محتاج نہیں ہے، کوئی اس کی ہمت اور طاقت سے باہر بھی نہیں ہے، طاقتور اتنا ہے کہ کوئی اس کو روکنا چاہے تو اس کو کوئی روک نہیں سکتا، اور جو نہ کرنا چاہے اس پر اس کو کوئی مجبور نہیں کرسکتا، اس کی شان یہ ہے کہ جب وہ کسی کام کے کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو اس کے کُنکہنے کی دیر ہوتی ہے، وہ کام ہوجاتا ہے۔ اور اللہ کے علاوہ جن چیزوں کو تم پوجتے ہو ان کی حقیقت کچھ نہیں ہے، یہ تو چند نام ہیں جو تم نے اور تمہارے آباءواجداد نے رکھ لیے ہیں کہ یہ لات ہے، یہ عزّیٰ ہے، یہ منات ہے، یہ بارش دینے والا ہے، یہ رزق دینے والا ہے، یہ مشکلات کو دُور کرنے والا ہے، یہ اولاد دینے والا ہے، یہ تمہاری کہی ہوئی باتیں ہیں اور تمہارے رکھے ہوئے نام ہیں، ان کی حقیقت کچھ نہیں ہے، اللہ تعالیٰ نے اس بارے میں کوئی دلیل نہیں اتاری، اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی کی حکومت نہیں ہے، اور اس کا حکم یہ ہے کہ تم صرف اس کی عبادت کرو، اس کے علاوہ کسی کے ساتھ بھی عبادت والا تعلق نہ رکھو، یہی سیدھا دین ہے، لیکن اکثر لوگ علم نہیں رکھتے۔

قیدیوں کے خواب کی تعبیر

حضرت یوسف علیہ السلام نے موقع غنیمت جان کر پہلے تو ان کو توحید کی دعوت دی پھر ان کے خوابوں کی تعبیر بتائی کہ تم میں سے ایک اپنے عہدے پر بحال ہوجائے گا اور پہلے کی طرح اپنے بادشاہ کے لئے شراب نچوڑے گا، اور دوسرے کو سُولی دے دی جائے گی اور پرندے اس کے سر کو نوچ نوچ کے کھائیں گے، یہ بھی حضرت یوسف علیہ السلام کی پیغمبرانہ شفقت تھی کہ اگرچہ خواب دیکھنے والے بھی متعین تھے، ان کے خواب متعین تھے، اور ان کے خوابوں کی تعبیریں بھی متعین تھیں لیکن پھر تعبیر اجمالی الفاظ کے ساتھ بتائی

تا کہ دوسرے کا دل نہ دکھے، اور آخر میں فرمایا کہ یہ محض اٹکل نہیں ہے، بلکہ جو کچھ تم نے پوچھا اس کے مطابق ہو کر رہے گا۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ یہ بات کہنے کی نوبت اس لیے پیش آئی کہ جب ان قیدیوں نے خوابوں کی تعبیریں سنی تو کہنے لگے ہم نے تو یہ خواب نہیں دیکھے بلکہ ہم تو صرف آپ کی بزرگی اور سچائی کا امتحان لینا چاہتے تھے تو حضرت یوسف علیہ السلام نے کہا قُضِيَ الْأَمْرُ الَّذِي فِيهِ تَسْتَفْتِيَانِ یہ خواب تم نے دیکھے ہیں یا نہیں جو کچھ میں نے بتایا ہے اس کے مطابق ہو کر رہے گا چنانچہ بعد کے حالات نے ثابت کر دیا کہ اسی طرح ہوا کہ ایک شخص اپنے عہدے پر بحال ہو گیا اور دوسرے کو پھانسی دے دی گئی، اسی وجہ سے لکھا ہے کہ اپنا خواب ہر کسی کے سامنے ذکر نہیں کرنا چاہیے بلکہ ایسے شخص کے سامنے اس کا تذکرہ کرنا چاہیے جو اس کی تعبیر کا صحیح علم رکھتا ہو کیونکہ تعبیر بتانے والا جو بھی بتاتا ہے اکثر اسی طرح ہو کر رہتا ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی کے سامنے اپنے خواب کا تذکرہ کریں اور وہ اس کی غلط تعبیر بتا دے اور پھر اس طرح ہو جائے جس طرح اس نے بتایا تھا، اس لیے خواب ہر کسی کے سامنے بیان نہ کیا کرو، جس کے متعلق علم ہو کہ یہ خواب کی تعبیر صحیح جانتا ہے اور میرا خیر خواہ بھی ہے اپنا خواب اس کو سنا کر اس سے تعبیر پوچھا کرو۔

یوسف علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے تنبیہ

جب حضرت یوسف علیہ السلام نے ان کو ان کے خوابوں کی تعبیر بتا دی تو پھر ان میں سے جس کے متعلق یقین تھا (یہاں ظن یقین کے معنی میں ہے کیونکہ وہ شخص متعین تھا جس نے یہ خواب دیکھا تھا اور اس کا نجات پانا بھی یقینی تھا) تو جس کے متعلق حضرت یوسف علیہ السلام کو یقین تھا کہ یہ نجات پا جائے گا اس کو حضرت یوسف علیہ السلام نے کہا کہ جب تو رہا ہو کر جائے گا تو اپنے بادشاہ کے سامنے میرا تذکرہ بھی کر دینا، کہ ایک شخص جیل میں پڑا ہے اس کے بارے میں سوچو، ہوا اس طرح کہ جب وہ قیدی رہا ہو کے گیا تو وہ بھول گیا کہ جیل میں مجھے کسی نے کوئی پیغام بھی دیا تھا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی آزادی کو اور دیر لگ گئی، اور اس کے بعد پھر چند سال جیل میں رہے۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ اس شخص کا بھول جانا یہ حضرت یوسف علیہ السلام کو تنبیہ کرنے کے لئے تھا کیونکہ ظاہری طور پر ان کی توجہ اللہ سے ہٹ کر بادشاہ کی طرف لگ گئی تھی، اگرچہ اتنی سی بات ظاہری طور پر جائز ہے لیکن "حَسَنَاتُ الْأَبْرَارِ سَيِّئَاتُ الْمُقَرَّبِينَ" کے تحت ابرار کی نیکیاں بھی مقربین کی سیئات شمار ہوتی ہیں، یہ ظاہری طور پر معمولی سی غفلت ہوئی تھی، اس غفلت پر تنبیہ کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے اس شخص کو یہ بات بھلا دی۔ اگر اس بات کو لے لیا جائے تو پھر اس آیت پر ایک سوال ہوتا ہے کہ پھر تو نسیان کی نسبت اللہ کی طرف ہونی چاہیے، پھر نسیان کی نسبت شیطان کی طرف کیوں کی؟ بھلایا تو اللہ تعالیٰ نے ہے اور اپنی حکمت کے تحت بھلایا ہے، تو پھر اس کا جواب یہ ہے کہ شیطان دل میں وسوسہ ڈالتا ہے جو بھولنے کا سبب بن گیا تو اس وسوسے کی وجہ سے اور اس کے سبب بننے کی وجہ سے نسیان کی نسبت شیطان کی طرف کر دی، جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعے میں آئے گا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے رفیق سفر نے کہا: وَمَا أَنْسَانِيهُ إِلَّا الشَّيْطَانُ أَنْ أَذْكُرَهُ (الکہف: ۶۳) کہ شیطان نے اس کا یاد کرنا بھلا دیا، حقیقت میں بھلانا تو اللہ کا کام ہے، لیکن چونکہ اس کا سبب شیطان بنتا ہے اس لیے اس کی طرف اس کی نسبت کر دی جاتی ہے، تو یہاں نسیان کی نسبت شیطان کی طرف اس لیے کی گئی ہے کہ وہ بھولنے کا سبب بنا تھا، کیونکہ وہ دل میں وسوسے اور خیالات

ڈالتا ہے جس کی وجہ سے انسان بھول جاتا ہے، اس طرح حضرت یوسف علیہ السلام کو تنبیہ بھی ہوگئی کہ جو ظاہری طور پر تھوڑی سی توجہ بادشاہ کی طرف ہوئی ہے یہ بھی آپ کی شانِ نبوّت کے خلاف ہے، آپ کی مکمل توجہ ہر کام میں اللہ کی طرف رہنی چاہیے، اور پھر اس کے نتیجے میں چند سال اور جیل میں رہے۔ یہاں بِضْعَ سِنِیْنَ کا لفظ ہے جو تین سے لے کر نو تک بولا جاتا ہے، بعض روایات میں آتا ہے کہ اس واقعے کے بعد مزید سات سال جیل میں رہنا پڑا اور پھر رہائی نصیب ہوئی جس کا مفصل قصہ آگے آرہا ہے۔

وَقَالَ الْمَلِكُ اِنِّیْۤ اَرٰى سَبْعَ بَقَرٰتٍ سِمَانٍ یَّاْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَّ سَبْعَ سُنْۢبُلٰتٍ

اور کہا بادشاہ نے میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ سات گائے ہیں جن کو کھا رہی ہیں سات گائیں دُبلی اور سات خوشے

خُضْرٍ وَّ اُخَرَ یٰبِسٰتٍ ؕ یٰۤاَیُّهَا الْمَلَاُ اَفْتُوْنِیْ فِیْ رُءْیَایَ اِنْ كُنْتُمْ لِلرُّءْیَا تَعْبُرُوْنَ ۝۴۳

سرسبز اور دوسرے خشک، اے سردارو! مجھے تم بتاؤ میرے خواب کے بارے میں اگر ہو تم خواب کی تعبیر بتانے والے ۝۴۳

قَالُوْۤا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ ۚ وَ مَا نَحْنُ بِتَاْوِیْلِ الْاَحْلَامِ بِعٰلِمِیْنَ ۝۴۴ وَ قَالَ الَّذِیْ

انہوں نے کہا یہ پریشان حال خواب ہیں، اور ہم ایسے خوابوں کی تعبیر نہیں جانتے ۝۴۴ اور کہا اس شخص نے جس نے

نَجَا مِنْهُمَا وَ ادَّكَرَ بَعْدَ اُمَّةٍ اَنَا اُنَبِّئُكُمْ بِتَاْوِیْلِهٖ فَاَرْسِلُوْنِ ۝۴۵

نجات پائی تھی ان دونوں میں سے اور یاد آ گیا تھا اس کو ایک مدت کے بعد کہ میں بتاؤں گا تمہیں اس کی تعبیر پس تم مجھے بھیج دو ۝۴۵

یُوْسُفُ اَیُّهَا الصِّدِّیْقُ اَفْتِنَا فِیْ سَبْعِ بَقَرٰتٍ سِمَانٍ یَّاْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَّ سَبْعِ

(اس نے کہا) اے یوسف! اے سچے! تو بتا ہمیں کہ سات موٹی گائیں ہیں جن کو کھا رہی ہیں سات دُبلی گائیں اور سات

سُنْۢبُلٰتٍ خُضْرٍ وَّ اُخَرَ یٰبِسٰتٍ ۙ لَّعَلِّیْۤ اَرْجِعُ اِلَى النَّاسِ لَعَلَّهُمْ یَعْلَمُوْنَ ۝۴۶ قَالَ

خوشے سرسبز اور دوسرے سات سوکھے ہوئے تاکہ میں لوٹوں لوگوں کی طرف شاید کہ وہ جان لیں ۝۴۶ یوسف نے کہا

تَزْرَعُوْنَ سَبْعَ سِنِیْنَ دَاَبًا ۚ فَمَا حَصَدْتُّمْ فَذَرُوْهُ فِیْ سُنْۢبُلِهٖۤ اِلَّا قَلِیْلًا مِّمَّا

تم کھیتی کروگے سات سال لگاتار پس جو تم کاٹو گے اس کو چھوڑ دو اس کے خوشے میں مگر تھوڑا سا

تَاْكُلُوْنَ ۝۴۷ ثُمَّ یَاْتِیْ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ سَبْعٌ شِدَادٌ یَّاْكُلْنَ مَا قَدَّمْتُمْ لَهُنَّ اِلَّا قَلِیْلًا مِّمَّا

جو تم کھاؤ ۝۴۷ پھر آئیں گے اس کے بعد سات سال سختی کے، تم کھا جاؤ گے جو تم نے رکھا ان کے لئے مگر تھوڑا سا

تُحْصِنُوْنَ ﴿۴۸﴾ ثُمَّ يَاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ عَامٌ فِيْهِ يُغَاثُ النَّاسُ وَفِيْهِ يَعْصِرُوْنَ ﴿۴۹﴾

جو تم محفوظ رکھو گے ﴿۴۸﴾ پھر آئے گا اس کے بعد ایک سال، اس میں بارش برسائی جائے گی لوگوں پر اور اس میں وہ رس نچوڑیں گے ﴿۴۹﴾

وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُوْنِيْ بِهٖ ۚ فَلَمَّا جَآءَهُ الرَّسُوْلُ قَالَ ارْجِعْ اِلٰى رَبِّكَ

اور کہا بادشاہ نے لے آؤ اس کو میرے پاس، پس جب آیا اس کے پاس قاصد تو اس نے کہا تُو لوٹ جا اپنے بادشاہ کی طرف

فَسْـَٔلْهُ مَا بَالُ النِّسْوَةِ الّٰتِيْ قَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ ؕ اِنَّ رَبِّيْ بِكَيْدِهِنَّ عَلِيْمٌ ﴿۵۰﴾

پس تُو پوچھ اس سے کہ کیا حقیقت ہے ان عورتوں کی جنہوں نے کاٹے تھے اپنے ہاتھ بیشک میرا ربّ ان کے مکر کو خوب جانتا ہے ﴿۵۰﴾

قَالَ مَا خَطْبُكُنَّ اِذْ رَاوَدْتُّنَّ يُوْسُفَ عَنْ نَّفْسِهٖ ؕ قُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا عَلِمْنَا عَلَيْهِ مِنْ

کہا بادشاہ نے کیا حقیقت ہے تمہاری جب تم نے پھسلایا یوسف کو اس کے نفس سے؟ وہ بولیں اللہ کی پناہ! نہیں معلوم ہمیں ان پر کوئی

سُوْٓءٍ ؕ قَالَتِ امْرَاَتُ الْعَزِيْزِ الْـٰٔنَ حَصْحَصَ الْحَقُّ ۫ اَنَا رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ وَاِنَّهٗ لَمِنَ

بُرائی، کہا عزیز کی بیوی نے اب واضح ہوگئی سچی بات، میں نے ہی پھسلایا تھا اس کو اس کے نفس سے اور بیشک وہ

الصّٰدِقِيْنَ ﴿۵۱﴾ ذٰلِكَ لِيَعْلَمَ اَنِّيْ لَمْ اَخُنْهُ

سچوں میں سے ہے ﴿۵۱﴾ یوسف نے کہا یہ بات میں نے اس لیے کی تاکہ عزیز مصر کو معلوم ہو جائے کہ میں نے اس کے پس پشت

بِالْغَيْبِ وَاَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ كَيْدَ الْخَآئِنِيْنَ ﴿۵۲﴾

اس سے خیانت نہیں کی اور یہ (بات بھی معلوم ہو جائے) کہ بیشک اللہ تعالیٰ خیانت کرنے والوں کی تدبیر چلنے نہیں دیتا ﴿۵۲﴾

وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِيْ ۚ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ ۢ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّيْ ؕ اِنَّ رَبِّيْ

میں اپنے نفس کو بری قرار نہیں دیتا، بیشک نفس البتہ بہت حکم دینے والا ہے بُرائی کا مگر جس وقت میرے ربّ کا رحم ہو، بیشک میرا ربّ

غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۵۳﴾ وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُوْنِيْ بِهٖٓ اَسْتَخْلِصْهُ لِنَفْسِيْ ۚ

بخشنے والا ہے رحم کرنے والا ہے ﴿۵۳﴾ بادشاہ نے کہا کہ لے آؤ اس کو میرے پاس، میں اس کو خالص قرار دیتا ہوں اپنے آپ کے لئے،

فَلَمَّا كَلَّمَهٗ قَالَ اِنَّكَ الْيَوْمَ لَدَيْنَا مَكِيْنٌ اَمِيْنٌ ﴿۵۴﴾

جس وقت بادشاہ نے گفتگو کی یوسف علیہ السلام کے ساتھ تو اس نے کہا بیشک تو آج ہمارے نزدیک ذی مرتبہ ہے اور ذی امانت ہے ﴿۵۴﴾

قَالَ اجْعَلْنِيْ عَلٰى خَزَآئِنِ الْاَرْضِ ۚ اِنِّيْ حَفِيْظٌ عَلِيْمٌ ﴿٥٥﴾ وَكَذٰلِكَ

یوسف علیہ السلام نے کہا کہ مجھے متعین کر دو ملکِ مصر کے خزانوں پر، بیشک میں نگہبانی کرنے والا ہوں اور علم رکھنے والا ہوں ﴿٥٥﴾ اسی طرح سے

مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِي الْاَرْضِ ۚ يَتَبَوَّاُ مِنْهَا حَيْثُ يَشَآءُ ۭ نُصِيْبُ بِرَحْمَتِنَا مَنْ نَّشَآءُ

ہم نے ٹھکانا دے دیا یوسف کو ارضِ مصر میں، ٹھکانا لے اس (ارضِ مصر) سے جہاں چاہے، پہنچاتے ہیں ہم اپنی رحمت جس کو چاہتے ہیں،

وَلَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿٥٦﴾ وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ﴿٥٧﴾

اور ہم محسنین کے اَجر کو ضائع نہیں کرتے ﴿٥٦﴾ البتہ آخرت کا اَجر بہتر ہے ان لوگوں کے لئے جو ایمان لاتے ہیں اور تقویٰ اختیار کرتے ہیں ﴿٥٧﴾

خلاصہ آیات مع تحقیق الالفاظ

[1] ذٰلِكَ لِيَعْلَمَ اَنِّيْ لَمْ اَخُنْهُ بِالْغَيْبِ وَاَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ كَيْدَ الْخَآئِنِيْنَ: حضرتِ شیخ (الہندؒ) نے اس کو یوسف علیہ السلام کا قول بنایا ہے، ''بیان القرآن'' میں بھی یہی توجیہ اختیار کی گئی ہے، اس کے مطابق مطلب یہ ہوگا کہ یہ بات میں نے اس لئے کی (یوسف علیہ السلام کہتے ہیں) کہ یہ اہتمام میں نے اس لئے کیا، لِيَعْلَمَ اَنِّيْ لَمْ اَخُنْهُ بِالْغَيْبِ: يَعْلَمَ کی ضمیر عزیزِ مصر کی طرف لوٹ جائے گی، لِيَعْلَمَ: تاکہ عزیزِ مصر کو معلوم ہو جائے، اَنِّيْ لَمْ اَخُنْهُ بِالْغَيْبِ: کہ میں نے اس کے پس پشت اس سے خیانت نہیں کی، لَمْ اَخُنْهُ: میں نے اس سے خیانت نہیں کی، بِالْغَيْبِ: اس کے پس پشت، وَاَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ كَيْدَ الْخَآئِنِيْنَ: اور یہ بات بھی معلوم ہو جائے کہ بیشک اللہ تعالیٰ خیانت کرنے والوں کی تدبیر چلنے نہیں دیتا، نہیں ہدایت دیتا خائنین کی کید کو، یعنی ان کی کید، ان کی تدبیر، ان کے فریب کو اللہ تعالیٰ چلنے نہیں دیتا، وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِيْ: یہ بھی یوسف علیہ السلام کا ہی قول ہے، میں اپنے نفس کو بَری قرار نہیں دیتا، میں اپنے نفس کی براءت نہیں کرتا، اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ بِالسُّوْٓءِ: بیشک نفس البتہ بہت حکم دینے والا ہے بُرائی کا، اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّيْ: ''مَا'' کو اگر ظرفیہ لیا جائے تو ''مگر جس وقت میرے رَبّ کا رحم ہو'' ایسے وقت میں پھر نفس بُرائی کا حکم نہیں دیتا، یا (''مَا'' موصولہ بنا کر) جس پر میرا رَبّ رحم کرے، اللہ کے رحم کے ساتھ ہی بچ سکتا ہے ورنہ نفس بُرائی کا حکم دینے والا ہے، اِنَّ رَبِّيْ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ: بیشک میرا رَبّ بخشنے والا ہے، رحم کرنے والا ہے۔ یہ تو قول ہم نے قرار دیا یوسف علیہ السلام کا، اور حافظ ابنِ تیمیہ اور ابنِ کثیر رحمہما اللہ دونوں اس کو قول قرار دیتے ہیں زلیخا کا، پھر ترجمہ یوں ہوگا (پیچھے سے جو قول زلیخا کا چلا آ رہا ہے قَالَتِ امْرَاَتُ الْعَزِيْزِ الْئٰنَ، یہاں سے لے کر غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ تک زلیخا کا ہی قول ہے حافظ ابنِ تیمیہؒ اور ابنِ کثیرؒ کے نزدیک) ان کے نزدیک مطلب یہ ہوگا کہ زلیخا نے کہا اب حق واضح ہو گیا، میں نے ہی اس کو بہلایا تھا پھسلایا تھا اس کے نفس سے، اور بیشک یہ البتہ سچوں میں سے ہے۔ اور میں یہ اقرار اس لئے کر رہی ہوں، یہ بات جو اس وقت میں ظاہر کر رہی ہوں یہ اقرار اس لئے کر رہی ہوں تاکہ عزیزِ مصر جان لے (لِيَعْلَمَ کی ضمیر وہی عزیزِ مصر

(۱) یہاں سے حضرت حکیم العصرؒ کی تقریر ہے۔ ریکارڈنگ دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے خلاصہ آیات مکمل تحریر نہیں کیا جا سکا۔

کی طرف) تا کہ عزیزِ مصر جان لے کہ میں نے پسِ پشت اس سے خیانت نہیں کی، یعنی جتنی بات تھی میں نے اس کا اقرار کر لیا جس طرح سے بیوی کی خیانت اپنے خاوند کے ساتھ ہوا کرتی ہے میں نے وہ خیانت اس سے نہیں کی، یعنی صرف بات تک ہی نوبت آئی، آگے اِبتلاء کوئی نہیں ہوا،'' تا کہ عزیزِ مصر جان لے کہ میں نے اس سے خیانت نہیں کی اس کے پسِ پشت، اور اللہ تعالیٰ خیانت کرنے والوں کا فریب چلنے نہیں دیتا'' اگر اس سے کوئی زیادہ معاملہ ہوا ہوتا تو وہ بھی پتا چل جاتا، جتنی بات ہوئی تھی اتنی نمایاں ہوگئی، باقی! یہ بات کہ اتنی شرارت بھی کیوں کی، چھیڑ چھاڑ کرنے کی بھی کیوں کوشش کی؟ اس کا جواب اس نے یہ دیا کہ وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِیْ: میں اپنے نفس کو بَری قرار نہیں دیتی، نفس بہت بُرائی کا حکم دینے والا ہے، ہاں جس پر میرے رَبّ کا رحم ہو وہی بچ سکتا ہے، جس طرح سے یوسف علیہ السلام ہیں ان کے اُوپر میرے رَبّ کا رحم تھا، جس کی بنا پر وہ کسی شرارت میں مبتلا نہیں ہوئے، باقی میں اپنے نفس کو بَری قرار نہیں دیتی،'' بیشک نفس البتہ بُرائی کا حکم دینے والا ہے مگر جس وقت کہ میرے رَبّ کا رحم ہو، یا، جس پر میرے رَبّ کا رحم ہو'' اِنَّ رَبِّیْ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ: بیشک میرا رَبّ غفور رحیم ہے، بخشنے والا ہے رحم کرنے والا ہے۔ تو یہ ہیں توبہ کے الفاظ جس طرح سے ''مدارک'' نے کہا کہ ''اِسْتَغْفَرَتْ رَبَّہَا'' کہ اس نے پھر اپنے رَبّ سے اِستغفار کیا، کیونکہ اپنی غلطی کا اقرار کر لینا کہ مجھ سے غلطی ہوگئی، میرا رَبّ غفور رحیم ہے یہ بھی توبہ کے الفاظ ہیں، تو ابنِ تیمیہ اور ابنِ کثیرؒ کے نزدیک اس آیت کا مطلب اس طرح سے ادا کیا گیا۔ باقی! ''ابوحیان'' ایک مفسر ہیں وہ اس قول کو تو زلیخا کا قول ہی قرار دیتے ہیں، لیکن لِیَعْلَمَ کی ضمیر یوسف علیہ السلام کی طرف لوٹاتے ہیں، کہ زلیخا نے کہا کہ میں اس وقت صاف صاف اقرار کر رہی ہوں تا کہ یوسف کو پتا چل جائے کہ میں نے اس کے پسِ پشت اس سے کوئی خیانت نہیں کی، جتنی بات تھی میں نے مان لی، باقی اس سے زائد میں نے اس کے اوپر کوئی الزام نہیں لگایا، لِیَعْلَمَ: تا کہ یوسف جان لے کہ میں نے پسِ پشت اس سے کوئی خیانت نہیں کی اور تا کہ یوسف جان لے کہ بیشک خیانت کرنے والوں کا مکر، فریب اللہ تعالیٰ چلنے نہیں دیتے۔ اور آگے مطلب وہی! کہ میں اپنے نفس کو بَری قرار نہیں دیتی، نفس البتہ بُرائی کا حکم دینے والا ہے مگر جس پر کہ میرے رَبّ کا رحم ہو، یا جس وقت میرے رَبّ کا رحم ہو، بیشک میرا رَبّ غفور رحیم ہے۔ وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُوْنِیْ بِہٖٓ: بادشاہ نے کہا کہ لے آؤ اس کو میرے پاس، اَسْتَخْلِصْهُ لِنَفْسِیْ: میں اس کو خالص قرار دیتا ہوں اپنے آپ کے لئے، یعنی اب اس کو عزیزِ مصر کے قبضے میں نہیں دوں گا بلکہ خالص اپنے لئے کر کے رکھ لوں گا، فَلَمَّا کَلَّمَهٗ: جس وقت بادشاہ نے گفتگو کی یوسف علیہ السلام کے ساتھ قَالَ: تو بادشاہ نے کہا، اِنَّكَ الْیَوْمَ لَدَیْنَا مَکِیْنٌ اَمِیْنٌ: بیشک تُو آج ہمارے نزدیک ذی مرتبہ ہے اور ذی امانت ہے، یعنی ہم تجھے معتبر قرار دیتے ہیں، اپنے نزدیک قابلِ اعتماد قرار دیتے ہیں اور امانت دار قرار دیتے ہیں، ذی مرتبہ ہے، باعزت ہے، قَالَ اجْعَلْنِیْ: یوسف علیہ السلام نے کہا کہ مجھے متعین کر دو، عَلٰی خَزَآئِنِ الْاَرْضِ: زمین کے خزانوں پر۔ الارض سے اَرضِ مصر مراد ہے۔ مُلکِ مصر کے خزانوں پر مجھے متعین کر دو، یعنی آمد خرچ اور معاشیات کا مکمل شعبہ جس کو کہتے ہیں وہ میرے سپرد کر دو، اِنِّیْ حَفِیْظٌ عَلِیْمٌ: بیشک میں نگہبانی کرنے والا ہوں اور علم رکھنے والا ہوں، حفیظ ہوں کہ میں حفاظت بھی کروں گا خزانے کی، اور حساب کتاب وغیرہ کا میں علم بھی رکھنے والا ہوں، وَکَذٰلِكَ مَکَّنَّا لِیُوْسُفَ فِی الْاَرْضِ: ہم نے اسی طرح سے قدرت دے دی، ٹھکانا دے دیا یوسف کو

زمین میں (''زمین'' سے زمینِ مصر مراد ہے) مصر کے مُلک میں ہم نے ان کو ٹھکانا دے دیا، یَتَبَوَّاُ مِنْهَا حَیْثُ یَشَآءُ: ٹھکانا لیتا تھا اس ارض سے، اَرضِ مصر سے جہاں چاہتا تھا، کیا مطلب؟ کہ پہلے جس طرح سے عزیزِ مصر کے گھر میں مقید تھا، بعد میں جیل کے اندر مقید رہا، وہ بات نہیں رہی، اب سارا مُلک اسی کا تھا، جہاں چاہے پھرے، جدھر چاہے دورہ کرے، جہاں چاہے ٹھہرے، اس کو مکمل اختیارات حاصل ہوگئے، یَتَبَوَّاُ مِنْهَا حَیْثُ یَشَآءُ: ٹھکانا لے اس اَرضِ مصر سے جہاں چاہے، نُصِیْبُ بِرَحْمَتِنَا مَنْ نَّشَآءُ: پہنچاتے ہیں ہم اپنی رحمت جس کو چاہتے ہیں، وَلَا نُضِیْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِیْنَ: اور ہم محسنین کے اَجر کو ضائع نہیں کرتے، وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ خَیْرٌ لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا یَتَّقُوْنَ: البتہ آخرت کا اَجر بہتر ہے ان لوگوں کے لئے جو ایمان لاتے ہیں اور تقویٰ اختیار کرتے ہیں۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَیْكَ

تفسیر

ماقبل سے ربط

پچھلے رکوع کے اختتام پر یہ بات ذکر کی گئی تھی کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے ساقی سے کہا تھا جس کے متعلق اُن کا خیال تھا کہ یہ چھوٹنے والا ہے کہ اپنے مالک کے سامنے میرا تذکرہ کیجیو، لیکن ساقی بھول گیا اور بادشاہ کے سامنے کوئی ذکر نہ کرسکا، اور یوسف علیہ السلام کئی سال تک جیل میں پڑے رہے، تو اللہ تعالیٰ کو یہ منظور نہیں تھا کہ ساقی یوسف علیہ السلام کے چھوٹنے کا واسطہ بنے، اور اللہ تعالیٰ جس شان وشوکت کے ساتھ اُن کو جیل سے باہر لانا چاہتے تھے وہ حالات ابھی اللہ کی حکمت کے تحت پیدا نہیں ہوئے تھے اس لیے ساقی کی یادداشت سے تو اس واقعے کو نکال دیا، اور جب اللہ نے چاہا تو اس کے لئے دوسرے اسباب پیدا فرمادیے، جیسے (اسی سورت کی) ابتدا میں آپ کے سامنے ذکر کیا گیا تھا وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰٓى اَمْرِهٖ، اللہ تعالیٰ اپنے اَمر کے اُوپر غالب ہے، کہ جو کام وہ کرنا چاہے اُس کے سامنے کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی، تو یہاں بھی جس وقت اللہ تعالیٰ کی حکمت کا تقاضا ہوا کہ یوسف علیہ السلام کو جیل سے نکالا جائے اور آگے اُن کو عزت اور کرامت سے نوازا جائے تو اُس کے لئے اسباب پیدا ہوگئے۔

بادشاہ کا خواب اور اَرکانِ سلطنت اُس کی تعبیر بتانے سے عاجز

بادشاہ نے خواب دیکھ لیا، یہ بادشاہ، اس کا ذکر آپ کے سامنے پہلے آیا تھا ''ریان بن الولید'' اس کا نام لکھا ہے، غالباً میں نے ابتدا میں ذکر کیا تھا کہ اُس وقت تک مصر کے بادشاہ بھی ''فرعون'' نہیں کہلانے لگے تھے، ''فرعون'' کا لفظ اُن کے لئے اُس وقت استعمال ہوا جب ان کی قومی حکومت بن گئی تھی، اور اس کے بارے میں بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ یہ عمالقہ میں سے تھا، یعنی بیرونی لوگوں نے قبضہ کر کے مصر پر حکومت قائم ہوئی تھی، یہ قبطیوں کی اپنی حکومت نہیں تھی، لیکن بعض تفسیروں میں یہاں وہ لفظ استعمال بھی کیا گیا ہے جیسے ''قصص القرآن'' میں یہی ذکر کیا گیا ہے کہ وہ ''فرعون'' ہی کہلاتا تھا، وقت کا ''فرعون'' تھا، اور بعض دوسری تفسیروں میں بھی توراۃ وغیرہ کے حوالے سے ''فرعون'' کا لفظ اس کے لئے استعمال کیا گیا ہے، کہ اُس وقت بھی یہ لوگ

''فرعون'' ہی کہلاتے تھے۔ تو یہ بادشاہ جو بعض کے نزدیک ''فرعون'' کا مصداق ہوا اس نے خواب دیکھا کہ سات موٹی موٹی گائے ہیں اور سات لاغر گائے ہیں، لیکن وہ جو لاغر سوکھی ہوئی گائے ہیں وہ ان سات موٹی گائیوں کو کھا گئیں، اور پھر وہ دیکھتا ہے کہ سات سبز خوشے ہیں اور سات خشک خوشے ہیں، اور وہ خشک خوشے اِن سبز خوشوں کے اوپر لپٹے اور اُن کو بھی خشک کر دیا یا اُن کو بھی ختم کر دیا اور کھا گئے۔ یہ خواب اُس نے دیکھا، تو بادشاہ نے اِس خواب کی بہت اہمیت محسوس کی کہ یہ تو کوئی بہت بڑا خواب ہے، اس میں کسی واقعے کی طرف اشارہ ہے، تو اپنے معتبر لوگ اکٹھے کر لیے، دربار کے اندر جن کو عزّت حاصل تھی، جو ذی مرتبہ تھے، اُن سب کو بلا لیا، بلا کے اُن کے سامنے خواب ذکر کیا، تو اُس وقت کے جو کاہن تھے اُس وقت کے جو اہلِ علم تھے، آخر دربار میں جن کو کرسی ملی ہوئی تھی، جو معزّز ہوتے ہیں وہ اُس وقت کے لحاظ سے ذی علم ہی ہوتے ہیں، کارندے، اس کے معتمد، حکومت کے کارکن اور ارکانِ سلطنت، وہ سارے کے سارے اکٹھے کر کے اُن کے سامنے بادشاہ نے خواب ذکر کیا، لیکن وہ اس کو کچھ نہ سمجھ پائے، بادشاہ کو مطمئن کرنے کے لئے کہ آپ فکر میں نہ پڑیں، آپ کے طبیعت کے اوپر یہ خواب اثر انداز ہو گیا، یہ تو ایسے ہی پراگندہ خیالات سے معلوم ہوتے ہیں، یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ خشک گائیاں موٹی گائیوں کو کھا گئیں، خشک خوشے جو تھے وہ سبز خوشوں کو کھا گئے، یہ تو ایسے پراگندہ سے خیالات معلوم ہوتے ہیں، بسا اوقات انسان کا معدہ خراب ہوتا ہے، تبخیر کے سے اثرات ہوتے ہیں، تو سویا ہوا انسان بہت منتشر سے خیالات دماغ میں لایا کرتا ہے، تو یہ ایسے ہی خیالات ہیں، فکر کرنے کی بات نہیں، باقی اصل بات یہ ہے کہ ہم خوابوں کا علم جانتے ہی نہیں، خوابوں کی تعبیر نہیں جانتے، ہم تو اُمورِ سلطنت کے ماہر ہیں اور یہ خوابوں کی تعبیر دینا ہمارا کام نہیں، ایک مطلب کے تحت یہ تفسیر ہے۔ یا یہ ہے کہ ہم تعبیر تو آپ کو بتائیں لیکن کوئی کام کا خواب تو ہو، اس قسم کے جو پراگندہ خیالات ہوتے ہیں ان کی کوئی تعبیر نہیں ہوتی، ہم ایسے خیالات کی کوئی تعبیر نہیں جانتے۔

خواب کی تعبیر معلوم کرنے کے لئے ساقی کا یوسف علیہ السلام کے پاس جانا

اس طرح سے انہوں نے بادشاہ کو مطمئن کرنے کی کوشش کی لیکن بادشاہ کو دِلی اطمینان نہ ہوا، وہ اِس خواب کی اہمیت سمجھتا تھا، یا اُس کے دل پر یہ اثر انداز تھا، وہ مطمئن نہ ہوا، تو جس مجلس کے اندر یہ تذکرہ وہ رہا تھا خواب کا اور اُس کی تعبیر کا، تو وہیں وہ ساقی بھی موجود تھا جو جیل سے ہو کے آیا تھا، اُس کو یاد آ گئے یوسف علیہ السلام، پھر اُس نے ذکر کیا کہ جی جیل میں مجھے بھی ایک خواب آیا تھا، میرے ساتھی کو بھی خواب آیا تھا، جیل میں ایک ایسا شخص ہے بہت محسن قسم کا، بڑا علم والا، اور اُس نے ہمارے خواب کی جو تعبیر دی تھی وہ سچی نکلی، اِس لیے مجھے بھیجو تو میں اُس سے پوچھ کر آتا ہوں، تو جب اِس قسم کا تذکرہ کیا تو بادشاہ نے کہا کہ جاؤ، جا کے اس سے دریافت کر کے آؤ، یعنی اُس نے تعریف جو کی تو تعریف کرنے کے بعد بادشاہ کی توجہ اُدھر کو ہو گئی، تو یہ ساقی جاتا ہے، یوسف علیہ السلام سے ملاقات ہوتی ہے، کئی سالوں کے بعد اور یوسف علیہ السلام نے جو پیغام دیا تھا وہ بھی اُس کو بھول گیا تھا اور وہ بادشاہ کے سامنے کوئی تذکرہ نہ کر سکا، اب جس وقت جاتا ہے تو جاتے ہی خطاب کرتا ہے یُوْسُفُ اَیُّهَا الصِّدِّیْقُ، یہ یُوْسُفُ منادیٰ ہے، حرفِ نداء محذوف ہے، کہ اے یوسف! اے سچے! اے راست باز انسان!، اِس سے تاثر ظاہر کرتا ہے کہ جیل کے اندر یوسف علیہ السلام کے متعلق اُس کو کیسی

عقیدت تھی، صدیق کا معنی یہ ہوتا ہے جس کا قول کے مطابق عمل ہو، ہر معاملے میں قول میں فعل میں کردار میں ہر چیز میں وہ سچا ہے، اے راست باز انسان! اے صدقِ مجسم! ہمیں اس خواب کی تعبیر بتا، وہ بادشاہ کا خواب اُس نے ان کے سامنے نقل کر دیا۔

یوسف علیہ السلام نے اخلاقِ کریمانہ کے طور پر خواب کی تعبیر بھی بتائی اور عمدہ مشورہ بھی دیا

تو یوسف علیہ السلام نے آگے سے کوئی ملامت نہیں کی، کہ اب آ گئے ہو خواب پوچھنے؟ جب اپنا کام پڑا تو اب یاد آیا؟ تجھے جو میں نے پیغام دیا تھا تو تُو نے کیوں نہیں ذکر کیا؟ جاؤ میں خواب کی تعبیر نہیں بتاتا، اگر اس قسم کی کوئی اَڑی کرتے تو ظاہری حالات کے اعتبار سے کر سکتے تھے، یا وہ کہتے کہ میں اُس وقت تک خواب نہیں بتاتا جب تک کہ میری یہ شرط نہ مانی جائے کہ مجھے جیل سے رہا کیا جائے گا، تو پہلے میرا مطالبہ مانو، پہلے ہمارا یہ مطالبہ پورا کرو اُس کے بعد خواب بتاؤں گا، اس قسم کا فائدہ اٹھانے کی کوئی کوشش نہیں کی، بلکہ اخلاقِ کریمانہ کے طور پر خواب کی تعبیر بھی بتائی اور اس کے اندر جس مشکل کا اشارہ تھا اُس کے حل کی تدبیر بھی بتا دی، اور پھر اُس کے بعد تبشیر بھی کر دی کہ اُس کے بعد یہ سختیاں دُور ہو جائیں گی اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اچھے حالات پیدا ہو جائیں گے، اتنی تفصیل کے ساتھ جواب دیا، پہلے تو خواب کی تعبیر کا ذکر کیا، اور تعبیر ذکر کرنے کے ساتھ جس مشکل کی طرف اشارہ تھا اُس سے چھوٹنے کی تدبیر بھی بتا دی، کہا کہ اِس میں اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ سات سال تو تم پر ایسے آنے والے ہیں کہ جس میں بہت خوش حالی ہوگی، خوب اچھی طرح سے پیداوار ہوگی، اور یہ دو چیزوں کا ذکر جو کیا، گائیوں کا اور خوشوں کا، تو یا تو اس لیے کہ قحط کا اثر بھی دو چیزوں پہ واقع ہوا کرتا ہے، خوش حالی کا اثر بھی دو چیزوں پہ واقع ہوتا ہے، خوش حالی ہوتی ہے تو نباتات بھی خوب ہوتی ہے حیوانات بھی خوب پلتے ہیں، اور جس وقت خشک سالی آتی ہے تو نباتات بھی ختم ہو جاتی ہے حیوانات بھی مرنے لگ جاتے ہیں، خشک سالی کا حیوانات پر بھی اثر پڑا کرتا ہے۔ تو سات سال تو ایسے آئیں گے کہ جن میں خوب سبزہ اگے گا اور تمہیں چاہیے کہ اُس میں خوب اچھی طرح سے کھیتی کرو، جتنی پیداوار ہو سب کو محفوظ رکھتے چلے جاؤ، خوشوں سے نہ نکالو، کیونکہ یہ غلہ جس وقت تک خوشوں میں بند رہتا ہے اس وقت تک اس کو کیڑا نہیں لگتا، اور جب یہ خوشوں سے نکال لیا جاتا ہے تو تبھی اس کو کیڑا لگتا ہے، تو چونکہ یہ دیر تک ذخیرہ محفوظ رکھنا ہے اس لیے اس کو خوشوں سے نہ نکالو، بلکہ اس کو خوشوں میں اسی طرح سے پڑا رہنے دو، اتنا سا نکالا کرو جس کو تم نے کھانا ہے، باقی سات سال تک یہ ذخیرہ کرتے چلے جاؤ۔ اور اس کے بعد سات سال ایسے آئیں گے کہ قحط پڑ جائے گا، ہر چیز خشک ہو جائے گی، حیوانات بھی ختم ہونے شروع ہو جائیں گے، نباتات بھی ختم ہو جائے گی، تو یہ ذخیرہ جو سات سال میں کیا ہوگا وہ سارے کا سارا ان سات سالوں میں ختم ہو جائے گا، مگر تھوڑا سا جو آگے بیج ڈالنے کے لئے بچا لو گے بس اِتنا سا بچے گا، ہمت کر کے تھوڑا سا جو بچا لو گے آئندہ بیج ڈالنے کے لئے، اس کے علاوہ سارے ذخیرے ختم ہو جائیں گے، یہ گویا کہ اس بات کی طرف اشارہ کر دیا کہ وہ سات سال پہلے سات سال کا جمع کیا ہوا کھا جائیں گے تو وہی کھانے کا مسئلہ آ گیا جو اوپر خواب کے اندر دیکھا گیا تھا۔ پھر جب یہ سات سال گزر جائیں گے تو پھر اگلا سال ایسا آئے گا کہ جس میں بارشیں ہوں گی پھر نباتات ہوگی پھر لوگوں کی تکلیفیں دُور کی جائیں گی، فریاد رسی کی جائے گی، یہ بشارت دے دی، یا تو یہ بشارت حضرت یوسف علیہ السلام اس سے سمجھے کہ جب سات کا عدد

پورا ہو جائے گا تو اس کے بعد آخر سابقہ حالات عود کر آئیں گے، اور ممکن ہے کہ خواب میں ہی اس قسم کا کوئی اشارہ ہو، وہ صاحبِ تعبیر ہی اِس کو بہتر جانتا ہے۔

تعبیر سُن کر بادشاہ کی یوسف علیہ السلام کے ساتھ ملاقات کی خواہش اور یوسف علیہ السلام کا انکار

تو یہ ساری کی ساری باتیں سُن کر ساقی واپس لوٹ کر آیا، جس وقت واپس آیا تو آ کے بادشاہ کے سامنے اُس نے تعبیر ذکر کی اُسی تفصیل کے ساتھ، تو بادشاہ بہت متاثر ہوا، اور اس کے دِل کو یہ بات لگ گئی کہ واقعی یہ تو کوئی سمجھ دار آدمی معلوم ہوتا ہے، کہ کس طرح سے اُس نے خواب کی ایک ایک بات کو ٹھکانے لگا دیا اور جس مشکل کی طرف اشارہ تھا اس کا حل بھی بتا دیا اور آگے بشارت بھی دے دی، تو اِس بات کا اُس کے اوپر بہت اثر ہوا، جب اثر ہوا تو اُس نے اس ساقی سے کہا کہ اس کو میرے پاس بُلا کے لاؤ جس نے یہ تعبیر دی ہے۔ اب ساقی واپس گیا دوڑا ہوا، جا کر یوسف علیہ السلام سے کہتا ہے کہ بادشاہ آپ کو یاد کرتے ہیں اور آپ سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں، اب اتنی دیر سے جو شخص جیل کی مصیبتیں جھیل رہا تھا تو اُس کے لئے تو یہ ایک بہت بڑی خوشی کی بات تھی، وہ تو اگر ذرا بھی انہوں نے اِس بارے میں کمزوری دکھائی ہوتی تو فوراً ہی اس پیغام کو سنتے ہوئے چل پڑتے، جیسے کہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت یوسف علیہ السلام کی تعریف فرمائی کہ کتنے صبر و استقامت والے تھے، فرمایا کہ اگر میں جیل میں اتنے سال رہا ہوتا جتنے سال یوسف رہے ہیں، ''لَوْ لَبِثْتُ فِي السِّجْنِ مَا لَبِثَ يُوسُفُ لَأَجَبْتُ الدَّاعِيَ'' پھر میرے پاس کوئی بُلانے والا آ جاتا کہ تجھے بادشاہ بُلا رہا ہے، تو ''لَأَجَبْتُ الدَّاعِيَ'' میں تو فوراً بات مان لیتا (بخاری ۶۸۰/۲)، لیکن یہ یوسف کیسے صبر و استقامت والے تھے کہ انہوں نے اس دعوت کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

یوسف علیہ السلام کی طرف سے رہائی سے پہلے واقعے کی تحقیق کا مطالبہ

فرمایا کہ میں نہیں جاؤں گا، پہلے میرے اِس مقدمے کا فیصلہ کیا جائے کہ مجھے جیل میں بھیجا کیوں گیا تھا؟ میرے اُوپر کیا الزام تھا جس کی بنا پر مجھے جیل میں بھیجا گیا؟ پہلے اس واقعے کی تحقیق کرو، تحقیق کرنے کے بعد مجھے بتلاؤ، تب میں جیل سے نکلوں گا، ورنہ میں نہیں آؤں گا۔ حضرت یوسف علیہ السلام اس طرح سے مطالبہ کر کے جیل کے اندر بیٹھے رہے، بادشاہ کی بات نہیں مانی، اور اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے یہ بات یوسف علیہ السلام کو جو سمجھائی سجھائی گئی تھی یہی حضرت یوسف علیہ السلام کی عظمت کا نشان ہے۔ جب یہ بات واپس پہنچی تو بادشاہ کے دِل میں اور عظمت پیدا ہو گئی، کہ عجیب شخص ہے کہ جیل سے نکلنا نہیں چاہتا اور پہلے اپنی صفائی دینا چاہتا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ واقعی اس کے اوپر کوئی جھوٹا الزام لگا ہے، ورنہ اگر کوئی سچا الزام ہو تو دوبارہ تحقیقات کا مطالبہ کرنے میں تو اور اپنی ذِلّت و رُسوائی کا اندیشہ ہوتا ہے، جب وہ مطالبہ کر رہا ہے کہ پہلے تحقیق کرو کہ مجھے جیل میں کیوں بھیجا گیا؟ وہ کیا واقعہ پیش آیا تھا؟ معلوم ہوتا ہے کہ وہ شخص ہے سچا، اور بڑا مضبوط کردار کا ہے، بڑا مضبوط حوصلے کا ہے، جو اتنی مصیبتوں کے بعد بھی چھوٹنا نہیں چاہتا جب تک کہ اس کے دامن کو صاف نہ کر دیا جائے، تو واقعہ چونکہ مشہور ہو چکا تھا، وہ بیگمات جو تھیں وہ بڑے بڑے گھروں کی تو

تھیں، جس وقت وہ ٹپکتا ہوا لہو لے کر گئی ہوں گی گھر زخمی ہاتھوں کے ساتھ، تو پتا تو چل ہی گیا تھا کہ کیا ہوا، اور حضرت یوسف علیہ السلام نے بھی اشارہ یہی کیا کہ اُس واقعے کی تحقیق کرو، وہ ہاتھ کاٹنے والی عورتوں کا کیا واقعہ تھا؟

یوسف علیہ السلام کی اَخلاقی بُلندی

یہاں لفظ یہی بولا مَا بَالُ النِّسْوَةِ الّٰتِیْ قَطَّعْنَ اَیْدِیَهُنَّ، جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لیے تھے ان عورتوں کا کیا واقعہ تھا؟ اس بات کی تحقیق کرو، یہاں مفسرین نے عام طور پر ایک بات لکھی ہے کہ یوسف علیہ السلام نے اِس کو عموم کے ساتھ ذکر کیا کہ اُن عورتوں کا واقعہ کیا ہے جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لیے تھے، اِمرأۃ العزیز کا ذِکر صراحتاً نہیں کیا، اگرچہ شرارت کی بنیاد جو تھی وہ اِمرأۃ العزیز کی طرف سے اُٹھی تھی لیکن اُس کا ذِکر صراحتاً نہیں کیا، کس لیے نہیں کیا؟ یہاں شیخ الاسلام ؒ نے بھی حاشیے کے اندر لکھا اور دوسری تفسیر والوں نے بھی لکھا کہ یہی اخلاق کی بُلندی ہے، کہ جہاں تک ہوسکا اپنے محسن کی اور محسنہ کی پردہ داری کی ہے، اپنی زبان سے صراحت نہیں کی کہ زلیخا نے میرے پہ تہمت لگائی، عزیزِ مصر کی بیوی ایسی تھی اُس کو بُلا کے پوچھو، کیا ہوا؟ اپنی طرف سے صراحت نہیں کی، بلکہ اِجمالی طور پر اُن عورتوں کی طرف واقعہ منسوب کر دیا کہ جنہوں نے ہاتھ کاٹے تھے اُن کے واقعے کی تحقیق کرو، یعنی حق پرورش کی یہاں بھی رعایت رکھی ہے اور زلیخا کا ذِکر صراحتاً کر کے اُس کی طرف کسی تہمت کو منسوب نہیں کیا کہ اُس نے میرے پہ تہمت لگائی تھی۔

واقعے کی تحقیق پر عورتوں کا علی الاعلان اِقرار

بادشاہ نے اُن سب عورتوں کو اکٹھا کر لیا، چونکہ اب تو اکٹھا کرنا ہی تھا کہ ملاقات کا شوق ہو گیا، اور اُن کے علم سے فائدہ اُٹھانا چاہتے ہیں، اور وہ باہر آتے ہی نہیں جس وقت تک کہ معاملہ صاف نہ ہو، تو فوراً عورتوں کو اکٹھا کر لیا، عورتوں کو اکٹھا کرنے کے بعد بادشاہ نے اُن کے سامنے سوال ہی اِس انداز میں کیا گویا کہ واقعے کی تحقیق بادشاہ کو پہلے ہو چکی ہے، اور اُن سے یہ پوچھا کہ تمہارا کیا واقعہ ہے جس وقت تم نے ہاتھ کاٹ لیے تھے تو اُس وقت کیا ہوا تھا، وہ عورتیں بھی سمجھ گئیں کہ یہ معاملہ اس طرح سے پیش ہو گیا ہے، تو انہوں نے صفائی کے ساتھ کہا کہ جی بالکل حاشاللہ! یوسف میں تو کوئی قصور نہیں تھا، ہم نے تو جس طرح سے بھی اُس کو دیکھا ہے پاک صاف دیکھا ہے، اس کے اندر کوئی کسی قسم کی بُرائی ہمیں معلوم نہیں، بادشاہ نے سوال کے اندر ذکر کیا تھا نا؟ کہ جب تم نے یوسف کو بہلایا تھا تو تمہارا کیا واقعہ تھا؟ وہ کہنے لگیں کہ جی واقعہ تو جو ہوا ہوا، بہر حال ہم اس بات کی شہادت دیتی ہیں کہ ہم نے یوسف میں کوئی بُرائی نہیں دیکھی۔

جیل سے باہر آنے سے قبل واقعے کی تحقیق کرانا کیوں ضروری تھا؟

اب یہ علی الاعلان صفائی ہو گئی، اب آپ جانتے ہیں کہ مُلک کے اندر جب اس قسم کے واقعات پیش آتے ہیں تو بچہ بچہ متوجہ ہو جاتا ہے، یہ بات مخفی تو رہتی نہیں، پہلے تو یوسف علیہ السلام کا واقعہ جو عزیز کے گھر پیش آیا تھا اُسی نے ہی اپنے ماحول کو متاثر کر لیا،

بعد میں اور عورتوں کے ساتھ جو واقعہ پیش آیا تو اس سے اور زیادہ بات پھیل گئی، پھیلنے کے بعد پھر جیل کے اندر گئے ہوں گے تو آخر جیل میں لوگ آتے رہتے ہیں، جاتے رہتے ہیں، گفتگو ہوتی رہتی ہے، کبھی کوئی چھوٹا، کبھی کوئی آیا، تو ان کا صدق ان کی امانت اور ان کا احسان اتنا نمایاں تھا کہ ہر جیل والا متاثر تھا، تو اس سے بھی تعارف ہوا ہوگا کہ جیل میں ایک ایسا آدمی ہے، پھر بادشاہ کے خواب کا تذکرہ ہوا ہوگا کہ بادشاہ کے خواب کی تعبیر ارکانِ سلطنت نہیں دے سکے اور اس ملک کے اندر جتنے کاہن جتنے علم والے تھے سب عاجز آگئے اور ایک شخص ہے جس نے تعبیر بتادی، تو ارکانِ سلطنت بھی سارے کے سارے متعارف ہو گئے، اور اس بات کا بھی سکہ بیٹھ گیا کہ کتنا سمجھدار آدمی ہے، پھر جب اس کو بلایا گیا اور اس نے آنے سے انکار کر دیا تو آخر یہ واقعہ بھی لوگوں کو متوجہ کرنے والا ہے کہ بڑا کوئی سخت آدمی ہے، کہ اتنی مدت ہوگئی جیل میں، اور بادشاہ بلا رہا ہے اور وہ آنے کے لئے تیار نہیں، بادشاہ کی ملاقات کرنے کے لئے تیار نہیں جس وقت تک کہ اس کے مقدمے کا فیصلہ نہ ہو، یہ ساری چیزیں ایسی ہیں جو کہ مخلوق کو یوسف علیہ السلام کی طرف متوجہ کر رہی ہیں، پھر جس وقت واقعے کی تحقیق ہوئی تو آخر جتنا ماحول تھا بادشاہ کا وہ سارے کا سارا سمجھ گیا کہ وہ بے گناہ ہے اور اس کو خواہ مخواہ جیل کے اندر ڈالا گیا، ورنہ اس کا کوئی قصور نہیں تھا، اس سے حضرت یوسف علیہ السلام کے اخلاق کا سکہ بیٹھ گیا، ورنہ اگر وہ بغیر تحقیق کے نکل آتے اور آنے کے بعد بادشاہ اُن کو کسی مرتبے پر پہنچا بھی دیتا پھر یہ چہ مہ گوئیاں ہوتیں کہ یہ وہی ہے جس کے ساتھ عزیزِ مصر کی بیوی کی گڑبڑ ہوئی تھی، محلے کی عورتوں کی گڑبڑ ہوئی تھی، تو یہ باتیں حضرت یوسف علیہ السلام کی عظمت کو نقصان بھی پہنچاتیں، اور ہوسکتا تھا کہ اس قسم کی باتوں سے بادشاہ متاثر ہو کر دوبارہ کوئی کارروائی کرتا حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ اور ان کو اس مرتبے سے گرانے کی کوشش کرتا۔ اور ایک نبی جس نے اپنے ماحول کے اندر جا کر لوگوں کو اخلاق کی تعلیم دینی ہے، پاکیزگی کی تعلیم دینی ہے، تو اس کے متعلق اس قسم کے وساوس لوگوں کے دِلوں میں موجود ہوں اس قسم کے خیالات ہوں تو آنے والی تبلیغ کے اندر یہ نقص بھی ڈال سکتے ہیں، اس لیے حضرت یوسف علیہ السلام نے اِن سب سوراخوں کو بند کر دیا اور اپنی عظمت لوگوں کے دِلوں میں پوری طرح سے بٹھادی، اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسے حالات پیش آگئے۔

زلیخا کا اِقرار

جب عورتوں نے اقرار کیا کہ مَا عَلِمْنَا عَلَیْهِ مِنْ سُوْٓءٍ، اب وہ عزیزِ مصر کی بیوی بھی وہیں تھی، اب وہ کس طرح سے چھپتی چھپاتی؟ تو اب اُس نے بھی صراحتاً اِقرار کرلیا، کہ جی! حق واضح ہوگیا، میں نے غلط کہا تھا کہ مَا جَزَآءُ مَنْ اَرَادَ بِاَهْلِكَ سُوْٓءًا اِلَّاۤ اَنْ یُّسْجَنَ اَوْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ، جس میں میں نے یہ تاثر دینے کی کوشش کی تھی کہ بُرائی کا ارادہ اِس نے کیا ہے، تو میں نے یہ بات غلط کہی تھی، اور اُس نے جو کہا تھا کہ هِیَ رَاوَدَتْنِیْ عَنْ نَّفْسِیْ اِس بات میں وہ سچا تھا، اب میں اس کا اقرار کرتی ہوں۔ صفائی کے ساتھ اُس نے اقرار کرلیا، حَصْحَصَ الْحَقُّ: حق بالکل نمایاں ہوگیا، اور وہ سچوں میں سے تھا، میں نے ہی اُس کو پھسلایا تھا، یہ بات صاف صاف زلیخا نے کہہ دی، سارے مجمع کے سامنے زلیخا نے جس وقت اس کا اقرار کرلیا تو اب کسی بدبخت کے لئے یہ گنجائش باقی نہیں رہی کہ یوسف علیہ السلام کی طرف اُنگلی اُٹھا سکے۔

’’ذٰلِكَ لِيَعْلَمَ اَنِّيْ لَمْ اَخُنْهُ بِالْغَيْبِ‘‘ کس کا قول ہے؟

اگلی بات میں نے آپ کے سامنے وضاحت سے کہہ دی کہ ذٰلِكَ لِيَعْلَمَ اَنِّيْ لَمْ اَخُنْهُ بِالْغَيْبِ یہ بات یوسف علیہ السلام کی طرف سے بھی ہوسکتی ہے کہ میں نے جو اس معاملے کے اندر اتنا اہتمام کیا ہے اپنی صفائی دینے کا، تو اس میں میں کوئی اپنی براءت نہیں کرنا چاہتا، کہ میں کہوں کہ میں ایسا ہوں، اپنی پاکیزگی کا دعویٰ کروں، نہیں، آخر جس نے مجھے اپنے گھر میں رکھا، بیٹوں کی طرح پالا، بچوں کی طرح کھلایا پہنایا، اس کے دل میں یہ خیال آجائے کہ اس نے میری بیوی کے ساتھ گڑبڑ کی ہے تو کتنی بری بات ہے، میں ساری تحقیق کے بعد یہ بات واضح کرنا چاہتا ہوں کہ عزیزِ مصر کو پتا چل جائے کہ میں نے کوئی خیانت نہیں کی، میں نے اس کے حق پرورش کی رعایت رکھی ہے، میں ایسا کوئی......! جس طرح سے ہم اپنی زبان میں کہیں کہ ایسا کوئی نمک حرام نہیں تھا کہ جس گھر میں کھاتا اسی گھر میں گڑبڑ کرتا، عزیزِ مصر کو اس بات کا یقین آجانا چاہیے میں نے یہ اہتمام اس لیے کیا ہے، اور یہ بھی پتا چل جانا چاہیے کہ خیانت کرنے والوں کا داؤ فریب چلا نہیں کرتا، دیکھو! اس نے کوئی تھوڑی سی گڑبڑ کی تھی وہ بات نمایاں ہوگئی، اگر میری طرف سے کوئی خیانت ہوتی تو میری بھی کوئی تدبیر کامیاب نہ ہوتی۔ باقی! اس سے کوئی پاکیزگی کا دعویٰ کرنا مقصود نہیں ہے، انسان کے ساتھ نفس لگا ہوا ہے، برائی کی تلقین کرتا ہے، لیکن اللہ کا رحم ہو جائے تو پھر انسان بچ سکتا ہے، تو انبیاء علیہم السلام پر چونکہ اللہ کا رحم ہوتا ہے، ہر وقت ہوتا ہے، اللہ کی حفاظت ساتھ ہوتی ہے، اُن کا نفس اُن کو برائی کی تلقین نہیں کرسکتا، تو گویا کہ یہ پاکیزگی جو بھی حاصل ہے وہ سب اللہ کی رحمت کے ساتھ اور اللہ کی توفیق کے ساتھ حاصل ہے، ورنہ انسان کا نفس فی حد ذاتہٖ تو برائی کی طرف ہی لے جاتا ہے۔ میرا رب غفور رحیم ہے، کہ اگر نفس برائی کی طرف مائل بھی کردے پھر انسان توبہ کرلے تو اللہ تعالیٰ اُس کو بخش دیتے ہیں۔ یہ ساری کی ساری تقریر حضرت یوسف علیہ السلام کی ہے کہ میں نے یہ اہتمام اپنی پاکیزگی ثابت کرنے کے لئے نہیں کیا، یہ میرا مقصود نہیں ہے کہ میں اپنی براءت ثابت کروں، اصل اپنے محسن کا دل صاف کرنا مقصود ہے کہ اس کو پتا چل جائے کہ میں کوئی خیانت نہیں کی۔ تو یہ بات بھی موقع محل کے مطابق عین ٹھیک ہے۔ اور اگر یہ زلیخا کا ہی قول نقل کردیا جائے تو پھر بھی بات صاف ہے، اس سے پھر وہ ساری کی ساری باتیں ختم ہو جاتی ہیں جو زلیخا کے متعلق لوگ کرتے ہیں کہ وہ ایسی تھی، وہ ایسی تھی، وہ بدمعاش تھی، وہ کنجری تھی، جس طرح سے لوگ اسٹیج کے اوپر آج کل اچھالتے ہیں، تو اگر ابنِ تیمیہ اور ابنِ کثیر کے نزدیک یہ قول زلیخا کا قرار دے دیا جائے تو کتنی اس میں بات صاف ہو جاتی ہے، کہ میں یہ آج اقرار کر رہی ہوں کہ میں نے اس کو پھسلایا تھا، اور وہ سچوں میں سے تھا، یہ میں صاف صاف بات اس لیے کر رہی ہوں تاکہ میرے خاوند کو پتا چل جائے کہ میں نے پسِ پشت کوئی خیانت نہیں کی، اگر اس سے زائد خیانت کی ہوتی تو وہ بھی چھپی نہ رہتی، وہ بھی پتا چل جاتا، خیانت کرنے والوں کا داؤ فریب چلا نہیں کرتا، اللہ تعالیٰ چلنے نہیں دیتے، تو جتنا مجھ سے قصور ہوا میں اُس کا اعتراف کرتا ہوں۔ باقی! تم کہو کہ اتنے بڑے گھر کی ہو کر تُو نے ایسی شرارت بھی کیوں کی؟ اُس کو پھسلانے کی کوشش کیوں کی؟ تو آخر نفس ہے، نفس برائی کا حکم دینے والا ہے، جس پہ اللہ کا رحم ہو وہی بچ سکتا ہے، جیسے کہ یوسف کا نفس تھا، اُس پہ اللہ کا رحم تھا وہ بچ گیا، میں تو اس درجے کی نہیں تھی، اس لیے میرے نفس نے برائی کی تلقین کی، نفس برائی کا حکم دینے

والا ہے، لیکن اللہ غفور رحیم ہے، میں اب اپنی غلطی کا اقرار کرتی ہوں، اللہ تعالیٰ میرا گناہ بخش دے گا، میرا رَبّ میرے گناہ کو معاف کردے گا، تو "مدارک" (تفسیر نسفی) کے قول کے مطابق گویا کہ یہ بھی اِستغفار کا کلمہ ہے، کہ غلطی کا اقرار کر لینے کے بعد اللہ تعالیٰ کو غفور رحیم کو قرار دینے کا مطلب یہی ہے کہ میں اپنی غلطی کو مانتی ہوں، اللہ تعالیٰ میرے گناہ کو معاف کردے گا۔ تو یہ زلیخا کا قول اگر بنالیا جائے، اِن بڑے بڑے علماء کے نزدیک جس طرح سے یہ زلیخا کا ہی قول ہے، تو پھر معاملہ بالکل صاف ہو جاتا ہے کہ کوئی اس قسم کی گڑبڑ ثابت نہیں ہوتی، جتنی اس نے خیانت کی تھی اتنا اقرار کرلیا اور اس کی وجہ آگے بیان کردی۔ اور یہ بھی (مطلب) ہوسکتا ہے کہ زلیخا کہتی ہے کہ میں مجلس میں صاف صاف اقرار کرتی ہوں تا کہ یوسف کو بھی یقین آجائے کہ میں نے اُس سے خیانت نہیں کی، جتنی سی بات ہوئی تھی میں نے اتنی کی ہے، مزید اُس کے اوپر میں نے تہمت نہیں لگائی، یعنی یہی کہا ہے کہ میں نے پھسلایا تھا وہ بچ گیا، پھسلانے تک ہی بات میں نے کی، آگے میں کوئی اس قسم کی باتیں اور نقل کرتی کہ میرے ساتھ پہلے یوں رہا، پھر انکار کرنے لگ گیا، اس قسم کی تہمت میں نے اس کے اوپر کوئی نہیں لگائی، جتنی سی بات تھی اتنی سی میں نے کرلی، باقی اگلے الفاظ کا وہی مطلب! کہ اتنا سا بھی مجھ سے اس لیے ہوا کہ آخر نفس ہے، امارۃ بالسوء ہے، بُرائی کا حکم دینے والا ہے، اس کی بُرائی سے تو وہی بچ سکتا ہے جس کے اوپر اللہ کا رحم ہو، یہ مطلب اس طرح سے بھی ادا ہو جائے گا۔

بادشاہ کی یوسف علیہ السلام کے ساتھ ملاقات، اور مُلک کی باگ ڈور یوسف علیہ السلام کے ہاتھ میں

جب یہ سارے کا سارا معاملہ صاف ہوگیا تو اب بادشاہ نے پوری رپورٹ پہنچائی ہوگی کہ جی واقعی ہمارے سامنے ثابت ہوگیا کہ آپ بے قصور ہیں، اور سارے کے سارے ارکانِ سلطنت، اُن کو بھی زیارت کا شوق ہوگیا ہوگا، اُن کے اوپر اخلاقی برتری ثابت ہوگئی، اب پیغام بھیجا تو یوسف علیہ السلام پھر پوری آن بان کے ساتھ تشریف لائے، اور تشریف لا کے جس وقت بالمشافہ گفتگو ہوئی بادشاہ کے ساتھ تو اُن کا علم، اُن کا اخلاق، اُن کا فہم، ان کی فراست اچھی طرح سے نمایاں ہوگئی، اب بادشاہ نے اُن کے سامنے کہا کہ آج ہم تجھے ذی مرتبہ قرار دیتے ہیں اور تو ہر لحاظ سے ہمارے نزدیک قابلِ اعتماد ہے، گویا کہ یہ ایک قسم کی پیشکش کردی کہ اب آپ ہمارے معاون بن جائیں، حکومت کے معاملے میں ہم آپ کے اوپر پورا پورا اعتماد کریں گے۔ تو پھر وہاں اُس مجلس وہ خواب کا تذکرہ بھی ہوا ہوگا، کہ یہ سات سال ایسے ہوگا، بعد میں سات سال ایسے ہوگا، اس کے متعلق کیا انتظام ہونا چاہیے، اب یوسف علیہ السلام کو چونکہ اُمورِ سلطنت میں شریک کرلیا گیا تو اب یوسف علیہ السلام نے اپنی ذمہ داری محسوس کرتے ہوئے کہا کہ یہ معاشیات کا شعبہ میرے سپرد کردو، مجھے اللہ تعالیٰ نے پوری طرح سے حفاظت کی توفیق بھی دی ہے اور میں امانت دار بھی ہوں، تو میں اِس پیداوار کے اُوپر کنٹرول کروں گا اور خزانے سنبھالوں گا، ان شاء اللہ العزیز! انتظام ٹھیک رہے گا، تو انہوں نے یہ سب سے مشکل مسئلہ جو تھا معاشیات کا، کہ مُلک کے معاش کو کس طرح سے محفوظ رکھا جائے؟ کس طرح سے سات سال پیداوار ہو؟ کس طرح سے اس کو ذخیرہ کیا جائے؟ بعد میں کس اندازے کے ساتھ اس کو تقسیم کیا جائے تا کہ آنے والے سات سال کے اندر مخلوق کو تکلیف نہ ہو؟ یہ ساری کی ساری باتیں میں جانتا ہوں، تو بادشاہ نے ان کو یہ سارے کے سارے اختیارات دے دیے۔ لیکن بعد میں روایات میں آتا

ہے کہ صرف اتنا ہی نہیں کہ ان کو خزانے کے اختیار دیے گئے تھے بلکہ بادشاہ نے اپنا...... جس طرح سے آج کل کی اصطلاح میں...... وزیر اعظم انہیں بنالیا، اور وہ نام کا بادشاہ باقی رہ گیا، باقی سارے کے سارے اُمورِ سلطنت جو تھے وہ حضرت یوسف علیہ السلام کے ہاتھ میں چلے گئے، یوں کہہ لیجئے کہ سارے کا سارا ملک حضرت یوسف علیہ السلام کے انگوٹھے کے نیچے آ گیا۔ اب اندازہ کیجئے کہ یہ وہی یوسف ہیں جن کو بھائیوں نے گھر سے چُرایا، کنویں کے اندر ڈالا، کنویں میں بند رہے، کنویں سے نکالے گئے، غلام بنا کر بیچ دیے گئے، پھر عزیزِ مصر کے گھر ایک خادم کی حیثیت میں رہے، پھر وہاں سے جیل میں پہنچا دیے گئے، کس طرح سے کال کوٹھڑیوں سے منتقل ہوتے ہوئے آئے، آج ملک کے مالک بن گئے، جہاں چاہیں دورہ کریں، جہاں چاہیں ٹھہریں، جس جگہ چاہیں ٹھکانا لیں، کوئی روکنے والا نہیں۔ اس بات کو نقل کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ ہم محسنین کو ایسے ہی اجر دیا کرتے ہیں، جس کو چاہتے ہیں ہم اپنی رحمت پہنچاتے ہیں، کہ دیکھو! ظاہر کیا تھا اور نتیجہ اُس کا کیا نکلا، حالات کی رفتار کیا تھی اور نتیجہ کتنا شاندار نکلا، وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰٓى اَمْرِهٖ کا یہ کتنا بہترین نمونہ سامنے آ گیا۔ تو محسنین کا اجر اللہ تعالیٰ ضائع نہیں کرتے، لیکن اگر کوئی شخص دنیا کے اندر احسان کی صفت کو اپنائے ہوئے ہے اور دنیا کے اندر اس کو مال و دولت وسعت کے ساتھ حاصل نہ ہی ہو، اقتدار نہ ہی حاصل ہو تو یہ کوئی بات نہیں، اصل اجر آخرت کا اجر ہے، اللہ تعالیٰ متقین کو اور محسنین کو آخرت میں جو اُجر دیتے ہیں وہ دنیا کے اُجر کے مقابلے میں بہت بہتر ہے، تو یوسف علیہ السلام کو دنیا میں بھی نوازا اور آخرت میں بھی دیں گے، لیکن اگر کسی کو احسان اور تقویٰ کے نتیجے میں دنیا کے اندر جاہ وجلال نہ ہی حاصل ہو تو اس کو مایوس نہیں ہونا چاہیے، اس کا اُجر آخرت میں محفوظ ہے اور آخرت کا اجر دنیا کے اجر کے مقابلے میں بہت بہتر ہے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

(نوٹ:- یوسف علیہ السلام کے ساتھ زلیخا کے نکاح کے متعلق تفصیل اگلے درس کے شروع میں ملاحظہ فرمائیں۔ ناقل)

وَجَآءَ اِخْوَةُ يُوْسُفَ فَدَخَلُوْا عَلَيْهِ فَعَرَفَهُمْ وَهُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ ۝۵۸ وَلَمَّا

آئے یوسف کے بھائی پھر داخل ہوئے یوسف پر، یوسف نے ان کو پہچان لیا اور وہ یوسف کو اجنبی جاننے والے تھے ۝۵۸ جب

جَهَّزَهُمْ بِجَهَازِهِمْ قَالَ ائْتُوْنِيْ بِاَخٍ لَّكُمْ مِّنْ اَبِيْكُمْ ۚ

تیار کر دیا ان کو ان کے سامان کے ساتھ تو کہا یوسف نے کہ لے آؤ تم میرے پاس اپنے بھائی کو جو تمہارے باپ کی جانب سے ہے،

اَلَا تَرَوْنَ اَنِّيْٓ اُوْفِي الْكَيْلَ وَاَنَا خَيْرُ الْمُنْزِلِيْنَ ۝۵۹ فَاِنْ لَّمْ تَاْتُوْنِيْ بِهٖ

کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ میں پورا کرتا ہوں کیل کو اور میں بہترین مہمان نواز ہوں ۝۵۹ پھر اگر تم اس کو میرے پاس نہیں لاؤ گے

فَلَا كَيْلَ لَكُمْ عِنْدِيْ وَلَا تَقْرَبُوْنِ ⑥⓪ قَالُوْا سَنُرَاوِدُ عَنْهُ

پس نہیں ہے تمہارے لیے کیل میرے پاس اور نہ تم میرے قریب ہی آنا⑥⓪ وہ کہنے لگے کہ ہم عنقریب بہلائیں گے اس سے

اَبَاهُ وَاِنَّا لَفٰعِلُوْنَ ⑥① وَقَالَ لِفِتْيٰنِهِ اجْعَلُوْا بِضَاعَتَهُمْ فِيْ رِحَالِهِمْ

اس کے باپ کواور بیشک ہم البتہ کرنے والے ہیں⑥① یوسف علیہ السلام نے اپنے خادموں سے کہا کہ رکھ دوان کی پُونجی ان کے سامان میں،

لَعَلَّهُمْ يَعْرِفُوْنَهَآ اِذَا انْقَلَبُوْٓا اِلٰٓى اَهْلِهِمْ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ⑥② فَلَمَّا رَجَعُوْٓا اِلٰٓى اَبِيْهِمْ

تاکہ پہچان لیں وہ اس پُونجی کو جس وقت لوٹیں اپنے گھر کی طرف تاکہ پھر یہ لوٹ کے آئیں⑥② جب وہ لوٹے اپنے باپ کی طرف

قَالُوْا يٰٓاَبَانَا مُنِعَ مِنَّا الْكَيْلُ فَاَرْسِلْ مَعَنَآ اَخَانَا نَكْتَلْ وَاِنَّا لَهٗ

تو کہنے لگے کہ اے ہمارے اَبا! ہم سے کیل روک لیا گیا پس بھیج تو ہمارے ساتھ ہمارے بھائی کو، ہم کیل لائیں، اور بیشک ہم اس کے لئے

لَحٰفِظُوْنَ ⑥③ قَالَ هَلْ اٰمَنُكُمْ عَلَيْهِ اِلَّا كَمَآ اَمِنْتُكُمْ

البتہ حفاظت کرنے والے ہیں⑥③ یعقوب علیہ السلام نے کہا کہ نہیں اعتبار کرتا میں تمہارا اس بیٹے پر مگر جیسے کہ اعتبار کیا تھا میں نے تمہارا

عَلٰٓى اَخِيْهِ مِنْ قَبْلُ ؕ فَاللّٰهُ خَيْرٌ حٰفِظًا ۠ وَّهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ⑥④ وَلَمَّا

اس کے بھائی پر اس سے پہلے، پس اللہ تعالیٰ بہترین حفاظت کرنے والا ہے، اور وہ بہترین رحم کرنے والا ہے⑥④ جس وقت

فَتَحُوْا مَتَاعَهُمْ وَجَدُوْا بِضَاعَتَهُمْ رُدَّتْ اِلَيْهِمْ ؕ قَالُوْا يٰٓاَبَانَا مَا نَبْغِيْ ؕ

انہوں نے اپنا سامان کھولا تو پایا انہوں نے اپنی پُونجی کو کہ لوٹادی گئی تھی ان کی طرف، کہنے لگے کہ اے ہمارے اَبا! ہمیں اور کیا چاہیے،

هٰذِهٖ بِضَاعَتُنَا رُدَّتْ اِلَيْنَا ۚ وَنَمِيْرُ اَهْلَنَا وَنَحْفَظُ اَخَانَا وَنَزْدَادُ كَيْلَ

یہ ہماری پُونجی لوٹادی گئی ہماری طرف، ہم اپنے گھروالوں کے لئے غلّہ لائیں گے اور اپنے بھائی کی حفاظت کریں گے اور ایک اُونٹ کا کیل

بَعِيْرٍ ؕ ذٰلِكَ كَيْلٌ يَّسِيْرٌ ⑥⑤ قَالَ لَنْ اُرْسِلَهٗ مَعَكُمْ حَتّٰى

ہم زیادہ لائیں گے، یہ تو تھوڑا سا کیل ہے⑥⑤ یعقوب علیہ السلام نے کہا کہ ہرگز نہیں بھیجوں گا میں اس کو تمہارے ساتھ جب تک کہ

تُؤْتُوْنِ مَوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ لَتَاْتُنَّنِيْ بِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يُّحَاطَ بِكُمْ ۚ فَلَمَّآ

تم مجھے پختہ عہد نہ دو اللہ کی جانب سے کہ تم اس کو میرے پاس لے کے آؤ گے مگر یہ کہ تم گھیرے میں آجاؤ، جس وقت

اٰتَوْهُ مَوْثِقَهُمْ قَالَ اللّٰهُ عَلٰى مَا نَقُوْلُ وَكِيْلٌ ۝٦٦ وَقَالَ يٰبَنِيَّ

انہوں نے یعقوب کو اپنا عہد دے دیا تو کہا یعقوب نے کہ اللہ نگہبان ہے اس بات پر جو ہم کہتے ہیں ۝٦٦ اور کہا کہ اے میرے بیٹو!

لَا تَدْخُلُوْا مِنْۢ بَابٍ وَّاحِدٍ وَّادْخُلُوْا مِنْ اَبْوَابٍ مُّتَفَرِّقَةٍ ۭ وَمَآ اُغْنِيْ عَنْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ

ایک دروازے سے داخل نہ ہونا، جُدا جُدا دروازوں سے داخل ہونا، نہیں دُور ہٹا سکتا میں تم سے اللہ کی جانب سے کسی

شَيْءٍ ۭ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ۭ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ ۚ وَعَلَيْهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ۝٦٧ وَلَمَّا

چیز کو، نہیں ہے حکم مگر اللہ کے لئے، اسی پر میں نے بھروسا کیا اور اسی پر ہی بھروسا کرنے والوں کو بھروسا کرنا چاہیے ۝٦٧ اور جب

دَخَلُوْا مِنْ حَيْثُ اَمَرَهُمْ اَبُوْهُمْ ۭ مَا كَانَ يُغْنِيْ عَنْهُمْ مِّنَ اللّٰهِ

وہ داخل ہوئے اس جگہ سے جہاں سے ان کے باپ نے ان کو حکم دیا تھا، نہیں دُور ہٹا سکتے تھے ان کے باپ ان سے اللہ کی جانب

مِنْ شَيْءٍ اِلَّا حَاجَةً فِيْ نَفْسِ يَعْقُوْبَ قَضٰىهَا ۭ وَاِنَّهٗ لَذُوْ عِلْمٍ لِّمَا عَلَّمْنٰهُ

سے کسی چیز کو مگر ایک کھٹک تھی یعقوب کے دِل میں جو اس نے پوری کرلی، اور بیشک وہ البتہ علم والا ہے بسبب ہمارے سکھانے کے،

وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝٦٨ ع

لیکن اکثر لوگ جانتے نہیں ۝٦٨

یوسف علیہ السلام کے ساتھ زلیخا کا نکاح ہوا یا نہیں؟ مفصل بحث

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ اس رُکوع کا ترجمہ ذکر کرنے سے پہلے مختصر الفاظ میں ایک مسئلہ ذکر کرنا چاہتا ہوں، جو عام طور پر مفسرین نے پچھلے رُکوع کے اختتام پر بیان کیا ہے، وہ واقعہ ہے یوسف علیہ السلام کے نکاح کا، کہ زلیخا کے ساتھ یوسف علیہ السلام کا نکاح ہوا یا نہیں؟ جہاں تک قرآنِ کریم کی آیات کا تعلق ہے کوئی لفظ ایسا نہیں کہ جس سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ یوسف علیہ السلام نے زلیخا سے نکاح کیا، قرآنِ کریم اس معاملے میں ساکت ہے، چپ ہے، خاموش ہے، اور اسی طرح سے سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال اور آپ سے منقولہ روایات کا سارے کا سارا ذخیرہ اس بارے میں ساکت ہے، خاموش ہے، اس میں نہ نکاح کے ہونے کا ذکر ہے، نہ نہ ہونے کا ذکر ہے، اس لئے حدیث شریف کے اندر بھی کسی صحیح روایت کے اندر یہ مذکور نہیں کہ یوسف علیہ السلام کا نکاح زلیخا سے ہوگیا تھا یا نہیں ہوا تھا، نہ نکاح ہونے کا ذکر ہے اور نہ نہ ہونے کا ذکر ہے، بلکہ خاموش ہیں۔ اور جہاں تک اسرائیلی راوایات کا تعلق ہے جو اگرچہ ہمارے محدثین کے معیار پر نہیں، کیونکہ محدثین کا معیار تو روایات کے پرکھنے کے لئے بہت اُونچا ہے، اور محدثین کے معیار پر تو شاید عام لوگوں میں سے بھی اکثر و بیشتر اپنے ماں باپ کا نکاح ثابت نہ کرسکیں، محدثین کے معیار پر تو عام لوگوں کے لئے بھی

مشکل ہے کہ اپنے ماں باپ کا نکاح ثابت کر دیں، (بہر حال) محدثین نے تو ان روایات پر اعتماد نہیں کیا، جیسے کہ حضرت شیخ الاسلام نے یہیں لکھا ان فوائد میں، کہ بعض علماء نے کہا ہے کہ یوسف علیہ السلام کا نکاح زلیخا سے ہو گیا تھا اور وہ عزیز مصر جو تھا قطفیر، وہ وفات پا گیا، اس کے بعد بادشاہ نے جو کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے ہاتھ پر مسلمان ہو گیا تھا، تو اس نے اِمرأۃ العزیز کا نکاح یوسف علیہ السلام کے ساتھ کر دیا، یہ بات لکھ کر کہتے ہیں: واللہ اعلم بالصواب! محدثین ان روایات پر اعتماد نہیں کرتے۔ تو محدثین کی طرف سے ان روایات کے اُوپر عدمِ اعتماد کا ذِکر کیا، اور مفسرین نے ان روایات کو جن کے اندر نکاح کا ذکر ہے اپنی کتابوں میں درج کیا ہے، علامہ سیوطیؒ نے اپنی کتاب ''درِ منثور'' میں اس کا ذِکر کیا ہے، اور حضرت تھانویؒ نے ''بیان القرآن'' میں اس کا ذکر کیا ہے، حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے اپنی کتاب ''معارف القرآن'' میں اس کا ذکر کیا ہے، ''مظہری'' نے تفصیل کے ساتھ اس بات کو بیان کیا ہے اور نکاح کا قول کیا ہے، اور اسی طرح سے بعض دوسری تفاسیر بھی ہیں کہ جنہوں نے اِن روایات کو لیا ہے اور لے کر یوسف علیہ السلام کے زلیخا کے ساتھ نکاح کا قول کیا ہے۔ اب اس مسئلے کو ہم اگر علمی انداز کے ساتھ سوچیں تو کیا یہ ممکن ہے اِمکانِ شرعی کے ساتھ کہ یوسف علیہ السلام کا نکاح زلیخا کے ساتھ ہو گیا ہو، یا اس میں کوئی شرعی طور پر اِمتناع ہے؟ یعنی شرعاً یہ ممتنع ہے ایسا نہیں ہو سکتا، تو یہ تو ایک واقعہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے گھروں میں کافر عورتیں رہی ہیں، قرآنِ کریم کے اندر صراحت ہے کہ نوح علیہ السلام کی بیوی کافرہ تھی اور اسی طرح سے لُوط علیہ السلام کی بیوی کافرہ تھی، سورۂ تحریم کے اندر دونوں کا ذِکر ہے اٹھائیسویں پارے کے آخری رکوع میں: ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوا امْرَاَتَ نُوْحٍ وَّامْرَاَتَ لُوْطٍ ۖ كَانَتَا تَحْتَ عَبْدَيْنِ مِنْ عِبَادِنَا صَالِحَيْنِ فَخَانَتٰهُمَا فَلَمْ يُغْنِيَا عَنْهُمَا مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا وَّقِيْلَ ادْخُلَا النَّارَ مَعَ الدّٰخِلِيْنَ، اس آیت کے اندر ان کے جہنمی ہونے کی صراحت ہے، تو کافر عورت نبی کے نکاح میں ہو سکتی ہے، ہاں! البتہ بدکار عورت، زانیہ عورت، یہ نبی کے نکاح میں نہیں آ سکتی، زِنا اگرچہ گناہِ کبیرہ ہے اور اس کا درجہ کُفر سے نیچے ہے، زِنا کی بخشش ہو سکتی ہے آخرت میں، یہ کبائر میں داخل ہے، کُفر کے درجے کا نہیں، کُفر اس سے بہت سنگین جرم ہے، لیکن نبی کے گھر میں کُفر کو برداشت کر لیا جاتا ہے، زِنا کو برداشت نہیں کیا جاتا، اس کی وجہ یہ ہے کہ عام معاشرے میں کُفر سے لوگ نفرت نہیں کرتے، کافر دنیا کے اندر ایک معزز زندگی گزار سکتا ہے، لیکن جہاں تک زانیہ کا تعلق ہے یا زانی کا تعلق ہے ہر معاشرے میں اس سے نفرت کی جاتی ہے، اور نبی کا دامن ایسے واقعے سے پاک رکھا جاتا ہے کہ جس سے لوگ نفرت کریں، اس لئے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں جس وقت بعض بدطینت لوگوں نے زبان کھولی تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے صفائی دی اور قرآنِ کریم کے اندر دس آیتیں نازل فرمائیں جن میں حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا کو پاک دامن ثابت کیا، اور اس کے بارے میں اُصول کے طور پر ایک بات ذِکر کر دی اَلْخَبِيْثٰتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ وَالْخَبِيْثُوْنَ لِلْخَبِيْثٰتِ (النور:۲۶) کہ خبیثہ عورتیں جو ہوتی ہیں یہ تو خبیثوں کے لائق ہوتی ہیں، اور زانیہ خبیثہ ہوتی ہے وہ نبی کے گھر میں نہیں رہ سکتی، نبی طیبون کا مصداق ہے اس کے لئے طیبات ہونی چاہیے، بہر حال زانیہ عورت نبی کے نکاح میں نہیں آ سکتی۔ اگر تو یہ ثابت ہو جائے کہ اِمرأۃ العزیز جس کا نام زلیخا ذِکر کیا جاتا ہے وہ زانیہ تھی، فاسقہ تھی، فاجرہ تھی، کوئی پیشہ ور تھی، تو ایسی صورت میں تو شرعاً ممتنع ہے کہ ایک نبی کے نکاح میں آئے، اور اگر اس کا زانیہ ہونا ثابت نہ ہو، فاسقہ فاجرہ ہونا ثابت نہ ہو تو ایسی صورت میں شرعی طور پر ممکن ہے کہ اس کے خاوند کے فوت ہو جانے کے بعد اس کا نکاح یوسف علیہ السلام سے ہو گیا ہو۔ اب وہ زانیہ

تھی یا نہیں؟ فاسقہ فاجرہ تھی یا نہیں؟ جہاں تک تو قرآنِ کریم کی آیات کا تعلق ہے وہ آپ کے سامنے گزر گئیں، ان میں کوئی لفظ ایسا نہیں کہ جس سے یہ ثابت کیا جا سکے کہ زلیخا زانیہ تھی، کیونکہ زلیخا کی محبت قرآنِ کریم سے اگر ثابت ہوتی ہے تو صرف یوسف علیہ السلام کے ساتھ ثابت ہوتی ہے، یوسف علیہ السلام کے علاوہ زلیخا کا کوئی یار، کوئی دوست، کوئی آشنا قرآنِ کریم سے ثابت نہیں، اور بالکل اسی طرح سے راویات بھی اس سلسلے میں خاموش ہیں، کسی روایت نے زلیخا کے دامن پر یہ تہمت نہیں لگائی کہ وہ ایسی تھی، فاسقہ تھی، فاجرہ تھی، زانیہ تھی، پیشہ ور تھی، سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال میں سے کسی قول کے اندر یہ بات موجود نہیں، یہ بات اگر لوگ کہتے ہیں تو صرف ایک اپنے اجتہاد کے ساتھ اور اپنے ذوق کے ساتھ قرآنِ کریم کی آیات سے اَخذ کر کے کہتے ہیں کہ ایک عورت جو اتنی جرأت کر لے کہ گھر کے خادم کے ساتھ وہ چھیڑ چھاڑ شروع کرنے کی کوشش کرے، پھر عورتیں اکٹھی ہو جائیں تو ان کے سامنے اس طرح سے کھل کر بولے، اس سے اخذ کرتے ہیں کہ وہ ایسی تھی ویسی تھی، جس قسم کے لفظ آپ عام طور پر بعض اسٹیجوں پر بھی سنتے رہتے ہیں، لیکن آپ کے سامنے ان آیات کی تفصیل آ گئی، میں نے آپ کے سامنے ہر چیز کو کھول کر رکھ دیا کہ اتنا قصور تو اس کا یقیناً ہے جتنا اس نے بعد میں اقرار بھی کیا، کہ اس کا دِل یوسف علیہ السلام پر آ گیا، اور یوسف علیہ السلام کو اپنی طرف مائل کرنے کی کوشش کی، لیکن واقعہ پیش نہیں آیا۔ اور پھر اس کا اپنے خاوند کے سامنے اس طرح سے منہ بنانا اور جھوٹ بول کے یوسف کو متہم کرنے کی کوشش کرنا کہ تیری اہل کے ساتھ چھیڑ چھاڑ اس نے کی ہے، اس کو قید کر دو یا اس کو سزا دو، یہ ساری کی ساری باتیں اس بات کی علامت ہیں کہ اس معاشرے کے اندر یہ چیز رواج کے طور پر موجود نہیں تھی، ورنہ وہ اپنے خاوند کے سامنے اس طرح سے بہانے کرنے کی کوشش نہ کرتی۔ اور اگر زلیخا اس قسم کی بدنام عورت ہوتی تو اتنی سی چھیڑ چھاڑ ہو جانے کے بعد دوسرے گھروں کے اندر اس کے تذکرے نہ شروع ہو جاتے کہ دیکھو! عزیز کی بیوی اپنے خادم سے چھیڑ چھاڑ کر رہی ہے، وہ تو بہت بڑی زبردست غلطی کر رہی ہے، اس قسم کی باتیں انہی عورتوں کے متعلق ہوا کرتی ہیں کہ جن عورتوں کو معاشرے کے اندر عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، ایک عورت کو سارے ہی جانتے ہیں کہ یہ طائفہ ہے، پیشہ ور ہے، وہ اگر کسی کے ساتھ آنکھ مچولی کھیل رہی ہو آنکھیں لڑا رہی ہو یا کھڑکیوں میں سے کھڑی ہوئی دوسرے کے ساتھ ہنس ہنس کے باتیں کر رہی ہو تو کون تذکرے کرتا ہے ان کے، کہ فلاں عورت مرد کی طرف دیکھ کر ہنس رہی تھی یا اس کے ساتھ وہ آنکھیں لڑا رہی تھی، کون تذکرے کرتا ہے جب پتا ہے کہ یہ تو پیشہ ور ہے، تو اس قسم کی عورتیں انسانوں کو چھوڑ و کتوں سے بھی مشغول رہیں تو کون پوچھتا ہے، اور اگر کسی شریف زادی کو کسی کی طرف ذرا ترچھی نگاہ سے دیکھتے ہوئے کسی نے دیکھ لیا تو تذکرے شروع ہو جایا کرتے ہیں کہ فلانے کی لڑکی فلانے کی طرف جھانک رہی تھی، فلانے کی لڑکی پردے کے پیچھے کھڑی ہوئی فلانے کے ساتھ باتیں کر رہی تھی، یہ تذکرے ہمیشہ شریف زادیوں کے متعلق ہوا کرتے ہیں، فاحشہ عورتوں کے متعلق اس قسم کے تذکرے نہیں ہوا کرتے۔ اور اس قسم کے تذکرے ہو جانے کے بعد پھر اس نے جو اپنے دامن کو صاف کرنے کی کوشش کی، ان عورتوں کے سامنے اپنا عذر واضح کرنے کی کوشش کی، یہ بھی اسی بات کی علامت ہے۔ پھر کل کے سبق میں آپ کے سامنے حافظ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ اور حافظ ابنِ کثیر رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یہ ذکر کیا گیا تھا کہ ذٰلِكَ لِيَعْلَمَ اَنِّيْ لَمْ اَخُنْهُ بِالْغَيْبِ یہ زلیخا کا قول ہے ان حضرات کے نزدیک، تو جس سے واشگاف طور پر یہ بات ثابت ہو گئی، قرآنِ کریم نے اس بات کو نقل کیا بقول ان حضرات کے، کہ زلیخا نے

یہ بات اچھی طرح سے واضح کردی کہ جتنی خیانت ہوئی تھی اتنی میں نے مان لی اور اس سے آگے کوئی معاملہ نہیں ہوا، اور یہ ساری بات میں کھل کے تفصیل سے اس لئے کر رہی ہوں تا کہ میرے خاوند کو یقین آ جائے کہ میں نے اس کے ساتھ پس پشت کوئی خیانت نہیں کی، جتنی بات ہوئی تھی میں نے کردی، باقی! پھر تمہارا یہ کہنا کہ تُو اتنی اُونچی عورت تھی اتنے بڑے گھر کی تھی، تُو نے اتنی چھیڑ چھاڑ بھی کیوں کی؟ تو اس نے آگے معذرت کردی کہ وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِیْ ۚ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ، اور پھر آگے جا کر اس نے لفظ استعمال کیے کہ اِنَّ رَبِّیْ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ: اس کے اوپر صاحبِ مدارک لکھتے ہیں کہ اِسْتَغْفَرَتْ رَبَّہَا کہ ان الفاظ سے ثابت ہوتا ہے کہ اس نے اپنے رَبّ سے اِستغفار کیا، کیونکہ اپنے جرم کے اقرار کر لینے کے بعد اللہ تعالیٰ کے غفور رحیم ہونے کا تذکرہ کرنا، اپنے قصوروار ہونے کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کے غفور رحیم ہونے کا تذکرہ کرنا، یہ بھی توبہ کے الفاظ ہیں۔ قرآنِ کریم کی آیات سے ہمیں تو یہ باتیں نظر آتی ہیں، اور ان میں کوئی لفظ ایسا نہیں جس سے ثابت ہوتا ہو کہ وہ فاحشہ تھی یا وہ زانیہ تھی یا کوئی اس قسم کی عورت تھی، ایسی بات نہیں، اور روایاتِ حدیث بھی اس سلسلے کے اندر خاموش ہیں۔

پھر ایک بات ہمارے لئے یہ بھی غور طلب ہے کہ اتنے بڑے بڑے حضرات جن کا تذکرہ میں نے آپ کے سامنے کیا ہے، یہ مفسرین، علامہ سیوطی ہو گئے، یا ہمارے موجودہ دور کے حضرت تھانوی رحمہ اللہ ہو گئے، حضرت مفتی محمد شفیع صاحب ہو گئے، یا حضرت قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی رحمہ اللہ ''تفسیر مظہری'' والے ہو گئے، ابنِ کثیر ہو گئے، یہ حضرات جو نکاح کی روایات کو نقل کرتے ہیں، تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ سارے کے سارے لوگ اس بات کے اِمکان کو تسلیم کئے ہوئے ہیں، اور اس نکاح کے ثابت ہو جانے کے ساتھ شریعت کے کسی اُصول کی خلاف ورزی نہیں سمجھتے، کہ اگر اس نکاح کا قول کر دیا جائے تو یہ شریعت کے کسی اُصول کی خلاف ورزی نہیں، اگر یہ بات یعنی زلیخا کا نکاح یوسف علیہ السلام کے ساتھ یہ مزاجِ شریعت کے خلاف ہوتا، یا اُصولِ شریعت کے خلاف ہوتا، یا قرآنِ کریم سے اس قسم کی بات نکلتی کہ نکاح نہیں ہو سکتا، تو یہ محمد بن اسحاق جیسے لوگوں کی روایتوں پر اعتماد کرتے ہوئے اپنی تفسیر کے اندر یہ مسئلہ نہ لکھتے، ان لوگوں کا ان روایات کو لے لینا اور اپنی کتابوں کے اندر درج کر دینا یا صراحت کے ساتھ نکاح کا قول کر دینا یہ علامت ہے اس بات کی کہ ان لوگوں کے نزدیک یہ قول قرآنِ کریم سے ٹکراتا نہیں ہے، ان لوگوں کے نزدیک یہ بات قرآنِ کریم کے خلاف نہیں ہے اگر یہ قول کر دیا جائے، اس بات کو برداشت کیا جا سکتا ہے۔

پھر آگے جو تفصیل ذکر کی گئی ہے روایات میں، اس میں یہ مذکور ہے کہ اسی بیوی سے اولاد بھی ہوئی، دو لڑکے اور ایک لڑکی، ایک لڑکے کا نام ''افراثیم'' یا ''افرائیم'' (کتابت میں کچھ فرق سا معلوم ہو رہا تھا کہ اُوپر تین نقطے ہیں یا ہمزہ دیا ہوا ہے)، اور ایک ''مِیشا''، اور بعض کتابوں کے اندر لفظ ''مَنشا'' معلوم ہوتا ہے، یہ دو لڑکے ہیں ''افراثیم'' یا ''افرائیم''، اور ''مِیشا'' یا ''مَنشا''، اور لڑکی کا نام ''رحمت'' لکھا ہے۔ اور پھر آگے تفصیل ذِکر کرتے ہوئے ''تفسیر مظہری'' کے اندر یہ مذکور ہے کہ ''افراثیم'' کی اولاد میں سے ''یوشع بن نون'' ہوئے علیہ السلام، صاحبِ موسیٰ، جو موسیٰ علیہ السلام کے ساتھی تھے، اور موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد موسیٰ علیہ السلام کے خلیفہ بنے اور وقت کے پیغمبر ہوئے، تو گویا کہ ان روایات کی طرف دیکھتے ہوئے زلیخا ایک نبی کی بیوی ثابت ہونے کے ساتھ ساتھ ایک نبی کی دادی بھی بنتی ہے، اس روایت کی طرف دیکھتے ہوئے یوشع بن نون کی دادی بھی ہو گئی، یوشع علیہ السلام ان کی اولاد میں سے ہوئے،

ایک دونسلوں کے بعد ہوئے جیسے بھی ہوئے وہ ان کی دادی بھی ہوگئی، اورلڑکی کا نام جو ''رحمت'' لکھا ہےتو ساتھ یہ بھی لکھا ہے'' مِن بَطْنِ زُلَيْخَا'' ، یہ یوسف علیہ السلام کی بچی، من بطن زلیخا، اس قسم کے لفظ روایات میں ہیں، یہ ایوب علیہ السلام کی بیوی ہے، تو اس روایت کی طرف دیکھتے ہوئے زلیخا ایک نبی کی ساس بھی ثابت ہوتی ہے۔ اب ان روایات کی طرف دیکھتے ہوئے ذرا ایک انصاف کی نظر ڈالیے، ایک عورت چلی جارہی ہے اور کسی شخص نے اپنے طور پر قرائن سے اخذ کر کے کہا کہ یہ عورت فاحشہ ہے، زانیہ ہے، بدمعاش ہے، ایک عورت کے متعلق آپ کو کسی نے قرائن سے اخذ کر کے کہا کہ یہ عورت اچھی نہیں معلوم ہوتی، اور ایک آدمی آپ سے کہتا ہے کہ نہیں نہیں! یہ تو تمہارے اُستاذ کی بیوی ہے، یہ تو تمہارے شیخ کی بیٹی ہے، یہ تو فلاں معزّز آدمی کی بیوی ہے، اب دو آدمی خبر دینے والے آپ کے سامنے آگئے، ایک اس کو فاحشہ، بدکارہ، زانیہ کہتا ہے، اور دُوسرا اس کو معزّز عورت قرار دیتا ہے، تو عقل اور انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ یا تو انسان اس کے ساتھ معاملہ کرے عزّت اور اکرام والا، اور اگر عزّت اور اکرام کا معاملہ کرنے کو طبیعت نہیں چاہتی تو سکوت اختیار کر کے علیحدہ ہوجائے، کسی بدمعاش عورت کے ساتھ عزّت والا معاملہ ہوجائے اس میں وہ حرج نہیں جتنا کسی معزّز عورت کے ساتھ بدمعاش عورت والا معاملہ ہوجائے تو اس کے اندر نقصان ہے، کسی بدکارہ عورت کو قوی دلیل نہ ہونے کی بنا پر آپ پاک دامن سمجھ لیں تو اس میں وہ نقصان نہیں، اور اگر کسی پاک دامن عورت کو بغیر دلیل کے آپ نے متہم کر دیا، تہمت لگادی تو یہ کبائر میں داخل ہے، پاک دامن عورت کے اُوپر اگر تہمت لگادی جائے بغیر کسی قوی دلیل کے، جس کا ذکر قرآنِ کریم میں ہے، تو یہ کبیرہ میں داخل ہے، اور اس قسم کے رمیِ محصنات کو سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑے بڑے گناہوں کے اندر شمار کیا ہے، اور ایسی صورت میں ''حدِ قذف'' لگ جاتی ہے اگر صاحبِ واقعہ مطالبہ کرلے کہ جو اس نے میرے اُوپر اِلزام لگایا ہے یا تو اسے کہو کہ ثابت کر، اور اگر یہ ثابت نہ کر سکے تو پھر اس کے اوپر ۸۰ دُرّے لگ جایا کرتے ہیں، جس کو ''حدِ قذف'' کہتے ہیں، تو بغیر دلیل کے کسی کو متہم کرنے کی بجائے بغیر دلیل کے کسی کو اچھا سمجھ لینا بہتر ہے۔ اب ایک عورت کے متعلق تو قرائن سے لوگ ثابت کرتے ہیں کہ ایسی ہے، اور ایک کے متعلق لوگ اتنے بڑے بڑے کہتے ہیں کہ نبی کی بیوی ہے، نبی کی دادی ہے، نبی کی ساس ہے، اتنے بڑے بڑے لوگ کہتے ہیں، تو ایسی صورت میں انصاف کا تقاضا یہی ہے کہ زبان درازی نہ کی جائے اور بُرے الفاظ نہ بولے جائیں، طبیعت اگر گوارہ کرتی ہے تو ان روایات کی طرف دیکھتے ہوئے کہہ دو کہ یوسف علیہ السلام کا نکاح ہوا ہے، اور اگر طبیعت برداشت نہیں کرتی آپ کی تو خاموشی اختیار کرلو، کون سا یہ فرض ہے کہ آپ نے اس کے اُوپر تبرّے ضرور کرنے ہیں، باقی! آپ اپنے اِجتہاد اور اِستنباط کو ترک کر دیجئے تو قرآن اور حدیث کے اندر کوئی ایسی بات نہیں کہ جس کے ساتھ زلیخا کو متہم کیا جاسکے، ان کی محبت اگر ثابت ہوتی ہے تو صرف یوسف علیہ السلام سے، اور اس درجے تک جس کا ذِکر قرآنِ کریم نے کیا ہے۔

حدیث شریف میں ایک واقعہ آتا ہے، ایک شخص ایک عورت سے نکاح کرتا ہے، جس وقت نکاح ہوگیا تو کوئی اور عورت آتی ہے (''مشکوٰۃ شریف'' میں کتاب النکاح میں روایت آئے گی، ''بخاری شریف'' میں بھی ہے) ایک عورت آتی ہے اور آکے کہتی ہے کہ یہ شخص اور یہ اس کی بیوی ان دونوں کو میں نے دُودھ پلایا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ اس ایک عورت نے آکے کہہ دیا کہ یہ دونوں آپس میں رضاعی بہن بھائی ہیں، ان کا نکاح آپس میں نہیں ہوسکتا، وہ شخص عورت کے خاندان سے جاکے پوچھتا ہے کہ

کیا تمہاری بچی کو اس عورت نے دُودھ پلایا ہے؟ وہ کہتے ہیں ہمیں تو پتا نہیں، انہوں نے نہیں پہچانا کہ یہ رضاعی ماں ہے، اب صرف ایک عورت ہے جس کے خلاف اتنی باتیں موجود ہیں کہ مرد کا قبیلہ بھی کہتا ہے کہ ہمیں نہیں معلوم، اور عورت کا قبیلہ بھی کہتا ہے کہ ہمیں نہیں معلوم کہ ہماری بچی کو اس نے دُودھ پلایا۔ وہ شخص اپنے گھر سے سوار ہو کے مدینہ منورہ سرورِ کائنات ﷺ کی خدمت میں آتا ہے، آ کے صورتِ واقعہ ذکر کرتا ہے، اور صورتِ واقعہ ذکر کر کے حضور ﷺ سے مسئلہ پوچھتا ہے، آپ جواب دیتے ہیں، کَیْفَ وَقَدْ قِیْلَ، اب تُو اس کو بیوی کیسے بنا کے رکھے گا، کہہ جو دیا گیا کہ تیری بہن ہے، جس کا مطلب محدثین، شارحین، فقہاء کے نزدیک یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ احتیاط اسی میں ہے کہ جُدا کر دو، اگرچہ یہ شرعی ثبوت کے طور پر کافی نہیں کہ وہ رضاعی ماں ہے، لیکن احتیاط اسی میں ہے کہ اس کو جُدا کر دو، چونکہ جب ایک عورت نے اس قسم کی بات کہہ دی تو لوگوں کے اندر یہ افواہ تو پھیل جائے گی کہ اس نے اپنی رضاعی بہن سے نکاح کر رکھا ہے، ایک شُبہ تو پیدا ہو گیا، اس شُبہ کی رعایت کرتے ہوئے اس کو ترک کر دیا جائے، تو اس نے اس کو چھوڑ دیا، چھوڑنے کے بعد دوسری سے نکاح کر لیا۔(۱) اس میں دیکھیے کیا مزاج دیا گیا ہے ہمیں، کہ اِشتباہ کی بھی کتنی رعایت رکھی جاتی ہے، اب یہاں اسی طرح سے اتنے علمائے کرام جو اپنی کتابوں کے اندر اس قسم کی روایتیں درج کرتے ہیں تو کیا اس میں اتنا سا بھی شُبہ پیدا نہیں ہوتا؟ کہ ہو سکتا ہے، اگرچہ کوئی ٹھوس ثبوت نہیں ہے لیکن ہو سکتا ہے، کوئی اِمتناعِ شرعی تو ہے نہیں، کوئی اِمتناعِ عقلی تو ہے نہیں، ہو سکتا ہے، تو جب یہ ہو سکتا ہے والی بات آ سکتی ہے، ایک اِشتباہ پیدا ہو گیا، تو اس اِشتباہ پیدا ہونے کے بعد پھر اس کے متعلق بُرے بُرے الفاظ بولنا، زبان درازی کرنا یہ کسی صورت میں مناسب نہیں ہے۔ اور قرآنِ کریم کے خلاف قطعاً یہ بات نہیں، اگر قرآنِ کریم کے خلاف ہوتی تو اتنے بڑے بڑے جبال العلم، جو علم کے پہاڑ ہیں وہ اپنی کتابوں کے اندر اس قسم کی روایات کو درج نہ کرتے، اس لیے احتیاط بہر صورت اسی میں ہے۔

پھر آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ ثبوت ہمیشہ نکاح ہونے کا ہوا کرتا ہے، شہادت جو ہوتی ہے وہ نکاح ہونے پہ ہوتی ہے، اور اگر کوئی کہے کہ مجھے نہیں پتا کہ نکاح ہوا کہ نہیں ہوا، تو اس کا کوئی اثر نہیں پڑا کرتا، دو آدمی کہنے والے موجود ہوں کہ نکاح ہو گیا تو یہ ثبوت کے لئے کافی ہے، دس ہزار آدمی کہتے ہوں کہ نکاح نہیں ہوا، ان کی بات کا اعتبار ہی کوئی نہیں، کیونکہ شہادت ہمیشہ مثبت پہلو پہ ہوتی ہے، شہادت ثبوت کے لئے ہوا کرتی ہے، نفی کے لئے نہیں ہوتی، ہو سکتا ہے کہ دو آدمیوں کی موجودگی میں نکاح ہوا تھا باقی کروڑوں آدمیوں کے سامنے نہیں ہوا، شہادت نفی کی نہیں ہوا کرتی، اس لیے اس قسم کی روایات جو کتابوں کے اندر موجود ہیں جن میں نکاح کا تذکرہ ہے چاہے وہ کسی درجے کی ہوں، محدثین کے معیار پر نہیں ہیں، لیکن اِشتباہ کا باعث یقیناً ہیں، اور دوسروں کا کہنا کہ ثبوت نہیں، ثبوت نہیں جو کہتے ہیں اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ عدمِ ثبوت ہے، ثبوتِ عدم نہیں، دونوں باتوں میں فرق ہے......! ایک آدمی کہتا ہے کہ مجھے نہیں معلوم کہ نکاح ہو گیا، اور ایک کہتا ہے کہ مجھے معلوم ہے کہ نہیں ہوا، دونوں باتوں میں فرق ہے، تو یہ بات اگر آئے گی تو اس درجے تک ہی آئے گی کہ ہمیں پتا نہیں کہ ہوا یا نہیں ہوا؟ اور دوسرے کہتے ہیں کہ ہمیں پتا ہے کہ ہو گیا، ان دونوں کے درمیان میں کوئی تعارض نہیں ہے، اس لیے اسرائیلی روایات کی طرف دیکھتے ہوئے بھی اگر کسی نے اس مسئلے کو ذکر کیا ہے تو

(۱) بخاری ۱/۳۶۰ باب اذا شھد شاھد الخ/ مشکوٰۃ ۲/۲۷۳ باب المحرمات، فصل اول، عن عقبہ۔

بہر حال اِشتباہ کا باعث یقیناً ہے، اس لیے ہم اس مسئلے کو ایسا ضروری قرار نہیں دیتے کہ جو اس کے خلاف کہے تو ہم کہیں کہ قرآن کا منکر، حدیث کا منکر، ایسی بات بھی نہیں، اور نہ ہم اس بات کو وثوق کے طور پر یوں ذکر کرتے ہیں کہ یقیناً نکاح ہوا ہے، بلکہ ہم اس کو ایک اِمکان کے درجے میں رکھتے ہوئے اِشتباہ کا باعث قرار دیتے ہیں، اس لیے زلیخا کے متعلق ہم کسی کو گرے ہوئے الفاظ استعمال کرنے کی اجازت نہیں دیتے اور اس کو بہر حال ہم خطرناک سمجھتے ہیں، اور اِمکانِ شرعی کے درجے میں ایک چیز یعنی ہو سکتی ہے، اور اس نکاح کا قول کرنے سے قرآن اور حدیث کی کسی دلیل کی بھی خلاف ورزی لازم نہیں آتی، کیونکہ زلیخا کو بدکارہ ثابت کرنا یہ لوگوں کی خانہ ساز بات ہے، اپنے گھر کی بنائی ہوئی بات ہے، قرآن وحدیث کے اندر اس قسم کی کوئی بات نہیں کہ جس کے ساتھ اس کو ایسی عورت ثابت کیا جاسکے۔

تو ان تفسیروں میں سے مودودی صاحب نے البتہ سختی کے ساتھ اس بات کی تردید کی ہے، اس نے اسی طرح سے لکھا ہے جس طرح سے اسٹیج والے لوگ کہتے ہیں، مودودی صاحب کی رگ انہی کے ساتھ ہے، وہ کہتے ہیں کہ وہ خبیثہ تھی، اَلْخَبِيْثٰتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ قرآنِ کریم کا فیصلہ ہے، ایسی خبیثہ عورت نبی کے نکاح میں نہیں آسکتی، تو گھر بیٹھے بیٹھے اس کو خواہ مخواہ خبیثہ ثابت کر دیا، اور قرآنِ کریم سے استدلال کر کے کہہ دیا کہ خبیثہ عورت نبی کے نکاح میں نہیں آسکتی۔ پہلے اس کا خبیثہ ہونا ثابت تو ہو، باقی ان حالات کے اندر اس قسم کے وسوسے کا آجانا، قدم کا ڈگمگا جانا، تو تفصیل آپ کے سامنے آچکی کہ اُن لوگوں کے اعتبار سے یہ چیز بعید نہیں تھی جو آخرت کے بھی منکر ہیں، مشرک ہیں، کافر ہیں، ان کا اخلاق کا وہ معیار نہیں ہو سکتا، اور اگر وہ بھی اس قسم کے حالات کے اندر سنبھلی رہتی تو پھر حضرت یوسف علیہ السلام کا کمال کس طرح سے نمایاں ہوتا؟ تو قرآن وحدیث کے اندر کوئی ایسی بات صراحتاً نہیں۔

تو ہمارا اور ہمارے اکابر کا مسلک اسی طرح سے ہے، کہ اگر قول کریں گے تو نکاح کا کریں گے، نہیں کریں گے تو بدزبانی نہیں کریں گے، اس بارے میں سکوت اختیار کریں گے۔ اس مسئلے کی طرف اشارہ چونکہ مفسرین نے اسی رکوع کے اختتام پر کیا تھا تو اس کی تفصیل میں نے آپ کی خدمت میں ذکر کر دی۔ اب اگلے رُکوع کا ترجمہ دیکھیے۔

(کسی سوال کے جواب میں فرمایا) مشرک جو ہوا کرتے ہیں وہ اللہ کو مانتے ہیں، مشرک کہتے ہی اس کو ہیں جو اللہ کو بھی مانتا ہو، اور جو سرے سے اللہ کے وجود کا منکر ہو وہ مشرک نہیں، مشرکینِ مکہ بھی اللہ تعالیٰ کو رَبّ مانتے تھے، اس لیے کبھی رَبّ کے ساتھ اگر اللہ تعالیٰ کا وہ تذکرہ کریں تو ان کے مشرک ہونے کی وجہ سے اس کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اور پھر ہو سکتا ہے کہ جس طرح سے بادشاہ کے متعلق لکھا ہے کہ یوسف علیہ السلام کی وعظ وتبلیغ سے مسلمان ہو گیا تھا تو ممکن ہے ان لوگوں نے بھی اس بات کو سمجھ لیا ہو، ورنہ کافر عورت مسلمان کے نکاح میں تو آپ جانتے ہیں کہ اسلام کے ابتدائی دور میں بھی رہی ہے، یعنی کُفر اگر ثابت ہو تو کُفر کے ساتھ یہ بات ثبوت تک نہیں پہنچی کہ نکاح نہیں ہوا، انبیاء علیہم السلام کے نکاح میں کافرہ عورتیں رہی ہیں، اور ہمارے اسلام میں بھی ابتدائی دور کے اندر اس بات کو برداشت کیا گیا تھا، یہ تو مدینہ منورہ میں منتقل ہو جانے کے بعد ممانعت آئی ہے کہ کوئی مسلمان مشرک عورت سے شادی نہ کرے، ورنہ پہلے صحابہ رضی اللہ عنہم کے گھر میں بھی مشرک عورتیں تھیں، تو مشرک رَبّ کو مانتے ہیں اور اِستغفار بھی کرتے ہیں، مشرکینِ مکہ جن کو مشرکین کے اندر قیادت کا درجہ حاصل ہے اِستغفار تو یہ بھی کیا کرتے تھے، اللہ تعالیٰ سے توبہ اور اِستغفار کرتے

تھے، رَبّ کہہ کے پکارتے تھے، ''لبیك اللّٰھم لبیك لبیك لا شریك لك لبیك'' یہ پڑھتے تھے وہ اپنے حج اور عمرے کے اندر، آگے کہہ دیا کرتے تھے ''اِلّا شریکًا تملکہ وما ملك'' ہاں! ایسا شریک ہے جس کے اُوپر تیرا قبضہ ہے، وہ تیرے اُوپر مالک نہیں ہے، یعنی ماتحت شریک۔ تو رَبّ کو وہ مانتے ہیں، اللہ کو وہ مانتے ہیں، مشرک قومیں جتنی بھی ہیں وہ اللہ کے وجود کی قائل ہیں، تو ''مدارک'' کے اندر یہ لفظ ہے، اِسْتَغْفَرَتْ رَبَّہَا۔ ترجمہ دیکھئے۔

خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ

وَجَآءَ اِخْوَةُ يُوْسُفَ فَدَخَلُوْا عَلَيْهِ: آئے یوسف علیہ السلام کے بھائی پھر داخل ہوگئے یوسف علیہ السلام پر، فَعَرَفَهُمْ: یوسف علیہ السلام نے ان کو پہچان لیا، وَهُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ: اور وہ یوسف کے لئے منکر تھے، اس کو اوپرا جاننے والے تھے، اجنبی جاننے والے تھے، یعنی پہچاننے والے نہیں تھے، وَلَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَازِهِمْ: جب تیار کردیا ان کو ان کے سامان کے ساتھ، ''جھاز'' کہتے ہیں کسی کو رخصت کرتے وقت جو سامان دیا جاتا ہے، اسی الف کا امالہ کرلیا جائے تو جہاز کی بجائے جہیز بن جاتا ہے، اور یہ جہیز وہی ہے جو اپنی بچی کو رخصت کرتے وقت ماں باپ دیا کرتے ہیں، وہ یہی لفظ ہے، ''جب تیار کردیا ان کو ان کے سامان کے ساتھ'' قَالَ ائْتُوْنِيْ بِاَخٍ لَّكُمْ: کہا یوسف علیہ السلام نے لے آؤ تم میرے پاس اپنے بھائی کو، مِّنْ اَبِيْكُمْ: جو تمہارے باپ کی جانب سے ہے، اَلَا تَرَوْنَ اَنِّيْٓ اُوْفِي الْكَيْلَ: کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ میں پورا کرتا ہوں کیل کو، یعنی کیل پورا کرکے دیتا ہوں، وَاَنَا خَيْرُ الْمُنْزِلِيْنَ: اور میں بہترین مہمان نواز ہوں، مُنْزِل کہتے ہیں مہمان نواز کو، نزیل کہتے ہیں آنے والے مہمان کو، ''میں بہترین میزبان ہوں'' فَاِنْ لَّمْ تَاْتُوْنِيْ بِهٖ: پھر اگر تم اس اپنے بھائی کو میرے پاس نہیں لاؤ گے، فَلَا كَيْلَ لَكُمْ عِنْدِيْ: پس نہیں ہے تمہارے لیے کیل میرے پاس، وَلَا تَقْرَبُوْنِ: نون کے نیچے جو کسرہ ہے وہ یائے متکلم پر دال ہے، اور نہ تم میرے قریب ہی آنا، قَالُوْا سَنُرَاوِدُ عَنْهُ اَبَاهُ: وہ کہنے لگے کہ ہم عنقریب بہلائیں گے اس سے اس کے باپ کو، وَاِنَّا لَفٰعِلُوْنَ: اور بیشک ہم البتہ کرنے والے ہیں، وَقَالَ لِفِتْيٰنِهِ: یوسف علیہ السلام نے اپنے خادموں سے کہا، فِتْیَان، فَتٰی کی جمع ہے، اجْعَلُوْا بِضَاعَتَهُمْ: رکھ دو ان کی بضاعت، ان کی پُونجی جو انہوں نے غلے کی قیمت میں ادا کی ہے، ''رکھ دو ان کی پُونجی'' فِيْ رِحَالِهِمْ: رِحال رَحل کی جمع ہے، ان کے کجاووں میں، ان کے اسباب میں، سامان میں رکھ دو، لَعَلَّهُمْ يَعْرِفُوْنَهَآ اِذَا انْقَلَبُوْٓا اِلٰٓى اَهْلِهِمْ: تاکہ پہچان لیں وہ اس پُونجی کو جس وقت لوٹیں اپنے گھر کی طرف، لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ: اور تاکہ پھر یہ لوٹ کے آئیں، فَلَمَّا رَجَعُوْٓا اِلٰٓى اَبِيْهِمْ: جب وہ لوٹے اپنے باپ کی طرف قَالُوْا يٰٓاَبَانَا: کہنے لگے کہ اے ہمارے اَبا! مُنِعَ مِنَّا الْكَيْلُ: ہم سے کیل روک لیا گیا، فَاَرْسِلْ مَعَنَآ اَخَانَا: پس بھیج تو ہمارے ساتھ ہمارے بھائی کو، نَكْتَلْ: ہم کیل لائیں، اِکْتَال: اپنے لئے کیل کرنا، ہم کیل لائیں، وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ: بیشک ہم اس کے لئے البتہ حفاظت کرنے والے ہیں، قَالَ هَلْ اٰمَنُكُمْ عَلَيْهِ: یعقوب علیہ السلام نے کہا کہ نہیں اعتبار کرتا میں تمہارا اس بیٹے پر، اِلَّا كَمَآ اَمِنْتُكُمْ عَلٰٓى اَخِيْهِ مِنْ قَبْلُ: مگر جیسے کہ اعتبار کیا تھا میں نے تمہارا اس کے بھائی پر اس سے پہلے، فَاللّٰهُ خَيْرٌ حٰفِظًا: پس اللہ تعالیٰ بہترین حفاظت کرنے والا ہے، وَّهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ: اور وہ بہترین رحم کرنے والا ہے، راحمین میں سے اَرحم ہے۔ وَلَمَّا فَتَحُوْا مَتَاعَهُمْ: جس وقت انہوں نے اپنا سامان کھولا، وَجَدُوْا بِضَاعَتَهُمْ رُدَّتْ

اِلَيْهِمْ: پایا انہوں اپنی پُونجی کو کہ لوٹا دی گئی تھی ان کی طرف، قَالُوْا يٰۤاَبَانَا: کہنے لگے کہ اے ہمارے اَبا! مَا نَبْغِيْ: ہمیں اور کیا چاہیے، هٰذِهٖ بِضَاعَتُنَا رُدَّتْ اِلَيْنَا: یہ ہماری پُونجی لوٹا دی گئی ہماری طرف، وَنَمِيْرُ اَهْلَنَا: ہم اپنے گھر والوں کے لئے غلہ لائیں گے، وَنَحْفَظُ اَخَانَا: اور ہم اپنے بھائی کی حفاظت کریں گے، وَنَزْدَادُ كَيْلَ بَعِيْرٍ: اور ایک اُونٹ کا کیل ہم زیادہ لائیں گے، ایک اُونٹ کا بوجھ جو کیل کر کے اس کے اوپر لادا جاتا ہے، ایک اُونٹ کا کیل، ایک اُونٹ کی بھرتی ہم زیادہ لائیں گے، ذٰلِكَ كَيْلٌ يَّسِيْرٌ: یہ تو کیل تھوڑا سا ہے، کیل سے مکیل مراد ہے کیل کیا ہوا غلہ، یہ تو تھوڑا سا ہے جو جلدی ختم ہو جائے گا، قَالَ لَنْ اُرْسِلَهٗ مَعَكُمْ: یعقوب علیہ السلام نے کہا کہ ہرگز نہیں بھیجوں گا میں اس کو تمہارے ساتھ، حَتّٰى تُؤْتُوْنِ مَوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ: جب تک کہ تم مجھے پختہ عہد نہ دو اللہ کی جانب سے، لَتَاْتُنَّنِيْ بِهٖۤ: کہ تم اس کو میرے پاس لے کے آؤ گے، اِلَّاۤ اَنْ يُّحَاطَ بِكُمْ: مگر یہ کہ تمہیں گھیر لیا جائے، تم گھیرے میں آ جاؤ، فَلَمَّاۤ اٰتَوْهُ مَوْثِقَهُمْ: جس وقت انہوں نے یعقوب علیہ السلام کو، اپنے باپ کو اپنا عہد دے دیا، قَالَ اللّٰهُ عَلٰى مَا نَقُوْلُ وَكِيْلٌ: کہا یعقوب علیہ السلام نے کہ اللہ وکیل ہے اس بات پر جو ہم کہتے ہیں، ضامن ہے، نگہبان ہے، کفیل ہے، وکیل ہے، وَقَالَ يٰبَنِيَّ: یعقوب علیہ السلام نے کہا کہ اے میرے بیٹو! ''يٰبَنِيَّ'' اصل میں ''بُنَيْنِيَ'' تھا، نون گر گیا اضافت کی وجہ سے، اور آ گے یاءِ متکلم کی آ گئی، دو یائیں اکٹھی ہو گئیں تو ادغام ہو گیا، يٰبَنِيَّ: اے میرے بیٹو! لَا تَدْخُلُوْا مِنْۢ بَابٍ وَّاحِدٍ: ایک دروازے سے داخل نہ ہونا، وَّادْخُلُوْا مِنْ اَبْوَابٍ مُّتَفَرِّقَةٍ: متفرق دروازوں سے داخل ہونا، علیحدہ علیحدہ دروازوں سے داخل ہونا، یعنی شہر کے جو دروازے ہیں جیسے پُرانے شہر آپ نے دیکھے ہوں گے ان کے اردگرد دیوار ہوتی ہے، دروازے ہوتے ہیں، ''ایک دروازے سے سارے نہ جائیو، مختلف دروازوں سے متفرق ہو کر جائیو، داخل ہو جدا جدا دروازوں سے'' وَمَاۤ اُغْنِيْ عَنْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ: نہیں دُور ہٹا سکتا میں تم سے اللہ کی جانب سے کسی چیز کو، یعنی اللہ کی تقدیر کو تو میں ٹال نہیں سکتا، اگر اللہ کی طرف سے کوئی بات آنی ہے تو آ کے ہی رہے گی، اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ: نہیں ہے حکم مگر اللہ کے لئے، عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ: اسی پر میں نے بھروسا کیا، وَعَلَيْهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ: اور اسی پر ہی بھروسا کرنے والوں کو بھروسا کرنا چاہیے، وَلَمَّا دَخَلُوْا مِنْ حَيْثُ اَمَرَهُمْ اَبُوْهُمْ: اور جب وہ داخل ہوئے اس جگہ سے جہاں سے ان کے باپ نے ان کو حکم دیا تھا، مَا كَانَ يُغْنِيْ عَنْهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ: نہیں دُور ہٹاتے تھے ان کے باپ ان سے اللہ کی جانب سے کسی چیز کو، اِلَّا حَاجَةً فِيْ نَفْسِ يَعْقُوْبَ قَضٰىهَا: مگر ایک حاجت، خواہش، ارمان، کھٹک، جس لفظ کے ساتھ چاہو اس کا ترجمہ کر لو، ''مگر ایک کھٹک تھی یعقوب کے دل میں جو اس نے پوری کر لی'' وَاِنَّهٗ لَذُوْ عِلْمٍ لِّمَا عَلَّمْنٰهُ: اور بے شک وہ البتہ علم والا ہے بسبب ہمارے سکھانے کے، لِمَا عَلَّمْنٰهُ: بسبب ہمارے تعلیم دینے کے اس کو، وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ: لیکن اکثر لوگ جانتے نہیں۔

تفسیر

برادرانِ یوسف کا غلّہ لینے کے لئے مصر کی طرف پہلا سفر

اس رُکوع کے اندر جو مضمون ذکر کیا گیا ہے وہ ترجمے سے ہی آپ کے سامنے واضح ہو گیا، پچھلی بات کے آخر میں وہ حالات خود بخود سمجھ میں آ رہے ہیں کہ جس وقت بادشاہ نے یوسف علیہ السلام کو خزائن الارض پہ متعین کر دیا تو حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنی

تدبیر کے ساتھ، خداداد فہم و فراست کے ساتھ سات سال تک غلے کی کاشت خوب کی، اور فاضل پیداوار کو اچھی طرح سے محفوظ رکھا، ذخیرے کر لیے، اور سات سال کے بعد پھر وہ قحط شروع ہوا، قحط جو شروع ہوا تو وہ صرف مصر کی سرزمین میں نہیں تھا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ کے علاقے، اُردن کا علاقہ ہو گیا، فلسطین کا علاقہ ہو گیا، شام کا علاقہ ہو گیا، یہاں تک وہ سارے کے سارے قحط کے اثرات تھے، تو غلہ جتنا جمع کر رکھا تھا حضرت یوسف علیہ السلام نے وہ اپنے مُلک کے باشندوں کی ضرورت سے فاضل تھا، اس لیے آپ نے مخلوق پر رحم کرتے ہوئے بیرونِ مُلک والوں کے ہاتھ میں بھی غلے کی فروخت شروع کر دی، لیکن ایک اندازے کے ساتھ تاکہ ایسا نہ ہو کہ کوئی تاجر یہاں سے غلہ خرید کے لے جائے اور باہر جا کے بلیک کرے اور مخلوقِ خدا کو تکلیف پہنچائے، اس لیے ایک اندازے کے ساتھ دیتے تھے جس طرح سے کہ راشن بندی ہوتی ہے، جتنا کوئی لینا چاہے اس طرح سے نہیں، کہ جتنا کوئی چاہے لے لے ایسے نہیں کرتے تھے، تو یہ خبر باہر ملکوں میں پہنچ گئی کہ مصر کے اندر غلہ ہے اور حکومت اس کو فروخت کر رہی ہے، تو دُور دُور سے لوگ اس غلے کو لینے کے لئے آنے لگے۔ تو یہ اُردن کا علاقہ جہاں حضرت یعقوب علیہ السلام آباد تھے، کنعان کا علاقہ جس کو آج بھی ''قریہ خلیل'' کے نام سے ذِکر کیا جاتا ہے، وہ آباد بستی ہے، وہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی، اسحاق علیہ السلام کی، یعقوب علیہ السلام کی سب کی قبریں ہیں، تو وہاں بھی یہ خبر پہنچی، تو یعقوب علیہ السلام نے بھی اپنے دس بیٹوں کو (بنیامین کو اپنے پاس رکھ لیا خدمت کے طور پر) ان دس بیٹوں کو بھیجا کہ جاؤ تم بھی اپنے اہل و عیال کے لیے وہاں سے غلہ لے کے آؤ، تو یہ گئے۔

یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں کو کیسے پہچان لیا اور بھائی کیوں نہ پہچان سکے؟

تو معلوم یوں ہوتا ہے کہ جو باہر سے آتے تھے ان کو اپنا پرمٹ حاصل کرنے کے لئے آج کل کی اِصطلاح میں، اجازت نامہ حاصل کرنے کے لئے حاکم کے سامنے پیش ہونا پڑتا تھا، تو حاکم ان کے حالات کی جستجو کرتا، جستجو کرنے کے بعد پھر ان کو اجازت نامہ لکھ کے دیتا، تو پھر آگے ڈپوؤں سے ذخیروں سے ان کو غلہ دے دیا جاتا تھا، تو اسی طرح سے یہ دس جو تھے یہ بھی اجازت نامہ حاصل کرنے کے لئے یوسف علیہ السلام کے سامنے پیش ہوئے، تو جس وقت یہ یوسف علیہ السلام کے سامنے پیش ہوئے تو یوسف علیہ السلام نے تو ان کو فوراً پہچان لیا، کیونکہ سرکاری طور پر جب یہ حاکمِ اعلیٰ کے سامنے پیش ہوں گے تو خدام بتاتے ہیں کہ فلاں علاقے کے لوگ آئے ہیں اور آپ سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں، اور پھر یوسف علیہ السلام نے ان کو بڑی عمر میں دیکھا ہوا تھا، اور بڑی عمر کا آدمی زیادہ بدلتا نہیں، اور یوسف علیہ السلام کو انہوں نے چھوٹی عمر میں دیکھا تھا، چھوٹی عمر کا آدمی بہت بدل جاتا ہے، دوسرے یہ کہ یوسف علیہ السلام کو تو انتظار تھا کہ اس علاقے کے دوسرے لوگ جو آرہے ہیں تو یعقوب کی اولاد بھی آئے گی، تو جس کا انتظار ہوتا ہے اس کو انسان قرائن سے بھی پہچان لیتا ہے، اور اُن کو تو یہ اندازہ ہی نہیں تھا کہ جس بھائی کو ہم کنویں میں ڈال آئے تھے اور وہاں سے نکال کے کسی قافلے کے ہاتھ میں غلام بنا کے بیچ آئے تھے وہ شاہِ مصر ہو گیا ہوگا، اور مصر کے تخت کے اُوپر متمکن ہوگا، اور سارے مُلک کی باگ ڈور اس کے ہاتھ میں ہوگی، وہ تو یہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے، جب سوچ بھی نہیں سکتے تھے تو ان کا وہم بھی ادھر نہیں گیا کہ یہ کہیں ہمارا بھائی نہ ہو، اس لیے یوسف علیہ السلام نے ان کو پہچان لیا وہ نہ پہچان سکے، تو جس طرح سے حاکم تحقیق کیا کرتا ہے تو یوسف علیہ السلام نے

واقعے کی تحقیق شروع کردی، معلوم ایسے ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حکمت کے تحت اِخفاء کا حکم تھا کہ اپنے آپ کو ظاہر نہیں کرنا، کچھ حضرت یعقوب علیہ السلام کے صبر کا امتحان تھا، کچھ ان کے لئے بھی تنبیہات کرنی تھیں، اور لاکھوں کروڑوں حکمتیں ہوں گی اس میں، بہر حال اظہار کی اجازت نہیں تھی، پوچھا کہاں سے آئے ہو؟ تمہارا نسب کیا ہے؟ اور تمہیں کتنا غلہ چاہیے؟ گھر کے افراد کتنے ہیں؟

یوسف علیہ السلام کا بھائیوں کو بنیامین کے لانے کے لئے ترغیب وترہیب کے ذریعے تیار کرنا

جس طرح سے راشن کارڈ بنانا ہو تو حالات دریافت کیے جاتے ہیں، تو یوسف علیہ السلام نے بھی دریافت کرنے شروع کردیے، تو انہوں نے بتایا کہ جی! ہمارے باپ کا یہ نام ہے، اور اصل یہ ہے کہ ہم بارہ بھائی تھے لیکن ان میں سے ایک تو بچپن میں گم ہوگیا، اور ایک بھائی کو باپ نے اپنے پاس رکھ لیا اپنی خدمت کے لئے، وہ چونکہ اس گم ہونے والے کا حقیقی بھائی تھا، اس لیے وہ باپ کی تسلی کا باعث ہے، تو مہربانی کرکے آپ ہمیں گیارہ خاندانوں کے لئے غلہ دیں، دس ہم اور ایک ہمارا وہ بھائی جو وہاں ہے، اب بات نکل آئی، یوسف علیہ السلام نے یہیں سے بات پکڑلی، فرمانے لگے کہ یہ تو ہمارے اُصول کے خلاف ہے کہ جو نہ آئے ہم اس کا غلہ دے دیں، ایسا تو ہم کرتے نہیں، دیکھو! تم نے یہ کہا ہے کہ ہمارا ایک اور بھائی بھی ہے اور تم نے اس کا غلہ مانگا ہے، معلوم ہوتا ہے تم کسی شریف خاندان کے لوگ ہو، تم پر اعتماد کرتا ہوا میں تمہیں دس بھائیوں کو تو دیتا ہوں، یہ تو پورا پورا جتنا اُصول ہے اس کے مطابق تم غلہ لے لو، باقی! اگر آئندہ آنا ہو تو اس گیارہویں بھائی کو ساتھ لائیو تب جا کے غلہ ملے گا، ورنہ میں سمجھوں گا کہ تم نے جھوٹ بول کے مجھے دھوکا دینے کی کوشش کی ہے، پھر تمہیں بھی ایک دانہ نہیں ملے گا، اس گیارہویں کو ساتھ لے کے آئیو تب پتا چل جائے گا کہ واقعی تمہارا بھائی ہے، اور یہاں اس کو لانے میں کوئی فکر کی بات تو ہے نہیں، دیکھ رہے ہو میں کتنی شرافت سے پیش آرہا ہوں، کتنی اچھی طرح سے مہمان نوازی کررہا ہوں، کتنا اچھی طرح سے غلہ دے رہا ہوں، باپ کو مطمئن کردینا کہ کوئی ایسی خطرے کی بات نہیں، باقی! اگر نہ لائے تو یاد رکھیو میرے پاس نہ آئیو، میں نہیں دوں گا، کیونکہ میں سمجھوں گا کہ تم نے مجھے دھوکا دے کے زیادہ حاصل کرنے کی کوشش کی ہے، ترغیب بھی دے دی، ساتھ ساتھ دھمکا بھی دیا تاکہ وہ ضرور لے کے آئیں۔ وہ کہنے لگے جی! بات اصل میں یہ ہے کہ ہمارے باپ کا معاملہ ہے، ہم اس کو بہکائیں گے تو سہی، اپنی طرف سے تو کوشش کریں گے، باقی! اگر وہ نہ مانا، ہم نہ لاسکے، تو اس میں ہمارا قصور نہیں ہوگا، اپنی طرف سے ہم کوشش کریں گے، اِنَّا لَفٰعِلُوْنَ: ہم ضرور کریں گے لیکن اگر باپ نہ مانا تو یہ ایک عذر ہے جس کی بنا پر ہمیں جھوٹا نہ سمجھئے، بہر حال اپنی طرف سے کوشش کریں گے، یہ وعدہ انہوں نے بھی کرلیا۔

یوسف علیہ السلام نے بھائیوں کی پُونجی ان کے سامان میں کیوں رکھوادی؟

اب یوسف علیہ السلام نے تو چونکہ بلوانا ہی تھا اپنے بھائی کو، اب اس میں ایک چیز اور بھی درمیان میں آگئی، کہ کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ قحط کا زمانہ ہے ممکن ہے غلہ خریدنے کے لئے ان کے پاس پیسے نہ ہوئے تو ایک شریف آدمی پھر بھی گھر بیٹھ رہتا ہے کہ پیسے ہی نہیں ہیں، کیا لے کے جائیں، تو جتنی پُونجی انہوں نے پہلے غلے کی ادا کی تھی وہ ساری کی ساری انہی کی بوریوں میں رکھوادی، کہ جس وقت یہ گھر جائیں گے تو ان کو پتا تو چل جائے گا کہ یہ پیسے بھول چوک کے طور پر نہیں آئے، کیونکہ اگر بھول چوک کے طور پر

آئے ہوں پھر تو آخر واپس کرنے ضروری ہوگئے، وہ سمجھیں گے کہ یہ جان کر رکھوائے گئے ہیں، تو ہمارے اوپر یہ احسان کیا گیا ہے کہ جیسے غلہ دے دیا ہماری پُونجی بھی واپس کر دی، تو پھر پیسے ان کے پاس ہوں گے احسان سے متاثر ہوں گے اور دوبارہ آنے میں ان کے سامنے کوئی کسی قسم کی رکاوٹ نہیں ہوگی، تو اس طرح سے وہ غلہ لے کے چلے گئے۔

برادرانِ یوسف کا یعقوب علیہ السلام سے بنیامین کو بھیجنے پر اِصرار

جس وقت وہ اپنے باپ کے پاس گئے تو جا کے حالات سُنائے ہوں گے کہ جی! مصر کا جو بادشاہ ہے، مصر کا جو اس وقت کا مختار ہے، متولّی ہے، وہ تو بہت خوش اخلاق انسان ہے، وہ ہمارے ساتھ یوں پیش آیا، یوں پیش آیا، ہماری یوں مہمانی کی، شاہی مہمانوں کی طرح ہمیں رکھا، دیکھو! بالکل بھر بھر کے ہمیں کیل دیے، پورا پورا تول کے دیا، لیکن آئندہ کے لئے اب غلہ نہیں ملے گا اگر ہمارا بھائی ہمارے ساتھ نہ گیا تو، مُنِعَ مِنَّا الْكَيْلُ: آئندہ کے لئے کیل ہم سے روک لیا گیا، اس نے کہہ دیا ہے کہ اگر اس کو نہیں لے کے آؤ گے تو پھر میرے قریب نہ آنا، اور جس وقت جا کے انہوں نے اپنا سامان کھولا تو اس میں سے پُونجی بھی نکل آئی تو مارے خوشی کے کہتے ہیں مَا نَبْغِیْ: اَبا! اور کیا چاہیے، یہ تو ہمارے پیسے بھی واپس آگئے، اس لیے اب ہم ضرور جائیں گے، ایسے مہربان بادشاہ کی طرف تو ضرور جانا چاہیے، ہم اپنے گھر والوں کے لئے غلہ لائیں گے اور پہلے سے ایک اُونٹ زیادہ لائیں گے، کیونکہ جتنا ہم لاچکے ہیں یہ تو بہت تھوڑا سا ہے جلدی ختم ہوجائے گا، اور قحط کا زمانہ پتا نہیں ابھی کتنا دراز ہے، اس طرح سے باتیں کر کر کے وہ اپنے اَبا کو گویا کہ بہلا رہے ہیں، تو جس وقت انہوں نے مطالبہ کرلیا کہ اب ہمارے ساتھ ہمارے بھائی کو بھیجو تا کہ ہم غلہ لے کے آئیں، تو یعقوب علیہ السلام کہنے لگے کہ یہ بات جو تم نے کہی ہے اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ، دیکھا نا؟ یہاں بھی انہوں نے کہا تھا کہ ہمارے ساتھ ہمارے بھائی کو بھیج دے، فَاَرْسِلْ مَعَنَآ اَخَانَا نَكْتَلْ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ، اور یہ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ وہی ہے جو انہوں نے یوسف علیہ السلام کے بارے میں بھی کہا تھا کہ ہم اس کی نگرانی کریں گے، حفاظت کریں گے۔

برادرانِ یوسف کا بنیامین کے متعلّق عہد کرنا

تو یعقوب علیہ السلام کہنے لگے کہ تمہارا اعتبار تو ویسے کروں گا جیسے پہلے بیٹے کے بارے میں بھی کرلیا تھا، مطلب کیا کہ جیسے تم نے وہاں محافظت کا وعدہ کرلیا تھا ویسے یہاں کر رہے ہو، لیکن جب تم کہتے ہو کہ اس کو لے جانے کے بغیر غلہ نہیں ملے گا تو یہ ایک مجبوری ہے، تو میں بھیج دوں گا اس کو، لیکن یہ ہے کہ میرے ساتھ پختہ عہد کرو کہ اس کو اپنے ساتھ ضرور لاؤ گے، ہاں! البتہ اگر اللہ کی طرف سے کوئی ایسی تقدیر واقع ہوگئی کہ تم سارے ہی کہیں رہ گئے تو پھر تو وہ بھی گیا، لیکن اگر تم آؤ تو اس کو ساتھ ضرور لے کر آؤ، یہ میرے ساتھ پختہ عہد کرو، انہوں نے اللہ کو گواہ کر کے پختہ عہد دیا تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے پھر آگے اللہ کا حوالہ دیا کہ جو باتیں ہم کر رہے ہیں اس کے اُوپر کارساز تو اللہ ہی ہے، یعنی اپنی طرف سے پختہ عہد حاصل کرلیا پھر بعد میں معاملہ اللہ کے سپرد کر دیا، اب یہ اعتبار کرنا اس لیے ضروری تھا کہ اس کے بغیر سارے اہل وعیال ہلاک ہوتے تھے، اپنے طور پر جتنی تدبیر کر سکتے تھے پختہ عہد لینے کی انہوں نے کی۔

یعقوب علیہ السلام نے الگ الگ دروازوں سے داخل ہونے کا حکم کیوں دیا؟

پھر آگے یعقوب علیہ السلام ایک نصیحت کرتے ہیں اپنے بیٹوں کو، یہ بھی ظاہری سبب اختیار کرنے کے طور پر ہے، کہ بیٹا! دیکھو جب مصر میں جاؤ تو گیارہ کے گیارہ ایک ہی دروازے سے اندر نہ جائیو، یہ بات کیوں کہی؟ ''بیان القرآن'' میں اور ''معارف القرآن'' میں تو یہ لکھا ہوا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام یہ احتیاطی تدبیر اختیار کر رہے ہیں کہ یہ خاندانِ نبوّت کے بچے ہیں، بڑے خوب صورت، اچھے، صحت مند، اور گیارہ کے گیارہ جو جائیں گے تو لوگ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے دیکھیں گے تو کہیں ان کو نظر نہ لگ جائے، نظرِبد سے بچانے کے لئے یہ تدبیر کی۔ باقی رہا کہ جب پہلی دفعہ گئے تو اس وقت اس قسم کی نصیحت کیوں نہیں کی، ایسی تدبیر کیوں نہیں بتائی؟ تو اس میں یہ ہوسکتا ہے کہ پہلے تو ایک عام مسافرانہ حیثیت میں گئے تھے، اور عزیزِ مصر نے جتنا ان کا اکرام کیا تھا لوگوں کے سامنے یہ بھی ہوگا، اب لوگ پھر ان کو تاڑ تاڑ کے دیکھیں گے کہ وہی عزیزِ مصر نے جن کا اکرام کیا تھا یہ وہی آگئے، اب یہ گیارہ ہیں، اس طرح سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے دیکھیں گے تو کہیں ان کو کوئی نظر وغیرہ نہ لگ جائے، یہ بات بھی اپنی جگہ صحیح ہوسکتی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی ہے کہ یہ گیارہ کے گیارہ چونکہ دوسرے ملک سے جارہے تھے، اور مصر کے مقابلے میں ان کا علاقہ ایسے تھا جس طرح سے کہ قبائلی علاقہ ہوتا ہے، وہاں کوئی منظم حکومت نہیں تھی، اور زمانہ تھا قحط کا، تو لوگ ان کو گھور گھور کے بایں معنی بھی دیکھ سکتے ہیں کہ یہ اتنا جتھے کا جتھا جو آرہا ہے اور ہیں بھی ہمارے ملک سے باہر کے لوگ، تو کہیں یہ ڈاکازنی کے لئے نہ آرہے ہوں، کوئی زورآوری نہ کسی کے ساتھ کرلیں، اور ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ لوگ یوں پیچھے لگ جائیں کہ ان کے پاس بہت سرمایہ ہوگا اس لیے ان کو لوٹنے کے لئے ان کے پیچھے لگ جائیں، اس قسم کے اسباب متعدد ہوسکتے ہیں جن کی بنا پر یعقوب علیہ السلام نے کہا، اس حکمت کے طور پر تم متفرق ہوکے شہر میں داخل ہویو، اکٹھے نہ جائیو، جتھے کا جتھا لوگوں کے سامنے نمایاں نہ ہونا۔ لیکن ساتھ یہ بھی کہہ دیا کہ دیکھو! یہ ایک تدبیر ہے، باقی اللہ کی طرف سے جو تقدیر ہے وہ بہر حال واقع ہوکے رہے گی، میں اس کو نہیں ٹال سکتا۔

ترکِ اَسباب بھی اچھا نہیں اور اَسباب پر یقین بھی دُرست نہیں

یہی بات ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے کہا کہ ہم نے اس کو علم دیا تھا، وہ علم والا شخص تھا، علم والوں کا کام یہ ہوتا ہے کہ نہ تو اَسباب سے مستغنی ہوتے ہیں اور نہ اَسباب کے اُوپر پورا اعتماد کرتے ہیں، علم والوں کا کام یہ ہوتا ہے، اور باقی دونوں طرف جہالت ہے کہ ایک شخص تقدیر کا اتنا تصور کرلے کہ اسباب ہی چھوڑ کے بیٹھ جائے، ہاتھ پاؤں توڑ کے بیٹھ جائے کہ جو ہونا ہے ہوجائے گا، یہ بھی کوئی اچھی بات نہیں ہے، انبیاء علیہم السلام کی سُنّت نہیں، اور ایک آدمی تدبیر پر اتنا اعتماد کرلے کہ اس کی تقدیر کی طرف نظر ہی نہ جائے اور وہ اَسباب کو سب کچھ سمجھ کے بیٹھ جائے یہ بھی کوئی اچھی بات نہیں ہے، علم والوں کا کام یہ ہوتا ہے کہ اَحکامِ شرعیہ کے تحت وہ کسی مقصد کو حاصل کرنے کے لئے تدبیر کرتے ہیں، لیکن تدبیر کے اوپر اعتماد نہیں ہوتا، حوالہ تقدیر کا ہوتا ہے کہ جو اللہ کو منظور ہے ہوگا وہی، لیکن ظاہری طور پر ہمارے دل میں ایک کھٹک ہے کہ اس کا انتظام یوں کرلینا، ایک خواہش ہے دل کے اندر، وہ کام اس طرح سے کرلینا، باقی ہوگا وہی جو اللہ تعالیٰ کو منظور ہے۔

تو یہ بچے بھی اسی طرح سے گئے، بنیامین کو ساتھ لے لیا، جیسے ان کے والد نے کہا تھا اسی طرح سے وہ مختلف دروازوں سے داخل ہوئے، اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یعقوب علیہ السلام نے یہ تدبیر جو بتائی تھی تو ان کا اس تدبیر پر بھروسہ نہیں تھا وہ علم والے تھے، اس لیے وہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر کو تو ٹال نہیں سکتے تھے، ہاں! دل میں ایک ارمان تھا جو انہوں نے نکال لیا، دل میں ایک کھٹک تھی جو انہوں نے ذکر کردی، ورنہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر پر ان کا ایمان تھا، تدبیر پر اعتماد نہیں تھا کہ تدبیر اختیار کرنے کے ساتھ تقدیر ٹل سکتی ہے۔ اکثر لوگ ان باتوں کو نہیں جانتے یا تو تقدیر کی طرف نظر رکھتے ہیں تو اسباب سے غافل ہو جاتے ہیں، یا اسباب کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو اسباب پر اتنا اعتماد کر لیتے ہیں تو ان کو پھر تدبیر سرے سے یاد ہی نہیں رہتی، یہ اکثر لوگ لاعلم ہوتے ہیں، یعقوب علیہ السلام ایسے نہیں تھے، ان کو ہم نے علم دیا تھا، علم کی وجہ سے انہوں نے دونوں پہلوؤں کو سمیٹا، سبب اختیار کیا لیکن سبب کے اوپر کلیۃً اعتماد نہیں کیا۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ أَسْتَغْفِرُكَ وَأَتُوْبُ إِلَيْكَ

وَلَمَّا دَخَلُوْا عَلٰى يُوْسُفَ اٰوٰۤى اِلَيْهِ اَخَاهُ قَالَ اِنِّیْۤ اَنَا اَخُوْكَ فَلَا تَبْتَىٕسْ

اور جب داخل ہوئے وہ یوسف پر تو ٹھکانا دیا یوسف نے اپنی طرف اپنے بھائی کو، اور کہا بیشک میں تیرا حقیقی بھائی ہوں پس تو غم نہ کر

بِمَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ۝۶۹ فَلَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَازِهِمْ جَعَلَ السِّقَایَةَ

ان کاموں کی وجہ سے جو یہ کرتے رہے ہیں ۝۶۹ جس وقت یوسف نے تیار کیا ان کو ان کے سامان کے ساتھ تو رکھ دیا ایک پیالہ

فِیْ رَحْلِ اَخِیْهِ ثُمَّ اَذَّنَ مُؤَذِّنٌ اَیَّتُهَا الْعِیْرُ اِنَّكُمْ لَسٰرِقُوْنَ ۝۷۰ قَالُوْا

اپنے بھائی کے سامان میں، پھر آواز دی آواز دینے والے نے اے قافلہ والو! بیشک تم البتہ چور ہو ۝۷۰ کہا یوسف کے بھائیوں نے

وَاَقْبَلُوْا عَلَیْهِمْ مَّاذَا تَفْقِدُوْنَ ۝۷۱ قَالُوْا نَفْقِدُ صُوَاعَ الْمَلِكِ

اس حال میں کہ وہ متوجہ ہوئے آواز دینے والوں پر کہ تم کیا چیز گم پاتے ہو؟ ۝۷۱ انہوں نے کہا کہ ہم گم پاتے ہیں بادشاہ کا پیمانہ

وَلِمَنْ جَآءَ بِهٖ حِمْلُ بَعِیْرٍ وَّاَنَا بِهٖ زَعِیْمٌ ۝۷۲ قَالُوْا تَاللّٰهِ لَقَدْ

اور اس شخص کے لئے جو اس پیمانے کو لائے گا ایک اونٹ کا بوجھ ہے اور میں اس کا ذمہ دار ہوں ۝۷۲ وہ کہنے لگے کہ اللہ کی قسم! البتہ تحقیق

عَلِمْتُمْ مَّا جِئْنَا لِنُفْسِدَ فِی الْاَرْضِ وَمَا كُنَّا سٰرِقِیْنَ ۝۷۳ قَالُوْا فَمَا جَزَآؤُهٗۤ اِنْ كُنْتُمْ

تم نے جان لیا، نہیں آئے ہم کہ فساد کریں زمین میں اور نہ ہم چور ہیں ۝۷۳ انہوں نے کہا کہ کیا بدلہ ہے اس شخص کا اگر تم

كٰذِبِيْنَ ﴿۷۴﴾ قَالُوْا جَزَآؤُهٗ مَنْ وُّجِدَ فِيْ رَحْلِهٖ فَهُوَ جَزَآؤُهٗ ؕ

جھوٹے ہوئے؟ ﴿۷۴﴾ انہوں نے کہا کہ اس کا بدلہ یہ ہے کہ وہ شخص کہ پایا جائے وہ پیالہ اس کے سامان میں وہ خود ہی اس کا بدل ہے،

كَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ ﴿۷۵﴾ فَبَدَاَ بِاَوْعِيَتِهِمْ قَبْلَ وِعَآءِ اَخِيْهِ ثُمَّ

اسی طرح سے بدلہ دیتے ہیں ہم ظالموں کو ﴿۷۵﴾ شروع کیا یوسف نے ان بھائیوں کی بوروں کو اپنے بھائی کی بوری سے پہلے پھر

اسْتَخْرَجَهَا مِنْ وِّعَآءِ اَخِيْهِ ؕ كَذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوْسُفَ ؕ مَا كَانَ لِيَاْخُذَ

نکال لیا اس نے وہ پیالہ اپنے بھائی کی بوری سے، اسی طرح سے ہم نے خفیہ تدبیر کی یوسف کے لئے، نہیں تھا یوسف کے لئے کہ لے لے

اَخَاهُ فِيْ دِيْنِ الْمَلِكِ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ؕ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ ؕ وَفَوْقَ كُلِّ

اپنے بھائی کو بادشاہ کے قانون میں مگر اللہ کا چاہنا ہی ہو کر رہتا ہے، اُونچا کرتے ہیں ہم جس کو چاہتے ہیں درجوں میں، اور ہر علم والے

ذِيْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ ﴿۷۶﴾ قَالُوْٓا اِنْ يَّسْرِقْ فَقَدْ سَرَقَ اَخٌ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ ۚ

کے اُوپر زیادہ علم والا ہے ﴿۷۶﴾ وہ بھائی کہنے لگے کہ اگر اُس نے چوری کی ہے تو اس سے پہلے اس کے بھائی نے بھی چوری کی تھی،

فَاَسَرَّهَا يُوْسُفُ فِيْ نَفْسِهٖ وَلَمْ يُبْدِهَا لَهُمْ ۚ قَالَ اَنْتُمْ شَرٌّ مَّكَانًا ۚ

یوسف نے اس بات کو چھپا لیا اپنے دِل میں اور ان کے لئے اس بات کو ظاہر نہ کیا، یوسف نے کہا کہ مرتبے کے لحاظ سے تم بہت بُرے لوگ ہو،

وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا تَصِفُوْنَ ﴿۷۷﴾ قَالُوْا يٰٓاَيُّهَا الْعَزِيْزُ اِنَّ لَهٗٓ اَبًا شَيْخًا كَبِيْرًا فَخُذْ

اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے اس بات کو جو تم بیان کرتے ہو ﴿۷۷﴾ وہ کہنے لگے کہ اے عزیز! اس کے لئے بہت بوڑھا باپ ہے، لے لے

اَحَدَنَا مَكَانَهٗ ۚ اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۷۸﴾ قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اَنْ نَّاْخُذَ اِلَّا مَنْ

ہم میں سے ایک کو اس کی جگہ، بیشک ہم تجھے محسنین میں سے دیکھتے ہیں ﴿۷۸﴾ یوسف علیہ السلام نے کہا کہ اللہ کی پناہ کہ ہم پکڑ لیں مگر اسی شخص کو

وَّجَدْنَا مَتَاعَنَا عِنْدَهٗٓ ۙ اِنَّآ اِذًا لَّظٰلِمُوْنَ ﴿۷۹﴾ فَلَمَّا اسْتَيْئَسُوْا

جس کے پاس ہم نے اپنا سامان پایا ہے، ہم تو اس وقت بے انصافی کرنے والے ہو جائیں گے ﴿۷۹﴾ پھر جس وقت وہ مایوس ہو گئے

مِنْهُ خَلَصُوْا نَجِيًّا ؕ قَالَ كَبِيْرُهُمْ اَلَمْ تَعْلَمُوْٓا اَنَّ اَبَاكُمْ قَدْ اَخَذَ عَلَيْكُمْ

یوسف کی طرف سے تو تنہا ہوئے سرگوشیاں کرتے ہوئے، ان میں سے بڑے نے کہا کیا تمہیں علم نہیں کہ تمہارے باپ نے تم پر

مَّوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ وَمِنْ قَبْلُ مَا فَرَّطْتُّمْ فِيْ يُوْسُفَ ۚ فَلَنْ

بہت پختہ عہد لیا تھا اللہ کی جانب سے اور اس سے قبل جو کوتاہی تم نے یوسف کے بارے میں کی تھی (وہ تمہیں یاد نہیں؟) پس میں ہرگز

اَبْرَحَ الْاَرْضَ حَتّٰى يَاْذَنَ لِيْٓ اَبِيْٓ اَوْ يَحْكُمَ اللّٰهُ لِيْ ۚ وَهُوَ

نہیں چھوڑوں گا اس علاقے کو جب تک کہ میرا باپ مجھے اجازت نہ دے دے یا اللہ تعالیٰ میرے لیے کوئی فیصلہ نہ فرما دے اور وہ

خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ ﴿۸۰﴾ اِرْجِعُوْٓا اِلٰٓى اَبِيْكُمْ فَقُوْلُوْا يٰٓاَبَانَآ اِنَّ ابْنَكَ سَرَقَ ۚ

بہترین فیصلہ کرنے والا ہے ﴿۸۰﴾ لوٹ جاؤ تم اپنے باپ کی طرف، جا کے اسے بتا دو اے ہمارے اَبا! بیشک تیرے بیٹے نے چوری کر لی

وَمَا شَهِدْنَآ اِلَّا بِمَا عَلِمْنَا وَمَا كُنَّا لِلْغَيْبِ حٰفِظِيْنَ ﴿۸۱﴾ وَسْـَٔلِ الْقَرْيَةَ الَّتِيْ

اور نہیں شہادت دی ہم نے مگر اسی چیز کی جو ہمیں معلوم ہے اور ہم غیب کی حفاظت کرنے والے نہیں تھے ﴿۸۱﴾ اور پوچھ لے اس شہر والوں سے

كُنَّا فِيْهَا وَالْعِيْرَ الَّتِيْٓ اَقْبَلْنَا فِيْهَا ۭ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ﴿۸۲﴾ قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ

جس کے اندر ہم تھے اور ان قافلے والوں سے جن کے اندر ہم واپس آئے، بیشک ہم سچے ہیں ﴿۸۲﴾ یعقوب علیہ السلام نے کہا بلکہ تمہارے لیے

لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا ۭ فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ ۭ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَنِيْ بِهِمْ جَمِيْعًا ۭ

تمہارے نفسوں نے کوئی بات بنا لی ہے، پس صبر جمیل میرا کام ہے، مجھے اُمید ہے کہ اللہ تعالیٰ عنقریب ان کو لے آئے گا سب کو،

اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ﴿۸۳﴾ وَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَقَالَ يٰٓاَسَفٰى عَلٰي يُوْسُفَ وَابْيَضَّتْ عَيْنٰهُ

بیشک وہ علم والا ہے حکمت والا ہے ﴿۸۳﴾ اور ان کی طرف سے منہ موڑ لیا اور کہا ہائے افسوس یوسف پر! سفید ہو گئیں اس کی آنکھیں

مِنَ الْحُزْنِ فَهُوَ كَظِيْمٌ ﴿۸۴﴾ قَالُوْا تَاللّٰهِ تَفْتَؤُا تَذْكُرُ يُوْسُفَ حَتّٰى تَكُوْنَ حَرَضًا اَوْ

غم کی وجہ سے پس وہ گھٹنے والے تھے ﴿۸۴﴾ وہ کہنے لگے کہ اللہ کی قسم! ہمیشہ یاد کرتا رہے گا تو یوسف کو حتیٰ کہ ہو جائے گا تو قریب الہلاک یا

تَكُوْنَ مِنَ الْهٰلِكِيْنَ ﴿۸۵﴾ قَالَ اِنَّمَآ اَشْكُوْا بَثِّيْ وَحُزْنِيْٓ

ہو جائے گا تو ہلاک ہونے والوں میں سے ہی ﴿۸۵﴾ یعقوب علیہ السلام نے کہا کہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ میں اپنی پریشانی اور اپنے غم کو اللہ کے

اِلَى اللّٰهِ وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۶﴾ يٰبَنِيَّ اذْهَبُوْا فَتَحَسَّسُوْا مِنْ يُّوْسُفَ وَاَخِيْهِ

سامنے ظاہر کرتا ہوں اور میں جانتا ہوں اللہ کی طرف سے جو تم نہیں جانتے ﴿۸۶﴾ اے میرے بیٹو! جاؤ، تلاش کرو یوسف کو اور اس کے بھائی کو،

وَلَا تَايْئَسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ لَا يَايْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۸۷﴾

اور اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو، بیشک بات یہ ہے کہ نہیں مایوس ہوتے اللہ کی رحمت سے مگر کافر لوگ ہی ﴿۸۷﴾

خلاصہ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ وَلَمَّا دَخَلُوْا عَلٰى يُوْسُفَ اٰوٰٓى اِلَيْهِ اَخَاهُ: اور جب داخل ہوئے وہ یوسف پر، دَخَلُوْا کی ضمیر اِخوۂ یوسف کی طرف جارہی ہے یعنی یوسف علیہ السلام کے بھائی، یہ ان کا دوسرا سفر ہے مصر کی طرف،'' جب یہ یوسف علیہ السلام پہ داخل ہوئے ٹھکانا دیا یوسف نے اپنی طرف اپنے بھائی کو'' اس بھائی سے مراد بنیامین ہے، قَالَ اِنِّيْٓ اَنَا اَخُوْكَ: اور یوسف علیہ السلام نے اس اپنے بھائی سے کہا: بیشک میں تیرا حقیقی بھائی ہوں، فَلَا تَبْتَىِٕسْ: پس تو غم نہ کر، بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ: ان چیزوں کی وجہ سے جو یہ کرتے رہے ہیں، یہ دوسرے بھائی جو ہمارے علاتی بھائی ہیں، جو کچھ یہ کرتے رہے ہیں اس کی وجہ سے اب غمگین نہ ہو،'' بسبب ان کاموں کے جو یہ کرتے رہے ہیں'' فَلَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَازِهِمْ: یہ لفظ پہلے بھی آپ کے سامنے گزر گیا، جس وقت یوسف علیہ السلام نے تیار کیا ان کو ان کے سامان کے ساتھ، جَعَلَ السِّقَايَةَ فِيْ رَحْلِ اَخِيْهِ: سقایہ سے پیالہ مراد ہے، پانی پینے کا پیالہ جس کو آگے صُوَاعَ الْمَلِكِ کے ساتھ تعبیر کیا ہے، بادشاہ کا پیمانہ،'' کر دیا ایک پیالہ اپنے بھائی کے سامان میں'' یعنی بنیامین کے سامان میں ایک پیالہ رکھوا دیا، ثُمَّ اَذَّنَ مُؤَذِّنٌ: پھر آواز دی آواز دینے والے نے، اعلان کیا اعلان کرنے والے نے، اَيَّتُهَا الْعِيْرُ: عیر کہتے ہیں اس قافلے کو جو غلہ لانے والا ہوتا ہے،'' اے قافلہ والو!'' اِنَّكُمْ لَسٰرِقُوْنَ: بیشک تم البتہ چور ہو، چُرانے والے ہو، قَالُوْا وَاَقْبَلُوْا عَلَيْهِمْ: کہا یوسف کے بھائیوں نے اس حال میں کہ وہ متوجہ ہوئے ان پر، آواز دینے والوں پر متوجہ ہوئے، قَالُوْا مَاذَا تَفْقِدُوْنَ، تو مَاذَا تَفْقِدُوْنَ یہ قَالُوْا کا مقولہ ہے، تم کیا چیز گُم پاتے ہو؟ یعنی یہ بات کہتے ہوئے انہوں نے آواز دینے والوں پر توجہ کی ادھر منہ پھیرا، منہ پھیر کر کہنے لگے کہ تم کیا چیز گُم پاتے ہو؟ تمہارا کیا گُم ہو گیا ہے؟ قَالُوْا نَفْقِدُ صُوَاعَ الْمَلِكِ: انہوں نے کہا کہ ہم گُم پاتے ہیں بادشاہ کا پیمانہ، وَلِمَنْ جَآءَ بِهٖ حِمْلُ بَعِيْرٍ: اور اس شخص کے لئے جو اس پیمانے کو لے آئے گا ایک اُونٹ کا بوجھ ہے، وَّاَنَا بِهٖ زَعِيْمٌ: اور میں اس کا کفیل ہوں، میں ذمہ دار ہوں، اگر کوئی شخص اس پیالے کو لے آئے تلاش کر کے دے دے ہم ایک اُونٹ کا بوجھ اس کو بطور اِنعام کے دیں گے، قَالُوْا تَاللّٰهِ لَقَدْ عَلِمْتُمْ: وہ کہنے لگے کہ اللہ کی قسم! البتہ تحقیق تم نے جان لیا، مَّا جِئْنَا لِنُفْسِدَ فِي الْاَرْضِ: نہیں آئے ہم کہ فساد کریں زمین میں، وَمَا كُنَّا سٰرِقِيْنَ: اور نہ ہم چور ہیں، ہم یہاں کوئی فساد کرنے کے لئے نہیں آئے نہ ہم کوئی چور ہیں، قَالُوْا فَمَا جَزَآؤُهٗ: انہوں نے کہا جو پیچھے تلاش کرنے کے لئے گئے تھے کہ کیا بدلہ ہے اس شخص کا، یعنی جس سے ہمارا سامان مل جائے جو چور ثابت ہو جائے'' کیا بدلہ ہے اس شخص کا'' اِنْ كُنْتُمْ كٰذِبِيْنَ: اگر تم جھوٹے ہوئے، قَالُوْا جَزَآؤُهٗ: انہوں نے کہا کہ بدلہ اس کا یہ ہے کہ مَنْ وُّجِدَ فِيْ رَحْلِهٖ: وہ شخص جس کے سامان میں وہ پیالہ پایا گیا، فَهُوَ جَزَآؤُهٗ: تو وہ خود ہی اس کی جزا ہے، یعنی اسی کو رکھ لیا جائے گا، اسی کو پکڑ لیا جائے گا، مَنْ وُّجِدَ فِيْ رَحْلِهٖ: وہ شخص کہ پایا جائے وہ پیالہ اس کے سامان میں فَهُوَ جَزَآؤُهٗ: وہ خود ہی اس کی جزا ہے، وہ خود ہی اس کا بدل ہے،

كَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ: اسی طرح سے بدلہ دیتے ہیں ہم ظالموں کو۔ فَبَدَاَ بِاَوْعِيَتِهِمْ: اوعیہ وعاء کی جمع ہے جیسا کہ آگے خود لفظ وعاء بھی آ رہا ہے۔ وعاء کہتے ہیں برتن کو، گونی کو جس کے اندر غلہ بھرا ہوا ہوتا ہے، "شروع کیا یوسف علیہ السلام نے ان بھائیوں کی گونیوں کو" قَبْلَ وِعَآءِ اَخِيْهِ: اپنے بھائی کی گونی سے قبل، یعنی اپنے بھائی کی گونی دیکھنے سے پہلے پہلے ان کی بوریاں دیکھیں، ثُمَّ اسْتَخْرَجَهَا مِنْ وِعَآءِ اَخِيْهِ: پھر نکال لیا اس نے وہ "سقایہ" اپنے بھائی کی بوری سے، اپنے بھائی کی خرجی سے، كَذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوْسُفَ: اسی طرح سے ہم نے تدبیر کی یوسف کے لئے، كِدْنَا! یعنی اس سارے عمل کی ذمہ داری اللہ نے لے لی، "ہم نے اسی طرح سے تدبیر کی، خفیہ تدبیر کی یوسف کے لئے" مَا كَانَ لِيَاْخُذَ اَخَاهُ فِيْ دِيْنِ الْمَلِكِ: نہیں تھا یوسف کے لئے کہ لے لے اپنے بھائی کو بادشاہ کے قانون میں، اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ: مگر اللہ کے چاہنے کے وقت، یعنی جو اللہ چاہتا ہے وہ ہو جاتا ہے، بادشاہ کے ظاہری قانون کا تقاضا یہ تھا، مصر کی حکومت کے قانون کا تقاضا یہ تھا کہ وہ اپنے بھائی کو لے نہیں سکتے تھے، اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ: مگر اللہ کا چاہنا ہی ہو کر رہتا ہے، (یا) لٰکِنْ اَخَذَ بِمَشِيْئَةِ اللّٰهِ: اللہ کی مشیت کے ساتھ، اللہ کے چاہنے کے ساتھ انہوں نے لے لیا اپنے بھائی کو۔ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ میں اَنْ مصدریہ ہے۔ اِلَّا "لٰکِنْ" کے معنی میں ہے، "لیکن اللہ کا چاہنا ہی ہو کے رہتا ہے" (یا) اللہ کے چاہنے کے ساتھ انہوں نے اپنے بھائی کو لے لیا، نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ: مَنْ نَّشَآءُ یہ نَرْفَعُ کا مفعول ہے، اُونچا کرتے ہیں ہم جس کو چاہتے ہیں درجوں میں، ہم جس کے چاہتے ہیں درجے بڑھا دیتے ہیں، وَفَوْقَ كُلِّ ذِيْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ: اور ہر علم والے کے اوپر زیادہ علم والا ہے۔ قَالُوْٓا اِنْ يَّسْرِقْ: وہ بھائی کہنے لگے کہ اگر اس نے چوری کی ہے فَقَدْ سَرَقَ اَخٌ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ: یہ دال پر جزا ہے، اگر اس نے چوری کی ہے، فَلَا عَجَبَ، تو کوئی تعجب کی بات نہیں، اس سے پہلے اس کے بھائی نے بھی چوری کی تھی، "بھائی" سے مراد "یوسف"، یعنی جس میں انہوں نے یہ تاثر دے دیا کہ یہ ہمارا حقیقی بھائی نہیں ہے، اگر یہ ہمارا حقیقی بھائی ہوتا تو اس کو چوری کی عادت نہ ہوتی، معلوم ہوتا ہے کہ ان میں چوری کی عادت ان کی ماں کی طرف سے آئی ہے، اس نے چوری کر لی تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہے اس سے پہلے اس کے بھائی نے بھی چوری کی تھی، فَاَسَرَّهَا يُوْسُفُ فِيْ نَفْسِهٖ: یوسف نے اس بات کو چھپا لیا اپنے دل میں، وَلَمْ يُبْدِهَا لَهُمْ: اور ان کے لئے اس بات کو ظاہر نہ کیا، قَالَ اَنْتُمْ شَرٌّ مَّكَانًا: یوسف علیہ السلام نے کہا۔ یا تو اَسَرَّهَا میں هَا ضمیر مبہم ہے، اور اس سے مراد یہی قول ہے جو آگے ہے اَنْتُمْ شَرٌّ مَّكَانًا ۚ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا تَصِفُوْنَ، یہی مراد ہے، یوسف نے یہ بات اپنے دل میں چھپا لی اور یہ بات ان کے سامنے ظاہر نہ کی اور اپنے دل میں کہا کہ تم بدتر ہو از روئے مکان کے، از روئے مرتبے کے، اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے اس بات کو جو تم بیان کرتے ہو، بڑے بُرے مرتبے کے لوگ ہو تم، یہ بات دل میں رکھی، ظاہر نہیں کی۔ یا یہ ہے کہ جو بات انہوں نے کہی تھی یوسف علیہ السلام اس کو اپنے دل میں ہی دبا گئے، اس کے متعلق کوئی اثر ظاہر نہیں کیا، اور انہیں خطاب کر کے کہا کہ اَنْتُمْ شَرٌّ مَّكَانًا: مرتبے کے لحاظ سے تم بہت بُرے لوگ ہو، اللہ ہی بہتر جانتا ہے جو تم بیان کرتے ہو، یہ کہنے کا مطلب یہ تھا کہ ابھی ابھی تو تم کہہ رہے تھے کہ وَمَا كُنَّا سٰرِقِيْنَ: ہم چور نہیں ہیں، اور ابھی ابھی کہنے لگ گئے کہ اس نے چوری کی ہے تو اس کا دوسرا بھائی بھی چور تھا، معلوم ہوتا ہے کہ تم چور ہی چور ہو سارے، اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ تم جو باتیں کرتے ہو ان کی حقیقت کیا ہے، بڑے بُرے لوگ ہو تم، ابھی تو کہہ رہے تھے ہم چور نہیں ہیں اور ابھی اپنے خاندان کی

چوریوں کی نشاندہی بھی کردی کہ اس نے چوری کی ہے تو کوئی تعجب کی بات نہیں اس کا بھائی بھی چور تھا، تو یہ بات انہیں خطاب کرکے کہی کہ بڑے بُرے لوگ ہو، بڑے بُرے درجے کے لوگ ہو تم، اللہ ہی بہتر جانتا ہے جو تم بیان کرتے ہو کہاں تک صحیح ہے، کہ اس کے بھائی نے بھی چوری کی تھی اور تم چور نہیں ہو، اللہ ہی بہتر جانتا ہے جو تم بیان کرتے ہو اس کی کیا حقیقت ہے۔ قَالُوْا يٰٓاَيُّهَا الْعَزِيْزُ: وہ کہنے لگے کہ اے عزیز! اِنَّ لَهٗٓ اَبًا شَيْخًا كَبِيْرًا: اس کے لئے باپ ہے بہت بوڑھا، بہت بوڑھا باپ ہے، فَخُذْ اَحَدَنَا مَكَانَهٗ: لے لے ہم میں سے ایک کو اس کی جگہ، ہم میں سے ایک کو اس کی جگہ لے لے، اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ: بیشک ہم تجھے محسنین میں سے دیکھتے ہیں، قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ: یوسف علیہ السلام نے کہا کہ اللہ کی پناہ! اَنْ نَّاْخُذَ: کہ ہم پکڑ لیں، اِلَّا مَنْ وَّجَدْنَا مَتَاعَنَا عِنْدَهٗٓ: مگر اسی شخص کو جس کے پاس ہم نے اپنا سامان پایا ہے، دیکھو! یہاں یوں نہیں کہا اِلَّا مَنْ سَرَقَ ''معاذ اللہ! کہ ہم پکڑیں مگر ایسے شخص کو جس نے چوری کی ہے'' یہ نہیں کہا، کیونکہ یوسف علیہ السلام تو جانتے تھے کہ بنیامین تو چوری نہیں کی، یہاں تعبیر کیسی اختیار کی، ''اللہ کی پناہ! کہ ہم پکڑیں مگر اسی شخص کو جس کے پاس ہم نے اپنا سامان پایا ہے'' ہم تو اسی کو رکھیں گے بھئی! جس کے پاس اپنا سامان پایا ہے، ہم تو کسی دوسرے کو نہیں پکڑتے، اِنَّآ اِذًا لَّظٰلِمُوْنَ: ہم تو اس وقت بے انصافی کرنے والے ہو جائیں گے، کیونکہ تمہارے خیال کے مطابق بھی پکڑنا اسی کو چاہئے جو تمہارے خیال کے مطابق چور ہے، تو اگر ہم نے دوسرے کو پکڑ لیا جس کے پاس ہمارا سامان نہیں نکلا تو تمہارے خیال کے مطابق بھی ہمارا یہ عمل ٹھیک نہیں ہوگا، دوسرے کو ہم سزا کس طرح سے دے دیں؟ دوسرے کو ہم کس طرح سے پکڑ لیں؟ فَلَمَّا اسْتَيْئَسُوْا مِنْهُ خَلَصُوْا نَجِيًّا: پھر جس وقت وہ مایوس ہو گئے یوسف کی طرف سے تو تنہا ہوئے سرگوشیاں کرتے ہوئے، علیحدہ ہو کے مشورہ کرنے لگے، قَالَ كَبِيْرُهُمْ: ان میں سے بڑے نے کہا: اَلَمْ تَعْلَمُوْٓا اَنَّ اَبَاكُمْ قَدْ اَخَذَ عَلَيْكُمْ مَّوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ: کیا تمہیں پتا نہیں؟ تمہیں یاد نہیں؟ کیا تمہیں علم نہیں؟ کہ تمہارے باپ نے تم پر بہت پختہ عہد لیا تھا اللہ کی جانب سے، وَمِنْ قَبْلُ مَا فَرَّطْتُّمْ فِيْ يُوْسُفَ: مَا فَرَّطْتُمْ میں ''مَا'' کو اگر مصدریہ بنالیں ''اور تمہیں یاد نہیں اپنا کوتاہی کرنا اس سے قبل یوسف کے بارے میں'' تو جس وقت یہ مصدر کی تاویل میں ہو جائے گا تو یہ بھی اَلَمْ تَعْلَمُوْٓا کے تحت ہوگا، اَلَمْ تَعْلَمُوْا تفریطکم من قبل فی یوسف، تمہیں یاد نہیں؟ تمہارا کوتاہی کرنا، اپنا کوتاہی کرنا یوسف کے بارے میں، یا، اس سے قبل جو کوتاہی تم نے یوسف کے بارے میں کی تھی وہ تمہیں یاد نہیں؟ فَلَنْ اَبْرَحَ الْاَرْضَ: پس میں ہرگز نہیں چھوڑوں گا اس زمین کو، اس علاقے کو، حَتّٰى يَاْذَنَ لِيْٓ اَبِيْٓ: جب تک کہ میرا باپ مجھے اجازت نہ دے دے، اَوْ يَحْكُمَ اللّٰهُ لِيْ: یا اللہ تعالیٰ میرے لئے کوئی فیصلہ نہ فرمادے، وَهُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ: اور وہ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے، اِرْجِعُوْٓا اِلٰٓى اَبِيْكُمْ: لوٹ جاؤ تم اپنے باپ کی طرف فَقُوْلُوْا: جاکے اسے بتادو، يٰٓاَبَانَآ: اے ہمارے اَبا! اِنَّ ابْنَكَ سَرَقَ: بیشک تیرے بیٹے نے چوری کرلی، وَمَا شَهِدْنَآ اِلَّا بِمَا عَلِمْنَا: اور نہیں شہادت دی ہم نے مگر اسی چیز کی جو ہمیں معلوم ہے، یعنی ہم نے جو کہا تھا کہ ہم اس کی حفاظت کریں گے، ہم اس کو یوں کریں گے، ساتھ لے کے آئیں گے، ''نہیں شہادت دی ہم نے مگر وہی جو ہمیں معلوم ہے'' وَمَا كُنَّا لِلْغَيْبِ حٰفِظِيْنَ: اور غیب کی ہم حفاظت کرنے والے نہیں تھے، ہمیں کیا پتا تھا کہ غیب سے کیا معاملہ پیش آنے والا ہے، وہ ہمیں کوئی محفوظ نہیں تھا کہ کیا ہو جائے گا، وَسْـَٔلِ الْقَرْيَةَ الَّتِيْ كُنَّا فِيْهَا: اور پوچھ لے اس بستی سے، ''بستی''

بول کر ''اہلِ بستی'' مراد ہیں، پوچھ لے اس شہر والوں سے جس کے اندر ہم تھے، ''قریہ'' کا لفظ یہاں مصر پر بولا گیا ہے جو دارالخلافہ تھا، بڑے شہر پہ بولا گیا ہے، ''پوچھ لے تو ان شہر والوں سے جس کے اندر ہم تھے'' وَالْعِيْرَ الَّتِيْٓ اَقْبَلْنَا فِيْهَا: اور پوچھ لے ان قافلہ والوں سے جن کے اندر ہم واپس آئے، جس قافلے میں ہم واپس آئے ہیں ان قافلے والوں سے پوچھ لو، وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ: بیشک ہم سچے ہیں، قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا: یعقوب علیہ السلام نے کہا کہ میرے بیٹے نے چوری نہیں کی (بل اِضراب کے لئے آتا ہے) نہیں! نہیں! چوری نہیں کی میرے بیٹے نے! بلکہ تمہارے لئے تمہارے نفسوں نے کوئی بات بنالی ہے، فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ: پس میں صبرِ جمیل اختیار کرتا ہوں، صبرِ جمیل میرا کام ہے، ''صبرِ جمیل'' وہ ہوتا ہے جس میں شکوہ شکایت کی نوبت نہ آئے، عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَنِيْ بِهِمْ جَمِيْعًا: مجھے اُمید ہے کہ اللہ تعالیٰ عنقریب ان کو لے آئے گا سب کو، یعنی اپنے دِل کے یقین کے طور پر کہتے ہیں کہ یوسف بھی صحیح ہے، بنیامین بھی ہے، اور تیسرا بھائی جو خود رہ گیا تھا، بہت قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سب کو میرے پاس لے آئے گا، اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ: بے شک وہ علم والا ہے حکمت والا ہے، یعنی مجھے اللہ کی رحمت سے اُمید ہے کہ سب بیٹے آجائیں گے، کیونکہ حضرت یعقوب علیہ السلام یہ یقین کئے ہوئے تھے کہ یوسف علیہ السلام کا خواب سچا ہے، اور اس خواب کے اندر یہ بھی تھا کہ جس وقت یوسف علیہ السلام کو عظمت ملے گی تو گیارہ بھائی موجود ہوں گے، گیارہ ستارے، تو ایسا واقعہ پیش آئے گا کہ جس وقت یوسف علیہ السلام کو ایک عظمت ملے گی، اس وقت گیارہ بھائی بھی موجود ہوں گے، اور یعقوب علیہ السلام اور ان کی بیوی بھی موجود ہوگی، اس لئے فرماتے ہیں کہ سب ٹھیک ہیں، مجھے اُمید ہے کہ سب آئیں گے، اکٹھے ہوں گے، وَتَوَلّٰى عَنْهُمْ: اور ان کی طرف سے منہ موڑ لیا، وَقَالَ: اور کہا، يٰٓاَسَفٰى عَلٰى يُوْسُفَ: ہائے افسوس یوسف پر! وَابْيَضَّتْ عَيْنٰهُ مِنَ الْحُزْنِ: سفید ہوگئیں اس کی آنکھیں غم کی وجہ سے، فَهُوَ كَظِيْمٌ: اور وہ گھٹنے والے تھے، یعنی دِل ہی دِل میں جب صدمہ دبایا جائے تو اندر سے انسان بھر سا جاتا ہے، غم سے بھرا ہوا، ''وہ گھٹنے والے تھے''، اُٹھ کے گئے تو یوسف کا صدمہ یاد آ گیا تو ''ہائے یوسف!'' بس یہ لفظ زبان سے نکلے اور آگے ان کا حال ہے کہ غم کی وجہ سے ان کی آنکھیں سفید ہوگئی تھیں، یعنی رونے کی وجہ سے آنکھوں کی سیاہی ختم ہوگئی جس کے نتیجے میں نابینا ہوگئے تھے، فَهُوَ كَظِيْمٌ: پس وہ گھٹنے والے تھے، یعنی دِل ہی دِل میں گھٹے گھٹے رہتے تھے، قَالُوْا تَاللّٰهِ تَفْتَؤُا: وہ کہنے لگے کہ اللہ کی قسم! تَفْتَؤُا یہ اصل میں لَا تَفْتَؤُا ہے۔ قَالُوْا تَاللّٰهِ تَفْتَؤُا تَذْكُرُ يُوْسُفَ حَتّٰى تَكُوْنَ حَرَضًا اَوْ تَكُوْنَ مِنَ الْهٰلِكِيْنَ: وہ کہنے لگے اللہ کی قسم! تُو ہمیشہ یاد کرتا رہے گا یوسف کو حتیٰ کہ ہوجائے گا تُو قریب الہلاک، حَرَض کہتے ہیں جس کو مرض اتنا پگھلا دے کہ مرنے کے قریب چلا جائے، ''حتیٰ کہ ہوجائے گا تو قریب الہلاک یا ہوجائے گا تو ہالکین میں سے ہی'' یا مرنے کے کنارے لگ جاؤ گے، یا مر ہی جاؤ گے یاد کرتے کرتے، اس کی یاد کو چھوڑو گے نہیں، قَالَ اِنَّمَآ اَشْكُوْا بَثِّيْ وَحُزْنِيْٓ اِلَى اللّٰهِ: یعقوب علیہ السلام نے کہا کہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ میں اپنی پریشانی اور اپنے حزن کو اللہ کے سامنے ظاہر کرتا ہوں، اَشْكُوْا: میں شکایت کرتا ہوں، بیان کرتا ہوں، بَثِّيْ: اپنا اِضطراب، اپنی پریشانی، حُزْنِيْٓ: اپنا غم، اِلَى اللّٰهِ: اللہ کی طرف، یعنی صبر کے خلاف وہ چیز ہے جو مخلوق کے سامنے شکوہ شکایت کی جائے، اللہ کے سامنے تو جتنا رو وَ اتنا اچھا ہے، میں اللہ کے سامنے اپنی پریشانی اور غم کو پھیلاتا ہوں، ظاہر کرتا ہوں، وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ: اور میں جانتا ہوں اللہ کی طرف سے جو تم نہیں

جانتے، یٰبَنِیَّ اذْهَبُوْا: اے میرے بیٹو! جاؤ۔ بَنِیَّ جمع ہے، بَنِیْنَ تھا، نون اضافت کی وجہ سے گر گیا، تو یاء کو یائے متکلم میں ادغام کردیا۔ ''اے میرے بیٹو! جاؤ'' فَتَحَسَّسُوْا مِنْ یُّوْسُفَ: تلاش کرو یوسف کو، وَاَخِیْهِ: اور اس کے بھائی کو، وَلَا تَایْـَٔسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللهِ: اور اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہوو، اِنَّهٗ لَا یَایْـَٔسُ مِنْ رَّوْحِ اللهِ: بیشک بات یہ ہے کہ نہیں مایوس ہوتے اللہ کی رحمت سے اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ: مگر کافر لوگ ہی، کافر لوگوں کے علاوہ اللہ کی رحمت سے کوئی مایوس نہیں ہوتا۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

تفسیر

برادرانِ یوسف کا مصر کی طرف دُوسرا سفر اور بنیامین کے ساتھ ان کا رویّہ

یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کا یہ دوسرا سفر ہے جس کی داستان اِس رکوع کے اندر ذکر کی گئی، پہلے سفر میں انہوں نے غلّہ حاصل کیا اور یوسف علیہ السلام سے اپنے بھائی کو لانے کا وعدہ کرلیا تھا، واپس گئے تو جا کے اپنے باپ کے سامنے یہ ضرورت ذکر کی کہ اس بھائی کو بنیامین کو ہمارے ساتھ بھیجو ورنہ غلّہ نہیں ملے گا، اور حفاظت کا وعدہ کرلیا، اور حضرت یعقوب علیہ السلام نے بھی اپنی طرف سے پوری احتیاطی تدبیر اختیار کر کے بنیامین کو ساتھ جانے کی اجازت دے دی، وہ ساتھ لے کے واپس پہنچ گئے، یوسف علیہ السلام کے سامنے چلے گئے، قرآنِ کریم زائد باتیں نقل نہیں کرتا، اپنے مقصد کی بات آپ کے سامنے بیان کرتا ہے، حالات کی رَوِش سے معلوم یوں ہوتا ہے کہ یوسف علیہ السلام کے گھر سے چلے جانے کے بعد یعقوب علیہ السلام کی توجہ ساری کی ساری بنیامین کی طرف ہوگئی تھی، اور جو ان کا مقصد تھا گھر سے یوسف کو نکالنے کا وہ حاصل نہیں ہوا تھا، یعقوب علیہ السلام یوسف کو یاد کرتے رہتے اور بنیامین کے ساتھ اپنا دِل بہلاتے، ان کا مقصد تھا کہ ساری توجہ پھر ہماری طرف ہوجائے گی جس وقت یوسف ان کی آنکھوں کے سامنے نہیں ہوگا، تو یہ مقصد ان کا حاصل نہ ہوا، تو جس طرح سے ان کے جذبات یوسف علیہ السلام کے متعلق تھے بنیامین کے متعلق بھی ایسے ہی تھے، گھر کے اندر بھی اس کے ساتھ کوئی گڑ بڑ کرتے رہتے ہوں گے، اور پھر جس وقت سفر میں اس کو ساتھ لے کے آئے تو راستے کے اندر بھی طعن وتشنیع کرتے رہے ہوں گے، وہ دس ایک پارٹی تھی اور یہ ایک ان سے علیحدہ تھا۔

یوسف علیہ السلام کا بنیامین کے سامنے اپنے آپ کو ظاہر کرنا اور تسلی دینا

تو یوسف علیہ السلام کے پاس جس وقت یہ پہنچے ہیں تو یوسف علیہ السلام نے کسی طرح سے ان کو ان بھائیوں سے علیحدہ کرلیا، علیحدہ کر کے ان کے سامنے اظہار کردیا کہ میں تیرا حقیقی بھائی ہوں، اور انہوں نے پھر داستان سُنائی ہوگی، یوسف علیہ السلام نے اپنی سُنائی ہوگی کہ میرے ساتھ انہوں نے یوں کیا، اور بنیامین نے اپنے قصے سُنائے ہوں گے کہ میرے ساتھ یہ یوں کرتے ہیں، اس لیے یوسف علیہ السلام نے کہا کہ فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ: بس جو کچھ ہوگیا اب اس کی وجہ سے غم نہ کرو، اب آئندہ ایسی کوئی نوبت نہیں آئے گی، یہ تسلی دے دی، یعنی یہ ساری کی ساری داستان فَلَا تَبْتَئِسْ سے نکل رہی ہے جو میں کہہ رہا ہوں کہ وہ بنیامین کو بھی پریشان کرتے

ہوں گے، طعن وتشنیع کرتے ہوں گے، ان کے ساتھ ان کے ہمدردی کے جذبات نہیں ہوں گے، راستے کے اندر بھی مختلف طریقوں سے اس کو پریشان کیا ہوگا، تو وہ ساری داستان بنیامین نے سُنائی ہوگی، یوسف علیہ السلام نے بھی اپنے حالات ذکر کیے ہوں گے، جس طرح سے دو بھائی ملتے ہیں تو آپس میں دُکھ سکھ کرتے ہیں، تو پھر کہا کہ فَلَا تَبْتَىٕسْ بِمَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ: جو کچھ یہ کرتے رہے ہیں ان کی وجہ سے اب تو غم نہ کر۔

یوسف علیہ السلام بنیامین کو اپنے پاس کیوں رکھنا چاہتے تھے؟

فَلَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَازِهِمْ: اب آگے جو ذکر کیا گیا ہے وہ ساری کی ساری تدبیر ہے بنیامین کو اپنے پاس رکھنے کی، اور یہ تدبیر کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ معلوم یوں ہوتا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے حضرت یوسف علیہ السلام کو ابھی اپنے آپ کے اظہار کی اجازت نہیں ملی تھی کہ یعقوب علیہ السلام کو اطلاع بھجوادیں کہ میں محفوظ ہوں، اور ان کا وہ غم، دُکھ، درد اِختتام کو پہنچ جائے، بلکہ اللہ تعالیٰ ابھی یعقوب علیہ السلام کو کچھ اور آزمانا چاہتا تھا، اور ان بھائیوں کو بھی کچھ ان کے کردار کی بنا پر تنبیہ کرنی مقصود تھی کہ حالات کچھ اس قسم کے پیدا ہوجائیں کہ ان کو بھی کچھ سرزنش ہوجائے اور ان کو بھی اپنی غلطی کا احساس ہوجائے، لیکن بنیامین سے جس قسم کے حالات سنے تھے ان حالات کی بنا پر وہ بھائیوں کے ساتھ اس کو واپس بھی بھیجنا نہیں چاہتے تھے، کیونکہ ان کو یہ خیال تھا کہ ان حالات کے تحت یہ لے تو آئے ہیں اس غرض سے کہ اگر یہ میرے تک نہ لے کے آتے تو غلّہ نہ ملتا، لیکن جب غلّہ لے کے یہاں سے چلے جائیں گے پھر تو بنیامین کی ضرورت ختم ہوگئی، تو کہیں ایسا نہ ہو کہ راستے کے اندر اس کے ساتھ بھی کوئی ایسی کارروائی کرلیں جیسے میرے ساتھ کی تھی، لانے میں تو آگئے ساتھ، کیونکہ ضرورت تھی کہ اگر نہ لے کے آتے تو غلّہ نہ ملتا، اس مجبوری کے تحت لے آئے، راستے میں ضائع نہیں کیا، لیکن اب جس وقت غلّہ حاصل ہوگیا اب تو ان کو کوئی مجبوری نہیں ہے، تو جب یہ واپس جائیں گے تو ہوسکتا ہے کہ راستے کے اندر اس کا بھی نقصان کردیں، اس لیے کسی صورت میں بھی یوسف علیہ السلام اپنے بھائی کو اس ہلاکت کے اندر ڈالنا نہیں چاہتے تھے، لیکن اگر بِلاوجہ روکتے تو کیوں روکتے؟ کیسے روکتے؟ بات ظاہر ہوتی تھی، یا وہ بھائی اَڑ کے بیٹھ جاتے کہ وجہ بتاؤ، کیوں ہمارے ساتھ اس ہمارے بھائی کو نہیں بھیجتے؟ ہم تو اپنے باپ سے پختہ عہد کر کے آئے ہیں، ہم نے تو اس کو لے کے جانا ہے، وہ بھائی بھی اَڑی کرتے، معاملہ مخفی نہ رہ سکتا، اور بظاہر یہ ظلم بھی ہوتا کہ بِلاوجہ ایک مسافر کو گرفتار کر کے بٹھالیا، وجہ بھی کوئی نہیں بتائی گئی یہ بظاہر ظلم بھی ہوتا، اور یوسف علیہ السلام کا جو معیار تھا احسان کا، عدل کا انصاف کا، اس کے بھی یہ بات خلاف ہوتی، اب اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے کچھ حالات اس قسم کے پیدا کردیے گئے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیدا کردیے گئے......! کیونکہ ساری کارروائی کی ذمہ داری اللہ نے قبول کی کہ كِدْنَا: ہم نے یہ تدبیر کی یوسف کے لئے۔

’’توریہ‘‘ کی حقیقت

اب یہ تدبیر کس طرح سے ہوئی؟ اہلِ علم کی اِصطلاح میں ایک لفظ استعمال ہوتا ہے ’’توریہ‘‘، ایک ہوتا ہے صراحتاً جھوٹ بولنا، ایک ہوتا ہے کہ بات اس انداز سے کی جائے کہ کرنے والے کے نزدیک وہ بات صحیح ہے، لیکن سننے والا مطلب کوئی ایسا سمجھ

لے جو کہ خلافِ واقع ہے، اور وہ اس مطلب کے تحت کسی چکّر میں آجائے اس کو کہتے ہیں ''توریہ''۔ سرورِ کائنات ﷺ کی زندگی میں بھی اس قسم کے واقعات ہیں کہ ایک دفعہ (ہجرت کے موقع پر) حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور سرورِ کائنات ﷺ چلے جارہے تھے تو ابوبکر سے کسی نے پوچھا کہ ''مَنْ هٰذَا؟'' یہ کون ہیں؟ اور ابوبکر ظاہر نہیں کرنا چاہتے تھے کہ یہ اللہ کے رسول ہیں، کیونکہ شہرت تو اس وقت تھی عرب میں، اس خیال سے ظاہر نہیں کرنا چاہتے تھے کہ کوئی نقصان نہ پہنچادے، تو جواب دیتے ہیں کہ ''رَجُلٌ یَهْدِیْنِی الطَّرِیْقَ'' یہ ایک آدمی ہے جو مجھے راستہ دِکھاتا ہے! اس زمانے میں چونکہ رواج تھا کہ جب باہر سفر پہ جاتے تھے تو راستہ دِکھانے والا بھی ساتھ لے لیا کرتے تھے، جو راستوں کے ماہر ہوتے وہ راہنمائی کا کام کرتے تھے، دِلیل، ہادی، راہنما۔ تو سننے والے نے سمجھا کہ شاید یہ کوئی ایسا ہی شخص ہے جو ابوبکر نے ساتھ لے لیا ہے جو اس کو راستہ بتاتا جارہا ہے کہ اِدھر کو جانا ہے اور اُدھر کو جانا ہے، اور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بات صحیح تھی کہ حضور ﷺ رَجل کا مصداق بھی تھے، اور ہادی بھی تھے، ہدایت بھی دیتے تھے، راستہ دِکھاتے تھے، لیکن اس راستے سے یہ ریگستانی راستہ مراد نہیں تھا، پہاڑوں کا راستہ مراد نہیں تھا، دِین کا راستہ مراد تھا۔ جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعے میں آپ کے سامنے گزرا کہ جب اس جابر (بادشاہ) نے پوچھا تھا کہ یہ تیرے ساتھ کون ہے؟ تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہہ دیا کہ میری بہن ہے، اور ابراہیم علیہ السلام کے دِل میں کیا تھا کہ یہ میری اسلامی بہن ہے، مذہبی طور پر دونوں آپس میں بہن بھائی ہیں، یا چچے کی بیٹی بھی بہن ہی ہوتی ہے، تو اس کا بیوی ہونا چھپالیا، اور سننے والے نے سمجھا کہ حقیقی بہن ہے اور حقیقی بہن سمجھ کے اس نے وہ معاملہ کیا، اور اگر اس کو پتا چلتا کہ بیوی ہے تو دوسرا معاملہ کرتا۔ تو اس قسم کے معاملات جو ہوا کرتے ہیں کہ ایسی بات کہہ دی جائے جس کا مطلب بولنے والے کے نزدیک اور ہو اور اس مطلب کے تحت وہ بالکل صحیح ہو، لیکن سننے والا اس کا مطلب کوئی ایسا سمجھ لے تبادُر کے طور پر جو خلافِ واقع ہے اور اس وجہ سے وہ کسی چکّر میں پڑ جائے یا کوئی نقصان نہ پہنچا سکے، تو نقصان سے بچنے کے لئے، دَفعِ مضرّت کے لئے اس قسم کی کارروائی جو کرلی جاتی ہے اس کو ''توریہ'' کہتے ہیں، وَرّٰی تَوْرِیَۃً، وری اس کا مادّہ ہے، وَارٰی یُوَارِیْ مُوَارَاۃً: چھپانا، یہ لفظ قرآنِ کریم میں بھی آیا ہوا ہے، کَیْفَ یُوَارِیْ سَوْءَۃَ اَخِیْهِ (المائدہ:۳۱) تو وَرّٰی تَوْرِیَۃً کا معنی ہوتا ہے حقیقت پہ پردہ ڈال دینا، یعنی ایسی کلام اختیار کرلی جس نے حقیقت پہ پردہ ڈال دیا، دوسرے کے سامنے حقیقت نمایاں نہ ہوئی، بات کرنے والا سمجھتا ہے کہ اس بات کی کیا حقیقت ہے۔

بنیامین کے سامان میں پیالہ رکھنے سے یوسف علیہ السلام کا مقصد اور اس کے بعد پیش آنے والی صورتِ حال (پہلا قول)

اب اس کو بعض مفسرین نے تو یوں ادا کیا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے دِل میں یہ جذبہ تھا کہ بنیامین کسی طرح سے رہ جائے لیکن رکھنے کی کوئی صورت سمجھ میں نہیں آتی تھی، اور بنیامین بھی چاہتے تھے کہ میں کسی طرح سے رہ جاؤں لیکن معاملے کو ظاہر کرنے کی ابھی اجازت نہیں تھی، تو یوسف علیہ السلام اس کو روکنے کے لئے کچھ نہ کرسکے، جس وقت یہ لوگ واپس ہونے لگے، اپنے سامان لے کر جانے لگے، تو پہلے جس طرح سے بھائیوں کے ساتھ مروّت کی تھی یوسف علیہ السلام نے کہ خفیہ طور پر ان کی پُونجی ان کی بوریوں میں

دلوادی تھی، کہ جائیں جا کے اپنی یہ ضرورت پوری کرلیں گے، بعد میں ان کے پاس پیسے ہوں گے پھر آ جائیں گے، یہ بھائیوں کے ساتھ مروّت کی تھی کہ ان کا سرمایہ ان کی بوریوں میں ڈال دیا، ان کو کوئی پتا نہیں تھا، وہاں جا کے پتا چلا کہ ہماری بوریوں میں کچھ ڈال دیا ہے، اسی طرح سے یوسف علیہ السلام نے اپنے اس خاص بھائی کے ساتھ مروّت کرتے ہوئے کہ اب جا تو یہ رہا ہی ہے مدد کرنے کی تو کوئی صورت نہیں، تو ایک قیمتی سا پیالہ چپکے سے اس کی بوری کے اندر رکھ دیا کہ جب یہ چلے جائیں گے، چلے جانے کے بعد کھولیں گے، کھولنے کے بعد یہ پیالہ اس کو مل جائے گا تو یہ ایک نشانی بھی ہوگی، یہ تو سمجھے گا کہ یوسف کی ہے، اور ایک قیمتی چیز مل جائے گی جو سرمائے کا کام بھی دے سکتی ہے، تو گویا کہ تحفہ اور ہدیہ کے طور پر خفیہ اس کی بوری کے اندر رکھ دیا، آگے کوئی کارروائی یوسف کے ذہن میں نہیں ہے کہ کیا ہوگا، کیا نہیں ہوگا؟ یہ گویا کہ ہدیے کے طور پر، تحفے کے طور پر، مروّت کے طور پر قیمتی سا پیالہ جو تھا چپکے سے، ظاہر نہیں کیا کسی کے سامنے، چپکے سے رکھ دیا، رکھ کے یوسف علیہ السلام تو ہو گئے فارغ، آپ نے آگے کچھ نہیں کیا، کسی دوسرے کو پتا نہیں تھا، جس وقت یہ قافلے والے گئے تو پیچھے جو کارندے تھے انہوں نے اپنے سامان کا جائزہ لیا تو وہ پیانہ جو تھا، شاہی پیانہ، قیمتی سا پیالہ، وہ کہیں نظر نہیں آیا، اب آپ جانتے ہیں کہ جب اس مکان سے یہ لوگ اُٹھ گئے ہیں اور اس کے بعد ایک سامان ملتا نہیں ہے، تو خیال یہی ہوگا کہ یہ جو باہر کے لوگ تھے یہ اُٹھا کے لے گئے، اگلی کارروائی ساری کارندوں کی ہے، وہ پیچھے بھاگے قافلے والوں کے، اور ان کو آواز دی کہ او قافلے والو! تم تو چور ہو، ہمارا سامان نقصان ہو گیا، اب وہ پیچھے متوجہ ہوئے اور متوجہ ہو کے کہنے لگے کہ کیا گم ہو گیا؟ پہلے تو یہ پوچھا کہ کیا گم ہو گیا؟ تم جو کہہ رہے ہو کہ تم چور ہو، تمہارا کیا گم ہو گیا؟ وہ کہنے لگے کہ ہمارا شاہی پیانہ نہیں ملا، جہاں سے تم اُٹھ کے آئے ہو وہیں پڑا ہوا تھا اور اب وہ مل نہیں رہا، تو وہ آگے سے کہتے ہیں کہ تمہیں معلوم ہونا چاہیے یہ ہمارا دوسرا سفر ہے، پہلے سفر میں بھی ہم آئے تھے، ہمارے حالات دیکھ کے تمہیں اندازہ نہیں ہوا؟ کہ ہم کس قسم کے شریف لوگ ہیں، ہم کوئی فساد مچانے والے نہیں ہیں، اور نہ ہم کوئی چور ہیں جو اس طرح سے آ گئے، تو وہ کہنے لگے کہ جی! پیانہ تو گم ہوا ہے، اب اگر ہمارے اُوپر گرفت ہو گئی سردار کی طرف سے تو ہم کیا کریں گے؟ مہربانی کر کے کوشش کرو، کہیں سے پیالہ تلاش کرو، اگر مل گیا تو ہم اِنعام کا وعدہ کرتے ہیں کہ ایک اُونٹ کا بوجھ اس کو انعام کے طور پر دیں گے، اور اعلان کرنے والے نے کہا کہ میں ذمہ لیتا ہوں کہ میں حکومت کی طرف سے ایک اُونٹ کا بوجھ دِلواؤں گا، پیالہ دے دو جس کے پاس ہے، گویا کہ ترغیب دے کے ان سے پیالہ حاصل کرنے کی کوشش کی، لیکن جب وہ نہیں مانے تو گھیر کے ان کو واپس لے آئے، کہ چلو پھر ہم تمہارے سامان کی تلاشی لیتے ہیں، جب وہ گھیرے گھرائے واپس آ گئے، بنیامین کو بھی پتا نہیں ہوگا کہ میرے سامان میں کچھ ہے، جس وقت گھیرے ہوئے واپس آ گئے تو آنا تو پھر حکومت کے سامنے ہی تھا، یوسف علیہ السلام کے سامنے آ گئے، اور بات ان سے (پہلے) ہو گئی کہ اچھا! تم مانتے نہیں، بتاؤ اگر کسی کے سامان سے نکل آیا اور تم چور ثابت ہو گئے تو پھر کیا سزا ہوگی؟ وہ کہنے لگے جی! ہمارے دستور کے مطابق تو جو چور ہو اس کے فعل کی سزا میں اسے لے لیا جاتا ہے، تو اس کو غلام بنا کے رکھ لینا اگر کسی کے ہاں سے نکل آیا، ہماری طرف سے تمہیں اجازت ہے۔ بات یہاں تک پہنچ گئی، جب بات یہاں تک پہنچ گئی، یوسف علیہ السلام کے سامنے پیش ہوئے تو یوسف علیہ السلام کو تو پتا تھا کہ میں نے پیالہ رکھا

ہے، تو جب بات یہاں تک پہنچ گئی تو انہوں نے بھی برداشت کر لی کہ ٹھیک ہے اگر اس بہانے سے بنیامین رہتا ہے تو اور ہمیں کیا چاہیے، تو جاتے ہی پہلے بنیامین کی بوری کو ہاتھ نہیں ڈالا کہ دیکھنے والے کو شبہ پڑ جائے کہ تمہیں تو پتا تھا کہ اس میں ہے، پہلے دوسرے بھائیوں کی بوریاں ڈھیری کروائیں اور ان میں تلاشی لی، کچھ نہ نکلا، آخر آخر میں بنیامین کی بوری دیکھی تو اس میں سے پیالہ نکل آیا، جب پیالہ نکل آیا تو بھائی بھی شرم کے مارے سرنگوں ہو گئے، ان کے سر بھی نیچے ہو گئے، اور بنیامین تو دل دل کے اندر سوچتے ہوں گے کہ چلو کوئی بات نہیں، چاہے چور ہی قرار پا جاؤں لیکن رہوں گا یہاں، جانا نہیں، اس لیے وہ نہیں بولے، ورنہ بولنے کی گنجائش تھی کہ جی! مجھے نہیں پتا، ہوسکتا ہے تمہارے بھرنے والوں نے رکھ دیا ہو، مجھے کیا معلوم، تو انہوں نے بھی صفائی دینے کی کوشش نہیں کی، وہ بھی چپ ہو گئے، چپ ہونے کا مطلب یہ تھا کہ انہوں نے اس جرم کو تسلیم کر لیا، بات جس قسم کی بن رہی تھی انہوں نے تسلیم کر لی، تو جس وقت وہ پیالہ نکل آیا تو بھائی ہو گئے شرمسار، اب ان کو یہ تنبیہ بھی ہے کہ آج دیکھو! کس طرح سے چوروں کی صورت میں یہ پکڑے ہوئے سامنے کھڑے ہیں، ان کے کردار پر ان کو کچھ سزا بھی دینا مقصود ہے، شرمسار کرنا بھی مقصود ہے اللہ تعالیٰ کی جانب سے، تاکہ انہیں کچھ تنبیہ ہو جائے، تو یوسف علیہ السلام نے بنیامین سے کہا کہ آ جاؤ پھر ادھر، تمہاری گونی سے جو نکلا ہے تو اس لیے اب تم نہیں جا سکتے، تم یہیں رہو ہمارے پاس، اب بھائی حیران ہیں پریشان ہیں کہ کیا کریں؟ پہلے تو غصے کا اظہار کیا بنیامین پر، کہنے لگے کہ اچھا! یہ چور ہے، اگر اس نے چوری کی ہے تو کوئی تعجب کی بات نہیں اس کا ایک اور بھائی تھا وہ بھی چور تھا، وہ بھی چوری کیا کرتا تھا، اس نے بھی چوری کی تھی، اب یہ جھوٹ بولا، سراسر بہتان لگا دیا یوسف علیہ السلام پر بھی محض غصہ نکالنے کے لئے، یعنی یہ تاثر دینے کے لئے کہ ان میں یہ عادت ان کی ماں کی جانب سے آئی ہے، یہ ہمارا حقیقی بھائی نہیں ہے، اگر ہمارا بھائی ہوتا تو جس طرح ہم چور نہیں یہ بھی چور نہ ہوتا، تو یوسف علیہ السلام نے اس بات کو دل میں دبا لیا اور اس کے اوپر کوئی اثر ظاہر نہیں کیا، دل دل میں کہا کہ بڑے بدتر لوگ ہو کہ اس کو چور بنا رہے ہو، اور ساتھ ساتھ اُس پر بھی چوری کا الزام لگا رہے ہو، اور خود اپنا پتا نہیں کہ اس کے سامان میں سے تو ایک پیالہ نکلا ہے، اور خود باپ سے کس طرح سے اس کے بیٹے کو چرایا، کس طرح سے قافلے کے ہاتھ میں بیچا، خود بڑے پاک دامن بنتے ہیں کہ ہم چور نہیں ہیں، اور یہ چور ہے اور اس کا بھائی بھی چور تھا، خود اپنا کردار یاد نہیں۔ یا ان کو تنبیہ کرتے ہوئے کہا کہ بھئی! اللہ ہی بہتر جانتا ہے جو کچھ تم کہتے ہو، ابھی تو کہتے تھے کہ ہم چور نہیں ہیں اور ابھی اس کو بھی چور بنا دیا اور اس کے کسی بھائی کو بھی چور بنا رہے ہو، تمہارا کچھ پتا نہیں چلتا کہ تم کیا لوگ ہو، یہ تنبیہ کرنے کے لئے اس طرح سے زبانی ان کو کہہ دیا ہو، اور بنیامین کو رکھ لیا۔ اس طرح سے تقریر کی جائے تو آپ کے سامنے بات آ گئی کہ یوسف علیہ السلام کا فعل صرف اتنا ہے کہ آپ نے گونی کے اندر پیالہ رکھا، باقی رکھا کس مقصد کے لئے تھا؟ اس میں یہ ہوسکتا ہے کہ بھائی کو ایک تحفہ اور ہدیہ دینا مقصود ہو، جس طرح سے پہلے بھائیوں کی گونیوں کے اندر ان کی پونجی ڈال دی تھی، اور آگے جو کچھ ہوا یہ واقعات اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیش آ گئے، چور کی سزا بھی ان سے پوچھ لی گئی، ورنہ اگر واقعۃً چوری ہوتی اور پکڑے جاتے تو بادشاہ کے قانون میں پھر بھی بنیامین کو وہ اپنے پاس رکھ نہیں سکتے تھے، کوئی اور سزا ہوگی، مالی تاوان ڈال دیا جاتا، مار پٹائی کا قانون ہوگا، بہر حال ان سے پوچھ کر جو سزا تجویز کی گئی تو اس بہانے

سے بنیامین کو یہاں ٹھہرا دیا گیا، یہ سارے کے سارے حالات اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہوئے، اور ہوئے یوسف علیہ السلام کے دل کی خواہش کے مطابق، وہ بنیامین کو رکھنا چاہتے تھے، اللہ تعالیٰ نے ایسی تدبیر کردی کہ بنیامین رہ گئے، بس زیادہ سے زیادہ بات یہاں یہ آتی ہے کہ جب یہ واقعہ اس حد تک پہنچا ہوگا کہ وہ چور بن کے آگئے اور ان کے مال کی تلاشی شروع ہوگئی تو یوسف علیہ السلام نے بتایا نہیں کہ یہ پیالہ میں نے رکھا ہے، خاموشی اختیار کرلی، اور خود اپنی زبان سے ان کے اُوپر الزام بھی نہیں لگایا، بلکہ جب انہوں نے کہا کہ اس کا باپ بوڑھا ہے، یہ نہیں جائے گا تو اس کو پریشانی ہوگی، ہم میں سے کسی کو رکھ لو، اس کو چھوڑ دو، تو یہ کہا کہ نہ بھئی! ہم تو اسے رکھیں گے جس کی بوری سے پیالہ نکلا ہے، ہم تو اسے رکھیں گے، کیونکہ وہ رکھنا ہی اسے چاہتے تھے، یہ نہیں کہا کہ جس نے چوری کی ہم تو اسے رکھیں گے، نہیں! جس کے پاس ہمارا سامان نکلا ہے ہم تو صرف اسی کو رکھیں گے ہم دوسرے کو نہیں رکھیں گے، اگر دوسرے کو رکھیں گے تو تمہارے خیال کے مطابق ہمارا یہ عمل ظلم ہوگا کہ جرم کسی نے کیا ہے پکڑا کوئی گیا، ہم ایسا نہیں کریں گے۔ تو اس تقریر کے مطابق حضرت یوسف علیہ السلام پر کوئی کسی قسم کا الزام نہیں آتا۔

عام مفسرین کا دُوسرا قول

لیکن عام طور پر مفسرین نے اس کو اس انداز سے بھی ذکر کیا ہے کہ یوسف علیہ السلام کے کہنے سے پیالہ رکھا گیا، یوسف علیہ السلام کے کہنے کی بنا پر اَیَّتُهَا الْعِیْرُ اِنَّكُمْ لَسٰرِقُوْنَ کی آواز دی گئی، لیکن یوسف علیہ السلام کا مقصد سارقون سے تھا وہ جو چوری کی تھی اپنے باپ سے بیٹے کو چُرا کے لے گئے اور جا کے اس طرح سے جھوٹ بولا اور اس طرح سے جا کے بیچ دیا، یوسف علیہ السلام کی نظر میں وہ واقعہ تھا کہ تم سارے کے سارے چور ہو، جنہوں نے اپنے اَبا سے چوری چوری سارے کے سارے معاملات کیے تھے، وہ سمجھے کہ ہم نے ظاہری کوئی چوری کی ہوئی ہے، ان کو تنبیہ کرنی مقصود تھی، تو یوسف علیہ السلام کے دِل میں کچھ تھا اور ان کے دِل میں کچھ آیا، جب وہ واپس آگئے تو انہی سے سزا پوچھی، کیونکہ یوسف علیہ السلام کو معلوم تھا کہ یعقوب علیہ السلام کی شریعت میں چور کی سزا یہ ہے کہ چوری کرنے والے کو اس کا غلام بنا دیا جاتا ہے جس کی چوری کی گئی، اس لیے سزا انہی سے پوچھی، اور ان سے پوچھنے کے بعد بنیامین کو اپنے پاس رکھ لیا۔ اس انداز کے ساتھ اگر تقریر کی جائے تو پھر یہ توریہ ثابت ہوتا ہے، پہلے میں تو ''توریہ'' بھی نہیں ہے کیونکہ یوسف علیہ السلام نے اپنی زبان سے کوئی بات ایسی نہیں کہی، یا ''توریہ'' ثابت ہوگا ان کو چور کہنے کی بنا پر، کہ یوسف علیہ السلام کا اشارہ اس واقعے کی طرف تھا جو انہوں نے اپنے باپ سے چوری چوری کیا تھا، اور وہ سمجھے کہ ہم نے کوئی نقد چوری کی ہے، جس کے بعد حالات اس قسم کے پیدا ہوگئے کہ بنیامین کو روک لیا گیا۔ اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ حالات ہم نے پیدا کردیے، یہ تدبیر ہم نے کی یوسف کے لئے، ورنہ بادشاہ کے قانون کے مطابق یوسف اپنے بھائی کو رکھ نہیں سکتے تھے۔

برادرانِ یوسف کی بنیامین کے چھڑانے کی ناکام کوشش کے بعد آپس میں مشورہ

بہرحال یہ معاملہ طے ہوگیا بنیامین کو روک لیا گیا، پہلے تو ان بھائیوں نے لجاجت کی یوسف علیہ السلام کے سامنے، کہ کسی طریقے

سے ان کو چھوڑ دیں، ان کا بوڑھا باپ ہے، اور اگر ان کو چھوڑنے پر آپ آمادہ ہی نہیں ہیں تو چلو ہم شخصی ضمانت دے دیتے ہیں کہ اس کو چھوڑ دو، ہم میں سے کسی ایک کو رکھ لو، اب اگر یہ صورت منظور کر لی جاتی تو آپ بھی جانتے ہیں کہ پھر بنیامین کا راستے میں وہ کیا حال کرتے، اگر اپنے میں سے ایک چھوڑ کے چلے جاتے بنیامین کو چھڑا کے لے جاتے پھر تو اور بھی زیادہ ان کی عداوت بھڑکتی، یوسف علیہ السلام کسی صورت میں ماننے کے لئے تیار نہ ہوئے، نہ بوڑھے باپ کا حوالہ ہی تسلیم کیا کہ چونکہ بوڑھا باپ ہے، یہ نہیں جائے گا تو اس کو تکلیف ہوگی، اور نہ یہ صورت مانی کہ تم میں سے کسی کو لے لوں۔ اب آپس میں علیحدہ ہو کے خلوت میں مشورہ کرنے لگے خَلَصُوْا نَجِیًّا: علیحدہ ہو گئے وہ سرگوشی کرتے ہوئے، کہ اب کیا کیا جائے، صورت حال ایسی ہے کہ بادشاہ تو کسی صورت میں مانتا نہیں اس کو چھوڑنے کے لئے، تو پھر ان میں جو بڑا تھا وہ کہنے لگا (معلوم ہوتا ہے کہ یہ بڑا وہی تھا جس نے وہاں بھی مشورہ دیا تھا کہ قتل نہ کرو، اگر تم نے اس کو باپ کی آنکھوں سے دُور کرنا ہی ہے تو کسی کنویں میں ڈال دو، اور یہاں بھی بولنے والا وہی ہے، ''کبیر'' سے یہاں مراد علم وفضل اور عقل کے اعتبار سے بڑا معلوم ہوتا ہے، کیونکہ اگر عمر کے لحاظ سے بڑا مراد ہوتا تو ''اکبرھم'' کا لفظ آنا چاہیے تھا، تو علم وفضل عقل سمجھ کے لحاظ سے وہ ان میں سے بڑا تھا، اس کو بڑائی حاصل تھی، اس کی رائے پر وہ اعتماد کرتے تھے) وہ کہنے لگا کہ دیکھو بھئی! پہلے یوسف کے بارے میں جو کوتاہی کی ہے وہ بھی تمہیں معلوم ہے، اب یہ دوسرا واقعہ ہو گیا، اور آتے ہوئے اَبّا نے ہم سے کتنے پختہ عہد لیے تھے کہ سارے گھر جاؤ تو علیحدہ بات ہے، ورنہ میرے بیٹے کو ساتھ لے کے آئیو، اب ہم کیا منہ دکھائیں گے؟ اس لیے اب یوں کرو کہ میں تو یہاں رہتا ہوں، میں تو جاتا نہیں، تم چلے جاؤ، جا کے باپ سے صحیح صحیح واقعہ بیان کر دینا، اور انہیں کہہ دینا کہ تیرے بیٹے نے چوری کی ہے، باقی! ہم نے جو کچھ تجھے کہا تھا کہ ہم حفاظت کریں گے، وہ تو جو ہمارے علم میں تھا اس کے مطابق بات کی تھی، ہمیں کیا پتا تھا کہ غیب میں کیا مقدر ہے اور کیا ہو جائے گا؟ غیب کی بات ہم نہیں جانتے تھے، اس لیے جو ظاہری حالات تھے اس کے مطابق ہم نے آپ کے سامنے شہادت دے دی تھی، اور ہم نے کہا تھا کہ ہم حفاظت کریں گے، غیب کا معاملہ ہمارے علم میں نہیں تھا کہ کیا ہونے والا ہے اور کیا نہیں؟ یہ بات جا کے اپنے اَبّا کے سامنے بیان کرو، اب اس کے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے، غلہ بھی لے جاؤ اور گھر والوں کو پہنچا دو، بال بچوں کو تکلیف نہ ہو، اور جا کے واقعہ بھی ذکر کر دو۔ چنانچہ پھر وہ اسی طرح سے قافلے کے ساتھ گئے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کنعان کے علاقے سے اور لوگ بھی غلہ لینے کے لئے آئے ہوئے تھے، جب وہاں پہنچے تو جا کے ان بیٹوں نے اپنے باپ کے سامنے وہی بیان کیا کہ تیرے بیٹے نے چوری کر لی جس کی بنا پر وہ پکڑ لیا گیا، اور دوسرا بھائی شرم کے مارے وہاں رہ گیا کہ میں تو یہیں بیٹھا ہوں، کوئی تدبیر کروں گا، کسی طریقے سے چھوٹ جائے، اللہ تعالیٰ کوئی فیصلہ کر دے، تب میں اس کو لے کے آؤں گا، ورنہ اگر باپ بلائے گا تو میں آؤں گا، ورنہ میں بھی اس کے ساتھ یہیں بیٹھا ہوں۔

یعقوب علیہ السلام کا دُوسری مرتبہ ''سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ'' کہنا بھی واقع کے مطابق تھا

یعقوب علیہ السلام نے جس وقت یہ بات سنی تو فوراً کہا کہ نہیں بھئی! میرے بیٹے نے چوری نہیں کی، یہ بھی تم نے کوئی بات بنالی۔ اب یاد ہوگا کہ یہی لفظ کہے تھے جب انہوں نے بھیڑیے کے کھانے کا ذکر کیا تھا، وہاں تو بات واقع کے مطابق تھی اور یہاں

ظاہری طور پر واقع کے مطابق نہیں ہے، کیونکہ یہاں بیٹے سچے ہیں، انہوں نے کہا کہ ان شہر والوں سے پوچھ لو، جا کے تحقیق کرلو، جس قافلے میں ہم آئے ہیں اس قافلے والوں سے پوچھ لو، یہ واقعہ تو سب کو معلوم ہے، ہم بالکل سچے ہیں، اس میں کسی قسم کا جھوٹ نہیں ہے، اور اپنے خیال کے مطابق یہ سچے ہی تھے، لیکن یعقوب علیہ السلام نے اسی بے اعتمادی کی بنا پر کہ چونکہ پہلے ایک واقعہ ہو چکا ہے تو کہا کہ یہ بھی ان کی کوئی سکیم ہے، تو اس لیے جس وقت نبی کوئی اجتہاد کرتا ہے تو کبھی وہ خلاف واقع بھی ہوسکتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُس کو اس پر برقرار نہیں رکھا جاتا، بلکہ حقیقت نمایاں کر دی جاتی ہے، یہاں بھی بعد میں حقیقت نمایاں ہوگئی، اور معلوم ہوگیا کہ ان بیٹوں کا قصور نہیں تھا، جو کچھ ہوا یہ اللہ کی طرف سے یوسف علیہ السلام کو جس طرح سے سکھایا پڑھایا گیا تھا، اس کے مطابق ہوا۔ اور اگر حقیقت دیکھی جائے تو یہاں بھی بات حقیقت ہے کہ ذوق کے طور پر وہ اتنا سمجھ گئے کہ ہے بیٹوں کی عمل دخل، اور واقعہ بھی تھا کہ بیٹوں کی سازش تھی، کیونکہ جس نے یہ کیا تھا یعنی یوسف علیہ السلام، وہ بھی تو بیٹوں میں ہی تھا، اگرچہ پوری تفصیل کے ساتھ اس کی تعیین نہ کرسکے کہ یہ کس کی طرف سے ہوئی ہے کس کی طرف سے نہیں ہوئی، لیکن تھی بیٹوں کی بنائی ہوئی بات۔

یوسف علیہ السلام کی یاد پر غم کی تازگی اور بیٹوں کے رَدِّ عمل پر ان کو نصیحت

جب یہ واقعہ ہوا اور یعقوب علیہ السلام کے سامنے ذکر کیا گیا تو یعقوب علیہ السلام کو پُرانا صدمہ بھی تازہ ہوگیا یوسف علیہ السلام والا، وہاں سے اُٹھ کے جدھر بیٹھتے تھے کونے میں ادھر کو منہ موڑ لیا اور ”ہائے یوسف!“ کہہ کے کچھ تھوڑا سا دُکھ کا اظہار کیا۔ اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس صدمے کے ساتھ وہ جو روتے رہے تو ان کی آنکھیں سفید ہوگئی تھیں، ان کی بینائی چلی گئی، زیادہ کثرت کے ساتھ رونے سے آنکھوں کی سیاہی ختم ہوجاتی ہے، جب آنکھوں کی سیاہی ختم ہوتی ہے تو بینائی بھی ختم ہوجاتی ہے۔ پھر انہوں نے کہا، یہ بیٹوں کی ایک قسم کی ملامت ہے جو انہوں نے یعقوب علیہ السلام کے اس عمل کے اوپر کی کہ جی! آپ تو بس روتے ہی رہیں گے، یا تو بالکل ہی مر جائیں گے یا مرنے کے قریب ہوجائیں گے، یوسف کی یاد آپ کے دِل سے جاتی نہیں ہے۔ یہ ان کی بات ایسی ہے جس میں ایک قسم کا غصے کا اظہار بھی ہے، کیونکہ یوسف علیہ السلام کو دُور کرنے سے ان کا مقصد تھا کہ ان کی توجہ ہماری طرف ہوجائے اور یوسف کو یہ بھول جائیں، لیکن جب یہ حال سامنے آتا ہے کہ جیسے جیسے وقت گزرتا ہے تو ان کے دِل میں تو یوسف زیادہ گھر کرتا چلا جا رہا ہے، اور یہ تو یوسف علیہ السلام کو ہی یاد کرتے رہتے ہیں، تو ایک قسم کی ناراضگی کا اظہار بھی ہے کہ آپ تو ہمیشہ اس کو یاد ہی کرتے رہیں گے حتیٰ کہ یا تو بالکل ہلاک ہوجائیں گے یا ہلاک کے قریب ہوجائیں گے۔ تو یعقوب علیہ السلام نے کہا کہ بیٹو! میں تو اپنی پریشانی کا اظہار صرف اللہ کے سامنے کرتا ہوں، اور مجھے جو باتیں معلوم ہیں وہ تم نہیں جانتے۔ یعقوب علیہ السلام کہنے لگے کہ میں سمجھتا ہوں کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے امتحان ہے، اور امتحان کی بھی ایک حد ہوتی ہے کہ پہلے ایک بیٹا جدا ہوا، پھر دُوسرا بیٹا جدا ہوا، پھر تیسرا بھی وہاں رہ گیا، اب مجھے معلوم ہے کہ اب اس امتحان کا اختتام ہونے والا ہے، اب یہ اپنی اِنتہا کو پہنچ گیا، اور جس وقت یہ اپنی اِنتہا کو پہنچ گیا ہے تو اللہ کی رحمت ہوگی، میرا یہ امتحان ختم ہوجائے گا، اور سارے کے سارے بیٹے میرے سامنے آجائیں گے، میرے بیٹے محفوظ ہیں،

کہیں گئے نہیں ہیں۔ یہ ایسے ہی ہے، سمجھانے کے لئے ایک بات ہے، گرمیوں کے موسم میں یا برسات کے موسم میں ساون بھادوں میں جس وقت بہت سخت حبس ہو جاتا ہے، سانس لینے کے لئے بھی دقت پیش آتی ہے، ایسے معلوم ہوتا ہے جیسے ہوا ہی ختم ہوگئی، گھٹن جب اپنی اِنتہا کو پہنچ جایا کرتی ہے تو لوگ کہا کرتے ہیں کہ اب یا بارش آئے گی یا آندھی آئے گی، اور ہوتا بھی ایسے ہی ہے کہ اس حبس کے بعد پھر شدت کے ساتھ آندھی آتی ہے، بارش آتی ہے، ہوا چلتی ہے۔ تو اس طرح سے یعقوب علیہ السلام سمجھ رہے تھے کہ کہ میرے اُوپر بھی یہ جو گھٹن طاری کی گئی ہے اب اِنتہا کو پہنچ گئی، اور اللہ تعالیٰ کے آزمانے کی بھی ایک حد ہوتی ہے، اب اس کے بعد حالات بدلیں گے اور رحمت کی گھٹا آئے گی اور برسے گی، میرے بیٹے سارے کے سارے آئیں گے اور میرا یہ امتحان اپنے اِختتام کو پہنچ جائے گا، حضرت یعقوب علیہ السلام کچھ اس قسم کی باتیں سمجھ رہے تھے، اور اس کی بنیاد یوسف علیہ السلام کا وہ خواب تھا، جس سے وہ سمجھتے تھے کہ جب ان کو برتری حاصل ہوگی، ان کی شان نمایاں ہوگی تو گیارہ کے گیارہ بھائی موجود ہونے چاہئیں اور میں بھی موجود ہوں گا اور میری بیوی بھی موجود ہوگی، اس لیے وہ اعتماد کیے ہوئے تھے کہ سارے کے سارے اکٹھے ہوں گے، اور اکٹھے ہونے کے بعد یہ واقعہ پیش آئے گا۔ اس لیے اپنے بیٹوں کو تلقین کرتے ہیں کہ بیٹو! جاؤ، مایوس نہ ہوو، مایوس ہونا کافروں کا کام ہے، اللہ کی رحمت پہ اعتماد رکھتے ہوئے جاؤ، اور جا کے یوسف علیہ السلام کو بھی تلاش کرو، اس کے بھائی کو بھی تلاش کرو، تیسرے کا نام اس لیے نہیں لیا کہ وہ تو اپنے اختیار سے رُکا ہوا تھا، اور رُکا ہوا بھی بنیامین کی خاطر تھا، جب بنیامین کو چھڑانے کی کوئی تدبیر بن جائے گی تو وہ تو خود آجائے گا، باقی یوسف علیہ السلام کو بھی تلاش کرو، یوسف بھی مل جائے گا، یوسف کہیں ہلاک نہیں ہوا جس طرح سے تم کہتے ہو، جاؤ، جا کے تلاش کرو اور اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہوو، تو باپ نے جس وقت یہ تاکید کی تو اَب یہ مصر کی طرف تیسرا سفر کریں گے، اس تیسرے سفر کے اندر پھر یوسف علیہ السلام بھی مل جائے گا، بنیامین بھی چھوٹ جائے گا، اور سب کی آپس میں ایک دوسرے سے ملاقات ہو جائے گی، آگے یہ مضمون آرہا ہے۔

فَلَمَّا دَخَلُوْا عَلَيْهِ قَالُوْا يٰٓاَيُّهَا الْعَزِيْزُ مَسَّنَا وَاَهْلَنَا الضُّرُّ وَجِئْنَا بِبِضَاعَةٍ مُّزْجٰىةٍ

پھر جب داخل ہوئے وہ یوسف پر تو کہنے لگے اے عزیز! پہنچی ہمیں اور ہمارے گھر والوں کو سختی، اور لائے ہیں ہم ناقص پونجی

فَاَوْفِ لَنَا الْكَيْلَ وَتَصَدَّقْ عَلَيْنَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَجْزِي الْمُتَصَدِّقِيْنَ ۝۸۸ قَالَ هَلْ

پس تُو پورا کر ہمارے لیے کیل کو اور ہم پر صدقہ کر بیشک اللہ تعالیٰ صدقہ کرنے والوں کو بدلہ دیتا ہے ﴿۸۸﴾ یوسف نے کہا کہ کیا

عَلِمْتُمْ مَّا فَعَلْتُمْ بِيُوْسُفَ وَاَخِيْهِ اِذْ اَنْتُمْ جٰهِلُوْنَ ۝۸۹ قَالُوْٓا ءَاِنَّكَ لَاَنْتَ

تمہیں معلوم ہے جو کچھ تم نے کیا تھا یوسف کے ساتھ اور اس کے بھائی کے ساتھ جبکہ تم نادان تھے؟ ﴿۸۹﴾ وہ کہنے لگے کیا بیشک تُو ہی

يُوسُفُ ۖ قَالَ اَنَا يُوسُفُ وَهٰذَآ اَخِيۡ ۫ قَدۡ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيۡنَا ۖ اِنَّهٗ مَنۡ

البتہ یوسف ہے؟ یوسف نے کہا میں یوسف ہوں اور یہ میرا حقیقی بھائی ہے، بیشک اللہ نے ہم پر احسان کیا، بیشک بات یہ ہے کہ جو شخص بھی

يَّتَّقِ وَيَصۡبِرۡ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيۡعُ اَجۡرَ الۡمُحۡسِنِيۡنَ ﴿۹۰﴾ قَالُوۡا تَاللّٰهِ لَقَدۡ

تقویٰ اختیار کرے اور صبر اختیار کرے تو بیشک اللہ تعالیٰ محسنین کے اُجر کو ضائع نہیں کرتا ﴿۹۰﴾ بھائی کہنے لگے خدا کی قسم! البتہ تحقیق

اٰثَرَكَ اللّٰهُ عَلَيۡنَا وَاِنۡ كُنَّا لَخٰطِـِٕيۡنَ ﴿۹۱﴾ قَالَ لَا تَثۡرِيۡبَ عَلَيۡكُمُ الۡيَوۡمَ ؕ يَغۡفِرُ اللّٰهُ

ترجیح دی تجھ کو اللہ تعالیٰ نے ہم پر اور بیشک ہم البتہ خطا وار تھے ﴿۹۱﴾ یوسف نے کہا کہ آج تم پر کوئی ملامت نہیں، اللہ تعالیٰ تمہیں

لَكُمۡ ۫ وَهُوَ اَرۡحَمُ الرّٰحِمِيۡنَ ﴿۹۲﴾ اِذۡهَبُوۡا بِقَمِيۡصِيۡ هٰذَا فَاَلۡقُوۡهُ عَلٰى وَجۡهِ

بخشے اور وہ تمام رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم کرنے والا ہے ﴿۹۲﴾ میری اس قمیص کو لے جاؤ پھر ڈال دو اس کو میرے باپ کے

اَبِيۡ يَاۡتِ بَصِيۡرًا ۚ وَاۡتُوۡنِيۡ بِاَهۡلِكُمۡ اَجۡمَعِيۡنَ ﴿۹۳﴾ وَلَمَّا فَصَلَتِ الۡعِيۡرُ قَالَ

چہرے پر، آئے گا وہ دیکھتا ہوا، اور لے آؤ میرے پاس اپنے تمام اہل وعیال کو ﴿۹۳﴾ جس وقت قافلہ (مصر سے) جدا ہوا تو کہا

اَبُوۡهُمۡ اِنِّيۡ لَاَجِدُ رِيۡحَ يُوۡسُفَ لَوۡلَاۤ اَنۡ تُفَنِّدُوۡنِ ﴿۹۴﴾ قَالُوۡا تَاللّٰهِ

ان کے باپ نے بیشک میں البتہ محسوس کرتا ہوں یوسف کی خوشبو اگر تم ضعفِ عقل کی طرف میری نسبت نہ کرو ﴿۹۴﴾ وہ کہنے لگے کہ اللہ کی قسم!

اِنَّكَ لَفِيۡ ضَلٰلِكَ الۡقَدِيۡمِ ﴿۹۵﴾ فَلَمَّاۤ اَنۡ جَآءَ الۡبَشِيۡرُ اَلۡقٰهُ عَلٰى وَجۡهِهٖ

بیشک تُو اپنی پُرانی غلطی میں پڑا ہوا ہے ﴿۹۵﴾ پس جس وقت بشارت دینے والا آ گیا تو ڈال دیا اس نے قمیص کو یعقوب کے چہرے پر

فَارۡتَدَّ بَصِيۡرًا ۚ قَالَ اَلَمۡ اَقُلۡ لَّكُمۡ ۚۙ اِنِّيۡۤ اَعۡلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا

پس وہ لوٹ کے دیکھنے والا ہو گیا، کہا یعقوب نے کہ میں نے تمہیں کہا نہیں تھا؟ کہ میں اللہ کی طرف سے وہ چیز جانتا ہوں جو تم نہیں

تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۹۶﴾ قَالُوۡا يٰۤاَبَانَا اسۡتَغۡفِرۡ لَنَا ذُنُوۡبَنَاۤ اِنَّا كُنَّا خٰطِـِٕيۡنَ ﴿۹۷﴾ قَالَ

جانتے ﴿۹۶﴾ وہ کہنے لگے کہ اے ہمارے اَبا! ہمارے لیے ہمارے گناہوں کی معافی مانگ بیشک ہم خطا وار تھے ﴿۹۷﴾ یعقوب نے کہا

سَوۡفَ اَسۡتَغۡفِرُ لَكُمۡ رَبِّيۡ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الۡغَفُوۡرُ الرَّحِيۡمُ ﴿۹۸﴾ فَلَمَّا دَخَلُوۡا

کہ میں عنقریب اِستغفار کروں گا تمہارے لیے اپنے رَبّ سے بیشک وہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے ﴿۹۸﴾ پس جب داخل ہوئے

عَلٰى يُوْسُفَ اٰوٰٓى اِلَيْهِ اَبَوَيْهِ وَقَالَ ادْخُلُوْا مِصْرَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ ﴿۹۹﴾ وَرَفَعَ

یوسف پر تو ٹھکانا دیا یوسف نے اپنی طرف اپنے والدین کو اور کہا کہ تم داخل ہو جاؤ مصر میں اِن شاء اللہ اَمن کے ساتھ ﴿۹۹﴾ اور اُٹھایا

اَبَوَيْهِ عَلَى الْعَرْشِ وَخَرُّوْا لَهٗ سُجَّدًا ۚ

یوسف نے اپنے والدین کو تخت پر اور سارے کے سارے گر پڑے یوسف کے لئے اس حال میں کہ وہ سجدہ کرنے والے تھے،

وَقَالَ يٰٓاَبَتِ هٰذَا تَاْوِيْلُ رُءْيَايَ مِنْ قَبْلُ ۫ قَدْ جَعَلَهَا

کہا یوسف نے کہ اے میرے اَبا! یہی میرے خواب کی حقیقت ہے جو میں نے اس سے قبل دیکھا تھا، بیشک میرے رَبّ نے اس

رَبِّيْ حَقًّا ۭ وَقَدْ اَحْسَنَ بِيْٓ اِذْ اَخْرَجَنِيْ مِنَ السِّجْنِ وَجَآءَ بِكُمْ مِّنَ الْبَدْوِ مِنْۢ بَعْدِ

خواب کو سچا کر دیا اور اس نے مجھ پہ احسان کیا جبکہ مجھے جیل سے نکالا اور تمہیں دیہات سے لے آیا بعد اس کے

اَنْ نَّزَغَ الشَّيْطٰنُ بَيْنِيْ وَبَيْنَ اِخْوَتِيْ ۭ اِنَّ رَبِّيْ لَطِيْفٌ لِّمَا

کہ شیطان نے میرے اور میرے بھائیوں کے درمیان پھوٹ ڈال دی تھی، بیشک میرا رَبّ باریک تدبیر کرنے والا ہے اس کام کے لئے

يَشَآءُ ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ﴿۱۰۰﴾ رَبِّ قَدْ اٰتَيْتَنِيْ مِنَ الْمُلْكِ وَعَلَّمْتَنِيْ

جو وہ چاہتا ہے، بیشک وہ علم والا ہے اور حکمت والا ہے ﴿۱۰۰﴾ اے میرے رَبّ! تحقیق تُو نے مجھے سلطنت دی اور تُو نے سکھایا مجھے

مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ ۚ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۣ اَنْتَ وَلِيّٖ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ

باتوں کو ٹھکانے لگانا، اے آسمانوں اور زمینوں کے پیدا کرنے والے! تُو ہی میرا کارساز ہے دُنیا میں اور آخرت میں

تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۰۱﴾

مجھے وفات دے مسلمان ہونے کی حالت میں اور مجھے ملا دے صالحین کے ساتھ ﴿۱۰۱﴾

خلاصہ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ فَلَمَّا دَخَلُوْا عَلَيْهِ: پھر جب داخل ہوئے وہ یوسف علیہ السلام پر۔ دَخَلُوْا کی ضمیر اِخوۃ یوسف کی طرف لوٹ گئی، قَالُوْا يٰٓاَيُّهَا الْعَزِيْزُ: کہنے لگے کہ اے عزیز! یوسف علیہ السلام کو "عزیز" کے لفظ کے ساتھ خطاب کیا۔ مَسَّنَا وَاَهْلَنَا الضُّرُّ: پہنچا ہمیں اور ہمارے گھر والوں کو نقصان۔ ضُرّ: تکلیف، مالی تنگی جو قحط سالی کی بنا پر پہنچی تھی، "ہمیں اور ہمارے گھر والوں کو ضُرّ

پہنچا" یعنی نقصان پہنچا، تکلیف پہنچی، سختی پہنچی ہمیں، وَجِئْنَا بِبِضَاعَةٍ مُّزْجٰىةٍ: بضاعة: پُونجی، یہ لفظ پہلے بھی آپ کے سامنے آیا تھا وَاَسَرُّوْهُ بِضَاعَةً۔ اور مُّزْجٰىةٍ تو یہ اَزْجٰی یُزْجِی سے ہے، جس کا معنی ہوتا ہے: چلانا، دفع کرنا، دُور ہٹانا، مُّزْجٰىةٍ اسم مفعول کا صیغہ ہوگیا جس کا معنی دُور ہٹائی ہوئی، دفع کی ہوئی، یعنی جس کو کوئی لینے کے لئے تیار نہیں، یہاں اس کا مفہوم ہے ناقص، "اور لائے ہیں ہم ناقص پُونجی" ہم گھٹیا سامان لائے ہیں، جس کو خوشی کے ساتھ کوئی قبول کرنے کے لئے تیار نہیں، ہر کوئی اس کو دُور ہٹاتا ہے، غیر مطلوب پُونجی لائے ہیں، فَاَوْفِ لَنَا الْكَيْلَ: پس تو پورا کر ہمارے لئے کیل کو، یعنی پُونجی اگرچہ ہماری کھوٹی ہے لیکن تو ہمیں کیل پورا پورا دے، وَتَصَدَّقْ عَلَيْنَا: اور ہم پر صدقہ کر، اِنَّ اللّٰهَ يَجْزِي الْمُتَصَدِّقِيْنَ: بیشک اللہ تعالیٰ صدقہ کرنے والوں کو بدلہ دیتا ہے، قَالَ هَلْ عَلِمْتُمْ مَّا فَعَلْتُمْ بِيُوْسُفَ وَاَخِيْهِ: یوسف علیہ السلام نے کہا کہ کیا تمہیں معلوم ہے جو کچھ تم نے کیا تھا یوسف کے ساتھ اور اس کے بھائی کے ساتھ؟ اِذْ اَنْتُمْ جٰهِلُوْنَ: جبکہ تم نادان تھے، یا، جس وقت کہ تم جذبات سے مغلوب تھے، کیونکہ "جہل" کا لفظ "حلم" کے مقابلے میں بھی آتا ہے، جس طرح سے یہ "علم" کے مقابلے میں آتا ہے، قَالُوْٓا: وہ کہنے لگے: ءَاِنَّكَ لَاَنْتَ يُوْسُفُ: کیا بیشک تُو ہی البتہ یوسف ہے؟ قَالَ: یوسف علیہ السلام نے کہا، اَنَا يُوْسُفُ وَهٰذَآ اَخِيْ: میں یوسف ہوں اور یہ میرا حقیقی بھائی ہے، قَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا: بیشک اللہ نے ہم پر احسان کیا، اِنَّهٗ مَنْ يَّتَّقِ وَيَصْبِرْ: بیشک بات یہ ہے کہ جو شخص بھی تقویٰ اختیار کرے اور صبر اختیار کرے، فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ: بیشک اللہ تعالیٰ محسنین کے اَجر کو ضائع نہیں کرتا، قَالُوْا: بھائی کہنے لگے تَاللّٰهِ: خدا کی قسم! لَقَدْ اٰثَرَكَ اللّٰهُ عَلَيْنَا: البتہ تحقیق ترجیح دی تجھ کو اللہ تعالیٰ نے ہم پر، وَاِنْ كُنَّا لَخٰطِـِٕيْنَ: اور بیشک ہم البتہ خطاوار تھے، چوکنے والے تھے، قَالَ لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ: یوسف علیہ السلام نے کہا کہ آج تم پر کوئی ملامت نہیں، يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ: اللہ تعالیٰ تمہیں بخشے، وَهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ: اور وہ تمام رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم کرنے والا ہے۔ اِذْهَبُوْا بِقَمِيْصِيْ هٰذَا: جاؤ تم میری اس قمیص کے ساتھ، یعنی میری اس قمیص کو لے جاؤ، ذَهَبَ: جانا، اور آگے بِقَمِيْصِيْ میں باء جو ہے یہ تعدیہ کی ہوجائے گی، تو ترجمہ یوں ہوجائے گا "میری اس قمیص کو لے جاؤ" فَاَلْقُوْهُ عَلٰى وَجْهِ اَبِيْ: پھر ڈال دو اس قمیص کو میرے باپ کے چہرے پر، يَاْتِ بَصِيْرًا: آئے گا وہ دیکھتا ہوا، وَاْتُوْنِيْ بِاَهْلِكُمْ اَجْمَعِيْنَ: اور لے آؤ میرے پاس اپنے تمام اہل وعیال کو۔ وَلَمَّا فَصَلَتِ الْعِيْرُ: عِير: قافلہ جو غلّہ لانے کے لئے ہوتا ہے، فَصَلَ فُصُوْل: جُدا ہونا، "جس وقت قافلہ مصر سے جُدا ہوا" یعنی مصر سے چل پڑا، جس وقت قافلہ مصر سے جُدا ہوا، قَالَ اَبُوْهُمْ: کہا ان کے باپ نے یعنی یعقوب علیہ السلام نے، اِنِّيْ لَاَجِدُ رِيْحَ يُوْسُفَ: بیشک میں البتہ محسوس کرتا ہوں یوسف کی خوشبو، لَوْلَآ اَنْ تُفَنِّدُوْنِ: تُفَنِّدُوْنِی نون کے اوپر جو کسرہ ہے وہ یائے متکلم پر دلالت کرتا ہے، فَنَّدَ تفنيد: فَنَد کی طرف نسبت کرنا، فند کہتے ہیں ضعفِ عقل کو جو بڑھاپے کی بنا پر ہو، تو تفنید کا معنی ہوجائے گا کہ کسی کو ضعفِ عقل کی طرف منسوب کرنا بڑھاپے کی وجہ سے، یعنی کسی کو اتنا بوڑھا قرار دے دینا کہ اس بڑھاپے کی وجہ سے اس کی عقل خراب ہوگئی، جس کو "بوڑھا کھوسٹ" کہتے ہیں، "بوڑھا کھپڑ"، جس کے حواس ٹھیک نہ رہیں، تو لَوْلَآ اَنْ تُفَنِّدُوْنِ کا معنی یہ ہوگا کہ اگر یہ بات نہ ہو کہ تم میری ضعفِ عقل کی طرف نسبت کرو بوجہ بڑھاپے کے، یعنی اگر تم یوں نہ کہنے لگ جاؤ کہ بوڑھا سٹھیا گیا، بوڑھے کا دماغ خراب ہوگیا، اگر تم یوں نہ کہنے لگ جاؤ تو میں ایک بات کہتا ہوں کہ مجھے تو یوسف کی

خوشبو آ رہی ہے۔ مُفَنَّد کہا جاتا ہے اس شخص کو جو سٹھایا ہوا ہو، یعنی بڑھاپے کی وجہ سے جس کے حواس خراب ہو گئے ہوں۔ آپ کو معلوم ہوگا مولانا احمد رضا خان بریلوی نے اکابرِ دیوبند کی عبارات کی قطع و برید کر کے کتاب لکھی تھی ''حسام الحرمین''، جس میں دستخط کروائے تھے ان کی تکفیر پر علمائے عرب سے، علمائے عرب سے دستخط کروالایا تھا، اس کے جواب میں حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری ؒ نے بھی ایک رسالہ لکھا تھا علمائے حرمین کے سوالات کے جواب میں، اس کا نام رکھا تھا ''المُهَنَّد علی المُفَنَّد'' تو وہاں مفند سے ''احمد رضا خان بریلوی'' مراد ہے، اور ''مهند'' کہتے ہیں ''ہندی تلوار'' کو، ''ہندی تلوار بڈھے کھوسٹ کے سر پر!'' یعنی ایسے بڈھے کے سر پر کہ بڑھاپے کی وجہ سے جس کا دماغ خراب ہو گیا، جو سٹھیا گیا ہے، ایسی باتیں کرتا ہے بہکی بہکی اس پر ہندی تلوار، تو وہ مفند لفظ یہی ہے جو اَنْ تُفَنِّدُوْنِ کے اندر ذکر کیا گیا ہے، کہ اگر تم یوں نہ کہو کہ بوڑھے کی عقل خراب ہو گئی اور عقل کے خراب ہونے کی وجہ سے بہکی بہکی باتیں کرتا ہے، اگر تم یہ بات نہ کہو یعنی جیسے ہم کہتے ہیں کہیں تم یوں نہ کہہ دینا کہ یہ تو پاگل ہے لیکن مجھے تو یوں محسوس ہوتا ہے، ''یوسف علیہ السلام کی خوشبو پاتا ہوں اگر تم میری ضعفِ عقل کی طرف نسبت نہ کرو، اگر تم یوں نہ کہو کہ بوڑھا سٹھیا گیا اور بہکی بہکی باتیں کرتا ہے'' قَالُوْا تَاللّٰهِ اِنَّكَ لَفِيْ ضَلٰلِكَ الْقَدِيْمِ: لیکن انہوں نے وہی بات کہی، وہ کہنے لگے کہ اللہ کی قسم! (یہ کہنے والے وہ لوگ ہیں جو گھر میں موجود ہیں، کیونکہ بھائی تو ابھی مصر سے پہنچے نہیں ہیں) کہنے لگے کہ اللہ کی قسم! بیشک تُو اپنی پُرانی غلطی میں پڑا ہوا ہے، ضلال سے یہاں وہی غلطی مراد ہے جس طرح سے کہ سورۃ کی ابتدا میں ذکر کیا تھا، ضلال سے دینی گمراہی مراد نہیں، ''بیشک تو اپنی پُرانی غلطی میں پڑا ہوا ہے''، ''پُرانی غلطی'' سے وہی غلطی مراد ہے کہ تو سمجھتا ہے کہ یوسف زندہ ہے، ملاقات ہوگی، یہ غلطی جو تجھے لگی ہوئی ہے پس اسی غلطی کی بنا پر تُو یہ باتیں کرتا ہے، تجھے خوشبو آنے لگ گئی، فَلَمَّآ اَنْ جَآءَ الْبَشِيْرُ: پس جس وقت بشارت دینے والا آ گیا، اَلْقٰىهُ عَلٰى وَجْهِهٖ: اَلْقٰىهُ کی ''ہ'' ضمیر قمیص کی طرف لوٹ گئی، ڈال دیا اس نے قمیص کو یعقوب علیہ السلام کے چہرے پر، فَارْتَدَّ بَصِيْرًا: پس وہ لوٹ کے دیکھنے والا ہو گیا، لوٹا وہ اس حال میں کہ دیکھنے والا تھا، لوٹ کے دیکھنے والا ہو گیا، قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ: کہا یعقوب علیہ السلام نے کہ میں نے تمہیں کہا نہیں تھا؟ اِنِّيْٓ اَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ: کہ میں اللہ کی طرف سے وہ چیز جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے، قَالُوْا يٰٓاَبَانَا: وہ کہنے لگے کہ اے ہمارے اَبا! اسْتَغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَآ: ہمارے لئے ہمارے گناہوں کی معافی مانگ، اِنَّا كُنَّا خٰطِـِٕيْنَ: بیشک ہم خطاوار تھے، قَالَ سَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّيْ: یعقوب علیہ السلام نے کہا کہ میں عنقریب اِستغفار کروں گا تمہارے لئے اپنے رَبّ سے، اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ: بیشک وہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے، فَلَمَّا دَخَلُوْا عَلٰى يُوْسُفَ: پس جس وقت داخل ہوئے یہ سارے کے سارے لوگ، یہ بھائی، اہل وعیال، والدین سب، ''جب داخل ہوئے یوسف علیہ السلام پر'' اٰوٰٓى اِلَيْهِ اَبَوَيْهِ: ٹھکانا دیا یوسف نے اپنی طرف اپنے ابوین کو، ابوین سے والدین مراد ہیں، اس لفظ کے ظاہر سے معلوم ہوتا ہے کہ یوسف علیہ السلام کی والدہ اس وقت تک زندہ تھی، اور اِبنِ کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے اسی کو ترجیح دی ہے کہ ظاہرِ قرآن اسی بات پر دلالت کرتا ہے، مجاز کی طرف جانے کی کوئی وجہ نہیں ہے، لیکن دوسرے بعض مفسرین نے جیسے کہ ابتدا میں میں نے ذکر کیا تھا یوں بھی لکھا ہے کہ یوسف علیہ السلام کی والدہ جو تھیں وہ بنیامین کے پیدا ہونے کے وقت وفات پا گئی تھیں، اور یہ خالہ ہے یوسف علیہ السلام کی، تو

خالہ بھی بمنزلۃ الاُمّ ہوتی ہے، اور ویسے بھی جب منکوحۃُ الاَب ہو تو ماں کے حکم میں ہوئی، کہ باپ کی منکوحہ ہے، بہر حال اس میں دونوں احتمال ہیں، اور ظاہر قرآن اسی بات پر دلالت کرتا ہے کہ وہ والدہ ہی ہوگی اور زندہ ہوگی، وَرَفَعَ اَبَوَيْهِ عَلَى الْعَرْشِ: اُٹھایا یوسف علیہ السلام نے اپنے والدین کو تخت پر، یعنی اُونچا کر کے تخت پہ بٹھایا، جس تخت پر وہ خود بیٹھا کرتے تھے، وَخَرُّوْا لَهٗ سُجَّدًا: اور سارے کے سارے گر پڑے یوسف علیہ السلام کے لئے اس حال میں کہ وہ سجدہ کرنے والے تھے، وَخَرُّوْا لَهٗ سُجَّدًا: لَهٗ کی ضمیر تو بہر حال یوسف علیہ السلام کے لئے ہے، اور لام کا معنی یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یوسف علیہ السلام کی وجہ سے وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے سجدہ شکر کرنے والے ہو گئے، تو سجدہ ان کا یوسف کو نہیں، جھکنا ان کا اللہ کے سامنے ہے لیکن یوسف کی وجہ سے، جس وقت یوسف علیہ السلام کی عظمت کو دیکھا ان کی شان وشوکت کو دیکھا تو اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے اللہ کے سامنے جھک گئے، اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یوسف علیہ السلام کی طرف جھک گئے، خَرُّوْا سُجَّدًا: گرے وہ اس حال میں کہ سجدہ کرنے والے تھے یوسف کے لئے، یعنی یہ سجدہ پھر تعظیم کے طور پر ہے جو اُس وقت جائز تھا، اور شریعتِ محمدی میں اس کو حرام ٹھہرا دیا گیا، اب تعظیماً بھی کسی کے سامنے اس طرح سے جھکنا جائز نہیں کہ جس کے اُوپر سجدے کا لفظ صادق آجائے، حتیٰ کہ رکوع کی کیفیت اختیار کرنا بھی درست نہیں ہے، اور یہ سجدۂ تعظیمی کا مسئلہ غالباً سورۂ بقرہ میں حضرت آدم علیہ السلام کے قصہ میں تفصیل سے ذکر کر دیا تھا، وَقَالَ يٰۤاَبَتِ هٰذَا تَاْوِيْلُ رُءْيَايَ مِنْ قَبْلُ: کہا یوسف علیہ السلام نے کہ اے میرے اَبا! یہی مطلب ہے میرے خواب کا، یہی میرے خواب کی حقیقت ہے جو میں نے اس سے قبل دیکھا تھا، قَدْ جَعَلَهَا رَبِّيْ حَقًّا: بیشک میرے رَبّ نے اس خواب کو سچا کر دیا، وَقَدْ اَحْسَنَ بِيْۤ: اور میرے رَبّ نے مجھ پہ احسان کیا، اِذْ اَخْرَجَنِيْ مِنَ السِّجْنِ: جبکہ مجھے جیل سے نکالا، وَجَآءَ بِكُمْ مِّنَ الْبَدْوِ: اور تمہیں دیہات سے لے آیا، مِنْۢ بَعْدِ اَنْ نَّزَغَ الشَّيْطٰنُ بَيْنِيْ وَبَيْنَ اِخْوَتِيْ: بعد اس کے شیطان نے میرے اور میرے بھائیوں کے درمیان پھوٹ ڈال دی تھی، فساد ڈال دیا تھا، اِنَّ رَبِّيْ لَطِيْفٌ لِّمَا يَشَآءُ: بیشک میرا رَبّ باریک تدبیر کرنے والا ہے اس کام کے لئے جو وہ چاہتا ہے، جو وہ چاہتا ہے اس کام کے لئے تدبیر کر دیتا ہے، اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ: بیشک وہ علم والا ہے اور حکمت والا ہے، رَبِّ: اے میرے رَبّ! قَدْ اٰتَيْتَنِيْ مِنَ الْمُلْكِ: تحقیق تُو نے مجھے سلطنت دی، وَعَلَّمْتَنِيْ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ: اور تُو نے سکھایا مجھ کو باتوں کو ٹھکانے لگانا، فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ: یا فاطرَ السماوات، اے آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے والے! اَنْتَ وَلِيّٖ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ: تُو ہی میرا کارساز ہے دُنیا میں اور آخرت میں، تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا: مجھے وفات دے مسلمان ہونے کی حالت میں، وَّاَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ: اور مجھے ملا دے صالحین کے ساتھ۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

تفسیر

ماقبل سے ربط

یوسف علیہ السلام کے نو بھائی (کیونکہ تین تو اب مصر میں ہیں یوسف علیہ السلام بھی، بنیامین بھی، اور تیسرے بھائی بھی جو وہاں ٹھہر

گئے تھے جنہوں نے کہا تھا کہ تم جا کے باپ کے سامنے واقعہ نقل کر دو، میں یہیں ٹھہروں گا جس وقت تک کہ والد صاحب خود نہ بلائیں اور مجھے آنے کی اجازت نہ دیں، یا جب تک کہ اللہ تعالیٰ ہی کوئی فیصلہ نہ فرمادیں) تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ تین اب مصر میں رُک گئے اور نو واپس آئے، آ کے انہوں نے اپنے اَبا کے سامنے واقعہ نقل کیا، جس کا ذکر آپ کے سامنے پچھلی آیات میں ہوا تھا۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کو چونکہ یقین تھا کہ یوسف علیہ السلام زندہ ہیں اور ان کی عظمت نمایاں ہوگی، اور ہم سب اس وقت موجود ہوں گے، اس لیے انہوں نے پورے وثوق کے ساتھ کہا تھا کہ بیٹو! مایوس نہ ہوؤ، جاؤ، جا کے یوسف کو اور اس کے بھائی کو تلاش کرو، تو اب باپ کے کہنے سے اور کچھ غلے کی ضرورت سے بیٹوں نے پھر مصر کی طرف سفر کیا، تو یہ ان کا تیسرا سفر ہے۔

برادرانِ یوسف کا تیسری مرتبہ یوسف علیہ السلام کے سامنے اپنے احتیاج کا ذِکر کرنا اور غلے کی درخواست کرنا

آپس میں انہوں نے سوچا یہ ہوگا کہ بنیامین چونکہ معلوم ہے کہ مصر میں ہے، اس لیے اسے تو ہم تلاش کریں، اور اس کی وجہ سے دوسرا بھائی بھی آجائے گا، اور یوسف علیہ السلام بھی ہوسکتا ہے کہ اسی علاقے میں ہو، کیونکہ وہ تو سمجھتے تھے کہ ہم نے ایسے قافلے کے ہاتھ میں بیچا ہے جو مصر کی طرف جارہا تھا، تو ہوسکتا ہے کہ اس کی بھی کچھ نشاندہی ہوجائے، انہی خیالات کے تحت، کچھ غلّہ لینے کے لئے، کچھ بنیامین کو چھڑانے کی تدبیر کرنے کے لئے، تیسرے بھائی کو واپس لانے کے لیے انہوں نے مصر کا یہ سفر کیا۔ تو مشورہ یوں کیا ہوگا کہ پہلے عزیزِ مصر کے سامنے پیش ہونا چاہیے، اس کے سامنے اپنی حاجت، ضرورت اور احتیاج ذِکر کریں، اگر ہم دیکھیں گے کہ اس کا دل نرم ہے اور ہمارے ساتھ کچھ ہمدردی کا اظہار کر رہا ہے تو پھر بھائی کو چھڑانے کی درخواست بھی کریں گے، اس لیے وہ پہلے سیدھے عزیزِ مصر کے پاس ہی گئے، تو جا کے اس کو اس کے عہدے کے لحاظ سے خطاب کرتے ہیں یَاَیُّهَا الْعَزِیْزُ، کیونکہ اس وقت ان کا عہدہ یہی تھا، جیسے کہ آپ کے سامنے پہلے تفصیل آچکی، اپنے احتیاج کو ذِکر کیا کہ ہمیں بھی اور ہمارے گھر والوں کو بھی بہت تکلیف پہنچی ہے، ہم قحط میں مبتلا ہیں، بڑی تنگی میں مبتلا ہیں، اور جو سرمایہ تھا وہ بھی سارے کا سارا ختم ہوگیا، اب ہمارے پاس کوئی قیمتی چیز نہیں ہے، گھٹیا سی پُونجی ہے جس کو کوئی خوشی کے ساتھ لینے کے لئے تیار نہیں، ہم اس کو لے کے آئے ہیں، تو ہماری اس پُونجی کی طرف نہ دیکھ، تُو بڑا محسن ہے، تُو بڑا نیکوکار ہے، ہم پر احسان کر، صدقے کے طور پر ہی سہی، خیرات کے طور پر ہی سہی، ہمیں کیل پورا پورا دے، یعنی ہماری اس کھوٹی پُونجی کی طرف دیکھتے ہوئے محروم نہ کر، اس کھوٹی پُونجی کو قبول کرلے اور جس طرح سے تُو پہلے ہمیں پورا کیل دیتا تھا اسی طرح سے پورا کیل دے، اور تُو ہم پر صدقہ کر یعنی اس کھوٹی پُونجی کو قبول کر کے مقابلے میں غلّہ پورا دے دینا، یہ ایسے ہی ہے جیسے تیری طرف سے صدقہ خیرات ہے، اس نرم معاملے کو گویا کہ وہ صدقہ خیرات قرار دے رہے ہیں، ''اللہ تعالیٰ صدقہ دینے والوں کو جزا دیتا ہے'' جب تو ہمارے ساتھ ایسا برتاؤ کرے گا جس طرح سے خیرات کرنے والے اور صدقہ کرنے والے کیا کرتے ہیں تو اللہ تجھے بدلہ دے گا۔ اب اگر اس عزیزِ مصر کو مسلمان سمجھتے ہوں تو جزا سے اُخروی جزا بھی مراد ہوسکتی ہے، ورنہ یہ بات تو تمام اُمتوں کے اندر ہی تھی، چاہے وہ کافر ہیں چاہے وہ مسلمان ہیں، وہ سمجھتے ہیں کہ نیکی کرنے والے کو بدلہ ملتا ہے، آخرت میں نہ سہی، دنیا کے متعلق تو ان کا خیال ہوتا ہی ہے، دُنیا میں شہرت اور اس قسم کی دوسری چیزیں صدقہ اور خیرات کے

عوض میں ملتی ہیں، یہ کافر بھی سمجھتے ہیں، اسی جذبے سے وہ بھی صدقہ خیرات کرتے ہیں، تو یہ جزی عام ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ صدقہ کرنے والوں کو جزا دیتا ہے، اگر وہ مؤمن ہوں تو آخرت میں بھی دیتا ہے دنیا میں بھی، اور اگر مؤمن نہ ہوں تو دنیا میں دیتا ہے، تو یہ لجاجت ہے ان کی طرف سے کہ اپنے احتیاج کو ذکر کرنے کے بعد کتنی مسکنت کے ساتھ وہ عزیز مصر سے گفتگو کر رہے ہیں۔

یوسف علیہ السلام کا بھائیوں سے ایسا سوال کہ بھائی چونک گئے اور یوسف علیہ السلام کو پہچان لیا

اب حضرت یوسف علیہ السلام سے نہ رہا گیا، جب انہوں نے اپنے اہل وعیال کے احتیاج کی خبر سنی، اور پھر بھائیوں کو اتنا جھکے ہوئے دیکھا، وہ سمجھ گئے کہ اب ان کے اعصاب ڈھیلے ہو گئے ہیں، کہ کتنے طنطنے والے اور کتنے کروفر والے لوگ تھے، لیکن حوادثات نے ان کو ڈھیلا کر دیا ہے، اب اس قسم کی گفتگو کرتے ہیں جس طرح سے ایک بہت عاجز اور مسکین گفتگو کیا کرتا ہے، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی اِذن ہو گیا ہوگا کہ اب اپنے آپ کو ظاہر کر دو، اس لیے حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے آپ کو ظاہر کرنے کے لئے ان پر ایک ایسا سوال کیا جس میں ان کو پورے کے پورے واقعات کی طرف متوجہ بھی کر دیا، لیکن ساتھ ساتھ ان کی طرف سے ایک عذر کا پہلو بھی ذکر کر دیا۔ یوں تو یاد دلایا کہ تمہیں پتا ہے کہ تم یوسف اور اس کے بھائی کے ساتھ کیا کچھ کرتے رہے؟ اس لفظ سے تو ان کا ذہن منتقل ہو جائے گا سارے ان واقعات کی طرف جو وہ کر چکے تھے، هَلْ عَلِمْتُمْ مَّا فَعَلْتُمْ بِيُوْسُفَ وَاَخِيْهِ: یوسف کے ساتھ اور اس کے بھائی کے ساتھ تم کیا کرتے رہے، تمہیں یاد ہے؟ تمہیں معلوم ہے؟، تو ان کے ذہن کو گزشتہ تاریخ کی طرف متوجہ کر دیا، لیکن ساتھ ساتھ ایک عذر کا پہلو بھی ہے اِذْ اَنْتُمْ جٰهِلُوْنَ: وہ تمہارا نادانی کا وقت تھا، اس وقت تم سمجھدار نہیں تھے۔ عذر کرنے والا آخر یہی عذر کیا کرتا ہے کہ جی! مجھ سے نادانی میں ہو گیا جو کچھ ہو گیا، اگر مجھے معلوم ہوتا کہ آپ ایسے خوش قسمت ہیں، اگر مجھے معلوم ہوتا کہ آپ کا نتیجہ یہ نکلنے والا ہے تو میں آپ کے ساتھ ایسی زیادتی کیوں کرتا۔ تو جو عذر انہوں نے کرنا تھا وہ حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنی طرف سے خود نقل کر دیا، یہی سخاوتِ نفس ہے، یہی حوصلہ ہے جو یوسف علیہ السلام نے دکھایا کہ معذرت ان کی طرف سے اپنی زبان سے کر دی، کہ تم نادان تھے، اس وقت تمہیں سمجھ نہیں تھی، ''بے سمجھی کے سامنے میں جو کچھ تم کرتے رہے یوسف کے ساتھ اور اس کے بھائی کے ساتھ، تمہیں پتا ہے؟ تمہیں یاد ہے؟ تمہیں معلوم ہے؟'' یا ''جاھلون'' کا مفہوم وہی کہ جس وقت تم اپنے جذبات میں مغلوب ہو گئے تھے اور تم نے اپنی عقل کے ساتھ سوچا نہیں، جذبات سے مغلوب ہو کے جو کچھ تم یوسف کے ساتھ اور اس کے بھائی کے ساتھ کرتے رہے تمہیں معلوم ہے؟

جب یوسف علیہ السلام نے یہ سوال کیا تو سوال کرنے کے ساتھ ہی بھائیوں کا ذہن منتقل ہوا کہ یہ ہمارے گھر کا بھیدی کون نکل آیا، اس کو کیا تعلق یوسف علیہ السلام سے، اور ہو سکتا ہے کہ پہلے بار بار آتے تھے، دیکھتے تھے، ان کے اخلاق کو دیکھتے، ان کی باتیں سنتے، تو یہ چیز بھی ساری کی ساری بنیاد بن گئی، اور یہ بات بھی ذہن میں آ گئی ہوگی کہ ہم نے یوسف کو بیچا بھی ایسے قافلے کے ہاتھ میں ہی تھا جو مصر کی طرف آیا، اور ممکن ہے کہ وہ خواب جو انہوں نے سنا ہوا تھا تو وہ بھی فوراً ان کے ذہن میں آ گیا کہ اس میں جو اشارہ تھا کہ ایک وقت اس کو بہت عظمت نصیب ہوگی، تو کہیں یہ باتیں کرنے والا خود وہی ہمارا بھائی یوسف نہ ہو، تو اس سوال کرنے کے ساتھ یہ

ساری چیزیں دفعۃً ان کے ذہن میں آگئیں۔ تو ذہن میں آنے کے بعد وہ پوچھتے ہیں کہ ءَاِنَّکَ لَاَنْتَ یُوْسُفُ: کیا تو ہی یوسف ہے؟ آپ نے فرمایا کہ ہاں! میں ہی یوسف ہوں اور یہ جو میرے پاس بیٹھا ہے یہ میرا حقیقی بھائی ہے۔

یوسف علیہ السلام کی طرف سے تحدیث بالنعمۃ

اب یہ بات کہنے کے ساتھ ہی حضرت یوسف علیہ السلام نے پورے کے پورے کے واقعات کو جوان کے ساتھ گزرے تھے اس ایک جملے میں سمو دیا کہ اللہ تعالیٰ نے توفیق دی کہ ہم نے تقویٰ اِختیار کیا، اللہ نے توفیق دی کہ ہم نے صبر کیا، ہم سے کوئی اس قسم کا کام نہیں ہوا جو تقوے کے خلاف ہو اور صبر کے خلاف ہو، تو جو شخص بھی تقویٰ اور صبر اِختیار کرتا ہے تو بیشک اللہ تعالیٰ محسنین کے اَجر کو ضائع نہیں کرتا، تو ہمیں بھی اللہ تعالیٰ نے تقویٰ اور صبر اِختیار کرنے کی توفیق دی تھی، یہ بات دعوے کی صورت میں نہیں، بلکہ تحدیث بالنعمۃ کی صورت میں ہے، کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں تقویٰ اور صبر کی توفیق دی ہے کہ ہم نے مشکلات کو برداشت کیا، اور میرے ہاتھ سے کوئی ایسا کام نہیں ہوا جو تقویٰ کے منافی ہو، تو اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج اللہ تعالیٰ نے اسی تقویٰ اور صبر کی برکت سے عزت سے نوازا ہے، وسعت سے نوازا ہے، مال و دولت سے نوازا ہے، یہ ساری کی ساری نعمتیں اسی تقویٰ اور صبر کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائی ہیں۔

اور اس واقعے کو نقل کرنے سے قرآنِ کریم کا مقصد بھی یہی ہے کہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو اور آپ کے صحابہ کو یہی تقویٰ اور صبر کا سبق سکھایا جائے، کہ تمام مشکلات کے حل کرنے کے لئے یہی ایک مفید اور مجرب نسخہ ہے، کتنی ہی مشکلات انسان کی زندگی میں کیوں نہ آئیں لیکن صبر اور تقویٰ کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے تو نتیجہ ہمیشہ اچھا نکلتا ہے۔ سورۂ ہود جو آپ کے سامنے گزری تھی اور اس میں کثرت کے ساتھ واقعات جو نقل کیے گئے تھے، تو ان واقعات کے آخر میں بھی یہی تھا کہ وَاصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰہَ لَا یُضِیْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِیْنَ، تو جیسے ان واقعات کو نقل کرنے بعد آخر نصیحت یہی کی گئی کہ صبر کیجئے، اللہ تعالیٰ محسنین کے اجر کو ضائع نہیں کرتے، تو اس واقعے کے اِختتام پر بھی اسی قسم کی بات آگئی کہ تقویٰ اور صبر اِختیار کرنے والے آخر کار کامیاب ہوتے ہیں۔

بھائیوں کا اِعترافِ جرم اور معافی کی درخواست اور یوسف علیہ السلام کی طرف سے تسلی

اب بھائی کہنے لگے کہ ''اللہ کی قسم! اللہ تعالیٰ نے تجھے ہم پر ترجیح دی، تُو اسی لائق تھا، اور ہم خطا کار تھے، غلطیاں ہم سے ہوئیں'' یہ اپنی غلطی کا اعتراف ہے، گویا کہ یوسف علیہ السلام کے سامنے معافی مانگنے والی بات ہے، کیونکہ جب انسان کسی کے سامنے مجرمانہ طور پر پیش ہو اور یہ کہے کہ جی! میں غلطی پر ہوں، اللہ تعالیٰ نے آپ پر بڑا فضل فرمایا، میں غلطی پر تھا، مجھ سے خطا ہوئی، تو یہ بھی اِقرارِ جرم اور اِعترافِ جرم کے بعد معافی مانگنے کا ایک عنوان ہوتا ہے۔ تو حضرت یوسف علیہ السلام نے فوراً ان کو تسلی دیتے ہوئے کہا کہ کوئی بات نہیں، آج تم پر کوئی ملامت نہیں ہے، اللہ تعالیٰ تمہیں معاف کرے، اور ''اللہ تمہیں معاف کرے'' کا مطلب یہ ہے کہ میری طرف سے بھی معاف، جو کچھ ہوگیا، کیونکہ اگر میں معاف نہ کروں گا تو اللہ تعالیٰ کے لئے معافی کا ذکر کس طرح سے کروں کہ اللہ تمہیں معاف کرے؟ اللہ تو معاف کرے گا ہی تب کہ جب بندہ اپنے حقوق معاف کر دے گا، جس میں اس بات کی طرف اشارہ

ہو گیا کہ میری طرف سے بھی معاف۔ سزا دینا تو اپنی جگہ رہا، لَا تَثْرِیْبَ عَلَیْكُمُ الْیَوْمَ: آج تم پر کسی قسم کی کوئی ملامت بھی نہیں گزشتہ حالات پر، میں نے بھی تمہیں معاف کر دیا، اور اللہ بھی تمہیں معاف کرے، وَهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ۔ تو ان لفظوں میں اپنی طرف سے بھی معافی کا اعلان ہے اور اللہ تبارک وتعالیٰ کے سامنے دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں معاف کرے۔

سرورِ کائنات ﷺ اور سیّدنا یوسف علیہ السلام کے واقعے میں مطابقت

سورۃ کے شروع میں سرورِ کائنات ﷺ کے حالات کے ساتھ اس کو مطابقت دیتے ہوئے میں نے ذکر کیا تھا کہ مکہ والوں نے جو حضور ﷺ کو نکالا تھا اور پھر حضور ﷺ فاتحانہ طور پر مکہ معظمہ میں آئے، اور یہی ظالم، آپ پر ظلم کرنے والے، آپ کو پریشان کرنے والے جب سارے کے سارے سامنے مجرمانہ حیثیت میں کھڑے تھے تو اس وقت سرورِ کائنات ﷺ نے سوال کیا تھا کہ میں تمہارے ساتھ کیا برتاؤ کروں گا؟ تو انہوں نے کہا تھا کہ تُو ایک شریف بھائی ہے اور شریف بھائی کا بیٹا ہے! مطلب یہ ہے کہ ہم تجھ سے شرافت کے معاملے کی توقع رکھتے ہیں کہ تُو ہم پر رحم کرے گا، نرمی اختیار کرے گا، تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں تمہیں وہی بات کہتا ہوں جو یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں سے کہی تھی: لَا تَثْرِیْبَ عَلَیْكُمُ الْیَوْمَ، آج تم پر کوئی کسی قسم کی ملامت نہیں، اِذْهَبُوْا فَاَنْتُمُ الطُّلَقَاءُ! جاؤ تم سب چھوٹے ہوئے ہو، کسی پر کوئی کسی قسم کی گرفت نہیں ہے۔(۱) تو اس واقعے کے ضمن میں گویا کہ سرورِ کائنات ﷺ اور صحابہ کے انجام کی طرف جو اِشارہ کیا گیا تھا عالَمِ ظاہر کے اندر اسی طرح سے پیش آیا کہ برادرانِ یوسف کی طرح اہلِ مکہ جتنے تھے وہ سارے کے سارے نادم ہوئے، اور سرورِ کائنات ﷺ کے سامنے مجرمانہ حیثیت میں پیش ہوئے، اور حضور ﷺ کی طرف سے بھی اسی طرح سے سخاوتِ نفس کا معاملہ ہوا جس طرح سے یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں سے کیا تھا۔

برادرانِ یوسف کی کنعان کی طرف روانگی...... اور آنے والے لفظوں میں یہود کے سوال کا جواب

اب جان پہچان ہو گئی، معافی ہو گئی، ایک دوسرے کے سامنے خوشی کا اظہار ہو گیا، اب حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں کو تیار کر کے بھیجا کہ جاؤ، اب والدین کو اور باقی اہل وعیال کو یہاں لے کے آ جاؤ، اور ان سے بھی واقعات سُن لیے ہوں گے، بنیامین سے سُن لیا ہوگا، کہ حضرت یعقوب علیہ السلام روتے روتے نابینا ہو گئے ہیں، تو اس لیے حضرت یوسف علیہ السلام نے کہا کہ جاتے ہوئے میری یہ قمیص لیتے جاؤ، یہ جا کے میرے باپ کے چہرے پہ ڈال دینا، وہ دیکھنے والا ہو جائے گا، یہ حضرت یوسف علیہ السلام کا معجزہ ہے، پیراہن یوسفی کے اندر یہ جو تاثیر نمایاں ہوئی کہ چہرے کے اُوپر ڈالنے سے بینائی لوٹ آئی، یہ معجزہ ہے، اور قمیص کو اس لیے بھیجا گیا ہوگا کہ پہلے پہلے حضرت یعقوب علیہ السلام کو جو صدمہ پہنچا تھا وہ بھی تو قمیص کی شکل میں ہی تھا کہ خون آلود قمیص ہی سامنے گئی تھی جو ان کے لئے رونے کا باعث بنی تھی، وَجَآءُوْ عَلٰى قَمِیْصِهٖ بِدَمٍ كَذِبٍ، جھوٹ موٹ کا خون لے گئے تھے، تو وہی قمیص ان کے لیے صدمے کا باعث بنی تھی، تو اب نشانی کے طور پر قمیص ہی بھیجی جا رہی ہے کہ جس کے ساتھ حضرت یعقوب علیہ السلام کو بشارت ہو گی خوشی ہو گی، اور یہی ان کے لئے بینائی کے لوٹنے کا باعث بن جائے گی۔ تو اپنی قمیص دے دی اور یہ کہہ دیا کہ اپنے سب گھر والوں کو لے کر مصر کے

(۱) السنن الکبریٰ للبیہقی ج۹ ص۱۹۹، باب فتح مکہ/ نیز دیکھیں: تفسیر مظہری، تفسیر رازی وغیرہ، سورۃ النصر کے تحت۔

اندر منتقل ہو جاؤ، تو یہاں سے اس سوال کا جواب بھی آ گیا جو ابتدا کے اندر شانِ نزول کے طور پر ذکر کیا گیا تھا کہ بعض لوگوں نے یہود سے سیکھ کے سرورِ کائنات ﷺ پر یہ سوال کیا تھا کہ ابراہیم علیہ السلام اور ان کی اولاد تو شام میں آباد ہوئی تھی، اور قرآنِ کریم بیان کرتا ہے کہ مصر میں فرعون نے ان پر ظلم کیا، پھر وہاں سے موسیٰ علیہ السلام چھڑا کے لائے، تو یہ پوری کی پوری قومِ بنی اسرائیل مصر میں کس طرح سے منتقل ہوگئی، یہ ایک تاریخی کا واقعے کا سوال تھا، تو سرورِ کائنات ﷺ کے اُوپر یہ سورۃ اُتری جس کے اندر یہ بتا دیا گیا کہ بنی اسرائیل کس طرح شام سے مصر میں منتقل ہوئے تھے، ان لفظوں میں اس کا جواب آ گیا، کہ یوسف علیہ السلام کو وہاں عزت ملی اور وہ وہاں بااختیار ہوئے، تو پھر انہوں نے اپنے سارے خاندان کو وہاں بُلا لیا، تو یہ سبب بنا مصر کی طرف بنی اسرائیل کے منتقل ہونے کا۔

یعقوب علیہ السلام کو دُور سے تو خوشبو محسوس ہوگئی، قریب سے خبر کیوں نہ ہوئی؟

اب وہ بھائی جس وقت مصر سے چلتے ہیں یوسف علیہ السلام کی قمیص لے کر، تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے چونکہ ان واقعات کے اختتام کا موقع آ گیا تھا، حضرت یعقوب علیہ السلام کے امتحان کا بھی اختتام ہو رہا تھا، تو وہیں سے ہی حضرت یوسف علیہ السلام کی قمیص کی خوشبو حضرت یعقوب علیہ السلام نے کنعان میں بیٹھے ہوئے محسوس کر لی، جو بعض روایات کے مطابق اس جگہ سے تقریباً دو سو، یا اڑھائی سو میل کے فاصلے پر تھا۔ تو یعقوب علیہ السلام اپنے گھر والوں سے کہتے ہیں کہ اگر تم یوں نہ کہہ دو کہ اس بوڑھے کی عقل خراب ہوگئی، یہ بہکی بہکی باتیں کرتا ہے، تو میں تمہیں ایک بات بتاتا ہوں کہ مجھے تو آج یوسف کی خوشبو آ رہی ہے، کہ جیسے یوسف سے ملاقات ہونے والی ہے۔ اب اللہ تعالیٰ کی طرف سے جس وقت اس امتحان کا اختتام تھا تو مصر سے خوشبو آ گئی، اور جب اللہ تعالیٰ نے کسی امتحان اور ابتلا کے اندر ڈالنا تھا تو کنعان کے کنوئیں میں پڑے رہے تو بھی پتا نہیں چلا، جیسے کہ ہمارے شیخ (سعدیؒ) گلستاں کے اندر نقل کرتے ہیں کہ:

یکے پرسید ازاں گم کردہ فرزند	کہ اے روشن گہر! پیرِ خردمند
زمصرش بوئے پیراہن شنیدی	چرا در چاہِ کنعانش ندیدی

شیخ سعدی کہتے ہیں کہ اس بوڑھے سے جس کا بیٹا گم ہو گیا تھا، اس سے کسی نے پوچھا کہ مصر سے تو آپ نے اس کے کپڑوں کی خوشبو سونگھ لی، کنعان کے کنوئیں میں جب پڑا ہوا تھا تو اس وقت تُو نے کیوں نہ دیکھ لیا؟ تو یعقوب علیہ السلام کی طرف سے جواب وہاں یہی نقل کیا گیا کہ:

بگفت احوالِ ما برقِ جہاں ست	دمے پیدا و دیگر دم نہاں ست
گہے بر طارمِ اعلیٰ نشینم	گہے بر پشتِ پائے خود نہ بینم [1]

ہمارے تو حالات اللہ تعالیٰ کی طرف سے بجلی کی طرح ہوتے ہیں، جو کبھی ظاہر ہو جاتی ہے اور کبھی چھپ جاتی ہے، اسی طرح کبھی تو ہم انتہائی بلندی پر ہوتے ہیں، جہاں ہماری نظر دُور دُور تک اللہ تعالیٰ پہنچا دیتے ہیں، اور کبھی ہمیں اپنے پاؤں کی خبر نہیں ہوتی کہ ہمارے پاؤں کے اُوپر کیا ہے؟ تو یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اظہار ہوتا ہے، جس چیز کو چھپانا چاہیں تو کوئی اس کو دیکھ نہیں سکتا،

---

(۱) گلستاں باب دوم، حکایت نمبر ۹۔

اور جس چیز کا اظہار کرنا چاہیں تو کتنے ہی پردوں کے پیچھے کیوں نہ ہو، اللہ تبارک وتعالیٰ اس کو ظاہر کر دیتے ہیں، انبیاء ﷷ کے علم کا بھی حال ہوتا ہے کہ جب اللہ چاہیں تو ان کے اُوپر انکشاف ہوتا ہے، جب نہیں چاہتے تو نہیں ہوتا۔

یعقوب علیہ السلام کی بات پر ناقدر گھر والوں کا رَدِّعمل اور یعقوب علیہ السلام کے اِطمینان کی وجہ

تو یہ گھر والوں کو بتا دیا کہ آج یوسف کی خوشبو آرہی ہے، لیکن گھر والے تو اس مقام کے نہیں تھے، اور نہ وہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی اس طرح سے عظمت محسوس کرتے تھے جس طرح سے ایک عارف آدمی عظمت محسوس کرتا ہے، وہ اسی خیال میں تھے کہ یوسف تو کہیں کا کہیں گیا ہوگا، یوسف کی خوشبو کہاں سے آئے گی، یہ اَبا کو وہی پُرانی غلطی لگی ہوئی ہے، جس کی بنا پر کہتا ہے کہ یوسف زندہ ہے اور ملاقات ہوگی، آج محبت نے کچھ زیادہ جوش مارا ہوگا تو خوشبو آنی شروع ہوگئی، اس لیے کہا کہ اللہ کی قسم! ہم تو تجھے پُرانی گمراہی میں دیکھتے ہیں، یہاں گمراہی سے وہی غلطی مراد ہے جو تمہیں لگی ہوئی ہے۔ لیکن پھر بشارت دینے والا آگیا، اس بشارت دینے والے سے مراد ان کے بیٹوں میں سے ایک بیٹا ہے جس کے ہاتھ میں یوسف علیہ السلام کی وہ قمیص تھی، تو سب سے پہلے سامنے آیا ہوگا، آتے ہی یہ کہا ہوگا کہ یوسف علیہ السلام مل گئے، اور ان کی قمیص ان کے چہرے کے اُوپر ڈال دی تو ان کی بینائی لوٹ آئی، تب حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے اہل وعیال کو متنبہ کر کے کہا کہ میں نہیں کہتا تھا؟ کہ مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسی باتیں معلوم ہیں جن کا تمہیں پتا نہیں ہے، وہ یہی باتیں تھیں کہ یوسف زندہ ہے اور ایک وقت آئے گا کہ اس کے خواب کا ظہور ہوگا، اور اس کی ایک عظمت سامنے آئے گی جس کی بنا پر سارا خاندان اس کے سامنے اس کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے جھکے گا۔

برادرانِ یوسف کے اپنے باپ سے معافی اور اِستغفار کی درخواست کرنا

اب بھائیوں سے جس طرح سے زیادتی یوسف علیہ السلام پہ ہوئی تھی اور یوسف علیہ السلام سے معافی مانگی تو اسی طرح سے یعقوب علیہ السلام پر بھی تو زیادتی ہوئی تھی کہ بیٹے سے محروم کیا اور بیٹے کی جدائی میں اتنا تڑپایا، اس لیے اپنے باپ کے سامنے بھی اپنی غلطی کا اقرار کر کے اِستغفار کی درخواست کرتے ہیں، ''کہنے لگے کہ اے ہمارے اَبا! ہمارے لیے ہمارے گناہوں کی معافی مانگو، بیشک ہم خطاکار تھے'' یہاں بھی وہی بات ہے کہ اپنی خطا کا اعتراف کیا اور اِستغفار کی درخواست کی، جس کا مطلب یہ ہے کہ آپ بھی اپنا حق معاف کر دیں جو ہمارے ہاتھوں سے آپ کو تکلیف ہوئی، اور اللہ تعالیٰ سے بھی درخواست کریں کہ ہمارے گناہوں کو معاف کردے، تو حضرت یعقوب علیہ السلام کا جواب بھی ایسے ہی ہوا کہ میں تمہارے لیے اپنے رَبّ سے اِستغفار کروں گا، کیا مطلب؟ کہ میری طرف سے تو معاف، اور اللہ تعالیٰ سے بھی درخواست کروں گا کہ جو تمہاری غلطیاں ہیں وہ معاف کردے اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ: بیشک وہ بخشنے والا ہے رحم کرنے والا ہے۔ ''کروں گا'' یعنی اُس وقت میں جو اِستغفار کے لئے مناسب ہے، جس طرح سے سَحر کے وقت کا انتظار تھا کہ صبح کے وقت میں دُعا کروں گا، یا کچھ تھوڑی سی تاخیر کی تاکہ مزید تحقیق ہو جائے کہ یوسف نے اپنا حق معاف کر دیا ہے کہ نہیں کر دیا، اُس کے ساتھ یہ اپنے معاملے کو صاف کر آئے کہ نہیں کر آئے، اس تحقیق کے بعد پھر میں تمہارے لیے دُعا کروں گا، استغفار کروں گا۔

خاندانِ یعقوب کی مصر میں آمد پر یوسف علیہ السلام کا اِستقبال کرنا

اب اسی پروگرام کے مطابق تمام اہل وعیال وہاں سے چلے اور مصر میں داخل ہو گئے، حضرت یوسف علیہ السلام کو اطلاع ملی تو استقبال کے لئے گئے، تو جب یہ لوگ یوسف علیہ السلام پر داخل ہوئے تو یوسف علیہ السلام نے اپنی طرف اپنے والدین کو ٹھکانا دیا، عزت کے ساتھ بٹھایا، اور فرمایا کہ داخل ہو جاؤ مصر میں ان شاء اللہ امن کی حالت میں، یہاں کوئی کسی قسم کا خوف وخطرہ نہیں ہے۔ ''داخل ہو جاؤ'' اگر تو سرحد پہ استقبال کیا تھا پھر تو یہ واقع کے مطابق ہے کہ مصر میں تشریف لے آیئے امن وچین کے ساتھ، اور اگر یہ وہاں پہنچ گئے تھے اور گھر جا کے ان کو بٹھا لیا، بٹھانے کے بعد یہ بات کہتے ہیں تو پھر یہ دوام کی طرف اشارہ ہے کہ اب مصر میں تمہارا داخلہ ہو گیا، اب مصر میں ہی رہو، اور پورے امن وعافیت کے ساتھ، کوئی کسی قسم کی پریشانی اور تکلیف نہیں ہے، تو جس تخت کے اوپر خود بیٹھتے تھے فیصلہ وغیرہ کرنے کے لئے، حکومت کا کام کرنے کے لئے، وہیں برابر اسی تخت کے اوپر اپنے والدین کو بٹھا لیا، تو ایسا ہوا ہوگا کہ جس طرح سے ایک دربار لگا کرتا ہے جیسے مجلسِ قضا ہوتی ہے، تو وہاں جو تخت پوش وغیرہ بچھتا ہوگا جس کے اوپر آ کے بیٹھتے تھے تو اپنے والدین کو وہاں بٹھا لیا، پھر حضرت یوسف علیہ السلام تشریف لائے ہوں گے تو جس طرح سے اس وقت شاہی دربار کی تعظیم کا دستور تھا کہ سارے خدام یوسف علیہ السلام کی تعظیم میں جھکے ہوں گے، تو ان کے جھکنے کو دیکھ کے بھائی بھی اور والدین بھی اسی طرح سے تعظیماً یوسف علیہ السلام کے لئے جھک گئے، باقاعدہ اس طرح سے سجدہ کیا ہو جس طرح سے ہم نماز میں کرتے ہیں یہ کوئی ضروری نہیں، تعظیماً جھکنا اس کا مصداق ہے، اور سجدے کی شکل میں ہو گیا ہو تو بھی کوئی فرق نہیں پڑتا، کیونکہ ہمارے تمام مفسرین لکھتے ہیں کہ تعظیماً سجدہ پہلی امتوں میں جائز تھا کہ اس طرح سے جھکا جائے جس میں سجدے کی کیفیت پیدا ہو جائے عظمت کے طور پر، یہ جائز تھا۔

سجدۂ تعظیمی کی شرعی حیثیت اور سجدۂ تعظیمی وسجدۂ عبادت میں فرق

ہماری شریعت میں یہ حرام ہو گیا، اب اِنحناء کی، کسی کے سامنے تعظیماً جھکنے کی اجازت نہیں ہے، رکوع کی کیفیت پیدا کرنی بھی ٹھیک نہیں سجدہ تو کیا ہی جائز ہوگا۔ حضور ﷺ کے سامنے تذکرہ ہوا کہ دوسری جگہ میں لوگ اپنے بڑے کی تعظیم اسی طرح کرتے ہیں کہ جب سامنے آتے ہیں تو سجدہ کرتے ہیں، تو ہمیں بھی اجازت دیجئے کہ ہم آپ کے لئے سجدہ کیا کریں، آپ نے فرمایا کہ نہیں، اگر میں اللہ کی علاوہ کسی دوسرے کو سجدہ کرنے کی اجازت دیتا تو میں بیوی سے کہتا کہ تو اپنے خاوند کو سجدہ کرے۔[1] جو اللہ تعالیٰ نے خاوند کو بیوی کے اوپر عظمت دی ہے تو بیوی سے سجدہ کرواتا، سجدہ صرف اللہ کی ذات کے لئے ہے، جس سے معلوم ہو گیا کہ اب سجدۂ عبادت اور سجدۂ تعظیم کا فرق اٹھا دیا گیا، جس طرح سے سجدۂ عبادت اللہ کے علاوہ کسی کے لئے نہیں اسی طرح سے سجدۂ تعظیم بھی کسی کے لئے نہیں ہے، لیکن ان دونوں میں فقہی درجے کے اعتبار سے اب بھی فرق ہے، کہ اگر کوئی تعظیماً سجدہ کرے اور عبادت کی نیت نہ ہو تو یہ فعل حرام ہے شرک نہیں، اور اگر عبادت کی نیت سے سجدہ کرے گا تو شرک ہے، یہ فرق آپ کی خدمت میں کئی دفعہ عرض کر دیا، کہ عبادت اور تعظیم کے درمیان فرق پڑتا ہے اپنے نظریے سے، دوسرے کو الٰہ سمجھ کے، اپنے اوپر

---

(۱) سنن ابن ماجہ ص ۱۳۳ باب حق الزوج علی المرأۃ/ نیز مشکوۃ ۲/ ۲۸۳، باب عشرۃ النساء، فصل ثالث۔

مافوق الاسباب صاحبِ اختیار سمجھتے ہوئے اس کے سامنے اگر جھکتا ہے تو یہ عبادت ہے، اور اگر ایسا نہیں تو پھر وہ جھکنا تعظیم کے طور پر ہے، تو ایک فعل حرام ہوگا اور ایک شرک، اس لیے ہر سجدہ کرنے والے کو فوراً مشرک نہیں کہا جاسکتا، بلکہ یہ کبیرہ گناہ ہے، ہاں البتہ اگر اس کا نظریہ وہ ہوجائے جس قسم کا نظریہ اللہ کے متعلق ہوتا ہے تو ایسے وقت اس کے فعل کو ہم عبادت قرار دیں گے، اس لیے یہ شرک ہوگا۔

تو جس وقت یہ سارے کے سارے جھک گئے، یا پھر وہی مطلب ہے جو میں نے عرض کر دیا کہ اللہ کے سامنے سجدۂ شکر ادا کیا یوسف علیہ السلام کی وجہ سے، پھر یوسف علیہ السلام کو سجدہ کرنا مراد نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کو کرنا مراد ہے، پھر اُس وقت یوسف علیہ السلام نے یاد دِلایا کہ اَبا! یہی ہے میرے خواب کا مطلب جو میں نے بچپن میں دیکھا تھا، اللہ تعالیٰ نے اس کو سچا ثابت کر دیا۔

یوسف علیہ السلام نے خاندان کے سامنے اپنی تکالیف کی بجائے اللہ کے اِحسانات کا تذکرہ کیا

اب بیٹھ گئے اکٹھے ہو کے، تو آپ جانتے ہیں جب دیر کے بعد ملاقات ہوئی ہو تو پھر گزشتہ واقعات کا تذکرہ ہو جاتا ہے، اب تذکرے میں یہ بات بھی آنی چاہیے تھی کہ بھائیوں نے میرے اوپر یہ زیادتی کی، مجھے یوں کنویں میں پھینکا، اس طرح سے مجھے بیچا، اور پھر اس طرح سے میں بِکا، وہاں عزیزِ مصر کے گھر میرے ساتھ یہ گزری، پھر میں جیل میں ڈال دیا گیا، وہاں میں نے اتنی تکلیفیں اٹھائیں، عام انسان کا طریقہ یہی ہے کہ وہ تکلیفات کو زیادہ اہمیت کے ساتھ بیان کرتا ہے، خود بھی روتا ہے دوسروں کو بھی رُلاتا ہے، ظلم وستم کی داستان سناتا ہے، لیکن یہاں تو ذکر کرنے والے بھی اللہ کے نبی، جن کو سُنایا جارہا ہے وہ بھی اللہ کے نبی، تو تمام تکلیفات کو تو پس پردہ ڈال دیا، جس چیز کو بھی ذکر کررہے ہیں وہ محض اللہ کے احسان کے اظہار کے طور پر، یہ نہیں ذکر کیا کہ مجھے جیل میں ڈالا گیا، وہاں مصیبتیں ہوئیں، نہیں! یہ ذکر کیا کہ اللہ نے میرے پہ احسان کیا کہ مجھے جیل سے نجات دی، جس میں اس بات کی طرف تو اشارہ ہو گیا کہ میں جیل میں گیا تھا، لیکن جیل میں کیا گزری اس کی کوئی تفصیل نہیں، تاکہ اس میں کوئی شکوہ شکایت کی صورت نہ پیدا ہو جائے، ہاں! البتہ اس احسان کو ذکر کر دیا کہ اللہ تعالیٰ نے میرے پہ احسان فرمایا کہ مجھے جیل سے نجات دی۔ اور دوسرے واقعات کو اس میں سمیٹ دیا کہ شیطان نے میرے اور میرے بھائیوں کے درمیان پھوٹ ڈال دی تھی، یہاں بھی نسبت شیطان کی طرف کر دی، کہ میرے بھائی تو ایسے نہیں تھے، وہ تو بہت اچھے تھے، لیکن شیطان نے درمیان میں فساد ڈال دیا، تو بھائیوں کے درمیان اور میرے درمیان شیطان نے فساد ڈال دیا تھا اس کے بعد پھر اللہ تعالیٰ تمہیں وہاں سے لے آیا، ورنہ اس فساد کے نتیجے میں تو کبھی بھی ملاقات نہیں ہونی چاہیے تھی، ہمارے دل آپس میں کبھی بھی صاف نہ ہوتے، لیکن یہ بھی اللہ کا احسان ہے (یہ بات بھی قَدْ اَحْسَنَ کے تحت ہی آرہی ہے) اللہ کا احسان ہے کہ تمہیں بدو سے لے آیا، دیہات سے لے آیا بعد اس کے کہ شیطان نے میرے اور میرے بھائیوں کے درمیان پھوٹ ڈال دی تھی، اِنَّ رَبِّیْ لَطِیْفٌ لِّمَا یَشَآءُ: واقعی اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے اس کے لئے تدبیر کر لیتا ہے، ورنہ یہ حالات ظاہری اسباب سے سوچے بھی نہیں جاسکتے تھے، لیکن جب اللہ کی مشیت ایسے ہی تھی تو اللہ تعالیٰ نے ویسی اس کے لئے تدبیر کر دی، اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِیْمُ الْحَكِیْمُ: بیشک وہ علم والا اور حکمت والا ہے۔

یوسف علیہ السلام کا بارگاہِ الٰہی میں دُعا کرنا

اب یہ سارے کے سارے حالات گزر گئے تو حضرت یوسف علیہ السلام اللہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، شکر ادا کرتے ہوئے اللہ کے سامنے دُعا کرتے ہیں، یہ آگے دُعائے یوسفی ہے، ''اے میرے پروردگار! تُو نے مجھے سلطنت دی'' یہ نعمت کا اقرار ہے، تحدیث بالنعمۃ کے طور پر، یہ بھی شکر کا ایک شعبہ ہے، ''اے میرے پروردگار تُو نے مجھے سلطنت دی اور تُو نے مجھے تاویل الاحادیث سکھائی، باتوں کو ٹھکانے لگانا سکھایا، اے آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنے والے! تُو ہی دُنیا اور آخرت میں میرا کارساز ہے'' اتنے اُونچے عہدے پر پہنچ جانے کے بعد بھی اللہ تعالیٰ کے سامنے اسی طرح سے لجاجت اور اسی طرح سے تضرّع اور زاری ہے۔ تَوَفَّنِیْ مُسْلِمًا: مجھے وفات دے مسلمان ہونے کی حالت میں، یعنی جس وقت بھی وفات دے، یہ نہیں کہ ابھی وفات مانگی جارہی ہے، آپ بھی یہ دُعا کر سکتے ہیں کہ اے اللہ! جس وقت بھی ہمیں وفات دے مسلمان ہونے کی حالت میں دے، جس طرح سے قرآنِ کریم میں ایک جگہ یہ صیغہ آیا: تَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ (آل عمران: ۱۹۳) اسی طرح سے یہ ہے کہ جب بھی وفات ہو مسلمان ہونے کی حالت میں ہو، ''اور مجھے صالحین کے ساتھ ملادے''، میرا اِلحاق صالحین کے ساتھ کردے، نیک بختوں میں مجھے بھی شامل کردے۔ یہاں حضرت یوسف علیہ السلام کا واقعہ اِختتام کو پہنچ گیا، اور پھر اس واقعے سے جو نتیجہ اخذ ہوا کہ سرورِ کائنات ﷺ نے نہ کسی کتاب میں پڑھا، نہ کسی سے سُنا اور اس طرح سے آپ ﷺ کا واقعہ نقل کردینا یہ آپ کی دلیلِ نبوّت ہے، اس کا ذکر اگلی آیت کے اندر آرہا ہے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

واقعۂ یوسف کا تتمہ

واقعے کے تتمے کے طور پر حضرت یوسف علیہ السلام کی دُعا کے بعد عام طور پر مفسرین نے ذکر کیا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام اپنی آل واولاد کے ساتھ مصر میں منتقل ہوگئے، پھر تقریباً ۱۱۰ سال کی عمر میں حضرت یعقوب علیہ السلام کا انتقال وہیں مصر میں ہوا، اور آپ نے وصیت فرمائی تھی کہ مجھے میرے آباؤ اجداد کے پاس لے جاکے دفن کرنا یعنی شام کے علاقے میں، جہاں سے مصر میں آئے تھے، تو حضرت یوسف علیہ السلام نے انتظام کرکے آپ کا جنازہ وہیں بھجوایا اور وہیں ان کو دفن کیا گیا، اور اس کے بعد حضرت یوسف علیہ السلام کا انتقال اسرائیلی روایات کے مطابق ایک سو بیس سال کی عمر میں ہوا، اور انہوں نے بھی وصیت کردی کہ جس وقت یہاں سے بنی اسرائیل مصر کو چھوڑ کے شام کی طرف جائیں تو اس وقت میری لاش کو بھی ساتھ لے جائیں، چنانچہ ان کو کسی تابوت میں رکھ کے دفن کردیا گیا تھا، اور جس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو لے کے آئے ہیں تو اس وقت پھر حضرت یوسف علیہ السلام کا تابوت بھی نکال لائے تھے، اور ان کو بھی لا کے شام کے اندر دفن کردیا تھا۔ اور اسی مقام پر حضرت مفتی محمد شفیع صاحب نے ''معارف القرآن'' میں اور قاضی ثناء اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی ''تفسیر مظہری'' میں یوسف علیہ السلام کے زلیخا کے ساتھ نکاح کا تذکرہ کیا ہے، اُس رکوع کے اختتام پر بھی تھا جہاں بادشاہ سے ملاقات کے بعد حضرت یوسف علیہ السلام کو اختیارات مل گئے تھے، وہاں بھی اکثر مفسرین نے ذکر کیا

ہے، اور ان حضرات نے یہاں اِس واقعے کے اختتام پہ ذکر کیا ہے، اور اُنہی بچوں کا ذکر کیا ہے کہ دو لڑکے پیدا ہوئے ''افرائیم'' اور ''میشا''، اور ایک لڑکی ''رحمت''، اور ''رحمت'' یہ ایوب علیہ السلام کے نکاح میں گئی، اور ''افرائیم'' کی نسل سے یوشع بن نون پیدا ہوئے، یہ تذکرہ یہاں تفاسیر کے اندر موجود ہے، تفصیل آپ کی خدمت میں پہلے عرض کر چکا ہوں۔

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ۚ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ اَجْمَعُوْٓا

یہ واقعہ غیب کی خبروں میں سے ہے ہم اس کو وحی کرتے ہیں آپ کی طرف، آپ ان کے پاس نہیں تھے جب انہوں نے اپنے امر کو

اَمْرَهُمْ وَهُمْ يَمْكُرُوْنَ ﴿۱۰۲﴾ وَمَآ اَكْثَرُ النَّاسِ وَلَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۰۳﴾ وَمَا

پختہ کیا تھا اور وہ تدبیریں کر رہے تھے ﴿۱۰۲﴾ اور لوگوں میں سے اکثر اگرچہ آپ کتنا ہی چاہیں ایمان لانے والے نہیں ﴿۱۰۳﴾ آپ ان

تَسْـَٔلُهُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۭ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۰۴﴾ وَكَاَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ

سے اس تبلیغ پر کوئی اَجر بھی نہیں مانگتے، نہیں ہے یہ مگر نصیحت جہانوں کے لئے ﴿۱۰۴﴾ اور کتنی ہی نشانیاں آسمانوں میں

وَالْاَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ ﴿۱۰۵﴾ وَمَا

اور زمین میں موجود ہیں یہ لوگ ان نشانیوں پر سے گزرتے ہیں اس حال میں کہ ان سے اعراض کرنے والے ہیں ﴿۱۰۵﴾ اور نہیں

يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ ﴿۱۰۶﴾ اَفَاَمِنُوْٓا اَنْ

ایمان لاتے ان میں سے اکثر اللہ کے ساتھ مگر اس حال میں کہ وہ شرک کرنے والے ہیں ﴿۱۰۶﴾ کیا پھر یہ لوگ مطمئن ہو گئے اس بات

تَاْتِيَهُمْ غَاشِيَةٌ مِّنْ عَذَابِ اللّٰهِ اَوْ تَاْتِيَهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۱۰۷﴾

سے کہ آجائے ان کے پاس کوئی محیط آفت اللہ کے عذاب سے یا آجائے ان کے پاس قیامت اچانک اور انہیں پتا بھی نہ ہو ﴿۱۰۷﴾

قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ ۣ عَلٰي بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ ۭ

آپ کہہ دیجئے یہی میرا راستہ ہے، میں اللہ کی طرف دعوت دیتا ہوں، میں بھی بصیرت پر ہوں اور میرے متبعین بھی بصیرت پر ہیں،

وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۰۸﴾ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا

اللہ پاک ہے اور میں مشرکین میں سے نہیں ہوں ﴿۱۰۸﴾ اور نہیں بھیجا ہم نے آپ سے قبل مگر بستیوں والوں میں سے آدمیوں کو ہی،

نُوْحِیْٓ اِلَیْهِمْ مِّنْ اَهْلِ الْقُرٰی ؕ اَفَلَمْ یَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَیَنْظُرُوْا كَیْفَ كَانَ عَاقِبَةُ

ہم ان کی طرف وحی کرتے ہیں، کیا یہ لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں، پھر یہ دیکھ لیتے کیسا انجام ہوا

الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ وَ لَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَیْرٌ لِّلَّذِیْنَ اتَّقَوْا ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۰۹﴾

ان لوگوں کا جو ان سے پہلے گزرے ہیں اور البتہ آخرت کا گھر بہتر ہے ان لوگوں کے لئے جو تقویٰ اختیار کرتے ہیں، کیا تم سوچتے نہیں ہو؟ ﴿۱۰۹﴾

حَتّٰۤی اِذَا اسْتَایْـَٔسَ الرُّسُلُ وَ ظَنُّوْۤا اَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا جَآءَهُمْ نَصْرُنَا ۙ

حتیٰ کہ جس وقت رسول مایوس ہوگئے اور انہوں نے گمان کیا کہ بیشک وہ غلطی میں ڈال دیے گئے تو ان کے پاس ہماری مدد آ گئی

فَنُجِّیَ مَنْ نَّشَآءُ ؕ وَ لَا یُرَدُّ بَاْسُنَا عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِیْنَ ﴿۱۱۰﴾ لَقَدْ كَانَ فِیْ قَصَصِهِمْ

پھر نجات دیا گیا جس کو ہم نے چاہا اور نہیں رد کیا جاتا ہمارا عذاب مجرم لوگوں سے ﴿۱۱۰﴾ البتہ تحقیق ان لوگوں کے واقعات میں

عِبْرَةٌ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ؕ مَا كَانَ حَدِیْثًا یُّفْتَرٰی وَ لٰكِنْ تَصْدِیْقَ الَّذِیْ بَیْنَ یَدَیْهِ

عبرت ہے عقل والوں کے لئے، یہ قرآن گھڑی ہوئی بات نہیں ہے، لیکن یہ تصدیق ہے اس کتاب کی جو اس سے پہلے گزری

وَ تَفْصِیْلَ كُلِّ شَیْءٍ وَّ هُدًی وَّ رَحْمَةً لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ ﴿۱۱۱﴾

اور تفصیل ہے ہر شی کی اور یہ ہدایت ہے اور رحمت ہے ان لوگوں کے لئے جو کہ ایمان لاتے ہیں ﴿۱۱۱﴾

خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ

واقعے کے ختم ہونے کے بعد اب اس واقعے کو دلیلِ نبوّت بنایا جارہا ہے سرورِ کائنات ﷺ کے لئے، اور اس واقعے کو سامنے رکھ کے مشرکینِ مکہ کے لئے ترہیب وترغیب کی جارہی ہے۔ ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَیْبِ نُوْحِیْهِ اِلَیْكَ: یہ واقعہ جو آپ کے سامنے ذکر کیا گیا غیب کی خبروں میں سے ہے ہم اس کو وحی کرتے ہیں آپ کی طرف، وَمَا كُنْتَ لَدَیْهِمْ اِذْ اَجْمَعُوْۤا اَمْرَهُمْ: آپ ان کے پاس نہیں تھے (لَدَیْهِمْ کی ضمیر اخوۂ یوسف کی طرف) آپ یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کے پاس نہیں تھے جب انہوں نے اپنے امر کو پختہ کیا تھا، یعنی یوسف علیہ السلام کے بارے میں پختہ فیصلہ کرلیا، وَهُمْ یَمْكُرُوْنَ: اور وہ تدبیریں کررہے تھے، یہ حالات جس وقت گزر رہے تھے تو آپ ان کے پاس نہیں تھے، تو مطلب کیا ہوا؟ پاس نہیں تھے مشاہدہ بھی نہیں کیا، اور یہ تو متفق علیہ بات ہے کہ آپ نے کتابیں نہیں پڑھیں، اور جو کتابیں اس وقت موجود تھیں توراۃ اور انجیل وغیرہ ان میں یہ واقعہ اتنی تفصیل کے ساتھ مذکور نہیں، بلکہ بہت سارے اجزاء اس واقعے کے ایسے ہیں جو خلافِ عقل یا انبیاء علیہم السلام کے مقام اور مرتبے کے مناسب نہیں وہ ان کتابوں میں مذکور ہیں، قرآن کریم نے ان سب کی اصلاح کی، تو یہ دلیل ہے اس بات کی کہ سرورِ کائنات ﷺ کو یہ واقعہ وحی کے ذریعے سے ہی بتایا

گیا ہے اور یہ دلیل ہے آپ کی نبوت کی۔ وَمَآ اَكْثَرُ النَّاسِ وَلَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِيْنَ: اور لوگوں میں سے اکثر اگر چہ آپ کتنا ہی چاہیں ایمان لانے والے نہیں، وَلَوْ حَرَصْتَ: اگر چہ آپ حرص ہی کریں، ''لوگوں میں سے اکثر اگر چہ آپ حرص کریں ایمان لانے والے نہیں'' وَمَا تَسْئَلُهُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ: آپ ان سے اس تبلیغ پر کوئی اجر بھی نہیں مانگتے، اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ: نہیں ہے یہ مگر نصیحت جہانوں کے لئے، وَكَاَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ: اور کتنی ہی نشانیاں آسمانوں میں اور زمین میں موجود ہیں يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا: یہ لوگ ان نشانیوں پر سے گزرتے ہیں، وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ: اس حال میں کہ ان سے اعراض کرنے والے ہیں، توجہ نہیں کرتے، وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ: اور نہیں ایمان لاتے ان میں سے اکثر اللہ کے ساتھ، اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ: مگر اس حال میں کہ وہ شرک کرنے والے ہیں، اَفَاَمِنُوْٓا اَنْ تَاْتِيَهُمْ غَاشِيَةٌ مِّنْ عَذَابِ اللّٰهِ: غاشیہ: چھپا لینے والی چیز، ڈھانپ لینے والی چیز، تو یہاں سے آفت مراد ہے جو محیط ہو جائے، سب کو گھیرے میں لے لے، ''کیا پھر یہ لوگ بے فکر ہو گئے، مطمئن ہو گئے اس بات سے کہ آجائے ان کے پاس کوئی محیط آفت اللہ کے عذاب سے'' اَوْ تَاْتِيَهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً: یا آجائے ان کے پاس قیامت اچانک، وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ: اور انہیں پتا بھی نہ ہو، قُلْ: آپ کہہ دیجئے هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ: یہی میرا راستہ ہے، اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ: میں اللہ کی طرف دعوت دیتا ہوں، عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ: میں اور وہ لوگ جو میرے متبع ہیں بصیرت پر ہیں، یعنی سوچ سمجھ کر ہم یہ راستہ اختیار کئے ہوئے ہیں، ایسے ہی جہالت کے ساتھ یا اندھی تقلید کے طور پر اختیار نہیں کئے ہوئے، عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا: میں بھی بصیرت پر ہوں اور میرے متبعین بھی بصیرت پر ہیں، بصیرت دل کی سوجھ بوجھ کو کہتے ہیں، وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ: اللہ پاک ہے اور میں مشرکین میں سے نہیں ہوں، وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا: اور نہیں بھیجا ہم نے آپ سے قبل مگر آدمیوں کو ہی، رجال رَجل کی جمع ہے، نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ: ہم ان کی طرف وحی کرتے ہیں، مِّنْ اَهْلِ الْقُرٰى: قریٰ قریہ کی جمع ہو گئی، ''بستیوں والوں میں سے''، ''نہیں بھیجا ہم نے آپ سے قبل مگر بستیوں والوں میں سے آدمیوں کو ہی'' نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ: ہم ان کی طرف وحی کرتے ہیں، اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ: کیا یہ لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں، فَيَنْظُرُوْا: پھر یہ دیکھ لیتے كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ: کیسا انجام ہوا ان لوگوں کا جو ان سے پہلے گزرے ہیں، وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ اتَّقَوْا: اور البتہ آخرت کا گھر بہتر ہے ان لوگوں کے لئے جو تقویٰ اختیار کرتے ہیں، اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ: کیا تم سوچتے نہیں ہو؟ حَتّٰٓى اِذَا اسْتَيْئَسَ الرُّسُلُ: حتّٰی یہ غایت ہے اور فعل محذوف ہے اُمهِلُوا حَتّٰٓى اِذَا اسْتَيْئَسَ الرُّسُلُ، پہلے کافر جو گزرے ہیں الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ کے تحت جن کا ذکر کیا گیا، ان کو مہلت دی گئی، بہت لمبی لمبی مہلتیں ان کو دی گئیں، حتّٰی کہ جس وقت رسول مایوس ہو گئے، رسولوں پہ نا اُمیدی طاری ہو گئی، وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا: اور ان رسولوں نے گمان کیا کہ بیشک وہ غلطی میں ڈال دیئے گئے، قَدْ كُذِبُوْا یہ ہماری قراءت تخفیف کی ہے كُذِبُوْا، دوسری قراءت كُذِّبُوْا کی ہے، ہم اپنی قراءت کے مطابق اس کا ترجمہ کرتے ہیں'' رسولوں نے گمان کیا کہ بیشک وہ رسول غلطی میں ڈال دیئے گئے'' جَآءَهُمْ نَصْرُنَا: ان کے پاس ہماری مدد آ گئی، فَنُجِّيَ مَنْ نَّشَآءُ: پھر نجات دیا گیا جس کو ہم نے چاہا، وَلَا يُرَدُّ بَاْسُنَا عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِيْنَ: نہیں رد کیا جاتا ہمارا عذاب مجرم لوگوں سے۔ لَقَدْ كَانَ فِيْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ: قَصص یہ مصدر بھی آتا ہے اور یہ قصہ کی جمع بھی ہے، جیسے اسی سورۃ کی ابتدا میں بھی یہ لفظ آیا تھا اَحْسَنَ الْقَصَصِ تو وہاں ذکر کیا تھا، قصہ کی جمع قِصص بھی آتی ہے، قَصص بھی آتی ہے قاف کے فتحہ کے ساتھ، تو یہ واقعات کے

معنی میں ہے،''البتہ تحقیق ان لوگوں کے واقعات میں عبرت ہے عقل والوں کے لئے''۔ اَلباب لُبّ کی جمع ہے، خالص عقل کو کہتے ہیں، مَاكَانَ حَدِيْثًا يُّفْتَرٰى: كَانَ کی ضمیر اس کتاب کی طرف لوٹ رہی ہے، یہ قرآن گھڑی ہوئی بات نہیں ہے، وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ: لیکن یہ تصدیق ہے اس کتاب کی جو اس سے پہلے گزری، تصدیق مصدِّق کے معنی میں، جس کا ذکر آپ کے سامنے بار بار آیا، کہ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ کا مصداق تورات ہوگئی، تورات کا یہ مصداق ہے یا تورات کا یہ مصدِّق ہے، دونوں طرح سے اس کا مفہوم ذکر کر دیا جاتا ہے، وَتَفْصِيْلَ كُلِّ شَيْءٍ: اور یہ قرآن تفصیل ہے ہر شئ کی، یعنی دین کے بارے میں جتنی چیزیں ضروری ہیں ان کی تفصیل ہے یعنی ان کی تفصیل کرنے والا ہے، تفصیل مُفصِّل کے معنی میں، وَّهُدًى وَّرَحْمَةً: اور یہ ہدایت ہے راہنمائی ہے اور رحمت ہے، یعنی ابتدا کے اعتبار راہنمائی ہے کہ اس سے راستہ معلوم ہوتا ہے کہ صحیح راستہ کون سا ہے، جس وقت انسان اس کو اختیار کرتا ہے تو نتیجۃً یہ رحمت ہے،''ان لوگوں کے لئے جو کہ ایمان لاتے ہیں'' فائدہ چونکہ یہی لوگ اٹھاتے ہیں اس لئے تعیین ہوگئی، لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ: ان لوگوں کے لئے جو ایمان لاتے ہیں۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

تفسیر

''علمِ غیب'' اور ''اِطلاع علی الغیب'' میں فرق

پہلے تو اس واقعے کو دلیلِ نبوّت کے طور پر ذکر کیا گیا کہ یہ غیب کی خبروں میں سے ہے، غیب کی خبروں میں سے ہونے کا مطلب یہی ہے جس طرح قرآنِ کریم میں دوسری جگہ الفاظ آئے مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَآ اَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ (سورۂ ہود:۴۹) کہ یہ ان واقعات میں سے ہے جو نہ تجھے معلوم تھے نہ تیری قوم کو معلوم تھے، آپ کو معلوم ہونے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا، اللہ تعالیٰ نے آپ کی طرف وحی کی، تو غیب کی خبریں اللہ تبارک وتعالیٰ انبیاء ﷺ کو وحی کے ذریعے سے بتلاتے رہتے ہیں، لیکن یہ علمِ غیب نہیں کہلاتا، جیسا کہ دُوسری جگہ قرآنِ کریم میں صراحت آگئی لَا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ (النمل:۶۵)، وہاں حصر کر دیا گیا کہ اللہ کے علاوہ غیب کو کوئی نہیں جانتا، براہِ راست علم اسی کو حاصل ہے، اور جو چیز عام طور پر مخلوق کی نظروں سے چھپی ہوئی ہو، ان کے علم میں نہ ہو، وہ بتلا دی جائے، اور اس بتلانے کے ساتھ وہ غیب کی خبر معلوم ہو جائے تو اس کو علمِ غیب نہیں کہتے، یہ تو سرورِ کائنات ﷺ کے بتلانے سے ہمیں بھی حاصل ہو گیا، اب جنّت ہم نے دیکھی نہیں، دوزخ ہم نے دیکھی نہیں، تو یہ بھی اُمورِ غائبہ میں سے ہے، آخرت کے جتنے بھی احوال ہیں یا گزشتہ اُمتوں کے واقعات ہیں یہ سارے کے سارے ہی غیب کی خبروں میں سے ہیں، اللہ تعالیٰ نے سرورِ کائنات ﷺ کو بتلا دیں، یہ ''اِطلاع علی الغیب'' ہے، اس ''اطلاع علی الغیب'' سے آپ ﷺ ''عالم الغیب'' نہیں کہلائیں گے، جس طرح سے آپ ﷺ کے بتلانے کے ساتھ ہمیں پتا چل گیا، اب جنّت، دوزخ کی تفصیل، آخرت کے اَحوال، گزشتہ اُمتوں کے احوال اور قصص ہمارے سامنے بیان کر دیے گئے تو ہمیں بھی اطلاع ہوگئی، تو علمِ غیب اصل کے اعتبار سے وہی کہلاتا ہے جس پر براہِ راست اطلاع ہو اور اس کو کسی ذریعے سے حاصل نہ کیا جائے، یہ شان صرف اللہ تعالیٰ کی ہے۔ اب اگر طبیب نبض دیکھ

کے اندر کے کچھ حالات معلوم کر لے، یا کوئی نجومی ستاروں کے اندر غور کر کے کسی آنے والے واقعے کا اندازہ کر لے، یہ قرائن کے ساتھ اور شواہد کے ساتھ جو چیز معلوم کی جاتی ہے چاہے وہ چھپی ہوئی ہو، یا آج کل جو آلات کے ذریعے سے اور ایکسریز کے ذریعے سے چھپی ہوئی چیزیں معلوم کر لیتے ہیں، زمین کے ایکسرے کرتے ہیں، اس کے اندر چھپی ہوئی چیزوں کا پتا چلتا ہے، تو ذرائع کے ساتھ جو علم حاصل ہوا کرتا ہے اس کو ''علمِ غیب'' نہیں کہتے، اس لیے ''علمِ غیب'' اللہ کی ہی صفت ہے، باقی! ''اِطلاع علی الغیب'' اللہ تعالیٰ انبیاء علیہم السلام کو کرتا رہتا ہے۔

ماضی کے واقعات بیان کرنا سرورِ کائنات ﷺ کی نبوّت کی دلیل ہے

تو یہاں بھی اسی طرح سے ہے کہ یہ ماضی کے واقعات ہیں جو آپ ﷺ سے بھی پوشیدہ تھے، آپ ﷺ کی قوم سے بھی پوشیدہ تھے، ہم نے آپ کی طرف وحی کی، تو وحی کے ساتھ معلوم ہو گئے، یہ دلیلِ نبوّت ہے، کیونکہ واقعے کو جاننے کے دو ہی ذریعے ہوتے ہیں، یا تو اِنسان مشاہدہ کرنے والا ہو کہ اس واقعے میں خود موجود تھا، ایک واقعہ پیش ہوا، آپ وہاں موجود تھے، اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تو بھی آپ کو یقینی طور پر علم حاصل ہو جائے گا، یا آپ کسی معتمد علیہ کتاب سے اس کو پڑھیں۔ اب ''کسی کتاب سے پڑھنا'' یہ تو سب جانتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ کے لئے نہیں ہے، کہ آپ کسی مدرسے میں داخل نہیں ہوئے، آپ نے کتابیں نہیں پڑھیں، اُمّی ہیں، اہلِ علم کی مجلس میں نہیں رہے، ان کی صحبت میں نہیں بیٹھے، وہ سبب تو یقینی طور پر منتفی تھا، اور اسی طرح سے یہ بھی ذکر کر دیا کہ جب وہ تدبیریں کر رہے تھے، مکر و فریب کر رہے تھے یوسف علیہ السلام کے خلاف، اور آخر کار انہوں نے پختہ ارادہ کر لیا کہ اس کو کنویں میں ڈال دیا جائے، جب یہ باتیں ہو رہی تھیں تو آپ اس وقت موجود نہیں تھے، موجود بھی نہیں تھے اور کتابوں میں بھی نہیں پڑھا، تو یہ یقینی طور پر متعین ہو گیا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو وحی کے ذریعہ سے یہ خبریں دی جا رہی ہیں۔

سرورِ کائنات ﷺ کو تسلی

آگے سرورِ کائنات ﷺ کے لئے تسلی ہے کہ آپ کا کام سمجھانا ہے، اور اگر یہ نہیں سمجھتے تو ہر وقت آپ ان کے پیچھے پڑ کر اپنے آپ کو غم میں نہ ڈالے رکھیں، جیسے کہ سورۂ کہف میں آئے گا فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ کہ آپ ان کے پیچھے اس طرح سے لگ گئے کہ آپ گھل گھل کے جان ہی دے دیں گے، ایسا کرنے کی ضرورت نہیں، آپ کا نبی ہونا تو بالکل واضح ہے، لیکن اکثر لوگ ایمان لانے والے نہیں، وَمَآ اَكْثَرُ النَّاسِ بِمُؤْمِنِيْنَ: بِمُؤْمِنِيْنَ یہ مَآ کی خبر ہے۔ وَلَوْ حَرَصْتَ: اگرچہ تو کتنا ہی چاہے، اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے۔ اور پھر ان کے ایمان نہ لانے سے آپ کا نقصان کوئی نہیں، آپ کون سا اس تبلیغ پہ ان سے کوئی تنخواہ مانگتے ہیں یا اُجرت مانگتے ہیں کہ اگر یہ تسلیم نہیں کریں گے تو آپ کا کوئی نقصان ہو جائے گا، آپ تو اللہ کی اس رحمت کو مفت بانٹ رہے ہیں، اس لیے اگر کوئی لے لے گا اور اس سے فائدہ اٹھائے گا تو اس کا اپنا نفع ہے، اور اگر کوئی نہیں لیتا تو اس میں آپ کا کوئی نقصان نہیں، ''آپ ان سے اس بات پر کوئی اجر نہیں مانگتے، اجرت نہیں مانگتے نہیں ہے یہ مگر نصیحت تمام جہانوں کے لئے'' نصیحت کے طور پر

یہ بات سامنے آگئی، قرآنِ کریم بطور ذکر کے آگیا، اس لیے اگر یہ استفادہ کریں فائدہ اٹھائیں تو ان کی اپنی سعادت ہے، اور اگر یہ اس کو قبول نہیں کرتے تو اس میں آپ کا کوئی نقصان نہیں۔

شرک کے ساتھ اللہ کو ماننا، نہ ماننے کے برابر ہے

یہ تو رسالت کے انکار کا ذکر تھا اور اس پر سرورِ کائنات ﷺ کو تسلی دی گئی تھی، آگے توحید سے انکار کا ذکر ہے، ''کتنی ہی نشانیاں آسمان اور زمین موجود ہیں'' جو اللہ کی وحدانیت پر دلالت کرتی ہیں، يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا: یہ لوگ ان نشانیوں پر سے گزر جاتے ہیں، وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ: اور یہ ان سے اِعراض کرنے والے ہوتے ہیں، توجہ ہی نہیں کرتے، اگر ان علامات اور نشانیوں کے اندر غور کرتے تو غور کرنے کی صورت میں ان کو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت سمجھ میں آسکتی تھی۔ باقی! یہ جو اللہ کا اقرار کرتے ہیں تو ان کا اللہ کا اقرار کرنا معتبر نہیں، کیونکہ ساتھ ساتھ یہ شرک بھی کرتے ہیں، ''اور ان میں سے اکثر ایمان نہیں لاتے اللہ پر مگر اس حال میں کہ یہ مشرک ہیں، شریک بھی ٹھہراتے ہیں'' اور شریک ٹھہرا کے اگر اللہ کو مانا جائے تو نہ ماننے کے برابر ہے، اس طرح سے نہ یہ آپ کی نبوّت کے قائل، اور نہ یہ اللہ کو ماننے والے ہیں، کیونکہ اگر اللہ کو مانتے ہیں تو ساتھ شرک کا ارتکاب کرتے ہیں، اور شرک کا ارتکاب کرتے ہوئے اللہ کو مانا جائے تو یہ نہ ماننے کے برابر ہے۔

شرک کے مختلف درجات

شرک کا ارتکاب کس طرح سے کرتے تھے؟ اس کے مختلف درجات ہیں، بعض تو براہِ راست ہی اس کے لئے شرک کا قول کرتے تھے، جس طرح سے شرکاء شفعاء اور الٰہ کا لفظ قرآنِ کریم میں استعمال کیا گیا ہے، انہوں نے بہت سارے آلہہ بنا لیے تھے، ایک اِلٰہ پر اِکتفاء نہیں کی، اور یہود و نصاریٰ اللہ تعالیٰ کے لئے اولاد کا قول کرتے تھے، تو جب اللہ کی طرف اولاد کی نسبت ہو جائے تو اولاد بھی اپنی ذاتی صفات میں باپ کے ساتھ شریک ہوتی ہے، تو یہ بھی شرک ہے، اور اس سے آگے اگر بڑھیے تو سرورِ کائنات ﷺ نے رِیاکاری کو بھی شرک قرار دیا، گویا کہ یہ بھی ایمان کے اندر نقص ہے، کہ اللہ پر ایمان ہو لیکن انسان کام کرے مخلوق کو دکھانے کے لئے اور مخلوق کو خوش کرنے کے لئے، تو ریا یہ بھی شرکِ اصغر ہے، اس لیے تنبیہ کے طور پر یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ بعض لوگ جو اپنے آپ کو مؤمن سمجھتے ہیں ایمان لاتے ہیں اور کلمہ پڑھتے ہیں لیکن در پردہ باطنی طور پر وہ بھی شرک کا ارتکاب کرتے ہیں، اور یہ شرک ریاکاری والا شرک ہے، تو اس لیے ایمان کا کمال تبھی ہوگا جب ہر قسم کا شرک ختم ہو جائے، اخلاص پیدا ہو جائے اور اپنے اعمال کے اندر ریاکاری کا جذبہ موجود نہ ہو، لوگوں کو خوش کرنے کے لئے اور دکھانے کے لئے کام نہ کیا جائے، محض اللہ کی رضا کے لئے کام کیا جائے، جیسے سورہ کہف کے آخر میں آیت آئے گی جس میں یہ الفاظ ہیں فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا: جو اللہ تعالیٰ کی ملاقات کی امید رکھتا ہے اسے چاہیے کہ نیک عمل کرے اور اپنے رَبّ کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرے، تو وہاں آپ ''جلالین'' اور دوسری تفسیروں میں پڑھیں گے کہ اس کا مفہوم بیان کیا ہوا گا اَیْ لَا یُرَائِیْ اس کو چاہیے کہ اپنے رَبّ کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرے یعنی ریاکاری اختیار نہ کرے، تو اللہ کے ساتھ صحیح ایمان

لانے کا طریقہ یہ ہے کہ اخلاص اور احسان کی صفت پیدا ہو جائے، کہ جتنے کام بھی عبادت کے طور پر کیے جاتے ہیں ان میں محض اللہ کی رضا مقصود ہو، اللہ کو خوش کرنا مقصود ہو، کسی کو دکھلانا بھی مقصود نہ ہو، ورنہ یہ بھی ایک درجے کا شرک ہے۔ اور اسی طرح سے قرآنِ کریم میں ہی آپ کے سامنے ایک اور بات بھی آئے گی اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ (الجاثیہ: ۲۳) کیا آپ نے ایسا شخص دیکھا کہ جس نے اپنی خواہش کو ہی اپنا اِلٰہ بنالیا، اور اللہ تعالیٰ نے علم کے باوجود اس کو گمراہی میں ڈال دیا، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اتباعِ ہویٰ، اپنی خواہشات کے پیچھے چلنا، اللہ تعالیٰ کے احکام کی پروانہ کرنا، یہ بھی اتخاذِ اِلٰہ ہے اور یہ بھی ایک درجے کا شرک ہے، جس وقت اللہ تعالیٰ کا حکم سامنے آجائے، شریعت کا حکم سامنے آجائے تو اس وقت انسان اگر اپنی خواہشات کی رعایت رکھتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے احکام کی رعایت نہیں رکھتا، اپنی خواہشات کی پیروی کرتا ہے تو یہ بھی ایک درجے کا شرک ہے کہ اپنے نفس کو اللہ کا شریک ٹھہرالیا، اور یہ عنوان بھی قرآنِ کریم میں صراحتاً ذکر کیا گیا، گویا کہ اتباعِ ہویٰ بھی ایک درجے میں اتخاذِ اِلٰہ ہے، تو کامل درجہ کا مؤمن وہ ہوگا جو اللہ کے احکام کے مقابلے میں اپنی خواہشات کو بھی مٹا دے، ورنہ اپنی خواہشات کی اِتباع کرنے والا بھی ایک درجے میں اللہ کے ساتھ دوسرے اِلٰہ کو بنائے بیٹھا ہے، اور حدیث شریف میں سرورِ کائنات ﷺ نے اسی مضمون کی وضاحت فرمائی: ''لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى يَكُوْنَ هَوَاهُ تَبَعًا لِّمَا جِئْتُ بِهٖ''[1] تم میں سے کوئی شخص کامل مؤمن نہیں ہوسکتا جس وقت تک اس کی خواہشِ نفس بھی اس دین کے تابع نہ ہو جائے جو دین میں لے کے آیا ہوں۔ تو اپنی خواہشات کو اگر نہ مٹایا جائے اور خواہشات کی رعایت رکھی جائے تو اگر آپ نے بت کو شریک نہیں کیا تو نفس کو اللہ کے ساتھ شریک کرلیا، کہ اللہ کے احکام کے مقابلے میں دوسرے کو آپ نے مطاع قرار دے لیا، جیسے یہود اور نصاریٰ کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا اِتَّخَذُوْۤا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (سورۂ توبہ: ۳۱) کہ ان لوگوں نے اپنے علماء کو اور پیروں کو اللہ کے علاوہ رَبّ بنالیا، تو اس کا معنی بھی تو یہی تھا کہ علماء اور پیروں کا یہ مقام بنالیا جائے کہ ان کے اَحکام کی رعایت رکھی جائے چاہے وہ صراحتاً اللہ کے حکم کے خلاف ہی کیوں نہ ہوں، تو یہ ایسے ہی ہے جیسے کہ ان کو رَبّ بنالیا، تو اَحبار و رُہبان کی اطاعت اس طرح سے کی جائے کہ اللہ کی اِطاعت کے مقابلے میں اس کو ترجیح دی جائے تو یہ بھی شرک ہے، اور اگر اپنے نفس کی بات اللہ کے احکام کے مقابلے میں مانی جائے گی تو یہ بھی شرک ہے۔ اور اس سے بھی آگے ترقی کرکے ہمارے قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی ؒ لکھتے ہیں کہ ''اَلنَّظَرُ اِلَى الْاَسْبَابِ مَعَ الْغَفْلَةِ عَنِ الْمُسَبِّبِ يُنَافِي التَّوْحِيْدَ فَالْمُوَحِّدُوْنَ هُمُ الصُّوْفِيَّةُ'' یہ چونکہ بہت بڑے صوفی ہیں، تو اس لیے تصوّف کے انداز میں بہت ساری باتیں کہہ جاتے ہیں، کہتے ہیں اسباب کے اُوپر نظر رکھنا مسبّب سے غفلت برتتے ہوئے، کہ یہ دھیان نہ رہے کہ جو کچھ ہوتا ہے اللہ کی جانب سے ہوتا ہے، اسباب بذاتِ خود کچھ نہیں ہیں، تو مسبّب سے غفلت ہو اور اَسباب پہ اعتماد ہو جائے کہ ہم نے چونکہ یوں کرلیا لہٰذا ایسا ہو جائے گا، فلاں چیز کا سبب ہمیں حاصل ہے، لہٰذا یہ بات یوں ہو جائے گی، اور یہ خیال نہ ہو کہ اگر اللہ چاہے گا تو ہوگی، اسباب کچھ نہیں ہیں، اسباب کے اندر تاثیر اللہ تعالیٰ رکھتے ہیں، تو اگر مسبّب سے غفلت ہو اور اسباب کے اوپر پوری طرح سے اعتماد آجائے تو یہ بھی توحید کے منافی ہے، اس لیے کہتے ہیں کہ صحیح طور پر اور کامل درجے کے موحد صوفیہ ہی

---

(۱) مشکوٰۃ ج۱ ص ۳۰ باب الاعتصام فصل ثانی / شرح السنۃ للبغوی ج۱ ص ۲۱۳۔

ہوتے ہیں، کہ جن کی توجہ ہر وقت اللہ تعالیٰ کی طرف رہتی ہے اور وہ اسباب پر بھی اعتماد نہیں کرتے، تو وَمَا یُؤْمِنُ اَکْثَرُھُمْ بِاللّٰہِ اِلَّا وَھُمْ مُّشْرِکُوْنَ میں اتنی ساری تعمیم ہے، اس لیے کامل طریقے سے اگر کوئی شخص مؤمن بننا چاہتا ہے تو اس کو ہر قسم کے شرک کا خاتمہ کرنا چاہیے، مشرکین کا شرک بہت جلی قسم کا تھا، اور یہود ونصاریٰ کا شرک اور طرح کا تھا، تو ہم کلمہ پڑھنے والے، صحیح طور پر سرورِ کائنات ﷺ کی اتباع میں ایمان لانے والے بھی بعض باتوں میں شرک کے اندر مبتلا ہو جاتے ہیں، اس لیے شرک کی رگ کو ختم کرنے کے لئے انسان کو بہت زیادہ متیقظ اور ہوشیار رہنا پڑتا ہے، تب جا کے ایمان کمال کو پہنچے گا۔

مشرکین کو دھمکی اور حضور ﷺ کا مشرکین سے اعلانِ براءت

اَفَاَمِنُوْٓا: کیا یہ لوگ بے فکر ہو گئے، یعنی کفر وشرک میں مبتلا ہیں، نبوت رسالت اور توحید کا انکار کرتے ہیں، تو پھر یہ بے فکر ہوئے بیٹھے ہیں اس بات سے کہ اللہ کے عذاب سے ان پر کوئی آفتِ محیط آ جائے، ایسی آفت آ جائے جو ان کا احاطہ کر لے ان کو ڈھانپ لے، یا ان پر قیامت آ جائے اچانک اور ان کو پتا بھی نہ چلے۔ یعنی ان کو بے فکر نہیں ہونا چاہیے، کسی وقت بھی یہ اللہ تعالیٰ کے عذاب کا نشانہ بن سکتے ہیں، اور کسی وقت بھی ان کے اوپر قیامت آ سکتی ہے، جس کے بعد پھر ان کی اللہ کے سامنے پیشی ہوگی، پھر ان کا برا انجام ان کے سامنے آ جائے گا۔ ''آپ انہیں کہہ دیجیے کہ میرا تو یہ راستہ ہے جو میں نے تمہارے سامنے بیان کر دیا'' یعنی اللہ کی طرف وحی جو آتی ہے اس کی اتباع اور اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرانا یہی میرا راستہ ہے، اور اسی کی میں دعوت دیتا ہوں، اور بے سوچے سمجھے میں اس راستے پر نہیں چلا، میں اور میرے متبع سب بصیرت پر ہیں، سمجھ سوچ کر عقل وبصیرت کے ساتھ ہم اس راستے کو اختیار کیے ہوئے ہیں، اور اسی راستے کی ہم دعوت دیتے ہیں، حاصل اور مرکزی عنوان ہمارے راستے کا یہی ہے کہ سُبْحٰنَ اللّٰہِ وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ اللہ پاک ہے ہر قسم کے شرک سے، اور میں مشرکین میں سے نہیں ہوں، ہمارے راستے کا بڑا عنوان یہی ہے، کہ ہمارا طریقہ شرک والا طریقہ نہیں۔

نبوّت پر عام طور پر ہونے والا اِشکال اور اس کا جواب

نبوّت کے بارے میں ان کا جو اِشکال ہوتا تھا وہ عام طور پر قرآنِ کریم میں ذکر کیا گیا ہے، کہتے تھے کہ بشر رسول کیسے ہو سکتا ہے؟ اب آگے گویا کہ ان کے اس اِشکال کو دُور کرنا مقصود ہے، کہ ''ہم نے آپ سے پہلے بھی جتنے رسول بھیجے ہیں سب رجال ہی تھے'' رجال کا لفظ بول کر دو باتیں مراد ہو سکتی ہیں، کسی عورت کو رسول نہیں بنایا گیا، جو رسول آیا وہ رجل ہی تھا، دوسری وہی بات کہ انسانوں کی طرف بھیجنے کے لئے ہم نے ہمیشہ انہی بستیوں میں سے رجال ہی منتخب کیے ہیں، لوگوں کی ہدایت کے لئے فرشتوں کو ہم نے رسول بنا کر نہیں بھیجا، بلکہ جن بستیوں میں رسول بھیجنا ہماری حکمت تھی ان بستیوں میں سے ہی رجال کو منتخب کیا گیا، اور چُن چُنا کے اللہ تعالیٰ نے ان کو اس منصب کے اوپر فائز کیا، تو ان لوگوں کا یہ خیال غلط ہے، اگر آپ رجل ہیں، بنی آدم میں سے ہیں، بشر ہیں، انسان ہیں، تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں، اللہ تعالیٰ نے جب بھی اہلِ قریٰ کی ہدایت کے لئے بھیجا ہے تو انہی اہلِ قریٰ میں سے، انہی بستیوں والوں میں سے رجال کو منتخب کیا ہے، اور ان کے ذمے ان لوگوں کی ہدایت لگائی ہے۔ باقی! ان کو چاہیے کہ

چلیں پھریں، اور دنیا کے اندر دیکھیں کہ یہی رجال جو اللہ کی طرف سے آئے تھے، انہی قبیلوں اور قوموں میں سے منتخب کر کے اللہ تعالیٰ نے جن کو یہ منصب دیا تھا، جنہوں نے ان کی بات مان لی ان کا انجام کیا ہوا، اور جنہوں نے ان کی بات نہیں مانی ان کا انجام کیا ہو، یہ تاریخ پڑھنے کے لئے ان کو دنیا میں چلنا پھرنا چاہیے، اور یہ تباہ شدہ بستیوں کو جا کر دیکھیں اور ان کی تاریخ پڑھیں تو انہیں پتا چل جائے گا کہ یہی رجال جو اللہ کی طرف سے منتخب ہو کے آتے ہیں جن پر اللہ کی طرف سے وحی آتی ہے، ان کی اتباع اور ان کی اطاعت انسان کے لئے نیک بختی کا باعث ہے، اور ان کی مخالفت اور ان کے ساتھ ٹکرانا دنیا اور آخرت کی بربادی کو سامنے لاتا ہے، تو یہ تاریخی واقعات زمین کے اوپر بکھرے پڑے ہیں، ان کو چلنا پھرنا چاہیے، اور ان کھنڈرات کو دیکھ کے عبرت حاصل کرنی چاہیے۔ اَفَلَمْ یَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَیَنْظُرُوْا کَیْفَ کَانَ عَاقِبَةُ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ: کیا پھر یہ لوگ چلے پھرے نہیں زمین میں، پھر دیکھیں کہ کیسا انجام ہوا ان لوگوں کا جو ان سے پہلے گزرے ہیں، وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَیْرٌ لِّلَّذِیْنَ اتَّقَوْا: جو لوگ تقویٰ اختیار کرتے ہیں ان کے لئے آخرت کا گھر بہتر ہے، اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ: کیا تم سوچتے نہیں ہو؟

کون سی مایوسی کفر ہے اور کون سی مایوسی کفر نہیں؟

حَتّٰۤى اِذَا اسْتَیْئَسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوْۤا اَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا: اس میں بھی ان کا ایک ذہنی مغالطہ دُور کرنا مقصود ہے، کہ وہ یہ سمجھتے تھے اور کہتے بھی تھے کہ آئے دِن عذاب کی دھمکیاں دی جا رہی ہیں لیکن یہ عذاب آتا کیوں نہیں؟ جس عذاب سے تم ہمیں ڈراتے ہو وہ عذاب آتا کیوں نہیں؟ اس قسم کے اِشکال بھی ان مشرکوں کی طرف سے عام طور پر کیے جاتے تھے، تو اللہ تعالیٰ اس میں اپنا ایک طریقہ اور اپنی ایک سُنّت واضح کرتے ہیں کہ میرا معاملہ قوموں کے ساتھ کس طرح سے رہا ہے، اور تمہارے ساتھ بھی برتاؤ اسی اُصول کے مطابق ہو رہا ہے، کہ پہلے انبیاء ﷺ آئے، قوموں نے ان کی مخالفت کی، انہوں نے اللہ کے عذاب سے ڈرایا، لیکن اللہ کے عذاب سے ڈرانے کے باوجود وہ قوم اسی طرح اَڑی رہی، اور اسی قسم کا مطالبہ کرتی رہی کہ اگر تم سچے ہو تو وہ عذاب کیوں نہیں لے آتے؟ لیکن اللہ تعالیٰ کی حکمت کے تحت ان کو اتنی مہلت دی گئی، اتنی مہلت دی گئی کہ کافر عذاب نہ آنے کی بنا پر دلیر ہوتے چلے گئے، کہ یہ جو ہمیں دھمکا رہے ہیں، ہمیں اس طرح سے دھمکیاں دے رہے ہیں یہ ایسے ہی باتیں ہیں، اگر یہ حقیقت ہوتی تو ہم اتنی مخالفت کرتے ہیں، انہیں اتنی تکلیفیں پہنچاتے ہیں تو عذاب آتا کیوں نہیں؟ اللہ تعالیٰ انہیں مہلت دیتا رہا، اتنی مہلت دی کہ رسولوں پر مایوسی طاری ہو گئی کہ شاید ہماری زندگی میں ان لوگوں کے اوپر عذاب آئے گا ہی نہیں، جیسے قرآنِ کریم میں دوسری جگہ لفظ ہے: وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى یَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ (البقرۃ: ۲۱۴) اتنا زلزلے میں ڈالا گیا ان رسولوں کو اور ان مؤمنین کو، اتنا مصیبتوں میں ڈالا گیا کہ وہ چیخ اُٹھے، پکار اُٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی جس کا وعدہ اللہ نے کر رکھا ہے؟ تو یہ اِمہال (مہلت دینے) کی غایت ہے، کہ اتنی مہلت اُن کو دی گئی حتّٰی کہ رسولوں کے اُوپر مایوسی طاری ہو گئی، یہ مایوسی ہے ظاہری اسباب کی طرف دیکھتے ہوئے، اللہ کی رحمت کی طرف دیکھتے ہوئے مایوسی تو جیسے پیچھے آیا تھا کہ یہ تو کفر ہے کہ انسان اللہ کی رحمت سے ہی مایوس ہو جائے، لَا تَایْئَسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ ۖ اِنَّهٗ لَا یَایْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ یہ لفظ آپ کے سامنے ابھی ابھی پیچھے گزرے ہیں، لیکن ظاہری

اسباب کی طرف دیکھ کے کسی پر مایوسی طاری ہو جائے کہ اگرچہ اللہ کی قدرت سے بعید نہیں لیکن ظاہری اسباب موافق نہیں ہیں، اس قسم کی مایوسی کفر نہیں، انبیاء علیہم السلام بھی ظاہری اسباب کی طرف دیکھ کے بسا اوقات اس قسم کے حالات میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

''وَظَنُّوٓا اَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا'' کا مفہوم و مطلب

وَظَنُّوٓا اَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا: ان لفظوں کا مطلب ذرا خیال سے سمجھئے!!! یہ ضمیریں ظاہر یہی ہے کہ رسولوں کی طرف لوٹ رہی ہیں، ظَنُّوٓا کا معنی ہوگا کہ رسولوں کو خیال گزرا، ظن مطلقاً خیال کو کہتے ہیں، رسول کو خیال گزرا، اَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا: کہ بیشک وہ رسول غلطی میں ڈال دیے گئے، اگر معنی یوں کریں تو پھر اس کا مطلب یہ ہوگا کہ انبیاء علیہم السلام کے لئے حالات اتنے ناسازگار ہوئے اور کافروں کے لئے سازگار ہوئے کہ انبیاء علیہم السلام پر مایوسی طاری ہوگئی اور ان کے دل کے اندر یہ خیال آنے لگ گیا کہ ہم جس انداز سے اللہ تعالیٰ کے وعدے کو سمجھے تھے کہ ان پر یہ عذاب آئے گا، معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا سمجھنا ٹھیک نہیں، ہم غلطی میں پڑ گئے ہیں، ہمارے سامنے ہماری عقل وفہم کے طور پر جو بات آئی تھی کہ اللہ تعالیٰ کی مدد یوں آئے گی اور اس طرح سے ان کو تباہ کر دیا جائے گا، ہم اللہ تعالیٰ کے وعدوں کا جس طرح سے مطلب سمجھے تھے وہ ہم نے صحیح نہیں سمجھا، ہم غلطی میں ڈال دیے گئے، یہ وسوسے بھی آنے لگ گئے، یعنی حالات کے ناسازگار ہونے کی وجہ سے اس قسم کے خیال آنے لگ گئے۔ اور اگر كُذِبُوْا کا ترجمہ وہی ہو جو بظاہر لغۃً معلوم ہوتا ہے، کہ ہمارے سامنے جھوٹ بولا گیا، گویا کہ یہ وعدے جو اللہ کی طرف سے ہمارے ساتھ کیے گئے تھے یہ وعدے غلط تھے، ہمارے سامنے جھوٹ بولا گیا، اس قسم کے خیالات آنے لگ گئے، تو پھر ہم اس کو کہیں گے وسوسۂ کفر، اور وسوسۂ کفر کفر نہیں، غیر اختیاری طور اس قسم کے خیالات اگر قلب کے اندر ابھرتے ہیں تو ان خیالات کا ابھرآنا یہ کفر نہیں ہے۔ اور اگر اس کا مطلب یہ ہو کہ ہمیں ہمارے نفسوں کی طرف سے غلطی میں ڈال دیا گیا، کہ ہم اللہ کے وعدوں کا مطلب صحیح نہیں سمجھے، اپنے فہم کے اعتبار سے ہم غلطی میں پڑ گئے، پھر گویا کہ اپنی نسبت اجتہادی خطا کی طرف کرنی مقصود ہے، کہ اللہ تعالیٰ کی بات کا مطلب کچھ اور ہوگا، اور ہم مطلب کچھ اور سمجھ گئے، ورنہ جو مطلب ہم سمجھے تھے اس کے مطابق تو اللہ کی نصرت آ جانی چاہیے تھی اور کافروں کو برباد ہو جانا چاہیے تھا، لیکن جب یہ کافر برباد نہیں ہوئے بلکہ دن بدن حالات ان کے حق میں اچھے ہوتے جا رہے ہیں اور ہمارے خلاف ہوتے جا رہے ہیں، تو معلوم ہو گیا کہ ہمارے نفسوں نے ہمیں غلطی میں ڈال دیا، ہماری عقل وفہم نے اللہ کے وعدوں کے سمجھنے کے اندر خطا کی ہے، اگر اللہ کے وعدوں کا مطلب وہی ہوتا جس طرح سے ہم سمجھے تھے تو آج تک یہ فیصلہ ہو جانا چاہیے تھا۔ پھر اپنی نسبت گویا کہ اجتہادی خطا کی طرف ہے کہ ہم مطلب صحیح نہیں سمجھے۔ تو وسوسۂ کفر ہو یا اپنی نسبت اجتہادی خطا کی طرف ہو یہ غیر اختیاری خیالات ہیں جو دل کے اندر آتے ہیں، اس لیے یہ عصمت کے بھی منافی نہیں، اور ان کو کسی قسم کی معصیت یا اللہ تعالیٰ کی نافرمانی بھی قرار نہیں دیا جا سکتا، اجتہادی خطا تو انبیاء علیہم السلام سے ہو سکتی ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو اس کے اوپر برقرار نہیں رکھا جاتا۔ جیسے مدینہ منورہ میں سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب دیکھا تھا کہ ہم مکہ معظمہ گئے ہیں اور عمرہ کیا ہے، اور عمرہ کرنے کے بعد کسی نے سر منڈایا، کسی نے بال کتروائے، یہ خواب دیکھا، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سامنے ذکر کر دیا، تو صحابہ کرام نے یہ سمجھا کہ یہ اشارہ ہو گیا کہ ہمیں

عمرہ کرنا چاہیے، اور سرورِ کائنات ﷺ کا خیال بھی ان کے ساتھ ہو گیا، عمرہ کرنے کے لئے گئے لیکن آگے کامیاب نہیں ہو سکے، حدیبیہ میں رُکاوٹ ڈال دی گئی، وہیں سے واپس آنا پڑا، تو خواب تو سچا دیکھا تھا جیسے قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ نے وضاحت کی: لَقَدْ صَدَقَ اللّٰہُ رَسُوْلَہُ الرُّءْیَا بِالْحَقِّ (سورۂ فتح: ۲۷) خواب تو سچا دیکھا تھا، لیکن اس کا جو مطلب سمجھ لیا گیا کہ شاید عمرہ ابھی کرنا ہے یہ مطلب ٹھیک نہیں سمجھا گیا، اللہ کے علم میں تھا کہ سال کے بعد یہ نوبت آئے گی، تو اس خواب کا یہ مطلب سمجھ لینا یہ ایک قسم کی اِجتہادی خطا ہے، لیکن بعد میں اس کی حقیقت کو ظاہر کر دیا گیا، تو خواب سچا تھا لیکن اس کا مطلب جو یہ قرار دیا کہ اِسی سال ہی عمرہ ہوگا اور ابھی ہوگا، یہ بات غلط تھی، چنانچہ جب عمرہ کرنے کی کوشش کی گئی تو کامیاب نہ ہوئے۔ اسی طرح سے اگر کسی بات کو سوچ کے انبیاء علیہم السلام ایک مطلب قرار دے لیں لیکن وہ مطلب صحیح نہ ہو ایسا ہو سکتا ہے، پھر اللہ کی طرف سے اس کی وضاحت ہو جاتی ہے، اِجتہادی خطا پر انبیاء علیہم السلام کو برقرار نہیں رکھا جاتا، اہلِ علم کے نزدیک یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ بعض چیزوں میں انبیاء علیہم السلام اِجتہاد کرتے ہیں، ایسا ہو سکتا ہے کہ لغزش ہو جائے اور صحیح نتیجے پر نہ پہنچیں، لیکن اللہ تعالیٰ اس خطا پر ان کو برقرار نہیں رکھتے بلکہ تنبیہ کر دی جاتی ہے، اور جو دوسرے مجتہدین ہیں وہ بھی اجتہاد کرتے ہیں، اور اجتہاد کرنے کے ساتھ کبھی وہ صحیح نتیجے پر پہنچیں گے کبھی غلط نتیجے پر پہنچیں گے، لیکن چونکہ نیک نیتی کے ساتھ اللہ کی رضا معلوم کرنے کے لئے کوشش کرتے ہیں اس لیے ان کی کوشش بہرحال مشکور ہے اور اللہ کی طرف سے ثواب ملے گا، لیکن یہاں یہ گارنٹی نہیں کہ مجتہد کو متنبہ بھی کر دیا جائے کہ تو نے جو نتیجہ اخذ کیا ہے یہ غلط ہے، اس لیے فقہ کے اندر جتنے اِجتہادی مسائل آتے ہیں، چاہے وہ کسی اِمام کے ہوں، سب کے متعلق عقیدہ یہی ہوتا ہے کہ اس میں غالب گمان یہ ہے کہ ہم صحیح سمجھے ہیں، لیکن ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ ہم صحیح نہ سمجھے ہوں اور دوسرا صحیح سمجھا ہو، علیٰ اِحتمالِ الخطا ان کو اختیار کیا جاتا ہے، اس لیے مخالف کے اُوپر طعن تشنیع جائز نہیں ہے، اس کے اوپر زبان درازی جائز نہیں ہے، ہمارے پاس کوئی گارنٹی نہیں کہ ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے جو اِجتہاد کیا یہی قطعی طور پر صحیح ہے، بلکہ ہم اس کو اَرجح سمجھتے ہیں، اَولیٰ بالحق سمجھتے ہیں کہ ہمارے نزدیک یہ بہتر ہے، باقی ایسا بھی ممکن ہے کہ ہمارے اِمام کی رائے ٹھیک نہ ہو اور دوسرے اِمام کی رائے ٹھیک ہو، دونوں طرف ہی اِحتمالِ خطا ہے، اور دونوں طرف ہی اِحتمالِ صواب ہے، اس لیے اپنے اپنے خیال کے مطابق اپنے اپنے اِجتہاد کے مطابق ان اَئمہ نے عمل کیا اور اپنے متبعین کو ہدایت دی، لیکن دوسرے کے اوپر طعن تشنیع اور زبان درازی نہیں کی جاسکتی، کیونکہ ہمارے پاس کوئی ایسی بیّن دلیل نہیں جس کی بنا پر ہم یہ کہیں کہ یہی صحیح ہے اور دوسرا صحیح نہیں ہے، ظنی مسائل میں اسی طرح سے نظریہ رکھا جاتا ہے، اور اسی انداز کے ساتھ ہی ان کے اوپر عمل کیا جاتا ہے۔ اور دوسرا مطلب تھا وسوسۂ کفر، تو یہ بھی کوئی ایسی بات نہیں ہے، اس کا ذکر بھی حدیث شریف میں آتا ہے ''مشکوٰۃ شریف، باب الوسوسہ'' میں آپ نے پڑھ لیا، کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ایک دفعہ سرورِ کائنات ﷺ کے سامنے ذکر کیا کہ یارسول اللہ! ہم اپنے دل میں ایسی باتیں پاتے ہیں کہ جل کر کوئلہ ہو جانا تو ہمیں گوارہ ہے لیکن ان باتوں کو ہم اپنی زبان پر نہیں لاسکتے، اس قسم کے وسوسے آتے ہیں، تو خیالات آپ کو بھی آتے ہیں ہمیں بھی آتے ہیں ہر کسی کو آتے ہیں، کہ انسان ان کو زبان پر نہیں لاسکتا، اخلاقیات کے متعلق اور عقیدے کے متعلق اس قسم کی باتیں غیر اختیاری طور پر قلب میں آجاتی ہیں، تو

سرورِ کائنات ﷺ نے پوچھا تھا کہ اچھا! تم اپنے دِلوں یہ کیفیت پاتے ہو؟ صحابہ ﷺ نے کہا کہ ہاں! تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''ذَاكَ صَرِيحُ الْإِيمَانِ''(۱) یہ تو خالص ایمان کی علامت ہے۔ تو ''ذَاكَ'' کا اِشارہ کدھر ہے؟ تو آپ نے ''مشکوٰۃ'' میں پڑھ لیا کہ ''ذَاكَ'' کا اشارہ یا تو ان خیالات کے آنے کی طرف ہے کہ اس قسم کے وسوسوں کا آنا یہی صریح ایمان ہے، یہی خالص ایمان ہے، جس کے متعلق ملا علی قاری ؒ نے ''مرقاۃ'' میں لکھا کہ شیطانی وسوسہ علامت ہے کہ قلب کے اندر ایمان ہے، کیونکہ چور وہیں آیا کرتے ہیں جہاں پتا ہو کہ مال ہے، خالی گھر کے اندر چور نہیں آیا کرتے، تو شیطان بھی کُفر کے اس قسم کے وسوسے اسی قلب کے اندر ڈالنے کی کوشش کرتا ہے کہ جس قلب کے اندر اس کو ایمان معلوم ہوتا ہے، اور جس قلب کے اندر ایمان نہ ہو تو وہاں تو جب حقیقتاً کُفر موجود ہے تو وسوسے کا کیا سوال! کُفر کا وسوسہ وہاں کیسے آئے گا جب حقیقتاً وہاں کُفر موجود ہے! اس لیے اس قسم کے وسوسوں کا آنا یہی علامت ہے کہ دل کے اندر ایمان ہے۔ اور یا یہ ہے کہ اس قسم کے خیال کے آنے کے بعد قلب کے اوپر اس انقباض کی کیفیت کا طاری ہونا جیسے انہوں نے اپنے لفظوں میں ظاہر کیا کہ ہم جل کے کوئلہ ہو جانا گوارہ کرتے ہیں لیکن ان باتوں کو زبان پر لانا گوارہ نہیں کرتے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وسوسے کے آنے سے ان کو بہت تکلیف ہوتی تھی، جیسے پاک دامن آدمی کو صاف ستھرے انسان کو زِنا کا خیال آئے تو وہ دل میں منقبض ہوگا کہ ایسی بات میرے دل میں کیوں آرہی ہے، اور ایک مؤمن کامل ہے تو اس کے دل میں کُفر کا وسوسہ آئے، اللہ اور اللہ کے رسول کے متعلق اس قسم کا خیال دل میں آئے جس کو وہ سمجھتا ہے کہ یہ ایمان کے منافی ہے تو اس کو تکلیف ہوتی ہے کہ ایسا خیال میرے دل میں کیوں آرہا ہے، تو یہ تکلیف محسوس ہونا یہی صریح ایمان کی علامت ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہارے دل کی حس ٹھیک ہے، اگر دل کی حس ٹھیک نہ ہوتی تو بُرے خیالات کے آنے کے ساتھ تمہیں تکلیف نہ ہوتی، تو بہر حال وسوسہ کسی قسم کا آجائے کتنا ہی گندا ہو، کتنا ہی کُفر ہو، کتنا ہی قبیح ہو، یہ عصمت کے بھی منافی نہیں، اور شرعی نقطۂ نظر سے اس کے اوپر کوئی کسی قسم کی گرفت بھی نہیں۔ تو اَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا کا اگر یہ مطلب بیان کیا جائے کہ رسولوں کو خیال ہوا، ان کو خیال گزرنے لگا یعنی وسوسے کے درجے میں، کہ ان کے سامنے غلط بیانی کی گئی ہے، انہیں خبریں غلط دی گئی ہیں، تو پھر یہ وسوسے کی بات ہے۔ بہر حال اس سے یہ بات تو معلوم ہوگئی کہ حالات ان کے لئے کتنے ناسازگار تھے، کہ اس قسم کے وسوسے بھی آنے لگ گئے، جَآءَهُمْ نَصْرُنَا: جب اس قسم کے حالات پیدا ہو گئے تو پھر ہماری مدد آگئی، اور نجات دے دیا گیا وہ جس کو ہم نے چاہا۔ تو اس لیے اِن لوگوں کو بھی اپنی اس مہلت سے فائدہ اٹھانا چاہیے، اس مہلت سے یہ مزید گمراہی میں مبتلا نہ ہوں، کہ اگر یہ عذاب کی خبریں سچی ہیں تو ہمارے اوپر آتا کیوں نہیں؟

دُوسری قراءت کا مفہوم

اور یہاں دوسری قراءت ہے: ''اَنَّهُمْ قَدْ كَذَبُوْا'' (یہ ہماری قراءت نہیں، دُوسری قراءت ہے اور متواتر ہے) کہ

(۱) صحیح مسلم ج ۱ ص ۷۹، باب بیان الوسوسة/ مشکوٰۃ ص ۱۸، باب الوسوسة، فصل اول، عن ابی ہریرۃ

انبیاء ؑ کو خیال گزرنے لگا کہ وہ جھٹلا دیے گئے، یعنی حالات ان کے اتنے خلاف ہوئے کہ ان کے دل میں یہ خیال آنے لگ گیا کہ جو لوگ ہمیں پہلے مانے بیٹھے ہیں، مسلمان، جنہوں نے ہمارا کلمہ پڑھا ہوا ہے، ان مصیبتوں کے بعد اور وعدۂ نصرت کے پورا نہ ہونے کی صورت میں اندیشہ ہے کہ یہ بھی ہماری تکذیب کرنے لگ جائیں گے، یہ بھی ایمان پر قائم نہیں رہیں گے، تو کُذِبُوا کی قراءت میں پھر یہ مفہوم ہو جائے گا۔ فَنُجِّیَ مَنْ نَّشَآءُ: نجات دیے گئے وہی لوگ جن کو ہم نے چاہا، وَلَا یُرَدُّ بَاْسُنَا عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِیْنَ: ہمارا عذاب رَدّ نہیں کیا جاتا مجرم لوگوں سے۔

گزشتہ واقعات سے عبرت کون حاصل کرتا ہے؟

لَقَدْ کَانَ فِیْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ: ان گزشتہ لوگوں کے واقعات میں عبرت ہے عقل والوں کے لئے۔ عبرت کا معنی یہی ہوتا ہے کہ اس میں غور کرو، غور کرنے کے بعد یوں سوچو کہ جب ان کے یہ حالات تھے تو ان کا انجام یہ ہوا، اگر ہمارے حالات بھی ایسے ہوئے تو ہمارا انجام بھی یہی ہوگا، جس طرح سے آپ قیاس کیا کرتے ہیں، تو قیاس ہی اعتبار ہے، لیکن یہ قیاس اور اعتبار بھی وہی کر سکتے ہیں جو خالص عقل والے ہیں، جن کی عقل شہوات کے سامنے مغلوب ہوگئی وہ یہ باتیں کہاں سوچیں گے۔

حقّانیتِ قرآن کا ذِکر

آگے پھر قرآنِ کریم کی حقانیت کا ذکر ہے جس طرح سے سورت کی ابتدا بھی اسی بات سے کی گئی تھی کہ اس کو کوئی گھڑی ہوئی بات نہ سمجھو، یہ کوئی تراشا ہوا قصہ نہیں ہے، مَا کَانَ حَدِیْثًا یُّفْتَرٰی: یہ قرآن کوئی گھڑی ہوئی چیز نہیں، وَلٰکِنْ تَصْدِیْقَ الَّذِیْ بَیْنَ یَدَیْهِ: یہ مصداق ہے اس کتاب کا جو اس سے پہلے گزری ہے، یہ اس کی مصدِّق ہے، یا اس کا مصداق ہے، اس کی وضاحت کئی دفعہ آپ کے سامنے آگئی، وَتَفْصِیْلَ کُلِّ شَیْءٍ: اور یہ ہر ضروری چیز کی تفصیل ہے، اور ہدایت اور رحمت ہے ان لوگوں کے لئے جو ایمان لاتے ہیں۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

سورة الرعد

آیاتها ۴۳ ۱۳ سورۃ الرعد مدنیۃ ۹۶ رکوعاتها ۶
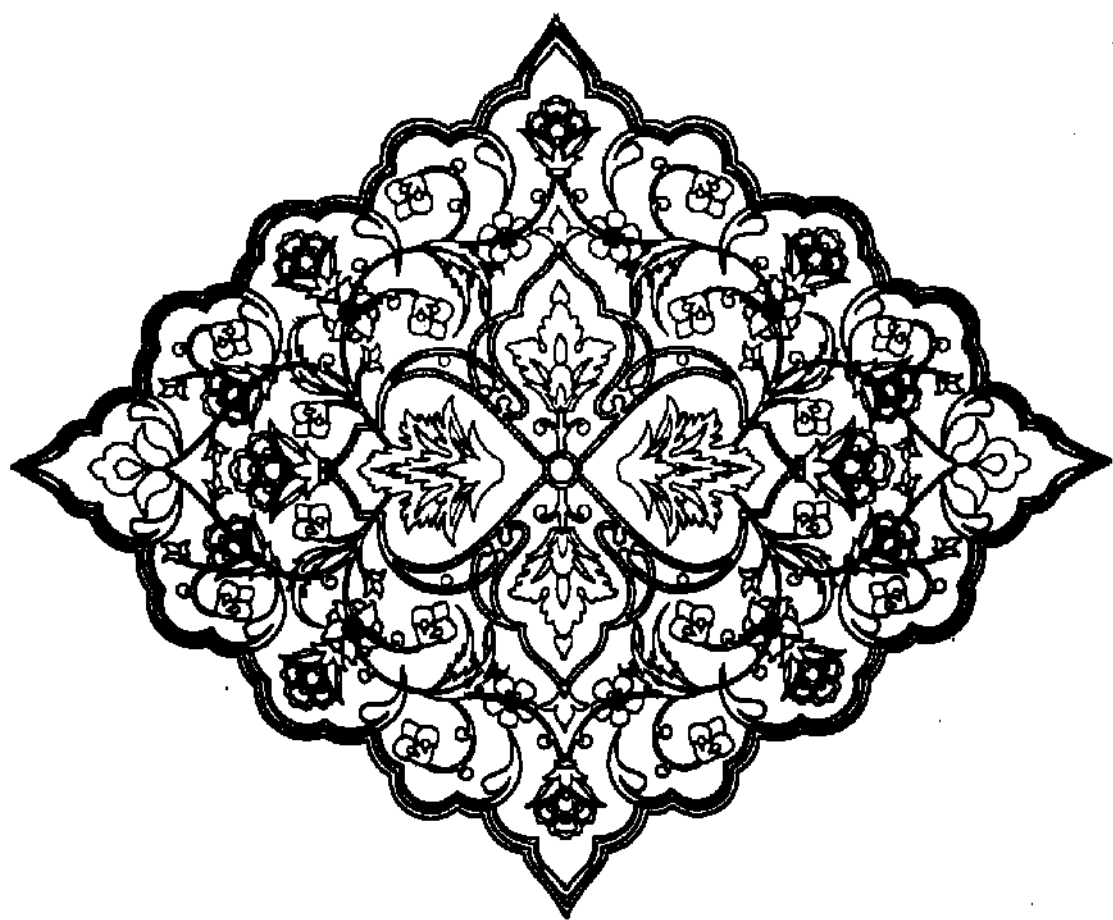
سورہ رعد مدینہ میں نازل ہوئی اس میں تینتالیس آیات ہیں اور چھ رکوع ہیں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

الٓمّٓرٰ ۚ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ ؕ وَالَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ

الٓمّٓرٰ- یہ کتاب کی آیتیں ہیں، اور آپ کے رَبّ کی طرف سے جو کچھ اتارا گیا ہے آپ کی طرف حق ہے لیکن بہت سے لوگ

لَا يُؤْمِنُوْنَ ① اَللّٰهُ الَّذِيْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ

ایمان نہیں لاتے ① اللہ وہی ہے جس نے آسمانوں کو بغیر ستونوں کے بلند فرمادیا تم ان آسمانوں کو دیکھ رہے ہو پھر وہ عرش پر مستوی ہوا،

وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ؕ كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ

اس نے چاند اور سورج کو مسخر فرمادیا، ہر ایک مدت مقررہ تک چلتا ہے، وہ کاموں کی تدبیر فرماتا ہے، نشانیوں کو واضح طور پر بیان فرماتا ہے

لَعَلَّكُمْ بِلِقَآءِ رَبِّكُمْ تُوْقِنُوْنَ ② وَهُوَ الَّذِيْ مَدَّ الْاَرْضَ وَجَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِيَ

تاکہ تم اپنے رَبّ کی ملاقات کا یقین کرلو ② اور وہی ہے جس نے زمین کو پھیلا دیا اور اس میں پہاڑ

وَاَنْهٰرًا ؕ وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ جَعَلَ فِيْهَا زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ يُغْشِي الَّيْلَ النَّهَارَ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ

اور نہریں پیدا فرمادیں اور ہر قسم کے پھلوں سے دو قسمیں پیدا فرمادیں، وہ رات کو دن پر ڈھانپ دیتا ہے، بلاشبہ اس میں

لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ③ وَفِي الْاَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ وَّجَنّٰتٌ مِّنْ اَعْنَابٍ

ان لوگوں کے لئے نشانیاں ہیں جو فکر کرتے ہیں ③ اور زمین میں ٹکڑے ہیں جو آپس میں پڑوسی ہیں اور انگوروں کے باغ ہیں

وَّزَرْعٌ وَّنَخِيْلٌ صِنْوَانٌ وَّغَيْرُ صِنْوَانٍ يُّسْقٰى

اور کھیتیاں ہیں، کھجور کے درخت ہیں، جن میں بعض کی جڑ بعض سے ملی ہوئی ہے اور بعض ملی ہوئی نہیں ہے، انہیں ایک ہی پانی سے

بِمَآءٍ وَّاحِدٍ ۚ وَنُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلٰى بَعْضٍ فِي الْاُكُلِ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ

سیراب کیا جاتا ہے، ہم بعض کو بعض پر فضیلت دیتے ہیں پھل میں، بے شک اس میں البتہ نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو

يَّعْقِلُوْنَ ۝۴ وَاِنْ تَعْجَبْ فَعَجَبٌ قَوْلُهُمْ ءَاِذَا كُنَّا تُرٰبًا ءَاِنَّا لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ۣ۬

سوچتے ہیں④ اگر تُو تعجب کرے تو ان کا قول قابلِ تعجب ہے کہ جب ہم مٹی بن جائیں گے تو کیا ہم نئے طریقے سے پیدا کیے جائیں گے؟

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ ۚ وَاُولٰٓئِكَ الْاَغْلٰلُ فِيْٓ اَعْنَاقِهِمْ ۚ وَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ

یہی لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رَبّ کا انکار کیا، یہی لوگ ہیں کہ ان کی گردنوں میں طوق ہیں اور یہ جہنم والے ہیں،

هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝۵ وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالسَّيِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ وَقَدْ

اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں⑤ اور یہ لوگ خوش حالی (کے پورا ہونے سے) پہلے ہی آپ سے بدحالی کا مطالبہ کرتے ہیں، حالانکہ

خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمُ الْمَثُلٰتُ ۭ وَاِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ لِّلنَّاسِ عَلٰي ظُلْمِهِمْ ۚ وَاِنَّ

ان سے پہلے عبرتناک سزائیں گزر چکی ہیں، اور بے شک تیرا رَبّ البتہ مغفرت والا ہے لوگوں کے لئے ان کے ظلم کے باجود، اور بے شک

رَبَّكَ لَشَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝۶ وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۭ

تیرا رَبّ سخت سزا دینے والا ہے⑥ اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس کے اُوپر کوئی نشانی کیوں نہیں اُتاری جاتی اس کے رَبّ کی طرف سے

اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرٌ وَّلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ ۝۷ۧ

آپ تو صرف ڈرانے والے ہیں، اور ہر قوم کے لئے ہدایت دینے والا ہوتا ہے⑦

تفسیر

(۱) یہاں سے سورۂ رعد شروع ہو رہی ہے اس کی ابتداء الٓمّٓرٰ سے ہے جو حروفِ مقطعات میں سے ہے ان کے معنی اللہ تعالیٰ کو ہی معلوم ہیں پہلے تو فرمایا کہ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ: یہ کتاب کی یعنی قرآنِ کریم کی آیات، پھر فرمایا وَالَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ: اور آپ کے رَبّ کی طرف سے جو نازل کیا گیا ہے وہ حق ہے اس کا حق ہونا امرِ واقعی ہے کوئی مانے یا نہ مانے وہ حق ہے وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ: چونکہ لوگ نظر وفکر سے کام نہیں لیتے اپنے باپ دادے اور رواج کو سب کچھ سمجھتے ہیں اس لیے ایمان قبول نہیں کرتے۔

دلائلِ قدرت

پھر فرمایا کہ اَللّٰهُ الَّذِيْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا: اتنے بڑے بڑے آسمان ہیں جو بغیر کسی ستونوں کے اتنی بلندی پر قائم ہیں اور یہ آسمان تمہاری نظروں کے سامنے ہیں جنہیں تم دیکھ رہے، ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ: استوی علی العرش کے بارے میں جو

(۱) ریکارڈنگ دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے یہاں سے چند آیات کا ترجمہ تفسیر ''انوار البیان'' سے ماخوذ ہے۔

اہل سنت والجماعت کا جو مسلک ہے ہم سورۂ اعراف کے رکوع نمبر چھ کی تفسیر میں بیان کر چکے ہیں، وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ: انہیں جس کام میں لگایا ہے اس میں لگے ہوئے ہیں، كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى: اللہ تعالیٰ نے جو نظام ان کے لئے مقرر فرمادیا ہے اس کے مطابق چلتے ہیں، ہر ایک کا مدار مقرر ہے ان کی رفتار اسی مدار پر ہے۔ بعض حضرات نے اجل مسمّٰی سے دنیا کا وجود مراد لیا ہے، اور مطلب یہ کہ چاند اور سورج وقت متعین تک چل رہے ہیں، اور وقت معین قیامت کا قائم ہونا ہے، جب قیامت قائم ہوگی تو چاند اور سورج کا نظام بھی ختم ہو جائے گا، يُدَبِّرُ الْاَمْرَ: اللہ تعالیٰ ہر کام کی تدبیر کرتا ہے یعنی عالم سفلی اور عالم علوی میں جو کچھ ہوتا ہے وہ سب اللہ تعالیٰ کی مشیت کے مطابق ہوتا ہے جس طرح چاہتا ہے تدبیر فرماتا ہے، يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ بِلِقَآءِ رَبِّكُمْ تُوْقِنُوْنَ: اس سے بعض حضرات نے آیات قرآنی مراد لی ہیں اور بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ اس سے دلائل توحید مراد ہیں خواہ دلائل تشریعیہ ہوں جو آیات قرآنیہ کو بھی شامل ہیں اور خواہ دلائل تکوینیہ ہوں جن میں سے بعض کا ذکر انہی آیات میں گزر چکا ہے، ان آیات کا بیان فرمانا اس لیے ہے کہ تم غور و فکر سے کام لو اور سمجھ لو کہ جب اللہ تعالیٰ ایسی ایسی عظیم چیزوں کے پیدا کرنے پر قادر ہے تو بدرجہ اولیٰ اسے مردوں کو زندہ کرنے پر قدرت ہے اسی کے حکم سے قیامت قائم ہوگی وہ مردوں کو زندہ فرمائے گا جو حساب کے موقع پر حاضر ہوں گے اور ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ عدل و انصاف کے ساتھ فیصلے فرمائے گا اسی کو بِلِقَآءِ رَبِّكُمْ سے تعبیر کیا۔

وَهُوَ الَّذِيْ مَدَّ الْاَرْضَ وَجَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِيَ: اور وہ اللہ جس نے زمین کو پھیلا دیا اور اس میں بوجھل پہاڑ پیدا فرمادیے جو اپنی جگہوں پر جمے ہوئے ہیں سورۃ لقمان میں فرمایا وَاَلْقٰى فِي الْاَرْضِ رَوَاسِيَ اَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ کہ اللہ نے زمین پر بھاری بوجھل پہاڑوں کو ڈال دیا تاکہ زمین تمہارے ساتھ حرکت نہ کرے، اور اس میں پہاڑوں کو پیدا فرمانے اور ان کو بوجھل بنانے اور زمین میں جمادینے کی حکمت بیان فرمائی، وَاَنْهٰرًا: یہ نہریں انسانوں کے پانی پینے اور جانوروں کو پلانے کے لئے اور کھیتوں کو سیراب کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمتیں ہیں، آیت شریفہ میں جو یہ فرمایا کہ زمین کو پھیلا دیا یہ پھیلانا زمین کے کرہ ہونے کے منافی نہیں ہے اگر زمین کروی ہو جیسے کہ اہل سائنس کہتے ہیں تو یہ زمین کے پھیلاؤ کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے، کیونکہ پھیلاؤ کے لئے کسی چیز کا اوّل تا آخر سطح واحد ہونا ضروری نہیں ہے، زمین چونکہ بہت بڑی ہے اس لیے انسانوں کا اس پر رہنا چلنا پھرنا اور سفر کرنا ایسا محسوس ہوتا ہے جیسا کہ سطح واحد پر ہی جا رہے ہیں۔ وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ جَعَلَ فِيْهَا زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ: اور زمین میں ہر طرح کے پھلوں میں سے دو دو قسم کے پھل پیدا فرمائے مثلاً بعض کھٹے ہیں اور بعض میٹھے بعض چھوٹے اور بعض بڑے کسی کا رنگ ہرا ہے کسی کا رنگ پیلا ہے چونکہ رنگ اور مزے دو سے زیادہ بھی ہوتے ہیں اس لیے بعض مفسرین نے فرمایا کہ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ میں تعداد انواع بیان کرنا مقصود ہے تعداد کا سب سے پہلا مرتبہ دو ہے، يُغْشِي الَّيْلَ النَّهَارَ: یعنی دن کی روشنی کے بعد رات کو لے آتا ہے جس سے دن کی روشنی ختم ہو جاتی ہے، جس طرح کسی روشن چیز کو کسی پردہ سے ڈھانپ دیا جائے اسی طرح رات ڈھانپ لیتی ہے۔ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ: بلاشبہ ان میں ان لوگوں کے لئے نشانیاں ہیں جو فکر کرتے ہیں یہ جو کچھ باتیں بیان کی گئی ہیں ان میں فکر کرنے والے فکر کریں اور یہ سوچیں کہ مذکورہ بالا چیز کی تخلیق اور ان کی ایجاد اور ان کی بقاء اور ان کی تسخیر اور ترتیب بغیر کسی متصرف کے نہیں ہو سکتی ان کا مالک بھی ہے اور ان کا خالق بھی ہے اگر غور کریں گے تو اس کی الوہیت اور وحدانیت سمجھ میں آجائے گی۔

وَ فِي الْاَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ: اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے زمین کی پیداوار کا ذکر فرمایا کہ اور اس پیداوار میں جو عجائبات قدرت ہیں ان کو بیان فرمایا ارشاد فرمایا کہ زمین میں بہت سے قطعے ہیں جو آپس میں ملے ہوئے ہیں ایک ٹکڑا دوسرے سے متصل ہے ان میں انگوروں کے باغات ہیں اور کھجور اور کھیتاں ہیں اور درخت ہیں جن میں بعض درخت ایسے ہیں جن کے اوپر جا کے ایک تنے کے دو تنے ہو جاتے ہیں اور عام درختوں میں ایسا ہی ہوتا ہے اور بعض درخت ایسے ہیں جن میں ایک ہی تنا ہوتا ہے جیسا کہ کھجور کے درختوں کا مشاہدہ کیا جاتا ہے ان باغوں کھیتیوں کو ایک ہی طرح کا پانی پلایا جاتا ہے لیکن اس کے باوجود مزوں میں مختلف ہیں، بعض پھلوں کو بعض دوسرے پھلوں پر فضیلت ہے اور یہ بات بھی دیکھی جاتی ہے کہ کھاری زمین اچھی زمین سے متصل ہے اور دونوں میں درخت ہیں لیکن کھاری زمین کا اثر میٹھی زمین کے پھلوں میں نہیں آتا بلکہ خود کھاری زمین کے پھل بھی میٹھے ہوتے ہیں پھلوں کے میٹھے پن کا مزاج زمین کی کھاری پن پر غالب آجاتا ہے، اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ: عقل والے غور کریں گے تو ان چیزوں کو دیکھ کر ان کے خالق و مالک کو پہچان سکتے ہیں جو ان چیزوں میں اپنی سمجھ کو خرچ نہیں کرتے وہ اہل عقل ہی نہیں۔

(۱) یعنی ایک ہی کھیت کے اندر پیدا ہونے والے درخت، ایک ہی پانی سے سیراب ہونے والے اور ایک ہی آب و ہوا میں نشوونما پانے والے، پھلوں کے اندر اختلاف ہے، ''ہم بعض کو بعض پر فضیلت دیتے ہیں پھل میں'' کسی کو کم پھل آتا ہے کسی کو زیادہ آتا ہے، کسی کو میٹھا آتا ہے کسی کو ترش آتا ہے، اور کسی کا چھوٹا ہوتا ہے کسی کا بڑا ہوتا ہے، اس قسم کے اختلافات۔ يُّسْقٰى بِمَآءٍ وَّاحِدٍ: سیراب کیے جاتے ہیں ایک ہی پانی سے، اور فضیلت دیتے ہیں ہم بعض کو بعض پر میوے میں، اُکل میں، ''بے شک اس میں البتہ نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو عقل رکھتے ہیں، جو سوچتے ہیں۔''

کُفّار کا اِنکارِ آخرت خود قابلِ تعجب ہے

''اگر تُو تعجب کرے تو ان کا قول تعجب کے قابل ہے'' جس طرح سے ترجمے میں میں نے واضح کر دیا، کہ آپ ان کی باتوں پر حیران ہوتے ہیں، واقعی ان کی باتیں حیرانی کے قابل ہیں، یہ بات خاص طور پر حیرانی کے قابل ہے کہتے ہیں جب ہم مٹی بن جائیں گے تو کیا ہم دوبارہ پیدا کیے جائیں گے؟ نئے طریقے سے پیدا کیے جائیں گے؟ یعنی اُن کا اس بات کو سن کے حیران ہونا، ان کی اس حیرانی کے اوپر ہمیں تعجب ہے، کہ اللہ تعالیٰ کی اتنی قدرتیں جاننے کے باوجود پھر ان کو اس پہ تعجب کیوں ہے؟ ان کی یہ بات عجیب ہے، اگر آپ ان کی اس بات پہ تعجب کریں تو یہ تعجب کے قابل ہے، جو یہ کہتے ہیں کہ کیا جس وقت ہم مٹی ہو جائیں گے پھر ہم نئے سرے سے پیدا کیے جائیں گے؟ ''یہی لوگ ہیں جو اپنے رَبّ کا انکار کرتے ہیں'' یعنی اگر یہ اپنے رَبّ کو صحیح معنی میں رَبّ مانتے تو اس کی قدرت میں شک نہ کرتے اور ان کے لیے بات سمجھنی آسان ہوتی، اب یہ اپنی زبان کے ساتھ اگرچہ کہتے ہیں کہ ہم اللہ کو رَبّ مانتے ہیں لیکن ان کا ماننا نہ ماننے کے برابر ہے، تو جو شخص آخرت کا قول نہیں کرتا یوں سمجھو کہ اس نے اللہ کو مانا ہی نہیں،

---

(۱) یہاں سے حضرت حکیم العصر ﷫ کی تقریر ہے۔

کیونکہ جب اللہ کو مانتا تو اللہ کی قدرت کو مانتا، قدرت کے ماننے کے بعد آخرت کے انکار کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ ''یہی لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رَبّ کا کُفر کیا، یہی لوگ ہیں کہ ان کی گردنوں میں طوق ہیں اور یہ جہنّم والے ہیں، اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں۔''

کُفّار کی طرف سے عذاب جلدی لانے کا مطالبہ اور اس کا جواب

وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ الخ: اس میں انکار ہے ان کی اس حالت پر جو کہتے تھے فَاْتِنَا، ہمارے پاس وہ عذاب لے آ، فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ، قرآنِ کریم میں کتنی آیات کے اندر یہ بات ذکر کی گئی ہے، تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ان کو اللہ نے خوش حالی دے رکھی ہے جو حسنہ کا مصداق ہے، کچھ وقت تک ان کو مہلت دی ہوئی ہے اس کے پورا ہونے سے پہلے ہی آپ سے سیئہ کا مطالبہ کرتے ہیں، یہ ان کی غلطی ہے، ان کو دنیا کی تاریخ پر غور کرنا چاہیے، کہ پہلے کس قسم کی عبرتناک سزائیں قوموں کو دی جاچکی ہیں، مَثلات عقوبات پہلے گزر چکی ہیں، ان کو ان میں غور کرنا چاہیے، کہ اللہ تعالیٰ اگر کسی کو سزا دینا چاہے تو پھر اس کو روکنے والا کوئی نہیں، یہ ان کو ڈھیل دی گئی ہے مہلت دی گئی ہے اس سے ان کو فائدہ اٹھانا چاہیے، قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمُ الْمَثُلٰتُ سے یہی تاثر دینا مقصود ہے کہ عذاب آنا کوئی مشکل نہیں ہے، اللہ تعالیٰ پہلے دیتے رہے ہیں، اور تمہیں چاہیے کہ اس نصیحت سے فائدہ اٹھاؤ، اور سوچ سمجھ کے صحیح طریقہ اختیار کرلو، ورنہ اللہ کی طرف سے عذاب آنے میں کوئی رکاوٹ نہیں، پہلے بہت لوگوں کو سزا دی جاچکی ہے۔ اصل میں اللہ تعالیٰ کی دونوں شانیں ہیں، کہ انسانوں کے بدکردار ہونے کے باوجود وہ پھر بھی مغفرت کا معاملہ کرتا ہے، درگزر کا معاملہ کرتا ہے، لیکن یہ مطلب بھی نہیں کہ سزا بالکل نہیں ہوگی وَاِنَّ رَبَّكَ لَشَدِيْدُ الْعِقَابِ، اور وہ سخت سزا دینے والا بھی ہے، اس کی دونوں ہی شانیں ہیں، تو اس وقت جو تمہیں حسنہ دے رکھی ہے، مہلت دے رکھی ہے اس سے فائدہ اٹھاؤ، ورنہ پھر اللہ تعالیٰ کی جس وقت شدید العقاب والی شان ظاہر ہوگی تو پھر اس کو ردّ نہیں کیا جاسکے گا۔

کُفّار کی طرف سے منہ مانگی نشانی کا مطالبہ اور اس کا جواب

''اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ اِس کے اوپر کوئی نشانی کیوں نہیں اتاری جاتی اِس کے رَبّ کی طرف سے'' ایسے موقع پر نشانی سے وہ نشانی مراد ہوا کرتی ہے جو وہ اپنے منہ سے مانگتے ہیں، ہماری مرضی کے مطابق ہمیں معجزہ کیوں نہیں دکھایا جاتا، اور یہ بھی بہت دفعہ آپ کے سامنے کہا جاچکا کہ اثباتِ نبوت کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے معجزہ آتا ہے، اسی کے اندر غور کرنا چاہیے، باقی اگر یہ دروازہ کھول دیا جائے کہ جو شخص جس قسم کا معجزہ مانگے دکھادیا جائے تو ایسی صورت میں تو دنیا کا نظم قائم ہی نہیں رہ سکتا، ایک کہے گا کہ مشرق کی طرف سے سورج نکالو، دوسرا کہے گا مغرب کی طرف سے نکالو تو مانتا ہوں، تیسرا کہے گا شمال کی طرف سے نکالو تو مانتا ہوں، تو کس کس کی بات مانی جائے گی، اس لیے یہ طریقہ ہی غلط ہے۔ اگر آپ ایک مقدمے کو ثابت کرنا چاہتے ہیں تو اس کے اوپر گواہ پیش کرنا چاہیے، گواہ آپ نے پیش کردیا، اب مدعا علیہ کا فرض ہے کہ اِس گواہ پر تنقید کرے کہ یہ گواہ اس دعوے کو ثابت کرنے کے لئے کافی ہے یا نہیں، عدالت کا اصول یہی ہے، اپنے دعوے پر جو شاہد پیش کردیا گیا تو بحث اس شاہد پہ ہوگی کہ یہ اس دعوے کو ثابت کرنے کے لئے کافی ہے یا نہیں، اس میں یہ نقص ہے اس لیے اس کی شہادت کافی نہیں، اس میں یہ کمی ہے جس کی بنا پر اس کی

شہادت کافی نہیں، یوں تو تنقید ہوسکتی ہے، باقی! مدعاعلیہ کو کوئی عدالت بھی اس بات کا حق نہیں دیتی کہ وہ کہے. جی! فلاں ڈپٹی کمشنر شہادت دے تو میں مانوں گا ورنہ نہیں مانتا، صدرِ مملکت آ کے گواہی دے تو میں مانوں گا ورنہ میں نہیں مانتا، فلاں شخص آ کر گواہی دے تو میں مانوں گا ورنہ میں نہیں مانتا، یہ دنیا کا کوئی اصول نہیں ہے، کیونکہ اگر اس طرح سے کرنا شروع کر دیا جائے تو کوئی دعویٰ بھی ثابت نہیں ہوگا۔ اسی طرح سے اثباتِ نبوّت کے لئے اللہ تعالیٰ جو دلائل قائم کرتا ہے ان پر تو تمہیں تنقید کا حق ہے کہ تم کہو کہ یہ دلیل کافی نہیں، یہ دلیل صحیح نہیں، لیکن یہ مطالبہ کرنا کہ فلاں دلیل قائم کرو گے تو ہم مانیں گے، یہ حق کسی کو نہیں دیا جاسکتا، کیونکہ اگر یہ دروازہ کھول دیا جائے پھر تو کوئی دعویٰ بھی ثابت نہیں کیا جاسکتا، ہر شخص نئی سے نئی دلیل کا مطالبہ کرے گا، اور یہ سلسلہ لا الی نہایۃ ممتد ہوسکتا ہے لمبا ہوسکتا ہے، اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرٌ: آپ تو صرف ڈرانے والے ہیں، اس لیے اس قسم کے مطالبے سے آپ گھبرائیں نہ، پریشان نہ ہوں، آپ کے ذمے معجزات کا دکھانا نہیں، آپ اپنا فرض ادا کیجئے، آپ تو اِنذار کرنے والے ہیں، اور ہر قوم کے لئے اللہ تعالیٰ راہنما بھیجتا ہے، اسی ضابطے کے تحت آپ کو بھی بھیج دیا، اگر یہ اس ہدایت سے فائدہ اٹھائیں گے تو ان کا فائدہ ہے، اور اگر اس سے فائدہ نہیں اٹھاتے تو اپنا نقصان کریں گے، آپ کے ذِمے نہ معجزات کا دکھانا ہے اور نہ اِن کو ایمان پر مجبور کرنا آپ کے ذِمے ہے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

اَللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَحْمِلُ كُلُّ اُنْثٰى وَمَا تَغِيْضُ الْاَرْحَامُ وَمَا تَزْدَادُ ؕ وَكُلُّ شَیْءٍ عِنْدَهٗ

اللہ جانتا ہے ہر عورت کے حاملہ ہونے کو اور رحموں کے گھٹنے اور ان کے بڑھنے کو، اور ہر چیز اس کے پاس

بِمِقْدَارٍ ۝۸ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْكَبِيْرُ الْمُتَعَالِ ۝۹ سَوَآءٌ مِّنْكُمْ مَّنْ

ایک خاص مقدار کے ساتھ ہے ۝۸ وہ غیب اور حاضر کو جاننے والا ہے، بڑائی والا ہے اور برتری والا ہے ۝۹ برابر ہے تم میں سے جو شخص

اَسَرَّ الْقَوْلَ وَمَنْ جَهَرَ بِهٖ وَمَنْ هُوَ مُسْتَخْفٍۢ بِالَّيْلِ وَسَارِبٌۢ بِالنَّهَارِ ۝۱۰

بات کو پوشیدہ کرے اور جو شخص اس (بات) کو ظاہر کرے، اور جو شخص چھپنے والا ہے رات میں اور جو کوئی چلنے پھرنے والا ہے دِن میں ۝۱۰

لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ يَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ

اللہ کے لئے باری باری آنے والے فرشتے ہیں انسان کے سامنے اور انسان کے پیچھے، حفاظت کرتے ہیں وہ اس (انسان) کی اللہ کے

اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ؕ وَاِذَآ

حکم سے، بے شک اللہ تعالیٰ نہیں بدلتا اس حالت کو جو کسی قوم میں ہے جب تک نہ بدلیں وہ اس چیز کو جو ان کے نفسوں میں ہے، اور جس وقت

اَرَادَ اللّٰهُ بِقَوْمٍ سُوْٓءًا فَلَا مَرَدَّ لَهٗ ۚ وَمَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّالٍ ﴿١١﴾ هُوَ الَّذِیْ

اللہ تعالیٰ ارادہ کرتا ہے کسی قوم کے ساتھ بُرائی کا تو اس کوئی رَدّ کرنے والا نہیں، اور نہیں ہے ان کے لئے اللہ کے علاوہ کوئی والی ⑪ اللہ وہی ہے

یُرِیْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّیُنْشِئُ السَّحَابَ الثِّقَالَ ﴿١٢﴾ ۚ

جو تمہیں دکھاتا ہے چمکنے والی بجلی اس حال میں تم ڈرنے والے ہوتے ہو اور اُمید رکھنے والے ہوتے ہو، اور اُٹھاتا ہے بوجھل بادلوں کو ⑫

وَیُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهٖ وَالْمَلٰٓئِكَةُ مِنْ خِیْفَتِهٖ ۚ

تسبیح بیان کرتا ہے رَعد اس حال میں کہ وہ متلبس ہے اللہ کی حمد کے ساتھ، اور فرشتے بھی (تسبیح بیان کرتے ہیں) اس کے ڈر سے،

وَیُرْسِلُ الصَّوَاعِقَ فَیُصِیْبُ بِهَا مَنْ یَّشَآءُ وَهُمْ یُجَادِلُوْنَ فِی اللّٰهِ ۚ وَهُوَ

اور بھیجتا ہے وہ بجلیاں پھر پہنچاتا ہے وہ بجلیاں جس کو چاہتا ہے، اور وہ لوگ جھگڑا کر رہے ہیں اللہ کے بارے میں حالانکہ اللہ تعالیٰ

شَدِیْدُ الْمِحَالِ ﴿١٣﴾ ؕ لَهٗ دَعْوَةُ الْحَقِّ ؕ وَالَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا یَسْتَجِیْبُوْنَ لَهُمْ

بہت سخت قوت والا ہے ⑬ برحق پکارا سی کے لئے ہے، اور اللہ کے علاوہ جن چیزوں کو یہ پکارتے ہیں وہ ان کی دُعا کا کچھ بھی جواب نہیں

بِشَیْءٍ اِلَّا كَبَاسِطِ كَفَّیْهِ اِلَى الْمَآءِ لِیَبْلُغَ

دے سکتیں مگر مثل (جواب دینے پانی کے) ایسے شخص کو جو اپنی ہتھیلیوں کو پھیلانے والا ہے پانی کی طرف تا کہ پانی اس کے منہ تک

فَاهُ وَمَا هُوَ بِبَالِغِهٖ ؕ وَمَا دُعَآءُ الْكٰفِرِیْنَ اِلَّا فِیْ ضَلٰلٍ ﴿١٤﴾ وَلِلّٰهِ یَسْجُدُ

پہنچ جائے اور وہ (پانی اس کے منہ تک) پہنچنے والا نہیں ہے، اور نہیں ہے کافروں کی دُعا مگر بے اَثر ⑭ اللہ ہی کے لئے سجدہ کرتی ہیں

مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّظِلٰلُهُمْ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ ﴿١٥﴾ ۩

وہ چیزیں جو آسمانوں میں ہیں اور زمین میں ہیں خوشی سے اور ناگواری سے، اور ان کے سائے بھی صبح شام (سجدہ کرتے ہیں) ⑮

قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ قُلِ اللّٰهُ ؕ قُلْ اَفَاتَّخَذْتُمْ

آپ (ان سے) پوچھئے کون ہے آسمانوں اور زمین کا رَبّ، پھر آپ خود ہی جواب دے دیں: اللہ! آپ پوچھئے کہ کیا اختیار کر لیے تم نے

مِّنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِیَآءَ لَا یَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا ؕ قُلْ هَلْ یَسْتَوِی الْاَعْمٰى

اللہ کے علاوہ اور کارساز؟ نہیں اختیار رکھتے وہ اپنی جانوں کے لئے نفع کا نہ نقصان کا، آپ کہہ دیں کہ کیا برابر ہے اندھا

وَالْبَصِيْرُ ۙ اَمْ هَلْ تَسْتَوِي الظُّلُمٰتُ وَالنُّوْرُ ۚ اَمْ جَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ خَلَقُوْا كَخَلْقِهٖ

اور دیکھنے والا؟ یا کیا برابر ہیں تاریکیاں اور نُور؟ یا بنائے انہوں نے اللہ کے لئے ایسے شرکاء کہ انہوں نے پیدا کیا ہو مثل اللہ کے پیدا کرنے کے،

فَتَشَابَهَ الْخَلْقُ عَلَيْهِمْ ۗ قُلِ اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴿۱۶﴾

پھر ان کے اُوپر پیدا کرنا مشابہ ہو گیا ہو۔ آپ کہہ دیجئے ہر چیز کو پیدا کرنے والا اللہ ہے، اور وہ اکیلا ہے سب کو سنبھالنے والا ہے ﴿۱۶﴾

اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَالَتْ اَوْدِيَةٌۢ بِقَدَرِهَا فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَدًا رَّابِيًا ۗ وَمِمَّا

اُتارا اللہ نے آسمان سے پانی پھر بہہ پڑیں وادیاں اپنے اندازے کے ساتھ پھر اُٹھا لیا سیلاب نے پھولنے والی جھاگ کو، اور اس چیز

يُوْقِدُوْنَ عَلَيْهِ فِي النَّارِ ابْتِغَآءَ حِلْيَةٍ اَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ

سے جس کو آگ میں ڈال کے اس کے اُوپر آگ جلاتے ہیں زیور بنانے کے لئے یا سامان بنانے کے لئے (اس چیز سے بھی) اسی جھاگ

مِّثْلُهٗ ۗ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ ۚ فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَآءً ۚ

جیسی جھاگ ہے، اسی طرح سے مثال بیان کرتا ہے اللہ تعالیٰ حق اور باطل کی، پھر جھاگ، وہ تو چلی جاتی ہے اس حال میں پھینکی ہوئی ہوتی ہے،

وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ ۗ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ ﴿۱۷﴾ لِلَّذِيْنَ

لیکن جو چیز لوگوں کو نفع دیتی ہے وہ زمین میں ٹھہری رہتی ہے، اسی طرح سے بیان کرتا ہے اللہ تعالیٰ مثالیں ﴿۱۷﴾ ان لوگوں کے لئے جو اپنے

اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمُ الْحُسْنٰى ۗ وَالَّذِيْنَ لَمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَهٗ لَوْ اَنَّ لَهُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا

رَبّ کی بات کو مانتے ہیں اچھی حالت ہے، اور جو لوگ اللہ تعالیٰ کی بات کو نہیں مانتے اگر ان کے لئے وہ سب کچھ ہو جو زمین میں ہے

وَّمِثْلَهٗ مَعَهٗ لَافْتَدَوْا بِهٖ ۗ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ سُوْٓءُ الْحِسَابِ ۙ وَمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۗ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿۱۸﴾

اور اس جیسا اور بھی اس کے ساتھ، تو وہ اس کو دے کے اپنے کو چھڑانے کی کوشش کریں، یہی لوگ ہیں کہ ان کے لئے بُرا حساب ہے

اور ان کا ٹھکانا جہنم ہے، اور وہ بہت بُرا ٹھکانا ہے ﴿۱۸﴾

خلاصہ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۔ اَللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَحْمِلُ كُلُّ اُنْثٰى: اللہ جانتا ہے، مَا تَحْمِلُ كُلُّ اُنْثٰى: "مَا" اگر مصدریہ بنا لیا جائے ترجمہ تو بھی ٹھیک ہے، "ہر اُنثیٰ کے اُٹھانے کو اور رحموں کے گھٹانے اور بڑھانے کو"، "رحموں کا گھٹنا اور رحموں کا بڑھنا اور ہر عورت کا

حاملہ ہونا اللہ تعالیٰ اس کو جانتا ہے"، اور اگر "مَا" کو موصولہ بنایا جائے تو بھی ترجمہ ہوسکتا ہے "اللہ جانتا ہے اس چیز کو جس کو اٹھاتی ہے ہر اُنثٰی" اور، وَمَا تَغِيْضُ الْاَرْحَامُ وَمَا تَزْدَادُ: اس میں زیادہ راجح یہی ہے کہ مصدریہ بنایا جائے، کیونکہ غَاضَ يَغِيْضُ یہ تو متعدی آتا ہے، اور اِزْدَادَ لازم ہے، "جس چیز کو گھٹاتے ہیں رحم اور جس چیز کو بڑھاتے ہیں" یہ ترجمہ بظاہر اچھا نہیں، "جس چیز کے ساتھ بڑھتے ہیں" پھر یوں ترجمہ ہوجائے گا، حاصل ایک ہی ہے کہ رحموں کے اندر کمی بیشی جو بھی پیدا ہوتی ہے اللہ تعالیٰ اس کو جانتے ہیں۔ غاض يَغِيْضُ: کم کرنا۔ سورۂ ہود میں نوح علیہ السلام کے واقعے میں یہ لفظ آیا تھا وَغِيْضَ الْمَآءُ: پانی کم کردیا گیا، تو غاض یغیض کم کرنے کے معنی میں ہوگیا، اور اِزْدَادَ: زیادہ ہونا، "جس چیز کے ساتھ رحم بڑھتے ہیں، یا، رحموں کا بڑھنا۔" عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ: وہ غیب اور حاضر کو جاننے والا ہے، الْكَبِيْرُ الْمُتَعَالِ: کبریائی والا ہے اور علوّ والا ہے، بڑائی والا ہے اور برتری والا ہے، سَوَآءٌ مِّنْكُمْ مَّنْ اَسَرَّ الْقَوْلَ: برابر ہے تم میں سے جو شخص بات کو پوشیدہ کرے، اور جو شخص اس بات کو ظاہر کرے، اور جو شخص چھپنے والا ہے رات میں اور جو کوئی چلنے پھرنے والا ہے دن میں، لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ: مُعَقِّبٰتٌ اصل میں مُعْتَقِبَات ہے (مظہری)، باری باری آنے والے، "اللہ کے لئے باری باری آنے والے فرشتے ہیں انسان کے سامنے اور انسان کے پیچھے" يَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ: حفاظت کرتے ہیں وہ اس انسان کی اللہ کے حکم سے، اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ: بے شک اللہ تعالیٰ نہیں بدلتا اس چیز کو اس حالت کو جو کسی قوم میں ہے، حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ: جب تک نہ بدلیں وہ اس چیز کو جو ان کے نفسوں میں ہے، وَاِذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِقَوْمٍ سُوْٓءًا: اور جس وقت اللہ تعالیٰ ارادہ کرتا ہے کسی قوم کے ساتھ برائی کا، فَلَا مَرَدَّ لَهٗ: اس کو کوئی رَدّ کرنے والا نہیں، "اور نہیں ہے ان کے لئے اللہ کے علاوہ کوئی والی" هُوَ الَّذِيْ يُرِيْكُمُ الْبَرْقَ: اللہ وہی ہے جو تمہیں دکھاتا ہے بجلی، اللہ وہ ہے جو تمہیں دکھلاتا ہے برق۔ برق: چمکنے والی بجلی۔ خَوْفًا وَّطَمَعًا: اس حال میں کہ تم ڈرنے والے ہوتے ہو اور امید رکھنے والے ہوتے ہو، خَوْفًا وَّطَمَعًا یہ يُرِيْكُمْ کی "كُمْ" ضمیر سے حال واقع ہوجائے گا، خوف اور طمع کی حالت میں اللہ تعالیٰ تمہیں دکھاتا ہے، یعنی تم پر دونوں حالتیں طاری ہوتی ہیں، خوف بھی طاری ہوتا ہے اور اُمید بھی لگی ہوتی ہے، وَيُنْشِئُ السَّحَابَ الثِّقَالَ: اور اُٹھاتا ہے بوجھل بادلوں کو، وَيُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهٖ: تسبیح بیان کرتا ہے رَعد اس حال میں کہ وہ متلبس ہے اللہ کی حمد کے ساتھ" وَالْمَلٰٓئِكَةُ مِنْ خِيْفَتِهٖ: اور فرشتے بھی تسبیح بیان کرتے ہیں اس کے ڈر سے، خِيْفَتِهٖ کی "ہ" ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹ جائیگی، تو گویا کہ ملائکہ يُسَبِّحُ کا فاعل بن رہا ہے، تسبیح کا معنی وہاں بھی ثابت ہوگیا، اور مِنْ خِيْفَتِهٖ مقابلۃً رعد کے لئے بھی ثابت ہوجائے گا، "رعد بھی اللہ کے خوف سے اللہ کی تسبیح بیان کرتا ہے اس حال میں کہ متلبس ہے اللہ کی حمد کے ساتھ، اور فرشتے بھی اللہ کی تسبیح بیان کرتے ہیں اللہ کے ڈر سے، اللہ کے خوف سے" وَيُرْسِلُ الصَّوَاعِقَ: صواعق صاعقہ کی جمع ہے، گرنے والی بجلی کو کہتے ہیں، جس طرح سے رَعد کڑکنے والی بجلی کو کہتے ہیں، یا رَعد کسی فرشتے کا نام ہے جو کہ اس بجلی کے نظام کے اوپر متعین ہے، اور برق چمکنے والی بجلی کو کہتے ہیں، یہ تین ہی درجے ہوا کرتے ہیں چمکتی بھی ہے کڑکتی بھی ہے اور بسا اوقات وہ گرتی بھی ہے، تو چمکنے کے اعتبار سے وہ "برق" کہلاتی ہے، کڑکنے کے اعتبار سے "رعد" کہلاتی ہے اور گرنے کے اعتبار سے "صاعقہ" کہلاتی ہے، تینوں کا مصداق بجلی ہے، "بھیجتا ہے وہ بجلیاں" فَيُصِيْبُ بِهَا مَنْ يَّشَآءُ: پھر پہنچاتا ہے وہ بجلیاں جس

کو چاہتا ہے، وَهُمْ يُجَادِلُوْنَ فِي اللّٰهِ: اور وہ لوگ جھگڑا کر رہے ہیں اللہ کے بارے میں، وَهُوَ شَدِيْدُ الْمِحَالِ: حالانکہ اللہ تعالیٰ بہت سخت عذاب والا ہے، محال قدرت کو بھی کہتے ہیں، محال تدبیر کو بھی کہتے ہیں، اور اسی طرح سے محال عذاب کو بھی کہتے ہیں، ''وہ سخت قوت والا ہے، سخت عذاب والا ہے، یا، اس کی تدبیر بہت سخت ہے''، لَهٗ دَعْوَةُ الْحَقِّ: برحق پکار اسی کے لئے ہے، یعنی ایسا پکارنا جس کے اوپر اثر مرتب ہو وہ صرف اللہ کے لئے ہے، وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ: اور وہ لوگ جو اللہ کے علاوہ کسی اور چیز کو پکارتے ہیں، لَا يَسْتَجِيْبُوْنَ لَهُمْ بِشَيْءٍ: وہ چیزیں جن کو یہ اللہ کے علاوہ پکارتے ہیں ان کے لئے کچھ بھی قبول نہیں کرسکتیں، ان کی دُعا کا کچھ بھی جواب نہیں دے سکتیں، اِلَّا كَبَاسِطِ كَفَّيْهِ اِلَى الْمَآءِ: باسط پھیلانے والا۔ كَفَّيْهِ: اپنی ہتھیلیوں کو۔ لفظی معنی بنے گا ''مگر مثل اس شخص کے جو اپنی ہتھیلیوں کو پھیلانے والا ہے پانی کی طرف'' لِيَبْلُغَ فَاهُ: تاکہ پانی اس کے منہ تک پہنچ جائے، وَمَا هُوَ بِبَالِغِهٖ: اور وہ پانی اس کے منہ تک پہنچنے والا نہیں ہے، لیکن مفہوم اس کا یوں مکمل کیا جائے گا کہ ''اللہ کے علاوہ جن چیزوں کو یہ پکارتے ہیں وہ ان کے لئے کچھ بھی جواب دینے کی طاقت نہیں رکھتیں، لَا يَسْتَجِيْبُوْنَ لَهُمْ بِشَيْءٍ: ان کی پکار کو کسی شئ کے ساتھ وہ قبول نہیں کرتیں مگر مثل قبول کرنے پانی کے اس کو پکارنے والے کی فریاد کو، یہ حاصل مفہوم ہو گیا اس کا، یعنی وہ ایسے ہی ان کو جواب دے سکتی ہیں جس طرح سے پانی کو کوئی پیاسا پکارے کہ میرے منہ میں آ جا، تو پانی اس کی بات مان لیتا ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ پانی تو بات مانتا نہیں، اگر کوئی پیاسا ہاتھ پھیلا پھیلا کے کنویں کے کنارے پہ کھڑا ہو کر پانی کو آواز دے کہ مجھے تیری ضرورت ہے، میری پیاس بجھا دے، تو میرے منہ میں آ جا، تو پانی آ سکتا ہے؟ نہیں آتا، تو جس طرح سے پانی کو پکارنے والا پیاس کی حالت میں پیاسا مر تو سکتا ہے لیکن پانی اس کے منہ تک نہیں پہنچے گا، اسی طرح سے یہ غیر اللہ کو پکارنے والے پکارتے ہی رہیں گے اور وہ چیزیں ان کی فریادرسی نہیں کرسکتیں، یہ ہے مفہوم ان کا، اور لفظوں کے تحت اس کو یوں بیان کر دیں گے کہ ''نہیں قبول کرتے وہ ان کے لئے کچھ بھی، نہیں جواب دیتے وہ ان کو کسی شئ کے ساتھ مگر مثل جواب دینے پانی کے ایسے شخص کو جو پھیلانے والا ہے اپنی ہتھیلیاں پانی کی طرف تاکہ وہ پانی اس کے منہ تک پہنچ جائے، اور وہ ان کے منہ تک پہنچنے والا نہیں'' وَمَا دُعَآءُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ: اور نہیں ہے کافروں کی دُعا مگر بے اثر، فِيْ ضَلٰلٍ کا یہ معنی ہے گمراہی میں یعنی بے اثر، یہ صدا بہ صحرا ہے، جہاں ہو کوئی بھی نہ اور کوئی آوازیں دے رہا ہو تو اس کو کہتے ہیں یہ صدا بہ صحرا ہے، اس پر کوئی کسی قسم کا جواب مرتب نہیں ہو سکتا، تو یہ ضلال اس حق کے مقابلے میں ہے جو پیچھے آیا لَهٗ دَعْوَةُ الْحَقِّ، اُس کا مفہوم ہم نے یہ بیان کیا کہ جس پکارنے پر اثر مرتب ہو وہ پکارنا صرف اللہ کے لئے ہے، اور کافر جو غیر اللہ کو پکارتا ہے وہ بے اثر ہے اس کے اوپر کوئی کسی قسم کا اثر مرتب نہیں ہو سکتا، اس کا پکارنا ضلال میں ہے، گمراہی میں ہے۔ ''اللہ ہی کے لئے سجدہ کرتی ہیں وہ چیزیں جو آسمان میں ہیں اور زمین میں ہیں'' طَوْعًا وَّ كَرْهًا: طوع کا معنی ہوتا ہے کسی کام کو دل کی خوشی سے کرنا، اور كَرْهًا کا معنی ہوتا ہے ناگواری سے کرنا، تو یہ يَسْجُدُ کے فاعل سے حال واقع ہو جائے گا، یہ مَنْ جو فاعل واقع ہو رہا ہے يَسْجُدُ کا، تو یہ دونوں مَنْ سے حال واقع ہو جائیں گے، ''اس حال میں کہ وہ خوشی سے سجدہ کرنے والا ہے اور ناگواری سے سجدہ کرنے والا ہے۔'' وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ: اللہ ہی کے لئے سجدہ کرتی ہیں وہ سب چیزیں جو آسمانوں میں ہیں اور زمین میں ہیں

خوشی سے اور ناگواری سے" وَّظِلٰلُهُمْ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ: اور ان کے سائے بھی صبح شام۔ ظِلٰلُهُمْ یہ بھی یَسْجُدُ کا فاعل ہے،" اور ان کے سائے بھی سجدہ کرنے والے ہیں صبح وشام"۔ آپ ان سے پوچھیے قُلْ: کہہ دیجئے، پوچھیے مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ: کون ہے آسمانوں اور زمین کا رَبّ؟ قُلِ: پھر آپ خود ہی بتادیں، جواب دے دیں: اللہ! قُلْ اَفَاتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِيَآءَ: پھر آپ انہیں پوچھیے، کہیے کہ کیا تم نے بنالیا اللہ کے علاوہ کارسازوں کو، اختیار کر لئے تم نے اللہ کے علاوہ اور کارساز؟ "نہیں اختیار رکھتے وہ اپنی جانوں کے لئے نفع کا نہ نقصان کا، آپ کہہ دیں کہ کیا برابر ہے اندھا اور دیکھنے والا، یا کیا برابر ہیں تاریکیاں اور نور؟" اَمْ جَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ: یا بنائے انہوں نے اللہ کے لئے شرکاء، خَلَقُوْا كَخَلْقِهٖ: ایسے شرکاء کہ انہوں نے پیدا کیا ہو مثل اللہ کے پیدا کرنے کے فَتَشَابَهَ الْخَلْقُ عَلَيْهِمْ: پھر ان کے اوپر پیدا کرنا مشتبہ ہوگیا ہو، متشابہ ہوگیا ہو، ان کو مغالطہ لگ گیا کہ جب اللہ کی پیدا کی ہوئی چیزیں بھی موجود ہیں اور دوسروں کی پیدا کی ہوئی چیزیں بھی موجود ہیں تو ہم کس کو خالق کہیں، کس کو اپنا مالک کہیں، کوئی اس قسم کا اشتباہ ان کو پڑ گیا، خلق ان کے اوپر متشابہ ہوگیا کہ جس طرح سے اللہ پیدا کرتا ہے ویسے وہ بھی پیدا کرتے ہیں" قُلِ: آپ کہہ دیجئے کوئی بات بھی نہیں ان میں سے، اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ: ہر چیز کو پیدا کرنے والا اللہ ہے۔ وَّهُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ: اور وہ اکیلا ہے سب کو سنبھالنے والا ہے، قہار کا مفہوم جس طرح سے آپ کی خدمت میں کئی دفعہ ذکر کیا، جو اپنی قوت کے ساتھ کنٹرول کرلے اس کو کہتے ہیں قہار، اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً: اتارا اللہ نے آسمان سے پانی، فَسَالَتْ اَوْدِيَةٌ: اودیۃ وادی کی جمع ہے، پھر بہہ پڑیں وادیاں بِقَدَرِهَا: اپنے اندازے کے ساتھ، جتنا کسی وادی میں وسعت تھی اتنا پانی اس نے سنبھال لیا، فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَدًا رَّابِيًا: زبد کہتے ہیں جھاگ کو اور رَابِيًا: پھولنے والی، "پھر اٹھالیا سیلاب نے پھولنے والی جھاگ کو" وَمِمَّا يُوْقِدُوْنَ عَلَيْهِ فِي النَّارِ: اَوْقَدَ النَّارَ: آگ جلانا،" اور اس چیز سے جس کو آگ میں ڈال کے اس کے اوپر آگ جلاتے ہیں زیور بنانے کے لئے یا سامان بنانے کے لئے" ابْتِغَآءَ حِلْيَةٍ اَوْ مَتَاعٍ: حلیہ زیور کو کہتے ہیں، متاع عام سامان ہوگیا، جیسے سونا چاندی آگ میں پگھلایا جاتا ہے زیور بنانے کے لئے، جیسے تانبا اور دوسری چیزیں لوہا وغیرہ یہ پگھلایا جاتا ہے دیگر سامان بنانے کے لئے، اسی وَمِمَّا يُوْقِدُوْنَ زَبَدٌ مِّثْلُهٗ: اس چیز سے بھی اسی جھاگ جیسی جھاگ ہے، جس طرح سے پانی پر جھاگ آجاتی ہے ان چیزوں پر بھی جھاگ آجاتی ہے، كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ: اسی طرح سے مثال بیان کرتا ہے اللہ تعالیٰ حق اور باطل کی، فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَآءً: پھر جھاگ، وہ تو چلی جاتی ہے اس حال میں کہ دفع کی ہوئی ہوتی ہے، پھینکی ہوئی ہوتی ہے، وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ: لیکن جو چیز لوگوں کو نفع دیتی ہے فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ: وہ زمین میں ٹھہری رہتی ہے، كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ: اسی طرح سے بیان کرتا ہے اللہ تعالیٰ مثالیں۔ لِلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمُ الْحُسْنٰى: ان لوگوں کے لئے جو اپنے رَبّ کی بات کو مانتے ہیں اچھی حالت ہے، وَالَّذِيْنَ لَمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَهٗ: اور جو کوئی اللہ تعالیٰ کی بات کو نہیں مانتا، لَوْ اَنَّ لَهُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا: اگر ان کے لئے وہ سب کچھ ہو جو زمین میں ہے، وَّمِثْلَهٗ مَعَهٗ: اور اس جیسا اور بھی اس کے ساتھ ہو، لَافْتَدَوْا بِهٖ: تو وہ اس کو دے کے اپنے کو چھڑانے کی کوشش کریں، حاصل اس کا یہ ہوا کہ جو اللہ تعالیٰ کی بات کو نہیں مانتے ان کا بُرا حال ہے، الحسنیٰ کے مقابلے میں السوء ہی آجائے گا، جنہوں نے اللہ کی بات کو مان لیا ان کے لئے تو اچھی حالت ہے، اور جنہوں نے اللہ کی

بات نہیں مانا ان کا بڑا برا حال ہے، اتنا برا حال ہوگا کہ جس وقت وہ اس مصیبت میں پھنسیں گے تو اگر اُن کے پاس وہ سب چیزیں ہوں جو زمین میں ہیں اور اُتنا اور بھی اس کے ساتھ ہو تو وہ سب کچھ دے کے اپنے آپ کو چھڑانا چاہیں گے، اُولٰٓئِكَ لَهُمْ سُوْٓءُ الْحِسَابِ: یہی لوگ ہیں کہ ان کے لئے برا حساب ہے، وَمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ: اور ان کا ٹھکانا جہنم ہے، وَبِئْسَ الْمِهَادُ: اور وہ بہت بُرا ٹھکانا ہے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

تفسیر

ماقبل سے ربط

پچھلے رکوع میں آپ کی خدمت میں ذکر کیا گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کے تصرفات اور اس کی قدرت کو ذکر کر کے وحدانیت کو ثابت کیا جا رہا ہے اور ساتھ ساتھ اس قدرت کے ذریعے سے اثباتِ معاد بھی مقصود ہے، کہ جب اللہ تعالیٰ اس طرح سے قدرت رکھنے والے ہیں تو دوبارہ زندہ کرنا ان کے لئے کوئی مشکل نہیں، اور رکوع کے آخر میں ان کا مطالبہ ذکر کیا گیا تھا کہ وہ سیئہ جلدی جلدی چاہتے ہیں حسنہ کا وقت گزرنے سے پہلے ہی، ان کو گزشتہ واقعات سے عبرت حاصل کرنی چاہیے، اور نبی کا کام معجزے دکھانا نہیں ہوتا جس طرح سے یہ کہتے ہیں کہ ہماری مرضی کے مطابق معجزے کیوں نہیں آتے، نبی تو صرف منذر ہوتا ہے، ہماری عادت ہے کہ ہم ہر قوم کے لئے ہادی بھیجتے ہیں، تو اسی ضابطے کے تحت یہ ہادی بھی بھیجے گئے ہیں، اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو نشانی سامنے آئے گی ان کو حاصل ہوگی وہ بتا دیں گے دکھا دیں گے، اور معجزے دکھانے کی قدرت نبی کو براہِ راست حاصل نہیں ہوتی، اب یہ رکوع جو آپ کے سامنے پڑھا گیا اس میں بھی اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنی کچھ صفاتِ مختصہ کو واضح کیا ہے، خصوصیت کے ساتھ علم اور قدرت کو، کیونکہ علم اور قدرت یہ دو چیزیں اُمہاتِ صفات میں شامل ہیں، بنیادی صفات ہیں، جو شخص اللہ تبارک وتعالیٰ کے علم کے متعلق صحیح تصور حاصل کر لے اور پھر اس کو قادر بھی مان لے تو پھر شرک کی جتنی باتیں ہیں وہ بھی ساری کی ساری ختم ہو جاتی ہیں اور معاد کے متعلق جس قسم کے اشکالات ہیں وہ بھی ختم ہو جاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے علمی اِحاطے کا ذِکر

تو پہلے اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنا وسیع العلم ہونا بیان فرمایا، عورتیں حاملہ ہوتی ہیں یا ہر مؤنث حاملہ ہوتی ہے تو اس کا حاملہ ہونا یہ بھی اللہ کے علم میں ہے، کب حاملہ ہوگی، کب نہیں ہوگی، اس نے کس چیز کو اٹھایا ہے، یعنی یہ جو بنیاد رکھی گئی ہے اس کے رحم میں، نر کی ہے یا مادہ کی ہے، کامل ہے یا ناقص ہے، (اسی طرح) رحموں کا گھٹنا بڑھنا، جس چیز کو رحم گھٹاتے ہیں، جس چیز کے ذریعے سے بڑھتے ہیں، جو کیفیت رحم کے اندر پیدا ہوتی ہے سب اللہ تبارک وتعالیٰ جانتے ہیں، جیسے آپ کے سامنے سورۂ لقمان کے آخر میں آئے گا اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ ۚ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ ۚ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْاَرْحَامِ: رحموں میں جو کچھ ہے وہ اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں، یہ علمی احاطہ ہے اللہ تعالیٰ کا، کہ جہاں سے تمہاری بنیاد شروع ہوئی اس وقت سے ہر کیفیت اللہ تعالیٰ کے سامنے ہے، کوئی حال تمہارا مخفی

نہیں، کیسا وجود بنے گا، کیسا رنگ ہوگا، مذکر ہوں گے مؤنث ہوں گے، عقلمند ہوں گے پاگل ہوں گے، اندھے ہوں گے سواکھے ہوں گے، سمجھدار ہوں گے بے سمجھ ہوں گے، باطنی صلاحیتیں، ظاہری حالت، جو کچھ ہے رحم کے اندر یہ اللہ تعالیٰ جانتے ہیں۔ ''اور ہر چیز اس کے نزدیک اندازے سے ہے'' جب ہر چیز اس کے پاس اندازے سے ہے تو اللہ تعالیٰ نے تمہیں کتنی مہلت دے رکھی ہے، پھر کب تم پہ عذاب آئے گا، کتنا سخت عذاب آئے گا، یا تم جس قسم کے معجزات مانگتے ہو وہ دکھائے جائیں گے یا نہیں دکھائے جائیں گے، یہ ساری کی ساری چیزیں اللہ تعالیٰ کے اندازے میں ہیں، اللہ تعالیٰ اپنے اندازے کے ساتھ اپنے علم وحکمت کے تقاضے سے اس کو ظاہر کرتا ہے، تمہیں چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کے علم پر اعتماد کرتے ہوئے ان چیزوں کو تسلیم کرو جس قسم کی چیزیں تمہیں بتائی جارہی ہیں، اور ایسی الٹ پلٹ باتیں کر کے اپنے آپ کو عذاب کی دعوت نہ دو، اللہ کے علم میں ہیں تمہارے سارے کے سارے حالات اور اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کا اندازہ کر رکھا ہے، جب اس کے اندازے کے مطابق عذاب کا وقت آجائے گا تو پھر کوئی رد کرنے والا نہیں ہوگا جس طرح سے آئندہ آیات کے اندر یہ تاثر دیا جارہا ہے۔

یہ تو ایک حال ذکر کیا تھا رحموں کا، اور آگے عمومی طور پر ذکر کر دیا کہ ''وہ غیب وشہادۃ کو جاننے والا ہے اور وہ کبریائی والا ہے اور علو والا ہے''، ''برابر ہے تم میں سے وہ شخص جو بات کو چھپائے'' زبان پر نہیں لاتا، دل میں چھپا رکھی ہے، یا چپکے چپکے کسی سے بات کرتا ہے، ''یا بات کو ظاہر کرے'' یہ انسان کے عمل کے ساتھ تعلق آ گیا اللہ کے علم کا، جس طرح سے پہلے غیر اختیاری احوال تھے تو یہ اقوال آ گئے، کہ بات تم چپکے چپکے کرو یا دل میں چھپا کے رکھو یا اس کو ظاہر کرو اللہ تعالیٰ جانتا ہے، اللہ کے نزدیک برابر ہیں، کوئی فرق ہی نہیں، جیسے وہ زبان پہ لائی ہوئی بات کو جانتا ہے، جہر کے ساتھ کہی ہوئی بات کو جانتا ہے، اسی طرح سے دل میں چھپائی ہوئی بات کو بھی جانتا ہے۔ اور آگے تعمیم اوقات کے اعتبار سے آ گئی کہ جو تم میں سے رات کو چھپنے والا ہے یا دن کو چلنے پھرنے والا ہے اللہ تعالیٰ کے نزدیک دونوں ہی برابر ہیں، یہ نہیں کہ رات کو کوئی چھپ جائے گا تو اللہ کو نظر نہیں آتا اور دن کو اگر چل پھر رہا ہو تو نظر آتا ہے، نہیں! اللہ تعالیٰ کے ہاں دونوں ہی برابر ہیں، جس طرح سے دن کو چلنے پھرنے والا ظاہر ہے مخفی نہیں ہے اللہ تعالیٰ اس کو جانتے ہیں اسی طرح سے رات کو چھپنے والا بھی اللہ تعالیٰ پہ مخفی نہیں، یہ ساری باتیں اللہ تعالیٰ کے علمی احاطے کے طور پر ذکر کر دی گئیں کہ اللہ تعالیٰ وسیع العلم ہے۔

اللہ کی طرف سے اِنسان کی حفاظت کا باطنی نظام

اور آگے یہ بتایا کہ اللہ تعالیٰ حافظ الخلق بھی ہے، لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ لَهٗ کی ضمیر اللہ کی طرف بھی لوٹا سکتے ہو، ''اللہ کے فرشتے ہیں''، اور انسان کی طرف اگر لوٹاؤ جیسے پیچھے ذکر آرہا ہے مُسْتَخْفٍۢ بِالَّيْلِ وَسَارِبٌۢ بِالنَّهَارِ کا، تو یہ بھی ٹھیک ہے ''انسان کے لئے فرشتے ہیں جو اس کے سامنے اور اس کے پیچھے پھرتے رہتے ہیں، اس کی حفاظت کرتے ہیں اللہ کے حکم سے'' یہ باطنی نظام ہے اللہ تبارک وتعالیٰ کا اپنی مخلوق کی حفاظت کے لئے، ورنہ انسان جس طرح سے دنیا میں رہتا ہے اور جتنی ناگوار چیزیں اس کے اردگرد پھیلی ہوئی ہیں اس کو تباہ کرنے والی اس کو برباد کرنے والی، اللہ تعالیٰ کی حفاظت اگر شامل حال نہ ہو تو انسان

زندگی نہیں گزار سکتا، واعظوں سے آپ سنتے رہتے ہیں، واقعہ تو جہاں تک ہے اللہ بہتر جانتا ہے، کہ نمرود ایک مچھر کے ذریعے سے ہی پریشان کر دیا گیا تھا جو اس کے ناک میں گھس گیا، دماغ میں چلا گیا، جا کے وہ خارش پیدا کرتا تھا، اور جب اس کے سر کے اوپر کوئی ٹھوکا ٹھوکی ہوتی رہتی تھی تو اس کو چین رہتا تھا، اور جہاں اس کو چھوڑ دیا جاتا تو اس کو تکلیف ہوتی تھی، تو ایک مچھر کے ذریعے سے نمرود کا دماغ پریشان کر دیا گیا، تو آج کل تو ماشاء اللہ مچھروں کی فوج آئی ہوئی ہے، اور آپ کی ناک کے سامنے کوئی فلٹر بھی نہیں لگا ہوا، کہ وہ مچھر جو ہیں وہ آپ کی ناک میں نہیں گھستے، ورنہ اگر ایک مچھر نمرود کو پریشان کر سکتا ہے تو ہمیں کیوں نہیں کر سکتا، ہماری ناک میں تو ہر روز بیسیوں مچھر گھس جائیں اور زندگی کو تلخ کر کے رکھ دیں، یہ اللہ کی حفاظت ہے، کتنے سانپ اور بچھو اس زمین کے اندر پھر رہے ہیں اور انسان اس کے اوپر وقت گزار رہا ہے، اللہ تعالیٰ حفاظت فرماتے ہیں، جنات ایک ایسی مخلوق ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اگر تھوڑی سی چھٹی ملتی ہے اور کسی انسان پر اس کو مسلط کر دیا جاتا ہے تو جس طرح سے جن اس کو ناچ نچواتے ہیں وہ آپ کے سامنے ہے کہ انسان ان کے سامنے کس طرح سے عاجز آجاتا ہے، تو ہم جو اس طرح سے دندناتے پھرتے ہیں اور جنات کی یلغار سے محفوظ ہیں اور ہمیں وہ کچھ نہیں کہتے یہ سب اللہ کی حفاظت ہے، فرشتے اللہ کی طرف سے متعین ہیں، تو جس میں یہ بتا دیا گیا کہ تم محفوظ اس وقت تک ہی ہو جس وقت تک اللہ کی طرف سے حفاظت کے فرشتے متعین ہیں، اور اگر اللہ تعالیٰ کسی وقت اپنی حکمت کے تحت فرشتوں کی حفاظت کو اٹھا لیتا ہے تو پھر یہی لوہا، یہی مٹی، یہی آگ، یہی پانی، اور اس قسم کے موذی جانور، رینگنے والے کیڑے یہی تمہاری زندگی کو ختم کر کے رکھ دیتے ہیں، پانی جو تمہاری زندگی کا باعث ہے وہ تمہیں ڈبو دے گا، آگ جو تمہارے لیے کھانا پکانے کے لئے باورچیوں کی جگہ متعین ہے وہی تمہیں بھسم کر کے رکھ دے گی، یہی مکان جو تمہاری حفاظت کے لئے کھڑے ہیں یہی تمہارے اوپر گریں گے اور تمہیں نیچے روند کے رکھ دیں گے، تو جن چیزوں کو انسان نے اپنے لیے زندگی اور بقاء کا ذریعہ سمجھا ہوا ہے یہی انسان کو ایک منٹ کے اندر ختم کر کے رکھ دیتی ہیں اگر اللہ تعالیٰ کسی وقت اپنی حفاظت کو اٹھا لے، تو ''اللہ کے لئے باری باری آنے والے فرشتے ہیں جو انسان کے سامنے اور اس کے پیچھے آتے رہتے ہیں'' حدیث شریف میں اس کی وضاحت موجود ہے، صبح و شام ان کی ڈیوٹیاں بدلتی ہیں، صبح آتے ہیں شام کو جاتے ہیں، شام کو آتے ہیں صبح جاتے ہیں، فجر کی نماز میں اور عصر کی نماز میں ان کا اجتماع ہوتا ہے،[1] يَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ: اللہ کے حکم سے یہ انسان کی حفاظت کرتے ہیں۔

''اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ'' کا ایک مشہور مفہوم، اور اس کا صحیح مفہوم

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ: بے شک اللہ تعالیٰ بدلتا نہیں اس حال کو جو کسی قوم میں ہے۔ ''اس حال'' سے خوش حالی مراد ہے کہ اگر کوئی قوم خوش حال ہے اللہ نے انہیں مہلت دے رکھی ہے ڈھیل دے رکھی ہے تو اللہ تعالیٰ اس خوش حالی کو ختم نہیں کرتا جس وقت تک وہ خود اپنے احوال کو ختم نہیں کرتے، اللہ نے مہلت دے رکھی ہے خوش حالی دے رکھی ہے تو انسان پھر ناشکرا ہو جاتا ہے، معصیت کی طرف آتا ہے، نافرمانی کی طرف آتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس خوش حالی کو بدحالی سے بدل دیتے ہیں، اس مہلت کو گرفت

(۱) بخاری ج۱ص۷۹ باب فضل صلاۃ العصر/ مسلم ۱/ ۲۲۷ باب فضل صلاتی الصبح والعصر/ مشکوۃ ۱/ ۶۲ باب فضائل الصلوۃ فصل اول۔

سے بدل دیتے ہیں۔ یہاں اس آیت کا مفہوم یہ ہے، یہ جو عام طور پر لوگ اس آیت کو پڑھتے ہیں اور پھر وہ ساتھ ایک شعر بھی بنائے پھرتے ہیں کہ:

خدا نے اس قوم کی حالت نہیں بدلی نہ ہو جن کو خیال خود اپنی حالت کے بدلنے کا

تو اس کا مطلب یہ ہے کہ بدحال قوم جس وقت تک اپنے احوال کو تبدیل نہ کرنا چاہے اور محنت نہ کرے اپنے احوال کی تبدیلی کے لئے اس وقت تک اللہ تعالیٰ انہیں خوش حال نہیں کرتے۔ یہ بات اگرچہ کسی درجے تک صحیح ہے کہ انسان کے سامنے نتائج اکثر وبیشتر اس کے عمل کے نتیجے میں آتے ہیں کہ اگر وہ بدحال ہے، محنت کرے، کوشش کرے تو اللہ تعالیٰ اس کو خوش حال کردیتے ہیں، لیکن بدحالی کے بعد خوش حالی کبھی کبھی انسان کے عمل کے بغیر بھی آجاتی ہے، اس آیت کا یہ مفہوم نہیں ہے۔ اس آیت کا مفہوم تو یہ ہے کہ اگر اللہ نے نعمتیں دے رکھی ہیں، خوش حالی دے رکھی ہے تو جس وقت تک انسان ناشکرا نہ ہو اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں مبتلا نہ ہو، اللہ تعالیٰ اپنی اس مہلت کو ختم نہیں کرتا، اللہ تعالیٰ اپنی اس ڈھیل کو ختم کرکے ان کے اوپر گرفت نہیں لاتا، یہاں اس آیت کو اس مفہوم میں ذکر کیا گیا ہے، وہ مضمون اگرچہ اپنی جگہ صحیح ہو لیکن اِن الفاظ کا وہ مفہوم نہیں ہے، کیونکہ یہاں تو ان کو دھمکی دی جارہی ہے کہ تم جو حسنہ کا وقت گزرنے سے پہلے پہلے عذاب کا مطالبہ کررہے ہو تو اپنے لیے کیوں مصیبت طلب کررہے ہو، اللہ نے تمہیں اچھی حالت دی ہے، تم صحت سے ہو، کھاتے پیتے ہو، عافیت سے ہو، اور اگر تم نے اپنے یہ احوال تبدیل کیے کہ اللہ کا شکر نہ اختیار کیا، کفر کی طرف چلے گئے، ناشکری کرتے رہے، ہماری نصیحت سے فائدہ نہ اٹھایا، رسولوں سے تم نے ہدایت حاصل نہ کی بلکہ ان کی تکذیب میں لگے رہے، پھر اللہ کی عادت یہی ہے کہ جب انسان اپنے نفسانی حالات کو تبدیل کردیتا ہے اور سمجھانے کے باوجود بھی ان کو سدھارنے کے لئے تیار نہیں ہوتا تو اللہ تعالیٰ اپنی نعمتیں چھین لیتے ہیں، اور جس قسم کی مہلت دی ہوئی ہوتی ہے اس کو ختم کردیتے ہیں، تو یہاں تغیر اچھائی سے بُرائی کی طرف ہے، اور لوگ جس قسم کا شعر پڑھا کرتے ہیں وہ تغیر بُرائی سے اچھائی کی طرف ہے، بات کسی درجے میں وہ بھی صحیح ہے لیکن اس آیت کا یہ مفہوم نہیں ہے، ''بے شک اللہ تعالیٰ نہیں بدلتے اس چیز کو جو کسی قوم میں ہے'' یعنی اچھی حالت، کسی قوم کو اگر اچھی حالت اللہ نے دے رکھی ہے تو اس کو اللہ تعالیٰ بدلتے نہیں ''جس وقت تک وہ خود نہ بدلیں ان احوال کو جو ان کے دلوں میں ہیں'' جب تک وہ اپنے احوال خود نہیں بدلتے کہ بدکردار ہوجائیں، اچھا اخلاق اختیار نہ کریں، سمجھانے کے باوجود نہ سمجھیں، تب اللہ تعالیٰ پھر اس دی ہوئی حالت کو بدل دیتے ہیں، جیسے کہ آگے خود وہی لفظ آگیا کہ اِذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِقَوْمٍ سُوْٓءًا فَلَا مَرَدَّ لَهٗ: جب اللہ تعالیٰ کسی قوم کے متعلق بُرائی کا ارادہ فرمالیتے ہیں کہ ان کو اب بُری حالت میں ڈالنا ہے فَلَا مَرَدَّ لَهٗ: تو پھر اس کو رَدّ کرنے والا کوئی نہیں۔ مَرَدّ یہ مصدر میمی ہے اور اسم فاعل کے معنی میں ہوگا، فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِهٖ جس طرح سے سورۂ یونس کے آخر میں آیا تھا، رَآدّ اسم فاعل کا صیغہ ہے، تو مَرَدّ مصدر میمی یہ بھی اسم فاعل کے معنی میں ہوجائے گا، ''تو اس بُرائی کو روکنے والا کوئی نہیں، اس بُرائی کو رَدّ کرنے والا کوئی نہیں'' جیسے وہاں یہ بات نفی کی گئی کہ جب اللہ تعالیٰ کسی کو فضل دینا چاہے تو فضل کو رَدّ کرنے والا کوئی نہیں ہے، فَلَا مَرَدَّ لَهٗ تو پھر اس کو رَدّ کرنے والا، اس سوء کو رَدّ کرنے والا کوئی نہیں، ''اور نہ ان لوگوں کے لئے پھر کوئی والی اور مددگار ہوتا ہے'' جب کسی کے متعلق سوء کا فیصلہ اللہ تعالیٰ فرمالیں تو پھر اس کا کوئی کارساز نہیں جو اس کو اس برائی سے بچالے۔

بارش کا نظام اور قدرتِ باری تعالیٰ کا تذکرہ

آگے اللہ تعالیٰ نے اپنا عظیم الشان ہونا اور قادر ہونا بیان فرمایا، کہ اللہ تمہیں بجلی دکھاتا ہے چمکتی ہے، خاص طور پر قرآنِ کریم کے نزول کے زمانے میں سارے کا سارا عرب جو تھا اس کی معیشت کا دارومدار بارش پہ تھا، بارش نہیں ہوتی تھی تو قحط سالی میں مبتلا ہوجاتے تھے، ان کے بہت بُرے حالات ہوتے تھے، جب کہیں سے بادل آتے اور بجلی چمکتی تو ان لوگوں کو بڑی اُمیدیں لگتیں کہ بارش آئے گی، بارش آئے گی تو ہمیں خوشحالی حاصل ہوگی، لیکن ساتھ ساتھ ڈر بھی لگتا کیونکہ اس میں عذاب کا پہلو بھی ہے کہ وہی چمکنے والی بجلی زور سے کڑکتی ہے، کڑک کے زمین پہ گرتی ہے تو سب کچھ ہی جلا کے رکھ دیتی ہے، بھسم کر کے رکھ دیتی ہے، بڑی بڑی عمارتیں اس کے سامنے یوں اڑ جاتی ہیں جس طرح سے کوئی روئی کا گالا ہوتا ہے، اور اسی طرح سے بارش اگر ہو اور سیلاب کی صورت اختیار کر جائے، طوفان کی صورت اختیار کر جائے تو یہ بھی ایک بربادی کا باعث ہے، ایسے واقعات ہوتے رہتے ہیں کہ بارش ہوئی اور اتنی زیادہ ہوگئی کہ فصلوں کے لئے مفید ہونے کی بجائے الٹا ان کو برباد کرگئی، آبادیوں کے لئے مفید ہونے کی بجائے ان کو بہا کے لے گئی، ایسا بھی تو ہوتا ہے، تو یہ اللہ کی قدرت ہے،''وہ تمہیں دکھاتا ہے برق، چمکنے والی بجلی'' بجلی کی چمک تمہارے سامنے نمایاں کرتا ہے، اور تمہارے اوپر دونوں کیفیتیں طاری ہوتی ہیں خوف کی بھی اور امید کی بھی، تم ڈرنے والے بھی ہوتے ہو کہ کہیں نقصان نہ ہوجائے، بارش طوفان کی صورت اختیار نہ کر لے، اور اسی طرح سے بجلی جو چمک رہی ہے، کڑک رہی ہے، کہیں گر کے نقصان نہ کر دے، اور تم امید لگانے والے بھی ہوتے ہو کہ بارش ہوگی اور اس کے ساتھ خوش حالی آئے گی۔'' اور وہی اُٹھاتا ہے بوجھل بادلوں کو' ثقال یہ ثقیل کی جمع ہے، اور سحاب یہ اسم جمع ہے، سحابۃٌ اس کا واحد آجائے گا،'' اٹھاتا ہے وہ بوجھل بادلوں کو۔''

رعد اس کڑک کو بھی کہتے ہیں اور رعد ایک فرشتے کا نام بھی ہے، جو اس قسم کے نظام کے اوپر متعین ہے، یعنی یہ بجلی جو چمک رہی ہے، کڑک رہی ہے، تم اس کی آواز سن رہے ہو، تمہیں بظاہر ایسے ہی گڑگڑاہٹ معلوم ہوتی ہے لیکن حقیقت کے اعتبار سے وہ بھی اللہ کی تسبیح بیان کر رہی ہے، یعنی وہ بھی اللہ کی مخلوق ہے اور اللہ کے سامنے اسی طرح سے سرافگندہ ہے جس طرح سے باقی چیزیں ہیں، جس طرح سے آپ کے سامنے سورۂ اسراء میں آئے گا اِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ (آیت: ۴۴) کوئی چیز ایسی نہیں جو اللہ کی تسبیح بیان نہ کرتی ہو اور اس کی حمد کا اقرار نہ کرتی ہو، تسبیح اور تحمید کا مطلب یہی ہوتا ہے، تسبیح کا معنی ہوتا ہے اللہ تعالیٰ کو صفاتِ نقص سے بری قرار دینا، اور تحمید کا معنی ہوتا ہے کہ صفاتِ کمال کے ساتھ متصف قرار دینا، یعنی یہ بجلی کی کڑک یہ بھی یہی ظاہر کرتی ہے کہ میرا پیدا کرنے والا، اس میں کوئی کسی قسم کا عیب نہیں، وہ سب خوبیوں کا مالک ہے۔ اور اگر یہ فرشتہ ہو تو فرشتوں کی تسبیح بھی یہی ہے: سبحان اللہ وبحمدہ،'' یہ کڑک اللہ کی تسبیح بیان کرتی ہے اس حال میں کہ اللہ کی حمد کے ساتھ متلبس ہے'' یعنی یہ بھی اللہ کی تسبیح وتحمید کرتی ہے، یا یہ فرشتہ جو اس نظم پہ متعین ہے،'' اور باقی فرشتے بھی اس سے ڈر کے اس کی تسبیح پڑھتے ہیں اور اس کی حمد بیان کرتے ہیں'' فرشتوں کو خصوصیت کے ساتھ ذکر کر دیا کیونکہ مشرکینِ مکہ ان کو بھی شرکاء بنائے بیٹھے تھے، تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں

کہ فرشتے تو سارے کے سارے اس سے ڈرتے ہیں اور ڈر کے ہر وقت اس کی حمد وثناء میں لگے ہوئے ہیں۔" اور بھیجتا ہے اللہ تعالیٰ بجلیاں" یہاں صواعق یہ بھی وہی بجلیاں ہو گئیں گرنے کے اعتبار سے، جیسے میں نے عرض کیا کہ تین ہی کیفیتیں ہیں: چمک، کڑک اور گرنا، تو گرنے کے اعتبار سے اس کو "صاعقہ" کہہ دیا جاتا ہے، "بھیجتا ہے اللہ تعالیٰ بجلیاں" فَيُصِيبُ بِهَا مَنْ يَّشَآءُ: جس کو چاہتا ہے پہنچا دیتا ہے، جس پہ چاہے گرا دیتا ہے۔" اور یہ لوگ اللہ کے بارے میں جھگڑا کرنے والے ہیں" اللہ کے بارے میں جھگڑا کرنے والے ہیں یعنی اللہ کی صفات میں، اللہ کی توحید میں، " حالانکہ وہ سخت قوت کا مالک ہے" وَهُوَ شَدِيْدُ الْمِحَالِ: سخت عذاب والا ہے یا سخت قوت والا ہے۔

"مجیب الدعوات" صرف اللہ ہے

آگے اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنا مجیب الدعوات ہونا بیان فرمایا، کہ مشرک غیر اللہ کو پکارتے ہیں اپنی مصیبتیں دُور کرنے کے لئے اور اپنے فوائد کے حاصل کرنے کے لئے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ایسا پکارنا جس کے اوپر کوئی اثر مرتب ہو وہ صرف اللہ کے لئے ہے، کیونکہ اللہ ہی مالک الملک ہے، اللہ ہی ہر قسم کے خزانوں کا مالک ہے، جس کے قبضے میں سب کچھ ہے اسے پکارو گے وہ تو تمہیں کچھ دے سکتا ہے، اور جس کے قبضے میں خود کچھ نہیں تم اس کو پکارتے بھی رہو گے تو تمہیں کیا دے سکتا ہے؟ کیونکہ اللہ کے علاوہ باقی جتنی چیزیں ہیں سب اللہ کی مخلوق ہیں، ان میں کوئی طاقت استعداد استطاعت جو بھی آئے گی وہ اللہ کے پیدا کرنے سے آئے گی، اگر اللہ پیدا نہ کرنا چاہے تو اس میں کچھ بھی نہیں، "ایسا پکارنا جس کے اوپر اثر مرتب ہو وہ صرف اللہ کے لئے ہے"۔ "اور جن لوگوں کو یہ اللہ کو چھوڑ کر پکار رہے ہیں وہ ان کے لئے کسی چیز کے ساتھ جواب نہیں دے سکتے، ان کی کسی فریاد کو قبول نہیں کر سکتے، مگر ایسے ہی جس طرح سے کوئی شخص پانی کو پکارے تو پانی قبول نہیں کر سکتا" یہ ایک حسی مثال دے دی کہ ایک پیاسا ہے، کتنا ہی تڑپ رہا ہو، اور کتنی ہی لجاجتیں کر رہا ہو پانی کے سامنے دونوں ہاتھ پھیلا پھیلا کے، کہ مجھے تیری ضرورت ہے، میرے منہ تک پہنچ جا، لیکن پانی تو نہیں پہنچ سکتا، اسی طرح سے باقی چیزیں ہیں، " مگر جیسے کہ پھیلانے والا ہو کوئی شخص اپنی ہتھیلیوں کو پانی کی طرف تا کہ وہ پانی اس کے منہ کو پہنچ جائے تو وہ پہنچنے والا نہیں ہے" اسی طرح سے باقی چیزیں بھی اس کی دعا پر، اس کی پکار پر کوئی کسی قسم کی کارروائی نہیں کر سکتیں، کافروں کی دُعا بے اثر ہے، " نہیں ہے دعا کافروں کی مگر ضلال میں، گمراہی میں، بے اثر" یہاں کافروں کی دُعا سے مراد وہی دُعا ہے جو ان کے کُفر کا منشا ہے یعنی غیر اللہ کو پکارنا، ورنہ اگر کافر اللہ کو پکارے تو اللہ کو پکارنے پر تو کافر کو بھی اللہ نعمتیں دیتا ہے، دُعا کافر کی بھی قبول ہو سکتی ہے، سورۂ اعراف میں آپ کے سامنے تفصیل آ گئی کہ یہ ابلیس لعین جس وقت اللہ تعالیٰ کے سامنے اڑ گیا، اکڑ گیا، اور اللہ تعالیٰ نے اس کو ملعون اور مردود ٹھہرا دیا، تو اس کے بعد اس نے دُعا کی تھی، أَنْظِرْنِيْٓ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ: مجھے قیامت تک کے لئے مہلت دے دے، تو اللہ تعالیٰ نے فوراً قبول کر لی، تو ایسے وقت میں جب وہ ملعون ہو رہا تھا، جب مردود ہو رہا تھا، اللہ تعالیٰ کا غضب اس کے اُوپر اتر رہا تھا تب اس نے دُعا کی تب بھی قبول ہو گئی، تو کافر اگر اللہ کو پکارے تو اللہ تعالیٰ دُعا قبول کر لیتا ہے، تو یہاں جو کہا جا رہا ہے مَا دُعَآءُ الْكٰفِرِيْنَ تو اس دُعا کا منشا کُفر ہے، اور دُعا کا منشا کُفر وہی ہے جو غیر اللہ کو پکارا جاتا

ہے،اس کے اوپر کوئی اثر نہیں مرتب ہوگا۔ یا پھر یہ آخرت کے معاملے میں ہے کہ آخرت میں جب جہنم میں ڈال دیے جائیں گے تو ہزاروں سال اللہ کو پکارتے رہیں گے عذاب کے دُور کرنے کے لئے ،لیکن ان کی دُعا کے اوپر کوئی اثر مرتب نہیں ہوگا، چاہے پھر وہ اللہ کو ہی پکاریں۔لیکن پہلا مطلب زیادہ صحیح ہے، دُعَآءُ الْکٰفِرِیْنَ وہی ہے جو وہ غیر اللہ کو پکارتے ہیں۔

''قادرِ مطلق'' اور ''حاکمِ مطلق'' صرف اللہ ہے

آگے وہی! اللہ تعالیٰ کا قادرِ مطلق ہونا اور حاکمِ مطلق ہونا ذکر کیا جارہا ہے، کہ جو کچھ آسمانوں میں ہیں زمین میں ہیں چاہیں یا نہ چاہیں وہ سب اللہ کے مطیع ہیں، بعضے تو اللہ کو سجدہ کرتے ہیں خوشی کے ساتھ، جیسے احکام اختیاریہ میں مؤمن مانتا ہے، ایمان لانے والے اللہ کے احکام کو مانتے ہیں، کَرْهًا کا معنی بغیر خوشی کے، ماننا پڑتا ہے چاہیں یا نہ چاہیں، یہ اَحکامِ تکوینیہ میں ہے، جو انسان کے اختیاری امور نہیں ہیں تو اس میں کافر بھی اللہ کے تابع ہے، پیدا ہونا، مرنا، بیماری، صحت، رزق کی تنگی، وسعت، اور اس قسم کے دوسرے حالات دنیا کے اندر جو ہوتے رہتے ہیں اس میں کسی کو کوئی اختیار نہیں، چاہیں یا نہ چاہیں ماننا ہی پڑتا ہے، تو ساری کی ساری مخلوق جو بھی آسمان میں ہے اور زمین میں ہے سب اللہ کے سامنے سجدہ ریز ہے، یعنی سب اس کی مطیع ہے، کوئی خوشی کے ساتھ کوئی ناگواری سے، اللہ کے حکم سے باہر کوئی نہیں، تو سجدہ اختیاری خوشی کے ساتھ جس طرح سے مؤمن کرتا ہے، فرشتے کرتے ہیں، اور تکوینی اَحکام کے تحت ساری کائنات ہی کرتی ہے، ''اور ان کے سائے صبح وشام'' یہ بھی اللہ کو سجدہ کرتے ہیں یہ بھی اللہ نے اپنا تصرف دکھایا ہے جس کا تعلق ہے سورج نکلنے چڑھنے اونچا ہونے اور غروب ہونے کے ساتھ، یہ سارے کا سارا نظم جتنا اللہ نے قائم کر رکھا ہے کہ صبح کو سائے کس طرف کو لمبے ہورہے ہیں، پھر سکڑتے جاتے ہیں، شام کو کدھر کو جارہے ہیں، یہ نظام سارے کا سارا اللہ تعالیٰ کا جو قائم کیا ہوا ہے یہ بتاتا ہے کہ ہر چیز اللہ کے حکم کے تابع ہے، اب آپ یہ چاہیں کہ ہمارا سایہ نہ پھیلے یا ہمارا سایہ نہ سکڑے، یہ ممکن ہے؟ اس کا تعلق ہے سورج کے چڑھنے کے ساتھ، سورج نکلے گا سایہ پھیلے گا، جیسے جیسے اونچا ہوتا چلا جائے گا سکڑتا چلا جائے گا، دوسری طرف کو سورج ڈھلتا چلا جائے گا سایہ دوسری طرف کو پھیلتا چلا جائے گا، انسان اپنے اوپر صبح وشام اللہ تعالیٰ کا یہ تصرف دیکھتا ہے، آپ ان سے پوچھیے کہ ربّ السماوات والارض کون ہے؟ اور اگر یہ بولنے میں تامّل کریں، یعنی عقیدہ تو ان کا بھی اگرچہ یہی ہے کہ ربّ اللہ ہے لیکن بسا اوقات مقابلے میں ایک بات مانتا ہوا انسان اس لیے جھجکتا ہے زبان سے اقرار کرتا ہوا کہ اس کا جو نتیجہ نکلے گا اس کا ماننا مشکل ہوجائے گا، تو چاہے وہ بات صحیح ہوتی ہے اپنے خیال کے مطابق ہوتی ہے لیکن زبان سے نکالتا نہیں، تو آپ ہی کہہ دیجیے کہ اللہ ہی ربّ السماوات والارض ہے۔ تو پھر آپ ان سے پوچھیے کہ تم نے اللہ کے علاوہ جو اور کارساز بنا رکھے ہیں وہ تو ایسے ہیں کہ اپنے نفسوں کے لئے ہی نفع کے حاصل کرنے اور نقصان کو دُور ہٹانے کی طاقت نہیں رکھتے، ''نہیں اختیار رکھتے وہ اپنے نفسوں کے لئے نفع کا'' یعنی نفع کے حاصل کرنے کا اختیار نہیں رکھتے، اور نہ نقصان کو دُور ہٹانے کا اختیار رکھتے ہیں، ایسے تم نے کارساز بنالیے ہیں۔ آپ ان سے یہ بھی پوچھیے کہ اندھا اور سوانکھا کبھی برابر ہوسکتے ہیں؟ نہیں ہوسکتے، تو جو اللہ تعالیٰ کی ان صفات کو جانتے سمجھتے ہیں اور اس کے تقاضے کے مطابق چلتے ہیں ان کی تو آنکھیں کھلی ہوئی ہیں وہ تو بصیر ہیں، اور جو

لوگ ان باتوں کو سمجھتے نہیں، جنہوں نے آنکھیں بند کر رکھی ہیں وہ اندھے کی طرح ہیں، دونوں برابر نہیں، مشرک اور موحد آپس میں برابر نہیں ہو سکتے، اور ایسے ہی تاریکی اور نور برابر نہیں ہو سکتے، تو کیا انہوں نے اللہ کے لئے ایسے شرکاء بنا لیے کہ جنہوں نے کوئی پیدا کیا اللہ کے پیدا کرنے کی طرح؟ پھر ان کے اوپر پیدا کرنا مشتبہ ہو گیا کہ خالق تو وہ بھی ہیں جیسے خالق اللہ ہے، تو ہم کس کو مانیں کس کو نہ مانیں، اس قسم کا اشتباہ انہیں پیدا ہو گیا؟ یہ کائنات کے اندر کوئی چیز ایسی دیکھ رہے ہیں؟ جس کے متعلق یہ کہتے ہوں کہ شرکاء کی پیدا کی ہوئی ہے۔ آپ کہہ دیجیے کہ ہر چیز کو پیدا کرنے والا اللہ ہی ہے، وہ اکیلا ہے اور سب کو سنبھالنے والا ہے، اللہ کے علاوہ خالق کوئی نہیں، جب خالق کوئی نہیں تو مالک بھی کوئی نہیں۔

حق اور باطل کو واضح کرنے کے لئے ایک مثال

آگے حق و باطل کو واضح کرنے کے لئے ایک مثال دی گئی ہے کہ اب یہاں اللہ کی طرف سے حق آیا ہے، باطل کے ساتھ ٹکر ہو گئی، بسا اوقات آپ دیکھیں گے کہ ظاہری حالات میں باطل غالب سا معلوم ہوتا ہے حق مغلوب معلوم ہوتا ہے، لیکن باطل آخر فنا ہونے والی چیز ہے اور حق ثابت رہنے والی چیز ہے، آج نہیں تو کل، یہ نتیجہ نکل ہی آئے گا، تو اس کو ایک مثال سے واضح فرمایا، اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَالَتْ اَوْدِيَةٌۢ بِقَدَرِهَا فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَدًا رَّابِيًا: اللہ تعالیٰ نے آسمان سے پانی اتارا، وادیاں بہہ پڑیں اپنے اندازے کے ساتھ، اپنے اندازے کا مطلب یہ ہے کہ جتنی کسی وادی کے اندر گنجائش ہے اتنا پانی لے کے وہ بہہ پڑی، ''سیلاب نے اٹھایا پھولی ہوئی جھاگ کو'' یہ آپ نے دیکھا ہوگا کہ جس وقت پانی چلتا ہے تو خس و خاشاک، جھاگ یہ سب پانی کے اوپر غالب آجاتے ہیں، بظاہر دیکھنے میں اس کو غلبہ حاصل ہو گیا، پانی نیچے دب گیا۔ اور ایسے ہی ان چیزوں سے جن کو آگ میں ڈال کے تپاتے ہیں، جن کے اوپر آگ جلاتے ہیں، آگ میں ڈال کر ان کو تپاتے ہیں زیور بنانے کے لئے جیسے چاندی وغیرہ ہو گئی، یا سامان بنانے کے لئے، سامان طلب کرنے کے لئے جس طرح سے باقی دھاتیں ہو گئیں، زَبَدٌ مِّثْلُهٗ: اس پر بھی اسی طرح سے جھاگ اور میل کچیل اوپر آجاتی ہے، میل کچیل اس کے اوپر بھی آجاتی ہے، بظاہر معلوم یہ ہوتا ہے کہ میل کچیل غالب آگئی دوسری چیز نیچے دب گئی، یہ دھاتیں جتنی ہیں جس وقت ان کو پگھلاتے ہیں سوائے سونے کے باقی سب کے اوپر میل آتی ہے، کہتے ہیں سونے کے اوپر نہیں میل آتی، چاندی وغیرہ اور دوسری چیزوں کے اوپر آجاتی ہے، بہر حال یہ جھاگ جس وقت اوپر نظر آئے گی تو بظاہر اس کا غلبہ معلوم ہوگا، لیکن تھوڑی دیر کے بعد آپ دیکھیں گے کہ وہ زبد، وہ جھاگ ساری کی ساری ناکارہ ہو کے چلی جاتی ہے، کسی کام کی نہیں رہتی، اور پانی اور اصل چیز جو نافع ہے وہ باقی رہ جاتی ہے، ''ایسے ہی اللہ تعالیٰ حق اور باطل کی مثال بیان فرماتے ہیں'' کہ حق اور باطل کے ٹکراؤ میں بسا اوقات باطل اوپر چڑھتا ہوا نظر آتا ہے، باطل کا غلبہ معلوم ہوتا ہے، لیکن اس کو ایسے سمجھو جس طرح سے جھاگ، تھوڑی دیر کے بعد یہ فنا ہو جائے گا اور حق نمایاں ہو جائے گا، ''زبد چلی جاتی ہے اس حال میں کہ وہ بیکار ہوتی ہے پھینکی ہوئی ہوتی ہے، دور ہٹائی ہوئی ہوتی ہے اور جو چیز لوگوں کو نفع دیتی ہے وہ زمین کے اندر ٹھہری رہ جاتی ہے، اسی طرح سے اللہ تعالیٰ مثالیں بیان فرماتے ہیں۔''

اہلِ ایمان اور اہلِ کُفر دونوں کا انجام

ان لوگوں کے لئے جواللہ تعالیٰ کی بات کو مان لیتے ہیں اچھی حالت ہے دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی، اور جو اللہ تعالیٰ کی بات کو نہیں مانتے ان کی بری حالت ہے (مقابلۃً یہ بات سمجھ میں آگئی) لیکن ان کی اس بُری حالت کو اس انداز سے ذکر کیا گیا کہ آخرت میں جب ان کا حال بُرا ہوگا تو اگر ان کے پاس وہ سب چیزیں ہوں جو زمین میں موجود ہیں اور اتنی اور بھی ساتھ، یعنی آج تو یہ اللہ تعالیٰ کے لئے اپنی ایک خواہش کو چھوڑنے کے لئے تیار نہیں، ٹکے ٹکے کے پیچھے بے ایمانی جو اختیار کر رہے ہیں، اور ایک آنے کا نقصان برداشت کرنے کیلئے تیار نہیں، کہ اگر ہم ایمان لاتے ہیں تو ہماری تجارت کو نقصان آتا ہے، ہماری جائیداد کو نقصان آتا ہے، لیکن آخرت میں جس وقت یہ پتا چلے گا کہ یہ سارا کا سارا عذاب کُفر کی بنا پر ہے اس وقت معلوم ہوگا کہ ایمان کتنی قیمتی چیز تھی، کہ آج اس نجات کو حاصل کرنے کے لئے ساری زمین کے خزانے بھی ناکافی ہیں، اور یہ نجات ایمان کی برکت سے حاصل ہو سکے گی، ''اگر ان کے پاس وہ سب کچھ ہو جو زمین میں ہے اور اتنا اور بھی ساتھ ہو تو اس کو دے کر اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کریں'' اُولٰٓئِكَ لَهُمْ سُوْٓءُ الْحِسَابِ: ان کے لئے برا حساب ہوگا۔

''بُرے حساب'' اور ''حسابِ یسیر'' میں فرق

بُرے حساب کا مطلب یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ ان کا محاسبہ شروع کریں گے تو بہت سختی سے حساب لیں گے، ان کی چھوٹی چھوٹی غلطیاں، چھوٹے چھوٹے گناہ وہ بھی معاف نہیں کیے جائیں گے بلکہ ان کے اوپر بھی گرفت ہوگی، ''مشکوۃ شریف'' میں آپ نے ''باب المیزان'' میں پڑھا تھا کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ بیان فرمایا کہ جس شخص کا بھی اللہ تعالیٰ نے حساب لے لیا وہ عذاب دیا جائے گا، مَنْ حُوْسِبَ عُذِّبَ، آخرت میں جس کا حساب بھی ہو گیا وہ عذاب میں ڈال دیا جائے گا، حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے اشکال کیا کہ یا رسول اللہ! قرآنِ کریم میں تو آتا ہے، فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَّسِيْرًا کہ بعضے لوگ ایسے بھی ہیں جن کا حسابِ یسیر ہوگا، آسان حساب ہوگا، اور اس حساب کے نتیجے میں يَنْقَلِبُ اِلٰٓى اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا (سورۃ الانشقاق) وہ تو کامیاب ہو کے، خوش ہو کے چلا جائے گا، تو معلوم ہوتا ہے کہ حساب ہوا ہے لیکن حسابِ یسیر ہے، اور اس کے نتیجے میں اس کو کامیابی حاصل ہوگئی، اور آپ کہتے ہیں کہ جس کا بھی حساب ہو گیا وہ ہلاک ہو جائے گا، تو ان دونوں باتوں میں تو تعارض ہے، آپ کے قول سے معلوم ہوتا ہے کہ جس کا بھی حساب ہو گیا وہ پکڑا جائے گا عذاب میں ڈالا جائے گا، اور یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ بعضوں کا حساب بڑا آسان سا حساب ہوگا جس کے نتیجے میں وہ کامیاب قرار دیے جائیں گے اور گھر کی طرف وہ خوشی خوشی جائیں گے۔ تو سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا کہ جن کے متعلق حسابِ یسیر کا ذکر آیا ہے یہ حقیقت میں حساب نہیں، یہ تو عرض ہے کہ ان کے سامنے ان کے اعمال کو پیش کر دیا جائے گا کہ تم نے یہ کیا، یہ کیا، یہ کیا، لیکن اس کے اوپر گرفت نہیں ہوگی کوئی بھی، ایک چیز نمایاں کر دی جائے گی، اللہ تعالیٰ کہہ دیں گے کہ دنیا میں بھی ہم نے تیری پردہ داری کی، چل آج بھی تجھے معاف کیا، تو یہ ظاہری طور پر حساب ہے حقیقت کے اعتبار سے صرف ایک پیشی ہے، وَمَنْ نُوْقِشَ فِی الْحِسَابِ فَقَدْ عُذِّبَ، اور جس کے حساب میں

گرفت شروع ہوگئی کہ تُو نے یہ کیوں کیا تھا؟ یہ کیوں نہیں کیا؟ وہ عذاب دیا جائے گا وہ نہیں چھوٹے گا۔"[1] تو اصل میں حساب یسیر کے مقابلے میں یہ لَهُمْ سُوْٓءُ الْحِسَابِ ہے، سُوْٓءُ الْحِسَابِ کا مطلب یہی ہے کہ کوئی غلطی ان کی معاف نہیں کی جائے گی، چھوٹی ہو بڑی ہو ہر ہر غلطی کے اوپر گرفت ہوگی، مسئلہ اسی طرح سے ہے کہ کافر کا کوئی گناہ آخرت میں معاف نہیں کیا جائے گا، اور مؤمن سے اسی قسم کے گناہ صادر ہوئے ہوں، چاہے اس سے بڑے بڑے بھی صادر ہوئے ہوں، لیکن مؤمن کا حساب حسابِ یسیر ہے جس کے نتیجے میں ان کو معاف کر دیا جائے گا۔

مثال سے وضاحت

دونوں باتوں میں فرق کو آپ اس طرح سے سمجھ لیجیے کہ ایک تو وہ طبقہ ہے جس کو فرمانبردار کہا جاتا ہے، اور ایک وہ طبقہ ہے کہ جو نافرمان اور باغی ہوتا ہے، جو فرمانبردار طبقہ ہے وہ اپنے حاکم کے ساتھ جس وقت فرمانبرداری کا معاملہ رکھتا ہے (حاکم کی مثال کو چھوڑیے اپنے مقامی حالات کو لے لیجیے) کہ ایک شاگرد ایسا ہے جو استاذ کا بہت فرمانبردار اور خدمت گزار ہے، وہ خدمت کرتا ہوا کوئی نقصان کر بیٹھتا ہے، چائے کے برتن دھو رہا تھا چائنک توڑ دی، گلاس ہاتھ سے گر گیا اور وہ گلاس ٹوٹ گیا، نقصان تو اس سے بھی ہوا، اس قسم کا فرمانبردار اگر اس قسم کا کوئی نقصان کر بیٹھتا ہے تو جواب کیا ملا کرتا ہے؟ "کوئی بات نہیں، کیا ہو گیا اگر ٹوٹ گیا، ٹوٹنا ہی تھا اس نے" تو تسلی دے دی جاتی ہے اور اس کے اوپر کوئی کسی قسم کی گرفت نہیں ہوتی، اور ایک نافرمان شرارتی شاگرد ہے وہ کبھی مکان میں جا گھستا ہے، اور جا کے شرارت کرتا ہوا گلاس کو یوں مارتا ہے اور توڑ دیتا ہے، اب اس کے ساتھ معاملہ کیا ہوگا؟ وہ اس کی بغاوت کا ایک نشان سمجھا جائے گا، اس کی وجہ سے اس کے اوپر سختی ہوگی، اب وہ آگے سے سوال کرتا ہے کہ دیکھو جی! یہی تو فرق ہے کہ اس سے گلاس ٹوٹا اسے کہہ دیا کوئی بات نہیں، اور میں نے بھی تو وہی حرکت کی ہے کہ میرے ہاتھ سے بھی تو گلاس ہی ٹوٹا ہے، لیکن میرے پہ اتنی ناراضگی! اور کان پکڑائے اور ڈنڈے لگائے اور یہ کہا اور وہ کہا، یہ سختی! یہ مساوات نہیں، یہ استاذ اپنے شاگردوں کے ساتھ برابری کی نظر نہیں رکھتے، جو اپنے پاس اٹھنے بیٹھنے والے ہوتے ہیں اپنے خدمت گزار ہوتے ہیں وہ غلطی کرتے ہیں تو پردہ ڈال دیا جاتا ہے، اور اگر ہم سے کوئی اس قسم کی بات ہو جاتی ہے تو اس سے چھوٹی بات ہوتی ہے تھوڑی بات ہوتی ہے تو اس کے اوپر گرفت شروع ہو جاتی ہے، اس قسم کے تبصرے طلبہ میں ہوتے ہیں کہ نہیں ہوتے؟ لیکن فرق اس میں یہی ہے کہ ظاہری عمل کو نہیں دیکھا جایا کرتا، جذبے کو دیکھا جایا کرتا ہے، ظاہری عمل میں تو ٹھیک ہے کہ چائنک دونوں سے ٹوٹی، نقصان کے اعتبار سے دونوں برابر ہیں، چائنک کا نقصان اس سے بھی ہوا، چائنک کا نقصان اس سے بھی ہوا، لیکن در پردہ اتنا فرق ہے جتنا زمین و آسمان میں ہوتا ہے، کہ ایک آدمی تو خدمت گزاری میں لگا ہوا تھا اور اس کے ہاتھ سے اتفاقاً چھوٹ کے ٹوٹ گئی، اور دوسرے نے جا کے شرارت کر کے ٹھوکر مار کے توڑی ہے، تو دنیا کی کوئی عدالت ان دونوں عملوں کو برابر ٹھہرا سکتی ہے؟ (نہیں)۔ بالکل اسی طرح سے مؤمن کی لغزشیں ایسے ہی ہیں جس طرح سے فرمانبردار سے خدمت کرتے ہوئے برتن ٹوٹ گیا، اور کافر کی جو

---

(۱) مشکوٰۃ ۲/ ۴۸۳ باب الحساب والقصاص والمیزان کی پہلی حدیث۔ ولفظہ مختلف/ بخاری ۱/ ۲۱ باب من سمع شیئا الخ۔

بھی حرکت ہوتی ہے وہ ایسے ہی ہے جس طرح سے باغی اور سرکش قسم کا آدمی جا کے نقصان کرتا ہے، اب اس کا چھوٹا چھوٹا نقصان اس کی بغاوت کے ثبوت کے طور پر پیش کیا جاتا ہے، اور اس کو اس کے لئے سزا دینے کے لئے ذریعہ بنایا جاتا ہے، اور اگر کسی کے جذبات اچھے ہوتے ہیں فرمانبردار ہوتا ہے تو اس کے ہاتھ سے اسی قسم کا نقصان ہو جاتا ہے چونکہ نیت اس کی صحیح ہوتی ہے ذہن میں بغاوت نہیں ہوتی تو کہہ دیا جاتا ہے کہ کوئی بات نہیں، کوئی حرج نہیں، تو اسی طرح سے جو لوگ ایمان لے آتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایک قسم کا فرمانبرداروں والا معاملہ کر لیتے ہیں، ان کے ہاتھ سے اگر کسی قسم کا کوئی نقصان ہوتا ہے، کوئی پاؤں لغزش کھا جاتا ہے، کسی جگہ وہ ڈگمگا جاتے ہیں، اللہ تعالیٰ کے مفوضہ فرائض ادا کرنے میں کوتاہی ہو جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس سے درگزر فرما جائیں گے یہ حسابِ یسیر ہے، اور جو مشرک اور کافر ہیں وہ ہیں باغی، اور ان کا منشا بغاوت ہے، تو ان کے چھوٹے چھوٹے گناہ جو ہیں ان کو بھی چھوڑا نہیں جائے گا، لَهُمْ سُوْٓءُ الْحِسَابِ کا یہی معنی ہے، تو اللہ تعالیٰ کے دربار کے اندر یہ فرق جو ہے وہ اسی وجہ سے ہے، جس طرح سے آپ فطرتِ انسانی کے طور پر اپنے معاملات میں فرق دیکھتے ہیں، کہ مؤمنوں کا حساب کسی اور انداز سے ہوگا، کافروں اور باغیوں کا حساب کسی اور انداز سے ہوگا، اُولٰٓئِكَ لَهُمْ سُوْٓءُ الْحِسَابِ: ان کے لئے برا حساب ہے، وَمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ: اور ان کا ٹھکانا جہنم ہے، وَبِئْسَ الْمِهَادُ: اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

اَفَمَنْ يَّعْلَمُ اَنَّمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ كَمَنْ هُوَ اَعْمٰى ؕ

کیا پھر وہ شخص جو جانتا ہے کہ جو کچھ اُتارا گیا تیری طرف تیرے رَبّ کی طرف سے حق ہے وہ اس شخص کی طرح ہے جو اندھا ہو؟

اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿۱۹﴾ الَّذِيْنَ يُوْفُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَلَا يَنْقُضُوْنَ الْمِيْثَاقَ ﴿۲۰﴾

اس کے سوا کچھ نہیں کہ نصیحت عقل والے ہی حاصل کرتے ہیں ﴿۱۹﴾ جو اللہ کے عہد کو پورا کرتے ہیں اور اپنے عہد کو توڑتے نہیں ﴿۲۰﴾

وَالَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ وَيَخَافُوْنَ سُوْٓءَ

اور وہ لوگ جو ملاتے ہیں اس چیز کو جس کے متعلق اللہ نے حکم دیا کہ اسے ملایا جائے اور اپنے رَبّ سے ڈرتے ہیں اور برے حساب

الْحِسَابِ ﴿۲۱﴾ وَالَّذِيْنَ صَبَرُوا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْفَقُوْا

سے اندیشہ کرتے ہیں ﴿۲۱﴾ اور وہ لوگ جو صبر کرتے ہیں اپنے رَبّ کی رضا طلب کرنے کے لئے اور نماز کو قائم کرتے ہیں اور خرچ کرتے ہیں

مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً وَّيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ

اس چیز میں سے جو ہم نے انہیں دی پوشیدہ طور پر بھی اور ظاہر طور پر بھی، اور دفع کرتے ہیں اچھائی کے ساتھ برائی کو،

أُولٰٓئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ ﴿۲۲﴾ جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا وَمَنْ صَلَحَ

آخرت میں اچھا انجام انہی کے لئے ہے ﴿۲۲﴾ ہیشگی کی باغات، ان میں یہ لوگ داخل ہوں گے اور وہ بھی (داخل ہوں گے) جو صلاحیت

مِنْ اٰبَآئِهِمْ وَاَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ وَالْمَلٰٓئِكَةُ يَدْخُلُوْنَ عَلَيْهِمْ مِّنْ كُلِّ بَابٍ ﴿۲۳﴾

والے ہیں ان کے آباء میں سے اور ان کی بیویوں میں سے اور ان کی اولاد میں سے، اور فرشتے داخل ہوں گے ان پر ہر دروازے سے ﴿۲۳﴾

سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ ﴿۲۴﴾ وَالَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ

یہ کہتے ہوئے کہ تم پر سلام بسبب تمہارے صبر کرنے کے، آخرت کا اچھا انجام بہت ہی بہتر ہے ﴿۲۴﴾ اور وہ لوگ جو اللہ کے عہد کو توڑتے ہیں

مِنْ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ

اس کے پختہ کرنے کے بعد اور قطع کرتے ہیں اس چیز کو جس کے متعلق اللہ نے حکم دیا ہے کہ اسے ملایا جائے اور زمین میں فساد کرتے ہیں

اُولٰٓئِكَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوْٓءُ الدَّارِ ﴿۲۵﴾ اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ

یہی لوگ ہیں کہ ان کے لئے لعنت ہے اور آخرت کا برا انجام انہی کے لئے ہے ﴿۲۵﴾ اللہ کشادہ کرتا ہے رزق جس کے لئے چاہتا ہے اور تنگ کرتا ہے،

وَفَرِحُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا مَتَاعٌ ﴿۲۶﴾ وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ

خوش ہو گئے یہ لوگ دُنیوی زندگی کے ساتھ، نہیں ہے دُنیوی زندگی آخرت کے مقابلے میں مگر تھوڑا سا سامان ﴿۲۶﴾ اور کافر لوگ

كَفَرُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ يُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْٓ

کہتے ہیں کیوں نہیں اُتاری گئی اس پر نشانی اس کے رب کی طرف سے؟ آپ کہہ دیجیے کہ اللہ بھٹکاتا ہے جس کو چاہتا ہے اور راستہ دِکھاتا ہے

اِلَيْهِ مَنْ اَنَابَ ﴿۲۷﴾ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ

اپنی طرف اس شخص کو جو اس کی طرف رُجوع کرے ﴿۲۷﴾ جو لوگ ایمان لاتے ہیں اور مطمئن ہوتے ہیں ان کے دِل اللہ کی یاد کے ساتھ،

اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ ﴿۲۸﴾ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ طُوْبٰى لَهُمْ

خبردار! اللہ کے ذِکر کے ساتھ ہی قلوب مطمئن ہوتے ہیں ﴿۲۸﴾ جو لوگ ایمان لاتے ہیں اور نیک عمل کرتے ہیں ان کے لئے اچھی حالت ہے

وَحُسْنُ مَاٰبٍ ﴿۲۹﴾ كَذٰلِكَ اَرْسَلْنٰكَ فِيْٓ اُمَّةٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهَآ اُمَمٌ لِّتَتْلُوَا۟

اور اچھا ٹھکانا ہے ﴿۲۹﴾ ایسے ہی بھیجا ہم نے آپ کو ایک جماعت میں جس سے پہلے بہت ساری جماعتیں گزر چکی ہیں تاکہ تو پڑھے

عَلَيْهِمُ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَهُمْ يَكْفُرُوْنَ بِالرَّحْمٰنِ ؕ قُلْ هُوَ رَبِّيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ

ان پر وہ چیز جو تیری طرف ہم نے وحی کی، اور وہ انکار کرتے ہیں رحمٰن کا، آپ کہہ دیجیے کہ وہ میرا رب ہے، کوئی معبود نہیں مگر وہی،

عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ مَتَابِ ۝۳۰ وَلَوْ اَنَّ قُرْاٰنًا سُيِّرَتْ بِهِ الْجِبَالُ اَوْ

اسی پر میں نے بھروسا کیا ہے، اسی کی طرف ہی میرا لوٹنا ہے ۳۰ اور اگر بے شک قرآن، چلائے جاتے اس کے ذریعے سے پہاڑ یا

قُطِّعَتْ بِهِ الْاَرْضُ اَوْ كُلِّمَ بِهِ الْمَوْتٰى ؕ بَلْ

اس کے ذریعے سے زمین قطع کی جاتی یا اس کے ذریعے سے مُردوں کے ساتھ بات کی جاتی (تو بھی یہ لوگ ایمان نہ لاتے) بلکہ

لِّلّٰهِ الْاَمْرُ جَمِيْعًا ؕ اَفَلَمْ يَايْـَٔسِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ لَّوْ يَشَآءُ اللّٰهُ لَهَدَى النَّاسَ جَمِيْعًا ؕ

سارے کا سارا امر اللہ ہی کے لئے ہے، کیا مؤمنوں کو اس بات پر اطمینان نہیں آتا کہ اگر اللہ چاہتا تو سب لوگوں کو ہدایت دے دیتا،

وَلَا يَزَالُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا تُصِيْبُهُمْ بِمَا صَنَعُوْا قَارِعَةٌ اَوْ تَحُلُّ قَرِيْبًا مِّنْ دَارِهِمْ حَتّٰى

ہمیشہ رہیں گے یہ کافر لوگ کہ پہنچتی رہے گی ان کو مصیبت بسبب ان کے کردار کے، یا اُترتی رہے گی ان کے گھر کے قریب یہاں تک

يَاْتِيَ وَعْدُ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ۝۳۱

کہ اللہ کا وعدہ آجائے، بے شک اللہ تعالیٰ وعدہ خلافی نہیں کرتا ۳۱

خلاصہ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ اَفَمَنْ يَّعْلَمُ اَنَّمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ كَمَنْ هُوَ اَعْمٰى: کیا پھر وہ شخص جو جانتا ہے کہ جو کچھ اُتارا گیا تیری طرف تیرے رَبّ کی طرف سے حق ہے وہ اس شخص کی طرح ہے جو اندھا ہو؟ كَمَنْ هُوَ اَعْمٰى: اللہ کی طرف سے جو کچھ تیری طرف اُتارا گیا اس کو حق جاننے والا گویا کہ سوا کھے کی طرح ہے، بصیر کی طرح ہے، اور جو اس کو حق نہیں سمجھتا وہ اندھے کی طرح ہے، دونوں آپس میں برابر نہیں ہوسکتے، اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ: اس کے سوا کچھ نہیں کہ نصیحت عقل والے ہی حاصل کرتے ہیں، عقل والے کون لوگ ہیں اَلَّذِيْنَ يُوْفُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ: جو اللہ کے عہد کو پورا کرتے ہیں وَلَا يَنْقُضُوْنَ الْمِيْثَاقَ: اور اپنے عہد کو توڑتے نہیں، میثاق پختہ عہد کو کہتے ہیں، وَالَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ: اور وہ لوگ جو ملاتے ہیں اس چیز کو جس کے متعلق اللہ نے حکم دیا کہ اسے ملایا جائے، وَيَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ: اور اپنے رَبّ سے ڈرتے ہیں، وَيَخَافُوْنَ سُوْٓءَ الْحِسَابِ: اور برے حساب سے اندیشہ کرتے ہیں، برے حساب کا خوف کرتے ہیں، وَالَّذِيْنَ صَبَرُوا: اور وہ لوگ جو صبر کرتے ہیں ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ: اپنے رَبّ کی رضا طلب کرنے کے لئے، وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ: اور نماز کو قائم کرتے ہیں، وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ: اور خرچ کرتے ہیں اس چیز میں سے جو ہم

نے انہیں دی، سِرًّا وَّعَلَانِيَةً: خرچ کرتے ہیں پوشیدہ طور پر بھی اور ظاہر طور پر بھی، پوشیدہ اور ظاہر، وَيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ: اور دفع کرتے ہیں اچھائی کے ساتھ برائی کو، اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ: دار سے دارِ آخرت مراد ہے، اور عقبیٰ: عاقبہ، اچھا انجام، اور یہ اضافت فی کے معنی میں ہے، ''آخرت میں اچھا انجام انہی کے لئے ہے'' جَنّٰتُ عَدْنٍ: وہ اچھا انجام کیا ہے؟ ہیشگی کے باغات يَّدْخُلُوْنَهَا: ان میں یہ لوگ داخل ہوں گے، وَمَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآئِهِمْ وَاَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ: اور وہ بھی داخل ہوں گے جو صلاحیت والے ہیں ان کے آباء میں سے اور ان کی ازواج میں سے اور ان کی ذریات میں سے۔ ذریات: اہل وعیال۔ ''اولاد میں سے بیویوں میں سے اور آباء میں سے جو صلاحیت والے ہیں جو جنت کے لائق ہیں وہ بھی داخل ہوں گے، وَالْمَلٰٓئِكَةُ يَدْخُلُوْنَ عَلَيْهِمْ مِّنْ كُلِّ بَابٍ: اور فرشتے داخل ہوں گے ان پر ہر دروازے سے یہ کہتے ہوئے سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ: تم پر سلام بسبب تمہارے صبر کرنے کے فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ: یہ فرشتوں کا قول ہوسکتا ہے اور براہِ راست اللہ تعالیٰ کا بھی ہوسکتا ہے، آخرت کا اچھا انجام بہت ہی بہتر ہے، نِعْمَ: کیا ہی اچھا ہے آخرت کا اچھا انجام، وَالَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ: اور وہ لوگ جو اللہ کے عہد کو توڑتے ہیں، مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ: اس کے پختہ کرنے کے بعد، وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ: اور قطع کرتے ہیں اس چیز کو جس کے متعلق اللہ نے حکم دیا ہے کہ اسے ملایا جائے، وَيُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ: اور زمین میں فساد کرتے ہیں، اُولٰٓئِكَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ: یہی لوگ ہیں کہ ان کے لئے لعنت ہے۔ لعنت: اللہ کی رحمت سے دُوری، اللہ کی رحمت سے محرومی، وَلَهُمْ سُوْٓءُ الدَّارِ: اور آخرت کا برا انجام انہی کے لئے ہے، اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ: اللہ کشادہ کرتا ہے رزق جس کے لئے چاہتا ہے، وَيَقْدِرُ: قدر اندازہ کرنے کو کہتے ہیں، یہاں بسط کے مقابلے میں قدر یہ تنگی کے معنی میں ہے، ''اللہ تعالیٰ کشادہ کرتا ہے رزق جس کے لئے چاہتا ہے اور تنگ کرتا ہے'' وَفَرِحُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا: خوش ہوگئے یہ لوگ دنیوی زندگی کے ساتھ، وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا مَتَاعٌ: نہیں ہے دنیوی زندگی آخرت کے مقابلے میں مگر تھوڑا سا سامان، برتنے کی چیز، فائدہ اٹھانے کی چیز، وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ: کافر لوگ کہتے ہیں کیوں نہیں اُتاری گئی اس پر نشانی اس کے ربّ کی طرف سے، قُلْ اِنَّ اللّٰهَ يُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ: آپ کہہ دیجئے کہ اللہ بھٹکاتا ہے جس کو چاہتا ہے، وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ اَنَابَ: اور راستہ دکھاتا ہے اپنی طرف اس شخص کو جو اس کی طرف رجوع کرے۔ اَنَابَ رجوع کرنے کے معنی میں۔ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ: یہ مَنْ اَنَابَ کا بیان ہے، جو لوگ ایمان لاتے ہیں اور ان کے قلوب اللہ کی یاد کے ساتھ سکون حاصل کرتے ہیں، اطمینان حاصل کرتے ہیں، مطمئن ہوتے ہیں اللہ کی یاد کے ساتھ ان کے دل، اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ: خبردار! ''اَلَا'' تنبیہ کے لئے ہے، جب کوئی اہم بات کہی جاتی ہے تو ہم جس طرح سے بات کرتے ہوئے تنبیہ کرنے کے لئے کہہ دیا کرتے ہیں خبردار! توجہ سے سنو، ہوش کرو، کان کھول کر سن لو، اس قسم کے لفظ اہم کلام سے پہلے تنبیہ کے لئے آیا کرتے ہیں، تو یہ اَلَا اسی طرح سے ہے، بِذِكْرِ اللّٰهِ: اللہ کے ذکر کے ساتھ ہی، یہ متعلق ہے تَطْمَئِنُّ کے، اور متعلق اصل کے اعتبار سے فعل سے پیچھے آنا چاہئے، یہاں اس کو مقدم کردیا گیا، تو تقدیمُ مَا حقُّهُ التَّاخيرُ يُفِيْدُ الْحَصْرَ، نحو کے اندر آپ قاعدہ پڑھتے رہتے ہیں، معانی میں پڑھتے رہتے ہیں، کہ جس چیز کا حق یہ تھا کہ اس کو پیچھے لایا جائے اگر اس کو مقدم کردیا جائے تو وہ حصر کا فائدہ دیتا ہے، یہ بات آپ کے سامنے سورۂ فاتحہ میں اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ کے تحت بھی آئی تھی، تو یہاں تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ بِذِكْرِ اللّٰهِ

کی بجائے بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَىِٕنُّ الْقُلُوْبُ یوں آ گیا، اب اس میں حصر کا معنی پیدا ہو گیا، اگر یہ بِذِكْرِ اللّٰهِ مؤخر ہوتا تو معنی یوں ہوتا ''قلوب اللہ کے ذکر کے ساتھ مطمئن ہوتے ہیں'' اس میں صرف یہ بات مذکور ہوتی کہ اللہ کا ذکر اطمینان کا ذریعہ ہے، کسی غیر سے نفی نہ ہوتی کہ اطمینان کسی اور چیز سے بھی حاصل ہو سکتا ہے یا نہیں، اس میں صرف یہ اثبات ہوتا کہ اللہ کے ذکر سے قلوب مطمئن ہوتے ہیں، اور اس کے علاوہ اور کوئی چیز قلوب کو مطمئن کرنے والی ہے یا نہیں اس کا کوئی ذکر نہیں، اور جب بِذِكْرِ اللّٰهِ کو مقدم کر دیا تو اب اس کا معنی یہ ہو گیا کہ ''اللہ کے ذکر کے ساتھ ہی قلوب مطمئن ہوتے ہیں'' یعنی اس کے علاوہ کوئی دوسری چیز نہیں جو قلوب کو اطمینان دلا سکے، قلوب کو اطمینان دلانے والی چیز صرف اللہ کا ذکر ہے، تو اس میں اللہ کے ذکر کو اطمینان کا باعث قرار دیا گیا اور اللہ کے ذکر کے علاوہ باقی جتنی چیزیں ہیں سب سے نفی کر دی گئی کہ وہ اطمینان کا باعث نہیں بن سکتیں، تقدیمُ مَا حقُّهُ التّاخیرُ یُفِیْدُ الحَصْرَ کا یہی مفہوم ہوا، یہاں حصر پیدا ہو گیا، ''خبردار! اللہ کے ذکر کے ساتھ ہی قلوب مطمئن ہوتے ہیں'' اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ: جو لوگ ایمان لاتے ہیں اور نیک عمل کرتے ہیں، طُوْبٰى لَهُمْ وَحُسْنُ مَاٰبٍ: ان کے لئے اچھی حالت ہے۔ طُوْبٰى یہ اطیب کا مؤنث ہے فُعلٰی کے وزن پر، ''ان کے لئے اچھی حالت ہے'' الحالةُ الطُّوْبٰى، ان کے لئے اچھی حالت ہے، اور اچھا ٹھکانا ہے، كَذٰلِكَ اَرْسَلْنٰكَ فِیْۤ اُمَّةٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهَاۤ اُمَمٌ: ایسے ہی بھیجا ہم آپ کو ایک جماعت میں جس سے پہلے بہت ساری جماعتیں گزر چکی ہیں، لِّتَتْلُوَاۡ عَلَیْهِمُ الَّذِیْۤ اَوْحَیْنَاۤ اِلَیْكَ: تاکہ تو پڑھے ان پر وہ چیز جو تیری طرف ہم نے وحی کی، وَهُمْ یَكْفُرُوْنَ بِالرَّحْمٰنِ: اور وہ انکار کرتے ہیں رحمٰن کا، قُلْ هُوَ رَبِّیْ: آپ کہہ دیجئے کہ وہ میرا رب ہے، لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ: کوئی معبود نہیں مگر وہی، عَلَیْهِ تَوَكَّلْتُ: اسی پر میں نے توکل کیا ہے، بھروسا کیا ہے، وَاِلَیْهِ مَتَابِ: متابی۔ باء کے اوپر جو کسرہ ہے یہ یائے متکلم کے اوپر دلالت کرتا ہے، ''اسی کی طرف ہی میرا لوٹنا ہے۔'' تابَ یَتُوْبُ لوٹنے کے معنی میں۔ وَلَوْ اَنَّ قُرْاٰنًا سُیِّرَتْ بِهِ الْجِبَالُ: اور اگر بے شک قرآن، چلائے جاتے اس کے ذریعے سے پہاڑ۔ سُیِّرَتْ: چلا دیے جاتے۔ تَسْیِیْر: چلانا۔ چلا دیے جاتے اس کے ذریعے سے پہاڑ، یعنی اپنی جگہ سے ہٹا دیے جاتے، اَوْ قُطِّعَتْ بِهِ الْاَرْضُ: یا اس کے ذریعے سے زمین قطع کی جاتی، ''زمین قطع کی جاتی'' اس کے مفہوم دو ہو سکتے ہیں، یا تو زمین کو قطع کر کے اس میں سے چشمے جاری ہو جاتے، یا یہ ہے کہ سفر اس کے ذریعے سے جلدی قطع ہوا کرتا، گھنٹوں کا سفر منٹوں میں ہو جاتا، اَوْ كُلِّمَ بِهِ الْمَوْتٰى: یا اس کے ذریعے سے موتی سے کلام کی جاتی، موتی میت کی جمع، ''مردوں کے ساتھ بات کی جاتی'' لَوْ کا جواب محذوف ہے، اگر یہ قرآن ایسا ہوتا لَمَا اٰمَنُوْا، تو بھی یہ لوگ ایمان نہ لاتے، بَلْ لِّلّٰهِ الْاَمْرُ جَمِیْعًا: بلکہ سارے کا سارا امر اللہ ہی کے لئے ہے، یعنی یہ چیزیں بذات خود کسی کو ایمان نہیں دلاتیں، ایمان دینے نہ دینے میں سارا اختیار اللہ کا ہی ہے، اَفَلَمْ یَایْــٴَسِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا: یایئس یہ لفظ یأس سے لیا گیا ہے ناامیدی۔ یَئِسَ یَیْئَسُ: ناامید ہونا، اور یہ لفظ آپ کے سامنے سورۂ یوسف میں بھی گزرا تھا، لَا تَایْــٴَسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ، اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو، مایوسی جو ہے اس میں کسی درجے کے اندر اطمینان بھی ہوتا ہے کہ جس وقت تک کسی چیز کے حاصل ہونے کی امید لگی رہے اس وقت تک دل میں ایک کھٹکا سا لگا رہتا ہے ایک طلب اور جستجو سی جاری رہتی ہے اور ایک پریشانی سی رہتی ہے، اور جب کسی چیز کی طرف سے مایوسی ہو جائے تو ایک درجے میں سکون سا ہو جایا کرتا ہے، وہ تردد اور وہ طلب تڑپ ختم ہو جاتی ہے مایوسی ہو جانے کے بعد، تو اس لئے یہاں یایئس جو ہے یہ سکون اور اطمینان کے معنی میں ہے،

"کیا مومنوں کو اس بات پر سکون اور اطمینان نہیں آتا" اَنْ لَّوْ یَشَآءُ اللّٰهُ لَهَدَى النَّاسَ جَمِيْعًا: کہ اگر اللہ چاہتا تو سب لوگوں کو ہدایت دے دیتا، کیا مومن اس بات کو جان لینے کے بعد مطمئن نہیں ہوتے کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو سب لوگوں کو ہدایت دے دیتا، وَلَا يَزَالُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا: ہمیشہ رہیں گے یہ لوگ جنہوں نے کفر کیا، تُصِيْبُهُمْ بِمَا صَنَعُوْا قَارِعَةٌ: پہنچتی رہے گی ان کو۔ لَا يَزَالُ ! ہمیشہ رہیں گے یہ کافر لوگ کہ پہنچتی رہے گی ان کو قارعہ، مصیبت، بِمَا صَنَعُوْا: بسبب ان کے کردار کے، جو کچھ انہوں نے کیا ہے اس کے سبب سے ان کو مصیبت پہنچتی رہے گی۔ قارعہ: مصیبت۔ قَرَعَ يَقْرَعُ کھٹکھٹانے کو کہتے ہیں، تو ایسا واقعہ جو انسان کے دل میں دھڑکا پیدا کردے اس کو قارعہ سے تعبیر کیا جاتا ہے، اَوْ تَحُلُّ قَرِيْبًا مِّنْ دَارِهِمْ: ان کو پہنچتی رہے گی یا اُترتی رہے گی ان کے گھر کے قریب، حَتّٰى يَاْتِيَ وَعْدُ اللّٰهِ: یہاں تک کہ اللہ کا وعدہ آ جائے، اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ: بے شک اللہ تعالیٰ وعدہ خلافی نہیں کرتا، اِخلاف فی الوعد کا معنی ہوتا ہے کہ جو وعدہ کیا ہے اس کو پورا نہ کیا جائے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

ماقبل سے ربط

پچھلے رکوع کے آخری حصے میں حق اور باطل کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے مثالوں کے ساتھ نمایاں کیا تھا، اور آخری آیت میں اہل حق واہل باطل کا کچھ انجام ذکر کیا تھا لِلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمُ الْحُسْنٰى، اور آگے آیا تھا وَالَّذِيْنَ لَمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَهٗ لَوْ اَنَّ لَهُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا الخ، اس میں اُن کے لئے برے انجام کا ذکر تھا، اِس وقت آپ کے سامنے جو آیات پڑھی گئی ہیں ان میں سے پہلے رکوع میں اہلِ حق اور اہلِ باطل کی صفات کو واضح کیا گیا ہے، اس میں بھی انہی دو فریقوں کا ذکر ہے، فریقین کا ذکر ہے، اور ان کی صفات کو واضح کیا گیا ہے، اور صفات کے ساتھ ساتھ پھر ان کا انجام بھی آ گے آ گیا۔

نصیحت حاصل کون کر سکتا ہے؟

پہلے تو یہ بتایا گیا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو کچھ آپ کے پاس اتارا جا رہا ہے، جن لوگوں نے جان لیا کہ یہ حق ہے وہ تو اس طرح سے ہیں جن کی آنکھیں کھل گئیں، حقیقت ان کو نظر آ گئی، وہ تو بینا ہیں، اس لیے جو کچھ اللہ کی طرف سے اترتا ہے ان کا دل قبول کرتا چلا جا رہا ہے، گویا کہ وہ ان کی اپنی دل کی باتیں ہیں، ان کی فطرت کا تقاضا ہے، جس طرح سے راہنمائی ہوتی چلی جا رہی ہے وہ سمجھتے ہیں کہ ایسے ہی ہونا چاہیے، دل اس طرح سے خوشی کے ساتھ ان کو قبول کرتے چلے جاتے ہیں، جیسے آنکھ کھل جانے کے بعد انسان کے سامنے راستہ نمایاں ہوتا چلا جاتا ہے وہ بھی اسی طرح سے کتاب سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اور جنہوں نے یہ علم حاصل نہیں کیا اور وہ اس اترنے والی چیز کو حق نہیں سمجھتے وہ اندھوں کی طرح ہیں، تو اندھے کے سامنے ہزار چراغ جلاتے چلے جاؤ، اس کے سامنے اندھیرے کا اندھیرا ہی رہتا ہے، تو یہ دونوں فریق کسی طرح سے بھی برابر نہیں ہو سکتے، جیسے یہاں رہتے ہوئے دونوں کا

حال برابر نہیں ہے انجام کے اعتبار سے بھی برابر نہیں ہے۔ اَلباب لُبّ کی جمع ہے خالص عقل والے، ''خالص عقل والے ہی نصیحت حاصل کرتے ہیں'' جن کی عقل شہوات سے مغلوب نہ ہو، جو اغراض کے بندے نہ ہوں، لالچ اور حرص کے مارے ہوئے نہ ہوں، اس قسم کے لوگ ہیں جو نصیحت حاصل کرتے ہیں، ''لُبّ'' ایسی خالص عقل کو کہتے ہیں جو جذبات سے مغلوب نہ ہو، نصیحت حاصل کرنا انہی کا کام ہے جو جذبات سے خالی ہو کر، اپنے ماحول سے آزاد ہو کر، مختلف قسم کی بندشیں جو انسان کے ذہن کے اوپر چڑھی ہوئی ہوتی ہیں ان کو اُتار کر، (مثلاً) تقلیدِ آباء ہے، اپنے ماحول کی پابندی ہے، دوست احباب کے حلقے ہیں، اپنے دُنیوی مفادات ہیں، ان چیزوں سے آزاد ہو کر جو سوچتے ہیں وہی لوگ نصیحت حاصل کر سکتے ہیں، ورنہ اگر عقل جذبات سے مغلوب ہو، اور انسان اپنے مفاد کے تحت سوچے تو کبھی صحیح نتیجے پر نہیں پہنچ سکتا۔

اہلِ حق کی صفات: عہد کی پاسداری

تو عقل والے جو نصیحت حاصل کرتے ہیں ان کی یہ صفات ہیں جو آگے اللہ تبارک وتعالیٰ نے ذکر کیں، ''اللہ کے ساتھ جو انہوں نے عہد کیا اس کو پورا کرتے ہیں'' اس عہد سے وہ عہدِ فطرت بھی مراد ہے جو آدم کو پیدا کرنے کے بعد آدم کی اولاد کو موجود کر کے اللہ تعالیٰ نے لیا تھا اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۖ قَالُوْا بَلٰى سورۂ اَعراف (آیت: ۱۷۲) کے اندر اس کی تفصیل آپ کے سامنے آئی تھی، اُس عہد کی پابندی کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے علاوہ کسی دوسرے کو رَبّ نہ سمجھا جائے، اپنی ضروریات کا پورا کرنے والا نہ سمجھا جائے، اس عہد کو وفا کرتے ہیں۔ ''اور عہد کو پختہ کرنے بعد توڑتے نہیں'' اور عہدُ اللہ کے تحت اللہ تعالیٰ کے تمام احکامات آجاتے ہیں، کیونکہ جس وقت ایک شخص ایمان قبول کرتا ہے، ''لا اِلٰہ اِلَّا اللہ محمد رسول اللہ'' کہتا ہے، تو یہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایک عہد ہے کہ میں اللہ کے علاوہ کسی کو معبود نہیں سمجھتا، عبادت اسی کی کروں گا، کسی اور کی نہیں کروں گا، اور اللہ تعالیٰ کی عبادت کے طریقے اللہ کے رسول سے سیکھوں گا، کلمے کا حاصل بھی ایک عہد ہے۔ اپنے درمیان اور اللہ کے درمیان محمد ﷺ کو واسطہ مان لیا گیا، کہ اللہ تعالیٰ کے متعلق وہ جو کچھ کہیں گے میں اسی کو ہی حق سمجھوں گا، اسی کے مطابق چلوں گا۔ تو اس عہد کے بعد وہ اس عہد کی پابندی کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ کے اَحکام جو اللہ کے رسول کی وساطت سے ملتے ہیں ان کے اوپر وہ عمل کرتے ہیں، اللہ کے ساتھ ان کا معاملہ صحیح ہے۔

صلۂ رحمی

دوسری بات!، کہ ''جس چیز کے متعلق اللہ نے حکم دیا کہ اس کو ملا کے رکھا جائے اس کو ملاتے ہیں'' اس کا اعلیٰ مصداق ہے صلہ رحمی، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جس قسم کے اَحکام ہمیں دیے ہیں وہ اپنی عبادت اور اطاعت بھی ہے اور اسی طرح سے مخلوقِ خدا کی خدمت اور ان کے ساتھ اپنے حالات کو ٹھیک رکھنا، خصوصیت کے ساتھ جن سے قربت اور رشتہ داری ہے، جتنا جتنا کسی کے ساتھ قرب ہوتا جائے گا، رشتہ داری ہوتی جائے گی، اتنا اتنا اس کے ساتھ صلہ کرنا جو ہے یہ بھی اللہ کی طرف سے حکم ہے، تو جس کو ملا کے رکھنے کا اللہ نے حکم دیا ہے وہ اس کو ملا کے رکھتے ہیں، جس چیز کے ساتھ صلہ کرنے کا اللہ نے حکم دیا ہے اس کے ساتھ صلہ کرتے

ہیں، صلہ رحم، رشتہ داروں کے ساتھ مل کے رہنا، ان کے حقوق کو ادا کرنا، ان کی غمی خوشی کے اندر شریک ہونا، موقع بموقع ان کے ساتھ تعاون کرنا، یہ ساری چیزیں صلہ رحمی میں داخل ہیں، حدیث شریف کے اندر اس کی بہت زیادہ تفصیل موجود ہے۔

خشیتِ خداوندی

وَيَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ: اور اپنے رَبّ سے خشیت رکھتے ہیں، یعنی اپنے رَبّ کی عظمت محسوس کرتے ہوئے اس سے ڈرتے ہیں، رَبّ سے ڈرنا اس طرح سے نہیں جس طرح سے انسان کسی موذی چیز سے یا کسی دشمن سے ڈرتا ہے، یہ رَبّ سے ڈرنا ایسے ہی ہوتا ہے جیسے اولاد اپنے ماں باپ سے ڈرتی ہے، شاگرد اپنے اُستاذ سے ڈرتا ہے، مرید اپنے شیخ سے ڈرتا ہے، یہ ڈرنا ہوتا ہے عظمت کی بنا پر کہ کہیں یہ ناراض نہ ہوجائے، بس یہ خوف دماغ پر مسلط ہوتا ہے، ''اور بُرے حساب کا اندیشہ رکھتے ہیں۔''

صبر و مستقل مزاجی

وَالَّذِيْنَ صَبَرُوا: اور یہ وہ لوگ ہیں جو کہ مستقل مزاج ہیں، صبر کا معنی آپ کی خدمت میں کئی دفعہ عرض کیا۔ صبر کا اصل مطلب یہ ہوا کرتا ہے کہ نفس کی خواہشات کے خلاف نفس کو پابند رکھا جائے، اللہ تعالیٰ کے احکام پر مستقل رہنا اور مختلف حالات کے تحت ڈگمگا نہ جانا یہ صبر کا مفہوم ہے، اس کو آپ اِستقامت کے ساتھ ادا کر سکتے ہیں، مصیبت کے وقت میں صبر کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ انسان گھبرا نہ جائے، اپنے آپ سے باہر نہ ہوجائے، ہوش وحواس نہ کھو بیٹھے، شکوہ شکایت نہ کرے، بلکہ اس کو برداشت کرے۔ کوئی نیکی کا حکم آ گیا تو جی چاہتا ہے کہ نہ کیا جائے تو وہاں اپنے نفس کو پابند رکھا جائے، خواہشات کے پیچھے آزاد نہ چھوڑ دیا جائے۔ گناہوں سے رکنے کے لئے نفس کو پابند رکھا جائے، نفس یہ چاہتا ہے کہ مجھے کرنے کی چھٹی ملے، لیکن اس کو پابند رکھا جائے، صبر میں یہ سب کچھ داخل ہے۔ اور پھر ان کا یہ صبر اپنے رَبّ کی رضا چاہنے کے لئے ہے، تو رَبّ کی رضا چاہنے کے لئے جو صبر ہوا کرتا ہے وہ آپ جانتے ہیں کہ اِبتدا سے ہی ہوجاتا ہے، جب ایک مصیبت آ گئی، خلاف مزاج واقعہ پیش آ گیا تو آپ اللہ کی رضا چاہنے کے لئے صبر کریں، یہ ہے فضیلت، ورنہ رودھو کے شور مچا کے گلا پھاڑ کے کپڑے پھاڑ کے آخر تھک ہار کے صبر تو سارے ہی کر لیتے ہیں، وہ جو صبر ایک غیر اختیاری سا صبر ہے وہ باعث فضیلت نہیں، اللہ کی رضا چاہنے کے لئے صبر کیا جائے، اور یہ صبر وہی ہے جو صدمہ اولیٰ کے وقت ہو، جب صدمہ پہنچا اسی وقت انسان اپنے آپ کو سنبھال لے، اِبتدا کے اندر اپنے آپ کو سنبھال لینا یہ اعلیٰ درجے کا صبر ہے۔

اِقامتِ صلوٰۃ اور اِنفاق فی سبیل اللہ

''نماز کو قائم کرتے ہیں، اور جو کچھ ہم نے دیا اس میں سے خرچ کرتے ہیں سراً بھی علانیۃً بھی، ظاہری طور پر بھی، خفیہ طور پر بھی'' اب جہاں بھی اِنفاق کا حکم آتا ہے وہاں اکثر وبیشتر لفظ آیا کرتے ہیں مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ، جو کچھ ہم نے دیا اس میں سے خرچ کرتے ہیں، یعنی انسان کے ذہن میں یہ بات ڈال دی گئی کہ تمہیں جس چیز کو خرچ کرنے کے لئے کہا جارہا ہے، یہ کوئی تم ماں کے بطن سے

نہیں لے کے آئے تھے، یہ تمہاری اپنی کوئی گھر کی چیز نہیں ہے، وہ ہمارا ہی دیا ہوا ہے، اس بات کو جو شخص اپنے ذہن کے اندر رکھے کہ میرے پاس جو کچھ ہے سب کچھ اللہ کا ہی دیا ہوا ہے، پھر اس میں اگر کچھ خرچ کرنے کا حکم دیا جائے تو انسان کو گراں نہیں گزرتا، خرچ کے آسان کرنے کے لئے یہ لفظ آپ کے سامنے آتا ہے۔ اگر آپ نے میرے پاس پیسے رکھے ہوئے ہیں بطور امانت کے، اور آپ کہتے ہیں کہ اس میں سے پانچ روپے فلاں کو دے دو، تو اگر میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ پیسے آپ کے ہی ہیں تو پھر آپ کے کہنے سے پانچ روپے دینے میں مجھے کیا تکلیف ہے، اور اگر میں سمجھتا ہوں کہ یہ پیسے میرے ہیں، پھر آپ کہیں کے اس میں سے پانچ روپے دے دو تو پھر میں سوچوں گا کہ میں اپنی چیز دوسرے کو کیوں دوں۔ تو یہاں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جو کچھ تمہارے پاس ہے وہ دیا ہوا ہمارا ہی ہے، اُس میں سے تمہیں خرچ کرنے کا حکم دیا ہے کہ فلاں جگہ اتنا دے دو، فلاں جگہ اتنا دے دو، اپنے اہل وعیال پہ خرچ کرلو، اتنا اپنی ذات پہ خرچ کرلو، اتنا کاروبار میں لگا دو، ہدایات وہی دیتا ہے، تو جب دیا ہوا اسی کا ہے تو اس کی دی ہوئی ہدایات کی پابندی انسان کے اوپر گراں نہیں ہونی چاہیے، ''وہ اللہ کے دیے ہوئے میں سے خرچ کرتے ہیں'' اگر پوشیدہ طور پر خرچ کرنے کی ضرورت ہو تو پوشیدہ طور پر خرچ کرتے ہیں، کہیں مصلحت یہ ہوتی ہے کہ کسی کے سامنے ظاہر نہ کیا جائے، اور اگر علی الاعلان خرچ کرنے میں مصلحت ہے تو علی الاعلان خرچ کرتے ہیں، دونوں طرح ضرورتیں پیش آتی رہتی ہیں، بلکہ جو فرض صدقات ہیں، زکوٰۃ وغیرہ ان کو تو علی الاعلان ہی صَرف کرنا چاہیے تا کہ کسی دوسرے کو یہ اِتہام کا موقع نہ ملے کہ یہ زکوٰۃ ادا نہیں کرتے، اور نفلی صدقات اکثر وبیشتر سرًّا ہونے چاہئیں، اور اگر سرًّا دینے کے ساتھ فائدہ زیادہ محسوس ہوتا ہے کہ جس کو ہم دینا چاہتے ہیں اگر ہم اس کو علی الاعلان دیں گے تو وہ بیچارہ ذلت محسوس کرے گا شرمسار ہو جائے گا تو وہاں سرًّا دینا افضل ہے، اور اگر علی الاعلان دینے میں یہ فائدہ محسوس ہو کہ لوگ دیکھیں گے، دیکھنے کے بعد ان کو بھی اسی طرح سے دینے کی عادت پڑے گی، وہ بھی میری نقل اُتاریں گے، اس طرح سے دوسرے آدمی کو فائدہ پہنچ سکتا ہے کہ میں پانچ روپے دوں گا تو دوسرا بھی دیکھ کے پانچ دس روپے دے دے گا، تو اس وقت میں علی الاعلان دے دینا بہتر ہوتا ہے، یہ موقع محل کی بات ہے، نہ سرًّا ضروری نہ علی الاعلان ضروری، اسی طرح سے نہ سرًّا نا جائز نہ علانیۃً ناجائز، موقع محل کے مطابق اس میں فضیلت پیدا ہو جاتی ہے، کبھی ظاہر کرکے دینے میں فضیلت ہوتی ہے، کبھی مخفی کر کے دینے میں فضیلت ہوتی ہے۔

اچھائی کے ساتھ بُرائی کو دفع کرنا

وَيَدْرَءُونَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ: یہ ایک اور صفت آگئی کہ اچھائی کے ساتھ برائی کو دفع کرتے ہیں، اس کا معنی پہلے بھی آپ کے خدمت میں عرض کیا تھا کہ اگر ان سے خود کوئی برائی ہو جاتی ہے کوئی گناہ ہو جاتا ہے تو نیکی کے ساتھ اس کی تلافی کرتے ہیں، اگر کسی کے ساتھ برا برتاؤ ہو گیا تو بعد میں اس کے ساتھ اچھا برتاؤ کر کے اس کا ازالہ کر دیتے ہیں، یا کوئی ان کے ساتھ بُرائی کرتا ہے تو بُرائی کا بدلہ بُرائی کے ساتھ نہیں دیتے بلکہ اچھائی کے ساتھ اس کو دفع کرتے ہیں، ''دفع کرتے ہیں اچھائی کے ساتھ بُرائی کو'' یعنی کوئی شخص ان کے ساتھ بُرا کرتا ہے تو وہ آگے سے اچھائی کرتے ہیں، یہ اعلیٰ درجہ کے عقل مندوں کی صفتیں ہیں جو اللہ تعالیٰ شمار

کررہے ہیں، اس قسم کی صفتیں پائی جائیں تو انسان عقل مند ہوتا ہے، یہ جو آجکل کا فلسفہ ہے کہ اینٹ کا جواب پتھر، یہ کوئی عقل کا تقاضا نہیں، کہتے ہیں کسی نے اینٹ ماری تو تم پتھر مارو، تب جا کے حالات ٹھیک رہیں گے، نہیں! قرآنِ کریم بار بار یہی تلقین کرتا ہے کہ بُرائی کو اچھائی کے ساتھ دفع کرو، اگر تمہارے ساتھ کوئی بُرا کرتا ہے تو مقابلے میں اس کے ساتھ احسان کرو، اچھائی کرو گے تو نقصان نہیں ہوگا، اور جو فائدہ آپ حاصل کرنا چاہتے ہیں وہ ہو جائے گا، جس طرح سے قرآنِ کریم میں دوسری جگہ بھی ہے اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَكَ وَبَیْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ (سورۃ حم سجدہ: ۳۴) کہ تیرے اور جس کے درمیان میں عداوت ہے اگر تم اس کی برائی کو اچھائی کے ساتھ دفع کرو گے تو ایسا ہو جائے گا گویا کہ گرم جوش دوست ہے، لیکن اس میں وہی بات ہے کہ مقابل کی سلامتِ طبع شرط ہے کہ جس کے ساتھ آپ یہ معاملہ کرنا چاہتے ہیں اس میں بھی کچھ سلامتی ہو شرافت ہو پھر تو واقعی وہ بُرائی کے مقابلے میں احسان کرنے سے متاثر ہوتا ہے، اور اگر مدِ مقابل نے قسم ہی کھا رکھی ہے پریشان کرنے کی، چاہے آپ اس پر احسان کریں چاہے کچھ کریں، اس کی فطرت ہی گندی ہے، وہ جانتا ہی نہیں کہ احسان کیا ہوتا ہے اور اچھائی کیا ہوتی ہے، تو ایسے بارے میں اللہ تعالیٰ نے جو جہاد مشروع کیا ہے وہ اسی لیے کیا ہے، کہ پھر اس کا علاج نعل دار جوتے سے کرو، وہ روشن دماغ پھر ساتھ ہونا چاہیے، جو احسان کے ساتھ متاثر نہ ہوں تو پھر ان کے لئے اَنْزَلْنَا الْحَدِیْدَ بھی ساتھ ہے، اللہ تعالیٰ نے لوہا اس لیے اُتارا ہے کہ اس قسم کے لوگوں کا دماغ پھر اس سے ٹھیک کیا جا۔ اکثر و بیشتر ایسے ہی ہوتا ہے کہ اگر بُرائی کے مقابلے میں آپ اچھائی کریں گے، ایک آدمی نے آپ کو غصے کے ساتھ گالی دی، آپ آگے مسکرا کے اس کے ساتھ بات کریں گے تو اس کا جوش ٹھنڈا ہو جائے گا، اس میں پھر زیادہ نقصان واقع نہیں ہوا کرتا۔

گزشتہ صفات سے متصف لوگوں کا انجامِ خیر

اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ: جن کے اندر یہ صفتیں پائی جاتی ہیں کہ اللہ کے عہد کی پابندی کرتے ہیں، صلہ رحمی کرتے ہیں، ہر وقت اپنے رَبّ سے ڈرتے ہیں، بُرے حساب کا خوف ان کے اوپر ہر وقت مسلط رہتا ہے، اللہ کی رضا چاہنے کے لئے صبر واستقامت اختیار کرتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، اللہ کے دیے ہوئے مال میں سے سرًّا اور علانیۃً خرچ کرتے ہیں، بُرائی کے جواب میں بُرائی نہیں کرتے اچھائی کرتے ہیں، اچھائی کے ذریعے سے بُرائی کو دفع کرتے ہیں، یہی لوگ ہیں جن کو آخرت میں اچھا انجام ملے گا۔ وہ اچھا انجام کیا ہے؟ ہیشگی کے باغات ہیں، داخل ہوں گے ان میں۔

اور یہ آگے اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے ایک اور اکرام ہے کہ یہ خود بھی جائیں گے اور ان کے آباء ازواج ذُریات وہ بھی جائیں گی، اس کی تفصیل آپ کے سامنے سورۂ طور میں آئے گی، جس کا حاصل یہ ہے کہ نیک آدمی کے متعلقین اگر اس درجے میں نہیں بھی ہوں گے جس درجے میں وہ خود نیک آدمی ہے تو اللہ تعالیٰ اس نیک آدمی کے اعزاز اور اکرام کے طور پر اس کے متعلقین کو ترقی دے کے اس کے درجے میں پہنچا دیں گے، تو متعلقین کا ایک درجے میں اکٹھے ہو جانا یہ بھی جنت کی نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے، اور اس موقع پر جا کے نسب اور نسبت کام آئے گی، نسب بھی کام آئے گی، نسبت بھی کام آئے گا، نسب تو جیسے باپ بیٹے کا تعلق

ہے، اور نسبت جیسے استاذی شاگردی ہے، پیری مریدی ہے، اور اسی طرح سے آپس میں دوستی اور محبت ہے، اس قسم کی نسبتیں بھی کام آئیں گی، ان کی ذریعے سے بھی ترقیِ درجات ہوگی، لیکن اِن کو ترقی دے کے اُن کے درجے میں تبھی پہنچایا جائے گا کہ ان میں جنت جانے کی صلاحیت ہو یعنی ایمان ہو، اور اگر کسی کے پاس ایمان ہی نہیں ہے تو پھر چاہے وہ نبی کا بیٹا ہو یا نبی کا باپ ہو، اور کتنے ہی بڑے ولی کی بیوی ہو، اگر اس کے پاس ایمان نہیں ہے تو پھر آخرت میں جا کے کوئی کسی قسم کی ترقی نہیں ہوگی اور جنت میں داخلہ نہیں ملے گا، تو مَنْ صَلَحَ میں صلاحیت کی قید لگا دی گئی۔ اور یہ اس قسم کے عقل مندوں کے لئے جن میں یہ صفات پائی جاتی ہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک مزید اکرام ہے کہ جہاں یہ جائیں گے وہاں یہ ان کے متعلقین بھی داخل ہو جائیں گے۔ اور پھر فرشتے ان پر ہر طرف سے، ہر دروازے سے آئیں گے، اور آ کر کہیں گے سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ، اِدھر سے آئیں گے اور کہیں گے جو تم نیکیاں کرتے رہے اس کی بنا پر تم پہ سلامتی ہو۔ اور فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ یہ اُن فرشتوں کا قول بھی ہو سکتا ہے اور براہِ راست اللہ کا قول بھی ہو سکتا ہے، کہ آخرت میں جو تمہیں اچھا انجام ملا ہے یہ بہت ہی بہتر چیز ہے، ''سو خوب ملا آخرت کا اچھا انجام۔''

ماؤف العقل لوگوں کی صفات اور ان کا انجامِ بد

اب مقابلے میں دوسرے لوگ آ گئے جو عقل مند نہیں ہیں، جنہوں نے اپنی عقلوں کو ماؤف کر رکھا ہے، اغراض کے پیچھے چلتے ہیں، شہوات سے مغلوب ہیں، تو یہ بے عقل لوگ مقابلے میں آ گئے ''جو اللہ کے عہد کو توڑتے ہیں اس کے پختہ کرنے کے بعد'' اسی تفصیل کے تحت جو اوپر آپ کے سامنے ذکر کر دی گئی، ''صلہ رحمی نہیں کرتے، قطع رحمی کرتے ہیں'' بھائیوں کے حقوق نہیں پہچانتے، بہنوں کے حقوق نہیں پہچانتے، ماں باپ کی خدمت نہیں کرتے، ان کے ساتھ احسان کا معاملہ نہیں ہے، اسی طرح دیگر رشتہ دار، ان کی غمی خوشی میں شریک نہیں، ان کے ساتھ کوئی تعاون کا معاملہ نہیں، یہ سب قطع رحمی کے اندر داخل ہیں، ''اور زمین میں فساد کرتے ہیں'' اور فساد ان دونوں باتوں کا لازمی نتیجہ ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور بندوں کے حقوق کی ادائیگی یہ دو چیزیں ہیں جو زمین میں امن قائم کرتی ہیں، اور اللہ کے احکام کی پابندی نہ کی جائے اور بندوں کے حقوق ادا نہ کیے جائیں تو فساد ہی فساد ہے، تو پہلی صورت زمین میں اصلاح کی ہے کہ اللہ کے احکام کی بھی پابند کرو اور اپنے متعلقین کے حقوق بھی ادا کرو، ہر شخص اپنے متعلقین کے حقوق کو اگر ادا کرتا چلا جائے تو ایسی صورت میں پھر اصلاح ہی اصلاح ہوتی ہے، اور جہاں دوسروں کے حقوق تلف کرنے شروع کر دیے جائیں اور اللہ کے احکام کی رعایت نہ رکھی جائے تو ایسی صورت میں فساد ہی فساد ہے، تو جو اللہ کے حقوق نہیں ادا کرتے اور صلہ رحمی نہیں کرتے قطع رحمی کرتے ہیں اُولٰٓئِكَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ: یہ ملعون ہیں، ان کے اوپر اللہ کی لعنت ہے، یہ اللہ کی رحمت سے محروم ہیں، ''اور آخرت میں برا انجام ان کے لئے ہوگا۔''

دُنیا میں مالی وسعت عند اللہ مقبول و مردود ہونے کی علامت نہیں

باقی اگر کوئی کہے کہ یہ جو اللہ کے عہد کو توڑتے ہیں، قطع رحمی کرتے ہیں، فسادی ہیں، دنیا کے اندر تو یہ بڑے خوش حال

ہیں، بڑا رزق ان کو حاصل ہے، بڑی کوٹھیاں ہیں، کاریں ہیں، ہر طرح سے خوش حال نظر آتے ہیں، اچھا کھاتے ہیں، اچھا پہنتے ہیں، چنانچہ کافر لوگ انہی چیزوں کو اپنے حق پر ہونے کی دلیل کے طور پر بیان کیا کرتے تھے، کہ جب ہم دنیا میں اتنے خوش حال ہیں، ہمیں اللہ نے اتنا رزق دے رکھا ہے، اور تم جو کہتے ہو کہ ہم اللہ کے پیارے ہیں، جوتیاں چٹخاتے پھرتے ہو، نہ کوئی کام کی روٹی ملے، نہ کپڑا ملے، نہ رہنے کی جگہ، تو دنیا کے اندر جو ان کو راحت اور آرام حاصل ہے اس کو وہ دلیل بناتے تھے کہ تم اللہ کے مقبول نہیں، ہم اللہ کے مقبول ہیں۔ تو یہاں ان ملعونوں کے اس نظریے کو رد کیا جا رہا ہے کہ دنیا کے اندر کسی کے پاس رزق کا زیادہ آجانا، پیسوں کا زیادہ حاصل ہو جانا یہ اللہ کے ہاں مرحوم ہونے کی علامت نہیں، بلکہ یہ تو اللہ کی اپنی تقسیم ہے کسی حکمت کے تحت، کہ جس کو چاہے زیادہ دے دے جس کو چاہے کم دے دے، دنیا کے اندر رزق کی وسعت اور رزق کی تنگی اللہ کے نزدیک مرحوم یا ملعون ہونے کا معیار نہیں ہے، بسا اوقات دنیا میں اللہ تعالیٰ ملعونوں کو زیادہ دیتا ہے، چنانچہ یہ بیچارے مزدور صبح سے لے کر شام تک ٹوکریاں اٹھانے والے، اور سارا دن کھیتوں کے اندر کام کرنے والے، جو خون پسینہ ایک کر دیتے ہیں، ان کے گھروں میں آپ کو وہ خوش حالی کہاں نظر آتی ہے جو جو سود خوروں کے گھروں میں ہے، جو رشوت لینے والوں کے گھروں میں ہے، تو یہ سود کھانا اور رشوت لینا یہ کوئی اچھا کام ہے جس کی بنا پر رزق کی خوش حالی حاصل ہو رہی ہے؟ اس سے بھی آگے چلیے، چور ایک ہی رات میں بغیر کسی محنت کے ہزاروں روپے اکھٹے کر لیتا ہے، جیب تراش صبح نکلتا ہے شام تک ہزاروں روپے اپنے گھر میں جمع کر لیتا ہے، لوگ ڈاکا مارتے ہیں ایک ہی دن میں بینک کو لوٹ کے لے جاتے ہیں، کروڑوں کے مالک بن جاتے ہیں، اور وہ خوش ہوں کہ دیکھو! جب اللہ نے ہمیں اتنے پیسے دے دیے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا طریقہ ہی اچھا ہے، جس کو آج دنیا کے اندر کوئی شخص جس کے بھیجے کے اندر تھوڑی سی بھی عقل ہے وہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ طریقے اچھے ہیں، کوئی شخص جس کی عقل وہوش قائم ہیں وہ ان جرائم کی کبھی حوصلہ افزائی نہیں کر سکتا، لیکن اگر وہ مجرم یہ کہیں کہ ہم تم سے اچھا کھاتے ہیں، اچھا پہنتے ہیں، اچھی جگہ رہتے ہیں، جتنی خوش حالی ہمیں ہے اتنی تو کسی کو بھی نہیں، تم مہینہ بھر رگڑے کھا کے مہینے کے آخر میں جا کے تمہیں اتنی تنخواہ ملتی ہے، ہم صبح نکلتے ہیں اور کسی کی جیب کاٹ لیتے ہیں، شام تک اس سے چار گنا زیادہ پیسے ہمیں حاصل ہو جاتے ہیں، تو ان کی باتیں سن کے تمہارے دل میں یہ خیال آئے گا؟ کہ ہمیں بھی یہی طریقہ اپنا لینا چاہیے، واقعی معلوم ہوتا ہے کہ یہ بہت ہی خوش حالی کا طریقہ ہے، اس میں تو بڑے پیسے حاصل ہوتے ہیں، لیکن عقل وہوش والا انسان کبھی اس مجرمانہ زندگی کی تعریف نہیں کر سکتا، چاہے اس میں گھنٹوں میں لاکھوں روپے انسان کما لیتا ہو، اس کے مقابلے میں محنت مزدوری کی زندگی زیادہ بہتر ہے، پیسے کنجروں کے پاس بھی زیادہ ہو سکتے ہیں، لُچوں کے پاس بھی زیادہ ہو سکتے ہیں، اور ایک شریف آدمی غربت اور مسکنت کے ساتھ اپنا وقت گزار سکتا ہے، تو رزق کی وسعت اور رزق کی تنگی یہ بالکل اس بات کی علامت نہیں کہ کون اللہ کا مقبول ہے کون اللہ کا مردود ہے، یہ اللہ تعالیٰ کی تقسیم اپنی حکمت کے تحت ہے۔ اگر ایک شخص دلیل کے تحت کمینہ ہے تو مال کی وسعت اس کو شریف نہیں ثابت کر سکتی، جس طرح سے ہمارا شیخ (سعدیؒ) کہتا ہے کہ:

”خر از جُلِ اطلس بپوشد خر است“[1]

---

(۱) بوستاں، باب چہارم، بعنوان حکایت دانشمند۔

اب گدھے کو اگر ریشم کا جھول پہنا دو تو وہ کوئی انسان تو نہیں بن جائے گا، گدھا ریشم کا جُل پہن کر بھی گدھے کا گدھا ہی رہتا ہے۔ اسی طرح سے اگر صفات تو یہ ہیں جو ملعونوں کی نقل کی گئی ہیں اور اللہ تعالیٰ کے ہاں وہ مردود ہے، دلیل کے ساتھ آپ جانتے ہیں کہ یہ شخص اچھا نہیں، تو اس کے اچھے لباس کو دیکھ کے، اس کی کارکوٹھی دیکھ کے یا اس کے پاس پیسوں کی وسعت دیکھ کے یہ خیال کرنا کہ یہ بڑا نیک بخت ہے، یہ تو بے عقلی کی بات ہے، عقل مندی کی بات نہیں ہے، انسان کو چاہیے کہ کردار وہ اختیار کرے جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک محبوب ہے، دنیا کے اندر اصلاح کا باعث ہے، امن اور سکون کا باعث ہے، پیسوں کی وسعت اور پیسوں کی کمی بیشی تو ہوتی رہتی ہے۔ تو یہ ملعون اپنے اچھے ہونے کے لئے جو استدلال اس بات سے کرتے ہیں کہ ہمارے پاس رزق بہت ہے، اُس کی یہاں تردید کی جا رہی ہے کہ ''اللہ کشادہ کرتا ہے رزق جس کے لئے چاہتا ہے اور تنگ کرتا ہے، یہ لوگ دنیوی زندگی پہ خوش ہیں، اور نہیں ہے دنیوی زندگی آخرت کے مقابلے میں مگر تھوڑا سا سامان''، جب آخرت کی نعمتیں ملیں گی تو اس کے مقابلے میں دُنیوی زندگی کا سامان ایسے معلوم ہوگا جیسے سمندر کے مقابلے قطرہ، بلکہ اس سے بھی کم۔

اِطمینان حاصل کرنے کا راستہ

''اور یہ کافر لوگ کہتے ہیں کہ اس کے اوپر کوئی نشانی کیوں نہیں اتاری جاتی'' جیسے پہلے رکوع کے آخر میں بھی آیا تھا، ''تو آپ ان کو کہہ دیجیے کہ معلوم یوں ہی ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے بھٹکا دیتا ہے، اور جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے، ہدایت اس کو دیتا ہے جو اس کی طرف رجوع کرے'' یعنی اتنی نشانیاں واضح ہو جانے کے بعد اور اس قسم کی معجز کلام کے سامنے آجانے کے بعد پھر بھی وہی مرغی کی ایک ٹانگ، کہ جیسی ہم کہتے ہیں ویسی نشانیاں کیوں نہیں سامنے نہیں آتیں، تو معلوم یوں ہی ہوتا ہے کہ تمہاری قسمت میں ہی ہدایت نہیں ہے، تمہاری قسمت میں ضلالت ہے، اللہ تعالیٰ نے تمہیں اس سے محروم کر رکھا ہے، اور جو اللہ کی طرف رجوع کرتے ہیں اللہ تعالیٰ انہیں سیدھا راستہ دکھا دیتا ہے۔ ''وہ ایمان لے آتے ہیں اور اللہ کے ذکر سے ہی ان کے قلوب مطمئن ہوتے ہیں'' یعنی وہ اس قسم کے معجزے نہیں مانگتے، کرشمے نہیں مانگتے، کہ ہمیں فلاں کرتب دکھاؤ تو ہم مانیں گے، وہ اللہ کی ذات کو سوچتے ہیں، اللہ کی صفات میں غور کرتے ہیں، اس کے علم و حکمت اور اس کی قدرت کے نمونے دیکھتے ہیں، جتنا وہ اللہ کو یاد کرتے جاتے ہیں اتنا ہی ان کو اطمینان زیادہ ہوتا چلا جاتا ہے کہ واقعی یہ راستہ صحیح راستہ ہے۔ تو دلوں کو اطمینان اگر آ سکتا ہے تو اسی طرح سے اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات سے تعلق قائم کرنے کے ساتھ آ سکتا ہے، ورنہ مشرک کافر تو میں جتنی تھیں انہوں نے انبیاء ﷺ کے ہزاروں معجزے دیکھے لیکن انہیں کبھی قلبی اطمینان نہیں ہوا، اور جنہوں نے اپنے دل کا رخ سیدھا کر کے اللہ کی ذات سے لگا لیا، اس کی صفات پہ غور کرنا شروع کر دیا، اللہ تعالیٰ کے جتنے تصرفات دنیا کے اندر چلتے ہیں ان میں غور کرنے لگ گئے، اطمینان حاصل کرنے کا یہ راستہ ہے۔ تو اس سے پھر عموم الفاظ کے ساتھ یہ بات نکل آتی ہے کہ دنیا کا ساز و سامان بھی انسان کے قلب کو سکون اور اطمینان نہیں دلا سکتا جتنا اطمینان اللہ کے ذکر کے ساتھ ہوتا ہے، دل کی اصل خوراک اللہ کی یاد ہے، جو لوگ اللہ کو یاد نہیں کرتے یعنی اللہ کے ساتھ ان کا ربط صحیح نہیں، اللہ تعالیٰ کے متعلق ان کی عقیدت صحیح نہیں، ان کا عقیدہ صحیح نہیں، ان کو دل کی صحیح غذا حاصل نہیں،

دل کی صحیح غذا سوائے اللہ کے یاد کے کوئی چیز نہیں ہے، جس وقت تک دل کو صحیح غذا نہیں دی جائے گی اس وقت تک دل کبھی مطمئن نہیں ہوسکتا۔'' جو ایمان لاتے ہیں نیک عمل کرتے ہیں ان کے لئے اچھی حالت ہے اور اچھا ٹھکانا ہے۔'' كَذٰلِكَ اَرْسَلْنٰكَ فِیْۤ اُمَّةٍ ہم نے آپ کو ایک ایسی جماعت میں بھیجا جس سے پہلے بہت ساری جماعتیں گزر چکی ہیں، بہت سارے انبیاء آئے، بہت ساری اُمتیں گزریں۔ بھیجا کس لیے؟ تاکہ آپ ان کے اوپر وہ کتاب پڑھیں، تلاوت کریں اس چیز کی جو ہم نے آپ کی طرف وحی کی ہے، اور یہ رحمٰن کا انکار کررہے ہیں، رحمٰن کے متعلق ایمان نہیں لاتے، آپ انہیں بتا دیجیے کہ تم مانتے ہو تو مانو نہیں مانتے تو نہ مانو، وہ رحمٰن میرا ربّ ہے، اور اس کے علاوہ کوئی دوسرا معبود نہیں، میں تو اسی پر بھروسا کرتا ہوں، اور اسی کی طرف میرا لوٹنا ہے۔

مشرکینِ مکہ کے مطالبات کا جواب

وَلَوْ اَنَّ قُرْاٰنًا سُیِّرَتْ بِهِ الْجِبَالُ: یہ ان کے ایک مطالبے کا جواب ہے، وہ کہتے تھے کہ مکہ معظمہ کے پہاڑ جنہوں نے مکہ معظمہ کی سرزمین کو تنگ کررکھا ہے، اور کاشت وغیرہ کے لئے یہاں کوئی جگہ نہیں ہے، معجزے کے طور پر وہ طلب کرتے تھے کہ ان پہاڑوں کو یہاں سے ہٹادو، اور کبھی کہتے تھے کہ یہاں پانی کی کمی ہے یہاں چشمے جاری کردو، یا کہتے تھے ہمیں سفر کرنے پڑتے ہیں اور سفر مشقت کے ہیں، تو جس طرح سے سلیمان علیہ السلام کے لئے تم کہتے ہو کہ ہوا مسخر کردی گئی تھی، مہینوں کا سفر گھنٹوں میں کرلیتے تھے، تو اسی طرح سے کوئی ایسی صورت پیدا کردو جس سے زمین قطع ہوجایا کرے، یعنی سفر قطع ہوجایا کرے، یا زمین میں سے چشمے جاری ہوجائیں، ان کے مطالبوں کی تفصیل سورۂ اسراء میں آئے گی کہ انہوں نے کیا کیا مطالبے کیے تھے؟ کہ ایسا کرکے دکھادو، ایسا کرکے دکھادو، یہ ہوجائے، وہ ہوجائے، اور کبھی وہ کہتے تھے کہ ہمارے مرے ہوئے آباؤاجداد کو ہمارے سامنے زندہ کردو، وہ ہم سے باتیں کریں، پھر ہم مانیں گے۔ تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اگر اس قرآن کے اندر اس قسم کے اثرات ظاہر بھی کردیے جائیں تو بھی یہ مانیں گے نہیں، جنہوں نے ماننا ہوتا ہے وہ تو اللہ کا نام سن کر ہی متاثر ہوجاتے ہیں، اور جنہوں نے نہیں ماننا ان کو جو چاہو دکھاتے چلے جاؤ وہ نہیں مانیں گے، کیونکہ یہ چیزیں مؤثر بالذات نہیں کہ جب یہ سامنے آجائیں گی تو دیکھنے والے ضرور ایمان لائیں گے، ورنہ اس قسم کے عجیب وغریب معجزے پہلی امتوں میں انبیاء علیہم السلام نے دکھائے تو بھی وہ لوگ متاثر نہیں ہوئے، حضور ﷺ نے اپنے مخاطبین کے سامنے حسی اور دوسرے ہر قسم کے معجزات نمایاں کیے لیکن یہ لوگ متاثر نہیں ہوئے، تو یہ اسباب اصل میں بذات خود ایمان کا باعث نہیں بنتے، انسان کے قلب میں ایمان نہیں ڈالتے، یہ معاملہ سارے کا سارا اللہ کے اختیار میں ہے۔ ایمان کن قلوب میں آیا کرتا ہے اس کے لئے اللہ کے بنائے ہوئے قوانین اور ضوابط علیحدہ ہیں، کہ انسان خلوص کے ساتھ حق کو سمجھنا چاہے، اپنی قوت نظریہ کو اور قوت عملیہ کو صرف کرے تو اللہ تعالیٰ سیدھا راستہ نمایاں کردیتے ہیں، ورنہ یہ معجزات بذات خود ایمان نہیں دلاتے، یہ مؤثر بالذات نہیں ہیں، ''اگر یہ قرآن ایسا ہوتا کہ اس کے ذریعے سے پہاڑوں کو چلا دیا جاتا'' جس طرح سے یہ لوگ مطالبہ کرتے ہیں ''یا اس کے ذریعے سے زمین قطع کردی جاتی'' یعنی چشمے جاری کردیے جاتے، یا اس کے ذریعے سے سفر قطع

ہونے لگ جاتا، جس طرح سے یہ مطالبہ کرتے ہیں'' یا ان کے ذریعے سے مُردوں سے باتیں ہو جاتیں'' تو بھی یہ ایمان نہ لاتے لَمَا اٰمَنُوا، کیونکہ یہ چیزیں مؤثر بالذات نہیں'' بلکہ اللہ ہی کے لئے امر ہے سارے کا سارا''۔ تو اس بات کو سن کے کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو سب کو زبردستی مؤمن بنا دیتا، مسلمانوں کو مؤمنوں کو مطمئن ہو جانا چاہیے، جو اس بات کا خیال رکھتے ہیں پریشان ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ یہ معجزے دکھا دیں تو شاید یہ لوگ مان ہی جائیں، مؤمنوں کے دل میں بھی اس قسم کے خیالات کبھی آ جاتے تھے کہ جیسے معجزے یہ مانگتے ہیں اگر ان کے سامنے اس قسم کے معجزات ظاہر کر دیے جائیں تو شاید یہ ایمان لے ہی آئیں گے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ایسا نہیں، اگر سب لوگوں کو مؤمن بنانا ہوتا تو اللہ تعالیٰ زبردستی بنا دیتا، ان کی فطرت ہی ایسی بنا دیتا کہ یہ غلطی کی طرف نہ جاتے، صحیح راستے پر چلتے، لیکن اللہ تعالیٰ نے اختیار دے کے جو ان کو چھوڑا ہے تو بعض مانیں گے بعض نہیں مانیں گے، اس بات پہ مسلمانوں کا دل مؤمنین کا دل مطمئن ہو جانا چاہیے۔ باقی یہ کافر لوگ جو دندناتے پھرتے ہیں یہ تھوڑے دن ہیں، ان کو ان کے کردار کے باعث کوئی نہ کوئی مصیبت پہنچتی رہے گی، یا ان کے گھروں کے پاس کوئی نہ کوئی اس قسم کا واقعہ پیش آتا رہے گا جو ان کے لئے تنبیہ کا باعث ہوگا حتیٰ کہ اللہ کا وعدہ آ جائے گا۔ یہاں اللہ کے وعدے سے مقصد یہ ہے کہ حق غالب ہو جائے اور یہ مغلوب ہو جائیں، تو گویا کہ فتح مکہ اس وعدے کا ایک مصداق ہے، تو جب فتح مکہ ہو گیا تو ان کا سارا کر و فر جتنا تھا ختم ہو گیا، نام و نشان مٹا دیا گیا'' بے شک اللہ تعالیٰ وعدے کے خلاف نہیں کرتے'' اور اس نے حق کے غلبے کا وعدہ کر رکھا ہے، اپنے وقت پر اللہ تعالیٰ اس وعدے کو پورا کریں گے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَاَمْلَيْتُ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثُمَّ

بے شک استہزا کیا گیا رسولوں کے ساتھ جو آپ سے پہلے گزرے ہیں پھر میں نے مہلت دی ان لوگوں کو جنہوں نے کفر کیا، پھر

اَخَذْتُهُمْ فَكَيْفَ كَانَ عِقَابِ ۝۳۲ اَفَمَنْ هُوَ قَآئِمٌ عَلٰى كُلِّ نَفْسٍۢ بِمَا كَسَبَتْ

میں نے ان کو پکڑا پھر میرا سزا دینا کیسا ہوا؟ ۝۳۲ کیا بھلا جو قائم ہے ہر نفس پر اس کے کسب کے ساتھ

وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ قُلْ سَمُّوْهُمْ اَمْ تُنَبِّئُوْنَهٗ بِمَا لَا يَعْلَمُ

ان لوگوں نے اللہ کے لئے شرکاء بنا لیے، آپ (ان سے) کہیے: ان کے نام لو! کیا خبر دیتے ہو تم اللہ کو ایسی چیز کی جس کو اللہ تعالیٰ نہیں جانتا

فِى الْاَرْضِ اَمْ بِظَاهِرٍ مِّنَ الْقَوْلِ بَلْ زُيِّنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مَكْرُهُمْ

زمین میں؟ یا ظاہری بات کے طور پر (ان کا ذکر کرتے ہو؟) بلکہ مزین کیا گیا ان لوگوں کے لئے جنہوں نے کفر کیا ان کے مکر کو

وَصُدُّوْا عَنِ السَّبِيْلِ ۗ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ ۝۳۳ لَهُمْ عَذَابٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا

اور وہ راستے سے روک دیے گئے، جس کو اللہ تعالیٰ بھٹکا دے اس کو کوئی راستہ دِکھانے والا نہیں ۝۳۳ ان کے لئے دُنیوی زندگی میں عذاب ہے

وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَقُّ ۚ وَمَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ وَّاقٍ ۝۳۴ مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِيْ وُعِدَ

اور آخرت کا عذاب بہت سخت ہے اور نہیں ہے ان کے لئے اللہ کے عذاب سے کوئی بچانے والا ۝۳۴ حالت اس جنّت کی جس کا متقین

الْمُتَّقُوْنَ ۗ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۗ اُكُلُهَا دَآئِمٌ وَّظِلُّهَا ۗ تِلْكَ عُقْبَى

سے وعدہ کیا گیا ہے، جاری ہوں گی اس کے نیچے سے نہریں، اس کا پھل دائمی ہے اور اس کا سایہ بھی دائمی ہے، یہ انجام ہے

الَّذِيْنَ اتَّقَوْا ۖ وَّعُقْبَى الْكٰفِرِيْنَ النَّارُ ۝۳۵ وَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَفْرَحُوْنَ

ان لوگوں کا جنھوں نے تقویٰ اختیار کیا اور کافروں کا انجام جہنّم ہے ۝۳۵ وہ لوگ جن کو ہم نے کتاب دی خوش ہوتے ہیں وہ

بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمِنَ الْاَحْزَابِ مَنْ يُّنْكِرُ بَعْضَهٗ ۗ

اس کتاب کے ذریعے سے جو آپ کی طرف اُتاری گئی، اور گروہوں میں سے کچھ لوگ وہ بھی ہیں جو اس کے بعض حصے کا انکار کرتے ہیں،

قُلْ اِنَّمَآ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ وَلَآ اُشْرِكَ بِهٖ ۗ اِلَيْهِ

آپ کہہ دیجیے اس کے سوا کچھ نہیں کہ مجھے حکم دیا گیا ہے میں اللہ کی عبادت کروں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤں، میں اسی

اَدْعُوْا وَاِلَيْهِ مَاٰبِ ۝۳۶ وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ حُكْمًا عَرَبِيًّا ۗ وَلَئِنِ

کی طرف بلاتا ہوں اور اسی کی طرف میرا ٹھکانا ہے ۝۳۶ ایسے ہی اُتارا ہم نے اس قرآن کو اس حال میں کہ یہ عربی حکم ہے، اگر

اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ

آپ نے ان کی خواہشات کی اتباع کی بعد اس کے کہ آپ کے پاس علم آ گیا تو نہیں ہے آپ کے لئے اللہ کے مقابلے میں کوئی کارساز

وَّلَا وَاقٍ ۝۳۷ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ وَجَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّذُرِّيَّةً ۗ

نہ کوئی بچانے والا ۝۳۷ البتہ تحقیق ہم نے بھیجے رسول آپ سے پہلے اور بنائیں ہم نے ان کے لئے بیویاں بھی اور اولاد بھی،

وَمَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ يَّاْتِيَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۗ لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ ۝۳۸ يَمْحُوا

کسی رسول کے لئے نہیں ہے کہ لے آئے وہ کوئی نشانی مگر اللہ کی توفیق کے ساتھ، ہر وقت کے لئے کوئی لکھی ہوئی چیز موجود ہے ۝۳۸ مٹاتا ہے

اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَيُثْبِتُ ۚۖ وَعِنْدَهٗۤ اُمُّ الْكِتٰبِ ۝۳۹ وَاِنْ مَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ

اللہ جو چاہتا ہے اور ثابت رکھتا ہے (جو چاہتا ہے)، اصل کتاب اسی کے پاس ہے ۝۳۹ اگر ہم آپ کو دکھا دیں بعض اس کا جس کا

نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ ۝۴۰

ہم ان سے وعدہ کرتے ہیں یا ہم آپ کو وفات دے دیں پس آپ کے ذمے تو پہنچا دینا ہی ہے اور حساب ہمارے ذمہ ہے ۝۴۰

اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا نَاْتِي الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا ؕ وَاللّٰهُ

کیا یہ لوگ دیکھتے نہیں کہ ہم آرہے ہیں زمین کے پاس اس حال میں کہ ہم اس کو گھٹاتے جا رہے ہیں اس کے کناروں سے، اللہ

يَحْكُمُ لَا مُعَقِّبَ لِحُكْمِهٖ ؕ وَهُوَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۝۴۱ وَقَدْ مَكَرَ الَّذِيْنَ

حکم دیتا ہے اور اس کے حکم کا پیچھا کرنے والا کوئی نہیں، اور وہ بہت جلدی حساب لینے والا ہے ۝۴۱ جو لوگ ان سے پہلے گزرے ہیں

مِنْ قَبْلِهِمْ فَلِلّٰهِ الْمَكْرُ جَمِيْعًا ؕ يَعْلَمُ مَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ ؕ وَسَيَعْلَمُ

انہوں نے خفیہ تدبیریں کی تھیں، پس تدبیر ساری کی ساری اللہ کے لئے ہے، جانتا ہے وہ جو کچھ کرتا ہے ہر نفس، اور عنقریب جان لیں گے

الْكُفّٰرُ لِمَنْ عُقْبَى الدَّارِ ۝۴۲ وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَسْتَ مُرْسَلًا ؕ قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ

کافر کہ آخرت کا انجام کس کے لئے ہے ۝۴۲ اور کافر لوگ کہتے ہیں کہ تُو بھیجا ہوا نہیں ہے، آپ کہہ دیجیے کہ اللہ گواہ

شَهِيْدًۢا بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ ۙ وَمَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتٰبِ ۝۴۳

کافی ہے میرے اور تمہارے درمیان اور وہ شخص (گواہ کافی ہے) جس کے پاس کتاب کا علم ہے ۝۴۳

خلاصہ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ: بے شک استہزاء کیا گیا رسولوں کے ساتھ جو آپ سے پہلے گزرے ہیں۔ اسْتِهْزَاء: ٹھٹھہ، مذاق، ہنسی اڑانا۔ فَاَمْلَيْتُ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا: پھر میں نے مہلت دی ان لوگوں کو جنہوں نے کفر کیا، ثُمَّ اَخَذْتُهُمْ: پھر میں نے ان کو پکڑا، فَكَيْفَ كَانَ عِقَابِ: عقابِ میں باء کے نیچے کسرہ یاء پر دلالت کرتا ہے، عقابی، پھر میرا سزا دینا کیسا ہوا، اَفَمَنْ هُوَ قَآئِمٌ عَلٰى كُلِّ نَفْسٍ: کیا بھلا جو قائم ہو ہر نفس پر، قائم ہو ہر نفس پر یعنی ہر نفس پر وہ قائم ہے حاکم ہے اس کا محاسبہ کرنے والا ہے اس کے احوال کو دیکھنے والا ہے، قَآئِمٌ کے اندر سارا مفہوم شامل ہے، ''قائم ہے ہر نفس پر'' بِمَا كَسَبَتْ: اس کے کسب کے ساتھ یعنی جو کچھ وہ نفس کرتا ہے اس پر محاسبہ کرنے کے لئے وہ قائم ہے۔ دوسری شق یہاں محذوف ہے، کیا وہ اس کی طرح ہو سکتا

ہے کہ جس کو اپنے ہی احوال کی خبر نہیں، یا کسی نفس کا وہ محاسبہ نہیں کر سکتا، کسی نفس کی وہ نگرانی نہیں کر سکتا، کیا ایسا شخص جو ہر حال سے واقف ہے اور ہر نفس پر محاسبہ کرنے والا ہے وہ اس کے برابر ہو سکتا ہے اس کی طرح ہو سکتا ہے؟ یہ دونوں برابر ہو سکتے ہیں کسی صورت میں؟ جواب خود واضح ہے کہ نہیں ہو سکتے، یہ استفہام انکاری ہے۔ وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ: ان لوگوں نے اللہ کے لئے شرکاء بنا لئے، قُلْ: آپ ان سے کہئے، سَمُّوْهُمْ: ان کے نام لو، وہ کون کون ہیں، کیا چیزیں ہیں جن کو اللہ کا تم نے شریک بنایا ہے، اَمْ تُنَبِّئُوْنَهٗ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي الْاَرْضِ: کیا خبر دیتے ہو تم اللہ کو ایسی چیز کی جس کو اللہ تعالیٰ نہیں جانتا زمین میں؟ اَمْ بِظَاهِرٍ مِّنَ الْقَوْلِ: یا ظاہری بات کے طور پر ان کا ذکر کرتے ہو؟ بَلْ زُيِّنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مَكْرُهُمْ: بلکہ مزین کیا گیا ان لوگوں کے لئے جنہوں نے کفر کیا ان کے مکر کو، جس قسم کی فریب کی باتیں، مکر فریب وہ کرتے ہیں وہ سب ان کے لئے مزین کر دیا گیا یعنی ان کو اچھا لگتا ہے، وَصُدُّوْا عَنِ السَّبِيْلِ: اور وہ راستے سے روک دیے گئے، وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ: جس کو اللہ تعالیٰ بھٹکا دے اس کو کوئی راستہ دکھانے والا نہیں، لَهُمْ عَذَابٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا: ان کے لئے دنیوی زندگی میں عذاب ہے، وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَقُّ: اور آخرت کا عذاب بہت سخت ہے، وَمَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ وَّاقٍ: اور نہیں ہے ان کے لئے اللہ کے عذاب سے کوئی بچانے والا۔ وَاقٍ وِقَايَةٌ سے ہے، یہ داعِی کی طرح ہے، اصل میں وَاقِیٌ تھا، "کوئی بچانے والا نہیں" مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ: حالت اس جنت کی جس کا متقین سے وعدہ کیا گیا ہے یہ ہے جو اگلے الفاظ میں ذکر کی جا رہی ہے تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ: جاری ہوں گی اس کے نیچے سے نہریں، اُكُلُهَا دَآئِمٌ وَّظِلُّهَا: اُکل: جو چیز کھائی جاتی ہے، پھل کے معنی میں، "اس کا پھل دائمی ہے اور اس کا سایہ بھی دائمی ہے، ظِلُّهَا دَائِمٌ، یہاں دَآئِمٌ کا لفظ مقابلۃً محذوف ہے، اُكُلُهَا دَآئِمٌ وَّظِلُّهَا دَآئِمٌ، اس کا پھل بھی دائمی ہے اور اس کا سایہ بھی دائمی ہے، وہ سدا بہار باغ ہیں وہ، تِلْكَ عُقْبَى الَّذِيْنَ اتَّقَوْا: یہ انجام ہے ان لوگوں کا جنہوں نے تقویٰ اختیار کیا، وَّعُقْبَى الْكٰفِرِيْنَ النَّارُ: اور کافروں کا انجام جہنم ہے۔ وَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ: وہ لوگ جن کو ہم نے کتاب دی يَفْرَحُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ: خوش ہوتے ہیں وہ اس کتاب کے ذریعے سے جو آپ کی طرف اتاری گئی، وَمِنَ الْاَحْزَابِ مَنْ يُّنْكِرُ بَعْضَهٗ: اور گروہوں میں سے کچھ لوگ وہ بھی ہیں جو اس کتاب کے بعض حصے کا انکار کرتے ہیں۔ احزاب حزب کی جمع۔ بَعْضَهٗ کی "ہٗ" ضمیر ما اُنزِل الیک کی طرف لوٹ رہی ہے، "جو کچھ آپ کی طرف اتارا گیا اس کے بعض حصے کا انکار کرتے ہیں" قُلْ: آپ کہہ دیجئے، اِنَّمَآ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ: اس کے سوا کچھ نہیں کہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں اللہ کی عبادت کروں، وَلَآ اُشْرِكَ بِهٖ: اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤں، اِلَيْهِ اَدْعُوْا: میں اسی کی طرف بلاتا ہوں، وَاِلَيْهِ مَاٰبِ: باء کے نیچے کسرہ یائے متکلم پر دلالت کرنے والا ہے، "اور اسی کی طرف میرا ٹھکانا ہے، میرا لوٹ کے جانا ہے" وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ حُكْمًا عَرَبِيًّا: ایسے ہی اتارا ہم نے اس قرآن کو اس حال میں کہ یہ ایک عربی حکم ہے، وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ: اگر آپ نے ان کی خواہشات کی اتباع کی بَعْدَمَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ: بعد اس کے کہ آپ کے پاس علم آ گیا، مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا وَاقٍ: تو نہیں ہے آپ کے لئے اللہ کے مقابلے میں کوئی ولی اور نہ کوئی بچانے والا، کوئی کارساز کوئی بچانے والا اللہ کے مقابلے میں نہیں ہوگا، وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ: البتہ تحقیق ہم نے بھیجے رسول آپ سے پہلے وَجَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّذُرِّيَّةً: اور بنائیں ہم نے ان کے لئے بیویاں بھی اور اولاد بھی۔ ازواج: بیویاں۔ ذریۃ: اولاد۔ وَمَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ يَّاْتِيَ بِاٰيَةٍ: کسی رسول کے لئے نہیں ہے کہ لے آئے وہ کوئی نشانی اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ: مگر اللہ کی

توفیق کے ساتھ، اللہ کے اذن سے، لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ: ہر وقت کے لئے اللہ کی کوئی تحریر ہے، وقت کے مناسب اللہ تعالیٰ نے اَحکام لکھ کر رکھے ہوئے ہیں، ہر وقت کے لئے اللہ کے ہاں کوئی تحریر ہے۔ کتاب، مکتوب کے معنی میں ہے لکھی ہوئی چیز۔ اجل: وقتِ معین۔ ''ہر اَجل کے لئے کوئی لکھی ہوئی چیز موجود ہے'' وقت کے مناسب جس قسم کے اَحکام ہوتے ہیں جس قسم کے حالات ہوتے ہیں اللہ نے لکھ کر رکھے ہوئے ہیں ویسے اترتے رہتے ہیں، يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ: مٹاتا ہے اللہ جس چیز کو چاہتا ہے وَيُثْبِتُ: مقابلۃً یہاں مَا يَشَآءُ محذوف ہے، ''مٹاتا ہے اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے'' وَيُثْبِتُ مَا يَشَآءُ: اور ثابت رکھتا ہے جس چیز کو چاہتا ہے، وَعِنْدَهٗۤ اُمُّ الْكِتٰبِ: اصل کتاب اسی کے پاس ہے، اُمّ الکتاب سے اصل کتاب مراد ہے، وَاِنْ مَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُهُمْ: اگر ہم آپ کو دکھادیں بعض اس کا جس کا ہم اِن سے وعدہ کرتے ہیں، اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ: یا ہم آپ کو وفات دے دیں فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ: پس آپ کے ذمے تو پہنچا دینا ہی ہے وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ: اور حساب ہمارے ذمے ہے۔ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا نَاْتِي الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا: کیا یہ لوگ دیکھتے نہیں کہ ہم آرہے ہیں زمین کو گھٹاتے ہوئے، نَاْتِي الْاَرْضَ: ہم زمین کے پاس آرہے ہیں، نَنْقُصُهَا: اس حال میں کہ ہم اس کو گھٹاتے جارہے ہیں مِنْ اَطْرَافِهَا: اس کے کناروں سے، وَاللّٰهُ يَحْكُمُ لَا مُعَقِّبَ لِحُكْمِهٖ: اللہ حکم دیتا ہے اور اس کے حکم کو باطل کرنے والا کوئی نہیں۔ معقِب کا معنی ہوتا ہے جو کسی چیز کے پیچھے لگ جائے پھر اس کو مٹا دے شکست دے دے، ''اس کے حکم کو شکست دینے والا کوئی نہیں، اس کے حکم کا پیچھا کرنے والا کوئی نہیں'' وَهُوَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ: اور وہ بہت جلدی حساب لینے والا ہے، وَقَدْ مَكَرَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ: جو لوگ ان سے پہلے گزرے ہیں انہوں نے بھی خفیہ تدبیریں کی تھیں فَلِلّٰهِ الْمَكْرُ جَمِيْعًا: تدبیر ساری کی ساری اللہ کے لئے ہے، يَعْلَمُ مَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ: جانتا ہے وہ جو کچھ کرتا ہے ہر نفس، وَسَيَعْلَمُ الْكُفّٰرُ: اور عنقریب جان لیں گے کافر لِمَنْ عُقْبَى الدَّارِ: آخرت کا اچھا انجام کس کے لئے ہے، وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَسْتَ مُرْسَلًا: اور کافر لوگ کہتے ہیں کہ تُو مرسَل نہیں ہے، بھیجا ہوا نہیں ہے، قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًۢا بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ: آپ کہہ دیجئے کہ اللہ گواہ کافی ہے میرے اور تمہارے درمیان، وَمَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتٰبِ: اور وہ شخص گواہ کافی ہے جس کے پاس کتاب کا علم ہے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

تفسیر

انبیاء علیہم السلام اور ان کے ورثاء کے ساتھ مخالفین کا اِستہزا

پہلی آیت کا تعلق تو سرورِ کائنات ﷺ کی تسلی سے ہے کہ یہ لوگ اگر آپ کے ساتھ استہزاء کرتے ہیں تو آپ اس کی پروا نہ کریں، آپ سے پہلے جو رسول گزرے ہیں ان کے ساتھ بھی اسی طرح سے استہزاء کیا گیا ہے، تو جب یہ معلوم ہے کہ اللہ کی طرف سے رسول آتے ہیں، وہ اس قوم کے ساتھ ہمدردی اور خیر خواہی کرتے ہیں، ان کو اچھی اچھی باتیں بتاتے ہیں لیکن ان کے مخاطب آگے سے اِستہزا کیا کرتے ہیں تو آپ بھی اسی جماعت کا ایک فرد ہیں، تو اگر آپ کے ساتھ ایسا معاملہ ہو رہا ہے تو گھبرانا نہیں چاہیے۔ بہرحال اس سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ اللہ کی طرف سے جو بھی مُرسَل ہوتے ہیں مخاطبین ان کا مذاق اڑایا ہی کرتے

ہیں، جس طرح سے رسولوں کے ساتھ ایسے ہوتا ہے، ورثائے انبیاء کے ساتھ بھی ہمیشہ اسی طرح سے ہی ہوتا آیا ہے، علماء، صلحاء، اولیاء جو کہ انبیاء علیہم السلام کے جانشین سمجھے جاتے ہیں، جاہل قسم کے لوگ دنیا کی محبت میں مبتلا لوگ جو خواہشات کے پیچھے چلنے والے ہوتے ہیں، یہ لوگ جب اُن کے سامنے رکاوٹ پیدا کرتے ہیں آڑ پیدا کرتے ہیں تو وہ اِن کا مذاق اڑاتے ہیں۔ تو یہ مذاق اُڑایا جانا یوں سمجھو کہ یہ تو انبیاء علیہم السلام کے وارث ہونے کی ایک نشانی ہے، تو جب انبیاء کے ساتھ ایسا ہوتا تھا تو ان کے ورثاء کے ساتھ بھی ایسا ہونا ہی چاہیے، تبھی تو جا کے صحیح جانشینی سامنے آئے گی، تو جیسے اللہ تعالیٰ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو پہلے رسولوں کا حوالہ دے کے تسلی دے رہے ہیں کہ پہلے رسولوں کے ساتھ بھی ایسے ہی ان لوگوں نے کیا اس لیے آپ گھبرائیں نہیں، تو اس لیے آپ حضرات کو بھی یہی مدنظر رکھنا چاہیے کہ علماء، صلحاء جو آپ کے اکابر ہیں، اسلاف ہیں، جن کا آپ اپنے آپ کو وارث قرار دیتے ہیں، ان کے ساتھ بھی ہمیشہ اسی طرح سے ہوتا آیا ہے، دنیا دار قسم کے لوگ ان کی تحقیر کرتے ہیں، تذلیل کرتے ہیں، استہزاء کرتے ہیں، اس لیے گھبرانے کی کوئی بات نہیں، ایسے حالات میں دل نہیں چھوڑنا چاہیے، جس جماعت کے ساتھ انسان شامل ہو گیا ہو اس جماعت کی جتنی خصوصیات اور جو لوازمات ہوتے ہیں سارے برداشت کرنے ہی پڑتے ہیں جیسے ہمارا شیخ (سعدیؒ) کہتا ہے کہ:

یا مکُن با پیلباناں دوستی یا بنا کُن خانۂ خود خوردِ پیل (1)

یا تو ہاتھی والوں سے یاری نہ لگایا کرو، اور اگر ہاتھی والوں سے یاری لگائی ہے تو پھر مکان اونچے اونچے بنانے چاہئیں، کہ جب وہ ہاتھی والے آئیں گے تو کم از کم ان کے لئے گنجائش تو ہو۔ تو اگر دوستی رسولوں کے ساتھ لگائی ہے انبیاء کے ساتھ لگائی ہے تو جس قسم کی مشکلات دُنیا کے اندر اُن کے لئے تھیں اس قسم کی آپ کو بھی پیش آئیں گی اور برداشت کرنی چاہئیں...... فَاَمْلَیْتُ لِلَّذِیْنَ کَفَرُوْا: میں نے ڈھیل دی ان لوگوں کو جنہوں نے کُفر کیا، پھر ان کو پکڑا، پھر میرا سزا دینا کیسا تھا؟ واقعات آپ کے سامنے آ چکے ہیں کہ جو لوگ اللہ کی گرفت میں آ گئے پھر ان کا کس طرح سے ستیاناس ہوا، کس طرح سے وہ برباد ہوئے، نام ونشان مٹ گئے۔

شرک کی تردید اور معبودانِ باطلہ کے پرستاروں سے سوال

آگے شرک کی تردید ہے کہ اللہ تعالیٰ تو ایسا ہے کہ ہر نفس کے اوپر قائم ہے، اور اس کے اعمال کا محاسبہ کرنے والا ہے، اس کے احوال سے واقف ہے، اس کی نگرانی کرنے والا ہے، اور اس کے مقابلے میں جو تجویز کر رکھے ہیں ان کو تو اپنے احوال کی بھی خبر نہیں، وہ نہ کسی کا محاسبہ کر سکتے ہیں، نہ کسی کو اس کے عمل کی جزا دے سکتے ہیں، تو یہ دونوں ایک جیسے کیسے ہو گئے؟ کہ جیسے اللہ کی عبادت کی جا رہی ہے ان کی بھی کی جا رہی ہے۔ اب آگے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ انہوں نے شرکاء تو بنا لیے، ان سے پوچھو کہ ذرا ان کے نام تو لیں کہ وہ شرکاء ہیں کون؟ ہمیں تو پتا ہی نہیں کہ زمین کے اندر کوئی ہمارے شرکاء بھی ہیں، یہ ''نَفْیُ الشَّیْءِ بِنَفْیِ لَوَازِمِہٖ'' کے اُصول کے ساتھ اس بات کو ذکر کیا جا رہا ہے، کسی چیز کی اگر نفی کرنی ہو تو اس کے لازم کی نفی کر دی جائے، اب یہ تو ایک بیّن بات ہے کہ اگر دنیا کے اندر کوئی ایسی چیز ہوتی تو وہ اللہ کی مخلوق ہوتی، اور اللہ اپنی مخلوق کو جانتا ہے، اور اللہ کا علم ذرّے ذرّے کو محیط ہے،

---

(1) گلستاں، باب ہشتم کا تقریباً آخر، ص ۲۳۹۔

دنیا کے اندر اگر کوئی ایسا ہوتا جس کے لئے اُلوہیت ثابت ہوتی یا وہ اللہ کا شریک ہوتا تو اللہ کو لازماً پتا ہوتا، یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ اللہ کا شریک ہو اور اللہ کو پتا نہ ہو، اور اللہ کی مخلوق ہو اور اللہ کو علم نہ ہو، تو یہاں بظاہر اللہ کے علم کی نفی کی جارہی ہے کہ تم اللہ کو ایسی چیز کی خبر دے رہے ہو جس کا اللہ کو بھی علم نہیں؟ تو معلوم ہو گیا کہ اس چیز کا وجود ہی نہیں ہے، کیونکہ اگر وہ چیز موجود ہوتی تو اللہ ضرور جانتا، تو یہ لازم کی نفی کر کے چیز کی نفی کی جارہی ہے، ''تم اللہ کو ایسی چیز کی خبر دے رہے جس کو اللہ جانتا ہی نہیں زمین میں؟ یا تم خود ہی اپنے خیال کے مطابق سطحی سطحی باتیں کرتے ہو؟'' یعنی تمہیں بھی پتا ہے کہ واقعہ کوئی نہیں، تو پھر تو اس کے باطل ہونے میں کیا ہی شبہ ہوسکتا ہے، یعنی تم بھی دل میں جانتے ہو کہ حقیقت کچھ نہیں ہے، اور ایسے ہی ظاہری طور پر ان کو شرکاء کہہ رہے ہو، تو پھر تو اس کے بطلان میں شک ہی کوئی نہیں، اور اگر واقعی تم شریک سمجھتے ہو تو پھر اللہ تعالیٰ کو تو پتہ نہیں کہ میرا کوئی شریک ہے، تو ''اللہ کو پتا نہیں'' کا مطلب یہ ہے کہ سرے سے کوئی شریک ہے ہی نہیں، اگر ہوتا تو اللہ کی مخلوق اور اللہ کا پیدا کیا ہوا ہوتا، اور اللہ کے علم میں ہوتا، تو جب اللہ جانتا ہی نہیں کہ دنیا کے اندر کوئی میرا شریک موجود ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شریک ہے ہی نہیں۔ ان کے عقائد کی بنیاد تو کوئی نہیں ہے، دلیل ان کے پاس کوئی نہیں، لیکن جس قسم کے مکر فریب انہوں نے باطل کی حمایت میں اپنی اغراض اور شہوات کے لئے اختیار کر رکھے ہیں، بس وہ انہیں اچھے لگ رہے ہیں، جس کو آپ کہہ سکتے ہیں کہ اپنی خاندانی گدی نشینی یہ چھوڑنا نہیں چاہتے، سمجھتے ہیں کہ یہی ہمارے رزق کا وسیلہ ہے، اسی کے ذریعے سے ہمیں عزت حاصل ہے، ورنہ ان کے عقیدوں کی حقیقت کچھ نہیں ہے، جو تدبیریں انہوں نے اختیار کر رکھی ہیں وہ ان کو اچھی معلوم ہو رہی ہیں، اور انہی مکر وفریب کی بنا پر ان کو صحیح راستے سے روک دیا گیا، تو جس سے معلوم ہو گیا کہ یہ لوگ اللہ کی طرف سے یہ لوگ بھٹکارے گئے، اور جس کو اللہ تعالیٰ بھٹکا دے پھر اس کو کوئی سیدھے راستے پر نہیں لاسکتا۔

دُنیا کی تکالیف مؤمن کے لئے رحمت اور کافر کے لئے عذاب ہی عذاب ہیں

''ان کو دنیوی زندگی میں بھی عذاب ہے'' اللہ تعالیٰ کی گرفت میں آتے ہیں، ویسے بھی مشرک کا دل ہر طرح سے جب پریشان رہتا ہے اور مختلف قسم کی مصیبتیں، بیماریاں، تکلیفیں، ان سے تو کوئی انسان بچتا ہی نہیں، مؤمن پر بھی یہ تکلیفیں آتی ہیں لیکن مؤمن کے لئے ان کی حیثیت عذاب کی نہیں رحمت کی ہے، کہ اس کے ساتھ ان کے گناہوں کی تلافی ہوتی ہے، کافر پر بھی یہی بخار، یہی تکلیفیں آتی ہیں لیکن اس کے لئے یہ عذاب ہی عذاب ہے، کیونکہ اس سے اس کے گناہوں کی تلافی نہیں ہوتی۔ تکلیف ظاہری طور پر بھئی! دونوں کو ہی آتی ہے لیکن دونوں میں اس طرح سے فرق ہے کہ جیسے ایک کاشت کار اپنے گھر سے غلے کی بوری اُٹھاتا ہے اور لے جا کے اپنے کھیت میں بکھیر دیتا ہے، بظاہر غلے کی ایک بوری تو اس کے گھر سے بھی نکل گئی، اور ایک گھر سے چور بوری اٹھا کے لے جاتے ہیں، ان دونوں باتوں میں فرق ہے؟ (جی)، جو اپنے گھر سے اختیار کے ساتھ غلے کی بوری اٹھا کے مٹی میں بکھیر کے آتا ہے ظاہری طور پر ضائع تو اس نے بھی کر دی، اور اس کے گھر میں ایک بوری کم ہو گئی، لیکن اس کے لئے کوئی پریشانی کی بات نہیں، کیوں؟ معلوم ہے کہ چند مہینوں کے بعد یہ ایک بوری ساٹھ بوریاں ہو کے واپس آجائے گی، اس کو امید لگی ہوئی ہے، یہ ایک تجارت ہے کہ اِدھر سے کچھ دیا اور اُدھر سے زیادہ آیا، لیکن جس کی چور اٹھا کے لے گئے اس کا پتا ہے کہ یہ نقصان ہی نقصان ہے،

اوپر نفع کوئی نہیں۔ اسی طرح سے مؤمن کو جو تکلیف آتی ہے وہ نتیجۃً ایک تجارت ہے، جس کے اوپر اللہ تعالیٰ ثواب دے گا، اس کے گناہوں کو معاف کرے گا، تو یہ اس سے فائدہ اٹھائے گا، وہ مصیبت رحمت ثابت ہوگی، اور کافر کے اوپر جو مصیبت آتی ہے وہ مصیبت ہی مصیبت ہے، کیونکہ اس کے اوپر کوئی نفع مرتب ہونے والا نہیں، نہ اس کے گناہ معاف ہوں گے نہ اس کے اوپر اس کو کسی قسم کا ثواب ملتا ہے، اس لیے جو کافر ہے وہ دنیا میں عذاب کے اندر ہے، کیونکہ دنیا میں رہتے ہوئے کوئی نہ کوئی تکلیف، پیٹ میں درد، سر میں درد، اولاد کا مرجانا، مالی نقصان اور اس قسم کے ناسازگار واقعات ہر کافر کو پیش آتے ہیں، ان کے حق میں یہ واقعات عذاب ہی عذاب ہیں، کیونکہ ان کے اوپر کوئی اثر مرتب ہونے والا نہیں، کہ ہم کہیں کہ یہ نتیجۃً رحمت ثابت ہو جائیں گے، ان کو ثواب ملے گا، ان کے گناہ معاف ہو جائیں گے، ایسی بات نہیں، بخلاف اس کے کہ مؤمن بھی اسی قسم کی تکلیفوں میں مبتلا ہوتا ہے اس کے لئے یہ تکلیفیں عذاب نہیں ہیں بلکہ اللہ کی رحمت ہیں، آخرت میں درجات بلند ہوتے ہیں، ثواب ملتا ہے، گناہ معاف ہوتے ہیں، اور اتنا ثواب ملے گا کہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ سرورِ کائنات ﷺ نے فرمایا کہ جس وقت قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اہلِ مصیبت کو ثواب دیں گے تو ان کے ثواب کو دیکھ کے اہلِ عافیت جن کو دُنیا میں کوئی تکلیف نہیں ہوئی وہ رشک کریں گے، کہیں گے کہ ہائے کاش! دُنیا میں ہمارے چمڑے قینچیوں سے کاٹے جاتے، ہم اس قسم کی مصیبتوں میں مبتلا ہوتے، تا کہ آج ہمیں بھی یہ ثواب ملتا،[1] تو مؤمن کی مصیبت تو نتیجۃً رحمت اس طرح سے ثابت ہوتی ہے۔ ''ان کے لئے دُنیوی زندگی میں عذاب ہے، اور آخرت کا عذاب تو بہت سخت ہے، اور اللہ کے عذاب سے ان کو کوئی بچانے والا نہیں۔''

مؤمنوں کے لئے سدابہار باغات ہیں

آگے مؤمنوں کی جزا کا ذکر اور اس کی وضاحت ہے۔ ''اس جنت کا حال جس کا وعدہ دیے جاتے ہیں متقون'' یہ ہے جو اگلے الفاظ میں بیان کیا جارہا ہے کہ ''اس کے نیچے سے نہریں جاری ہیں، اس کے پھل بھی دائم، اور اس کا سایہ بھی دائم'' یعنی سدابہار باغات ہیں، یہ نہیں کہ ان کے اوپر کبھی کوئی خزاں کا موسم آجائے، پتے جھڑ جائیں اور بیٹھنے کو سایہ بھی نہ ملے، یا پھل کھانے کو نہ ملے، جس طرح سے دنیا میں باغات کے اوپر خزاں کا موسم آتا ہے، پتوں اور پھلوں سے باغات خالی ہو جاتے ہیں، ایسی بات نہیں ہے، اُكُلُهَا دَآئِمٌ وَّظِلُّهَا: اس کا پھل بھی دائم ہے اور اس کا سایہ بھی دائم ہے، یعنی وہ باغ سدابہار ہیں، ''یہ انجام ہے ان لوگوں کا جنہوں نے تقویٰ اختیار کیا، اور کافروں کا انجام آگ ہے۔''

منصف قسم کے اہلِ کتاب کا قبولِ حق

وَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ: اس سے منصف قسم کے اہلِ کتاب مراد ہیں، چاہے وہ یہود ہوں چاہے نصاریٰ، کیونکہ یہود میں بھی ایسے تھے تورات کے پڑھنے والے، کہ جب رسول اللہ ﷺ کا ذکر ان کے سامنے آیا تو انہوں نے فوراً قبول کرلیا، خوش ہو گئے کہ جس کتاب کا وعدہ اللہ نے کیا تھا وہ کتاب آگئی، جیسے عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھی مدینہ منوّرہ میں تھے، اور نصاریٰ میں بھی ایسے لوگ تھے اِنجیل پڑھنے والے، کہ جو اِنجیل کو پڑھ کے یہ جانتے ہوئے تھے کہ ایک ایسا پیغمبر آنے والا ہے اور ایسی کتاب

---

(۱) سنن ترمذی ۲/۶۶، باب ما جاء فی ذهاب البصر/ مشکوۃ ج ۱ ص ۱۳۷، باب عیادة المریض، فصل ثانی، عن جابر۔

آنے والی ہے، جب ان کے سامنے یہ چیز آئی تو خوش ہو گئے اور فوراً قبول کر لیا، جیسے نجاشی اور اس کے ساتھی: ''وہ لوگ جن کو ہم نے کتاب دی وہ خوش ہوتے اس چیز کے ساتھ جو آپ کی طرف اتاری گئی۔''

ضدی کُفار کی ہٹ دھرمی

''اور گروہوں میں بعض وہ بھی ہیں جو اس کتاب کے بعض حصے کا انکار کرتے ہیں'' گروہوں سے اس وقت کے گروہ مراد ہیں، یہود نصاریٰ مشرکین، یُنْکِرُ بَعْضَهٗ: اس کے بعض حصے کا انکار کرتے ہیں، کیونکہ قرآنِ کریم میں جتنی باتیں ذکر کی گئی ہیں یہ لوگ ہر ہر بات کا انکار نہیں کرتے تھے، اسی بعض کا انکار کرتے تھے جو ان کی منشاء کی خلاف تھا، یہود و نصاریٰ اللہ کے قائل تھے، آخرت کے قائل تھے، جنت دوزخ کے قائل تھے، تو ان باتوں کے ذکر پر ان کو ان انکار کرنے کیا ضرورت تھی، وہ انکار وہیں کرتے جب ان کی تحریفات کو ظاہر کیا جاتا، اور سرورِ کائنات ﷺ کی نبوّت اور رسالت کو بیان کیا جاتا، اور اس چیز کے وہ منکر تھے، اسی طرح سے مشرکینِ مکہ بھی ہر ہر چیز کے منکر نہیں تھے، آخرت کا انکار کرتے تھے، سرورِ کائنات ﷺ کی نبوّت کا انکار کرتے تھے، باقی! جہاں اللہ تعالیٰ کی ذات کا صفات کا اور اس کے تصرفات کا ذکر آتا ہے تو ان باتوں کو وہ بھی مانتے تھے۔

دِینِ اِسلام کا خلاصہ

''آپ کہہ دیجیے کہ انکار کرنے کی تو کوئی بات نہیں، میری تو لائی ہوئی چیز کا خلاصہ یہی ہے کہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں اللہ کی عبادت کروں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤں'' یہ بات تو آ گئی توحید کے بارے میں، ''اسی کی طرف میں دعوت دیتا ہوں'' یہ میری رسالت ہے، ''اور اسی کی طرف میں نے لوٹ کے جانا ہے'' یہ معاد ہے، بنیادی طور پر یہ تین ہی چیزیں میرے دِین میں داخل ہیں۔

اللہ کے منسوخ کردہ اَحکام پر جمے رہنا اِتباعِ خواہشِ نفس ہے

باقی رہا کہ اَحکام پہلے کچھ اور تھے اب کچھ اور آ گئے، پہلی شریعتیں منسوخ ہو گئیں، یہ اللہ تعالیٰ کرتا رہتا ہے، پہلے انبیاء ﷺ پر بھی کتابیں اُتاریں اَحکام اُتارے جن کو اپنی حکمت اور مصلحت کے تحت بعض اوقات تبدیل کر دیا، اسی طرح سے اگر اس میں بھی کچھ اَحکام تبدیل کر دیے گئے ہیں تو یہ انکار کی کوئی وجہ نہیں، ''جیسے دوسری کتابیں اتاری گئیں، ''ایسے ہی اللہ نے اس قرآن کو اُتارا اس حال میں کہ یہ عربی حکم ہے''۔ ''اور اگر آپ نے اتباع کی ان کی خواہشات کی'' یہ خطاب بظاہر سرورِ کائنات ﷺ کو ہے، اور مایوس کرنا ان کو مقصود ہے جو اس کوشش میں لگے رہتے تھے کہ شاید ہمارے کہنے سے یہ کچھ چھوڑ دیں گے، ہمارے طریقے کو اپنا لیں گے، قرآنِ کریم کی کچھ آیات کو خارج کر دیں گے، جیسے سورۂ یونس میں آپ کے سامنے آیا تھا کہ یا اس قرآن کو بدل دو یا اس کی جگہ کوئی اور قرآن لے آؤ، اس قسم کی وہ اُمیدیں لگائے بیٹھے تھے، تو یہ آیت ان کی اُمیدوں کو ختم کرنے کے لئے ہے، بظاہر اس میں خطاب سرورِ کائنات ﷺ کو ہے، حقیقت کے اعتبار سے ان کو نا اُمید کرنا مقصود ہے کہ تم اُمید نہ رکھو کہ یہ تمہارا طریقہ قبول کر لیں گے، حضور ﷺ کو خطاب کر کے جا رہا ہے کہ ''اگر آپ ان کی خواہشات کے پیچھے لگے'' خواہشات سے مراد ان کے غلط خیالات جو

اللہ کی اُتاری ہوئی کتاب کے خلاف ہیں، چاہے ان کی بنیاد پہلے اللہ کی کتاب پر ہی ہو، توراۃ کے اَحکام ہیں، انجیل کے اَحکام ہیں، لیکن جب اللہ نے ان کو منسوخ کر دیا اب ان کے اوپر جمے رہنا ہوائے نفس کے علاوہ کچھ نہیں ہے، وہ سب اَہواء ہیں، ''اگر آپ نے اِتباع کی ان کی اَہواء کی، بعد اس کے کہ آپ کے پاس علم آ گیا، تو اللہ کے عذاب سے تجھے بچانے کے لئے نہ کوئی حمایتی ہوگا نہ کوئی بچانے والا'' ولی: کارساز۔ کوئی کارساز، کوئی بچانے والا نہیں ہوگا اللہ کے عذاب سے اگر تو ان کے خیالات کے پیچھے لگ گیا۔ یہی آیات جو اہلِ علم کو بھی ان کا منصب یاد دِلاتی ہیں کہ جس مسئلے کو وہ علمی رو سے سمجھتے ہوں کہ یہ اس طرح سے ہے، پھر جاہلوں کی خواہشات کے طور پر اس مسئلے کے خلاف چلنا اسی قسم کی وعیدوں کا مصداق بنا دیتا ہے، علم کے جہل کو تابع نہیں کرنا چاہیے، علمی انداز کے ساتھ آپ جس طریقے کو سمجھتے ہیں کہ یہ طریقہ ٹھیک ہے سُنّت کے مطابق ہے اللہ کے اَحکام کے مطابق ہے تو پھر اس کے اوپر جم جانا چاہیے، جاہلوں کے ماحول میں جا کر جاہلوں کے زور لگانے سے اور جاہلوں کے اِصرار سے اپنے طریقے کو انسان چھوڑ دے اور ان جاہلوں کے بنائے ہوئے جہالت والے طریقے پہ چل پڑے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ علم آنے کے بعد آپ ان کی خواہشات کے پیچھے لگ گئے۔

مسئلۂ رِسالت پر کافروں کے شبہات کا جواب

''آپ سے پہلے ہم نے بہت سارے رسولوں کو بھیجا اور ان کے لئے بیویاں اور بچے بنائے'' مشرکین کہتے تھے یہ تو ہم جیسا بشر ہے کہ اس کی بیویاں بھی ہیں اس کی اولاد بھی ہے، تو فرمایا کہ پہلے رسول بھی ایسے ہی تھے، ان کی بیویاں بھی تھیں اور ان کی اولاد بھی تھی۔ اور یہ معجزات طلب کرتے ہیں کہ فلاں قسم کا معجزہ ہمیں دکھا دو، جس طرح سے پچھلی آیات میں آیا تھا، تو ''کسی رسول کے لئے یہ مناسب نہیں کہ اللہ کی اجازت کے بغیر کوئی نشانی لے آئے'' نشانی سے معجزہ بھی مراد ہو سکتا ہے اور قرآنِ کریم کی آیات بھی مراد ہو سکتی ہیں، کہ وہ جو کہتے ہیں کہ کوئی اور قرآن لے آ، یا اس قرآن میں کوئی تبدیلی کر دے، تو اس کا جواب دیا کہ کسی رسول کے لئے مناسب نہیں کہ اللہ کی کتاب میں کوئی تبدیلی کر سکے اور کوئی ایک آیت بھی اللہ کی اجازت کے بغیر لے آئے۔ ''ہر وقت کے لئے اللہ تعالیٰ کے ہاں لکھا ہوا حکم ہے'' اور اس وقت کے مناسب اللہ تعالیٰ اَحکام اُتارتے رہتے ہیں۔

تقدیر کی کون سی قسم میں تبدیلی ہوتی ہے؟

یَمْحُوا اللّٰہُ مَا یَشَآءُ وَ یُثْبِتُ: مٹاتے رہتے ہیں اللہ تعالیٰ جو چاہتے ہیں، اور ثابت رکھتے ہیں جو چاہتے ہیں۔ اس کا تعلق اَحکام کے ساتھ بھی لگایا گیا ہے، اور حاصل ان الفاظ کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اِبتدا سے اَحکام اُتارے، آنے والے وقتوں میں ان اوقات کے مناسب اَحکام اُتارتے رہے، پچھلے اَحکام میں جس کو چاہا مٹایا اور جس کو چاہا باقی رکھا، توراۃ میں کچھ اَحکام آئے، اِنجیل میں ان میں سے کچھ کو منسوخ کر دیا گیا، جس کو چاہا باقی رکھا، جس کو چاہا مٹا دیا، پھر توراۃ انجیل کے کچھ اَحکام قرآن میں منسوخ کر دیے گئے اور جس حکم کو چاہا اللہ نے باقی رکھا، جس کو چاہا مٹا دیا، اصل کتاب اللہ کے پاس ہی ہے۔ تو یہ محو و اِثبات اَحکام کے متعلق بھی ہو سکتا ہے، اور یہ محو و اِثبات انسان کی تقدیر کے متعلق بھی ہو سکتا ہے، روایات میں تفصیل موجود ہے، سرورِ کائنات ﷺ نے

فرمایا کہ جس وقت بچہ اپنی ماں کے بطن میں وجود اختیار کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک فرشتہ متعین ہے جو رُوح ڈالنے سے پہلے وہ اللہ سے پوچھتا ہے کہ میں اس کی تقدیر کیا لکھوں؟ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی عمر لکھی جاتی ہے، اس کا رزق لکھا جاتا ہے، اس کا عمل لکھا جاتا ہے، اور یہ لکھا جاتا ہے کہ یہ نتیجۂ بد بخت ہوگا یا نیک بخت ہوگا، یہ سب چیزیں تحریر میں آجاتی ہیں،[1] لیکن یہ جو تحریر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتی ہے یہ قابلِ تبدیلی بھی ہے یا نہیں؟ روایات کی طرف دیکھتے ہوئے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے علم میں تو کوئی تبدیلی نہیں ہوتی جو ''قضائے مبرم'' کہلاتی ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے نچلے درجے میں اپنی حکمت کے تحت جو تحریریں کی ہوئی ہیں چاہے وہ تحریر لوحِ محفوظ میں ہو، چاہے وہ تحریر ہو جو فرشتوں کو لکھ کر دی جاتی ہے کہ یہ معاملہ تم نے یوں طے کرنا ہے، چاہے وہ تحریر ہے جو بچے کے بنتے وقت اس کی پیشانی پر ثبت کر دی جاتی ہے، یہ مختلف حالات کے تحت بدلتی رہتی ہے، اور اس کا بدلنا بھی اللہ کے علم کے مطابق ہوتا ہے، جیسے حدیث شریف میں آتا ہے کہ صلہ رحمی کرنے سے رزق میں اور عمر میں برکت ہوتی ہے، والدین کی نافرمانی کرنے سے انسان رزق سے محروم ہوتا ہے، دُعا تقدیر کو ٹال دیتی ہے، تو یہ اَسباب کے درجے میں تحتانی طور پر اس قسم کے تغیرات ہوتے رہتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان لکھی ہوئی باتوں میں سے جس کو چاہتا ہے ثابت رکھتا ہے، جس کو چاہتا ہے مٹا دیتا ہے۔ لیکن یہ سارے کے سارے تغیرات ''تقدیر معلق''، ''قضائے معلق'' میں ہوتے ہیں جو نچلے درجے کی ہے، باقی اللہ کے علم میں کوئی تبدیلی نہیں، اللہ کے علم میں ہوتا ہے کہ اس نے یہ کام کرنا ہے یا نہیں کرنا، نچلی سطح پہ تحریر ہوگی کہ اگر یہ صلہ رحمی کرے گا تو اس کی عمر اتنی، صلہ رحمی نہیں کرے گا تو اس کی عمر اتنی، لیکن اللہ کے علم میں ہے کہ صلہ رحمی کرے گا یا نہیں، وہاں ہر چیز متعین ہے۔

حضرت مجددّ الف ثانی کی دُعا سے تقدیر بدلنے کا واقعہ

اسی آیت کی تفصیل کرتے ہوئے قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ نے ''تفسیر مظہری'' میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی طرف سے نقل کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ جو رحمِ مادر میں شقی اور سعید لکھ دیتے ہیں، حالات کے تحت ان میں بھی تبدیلی ہو جاتی ہے، محو و اِثبات ان میں بھی ہو جاتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا مسلک نقل کرنے کے بعد ایک واقعہ بیان فرماتے ہیں، کہتے ہیں کہ دیکھو! اس سے اس کی تائید ہوتی ہے، مجددِ الفِ ثانی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ نقل فرمایا ''مقاماتِ مجددّیہ'' سے، کہ حضرت مجددّ رحمۃ اللہ علیہ کے دو صاحبزادے تھے، محمد سعید اور محمد معصوم، اور ان دونوں کے ایک معلم تھے، ان کو پڑھانے کے لئے اُستاذ رکھے ہوئے تھے، مُلا طاہر لاہوری، حضرت مجددّ صاحب نے ایک دِن اپنے بیٹوں کے سامنے ذکر کیا کہ میں نے تمہارے اُستاذ مُلا طاہر لاہوری کی پیشانی پہ شقی لکھا ہوا دیکھا ہے کہ یہ تو اَزلی بد بخت ہے، اس کی پیشانی پہ ''شقی'' لکھا ہوا ہے، (جس طرح سے حدیث شریف میں آتا ہے کہ شقی اور سعید لکھا جاتا ہے، اور آثار سے معلوم یہی ہوتا ہے کہ اس تحریر کی نسبت پیشانی کی طرف ہوتی ہے)، اب بیٹے بھی آخر مجددّ کے ہی تھے، آنے والے وقت میں وہ بھی اِمامِ ہدایت بننے والے تھے، ہم جیسے ہوتے تو اس بات کو اس پہلو سے سوچتے کہ جب ہمارا اُستاذ بد بخت ہے تو ہم اس کے پاس نہیں پڑھتے، اس کی شقاوت اور اس کی

(۱) بخاری ۱/۵۶۱ باب ذکر الملائکۃ / مسلم ۲/۳۳۲ باب کیفیۃ خلق الآدمی / مشکوٰۃ ج ۱ ص ۲۰ باب الایمان بالقدر فصل اول، عن عبداللہ بن مسعود۔

بدبختی کا اثر ہم پر بھی پڑ جائے گا، انہوں نے اپنے اباجی سے، مجدد صاحب رحمہ اللہ سے اصرار کیا کہ حضرت! دُعا فرمائیے کہ ہمارے اُستاذ کی یہ تقدیر بدل جائے، اللہ تعالیٰ ان کی شقاوت کو سعادت سے بدل دے، تو حضرت مجدد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں نے غور کیا، ''نَظَرْتُ فِی اللَّوْحِ الْمَحْفُوْظِ فَاِذَا فِیْهِ اَنَّهٗ قَضَاءٌ مُبْرَمٌ'' میں نے لوحِ محفوظ میں نظر ڈال کر دیکھا تو وہ تو اٹل فیصلہ تھا، وہ تو قضائے مبرم تھی، قطعی قضا، کہ جس کے اندر کوئی کسی قسم کا تغیر نہیں ہوسکتا تھا، تو میں نے بیٹوں کے سامنے ذکر کیا کہ یہ تو قضائے مبرم ہے، اس کے تو ٹلنے کا سوال ہی نہیں، بیٹوں نے پھر اصرار کیا کہ نہیں جی! کوئی نہ کوئی صورت ضرور ہونی چاہیے، تو پھر مجدد صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مجھے یاد آگیا کہ حضرت شیخ عبد القادر جیلانی رحمہ اللہ نے ایک جگہ لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے میری دُعا سے قضائے مبرم بھی ٹال دی تھی، تو مجھے بھی حوصلہ ہوگیا، میں نے اللہ کے سامنے ہاتھ اُٹھائے اور دُعا کی، جس میں یہی کہا کہ یا اللہ! جس طرح سے تُو نے اپنے اُس نیک بندے کی دُعا قبول کر کے قضائے مبرم ٹال دی تھی، میں بھی تیرے سامنے اِلتجا کرتا ہوں، اور میری دُعا کے ساتھ ملا طاہر لاہوری کی اس قضا کو بدل دے، شقی کی بجائے اس کو سعید کر دے۔ تو حضرت مجدد صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس کی پیشانی سے ''شقی'' کا لفظ مٹا اور ''سعید'' کا لفظ لکھ دیا گیا۔ قاضی صاحب نے اس واقعے کو اِسی آیت کے تحت بیان فرمایا۔

مذکورہ واقعے پر ایک اِشکال اور اس کا جواب

لیکن اس واقعے کے ذِکر کرنے کے بعد پھر خود ہی اِشکال کیا ہے کہ قضائے مبرم وہ ہوتی جو ٹلے نہیں، یہ تو ٹل گئی، پھر قضائے مبرم کیسے رہی؟ منطق میں جیسے آپ کہا کرتے ہیں کہ ھٰذَا خُلْفٌ یہ تو خلافِ مفروض ہوگیا، کہ اُدھر تو کہتے ہو کہ قضائے مبرم وہ ہے جو ٹل نہیں سکتی، اور اِدھر کہتے ہو کہ ٹل گئی، تو وہ قضائے مبرم کیسے ہوئی؟ پھر اس کا حل خود قاضی صاحب نے بیان فرمایا اور میں نے بعض کتابوں میں دیکھا ہے کہ غالباً حضرت مجدد رحمہ اللہ نے بھی یہی توجیہ فرمائی تھی، کہ اللہ تعالیٰ کے فیصلے لوحِ محفوظ میں یوں لکھے ہوئے ہوتے ہیں کہ کسی کی تو تعلیق ساتھ لکھ دی جاتی ہے کہ اگر ایسا ہوگیا تو اس کو بدل دیا جائے گا، اور کسی کی تعلیق کتاب میں لکھی ہوئی نہیں ہوتی، اللہ کے علم میں ہوتی ہے، کیونکہ اللہ کا علم سارا لوحِ محفوظ میں تو نہیں آگیا، اپنی حکمت کے تحت فیصلہ لکھ دیا جاتا ہے اور اس فیصلے کی شرط یا اس کی تعلیق اللہ کے علم میں ہوتی ہے، دیکھنے والا بظاہر سمجھتا ہے کہ یہ معلق نہیں بلکہ مبرم ہے، اور اللہ کے علم میں وہ معلق ہوتی ہے، تو یہاں بھی واقعہ ایسے ہی تھا کہ لوحِ محفوظ میں اس کی تعلیق مذکور نہیں تھی جس کی بنا پر ظاہری نظر میں اس کو مبرم سمجھا گیا، اور اللہ کے علم میں اس کی تعلیق تھی کہ حضرت مجدد دُعا کریں گے تو اس کو بدل دیا جائے گا، تو حضرت مجدد کی دُعا کے ساتھ اس میں تبدیلی آگئی۔

''نگاہِ مردِ مؤمن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں'' واقعات کی روشنی میں

اسی قسم کے واقعات ہیں جن کی وجہ سے عام طور پر ایک فقرہ مشہور ہے، وہ منسوب تو ہے علامہ اقبال کی طرف، لیکن مضمون اس کا صحیح ہے کہ ''نگاہِ مردِ مؤمن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں'' (بانگ درا) اور اس پر لوگوں کو بہت اِشکال ہوتا ہے، کہتے ہیں

کہ اگر نگاہِ مردِ مؤمن سے تقدیریں بدل جاتی ہیں تو نوح علیہ السلام نے اپنے بیٹے کی تقدیر کیوں نہ بدل دی؟ ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ کی کیوں نہ بدل دی؟ اس طرح دُنیا کے جتنے واقعات ہیں سارے اکٹھے کر کے بیٹھ جاتے ہیں۔ ہمارے علاقے میں ایک شاعر ہوتے تھے ''ظہیر الدین''، اس کی ایک بڑی لمبی نظم ہے اس بارے میں، یعنی اس شعر کی تردید میں کہ نگاہِ مردِ مؤمن سے تقدیر بدل سکتی ہے تو فلاں نے کیوں نہ بدل دی، فلاں نے کیوں نہ بدل دی؟ تو اصل بات یہ ہے کہ یہ قضیہ مہملہ ہے یہ کوئی موجبہ کلیہ نہیں کہ ہر مؤمن ہر کسی کی ہر تقدیر بدلنے کا باعث اور سبب بن جاتا ہے، اگر دعویٰ ایسا ہوتا تو جزئیات کے ساتھ اس کے اوپر انکار کیا جاسکتا، ورنہ ہم دیکھتے ہیں بزرگوں کی دُعاؤں سے اللہ تبارک وتعالیٰ بعض چیزیں دے دیتے ہیں، بعض تکلیفیں دُور ہٹا دیتے ہیں، تو ظاہری اسباب کے طور پر ان کی طرف تغیر کی نسبت کرنا کہ ان کی دُعا کی برکت سے اللہ نے یہ کر دیا، ان کی توجہ سے اللہ نے یہ کر دیا، یہ نسبت صحیح ہے۔ تو قضیہ مہملہ کے طور پر اگر اس کو ذکر کیا جائے تو اس میں کوئی کسی قسم کا اِشکال نہیں، البتہ موجبہ کلیہ صحیح نہیں کہ ہم کہیں کہ ہر مؤمن ہر کسی کی ہر تقدیر تبدیل کرواسکتا ہے، یہ بات نہیں ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور عمرو بن ہشام جس کو ''ابوجہل'' کہتے ہیں، دونوں کے لئے اللہ کے سامنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ اُٹھے، اس عنوان کے ساتھ کہ ''اَللّٰهُمَّ اَيِّدِ الْاِسْلَامَ بِعُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ اَوْ بِعَمْرِو بْنِ هِشَامٍ''[۱] تردید کے طور پر دو میں سے ایک مانگا، کہ اے اللہ اسلام کو قوت پہنچا، یا تو عمر بن خطاب کے ذریعے سے یا عمرو بن ہشام کے ذریعے سے۔ اللہ تعالیٰ نے عمر بن خطاب کو منتخب کر دیا۔ تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دُعا سے عمر بن خطاب کی تقدیر بدل گئی، کُفر سے ایمان نصیب ہوگیا، کیونکہ ظاہری سبب یہی پیش آیا، اس لیے ظاہری سبب کی طرف اس کی نسبت کی جاسکتی ہے۔ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اپنی ماں کی شکایت لے کے آئے، کہ جی! وہ آپ کو بُرا بھلا کہتی ہے، کُفر کرتی ہے، شرک کرتی ہے، اس کے لئے دُعا کیجیے، مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''اَللّٰهُمَّ اهْدِ اُمَّ اَبِي هُرَيْرَةَ''[۲] اے اللہ! ابوہریرہ کی ماں کو ہدایت دے دے، ابوہریرہ بشارت سُن کے واپس گئے تو جاتے ہی ماں نے کلمہ پڑھ لیا، اب اس قسم کے واقعات جو احادیث میں آتے ہیں تو ان کی طرف دیکھ کے سبب کے طور پر یہ نسبت کی جاسکتی ہے کہ فلاں کی دُعا سے تقدیر بدل گئی، یہ ظاہری سبب کے طور پر ہے، ورنہ اللہ کے علم میں کوئی کسی قسم کا تغیر نہیں ہوتا، وَعِنْدَهٗٓ اُمُّ الْكِتٰبِ: اصل کتاب اللہ کے پاس ہی ہے۔

مشرکین وکُفّار پر عذاب کی ایک صورت

آگے بھی رسول اللہ کے لئے تسلی ہے کہ یہ بار بار عذاب کا مطالبہ کرتے ہیں، ''جس چیز کا ہم نے ان سے وعدہ کیا اگر اس کا کچھ حصہ آپ کو دکھا دیں زندگی میں، یا آپ کو وفات دے دیں'' بہر حال یہ چھوٹ نہیں سکتے، ہم آپ کو وفات دیں یا آپ کے سامنے ہی عذاب ظاہر کر دیں، آپ کی زندگی میں اس کو نمایاں کر دیں اس میں کوئی حرج نہیں، ''آپ کے ذِمّے تو پہنچا دینا ہے، حساب ہمارے ذِمّے ہے'' چاہے آپ کی زندگی میں ان کا محاسبہ کر لیں، چاہے آپ کی وفات کے بعد۔ اور ان کو اس بات میں محتاط ہوجانا چاہیے کہ اللہ کا عذاب آنے والا ہے، یہ دیکھتے نہیں؟ کہ ان کی حکومت دن بدن ختم ہوتی جارہی ہے، اسلام اردگرد پھیلتا جارہا

(۱) ترمذی ۲۰۹/۲ باب فی مناقب عمر۔ ولفظه: اَللّٰهُمَّ اَعِزَّ الْاِسْلَامَ بِاَبِي جَهْلِ ابْنِ هِشَامٍ اَوْ بِعُمَرَ۔
(۲) صحیح مسلم ۳۰۱/۲ باب من فضائل ابی ہریرة/مشکوٰة ۵۳۵/۲ باب فی المعجزات، فصل اول، عن ابی ہریرة۔

ہے، اور اسلام پھیلنے کے ساتھ ان کا علاقہ سکڑتا چلا جا رہا ہے، تو آخر ایک دن آ جائے گا کہ سارا علاقہ ہی اسلام کے زیر اثر آ جائے گا، ''کیا یہ دیکھتے نہیں کہ ہم آ رہے ہیں زمین کو گھٹاتے ہوئے'' یہ گھٹانا اسلام کے پھیلنے کے ساتھ ہے، کہ کفر کی عمل داری ختم ہو رہی ہے، مشرکین کا اثر و رسوخ ختم ہو رہا ہے، اور قبائل دِن بدن اسلام قبول کرتے جا رہے ہیں، اور ان کا علاقہ سکڑتا جا رہا ہے، ''اللہ تعالیٰ فیصلہ کرنے والا ہے، اور اس کے فیصلے کو باطل کرنے والا کوئی نہیں'' کوئی شخص ایسا نہیں جو اللہ کے حکم کے پیچھے لگ جائے اور اس کے فیصلے کو باطل کر دے، وَهُوَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ: اور وہ بہت جلد حساب لینے والا ہے۔ یہ سورۃ چونکہ مکی ہے اس لیے اَنَّا نَاْتِي الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا یہ اِشاعتِ اسلام سے تعلق رکھتا ہے، جیسے جیسے لوگ مسلمان ہوتے جا رہے ہیں مشرکین کا اثر ختم ہوتا چلا جا رہا ہے، تو گویا کہ ان کا علاقہ سمٹتا جا رہا ہے، اور اگر اس سورت کو مدنی قرار دیا جائے جس طرح سے اِبتدا میں آپ کے مصاحف میں ''مدنی'' ہونا ہی لکھا ہوا ہے، تو پھر فتوحات بھی مراد ہو سکتی ہیں، لیکن راجح یہی ہے کہ سورۃ مکی ہے، مدنی نہیں۔

منکرین کا انجام

وَقَدْ مَكَرَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلِلّٰهِ الْمَكْرُ جَمِيْعًا: حق کو شکست دینے کے لئے اور اہلِ حق کو تنگ کرنے کے لئے پہلے لوگوں نے بھی بڑے بڑے مکر کیے تھے، بڑی بڑی تدبیریں کی تھیں، لیکن ہر تدبیر اللہ ہی کے لئے ہے، اللہ چاہے تو اس میں اثر نمایاں ہوتا ہے اور اگر اللہ نہ چاہے تو اس تدبیر کے اندر کوئی کسی قسم کا اثر نمایاں نہیں ہوتا، اللہ تعالیٰ کا علم محیط ہے، وہ جانتا ہے جو کچھ کرتا ہے کوئی نفس، یعنی ہر نفس جو کچھ بھی کرے اللہ تعالیٰ سب جانتا ہے، وَسَيَعْلَمُ الْكُفّٰرُ لِمَنْ عُقْبَى الدَّارِ: عنقریب کافر جان لیں گے کہ آخرت کا اچھا انجام کس کے لئے ہے۔

سرورِ کائنات ﷺ کی رِسالت پر اللہ کی اور اہلِ علم کی شہادت

وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا: اور کہتے ہیں وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا، لَسْتَ مُرْسَلًا: کہ تو رسول نہیں ہے، آپ اپنی رسالت کو ان کے سامنے پیش کرتے ہیں وہ کہتے ہیں لَسْتَ مُرْسَلًا، آپ کہہ دیجیے کہ اللہ گواہ کافی ہے میرے اور تمہارے درمیان، اور اہلِ علم گواہ کافی ہیں۔ ''اہلِ علم'' سے مراد وہی اہلِ علم ہیں جن کا ذکر پیچھے آیا تھا: اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَفْرَحُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ، نصاریٰ میں سے جو منصف تھے وہ ایمان لے آئے، یہود میں سے جو منصف تھے ایمان لے آئے ان کی شہادت بھی میری رسالت کو ثابت کرنے کے لئے کافی ہے، اور اللہ کی شہادت بھی کافی ہے، اور اللہ کی شہادت سے مراد ہوتا ہے معجزات کا اظہار، کہ اللہ نے میرے پر یہ کتاب اُتاری جس کی مثال تم نہیں لا سکتے، یہ اللہ کی شہادت ہے کہ میں اللہ کا رسول ہوں، اور اسی طرح سے دیگر معجزات جو میرے ہاتھ پہ ظاہر ہو رہے ہیں وہ اللہ کی شہادت ہے، تو اللہ کی شہادت بھی کافی، اور اہلِ علم کی شہادت بھی کافی، تم اگر نہیں مانتے تو نہ سہی، میرا دعویٰ دلیل کے ساتھ مدلل ہے۔ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا، اللہ، کفی کا فاعل ہے اور فاعل کے اوپر باء زائدہ آئی ہوئی ہے۔ ''کافی ہے گواہ اللہ میرے اور تمہارے درمیان، اور کافی ہے گواہ وہ شخص جس کے پاس کتاب کا علم ہے۔''

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ
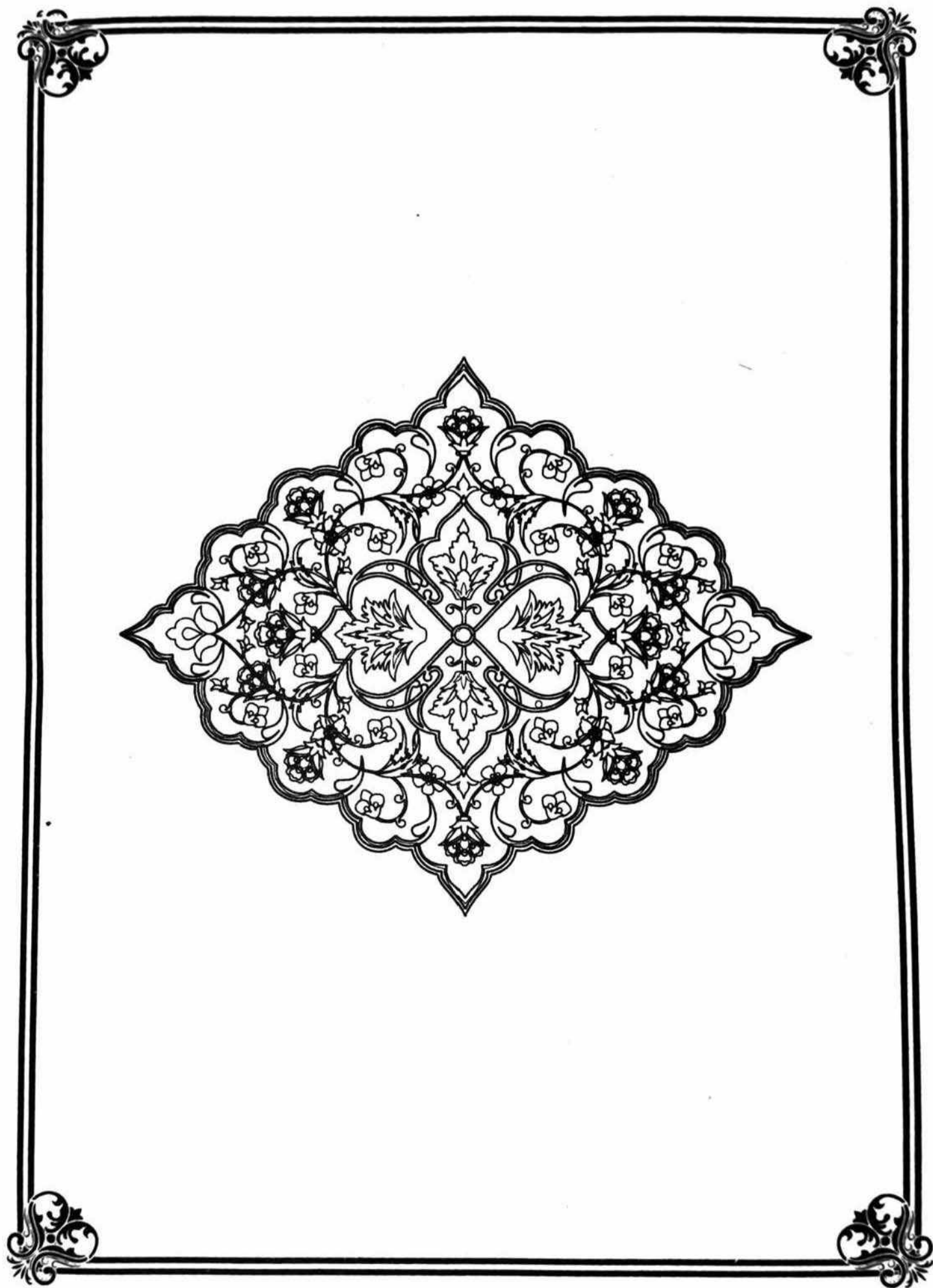
سُورَةُ اِبْرَاهِيمَ
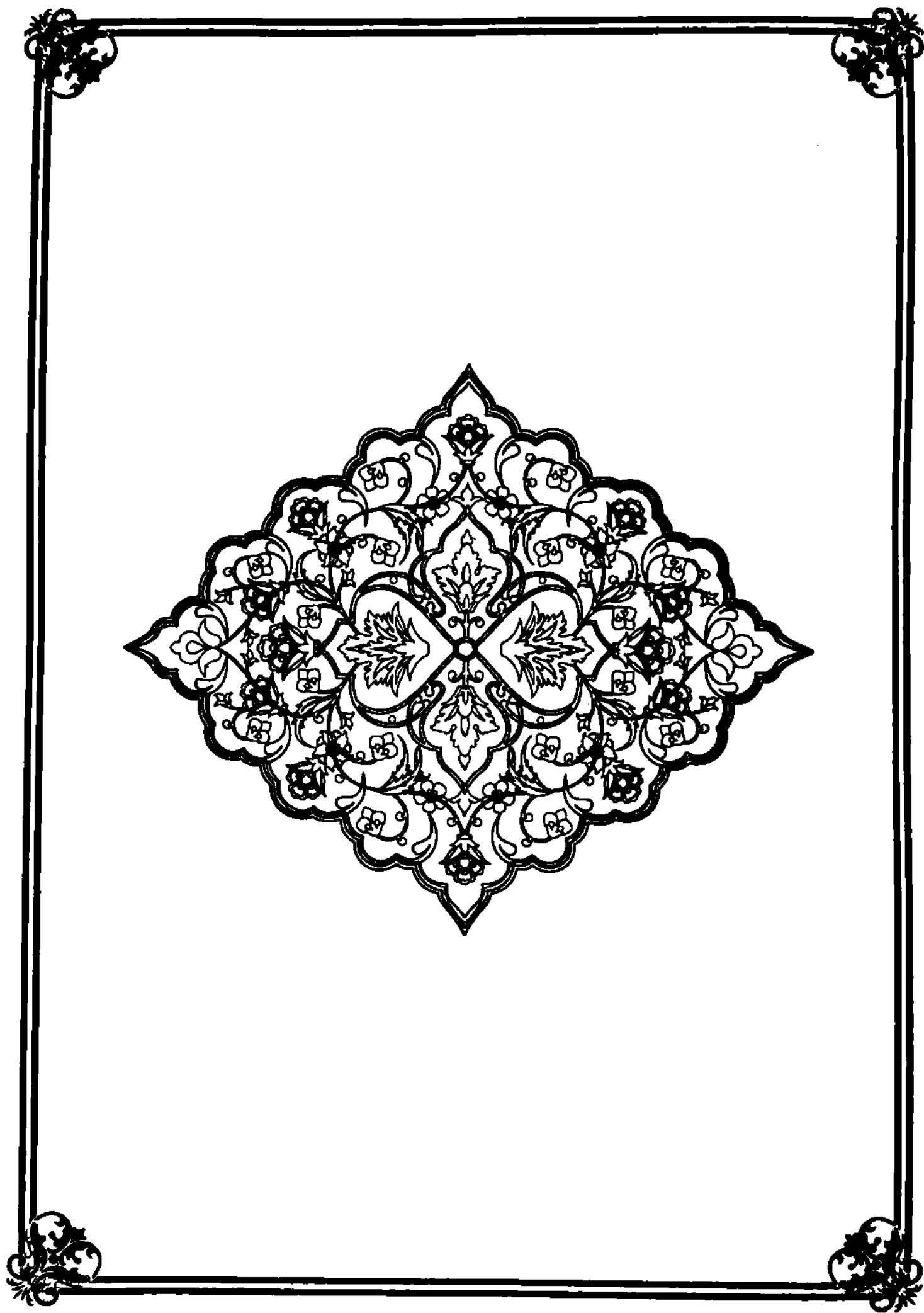
آیاتها ۵۲ ۱۴ سُوْرَۃُ اِبْرٰهِیْمَ مَکِّیَّۃٌ ۷۲ رکوعاتها ۷

سورۂ ابراہیم مکہ میں اُتری اور اس کی ۵۲ آیتیں ہیں سات رُکوع ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے۔

الٓرٰ ۚ كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَیْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۙ بِاِذْنِ رَبِّهِمْ

الٓرٰ۔ یہ کتاب ہے ہم نے اس کو اُتارا آپ کی طرف، تاکہ آپ نکالیں لوگوں کو تاریکیوں سے نُور کی طرف ان کے ربّ کے اِذن سے،

اِلٰى صِرَاطِ الْعَزِیْزِ الْحَمِیْدِ ۙ ① اللّٰهِ الَّذِیْ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا

یعنی اس کے راستے کی طرف جو عزت والا ہے تعریف کیا ہوا ہے ① یعنی اللہ جس کے لئے وہ سب چیزیں جو آسمانوں میں ہیں اور جو

فِی الْاَرْضِ ؕ وَوَیْلٌ لِّلْكٰفِرِیْنَ مِنْ عَذَابٍ شَدِیْدِ ۙ ② الَّذِیْنَ یَسْتَحِبُّوْنَ الْحَیٰوةَ

زمین میں ہیں، اور خرابی ہے کافروں کے لئے یعنی سخت عذاب ② جو دنیوی زندگی کو آخرت کے مقابلے

الدُّنْیَا عَلَى الْاٰخِرَةِ وَیَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَیَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ؕ اُولٰٓئِكَ فِیْ ضَلٰلٍ

میں پسند کرتے ہیں اور اللہ کے راستے سے روکتے ہیں اور اس میں کجی تلاش کرتے ہیں یہ لوگ بہت دُور کی گمراہی

بَعِیْدٍ ③ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِیُبَیِّنَ لَهُمْ ؕ

میں پڑے ہوئے ہیں ③ نہیں بھیجا ہم نے کسی رسول کو مگر اس کی قوم کی زبان میں تاکہ وہ رسول ان کے لئے اللہ کے احکام کو واضح کرے،

فَیُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ یَّشَآءُ وَیَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ ؕ وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ④ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا

پھر اللہ تعالیٰ بھٹکاتا ہے جس کو چاہتا ہے اور صحیح راستے پر چلاتا ہے جس کو چاہتا ہے، وہ زبردست ہے حکمت والا ہے ④ البتہ تحقیق بھیجا

مُوْسٰى بِاٰیٰتِنَآ اَنْ اَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۙ وَذَكِّرْهُمْ بِاَیّٰىمِ اللّٰهِ ؕ

ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو اپنی نشانیوں کے ساتھ کہ نکال تُو اپنی قوم کو ظلمات سے نُور کی طرف اور یاد دِلا انہیں اللہ تعالیٰ کے معاملات،

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ⑤ وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ

بے شک اس میں البتہ نشانیاں ہیں ہر صابر شاکر کے لئے ⑤ یاد کیجئے جب موسیٰ علیہ السلام نے کہا اپنی قوم کو کہ یاد کرو اللہ کا احسان

عَلَيْكُمْ اِذْ اَنْجٰىكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ وَيُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ

جو تم پر ہے جب اس نے تمہیں نجات دی فرعون کے لوگوں سے جو تمہیں پہنچاتے تھے سخت عذاب، ذبح کرتے تھے تمہارے بیٹوں کو

وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ ؕ وَفِيْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ ۝۶ وَاِذْ تَاَذَّنَ

اور زندہ چھوڑتے تھے تمہاری عورتوں کو، اور اس میں آزمائش تھی تمہارے رب کی طرف سے بہت بڑی ۝۶ اور یاد کیجئے جبکہ اطلاع دی

رَبُّكُمْ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ ۝۷ وَقَالَ مُوْسٰٓى

تمہارے رب نے کہ اگر تم شکر کرو گے تو میں تمہیں زیادہ دوں گا، اور اگر تم ناشکری کرو گے تو پھر میرا عذاب بہت سخت ہے ۝۷ کہا موسیٰ علیہ السلام

اِنْ تَكْفُرُوْٓا اَنْتُمْ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ حَمِيْدٌ ۝۸ اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَبَؤُا

نے کہ اگر ناشکری کرو تم اور وہ سب لوگ جو زمین میں موجود ہیں تو اللہ تعالیٰ بے نیاز ہے تعریف کیا ہوا ہے ۝۸ کیا تمہارے پاس خبر نہیں آئی

الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ قَوْمِ نُوْحٍ وَّعَادٍ وَّثَمُوْدَ ۬ؕ وَالَّذِيْنَ مِنْ بَعْدِهِمْ ؕ لَا يَعْلَمُهُمْ

ان لوگوں کی جو تم سے پہلے گزرے ہیں یعنی قوم نوح کی، عاد کی، ثمود کی اور ان لوگوں کی جو کہ ان کے بعد ہیں، ان کو سوائے اللہ کے

اِلَّا اللّٰهُ ؕ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَرَدُّوْٓا اَيْدِيَهُمْ فِيْٓ اَفْوَاهِهِمْ وَقَالُوْٓا

کوئی نہیں جانتا، ان کے پاس ان کے رسول آئے واضح دلائل لے کر، لوٹا دیا ان لوگوں نے اپنے ہاتھوں کو اپنے مونہوں میں، اور یہ کہا

اِنَّا كَفَرْنَا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ وَاِنَّا لَفِيْ شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَنَآ اِلَيْهِ مُرِيْبٍ ۝۹

کہ ہم نے کفر کیا اس چیز کے ساتھ جس کے ساتھ تم بھیجے گئے اور بے شک ہم البتہ ایسی شک میں ہیں جو ہمیں تردد میں ڈالے ہوئے ہے ۝۹

قَالَتْ رُسُلُهُمْ اَفِي اللّٰهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ يَدْعُوْكُمْ

ان کے رسولوں نے کہا کیا تم اللہ کے بارے میں شک کرنے والے ہو؟ جو پیدا کرنے والا ہے آسمانوں کو اور زمین کو، دعوت دیتا ہے تمہیں

لِيَغْفِرَ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَيُؤَخِّرَكُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ قَالُوْٓا اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ؕ

تاکہ بخش دے تمہیں تمہارے گناہ اور تاکہ مہلت دے تمہیں ایک متعین وقت تک، وہ کہنے لگے کہ نہیں ہو تم مگر بشر ہم جیسے،

تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَصُدُّوْنَا عَمَّا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا فَاْتُوْنَا بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ۝۱۰ قَالَتْ

ارادہ کرتے ہو تم کہ روک دو ہمیں اس چیز سے جس کی عبادت کرتے تھے ہمارے آباء، پس لے آؤ تم ہمارے پاس واضح دلیل ۝۱۰ کہا

لَهُمْ رُسُلُهُمْ اِنْ نَّحْنُ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَمُنُّ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ

ان کو ان کے رسولوں نے نہیں ہیں ہم مگر بشر تم جیسے، لیکن اللہ تعالیٰ احسان کرتا ہے جس پر چاہتا ہے اپنے بندوں میں سے،

وَمَا كَانَ لَنَآ اَنْ نَّاْتِيَكُمْ بِسُلْطٰنٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ

نہیں ہے ہمارے لیے کہ ہم لے آئیں تمہارے پاس کوئی دلیل مگر اللہ کی توفیق کے ساتھ، اور اللہ پر ہی چاہیے کہ بھروسا کریں

الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۱﴾ وَمَا لَنَآ اَلَّا نَتَوَكَّلَ عَلَى اللّٰهِ وَقَدْ هَدٰىنَا سُبُلَنَا ؕ وَلَنَصْبِرَنَّ

ایمان لانے والے (۱۱) کیا ہو گیا ہمیں کہ ہم بھروسا نہ کریں اللہ پر حالانکہ ہمارے راستے اس نے ہمیں دکھا دیے، اور البتہ ضرور صبر کریں گے

عَلٰى مَآ اٰذَيْتُمُوْنَا ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ﴿۱۲﴾ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِرُسُلِهِمْ

تمہارے تکلیف پہنچانے پر، اور اللہ پر چاہیے کہ توکل کرنے والے توکل کریں (۱۲) کہا ان لوگوں نے جنھوں نے کفر کیا اپنے رسولوں کو،

لَنُخْرِجَنَّكُمْ مِّنْ اَرْضِنَآ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا ؕ فَاَوْحٰٓى اِلَيْهِمْ

البتہ ضرور نکال دیں گے ہم تمہیں اپنے علاقے سے یا البتہ ضرور لوٹ آؤ گے تم ہمارے طریقے میں، پس وحی بھیجی ان (رسولوں) کی طرف

رَبُّهُمْ لَنُهْلِكَنَّ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۳﴾ وَلَنُسْكِنَنَّكُمُ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ؕ ذٰلِكَ

ان کے رب نے البتہ ضرور ہلاک کریں گے ہم ظالموں کو (۱۳) اور البتہ ضرور ٹھہرائیں گے ہم تمہیں زمین میں ان کے بعد، یہ (وعدہ)

لِمَنْ خَافَ مَقَامِيْ وَخَافَ وَعِيْدِ ﴿۱۴﴾ وَاسْتَفْتَحُوْا وَخَابَ كُلُّ

اس شخص کے لئے ہے جو کہ میرے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرے اور میری وعید کا خوف کرے (۱۴) انبیاء نے فتح طلب کی اور نامراد ہوا ہر

جَبَّارٍ عَنِيْدٍ ﴿۱۵﴾ مِّنْ وَّرَآئِهٖ جَهَنَّمُ وَيُسْقٰى مِنْ مَّآءٍ صَدِيْدٍ ﴿۱۶﴾ يَّتَجَرَّعُهٗ وَلَا يَكَادُ

جابر ضدی (۱۵) اس کے سامنے جہنم ہے، پلایا جائے گا وہ پانی یعنی پیپ (۱۶) گھونٹ گھونٹ کر کے پیے گا اس کو اور نہیں قریب کہ

يُسِيْغُهٗ وَيَاْتِيْهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّمَا هُوَ بِمَيِّتٍ ؕ وَمِنْ وَّرَآئِهٖ عَذَابٌ

گزار لے اس کو اپنے حلق سے، آئے گی اس کے پاس موت ہر طرف سے لیکن وہ مرے گا نہیں، اور اس کے سامنے سخت

غَلِيْظٌ ﴿۱۷﴾ مَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ اَعْمَالُهُمْ كَرَمَادِ ۣاشْتَدَّتْ بِهِ

عذاب ہے (۱۷) مثال ان لوگوں کی جنھوں نے کفر کیا اپنے رب کے ساتھ ان کے اعمال اس راکھ کی طرح ہوں گے جس کے اوپر سخت ہوا

الرِّيْحُ فِيْ يَوْمٍ عَاصِفٍ ؕ لَا يَقْدِرُوْنَ مِمَّا كَسَبُوْا عَلٰى شَيْءٍ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ

چل پڑی ہو آندھی والے دن میں، نہیں قادر ہوں گے یہ اپنے کیے ہوئے میں سے کسی شی پر، یہ بہت دُور کی

الْبَعِيْدُ ﴿۱۸﴾ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ؕ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ

گمراہی ہے ⑱ کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ بے شک پیدا کیا اللہ تعالیٰ نے آسمانوں کو اور زمین کو ٹھیک، اگر چاہے تو لے جائے تم سب کو

وَيَاْتِ بِخَلْقٍ جَدِيْدٍ ﴿۱۹﴾ وَّمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ ﴿۲۰﴾ وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ جَمِيْعًا فَقَالَ

اور لے آئے نئی مخلوق کو ⑲ اور یہ بات اللہ پر گراں نہیں ⑳ یہ سارے کے سارے اللہ کے سامنے ظاہر ہو جائیں گے، کہیں گے

الضُّعَفٰٓؤُا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا فَهَلْ اَنْتُمْ مُّغْنُوْنَ عَنَّا مِنْ عَذَابِ اللّٰهِ

کمزور لوگ ان لوگوں کو جو کہ بڑے بنے ہوئے ہیں بے شک ہم تمہارے تابع تھے، کیا تم دُور ہٹانے والے ہو ہم سے اللہ کے عذاب

مِنْ شَيْءٍ ؕ قَالُوْا لَوْ هَدٰىنَا اللّٰهُ لَهَدَيْنٰكُمْ ؕ سَوَآءٌ عَلَيْنَآ اَجَزِعْنَآ اَمْ

سے کوئی چیز؟ وہ کہیں گے اگر اللہ ہمیں سیدھے راستے پہ چلاتا تو ہم تمہیں بھی ہدایت دیتے، برابر ہے ہم پر کہ ہم بے صبری کریں یا

صَبَرْنَا مَا لَنَا مِنْ مَّحِيْصٍ ﴿۲۱﴾ وَقَالَ الشَّيْطٰنُ لَمَّا قُضِيَ الْاَمْرُ اِنَّ اللّٰهَ

ہم صبر کریں، ہمارے لیے ہٹنے کی کوئی جگہ نہیں ہے ㉑ اور شیطان کہے گا جس وقت کہ فیصلہ ہو جائے گا امر کا، بے شک اللہ نے

وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ وَوَعَدْتُّكُمْ فَاَخْلَفْتُكُمْ ؕ وَمَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ

تم سے وعدہ کیا تھا اور سچا وعدہ کیا تھا اور کچھ میں نے بھی تم سے وعدے کیے تھے پھر میں نے وہ وعدے پورے نہیں کیے، مجھے تم پر

مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّآ اَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِيْ ۚ فَلَا تَلُوْمُوْنِيْ

کوئی زور حاصل نہیں تھا سوائے اس کے کہ میں نے تمہیں دعوت دی تھی، تم نے میری وہ دعوت قبول کر لی، پس تم مجھے ملامت نہ کرو،

وَلُوْمُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ؕ مَآ اَنَا بِمُصْرِخِكُمْ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُصْرِخِيَّ ؕ اِنِّيْ كَفَرْتُ بِمَآ

اپنے آپ کو ملامت کرو، نہیں ہوں میں تمہارے لیے کوئی مدد کرنے والا، اور تم میری فریاد رسی کرنے والے نہیں ہو، اس سے پہلے جو

اَشْرَكْتُمُوْنِ مِنْ قَبْلُ ؕ اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۲۲﴾ وَاُدْخِلَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا

تم نے مجھے شریک ٹھہرایا میں اس کا انکار کرتا ہوں، بے شک ظالموں کے لئے دردناک عذاب ہے ㉒ داخل کیے جائیں گے وہ لوگ جو ایمان لائے

وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ ؕ
اور انہوں نے نیک عمل کیے، باغات میں، جاری ہوں گی ان کے نیچے سے نہریں، ہمیشہ رہنے والے ہوں گے اس میں،
تَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ ﴿۲۳﴾
ان کا آپس میں تحیہ اس میں سلام ہوگا ﴿۲۳﴾

تفسیر

سورۂ ابراہیم کے مضامین کا خلاصہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ سورۂ ابراہیم مکہ میں اتری اور اس کی ۵۲ آیتیں ہیں سات رکوع ہیں، مکی سورتوں کی طرح اس میں اصول کا ذکر ہی آئے گا، سرورِ کائنات ﷺ کی رسالت کا ذکر ہوگا، اور اس کی تائید کے لئے انبیاء علیہم السلام کا ذکر اجمالاً کیا جائے گا، کہ جس وقت انبیاء علیہم السلام آئے تھے تو ان کے مخاطبین نے بھی اسی قسم کے شبہات پیش کیے تھے، بشر ہونے کی بنا پر انکار کیا، اپنے آباؤ اجداد کے طریقہ کے خلاف ہونے کی بناء پر ان کے طریقے کا انکار کیا، اور انبیاء علیہم السلام نے ان کے سامنے توحید پیش کی، رسالت کی وضاحت فرمائی، معاد کا تذکرہ کیا، اس سے سرورِ کائنات ﷺ کی دعوت کا تسلسل اور ماقبل کے انبیاء علیہم السلام کے ساتھ مماثلت کا ذکر واضح طور پر ہو جائے گا۔ اور پھر ان واقعات کے سلسلے میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر خصوصیت سے آئے گا اور کچھ تفصیل سے، کہ انہوں نے جو بیت اللہ بنایا تھا جس کے مجاور ہونے کی بناء پر یہ قریش عرب کی سیادت اور قیادت حاصل کیے ہوئے ہیں، اور ان کو دوسرے قبائل کے اوپر برتری حاصل ہے، اور اسی بیت اللہ کی وجہ سے یہ دنیا کے اندر خوش حال ہیں، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف یہ نسبت بھی رکھتے ہیں اور اس نسبت کے اوپر فخر بھی کرتے ہیں، تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ بیت اللہ کس مقصد کے لئے بنایا تھا، اور اپنی اولاد کو اس بیت اللہ کے پاس کس لیے آباد کیا تھا، تو اس کی وضاحت اللہ تبارک وتعالیٰ فرمائیں گے کہ اس لیے بنایا گیا تھا تا کہ اللہ کی عبادت کریں اور کفر و شرک سے بچیں، اور آج اس بیت اللہ کے مجاور اس مقصد کے خلاف چل رہے ہیں، اس لیے ان کا اپنے آپ کو ابراہیم علیہ السلام کی طرف منسوب کر کے اس نسبتِ ابراہیمی پر فخر کرنا یہ غلط ہے، اس کی وضاحت خصوصیت کے ساتھ کی جائے گی۔ اور پھر قرآنِ کریم کی عادت تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ مضمون ایک سے دوسری طرف منتقل ہوتا چلا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کا تذکرہ ہوگا، اور ساتھ ساتھ ماننے والوں کے لئے دنیا اور آخرت کی بشارت بھی ہوگی، اور نہ ماننے والوں کے لئے وعید کا تذکرہ بھی ہوگا، دنیا کے اندر ان کی بربادی کا ذکر ہوگا، اور آخرت میں عذابِ جہنم کا ذکر آئے گا۔ پھر خصوصیت سے جو لوگ بڑوں کے پیچھے لگنے کی بناء پر سوچنے کے عادی نہیں، تو یہ بتایا جائے گا کہ آج جو اپنے بڑوں کے پیچھے لگے ہوئے ہیں، اور ان

سرداروں کی مخالفت کی جرأت نہیں کرتے، قیامت کے دن یہ کس طرح سے ایک دوسرے کے اوپر لعنت بھیجیں گے اور ایک دوسرے کے اوپر پھٹکار کریں گے، بڑے چھوٹوں سے بیزار ہوجائیں گے اور چھوٹے بڑوں سے بیزار ہوجائیں گے، اور دنیا کے اندر انہوں نے جس قسم کے تعلقات قائم کررکھے ہیں یہ کوئی کام نہیں آئیں گے۔ اور پھر خصوصیت سے ان کا جو مہالیڈر ہے، بڑا لیڈر، ابلیسِ لعین، جو ان سب کو برائیوں پر اُکساتا ہے، اور انبیاء ﷺ کی مخالفت پر ابھارتا ہے، تو جہنم میں جس وقت یہ چھوٹے اور بڑے آپس میں الجھ پڑیں گے، ضعفاء اور مستکبرین کی آپس میں زبان درازی ہوگی، ایک دوسرے پر لعنت کریں گے، تو اس کے بعد پھر یہ اکٹھے ہو کے سارے ابلیس کے پاس جائیں گے، کہ تو اس قسم کی چیزیں ہمیں سکھاتا تھا، ہمیں بہکاتا تھا، آج تیرا کیا خیال ہے، تو کچھ کام آسکتا ہے کہ نہیں آسکتا؟ تو اس سورت میں خصوصیت کے ساتھ ابلیس کا خطبہ ذکر کیا جائے گا جو جہنم میں اس نے جہنمیوں کے سامنے دینا ہے، اس کے ذکر کرنے سے بھی مقصد یہی ہے کہ آج تم اس کی چالوں کو سمجھتے نہیں، اور قیامت کے دن تمہارے سامنے یہ بات آجائے گی کہ وہ تمہیں بہکاتا تھا اور غلط راستے پر ڈالتا تھا، سبز باغ دکھاتا تھا، کیا کیا باتیں وہ تمہارے دل میں وہ اِلقاء کرتا تھا، لیکن وہ سب جھوٹ نکلیں، اور اللہ تعالیٰ کے راستے کو چھوڑ کر اس کے راستے پر چلنا دنیا و آخرت میں خسارے کا باعث ہے۔ اس قسم کا مضمون ہے جو اس سورت کے اندر ذکر کیا گیا، الفاظ بھی نہایت آسان ہیں اور مفہوم بھی بہت واضح ہے، اس لیے میں کچھ کچھ وضاحت ساتھ ساتھ ہی کرتا چلا جاؤں گا ترجمے میں، دوبارہ پھر اس کے اوپر مسلسل تقریر کی ضرورت نہیں ہوگی، بار بار گزرے ہوئے مضامین ہیں، نئی بات کوئی نہیں۔

قرآنِ کریم اُتارنے کا مقصد...... ہدایت حقیقتاً من جانب اللہ ہے

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ الٓرٰ: بہت دفعہ آپ کے سامنے ان کا تذکرہ ہوگیا کہ یہ حروفِ مقطعات ہیں، اللہ اعلم بمرادہ بذالك، ان حروف سے اللہ کی جو مراد ہے وہ اللہ ہی بہتر جانتے ہیں۔ پہلی آیات میں سرورِ کائنات ﷺ کی رسالت مذکور ہے، اور آپ کی رسالت کی دلیل چونکہ یہ کتاب ہے جو اللہ تعالیٰ نے آپ کی طرف اتاری، تو پہلے کتاب کا تذکرہ ہے، کِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ: هٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ یہ کتاب ہے، ہم نے اس کو اتارا آپ کی طرف۔ آگے اس کتاب کے اتارنے کا مقصد واضح کیا گیا ہے، لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ: تاکہ آپ نکالیں لوگوں کو تاریکیوں سے نور کی طرف، بِاِذْنِ رَبِّهِمْ: ان کے رَبّ کے اِذن سے، ان کے رَبّ کی توفیق سے۔ ظلمات ظلمۃ کی جمع ہے، تاریکی۔ ہدایت کا راستہ ایک ہی ہے اس لیے نور کو واحد کے ساتھ ذکر کیا گیا، اور گمراہی کے راستے بہت سارے ہیں اس لیے اس کو ظلمات کے ساتھ تعبیر کر دیا گیا۔ نکالنا آپ کا اسی طرح سے ہے رہنمائی کرکے، وعظ و تلقین کے ساتھ، باقی حقیقتاً ہدایت جو نصیب ہوتی ہے وہ اللہ کی طرف سے ہی ہے، اس لیے بِاِذْنِ رَبِّهِمْ کی قید ساتھ لگ گئی۔ تو لِتُخْرِجَ میں یہ مقصد واضح کر دیا گیا کہ کتاب کو اس لیے اتارا ہے تاکہ آپ نکالیں لوگوں کو۔ النَّاسَ کے لفظ کے ساتھ تعبیر کر دیا، معلوم ہوگیا کہ کسی گروہ یا کسی خاص قوم کے ساتھ اس کا تعلق نہیں، بلکہ جو بھی النَّاسَ کا مصداق ہے وہ سب اس کتاب کا

مخاطب ہے، اور سرورِ کائنات ﷺ اس کی طرف پیغمبر بنا کے بھیجے گئے ہیں، آپ ﷺ کی رسالت عام ہے۔ ''تاکہ نکالے تو لوگوں کو تاریکیوں سے نور کی طرف اُن کے رَبّ کے اِذن سے'' اِلٰی صِرَاطِ الْعَزِیْزِ الْحَمِیْدِ ۙ اللّٰهِ الَّذِیْ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ: یہ اِلَى النُّوْرِ سے بدل ہے۔ نور کی طرف نکالے یعنی عزیز حمید کے راستے کی طرف نکالے۔ عزیز: عزت والا۔ حمید: صفتایا ہوا، تعریف کیا ہوا۔ اور اللہ یہ بھی اُس کا بیان ہے، یعنی عزیز حمید کا مصداق اللہ ہے، جس کے لئے وہ سب چیزیں ہیں جو آسمانوں میں ہیں، جو زمین میں ہیں۔ وَوَیْلٌ لِّلْکٰفِرِیْنَ: اور خرابی ہے کافروں کے لئے، مِنْ عَذَابٍ شَدِیْدٍ: یہ وَیْلٌ کا بیان ہے۔ تو یہ راستہ جس کی طرف قرآنِ کریم بلا رہا ہے یا سرورِ کائنات ﷺ دعوت دے رہے ہیں وہ نور کا مصداق بھی ہے اور صراط کا مصداق بھی ہے، یعنی اگر کوئی شخص اللہ تعالیٰ کا راستہ اختیار کرنا چاہتا ہے جو اس کو اللہ تعالیٰ تک پہنچا دے تو وہ یہی راستہ ہے جس کی طرف قرآنِ کریم دعوت دے رہا ہے۔ آگے اللہ کی صفت ذکر کر دی جس میں ظاہر ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ ساری کائنات کے مالک ہیں، اور منکرین کے لئے وَیل ہے، وَیل کا معنی خرابی، اور مِنْ عَذَابٍ شَدِیْدٍ اس وَیل کا بیان ہے، ''خرابی ہے کافروں کے لئے یعنی سخت عذاب۔''

منکرین کی غلط عادات

اَلَّذِیْنَ یَسْتَحِبُّوْنَ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا عَلَی الْاٰخِرَةِ: لفظوں میں تو یہ کافرین کی صفت ہے کہ کافر وہ لوگ ہیں جو دنیوی زندگی کو آخرت کے مقابلے میں پسند کرتے ہیں، لیکن اصل میں ان کے کُفر کی وجہ پر بھی اس میں روشنی پڑ گئی کہ انہوں نے کُفر جو اختیار کر رکھا ہے تو اس کی اصل وجہ یہی ہے کہ دنیا کی محبت مبتلا ہیں، اور آخرت کے مقابلے میں اس کو ترجیح دیتے ہیں۔ وَیَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ: اور اللہ کے راستے سے روکتے ہیں، یعنی خود گمراہ ہیں، دوسروں کو بھی روکتے ہیں، وَیَبْغُوْنَهَا عِوَجًا: طلب کرتے ہیں اس راستے کو۔ عِوَج: کجی۔ یعنی اس راستے میں کجی طلب کرتے ہیں، کجی طلب کرنے کا ایک مطلب تو یہ ہوتا ہے کہ ہر وقت متلاشی رہتے ہیں کہ ہمیں کوئی اعتراض کی بات مل جائے تاکہ ہم لوگوں کو وہ اعتراض کی بات بتائیں اور اس سے بدظن کریں، جس طرح سے مخالفین کا طریقہ ہوا کرتا ہے کہ مخالف نظریے کے ساتھ کسی کی وعظ سنتے ہیں تقریر سنتے ہیں، تو اس میں یہ نہیں دیکھا کرتے کہ اچھی باتیں کتنی آ گئیں، بلکہ یہ تلاش کیا کرتے ہیں کہ اس نے غلط لفظ کونسا استعمال کیا ہے یا غلط بات کونسی کہی ہے، پھر بعد میں تشہیر جو کی جاتی ہے تو وہ اسی غلطی کی اور اسی لغزش کی جاتی ہے، اچھی باتوں کا تذکرہ نہیں ہوتا۔ تو یہ بھی قرآنِ کریم کو مخالفانہ ذہن کے ساتھ سنتے ہیں، معاندانہ ذہن کے ساتھ اس کے اوپر غور کرتے ہیں، مقصد ان کا یہ ہے کہ اس میں کوئی نہ کوئی اعتراض کی بات نکال لیں تاکہ اس بات کے ذریعے سے ہم لوگوں کے سامنے اپنے مسلک کو واضح کر سکیں اور اس راستے سے روک سکیں، یَبْغُوْنَهَا عِوَجًا کا یہ معنی ہے، ہر وقت اس راستے کے اندر کجی کے طالب ہیں، کجی کے متلاشی ہیں، کہ ان کے ہاتھ میں کوئی کجی، کوئی اعتراض کی بات، کوئی کمی آ جائے۔ اور اس کا ایک مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ خود صراطِ مستقیم پر نہیں، بلکہ یہ خود ٹیڑھے راستے پر ہیں، اور اسی ٹیڑھے راستے کو یہ قرآنِ کریم میں تلاش کرتے ہیں، مطلب یہ ہے کہ یہ قرآنِ کریم کو اگر سنتے ہیں یا اس میں اگر غور کرتے ہیں تو اس لیے غور نہیں کرتے کہ ہمارے سامنے

قرآن سے کوئی راستہ واضح ہو تو ہم اس راستے پر چلیں جو کہ ہدایت حاصل کرنے کا طریقہ ہے، کہ آپ خالی الذہن ہو کے قرآنِ کریم کو پڑھیں، اس کے اوپر غور کریں، جو طریقہ اس کا ثابت ہو جائے اس کو اختیار کریں، یہ تو ہے سیدھا طریقہ، فطرت کا طریقہ، کہ پھر انسان صحیح راستہ پا سکتا ہے، کہ پہلے خالی الذہن ہو جائے، اپنے خیالات کو دماغ سے نکال دے، اور پھر قرآنِ کریم پڑھے، جو راستہ قرآنِ کریم دکھاتا چلا جائے عقائد میں اور اعمال میں، اس کو اختیار کرتا چلا جائے۔ لیکن یہ اپنی کج فطرت کو قرآن میں تلاش کرتے ہیں، نظریے ان کے اپنے ہیں، خیالات ان کے اپنے ہیں، اور یہ غور کرتے ہیں تا کہ ان کی تائید میں قرآنِ کریم سے کوئی بات آجائے، تو پھر ہم کہیں کہ دیکھو! کہ جو ہمارا خیال ہے وہ بھی قرآن سے ثابت ہے، تمہاری کتاب سے ہی دلیل ملتی ہے کہ ہمارا خیال بھی ٹھیک ہے، یعنی قرآنِ کریم کے تابع ہونے کی بجائے قرآنِ کریم کو اپنے تابع کرنے کی کوشش کرتے ہیں، پھر يَبْغُوْنَهَا عِوَجًا کا یہ معنی ہوگا، اور آج بھی آپ کو دونوں قسم کے انسان مل سکتے ہیں، جو صحیح طور پر نیک نیتی سے ہدایت کے متلاشی ہیں وہ تو یہ دیکھتے ہیں کہ قرآن میں کیا آیا ہے، ہم اس کے مطابق اپنا عقیدہ رکھیں، اور بعضے لوگ اس قسم کے ہوا کرتے ہیں کہ نظریہ پہلے بنا لیتے ہیں، خیال پہلے جما لیتے ہیں، اور اس کے بعد قرآنِ کریم سے اس کے لئے تائید تلاش کرتے ہیں، تو یہ لوگ خود بھی گمراہ ہوتے ہیں اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتے ہیں، خود ٹیڑھے ہیں اور قرآنِ کریم کو بھی ٹیڑھا کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اپنی کجی اور ٹیڑھ کے لئے قرآنِ کریم سے دلیل تلاش کرتے ہیں، پھر يَبْغُوْنَهَا عِوَجًا کا یہ معنی بھی ہو جائے گا...... گویا کہ یہاں کافروں کی تین باتیں ذکر کر دی گئیں، آخرت کے مقابلے میں دنیا کی زندگی سے محبت رکھنا، اور اللہ کے راستے سے روکنے کی کوشش کرنا، اور قرآنِ کریم کو اپنے خیالات کے تابع بنانے کی کوشش کرنا (يَبْغُوْنَهَا عِوَجًا کا یہ مفہوم نکل آئے گا)، جن لوگوں کے یہ حالات اور جذبات ہیں اُولٰٓئِكَ فِيْ ضَلٰلٍۭ بَعِيْدٍ: یہ بہت دُور کی گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں، یعنی ایک تو قریب قریب ہوتا ہے کہ راستے سے ہٹ گیا لیکن قریب قریب ہے، اس کے سمجھنے اور سنبھلنے کا زیادہ امکان ہوتا ہے، لیکن جو اس طرح سے ہو جائیں کہ دنیوی زندگی کی محبت میں مبتلا ہو جائیں، آخرت کی پروا نہ کریں، یہی نہیں کہ خود گمراہ ہیں بلکہ دوسروں کو گمراہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اور قرآنِ کریم کو اپنے خیالات کے تابع کرنے کی کوشش کرتے ہیں، یہ تو بہت دُور کی گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں، ایسے لوگوں کا سمجھنا مشکل ہوتا ہے۔

ہر رسول و نبی کو اس کی قوم کی ہی زبان میں بھیجنے کی حکمت

(وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ) پھر وہ لوگ سرورِ کائنات ﷺ پر ایک یہ اعتراض بھی کیا کرتے تھے کہ یہ رسول بھی عربی ہے اور قرآن بھی عربی ہے، جس سے یہ شبہ پڑتا ہے کہ یہ انہوں نے خود بنا لیا ہوگا، تو ایسا کیوں نہ ہوا کہ اگر رسول عربی تھا تو قرآن کسی اور زبان میں ہوتا، تا کہ یہ شبہ ہی نہ رہتا کہ یہ رسول نے خود بنا لیا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ پہلے جتنے بھی رسول ہم نے بھیجے ہیں وہ ان کی قوم کی زبان میں ہی بھیجے ہیں، تا کہ ان کے جو اوّل مخاطب ہیں وہ رسول ان کو اچھی طرح سے سمجھا لیں، اور رسول کے لئے تفہیم آسان ہو، اور ان کے لئے سمجھنا آسان ہو۔ اور یہ تو ایک بڑی بے جوڑ سی بات ہے کہ جو نبی کے مخاطب ہیں وہ اور زبان رکھتے ہوں اور اور نبی کے اوپر جو ہدایت اتاری جائے وہ اور زبان میں ہو، تو آپس میں کس طرح سے یہ

بات بن سکتی ہے، اگر ایسا ہوتا تو پھر تم لوگ ہی اعتراض کرتے، جیسے دوسری جگہ مذکور ہے کہ رسول تو عربی ہے اور اس کے اوپر قرآن عجمی اتر آیا، یہ کیسا بے جوڑ قصہ ہے؟[1] پھر اس قسم کا اعتراض ہوجاتا۔ تو اللہ تعالیٰ کی عادت یہی ہے کہ ہر رسول کو اس نے اپنی قوم کی زبان میں بھیجا ہے۔

لیکن باقی رسول جتنے آئے ان کی قوم اور اُمت ایک ہی تھی، جو قوم تھی وہی اُمت تھی، اسی قوم کو سمجھانے کے لئے اور دعوت دینے کے لئے آئے تھے، تو قوم بھی وہی اور اُمت بھی وہی، سرورِ کائنات ﷺ کی قوم تو عرب تھی، اس لیے اللہ نے پہلے مخاطب ہونے کی وجہ سے ان کی زبان کا لحاظ کرتے ہوئے کتاب ان کی زبان میں اتاری، رسول اللہ کی زبان بھی عربی ہے اور آپ کی قوم کی زبان بھی عربی ہے، تو قرآن بھی عربی میں آیا۔ لیکن آپ کی اُمت عام ہے جس طرح سے قرآنِ کریم میں قطعی دلائل قائم ہیں، اور یہ مسئلہ ضروریاتِ دین میں سے ہے کہ رسول اللہ ﷺ تمام لوگوں کی طرف مبعوث کیے گئے ہیں، حدیث شریف میں آپ نے بار بار پڑھ لیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مجھے جو اللہ تعالیٰ نے باقی نبیوں کے مقابلے میں خصوصیات عطا فرمائی ہیں، ان میں سے ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ہر نبی اپنی قوم کی طرف آیا لیکن مجھے اللہ تعالیٰ نے کافۃ الناس کی طرف مبعوث کیا ہے، میں سب کی طرف نبی بن کے آیا ہوں۔ پھر قوم کو تو اسی زبان میں سمجھا دیا، پھر اللہ تعالیٰ نے اس قومِ عرب میں اتنی صلاحیت رکھی کہ دوسری قوموں کے سامنے اس کو پیش کیا ان کی زبان میں، حتیٰ کہ ہر زبان میں قرآنِ کریم کے ترجمے ہوگئے، ہر زبان میں اس کی تفسیر لکھی گئی، اب کوئی شخص یہ کہنے کا مجاز نہیں، کسی کے لئے یہ کہنے کی گنجائش نہیں کہ ہم قرآنِ کریم سے ہدایت حاصل نہیں کر سکتے، چونکہ یہ ہماری سمجھ سے باہر ہے۔ اور اگر سرورِ کائنات ﷺ کی اُمتِ عامہ کی طرف دیکھتے ہوئے تمام زبانوں کا لحاظ کر کے قرآنِ کریم کو مختلف زبانوں میں اتار دیا جاتا تو آپ جانتے ہیں کہ پھر کوئی مرکز قائم نہ ہوتا، وحدانیت نہ رہتی، ہر زبان کے اندر کتاب اتری ہوتی تو قوم اس کو لے کے علیحدگی اختیار کر لیتی، اب ایک کتاب مرکز کی حیثیت اختیار کر گئی، اور ساری کی ساری اُمتِ مسلمہ چاہے وہ کوئی زبان بولنے والی ہے اس کا رجوع اسی قرآن کی طرف ہوگیا، اسی زبان میں اس کو پڑھتے ہیں، اور سمجھتے ہیں تو جس کی بنا پر اس اُمت کے اندر وحدانیت راسخ ہوگئی کہ ایک رسول، اور ایک ہی کتاب، اور ایک ہی مرکزی زبان۔ ''نہیں بھیجا ہم نے کسی رسول کو مگر اس کی قوم کی زبان میں'' زبان سے لغات مراد ہے، لِيُبَيِّنَ لَهُمْ: تا کہ وہ رسول ان کے لئے اللہ کے اَحکام کو واضح کرے۔'' پھر اللہ تعالیٰ بھٹکاتا ہے جس کو چاہتا ہے اور صحیح راستے پر چلاتا ہے جس کو چاہتا ہے'' اور اللہ تعالیٰ کے چاہنے کا دستور آپ کے سامنے بارہا آگیا کہ جو لوگ خلوص اور نیک نیتی کے ساتھ نبیوں کی باتیں سنتے ہیں، ہدایت کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ انہیں سیدھے راستے پر چلنے کی توفیق دے دیتا ہے، اور جو ایسا نہیں کرتے ان کو بھٹکا دیتا ہے، ''وہ زبردست ہے حکمت والا ہے۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم کا تذکرہ اور اس کا مقصد

آگے انبیاء علیہم السلام کا تذکرہ آگیا، جس سے تائید ہوگی کہ پہلے سے رسول آتے رہے ہیں اور اس قسم کی تعلیم پیش کرتے رہے

---

(۱) وَلَوْ جَعَلْنٰهُ قُرْاٰنًا اَعْجَمِيًّا لَّقَالُوْا لَوْلَا فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ ءَاَعْجَمِيٌّ وَّعَرَبِيٌّ (پارہ: ۲۴، سورۃ حم سجدہ، آیت: ۴۴)

ہیں، تو سرورِ کائنات ﷺ کی تعلیم کی مماثلت ان کے ساتھ واضح ہو جائے گی، ''البتہ تحقیق بھیجا ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو اپنی نشانیوں کے ساتھ'' بہت دفعہ ان کا تذکرہ آپ کے سامنے آ گیا، یہ کہہ کر بھیجا تھا اَنْ اَخْرِجْ قَوْمَكَ۔ اِرسال کے اندر قول والا معنی ہے، اور ''اَن'' اس کی تفسیر ہے، جس طرح سے نحو کے اندر آپ پڑھا کرتے ہیں۔ ہم نے اس کو کہا (اَرْسَلْنَا کے اندر یہ بات آ گئی) ''کہ نکال تُو اپنی قوم کو ظلمات سے نُور کی طرف، اور یاد دلا انہیں ایامُ اللہ'' اَیَّام یوم کی جمع ہے، لفظی معنی بنتا ہے اللہ کے دِن، اللہ کے دِن انہیں یاد دِلاؤ، اور ''اللہ کے دِنوں'' سے مراد وہ دِن ہیں کہ جن دِنوں میں اللہ تعالیٰ نے کسی قوم کے ساتھ نعمت کا یا عذاب کا معاملہ فرمایا، کسی قوم کے اوپر خاص احسان کیا یا کسی قوم کے اوپر خاص عذاب آیا وہ اللہ کے ایام کہلاتے ہیں، جس طرح سے بنی اسرائیل کو سمندر سے نجات دی اور فرعونیوں کو غرق کر دیا، اور اِن (بنی اسرائیل) کے اُوپر من اور سلویٰ اتارا، سائے کے لئے ان کے اوپر بادل بھیج دیے، اس قسم کی نعمتیں اللہ تعالیٰ نے جن ایام میں ان کو دِیں، وہ بھی اس کا مصداق ہیں، اور گزشتہ انبیاء کی اُمتوں کے اوپر جس طرح سے عذاب آئے وہ بھی اس کا مصداق ہیں، اس لیے اس کا حاصل ترجمہ یہ کر دیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے معاملات انہیں یاد دِلاؤ، ''ایام اللہ'' سے ''اللہ کے معاملات'' مراد ہو گئے، کیونکہ ''ایام'' سے مراد وہ ایام ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے کسی قوم کے ساتھ کوئی خاص برتاؤ کیا ہے، تو اس کا حاصل ہو جائے گا اللہ کے معاملات، اللہ کے معاملات میں دونوں قسم کے معاملات آ گئے احسان والے بھی اور عذاب والے بھی، ''یاد دلاؤ انہیں اللہ کے معاملات، بے شک اس میں البتہ نشانیاں ہیں لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ: ہر صابر شاکر کے لئے۔ جو صبر و شکر کو اپنا لے اس کے لئے ان واقعات میں بہت ساری نشانیاں ہیں۔'' یاد کیجیے جب موسیٰ علیہ السلام نے کہا اپنی قوم کو کہ یاد کرو اللہ کا احسان جو تم پر ہے، جب اس نے تمہیں نجات دی فرعون کے لوگوں سے جو تمہیں پہنچاتے تھے سخت عذاب، ذبح کرتے تھے تمہارے بیٹوں کو اور زندہ چھوڑتے تھے تمہاری عورتوں کو، اور اس میں آزمائش تھی تمہارے رَبّ کی طرف سے بہت بڑی'' بلاء کا لفظ پہلے آپ کے سامنے ذکر ہوا تھا کہ یہ آزمائش کے معنی میں بھی ہوسکتا ہے، مصیبت کے معنی میں بھی ہوسکتا ہے، انعام کے معنی میں بھی ہوسکتا ہے، ''اس میں مصیبت تھی تمہارے لیے'' تو پھر اشارہ ہو جائے گا ذبحِ اَبناء اور اِستحیاءِ نساء کی طرف، یا ''انعام تھا'' پھر اشارہ ہو جائے گا نجات کی طرف، اور اگر اس کا حاصل ترجمہ آزمائش کر لیا جائے تو دونوں کو ہی شامل ہے، کیونکہ انعام میں بھی آزمائش ہوتی ہے، اور اسی طرح سے عذاب میں بھی آزمائش ہوتی ہے، ''اس میں آزمائش تھی تمہارے رَبّ کی طرف سے بہت بڑی۔''

''شکر'' کے فوائد اور ''ناشکری'' کے نقصانات

وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكُمْ: اور یاد کیجیے جبکہ تمہارے رَبّ نے اطلاع دے دی۔ تَاَذَّنَ: اطلاع دینا۔ جبکہ اطلاع دی تمہارے رَبّ نے کہ اگر تم شکر کرو گے تو میں تمہیں اپنی نعمت زیادہ کر دوں گا، لَاَزِيْدَنَّكُمْ: میں تمہیں زیادہ دوں گا، یعنی اپنی اس نعمت میں اضافہ کروں گا۔ شکر پر نعمت کے اضافے کا وعدہ ہے، اور شکر کا مفہوم بہت دفعہ آپ کے سامنے ذکر کر دیا گیا، قدردانی، کہ اللہ کی نعمتوں کی قدر کرو، دل و جان سے اللہ کی عظمت محسوس کرو، اس کو محسن مانو، اور اس کی دی ہوئی نعمتوں کو اس کی نافرمانی میں خرچ نہ

کرو، اور یہ سمجھو کہ ہمارا کوئی استحقاق نہیں، ہمارا کوئی کمال نہیں، جو کچھ دیا ہے اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف سے عطا فرمایا ہے، شکر کا مفہوم یہی ہوتا ہے۔ اور اس کا لازمہ ہے طاعت، شکر گزار وہی ہے جو اپنے محسن کی طاعت بھی کرتا ہے، اور اس کی دی ہوئی نعمتوں کو اس کی مرضی کے خلاف صَرف نہیں کرتا۔ اسی لیے بعض بزرگوں نے لکھا ہے کہ جو شخص یہ چاہتا ہے کہ میرا خاتمہ ایمان پر ہو، اسے چاہیے کہ ایمان والی نعمت کا خصوصیت کے ساتھ اللہ کے سامنے شکر ادا کرتا رہے، کہ اے اللہ! تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ تُو نے ہمیں ایمان کی دولت نصیب فرمائی، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ ہے کہ جس نعمت کے اوپر شکر کیا جائے میں اس نعمت کو بڑھاؤں گا، اور بڑھائی تبھی جائے گی جب اصل باقی رہے، تو اگر خصوصیت کے ساتھ ایمان کی نعمت کا شکر ادا کرو گے تو اللہ تعالیٰ اس ایمان کو باقی رکھے گا، بلکہ اس ایمان میں ترقی دے گا۔ اور آپ کو یاد ہوگا کہ کھانا کھانے کے بعد جس قسم کی دعا حدیث شریف میں تلقین کی گئی ہے اس میں ایمان پر شکر کا ذکر بھی ہے "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ اَطْعَمَنَا وَسَقَانَا وَجَعَلَنَا مُسْلِمِيْنَ"[1] گویا کہ جب کھانا کھایا تو ایک ظاہری نعمت کا شکر جس طرح سے ادا کیا تو ساتھ ہی یاددہانی کروا دی کہ اس باطنی نعمت کا بھی شکر ساتھ ساتھ ادا کرو۔ تو شکر ادا کرنا نعمت میں زیادتی کا باعث ہے، ایمان کو مستحضر کر کے اگر اس پر شکر کرتے رہیں گے تو اِن شاء اللہ! ایمان باقی بھی رہے گا بلکہ اس میں ترقی ہوگی۔ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ: اور اگر تم ناشکری کرو گے، میری نعمتوں کی قدر نہیں کرو گے، اِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ: تو پھر میرا عذاب بہت سخت ہے، تو وہ عذاب اس کُفرانِ نعمت پر آ سکتا ہے، ضروری نہیں کہ دنیا کے اندر کُفران اور ناشکری پر عذاب آ جائے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے یوں نہیں کہا کہ میں تمہیں ضرور عذاب دوں گا، بلکہ یہ کہا کہ میرا عذاب بہت سخت ہے، یعنی اس کا خیال کرو، ناشکری کی بنا تمہیں یہ سزا مل سکتی ہے۔ اب موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ اگر تم ناشکری کرو، اِنْ تَكْفُرُوْٓا اَنْتُمْ، یہ اپنے مخاطبین سے کہتے ہیں، جس میں یہ بتانا مقصود ہے کہ کُفر اور ناشکری سے نقصان تمہارا اپنا ہی ہوگا، اللہ تعالیٰ کا کوئی نقصان نہیں، "کہا موسیٰ علیہ السلام نے کہ اگر تم ناشکری کرو اور وہ سب لوگ جو زمین میں موجود ہیں سارے کے سارے ہی کُفر کرنے لگ جائیں، سب ناشکرے ہو جائیں تو اللہ کا کوئی نقصان نہیں، فَاِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ حَمِيْدٌ: اللہ تعالیٰ بے نیاز ہے تعریف کیا ہوا ہے۔ یہ دال بر جزاء ہے، یعنی تمہاری اس ناشکری سے اللہ کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا، اللہ غنی ہے بے نیاز ہے۔

اُمَمِ سابقہ کی اپنے نبیوں سے رویے کی مشترکہ تاریخ

اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَبَؤُا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ: کیا تمہارے پاس خبر نہیں آئی ان لوگوں کی جو تم سے پہلے گزرے ہیں۔ آگے اس کا بدل آ گیا، قَوْمِ نُوْحٍ وَّعَادٍ وَّثَمُوْدَ ۬ؕ وَالَّذِيْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ: یعنی قومِ نوح کی، عاد کی اور ثمود کی اور ان لوگوں کی جو کہ ان کے بعد ہیں، لَا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا اللّٰهُ: جن کی تفصیل اللہ کے علاوہ کوئی نہیں جانتا، کہ کتنی قومیں پیدا ہوئیں، کتنی گزریں، دیکھو! حدیث شریف میں آتا

(۱) ترمذی ۲/ ۱۸۳، باب ما یقول اذا فرغ من الطعام / مشکوٰۃ ۲/ ۳۶۵، کتاب الاطعمۃ، فصل ثانی۔ نوٹ: احادیث میں "وجعلنا مسلمین" کا لفظ ملا ہے۔

ہے (اگر چہ وہ خبر واحد ہے یقین کا باعث نہیں بن سکتی، لیکن پھر بھی اس سے ظن حاصل ہو جاتا ہے) سرورِ کائنات ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کم وبیش ایک لاکھ چوبیس ہزار نبی آئے ہیں، جن میں سے تین سو تیرہ رسول تھے،[1] یہ ایک حدیث میں موجود ہے، اور جن کا ذکر قرآنِ کریم میں ہمارے سامنے آیا ہوا ہے وہ صرف پچیس کے قریب ہیں، اور حدیث شریف والے بھی اگر ساتھ ملا لیے جائیں تو بھی ان کی تعداد ۳۰ سے متجاوز نہیں ہوتی، تو جن انبیاء علیہم السلام کا ذکر آپ کے سامنے آیا ہوا ہے وہ تو چند ہیں جن کو آپ اُنگلیوں پر شمار کر لیتے ہیں، اور حدیث شریف میں آ گیا کہ اللہ تعالیٰ نے ایک لاکھ چوبیس ہزار بھیجے ہیں، اب ایک لاکھ چوبیس ہزار جو آئے تو تو کتنی قوموں کی طرف آئے، ان قوموں کے کیا حالات تھے، وہ قرآنِ کریم میں تفصیل کے ساتھ بیان نہیں کیے گئے، ان سب کو اس اجمال میں لے لیا گیا کہ لَا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا اللّٰهُ، اسی لیے بعض حضرات کا یہ قول آتا ہے کہ نسب بیان کرنے والے جو آدم علیہ السلام تک نسب پہنچاتے ہیں یہ سب جھوٹے ہیں، اللہ تعالیٰ تو کہتا ہے کہ درمیان میں اتنی قومیں گزری ہیں جن کا سوائے اللہ کی کسی کو کوئی پتا نہیں، تو ان کو کہاں سے پتا چل گیا کہ فلاں فلاں کا بیٹا ہے، فلاں فلاں کا بیٹا ہے، یہ تو بہت قریب زمانے تک جہاں سے کچھ تاریخ شروع ہوئی ہے نسب صحیح طور پر بیان کیا جا سکتا ہے، باقی! آدم علیہ السلام تک ہمارے اجداد میں کیا کیا واسطے آئے، کن کن قوموں سے ہو کے آگے سلسلہ گزرا ہے، اس کا کسی کو پتا نہیں سوائے اللہ تعالیٰ کے، لَا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا اللّٰهُ: ان کو سوائے اللہ کے کوئی نہیں جانتا۔ آگے سب کا مشترکہ حال ذکر کیا جا رہا ہے، جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ: ان کے پاس ان کے رسول آئے واضح دلائل لے کر، فَرَدُّوْٓا اَيْدِيَهُمْ فِيْٓ اَفْوَاهِهِمْ: لوٹا دیا ان لوگوں نے اپنے ہاتھوں کو اپنے مونہوں میں۔ یہ سب ضمیریں انہی کی طرف ہی لوٹ گئیں، انبیاء علیہم السلام کے مخاطبین نے اپنے ہاتھ اپنے ہی مونہوں میں لوٹائے، اپنے مونہوں میں لوٹانے کا کیا مطلب؟ جس طرح سے تعجب کے ساتھ انسان اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیتا ہے کہ یہ کیسی باتیں کر رہے ہیں، یا اپنے منہ کی طرف ہاتھ لوٹا کے اس طرح سے اشارہ کیا کہ چپ ہو جاؤ، بولو نہیں، یا اس کلمہ معنی بھی ہے کہ اپنے ہاتھ انبیاء علیہم السلام کے مونہوں پہ لوٹا دیے، کہ جس طرح سے ایک آدمی آپ کے سامنے ایک بات کرنا چاہتا ہے، آپ کو سننا گوارہ نہیں، تو آپ گستاخی کر کے جرأت کر کے اس کا منہ پکڑ لیتے ہیں اور اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیتے ہیں، کہ خبردار! اگر منہ سے بولے، منہ سے کوئی لفظ نہ نکالو، تو پھر اَيْدِيَهُمْ کی ضمیر تو کافروں کی لوٹ جائے گی، اور اَفْوَاهِهِمْ کی ضمیر انبیاء کی طرف لوٹ جائے گی، ''ان کافروں نے اپنے ہاتھ انبیاء کے منہ میں لوٹا دیے'' یعنی ان کے مونہوں پر رکھ دیے تا کہ وہ بولیں نہیں، ان کو منہ سے پکڑ لیا تا کہ ان کی زبان سے کوئی بات نہ نکلے۔ اور آیدی کا لفظ کلامِ عرب میں احسانات کے لئے بھی بولا جاتا ہے، یَد کا لفظ احسان کے لئے بولتے ہیں، یہ بھی معنی ہو سکتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام نے جتنے احسانات ان لوگوں کے اوپر کیے وہ سب انہوں نے انبیاء علیہم السلام کے مونہوں پر دے مارے، یعنی نبی کی طرف سے ہدایت کی بات قوم کے اوپر ایک بہت بڑا احسان ہوتا ہے، آپ کو کوئی نصیحت کرتا ہے تو یہ نصیحت بہت بڑا احسان ہے، مالی احسان اس کے مقابلے میں کوئی چیز نہیں ہے، ایک شخص آپ کو پانچ روپے

(۱) صحیح ابن حبان ج ۲ ص ۷۷، رقم الحدیث: ۳۶۱ / مشکوٰۃ ۲/ ۵۱۱، باب بدء الخلق فصل ثالث کا آخر۔

دے دے پانچ روپے کیا ہیں، شام تک آپ کھا پی کے اس کا پیشاب پاخانہ بنادیں گے، بس ایک زبان کی لذت ہے، تھوڑی دیر کے لئے آپ اٹھالیں گے اور اس کے بعد قصہ ختم، لیکن اگر کوئی آپ کو نفع کی بات بتاتا ہے نصیحت کی بات بتاتا ہے اور آپ اس کو پلے باندھ لیتے ہیں تو زندگی بھر کے لئے وہ مفید ہے، اور ایک ایک نصیحت کی بات انسان کی زندگی میں انقلاب برپا کر دیتی ہے، تو یہ بہت بڑے روحانی احسانات ہوتے ہیں جو انسان کو نیکی سکھاتے ہیں، اور اس قسم کی باتیں جو انسان کو گمراہی سے نکالتی ہیں، تو انبیاء ﷺ کے جتنے احسانات تھے، وہ اپنے جگر سوزی کے ساتھ، دل سوزی کے ساتھ محنت کے ساتھ ان احسانات کی بارش کرتے تھے، لوگوں کو گمراہی سے نکالنے کے لئے، دینی ہدایت کے لئے، اور جس قسم کی گمراہیوں میں مبتلا تھے ان سے بچانے کے لئے، تاکہ دنیوی اور اخروی عذابوں سے یہ لوگ بچ سکیں، لیکن انہوں ان احسانات کی کوئی قدر نہ کی، بلکہ ان کے احسانات کو انہی کی منہ پر دے مارا، قبول نہ کیا، تو یہ بھی ان الفاظ کا مفہوم ہوسکتا ہے ''لوٹا دیا انہوں نے اُن کے احسانات کو ان کے مونہوں میں'' یعنی ان کے احسانات انہی کے منہ میں دے مارے، اور ان کی باتوں کو قبول نہ کیا۔ لفظوں کے تحت یہ سارے مطلب نکل سکتے ہیں۔ وَقَالُوْٓا اِنَّا كَفَرْنَا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ: اور یہ کہا کہ ہم نے کُفر کیا اس چیز کے ساتھ جس کے ساتھ تم بھیجے گئے، وَاِنَّا لَفِيْ شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَنَآ اِلَيْهِ مُرِيْبٍ: اور بے شک ہم البتہ شک میں ہیں ایسی شک جو ہمیں چین نہیں لینے دیتی (مُرِيْبٍ یہ شَكٍّ کی صفت ہے) جو ہمیں تردّد میں ڈالے ہوئے ہے، اس بات کی طرف سے ہم شک میں ہیں جس کی طرف تو ہمیں بلاتا ہے، ہمارا دل قرار نہیں پکڑتا، بلکہ ہمارا دل اس بارے میں بے چینی محسوس کر رہا ہے، یہ باتیں ہمارے لیے قابلِ قبول نہیں ہیں۔ قَالَتْ رُسُلُهُمْ: ان کے رسولوں نے کہا اَفِي اللّٰهِ شَكٌّ: کیا تم اللہ کے بارے میں شک کرنے والے ہو؟ یعنی اللہ کی توحید کے بارے میں؟'' جو اللہ پیدا کرنے والا ہے آسمانوں کو اور زمین کو، دعوت دیتا ہے تمہیں کہ تاکہ تمہیں بخش دے'' اللہ کی دعوت بھی تمہارے نفع کے لئے ہے، ''تاکہ بخش دے تمہیں تمہارے گناہ'' مِنْ کو اگر تبعیضیہ بنالیا جائے ''بخش دے تمہارے بعض گناہ'' تو اس سے مراد یہ ہوگا کہ ایمان لانے سے پہلے کے گناہ ایمان لانے کی برکت سے معاف ہوجائیں گے، باقی! جس وقت ایمان لے آؤ گے تو ایمان لانے کے بعد پھر آگے گناہوں کا اور نیکیوں کا حساب علیحدہ چلے گا، یعنی ایمان لانے سے پچھلے گناہ تو معاف ہوتے ہیں، بعد میں آنے والے گناہوں کی معافی کا وعدہ نہیں ہوتا، آگے اگر گناہ کرو گے تو اس کا حساب علیحدہ ہے، اس کے لئے علیحدہ توبہ کا مطالبہ ہوگا، ''تاکہ معاف کردے تمہیں تمہارے کچھ گناہ'' کچھ گناہوں سے مراد وہی گزشتہ گناہ، یا پھر اس سے حقوق اللہ مراد ہوتے ہیں، کیونکہ حقوق العباد ذمے رہ جاتے ہیں، چاہے ایمان سے پہلے کے ہوں، آپ نے کسی سے قرض لیا ہوا ہے، قرض لینے کے بعد اگر آپ مؤمن ہوگئے تو اس کا یہ معنی نہیں کہ قرض معاف ہوگیا، وہ تو دینا ہی پڑے گا، حقوق اللہ تو معاف ہوسکتے ہیں حقوق العباد معاف نہیں ہوتے۔ وَيُؤَخِّرَكُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى: تاکہ بخش دے وہ تمہیں تمہارے کچھ گناہ اور تاکہ مہلت دے تمہیں ایک متعین وقت تک۔ مہلت دینے کا مطلب یہ ہے کہ خوش اسلوبی کے ساتھ، خیر وخوبی کے ساتھ، امن وعافیت کے ساتھ تمہیں باقی رکھے، ورنہ عمر تو کافر کی بھی گزرتی ہے مؤمن کی بھی گزرتی ہے، لیکن کافر

کی عمر عافیت لیے ہوئے نہیں ہوتی اور مومن کی عمر عافیت لیے ہوئے ہوتی ہے، اس کا جو وقت بھی گزرتا ہے بہرحال اس کے نفع میں گزرتا ہے، اور کافر کے لئے ایسی بات نہیں "تاکہ مہلت دے تمہیں ایک وقت معین تک" ...... "کہا انہوں نے نہیں ہو تم مگر بشر ہم جیسے" یہ مشترکہ تاریخ آرہی ہے، جس سے معلوم ہو گیا کہ انبیاء ﷺ کے ساتھ لوگوں نے ہمیشہ ایسا معاملہ کیا، "وہ کہنے لگے کہ نہیں ہو تم مگر بشر ہم جیسے، ارادہ کرتے ہو تم ہمیں روکنے کا اس چیز سے جس کی عبادت کرتے تھے ہمارے آباء" فَأْتُونَا بِسُلْطَانٍ مُّبِينٍ: پس لے آؤ تم ہمارے پاس واضح دلیل، اپنے حق ہونے پر کہ تم اللہ کے رسول ہو واضح دلیل لے آؤ، ہمیں تو یوں ہی معلوم ہوتا ہے کہ تم صرف ہمارے آبائی طریقے کو مٹانے کے لئے آئے ہو، ہمارے آباؤ اجداد کے طریقے سے ہمیں روکنا چاہتے ہو۔ دیکھو اعبُدُ کا نَ یَعۡبُدُ اٰبَآؤُنَا، عبادت کا لفظ بولتے ہیں، "ارادہ کرتے ہو تم کہ روک دو تم ہمیں اس چیز سے جس کی عبادت کرتے تھے ہمارے آباء، پس لے آؤ تم واضح دلیل" ...... "کہا ان کو ان کے رسولوں نے نہیں ہیں ہم مگر بشر تم جیسے" یعنی یہ بات تو صحیح ہے کہ ہم تم جیسے بشر ہیں، آدم کی اولاد میں سے ہیں، اسی طرح سے ماں باپ سے پیدا ہوئے ہیں جس طرح تم ہوتے ہو، وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَمُنُّ عَلٰى مَنۡ يَّشَآءُ مِنۡ عِبَادِهٖ: لیکن اللہ تعالیٰ احسان کرتا ہے جس پر چاہتا ہے اپنے بندوں میں سے، وہ احسان وحی والا اللہ تعالیٰ نے ہم پر کر دیا، "نہیں ہے ہمارے لیے کہ ہم لے آئیں تمہارے پاس کوئی دلیل مگر اللہ کی توفیق کے ساتھ" تم جو سلطانِ مبین کا مطالبہ کرتے ہو تو کسی معجزے کا لانا اور دکھانا ہمارے بس کی بات نہیں ہے، اللہ کی طرف سے توفیق ہوگی اور اللہ کی طرف سے ظاہر ہوگا تو ہم ظاہر کر دیں گے، "اور اللہ پر ہی چاہیے کہ بھروسہ کریں ایمان لانے والے" وَمَا لَنَآ اَلَّا نَتَوَكَّلَ عَلَى اللّٰهِ: کیا ہو گیا ہمیں کہ ہم بھروسہ نہ کریں اللہ پر وَقَدۡ هَدٰٮنَا سُبُلَنَا: حالانکہ اس نے ہمیں راستوں کی ہدایت دے دی، اس نے دکھا دیے ہمیں ہمارے راہ، ہمارے راستے اس نے ہمیں دکھا دیے، وَلَنَصۡبِرَنَّ عَلٰى مَاۤ اٰذَيۡتُمُوۡنَا: اور البتہ ضرور صبر کریں گے تمہارے تکلیف پہنچانے پر، تم تکلیفیں دیتے رہو، جو تکلیف تم ہمیں پہنچاؤ گے ہم اس کو سہیں گے، ہم اس کو برداشت کریں گے، "اور اللہ پر چاہیے کہ توکل کرنے والے توکل کریں" ...... "کہا ان لوگوں نے جنہوں نے کفر کیا اپنے رسولوں کو، البتہ ضرور نکال دیں گے ہم تمہیں اپنے علاقے سے، یا البتہ ضرور لوٹ آؤ گے تم ہمارے طریقے میں" لوٹ آنے کا مطلب یہ ہے کہ جیسے پہلے چپ کر کے ہمارے ساتھ شامل رہتے تھے (اگرچہ نبی گمراہی میں ساتھ نہیں دیا کرتا، کفر و شرک میں ساتھ نہیں دیتا، کسی وقت میں بھی نبی کفر و شرک میں مبتلا نہیں ہو سکتا، لیکن چونکہ پہلے انکار نہیں کرتے تھے، توحید کی دعوت نہیں دیتے تھے، خاموشی کے ساتھ وقت گزارتے تھے، تو وہ لوگ سمجھتے کہ ہمارے ساتھ تھے) کہا کہ جس طرح پہلے تھے ویسے ہو جاؤ، ورنہ ہم تمہیں اپنے علاقے سے نکال دیں گے...... فَاَوۡحٰۤى اِلَيۡهِمۡ رَبُّهُمۡ: پس وحی بھیجی ان رسولوں کی طرف ان کے رب نے، البتہ ضرور ہلاک کریں گے ہم ظالموں کو، وَلَنُسۡكِنَنَّكُمُ الۡاَرۡضَ مِنۡۢ بَعۡدِهِمۡ: اور البتہ ضرور ٹھہرائیں گے ہم تمہیں زمین میں ان کے بعد۔ یعنی یہ اجمالی تذکرہ ہے کہ انبیاء ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے ظالموں کے ہلاک کرنے بعد آباد رکھا، اس کو اجمالاً ذکر کر دیا گیا کہ یہ تو کہتے ہیں ہم تمہیں نکال دیں گے لیکن نکلیں گے یہ، برباد یہ ہو جائیں گے، اور اللہ تعالیٰ تمہیں اس میں آباد کرے

گا، تمہیں بھی آباد کرے گا تمہارے متبعین کو بھی آباد کرے گا، تفصیلی واقعات آپ کے سامنے سورہ اعراف میں اور سورہ ہود میں گزر چکے ہیں، اور یہ وعدہ جو وَلَنُسْكِنَنَّكُمُ کے اندر کیا جا رہا ہے "یہ وعدہ اس شخص کے لئے ہے جو کہ میرے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرے" وَخَافَ وَعِيْدِ: أي وَخَافَ وَعِيْدِي: اور میری وعید کا خوف کرے، جس قسم کی وعیدیں دی جا رہی ہیں ان سے وہ ڈرے، اس کے لئے یہ وعدہ ہے۔

کافروں کا انجام

وَاسْتَفْتَحُوْا: اِستفتاح: فتح طلب کرنا۔ اس کی ضمیر انبیاء علیہم السلام کی طرف بھی لوٹ سکتی ہے کہ انبیاء علیہم السلام نے دُعائیں کی کہ یا اللہ! ہمارے اور ان کے درمیان فیصلہ کر دے، اور یہ ضمیر کافروں کی طرف بھی لوٹ سکتی ہے کہ کافروں نے دُعا مانگی کہ آخری فیصلہ ہو جائے، وَخَابَ كُلُّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ: اور نامراد ہوا ہر جابر ضدی، جو جابر سرکش تھا ضدی تھا (عنید کے معنی ضدی) وہ نامراد ہوا، وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوا۔ تو استفتاح کی نسبت دونوں کی طرف ہو سکتی ہے، بعض مفسرین نے اس کی نسبت انبیاء علیہم السلام کی طرف کی جیسے کہ حضرت شیخ الہند کا ترجمہ ہے "فیصلہ لگے مانگنے پیغمبر"، اور بعض نے اس کی نسبت کُفار کی طرف کی ہے، "بیان القرآن" میں یہی ترجمہ اختیار کیا گیا ہے۔ وَخَابَ كُلُّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ میں تو ان کی دُنیوی بربادی کا ذکر آ گیا، مِنْ وَّرَآئِهٖ جَهَنَّمُ: وراء کا لفظ آگے پیچھے دونوں معنوں میں آیا کرتا ہے۔ ان کے سامنے جہنم ہے۔ "ہٖ" ضمیر كُلُّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ کی طرف لوٹ رہی ہے، لفظوں کو دیکھتے ہوئے مفرد کی ضمیر لوٹائی گئی، "اس کے سامنے جہنم ہے" جَهَنَّمُ وَيُسْقٰى مِنْ مَّآءٍ صَدِيْدٍ: ماء: پانی۔ صدید کہتے ہیں پیپ کو۔ اور صَدِيْدٍ یہ مَآءٍ کا بیان ہے۔ "پلائے جائیں گے وہ پانی یعنی پیپ" وہ پانی جو ان کو پینے کے لئے دیا جائے گا وہ پیپ ہوگی، يَّتَجَرَّعُهٗ: گھونٹ گھونٹ کر کے پئیں گے اس کو۔ تجرّع: جرعہ جرعہ یعنی ایک ایک گھونٹ کر کے اس کو پینے کی کوشش کریں گے، وَلَا يَكَادُ يُسِيْغُهٗ: لیکن وہ اس کو آگے حلق سے گزار نہیں سکے گا، نہیں قریب کہ گزار لے اس کو حلق سے، (یہ مفرد ضمیر جَبَّارٍ عَنِيْدٍ کے لفظ کی طرف دیکھتے ہوئے ہے، ورنہ معنی جمع کا ہے، اس لیے مفرد کے طور پر ترجمہ کرتے جاؤ تو بھی ٹھیک ہے، جمع کے طور پر کرتے جاؤ تو بھی ٹھیک ہے) یعنی اپنے ارادے کے طور پر تو اس کو گھونٹ گھونٹ کر کے پینا چاہے گا، لیکن گلے میں اٹک جائے گی، اور اس کو وہ آگے گزار نہیں سکے گا، وَلَا يَكَادُ يُسِيْغُهٗ: نہیں قریب کہ اس کو گزار لے اپنے حلق سے، وَيَاْتِيْهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ: آئے گی اس کے پاس موت ہر طرف سے، "موت" سے مراد اَسبابِ موت، ہر طرف سے اس کے لئے اَسبابِ موت جمع ہوں گے، کہ اب مرے، اب مرے، وَمَا هُوَ بِمَيِّتٍ: لیکن مرے گا نہیں، اسی لیے جہنم کی زندگی کو قرآنِ کریم میں یوں ذکر کیا گیا کہ لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰى (طٰہٰ: ۷۴، الاعلیٰ: ۱۳) کہ نہ تو اس میں مرے گا نہ اس میں زندہ ہوگا، یعنی زندہ ہونا بے کار، زندہ تو وہ ہوگا، لیکن وہ زندگی بے کار جس میں کوئی راحت نہیں ہے، اور موت واقعۃً نہیں آئے گی، "اور اس کے سامنے سخت عذاب ہے" یعنی اس کے علاوہ اور عذاب بھی۔

کافروں کے نیک اعمال کی حیثیت پر ایک مثال

مَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ: اس آیت کا حاصل یہ ہے کہ جب کافروں کو آخرت کا عذاب بتایا جاتا ہے تو وہ سوچنے لگ

جاتے ہیں کہ آخر نیکی کے کچھ کام ہم بھی تو کرتے ہیں، اگر آخرت ہوئی تو اللہ تعالیٰ ہمیں بھی ان کا ثواب دے گا اگر آخرت ہوئی تو، اوّل تو آخرت ہوگی ہی نہیں، اگر آخرت ہوئی تو ہماری نیکیوں کا ہمیں بدلہ ملے گا، غریب پروری کرتے ہیں، یتیموں پر شفقت کرتے ہیں، حاجیوں کو پانی پلاتے ہیں، اس قسم کے نیک کام جو مشرک کیا کرتے تھے تو کبھی کبھی ان کے دل میں یہ خیال آتا کہ اگر آخرت ہوگی جس طرح سے یہ کہتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ہمیں بھی ان اعمال کا ثواب دے گا۔ قرآنِ کریم میں متعدد آیات کے اندر اس بات کو ذکر کیا گیا ہے کہ کافروں کے عمل کے اوپر آخرت میں کوئی ثواب مرتب نہیں ہوگا، اس آیت میں یہی ذکر کیا گیا ہے، ''مثال ان لوگوں کی جنہوں نے کفر کیا اپنے رَبّ کے ساتھ'' اَعْمَالُهُمْ: ان کے اعمال كَرَمَادٍ : راکھ کی طرح ہوں گے (راکھ: یہ ایندھن جلنے کے بعد جو چولہے میں پڑی ہوتی ہے، یہ بہت ہلکی چیز ہوتی ہے اور ہوا میں بہت جلدی اڑتی ہے) ان کے اعمال راکھ کی طرح ہوں گے، اشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيْحُ: ''ہٖ'' کی ضمیر رَماد کی طرف لوٹ رہی ہے۔ ایسی رَماد کہ جس کے اُوپر سخت ہوا چل پڑی ہو فِيْ يَوْمٍ عَاصِفٍ: آندھی کے دِن۔ عَاصِفٍ جو یوم کی صفت بنائی گئی ہے یہ بحالِ متعلقہ ہے، اصل کے اعتبار عاصف یہ ہوا کی صفت ہے۔ ایسے دِن میں جس میں جھکڑ چلتے ہوں سخت ہوا اُس راکھ کے اوپر چل جائے، ان کے عملوں کی مثال ایسے ہی ہے، آپ جانتے ہیں کہ راکھ بہت ہلکی چیز ہے، جب اس کے اوپر آندھی چل جائے جھکڑ چل جائے تو اس کا تو نام ونشان ہی باقی نہیں رہے گا، اسی طرح سے ان کافروں کے یہ اعمال جو ان کو نیک معلوم ہو رہے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کو خاک اور راکھ بنا کے یوں اُڑا دے گا کہ ان کا نام ونشان باقی نہیں رہے گا، لَا يَقْدِرُوْنَ مِمَّا كَسَبُوْا عَلٰى شَيْءٍ: نہیں قادر ہوں گے یہ اپنے کیے ہوئے میں سے کسی شَے پر، یعنی اس سے کوئی فائدہ نہیں اُٹھا سکیں گے ''یہ بہت دور کی گمراہی ہے۔''

قدرتِ باری تعالیٰ کا ذِکر

''کیا آپ نے دیکھا نہیں کہ بے شک پیدا کیا اللہ تعالیٰ نے آسمانوں کو اور زمین کو ٹھیک ٹھیک، اگر چاہے تو لے جائے تم سب کو اور لے آئے نئی مخلوق کو'' اللہ کو یہ قدرت بھی ہے، کہ یکدم تم سب کو ختم کردے اور اور مخلوق لے آئے، ''یکدم'' اس لیے کہہ رہا ہوں کہ تدریجاً تو اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے ایسے ہی کرتا ہے، مثلاً آج جتنے لوگ موجود ہیں ایک وقت آئے گا کہ ان میں سے ایک بھی باقی نہیں ہوگا، نئی آبادی ہوگی، یہ تو ہوتا ہی ہے، آج سے پچاس ساٹھ سال پہلے جو لوگ تھے ان میں سے اکثریت ختم ہوگئی، تھوڑے باقی ہیں، اور جو تھوڑے باقی ہیں وہ ختم ہوتے جائیں گے، نئے آتے چلے جا رہے ہیں، تو تدریجی طور پر تو اللہ تعالیٰ ایسے کرتا ہی ہے، کہ پچھلوں کو اُٹھاتا جاتا ہے، نئے لاتا جاتا ہے، لیکن اللہ کو یہ قدرت بھی ہے کہ یکدم سب کو ختم کردے اور یکدم نئی آبادی کردے، اس لیے اس کے لئے مار کے دوبارہ زندہ کرنا کوئی مشکل نہیں۔ اصل میں یہاں سے معاد کا تذکرہ کرنا ہی مقصود ہے جس طرح سے پیچھے عذاب کا ذکر آ رہا ہے، ''اور یہ بات اللہ پر گراں نہیں، اللہ پر مشکل نہیں۔''

''مستضعفین و مستکبرین'' کا آپس میں مکالمہ

وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ جَمِيْعًا: یہ سارے کے سارے اللہ کے سامنے ظاہر ہو جائیں گے، اللہ کے سامنے نمایاں ہو جائیں گے، فَقَالَ

الضُّعَفٰٓؤُا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا: یہ ہے چھوٹوں اور بڑوں کی آپس میں لڑائی، آج جو اپنے لیڈر کے پیچھے جھنڈا اُٹھائے پھر رہے ہیں، جو وہ کہتا ہے یہ اس کے پیچھے لگے ہوئے ہیں، اور ہر کام اس کے کہنے کے مطابق کرتے ہیں، قیامت کے دن جا کے ان کی آپس میں خوب جوتیوں میں بٹے گی۔ ''کہیں گے کمزور لوگ'' کمزوروں سے تابعین مراد ہیں، ''کہیں کمزور لوگ ان لوگوں کو جو کہ بڑے بنے ہوئے ہیں'' اِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا: بے شک ہم تمہارے لیے تابع تھے۔ تَبَعْ تابع کی جمع ہے۔ ہم تمہارے پچھلگ تھے، فَهَلْ اَنْتُمْ مُّغْنُوْنَ عَنَّا مِنْ عَذَابِ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ: کیا تم دُور ہٹانے والے ہو ہم سے اللہ کے عذاب سے کوئی چیز؟ اللہ کے عذاب سے کوئی چیز تم دُور ہٹا سکتے ہو؟ قَالُوْا: وہ کہیں گے لَوْ هَدٰىنَا اللّٰهُ لَهَدَيْنٰكُمْ: اگر اللہ ہمیں سیدھے راستے پہ چلاتا تو ہم تمہیں بھی ہدایت دیتے، جب ہم خود محروم تھے تمہیں ہم صحیح راستہ کیسے بتا سکتے تھے، سَوَآءٌ عَلَيْنَآ: برابر ہے ہم پر، اَجَزِعْنَآ اَمْ صَبَرْنَا: یہ ہمزہ اور اَمْ تسویہ پیدا کرنے کے لئے ہے، برابری کے لئے۔ جس طرح سے آپ پڑھتے ہیں ''چہ بر تخت مُردن، چہ بر روئے خاک'' (گلستاں) یہ چہ چہ برابری کے لئے ہے، یعنی زمین پہ مرنا اور تخت پہ مرنا برابر ہے، اسی طرح سے یہاں بھی استفہام تسویہ کے لئے ہے، ''برابر ہے ہم پر کہ ہم بے صبری کریں یا ہم صبر کریں'' مَا لَنَا مِنْ مَّحِيْصٍ: ہمارے لیے کوئی چارہ کار نہیں۔ مَحِيْص ظرف کا صیغہ ہے۔ ہمارے لیے ہٹنے کی کوئی جگہ نہیں ہے کہ ہم اس عذاب سے بچ کے کسی طرف چلے جائیں، ہمارے لیے کوئی مَحِیص نہیں۔

جہنم میں شیطان کی اپنے متبعین کے سامنے تقریر

وَقَالَ الشَّيْطٰنُ: پھر یہ سارے کے سارے اکٹھے ہو کے اس مہا لیڈر کے سامنے جائیں گے، اپنے قائد اعظم کے سامنے، تو شیطان کہے گا، لَمَّا قُضِيَ الْاَمْرُ: جس وقت کہ فیصلہ ہو جائے گا امر کا، اِنَّ اللّٰهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ: بے شک اللہ نے تم سے وعدہ کیا تھا اور سچا وعدہ کیا تھا، وَوَعَدْتُّكُمْ: اور کچھ میں نے بھی تم سے وعدے کیے تھے، فَاَخْلَفْتُكُمْ: وہ میں نے غلط وعدے کیے تھے، یعنی اس کا اِخلاف واضح ہو گیا، اصل میں اَخْلَفَ فِي الْوَعْدِ کا معنی ہوتا ہے وعدے کو پورا نہ کرنا، ''پھر میں نے وہ وعدے پورے نہیں کیے'' یعنی میرے وہ وعدے جھوٹے تھے، جیسے دوسری جگہ ہے اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ (آل عمران: ۹، رعد: ۳۱) تو یُخلِف اِسی اِخلاف سے ہے، ''میں نے وہ وعدے غلط کیے تھے، جھوٹے کیے تھے، میں نے اُن وعدوں کا خلاف کیا'' وَمَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ: میرے لیے تم پر کوئی غلبہ حاصل نہیں تھا، کہ میں زبردستی تمہیں گمراہی پر لگا دیتا، مجھے تم پر کوئی زور حاصل نہیں تھا، اِلَّآ اَنْ دَعَوْتُكُمْ: سوائے اس کے کہ میں نے تمہیں دعوت دی تھی، فَاسْتَجَبْتُمْ لِيْ: تم نے میری وہ دعوت قبول کر لی، میں نے کوئی زبردستی تو تمہیں برائی پر نہیں لگایا تھا فَلَا تَلُوْمُوْنِيْ: پس تم مجھے ملامت نہ کرو، وَلُوْمُوْٓا اَنْفُسَكُمْ: اپنے آپ کو ملامت کرو، تو بے سوچے سمجھے میرے پیچھے کیوں لگ گئے تھے، ایک طرف اللہ کے وعدے تھے ایک طرف میرے وعدے تھے، میں نے تو تمہیں صرف بلایا ہی تھا، کوئی زبردستی تو اس راستے پہ نہیں چلایا، جب تم اپنی عقل وفکر کے ساتھ میرے پیچھے لگ گئے اور میری بات تم نے قبول کر لی تو مجھے ملامت نہ کرو، اپنے آپ کو ملامت کرو، مَآ اَنَا بِمُصْرِخِكُمْ: نہیں ہوں میں تمہارے لیے کوئی مدد کرنے والا۔ مُصْرِخ کہتے ہیں فریادرس کو، میں تمہاری فریادرسی کرنے والا نہیں ہوں، وَمَآ اَنْتُمْ بِمُصْرِخِيَّ: اور تم میری فریادرسی کرنے والے نہیں ہو، نہ میں تمہارے کام آسکتا ہوں نہ تم میرے کام

آسکتے ہو، اِنِّیْ كَفَرْتُ بِمَاۤ اَشْرَكْتُمُوْنِ مِنْ قَبْلُ: اس سے پہلے (یعنی دنیا میں) جوتم نے مجھے شریک ٹھہرایا (اشرکتمونی) میں تو اس کا سرے سے منکر ہی ہوں، کہ میں کب شریک تھا جوتم مجھے شریک بنائے پھر رہے تھے، تمہارے شریک ٹھہرانے کا میں منکر ہوں، میں انکار کرتا ہوں، میں کوئی شریک نہیں تھا، تم ایسے ہی مجھے شریک ٹھہراتے رہے۔ یا مطلب یہ ہے کہ اس سے قبل جوتم نے مجھے شریک ٹھہرایا اس کی وجہ سے میں کافر ہوا، تم سب جو مجھے ماننے لگ گئے تو میں بھی بڑا بن کے بیٹھ گیا، اور اگر تم میری نہ مانتے تو ہوسکتا ہے میں ہی سیدھے راستے پہ آجاتا، تم نے میرے ساتھ موافقت کر کے مجھے شریک ٹھہرا کے اُلٹا مجھے بھی کافر بنا دیا، یہ ان کو الزام دے گا کہ اگر تم میری تائید نہ کرتے، میری بات نہ مانتے تو ممکن ہے کہ میں ہی سیدھا ہو جاتا، دونوں طرح سے اس کا مفہوم ذکر کیا جا رہا ہے، اس دوسرے مفہوم کے اعتبار سے معنی ہوگا کہ میں کافر ہوا تمہارے شریک ٹھہرانے کی وجہ سے، میں نے کُفر کیا (قرطبی)، اور پہلا مفہوم جو آپ کے سامنے ذکر کیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ میں منکر ہوں، جو اس سے قبل تم نے مجھے شریک ٹھہرایا میں اس کا انکار کرتا ہوں (عام تفاسیر) اِنَّ الظّٰلِمِیْنَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ: بے شک ظالموں کے لئے دردناک عذاب ہے۔

مؤمنین کے لئے اُخروی اِنعامات

''داخل کیے جائیں گے وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے باغات میں، جاری ہوں گی ان کے نیچے سے نہریں، ہمیشہ رہنے والے ہوں گے اس میں،'' بِاِذْنِ رَبِّهِمْ: داخل کیے جائیں گے اپنے رَبّ کی توفیق کے ساتھ، تَحِیَّتُهُمْ فِیْهَا سَلٰمٌ: ان کا آپس میں تحیہ سلام ہوگا، یعنی یہ جہنمی لوگ آپس میں لعنت پھٹکار کریں گے، لیکن مؤمن جب آپس میں ملیں گے (تحیة: دُعا۔ تحیۃ اصل میں تحییۃ ہے، اور بعد میں سلام کہنے میں استعمال ہوتا ہے) آپس میں ان کا سلام یہی ہوگا السلام علیکم، دُعا یہی ہوگی، آپس میں ملیں گے تو السلام علیکم، فرشتے آئیں گے تو السلام علیکم، یہ پیچھے آیا تھا وَالْمَلٰٓئِكَةُ یَدْخُلُوْنَ عَلَیْهِمْ مِّنْ كُلِّ بَابٍ ﴿۲۳﴾ سَلٰمٌ عَلَیْكُمْ (الرعد: ۲۴)، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی اسی طرح سے سَلٰمٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِیْمٍ (سورۂ یٰس: ۵۸)، جدھر سے دیکھو سلامتی ہی سلامتی کی آواز ہوگی، ایک دوسرے کو یوں دُعائیں دیں گے، کوئی کسی کے اوپر آوازیں نہیں کسے گا، اور کوئی کسی کو پریشان نہیں کرے گا۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَیْكَ

اَلَمْ تَرَ كَیْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَیِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَیِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ
اے مخاطب! کیا تو نے نہیں دیکھا کیسے مثال دی اللہ تعالیٰ نے پاکیزہ کلمے کی جیسے کہ ایک پاکیزہ درخت ہو اس کی جڑ ثابت ہے (زمین میں)
وَّفَرْعُهَا فِی السَّمَآءِ ﴿۲۴﴾ تُؤْتِیْۤ اُكُلَهَا كُلَّ حِیْنٍۭ بِاِذْنِ رَبِّهَا ؕ وَیَضْرِبُ اللّٰهُ
اور اس کی شاخیں اُٹھی ہوئی ہیں آسمان میں ﴿۲۴﴾ دیتا ہے اپنا میوہ ہر وقت اپنے رَبّ کی توفیق کے ساتھ، اور بیان کرتا ہے اللہ تعالیٰ

الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ۝٢٥ وَمَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيْثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيْثَةِ

مثالیں لوگوں کے لئے تا کہ وہ نصیحت حاصل کریں ۝۲۵ اور مثال ردّی کلمہ کی ردّی درخت کی طرح ہے

اجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْاَرْضِ مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ ۝٢٦ يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ

جو اکھیڑ لیا جائے زمین کے اُوپر سے ہی، نہیں ہے اس کے لئے کوئی قرار ۝۲۶ ثابت رکھتا ہے اللہ تعالیٰ قولِ ثابت کی وجہ سے ان لوگوں کو

اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ۚ وَيُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِيْنَ ۙ

جو ایمان لے آئے (ثابت رکھتا ہے) دُنیوی زندگی میں اور آخرت میں، اور بھٹکاتا ہے اللہ تعالیٰ ظالموں کو،

وَيَفْعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ ۝٢٧ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ كُفْرًا وَّاَحَلُّوْا

اور کرتا ہے اللہ جو چاہتا ہے ۝۲۷ کیا آپ نے دیکھا ان لوگوں کی طرف جنہوں نے اللہ کے احسان کو کفر سے بدل دیا اور اُتار دیا انہوں

قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ ۝٢٨ جَهَنَّمَ ۚ يَصْلَوْنَهَا ۗ وَبِئْسَ الْقَرَارُ ۝٢٩ وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ

نے اپنی قوم کو ہلاکت کے گھر میں جو جہنّم ہے ۝۲۸ داخل ہوں گے اس میں اور وہ بہت بری ٹھہرنے کی جگہ ہے ۝۲۹ اور انہوں نے اللہ

اَنْدَادًا لِّيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِهٖ ۗ قُلْ تَمَتَّعُوْا فَاِنَّ مَصِيْرَكُمْ اِلَى النَّارِ ۝٣٠

کے لئے مقابل بنا لیے تا کہ اللہ کے راستے سے بھٹکائیں، آپ کہہ دیجئے کہ تم فائدہ اُٹھالو، بے شک تمہارا ٹھکانا جہنّم کی طرف ہے ۝۳۰

قُلْ لِّعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً مِّنْ

میرے ان بندوں کو کہہ دو جو ایمان لاتے ہیں وہ نماز کو قائم کریں اور جو کچھ ہم نے انہیں دیا ہے اس میں سے پوشیدہ اور ظاہر خرچ کریں

قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خِلٰلٌ ۝٣١ اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ

ایسے دن کے آنے سے پہلے کہ جس دن میں کوئی خرید وفروخت نہیں ہوگی اور نہ کوئی یاری باشی ہوگی ۝۳۱ اللہ وہ ہے جس نے پیدا کیا

السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ

آسمانوں کو اور زمین کو اور اُتارا اس نے آسمان سے پانی، پھر نکالا اس پانی کے ذریعے سے تمہارے لیے رزق پھلوں سے،

وَسَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ لِتَجْرِيَ فِي الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْاَنْهٰرَ ۝٣٢ وَسَخَّرَ

اور مسخر کیا تمہارے نفع کے لئے کشتیوں کو جو چلتی ہیں سمندر میں اللہ کے حکم سے، اور مسخر کیا تمہارے نفع کے لئے دریاؤں کو ۝۳۲ اور مسخر کیا

لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآىِٕبَيْنِ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ﴿۳۳﴾

تمہارے نفع کے لئے سورج کو اور چاند کو اس حال میں کہ وہ ایک ہی حال پہ چلنے والے ہیں، اور مسخر کیا تمہارے نفع کے لئے رات اور دن کو ﴿۳۳﴾

وَاٰتٰىكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ ؕ وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ؕ اِنَّ الْاِنْسَانَ

اور دیا اللہ نے تمہیں ہر اس چیز سے جو تم نے اس سے مانگا، اور اگر تم اللہ کی نعمتوں کو شمار کرو تو تم ان کو شمار نہیں کر سکتے، بے شک انسان

لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ ﴿۳۴﴾ وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا

البتہ بہت بے انصاف اور بہت ناشکرا ہے ﴿۳۴﴾ یاد کیجئے جس وقت کہ ابراہیم نے کہا کہ اے میرے رَبّ! بنادے اس شہر کو امن والا،

وَّاجْنُبْنِيْ وَبَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ ﴿۳۵﴾ رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا

اور دُور رکھ مجھے اور میرے بیٹوں اس بات سے کہ ہم عبادت کریں بتوں کی ﴿۳۵﴾ اے میرے رَبّ! بے شک ان بتوں نے گمراہ کر دیا بہت

مِّنَ النَّاسِ ۚ فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَاِنَّهٗ مِنِّيْ ۚ وَمَنْ عَصَانِيْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۳۶﴾

سے لوگوں کو، پس جس شخص نے میری اتباع کی پس بے شک وہ تو میرا ہے ہی، اور جس نے میری نافرمانی کی پس تو غفور رحیم ہے ﴿۳۶﴾

رَبَّنَآ اِنِّيْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ

اے میرے رَبّ! بے شک میں نے آباد کر دیا اپنی اولاد میں سے بعض کو ایسی وادی میں جو کہ کھیتی باڑی والی نہیں ہے (آباد کیا)

عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ ۙ رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ اَفْىِٕدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيْٓ اِلَيْهِمْ

تیرے حرمت والے گھر کے پاس، اے ہمارے پروردگار! تاکہ یہ نماز قائم کریں پس کر دے تُو کچھ لوگوں کے دل مائل ان کی طرف،

وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ ﴿۳۷﴾ رَبَّنَآ اِنَّكَ تَعْلَمُ مَا نُخْفِيْ وَمَا

اور رزق دے ان کو پھلوں سے تاکہ یہ شکر گزار رہیں ﴿۳۷﴾ اے ہمارے رَبّ! بے شک تُو جانتا ہے اس چیز کو جو ہم چھپاتے ہیں اور جو ہم

نُعْلِنُ ؕ وَمَا يَخْفٰى عَلَى اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ ﴿۳۸﴾ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ

ظاہر کرتے ہیں، نہیں مخفی اللہ پر کوئی چیز بھی زمین میں اور نہ آسمان میں ﴿۳۸﴾ شکر ہے اس اللہ کا جس نے

وَهَبَ لِيْ عَلَى الْكِبَرِ اِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ ؕ اِنَّ رَبِّيْ لَسَمِيْعُ الدُّعَآءِ ﴿۳۹﴾ رَبِّ اجْعَلْنِيْ

مجھے عطا کیا بڑھاپے کے باوجود اسماعیل اور اسحاق، بے شک میرا رَبّ البتہ دُعا سننے والا ہے ﴿۳۹﴾ اے میرے رَبّ! کر دے مجھ کو

مُقِيْمَ الصَّلٰوةِ وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ رَبَّنَا وَتَقَبَّلْ دُعَآءِ ﴿۴۰﴾ رَبَّنَا اغْفِرْ لِيْ

نماز قائم کرنے والا اور میری اولاد میں سے بھی بعض کو، اے ہمارے رَبّ! میری دُعا کو قبول فرما ﴿۴۰﴾ اے ہمارے پروردگار! بخش دے مجھے

وَلِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ يَوْمَ يَقُوْمُ الْحِسَابُ ﴿۴۱﴾ وَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ غَافِلًا عَمَّا

اور میرے والدین کو اور مؤمنوں کو جس دن کہ حساب قائم ہو ﴿۴۱﴾ ہرگز بے خبر نہ سمجھ اللہ کو ان کاموں سے

يَعْمَلُ الظّٰلِمُوْنَ اِنَّمَا يُؤَخِّرُهُمْ لِيَوْمٍ تَشْخَصُ فِيْهِ الْاَبْصَارُ ﴿۴۲﴾

جو یہ ظالم کرتے ہیں، سوائے اس کے نہیں کہ اللہ تعالیٰ انہیں ڈھیل دیتا ہے ایسے دن کے لئے جس میں آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں گی ﴿۴۲﴾

مُهْطِعِيْنَ مُقْنِعِيْ رُءُوْسِهِمْ لَا يَرْتَدُّ اِلَيْهِمْ طَرْفُهُمْ وَاَفْـِٕدَتُهُمْ

یہ دوڑنے والے ہوں گے، اپنے سروں کو اُٹھانے والے ہوں گے، ان کی نظر ان کی طرف نہیں لوٹے گی، اور ان کے دل بھی

هَوَآءٌ ﴿۴۳﴾ وَاَنْذِرِ النَّاسَ يَوْمَ يَاْتِيْهِمُ الْعَذَابُ فَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رَبَّنَا

خالی ہوں گے ﴿۴۳﴾ لوگوں کو ڈرایئے جس دن کہ آئے گا ان کے پاس عذاب پھر کہیں گے وہ لوگ جنہوں نے ظلم کیا اے ہمارے پروردگار!

اَخِّرْنَآ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ نُّجِبْ دَعْوَتَكَ وَنَتَّبِعِ الرُّسُلَ

ڈھیل دے دے ہمیں تھوڑے سے وقت کے لئے، ہم تیری دعوت کو قبول کرلیں گے اور تیرے رسولوں کی اتباع کرلیں گے،

اَوَلَمْ تَكُوْنُوْٓا اَقْسَمْتُمْ مِّنْ قَبْلُ مَا لَكُمْ مِّنْ زَوَالٍ ﴿۴۴﴾ وَّسَكَنْتُمْ فِيْ مَسٰكِنِ الَّذِيْنَ

کیا تم قسمیں نہیں کھایا کرتے تھے اس سے قبل کہ تمہارے لیے زوال نہیں ہے ﴿۴۴﴾ اور رہے تم ان لوگوں کے گھروں میں جنہوں نے

ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَتَبَيَّنَ لَكُمْ كَيْفَ فَعَلْنَا بِهِمْ وَضَرَبْنَا لَكُمُ الْاَمْثَالَ ﴿۴۵﴾

ظلم کیا تھا اپنے نفسوں پر، اور تمہارے لیے واضح ہو گیا تھا کہ ہم نے ان کے ساتھ کیا کیا، اور ہم نے تمہارے لیے مثالیں بھی بیان کیں ﴿۴۵﴾

وَقَدْ مَكَرُوْا مَكْرَهُمْ وَعِنْدَ اللّٰهِ مَكْرُهُمْ وَاِنْ كَانَ مَكْرُهُمْ لِتَزُوْلَ مِنْهُ الْجِبَالُ ﴿۴۶﴾

ان لوگوں نے اپنی تدبیریں کیں اور اللہ کے پاس ہے ان کا مکر، بے شک ان کی تدبیر ایسی تھی کہ اس کے ذریعے سے پہاڑ ٹل جائیں ﴿۴۶﴾

فَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ مُخْلِفَ وَعْدِهٖ رُسُلَهٗ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ

پس ہرگز نہ گمان کر تو اے مخاطب! اللہ کو اپنے وعدے کے خلاف کرنے والا اپنے رسولوں کے ساتھ، بے شک اللہ تعالیٰ زبردست ہے

ذُو انْتِقَامٍ ﴿٤٧﴾ يَوْمَ تُبَدَّلُ الْأَرْضُ غَيْرَ الْأَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ وَبَرَزُوْا

انتقام والا ہے ﴿۴۷﴾ جس دن کہ بدل دی جائے گی اس زمین کے علاوہ اور آسمان بھی، اور ظاہر ہو جائیں گے سارے کے سارے

لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ﴿٤٨﴾ وَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ يَوْمَئِذٍ مُّقَرَّنِيْنَ فِي الْأَصْفَادِ ﴿٤٩﴾

اللہ واحد قہار کے لئے ﴿۴۸﴾ دیکھے گا تُو مجرموں کو اس دن جکڑے ہوئے ہوں گے زنجیروں میں ﴿۴۹﴾

سَرَابِيْلُهُمْ مِّنْ قَطِرَانٍ وَّتَغْشٰى وُجُوْهَهُمُ النَّارُ ﴿٥٠﴾ لِيَجْزِيَ اللّٰهُ كُلَّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ

ان کے لباس تارکول کے ہوں گے اور ان کے چہروں کو آگ ڈھانپ لے گی ﴿۵۰﴾ تاکہ اللہ تعالیٰ بدلہ دے دے ہر نفس کو اس کے کیے کا،

اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿٥١﴾ هٰذَا بَلٰغٌ لِّلنَّاسِ وَلِيُنْذَرُوْا

بے شک اللہ تعالیٰ جلدی حساب لینے والا ہے ﴿۵۱﴾ یہ (اللہ تعالیٰ کی طرف سے) پیغام پہنچا دینا ہے لوگوں کو، اور تاکہ اس کے ذریعے سے یہ

بِهٖ وَلِيَعْلَمُوْٓا اَنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَّلِيَذَّكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿٥٢﴾

ڈرائے جائیں، اور تاکہ یہ جان لیں کہ اللہ وہ اِلٰہ واحد ہے، اور تاکہ نصیحت حاصل کریں عقل والے ﴿۵۲﴾

تفسیر

خلاصۂ آیات

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً: اَلَمْ تَرَ کا خطاب عام ہے، اے مخاطب! کیا تُو نے نہیں دیکھا، کیسے مثال دی اللہ تبارک وتعالیٰ نے پاکیزہ کلمے کی، كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ، یہ اس مثال کا بیان ہے، پاکیزہ درخت کی طرح، جیسے کہ ایک پاکیزہ درخت ہو، اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ: اَصْلُهَا ثَابِتٌ فی الارض۔ فِي السَّمَآءِ کے مقابلے کے طور پر پہلے جزء میں فی الارض محذوف ہوگا، اور فَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ: اَيْ فَرْعُهَا عَالٍ فِي السَّمَآءِ، تو ثَابِتٌ کے مقابلے میں دوسرے جزء کے اندر عالٍ کو محذوف مان لیا، تقابل کے طور پر بات واضح ہے، "اس کی جڑ ثابت ہے زمین میں اور اس کی شاخیں اٹھی ہوئی ہیں، بلند ہونے والی ہیں آسمان میں" یعنی آسمان کی جہت میں، بلندی کی جانب، اوپر کی جانب اس کی شاخیں پھیلنی والی ہیں، اٹھنے والی ہیں، تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا: اُكل کا لفظ پہلے بھی آپ کے سامنے گزر رہا تھا، پھل، میوہ، جو چیز کھائی جاتی ہے، "دیتا ہے وہ درخت اپنا میوہ" كُلَّ حِيْنٍ: ہر وقت، ہر وقت سے مراد ہے جو وقت اس کا میوہ دینے کا ہے، بِاِذْنِ رَبِّهَا: اپنے رَبّ کی توفیق کے ساتھ، "دیتا ہے اپنا پھل ہر وقت اپنے رَبّ کی توفیق کے ساتھ" وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ: اور بیان کرتا ہے اللہ تعالیٰ مثالیں لوگوں کے لئے، لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ: تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں، وَمَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيْثَةٍ: اور مثال ردّی کلمے کی، كَشَجَرَةٍ خَبِيْثَةٍ: ردّی درخت کی طرح ہے، اجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ

الْاَرْضِ، جو اکھیڑ لیا جائے زمین کے اوپر سے ہی، مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ: نہیں ہے اس کے لئے کوئی قرار، ٹھہرنا، اس کے لئے کوئی ٹھہراؤ نہیں، یُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَ فِی الْاٰخِرَةِ: ثابت رکھتا ہے اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو جو ایمان لے آئے قولِ ثابت کی وجہ سے (بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ کا تعلق یُثَبِّتُ کے ساتھ ہے) ثابت قدم رکھتا ہے اللہ تعالیٰ، مضبوط رکھتا ہے اللہ تعالیٰ قولِ ثابت کی وجہ سے ان لوگوں کو جو ایمان لے آئے، ثابت رکھتا ہے دنیوی زندگی میں اور آخرت میں، وَ یُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِیْنَ: اور بھٹکا تا ہے اللہ تعالیٰ ظالموں کو، وَ یَفْعَلُ اللّٰهُ مَا یَشَآءُ: اور کرتا ہے اللہ جو چاہتا ہے۔

''کلمۂ طیبہ'' کا مصداق اور اس کی مثال

یہ آیات کلمۂ توحید اور کلمۂ شرک کے بیان کے لئے ہیں، کلمۂ توحید کی اللہ نے مدح فرمائی، اور کلمۂ شرک کی مذمت کی، کلمہ طیبہ سے کلمۂ توحید مراد ہے''لا اِلٰہ اِلّا اللہ''، اور اس کی مثال اللہ تعالیٰ نے ایک ایسے درخت کے ساتھ دی جو بہت عمدہ ہے، اور اس کی جڑیں زمین میں ثابت ہیں، اور اس کی شاخیں بلندی میں پھیلی ہوئی ہیں، اور درخت کی خوبی یہی ہوتی ہے کہ اس کی جڑ زمین میں نیچے تک دھنسی ہوئی ہو تا کہ جڑ کی طرف سے بھی صحیح خوراک حاصل کر سکے، اور اس کی شاخیں بلندی میں پھیلی ہوئی ہوں تو فضا کی طرف سے بھی صحیح خوراک حاصل کر سکتا ہے، درخت کو غذا دونوں جانب سے ملا کرتی ہے، شاخوں کی طرف سے بھی وہ غذا حاصل کرتا ہے اور جڑ کی طرف سے بھی غذا حاصل کرتا ہے، تو جب وہ مضبوط ہے، جڑ بھی اس کی اچھی ہے، شاخیں بھی اس کی پھیلی ہوئی ہیں تو وہ پُر بہار ہے، جب بھی موسم آتا ہے وہ خوب پھل دیتا ہے اپنے رَبّ کی توفیق سے، تو کلمۂ توحید بھی اسی طرح سے ہے کہ توحید کی جڑ انسان کے قلب میں بھی ہے فطرت کا تقاضا ہے، عقل کا تقاضا ہے، فطرت اور عقل کے ساتھ بھی اس کلمۂ توحید کو قوت حاصل ہوتی ہے، اس کی جڑ انسان کے قلب میں ہے، پھر اللہ تعالیٰ کے نزدیک چونکہ یہ مقبول ہے تو اس کے اثرات اوپر کی طرف بھی جاتے ہیں، توحید کے عقیدے کے بعد جو اعمال کیے جاتے ہیں وہ خدا تعالیٰ کی طرف بلندی کی طرف جاتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی طرف جاتے ہیں، اللہ کے ہاں مقبول ہوتے ہیں اور اس کے اوپر ثمرات (یعنی) اللہ کی رضا، دنیا اور آخرت کی خیر و خوبی، وہ ان کے اعمال کے اوپر مرتب ہوتے ہیں، کلمۂ توحید اس طرح سے ہے، گویا کہ فطرت بھی اس کو قبول کرتی ہے، عقل بھی اس کی تائید کرتی ہے، اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک بھی یہ مقبول ہے، فطرت اور عقل کے دلائل بھی اس کو پختہ کرتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو وحی آتی ہے اور علومِ الٰہی جو نازل ہوتے ہیں وہ بھی اس کی تائید کرتے ہیں، تو پھر اس کے ثمرات انسان دنیا اور آخرت کے اندر اٹھاتا ہے، جس طرح سے آگے لفظ آئیں گے کہ اسی قولِ ثابت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت میں مؤمنوں کو ثابت رکھتا ہے، تو یہ پُر بہار درخت ہے۔''اللہ تعالیٰ مثالیں دیتا ہے لوگوں کو تا کہ لوگ اِس کو سمجھ سکیں'' مثال کے ساتھ بات اچھی سمجھ میں آ جاتی ہے، معنوی چیز ایک محسوس شکل میں سامنے آ جاتی ہے۔

''کلمۂ خبیثہ'' کا مصداق اور اس کی مثال

اور اس کے مقابلے میں کلمۂ شرک کی مثال دی شجرۂ خبیثہ کے ساتھ، شجرۂ خبیثہ سے مراد جھاڑیاں، جھاڑ جھنکاڑ، جو ویران

زمینوں کے اندر اُگ آیا کرتا ہے، یا بعض آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ شجرۂ خبیثہ کا مصداق کوڑتمے (اندرائن) کی بیل کو قرار دیا گیا ہے، حنظل کی بیل، اور "حنظل" کہتے ہیں کوڑتمے کو، یا جو بھی ردّی قسم کی جھاڑیاں اُگ جایا کرتی ہیں، جن کی جڑ زمین میں بھی مضبوط نہیں ہوتی اور شاخیں بھی اوپر کو پھیلی ہوئی نہیں ہوتیں، وہ کوئی کارآمد نہیں ہیں، بے ثمر ہیں بے فائدہ ہیں، الٹا تکلیف دہ ہیں، کہیں دامن اٹک گیا، کہیں ہاتھ میں کانٹا لگ گیا، کہیں پاؤں کو تکلیف ہوگئی، جڑ ان کی مضبوطی نہیں ہوتی، شاخیں ان کی پھیلی ہوئی نہیں ہوتیں، جب یہ دونوں باتیں نہیں ہیں تو پھر نہ وہ پوری طرح سے سرسبز و شاداب ہو سکتے ہیں، نہ اس کے اوپر کوئی ثمرہ ہی مرتب ہوسکتا ہے، پھل وغیرہ جو انسان کی زندگی کے لئے ضروری ہو مفید ثابت ہو جائے ایسی بات بھی نہیں ہے۔ تو کلمۂ شرک چونکہ فطرت کے بھی خلاف ہے، عقل کے بھی خلاف ہے، فطرت بھی کلمۂ شرک کو قبول نہیں کرتی، عقل بھی کلمۂ شرک کی تائید نہیں کرتی، تو پھر اس کے اعمال اوپر اللہ کی طرف کیسے جا سکتے ہیں اور اللہ کے ہاں کس طرح سے قبول ہوں گے۔ تو وہ مثال پہلے آپ کے سامنے آگئی کہ مشرک اگر کوئی نیکی کرتا بھی ہے تو اس کی مثال ایسے ہی ہے جس طرح سے کہ راکھ ہو، تو جس طرح سے راکھ ہوا کا مقابلہ نہیں کر سکتی بلکہ اگر اس کے اوپر ہوا چل جائے تو وہ بے نام و نشان ہو جاتی ہے اس کا ذرہ ذرہ بکھر جاتا ہے، اسی طرح سے مشرکوں کے اعمال کے اندر بھی کوئی وزن نہیں ہوتا، تو یہ عقل کے بھی خلاف ہیں، فطرت کے بھی خلاف ہیں، اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی اس کی کوئی تائید نہیں، اس کی تشبیہ شجرۂ خبیثہ کے ساتھ دی گئی۔ وہاں ذکر کیا تھا کہ وہ ہر وقت اپنا میوہ دیتا ہے اور شجرۂ خبیثہ پر تو میوہ آنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، یہ تو اُلٹا انسان کے لئے تکلیف دہ ہی ہے، اس کو کوئی قرار نہیں ہوتی، مضبوطی نہیں ہوتی۔

"کلمۂ طیبہ" کی برکات دونوں جہانوں میں نصیب ہوتی ہیں

تو اللہ تعالیٰ اسی قولِ ثابت کے ذریعے سے مؤمنوں کو دنیا میں بھی مضبوط رکھتے ہیں اور آخرت میں ثابت قدم رکھیں گے، بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے، جیسے کہ "مشکوٰۃ شریف" میں "باب اثبات عذاب القبر" کی پہلی روایت میں عذابِ قبر کے ثبوت کے طور پر اس آیت کو پیش کیا ہوا ہے، کہ قبر میں جس وقت مؤمن پر یہ سوال ہوگا: "مَنْ رَّبُّكَ، مَا دِيْنُكَ، وَمَاتَقُوْلُ فِي هٰذَا الرَّجُلِ،" تو اللہ تعالیٰ مؤمن کو ثابت قدم رکھیں گے اور وہ صحیح جواب دے گا اور وہ کامیاب ہوگا، تو پھر سرورِ کائنات ﷺ نے اس آیت کی تلاوت فرمائی۔[1] جس سے معلوم ہوگیا کہ تثبیت سے مراد قبر کے اندر ثابت قدم رکھنا ہے، کہ جب منکر نکیر کے سوال ہوں گے تو مؤمن مضبوط رہے گا اور صحیح جواب دے گا۔ باقی رہا کہ قبر کا معاملہ جس کو ہم برزخ کے ساتھ تعبیر کرتے ہیں وہ حیاتِ دنیا کا مصداق ہے یا آخرت کا، اس میں دونوں باتیں ہو سکتی ہیں، کیونکہ برزخ ایک درمیانی چیز ہے، دنیا کے اعتبار سے یہ آخرت ہے، آخرت کے اعتبار سے یہ دنیا ہے، ہمارے لیے تو وہ آخرت ہے دنیوی زندگی کے اعتبار سے، اور آخرت کے اعتبار سے یہ دنیا ہے، پھر اگر حیاتِ دنیا سے یہ زندگی مراد لی جائے جس میں ہم اس وقت موجود ہیں تو کلمے کی برکت سے اللہ تعالیٰ مؤمنوں کو اس حیاتِ دنیا میں مضبوط رکھتا ہے، ان کے دلوں کے اندر مضبوطی ہوتی ہے اطمینان ہوتا ہے، دنیا کے حوادث اپنی مرضی کے خلاف آتے بھی ہیں تو

(۱) حدیث محولہ بالا میں تو تین سوالوں کے یہ الفاظ نہیں ملے۔ البتہ دوسری احادیث میں مذکور ہیں۔ دیکھئے نسخہ مشکوٰۃ ص ۲۵ باب اثبات عذاب القبر، فصل ثانی

مؤمن ان کو سہارا جاتا ہے، اسی کلمے کی برکت سے اس کو صبر وشکر کی توفیق ہوتی ہے، یہ پریشان نہیں ہوتا، اگر کلمہ صحیح طور پر قلب کے اندر موجود ہو تو مؤمن بہت مطمئن ہوتا ہے، اللہ کے ساتھ صحیح تعلق ہونے کی بناء پر اس کو صبر وشکر کی زندگی نصیب ہوتی ہے، تو اس دنیا میں بھی ثابت قدم رہا، اور مرنے کے بعد اگلی زندگی جو آئے گی برزخ کی اس میں بھی ثابت قدم رہے گا، کہ منکر نکیر آئیں گے، اس قسم کے واقعات قبر میں جو پیش آئیں گے تو مؤمن اسی کلمے کی برکت سے مضبوط رہے گا، اور اللہ تعالیٰ اس کو وہاں بھی اسی طرح سے کامیاب کریں گے مطمئن رکھیں گے، پھر تو آخرت سے مراد برزخ کی زندگی ہوگئی۔ اور اگر آخرت سے حقیقتاً آخرت مراد ہو یعنی قیامت کے بعد کے حالات، کہ اللہ تعالیٰ مؤمنوں کو کلمے کی برکت سے قیامت میں بھی ٹھیک ٹھاک رکھے گا اور یہ ثابت قدم رہیں گے مضبوط رہیں گے، اور حیاتِ دنیا سے مراد ہو جائے برزخ کی زندگی، ایسے بھی ہوسکتا ہے، برزخ یہ درمیان میں رکاوٹ ہے، یہ آخرت کی طرف دیکھتے ہوئے دنیا کی جانب ہے، دنیا کی طرف دیکھتے ہوئے آخرت کی جانب ہے، تو مطلب یہ ہوا کہ اس کلمے کا ثمرہ انسان دنیا اور آخرت دونوں جگہ اٹھائے گا، یہ قولِ ثابت یہ مضبوط قول جو شجرۂ طیبہ کی طرح قلب کے اندر گڑا ہوا ہے اس کی برکات دونوں جہانوں میں نصیب ہوں گی۔ وَ يُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِيْنَ: ظالمین سے مشرکین مراد ہیں اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ (سورۂ لقمان: ۱۳) ظالموں کو اللہ بھٹکائے گا، چونکہ ان کے دل کے اندر اللہ کے ساتھ تعلق صحیح نہیں ہوتا، تو دنیا کے اندر بھی یہ بھٹکے پھرتے ہیں اور ان کو قلبی طور پر اطمینان نصیب نہیں ہوتا، طبیعت کے خلاف ذرا واقعہ پیش آجائے تو انتہائی پریشان ہو جاتے ہیں، اور برزخ میں بھی بھٹکیں گے اور آخرت میں بھی دھکے کھائیں گے وَيَفْعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ: اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے، اور اللہ تعالیٰ کا چاہنا اس کے علم وحکمت کے مطابق ہے جیسے اس کے علم وحکمت کا تقاضا ہوتا ہے ویسے ہی اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں۔

مشرکین کی مذمّت اور مسلمانوں کے لئے کچھ ہدایات

اگلے الفاظ میں مشرکین کی مذمت کی گئی ہے اور مسلمانوں کو ہدایات دی گئی ہیں اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ كُفْرًا: کیا آپ نے دیکھا ان لوگوں کی طرف جنہوں نے بدل دیا اللہ کے احسان کو کُفر کے ساتھ۔ ''اللہ کے احسان کُفر سے بدل دیا'' یہاں مضاف محذوف مان لیجیے: ''بَدَّلُوْا شُكْرَ نِعْمَةِ اللّٰهِ كُفْرًا'' اللہ کے احسان کا شکر ادا کرنے کی بجائے انہوں نے کُفر اختیار کیا، ناشکری اختیار کی، اللہ کے احسان کے شکر کو کُفر سے بدل دیا، وَّاَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ: اور اتار دیا انہوں نے اپنی قوم کو ہلاکت کے گھر میں، دَارَ الْبَوَارِ کا بیان آ گیا جَهَنَّمَ ''اتار دیا انہوں نے اپنی قوم کو ہلاکت کے گھر میں جو جہنم ہے'' يَصْلَوْنَهَا: داخل ہوں گے اس میں، وَبِئْسَ الْقَرَارُ: اور وہ بہت بُرا ٹھکانا ہے۔ قرار مَقَرّ کے معنی میں ہے، دوزخ بہت بُری ٹھہرنے کی جگہ ہے۔ وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا: اور انہوں نے اللہ کے ساتھ ''نِد'' بنا لیے۔ ''نِد'' مقابل کو کہتے ہیں، اللہ کے لیے مقابل بنا لیے، مقابلے میں شرکاء کھڑے کر لیے، لِيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِهٖ: تا کہ اللہ کے راستے سے دوسروں کو بھٹکائیں، قُلْ تَمَتَّعُوْا: آپ کہہ دیجیے کہ تم فائدہ اٹھالو۔ تمتُّع فائدہ اُٹھانے کو کہتے ہیں۔ فَاِنَّ مَصِيْرَكُمْ اِلَى النَّارِ: بے شک تمہارا ٹھکانا جہنم کی طرف ہے۔ تو کلمۂ شرک کی وضاحت کرنے کے بعد یہ مشرکین کی مذمت ہے، اور الَّذِيْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ كُفْرًا کا مصداقِ اوّل کُفارِ مکہ ہیں، انہی کی طرف مخاطب کو متوجہ کیا جا رہا ہے کہ

دیکھو! اللہ تعالیٰ نے ان کو کیسی کیسی نعمتیں دیں، کیسے کیسے ان کے اوپر احسانات کیے، لیکن انہوں نے شکر ادا کرنے کی بجائے کُفر کی زندگی اختیار کی، ناشکری اختیار کر لی، اور اپنی پوری کی پوری قوم کو (اصل میں یہ اُن کے لیڈروں کا حال بیان ہوگا) پوری کی پوری قوم کو انہوں نے ہلاکت کے گھر میں اتار دیا، اور ہلاکت کے گھر سے مراد جہنم ہے جس میں یہ داخل ہوں گے، اور ان کا حال یہ ذکر کیا ہے کہ اللہ کے مقابلے میں دوسرے شرکاء قائم کر لیے، تا کہ دوسرے لوگوں کو اللہ کے راستے سے بھٹکا ئیں، انہیں کہہ دو کہ یہ کُفر و شرک کی زندگی میں (جو اس وقت تم سمجھ رہے ہو کہ ہم عیش و عشرت میں ہیں) چند روز فائدہ اٹھا لو، اب وقت بہت قریب آ گیا ہے کہ یہ جھاڑ جھنکاڑ اس زمین سے صاف کر دی جائے گا، شرک اکھڑ جائے گا، مشرکین اکھیڑ دیے جائیں گے، اب زمین کو صاف کرنے کا وقت آ گیا ہے، اب یہاں اس قسم کے درخت بوئے جائیں گے جو سدا بہار ہوتے ہیں، جو مخلوق کے لئے مفید ہوتے ہیں، انسان بھی ان سے فائدہ اٹھاتا ہے، اللہ کا کلمہ بلند ہوگا، اب یہ وقت آ گیا ہے، اس لیے تَمَتَّعُوْا کے اندر ان کو دھمکایا جا رہا ہے کہ کھا پی لو، چند روز ہیں، اس کے بعد تمہارا ٹھکانا جہنم میں بننے والا ہے۔ تَمَتَّعُوْا: فائدہ اٹھا لو، چند روز مزے اڑا لو، فَاِنَّ مَصِيْرَكُمْ اِلَى النَّارِ: بے شک تمہارا ٹھکانا جہنم کی طرف ہے۔ یہ بتا دیا گیا کہ اب دنیا میں بھی تمہارا کوئی ٹھکانا نہیں، یہاں بھی بربادی تم پہ آنے والی ہے، اور آخرت میں جاؤ گے تو وہاں بھی تمہیں کوئی کسی قسم کی عیش و عشرت نصیب نہیں ہوگی، وہاں تمہارا ٹھکانا جہنم ہے۔

موحدین کی مدح...... ''سفارش'' نجات کے لئے قابلِ اعتماد ذریعہ نہیں

آگے موحدین کی مدح ہے اور مزید شکر کی تاکید ہے، قُلْ لِّعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا: یہ مؤمنین کا شرف ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے بندے کہہ کے یہاں ذکر کیا ہے، ''میرے ان بندوں کو کہہ دو جو ایمان لاتے ہیں'' کیا کہہ دو؟ يُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ: وہ نماز کو قائم رکھیں، نماز کو قائم کریں، وَيُنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً: اور جو کچھ ہم نے انہیں دیا ہے اس میں سے پوشیدہ اور ظاہر خرچ کرتے رہیں، مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خِلٰلٌ: ایسے دِن کے آنے سے قبل...... خرچ کرتے رہیں، خرچ کر لیں ایسے دِن کے آنے سے پہلے کہ جس دِن میں کوئی خرید و فروخت نہیں ہوگی، اور نہ اس دِن کے اندر کوئی یاری باشی ہوگی، یعنی وہ دِن ایسا ہوگا کہ جس میں چھوٹی ہوئی نیکی کی آپ تلافی نہیں کر سکیں گے، نہ تو وہاں کوئی بازار لگے گا کہ جس میں نیکیاں بکتی ہوں اور آپ کے پاس سرمایہ موجود ہو تو آپ جا کے نیکیاں خرید کے اپنی اس کمی کو پورا کر لیں، ایسا بھی نہیں ہوگا، اور وہاں کوئی ایسی یاری باشی نہیں ہوگی کہ دوستی کے طور پر ہی آپ کو کوئی اپنی نیکیاں دے دے اور اس طرح سے آپ فائدہ اٹھا لیں، یہ بھی نہیں ہوگا، یہ کوئی قابل اعتماد ذریعہ نہیں کہ کوئی دوست آپ کے لیے بخشش کا ذریعہ بن جائے گا، ایسی کوئی بات نہیں ہے، اس لیے ایسا دِن آنے سے قبل قبل اللہ کے راستے میں خرچ کر لیں، یہ خرچ کیا ہوا سرمایہ وہاں نیکیاں خریدنے کا باعث بنے گا، نیکیوں کے حاصل ہونے کا باعث بنے گا، ورنہ کوئی دوسرا ذریعہ نہیں جس کے اوپر اعتماد کیا جا سکے، اللہ تعالیٰ اگر بعض کو بعض کی سفارش کے ساتھ بخشیں گے بھی تو (اوّل تو) ایسے دوست کم ہیں، اور پھر یہ بھی معلوم نہیں کہ کس کے لئے سفارش کی اجازت ہو، کس کے لئے سفارش کی اجازت نہ ہو، اس لیے یہ کوئی ایسا قابلِ اعتماد ذریعہ نہیں کہ انسان اعتماد کر کے بیٹھ جائے کہ میرا فلاں دوست چونکہ اللہ کا مقبول ہے، وہ سفارش کر کے چھڑا لے گا، یہ کوئی

قابلِ اعتماد ذریعہ نہیں ہے۔ تو میرے بندوں کو یہ بات سمجھا دیجئے کہ بدنی عبادت میں بھی لگے رہیں اور مالی عبادت میں بھی لگے رہیں، مالی عبادت کے ذریعے سے اور بدنی عبادت کے ذریعے سے قیامت کا دن آنے سے پہلے پہلے نیکیاں اکٹھی کرلیں، ورنہ پھر اس کی تلافی کی کوئی صورت نہیں ہوگی۔

اللہ تعالیٰ کے اِنعامات کا ذِکر اور اس کا مقصد

''اللہ وہ ہے جس نے پیدا کیا آسمانوں کو اور زمین کو''، یہ اس کی نعمتوں کا ذکر آ گیا'' اور اتارا اس نے آسمان سے پانی، پھر نکالا اس پانی کے ذریعے سے رزق تمہارے لیے'' فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ: رِزْقًا لَّكُمْ یہ اَخرج کا مفعول ہے، پھر نکالا اس پانی کے ذریعے سے تمہارے لیے رزق، مِنَ الثَّمَرٰتِ یہ بیان ہے۔ پھلوں سے۔ پھلوں سے رزق نکالا۔ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ: سَخَّرَ: مسخر کیا، کام میں لگایا، تابع فرمان کرلیا تمہارے نفع کے لئے۔'' اللہ نے مسخر کیا تمہارے نفع کے لئے کشتیوں کو جو چلتی ہیں سمندر میں اللہ کے حکم سے'' فُلک واحد جمع دونوں طرح سے آتا ہے، واحد کے طور پر بھی ترجمہ کرسکتے ہیں، ''مسخر کیا اللہ تعالیٰ نے تمہارے نفع کے لئے (یعنی یہ چیزیں تمہارے کام میں لگادیں) کشتی کو جو چلتی ہے سمندر میں اللہ کے حکم کے ساتھ''، وَسَخَّرَ لَكُمُ الْاَنْهٰرَ: اور مسخر کیا اللہ تعالیٰ نے، کام میں لگادیا اللہ تعالیٰ نے تمہارے نفع کے لئے دریاؤں نہروں کو، نہریں اور دریا بہادیے جس سے تم فائدہ اٹھاتے ہو، وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآىِٕبَيْنِ: اور مسخر کیا اللہ تعالیٰ نے تمہارے نفع کے لئے، کام میں لگادیا اللہ تعالیٰ نے تمہارے نفع کے لئے سورج کو اور چاند کو دَآىِٕبَيْنِ: اس حال میں کہ وہ ایک ہی حال پہ چلنے والے ہیں۔ دائب: ایک حال پر چلنے والا۔ انہوں نے ایک عادت اختیار کرلی اس عادت کے مطابق چل رہے ہیں، ایک دستور کے مطابق چل رہے ہیں، وقت پہ چڑھنا، وقت پہ غروب ہونا، رفتار کی ایک متعین مقدار ہے، یہ ساری کی ساری چیزیں ہیں، وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ: اور کام میں لگادیا اللہ تعالیٰ نے تمہارے نفع کے لئے رات اور دن کو۔ یہ ساری کی ساری چیزیں اللہ تعالیٰ نے تمہیں بطور نعمت کے دیں، اللہ تعالیٰ کی یہ مسخر ہیں، اللہ تعالیٰ کی یہ تابع کی ہوئی ہیں اور تمہارے نفع کے لئے، تو جس میں اس بات کی طرف اشارہ کردیا کہ آسمان کی کائنات ہو یا زمین کی کائنات ہو یہ سب تمہارے نفع کے لئے ہے، اور یہ انسان کا کتنا جاہلانہ کارنامہ ہے کہ جو چیزیں اللہ تعالیٰ نے اس کے نفع کے لئے بنائی تھیں اور اس کے لئے بطور خادم کے کام کررہی تھیں انسان انہی کے سامنے ہی جھک گیا اور انہی کو معبود بنالیا، کسی نے سورج کو معبود بنالیا کسی نے چاند کو، کوئی پانی کو پوج رہا ہے، کوئی درختوں کو پوج رہا ہے، کوئی آسمان کی کسی مخلوق کو پوج رہا ہے، کوئی زمین کی کسی چیز کو بت بنا کے اپنے سامنے رکھے ہوئے ہے، یہ تو ساری کی ساری چیزیں تمہارے لیے اللہ نے بطور خادم کے بنائی تھیں، کہ ان سے خدمت لو اور اللہ کی عبادت کرو، پھر یہ نعمتیں جو بھی ہیں آسمان کی طرف سے ملتی ہیں یا زمین کی طرف سے ملتی ہیں، ان کا تعلق زمان کے ساتھ ہے یا مکان کے ساتھ ہے، سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں تو ان کی کسی غیر کی طرف نسبت بھی نہ کرو۔ وَاٰتٰىكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ: اور دیا اللہ نے تمہیں ہر اس چیز سے جو تم نے اس اللہ سے مانگا، جو تم نے مانگا اللہ نے تمہیں دیا، بن مانگے بھی بہت کچھ دیا، اور جو کچھ مانگتے ہو وہ بھی دیتا ہے۔ اب یہاں بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ تم مانگتے ہو اللہ تعالیٰ تمہیں دیتا ہے، اور کئی دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ

انسان دُعائیں کرتا ہے لیکن وہ دُعا قبول نہیں ہوتی، جو مانگتے ہیں وہ نہیں ملتا، یہ ظاہری طور پر ان الفاظ پہ ایک اِشکال ہوتا ہے لیکن آپ دیکھ لیجیے کہ اس بات کا تذکرہ کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں دیا جو کچھ تم نے مانگا، اس چیز کا تذکرہ نعمتوں کے سلسلے میں ہے، اللہ تعالیٰ اپنے اِنعامات ذکر کررہا ہے، اور یہ ایک واقعہ ہے کہ انسان کم علم ہے، اس کو ہر چیز کے انجام کا پتا نہیں، بسا اوقات یوں ہوتا ہے کہ انسان اپنے لیے ایک دُعا مانگتا ہے اور نتیجۃً وہ اس کے لئے مفید نہیں ہوتی، ایک چیز طلب کرتا ہے وہ اس کے لئے نقصان دِہ ہوتی ہے، تو ایسی چیز کا دینا نعمت نہیں ہے، بلکہ اس چیز سے بچالینا اللہ کا احسان ہوتا ہے، کہ ہم تو جہالت کے ساتھ اپنے لیے ہلاکت کا سامان مانگتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ ہمیں وہ نہیں دیتا تو یہ اللہ کا احسان ہے، اور یہ دینا مقامِ نعمت میں ذکر کیا گیا ہے، اس لیے اس میں یہ قید خود بخود سیاق وسباق کے طور پر لگی ہوئی ہوگی کہ جو تم نے اللہ سے مانگا اور وہ اللہ کی حکمت کے مطابق تمہارے لیے مناسب بھی ہوا تو اللہ نے تمہیں دے دیا، اور اگر اللہ کے علم وحکمت کے مطابق وہ چیز تمہارے لیے مفید نہیں یا تمہیں دے دی جائے تو اس سے نظامِ عالم کے اندر کسی قسم کا خلل پڑتا ہے تو ایسی صورت میں اس کا نہ دینا ہی اللہ کا احسان ہے، تو جس وقت مقامِ نعمت میں اس چیز کو ذکر کیا جارہا ہے تو جس کا دعا قبول ہونا ہمارے لیے نعمت ہے وہی اللہ تعالیٰ قبول کریں گے، اور جس کا قبول ہونا ہمارے لیے نقصان دِہ ہے اللہ تعالیٰ قبول نہیں کریں گے، جس طرح سے ہمارا شیخ (سعدیؒ) اسی بات کو سمجھاتا ہے گلستان کے اندر کہ ''پدر را عسل بسیار ست لیکن پسر گرمی دارست'' کہتے ہیں کہ باپ کے پاس شہد تو بہت موجود ہے، اور بیٹا کھانے کے لئے مانگ رہا کہ مجھے شہد چاٹنے کے لئے دو، لیکن باپ اس کو قریب نہیں لگنے دیتا، تو یہ باپ کی بیٹے پر شفقت ہے، کیونکہ ''پسر گرمی دارست'' بیٹے کا مزاج گرم ہے، شہد چاٹے گا تو بیمار ہوجائے گا، تو چاہے باپ کے پاس شہد ٹینوں کے ٹین بھرے ہوئے ہوں لیکن اگر وہ بیٹے کے مزاج کے موافق نہیں ہے تو بیٹا چاہے چلائے روئے، جو چاہے کرے، باپ نہیں دے گا، کہ یہ باپ کی شفقت ہے۔ تو اسی بات کو ذکر کرکے کہتے ہیں کہ:

آں کس کہ ترا توانگرت نے گرداند　　　　او مصلحتِ تو از تو بہتر داند[1]

کہ تُو اپنے لیے دولت مانگتا ہے، تونگری مانگتا ہے، اور وہ خزانوں کا مالک ہے، تجھے دولت دے بھی سکتا ہے، لیکن وہ تیری مصلحت بہتر جانتا ہے کہ دولت اگر خوب مل گئی تو تُو وقت کا فرعون ہوجائے گا، سرکش ہوجائے گا، اپنا دِین برباد کرلے گا، اپنے اخلاق برباد کرلے گا، تیری بہتری اسی میں ہی ہے کہ تجھے اتنا ہی ملے جتنا مل رہا ہے، تو ایسے وقت میں یوں نہیں سمجھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں نہیں دے رہا تو اس میں اللہ کی کوئی ناراضگی ہے، یا اللہ تو کہتا ہے کہ جو مانگو میں دیتا ہوں، تو اللہ کیوں نہیں دیتا؟ یہ نہیں کہنا چاہیے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی حکمت اور اس کا علم ہمارے لیے زیادہ مفید ہے ہمارے اپنے فہم کے مقابلے میں، تو جو معاملہ ہمارے لیے مفید ہوتا ہے اللہ تعالیٰ وہ ہمارے ساتھ کرتے ہیں۔ اور ہر مانگی ہوئی چیز اگر ملنے لگ جائے کہ اُدھر منہ سے نکلی اور اُدھر پوری کردی جائے تو انسان خود برباد ہوجائے گا، گھروں میں آپ نے دیکھا ہوگا کہ مائیں جس وقت بچوں سے تنگ آجاتی ہیں تو کیسی موٹی موٹی

---

(۱) گلستان، باب سوم، حکایت ۱۵۔ تقریر: گرمی خوار است۔

بدعائیں کرتی ہیں، اب اگر یہ دعا اسی وقت قبول کر لی جائے تو آپ میں سے کوئی بھی اِس وقت موجود نہ ہوتا، ماں کی دعاؤں کے ساتھ ہی سارے خاک میں ہوجاتے، اپنی جان کے لئے، اپنے مال کے لئے، اپنے مویشیوں کے لئے کس قسم کے تحت لفظ انسان زبان سے نکال دیتا ہے جب کسی وجہ سے تنگ ہوتا ہے، تو ایسی باتوں کا قبول نہ کرنا بھی انسان کے لئے رحمت ہے۔ اور اس کا ایک مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ فطرت کے لحاظ سے جو چیز تمہارے لیے ضروری تھی کہ جیسا اللہ نے تمہیں بنایا، تمہیں کھانے کی ضرورت ہے، تمہیں پہننے کی ضرورت ہے، تمہیں پینے کی ضرورت رہائش کی ضرورت ہے، خلقت اور فطرت کے لحاظ جو چیز ضروری تھی، یعنی تمہارا یہ سوال دلالت حال کے ساتھ ہے، جیسی جیسی تمہاری ضرورتیں تھیں اللہ نے سب پوری کر دیں، یہ مفہوم بھی اس آیت کا ہوسکتا ہے، اور یہ اپنی جگہ بالکل واضح بات ہے۔ وَ اِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا: اور اگر تم اللہ کے احسان شمار کرو تو تم ان کو شمار نہیں کر سکتے، اللہ تعالیٰ کے تمہارے اوپر اتنے احسانات ہیں کہ تم ان کی تفصیل بھی نہیں جانتے، یہ بارش آتی ہے تو کہاں کہاں سے اللہ اس کے لئے اسباب پیدا کرتے ہیں، زمین سے نباتات اُگتی ہے تو کیسے کیسے ذریعے سے اللہ تعالیٰ ان کو تمہارے سامنے لاتے ہیں، اور تمہارے اندر کیا مشینری کام کر رہی ہے، کس طریقے سے اللہ نے تمہیں عافیت اور صحت دے رکھی ہے، تو اِس کا تو تم اِحصاء بھی نہیں کر سکتے۔ اب یہ سائنسدان اور محققین لگے ہوئے ہیں حالات معلوم کرنے کے لئے، نت کوئی نہ کوئی چیز اس قسم کی ظاہر ہوجاتی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ واقعی دیکھو انسان کے لئے اللہ نے کیسی کیسی چیزیں بنائیں، اور کیسی کیسی چیزیں اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے اس کائنات کے اندر رکھی ہیں جن سے ہم فائدہ اٹھا سکتے ہیں، تو ابھی کوئی پتا نہیں کیا کچھ سامنے آنے والا ہے، ہم اللہ تعالیٰ کی کائنات سے کس کس طریقے سے فائدہ اٹھا رہے ہیں، کیسی کیسی چیزیں ہمیں فائدہ پہنچا رہی ہیں اس کی تفصیل ہمیں کچھ معلوم نہیں، جتنا معلوم کرتے جاؤ آگے میدان وسیع نظر آتا ہے، ''اگر شمار کرو، اگر تم گننا چاہو اللہ کی نعمتوں کو تو تم ان کا اِحصاء نہیں کر سکتے، تم ان کو اپنے شمار میں نہیں لا سکتے'' ۔ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ: یہ انسان کی شکایت ہے باعتبار نوع کے، کہ بے شک انسان البتہ بہت ہی ظالم اور بہت ہی ناشکرا ہے، ظالم سے بدعمل مراد ہے، عملی زندگی بھی اس کی خراب، اور ناشکرا ہے، یہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی تعمیل نہیں کرتا، ورنہ اللہ تعالیٰ کے اتنے احسانات ہیں کہ ان کی موجودگی میں تو انسان کو چاہیے کہ کسی وقت بھی اللہ کی نافرمانی نہ کرے، ''بہت بے انصاف اور بہت ناشکرا ہے۔''

اِبراہیم علیہ السلام کا تذکرہ اور اِس سے مقصد

آگے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ آگیا، اور یہ بھی اصل میں مشرکینِ مکہ کو ہی سنانا مقصود ہے، کہ تمہاری یہ خوش حالی جس سے تم اِس وقت فائدہ اٹھا رہے ہو یہ سب حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعاؤں کا صدقہ ہے، اور ابراہیم علیہ السلام نے یہاں جو اپنی اولاد کو آباد کیا تھا جو تمہارے جدِّ اعلیٰ ہیں، اس مقصد کے لئے کیا تھا تا کہ اس بیت اللہ کو آباد کریں، نماز پڑھیں، اللہ کی توحید کو اختیار کریں، بتوں وغیرہ کی عبادت سے بچیں، جو اس وقت بت پرستی دنیا کے اندر چل رہی تھی، اور جن مقاصد کے لئے اس گھر کو قائم کیا گیا تھا وہ

سارے کے سارے مقاصد تم نے تلف کر دیے، اور بالکل اس کے برعکس چل گئے، تو اب اللہ تعالیٰ کے احسانات سے تم فائدے اُٹھا رہے ہو کہ یہ دارالامن ہے اور اس میں ہر قسم کی رزق کی فراوانی ہے، یہ چیزیں ایسی ہیں کہ جن سے تم فائدہ اٹھاتے ہو، حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دُعا کی برکت سے اللہ نے ساری کی ساری رکھیں، لیکن حضرت ابراہیم کا یہاں اپنی اولاد کو آباد کرنے سے جو اصل مقصد تھا اللہ کے گھر کو آباد کرنا، نماز پڑھنا، توحید اختیار کرنا، ان مقاصد کو تم بھلا بیٹھے۔

اِبراہیم علیہ السلام کی دُعائیں اور ان کے ثمرات

وَإِذْ قَالَ إِبْرٰهِيْمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا: واقعہ آپ کے سامنے سورۂ بقرہ میں گزر چکا۔ یاد کیجیے جس وقت کہ ابراہیم نے کہا کہ اے میرے رَبّ! بنادے اس شہر کو امن والا، وَّاجْنُبْنِيْ وَبَنِيَّ: اور دُور رکھ مجھے اور میرے بیٹوں کو، بیٹوں سے یہاں سے یہاں نسل مراد ہے، چاہے اس وقت حضرت اسماعیل علیہ السلام کو ہی آباد کیا تھا، لیکن آگے نسل تو چلنے والی تھی، ''بچا تو مجھے اور میرے بیٹوں کو اس بات سے کہ ہم عبادت کریں بتوں کی'' اپنے کو ساتھ شامل کر کے گویا کہ دُعا کی جا رہی ہے، مجھے بھی بچا اور میری اولاد کو بھی بچا کہ ہم عبادت کریں بتوں کی، ''اے میرے رَبّ! بے شک ان بتوں نے گمراہ کر دیا بہت سے لوگوں کو'' یعنی بہت سارے لوگوں کی گمراہی کا باعث بن گئے، ظاہری سبب بننے کے اعتبار سے اِضلال کی نسبت ان کی طرف ہو رہی ہے، ''بے شک انہوں نے گمراہ کر دیا لوگوں میں سے بہتوں کو'' فَمَنْ تَبِعَنِيْ: پس جس شخص نے میری اتباع کی، جو میرے طریقے پر چلا، فَإِنَّهٗ مِنِّيْ: پس بے شک وہ تو میرا ہے ہی، اس کی تو بخشش کا وعدہ ہے، ''جو میرے طریقے پہ چلا وہ تو میرا ہی ہے'' وَمَنْ عَصَانِيْ: اور جس نے میری نافرمانی کی فَإِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ: اس کا معاملہ تیرے سپرد ہے، تو غفور رحیم ہے، غفور رحیم ہونے کے لحاظ سے ان کے لئے بھی انتظام کر دے بخشش کا اور رحمت کا، اور اس کی یہی صورت ہے کہ کوئی ہدایت کی صورت ان کے لئے پیدا ہو جائے۔ یا یہ ہے کہ معاملہ تیرے سپرد ہے، ان کے متعلق میں کچھ نہیں کہتا، تو غفور رحیم ہے، تیرا جو معاملہ ان کے ساتھ ہوگا وہ تیری اپنی شان کے لائق ہے۔ جنہوں نے میری بات لی وہ تو میرے ہو گئے، ان کے لئے تو مغفرت کا وعدہ ہے ہی، اور جنہوں نے نافرمانی کی ان کا معاملہ تیرے سپرد ہے، تُو جانے اور تیرے بندے جانیں، تُو غفور رحیم ہے، میں یہ توقع رکھتا ہوں کہ ان کے لئے بھی کوئی ہدایت کا انتظام کر کے کوئی مغفرت کی صورت پیدا کر دے۔ دنیا کے اندر رہتے ہوئے ہدایت کا مل جانا یہی اللہ تبارک وتعالیٰ کے ہاں مغفرت حاصل کرنے کا ذریعہ ہے، مطلب یہ ہے کہ ان کے ساتھ تیرا معاملہ تیری شان کے لائق ہوگا، تو جان اور تیرے بندے جانیں، میں ان کے متعلق کچھ نہیں کہتا۔ ''اے میرے رَبّ! بے شک میں نے آباد کر دیا اپنی اولاد میں سے بعض کو ایسی وادی میں جو کہ کھیتی باڑی والی نہیں ہے'' ایسی وادی میں جو زرع کے بغیر ہے، جو کھیتی والی نہیں ہے، اس میں کھیتی نہیں ہوتی، نباتات نہیں اُگتی، ''تیرے حرمت والے گھر کے پاس۔'' ''اے اللہ! اے میرے پروردگار! میرا ان کو آباد کرنے کا مقصد یہ ہے تا کہ یہ نماز قائم کریں، پس کر دے تو کچھ لوگوں کے دل مائل ان کی طرف، اور رزق دے ان کو پھلوں سے، تا کہ یہ شکر گزار رہیں'' ...... یہ ہے دُعا جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی اولاد کے لئے کی تھی، شہر کے متعلق دُعا کی کہ اس جگہ کو امن والا بنا دو، کیونکہ جس وقت تک انسان کو اپنے وطن میں امن حاصل نہ ہو اس

وقت تک وہ آگے کوئی صحیح کام نہیں کرسکتا، یہ دُعا بھی اللہ تعالیٰ نے قبول کی، کہ مکہ معظمہ کو حرمِ آمن بنادیا، جاہلیت کے زمانے میں بھی اس کے اثرات نمایاں تھے، کہ مشرک اور کافر بھی اس علاقے میں فساد نہیں کرتے تھے، حرم کی حدود میں کسی شکاری جانور تک کو ڈرایا بھگایا نہیں جاتا تھا، اور آپ کی اولاد بہت حد تک بُت پرستی سے محفوظ رہی، اور جو بعد میں بُت پرستی کے اندر مبتلا ہو گئے ان کو یہ بتایا جارہا ہے کہ تمہارے آباء اجداد کا یہ طریقہ نہیں تھا، یہ طریقہ تم نے کہاں سے لے لیا؟ ورنہ تمہارے جدِ اعلیٰ اور ان کی جو قریبی اولاد تھی ان کا طریقہ بُت پرستی نہیں ہے، اس سے تو بچنے کے لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دُعا کی تھی، اور اُس زمانے میں چونکہ دنیا کے اندر بُت پرستی ہورہی تھی، اس لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام اللہ کے سامنے ہاتھ پھیلاتے ہیں کہ یہ بت بہت ساری مخلوق کے لئے گمراہی کا باعث بنے ہوئے ہیں، اس لیے میں کہہ رہا ہوں کہ مجھے بھی اور میری اولاد کو بھی اس سے محفوظ رکھ۔ جو میرے طریقے پہ چلیں گے وہ تو میرے ہیں ہی، اور جو میری نافرمانی کریں گے ان کا معاملہ تیرے سپرد، تو غفور رحیم ہے، جو معاملہ بھی تو ان کے ساتھ کرے گا اس میں کوئی کسی قسم کی زیادتی اور ظلم کا شائبہ نہیں ہوگا۔

اور یہ مکہ کا علاقہ اِس وقت تک غیر ذی زرع ہے، یعنی پتھریلا ہے، پانی کی بھی کمی ہے، زمین نباتات کو قبول نہیں کرتی، اب سڑکوں کے کناروں پر کچھ باہر سے لا لا کر مٹی ڈال کے کچھ پھول اور کچھ نباتات گھاس وغیرہ لگایا ہوا ہے تو کچھ خوبصورتی ہوگئی، ورنہ تو سارا خشک کا خشک علاقہ پڑا ہے، وہاں کوئی چیز نہیں اُگتی، اِس وقت تک بھی حالات ایسے ہی ہیں، پیداوار یہاں نہیں ہے، جب پیداوار نہیں ہے تو ان کے کھانے پینے کے لئے تو کچھ چاہیے، آباد تو ان کو اس لیے کیا ہے تاکہ اللہ کی عبادت کریں، اب یہ اس وادی کے اندر جو بیٹھے ہیں جہاں آس پاس کوئی کسی قسم کی انسانی آبادی نہیں، تو کچھ لوگوں کے دل ادھر مائل کردے تاکہ وہ یہاں آجائیں اور یہ علاقہ آباد ہوجائے، اب مفسرین کہتے ہیں کہ ابراہیم علیہ السلام نے ''کچھ لوگ'' کہہ دیا، کہ کچھ لوگوں کے دل مائل کردے، اور وہ اس طرح سے مائل ہوئے ہیں کہ دنیا کس طرح سے ٹوٹی پڑی ہے، دُور دُور سے دنیا کے دوسرے کناروں سے لوگ مکہ معظمہ کی طرف بھاگے جارہے ہیں، یہ سب حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دُعا کا اثر ہے، اور اگر سارے لوگوں کے لئے دُعا کردیتے کہ ان کے دل مائل کردے تو اس سے بھی زیادہ لوگوں کا رجحان ہوتا، لیکن اللہ کی حکمت یہی تھی، اب کچھ لوگوں کے دل مائل ہوئے، اسی وقت ہی بنی جرہم کا قبیلہ آیا اور آکے وہاں آباد ہوگیا، پھر اللہ تعالیٰ نے اس کو مرکز کی حیثیت دی، دور دور سے لوگ اس کے حج اور زیارت کے لئے آتے ہیں، اور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کے بعد تو عالمی طور پر یہ مرکز قرار پاگیا، پہلے اگر علاقائی مرکز تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کے بعد یہ عالمی مرکز بن گیا، اور دنیا کا کوئی کنارہ نہیں جدھر سے لوگ پرواز کر کر کے نہ آرہے ہوں۔

''اور ان کو پھلوں سے رزق دے'' یہ بھی مشاہدہ ہے کہ جتنا رزق مکہ معظمہ کے اندر فراوانی کے ساتھ موجود ہے شاید کسی شہر میں نہیں ہوگا، دنیا کے ہر حصے کے پھل وغیرہ وہاں کثرت کے ساتھ موجود ہیں، کسی چیز کی کمی نہیں، حالانکہ خود زمین ایسی ہے جو کچھ بھی نہیں اُگاتی، یہ سب دُعائیں ایسی ہیں جو قبول ہوئیں اور ان کا مشاہدہ انسان اپنی آنکھوں سے کرسکتا ہے۔

''اے ہمارے ربّ! بےشک تو جانتا ہے اس چیز کو جو ہم چھپاتے ہیں اور جو ہم ظاہر کرتے ہیں'' ہمارا ظاہر باطن سب

تیرے سامنے ہے، اس لیے ہماری حالت کوئی مخفی نہیں، لیکن ہم اپنی نیازمندی کے اظہار کے لئے بندگی کے اظہار کے لئے تیرے سامنے ہاتھ پھیلاتے ہیں اور اپنی زبان سے مانگتے ہیں، ورنہ ہماری کوئی چیز تجھ سے مخفی نہیں ہے، ''نہیں مخفی اللہ پر کوئی چیز بھی زمین میں اور نہ آسمان میں۔'' اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ وَهَبَ لِيْ عَلَى الْكِبَرِ: شکر ہے اس اللہ کا جس نے مجھے عطا کیا بڑھاپے کے باوجود اسماعیل اور اسحاق۔ پہلے اسماعیل پیدا ہوئے پھر ان کے بعد اسحاق، یہ دونوں بڑھاپے کی اولاد ہیں، اور یہ دو عظیم الشان تھے اس لیے ان کو ذکر کر دیا، ورنہ آخر عمر میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد اور بھی تھی، حضرت ابراہیم نے ایک کنعانی بیوی کے ساتھ شادی کی، جیسے ''بیان القرآن'' میں ہے کہ چھ بیٹے اس سے پیدا ہوئے، مشہور یہی دو ہیں، ورنہ اس کے علاوہ اور اولاد بھی ہے حضرت ابراہیم کی، ''بے شک میرا رَبّ البتہ دُعا سننے والا ہے''، ''اے میرے رَبّ! کر دے مجھ کو نماز قائم کرنے والا، اور میری اولاد میں سے بھی بعض کو'' رَبَّنَا وَتَقَبَّلْ دُعَآءِ: دُعَآءِ ہمزے کے نیچے جو کسرہ ہے یہ یائے متکلم پر دال ہے۔ اے میرے رَبّ! میری دُعا کو قبول فرما۔ رَبَّنَا، رَبِّ یہ بار بار اس کا تکرار کیا جا رہا ہے دُعا میں اِلحاح اور زاری کے طور پر، اللہ تعالیٰ کو بار بار اس طرح سے خطاب کرنا یہ اِلحاح اور زاری ہے۔ ''اے ہمارے پروردگار! بخش دے مجھے اور میرے والدین کو'' معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک حضرت ابراہیم کو والدین کے لئے دُعا کرنے سے منع نہیں کیا گیا تھا، اور جب واضح ہو گیا کہ شرک پر اس کا انتقال ہوا ہے اور مشرک کی بخشش نہیں ہو سکتی تو تَبَرَّاَ مِنْهُ (سورۂ توبہ: ۱۱۴) جس طرح سے دوسری جگہ الفاظ موجود ہیں۔ تو اس وقت تک ان کو یہ اطلاع نہیں ملی ہوگی، اور اپنے وعدے کے مطابق وہ اِستغفار کرتے رہے جیسے کہ جاتے ہوئے وعدہ کر لیا تھا سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّيْ (سورۂ مریم: ۴۷)، تو اِستغفار کرتے رہے اور جب اللہ کی طرف سے اطلاع ہوگئی کہ اس کا خاتمہ کُفر پر ہو گیا ہے تو لاتعلق ہو گئے۔ والد کے متعلق تو صراحت ہے، والدہ کا ذکر قرآنِ کریم میں نہیں، اس لیے ان کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا، بعض آثار سے معلوم ہوتا ہے جیسے کہ ''بیان القرآن'' میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیا ہے کہ ان کی والدہ مسلمان ہوگئی تھیں، لیکن بہرحال اس کا کوئی واضح ثبوت نہیں ہے۔ ''اور بخش دے مؤمنوں کو جس دِن کہ حساب قائم ہو۔''

ضدی کُفّار کے لئے اُخروی وعیدات کا ذِکر

اب یہ آخری آیات وعدو وعید پر ہی مشتمل ہیں، خصوصیت کے ساتھ اس میں وعید کا مضمون ہے وَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ غَافِلًا عَمَّا يَعْمَلُ الظّٰلِمُوْنَ: اللہ تعالیٰ کو غافل نہ سمجھ، بے خبر نہ سمجھ ان کاموں سے جو کہ ظالم کرتے ہیں، یہ مشرک کافر جو کچھ کر رہے ہیں اس سے اللہ تعالیٰ کو بے خبر نہ سمجھیں، یعنی اگر یہ سمجھیں کہ جب اللہ کی طرف سے گرفت نہیں آتی تو اللہ کو ہمارے کاموں کا پتا نہیں ہے، یہ غلط ہے، ''ہرگز غافل نہ سمجھ اللہ کو، بے خبر نہ سمجھ اللہ کو ان کاموں سے جو یہ ظالم کرتے ہیں۔'' اِنَّمَا يُؤَخِّرُهُمْ لِيَوْمٍ تَشْخَصُ فِيْهِ الْاَبْصَارُ: سوائے اس کے نہیں کہ اللہ تعالیٰ انہیں ڈھیل دیتا ہے ایسے دن کے لئے جس میں آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں گی۔ تَشْخَصُ یہ لفظ شُخوص سے لیا گیا ہے، شَخَصَ الْبَصَرُ: آنکھیں پھٹی رہ جانا، جب انسان دہشت زدہ ہو جاتا ہے تو اس طرح سے

آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کسی چیز کی طرف دیکھتا ہے۔ ''جس دن آنکھیں پھٹی رہ جائیں گی'' مُهْطِعِيْنَ: یہ دوڑنے والے ہوں گے، مُقْنِعِيْ رُءُوْسِهِمْ: اپنے سروں کو اٹھانے والے ہوں گے، مُقْنِعِيْ اصل میں مُقْنِعِيْنَ تھا، نون اضافت کی وجہ سے گر گیا۔ اِقناع: بلند کرنا۔ اور اِھطاع بھاگنے کو کہتے ہیں، ''بھاگنے والے ہوں گے، سروں کو اٹھانے والے ہوں گے'' لَا يَرْتَدُّ اِلَيْهِمْ طَرْفُهُمْ: اور ان کی نظر ان کی طرف نہیں لوٹے گی، اپنی طرف بھی لوٹ کے جھانک نہیں سکیں گے، جیسے انسان بہت پریشان حال ہوتا ہے تو اس طرح سے آنکھیں اٹھائی ہوئی ہیں، سر اوپر کو اٹھایا ہوا ہے، اور دہشت زدہ ہو کے بھاگا جا رہا ہے، یہی کیفیت ان کی ہوگی، ''ان کی نظر ان کی طرف نہیں لوٹے گی'' وَاَفْـِٕدَتُهُمْ هَوَآءٌ: اور ان کے دل بھی خالی ہوں گے، دل بھی اُڑے ہوئے ہوں گے، دلوں کو بھی کوئی کسی قسم کا قرار نہیں ہوگا، ہوا ہو جانا یہ پریشانی سے کنایہ ہوتا ہے، جیسے کہتے ہیں اس کے حواس اُڑ گئے، اور اس کا دل ہوا ہو گیا، اس کے چہرے سے ہوائیاں اُڑنے لگیں، یہ اردو کے مختلف محاورے ہیں۔ ''ان کے دل بھی اُڑے اڑے ہوں گے، دل بھی ہَوا ہوں گے۔''
وَاَنْذِرِ النَّاسَ يَوْمَ يَاْتِيْهِمُ الْعَذَابُ: لوگوں کو ڈرایئے جس دن کہ آئے گا ان کے پاس عذاب، فَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا: پھر کہیں گے وہ لوگ جنہوں نے ظلم کیا رَبَّنَآ اَخِّرْنَآ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ: اے ہمارے پروردگار! ہمیں تھوڑی سے وقت کے لئے ڈھیل دے دے، مہلت دے دے، مؤخر کر دے ہمیں تھوڑے سے وقت کے لئے، نُّجِبْ دَعْوَتَكَ: ہم اس تھوڑے سے وقت میں کیا کریں گے؟ ہم تیری دعوت کو قبول کر لیں گے، وَنَتَّبِعِ الرُّسُلَ: اور تیرے رسولوں کی اتباع کر لیں گے، پہلے ہم سے جو غلطی ہو گئی اب اس کی تلافی کے لئے ہمیں تھوڑا سا وقت دے دو، پھر یہ اس طرح سے کہیں گے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جواب ملے گا اَوَلَمْ تَكُوْنُوْٓا اَقْسَمْتُمْ مِّنْ قَبْلُ مَا لَكُمْ مِّنْ زَوَالٍ: کیا تم قسمیں نہیں کھایا کرتے تھے اس سے قبل کہ تمہارے لیے زوال نہیں ہے، تم تو سمجھتے تھے کہ ہم ایسے ہی عروج پر رہیں گے، اسی طرح سے ہمیں یہ خوش حالی حاصل رہے گی، ہم پر زوال آئے گا ہی نہیں، یہ تم قسمیں کھا کھا کے کہا کرتے تھے، وَسَكَنْتُمْ فِيْ مَسٰكِنِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ: اور رہے تم ان لوگوں کے گھروں میں جنہوں نے ظلم کیا تھا اپنے نفسوں پر، یعنی پہلی قومیں جو برباد ہو گئیں اور عذاب کے ساتھ تباہ ہوئیں اُنہیں کے ٹھکانوں میں تم ٹھہرے ہوئے تھے، وَتَبَيَّنَ لَكُمْ كَيْفَ فَعَلْنَا بِهِمْ: اور تمہارے لیے واضح ہو گیا تھا کہ ہم نے ان کے ساتھ کیا کیا، وَضَرَبْنَا لَكُمُ الْاَمْثَالَ: اور ہم نے تمہارے لیے مثالیں بھی بیان کیں، مثالوں کے ساتھ ہم نے بات واضح کر دی، تمہیں پتا ہے کہ ان کے ساتھ ہم نے کیا کیا تھا، ان کے گھروں میں رہتے ہوئے، ان کے علاقوں میں رہتے ہوئے پھر تم متنبہ نہیں ہوئے؟ یہ ان کو ڈانٹ پلا دی جائے گی، کہ مہلت ملنے کا تو سوال ہی نہیں، اب یاد کرو اس حال کو جب تم قسمیں کھاتے تھے، سمجھائے ہوئے تم سمجھتے نہیں تھے، اور ان تباہ شدہ قوموں کے علاقوں میں اور ان کے گھروں میں رہتے تھے، اور تمہیں پتا بھی چل گیا تھا کہ ان کو کس طرح سے تباہ کیا گیا ہے، ہم نے بھی وضاحت کر دی تھی، اب کون سا عذر تمہارے پاس باقی ہے جس کی بنا پر تمہیں دوبارہ مہلت دے دی جائے۔ وَقَدْ مَكَرُوْا مَكْرَهُمْ: ان لوگوں نے مکر وفریب کیا، اپنی تدبیریں کیں، جو یہ کر سکتے تھے حق کو مٹانے کے لئے، وَعِنْدَ اللّٰهِ مَكْرُهُمْ: اور ان کی تدبیر کے اللہ کے قبضے میں ہے، اللہ کے مقابلے میں ان کی تدبیر کیسے چل سکتی تھی؟

''اللہ کے پاس ہے ان کا مکر'' وَاِنْ كَانَ مَكْرُهُمْ لِتَزُوْلَ مِنْهُ الْجِبَالُ: اِنْ مخففه من المثقله ہے۔ بے شک ان کی تدبیر ایسی تھی کہ اس کے ذریعے سے پہاڑ ٹل جائیں، یعنی اپنے طور پر انہوں نے ایسی خطرناک خطرناک چالیں چلیں جو پہاڑوں کو بھی اپنی جگہ سے ہلا دیتیں، لیکن چونکہ حق کا محافظ اللہ تھا اس لیے ان کے مکر وفریب حق کے مقابلے میں نہیں چل سکے، ''بے شک تھی ان کی تدبیر کہ زائل ہو جائیں اس کے ذریعے سے پہاڑ'' یہ ان کی تدبیر اور ان کی چال اور فریب کی شدت بیان کرنے کے لئے ہے، کہ ایسی ایسی گہری سازشیں! ایسے ایسے مکر وفریب! جو پہاڑوں کو بھی اپنی جگہ سے ہلا دیتے، ایسے ایسے مکر وفریب انہوں نے کیے، لیکن وہ سب اللہ کے قبضے میں تھے، اللہ نے حق کے مقابلے میں کامیاب نہیں ہونے دیے۔ ''پس ہر گز نہ گمان کر تو اے مخاطب! اللہ کو اپنے وعدے کے خلاف کرنے والا اپنے رسولوں کے ساتھ'' اللہ نے اپنے رسولوں کے ساتھ جو وعدے کر لیے ہیں اللہ تعالیٰ اس کے خلاف نہیں کرے گا، ''ہر گز نہ گمان کر تو اللہ کو، ہر گز نہ سمجھ تو اللہ کو اپنے وعدے کے خلاف کرنے والا اپنے رسولوں کے ساتھ'' یعنی رسولوں کے ساتھ جو اس نے وعدہ کر لیا ہے اللہ تعالیٰ اس کے خلاف نہیں کرے گا، ''بے شک اللہ تعالیٰ زبردست ہے انتقام والا ہے۔'' يَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ: جس دِن کہ بدل دی جائے گی زمین اس زمین کے علاوہ، یعنی یہ زمین نہیں رہے گی، اس زمین میں تو لوگوں کی ملکیتیں ہیں، کوٹھیاں ہیں، کوٹھے ہیں، بنگلے ہیں، قلعے ہیں، جن میں چھپ چھپا سکتے ہیں، ادھر ادھر بھاگ سکتے ہیں، لیکن آخرت کی زمین ایسی زمین نہیں ہوگی، نہ کسی کا قلعہ ہوگا، نہ کسی کی کوٹھی، کسی کی حفاظت کی کوئی چیز نہیں ہوگی، نشیب وفراز اور چھپنے کی جگہ کوئی نہیں ہوگی، ''جس دِن کہ تبدیل کر دی جائے گی زمین اس زمین کے علاوہ اور آسمان بھی'' یعنی آسمان زمین دونوں میں تبدیلی آ جائے گی، یہ دنیا والے زمین وآسمان تو فانی ہیں اور آخرت کے زمین وآسمان جو قائم کیے جائیں گے ان کے اوپر فنا بھی طاری نہیں ہوگا، وہ دائمی ہوں گے۔ وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ: اور یہ لوگ سارے کے سارے اللہ واحد کے سامنے ظاہر ہو جائیں گے، بَرَزُوْا کا لفظ پہلے بھی (اسی سورۃ میں) آیا تھا بَرَزُوْا لِلّٰهِ جَمِيْعًا۔ بَرَزَ بُرُوز: نکل کھڑے ہونا، ظاہر ہو جانا، ''ظاہر ہو جائیں گے سارے کے سارے اللہ واحد قہار کے لئے'' قہار کا لفظ پہلے بھی آیا ہے، قہار کہتے ہیں جو اپنی طاقت اور زور کے ساتھ سب کو سنبھال لے، جو سب پہ زبردست ہو، ہر کسی پہ کنٹرول کر لے۔ ''دیکھے گا تو مجرموں کو اس دن جکڑے ہوئے زنجیروں میں'' اصفاد صَفَد کی جمع ہے، صفد زنجیر کو کہتے ہیں، ''مجرمین کو تو دیکھے گا اس دِن جکڑے ہوئے ہوں گے زنجیروں میں'' سَرَابِيْلُهُمْ مِّنْ قَطِرَانٍ: سرابیل سربال کی جمع ہے، حضرت شیخ (الہندؒ) نے اس کا ترجمہ کُرتے کے ساتھ کیا ہے یعنی قمیص، اور مطلق لباس بھی اس سے مراد لے سکتے ہیں، جیسے سورۂ نحل کے اندر غالباً لفظ آئے گا سَرَابِيْلَ تَقِيْكُمُ الْحَرَّ وَسَرَابِيْلَ تَقِيْكُمْ بَاْسَكُمْ (آیت:۸۱) ایسا لباس جو تمہیں گرمی سے بچاتا ہے، ایسا لباس جو تمہیں ایک دوسرے کی لڑائی سے بچاتا ہے کہ تم زرہیں وغیرہ بنا لیتے ہو، اور ''قطران'' ایک تیل ہے جو آگ کو قبول کرتا ہے، تارکول کے ساتھ اس کی تعبیر کی گئی ہے، اور گندھک کے ساتھ بھی اس کا ترجمہ کیا گیا ہے۔ ''ان کا لباس گندھک کا ہوگا یا تارکول کا ہوگا'' مطلب یہ ہے کہ جیسے تارکول ملا ہوا ہو تو چہرہ بھی سیاہ ہو جاتا ہے بدن بھی کالا ہو جاتا ہے، پھر

وہ آگ کو جلدی قبول کرتا ہے، تو بدن کے اوپر ایسی چیز چڑھائی ہوئی ہوگی جس کے ساتھ ان کے رنگ بھی بدلے ہوئے ہوں گے اور آگ بھی خوب بھڑکے گی، گندھک بھی اسی طرح سے آگ کو قبول کرتی ہے، ''ان کے لباس گندھک کے ہوں گے یا تارکول کے ہوں گے، اوران کے چہروں کو آگ ڈھانپ لے گی'' اور جب چہرے کو بھی آگ سے نہیں بچاسکیں گے تو باقی بدن کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، کیونکہ چہرہ ایک اشرف جزء ہے جس کو انسان زیادہ سے زیادہ حد تک بچانے کی کوشش کرتا ہے، ''ان کے چہروں کو آگ ڈھانپ لے گی۔'' اور یہ سارے کا سارا کس لیے ہوگا؟ لِيَجْزِيَ اللّٰهُ كُلَّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ: تا کہ اللہ تعالیٰ بدلہ دے دے ہر نفس کو اس کے کیے کا، اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ: بے شک اللہ تعالیٰ جلدی حساب لینے والا ہے۔ هٰذَا بَلٰغٌ لِّلنَّاسِ: ''بلاغ'' تبلیغ کے معنی میں ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیغام پہنچا دینا ہے لوگوں کو، کہ جو کچھ سنایا جارہا ہے یہ سب اللہ کی طرف سے احکام پہنچائے جارہے ہیں، پیغام پہنچایا جارہا ہے، وَلِيُنْذَرُوْا بِهٖ: اس کا اگر معطوف علیہ محذوف نکالنا ہو لِيُصَدِّقُوْا مُبَلِّغَهٗ وَلِيُنْذَرُوْا بِهٖ تا کہ اس کے مبلغ کی، پہنچانے والے کی تصدیق کریں، اور تا کہ اس کے ذریعے سے یہ ڈرائے جائیں، وَلِيَعْلَمُوْٓا اَنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ: اور تا کہ یہ جان لیں کہ اللہ وہ الٰہ واحد ہے، وَّلِيَذَّكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ: اور تا کہ نصیحت حاصل کرلیں عقل والے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ